قرآن کریم کی دو مستند اور مقبول تفسیریں

# آسان بیان القرآن

مع

# تفسیر عثمانی

## سورۂ یونس تا سورۂ القصص

2

ترجمہ قرآن شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ

خلاصہ تفسیر حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

فوائد تفسیر شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

تسہیل و ترتیب

عمر انور بدخشانی

استاذ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

Banuri

بنوری

بسم الله الرحمن الرحيم

وقل رب زدني علما

اللهم صل على سيدنا محمد وسلم

2019 — ١٤٤٠

Banuri
بنوری

Banuripublishers@gmail.com

قرآن کریم کی دو مستند اور مقبول تفسیریں

# آسان بیان القرآن

مع

# تفسیر عثمانی

سورۂ یونس تا سورۃ القصص

2

ترجمہ قرآن: شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ

خلاصہ تفسیر: حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

فوائد تفسیر: شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

تسہیل و ترتیب


عمر انور بدخشانی

استاذ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی



Banuri

بنوری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# فہرست

ایاتها ۱۰۹ ۔ ۱۰ سُوْرَةُ يُوْنُسَ مَكِّيَّةٌ ۵۱ ۔ رکوعاتها ۱۱

**خلاصہ تفسیر**: اس تمام تر سورت کا حاصل چند مضامین ہیں: ① توحید کا اثبات ② رسالت کا اثبات ③ قرآن کا اثبات ④ آخرت کا اثبات ⑤ بعض قصوں سے دھمکی اور ان کے ضمن میں شرک کو باطل کرنا ⑥ رسالت کے متعلق بعض شبہات کا جواب ⑦ قرآن کو جھٹلانے والوں کا رد اور ان کی سزا ⑧ دنیا کے فانی ہونے کا بیان ⑨ آخرت سے متعلق بعض شبہات کا جواب ⑩ آپ ﷺ کی تسلی کا سامان، ان سب مضامین میں کفار کے ساتھ مباحثہ ہے، گذشتہ سورت میں ان سے گفتگو تھی مگر وہاں تلوار سے تھی یہاں زبانی ہے، نیز پیچھے سب کفار کے ساتھ کلام تھا اور اس سورت میں صرف مشرکین کے ساتھ، پس باہم دونوں سورتوں میں بھی اور اس سورت کے اجزا میں بھی ربط و مناسبت معلوم ہوگئی، خلاصہ یہ کہ سورۃ توبہ میں انہی مقاصد کے لئے منکرین و کفار کے ساتھ جہاد اور کفر و شرک کی طاقت کو مادی اسباب کے ذریعہ توڑنے کا بیان تھا، اور یہ سورت چونکہ احکام جہاد کے نازل ہونے سے پہلے مکہ میں نازل ہوئی اس میں مذکورہ مقاصد کو مکی دور کے قانون کے مطابق صرف دلائل و براہین کے ذریعہ ثابت کیا گیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ①

الر۔ یہ آیتیں ہیں پکی کتاب کی

**خلاصہ تفسیر**: الٓرٰ (کا مطلب تو اللہ کو معلوم ہے) یہ (جو آگے آتی ہیں) پرحکمت کتاب (یعنی قرآن) کی آیتیں ہیں (جو حق ہونے کی وجہ سے جاننے اور ماننے کے قابل ہیں)۔

* * *

**فائدہ**: یہ آیتیں ایسی مضبوط و محکم کتاب کی ہیں جس کی ہر بات پکی ہے، الفاظ اس لیے کہ ہمیشہ تبدیل و تحریف سے محفوظ رہیں گے، علوم اس لیے کہ تمام تر عقل و حکمت کے موافق ہیں، احکام اس وجہ سے کہ آئندہ کوئی دوسری ناسخ کتاب آنے والی نہیں، اخبار و قصص اس طرح کہ ٹھیک ٹھیک واقعہ کے مطابق ہیں، اور ایسا کیوں نہ ہو، جب کہ خدائے علیم و حکیم نے اس کو اپنے علم کامل کے زور سے اتارا ہے۔

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا

کیا لوگوں کو تعجب ہوا کہ وحی بھیجی ہم نے ایک مرد پر ان میں سے یہ کہ ڈر سنا دے لوگوں کو اور خوشخبری سنا دے ایمان والوں کو

وقف النبي صلی اللہ علیہ وسلم

اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ②

کہ ان کے لیے پایہ سچا ہے اپنے رب کے یہاں لے کہنے لگے منکر بیشک یہ تو جادوگر ہے صریح ۲

**خلاصہ تفسیر**: (اور چونکہ جن پیغمبر پر قرآن کا نزول ہوا ہے ان کی نبوت کا کفار انکار کرتے تھے اس لئے جواب میں فرماتے ہیں کہ) کیا ان (مکہ کے) لوگوں کو اس بات سے تعجب ہوا کہ ہم نے ان میں سے ایک شخص کے پاس (جو کہ ان کی طرح بشر ہے) وحی بھیج دی (جس کا خلاصہ یہ ہے) کہ (عام طور پر) سب آدمیوں کو (احکام خداوندی کے خلاف کرنے پر) ڈرایئے، اور جو ایمان لے آئے ان کو یہ خوشخبری سنایئے کہ ان کے رب کے پاس (پہنچ کر) ان کو پورا مرتبہ ملے گا (یعنی اگر ایسا مضمون کسی بشر پر وحی کے ذریعہ سے نازل ہو جائے تو کوئی تعجب کی وجہ نہیں، مگر) کافر

(اس قدر متعجب ہوئے کہ آپ کی نسبت) کہنے لگے کہ (نعوذ باللہ) یہ شخص تو بلا شبہ صریح جادوگر ہے (نبی نہیں ہے، کیونکہ نبوت بشر کے لئے نہیں ہوسکتی)۔
مشرکین کی یہ بھی ایک جہالت تھی کہ بغیر کسی دلیل کے نبوت اور بشریت میں منافات سمجھتے تھے کہ نبوت بشر کے لیے نہیں ہوسکتی۔

* * *

**فائدہ:** لے یعنی اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ انسانوں کی اصلاح وہدایت کے لیے حق تعالیٰ ایک انسان ہی کو مامور فرمادے اور اس کی طرف وہ پیغام بھیجے جس کی دوسروں کو بلا واسطہ خبر نہ ہو، وہ تمام لوگوں کو خدا کی نافرمانی کے مہلک نتائج وعواقب سے آگاہ کرے، اور خدا کی بات ماننے والوں کو بشارت پہنچائے کہ رب العزت کے یہاں اعمال صالحہ کی بدولت ان کا کتنا اونچا مرتبہ اور کیسا بلند پایہ ہے، اور کیسی سعادت وفلاح ازل سے ان کے لیے لکھی جاچکی ہے۔

**فائدہ:** ۲ے یعنی وحی قرآنی کو فوق العادت موثر وبلیغ ہونے کی وجہ سے جادو اور اس کے لانے والے کو جادوگر کہتے ہیں۔

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ

تحقیق تمہارا رب اللہ ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین چھ دن میں لے پھر قائم ہوا عرش پر ۲ے تدبیر کرتا ہے

الْأَمْرَ ۖ مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ إِذْنِهِ ۚ ذٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ③

کام کی ۳ے کوئی سفارش نہیں کرسکتا مگر اس کی اجازت کے بعد ۴ے وہ اللہ ہے رب تمہارا سو اس کی بندگی کرو، کیا تم دھیان نہیں کرتے ۵ے

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے قرآن ورسالت کا ذکر تھا، اب توحید کا بیان ہے:

بلاشبہ تمہارا رب (حقیقی) اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو چھ روز (کی مقدار) میں پیدا کردیا (پس اعلی درجہ کا قادر ہے) پھر عرش پر (جو تخت سلطنت کے مشابہ ہے اس طرح) قائم (اور جلوہ فرما) ہوا (کہ جو اس کی شان کے لائق ہے تاکہ عرش سے زمین وآسمان میں احکام جاری فرمائے، جیسا آگے ارشاد ہے کہ) وہ ہر کام کی (مناسب) تدبیر کرتا ہے (پس حکیم بھی ہے، اس کے سامنے) کوئی سفارش کرنے والا (سفارش) نہیں (کرسکتا ہے) بدون اس کی اجازت کے (پس عظیم بھی ہوا، پس) ایسا اللہ تمہارا رب (حقیقی) ہے سو تم اس کی عبادت کرو (اور شرک مت کرو) کیا تم (ان دلائل کے سننے کے بعد) پھر بھی نہیں سمجھتے۔

* * *

**فائدہ:** لے خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ: یعنی اتنے وقت میں جو چھ دن کے برابر تھا، اور ایک دن ابن عباس کی تفسیر کے موافق ایک ہزار سال کا لیا جائے گا، گویا چھ ہزار سال میں زمین وآسمان وغیرہ تیار ہوئے، بلاشبہ حق تعالیٰ قادر تھا کہ آنِ واحد میں ساری مخلوق کو پیدا کر دیتا، لیکن حکمت اسی کو مقتضی ہوئی کہ تدریجاً پیدا کیا جائے، شاید بندوں کو سبق دینا ہو کہ قدرت کے باوجود ہر کام سوچ سمجھ کر تانّی اور متانت سے کیا کریں، نیز تدریجی تخلیق میں بہ نسبت دفعتاً پیدا کرنے کے اس بات کا زیادہ اظہار ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ فاعل بالاضطرار نہیں بلکہ ہر چیز کا وجود بالکلیہ اس کی مشیت و اختیار سے وابستہ ہے جب چاہے، جس طرح چاہے پیدا کرے۔

**فائدہ:** ۲ے ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ: سورہ اعراف کے ساتویں رکوع کے شروع میں اسی طرح کی آیت گزر چکی اُسکا فائدہ ملاحظہ کیا جائے۔

**فائدہ:** ۳ے يُدَبِّرُ الْأَمْرَ: یعنی مخلوق کے تمام کاموں کی تدبیر وانتظام اسی کے ہاتھ میں ہے۔

**فائدہ:** ۴ے مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ إِذْنِهِ: یعنی شریک اور حصہ دار تو اس کی خدائی میں کیا ہوتا، سفارش کے لیے بھی اس کی اجازت کے بدون لب نہیں ہلا سکتا۔

**فائدہ:** ۵ے أَفَلَا تَذَكَّرُونَ: یعنی دھیان کرو کہ ایسے رب کے سوا جس کی صفات اوپر بیان ہوئیں دوسرا کون ہے جس کی بندگی اور پرستش کی

جا سکے، پھر تم کو کیسے جرأت ہوتی ہے کہ اس خالق و مالک شہنشاہِ مطلق اور حکیم برحق کے پیغاموں اور پیغامبروں کو محض اوہام وظنوں کی بناء پر جھٹلانے لگو۔

اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ

اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے تم سب کو ۱ وعدہ ہے اللہ کا سچا، وہی پیدا کرتا ہے اول بار پھر دوبارہ کرے گا اس کو تا کہ بدلہ دے ان کو جو

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ

ایمان لائے تھے اور کیے تھے کام نیک انصاف کے ساتھ ۲ اور جو کافر ہوئے ان کو پینا ہے کھولتا پانی اور عذاب ہے دردناک

بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ④

اس لیے کہ کفر کرتے تھے

**خلاصہ تفسیر:** (پیچھے توحید کا بیان تھا، اب معاد یعنی آخرت کا ذکر ہے) تم سب کو اللہ ہی کے پاس جانا ہے، اللہ نے (اس کا) سچا وعدہ کر رکھا ہے، بیشک وہی پہلی بار بھی پیدا کرتا ہے پھر وہی دوبارہ بھی (قیامت کو) پیدا کرے گا تا کہ ایسے لوگوں کو جو کہ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے انصاف کے ساتھ (پوری پوری) جزا دے (اور اس میں ذرا کمی نہ کرے، بلکہ بہت کچھ زیادہ دے دے) اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے واسطے (آخرت میں) کھولتا ہوا پانی پینے کو ملے گا، اور دردناک عذاب ہوگا ان کے کفر کی وجہ سے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی اسی سے تم سب کا آغاز ہوا، اور اسی کی طرف انجام کار سب کو جانا ہے، پھر اس کے احکام وسفراء سے سرتابی کرنا کیسے روا ہوسکتا ہے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی چھوٹی سے چھوٹی نیکی بھی ضائع نہ ہو۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ

وہی ہے جس نے بنایا سورج کو چمک (چمکتا) اور چاند کو چاندنا ۱ مقرر کیں اس کے لیے منزلیں ۲ تا کہ پہچانو گنتی برسوں کی

وَالْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ⑤

اور حساب ۳ یوں ہی نہیں بنایا اللہ نے یہ سب کچھ مگر تدبیر سے ۴ ظاہر کرتا ہے نشانیاں ان لوگوں کے لیے جن کو سمجھ ہے ۵

**خلاصہ تفسیر:** (اب پھر توحید کا بیان ہے) وہ اللہ ایسا ہے جس نے آفتاب کو چمکتا ہوا بنایا اور چاند کو (بھی) نورانی بنایا اور اس (کی چال) کے لئے منزلیں مقرر کیں (کہ ہر روز ایک منزل طے کرتا ہے) تا کہ (ان اجرام کے ذریعہ سے) تم برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کر لیا کرو، اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں بے فائدہ نہیں پیدا کیں، وہ یہ دلائل ان لوگوں کو صاف بتلا رہے ہیں جو دانش رکھتے ہیں۔

**وَقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ:** منزل سے مراد وہ مسافت ہے جس کو کوئی ستارہ شب وروز میں طے کر لے، اس معنی کے اعتبار سے سورج کے لیے بھی منزلیں ہیں، لیکن چونکہ چاند کی چال بہ نسبت سورج کے تیز ہے اور اس کا منازل کو طے کرنا ہر ایک کو محسوس ہوتا ہے اس لیے اسی کے واسطے منزلیں خاص طور سے بیان کی گئیں، اور اس اعتبار سے چاند کی منزلیں انتیس یا تیس ہوئیں، مگر چونکہ اٹھائیس رات سے زیادہ نظر نہیں آتا اس لیے مشہور اٹھائیس منزلیں ہیں۔

**لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ:** اگرچہ سورج اور چاند دونوں سے برسوں کی گنتی اور ہر قسم کے حساب کا کام چلتا ہے، لیکن چونکہ

سورج کا دورہ ایک سال میں ختم ہوتا ہے اس لیے مناسب یہ ہے کہ برسوں کی گنتی کا بیان سورج کے متعلق کہا جائے اور اس سے چھوٹے حساب کو چاند کے متعلق کہا جائے اور اسی لیے عدد السنین کے بعد لفظ الحساب بڑھایا گیا تعمیم بعد تخصیص کے طور پر یعنی خصوصیت کے بعد عموم کے لیے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ **جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا:** بعض کے نزدیک "نور" عام ہے "ضیاء" سے، "ضیاء" خاص اس نور کو کہتے ہیں جو زیادہ تیز اور چمکدار ہو، بعض نے کہا کہ جس کی روشنی ذاتی ہو، وہ "ضیاء" اور جس کی دوسرے سے مستفاد ہو، وہ "نور" ہے، سورج کی روشنی البتہ سورج سے مستفاد ہے، اور بعض محققین نے دونوں میں یہ فرق بتلایا ہے کہ "نور" مطلق روشنی کو کہتے ہیں، "ضیاء" اور "ضوء" اس کے انتشار (پھیلاؤ) کا نام ہے، سورج کی روشنی کا پھیلاؤ چونکہ زیادہ ہے، اس لیے "ضیاء" سے تعبیر فرمایا، واللہ اعلم بمرادہ۔

**فائدہ:** ۲ **وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ:** یعنی روزانہ بتدریج گھٹتا بڑھتا ہے **وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ** (یس:۳۹) علمائے ہیئت نے اس کے دورے کی تقسیم کر کے اٹھائیس منزلیں مقرر کی ہیں، جو بارہ بروج پر منقسم ہیں، قرآن میں خاص ان کی مصطلحات مراد نہیں، مطلق سیر ومسافت کے مدارج مراد ہیں۔

**فائدہ:** ۳ **عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابِ:** یعنی برسوں کی گنتی اور مہینوں اور دنوں کے چھوٹے موٹے حساب سب چاند سورج کی رفتار سے وابستہ کر دیے ہیں، اگر چاند سورج نہ ہوں تو دن رات، قمری اور شمسی مہینے، اور سال وغیرہ کیسے متعین ہوں، حالانکہ علاوہ دنیاوی زندگی اور معاشی کاروبار کے بہت سے احکام شرعیہ میں بھی تعین اوقات کی ضرورت ہے۔

**فائدہ:** ۴ **مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ:** یعنی فلکیات کا سلسلہ یوں ہی کیف ما اتفق نہیں، بلکہ بڑے عظیم الشان نظام و تدبیر کے ماتحت اور ہزارہا فوائد و حکم پر مشتمل ہے۔

**فائدہ:** ۵ **لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ:** یعنی سمجھ دار لوگ مصنوعات کے اس نظام کو دیکھ کر خداوند قادر و حکیم کی ہستی کا سراغ پاتے ہیں اور مادیات کے انتظام سے روحانیات کے متعلق بھی اندازہ کر لیتے ہیں کہ وہاں کی دنیا میں کیسے کیسے چاند سورج خدا نے پیدا کیے ہوں گے انہی کو انبیاء و مرسلین کہہ لیجئے۔

## اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ ۝۶

البتہ بدلنے میں رات اور دن کے اور جو کچھ پیدا کیا ہے اللہ نے آسمانوں اور زمین میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ڈرتے ہیں

**خلاصہ تفسیر:** بلاشبہ رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آنے میں اور جو کچھ اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے ان سب میں ان لوگوں کے واسطے (توحید کے) دلائل ہیں جو (خدا کا) ڈر مانتے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** بلاشبہ دنیا کی ہر چھوٹی بڑی چیز میں خدا کی ہستی اور وحدانیت کے دلائل موجود ہیں: وَفِي كُلِّ شَيْءٍ لَهٗ اٰيَةٌ تَدُلُّ عَلٰى اَنَّهٗ وَاحِد سورہ بقرہ میں پارہ سیقول کے ربع کے قریب ایک آیت گزر چکی جس میں زیادہ بسط و تفصیل سے ان نشانہائے قدرت کا بیان ہوا ہے۔

## اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ

البتہ جو لوگ امید نہیں رکھتے ہمارے ملنے کی اور خوش ہوئے دنیا کی زندگی پر اور اسی پر مطمئن ہو گئے اور جو لوگ

## عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝۷ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۸

ہماری نشانیوں (قدرتوں) سے بے خبر ہیں ۱ ایسوں کا ٹھکانا ہے آگ بدلہ اس کا جو کماتے تھے ۲

**خلاصہ تفسیر:** (اب پھر معاد یعنی آخرت کا بیان ہے) جن لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے اور وہ دنیوی زندگی پر راضی ہو گئے ہیں (آخرت کی طلب اصلاً نہیں کرتے) اور اس میں جی لگا بیٹھے ہیں (آئندہ کی کچھ خبر نہیں) اور جو لوگ ہماری آیتوں سے (جو کہ بعثت یعنی دوبارہ زندہ کیے جانے پر دلالت کرتی ہیں) بالکل غافل ہیں، ایسے لوگوں کا ٹھکانہ ان کے (ان) اعمال کی وجہ سے دوزخ ہے۔

**وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا:** یہاں آیت میں ''دنیا پر راضی اور مطمئن رہنا'' پر مذمت مرتب کرنا ان دونوں کے برے اور مذموم ہونے کی دلیل ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی دنیا میں ایسا دل لگایا کہ آخرت کی اور خدا کے پاس جانے کی کچھ خبر ہی نہ رہی، اسی چند روزہ حیات کو مقصود و معبود بنالیا، اور قدرت کی جو نشانیاں اوپر بیان ہوئیں، ان میں کبھی غور و تامل نہ کیا کہ ایسا مضبوط اور حکیمانہ نظام یوں ہی بیکار نہیں بنایا گیا، ضرور اس سارے کارخانہ کا کوئی خاص مقصد ہو گا، پھر جس نے پہلی مرتبہ ایسی عجیب و غریب مخلوقات پیدا کر دی، اس کو دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی دل و دماغ سے، زبان سے، ہاتھ پاؤں سے، جو کچھ انہوں نے کمائی کی اس کا بدلہ دوزخ کی آگ ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ

البتہ جو لوگ ایمان لائے اور کام کیے اچھے ہدایت کرے گا ان کو رب ان کے ایمان سے ۱؎ بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں

فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿٩﴾ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ

باغوں میں آرام کے، ان کی دعا اس جگہ یہ کہ پاک ذات ہے تیری یا اللہ ۲؎ اور ملاقات ان کی سلام ۳؎ اور خاتمہ ان کی دعا کا اس پر

اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠﴾ ع

کہ سب خوبی اللہ کو جو پروردگار سارے جہان کا ۴؎

**خلاصہ تفسیر:** (اور) یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے ان کا رب ان کو بوجہ ان کے مومن ہونے کے ان کے مقصد (یعنی جنت) تک پہنچا دے گا، ان کے (مسکن کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی چین کے باغوں میں۔

(جس وقت وہ جنت میں جائیں گے اور عجائبات کا دفعۃً معائنہ کریں گے تو اس وقت) ان کے منہ سے یہ بات نکلے گی کہ سبحان اللہ! اور (پھر جب ایک دوسرے کو دیکھیں گے تو) ان کا باہمی سلام یہ ہوگا السلام علیکم، اور (جب اطمینان سے وہاں جا بیٹھیں گے اور اپنے پرانے مصائب و تکالیف کا موجودہ وقت کے دائمی عیش و راحت سے موازنہ کریں گے تو) ان کی (اس وقت کی باتوں میں) اخیر بات یہ ہوگی الحمد للہ رب العلمین (جیسا دوسری آیت میں ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ)۔

**وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ:** شبہ ہوتا ہے کہ کیا اس کے بعد وہ کوئی بات نہ کریں گے؟ اس کا جواب خلاصہ تفسیر میں واضح کر دیا کہ ان کی اس وقت کی باتوں میں اخیر بات یہ ہوگی۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ **يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ:** یعنی ایمان کی بدولت اور اسکی روشنی میں حق تعالیٰ مومنین کو مقصد اصلی (جنت) تک پہنچائے گا۔

**فائدہ:** ۲؎ **سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ:** جنتی جنت کی نعمتوں اور خدا کے فضل و احسان کو دیکھ کر ''سبحان اللہ'' پکاریں گے، اور جب خدا سے کچھ مانگنے کی خواہش ہوگی، مثلاً کوئی پرندہ یا پھل دیکھا اور ادھر رغبت ہوئی تو سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ کہیں گے، اتنا سنتے ہی فرشتے وہ چیز فوراً حاضر کر دیں گے، گویا یہ ہی

ایک لفظ تمام دعاؤں کے قائم مقام ہوگا، دنیا میں بھی بڑے آدمیوں کے یہاں دستور ہے کہ مہمان اگر کسی چیز کو پسند کر کے صرف تعریف کر دے تو غیور میزبان کوشش کرتا ہے کہ وہ چیز مہمان کے لیے مہیا کرے۔

**فائدہ:** ۳؎ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلٰمٌ: جنتی ملاقات کے وقت ایک دوسرے کو سلام کریں گے، جیسے دنیا میں مسلمانوں کا دستور ہے، نیز فرشتوں کا جنتیوں کو سلام کرنا، بلکہ خود خداوند رب العزت کی طرف سے تحفہ سلام کا آنا قرآن میں منصوص ہے سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ (یس:۵۸) وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ (الرعد:۲۳)

**فائدہ:** ۴؎ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ: جنت میں پہنچ کر جب دنیاوی تفکرات وکدورات کا خاتمہ ہوجائے گا اور محض سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ کہنے پر ہر چیز حسب خواہش ملتی رہے گی تو ان کی ہر دعا کا خاتمہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ پر ہوگا اور طبعاً ایسا ہی ہونا چاہیے۔

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ؕ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ

اور اگر جلدی پہنچا دے اللہ لوگوں کو برائی جیسے کہ جلدی مانگتے ہیں وہ بھلائی تو ختم کر دی جائے ان کی عمر، سو ہم چھوڑے رکھتے ہیں ان کو جن کو

لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ⑪

امید نہیں ہماری ملاقات کی ان کی شرارت میں سرگرداں

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے آیت: اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ میں کفار کا آخرت میں مستحق عذاب ہونا بیان فرمایا گیا، ایسے مضامین پر کفار جھٹلانے کی غرض سے یہ کہا کرتے تھے کہ ہم تو عذاب کو حق جب سمجھیں گے کہ ہم پر یہاں دنیا ہی میں عذاب نازل ہوجائے، اس کے بعد دنیا میں عذاب نازل نہ ہونے سے یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ آخرت میں بھی عذاب نہ ہوگا، چنانچہ اب اس کا جواب ارشاد ہوتا ہے:

اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں پر (ان کی جلدی مچانے کے موافق) جلدی سے نقصان واقع کر دیا کرتا جس طرح وہ فائدہ کے لئے جلدی مچاتے ہیں (اور اس کے موافق حق تعالیٰ وہ فائدہ جلدی واقع کر دیتے ہیں اسی طرح اگر نقصان بھی جلدی واقع کر دیا کرتا) تو ان کا وعدہ (عذاب) کبھی کا پورا ہو چکا ہوتا (لیکن ہماری حکمت چونکہ اس کو تقاضہ نہیں کرتی، چنانچہ حکمت کا بیان آگے آتا ہے) سو (اس لئے) ہم ان لوگوں کو جن کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے ان کے حال پر (بلا عذاب چندروز) چھوڑے رکھتے ہیں کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں (تاکہ زیادہ عذاب کے مستحق ہوجائیں اور یہی حکمت ہے جلدی عذاب نہ آنے کی، مگر یہ حکمت بدبختوں کے واسطے ہے، ورنہ جلدی عذاب نہ آنے میں یہ بھی حکمت ہے کہ اگر اب نہیں سمجھے تو شاید آئندہ سمجھ جائیں، چنانچہ جن کی قسمت میں تھا وہ بعد میں ایمان لے آئے، یہ حکمت سعادت مندوں کے لیے ہے)۔

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ: اگر کسی کو شبہ ہو کہ آیت سے دو باتیں سمجھ میں آتی ہیں: ایک یہ کہ شر مانگنے سے بھی جلدی واقع نہیں ہوتا، دوسرا یہ کہ خیر مانگنے سے جلدی واقع ہوتی ہے، حالانکہ اس کے خلاف بھی بکثرت ہوتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ اصل مقتضائے رحمت یہی ہے کہ خیر جلدی واقع ہوتی ہے اور شر جلدی واقع نہیں ہوتا، لیکن اگر کسی عارض کی وجہ سے اس کا عکس ہوجائے تو وہ اور بات ہے، نیز کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جو شر یا نقصان واقع ہوا ہے اس میں کسی دوسرے کے لیے خیر ہوتی ہے، اور جس خیر میں توقف ہوتا ہے اس میں کوئی شر بھی پوشیدہ ہوتا ہے، پس اس شر کا واقع ہونا حقیقت میں خیر کا واقع ہوتا ہے، کیونکہ تمہارے واسطے اگر وہ شر ہے تو دوسروں کے لیے خیر ہے، اور اس خیر میں توقف ہونا حقیقت میں شر میں توقف ہونا ہے کہ دوسروں کے لیے اس میں نقصان ہے، پس یہ شبہ جاتا رہا کہ بعض دفعہ ہم تو اس کے خلاف پاتے ہیں کہ شر جلدی واقع ہوجاتا ہے اور خیر کے لیے دعائیں کرتے ہیں اس کا ظہور بہت دیر میں ہوتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** دو آیت پہلے فرمایا تھا جو لوگ غفلت میں پڑے ہیں اور ہمارے ملنے کی امید نہیں رکھتے، ان کا ٹھکانا دوزخ ہے، یہاں یہ بتلانا ہے

کہ خدا ایسے مجرموں کو دنیا میں فوراً نہیں پکڑتا بلکہ مہلت دیتا ہے، حالانکہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ کبھی بے باک و بے حیا بن کر خود اپنے او پر جلد عذاب آنے کا مطالبہ کرتے ہیں مثلاً کہتے ہیں: اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ (الانفال: ۳۲) کبھی دنیاوی حوادث سے تنگ آ کر اپنے یا اپنی اولاد وغیرہ کے حق میں بددعائیں کرنے لگتے ہیں، جیسا کہ تجربہ سے ظاہر ہے، اب اگر خدا تعالیٰ ان کی درخواست ودعاء کے موافق فوراً ہاتھوں ہاتھ کوئی عذاب یا برائی اس قدر جلد ان کو پہنچا دے جتنی جلد وہ بھلائی کے پہنچنے کی خواہش رکھتے ہیں تو بدی کے وبال سے ایک منٹ بھی فرصت نہ پائیں اور رشتہ حیات اسی وقت منقطع ہو جائے، مگر خدا کے یہاں نیکی و بدی دونوں میں حسب مصلحت تاخیر وتحمل ہوتا ہے، تاکہ نیک لوگ تربیت پائیں اور بدکار غفلت میں پڑے رہ کر پیمانہ شرارت لبریز کرلیں۔

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ

اور جب پہنچے انسان کو تکلیف پکارے ہم کو پڑا ہوا یا بیٹھا یا کھڑا، پھر جب ہم کھول دیں اس سے وہ تکلیف چلا جائے

كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ۭ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ⑫

گویا کبھی نہ پکارا تھا ہم کو کسی تکلیف پہنچنے پر، اسی طرح پسند آیا ہے بے باک لوگوں کو جو کچھ کر رہے ہیں

**خلاصہ تفسیر**: پیچھے توحید کا ذکر ہوا، آگے ایک خاص طور پر شرک کا باطل ہونا بیان فرماتے ہیں وہ یہ کہ مصیبت میں خود مشرکین بھی خدا کے سوا سب کو چھوڑ بیٹھتے ہیں، پس جس طرح کہ واقع میں شرک باطل ہے، ان عقیدہ والوں کے طرز عمل سے بھی وہ لچر ثابت ہوتا ہے۔

اور جب انسان کو (یعنی ان میں سے بعض کو) کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم کو پکارنے لگتا ہے، لیٹے بھی، بیٹھے بھی، کھڑے بھی (اور اس وقت کوئی بت وغیرہ یاد نہیں رہتا ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ) پھر جب (اس کی دعا و التجاء کے بعد) ہم اس کی وہ تکلیف ہٹا دیتے ہیں تو پھر اپنی پہلی حالت پر آ جاتا ہے (اور ہم سے ایسا بے تعلق ہو جاتا ہے) کہ گویا جو تکلیف اس کو پہنچی تھی اس کے ہٹانے کے لئے کبھی ہم کو پکارا ہی نہ تھا (اور پھر وہی شرک کی باتیں کرنے لگتا ہے: نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْٓا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا) ان حد سے نکلنے والوں کے اعمال (بد) ان کو اسی طرح مستحسن معلوم ہوتے ہیں (جس طرح ہم نے ابھی بیان کیا ہے)۔

**وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا**: اس آیت کا مضمون چند آیتوں میں مختلف الفاظ سے آیا ہے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ راحت کے وقت انسان میں یہ باتیں پیدا ہوتی ہیں: ① اعراض یعنی خدا سے منہ موڑنا ② نسیان یعنی نعمتوں اور مصائب کو بھول جانا ③ دعاء چھوڑ دینا ④ اترانا ⑤ فخر کرنا، ان سب باتوں کا جمع ہوسکنا ظاہر ہے، اور مصیبت میں یہ باتیں پیدا ہوتی ہیں: ① ناامیدی ② ناشکری ③ دعا، اس میں بظاہر شبہ ہوسکتا ہے کہ ناامیدی اور دعا کا جمع ہونا بظاہر مشکل ہے، کیونکہ دعاء امید ہی میں کی جاتی ہے، سو یا تو یوں کہا جائے کہ زبان سے دعا کرتا ہے مگر دل میں مایوسی ہوتی ہے، یا یوں کہا جائے کہ اول اول خوب دعا کرتا ہے پھر مایوس ہو کر چھوڑ دیتا ہے۔

اور سورہ حم فصلت کے آخر میں جو ارشاد ہوا ہے کہ: لا يسئم الانسان من دعاء الخير یعنی انسان بھلائی کی دعا سے کبھی نہیں گھبراتا تو یہاں دعا سے مراد محض تمنا آرزو اور حرص ہے، یہ باتیں تو ہر حالت میں تازہ رہتی ہیں خواہ راحت کا وقت ہو یا ناامیدی کا، اس کا خواہش مند تو انسان ہر حال میں ہوتا ہے، اگرچہ راحت وناامیدی کے وقت دعا نہیں کرتا۔

اگر یہاں انسان سے مراد کافر لیا جائے تو اس پر دلالت کرتا ہے کہ دعا اور عبادت اگر ایمان سے نہ ہو بلکہ محض مجبوری اور اضطرار کی وجہ سے ہو تو شرعاً نافع اور مفید نہیں، اور ایسی ہی دعا اور عبادت اس آیت میں مذکور ہے: فاذا ركبوا في الفلك دعوا الله مخلصين له الدين۔

* * *

**فائدہ**: یعنی انسان اول بے باکی سے خود عذاب طلب کرتا اور برائی اپنی زبان سے مانگتا ہے، مگر کمزور اور بودا اتنا ہے کہ جہاں ذرا تکلیف

پہنچی گھبرا کر ہمیں پکارنا شروع کر دیا، جب تک مصیبت رہی کھڑے، بیٹھے، لیٹے ہر حالت میں خدا کو پکارتا رہا، پھر جہاں تکلیف ہٹالی گئی، سب کہاسنا بھول گیا، گویا خدا سے کبھی کوئی واسطہ نہ تھا، وہ ہی غرور غفلت کا نشہ، وہ ہی اکڑفوں رہ گئی، جس میں پہلے مبتلا تھا، حدیث میں ہے کہ تو خدا کو اپنے عیش وآرام میں یاد رکھ، خدا تجھ کو تیری سختی اور مصیبت میں یاد رکھے گا، مومن کی شان یہ ہے کہ کسی وقت خدا کو نہ بھولے، سختی پر صبر اور فراخی پر خدا کا شکر ادا کرتا رہے، یہ ہی وہ چیز ہے جس کی توفیق مومن کے سوا کسی کو نہیں ملتی۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا

اور البتہ ہم ہلاک کر چکے ہیں جماعتوں کو تم سے پہلے جب ظالم ہو گئے، حالانکہ لائے تھے ان کے پاس رسول ان کی کھلی نشانیاں اور ہرگز نہ تھے

لِيُؤْمِنُوْا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۳﴾

ایمان لانے والے، یوں ہی سزا دیتے ہیں ہم قوم گناہ گاروں کو

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے کفار کا مستحق عذاب ہونا بیان فرمایا، اب اس کی تاکید کے لیے کفار سابقین کا طرح طرح کے عذاب سے ہلاک ہونا اجمالاً بیان فرماتے ہیں تاکہ تنبیہ ہو جائے کہ یہ بھی عذاب کے مستحق ہیں مگر بعض حکمتوں کی وجہ سے دنیا میں سخت عذاب رک رہا ہے۔

اور ہم نے تم سے پہلے بہت سے گروہوں کو (عذاب کی مختلف اقسام سے) ہلاک کر دیا ہے جب کہ انہوں نے ظلم (یعنی کفر وشرک) کیا حالانکہ ان کے پاس ان کے پیغمبر بھی دلائل لے کر آئے اور وہ (انتہائی حسد وعناد کی وجہ سے) ایسے کب تھے کہ ایمان لے آتے، ہم مجرم لوگوں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں (جیسا ہم نے ابھی بیان کیا ہے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی اگر ان کی درخواست کے موافق جلدی عذاب نہ آئے یا تکلیف ومصیبت آکر ٹل جائے تو بے فکر نہیں ہونا چاہیے، ظلم وشرارت اور بے ایمانی کی سزا جلد یا بدیر مل کر رہے گی، سنت اللہ قدیم سے یہ ہی ہے کہ جب لوگ انبیاء ومرسلین کے کھلے نشان دیکھنے کے بعد بھی ظلم وتکذیب پر کمر بستہ رہے اور کسی طرح ایمان وتسلیم کی طرف نہ جھکے تو آسمانی عذاب نے ان کو ہلاک کر ڈالا، ہمیشہ مجرموں کو کسی نہ کسی رنگ میں سزا ملتی رہی۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

پھر تم کو ہم نے نائب کیا زمین میں ان کے بعد تاکہ دیکھیں تم کیا کرتے ہو

**خلاصہ تفسیر:** پھر ان کے بعد ہم نے دنیا میں بجائے ان کے تم کو آباد کیا تاکہ (ظاہری طور پر بھی) ہم دیکھ لیں کہ تم کس طرح کام کرتے ہو (آیا ویسا ہی شرک وکفر کرتے ہو یا ایمان لاتے ہو)۔

لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ: یعنی تاکہ ہم دیکھ لیں، یہاں خلاصہ تفسیر میں ''ظاہری طور پر'' اس لیے بڑھایا گیا کہ خدا تعالی کو واقع ہونے سے پہلے بھی علم ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی پہلوں کی جگہ اب تم کو زمین پر بسایا تاکہ دیکھا جائے کہ تم کہاں تک خالق ومخلوق کے حقوق پہچانتے ہو، اور خدا کے پیغمبروں کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہو، نیک وبد جیسے عمل کرو گے اسی کے مناسب تم سے برتاؤ کیا جائے گا۔

**ربط:** آگے اس معاملہ کا ذکر ہے جو قرآن کریم یا پیغمبر ﷺ یا خداوند قدوس کے ساتھ انہوں نے کیا۔

وَ اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا ائۡتِ بِقُرۡاٰنٍ غَیۡرِ ہٰذَاۤ

اور جب پڑھی جاتی ہیں ان کے سامنے آیتیں ہماری واضح کہتے ہیں وہ لوگ جن کو امید نہیں ہم سے ملاقات کی لے آ کوئی قرآن اس کے سوا

اَوۡ بَدِّلۡہُ ؕ قُلۡ مَا یَکُوۡنُ لِیۡۤ اَنۡ اُبَدِّلَہٗ مِنۡ تِلۡقَآیِٔ نَفۡسِیۡ ۚ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ ۚ

یا اس کو بدل ڈال ۱؎ تو کہہ دے میرا کام نہیں کہ اس کو بدل ڈالوں اپنی طرف سے، میں تابعداری کرتا ہوں اسی کی جو حکم آئے میری طرف

اِنِّیۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَیۡتُ رَبِّیۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۵﴾

میں ڈرتا ہوں اگر نافرمانی کروں اپنے رب کی بڑے دن کے عذاب سے ۲؎

**خلاصہ تفسیر**: پیچھے توحید وآخرت کے متعلق گفتگو تھی، اب قرآن ورسالت کے صدق وحقیقت کا بیان ہے۔

اور جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں جو بالکل صاف صاف ہیں تو یہ لوگ جن کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے (آپ سے) یوں کہتے ہیں کہ (یاتو) اس کے سوا کوئی (پورا) دوسرا قرآن (ہی) لا یئے (جس میں ہمارے طریقے اور مسلک کے خلاف مضامین نہ ہوں) یا (کم ازکم) اسی (قرآن) میں کچھ ترمیم کردیجئے (کہ ہمارے مسلک کے خلاف مضامین اس سے حذف کردیجئے اور اس سے یہ بھی سمجھ میں آیا کہ وہ لوگ قرآن کو کلام محمدی سمجھتے تھے، اللہ تعالیٰ اسی بنا پر جواب تعلیم فرماتے ہیں کہ:) آپ یوں کہہ دیجئے کہ (قطع نظر اس سے کہ ایسے مضامین کا حذف کرنا فی نفسہ کیسا ہے خود) مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ میں اپنی طرف سے اس میں ترمیم کردوں (اور جب کچھ کا حذف کرنا بھی ممکن نہیں تو سارے کا حذف کرنا تو بدرجہ اولی ناممکن ہے، کیونکہ وہ میرا کلام تو ہے ہی نہیں، بلکہ اللہ کا کلام ہے جو وحی کے ذریعہ سے آیا ہے، جب یہ ہے تو) بس میں تو اسی کا اتباع کروں گا جو میرے پاس وحی کے ذریعہ سے پہنچا ہے (اور بالفرض خدانخواستہ) اگر میں (وحی کا اتباع نہ کروں بلکہ) اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک بڑے بھاری دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں (جو گناہ گاروں کے لئے مخصوص ہے اور نافرمانی کی وجہ سے تمہارے ہی نصیب میں ہے، سو میں تو اس عذاب پر یا اس کے سبب پر جو کہ معصیت ہے جرأت نہیں رکھتا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ قرآن کی عام پند ونصیحت تو بہت سے پسند کرتے لیکن بت پرستی یا ان کے مخصوص عقائد ورسوم کا رد ہوتا تو وحشت کھاتے اور ناک بھوں چڑھا کر رسول اللہ ﷺ سے کہتے کہ اپنے خدا سے کہہ کر یا تو دوسرا قرآن لے آیئے جس میں یہ مضامین نہ ہوں اور اگر یہی قرآن رہے تو اتنے حصہ میں ترمیم کردیجئے جو بت پرستی وغیرہ سے متعلق ہے، جن لوگوں نے پتھر کی مورتیوں پر خدائی اختیارات تقسیم کر رکھے تھے، ان کی ذہنیت سے کچھ مستبعد نہیں کہ ایک پیغمبر کو اس طرح کے تصرفات واختیارات کا مالک فرض کرلیں، یا یہ کہنا بھی محض الزام واستہزاء کے طور پر ہوگا، بہرحال اس کا تحقیقی جواب آگے مذکور ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی کسی فرشتہ یا پیغمبر کا یہ کام نہیں کہ اپنی طرف سے کلام الٰہی میں ترمیم کرکے ایک شوشہ بھی تبدیل کرسکے، پیغمبر کا فرض یہ ہے کہ جو وحی خدا کی طرف سے آئے بلاکم وکاست اس کے حکم کے موافق چلتا رہے، وہ خدا کی وحی کا تابع ہوتا ہے، خدا اس کا تابع نہیں ہوتا کہ جیسا کلام تم چاہو، خدا کے یہاں سے لاکر پیش کردے، وحی الٰہی میں ادنیٰ سے ادنیٰ تصرف اور قطع وبرید کرنا بڑی بھاری معصیت ہے پھر جو معصوم بندے سب سے زیادہ خدا کا ڈر رکھتے ہیں (انبیاء علیہم السلام) وہ ایسی معصیت ونافرمانی کے قریب کہاں جاسکتے ہیں اِنِّیۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَیۡتُ رَبِّیۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ میں گویا ان بیہودہ فرمائش کرنے والوں پر تعریض ہوگئی کہ ایسی سخت نافرمانی کرتے ہوئے تم کو بڑے دن کے عذاب سے ڈرنا چاہیے۔

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَیْكُمْ وَلَاۤ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا

کہہ دے اگر اللہ چاہتا تو میں نہ پڑھتا اسکو تمہارے سامنے اور نہ وہ تم کو خبر کرتا اسکی، کیونکہ میں رہ چکا ہوں تم میں ایک عمر اس سے پہلے، کیا پھر

تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰیٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۷﴾

تم نہیں سوچتے ۱؎ پھر اس سے بڑا ظالم کون جو باندھے اللہ پر بہتان یا جھٹلائے اس کی آیتوں کو، بیشک بھلا نہیں ہوتا گناہ گاروں کا ۲؎

**خلاصہ تفسیر**: (اور اگر ان کو اس کے وحی ہونے میں کلام ہے اور یہ آپ ہی کا کلام سمجھے جاتے ہیں تو) آپ یوں کہہ دیجئے کہ (یہ تو ظاہر ہے کہ یہ قرآن معجزہ ہے، کوئی بشر اس پر قادر نہیں ہوسکتا، خواہ میں ہوں یا تم ہو، سو) اگر خدا تعالیٰ کو منظور ہوتا (کہ میں یہ کلام معجز نما تم کو نہ سناؤں اور اللہ تعالیٰ میرے ذریعہ سے تم کو اس کی اطلاع نہ دے) تو (اس کلام کو مجھ پر نازل نہ فرماتا، پس) نہ تو میں تم کو یہ (کلام) پڑھ کر سناتا اور نہ اللہ تعالیٰ تم کو اس کی اطلاع دیتا (پس جب میں تم کو سنا رہا ہوں اور میرے ذریعہ سے تم کو اطلاع ہو رہی ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو اس معجز کلام کا سنوانا اور اطلاع کرنا منظور ہوا، اور سنانا اور اطلاع دینا اس کے معجزہ ہونے کی وجہ سے بغیر وحی کے ممکن نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ وہ وحی منزل اور کلام الٰہی ہے) کیونکہ (آخر) اس (کلام کے ظاہر کرنے) سے پہلے بھی تو ایک بڑے حصہ عمر تک تم میں رہ چکا ہوں (پھر اگر یہ میرا کلام ہے تو یا تو اتنی مدت تک ایک جملہ بھی میری زبان سے اس طرز کا نہ نکلا یا اب اچانک اتنی بڑی بات عجیب وغریب بنالی، یہ تو بالکل عقل کے خلاف ہے) پھر کیا تم اتنی عقل نہیں رکھتے۔

(جب اس کا کلام الٰہی اور حق ہونا ثابت ہو گیا پھر بھی مجھ سے ترمیم کی درخواست کرتے ہو اور اس کو نہیں مانتے تو سمجھ لو کہ) اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے (جیسا میرے لئے تجویز کرتے ہو) یا اس کی آیتوں کو جھوٹا بتلائے (جیسا اپنے لئے تجویز کر رکھا ہے) یقیناً ایسے مجرموں کو اصلاً فلاح نہ ہوگی (بلکہ دائمی عذاب میں ہوں گے)۔

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَیْكُمْ: یعنی جب خدا نے اس کو مجھ پر نازل فرمایا ہے تو ضرور اس کو سناؤں گا، خواہ تمہارے مسلک کے خلاف ہو یا موافق، میں اس میں ترمیم نہیں کرسکتا، کیونکہ یہ خدا کی طرف بذریعہ وحی میرے پاس پہنچا ہے، جس کی پوری دلیل ہے کہ اگر تم سے ہوسکے تو اس جیسا کلام بنا کر دکھادو، جب کوئی بشر اس پر قادر نہیں تو اس کے من جانب اللہ ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ: اب شاید کوئی یہ بعید احتمال نکالتا کہ ممکن ہے عام لوگ اس پر قادر نہ ہوں، آپ اس پر قادر ہوں، تو اس کا جواب دے دیا جس کا حاصل یہ ہے کہ اچانک چالیس سال کے بعد ایسے اعلیٰ طرز کا طویل کلام پیش کر دینا ممتنع ہے اور معجزہ اسی کو بولتے ہیں جو عادتاً محال ہو۔

* * *

**فائدہ**: ۱؎ یعنی جو خدا چاہتا ہے وہ ہی تمہارے سامنے پڑھتا ہوں اور جتنا وہ چاہتا ہے میرے ذریعہ سے تم کو خبردار کرتا ہے، اگر وہ اس کے خلاف چاہتا تو میری کیا طاقت تھی کہ خود اپنی طرف سے ایک کلام بنا کر اس کی طرف منسوب کر دیتا، آخر میری عمر کے چالیس سال تمہاری آنکھوں کے سامنے گزرے، اس قدر طویل مدت میں تم کو میرے حالات کے متعلق ہر قسم کا تجربہ ہو چکا، میرا صدق وعفاف، امانت و دیانت وغیرہ اخلاق حسنہ تم میں ضرب المثل رہے، میرا اُمّی ہونا اور کسی ظاہری معلم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہ کرنا ایک معروف ومسلم واقعہ ہے، پھر چالیس برس تک جس نے نہ کوئی قصیدہ لکھا ہو، نہ مشاعروں میں شریک ہوا ہو، نہ کبھی کتاب کھولی ہو نہ قلم ہاتھ میں لیا ہو، نہ کسی درسگاہ میں بیٹھا ہو دفعتاً ایسا کلام بنالائے جو اپنی فصاحت و بلاغت، شوکت وجزالت، جدت اسلوب اور سلاست وروانی سے جن وانس کو عاجز کر دے، اس کے علوم وحقائق کے سامنے تمام دنیا کے معارف ماند پڑ جائیں، ایسا مکمل اور عالمگیر قانون ہدایت نوع انسان کے ہاتھوں میں پہنچائے جس کے آگے سب پچھلے قانون ردی ہو جائیں، بڑی بڑی قوموں اور ملکوں کے مردہ قالب میں روح تازہ پھونک کر ابدی حیات اور نئی زندگی کا سامان بہم پہنچائے، یہ بات کس کی سمجھ میں آسکتی ہے، تم کو سوچنا چاہیے کہ جس پاک

سرشت انسان نے چالیس برس تک کسی انسان پر جھوٹ نہ لگایا ہو، کیا وہ ایک دم ایسی جسارت کرسکتا ہے کہ معاذ اللہ خداوند قدوس پر جھوٹ باندھنے اور افتراء کرنے لگے؟ ناچار ماننا پڑے گا کہ جو کلام الٰہی تم کو سناتا ہوں، اس کے بنانے یا پہنچانے میں مجھے اصلاً اختیار نہیں، خدا جو کچھ چاہتا ہے میری زبان سے تم کو سناتا ہے، ایک نقطہ یا زیر زبر تبدیل کرنے کا کسی مخلوق کو حق حاصل نہیں۔

**فائدہ:** ۲ یعنی گنہگاروں اور مجرموں کو حقیقی کامیابی اور بھلائی حاصل نہیں ہوسکتی، اب تم خود فیصلہ کرلو کہ ظالم و مجرم کون ہے اگر (بفرضِ محال) میں جھوٹ بنا کر خدا کی طرف منسوب کرتا ہوں تو مجھ سا ظالم کوئی نہیں ہوسکتا، لیکن گذشتہ آیت میں جو دلیل بیان کی گئی اس سے ثابت ہو چکا کہ یہ احتمال بالکل باطل ہے، پس جب میرا سچا ہونا ثابت ہے اور تم جہل یا عناد سے خدا کے کلام کو جھٹلا رہے ہو تو اب زمین کے پردہ پر تم سے بڑا ظالم کوئی نہیں ہوسکتا۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ

اور پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا اس چیز کی جو نہ نقصان پہنچا سکے ان کو نہ نفع اور کہتے ہیں یہ تو ہمارے سفارشی ہیں اللہ کے پاس ۱

قُلْ اَتُنَبِّــُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ⑱

تو کہہ کیا تم اللہ کو بتلاتے ہو جو اس کو معلوم نہیں آسمانوں میں اور نہ زمین میں، وہ پاک ہے اور برتر ہے اس سے جس کو شریک کرتے ہیں ۲

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے مشرکین کے طریقہ کا کمزور ہونا بیان کیا گیا، آگے بھی شرک کا باطل ہونا بیان کیا جاتا ہے۔

اور یہ لوگ اللہ (کی توحید) کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو (عبادت نہ کرنے کی صورت میں) نہ ان کو ضرر پہنچا سکیں اور نہ (عبادت کرنے کی صورت میں) ان کو نفع پہنچا سکیں، اور (اپنی طرف سے بلا دلیل ایک نفع تراش کر) کہتے ہیں کہ یہ (معبود) اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں (اس لئے ہم ان کی عبادت کرتے ہیں) آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم خدا تعالیٰ کو ایسی چیز بتلاتے ہو جو خدا تعالیٰ کو معلوم نہیں نہ آسمانوں میں نہ زمین میں (یعنی جو چیز اللہ کے علم میں نہ ہو، اس کا وجود اور واقع ہونا محال ہے تو تم ایک محال چیز کے پیچھے لگے ہو) وہ پاک اور برتر ہے ان لوگوں کے شرک سے۔

مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ: اگر حقیقی نفع و نقصان مراد لیا جائے تب تو ظاہر ہے کہ خدا کے سوا کوئی بھی نہیں پہنچا سکتا، نہ جاندار نہ بے جان، اور اگر ظاہری نفع و نقصان مراد لیا جائے جب بھی اصنام یعنی بت تو یہ بھی نہیں کرسکتے، کیونکہ وہ محض بے جان ہیں اور مکہ والے ان کو معبود سمجھتے تھے، اور زندہ آدمی اگر بظاہر نفع و نقصان پہنچا بھی دے تو اس کا معبود ہونا اس سے لازم نہیں آسکتا، کیونکہ خود اس میں یہ قدرت نہیں، بلکہ خدا کی طرف سے دی ہوئی ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ: یعنی مشرکین کہتے ہیں کہ یہ معبود اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں، اس کے دو جواب ہیں: ایک یہ کہ تمہارا یہ کہنا ہی غلط ہے کہ وہ سفارشی ہیں، وہ ہرگز خدا تعالیٰ کے یہاں تمہاری سفارش نہ کرسکیں گے، دوسرے یہ کہ سفارش کرنے والے لیے معبود ہونا کب لازم ہے، ان دونوں جوابوں کی طرف: قُلْ اَتُنَبِّــُٔوْنَ اللّٰهَ میں اشارہ کردیا، یعنی خدا تعالیٰ کو تو ان چیزوں کا شفیع یا معبود برحق ہونا معلوم نہیں اور خدا تعالیٰ کا علم تمام اشیاء کو محیط ہے، جب خدا کو ان کا علم نہیں تو معلوم ہوا کہ ان کے شفیع یا معبود ہونے کا نہ کہیں وجود ہے نہ امکان، بلکہ حق یہ ہے کہ محال ہے، اس سے شرک کا عقیدہ باطل ہوگیا، اور مشرکین دنیا میں تو بتوں کو حقیقۃً سفارشی مانتے تھے کہ مصیبت کو دور کرنے میں ان کا دخل سمجھتے تھے اور آخرت میں بطور فرض ان کو سفارشی سمجھتے تھے کہ اگر بالفرض قیامت کوئی چیز ہے تو یہ وہاں بھی ہمارے کام آئیں گے، ورنہ تو وہ آخرت کے قائل نہ تھے جیسا کہ اس آیت میں ہے: ولئن رجعت الی ربی ان لی عندہ للحسنی۔

* * *

**فائدہ:** ۱ وہ معاملہ تو خدا اور پیغمبر کے ساتھ تھا، اب ان کی خدا پرستی کا حال سنیے کہ خدا کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جن کے قبضہ قدرت میں نفع و ضرر کچھ بھی نہیں، جب پوچھا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ بیشک بڑا خدا تو ایک ہے جس نے آسمان و زمین پیدا کیے مگر ان اصنام (بتوں)

وغیرہ کو خوش رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ یہ سفارش کر کے بڑے خدا سے دنیا میں ہمارے اہم کام درست کرا دیں گے اور اگر موت کے بعد دوسری زندگی کا سلسلہ ہوا تو وہاں بھی ہماری سفارش کریں گے باقی چھوٹے موٹے کام جو خود ان کے حدود اختیار میں ہیں ان کا تعلق تو صرف ان ہی سے ہے، بنا ٴعلیہ ہم کو ان کی عبادت کرنی چاہیے۔

**فائدہ:** ۲۔ یعنی بتوں کا شفیع ہونا اور شفیع کا مستحق عبادت ہونا دونوں دعوے غلط اور بے اصل ہیں اور ظاہر ہے کہ خدا کے علم میں وہ ہی چیز ہو گی جو واقعی ہو، لہذا تعلیم الٰہی کے خلاف ان غیر واقعی اور خود تراشیدہ اصول کو حق بجانب ثابت کرنا گویا خدا تعالیٰ کو ایسی چیزوں کے واقعی ہونے کی خبر دینا ہے جن کا وقوع آسمان و زمین میں کہیں بھی اسے معلوم نہیں یعنی کہیں ان کا وجود نہیں، ہوتا تو اس کے علم میں ضرور ہوتا، پھر اس سے منع کیوں کرتا۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ

اور لوگ جو ہیں سو ایک ہی امت ہیں پیچھے جدا جدا ہو گئے، اور اگر نہ ایک بات پہلے ہو چکتی تیرے رب کی تو فیصلہ ہو جاتا

بَيْنَھُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ⑲

ان میں جس بات میں کہ اختلاف کر رہے ہیں

**خلاصہ تفسیر:** اور (یہ شرک کا طریقہ عقلاً و شرعاً باطل ہونے کے علاوہ قدیم بھی تو نہیں، کیونکہ پہلے) تمام آدمی ایک ہی طریقہ کے تھے (یعنی سب موحد تھے، کیونکہ آدم علیہ السلام عقیدہ توحید لے کر آئے، ان کی اولاد بھی ایک زمانے تک انہیں کے عقیدہ اور طریقے پر رہی) پھر (اپنی کج رائی سے) انہوں نے (یعنی بعض نے) اختلاف پیدا کر لیا (یعنی توحید سے پھر گئے، مشرک ہو گئے اور یہ مشرک لوگ ایسے مستحق عذاب ہیں کہ) اگر ایک بات نہ ہوتی جو آپ کے رب کی طرف سے پہلے ٹھہر چکی ہے (کہ پورا عذاب ان کو ابھی نہیں، بلکہ آخرت میں دیا جائے گا) تو جس چیز میں یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں ان کا قطعی فیصلہ (دنیا ہی میں) ہو چکا ہوتا (یعنی اگر یہ بات نہ ہوتی کہ خدا تعالیٰ نے ان کے لیے پورا عذاب آخرت میں مقدر کیا ہے تو دنیا ہی میں وہ عذاب بھیج دیا جاتا جس سے عملی فیصلہ یہیں ہو جاتا)۔

* * *

**فائدہ:** ممکن تھا مشرکین کہتے کہ خدا نے تمہارے دین میں منع کیا ہو گا ہمارے دین میں منع نہیں کیا، اس کا جواب دے دیا کہ اللہ کا دین ہمیشہ سے ایک ہے، اعتقادات حقہ میں کوئی فرق نہیں، درمیان میں جب لوگ بہک کر جدا جدا ہو گئے، خدا نے ان کے سمجھانے اور دین حق پر لانے کو انبیاء بھیجے، کسی زمانہ اور کسی ملت میں خدا نے شرک کو جائز نہیں رکھا باقی لوگوں کے باہمی اختلافات کو زبردستی اس لیے نہیں مٹایا گیا کہ پہلے سے خدا کے علم میں یہ بات طے شدہ تھی کہ یہ دنیا دار عمل (موقع واردات) ہے، قطعی اور آخری فیصلہ کی جگہ نہیں، یہاں انسانوں کو کسب و اختیار دے کر قدرے آزاد چھوڑا گیا ہے کہ وہ جو راہ عمل چاہیں اختیار کریں، اگر یہ بات پیشتر طے نہ ہو چکی ہوتی تو سارے اختلافات کا فیصلہ ایک دم کر دیا جاتا۔

وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ

اور کہتے ہیں کیوں نہ اتری اس پر ایک نشانی اس کے رب سے، سو تو کہہ دے کہ غیب کی بات اللہ ہی جانے، سو منتظر رہو

اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ⑳ ع

میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے بعض آیات میں رسالت کا مسئلہ گذرا، اب پھر رسالت کا بیان ہے۔

اور یہ لوگ (براہ عناد سینکڑوں معجزات ظاہر ہوجانے کے باوجود خصوصاً معجزہ قرآن دیکھنے اور اس کی مثال سے عاجز ہونے کے باوجود) یوں کہتے ہیں کہ ان پر (یعنی محمد ﷺ پر ہمارے فرمائشی معجزات میں سے) کوئی معجزہ کیوں نہیں نازل ہوا؟ تو آپ فرما دیجئے کہ (معجزہ کا اصل مقصد رسول کی حقانیت اور نبوت کو ثابت کرنا ہوتا ہے، وہ تو بہت سے معجزات کے ذریعہ ہو چکا ہے، اس لیے اب فرمائشی معجزات کی ضرورت تو باقی رہی نہیں، البتہ امکان دونوں طرف ہے کہ یہ فرمائشیں پوری ہوتی ہیں یا نہیں، سو اس کا تعلق علم غیب سے ہے اور) غیب کا علم صرف خدا کو ہے (مجھ کو نہیں) اس لئے تم بھی منتظر رہو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں (کہ تمہاری ہر فرمائش پوری ہوتی ہے یا نہیں، خلاصہ یہ کہ ان باتوں کا منصب رسالت سے کوئی تعلق نہیں، میں نہیں جانتا، نہ مجھ کو کوئی دخل، البتہ اصل مقصود ثابت کرنے کے لیے میں ہر وقت آمادہ ہوں اور ثابت بھی کر چکا ہوں)۔

**لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ**: فرمائشی معجزات کے ظاہر نہ کرنے کی حکمت قرآن کریم میں کئی جگہ بتلا دی گئی ہے کہ ان کے ظاہر ہونے کے بعد اللہ تعالی کی عادت یہ ہے کہ اگر پھر بھی ایمان نہ لائیں تو ساری قوم ہلاک کر دی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کو اس امت کے لئے ایسا عذاب عام منظور نہیں، بلکہ اس کو تا قیامت باقی رکھنا مقدر ہو چکا ہے۔

* * *

**فائدہ**: یعنی جن نشانیوں کی وہ فرمائش کرتے تھے، ان میں سے کوئی نشانی کیوں نہ اتری؟ جواب کا حاصل یہ ہے کہ صداقت کے نشان پہلے بہتیرے دیکھ چکے ہو، فرمائشی نشان دکھلانا ضروری نہیں نہ چنداں مفید ہے، آئندہ جو خدا کی مصلحت ہوگی وہ نشان دکھلائے گا، اس کا علم خدا ہی کو ہے کہ مستقبل میں کس شان اور نوعیت کے نشان ظاہر کرے گا، سو تم منتظر رہو، ہم بھی انتظار کرتے ہیں، ''موضح القرآن'' میں ہے یعنی اگر کہیں کہ ہم کاہے سے جانیں کہ تمہاری بات سچ ہے، فرمایا کہ آگے دیکھو حق تعالیٰ اس دین کو روشن کرے گا اور مخالف ذلیل ہوں گے برباد ہوجائیں گے سو ویسا ہی ہوا، سچ کی نشانی ایک بار کافی ہے اور ہر بار مخالف ذلیل ہوں تو فیصلہ ہو جائے، حالانکہ فیصلے کا دن دنیا میں نہیں۔

**وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا ؕ قُلِ اللّٰهُ**

اور جب چکھائیں ہم لوگوں کو مزا اپنی رحمت کا بعد ایک تکلیف کے جو انکو پہنچی تھی اس وقت بنانے لگیں حیلے ہماری قدرتوں میں، کہہ دے کہ اللہ

**اَسْرَعُ مَكْرًا ؕ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ﴿۲۱﴾**

سب سے جلد بنا سکتا ہے حیلے، تحقیق ہمارے فرشتے لکھتے ہیں حیلہ بازی تمہاری

**خلاصہ تفسیر**: گذشتہ آیت میں مشرکین کے اعتراض کا ذکر تھا، اب اس اعتراض کی علت بیان فرماتے ہیں کہ اس اعتراض کی علت اعراض ہے اور اعراض کی علت عیش پرستی ہے کہ راحت سے زندگی بسر کر رہے ہیں، اگر مصیبت آپڑے تو سب اعتراض بھول جائیں، نیز یہ آیت فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ کے مضمون کا تتمہ بھی ہے اور آگے آنے والی آیت فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ کی تمہید بھی ہے۔

اور جب ہم لوگوں کو بعد اس کے کہ ان پر کوئی مصیبت پڑ چکی ہو کسی نعمت کا مزہ چکھا دیتے ہیں تو فوراً ہی ہماری آیتوں کے بارے میں شرارت کرنے لگتے ہیں (یعنی ان سے اعراض کرتے ہیں اور ان کے ساتھ تکذیب واستہزا سے پیش آتے ہیں اور براہ اعتراض وعناد دوسرے معجزات کی فرمائشیں کرتے ہیں اور گذشتہ مصیبت سے عبرت نہیں پکڑتے، پس معلوم ہوا کہ ان کے اعتراض کا اصل سبب اللہ کی نازل کردہ آیات ومعجزات سے اعراض ہے اور یہ اعراض دنیا کی نعمتوں میں مست ہوجانے سے پیدا ہوا ہے، آگے وعید ہے کہ) آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس شرارت کی سزا بہت جلد دے گا، بالیقین ہمارے فرشتے تمہاری سب شرارتوں کو لکھ رہے ہیں (پس علم الٰہی میں محفوظ ہونے کے علاوہ دفتر میں بھی محفوظ ہیں)۔

* * *

**فائدہ**: اہل مکہ پر حق تعالیٰ نے سات سال کا قحط مسلط کیا، جب ہلاکت کے قریب پہنچ گئے تو گھبرا کر حضور ﷺ سے دعاء کی درخواست

کی اور وعدہ کیا کہ یہ عذاب اٹھ جائے تو ہم ایمان لے آئیں گے آپ ﷺ کی دعاء سے خدا نے سماں کر دیا، قحط کی بلاء دور ہوئی تو پھر وہی شرارتیں کرنے لگے، خدا کی آیتوں کو جھٹلاتے اور اس کی قدرت ورحمت پر نظر نہ رکھتے، بلکہ انعامات الٰہیہ کو ظاہری اسباب وحیل اور محض بے اصل خیالات واوہام کی طرف نسبت کرنے لگتے، اس کا جواب دیا کہ اچھا تم خوب مکروفریب اور حیلہ بازی کر لو، مگر یہ یادر ہے کہ تمہاری حیلہ بازیاں ایک ایک کر کے لکھی جا رہی ہیں، وہ سارا دفتر قیامت کے دن تمہارے سامنے رکھ دیا جائے گا، پھر جب تمہاری کوئی حیلہ بازی فرشتوں سے مخفی نہیں، خدا کے علم محیط سے کہاں باہر رہ سکتی ہے، تم اپنے مکروحیلہ سازی پر مغرور ہو، حالانکہ خدا کا جوابی مکر (تدبیر خفی) تمہارے مکروتدبیر سے کہیں تیز اور سریع الاثر ہے وہ مجرم کی باگ اتنی ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے کہ مجرم کو نشہ غفلت میں چور ہو کر سزا کا تصور بھی نہیں آتا، جب پیمانہ شقاوت لبریز ہو جاتا ہے تو دفعتًا پکڑ کر ٹینٹوا دبا دیتا ہے، لہٰذا عاقل کو چاہیے کہ خدا کی نرمی، بردباری اور خوش کن حالات کو دیکھ کر مغرور نہ ہو، نہ معلوم نرمی کے بعد کیسی سخت آنے والی ہے، جیسے آگے بحری سفر کی مثال میں بیان فرمایا، حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ سختی کے وقت آدمی کی نظر اسباب سے اٹھ کر صرف اللہ پر رہتی ہے، جہاں سخت گھڑی گزری اور کام بن گیا پھر خدا کو بھول کر اسباب پر آرہتا ہے، ڈرتا نہیں کہ خدا پھر ویسی ہی تکلیف اور سختی کا ایک سبب کھڑا کر دے، اسی کے ہاتھ میں سب اسباب کی باگ ہے، چنانچہ آگے دریائی سفر کی مثال میں اس کی ایک صورت بیان فرمائی۔

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ

وہی تم کو پھراتا ہے جنگل اور دریا میں، یہاں تک کہ جب تم بیٹھے کشتیوں میں، اور لے کر چلیں وہ لوگوں کو اچھی ہوا سے

وَّفَرِحُوْا بِهَا جَاۗءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَاۗءَھُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّھُمْ اُحِيْطَ

اور خوش ہوئے اس سے آئی کشتیوں پر ہوا تند اور آئی ان پر، موج ہر جگہ سے اور جان لیا انہوں نے کہ وہ گھر

بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ لَىِٕنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿22﴾

گئے، پکارنے لگے اللہ کو خالص ہو کر اس کی بندگی میں، اگر تو نے بچا لیا ہم کو اس سے تو بیشک ہم رہیں گے شکر گزار

**خلاصہ تفسیر**: (اب پھر توحید کا بیان ہے) وہ (اللہ) ایسا ہے کہ تم کو خشکی اور دریا میں لئے لئے پھرتا ہے (یعنی جن آلات و اسباب سے تم چلتے پھرتے ہو وہ سب اللہ ہی کے دیئے ہوئے ہیں) یہاں تک کہ (بعض اوقات) جب تم کشتی میں سوار ہوتے ہو، اور وہ کشتیاں لوگوں کو موافق ہوا کے ذریعہ سے لے کر چلتی ہیں اور وہ لوگ ان (کی رفتار) سے خوش ہوتے ہیں (اسی حالت میں اچانک دفعۃً) ان پر ایک جھونکا (مخالف) ہوا کا آتا ہے اور ہر طرف سے ان (لوگوں) پر موجیں اٹھی چلی آتی ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ (بری طرح) گھر گئے (اس وقت) سب خالص اعتقاد کر کے اللہ ہی کو پکارنے لگتے ہیں (کہ اے اللہ!) اگر آپ ہم کو اس (مصیبت) سے بچالیں تو ہم ضرور حق شناس (یعنی موحد) بن جائیں (یعنی اس وقت جیسا توحید کا اعتقاد ہو گیا ہے اس پر قائم رہیں)۔

دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ: روح المعانی میں ہے کہ ''اس زمانہ میں اکثر لوگوں کا یہ حال ہے کہ ایسے وقت میں بھی بزرگوں کو ہی پکارتے ہیں''، تو اس حیثیت سے یہ لوگ ان مشرکین سے بھی زیادہ قابل افسوس ہوئے جو مصیبت کے وقت خاص اللہ کو پکارتے تھے۔

فَلَمَّآ اَنْجٰىھُمْ اِذَا ھُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ يٰٓاَيُّھَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓي

پھر جب بچا دیا ان کو اللہ نے لگے شرارت کرنے اسی وقت زمین میں ناحق کی ؁ سنو لوگوں تمہاری شرارت ہے

اَنۡفُسِكُمۡ ۙ مَّتَاعَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ ثُمَّ اِلَيۡنَا مَرۡجِعُكُمۡ فَنُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۳﴾

تمہی پر، نفع اٹھالو دنیا کی زندگانی کا، پھر ہمارے پاس ہے تم کو لوٹ کر آنا پھر ہم بتلا دیں گے جو کچھ کہ تم کرتے تھے ۲؎

**خلاصه تفسیر:** پھر جب اللہ تعالیٰ ان کو (اس مہلک سے) بچالیتا ہے تو فوراً ہی وہ زمین (کے مختلف خطوں) میں ناحق کی سرکشی کرنے لگتے ہیں (یعنی وہی شرک و معصیت) اے لوگو! (سن لو) یہ تمہاری سرکشی تمہارے لئے وبال (جان) ہونے والی ہے (بس) دنیوی زندگی میں (چندے اس سے) فائدہ اٹھا رہے ہو، پھر ہمارے پاس تم کو آنا ہے، پھر ہم سب تمہارا کیا ہوا تم کو جتلا دیں گے (اور اس کی سزا دیں گے)۔

* * *

**فائده:** ۱؎ یعنی ابتداء میں ہوا خوشگوار اور موافق تھی، مسافر ہنستے کھیلتے آرام سے چلے جا رہے تھے کہ یکا یک ایک زور کا طوفانی جھکڑ چلنے لگا اور چاروں طرف سے پانی کے پہاڑ اٹھ کر کشتی (یا جہاز) سے ٹکرانے لگے، جب سمجھ لیا کہ ہر طرف سے موت کے منہ میں گھرے ہوئے ہیں، بھاگنے اور نکلنے کی کوئی سبیل نہیں، تو سارے فرضی معبودوں کو چھوڑ کر خدائے واحد کو پکارنے لگے جو اصل فطرت انسانی کا تقاضا تھا، ہر چیز سے مایوس ہو کر خالص خدا کی بندگی اختیار کی اور بڑے پکے عہد و پیمان باندھے کہ اگر مصیبت سے خدا نے نجات دی تو ہمیشہ اس کے شکر گذار رہیں گے، کوئی بات کفران نعمت کی نہ کریں گےلیکن جہاں ذرا امن نصیب ہوا ساحل پر قدم رکھتے ہی شرارتیں اور ملک میں اودھم مچانا شروع کر دیا، تھوڑی دیر بھی عہد پر قائم نہ رہے۔

**تنبیه:** اس آیت میں ان مدعیان اسلام کے لیے بڑی عبرت ہے جو جہاز کے طوفان میں گھر جانے کے وقت بھی خدائے واحد کو چھوڑ کر غیر اللہ کو مدد کے لیے پکارتے ہیں، فتح مکہ کے بعد ابوجہل کا بیٹا عکرمہ مسلمان نہ ہوا تھا، مکہ سے بھاگ کر بحری سفر اختیار کیا، تھوڑی دور جا کر کشتی کو طوفانی ہواؤں نے گھیر لیا، ناخدا نے مسافروں سے کہا کہ ایک خدا کو پکارو، یہاں تمہارے معبود کچھ کام نہ دیں گے، عکرمہ نے کہا کہ یہ ہی تو وہ خدا ہے جس کی طرف محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم کو بلاتے ہیں، اگر دریا میں رب محمد کے بدون نجات نہیں مل سکتی تو خشکی میں بھی اس کی دستگیری اور اعانت کے بغیر نجات پانا محال ہے، اے خدا! اگر تو نے اس مصیبت سے نکال دیا تو میں واپس ہو کر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ میں ہاتھ دوں گا، مجھے امید ہے کہ وہ اپنے اخلاق کریمہ سے میری تقصیرات کو معاف فرمائیں گے، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف با اسلام ہوئے، رضی اللہ عنہ۔

**فائده:** ۲؎ یعنی تمہاری شرارت کا وبال تمہیں پڑے گا، اگر چند روز شرارتیں کر کے فرض کرو کچھ دنیا کا نفع حاصل کر ہی لیا تو انجام کار پھر خدا کی طرف لوٹنا ہے، وہاں تمہارا سب کیا دھرا آگے آئے گا، خداوند رب العزت سزا دے کر بتلا دے گا کہ تمہارے کرتوت کیسے تھے۔

اِنَّمَا مَثَلُ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا كَمَآءٍ اَنۡزَلۡنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخۡتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الۡاَرۡضِ مِمَّا يَاۡكُلُ

دنیا کی زندگانی کی وہی مثل ہے جیسے ہم نے پانی اتارا آسمان سے پھر رلا ملا نکلا اس سے سبزہ زمین کا جو کہ کھائیں

النَّاسُ وَالۡاَنۡعَامُ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذَتِ الۡاَرۡضُ زُخۡرُفَهَا وَازَّيَّنَتۡ وَظَنَّ اَهۡلُهَاۤ

آدمی اور جانور ۱؎ یہاں تک کہ جب پکڑی زمین نے رونق اور مزین ہوگئی اور خیال کیا زمین والوں نے

اَنَّهُمۡ قٰدِرُوۡنَ عَلَيۡهَاۤ ۙ اَتٰٮهَاۤ اَمۡرُنَا لَيۡلًا اَوۡ نَهَارًا فَجَعَلۡنٰهَا حَصِيۡدًا كَاَنۡ لَّمۡ تَغۡنَ بِالۡاَمۡسِ ؕ

کہ یہ ہمارے ہاتھ لگے گی ۲؎ ناگاہ پہنچا اس پر ہمارا حکم رات کو یا دن کو پھر کر ڈالا اس کو کاٹ کر ڈھیر گویا کل یہاں نہ تھی آبادی

كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّتَفَكَّرُوۡنَ ﴿۲۴﴾

اسی طرح ہم کھول کر بیان کرتے ہیں نشانیوں کو ان لوگوں کے سامنے جو غور کرتے ہیں ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے فرمایا تھا کہ کفر و معاصی کے ساتھ یہ تمہاری دنیا میں راحت وکامیابی چندروزہ ہے، پھر آخرت میں سزا بھگتنی ہے، اب آگے دنیا دنیا کا فانی ہونا اور آخرت کی جزا وسزا کا باقی ہونا تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

بس دنیوی زندگی کی حالت تو ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس (پانی) سے زمین کی نباتات جن کو آدمی اور چوپائے کھاتے ہیں خوب گنجان ہو کر نکلے، یہاں تک کہ جب وہ زمین اپنی رونق کا پورا حصہ لے چکی اور اس کی خوب زیبائش ہوگئی (یعنی سبزہ سے خوش نما معلوم ہونے لگی) اور اس (زمین) کے مالکوں نے سمجھ لیا کہ اب ہم اس (کے نباتات پھلوں) پر بالکل قابض ہو چکے تو (ایسی حالت میں) دن میں یا رات میں اس پر ہماری طرف سے کوئی حادثہ آپڑا (جیسے پالا یا خشکی یا اور کچھ) سو ہم نے اس کو ایسا صاف کر دیا کہ گویا کل (یہاں) وہ موجود ہی نہ تھی (پس اسی نباتات ہی کی طرح دنیوی زندگی ہے) ہم اس طرح آیات کو صاف صاف بیان کرتے ہیں ایسے لوگوں کے (سمجھانے کے) لئے جو سوچتے ہیں (سو دنیا تو دار الزوال ٹھہری)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ: بعض نے فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ کے معنی کثرت پیداوار کے لیے ہیں، کیونکہ جب زمین کی پیداوار زیادہ قوی ہوتی ہے تو گنجان ہو کر ایک جز دوسرے سے مل جاتا اور لپٹ جاتا ہے، بعض نے بہ کی "ب" کو مصاحبت کے لیے لے کر یہ معنی کیے ہیں کہ زمین کا سبزہ پانی کے ساتھ رل مل جاتا ہے، کیونکہ نباتات اجزائے مائیہ کو اپنے اندر جذب کرتے ہیں، جس طرح کھانا انسان کا جزو بدن بنتا ہے، ایسے ہی پانی، گویا نباتات کی غذا بنتی ہے، مترجم رحمہ اللہ کے صنیع سے مترشح ہوتا ہے کہ اختلاط سے یہ مراد لے رہے ہیں کہ زمین اور پانی کے ملنے سے جو سبزہ نکلتا ہے اس میں آدمی کی اور جانوروں کی خوراک مخلوط (رلی ملی) ہوتی ہے، مثلاً گیہوں کے درخت میں دانہ ہے جو انسان کی غذا بنتی ہے اور بھوسہ بھی ہے جو جانوروں کی خوراک ہے، اسی طرح درختوں میں پھل اور پتے لگتے ہیں جن میں سے ہر ایک کے کھانے والے علیحدہ ہیں۔

**فائدہ:** ۲ وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَادِرُونَ عَلَيْهَا: یعنی مختلف الوان و اشکال کی نباتات میں زمین کو پر رونق اور مزین کر دیا اور کھیتی وغیرہ ایسی تیار ہوگئی کہ مالکوں کو کامل بھروسہ ہوگیا کہ اب اس سے پورا فائدہ اٹھانے کا وقت آگیا ہے۔

**فائدہ:** ۳ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ: یعنی ناگہاں خدا کے حکم سے دن میں یا رات میں کوئی آفت پہنچی (مثلاً بگولا آگیا، یا اولے پڑ گئے یا ٹڈی دل پہنچ گیا، وعلیٰ ہذا القیاس) اس نے تمام زراعت کا ایسا صفایا کر ڈالا، گویا کبھی یہاں ایک تنکا بھی نہ اُگا تھا، ٹھیک اسی طرح حیات دنیا کی مثال سمجھ لو کہ خواہ کتنی ہی حسین وتروتازہ نظر آئے، حتیٰ کہ بیوقوف لوگ اس کی رونق ودلربائی پر مفتون ہو کر اصلی حقیقت کو فراموش کر دیں لیکن اس کی یہ شادابی اور زینت وبہجت محض چندہ روزہ ہے جو بہت جلد زوال وفناء کے ہاتھوں نسیاً منسیاً ہو جائے گی، حضرت شاہ صاحب نے اس مثال کو نہایت لطیف طرز میں خاص انسانی حیات پر منطبق کیا ہے یعنی پانی کی طرح روح آسمان (عالم بالا) سے آئی، کالبد خاکی میں مل کر قوت پکڑی، دونوں کے ملنے سے آدمی بنا، پھر کام کیے انسانی اور حیوانی دونوں طرح کے، جب ہر ہنر میں پورا ہوا اور اس کے متعلقین کو اس پر بھروسہ ہوگیا، ناگہاں موت آپہنچی، جس نے ایک دم میں سارا بنا بنایا کھیل ختم کر دیا، پھر ایسا بے نام نشان ہوا گویا کبھی زمین پر آباد ہی نہ ہوا تھا۔

**فائدہ:** لَيْلًا أَوْ نَهَارًا (رات کو یا دن کو) شاید اس لیے فرمایا کہ رات کا وقت غفلت کا ہے اور دن میں لوگ عموماً بیدار ہوتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ جب خدا کا حکم آپہنچے، پھر سوتا ہو یا جاگتا، غافل ہو یا بیدار کوئی شخص کسی حالت میں اس کو روک نہیں سکتا۔

وَاللَّهُ يَدْعُوا إِلَىٰ دَارِ السَّلَامِ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٢٥﴾

اور اللہ بلاتا ہے سلامتی کے گھر کی طرف، اور دکھلاتا ہے جس کو چاہے راستہ سیدھا

**خلاصہ تفسیر:** اور اللہ تعالیٰ دار البقاء کی طرف تم کو بلاتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے راہ راست پر چلنے کی توفیق دے دیتا ہے (جس

سے دارالبقاء تک رسائی ہوسکتی ہے)۔

فائدہ: یعنی دنیا کی زائل وفانی زندگی پر مت ریجھو، دارالسلام (جنت) کی طرف آؤ، خدا تم کو سلامتی کے گھر کی طرف بلا رہا ہے اور وہاں تک پہنچنے کا راستہ بھی دکھلا تا رہا ہے، وہ ہی گھر ہے جہاں کے رہنے والے ہر قسم کے رنج و غم، پریشانی، تکلیف، نقصان، آفت اور فنا وزوال وغیرہ سے صحیح و سالم رہیں گے، فرشتے ان کو سلام کریں گے، خود رب العزت کی طرف سے تحفہ سلام پہنچے گا۔

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ؕ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ

جنہوں نے کی بھلائی ان کے لیے ہے بھلائی اور زیادتی ۱ے اور نہ چڑھے گی ان کے منہ پر سیاہی اور نہ رسوائی، وہ ہیں جنت والے

هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۶﴾

وہ اسی میں رہا کریں گے ۲ے

خلاصہ تفسیر: (اب جزا و سزا کا بیان ہے کہ) جن لوگوں نے نیکی کی ہے (یعنی ایمان لائے ہیں) ان کے واسطے خوبی (یعنی جنت) ہے، اور مزید براں (خدا کا دیدار) بھی، اوران کے چہروں پر نہ کدورت (غم کی) چھائے گی اور نہ ذلت، یہ لوگ جنت میں رہنے والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ: مسلم کی حدیث میں زِيَادَةٌ کی تفسیر رؤیت باری تعالی سے آئی ہے، یعنی جنت میں اللہ تعالی کا دیدار، اور اس کو زِيَادَةٌ فرمانا اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ تمام اخروی نعمتوں سے افضل ہے، کیونکہ یہ ایسی نعمت ہے کہ اسکے سامنے تمام نعمتوں کی کچھ حقیقت نہیں۔

فائدہ: ۱ے بھلے کام کرنے والوں کو وہاں بھلی جگہ ملے گی (یعنی جنت) اور اس سے زیادہ بھی کچھ ملے گا، یعنی حق تعالیٰ کی رضاء اور اس کا دیدار زیادۃ کی تفسیر "دیدار مبارک" سے کئی احادیث صحیحہ میں وارد ہوئی ہے اور بہت سے صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم سے منقول ہے، حضرت صہیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا کہ جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں داخل ہو چکیں گے تو ایک پکارنے والا پکارے گا: "اے اہل جنت! تمہارے لیے ایک وعدہ خدا کا باقی ہے جواب پورا کرنا چاہتا ہے، جنتی کہیں گے کہ وہ کیا ہے؟ کیا خدا نے اپنے فضل سے ہماری حسنات کا پلہ بھاری نہیں کر دیا، کیا اس نے ہمارے چہروں کو سفید اور نورانی نہیں بنایا؟ کیا اس نے ہم کو دوزخ سے بچا کر جنت جیسے مقام میں نہیں پہنچایا؟ (یہ سب کچھ تو ہو چکا، آگے کون سی چیز باقی رہی) اس پر حجاب اٹھا دیا جائے گا، اور جنتی حق تعالی کی طرف نظر کریں گے، پس خدا کی قسم کوئی نعمت جو ان کو عطا ہوئی ہے دولت دیدار سے زیادہ محبوب نہ ہوگی نہ اس سے بڑھ کر کوئی چیز ان کی آنکھیں ٹھنڈی کر سکے گی"، رزقنا اللہ سبحانہ، وتعالیٰ بمنہ وفضلہ۔

فائدہ: ۲ے یعنی عرصات محشر میں جو جس طرح کفار فجار کے چہروں پر سخت ذلت وظلمت چھائی ہوگی، جنتیوں کے چہرے اس کے خلاف ہوں گے، سیاہی اور رسوائی کیسی وہاں تو نور ہی نور اور رونق ہی رونق ہوگی۔

وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ

اور جنہوں نے کمائیں برائیاں بدلہ ملے برائی کا اس کے برابر ۱ے اور ڈھانک لے گی ان کو رسوائی، کوئی نہیں ان کو اللہ سے بچانے والا

كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷﴾

گویا کہ ڈھانک دیئے گئے ان کے چہرے اندھیری رات کے ٹکڑوں سے ۲ے وہ ہیں دوزخ والے، وہ اسی میں رہا کریں گے

**خلاصہ تفسیر:** اور جن لوگوں نے بدکام کئے (یعنی کفر وشرک کیا) ان کی بدی کی سزا اُس کے برابر ملے گی (بدی سے زیادہ نہ ہوگی) اور ان کو ذلت چھا لے گی، ان کو اللہ (کے عذاب) سے کوئی نہ بچا سکے گا (ان کے چہروں کی کدورت کی ایسی حالت ہوگی کہ) گویا ان کے چہروں پر اندھیری رات کے پرت کے پرت (یعنی ٹکڑے) لپیٹ دیئے گئے ہیں، یہ لوگ دوزخ میں رہنے والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی بدی سے زائد نہ ہوگا، کم سزا دیں یا بعض برائیوں کو بالکل معاف کر دیں ان کو اختیار ہے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی ان کے چہرے اس قدر سیاہ و تاریک ہوں گے گویا اندھیری رات کی تہیں ان پر جما دی گئی ہیں (اعاذنا اللہ منہا)۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنْتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا

اور جس دن جمع کریں گے ہم ان سب کو پھر کہیں گے شرک کرنے والوں کو کھڑے ہو اپنی اپنی جگہ تم اور تمہارے شریک ۱ پھر تڑوا دیں گے ہم

بَيْنَهُمْ ۖ وَقَالَ شُرَكَاؤُهُمْ مَا كُنْتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُونَ ﴿٢٨﴾ فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ

آپس میں ان کو اور کہیں گے ان کے شریک تم ہماری تو بندگی نہ کرتے تھے، سو اللہ کافی ہے شاہد ہمارے اور تمہارے بیچ میں

إِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغَافِلِينَ ﴿٢٩﴾

ہم کو تمہاری بندگی کی خبر نہ تھی ۲

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے مشرکین کے حق میں فرمایا تھا کہ ان کو خدا کے عذاب سے کوئی نہ بچا سکے گا، چونکہ مشرکین اپنے معبودوں کو اپنا شفیع کہتے تھے، اس لیے اب ان معبودین کا قیامت میں ان عبادت کرنے والوں سے بے تعلقی ظاہر کرنا بیان فرماتے ہیں جس سے یہ بات لازم آ گئی کہ وہ کچھ نفع نہیں دے سکتے۔

اور وہ دن بھی قابل ذکر ہے جس روز ہم ان سب (مخلوقات) کو (میدان قیامت میں) جمع کریں گے، پھر (من جملہ ان تمام مخلوقات کے) مشرکین سے کہیں گے کہ تم اور تمہارے (تجویز کئے ہوئے) شریک (جن کو تم عبادت میں خدا کا شریک ٹھہراتے تھے ذرا) اپنی جگہ ٹھہرو (تاکہ تمہیں تمہارے عقیدہ کی حقیقت معلوم کرائی جائے) پھر ہم ان (عابدین ومعبودین) کی آپس میں پھوٹ ڈال دیں گے اور ان کے وہ شرکاء (ان سے خطاب کر کے) کہیں گے کہ تم ہماری عبادت نہیں کرتے تھے (کیونکہ عبادت سے مقصود معبود کا راضی کرنا ہوتا ہے) سو ہمارے تمہارے درمیان خدا کافی گواہ ہے کہ ہم کو تمہاری عبادت کی خبر بھی نہ تھی (اور راضی ہونا تو درکنار البتہ شیاطین کی تعلیم تھی اور وہی راضی تھے، پس اس اعتبار سے تم ان کی پرستش کرتے تھے، جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا: بل کانوا یعبدون الجن کہ یہ تو جنوں کی عبادت کرتے تھے)۔

**وَقَالَ شُرَكَاؤُهُمْ مَا كُنْتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُونَ:** اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ کیا بت بھی بولیں گے؟ تو جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی محال نہیں، اور ان کا غافل ہونا ان کی عبادت سے ظاہر ہے، کیونکہ ظاہر ہے کہ یہاں بتوں کو ایسا شعور نہیں ہے، اور اگر یہ مضمون دوسرے معبودین ملائکہ وغیرہ کو بھی عام لیا جائے تو ان کا غافل ہونا بھی صحیح ہے، کیونکہ ملائکہ وغیرہ کا علم سب باتوں کو محیط نہیں، سب اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی جن کو تم نے اپنے خیال میں خدا کا شریک ٹھہرا رکھا تھا، یا جن کو خدا کے بیٹے بیٹیاں کہتے تھے، مثلاً مسیح علیہ السلام جو نصاریٰ کے نزدیک "ابن اللہ" بلکہ "عین اللہ" تھے یا "ملائکۃ اللہ" یا "احبار و رُہبان" کہ انہیں بھی ایک حیثیت سے خدائی کا منصب دے رکھا تھا، یا اصنام و اوثان جن پر مشرکین مکہ نے خدائی کے اختیارات تقسیم کر رکھے تھے، سب کو حسب مراتب اپنی اپنی جگہ کھڑے ہونے کا حکم ہوگا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اسی وقت عجیب افراتفری اور نفسی نفسی ہوگی، عابدین ومعبودین میں جدائی پڑ جائے گی اور دنیا میں اپنے اوہام وخیالات کے موافق جو رشتے جوڑ رکھے تھے، سب توڑ دیے جائیں گے، اس ہولناک وقت میں جبکہ مشرکین کو اپنے فرضی معبودوں سے بہت کچھ توقعات تھیں، وہ صاف جواب دے دیں گے کہ تمہارا ہم سے کیا تعلق، تم جھوٹ بکتے ہو کہ ہماری بندگی کرتے تھے (تم اپنے عقیدہ کے موافق جس چیز کو پوجتے تھے اس کے لیے وہ خدائی صفات تجویز کرتے تھے، جو فی الواقع اس میں موجود نہیں تھیں تو حقیقت میں وہ عبادت اور بندگی واقعی ''مسیح'' یا ''ملائکہ'' کی نہ ہوئی اور نہ حقیقت میں بے جان مورتیوں کی پوجا تھی، محض اپنے خیال اور وہم یا شیطان لعین کی پرستش کو فرشتے یا نبی یا نیک انسان یا کسی تصویر وغیرہ کے نامزد کردیتے تھے) خدا گواہ ہے کہ ہماری رضا یا اذن سے تم نے یہ حرکت نہیں کی، ہم کو کیا خبر تھی کہ انتہائی حماقت وسفاہت سے خدا کے مقابلہ میں ہمیں معبود بنا ڈالو گے۔

تنبیہ: یہ گفتگو اگر حضرت مسیح وغیرہ ذوی العقول مخلوق کی طرف سے مانی جائے تو کوئی اشکال نہیں، اور ''اصنام'' (بتوں) کی جانب سے ہو تو کچھ بعید نہیں کہ حق تعالیٰ مشرکین کی انتہائی مایوسی اور حسرت ناک درماندگی کے اظہار کے لیے اپنی قدرت کاملہ سے پتھر کی مورتیوں کو گویا کر دے: قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (فصلت:۲۱)

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ

وہاں جانچ لے گا ہر کوئی جو اس نے پہلے کیا تھا اور رجوع کریں گے اللہ کی طرف جو سچا مالک ہے ان کا اور جاتا رہے گا ان کے پاس سے

مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ؀۳۰ ع

جو جھوٹ باندھا کرتے تھے

خلاصہ تفسیر: اس مقام پر ہر شخص اپنے اگلے کئے ہوئے کاموں کا امتحان کرلے گا (کہ آیا واقع میں یہ اعمال نافع تھے یا نہیں، چنانچہ ان مشرکین کو بھی حقیقت کھل جائے گی کہ جن کی شفاعت کے بھروسے ہم ان کو پوجتے تھے، انہوں نے بھی الٹی ہمارے خلاف شہادت دی! نفع کی تو کیا امید کی جائے) اور یہ لوگ اللہ (کے عذاب) کی طرف جو ان کا مالک حقیقی ہے لوٹائے جائیں گے، اور جو کچھ معبود تراش رکھے تھے سب ان سے غائب (اور گم) ہوجائیں گے (کوئی بھی تو کام نہ آئے گا)۔

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ: یہ جو فرمایا کہ اس وقت امتحان کرلے گا مطلب یہ ہے کہ اس وقت اچھی طرح علم ہوجائے گا، ورنہ مطلق علم تو مرنے کے ساتھ ہی نیز قبر میں حاصل ہوجائے گا۔

وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ: یہاں کفار کا اللہ تعالیٰ کو ''مولیٰ'' فرمادینا ''مالکیت'' کے معنی کے اعتبار سے ہے، اور لا مولیٰ لھم میں اس کی نفی کرنا محب وناصر کے معنی کے اعتبار سے ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی جھوٹے اور بے اصل توہمات سب رفو چکر ہوجائیں گے، ہر شخص بہ رایٔ العین مشاہدہ کرلے گا کہ اس سچے مالک کے سوا رجوع کرنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں، اور ہر ایک انسان کو اپنے تمام برے بھلے اعمال کا اندازہ ہوجائے گا کہ کتنا وزن رکھتے ہیں۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ

تو پوچھ کون روزی دیتا ہے تم کو آسمان سے اور زمین سے ۱؎ یا کون مالک ہے کان اور آنکھوں کا ۲؎ اور کون نکالتا ہے زندہ کو

الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ۭ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ؀۳۱

مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے ۳؎ اور کون تدبیر کرتا ہے کاموں کی ۴؎ سو بول اٹھیں گے کہ اللہ تو تو کہہ پھر ڈرتے نہیں ہو

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے کئی آیتوں میں توحید کا اثبات اور شرک کا ابطال ہے، اب پھر یہی مضمون ہے۔

آپ (ان مشرکین سے) کہئے کہ (بتلاؤ) وہ کون ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق پہنچاتا ہے (یعنی آسمان سے بارش برساتا ہے اور زمین سے نباتات پیدا کرتا ہے جس سے تمہارا رزق تیار ہوتا ہے) یا (یہ بتلاؤ کہ) وہ کون ہے جو (تمہارے) کانوں اور آنکھوں پر پورا اختیار رکھتا ہے (کہ پیدا بھی اسی نے کیا، حفاظت بھی وہی کرتا ہے اور اگر چاہتا ہے تو ان پر آفت بھیج دیتا ہے) اور وہ کون ہے جو جاندار (چیز) کو بے جان (چیز) سے نکالتا ہے اور بے جان (چیز) کو جاندار (چیز) سے نکالتا ہے (جیسے نطفہ اور انڈا کہ وہ جاندار سے نکلتا ہے اور اس سے جاندار پیدا ہوتا ہے) اور وہ کون ہے جو تمام کاموں کی تدبیر کرتا ہے (ان سے سوالات کیجئے) سو ضرور وہ (جواب میں) یہی کہیں گے کہ (ان سب افعال کا فاعل) اللہ (ہے) تو ان سے کہئے کہ پھر (شرک سے) کیوں نہیں پرہیز کرتے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ ﴿قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾: آسمان کی طرف سے بارش اور حرارت شمس وغیرہ پہنچتی ہے اور زمینی مواد اس کے ساتھ ملتے ہیں تب انسان کی روزی مہیا ہوتی ہے۔

**فائدہ:** ۲ ﴿اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ﴾: یعنی ایسے عجیب وغریب محیر العقول طریقہ سے کس نے کان اور آنکھ پیدا کی، پھر ان کی حفاظت کا سامان کیا، کون ہے جو ان تمام قوائے انسانی کا حقیقی مالک ہے کہ جب چاہے عطا فرمادے اور جب چاہے چھین لے۔

**فائدہ:** ۳ ﴿وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ﴾: مثلاً ''نطفہ'' یا ''بیضہ'' سے جاندار کو، پھر جاندار سے نطفہ اور بیضہ کو نکالتا ہے، یا روحانی اور معنوی طور پر جو شخص یا قوم مردہ ہوچکی اس میں سے زندہ دل افراد پیدا کرتا ہے اور زندہ قوموں کے اخلاف پر ان کی بدبختی سے موت طاری کر دیتا ہے۔

**فائدہ:** ۴ ﴿وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ﴾: یعنی دنیا کے تمام کاموں کی تدبیر وانتظام کون کرتا ہے۔

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚۖ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾

سو یہ اللہ ہے رب تمہارا سچا، پھر کیا رہ گیا سچ کے پیچھے مگر بھٹکنا، سو کہاں سے لوٹے جاتے ہو

**خلاصہ تفسیر:** سو (جس کے یہ افعال واوصاف مذکور ہوئے) یہ ہے اللہ جو تمہارا رب حقیقی ہے (اور جب امر حق ثابت ہوگیا) پھر (امر) حق کے بعد اور کیا رہ گیا بجز گمراہی کے (یعنی جو امر حق کی ضد ہوگی وہ گمراہی ہے اور توحید کا حق ہونا ثابت ہوگیا، پس شرک یقیناً گمراہی ہے) پھر (حق کو چھوڑ کر) کہاں (باطل کی طرف) پھرے جاتے ہو۔

﴿فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ﴾: سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حق اور ضلال کے درمیان کوئی واسطہ نہیں، جو حق نہیں ہوگا وہ ضلال وگمراہی میں داخل ہوگا، ایسا کوئی کام نہیں ہوسکتا جو نہ حق ہو نہ گمراہی، اور یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ دو متضاد چیزیں حق ہوں، تمام اصول عقائد میں یہ قاعدہ جمہور امت کے نزدیک مسلم ہے، البتہ جزئی مسائل اور جزئیات فقہیہ میں علماء کا اختلاف ہے، بعض حضرات کے نزدیک اجتہادی مسائل میں دونوں جانبوں کو حق کہا جائے گا اور جمہور اس پر متفق ہیں کہ اجتہادی مسائل میں جانب خلاف کو ضلال وگمراہی نہیں کہہ سکتے۔

* * *

**فائدہ:** مشرکین کو بھی اعتراف تھا کہ یہ امور کلیہ اور عظیم الشان کام اللہ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا، اس لیے فرمایا کہ جب اصل خالق ومالک اور تمام عالم کا مدبر اسی کو مانتے ہو، پھر ڈرتے نہیں کہ اس کے سوا دوسروں کو معبود بناؤ، معبود تو وہ ہی ہونا چاہیے، جو خالق کل، مالک الملک، رب مطلق اور متصرف علی الاطلاق ہو، اس کا اقرار کر کے کہاں الٹے پاؤں واپس جارہے ہو، جب سچا وہ ہی ہے تو سچ کے بعد بجز جھوٹ کے کیا رہ گیا، سچ کو چھوڑ کر جھوٹے اوہام میں بھٹکنا عاقل کا کام نہیں ہوسکتا۔

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾

اسی طرح ٹھیک آئی بات تیرے رب کی ان نافرمانوں پر کہ یہ ایمان نہ لائیں گے

**خلاصہ تفسیر:** (آگے تسلی ہے رسول اللہ ﷺ کی کہ ان لوگوں کی باطل پرستی پر مغموم ہوا کرتے تھے، ارشاد ہے کہ جس طرح یہ لوگ ایمان نہیں لاتے) اسی طرح آپ کے رب کی یہ (ازلی) بات کہ یہ ایمان نہ لائیں گے تمام متمرد (سرکش) لوگوں کے حق میں ثابت ہو چکی ہے (یعنی جس طرح یہ لوگ ایمان نہیں لاتے، اسی طرح ہمیشہ سے سرکشوں کا یہی حال ہے، پھر آپ کیوں مغموم ہوں)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی اللہ نے ازل سے ان متمرد سرکشوں کی قسمت میں ایمان نہیں لکھا، جس کا سبب علم الٰہی میں ان کی سرکشی اور نافرمانی ہے، اس طرح خدا کی لکھی ہوئی بات ان پر فسق و نافرمانی کی وجہ سے راست آئی۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ

پوچھ کوئی ہے تمہارے شریکوں میں جو پیدا کرے خلق کو پھر دوبارہ زندہ کرے، تو کہہ اللہ پہلے پیدا کرتا ہے پھر اس کو دہرائے گا

فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۴﴾

سو کہاں سے پلٹے جاتے ہو

**خلاصہ تفسیر:** (اور) آپ (ان سے) یوں (بھی) کہئے کہ کیا تمہارے (تجویز کئے ہوئے) شرکاء میں (عام اس سے کہ ذوی العقول ہوں جیسے شیاطین یا غیر ذوی العقول جیسے بت) کوئی ایسا ہے جو پہلی بار بھی (مخلوق کو) پیدا کرے، پھر (قیامت میں) دوبارہ بھی پیدا کرے (اگر وہ اس وجہ سے کہ ان کے شرکاء کی توہین ہے کہ یوں کہا جائے کہ ان میں کوئی ایسا نہیں اس لیے وہ جواب میں تامل کریں تو) آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی پہلی بار بھی پیدا کرتا ہے، پھر وہی دوبارہ بھی پیدا کرے گا، سو (اس کی تحقیق کے بعد بھی) پھر تم کہاں (حق سے) پھرے جاتے ہو۔

**هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ:** مشرکین سے یہ سوال کیوں ہوا حالانکہ وہ خود دوبارہ زندہ ہونے کے قائل نہ تھے؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ دوبارہ زندہ ہونے پر چونکہ قطعی دلائل قائم ہو چکے ہیں، اس لیے اس کو مسلمات میں سے قرار دے کر یہ گفتگو کی گئی۔

* * *

**فائدہ:** یہاں تک ''مبدأ'' کا ثبوت تھا، اب ''معاد'' کا ذکر ہے، یعنی جب اعتراف کر چکے کہ زمین، آسمان، سمع و بصر، موت و حیات، سب کا پیدا کرنے والا اور تھامنے والا وہ ہی ہے تو ظاہر ہے کہ مخلوق کو مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کرنا اور دوہرا دینا بھی اسی کا فعل ہو سکتا ہے پھر انبیاء علیہم السلام کی زبانی جب وہ خود اس دہرانے کی خبر دیتا ہے تو اس کی تسلیم میں کیا عذر ہے ''مبدأ'' کا اقرار کر کے ''معاد'' کی طرف سے کہاں پلٹے جاتے ہو۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ؕ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ

پوچھ کوئی ہے تمہارے شریکوں میں جو راہ بتلائے صحیح، تو کہہ اللہ راہ بتلاتا ہے صحیح تو اب جو کوئی راہ بتائے صحیح

اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۵﴾

اس کی بات ماننی چاہیے یا اس کی جو آپ نہ پائے راہ مگر جب کوئی اور اس کو راہ بتلائے، سو کیا ہو گیا تم کو، کیسا انصاف کرتے ہو

**خلاصہ تفسیر:** (اور) آپ (ان سے یوں بھی) کہئے کہ کیا تمہارے (تجویز کئے ہوئے ذوی العقول) شرکاء میں (جیسے

شیاطین ) کوئی ایسا ہے کہ امرحق کا راستہ بتلاتا ہو؟ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی امرحق کا راستہ ( بھی ) بتلاتا ہے ( چنانچہ اس نے عقل دی، انبیاء بھیجے، بخلاف شیاطین کے کہ اولا تو وہ ان افعال پر قادر نہیں اور جس کی قدرت بھی ان کو دی گئی ہے یعنی تعلیم دینا اس کو وہ گمراہ کرنے اور بہکانے میں صرف کرتے ہیں ) تو پھر ( ان سے کہئے کہ یہ بتلاؤ کہ ) آیا جو شخص امرحق کا رستہ بتلاتا ہو وہ زیادہ اتباع کے لائق ہے، یا وہ شخص جس کو بے بتلائے خود ہی راستہ نہ سوجھے ( اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ سمجھانے پر بھی اس پر نہ چلے جیسے شیاطین ہیں کہ ان کو ہدایت کا راستہ خود تو کیا معلوم ہوتا، بتلانے پر بھی اس پر نہیں چلتے ، ایسا شخص اتباع کے قابل کب ہوسکتا ہے، پھر جب یہ اتباع کے بھی لائق نہیں تو عبادت کے لائق تو کب ہو سکتے ہیں ) تو ( اے مشرکین ! ) تم کو کیا ہو گیا، تم کیسی تجویزیں کرتے ہو ( کہ توحید کو چھوڑ کر شرک کو اختیار کرتے ہو )۔

* * *

**فائدہ:** ''مبدأ'' و ''معاد'' کے بعد درمیانی وسائط کا ذکر کرتے ہیں، یعنی جس طرح اول پیدا کرنے والا اور دوبارہ چلانے والا وہ ہی خدا ہے، ایسے ہی ''معاذ'' کی صحیح راہ بتلانے والا بھی کوئی دوسرا نہیں، خدا ہی بندوں کی صحیح اور سچی راہنمائی کرسکتا ہے، مخلوق میں کوئی بڑا ہو یا چھوٹا، سب اسی کی راہنمائی کے محتاج ہیں، اسی کی ہدایت وراہنمائی پر سب کو چلنا چاہئے، بت مسکین تو کس شمار میں ہیں جو کسی کی راہنمائی سے بھی چلنے کی قدرت نہیں رکھتے، بڑے بڑے مقربین ( انبیاء وملائکہ علیہم السلام ) بھی برابر یہ اقرار کرتے آئے ہیں کہ خدا کی ہدایت ودستگیری کے بدون ہم ایک قدم نہیں اٹھا سکتے، ان کی راہنمائی بھی اسی لیے بندوں کے حق میں قابل قبول ہے کہ خدا بلا واسطہ ان کی راہنمائی فرماتا ہے، پھر یہ کس قدر ناانصافی ہے کہ انسان اس ہادی مطلق کو چھوڑ کر باطل اور کمزور سہارے ڈھونڈے یا مثلاً احبار ورہبان، برہمنوں اور مہنتوں کی راہنمائی پر اندھا دھند چلنے لگے۔

**وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ۭ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـــًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۝۳۶**

اور وہ اکثر چلتے ہیں محض اٹکل پر سو اٹکل کام نہیں دیتی حق بات میں کچھ بھی۱ اللہ کو خوب معلوم ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں

**خلاصہ تفسیر:** اور ( تماشہ یہ کہ اپنی اس تجویز اور عقیدہ پر یہ لوگ دلیل بھی کوئی نہیں رکھتے، بلکہ ) ان میں سے اکثر لوگ صرف بے اصل خیالات پر چل رہے ہیں ( اور ) یقینا بے اصل خیالات امرحق ( کو ثابت کرنے میں ) ذرا بھی مفید نہیں ( خیر ) یہ جو کچھ کر رہے ہیں یقینا اللہ کو سب خبر ہے ( وقت پر سزا دے گا )۔

**وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا:** یعنی ان میں سے اکثر لوگ صرف بے اصل خیالات پر چل رہے ہیں، روح المعانی میں ہے کہ اس سے عقل پرست بہت کم محفوظ ہیں، چنانچہ ذات وصفات باری کے متعلق اکثر اہل ظاہر فلسفیوں کے دلائل متعارض پائے جاتے ہیں، اور یہ تعارض ظنیات میں ہوتا ہے، ایمانیات کی یہ شان نہیں، چنانچہ جو شخص اس سے بچنا چاہے تو وہ سلف صالح کا اتباع کرے اور فلسفیات میں مشغول نہ ہو جس کا حاصل شکوک وشبہات بڑھنے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

* * *

**فائدہ:** جب معلوم ہو چکا کہ ''مبدی''، ''معید'' اور ''ہادی'' وہ ہی اللہ ہے تو اس کے خلاف شرک کی راہ اختیار کرنے والوں کو سوچنا چاہیے کہ ان کے ہاتھ میں کون سی دلیل وبرہان ہے جس کی بناء پر ''توحید'' کے مسلک قویم وقدیم کو چھوڑ کر ضلالت کے گڑھے میں گرے جا رہے ہیں، سچ تو یہ ہے کہ ان کے پاس سوائے ظنوں واوہام اور اٹکل پچو باتوں کے کوئی چیز نہیں، بھلا اٹکل کے تیر حق وصداقت کی بحث میں کیا کام دے سکتے ہیں۔

**وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰي مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ**

اور وہ نہیں یہ قرآن کہ کوئی بنا لے اللہ کے سوا۱ اور لیکن تصدیق کرتا ہے اگلے کلام کی ۲ اور بیان کرتا ہے ان چیزوں کو

الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۷﴾

جو تم پر لکھی گئیں جس میں کوئی شبہ نہیں پروردگار عالم کی طرف سے ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے بعض آیات میں قرآن کی حقانیت کا بیان تھا، اب پھر وہی مضمون ہے۔

اور یہ قرآن افتراء کیا ہوا نہیں ہے کہ غیر اللہ سے صادر ہوا ہو بلکہ یہ تو ان کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے جو اس کے قبل (نازل) ہو چکی ہیں، اور احکام ضروریہ (الٰہیہ) کی تفصیل بیان کرنے والا ہے (اور) اس میں کوئی بات شک (وشبہ) کی نہیں (اور وہ) رب العالمین کی طرف سے (نازل ہوا) ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: پچھلی آیات میں فرمایا تھا کہ مشرکین محض ظن وتخمین کی پیروی کرتے ہیں، حالانکہ پیروی کے قابل اس کی بات ہے جو صحیح راستہ بتلائے، اسی مناسبت سے یہاں قرآن کریم کا ذکر شروع کیا کہ آج دنیا میں وہی ایک کتاب صحیح راستہ بتلانے والی اور ظنون واوہام کے مقابلہ میں سچ حقائق پیش کرنے والی ہے، اس کے علوم ومعارف، احکام وقوانین اور معجزانہ فصاحت وجزالت پر نظر کر کے کہنا پڑتا ہے کہ یہ قرآن وہ کتاب نہیں جو خداوند قدوس کے سوا کوئی دوسرا شخص بنا کر پیش کر سکے، پورا قرآن تو بجائے خود رہا اس کی ایک سورت کا مثل لانے سے بھی تمام جن وانس عاجز ہیں جیسا کہ آگے آتا ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ: قرآن کا کلام الٰہی ہونا اس سے ظاہر ہے کہ وہ تمام کتب سماویہ سابقہ کی سچائی پر مہر تصدیق ثبت کرتا، ان کے اصل مضامین کی حفاظت اور ان کی پیشین گوئیوں کی صداقت کا اعلانیہ اظہار کرتا ہے۔

**فائدہ:** ۳؎ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ: یعنی احکام الٰہیہ اور ان حقائق ومعارف کو جو پچھلی کتابوں میں نہایت اجمالی طور پر مذکور تھیں کافی تفصیل سے بیان کرتا ہے، سچ تو یہ ہے کہ اس کتاب میں عاقل کے لیے شک وشبہ کی قطعاً گنجائش نہیں، ایسا جامع، بلیغ، پر حکمت اور نور صداقت سے بھرا ہوا کلام رب العالمین ہی کا ہو سکتا ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ

کیا لوگ کہتے ہیں کہ یہ بنا لایا ہے، تو کہہ دے تم لے آؤ ایک ہی سورت ایسی اور بلا لو جس کو بلا سکو اللہ کے سوا اگر

كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ

تم سچے ہو ۱؎ بات یہ ہے کہ جھٹلانے لگے جس کے سمجھنے پر انہوں نے قابو نہ پایا ۲؎ اور ابھی آئی نہیں اس کی حقیقت ۳؎ اسی طرح جھٹلاتے رہے

الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۹﴾

ان سے اگلے سو دیکھ لے کیسا ہوا انجام گناہ گاروں کا

**خلاصہ تفسیر:** کیا (اس کے افتراء نہ ہونے کے باوجود) یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپ نے اس کو افتراء کر لیا ہے، آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ (اچھا) تو پھر تم (بھی تو عربی ہو اور اعلیٰ درجہ کے فصیح بلیغ بھی ہو) اس کی مثل ایک ہی سورت (بنا) لاؤ، اور (اکیلے نہیں) جن جن غیر اللہ کو بلا سکو ان کو (مدد کے لئے) بلا لو اگر تم سچے ہو (کہ نعوذ باللہ اس کو میں نے تصنیف کر لیا ہے تو تم بھی تصنیف کر لاؤ، مگر مشکل تو یہ ہے کہ اس قسم کے دلائل سے فائدہ اسی کو ہوتا ہے جو سمجھنا بھی چاہے)۔

(سوان لوگوں نے تو کبھی سمجھنا ہی نہ چاہا) بلکہ ایسی چیز کی تکذیب کرنے لگے جس (کے صحیح غلط ہونے) کو اپنے احاطہ علم میں نہیں لائے (اور اس کی حالت سمجھنے کا ارادہ نہیں کیا پھر ایسوں سے سمجھنے کی کیا امید کی جائے جو غور بھی نہیں کرنا چاہتے) اور (ان کی اس بےفکری اور بے پرواہی کی وجہ یہ ہے کہ) ہنوز ان کو اس (قرآن کی تکذیب) کا اخیر نتیجہ نہیں ملا (یعنی عذاب نہیں آیا، ورنہ سارا نشہ ہرن ہوجاتا اور آنکھیں کھل جاتیں اور حق و باطل کا امتیاز ہوجاتا، لیکن آخر کبھی تو وہ نتیجہ پیش آنے والا ہے ہی، اگرچہ اس وقت ایمان نافع نہ ہوگا، چنانچہ) جو (کافر) لوگ ان سے پہلے ہوئے ہیں اسی طرح (جیسے بے تحقیق یہ جھٹلا رہے ہیں) انہوں نے بھی (حق کو) جھٹلایا تھا، سو دیکھ لیجئے ان ظالموں کا انجام کیسا (برا) ہوا (اسی طرح ان کا ہوگا)۔

**قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ:** بعض وہمیوں نے یہ شبہ نکالا ہے کہ بسا اوقات متکلم میں کوئی ایسی خصوصیت ہوتی ہے جو کہ دوسروں میں نہیں ہوتی، پس دوسروں کا قرآن کے مثل نہ بنا سکنا اعجاز کی دلیل نہیں ہوسکتی، جواب اس کا یہ ہے کہ اگر آپ کے اندر وہ خصوصیت ہوتی تو آپ کے ہر کلام میں ہوتی، دوسرے چالیس سال کے بعد وہ خصوصیت اچانک کیسے پیدا ہوگئی، تیسرے ہزار خصوصیات ہو، لیکن دوسرے ادیب بلغاء کوشش کر کے تھوڑا بہت کلام تو ویسا لاسکتے ہیں، یہاں ایک بھی ایسا کیوں نہ ہوسکا، چوتھے خصوصیت والا قیامت تک کا دعوی نہیں کرسکتا، یہی وجہ ہے کہ کفار نے یہ شبہات پیش نہ کیے، پانچویں یہ وہم تو ہر معجزہ میں آپ نکالیں گے کہ یہ ماہر فن کی خصوصیت ہے تو پھر کسی نبی کا بھی کوئی معجزہ دلیل نہ رہے گا، خصوصیت نہ ہوئی بلا ہوئی، اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کلام میں تمام ادیب و بلغاء کو عاجز کر دینا بڑا معجزہ ہے، کیونکہ بات کرنا ہر ایک کو آسان ہے، دوسرے کام ہر ایک کو سہل نہیں، یہاں یہ واضح رہے کہ حدیث کی عبارت اوروں سے ابلغ ہے مگر اس کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں فرمایا گیا۔

**بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ:** مطلب یہ ہے کہ آدمی جس معاملہ میں کلام کرے پہلے اس کی تحقیق کرلے، اس کے بعد جو کلام کرنا ہو کرے۔

**وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ:** تأویل سے مراد اس جگہ مآل اور انجام ہے، مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی غفلت اور بےفکری سے قرآن میں غور نہیں کیا اور اس کی تکذیب کے انجام بد کو نہیں پہچانا، اس لئے تکذیب میں لگے ہوئے ہیں، مگر موت کے بعد ہی سب حقائق کھل جائیں گے اور اپنے کئے کا مآل بد ہمیشہ کے لئے گلے کا ہار ہوجائے گا۔

**بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ:** یہ ان کی اس بات پر مذمت ہے کہ وہ غور فکر اور تدبر سے قبل اور حقیقت پر مطلع ہوئے بغیر حق بات کو جھٹلانے میں جلد بازی سے کام لیتے ہیں، منکرین تصوف کی بزرگوں کے کلام کے بارے میں بھی یہی عادت ہے کہ نہ غور کرتے ہیں، نہ ان اصطلاحات کو جانتے ہیں جن پر وہ کلام مبنی ہے اور اعتراض کر بیٹھتے ہیں، ان کو تو ایسی حالت میں تحقیق اور تدبر کی ضرورت تھی جس کے ذریعے وہ بات کی تہہ تک پہنچ جاتے۔

* * *

**فائدہ: إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ:** یعنی اگر میں بنالایا ہوں تو تم بھی میری طرح بشر ہو سب مل کر ایک سورت جیسی سورت بنالاؤ، ساری مخلوق کو دعوت دو، جن وانس کو جمع کرلو، تمام جہان کے فصیح وبلیغ، پڑھے لکھے اور ان پڑھ اکٹھے ہوکر ایک چھوٹا سا کلام قرآن کی مانند پیش کردو تو سمجھ لیا جائے گا کہ قرآن بھی کسی بشر کا کلام ہے جس کا مثل دوسرے لوگ لاسکتے ہیں، مگر محال ہے کہ ابدالآباد تک کوئی مخلوق ایسا حوصلہ کرسکے، قرآن کریم ہی وہ کتاب ہے جس میں تہذیب اخلاق، تمدن ومعاشرت، حکومت وسیاست، معرفت وروحانیت، تزکیہ نفوس، تنویر قلوب، غرضیکہ وصول الی اللہ اور تنظیم ورفاہیہ خلائق کے وہ تمام قوانین وطریق موجود ہیں، جن سے آفرینش عالم کی غرض پوری ہوتی ہے، اور جن کی ترتیب وتدوین کی ایک اُمّی قوم کے اُمّی فرد سے کبھی امید نہیں ہوسکتی تھی، پھر ان تمام علوم وہدایات کا تکفل کرنے کے ساتھ اس کتاب کی غلغلہ انداز فصاحت وبلاغت، جامع ومؤثر اور دلربا طرز بیان، دریا کا سا تموج، سہل ممتنع سلاست وروانی، اسالیب کلام کا تفنن اور اس کی لذت وحلاوت اور شہنشاہانہ شان وشکوہ یہ سب چیزیں ایسی ہیں جنہوں نے بڑے زور وشور اور بلند آہنگی سے سارے جہان کو مقابلہ کا چیلنج دے دیا ہے، جس وقت سے قرآن کے جمال جہاں آراء نے غیب کی نقاب الٹی اور اولاد آدم کو اپنے سے روشناس کیا، اس کا برابر یہی دعویٰ رہا کہ میں خدائے قدوس کا کلام ہوں، اور جس طرح خدا کی زمین جیسی زمین، خدا کے سورج جیسا سورج، اور خدا کے آسمان جیسا آسمان پیدا کرنے سے دنیا عاجز ہے، اسی طرح خدا کے قرآن جیسا قرآن بنانے سے بھی دنیا عاجز رہے گی، قرآن کے مٹانے کی لوگ سازشیں کریں گے، مگر گا تھیں

گے، مقابلہ کے جوش میں کٹ مریں گے، اپنی مدد کے لیے دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کو دعوت دیں گے، کوئی حیلہ، کوئی تدبیر، کوئی داؤ پیچ اٹھا نہ رکھیں گے، اپنے کو اور دوسروں کو مصیبت میں ڈالیں گے، سارے مصائب و دواہی کا تحمل ان کے لیے ممکن ہوگا مگر قرآن کی چھوٹی سی سورت کا مثل لانا ممکن نہ ہوگا قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا (الاسراء:88)

**فائدہ:** ۲؎ بِمَا لَمْ یُحِیْطُوْا بِعِلْمِهٖ: یعنی قرآن کو ''مفتری'' کہنا سمجھ کر نہیں، محض جہل و سفاہت اور قلت تدبر سے ہے، تعصب و عناد انہیں اجازت نہیں دیتا کہ ٹھنڈے دل سے قرآن کے حقائق اور وجوہ اعجاز میں غور کریں، بدفہمی یا قوائے فکریہ کے ٹھیک استعمال نہ کرنے کی وجہ سے جب قرآن پاک کے دلائل وعجائب کو پوری طرح نہیں سمجھ سکے، تو جھٹلانا شروع کر دیا۔

**فائدہ:** ۳؎ وَلَمَّا یَاْتِهِمْ تَاْوِیْلُهٗ: بعض مفسرین نے ''تاویل'' کے معنی ''تفسیر'' کے لیے ہیں، یعنی مطالب قرآن ان کے دماغ میں نہیں اترے اور بعض نے قرآنی پیشین گوئیاں مراد لی ہیں، یعنی تکذیب کی ایک وجہ بعض سادہ لوحوں کے حق میں یہ بھی ہے کہ مستقبل کے متعلق قرآن نے جو خبریں دی ہیں، ان کے وقوع کا ابھی وقت نہیں آیا، لہٰذا وہ منتظر ہیں کہ ان کا ظہور کب ہوتا ہے، مگر سوچنا چاہیے کہ یہ وجہ تکذیب کی کیسے ہوسکتی ہے؟ زائد از زائد توقف کی وجہ ہو تو ہو۔

---

## وَمِنْهُمْ مَّنْ یُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا یُؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِیْنَ ﴿۴۰﴾ ع

اور بعضے ان میں یقین کریں گے قرآن کا اور بعضے یقین نہ کریں گے، اور تیرا رب خوب جانتا ہے شرارت والوں کو

**خلاصہ تفسیر:** اور (ہم جو ان کا برا انجام بتلا رہے ہیں، وہ سب کے لیے نہیں، کیونکہ) ان میں سے بعض ایسے ہیں جو اس (قرآن) پر ایمان لے آئیں گے اور بعض ایسے ہیں کہ اس پر ایمان نہ لائیں گے اور آپ کا رب (ان) مفسدوں کو خوب جانتا ہے (جو ایمان نہ لائیں گے، پس خاص ان کو مقررہ وقت پر سزا دے گا)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی آگے چل کر ان میں کچھ لوگ مسلمان ہونے والے ہیں، انہیں چھوڑ کر جو باقی لوگ شرارت پر قائم رہیں گے، خدا سب کو خوب جانتا ہے، موقع پر مناسب سزا دے گا۔

## وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّیْ عَمَلِیْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِیْٓــُٔوْنَ مِمَّاۤ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۱﴾

اور اگر تجھ کو جھٹلائیں تو کہہ میرے لیے میرا کام اور تمہارے لیے تمہارا کام، تم پر ذمہ نہیں میرے کام کا اور مجھ پر ذمہ نہیں جو تم کرتے ہو

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے ان لوگوں کی تکذیب اور اس تکذیب کا مناظرانہ جواب مذکور تھا، اب ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کا جواب اعراض کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور ان کی ہدایت سے مایوس کر کے آپ ﷺ کو تسلی دی جاتی ہے:

اور اگر (ان دلائل کے بعد بھی) آپ کو جھٹلاتے رہیں تو (بس اخیر بات) یہ کہہ دیجئے کہ (اچھا صاحب!) میرا کیا ہوا مجھ کو ملے گا اور تمہارا کیا ہوا تم کو ملے گا، تم میرے عمل کے جواب دہ نہیں ہو اور میں تمہارے عمل کا جوابدہ نہیں ہوں (جس طریقہ پر چاہو رہو، خود معلوم ہو جائے گا)۔

لِّیْ عَمَلِیْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ: یعنی میرا کیا ہوا مجھے ملے گا اور تمہارا کیا ہوا تمہیں ملے گا، چنانچہ اہل طریق صوفیاء کی بھی یہی عادت ہے کہ مناظرہ میں جس وقت وہ مخالف کی جانب سے ضد اور ہٹ دھرمی دیکھتے ہیں تو یہی کہہ دیتے ہیں کہ: لِّیْ عَمَلِیْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ یعنی ضد اور جھگڑے کے بجائے ایک طرف ہو جانے کو پسند کرتے ہیں اور مخالفین کو ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں، بخلاف الفاظ پرستوں کے کہ وہ مناظرہ کے موقع پر کبھی ایسی بات نہیں کہتے بلکہ اس طرح کہنے کو اپنی ہار سمجھتے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** یعنی اگر دلائل وبراہین سننے کے بعد بھی یہ لوگ آپ کی تکذیب کریں تو کہہ دیجئے کہ ہم اپنا فرض ادا کر چکے، تم سمجھانے پر نہیں مانتے تو اب میرا تمہارا راستہ الگ الگ ہے، تم اپنے عمل کے ذمہ دار ہو میں اپنے عمل کا، ہر ایک کو اس کے عمل کا ثمرہ مل کر رہے گا، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ (معاذ اللہ) "اگر اللہ کا حکم غلط پہنچاؤں تو میں گنہگار ہوں، اور میں سچ لاؤں تم نہ مانو تو گناہ تم پر ہے، بہرحال ماننے میں کسی طرح تمہارا نقصان نہیں"۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۴۲

اور بعضے ان میں کان رکھتے ہیں تیری طرف، کیا تو سنائے گا بہروں کو اگرچہ ان کو سمجھ نہ ہو

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تَهْدِى الْعُمْىَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ۝۴۳

اور بعضے ان میں نگاہ کرتے ہیں تیری طرف، کیا تو راہ دکھائے گا اندھوں کو اگرچہ وہ سوجھ نہ رکھتے ہوں

**خلاصہ تفسیر:** اور (آپ ان کے ایمان کی توقع چھوڑ دیجیے کیونکہ) ان میں (اگرچہ) بعض ایسے (بھی) ہیں جو (ظاہر میں) آپ کی طرف کان لگا لگا کر بیٹھتے ہیں (لیکن دل میں ایمان اور حق طلبی کا ارادہ نہیں ہے، اس اعتبار سے ان کا سننا نہ سننا برابر ہے، پس ان کی حالت بہروں کی سی ہوئی تو) پھر کیا آپ بہروں کو سنا (کر ان سے ماننے کا انتظار کر) تے ہیں گو ان کو سمجھ بھی نہ ہو (ہاں! اگر سمجھ ہوتی تو بہرے پن میں بھی کچھ کام چل سکتا) اور (اسی طرح) ان میں بعض ایسے ہیں کہ (ظاہراً) آپ کو (معجزات وکمالات کے ساتھ) دیکھ رہے ہیں (لیکن طلب حق نہ ہونے کی وجہ سے ان کی حالت اندھوں کی سی ہے تو) پھر کیا آپ اندھوں کو رستہ دکھلانا چاہتے ہیں گو ان کو بصیرت بھی نہ ہو (ہاں! اگر بصیرت ہوتی تو اندھے پن میں بھی کچھ کام چل سکتا)۔

* * *

**فائدہ:** بعض لوگ بظاہر قرآن شریف اور آپ کا کلام مبارک سنتے ہیں اور آپ کے معجزات وکمالات دیکھتے ہیں مگر دیکھنا سننا وہ نافع ہے جو دل کے کانوں اور دل کی آنکھوں سے ہو، یہ آپ کے اختیار میں نہیں کہ آپ دل کے بہروں کو اپنی بات سنا دیں، بحالیکہ وہ سخت بہرہ پن کی وجہ سے قطعاً کسی کلام کو نہ سمجھ سکتے ہوں یا دل کے اندھوں کو راہ حق دکھلا دیں جبکہ انہیں کچھ بھی نہ سوجھتا ہو، "موضح القرآن" میں ہے: "یعنی کان رکھتے ہیں یا نگاہ کرتے ہیں اس توقع پر کہ آپ ہمارے دل پر تصرف کر دیں جیسا بعضوں پر ہو گیا، سو یہ بات اللہ کے ہاتھ ہے"، بعض مفسرین نے لَا يَعْقِلُوْنَ سے مطلق عقل کی اور لا یبصرون سے بصیرت کی نفی مراد لی ہے، مطلب یہ ہے کہ ایسے اندھے، بہرے جو علاوہ نہ سننے اور نہ دیکھنے کے ہر قسم کی سمجھ بوجھ سے محروم ہیں، ان کو آپ کس طرح سنا اور دکھا کر منوا سکتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۴۴

اللہ ظلم نہیں کرتا لوگوں پر کچھ بھی لیکن لوگ اپنے اوپر آپ ظلم کرتے ہیں

**خلاصہ تفسیر:** (ان کی عقلیں جو اس طرح تباہ ہو گئیں تو) یہ یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا (کہ ان کو ہدایت کی قابلیت نہ دی ہو اور پھر مواخذہ فرمائے) لیکن لوگ خود ہی اپنے آپ کو تباہ کرتے ہیں (کہ وہبی قابلیت کو ضائع کر دیتے ہیں اور اس سے کام نہیں لیتے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جن کے دل میں اثر نہیں ہوتا، یہ ان ہی کی تقصیر ہے، خود اپنی بے اعتدالیوں اور غلط کاریوں سے انہوں نے قوائے ادراکیہ کو تباہ کر لیا ہے، ورنہ اصل فطرت سے ہر آدمی کو خدا نے سمجھنے اور قبول کرنے کی استعداد بخشی ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ؕ قَدْ خَسِرَ

اور جس دن ان کو جمع کرے گا گویا وہ نہ رہے تھے مگر ایک گھڑی دن ۱؎ ایک دوسرے کو پہچانیں گے ۲؎ بیشک خسارے میں پڑے

الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۴۵﴾

جنہوں نے جھٹلایا اللہ سے ملنے کو اور نہ آئے وہ راہ پر ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** اوپر آیات میں کفر و تکذیب پر عذاب کی وعید فرمائی ہے، آگے اس عذاب کے دنیا میں واقع نہ ہونے سے کفار جو شبہات کرتے تھے ان کا جواب بتلاتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ اگرچہ کبھی دنیا میں بھی عذاب واقع ہو جائے لیکن اصلی وقت اس کا یوم حشر ہے، اسی لیے دنیا میں اس کا کچھ حصہ ظاہر ہوتا ہے: **واما نرینك بعض الذی نعدهم**، اور کامل طور پر اسی وقت حشر میں ہوگا: **ولو ان لكل نفس ظلمت**، پس دنیا میں واقع نہ ہونا نہ مضر ہے اور نہ میرے اختیار میں ہے: **قل لا املك لنفسی**، اور نہ تمہارے لیے مصلحت ہے کیونکہ فوری عذاب میں ایمان کی مہلت بھی فوت ہو جائے گی: **ماذا یستعجل**۔

اور ان کو وہ دن یاد دلایئے جس میں اللہ تعالیٰ ان کو اس کیفیت سے جمع کرے گا کہ (وہ سمجھیں گے کہ) گویا وہ (دنیا یا برزخ میں) سارے دن کی ایک آدھ گھڑی رہے ہوں گے (چونکہ وہ دن دراز بھی ہوگا اور سخت بھی ہوگا، اس لئے دنیا اور برزخ کی مدت اور تکلیف سب بھول کر ایسا سمجھیں گے کہ وہ زمانہ بہت جلد گزر گیا) اور آپس میں ایک دوسرے کو پہچانیں گے (بھی، لیکن اس سے اور زیادہ رنج و صدمہ ہوگا کہ پہچان کر بھی ایک دوسرے کی مدد نہ کر سکیں گے، کیونکہ شناسا لوگوں سے نفع کی توقع ہوا کرتی ہے) واقعی (اس وقت سخت) خسارے میں پڑے وہ لوگ جنہوں نے اللہ کے پاس جانے کو جھٹلایا اور وہ (دنیا میں بھی) ہدایت پانے والے نہ تھے (اس لئے آج قیامت کے روز خسارہ میں پڑے، پس ان کے عذاب کا اصلی وقت تو یہ دن ہے، ان کو یاد دلا دیجیے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ: یعنی محشر کے ہولناک اہوال و حوادث کو دیکھ کر عمر بھر کا عیش و آرام اس قدر حقیر و قلیل نظر آئے گا گویا دنیا میں ایک گھڑی سے زیادہ ٹھہرے ہی نہ تھے اور افسوس کریں گے کہ ساری عمر کیسی فضول اور بیکار گزری، جیسے آدمی گھنٹہ دو گھنٹہ یوں ہی گپ شپ میں بیکار گزار دیتا ہے، نیز وہاں کی زہرہ گداز مصائب کو دیکھ کر خیال کریں گے کہ گویا دنیا میں کچھ مدت قیام ہی نہ ہوا جو یہ وقت آ لیا، گھڑی دو گھڑی ٹھہرے اور یہاں آ پھنسے، کاش وہاں کی مدت قیام کچھ طویل ہوتی تو یہ دن اس قدر جلد نہ دیکھنا پڑتا، بعض مفسرین نے کہا کہ برزخ (قبر) میں ٹھہرنے کی مدت کو ایک گھڑی کے برابر سمجھیں گے، واللہ اعلم۔

**فائدہ:** ۲؎ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ: مگر کچھ مدد نہ کر سکیں گے نفسی نفسی پڑی ہوگی، بھائی بھائی کے اور بیٹا باپ کے کام نہ آئے گا فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ (المؤمنون:۱۰۱) يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ وَصَاحِبَتِهٖ (عبس:۳۴ تا ۳۶)

**فائدہ:** ۳؎ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ: باقی جنہوں نے لقاء اللہ کی تصدیق کی اور سیدھی راہ پر چلے وہ سراسر فائدہ میں ہیں۔

وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ

اور اگر ہم دکھائیں گے تجھ کو کوئی چیز ان وعدوں میں سے جو کیے ہم نے ان سے یا وفات دیں تجھ کو سو ہماری ہی طرف ہے، ان کو لوٹنا، پھر اللہ

شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۶﴾

شاہد ہے ان کاموں پر جو کرتے ہیں

**خلاصه تفسیر:** اور (دنیا میں ان پر عذاب واقع ہونا سواس کی نسبت یہ بات ہے کہ) جس (عذاب) کا ان سے ہم وعدہ کررہے ہیں اس میں سے کچھ تھوڑا سا (عذاب) اگر ہم آپ کو دکھلا دیں (یعنی آپ کی حیات میں ان پر عذاب نازل ہوجائے) یا (عذاب کے نزول سے قبل ہی) ہم آپ کو وفات دے دیں (پھر خواہ بعد میں نزول ہو یا نہ ہو) سو (دنیا میں عذاب ہونے کی دوصورتیں ہیں: یا تو آپ کے سامنے ہو یا آپ کے سامنے نہ ہو، اور ان دونوں صورتوں میں سے کوئی سی شق ضروری نہیں، لیکن ہر حال اور ہر احتمال پر) ہمارے پاس تو ان کو آنا ہی ہے، پھر (سب کو معلوم ہے کہ) اللہ ان کے سب افعال کی اطلاع رکھتا ہی ہے (پس وہاں ان پر یقیناً سزا دے گا، غرض یہ کہ دنیا میں سزا ہو یا نہ ہو مگر اصلی موقعہ پر ضرور ہوگی)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی ہم نے کفار کو عذاب دینے اور اسلام کو غالب و منصور کرنے کے جو وعدے کیے ہیں، خواہ ان میں سے بعض وعدے کسی حد تک آپ کی موجودگی میں پورے کر کے دکھلا دیے جائیں، جیسے "بدر" وغیرہ میں دکھلا دیا، یا آپ کی وفات ہوجائے، اس لیے آپ کے سامنے ان میں سے بعض کا ظہور نہ ہو، بہر صورت یہ یقینی ہے کہ وہ سب پورے ہو کر رہیں گے، اگر کسی مصلحت سے دنیا میں ان کفار کو سزا نہ دی گئی تو آخرت میں ملے گی، ہم سے بچ کر کہاں بھاگ سکتے ہیں، سب کو ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے اور ان کے تمام اعمال ہمارے سامنے ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ غلبہ اسلام کچھ حضرت ﷺ کے روبرو ہوا، اور باقی آپ ﷺ کی وفات کے بعد خلفاء کے ہاتھوں سے، گویا نَتَوَفَّيَنَّكَ میں اس طرف اشارہ ہے۔ واللہ اعلم۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٤٧﴾

اور ہر فرقے کا ایک رسول ہے، پھر جب پہنچا ان کے پاس رسول ان کا فیصلہ ہوا ان میں انصاف سے اور ان پر ظلم نہیں ہوتا

**خلاصہ تفسیر:** اور (یہ سزا جو ان کے لئے تجویز ہوئی ہے پوری طرح حجت تمام کرنے اور عذر زائل کرنے کے بعد ہوئی ہے، اور ان کی کیا تخصیص ہے بلکہ ہمیشہ سے ہماری عادت رہی ہے کہ جن امتوں کو ہم نے مکلف بنانا چاہا ہے ان میں سے) ہر ہر امت کے لئے ایک حکم پہنچانے والا (ہوا) ہے، سو جب ان کا وہ رسول (ان کے پاس) آچکتا ہے (اور احکام پہنچا دیتا ہے اس کے بعد) ان کا فیصلہ انصاف کے ساتھ کیا جاتا ہے (وہ فیصلہ یہی ہے کہ نہ ماننے والوں کو ابدی عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے) اور ان پر (ذرا) ظلم نہیں کیا جاتا (کیونکہ اتمام حجت کے بعد سزا دینا خلاف انصاف نہیں ہے، خلاصہ یہ کہ ہر امت کے لیے عذاب کی تجویز اور فیصلہ رسول آنے کے بعد اور حجت تمام کرنے کے بعد ہوا ہے)۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ: محققین نے اس سے اخذ کیا ہے کہ ایسے علاقوں اور قوم کے بارے میں خاموشی اختیار کرنی چاہیے جن کے بارے میں قرائن وشواہد سے معلوم نہیں ہوسکا کہ ان میں اللہ تعالیٰ نے کوئی رسول بھیجا یا نہیں؟ کیونکہ رسول ہونے کی صورت میں بعض رسل کا انکار لازم آئے گا، اور نہ ہونے کی صورت میں اقرار، تو درمیانی اور معتدل راہ یہ ہے کہ ان کے بارے میں کسی قسم کا حکم لگانے یا نظریہ قائم کرنے سے گریز کیا جائے، کیونکہ کسی چیز کا نہ جاننا اس چیز کے نہ ہونے پر دلالت نہیں کرتا، کیونکہ ظاہر تو یہی ہے کہ وہ امت بھی رسول سے خالی نہیں رہی (بعض اکابر اہل طریق نے اس احتیاط اور احتمال کی تصریح فرمائی ہے)۔

* * *

**فائدہ:** پہلے اس امت اور اس کے رسول اکرم ﷺ کا ذکر تھا، اب عام اقوام وامم کا ضابطہ بتلاتے ہیں کہ ہر جماعت اور فرقہ کے پاس خدا کے احکام پہنچانے والے بھیجے گئے ہیں جن کو "رسول" کہیے، تاکہ خدا کی حجت تمام ہو، اتمام حجت سے پہلے کسی کو عذاب نہیں دیا جاتا، لوگ عمل پہلے سے کرتے ہیں، مگر دنیا میں ان کو سزا رسول پہنچنے اور حجت تمام کرنے کے بعد دی جاتی ہے، خدا کے یہاں یہ ظلم اور اندھیر نہیں کہ بدون پیشتر سے آگاہ کرنے اور ملزم ثابت ہونے کے مجرموں کو فیصلہ سنا دیا جائے، قیامت میں بھی باقاعدہ پیشی ہوگی، فرد جرم لگائیں گے، گواہ پیش ہوں گے، ہر قوم کے ساتھ ان کے پیغمبر موجود ہوں گے، ان کے بیانات وغیرہ کے بعد نہایت انصاف سے فیصلہ ہوگا وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتَٰبُ

وَجَاۤىءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَاۤءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (الزمر:۶۹) مجاہد وغیرہ نے آیت کو قیامت کے احوال پر محمل کیا ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا

اور کہتے ہیں کب ہے یہ وعدہ اگر تم سچے ہو۔ تو کہہ میں مالک نہیں اپنے واسطے برے کا نہ بھلے کا مگر

مَا شَاۤءَ اللّٰهُ ؕ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَاۤءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۴۹﴾

جو چاہے اللہ، ہر فرقے کا ایک وعدہ ہے، جب آپہنچے گا ان کا وعدہ پھر نہ پیچھے سرک سکیں گے ایک گھڑی اور نہ آگے سرک سکیں گے ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور یہ لوگ (عذاب کی وعیدیں سن کر تکذیب کے ارادہ سے یوں) کہتے ہیں کہ (اے نبی! اور اے مسلمانوں!) یہ وعدہ (عذاب کا) کب (واقع) ہوگا، اگر تم سچے ہو (تو واقع کیوں نہیں کرا دیتے) آپ (سب کی طرف سے جواب میں) فرما دیجئے کہ میں (خود) اپنی ذات خاص کے لئے تو کسی نفع (کے حاصل کرنے) کا اور کسی ضرر (کے دور کرنے) کا اختیار رکھتا ہی نہیں مگر جتنا (اختیار) خدا کو منظور ہو (اتنا اختیار البتہ حاصل ہے، پس جب خاص اپنے نفع اور نقصان کا مالک نہیں تو دوسرے کو نفع و نقصان کا کیونکر مالک ہوں گا، پس عذاب واقع کرنا میرے اختیار میں نہیں، رہا یہ کہ پھر کب واقع ہوگا؟ سو بات یہ ہے کہ) ہر امت کے (عذاب کے) لئے (اللہ کے نزدیک) ایک معین وقت ہے (خواہ دنیا میں یا آخرت میں، سو) جب ان کا وہ معین وقت آپہنچتا ہے تو (اس وقت) ایک ساعت نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ آگے سرک سکتے ہیں (بلکہ فوراً عذاب واقع ہو جاتا ہے، اسی طرح تمہارے عذاب کا بھی وقت معین ہے، اس وقت آ جائے گا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی عذاب آنے کی جو دھمکیاں دیتے ہو، محض جھوٹ اور بے اصل ہیں، اگر واقعی تم سچے ہو تو لے کیوں نہیں آتے، آخر یہ وعدہ کب پورا ہوگا۔

**فائدہ:** ۲ یعنی عذاب وغیرہ بھیجنا خدا کا کام ہے، میرے قبضہ اور اختیار میں نہیں، میں خود اپنے نفع نقصان کا صرف اسی قدر مالک ہوں جتنا اللہ چاہے، پھر دوسروں پر کوئی بھلائی برائی وارد کرنے کا مستقل اختیار مجھے کہاں سے ہوتا، ہر قوم کی ایک مدت اور میعاد خدا کے علم میں مقرر ہے، جب میعاد پوری ہو کر اس کا وقت پہنچ جائے گا، ایک سیکنڈ کا تخلف نہ ہو سکے گا، غرض عذاب کے لیے جلدی مچانے سے کچھ فائدہ نہیں، خدا کے علم میں جو وقت طے شدہ ہے اس سے ایک منٹ آگے پیچھے نہیں سرک سکتے، زمخشری کے نزدیک لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (الاعراف:۳۴) اس سے کنایہ ہے کہ عذاب کا اپنے وقت معین پر آنا اٹل ہے، کنایہ میں حقیقت تقدم و تاخر کا نفیاً یا اثباتاً اعتبار نہیں، فتنبہ لہ۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۰﴾

تو کہہ بھلا دیکھو تو اگر آپہنچے تم پر عذاب اس کا راتوں رات یا دن کو تو کیا کرلیں گے اس سے پہلے گناہ گار

**خلاصہ تفسیر:** (اور وہ جو فرمائش کرتے ہیں کہ جو کچھ ہونا ہے جلدی ہو جائے جیسا کہ مذکورہ آیت: مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اور دوسری آیات مثلاً رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا میں ان کی اس جلد بازی کا ذکر ہے، اس سے ان کی مراد محض تکذیب تھی تو) آپ (اس کے متعلق ان سے) فرما دیجئے کہ یہ تو بتلاؤ اگر تم پر خدا کا عذاب رات کو آپڑے یا دن کو (آپڑے) تو (یہ تو بتلاؤ کہ) عذاب میں کون چیز ایسی ہے کہ مجرم لوگ اس کو جلدی مانگ رہے ہیں (یعنی عذاب تو سخت اور پناہ مانگنے کی چیز ہے، نہ کہ جلدی مانگنے کی، نہ معلوم تم نے عذاب کو کیا سمجھا ہے جو یوں بے دھڑک جلدی مچا رہے ہو)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی رات کو سوتے ہوئے یا دن میں جب تم دنیا کے دھندوں میں مشغول ہو، اگر اچانک خدا کا عذاب آ جائے تو مجرم جلدی کر کے کیا

بچاؤ کر سکیں گے؟ جب بچاؤ نہیں کر سکتے پھر وقت پوچھنے سے کیا فائدہ؟ مترجم رحمہ اللہ نے نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ کا یہ ترجمہ حضرت شاہ صاحب کے مذاق کے موافق کیا ہے عموماً مفسرین نے یہ مطلب لیا ہے کہ عذاب الٰہی کے آنے میں کون سی ایسی خوشی اور مزے کی بات ہے، جس کی وجہ سے مجرمین جلدی طلب کر رہے ہیں، یا یہ کہ تعجب کا مقام ہے کہ مجرمین کیسی سخت خوفناک چیز کے لیے جلدی مچا رہے ہیں، حالانکہ ایک مجرم کے لائق تو یہ تھا کہ وہ آنے والی سزا کے تصور سے کانپ اٹھتا اور ڈر کے مارے ہلاک ہو جاتا، (البحر المحیط)

أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ آمَنْتُمْ بِهِ ۚ آلْآنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ ﴿٥١﴾

کیا پھر جب عذاب واقع ہو چکے گا تب اس پر یقین کرو گے، اب قائل ہوئے اور تم اسی کا تقاضا کرتے تھے

**خلاصہ تفسیر:** (اور چونکہ جلد بازی سے ان کا مقصود جھٹلانا ہے اس لئے فرماتے ہیں کہ) کیا (اب تو تکذیب کر رہے ہو جو کہ وقت ہے تصدیق کے نافع ہونے کا) پھر جب وہ (اصلی موعود) آہی پڑے گا (اس وقت) اس کی تصدیق کرو گے (جس وقت کہ تصدیق نافع نہ ہوگی، اور اس وقت کہا جائے گا کہ) ہاں! اب مانا حالانکہ (پہلے سے) تم (جھٹلانے کی غرض سے) اس کی جلدی مچایا کرتے تھے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی عذاب کے لیے جلدی کرنا اس بناء پر ہے کہ انھیں اس کے آنے کا یقین نہیں، اس وقت یقین ہوتا تو فائدہ ہو سکتا تھا کہ بچنے کی کوشش کرتے، عذاب آچکنے کے بعد یقین آیا تو کیا فائدہ ہوگا، اس وقت خدا کی طرف سے کہہ دیا جائے گا کہ اچھا اب قائل ہوتے ہو، اور پہلے سے جھٹلاتے رہے، کیونکہ تقاضا کرنا بھی جھٹلانے اور مذاق اڑانے کی نیت سے تھا، اس وقت اقرار کرنے سے کچھ نفع نہیں فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ۭ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ (غافر: ۸۵-۸۴)

ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿٥٢﴾

پھر کہیں گے گنہگاروں کو چکھتے رہو عذاب ہمیشگی کا، وہی بدلہ ملتا ہے جو کچھ کماتے تھے۔ ۱

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ۭ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ۚ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿٥٣﴾

اور تجھ سے خبر پوچھتے ہیں کیا سچ ہے یہ بات، تو کہہ البتہ قسم میرے رب کی یہ سچ ہے، اور تم تھکا نہ سکو گے ۲

**خلاصہ تفسیر:** پھر ظالموں (مشرکوں) سے کہا جائے گا کہ ہمیشہ کا عذاب چکھو، تم کو تمہارے ہی کئے کا بدلہ ملا ہے، اور وہ (انتہائی تعجب و انکار سے) آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا عذاب واقعی امر ہے؟ آپ فرما دیجئے کہ ہاں! قسم میرے رب کی کہ وہ واقعی امر ہے، اور تم کسی طرح خدا کو عاجز نہیں کر سکتے (کہ وہ عذاب دینا چاہے اور تم بچ جاؤ)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ جو کفر و شرک اور تکذیب کرتے رہے تھے، اب ہمیشہ اس کا مزا چکھتے رہو، یہ قیامت میں کہا جائے گا۔

**فائدہ:** ۲ یعنی غفلت کے نشہ میں چور ہو کر تعجب سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ سچ ہے کہ ہم موت کے بعد دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور دائمی عذاب کا مزہ چکھیں گے؟ کیا واقعی ریزہ ریزہ ہو کر اور خاک میں مل کر پھر از سر نو ہم کو موجود کیا جائے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجئے کہ تعجب کی کیا بات ہے، یہ چیز تو یقیناً ہونے والی ہے، تمہارا مٹی میں مل جانا اور پارہ پارہ ہو جانا خدا کو اس سے عاجز نہیں کر سکتا کہ پہلے کی طرح تمہیں دوبارہ پیدا کر دے اور شرارتوں کا مزہ چکھائے، ممکن نہیں کہ اس کے قبضہ سے نکل بھاگو اور فرار ہو کر (معاذ اللہ) اسے عاجز کر سکو۔

**تنبیه:** اس آیت کے مشابہ دو آیتیں قرآن کریم میں ہیں: ① ایک سورہ سبا میں وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَأْتِيْنَا السَّاعَةُ ؕ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَأْتِيَنَّكُمْ (سباء:٣) ② دوسری ''تغابن'' میں زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ؕ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ؕ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ (التغابن:٧) یہ دونوں قیامت اور معاد کے متعلق ہیں ان ہی کی مناسبت سے حافظ ابن کثیرؒ نے آیت حاضرہ کو معاد کے متعلق رکھا ہے۔

وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا

اور اگر ہو ہر شخص گناہ گار کے پاس جتنا کچھ ہے زمین میں البتہ دے ڈالے اپنے بدلے میں ؎۱ اور چھپے چھپے پچتائیں گے جب دیکھیں گے

الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٥٤﴾

عذاب، اور ان میں فیصلہ ہوگا انصاف سے اور ان پر ظلم نہ ہوگا ؎۲

**خلاصہ تفسیر:** اور (اس عذاب کی یہ شدت ہوگی کہ) اگر ہر ہر مشرک شخص کے پاس اتنا (مال) ہو کہ ساری زمین میں بھر جائے تب بھی اس کو دے کر اپنی جان بچانا چاہیں گے (اگر چہ نہ وہاں خزانہ ہوگا کہ دے سکے اور نہ لیا جائے گا، لیکن عذاب کی شدت اس درجہ کی ہوگی کہ اگر ساری دنیا کا مال بھی ہوتا تو سب دینے پر راضی ہو جائیں گے) اور جب عذاب دیکھیں گے تو (مزید رسوائی کے خوف سے) پشیمانی کو (اپنے دل ہی دل میں) پوشیدہ رکھیں گے (یعنی قول وفعل سے ندامت کے آثار ظاہر نہ ہونے دیں گے، تا کہ دیکھنے والے نہ ہنسیں اور رسوائی نہ ہو، لیکن آخر میں یہ ضبط وتحمل بھی عذاب کی شدت کے سامنے نہ چلے گا) اور ان کا فیصلہ انصاف کے ساتھ ہوگا اور ان پر (ذرا) ظلم نہ ہوگا۔

* * *

**فائدہ:** ؎۱ یعنی اگر روئے زمین کے خزانے فرض کرو اس کے قبضہ میں ہوں تو کوشش کرے کہ یہ سب دے کر خدا کے عذاب سے اپنے آپ کو بچالے۔

**فائدہ:** ؎۲ دل میں اپنی حرکتوں پر پشیمان ہوں گے اور چاہیں گے لوگوں پر پشیمانی کا اظہار نہ ہو مگر تا کجے، کچھ دیر آثار ندامت ظاہر نہ ہونے دیں گے، آخر بے اختیار ظاہر ہو کر رہیں گے، اس وقت کہیں گے يٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ (الزمر:٥٦) اور يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا (الانبياء:٩٧)

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٥٥﴾

سن رکھو اللہ کا ہے جو کچھ ہے آسمان اور زمین میں، سن رکھو وعدہ اللہ کا سچ ہے ؎۱ پر بہت لوگ نہیں جانتے ؎۲

هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٥٦﴾

وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے اور اسی کی طرف پھر جاؤ گے ؎۳

**خلاصہ تفسیر:** یاد رکھو کہ جتنی چیزیں آسمانوں میں اور زمین میں ہیں سب اللہ ہی کی ملک ہیں (ان میں حق تعالیٰ جس طرح چاہیں تصرف کریں اور یہ مجرم بھی اللہ کی ملک میں داخل ہیں ان کا فیصلہ بھی جس طرح چاہتے کر سکتے تھے مگر ان پر کسی قسم کی زیادتی نہ کی جائے گی، فیصلہ انصاف کے ساتھ کیا جائے گا) یاد رکھو کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے (پس قیامت ضرور آئے گی) لیکن بہت سے آدمی یقین ہی نہیں کرتے۔

وہی جان ڈالتا ہے، وہی جان نکالتا ہے (پس دوبارہ پیدا کرنا اس کو کیا مشکل ہے) اور تم سب اسی کے پاس لائے جاؤ گے (اور حساب و کتاب اور پھر اس پر ثواب وعذاب ہوگا)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی سارے جہان میں حکومت صرف اللہ کی ہے، انصاف ہو کر رہے گا، کوئی مجرم نہ کہیں بھاگ سکتا ہے، نہ رشوت دے کر چھوٹ سکتا ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی سوء استعداد، بدفہمی اور غفلت سے اکثر لوگ ان حقائق کو نہیں سمجھتے، اسی لیے جو زبان پر آئے بک دیتے ہیں اور جو جی میں آئے کرتے ہیں۔

فائدہ: ۳ جلانا اور مارنا جب اسی کا فعل ہے تو دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے۔

يَآَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ

اے لوگوں! تمہارے پاس آئی ہے نصیحت تمہارے رب سے اور شفاء دلوں کے روگ کی ، اور ہدایت اور رحمت

لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٥٧﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿٥٨﴾

مسلمانوں کے واسطے ۱ کہہ اللہ کے فضل سے اور اسکی مہربانی سے سو اسی پر ان کو خوش ہونا چاہیے ۲ یہ بہتر ہے ان چیزوں سے جو جمع کرتے ہیں ۳

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے بعض آیات میں قرآن کریم کی حقانیت کا بیان تھا، اب دوبارہ اسی کا بیان ہے اور ساتھ ہی اس کی فضیلت بھی، نیز اس سے پیچھے ڈرا کر دعوت دی گئی تھی، اب آگے ترغیب کے ساتھ دعوت ہے۔

اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک ایسی چیز آئی جو (برے کاموں سے روکنے کے لئے) نصیحت ہے اور (اگر اس پر عمل کر کے برے کاموں سے بچیں تو) دلوں میں جو (برے کاموں سے) روگ (یعنی بیماریاں ہوجاتی) ہیں ان کے لئے شفاء ہے، اور (نیک کاموں کے کرنے کے لئے) رہنمائی کرنے والی ہے، اور (اگر اس پر عمل کر کے نیک کاموں کو اختیار کریں تو) رحمت (اور ذریعہ ثواب) ہے (اور یہ سب برکات) ایمان والوں کے لئے (ہیں کیونکہ عمل وہی کرتے ہیں، پس قرآن کریم کی یہ برکات سنا کر) آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ (جب قرآن ایسی چیز ہے) تو لوگوں کو خدا کے اس انعام اور رحمت پر خوش ہونا چاہئے (اور اس کو عظیم دولت سمجھ کر لینا چاہئے) وہ اس (دنیا) سے بدرجہا بہتر ہے جس کو جمع کر رہے ہیں (کیونکہ دنیا کا نفع قلیل اور فانی ہے اور قرآن کا نفع بہت زیادہ اور باقی رہنے والا ہے)۔

وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ: اس میں دلیل ہے کہ قلوب میں بھی امراض ہوتے ہیں اور یہ جسمانی امراض سے بھی زیادہ سخت ہوتے ہیں جیسے شک، نفاق، حسد، تکبر وغیرہ۔

وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ: قرآن کے بارے میں جو موعظت (نصیحت) شفا، ہدایت اور رحمت کے الفاظ فرمائے گئے ہیں ان کا فرق خلاصہ تفسیر میں ترجمہ ہی سے ظاہر ہے، اور میرے نزدیک لِّلْمُؤْمِنِيْنَ کی قید سب کے ساتھ ہے، یعنی یہ باتیں قرآن سے مسلمان ہی حاصل کرتے ہیں، چنانچہ دوسری آیتوں میں ہر صفت کے ساتھ "مؤمنین" کی قید مذکور ہے: قل هو للذين اٰمنوا هدى وشفاء، وننزل من القراٰن ما هو شفاء ورحمة للمؤمنين، هذا بيان للناس وهدى وموعظة للمتقين، ان سب آیتوں میں قرآن کو ہدایت، شفا، رحمت اور موعظت مسلمانوں ہی کے حق میں فرمایا گیا ہے، اگرچہ نزول کے اعتبار سے سب کے لیے یہ باتیں عام ہیں، مگر فائدے اور نفع کے لحاظ سے مسلمانوں ہی کے لیے خاص ہیں۔

فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا: یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن کریم کی ایک دوسری آیت کے ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ فرح وخوشی کا

اس دنیا میں کوئی مقام ہی نہیں، ارشاد ہے: لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ یعنی خوشی میں مست نہ ہو، اللہ ایسے خوش ہونے والوں کو پسند نہیں فرماتے اور آیت مذکورہ میں بصیغہ امر خوش ہونے کا حکم دیا گیا ہے، اس ظاہری تعارض کا ایک جواب تو یہ ہے کہ جہاں خوش ہونے کو منع فرمایا ہے وہاں خوشی کا تعلق متاع دنیا سے ہے اور جہاں خوش ہونے کا حکم دیا ہے وہاں خوشی کا تعلق اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت سے ہے، دوسرا فرق یہ بھی ہے کہ ممانعت کی جگہ میں مطلق خوشی مراد نہیں بلکہ خوشی میں بدمست ہوجانا مراد ہے، اجازت کی جگہ میں مطلق خوشی مراد ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ: یہ سب صفات قرآن کریم کی ہیں، قرآن اول سے آخر تک نصیحت ہے جو لوگوں کو مہلک اور مضر باتوں سے روکتا ہے، دلوں کی بیماریوں کے لیے نسخہ شفا ہے، وصول الی اللہ اور رضائے خداوندی کا راستہ بتاتا ہے، اور اپنے ماننے والوں کو دنیا و آخرت میں رحمت الٰہیہ کا مستحق ٹھہراتا ہے، بعض محققین کے نزدیک اس آیت میں نفس انسانی کے مراتب کمال کی طرف اشارہ ہے، یعنی جو شخص قرآن کریم سے تمسک کرے ان تمام مراتب پر فائز ہوسکتا ہے: ① اپنے ظاہر کو نالائق افعال سے پاک کرنا، لفظ موعظة میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

② باطن کو عقائد فاسدہ اور ملکات رویہ سے خالی کرنا جو شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ سے مفہوم ہوتا ہے۔

③ نفس کو عقائد حقہ اور اخلاق فاضلہ سے آراستہ کرنا، جس کے لیے لفظ ھدی زیادہ مناسب ہے۔

④ ظاہر و باطن کی درستی کے بعد انوار رحمت الٰہیہ کا نفس پر فائض ہونا، جو لفظ رحمة کا مدلول ہے۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے جو تقریر کی ہے اس میں ان چار لفظوں سے شریعت، طریقت، حقیقت اور نبوت و خلافت کی طرف علی الترتیب اشارہ کیا ہے، یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں اور نہ اس قسم کے مضامین خالص تفسیر کی مد میں آسکتے ہیں۔

**فائدہ:** ۲فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا: "فرح" (خوش ہونا) محمود بھی ہے اور مذموم بھی، کسی نعمت پر اس حیثیت سے خوش ہونا کہ اللہ کے فضل و رحمت سے ملی ہے، محمود ہے، جیسے یہاں فرمایا: فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا اور حُطام دنیا پر خوش ہونا اور اکڑنا خصوصاً یہ خیال کر کے ہم کو اپنی لیاقت سے حاصل ہوئی ہے، سخت مذموم ہے، قارون اپنے مال و دولت کی نسبت کہتا تھا: اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ اس کو فرمایا: لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (القصص: ۷۶-۷۷)

**فائدہ:** ۳هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ: یعنی اصل چیز خدا کا فضل و رحمت ہے، انسان کو اسی کی تلاش کرنی چاہیے مال و دولت، جاہ و حشم، سب اس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ

تو کہہ بھلا دیکھو تو اللہ نے جو اتاری تمہارے واسطے روزی پھر تم نے ٹھہرائی اس میں سے کوئی حرام اور کوئی حلال، کہہ کیا اللہ نے حکم دیا تم کو

اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ

یا اللہ پر افتراء کرتے ہو ۱ اور کیا خیال ہے جھوٹ باندھنے والوں کا اللہ پر قیامت کے دن ۲ اللہ تو

فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۶۰﴾ ع

فضل کرتا ہے لوگوں پر اور لیکن بہت لوگ حق نہیں مانتے ۳

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے شرک کا ابطال تھا، شرک کی رسموں میں ایک حلال کو حرام سمجھنا بھی ہے، اب اس رسم کی برائی بیان کی جاتی ہے۔

آپ (ان سے) کہئے کہ یہ تو بتلاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے (فائدے کے) لئے جو کچھ رزق بھیجا تھا، پھر تم نے (اپنی طرف سے) اس کا

کچھ حصہ حرام اور کچھ حلال قرار دے لیا (حالانکہ اس حرام سمجھنے کی کوئی دلیل تمہارے پاس نہیں تو) آپ (ان سے) پوچھئے کہ کیا تم کو خدا نے حکم دیا ہے یا (محض) اللہ پر (اپنی طرف سے) افتراء ہی کرتے ہو (چونکہ پہلی صورت کا احتمال ہی نہیں، بلکہ دوسری صورت متعین ہے کہ وہ اللہ پر بہتان ہی باندھتے ہیں، اس لیے اب اس پر وعید بیان فرماتے ہیں) اور جو لوگ اللہ پر جھوٹ افتراء باندھتے ہیں ان کا قیامت کی نسبت کیا گمان ہے (جو بالکل ڈرتے نہیں، کیا یہ سمجھتے ہیں کہ قیامت نہیں آئے گی یا آئے گی مگر ہم سے باز پرس نہ ہوگی) واقعی لوگوں پر اللہ کا بڑا ہی فضل ہے (کہ ساتھ کے ساتھ سزا نہیں دیتا، بلکہ توبہ کے لیے مہلت دے رکھی ہے) لیکن اکثر آدمی بے قدر ہیں (ورنہ توبہ کر لیتے)۔

**مَّآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ لَكُمۡ مِّنۡ رِّزۡقٍ فَجَعَلۡتُمۡ مِّنۡهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا**: اس میں ان لوگوں پر رد ہے جو بعض مباح اور جائز امور کو اعتقاداً یا عملاً زہد و قناعت اور ترک دنیا کے عنوان سے اپنے اوپر حرام کر لیتے ہیں، البتہ جو شخص بطور علاج کرے تو وہ مستثنیٰ ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی قرآن جو نصیحت، شفاء اور ہدایت و رحمت بن کر آیا ہے وہ ہی استناد اور تمسک کرنے کے لائق ہے، احکام الٰہیہ کی معرفت اور حلال و حرام کی تمیز اسی سے ہو سکتی ہے، یہ کیا واہیات ہے کہ خدا نے تو تمہارے انتفاع کے لیے ہر قسم کی روزی پیدا کی، پھر تم نے محض اپنی آراء و اہواء سے اس میں سے کسی چیز کو حلال، کسی کو حرام ٹھہرا لیا، بھلا تحلیل و تحریم کا تم کو کیا حق ہے؟ کیا تم یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہو کہ خدا تعالیٰ نے ایسا حکم دیا، یا یوں ہی خدا پر افتراء کر رہے ہو، اگلی آیت میں صاف اشارہ کر دیا کہ بجز افتراء علی اللہ کے اور کچھ نہیں۔

**تنبیہ:** جن چیزوں کو حلال و حرام کیا تھا، ان کا مفصل تذکرہ مائدہ اور انعام میں گزر چکا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی یہ لوگ روز قیامت کے متعلق کیا خیال کر رہے ہیں کہ کیا معاملہ ان کے ساتھ ہوگا سخت پکڑے جائیں گے، یا سستے چھوٹ جائیں گے، عذاب بھگتنا پڑے گا یا نہیں، کن خیالات میں پڑے ہیں، یاد رکھیں جو دردناک سزا ملنے والی ہے وہ ٹل نہیں سکتی۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی خدا اپنے فضل سے دنیا میں بہت کچھ مہلت دیتا ہے، بہت سی تقصیرات سے درگزر کرتا ہے، لیکن بہت لوگ نرمی اور اغماض کو دیکھ کر بجائے شکر گذار ہونے کے اور زیادہ دلیر اور بے خوف ہو جاتے ہیں، آخر سزا دینی پڑتی ہے:

حلمِ حق با تو مواساہا کند چوں نتو از حد بگزری رسوا کند

**وَمَا تَكُوۡنُ فِىۡ شَاۡنٍ وَّمَا تَتۡلُوۡا مِنۡهُ مِنۡ قُرۡاٰنٍ وَّلَا تَعۡمَلُوۡنَ مِنۡ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيۡكُمۡ**

اور نہیں ہوتا تو کسی حال میں اور نہ پڑھتا ہے اس میں سے کچھ قرآن اور نہیں کرتے ہو تم لوگ کچھ کام کہ ہم نہیں ہوتے

**شُهُوۡدًا اِذۡ تُفِيۡضُوۡنَ فِيۡهِ‌ؕ وَمَا يَعۡزُبُ عَنۡ رَّبِّكَ مِنۡ مِّثۡقَالِ ذَرَّةٍ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا فِى السَّمَآءِ**

حاضر تمہارے پاس جب تم مصروف ہوتے ہو اس میں، اور غائب نہیں رہتا تیرے رب سے ایک ذرہ بھر زمین میں اور نہ آسمان میں

**وَلَاۤ اَصۡغَرَ مِنۡ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكۡبَرَ اِلَّا فِىۡ كِتٰبٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۶۱﴾**

اور نہ چھوٹا اس سے اور نہ بڑا جو نہیں ہے کھلی ہوئی کتاب میں

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے بہت سی آیتوں میں کفار کا انکار، تکذیب، عناد اور مخالفت بیان ہوئی، چونکہ یہ امور طبعاً حضور ﷺ کے لیے تکلیف دہ ہیں اس لیے اب آپ ﷺ کی تسلی کا مضمون ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ہمیں سب احوال کی اطلاع ہے: **وما تکون فی شان الخ**، اور اپنی اطاعت کرنے والوں کی ہم دونوں جہاں میں حفاظت کرتے ہیں: **الا ان اولیاء اللہ لا خوف الخ**، اور قدرت کاملہ بھی صرف ہم ہی کو حاصل ہے نہ کہ دوسرے شرکاء کو: **ان العزۃ للہ الخ** پس علم و قدرت کا اعتقاد اور حفاظت کا وعدہ تسلی کے لیے کافی ہے۔

اور آپ (خواہ) کسی حال میں ہوں اور (من جملہ ان احوال کے) آپ کہیں سے قرآن پڑھتے ہوں اور (اس طرح اور لوگ بھی جتنے ہوں) تم جو کام بھی کرتے ہو ہم کو سب کی خبر رہتی ہے جب تم اس کام کو کرنا شروع کرتے ہو، اور آپ کے رب (کے علم) سے کوئی چیز ذرہ برابر بھی غائب نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں (بلکہ سب اس کے علم میں حاضر ہیں) اور نہ کوئی چیز اس (مقدار مذکور) سے چھوٹی اور نہ کوئی چیز (اس سے) بڑی مگر یہ سب (احاطہ علم الٰہی کی وجہ سے) کتاب مبین (یعنی لوح محفوظ) میں (لکھی ہوئی) ہے۔

***

**فائدہ** : پہلے قرآن کریم کے اوصاف بیان کیے تھے وہ سراپا نور ہدایت، شفائے قلوب، نعمت عظمیٰ اور رحمت کبریٰ ہیں، پھر اشارہ کیا کہ ہدایت وبصیرت کی ایسی صاف روشنی کو چھوڑ کر لوگ اپنے اوہام وخیالات کے اندھیرے میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور خدا پر افتراء کر کے اس کے فضل وانعام کی ناقدری کرتے ہیں، اس آیت میں متنبہ کیا کہ لوگ کس حال میں ہیں اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا شان ہے، آپ شب و روز مالک حقیقی کی وفاداری، ہمدردی خلائق کی جن شون عظیمہ کے مظہر بنتے ہیں، خصوصاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو امتیازی شان قرآن پڑھنے پڑھانے کے وقت ظاہر ہوتی ہے یعنی قرآن کے ذریعے سے جو جہاد آپ کر رہے ہیں وہ سب خدا کے حضور میں ہے اور لوگ جو کچھ اچھا یا برا معاملہ کرتے ہیں وہ سب بھی خدا کی نظر کے سامنے ہیں، جس وقت مخلوق کوئی کام شروع کرتی اور اس میں مشغول ومنہمک ہو جاتی ہے، خواہ اسے خدا کا تصور نہ آئے، لیکن خدا اس کو برابر دیکھ رہا ہے فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّه، يَرَاكَ زمین وآسمان میں کہیں ایک ذرہ برابر یا اس سے چھوٹی بڑی چیز نہیں جو خدا تعالیٰ کے علم محیط سے غائب ہو، بلکہ علم الٰہی سے نیچے اتر کر تمام "مَاكَانَ وَمَايَكُوْنُ" کا حال کتاب مبین (لوح محفوظ) میں ثبت ہے، جسے "عالم تدبیر" میں "صحیفہ علم الٰہی کہنا چاہیے، جب حق تعالیٰ پر کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز پوشیدہ نہیں تو ان مکذبین معاندین کے معاملات واحوال کیسے مخفی رہ سکتے ہیں، پھر روز جزاء کی کارروائی کے متعلق یہ کیا خیال کر رہے ہیں، وہ خوب سمجھ لیں کہ ان کی ہر چھوٹی بڑی حرکت خدا کے سامنے ہے وہاں کوئی خیانت اور چوری نہیں چل سکے گی، ہر عمل کی سزا مل کر رہے گی، اور جس طرح دشمنوں کے معاملات اس کے سامنے ہیں، ان کے بالمقابل دوستوں کا ذرہ ذرہ حال بھی اس کے علم میں ہے، اگلی آیات میں ان کو بشارت سنائی گئی۔

## اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾

یاد رکھو جو لوگ اللہ کے دوست ہیں نہ ڈر ہے ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے

**خلاصہ تفسیر**: پیچھے علم الٰہی کا بیان ہوا، اب آگے مخلص اطاعت کرنے والوں کی حفاظت کا بیان ہے:

یاد رکھو اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ (ناک واقعہ پڑنے والا) ہے اور نہ وہ (کسی مطلوب کے فوت ہونے پر) مغموم ہوتے ہیں (یعنی اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کو خوف ناک اور غم ناک حوادث سے بچاتا ہے)۔

**اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ**: اولیاء اللہ پر خوف وغم نہیں ہوتا، اس سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ آخرت میں حساب کتاب کے بعد جب ان کو ان کے مقام جنت میں داخل کر دیا جائے گا تو خوف وغم سے ان کو ہمیشہ کے لئے نجات ہو جائے گی، نہ کسی تکلیف و پریشانی کا خطرہ رہے گا نہ کسی محبوب ومطلوب چیز کے ہاتھ سے نکل جانے کا غم ہوگا، بلکہ جنت کی نعمتیں دائمی اور لازوال ہوں گی، اس معنی کے اعتبار سے تو مضمون آیت پر کوئی اشکال نہیں لیکن یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس میں اولیاء اللہ کی کوئی خصوصیت نہ رہی بلکہ تمام اہل جنت جن کو جہنم سے نجات مل گئی ہو اسی حال میں ہوں گے، ہاں! یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو لوگ انجام کار جنت میں پہنچ گئے وہ سب "اولیاء اللہ" ہی کہلائیں گے، دنیا میں ان کے اعمال کتنے ہی مختلف رہے ہوں مگر دخول جنت کے بعد سب کے سب "اولیاء اللہ" کی ہی فہرست میں شمار ہوں گے۔

لیکن بہت سے مفسرین نے فرمایا کہ اولیاء اللہ پر خوف وغم نہ ہونا دنیا وآخرت دونوں کے لئے عام ہے اور اولیاء اللہ کی خصوصیت یہی ہے کہ دنیا میں بھی وہ خوف وغم سے محفوظ ہیں اور آخرت میں ان پر خوف وغم نہ ہونا تو سب ہی جانتے ہیں، اور اس میں سب اہل جنت داخل ہیں، مگر اس پر

حالات وواقعات کے اعتبار سے یہ اشکال ہے کہ دنیا میں تو یہ بات مشاہدہ کے خلاف ہے کیونکہ اولیاء اللہ تو کیا انبیاء علیہم السلام بھی اس دنیا میں خوف وغم سے محفوظ نہیں، بلکہ ان کا خوف وخشیت اوروں سے زیادہ ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے: اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا ، یعنی اللہ تعالیٰ سے پوری طرح علماء ہی ڈرتے ہیں، اور دوسری جگہ میں اولیاء اللہ ہی کا یہ حال بیان فرمایا ہے: وَالَّذِیْنَ ھُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّھِمْ مُّشْفِقُوْنَ اِنَّ عَذَابَ رَبِّھِمْ غَیْرُ مَاْمُوْنٍ، یعنی یہ لوگ اللہ کے عذاب سے ہمیشہ ڈرتے رہتے ہیں کیونکہ ان کے رب کا عذاب ایسی چیز نہیں جس سے کوئی بے فکر ہوکر بیٹھ سکے، اس لئے روح المعانی میں علامہ آلوسیؒ نے یہ فرمایا کہ حضرات اولیاء اللہ کا دنیا میں خوف وغم سے محفوظ ہونا اس اعتبار سے ہے کہ جن چیزوں کے خوف وغم میں عام طور سے اہل دنیا مبتلا رہتے ہیں کہ دنیوی مقاصد، آرام وراحت، عزت ودولت میں ذراسی کمی ہوجانے پر مرنے لگتے ہیں اور ذرا ذرا سی تکلیف وپریشانی کے خوف سے ان سے بچنے کی تدبیروں میں رات دن کھوئے رہتے ہیں، اولیاء اللہ کا مقام ان سب سے بالا وبلند ہوتا ہے، ان کی نظر میں نہ دنیا کی فانی عزت ودولت، راحت وآرام کوئی چیز ہے جس کے حاصل کرنے میں سرگرداں ہوں، اور نہ یہاں کی محنت وکلفت اور رنج کچھ قابل التفات ہے جس کی مدافعت میں پریشان ہوں، اللہ جل شانہ کی عظمت ومحبت اور خوف وخشیت ان حضرات پر ایسی چھائی ہوتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں دنیا کی رنج وراحت، سود وزیاں پرکاہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتے۔

خلاصہ یہ کہ خوف سے خدا کا خوف، اور غم سے آخرت کا غم مراد نہیں ہے، بلکہ دنیوی خوف وغم کی نفی کرنا مقصود ہے جس کا احتمال دشمنوں کی مخالفت سے ہوسکتا ہے، یہ خوف مؤمنین کاملین کو نہیں ہوتا، ان کا ہر وقت اللہ پر اعتماد ہوتا ہے، ہر واقعہ کی حکمت کا اعتقاد رکھتے ہیں، اس میں مصلحت سمجھتے ہیں جس کی بشارت قرآن وحدیث میں دی گئی ہے، اور یہ بشارت سب مسلمانوں کے لیے عام ہے جس میں رویاء صالحہ وغیرہ سب داخل ہیں، اس تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسا آپ کو ان کے گمراہ ہونے کا غم تھا ایسا ہی کبھی ان کی مخالفت اور ضرر رسانی کے احتمال سے بھی تردد ہوا کرتا تھا، واللہ اعلم۔

* * *

**فائدہ:** ابن کثیرؒ نے روایات حدیثیہ کی بناء پر اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اولیاء اللہ (خدا کے دوستوں) کو آخرت میں اہوال محشر کا کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ دنیا کے چھوٹ جانے پر غمگین ہوں گے، بعض مفسرین نے آیت کو کچھ عام رکھا ہے، یعنی ان پر اندیشہ ناک حوادث کا وقوع نہ دنیا میں ہوگا نہ آخرت میں، اور نہ کسی مطلوب کے فوت ہونے پر وہ مغموم ہوتے ہیں، گویا خوف سے خوف حق یا غم سے غمِ آخرت کی نفی مراد نہیں، بلکہ دنیا میں دنیاوی خوف وغم کی نفی مراد ہے جس کا احتمال مخالفت اعداء وغیرہ سے ہوسکتا ہے وہ مومنین کاملین کو نہیں ہوتا، ہر وقت ان کا اعتماد اللہ پر ہوتا ہے اور تمام واقعات تکوینیہ کے خالی از حکمت نہ ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں، اس اعتماد واعتقاد کے استحضار سے انھیں خوف وغم نہیں ستاتا۔

میرے نزدیک لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ کا مطلب یہ لیا جائے کہ اولیاء اللہ پر کوئی خوفناک چیز (ہلاکت یا معتد بہ نقصان) دنیا وآخرت میں واقع ہونے والی نہیں، اگر فرض کیجئے دنیا میں صورتاً کوئی نقصان پیش بھی آئے تو چونکہ نتیجہ وہ ان کے حق میں نفع عظیم کا ذریعہ بنتا ہے، اس لیے اس کو معتد بہ نقصان نہیں کہا جاسکتا، رہا کسی سبب دنیاوی یا اخروی کی وجہ سے ان کو کسی وقت خوف لاحق ہونا، وہ آیت کی اس تقریر کے منافی نہ ہوگا، کیونکہ آیت نے صرف یہ خبر دی ہے کہ ان پر کوئی خوفناک چیز نہ پڑے گی، یہ نہیں کہا کہ انھیں کسی وقت خوف لاحق نہ ہوگا، شاید لا یحزنون کے مناسب لا یخافون نہ فرمانے اور لا خوف علیھم کی تعبیر اختیار کرنے میں یہی نکتہ ہو، باقی لا یحزنون کا تعلق میرے خیال میں مستقبل سے ہے، یعنی موت کے وقت اور موت کے بعد غمگین نہ ہوں گے جیسا کہ فرمایا: تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا (فصلت: ۳۰) اور فرمایا: لَا یَحْزُنُھُمُ الْفَزَعُ الْاَکْبَرُ وَتَتَلَقّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ھٰذَا یَوْمُکُمُ الَّذِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (الانبیاء: ۱۰۳) واللہ تعالیٰ اعلم بمرادہ۔

الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ لَھُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ؕ لَا تَبْدِیْلَ

جو لوگ کہ ایمان لائے اور ڈرتے رہے ۱ ان کے لیے خوش خبری دنیا کی زندگانی میں اور آخرت میں ۲ بدلتی نہیں

لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۴﴾

اللہ کی باتیں ؁ یہی ہے بڑی کامیابی

خلاصہ تفسیر: (اور) وہ (اللہ کے دوست) وہ ہیں جو ایمان لائے اور (معاصی سے) پرہیز رکھتے ہیں (یعنی ایمان اور تقوی سے اللہ کا قرب نصیب ہوتا ہے، خوف وحزن سے ان کے محفوظ رہنے کی وجہ یہ ہے کہ) ان کے لیے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی (من جانب اللہ خوف وحزن سے بچنے کی) خوش خبری ہے (اور) اللہ کی باتوں (وعدوں) میں کچھ فرق ہوا نہیں کرتا (پس جب بشارت میں ان سے وعدہ کیا گیا اور وعدہ ہمیشہ صحیح ہوتا ہے اس لئے خوف وغم کا نہ ہونا لازمی ہے اور) یہ (بشارت جو مذکور ہوئی) بڑی کامیابی ہے۔

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ: ولایت یعنی اللہ سے دوستی کا دارومدار صرف ایمان وتقوی پر ہے، چنانچہ ایمان وتقوی پر ولایت کی بنیاد رکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ ولایت کے لیے یہ شرط نہیں کہ اس کے ہاتھ پر کوئی کرامت بھی صادر ہوا کرے، مزید تفصیل سورہ انفال میں آیت ۳۴: ان اولیاؤہ الا المتقون کے تحت ملاحظہ کریں۔

* * *

فائدہ: ۱۔ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ: یہ اولیاء اللہ کی تعریف فرمائی، یعنی مومن متقی خدا کا ولی ہوتا ہے، پہلے کئی مواقع میں معلوم ہو چکا ہے کہ ایمان وتقویٰ کے بہت سے مدارج ہیں، پس جس جس درجہ کا ایمان وتقویٰ کسی میں موجود ہوگا، اسی درجہ میں ولایت کا ایک حصہ اس کے لیے ثابت ہوگا، پھر جس طرح مثلاً دس بیس روپیہ بھی مال ہے اور پچاس، سو، ہزار دو ہزار، لاکھ دو لاکھ روپیہ بھی لیکن عرف عام میں دس بیس روپے کے مالک کو ''مالدار'' نہیں کہا جاتا، جب تک معتد بہ مقدار مال ودولت موجود نہ ہو، اسی طرح سمجھ لیجئے کہ ایمان وتقویٰ کسی مرتبہ میں ہو، وہ ''ولایت'' کا شعبہ ہے اور اس حیثیت سے سب مومنین فی الجملہ ''ولی'' کہلائے جاسکتے ہیں، لیکن عرف میں ''ولی'' اسی کو کہا جاتا ہے جس میں ایک خاص اور ممتاز درجہ ایمان وتقویٰ پایا جاتا ہو، احادیث میں کچھ علامات وآثار اس ولایت کے ذکر کیے گئے ہیں، مثلاً ان کو دیکھنے سے خدا یاد آنے لگے یا مخلوق خدا سے ان کو بےلوث محبت ہو، عارفین نے اپنے اپنے مذاق کے موافق ''ولی'' کی تعریفیں کی ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

فائدہ: ۲۔ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ: اولیاء اللہ کے لیے دنیا میں کئی طرح کی بشارتیں ہیں، مثلاً حق تعالیٰ نے انبیاء کی زبانی جو لَا خَوْفٌ، عَلَيْهِمْ وغیرہ کی بشارت دی ہے، یا فرشتے موت کے قریب ان کو کہتے ہیں: وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (فصلت: ۳۰) یا کثرت سے سچے اور مبارک خواب انھیں نظر آتے ہیں، یا ان کی نسبت دوسرے بندگان خدا کو دکھائی دیتے ہیں جو حدیث صحیح کے موافق نبوت کے چھیالیس اجزاء میں سے ایک جزو ہے، یا ان کے معاملات میں خدا کی طرف سے خاص قسم کی تائید وامداد ہوتی ہے یا خواص میں اور کبھی خواص سے گزر کر عوام میں بھی ان کو مقبولیت حاصل ہوتی ہے، اور لوگ ان کی مدح وثناء اور ذکر خیر کرتے ہیں، یہ سب چیزیں دنیاوی بشارت کے تحت میں درجہ بدرجہ آسکتی ہیں، مگر اکثر روایات میں لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کی تفسیر رویائے صالحہ سے کی گئی ہے، واللہ اعلم، رہی بشارت اخروی، وہ خود قرآن میں منصوص ہے: بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اور حدیث میں بھی یہی تفسیر منقول ہے۔

فائدہ: ۳۔ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ: یعنی اللہ کی باتیں اور اسکے وعدے سب پختہ اور اٹل ہیں، جو بشارتیں دی ہیں ضرور پہنچ کر رہیں گی۔

وقف لازم

وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ؕ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۵﴾

اور رنج مت کر ان کی بات سے، اصل میں سب زور اللہ کے لیے ہے، وہی ہے سننے والا جاننے والا

خلاصہ تفسیر: اور (جب آپ نے مقبول بندوں کا محفوظ ہونا سن لیا تو) آپ کو ان کی باتیں غم میں نہ ڈالیں (یعنی ان کی کفریات

سے آپ مغموم نہ ہوں کیونکہ علم وحفاظت کے علاوہ) تمام تر غلبہ (اور کامل قدرت بھی) خدا ہی کے لئے (ثابت) ہے (وہ اپنی قدرت سے حسب وعدہ آپ کی حفاظت کرے گا) وہ (ان کی باتیں) سنتا ہے (اور ان کی حالت) جانتا ہے (وہ آپ کا بدلہ ان سے خود لے لے گا)۔

اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا: کسی دوسرے میں جو عزت نظر آتی ہے وہ بھی درحقیقت اللہ تعالی کے لیے ثابت ہے، اور وُہ غیر بھی اللہ کی عزت وکرامت کا ایک مظہر اور سایہ سا ہے، جیسے روشنی حقیقۃً سورج کی صفت ہے اور زمین جو اپنی ذات میں روشنی سے خالی ہے سورج کی ضیا پاشی سے منور ہوتی ہے، سورج ڈوب جائے تو تاریکی رہ جاتی ہے، اسے مسئلہ مظہریت کہا جاتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** اوپر سے اعدائے مکذبین کا ذکر چلا آتا تھا، ان کے بالمقابل دوستوں کا تذکرہ فرمایا اور ان کو دارین میں محفوظ رہنے کی بشارت سنائی، اسی سلسلہ میں حضور ﷺ کو تسلی دی جاتی ہے کہ آپ ﷺ احمقوں اور شریروں کی باتوں سے رنجیدہ نہ ہوں، غلبہ اور زور سب خدا کے لیے ہے وہ اپنے زور تائید سے حق کو غالب ومنصور اور مخالفین کو ذلیل ورسوا کر کے چھوڑے گا وہ ان کی سب باتیں سنتا اور سب حالات جانتا ہے۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ ؕ وَمَا یَتَّبِعُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ

سنتا ہے اللہ کا ہے جو کوئی ہے آسمانوں میں اور جو کوئی ہے زمین میں، اور یہ جو پیچھے پڑے ہیں اللہ کے سوا شریکوں کو پکارنے والے

اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ﴿۶۶﴾

سو یہ کچھ نہیں مگر پیچھے پڑے ہیں اپنے خیال کے اور کچھ نہیں مگر اٹکلیں دوڑاتے ہیں

**خلاصہ تفسیر:** یاد رکھو کہ جتنے کچھ آسمانوں میں ہیں اور جتنے زمین میں ہیں (یعنی فرشتے اور جن وانس) یہ سب اللہ ہی کے (مملوک) ہیں (اس کی حفاظت یا انتقام کو کوئی روک نہیں سکتا اس لیے پوری طرح تسلی رکھنی چاہئے) اور (اگر کسی کو شبہ ہو کہ شاید یہ باطل معبود مزاحمت کر سکیں تو اس کی حقیقت سن لو کہ) جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر دوسرے شرکاء کی عبادت کر رہے ہیں (خدا جانے) کس چیز کا اتباع کر رہے ہیں (یعنی ان کے اس عقیدہ کی کیا دلیل ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ مشرکین کے پاس اس عقیدہ کی کچھ بھی دلیل نہیں) محض بے سند خیال کا اتباع کر رہے ہیں اور محض خیالی باتیں کر رہے ہیں (پس واقع میں ان کے شرکاء میں نہ علم ہے نہ قدرت، محض بے سند قیاسی خیال ہے، پھر ان میں مزاحمت کے احتمال کی کب گنجائش ہے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی کل زمین وآسمان میں خدائے واحد کی سلطنت ہے، سب جن وانس اور فرشتے اسی کے مملوک ومخلوق ہیں، مشرکین کا غیر اللہ کو پکارنا اور انھیں خدائی کا حصہ دار بنانا محض اٹکل کے تیر اور واہی تباہی خیالات ہیں، ان کے ہاتھ میں نہ کوئی حقیقت ہے نہ حجت وبرہان، خالی اوہام وظنون کی اندھیریوں میں پڑے ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۷﴾

وہی ہے جس نے بنایا تمہارے واسطے رات کو کہ چین حاصل کرو اس میں اور دن دیا دکھلانے والا، بیشک اسمیں نشانیاں ہیں ان لوگوں کیلئے جو سنتے ہیں

**خلاصہ تفسیر:** اوپر کی آیتوں سے جس طرح تسلی مقصود ہے اسی طرح توحید بھی ان سے سمجھ آتی ہے، اور پہلے بھی توحید کے بارے میں آیات آچکی ہیں، آگے بھی توحید کا مضمون ہے۔

وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے تمہارے لئے رات بنائی تاکہ تم اس میں آرام کرو، اور دن بھی اس طور پر بنایا کہ (روشن ہونے کی وجہ سے) دیکھنے بھالنے کا ذریعہ ہے، اس (بنانے) میں دلائل (توحید) ہیں ان لوگوں کے لئے جو (تدبر کے ساتھ ان مضامین کو) سنتے ہیں (مگر مشرکین ان

دلائل میں غور نہیں کرتے اور شرک کی باتیں کرتے ہیں)۔

جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ: اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ رات کو کسی قدر آرام اور نیند کرنا بہتر ہے، کیونکہ اس میں مصلحت الٰہیہ کی موافقت ہے، اور ادب کا بھی یہی تقاضا ہے کہ ہر حکم میں موافقت کی جائے۔

* * *

**فائدہ:** دن رات اور اندھیرے اجالے کا پیدا کرنے والا وہی ایک خدا ہے، اسی سے خیر وشر اور تمام متقابل اشیاء کی پیدائش کو سمجھ لو، اس میں ''مجوس'' کے شرک کا رد ہو گیا، اور ادھر بھی لطیف اشارہ کر دیا کہ جس طرح رات کی تاریکی کے بعد خدا روز روشن کو لاتا ہے اور دن کے اُجالے میں وہ چیزیں نظر آتی ہیں جو شب کی ظلمت میں دکھائی نہ دیتی تھیں، ایسے ہی مشرکین کے اوہام وظنون کی اندھیریوں کا پردہ چاک کرنے کے لیے اس نے قرآن کریم کا آفتاب چمکایا جو لوگوں کو وصول الی اللہ کا ٹھیک راستہ دکھانے والا ہے۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِيُّ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ

کہتے ہیں ٹھہرا لیا اللہ نے بیٹا وہ پاک ہے، وہ بے نیاز ہے، اسی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں، نہیں تمہارے پاس

مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۶۸

کوئی سند اس کی، کیوں جھوٹ کہتے ہو اللہ پر جب بات کی تم کو خبر نہیں

**خلاصہ تفسیر:** (چنانچہ) وہ کہتے ہیں (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ اولاد رکھتا ہے، سبحان اللہ! (کیسی سخت بات کہی) وہ تو کسی کا محتاج نہیں (اور سب اس کے محتاج ہیں) اسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے (تو سب اس کے مملوک ہوئے اور وہ مالک ہوا، ثابت ہوا کہ کمالات میں کوئی اس کا شریک اور ہم جنس نہیں، پھر اگر اولاد ہم جنس ہوئی تو خدا کا ہم جنس ہونا تو باطل ہو چکا، اور اگر غیر جنس اولاد ہوئی تو ایسی اولاد ہونا خود عیب ہے اور اللہ تعالیٰ عیوب سے پاک ہے جیسا کہ سُبْحٰنَهٗ میں اس طرف اشارہ بھی ہے، سو خدا کے لیے اولاد کا ہونا مطلقاً باطل ہو گیا، ہم نے جو اولاد کے نہ ہونے کا دعویٰ کیا تھا اس پر تو ہم نے دلیل قائم کر دی، اب رہا تمہارا دعویٰ سو) تمہارے پاس (بجز بیہودہ دعوے کے) اس (دعویٰ) پر کوئی دلیل (بھی) نہیں (تو) کیا اللہ کے ذمے ایسی بات لگاتے ہو جس کا تم (کسی دلیل سے) علم نہیں رکھتے۔

اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ: اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے متعلق ظن وتخمینہ اور قیاس آرائی سے کلام کرنے پر انکار ہے خواہ وہ استدلالی ہوں یا ذوقی ہوں، اس میں اہل علم واہل تصوف بکثرت مبتلا ہیں۔

* * *

**فائدہ:** اس میں عیسائیوں کے شرک کا رد ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے، سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اگر وہ واقعی طور پر مسیح کو خدا کا (معاذ اللہ) صلبی بیٹا سمجھتے ہیں تو اس سے بڑھ کر کیا گستاخی ہوگی، خداوند قدوس بالبداہت بیوی بچوں سے پاک ہے، اور اگر بیٹے سے مراد متبنّیٰ ہے تو خدا کو اس کی ضرورت کیا پیش آئی کہ ایک مخلوق کو متبنّیٰ بنائے، کیا معاذ اللہ اسے اولاد کی حسرت اور بیٹا نہ ہونے کا غم تھا؟ یا فکر تھی کہ اس کے بعد مال ودولت کا وارث اور اس کا نام روشن کرنے والا کون ہوگا؟ یا یہ کہ بڑھاپے اور حرج مرج میں کس سے سہارا ملے گا؟ (العیاذ باللہ) وہ تو سب سے بے نیاز ہے اور سب ہر وقت اس کے محتاج ہیں، اسے بیٹے پوتے یا متبنّیٰ وغیرہ کی احتیاج کہاں ہو سکتی ہے؟ سب چیزیں اس کی مملوک ومخلوق ہیں، پھر مالک ومملوک اور خالق ومخلوق کے درمیان ان نسبتی رشتوں کی کہاں گنجائش ہے، یہ بڑی سخت بات ہے کہ خدا کی نسبت محض جہالت سے ایسی جھوٹی اور بے سند باتیں کہی جائیں۔

قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ

کہہ جو لوگ باندھتے ہیں اللہ پر جھوٹ بھلائی نہیں پاتے، تھوڑا سا نفع اٹھا لینا دنیا میں پھر ہماری طرف ہے ان کو لوٹنا

الثلثة ع ۱۰/۱۲ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۰﴾

پھر چکھائیں گے ہم ان کو سخت عذاب بدلہ ان کے کفر کا

**خلاصہ تفسیر:** آپ (ان کا مفتری یعنی بہتان طراز ہونا ثابت کر کے اس بہتان کی وعید سنانے کے لئے) کہہ دیجئے کہ جو لوگ اللہ پر جھوٹ افتراء کرتے ہیں (جیسے مشرکین) وہ (کبھی) کامیاب نہ ہوں گے۔

(اگر کسی کو شبہ ہو کہ ہم تو ان لوگوں کو دنیا میں خوب کامیاب اور آرام وراحت میں مشغول پاتے ہیں، تو جواب یہ ہے کہ) یہ دنیا میں (چند روزہ) تھوڑا سا عیش ہے (جو بہت جلد ختم ہو جاتا ہے) پھر (مرکر) ہمارے ہی پاس ان کو آنا ہے، پھر (آخرت میں) ہم ان کو ان کے کفر کے بدلے سزائے سخت (کا مزا) چکھادیں گے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی خدا پر جھوٹ باندھنے والے خواہ دنیا میں کیسی ہی طاقت رکھتے ہوں اور اپنے ساز وسامان پر مغرور ہوں لیکن انھیں حقیقی بھلائی اور کامیابی ہرگز نصیب نہیں ہو سکتی، تھوڑے دن دنیا کے مزے اڑالیں، انجام کار ان کا معاملہ خدا کی طرف رجوع ہوگا، جہاں سے اپنے جرائم کی پاداش میں نہایت سخت عذاب کا مزہ چکھیں گے۔

وقف لازم وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ

اور سنا ان کو حال نوح کا۔ جب کہا اپنی قوم کو اے قوم اگر بھاری ہوا ہے تم پر میرا کھڑا ہونا اور نصیحت کرنا

بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ

اللہ کی آیتوں سے تو میں نے اللہ پر بھروسہ کیا اب تم سب مل کر مقرر کرو اپنا کام اور جمع کرو اپنے شریکوں کو پھر نہ رہے تم کو اپنے کام میں

غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۷۱﴾

شبہ پھر کر گزرو میرے ساتھ اور مجھ کو مہلت نہ دو۔

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے متعدد مضامین بیان ہوئے، آگے بعض واقعات سے ان سب کی تائید فرماتے ہیں، توحید کی اس طرح کہ انبیاء پہلے سے توحید کی دعوت دیتے آئے، رسالت کی اس طرح کہ پہلے بھی رسول گذرے ہیں، دھمکی اور وعید کی تائید اس طرح کہ گذشتہ امتوں پر عذاب نازل ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی اس طرح کہ پہلے لوگ بھی تکذیب کرتے آئے ہیں، آخر میں انبیاء کو غلبہ حاصل ہوا، سو اول نوح علیہ السلام کا قصہ بیان کیا جاتا ہے۔

اور آپ ان کو نوح کا قصہ پڑھ کر سنایئے (جو کہ اس وقت واقع ہوا تھا) جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم! اگر تم کو میرا رہنا (یعنی وعظ گوئی کی حالت میں رہنا) اور احکام خداوندی کی نصیحت کرنا بھاری (اور ناگوار) معلوم ہوتا ہے تو (ہوا کرے، میں کچھ پرواہ نہیں کرتا، کیونکہ) میرا تو خدا ہی پر بھروسہ ہے، سوتم (مجھے نقصان پہنچانے کے متعلق) اپنی تدابیر (جو کچھ کر سکو) مع اپنے شرکاء (یعنی بتوں) کے پختہ کرلو (یعنی

تم اور تمہارے معبود سب مل کر میری ضرر رسانی میں اپنا ارمان نکال لو) پھر تمہاری وہ تدبیر تمہاری گھٹن (اور دل تنگی) کا باعث نہ ہونا چاہئے (یعنی اکثر خفیہ تدبیر سے طبیعت گھٹا کرتی ہے، سو خفیہ تدبیر کی ضرورت نہیں، جو کچھ تدبیر کرو دل کھول کر علانیہ کرو، میرا لحاظ پاس نہ کرو اور نہ میرے چلے جانے نکل جانے کا اندیشہ کرو، کیونکہ اتنے آدمیوں کے پہرے میں سے ایک آدمی کا نکل جانا بھی مستبعد ہے، پھر اخفا کی کیا ضرورت ہے) پھر میرے ساتھ (جو کچھ کرنا ہے) کر گزرو، اور مجھ کو (ذرا) مہلت نہ دو (حاصل یہ کہ میں تمہاری ان باتوں سے نہ ڈرتا ہوں اور نہ تبلیغ سے رک سکتا ہوں)۔

* * *

**فائدہ:** ۱۔ یعنی اہل مکہ کو نوح اور اس کی قوم کا حال سناؤ، تاکہ معلوم ہو کہ مکذبین و مفترین کو حقیقی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی، ان کی اچھل کود اور چمک دمک محض چند روزہ ہے جو انجام کار ہلاکت ابدی پر منتہی ہوتی ہے، اہل مکہ کو قوم نوح کا قصہ سن کر عبرت حاصل کرنا چاہیے کہ اگر وہ خاتم الانبیاء ﷺ کی تکذیب و عداوت اور اپنی شرکیات سے باز نہ آئے تو ان کا انجام بھی ویسا ہی ہو سکتا ہے جو نوح کی تکذیب کرنے والوں کا ہوا، نیز اس واقعہ کے بیان کرنے میں پیغمبر ﷺ کو تسلی دینا ہے کہ آپ ان لوگوں کی دشمنی اور شرارت سے زیادہ دلگیر نہ ہوں، ہر نبی کو اس قسم کے حالات کا مقابلہ کرنا پڑا ہے پھر آخر میں حق ہی غالب ہو کر رہا اور حق و صداقت کے دشمن تباہ و برباد کر دیئے گئے، عام سامعین کو ان واقعات کے ایسے مفصل بیان سے یہ سبق ملتا ہے کہ نبی عربی ﷺ باوجود امی ہونے اور کسی مخلوق کے سامنے ایک منٹ کے لیے بھی زانوئے تلمذ تہ نہ کرنے کے پچھلی قوموں کے اس قدر صحیح اور پختہ احوال بیان فرماتے ہیں جو بظاہر بدون تعلیم اور طویل استفادہ کے ممکن نہیں، ناچار ماننا پڑے گا کہ آپ کا معلم کوئی انسان نہیں بلکہ سب انسانوں کا پیدا کرنے والا ہے، یہ تو آپ کی سچائی کی ایک دلیل ہوگی۔

**فائدہ:** ۲۔ یعنی تمہاری خوشی ناخوشی یا موافقت و مخالفت کی مجھے ذرہ برابر پرواہ نہیں، تمام پیغمبروں کی طرح میرا بھروسہ صرف خدائے واحد پر ہے، اگر تم میری نصیحت و فہمائش سے برا مانو تو مانا کرو، میں اپنے فرائض منصبی کے ادا کرنے میں قصور نہیں کر سکتا، تم برا مان کر مجھ سے دشمنی کرو اور نقصان پہنچانا چاہو تو یہ چیز میرے ارادوں پر قطعاً اثر ڈالنے والی نہیں، جو کچھ تمہارے امکان میں ہے شوق سے کر گزرو، میرے خلاف مشورہ کر کے کوئی تجویز پختہ کر لو، اپنے رفقائے کار بلکہ فرضی معبودوں کو بھی جمع کر کے ایک غیر مشکوک اور غیر مشتبہ رائے پر قائم ہو جاؤ، پھر متفقہ طاقت سے اسے جاری کر ڈالو، ایک منٹ کی مہلت بھی مجھ کو نہ دو پھر دیکھ لو کہ پیغمبرانہ استقامت و توکل کا پہاڑ تمام دنیا کی طاقتوں اور تدبیروں کو کچل کر کس طرح پاش پاش کر ڈالتا ہے۔

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۷۲﴾

پھر اگر منہ پھیرو گے تو میں نے نہیں چاہی تم سے مزدوری، میری مزدوری ہے اللہ پر اور مجھ کو حکم ہے کہ رہوں فرمانبردار

**خلاصہ تفسیر:** (گزشتہ آیت میں خوف کی نفی فرمائی، اب طمع کی نفی فرماتے ہیں) پھر بھی اگر تم اعراض ہی کئے جاؤ تو (یہ سمجھو کہ) میں نے تم سے (اس تبلیغ پر) کوئی معاوضہ تو نہیں مانگا (اور میں تم سے کیوں مانگتا کیونکہ) میرا معاوضہ تو صرف (حسب وعدہ کرم) اللہ ہی کے ذمے ہے (غرض نہ تم سے ڈرتا ہوں نہ کچھ خواہش رکھتا ہوں) اور (چونکہ) مجھ کو حکم کیا گیا ہے کہ میں اطاعت کرنے والوں میں رہوں (اس لئے تبلیغ میں حکم کی تعمیل رکھتا ہوں، اگر تم نہ مانو گے میرا کیا نقصان ہے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی تمہارے مقابلہ میں نہ جانی و بدنی تکالیف سے گھبراتا ہوں اور نہ مالی نقصان کی کوئی فکر ہے کیونکہ میں نے خدمت تبلیغ و دعوت کا کچھ معاوضہ تم سے کبھی طلب نہیں کیا جو یہ اندیشہ ہو کہ تمہاری ناخوشی سے میری تنخواہ بند ہو جائے گی یا کم از کم تم کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ میری ساری جدوجہد مال کی حرص اور روپیہ کے لالچ سے تھی، میں جس کا کام کر رہا اور حکم بجا لا رہا ہوں اسی کے ذمہ میری اجرت ہے جب میں اس کا فرمانبردار ہوں اور خدمت مفوضہ بے خوف و خطر انجام دیتا ہوں تو کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے فضل و رحمت کے دروازے مجھ پر نہ کھولے رکھے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ

پھر اسکو جھٹلایا سو ہم نے بچا لیا اسکو اور جو اسکے ساتھ تھے کشتی میں اور انکو قائم کر دیا جگہ پر اور ڈبو دیا انکو جو جھٹلاتے تھے ہماری باتوں کو

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾

سو دیکھ لے کیسا ہوا انجام ان کا جن کو ڈرایا تھا

**خلاصہ تفسیر:** سو (اس بلیغ وعظ ونصیحت کے باوجود بھی) وہ لوگ ان کو جھٹلاتے رہے، پس (اس پر طوفان کا عذاب مسلط ہوا اور) ہم نے (اس عذاب سے) ان کو اور جو ان کے ساتھ کشتی میں تھے ان کو نجات دی، اور ان کو (زمین) پر آباد کیا، اور (باقی جو لوگ رہ گئے تھے) جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا ان کو (اس طوفان میں) غرق کر دیا، سو دیکھنا چاہئے کیسا (برا) انجام ہوا اُن لوگوں کا جو (عذاب الٰہی سے) ڈرائے جا چکے تھے (یعنی بے خبری میں ہلاک نہیں کئے گئے، پہلے کہہ دیا، سمجھا دیا، نہ مانا تو سزا پائی)۔

**وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ:** یہاں بعض لوگوں کو شبہ ہوجاتا ہے کہ جب طوفان کے بعد چند لوگ بچ گئے تو اس وقت دنیا میں وہی تھے اور نوح علیہ السلام کی دعوت اور نبوت ان سب کے لیے عام تھی تو نبوت عامہ حضور ﷺ کے لیے خاص نہ رہی؟ جواب یہ ہے کہ نبوت عامہ کا آپ کے ساتھ مخصوص ہونا اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مختلف امتیں موجود ہوں اس وقت بھی آپ کی بعثت سب کی طرف ہوگی، اور آپ سب امتیوں کے نبی ہوں گے، اور یہ خصوصیت اب بھی باقی ہے، کیونکہ اس صورت میں طوفان کے بعد مختلف قومیں ہی نہ رہیں تھی، بلکہ نوح علیہ السلام ہی کی قوم کے چند آدمی رہ گئے تھے، ان کے نبی تو آپ پہلے سے بھی تھے تو طوفان کے بعد ان کی نبوت عام کہاں ہوئی، خوب سمجھ لو۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جس کے پاس چشم عبرت ہو وہ دیکھ لے کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا، ان لوگوں کو سینکڑوں برس نوح علیہ السلام نے نصیحت کی، نفع وضرر سے آگاہ کیا جب کوئی بات موثر نہ ہوئی بلکہ الٹا عناد وفرار بڑھتا گیا، اس وقت خدا نے سخت طوفان پانی کا بھیجا، سب مکذبین غرقاب کر دیئے گئے، صرف نوح علیہ السلام اور چند نفوس جو ان کے ساتھ کشتی پر سوار تھے محفوظ رہے، ان ہی سے آگے نسل چلی، اور ڈوبنے والوں کی جگہ یہ ہی آباد ہوئے، نوح علیہ السلام کا کچھ قصہ سورہ اعراف میں گزر چکا ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا

پھر بھیجے ہم نے نوح کے بعد کتنے پیغمبران کی قوم کی طرف پھر لائے ان کے پاس کھلی دلیلیں سو ان سے یہ نہ ہوا کہ ایمان لے آئیں اس بات پر

كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۭ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰي قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۷۴﴾

جس کو جھٹلا چکے تھے پہلے سے [1] اسی طرح ہم مہر لگا دیتے ہیں دلوں پر حد سے نکل جانے والوں کے [2]

**خلاصہ تفسیر:** نوح علیہ السلام کا قصہ گذرا، اب عاد وثمود وغیرہ کا قصہ اجمالا مذکور ہے۔

پھر نوح کے بعد ہم نے اور رسولوں کو ان کی قوموں کی طرف بھیجا، سو وہ ان کے پاس معجزات لے کر آئے (مگر) پھر (بھی ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کی یہ کیفیت تھی کہ) جس چیز کو انہوں نے اول (وہلہ) میں (ایک بار) جھوٹا کہہ دیا یہ نہ ہوا کہ پھر اس کو مان لیتے (اور جیسے یہ لوگ دل کے سخت تھے) اللہ تعالیٰ اسی طرح کافروں کے دلوں پر بند لگا دیتے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی نوح کے بعد ہود صالح لوط ابراہیم شعیب وغیرہ انبیاء کو اپنی اپنی قوم کی طرف کھلے ہوئے نشانات دے کر بھیجا، لیکن جس جہالت اور کفر کی حالت میں وہ لوگ اپنے اپنے پیغمبر کی بعثت سے پہلے تھے اور جن چیزوں کو پیشتر سے جھٹلاتے چلے آرہے تھے، یہ توفیق نہ ہوئی کہ انبیاء کے تشریف لانے اور سمجھانے کے بعد ان کو مان لیتے، بلکہ جن اصول صحیحہ کی تکذیب پہلے قوم نوح کر چکی تھی، ان سبھوں نے بھی ان کے ماننے سے انکار کر دیا، اور جب پہلی مرتبہ منہ سے "نہ" نکل گئی، ممکن نہ تھا کہ پھر کبھی "ہاں" نکل سکے، اسی بے ایمانی اور تکذیب حق پر آخر تک اڑے رہے۔

**فائدہ:** ۲؎ جو لوگ تکذیب و عداوت حق میں حد سے نکل جاتے ہیں ان کے دلوں میں مہر لگنے کی یہ ہی صورت ہوتی ہے کہ اول تکذیب کرتے ہیں، پھر اس پر ضد اور اصرار کرتے محض دشمنی اور عناد کی روش اختیار کر لیتے ہیں، یہاں تک کے دل کی کلیں بگڑ جاتی ہیں اور قبول حق کی استعداد باقی نہیں رہتی۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا

پھر بھیجا ہم نے ان کے پیچھے موسیٰ اور ہارون کو فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس اپنی نشانیاں دے کر پھر تکبر کرنے لگے

وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝۷۵ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۷۶

اور وہ تھے لوگ گناہ گار ۱؎ پھر جب پہنچی ان کو سچی بات ہمارے پاس سے کہنے لگے یہ تو جادو ہے کھلا ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اب موسیٰ علیہ السلام کا قصہ فرعون کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

پھر ان (مذکورہ) پیغمبروں کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کو فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس اپنے معجزات (عصا اور ید بیضاء) دے کر بھیجا، سو انہوں نے (دعوے کے ساتھ ہی ان کی تصدیق کرنے سے) تکبر کیا (اور طلب حق کے لئے غور بھی تو نہ کیا) اور وہ لوگ جرائم کے خوگر تھے (اس لئے اطاعت نہ کی) پھر جب (دعویٰ کے بعد) ان کو ہمارے پاس سے (موسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر) صحیح دلیل پہنچی (مراد اس سے معجزہ ہے) تو وہ لوگ کہنے لگے کہ یقیناً یہ صریح جادو ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی جرائم پیشہ لوگ تھے، نافرمانی کی خو قبول حق کی اجازت کہاں دیتی، تکبر مانع ہوا کہ خدا کی نشانیوں کو دیکھ کر اس کے سفراء کے سامنے گردن جھکائیں: وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (النمل: ۱۴) یہ ہی تکبر تھا، جس نے فرعون سے یہ الفاظ کہلوائے: اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ (الشعراء: ۱۸)

**فائدہ:** ۲؎ یعنی "عصا" اور "ید بیضا" وغیرہ کے معجزات دیکھ کر اور موسیٰ علیہ السلام کی نہایت پر تاثیر باتیں سن کر کہنے لگے کہ یہ سب کھلا ہوا جادو ہے کیونکہ ان کے خیال میں تمام فوق العادت چیزوں کا آخری درجہ "جادو" ہی ہو سکتا تھا۔

قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ۭ اَسِحْرٌ هٰذَا ۭ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ۝۷۷

کہا موسیٰ نے کیا تم یہ کہتے ہو حق بات کو جب وہ پہنچے تمہارے پاس، کیا یہ جادو ہے، اور نجات نہیں پاتے جادو کرنے والے

**خلاصہ تفسیر:** موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کیا تم اس صحیح دلیل کی نسبت جبکہ وہ تمہارے پاس پہنچی ایسی بات کہتے ہو (کہ یہ جادو ہے) کیا یہ جادو ہے؟! حالانکہ جادوگر (جب کہ نبوت کا دعویٰ کریں تو اس وقت کوئی خارق عادت ظاہر کرنے میں) کامیاب نہیں ہوا کرتے (اور میں کامیاب ہوا کہ اول دعویٰ کیا پھر معجزات ظاہر کر دیئے)۔

**وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ:** خلاصہ تفسیر کی تقریر سے یہ شبہ جاتا رہا کہ ہم تو بعض دفعہ ساحروں کو کامیاب پاتے ہیں، حاصل جواب کا یہ ہوا کہ جو

ساحر نبوت کا مدعی ہو اس کے ہاتھ پر معجزہ ظاہر نہیں ہو سکتا، اس کی کامیابی شرعاً محال ہے۔

وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ: اسی پر اہل باطل کے بڑوں کا حال قیاس کر لیا جائے کہ ان کی بات نہیں چلتی یعنی اس میں برکت اور بقا نہیں، مطلب یہ کہ اہل حق کے مخالفین کی ناکامی کا تذکرہ ہے کہ دنیا میں ظاہری طور پر ان کا کتنا ہی حکم چلتا ہو اور کتنے ہی لوگ ان کی باتوں کی پیروی کرنے والے ہوں مگر ان کے اقوال و افعال کو دوام و استقرار نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کی باتوں کو بقا حاصل ہوتا ہے، کیونکہ ان کا کلام ایسی تعلیمات پر قائم ہوتا ہے جو سراسر حق کے مخالف ہوتی ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی حق کو جادو کہتے ہو، کیا جادو ایسا ہوتا ہے؟ اور کیا جادو کرنے والے نبوت کا دعویٰ کر کے حق و باطل کی کشمکش سے کامیاب نکل سکتے ہیں، سحر اور معجزہ میں تمیز نہ کر سکنا ان کوتاہ فہموں کا کام ہے جو سونے اور پیتل میں تمیز نہ کر سکیں، پیغمبر کے روشن چہرے، پاکیزہ اخلاق، نور تقویٰ، پر شوکت و عظمت احوال میں بدیہی شہادت اس کی موجود ہوتی ہے کہ جادوگری اور شعبدہ بازی سے انھیں کوئی دور کی نسبت بھی نہیں، پھر پیغمبر کو "ساحر" کہنا کس درجہ بے حیائی یا دیوانگی ہے۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ط

بولے کیا تو آیا ہے کہ ہم کو پھیر دے اس راستہ سے جس پر پایا ہم نے اپنے باپ دادوں کو اور تم دونوں کو سرداری مل جائے اس ملک میں

وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۸﴾

اور ہم نہیں ہیں تم کو ماننے والے

خلاصہ تفسیر: وہ لوگ (اس تقریر کا کچھ جواب نہ دے سکے، ویسے ہی براہ جہالت) کہنے لگے کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ اس طریقہ سے ہٹا دو جس پر ہم نے اپنے بزرگوں کو دیکھا ہے اور (اس لئے آئے ہو کہ) تم دونوں کو دنیا میں ریاست (اور سرداری) مل جائے اور (تم خوب سمجھ لو کہ) ہم تو تم دونوں کو کبھی نہ مانیں گے۔

* * *

فائدہ: یعنی معاذ اللہ تم دنیا کے حریص اور بدنیت ہو، ایک سیاسی تحریک کو مذہبی رنگ میں پیش کرتے ہو، تمہاری غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ مذہبی حیثیت سے ایک انقلاب عظیم برپا کر کے اس ملک میں اپنی حکومت اور سرداری جماؤ، اور یہاں کے قدیم سرداروں (قبطیوں) کو برطرف کر دو، سو یاد رہے کہ یہ خواہش پوری ہونے والی نہیں، ہم لوگ ہرگز تمہاری بات نہ مانیں گے نہ تمہاری بزرگی کبھی تسلیم کریں گے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۷۹﴾ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا

اور بولا فرعون لاؤ میرے پاس جو جادوگر ہو پڑھا ہوا لے پھر جب آئے جادوگر کہا ان کو موسیٰ نے ڈالو

مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۸۰﴾

جو تم ڈالتے ہو ۲

خلاصہ تفسیر: اور فرعون نے (اپنے سرداروں سے) کہا کہ میرے پاس تمام ماہر جادوگروں کو (جو ہمارے قلمرو یعنی سلطنت میں ہیں) حاضر کرو (چنانچہ جمع کئے گئے) سو جب وہ آئے (اور موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ ہوا تو) موسیٰ (علیہ السلام) نے ان سے فرمایا کہ ڈالو جو کچھ تم

کو (میدان میں) ڈالنا ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یہ موسیٰ علیہ السلام کی تقریر کا جواب تھا، یعنی رہا سحر اور معجزہ کا جھگڑا، اس کا ہم عملاً تصفیہ کیے دیتے ہیں کہ اس ملک کے بڑے بڑے ماہر جادوگر اکٹھے کیے جائیں، پھر آپ ان کے خوارق کے مقابل اپنے معجزات دکھلائیں، دنیا مشاہدہ کرلے گی کہ تم پیغمبر ہو یا (معاذ اللہ) جادوگر ہو، اس کے لیے فرعون نے تمام ملک میں گشتی جاری کردی اور آدمی بھیج دیے کہ مشاق اور ماہر جادوگر جہاں کہیں ہوں فوراً حاضر کیے جائیں، اس کا مفصل واقعہ سورہ اعراف میں گزر چکا، وہاں ملاحظہ کرلیا جائے۔

**فائدہ:** ۲؎ دوسری جگہ مذکور ہے کہ ساحرین نے موسیٰ علیہ السلام سے دریافت کیا تھا کہ اپنا کرتب دکھلانے میں تم پہل کرتے ہو یا ہم کریں اس کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ جو تم کو دکھلانا ہے دکھلاؤ کیونکہ باطل کی پوری زور آزمائی اور نمائش کے بعد حق کا آنا اور باطل کو نیچا دکھا کر ملیامیٹ کردینا زیادہ موثر اور غلبہ حق کو زیادہ واضح کرنے والا ہے۔

فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ

پھر جب انہوں نے ڈالا موسیٰ بولا کہ جو تم لائے ہو سو جادو ہے ۱؎ اب اللہ اس کو بگاڑتا ہے، بیشک اللہ نہیں سنوارتا

عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع ۱۲

شریروں کے کام ۲؎ اور اللہ سچا کرتا ہے حق بات کو اپنے حکم سے اور پڑے برا مانیں گناہ گار

**خلاصہ تفسیر:** سو جب انہوں نے (اپنا جادو کا سامان) ڈالا تو موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ جو کچھ تم (بنا کر) لائے ہو جادو یہ ہے (نہ وہ جس کو فرعون والے جادو کہتے ہیں) یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اس (جادو) کو ابھی درہم برہم کئے دیتا ہے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ ایسے فسادیوں کا کام بننے نہیں دیتا (جو معجزہ کے ساتھ مقابلہ سے پیش آئیں) اور اللہ تعالیٰ (جس طرح اہل باطل کے باطل کو حق معجزات کے مقابلہ میں باطل کردیتا ہے اسی طرح) دلیل صحیح (یعنی معجزہ) کو اپنے وعدوں کے موافق (جو کہ انبیاء کی نبوت کے ثبوت کے متعلق ہیں) ثابت کردیتا ہے گو مجرم (اور کافر) لوگ کیسا ہی ناگوار سمجھیں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ: یہاں بھی ''مفسد'' سے مراد وہ مفسد ہے جو معجزہ کا مقابلہ کرے، اس کی کامیابی بھی شرعاً محال ہے، اسی طرح سورہ طٰہ میں جو آیا ہے: ولا يفلح الساحر حيث اتى کہ جادوگر جب کبھی آئے کامیاب نہیں ہوسکتا، اس سے بھی یہی مراد ہے کہ جب معجزہ کا مقابلہ کرتے ہوئے آئے اس وقت کامیاب نہیں ہوتا، کیونکہ عادت اللہ یہی جاری ہے کہ نبی کے مقابلہ میں جھوٹا کامیاب نہیں ہوسکتا، اسی طرح اگر کوئی نبوت کا جھوٹا دعویٰ کردے اس کے ہاتھ سے بھی معجزہ ظاہر نہیں ہوسکتا۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ ساحرین نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں زمین پر پھینک دیں اور تخییل و نظر بندی سے دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہونے لگا گویا تمام میدان زندہ سانپوں سے بھرا ہوا ہے، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ''جادو'' یہ ہے، وہ جادو نہ تھا جسے فرعون اور اس کے خوشامدیوں نے جادو کہا تھا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی بس تم اپنی قوت صرف کر چکے، اب سنبھل جانا کہ خدا اپنی قدرت و رحمت سے یہ سب بنا بنایا کھیل بگاڑتا ہے جو میرے مقابلہ میں پھر کبھی نہیں سنور سکے گا، کیونکہ خدا کی عادت و حکمت کے خلاف ہے کہ مصلح و مفسد کے مقابلہ کے وقت جبکہ اس سے مقصود خالص اتمام حجت ہو مفسدوں اور شریروں کی بات سنوار دے اور کلمہ حق کو پست و مغلوب کردے۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۭ

پھر کوئی ایمان نہ لایا موسیٰ پر مگر کچھ لڑکے اس کی قوم کے ڈرتے ہوئے فرعون سے اور ان کے سرداروں سے کہ کہیں ان کو بچلا نہ دے ۲؎

وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۸۳﴾

اور فرعون چڑھ رہا ہے ملک میں، اور اس نے ہاتھ چھوڑ رکھا ہے ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** پس (جب عصا کا معجزہ ظاہر ہوا تو) موسیٰ (علیہ السلام) پر (شروع شروع میں) ان کی قوم میں سے صرف قدرے قلیل آدمی ایمان لائے وہ بھی فرعون سے اور اپنے حکام سے ڈرتے ڈرتے کہ کہیں (ظاہر ہونے پر) ان کو تکلیف (نہ) پہنچائے، اور واقع میں (ان کا ڈرنا بے جا نہ تھا، کیونکہ) فرعون اس ملک میں زور (سلطنت) رکھتا تھا، اور یہ بھی بات تھی کہ وہ حد (انصاف) سے باہر ہو جاتا تھا (ظلم کرنے لگتا تھا پھر جو شخص حکومت کے ساتھ ظلم کرتا ہو اس سے تو ڈر لگتا ہی ہے)۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ: یعنی موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے قدرے قلیل آدمی ایمان لائے، اس مقام پر بعض کو یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ بنی اسرائیل چونکہ فرعون کے ہاتھوں سب کے سب مصیبتوں میں مبتلا تھے، اس لیے موسیٰ علیہ السلام کا کوئی بھی مخالف نہ تھا، پھر اس کے کیا معنی کہ تھوڑے آدمی ایمان لائے اور اپنے سرداروں سے ڈرنے کی کیا وجہ؟ نیز سیر سے معلوم ہوتا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے چلے ہیں تو آپ کے ساتھ لاکھوں تھے، جس سے معلوم ہوا کہ بہت لوگ ایمان لائے تھے؟ جواب یہ ہے کہ مخالف نہ ہونا اور ساتھ ہو لینا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سب ایمان بھی لے آئے تھے، بلکہ دل میں یہ قصد ہوگا کہ ابھی سے مسلمان ہو کر کون پریشانی میں پڑے، موقع پر ایمان لے آئیں گے، ہاں ان میں جو سچے طالب خدا تھے ان سے بے پروائی اور تاخیر نہ ہو سکی، وہ قاعدہ کے موافق جبھی ایمان لے آئے اگرچہ اس کا عام اعلان نہ کیا اور قبطیوں کے خوف سے اپنے ایمان کو چھپائے رکھا، پس سرداروں سے مراد قبطی لوگ ہیں کہ وہی حکام تھے، بنی اسرائیل کے قبیلوں کے سردار مراد نہیں، کیونکہ ان سے کچھ خوف نہ تھا، اور یہ قصہ شروع شروع کا ہے، پھر کچھ ہمت بڑھتی گئی اور مسلمان بڑھتے گئے، تفسیر مدارک میں اس جگہ "أوّل الأمر" کی قید صراحۃً مذکور ہے، یعنی تھوڑے آدمیوں کا ایمان لانا اور ڈرتے ڈرتے ایمان لانا یہ شروع کی حالت ہے، اب سب شبہات دور ہوگئے۔

* * *

فائدہ: فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ: "بنی اسرائیل" فرعونیوں کے ہاتھوں سخت مصیبت اور ذلت اٹھا رہے تھے اور پرانی پیشین گوئیوں کے مطابق منتظر تھے کہ فرعون کے مظالم کا خاتمہ کرنے اور اس کی سلطنت کا تختہ الٹنے والا "اسرائیلی" پیغمبر مبعوث ہو، موسیٰ علیہ السلام ٹھیک اسی شان سے تشریف لائے جس کا انھیں انتظار تھا، اس لیے تمام "بنی اسرائیل" قدرتی طور پر موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کو نعمت عظمیٰ سمجھتے تھے، وہ دل سے حضرت موسیٰ کو سچا جانتے اور ان کی عزت کرتے تھے، مگر اکثر آدمی فرعونی سرداروں سے خوفزدہ تھے، اسی لیے ابتداء میں شرعی طور پر ایمان نہیں لائے، وقت کے منتظر رہے کہ جس وقت حق کا غلبہ ہوگا مسلمان ہو جائیں گے، بنی اسرائیل کے تھوڑے سے نوجوانوں نے ہمت کر کے باوجود فرعونیوں سے خائف ہونے کے اپنے اسلام کا اظہار و اعلان کر دیا، چند گنے چنے قبطی بھی جو فرعون کی قوم سے تھے، مشرف بایمان ہوئے، اخیر میں جب موسیٰ علیہ السلام کا اثر اور حق کا غلغلہ بڑھتا گیا، تب پوری قوم بنی اسرائیل کی جو تقریباً چھ لاکھ بالغ مردوں پر مشتمل تھی مسلمان ہوگئی، یہاں ابتداء کا قصہ بیان ہوا ہے۔

فائدہ: عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ: ان کے سرداروں سے مراد یا تو فرعون کے حکام و عمال ہیں، یا بنی اسرائیل کے وہ سردار مراد ہیں جو خوف یا طمع وغیرہ کی وجہ سے اپنے ہم قوموں کو فرعون کی مخالفت سے ڈراتے دھمکاتے تھے اور بچلا دینے کا مطلب یہ ہے کہ فرعون ایمان لانے کی خبر سن کر سخت ایذائیں پہنچائے جن سے گھبرا کر ممکن ہے بعض ضعیف القلب راہ حق سے بچل جائیں۔

فائدہ: <sup></sup>۳ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ: یعنی ان کا خوف کھانا بھی کچھ بیجا نہ تھا، کیونکہ اس وقت ملک میں فرعون کی مادی طاقت بہت بڑھ چڑھ کر تھی اور اس کا ظلم و عدوان اور کفر طغیان حد سے متجاوز ہو چکا تھا، کمزوروں کو ستانے کے لیے اس نے بالکل ہاتھ چھوڑ رکھا تھا۔

وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ﴿۸۴﴾

اور کہا موسیٰ نے اے میری قوم اگر تم ایمان لائے ہو اللہ پر تو اسی پر بھروسہ کرو اگر ہو تم فرماں بردار

**خلاصہ تفسیر:** اور موسیٰ (علیہ السلام) نے (جب ان کو خائف دیکھا تو ان سے) فرمایا اے میری قوم! اگر تم (سچے دل سے) اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو (سوچ بچار مت کرو، بلکہ) اسی پر توکل کرو اگر تم (اس کی) اطاعت کرنے والے ہو۔

* * *

**فائدہ:** یعنی گھبرانے اور خوف کھانے کی ضرورت نہیں، ایک فرمان بردار مومن کا کام اپنے مالک کی طاقت پر بھروسہ کرنا ہے جسے خدا کی لامحدود قدرت و رحمت پر یقین ہوگا، وہ یقیناً ہر معاملہ میں خدا پر اعتماد کرے گا اور اس اعتماد کا اظہار جب ہی ہو سکتا ہے کہ بندہ اپنے کو بالکلیہ خدا کے سپرد کر دے، اسی کے حکم پر چلے اور تمام جد و جہد میں صرف اسی پر نظر رکھے۔

فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ﴿۸۵﴾

تب وہ بولے ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا، اے رب ہمارے نہ آزما ہم پر زور اس ظالم قوم کا ۱

وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴿۸۶﴾

اور چھڑا دے ہم کو مہربانی فرما کر ان کافر لوگوں سے ۲

**خلاصہ تفسیر:** انہوں نے (جواب میں) عرض کیا کہ ہم نے اللہ ہی پر توکل کیا (اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ) اے ہمارے پروردگار! ہم کو ان ظالموں کا تختۂ مشق نہ بنا، اور ہم کو اپنی رحمت کے صدقے ان کافروں سے نجات دے (یعنی جب تک ہم پر ان کی حکومت مقدر ہے ظلم نہ کرنے پائیں، اور پھر ہمیں ان کی حکومت کے دائرہ ہی سے نکال دیجیے)۔

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ: روح المعانی میں ہے کہ کوئی شخص یہ شبہ نہ کرے کہ ایسی دعا توکل کے خلاف ہے، کیونکہ توکل کا حاصل یہ ہے کہ اسباب پر نظر نہ ہو، بلکہ صرف مسبب الاسباب یعنی اسباب پیدا کرنے والی ذات اللہ تعالیٰ پر نظر ہو، اور اس عقیدے کے ساتھ اگر اسباب کو اختیار کرے تب بھی متوکل قرار دیا جائے گا، اسباب پیدا کرنے والی ذات یعنی اللہ تعالیٰ پر نظر رکھتے ہوئے دنیاوی اسباب کو اختیار کرنے سے توکل میں کمی نہیں آتی تو دعا سے جو کہ مادی اسباب سے بہت دور ہے توکل میں کیسے کمی واقع ہو سکتی ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ موسیٰ علیہ السلام کی نصیحت پر انہوں نے اخلاص کا اظہار کیا کہ بیشک ہمارا بھروسہ خالص خدا پر ہے، اسی سے دعا کرتے ہیں کہ ہم کو ان ظالموں کا تختۂ مشق نہ بنائے اس طرح کہ یہ ہم پر اپنے زور و طاقت سے ظلم ڈھاتے رہیں اور ہم ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں، ایسی صورت میں ہمارا دین بھی خطرہ میں ہے، اور ان ظالموں یا دوسرے دیکھنے والوں کو یہ ڈینگ مارنے کا موقع ملے گا کہ اگر ہم حق پر نہ ہوتے تو تم پر ایسا تسلط و تفوق کیوں حاصل ہوتا اور تم اس قدر پست و ذلیل کیوں ہوتے، یہ خیال ان گمراہوں کو اور زیادہ گمراہ کر دے گا، گویا ایک حیثیت سے ہمارا وجود ان کے لیے فتنہ بن جائے گا۔

**فائدہ:** ۲ یعنی ان کی غلامی اور محکومی سے ہم کو نجات دے اور دولت آزادی سے مالا مال فرما۔

وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً

اور حکم بھیجا ہم نے موسیٰ کو اور اس کے بھائی کو کہ مقرر کرو اپنی قوم کے واسطے مصر میں سے گھر ۱ اور بناؤ اپنے گھر قبلہ رو

وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۷﴾

اور قائم کرو نماز ۲ اور خوشخبری دے ایمان والوں کو ۳

**خلاصہ تفسیر:** اور ہم نے (اس دعا کے قبول کرنے کا سامان کیا کہ) موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے بھائی (ہارون علیہ السلام) کے پاس وحی بھیجی کہ تم دونوں اپنے ان لوگوں کے لئے (بدستور) مصر میں گھر برقرار رکھو (یعنی وہ ڈر کر گھر نہ چھوڑیں، ہم ان کے محافظ ہیں) اور (نماز کے اوقات میں) تم سب اپنے انہی گھروں کو نماز پڑھنے کی جگہ قرار دے لو (یعنی خوف کی وجہ سے مساجد کی حاضری معاف ہے) اور (یہ ضروری ہے کہ) نماز کے پابند رہو (تاکہ نماز کی برکت سے اللہ تعالیٰ جلدی اس مصیبت سے چھڑا دے) اور (اے موسیٰ!) آپ مسلمانوں کو بشارت دے دیں (کہ اب جلدی یہ مصیبت ختم ہو جائے گی)۔

**وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً:** یعنی تم سب اپنے گھروں کو نماز پڑھنے کی جگہ قرار دے لو، حاصل یہ ہے کہ پہلی امتوں میں بجز مساجد کے اور جگہ نماز نہ ہوتی تھی، مگر خوف میں ان کو اجازت دی گئی کہ گھر ہی میں نماز پڑھ لیں، پھر اس میں بھی گھر کے ہر حصہ میں درست نہ ہوتی تھی، بلکہ مقام متعین کرنا پڑتا تھا، اس بنا پر پھر بھی امت محمد یہ اس خصوصیت میں ان سے ممتاز رہی کہ ان کے لیے اس تعیین کی بھی حاجت نہیں۔

**وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ:** شاید نماز کی پابندی کا حکم اس طور سے ہوا ہو جیسا کہ دوسری آیت میں ہے: **واستعينوا بالصبر والصلوة** کہ نماز اور صبر سے مدد واعانت حاصل کرو، یہاں نماز کی تاکید اسی غرض سے فرمائی گئی ہو کہ اس کی برکت سے مدد واعانت حاصل ہوگی، اس بنا پر یہ آیت تفصیل ہو جائے گی اس قول کی کہ: **وقال موسى لقومه استعينوا بالله واصبروا** یعنی موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اے قوم! اللہ سے مدد مانگو، اللہ سے مدد مانگنے کا یہی مطلب ہو جائے گا کہ نماز پڑھتے رہو اور اس کی برکت سے جلدی مدد پہنچ جائے گی، اور یہ سب احکام دعا کی قبولیت کے آثار میں سے ہیں، کیونکہ گھروں میں رہنے کا حکم دے کر سفر کی تشویش سے بچا لیا اور نمازیں گھر میں پڑھنے کی اجازت دے دی، باہر نکلنا معاف کر دیا کہ اس سے اظہار ہوتا اور پابندی نماز کی تاکید سے نجات کی تدبیر بتلا دی۔

**وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ:** آخر میں بشارت سنانے کا حکم دے دیا کہ بنی اسرائیل کو خوش خبری سنا دو، اس میں نجات دینے کا وعدہ کر لیا اور ان سب باتوں میں دعا قبول ہونے کے آثار ظاہر ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا: حضرت شاہ صاحب ؒ لکھتے ہیں جب فرعون کی ہلاکت کا وقت قریب آیا تو حکم ہوا کہ اپنی قوم بنی اسرائیل کو ان میں شامل نہ رکھو اپنا محلہ جدا بساؤ کہ آگے ان پر آفتیں آنے والی ہیں، اس وقت تمہاری قوم ظاہری طور پر بھی آفتوں سے الگ تھلگ رہے، مفسرین نے تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا سے مراد یہ لی ہے کہ اپنے مکانوں میں ٹھہرے رہو اور ان میں سے بعض کو عبادت کے لیے مخصوص کر لو۔

**فائدہ:** ۲ وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ: فرعون نے مسجدیں اور عبادت گاہیں خراب کر دی تھیں کوئی باہر نکل کر خدا کی عبادت نہ کر سکتا تھا، بحالت مجبوری حکم ہوا کہ مکان میں کوئی جگہ نماز کے لیے رکھو جو قبلہ رو ہو، نماز ترک مت کرو کہ اسی کی برکت سے خدا کی مدد آتی ہے: وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (البقرۃ: ۴۵) ہجرت سے پہلے مکہ میں ایسا ہی حال مسلمانوں کا تھا۔

**فائدہ:** ۳ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ: دنیا میں فتح و نصرت کی اور آخرت میں نجات و رضائے الٰہی کی۔

وَقَالَ مُوۡسٰى رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَيۡتَ فِرۡعَوۡنَ وَمَلَاَهٗ زِيۡنَةً وَّاَمۡوَالًا فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوۡا

اور کہا موسیٰ نے اے رب ہمارے تو نے دی ہے فرعون کو اور اسکے سرداروں کو رونق اور مال دنیا کی زندگی میں ۱ اے رب اس واسطے کہ بہکائیں

عَنۡ سَبِيۡلِكَ‌ ۚ رَبَّنَا اطۡمِسۡ عَلٰٓى اَمۡوَالِهِمۡ وَاشۡدُدۡ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ فَلَا يُؤۡمِنُوۡا حَتّٰى يَرَوُا الۡعَذَابَ

تیری راہ سے ۲ اے رب مٹا دے ان کے مال اور سخت کر دے ان کے دل کہ نہ ایمان لائیں جب تک دیکھ لیں عذاب

الۡاَلِيۡمَ ۝۸۸ قَالَ قَدۡ اُجِيۡبَتۡ دَّعۡوَتُكُمَا فَاسۡتَقِيۡمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيۡلَ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۝۸۹

دردناک ۳ فرمایا قبول ہو چکی دعا تمہاری ۴ سو تم دونوں ثابت رہو اور مت چلو راہ ان کی جو ناواقف ہیں ۵

**خلاصہ تفسیر**: اور موسیٰ (علیہ السلام) نے (دعا میں) عرض کیا کہ اے ہمارے رب! (ہم کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ) آپ نے فرعون کو اور اس کے سرداروں کو سامان تجمل اور طرح طرح کے مال دنیوی زندگی میں اے ہمارے رب اسی واسطے دیئے ہیں کہ وہ آپ کی راہ سے (لوگوں کو) گمراہ کریں (پس جب ہدایت ان کے مقدر میں نہیں اور جو حکمت تھی وہ حاصل ہوچکی تو اب ان کے مال اور جان کو کیوں باقی رکھا جائے پس) اے ہمارے رب! ان کے مالوں کو نیست نابود کر دیجئے، اور (ان کی جانوں کی ہلاکت کا سامان اس طرح کر دیجئے کہ) ان کے دلوں کو (زیادہ) سخت کر دیجئے (جس سے ہلاکت کے مستحق ہوجائیں) سو یہ ایمان نہ لانے پائیں (بلکہ روز بروز ان کا کفر ہی بڑھتا رہے) یہاں تک کہ عذاب الیم (کے مستحق ہوکر اس) کو دیکھ لیں (اور عذاب دیکھنے کے بعد ایمان مقبول نہیں ہوتا، موسیٰ علیہ السلام نے بد دعا کی اور ہارون علیہ السلام آمین کہتے رہے)۔

حق تعالیٰ نے فرمایا کہ تم دونوں کی دعا قبول کرلی گئی (کیونکہ آمین کہنا بھی دعا میں شریک ہونا ہے، یعنی ہم ان کے مال وجان اب ہلاک کرنے والے ہیں) سو تم (اپنے منصبی کام یعنی تبلیغ پر) مستقیم رہو (یعنی اگر چہ ہدایت ان کی تقدیر میں نہ ہو، مگر تبلیغ میں تمہارا فائدہ ہے) اور ان لوگوں کی راہ نہ چلنا جن کو (ہمارے وعدے کے سچے ہونے کا یا توقف میں حکمت ہونے کا یا تبلیغ کے ضروری ہونے کا) علم نہیں (یعنی ہمارے وعدہ کو سچا سمجھو اور اگر ہلاکت میں دیر ہوجائے اس میں حکمت سمجھو اور اپنے منصبی کام میں لگے رہو)۔

رَبَّنَا لِيُضِلُّوۡا عَنۡ سَبِيۡلِكَ: سوال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مال و دولت گمراہ کرنے اور گمراہ ہونے کے لیے کیوں دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حکیم کا فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا، کوئی حکمت ہوگی اگر چہ ہم تعیین کے ساتھ بیان نہ کرسکیں، باقی یہ ضرور ہے کہ ان لوگوں نے جب خود ہی گمراہی کا قصد کیا، اسی کو اختیار کیا، اس وقت خدا تعالیٰ نے بھی اس کے سامان کر دیے جیسا کہ ان کی عادت ہے کہ جو شخص جیسا قصد و ارادہ کرتا ہے ویسا ہی سامان کر دیتے ہیں، اس لیے گمراہ کرنے کے واسطے مال و دولت دینے سے وہ معذور نہیں ہوسکتے۔

رَبَّنَا اطۡمِسۡ عَلٰٓى اَمۡوَالِهِمۡ: یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ موسیٰ علیہ السلام تو ہدایت کے لیے آئے تھے اور بد دعا کرنے لگے، ہدایت نہ ہونے کی اصل یہ ہے کہ ہدایت کے لیے آنے کے تو یہ معنی ہیں کہ ان کو دین کی راہ کی طرف بلاتے رہیں، سو یہ تو بد دعا کے بعد بھی کرتے رہے، بد دعا میں اور ہدایت کرنے میں کوئی منافات نہیں، اور دراصل بد دعا سے ان کی گمراہی کی بد دعا کرنا مقصود نہ تھا، کیونکہ یہ تو ان کو یقینی طور پر معلوم ہوگیا تھا وحی کے ذریعہ یہ حقیقت منکشف ہونے کے بعد کہ اب یہ ایمان نہ لائیں گے تو یقین کے بعد اس کے لیے بد دعا کرنے کی کیا ضرورت رہی، بلکہ ان کا اصل مقصود ان کی ہلاکت کی بد دعا کرنا تھا اور ایمان نہ لانے کی بد دعا صرف تقدیر کی موافقت کے لیے کردی کہ جب مرضی الٰہی یہی ہے کہ یہ ایمان نہ لائیں گے تو میں بھی اس کی موافقت کرتا ہوں، اس لیے اس میں اشکال نہ رہا، جیسا کہ نوح علیہ السلام نے جب وحی سے معلوم کرلیا کہ اب میری قوم میں سے کوئی ایمان نہ لائے گا تو ان کی ہلاکت کی بد دعا کی، اور تقدیر کی موافقت کے لیے وَاشۡدُدۡ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ بھی فرمادیا، یعنی جب تقدیر میں یہی

ہے کہ یہ ایمان نہ لائیں گے تو میں بھی موافقت کرتا ہوں، پس ان کے دل مزید سخت کر دیجیے۔

بد دعا بظاہر ایک رسول و پیغمبر کی زبان سے بہت بعید معلوم ہوتی ہے، کیونکہ پیغمبر کا وظیفہ زندگی ہی یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو ایمان عمل صالح کی طرف دعوت دیں اور اس کے لئے تدبیریں کریں، مگر یہاں واقعہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ساری تدبیریں کرنے کے بعد ان کی اصلاح سے مایوس ہو چکے تھے اور اب چاہتے تھے کہ یہ اپنے اعمال کی سزا دیکھیں، اس میں یہ احتمال تھا کہ کہیں یہ لوگ عذاب آتا دیکھ کر ایمان کا اقرار نہ کرلیں اور اس طرح عذاب ٹل جائے، اس لئے کفر سے بغض ونفرت اس دعا کا سبب بنی، جیسے فرعون غرق ہونے کے وقت ایمان کا اقرار کرنے لگا تو جبریل امین نے اس کا منہ بند کر دیا کہ کہیں رحمت الٰہی متوجہ ہو کر یہ عذاب سے نہ بچ جائے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ بددعا در حقیقت بد دعا نہ ہو، بلکہ ایسی ہو جیسے شیطان پر لعنت کہ وہ تو بنص قرآن خود ہی ملعون ہے، پھر اس پر لعنت کرنے کا منشا اس کے سوا نہیں کہ جس پر اللہ تعالیٰ نے لعنت مسلط کر دی ہم بھی اس پر لعنت کرتے ہیں، اس صورت میں مطلب اس کا یہ ہوگا کہ ان کے دلوں کا سخت اور نا قابل ایمان و اصلاح ہونا من جانب اللہ مقرر ہو چکا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بصورت بددعا اس کا اظہار فرمایا۔

---

**فائدہ: ۱ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا:** یعنی ہر قسم کا سامان رونق و آسائش کا دیا، مثلاً حسن صورت، سواری، عمدہ پوشاک، اثاث البیت وغیرہ اور مال و دولت کے خزانے، سونے چاندی وغیرہ کی کانیں عطا فرمائیں۔

**فائدہ: ۲ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ:** اگر لِيُضِلُّوْا میں لام تعلیل لیا جائے تو مطلب یہ ہے کہ تکوینی طور پر یہ سامان ان نابکاروں کو اس لیے دیا گیا کہ مغرور ہو کر خود گمراہ ہوں اور دوسروں کو گمراہ کرنے میں خرچ کریں، بڑی آزادی سے دل کھول کر زور لگالیں، آخر میں دیکھ لیں گے کہ وہ کچھ بھی کام نہ آیا، جب خالق خیر وشر کا اللہ ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا کوئی فعل خالی از حکمت نہیں ہوسکتا، لامحالہ ''خلق شر'' میں بھی مجموعہ عالم کے اعتبار سے کوئی حکمت ضرور ہوگی، وہ ہی حکمت شریروں کو اس قدر سامان دیے جانے میں سمجھ لیجئے: كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَاۗءِ وَهٰٓؤُلَاۗءِ مِنْ عَطَاۗءِ رَبِّكَ (الاسراء: ۲۰) اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا (آل عمران: ۱۷۸) بعض مفسرین نے لِيُضِلُّوْا میں ''لام عاقبت'' لیا ہے جیسے فَالْتَقَطَهٗ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا میں ''لام عاقبت'' ہے، اس وقت مطلب یہ ہوگا کہ یہ سامان دیا تو اس لیے تھا کہ امور خیر میں خرچ کریں اور نعمتوں کو لے کر منعم حقیقی کو پہچانیں، اس کے شکر گزار بندے بنیں مگر اس کے برخلاف انہوں نے اپنی بدبختی سے خدا کی نعمتوں کو لوگوں کے بہکانے اور گمراہ کرنے میں ایسا بے دریغ خرچ کیا گویا وہ اسی کام کے لیے ان کو دی گئی تھیں، اس تفسیر پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔

**فائدہ: ۳ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ:** جب موسیٰ علیہ السلام مدت دراز تک ہر طرح ہدایت کر چکے اور عظیم الشان معجزات دکھلا چکے مگر معاندین کا جحود و عناد بڑھتا ہی رہا، حتیٰ کہ تجربہ اور طول صحبت یا وحی الٰہی سے پوری طرح ثابت ہو گیا کہ یہ لوگ کبھی ایمان لانے والے نہیں، تب ان کی ہلاکت کی دعاء فرمائی، تا کہ ان کی گندگی سے دنیا جلد پاک ہو اور دوسروں کے لیے ان کی بدانجامی درس عبرت بنے، آپ نے بددعاء کی کہ خداوندا! ان کے اموال کو تباہ اور ملیا میٹ کر دے اور ان کے دلوں پر سخت گرہ لگا دے جن میں کبھی ایمان و یقین نفوذ نہ کرے، بس اسی وقت یقین حاصل ہو جب اپنی آنکھوں سے عذاب الیم کا مشاہدہ کرلیں یہ دعاء ان کے حق میں ایسی سمجھو جیسے ابلیس کو ''لعنۃ اللہ'' یا کفار کو ''خَذَلَهُمُ اللهُ'' کہا جاتا ہے، حالانکہ ان کی ملعونیت وخذلان کا قطعی فیصلہ پیشتر سے کیا جا چکا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے آیت کی تقریر دوسری طرز سے کی ہے فرماتے ہیں: ''سچے ایمان کی ان سے امید نہ تھی مگر جب کچھ آفت پڑتی تو جھوٹی زبان سے کہتے کہ اب ہم مانیں گے، اس میں عذاب تھم جاتا، کام فیصل نہ ہوتا، دعاء اس واسطے مانگی کہ یہ جھوٹا ایمان نہ لائیں، دل ان کے سخت رہیں تا کہ عذاب پڑ چکے اور کام فیصل ہو''۔

**فائدہ: ۴ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا:** روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ دعا کرتے تھے اور ہارون علیہ السلام ''آمین'' کہتے جاتے تھے، اس لحاظ سے دعوتکما فرمایا۔

**فائدہ: ۵ وَلَا تَتَّبِعٰۗنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ:** یعنی اپنا کام استقلال اور ثابت قدمی سے انجام دیتے رہو، اگر قبول دعاء کے

آثار دیر سے ظاہر ہوں تو نادان لوگوں کی طرح شتابی مت کرو، وقت مقدر پر یہ ہی ہو کر رہے گا، گھبرانے سے کچھ حاصل نہیں۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَدْرَكَهُ

اور پار کردیا ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پھر پیچھا کیا ان کا فرعون نے اور اس کے لشکر نے شرارت سے اور تعدی سے، یہاں تک کہ جب

الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَاۗءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ ٩٠

ڈوبنے لگا، بولا یقین کر لیا میں نے کہ کوئی معبود نہیں مگر جس پر کہ ایمان لائے بنی اسرائیل اور میں ہوں فرمانبرداروں میں

اٰۗلْــٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ ٩١

اب یہ کہتا ہے اور تو نافرمانی کرتا رہا اس سے پہلے اور رہا گمراہوں میں

**خلاصہ تفسیر**: اور (جب ہم نے فرعون کو ہلاک کرنا چاہا تو موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو مصر سے باہر نکال لے جاییے، چنانچہ وہ سب کو لے کر چلے، رستہ میں دریائے شور حائل ہوا، موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اس میں راستہ ہوگیا اور) ہم نے بنی اسرائیل کو (اس) دریا سے پار کردیا پھر ان کے پیچھے پیچھے فرعون مع اپنے لشکر کے ظلم اور زیادتی کے ارادہ سے (دریا میں) چلا (کہ دریا سے نکل کر ان سے قتل وقتال کرے، لیکن وہ دریا سے پار نہ ہوسکا) یہاں تک کہ جب ڈوبنے لگا (اور عذاب کے فرشتے نظر آنے لگے) تو (سراسیمہ یعنی پریشان اور مضطرب ہوکر) کہنے لگا میں ایمان لاتا ہوں کہ بجز اس کے کہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں کوئی معبود نہیں اور میں مسلمانوں میں داخل ہوتا ہوں (سو مجھ کو اس غرق سے اور عذاب آخرت سے نجات دی جائے، فرشتہ کے ذریعہ سے) جواب دیا گیا کہ اب ایمان لاتا ہے (جبکہ آخرت کا معائنہ شروع ہوگیا) اور (معائنہ آخرت سے) پہلے سے سرکشی کرتا رہا اور مفسدوں میں داخل رہا (اب نجات چاہتا ہے)۔

**قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ**: فرعون کے اس کہنے سے کہ میں مسلمانوں میں داخل ہوتا ہوں موسی علیہ السلام کی رسالت کی بھی تصدیق ہوگئی، مگر چونکہ یہ ایمان معائنہ آخرت کے وقت تھا کہ عالم آخرت منکشف ہوچکا تھا اس لیے مقبول نہیں ہوا جیسا کہ ارشاد ہے: فلم يك ينفعهم ايمانهم لما راوا باسنا کہ جب ہمارا عذاب دیکھ لیا اس وقت ان کو ایمان نے نفع نہ دیا۔

رہا یہ شبہ کہ جب اس حالت میں یقینا ایمان مقبول نہیں ہوسکتا تو حدیث میں جو آتا ہے کہ جبرئیل علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں اس وقت فرعون کے منہ میں کیچڑ ٹھونستا تھا کہ مبادا کہیں اس پر رحمت نہ ہوجائے اور ایک روایت میں ہے کہ کہیں مغفرت نہ ہوجائے تو اس کے کیا معنی ہوں گے؟ جب اس وقت یقینا رحمت ومغفرت نہیں ہوسکتی تو اس فعل کی کیا ضرورت تھی؟ جواب یہ ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کے قول میں دنیوی رحمت ومغفرت مراد ہے، اخروی نہیں، حاصل یہ کہ اگرچہ ان الفاظ سے شرعی ایمان ثابت نہ ہونے کی وجہ سے آخرت میں تو اس کو کچھ نفع نہ ہوتا، لیکن شاید جس طرح منافقین کا ایمان آخرت میں نافع نہیں، مگر جان ومال بچانے کے لیے دنیا میں کافی ہوجاتا ہے، اسی طرح وہ شاید ان الفاظ کی بدولت غرق سے بچ جاتا اور اس کا بچنا فساد عالم کا سبب ہوتا اس لیے منہ بند کرتے تھے کہ پھر یہ الفاظ نہ نکلیں، اور بعض اکابر سے جو فرعون کے ایمان کا صحیح ہونا منقول ہے وہ کسی نے ان کی تصنیف میں اضافہ کردیا ہے، چنانچہ ''الیواقیت والجواہر'' میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

**اٰۗلْــٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ**: اس سے ثابت ہوا کہ عین موت کے وقت کا ایمان لانا شرعاً معتبر نہیں، اس کی مزید تشریح اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بندہ کی توبہ قبول فرماتے رہتے ہیں جب تک غرغرہ موت کا وقت نہ آجائے، غرغرہ موت سے مراد وہ وقت ہے جب نزع روح کے وقت فرشتے سامنے آجاتے ہیں اس وقت دار العمل دنیا کی زندگی ختم ہوکر آخرت کے احکام شروع ہوجاتے ہیں، اس لئے اس وقت کا کوئی عمل قابل قبول نہیں، نہ ایمان نہ کفر، ایسے وقت جو ایمان لاتا ہے اس کو بھی مومن نہیں کہا جائے گا اور

اس کے ساتھ کفن دفن میں مسلمانوں کا سا معاملہ نہ کیا جائے گا، جیسا کہ فرعون کے اس واقعہ سے ثابت ہے کہ بالا جماع فرعون کی موت کفر پر قرار دی گئی ہے نصوص قرآن سے بھی یہی واضح ہے اور جس کسی نے فرعون کے اس ایمان کو معتبر کہا ہے یا تو اس کی کوئی تاویل کی جائے ورنہ اسے غلط کہا جائے گا، اس طرح اگر خدانخواستہ ایسی ہی نزع روح کی حالت میں کسی شخص کی زبان سے کلمہ کفر نکل جائے تو اس کو کافر بھی نہ کہا جائے گا، بلکہ اس کے جنازہ کی نماز پڑھ کر مسلمانوں کی طرح دفن کیا جائے گا اور اس کے کلمہ کفر کی تاویل کی جائے گی جیسا کہ بعض اولیاء اللہ کے حالات سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ جو کلمہ ان کی زبان سے نکل رہا تھا لوگ اس کو کلمہ کفر سمجھ کر پریشان تھے بعد میں کچھ ہوش آیا اور اپنا مطلب بتلایا تو سب کو اطمینان ہو گیا کہ وہ عین ایمان کا کلمہ تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس وقت روح نکل رہی ہو اور نزع کا عالم ہو وہ وقت دنیا کی زندگی میں شمار نہیں، اس وقت کا کوئی عمل بھی شرعاً معتبر نہیں، اس سے پہلے پہلے ہر عمل معتبر ہے، مگر دیکھنے والوں کو اس میں بڑی احتیاط لازم ہے کیونکہ اس کا صحیح اندازہ کرنے میں غلطی ہو سکتی کہ یہ وقت نزع روح کا اور غرغرہ موت کا ہے یا اس سے پہلے کا۔

* * *

**فائدہ:** موسیٰ علیہ السلام کئی لاکھ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے، فرعون کو خبر ہوئی تو ایک لشکر جرار لے کر تعاقب کیا، تا کہ اس کے پنجہ ظلم سے چھوٹنے نہ پائیں، بنی اسرائیل جب بحر قلزم کے کنارے پہنچے تو سخت پریشان ہوئے، آگے سمندر اور پیچھے فرعون کا لشکر دبا تا چلا آ رہا تھا، موسیٰ علیہ السلام نے تسلی دی اور حق تعالیٰ کے حکم سے لاٹھی دریا پر ماری، سمندر کا پانی ادھر ادھر کھڑا ہو گیا اور درمیان میں خدا نے بارہ راستے خشک بنا دیئے، یہ پار ہوئے، ادھر فرعون لشکر سمیت سمندر کے کنارے پہنچ گیا، خشک راستے دیکھ کر سب نے اسی میں گھوڑے ڈال دیے جب ایک ایک کر کے تمام فوج دریا کے وسط میں پہنچی، پانی کو حکم ہوا کہ مل جائے فوراً پانی کے طبقات مل گئے، سب لشکر اور سامان موجوں کی نذر ہو گیا، فرعون نے دیکھا کہ اب ڈوبتا ہوں اس وقت گھبرا کر ایمان و اسلام کا لفظ زبان پر لایا کہ شاید بنی اسرائیل کا خدا ''ایمان'' کا لفظ سن کر دریا کی موجوں سے باہر نکال دے، اس پر خدا کی طرف سے ارشاد ہوا: آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ یعنی ساری عمر مخالف ہو کر گمراہی پھیلاتا اور شرارتیں کرتا رہا، اب عذاب دیکھ کر یقین لایا اس وقت کا یقین کیا معتبر ہے فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ۭ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ (غافر: ۸۵)

**تنبیہ:** قبض روح اور معائنہ عذاب کے وقت ایمان لانا ''ایمان غرغرہ'' یا ''ایمان باس'' یا ''ایمان یاس'' کہلاتا ہے، جو ''اہل السنت و الجماعت'' کے نزدیک نافع نہیں شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ نے "کتاب الیواقیت والجواہر" میں ''فتوحات مکیہ'' سے عبارت نقل کی ہے، جس میں ایمان فرعون کی بابت یہی تصریح ہے اور دیباچہ میں لکھا ہے کہ ''فتوحات'' کے نسخوں میں ملحدین و زنادقہ نے بہت سی عبارتیں مدسوس کر دی ہیں میرے پاس جو نہایت مستند و معتبر نسخہ ''فتوحات'' کا ہے اس میں ان عبارتوں کا پتہ نہیں واللہ اعلم۔

**فائدہ:** اخیر وقت میں فرعون سے لفظ امنتُ کہلا کر حضرت موسیٰ کی دعاء: لَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ (الشعراء: ۲۰۱) کی مقبولیت کا خدا نے مشاہدہ کرا دیا۔

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿۹۲﴾

سو آج بچائے دیتے ہیں ہم تیرے بدن کو تا کہ ہووے تو اپنے پچھلوں کے واسطے نشانی، اور بیشک بہت لوگ ہماری قدرتوں پر توجہ نہیں کرتے

**خلاصہ تفسیر:** سو (مطلوبہ نجات کے بجائے) آج ہم تیری لاش کو (پانی میں تہ نشین ہونے سے) نجات دیں گے تا کہ تو ان کے لئے موجب عبرت ہو جو تیرے بعد (موجود) ہیں (کہ تیری بدحالی اور تباہی دیکھ کر احکام الٰہیہ کی مخالفت سے ڈریں) اور حقیقت یہ ہے کہ (پھر بھی) بہت سے آدمی ہماری (ایسی ایسی) عبرتوں سے غافل ہیں (اور احکام الٰہیہ کی مخالفت سے نہیں ڈرتے)۔

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ: لاش کے بچا لینے اور پانی پر تیر آنے کو نجات فرمانا بطور شرمندہ کرنے اور مایوس کر دینے کے ہے کہ ایسی نجات

ہوگی جو تیرے لیے زیادہ رسوائی کا سبب ہو جیسا کہ معرکہ جنگ میں بعضوں کی لاش یا سر اس لیے محفوظ رکھا جاتا ہے تاکہ اس کی تشہیر کی جائے، اور بعض نے یہ وجہ بھی نقل کی ہے کہ بنی اسرائیل کو فرعون کے غرق ہونے میں اس کی انتہائی عظمت و ہیبت کی وجہ سے شبہ تھا ان کو بھی یقین آ گیا۔

**فائدہ:** ''موضح القرآن'' میں ہے کہ جیسا بے وقت ایمان لایا، بے فائدہ، ویسا ہی اللہ نے مرے پیچھے اس کا بدن دریا میں سے نکال کر ٹیلے پر ڈال دیا کہ ''بنی اسرائیل'' دیکھ کر شکر کریں اور پیچھے آنے والے اس کے حال سے عبرت پکڑیں، ورنہ اس کو بدن کے بچنے سے کیا فائدہ، جیسا بے فائدہ ایمان تھا ویسی ہی بے فائدہ نجات مل گئی، جدید تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ فرعون کی لاش آج تک محفوظ چلی آتی ہے لیکن الفاظ قرآنی کی صحت اس کے ثبوت پر موقوف نہیں (اتفاق) بنی اسرائیل کے نجات پانے اور فرعون کے غرق ہونے کا واقعہ ''عاشوراء'' کے دن ہوا، اور اتفاق سے آج بھی جب بندہ یہ سطریں لکھ رہا ہے یوم عاشوراء ۱۴۴۸ ہجری ہے، خدا ہم کو دنیا و آخرت میں اپنے عذاب سے محفوظ رکھے اور دشمنان دین کا بیڑا غرق کرے، آمین۔

وَلَقَدۡ بَوَّاۡنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ مُبَوَّاَ صِدۡقٍ وَّرَزَقۡنٰہُمۡ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ۚ فَمَا اخۡتَلَفُوۡا حَتّٰی

اور جگہ دی ہم نے بنی اسرائیل کو پسندیدہ جگہ اور کھانے کو دیں ستھری چیزیں [1] سو ان میں پھوٹ نہیں پڑی یہاں تک کہ

جَآءَہُمُ الۡعِلۡمُ ؕ اِنَّ رَبَّکَ یَقۡضِیۡ بَیۡنَہُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ فِیۡمَا کَانُوۡا فِیۡہِ یَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۹۳﴾

پہنچی ان کو خبر، بیشک تیرا رب ان میں فیصلہ کرے گا قیامت کے دن جس بات میں کہ ان میں پھوٹ پڑی [2]

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے قصہ میں بنی اسرائیل پر انعام عظیم کا ذکر تھا کہ ان کو کیسی بڑی اذیت سے نجات دی، اب اپنی بقیہ نعمت کی حکایت اور بنی اسرائیل کی سرکشی کی شکایت ارشاد ہے۔

اور ہم نے (فرعون کو غرق کرنے کے بعد) بنی اسرائیل کو بہت اچھا ٹھکانا رہنے کو دیا (کہ اس وقت تو مصر کے مالک ہو گئے اور ان کی اول ہی نسل کو بیت المقدس اور ملک شام عمالقہ پر فتح دے کر عطا فرمایا) اور ہم نے ان کو نفیس چیزیں کھانے کو دیں (مصر میں بھی باغ اور چشمے تھے اور شام کی نسبت بٰرَكۡنَا فِیۡهَا آیا ہے) سو (چاہیئے تھا کہ ہماری اطاعت میں زیادہ سرگرم رہتے، لیکن انہوں نے الٹا دین میں اختلاف کرنا شروع کیا اور غضب یہ کہ) انہوں نے (جہل کی وجہ سے) اختلاف نہیں کیا یہاں تک کہ ان کے پاس (احکام کا) علم پہنچ گیا (تھا، اور پھر اختلاف کیا، آگے اس اختلاف پر وعید ہے کہ) یقینی بات ہے کہ آپ کا رب ان (اختلاف کرنے والوں) کے درمیان قیامت کے دن ان امور میں فیصلہ (عملی) کرے گا جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے۔

**مُبَوَّاَ صِدۡقٍ وَّرَزَقۡنٰہُمۡ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ:** مصر میں بھی باغ اور چشمے تھے، اور شام کی نسبت: بٰرَكۡنَا فِیۡهَا آیا ہے کہ ہم نے اس میں برکت رکھی ہے، چنانچہ ظاہری اور باطنی ہر طرح کی برکت وہاں ہے، اور ''اچھے ٹھکانے'' کی تفسیر مصر اور شام ہی کے ساتھ در منثور میں منقول ہے۔

**فَمَا اخۡتَلَفُوۡا حَتّٰی جَآءَہُمُ الۡعِلۡمُ:** اختلاف کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ① ایک یہ کہ نبوت کی تصدیق کے باوجود انبیاء کے احکام میں طرح طرح کے حیلے اور حجتیں نکالتے تھے ② دوسرے یہ کہ بعض انبیاء کو مانتے تھے، بعض کو نہ مانتے تھے جس میں یہود کا ہمارے حضور ﷺ کو نہ ماننا بھی داخل ہے۔

* * *

**فائدہ:** [1] یعنی فرعونیوں کو ہلاک کر کے اول ملک مصر دیا، پھر کچھ عرصہ کے بعد عمالقہ کو نکال کر ملک شام دیا گیا، دونوں ملک سرسبز و شاداب ہیں جہاں ستھری اور لذیذ چیزوں کی افراط ہے، غرض یہ ہے کہ بنی اسرائیل حلال و طیب نعمتوں سے مالا مال کر دیئے گئے۔

**فائدہ:** [2] یعنی مادی انعام و اکرام کے ساتھ دینی و روحانی نعمت سے سرفراز فرمایا کہ تورات شریف کا علم دیا، جس میں دین کے اصول و

فروع بیان ہوئے تھے، اور اگلے پچھلوں کے متعلق خبریں تھیں ان واضح حقائق سے خبردار ہونے کے بعد لائق نہ تھا کہ ایسی صاف چیزوں میں اختلاف کرکے آپ میں پھوٹ ڈالیں اور فرقہ بندی کی نحوست میں گرفتار ہوں، مگر باوجود علم صحیح اور خبر صادق پہنچ جانے کے طرح طرح کے اختلافات پیدا کیے اور پھوٹ ڈال کر رہے، بعض احکام میں اپنے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام سے بھی کٹ حجتی کی جیسا کہ ذبح بقر کے واقعہ میں گزرا، بعد میں آنے والے پیغمبروں خصوصاً خاتم النبیین ﷺ کی بعض نے تصدیق اور اکثروں نے تکذیب کی، حالانکہ ان کے متعلق بہت سی پیشین گوئیوں پر مطلع ہو چکے تھے، بلکہ بعثت محمدی سے پہلے نبی آخر الزمان ﷺ کی آمد کے منتظر تھے اور مشرکین سے کہتے تھے کہ ہم پیغمبر آخر الزماں کے ساتھ ہو کر تمہاری خبر لیں گے، نہ صرف اسی مسئلہ میں اختلاف ہوا بلکہ خود اپنے مذہب میں تحریف کر کے اصول وفروع بدل ڈالے اور رفتہ رفتہ بیسیوں فرقے پیدا ہو گئے، مسیح علیہ السلام سے تین سو برس بعد قسطنطین اعظم جو ایک فلسفی مزاج بادشاہ تھا، از راہ نفاق دین نصرانیت میں داخل ہوا تو پادریوں نے اس کی خاطر جدید قوانین وضع کیے اور نئی شریعت بنائی، اس نے ان کے لیے بڑے بڑے گرجا اور معابد ومشاہد تعمیر کرائے اور اس نئے دین مسیحی کی جو اصل مسیحیت کو بگاڑ کر تیار کیا گیا تھا خوب اشاعت ہوئی، بجز چند تارک الدنیا راہبوں کے جو بستیوں سے الگ جنگلوں اور پہاڑوں میں جا رہے تھے، کوئی شخص اصلی دین مسیحی پر قائم نہ رہا تھا، صلیب کی پرستش، مشرق کی طرف نماز پڑھنا، کلیساؤں میں مسیح ومریم وغیرہ کی تصاویر پوجنا، خنزیر وغیرہ کو حلال کرنا اور اسی طرح کی تحریفات نے حقیقی مسیحیت کو بالکل مسخ کر ڈالا، اور یہی مسخ شدہ مسیحیت ساری دنیا میں پھیل گئی، یہ زمانہ تھا جب ملک شام، بیت المقدس، جزیرہ اور بلادِ روم پر نصاریٰ کا تسلط تھا، تا آنکہ فاروق اعظم کے عہد میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان ممالک کو نصاریٰ کے قبضہ سے نکالا، وللہ الحمد والمنہ۔

فَإِنْ كُنتَ فِي شَكٍّ مِّمَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ فَسْـَٔلِ ٱلَّذِينَ يَقْرَءُونَ ٱلْكِتَٰبَ مِن قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ

سو اگر تو ہے شک میں اس چیز سے کہ اتاری ہم نے تیری طرف تو پوچھ ان سے جو پڑھتے ہیں کتاب تجھ سے پہلے، بیشک آئی ہے

جَآءَكَ ٱلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ ٱلْمُمْتَرِينَ ۝٩٤ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ ٱلَّذِينَ كَذَّبُوا۟ بِـَٔايَٰتِ ٱللَّهِ

تیرے پاس حق بات تیرے رب سے سو تو ہرگز مت ہو شک کرنے والا، اور مت ہو ان میں جنہوں نے جھٹلایا اللہ کی باتوں کو

فَتَكُونَ مِنَ ٱلْخَٰسِرِينَ ۝٩٥

پھر تو بھی ہو جائے خرابی میں پڑنے والا۔

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے یہود کا دین میں اختلاف کرنا مذکور تھا، چونکہ مشرکین بھی اس اختلاف میں ان کے شریک بلکہ ان سے بڑھے ہوئے تھے، اس لیے اب قرآن کی حقانیت سے خاص طرز پر اسلام کی حقانیت ثابت فرماتے ہیں۔

پھر (دین محمدی کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے ہم ایک ایسا کافی طریقہ بتلاتے ہیں جو کہ غیر صاحب وحی کے لئے بھی کافی ہوگا، وہ ایسا ہے کہ آپ صاحب وحی ہیں، مگر آپ سے بھی اگر اس کا خطاب بطور قضیہ شرطیہ کے کیا جائے تو ممکن ہے اس طرح سے کہ) اگر (بالفرض) آپ اس (کتاب) کی طرف سے شک (اور شبہ) میں ہوں جس کو ہم نے آپ کے پاس بھیجا ہے تو (اس شک کے دور کرنے کا ایک آسان طریقہ یہ بھی ہے کہ) آپ ان لوگوں سے پوچھ دیکھیے جو آپ سے پہلے کی کتابوں کو پڑھتے ہیں (مراد توریت وانجیل ہیں، یعنی اگر وہ لوگ تورات وانجیل کو بعینہ پڑھ دیں اور اس میں خیانت نہ کریں تو ان کے پڑھ دینے سے قرآن کی تصدیق ہو جائے گی، کیونکہ ان میں قرآن کی پیشین گوئی موجود ہے) بیشک آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے سچی کتاب آئی ہے آپ ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں، اور نہ (شک کرنے والوں سے بڑھ کر) ان لوگوں میں ہوں جنہوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا، کہیں آپ (نعوذ باللہ) تباہ نہ ہو جائیں۔

فَإِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ: ظاہر میں خطاب آپ کو ہے، مگر مقصود دوسروں کو خطاب کرنا ہے، آپ کو خطاب کرنے میں اس دلیل کے کافی ہونے پر تاکید اور مبالغہ ہوگیا کہ جب صاحب وحی کو جو کہ بلا واسطہ حق تعالی سے علوم حاصل کرتا ہے، یا فرشتوں کی باتیں سنتا ہے اہل علم سے پوچھنا قرآن کی تصدیق کے لیے کافی ہوسکتا ہے تو دوسروں کے لیے کیسے کافی نہ ہوگا۔

فَسْئَلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ: یہاں اشکال ہوتا ہے کہ اہل کتاب تو خود تکذیب کرتے تھے پھر ان سے پوچھنا کیسے کہہ دیا گیا؟ حاصل جواب کا یہ ہے کہ جب وہ اصل مضمون پڑھ دیں تو اخفا نہیں رہ سکتا، سننے والا خود سمجھ جائے گا اگرچہ وہ جھٹلاتے رہیں۔

فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ: اخیر میں جو فرمایا کہ شک کرنے والوں میں نہ ہوں اور تباہ نہ ہو جائیں، ان میں بھی مقصود دوسروں کو سنانا ہے، آپ کو خطاب کرنے سے مبالغہ ہوگیا کہ جس ذات میں شک وغیرہ کا احتمال بھی نہیں ہوسکتا جب اس کو روکا جاتا ہے تو جس میں احتمال ہے اس کو بدرجہ اولی روکنا چاہیے، چنانچہ آیت نازل ہونے کے وقت آپ نے یہ بات ظاہر کرنے کے لیے کہ مقصود مجھ کو خطاب نہیں ہے یہ فرمایا کہ: "لا اشك و لا أسئل" یعنی نہ مجھ کو شک ہے نہ میں پوچھوں گا، مطلب یہ کہ جس کو شک ہے اصل میں اسی کو یہ خطاب ہے۔

---

**فائدہ:** ۱ے بظاہر یہ خطاب پیغمبر ﷺ کو ہے، لیکن حقیقت میں آپ کو مخاطب بنا کر دوسروں کو سنانا مقصود ہے جو ایک امی کی زبان سے ایسے عظیم الشان حقائق و واقعات سن کر حیرت زدہ رہ جاتے ہیں اور جہل و تعصب کی وجہ سے ان کی واقعیت میں شک و تردد کا اظہار کرنے لگتے ہیں، ورنہ ظاہر ہے کہ آپ خود اپنی لائی ہوئی چیزوں میں کیسے شک و شبہ کر سکتے تھے اور جس کی طرف تمام دنیا کو دعوت دیتے اور پہاڑ سے زیادہ مضبوط یقین سننے والوں کے قلوب میں پیدا کر دیتے تھے، اس کو خود اپنی زبان سے کیسے جھٹلاتے، چند آیات کے بعد صاف فرمادیا: قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ (یونس: ۱۰۴) یہ آیت صاف بتلا رہی ہے کہ شک کرنے والے دوسرے لوگ تھے جن کے مقابلہ میں آپ اپنے غیر متزلزل اور اٹل عقیدہ کا اعلان کر رہے ہیں، بہرحال ان آیات میں پیغمبر کی زبان سے قرآن کے ہر ایک مخاطب کو متنبہ کیا کہ کفر و تکذیب کی بیماری شک سے شروع ہوتی ہے، اگر تم کو قرآن کے بیان کردہ واقعات میں شک و شبہ پیدا ہو تو اس کا فوراً علاج کرو، یعنی جو لوگ کتب سابقہ کا علم رکھتے ہیں، ان سے تحقیق کرلو، آخر ان میں کچھ آدمی سچے اور انصاف پسند بھی ہیں، وہ بتائیں گے کہ نبی اُمّی نے جو کچھ بیان فرمایا کہاں تک درست ہے، بلاشبہ جو کچھ آپ لائے وہ سچ کے سوا کچھ نہیں، وہ پروردگار کا اتارا ہوا ہے جس میں شک و تردد کی قطعاً گنجائش نہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ

جن پر ثابت ہو چکی بات تیرے رب کی وہ ایمان نہ لائیں گے، اگرچہ پہنچیں ان کو ساری نشانیاں

حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۹۷﴾

جب تک نہ دیکھ لیں عذاب دردناک ۱ے

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے ایمان نہ لانے والوں کا ذکر تھا، چونکہ آپ ﷺ کو اس بات سے طبعاً رنج ہوتا تھا اس لیے اب آپ ﷺ کی تسلی فرماتے ہیں کہ ان کا ایمان نہ لانا مقدر ہو چکا ہے اس لیے اس کے خلاف نہ ہوگا، البتہ اگر قوم یونس کی طرح ان کا ایمان لانا مقدر ہو چکا ہوتا تو ان کی طرح یہ بھی ایمان لے آتے۔

یقیناً جن لوگوں کے حق میں آپ کے رب کی (یہ ازلی) بات (کہ یہ ایمان نہ لائیں گے) ثابت ہو چکی ہے وہ (کبھی) ایمان نہ لائیں گے، گو ان کے پاس تمام دلائل (ثبوت حق کے) پہنچ جائیں، جب تک کہ عذاب دردناک کو نہ دیکھ لیں (مگر اس وقت ایمان نافع نہیں ہوتا)۔

**فائدہ:** ۱؎ اگر بیہودہ شکوک کا علاج نہ کیا جائے تو چند روز میں شک ترقی کر کے امتراء (جدل) اور ''امتراء'' ترقی کر کے تکذیب کی حد تک جا پہنچے گا جس کا نتیجہ خسران وخرابی کے سوا کچھ نہیں، تکذیب کے بعد ایک اور درجہ ہے، جہاں پہنچ کر دل پر مہر لگ جاتی ہے، تکذیب کرتے کرتے قبول حق کی استعداد بھی برباد ہو جاتی ہے، ایسا شخص اگر دنیا جہان کے سارے نشان دیکھ لے تب بھی ایمان نہ لائے، اسے عذاب الیم دیکھ کر ہی یقین آئے گا، جبکہ اس یقین سے کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

**فائدہ:** كَلِمَةُ رَبِّكَ (رب کی بات) سے مراد غالباً وہ ہے جو دوسری جگہ فرمایا: لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (ہود:۱۱۹) یعنی دوزخ کو جن وانس سے بھروں گا، جن لوگوں پر بدبختی، سوء استعداد اور شامت اعمال سے یہ بات علم الٰہی میں ثابت ہو چکی، یہاں انکا ذکر ہے۔

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ؕ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ

سو کیوں نہ ہوئی کوئی بستی کہ ایمان لاتی پھر کام آتا ان کو ایمان لانا مگر یونس کی قوم، جب وہ ایمان لائی اٹھا لیا ہم نے ان پر سے

عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۹۸﴾

ذلت کا عذاب دنیا کی زندگانی میں اور فائدہ پہنچایا ہم نے ان کو ایک وقت تک

**خلاصہ تفسیر:** چنانچہ (جن بستیوں پر عذاب آچکا ہے ان میں سے عذاب آنے سے پہلے) کوئی بستی ایمان نہ لائی کہ ایمان لانا اس کو نافع ہوتا (کیونکہ ان کے ایمان کی بابت مشیت متعلق نہ ہوئی تھی نہ انہوں نے خود چاہا نہ خدا نے چاہا) ہاں! مگر یونس (علیہ السلام) کی قوم (کہ ان کے ایمان کے ساتھ مشیت متعلق ہوئی تھی، اس لئے وہ موعودہ عذاب کے صرف آثار کو دیکھ کر ایمان لے آئے، اور) جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے رسوائی کے عذاب کو دنیوی زندگی میں ان پر سے ٹال دیا اور ان کو ایک وقت خاص (یعنی وقت موت) تک (خیر خوبی کے ساتھ) عیش دیا (پس اور قریوں بستیوں کا ایمان نہ لانا اور قوم یونس علیہ السلام کا ایمان لانا دونوں مشیت سے ہوئے)۔

**فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ:** قوم یونس کے قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کے ایمان نہ لانے پر وحی الٰہی سے یونس علیہ السلام نے ان کو عذاب کی خبر دی اور خود چلے گئے، جب مقررہ وقت پر عذاب کے آثار شروع ہوئے تو تمام قوم نے حق تعالیٰ کے روبرو گریہ وزاری شروع کی اور ایمان لے آئے تو وہ عذاب ٹل گیا، قوم یونس کو آثار کے ذریعہ عذاب کا آنا غالب گمان سے معلوم ہو گیا تھا یا عذاب آ گیا تھا مگر ابھی فرشتے نظر نہ آئے تھے، نہ عالم آخرت منکشف ہوا تھا کہ ایمان لے آئے، پس یہ آیت: فلم يك ينفعهم ايمانهم لما راوا باسنا کے خلاف نہیں، کیونکہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ عذاب آجانے اور عالم آخرت دیکھ لینے کے بعد ایمان نافع نہیں ہوتا، اور قوم یونس پہلے ہی ایمان لے آئے تھے، غرض ان لوگوں میں صلاحیت تھی جلدی ایمان لے آئے، خدا کی مشیت بھی ان کے ارادہ کے مطابق متعلق ہوئی۔

**وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ:** یعنی ان کو ایک وقت خاص تک خیر وخوبی کے ساتھ عیش دیا، یہاں عیش کے ساتھ ''خیر وخوبی'' کی جو قید لگائی گئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا عیش دیا جو آخر میں باعث وبال نہ بنے، دلیل اس کی سورہ ہود کی آیت ہے: يمتعكم متاعا حسنا الى اجل مسمى یعنی خدا پر ایمان لاؤ تو خیر وخوبی کے ساتھ خاص مدت تک یعنی موت تک عیش دیں گے، وہاں یہی مراد ہے کہ ایمان واعمال صالحہ کے ساتھ جو عیش ہو وہ انجام کار وبال جان نہیں ہوتا، حقیقت اس کی یہ ہے جو حاصل ہے آیت اتنا في الدنيا حسنة کا، جس کی تفسیر سورہ بقرہ میں گزر چکی ہے، پس یہ شبہ جاتا رہا کہ دنیا کا عیش تو کفار کو بھی عام ہے پھر ایمان پر اسے کیوں مرتب فرمایا؟ جواب یہ ہے کہ کفار کا عیش خیر وخوبی کے ساتھ نہیں، اس کا انجام وبال جان ہے، اور حیات دنیا کا بطور خاص ذکر مبالغہ کے لیے ہے، یعنی آخرت میں تو ایمان نافع ہوتا ہی ہے، ان کو ایمان کی بدولت دنیا میں بھی عیش دیا گیا۔

**فائدہ:** یعنی جتنی بستیاں تکذیب انبیاء اور شرارتوں کی وجہ سے مستوجب عذاب ٹھہریں، ان میں سے کسی کو ایسی طرح ایمان لانے کی نوبت نہ آئی جو عذاب الٰہی سے نجات دیتا، صرف یونس علیہ السلام کی قوم کی ایک مثال ہے جس نے ایمان لا کر اپنے کو آسمانی عذاب سے بال بال بچا لیا جو بالکل ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا، خدا نے ایمان کی بدولت دنیاوی زندگی میں ان پر سے آنے والی بلا ٹال دی اور جس وقت تک انھیں دنیا میں رہنا تھا یہاں کے فوائد و برکات سے متمتع کیا۔

مفسرین نے نقل کیا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام سرزمین موصل میں اہل نینوا کی طرف مبعوث ہوئے، وہاں کے لوگ بت پرست تھے، یونس علیہ السلام لگا تار سات سال تک پند و نصیحت کرتے رہے، انہوں نے ایک نہ سنی، یوماً فیوماً انکار و تکذیب بڑھتا رہا، آخر حضرت یونس نے تنگ آکر انکو آگاہ کیا کہ (باز نہ آئے تو) تین دن کے اندر عذاب آنے والا ہے، جب تیسری شب آئی یونس علیہ السلام آدھی رات گزرنے پر بستی سے نکل کھڑے ہوئے، صبح ہوتے ہی آثار عذاب کے نظر آنے لگے، آسمان پر نہایت ہولناک اور سیاہ بادل چھا گیا جس سے دھواں نکلتا تھا، وہ ان کے مکانوں سے قریب ہوتا جاتا تھا حتیٰ کہ ان کی چھتیں بالکل تاریک ہو گئیں، یہ آثار دیکھ کر جب انھیں ہلاکت کا یقین ہو گیا تو یونس کی تلاش ہوئی، وہ نہ ملے تو سب لوگ عورتوں بچوں سمیت بلکہ مواشی اور جانوروں کو بھی ساتھ لے کر جنگل میں نکل آئے اور سچے دل سے خدا کی طرف رجوع ہوئے، خوف سے چیخیں مارتے تھے اور بڑے اخلاص و تضرع سے خدا کو پکار رہے تھے، چاروں طرف آہ و بکاء کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور کہتے جاتے تھے کہ: "آمنا بما جاءَ به یونس" جو کچھ یونس علیہ السلام لائے ہم اس پر ایمان لاتے ہیں، حق تعالیٰ نے ان کے تضرع و بکاء پر رحم فرمایا اور آثار عذاب جو پیدا ہو چکے تھے اٹھا لیے گئے۔

یہاں پہنچ کر علمائے سلف کے دو قول ہیں: ① اکثر علماء کہتے ہیں کہ ابھی اصلی عذاب کا معائنہ ان کو نہ ہوا تھا، صرف علامات و آثار نظر آئے تھے، ایسے وقت کا ایمان شرعاً معتبر اور نافع ہے، ''ایمان بأس'' جو معتبر و مقبول نہیں اس سے مراد یہ ہے کہ عین عذاب کو دیکھ کر اور اس میں پھنس کر ایمان لائے جیسے فرعون نے سمندر کی موجوں میں پھنس کر اقرار کیا تھا۔

② بعض علماء کے نزدیک قوم یونس کا ایمان بھی فرعون کی طرح ''ایمان بأس'' تھا جو عام ضابطہ کے موافق نافع نہ ہونا چاہیے تھا، لیکن حق تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے خلاف قاعدہ بطور استثناء اس قوم کا یہ ایمان معتبر رکھا، فرعون کے ایمان کی طرح رد نہیں فرمایا، پھر اختلاف ہوا ہے کہ آیا ان کے ایمان کا معتبر ہونا صرف دنیاوی زندگی تک محدود تھا کہ دنیا میں آنے والا عذاب ٹل گیا، یا آخرت میں بھی موجب نجات ہوگا، ''ابن کثیر'' نے دوسرے احتمال کو ترجیح دی ہے یعنی دنیا اور آخرت دونوں جگہ مفید و معتبر ہوگا، واللہ اعلم۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے نہایت لطیف و دقیق طرز میں آیت کی تفسیر کی ہے: ''یعنی دنیا میں عذاب دیکھ کر یقین لانا کسی کو کام نہیں آیا، مگر قوم یونس کو، اس واسطے کہ ان پر حکم عذاب کا نہ پہنچا تھا، حضرت یونس کی شتابی سے محض صورت عذاب کی نمودار ہوئی تھی (تاکہ ان کی نظر میں حضرت یونس کی بات جھوٹی نہ ہو) وہ ایمان لائے پھر بچ گئے اور صورت عذاب ہٹالی گئی، اسی طرح مشرکین مکہ کہ فتح مکہ میں فوج اسلام ان پر پہنچی قتل و غارت کے لیے، لیکن ان کا ایمان قبول ہو گیا اور امان ملی''، حضرت یونس کے قصہ کا بقیہ سورۃ الصافات وغیرہ میں آئے گا۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۭ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٩٩﴾

اور اگر تیرا رب چاہتا بیشک ایمان لے آتے جتنے لوگ کہ زمین میں ہیں سارے تمام، اب کیا تو زبردستی کرے گا لوگوں پر کہ ہو جائیں با ایمان ۱۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَي الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿١٠٠﴾

اور کسی سے نہیں ہو سکتا کہ ایمان لائے مگر اللہ کے حکم سے، اور وہ ڈالتا ہے گندگی ان پر جو نہیں سوچتے ۲۔

**خلاصہ تفسیر:** اور (قوم یونس ہی کی کیا تخصیص ہے) اگر آپ کا رب چاہتا تو تمام روئے زمین کے لوگ سب کے سب ایمان

لے آتے (مگر بعض حکمتوں کی وجہ سے یہ نہ چاہا، اس لئے سب ایمان نہیں لائے) سو (جب یہ بات ہے تو) کیا آپ لوگوں پر زبردستی کر سکتے ہیں جس میں وہ ایمان ہی لے آئیں، حالانکہ کسی شخص کا ایمان لانا بدون خدا کے حکم (یعنی مشیت) کے ممکن نہیں، اور اللہ تعالیٰ بے عقل لوگوں پر (کفر کی) گندگی واقع کر دیتا ہے (یعنی ان کی تقدیر میں ایمان نہ ہونے کی وجہ ان کا جہل اور نادانی ہے کہ وہ خود حق کو نہیں سمجھنا چاہتے، اس لیے کفر میں مبتلا ہیں، اگرچہ جہل کا سلسلہ بھی مشیت وحکمت ہی تک پہنچتا ہے)۔

**اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ:** اس میں دلالت ہے کہ دعوت وتبلیغ کے بعد نتائج وثمرات کے پیچھے نہیں لگنا چاہیے، اپنا کام جاری رکھنا ہی کافی ہے۔

* * *

**فائدہ: ۱** یعنی آپ کو یہ قدرت نہیں کہ زبردستی کسی کے دل میں ایمان اتار دیں، خدا چاہتا تو بیشک سب آدمیوں کے دلوں میں ایمان ڈال سکتا تھا، مگر جیسا کہ پہلے متعدد مواضع میں تقریر کی جا چکی ہے، ایسا کرنا اس کی تکوینی حکمت ومصلحت کے خلاف تھا، اس لیے نہیں کیا۔

**فائدہ: ۲** خدا کی مشیت وتوفیق اور حکم تکوینی کے بدون کوئی ایمان نہیں لا سکتا، اور یہ حکم وتوفیق ان ہی کے حق میں ہوتی ہے جو خدا کے نشانات میں غور کریں اور عقل وفہم سے کام لیں، جو لوگ سوچنے سمجھنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے انھیں خدا تعالیٰ کفر وشرک کی گندگی میں پڑا رہنے دیتا ہے۔

## قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰۱

تو کہہ دیکھو تو کیا کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں، اور کچھ کام نہیں آتی نشانیاں اور ڈرانے والے ان لوگوں کو جو نہیں مانتے

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے تسلی کے مضمون سے قبل ایمان نہ لانے والوں کا ذکر تھا، اب بتلاتے ہیں کہ عناد اور ایمان سے ناامیدی کے باوجود یہ لوگ پھر بھی دائرۂ تکلیف سے باہر نہیں، اور اس عناد پر عذاب کی وعید کا مستحق ہونا بھی بیان کیا جاتا ہے۔

آپ کہہ دیجئے کہ تم غور کرو (اور دیکھو) کہ کیا کیا چیزیں ہیں آسمان میں اور زمین میں (آسمانوں میں ستارے وغیرہ اور زمین میں بے انتہا مخلوق نظر آتی ہے، یعنی ان میں غور کرنے سے توحید کی عقلی دلیل حاصل ہوگی، یہ ان کے مکلف ہونے کا بیان ہوا) اور جو لوگ (عناداً) ایمان نہیں لاتے ان کو دلائل اور دھمکیاں کچھ فائدہ نہیں پہنچاتے (یہ ان کے عناد کا بیان ہوا)۔

**قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ:** اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق کے لیے مخلوقات پر غور کرنا، خالق کی طرف فکر وتوجہ کرنے کے خلاف نہیں (دونوں صحیح ہیں) یعنی شرعی حدود کا خیال رکھتے ہوئے مخلوق کو دیکھنا اس وجہ سے کہ اس سے خالق کی پہچان حاصل ہو درست عمل ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی سوچنے اور غور کرنے والوں کے لیے آسمان وزمین میں خدا کی قدرت وحکمت اور توحید وتفرید کے کیا کچھ نشان موجود ہیں، بلکہ ذرہ ذرہ اور پتہ پتہ اس کی توحید پر دلالت کرتا ہے، لیکن جو کسی بات کو ماننا اور تسلیم کرنا نہیں چاہتے ان کے لیے یہ سب نشانات ودلائل بیکار ہیں اور ڈرانے والے پیغمبروں کی تنبیہ وتخویف بھی غیر موثر ہے۔

## فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ

سو اب کچھ نہیں جس کا انتظار کریں مگر انہی کے سے دن جو گزر چکے ہیں ان سے پہلے، تو کہہ اب راہ دیکھو میں بھی تمہارے ساتھ

## مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝۱۰۲

راہ دیکھتا ہوں

**خلاصہ تفسیر:** سو (ان کی عناد کی حالت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) وہ لوگ (بدلالت حال) صرف ان لوگوں کے سے واقعات کا انتظار کر رہے ہیں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں (یعنی دلائل اور وعیدوں کے باوجود جو ایمان نہیں لاتے تو ان کی حالت اس شخص کے مشابہ ہے جو ایسے عذاب کا منتظر ہو جو کہ پہلی قوموں پر آیا تھا، سو) آپ فرما دیجئے کہ اچھا تو تم (اس کے) انتظار میں رہو میں بھی تمہارے ساتھ (اس کے) انتظار کرنے والوں میں ہوں۔

* * *

**فائدہ:** ایسی ضدی اور معاند قوم کیلئے جو کسی دلیل اور نشان کو نہ مانے اور کچھ باقی نہیں بجز اسکے کہ گذشتہ مکذبین پر جو آفات وحوادث نازل ہوئے ہیں، ان کا یہ بھی انتظار کریں، سو بہتر ہے تم اور ہم دونوں مل کر اس وقت کا انتظار کرتے ہیں تا کہ صادق وکاذب کا آخری فیصلہ سامنے آجائے۔

ع ۱۰ / ۱۵

ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

پھر ہم بچا لیتے ہیں اپنے رسولوں کو اور ان کو جو ایمان لائے اسی طرح، ذمہ ہے ہمارا بچا لیں گے ایمان والوں کو

**خلاصہ تفسیر:** (اب پھر پہلی قوموں کا حال بیان فرماتے ہیں کہ ہم جب ان پر عذاب واقع کرتے تھے تو) پھر ہم (اس عذاب سے) اپنے پیغمبروں کو اور ایمان والوں کو بچا لیتے تھے (جس طرح اُن مؤمنین کو ہم نے نجات دی تھی) ہم اسی طرح سب ایمان والوں کو نجات دیا کرتے ہیں، یہ (حسب وعدہ) ہمارے ذمہ ہے (پس اسی طرح اگر ان کفار پر کوئی افتاد پڑی تو مسلمان اس سے محفوظ رہیں گے، خواہ دنیا میں خواہ آخرت میں)۔

ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: مسلمانوں کا آخرت کے عذاب سے بچنا تو ظاہر ہے، اور پہلے عذابوں میں دنیاوی عذاب سے بھی بچنا ظاہر ہے، اور اس امت کے کفار پر جو دنیاوی عذاب آتا ہے یعنی قتل وغیرہ اس سے مسلمانوں کا بچنا اس طرح ہے کہ مسلمانوں کے حق میں یہ قتل وغیرہ عذاب نہیں ہوتا، بلکہ ان کے لیے اس میں بڑا ثواب اور بڑے درجات ہیں، خوب سمجھ لو۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جیسے پہلی قوموں کے ساتھ ہماری عادت رہی ہے کہ مکذبین کو ہلاک کر کے پیغمبروں اور مؤمنین کو بچایا، اسی طرح موجودہ اور آئندہ مؤمنین کی نسبت ہمارا وعدہ ہے کہ ان کو نجات دیں گے آخرت میں عذاب الیم سے اور دنیا میں کفار کے مظالم اور سختیوں سے ہاں شرط یہ ہے کہ مؤمنین مؤمنین ہوں، یعنی وہ صفات وخصال رکھتے ہوں جو قرآن وحدیث میں مؤمنین کی بیان ہوئیں ہیں۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

کہہ دے اے لوگو اگر تم شک میں ہو میرے دین سے تو میں عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو اللہ کے سوا

وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ښ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۴﴾

اور لیکن میں عبادت کرتا ہوں اللہ کی جو کھینچ لیتا ہے تم کو، اور مجھ کو حکم ہے کہ رہوں ایمان والوں میں

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے کفار کے جھٹلانے کا ذکر تھا، اب دین اسلام کے رکن اعظم یعنی توحید کا ذکر ہے تا کہ اس کی حقیقت میں غور کر کے اسلام کی حقانیت کا علم ہو سکے۔

آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ اے لوگو! اگر تم میرے دین کی طرف سے شک (اور تردد) میں ہو تو (میں تم کو دین اسلام کی حقیقت بتلاتا ہوں وہ یہ ہے کہ) میں ان معبودوں کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو، لیکن ہاں! اس معبود کی عبادت کرتا ہوں جو تمہاری جان

قبض کرتا ہے اور مجھ کو (من جانب اللہ) یہ حکم ہوا ہے کہ میں (ایسے معبود پر) ایمان لانے والوں میں سے ہوں۔

اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ: یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ کفار تو پوری طرح منکر تھے پھر مؤمن کی بابت شک اور تردد کیوں فرمایا گیا؟ جواب یہ ہے کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس دین میں تو شک بھی نہیں ہونا چاہیے چہ جائیکہ انکار و تکذیب۔

وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

اور یہ کہ سیدھا کر منہ اپنا دین پر حنیف ہو کر، اور مت ہو شرک والوں میں، اور مت پکار اللہ کے سوا ایسے کو

مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾

کہ نہ بھلا کرے تیرا، اور نہ برا، پھر اگر تو ایسا کرے تو تو بھی اس وقت ہو ظالموں میں ۱؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (مجھ کو) یہ (حکم ہوا ہے) کہ اپنے آپ کو اس دین (توحید خالص) کی طرف اس طرح متوجہ رکھنا کہ اور سب طریقوں سے علیحدہ ہو جاؤ اور کبھی مشرک مت بننا، اور (یہ حکم ہوا ہے کہ) خدا (کی توحید) کو چھوڑ کر ایسی چیز کی عبادت مت کرنا جو تجھ کو نہ (عبادت کرنے کی حالت میں) کوئی نفع پہنچا سکے، اور نہ (ترک عبادت کی حالت میں) کوئی ضرر پہنچا سکے، پھر اگر (بالفرض) ایسا کیا (یعنی غیر اللہ کی عبادت کی) تو اس حالت میں (اللہ کا) حق ضائع کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی اگر میرا طریقہ اور مسلک دینی تمہاری سمجھ میں نہیں آیا، اس لیے اس کی نسبت شکوک و شبہات میں پھنسے ہوئے ہو، تو میں تمہیں اپنے دین کا اصل اصول (جو توحید خالص ہے) سمجھائے دیتا ہوں، خلاصہ یہ ہے کہ میں تمہارے ان فرضی معبودوں کی عبادت سے سخت نفور اور بیزار ہوں جس کے اختیار کرنے کا امکان بھی کبھی میری طرف سے دل میں نہ لانا، میری عبادت خالص اس خداوند قدوس کے لیے ہے جس کے قبضہ میں تمہاری سب کی جانیں ہیں کہ جب تک چاہے انھیں جسموں میں چھوڑے رکھے اور جب چاہے ایک دم میں کھینچ لے گویا موت و حیات کا رشتہ جس کے ہاتھ میں ہے بندگی اسی کی ہوسکتی ہے، نہ صرف یہ کہ جوارح سے اس کی بندگی کی جائے، ضروری ہے کہ دل میں اس کی توحید و تفرید پر پورا یقین و ایمان ہو اور ظاہر و باطن میں اسی دین حنیف پر جو ابراہیم خلیل اللہ کا دین ہے پوری ہمت اور توجہ سے مستقیم رہ کر شرک جلی و خفی کا تسمہ نہ لگا رہنے دیا جائے، جس طرح عبادت صرف اسی کی کریں، استعانت کے لیے بھی اسی کو پکاریں، کیونکہ ہر قسم کا نفع نقصان اور بھلائی برائی تنہا اسی کے قبضہ میں ہے، مشرکین کی طرح ایسی چیزوں کو مدد کے لیے پکارنا جو کسی نفع نقصان کی مالک نہ ہوں سخت بے موقع بات بلکہ ظلم عظیم (یعنی شرک) کا ایک شعبہ ہے، اگر بفرض محال نبی سے ایسی حرکت صادر ہو تو ان کی عظیم الشان شخصیت کو لحاظ کرتے ہوئے ظلم اعظم ہوگا۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ

اور اگر پہنچا دیوے تجھ کو اللہ کچھ تکلیف تو کوئی نہیں اسکو ہٹانے والا اسکے سوا، اور اگر پہنچانا چاہے تجھ کو کچھ بھلائی تو کوئی پھیرنے والا نہیں اسکے فضل کو

يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۷﴾

پہنچائے اپنا فضل جس پر چاہے اپنے بندوں میں، اور وہی ہے بخشنے والا مہربان

**خلاصہ تفسیر:** اور (مجھ سے یہ کہا گیا ہے کہ) اگر تم کو اللہ تعالیٰ کوئی تکلیف پہنچائے تو بجز اس کے اور کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں ہے، اور اگر وہ تم کو کوئی راحت پہنچانا چاہے تو اس کے فضل کا کوئی ہٹانے والا نہیں (بلکہ) وہ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہیں مبذول فرمائیں

اور وہ بڑی مغفرت بڑی رحمت والے ہیں (اور مغفرت ورحمت میں فضل واحسان کے بھی تمام افراد داخل ہیں، جب حق تعالی رحمت ومغفرت کے ساتھ موصوف ہیں پس لامحالہ وہ صاحب فضل بھی ہیں، خلاصہ یہ کہ میرا دین تو یہ ہے جس میں کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے)۔

* * *

**فائدہ:** جب ان چیزوں کو پکارنے سے منع کیا جن کے قبضہ میں تمہارا بھلا برا کچھ نہیں تو مناسب ہوا کہ اس کے بالمقابل مالک علی الاطلاق کا ذکر کیا جائے جو تکلیف وراحت اور بھلائی برائی کے پورے سلسلہ پر کامل اختیار اور قبضہ رکھتا ہے جس کی بھیجی ہوئی تکلیف کو دنیا میں کوئی نہیں ہٹا سکتا، اور جس پر فضل ورحمت فرمانا چاہے، کسی کی طاقت نہیں کہ اسے محروم کر سکے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ

کہہ دے اے لوگوں پہنچ چکا حق تم کو تمہارے رب سے ،اب جو کوئی راہ پر آئے سو وہ راہ پاتا ہے اپنے بھلے کو

وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۱۰۸ؕ

اور جو کوئی بہکا پھرے سو بہکا پھرے گا اپنے برے کو، اور میں تم پر نہیں ہوں مختار

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے دین اسلام کی حقانیت ظاہر کی گئی ہے، اب بتلاتے ہیں کہ اس بیان سے حجت تمام ہوگئی۔

آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ اے لوگو! تمہارے پاس (دین) حق تمہارے رب کی طرف سے (بدلیل) پہنچ چکا ہے، سو (اس کے پہنچ جانے کے بعد) جو شخص راہ راست پر آجائے گا، سو وہ اپنے (نفع کے) واسطے راہ راست پر آئے گا، اور جو شخص (اب بھی) بے راہ رہے گا تو اس کا بے راہ ہونا (یعنی اس کا وبال بھی) اسی پر پڑے گا، اور میں تم پر (کچھ بطور ذمہ داری کے) مسلط نہیں کیا گیا (کہ تمہاری بے راہی کی باز پرس مجھ سے ہونے لگے تو میرا کیا نقصان ہے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی حق واضح طور پر دلائل وبراہین کے ساتھ پہنچ چکا، جس کے قبول نہ کرنے کا کوئی معقول عذر کسی کے پاس نہیں خدا کی آخری حجت بندوں پر تمام ہوگئی، اب ہر ایک اپنا نفع نقصان سوچ لے جو خدا کی بتلائی ہوئی راہ پر چلے گا دنیا وآخرت میں کامیاب ہوگا، جو اسے چھوڑ کر ادھر ادھر بھٹکتا پھرے گا خود پریشان اور ذلیل وخوار رہے گا اپنے بھلے برے کو خوب سمجھ کر ہر شخص اپنے مستقبل کا انتظام کر لے اور جو راستہ پسند ہو اختیار کرے پیغمبر کوئی مختار بنا کر نہیں بھیجے گئے جو تمہارے افعال کے ذمہ دار اور جواب دہ ہوں، ان کا کام صرف آگاہ کر دینے اور راستہ بتلا دینے کا ہے، اس پر چلنا، چلنے والے کے اختیار میں ہے۔

وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚۖ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۱۰۹ؒ ع ۱۱

اور تو چل اسی پر جو حکم پہنچے تیری طرف اور صبر کر جب تک فیصلہ کرے اللہ، اور وہ ہے سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے دعوت کامل اور حجت تمام کر چکے، چونکہ اس کے بعد بھی بعض منکر رہے جس سے آپ ﷺ کو رنج پہنچتا تھا، اس لیے اب آپ ﷺ کی تسلی پر سورت کو ختم فرماتے ہیں۔

اور آپ اس کا اتباع کرتے رہئے جو کچھ آپ کے پاس وحی بھیجی جاتی ہے (اتباع وحی میں سب اعمال کے ساتھ تبلیغ بھی آگئی، یعنی عمل بھی کرتے رہیے اور تبلیغ احکام بھی) اور (ان کے کفر وایذاء پر) صبر کیجئے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ (ان کا) فیصلہ کر دیں گے (خواہ یہ فیصلہ دنیا میں ہو کہ مخالفین ہلاک کر دیے جائیں یا آخرت میں عذاب کے ساتھ ہو، مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے ذاتی اور منصبی کام میں لگے رہئے، ان کی فکر نہ کیجئے) اور وہ سب فیصلہ

کرنے والوں میں اچھا (فیصلہ کرنے والا) ہے۔

ایسی گفتگو اور اسی طرح اس سے پہلے آیت کی گفتگو عادتاً کلام اور مناظرہ کے بالکل اخیر میں ہوا کرتی ہے، پس ان پر سورت کا اختتام کرنا نہایت لطیف حسن ختام ہے۔

* * *

**فائدہ:** اس میں آنحضرت ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر یہ لوگ حق کو قبول نہ کریں تو اپنے کو ان کے غم میں نہ گھلائیں، آپ خدا کے احکام کی پیروی کرتے رہیے اور تبلیغ وغیرہ کے کام میں لگے رہیے، اور جو شدائد اس راستہ میں پہنچیں ان پر صبر کیجئے، مخالفین کی ایذاء رسانیوں کا تحمل کرتے رہنا چاہیے، یہاں تک کہ خدا آپ کے اور ان کے درمیان بہترین فیصلہ کر دے یعنی حسب وعدہ آپ کو منصور و غالب کرے یا جہاد کا حکم بھیج دے۔

ایاتھا ۱۲۳ | ۱۱ سُورَةُ هُودٍ مَكِّيَّةٌ ۵۲ | رکوعاتھا ۱۰

**خلاصہ تفسیر:** اس سورت کا آغاز اور گذشتہ سورت کا اختتام متحد ہے کہ دونوں میں توحید و رسالت کا اثبات ہے، اور بقیہ مضامین میں باہم تناسب اور گزشتہ سورت کے مضامین میں سے تقارب ظاہر ہے۔

سورۃ ہود ان سورتوں میں سے ہے، جن میں پچھلی قوموں پر نازل ہونے والے قہر الٰہی اور مختلف قسم کے عذابوں کا اور پھر قیامت کے ہولناک واقعات اور جزاء و سزا کا ذکر خاص انداز میں آیا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کی ریش مبارک میں کچھ بال سفید ہو گئے تو حضرت صدیق اکبرؓ نے بطور اظہار رنج کے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ بوڑھے ہو گئے، تو آپ نے فرمایا کہ ہاں مجھے سورۃ ہود نے بوڑھا کر دیا، اور بعض روایات میں سورۃ ہود کے ساتھ سورۃ واقعہ اور مرسلات اور عم یتساءلون اور سورۃ تکویر کا بھی ذکر ہے، مطلب یہ تھا کہ ان واقعات کے خوف و دہشت کی وجہ سے بڑھاپے کے آثار ظاہر ہو گئے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓرٰ قف كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۙ﴿۱﴾

الر۔ یہ کتاب ہے کہ جانچ لیا ہے اس کی باتوں کو پھر کھولی گئی ہیں ایک حکمت والے خبردار کے پاس سے

**خلاصہ تفسیر:** پہلے قرآن کا منزل من اللہ ہونا، توحید پر مشتمل ہونا، حضور ﷺ کا بشیر و نذیر یعنی رسول ہونا بیان کیا جاتا ہے۔

الٓرٰ (کے معنی تو اللہ کو معلوم) یہ (قرآن) ایک ایسی کتاب ہے کہ اس کی آیتیں (دلائل سے) محکم کی گئی ہیں، پھر (اس کے ساتھ) صاف صاف (بھی) بیان کی گئی ہیں (اور وہ کتاب ایسی ہے کہ) ایک حکیم باخبر (یعنی اللہ تعالیٰ) کی طرف سے (آئی ہے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی یہ قرآن کریم وہ عظیم الشان اور جلیل القدر کتاب ہے جس کی آیتیں لفظی و معنوی ہر حیثیت سے نہایت جچی تلی ہیں، نہ ان میں تناقض ہے نہ کوئی مضمون حکمت یا واقعہ کے خلاف ہے نہ باعتبار معجزانہ فصاحت و بلاغت کے ایک حرف پر نکتہ چینی ہو سکتی ہے، جس مضمون کو جس عبارت میں ادا کیا ہے محال ہے کہ اس سے بہتر تعبیر ہو سکے، الفاظ کی قبا معانی کی قامت پر ذرا بھی نہ ڈھیلی ہے نہ تنگ، جن اصول و فروع، اخلاق و اعمال اور قیمتی پند و نصیحت پر یہ آیات مشتمل ہیں اور جو دلائل و براہین اثبات دعاوی کے لیے استعمال کی گئی ہیں، وہ سب علم و حکمت کے کانٹے میں تلی ہوئی ہیں، قرآنی حقائق و دلائل ایسے مضبوط و محکم ہیں کہ زمانہ کتنی ہی پلٹیاں کھائے ان کے بدلنے یا غلط ہونے کا کوئی امکان نہیں، عالم کے مزاج کی پوری تشخیص کر کے اور قیامت تک پیش آنے والے تغیرات و حوادث کو من کل الوجوہ جانچ تول کر ایسی معتدل اور ابدی غذائے روح، مائدہ قرآنی کے ذریعے سے پیش کی گئی

ہے جو تناول کرنے والوں کے لیے ہر وقت اور ہر حالت میں مناسب و ملائم ہو، ان تمام حکیمانہ خوبیوں کے باوجود یہ نہیں کہ اجمال و ابہام کی وجہ سے کتاب معمہ اور چیستان بن کر رہ جاتی بلکہ معاش و معاد کی تمام مہمات کو خوب کھول کر سمجھایا ہے اور موقع بہ موقع دلائل توحید، احکام، مواعظ، قصص، ہر چیز بڑی خوبصورتی اور قرینہ سے الگ الگ رکھی ہے، اور تمام ضروریات کا کافی تفصیل سے بیان ہوا ہے، نزولی حیثیت میں بھی یہ حکمت مرعی رہی ہے کہ پورا قرآن ایک دم نہیں اتارا بلکہ وقتاً فوقتاً موقع و مصلحت کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ آیات کا نزول ہوتا رہا، قرآن میں ان تمام باریکیوں کو مجتمع دیکھ کر آدمی حیران ہو جاتا ہے، مگر حیرت کی کوئی وجہ نہیں، اگر حکیم مطلق اور خبیر برحق کے کلام میں سب حکمتیں اور خوبیاں جمع نہ ہوں گی تو اور کس کلام میں توقع کی جا سکتی ہے۔

أَلَّا تَعْبُدُوٓا إِلَّا ٱللَّهَ ۚ إِنَّنِى لَكُم مِّنْهُ نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ ﴿٢﴾

کہ عبادت نہ کرو مگر اللہ کی ۱ میں تم کو اسی کی طرف سے ڈر اور خوش خبری سناتا ہوں ۲

**خلاصہ تفسیر**: (اس کتاب کا بڑا مقصد) یہ (ہے) کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت مت کرو، میں تم کو اللہ کی طرف سے (ایمان نہ لانے پر عذاب سے) ڈرانے والا اور (ایمان لانے پر ثواب کی) بشارت دینے والا ہوں۔

* * *

**فائدہ**: ۱ یعنی اس محکم و مفصل کتاب کے نازل کرنے کا بڑا مقصد یہ ہے کہ دنیا کو صرف خدائے واحد کی عبادت کی طرف دعوت دی جائے اور اس کے طریقے سکھائے جائیں، اسی عظیم و جلیل مقصد کے لیے پہلے انبیاء تشریف لائے تھے: وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِىٓ إِلَيْهِ أَنَّهُۥ لَآ إِلَٰهَ إِلَّآ أَنَا۠ فَٱعْبُدُونِ (الانبیاء: ۲۵) وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِى كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ ٱعْبُدُوا ٱللَّهَ وَٱجْتَنِبُوا ٱلطَّٰغُوتَ (النحل: ۳۶)

**فائدہ**: ۲ یعنی جو کتاب کو مانے اور شرک چھوڑ کر خدائے واحد کی عبادت کرے اسے فلاح دارین کی خوشخبری سناتے ہیں، جو نہ مانے اور کفر و شرک اختیار کرے اس کو عذاب الٰہی سے ڈراتے ہیں۔

وَأَنِ ٱسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوٓا إِلَيْهِ يُمَتِّعْكُم مَّتَٰعًا حَسَنًا إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى وَيُؤْتِ

اور یہ کہ گناہ بخشواؤ اپنے رب سے پھر رجوع کرو اس کی طرف کہ فائدہ پہنچائے تم کو اچھا فائدہ ایک وقت مقرر تک ۱ اور دیوے

كُلَّ ذِى فَضْلٍ فَضْلَهُۥ ۖ وَإِن تَوَلَّوْا فَإِنِّىٓ أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيرٍ ﴿٣﴾

ہر زیادتی والے کو زیادتی اپنی ۲ اور اگر تم پھر جاؤ گے تو میں ڈرتا ہوں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے ۳

إِلَى ٱللَّهِ مَرْجِعُكُمْ ۖ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ﴿٤﴾

اللہ کی طرف ہے تم کو لوٹ کر جانا، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے

**خلاصہ تفسیر**: اب توبہ واستغفار یعنی ایمان کا حکم اور اس پر بشارت بیان کی جاتی ہے۔

اور (اس کتاب کے مقاصد میں سے) یہ (بھی ہے) کہ تم لوگ اپنے گناہ (شرک و کفر وغیرہ) اپنے رب سے معاف کراؤ (یعنی ایمان لاؤ، اور) پھر (ایمان لا کر) اس کی طرف (عبادت سے) متوجہ رہو (یعنی عمل صالح کرو، پس ایمان و عمل صالح کی برکت سے) وہ تم کو وقت مقررہ (یعنی موت کے وقت) تک (دنیا میں) خوش عیشی دے گا اور (آخرت میں) ہر زیادہ عمل کرنے والے کو زیادہ ثواب دے گا (یہ کہنا بھی بمنزلہ ''بشیر'' کہنے کے ہے) اور اگر (ایمان لانے سے) تم لوگ اعراض (ہی) کرتے رہے تو مجھ کو (اس صورت میں) تمہارے لئے ایک بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے (یہ کہنا بمنزلہ ''نذیر'' کہنے کے ہے، اور عذاب کو بعید مت سمجھو، کیونکہ) تم (سب) کو اللہ ہی کے پاس جانا ہے، اور وہ ہر شئے پر پوری

قدرت رکھتا ہے (پھر بعید سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں، البتہ اگر وہاں تمہاری حاضری نہ ہوتی، یا نعوذ باللہ اس کو قدرت نہ ہوتی تو عذاب واقع نہ ہوتا، پس ایسی حالت میں ایمان اور توحید سے اعراض نہ کرنا چاہئے)۔

ثُمَّ تُوبُوٓا اِلَيۡهِ يُمَتِّعۡكُمۡ مَّتَاعًا حَسَنًا: اس سے مراد ''حیات طیبہ'' ہے جو ایسے شخص کے لیے مخصوص ہے جو ایمان اور عمل صالح کے ساتھ موصوف ہو، روح المعانی میں ہے کہ اس سے مراد ''امن وراحت'' کی زندگی ہے، اور یہ حدیث الدنیا سجن المؤمن اور حدیث اشد الناس بلاء الامثل فالامثل کے خلاف نہیں، کیونکہ امن سے مراد غیر اللہ سے مامون ومحفوظ ہونا ہے، اور راحت سے مراد حق تعالیٰ پر نظر رکھنے اور اس کا قرب حاصل کرنے سے خوش عیشی ہونا ہے، ایسا شخص مشقت کو نعمت سمجھتا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى: جو پچھلی تقصیرات معاف کرائے اور آئندہ کے لیے خدا کی طرف دل سے رجوع ہو، تو دنیا کی زندگی اچھی طرح گزرے کیونکہ مومن قانت خواہ کسی حال میں ہو مگر خدا کے فضل وکرم کی بڑی بڑی امیدیں رکھتا ہے وہ حق تعالیٰ کی رضا جوئی اور مستقبل کی عظیم الشان خوشحالی کے تصور میں اس قدر مگن رہتا ہے کہ یہاں کی بڑی بڑی سختیوں کو خاطر میں نہیں لاتا وہ جب خیال کرتا ہے کہ میں اپنی زندگی کے فرائض صحیح طور پر انجام دے رہا ہوں جس کا صلہ مجھ کو ضرور ایک دن عرش والی سرکار سے ملنے والا ہے تو اپنی کامیابی اور حق تعالیٰ کے وعدوں پر اعتماد کر کے اس کا دل جوش مسرت سے اچھلنے لگتا ہے، اسے دنیا کی تھوڑی سی پونجی میں وہ سکون قلبی اور راحت باطنی نصیب ہوتی ہے جو بادشاہوں کو بیشمار سامانوں اور اموال وخزائن سے حاصل نہیں ہوسکتی، بلکہ بعض اوقات یہاں کے چندروزہ تکلیفوں اور سختیوں میں وہ لذت پاتے ہیں جو اغنیاء وملوک اپنے عیش وتنعم میں محسوس نہیں کرتے، ایک محب وطن سیاسی قیدی کو اگر فرض کیجئے یقین ہو جائے کہ میری اسیری سے ملک اجنبیوں کی غلامی سے آزاد ہو جائے گا اور مجھے قید سے نکلتے ہی ملک کی جمہوریہ کا صدر بنا دیا جائے گا تو کیا اسے جیل خانہ کی بند کوٹھڑی میں سرور واطمینان کی کیفیت اس بادشاہ سے زیادہ حاصل نہ ہوگی؟ جس کے لیے ہر قسم کا سامان عیش وطرب فراہم ہیں مگر اندیشہ لگا ہوا ہے کہ وہ ایک ہفتہ کے اندر نہایت ذلت کے ساتھ تخت شاہی سے اتارا جانے والا ہے، اس پر دنیا کے جیل خانہ میں ایک مومن قانت کی زندگی کو قیاس کرلو۔

فائدہ: ۲۔ وَيُؤۡتِ كُلَّ ذِىۡ فَضۡلٍ فَضۡلَهٗ: جو جس قدر زیادہ بڑھ کر عمل کرے گا اسی قدر خدا کے فضل سے زیادہ حصہ پائے گا، آخرت میں اجر وثواب اور دنیا میں مزید طمانیت حاصل ہوگی۔

فائدہ: ۳۔ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ عَذَابَ يَوۡمٍ كَبِيۡرٍ: یعنی میری بات نہ مانو گے تو عذاب قیامت یقینی ہے، باقی یہ فرمانا کہ ''میں ڈرتا ہوں'' اس سے مقصود حضور کی عام شفقت وہمدردی، خلائق کا اظہار کرنا ہے۔

اَلَاۤ اِنَّهُمۡ يَثۡنُوۡنَ صُدُوۡرَهُمۡ لِيَسۡتَخۡفُوۡا مِنۡهُ ؕ اَلَا حِيۡنَ يَسۡتَغۡشُوۡنَ ثِيَابَهُمۡ ۙ

سنتا ہے وہ دوہرے کرتے ہیں اپنے سینے تاکہ چھپائیں اس سے، سنتا ہے جس وقت اوڑھتے ہیں اپنے کپڑے

يَعۡلَمُ مَا يُسِرُّوۡنَ وَمَا يُعۡلِنُوۡنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۵﴾

جانتا ہے جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں، وہ تو جاننے والا ہے دلوں کی بات

خلاصہ تفسیر: (اب علم الٰہی کا اثبات ہے، اور ایسا علم وقدرت دونوں توحید کی دلیل ہیں) یاد رکھو وہ لوگ دوہرا کئے دیتے ہیں اپنے سینوں کو (اور اوپر سے کپڑا لپیٹ لیتے ہیں) تاکہ اپنی باتیں خدا سے چھپا سکیں (یعنی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو باتیں کرتے ہیں تو اس طرح کہ کسی کو خبر نہ ہو جائے اور جس کو یہ اعتقاد ہوگا کہ خدا کو ضرور خبر ہوتی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا صاحب وحی ہونا دلائل سے ثابت ہے، پس وہ اخفاء کی ایسی تدبیر کبھی نہ کرے گا، کیونکہ ایسی تدبیر کرنا گویا بدلالت حال اللہ سے پوشیدہ رہنے کی کوشش کرنا ہے، سو) یاد رکھو کہ وہ لوگ جس وقت (دوہرے

ہوکر) اپنے کپڑے (اپنے اوپر) لپیٹتے ہیں وہ اس وقت بھی سب جانتا ہے جو کچھ چپکے باتیں کرتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر باتیں کرتے ہیں (کیونکہ) بالیقین وہ (تو) دلوں کے اندر کی باتیں جانتا ہے (تو زبان سے کہی ہوئی تو کیوں نہ جانے گا)۔

* * *

**فائدہ:** سزا دینے کے لیے ضروری ہے کہ مجرم حاضر ہو، حاکم سزا دینے کی پوری قدرت اور کامل اختیار رکھتا ہو، مجرمین کی کل کارروائیاں اس کے علم میں ہوں، **الی اللہ مرجعکم** میں بتلا دیا کہ مجرم وغیر مجرم سب کو خدا کے یہاں حاضر ہونا ہے، **وھو علی کل شیء قدیر** میں قدرت واختیار کا عموم بیان فرمایا اور: اَلَآ اِنَّهُمۡ يَثۡنُوۡنَ صُدُوۡرَهُمۡ سے بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ تک اس کے علم محیط کی وسعت کو ظاہر کیا کہ خدا ہر کھلی چھپی چیز کو یکساں جانتا ہے حتیٰ کہ دلوں کی تہ میں جو خیالات، ارادے اور نیتیں پوشیدہ ہوتی ہیں ان پر بھی مطلع ہے، پھر کوئی مجرم اپنے جرم کو کس طرح اس سے مخفی رکھ کر نجات پاسکتا ہے۔

**تنبیہ:** ان آیات کے شان نزول میں مفسرین کا اختلاف ہے صحیح ترین روایت ابن عباسؓ کی بخاری میں ہے کہ بعض مسلمانوں پر حیاء کا اس قدر حد سے زیادہ غلبہ ہوا کہ استنجا یا جماع وغیرہ ضروریات بشری کے وقت کسی حصہ بدن کو برہنہ کرنے سے شرماتے تھے کہ آسمان والا ہم کو دیکھتا ہے، برہنہ ہونا پڑتا تو غلبہ حیاء سے جھکے جاتے اور شرم گاہ کو چھپانے کے لیے سینہ کو دوہرا کئے لیتے تھے، اس طرح کے آثار کبھی کبھی غایت تادب مع اللہ اور غلبہ حیاء سے ناشی ہوسکتے ہیں، اور ایسے لوگ صوفیہ کی اصطلاح میں "مغلوب الحال" کہلاتے ہیں چونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا کسی مسئلہ میں ایسا غلو اور تعمق آئندہ امت کو ضیق میں مبتلا کرسکتا تھا اس لیے قرآن نے اَلَا حِيۡنَ يَسۡتَغۡشُوۡنَ ثِيَابَهُمۡ سے ان کی اصلاح فرمادی یعنی اگر بوقت ضرورت بدن کو کھولنے میں خدا سے حیاء آتی ہے اس لیے جھکے جاتے ہو تو غور کرو کہ کپڑے پہننے کی حالت میں تمہارا ظاہر و باطن کیا خدا کے سامنے نہیں ہے؟ جب انسان اس سے کسی وقت نہیں چھپ سکتا پھر ضروریات بشریہ کے متعلق اس قدر غلو سے کام لینا ٹھیک نہیں، واضح ہو کہ ربط آیات کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک آیت کا مضمون دوسری کے مضمون سے مناسبت رکھتا ہو، سبب نزول سے مناسبت رکھنا ضروری نہیں۔

ع وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِى الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزۡقُهَا وَيَعۡلَمُ مُسۡتَقَرَّهَا وَمُسۡتَوۡدَعَهَا ؕ

اور کوئی نہیں چلنے والا زمین پر مگر اللہ پر ہے اس کی روزی ۱ اور جانتا ہے جہاں وہ ٹھہرتا ہے اور جہاں سونپا جاتا ہے ۲

كُلٌّ فِىۡ كِتٰبٍ مُّبِيۡنٍ ۝۶

سب کچھ موجود ہے کھلی کتاب میں ۳

**خلاصہ تفسیر:** اب توحید کے متعلق رزق دینے کا بیان ہے جس سے مسئلہ علم کی بھی تائید ہوتی ہے۔

اور کوئی (رزق کھانے والا) جاندار روئے زمین پر چلنے والا ایسا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو (اور رزق رسانی کے لئے علم کی ضرورت ہوتی ہے، سو) وہ ہر ایک کی زیادہ رہنے کی جگہ کو اور چند روز رہنے کی جگہ کو جانتا ہے (اور ہر ایک کو وہاں ہی رزق پہنچاتا ہے، اور اگرچہ سب چیزیں علم الٰہی میں تو ہیں ہی، مگر اس کے ساتھ ہی) سب چیزیں کتاب مبین (یعنی لوح محفوظ) میں (بھی منضبط و مندرج) ہیں (غرض واقعات ہر طرح محفوظ ہیں علم الٰہی میں بھی اور لوح محفوظ میں بھی درج ہیں)۔

**وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِى الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزۡقُهَا:** اس کے خلاصہ تفسیر میں "رزق کھانے والا جاندار" اس لیے کہا کہ بعض بے کھائے پیے مرجاتے ہیں تو شبہ ہوسکتا ہے کہ ایسوں کو رزق کہاں پہنچتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہاں خاص وہی جاندار مراد ہیں جو رزق کھاتے ہیں، ان کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ان کی روزی ہمارے ذمہ ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہر جاندار کا رزق اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لیا ہے تو پھر ایسے واقعات کیوں پیش آتے ہیں کہ بہت

سے جانور اور انسان غذا نہ ملنے کے سبب بھوکے پیاسے مرجاتے ہیں؟ اس کے جواب علماء نے متعدد لکھے ہیں، ایک جواب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ رزق کی ذمہ داری اسی وقت تک ہے جب تک اس کی اجل مقدر یعنی عمر پوری نہیں ہوجاتی، جب یہ عمر پوری ہوگئی تو اس کو بہر حال مرنا ہے اور اس جہان سے گزرنا ہے جس کا عام سبب امراض ہوتے ہیں کبھی جلنا یا غرق ہونا یا چوٹ اور زخم بھی سبب ہوتا ہے، اسی طرح ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا رزق بند کر دیا گیا، اس سے موت واقع ہوئی۔

**وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا**: زیادہ رہنے کی جگہ ماں کا رحم ہے اور چند روز رہنے کی جگہ باپ کی پشت ہے، اور اگرچہ سب جانداروں کے لیے اس تفسیر پر مستقر و مستودع عام نہیں، لیکن ان جانداروں کو جو ماں کے رحم اور باپ کی پشت میں ہوتے ہیں حق تعالیٰ جانتے ہیں اور وہیں غذا پہنچاتے ہیں تو جن جانوروں کی پیدائش رحم وغیرہ میں نہیں ہوتی ان کے ساتھ علم الٰہی بدرجہ اولیٰ متعلق ہوگا، کیونکہ ان کا وجود تو کھلا ہوا ظاہر ہوتا ہے، جب پوشیدہ چیزوں کو جانتے اور روزی پہنچاتے ہیں ظاہر چیزوں کو کیوں نہ جانیں گے، پس الفاظ قرآن سے حق تعالیٰ کے علم کا تمام چیزوں کے ساتھ عام طور پر متعلق ہونا سمجھا گیا۔

**اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا**: اس میں رزق کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کی ترغیب ہے، روح المعانی میں ہے کہ اگر دنیاوی اسباب کو اس اعتقاد کے ساتھ اختیار کیا جائے کہ مسبب یعنی اسباب کے بنانے والے بھی اللہ تعالیٰ ہیں تو یہ توکل کے خلاف نہیں ہے، یہ اعتقاد ہرگز نہ ہو کہ بغیر اسباب کے رزق حاصل ہی نہیں ہوسکتا، خلاصہ یہ ہے کہ ربط و تعلق اور بھروسہ حق تعالیٰ پر ہونا چاہیے۔

* * *

**فائدہ: ۱۔ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا**: پہلے علم الٰہی کی وسعت بیان ہوئی تھی یہ اسی مضمون کا تکملہ ہے، یعنی زمین پر چلنے والا ہر جاندار جسے رزق کی احتیاج لاحق ہو، اس کو روزی پہنچانا خدا نے محض اپنے فضل سے اپنے ذمہ لازم کرلیا ہے، جس قدر روزی جس کے لیے مقدر ہے یقیناً پہنچ کر رہے گی، جو وسائل و اسباب بندہ اختیار کرتا ہے، وہ روزی پہنچنے کے دروازے ہیں، اگر آدمی کی نظر اسباب و تدابیر اختیار کرتے وقت مسبب الاسباب پر ہو تو یہ توکل کے منافی نہیں البتہ خدا کی قدرت کو ان اسباب عادیہ میں محصور و مقید نہ سمجھا جائے، وہ گاہ بگاہ سلسلہ اسباب کو چھوڑ کر بھی روزی پہنچاتا یا اور کوئی کام کر دیتا ہے، بہر حال جب تمام جانداروں کی حسب استعداد غذاء اور معاش مہیا کرنا حق تعالیٰ کا کام ہے تو ضروری ہے کہ اس کا علم ان سب پر محیط ہو ورنہ ان کی روزی کی خبر گیری کیسے کر سکے گا۔

**فائدہ: ۲۔ وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا**: حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: مستقر (جہاں ٹھہرتا ہے) بہشت و دوزخ اور مُستودَع (جہاں سونپا جاتا ہے) اس کی قبر ہے، پہلے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ الخ میں دنیاوی زندگی کا بیان تھا، یہاں برزخ اور آخرت کا بیان ہوا، مطلب یہ ہوا کہ خدا ابتداء سے انتہاء تک تمہاری ہستی کے تمام درجات کا علم رکھتا ہے، **مستقر و مُستودَع** کی تعیین میں مفسرین کے بہت اقوال ہیں پہلے سورہ انعام میں بھی ہم کچھ لکھ چکے ہیں ① ابن کثیرؒ نے کہا کہ زمین میں جہاں تک چلے پھرے اس کی منتہائے سیر کو **مستقر** اور پھر پھرا کر جس ٹھکانے پر آئے اسے **مُستودَع** کہتے ہیں۔

② ابن عباسؓ کے نزدیک اس زندگی میں جہاں رہے وہ **مستقر** اور موت کے بعد جہاں دفن کیا جائے وہ **مُستودَع** ہے۔

③ مجاہدؒ نے **مستقر** سے رحم مادر اور **مُستودَع** سے صلب پدر مراد لی ہے۔

④ عطاءؒ نے اس کے عکس کا دعویٰ کیا۔

⑤ بعض متفلسفین کا خیال ہے کہ زمین میں حیوانات کا جو مسکن بالفعل ہے اسے **مستقر** اور وجود فعلی سے پہلے جن مواد و مقار میں رہ کر آئے انھیں **مُستودَع** کہا گیا ہے یعنی حق تعالیٰ ان تمام مختلف مواد اور اطوار و ادوار کا عالم ہے جن میں سے کوئی حیوان گزر کر اپنی موجودہ ہیئت کذائی تک پہنچا ہے، وہ ہی اپنے علم محیط سے ہر مرتبہ وجود میں اس کی استعداد کے مناسب وجود و کمالات وجود فائض کرتا ہے۔

فائدہ: ۳؎ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ: یعنی "لوح محفوظ" میں جوصحیفہ علم الٰہی ہے، پھر علم الٰہی میں ہر چیز کیسے موجود نہ ہوگی۔

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ

اور وہی ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین چھ دن میں ۱؎ اور تھا اس کا تخت پانی پر ۲؎ تاکہ آزمائے تم کو کہ کون تم میں

اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا

اچھا کرتا ہے کام ۳؎ اور اگر تو کہے کہ تم اٹھو گے مرنے کے بعد تو البتہ کافر کہنے لگیں

اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

یہ کچھ نہیں مگر جادو ہے کھلا ہوا ۴؎

**خلاصہ تفسیر:** آگے پیدائش عالم اور ساتھ ہی اس کی حکمتیں بیان فرماتے ہیں جس سے دوبارہ زندہ ہونے کی بھی تائید ہوتی ہے، کیونکہ پہلی بار پیدا کرنا دلیل ہے اس بات پر کہ وہ دوبارہ بھی پیدا کرسکتا ہے۔

اور وہ (اللہ) ایسا ہے کہ سب آسمان اور زمین کو چھ دن (کی مقدار) میں پیدا کیا اس وقت اس کا عرش پانی پر تھا (کہ یہ دونوں چیزیں پہلے سے پیدا ہو چکی تھیں، نیچے پانی کے سوا کچھ نہ تھا، اوپر کی جانب عرش کے سوا کچھ نہ تھا، اور یہ پیدا کرنا اس لئے ہے) تاکہ تم کو آزمائے کہ (دیکھیں) تم میں اچھا عمل کرنے والا کون ہے (مطلب یہ ہے کہ زمین وآسمان کو پیدا کیا، تمہارے حوائج ومنافع اس میں پیدا کئے، تاکہ تم ان کو دیکھ کر توحید پر استدلال کرو اور ان سے فائدہ اٹھا کر منعم کا شکر اور خدمت جو کہ عبادت ہے عمل صالح سے بجالاؤ، سو بعض نے ایسا کیا، بعض نے نہ کیا)۔

(پیچھے ایمان لانے پر ثواب کا وعدہ اور ایمان نہ لانے پر عذاب کی وعید تھی اور ان دونوں کا اجمالی بیان لیبلو کم میں مذکور تھا، یہ سب بعث یعنی مرنے کے بعد آخرت میں ہوگا، اس لیے اب بعث کے متعلق بیان ہے) اور اگر آپ (لوگوں سے) کہتے ہیں کہ یقیناً تم لوگ مرنے کے بعد (قیامت کے روز دوبارہ) زندہ کئے جاؤ گے تو (ان میں) جو لوگ کافر ہیں وہ (قرآن کی نسبت) کہتے ہیں کہ یہ تو نرا صاف جادو ہے۔

اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ: جادو چونکہ مؤثر ہوتا ہے لیکن باطل اس لیے قرآن کو جادو کہتے تھے کہ قرآن کے مضامین کا مؤثر ہونا بھی مشاہدہ کرتے تھے اور انتہائی عناد کی وجہ سے نعوذ باللہ قرآن کو جادو کی طرح باطل سمجھتے تھے اور مقصود اس سے آخرت کا انکار تھا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ: یہ علم کے بعد قدرت کا بیان ہے، اس کی تفسیر سورہ اعراف کے ساتویں رکوع میں گزر چکی۔

فائدہ: ۲؎ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ: یعنی آسمان وزمین کی پیدائش سے پہلے پانی مخلوق ہوا جو آئندہ اشیاء کا مادہ حیات بننے والا تھا: وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (الانبیاء: ۳۰) اس وقت عرش خداوندی اسی کے اوپر تھا جیسے اب سماوات کے اوپر ہے، گویا یہ ایک صورت تھی جو اس حقیقت کو ظاہر کر رہی تھی کہ کائنات کا مادہ اور ذریعہ حیات بالکلیہ رب العرش کے تسلط وتصرف اور قیومیت مطلقہ کے ماتحت ہے، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۳؎ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا: یعنی اس سارے نظام کی تخلیق وترتیب سے مقصود تمہارا یہاں بسانا اور امتحان کرنا ہے کہ کہاں تک اس عجیب وغریب نظام اور سلسلہ مصنوعات میں غور کرکے خالق ومالک کی صحیح معرفت حاصل کرتے اور مخلوقات ارضی وسماوی سے منتفع ہو کر محسن شناسی اور سپاس گذاری کا فطری فرض بجالاتے ہو، یہ مقام تمہاری سخت آزمائش کا ہے، مالک حقیقی دیکھتا ہے کہ تم میں سے کونسا غلام صدق واخلاص اور سلیقہ مندی سے اچھا کام کرتا اور فرائض بندگی انجام دیتا ہے۔

فائدہ: ۴؎ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ: جب یہ دنیا امتحان وآزمائش کی جگہ ہے تو ضرور ہے کہ اس کے بعد مجازات انعام وانتقام کا سلسلہ

ہوتا شاکرین وکافرین کو اپنے اپنے کیے کا پھل ملے، اسی لیے یہاں بعث بعد الموت کا ذکر کیا گیا، یعنی کفار مکہ کو یقین نہیں آتا کہ موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جائیں گے، اور اپنے جرائم کی سزا بھگتیں گے، جب وہ قرآن میں یا حضور ﷺ کی زبان سے بعث بعد الموت کا نہایت موثر بیان سنتے ہیں تو کہتے ہیں کہ آپ کا یہ بیان کھلا ہوا جادو ہے جس نے بہت سے لوگوں کو مرعوب و مسحور کرلیا، مگر یاد رکھیے ہم پر یہ جادو چلنے والا نہیں۔ (ابن کثیر)

وَلَئِنْ أَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِلَىٰ أُمَّةٍ مَّعْدُودَةٍ لَّيَقُولُنَّ مَا يَحْبِسُهُ ۗ أَلَا يَوْمَ يَأْتِيهِمْ

اور اگر ہم روکے رکھیں ان سے عذاب کو ایک مدت معلوم تک تو کہنے لگیں کس چیز نے روک دیا عذاب کو، سنتا ہے جس دن آئے گا ان پر

لَيْسَ مَصْرُوفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ⑧ ع

نہ پھیرا جائے گا ان سے اور گھیر لے گی ان کو وہ چیز جس پر ٹھٹھے کیا کرتے تھے

**خلاصہ تفسیر:** (اب ان کے انکار کے منشاء کا جواب ارشاد ہے) اور اگر تھوڑے دنوں تک (مراد دنیوی زندگی ہے) ہم ان سے عذاب (موعود) کو ملتوی رکھتے ہیں (کہ اس میں حکمتیں ہیں) تو (بطور انکار واستہزاء کے) کہنے لگتے ہیں کہ (جب ہم تمہارے نزدیک مستحق عذاب ہیں تو) اس عذاب کو کون چیز روک رہی ہے (یعنی اگر عذاب کوئی چیز ہوتی تو اب تک ہو چکا ہوتا، جب نہیں ہوا تو معلوم ہوا کہ کچھ بھی نہیں، حق تعالیٰ جواب دیتے ہیں کہ) یاد رکھو جس دن (وقت موعود پر) وہ (عذاب) ان پر آپڑے گا تو پھر کسی کے ٹالے نہ ٹلے گا، اور جس (عذاب) کے ساتھ یہ استہزاء کر رہے تھے وہ ان کو آگھیرے گا (مطلب یہ کہ مستحق عذاب ہونے کے باوجود یہ تاخیر اس لئے ہے کہ بعض حکمتوں سے اس کا وقت معین ہے پھر اس وقت ساری کسر نکل جائے گی)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جب ان کی شرارتوں پر عذاب الٰہی سے ڈرایا جاتا ہے، مگر خدا کی حکمت ایک مدت معین تک عذاب کو روکے رکھتی ہے تو تکذیب واستہزاء کے طور پر کہتے ہیں کہ وہ عذاب کہاں ہے؟ آخر آتا کیوں نہیں؟ کس چیز نے اسے پکڑ رکھا ہے؟ فرماتے ہیں کیا مذاق کرتے ہو، وقت معین پر جب عذاب آئے گا کسی کے ٹالے نہ ٹلے گا اور ہر طرف سے گھیر کر تباہ و برباد کر کے چھوڑے گا۔

وَلَئِنْ أَذَقْنَا الْإِنسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ إِنَّهُ لَيَئُوسٌ كَفُورٌ ⑨ وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ نَعْمَاءَ

اور اگر ہم چکھا دیں آدمی کو اپنی طرف سے رحمت پھر وہ چھین لیں اس سے، تو وہ ناامید ناشکر ہوتا ہے ۱؎ اور اگر ہم چکھا دیں اس کو آرام

بَعْدَ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُ لَيَقُولَنَّ ذَهَبَ السَّيِّئَاتُ عَنِّي ۚ إِنَّهُ لَفَرِحٌ فَخُورٌ ⑩ إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا

بعد تکلیف کے جو پہنچی تھی اس کو تو بول اٹھے دور ہوئیں برائیاں مجھ سے، وہ تو اترانے والا شیخی خورا ہے ۲؎ مگر جو لوگ صابر ہیں

وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ⑪

اور کرتے ہیں نیکیاں، ان کے واسطے بخشش ہے اور ثواب بڑا ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے عذاب میں تاخیر کی وجہ سے ان کا عذاب اور قیامت سے انکار کر دینے کا بیان تھا، اب اس کی تائید کے لیے انسان کا ایک اکثری طبعی مزاج اور خاصہ بیان کیا جاتا ہے۔

اور اگر ہم انسان کو اپنی مہربانی کا مزا چکھا کر اس سے چھین لیتے ہیں تو وہ ناامید اور ناشکرا ہو جاتا ہے، اور اگر اس کو کسی تکلیف کے بعد جو کہ

اس پر واقع ہوئی ہو کسی نعمت کا مزا چکھائیں تو (ایسا اتراتا ہے کہ) کہنے لگتا ہے کہ میرا سب دکھ درد رخصت ہوا (اب کبھی نہ ہوگا، پس) وہ اترانے لگتا ہے شیخی بگھارنے لگتا ہے، مگر جو لوگ مستقل مزاج ہیں اور نیک کام کرتے ہیں (اس سے مراد مؤمنین ہیں، کیونکہ ہر مسلمان میں کم وبیش استقلال پسند اور نیک اعمال ہوتے ہیں، سو) وہ ایسے نہیں ہوتے (بلکہ نعمت کے زوال کے وقت صبر سے کام لیتے ہیں اور نعمت کے عطاء کے وقت شکر واطاعت بجالاتے ہیں جو کہ حاصل اعمال صالحہ کا، پس) ایسے لوگوں کے لئے بڑی مغفرت اور بڑا اجر ہے (خلاصہ یہ ہے کہ بجز مؤمنین کے اکثر آدمی ایسے ہی ہیں کہ ذرا سی دیر میں نڈر ہوجائیں ذرا سی دیر میں ناامید ہوجائیں اس لئے یہ لوگ تاخیر عذاب کے سبب بے خوف اور منکر ہوگئے)۔

**وَلَىِٕنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ:** جب انسان کی یہ حالت ہے کہ ایک تکلیف واقع ہونے کے بعد اگر زائل ہوجائے تو اس کے دوبارہ آجانے کا احتمال بھی بھلا دیتا ہے تو قیامت کی تکلیف تو ابھی واقع بھی نہیں ہوئی اس کا انکار کیا عجب ہے، اور بظاہر مقصود اس مقام کا صرف اسی مضمون **وَلَىِٕنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ** سے حاصل ہے، باقی پہلا مضمون یعنی نعمت کے زائل ہوجانے پر مایوسی اور ناامیدی ہوجانا غالبا وہ اس کی تاکید کے لیے لایا گیا ہے، کیونکہ منشا دونوں کا ایک ہے، وہ منشا یہ ہے کہ جو چیز انسان کو فی الحال درپیش ہو اس کے زائل نہ ہونے کا یقین کر لیتا ہے اور آئندہ پیش آنے والی چیزوں کا احتمال اور خیال بھی نہیں کرتا، اس آیت کے متعلق کچھ ضروری باتیں سورہ یونس آیت ۱۲: **وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ** کے تحت لکھی گئی ہیں وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

**وَلَىِٕنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ (الی قوله) اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا:** روح المعانی میں ہے کہ اس شکایت میں اس طرف اشارہ ہے کہ بندہ کو ہر حالت میں خواہ عیش ہو یا تکلیف ہو حق تعالی ہی پر بھروسہ اور توکل کرنا چاہیے، چنانچہ انسان کی طبعی حالت (رحمت کے بعد تکلیف پہنچنے پر مایوسی وکفران نعمت کا اظہار کرنا اور تکلیف ومصیبت کے بعد نعمت حاصل ہونے پر خوشی اور فخر کرنا) کو بیان فرما کر صابرین کو مستثنیٰ فرمانا اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی اب تو کہتے ہیں عذاب کہاں ہے، کیوں نہیں آتا، لیکن آدمی بودا اور تھڑ دلا اتنا ہے کہ اگر خدا چند روز اپنی مہربانی سے عیش و آرام میں رکھنے کے بعد تکلیف میں مبتلا کردے تو پچھلی مہربانیاں بھی بھلا دیتا ہے اور ناامید ہو کر آئندہ کے لیے آس توڑ بیٹھتا ہے، گذشتہ پر ناشکری اور آئندہ سے مایوسی، یہ ہی اس کی زندگی کا حاصل ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی مصیبت کے بعد اگر خدا آرام وآسائش نصیب کرے تو سمجھتا ہے کہ گویا اب ہمیشہ کے لیے مصائب وتکالیف کا خاتمہ ہو چکا پچھلی کیفیت کبھی لوٹ کر آنے والی نہیں، اس وقت غافل ومغرور ہو کر شیخیاں مارتا اور اتراتا پھرتا ہے حالانکہ چاہیے تھا کہ پچھلی حالت یاد کر کے خدا کا شکر ادا کرتا اور اس کے احسان کے سامنے جھک جاتا۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی جو حال اوپر عام انسانوں کا بیان ہوا، اس سے اللہ کے وہ بندے مستثنیٰ ہیں جو تکلیف ومصیبت کا مقابلہ صبر واستقامت سے کرتے اور امن وراحت کے وقت شکر گزاری کے ساتھ عمل صالح میں مستعدی دکھاتے ہیں، ایسے اولوالعزم وفاداروں کی جماعت ہی عظیم الشان بخشش و انعام کی مستحق ہے۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَضَآىِٕقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ

سو کہیں تو چھوڑ بیٹھے گا کچھ چیز اس میں سے جو وحی آئی تیری طرف اور تنگ ہوگا اس سے تیرا جی اس بات پر کہ وہ کہتے ہیں کیوں نہ اترا اِس پر

كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ۭ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۲﴾

خزانہ یا کیوں نہ آیا اس کے ساتھ فرشتہ، تو تو ڈرانے والا ہے، اور اللہ ہے ہر چیز کا ذمہ دار

**خلاصہ تفسیر:** سورت کے شروع میں رسالت وتوحید کا بیان تھا، آگے بھی رسالت کے متعلق اس ترتیب سے بحث ہے کہ پہلے ان

کے استہزا کی وجہ سے آپ ﷺ کے تنگ دل ہونے پر تسلی، پھر قرآن کی حقانیت پر ان لوگوں کے شبہ کا جواب، پھر صراحۃً قرآن کی حقانیت کا اثبات اور بحث رسالت کے ساتھ توحید کا بیان ہے جو کہ رسالت کے اعظم مقاصد میں سے ہے۔

(یہ لوگ جو انکار و استہزاء سے پیش آتے ہیں) سو شاید آپ (تنگ ہو کر) ان احکام میں سے جو کہ آپ کے پاس وحی کے ذریعہ بھیجے جاتے ہیں بعض کو (یعنی تبلیغ کو) چھوڑ دینا چاہتے ہیں (یعنی کیا ایسا ممکن ہے کہ آپ تبلیغ ترک کر دیں، سو ظاہر ہے کہ ایسا ارادہ تو آپ کر نہیں سکتے، پھر تنگ ہونے سے کیا فائدہ) اور آپ کا دل اس بات سے تنگ ہوتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ (اگر یہ نبی ہیں تو) ان پر کوئی خزانہ کیوں نہیں نازل ہوا، یا ان کے ہمراہ کوئی فرشتہ (جو ہم سے بھی بولتا چالتا) کیوں نہیں آیا (یعنی وہ جو یوں کہتے ہیں کہ ایسے ایسے معجزات کیوں نہیں دیئے گئے، سو ایسی باتوں سے آپ تنگ نہ ہو جایے، کیونکہ) آپ تو (ان کفار کے اعتبار سے) صرف ڈرانے والے ہیں (یعنی پیغمبر ہیں اور پیغمبر کے لیے مطلق کسی ایک معجزہ کی ضرورت ہوا کرتی ہے، خاص معجزہ کی ضرورت نہیں) اور پورا اختیار رکھنے والا ہر شئے پر (تو) صرف اللہ ہی ہے (آپ نہیں ہیں، جب یہ بات ہے تو ان معجزات کا ظاہر کرنا آپ کے اختیار سے باہر ہے پھر اس کی فکر اور اس فکر سے دل تنگی کیوں ہو)۔

**فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعۡضَ مَا يُوحَىٰٓ إِلَيۡكَ**: اس میں دو باتوں پر دلالت ہے: ① ایک یہ کہ جب مخاطب کی رغبت و توجہ بات کی طرف نہ ہو تو اس سے متکلم کا دل منقبض ہو جاتا ہے ② دوسری بات یہ کہ اگر وعظ و ارشاد ضروری ہو تو متکلم کو اس انقباض کے تقاضے یعنی ترک کلام پر عمل نہیں کرنا چاہیے بلکہ وعظ و نصیحت جاری رکھنی چاہیے۔

* * *

**فائدہ**: مشرکین مکہ شرک و بت پرستی کی تردید سے بہت غیظ کھاتے تھے مشرکانہ خرافات پر جس قدر ان کی تحمیق و تجہیل کی جاتی اسی قدر ان کے غصہ کی آگ بھڑکتی تھی، کبھی کوشش کرتے تھے کہ آپ کو اس معاملہ میں ذرا ڈھیلا کر دیں اور اس سب سے بڑے اور بنیادی مسئلہ کی تبلیغ میں نرمی اور تساہل برتنے پر آمادہ کریں جب ادھر سے مایوس ہوتے تو محض دق کرنے کو عجیب بیہودہ فرمائشیں کرنے لگتے مثلاً یہ کہتے کہ آپ سچے ہیں اور منصب رسالت پر مامور ہو کر آئے ہیں تو آپ کے ساتھ خدا کے یہاں سے مال و دولت کا بڑا خزانہ آنا چاہیے تھا، یا آسمان سے ایک فرشتہ آتا جو آپ کے ہمراہ تصدیق کے لیے ہر طرف جایا کرتا، لَوۡلَآ أُنزِلَ عَلَيۡهِ كَنزٌ أَوۡ جَآءَ مَعَهُۥ مَلَكٌۚ گویا جب آپ کے پاس اپنی بات منوانے کے لیے نہ مادی طاقت ساتھ ہے نہ روحانی، پھر ہم کس طرح تسلیم کر سکتے ہیں، آپ ان بیہودہ شبہات اور فرمائشوں سے سخت مغموم اور دلگیر ہوتے تھے، ممکن ہے کبھی ایسا خیال بھی دل میں گزرتا ہو کہ ان کے معبودوں کے معاملہ میں اگر خدا کی جانب سے اس قدر سختی اختیار کرنے کا حکم نہ رہے، تردید کی جائے مگر فی الحال قدرے نرمی اور رواداری کے ساتھ تو شاید زیادہ موثر اور مفید ہو، یا جو فرمائشیں یہ لوگ کرتے ہیں ان کی یہ ضد بھی کسی حد تک پوری کر دی جائے تو کیا عجب ہے مسلمان ہو جائیں بہر حال وہ ایسا نازک اور پر خطر وقت تھا کہ تمام دنیا باطل پرستی کے شور سے گونج رہی تھی صرف ایک مقدس ہستی تھی جس کے حلقوم سے حق کی آواز نکل کر باطل کے قلعوں میں زلزلہ ڈالتی تھی، آپ چاروں طرف سے موذی دشمنوں کے نرغہ میں گھر رہے تھے، کوئی جھٹلاتا کوئی طعن کرتا کوئی مذاق اڑاتا تھا، اس ماحول کا تصور کرو اور اس مبلغ اعظم کی قوت قلب اور ہمت مردانہ کا اندازہ لگاؤ، جس کا تمام تر اعتماد و اتکال ظاہری اسباب سے ہٹ کر خداوند قدوس کے وعدوں پر تھا، آپ جب محزون و دلگیر ہوتے تو صرف اپنے پروردگار کی آواز سے ہی تسلی پاتے اور دنیا کے مقابلہ میں تازہ دم ہو کر کھڑے ہو جاتے تھے اس سلسلہ میں یہ آیتیں نازل ہوئیں جن کا حاصل یہ ہے کہ آپ ان لوگوں کی بیہودہ خرافات اور فرمائشوں کی وجہ سے اس قدر فکرمند اور غمگین نہ ہوں نہ اپنے دل میں ان لوگوں کی مراعات کا خیال لائیں کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ وحی الٰہی نے جو چیزیں آپ کو سکھلائی ہیں اور جس بے خوف و خطر تبلیغ کا حکم دیا ہے اس کے بعض حصہ کو ان لوگوں کی خرافات سے تنگ دل ہو کر چھوڑ بیٹھیں جب یہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ پیغمبرانہ عصمت اور اولوالعزمی مانع ہے تو تنگدل ہونے سے کیا فائدہ، آپ کا کام صرف بھلے برے سے آگاہ کر دینا ہے ان کی ہدایت کی ذمہ داری آپ پر نہیں، خدا تعالیٰ جس کے سپرد ہر چیز ہے، ان کا معاملہ بھی اسی کے سپرد کیجیے اور صبر و استقامت کے ساتھ فرائض تبلیغ کی انجام دہی میں ثابت قدم رہیے۔

أَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَأْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ

کیا کہتے ہیں کہ بنا لایا ہے، تو قرآن کو کہہ دے تم بھی لے آؤ ایک دس سورتیں ایسی بنا کر اور بلا لو جس کو بلا سکو

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۳﴾ فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ

اللہ کے سوا اگر ہو تم سچے۔ پھر اگر نہ پورا کریں تمہارا کہنا تو جان لو کہ قرآن تو اترا ہے اللہ کی وحی سے

وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾

اور یہ کہ کوئی حاکم نہیں اس کے سوا، پھر اب تم حکم مانتے ہو

**خلاصہ تفسیر:** (چونکہ پیغمبر کے لئے مطلق معجزہ کی ضرورت ہے اور آپ کا بڑا معجزہ قرآن ہے تو اس کو نہ ماننے کی کیا وجہ) کیا (اس کی نسبت) یوں کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپ نے اس کو (اپنی طرف سے) خود بنالیا ہے، آپ جواب میں فرما دیجئے کہ (اگر یہ میرا بنایا ہوا ہے) تو (اچھا) تم بھی اس جیسی دس سورتیں (جو تمہاری) بنائی ہوئی (ہوں) لے آؤ اور (اپنی مدد کے لئے) جن جن غیر اللہ کو بلا سکو بلا لو اگر تم سچے ہو۔
پھر یہ کفار اگر تم لوگوں کا (یعنی پیغمبر ﷺ اور مؤمنین کا یہ) کہنا (کہ قرآن کی مثل بنالاؤ) نہ کر سکیں تو تم (ان سے کہہ دو کہ اب تو) یقین کرلو کہ یہ قرآن اللہ ہی کے علم (اور قدرت) سے اترا ہے (اس میں اور کسی علم وقدرت کا دخل نہیں) اور یہ (بھی یقین کرلو) کہ اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں (کیونکہ معبود تمام صفات کمال میں پورا ہوتا ہے، پھر اگر کوئی اور معبود ہوتا تو اس کو بھی پوری قدرت ہوتی اور اس قدرت سے وہ تم لوگوں کی مدد کرتا، کیونکہ دین کی تحقیق کے موقع کا یہی تقاضا تھا کہ وہ تمہاری مدد کرتا اور تم قرآن کے مثل کلام بنالاتے، پس قرآن کا مثل نہ لا سکنے سے رسالت اور توحید دونوں ثابت ہو گئے، جب دونوں ثابت ہو گئے) تو اب بھی مسلمان ہوتے ہو (یا نہیں)۔

**فَأْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ:** سورہ یونس اور سورہ بقرہ میں ایک سورت لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے اور یہاں دس سورتوں کا پہلے مطالبہ اور اس سے عاجز ہونے کے بعد ایک سورت سے معارضہ مناسب ہے، اور سورہ یونس اگر مدنی ہے جیسا کہ ایک قول ہے تب تو اس کی بھی یہی توجیہ ہے، اور اگر سورہ یونس مکی ہو اور سورہ ہود سے مقدم ہو جیسا کہ اتقان میں یہ قول بھی ہے تو میرے نزدیک اس کی توجیہ یہ ہے کہ ایک سورت کا مطالبہ تو قرآن کے فی نفسہ اعجاز کے اعتبار سے ہے اور وہ لوگ جو دعوی کرتے تھے کہ ہم قرآن کے مثل کلام کہہ سکتے ہیں: لونشاء لقلنا مثل ھذا اس دعوی کی وجہ سے دس سورتوں کا مطالبہ کیا گیا کہ جب تم ایسا کلام کہنے پر قادر ہو تو دس سورتیں لانا تم کو دشوار نہ ہوگا، اس جیسی دس سورتیں بنالاؤ۔

* * *

**فائدہ:** یعنی فرمائشی معجزے طلب کرتے ہیں، جن کا دیا جانا مصلحت نہیں، اور جو سب سے بڑا معجزہ (قرآن) ان کے سامنے ہے، اسے مانتے نہیں، کہتے ہیں یہ تو (معاذ اللہ) تمہاری بنائی ہوئی گھڑت ہے، اس کا جواب دیا کہ تم بھی آخر عرب ہو، فصاحت و بلاغت کا دعویٰ رکھتے ہو، سب مل کر ایسی ہی دس سورتیں گھڑ کر پیش کر دو اور اس کام میں مدد دینے کے لیے تمام مخلوق کو بلکہ اپنے ان معبودوں کو بھی بلالاؤ جنہیں خدائی کا شریک سمجھتے ہو اگر نہ کر سکو اور کبھی نہ کر سکو گے تو سمجھ لو کہ ایسا کلام خالق ہی کا ہو سکتا ہے جس کا مثل لانے سے تمام مخلوق عاجز رہ جائے، تو یقیناً یہ وہ کلام ہے جو خدا نے اپنے علم کامل سے پیغمبر پر اتارا ہے، بیشک جس کے کلام کا مثل نہیں ہو سکتا اس کی ذات وصفات میں کون شریک ہو سکتا ہے، ایسا بے مثال کلام اسی بے مثال خدا کا ہے جس کا کوئی شریک نہیں کیا اسے واضح دلائل کے بعد بھی مسلمان ہونے اور خدا کا حکم بردار بننے میں کسی چیز کا انتظار ہے۔

**تنبیہ:** اعجاز قرآن کی کچھ تفصیل سورہ یونس میں گزر چکی ہے، ابتداء میں پورے قرآن سے تحدی کی گئی تھی، پھر دس سورتوں سے ہوئی، پھر

ایک سورت سے جیسا کہ بقرہ اور یونس میں گزرا، گویا ان کا عجز بتدریج نمایاں کیا گیا۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ﴿١٥﴾

جو کوئی چاہے دنیا کی زندگانی اور اس کی زینت بھگتا دیں گے ہم ان کو ان کے عمل دنیا میں اور ان کو اس میں کچھ نقصان نہیں ۱؎

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٦﴾

یہی ہیں جن کے واسطے کچھ نہیں آخرت میں آگ کے سوا ۲؎ اور برباد ہوا جو کچھ کیا تھا یہاں اور خراب گیا جو کمایا تھا ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے بعض آیات میں توحید، رسالت، قرآن اور آخرت کے منکرین ومخالفین کو عذاب کی وعید سنائی گئی تھی، اس پر وہ کہہ سکتے تھے کہ ہم تو بڑے نیک کام کرتے ہیں، جیسے مہمانداری، غریب پروری اور صلہ رحمی وغیرہ تو اگر قیامت کوئی چیز ہے تو ہمیں تو اس دن ثواب ملنا چاہیے نہ کہ عذاب، چنانچہ اب آگے اس باطل گمان کی تردید فرماتے ہیں۔

جو شخص (اپنے اعمال خیر سے) محض حیات دنیوی (کی منفعت) اور اس کی رونق (حاصل کرنا) چاہتا ہے (جیسے شہرت، نیک نامی، جاہ، اور آخرت کا ثواب حاصل کرنے کی اس کی نیت نہ ہو) تو ہم ان لوگوں کے (ان) اعمال (کی جزا) ان کو دنیا ہی میں پورے طور سے بھگتا دیتے ہیں اور ان کے لئے دنیا میں کچھ کمی نہیں ہوتی (رہا آخرت میں، سو) یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے لئے آخرت میں بجز دوزخ کے اور کچھ (ثواب وغیرہ) نہیں اور انہوں نے جو کچھ کیا تھا وہ آخرت میں سب (کاسب) ناکارہ (ثابت) ہوگا اور (واقع میں تو) جو کچھ کر رہے ہیں وہ (اب بھی) بے اثر ہے (نیت میں فساد کی وجہ سے، اگرچہ ظاہری صورت سے کچھ اس کا اعتبار کیا جاتا ہے، مگر آخرت میں ظاہری صورت کا بھی اعتبار نہ ہوگا)۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا: اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ کفار کی نیت بجز دنیا کے کچھ نہیں ہوتی، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان میں جو ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی نیت بجز دنیا کے کچھ نہ ہو تو اس آیت میں ان کا بیان ہے، جیسا کہ بعض اوقات بعض مسلمانوں کی نیت بھی صرف دنیا ہی کے لیے ہوتی ہے، اسی لیے بعض مفسرین نے اس آیت کو عام کہا ہے، مگر اولی یہ ہے کہ اس کو کفار کے ساتھ خاص کیا جائے، کیونکہ یہاں فرمایا ہے کہ ان کے لیے جہنم کے سوا کچھ نہیں، اگرچہ تاویل کر کے عام کہہ سکتے ہیں "لیس لهم على هذه الاعمال الا النار" لیکن یہ تاویل بعید ہے، اور دوسرے مسلمانوں کے لیے معافی کا بھی احتمال ہے اور مؤمنین میں جو ریا کار ہیں ان کے لیے دیگر احادیث آئی ہیں۔

ائمہ تفسیر کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ آیتیں کفار کے حق میں آئی ہے یا مسلمانوں کے یا مسلم وکافر دونوں سے متعلق ہے؟ آیت کے آخری جملہ میں جو الفاظ آئے ہیں کہ آخرت میں ان کے لئے بجز دوزخ کے کچھ نہیں، اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کفار ہی کے متعلق ہے، کیونکہ مسلمان کتنا ہی گناہگار ہو، گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد آخر کار جنت میں جائے گا، اسی لئے ضحاک وغیرہ مفسرین نے اس کو کفار ہی کے متعلق قرار دیا ہے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ مسلمان ہیں جو اپنے نیک اعمال سے صرف دنیا کی بھلائی، راحت، دولت، عزت کے طلبگار ہیں، نیک عمل اسی نیت سے کرتے ہیں کہ دنیا میں عزت وراحت ملے، اور مذکورہ جملہ کا مطلب یہ ہے جب تک اپنے اعمال بد کی سزا نہ بھگت لیں گے اس وقت تک ان کو بجز دوزخ کے کچھ نہ ملے گا۔

اور زیادہ راجح اور واضح بات یہ ہے کہ یہ آیت ان لوگوں سے متعلق ہے جو اپنے اعمال صالح کو صرف دنیا کے فوائد دولت، عزت، صحت وغیرہ کی نیت سے کرتے ہیں، خواہ ایسا کرنے والے کافر ہوں جو آخرت کے قائل ہی نہیں، یا مسلمان ہوں جو زبان سے آخرت کے قائل ہیں مگر عمل میں اس کی فکر نہیں رکھتے، بلکہ ساری فکر دنیا ہی کے فوائد سے وابستہ رکھتے ہیں، حضرات مفسرین میں سے مجاہد، میمون بن مہران، معاویہ نے اسی کو اختیار فرمایا ہے، رسول کریم ﷺ کی مشہور حدیث انما الاعمال بالنیات سے بھی اسی معنی کی تائید ہوتی ہے کہ جو شخص اپنے عمل میں جس چیز کی نیت کرتا ہے، اس

کو وہی ملتی ہے، جو دنیا کی نیت کرتا ہے اس کو دنیا ملتی ہے، جو آخرت کی نیت کرتا ہے آخرت ملتی ہے، جو دونوں کی نیت کرتا ہے اس کو دونوں ملتی ہیں، تمام اعمال کا مدار نیت پر ہونا ایک ایسا اصول ہے جو ہر ملت و مذہب میں تسلیم کیا گیا ہے۔

**مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا:** روح المعانی میں اس طرح تفسیر کی گئی ہے کہ جو شخص اپنے دینی واخروی عمل کے ذریعے دنیا کا طلب گار ہو مثلاً شہرت، جاہ اور تعریف چاہتا ہو تو ہم انہیں ان کے اعمال کی پوری جزا دنیا میں ہی دے دیتے ہیں بشرطیکہ ہم چاہیں، میرے نزدیک اس کے عموم میں نفسانی لذتیں اور طبعی ذوق وشوق بھی داخل ہو گئے، کیونکہ یہ بھی دنیا ہی میں داخل ہیں۔

**نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا:** آیت مذکورہ میں جو یہ ارشاد ہوا ہے کہ دنیا کا ارادہ کرنے والوں کو ان کے عمل کا بدلہ دنیا ہی میں پورا دے دیا جاتا ہے، اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں کہ باوجود دنیا کا ارادہ کرنے اور کوشش کرنے کے دنیا میں بھی ان کا مطلب پورا نہیں ہوتا اور بعض دفعہ کچھ بھی نہیں ملتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیت میں اس جگہ اجمال ہے، اس کی پوری تفصیل سورۃ اسراء کی اس آیت میں ہے جس میں فرمایا: **مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ**، یعنی جو شخص دنیا ہی کا ارادہ کر رہتا ہے ہم اس کو دنیا ہی میں نقد دے دیتے ہیں مگر یہ دنیا دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہے: ① اول یہ کہ جس قدر دنیا چاہیں اتنا ہی دیتے ہیں، ان کی مانگ اور طلب کے برابر دینا ضروری نہیں ② دوسرے یہ کہ صرف اسی شخص کو دیتے ہیں جس کو دینا بتقاضائے حکمت مناسب سمجھتے ہیں، ہر ایک کو دینا ضروری نہیں۔

**وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ:** یعنی ان کے لیے دنیا میں کچھ کمی نہیں ہوتی، مطلب یہ کہ دنیا ہی میں ان کے نیک اعمال کے عوض ان کو نیک نامی، صحت وفراغ، عیش وعشرت اور کثرت مال واولاد عنایت کر دیا جاتا ہے بشرطیکہ یہ نیک اعمال دوسرے اعمال بد پر غالب ہوں، اور اگر برے اعمال غالب ہوں تو پھر یہ اثر مرتب نہیں ہوتا، پس یہ اشکال نہ رہا کہ بعض اوقات دنیا میں بھی کچھ نہیں ملتا، کیونکہ اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ نیک اعمال اور برے اعمال کی خصوصیت کے آثار مختلف ہیں، دونوں کے مجموعہ میں جو غالب ہوگا اسی کا اثر مرتب ہوگا۔

**لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ:** اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کو نیک اعمال سے آخرت میں کچھ نفع نہ ہوگا، اگر چہ ان کی نیت ثواب آخرت ہی حاصل کرنے کی ہو، کیونکہ قبول اعمال کے لیے ایمان شرط ہے اور بعض احادیث جو ابوطالب کے لیے عذاب کی تخفیف معلوم ہوتی ہے تو میرے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض لوگوں کو ابتدا ہی سے ہلکا عذاب شروع ہوگا، لیکن جس درجہ کا عذاب ہوگا پھر اس سے کم نہ ہوگا، بلکہ آیت: **زدناهم عذابا فوق العذاب** سے معلوم ہوتا ہے کہ بجائے کمی کے آئندہ زیادتی ہوتی رہے گی، لیکن جس کا عذاب شروع سے ہلکا ہوگا وہ زیادتی کے بعد بھی ان سے کم رہے گا جن کو ابتدا ہی سے سخت عذاب شروع ہوگا، اس اعتبار سے ابوطالب کا عذاب ہمیشہ سب سے کم ہی رہے گا جس کا سبب حضور ﷺ کی کرامت ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ **وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ:** یعنی ایسے واضح ثبوت کے بعد جو شخص قرآن پر ایمان نہیں لاتا، یا اس کے بتلائے ہوئے راستہ پر نہیں چلتا بلکہ دنیا کی چند روزہ زندگی اور فانی ٹیپ ٹاپ ہی کو قبلہ مقصود ٹھہرا کر عملی جدوجہد کرتا ہے، اگر بظاہر کوئی نیک کام مثلاً خیرات وغیرہ کرتا ہے تو اس سے بھی آخرت کی بہتری اور خدا کی خوشنودی مقصود نہیں ہوتی محض دنیاوی فوائد کا حاصل کر لینا پیش نظر ہوتا ہے، ایسے لوگوں کی بابت خواہ وہ یہود ونصاریٰ ہوں یا مشرکین یا منافقین یا دنیا پرست ریا کار مسلمان بتلا دیا کہ دنیا ہی میں ان کا بھگتان کر دیا جائے گا، جو اعمال اور کوششیں وہ حصول دنیا کے لیے کریں گے ان کے کم وکیف کو ملحوظ رکھتے ہوئے خدا تعالیٰ اپنے علم وحکمت سے جس قدر مناسب جانے گا اور دینا چاہے گا یہیں عطا فرما دے گا، احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو خیرات وغیرہ کے کام کرے اس کی یہ فانی اور صوری حسنات جو روح ایمان سے یکسر خالی ہیں، دنیا میں رائگاں نہیں جاتیں ان کے بدلہ میں خدا تعالیٰ تندرستی، مال، اولاد، عزت وحکومت وغیرہ دے کر سب کھاتہ بے باق کر دیتا ہے، مرنے کے بعد دوسری زندگی میں کوئی چیز اس کے کام آنے والی نہیں جس کافر کے لیے جس درجہ کی سزا تجویز ہو چکی ہے وہ کبھی اس سے ٹلنے یا کم ہونے والی نہیں: **مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ** (الاسراء:۱۸) ریاء کار اور دنیا پرست عالم، متصدق اور مجاہد کے حق میں جو وعید آئی ہے، اس کا حاصل بھی یہ

ہی ہے کہ ان سے محشر میں کہا جائے گا کہ جس غرض کے لیے تو نے علم سکھلایا، صدقہ و جہاد کیا وہ دنیا میں حاصل ہو چکی اب ہمارے پاس تیرے لیے کچھ نہیں، فرشتوں کو حکم ہوگا کہ اسے جہنم میں لے جاؤ (اعاذنا اللہ منہا)

**فائدہ:** ۲۔ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ: یعنی ان اعمال پر دوزخ کے سوا اور کسی چیز کے مستحق نہیں کفار ابدی طور پر ریاء کار مسلمان محدود مدت کے لیے، ہاں خدا تعالیٰ بعض مومنین کو محض اپنے فضل و کرم سے معاف فرمادے، وہ الگ بات ہے۔

**فائدہ:** ۳۔ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: یعنی دنیا میں جو کام دنیاوی اغراض کے لیے کیے تھے، آخرت میں پہنچ کر ظاہر ہوگا کہ وہ سب برباد ہوئے اور ریاء کاری یا دنیا پرستی کے سلسلہ میں بظاہر جو نیکیاں کمائی تھیں سب یونہی خراب گئیں یہاں کوئی کام نہ آئیں۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى

بھلا ایک شخص جو ہے صاف راستہ پر اپنے رب کے اور اسکے ساتھ ساتھ ہے ایک گواہ اللہ کی طرف سے اور اس سے پہلے گواہ تھی موسیٰ کی کتاب

اِمَامًا وَّرَحْمَةً ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ

راستہ بتلاتی اور بخشواتی (اوروں کی برابر ہے) ۱۔ یہی لوگ مانتے ہیں قرآن کو، اور جو کوئی منکر ہو اس سے سب فرقوں میں سے سو دوزخ ہے ٹھکانا اسکا ۲۔

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۷﴾

سو تو مت رہ شبہ میں اس سے، بیشک وہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے اور پر بہت سے لوگ یقین نہیں کرتے ۳۔

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے کفار کا قرآن کریم کو جھٹلانا مذکور تھا، اب مسلمانوں کا اس کی تصدیق کرنا حقانیت کی دلیل کے ساتھ بیان کی جاتا ہے، اور مؤمنین کے مقابلہ میں منکرین کی وعید کا بھی ذکر فرما دیا گیا۔

کیا منکر قرآن ایسے شخص کی برابری کر سکتا ہے جو قرآن پر قائم ہو جو کہ اس کے رب کی طرف سے آیا ہے اور اس (قرآن) کے ساتھ ایک گواہ تو اسی میں موجود ہے (یعنی اس کا معجز ہونا جو کہ دلیل عقلی ہے) اور (ایک) اس سے پہلے (یعنی) موسیٰ (علیہ السلام) کی کتاب (یعنی توریت اس کے ساتھ شہادت کے لئے موجود) ہے جو کہ (احکام بتلانے کے اعتبار سے) امام ہے اور (احکام پر جو ثمرہ و ثواب ملے گا اس کے اعتبار سے وہ کتاب سبب) رحمت ہے (یہ دلیل نقلی ہے، غرض قرآن کے صدق و صحت پر عقلی اور نقلی دونوں دلیلیں موجود ہیں، پس ان ہی دلائل کے سبب سے) ایسے لوگ (جن کا ذکر ہوا کہ وہ صاحب بینہ ہیں) اس قرآن پر ایمان رکھتے ہیں اور (کافر کا یہ حال ہے کہ) جو شخص دوسرے فرقوں میں سے اس قرآن کا انکار کرے گا تو دوزخ اس کے وعدہ کی جگہ ہے (پھر قرآن کا ماننے والا اور نہ ماننے والا برابر کب ہو سکتا ہے) سو (اے مخاطب!) تم قرآن کی طرف سے شک میں مت پڑنا، بلا شک و شبہ وہ سچی کتاب ہے تمہارے رب کے پاس سے (آئی ہے) لیکن (ان دلائل کے باوجود غضب ہے کہ) بہت سے آدمی ایمان نہیں لاتے۔

* * *

**فائدہ:** ۱۔ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً: یعنی یہ شخص اور وہ ریاء کار دنیا پرست جن کا ذکر پہلے ہوا کیا برابر ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں، بَيِّنَة (صاف راستہ) سے مراد وہ راستہ ہے جس پر انسان اپنی اصلی اور صحیح فطرت کے موافق چلنا چاہتا ہے، بشرطیکہ گرد و پیش کے حالات و خیالات سے متاثر نہ ہو، اور وہ توحید، اسلام اور قرآن کا راستہ ہے: فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (الروم: ۳۰) وفی حدیث: كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْ يُنَصِّرَانِهٖ اَوْ يُمَجِّسَانِهٖ الخ اور شَاهِدٌ مِّنْهُ (گواہ اللہ کی طرف سے) قرآن عظیم ہے جو گواہی دیتا ہے کہ ''دین فطرت'' (توحید و اسلام) پر چلنے والا بیشک ٹھیک

راستہ پر چل رہا ہے اور وہ قرآن اپنی حقانیت کا بھی خود گواہ ہے آفتاب آمد دلیل آفتاب، چونکہ قرآن کے لانے والے جبرائیل امین اور لینے والے محمد ﷺ ہیں، اس اعتبار سے ان کو بھی شاہد کہہ سکتے ہیں، بلکہ حضور ﷺ کی شان تو یہ ہے کہ آپ کے اخلاق و عادات، معجزات، زبان مبارک، چہرہ نورانی، ہر چیز سے شہادت ملتی ہے کہ جس دین کے آپ حامل ہیں وہ بالکل سچا دین ہے، آگے: وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً کا مطلب یہ ہے کہ قرآن سے پہلے جو وحی کسی نبی پر نازل کی گئی وہ بھی دین فطرت کی صداقت پر گواہ تھی، خصوصا موسیٰ علیہ السلام پر جو عظیم الشان کتاب (تورات) اتاری گئی قرآن سے پیشتر اسے ایک بڑا بھاری شاہد ان لوگوں کی حقانیت کا کہنا چاہیے جو دین فطرت کے صاف راستہ پر چلتے ہیں۔

**فائدہ:** ۲ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ: یعنی یہود، نصاریٰ، بت پرست، مجوس، عرب، عجم، یورپ ایشیا کسی فرقہ جماعت اور ملک وملت سے تعلق رکھتا ہو جب تک قرآن کو نہ مانے گا نجات نہیں ہو سکتی، جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ کی بعض احادیث میں آپ نے بہت تصریح و تعمیم کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

**فائدہ:** ۳ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ: یہ خطاب ہر شخص کو ہے جو قرآن سنے یا حضور ﷺ کو مخاطب بنا کر دوسروں کو سنانا مقصود ہے کہ قرآن کی صداقت اور "من اللہ" ہونے میں قطعا شک وشبہ کی گنجائش نہیں، جو لوگ نہیں مانتے وہ احمق ہیں یا معاند۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ؕ اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جو باندھے اللہ پر جھوٹ ۱ وہ لوگ رو برو آئیں گے اپنے رب کے اور کہیں گے گواہی دینے والے

هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۸﴾ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ

یہی ہیں جنہوں نے جھوٹ کہا تھا اپنے رب پر ۲ سن لو پھٹکار ہے اللہ کی ناانصاف لوگوں پر، جو کہ روکتے ہیں

سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۹﴾

اللہ کی راہ سے اور ڈھونڈھتے ہیں اس میں کجی، اور وہی ہیں آخرت سے منکر ۳

**خلاصہ تفسیر:** گذشتہ آیت میں ماننے اور نہ ماننے والوں کی حالت کا برابر نہ ہونا ایک مثال کے ساتھ بیان کیا گیا، اب آگے ان دونوں کا جزا میں برابر نہ ہونا ایک مثال کے ساتھ بیان فرماتے ہیں۔

اور ایسے شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے (کہ اس کی توحید، اس کے رسول کی رسالت اور اس کے کلام اللہ ہونے کا انکار کرے) ایسے لوگ (قیامت کے روز) اپنے رب کے سامنے (مجرم اور مفتری ہونے کی حیثیت سے) پیش کئے جائیں گے اور (اعمال کے) گواہ فرشتے (علی الاعلان) یوں کہیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے اپنے رب کی نسبت جھوٹی باتیں لگائی تھیں، سب سن لو کہ ایسے ظالموں پر خدا کی (زیادہ) لعنت ہے جو کہ (اپنے کفر وظلم کے ساتھ) دوسروں کو بھی خدا کی راہ (یعنی دین) سے روکتے تھے، اور اس (راہ دین) میں کجی (اور شبہات) نکالنے کی تلاش (اور فکر) میں رہا کرتے تھے (تاکہ دوسروں کو گمراہ کریں) اور آخرت کے بھی منکر تھے (یہ فرشتوں کے اعلان کا مضمون تھا)۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا: اسی کی نظیر وہ شخص ہے جو اپنی وضع قطع اور دعویٰ سے ولایت ظاہر کرتا ہو اور اولیاء اللہ کے جیسے کلمات سے گفتگو کرتا ہو مگر باطن میں فاسق اور جاہل ہو۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی قرآن جھوٹ اور افتراء نہیں، خدا کا سچا پیغام ہے جس کو قبول کرنا ضروری ہے خوب سمجھ لو کہ اس شخص سے زیادہ ظالم کوئی نہیں ہو سکتا جو خدا پر جھوٹ باندھے، مثلا اس کا کلام نہ ہو اور کہہ دے کہ اس کا کلام ہے یا واقعی اس کا ہو اور خدا بار بار فرمائے کہ میرا کلام ہے مگر باوجود روشن

دلائل کے جھٹلاتا رہے اور کہتا ہے کہ اس کا نہیں۔

**فائدہ:** ۲ یعنی محشر میں جب خدا کے سامنے علیٰ رؤس الاشہاد پیش ہوں گے اور ان کی شرارتوں کے دفتر کھولے جائیں گے اس وقت گواہی دینے والے (ملائکہ، انبیاء، صالحین بلکہ خود ان کے ہاتھ پاؤں) کہیں گے کہ یہ ہی وہ بدبخت ظالم ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی نسبت جھوٹ بکا تھا۔

**فائدہ:** ۳ یہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے یعنی جو لوگ ظلم و ناانصافی سے خدا کے کلام کو جھوٹا بتلاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر آخرت کے منکر ہیں دوسروں کو خدا کی راہ پر چلنے سے روکتے ہیں اور اس تلاش میں رہتے ہیں کہ سیدھے کو ٹیڑھا ثابت کریں، ایسے ظالموں پر خدا کی خصوصی لعنت ہے۔

أُولَٰئِكَ لَمْ يَكُونُوا مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ۘ

وہ لوگ نہیں تھکانے والے زمین میں بھاگ کر اور نہیں ان کے واسطے اللہ کے سوا کوئی حمایتی ۱

يُضَاعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ۚ مَا كَانُوا يَسْتَطِيعُونَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوا يُبْصِرُونَ ﴿٢٠﴾

دونا ہے ان کے لیے عذاب ۲ نہ طاقت رکھتے تھے سننے کی اور نہ دیکھتے تھے ۳

**خلاصہ تفسیر:** (آگے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ) یہ لوگ (تمام) زمین (کے تختہ) پر (بھی) خدا تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے تھے (کہ کہیں جا چھپتے اور خدا تعالیٰ کے ہاتھ نہ آتے) اور نہ ان کا خدا کے سوا کوئی مددگار ہوا (کہ گرفتاری کے بعد چھڑا لیتا) ایسوں کو (اوروں سے) دونی سزا ہوگی (ایک اپنے کافر ہونے کی اور ایک دوسروں کو کافر بنانے کی کوشش کرنے کی) یہ لوگ (مارے نفرت کے احکام الٰہی کو) سن نہ سکتے تھے اور نہ (انتہائی عناد کی وجہ سے راہ حق کو) دیکھتے تھے۔

**يُضَاعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ:** یہ سزا دوسروں کے اعتبار سے دگنی ہوگی، خود ان کے عمل سے زیادہ سزا نہ ہوگی، چنانچہ خلاصہ تفسیر میں ''اوروں سے'' کی قید بڑھا کر اس بات کو ظاہر کر دیا گیا، پس اب یہ اشکال نہ رہا کہ قرآن میں تو من جاء بالسیئۃ فلا یجزی الا مثلھا میں گناہوں کی سزا کا عمل کے برابر ہونا بتلایا گیا ہے اور یہاں اس آیت میں دگنی سزا معلوم ہوتی ہے، جواب ظاہر ہے کہ سزا عمل ہی کے برابر ہوگی مگر اوروں سے زیادہ ہوگی، کیونکہ ان کے گناہ بھی دوسروں کے گناہ سے زیادہ ہوں گے کہ دوسروں کو بھی دین حق سے روکتے تھے۔

اور اگر پچھلی آیت میں **یصدّون** کے معنی روکنے کے نہ ہوں بلکہ اعراض کے معنی لیے جائیں جس میں دوسروں کو گمراہ کرنا مفہوم نہیں تو اس صورت میں دگنی سزا کی یہ وجہ تو نہ ہوگی کہ گناہ کئی ہوئے، بلکہ یہ وجہ ہوگی کہ حق سے بے رخی کرنا خود ایسا سخت گناہ ہے جو سخت عذاب ہی کا تقاضہ کرتا ہے، جب بھی سزا عمل کے برابر ہی ہوگی، خوب سمجھ لو۔

* * *

**فائدہ:** ۱ **وَمَا كَانَ لَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ:** یعنی اتنی وسیع زمین میں نہ کہیں بھاگ کر خدا سے چھپ سکتے ہیں اور نہ کوئی مددگار اور حمایتی مل سکتا ہے جو خدا کے عذاب سے بچاوے۔

**فائدہ:** ۲ **يُضَاعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ:** کیونکہ خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کو گمراہ کیا۔

**فائدہ:** ۳ **وَمَا كَانُوا يُبْصِرُونَ:** یعنی دنیا میں ایسے اندھے بہرے بنے کہ نہ حق بات سننے کی تاب تھی نہ خدا کے نشانوں کو دیکھتے تھے جنہیں دیکھ کر ممکن تھا راہ ہدایت پا لیتے، حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ: ''اللہ پر جھوٹ بولا ہے اصل اور غلط باتیں اس کی طرف منسوب کیں، کہاں سے لائے؟ غیب سے سن نہ آتے تھے غیب کو دیکھتے نہ تھے پھر ان کا ماخذ کیا ہے''۔

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۱﴾ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ

وہی ہیں جو کھو بیٹھے اپنی جان اور گم ہوگیا ان سے جو جھوٹ باندھا تھا ۱ اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ آخرت میں

هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴿۲۲﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِكَ

یہی ہیں سب سے زیادہ نقصان میں، البتہ جو لوگ ایمان لائے اور کام کیے نیک اور عاجزی کی اپنے رب کے سامنے، وہ ہیں

اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۳﴾

جنت کے رہنے والے، وہ اسی میں رہا کریں گے ۲

**خلاصہ تفسیر:** یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو برباد کر بیٹھے اور جو معبود انہوں نے تراش رکھے تھے (آج) ان سے سب غائب (اور گم) ہو گئے (کوئی بھی تو کام نہ آیا، پس) لازمی بات ہے کہ آخرت میں سب سے زیادہ خسارہ میں یہی لوگ ہوں گے (یہ تو کافروں کا انجام ہوگا، آگے مسلمانوں کا انجام مذکور ہے کہ) بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے اچھے کام کئے اور (دل سے) اپنے رب کی طرف جھکے (یعنی اپنے دل میں انقیاد اور خشوع پیدا کیا) ایسے لوگ اہل جنت ہیں (اور) وہ اس میں ہمیشہ رہا کریں گے (یہ دونوں کے انجام کا فرق بیان ہو گیا)۔

**اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ:** اس میں تمام عقائد واعمال اور کیفیات نفسانیہ کی طرف اشارہ ہو گیا کہ وہ سب میں خدا تعالیٰ کے تابع دار ہیں۔

آیت میں اہل جنت کے اوصاف کی یہ ترتیب بیان کی گئی ہے: ① الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا پہلا درجہ ایمان (تصحیح عقائد) کا ② وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ دوسرا درجہ عمل صالح (اصلاح اعمال) کا ③ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ تیسرا درجہ تزکیہ نفس (اخلاق کاملہ) کا، تصوف کی یہی حقیقت ہے اور صوفیا کاملین کی بنیادی تعلیمات بھی یہی ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ جان کا کھو بیٹھنا، یہ ہی کہ ابدی عذاب میں گرفتار ہوئے اور سب جھوٹے دعوے وہاں پہنچ کر گم ہو گئے۔

**فائدہ:** ۲ منکرین کی بدانجامی کے بالمقابل مومنین کا انجام نیک بیان فرمایا، ان کی عاجزی خدا کو پسند آئی اس لیے اپنی دائمی خوشنودی کا مقام عطا فرمایا۔

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ۭ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾ ع

مثال ان دونوں فرقوں کی جیسے ایک تو اندھا اور بہرا اور دوسرا دیکھتا اور سنتا، کیا برابر ہے دونوں کا حال، پھر کیا تم غور نہیں کرتے

**خلاصہ تفسیر:** اب دونوں کی حالت کا فرق بتلاتے ہیں جس کی وجہ سے انجام کا فرق مرتب ہوتا ہے پس ارشاد ہے کہ:

دونوں فریق (مذکورہ یعنی مومن و کافر) کی حالت ایسی ہے جیسے ایک شخص ہو اندھا بھی اور بہرا بھی (جو نہ عبارت کو سنے، نہ اشارہ کو دیکھے تو اس کے سمجھنے کی عادۃً کوئی صورت ہی نہیں) اور ایک شخص ہو جو دیکھتا بھی ہو اور سنتا بھی ہو (اس کو سمجھنا بہت آسان ہو) کیا یہ دونوں شخص حالت میں برابر ہیں (ہرگز نہیں، یہی حالت کافر اور مسلمان کی ہے کہ کافر ہدایت سے بہت دور اور مسلمان ہدایت کے ساتھ موصوف ہے) کیا تم (اس فرق کو) سمجھتے نہیں (اس میں شبہ اور تردد کی گنجائش ہی نہیں ان دونوں میں فرق بدیہی ہے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی منکرین تو اندھے بہرے ہیں جیسا کہ دو تین آیت پہلے فرمایا تھا: مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ (ہود:۲۰) پھر جسے نہ خود نظر آئے نہ دوسرے کی سن سکے، اس کا آغاز وانجام کیسے ان روشن ضمیر ایمانداروں کے برابر ہوسکتا ہے جو بصیرت کی آنکھوں سے حق و باطل اور بھلے برے میں تمیز کرتے اور اپنے ہادیوں کی باتیں بگوش ہوش سنتے ہیں، غور کرو کہ دونوں کا انجام یکساں کس طرح ہوسکتا ہے؟ آگے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا قصہ اسی مضمون کی تائید میں پیش کرتے ہیں:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ ۡ اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۲۵

اور ہم نے بھیجا نوح کو اس کی قوم کی طرف، کہ میں تم کو ڈر کی بات سناتا ہوں کھول کر [1]

اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ۲۶

کہ نہ پرستش کرو اللہ کے سوا [2] میں ڈرتا ہوں تم پر دردناک دن کے عذاب سے [3]

**خلاصہ تفسیر:** یہاں تک توحید، رسالت، آخرت، عذاب، ایمان والوں کی کامیابی اور کفار کی ناکامی وغیرہ سے متعلق جو مضامین ذکر ہوئے اب ان سب کی تائید کے لیے آگے چند قصے بیان کیے جاتے ہیں۔

اور ہم نے نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کے پاس رسول بنا کر (یہ پیغام دے کر) بھیجا کہ تم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت مت کرو (اور جو بت تم نے قرار دے رکھے ہیں، وَدّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کو چھوڑ دو، چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے جا کر ان سے فرمایا کہ) میں تم کو (غیر اللہ کی عبادت کی صورت میں) صاف صاف ڈراتا ہوں (اور اس ڈرانے کی تفصیل یہ ہے کہ) میں تمہارے حق میں ایک بڑے تکلیف دینے والے دن کے عذاب کا اندیشہ کرتا ہوں۔

* * *

**فائدہ:** [1] یعنی نہایت وضاحت کے ساتھ وہ چیزیں بتلاتا ہوں جن کے ارتکاب پر مہلک عذاب نازل ہونے کا اندیشہ ہے، یا جو اس عذاب سے محفوظ رہنے کے ذرائع ہیں۔

**فائدہ:** [2] یعنی وَدّ، سواع، یغوث، یعوق، نسر کی جن کا ذکر سورہ نوح میں آئے گا۔

**فائدہ:** [3] یعنی غیر اللہ کی پرستش سے باز نہ آنے کی صورت میں سخت عذاب آنے کا ڈر ہے، ''دردناک دن'' سے وہ دن مراد ہے جس میں المناک اور دردانگیز حوادث کا وقوع ہو، مثلاً قیامت کا دن یا وہ دن جس میں قوم نوح غرق کی گئی۔

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا

پھر بولے سردار جو کافر تھے اس کی قوم کے ہم کو تو نظر نہیں آتا مگر ایک آدمی ہم جیسا اور دیکھتے نہیں کوئی تابع ہوا ہو تیرا مگر

الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِىَ الرَّاْىِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۢ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ۲۷

جو ہم میں نیچ قوم ہیں بلا تأمل، اور ہم نہیں دیکھتے تم کو اوپر اپنے کچھ بڑائی بلکہ ہم کو تو خیال ہے کہ تم سب جھوٹے ہو

**خلاصہ تفسیر:** سو ان کی قوم میں جو کافر سردار تھے وہ (جواب میں) کہنے لگے کہ (تم جو نبوت کا دعوی کرتے ہو جیسا کہ اپنے آپ کو نذیر مبین بتلاتے ہو تو یہ بات ہمارے جی کو نہیں لگتی، کیونکہ) ہم تو تم کو اپنے ہی جیسا آدمی دیکھتے ہیں (اور بشر کا نبی ہونا دور از کار ہے) اور اگر (کچھ لوگوں کے اتباع کرنے سے استدلال کیا جائے تو وہ قابل استدلال نہیں، کیونکہ) ہم دیکھتے ہیں کہ تمہارا اتباع انہیں لوگوں نے کیا ہے جو ہم میں

بالکل رذیل ہیں (جن کی عقل اکثر کم ہوتی ہے، پھر) وہ (اتباع) بھی محض سرسری رائے سے (ہے، یعنی اول تو ان کی عقل ہی صائب نہیں، غور کے بعد بھی غلطی کرتے ہیں، دوسرے پھر غور بھی نہیں کیا، اس لئے ایسے لوگوں کا تمہیں نبی سمجھ لینا یہ کوئی حجت نہیں، بلکہ اس کے برعکس ہمارے اتباع سے مانع ہے، کیوں کہ شرفاء کو رذیلوں کی موافقت سے عار آتی ہے، نیز اکثر ایسے کم حوصلہ لوگوں کی اغراض بھی حصول مال یا اس کی توقع ہوا کرتی ہے، سو یہ لوگ بھی دل سے ایمان نہیں لائے) اور (اگر یہ کہا جائے کہ باوجود رذیل ہونے کے ان لوگوں کو کسی خاص وجہ سے ہم پر فضیلت ہے جس کے اعتبار سے ان کی رائے آپ کی اتباع میں صائب ہے تو وہ بات بتلاؤ، سو) ہم تم لوگوں میں (یعنی تم میں اور مسلمانوں میں) کوئی بات اپنے سے بھی زیادہ نہیں پاتے (اس لئے ہم مسلمانوں کی رائے کو صحیح نہیں سمجھتے) بلکہ ہم تم کو (بالکل) جھوٹا سمجھتے ہیں۔

**وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا**: اس میں ان لوگوں پر رد ہے جو ولایت کے حصول کے لیے کسی عرفی شرافت اور وجاہت کا ہونا ضروری سمجھتے ہیں، چنانچہ ولایت کے لیے کسی عرفی شرافت کا ہونا ضروری نہیں، البتہ نبوت کا تاج اللہ تعالی نے ان اصحاب کو پہنایا جو اپنے زمانے میں خاندانی شرافت و بزرگی کے حامل تھے، چونکہ اس میں وہ مصلحتیں ہیں جو نبوت سے مقصود ہیں کہ ہر قسم کے لوگ ان کی اتباع کریں، اور شرفاء کی اتباع سے شرفاء کو عار نہیں آتی۔

* * *

**فائدہ**: یعنی رسول کو تمام قوم کے مقابلہ میں کوئی نمایاں امتیاز ہونا چاہیے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ تم ہماری طرح جنس بشر سے ہیں، آسمان کے فرشتے نہیں، جس کے سامنے خواہ مخواہ انسانوں کی گردنیں جھک جائیں پھر بشر بھی ایسے نہیں جسے کوئی خاص تفوق اور بڑائی ہم پر حاصل ہوتی مثلا بڑے دولت مند یا جاہ و حکمت کے مالک ہوتے، جو لوگ تمہارے پیرو ہوئے وہ بھی ماشاء اللہ سب کے سب مفلس، رذیل، پست اور ادنیٰ طبقہ کے لوگ ہیں جن کے ساتھ بیٹھنا بھی ہم جیسے شریفوں کے لیے ننگ و عار کا موجب ہے تو کیا ساری خدائی میں سے تم ہی ملے تھے جنہیں خدا نے اپنے منصب کی سفارت پر مامور فرمایا، آخر ہم تم سے حسب نسب، مال و دولت، خَلق وخُلق کس بات سے کم تھے؟ جو ہمارا انتخاب اس عہدہ کے لیے نہ ہو گیا، کم از کم آپ کا اتباع کرنے والے ہی کوئی معزز اور بڑے آدمی ہوتے، بھلا ان موچیوں اور حجاموں کا تابع ہو جانا آپ کے لیے کیا موجب فضل و شرف ہو سکتا ہے؟ اور کس طرح صداقت کی دلیل بن سکتی ہے؟ ایسے سطحی لوگوں کا جن کی پستی اور رذالت بالکل عیاں ہے بے سوچے سمجھے اور بدون غور و تامل کے ظاہری اور سرسری طور پر ایمان لے آنا آپ کا کونسا کمال ہے؟ بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ تم اور تمہارے ساتھی سب جھوٹے ہو، تم نے ایک بات بنائی اور چند بیوقوفوں نے ہاں میں ہاں ملا دی تا کہ اس طرح ایک نئی تحریک اٹھا کر کوئی امتیاز اور بزرگی حاصل کرلیں، یہ ان ملعونوں کی تقریر کا ماحصل تھا، نوح علیہ السلام نے جو جواب دیا آگے آتا ہے:

قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَاٰتٰىنِیْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّیَتْ عَلَیْكُمْ ؕ

بولا اے قوم دیکھو تو اگر میں ہوں صاف راستہ پر اپنے رب کے اور اس نے بھیجی مجھ پر رحمت اپنے پاس سے پھر اس کو تمہاری آنکھ سے مخفی رکھا

اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ﴿۲۸﴾

تو کیا ہم تم کو مجبور کر سکتے ہیں اس پر اور تم اس سے بیزار ہو

**خلاصہ تفسیر**: نوح (علیہ السلام) نے فرمایا کہ اے میری قوم! (تم جو کہتے ہو کہ نبوت تمہارے جی کو نہیں لگتی تو) بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر میں اپنے رب کی جانب سے دلیل پر (قائم) ہوں (جس سے میری نبوت ثابت ہوتی ہو) اور اس نے مجھ کو اپنے پاس سے رحمت (یعنی نبوت) عطا فرمائی ہو، پھر وہ (نبوت یا اس کی حجت) تم کو نہ سوجھتی ہو تو (میں کیا کروں مجبور ہوں) کیا ہم اس (دعویٰ یا دلیل) کو تمہارے سر منڈھ دیں اور تم اس سے نفرت کئے چلے جاؤ۔

**اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ:** مطلب یہ ہے کہ تمہارا یہ کہنا کہ نبوت ہمارے جی کو نہیں لگتی، اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نبوت اور بشریت کا جمع ہونا محال سمجھتے ہو کہ بشر رسول نہیں ہوسکتا اور اس کی تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں، اور میرے پاس دونوں کے جمع ہونے پر دلیل موجود ہے یعنی معجزہ، رہا مسلمانوں کا اتباع میں اس کو حجت قرار نہیں دیتا، میری نبوت کے لیے معجزہ کافی دلیل ہے، لیکن معجزہ اور دلیل سے نتیجہ پر پہنچ جانا غور فکر اور تامل پر موقوف ہے جو تم کرتے نہیں، تو یہ میرے بس سے باہر ہے، اس تقریر سے کفار کی اس بات کا بھی جواب ہو گیا کہ رذیل مسلمانوں کا اتباع حجت نہیں۔

کفار نے مسلمانوں کو رذیل اس لیے کہا کہ وہ اکثر غریب لوگ تھے اور پیشے بھی ایسے ہی کرتے تھے جو عرف میں حقیر سمجھے جاتے ہیں اور کفار نے جو ان کی رائے کو کمزور کہا اور ان کی فضیلت کا انکار کیا تو چونکہ نبوت کا ثابت ہونا اس کے جواب پر موقوف نہ تھا اس لیے یہاں ایسی باتوں کے جواب سے تعرض نہیں کیا گیا، نیز اس کا جواب بدیہی بھی ہے، وہ یہ کہ حق بات قبول کرنے کے بارے میں کفار کا خاص یہ دعویٰ مشاہدہ سے باطل ہے، ایسے لوگ حق کو بہت جلدی قبول کرتے ہیں، چنانچہ حدیث میں بھی یہ مضمون آیا ہے، کیونکہ غریبوں میں تکبر وغیرہ جو حق سے مانع ہیں نہیں ہوتے پھر اس سے بڑھ کر سلامت رائے اور فضیلت کیا ہوگی۔

**اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ:** روح المعانی میں ہے کہ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ منکر اور ہٹ دھرم جب تک انکار پر قائم رہیں تو انہیں اہل اللہ سے فائدہ نہیں ہوسکتا۔

* * *

**فائدہ:** یعنی یہ صحیح ہے کہ پیغمبر کو عام انسانوں سے بالکل ممتاز ہونا چاہیے لیکن وہ امتیاز مال و دولت ملک وحکومت اور دنیا کی ٹیپ ٹاپ میں نہیں، بلکہ اعلیٰ اخلاق، بہترین ملکات، تقویٰ، خدا ترسی، حق پرستی، دردمندی، خلائق اور ان صریح آیات ونشانات پیش کرنے سے ان کو امتیاز حاصل ہوتا ہے جو حق تعالیٰ بطور اتمام حجت و اکمال نعمت ان کے اندر قائم کرتا یا ان کے ذریعہ سے ظاہر فرماتا ہے، وہ وحی الٰہی اور ربانی دلائل و براہین کی روشنی میں صاف راستہ پر چلتے ہیں اور دن رات خدا کی خصوصی رحمتیں ان پر بارش کی طرح برستی ہیں، نوح علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر یہ سب چیزیں مجھ میں کھلے طور پر موجود ہوں اور یقینا موجود ہیں، لیکن جس طرح اندھے کو سورج کی روشنی نظر نہیں آتی، تمہاری آنکھیں بھی اس نور الٰہی کے دیکھنے سے قاصر رہیں، تو کیا ہم زبردستی مجبور کر کے تم سے اس نور اور رحمت کا اقرار کرا سکتے ہیں جس سے تم اس قدر نفور و بیزار ہو کہ آنکھ کھول کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے، خلاصہ یہ ہوا کہ میری بزرگی و برتری جو تم کو نظر نہیں آتی، یہ اس لیے ہے کہ تمہارے دل کی آنکھیں اندھی ہیں یا بند ہیں۔

وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ

اور اے میری قوم نہیں مانگتا میں تم سے اس پر کچھ مال، میری مزدوری نہیں مگر اللہ پر اور میں نہیں ہانکنے والا ایمان والوں کو

اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْـهَلُوْنَ ۝۲۹

ان کو ملنا ہے اپنے رب سے [1] لیکن میں دیکھتا ہوں تم لوگ جاہل ہو [2]

**خلاصہ تفسیر:** اور (اتنی بات اور زائد فرمائی کہ) اے میری قوم! (یہ تو سوچو کہ اگر میں نبوت کا غلط دعویٰ کرتا تو آخر اس میں میرا کچھ مطلب تو ہوتا مثلاً یہی کہ اس کے ذریعہ سے خوب مال کماؤں گا سو تم کو معلوم ہے کہ) میں تم سے اس (تبلیغ) پر کچھ مال نہیں مانگتا، میرا معاوضہ تو صرف اللہ کے ذمہ ہے (اسی سے آخرت میں اس کا طالب ہوں اسی طرح اور اغراض بھی اگر غور کرو تو ہرگز نہ پاؤ گے، جب کوئی غرض نہیں پھر مجھے جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ تھا! خلاصہ یہ ہے کہ مجھے جھوٹے دعویٰ کی کوئی ضرورت نہیں، اور سچے دعویٰ پر دلیل قائم ہے، پھر نبوت میں کیا شبہ ہوسکتا ہے) اور (تم جو رذیلوں کی اتباع کو اپنے اتباع کے لیے مانع سمجھتے ہو اور صراحۃً یا دلالۃً یہ چاہتے ہو کہ میں ان کو اپنے پاس سے نکال دوں سو) میں تو ان ایمان والوں کو

نکالتا نہیں ( کیونکہ ) یہ لوگ اپنے رب کے پاس ( عزت ومقبولیت کے ساتھ ) جانے والے ہیں ( اور بھلا کوئی شخص مقربان شاہی کو نکالا کرتا ہے، اس سے ان لوگوں کی اس بات کا بھی جواب ہوگیا کہ یہ غریب دل سے ایمان نہیں لائے ) لیکن واقعی میں تم لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ ( خواہ مخواہ کی ) جہالت کر رہے ہو ( اور بے ڈھنگی باتیں کررہے ہو ) ۔

**وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْــَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا**: یہاں بطور خاص مال کو اس لیے ذکر کیا گیا کیونکہ اکثر جھوٹے مدعیوں کا مقصود مال ہی ہوتا ہے، اور جاہ بھی اگر مطلوب ہوتی ہے تو اکثر مال ہی کی غرض سے ہوتی ہے جیسا کہ مشاہدہ ہے۔

**وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْــَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا**: مشائخ کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے، کیونکہ مال کی طلب لوگوں کے لیے رشد ہدایت حاصل کرنے میں قوی مانع ہے، میری رائے میں تو مصارف خیر کے لیے بھی نامناسب ہے، عقول ضعیف ہیں اور بخل وحرص غالب ہے، حب دنیا کے ادنی شبہ سے بھی لوگ شک میں پڑ جاتے ہیں اور امور خیر کا اللہ تعالی کفیل ہے وہ ہمارے مانگنے پر موقوف نہیں۔

* * *

**فائدہ**: ۱۔ یعنی میں تبلیغ کے کام کی کوئی تنخواہ تم سے نہیں مانگتا، جو مالی خودغرضی کا شبہ ہو، میں اپنے پروردگار کا نوکر ہوں اسی کے یہاں سے مزدوری ملے گی بحمد اللہ نہ مجھے تمہارے مال کی طلب ہے نہ ضرورت، پھر غریبوں کو چھوڑ کر مالداروں کی طرف کیوں جھکوں، اگر تم میرے اتباع کو محض ان کی افلاس یا پیشہ کی وجہ سے حقیر وذلیل سمجھتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ میں وہ نہیں جو دولت ایمان کے سرمایہ داروں کو ظاہری خستہ حالی کی بناء پر جانوروں کی طرح دھکے دے کر نکال دوں انھیں ایک روز اپنے پروردگار سے ملنا ہے، وہ میری شکایت اس کے دربار میں کریں گے کہ آپ کے پیغمبر نے متکبر دنیاداروں کی خاطر ہم غریب وفاداروں کو نکال دیا تھا، میں ظاہر حال کے خلاف یہ کیونکر سمجھ لوں کہ ان کا ایمان محض ظاہری اور سرسری ہے، دلوں کو چیر کر دیکھنا میرا کام نہیں، یہ پروردگار کے یہاں پتہ چلے گا کہ ان کے دلوں کی کیا حالت تھی۔

**فائدہ**: ۲۔ یعنی جہل وحماقت سے انجام پر نظر نہیں کرتے، صرف ان کی ظاہری شکستگی دیکھ کر حقیر سمجھتے ہو، اور ایسی مہمل درخواست کرتے ہو کہ ان کو ہٹا دیا جائے تو ہم تمہارے پاس آئیں، کیا غربت اور کسب حلال کوئی عیب ہے؟ یہ ہی چیز تو ہے جو حق کے قبول کرنے میں مزاحم نہیں ہوتی، عموما دولت وجاہ کا نشہ انسان کو قبول حق سے محروم رکھتا ہے اسی لیے ہرقل کی حدیث میں آیا کہ انبیاء کے متبعین ضعفاء ہوتے ہیں بہرحال تم نہیں جانتے کہ سب کو خدا کے پاس جمع ہونا ہے، وہاں پہنچ کر ظاہر ہوگا کہ اپنے کو ان سے بہتر سمجھنا تمہارا جاہلانہ غرور تھا۔

## وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ۝۳۰

اور اے قوم کون چھڑائے مجھ کو اللہ سے اگر ان کو ہانک دوں، کیا تم دھیان نہیں کرتے

**خلاصہ تفسیر**: اور ( بالفرض والتقدیر ) اگر میں ان کو نکال بھی دوں تو ( یہ بتلاؤ کہ ) مجھ کو خدا کی گرفت سے کون بچائے گا ( کیا تم میں اتنی ہمت ہے جو ایسے بیہودہ مشورے دے رہے ہو ) کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے۔

**وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ**: صوفیہ عارفین نے کہا ہے کہ مسکینوں اور کم حیثیت والوں کو اپنی مجلس اور خصوصی التفات وتوجہ سے دور نہ کرنا انبیاء کی سنت ہے، اسی طرح جو شخص اللہ تعالی کی طرف متوجہ ہو اس سے اعراض نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اس کی جانب اللہ کی بھی توجہ ہے تو اس سے اعراض کرنا گویا حق تعالی سے اعراض کرنا ہے۔

* * *

**فائدہ**: یعنی میں تمہارے کبروغرور اور جہالت سے متاثر ہو کر اپنا نقصان کیسے کروں، اگر تمہاری رعایت سے میں نے خدا کے مخلص بندوں کو دھکے دے دیئے تو اس کی سزا اور گرفت سے مجھ کو کون بچا سکے گا۔

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ

اور میں نہیں کہتا تم کو کہ میرے پاس ہیں خزانے اللہ کے اور نہ میں خبر رکھوں غیب کی اور نہ کہوں کہ میں فرشتہ ہوں اور نہ کہوں گا کہ جو لوگ

تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ۭ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ښ اِنِّىْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۳۱

تمہاری آنکھ میں حقیر ہیں نہ دے گا ان کو اللہ بھلائی، اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ ان کے جی میں ہے، یہ کہوں تو میں بے انصاف ہوں

**خلاصہ تفسیر:** گذشتہ تقریر میں ان کے تمام شبہات کا جواب ہوگیا، آگے ان سب جوابوں کا پھر تتمہ ہے، یعنی جب میری نبوت دلیل سے ثابت ہے تو اول تو تمہارا اس کو بعید سمجھنا محض فضول ہے، کیونکہ دلیل کے سامنے بعید یعنی خلاف عادت سمجھنا کوئی چیز نہیں، پھر یہ کہ وہ کوئی بعید بات بھی تو نہیں کہ سمجھ سے بالاتر ہو، البتہ اگر میں کسی عجیب وغیر چیز کا دعویٰ کرتا تو تمہارا انکار واستبعاد برا نہ تھا، اگرچہ دلیل کے بعد وہ پھر بھی قابل توجہ نہ تھا لیکن میں تو کسی ایسی عجیب بات کا دعویٰ ہی نہیں کرتا، چنانچہ:

اور میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں، اور نہ میں (یہ کہتا ہوں کہ میں) تمام غیب کی باتیں جانتا ہوں، اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں (اگر میں ان باتوں کا دعویٰ کرتا تو تمہارا انکار معتبر ہوسکتا تھا، کیونکہ یہ باتیں بیشک انسان کے لیے ثابت نہیں ہوسکتیں، لیکن نبوت تو کوئی محال وبعید چیز نہیں جو انسان کے لیے ثابت نہ ہوسکے) اور (یہ تو اپنی نبوت کے متعلق ارشاد فرمایا، آگے اپنے متبعین کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں) جو لوگ تمہاری نگاہوں میں حقیر ہیں میں ان کی نسبت (تمہاری طرح) یہ نہیں کہہ سکتا کہ (یہ لوگ دل سے ایمان نہیں لائے، اس لئے) اللہ تعالیٰ ہرگز ان کو ثواب نہ دے گا، ان کے دل میں جو کچھ ہو اس کو اللہ ہی خوب جانتا ہے (یعنی ممکن ہے کہ ان کے دلوں میں اخلاص ہو تو پھر میں ایسی بات کیونکر کہہ دوں) میں تو (اگر ایسی بات کہہ دوں تو) اس صورت میں ستم ہی کروں (کیونکہ بے دلیل دعویٰ کرنا گناہ ہے)۔

بعض باتیں جو محض ظاہری حواس سے معلوم نہیں ہوسکتی ہوں وہ ''مستبعد'' یعنی خلاف عادت ہوتی ہیں، یعنی مستبعد وہ ہے جس کے واقع ہونے کو عقل جائز بتلائے مگر چونکہ اس کا واقع ہونا کبھی دیکھا نہیں، دیکھنے والوں سے بکثرت سنا نہیں، اس لیے اس کو سن کر اول وہلہ میں حیرت زدہ ہوجائے، جتنے بھی معجزات ہیں وہ مستبعد یعنی خلاف عادت ہیں، چونکہ مستبعد واقع ہوسکتا ہے، اس لیے فی نفسہ ممکن ہونے کی وجہ سے جب مخبر صادق کی خبر سے اس کا واقع ہونا معلوم ہوگیا ہو تو اس کے واقع ہونے کو ترجیح ہوجائے گی، البتہ اگر عقلی یا شرعی دلیل سے اس کا محال اور ممتنع ہونا ثابت ہوجائے تو پھر اس کو مستبعد سمجھنا صحیح بلکہ اس سے بڑھ کر محال سمجھنا واجب ہے۔

**وَلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ:** نوح علیہ السلام نے پہلے: اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ میں ان کا مخلص ہونا ثابت کیا، اور یہاں اس جگہ اتنی بات پر اکتفا کیا کہ ان کے غیر مخلص ہونے پر کوئی دلیل نہیں، یہ نرمی اور ملاطفت کی گفتگو ہے، یعنی اگر تم ان کے مخلص ہونے کے معتقد نہیں تو بلا دلیل ان کے غیر مخلص ہونے کے بھی معتقد نہ بنو۔

**وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ (الی قولہ) وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ:** اس میں تصریح ہے کہ ارشاد وتبلیغ دین سے وابستہ شخص کا صاحب کشف یا صاحب تصرف یا بشری ضروریات میں عام لوگوں سے ممتاز ہونا ضروری نہیں، البتہ اسے علم وعمل کے ساتھ متصف ہونا ضروری ہے۔

* * *

**فائدہ:** کفار نے نوح علیہ السلام کو کہا تھا کہ تم ہمارے جیسے بشر ہو، جتھے اور دولت کے اعتبار سے بھی کچھ امتیاز نہیں رکھتے، اس کا جواب نہایت متانت وانصاف کے ساتھ دیتے ہیں کہ بیشک جیسا امتیاز تم دیکھنا چاہتے ہو اس کا ہم دعویٰ نہیں رکھتے، بلا شبہ میں ایک بشر ہوں، فرشتہ نہیں، نہ خدا نے اپنے سارے خزانے میرے تصرف واختیار میں دے دیے ہیں، نہ تمام غیب کی باتوں پر مطلع کیا گیا ہوں، لیکن ان تمام باتوں کے اعتراف کے ساتھ تمہاری طرح یہ کبھی نہ کہوں گا کہ جو لوگ تمہاری نگاہ میں معیوب وحقیر ہیں (یعنی میں اور میرے رفقاء) ان کو خدا ہرگز کوئی خیر (بھلائی) نہیں دے

سکتا، مثلاً ان میں سے کسی کو نبوت وحکمت عطا فرمادے اور باقیوں کو ایمان وعرفان کی دولت سے بہرہ ور کرے، خوب سمجھ لو حق تعالیٰ ان کے دلوں کی استعدادات وکیفیات کو پوری طرح جانتا ہے ہر ایک کی استعداد کے مناسب فیض پہنچاتا اور باطنی احوال وکیفیات کے موافق برتاؤ کرتا ہے اس نے جو خاص مہربانی مجھ پر یا میرے ساتھیوں پر کی ہے، وہ تمہاری آنکھ سے پوشیدہ ہے، اگر میں یہ کہنے لگوں کہ جو تمہیں بظاہر شکستہ حال اور حقیر دکھائی دیتے ہیں، خدا تعالیٰ نے بھی جو بواطن کا جاننے والا ہے انھیں کوئی عزت وشرف نہیں بخشا تو نہایت بے اصولی اور ناانصافی کی بات ہوگی۔

**تنبیہ:** اس آیت کے ابتدائی تین جملے سورہ انعام میں گزر چکے، وہاں کے فوائد دیکھ لیے جائیں۔

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۲﴾

بولے اے نوح تو نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت جھگڑ چکا اب لے آ جو تو وعدہ کرتا ہے ہم سے اگر تو سچا ہے

**خلاصہ تفسیر:** (جب نوح علیہ السلام نے سب باتوں کا پورا پورا جواب دے دیا جس کا جواب پھر ان سے کچھ بن نہ پڑا تو عاجز ہوکر) وہ لوگ کہنے لگے کہ اے نوح! تم ہم سے بحث کر چکے پھر اس بحث کو بڑھا بھی چکے ہو سو (اب بحث چھوڑو اور) جس چیز سے تم ہم کو دھمکایا کرتے ہو (کہ عذاب آجائے گا) وہ ہمارے سامنے لے آؤ۔

* * *

**فائدہ:** حضرت نوح علیہ السلام قبل از طوفان ساڑھے نوسو برس ان میں رہے، شب وروز سرا وعلانیۃ انھیں نصیحت کرتے، ہر شبہ کا جواب دیتے، تبلیغ وتفہیم اور بحث ومناظرہ کا سلسلہ جاری رہتا، اسی جھگڑے میں صدیاں گزر گئیں، کفار نے ان کی حقانی بحثوں اور شب وروز کی روک ٹوک سے عاجز ہوکر کہا کہ اب یہ سلسلہ بند کیجئے، بس اگر آپ سچے ہیں تو عذاب کی دھمکیاں دیتے رہے ہو وہ فوراً لے آؤ تا کہ یہ روز روز کا جھگڑا ختم ہو۔

قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْۤ اِنْ اَرَدْتُّ

کہا کہ لائے گا تو اس کو اللہ ہی اگر چاہے گا اور تم نہ تھکا سکو گے بھاگ کر ۱؎ اور نہ کارگر ہوگی تم کو میری نصیحت جو چاہوں

اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ؕ هُوَ رَبُّكُمْ ۫ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۴﴾

کہ تم کو نصیحت کروں اگر اللہ چاہتا ہوگا کہ تم کو گمراہ کرے، وہی ہے رب تمہارا، اور اسی کی طرف لوٹ جاؤ گے ۱؎

**خلاصہ تفسیر:** انہوں نے فرمایا کہ (اس کو لانے والا میں کون ہوں مجھے تو پہنچا دینے اور سنا دینے کا حکم تھا سو میں بجا لا چکا) اس کو تو اللہ تعالیٰ بشرطیکہ اس کو منظور ہو تمہارے سامنے لائے گا اور (اس وقت پھر) تم اس کو عاجز نہ کرسکو گے (کہ وہ عذاب واقع کرنا چاہے اور تم نہ ہونے دو) اور (جو میرا کام تھا پہنچا دینا اور سنا دینا اس میں میں نے تمہاری پوری خیرخواہی اور دلسوزی کی، لیکن) میری خیرخواہی تمہارے کام نہیں آسکتی گو میں تمہاری کیسی ہی خیرخواہی کرنا چاہوں جب کہ اللہ ہی کو تمہارا گمراہ کرنا منظور ہو (جس کی وجہ تمہارا عناد اور تکبر ہے، مطلب یہ کہ جب تم ہی اپنی بدقسمتی سے اپنے لئے نفع حاصل کرنا اور نقصان سے بچنا نہ چاہو تو میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے) وہی تمہارا مالک ہے (اور تم اس کے غلام مملوک ہو، تم پر اس کے تمام حقوق واجب ہیں اور تم ان کو براہ عناد ضائع کر کے مجرم ہو رہے ہو) اور اسی کے پاس تم کو جانا ہے (وہ تمہارے اس سارے کفر وعناد کی کسر نکال دے گا)۔

اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ: مخالفین ومعاندین کے جواب میں ایسا ہی کہنا اہل حق کی شان ہے، ورنہ اہل باطل کی زبانوں پر تو بڑے بڑے دعوے رہتے ہیں کہ جو میرا مخالف ہے اس کا یہ حال ہوجائے گا، وہ حال ہوجائے گا، وہ تباہ وبرباد ہوجائے گا، اس کی ذلت ورسوائی ہوگی وغیرہ وغیرہ۔

وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْۤ اِنْ اَرَدْتُّ: اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ ہدایت انسان کے قبضہ میں نہیں ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی یہ چیز میرے قبضہ میں نہیں، خدا جس وقت اپنی حکمت کے موافق چاہے گا عذاب نازل کر دے گا، ہمارا فرض صرف آگاہ کر دینا تھا، باقی عذاب تو ایسی ہولناک اور عظیم الشان چیز ہے، جس کا لے آنا اور دفع کر دینا دونوں پہلو قوائے بشریہ کے دائرہ سے خارج ہیں، جب مشیت الٰہی ہوگی تو کہیں بھاگ کر پناہ نہ لے سکو گے، ایسا کون ہے جو خدا کو (معاذ اللہ) تھکا کر عاجز کر سکے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی کفر پر اس قدر اصرار وضد اور انتہائی شوخ چشمی سے نزول عذاب کی استدعاء پتہ دیتی ہے کہ خدا کا ارادہ یہ ہی ہے کہ تم کو گمراہی میں پڑا رہنے دے اور آخر کار ہلاک کر دے، پس اگر تمہاری بدکرداری کے سبب سے خدا نے یہ ہی چاہا تو میں کتنا ہی نصیحت وخیر خواہی کر کے تم کو نفع پہنچانا چاہوں، کچھ نافع اور موثر نہ ہوگا، تمہارا رب وہ ہی ہے جس کے ملک وتصرف میں ہر چیز ہے جیسا جس کے ساتھ معاملہ کرے، کوئی روک نہیں سکتا، سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے وہ ہی سب کے اعمال کی جزاء وسزا دینے والا ہے۔

**ربط:** حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں یہاں تک جتنے سوالات واعتراضات اس قوم کے تھے، وہ ہی تھے حضرت کی قوم کے، گویا یہ سب جواب ان کو ملے، ایک ان کا نیا دعویٰ تھا، اسے آگے قصہ کے درمیان میں بیان فرماتے ہیں۔

ع أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ فَعَلَيَّ إِجْرَامِي وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تُجْرِمُونَ ﴿٣٥﴾

کیا کہتے ہیں کہ بنا لایا قرآن کو ۱؎ کہہ دے اگر میں بنا لایا ہوں تو مجھ پر ہے میرا گناہ اور میرا ذمہ نہیں جو تم گناہ کرتے ہو ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے نوح علیہ السلام کی گفتگو اور قوم والوں کا بحث کرنا بیان ہوا، چونکہ حضور ﷺ کے ساتھ بھی کفار قریش بحث مباحثہ کیا کرتے تھے اس لیے قصہ کے درمیان میں ضمنا اور تبعا اس کے متعلق ایک آیت آ گئی۔

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ محمد (ﷺ) نے یہ قرآن خود تراش لیا ہے، آپ (جواب میں) فرما دیجئے کہ اگر (بالفرض) میں نے تراشا ہوگا تو میرا یہ جرم مجھ پر (عائد) ہوگا (اور تم میرے جرم سے بری الذمہ ہو گے) اور (اگر تم نے یہ دعوی جھوٹ تراشا ہوگا، یعنی مجھ پر بہتان لگایا ہوگا تو تمہارا یہ جرم تم پر عائد ہوگا اور) میں تمہارے اس جرم سے بری الذمہ رہوں گا۔

**فَعَلَيَّ إِجْرَامِي وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تُجْرِمُونَ:** یہ اخیر درجہ کا جواب ہے، اور اصل جواب وہ ہے جو اسی سورت کے دوسرے رکوع میں دیا گیا ہے: **قل فاتوا بعشر سور مثلہ** کہ اگر یہ قرآن میرا بنایا ہوا ہے تو اس جیسی چند سورتیں تم بھی بنا لاؤ، اس جواب سے ان کے اس افتراء کا بہتان ہونا ثابت کر دیا گیا تھا، لیکن جو شخص نہ دلیل میں اعتراض کر سکے اور نہ حق بات کو تسلیم کرے اس سے اخیر درجہ یہی کہا جاتا ہے کہ خیر بھائی جیسا میں نے کیا ہوگا میں بھگتوں گا، جیسا تم کر رہے ہو تم بھگتو گے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یہ گفتگو کفار مکہ کی آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھی کہ قرآن آپ خود بنا لائے ہیں، خدا کا کلام نہیں ہے، حضرت نوح کتاب نہ لائے تھے جو ان کی قوم یہ بات کہتی، (کذا فی الموضح) لیکن بعض مفسرین نے اس آیت کو بھی نوح کے قصہ کا جزو بتلایا ہے، یعنی ان کی قوم نے کہا کہ جن باتوں کو نوح خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ خود ان کی گھڑنت ہیں، بعض نے کہا کہ گفتگو تو اہل مکہ کی حضور ﷺ سے ہے مگر اس کا تعلق خاص نوح کے قصہ سے تھا گویا وہ کہتے تھے کہ یہ داستان آپ نے جھوٹ بنا لی ہے، واقعہ میں ان قصوں کی کوئی اصل نہیں۔

**فائدہ:** ۲؎ قرآن کو "مفتریٰ" کہنے کا تحقیقی جواب اسی سورت میں ایک رکوع پہلے گزر چکا، یہاں آخری بات فرمائی یعنی قرآن کا کلام الٰہی ہونا نہایت واضح ومحکم دلائل سے بار بار ثابت کیا جا چکا ہے ایسی روشن چیز کی تکذیب کر کے جو گناہ تم سمیٹ رہے ہو اس کا وبال تم پر ہی پڑے گا، اس کی فکر کرو اس کا میں ذمہ دار نہیں، ہاں بفرض محال اگر میں نے افتراء کیا ہو تو اس کا گناہ مجھ پر پڑ سکتا ہے، سو بحمد اللہ ایسا ہوا نہیں۔

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾

اور حکم ہوا طرف نوح کی کہ اب ایمان نہ لائے گا تیری قوم میں مگر جو ایمان لا چکا سو غمگین نہ رہ ان کاموں پر جو کر رہے ہیں

**خلاصہ تفسیر:** (اب پھر نوح علیہ السلام کا قصہ بیان کیا جاتا ہے) اور (جب نصیحت کرتے ہوئے ایک زمانہ دراز گزر گیا اور کچھ اثر نہ ہوا تو) نوح کے پاس وحی بھیجی گئی کہ سوا اُن کے جو (اس وقت تک) ایمان لا چکے ہیں اور کوئی (نیا) شخص تمہاری قوم میں سے ایمان نہ لائے گا سو جو کچھ یہ لوگ (کفر وایذاء واستہزاء) کر رہے ہیں اس پر کچھ غم نہ کرو (کیونکہ غم تو خلاف توقع سے ہوتا ہے، جب ان سے مخالفت کے سوا کوئی اور توقع ہی نہیں پھر کیوں غم کیا جائے)۔

* * *

**فائدہ:** جب قوم کی ایذائیں حد سے گزر گئیں، تو نوح علیہ السلام نے سینکڑوں برس ظالموں کی زہرہ گداز جفائیں جھیلنے کے بعد خدا کے آگے شکوہ کیا: فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ (القمر: ۱۰) کہ میں مغلوب وضعیف ہوں، آپ ان سے بدلہ لیجئے، ارشاد ہوا کہ جن گنے چنے افراد کی قسمت میں ایمان لانا تھا، لا چکے، آئندہ ان میں کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے، لہذا اب آپ ان کی عداوت تکذیب اور ایذاء رسانی سے زیادہ غمگین نہ رہیں، عنقریب خدا کی شمشیر انتقام بے نیام ہونے والی ہے جو سب شرارتوں اور شریروں کا خاتمہ کر ڈالے گی۔

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۳۷﴾

اور بنا کشتی روبرو ہمارے اور ہمارے حکم سے اور نہ بات کر مجھ سے ظالموں کے حق میں، یہ بیشک غرق ہوں گے

**خلاصہ تفسیر:** اور (چونکہ ہمارا ارادہ اب ان کو غرق کرنے کا ہے اس لئے طوفان آنے کو ہے، پس) تم (اس طوفان سے بچنے کے لئے) ہماری نگرانی میں اور ہمارے حکم سے کشتی تیار کر لو (کہ اس کے ذریعہ سے تم اور مؤمنین طوفان سے محفوظ رہو گے) اور (یہ سن لو کہ) مجھ سے کافروں (کی نجات) کے بارے میں کچھ گفتگو مت کرنا (کیونکہ) وہ سب غرق کئے جائیں گے (ان کے لئے یہ قطعی طور پر تجویز ہو چکا ہے تو ان کی سفارش بے کار ہوگی)۔

**وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا:** ان آیات سے بعض خیال پرستوں کے اس قول کی غلطی بخوبی ظاہر ہوگئی جس کو ایک کتاب میں ظاہر کیا گیا ہے کہ نوح علیہ السلام میں نعوذ باللہ شفقت ورحم کا مادہ ہی نہ تھا، اسی وجہ سے انہوں نے یہ دعا کی: رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا اے اللہ! زمین پر کسی کافر کو بستا ہوا نہ چھوڑیے، بغیر حقیقت معلوم کیے ایک نبی کی شان میں یہ بات کہنا کتنی بڑی گستاخی ہے، ان آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام کی اس بد دعا کا منشا یہ نہ تھا کہ معاذ اللہ ان میں شفقت ورحمت کا مادہ نہ تھا، بلکہ ان کو قطعی طور پر معلوم ہو چکا تھا کہ اب یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے اور یقینا ان پر عذاب الٰہی نازل ہونے والا ہے تو ارادہ الٰہی کے ساتھ موافقت کرتے ہوئے انہوں نے بھی دشمنان خدا کے لیے بد دعا کر دی جس سے محض تقدیر کے ساتھ اپنی موافقت کا اور دشمنان خدا پر اپنا غصہ اور ناراضی کا ظاہر منظور تھا، نیز اس بد دعا میں ان لوگوں کی ہلاکت کی مصالح بیان کر کے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ میں اس عذاب کو جو اُن پر نازل ہونے والا ہے حکمت اور عدل کے مطابق سمجھتا ہوں، اگر نوح علیہ السلام میں شفقت ورحمت کا مادہ نہ ہوتا تو فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ان کو نہ فرمایا جاتا کہ جو کچھ یہ کر رہے ہیں اس پر غم نہ کرو، نیز یہ بھی نہ فرمایا جاتا: وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا کہ مجھ سے ان کافروں کے بارے میں کچھ گفتگو نہ کرنا، علاوہ ازیں اگر نوح علیہ السلام کی بد دعا کا نعوذ باللہ یہی منشا تھا کہ ان میں رحم کا مادہ نہ تھا تو یہ الزام بہت دور تک پہنچے گا، کیونکہ جب حق تعالی نے اس بد دعا کو قبول فرمایا تو کیا حق تعالی پر بھی یہی الزام لگایا جائے گا (استغفر اللہ) بلکہ خدا تعالی کے اس بد دعا کو قبول کر لینے سے صاف معلوم ہو گیا کہ وہ بد دعا رحمت، حکمت اور عدل کے ہرگز خلاف نہ تھی، ورنہ کبھی قبول نہ

ہوتی، کیونکہ خدا تعالی انبیاء کی ہر دعا قبول کرنے پر مجبور نہیں ہیں، احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کی بعض دعائیں مقبول نہیں ہوئیں، یاد رکھو کہ انبیاء علیہم السلام کے ہر فرد میں تمام صفات حمیدہ جمع ہوتی ہیں، یہ اور بات ہے کہ کسی میں بحکم الٰہی ایک صفت کا زیادہ ظہور و غلبہ ہوا، کسی میں دوسری کا، باقی کسی صفت حمیدہ سے خالی کوئی نبی نہیں ہوا۔

* * *

**فائدہ:** حق تعالیٰ نے نوح علیہ السلام سے فرمایا کہ ایک کشتی ہمارے روبرو (یعنی ہماری حفاظت و نگرانی میں) ہمارے حکم اور تعلیم و الہام کے موافق تیار کرو، کیونکہ عنقریب پانی کا سخت خوفناک طوفان آنے والا ہے، جس میں یہ سب ظالمین و مکذبین یقیناً غرق کیے جائیں گے، ان کے حق میں اب یہ فیصلہ نافذ ہو کر رہے گا، آپ کسی ظالم کی سفارش وغیرہ کے لیے ہم سے کوئی بات نہ کریں، آنے والا عذاب بالکل اٹل ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب قوم لوط کے حق میں جھگڑنا شروع کیا تھا ان کو بھی اسی طرح کا ارشاد ہوا تھا: يَٰٓإِبْرَٰهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هَٰذَآ ۖ إِنَّهُۥ قَدْ جَآءَ أَمْرُ رَبِّكَ ۖ وَإِنَّهُمْ ءَاتِيهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُودٍ (ہود: ۷۶)

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأٌ مِّنْ قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ ۚ قَالَ إِنْ تَسْخَرُوا مِنَّا فَإِنَّا نَسْخَرُ

اور وہ کشتی بناتا تھا ۱؎ اور جب گزرتے اس پر سردار اس کی قوم کے ہنسی کرتے اس سے ۲؎ بولا اگر تم ہنستے ہو ہم سے تو ہم ہنستے ہیں

مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُونَ ﴿٣٨﴾ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ۙ مَنْ يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ﴿٣٩﴾

تم سے جیسے تم ہنستے ہو ۳؎ اب جلد جان لو گے کہ کس پر آتا ہے عذاب کہ رسوا کرے اس کو اور اترتا ہے اس پر عذاب دائمی ۴؎

**خلاصہ تفسیر:** (غرض نوح علیہ السلام نے سامان کشتی کا جمع کیا) اور وہ کشتی تیار کرنے لگے (خواہ خود یا دوسرے کاریگروں کے ذریعہ سے) اور (تیاری کے دوران) جب کبھی ان کی قوم میں کسی رئیس گروہ کا ان پر گزر ہوتا تو (ان کو کشتی بناتا دیکھ کر اور یہ سن کر کہ طوفان آنے والا ہے) ان سے ہنسی کرتے (کہ دیکھو پانی کا کہیں نام و نشان نہیں مفت مصیبت جھیل رہے ہیں) آپ فرماتے کہ اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم تم پر ہنستے ہیں جیسا تم ہم پر ہنستے ہو (کہ عذاب ایسا نزدیک آ پہنچا ہے اور تم کو ہنسی سوجھ رہی ہے، ہم اس پر ہنستے ہیں) سو ابھی تم کو معلوم ہوا جاتا ہے کہ وہ کون شخص ہے جس پر (دنیا میں) ایسا عذاب آیا جاتا ہے جو اس کو رسوا کر دے گا اور (مرنے کے بعد) اس پر دائمی عذاب نازل ہوتا ہے (غرض اسی طرح کے مکالمات اور معاملات ہوا کرتے)۔

**فَإِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُونَ:** یہاں ایک شبہ کیا جاتا ہے کہ تمسخر کا جواب تمسخر سے دینا شان پیغمبری کے مناسب نہیں، پھر حضرت نوح علیہ السلام کو ایسا جواب دینے کی کیوں ہدایت کی گئی؟ جواب یہ ہے کہ یہ شبہ نہایت سطحی اور بے وزن ہے، کیونکہ کسی بھی مقابلہ وقوت کے وقت مقابلہ وقوت کا استعمال کرنا ضروری ہوتا ہے، یہ موقع ضبط و تحمل کا نہیں تھا، صبر و سکوت کا موقع اور ہوتا ہے۔

اس میں اس بات پر بھی دلالت ہے کہ انتقام کے موقع پر انتقامی جواب دینا مکارم اخلاق کے خلاف نہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ **وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ:** کہتے ہیں کشتی سالہا سال میں تیار کی، کشتی کیا تھی بڑا جہاز تھا، جس میں الگ الگ درجے تھے مفسرین نے اس کی تفاصیل میں بہت سی مبالغہ آمیز اور عجیب و غریب روایات بیان کی ہیں جن میں اکثر اسرائیلیات ہیں۔

**فائدہ:** ۲؎ **مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأٌ مِّنْ قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ:** کہ دیکھو! پیغمبر سے بڑھئی بن گئے، کبھی ایک عجیب سی چیز دیکھ کر نوح علیہ السلام سے پوچھتے کہ یہ کیا بناتے ہو؟ آپ فرما دیتے کہ ایک گھر بناتا ہوں جو پانی پر چلے گا اور ڈوبنے سے بچائے گا، وہ سن کر ہنسی اڑاتے کہ خشک زمین پر ڈوبنے کا بچاؤ کر رہے ہیں۔

**فائدہ:** ۳؎ فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ: حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''وہ ہنستے تھے کہ خشک زمین پر غرق کا بچاؤ کرتا ہے، یہ ہنستے تھے اس پر کہ موت سر پر کھڑی ہے اور یہ ہنستے ہیں''، اسی تفسیر کے موافق مترجم محقق نے فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ کا ترجمہ بصیغہ حال کیا ہے، ابن کثیر وغیرہ نَسْخَرُ مِنْكُمْ الخ میں استقبال کے معنی مراد لیتے ہیں، یعنی آج تم ہمیں احمق بناتے اور ہنستے ہو، لیکن وہ زمانہ قریب ہے کہ اس کے جواب میں تمہاری حماقت وسفاہت پر ہم کو ہنسنے کا موقع ملے گا، جب تم اپنے جرائم کی پاداش میں سزایاب ہو گئے۔

**فائدہ:** ۴؎ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ: یعنی اب زیادہ تاخیر نہیں، جلد آشکارا ہو جائیگا کہ دنیا کا رسوا کن اور آخرت کا دائمی عذاب کس پر نازل ہوتا ہے؟

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ

یہاں تک کہ جب پہنچا حکم ہمارا اور جوش مارا تنور نے ۱؎ کہا ہم نے چڑھا لے کشتی میں ہر قسم سے جوڑا دو عدد ۲؎ اور اپنے گھر کے لوگ

اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۴۰﴾

مگر جس پر پہلے ہو چکا ہے حکم ۳؎ اور سب ایمان والوں کو، اور ایمان نہ لائے تھے اس کے ساتھ مگر تھوڑے ۴؎

**خلاصہ تفسیر:** یہاں تک کہ جب ہمارا حکم (عذاب کا قریب) آپہنچا، اور زمین سے پانی ابلنا شروع ہوا (یہ علامت تھی طوفان شروع ہو جانے کی، اور اوپر سے پانی برسنا شروع ہوا، اس وقت) ہم نے (نوح علیہ السلام سے) فرمایا کہ ہر قسم (کے جانوروں) میں سے (جو کہ انسان کے لئے کارآمد ہیں اور پانی میں زندہ نہیں رہ سکتے) ایک ایک نر اور ایک ایک مادہ یعنی دو عدد اس (کشتی) میں چڑھا لو اور اپنے گھر والوں کو بھی (چڑھا لو) باستثناء اس کے جس پر (غرق ہونے کا) حکم نافذ ہو چکا ہے (یعنی ان میں جو کافر ہو جن کے بارے میں اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ کہہ دیا گیا ہے، اس کو سوار مت کرنا اور گھر والوں کے علاوہ) دوسرے ایمان والوں کو بھی (سوار کر لو) اور بجز قلیل آدمیوں کے ان کے ساتھ کوئی ایمان نہ لایا تھا (بس ان ہی کے سوار کرنے کا حکم ہو گیا)۔

قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ: بعض کے نزدیک یہ طوفان عمومی نہ تھا، لیکن ظاہر آیات سے طوفان کا عمومی ہونا ہی معلوم ہوتا ہے جن میں تاویل کرنا بعید ہے جیسا کہ ارشاد ہے: **وجعلنا ذريته هم البقين، وقال نوح رب لا تذر على الارض من الكافرين ديارا**، یعنی طوفان کے بعد صرف نوح علیہ السلام ہی کی اولاد سے نسل باقی رہی، اور طوفان کے عمومی ہونے پر بظاہر جو بعض اشکالات واقع ہوتے ہیں سب کے جواب قریب قریب موجود ہیں، مثلاً ایک اشکال یہ کہ ایک کشتی میں اقسام کے حیوانات کیسے سما سکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کشتی نوح میں ساری دنیا بھر کے جانور جمع نہیں کئے گئے تھے، بلکہ صرف وہ جانور جو نر و مادہ کے جوڑے سے پیدا ہوتے ہیں اور پانی میں زندہ نہیں رہ سکتے وہ سوار کیے گئے تھے، جو جانور پانی میں رہ سکتے ہیں وہ یقیناً سوار نہیں کیے گئے، اور خشکی کے جانوروں میں بھی بغیر نر و مادہ کے پیدا ہونے والے حیوانات سب نکل گئے، رہی جانوروں کی اور اقسام سو ان میں سے ممکن ہے کہ وہی جانور سوار کیے گئے ہوں جن سے انسانی حاجت وضرورت متعلق ہے، جیسے کھانے اور سواری کے قابل جانور اور بوجھ لادنے اور کام لیے جانے کے لائق جانور تاکہ طوفان ختم ہونے کے بعد بقیہ انسانوں کو تکلیف نہ ہو سو ایسے جانور بہت کم ہیں، ہر ایک کا جوڑا رکھنا کچھ مشکل نہیں، اور جن سے انسانی حاجت وضرورت متعلق نہیں جیسے درندے وغیرہ وہ سوار نہ کیے گئے ہوں اور انہیں اللہ تعالیٰ نے بعد میں دوبارہ پیدا کر دیا ہو، یا یہ کہ بطور خرق عادت اس کشتی میں ان کی بھی جگہ ہو گئی ہو، غرض ہر اس جانور کا جوڑا کشتی میں رکھ لیا جس کی نسل باقی رہنی مقدر تھی، اس سے وہ شبہ دور ہو گیا جو سطحی نظر میں پیدا ہو سکتا ہے کہ کشتی میں اتنی وسعت کیسے ہو گئی کہ دنیا بھر کے جانور سما گئے۔

ایک سوال یہ بھی ہوتا ہے کہ باقی جانوروں کی کیا خطا تھی کہ انہیں طوفان میں غرق کیا گیا؟ جواب یہ ہے کہ وہ طوفان کفار کے حق میں عذاب تھا، اور جانوں کے لیے بمنزلہ طبعی موت کے تھا جو ہر روز واقع ہوا کرتی ہے، اس لیے یہ سوال نہیں ہو سکتا کہ بہائم نے کیا خطا کی تھی، طبعی موت کے لیے خطا

وار ہونے کی ضرورت نہیں، ان کے حق میں وہ تھوڑا ہی تھا۔

ایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ نابالغ بچے کیوں غرق کیے گئے؟ جس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ چند روز پہلے توالد وتناسل بند ہوگیا ہو، پس پرانے نابالغ بالغ ہو گئے ہوں اور نئے پیدا نہ ہوئے ہوں جیسا کہ روح المعانی میں بھی نقل کیا ہے کہ چالیس سال پہلے توالد وتناسل بند ہوگیا تھا، یا یہ کہ وہ بچے بڑے ہوکر کافر ہوتے جیسا کہ: لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ سے سمجھ آتا ہے کہ اب اور کوئی ایمان نہ لائے گا، پس ان نابالغ بچوں کا غرق ہوجانا ان کے لیے رحمت کا سبب ہوا کہ کفر اور اس کے وبال سے بچ گئے۔

**وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ**: کشتی میں جو اہل ایمان سوار تھے ان کی تعداد میں اختلاف ہے، سب سے بڑا عدد یہ ہے کہ اسی (۸۰) مرد تھے اور اسی (۸۰) عورتیں، مگر نسل ان سب کی نہیں چلی، اب تمام عالم کے انسان صرف نوح علیہ السلام کی اولاد ہیں، واللہ اعلم۔

* * *

**فائدہ**: ۱۔ وَفَارَ التَّنُّوْرُ: یعنی نوح علیہ السلام کشتی تیار کرتے رہے یہاں تک کہ وعدہ کے موافق خدا کا حکم پہنچ گیا "بادلوں" کو کہ برس پڑیں اور زمین کو کہ ابل پڑے، اور فرشتوں کو کہ تعذیب وغیرہ کے متعلق اپنے فرائض منصبی سرانجام کریں، آخر اوپر سے بارش آئی اور نیچے زمین کی سطح سے چشموں کی طرح جوش مار کر پانی ابلنے لگا، حتیٰ کہ روٹی پکانے کے تنوروں میں بھی جہاں آگ بھری ہوتی ہے، پانی ابل پڑا۔

**تنبیہ**: "تنور" کے معنی میں اختلاف ہے: ① بعض مطلق روٹی پکنے کا تنور مراد لیتے ہیں۔

② بعض کہتے ہیں کہ ایک تنور حضرت حواء سے منتقل ہوتے ہوتے حضرت نوح علیہ السلام کے پاس پہنچا تھا، وہ ان کے گھر میں طوفان کا نشان ٹھہرایا گیا تھا کہ جب اس سے پانی ابلے کشتی میں سوار ہوجاؤ۔

③ بعض کے نزدیک تنور کوئی خاص چشمہ "کوفہ" یا "جزیرہ" میں تھا۔

④ بعض نے دعویٰ کیا ہے کہ "تنور" صبح کے اجالے اور روشنی کو کہا ہے، یعنی صبح کی روشنی خوب چمکنے لگے۔

⑤ ابوحیان کہتے ہیں کہ **فار التنور** ممکن ہے "ظہور عذاب" اور "شدت ہول" سے کنایہ ہو جیسے "حمی الوطیس" شدت حرب سے کنایہ ہے۔

⑥ ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ "تنور" کے معنی وجہ ارض (سطح زمین) کے ہیں، ہم نے اوپر جو تفسیر کی مقدم اسی معنی کو رکھا ہے، اشارہ بعض دوسرے معانی کی طرف بھی کردیا، حافظ ابن کثیرؒ یہی تفسیر لکھنے کے بعد فرماتے ہیں: وَهٰذَا قَوْلُ جُمْهُوْرِ السَّلَفِ وَعُلَمَاءِ الْخَلَفِ، واللہ اعلم۔

**فائدہ**: ۲۔ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ: یعنی جانوروں کی ضرورت ہے اور نسل باقی رہنی مقدر ہے ان میں سے ایک ایک جوڑا (نر اور مادہ دونوں) لے کر کشتی پر سوار کرلو۔

**فائدہ**: ۳۔ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ: یعنی مقدر ہو چکا ہے کہ وہ ظالموں کے زمرہ میں داخل ہونے کی وجہ سے غرق کئے جائیں گے وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ (ہود: ۳۷) اس سے مراد ہے نوح کا بیٹا "یام" جس کا لقب کنعان تھا اور کنعان کی والدہ "واعلہ" گھروالوں میں سے یہ دونوں علیحدہ رہے اور غرق ہوئے۔

**فائدہ**: وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ: ۴۔ یعنی اسی (۸۰) مرد یا کم وبیش۔

---

## وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۱﴾

اور بولا سوار ہوجاؤ اس میں اللہ کے نام سے ہے اس کا چلنا اور ٹھہرنا، تحقیق میرا رب ہے بخشنے والا مہربان

---

**خلاصہ تفسیر**: اور نوح (علیہ السلام) نے (سب جانوروں کو سوار کرکے اپنے متبعین سے) فرمایا کہ (آؤ) اس کشتی میں سوار

ہوجاؤ (اورغرق سے کچھ اندیشہ مت کرنا کیونکہ) اس کا چلنا اورٹھہرنا (سب) اللہ ہی کے نام سے ہے (اور وہی اس کے محافظ ہیں، پھر اندیشہ کیوں کیا جائے اور اگر چہ بندوں کے گناہ سب کے غرق ہونے کے مقتضی ہیں مگر) بالیقین میرا رب غفور ہے رحیم ہے (وہ اپنی رحمت سے گناہ بخش دیتا ہے اور حفاظت بھی کرتا ہے)۔

* * *

**فائدہ:** نوح علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں کوفرمایا کہ بنام خدا کشتی پرسوار ہوجاؤ، کچھ فکرمت کرو اس کا چلنا اورٹھہرنا سب خدا کے اذن وحکم اوراس کے نام کی برکت سے ہے، غرقابی کا کوئی اندیشہ نہیں، میرا پروردگار مومنین کی کوتاہیوں کومعاف کرنے والا اوران پر بیحد مہربان ہے، وہ اپنے فضل سے ہم کو صحیح سلامت اتارے گا، اس آیت سے نکلتا ہے کہ کشتی وغیرہ پرسوار ہوتے وقت بِسْمِ اللهِ کہنا چاہیے۔

وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۚ وَنَادٰى نُوْحُ ۨابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا

اور وہ لیے جارہی تھی ان کولہروں میں جیسے پہاڑ، اور پکارا نوح نے اپنے بیٹے کواور وہ ہورہا تھا کنارے اے بیٹے سوار ہوجا ساتھ ہمارے

وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۲﴾

اورمت رہ ساتھ کافروں کے

**خلاصہ تفسیر:** (غرض سب کشتی پرسوار ہوگئے اوراس اثناء میں پانی بڑھ گیا) اوروہ کشتی ان کولے کر پہاڑ جیسی موجوں میں چلنے لگی اورنوح (علیہ السلام) نے اپنے (ایک سگے یا سوتیلے) بیٹے کو (جس کا نام کنعان تھا اوروہ باوجود سمجھانے کے ایمان نہ لایا تھا اورایمان نہ لانے کی وجہ سے کشتی میں سوار نہ کیا گیا تھا اوراس وقت کشتی کنارے کے قریب ہی تھی اوروہ کنارہ پرموجود تھا آخری باردعوت کے طور پر) پکارا، اوروہ (کشتی سے) علیحدہ مقام پرتھا کہ اے میرے پیارے بیٹے! (کشتی میں سوار ہونے کی جوشرط ہے یعنی ایمان اس کوبجالا کرجلدی) ہمارے ساتھ سوار ہوجا اور (عقیدہ میں) کافروں کے ساتھ مت ہو (یعنی کفرکو چھوڑ دے کہ غرق سے بچ جائے)۔

**وَنَادٰى نُوْحُ ۨابْنَهٗ:** کنعان کوبعض نے کہا ہے کہ نوح علیہ السلام کا ہی بیٹا تھا اوربعض نے کہا کہ ان کا ربیب تھا، یعنی ان کی بیوی کا بیٹا تھا، اور چونکہ بعض اہل سیر نے ان کی بیوی کا بھی کشتی میں ہونا روایت کیا ہے جبکہ قرآن میں ان کی بیوی کا کافرہونا اورکافروں کا نجات نہ پانا مذکور ہے اس لیے بعض علماء قائل ہوئے ہیں کہ ان کی ایک بیوی مؤمن تھی اورایک کافر۔

* * *

**فائدہ:** یعنی کشتی پہاڑ جیسی موجوں کو چیرتی پھاڑتی بےخوف وخطر چلی جارہی تھی، سوار ہونے کے بعد نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے ''یام'' (کنعان) کوجو اپنے بھائی وغیرہ سارے کنبہ سے کنارے ہوکر کافروں کی صحبت میں تھا، آواز دی کہ ان بدبخت کافروں کی معیت چھوڑ کر ہمارے ساتھ سوار ہوجا! تاکہ اس مصیبت عظمیٰ سے نجات پاسکے۔

**تنبیہ:** یا تو نوح علیہ السلام اسے مومن خیال کرتے تھے، اس لیے آواز دی خواہ واقعہ میں مومن نہ ہو یا کافر جانتے ہوں مگر یہ توقع ہوگی کہ ان ہولناک نشانات کودیکھ کرمسلمان ہوجائے گا، یا واھلك کے عموم میں داخل سمجھ کرشفقت پدری کے جوش سے ایسا کیا ہو، اور **الا من سبق علیہ القول** کومجمل ہونے کی وجہ سے اس پرمنطبق نہ سمجھتے ہوں، واللہ اعلم۔

قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ۭ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ

بولا جالگوں گا کسی پہاڑ کو جو بچالے گا مجھ کو پانی سے ۔ کہا کوئی بچانے والا نہیں آج اللہ کے حکم سے مگرجس پر وہی رحم کرے

وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿٤٣﴾

اور حائل ہوگئی دونوں میں موج پھر ہو گیا ڈوبنے والوں میں ۲

**خلاصہ تفسیر**: وہ کہنے لگا کہ میں ابھی کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا جو مجھ کو پانی (میں غرق ہونے) سے بچالے گا (کیونکہ وہ وقت ابتداء طوفان کا تھا پہاڑوں کے اوپر پانی نہ پہنچا تھا) نوح نے فرمایا کہ آج اللہ کے قہر سے کوئی بچانے والا نہیں (نہ پہاڑ اور نہ اور کوئی چیز) لیکن جس پر وہی رحم کرے (تو اس کو خود ہی بچالے، غرق کنعان اس وقت بھی ایمان نہ لایا اور پانی زور شور کے ساتھ اس طرف سے بڑھ گیا) اور دونوں (باپ بیٹوں) کے بیچ میں ایک موج حائل ہوگئی پس وہ (بھی دوسرے کافروں کی طرح) غرق ہو گیا۔

يٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا (الی قولہ) سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ: اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ انسان اگر ایسے اسباب کو اپنے تصرف میں لاتا ہے جن کے استعمال کی اللہ کی طرف سے اجازت ہے تو اس سے آدمی متوکلین کی صف سے نہیں نکلتا جیسے کشتی نوح میں سوار ہونا، اور اگر موقع کے اعتبار سے ایسے اسباب کو استعمال کرتا ہے جن کی اجازت نہیں تو یہ متوکل نہیں رہتا، کیونکہ اس نے منشاالٰہی کے خلاف کام کیا، جیسے کنعان کا پہاڑ کی پناہ لینا۔

* * *

**فائدہ**: ۱ وہ اپنے جہل و غباوت سے ابھی یہ خیال کر رہا تھا کہ جس طرح معمولی سیلابوں میں بعض اوقات کسی بلندی پر چڑھ کر آدمی جان بچالیتا ہے، میں بھی کسی اونچے پہاڑ پر چڑھ کر جان بچالوں گا۔

**فائدہ**: ۲ یعنی کس خبط میں پڑا ہے، یہ معمولی سیلاب نہیں، عذاب الٰہی کا طوفان ہے، پہاڑ کی کیا حقیقت کوئی چیز آج عذاب سے نہیں بچا سکتی ہاں خدا ہی کسی پر رحم کرے تو بچ سکتا ہے مگر اس ہنگامہ دار وگیر اور مقام انتقام میں کٹر مجرموں پر رحم کیسا؟ باپ بیٹے کی گفتگو پوری نہ ہوئی تھی کہ پانی کی ایک موج نے درمیان میں حائل ہو کر ہمیشہ کے لیے دونوں کو جدا کر دیا۔

وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ

اور حکم آیا اے زمین نگل جا اپنا پانی اور اے آسمان تھم جا اور سکھا دیا گیا پانی اور ہو چکا کام اور کشتی ٹھہری

عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٤٤﴾ ربع

جودی پہاڑ پر اور حکم ہوا کہ دور ہو قوم ظالم

**خلاصہ تفسیر**: اور (جب کفار سب غرق ہو چکے تو) حکم ہو گیا کہ اے زمین! اپنا پانی (جو کہ تیری سطح پر موجود ہے) نگل جا، اور اے آسمان! (برسنے سے) تھم جا (چنانچہ دونوں امر واقع ہو گئے) اور پانی گھٹ گیا اور قصہ ختم ہوا اور کشتی (کوہ) جودی پر آٹھہری اور کہہ دیا گیا کہ کافر لوگ رحمت سے دور۔

اس سے معلوم ہوا کہ طوفان کا پانی پہاڑ سے اونچا تھا، اور قصہ ختم ہونے میں سب باتیں آگئیں، نوح علیہ السلام کی نجات، کافروں کا غرق، اور طوفان کا خاتمہ۔

بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ: یہ شاید اس لیے فرمایا گیا کہ عبرت تازہ ہو جائے کہ کفر کا وبال یہ ہے تا کہ آئندہ زمانہ والے اس سے بچے رہیں۔

* * *

**فائدہ**: ایک مدت تک اس قدر پانی برسا گویا آسمان کے دہانے کھل گئے اور زمین کے پردے پھٹ گئے، درخت اور پہاڑیاں تک پانی میں چھپ گئیں، اصحاب سفینہ کے سوا تمام لوگ جن کے حق میں نوح علیہ السلام نے دعا کی تھی: رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ

دَیَّارًا (نوح:۲۶) غرق ہو گئے، اس وقت خداوند قدوس نے زمین کو حکم دیا کہ اپنا پانی نگل جا! اور بادل کو فرمایا کہ تھم جا! پھر کیا مجال تھی کہ دونوں اس کے امتثال حکم میں ایک لمحہ کی تاخیر کرتے، چنانچہ پانی خشک ہونا شروع ہو گیا، کشتی ''جودی'' پہاڑ پر جا لگی جو بعض کے نزدیک موصل میں تھا، اور جو کام خدا نے چاہا (یعنی مجرمین کو سزا دینا) وہ پورا ہو چکا، ظالموں کے حق میں کہہ دیا گیا کہ خدا کی رحمت سے دور ہو کر ہمیشہ کے لیے مصیبت وہلاکت کے غار میں پڑے رہو۔

**تنبیہ:** اس میں اختلاف ہے کہ طوفان نوح تمام دنیا میں آیا یا خاص ملکوں میں، اس کے فیصلہ کا یہاں موقع نہیں، مگر یاد رہے کہ ''دائرۃ المعارف'' میں بعض محققین یورپ کے ایسے اقوال ودلائل نقل کیے ہیں جو عموم طوفان کی تائید کرتے ہیں، جو لوگ عام طوفان کے قائل ہیں، ان میں سے اکثر کے نزدیک موجودہ دنیا کے کل انسان نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں ''سام''، ''حام''، ''یافث'' کی اولاد ہیں، وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ (الصافات:۷۷) طوفان سے جو بچے اور حیوانات ہلاک ہوئے، ان کا ہلاک بطور تعذیب نہ تھا بلکہ جیسے خدا دوسرے اسباب طبعیہ کے ذریعہ سے ان پر موت وارد کرتا ہے اور وہ ظلم نہیں ہوتا، اسی طرح یہاں ان کی موت اس ذریعہ سے واقع ہوئی آخر اب بھی جو سیلاب اور طوفان آتے ہیں ان میں کتنے جانور اور بچے ہلاک ہو جاتے ہیں۔

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۴۵﴾

اور پکارا نوح نے اپنے رب کو کہا اے رب میرا بیٹا ہے میرے گھر والوں میں اور بیشک تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب سے بڑا حاکم ہے

قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ

فرمایا اے نوح وہ نہیں تیرے گھر والوں میں، اس کے کام ہیں خراب، سو مت پوچھ (طلب کر) مجھ سے جو تجھ کو معلوم نہیں

اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۴۶﴾

میں نصیحت کرتا ہوں تجھ کو کہ نہ ہو جائے تو جاہلوں میں

**خلاصہ تفسیر:** اور (جب) نوح (علیہ السلام نے کنعان کو ایمان لانے کے لئے فرمایا اور اس نے نہ مانا تو اس کے غرق ہونے سے پہلے انہوں) نے (اس امید پر کہ شاید حق تعالیٰ اپنی قدرت سے اس کے دل میں ایمان القاء فرما دیں اور یہ ایمان لے آئے) اپنے رب کو پکارا اور عرض کیا کہ اے میرے رب! میرا یہ بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے، اور آپ کا (یہ) وعدہ بالکل سچا ہے (کہ گھر والوں میں جو ایمان والے ہیں ان کو بچا لوں گا) اور (اگرچہ یہ سردست ایمان والا اور نجات کا مستحق نہیں ہے لیکن) آپ احکم الحاکمین (اور بڑی قدرت والے) ہیں (اگر آپ چاہیں تو اس کو مومن بنا دیں تاکہ یہ بھی اس سچے وعدہ کا مستحق بن جائے) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے نوح! یہ شخص (ہمارے علم ازلی میں) تمہارے (ان) گھر والوں میں نہیں (جو ایمان لا کر نجات پائیں گے یعنی اس کی قسمت میں ایمان نہیں، بلکہ) یہ (خاتمہ تک) تباہ کار (یعنی کافر رہنے والا) ہے سو مجھ سے ایسی چیز کی درخواست مت کرو جس کی تم کو خبر نہیں (یعنی ایسے احتمالی امر کی دعا مت کرو) میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ تم نادانوں میں داخل نہ ہو جاؤ۔

**رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ:** اس عرض وگزارش کا خلاصہ اس کے مومن ہونے کے لیے دعا کرنا تھی، یہ مقصود نہ تھا کہ کافر ہونے کے باوجود صرف اس وجہ سے کہ وہ میرے اہل وعیال میں داخل ہے اس کو نجات دے دی جائے۔

**قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ:** اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ نسب کی بڑائی کے ساتھ اگر صلاح وتقویٰ جمع نہ ہوں تو ایسا نسب کالعدم ہے، مطلب یہ کہ نجات کے لیے صرف خاندانی رتبہ وشرافت کافی نہیں، بلکہ اس کے ساتھ اعمال حسنہ کی بھی اشد ضرورت ہے۔

**فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ:** بات یہ ہے کہ نوح علیہ السلام سے یہ فرمایا گیا تھا کہ اپنے گھر والوں کو کشتی پر سوار کر لو بجز ان

لوگوں کے جن کے بارے میں غرق کا حکم نافذ ہو چکا ہے، اس سے نوح علیہ السلام یہ سمجھے کہ جن لوگوں کا خاتمہ کفر پر ہونے والا ہے ان کو نجات نہ ہوگی، اور ایسے ہی ان لوگوں کی بابت یہ حکم بھی ہے: وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا کہ ظالموں کے بارے میں مجھ سے کوئی گفتگو نہ کرنا، لیکن تعیین کے طور پر آپ کو یہ نہ بتلایا گیا تھا کہ کفر پر خاتمہ کس کس کا ہونے والا ہے، اس لیے ان کو احتمال ہوا کہ شاید میرے بیٹے کے لیے کفر پر خاتمہ مقدر نہ ہوا ہو، اگر چہ اس وقت تک وہ کافر ہے، اس احتمال پر اس کے لیے دعا کر دی کہ اس کو ایمان عطا کر دیا جائے، مگر چونکہ اس میں یہ احتمال بھی تھا کہ شاید اس کے لیے علم الٰہی میں کفر پر ہی خاتمہ مقدر ہو، اور یہ بھی ان لوگوں میں داخل ہو جن کی نسبت دعا و سفارش سے منع کیا گیا ہے تو اس احتمال پر نظر نہ کرنے کی وجہ سے حق تعالیٰ نے ان کو تنبیہ فرمائی کہ جس چیز کی تم کو پوری خبر نہیں ہے، محض ایک احتمال کی بنا پر تم نے کیوں دعا کی اور دوسرے احتمال پر نظر کیوں نہ کی۔

خلاصہ یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام کو اس بیٹے کے کفر کا پورا حال معلوم نہ تھا اس کے نفاق کی وجہ سے وہ اس کو مسلمان ہی جانتے تھے، اسی لئے اس کو اپنے اہل کا ایک فرد قرار دے کر طوفان سے بچانے کی دعا کر بیٹھے ورنہ اگر ان کو حقیقت حال معلوم ہوتی تو ایسی دعا نہ کرتے، کیونکہ ان کو صریح طور پر پہلے ہی یہ ہدایت دے دی گئی تھی کہ جب طوفان آجائے تو پھر آپ ان سرکشوں میں سے کسی کے متعلق کوئی سفارش کی گفتگو نہ فرمائیں، اس صاف و صریح حکم کے بعد ناممکن تھا کہ پیغمبر خدا اس کی خلاف ورزی کی جرأت کرتے، بجز اس احتمال کے جس کو اوپر خلاصہ تفسیر میں لیا گیا ہے کہ اس دعا کا حاصل اس بیٹے کے مومن ہو جانے کی دعا ہے، یہ نہیں کہ اس کے موجودہ حال میں اس کو طوفان سے بچایا جائے، لیکن حضرت نوح علیہ السلام کی اس کے کفر سے لاعلمی اور اس کی بناء پر دعا نجات کو بھی حق تعالیٰ نے عذر صحیح قرار نہیں دیا اور اسی لئے تنبیہ کی گئی کہ بغیر علم کے ایسی دعا کیوں کی۔

یہ شبہ نہ کیا جائے کہ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ سے تو بتلا دیا گیا تھا کہ اب اور کوئی ایمان نہ لائے گا، پھر نوح علیہ السلام کو کنعان کے بارے میں ایمان کا احتمال کیوں ہوا؟ جواب یہ ہے کہ وہ حکم قوم کے اعتبار سے ہے، اہل وعیال کے اعتبار سے ہونا ثابت نہیں، پس نوح علیہ السلام کی عصمت پر اس دعا سے کوئی اشکال لازم نہیں آتا۔

**فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ**: تفسیر روح المعانی میں بحوالہ قاضی بیضاوی نقل کیا ہے کہ جب اس آیت سے مشتبہ الحال کے لئے دعا کرنے کی ممانعت معلوم ہوئی تو جس معاملہ کا ناجائز وحرام ہونا معلوم ہو اس کے لئے دعا کا ناجائز ہونا بدرجہ اولی ثابت ہو گیا، اس سے ایک مسئلہ یہ بھی معلوم ہوا کہ دعا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دعا کرنے والا پہلے یہ معلوم کرلے کہ جس کام کی دعا کر رہا ہے وہ جائز وحلال ہے یا نہیں، مشتبہ حالت میں دعا کرنے سے منع فرمایا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آج کل کے مشائخ میں جو یہ عام رواج ہو گیا ہے کہ جو شخص کسی دعا کے لئے آیا اس کے واسطے ہاتھ اٹھا دیئے اور دعا کر دی، حالانکہ اکثر ان کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس مقدمہ کے لئے یہ دعا کرا رہا ہے اس میں یہ خود ناحق پر ہے یا ظالم ہے، یا کسی ایسے مقصد کے لئے دعا کرا رہا ہے جو اس کے لئے حلال نہیں، کوئی ایسی ملازمت اور منصب ہے جس میں یہ حرام میں مبتلا ہوگا یا کسی کی حق تلفی کر کے اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے گا، ایسی دعائیں حالت معلوم ہونے کی صورت میں تو حرام وناجائز ہیں ہی، اگر حالت اشتباہ کی حالت بھی ہو تو حقیقت حال اور معاملہ کے جائز ہونے کا علم حاصل کئے بغیر دعا کیلئے اقدام کرنا بھی مناسب نہیں۔

* * *

**فائدہ**: نوح علیہ السلام نے یہ کس وقت عرض کیا، کنعان کے غرق ہونے سے پہلے یا غرق ہونے کے بعد، دونوں احتمال ہیں، نیز کنعان کو اس کی منافقانہ اوضاع واطوار دیکھ کر غلط فہمی سے مومن سمجھ رہے تھے یا کافر سمجھتے ہوئے بارگاہ رب العزت میں یہ گزارش کی، دونوں باتوں کا امکان ہے، اگر مومن سمجھ کر غرقابی سے پہلے عرض کیا تھا تو مقصود اپنی اضطرابی کیفیت کا اظہار اور خدا سے کہہ کر اس کے بچاؤ کا انتظام کرنا تھا، اگر غرقابی کے بعد یہ گفتگو ہوئی تو محض معاملہ کی اصل حقیقت معلوم کرنے کی غرض سے اپنا خلجان یا اشکال پیش کیا، یعنی خداوندا! تو نے میرے گھر والوں کو بچانے کا وعدہ کیا تھا، اور کنعان مومن ہونے کی وجہ سے اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ (ہود: ۴۰) کے استثناء میں بظاہر داخل نہیں، پھر اس کی غرقابی کا راز کیا ہے؟ بلاشبہ آپ کا وعدہ سچا ہے، کسی کو یہ خیال نہیں گزر سکتا کہ معاذ اللہ وعدہ خلافی کی ہو، آپ احکم الحاکمین اور شہنشاہ مطلق ہیں، سمجھ میں آئے یا نہ آئے، کسی کو حق نہیں کہ آپ کے فیصلہ کے سامنے دم مار سکے، یا آپ کو وعدہ خلافی پر مجبور کر سکے، فقط قلبی اطمینان کے لیے بطریق استعلام واستفسار اس واقعہ کا راز معلوم کرنا چاہتا ہوں

، جواب ملا یہ ان گھر والوں میں سے نہیں جن کے بچانے کا وعدہ تھا، بلکہ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ میں شامل ہے، کیونکہ اس کے عمل خراب ہیں، تم کو اس کے کفر وشرک کی خبر نہیں، مقام تعجب ہے کہ پیغمبرانہ فراست کی روشنی میں صریح آثار کفر کے باوجود ایک کافر کا حال مشتبہ ہے، جس شخص کا واقعی حال تمہیں معلوم نہیں اس کے بارہ میں ہم سے ایسی نامناسب رعایت یا اس طرح کی کیفیت مت طلب کرو، مقربین کو لائق نہیں کہ وہ بے سوچے سمجھے ادب ناشناس جاہلوں کی سی باتیں کرنے لگیں، آیت کی یہ تقریر اس صورت میں ہے کہ نوح علیہ السلام کنعان کو مومن سمجھتے ہوں اور اگر کافر سمجھتے تھے تو شاید اس درخواست یا سوال کا منشاء یہ ہو کہ ''انجاء'' کے ذکر میں ''اہل'' کو چونکہ عام مومنین سے الگ کر کے بیان فرمایا تھا، اس سے نوح علیہ السلام نے یہ خیال کیا کہ میرے اہل کو اس دنیاوی عذاب سے محفوظ رکھنے کے لیے ایمان شرط نہیں اور اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مجمل تھا، اس لیے اس کے مصداق کی تعیین نہیں کر سکے، بناء علیہ شفقت پدری کے جوش میں عرض کیا کہ اللہ العالمین! میرا بیٹا یقیناً میرے اہل میں داخل ہے جس کے بچانے کا آپ وعدہ فرما چکے ہیں پھر یہ کیوں غرق کیا جا رہا ہے یا غرق کر دیا گیا، جواب ملا کہ تمہارا پہلا ہی مقدمہ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ (ہود: ۴۵) غلط ہے، جس اہل کے بچانے کا وعدہ تھا اس میں یہ داخل نہیں، کیونکہ اس کے کرتوت بہت خراب ہیں نیز اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ کے مصداق کا تم کو کچھ علم نہیں کہ وہ کون لوگ ہیں، پھر جس چیز کا علم تم نہیں رکھتے اس کی نسبت ایسے محاجہ کے رنگ میں سوال یا درخواست کرنا تمہارے لیے زیبا نہیں۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَتَرْحَمْنِيْٓ

بولا اے رب میں پناہ لیتا ہوں تیری اس سے کہ پوچھوں (مانگوں) تجھ سے جو معلوم نہ ہو مجھ کو ۱ اور اگر تو نہ بخشے مجھ کو اور رحم نہ کرے

اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۴۷

تو میں ہوں نقصان والوں میں ۲

**خلاصہ تفسیر:** نوح نے عرض کیا کہ میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ (آئندہ) آپ سے ایسے امر کی درخواست کروں جس کی مجھ کو خبر نہ ہو، اور (گذشتہ معاف کر دیجئے، کیونکہ) اگر آپ میری مغفرت نہ فرمائیں گے اور مجھ پر رحم نہ فرمائیں گے تو میں تو بالکل تباہ ہی ہو جاؤں گا۔

* * *

**فائدہ: ۱** حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ آدمی وہ ہی پوچھتا ہے جو معلوم نہ ہو، لیکن مرضی معلوم ہونی چاہیے، یہ کام جاہل کا ہے کہ بڑے کی مرضی پوچھنے کی نہ دیکھے، پھر پوچھے، مرضی کیوں نہ تھی؟ اسے ہم فائدہ گزشتہ میں بیان کر چکے ہیں۔

**فائدہ: ۲** حضرت نوح کانپ اٹھے اور توبہ کی، لیکن یہ نہ کہا کہ پھر ایسا نہ کروں گا کہ اس میں دعویٰ نکلتا ہے، بندہ کو کیا مقدور ہے، چاہیے اس کی پناہ مانگے کہ مجھ سے پھر نہ ہو اور دل میں عزم نہ کرنے کا رکھے، حضرت آدم علیہ السلام اور یونس علیہ السلام وغیرہ کی توبہ کے جو الفاظ قرآن میں نقل ہوئے ہیں ان میں یہ ہی ادب ملحوظ رہا ہے۔

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓي اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ۭ

حکم ہوا اے نوح! اتر سلامتی کے ساتھ ہماری طرف سے اور برکتوں کے ساتھ تجھ پر اور ان فرقوں پر جو تیرے ساتھ ہیں

وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۴۸

اور دوسرے فرقے ہیں کہ فائدہ دیں گے ان کو پھر پہنچے گا ان کو ہماری طرف سے عذاب دردناک

**خلاصہ تفسیر:** (جب جودی پہاڑ پر کشتی ٹھہرنے کے چند روز بعد پانی بالکل اتر گیا تو اس وقت نوح علیہ السلام سے) کہا گیا

(یعنی اللہ تعالیٰ نے خود یا کسی فرشتہ کے ذریعہ سے ارشاد فرمایا) کہ اے نوح! (اب جودی پر سے زمین پر) اترو ہماری طرف سے سلام اور برکتیں لے کر جو تم پر نازل ہوں گی اور ان جماعتوں پر کہ تمہارے ساتھ ہیں (کیونکہ ساتھ والے سب مسلمان تھے اور اس علت میں شریک ہونے کی وجہ سے قیامت تک کے مسلمانوں پر بھی سلام و برکات کا نازل ہونا معلوم ہو گیا) اور (چونکہ یہ کلام بعد والے مسلمانوں پر بھی برکات کے نازل ہونے پر دلالت کرتا ہے اور بعد والوں میں بعض کافر بھی ہوں گے اس لئے ان کا حال بھی بیان فرماتے ہیں کہ) بہت سی ایسی جماعتیں بھی ہوں گی کہ ہم ان کو (دنیا میں) چند روز عیش دیں گے، پھر (آخرت میں) ان پر ہماری طرف سے سزا سخت واقع ہوگی۔

* * *

**فائدہ:** یعنی کشتی سے جودی پر، پھر جودی سے زمین پر اترے، برکتیں اور سلامتی آئندہ تم پر اور ان اقوام پر رہے گی جو تمہارے ساتھیوں سے پیدا ہونے والی ہیں، فی الحال جو زمین طوفان سے بالکل اجڑ گئی ہے خدا دوبارہ آباد کر دے گا اور اس کی رونق و برکت پھر عود کر آئے گی، ''سلامت'' کے لفظ سے گویا حق تعالیٰ نے تسلی فرما دی کہ پھر ساری نوع انسانی پر قیامت سے پہلے ایسی عام ہلاکت نہ آئے گی، مگر بعضے فرقے ہلاک ہوں گے۔

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ

یہ باتیں من جملہ غیب کی خبروں کے ہیں کہ ہم بھیجتے ہیں تیری طرف، نہ تجھ کو ان کی خبر تھی اور نہ تیری قوم کو اس سے پہلے ۱

فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝۴۹ ع ۴

سو تو صبر کر، البتہ انجام بھلا ہے ڈرنے والوں کا ۲

**خلاصہ تفسیر:** نوح علیہ السلام کے قصہ کے اختتام پر دیگر فوائد کے علاوہ دو فائدے بیان فرماتے ہیں: (۱) نبوت محمدیہ پر دلیل قائم ہونا (۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی۔

یہ قصہ (آپ کے اعتبار سے) من جملہ اخبار غیب کے ہے جس کو ہم وحی کے ذریعہ سے آپ کو پہنچاتے ہیں، اس (قصہ) کو اس (ہمارے بتلانے) کے قبل نہ آپ جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم (جانتی تھی، اس اعتبار سے غیب تھا اور وحی کے سوا دوسرے ذرائع اس کے معلوم ہونے کے یقینا نہیں، پس ثابت ہو گیا کہ آپ کو وحی کے ذریعہ سے یہ معلوم ہوا ہے اور یہی نبوت ہے، لیکن کفار نبوت کے ثابت ہونے کے بعد بھی آپ کی مخالفت کرتے ہیں) سو صبر کیجئے (جیسا اس قصہ میں نوح علیہ السلام کا صبر آپ کو معلوم ہوا ہے) یقینا نیک انجامی متقیوں ہی کے لئے ہے (جیسا نوح علیہ السلام کے قصہ میں معلوم ہوا کہ کفار کا انجام برا ہے اور مسلمانوں کا انجام اچھا ہوا، اسی طرح ان کفار کا چند روزہ زور و شور ہے، پھر اخیر میں غلبہ حق ہی کو ہوگا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی یہ دلائل نبوت میں سے ہے کہ ایک امی کی زبان سے امم سابقہ کے ایسے مستند و مفصل واقعات سنوائے جائیں۔

**فائدہ:** ۲ جیسے نوح اور ان کے رفقاء کا انجام بھلا ہوا آپ کے ساتھیوں کا مستقبل بھی نہایت تابناک اور کامیاب ہے، آپ کفار کی ایذاؤں پر صبر کریں، گھبرا کر تنگدل نہ ہوں، جیسے نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو برس صبر کیا۔

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ

اور عاد کی طرف ہم نے بھیجا ان کے بھائی ہود کو بولا اے قوم بندگی کرو اللہ کی کوئی تمہارا حاکم نہیں سوائے اس کے

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ۝۵۰

تم سب جھوٹ کہتے ہو

**خلاصہ تفسیر:** نوح علیہ السلام کے قصہ کے بعد حضرت ہود علیہ السلام اور قوم عاد کا قصہ بیان کیا جاتا ہے۔
اور ہم نے (قوم) عاد کی طرف ان کے (برادری یا وطن کے) بھائی ہود (علیہ السلام) کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا، انہوں نے (اپنی قوم سے) فرمایا اے میری قوم! تم (صرف) اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (ہونے کے قابل) نہیں، تم (اس بت پرستی کے اعتقاد میں) محض مفتری (جھوٹے) ہو (کیونکہ اس کا باطل ہونا دلیل سے ثابت ہے)۔

* * *

**فائدہ:** کہ پتھر کے بت بھی با اختیار حاکم بلکہ معبود ہیں، سورہ اعراف میں قوم ہود کا قصہ گزر چکا۔

يٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۵۱﴾

اے قوم میں تم سے نہیں مانگتا اس پر مزدوری، میری مزدوری اسی پر ہے جس نے مجھ کو پیدا کیا ۱ پھر کیا تم نہیں سمجھتے ۲

**خلاصہ تفسیر:** اے میری قوم! (میری نبوت جو دلائل سے ثابت ہے اس کی مزید تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ) میں تم سے (تبلیغ) پر کچھ معاوضہ نہیں مانگتا، میرا معاوضہ تو صرف اس (اللہ) کے ذمہ ہے جس نے مجھ کو (عدم محض سے) پیدا کیا، پھر کیا تم (اس کو) نہیں سمجھتے (کہ میری نبوت کے صحیح ہونے پر دلیل موجود ہے اور خود غرضی جو کہ مانع نبوت ہے وہ مفقود ہے، پھر نبوت میں شبہ کی کیا وجہ)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی تمہارے مال کی مجھے ضرورت نہیں، میرا پیدا کرنے والا ہی تمام دنیاوی ضروریات اور اخروی اجر و ثواب کا کفیل ہے یہ بات ہر ایک پیغمبر نے اپنی قوم سے کہی تا کہ نصیحت بے لوث اور موثر ہو، لوگ ان کی محنت کو دنیاوی طمع پر محمول نہ کریں۔
**فائدہ:** ۲ یعنی اس قدر غبی ہو، اتنی موٹی بات بھی نہیں سمجھتے کہ ایک شخص بے طمع بے غرض، محض دردمندی اور خیر خواہی سے تمہاری فلاح دارین کی بات کہتا ہے، تم اسے دشمن اور بدخواہ سمجھ کر دست و گریباں ہوتے ہو۔

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ

اور اے قوم گناہ بخشواؤ اپنے رب سے پھر رجوع کرو اسی کی طرف ۱ چھوڑے گا تم پر آسمان سے دھاریں ۲ اور زیادہ دے گا تم کو

قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

زور پر زور اور روگردانی نہ کرو گناہ گار ہو کر ۳

**خلاصہ تفسیر:** اور اے میری قوم! تم اپنے گناہ (کفر و شرک وغیرہ) اپنے رب سے معاف کراؤ (یعنی ایمان لاؤ اور) پھر (ایمان لا کر) اس کی طرف (عبادت سے) متوجہ ہو (یعنی عمل صالح کرو، پس ایمان و عمل صالح کی برکت سے) وہ تم پر خوب بارش برسا دے گا (درمنثور میں ہے کہ قوم عاد پر تین سال متواتر قحط پڑا تھا اور بارش تو ویسے بھی مطلوب ہی ہے) اور (ایمان و عمل کی برکت سے) تم کو قوت دے کر تمہاری قوت (موجودہ) میں ترقی کر دے گا (پس ایمان لے آؤ) اور مجرم رہ کر (ایمان سے) اعراض مت کرو۔
**ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا:** اس میں دلیل ہے کہ طاعات و عبادات سے دنیاوی راحت و چین بھی ملتا ہے اگرچہ اصلی جزا تو آخرت ہی میں ملے گی۔

* * *

**فائدہ:** ۱ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ: اسی سورت کے شروع میں اسی جملہ کی تفسیر گزر چکی۔

فائدہ: ۲۔ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا: یعنی موقع بہ موقع خوب بارشیں دے گا، وہ قوم چونکہ کھیتی، باغ لگانے سے بڑی دلچسپی رکھتی تھی اس لیے ایمان لانے کے ظاہری فوائد و برکات وہ بیان کیے جو ان کے حق میں خصوصی طور پر موجب ترغیب ہوں، لکھتے ہیں کہ وہ لوگ تین سال سے خشک سالی اور امساک باراں کی مصیبت میں گرفتار تھے، ہود علیہ السلام نے وعدہ کیا کہ ایمان لا کر خدا کی طرف رجوع کرو گے تو یہ مصیبت دور ہو جائے گی۔

فائدہ: ۳۔ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ: یعنی مالی اور بدنی قوت بڑھائے گا، اولاد میں برکت دے گا، خوشحالی میں ترقی ہوگی، اور مادی قوت کے ساتھ روحانی و ایمانی قوت کا اضافہ کر دیا جائے گا، بشرطیکہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع ہو کر اس کی اطاعت سے مجرموں کی طرح روگردانی نہ کرو۔

قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۳﴾

بولے اے ہود تو ہمارے پاس کوئی سند لے کر نہیں آیا اور ہم نہیں چھوڑنے والے اپنے ٹھاکروں (معبودوں) کو تیرے کہنے سے اور ہم نہیں تجھ کو ماننے والے

**خلاصہ تفسیر**: ان لوگوں نے جواب دیا کہ اے ہود! آپ نے ہمارے سامنے (اپنے اللہ کی طرف سے رسول ہونے کی) کوئی دلیل تو پیش نہیں کی (یہ قول ان کا عناد تھا) اور ہم آپ کے (صرف) کہنے سے تو اپنے معبودوں (کی عبادت) کو چھوڑنے والے ہیں نہیں، اور ہم کسی طرح آپ کا یقین کرنے والے نہیں۔

مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ: یعنی آپ نے ہمارے سامنے کوئی دلیل معجزہ تو پیش نہیں کیا، قوم عاد کی یہ بات محض عناد کی وجہ سے تھی، کیونکہ معجزہ سے کوئی نبی خالی نہیں اگرچہ اس کی تعیین ہمیں نہ پہنچی ہو، چنانچہ حدیث میں ہے: "ما من نبی الا قد اعطی من الایات ما مثله امن علیه البشر" کہ کوئی نبی ایسا نہیں ہوا جس کو کوئی نشانی ایسی نہ دی گئی ہو جس پر انسان ان کی تصدیق کرنے لگیں۔

* * *

فائدہ: یہ ان کی کھلی ہٹ دھرمی تھی جو کہتے تھے کہ آپ کوئی واضح سند اور دلیل اپنی صداقت کی نہیں لائے، خدا جسے پیغمبری کے عہدہ پر فائز کرے، ضرور ہے کہ اس کو تقرر کی سند اور پروانہ عطا فرمائے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ جو نبی مبعوث ہوا اس کے ساتھ ایسے واضح نشان بھیجے گئے جس پر آدمی ایمان لانا چاہیں تو لا سکتے ہیں، اس لیے بالیقین کہا جا سکتا ہے کہ ہود علیہ السلام نے نشان پیش کیے ہوں گے، مگر وہ لوگ ہٹ دھرمی اور بے حیائی سے یہ ہی کہتے رہے کہ آپ کوئی کھلا ہوا نشان نہیں لائے (شاید یہ مراد ہو کہ ایسا نشان نہ لائے جو سب کی گردنیں پکڑ کر ایمان لانے پر مجبور کر دے) بہر حال ہم محض تیرے کہنے سے اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑ سکتے، نہ کبھی تیری رسالت پر ایمان لا سکتے ہیں۔

اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّيْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا

ہم تو یہی کہتے ہیں کہ تجھ کو آسیب پہنچایا ہے کسی ہمارے ٹھاکروں (معبودوں) نے بری طرح ۱۔ بولا میں گواہ کرتا ہوں اللہ کو اور تم گواہ رہو

اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۵۵﴾

کہ میں بیزار ہوں ان سے جن کو تم شریک کرتے ہو، اس کے سوا، سو برائی کرو میرے حق میں تم سب مل کر پھر مجھ کو مہلت نہ دو

**خلاصہ تفسیر**: (اور) ہمارا قول تو یہ ہے کہ ہمارے معبودوں میں سے کسی نے آپ کو کسی خرابی میں (مثلاً جنون وغیرہ میں) مبتلا کر دیا ہے (چونکہ آپ نے ان کی شان میں گستاخی کی، انہوں نے باؤلا کر دیا، اس لئے ایسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو کہ خدا ایک ہے میں نبی ہوں) ہود (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (تم جو کہتے ہو کہ کسی بت نے مجھے باؤلا کر دیا ہے تو) میں (علی الاعلان) اللہ کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی (سن لو اور) گواہ رہو

کہ میں ان چیزوں سے (بالکل) بیزار ہوں جن کو تم خدا کے سوا شریک (عبادت) قرار دیتے ہو، سو (میری دشمنی تو ان کے ساتھ پہلے سے بھی ظاہر ہے اور اب اس اعلان براءت سے اور زیادہ مؤکد ہوگئی تو اگر ان بتوں میں کچھ قوت ہے تو) تم (اور وہ) سب مل کر میرے ساتھ (ہر طرح کا) داؤ گھات کرلو (اور) پھر مجھ کو ذرا مہلت نہ دو (اور کوئی کسر نہ چھوڑو، دیکھوں تو سہی میرا کیا کرلیں گے اور جب وہ جھوٹے خدا تمہارے ساتھ مل کر کچھ نہیں کر سکتے تو اکیلے تو کیا خاک کریں گے)۔

**فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ**: اس سے ہود علیہ السلام کے قوی توکل کا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ آپ ان تمام جابر اور سرکشوں میں تنہا تھے، پھر بھی آپ نے ان کی اور ان کے معبودوں کی کیسی مذمت کی اور ان کو کیسے مشتعل کیا۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یہ جو تم بہکی بہکی باتیں کرتے ہو اور سارے جہان کو بیوقوف بتلا کر اپنا دشمن بنا رہے ہو، ہمارا خیال یہ ہے کہ ہمارے دیوتاؤں میں سے کسی نے آسیب پہنچا کر تمہیں مجنون اور پاگل کردیا ہے (العیاذ باللہ) تم جو ان کی عبادت سے روکتے اور برا بھلا کہتے تھے، انہوں نے اس گستاخی کی سزا دی کہ اب تم بالکل دیوانوں کی سی باتیں کرنے لگے۔

**اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیْ وَرَبِّكُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِهَا ؕ**

میں نے بھروسہ کیا اللہ پر جو رب ہے میرا اور تمہارا، کوئی نہیں زمین پر پاؤں دھرنے والا مگر اللہ کے ہاتھ میں ہے چوٹی اس کی

**اِنَّ رَبِّیْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۵۶﴾**

بیشک میرا رب ہے سیدھی راہ پر

**خلاصہ تفسیر:** (اور میں یہ دعوی اس لئے دل کھول کر کر رہا ہوں کہ تمہارے بت تو محض عاجز ہیں ان سے تو اس لئے نہیں ڈرتا، رہ گئے تم، سو اگرچہ تمہیں کچھ قدرت طاقت حاصل ہے لیکن میں تم سے اس لئے نہیں ڈرتا کیونکہ) میں نے اللہ پر توکل کرلیا ہے جو میرا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی مالک ہے جتنے روئے زمین پر چلنے والے ہیں سب کی چوٹی اس نے پکڑ رکھی ہے (یعنی سب اس کے قبضے میں ہیں، اس کے حکم کے بغیر کوئی کان نہیں ہلا سکتا اس لئے میں تم سے بھی نہیں ڈرتا، ہود علیہ السلام کی اس تقریر سے ایک نیا معجزہ بھی ظاہر ہوگیا کہ ایک شخص تن تنہا جس میں مقابلہ کی ظاہری قوت کچھ نہ تھی ایسے بڑے بڑے زور آور لوگوں سے ایسی مخالفانہ گفتگو کرے اور وہ اس کا کچھ نہ کرسکیں یہ خود ایک کھلا معجزہ ہے، پس اس سے ان کے اس قول کا بھی جواب ہوگیا کہ: مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ کہ تم کوئی دلیل معجزہ ہمارے پاس نہیں لائے، اگر سابقہ معجزہ سے قطع نظر کیا جائے تو یہ دوسرا معجزہ ہے، پس نبوت پر دلیل قائم ہوگئی، اور قوم کے اشتباہ کا جو سبب تھا کہ: اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ اس کا بھی جواب ہوگیا، پس نبوت ثابت ہوگئی، اس سے توحید کا وجوب بھی ثابت ہوگیا جس کی طرف میں بلاتا ہوں پس توحید ونبوت ثابت ہوجانے کے بعد ان کا یہ کہنا کہ: مَا نَحْنُ بِتَارِكِیْٓ اٰلِهَتِنَا کہ ہم اپنے بتوں کو چھوڑنے والے نہیں باطل ہوگیا اور صراط مستقیم واضح ہوگیا، اور) یقینا میرا رب صراط مستقیم پر (چلنے سے ملتا) ہے (پس تم بھی اس صراط مستقیم کو اختیار کرو تاکہ مقبول ومقرب ہوجاؤ)۔

خلاصہ تفسیر میں دوسرے معجزہ کی تقریر میں جو احقر نے لفظ ''تن تنہا'' کہا ہے مراد اس سے یہ ہے کہ اس وقت اگر چند مسلمان بھی ان کے ساتھ ہوں تب بھی ان سے ہود علیہ السلام کو ظاہری قوت کچھ حاصل نہ تھی، اتنے زبردست کثیر التعداد مخالفوں کے مقابلہ میں مٹھی بھر مسلمان کیا شمار میں آسکتے ہیں، پس یہ شبہ نہیں ہوسکتا کہ آگے آیت میں: الذین امنوا معہ تن تنہا ہونے کے منافی ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی وہ بے چاری پتھر کی مورتیں تو مجھے کیا گزند پہنچا سکتیں، تم سب جو بڑے شہ زور، تنومند اور طاقتور نظر آتے ہو اپنے دیوتاؤں کی

فوج میں بھرتی ہو کر اور مجھ جیسے یکہ وتنہا پر پوری قوت سے بیک وقت ناگہاں حملہ کر کے بھی میرا بال بیکا نہیں کر سکتے، سنو میں خدا کو گواہ بنا کر اعلان کرتا ہوں اور تم سب بھی اس پر گواہ رہو کہ میں تمہارے جھوٹے دیوتاؤں سے قطعاً بیزار ہوں، تم سب جمع ہو کر جو برائی مجھے پہنچا سکتے ہو پہنچاؤ نہ ذرا کوتاہی کرو نہ ایک منٹ کی مجھے مہلت دو، اور خوب سمجھ لو کہ میرا بھروسہ خدائے وحدہ لاشریک لہ پر ہے جو میرا رب ہے اور وہی تمہارا بھی مالک وحاکم ہے، گو بدفہمی سے تم نہیں سمجھتے، نہ صرف میں اور تم بلکہ ہر چھوٹی بڑی چیز جو زمین پر چلتی ہے خالص اس کے قبضہ اور تصرف میں ہے گویا ان کے سر کے بال اس کے ہاتھ میں ہیں، جدھر چاہے پکڑ کر کھینچے اور پھیر دے، کسی کی مجال نہیں کہ اس کے قبضہ اختیار سے نکل کر بھاگ جائے، نہ ظالم اس کی گرفت سے چھوٹ سکتے ہیں نہ سچے اس کی پناہ میں رہ کر رسوا ہو سکتے ہیں، بلاشبہ میرا پروردگار عدل وانصاف کی سیدھی راہ پر ہے اس کے ہاں نہ ظلم ہے نہ بے موقع انعام، اپنے بندوں کو نیکی اور خیر کی جو سیدھی راہ اس نے بتلائی، بیشک اسی پر چلنے سے وہ ملتا ہے اور اس پر چلنے والوں کی حفاظت کرنے کے لیے خود ہر وقت وہاں موجود ہے۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ؕ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ

پھر اگر تم منہ پھیرو گے تو میں پہنچا چکا تم کو جو میرے ہاتھ بھیجا تھا تمہاری طرف، اور قائم مقام کرے گا میرا رب اور لوگ

وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿۵۷﴾

اور نہ بگاڑ سکو گے اللہ کا کچھ، تحقیق میرا رب ہے ہر چیز پر نگہبان

**خلاصہ تفسیر:** پھر اگر (اس بلیغ بیان کے بعد بھی) تم (راہ حق سے) پھرے رہو گے تو میں تو (معذور سمجھا جاؤں گا، کیونکہ) جو پیغام دے کر مجھ کو بھیجا گیا تھا وہ تم کو پہنچا چکا ہوں (لیکن تمہاری کم بختی آئے گی کہ تم کو اللہ تعالیٰ ہلاک کر دے گا) اور تمہاری جگہ میرا رب دوسرے لوگوں کو اس زمین میں آباد کر دے گا (سو تم اس اعراض وکفر میں اپنا ہی نقصان کر رہے ہو) اور اس کا تم کچھ نقصان نہیں کر رہے (اور اگر اس ہلاکت میں کسی کو یہ شبہ ہو کہ خدا کو کیا خبر کہ کون کیا کر رہا ہے تو خوب سمجھ لو کہ) بالیقین میرا رب ہر شے کی نگہداشت کرتا ہے (اس کو سب خبر رہتی ہے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی ایسی صاف اور کھری کھری باتیں سن کر بھی نہ مانو گے تو اب میرا کچھ نقصان نہیں، میں فرض تبلیغ پوری طرح ادا کر چکا تم اپنی فکر کر لو، ضرور ہے کہ اس قسم کی ہٹ دھرمی اور تعصب وعناد پر آسمان سے عذاب آئے جو تم کو ہلاک کر ڈالے، خدا کی زمین تمہاری تباہی سے ویران نہ ہوگی، وہ دوسرے لوگوں کو تمہارے اموال وغیرہ کا وارث بنا دے گا، تمہارا قصہ ختم کر دینے سے یاد رکھو خدا کا یا اس کے پیغمبروں کا کچھ نہیں بگڑتا نہ اس کا ملک خراب ہوتا ہے، جب وہ ہر چیز کا محافظ ونگہبان ہے تو ہر قابل حفاظت چیز کی حفاظت اور اس کے سامان کی حفاظت اپنی قدرت کاملہ سے کر دے گا۔

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۵۸﴾

اور جب پہنچا ہمارا حکم بچا دیا ہم نے ہود کو اور جو لوگ ایمان لائے تھے اس کے ساتھ اپنی رحمت سے، اور بچا دیا ان کو ایک بھاری عذاب سے

**خلاصہ تفسیر:** (غرض ان تمام حجتوں پر بھی ان لوگوں نے نہ مانا) اور (سامان عذاب شروع ہوا، سو) جب ہمارا حکم (عذاب کے لئے) پہنچا (اور طوفانی ہوا کا عذاب نازل ہوا تو) ہم نے ہود (علیہ السلام) کو اور جو ان کے ہمراہ اہل ایمان تھے ان کو اپنی عنایت سے (اس عذاب سے بچا لیا) اور ان کو ہم نے ایک بہت ہی سخت عذاب سے بچا لیا۔

**وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا:** بادصرصر یعنی طوفانی ہوا کا عذاب نازل ہوا، سورہ مؤمنون کے تیسرے رکوع میں جس قوم کا ذکر ہے بعض نے اس کو بھی قوم عاد پر محمول کیا ہے وہاں صیحہ یعنی سخت آواز کا عذاب مذکور ہے، سو ممکن ہے کہ یہ بھی ہوا ہو، واللہ اعلم۔

* * *

**فائدہ:** یعنی سات رات اور آٹھ دن مسلسل آندھی کا طوفان آیا جیسا کہ سورہ اعراف میں ہم ذکر کر چکے ہیں، مکان گر گئے چھتیں اڑ گئیں، درخت جڑ سے اکھڑ کر کہیں کے کہیں جا پڑے، ہوا ایسی مسموم تھی کہ آدمیوں کی ناک میں داخل ہو کر نیچے سے نکل جاتی اور جسم کو پارہ پارہ کر ڈالتی تھی، اس ہولناک عذاب سے ہم نے ہود علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو جو آخر میں چار ہزار تک پہنچ گئے تھے بالکل محفوظ رکھا اور ایمان و عمل صالح کی بدولت آخرت کے بھاری عذاب سے بھی ان کو نجات دے دی۔

وَتِلْكَ عَادٌ ۟ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۵۹﴾

اور یہ تھے عاد کے منکر ہوئے اپنے رب کی باتوں سے اور نہ مانا اس کے رسولوں کو اور مانا حکم ان کا جو سرکش تھے مخالف

**خلاصہ تفسیر:** (اب اوروں کو عبرت دلانے کے لئے فرماتے ہیں) اور یہ (جن کا ذکر ہوا) قوم عاد تھی، جنہوں نے اپنے رب کی آیات (یعنی دلائل اور احکام) کا انکار کیا، اور اس کے رسولوں کا کہنا نہ مانا، اور تمام تر ایسے لوگوں کے کہنے پر چلتے رہے جو ظالم (اور) ضدی تھے۔

**وَعَصَوْا رُسُلَهٗ:** یہ جو فرمایا کہ عاد نے رسولوں کا کہنا نہ مانا، حالانکہ ان کے پاس تو صرف ہود علیہ السلام کا تشریف لانا ثابت ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ پیغمبر مسئلہ توحید میں سب متفق ہیں، جب ہود علیہ السلام کا کہنا نہ مانا تو جتنے پیغمبر جو ان سے پہلے گزرے تھے بلکہ جو آئندہ بھی ہوئے ان سب ہی کی مخالفت ہوئی، اس میں اشارہ ہو گیا کہ بعض مقبولین (اہل اللہ) پر انکار ایسا ہی ہے جیسے سب مقبولین پر، کیونکہ ان سب کا مقصود ایک ہی ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی ان کے کھنڈرات کو چشم عبرت سے دیکھو کہ یہ وہ قوم عاد تھی جن کے بڑوں نے بہت طمطراق سے اپنے پروردگار کی باتوں کا مقابلہ کیا اور اس کے پیغمبروں کی نافرمانی کی، اور چھوٹوں نے بڑے شیطانوں کی پیروی کی، آخر دونوں تباہ و برباد ہوئے۔

**تنبیہ:** رسلہ شاید اس لیے فرمایا کہ ایک کی تکذیب سب پیغمبروں کی تکذیب ہے، کیونکہ توحید وغیرہ اصول دین میں سب متفق اور ایک دوسرے کے مصدق ہیں۔

وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ

اور پیچھے سے آئی ان کو اس دنیا میں پھٹکار قیامت کے دن بھی [1] سن لو عاد منکر ہوئے اپنے رب سے

اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ﴿۶۰﴾ ع ۵

سن لو پھٹکار ہے عاد کو جو قوم تھی ہود کی [2]

**خلاصہ تفسیر:** اور (ان افعال کا یہ نتیجہ ہوا کہ) اس دنیا میں بھی لعنت ان کے ساتھ ساتھ رہی اور قیامت کے دن بھی (ان کے ساتھ ساتھ رہے گی، چنانچہ دنیا میں اس کا اثر عذاب طوفان سے ہلاک ہونا تھا اور آخرت میں دائمی عذاب ہوگا) خوب سن لو، قوم عاد نے رب کے ساتھ کفر کیا، خوب سن لو (اس کفر کا یہ خمیازہ ہوا کہ) رحمت سے دوری ہوئی (دونوں جہاں میں) عاد کو جو کہ ہود کی قوم تھی۔

**اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ:** اس میں دلیل ہے کہ اہل حق سے عناد اور دشمنی رکھنے والوں پر ہلاکت کی دعا کرنا کمال اخلاق کے خلاف نہیں۔

* * *

**فائدہ:** [1] یعنی خدا کی لعنت (پھٹکار) دنیا میں ان کے پیچھے لگا دی گئی کہ جہاں جائیں ساتھ جائے اور قیامت تک جہاں ان کا ذکر ہو لعنت کے ساتھ ہو، بلکہ قیامت کے بعد بھی وہ ان کا پیچھا نہ چھوڑے گی، لعنت کا طوق ہمیشہ ان کے گلے میں پڑا رہے گا۔

**فائدہ:** [2] بعض مفسرین نے کہا کہ قیامت کے دن یوں پکارا جائے گا: اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ الخ (ہود: ۶۰)

**تنبیہ:** عاد کے ساتھ **قوم ھود** کا لفظ یا تو اس لیے بڑھایا کہ دونوں کا تصور سننے والے کے دماغ میں ساتھ ساتھ آئے، یعنی ''ہود'' کا کیا حال تھا، اور یہ اسی کی قوم تھی جس کا حشر یہ ہوا، اور ممکن ہے اس پر تنبیہ کرنا ہو کہ ''عاد'' دو ہیں: ''اولیٰ'' اور ''اخریٰ''، اسی لیے ایک جگہ فرمایا: **وَاَنَّهٗۤ اَهۡلَكَ عَادَا الۡاُوۡلٰى** (النجم: ۵۰) یہاں ''عاد اولیٰ'' مراد ہے جس کی طرف ''ہود'' مبعوث ہوئے تھے، واللہ اعلم۔

(وقف لازم) وَاِلٰى ثَمُوۡدَ اَخَاهُمۡ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَـكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ ؕ هُوَ اَنۡشَاَكُمۡ

اور ثمود کی طرف بھیجا ان کا بھائی صالح ۱؎ بولا اے قوم بندگی کرو اللہ کی کوئی حاکم نہیں تمہارا اس کے سوا، اسی نے بنایا تم کو

مِّنَ الۡاَرۡضِ وَاسۡتَعۡمَرَكُمۡ فِيۡهَا فَاسۡتَغۡفِرُوۡهُ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَيۡهِ ؕ اِنَّ رَبِّىۡ قَرِيۡبٌ مُّجِيۡبٌ ﴿۶۱﴾

زمین سے ۲؎ اور بسایا تم کو اس میں سو گناہ بخشواؤ اس سے اور رجوع کرو اس کی طرف، تحقیق میرا رب نزدیک ہے قبول کرنے والا ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** اب ثمود یعنی قوم صالح علیہ السلام کا قصہ بیان کیا جاتا ہے۔

اور ہم نے (قوم) ثمود کے پاس ان کے بھائی صالح (علیہ السلام) کو پیغمبر بنا کر بھیجا، انہوں نے (اپنی قوم سے) فرمایا اے میری قوم! (صرف) اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (ہونے کے قابل) نہیں (اس کا تم پر یہ انعام ہے کہ) اس نے تم کو زمین (کے مادہ سے) پیدا کیا اور تم کو اس (زمین) میں آباد کیا (یعنی وجود کے بعد نعمت بقاء بھی عطا فرمائی، ان دونوں میں سب نعمتیں آ گئیں، جب وہ ایسا منعم ہے) تو تم اپنے گناہ (شرک کفر وغیرہ) اس سے معاف کراؤ (یعنی ایمان لاؤ اور) پھر (ایمان لا کر) اس کی طرف (عبادت سے) متوجہ رہو (یعنی عمل صالح کرو) بیشک میرا رب (اس شخص سے) قریب ہے (جو اس کی طرف متوجہ ہو، اور اس شخص کی عرض) قبول کرنے والا ہے (جو اس سے گناہ معاف کراتا ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ ان کا قصہ اعراف میں گزر چکا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی اول آدم کو مٹی سے پیدا کیا پھر زمین سے غذائیں پیدا کیں جن سے نطفہ وغیرہ بنتا ہے جو مادہ ہے آدمی کی پیدائش کا۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی پیدا کر کے باقی رکھا، بقاء کا سامان کیا، زمین کے آباد کرنے کی ترکیبیں بتلائیں، تدابیر الہام فرمائیں، جب وہ ایسا منعم و محسن ہے تو چاہیے آدمی اسی کی طرف ایمان وطاعت کے ساتھ رجوع کرے اور کفر وشرک وغیرہ جو گناہ کر چکا ہے ان کی معافی چاہے، وہ ہم سے بالکل نزدیک ہے، ہر بات خود سنتا ہے اور جو توبہ اور استغفار صدق دل سے کیا جائے اسے سن کر قبول کرتا ہے۔

قَالُوۡا يٰصٰلِحُ قَدۡ كُنۡتَ فِيۡنَا مَرۡجُوًّا قَبۡلَ هٰذَاۤ اَتَنۡهٰٮنَاۤ اَنۡ نَّعۡبُدَ مَا يَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَا

بولے اے صالح تجھ سے تو ہم کو امید تھی اس سے پہلے، کیا تو ہم کو منع کرتا ہے کہ پرستش کریں جن کی پرستش کرتے رہے ہمارے باپ دادے

وَاِنَّنَا لَفِىۡ شَكٍّ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَاۤ اِلَيۡهِ مُرِيۡبٍ ﴿۶۲﴾

اور ہم کو تو شبہ ہے اس میں جس کی طرف تو بلاتا ہے ایسا کہ دل نہیں مانتا

**خلاصہ تفسیر:** وہ لوگ کہنے لگے اے صالح! تم تو اس کے قبل ہم میں ہونہار (معلوم ہوتے) تھے (یعنی ہم کو تم سے امید تھی کہ اپنی لیاقت و وجاہت سے فخر قوم اور ہمارے لئے مایہ ناز اور ہمارے سرپرست بنو گے، افسوس اس وقت جو باتیں کر رہے ہو اس سے تو ساری امیدیں خاک میں ملتی نظر آتی ہیں) کیا تم ہم کو ان چیزوں کی عبادت سے منع کرتے ہو جن کی عبادت ہمارے بڑے کرتے آئے ہیں (یعنی تم ان سے منع مت کرو) اور جس دین کی طرف تم ہم کو بلا رہے ہو (یعنی توحید) واقعی ہم تو اس کی طرف سے (بھاری) شبہ میں ہیں جس نے ہم کو تردد میں ڈال رکھا ہے

(کہ مسئلہ توحید ہمارے خیال ہی میں نہیں آتا)۔

وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ: بظاہر قوم ثمود کے حال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ توحید کے بالکل منکر تھے، پھر جو یہاں اس کو "شک" سے تعبیر کیا ہے تو شک سے مراد مطلق انکار ہے اگرچہ یقین جانب مخالف ہی کے ساتھ ہو۔

---

**فائدہ:** یعنی تجھ سے امید تھی کہ آگے چل کر بڑا فاضل اور نیک مرد ہوگا جس کو معزز بزرگوں کا جانشین سمجھ کر قوم سر پر بٹھائے گی، تیری پیشانی سے رشد وصلاح کے آثار ہویدا تھے، سب کو توقع تھی، کہ مستقبل قریب میں بڑا فائدہ تجھ سے پہنچے گا، رائے وتدبیر، صلاح ومشورہ سے اپنے قومی بھائیوں کی راہنمائی اور نہایت قوت قلب کے ساتھ آبائی مذہب کی حمایت وتائید کرے گا، یہ درست ہے کہ ابتداء سے تجھ کو بت پرستی مبغوض تھی اور عام قومی مذہب سے الگ تھلگ رہتا تھا، تاہم تیری سمجھ اور فطری قابلیت پر اعتماد کر کے ہم کو امید رہی کہ آگے چل کر عقل وتجربہ کی پختگی کے بعد یہ روش نہ رہے گی، لیکن افسوس یک بیک تو ایسی باتیں کرنے لگا جس نے تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا، تو نے ہمارے آباؤ اجداد کے قدیم مذہب کے خلاف اعلانیہ جہاد شروع کر کے سب توقعات خاک میں ملا دیں، کیا تو یہ چاہتا ہے کہ ہم ایک خدا کو لے کر سارے پرانے دیوتاؤں کو چھوڑ بیٹھیں، ہمارے نزدیک بزرگوں کی روش کے خلاف ایسا مسلک اختیار کرنا سخت شبہ کی چیز ہے جسے ہمارا دل کسی طرح نہیں مانتا،" موضح القرآن" میں ہے،" یعنی ہونہار لگتا تھا کہ باپ دادے کی راہ روشن کرے گا، تو لگا مٹانے۔"

---

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ

بولا اے قوم بھلا دیکھو تو اگر مجھ کو سمجھ مل گئی اپنے رب کی طرف سے اور اس نے مجھ کو دی رحمت اپنی طرف سے پھر کون بچائے مجھ کو

مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ﴿۶۳﴾

اس سے اگر اس کی نافرمانی کروں ۱؎ سو تم کچھ نہیں بڑھاتے میرا سوائے نقصان کے ۲؎

---

**خلاصہ تفسیر:** آپ نے (جواب میں) فرمایا کہ میری قوم! (تم جو کہتے ہو کہ میں توحید کی دعوت اور بت پرستی سے ممانعت نہ کروں تو) بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر میں اپنے رب کی جانب سے دلیل پر (قائم) ہوں (جس سے توحید ثابت ہے) اور اس نے مجھ کو اپنی طرف سے رحمت (یعنی نبوت) عطا فرمائی ہو (جس سے توحید کی دعوت کا میں مامور ہوں) سو (اس حالت میں) اگر میں خدا کا کہنا نہ مانوں (اور دعوت توحید کو ترک کر دوں جیسا تم کہتے ہو) تو (یہ بتلاؤ کہ) پھر مجھ کو خدا (کے عذاب) سے کون بچالے گا تو تم تو (ایسا برا مشورہ دے کر) سراسر میرا نقصان ہی کر رہے ہو (یعنی اگر خدانخواستہ قبول کرلوں تو نقصان کے سوا اور کیا ہاتھ آئے گا)۔

---

**فائدہ:** ۱؎ یعنی تمہارے شک وشبہ کی وجہ سے میں ایک صاف راستہ کیسے چھوڑ سکتا ہوں، خدا نے مجھ کو سمجھ دی اور اپنی رحمت عظیمہ سے منصب پیغمبری عطا کیا، اب اگر فرض کیجئے میں اس کی نافرمانی کرنے لگوں اور جن چیزوں کے پہنچانے کا حکم ہے نہ پہنچاؤں تو مجھ کو اس کی سزا سے کون بچا لے گا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی بجائے اس کے کہ اپنے سچے خیرخواہ اور محسن کی قدر کرتے مجھے فرائض دعوت وتبلیغ سے رک جانے کا مشورہ دے کر ناقابل تلافی نقصان پہنچانا چاہتے ہو، بعض سلف نے اس جملہ کا مطلب یہ لیا ہے کہ تمہاری گفتگو سے مجھ میں کوئی چیز نہیں بڑھتی بجز اس یقین کے کہ تم اپنا سخت نقصان کر رہے ہو، مگر سیاق کے مناسب پہلے معنی ہیں۔

وَيٰقَوۡمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمۡ اٰيَةً فَذَرُوۡهَا تَاۡكُلۡ فِىۡۤ اَرۡضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوۡهَا بِسُوۡٓءٍ فَيَاۡخُذَكُمۡ

اور اے قوم یہ اونٹنی ہے اللہ کی تمہارے لیے نشانی سو چھوڑ دو اسکو کھاتی پھرے اللہ کی زمین میں اور مت ہاتھ لگاؤ اسکو بری طرح پھر تو آ پکڑے گا تم کو

عَذَابٌ قَرِيۡبٌ ﴿۶۴﴾ فَعَقَرُوۡهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوۡا فِىۡ دَارِكُمۡ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعۡدٌ غَيۡرُ مَكۡذُوۡبٍ ﴿۶۵﴾

عذاب بہت جلد، پھر اس کے پاؤں کاٹے تب کہا فائدہ اٹھالو اپنے گھروں میں تین دن، یہ وعدہ ہے جو جھوٹا نہ ہوگا

**خلاصہ تفسیر:** چونکہ انہوں نے رسالت کے ثبوت کے لئے معجزہ کی بھی درخواست کی تھی اس لئے آپ نے فرمایا:

اور اے میری قوم! (تم جو معجزہ چاہتے ہو سو) یہ اونٹنی ہے اللہ کی جو تمہارے لئے دلیل (بنا کر ظاہر کی گئی) ہے (اور چونکہ وہ اللہ کی اونٹنی تھی اسی لیے اللہ کی اونٹنی کہلائی) سو (علاوہ اس کے یہ معجزہ ہونے کی وجہ سے میری رسالت پر دلیل ہے خود اس کے بھی کچھ حقوق ہیں، من جملہ ان کے یہ ہے کہ) اس کو چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں (گھاس چارہ) کھاتی پھرا کرے (اسی طرح اپنی باری کے دن پانی پیتی رہے جیسا کہ دوسری آیت میں ہے) اور اس کو برائی (اور تکلیف دہی) کے ساتھ ہاتھ بھی مت لگانا کبھی تم کو فوری عذاب آ پکڑے (یعنی دیر نہ لگے) سو انہوں نے (اس قدر اتمام حجت کے باوجود) اس (اونٹنی) کو مار ڈالا تو صالح (علیہ السلام) نے فرمایا (خیر) تم اپنے گھروں میں تین دن اور صبر کرلو (تین دن کے بعد عذاب آتا ہے، اور) یہ ایسا وعدہ ہے جس میں ذرا جھوٹ نہیں (کیونکہ من جانب اللہ ہے)۔

* * *

**فائدہ:** حضرت صالح علیہ السلام سے قوم نے معجزہ طلب کیا تھا، وہ انھیں دکھلا دیا، اس واقعہ کی پوری تفصیل اور الفاظ کی تشریح سورہ اعراف میں آٹھویں پارہ کے ختم پر گزر چکی ہے، وہاں ملاحظہ کرلی جائے۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا نَجَّيۡنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ بِرَحۡمَةٍ مِّنَّا وَمِنۡ خِزۡىِ يَوۡمِئِذٍ ؕ

پھر جب پہنچا حکم ہمارا بچا دیا ہم نے صالح کو اور جو ایمان لائے اس کے ساتھ اپنی رحمت سے اور اس دن کی رسوائی سے ۱

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الۡقَوِىُّ الۡعَزِيۡزُ ﴿۶۶﴾

بیشک تیرا رب وہی ہے زور والا زبردست ۲

**خلاصہ تفسیر:** سو (تین دن گزرنے کے بعد) جب ہمارا حکم (عذاب کے لئے) آپہنچا ہم نے صالح (علیہ السلام) کو اور جو ان کے ہمراہ اہل ایمان تھے ان کو اپنی عنایت سے (اس عذاب سے) بچالیا اور (ان کو کیسی چیز سے بچالیا) اس دن کی بڑی رسوائی سے بچالیا (کیونکہ قہر الٰہی میں مبتلا ہونے سے بڑھ کر کیا رسوائی ہوگی) بیشک آپ کا رب ہی قوت والا غلبہ والا ہے (جس کو چاہے سزا دے دے جس کو چاہے بچالے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی جب حکم عذاب پہنچا تو ہم نے صالح اور ان کے ساتھیوں کو بچا دیا، اور کاہے سے بچا دیا؟ اس دن کی رسوائی سے، وَمِنۡ خِزۡىِ يَوۡمِئِذٍ، نَجَّيۡنَا کی شرح وتفصیل ہے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی جسے چاہے ہلاک کردے اور جسے چاہے بچادے

وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۶۷﴾

اور پکڑ لیا ان ظالموں کو ہولناک آواز نے پھر صبح کو رہ گئے اپنے گھروں میں اوندھے پڑے ہوئے

كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَاۤ اِنَّ ثَمُوْدَاۡ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿۶۸﴾ ع

جیسے کبھی رہے ہی نہ تھے وہاں ۱؎ سن لو ثمود منکر ہوئے اپنے رب سے، سن لو پھٹکار ہے ثمود کو ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور ان ظالموں کو ایک نعرہ نے آدبایا (کہ وہ آواز تھی جبریل علیہ السلام کی) جس سے وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے (اور ان کی یہ حالت ہوگئی) جیسے ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے، خوب سن لو (قوم) ثمود نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا، خوب سن لو (اس کفر کا یہ خمیازہ ہوا کہ) رحمت سے ثمود کو دوری ہوئی۔

**وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ:** یہ واقعہ سورہ اعراف آیت: ۷۸ آٹھویں پارہ کے آخر میں آیا ہے وہاں: **فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ**، یعنی زلزلہ کا عذاب مذکور ہے، وجہ تطبیق اسی جگہ بیان کر دی گئی ہے وہاں ملاحظہ فرمایے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی بے نام ونشان ہوگئے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں ان پر عذاب آیا اس طرح کہ رات کو پڑے سوتے تھے فرشتہ نے چنگھاڑ ماری سب کے جگر پھٹ گئے، بعض آیات میں رَجْفَۃٌ کا لفظ آیا ہے، یعنی ''زلزلہ'' یا ''کپکپی'' سے ہلاک ہوئے، سورہ اعراف میں ہم اس کے متعلق تطبیق کی صورت لکھ چکے ہیں۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی جو اپنے پروردگار کی آیات واحکام سے منکر ہو اس کی یہ گت بنتی ہے اور ایسی پھٹکار پڑتی ہے کہ سن کر عبرت حاصل کرو۔

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿۶۹﴾

اور البتہ آچکے ہیں ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر بولے سلام، وہ بولا سلام ہے پھر دیر نہ کی لے آیا ایک بچھڑا تلا ہوا

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے قوم ثمود کا قصہ بیان ہوا، اکثر مقامات پر اس کے بعد قوم لوط کا قصہ مذکور ہے، یہ قرینہ ہے اس بات کا کہ یہاں بھی زیادہ مقصود قوم لوط ہی کا قصہ کا بیان کرنا ہے، درمیان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ بعض خاص وجوہ سے آگیا: ① ایک وجہ تو یہ کہ ان دونوں انبیاء میں خاص تعلق ہے کہ دونوں قصوں میں ملائکہ کی جماعت ایک ہی تھی، پھر دونوں پیغمبر رشتہ دار بھی ہیں اور مسکن بھی دونوں کا قریب تھا اور لوط علیہ السلام کے بارے میں ابراہیم علیہ السلام نے کلام بھی کیا تھا، چنانچہ **فما خطبکم** کے سوال وجواب سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان ملائکہ کا اصل مقصد قوم لوط پر عذاب نازل کرنا تھا، مگر چونکہ غالباً مستقل صاحب شریعت تو حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی تھے اور لوط علیہ السلام ان کی طرف سے بطور نیابت کے تھے اس لیے پہلے عذاب کی خبر ابراہیم علیہ السلام کو دینے آئے ② دوسری وجہ یہ کہ ان دونوں قصوں کے متصل آنے سے اشارہ ہوگیا کہ قہر اور رحمت دونوں کا مدار طاعت ومعصیت ہے، دیکھو وہی ملائکہ اطاعت کرنے والوں کے لیے مبشر تھے اور وہی ملائکہ نافرمانوں کے لیے منذر اور عذاب کے لانے والے بھی تھے ③ تیسری وجہ یہ کہ ایک قصہ دوسرے کے لیے متمم ہے۔

اور ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے (بشر کی شکل میں) ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس (ان کے فرزند اسحاق علیہ السلام کی) بشارت لے کر آئے (اگر چہ ملائکہ کے آنے کا مقصود اعظم قوم لوط کو ہلاک کرنا تھا جیسا کہ: **فما خطبکم** سے معلوم ہوتا ہے) اور (آنے کے وقت) انہوں نے سلام کیا، ابراہیم (علیہ السلام) نے بھی سلام کیا (پہچانا نہیں کہ یہ فرشتے ہیں، کیونکہ وہ آدمی کی شکل میں تھے بلکہ معمولی مہمان سمجھے اسی لیے کھانا لائے جیسا کہ **قوم منکرون** سے معلوم ہوتا ہے) پھر دیر نہیں لگائی کہ ایک تلا ہوا (موٹا لقولہ تعالیٰ **سمین**) بچھڑا لائے (اور ان کے سامنے رکھ دیا)۔

ثُمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ: اس میں دو باتوں پر دلالت ہے: ①ایک مہمان نوازی کے بعض آداب پر کہ ٹھہرانے میں اکرام کرے، پھر طعام سے اکرام کرے ②دوسرے اس بات پر کہ بعض اوقات بعض حکمتوں کے سبب کاملین کو بھی کشف نہیں ہوتا، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اور اسی طرح حضرت لوط علیہ السلام نے اول وہلہ میں ملائکہ کو نہیں پہچانا۔

---

**فائدہ:** اس سورت کے قصص کی ترتیب اعراف کی ترتیب کے موافق ہے، صرف قوم لوط کے قصہ سے پہلے یہاں ابراہیم علیہ السلام کا تھوڑا سا قصہ بیان فرمایا ہے، مگر تعبیر ایسی رکھی جو ظاہر کرتی ہے کہ مقصود اصلی لوط علیہ السلام کا قصہ بیان کرنا ہے چونکہ اس میں اور ابراہیم کے قصہ میں کئی طرح کی مناسبت اور تعلق پایا جاتا تھا اس لیے بطور تمہید وتوطیہ ابراہیم کا قصہ مذکور ہوا، لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم کے خالہ زاد بھائی ہیں جو آپ کے ہمراہ عراق سے ہجرت کر کے آئے، ایک ہی جماعت فرشتوں کی دونوں کے پاس بھیجی گئی، حضرت ابراہیم نے قوم لوط کی ہلاکت کے مسئلہ میں فرشتوں سے بحث کی جو آگے آتی ہے یہ فرشتے نہایت حسین وجمیل نوجوانوں کی شکل میں لوط علیہ السلام کی طرف جاتے ہوئے حضرت ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر آئے کہ حق تعالیٰ نے ان کو اپنا خلیل بنایا ہے اور اس بڑھاپے میں حضرت سارہ کے بطن سے بیٹا عطا کرنے والا ہے، نیز یہ کہ قوم لوط کے بدمعاشوں اور ظالموں کے وجود سے عنقریب دنیا پاک کر دی جائے گی جس میں حضرت ابراہیم وحضرت لوط کے متبعین کو کسی قسم کا ضرر نہ پہنچے گا، فرشتوں نے ابراہیم کو سلام کیا، آپ نے جواب دیا مگر اول وہلہ میں پہچان نہ سکے، جیسے ابتداء حضرت لوط نے بھی ان کو نہیں پہچانا، (بلکہ صحیحین کی حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ جبرائیل آدمی کی شکل میں حضور ﷺ سے سوال وجواب کرتے رہے، جب اٹھ کر چلے گئے تب آپ کو بتلایا گیا کہ یہ جبرائیل تھے) گویا متنبہ کر دیا کہ نبی کو بھی فرشتہ وغیرہ کا علم ضروری خدا کے دینے سے ہوتا ہے، وہ کسی وقت مخفی رکھنا چاہے تو کسی کی قدرت نہیں کہ معلوم کر سکے، بہرحال ابراہیم علیہ السلام انھیں آدمی سمجھ کر مہمان نوازی کے لیے اٹھے اور نہایت فربہ بچھڑا بھون تل کر سامنے حاضر کیا۔

---

فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ

پھر جب دیکھا ان کے ہاتھ نہیں آتے کھانے پر تو کھٹکا اور دل میں ان سے ڈرا، وہ بولے مت ڈر

اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ؕ﴿۷۰﴾

ہم بھیجے ہوئے آئے ہیں طرف قوم لوط کی ؎

---

**خلاصہ تفسیر:** (یہ تو فرشتے تھے کیوں کھاتے) سو جب ابراہیم (علیہ السلام) نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کھانے تک نہیں بڑھتے تو ان سے متوحش ہوئے اور ان سے دل میں خوف زدہ ہوئے (کہ یہ مہمان تو نہیں کوئی مخالف نہ ہوں کہ فاسد ارادہ سے آئے ہوں اور میں گھر میں ہوں احباب واصحاب پاس نہیں، یہاں تک کہ بے تکلفی سے اس کو زبان سے بھی ظاہر کر دیا لقولہ تعالیٰ: قال انا منکم وجلون) وہ فرشتے کہنے لگے ڈرو مت (ہم آدمی نہیں فرشتے ہیں، آپ کے پاس بشارت لے کر آئے ہیں کہ آپ کے ایک فرزند پیدا ہوگا اسحاق، اور اس کے بعد ایک فرزند ہوگا یعقوب، بشارت اس لئے کہا کہ اول تو اولاد خوشی کی چیز ہے، پھر ابراہیم علیہ السلام بوڑھے ہو گئے تھے، بیوی بھی بہت بوڑھی تھیں، اولاد کی امید نہ رہی تھی، آپ نے نور نبوت سے توجہ کر کے پہچان لیا کہ واقعی فرشتے ہیں، لیکن فراست نبوت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس کے سوا اور بھی کسی بڑے کام کے لئے آئے ہیں، اس لئے اس کی تعیین کے ساتھ سوال کیا: فما خطبکم یعنی کس کام کے لئے آئے ہیں؟ اس وقت انہوں نے کہا کہ) ہم قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں (تا کہ ان کو سزا کفر میں ہلاک کریں، ان میں تو یہ گفتگو ہو رہی تھی)۔

وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً: ابراہیم علیہ السلام کو فرشتوں کے نہ کھانے سے جو خوف ہوا وہ ظاہری اسباب کے اعتبار سے طبعی خوف تھا، اگرچہ اتنے مجمع کے مقابلہ کے لیے آپ کے خادم موجود تھے لیکن خاص گھر میں تو کوئی نہ تھا، پھر ان کو فرشتہ یقین کر لینا صرف ان کے دعوی کی بنیاد پر نہ تھا، اپنی

قوت قدسیہ کے ذریعہ سے متوجہ ہو کر یقین کیا جس سے اولاً توجہ نہ فرمائی تھی، جیسے بعض اوقات محسوسات میں بھی یہ قصہ پیش آتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ کہ آخر یہ کون ہیں، کس غرض سے آئے ہیں؟ ہم کھانا پیش کرتے ہیں، یہ اسے ہاتھ نہیں لگاتے، اس وقت کے دستور کے موافق جو مہمان کھانے سے انکار کرتا، سمجھا جاتا تھا کہ یہ کسی اچھے خیال سے نہیں آیا، ابراہیم علیہ السلام گھبرائے کہ اگر آدمی ہیں تو کھانے سے انکار کرنا ضرور کچھ معنی رکھتا ہے اور فرشتے ہیں تو نہ معلوم کس مطلب کے لیے بھیجے گئے ہیں، آیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی یا میری قوم کے حق میں کوئی ناخوشگوار چیز لے کر آئے، اسی حیص وبیص میں زبان سے اظہار بھی کر دیا: اِنَّا مِنۡكُمۡ وَجِلُوۡنَ (الحجر: ۵۲) یعنی ہم کو تم سے اندیشہ ہے، عموماً مفسرین نے ابراہیم کے خوف کی یہ ہی توجیہات کی ہیں، مگر حضرت شاہ صاحب نے میرے نزدیک نہایت لطیف توجیہ کی کہ فرشتوں کے ساتھ جو عذاب الٰہی تھا اور شان غضب وانتقام کے مظہر بن کر قوم لوط کی طرف جا رہے تھے اس کا طبعی اثر یہ تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کے قلب پر ایک طرح کے خوف وخشیت کی کیفیت طاری ہوئی جس کا اظہار انہوں نے اِنَّا مِنۡكُمۡ وَجِلُوۡنَ (الحجر: ۵۲) کہہ کر کیا، یعنی ہم کو تم سے ڈر لگتا ہے، واللہ اعلم۔

**فائدہ:** ۲ یعنی ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہم فرشتے ہیں، جو قوم لوط کو تباہ کرنے کیلئے بھیجے گئے ہیں، آپ کچھ اندیشہ ضر رکا نہ کیجئے۔

**وَامۡرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتۡ فَبَشَّرۡنٰهَا بِاِسۡحٰقَ ۙ وَمِنۡ وَّرَآءِ اِسۡحٰقَ يَعۡقُوۡبَ ﴿۷۱﴾**

اور اس کی عورت کھڑی تھی تب وہ ہنس پڑی پھر ہم نے خوشخبری دی اس کو اسحاق کے پیدا ہونے کی اور اسحاق کے پیچھے یعقوب کی

**خلاصہ تفسیر:** اور ابراہیم کی بیوی (حضرت سارہ کہیں) کھڑی (سن رہی) تھیں پس (خوشی سے) ہنسیں (اور بولتی پکارتی آئیں، کیونکہ انہیں اسماعیل علیہ السلام کے بطن ہاجرہ سے پیدا ہونے کے بعد اولاد کی تمنا تھی، اور تعجب سے ماتھے پر ہاتھ مارا، جیسا کہ: فَصَكَّتۡ وَجۡهَهَا سے معلوم ہوتا ہے) سو ہم نے (یعنی ہمارے فرشتوں نے) ان کو (مکرر) بشارت دی اسحاق (کے پیدا ہونے) کی، اور اسحاق کے پیچھے یعقوب کی (جو کہ اسحاق کے فرزند ہوں گے، جس سے معلوم ہو گیا کہ تمہارے ہاں فرزند ہو گا اور زندہ رہے گا یہاں تک کہ وہ بھی صاحب اولاد ہو گا)۔

**وَامۡرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتۡ:** سارہ علیہا السلام پہلے اس جگہ نہ تھیں، شاید پردہ میں ہوں، پھر جب معلوم ہو گیا کہ یہ فرشتے ہیں سامنے چلی آئیں جیسا کہ فاقبلت امراته فی صرة سے معلوم ہوتا ہے، اور ہنسنا یہ عورتوں کا طبعی امر ہے کہ بسا اوقات خوشی کی بات پر مردوں کو چاہے ہنسی نہ آئے عورتوں کو آ جاتی ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی حضرت سارہ جو مہمانوں کی خدمت گزاری یا اور کسی کام کے لیے وہاں کھڑی تھیں اس ڈر کے رفع ہونے سے خوش ہو کر ہنس پڑیں، حق تعالیٰ نے خوشی پر اور خوشیاں سنائیں کہ تجھ کو اس عمر میں بیٹا ملے گا، (اسحاق علیہ السلام) اور اس کی نسل سے ایک پوتا یعقوب عطا ہو گا، جس سے ایک بڑی بھاری قوم بنی اسرائیل اٹھنے والی ہے یہ بشارت حضرت سارہ کو شاید اس لیے سنائی گئی کہ حضرت ابراہیم کے ایک بیٹا (اسمٰعیل علیہ السلام) حضرت ہاجرہ کے بطن سے پہلے ہی موجود تھا، سارہ کو تمنا تھی کہ مجھے بھی بیٹا ملے، مگر بوڑھی ہو کر مایوس ہو چکی تھی، اس وقت یہ بشارت ملی، بعض علماء نے بیان کیا، علماء نے وَمِنۡ وَّرَآءِ اِسۡحٰقَ يَعۡقُوۡبَ سے استدلال کیا ہے کہ حضرت اسحاق "ذبیح" نہ تھے، اسماعیل علیہ السلام تھے۔ (راجع ابن کثیر)

**قَالَتۡ يٰوَيۡلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوۡزٌ وَّهٰذَا بَعۡلِىۡ شَيۡخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَىۡءٌ عَجِيۡبٌ ﴿۷۲﴾**

بولی اے خرابی کیا میں بچہ جنوں گی، اور میں بڑھیا ہوں اور یہ خاوند میرا ہے بوڑھا ۱ یہ تو ایک عجیب بات ہے ۲

**خلاصہ تفسیر:** (اس وقت حضرت سارہ) کہنے لگیں کہ ہائے خاک پڑے اب میں بچہ جنوں گی بڑھیا ہو کر اور یہ میرے میاں (بیٹھے) ہیں بالکل بوڑھے، واقعی یہ بھی عجیب بات ہے۔

ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّھٰذَا بَعْلِیْ شَیْخًا: اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ ظاہری اسباب کے اعتبار سے کسی بات پر تعجب کرنا مسبب الاسباب یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کامل یقین رکھنے کے خلاف نہیں۔

فائدہ: ١ یہاں یٰوَیْلَتٰی کا لفظ ایسا ہے جیسے ہمارا محاورات میں عورتیں کہہ دیتی ہیں کہ میں ''نگوڑی'' کیا اس بڑھاپے میں اولاد جنوں گی، حضرت سارہ کی عمر کہتے ہیں اس وقت ننانوے سال تھی اور حضرت ابراہیم سو سال یا اس سے بھی متجاوز تھے۔

فائدہ: ٢ یعنی ایسا ہو تو بالکل انوکھی اور عجیب وغریب بات ہوگی۔

قَالُوْٓا اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ رَحْمَتُ اللّٰہِ وَبَرَکٰتُہٗ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الْبَیْتِ ط اِنَّہٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ﴿۷۳﴾

وہ بولے کیا تو تعجب کرتی ہے اللہ کے حکم سے اللہ کی رحمت سے اور برکتیں تم پر اے گھر والو، تحقیق اللہ ہے تعریف کیا گیا بڑائیوں والا

خلاصہ تفسیر: فرشتوں نے کہا کہ کیا (خاندان نبوت میں رہ کر اور ہمیشہ معجزات وعجیب معاملات دیکھ دیکھ کر) تم خدا کے کاموں میں تعجب کرتی ہو (پھر تعجب کیسا اور خصوصاً) اس خاندان کے لوگوں پر تو اللہ تعالیٰ کی (خاص) رحمت اور اس کی (انواع واقسام کی) برکتیں (نازل ہوتی رہتی) ہیں، بیشک وہ (اللہ تعالیٰ) تعریف کے لائق (اور) بڑی شان والا ہے (وہ بڑے سے بڑا کام کرسکتا ہے، سو تعجب کے بجائے اس کی تعریف اور شکر میں مشغول ہو)۔

قَالُوْٓا اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ: یہ دلیل ہے کہ ملائکہ کا غیر نبی کے ساتھ کلام کرنا ممکن ہے۔

فائدہ: یعنی جس گھرانے پر خدا کی اس قدر رحمتیں اور برکتیں نازل رہی ہیں اور جنہیں ہمیشہ معجزات وخوارق دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہا، کیا ان کے لیے یہ کوئی تعجب کا مقام ہے؟ ان کا تعجب کرنا خود قابل تعجب ہے، انھیں لائق ہے کہ بشارت سن کر تعجب کی جگہ خدا کی تحمید وتمجید کریں کہ سب بڑائیاں اور خوبیاں اسی کی ذات میں جمع ہیں۔

تنبیہ: بعض محققین نے لکھا ہے کہ نمازوں میں جو درود شریف پڑھتے ہیں اسکے الفاظ میں اس آیت سے اقتباس کیا گیا ہے۔

فَلَمَّا ذَھَبَ عَنْ اِبْرٰھِیْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْہُ الْبُشْرٰی یُجَادِلُنَا فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۴﴾

پھر جب جاتا رہا ابراہیم سے ڈر اور آئی اس کو خوش خبری جھگڑنے لگا ہم سے قوم لوط کے حق میں

خلاصہ تفسیر: پھر جب ابراہیم (علیہ السلام) کا وہ خوف زائل ہوگیا (یعنی جب فرشتوں نے لَا تَخَفْ کہہ دیا کہ ڈرو نہیں، اور خود بھی ان کا فرشتہ ہونا معلوم ہوگیا) اور ان کو خوشی کی خبر ملی (کہ اولاد پیدا ہوگی) تو (ادھر سے بےفکر ہو کر قوم لوط کی حالت کی طرف متوجہ ہوئے کہ وہ ہلاک کی جائے گی اور) ہم سے لوط (علیہ السلام) کی قوم کے بارے میں (اصرار ومبالغہ کے ساتھ سفارش کی، اصرار کی وجہ سے وہ سفارش بظاہر) جدال (ومباحثہ کی صورت تھا) کرنا شروع کیا (جس کی تفصیل دوسری آیت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ وہاں تو لوط علیہ السلام بھی موجود ہیں اس لئے عذاب نہ بھیجا جائے کہ انہیں نقصان پہنچے گا، مطلب یہ ہوگا کہ اس بہانہ سے قوم بچ جائے جیسا فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ سے ظاہرا معلوم ہوتا ہے اور شاید ابراہیم علیہ السلام کو ان کے ایمان لانے کی امید ہو)۔

یُجَادِلُنَا فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ: یہ مجادلہ کی گفتگو اگرچہ فرشتوں سے ہوئی تھی مگر حق تعالیٰ سے عرض کرنا مقصود تھا اس لیے یجادلنا فرمایا کہ ہم سے جدال شروع کیا۔

إِنَّ إِبْرَٰهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّٰهٌ مُّنِيبٌ ﴿٧٥﴾ يَٰٓإِبْرَٰهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هَٰذَآ ۖ إِنَّهُۥ قَدْ جَآءَ أَمْرُ رَبِّكَ ۖ

البتہ ابراہیم تحمل والا نرم دل ہے رجوع رہنے والا،اے ابراہیم! چھوڑ یہ خیال، وہ تو آچکا حکم تیرے رب کا

وَإِنَّهُمْ ءَاتِيهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُودٍ ﴿٧٦﴾

اوران پرآتا ہے عذاب جولوٹایانہیں جاتا

**خلاصہ تفسیر:** واقعی ابراہیم بڑے حلیم الطبع رحیم المزاج رقیق القلب تھے (اس لئے سفارش میں مبالغہ کیا)۔

(ارشاد ہوا کہ) اے ابراہیم! (اگر چہ بہانہ بظاہر لوط علیہ السلام کا ہے مگر اصلی مطلب معلوم ہوگیا کہ قوم کی سفارش مقصود ہے،سو) اس بات کو جانے دو (یہ ایمان نہ لائیں گے اسی لئے) تمہارے رب کا حکم (اس کے متعلق) آچکا ہے،اور (اس کے سبب سے) ان پر ضرور ایسا عذاب آنے والا ہے جو کسی طرح ہٹنے والا نہیں (اس لئے اس بارے میں کچھ کہنا سننا بیکار ہے، رہا لوط علیہ السلام کا وہاں ہونا،سوان کو اور سب ایمان والوں کو وہاں سے علیحدہ کر دیا جائے گا،اس کے بعد عذاب آئے گا تا کہ انہیں نقصان نہ پہنچے، چنانچہ اس پر بات ختم ہوگئی)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی ادھر سے مطمئن ہوئے تو فوراً قوم لوط کے مسئلہ میں فرشتوں سے بحث شروع کردی،جس کا خلاصہ سورہ عنکبوت میں بیان فرمایا کہ فرشتوں نے ابراہیم کو مطلع کیا کہ ہم ان بستیوں کو ہلاک کرنے آئے ہیں،ابراہیم بولے کہ ان میں تو خود لوط علیہ السلام موجود ہیں (پھر ایک پیغمبر کو ان میں موجود ہوتے ہوئے کیسے ہلاک کیے جاسکتے ہیں؟) فرشتوں نے کہا ہم سب کو جانتے ہیں جو وہاں رہتے ہیں لوط اور اس کے متعلقین کو وہاں سے علیحدہ کر کے عذاب نازل کیا جائے گا،تفاسیر میں اس بحث کی جو تفاصیل بیان ہوئی ہیں اللہ جانے کہاں تک صحیح ہیں،بہرحال اسی بحث کو مبالغۃ لفظ یجادلنا سے تعبیر فرمایا،جس سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اپنی فطری شفقت،نرم خوئی اور رحم دلی سے اس قوم پر ترس کھا کر حق تعالیٰ کی جناب میں کچھ سفارش کرنا چاہتے تھے اسی کا جواب دیا کہ اس خیال کو چھوڑیے ان ظالموں کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے اب خدا کا حکم واپس نہیں ہوسکتا،عذاب آ کر رہے گا جو کسی سفارش یا دعاء وغیرہ سے نہیں ٹل سکتا۔

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِىٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَقَالَ هَٰذَا يَوْمٌ عَصِيبٌ ﴿٧٧﴾

اور جب پہنچے ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس غمگین ہوا ان کے آنے سے اور تنگ ہوا دل میں اور بولا آج دن بڑا سخت ہے

**خلاصہ تفسیر:** اور (ابراہیم علیہ السلام کے پاس سے فارغ ہوکر) جب ہمارے وہ فرشتے لوط (علیہ السلام) کے پاس آئے تو لوط ان کے (آنے کی) وجہ سے (اس لئے) مغموم ہوئے (کہ وہ بہت حسین نوجوانوں کی شکل میں آئے تھے اور لوط علیہ السلام نے انہیں آدمی سمجھا اور اپنی قوم کی نامعقول حرکت کا خیال آیا) اور (اس وجہ سے) ان کے (آنے کے) سبب بہت تنگدل ہوئے (اور غایت تنگدلی سے) کہنے لگے کہ آج کا دن بہت بھاری ہے (کہ ان کی تو ایسی صورتیں اور قوم کی یہ حرکتیں اور میں تن تنہا، دیکھئے کیا ہوتا ہے؟!)۔

* * *

**فائدہ:** فرشتے نہایت حسین وجمیل بے ریش و بروت نوجوانوں کی شکل میں تھے،ابتداء حضرت لوط نے نہ پہچانا کہ فرشتے ہیں،معمولی مہمان سمجھے،ادھر اس قوم کی بے حیائی اور خوئے بد معلوم تھی،سخت فکرمند اور تنگ دل ہوئے کہ یہ بدمعاش اور مہمانوں کا پیچھا کریں گے،مہمانوں کو چھوڑنا بھی مشکل اور ان خبیثوں کے ہاتھوں سے چھڑانا بھی دشوار،گویا ساری قوم سے لڑائی مول لینا ہے۔

وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ

اور آئی اس کے پاس قوم اس کی دوڑتی بے اختیار، اور آگے سے کر رہے تھے برے کام ۱؎ بولا اے قوم یہ میری بیٹیاں حاضر ہیں

هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ﴿۷۸﴾

یہ پاک ہیں تم کو ان سے سو ڈرو تم اللہ سے اور مت رسوا کرو مجھ کو میرے مہمانوں میں، کیا تم میں ایک مرد بھی نہیں نیک چلن ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور ان کی قوم (نے جو یہ خبر سنی تو) ان کے (یعنی لوط علیہ السلام کے) پاس دوڑے ہوئے آئے اور پہلے سے نامعقول حرکتیں کیا ہی کرتے تھے (اسی خیال سے اب بھی آئے) لوط (علیہ السلام بڑے گھبرائے اور براہ خوشامد) فرمانے لگے کہ اے میری قوم! یہ میری (بہو) بیٹیاں (جو تمہارے گھروں میں ہیں) موجود ہیں وہ تمہارے (نفس کی کامرانی کے) لئے (اچھی) خاصی ہیں سو (مردوں پر نگاہ کرنے کے بارے میں) اللہ سے ڈرو اور میرے مہمانوں میں مجھ کو فضیحت (رسوا) مت کرو (یعنی ان مہمانوں کو کچھ کہنا مجھے شرمندہ اور رسوا کرنا ہے، اگر ان کی رعایت نہیں کرتے کہ مسافر ہیں تو میرا خیال کرو کہ تم میں رہتا سہتا ہوں، افسوس اور تعجب ہے) کیا تم میں کوئی بھی (معقول آدمی اور) بھلا مانس نہیں (کہ اس بات کو سمجھے اور اوروں کو سمجھائے)۔

**يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ:** یہاں مجازاً بیٹیوں سے امت کی عورتیں مراد ہیں جو اُن کے گھروں میں موجود تھیں، کیونکہ نبی امت کے لیے باپ ہوتا ہے، اور حقیقی معنی یعنی خود لوط علیہ السلام کی بیٹیاں اس سے مراد نہیں ہوسکتیں کہ آپ کی دو یا تین بیٹیاں تھیں، سو کس کس سے ان کا نکاح کرتے، وہ تو سارے اسی مرض میں مبتلا تھے۔

روح المعانی میں ہے کہ مطلب یہ کہ ان سے نکاح کرلو، اس سے مقصود اپنے مہمانوں کی آبرو بچانا تھا، اس میں دلالت ہے کہ مصلحت شرعی مقدم ہے عرف اور رسم ورواج پر، اور شریعت کے مقابلہ میں عرف کا اعتبار نہیں، چنانچہ اپنی لڑکیوں کا خود پیش کرنا عرف کے خلاف تھا، لیکن آپ نے مہمانوں کی عزت وآبرو بچانے کی غرض سے جو کہ مقصود شرعی ہے اس عرف کی کچھ پرواہ نہ کی۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی اس قوم کو نامعقول حرکتوں اور خلاف فطرت فواحش کی جو عادت پڑی ہوئی تھی کہاں چین سے بیٹھنے دیتی، وہ ایسے خوبصورت لڑکوں کی خبر پاتے ہی نہایت بے حیائی کے ساتھ لوط علیہ السلام کے مکان پر اندھا دھند چڑھ دوڑے اور پوری قوت وشدت سے مطالبہ کیا کہ مہمان ان کے حوالے کردیئے جائیں کیونکہ ہم پہلے ہی منع کرچکے ہیں کہ تم کسی مرد کو اپنا مہمان نہ بنایا کرو، یہاں آنے والے مہمان کو ہم پر چھوڑ دو، ہم جو چاہیں کریں۔

**فائدہ:** ۲؎ حضرت لوط نے مہمانوں کی آبرو بچانے کے لیے ہر قسم کی کوشش کی، آخری بات اس شہوت پرست قوم سے یہ کہی کہ ظالمو! یہ میری بیٹیاں تمہارے لیے حاضر ہیں، نکاح ہوجانے پر اس سے بطریق حلال تمتع کرسکتے ہو جو نہایت پاکیزہ اور شائستہ طریقہ ہے، خدا سے ڈرنا چاہیے کہ پاک اور مشروع طریقہ کو چھوڑ کر ایسے خلاف فطرت گندے کاموں میں مبتلا ہوتے ہو کم ازکم میری ہی رعایت کرو میں ان مقدس مہمانوں کے سامنے شرمندہ اور رسوا نہ ہوں، مہمان کی بے عزتی میزبان کی بے عزتی ہے، کیا تم میں ایک شخص بھی نہیں جو سیدھی سیدھی باتوں کو سمجھ کر نیکی اور تقویٰ کی راہ اختیار کرے۔

**تنبیہ:** هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ سے مراد عام طور پر اس قوم کی لڑکیاں ہیں جن کو تجوزاً ''بیٹیاں'' کہا گیا، کیونکہ پیغمبر امت کے حق میں روحانی باپ ہوتا ہے، اور ویسے بھی محاورات میں قوم کے بڑے بوڑھے سب کی لڑکیوں کو اپنی ''بیٹیاں'' کہہ کر پکار سکتے ہیں، اور اگر خاص لوط علیہ السلام کی بیٹیاں مراد ہوں تو شاید ان میں سے بعض ممتاز لوگوں کے نکاح کے لیے پیش کی ہوں گی، اس وقت کافر کا نکاح مسلمان عورت سے جائز تھا، بعض مفسرین نے فرمایا کہ لوط علیہ السلام کا مقصود اس قول سے نکاح وغیرہ کچھ نہ تھا، بلکہ ان کی زیادتیوں سے عاجز ہوکر مہمانوں کی آبرو بچانے کی دھن میں انتہائی تواضع سے یہ

لفظ کہے، تاکہ ان میں غیرت وحیاء کا کچھ شائبہ اور آدمیت کا کوئی ذرہ بھی موجود ہو تو یہ لفظ سن کر جھینپ جائیں، اور نرمی اختیار کرلیں، مگر وہ ایسے حیادار کاہے کو تھے؟ کان پر جوں بھی نہ رینگی، پہلے سے زیادہ بے باک ہوکر بے غیرتی کا مظاہرہ کرنے لگے۔

قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ﴿۷۹﴾

بولے تو تو جانتا ہے ہم کو تیری بیٹیوں سے کچھ غرض نہیں، اور تجھ کو تو معلوم ہے جو ہم چاہتے ہیں ۱؎

قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ﴿۸۰﴾

کہنے لگا کاش مجھ کو تمہارے مقابلہ میں زور ہوتا، یا جا بیٹھتا کسی مستحکم پناہ میں ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** وہ لوگ کہنے لگے کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہم کو آپ کی ان (بہو) بیٹیوں کی کوئی ضرورت نہیں (کیونکہ عورتوں سے ہم کو رغبت ہی نہیں) اور آپ کو تو معلوم ہے (یہاں آنے سے) جو ہمارا مطلب ہے، لوط (علیہ السلام نہایت عاجز اور زچ ہوکر) فرمانے لگے کیا خوب ہوتا اگر میرا تم پر کچھ زور چلتا (کہ خود تمہارے شر کو دفع کرتا) یا کسی مضبوط پایہ کی پناہ پکڑتا (مراد یہ کہ میرا کوئی کنبہ قبیلہ ہوتا کہ میری مدد کرتا)۔

اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ: یہ بات آپ نے طبعی تقاضے کی وجہ سے فرمائی، کیونکہ طبعی تقاضے کے درجہ میں ظاہری اسباب کی طرف خیال جایا کرتا ہے، ترمذی کی حدیث میں ہے کہ لوط علیہ السلام کے بعد سب انبیاء جتھے والے ہوئے تاکہ پریشانی نہ ہونے پائے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ پھر اتنی حجت وتکرار کیوں کررہا ہے، ہم اپنا ناپاک ارادہ پورے کیے بدون نہ ہٹیں گے۔

**فائدہ:** ۲؎ لوط علیہ السلام کی زبان سے انتہائی گھبراہٹ اور پریشانی میں بے ساختہ الفاظ نکلے کہ کاش مجھ میں بذات خود تم سب سے لڑنے اور مقابلہ کرنے کی طاقت ہوتی یا کوئی طاقتور اور مضبوط پناہ دینے والا ہوتا، یعنی میرا کنبہ اور جتھا یہاں ہوتا، حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "يَرْحَمُ اللهُ لُوْطًا لَقَدْ كَانَ يَأْوِيْ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ" خدا لوط پر رحم فرمائے، بیشک وہ مضبوط مستحکم پناہ حاصل کررہے تھے، یعنی خداوند قدوس کی مگر اس وقت سخت گھبراہٹ اور بیحد ضیق کی وجہ سے ادھر خیال نہ گیا، بے ساختہ ظاہری اسباب پر نظر گئی، لوط کے بعد جو انبیاء مبعوث ہوئے سب بڑے جتھے اور قبیلے والے تھے۔

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ

مہمان بولے اے لوط ہم بھیجے ہوئے ہیں تیرے رب کے ہرگز نہ پہنچ سکیں گے تجھ تک ۱؎ سو لے نکل اپنے لوگوں کو کچھ رات سے اور مڑ کر نہ دیکھے

مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ۭ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ۭ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۭ

تم میں کوئی مگر عورت تیری، کہ اس کو پہنچ کر رہے گا جو ان کو پہنچے گا ۲؎ ان کے وعدہ کا وقت ہے صبح

اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ﴿۸۱﴾

کیا صبح نہیں ہے نزدیک ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** (فرشتوں نے لوط علیہ السلام کا جو اس قدر اضطراب دیکھا تو) فرشتے کہنے لگے اے لوط! (ہم آدمی نہیں جو آپ اس قدر گھبراتے ہیں) ہم تو آپ کے رب کے بھیجے ہوئے (فرشتے) ہیں (یہ لوگ ہمارا تو کیا کرسکتے ہیں اور آپ اپنے لئے بھی اندیشہ نہ کریں) آپ

تک ( بھی ) ہرگز ان کی رسائی نہیں ہوگی ( کہ آپ کو کچھ تکلیف پہنچا سکیں اور ہم ان پر عذاب نازل کرنے آئے ہیں ) سو آپ رات کے کسی حصہ میں اپنے گھر والوں کو لے کر ( یہاں سے باہر ) چلے جایئے ، اور تم میں سے کوئی پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھے (یعنی سب جلدی چلے جائیں ) ہاں! مگر آپ کی بیوی (مسلمان نہ ہونے کی وجہ سے ساتھ نہ جائے گی ) اس پر بھی وہی آفت آنے والی ہے جو اور لوگوں پر آئے گی (اور ہم رات کے وقت نکل جانے کو اس لئے کہتے ہیں کہ ) ان کے (عذاب کے ) وعدہ کا وقت صبح کا وقت ہے ( لوط علیہ السلام بہت پریشان ہو گئے تھے فرمانے لگے کہ جو کچھ ہونا ہے ابھی ہوجائے ، فرشتوں نے کہا) کیا صبح کا وقت قریب نہیں (یعنی آپ گھبرایئے نہیں، صبح بھی ابھی آیا چاہتی ہے )۔

***

**فائدہ:** ۱ جب لوط علیہ السلام کے اضطراب وقلق کی حد ہوگئی، تب مہمانوں نے کہا کہ حضرت آپ کس فکر میں ہیں مطلق پریشان نہ ہوں، ہم خدا کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں جو ان کو تباہ و ہلاک کرنے کے لیے آئے ہیں یہ خبیث ہمارا تو کیا بگاڑ سکتے آپ تک بھی نہیں پہنچ سکیں گے، تفاسیر میں ہے کہ وہ شریر لوگ دروازہ توڑ کر یا دیوار پھاند کر اندر گھسے جاتے تھے، تب جبرائیل علیہ السلام نے خدا سے اجازت لے کر لوط علیہ السلام کو علیحدہ بٹھا دیا اور ایک ذرا بازو ان ملعونوں کی طرف ہلایا، جو سب کے سب نپٹ اندھے ہو گئے اور کہنے لگے کہ بھاگو! لوط کے مہمان تو بڑے جادوگر معلوم ہوتے ہیں۔

**فائدہ:** ۲ یعنی صبح کو عذاب آنے والا ہے، تھوڑی رات رہے آپ اپنے متعلقین کو لے کر یہاں سے تشریف لے جایئے اور اپنے ہمراہیوں کو ہدایت کر دیجئے کہ جلدی کریں اور کوئی پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھے، ہاں تیری عورت کے وہ ساتھ نہ جائے گی یا پیچھے پھر کر دیکھے گی اسی طرح اس عذاب کی لپیٹ میں آجائے گی جو سب قوم کو پہنچنے والا ہے، کہتے ہیں اسی عورت نے قوم کو مہمانوں کی آمد سے مطلع کیا تھا۔

**فائدہ:** ۳ یعنی خوش ہوجایئے اب ان ظالموں کے ہلاک ہونے میں کچھ دیر نہیں ہے صبح ہوتے ہی سب کا صفایا ہوجائے گا۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ ﴿۸۲﴾

پھر جب پہنچا حکم ہمارا کر ڈالی ہم نے وہ بستی اوپر نیچے اور برسائے ہم نے اس پر پتھر کنکر کے ۱ تہہ بہ تہہ ۲

مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ۭ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۳﴾ النصف ع ۱۵

نشان کیے ہوئے تیرے رب کے پاس ۱ اور نہیں ہے وہ بستی ان ظالموں سے کچھ دور ۲

**خلاصہ تفسیر:** (غرض لوط علیہ السلام راتوں رات دور نکل گئے اور صبح ہوئی اور عذاب کا سامان شروع ہوا) سو جب ہمارا حکم (عذاب کے لئے ) آ پہنچا تو ہم نے اس زمین ( کو الٹ کر اس ) کا اوپر کا تختہ تو نیچے کر دیا (اور نیچے کا تختہ اوپر کر دیا ) اور اس سرزمین پر کھنگر کے پتھر (مراد جھانوہ ہے جو پک کر پتھر کی طرح سخت ہوجاتا ہے ) برسانا شروع کئے جو لگا تار گر رہے تھے، جن پر آپ کے رب کے پاس (یعنی عالم غیب میں ) خاص نشان بھی تھا (جس سے دوسرے پتھروں سے وہ پتھر ممتاز تھے ) اور ( اہل مکہ کو چاہئے کہ اس قصہ سے عبرت پکڑیں کیونکہ ) یہ بستیاں ( قوم لوط کی ) ان ظالموں سے کچھ دور نہیں ہیں (ہمیشہ ملک شام کو آتے جاتے ان کی بربادی کے آثار دیکھتے ہیں، پس انہیں اللہ اور رسول کی مخالفت سے ڈرنا چاہئے )۔

**جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً:** یہاں دو عذابوں کا ذکر ہے: ① تختہ الٹ جانا ② پتھر برسنا، سو بعض نے تو کہا ہے کہ پہلے زمین اوپر اٹھا کر لوٹ دی گئی جب وہ نیچے کو گرے تو اوپر سے پتھراؤ کیا اور یہی قول زیادہ ظاہر ہے، لیکن اس صورت میں یہ ماننا پڑے گا کہ زمین کو اٹھا کر تھوڑی دیر اوپر روک لیا گیا ہوگا، یہ لوگ زمین سے پہلے نیچے گرے، اور زمین بعد میں، ورنہ پتھراؤ کی کوئی صورت نہ ہوگی، کیونکہ اگر زمین بھی ان کے ساتھ ہی چھوڑ دی گئی ہو تو ثقل کی وجہ سے زمین جلدی نیچے آتی ہوگی اور وہ لوگ اس سے لگے لپٹے رہے ہوں تو پتھراؤ کیسے ہوگا، البتہ اگر زمین کے اس طبعی تقاضے کو باقی نہ سمجھا جائے تو اس کی کوئی ضرورت نہیں، اور بعض نے کہا ہے کہ جو بستی میں تھے وہ الٹ دیے گئے اور جو باہر گئے ہوئے تھے ان پر

پتھر برسے، اورایک روایت میں ان پر صیحہ یعنی سخت آواز کا عذاب آیا ہے، سوممکن ہے کہ اول سخت آواز ہوئی ہو، پھرالٹ دیا گیا ہو چنانچہ اسی جگہ **فجعلنا** پر حرف فا آنے سے معلوم ہوتا ہے۔

**مُّسَوَّمَةً عِنۡدَ رَبِّكَ**: درمنثور کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پتھروں پر خاص رنگ اور ہیئت کے نقوش بنے ہوئے تھے جو دنیا کے پتھروں میں نہیں دیکھے جاتے۔

* * *

**فائدہ**: ۱ جبرائیل علیہ السلام نے ان بستیوں کو اٹھا کر آسمان کے قریب سے نیچے پٹک دیا، اس طرح سب بستیاں تہ وبالا ہوگئیں، پھر ان کی نکایت اور ذلت ورسوائی کی پوری تکمیل کے لیے اوپر سے جھانوے اور پتھر برسائے گئے، شہر کی آبادی سے الگ جو افراد اس قوم کے جس جگہ تھے وہیں پتھروں سے ہلاک کیے گئے (العیاذ باللہ)

**تنبیہ**: **حِجَارَةً مِّنۡ سِجِّيۡلٍ**: جوسزا اُس قوم کو اوپر نیچے کرنے کی ملی ان کی شرمناک حرکت سے ظاہری مناسبت بھی رکھتی ہے۔

**فائدہ**: ۲ **مَّنۡضُوۡدٍ**: کے معنی مترجم محقق نے "تہ بہ تہ" کئے ہیں، بعض نے یہ معنی لیے کہ پتھر مسلسل یکے بعد دیگرے برس رہے تھے۔

**فائدہ**: ۳ **مُّسَوَّمَةً عِنۡدَ رَبِّكَ**: یعنی کوئی خاص علامت ان پر تھی جو عام پتھروں سے ممتاز کر کے ظاہر کرتی تھی کہ یہ عذاب الٰہی کے پتھر ہیں، بعض کہتے ہیں کہ ہر پتھر پر اس کا نام درج تھا جس کی ہلاکت کا وہ سبب بنا، واللہ اعلم۔

**فائدہ**: ۴ **وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ بِبَعِيۡدٍ**: یعنی باعتبار زمانہ کے بھی قریب ہے کیونکہ عاد وثمود اور قوم نوح وغیرہ کے بعد یہ واقعہ ہوا اور باعتبار مکان کے بھی، کیونکہ انکی بستیاں مدینہ اور شام کے درمیان میں تھیں، گزرنے والے قافلے وہاں کھنڈرات مشاہدہ کرتے تھے، یا اس جملہ: **وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ بِبَعِيۡدٍ** کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح کا عذاب ایسے ظالموں سے اب بھی کچھ دور نہیں، ہمیشہ خدا کے غضب سے ڈرتے رہنا چاہیے۔

**تنبیہ**: اس قصہ کے بعض اجزاء اعراف میں گزر چکے ہیں وہاں ملاحظہ کیے جائیں۔

---

وَاِلٰى مَدۡيَنَ اَخَاهُمۡ شُعَيۡبًا ؕ قَالَ يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ ؕ وَلَا تَنۡقُصُوا

اور مدین کی طرف بھیجا ان کے بھائی شعیب کو، بولا اے میری قوم بندگی کرو اللہ کی کوئی نہیں تمہارا معبود اس کے سوا، اور نہ گھٹاؤ

الۡمِكۡيَالَ وَالۡمِيۡزَانَ اِنِّىۡۤ اَرٰٮكُمۡ بِخَيۡرٍ وَّاِنِّىۡۤ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ عَذَابَ يَوۡمٍ مُّحِيۡطٍ ﴿۸۴﴾

ناپ اور تول کو ۱ میں دیکھتا ہوں تم کو آسودہ حال اور ڈرتا ہوں تم پر عذاب سے ایک گھیر لینے والے دن کے ۲

**خلاصہ تفسیر**: اب حضرت شعیب علیہ السلام کا قصہ بیان کیا جاتا ہے۔

اور ہم نے مدین (والوں) کی طرف ان کے بھائی شعیب (علیہ السلام) کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا، انہوں نے (اہل مدین سے) فرمایا کہ اے میری قوم! تم (صرف) اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (بننے کے قابل) نہیں (یہ حکم تو دیانات وعقائد کے متعلق ان کے مناسب حال تھا) اور (دوسرا حکم معاملات کے متعلق ان کے مناسب یہ فرمایا کہ) تم ناپ تول میں کمی مت کیا کرو (کیونکہ) میں تم کو فراغت کی حالت میں دیکھتا ہوں (پھر تم کو ناپ تول میں کمی کرنے کی کیا ضرورت پڑی ہے اور حقیقت میں تو کسی کو بھی اس کی ضرورت نہیں ہوتی) اور (علاوہ اس کے کہ ناپ تول میں کمی نہ کرنا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا بھی تقاضا ہے اور خود اس سے جو نقصان کا خوف ہے وہ بھی یہی تقاضا کرتا ہے کہ اس میں کمی نہ کی جائے، کیونکہ اس میں) مجھ کو تم پر اندیشہ ہے ایسے دن کے عذاب کا جو انواع عذاب کا جامع ہوگا۔

* * *

**فائدہ**: ۱ یہ قصہ بھی سورہ اعراف میں گزر چکا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی خدا نے فراغت اور آسودگی عنایت کی تو ڈرتے رہو، کہیں نافرمانی سے چھن نہ جائے اور آسائش وخوشحالی سلب ہوکر دنیاوی یا اخروی عذاب مسلط نہ کردیا جائے۔

وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي

اور اے قوم پورا کرو ناپ اور تول کو انصاف سے ۱؎ اور نہ گھٹادو لوگوں کو ان کی چیزیں ۲؎ اور مت مچاؤ

الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۸۵﴾ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۸۶﴾

زمین میں فساد ۳؎ جو بچ رہے اللہ کا دیا وہ بہتر ہے تم کو اگر ہو تم ایمان والے ۴؎ اور میں نہیں ہوں تم پر نگہبان ۵؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (اگرچہ کمی کی مخالفت سے پورا ناپ تول کرنے کا حکم خود لازم آگیا تھا مگر تاکید کے لیے ممانعت کے بعد اس بات کی صراحت بھی فرمائی کہ:) اے میری قوم! تم ناپ اور تول پوری پوری طرح کیا کرو اور لوگوں کا ان کی چیزوں میں نقصان مت کیا کرو (جیسے تمہاری عادت ہے) اور (شرک اور لوگوں کے حقوق میں کمی کر کے) زمین میں فساد کرتے ہوئے حد (توحید وعدل) سے مت نکلو (لوگوں کے حقوق ادا کرنے کے بعد) اللہ کا دیا ہوا جو کچھ (حلال مال) بچ جائے وہ تمہارے لئے (اس حرام کمائی سے) بدرجہا بہتر ہے (کیونکہ حرام کمائی میں اگرچہ وہ زیادہ ہو برکت نہیں اور اس کا انجام جہنم ہے اور حلال میں اگرچہ وہ کم ہو برکت ہوتی ہے اور اس کا انجام رضائے حق ہے) اگر تم کو یقین آئے (تو مان لو) اور (اگر یقین نہ آئے تو تم جانو) میں تمہارا پہرہ دینے والا تو ہوں نہیں (میں تم سے جبراً یہ افعال چھڑانے سے رہا، جیسا کرو گے بھگتو گے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ: یعنی اب تک جو ظلم وعدوان کا معیار وقانون تھا، اس کی اصلاح کرو۔

**فائدہ:** ۲؎ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ: یعنی صرف ناپ تول میں نہیں بلکہ کسی چیز میں بھی لوگوں کے حقوق تلف مت کرو۔

**فائدہ:** ۳؎ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ: یعنی شرک وکفر سے یا کم ناپنے تولنے سے یا دوسری طرح اتلاف حقوق اور ظلم وستم کر کے زمین میں فساد مت مچاؤ، کہتے ہیں وہ لوگ ڈکیتی ڈالتے تھے اور امانت میں خیانت کرتے تھے۔

**فائدہ:** ۴؎ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ: ایک ایماندار کے لیے اللہ کا دیا ہوا جو ٹھیک ٹھیک حقوق ادا کر کے بچ رہے گو قلیل ہو، اس کثیر سے بہتر ہے جو حرام طریقہ سے حاصل کیا جائے یا جس میں لوگوں کے حقوق مارے جائیں، مال حلال میں جو ٹھیک ناپ تول کرلیا دیا جائے فی الحال برکت ہوتی ہے، اور خدا کے یہاں اجر ملتا ہے۔

**فائدہ:** ۵؎ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ: یعنی میں نے تم کو نصیحت کردی، آگے اس کا ذمہ دار نہیں کہ تم سے زبردستی عمل کرا کے چھوڑوں۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ

بولے اے شعیب کیا تیرے نماز پڑھنے نے تجھ کو یہ سکھایا کہ ہم چھوڑ دیں جن کو پوجتے رہے ہمارے باپ دادے، یا

اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿۸۷﴾

چھوڑ دیں کرنا جو کچھ کہ کرتے ہیں اپنے مالوں میں، تو ہی بڑا باوقار ہے نیک چلن

**خلاصہ تفسیر:** وہ لوگ (یہ تمام وعظ ونصیحت سن کر) کہنے لگے اے شعیب! کیا تمہارا (مصنوعی اور وہمی) تقدس تم کو (ایسی ایسی باتوں کی) تعلیم کر رہا ہے کہ (تم ہم سے کہتے ہو کہ) ہم ان چیزوں (کی پرستش) کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے بڑے کرتے آئے ہیں اور اس

بات کوچھوڑ دیں کہ ہم اپنے مال میں جو چاہیں تصرف کریں، واقعی آپ ہیں بڑے عقل مند دین پر چلنے والے۔

یعنی جن باتوں سے ہم کو منع کرتے ہو دونوں میں سے کوئی برا نہیں، کیونکہ ایک کی دلیل تو نقلی ہے کہ ہمارے بڑوں سے بت پرستی ہوتی آئی ہے، دوسرے کی دلیل عقلی ہے کہ اپنا مال ہے، اس میں ہر طرح کا اختیار ہے، پس ہم کو منع نہ کرو، اور ''حلیم رشید''، تمسخر سے کہا، جیسا کہ بد دینوں کی عادت ہوتی ہے دین داروں کے ساتھ تمسخر کرنے کی، اور ان کی نقلی و عقلی دونوں دلیلوں کا فساد بدیہی یعنی واضح اور ظاہر ہے۔

* * *

**فائدہ:** یہ بطور استہزاء و تمسخر کہہ رہے تھے، کہ بس زیادہ بزرگ نہ بنئے، کیا ساری قوم میں ایک آپ ہی بڑے عقلمند، باوقار اور نیک چلن رہ گئے ہیں؟ باقی ہم اور ہمارے بزرگ سب جاہل اور احمق ہی رہے؟ حضرت شعیب علیہ السلام نماز بہت کثرت سے پڑھتے تھے، کہنے لگے کہ شاید آپ کی نماز یہ حکم دیتی ہے کہ ہم سے باپ دادوں کا پرانا دین چھڑوا دیں اور ہمارے اموال میں ہمارا مالکانہ اختیار نہ رہنے دیں، بس آپ اپنی نماز پڑھے جایئے، ہمارے مذہبی و دنیاوی معاملات اور ناپ تول کے قصوں میں دخل دینے کی ضرورت نہیں، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''جاہلوں کا دستور ہے کہ نیکوں کے کام آپ نہ کرسکیں تو انھیں کو چڑانے لگیں، یہ ہی خصلت ہے کفر کی''، بعض مفسرین نے اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ کو استہزاء پر نہیں، واقعیت پر حمل کیا ہے، یعنی تو ایک سمجھ دار، باوقار، اور نیک چلن آدمی ہے، پھر ایسی بے موقع باتیں کیوں کرنے لگا، جیسے صالح علیہ السلام کو کہا تھا: قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ (ہود: ٦٢)

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ

بولا اے قوم دیکھو تو اگر مجھ کو سمجھ آ گئی اپنے رب کی طرف سے اور اس نے روزی دی مجھ کو نیک روزی ۱؎ اور میں یہ نہیں چاہتا کہ

اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ

بعد کو خود کروں وہ کام جو تم سے چھڑاؤں ۲؎ میں تو چاہتا ہوں سنوارنا جہاں تک ہو سکے

وَمَا تَوْفِيْقِيْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿۸۸﴾

اور بن آنا ہے اللہ کی مدد سے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** شعیب (علیہ السلام) نے فرمایا اے میری قوم! (تم جو مجھ سے چاہتے ہو کہ میں تمہیں توحید و عدل کی نصیحت نہ کروں تو) بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر میں اپنے رب کی جانب سے دلیل پر (قائم) ہوں (جس سے توحید و عدل ثابت ہے) اور اس نے مجھ کو اپنی طرف سے ایک عمدہ دولت (یعنی نبوت) دی ہو (جس سے مجھ پر ان احکام کی تبلیغ واجب ہے، یعنی جب توحید و عدل کا حق ہونا بھی ثابت اور میرے اوپر ان کی تبلیغ بھی واجب) تو پھر کیسے تبلیغ نہ کروں اور میں (جس طرح ان باتوں کی تم کو تعلیم کرتا ہوں خود بھی تو ان پر عمل کرتا ہوں) یہ نہیں چاہتا ہوں کہ تمہارے برخلاف ان کاموں کو کروں جن سے تم کو منع کرتا ہوں (برخلاف سے یہی مراد ہے کہ تم کو اور راہ بتلاؤں اور خود دوسری راہ پر چلوں، مطلب یہ ہے کہ میری نصیحت محض خیر خواہی و دل سوزی سے ہے جس کا قرینہ ہے کہ میں وہی باتیں بتلاتا ہوں جو اپنے نفس کے لئے بھی پسند کرتا ہوں غرض) میں تو اصلاح چاہتا ہوں جہاں تک میرے امکان میں ہے، اور مجھ کو جو کچھ (عمل و اصلاح کی) توفیق ہوجاتی ہے صرف اللہ ہی کی مدد سے ہے (ورنہ کیا میں اور کیا میرا ارادہ) اسی پر میں بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی کی طرف (تمام امور میں) رجوع کرتا ہوں۔

خلاصہ یہ کہ توحید و عدل کے وجوب پر دلائل بھی قائم ہیں، اور اور خدا ہی کے حکم سے اس کی تبلیغ ہو رہی ہے، اور ناصح بھی ایسا دل سوز اور مصلح

موجود ہے، پھر بھی نہیں مانتے، بلکہ الٹی مجھ سے یہ امید رکھتے ہو کہ میں کہنا چھوڑ دوں، اس سے زیادہ کیا بدبختی ہوگی، چونکہ اس تقریر میں دل سوزی اور اصلاح کو اپنی طرف منسوب کیا تھا، اس لئے وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ بھی فرمادیا، یعنی میں خود کچھ نہیں ہوں، یہ سب خدا کی توفیق سے ہے۔

اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ: اس سے معلوم ہوا کہ خلوص کے ساتھ ساتھ اصلاح کی کوشش بھی کرنی چاہیے، اور اس کوشش میں بھی توکل کرے، توکل کا مطلب یہ نہیں کہ کوشش چھوڑ دے کہ خود ہی اصلاح ہو جائے گی، لیکن صرف اپنی محنت اور کوشش پر بھروسہ بھی نہ کرے کہ بس یہی کافی ہے، بلکہ توکل کرتے ہوئے بھرپور محنت اور کوشش کرے اور اسکے ساتھ ساتھ اخلاص کا دامن بھی نہ چھوٹے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا: یا تو ظاہری روزی مراد ہے، یعنی ناپ تول میں کمی بیشی کیے بدون حلال وطیب طریق سے روزی مرحمت فرمائی یا باطنی روزی یعنی علم وحکمت اور نبوت عطا کی، خلاصہ یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ نے مجھ کو فہم وبصیرت دے کر وہ صاف راستہ دکھلا دیا جو تم کو نظر نہیں آتا اور اس دولت سے مالا مال کیا جس سے تمہیں حصہ نہیں ملا تو کیا اس کا حق یہ ہے کہ میں "معاذ اللہ" تمہاری طرح اندھا بن جاؤں اور خدا کے احکام سے روگردانی کرنے لگوں، یا تمہارے استہزاء وتمسخر سے گھبرا کر نصیحت کرنا اور سمجھانا چھوڑ دوں؟ ہرگز نہیں۔

**فائدہ:** ۲ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ: یعنی جن بری باتوں سے تم کو روکتا ہوں میری یہ خواہش نہیں کہ تم سے علیحدہ ہو کر خود ان کا ارتکاب کروں مثلاً تمہیں تارک الدنیا بناؤں اور خود دنیا سمیٹ کر گھر میں بھر لوں، نہیں جو نصیحت تم کو کرتا ہوں میں تم سے پہلے اس کا پابند ہوں، تم یہ الزام مجھ پر نہیں رکھ سکتے کہ میری نصیحت کسی خودغرضی اور ہوا پرستی پر محمول ہے۔

**فائدہ:** ۳ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ: میری تمام تر کوشش یہ ہے کہ تمہاری دینی و دنیاوی حالت درست ہو جائے، موجودہ ردی حالت سے نکل کر بام ایمان وعرفان پر چڑھنے کی کوشش کرو، اس مقصد اصلاح کے سوا دوسرا مقصد نہیں، جسے میں اپنے مقدور واستطاعت کے موافق کسی حال نہیں چھوڑ سکتا، باقی یہ کہ میری بات بن آئے اور اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاؤں، یہ سب خداوند قدس کے قبضہ میں ہے، اسی کی امداد وتوفیق سے سب کام انجام پا سکتے ہیں، میرا بھروسہ اسی پر ہے اور ہر معاملہ میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ

اور اے قوم نہ کمائیو میری ضد کرکے یہ کہ پڑے تم پر جیسا کچھ کہ پڑ چکا قوم نوح پر یا قوم ہود پر یا قوم صالح پر

وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾ وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ﴿۹۰﴾

اور قوم لوط تو تم سے کچھ دور ہی نہیں ۱ اور گناہ بخشواؤ اپنے رب سے اور رجوع کرو اس کی طرف، البتہ میرا رب ہے مہربان محبت والا ۲

**خلاصہ تفسیر:** (یہاں تک تو ان کے قول کا جواب ہوگیا، اب ترہیب وترغیب فرماتے ہیں) اور اے میری قوم! میری ضد (اور عداوت) تمہارے لئے اس کا باعث نہ ہو جائے کہ تم پر بھی اسی طرح کی مصیبتیں آ پڑیں جیسے قوم نوح یا قوم ہود یا قوم صالح پر پڑی تھیں اور (اگر ان قوموں کا قصہ پرانا ہو چکا ہے اور اس لئے تم اس سے متاثر نہیں ہوتے تو) قوم لوط تو (ابھی) تم سے (بہت) دور (زمانہ میں) نہیں ہوئی (یعنی ان قوموں کی نسبت قوم لوط کا زمانہ بہت ہی نزدیک گزرا ہے، اسی کے قصہ سے عبرت حاصل کرو، یہ تو ترہیب کا مضمون تھا)۔

(اب ترغیب ہے) اور تم اپنے رب سے اپنے گناہ (یعنی شرک وظلم) معاف کراؤ (یعنی ایمان لاؤ، کیونکہ ایمان سے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اگرچہ حقوق ادا کرنے پڑیں) پھر (اطاعت وعبادت کے ساتھ) اس کی طرف متوجہ ہو، بلاشک میرا رب بڑا مہربان بڑی محبت والا ہے (وہ گناہ کو معاف کر دیتا ہے اور اطاعت کو قبول کرتا ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی میری ضد اور عداوت کے جوش میں ایسی حرکتیں مت کرنا جو تم کو گزشتہ اقوام کی طرح سخت تباہ کن عذاب کا مستحق بنادیں، نوح، ہود اور صالح علیہم السلام کی امتوں پر تکذیب وعداوت کی بدولت جو عذاب آئے وہ پوشیدہ نہیں، اور لوط علیہ السلام کی قوم کا قصہ تو ان سب کے بعد ماضی قریب میں ہوا ہے اس کی یاد تمہارے حافظہ میں تازہ ہوگی ان نظائر کو فراموش مت کرو۔

**فائدہ:** ۲؎ کیسا ہی پرانا اور کٹر مجرم ہو جب صدق دل سے اس کی بارگاہ میں رجوع ہو کر معافی چاہے وہ اپنی مہربانی سے معاف کر دیتا ہے، بلکہ اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ

بولے اے شعیب ہم نہیں سمجھتے بہت باتیں جو تو کہتا ہے ۱؎ اور ہم تو دیکھتے ہیں کہ تو ہم میں کمزور ہے ۲؎ اور اگر نہ ہوتے تیرے بھائی بند

لَرَجَمْنٰكَ ۫ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ﴿۹۱﴾

تو تجھ کو ہم سنگسار کر ڈالتے اور ہماری نگاہ میں تیری کچھ عزت نہیں ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** وہ لوگ (یہ لاجواب دل آویز تقریر سن کر معقول جواب سے عاجز ہو کر براہ جہالت) کہنے لگے کہ شعیب! بہت سی باتیں تمہاری کہی ہوئی ہماری سمجھ میں نہیں آتیں (یہ بات بیہودہ بنائی، جس کا سبب یا تو یہ ہے کہ اچھی طرح توجہ سے شعیب علیہ السلام کی باتیں نہ سنی ہوں، یا تحقیر کے طور پر کہا ہو کہ نعوذ باللہ یہ باتیں ہذیان ہیں سمجھنے کے قابل نہیں، چنانچہ بد دینوں سے یہ سب امور واقع ہوتے ہیں) اور ہم تم کو اپنے (مجمع) میں کمزور دیکھ رہے ہیں اور اگر تمہارے خاندان کا (جو کہ ہمارے ہم مذہب ہیں ہمیں) پاس نہ ہوتا تو ہم تم کو (کبھی کا) سنگسار کر چکے ہوتے اور ہماری نظر میں تمہاری کچھ توقیر ہی نہیں (لیکن جس کا لحاظ ہوتا ہے اس کے سبب اس کے رشتہ دار کی بھی رعایت ہوتی ہے، مطلب ان کا یہ تھا کہ تم ہم کو یہ مضامین مت سناؤ ورنہ تمہاری جان کا خطرہ ہے، پہلے تمسخر کے طور پر تبلیغ سے روکا تھا اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ الخ اور اب دھمکی دے کر روکا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ سمجھتے سب کچھ تھے لیکن عناد اور حق پوشی سے ایسا کہتے تھے کہ تیری بات کچھ نہیں سمجھتے، نہ معلوم کیا مجذوبوں کی بڑہانک رہا ہے (العیاذ باللہ) اور اگر واقعی وہ ایسی سیدھی اور صاف باتیں بے توجہی یا غباوت کی وجہ سے سمجھتے نہ تھے تو یہ کلام اپنے ظاہر پر محمول ہوگا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی ایک کمزور اور بے حقیقت آدمی خواہ مخواہ سارے جہان کو اپنا دشمن بنا رہا ہے، اسے چاہیے اپنے حال پر رحم کھائے، بیٹھے بٹھائے اپنے کو موت کے منہ میں ڈالنے سے کیا فائدہ ہے

**تنبیہ:** بعض سلف نے ضعیف کے معنی "ضریر البصر" (نابینا) کے منقول ہیں، شاید کسی خاص وقت میں عارضی طور پر ظاہری بینائی جاتی رہی ہو، جیسے یوسف علیہ السلام کے فراق میں حضرت یعقوب کا حال ہوا تھا، مفسرین نے بعض روایات نقل کی ہیں کہ حضرت شعیب علیہ السلام روتے بہت تھے، حتیٰ کہ نگاہ جاتی رہی، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ شعیب! اس قدر کیوں روتا ہے؟ جنت کے شوق میں یا دوزخ کے ڈر سے؟ عرض کیا پروردگار! تیری لقاء کا خیال کر کے روتا ہوں کہ جس وقت آپ کا دیدار ہوگا نہ معلوم میرے ساتھ کیا برتاؤ کریں گے؟ ارشاد ہوا تجھ کو ہماری لقاء (دیدار) مبارک ہو، اے شعیب! اسی لیے میں نے اپنے کلیم موسیٰ ابن عمران کو تیری خدمت کے لیے کھڑا کر دیا ہے، کہتے ہیں خدا نے ان کی بینائی واپس کر دی، وَاللّٰهُ تَعَالٰى اَعْلَمُ بِصِحَّتِهٖ۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی تیرے کنبہ کے لوگ جو ہمارے ساتھ ہیں ان کا خیال آتا ہے ورنہ اب تک تجھے سنگسار کر ڈالتے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَاۗءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۭ اِنَّ رَبِّيْ

بولا اے قوم کیا میرے بھائی بندوں کا دباؤ تم پر زیادہ ہے اللہ سے ،اور اس کو ڈال رکھا تم نے پیٹھ پیچھے بھلا کر، تحقیق میرے رب کے

بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿٩٢﴾

قابو میں ہے جو کچھ کرتے ہو

**خلاصہ تفسیر:** شعیب (علیہ السلام) نے (جواب میں) فرمایا اے میری قوم! (افسوس اور تعجب ہے کہ میری جونسبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے کہ میں اس کا نبی ہوں وہ تو مجھے ہلاک کرنے سے تم کو مانع نہ ہوئی اور جونسبت میری خاندان کے ساتھ ہے کہ ان کا رشتہ دار ہوں وہ اس سے مانع ہوئی تو اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ تم خاندان کا لحاظ اللہ سے بھی زیادہ کرتے ہو تو) کیا میرا خاندان تمہارے نزدیک (نعوذ باللہ) اللہ سے بھی زیادہ باتوقیر ہے (کہ خاندان کا تو پاس کیا) اور اس کو (یعنی اللہ تعالیٰ کو) تم نے پس پشت ڈال دیا (یعنی اللہ کا پاس نہ کیا، سو اس کا خمیازہ عنقریب بھگتو گے، کیونکہ) یقیناً میرا رب تمہارے سب اعمال کو (اپنے علم میں) احاطہ کئے ہوئے ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی افسوس اور تعجب ہے کہ خاندان کی وجہ سے میری رعایت کرتے ہو اس وجہ سے نہیں کرتے کہ میں خدا کا بھیجا ہوا ہوں اور صاف وصریح نشانات اپنی سچائی کے دکھلا رہا ہوں گویا تمہاری نگاہ میں میرے خاندان کی عزت اور اس کا دباؤ خداوند قدوس سے زیادہ ہے، خدا کی عظمت وجلال کو ایسا بھلا دیا کہ کبھی تمہیں تصور بھی نہیں آتا، جو قوم خدا تعالیٰ کو بھلا کر (معاذ اللہ) پس پشت ڈال دے اسے یاد رکھنا چاہیے، کہ اس کے تمامی افعال و اعمال خدا تعالیٰ کے علم وقدرت کے احاطہ میں ہیں، تم کوئی کام کرو اور کسی حالت میں ہو، ایک آن کے لیے بھی اس کے قابو سے باہر نہیں۔

وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰي مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۭ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ

اور اے میری قوم کام کیے جاؤ اپنی جگہ میں بھی کام کرتا ہوں، آگے معلوم کر لو گے کس پر آتا ہے عذاب رسوا کرنے والا

وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۭ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ﴿٩٣﴾

اور کون ہے جھوٹا، اور تاکتے رہو میں بھی تمہارے ساتھ تاک رہا ہوں

**خلاصہ تفسیر:** اور اے میری قوم! (اگر تم کو عذاب کا بھی یقین نہیں آتا تو خیر بات یہ ہے کہ تم جانو بہتر ہے) تم اپنی حالت پر عمل کرتے رہو میں بھی (اپنے طور پر) عمل کر رہا ہوں (سو) اب جلدی تم کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کون شخص ہے جس پر ایسا عذاب آیا چاہتا ہے جو اس کو رسوا کر دے گا، اور وہ کون شخص ہے جو جھوٹا تھا (یعنی تم مجھ کو دعوی نبوت میں جھوٹا ہی کہتے ہو اور حقیر سمجھتے ہو تو اب معلوم ہو جائے گا کہ جھوٹ کے جرم کا مرتکب اور ذلت کی سزا کا مستحق کون ہے؟ تم یا میں!) اور تم بھی منتظر رہو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں (کہ دیکھیں عذاب واقع ہوتا ہے جیسا کہ میں کہتا ہوں، یا عذاب واقع نہیں ہوتا جیسا کہ تمہارا گمان ہے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی اچھا، تم اپنی ضد اور ہٹ پر جمے رہو، میں خدا کی توفیق سے راہ ہدایت پر ثابت قدم ہوں عنقریب پتہ چل جائے گا کہ ہم میں سے کس کو خدا کا عذاب فضیحت کرتا ہے اور کون جھوٹا ثابت ہوتا ہے، اب ہم اور تم دونوں آسمانی فیصلہ کا انتظار کرتے ہیں۔

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا

اور جب پہنچا ہمارا حکم بچا دیا ہم نے شعیب کو اور جو ایمان لائے تھے اس کے ساتھ اپنی مہربانی سے اور آ پکڑا ان ظالموں کو

الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿٩٤﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۭ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ

کڑک نے پھر صبح کو رہ گئے اپنے گھروں میں اوندھے پڑے ہوئے، گویا کبھی وہاں بسے ہی نہ تھے ۱ سن لو پھٹکار ہے مدین کو

ع ٨ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿٩٥﴾

جیسے پھٹکار ہوئی تھی ثمود کو ۲

**خلاصہ تفسیر:** (غرض ایک زمانہ کے بعد عذاب کا سامان شروع ہوا) اور جب ہمارا حکم (عذاب کے لیے) آپہنچا (تو) ہم نے (اس عذاب سے) شعیب (علیہ السلام) کو اور جو ان کی ہمراہی میں اہل ایمان تھے ان کو اپنی عنایت (خاص) سے بچا لیا اور ان ظالموں کو ایک سخت آواز نے (جو کہ نعرہ جبریل تھا) آ پکڑا، سو اپنے گھروں کے اندر اوندھے گرے رہ گئے (اور مر گئے) جیسے کبھی ان گھروں میں بسے ہی نہ تھے، خوب سن لو (اور عبرت پکڑو) مدین کو رحمت سے دوری ہوئی جیسا ثمود رحمت سے دور ہوئے تھے۔

**وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ:** نویں پارہ کے شروع میں اہل مدین کا عذاب رجفۃ یعنی زلزلہ مذکور ہے، اور یہاں صیحۃ یعنی سخت آواز، دونوں کا جمع ہونا ممکن ہے، چنانچہ ابھی پیچھے قوم ثمود کے بارے میں بعینہ یہی مضمون گزرا ہے، کہ یہاں سخت آواز کا ذکر ہے اور وہاں زلزلہ کا، پس زلزلہ اور سخت آواز کے عذابوں میں دونوں قومیں شریک ہیں، مفسرین نے کہا ہے کہ قوم مدین کی حالت کو اللہ تعالیٰ نے یہاں: كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ میں ثمود کی حالت سے اسی وجہ سے تشبیہ دی کہ دونوں کا عذاب ایک طرح کا تھا۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یہاں قوم شعیب کا کڑک (فرشتہ کی چیخ) سے ہلاک ہونا مذکور ہے اور اعراف میں رجفہ کا لفظ آیا ہے یعنی زلزلہ سے ہلاک ہوئے، اور سورہ شعراء میں عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ آیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ عذاب کے بادل سائبان کی طرح ان پر محیط ہو گئے، ابن کثیر لکھتے ہیں کہ یہ تینوں قسم کے عذاب اس قوم کے حق میں جمع کر دیئے گئے تھے، پھر ہر سورت میں وہاں کے سیاق کے مناسب عذاب کا ذکر کیا گیا، اعراف میں تھا کہ ان لوگوں نے شعیب سے کہا کہ ہم تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو اپنی سرزمین سے نکال دیں گے، وہاں بتلا دیا کہ جس زمین سے نکالنا چاہتے تھے، اسی کے زلزلہ سے ہلاک ہوئے، یہاں ان کے سخت گستاخانہ مقالات کا ذکر تھا، اس لیے بالمقابل آسمانی صیحہ (کڑک) کا ذکر فرمایا، گویا عذاب الٰہی کی ایک کڑک میں ان کی سب آوازیں گم ہو گئیں، سورہ شعراء میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے: فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (الشعراء: ۱۸۷) یعنی اگر تو سچا ہے تو ہم پر آسمان کا ایک ٹکڑا گرا دے، اس کے مقابلہ میں عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ کا تذکرہ فرمایا۔

**فائدہ:** ۲ یعنی دونوں صیحہ سے ہلاک ہوئے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿٩٦﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ

اور البتہ بھیج چکے ہیں ہم موسیٰ کو اپنی نشانیاں اور واضح سند دے کر ۱ فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس پھر وہ چلے حکم پر فرعون کے، اور نہیں

فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴿٩٧﴾ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۭ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿٩٨﴾

بات فرعون کی کچھ کام کی ۲ آگے ہوگا اپنی قوم کے قیامت کے دن پھر پہنچائے گا ان کو آگ پر، اور برا گھاٹ ہے جس پر پہنچے

**خلاصہ تفسیر**: اب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قصہ بیان کیا جاتا ہے۔

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو (بھی) اپنے معجزات اور دلیل روشن دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس بھیجا، سو (نہ فرعون نے مانا اور نہ ان کے سرداروں نے مانا، بلکہ فرعون بھی اپنے کفر پر رہا اور) وہ لوگ (بھی) فرعون (ہی) کی رائے پر چلتے رہے اور فرعون کی رائے کچھ صحیح نہ تھی، وہ (فرعون) قیامت کے دن اپنی قوم سے آگے آگے ہوگا پھر ان (سب) کو دوزخ میں جا اُتارے گا، اور وہ (دوزخ) بہت ہی بری جگہ ہے اترنے کی جس میں یہ لوگ اتارے جائیں گے۔

**وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ**: سلطان مبین سے مراد یا تو عصا اور ید بیضا ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے دیے گئے نو معجزات میں سے دو بڑے معجزے ہیں، اور یا موسیٰ علیہ السلام کی وہ بلیغ تقریر مراد ہے جو آپ نے توحید کے بارے میں فرعون کے سامنے فرمائی۔

* * *

**فائدہ**: ١ نشانیوں سے غالباً معجزات اور وہ نو آیتیں مراد ہیں جن کا ذکر: وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ (الاسراء:١٠١) میں ہوا ہے، ان میں سے معجزہ عصا کو جو نہایت ظاہر و قاہر معجزہ تھا شاید سُلْطَانٌ مُّبِيْنٌ (واضح سند) فرمایا یا سُلْطَانٌ مُّبِيْنٌ سے وہ روشن دلائل مراد ہوں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سامنے خدا تعالیٰ کے وجود و توحید وغیرہ کے متعلق پیش کیے جن کا ذکر دوسرے مقامات میں آئے گا، اور ممکن ہے سُلْطَانٌ مُّبِيْنٌ سے اس کے لغوی معنی (یعنی کھلا ہوا غلبہ) مراد لیے گئے ہوں، کیونکہ فرعونیوں کے مقابلہ پر بار بار حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نمایاں غلبہ اور فتح مبین حاصل ہوتی رہی۔

**فائدہ**: ٢ یعنی کھلے کھلے نشان دیکھ کر بھی فرعونیوں نے پیغمبر خدا کی بات نہ مانی، اسی دشمن خدا کے حکم پر چلتے رہے، حالانکہ اس کی کوئی بات ٹھکانے کی نہ تھی، جسے مان کر انسان بھلائی حاصل کر سکتا۔

**فائدہ**: ٣ جس طرح یہاں کفر و تکذیب میں ان کا امام تھا، قیامت کے دن بھی امام رہے گا، جو لوگ دنیا میں اسکی اندھی تقلید کر رہے تھے وہ اس کے پیچھے پیچھے آخر منزل (جہنم) تک پہنچ جائیں گے، یہی وہ گھاٹ ہے جہاں ٹھنڈے پانی کی جگہ بھسم کر دینے والی آگ ملے گی۔

## وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿٩٩﴾

اور پیچھے سے ملتی رہی اس جہان میں لعنت اور دن قیامت کے بھی، برا انعام ہے جو ان کو ملا

**خلاصہ تفسیر**: اور اس دنیا میں بھی لعنت ان کے ساتھ ساتھ رہی اور قیامت کے دن بھی (ان کے ساتھ ساتھ رہے گی، چنانچہ یہاں قہر سے غرق ہوئے اور وہاں دوزخ نصیب ہوگی) برا انعام ہے جو ان کو دیا گیا۔

* * *

**فائدہ**: یعنی رہتی دنیا تک لوگ فرعون اور فرعونیوں پر لعنت بھیجتے رہیں گے، پھر قیامت میں ملائکۃ اللہ اور اہل موقف کی طرف سے لعنت پڑے گی، غرض لعنت کا سلسلہ لگا تار ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہے گا، گویا یہ انعام ہے جو ان کے کارناموں پر دیا گیا۔

## ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَاۗىِٕمٌ وَّحَصِيْدٌ ﴿١٠٠﴾

یہ تھوڑے سے حالات ہیں بستیوں کے کہ ہم سناتے ہیں تجھ کو بعض ان میں سے اب تک قائم ہیں اور بعض کی جڑ کٹ گئی

**خلاصہ تفسیر**: پیچھے کئی واقعات بیان ہوئے، من جملہ ان کے فوائد کے ایک فائدہ پر متنبہ فرماتے ہیں کہ ان سے دنیا و آخرت دونوں کے اعتبار سے سننے والوں کو تہدید اور دھمکی منظور ہے، اور ضمناً مقابلہ کے طور پر مؤمنین کا کامیاب ہونا بھی ذکر فرماتے ہیں۔

یہ (جو کچھ اوپر واقعات میں مذکور ہوا) ان (غارت شدہ) بستیوں کے بعض حالات تھے جن کو ہم آپ سے بیان کرتے ہیں (سو) بعض

بستیاں تو ان میں (اب بھی) قائم ہیں (مثلاً مصر کہ آل فرعون کے ہلاک ہونے کے بعد بھی آباد رہا) اور بعض کا بالکل خاتمہ ہوگیا۔

* * *

**فائدہ:** یعنی پچھلی قوموں کے قصے جو تم کو سنائے گئے کہ کس طرح انہوں نے پیغمبروں کی تکذیب اور گستاخیاں کیں، پھر کس طرح تباہ ہوئے، ان میں سے بعض کی بستیاں ابھی آباد ہیں جیسے مصر جو فرعون کا مقام تھا اور بعض اجڑ گئیں، مگر ان کے کچھ کھنڈر باقی ہیں، جیسے قوم لوط کی بستیاں، اور بعض کا نشان بھی صفحۂ ہستی پر باقی نہ رہا۔

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن ظلم کر گئے وہی اپنی جان پر پھر کچھ کام نہ آئے ان کے ٹھاکر (معبود) جن کو پکارتے تھے سوائے اللہ کے

مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴿۱۰۱﴾

کسی چیز میں جس وقت پہنچا حکم تیرے رب کا ۱ اور نہیں بڑھایا انکے حق میں سوائے ہلاک کرنے کے ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور (ہم نے جو ان مذکورہ بستی والوں کو سزائیں دیں، سو) ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا (یعنی ہم نے ان کو یہ سزائیں بلا قصور نہیں دیں جو کہ صورۃً ظلم ہے) لیکن انہوں نے خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا (کہ ایسی حرکتیں کیں جن سے سزا کے مستحق ہوئے) سو ان کے وہ معبود جن کو وہ خدا کو چھوڑ کر پوجتے تھے ان کو کچھ فائدہ نہ پہنچا سکے جب آپ کے رب کا حکم (عذاب کے لئے) آپہنچا (کہ ان کو عذاب سے بچالیتے) اور (فائدہ تو کیا پہنچاتے اور) الٹا ان کو نقصان پہنچایا (یعنی نقصان کا سبب ہوئے کہ ان کی پرستش کی بدولت سزا پائی)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی خدا نے کسی کو بے قصور نہیں پکڑا جس سے ظلم کا وہم ہو سکے، جب وہ جرائم کے ارتکاب میں حد سے آگے نکل گئے اور اس طرح اپنے کو کھلم کھلا سزا کا مستحق ٹھہرادیا تب خدا کا عذاب آیا، پھر دیکھ لو جن معبودوں (دیوتاؤں) کا انھیں بڑا سہارا تھا اور جن سے بڑی بڑی توقعات قائم کر رکھی تھیں وہ ایسی سخت مصیبت کے وقت کچھ بھی کام نہ آئے۔

**فائدہ:** ۲ باطل معبود کام کیا آتے؟ الٹے ہلاکت کا سبب بنے، جب انھیں نفع وضرر کا مالک سمجھا، امیدیں قائم کیں، چڑھاوے چڑھائے تعظیم اور ڈنڈوت کی، تو یہ روز بد دیکھنا پڑا، تکذیب انبیاء وغیرہ کا جو عذاب ہوتا شرک و بت پرستی کا عذب اس پر مزید رہا۔

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۰۲﴾

اور ایسی ہی ہے پکڑ تیرے رب کی جب پکڑتا ہے بستیوں کو اور وہ ظلم کرتے ہوتے ہیں، بیشک اس کی پکڑ دردناک ہے شدت (زور) کی

**خلاصہ تفسیر:** اور آپ کے رب کی دار و گیر (پکڑ دھکڑ) ایسی ہی (سخت) ہے جب وہ کسی بستی والوں پر دار و گیر (پکڑ دھکڑ) کرتا ہے جبکہ وہ ظلم (وکفر) کیا کرتے ہوں، بلا شبہ اس کی دار و گیر بڑی الم رساں (اور) سخت ہے (کہ اس سے سخت تکلیف پہنچتی ہے اور اس سے کوئی بچ نہیں سکتا)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی ظالموں کو بڑی حد تک مہلت دی جاتی ہے، جب کسی طرح باز نہیں آتے تو پکڑ کر گلا دبا دیا جاتا ہے، مجرم چاہے کہ تکلیف کم ہو، یا اس کی پکڑ سے چھوٹ کر بھاگ نکلے، ایں خیال است ومحال است وجنوں۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ

اس بات میں نشانی ہے اس کو جو ڈرتا ہے آخرت کے عذاب سے ۱؎ وہ ایک دن ہے جس میں جمع ہوں گے سب لوگ اور وہ دن ہے

مَّشْهُوْدٌ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿۱۰۴﴾ؕ

سب کے پیش ہونے کا ۲؎ اور اس کو ہم دیر جو کرتے ہیں سو ایک وعدہ کے لیے جو مقرر ہے ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** ان واقعات میں اس شخص کے لئے بڑی عبرت ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہو (وجہ عبرت ظاہر ہے کہ جب دنیا کا عذاب ایسا سخت ہے حالانکہ یہ دار الجزاء نہیں تو آخرت کا جو کہ دار الجزاء ہے کیسا سخت عذاب ہوگا) وہ (یعنی آخرت کا دن) ایسا دن ہوگا کہ اس میں تمام آدمی جمع کئے جائیں گے اور وہ سب کی حاضری کا دن ہے، اور (وہ دن اگر چہ اب تک آیا نہیں، لیکن اس سے کوئی اس کے آنے میں شک نہ کرے، آئے گا ضرور) ہم اس کو صرف تھوڑی مدت کے لئے (بعض مصلحتوں کی وجہ سے) ملتوی کئے ہوئے ہیں۔

**فائدہ:** ۱؎ یعنی دنیا جو "دارِ عمل" ہے، جب اس میں شرک وکفر اور تکذیب انبیاء پر سزائیں ملتی ہیں اور اس قدر سخت ملتی ہیں تو یہ ایک نشان اس بات کے معلوم کرنے کا ہے کہ آخرت میں جو خالص "دار جزاء" ہے کیا کچھ سزا ان جرائم پر ملے گی؟ اور کیا صورت رستگاری کی ہوگی، عقلمند آدمی کے لیے جو اپنے انجام کو سوچ کر ڈرتا رہتا ہے، اس چیز میں بڑی عبرت ونصیحت ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی تمام دنیا کا بیک وقت فیصلہ اسی دن ہوگا جب سارے اولین وآخرین اکٹھے کیے جائیں گے اور کوئی شخص غیر حاضر نہ رہ سکے گا، گویا خدائی عدالت کی سب سے بڑی پیشی کا دن وہ ہی ہوگا۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی اللہ کے علم میں جو میعاد مقرر ہے وہ پوری ہو جائے گی تب وہ دن آئے گا، تاخیر سے یہ گمان مت کرو کہ یہ محض فرضی اور وہمی باتیں ہیں۔

يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ﴿۱۰۵﴾

جس دن وہ آئے گا بات نہ کر سکے گا کوئی جاندار مگر اس کے حکم سے، سو ان میں بعض بد بخت ہیں اور بعض نیک بخت

**خلاصہ تفسیر:** (پھر) جس وقت وہ دن آئے گا (ہیبت کے مارے لوگوں کا یہ حال ہوگا کہ) کوئی شخص بدون خدا کی اجازت کے بات تک (بھی) نہ کر سکے گا (ہاں! جب حساب کتاب کے لیے حاضری ہوگی اور ان کے اعمال پر جواب طلب کیا جائے گا اس وقت البتہ منہ سے بات نکلے گی، خواہ وہ بات مقبول ہو یا مقبول نہ ہو، سو اس حالت میں تو سب اہل محشر شریک ہوں گے) پھر (آگے) ان میں (یہ فرق ہوگا کہ) بعض تو شقی (یعنی کافر) ہوں گے اور بعض سعید (یعنی مومن) ہوں گے۔

**لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ:** اس تقریر سے ان تمام آیات میں جو اس مضمون کے متعلق ہیں کوئی شبہ نہیں رہا جن سے کسی کا نہ بولنا ثابت ہے تو وہ اجازت سے پہلے کی حالت ہے، اور جن سے بولنا اور جواب دینا اور آپس میں گفتگو کرنا ثابت ہے تو وہ اجازت کے بعد کی حالت ہے۔

**فائدہ:** یعنی کوئی شخص ایسی بات جو منقول ونافع ہو بدون حکم الٰہی کے نہ کر سکے گا اور محشر کے بعض مواقف میں تو مطلقاً ایک حرف بھی اذن واجازت کے بدون منہ سے نہ نکال سکیں گے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ﴿١٠٦﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ

سو جو لوگ بدبخت ہیں وہ تو آگ میں ہیں ان کو وہاں چیخنا ہے اور دھاڑنا، ہمیشہ رہیں اس میں جب تک رہے آسمان

وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿١٠٧﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ

اور زمین مگر جو چاہے تیرا رب، بیشک تیرا رب کر ڈالتا ہے جو چاہے، اور جو لوگ نیک بخت ہیں سو جنت میں ہیں

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿١٠٨﴾

ہمیشہ رہیں اس میں جب تک رہے آسمان اور زمین مگر جو چاہے تیرا رب، بخشش ہے بے انتہا

**خلاصہ تفسیر:** سو جو لوگ شقی ہیں وہ تو دوزخ میں ایسے حال سے ہوں گے کہ اس میں ان کی چیخ و پکار پڑی رہے گی (اور) ہمیشہ ہمیشہ کو اس میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں (یہ محاورہ ہے ہمیشگی اور دوام بیان کرنے کے لیے) اور کوئی نکلنے کی سبیل نہ ہوگی ہاں اگر خدا ہی کو (نکالنا) منظور ہو تو دوسری بات ہے (کیونکہ) آپ کا رب جو کچھ چاہے اس کو پورے طور سے کر سکتا ہے (مگر قدرت کے باوجود یہ یقینی ہے کہ خدا تعالیٰ یہ بات نہ چاہیں گے اس لئے نکلنا کبھی نصیب نہ ہوگا)۔

اور رہ گئے وہ لوگ جو سعید ہیں سو وہ جنت میں ہوں گے (اور) وہ اس میں (داخل ہونے کے بعد) ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں (اگرچہ جانے سے قبل کچھ سزا بھگتی ہو) ہاں اگر خدا ہی کو (نکالنا) منظور ہو تو دوسری بات ہے (مگر یہ یقینی ہے کہ خدا یہ بات کبھی نہ چاہے گا، پس نکلنا بھی کبھی نہ ہوگا بلکہ) وہ غیر منقطع عطیہ ہوگا۔

**مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ:** یہ محاورہ ہے ہمیشگی اور دوام بیان کرنے کے لیے، یعنی نکلنے کی کوئی سبیل کبھی نہ ہوگی، چنانچہ اب بھی محاورہ میں بولا جاتا ہے کہ یہ بات قیامت تک نہیں ہو سکتی، یعنی کبھی نہیں ہو سکتی، یہ مطلب نہیں کہ قیامت کے بعد ہو جائے گی۔

**اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ:** اس سے یہ بات بتلادی کہ حق تعالیٰ ایک قانون مقرر کر دینے کے بعد اس کے خلاف کرنے سے عاجز نہیں ہو جاتے، وہ اس قانون کو توڑ دینے پر بھی قادر ہیں، اگرچہ یہ یقینی ہے کہ توڑیں گے کبھی نہیں۔

اس کی آسان توجیہ یہ ہے کہ یہاں سعید سے نیک کار اور شقی سے بدکار مراد لیا جائے، خواہ مؤمن ہو یا کافر، اور ''ما'' کو ''من'' کے معنی کہا جائے، پس معنی یہ ہوئے کہ عاصی و نافرمان جہنم میں ہوگا مگر جس کو خدا چاہے یعنی ایمان لے آئے، اور مطیع جنت میں ہوگا مگر جس کو خدا چاہے یعنی اس کا خاتمہ کفر پر ہو جائے، پس مذکورہ بالا آیتوں میں اس پر دلالت ہے کہ نہ اپنی طاعت پر ناز کرے اور نہ عصیان پر مایوس ہو، جن لوگوں نے اس آیت سے جہنم کے فنا ہو جانے پر استدلال کیا ہے ان کے جواب میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ: ''اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال'' پھر قطعی دلائل اور اجماع اس کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ اس نظریہ کے باطل ہونے کی مستقل دلیل ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ان آیات کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ① ایک یہ کہ جس قدر مدت آسمان و زمین دنیا میں باقی رہے اتنی مدت تک اشقیاء دوزخ میں اور سعداء جنت میں رہیں گے مگر جو اور زیادہ چاہے تیرا رب، وہ اسی کو معلوم ہے، کیونکہ ہم جب طویل سے طویل زمانہ کا تصور کرتے ہیں تو اپنے ماحول کے اعتبار سے بڑی مدت یہ ہی خیال میں آتی ہے، اسی لیے مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وغیرہ الفاظ محاورات عرب میں دوام کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے بولے جاتے ہیں، باقی دوام و ابدیت کا اصلی مدلول جسے لامحدود زمانہ کہنا چاہیے وہ حق تعالیٰ ہی کے علم غیر متناہی کے ساتھ مختص ہے، جس کو

مَاشَآءَ رَبُّكَ سے ادا کیا② دوسرے معنی آیت کے یہ ہو سکتے ہیں کہ لفظ: مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ کو کنایہ دوام سے مانا جائے، یا آسمان و زمین سے آخرت کا زمین و آسمان مراد لیا جائے، جیسے فرمایا: يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ (ابراہیم: ۴۸) مطلب یہ ہوا کہ اشقیاء دوزخ اور سعداء جنت میں اس وقت تک رہیں گے جب تک آخرت کے زمین و آسمان باقی رہیں، یعنی ہمیشہ، مگر جو چاہے تیرا رب تو موقوف کر دے، وہاں ہمیشہ نہ رہنے دے، کیونکہ جنتیوں اور دوزخیوں کا خلود بھی اسی کی مشیت و اختیار سے ہے، لیکن وہ چاہ چکا کہ کفار و مشرکین کا عذاب اور اہل جنت کا ثواب کبھی موقوف نہ ہوگا، چنانچہ فرما دیا: وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ (البقرۃ: ۱۶۷) اور يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ (المائدہ: ۳۷) اور اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (النساء: ۴۸) اس پر تمام اہل اسلام کا اجماع رہا ہے اور ہمارے زمانہ کے بعض نام نہاد مفسرین نے جو کچھ اس کے خلاف چیزیں پیش کی ہیں وہ یا روایات ضعیفہ و موضوعہ ہیں یا اقوال غریبہ مؤولہ، یا بعض آیات و احادیث ہیں جن کا مطلب کوتاہ نظری یا بدفہمی سے غلط سمجھ لیا گیا ہے، اگر خدا کی توفیق سے مستقل تفسیر لکھنے کی نوبت آئی، اس میں مفصل کلام کیا جائے گا، اختصار کی وجہ سے یہاں گنجائش نہیں، رہا عصاۃ موحدین کا مسئلہ یعنی جو مسلمان گناہوں کی بدولت دوزخ میں ڈالے جائیں گے (العیاذ باللہ) ان کے متعلق احادیث صحیحہ نے ہم کو خدا کی مشیت پر مطلع کر دیا ہے کہ ایک دن ضرور ان کو نکال کر جنت میں پہنچائیں گے جہاں سے کسی جنتی کو کبھی نکلنا نہیں، شاید اسی لحاظ سے جنتیوں کے ذکر میں عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ اور اشقیاء کے ذکر میں اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ارشاد ہوا، تاکہ معلوم ہو جائے کہ بعض اشقیاء دوزخ سے نکالے جائیں گے مگر سعید کوئی جنت سے خارج نہ کیا جائے گا۔

**تنبیہ:** اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ سے متنبہ فرما دیا کہ خدا کے ہمیشہ رہنے اور مخلوق کے ہمیشہ رہنے میں فرق ہے، کسی مخلوق کا ہمیشہ رہنا بہمہ وجوہ خدا کی مشیت پر موقوف ہے، وہ جب چاہے فنا کر سکتا ہے، نیز یہ جتلا دیا کہ جزاء و سزا دینا اس کے اختیار و مشیت کے تابع ہے، ''آریہ سماج'' وغیرہ کے عقیدہ کے موافق وہ اس پر مجبور نہیں۔

---

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ۭ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ۭ

سو تو نہ رہ دھوکے میں ان چیزوں سے جن کو پوجتے ہیں یہ لوگ، کچھ نہیں پوجتے مگر ویسا ہی جیسا کہ پوجتے تھے انکے باپ دادے اس سے پہلے

وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿۱۰۹﴾ ع

اور ہم دینے والے ہیں ان کو ان کا حصہ یعنی عذاب سے بلا نقصان

---

**خلاصہ تفسیر:** (جب کفر کا وبال اوپر کی آیتوں سے معلوم ہو چکا) سو (اے مخاطب!) جس چیز کی یہ پرستش کرتے ہیں اس کے بارے میں ذرا شبہ نہ کرنا (بلکہ یقین رکھنا کہ کفار کا یہ عمل باطل ہونے کی وجہ سے سزا کا باعث ہے، اور باطل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ) یہ لوگ بھی اسی طرح (بلا دلیل بلکہ خلاف دلیل) عبادت (غیر اللہ کی) کر رہے ہیں جس طرح ان کے قبل ان کے باپ دادا عبادت کرتے تھے (جو امر صحیح دلیل کے خلاف ہو وہ باطل اور سزا کا باعث ہوتا ہے) اور ہم یقیناً (قیامت میں) ان کا حصہ (عذاب کا) ان کو پورا پورا بے کم و کاست پہنچا دیں گے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی اتنی مخلوق کا شرک و بت پرستی کے راستہ پر پڑ لینا اور اب تک سزایاب نہ ہونا، کوئی ایسی چیز نہیں جس سے دھوکہ کھا کر آدمی شبہ میں پڑ جائے، یہ لوگ اپنے باپ دادوں کی کورانہ تقلید کر رہے ہیں، وہ جھوٹے معبود ان کے کیا کام آئے، جو ان کے کام آئیں گے؟ یقیناً ان سب کو آخرت میں عذاب کا پورا حصہ ملے گا، جس میں کوئی کمی نہ ہوگی یا کبھی کم نہ کیا جائے گا گویا لفظ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ، عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ کے مقابل ہوا، بعض مفسرین کہتے ہیں کہ دنیا میں رزق وغیرہ کا جو حصہ مقدر ہے وہ پورا ملے گا، پھر شرک کی پوری سزا بھگتیں گے۔

وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡكِتٰبَ فَاخۡتُلِفَ فِيۡهِ ؕ وَلَوۡلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتۡ مِنۡ رَّبِّكَ لَقُضِىَ بَيۡنَهُمۡ ؕ

اور البتہ ہم نے دی تھی موسیٰ کو کتاب پھر اس میں پھوٹ پڑ گئی، اور اگر نہ ہوتا ایک لفظ کہ پہلے فرما چکا تھا تیرا رب تو فیصلہ ہو جاتا ان میں

وَاِنَّهُمۡ لَفِىۡ شَكٍّ مِّنۡهُ مُرِيۡبٍ ﴿۱۱۰﴾

اور ان کو اس میں شبہ ہے کہ مطمئن نہیں ہونے دیتا

**خلاصہ تفسیر:** پچھے قوموں کے واقعات سے پہلے حضور ﷺ کو تسلی، عذاب کے مؤخر ہونے کی حکمت، اپنے وقت پر عذاب کا واقع ہونا اور احکام کی بجا آوری کی ترغیب اور فضیلت کے مضامین مذکور ہوئے تھے، اب آگے پھر ان ہی مضامین کی طرف رجوع ہے۔

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب (یعنی توریت) دی تھی، سو اس میں (بھی قرآن کی طرح) خلاف کیا گیا (کہ کسی نے مانا، کسی نے نہ مانا، یہ آپ کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہوئی، پس آپ مغموم نہ ہوں) اور (یہ منکرین ایسے مستحق عذاب ہیں کہ) اگر ایک بات نہ ہوتی جو آپ کے رب کی طرف سے پہلے ٹھہر چکی ہے (کہ ان کو پورا عذاب آخرت میں دوں گا) تو (جس چیز میں یہ اختلاف کر رہے ہیں) ان کا (قطعی) فیصلہ (دنیا ہی میں) ہو چکا ہوتا (یعنی اب تک ان پر عذاب واقع ہو چکا ہوتا) اور یہ لوگ (براہین قائم ہو جانے کے باوجود ابھی تک) اس (قطعی فیصلہ یعنی عذاب) کی طرف سے ایسے شک میں (پڑے) ہیں جس نے ان کو تردد میں ڈال رکھا ہے (کہ ان کو عذاب کا یقین ہی نہیں آتا، انکار ہی کیے جاتے ہیں، شک کا یہی مطلب ہے)۔

* * *

**فائدہ:** موسیٰ علیہ السلام کو تورات دے کر بھیجا تو آپس میں پھوٹ پڑ گئی، کسی نے قبول کیا کسی نے نہ کیا، جس طرح آج قرآن عظیم کے متعلق یہ ہی اختلاف ہو رہا ہے، بیشک خدا کو قدرت تھی کہ یہ اختلاف وتفریق پیدا نہ ہونے دیتا یا پیدا ہو چکنے کے بعد تمام مکذبین کا فوراً استیصال کر کے سارے جھگڑے ایک دم میں چکا دیتا، مگر اس کی حکمت تکوینی اس کو مقتضی نہ ہوئی، ایک بات اس کے یہاں پہلے سے طے شدہ ہے کہ انسان کو ایک خاص حد تک کسب واختیار کی آزادی دے کر آزمائے کہ وہ کس راستہ پر چلتا ہے، آیا خالق ومخلوق کا ٹھیک ٹھیک حق پہچان کر خدا کی رحمت وکرامت کا مستحق بنتا ہے یا کجروی اور غلط کاری سے فطرت صحیحہ کی راہنمائی کو خیر باد کہہ کر اپنے کو غضب وسخط کا مظہر ٹھہراتا ہے، لِيَبۡلُوَكُمۡ اَيُّكُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا (ہود:۷) اسی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے انسان کی ساخت ایسی بنائی کہ وہ نیکی یا بدی کے اختیار کرنے میں بالکل مجبور ومضطر نہ ہو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں خیر وشر اور نیک وبد کی باہمی آویزش جاری رہے بعدہ مرحوم ومغضوب علیحدہ کیے جائیں، تاکہ اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ رَبُّكَ کے ساتھ لَاَمۡلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنۡكُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ (الاعراف:۱۸) والی بات بھی پوری ہو، غالباً یہ ہی وہ کلمہ (لفظ) ہے جو اگر نہ فرما چکا ہوتا تو سب اختلاف کا ایک دم خاتمہ کر دیا جاتا، عام لوگ ان حکمتوں کو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے شک میں پڑے ہوئے ہیں کہ آئندہ بھی ان اختلاف کا فیصلہ ہوگا یا نہیں۔

وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمۡ رَبُّكَ اَعۡمَالَهُمۡ ؕ اِنَّهٗ بِمَا يَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ ﴿۱۱۱﴾

اور جتنے لوگ ہیں جب وقت آیا پورا (بھگتا) دے گا رب تیرا ان کو ان کے اعمال، اس کو سب خبر ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں

**خلاصہ تفسیر:** اور (کسی کے شک وانکار سے یہ عذاب ٹلے گا نہیں، بلکہ) بالیقین سب کے سب ایسے ہی ہیں کہ آپ کا رب ان کو ان کے اعمال (کی جزا) کا پورا پورا حصہ دے گا، بالیقین وہ ان کے سب اعمال کی پوری خبر رکھتا ہے (یعنی جب ان کی سزا کا معاملہ آپ سے کچھ سروکار نہیں رکھتا تو آپ اور آپ کے متبعین مسلمان اپنے کام میں لگے رہیں، وہ کام اگلی آیات میں مذکور ہیں)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی ابھی وقت نہیں آیا کہ ہر ایک کے عمل کا پورا بھگتان کیا جائے، لیکن جب وقت آئے گا تو یقیناً ذرہ ذرہ کا حساب کردیا جائے گا، تاخیر عذاب سے یہ نہ سمجھو کہ اسے تمہارے اعمال کی خبر نہیں۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۲﴾

سوتو سیدھا چلا جا جیسا تجھ کو حکم ہوا اور جس نے توبہ کی تیرے ساتھ اور حد سے نہ بڑھو، بیشک وہ دیکھتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو

**خلاصہ تفسیر:** (وہ کام یہ ہیں کہ آپ) جس طرح کہ آپ کو حکم ہوا ہے (راہ دین پر) مستقیم رہیے، اور وہ لوگ بھی (مستقیم رہیں) جو کفر سے توبہ کرکے آپ کے ساتھ ہیں اور دائرہ (دین) سے ذرا مت نکلو، یقیناً وہ تم سب کے اعمال کو خوب دیکھتا ہے۔

**فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ:** استقامت کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ اور مخلوق کے حقوق کا ادا کرنا، کثرت کا وحدت میں اور وحدت کا کثرت میں مشاہدہ کرنا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی استقامت اور ہے اور آپ کے اَتباع کی اور۔

* * *

**فائدہ:** آپ ان مشرکین کی جھنجھٹ میں نہ پڑیے، آپ کو اور ان لوگوں کو جنھوں نے کفر وغیرہ سے توبہ کرکے آپ کی معیت اختیار کرلی اور حق تعالیٰ کی طرف رجوع کیا، احکام الٰہیہ پر نہایت پامردی اور استقلال کے ساتھ ہمیشہ جمے رہنا چاہیے، عقائد، اخلاق، عبادات، معاملات، دعوت و تبلیغ وغیرہ، ہر چیز میں افراط وتفریط سے علیحدہ ہوکر توسط واستقامت کی راہ پر سیدھے چلے جاؤ، کسی معاملہ میں افراط یا تفریط کی جانب اختیار کرکے حد سے نہ نکلو، اور یقین رکھو کہ حق تعالیٰ ہر آن تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

اور مت جھکو ان کی طرف جو ظالم ہیں پھر تم کو لگے گی آگ، اور کوئی نہیں تمہارا اللہ کے سوا مددگار پھر کہیں مدد نہ پاؤگے

**خلاصہ تفسیر:** اور (اے مسلمانو! ان) ظالموں کی طرف (یا جو ان کے جیسے ہوں ان کی طرف دلی دوستی سے یا اعمال واحوال میں شرکت ومشابہت سے) مت جھکو، کبھی تم کو دوزخ کی آگ لگ جائے اور (اس وقت) خدا کے سوا تمہارا کوئی رفاقت کرنے والا نہ ہو پھر تمہاری حمایت کسی طرف سے بھی نہ ہو (کیونکہ رفاقت تو حمایت سے زیادہ آسان ہے جب رفاقت کرنے والا ہی کوئی نہیں تو حمایت کا کب احتمال ہوسکتا ہے)۔

**وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا:** علماء محققین نے تصریح کی ہے کہ بلاضرورت شدید کفار کی وضع قطع اختیار کرنا، اسی طرح طاقت وقدرت کے باوجود ان پر نکیر نہ کرنا اور مداہنت (چشم پوشی) کرنا، ان کی تعظیم کرنا، اور بلاضرورت شرعیہ ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا سب کچھ اس ممانعت میں داخل ہے۔

* * *

**فائدہ:** پہلے لَا تَطْغَوْا میں حد سے نکلنے کو منع کیا تھا اب بتلاتے ہیں کہ جو لوگ ظالم (حد سے نکلنے والے) ہیں، ان کی طرف تمہارا ذرا سا میلان اور جھکاؤ بھی نہ ہو، ان کی موالات، مصاحبت، تعظیم وتکریم، مدح وثنا، ظاہری تشبہ، اشتراک عمل، ہر بات سے حسب مقدور محترز رہو، مبادا آگ کی لپٹ تم کو نہ لگ جائے، پھر نہ خدا کے سوا تم کو کوئی مددگار ملے گا اور نہ خدا کی طرف سے کوئی مدد پہنچے گی۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ

اور قائم کر نماز کو دونوں طرف دن کے اور کچھ ٹکڑوں میں رات کے [۱] البتہ نیکیاں دور کرتی ہیں برائیوں کو

ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

یہ یادگاری ہے یاد رکھنے والوں کو [۲] اور صبر کر البتہ اللہ ضائع نہیں کرتا ثواب نیکی کرنے والوں کا [۳]

**خلاصہ تفسیر:** اور (اے محمد ﷺ) آپ نماز کی پابندی رکھئے دن کے دونوں سروں پر (یعنی شروع اور آخر میں) اور رات کے کچھ حصوں میں، بیشک نیک کام (نامہ اعمال سے) مٹا دیتے ہیں برے کاموں کو، یہ بات (کہ نیکیوں سے گناہ معاف ہوجاتے ہیں) ایک (جامع) نصیحت ہے نصیحت ماننے والوں کے لیے (کیونکہ ہر نیکی اس قاعدہ کلیہ میں داخل ہے، پس اس سے ہر نیکی کی رغبت ہونی چاہئے) اور (ان مخالفین کی طرف سے جو معاملات پیش آتے ہیں ان پر) صبر کیا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتے (کیونکہ صبر بھی اعلیٰ درجہ کی نیکی ہے اس کا پورا اَجر ملے گا)۔

**طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ:** دن کے دوسروں سے مراد بعض کے نزدیک فجر اور عصر ہے، اور بعض کے نزدیک دو حصے مراد ہیں، ایک اول کا، ایک آخر کا، اول کے حصہ میں صبح کی نماز ہے، آخر کے حصہ میں ظہر وعصر ہے، رات کے حصوں سے مراد مغرب اور عشا کا وقت ہے، پس ایک قول پر اس آیت میں پانچوں نمازیں مراد ہیں اور ایک قول پر ظہر کے سوا چار نمازیں مراد ہیں، اور ظہر کا ذکر سورہ روم کی آیت: **وحین تظهرون** میں ہے، اور شاید چار نمازوں کا ذکر اس جگہ بطور خاص اہتمام کے لیے ہو، کیونکہ فجر اور عشا نیند کا وقت ہے، عصر کاروبار میں مشغولی کا، مغرب کا وقت گھر آنے اور کھانے کا، بخلاف ظہر کا وقت کہ وہ بالکل فراغت کا ہوتا ہے اور چونکہ اصل میں ان احکام کا سنانا دوسروں کو مقصود ہے اس لیے ان کی حالت کے اعتبار سے یہ تخصیص ہوئی، ورنہ حضور ﷺ کے لیے تو سب اوقات برابر تھے۔

**اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ:** برے کاموں سے مراد گناہ صغیرہ ہیں کہ وہ نیکیوں سے معاف ہوجاتے ہیں، اس مسئلہ کی تحقیق سورہ نساء آیت ۳۱: اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ کے تحت گزر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمایے۔

**اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ:** طاعت کے انوار سے گناہوں کی ظلمتیں دور ہوجاتی ہیں اور پھر طاعت کی استقامت سے معصیت کا مادہ کمزور پڑ جاتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱۔ **طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ:** ظالموں کی طرف مت جھکو، بلکہ خدائے وحدہ لاشریک لہ کی طرف جھکو، یعنی صبح وشام اور رات کی تاریکی میں خشوع وخضوع سے نمازیں ادا کرو کہ یہ ہی بڑا ذریعہ خدا کی مدد حاصل کرنے کا ہے۔

**تنبیہ:** دن کے دونوں طرف یعنی طلوع وغرب سے پہلے فجر اور عصر کی نمازیں مراد ہیں، یا ایک طرف فجر اور دوسری طرف مغرب کو رکھا جائے کہ وہ بھی بالکل غروب کے متصل ہوتی ہے، اور بعض سلف کے نزدیک اس میں فجر اور ظہر وعصر تینوں نمازیں داخل ہیں، گویا دن کے دو حصے کرکے پہلے حصے میں فجر کو اور دوسرے حصہ میں جو نصف النہار سے شروع ہوکر غروب پر ختم ہوتا ہے، دونوں نمازوں (ظہر وعصر) کو شمار کرلیا، زلف اور **وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ** سے فقط ''عشاء'' یا ''مغرب وعشاء'' دونوں مراد ہیں، ابن کثیر نے یہ احتمال بھی لکھا ہے کہ اور **طَرَفَیِ النَّهَارِ** سے فجر اور **وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ** سے تہجد مراد ہو، کیونکہ ابتدائے اسلام میں یہ ہی تین نمازیں فرض ہوئی تھیں، بعدہ تہجد کی فرضیت منسوخ ہوئی اور باقی دو کے ساتھ تین کا اضافہ کیا گیا (واللہ اعلم)

**فائدہ:** ۲۔ **ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِیْنَ:** یعنی نمازوں کا قائم رکھنا، خدا کی یادگاری ہے، جیسے دوسری جگہ فرمایا، اور **اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ** یا یہ مطلب ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ کا ضابطہ یادرکھنے والوں کے لیے یادرکھنے کی چیز ہے، جسے کبھی فراموش نہ کرنا چاہیے، کیونکہ اس سے مومن کو نیکیوں کی طرف خاص ترغیب ہوتی ہے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''نیکیاں دور کرتی ہیں برائیوں کو تین طرح، جو نیکیاں کرے اس کی برائیاں معاف ہوں، اور جو نیکیاں اختیار کرے اس سے خوبی برائیوں کی چھوٹے، اور جس ملک میں نیکیوں کا رواج ہو وہاں ہدایت آئے اور گمراہی مٹے لیکن تینوں جگہ وزن غالب چاہیے، جتنا میل اتنا صابون''۔

**فائدہ:** ۳۔ **فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ:** قرآن کریم میں غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی امداد واعانت حاصل کرنے میں دو چیزوں کو خاص دخل ہے، صلوٰۃ اور صبر یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (البقرۃ: ۱۵۳)

یہاں بھی ''صلوٰۃ'' کے بعد ''صبر'' کا حکم فرمایا، مطلب یہ ہے کہ مومن خدا کی عبادت وفرمانبرداری میں ثابت قدم رہے اور کسی دکھ درد کی پروانہ کرے، تب خدا کی مدد ونصرت حاصل ہوتی ہے اس کے یہاں کسی نیکوکار کا اجر ضائع نہیں ہوتا، بلکہ اندازہ سے زائد ملتا ہے۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا

سو کیوں نہ ہوئے ان جماعتوں میں جو تم سے پہلے تھیں ایسے لوگ جن میں اثر خیر رہا ہو کہ منع کرتے رہتے بگاڑ کرنے سے ملک میں مگر تھوڑے

مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿١١٦﴾

کہ جن کو ہم نے بچالیا ان میں سے، اور چلے وہ لوگ جو ظالم تھے وہی راہ جس میں عیش سے رہے تھے اور تھے گناہ گار

**خلاصہ تفسیر:** پچھلی امتوں کا حال سنا کر ان کی ہلاکت کے دو سبب بتلاتے ہیں: ایک سبب قریب اور ایک سبب بعید، بالفاظ دیگر ایک ظاہری سبب ظاہری اور ایک باطنی سبب، ظاہری سبب تو ان کی نافرمانی ہے، اور باطنی سبب یہ تھا کہ اللہ کا ارادہ اور اس کی مشیت وحکمت تھی کہ سب لوگ ایک راہ پر نہ چلیں، پہلے کے بیان سے اپنا رحم وکرم اور دوسرے کے بیان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور غم کا دور کرنا مقصود ہے۔

(اوپر جو سابقہ قوموں کی ہلاکت کے واقعات مذکور ہوئے) تو (وجہ اس کی یہ ہوئی کہ) جو امتیں تم سے پہلے گزری ہیں ان میں ایسے سمجھ دار لوگ نہ ہوئے جو کہ (دوسروں کو) ملک میں فساد (یعنی کفر وشرک) پھیلانے سے منع کرتے بجز چند آدمیوں کے کہ جن کو ان میں سے ہم نے (عذاب سے) بچالیا تھا (کہ وہ تو البتہ جیسے خود کفر وشرک سے تائب ہو گئے تھے دوسروں کو بھی منع کرتے رہتے تھے اور ان ہی دونوں عمل کی برکت سے وہ عذاب سے بچ گئے تھے، باقی اور لوگ چونکہ خود ہی کفر میں مبتلا تھے انہوں نے دوسروں کو بھی منع نہ کیا) اور جو لوگ نافرمان تھے وہ جس ناز ونعمت میں تھے اسی کے پیچھے پڑے رہے اور جرائم کے خوگر ہو گئے (کہ اس سے باز ہی نہ آئے)۔

يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ: پچھلی اقوام پر عذاب الٰہی نازل ہونے کی وجہ اور لوگوں کو اس سے بچنے کی ہدایت اس طرح دی گئی ہے کہ ان پچھلی قوموں میں افسوس ہے کہ ایسا نہ ہوا کہ ان میں کچھ بھی سمجھ دار نیک لوگ ہوتے جو اپنی قوم کو فساد کرنے سے باز رکھتے، بجز تھوڑے سے لوگوں کے جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کا اتباع کیا، اور وہی عذاب سے محفوظ رہے، اور باقی پوری قوم دنیا کی لذتوں میں پھنس کر جرائم پیشہ بن گئی۔

حاصل مطلب یہ ہوا کہ نافرمانی تو ان میں عام طور پر رہی اور فساد سے منع کرنے والا کوئی ہوا نہیں اس لیے سب ایک ہی عذاب میں مبتلا ہوئے، ورنہ کفر کی وجہ سے عذاب عام ہوتا اور فساد کی وجہ سے عذاب خاص، اب منع نہ کرنے کی وجہ سے غیر مفسد بھی مفسد ہونے میں شریک قرار دیے گئے، اس لیے جو عذاب مجموعہ کفر وفساد پر نازل ہوا وہ بھی عام رہا، پس اس آیت پر جو شبہ ظاہر میں ہوتا ہے کہ اصل وجہ ہلاک کرنے کی تو کفر تھا نہ کہ فساد سے منع کرنا، اس کا جواب اس تقریر سے ہو گیا کہ فساد سے منع نہ کرنا مطلق عذاب کا سبب نہیں بلکہ خاص عذاب کا سبب ہے۔

اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ: اس آیت میں اہل الرائے اور سمجھ دار لوگوں کو لفظ اُولُوْا بَقِيَّةٍ سے تعبیر کیا ہے، ''بقیہ'' کا لفظ باقی ماندہ چیز کے لیے بولا جاتا ہے، اور انسان کی عادت یہ ہے کہ جو چیز سب سے زیادہ عزیز ومحبوب ہوتی ہے اس کو ہر حال میں اپنے لئے محفوظ اور باقی رکھنے کا اہتمام کرتا ہے، ضرورت پڑنے پر دوسری ساری چیزیں قربان کر دیتا ہے مگر اس کو نہیں دیتا، اسی لئے عقل وبصیرت کو بقیہ کہا جاتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ عزیز ہے، یہاں اہل رائے کو بطور خاص اس لیے ذکر کیا کہ جب انہوں نے منع نہ کیا تو دوسروں کا منع نہ کرنا تو بدرجہ اولی سمجھا گیا۔

* * *

**فائدہ:** یہ پچھلوں کا حال سنا کر امت محمدیہ کو ابھارا گیا ہے کہ ان میں ''امر بالمعروف'' اور ''نہی عن المنکر'' کرنے والے بکثرت موجود رہنے چاہیں، گزشتہ قومیں اس لیے تباہ ہوئیں کہ عام طور پر لوگ عیش وعشرت کے نشہ میں چور ہو کر جرائم کا ارتکاب کرتے رہے اور بڑے بااثر آدمی جن میں کوئی اثر خیر کا باقی نہیں تھا انہوں نے منع کرنے چھوڑ دیا، اس طرح کفر وعصیان اور ظلم وطغیان سے دنیا کی جو حالت بگڑ رہی تھی اس کا سنوارنے والا کوئی

نہ رہا، چند گنتی کے آدمیوں نے ''امر بالمعروف'' کی کچھ آواز بلند کی مگر نقار خانہ میں طوطی کی صدا کون سنتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ منع کرنے والے عذاب سے محفوظ رہے باقی سب قوم تباہ ہوگئی، شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''نیک لوگ غالب ہوتے تو قوم ہلاک نہ ہوتی، تھوڑے تھے سو آپ بچ گئے''، حدیث صحیح میں ہے کہ جب ظالم کا ہاتھ پکڑ کر ظلم سے نہ روکا جائے اور لوگ ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' ترک کر بیٹھیں، تو قریب ہے کہ خدا تعالیٰ ایسا عام عذاب بھیجے جو کسی کو نہ چھوڑے (العیاذ باللہ)۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿١١٧﴾

اور تیرا رب ہرگز ایسا نہیں کہ ہلاک کرے بستیوں کو زبردستی سے اور لوگ وہاں کے نیک ہوں

**خلاصہ تفسیر:** اور (اس سے ثابت ہوگیا کہ) آپ کا رب ایسا نہیں کہ بستیوں کو کفر کے سبب ہلاک کردے اور ان کے رہنے والے (اپنی اور دوسروں کی) اصلاح میں لگے ہوں (بلکہ جب بجائے اصلاح کے فساد کریں اور فساد کرنے والوں کو منع نہ کریں اس وقت عذاب خاص کے مستحق ہو جاتے ہیں)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جس بستی کے لوگ اپنی حالت درست کرنے کی طرف متوجہ ہوں، نیکی کو رواج دیں، ظلم و فساد کو روکیں تو خداوند قدوس کی یہ شان نہیں کہ خواہ مخواہ انھیں زبردستی پکڑ کر ہلاک کردے، عذاب اسی وقت آتا ہے جب لوگ کفر و عصیان یا ظلم و طغیان میں حد سے نکل جائیں۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿١١٨﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ

اور اگر چاہتا تیرا رب کر ڈالتا لوگوں کو ایک راستہ پر اور ہمیشہ رہتے ہیں اختلاف میں، مگر جن پر رحم کیا تیرے رب نے اور

وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿١١٩﴾

اور اسی واسطے ان کو پیدا کیا ہے، اور پوری ہوئی بات تیرے رب کی کہ البتہ بھر دوں گا دوزخ جنوں سے اور آدمیوں سے اکٹھے ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور اگر اللہ کو منظور ہوتا سب آدمیوں کو ایک ہی طریقہ کا بنا دیتا (یعنی سب کو مومن کر دیتا، لیکن بعض حکمتوں کی وجہ سے ایسا منظور نہ ہوا، اس لئے دین حق کے خلاف مختلف طریقوں پر ہوگئے) اور (آئندہ بھی) ہمیشہ اختلاف (ہی) کرتے رہیں گے مگر جس پر آپ کے رب کی رحمت ہو (وہ دین حق کے خلاف طریقہ اختیار نہ کرے گا) اور (آپ اس اختلاف پر غم یا افسوس یا تعجب نہ کیجیے کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو اسی واسطے پیدا کیا ہے (کہ ان میں اختلاف رہے) اور (اختلاف کے لیے پیدا کرنے کی وجہ یہ ہے کہ) آپ کے رب کی یہ بات پوری ہوگی کہ میں جہنم کو جنات سے اور انسانوں سے دونوں سے بھر دوں گا۔

**وَلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ:** اس اختلاف سے مراد وہ اختلاف ہے جو اتفاق کے بعد پیدا ہو، کیونکہ پہلے تو سب موحد ہی تھے، پس آیت کان الناس امۃ واحدۃ سے اس آیت کا کوئی تعارض نہیں، کیونکہ اتفاق کا زمانہ دوسرا تھا اور اختلاف کا زمانہ دوسرا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اختلاف سے مراد اس جگہ دین حق اور تعلیم انبیاء کی مخالفت ہے، اجتہادی اختلاف جو ائمہ دین اور فقہاء اسلام میں ہوا ناگزیر ہے اور عہد صحابہ سے ہوتا چلا آیا ہے، وہ اس میں داخل نہیں، نہ وہ رحمت الٰہی کے خلاف ہے، بلکہ مقتضائے حکمت و رحمت ہے، جن حضرات نے ائمہ مجتہدین کے اختلاف کو اس آیت کی رو سے غلط، خلاف رحمت قرار دیا ہے، یہ خود سیاق آیت کے بھی خلاف ہے اور صحابہ و تابعین کے تعامل کے بھی، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

**لَاَمۡلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الۡجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِيۡنَ**: خود اس بات کی حکمت یہ ہے کہ جس طرح اہل جنت میں رحمت کی صفت ظاہر ہوئی، اہل جہنم میں غضب کی صفت ظاہر ہوئی، پھر اس ظہور کی حکمت اور اس حکمت کی حکمت یہ اللہ ہی کو معلوم ہے، غرض اس ظہور کی حکمت سے بعضوں کا جہنم میں جانا ضروری ہے، اور جہنم میں جانے کے لیے کفار کا عالم میں ہونا تکویناً ضروری ہے، اور کفار کے وجود سے اختلاف لازم ہے، یہ ہے وجہ سب کے مسلمان نہ ہونے کی، باقی اس سے کفار کا مجبور ہونا لازم نہیں آتا، ارادہ اور اختیار سب کو دیا گیا ہے اور وعدہ ہے کہ جو جیسا ارادہ کرے گا اسکو پورا کر دیا جائے گا۔

**وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمۡ**: روح المعانی میں ہے کہ اس اختلاف کیلئے ان کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ اس کے جمال یعنی لطف اور اسکے جلال یعنی قہر کے مظاہر ہوں، اور یہ **وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون** کے خلاف نہیں، اول غایت تکوینی ہے اور ثانی غایت تشریعی ہے۔

* * *

**فائدہ: ۱** یعنی جیسا کہ بارہا پہلے لکھا جا چکا ہے خدا تعالیٰ کی حکمت تکوینی اس کو مقتضی نہیں ہوئی کہ ساری دنیا کو ایک ہی راستہ پر ڈال دیتا، اسی لیے حق کے قبول کرنے نہ کرنے میں ہمیشہ اختلاف رہتا ہے اور رہے گا، مگر فی الحقیقت اختلاف اور پھوٹ ڈالنے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے صاف وصریح فطرت کے خلاف حق کو جھٹلایا، اگر فطرت سلیمہ کے موافق سب چلتے تو کوئی اختلاف نہ ہوتا، اسی لیے اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ رَبُّكَ سے متنبہ فرما دیا کہ جس پر خدا نے ان کی حق پرستی کی بدولت رحم کیا وہ اختلاف کرنے والوں سے مستثنیٰ ہیں۔

**فائدہ: ۲** یعنی دنیا کی آفرینش سے غرض یہ ہی ہے کہ حق تعالیٰ کی ہر قسم کی صفات "جمالیہ" و "قہریہ" کا ظہور ہو، اس لیے مظاہرہ کا مختلف ہونا ضروری ہے تاکہ ایک جماعت اپنے مالک کی وفاداری و اطاعت دکھا کر رحمت و کرم اور رضوان و غفران کا مظہر بنے، جو اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ رَبُّكَ کی مصداق ہے اور دوسری جماعت اپنی بغاوت و غداری سے اس کی صفت عدل و انتقام کا مظہر بن کر اس دوام کی سزا بھگتے، جس پر خدا کی یہ بات پوری ہو لَاَمۡلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنۡكُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ (الاعراف:۱۸) بہر حال آفرینش عالم کا تشریعی مقصد عبادت ہے: وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِيَعۡبُدُوۡنِ (الذاریات:۵۶) اور تکوینی غرض یہ ہے کہ تشریعی مقصد کو اپنے کسب و اختیار سے پورا کرنے اور نہ کرنے والے دو گروہ ایسے موجود ہوں جو حق تعالیٰ کی صفات جلالیہ و جمالیہ یا بالفاظ دیگر لطف وقہر کے مورود و مظہر بن سکیں:

در کارخانہ عشق از کفر ناگزیر است ۔۔۔ دوزخ کرا بسوزد گر بولہب نہ باشد

پھر لطف و کرم سے مظاہر بھی اپنے مدارج استعداد و عمل کے اعتبار سے مختلف ہوں گے:

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونق چمن ۔۔۔ اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِىۡ هٰذِهِ الۡحَقُّ

اور سب چیز بیان کرتے ہیں ہم تیرے پاس رسولوں کے احوال سے جس سے تسلی دیں تیرے دل کو، اور آئی تیرے پاس اس سورت میں تحقیق بات

وَمَوۡعِظَةٌ وَّذِكۡرٰى لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۲۰﴾

اور نصیحت اور یادداشت ایمان والوں کو

**خلاصہ تفسیر**: پیچھے قصوں اور واقعات کی علت و حکمت مذکور تھی، اب ان واقعات کو بیان کرنے کی حکمت بتائی جاتی ہے۔

اور پیغمبروں کے قصوں میں سے ہم یہ سارے (مذکورہ) قصے آپ سے بیان کرتے ہیں جن کے ذریعہ سے ہم آپ کے دل کو تقویت دیتے ہیں (قصوں کے بیان کا ایک فائدہ تو یہ ہوا جس کا حاصل آپ کو تسلی دینا ہے) اور ان قصوں میں آپ کے پاس ایسا مضمون پہنچا ہے جو خود بھی راست (اور قطعی) ہے اور مسلمانوں کے لیے (برے کاموں سے روکنے کے لیے) نصیحت ہے اور (اچھے کام کرنے کے لیے) یاددہانی ہے (یہ قصوں کے بیان کا دوسرا فائدہ ہوا، واقعات کے بیان کرنے میں ایک فائدہ نبی کے لیے، دوسرا اُمت کے لیے)۔

**وَكُلًّا نَّقُصُّ (الی قوله) نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ**: اس میں دلیل ہے کہ اللہ کے مقبول بندوں کا تذکرہ قلوب کی ایمانی تقویت کا ذریعہ ہے ،اس لیے مشائخ اہل طریقت نے ہر دور میں اولیا صالحین کی حکایات جمع کرنے کا خاص اہتمام کیا ہے۔

**وَجَآءَكَ فِیْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰی**: ''حق'' ہونا یہ توان آیات قرآنیہ کی ذاتی صفت ہے جو قصص پر مشتمل ہیں،اور ''موعظۃ و ذکریٰ''،یعنی نصیحت و یاددہانی ہونا یہ اضافی صفت ہے جن میں سے ایک زاجر اور ایک آمر ہے۔

* * *

**فائدہ**: اوپر بہت سے انبیاء و رسل کے قصص مذکور ہوئے تھے،اب ختم سورت پر ذکر قصص کی بعض حکمتوں پر تنبیہ فرماتے ہیں،یعنی گزشتہ اقوام و رسل کے واقعات سن کر پیغمبر ﷺ کا قلب بیش از بیش ساکن و مطمئن ہوتا ہے اور امت کو تحقیقی باتیں معلوم ہوتی ہیں،جن میں نصیحت و تذکیر کا بڑا سامان ہے،آدمی جب سنتا ہے کہ میرے ابنائے نوع پہلے فلاں فلاں جرائم کی پاداش میں ہلاک ہو چکے ہیں تو ان سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ فلاں راستہ اختیار کرنے سے پچھلوں کو نجات ملی تو طبعاً اسکی طرف دوڑتا ہے،فی الحقیقت قرآن کریم میں قصص کا حصہ اس قدر موثر و مذکر واقع ہوا ہے کہ کوئی شخص جس میں تھوڑا سا آدمیت کا جزء ہو اور خوف خدا کی ذراسی ٹیس دل میں رکھتا ہو انھیں سن کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا،باقی قصص یا بعض دوسرے مضامین کی تکرار جو قرآن کریم میں پائی جاتی ہے اس پر ہم نے رسالہ ''القاسم'' کے ابتدائی دور میں ایک مستقل مضمون لکھا ہے اسے ملاحظہ کرلیا جائے۔

**وَقُلْ لِّلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾**

اور کہہ دے ان کو جو ایمان نہیں لاتے کام کیے جاؤ اپنی جگہ پر ہم بھی کام کرتے ہیں،اور انتظار کرو ہم بھی منتظر ہیں

**خلاصہ تفسیر**: اس سورت کے مجموعہ میں توحید،رسالت،آخرت اور حقانیت قرآن کا اثبات اور شبہات کی نفی سے اتمام دعوت اور حجت لازم کرنے کا حق کافی طور پر ادا کر دیا گیا،اب جو لوگ اس پر بھی نہ مانیں تو ان سے آخری کلام کر کے سورت کو ختم کیا جاتا ہے۔

اور جو لوگ (ان قطعی دلائل اور حجتوں کے باوجود بھی) ایمان نہیں لاتے ان سے کہہ دیجئے کہ (میں تم سے الجھتا نہیں) تم اپنی حالت پر عمل کرتے رہو ہم بھی (اپنے طور پر) عمل کر رہے ہیں اور (ان اعمال کے نتیجہ کے) تم (بھی) منتظر رہو ہم بھی منتظر ہیں (سو عنقریب باطل کھل جائے گا)۔

* * *

**فائدہ**: اس مضمون کی آیات پہلے اسی سورت میں گزر چکی ہیں،مطلب یہ ہے کہ اگر میری بات نہیں مانتے تو بہتر ہے تم اپنی ضد پر جمے رہو،میں اپنے مقام میں تمہارے انجام بد کا منتظر ہوں،چند روز میں پتہ چل جائے گا کہ ظالموں کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے: **وَّیَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآىِٕرَ ؕ عَلَیْهِمْ دَآىِٕرَةُ السَّوْءِ** (التوبہ:۹۸)

**وَلِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَیْهِ ؕ**

اور اللہ کے پاس چھپی ہے بات آسمانوں کی اور زمین کی اور اسی کی طرف رجوع ہے سب کام کا سو اسی کی بندگی کر اور اسی پر بھروسہ رکھ

ع **وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾**

اور تیرا رب بے خبر نہیں جو کام تم کرتے ہو

**خلاصہ تفسیر**: اور آسمانوں اور زمین میں جتنی غیب کی باتیں ہیں ان کا علم خدا ہی کو ہے (سو بندوں کے اعمال تو غیب بھی نہیں ان کا علم تو حق تعالی کو بدرجہ اولی ہے) اور سب امور اسی کی طرف رجوع ہوں گے (یعنی علم اور اختیار کی دونوں صفتیں حق تعالی میں ہیں،پھر اسے کیا مشکل ہے اگر اعمال کی جزا و سزا دے دے،اور جب وہ ایسا علم و اختیار رکھتا ہے) تو (اے محمد ﷺ!) آپ اسی کی عبادت کیجئے (جس میں تبلیغ بھی داخل ہے)

اور اسی پر بھروسہ رکھئے (اگر تبلیغ احکام میں کسی اذیت کا احتمال ہو تو اندیشہ نہ کیجیے، یہ خطاب بیچ میں آپ ﷺ کو فرما کر پھر پہلے مضمون کو پورا فرماتے ہیں یعنی) اور آپ کا رب ان باتوں سے بے خبر نہیں جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو (جیسا کہ پیچھے عالم الغیب ہونے سے اعمال کا بدرجہ اولی خدا کو معلوم ہونا ثابت ہو چکا، اور اس آیت پر سورت کا حسن ختام ظاہر ہے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی آپ ان کے کفر وشرارت سے دلگیر نہ ہوں اپنا کام کیے جائیں اور ان کا فیصلہ خدا کے حوالہ کریں، اس سے آسمان وزمین کی کوئی بات چھپی نہیں، سب معاملات ہر پھر کر اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں، وہاں ان کو پتہ لگ جائے گا کہ وہ کس خبط میں پڑے ہوئے تھے، آپ تو دل وجان سے اپنے پروردگار کی بندگی اور فرمانبرداری میں لگے رہیے، اور تنہا اسی کی اعانت پر بھروسہ رکھیے، وہ تمہارے مخلصانہ اعمال سے بے خبر نہیں ان کے مناسب تم سے معاملہ کرے گا، حدیث میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے سوال کیا یا رسول اللہ! آپ پر بڑھاپے کے آثار بہت جلد آ گئے؟ فرمایا "شَيَّبَتْنِيْ هُوْدٌ وَاَخَوَاتُها" سورہ ہود اور اس کی بہنوں نے مجھے بوڑھا کر دیا، بعض علماء نے لکھا ہے کہ سورہ ہود کی جس آیت نے آپ کو بوڑھا کر دیا یہ تھی: فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۭ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (ہود:۱۱۲) رزقنا الله سبحانه و تعالىٰ الاستقامة على دين و سنته نبيه ﷺ

## ایاتها ۱۱۱ ۱۲ سُورَۃُ یُوسُفَ مَکِّیَّۃٌ ۵۳ رکوعاتها ۱۲

**خلاصہ تفسیر:** تقریباً مکمل سورت حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ پر مشتمل ہے، قصہ کے آغاز سے قبل قرآن کریم کی حقیقت بیان کی گئی جس میں یہ قصہ ذکر ہوا، قصہ کے مکمل ہونے کے بعد اول توحید کا مضمون، اس کے درمیان میں وعید، پھر رسالت کی بحث اور اس کے منکرین کی بدانجامی کی اجمالی حکایت، اور ایسی حکایات وقصوں کا موجب عبرت ہونا، اور قرآن کریم کا حق ہونا بیان کیا گیا ہے جس میں یہ قصے ہیں، اور اسی پر سورت کا اختتام ہے، پس سورت کا زیادہ حصہ قصہ پر مشتمل ہے جس کے بیان کی حکمت گزشتہ سورت کی اخیر آیت میں مذکور ہوئی تھی، اور اس سورت کا کچھ حصہ اصول دین کے بارے میں ہے جن میں کفار کی مخالفت کرنے کی وجہ سے آپ ﷺ کو جو غم ہوتا تھا اس کے ازالہ اور تسلی کے لیے یہ قصہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں کی مخالفت سے کوئی نقصان نہیں پہنچا، بلکہ انجام کار وہی ترقی کا سبب ہو گیا، اسی طرح آپ ﷺ کو بھی آپ کی قوم کی مخالفت مضر نہ ہوگی، اس تقریر سے دونوں سورتوں کی اور خود اس سورت کے اجزا کی بھی مناسبت معلوم ہو گئی، اور چونکہ اس قصہ کے اجزا کا ربط محتاج بیان نہیں اور یہی سورت کا بڑا حصہ ہے اس لیے ان میں دیگر مقامات کی طرح مستقل طور پر تقریر بیان نہ کی جائے گی۔

**فائدہ اول:** درمنثور میں حضرت ابن عباس ؓ سے اس سورت کا شان یہ مروی ہے کہ صحابہ نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگر آپ ہم کو کوئی قصہ سنا دیں تو خوب ہو، اس پر یہ قصہ نازل ہوا، اور خازن میں ابن عباس ؓ ہی سے مروی ہے کہ یہود نے مشرکین کے ذریعے امتحاناً آنحضرت ﷺ سے بنی اسرائیل کے ملک مصر میں آباد ہونے کی وجہ دریافت کی تھی کہ بنی اسرائیل تو شام میں رہتے تھے وہ مصر میں کیسے پہنچے؟ اس کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی جو کہ عجیب وغریب بصائر وعبر پر مشتمل ہے اور اس بات کا جواب ہے کہ بنی اسرائیل شام سے چل کر کس طرح مصر میں آباد ہوئے، غرض ان کے جواب میں بذریعہ وحی یہ پورا قصہ نازل کیا گیا جو رسول کریم ﷺ کا معجزہ اور آپ کی نبوت کا بڑا شاہد تھا کہ آپ امی محض تھے اور عمر بھر مکہ میں مقیم رہے، کسی سے تعلیم حاصل نہیں کی اور نہ کوئی کتاب پڑھی، پھر وہ تمام واقعات جو تورات میں مذکور تھے صحیح صحیح بتلا دیئے، بلکہ بعض وہ چیزیں بھی بتلا دیں جن کا ذکر تورات میں نہ تھا اور اس کے ضمن میں بہت سے احکام وہدایات ہیں جو آگے بیان ہوں گی۔

نیز یہ قصہ آنحضرت ﷺ کے حال سے بہت مشابہت رکھتا ہے، یوسف علیہ السلام کی طرح آپ ﷺ کی نبوت کا آغاز بھی رویائے صالحہ سے ہوا، پھر جیسا کہ یوسف علیہ السلام پر ان کے بھائیوں نے حسد کیا اور طرح طرح کی ان کو تکلیفیں پہنچائیں، بالآخر اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام

کوصبر اور استقامت کی برکت سے عزت اور غلبہ نصیب فرمایا اور جب کامیابی دیکھی تو بھائیوں سے کوئی انتقام نہیں لیا، بلکہ **لا تثریب علیکم الیوم یغفر اللہ لکم وھو ارحم الرحمین** کہہ کر درگزر فرمایا اور کبھی بھی کوئی حرف شکوہ اور شکایت کا زبان پر نہیں آیا، اور مزید برآں ان کو انعام و اکرام سے سرفراز فرمایا، اسی طرح آنحضرت ﷺ کو قریش سے بہت سی تکلیفیں پہنچیں اور آپ ﷺ نے حسب ارشاد خداوندی استقامت اور صبر سے کام لیا، بالآخر جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو اس وقت آپ ﷺ نے قریش پر کوئی ملامت نہیں کی اور نہ گزشتہ کا کوئی شکوہ کیا بلکہ یوسف علیہ السلام کی طرح یہ فرمایا: "لا تثریب علیکم الیوم، یغفر اللہ لکم وھو ارحم الرحمین، اذھبوا انتم الطلقاء" اور یوسف علیہ السلام کی طرح آپ ﷺ نے بھی طلقاء قریش کو غنائم حنین میں سے بطور تالیف قلب سو سو اونٹ عطاء کیے تا کہ اسلام کی کراہت ونفرت، الفت وموانست میں بدل جائے، اور یوسف علیہ السلام کی سنت کا اتباع ہوجائے کہ جس طرح یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے ساتھ سلوک اور احسان کیا اسی طرح آپ ﷺ بھی اپنے بھائیوں کے ساتھ سلوک اور احسان فرمائیں، علاوہ ازیں اس قصہ میں آپ ﷺ کی تسلی بھی ہے کہ یوسف علیہ السلام کی طرح بھائیوں کی ایذا رسانیوں پر صبر کیجئے اور جادہ حق پر قائم اور مستقیم رہیے اور نتیجہ کا انتظار کیجیے۔

**فائدہ دوم**: یہ قصہ تفصیل سے صرف اسی سورۃ میں آیا ہے، پورے قرآن میں دوبارہ اس کا کہیں ذکر نہیں، اس کی وجہ روح المعانی میں یہ لکھی ہے کہ یہ قصہ صحابہ کی درخواست پر نازل ہوا تھا اس لیے تفصیل کے ساتھ ایک جگہ بیان کیا گیا تا کہ ان کا مقصود حاصل ہوجائے اور قصہ کے تفصیلی احاطہ سے انہیں راحت اور سیری ہو، یہ خصوصیت صرف قصہ یوسف ہی کی ہے، ورنہ تمام انبیاء علیہم السلام کے قصص وواقعات پورے قرآن میں ہر مقام کے مناسب خاص حکمت کے تحت اجزاء اجزاء کر کے لائے گئے ہیں اور بار بار لائے گئے، جبکہ اس قصہ کے سب اجزاء اور فوائد ایک جگہ جمع کر دیے گئے اس لیے اس میں تکرار نہیں، دوسرے قصوں میں چونکہ استیعاب نہیں، اس لیے ہر مقام کے مناسب مختلف فوائد کے لیے کچھ کچھ اجزاء لائے گئے، روح المعانی میں اس کی ایک وجہ یہ بھی لکھی ہے کہ دیگر قصوں میں گناہوں کی مذمت اور ان پر زجر وتنبیہ مقصود ہے، اور ان کا اہم ہونا تکرار کا تقاضہ کرتا ہے، بخلاف قصہ یوسف علیہ السلام کے جیسا کہ ظاہر ہے، اور قرآن کریم کے دیگر کچھ قصوں اور واقعات میں بھی تکرار نہ ہونے کی یہی دو وجہ ہیں جیسے کہ قصہ اصحاب کہف، قصہ ذوالقرنین، قصہ موسیٰ وخضر علیہما السلام اور قصہ ذبح اسماعیل علیہ السلام، مذکورہ تمام واقعات بھی قرآن کریم میں ایک مقام پر بیان فرمائے گئے۔

نیز قرآن کریم جو اقوام عالم کے لئے آخری ہدایت نامہ کی حیثیت سے بھیجا گیا ہے اس میں پوری اقوام عالم کی تاریخ کا وہ منتخب حصہ لے لیا گیا ہے جو انسان کے حال اور مآل کی اصلاح کے لئے نسخہ کیمیا ہے، مگر قرآن کریم نے تاریخ عالم کے اس حصہ کو بھی اپنے مخصوص و بے مثال انداز میں اس طرح لیا ہے کہ اس کا پڑھنے والا یہ محسوس نہیں کرسکتا کہ یہ کوئی تاریخ کی کتاب ہے، بلکہ ہر مقام پر جس قصہ کا کوئی ٹکڑا عبرت وموعظت کے لیے ضروری سمجھا گیا صرف اتنا ہی حصہ وہاں بیان کیا گیا اور پھر کسی دوسرے موقع پر اس حصہ کی ضرورت سمجھی گئی تو پھر اس کا اعادہ کر دیا گیا، اسی لئے ان قصوں کے بیان میں واقعاتی ترتیب کی رعایت نہیں کی گئی، بعض جگہ قصہ کا ابتدائی حصہ بعد میں اور آخری حصہ پہلے ذکر کر دیا گیا ہے، اس خاص اسلوب قرآنی میں یہ مستقل ہدایت ہے کہ دنیا کی تاریخ اور اس کے گذشتہ واقعات کا پڑھنا یا درکھنا خود کوئی مقصد نہیں، بلکہ انسان کا مقصد ہر قصہ وخبر سے کوئی عبرت ونصیحت حاصل کرنا ہونا چاہئے، اسی لئے بعض اہل تحقیق نے فرمایا کہ انسان کے کلام کی جو دو قسمیں خبر اور انشاء مشہور ہیں، ان دونوں قسموں میں سے مقصود اصلی انشاء ہی ہے، خبر بحیثیت خبر کبھی مقصود نہیں ہوتی، بلکہ دانشمند انسان کا مقصد ہر خبر اور واقعہ کو سننے اور دیکھنے سے صرف اپنے حال اور عمل کی اصلاح ہونی چاہئے، حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کو ترتیب کے ساتھ ایک جگہ بیان کرنے کی ایک حکمت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ تاریخ نگاری بھی ایک مستقل فن ہے اس میں اس فن والوں کے لئے خاص ہدایات ہیں کہ بیان میں نہ اتنا اختصار ہونا چاہئے جس سے بات ہی پوری نہ سمجھی جاسکے اور نہ اتنا طول ہونا چاہئے کہ اس کا پڑھنا اور یاد رکھنا مشکل ہوجائے جیسا کہ اس قصہ کے قرآنی بیان سے واضح ہوتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓرٰ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿١﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٢﴾

الرٰ، یہ آیتیں ہیں واضح کتاب کی ۱۔ ہم نے اس کو اتارا ہے قرآن عربی زبان کا تاکہ تم سمجھ لو ۲۔

**خلاصہ تفسیر:** الرٰ (اسکے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ آیتیں ہیں ایک واضح کتاب کی (جس کے الفاظ اور معانی بہت صاف ہیں) ہم نے اس کو اتارا ہے قرآن عربی زبان کا تاکہ تم (اہل زبان ہونے کی وجہ سے دوسروں سے پہلے) سمجھو (پھر تمہارے واسطے سے دوسرے لوگ سمجھیں)۔

* * *

**فائدہ:** ۱۔ جس کا من عند اللہ ہونا بالکل واضح ہے اور جن احکام وشرائع یا مواعظ ونصائح پر وہ مشتمل ہے نہایت روشن اور صاف ہیں۔

**فائدہ:** ۲۔ یعنی عربی زبان جو تمام زبانوں میں زیادہ فصیح ووسیع اور منضبط و پرشوکت زبان ہے، نزول قرآن کے لیے منتخب کی گئی، جب خود پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو ظاہر ہے کہ دنیا میں اس کے اولین مخاطب عرب ہوں گے، پھر عرب کے ذریعہ سے چاروں طرف یہ روشنی پھیلے گی، اسی کی طرف لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ میں اشارہ فرمایا کہ تمہاری زبان میں اتارنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ تم جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم ہو اول اس کے علوم ومعارف کا مزہ چکھو پھر دوسروں کو چکھاؤ، چنانچہ ایسا ہی ہوا، ابن کثیر لکھتے ہیں: "اُنْزِلَ اَشْرَفُ الْكُتُبِ بِاَشْرَفِ اللّغَاتِ عَلٰى اَشْرَفِ الرُّسُلِ بِسَفَارَةِ اَشْرَفِ الْمَلَائِكَةِ وَكَانَ ذٰلِكَ فِىْ اَشْرَفِ بِقَاعِ الْاَرْضِ وَابْتِدَاءُ اِنْزَالِهٖ فِىْ اَشْرَفِ شُهُورِ السَّنَةِ وَهُوَ رَمَضَانُ فكَمِلَ مِنْ كُلِّ الْوُجُوْهِ"۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ

ہم بیان کرتے ہیں تیرے پاس بہت اچھا بیان اس واسطے کہ بھیجا ہم نے تیری طرف یہ قرآن، اور تو تھا

مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿٣﴾

اس سے پہلے البتہ بے خبروں میں

**خلاصہ تفسیر:** ہم نے جو یہ قرآن آپ کے پاس بھیجا ہے اس کے ذریعہ سے ہم آپ سے ایک بڑا عمدہ قصہ بیان کرتے ہیں اور اس سے پہلے آپ (اس قصہ سے) بالکل بے خبر تھے (کیونکہ نہ آپ نے کوئی کتاب پڑھی تھی، نہ کسی صاحب کتاب سے کچھ سنا تھا اور اس قصہ کی شہرت بھی ایسی نہیں تھی کہ عوام جانتے ہوں، پس اس سے ثابت ہوا کہ یہ قرآن وحی ہے)۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ: اس قصہ کو "احسن القصص" یعنی بڑا عمدہ قصہ کیوں فرمایا؟ اس کی وجہ روح المعانی میں مختصر الفاظ میں یہ لکھی ہے کہ یہ قصہ ان باتوں پر مشتمل ہے: حاسد ومحسود، مالک ومملوک، شاہد ومشہود، عاشق ومعشوق، قید ورہائی، قحط اور کشادگی، گناہ اور معافی، فراق ووصال، بیماری وصحت، اقامت وسفر، عزت وذلت، نیز ان نتائج کو مفید ہے کہ قضا وقدر کو کوئی ٹال نہیں سکتا، جس کو خدا کوئی چیز دینا چاہیں کوئی روک نہیں سکتا، حسد سے حاسد ہی کو نقصان اور رسوائی پہنچتی ہے، صبر تمام راحت کی کنجی ہے، تدبیر کرنا عقل کی بات، امور معاش کی درستگی میں عقل کام کی چیز ہے، عفت و پاکدامنی عزت ورفعت کا سبب ہے، اس قصہ میں عبرتیں، حکمتیں اور نکات ہیں، اس میں بادشاہوں سے لے کر غلاموں تک کا برتاؤ، عورتوں کے مکروفریب، دشمنوں کی ایذاء پر صبر اور قدرت کے وقت عفو اور جود وکرم اور حاسد ومحسود کے انجام کا بیان ہے وغیرہ ذلک۔

* * *

**فائدہ:** یعنی اس وحی کے ذریعہ سے جو قرآن کی صورت میں ہم پر نازل ہوتی ہے، ہم ایک نہایت اچھا بیان نہایت حسین طرز میں تم کو

سناتے ہیں، جس سے اب تک اپنی قوم کی طرح تم بھی بے خبر تھے، گو یہ واقعہ کتب تاریخ اور بائبل میں پہلے سے مذکور تھا مگر محض ایک افسانہ کی صورت میں تھا، قرآن کریم نے اس کے ضروری اور مفید اجزاء کو ایسی عجیب ترتیب اور بلیغ و موثر انداز میں بیان فرمایا، جس نے نہ صرف پہلے تذکرہ نویسوں کی کوتاہیوں پر مطلع کیا بلکہ موقع بہ موقع نہایت ہی اعلیٰ نتائج کی طرف راہنمائی کی اور قصہ کے ضمن میں علوم و ہدایات کے ابواب مفتوح کر دیئے، یہ بات کہ خداوند قدوس کی تقدیر کو کوئی چیز نہیں روک سکتی، اور خدا جب کسی پر فضل کرنا چاہے تو سارا جہان مل کر بھی اپنی ساری امکانی تدابیر سے اسے محروم نہیں کر سکتا، صبر و استقامت دنیاوی و اخروی کامیابی کی کلید ہے، حسد و عداوت کا انجام حذلان و نقصان کے سوا کچھ نہیں، عقل انسانی بڑا شریف جوہر ہے جس کی بدولت آدمی بہت سی مشکلات پر غالب آتا اور اپنی زندگی کو کامیاب بنالیتا ہے، اخلاقی شرافت اور پاکدامنی انسان کو دشمنوں اور حاسدوں کی نظر میں بھی آخرکار معزز بنا دیتی ہے، یہ اور اس قسم کے بیشمار حقائق ہیں جن پر اس احسن القصص کے ضمن میں متنبہ فرمایا ہے۔

مفسرین نے اس سورت کے شان نزول میں کئی روایتیں نقل کی ہیں، سب کو ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود نے مشرکین مکہ کے ذریعہ سے امتحاناً یہ سوال کیا کہ حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد تو شام میں رہتی تھی پھر بنی اسرائیل مصر میں کیسے پہنچ گئے جو موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے مقابلہ کی نوبت آئی، شاید مسلمانوں کو بھی ایک مفصل تاریخی واقعہ جو بصائر و عبر سے مملو ہو سننے کا اشتیاق ہوا ہوگا، ادھر اس قصہ کے ضمن میں جن احوال و حوادث کا تذکرہ ہونے والا تھا وہ کئی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم کے حالات سے مشابہت رکھتے تھے، اور ان کا ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں موجب تسکین خاطر اور آپ کی قوم کے حق میں موجب عبرت تھا، ان وجوہ سے یہ پورا واقعہ کافی بسط و تفصیل سے قرآن کریم میں بیان فرمایا، تاکہ پوچھنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ اسرائیل (یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام) اور ان کی اولاد کے شام سے مصر آنے کا سبب حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ ہوا ہے، پھر وہیں ان کی نسل پھیلی اور بڑھتی رہی تا آنکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آخر فرعون اور قبطیوں کی غلامی سے انھیں نجات دلائی۔

إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ

جس وقت کہا یوسف نے اپنے باپ سے اے باپ میں نے دیکھا خواب میں گیارہ ستاروں کو اور سورج کو اور چاند کو دیکھا میں نے ان کو

لِي سَاجِدِينَ ﴿٤﴾ قَالَ يَا بُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَىٰ إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا ۖ

اپنے واسطے سجدہ کرتے ہوئے کہا اے بیٹے! مت بیان کرنا خواب اپنا اپنے بھائیوں کے آگے پھر وہ بنائیں گے تیرے واسطے کچھ فریب

إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنسَانِ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿٥﴾

البتہ شیطان ہے انسان کا صریح دشمن ؎

**خلاصہ تفسیر:** (آغاز قصہ) وہ وقت قابل ذکر ہے جبکہ یوسف (علیہ السلام) نے اپنے والد (یعقوب علیہ السلام) سے کہا کہ ابا! میں نے (خواب میں) گیارہ ستارے اور سورج اور چاند دیکھے ہیں ان کو اپنے سامنے سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے، انہوں نے (جواب میں) فرمایا کہ بیٹا! اپنے اس خواب کو اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کرنا (کیونکہ وہ خاندان نبوت میں ہونے کی وجہ سے اس خواب کی تعبیر جانتے ہیں کہ گیارہ ستارے گیارہ بھائی ہیں، سورج والد، اور چاند ماں، اور سجدہ کرنے سے مراد ان سب کا تمہارے لئے مطیع و فرمانبردار ہونا ہے) پس (یہ سمجھ کر) وہ تمہارے (ایذاء رسانی کے) لئے کوئی خاص تدبیر کریں گے (یعنی بھائیوں میں سے اکثر کیونکہ دس بھائی علاتی تھے ان سے ایذا کا خطرہ تھا، صرف ایک بھائی حقیقی بنیامین تھے، ان سے اگرچہ کسی نقصان کا تو اندیشہ نہ تھا مگر یہ احتمال تھا کہ شاید ان کے منہ سے بات نکل جائے پھر فتنہ ہو) بلاشبہ شیطان آدمی کا کھلا دشمن ہے (اس لئے بھائیوں کے دل میں وسوسے ڈالے گا)۔

**اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ**: گیارہ ستارے گیارہ بھائی ہیں، سورج باپ کیونکہ وہ درجہ میں بڑا ہے، اور چاند ماں کیونکہ وہ درجہ میں کم ہے، یا لفظ کے مذکر ومؤنث ہونے کی وجہ سے اس کے برعکس کہ شمس عربی میں مؤنث ہے اس سے ماں مراد ہو، اور قمر مذکر ہے اس سے باپ مراد ہو، اور سجدہ سے اصلی مراد اطاعت وانقیاد ہے، اور یہ دیکھنا غالبا حالت خواب میں تھا، کیونکہ لفظ ''رؤیا'' کا اطلاق اکثر خواب پر ہوتا ہے۔

یہ کل بارہ بھائی تھے، دو حقیقی یوسف اور بنیامین اور دس علاتی (باپ شریک) بھائیوں کے ستارہ کی شکل میں ہونے سے ان کی نبوت ثابت نہیں ہوتی، کیونکہ نورانیت صحابی ہونے سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ اخیر میں سجدہ کے وقت وہ تائب ہو کر کامل صحابی تھے۔

**لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ**: بھائیوں کا خواب کی تعبیر سمجھ لینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ تعبیر خواب کے معجزہ میں وہ بھی یوسف علیہ السلام کے برابر تھے، اور اس سے ان کا نبی یا ولی ہونا بھی لازم نہیں آتا، کیونکہ یہ تو خاندان نبوت سے مناسبت ہونے کی وجہ سے ہوا، نیز وہ بھائی بھی گمان کے طور پر سمجھتے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے یوسف کو اپنا خواب بھائیوں کے سامنے بیان کرنے سے منع فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ خواب ایسے شخص کے سامنے بیان نہ کرنا چاہئے جو اس کا خیر خواہ اور ہمدرد نہ ہو اور نہ ایسے شخص کے سامنے جو تعبیر خواب میں ماہر نہ ہو۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمان کو دوسرے کے شر سے بچانے کے لئے اس کی کسی بری خصلت یا نیت کا اظہار کر دینا جائز ہے یہ غیبت میں داخل نہیں، جیسا کہ یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام سے اس کا اظہار کر دیا کہ بھائیوں سے ان کو خطرہ ہے۔

اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس شخص کے متعلق یہ احتمال ہو کہ ہماری خوش حالی اور نعمت کا ذکر سنے گا تو اس کو حسد ہوگا اور نقصان پہنچانے کی فکر کرے گا تو اس کے سامنے اپنی نعمت دولت وعزت وغیرہ کا ذکر نہ کرے، رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''اپنے مقاصد کو کامیاب بنانے کے لئے ان کو راز میں رکھنے سے مدد حاصل کرو، کیونکہ دنیا میں ہر صاحب نعمت سے حسد کیا جاتا ہے''۔

**فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا**: یعنی پھر وہ تمہارے لیے کوئی خاص تدبیر کریں گے، یہ تدبیر ومنصوبہ اس غرض سے ہونا ضروری نہیں کہ یہ تعبیر واقع نہ ہوگی، بلکہ یہ تو وہ بھی جانیں گے کہ تعبیر تو یقینی طور پر واقع ہوگی مگر حسد کی وجہ سے ایذا دیں گے۔

* * *

**فائدہ**: ۱؎ یعنی گیارہ ستارے اور چاند سورج میرے آگے جھک رہے اور پست ہو رہے ہیں، یہ خواب لڑکپن میں دیکھا تھا، سچ ہے ''ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات''۔

**فائدہ**: ۲؎ یعنی شیطان ہر وقت انسان کی گھات میں لگا ہے، وسوسہ اندازی کر کے بھائیوں کو تیرے خلاف اکسا دے گا، کیونکہ خواب کی تعبیر بہت ظاہر تھی، اور یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کو جو بہرحال خاندان نبوت میں سے تھے، ایسے واضح خواب کا سمجھ لینا کچھ مشکل نہ تھا کہ گیارہ ستارے گیارہ بھائی ہیں اور چاند سورج ماں باپ ہیں گویا یہ سب کسی وقت یوسف علیہ السلام کی عظمت شان کے سامنے سر جھکائیں گے چنانچہ آخر سورت میں: **يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۡ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا** (یوسف:۱۰۰) کہہ کر اسی طرف اشارہ کیا، معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام خواب سے پیشتر ہی یہ محسوس کرتے تھے کہ یوسف کے ساتھ باپ کی خصوصی محبت کو دیکھ کر اس کے علاتی بھائی دل ہی دل میں کڑھتے ہیں، اب انہوں نے خیال کیا کہ اگر کہیں یہ خواب سن پائے تو شیطان حسد کی آگ ان کے دلوں میں بھڑکا دے گا اور جوش حسد میں آنکھیں بند کر کے ممکن ہے وہ کوئی ایسی حرکت کر گزریں جو یوسف کی اذیت اور خود ان کی رسوائی اور بدانجامی کا موجب ہو، اس لیے آپ نے یوسف علیہ السلام کو منع فرما دیا کہ اپنا خواب بھائیوں کے روبرو ظاہر نہ کریں، یوسف کا ایک حقیقی بھائی ''بنیامین'' تھا، اس کے سامنے ذکر کرنے کی بھی اجازت نہیں دی، گو اس سے برائی کا کچھ اندیشہ نہ تھا، لیکن یہ ممکن تھا کہ وہ سن کر بے احتیاطی سے دوسروں کے سامنے تذکرہ کر دے، اور اس طرح یہ خبر لوگوں میں شائع ہو جائے۔

**تنبیہ**: حافظ ابن تیمیہ نے ایک مستقل رسالہ میں لکھا ہے کہ قرآن، لغت اور عقلی اعتبارات میں سے کوئی چیز اس خیال کی تائید نہیں کرتی

کہ برادران یوسف انبیاء تھے، نہ رسول کریم ﷺ نے اس کی خبر دی، نہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں کوئی اس کا قائل تھا، بھلا حقوق والدین، قطع رحم، مسلمان بھائی کے قتل پر اقدام کرنا، اس کو غلام بنا کر بیچ ڈالنا اور بلا دکفر کی طرف بھیج دینا، پھر صریح جھوٹ اور حیلے بنانا وغیرہ ایسی حرکات شنیعہ کیا کسی نبی کی طرف (خواہ قبل از بعثت ہی سہی) منسوب کی جاسکتی ہیں (العیاذ باللہ)، جن لوگوں نے برادران یوسف کی نبوت کا خیال ظاہر کیا ہے، ان کے پاس لفظ ''اسباط'' کے سوا کوئی دلیل نہیں، حالانکہ ''اسباط'' خاص صلبی اولاد کو نہیں بلکہ اقوام وامم کو کہتے ہیں، اور ''بنی اسرائیل'' کی اسباط پر تقسیم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں ہوئی ہے۔

وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى

اور اسی طرح برگزیدہ کرے گا تجھ کو تیرا رب ۱ اور سکھلائے گا تجھ کو ٹھکانے پر لگانا باتوں کا ۲ اور پورا کرے گا اپنا انعام تجھ پر اور یعقوب کے

اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۶ ع

گھر پر ۳ جیسا پورا کیا ہے تیرے دو باپ دادوں پر اس سے پہلے ابراہیم اور اسحاق پر ۴ البتہ تیرا رب خبردار ہے حکمت والا ۵

**خلاصہ تفسیر**: اور (جس طرح اللہ تعالیٰ تم کو یہ عزت دے گا کہ سب تمہارے تابع ومطیع ہوں گے) اس طرح تمہارا رب تم کو (دوسری عزتیں بھی دے گا کہ تمہیں نبوت کے لیے) منتخب کرے گا اور (باریک باریک علوم مثلا) تم کو خوابوں کی تعبیر دے گا اور (اس کے علاوہ دوسری نعمتیں دے کر بھی) تم پر اور اولاد یعقوب پر اپنا انعام کامل کرے گا جیسا کہ اس سے پہلے تمہارے دادا ابراہیم واسحاق (علیہما السلام) پر اپنا انعام کامل کر چکا ہے واقعی تمہارا رب بڑا علم والا بڑی حکمت والا ہے (کہ ہر ایک کے مناسب فیض عطا فرماتا ہے)۔

وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ: یہ بشارتیں جو یعقوب علیہ السلام نے دیں یا تو اسی خواب سے سمجھے یا وحی سے۔

وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ: آل یعقوب پر نعمت تمام کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ یعقوب علیہ السلام کے سب بیٹے نبی تھے، کیونکہ نعمت نبوت کے سوا دوسری باتوں کو بھی عام ہے، پس نعمت میں سب شریک ہیں، جس کے جیسے عمل ویسی نعمت، سب کی برابری ضروری نہیں، اور اگر نعمت سے نبوت ہی مراد ہو تو آل یعقوب سے ان کی نسل بھی مراد ہو سکتی ہے، سو ان کی نسل میں آگے بہت نبی ہوئے، اور یعقوب علیہ السلام نے اتمام نعمت میں اپنا ذکر تواضعاً نہیں فرمایا۔

* * *

**فائدہ**: ۱ وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ: یعنی جس طرح ایسا اچھا خواب دکھلایا، اسی طرح محض جاذبہ رحمت سے اپنی بارگاہ قرب میں تجھ کو خصوصی مقام عطا فرمائے گا، چنانچہ نبوت عطاء فرمائی اور طرح طرح کی ظاہری وباطنی نوازشیں کیں۔

**فائدہ**: ۲ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ: مثلاً تعبیر رؤیا، یعنی خواب سن کر اس کے اجزاء کو ذہانت وفراست سے ٹھکانے پر لگا دینا، یا ہر بات کے موقع ومحل کو سمجھنا، اور معاملات کے عواقب ونتائج کو فوراً پرکھ لینا، یا خدا اور پیغمبروں کے ارشادات اقوام وامم کے قصص اور کتب منزلہ کے مضامین کی تہہ تک پہنچ جانا، یہ سب چیزیں تاویل الاحادیث کے تحت میں مندرج ہو سکتی ہیں۔

**فائدہ**: ۳ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ: یعنی اخروی نعمتوں کے ساتھ دنیاوی نعمتیں عطا فرمائے گا، نبوت کے ساتھ بادشاہت میں حصہ دے گا اور شدائد ومحن سے نجات دے کر خوشحالی وفراغ بالی کی زندگی نصیب کرے گا، یعقوب کے گھرانے کو دنیاوی مکروہات اور مادی تکلیفوں سے رہائی دے گا اور آئندہ ان کی نسل سے بڑے بڑے پیغمبر اور بادشاہ پیدا کرے گا۔

**فائدہ**: ۴ عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ: حضرت یعقوب علیہ السلام نے تواضعاً اپنا نام نہیں لیا، اپنے والد حضرت اسحاق اور ان کے والد حضرت ابراہیم کا ذکر فرمایا، حضرت ابراہیم کو خدا نے اپنا خلیل اور نبی بنایا ان کے دشمن نمرود کو ہلاک کیا، آگ کے شعلوں کو ان کے لیے گلزار بنا

دیا، اسحاق کو نبوت عطا کی، پھر ان کے صلب سے حضرت یعقوب جیسا نبی پیدا کیا، جس سے تمام انبیائے بنی اسرائیل کا سلسلہ چلا، حدیث صحیح میں ہے، الکریم ابن الکریم ابن الکریم ابن الکریم، یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراھیم۔

**تنبیہ:** حضرت یعقوب علیہ السلام نے جو پیشین گوئی کی اسکا کچھ حصہ تو غالبا حضرت یوسف کے خواب سے سمجھے اور اس سے کہ اتنی چھوٹی عمر میں ایسا موزوں ومبارک خواب دیکھا اور کچھ حضرت یوسف کے خصائل وشمائل سے یا وحی الٰہی کے ذریعہ سے مطلع ہوئے ہونگے۔

**فائدہ:** ﴿عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾: یعنی وہ ہر ایک کی مناسبت واستعداد سے باخبر ہے، اپنی حکمت سے اسی کے مناسب فیض پہنچاتا ہے۔

---

## لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٌ لِلسَّائِلِينَ ۞

البتہ ہیں یوسف کے قصے میں اور اس کے بھائیوں کے قصہ میں نشانیاں پوچھنے والوں کے لیے

---

**خلاصہ تفسیر:** یوسف (علیہ السلام) کے اور ان کے (علاتی یعنی باپ شریک) بھائیوں کے قصہ میں (خدا کی قدرت اور آپ کی نبوت کے) دلائل موجود ہیں ان لوگوں کے لئے جو (آپ سے ان کا قصہ) پوچھتے ہیں (کیونکہ یوسف علیہ السلام کو ایسی بے کسی اور بے بسی سے سلطنت ورفعت تک پہنچا دینا یہ خدا ہی کا کام تھا جس سے مسلمانوں کو عبرت اور ایمانی قوت حاصل ہوگی اور یہود جنہوں نے آنحضرت ﷺ کی آزمائش کے لئے یہ قصہ پوچھا تھا ان کے لئے اس میں نبوت کی دلیل مل سکتی ہے اگر غور کریں)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جو لوگ اس طرح کے واقعات دریافت کر کے کسی نتیجہ پر پہنچنا چاہتے ہیں ان کے لیے یوسف اور ان کے بھائیوں کی سرگزشت میں ہدایت وعبرت کی بہت سی نشانیاں موجود ہیں، اس قصہ کو سن کر قلوب میں حق تعالیٰ کی عظیم قدرت وحکمت کا نقش جم جاتا ہے، نبی کریم ﷺ کی صداقت کا بین ثبوت ملتا ہے کہ آپ باوجود امی ہونے اور کسی کتاب یا معلم سے استفادہ نہ کرنے کے ایسے منقح ومنضبط تاریخی حقائق کا انکشاف فرما رہے ہیں، جن کے بیان کی بجز اعلام ربانی کے کوئی توجیہ نہیں ہوسکتی، خصوصا قریش مکہ کے لیے (جو یہود کے اکسانے سے اس قصہ کے متعلق حضور ﷺ سے سوال کر رہے تھے) اس واقعہ میں بڑا عبرت آموز سبق ہے کہ جس طرح حضرت یوسف کو بھائیوں نے گھر سے نکالا، از راہ حسد قتل یا جلا وطن کرنے کے مشورے کیے، طرح طرح سے ایذائیں پہنچائیں، اہانت واستخفاف میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، آخر ایک دن آیا کہ یوسف کی طرف نادم محتاج ہو کر آئے، یوسف علیہ السلام کو خدا نے دین ودنیا کے اعلیٰ مناصب پر فائز کیا اور انہوں نے اپنے عروج واقتدار کے وقت بھائیوں کے جرائم سے چشم پوشی کی اور نہایت دریا دلی سے سب کے قصور معاف کر دیے، ٹھیک اسی طرح حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی برادری نے آپ ﷺ کے متعلق ناپاک منصوبے باندھے، دکھ پہنچائے، عزت وآبرو پر حملے کیے، حتی کہ وطن چھوڑنے پر مجبور کیا، لیکن جلد وہ دن آنے والا تھا جب وطن سے علیحدہ ہو کر آپ ﷺ کی کامیابی اور رفعت شان کا آفتاب چمکا، اور چند سال کے بعد فتح مکہ کا وہ تاریخ دن آپہنچا جبکہ آپ نے اپنے قومی اور وطنی بھائیوں کی گزشتہ تقصیرات پر بعینہ حضرت یوسف والے کلمات ﴿لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ (یوسف:۹۲) فرما کر قلم عفو کھینچ دیا۔

---

## إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ط إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ۞

جب کہنے لگے البتہ یوسف اور اسکا بھائی زیادہ پیارا ہے ہمارے باپ کو ہم سے اور ہم ان سے قوت والے لوگ ہیں، البتہ ہمارا باپ صریح خطا پر ہے

---

**خلاصہ تفسیر:** وہ وقت قابل ذکر ہے جبکہ ان (علاتی یعنی باپ شریک) بھائیوں نے (باہمی مشورہ کے طور پر) یہ گفتگو کی کہ (یہ کیا بات ہے کہ) یوسف اور ان کا (حقیقی) بھائی (بنیامین) ہمارے باپ کو زیادہ پیارے ہیں حالانکہ (وہ دونوں کم عمری کی وجہ سے ان کی خدمت کے قابل بھی نہیں اور) ہم ایک جماعت ہیں (کہ اپنی قوت وکثرت کی وجہ سے ان کی ہر طرح کی خدمت بھی کرتے ہیں تو ہم زیادہ عزیز ہونے چاہئیں)

واقعی ہمارے باپ کھلی (اس بارے میں) غلطی میں ہیں (غرض انہوں نے مشورہ کیا کہ یوسف کے ہوتے ہوئے تو امید مت رکھو کہ تم زیادہ عزیز ہوسکو گے اور بنیامین سے جو محبت ہے وہ صرف اس وجہ سے کہ یوسف کے حقیقی بھائی ہیں، اصل میں زیادہ خاطر یوسف ہی کی مقصود ہے اور زیادہ محبوب اصل میں وہی ہیں، اس لئے یوسف کو کسی تدبیر سے باپ کے پاس سے ہٹانا چاہئے)۔

**اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا:** یوسف علیہ السلام کے ساتھ سب سے زیادہ محبت ہونے کی قریب تر وجہ یہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام اپنی فراست نبوت سے ان کو ہونہار دیکھتے تھے اور خواب سننے کے بعد یہ بات زیادہ مؤکد ہوگئی جیسا کہ ان کے ارشاد: **وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ** سے مترشح ہوتا ہے۔

اس میں دلالت ہے کہ شیخ، استاذ کو جائز ہے کہ اپنے کسی شاگرد یا مرید کے ساتھ دوسروں کی بہ نسبت زیادہ محبت، شفقت وعنایت کا معاملہ کرے، بشرطیکہ اس میں رشد وہدایت کے آثار زیادہ پائے جاتے ہوں۔

**اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ:** اپنے والد کے بارے میں جو یہ کہا کہ: اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ اس میں لفظ ''ضلال'' کے لغوی معنی گمراہی کے ہیں، مگر یہاں گمراہی سے مراد دینی گمراہی نہیں، یہ لوگ یوں سمجھتے تھے کہ یوسف علیہ السلام کی نسبت ایسا خیال یہ والد یعقوب علیہ السلام کا اجتہاد ہے، اور نبی سے اجتہاد میں غلطی ہونا نبوت کے منافی نہیں، پس ضلال سے مراد اجتہادی غلطی ہے، گمراہی نہیں، ورنہ ایسا خیال کرنے سے یہ سب کے سب کافر ہوجاتے، کیونکہ یعقوب علیہ السلام اللہ تعالی کے برگزیدہ پیغمبر اور نبی ہیں ان کی شان میں ایسا خیال قطعی کفر ہے، اور یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے متعلق خود قرآن کریم میں مذکور ہے کہ بعد میں انہوں نے اپنے جرم کا اعتراف کرکے والد سے دعاء مغفرت کی درخواست کی جس کو ان کے والد نے قبول کیا، جس سے ظاہر یہ ہے کہ ان سب کی خطا معاف ہوئی یہ سب اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ یہ سب مسلمان ہوں ورنہ کافر کے حق میں دعاء مغفرت جائز نہیں، اسی لئے ان بھائیوں کے مسلمان ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ لفظ ''ضلال'' اس جگہ صرف اس معنی میں بولا گیا ہے کہ بھائیوں کے زعم کے مطابق ہمارے حقوق میں برابری نہیں کرتے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض اوقات چھوٹوں کو اپنے بڑوں پر خطاء اجتہادی کا ویسا ہی گمان ہوتا ہے جیسا کہ ان بھائیوں کو اپنے والد یعقوب علیہ السلام پر ہوا تھا۔

***

**فائدہ:** حضرت یعقوب علیہ السلام یوسف اور ان کے عینی بھائی بنیامین سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے کیونکہ یہ دونوں اپنے علاتی بھائیوں سے چھوٹے تھے، والدہ کا انتقال ہو چکا تھا اور خاص حضرت یوسف کی نسبت اپنے نور فراست یا الہام ربانی سے سمجھ چکے تھے کہ ان کا مستقبل نہایت درخشاں ہے اور نبوت کا خاندانی سلسلہ ان کی ذات سے وابستہ ہونے والا ہے، خود یوسف علیہ السلام کا حسن صورت وسیرت اور کمال ظاہری و باطنی پدر بزرگوار کی محبت خصوصی کو اپنی طرف جذب کرتا تھا، دوسرے بھائیوں کو یہ چیز ناگوار تھی، وہ کہتے تھے کہ وقت پر کام آنے والے تو ہم ہیں، ہمارا ایک طاقتور جتھا ہے جو باپ کی ضعیفی میں کام آسکتا ہے، ان چھوٹے لڑکوں سے کیا امید ہوسکتی ہے؟ ان ہی خیالات کے ماتحت اپنے والد بزرگوار کی نسبت کہتے تھے کہ وہ اس معاملہ میں سخت غلطی اور صریح خطا پر ہیں، اپنے نفع ونقصان کا صحیح موازنہ نہیں کرتے۔

**اُقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ﴿٩﴾**

مار ڈالو یوسف کو یا پھینک دو کسی ملک میں کہ خالص رہے تم پر توجہ تمہارے باپ کی لـ اور ہو رہنا اس کے بعد نیک لوگ ٢ـ

**خلاصہ تفسیر:** (جس کی صورت یہ ہے کہ) یا تو یوسف کو قتل کر ڈالو یا اس کو کسی (دور دراز) سرزمین میں ڈال آؤ تو (پھر) تمہارے باپ کا رخ خالص تمہاری طرف ہوجائے گا اور تمہارے سب کام بن جائیں گے۔

**يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ (الى قوله) قَوْمًا صٰلِحِيْنَ:** اگر اس درست حالی کو دینی صلاحیت پر محمول کیا جائے تو اس پر دلالت ہوگی کہ شاگرد اور مرید کی اصلاح میں استاذ اور شیخ کی توجہ کا بہت بڑا دخل ہے۔

**فائدہ:** لہ یعنی رشک وحسد کی آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی، آخر آپس میں مشورہ کیا کہ یوسف کی موجودگی میں ممکن نہیں کہ والد بزرگوار کی خصوصی محبت وتوجہ کو ہم اپنی طرف کھینچ سکیں، اس لیے یوسف کا قصہ ہی یہاں سے ختم کر دینا چاہیے خواہ قتل کر دو یا کسی دور دراز ملک کی طرف پھینک دو جہاں سے واپس نہ آ سکے، جب وہ نہ رہیں گے تو باپ کی ساری توجہات اور مہربانیوں کے ہم ہی تنہا حق دار رہ جائیں گے، بنیامین کے معاملہ کو غالباً ان کے یہاں کوئی اہمیت نہیں تھی، گویا اس کی محبت کو یوسف کی محبت کا ضمیمہ سمجھتے تھے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی ایک مرتبہ قتل وغیرہ کا گناہ کرنا پڑے گا، اس سے فارغ ہو کر توبہ کر لیں گے اور خوب نیک بن جائیں گے، گویا رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی، بعض مفسرین نے: وَتَكُونُوا مِنۢ بَعۡدِهِۦ قَوۡمٗا صَٰلِحِينَ کے معنی یہ لیے ہیں کہ یوسف کے بعد ہمارے سب کام ٹھیک اور درست ہو جائیں گے کیونکہ پدر بزرگوار کا دست شفقت یوسف سے مایوس ہو کر صرف ہمارے ہی سروں پر رہا کرے گا۔

قَالَ قَآئِلٞ مِّنۡهُمۡ لَا تَقۡتُلُواْ يُوسُفَ وَأَلۡقُوهُ فِي غَيَٰبَتِ ٱلۡجُبِّ يَلۡتَقِطۡهُ بَعۡضُ ٱلسَّيَّارَةِ

بولا ایک بولنے والا ان میں مت مار ڈالو یوسف کو اور ڈال دو اس کو گم نام کنوئیں میں کہ اٹھا لے جائے اس کو کوئی مسافر

إِن كُنتُمۡ فَٰعِلِينَ ۝١٠

اگر تم کو کرنا ہے

**خلاصہ تفسیر:** انہی میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ یوسف کو قتل نہ کرو (کہ وہ بڑا جرم ہے) اور ان کو کسی اندھیرے کنویں میں ڈال دو (جس میں اتنا پانی نہ ہو جس میں ڈوبنے کا خطرہ ہو ورنہ وہ تو قتل ہی ہے، البتہ بستی اور راہ گذر سے بہت دور بھی نہ ہو) تا کہ ان کو کوئی راہ چلتا مسافر نکال لے جائے اگر تم کو (یہ کام) کرنا ہی ہے (تو اس طرح کرو، اس صورت میں وہ باپ سے جدا ہو جائیں گے اور قتل کے گناہ سے بھی بچو گے، غرض اس پر سب کی رائے متفق ہو گئی)۔

* * *

**فائدہ:** یہ کہنے والا "یہودا" تھا یعنی قتل کرنا بہت سخت بات ہے اور ہمارا مقصد بدون اس کے بھی حاصل ہو سکتا ہے، اگر تم یوسف کو یہاں سے علیحدہ کرنا چاہتے ہو تو آسان صورت یہ ہے کہ اس کو بستی سے دور کسی گم نام کنوئیں میں ڈال دو، ابوحیان نے بعض اہل لغت سے نقل کیا ہے کہ غیابت الجب اس طاقچہ وغیرہ کو کہتے ہیں جو کنوئیں (باؤلی) میں پانی سے ذرا اوپر بنا ہوا ہو، غرض یہ تھی کہ ہم خواہی نہ خواہی عمداً ہلاک کرنے کا گناہ اپنے سر نہ لیں، ایسے کنوئیں میں ڈال دینے کے بعد بہت ممکن ہے کوئی مسافر ادھر سے گزرے اور خبر پا کر کنوئیں سے نکال لے جائے، اس صورت میں ہمارا مقصد حاصل ہو جائے گا اور خون ناحق میں ہاتھ رنگین نہ کرنے پڑیں گے گویا سانپ مر جائے گا اور لاٹھی نہ ٹوٹے گی۔

قَالُواْ يَٰٓأَبَانَا مَا لَكَ لَا تَأۡمَ۬نَّا عَلَىٰ يُوسُفَ وَإِنَّا لَهُۥ لَنَٰصِحُونَ ۝١١

بولے اے باپ کیا بات ہے کہ تو اعتبار نہیں کرتا ہمارا یوسف پر اور ہم تو اس کے خیر خواہ ہیں لہ

أَرۡسِلۡهُ مَعَنَا غَدٗا يَرۡتَعۡ وَيَلۡعَبۡ وَإِنَّا لَهُۥ لَحَٰفِظُونَ ۝١٢

بھیج اس کو ہمارے ساتھ کل کو خوب کھائے اور کھیلے اور ہم تو اس کے نگہبان ہیں ۲

**خلاصہ تفسیر:** (اور) سب نے (مل کر باپ سے) کہا کہ ابا! اس کی کیا وجہ ہے کہ یوسف کے بارے میں آپ ہمارا اعتبار نہیں

کرتے (کہ کبھی کہیں ہمارے ساتھ نہیں بھیجتے) حالانکہ ہم اس کے (دل وجان سے) خیر خواہ ہیں (ایسا نہیں ہونا چاہئے، بلکہ) آپ اس کو کل ہمارے ساتھ (جنگل) بھیجئے کہ ذرا وہ کھائیں کھیلیں اور ہم ان کی پوری حفاظت رکھیں گے۔

* * *

**فائدہ: ١** اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بھی باپ سے اس قسم کی درخواست کر چکے تھے مگر انکا دل ان کے ساتھ بھیجنے پر مطمئن نہ ہوا۔

**فائدہ: ٢** ایسے خوبصورت بچے کے قُویٰ گھر میں خالی پڑے رہنے سے بیکار ہو جاتے ہیں، مناسب ہے کہ ہمارے ساتھ اس کو بکریاں چرانے کے لیے جنگل بھیج دیجئے، وہاں جنگل کے پھل میوے خوب کھائے گا اور کھیل کود سے جسمانی ورزش بھی ہو جائے گی، کہتے ہیں ان کا کھیل بھاگ دوڑ اور تیراندازی تھی، اور ویسے بھی بچوں کے لیے مناسب حد تک کھیلنا جیسا کہ ابوحیان نے کہا ہے نشاط وشگفتگی کا موجب ہے، غرض یعقوب علیہ السلام سے یوسف کو ساتھ لے جانے کی پرزور درخواست کی اور نہایت مؤکد طریقہ سے اطمینان دلایا کہ ہم برابر اس کی حفاظت کریں گے، مفسرین نے لکھا ہے کہ خود یوسف کو بھی جداگانہ طور پر ساتھ چلنے اور باپ سے اجازت لینے کی ترغیب دی۔

## قَالَ اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَاَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾

بولا مجھ کو غم ہوتا ہے اس سے کہ تم اس کو لے جاؤ اور ڈرتا ہوں اس سے کہ کھا جائے اس کو بھیڑیا اور تم اس سے بے خبر رہو

**خلاصہ تفسیر:** یعقوب (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (مجھے ساتھ بھیجنے سے دو باتیں مانع ہیں ایک حزن اور ایک خوف، حزن تو یہ کہ) مجھ کو یہ بات غم میں ڈالتی ہے کہ اس کو تم (میری نظروں کے سامنے سے) لے جاؤ اور (خوف یہ کہ) میں یہ اندیشہ کرتا ہوں کہ اس کو کوئی بھیڑیا کھا جائے اور تم (اپنے مشاغل میں) اس سے بے خبر رہو (کیونکہ اس جنگل میں بھیڑیئے بہت تھے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی یوسف کی جدائی اور تمہارے ساتھ جانے کا تصور ہی مجھے غمگین بنائے دیتا ہے اس پر یہ خوف مزید رہا کہ بچہ ہے، تمہاری بے خبری اور غفلت میں بھیڑیا وغیرہ کوئی درندہ نہ پھاڑ کھائے، لکھا ہے کہ اس جنگل میں بھیڑیے کثرت سے تھے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: "ان کو آگے چل کر بھیڑیے کا بہانہ کرنا تھا وہ ہی ان کے دل میں خوف آیا"، بعض محققین کا خیال یہ ہے کہ اَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ فرمانا حضرت یعقوب جیسے پیغمبر کے درجہ توکل وتفویض سے ذرا نازل بات تھی، اس کا جواب یہ ملا کہ لڑکوں نے گویا ان کے منہ میں سے بات پکڑ لی، جو اندیشہ ظاہر کیا تھا وہ ہی واقعہ بنا کر آئے۔

## قَالُوْا لَىِٕنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

بولے اگر کھا گیا اس کو بھیڑیا اور ہم ایک جماعت ہیں قوت ور تو تو ہم نے سب کچھ گنوا دیا

**خلاصہ تفسیر:** وہ بولے اگر اس کو بھیڑیا کھا لے اور ہم ایک جماعت کی جماعت (موجود) ہوں تو ہم بالکل ہی گئے گذرے ہوئے (کیونکہ جماعت کی قوت بھی زیادہ ہوتی ہے اور کئی آدمیوں کا نگرانی کرنا بھی آسان ہے، اس لیے یہ اندیشہ بھی فضول ہے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی اگر ہماری جیسی طاقتور جماعت کی موجودگی میں چھوٹے بھائی کو بھیڑیا کھا جائے تو سمجھو کہ ہم بالکل ہی گئے گزرے ہیں، اس سے بڑھ کر کیا خسارہ ہوگا کہ دس گیارہ تومند بھائیوں کی آنکھوں کے سامنے سے ایک کمزور بچہ بھیڑیے کے منہ میں پہنچ جائے، ایسا ہو تو کہنا چاہیے کہ ہم نے اپنا سب کچھ گنوا دیا۔

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ

پھر جب لے کر چلے اس کو اور متفق ہوئے کہ ڈالیں اس کو گمنام کنوئیں میں، اور ہم نے اشارہ کر دیا اس کو کہ تو جتائے گا ان کو

بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵﴾

ان کا یہ کام اور وہ تجھ کو نہ جانیں گے

**خلاصہ تفسیر:** (غرض کہہ سن کر یعقوب علیہ السلام سے یہ ان کو لے کر چلے) سو جب ان کو (اپنے ساتھ جنگل) لے گئے اور (طے شدہ منصوبہ کے مطابق) سب نے پختہ ارادہ کرلیا کہ ان کو کسی اندھیرے کنویں میں ڈال دیں (پھر اپنی تجویز پر عمل بھی کرلیا) اور (اس وقت یوسف علیہ السلام کی تسلی کے لئے) ہم نے ان کے پاس وحی بھیجی کہ (تم مغموم نہ ہو، ہم تم کو یہاں سے خلاصی دے کر بڑے رتبہ پر پہنچادیں گے اور ایک دن وہ ہوگا کہ) تم ان لوگوں کو یہ بات جتلاؤ گے اور وہ تم کو (اس وجہ سے کہ غیر متوقع طور پر شاہانہ صورت میں دیکھیں گے) پہچانیں گے بھی نہیں (چنانچہ واقعہ اسی طرح پیش آیا کہ بھائی مصر پہنچے اور آخر کار یوسف علیہ السلام نے ان کو جتلایا: هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ کہ تم کو کچھ خبر ہے کہ تم نے یوسف کے ساتھ کیا کیا تھا، غرض یوسف علیہ السلام کا تو یہ قصہ ہوا)۔

**فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ:** شبہ ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام سے سیر وتفریح اور کھیلنے کودنے کی اجازت مانگی گئی اور انہوں نے اس کی ممانعت نہیں فرمائی، حالانکہ عبث اور لایعنی کاموں کی تجویز انبیاء علیہم السلام کی شان کے خلاف ہے، سو اصل یہ ہے کہ یہ لہو ولعب عبث اس لیے نہیں کہ اس سے مراد دوڑنا اور تیر اندازی وغیرہ کرنا ہے جو کہ مفید کام ہیں، مشہور جواب تو یہی ہے، اور احقر کہتا ہے کہ نشاط بڑھانا بھی فوائد مقصودہ میں سے ہے جو کہ بچوں کے لیے ضروری ہے، اور ضروری مشاغل میں جی کا لگنا اسی نشاط پر موقوف ہے، اور ضروری امر کا مقدمہ بھی ضروری ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ سیر وتفریح کھیل کود جائز حدود کے اندر جائز ومباح ہیں، مگر یہ شرط ہے کہ اس کھیل کود میں شرعی حدود سے تجاوز نہ ہو اور کسی ناجائز فعل کی آمیزش نہ ہو، کیونکہ اس سے نشاط قلبی حاصل ہوتی ہے جو علم وعمل میں معین اور مددگار ہوتی ہے۔

**وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ:** جو معاملہ یوسف علیہ السلام کے ساتھ ان کے بھائیوں نے کیا اس میں تاویل دشوار ہے اس لیے ظاہراً وہ گناہ ضرور تھا، لیکن آخر میں بھائیوں کا استغفار اور معذرت کرنا قرآن سے صراحۃً ثابت ہے اور توبہ یقیناً گناہوں سے پاک کرنے والی ہے۔

**وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ:** اہل سیر کا اتفاق ہے کہ کنویں میں ڈالے جانے کے وقت یوسف علیہ السلام کم سن تھے، اس وقت آپ کے پاس وحی آئی، پس چالیس برس کے بعد وحی نازل ہونا یہ اکثری قاعدہ کے اعتبار سے ہے، قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔

* * *

**فائدہ:** مفسرین نے بہت سے درمیانی قصے نہایت درد انگیز اور رقت خیز پیرایہ میں نقل کیے ہیں جنہیں سن کر پتھر کا کلیجہ موم ہوجائے، خدا جانے وہ کہاں تک صحیح ہیں، قرآن کریم اپنے خاص نصب العین کے اعتبار سے اس قسم کی تفاصیل کو زیادہ درخوار اعتناء اور لائق ذکر نہیں سمجھتا کیونکہ ان اجزاء سے کوئی مہم مقصد متعلق نہیں ہے، قرآن کریم اپنے سامعین کے دلوں میں وہ رقت پیدا کرنا چاہتا ہے جس کا منشاء خاص ایمان وعرفان ہو، عام رقت جو ہر کافر ومومن بلکہ حیوانات تک میں طبعاً مشترک ہے اس پر عام خطباء کی طرح زور ڈالنا قرآن کی عادت نہیں، یہاں بھی اس نے درمیانی واقعات حذف کر کے آخری بات بتلادی کہ برادران یوسف یوسف کو بلطائف الحیل باپ کے پاس سے لے گئے اور ٹھہری ہوئی قرارداد کے موافق کنوئیں میں ڈالنے کا تہیہ کرلیا، اس وقت ہم نے یوسف کو اشارہ کیا جس کی دوسروں کو مطلق خبر نہیں ہوئی کہ گھبراؤ نہیں، ایک وقت آیا چاہتا ہے کہ یہ سب کارروائیاں تم ان کو یاد دلاؤ گے اور اس وقت تم ایسے بلند مقام اور اعلیٰ مرتبہ پر ہوگے کہ یہ تم کو پہچان نہ سکیں گے یا طول عہد کی وجہ سے تم کو شناخت نہ کرسکیں گے، یہ خدائی

اشارہ خواب میں ہوا یا بیداری میں، بطریق الہام ہوا یا فرشتہ کے ذریعہ سے، اس کی تفصیل قرآن میں نہیں، البتہ ظاہر الفاظ کو دیکھ کر کہا گیا ہے کہ وحی کا آنا چالیس برس کی عمر پر موقوف نہیں ہے کیونکہ حضرت یوسف اس وقت بہت کم عمر تھے، واللہ اعلم۔

وَجَآءُوْٓا اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ۝۱۶ قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ

اور آئے اپنے باپ کے پاس اندھیرا پڑے روتے ہوئے ۱؎ کہنے لگے اے باپ ہم لگے دوڑنے آگے نکلنے کو اور چھوڑا یوسف کو اپنے

مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ۝۱۷

اسباب کے پاس پھر اس کو کھا گیا بھیڑیا ۲؎ اور تو باور نہ کرے گا ہمارا کہنا اور اگرچہ ہم سچے ہوں ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (ادھر) وہ لوگ اپنے باپ کے پاس عشاء کے وقت روتے ہوئے پہنچے (اور جب یعقوب علیہ السلام نے رونے کا سبب پوچھا تو) کہنے لگے ابا! ہم سب تو آپس میں دوڑ لگانے میں (کہ دیکھیں کون آگے نکلتا ہے اس میں) لگ گئے اور یوسف کو ہم نے (ایسی جگہ جہاں بھیڑیا آنے کا گمان بھی نہ تھا) اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا، بس (اتفاقا) ایک بھیڑیا (آیا اور) ان کو کھا گیا اور آپ تو ہمارا کاہے کو یقین کرنے لگے گو ہم کیسے ہی سچے ہوں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یا تو گھر پہنچتے پہنچتے اندھیرا ہو گیا یا جان بوجھ کر اندھیرے سے آئے کہ دن کے اجالے میں باپ کو منہ دکھانا زیادہ مشکل تھا اور رات کی سیاہ چادر بے حیائی، سنگدلی اور جھوٹی آہ و بکاء کی کسی حد تک پردہ داری کر سکتی تھی، اعمش نے خوب فرمایا کہ برادران یوسف کا گریہ و بکاء سننے کے بعد ہم کسی شخص کو محض چشم اشکبار سے سچا نہیں سمجھ سکتے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی ہم نے حفاظت میں کچھ کوتاہی نہیں کی، ہمارے کپڑے جوتے وغیرہ قابل حفاظت چیزیں جہاں رکھی تھیں وہیں یوسف کو بٹھلایا اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے کو بھاگ دوڑ شروع کی، بس ذرا آنکھ سے اوجھل ہونا تھا کہ بھیڑیے نے یوسف کو آ دبوچا، اس موقع پر اتنی ذرا سی دیر میں احتمال بھی نہ تھا کہ بھیڑیا پہنچ کر فورا یوسف کو شکار کر لے گا۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی یوسف کے معاملہ میں پہلے ہی سے آپ کو ہماری طرف بدگمانی ہے، اگر آپ کے نزدیک ہم بالکل سچے ہوں تب بھی اس معاملہ خاص میں کسی طرح ہماری بات کا یقین نہیں کر سکتے۔

وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ

اور لائے اس کے کرتے پر لہو لگا کر جھوٹ ۱؎ بولا یہ ہرگز نہیں بلکہ بنا دی ہے تم کو تمہارے جیوں نے ایک بات، اب صبر ہی بہتر ہے

وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ۝۱۸

اور اللہ ہی سے مدد مانگتا ہوں اس بات پر جو تم ظاہر کرتے ہو ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (جب یعقوب علیہ السلام کے پاس آنے لگے تھے تو) یوسف کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون بھی لگا لائے تھے (کہ کسی جانور کا خون ان کی قمیص پر ڈال کر اپنے قول کی سند کے لئے پیش کیا) یعقوب (علیہ السلام) نے (دیکھا تو کرتا کہیں سے پھٹا نہیں تھا تو) فرمایا (یوسف کو بھیڑیئے نے ہرگز نہیں کھایا) بلکہ تم نے اپنے دل سے ایک بات بنا لی ہے سو (خیر) میں صبر ہی کروں گا جس میں شکایت کا نام نہ ہوگا، اور جو

باتیں تم بتاتے ہو ان میں اللہ ہی مدد کرے (کہ اس وقت مجھے ان پر صبر آجائے اور آئندہ تمہارا جھوٹ کھل جائے بہر حال حضرت یعقوب علیہ السلام صبر کر کے بیٹھ رہے)۔

**بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا**: مشہور قول یہ ہے کہ اس قمیص کو صحیح سالم دیکھنے سے کہ کہیں سے پھٹا ہوا چرا ہوا نہ تھا آپ نے ان کی بات غلط ہونا معلوم کیا، لیکن اگر یہ روایت ثابت نہ ہو تو ذوق اجتہاد اور شہادت قلب سے سمجھ لیا ہوگا، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے دل کی شہادت اکثر تو واقع کے مطابق ہی ہوتی ہے اور کبھی واقع کے خلاف بھی ہو جاتی ہے، چنانچہ یعقوب علیہ السلام نے جو بات اپنے صاحبزادوں سے اس وقت کہی تھی کہ: بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا یعنی تمہارے نفوس نے ایک بات بنائی ہے، یہی بات اُس وقت بھی کہی جبکہ مصر میں یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی بنیامین ایک چوری کے الزام میں پکڑ لیے گئے اور ان کے بھائیوں نے یعقوب علیہ السلام کو اس کی خبر کی تو اس وقت بھی فرمایا: بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ یہاں غور کرنے کا مقام ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ دونوں باتیں اپنی رائے سے کہی تھیں، ان میں سے پہلی بات صحیح نکلی، دوسری بنیامین والی صحیح نہیں تھی، کیونکہ اس میں بھائیوں کا قصور نہ تھا، اس سے معلوم ہوا کہ رائے کی غلطی پیغمبروں سے بھی ابتداءً ہو سکتی ہے، اگرچہ بعد میں ان کو بوحی الٰہی غلطی پر قائم رہنے نہیں دیا جاتا، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کشف و فراست کا ہمیشہ صحیح ہونا ضروری نہیں، نیز قرطبی میں ہے کہ اس سے ثابت ہوا کہ رائے کی غلطی بڑے بڑوں سے ہو سکتی ہے، اس لئے ہر صاحب رائے کو چاہئے کہ اپنی رائے کو متہم سمجھے، اس پر ایسا جمود نہ کرے کہ دوسروں کی بات سننے ماننے کو تیار نہ ہو۔

**فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ**: ''صبر جمیل'' کی یہ تفسیر کہ اس کے ساتھ کوئی حرف شکایت نہ ہو طبری نے مرفوع حدیث کے حوالہ سے بیان کی ہے، یہاں بظاہر یہ اشکال ہوتا ہے کہ جب یعقوب علیہ السلام کو برادران یوسف کے بیان کا غلط ہونا یقینا یا گمان غالب سے معلوم ہو گیا تھا تو پھر یوسف علیہ السلام کو تلاش کیوں نہیں کیا؟ ایسے صبر میں تو دوسرے کی جان تلف ہونے کا اندیشہ ہے؟ جواب یہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو وحی سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ وہ تلف نہ ہوں گے، لیکن میری قسمت میں طویل مفارقت مقدر ہے، میری تلاش سے نہ ملیں گے، اب کوئی اشکال نہ رہا۔

* * *

**فائدہ**: 1 ایک بکری یا ہرن وغیرہ ذبح کر کے اس کا خون یوسف کی قمیص پر چھڑک لائے تھے وہ جھوٹا خون پیش کر کے باپ کو یقین دلانے لگے، کہ بھیڑیے کے زخمی کرنے سے یہ کرتہ خون آلود ہو گیا۔

**فائدہ**: 2 بھلا جس کو شام میں بیٹھ کر مصر سے یوسف کے کرتہ کی خوشبو آتی تھی وہ بکری کے خون پر یوسف کے خون کا گمان کب کر سکتا تھا، انہوں نے سنتے ہی جھٹلا دیا، اور جیسا کہ بعض تفاسیر میں ہے کہنے لگے کہ وہ بھیڑیا واقعی بڑا حلیم و متین ہوگا جو یوسف کو لے گیا اور خون آلود کرتہ کو نہایت احتیاط سے صحیح و سالم اتار کر رکھ گیا، سچ ہے: ''دروغ گو را حافظہ نہ باشد'' خون کے چھینٹے تو دیے مگر یہ خیال نہ رہا کہ قمیض کو بے ترتیبی سے نوچ کر اور پھاڑ کر پیش کرتے، حضرت یعقوب علیہ السلام نے صاف طور پر فرما دیا کہ یہ سب تمہاری سازش اور اپنے دلوں سے تراشی ہوئی باتیں ہیں، بہر حال میں صبر جمیل اختیار کرتا ہوں جس میں نہ کسی غیر کے سامنے شکوہ ہوگا نہ تم سے انتقام کی کوشش، صرف اپنے خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اس صبر میں میری مدد فرمائے اور اپنی اعانت غیبی سے جو باتیں تم ظاہر کر رہے ہو، ان کی حقیقت اس طرح آشکارا کر دے کہ سلامتی کے ساتھ یوسف سے دوبارہ ملنا نصیب ہو۔

معلوم ہوتا ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو مطلع کر دیا گیا تھا کہ جس امتحان میں وہ مبتلا کیے گئے ہیں وہ پورا ہو کر رہے گا اور ایک مدت معین کے بعد اس مصیبت سے نجات ملے گی، فی الحال ڈھونڈنے یا انتقامی تدابیر اختیار کرنے سے کوئی فائدہ نہیں، یوسف ابھی ملیں گے نہیں، ہاں! دوسرے بیٹے ساری دنیا میں رسوا ہو جائیں گے اور ممکن ہے کہ طیش میں آکر خود یعقوب علیہ السلام کو ایذاء پہنچانے کی کوشش کریں، کذا قال الامام الرازی فی الکبیر. واللہ اعلم۔

وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَأَدْلٰى دَلْوَهٗ ؕ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ

اور آیا ایک قافلہ پھر بھیجا اپنا پانی بھرنے والا، اس نے لٹکایا اپنا ڈول، کہنے لگا کیا خوشی کی بات ہے یہ ہے ایک لڑکا ۱؎

وَأَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾

اور چھپالیا اس کو تجارت کا مال سمجھ کر ۲؎ اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (یوسف علیہ السلام کا یہ قصہ ہوا کہ اتفاق سے ادھر) ایک قافلہ آ نکلا (جو مصر کو جا رہا تھا) اور انہوں نے اپنا آدمی پانی لانے کے واسطے (یہاں کنویں پر) بھیجا اور اس نے اپنا ڈول ڈالا (یوسف علیہ السلام نے ڈول کو پکڑ لیا جب ڈول باہر آیا تو اس نے یوسف علیہ السلام کو دیکھا خوش ہوکر) کہنے لگا ارے! بڑی خوشی کی بات ہے یہ تو بڑا اچھا لڑکا نکل آیا (قافلہ والوں کو خبر ہوئی تو وہ بھی خوش ہوئے) اور ان کو مال (تجارت) قرار دے کر (اس خیال سے) چھپالیا (کہ کوئی دعویدار نہ کھڑا ہوجائے تو پھر اس کو مصر لے جاکر بڑی قیمت پر بیچ کر نفع کمائیں گے) اور اللہ کو ان سب کی کارگزاریاں معلوم تھیں (کہ بھائی ان کو بے وطن اور قافلے والے قیمت بنا رہے تھے اور اللہ ان کو زمانے کا بادشاہ بنا رہا تھا)۔

* * *

**فائدہ: ۱؎ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ:** کہتے ہیں تین روز تک یوسف علیہ السلام کنوئیں میں رہے، قدرت الٰہی نے حفاظت کی، ایک بھائی یہودا کے دل میں ڈال دیا کہ وہ ہر روز کنوئیں میں کھانا پہنچا آتا تھا، ویسے بھی سب بھائی خبر رکھتے تھے کہ مرے نہیں، کسی دوسرے ملک کا مسافر نکال لے جائے تو ہمارے درمیان سے یہ کانٹا نکل جائے، سچ ہے: ''گل است سعدی و در چشم دشمناں خار است''، آخر مدین سے مصر کو جانے والا ایک قافلہ ادھر سے گزرا، انہوں نے کنواں دیکھ کر اپنا آدمی پانی بھرنے کو بھیجا اس نے ڈول پھانسا تو حضرت یوسف چھوٹے تو تھے ہی ڈول میں ہو بیٹھے اور رسی ہاتھ سے پکڑ لی کھینچنے والے نے ان کا حسن و جمال دیکھ کر بے ساختہ خوشی سے پکارا کہ یہ تو عجیب لڑکا ہے بڑی قیمت کو بکے گا۔

**فائدہ: ۲؎ وَأَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً:** یعنی کھینچنے والے نے اس واقعہ کو دوسرے ہمراہیوں سے چھپانا چاہا کہ اوروں کو خبر ہوگی تو سب شریک ہوجائیں گے، شاید یہ ظاہر کیا کہ یہ غلام اس کے مالکوں نے مجھ کو دیا ہے تاکہ مصر کے بازار میں فروخت کروں۔

**فائدہ: ۳؎ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ:** یعنی بھائی بے وطن کرنا چاہتے تھے اور قافلہ والے بیچ کر دام وصول کرنے کا ارادہ کر رہے تھے اور خدا تعالیٰ خزائن مصر کا مالک بنانا چاہتا تھا، وہ اگر چاہتا تو ان کارروائیوں کو ایک سیکنڈ میں روک دیتا، لیکن اس کی مصلحت تاخیر میں تھی، اس لیے سب چیزوں کو جانتے اور دیکھتے ہوئے انہیں ڈھیل دی گئی۔

ع ۲ / ۱۲

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ ۢ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ﴿۲۰﴾

اور بیچ آئے اس کو بھائی ناقص قیمت کو گنتی کی چونیاں ۱؎ اور ہو رہے تھے اس سے بیزار ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** (ادھر وہ بھائی بھی آس پاس خبر گیری کیلئے لگے ہوئے تھے اور وقتاً فوقتاً کنویں میں دیکھ آتے، کچھ کھانا بھی پہنچا دیتے جس سے مقصد یہ تھا کہ یوسف ہلاک بھی نہ ہوں اور کوئی ان کو نکال لے، لیکن کہیں دوسری جگہ لے جائے اور یعقوب علیہ السلام تک خبر نہ پہنچے، غرض اس روز جب یوسف علیہ السلام کو کنویں میں نہ دیکھا اور پاس ایک قافلہ دیکھا تو تجسس کرتے کرتے یوسف تک جا پہنچے، اور قافلہ والوں سے کہا کہ یہ ہمارا غلام ہے بھاگ گیا تھا، اب ہم اس کو رکھنا نہیں چاہتے) اور (بھائیوں نے یہ بات بنا کر) ان کو بہت ہی کم قیمت پر (قافلہ والوں کے ہاتھ) بیچ ڈالا یعنی گنتی کے چند درہم کے بدلے میں، اور (وجہ یہ تھی کہ) یہ لوگ کچھ ان کے قدر دان تو تھے ہی نہیں (کہ یوسف کو عمدہ مال سمجھ کر بڑی قیمت سے بیچتے، کیونکہ ان کو بیچنا

مقصود نہ تھا، بلکہ بلا کی طرح ان کو یہاں سے ٹالنا مقصود تھا، یوسف علیہ السلام ڈر کے مارے خاموش رہے کہ مار نہ ڈالیں اور اسی کو غنیمت سمجھا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ بھائیوں کو خبر ہوئی کہ قافلہ والے نکال لے گئے، وہاں پہنچے اور ظاہر کیا کہ یہ ہمارا غلام بھاگ آیا ہے چونکہ اسے بھاگنے کی عادت ہے اس لیے ہم رکھنا نہیں چاہتے، تم خرید تو خرید سکتے ہو، مگر بہت سخت نگرانی رکھنا کہیں بھاگ نہ جائے کہتے ہیں اٹھارہ درہم یا کم وبیش میں بیچ ڈالا، اور نو بھائیوں نے دو دو درہم (تقریباً آٹھ آٹھ آنے) بانٹ لیے، ایک بھائی یہودا نے حصہ نہیں لیا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی اس قدر ارزاں بیچنے سے تعجب مت کرو، وہ اتنے بیزار تھے کہ مفت ہی دے ڈالتے تو مستبعد نہ تھا، جو پیسے مل گئے غنیمت سمجھا، بعض مفسرین کہتے ہیں آیت میں اس بیع کا ذکر ہے جو قافلہ والوں نے مصر پہنچ کر کی، اگر ایسا ہوتو کہا جائے گا کہ پڑی ہوئی چیز کی قدر نہ کی اور یہ اندیشہ رہا کہ پھر کوئی آ کر دعویٰ نہ کر بیٹھے، نیز آبق (بھگوڑا) ہونے کا عیب سن چکے تھے، اس لیے سستے داموں بیچ ڈالا، والظاهر هو الاول، واللہ اعلم۔

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ۭ

اور کہا جس شخص نے خرید کیا اس کو مصر سے اپنی عورت کو آبرو سے رکھ اس کو شاید ہمارے کام آئے یا ہم کرلیں اس کو بیٹا ۱؎

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۡ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۭ

اور اسی طرح جگہ دی ہم نے یوسف کو اس ملک میں، اور اس واسطے کہ اسکو سکھائیں کچھ ٹھکانے پر بٹھانا باتوں کا (کل درست کرنی باتوں کی) ۲؎

وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓي اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٢١﴾

اور اللہ طاقتور رہتا ہے اپنے کام میں ولیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** (قافلہ والے یوسف علیہ السلام کو بھائیوں سے خرید کر مصر لے گئے، وہاں عزیز مصر کے ہاتھ فروخت کر دیا) اور جس شخص نے مصر میں ان کو خریدا تھا (یعنی عزیز) اس نے (ان کو اپنے گھر لا کر اپنی بیوی کے سپرد کیا اور) اپنی بیوی سے کہا کہ اس کو خاطر سے رکھنا کیا عجب ہے کہ (بڑا ہوکر) ہمارے کام آئے (جیسا کہ پروردہ لوگ اپنے کام آیا کرتے ہیں) یا ہم اس کو بیٹا بنالیں (مشہور یہ ہے کہ ان کے ہاں اولاد نہ تھی اس لیے یہ بات کہی)۔

اور ہم نے (جس طرح یوسف علیہ السلام کو اپنی خاص عنایت سے اس اندھیرے کنویں سے نجات دی) اسی طرح یوسف کو اس سرزمین (مصر) میں خوب قوت دی (مراد اس سے سلطنت ہے) اور (یہ نجات دینا اس غرض سے بھی تھا) تاکہ ہم ان کو خوابوں کی تعبیر دینا بتلا دیں (مطلب یہ کہ نجات دینے سے مقصود یہ تھا کہ ان کو ظاہری اور باطنی دولت سے مالا مال کریں) اور اللہ تعالیٰ اپنے (چاہے ہوئے) کام پر غالب (اور قادر) ہے (جو چاہے کرے) لیکن اکثر آدمی جانتے نہیں (کیونکہ ایمان ویقین والے کم ہی ہوتے ہیں)۔

**وَقَالَ الَّذِي اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ:** اس عورت کا نام بعض نے "راعیل" کہا ہے اور مشہور "زلیخا" ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ ان دونوں میں ایک نام ہے اور ایک لقب ہے، اور اس کا شوہر "عزیز" کے لقب سے مشہور تھا، اور سلطنت مصر کے مدار المہام کا یہی لقب ہوتا تھا اور نام اس شخص کا قطفیر ہے، واللہ اعلم۔

**وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ:** یہ بات قصہ کے درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر لائی گئی ہے تاکہ خرید وفروخت کے قصہ کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوجائے کہ اگرچہ یوسف علیہ السلام اس وقت بظاہر ناگوار حالت میں ہیں، کیونکہ موجودہ حالت یعنی غلام بن کر رہنا بظاہر کوئی اچھی

حالت نہ تھی، مگر حق تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ چندروزہ حالت ذریعہ کے طور پر ہے، اصل مقصد سلطنت اور علوم کے ذریعہ ان کو اونچا مقام عطا فرمانا ہے، موجودہ عارضی حالت اصلی مقاصد کے لیے ذریعہ اور پیش خیمہ ہے، چنانچہ ترقی سلطنت کا سبب اور زینہ عزیز مصر کو اور اس کے گھر میں پرورش پانے کو بنایا گیا، اسی طرح علوم اور قلبی واردات کے لیے بھی مصیبتیں اور مشقتیں سبب ہوجایا کرتی ہیں، پس اس اعتبار سے فیضان علوم میں بھی ان کو دخل ہوا، اور عام طور پر امراء کے گھر پرورش پانے سے سلیقہ اور تجربہ بھی بڑھتا ہے جس کی ضرورت سلطنت اور علوم دونوں میں ہے، بالخصوص علم تعبیر میں تو اسکی بہت ضرورت ہوتی ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا: کہتے ہیں مصر پہنچ کر نیلام ہوا، عزیز مصر جو وہاں کا مدار المہام تھا، اس کی بولی پر معاملہ ختم ہوا، اس نے اپنی عورت (زلیخا یا راعیل) سے کہا کہ نہایت پیارا، قبول صورت، اور ہونہار لڑکا معلوم ہوتا ہے، اس کو پوری عزت وآبرو سے رکھو، غلاموں کا معاملہ مت کرو، شاید بڑا ہوکر ہمارے کام آئے، ہم اپنا کاروبار اس کے سپرد کردیں، یا جب اولاد نہیں ہے تو بیٹا بنالیں۔

**فائدہ:** ۲ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ: یعنی ہم نے اپنی قدرت کاملہ اور تدبیر لطیف سے یوسف کو بھائیوں کی حاسدانہ سختیوں اور کنوئیں کی قید سے نکال کر عزیز مصر کے یہاں پہنچادیا، پھر اس کے دل میں یوسف کی محبت ووقعت القاء فرمائی اس طرح ہم نے ان کو مصر میں ایک معزز جگہ دی اور اہل مصر کی نظروں میں ان کو وجیہ ومحبوب بنادیا، تاکہ یہ چیز آئندہ ترقیات اور سربلندیوں کا پیش خیمہ ہو، اور بنی اسرائیل کو مصر میں بسانے کا ذریعہ بنے، ساتھ ہی یہ بھی منظور تھا کہ عزیز مصر کے یہاں رہ کر بڑے سرداروں کی صحبت دیکھیں تاکہ سلطنت کے رموز واشارات سمجھنے اور تمام باتوں کو ان کے ٹھکانے پر بٹھانے کا کامل سلیقہ اور تجربہ حاصل ہو۔

**تنبیہ:** اسی سورت کے پہلے رکوع میں تاویل الاحادیث کا لفظ گزر چکا ہے، اس کی تفسیر وہاں ملاحظہ کرلی جائے۔

**فائدہ:** ۳ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ: یعنی بھائیوں نے یوسف کو گرانا چاہا، خدا نے ان کو آسمان رفعت پر پہنچادیا، اکثر لوگ کوتاہ نظری سے دیکھتے نہیں کہ انسانی تدبیروں کے مقابلہ میں کس طرح خدا کا بندوبست غالب آتا ہے۔

## وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

اور جب پہنچ گیا اپنی قوت کو دیا ہم نے اس کو حکم اور علم ۱ اور ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں ہم نیکی والوں کو ۲

**خلاصہ تفسیر:** (اسی جملہ معترضہ کا بقیہ تتمہ آگے یہ ہے) اور جب وہ اپنی جوانی (یعنی سن بلوغ یا کمال شباب) کو پہنچے ہم نے ان کو حکمت اور علم عطا کیا (مراد اس سے علوم نبوت کا عطا کرنا ہے) اور ہم نیک لوگوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں (جس طرح یوسف علیہ السلام کو شریعت پر عمل کرنے کی بدولت بدلہ دیا کہ ان کے علم وحکمت میں ترقی فرماتے رہے)۔

**وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ:** اس جملہ میں بھی پہلے سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ یوسف علیہ السلام پر تہمت لگانے کا جو قصہ آگے بیان ہوگا وہ سراسر تہمت اور جھوٹ ہوگا، کیونکہ یوسف علیہ السلام صاحب حکمت تھے، اور حکمت علم نافع کو کہتے ہیں جس کے ساتھ علم بھی کامل ہو، اور ان باتوں کا صادر ہونا حکمت کے خلاف ہے، پس ان کا یوسف علیہ السلام سے صادر ہونا بھی غلط ہے۔

**اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا:** حکمت اور علم عطا کرنے سے مراد اس جگہ عطاء نبوت ہے، اور پیچھے آیت: وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ میں بلوغ سے پہلے کنویں میں جس وحی کا ذکر گذر چکا وہ ایک خاص واقعہ کے متعلق ہے، وہ علوم دینیہ سے نہیں جو علم وحکمت سے مراد ہے، پس دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی جب یوسف کے تمام قویٰ حد کمال کو پہنچ گئے تو خدا کے یہاں سے عظیم الشان علم وحکمت کا فیض پہنچا، نہایت مشکل عقدے اپنی فہم رسا سے حل کرتے، بڑی خوبی اور دانائی سے لوگوں کے نزاعات چکاتے، دین کی باریکیاں سمجھتے، جو زبان سے کہتے وہ کرکے دکھاتے، سفیہانہ

اخلاق سے قطعا پاک وصاف اور علم شرائع کے پورے ماہر تھے، تعبیر رؤیا کا علم تو ان کا مخصوص حصہ تھا۔

**فائدہ:** ۲۔ جو لوگ فطرت کی راہنمائی یا تقلید صالحین اور توفیق ازلی سے نوائب وحوادث پر صابر رہ کر عمدہ اخلاق اور نیک چال چلن اختیار کرتے ہیں، حق تعالیٰ ان پر ایسے ہی انعام فرماتا ہے۔

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ

پھسلایا اس کو اس کی عورت نے جس کے گھر میں تھا اپنا جی تھامنے سے اور بند کر دیے دروازے اور بولی شاب کر ۱؎ کہا خدا کی پناہ

اِنَّهٗ رَبِّيْۤ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

عزیز مالک ہے میرا اچھی طرح رکھا ہے مجھ کو، بیشک بھلائی نہیں پاتے جو لوگ کہ بے انصاف ہوں ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** (آگے اس تہمت کے قصہ کا بیان ہے کہ یوسف علیہ السلام عزیز مصر کے گھر میں آرام وراحت کے ساتھ رہنے لگے) اور (اسی درمیان میں یہ ابتلاء اور امتحان کا واقعہ پیش آیا کہ) جس عورت کے گھر میں یوسف رہتے تھے وہ (ان پر مفتون ہوگئی اور) ان سے اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے ان کو پھسلانے لگی اور (گھر کے) سارے دروازے بند کر دیئے اور (ان سے) کہنے لگی آجاؤ تم ہی سے کہتی ہوں، یوسف (علیہ السلام) نے کہا (کہ اول تو یہ کام خود بڑا بھاری گناہ ہے) اللہ بچائے (دوسرے) وہ (یعنی تیرا شوہر) میرا مربی (اور محسن) ہے کہ مجھ کو کیسی اچھی طرح رکھا (تو کیا میں اس کے ناموس میں خلل اندازی کروں) ایسے حق فراموشوں کو فلاح نہیں ہوا کرتی (بلکہ اکثر تو دنیا ہی میں ایسے لوگ ذلیل اور پریشان ہوتے ہیں ورنہ آخرت میں تو عذاب یقینی ہے)۔

اِنَّهٗ رَبِّيْۤ اَحْسَنَ مَثْوَايَ: زنا اگرچہ ہر حالت میں قبیح ہے، لیکن یوسف علیہ السلام نے دو وجہ سے عزیز کے محسن ہونے کو یاد دلایا، ایک تو یہ کہ اس صورت میں زنا بہت ہی زیادہ قبیح ہے، دوسرے یہ کہ مخاطب اس وقت زلیخا تھی اور وہ شرعی قباحت کو تو مطلق نہ سمجھتی تھی اور عقلی باریک دلیل کو بھی نہ سمجھتی، اس لیے ایسی عقلی قباحت بیان فرمائی جس سے اس پر حجت قائم ہو جائے اور جس کو وہ بھی خوب سمجھ لے، نیز اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ محسن وخیرخواہ اگرچہ کافر ہی کیوں نہ ہو تب بھی اس کی رعایت کرنی چاہیے اور اہل طریق اس بارے میں سب سے آگے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ ادھر تو الطاف غیبیہ حضرت یوسف کی عجیب وغریب طریقہ سے تربیت فرما رہے تھے، ادھر عزیز کی بیوی (زلیخا) نے ان کے سامنے ایک نہایت ہی مزلۃ الاقدام موقع امتحان کھڑا کر دیا، یعنی حضرت یوسف کے حسن وجمال پر زلیخا مفتون ہوگئی اور دلکشی وہوشربائی کے سارے سامان جمع کر کے چاہا کہ یوسف کے دل کو ان کے قابو سے باہر کر دے، ایک طرف عیش ونشاط کے سامان، نفسانی جذبات پورے کرنے کے لیے ہر قسم کی سہولیتیں، یوسف علیہ السلام کا ہر وقت زلیخا کے گھر میں موجود رہنا، اس کا نہایت محبت اور پیار سے رکھنا، تنہائی کے وقت خود عورت کی طرف سے ایک خواہش کا بیتابانہ اظہار، کسی غیر کے آنے جانے کے سب دروازے بند، دوسری طرف جوانی کی عمر، قوت کا زمانہ، مزاج کا اعتدال، تجرد کی زندگی، یہ سب دواعی واسباب ایسے تھے جن سے ٹکرا کر بڑے سے بڑے زاہد کا تقوی بھی پاش پاش ہو جاتا، مگر خدا نے جس کو محسن قرار دے کر علم وحکمت کے رنگ میں رنگین کیا اور پیغمبرانہ عصمت کے بلند مقام پر پہنچایا، اس پر کیا مجال تھی کہ شیطان کا قابو چل جاتا، اس نے ایک لفظ کہا: معاذ اللہ (خدا کی پناہ) اور شیطانی جال کے سارے حلقے توڑ ڈالے، کیونکہ جس نے خدا کی پناہ لی اس پر کس کا وار چل سکتا ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی خدا کی پناہ میں ایسی قبیح حرکت کیسے کر سکتا ہوں؟ علاوہ بریں ''عزیز'' میرا مربی ہے جس نے مجھے ایسے عزت وراحت سے رکھا، کیا میں اپنے محسن کے ناموس پر حملہ کروں؟ ایسی محسن کشی اور بے انصافی کرنے والے کبھی بھلائی اور کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتے نیز جب ظاہری مربی کا ہم کو اس قدر پاس ہے تو سمجھ لو کہ اس پروردگار حقیقی سے ہمیں کس قدر شرمانا اور حیا کرنا چاہیے جس نے محض اپنے فضل سے ہماری تربیت فرمائی اور اپنے

بندوں کو ہماری خدمت وراحت رسانی کے لیے کھڑا کر دیا۔

**تنبیہ:** بعض مفسرین نے انہ ربی کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع کی ہے۔

**وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۭ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْۗءَ**

اور البتہ عورت نے فکر کیا اسکا، اور اس نے فکر کیا عورت کا ۱ اگر نہ ہوتا یہ کہ دیکھے قدرت اپنے رب کی ۲ یوں ہی ہوا تا کہ ہٹائیں ہم اس سے برائی

**وَالْفَحْشَاۗءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۝۲۴**

اور بے حیائی، البتہ وہ ہے ہمارے برگزیدہ بندوں میں ۳

**خلاصہ تفسیر:** اور اس عورت کے دل میں ان کا خیال (عزم کے درجہ میں) جم ہی رہا تھا اور ان کو بھی اس عورت کا کچھ کچھ خیال (امر طبعی کے درجہ میں) ہو چلا تھا (جو کہ اختیار سے باہر ہے، جیسے گرمی کے روزہ میں پانی کی طرف طبعی میلان ہوتا ہے، مگر روزہ توڑنے کا وسوسہ تک بھی نہیں آتا، البتہ) اگر اپنے رب کی دلیل کو (یعنی اس فعل کے گناہ ہونے کی دلیل کو جو کہ حکم شرعی ہے) انہوں نے نہ دیکھا ہوتا (یعنی ان کو شریعت کا علم عملی قوت کے ساتھ حاصل نہ ہوتا) تو زیادہ خیال ہو جانا عجب نہ تھا (کیونکہ اس کے قوی دواعی اور اسباب سب جمع تھے مگر) ہم نے اسی طرح ان کو علم دیا تا کہ ہم ان سے صغیرہ اور کبیرہ گناہ کو دور رکھیں (یعنی ارادہ سے بھی بچالیا اور فعل سے بھی کیونکہ) وہ ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے تھے (اور برگزیدہ بھی اعلیٰ درجہ کے نبی ہونے کی وجہ سے جن کے لیے عصمت لازم ہے)۔

**وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ:** بعض محققین نے وَهَمَّ بِهَا کی تفسیر اور طرح کی ہے کہ وَهَمَّ بِهَا کو لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ کے ساتھ ملایا ہے، جس سے یہ معنی حاصل ہوئے کہ یوسف علیہ السلام بھی خیال کر لیتے اگر خدا کی برہان کو نہ دیکھتے، مگر اب خیال بھی نہ ہوا، یہ تفسیر بھی نہایت لطیف ہے، مگر احقر نے اوپر خلاصہ تفسیر میں اس تفسیر کو اس لیے اختیار کیا کہ اس میں یوسف علیہ السلام کا کمال زیادہ ہے کہ رغبت کے باوجود جس کا سبب طبیعت کی قوت، بدن کی صحت، مزاج کا اعتدال اور قُویٰ کی سلامتی تھی پھر رک گئے، اس میں صبر اور مجاہدہ زیادہ ہے، جس کو رغبت ہی نہ ہوتی ہو وہ اگر زنا سے رک جائے تو کیا کمال ہے، نامرد کا زنا سے رکنا کچھ بھی کمال نہیں، پس اس جگہ جو اشکال پڑتا ہے وہ اس طرح دور ہوا کہ زلیخا کا قصہ اور قسم کا ہے، وہ اپنے اختیار سے زنا کا ارتکاب چاہتی تھی، اور یوسف علیہ السلام کا خیال اور طرح کا ہے کہ کامل مرد ہونے کی وجہ سے رغبت اور شہوت کو بے اختیار ہیجان ہوا تھا، ارادہ واختیار سے اس برے کام کا ان کو وسوسہ بھی نہ تھا، یہی کامل عفت اور عصمت ہے، اور اس تفسیر کا قرینہ خود الفاظ قرآن میں موجود ہے، زلیخا کے ارادہ کو حق تعالیٰ نے لام اور قد (ولقد) سے مؤکد فرمایا ہے جس سے پختگی معلوم ہوتی ہے۔

* * *

**فائدہ: ۱ وَهَمَّ بِهَا:** یعنی عورت نے پھانسنے کی فکر کی اور اس نے فکر کی کہ عورت کا داؤ چلنے نہ پائے اگر اپنے رب کی حجت وقدرت کا معائنہ نہ کرتا تو ثابت قدم رہنا مشکل تھا، بعض مفسرین نے وَهَمَّ بِهَا کو وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ سے علیحدہ کر کے لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ سے متعلق کیا ہے، جیسے اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰي قَلْبِهَا کی ترکیب ہے، اس وقت مقصود یوسف کے حق میں ھمّ کا ثابت کرنا نہیں، بلکہ نفی کرنا ہے، ترجمہ یوں ہوگا کہ عورت نے یوسف کا ارادہ کیا اور یوسف بھی عورت کا ارادہ کرتا اگر اپنے پروردگار کی قدرت وحجت نہ دیکھ لیتا، بعض نے وَهَمَّ بِهَا میں لفظ هَمَّ کو بمعنی میلان ورغبت کے لیا ہے، یعنی یوسف کے دل میں کچھ رغبت ومیلان بے اختیار پیدا ہوا، جیسے روزہ دار کو گرمی میں ٹھنڈے پانی کی طرف طبعاً رغبت ہوتی ہے لیکن نہ وہ پینے کا ارادہ کرتا ہے نہ یہ بے اختیاری رغبت کچھ مضر ہے، بلکہ باوجود رغبت طبعی کے اس سے قطعاً محترز رہنا مزید اجر وثواب کا موجب ہے، اسی طرح سمجھو کہ ایسے اسباب ودواعی قویہ کی موجودگی سے طبع بشری کے موافق بلا اختیار وارادہ یوسف علیہ السلام کے دل میں کسی قسم کی

رغبت ومیلان کا پایا جانا نہ عصمت کے منافی ہے نہ ان کے مرتبہ کو گھٹاتا ہے، بلکہ صحیح مسلم میں ابو ہریرہ کی حدیث ہے کہ اگر بندہ کا میلان کسی برائی کی طرف ہوا لیکن اس پر عمل نہ کیا تو اس کے فرد حسنات میں ایک نیکی لکھی جاتی ہے، خدا فرماتا ہے کہ اس نے (باوجود رغبت میلان) میرے خوف سے اس برائی کو ہاتھ نہ لگایا، بہر حال باوجود اشتراک لفظی کے زلیخا کے هَمَّ اور یوسف کے هَمَّ میں زمین وآسمان کا تفاوت ہے، اس لیے قرآن کریم نے هَمَّ کو ایک ہی لفظ میں جمع نہیں کیا اور نہ زلیخا کے هَمَّ پر ''لام'' اور ''قد'' داخل کیا گیا، بلکہ سیاق ولحاق میں بہت سے دلائل یوسف علیہ السلام کی طہارت ونزاہت پر قائم فرمائیں جو غور کرنے والوں پر پوشیدہ نہیں، تفصیل روح المعانی اور کبیر وغیرہ میں موجود ہے۔

**فائدہ: ۲** لَوۡلَاۤ اَنۡ رَّاٰ بُرۡهَانَ رَبِّهٖ: برھان دلیل وحجت کو کہتے ہیں، یعنی اگر یوسف علیہ السلام اپنے رب کی دلیل نہ دیکھتے تو قلبی میلان پر چل پڑتے، دلیل کیا تھی؟ ① زنا کی حرمت وشناعت کا وہ عین الیقین جو حق تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا ② یا وہ ہی دلیل جو خود انہوں نے زلیخا کے مقابلہ میں اِنَّهٗ رَبِّیۡۤ اَحۡسَنَ مَثۡوَایَ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ کہہ کر پیش کی ③ بعض کہتے ہیں کہ خدا کی قدرت سے اس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام نظر آئے کہ انگلی دانتوں میں دبائے سامنے کھڑے ہیں ④ بعض نے کہا کہ کوئی غیبی تحریر نظر پڑی جس میں اس فعل سے روکا گیا، واللہ اعلم۔

**فائدہ: ۳** اِنَّهٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُخۡلَصِیۡنَ: یعنی یہ ''برہان'' دکھانا اور ایسی طرح ثابت قدم رکھنا اس لیے تھا کہ یوسف ہمارے برگزیدہ بندوں میں ہیں، لہٰذا کوئی چھوٹی بڑی برائی خواہ ارادہ کے درجہ میں ہو یا عمل کے، ان تک نہ پہنچ سکے۔

وَاسۡتَبَقَا الۡبَابَ وَقَدَّتۡ قَمِیۡصَهٗ مِنۡ دُبُرٍ وَّاَلۡفَیَا سَیِّدَهَا لَدَا الۡبَابِ ؕ قَالَتۡ مَا جَزَآءُ

اور دونوں دوڑے دروازے کو اور عورت نے چیر ڈالا اسکا کرتہ پیچھے سے اور دونوں مل گئے عورت کے خاوند سے دروازے کے پاس ۱. بولی اور کچھ سزا نہیں

مَنۡ اَرَادَ بِاَهۡلِكَ سُوۡٓءًا اِلَّاۤ اَنۡ یُّسۡجَنَ اَوۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۲۵﴾

ایسے شخص کی جو چاہے تیرے گھر میں برائی مگر یہی کہ قید میں ڈالا جائے یا عذاب دردناک ۲.

**خلاصہ تفسیر:** (جب اس عورت نے پھر وہی اصرار کیا تو یوسف علیہ السلام وہاں سے جان بچا کر بھاگے اور وہ ان کو پکڑنے کے لئے ان کے پیچھے چلی) اور وہ دونوں آگے پیچھے دروازہ کی طرف دوڑے اور (دوڑنے میں جو یوسف کو پکڑنا چاہا تو) اس عورت نے ان کا کرتہ پیچھے سے پھاڑ ڈالا (یعنی اس نے کرتہ پکڑ کر کھینچنا چاہا اور یوسف علیہ السلام آگے کی طرف دوڑے تو کرتہ پھٹ گیا مگر یوسف علیہ السلام دروازے سے باہر نکل گئے) اور (عورت بھی ساتھ تھی تو) دونوں نے (اتفاقاً) اس عورت کے شوہر کو دروازے کے پاس (کھڑا) پایا، عورت (خاوند کو دیکھ کر سٹ پٹائی اور فوراً بات بنا کر) بولی کہ جو شخص تیری بیوی کے ساتھ بدکاری کا ارادہ کرے اس کی سزا بجز اس کے اور کیا (ہو سکتی) ہے کہ وہ جیل خانے بھیجا جائے یا اور کوئی دردناک سزا ہو (جیسے ضرب جسمانی)۔

وَاسۡتَبَقَا الۡبَابَ: پیچھے آیت میں: وَغَلَّقَتِ الۡاَبۡوَابَ سے دروازوں کا متعدد ہونا معلوم ہوتا ہے جبکہ یہاں: وَاسۡتَبَقَا الۡبَابَ سے دروازہ کا ایک ہونا معلوم ہوتا ہے جس کی طرف یوسف علیہ السلام دوڑے تھے، اور اَلۡفَیَا سَیِّدَهَا لَدَا الۡبَابِ سے اس دروازہ کا کھلا ہونا معلوم ہوتا ہے جہاں عزیز کو کھڑا پایا، سو غالب یہ ہے کہ یہ چند دروازے ایسے تھے جیسے امراء کے مکانات میں ایک ایک کمرہ میں کئی کئی دروازے مختلف جوانب میں ہوا کرتے ہیں، ان کا آگے پیچھے ہونا ضروری نہیں جیسا کہ مشہور ہے، پھر یوسف علیہ السلام ان دروازوں میں سے کسی ایک کی طرف دوڑے ہوں گے، اور اس کو جلدی سے کھول کر باہر گئے ہوں گے جیسا کہ معمولی طور پر صرف کنڈی لگا کر بند کر لیا جاتا ہے، اور کنڈی کھولنے سے دروازہ کھل جاتا ہے۔

وَاسۡتَبَقَا الۡبَابَ: اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس جگہ گناہ میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو اس جگہ ہی کو چھوڑ دینا چاہئے، جیسا یوسف علیہ السلام نے وہاں سے بھاگ کر اس کا ثبوت دیا، دوسری بات یہ کہ احکام الٰہیہ کی اطاعت میں انسان پر لازم ہے کہ اپنی مقدور بھر کوشش میں کمی نہ کرے، خواہ اس کا

نتیجہ بظاہر کچھ برآمد ہوتا نظر نہ آئے، نتائج اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں، انسان کا کام اپنی محنت اور مقدور کو اللہ کی راہ میں صرف کر کے اپنی بندگی کا ثبوت دینا ہے، جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے دروازے سب بند ہونے اور تاریخی روایات کے مطابق مقفل ہونے کے باوجود دروازہ کی طرف دوڑنے میں اپنی پوری قوت خرچ فرمادی، ایسی صورت میں اللہ جل شانہ کی طرف سے امداد واعانت کا بھی اکثر مشاہدہ ہوتا ہے کہ بندہ جب اپنی کوشش پوری کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کامیابی کے اسباب بھی مہیا فرما دیتے ہیں، ایسی صورت میں اگر ظاہری کامیابی بھی حاصل نہ ہو تو بندہ کے لئے یہ ناکامی بھی کامیابی سے کم نہیں۔

* * *

**فائدہ: ۱** آگے یوسف تھے کہ جلدی دروازہ کھول کر نکل جائیں، اور پیچھے زلیخا انھیں روکنے کے لیے تعاقب کر رہی تھیں، اتفاقاً یوسف کے قمیص کا پچھلا حصہ زلیخا کے ہاتھ میں آ گیا، اس نے پکڑ کر کھینچنا چاہا، کھینچا تانی میں کرتہ پھٹ گیا، مگر یوسف جوں توں کر کے مکان سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے، ادھر یہ دونوں آگے پیچھے دروازہ پر پہنچے، ادھر عورت کا خاوند عزیز مصر بھی پہنچ گیا، عورت نے فوراً بات بنانی شروع کی۔

**فائدہ: ۲** عورت نے الزام یوسف پر رکھا کہ اس نے مجھ سے بُرا ارادہ کیا، ایسے شخص کی سزا یہ ہونی چاہیے کہ جیل خانہ بھیجا جائے یا کوئی اور سخت مار پڑے۔

قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ

یوسف بولا اسی نے خواہش کی مجھ سے کہ نہ تھاموں اپنے جی کو اور گواہی دی ایک گواہ نے عورت کے لوگوں میں سے ۱ اگر ہے کرتہ اسکا پھٹا آگے سے

فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۶﴾ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۷﴾

تو عورت سچی ہے اور وہ ہے جھوٹا، اور اگر ہے کرتا اس کا پھٹا پیچھے سے تو یہ جھوٹی ہے اور وہ سچا ہے

**خلاصہ تفسیر:** یوسف (علیہ السلام) نے کہا (کہ یہ جو میری طرف الزام کا اشارہ کرتی ہے بالکل جھوٹی ہے، بلکہ معاملہ برعکس ہے) یہی مجھ سے اپنا مطلب نکالنے کے لئے مجھ کو پھسلاتی تھی، اور (اس موقع پر) اس عورت کے خاندان میں سے ایک گواہ نے (جو کہ شیر خوار بچہ تھا اور یوسف علیہ السلام کے معجزے سے بول پڑا اور آپ کی براءت پر) شہادت دی (اس بچہ کا بولنا ہی یوسف علیہ السلام کا ایک معجزہ تھا، اس پر دوسرا معجزہ یہ ہوا کہ اس شیر خوار بچہ نے ایک معقول علامت بتا کر عاقلانہ فیصلہ بھی کیا اور کہا) کہ ان کا کرتہ (دیکھو کہاں سے پھٹا ہے؟) اگر آگے سے پھٹا ہے تو عورت سچی ہے اور یہ جھوٹے، اور اگر وہ کرتہ پیچھے سے پھٹا ہے تو عورت جھوٹی ہے اور یہ سچے ہیں۔

**قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ:** اس سے یہ ثابت ہوا کہ کسی شخص پر کوئی غلط تہمت باندھی تو اپنی صفائی پیش کرنا سنت انبیاء علیہم السلام ہے، یہ کوئی توکل یا بزرگی نہیں کہ اس وقت خاموش رہ کر اپنے آپ کو مجرم قرار دے دے، اس میں یہ بھی دلالت ہے کہ مخالف کا عیب ایسے وقت ظاہر کر دینا جبکہ چھپانے سے خود کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو یہ مکارم اخلاق کے خلاف نہیں۔

**وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا:** لفظ "شاہد" جب عام فقہی معاملات اور مقدمات میں بولا جاتا ہے تو اس سے وہ شخص مراد ہوتا ہے جو زیر نزاع معاملہ کے متعلق اپنا چشم دید کوئی واقعہ بیان کرے، اس آیت میں جس کو "شاہد" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اس نے کوئی واقعہ یا اس کے متعلق اپنا کوئی مشاہدہ بیان نہیں کیا، بلکہ فیصلہ کرنے کی ایک صورت کی طرف اشارہ کیا ہے اس کو اصطلاحی طور پر "شاہد" نہیں کہا جا سکتا، قرآن کریم نے یہاں اس شخص کو "شاہد" اس معنی کے اعتبار سے فرمایا ہے کہ جس طرح شاہد کے بیان سے معاملہ کا تصفیہ آسان ہو جاتا ہے اور کسی ایک فریق کا حق پر ہونا ثابت ہو جاتا ہے اس بچہ کے بیان سے بھی یہی فائدہ حاصل ہو گیا کہ اصل تو اس کی معجزانہ گویائی ہی حضرت یوسف علیہ السلام کی براءت کے لئے شاہد تھی اور پھر اس نے جو علامات بتلائیں ان کا حاصل بھی انجام کار یوسف علیہ السلام ہی کی براءت کا ثبوت ہے، اس لئے یہ کہنا صحیح ہو گیا کہ اس نے یوسف علیہ السلام کے حق میں گواہی

دی، حالانکہ اس نے یوسف علیہ السلام کو سچا نہیں کہا، بلکہ دونوں احتمالوں کا ذکر کر دیا تھا، اور زلیخا کے سچے ہونے کا ایک ایسی صورت میں بھی فرضی طور پر تسلیم کر لیا تھا جس میں ان کا سچا ہونا یقینی نہ تھا بلکہ دوسرا بھی احتمال موجود تھا، کیونکہ کرتے کا سامنے سے پھٹنا دونوں صورتوں میں ممکن ہے اور یوسف علیہ السلام کے سچے ہونے کو صرف ایسی صورت میں تسلیم کیا تھا جس میں اس کے سوا کوئی دوسرا احتمال ہی نہیں ہو سکتا لیکن انجام کار نتیجہ اس حکمت عملی کا یہی تھا کہ یوسف علیہ السلام کا بری ہونا ثابت ہو، اور یوسف علیہ السلام اگر اس وقت نبی نہ ہوں تو اس خارق عادت کو اصطلاح میں معجزہ کے بجائے ''ارہاص'' کہیں گے۔

* * *

**فائدہ:** لہ اب یوسف کو واقعہ ظاہر کرنا پڑا کہ عورت نے میرے نفس کو بے قابو کرنا چاہا، میں نے بھاگ کر جان بچائی، یہ جھگڑا ابھی چل رہا تھا کہ خود عورت کے خاندان کا ایک گواہ عجیب طریقہ سے یوسف کے حق میں گواہی دینے لگا، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیر خوار بچہ تھا، جو خدا کی قدرت سے حضرت یوسف کی برأت و وجاہت عند اللہ ظاہر کرنے کو بول پڑا، اور بعض علماء کہتے ہیں کہ بچہ نہیں کوئی مرد دانا تھا جس نے ایسی پتہ کی بات کہی، واللہ اعلم۔

فَلَمَّا رَاٰ قَمِيۡصَهٗ قُدَّ مِنۡ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنۡ كَيۡدِكُنَّ‌ ؕ اِنَّ كَيۡدَكُنَّ عَظِيۡمٌ ۝۲۸

پھر جب دیکھا عزیز نے کرتا اس کا پھٹا ہوا پیچھے سے کہا بیشک یہ ایک فریب ہے تم عورتوں کا، البتہ تمہارا فریب بڑا ہے

يُوۡسُفُ اَعۡرِضۡ عَنۡ هٰذَا‌ ٚ وَاسۡتَغۡفِرِىۡ لِذَنۡۢبِكِ ‌ۖۚ اِنَّكِ كُنۡتِ مِنَ الۡخٰطِـئِيۡنَ ۝۲۹ ع ۱۳

یوسف جانے دے اس ذکر کو اور عورت تو بخشوا اپنا گناہ، بیشک تو ہی گناہ گار تھی لہ

**خلاصہ تفسیر:** (غرض اس فیصلہ کے مطابق وہ کرتا دیکھا تو پیچھے سے پھٹا ہوا نکلا) سو جب (عزیز نے) ان کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہوا دیکھا (تو عورت سے) کہنے لگا کہ (تو نے جو کہا تھا: ماجزاء من اراد باھلك، الخ) یہ تم عورتوں کی چالاکی ہے، بیشک تمہاری چالاکیاں بھی غضب کی ہوتی ہیں (پھر یوسف علیہ السلام کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا) اے یوسف! اس بات کو جانے دو (یعنی اس کا چرچا یا خیال مت کرو) اور (عورت سے کہا کہ) اے عورت! تو (یوسف سے) اپنے قصور کی معافی مانگ، بیشک سراسر تو ہی قصوروار ہے۔

مقدمات اور خصومات کے فیصلوں میں قرائن اور علامات سے کام لیا جا سکتا ہے جیسا کہ اس شاہد نے کرتے کے پیچھے سے پھٹنے کو اس کی علامت قرار دیا کہ یوسف علیہ السلام بھاگ رہے تھے زلیخا پکڑ رہی تھی، اس معاملہ میں اتنی بات پر تو سب فقہاء کا اتفاق ہے کہ معاملات کی حقیقت پہچاننے میں علامات اور قرائن سے ضرور کام لیا جائے جیسا کہ یہاں کیا گیا، لیکن محض علامات و قرائن کو کافی ثبوت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا، واقعہ یوسف علیہ السلام میں بھی درحقیقت براءت کا ثبوت تو اس بچہ کی معجزانہ انداز سے گویائی ہے، علامات و قرائن جن کا ذکر کیا گیا ہے ان سے اس معاملہ کی تائید ہو گئی۔

* * *

**فائدہ:** لہ اگر گواہ شیر خوار بچہ تھا جیسا کہ بعض معتبر روایات میں ہے تب تو اس کا بولنا اور ایسی گواہی دینا جو انجام کار یوسف کے حق میں مفید ہو، خود مستقل دلیل یوسف کی سچائی کی تھی، کرتہ کا آگے یا پیچھے سے پھٹا ہونا شہادت سے زائد بطور ایک علامت اور قرینہ کے سمجھنا چاہیے، اور اگر گواہ کوئی مرد دانا تھا تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خارجی طریقہ سے حقیقت حال پر مطلع ہو چکا تھا مگر اس نے نہایت دانائی سے ایسے پیرایہ میں شہادت دی جو دفعتاً کسی کی جانبداری پر بھی محمول نہ ہو اور آخر کار یوسف کی برأت ثابت کر دے، جو پیرایہ اظہار واقعہ کا اس نے اختیار کیا وہ غیر جانبداروں کے نزدیک نہایت معقول تھا، کیونکہ اگر عورت کے دعوے کے موافق یوسف نے (معاذ اللہ) اس کی طرف اقدام کیا تو ان کا چہرہ عورت کی طرف ہوگا تو ظاہر ہے کہ کشمکش میں کرتہ بھی سامنے سے پھٹے اور اگر یوسف کا کہنا صحیح ہے کہ عورت مجھ کو اپنی طرف بلاتی تھی میں دروازہ کی طرف بھاگا، اس نے پکڑنے کے لیے میرا تعاقب

کیا تو کھلی ہوئی بات ہے کہ کرتہ پیچھے سے پھٹا ہوگا کیونکہ اس صورت میں یوسف اس کی طرف متوجہ نہیں تھے بلکہ ادھر سے پیٹھ پھیر کر بھاگ رہے تھے، بہر حال جب دیکھا گیا کہ کرتہ آگے سے نہیں پیچھے سے پھٹا ہے، تو عزیز نے سمجھ لیا کہ یہ سب عورت کا مکر وفریب ہے، یوسف قصور وار نہیں، چنانچہ اس نے صاف کہہ دیا کہ زلیخا کی پرفریب کارروائی اسی قسم کی ہے جو عموما عورتیں کیا کرتی ہیں، اس نے یوسف سے استدعا کی کہ جو ہونا تھا ہو چکا آئندہ اس کا ذکر مت کرو کہ سخت رسوائی اور بدنامی کا موجب ہے، اور عورت کو کہا کہ یوسف سے یا خدا سے اپنے قصور کی معافی مانگ، یقینا قصور تیرا ہی تھا۔

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ

اور کہنے لگیں عورتیں اس شہر میں عزیز کی عورت خواہش کرتی ہے اپنے غلام سے اس کے جی کو، فریفتہ ہو گیا اس کا دل اس کی محبت میں

اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾

ہم تو دیکھتے ہیں اس کو صریح خطا پر

**خلاصہ تفسیر:** اور چند عورتوں نے جو کہ شہر میں رہتی تھیں یہ بات کہی کہ عزیز کی بیوی اپنے غلام کو اس سے اپنا (ناجائز) مطلب حاصل کرنے کے لئے پھسلاتی ہے (کیسی گری ہوئی حرکت ہے کہ غلام پر گرتی ہے) اس غلام کا عشق اس کے دل میں جگہ پکڑ گیا ہے، ہم تو اس کو صریح غلطی میں دیکھتے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** یعنی شدہ شدہ شہر کی عورتوں نے کہنا شروع کیا کہ عزیز کی عورت اپنے نوجوان غلام پر مفتون ہو گئی، چاہتی ہے کہ اس کے نفس کو بے قابو کر دے، غلام کی محبت اس کے دل کی تہ میں پیوست ہو چکی ہے، حالانکہ ایسے معزز عہدہ دار کی بیوی کے لیے یہ سخت شرمناک کی بات ہے کہ وہ ایسے غلام پر گرنے لگے، ہمارے نزدیک اس معاملہ میں وہ اعلانیہ غلطی پر ہے۔

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ

پھر جب سنا اس نے ان کا فریب [1] بلوا بھیجا ان کو اور تیار کی ان کے واسطے ایک مجلس اور دی ان کو ہر ایک کے ہاتھ میں

سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۫ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ

ایک چھری اور بولی یوسف نکل آ ان کے سامنے پھر جب دیکھا اس کو ششدر رہ گئیں اور کاٹ ڈالے اپنے ہاتھ [2] اور کہنے لگیں حاشا للہ

مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴿۳۱﴾

نہیں یہ شخص آدمی یہ تو کوئی فرشتہ ہے بزرگ [3]

**خلاصہ تفسیر:** سو جب اس عورت نے ان عورتوں کی بدگوئی (کی خبر) سنی تو کسی کے ہاتھ ان کو بلا بھیجا (کہ تمہاری دعوت ہے) اور ان کے واسطے مسند تکیہ لگایا اور (جب وہ آئیں اور ان کے سامنے مختلف قسم کے کھانے اور پھل حاضر کئے جن میں بعض چیزیں چاقو سے تراش کر کھانے کی تھیں اس لئے) ہر ایک کو ان میں سے ایک ایک چاقو (بھی) دے دیا (جو ظاہر میں تو پھل تراشنے کا بہانہ تھا اور اصل مقصد وہ تھا جو آگے آتا ہے کہ یہ حواس باختہ ہو کر اپنے ہاتھوں کو زخمی کر لیں گی) اور (یہ سب سامان درست کر کے یوسف علیہ السلام کو جو کسی دوسرے مکان میں تھے) کہا کہ ذرا ان کے سامنے تو آ جاؤ (یوسف کو خبر نہ تھی کہ معاملہ کیا ہے اور کیوں مجھے بلاتی ہے، یہ سمجھ کر کہ کوئی صحیح غرض ہوگی باہر آ گئے) سو عورتوں نے جب ان کو دیکھا تو (ان

کے جمال سے ) حیران رہ گئیں اور (اس حیرت میں ) اپنے ہاتھ کاٹ لئے ( چاقو سے پھل تراش رہی تھیں یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر ایسی بدحواسی چھائی کہ چاقو ہاتھ پر چل گیا) اور کہنے لگیں حاش للہ! یہ شخص آدمی ہرگز نہیں، یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے (مطلب یہ کہ ایسا حسن و جمال آدمی میں کب ہوتا ہے، البتہ فرشتے ایسے نورانی ہوتے ہیں)۔

**فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ**: روح المعانی میں ہے کہ حسینان مصر کا یہ حال ''مشاہدہ مخلوق'' (سیدنا یوسف علیہ السلام) کے غلبہ سے ایسا بے قابو ہو گیا، اسی پر قیاس کیا جائے کہ ''مشاہدہ خالق'' کا کیسا کچھ اثر ہوگا، تو اگر ایسے شخص سے کوئی بات خلاف ظاہر سرزد ہو جائے تو اس پر اعتراض وانکار نہیں کرنا چاہیے۔

* * *

**فائدہ: ۱ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ**: عورتوں کی گفتگو کو مکر (فریب) اس لیے کہا کہ مکاروں کی طرح چھپ چھپ کر یہ باتیں کرتی تھیں، اور زلیخا پر طعن کر کے گویا اپنی پارسائی کا اظہار مقصود تھا، حالانکہ یوسف کے بے مثال حسن و جمال کا شہرہ جس عورت کے کان میں پڑتا تھا، اس کی دید کا اشتیاق دل میں چٹکیاں لینے لگتا تھا، کچھ بعید نہیں کہ زلیخا پر طعن وتشنیع اور نکتہ چینی کرنے والیوں کے دلوں میں یہ ہی غرض پوشیدہ ہو کہ زلیخا کو غصہ دلا کر کسی ایسی حرکت پر آمادہ کر دیں جو یوسف کے دیدار کا سبب بن جائے، یا زلیخا کے دل میں اس کی نفرت بٹھا کر اپنی طرف مائل کرنے کا موقع نکالیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ زلیخا نے بعض عورتوں کو اس معاملہ میں اپنا رازدار بنایا ہو، اس نے رازداری کی جگہ پردہ داری اور خوردہ گیری شروع کر دی بہرحال ان کی گفتگو کو لفظ ''مکر'' سے ادا کرنے میں یہ سب احتمالات ہیں۔

**فائدہ: ۲ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ**: یعنی دعوت کر کے ان عورتوں کو بلوا بھیجا اور کھانے پینے کی ایک مجلس ترتیب دی جس میں بعض چیزیں چاقو سے تراش کر کھانے اور میوے وغیرہ کے سامنے چن کر ہر ایک عورت کے ہاتھ میں ایک چاقو دے دیا، تاکہ تراشنے کے قابل چیزوں کے کھانے میں کسی کو کلفت انتظار اٹھانا نہ پڑے، یہ سب سامان درست کر کے اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو جو کہیں قریب ہی موجود تھے آواز دی کہ ادھر نکل آئے، نکلنا تھا کہ بجلی سی کوندگئی، تمام عورتیں یوسف کے حسن و جمال کا دفعتاً مشاہدہ کرنے سے ہوش وحواس کھو بیٹھیں، اور مدہوشی کے عالم میں چھریوں سے پھلوں کی جگہ ہاتھ کاٹ لیے، گویا قدرت نے یہ ایک مستقل دلیل یوسف علیہ السلام کی نزاہت وصداقت پر قائم فرما دی کہ جس کے جمال بے مثال کی ذرا سی جھلک نے دیکھنے والی عورتوں کے حواس گم کر دیے، بحالیکہ یوسف نے آنکھ اٹھا کر بھی ان کے حسن وخوبی کی طرف نہ دیکھا تو یقیناً واقعہ یوں ہی ہوا ہوگا کہ زلیخا اس کے جمال ہوشربا کو دیکھ کر ہوش وخرد کھو بیٹھی، اور وہ معصوم فرشتہ اس کی طرح اپنا دامن عفت بچاتا ہوا صاف نکل گیا۔

**فائدہ: ۳ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ**: یعنی حسن و جمال اور نورانی صورت کے اعتبار سے فرشتہ معلوم ہوتا ہے کسی نے خوب کہا ہے:

قَوْمٌ اِذَا قُوبِلُوا كَانُوا مَلَائِكَةً　　حُسْنًا وَ اِنْ قُوتِلُوا كَانُوا عَفَارِيتًا

یا حیاء وعفت اور پاکدامنی جو چہرہ اور چال ڈھال سے ٹپک رہی تھی اسے دیکھ کر کہا کہ یہ آدمی نہیں کوئی معصوم فرشتہ معلوم ہوتا ہے

قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ؕ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ

بولی یہ وہی ہے کہ طعنہ دیا تھا تم نے مجھ کو اس کے واسطے ۱ اور میں نے لینا چاہا تھا اس سے اس کا جی پھر اس نے تھام رکھا ۲

وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۳۲﴾

اور بیشک اگر نہ کریگا جو میں اس کو کہتی ہوں تو قید میں پڑے گا اور ہوگا بےعزت ۳

**خلاصہ تفسیر**: وہ عورت بولی تو (دیکھ لو) وہ شخص یہی ہے جس کے بارے میں تم مجھ کو برا بھلا کہتی تھیں (کہ اپنے غلام کو چاہتی ہے) اور واقعی میں نے اس سے اپنا مطلب حاصل کرنے کی خواہش کی تھی مگر یہ پاک صاف رہا، اور (پھر یوسف علیہ السلام کے دھمکانے اور سنانے کو کہا

کہ) اگر آئندہ میرا کہنا نہ مانے گا (جیسا کہ اب تک نہیں مانا) تو بیشک جیل خانہ بھیج دیا جائیگا اور بے عزت بھی ہوگا۔

***

**فائدہ:** لـ اب زلیخا کو موقع ملا کہ عورتوں کے طعن و تشنیع کا تیر ان ہی کی طرف لوٹا دے، گویا اس وقت فَذٰلِكُنَّ الَّذِىْ لُمْتُنَّنِىْ فِيْهِ کہہ کر وہ اس شعر کا خلاصہ ادا کر رہی تھی:

این است کہ خوں خوردہ و دل بردہ بسے را — بسم اللہ اگر تابِ نظر ہست کسے را

**فائدہ:** ۲ مجمع کا رنگ دیکھ کر زلیخا بالکل ہی کھلی پڑی اور واقعہ کا صاف صاف اظہار کر دیا کہ بیشک میں نے ان کا دل لینا چاہا تھا، مگر اس بندہ خدا نے ایسا مضبوط تھامے رکھا کہ کسی طرح نہ دیا، یہ خدا تعالیٰ نے شہر کی عورتوں کے مجمع میں حضرت یوسف علیہ السلام کی کمال عصمت وعفت اور غایت نزاہت وطہارت کا اقبالی ثبوت پیش کر دیا، زلیخا کا حال اس وقت وہ ہی تھا جو کسی نے کہا ہے:

لَاتَخَفْ مَاصَنَعَتْ بِكَ الْاَشْوَاقُ — وَاشْرَحْ هَوَاكَ فَكُلُّنَا عُشَّاق

**فائدہ:** ۳ زلیخا کی اس گفتگو میں کچھ تو عورتوں پر اپنی معذوری اور نامرادی کا اظہار تھا، تاکہ ان کی ہمدردی حاصل کر سکے، اور کچھ یوسف علیہ السلام کو تحکمانہ دھمکیوں سے مرعوب کرنا تھا کہ وہ خوفزدہ ہو کر آئندہ اس کی مطلب برآوری پر آمادہ ہو جائیں، حالانکہ:

عنقا شکار کس نہ شود دام باز چیں — کانجا ہمیشہ باد بدست دام را

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ

یوسف بولا اے رب مجھ کو قید پسند ہے اس بات سے جس کی طرف مجھ کو بلاتی ہیں، اور اگر تو نہ دفع کرے گا مجھ سے انکا فریب تو مائل ہو جاؤں گا

اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۳﴾

ان کی طرف اور ہو جاؤں گا بے عقل

**خلاصہ تفسیر:** (وہ عورتیں بھی یوسف علیہ السلام سے کہنے لگیں کہ تمہیں اپنی محسن عورت سے ایسی بے اعتنائی مناسب نہیں، جو یہ کہے اس کو ماننا چاہئے) یوسف نے (یہ باتیں سنی کہ یہ تو سب اسی کی ہاں میں ہاں ملاتی ہیں تو حق تعالیٰ سے) دعاء کی کہ اے میرے رب! جس (ناجائز) کام کی طرف یہ عورتیں مجھے بلا رہی ہیں اس سے تو جیل خانہ میں جانا ہی مجھ کو زیادہ پسند ہے اور اگر آپ ان کے داؤ پیچ کو مجھ سے دفع نہ کریں گے تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور نادانی کا کام کر بیٹھوں گا۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ: یوسف علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ جیل خانہ مجھے پسند ہے کوئی قید و بند کی طلب یا خواہش نہیں، بلکہ گناہ کے مقابلہ میں اس دنیوی مصیبت کو آسان سمجھنے کا اظہار ہے، اور یوسف علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ **والا تصرف عنی کیدھن** الخ، یعنی اگر آپ کے داؤ پیچ کو دور نہ کریں گے، مقصود اس سے یہ ہے کہ ان عورتوں کے مکر حیلہ کو مجھ سے دور فرما دیجیے، تو ان الفاظ سے دعا مقصود تھی، اس لیے اس کے فوراً بعد اگلی ہی آیت میں **فاستجاب لہ ربہ** الخ فرمایا، کہ خدا تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کی اور دعا کی قبولیت کا بیان خود قرآن میں ہے کہ: **فصرف عنہ کیدھن** کہ خدا نے ان عورتوں کے داؤ پیچ یوسف سے دور کر دیے، پھر ان پر کوئی کوشش نہ کر سکی، جیل میں جانا دعا کی قبولیت کی وجہ سے نہیں تھا جیسا کہ مشہور ہے کہ یوسف علیہ السلام نے قید کی دعا کی تھی اس لیے جیل میں گئے، کیونکہ قید کی درخواست تو نہیں کی تھی، بلکہ اس گناہ کی برائی کے مقابلہ میں اس جیل کی آزمائش کو کم برا کہا، چنانچہ آگے **ثم بدا لھم من بعد ما** مستقل کلام ہے، اس دعا کی قبولیت کا تتمہ نہیں۔

وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ: اور یہ فرمانا کہ اگر آپ ان کے مکر و کید کو دفع نہ کریں گے تو ممکن ہے کہ میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں، یہ عصمت نبوت کے خلاف نہیں، کیونکہ یہ عصمت بھی تو حفاظت خداوندی کی بدولت ہی ہے، چونکہ انبیاء علیہم السلام کی نظر حقیقی مؤثر کی طرف ہوتی ہے، اس

لیے انہیں اپنی عصمت پر اعتماد اور ناز نہیں ہوتا، کیونکہ عصمت کا تو حاصل ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو گناہ سے بچانے کا تکوینی طور پر انتظام فرما کر اس کو گناہ سے بچالیں اور اگر چہ بمقتضاء نبوت یہ مقصد پہلے ہی سے حاصل تھا، مگر پھر بھی غایت خوف ادب سے اس کی دعاء کرنے پر مجبور ہو گئے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر گناہ کا کام جہالت سے ہوتا ہے، علم کا تقاضا گناہوں سے اجتناب ہے۔

* * *

**فائدہ:** معلوم ہوتا ہے کہ زلیخا کا مایوسانہ غصہ اور مظلومانہ انداز بیان اس کی ہم جنسوں پر اثر کر گیا، یا پہلے ہی سے کچھ ملی بھگت ہوگی، بہر حال لکھا ہے کہ اب عورتوں نے یوسف کو سمجھانا شروع کیا کہ تم کو اپنی محسنہ اور سیدہ کا کہنا ماننا چاہیے، آخر اس غریب پر اتنا ظلم کیوں کرتے ہو، پھر یہ بھی سوچ لو کہ نافرمانی کا نتیجہ کیا ہوگا، خواہ مخواہ مصیبت سر پر لینے سے کیا فائدہ، کہتے ہیں کہ بظاہر زبان سے وہ زلیخا کی سفارش کر رہی تھیں مگر دل ہر ایک کا یوسف کو اپنی طرف کھینچنا چاہتا تھا، یوسف نے جب دیکھا کہ یہ عورت بری طرح پیچھے پڑی ہے اور شیطان ہر طرف اپنا جال بچھانے لگا ہے تو نہایت عزم و استقلال اور پیغمبرانہ استقامت سے بارگاہ احدیت میں درخواست کی کہ مجھے ان کے مکر و فریب سے بچایئے، اگر اس سلسلہ میں قید ہونا پڑے تو میں قید کو ارتکاب معصیت پر ترجیح دیتا ہوں، اگر آپ میری دستگیری نہ فرمائیں گے تو ڈر ہے کہ بے عقل ہو کر ان کی ابلہ فریبیوں کی طرف نہ جھک پڑوں، یہاں یوسف علیہ السلام کی زبانی یہ جتلا دیا کہ انبیاء کی عصمت بھی حق تعالیٰ کی دستگیری سے ہے اور یہ کہ وہ اپنی عصمت پر مغرور نہیں ہوتے بلکہ عصمت کا جو منشاء ہے (حفاظت وصیانت الٰہی) اسی پر نظر رکھتے ہیں۔

فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۴﴾

سو قبول کر لی اس کی دعا اس کے رب نے پھر دفع کیا اس سے ان کا فریب ۱؎ البتہ وہی ہے سننے والا خبر دار ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** سو ان کی دعاء ان کے رب نے قبول کی اور ان عورتوں کے داؤ پیچ کو ان سے دور رکھا، بیشک وہ (دعاؤں کا) بڑا سننے والا (اور ان کے احوال کا) خوب جاننے والا ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی ان کو عصمت وعفت پر پوری طرح ثابت قدم رکھا کسی کا فریب چلنے نہ دیا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی سب کی دعائیں سنتا ہے اور خبر رکھتا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اپنے مانگنے سے قید میں پڑے لیکن اللہ تعالیٰ نے اتنا ہی قبول فرمایا کہ ان کا فریب دفع کر دیا، باقی قید ہونا قسمت میں، آدمی کو چاہیے کہ گھبرا کر اپنے حق میں برائی نہ مانگے، پوری بھلائی مانگے گو ہو گا وہی جو قسمت میں ہے''، ترمذی میں ہے کہ ایک شخص کو حضور ﷺ نے یہ دعا مانگتے سنا: ''اللّٰهُمَّ اِنِّی اَسْاَلُكَ الصَّبْرَ'' (اے اللہ میں تجھ سے صبر مانگتا ہوں) آپ نے فرمایا: ''سألت الله البلاء ، فاسئله العافية'' (تو نے اللہ سے بلا طلب کی کیونکہ صبر تو بلاء پر ہوگا، اب تو اس سے عافیت مانگ)۔

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۳۵﴾ ع

پھر یوں سمجھ میں آیا لوگوں کی ان نشانیوں کے دیکھنے پر کہ قید رکھیں اس کو ایک مدت تک

**خلاصہ تفسیر:** پھر (یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی کی) مختلف نشانیاں دیکھنے کے بعد (عزیز وغیرہ کو خود تو یوسف کی براءت کا یقین آگیا تھا مگر عوام میں چرچا ہو گیا تھا اس کو ختم کرنے کی غرض سے) ان لوگوں کو (یعنی عزیز اور اس کے متعلقین کو) یہی مصلحت معلوم ہوئی کہ ان کو ایک وقت (خاص) تک قید میں رکھیں۔

مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ: نشانیوں سے مراد شیر خوار بچہ کے بولنے کا معجزہ جو کہ عقلی دلیل ہے اور قمیص کا پیچھے سے پھٹا ہونا جو عادی دلیل

ہے اور زلیخا کا سب عورتوں کے سامنے اقرار کرنا کہ میں نے اس سے اپنا مطلب حاصل کرنے کی خواہش کی تھی مگر یہ پاک صاف رہا اور یہ اقرار عزیز تک پہنچ گیا تھا: ''نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا''، غرض ان سب باتوں سے یوسف علیہ السلام کی نزاہت معلوم ہو چکی تھی۔

* * *

**فائدہ:** یعنی باوجودیکہ حضرت یوسف کی برأت نزاہت کے بہت سے نشان دیکھ چکے تھے، پھر بھی ان کی مصلحت یہ ہوئی کہ یوسف کو ایک مدت تک قید میں رکھا جائے، تاکہ عام لوگ سمجھیں کہ قصور یوسف ہی کا تھا، عورت بیچاری مفت میں بدنام ہوئی، گویا عورت نے قید کی جو دھمکی دی تھی اسے پورا کرا کے چھوڑا، ان لوگوں کی غرض تو یہ ہوئی کہ عورت سے یہ بدنامی زائل ہو، یعنی ایک مدت تک یوسف اس کی نظر سے دور رہیں، اور عورت کا مطلب یہ ہوگا کہ شاید قید کی سختیاں اٹھا کر یوسف کچھ نرم پڑ جائیں، اس طرح اپنا مطلب نکال سکوں۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ۭ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّىْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّىْٓ

اور داخل ہوئے قید خانہ میں اسکے ساتھ دو جوان، کہنے لگا ان میں سے ایک میں دیکھتا ہوں کہ میں نچوڑتا ہوں شراب، اور دوسرے نے کہا میں

اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۭ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝36

دیکھتا ہوں کہ اٹھا رہا ہوں اپنے سر پر روٹی کہ جانور کھاتے ہیں اس میں سے، بتلا ہم کو اس کی تعبیر ہم دیکھتے ہیں تجھ کو نیکی والا

**خلاصہ تفسیر:** اور یوسف کے ساتھ (یعنی اسی زمانے میں) اور بھی دو غلام (بادشاہ کے) جیل خانے میں داخل ہوئے (جن میں ایک ساقی تھا دوسرا روٹی پکانے والا باورچی، ان کی قید کا سبب یہ شبہ تھا کہ انہوں نے کھانے اور شراب میں زہر ملا کر بادشاہ کو دیا ہے، ان کا مقدمہ زیر تحقیق تھا، اس لئے یہ دونوں قید کر دیئے گئے، انہوں نے جو یوسف علیہ السلام میں بزرگی کے آثار پائے تو) ان میں سے ایک نے (یوسف علیہ السلام سے) کہا کہ میں اپنے آپ کو خواب میں دیکھتا ہوں کہ (جیسے) شراب (بنانے کے لئے انگور کا شیرہ) نچوڑ رہا ہوں (اور بادشاہ کو وہ شراب پلا رہا ہوں) اور دوسرے نے کہا کہ میں اپنے کو اس طرح دیکھتا ہوں کہ (جیسے) اپنے سر پر روٹیاں لئے جاتا ہوں (اور) اس میں سے پرندے (نوچ نوچ کر) کھاتے ہیں ہم کو اس خواب کی (جو ہم دونوں نے دیکھا ہے) تعبیر بتلایئے، آپ ہم کو نیک آدمی معلوم ہوتے ہیں۔

**وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ:** یوسف علیہ السلام جیل میں بھیجے گئے جو مجرموں اور بدمعاشوں کی بستی ہوتی ہے، مگر یوسف علیہ السلام نے ان کے ساتھ بھی حسن اخلاق، حُسن معاشرت کا وہ معاملہ کیا جس سے یہ سب گرویدہ ہو گئے، جس سے معلوم ہوا کہ مصلحین کیلئے لازم ہے کہ مجرموں خطا کاروں سے شفقت و ہمدردی کا معاملہ کر کے انکو اپنے سے مانوس و مربوط کریں، کسی قدم پر منافرت کا اظہار نہ ہونے دیں۔

**اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ:** اس سے یہ معلوم ہوا کہ تعبیر خواب ایسے ہی لوگوں سے دریافت کرنا چاہئے جن کے نیک صالح اور ہمدرد ہونے پر اعتماد ہو۔

* * *

**فائدہ:** یعنی اسی زمانہ میں دو جوان قیدی جیل خانہ میں لائے گئے، جن میں ایک بادشاہ مصر (ریان بن الولید) کا نانبائی اور دوسرا ساقی (شراب پلانے والا تھا)، دونوں بادشاہ کو زہر دینے کے الزام میں ماخوذ تھے، قید خانہ میں یوسف علیہ السلام کی مروت و امانت، راست گوئی، حسن اخلاق، کثرت عبادت، معرفت تعبیر اور ہمدردی خلائق کا چرچا تھا، یہ دونوں قیدی حضرت یوسف سے بہت مانوس ہو گئے اور بڑی محبت کا اظہار کرنے لگے، ایک روز دونوں نے اپنا اپنا خواب بیان کیا، ساقی نے کہا میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ بادشاہ کو شراب پلا رہا ہوں، نانبائی نے کہا کہ میرے سر پر کئی ٹوکرے ہیں جس میں سے پرندے نوچ کر کھا رہے ہیں، یوسف علیہ السلام کو بزرگ دیکھ کر تعبیر مانگی۔

قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ۭ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ

بولا نہ آنے پائے گا تم کو کھانا جو ہر روز تم کو ملتا ہے مگر بتا چکوں گا تم کو اس کی تعبیر اس کے آنے سے پہلے، یہ علم ہے کہ مجھ کو سکھایا

رَبِّيْ ۭ اِنِّىْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝

میرے رب نے، میں نے چھوڑا دین اس قوم کا کہ ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور آخرت سے وہ لوگ منکر ہیں

**خلاصہ تفسیر**: یوسف (علیہ السلام) نے (جب یہ دیکھا کہ یہ لوگ اعتقاد کے ساتھ میری طرف مائل ہوئے ہیں تو چاہا کہ انہیں سب سے پہلے ایمان کی دعوت دی جائے، اس لئے اول اپنا نبی ہونا ایک معجزہ سے ثابت کرنے کے لئے) فرمایا کہ (دیکھو) جو کھانا تمہارے پاس آتا ہے جو کہ تم کو کھانے کے لئے (جیل خانے میں) ملتا ہے میں اس کے آنے سے پہلے اس کی حقیقت تم بتلا دیا کرتا ہوں (کہ فلاں چیز آئے گی اور ایسی ہوگی اور) یہ بتلا دینا اس علم کی بدولت ہے جو مجھ کو میرے رب نے تعلیم فرمایا ہے (یعنی مجھے وحی سے معلوم ہوجاتا ہے تو یہ ایک معجزہ ہے جو میری نبوت کی دلیل ہے، نبوت ثابت کرنے کے بعد اب توحید ثابت فرماتے ہیں، یعنی جب میری نبوت اور میرا کمال دلیل سے ثابت ہے تو جس طریقہ کو میں اختیار کروں اور اسے صحیح بتلاؤں وہ حق ہوگا، سو وہ طریق یہ ہے کہ) میں نے تو ان لوگوں کا مذہب (پہلے ہی سے) چھوڑ رکھا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں لائے اور وہ لوگ آخرت کے بھی منکر ہیں۔

**قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ**: اس وقت یہ معجزہ خاص طور پر شاید اس لئے مناسب تھا کہ جس واقعہ میں قیدیوں نے تعبیر کے لئے ان کی طرف رجوع کیا وہ واقعہ بھی کھانے ہی سے متعلق تھا، تو یہ معجزہ ان کے حال کے زیادہ مناسب ہوا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حق کی دعوت دینے والوں اور اصلاح خلق کی خدمت کرنے والوں کا طرز عمل یہ ہونا چاہئے کہ پہلے حسن اخلاق اور علمی و عملی کمالات کے ذریعہ خلق اللہ پر اپنا اعتماد قائم کریں، خواہ اس میں ان کو کچھ اپنے کمالات کا اظہار بھی کرنا پڑے، جیسا یوسف علیہ السلام نے اس موقع پر اپنا معجزہ بھی ذکر کیا اور اپنا خاندان نبوت کا ایک فرد ہونا بھی ظاہر کیا، یہ اظہار کمال اگر اصلاح خلق کی نیت سے ہو اپنی ذاتی بڑائی ثابت کرنے کے لئے نہ ہو تو یہ وہ تزکیہ نفس نہیں جس کی ممانعت قرآن کریم میں آئی ہے: فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ یعنی پاک نفسی کا اظہار نہ کرو۔

**اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا**: اگر کوئی عالم اپنے علمی کمالات وفضائل اس نیت سے بیان کرے کہ لوگ اس سے نفع اٹھائیں اور اس پر اعتماد کریں تو اپنی ایسی خوبیوں کو بیان کر دینا جائز ہے، یہ ممنوعہ تزکیہ میں داخل نہیں ہے، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ظاہر کر دیا تھا، اور جن بزرگوں نے اپنے کمالات ظاہر کیے ہیں اور اس کی پروا نہیں کی کہ لوگ انہیں مدعی کہیں گے ان کا بھی یہی منشا تھا۔

* * *

**فائدہ**: یوسف علیہ السلام نے اول ان کو تسلی دی کہ بیشک خوابوں کی تعبیر تمہیں بہت جلد معلوم ہوا چاہتی ہے روزمرہ جو کھانا تم کو ملتا ہے اس کے آنے سے پیشتر میں تعبیر بتلا کر فارغ ہو جاؤں گا، لیکن تعبیر خواب سے زیادہ ضروری اور مفید ایک چیز پہلے تم کو سناتا ہوں، وہ یہ کہ تعبیر وغیرہ کا یہ علم مجھ کو کہاں سے حاصل ہوا، سو یاد رکھو کہ میں کوئی پیشہ ور کاہن یا منجم نہیں بلکہ میرے علم کا سرچشمہ وحی اور الہام ربانی ہے جو مجھ کو حق تعالیٰ نے اس کی بدولت عطا فرمایا کہ میں نے ہمیشہ سے کافروں اور باطل پرستوں کے دین وملت کو چھوڑے رکھا اور اپنے مقدس آباؤ اجداد (حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب) جیسے انبیاء ومرسلین کے دین توحید پر چلا اور ان کا اسوہ حسنہ اختیار کیا، ہمارا سب سے بڑا اور مقدم مطمح نظر یہ ہی رہا کہ دنیا کی کسی چیز کو کسی درجہ میں بھی خدا کا شریک نہ بنائیں نہ ذات میں، نہ صفات میں، نہ افعال میں، نہ ربوبیت ومعبودیت میں، صرف اسی کے آگے جھکیں، اسی سے محبت کریں، اسی پر بھروسہ رکھیں، اور اپنا جینا مرنا سب اسی ایک پروردگار کے حوالہ کر دیں، بہرحال یوسف علیہ السلام نے موقع مناسب دیکھ کر نہایت موثر طرز میں ان

قیدیوں کو ایمان وتوحید کی طرف آنے کی ترغیب دی، پیغمبروں کا کام یہ ہی ہوتا ہے کہ دعوت وتبلیغ حق کا کوئی مناسب موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں، یوسف علیہ السلام نے دیکھا کہ ان قیدیوں کے دل میری طرف متوجہ اور مجھ سے مانوس ہیں، قید کی مصیبت میں گرفتار ہو کر شاید کچھ نرم بھی ہوئے ہوں گے، لاؤ ان حالات سے فرض تبلیغ کے ادا کرنے میں فائدہ اٹھائیں، اول ان کو دین کی باتیں سکھلائیں، پھر تعبیر بھی بتلادیں گے، یہ تسلی پہلے کر دی کہ کھانے کے وقت تک تعبیر معلوم ہو جائے گی تا کہ وہ نصیحت سے اکتائیں نہیں۔

**تنبیہ:** بہت سے مفسرین نے لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖ کے معنی یہ لیے ہیں کہ کبھی کھانا تمہارے پاس نہیں آتا ہے مگر میں آنے سے پہلے اس کی حقیقت پر تم کو مطلع کر دیا کرتا ہوں، یعنی آج کیا کھانا آئے گا، کس قسم کا ہوگا، پھر تعبیر بتلانا کیا مشکل ہے، گویا اول حضرت یوسف نے معجزہ کی طرف توجہ دلا کر انھیں اپنی نبوت کا یقین دلانا چاہا، تا کہ آئندہ جو نصیحت کریں زیادہ موثر واقع فی النفس ہو، اس تقدیر پر یوسف کا یہ معجزہ ایسا ہی ہوگا جیسے حضرت مسیح نے فرمایا تھا: وَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ (آل عمران:۴۹) مگر مترجم محقق نے پہلی تفسیر اختیار کی ہے واللہ اعلم، حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ لکھتے ہیں حق تعالیٰ نے قید میں یہ حکمت رکھی کہ ان کا دل کافروں کی محبت سے (یعنی کافر جوان کی محبت و مدارت کرتے تھے، اس سے) ٹوٹا تو دل پر اللہ کا علم روشن ہوا، چاہا کہ اول ان کی دین کی بات سنا دیں پیچھے تعبیر خواب کہیں، اس واسطے تسلی کر دی، تا کہ نہ گھبرائیں، کہا کہ کھانے کے وقت تک وہ بھی بتا دوں گا۔

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ

اور پکڑا میں نے دین اپنے باپ دادوں کا ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کا ،ہمارا کام نہیں کہ شریک کریں اللہ کا کسی چیز کو

ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾

یہ فضل ہے اللہ کا ہم پر اور سب لوگوں پر لیکن بہت لوگ احسان نہیں مانتے

**خلاصہ تفسیر:** اور میں نے اپنے ان (بزرگوار) باپ دادوں کا مذہب اختیار کر رکھا ہے ابراہیم کا اور اسحاق کا اور یعقوب کا (علیہم السلام اور اس مذہب کا رکن اعظم توحید یہ ہے کہ) ہم کو کسی طرح زیبا نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی شے کو شریک (عبادت) قرار دیں، یہ (عقیدہ توحید) ہم پر اور (دوسرے) لوگوں پر (بھی) خدا تعالیٰ کا ایک فضل ہے (کہ اس کی بدولت دنیا وآخرت کی فلاح ہے) لیکن اکثر لوگ (اس نعمت کا) شکر (ادا) نہیں کرتے (یعنی توحید کی قدر اور اسے اختیار نہیں کرتے)۔

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ: تبلیغ وارشاد کا ایک اہم اصول یہ بتلایا گیا ہے کہ داعی اور مصلح کا فرض ہے کہ ہر وقت ہر حال میں اپنے وظیفہ دعوت وتبلیغ کو سب کاموں سے مقدم رکھے، کوئی اس کے پاس کسی کام کے لئے آئے، وہ اپنے اصلی کام کو نہ بھولے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس قیدی تعبیر خواب دریافت کرنے کے لئے آئے تو یوسف علیہ السلام نے تعبیر خواب کے جواب سے پہلے دعوت وتبلیغ کے ذریعہ ان کو رشد و ہدایت کا تحفہ عطا فرمایا، یہ نہ سمجھے کہ دعوت وتبلیغ کسی جلسہ کسی منبر یا اسٹیج ہی پر ہوا کرتی ہے، شخصی ملاقاتوں اور نجی مذاکروں کے ذریعہ یہ کام اس سے زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔

ایک مسئلہ اسی ارشاد واصلاح سے متعلق ہے کہ حکمت کے ساتھ وہ بات کہی جائے جو مخاطب کو دل نشین ہو سکے، جیسا یوسف علیہ السلام نے ان کو یہ دکھلایا کہ مجھے جو کوئی کمال حاصل ہوا وہ اس کا نتیجہ ہے کہ میں نے ملت کفر کو چھوڑ کر ملت اسلام کو اختیار کیا اور پھر کفر وشرک کی خرابیاں دل نشین انداز میں بیان فرمائیں۔

* * *

**فائدہ:** یعنی ہمارا خالص توحید اور ملت ابراہیمی پر قائم رہنا نہ صرف ہمارے حق میں بلکہ سارے جہان کے حق میں رحمت وفضل ہے،

کیونکہ خاندان ابراہیمی ہی کی شمع سے سب لوگ اپنے دلوں کے چراغ روشن کر سکتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ بہت سے لوگ خدا کی اس نعمت عظیمہ کی قدر نہیں کرتے، چاہیے یہ تھا کہ اس کا احسان مان کر راہ توحید پر چلتے وہ الٹی ناشکری کر کے شرک وعصیان کی راہ اختیار کر رہے ہیں۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿٣٩﴾

اے رفیقو قید خانہ کے بھلا کئی معبود جدا جدا بہتر یا اللہ اکیلا زبردست

**خلاصہ تفسیر:** اے قید خانہ کے رفیقو! (ذرا سوچ کر بتلاؤ کہ عبادت کے واسطے) متفرق معبود اچھے ہیں یا ایک معبود برحق جو سب سے زبردست ہے وہ اچھا (جواب اس کا ظاہر ہے کہ غلامی ایک ہی آقا کی اچھی ہوتی ہے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی مختلف انواع واشکال کے چھوٹے بڑے دیوتا جن پر تم نے خدائی اختیارات تقسیم کر رکھے ہیں ان سے لو لگانا بہتر ہے یا اس اکیلے زبردست خدا سے جس کو ساری مخلوق پر کلی اختیار اور کامل تصرف وقبضہ حاصل ہے اور جس کے آگے نہ کسی کا حکم چل سکتا ہے نہ اختیار، نہ اسے کوئی بھاگ کر ہرا سکتا ہے نہ مقابلہ کر کے مغلوب کر سکتا ہے، خود سوچو کہ سر عبودیت ان میں سے کس کے سامنے جھکایا جائے۔

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ

کچھ نہیں پوجتے ہو سوائے اس کے مگر نام ہیں جو رکھ لیے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے نہیں اتاری اللہ نے ان کی کوئی سند ۱

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٤٠﴾

حکومت نہیں ہے کسی کی سوائے اللہ کے، اس نے فرما دیا کہ نہ پوجو مگر اسی کو ۲ یہی ہے راستہ سیدھا پر بہت لوگ نہیں جانتے ۳

**خلاصہ تفسیر:** تم لوگ تو خدا کو چھوڑ کر صرف چند بے حقیقت ناموں کی عبادت کرتے ہو جن کو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے (آپ ہی) ٹھہرالیا ہے، خدا تعالیٰ نے تو ان (کے معبود ہونے) کی کوئی دلیل (عقلی یا نقلی) بھیجی نہیں (اور) حکم خدا ہی کا ہے، اس نے یہ حکم دیا ہے کہ بجز اس کے اور کسی کی عبادت مت کرو (پس اسی حکم پر عمل کرنا چاہیے) یہی (توحید اور عبادت صرف حق تعالیٰ کے لئے مخصوص کرنا) سیدھا طریقہ ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے (اور اس طریقہ کو اختیار نہیں کرتے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی یوں ہی بے سند اور بے ٹھکانے کچھ نام رکھ چھوڑے ہیں جن کے نیچے حقیقت ذرہ برابر نہیں، ان ہی نام کے خداؤں کی پوجا کر رہے ہو، ایسے جہل پر انسان کو شرمانا چاہیے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی قدیم سے اللہ انبیاء علیہم السلام کی زبانی یہ ہی حکم بھیجتا رہا کہ خدا کی عبادت میں کسی کو شریک مت کرو وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ (الزخرف: ۴۵)

**فائدہ:** ۳ یعنی توحید خالص کے راستہ میں اینچ پینچ کچھ نہیں، سیدھی اور صاف سڑک ہے جس پر چل کر آدمی بے کھٹکے خدا تک پہنچتا ہے، لیکن بہت لوگ حماقت یا تعصب سے ایسی سیدھی بات کو بھی نہیں سمجھتے۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ

اے رفیقو قید خانہ کے ایک جو ہے تم دونوں میں سو پلائے گا اپنے خاوند (مالک) کو شراب، اور دوسرا جو ہے سو لی (پر چڑھے گا) دیا جائے گا

فَتَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّأْسِهٖ ؕ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ﴿۴۱﴾

پھر کھائیں گے جانور اس کے سر میں سے، فیصل ہوا وہ کام جس کی تحقیق تم چاہتے تھے

**خلاصہ تفسیر:** (ایمان کی دعوت وتبلیغ کے بعد اب ان کے خواب کی تعبیر بتاتے ہیں کہ) اے قید خانہ کے رفیقو! تم میں ایک تو (جرم سے بری ہو کر) اپنے آقا کو (بدستور) شراب پلایا کرے گا، اور دوسرا (مجرم قرار پا کر) سولی دیا جائے گا اور اس کے سر کو پرندے (نوچ نوچ کر) کھائیں گے، اور جس بارے میں تم پوچھتے تھے وہ اسی طرح مقدر ہو چکا (یعنی یوں ہی ہوگا، چنانچہ مقدمہ کی تنقیح کے بعد اسی طرح ہوا کہ ایک بری ثابت ہوا، اور دوسرا مجرم، دونوں جیل خانہ سے بلائے گئے، ایک رہائی کے لیے اور دوسرا سزا کے لئے)۔

**وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ:** اس سے ثابت ہوا کہ جو معاملہ مخاطب کے لئے تکلیف دہ اور ناگوار ہو اس کا اظہار ضروری ہو تو مخاطب کے سامنے جہاں تک ممکن ہو ایسے انداز سے ذکر کیا جائے کہ اس کو تکلیف کم سے کم پہنچے، جیسے تعبیر خواب میں ایک شخص کی ہلاکت متعین تھی، مگر یوسف علیہ السلام نے اس کو مبہم رکھا، یہ متعین کر کے نہیں کہا کہ تم سولی چڑھائے جاؤ گے۔

* * *

**فائدہ:** فرض تبلیغ ادا کرنے کے بعد یوسف علیہ السلام نے ان کے خوابوں کی تعبیر بیان فرمائی، کہ جس نے خواب میں شراب پلاتے دیکھا اس کی تعبیر یہ ہے کہ وہ بیداری میں بادشاہ کو شراب پلائے گا، اور جس نے سر پر سے جانوروں کو روٹیاں کھاتے دیکھا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سولی دیا جائے گا، پھر جانور اس کے سر سے نوچ نوچ کر کھائیں گے، قضا وقدر کا فیصلہ یہ ہی ہے جو کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتا، جو بات تم پوچھتے تھے وہ میں نے بتلا دی، یہ بالکل طے شدہ امر ہے، جس میں تخلف نہیں ہو سکتا چنانچہ ایسا ہی ہوا، ساقی زہر خورانی کی تہمت سے بری ہو گیا، اور خباز (نانبائی) کو جرم ثابت ہونے کی وجہ سے سزائے موت دی گئی۔

وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ؗ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ

اور کہہ دیا یوسف نے اس کو جس کو گمان کیا تھا کہ بچے گا ان دونوں میں میرا ذکر کرنا اپنے خاوند (مالک) کے پاس ا۔ سو بھلا دیا اس کو شیطان نے ذکر کرنا

ع ۱۵ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ﴿۴۲﴾

اپنے خاوند سے پھر رہا قید میں کئی برس ۲۔

**خلاصہ تفسیر:** اور (جب وہ لوگ جیل خانہ سے جانے لگے تو) جس شخص پر رہائی کا گمان تھا اس سے یوسف (علیہ السلام) نے فرمایا کہ اپنے آقا کے سامنے میرا بھی تذکرہ کرنا (کہ ایک شخص بے قصور قید میں ہے، اس نے وعدہ کر لیا) پھر اس کو اپنے آقا سے (یوسف علیہ السلام کا) تذکرہ کرنا شیطان نے بھلا دیا تو (اس وجہ سے) قید خامہ میں اور بھی چند سال ان کا رہنا ہوا۔

**وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ:** چونکہ تدبیر کرنا اور ظاہری اسباب کا استعمال کرنا جائز ہے اس لیے اس میں یوسف علیہ السلام پر کوئی شبہ نہیں ہو سکتا، اس میں دلالت ہے کہ اگر مصائب وآلام سے نجات کے لیے کسی سے مدد طلب کرنے میں کوئی حرج کی بات نہیں، خصوصا ایسے شخص سے جس پر احسان کیا ہو، کیونکہ یہ اسباب مشروعہ میں سے ہے، اسے احسان کا بدلہ یا عوض چاہنا نہیں کہا جائے گا، احسان سے محبت پیدا ہوتی ہے اور محبت کی وجہ سے مدد طلب کرنا گوارہ ہو جاتی ہے، نیز ایسی مدد طلب کرنا توکل کے بھی خلاف نہیں ہے۔

**فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ:** یہ جو فرمایا کہ چند سال اور بھی رہنا ہوا تو یہ بطور عتاب کے نہیں ہے، بلکہ اس شخص کے بھول جانے پر محض اس نتیجہ کو مرتب کرنا مقصود ہے کہ وہ جو بھول گیا اس لیے یوسف کے نکلنے کا کوئی سامان نہ ہوا، خوب سمجھ لو، اور لفظ بضع کا اطلاق عربی زبان میں تین

سے دس تک آتا ہے، پس اس کے درمیان میں جتنے عدد ہیں ہر عدد کا آیت میں احتمال ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یہاں ''ظن'' یقین کے معنی میں سے ہے جیسے الَّذِیۡنَ یَظُنُّوۡنَ اَنَّہُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّہِمۡ (البقرۃ:۴۶) میں یعنی یوسف علیہ السلام کو دونوں میں سے جس شخص کی بابت یقین تھا کہ بری ہوجائے گا جب وہ قید خانہ سے نکلا تو فرمایا اپنے بادشاہ کی خدمت میں میرا بھی ذکر کرنا کہ ایک ایسا شخص بےقصور قید خانہ میں برسوں سے پڑا ہے، مبالغہ کی ضرورت نہیں، میری جو حالت تو نے مشاہدہ کی ہے بلا کم وکاست کہہ دینا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی شیطان نے چھوٹنے والے قیدی کے دل میں مختلف خیالات ووساوس ڈال کر ایسا غافل کیا کہ اسے بادشاہ کے سامنے اپنے محسن بزرگ (یوسف علیہ السلام) کا تذکرہ کرنا یاد ہی نہ رہا، نتیجہ یہ ہوا کہ یوسف کو کئی سال اور قید میں رہنا پڑا، مدت دراز کے بعد جب بادشاہ نے ایک خواب دیکھا اور اس کی تعبیر کسی کی سمجھ میں نہ آئی تب اس شخص کو یوسف علیہ السلام یاد آئے جیسا کہ آگے آتا ہے: وَقَالَ الَّذِیۡ نَجَا مِنۡہُمَا وَادَّکَرَ بَعۡدَ اُمَّۃٍ (یوسف:۴۵) بھلانے کی نسبت شیطان کی طرف اس لیے کی گئی کہ وہ القائے وساوس وغیرہ کا ذریعہ ہے جو سبب بنتا ہے نسیان کا، حضرت موسیٰ کے رفیق سفر نے کہا تھا: وَمَاۤ اَنۡسٰنِیۡہُ اِلَّا الشَّیۡطٰنُ اَنۡ اَذۡکُرَہٗ (الکہف:۶۳) لیکن ہر ایک شر میں حق تعالیٰ کوئی خیر کا پہلو رکھ دیتا ہے، یہاں بھی گو اس نسیان کا نتیجہ تطویل قید کی صورت میں ظاہر ہوا، تاہم حضرت شاہ صاحبؒ کی نکتہ آفرینی کے موافق اس میں یہ تنبیہ ہوگئی کہ ایک پیغمبر کا دل ظاہری اسباب پر نہیں ٹھہرنا چاہیے، بلکہ ابن جریر اور بغوی وغیرہ نے بعض سلف سے نقل کیا ہے کہ وہ فَاَنۡسٰہُ الشَّیۡطٰنُ ذِکۡرَ رَبِّہٖ کی ضمیر یوسف علیہ السلام کی طرف راجع کرتے ہیں، گویا اُذۡکُرۡنِیۡ عِنۡدَ رَبِّکَ کہنا ایک طرح کی غفلت تھی جو یوسف علیہ السلام کو عارض ہوئی، انہوں نے قیدی کو کہا کہ اپنے رب سے میرا ذکر کرنا حالانکہ چاہیے تھا کہ سب ظاہری سہارے چھوڑ کر وہ خود اپنے رب سے فریاد کرتے، بیشک کشف شدائد کے وقت مخلوق سے ظاہری استعانت اور اسباب کی مباشرت مطلقاً حرام نہیں ہے، لیکن ابرار کی حسنات مقربین کی سیئات بن جاتی ہیں، جو بات عامۃ الناس بے کھٹکے کر سکتے ہیں انبیاء علیہم السلام کے منصب عالی کے اعتبار سے وہ ہی بات ایک قسم کی تقصیر بن جاتی ہے، امتحان وابتلاء کے موقع پر انبیاء کی شان رفیع اسی کو مقتضی ہے کہ رخصت پر نظر نہ کریں، انتہائی عزیمت کی راہ چلیں، چونکہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کا اُذۡکُرۡنِیۡ عِنۡدَ رَبِّکَ کہنا عزیمت کے خلاف تھا، اس لیے عتاب آمیز تنبیہ ہوئی کہ کئی سال تک مزید قید اٹھانی پڑی اور اسی لیے ''اِنساء'' کی نسبت شیطان کی طرف کی گئی، واللہ اعلم بالصواب، زیادہ تفصیل روح المعانی میں ہے۔

وَقَالَ الۡمَلِکُ اِنِّیۡۤ اَرٰی سَبۡعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاۡکُلُہُنَّ سَبۡعٌ عِجَافٌ وَّسَبۡعَ سُنۡۢبُلٰتٍ خُضۡرٍ

اور کہا بادشاہ نے میں خواب میں دیکھتا ہوں سات گائیں موٹی ان کو کھاتی ہیں سات گائیں دبلی اور سات بالیں ہری

وَّاُخَرَ یٰبِسٰتٍ ؕ یٰۤاَیُّہَا الۡمَلَاُ اَفۡتُوۡنِیۡ فِیۡ رُءۡیَایَ اِنۡ کُنۡتُمۡ لِلرُّءۡیَا تَعۡبُرُوۡنَ ﴿۴۳﴾ قَالُوۡۤا اَضۡغَاثُ

اور دوسری سوکھی ۱؎ اے دربار والو! تعبیر کہو مجھ سے میرے خواب کی اگر ہو تم خواب کی تعبیر دینے والے ۲؎ بولے یہ خیالی

اَحۡلَامٍ ۚ وَمَا نَحۡنُ بِتَاۡوِیۡلِ الۡاَحۡلَامِ بِعٰلِمِیۡنَ ﴿۴۴﴾

خواب ہیں، اور ہم کو ایسے خوابوں کی تعبیر معلوم نہیں ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** اور بادشاہ مصر نے (بھی اس درمیان میں ایک خواب دیکھا اور ارکان دولت کو جمع کر کے ان سے) کہا کہ میں (خواب میں کیا) دیکھتا ہوں کہ سات گائیں فربہ (موٹی) ہیں جن کو سات لاغر (کمزور) گائیں کھا گئیں، اور سات بالیں سبز ہیں اور ان کے علاوہ سات اور ہیں جو کہ خشک ہیں (اور ان خشک بالوں نے اسی طرح ان سات سبز پر لپٹ کر ان کو خشک کردیا) اے درباروالو! اگر تم (خواب کی) تعبیر دے سکتے ہو تو میرے اس خواب کے بارے میں مجھ کو جواب دو، وہ لوگ کہنے لگے کہ (اول تو یہ کوئی خواب ہی نہیں جس سے آپ فکر میں پڑیں) یونہی

پریشان خیالات ہیں، اور (دوسرے) ہم لوگ (کہ امور سلطنت میں ماہر ہیں) خوابوں کی تعبیر کا علم بھی نہیں رکھتے۔

**اِنِّیۡۤ اَرٰی سَبۡعَ بَقَرٰتٍ**: خواب میں گایوں اور بالوں دونوں کا نظر آنا شاید اس لیے ہو کہ قحط کا اثر حیوانات اور نباتات ہی پر ہوتا ہے۔

**قَالُوۡۤا اَضۡغَاثُ اَحۡلَامٍ**: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ وزراء و اعیان سلطنت فن تعبیر سے ناواقف تھے اس لیے بادشاہ کے کلام میں بھی شک پایا جاتا ہے کہ "اگر تم تعبیر دے سکتے ہو"، اور خود ان وزراء نے بھی اپنی واقفیت کا انکار کیا کہ ہم لوگ خوابوں کی تعبیر کا علم نہیں رکھتے، دو جواب اس لئے دیئے کہ پہلے جواب سے بادشاہ کے دل سے پریشانی اور وسوسہ دور کرنا مقصود ہے کہ یہ کوئی خواب نہیں جس سے آپ فکر میں پڑیں، اور دوسرے جواب سے اپنا عذر ظاہر کرنا مقصود ہے، خلاصہ یہ کہ اول تو ایسی خواب قابل تعبیر نہیں، دوسرے ہم اس فن سے واقف نہیں۔

پس اب یہ شبہ نہیں ہوسکتا کہ جب وہ تعبیر نہ جانتے تھے تو صرف دوسرا جملہ ہی کہہ دینا کافی تھا اور ان کا "اضغاث احلام" کہنا کہ یوں ہی پریشان خیالات ہیں یہ تعبیر جاننے کی دلیل نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ تفصیلاً تو ہم جانتے نہیں، مگر خوابوں کی جیسی شان ہوتی ہے اس سے اجمالاً اتنا کہہ سکتے ہیں کہ یہ خواب نہیں محض خیال ہے، تو اتنا اجمالی علم مہارت فن کی دلیل نہیں ہوسکتی، اور چونکہ ان لوگوں کا یہ جواب تعبیر کے طور پر نہ تھا اس لیے اس خواب کی دوسری تعبیر جو یوسف علیہ السلام نے دی وہی واقع ہوئی، ورنہ جیسا حدیث میں آیا ہے کہ اول ہی تعبیر واقع ہوا کرتی ہے بشرطیکہ اصول تعبیر کے مطابق وہ خواب اس تعبیر کا احتمال بھی رکھتا ہو، اور اگر قاعدے کے مطابق وہ خواب اس تعبیر کا احتمال نہ رکھتا ہو تو واقع ہونا ضروری نہیں، پس جہاں کہیں دو تعبیروں میں سے دوسری تعبیر واقع ہو اور پہلی واقع نہ ہو تو سمجھ لو کہ پہلی تعبیر قاعدے کے موافق نہ تھی، اور خواب کی تعبیر کے قواعد چونکہ بہت دقیق ہیں اس لیے ان کا احاطہ کسی قدر دشوار ہے۔

* * *

**فائدہ**: ۱؎ وہ سوکھی بالیں ہری بالوں پر لپٹتی ہیں اور انھیں خشک کر دیتی ہیں، یہ خواب بادشاہ مصر ریان بن الولید نے دیکھا، جو آخر کار حضرت یوسف علیہ السلام کی رہائی کا اور ظاہری عروج کا سبب بنا، یوسف علیہ السلام کے قصہ میں جا بجا اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ خدا جب کوئی بات چاہتا ہے غیر متوقع طریقہ سے اس کے ایسے اسباب فراہم کر دیتا ہے جن کی طرف آدمی کا خیال نہیں جاتا۔

**فائدہ**: ۲؎ یعنی اگر اس فن میں کچھ مہارت رکھتے ہو تو میرے خواب کی تعبیر بتلاؤ۔

**فائدہ**: ۳؎ معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اس فن سے جاہل تھے، اپنے جہل کا صاف لفظوں میں اقرار کرنے سے شرمائے تو یوں بات بنادی کہ یہ کوئی خواب نہیں، محض پریشان خیالات ہیں، بسا اوقات انسان کو نیند میں ایسی صورتیں مخیل ہو جاتی ہیں جو لائق اعتناء نہیں، نہ ہم ایسے خوابوں کی تعبیر کا علم رکھتے ہیں، کیونکہ وہ علم تعبیر رؤیا کے اصول کے ماتحت نہیں ہوتے۔

---

وَقَالَ الَّذِیۡ نَجَا مِنۡهُمَا وَادَّكَرَ بَعۡدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمۡ بِتَاۡوِیۡلِهٖ فَاَرۡسِلُوۡنِ ﴿۴۵﴾

اور بولا وہ جو بچا تھا ان دونوں میں سے اور یاد آ گیا اس کو مدت کے بعد میں بتاؤں تم کو اس کی تعبیر سو تم مجھ کو بھیجو

---

**خلاصہ تفسیر**: اور ان (مذکورہ) دو قیدیوں میں سے جو رہا ہو گیا تھا (وہ مجلس میں حاضر تھا) اس نے کہا اور مدت کے بعد اس کو (یوسف علیہ السلام کی وصیت کا) خیال آیا میں اس کی تعبیر کی خبر لائے دیتا ہوں، آپ لوگ مجھ کو ذرا جانے کی اجازت دیجئے۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ وہ لوگ تعبیر کے عالم نہ تھے، ورنہ علماء تعبیر کے فیصلہ کے بعد وزراء سلطنت کے روبرو ایسی جرات نہ ہوتی، اس سے معلوم ہوا کہ وہ لوگ خود بھی صحیح تعبیر کے مشتاق اور منتظر تھے۔

* * *

**فائدہ**: اب خواب کے سلسلہ میں ساقی کو جو قید سے چھوٹ کر آیا تھا مدت کے بعد حضرت یوسف یاد آئے اس نے بادشاہ اور اہل دربار سے کہا کہ اگر مجھے ذرا جانے کی اجازت دو تو میں اس خواب کی تعبیر لا سکتا ہوں، قید خانہ میں ایک مقدس بزرگ فرشتہ صورت موجود ہے جو فن تعبیر کا ماہر ہے

(ممکن ہے اس نے اپنے خواب کا قصہ بھی ذکر کیا ہو) میں تعبیر لینے کے لیے اس کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں چنانچہ اجازت دی گئی، اس نے یوسف علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوکر وہ عرض کیا جو آگے آتا ہے۔

يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعِ سُنْبُلَاتٍ

جا کر کہا اے یوسف اے سچے ۱؎ حکم دے ہم کو اس خواب میں سات گائیں موٹی ان کو کھائیں سات دبلی اور سات بالیں

خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ لَعَلِّي أَرْجِعُ إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٤٦﴾

ہری اور دوسری سوکھی، تا کہ لے جاؤں میں لوگوں کے پاس شاید ان کو معلوم ہو ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** (چنانچہ دربار سے اجازت ہوئی اور وہ قید خانہ میں یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچا اور جا کر کہا:) اے یوسف! اے صدق مجسم! آپ ہم لوگوں کو اس (خواب) کا جواب (یعنی تعبیر) دیجئے کہ سات گائیں موٹی ہیں ان کو سات دبلی گائیں کھا گئیں، اور سات بالیں ہری ہیں اور اس کے علاوہ (سات) خشک بھی ہیں (کہ ان خشک کے لپٹنے سے وہ ہری بھی خشک ہوگئیں، آپ تعبیر بتلائیے) تا کہ میں (جنہوں نے مجھے بھیجا ہے) ان لوگوں کے پاس لوٹ کر جاؤں (اور بیان کروں) تا کہ (اس کی تعبیر اور اس سے آپ کا حال) ان کو بھی معلوم ہوجائے (تعبیر کے موافق عملدرآمد کریں اور آپ کی خلاصی کی کوئی صورت نکلے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ کہنے سے یہ غرض تھی کہ آپ مجسم سچ ہیں، جو بات کبھی آپ کی زبان سے نکلی سچ ہوکر رہی امید ہے جو تعبیر اس خواب کی بیان کردیں گے ہو بہو پوری ہوکر رہے گی، یہ لفظ بتلا رہا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے صدق و دیانت کا نقش کس طرح عام و خاص کے قلوب پر بیٹھ جاتا ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی خواب کی تعبیر اور اس کے ذریعہ سے آپ کی قدر و منزلت معلوم ہو۔

قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأَبًا فَمَا حَصَدْتُمْ فَذَرُوهُ فِي سُنْبُلِهِ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تَأْكُلُونَ ﴿٤٧﴾

کہا تم کھیتی کرو گے سات برس جم کر، سو جو کاٹو اس کو چھوڑ دو اس کی بال میں مگر تھوڑا سا جو تم کھاؤ

ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تُحْصِنُونَ ﴿٤٨﴾

پھر آئیں گے اس کے بعد سات برس سختی کے کھا جائیں گے جو رکھا تم نے ان کے واسطے مگر تھوڑا سا جو روک رکھو گے بیج کے واسطے

ع ۱۶ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ ﴿٤٩﴾

پھر آئے گا اس کے پیچھے ایک برس اس میں مینہ برسے گا لوگوں پر اور اس میں رس نچوڑیں گے

**خلاصہ تفسیر:** آپ نے فرمایا کہ (ان سات موٹی گایوں اور سات سبز بالوں سے پیداوار اور بارش کے سات سال مراد ہیں پس) تم سات سال متواتر (خوب) غلہ بونا، پھر جو فصل کاٹو اس کو بالوں ہی میں رہنے دینا (تا کہ گھن نہ لگ جائے) ہاں! مگر تھوڑا سا جو تمہارے کھانے میں آئے (تو وہ بالوں میں سے نکالا ہی جائے گا باقی کو بالوں سے مت نکالنا)۔

پھر اس (سات برس) کے بعد سات برس ایسے سخت (اور قحط کے) آئیں گے جو کہ اس (تمام تر) ذخیرہ کو کھا جائیں گے جس کو تم نے ان

برسوں واسطے جمع کر کے رکھا ہوگا، ہاں! مگر تھوڑا سا جو (بیج کے واسطے) رکھ چھوڑو گے (وہ البتہ بچ جائے گا اور ان خشک بالوں اور دبلی گایوں سے ان ہی سات سال کی طرف اشارہ ہے جن میں قحط پڑے گا)۔

پھر اس (سات برس) کے بعد ایک برس ایسا آئے گا جس میں لوگوں کے لئے خوب بارش ہوگی، اور اس میں (بوجہ اس کے کہ انگور کثرت سے پھلیں گے) شیرہ بھی نچوڑیں گے (اور شرابیں پئیں گے)۔

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا: اس میں اخلاق حسنہ کی تعلیم ہے کہ رہا ہونے والے قیدی نے یوسف علیہ السلام کا اتنا کام نہ کیا کہ بادشاہ سے ذکر کر دیتا اور ان کو مزید سات سال قید کی مصیبت میں گذارنے پڑے، اب سات سال کے بعد جب وہ اپنا مطلب تعبیر خواب کا لے کر حاضر ہوا تو عام انسانی عادت کا تقاضا تھا کہ اس کو ملامت کرتے اس پر خفا ہوتے کہ تجھ سے اتنا کام نہ ہوسکا، مگر یوسف علیہ السلام نے اپنے پیغمبرانہ اخلاق کا اظہار فرمایا کہ اس کو ملامت تو کیا اس قصہ کا ذکر تک بھی نہیں کیا، چنانچہ اللہ کے نیک بندوں کی بھی یہی شان ہونی چاہیے کہ ایسے شخص کے حقوق میں بھی کمی نہ کریں جو ان کے حق میں کمی کرے۔

ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ: غالباً یہ آپ نے اس سے سمجھا کہ جب سات لاغر گایوں اور خشک بالوں سے قحط کے سات برس مراد ہیں تو لامحالہ ان سات سالوں کے بعد شدت نہ رہے گی، بارش وغیرہ خوب ہوگی، واللہ اعلم۔

* * *

**فائدہ:** یوسف علیہ السلام نے تعبیر بتلانے میں دیر نہ کی نہ کوئی شرط لگائی، نہ اس شخص کو شرمندہ کیا کہ تجھ کو اتنی مدت کے بعد اب میرا خیال آیا، اس سے انبیاء علیہم السلام کے اخلاق و مروت کا اندازہ ہوتا ہے، پھر وہ صرف خواب کی تعبیر مانگتا تھا، آپ نے تین چیزیں عطا فرمائیں، تعبیر، تدبیر، تبشیر، آپ کے کلام کا حاصل یہ تھا کہ سات موٹی گائیں اور سات ہری بالیں سات برس ہیں، جن میں متواتر خوشحالی رہے گی، کھیتوں میں خوب پیداوار ہوگی، حیوانات و نباتات خوب بڑھیں گے، اس کے بعد سات سال قحط ہوگا جس میں سارا پچھلا اندوختہ کھا کر ختم کر ڈالو گے، صرف آئندہ تخم ریزی کے لیے کچھ تھوڑا سا باقی رہ جائے گا، یہ سات سال دبلی گائیں اور سوکھی بالیں ہیں جو موٹی گائیوں اور ہری بالوں کو ختم کر دیں گی، تعبیر بتلانے کے دوران میں حضرت یوسف نے از راہ شفقت و ہمدردی خلائق ایک تدبیر بھی تلقین فرمادی کہ اول سات سال میں جو پیداوار ہو اسے بڑی حفاظت سے رکھو اور کفایت شعاری سے اٹھاؤ، کھانے کے لیے جس قدر غلہ کی ضرورت ہو اسے الگ کر لو اور تھوڑا تھوڑا احتیاط سے کھاؤ، باقی غلہ بالوں میں رہنے دو تاکہ اس طرح کیڑے وغیرہ سے محفوظ رہ سکے، اور سات سال کی پیداوار چودہ سال تک کام آئے، ایسا نہ کرو گے تو قحط کا مقابلہ کرنا دشوار ہوگا، یہ تعبیر و تدبیر بتلانے کے بعد انھیں بشارت سنائی جو غالباً آپ کو وحی سے معلوم ہوئی ہوگی، یعنی سات سال قحط رہنے کے بعد جو سال آئے گا اس میں حق تعالیٰ کی طرف سے فریادرسی ہوگی اور خوب مینہ برسے گا، کھیتی باڑی، پھل میوے نہایت افراط سے پیدا ہوں گے، جانوروں کے تھن دودھ سے بھر جائیں گے، انگور وغیرہ نچوڑنے کے قابل چیزوں سے لوگ شراب کشید کریں گے، یہ آخری بات سائل کے حسب حال فرمائی، کیونکہ وہ یہ ہی کام کرتا تھا۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْئَلْهُ

اور کہا بادشاہ نے لے آؤ اسکو میرے پاس، پھر جب پہنچا اسکے پاس بھیجا ہوا آدمی کہا لوٹ جا اپنے خاوند (مالک) کے پاس اور پوچھ اس سے

مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ۝۵۰

کیا حقیقت ہے ان عورتوں کی جنہوں نے کاٹے تھے ہاتھ اپنے لے میرا رب تو ان کا فریب سب جانتا ہے ۲

**خلاصہ تفسیر:** (غرض وہ شخص تعبیر لے کر دربار میں پہنچا) اور (جا کر بیان کیا) بادشاہ نے (جو تعبیر کو سنا تو آپ کے علم و فضل کا

معتقد ہوا اور) حکم دیا کہ ان کو میرے پاس لاؤ (چنانچہ یہاں سے قاصد چلا) پھر جب ان کے پاس قاصد پہنچا (اور پیغام دیا تو) آپ نے فرمایا کہ (جب تک میرا اُس تہمت سے بری ہونا اور بے قصور ہونا ثابت نہ ہوجائے گا میں نہ آؤں گا) تو اپنی سرکار کے پاس لوٹ جا، پھر اس سے دریافت کر کہ (کچھ تم کو خبر ہے) ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے (مطلب یہ تھا کہ ان کو بلا کر اس واقعہ کے متعلق میرے حال کی تفتیش وتحقیق کی جائے جس کی وجہ سے مجھ کو قید کی گئی، عورتوں کے حال سے مراد ان کا یوسف علیہ السلام کے حال سے واقف یا ناواقف ہونا ہے، خاص ان عورتوں کا ذکر شاید اس لئے کیا ہو کہ ان کے سامنے زلیخا نے یہ اقرار کیا تھا: وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ) میرا رب ان عورتوں کے فریب کو خوب جانتا ہے (یعنی اللہ کو تو معلوم ہی ہے کہ زلیخا کا مجھ پر تہمت لگا کر ایک چال چلی ہے، مگر لوگوں کے سامنے بھی اس پر فریب چال کی تنقیح ہوجانا مناسب ہے)۔

**وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ:** اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص اور مقبول بندوں کے مقاصد پورا کرنے کے لئے خود ہی غیبی تدابیر سے انتظام فرماتے ہیں، ان کو کسی مخلوق کا ممنون احسان کرنا پسند نہیں فرماتے، یہی وجہ ہوئی کہ یوسف علیہ السلام نے جو رہا ہونے والے قیدی سے کہا تھا کہ بادشاہ سے میرا ذکر کرنا اس کو تو بھلا دیا گیا اور پھر پردہ غیب سے ایک تدبیر ایسی کی گئی جس میں یوسف علیہ السلام کسی کے ممنون بھی نہ ہوں اور پوری عزت وشان کے ساتھ جیل کی رہائی کا مقصد بھی پورا ہوجائے، اس کا یہ سامان کیا کہ بادشاہ مصر کو ایک پریشان کن خواب دکھلایا جس کی تعبیر سے اس کے درباری اہل علم وفن عاجز ہوئے، اس طرح ضرورت مند ہو کر یوسف علیہ السلام کی طرف رجوع کرنا پڑا۔

**قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ:** اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مقتدا اور صاحب علم آدمی پر اگر الزامات اور تہمتیں ہوں تو پہلے ان کی صفائی کر لینی چاہیے، تاکہ ان کی دعوت وتبلیغ کے اثرات پر غلط اثر نہ پڑے، اس موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل سے رہائی اور شاہی دعوت کا پیغام ملنے کے باوجود رہائی سے پہلے اس کی کوشش فرمائی کہ لوگوں کے شبہات دور ہوجائیں، اس میں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کسی کی چالاکی دیر تک چلنے نہیں پاتی آخر اصلیت ظاہر ہو ہی جاتی ہے۔

اس موقع پر صحیح بخاری اور جامع ترمذی میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ ایک حدیث میں رسول کریم ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ ''اگر میں اتنی مدت جیل میں رہتا جتنا یوسف علیہ السلام رہے ہیں اور پھر مجھے رہائی کے لئے بلایا جاتا تو فوراً قبول کر لیتا''، اس حدیث میں یہ بات قابل غور ہے کہ منشاء حدیث کا یوسف علیہ السلام کے صبر وتحمل اور مکارم اخلاق کی تعریف ومدح کرنا ہے، مگر اس کے بالمقابل جس صورت حال کو رسول کریم ﷺ نے اپنی طرف منسوب کر کے فرمایا کہ ''میں ہوتا تو دیر نہ کرتا'' اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ حضرت یوسف کے اس طرز عمل کو افضل فرما رہے ہیں اور اپنی شان میں فرماتے ہیں کہ میں ہوتا تو اس افضل پر عمل نہ کر پاتا، بلکہ اس میں مفضول کو اختیار کر لیتا جو بظاہر افضل الانبیاء (ﷺ) کے شایان شان نہیں تو اس کے جواب میں کہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ رسول کریم ﷺ بلاشبہ تمام انبیاء علیہم السلام میں افضل ہیں مگر کسی جزدی عمل میں کسی دوسرے پیغمبر کی افضلیت اس کے منافی نہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے طریق کار میں ان کے صبر وتحمل اور مکارم اخلاق کا عظیم الشان ثبوت ہے اور وہ اپنی جگہ قابل تعریف ہے، لیکن رسول کریم ﷺ نے جس طریق کار کو اپنی طرف منسوب فرمایا تعلیم امت اور خیر خواہی عوام کے لئے مناسب اور افضل ہے، کیونکہ بادشاہوں کے مزاج کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا، ایسے موقع پر شرطیں لگانا یا دیر کرنا عام لوگوں کے لئے مناسب نہیں ہوتا، احتمال ہے کہ بادشاہ کی رائے بدل جائے اور پھر یہ جیل کی مصیبت بدستور قائم رہے، یوسف علیہ السلام کو تو بوجہ رسول خدا ہونے کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ علم بھی ہوسکتا ہے کہ اس تاخیر سے کچھ نقصان نہیں ہوگا، لیکن دوسروں کو تو یہ درجہ حاصل نہیں رحمۃ للعالمین ﷺ کے مزاج ومذاق میں عامہ خلائق کی بہبود کی اہمیت زیادہ تھی اس لئے فرمایا کہ ''مجھے یہ موقع ملتا تو دیر نہ کرتا''، واللہ اعلم۔

**مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ:** اس میں یہ ہے کہ جس شخص کے حقوق کسی کے ذمہ ہوں اور اس حیثیت سے وہ واجب الاحترام

ہو، اگر ناگزیر حالات میں اس کے خلاف کوئی کاروائی کرنی بھی پڑے تو اس میں بھی مقدور بھر حقوق واحترام کی رعایت کرنا شرافت کا مقتضی ہے، جیسے یوسف علیہ السلام نے اپنی براءت کے لئے معاملہ کی تحقیقات کے واسطے عزیز یا اس کی بیوی کا نام لینے کے بجائے ان عورتوں کا ذکر کیا جنہوں نے ہاتھ کاٹ لئے تھے، کیونکہ مقصد اس سے بھی حاصل ہوسکتا تھا۔

* * *

**فائدہ:** ۱۔ بادشاہ کچھ تو پہلے ہی ساقی کے تذکرے سے حضرت یوسف کا معتقد ہوگیا تھا، اب جو ایسی موزوں و دل نشین تعبیر اور رعایا کی ہمدردی کی تدبیر سنی تو ان کے علم وفضل، عقل ودانش اور حسن اخلاق کا سکہ اس کے دل پر بیٹھ گیا، فوراً حکم دیا کہ ایسے شخص کو میرے پاس لاؤ، تاکہ اس کی زیارت سے بہرہ اندوز ہوں اور اس کے مرتبہ اور قابلیت کے موافق عزت کروں، قاصد پیام شاہی لے کر حضرت یوسف علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا، مگر یوسف کی نظر میں اپنی دینی واخلاقی پوزیشن کی برتری اور صفائی اعلیٰ سے اعلیٰ دنیاوی عزت ووجاہت سے زیادہ مہم تھی، آپ جانتے تھے کہ پیغمبر خدا کی نسبت لوگوں کی ادنیٰ بدگمانی بھی ہدایت وارشاد کے کام میں بڑی بھاری رکاوٹ ہے، اگر آج میں بادشاہی فرمان کے موافق چپ چپاتے قید خانہ سے نکل گیا اور جس جھوٹی تہمت کے سلسلہ میں سالہا سال قید وبند کی مصائب اٹھائیں اس کا قطعی طور پر استیصال نہ ہوا تو بہت ممکن ہے کہ بہت سے ناواقف لوگ میری عصمت کے متعلق تردد اور شبہ میں پڑے رہ جائیں اور حاسدین کچھ زمانہ کے بعد ان ہی بے اصل اثرات سے فائدہ اٹھا کر کوئی اور منصوبہ میرے خلاف کھڑا کردیں، ان مصالح پر نظر کرتے ہوئے آپ نے حکم شاہی کے امتثال میں جلدی نہ کی بلکہ نہایت صبر واستقلال کا مظاہرہ کرتے ہوئے قاصد کو کہا کہ تو اپنے مالک (بادشاہ) سے واپس جاکر دریافت کرکہ تجھ کو ان عورتوں کے قصہ کی کچھ حقیقت معلوم ہے جنہوں نے دعوت کے موقع پر اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے، حضرت یوسف کو ان عورتوں کے ناموں کی تفصیل کہاں معلوم ہوگی، یہ خیال کیا ہوگا کہ ایسا واقعہ ضرور عام شہرت حاصل کرچکا ہے، اس لیے واقعہ کے ایک ممتاز جزء (ہاتھ کاٹنے) کو ظاہر کرکے بادشاہ کو توجہ دلائی کہ اس مشہور ومعروف قصہ کی تفتیش وتحقیق کرے، غالباً اب وہ عورتیں بتلادیں گی کہ تقصیر کس کی ہے، نبی کریم ﷺ نے صحیحین کی حدیث میں حضرت یوسف کے کمال صبر وتحمل کی اس طرح داد دی ہے: لَوْ لَبِثْتُ فِي السِّجْنِ مَالَبِثَ يُوسُفَ، لَأَجَبْتُ الدَّاعِيَ (اگر میں اتنی مدت قید میں رہتا جتنا یوسف رہا تو بلانے والے کی اجابت کرتا یعنی فوراً ساتھ ہولیتا) محققین کہتے ہیں کہ اس میں حضرت یوسف کے صبر وتحمل کی تعریف اور لطیف رنگ میں اپنی عبودیت کاملہ کا اظہار ہے، ہم نے اس مضمون کی تفصیل شرح صحیح مسلم میں کی ہے، یہاں اختصار کی وجہ سے زیادہ نہیں لکھ سکتے۔

**فائدہ:** ۲۔ حضرت یوسف نے "سب کا فریب" فرمایا، اس واسطے کہ ایک کا فریب تھا اور سب اس کی مددگار تھیں اور اصل فریب والی کا نام شاید حق پرورش کی وجہ سے نہیں لیا، حیاء کی وجہ سے گول مول فرمایا، کیونکہ جانتے تھے کہ اصل حقیقت آخر کھل کر رہے گی، کذا فی الموضح۔

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ

کہا بادشاہ نے عورتوں کو کیا حقیقت ہے تمہاری جب تم نے پھسلانا چاہا یوسف کو اسکے نفس کی حفاظت سے ۱۔ بولیں حاشاللہ ہم کو معلوم نہیں اس پر کچھ برائی

قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ۫ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۵۱﴾

بولی عورت عزیز کی اب کھل گئی سچی بات، میں نے پھسلانا چاہا تھا اس کو اس کے جی سے اور وہ سچا ہے ۲۔

**خلاصہ تفسیر:** (چنانچہ بادشاہ نے ان عورتوں کو حاضر کیا) کہا کہ تمہارا کیا واقعہ ہے جب تم نے یوسف سے اپنے مطلب کی خواہش کی (یعنی ایک نے خواہش کی تھی اور بقیہ نے اس کی مدد کی، کیونکہ کسی کام میں مدد کرنا گویا وہ کام کرنا ہوا، غرض اس وقت تم کو کیا تحقیق ہوا) عورتوں نے جواب دیا کہ حاش للہ! ہم کو ان میں ذرا بھی تو برائی کی بات نہیں معلوم ہوئی (وہ تو بالکل پاک صاف ہیں) عزیز کی بیوی (جو کہ حاضر تھی) کہنے لگی کہ

اب تو حق بات (سب پر) ظاہر ہو ہی گئی (اب چھپانا بیکار ہے سچ یہی ہے کہ) میں نے ان سے اپنے مطلب کی خواہش کی تھی (نہ کہ انہوں نے جیسا میں نے الزام لگا دیا تھا) اور بیشک وہی سچے ہیں (اور غالباً ایسی بات کا اقرار کر لینا مجبوری کی حالت میں زلیخا کو پیش آیا)۔

مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ: شاید بادشاہ نے اس عنوان سے اس لئے پوچھا ہو تا کہ مجرم سن لے کہ بادشاہ کو اتنی بات معلوم ہے کہ کسی عورت نے ان سے اپنا مطلب پورا کرنے کی بات کی تھی، شاید بادشاہ کو اس مجرم کا نام بھی معلوم ہو، سو اس حالت میں انکار نہ چل سکے گا، پس اس طرح شاید مجرم خود صاف صاف اقرار کر لے۔

حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ: اس وقت ان عورتوں نے زلیخا کا وہ اقرار شاید اس لئے ظاہر نہ کیا ہو کہ زیادہ مقصود یوسف علیہ السلام کی صفائی اور پاک دامنی کا ثبوت تھا اور وہ اتنی بات سے حاصل ہو گیا، زیادہ کہنے کی کیا ضرورت، یا زلیخا کے روبرو ہونے کی وجہ سے حیاء مانع ہوئی کہ اس کا نام لیں، یا عداوت پیدا ہونے کا احتمال ہوا ہو۔

* * *

**فائدہ:** لے بادشاہ نے دریافت کرنے کا ایسا عنوان اختیار کیا گویا وہ پہلے سے خبر رکھتا ہے تا کہ یہ دیکھ کر انھیں جھوٹ بولنے کی ہمت نہ ہو، نیز یوسف علیہ السلام کی استقامت وصبر کا اثر پڑا ہوگا کہ بدون اظہار برأت کے جیل سے نکلنا گوارا نہیں کرتے اور اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ کہہ کر ان کے "کید" کا اظہار فرما رہے ہیں، ادھر ساقی وغیرہ نے واقعات سنائے ہوں گے ان سے بھی یوسف کی نزاہت اور عورتوں کے مکائد کی تائید ملی ہوگی۔

**فائدہ:** ٢ سب عورتوں کی متفقہ شہادت کے بعد خود زلیخا نے بھی صاف اقرار کر لیا کہ قصور میرا ہے، یوسف بالکل سچے ہیں، بیشک میں نے ان کو اپنی جانب مائل کرنا چاہا تھا، لیکن وہ ایسے کا ہے کو تھے کہ میرے داؤ میں آ جاتے۔

## ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ﴿٥٢﴾

یوسف نے کہا یہ اس واسطے کہ عزیز معلوم کر لیوے کہ میں نے اسکی چوری نہیں کی چھپ کر اور یہ کہ اللہ نہیں چلاتا (چلنے دیتا) فریب دغابازوں کا

**خلاصہ تفسیر:** (غرض تمام صورت مقدمہ اور سب کے اظہارات اور یوسف علیہ السلام کی براءت کا ثبوت ان کے پاس کہلا کر بھیجا اس وقت) یوسف (علیہ السلام) نے فرمایا کہ یہ تمام اہتمام (جو میں نے کیا) محض اس وجہ سے تھا تا کہ عزیز کو (زیادہ) یقین کے ساتھ معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں اس کی آبرو میں دست اندازی نہیں کی اور یہ (بھی معلوم ہو جائے) کہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کے فریب کو چلنے نہیں دیتا (چنانچہ زلیخا نے عزیز کی حرمت میں خیانت کی تھی کہ دوسرے پر نگاہ ڈالی، خدا نے اس کی قلعی کھول دی سو میری یہی غرض تھی)۔

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ: یوسف علیہ السلام کے اس اہتمام براءت سے معلوم ہوا کہ تہمت دور کرنے کی کوشش کرنا ضروری اور امر مطلوب ہے، احادیث میں بھی اسکا مطلوب ہونا وارد ہے، اس کے فوائد میں سے یہ بھی ہے کہ لوگ غیبت سے بچیں گے، اپنا دل بھی تشویش سے محفوظ رہے گا، اگرچہ عزیز کو آپ کی براءت پہلے سے معلوم تھی، مگر اسکے یقین کو پختہ کرنا اور عوام میں جو بدنامی ہوئی اس کا دور کرنا بھی ضروری مصلحت تھی۔

اس میں مکارم اخلاق کی تعلیم بھی ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھوں سات سال یا بارہ سال جیل خانہ کی تکلیف برداشت کرنی پڑی تھی، رہائی کے وقت ان سے کوئی انتقام لینا تو کیا اس کو بھی برداشت نہ کیا کہ ان کو کوئی ادنیٰ تکلیف ان سے پہونچے جیسے اس آیت لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ میں اس کا اہتمام کیا گیا ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی اتنی تحقیق وتفتیش اس لیے کرائی کہ پیغمبرانہ عصمت و دیانت بالکل آشکارا ہو جائے اور لوگ معلوم کر لیں کہ خائنوں اور دغابازوں کا فریب اللہ چلنے نہیں دیتا، چنانچہ عورتوں کا فریب نہ چلا، آخر حق حق ہو کر رہا۔

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۵۳﴾

اور میں پاک نہیں کہتا اپنے جی کو، بیشک جی تو سکھلاتا ہے برائی مگر جو رحم کر دیا میرے رب نے، بیشک میرا رب بخشنے والا ہے مہربان

**خلاصہ تفسیر**: اور (باقی) میں اپنے نفس کو (بھی بالذات) بری (اور پاک) نہیں بتلاتا (کیونکہ) نفس تو (ہر ایک کا) بری ہی بات بتلاتا ہے بجز اس (نفس) کے جس پر میرا رب رحم کرے (اور اس میں برے کاموں کے حکم کرنے کا مادہ نہ رکھے، جیسا کہ انبیاء علیہم السلام کے نفوس مطمئنہ ہوتے ہیں جن میں یوسف علیہ السلام کا نفس بھی داخل ہے، خلاصہ یہ ہوا کہ میری نزاہت وعصمت میرے نفس کا ذاتی کمال نہیں، بلکہ رحمت وعنایت الٰہی کا اثر ہے کہ میرا نفس برائی کا حکم نہیں کرتا، ورنہ جیسے دوسروں کے نفوس ہیں ویسا ہی میرا بھی ہوتا) بلکہ میرا رب بڑی مغفرت والا بڑی رحمت والا ہے۔

**وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ**: حضرت یوسف علیہ السلام کے اس قول میں نیک اور متقی پرہیزگار بندوں کے لئے یہ ہدایت ہے کہ جب ان کو کسی گناہ سے بچنے کی توفیق ہو جائے تو اس پر ناز نہ کریں اور اس کے بالمقابل گناہگاروں کو حقیر نہ سمجھیں، بلکہ ارشاد یوسفی کے مطابق اس بات کو اپنے دل میں جمائیں کہ یہ ہمارا کوئی ذاتی کمال نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے نفس امارہ کو ہم پر غالب نہیں آنے دیا، ورنہ ہر انسان کا نفس اس کو طبعی طور پر برے ہی کاموں کی طرف کھینچتا ہے۔

**اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوۡٓءِ**: یعنی اوپر جو نفس کی دو قسمیں معلوم ہوئیں: امارہ جو بری باتوں کا حکم کرتا ہے، اور دوسرا مطمئنہ، جس میں بری باتوں کا مادہ نہیں ہوتا، سو امارہ اگر توبہ کر لے تو اس کی مغفرت فرمائی جاتی ہے اور توبہ کے مرتبہ میں اس کو لوامہ کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ اپنے آپ کو ملامت کرنے لگتا ہے، اور جو نفس مطمئنہ ہے اس کا اس کا یہ ذاتی کمال نہیں، بلکہ عنایت ورحمت خداوندی کا اثر ہے، پس جب امارہ توبہ کر لے تو اس میں صفت غفور کا ظہور ہوتا ہے، اور نفس مطمئنہ میں صفت رحیم کا ظہور ہوتا ہے۔

یہ تمام تر مضمون یوسف علیہ السلام کی تقریر کا ہوا، رہی یہ بات کہ براءت ونزاہت کے ثبوت کی یہ صورت رہائی کے بعد بھی تو ممکن تھی پھر رہائی سے پہلے ہی اس کا اہتمام کیوں کیا؟ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جتنا یقین لوگوں کو اس ترتیب میں ہو سکتا ہے اس کے خلاف میں نہیں ہو سکتا، کیونکہ دلائل کے ساتھ اگرچہ ہر وقت براءت ثابت کرنا ممکن تھا، لیکن اس خاص سورت میں اتنی بات زیادہ ہے کہ بادشاہ اور عزیز سمجھ سکتے ہیں کہ جب براءت کے ثبوت کے بغیر یہ رہا ہونا نہیں چاہتے حالانکہ ایسی حالت میں رہائی بہت زیادہ مطلوب اور ہر چیز سے زیادہ مرغوب ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنی نزاہت وبراءت کا پورا یقین ہے، اور اس کے ثابت ہو جانے کا پورا اطمینان ہے، بقول مشہور: ''آں را کہ حساب پاک ست از محاسبہ چہ باک'' اور ظاہر ہے کہ ایسا کامل یقین صرف بری کو ہو سکتا ہے ملوث کو نہیں ہو سکتا۔

* * *

**فائدہ**: چونکہ حضرت یوسف نے اپنی براءت پر بہت زیادہ زور دیا، ممکن تھا کوئی سطحی آدمی اس سے فخر اور غرور واعجاب کا شبہ کرنے لگتا اس لیے اپنی نزاہت کی حقیقت کھول دی کہ میں کوئی شیخی نہیں مارتا نہ پاک صاف رہنے میں اپنے نفس پر بھروسہ کر سکتا ہوں، محض خدا کی رحمت واعانت ہے جو کسی نفس کو برائی سے روکتی ہے، یہ ہی رحمت خصوصی عصمت انبیاء علیہم السلام کی کفیل وضامن ہے ورنہ نفس انسانی کا کام عموماً برائی کی ترغیب دینا تھا، خدا تعالیٰ کی خصوصی توفیق ودستگیری نہ ہوتی تو میرا نفس بھی دوسرے نفوس بشریہ کی طرح ہوتا، اِنَّ رَبِّیۡ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ سے اشارہ کر دیا، کہ نفس امارہ جب توبہ کر کے ''لوامہ'' بن جائے تو خدا اس کی پچھلی تقصیرات معاف فرما دیتا ہے، بلکہ رفتہ رفتہ مہربانی سے ''نفس مطمئنہ'' کے درجہ تک پہنچا دیتا ہے۔

**تنبیہ**: حافظ ابن تیمیہ اور ابن کثیر وغیرہ نے: ذٰلِكَ لِیَعۡلَمَ اَنِّیۡ لَمۡ اَخُنۡهُ بِالۡغَیۡبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا یَهۡدِیۡ كَیۡدَ الۡخَآئِنِیۡنَ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ تک زلیخا کا مقولہ قرار دیا ہے یعنی زلیخا نے اَنَا رَاوَدۡتُّهٗ عَنۡ نَّفۡسِهٖ کا اقرار کر کے کہا کہ اس قرار واعتراف سے عزیز کو یہ معلوم کرانا ہے کہ میں نے اس کی پیٹھ پیچھے کوئی بڑی خیانت نہیں کی، بیشک یوسف کو پھسلانا

چاہا تھا مگر میری مراودت ان پر کارگر نہیں ہوئی، اگر میں نے مزید خیانت کی ہوتی تو ضرور اس کا پردہ فاش ہو کر رہتا، کیونکہ خدا خائنوں کے مکر و فریب کو چلنے نہیں دیتا، ہاں میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتی جتنی غلطی مجھ سے ہوئی اس کا اقرار کر رہی ہوں، دوسرے آدمیوں کی طرح نفس کی شرارتوں سے میں بھی پاک نہیں، ان سے تو یوسف جیسا پاکباز انسان ہی محفوظ رہ سکتا ہے، جس پر خدا کی خاص مہربانی اور رحمت ہے، ابوحیان نے بھی اس کو زلیخا کا مقولہ قرار دیا ہے، لیکن لِيَعْلَمَ اور لَمْ أَخُنْهُ کی ضمیریں بجائے عزیز کے یوسف کی طرف راجع کی ہیں، یعنی اپنی خطا کا صاف اقرار اس لیے کرتی ہوں کہ یوسف کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں کوئی غلط بات نہیں کہی نہ اپنے جرم کو ان کی طرف منسوب کیا، واللہ اعلم۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ

اور کہا بادشاہ نے لے آؤ اس کو میرے پاس میں خالص کر رکھوں اس کو اپنے کام میں ۱ے پھر جب بات چیت کی اس سے،

قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ﴿۵۴﴾

کہا واقعی تو نے آج سے ہمارے پاس جگہ پائی معتبر ہو کر ۲ے

**خلاصہ تفسیر:** (یہ ساری باتیں بادشاہ نے سنیں) اور (یہ سن کر اس) بادشاہ نے کہا کہ ان کو میرے پاس لاؤ میں ان کو خاص اپنے (کام کے) لئے رکھوں گا (اور عزیز سے ان کو لے لوں گا، اب اسکے ماتحت نہ رہیں گے، چنانچہ لوگ ان کو بادشاہ کے پاس لائے) پس جب بادشاہ نے ان سے باتیں کیں (اور باتوں سے آپ کا مزید فضل و کمال ظاہر ہوا) تو بادشاہ نے (ان سے) کہا کہ تم ہمارے نزدیک آج (سے) بڑے معزز اور معتبر ہو۔

* * *

**فائدہ:** ۱ے یعنی میرا مشیر خاص رہے گا۔

**فائدہ:** ۲ے کچھ پہلے سے معتقد ہو چکا تھا، بالمشافہ باتیں سن کر بالکل ہی گرویدہ ہو گیا اور حکم دے دیا کہ آج سے آپ ہمارے پاس نہایت معزز و معتبر ہو کر رہیں گے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''اب عزیز کا علاقہ موقوف کیا اپنی صحبت میں رکھا''۔

قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۵﴾

یوسف نے کہا مجھ کو مقرر کر ملک کے خزانوں پر، میں نگہبان ہوں خوب جاننے والا

**خلاصہ تفسیر:** (اس کے بعد اس خواب کی تعبیر کا ذکر آیا اور بادشاہ نے کہا کہ اتنے بڑے قحط کا اہتمام بڑا بھاری کام ہے یہ انتظام کس کے سپرد کیا جائے) یوسف (علیہ السلام) نے فرمایا کہ ملکی خزانوں پر مجھ کو مامور کر دو، میں (ان کی) حفاظت (بھی) رکھوں گا اور (آمد و خرچ کے انتظام اور اس کے حساب کتاب کے طریقہ سے بھی) خوب واقف ہوں (چنانچہ بجائے اس کے کہ یوسف علیہ السلام کو کوئی خاص منصب دیا جاتا بادشاہ نے اپنے ہر قسم کے پورے اختیارات ان کو دے دیئے)۔

قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ: یوسف علیہ السلام کی اس بات سے معلوم ہوا کہ کسی عہدہ اور منصب کو طلب کرنا خاص صورتوں میں جائز ہے، جیسے یوسف علیہ السلام نے خزائن ارض کا انتظام اور ذمہ داری طلب فرمائی، مگر اس میں یہ تفصیل ہے کہ جب کسی خاص عہدہ کے متعلق یہ معلوم ہو کہ کوئی دوسرا آدمی اس کا اچھا انتظام نہیں کر سکے گا اور اپنے بارے میں یہ اندازہ ہو کہ عہدہ کے کام کو اچھا انجام دے سکے گا، اور کسی گناہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ نہ ہو، ایسی حالت میں عہدہ کا خود طلب کر لینا بھی جائز ہے بشرطیکہ حُبّ جاہ و مال اس کا سبب نہ ہو بلکہ خلق اللہ کی صحیح خدمت اور انصاف کے ساتھ ان کے حقوق پہنچانا مقصود ہو، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے صرف یہی مقصد تھا اور جہاں یہ صورت نہ ہو تو حدیث میں رسول کریم ﷺ نے حکومت کا کوئی عہدہ خود طلب کرنے سے منع فرمایا ہے اور جس نے خود کسی عہدہ کی درخواست کی اس کو عہدہ نہیں دیا۔

**اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ**: حضرت یوسف علیہ السلام کے اس قول سے یہ ثابت ہوا کہ ضرورت کے موقع پر اپنے کسی کمال یا فضیلت کا ذکر کر دینا تزکیہ نفس یعنی پاکبازی جتلانے میں داخل نہیں جس کی قرآن کریم میں ممانعت آئی ہے بشرطیکہ اس کا ذکر کرنا کبر وغرور اور فخر وتعلّی کی وجہ سے نہ ہو۔

* * *

**فائدہ**: یعنی دولت کی حفاظت بھی پوری کروں گا اور اس کی آمد وخرچ کے ذرائع اور حساب وکتاب سے خوب واقف ہوں، یوسف نے خود درخواست کر کے مالیات کا کام اپنے سر لیا، تا کہ اس ذریعہ سے عامہ خلائق کو پورا نفع پہنچا سکیں، خصوصاً آنے والے خوفناک قحط میں نہایت خوش انتظامی سے مخلوق کی خبر گیری اور حکومت کی مالی حالت کو مضبوط رکھ سکیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام دنیا کی عقل بھی کامل رکھتے ہیں، اور یہ کہ ہمدردی خلائق کے لیے مالیات کے قصوں میں پڑنا شان نبوت یا بزرگی کے خلاف نہیں سمجھتے نیز ایک آدمی اگر نیک نیتی سے یہ سمجھے کہ فلاں منصب کا میں اہل ہوں اور دوسروں سے یہ کام اچھی طرح بن نہ پڑے گا تو مسلمانوں کی خیر طلبی اور نفع رسانی کی غرض سے اس کی خواہش یا درخواست کر سکتا ہے، اگر حسب ضرورت اپنے بعض خصال حسنہ اور اوصاف حمیدہ کا تذکرہ کرنا پڑے تو یہ ناجائز مدح سرائی میں داخل نہیں، عبدالرحمن بن سمرہ کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص از خود امارت طلب کرے تو اس کا بار اسی کے کندھوں پر ڈال دیا جاتا ہے (غیبی اعانت مددگار نہیں ہوتی) یہ اس وقت ہے جب طلب کرنا محض نفس پروری اور جاہ پسندی وغیرہ اغراض کی بناء پر ہو، واللہ اعلم۔

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ۭ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ

اور یوں قدرت دی ہم نے یوسف کو اس زمین میں، جگہ پکڑتا تھا اس میں جہاں چاہتا ا۔ پہنچا دیتے ہیں ہم رحمت اپنی جس کو چاہیں

وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ ع

اور ضائع نہیں کرتے ہم بدلہ بھلائی والوں کا، اور ثواب آخرت کا بہتر ہے ان کو جو ایمان لائے اور رہے پرہیزگاری میں ۲۔

**خلاصہ تفسیر**: (گویا حقیقت میں بادشاہ یوسف علیہ السلام ہی ہو گئے اگرچہ برائے نام وہ بادشاہ رہا، اور یوسف ''عزیز'' کے عہدہ سے مشہور ہو گئے، چنانچہ ارشاد ہے) اور ہم نے ایسے (عجیب) طور پر یوسف (علیہ السلام) کو ملک (مصر) میں با اختیار بنا دیا کہ اس میں جہاں چاہیں رہیں سہیں (جیسا کہ بادشاہوں کو آزادی ہوتی ہے، یعنی یا تو وہ وقت تھا کہ کنویں میں قید تھے، پھر عزیز کی ماتحتی میں مقید رہے اور یا آج یہ خود مختاری اور آزادی عنایت ہوئی، بات یہ ہے کہ) ہم جس پر چاہیں اپنی عنایت متوجہ کر دیں اور ہم نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے (یعنی دنیا میں بھی نیکی کا اجر ملتا ہے کہ حیات طیبہ اور پاکیزہ زندگی عطا فرماتے ہیں خواہ مالدار بنا کر جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے لئے ہوا، اور خواہ تنگ دستی اور فقر کے ساتھ قناعت ورضا عطا کر کے جس سے لذیذ عیش میسر ہوتا ہے، پس بعضوں کو دنیوی ثروت نہ ملنے سے اشکال لازم نہیں آتا، یہ اجر تو آج دنیا میں ہوا) اور آخرت کا اجر کہیں زیادہ بڑھ کر ہے ایمان اور تقویٰ والوں کے لئے۔

* * *

**فائدہ**: ا۔ جہاں چاہتے اترتے اور جو چاہتے تصرف کرتے، گویا ریان بن الولید برائے نام بادشاہ تھا، حقیقت میں یوسف بادشاہی کر رہے تھے اور ''عزیز'' کہہ کر پکارے جاتے تھے جیسا کہ آگے آئے گا، بعض علماء نے لکھا ہے کہ بادشاہ آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا، نیز اسی زمانہ میں عزیز مصر کا انتقال ہوا تو اس کی عورت زلیخا نے آپ سے شادی کر لی، واللہ اعلم، محدثین اس پر اعتماد نہیں کرتے۔

**فائدہ**: ۲۔ جو بھلائی اور نیکی کا راستہ اختیار کرے خدا اس کو دنیا میں بھی میٹھا پھل دیتا ہے، خواہ ثروت وحکومت یا لذت عیش، حیات طیبہ، اور غنائے قلبی، حضرت یوسف کو یہ سب چیزیں عنایت فرمائیں، رہا آخرت کا اجر، سو وہ ایک ایماندار و پرہیزگار کے لیے دنیا کے اجر سے کہیں بہتر ہے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یہ جواب ہوا ان کے سوال کا کہ اولاد ابراہیم اس طرح ''شام'' سے مصر میں آئی اور بیان ہوا کہ بھائیوں نے حضرت یوسف کو گھر سے

دور پھینکا تا کہ ذلیل ہو، اللہ نے عزت دی اور ملک پر اختیار دیا، ایسا ہی ہوا ہمارے حضرت ﷺ کو''۔

وَجَآءَ اِخۡوَةُ يُوۡسُفَ فَدَخَلُوۡا عَلَيۡهِ فَعَرَفَهُمۡ وَهُمۡ لَهٗ مُنۡكِرُوۡنَ ۝٥٨

اور آئے بھائی یوسف کے پھر داخل ہوئے اس کے پاس تو اس نے پہچان لیا ان کو، اور وہ نہیں پہچانتے تھے

**خلاصہ تفسیر:** غرض یوسف علیہ السلام نے با اختیار ہو کر غلہ کاشت کرانا اور جمع کرانا شروع کیا، سات برس کے بعد قحط شروع ہوا یہاں تک کہ دور دور سے یہ خبر سن کر کہ مصر میں سلطنت کی طرف سے غلہ فروخت ہوتا ہے جوق در جوق لوگ آنا شروع ہوئے:

اور (کنعان میں بھی قحط ہوا) یوسف (علیہ السلام) کے بھائی (بھی بجز بنیامین کے غلہ لینے مصر میں) آئے، پھر یوسف کے پاس پہنچے، سو یوسف نے (تو) ان کو پہچان لیا اور انہوں نے یوسف کو نہیں پہچانا۔

**فَعَرَفَهُمۡ وَهُمۡ لَهٗ مُنۡكِرُوۡنَ:** یعنی یوسف نے ان کو پہچان لیا اور انہوں نے یوسف کو نہ پہچانا، کیونکہ بھائیوں میں تغیر کم ہوا تھا، نیز یوسف علیہ السلام کو ان کے آنے کا خیال اور قوی احتمال بھی تھا، پھر نو وارد سے پوچھ بھی لیتے ہیں کہ آپ کون ہیں کہاں سے آئے ہیں اور شناسا لوگوں کو تھوڑی معلومات سے اکثر پہچان بھی لیتے ہیں بخلاف یوسف علیہ السلام کے، ان کی چونکہ جدائی کے وقت عمر بہت کم تھی، اس لیے تغیر بھی زیادہ ہو گیا تھا، اور بھائیوں کو یوسف علیہ السلام کے ہونے کا احتمال بھی نہ تھا، پھر حکام سے کوئی پوچھ بھی نہیں سکتا کہ آپ کون ہیں؟۔

* * *

**فائدہ:** موضح القرآن میں ہے:''جب حضرت یوسف ملک ''مصر'' پر مختار ہوئے خواب کے موافق سات برس خوب آبادی کی اور ملک کا اناج بھرتے گئے، پھر سات برس کے قحط میں ایک بھاؤ میانہ باندھ کر بکوایا اپنے ملک والوں کو اور پردیسیوں کو سب کو برابر مگر پردیسی کو ایک اونٹ سے زیادہ نہ دیتے تھے، اس میں خلق بچی قحط سے اور خزانہ بادشاہ کا بھر گیا، ہر طرف خبر تھی کہ مصر میں اناج سستا ہے ان کے بھائی خریدنے کی غرض سے آئے''، ان کے تن و توش، ہیئت، وضع قطع میں چنداں تغیر نہ ہوا تھا، ادھر حضرت یوسف برابر اپنے باپ بھائیوں کا تفقد کرتے رہے ہوں گے اور وہاں پہنچنے پر ان کا نام و نشان بھی دریافت کر لیا ہوگا جیسا کہ سلاطین واعیان سے ملاقات کرنے میں عموماً ہوا کرتا ہے، چنانچہ بعض تفاسیر میں ہے کہ انہوں نے یوسف علیہ السلام سے اپنا نام و نسب وغیرہ بیان کیا، ہاں یوسف علیہ السلام جدائی کے وقت چونکہ بہت چھوٹے تھے اور بھائیوں کو پہلے سے ادھر خیال بھی نہ تھا، بادشاہوں کے یہاں عام آدمیوں کی یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ ان کا نام و نسب وغیرہ دریافت کریں، اس لیے وہ یوسف کو نہ پہچان سکے۔

وَلَمَّا جَهَّزَهُمۡ بِجَهَازِهِمۡ قَالَ ائۡتُوۡنِىۡ بِاَخٍ لَّكُمۡ مِّنۡ اَبِيۡكُمۡ‌ ۚ اَلَا تَرَوۡنَ اَنِّىۡۤ اُوۡفِى الۡكَيۡلَ

اور جب تیار کر دیا انکو انکا اسباب کہا لے آئیو میرے پاس ایک بھائی جو تمہارا ہے باپ کی طرف سے، تم نہیں دیکھتے ہو کہ میں پورا دیتا ہوں ناپ

وَ اَنَا خَيۡرُ الۡمُنۡزِلِيۡنَ ۝٥٩ فَاِنۡ لَّمۡ تَاۡتُوۡنِىۡ بِهٖ فَلَا كَيۡلَ لَكُمۡ عِنۡدِىۡ وَلَا تَقۡرَبُوۡنِ ۝٦٠

اور خوب طرح اتارتا ہوں مہمانوں کو۔۱ پھر اس کو نہ لائے میرے پاس تو تمہارے لیے بھرتی نہیں میرے نزدیک اور میرے پاس نہ آئیو۲

**خلاصہ تفسیر:** یوسف علیہ السلام کا معمول تھا کہ ہر شخص کے ہاتھ غلہ صرف بقدر حاجت فروخت کرتے تھے، چنانچہ ان کو بھی جب فی آدمی ایک ایک اونٹ غلہ قیمت کے عوض ملنے لگا تو انہوں نے کہا کہ ہمارا ایک علاتی (باپ شریک) بھائی بھی ہے، اس کو باپ نے اس وجہ سے کہ ان کا ایک بیٹا گم ہو گیا تھا اپنی تسلی کے لئے رکھ لیا ہے، اس کے حصہ کا بھی ایک اونٹ غلہ زیادہ دے دیا جائے، یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ قانون کے خلاف ہے، اگر اس کا حصہ لینا ہے تو وہ خود آکر لے جائے، غرض بھائیوں کے حصہ کا غلہ ان کو دلوا دیا:

اور جب یوسف (علیہ السلام) نے ان کا سامان (غلہ کا) تیار کر دیا تو (چلتے وقت) فرما دیا کہ (اگر یہ غلہ خرچ کر کے آئندہ آنے کا ارادہ کرو تو)

اپنے علاتی بھائی کو بھی (ساتھ) لانا (تا کہ اس کا حصہ بھی دیا جا سکے) تم دیکھتے نہیں ہو کہ میں پورا ناپ کر دیتا ہوں اور میں سب سے زیادہ مہمان نوازی کرتا ہوں (پس اگر تمہارا وہ بھائی آئے گا اس کو بھی پورا حصہ دے دوں گا اور اس کی خوب خاطر داشت کروں گا جیسا تم نے اپنے ساتھ دیکھا، غرض آنے میں تو نفع ہی نفع ہے) اور اگر تم (دوبارہ آئے اور) اس کو میرے پاس نہ لائے تو (میں سمجھوں گا کہ تم مجھے دھوکہ دے کر غلہ زیادہ لینا چاہتے تھے تو اس کی سزا میں) نہ میرے پاس تمہارے نام کا غلہ ہوگا، اور نہ تم میرے پاس آنا (پس اس کے نہ لانے میں یہ نقصان ہوگا کہ تمہارے حصہ کا غلہ بھی ختم ہو جائے گا)۔

**اَلَا تَرَوْنَ اَنِّیْٓ اُوْفِی الْكَیْلَ وَاَنَا خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ**: یوسف علیہ السلام کے یہ کہنے سے معلوم ہوا کہ اپنی خوش معاملگی اور کریمانہ اخلاق کا اظہار کرنا تواضع کے خلاف نہیں ہے، بشرطیکہ اپنی مدح و تعریف مقصود نہ ہو۔

بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ اس مرتبہ یوسف علیہ السلام نے بنیامین کا بھی حصہ دے دیا مگر آئندہ کے لیے روک دیا تھا کہ بنیامین کے بغیر غلہ لینے مت آنا، یہاں یوسف علیہ السلام کے اس واقعہ میں ایک بات حیرت انگیز ہے کہ ایک طرف تو ان کے والد ماجد پیغمبر خدا یعقوب علیہ السلام ان کی مفارقت سے اتنے متاثر کہ روتے روتے نابینا ہو گئے اور دوسری طرف یوسف علیہ السلام جو خود بھی نبی و رسول ہیں، باپ سے فطری اور طبعی محبت کے علاوہ ان کے حقوق سے بھی پوری طرح باخبر ہیں، لیکن چالیس سال کے طویل زمانہ میں ایک مرتبہ بھی کبھی یہ خیال نہ آیا کہ میرے والد میری جدائی سے بے چین ہیں، اپنی خیریت کی خبر کسی ذریعہ سے ان تک پہنچوا دیں، خبر پہنچوا دینا تو اس حالت میں بھی کچھ بعید نہ تھا جب وہ غلامی کی صورت میں مصر پہنچ گئے تھے، پھر عزیز مصر کے گھر میں تو ہر طرح کی آزادی اور آسائش کے سامان بھی تھے، اس وقت کسی ذریعہ سے گھر تک خط یا خبر پہونچوا دینا کچھ مشکل نہ تھا، اسی طرح جیل کی زندگی میں دنیا جانتی ہے کہ سب خبریں ادھر کی ادھر پہونچتی ہی رہتی ہیں، خصوصاً جب اللہ تعالیٰ نے عزت کے ساتھ جیل سے رہا فرمایا اور ملک مصر کا اقتدار ہاتھ میں آیا اس وقت تو خود چل کر والدین خدمت میں حاضر ہونا سب سے پہلا کام ہونا چاہئے تھا اور یہ کسی وجہ سے مصلحت کے خلاف ہوتا تو کم از کم قاصد بھیج کر والد کو مطمئن کر دینا تو معمولی بات تھی، نیز یوسف علیہ السلام نے جس طرح اپنے بھائی بنیامین کو بلانے کی تدبیر کی اپنے والد یعقوب علیہ السلام کے بلانے کا اہتمام کیوں نہ فرمایا؟ لیکن پیغمبر خدا یوسف علیہ السلام سے کہیں منقول نہیں کہ اس کا ارادہ بھی کیا ہو اور خود کیا ارادہ کرتے جب بھائی غلہ لینے کے لئے آئے تو ان کو بھی اصل واقعہ کے اظہار کے بغیر رخصت کر دیا، یہ تمام حالات کسی ادنیٰ انسان سے بھی متصور نہیں ہو سکتے، اللہ کے برگزیدہ رسول سے یہ صورت کیسے برداشت ہوئی ؟!۔

اس حیرت انگیز خاموشی کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کو وحی سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ابھی ملاقات مقدر نہیں ہے، یا ہو سکتا ہے کوئی اور پوشیدہ مصلحت ہو، ایک جواب یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ کے ماتحت یوسف علیہ السلام کو اپنے اظہار سے روک دیا ہوگا، تفسیر قرطبی میں اس کی تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی حضرت یوسف علیہ السلام کو روک دیا تھا کہ اپنے گھر اپنے متعلق کوئی خبر نہ بھیجیں، اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کو وہی جانتے ہیں، انسان ان کا کیا احاطہ کر سکتا ہے، کبھی کوئی چیز کسی کے سمجھ میں بھی آ جاتی ہے، یہاں بظاہر اس کی اصل حکمت اس امتحان کی تکمیل تھی جو یعقوب علیہ السلام کا لیا جا رہا تھا، کیونکہ ابھی ان کا ایک اور امتحان بنیامین کی مفارقت کے ذریعہ بھی ہونے والا تھا، اور یہی وجہ تھی کہ اس واقعہ کی ابتداء ہی میں جب یعقوب علیہ السلام کو یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ یوسف کو بھیڑیئے نے نہیں کھایا، بلکہ بھائیوں کی کوئی شرارت ہے تو اس کا طبعی اقتضاء یہ تھا کہ اسی وقت جگہ پر پہنچتے، تحقیق کرتے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو دھیان اس طرف نہ جانے دیا اور پھر مدتوں کے بعد انہوں نے بھائیوں سے یہ بھی فرمایا کہ جاؤ یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو، جب اللہ تعالیٰ کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو اس کے سب اسباب اسی طرح جمع فرما دیتے ہیں۔

* * *

**فائدہ**: [1] حضرت یوسف نے اپنے بھائیوں کی خوب مدارات اور مہمانداری کی، ایک ایک اونٹ فی کس غلہ دیا، یہ خاص مہربانی اور اخلاق دیکھ کر کہتے ہیں انہوں نے درخواست کی کہ ہمارے ایک علاتی بھائی (بنیامین) کو بوڑھے غمزدہ باپ نے تسکین خاطر کے لیے اپنے پاس روک لیا ہے کیونکہ اس کا دوسرا عینی بھائی (یوسف) جو باپ کو بیحد محبوب تھا مدت ہوئی کہیں جنگل میں ہلاک ہو چکا ہے، اگر بنیامین کے حصہ کا غلہ بھی ہم کو مرحمت

فرمائیں تو بڑی نوازش ہوگی، یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ اس طرح غائب کا حصہ دینا خلاف قاعدہ ہے تم پھر آؤ تو بنیامین کو ساتھ لاؤ تب اس کا حصہ پا سکو گے، میرے اخلاق اور مہمان نوازی کو تم خود مشاہدہ کر چکے ہو، کیا اس کے بعد تمہیں اپنے چھوٹے بھائی کے لانے میں کچھ تردد ہوسکتا ہے؟

**فائدہ:** ۲۔ یعنی نہ لائے تو سمجھا جائے گا کہ تم جھوٹ بول کر اور دھوکہ دے کر خلاف قاعدہ ایک اونٹ زیادہ لینا چاہتے تھے اس کی سزا یہ ہوگی کہ آئندہ خود تمہارا حصہ بھی سوخت ہوجائے گا بلکہ میرے پاس یا میرے قلمرو میں آنے کی بھی اجازت نہ ہوگی۔

قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَاِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ﴿٦١﴾

بولے ہم خواہش کریں گے اس کے باپ سے اور ہم کو یہ کام کرنا ہے

**خلاصہ تفسیر:** وہ بولے (دیکھئے) ہم (اپنے امکان کی حد تک تو) اس کے باپ سے اس کو مانگیں گے اور ہم اس کام کو (یعنی کوشش اور درخواست) ضرور کریں گے (آگے باپ کے اختیار میں ہے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی گو باپ سے اس کا جدا کرنا سخت مشکل ہے تاہم ہماری یہ کوشش ہوگی کہ باپ کو کسی تدبیر سے راضی کرلیں، امید ہے کہ کسی نہ کسی طرح ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوکر رہیں گے۔

وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَآ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمْ

اور کہہ دیا اپنے خدمت گاروں کو رکھ دو ان کی پونجی ان کے اسباب میں شاید اس کو پہچانیں جب پھر کر پہنچیں اپنے گھر

لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٦٢﴾

شاید وہ پھر آجائیں

**خلاصہ تفسیر:** (اور جب وہاں سے بالکل چلنے لگے تو) یوسف (علیہ السلام) نے اپنے نوکروں سے کہہ دیا کہ ان کی جمع پونجی (جس کے عوض انہوں نے غلہ خریدا ہے) ان (ہی) کے اسباب میں (چھپا کر) رکھ دو تاکہ جب اپنے گھر جائیں تو اس کو (جب وہ سامان میں سے نکلے) پہچانیں شاید (یہ احسان و کرم دیکھ کر) پھر دوبارہ آئیں۔

**اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ:** چونکہ یوسف علیہ السلام کو ان کا دوبارہ آنا اور ان کے بھائی کا لانا منظور تھا اس لئے کئی طرح سے اس کی تدبیر کی: ① اول وعدہ کیا کہ اگر بنیامین کو لاؤ گے تو اس کا بھی حصہ ملے گا ② دوسرے وعید سنادی کہ اگر نہ لاؤ گے تو اپنا حصہ بھی نہ پاؤ گے ③ تیسرے دام جو کہ نقد کے علاوہ کوئی اور چیز تھی واپس کردی دو خیال سے: ۱۔ ایک یہ کہ اس سے احسان و کرم پر استدلال کر کے پھر آئیں گے ۲۔ دوسرے اس لئے کہ شاید ان کے پاس اور دام نہ ہوں اور اس لئے پھر نہ آسکیں اور جب یہ دام ہوں گے انہی کو لے کر پھر آسکتے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جو پونجی دے کر غلہ خریدا تھا، حکم دیا کہ وہ بھی خفیہ طور پر ان کے اسباب میں رکھ دو تاکہ گھر پہنچ کر جب اسباب کھولیں اور دیکھیں کہ غلہ کے ساتھ قیمت بھی واپس دے دی گئی تو دوبارہ ادھر آنے کی ترغیب مزید ہو کہ ایسے کریم بادشاہ کہاں ملتے ہیں، اور ممکن ہے قیمت نہ موجود ہونے کی بناء پر دوبارہ آنے سے مجبور رہیں اس لیے قیمت واپس کردی، بعض نے کہا کہ یوسف علیہ السلام نے بھائیوں سے قیمت لینا مروت و کرم کے خلاف سمجھا۔

فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ

پھر جب پہنچے اپنے باپ کے پاس بولے اے باپ روک دی گئی ہم سے بھرتی سو بھیج ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو کہ بھرتی لے آئیں

وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝٦٣ قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ؕ

اور ہم اس کے نگہبان ہیں ۱؎ کہا میں کیا اعتبار کروں تمہارا اس پر مگر وہی جیسا اعتبار کیا تھا اس کے بھائی پر اس سے پہلے

فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝٦٤

سو اللہ بہتر ہے نگہبان، اور وہی ہے سب مہربانوں سے مہربان ۲؎

**خلاصہ تفسیر**: غرض جب لوٹ کر اپنے باپ (یعقوب (علیہ السلام) کے پاس پہنچے کہنے لگے اے ابا! (ہماری بڑی خاطر ہوئی اور غلہ بھی ملا، مگر بنیامین کا حصہ نہیں ملا، بلکہ بنیامین کو ساتھ لیے جائے بغیر آئندہ بھی) ہمارے لئے (مطلقا) غلہ کی بندش کردی گئی، سو (اس صورت میں ضروری ہے کہ) آپ ہمارے بھائی (بنیامین) کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے تاکہ (دوبارہ غلہ لانے سے جو بات مانع ہے وہ دور ہو جائے اور) ہم (پھر) غلہ لاسکیں اور (اگر ان کے بھیجنے سے آپ کو کوئی اندیشہ ہی مانع ہے تو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ) ہم ان کی پوری حفاظت رکھیں گے۔

یعقوب (علیہ السلام) نے فرمایا کہ بس (رہنے دو) میں اس کے بارے میں بھی تمہارا ویسا ہی اعتبار کرتا ہوں جیسا اس سے پہلے اس کے بھائی (یوسف علیہ السلام) کے بارے میں تمہارا اعتبار کر چکا ہوں (یعنی میرا دل تو گواہی نہیں دیتا کہ تم اس کی حفاظت کرو گے، مگر تم کہتے ہو کہ اس کے جائے بغیر آئندہ غلہ نہ ملے گا اور عادۃً زندگی کا مدار غلہ ہی پر ہے اور جان بچانا فرض ہے) سو (خیر اگر لے ہی جاؤ گے تو) اللہ (کے سپرد، وہی) سب سے بڑھ کر نگہبان ہے (میری نگہبانی سے کیا ہوتا ہے) اور وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے (میری محبت اور شفقت سے کیا ہوتا ہے)۔

**فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ**: کسی انسان کے وعدہ اور حفاظت پر حقیقی طور سے بھروسہ کرنا غلطی ہے، اصل بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر ہونا چاہئے وہی حقیقی کارساز اور مسبب الاسباب ہیں، اسباب کو مہیا کرنا پھر ان میں تاثیر دینا سب انہی کی قدرت میں ہے، اسی لئے یعقوب علیہ السلام نے فرمایا فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا۔

* * *

**فائدہ**: ۱؎ یعنی یوسف کی طرح اس کے متعلق کچھ تردد نہ کیجئے، اب ہم چوکنے ہو گئے ہیں پوری طرح حفاظت کریں گے۔

**فائدہ**: ۲؎ یعنی یہ ہی الفاظ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ تم نے یوسف کو ساتھ لے جاتے وقت کہے تھے، پھر تمہارے وعدہ پر کیا اعتبار ہو، ہاں اس وقت ضرورت شدید ہے، جس سے اغماض نہیں کیا جاسکتا، اس لیے تمہارے ساتھ بھیجنا ناگزیر معلوم ہوتا ہے، سو میں اس کو خدا کی حفاظت میں دیتا ہوں، وہ ہی اپنی مہربانی سے اس کی حفاظت کرے گا، اور مجھ کو یوسف کی جدائی کے بعد دوسری مصیبت سے بچائے گا۔

وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ؕ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ؕ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا

اور جب کھولی اپنی چیز بست پائی اپنی پونجی کہ پھیر دی گئی انکی طرف، بولے اے باپ ہم کو اور کیا چاہیے (دے جو ہم چاہتے ہیں)، یہ پونجی ہماری

رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ؕ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ۝٦٥

پھیر دی ہے ہم کو، اب جائیں تو رسد لائیں ہم اپنے گھر کو اور خبرداری کرینگے اپنی بھائی کی اور زیادہ لیویں بھرتی ایک اونٹ کی ۱؎ وہ بھرتی آسان ہے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (اس گفتگو کے بعد) جب انہوں نے اپنا اسباب کھولا تو (اس میں) ان کی جمع پونجی (بھی) ملی کہ ان ہی کو واپس کردی گئی، کہنے لگے کہ اے ابا! (لیجئے) اور ہم کو کیا چاہئے، یہ ہماری جمع پونجی بھی تو ہم ہی کو لوٹا دی گئی (ایسا کریم بادشاہ ہے اور اس سے زیادہ کس عنایت کا انتظار کریں، یہ عنایت بہت ہے، اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ایسے کریم بادشاہ کے پاس پھر جائیں گے اور وہ موقوف ہے بھائی کو ساتھ لے جانے پر، اس لئے اجازت ہی دیدیجئے ان کو ساتھ لے جائیں گے) اور اپنے گھر والوں کے واسطے (مزید) رسد لائیں گے، اور اپنے بھائی کی خوب حفاظت رکھیں گے، اور ایک اونٹ کا بوجھ غلہ اور زیادہ لائیں گے (کیونکہ جس قدر اس وقت لائے ہیں) یہ تو تھوڑا سا غلہ ہے (جلد ہی ختم ہو جائے گا، پھر اور ضرورت ہوگی اور آئندہ غلہ ملنا بنیامین کو ساتھ لے جانے پر موقوف ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی بنیامین کا حصہ۔

**فائدہ:** ۲ یعنی ایسی آسان بھرتی کو چھوڑنا نہیں چاہیے، جس طرح ہو بنیامین کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے، بعض نے ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ کا اشارہ پہلے جو غلہ لائے تھے اس کی طرف کیا ہے اور یسیر کو بمعنی قلیل لیا ہے، یعنی جو پہلے لائے ہیں وہ حاجت کے اعتبار سے تھوڑا ہے، قحط کے زمانہ میں کہاں تک کام دے گا، لہذا ضروری ہے کہ جس طرح بن پڑے، ہم دوبارہ جائیں اور سب کا حصہ لے کر آئیں۔

قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ

کہا ہرگز نہ بھیجوں گا اسکو تمہارے ساتھ یہاں تک کہ دو مجھ کو عہد خدا کا کہ البتہ پہنچا دو گے اسکو میرے پاس، مگر یہ کہ گھیرے (گھر) جاؤ تم سب

فَلَمَّاۤ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۶۶﴾

پھر جب دیا اس کو سب نے عہد بولا اللہ ہماری باتوں پر نگہبان ہے

**خلاصہ تفسیر:** یعقوب (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (خیر اس حالت میں بھیجنے سے انکار نہیں، لیکن) اس وقت تک ہرگز اس کو تمہارے ہمراہ نہ بھیجوں گا جب تک کہ اللہ کی قسم کھا کر مجھ کو پکا قول نہ دو گے کہ تم اس کو ضرور لے ہی آؤ گے، ہاں! اگر کہیں گھر ہی جاؤ تو مجبوری ہے (چنانچہ سب نے اس پر قسم کھالی) سو جب وہ قسم کھا کر اپنے باپ کو قول دے چکے تو انہوں نے فرمایا کہ ہم لوگ جو بات چیت کر رہے ہیں یہ سب اللہ کے حوالے ہے (یعنی وہی ہمارے قول و اقرار کا گواہ ہے کہ سن رہا ہے اور وہی اس قول کو پورا کر سکتا ہے)۔

لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ: اس میں ایک بات یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسی قسم دینا نہیں چاہئے جس کا پورا کرنا بالکل اس کے قبضہ میں نہ ہو جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے بنیامین کو صحیح وسالم واپس لانے کی قسم دی تو اس میں سے اس حالت کو مستثنیٰ کر دیا کہ یہ بالکل عاجز و مجبور ہو جائیں یا خود بھی سب ہلاکت میں پڑ جائیں، اسی لئے رسول کریم ﷺ نے جب صحابہ کرام سے اپنی اطاعت کا عہد لیا تو خود اس میں استطاعت کی قید لگا دی یعنی جہاں تک ہماری قدرت و استطاعت میں داخل ہے، ہم آپ کی پوری اطاعت کریں گے۔

قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ: اس کہنے سے دو غرض ہوئیں: ① ایک ان کو اپنے قول کے خیال رکھنے کی ترغیب اور تنبیہ کہ اللہ کو حاضر و ناضر سمجھنے سے یہ بات ہوتی ہے ② اور دوسرے اپنی اس تدبیر کا منتہی تقدیر کو قرار دیا کہ اگر خدا تعالیٰ کو منظور ہوگا تب یہ قول و قرار پورا ہو سکتا ہے، اور یہی توکل کا حاصل ہے، اور اس کے بعد بنیامین کو ہمراہ جانے کی اجازت دے دی، غرض دوبارہ مصر کے سفر کو مع بنیامین سب تیار ہو گئے۔

ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ یعقوب علیہ السلام جب ان بیٹوں کا تجربہ کر چکے تھے تو پھر حضرت بنیامین کو خطرہ میں ڈالنا کیسے جائز تھا؟ اس کا جواب خلاصہ تفسیر میں گذر چکا کہ بنیامین کو نہ بھیجنے میں نقصان یقینی تھا اور بھیجنے میں نقصان کا اندیشہ تھا جس کا تدارک بھی قسم اور عہد و پیمان سے ہو گیا، سو

اب بنیامین کو بھیجنا جائز بلکہ ضروری ہوگیا تھا۔

برادران یوسف سے جو خطا اس سے پہلے سرزد ہوئی وہ بہت سے کبیرا اور شدید گناہوں پر مشتمل تھی، مثلاً اول، جھوٹ بول کر والد کو اس پر آمادہ کرنا کہ وہ یوسف کو ان کے ساتھ تفریح کے لئے بھیج دیں، دوسرے والد سے عہد کر کے اس کی خلاف ورزی، تیسرے چھوٹے معصوم بھائی سے بے رحمی اور شدت کا برتاؤ، چوتھے ضعیف والد کی انتہائی دل آزاری کی پروا نہ کرنا، پانچویں ایک بے گناہ انسان کو قتل کرنے کا منصوبہ بنانا چھٹے ایک آزاد انسان کو جبراً اور ظلماً فروخت کر دینا، یہ ایسے انتہائی اور شدید جرائم تھے کہ جب یعقوب علیہ السلام پر یہ واضح ہوگیا کہ انہوں نے جھوٹ بولا ہے اور دیدہ و دانستہ یوسف علیہ السلام کو ضائع کیا ہے تو اس کا تقاضا بظاہر یہ تھا کہ وہ ان صاحبزادوں سے قطع تعلق کر لیتے یا ان کو نکال دیتے، مگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایسا نہیں کیا، بلکہ وہ بدستور والد کی خدمت میں رہے، یہاں تک کہ انھیں مصر سے غلہ لانے کے لئے بھیجا اور اس پر مزید یہ کہ دوبارہ پھر ان کو چھوٹے بھائی کے متعلق والد سے عرض معروض کرنے کا موقع ملا اور بالآخران کی بات مان کر چھوٹے صاحبزادہ کو بھی ان کے حوالہ کر دیا، اس سے معلوم ہوا کہ اولاد سے کوئی گناہ وخطا سرزد ہو جائے تو باپ کو چاہئے کہ تربیت کر کے ان کی اصلاح کی فکر کرے اور جب تک اصلاح کی امید ہو قطع تعلق نہ کرے، جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایسا ہی کیا اور بالآخر وہ سب اپنی خطاؤں پر نادم اور گناہوں سے تائب ہوئے، ہاں! اگر اصلاح سے مایوسی ہو جائے اور ان کے ساتھ تعلق قائم رکھنے میں دوسروں کے دین کا ضرر محسوس ہو تو پھر قطع تعلق کر لینا مناسب ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی اگر تقدیر الٰہی سے کوئی ایسا حادثہ پیش آجائے جس میں تم سب گھر جاؤ اور نکلنے کی کوئی سبیل نہ رہے تب تو میں کیا کہہ سکتا ہوں، ہاں اپنے مقدور اور زندگی بھر بنیامین کی حفاظت میں کوتاہی نہ کرو گے، یہ پختہ عہد و پیمان اور قسمیں لے کر زیادہ تاکید واہتمام کے طور پر فرمایا: وَاللّٰہُ عَلٰی مَانَقُوْلُ وَکِیْلٌ یعنی جو کچھ عہد و پیمان ہم اس وقت کر رہے ہیں وہ سب خدا کے سپرد ہیں، اگر کسی نے خیانت اور بدعہدی کی وہ ہی سزا دے گا، یا یہ کہ قول وقرار تو اپنے مقدور کے موافق پختہ کر رہے ہیں لیکن ان باتوں سے جو مقصد اصلی ہے وہ خدا کی حفاظت ونگہبانی سے ہی پورا ہو سکتا ہے، خدا نہ چاہے تو سارے اسباب وتدابیر رکھی رہ جائیں، کچھ نہ ہو، حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''ظاہری اسباب بھی پختہ کر لیے اور بھروسہ اللہ پر رکھا، یہی حکم ہے ہر کسی کو''۔

**وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَمَاۤ اُغْنِيْ عَنْكُمْ**

اور کہا اے بیٹو نہ داخل ہونا ایک دروازہ سے اور داخل ہونا کئی دروازوں سے جدا جدا، اور میں نہیں بچا سکتا تم کو

**مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۶۷﴾**

اللہ کی کسی بات سے، حکم کسی کا نہیں سوائے اللہ کے، اسی پر مجھ کو بھروسہ ہے، اور اسی پر بھروسہ چاہیے بھروسہ کرنے والوں کو

**خلاصہ تفسیر:** اور (چلتے وقت) یعقوب (علیہ السلام) نے (ان سے) فرمایا کہ اے میرے بیٹو! (جب مصر میں پہنچو تو) سب کے سب ایک ہی دروازہ سے مت جانا بلکہ علیحدہ علیحدہ دروازوں سے جانا اور (یہ محض ایک ظاہری تدبیر ہے، بعض مکروہات مثلاً نظر بد وغیرہ سے بچنے کی، باقی) خدا کے حکم کو تم پر سے میں ٹال نہیں سکتا، حکم تو بس اللہ تعالیٰ کا (چلتا) ہے (اس ظاہری تدبیر کے باوجود دل سے) اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی پر بھروسہ رکھنے والوں کو بھروسہ رکھنا چاہیے (یعنی تم بھی اسی پر بھروسہ رکھنا، تدبیر پر نظر مت کرنا، غرض سب رخصت ہو کر چل پڑے)۔

يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ: ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو یہ وصیت پہلی مرتبہ نہیں کی، اس دوسرے سفر کے موقع پر وصیت فرمائی؟ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ پہلی مرتبہ تو یہ لوگ مصر میں مسافرانہ اور شکستہ حالت میں داخل ہوئے تھے، نہ کوئی ان کو پہچانتا تھا، نہ کسی سے ان کے حال پر زیادہ توجہ دینے کا خطرہ تھا، مگر پہلے ہی سفر میں ملک مصر نے ان کو غیر معمولی اکرام کیا، جس سے عام ارکان دولت اور

شہر کے لوگوں میں تعارف ہوگیا تو اب یہ خطرہ قوی ہوگیا کہ کسی کی نظر لگ جائے، یا سب کو ایک باشوکت جماعت سمجھ کر کچھ لوگ حسد کرنے لگیں، نیز اس مرتبہ بنیامین چھوٹے بیٹے کا ساتھ ہونا بھی والد کے لئے اور زیادہ توجہ دینے کا سبب ہوا، پہلی بار وہ ساتھ نہ تھے۔

**وَمَآ اُغْنِیْ عَنْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ**: حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایک طرف تو نظر بد یا حسد کے اندیشہ سے اولاد کو یہ وصیت فرمائی کہ سب مل کر ایک دروازہ سے شہر میں داخل نہ ہوں، دوسری طرف ایک حقیقت کا اظہار بھی ضروری سمجھا جس سے غفلت کی بناء پر ایسے معاملات میں بہت سے عوام جاہلانہ خیالات واوہام کے شکار ہوجاتے ہیں وہ یہ کہ نظر بد کی تاثیر کسی انسان کے جان ومال میں ایک قسم کا مسمریزم ہے اور وہ ایسا ہی ہے جیسے مضر دوا یا غذا انسان کو بیمار کردیتی ہے، گرمی، سردی کی شدت سے امراض پیدا ہوجاتے ہیں، اسی طرح نظر بد یا مسمریزم کے تصرفات بھی انہی اسباب عادیہ میں سے ہیں کہ نظر یا خیال کی قوت سے اس کے آثار ظاہر ہوجاتے ہیں، ان میں خود کوئی تاثیر حقیقی نہیں ہوتی، بلکہ سب اسباب عالم حق جل شانہ کی قدرت کاملہ اور مشیت وارادہ کے تابع ہیں، تقدیر خداوندی کے مقابلہ میں نہ کوئی مفید تدبیر مفید ہوسکتی ہے نہ مضر تدبیر کی مضرت اثر انداز ہوسکتی ہے اس لئے ارشاد فرمایا: **وَمَآ اُغْنِیْ عَنْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَعَلَیْہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُتَوَکِّلُوْنَ** یعنی نظر بد سے بچنے کی جو تدبیر میں نے بتلائی ہے میں جانتا ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت وارادہ کو نہیں ٹال سکتی، حکم تو صرف اللہ ہی کا چلتا ہے، البتہ انسان کو ظاہری تدبیر کرنے کا حکم ہے اس لئے یہ وصیت کی گئی، مگر میرا بھروسہ اس تدبیر پر نہیں، بلکہ اللہ ہی پر اعتماد ہے اور ہر شخص کو یہی لازم ہے کہ اسی پر اعتماد اور بھروسہ کرے ظاہری اور مادی تدبیروں پر بھروسہ نہ کرے۔

* * *

**فائدہ:** برادران یوسف پہلی مرتبہ جو مصر گئے تھے عام مسافروں کی طرح بلا امتیاز شہر میں داخل ہو گئے تھے لیکن یوسف علیہ السلام کی خاص توجہات والطاف کو دیکھ کر یقیناً وہاں کے لوگوں کی نظریں ان کی طرف اٹھنے لگی ہوں گی، اب دوبارہ جانا خاص شان واہتمام سے بلکہ کہنا چاہیے کہ ایک طرح کی یوسف کی دعوت پر تھا، بنیامین جس کی حفاظت ومحبت یعقوب علیہ السلام یوسف کے بعد بہت کرتے تھے، بھائیوں کے ہمراہ تھے یعقوب علیہ السلام کو خیال گزرا کہ ایک باپ کے گیارہ وجیہ خوش رو بیٹوں کا خاص شان سے بہیئت اجتماعی شہر میں داخل ہونا خصوصاً اس برتاؤ کے بعد جو عزیز مصر (یوسف) کی طرف سے لوگ پہلے مشاہدہ کر چکے تھے، ایسی چیز ہے جس کی طرف عام نگاہیں ضرور اٹھیں گی، "العین حق" نظر لگ جانا ایک حقیقت ہے (اور آجکل مسمریزم کے عجائبات تو عموماً اسی قوت نگاہ کے کرشمے ہیں) یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کو نظر بد اور حسد وغیرہ مکروہات سے بچانے کے لیے یہ ظاہری تدبیر تلقین فرمائی کہ متفرق ہو کر معمولی حیثیت سے شہر کے مختلف دروازوں سے داخل ہوں، تاکہ خواہی نہ خواہی پبلک کی نظریں ان کی طرف نہ اٹھیں ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کر دیا کہ میں کوئی تدبیر کر کے قضاء وقدر کے فیصلوں کو نہیں روک سکتا، تمام کائنات میں حکم صرف خدا کا چلتا ہے، ہمارے سب انتظامات حکم الٰہی کے مقابلہ میں بیکار ہیں، ہاں تدبیر کرنا بھی اسی نے سمجھایا ہے اور جائز رکھا ہے، آدمی کو چاہیے کہ بچاؤ کی تدبیر کرلے مگر بھروسہ خدا پر رکھے گویا لڑکوں کو سنایا کہ میری طرح تم بھی تہ دل سے خدا کی حفاظت پر بھروسہ رکھو، تدابیر پر مغرور نہ بنو۔

وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَیْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ؕ مَا کَانَ یُغْنِیْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا حَاجَةً

اور جب داخل ہوئے جہاں سے کہا تھا ان کے باپ نے[1] کچھ نہ بچا سکتا تھا ان کو اللہ کی کسی بات سے مگر ایک خواہش تھی

فِیْ نَفْسِ یَعْقُوْبَ قَضٰهَا ؕ وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۶۸ ع

یعقوب کے جی میں سو پوری کر چکا، اور وہ تو خبردار تھا جو کچھ ہم نے اس کو سکھایا، لیکن بہت لوگوں کو خبر نہیں[2]

**خلاصہ تفسیر:** اور جب (مصر پہنچ کر) جس طرح ان کے باپ نے کہا تھا (اسی طرح شہر کے) اندر داخل ہوئے تو باپ کا ارمان پورا ہوگیا (باقی) ان کے باپ کو ان سے (یہ تدبیر بتلا کر) خدا کا حکم ٹالنا مقصود نہ تھا (تاکہ ان پر کسی قسم کا اعتراض یا اس تدبیر کے نافع ہونے سے ان پر

کوئی شبہ لازم آئے، چنانچہ خود انہوں نے ہی فرمادیا تھا: وَمَآ اُغْنِیْ عَنْكُمْ الخ) لیکن یعقوب (علیہ السلام) کے جی میں (تدبیر کے درجہ میں) ایک ارمان (آیا) تھا جس کو انہوں نے ظاہر کردیا، اور وہ بلاشبہ بڑے عالم تھے بایں وجہ کہ ہم نے ان کو علم دیا تھا (وہ اپنے علم کے خلاف تدبیر کے مؤثر حقیقی ہونے کا کب اعتقاد کرسکتے تھے، ان کے اس قول کی وجہ صرف وہی ایک عملی تدبیر بتلانا اور ظاہری انتظام کرنا تھا جو کہ جائز اور محمود ہے) لیکن اکثر لوگ اس کا علم نہیں رکھتے (بلکہ جہل سے تدبیر کو مؤثر حقیقی اعتقاد کرلیتے ہیں)۔

مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ: توکل کے ساتھ تدبیر کرنا شان نبوت کے خلاف نہیں، البتہ اگر نظر بد کوئی چیز نہ ہوتی تب بھی شبہ کی گنجائش تھی، لیکن دلیل نقلی اور تجربہ سے نظر بد کا مؤثر ہونا خود ثابت ہے اس لیے شبہ کی اصلاً گنجائش نہیں رہی، اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے جس حقیقت کا اظہار فرمایا، اتفاقاً ہوا بھی کچھ ایسا ہی کہ اس سفر میں بنیامین کو حفاظت کے ساتھ واپس لانے کی ساری تدبیریں مکمل کرلینے کے باوجود سب چیزیں ناکام ہوگئیں اور بنیامین کو مصر میں روک لیا گیا جس کے نتیجہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کو ایک دوسرا شدید صدمہ پہنچا، ان کی تدبیر کا ناکام ہونا جو اس آیت میں ذکر ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ اصل مقصد کے لحاظ سے تو بظاہر تدبیر ناکام ہوگئی اگرچہ نظر بد یا حسد وغیرہ سے بچنے کی تدبیر کامیاب ہوئی، کیونکہ اس سفر میں ایسا واقعہ پیش نہیں آیا، مگر بتقدیر الٰہی جو حادثہ پیش آنے والا تھا اس طرف یعقوب علیہ السلام کی نظر نہ گئی اور نہ اس کے لئے کوئی تدبیر کرسکے، مگر اس ظاہری ناکامی کے باوجود ان کے توکل کی برکت سے یہ دوسرا صدمہ پہلے صدمہ کا بھی علاج ثابت ہوا اور بڑی عافیت وعزت کے ساتھ یوسف علیہ السلام اور بنیامین دونوں سے ملاقات انجام کار نصیب ہوئی، سو اس تدبیر کا مفید نہ ہونا اصل مقصود کے اعتبار سے صحیح ہوا، اور یعقوب علیہ السلام کی اس تدبیر کے بیان کرنے سے احقر کے ذوق میں غالباً خود اس قول کا نقل کرنا یا ایسی تدبیروں کی ترغیب دینا مقصود نہیں ہے، بلکہ اس مشہور حکایت پر ظاہر میں جو شبہ ہوتا تھا کہ یہ تدبیر شان نبوت کے خلاف ہے اس کا جواب دینا مقصود ہے کہ خلاف شان اس وقت ہوتی جبکہ اس کو مؤثر حقیقی سمجھتے، اور خدا پر بھروسہ رکھ کر تدبیر کرنا شان نبوت کے خلاف نہیں۔

مذکورہ آیتوں سے چند مسائل اور احکام معلوم ہوئے: ① اول: یہ کہ نظر بد کا لگ جانا حق ہے، اس سے بچنے کی تدبیر کرنا اسی طرح مشروع اور محمود ہے جس طرح مضر غذاؤں اور مضر افعال سے بچنے کی تدبیر کرنا ② دوسرے: یہ کہ لوگوں کے حسد سے بچنے کے لئے اپنی مخصوص نعمتوں اور اوصاف کا لوگوں سے چھپانا درست ہے ③ تیسرے: یہ کہ مضر آثار سے بچنے کے لئے ظاہری اور مادی تدبیریں کرنا توکل اور شان انبیاء علیہم السلام کے خلاف نہیں ④ چوتھے: یہ کہ جب ایک شخص کو کسی دوسرے شخص کے بارے میں کسی تکلیف کے پہنچ جانے کا اندیشہ ہو تو بہتر یہ ہے کہ اس کو آگاہ کردے اور اندیشہ سے بچنے کی ممکن تدبیر بتلادے جیسے یعقوب علیہ السلام نے کیا ⑤ پانچویں: یہ کہ جب کسی شخص کو دوسرے شخص کا کوئی کمال یا نعمت تعجب انگیز معلوم ہو اور خطرہ ہو کہ اس کو نظر بد لگ جائے گی تو اس پر واجب ہے کہ اس کو دیکھ کر ''بارک اللہ'' یا ''ماشاء اللہ'' کہہ لے تاکہ دوسرے کو کوئی تکلیف نہ پہونچے ⑥ چھٹے: یہ کہ نظر بد سے بچنے کے لئے ہر ممکن تدبیر کرنا جائز ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی دعاء اور تعویذ وغیرہ سے علاج کیا جائے جیسا کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت جعفر بن ابی طالب کے دو لڑکوں کو کمزور دیکھ کر اس کی اجازت دی کہ تعویذ وغیرہ کے ذریعہ ان کا علاج کیا جائے ⑦ ساتویں: یہ کہ دانشمند مسلمان کا کام یہ ہے کہ ہر کام میں اصل بھروسہ تو اللہ تعالیٰ پر رکھے مگر ظاہری اور مادی اسباب کو بھی نظر انداز نہ کرے جس قدر جائز اسباب اپنے مقصد کے حصول کے لئے اس کے اختیار میں ہوں ان کو بروئے کار لانے میں کوتاہی نہ کرے جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے کیا اور رسول کریم ﷺ نے بھی اس کی تعلیم فرمائی ہے، یہی پیغمبرانہ توکل اور سنت رسول ﷺ ہے۔

* * *

**فائدہ:** لے یعنی مختلف دروازوں سے علیحدہ علیحدہ۔

**فائدہ:** لے یعنی جس طرح کہا تھا داخل ہوئے تو اگرچہ نظر یا ٹوک نہ لگی، لیکن تقدیر اور طرف سے آئی (بنیامین کو الزام سرقہ کے سلسلہ میں روک لیا گیا) تقدیر دفع نہیں ہوتی، سو جن کو علم ہے ان کو تقدیر کا یقین اور اسباب کا بچاؤ دونوں حاصل ہو سکتے ہیں، لیکن بے علم سے ایک ہو تو دوسرا نہ ہو، یا

ہمہ تن اسباب پر اتکاء کر کے تقدیر کا انکار کر بیٹھتا ہے یا تقدیر پر یقین رکھنے کے یہ معنی سمجھ لیتا ہے کہ اسباب کو معطل کر دیا جائے، البتہ عارف اور باخبر لوگ تقدیر و تدبیر کو جمع کرتے اور ہر ایک کو اس کے درجہ میں رکھتے ہیں۔

وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّيْۤ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۹﴾

اور جب داخل ہوئے یوسف کے پاس اپنے پاس رکھا اپنے بھائی کو، کہا تحقیق میں ہوں بھائی تیرا سو غمگین مت ہو ان کاموں سے جو انہوں نے کیے ہیں

**خلاصہ تفسیر:** اور جب یہ لوگ (یعنی برادران یوسف) یوسف (علیہ السلام) کے پاس پہنچے (اور بنیامین کو پیش کر کے کہا کہ ہم آپ کے حکم کے موافق ان کو لائے ہیں) انہوں نے اپنے بھائی کو اپنے ساتھ ملا لیا (اور تنہائی میں ان سے) کہا کہ میں تیرا بھائی (یوسف) ہوں، سو یہ لوگ جو کچھ (بدسلوکی) کرتے رہے ہیں اس کا رنج مت کرنا (کیونکہ اب تو اللہ نے ہمیں ملا دیا، اب سب غم بھلا دینا چاہئے)۔

یوسف علیہ السلام کے ساتھ بدسلوکی تو ظاہر اور مشہور ہے، رہا بنیامین کے ساتھ، سو یا تو ان کو بھی کچھ تکلیف دی ہو ورنہ یوسف علیہ السلام کی جدائی کیا ان کے حق میں کچھ کم تکلیف تھی، پھر دونوں بھائیوں نے مشورہ کیا کہ کوئی ایسی صورت ہو کہ بنیامین یوسف علیہ السلام کے پاس رہیں، کیونکہ ویسے بغیر کسی تدبیر کے رہنے میں تو دوسرے بھائیوں کے اصرار اور جھگڑا کرنے کا اندیشہ تھا، وہ بنیامین کو ساتھ واپس لے جانے پر عہد اور قسم دے چکے تھے، اور پھر اگر وجہ بھی ظاہر ہو گئی تو راز کھلا اور اگر مخفی رہی تو یعقوب علیہ السلام کا رنج بڑھے گا کہ بلا سبب کیوں رکھے گئے یا کیوں رہ گئے، یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ تدبیر تو ہے مگر ذرا تمہاری بدنامی ہے، بنیامین نے کہا کچھ پرواہ نہیں، غرض ان میں یہ امر قرار پا گیا اور ادھر سب کو غلہ دے کر ان کی رخصت کا سامان درست کیا گیا۔

یہاں ایک سوال ہوتا ہے کہ یعقوب علیہ السلام بھی مشہور لوگوں میں سے تھے اور یوسف علیہ السلام بھی بہت مشہور تھے، پھر اتنے عرصہ تک یوسف علیہ السلام کی خبر ان کو کیسے مخفی رہی؟ اس کا جواب روح المعانی میں یہ دیا ہے کہ یہ بات غلبہ تقدیر سے خلاف عادت ہوئی، خدا تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ان سے خبر کو پوشیدہ رکھا۔

* * *

**فائدہ:** حضرت یوسف نے بنیامین کے ساتھ ممتاز معاملہ کیا، اور خلوت میں آہستہ سے آگاہ کر دیا کہ میں تیرا حقیقی بھائی (یوسف) ہوں، جو مظالم ان علاتی بھائیوں نے ہم پر کیے کہ مجھے باپ سے جدا کر کے کنویں میں ڈالا، غلام بنا کر بیچا، اور ہمارے باپ بھائی وغیرہ کو فراق کے صدمہ میں مبتلا کیا یا اب یہاں آتے ہوئے تمہارے ساتھ کوئی سختی کی، ان باتوں سے غمگین مت ہو، وقت آ گیا ہے کہ ہمارے سب غم غلط ہو جائیں اور سختیوں کے بعد حق تعالیٰ راحت و عزت نصیب فرمائے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''اس بھائی کو جو یوسف نے آرزو سے بلایا اوروں کو حسد ہوا، اس سفر میں اس کو بات بات پر جھڑکتے اور طعنے دیتے، اب حضرت یوسف نے تسلی کر دی''۔

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِيْ رَحْلِ اَخِيْهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ

پھر جب تیار کر دیا ان کے واسطے اسباب ان کا رکھ دیا پینے کا پیالہ اسباب میں اپنے بھائی کے پھر پکارا پکارنے والے نے اے قافلہ والو

اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ ﴿۷۱﴾

تم تو البتہ چور ہو۔ کہنے لگے منہ کر کے ان کی طرف تمہاری کیا چیز گم ہو گئی۔

**خلاصہ تفسیر:** پھر جب یوسف (علیہ السلام) نے ان کا سامان (غلہ اور روانگی کا) تیار کر دیا تو (خود یا کسی معتمد کے ذریعہ) پانی پینے کا برتن (کہ وہی غلہ دینے کا پیمانہ بھی تھا) اپنے بھائی کے اسباب میں رکھ دیا، پھر (جب یہ لاد پھاند کر خوشی خوشی چلے تو یوسف علیہ السلام کے حکم سے

پیچھے سے) ایک پکارنے والے نے پکارا کہ اے قافلہ والو! تم ضرور چور ہو، وہ ان (تلاش کرنے والوں) کی طرف متوجہ ہوکر کہنے لگے کہ تمہاری کیا چیز گم ہوگئی ہے (جس کی چوری کا ہم پر شبہ ہوا)۔

**إِنَّكُمْ لَسَٰرِقُونَ:** ظاہر یہ ہے کہ یہ اعلان یوسف علیہ السلام کے حکم سے ہوا تو اس بات کے سچ ہونے کی کیا توجیہ ہے؟ احقر کے نزدیک یہ توریہ ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ ایسی بات کہی جائے جس سے کہنے والے کی مراد کچھ ہو اور سننے والا دوسرے معنی سمجھے، اور توریہ ضرورت کے وقت جائز ہے، پس یوسف علیہ السلام کی مراد ان کو چور کہنے سے یہ تھی کہ ان لوگوں نے یعقوب علیہ السلام سے یوسف علیہ السلام کو بطور چوری کے غائب کر دیا تھا اور سننے والے یہ سمجھے کہ پیمانہ شاہی کے چور یہی ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی جب یوسف علیہ السلام کے حکم سے ان کا غلہ لدوایا اور سامان سفر تیار کیا گیا تو ایک چاندی کا پیالہ اپنے بھائی بنیامین کے اسباب میں بلا اطلاع رکھ دیا، جس وقت قافلہ روانہ ہونے لگا، محافظین کو پیالہ کی تلاش ہوئی، آخر ان کا شبہ اسی قافلہ پر گیا، قافلہ تھوڑی دور نکلا تھا کہ محافظین میں سے کسی نے آواز دی کہ ٹھہرو، تم لوگ یقیناً چور معلوم ہوتے ہو۔

**تنبیہ:** اگر یہ لفظ یوسف کے حکم سے کہے گئے تو یہ مطلب ہوگا کہ کوئی مال چراتا ہے، تم وہ ہو جنہوں نے باپ کی چوری سے بھائی کو بیچ ڈالا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی ہم کو خواہ مخواہ چور کیوں بناتے ہو، اگر تمہاری کوئی چیز گم ہوئی ہے وہ بتلاؤ ہم ابھی کہیں گئے نہیں ہمارے اسباب میں تلاش کرلو۔

قَالُوا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَن جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ وَأَنَا بِهِ زَعِيمٌ ﴿٧٢﴾

بولے ہم نہیں پاتے بادشاہ کا پیمانہ اور جو کوئی اس کو لائے اس کو ملے ایک بوجھ اونٹ کا، اور میں ہوں اس کا ضامن

**خلاصہ تفسیر:** انہوں نے کہا کہ ہم کو بادشاہی پیمانہ نہیں ملتا (وہ غائب ہے) اور جو شخص اس کو (لاکر) حاضر کرے اس کو ایک بار شتر (اونٹ) غلہ (بطور انعام کے خزانہ سے) ملے گا (یا یہ مطلب ہو کہ اگر خود چور بھی مال دیدے تو معافی کے بعد انعام پائے گا) اور میں اس (کے دلوانے) کا ذمہ دار ہوں (غالباً یہ پکار اور یہ انعام کا وعدہ یوسف علیہ السلام کے حکم سے ہوا تھا)۔

**صُوَاعَ الْمَلِكِ:** وہ پانی پینے کا خاص ممتاز برتن تھا، اسے غلہ ناپنے کے لیے تجویز کیا تھا. جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ لینے والوں کا اعزاز و اکرام ظاہر ہو، سائلین بھیک مانگنے والوں کی طرح ذلیل نہ سمجھے جائیں، نیز غلہ تھوڑا تھوڑا بقدر ضرورت دیا جاتا تھا اس لیے چھوٹا برتن تجویز کیا، چونکہ اس سے بادشاہی کام ہوتا تھا اس لیے اس کا لقب ''صواع الملک'' ہوگیا تھا، یہ ضروری نہیں کہ خاص بادشاہ کے پینے کا برتن ہو، اور نہ یہ ضروری ہے کہ بادشاہ سے مراد یوسف علیہ السلام ہوں۔

* * *

**فائدہ:** محافظین نے کہا، بادشاہ کے پانی پینے کا پیالہ یا غلہ ناپنے کا پیمانہ گم ہوگیا ہے، اگر بدون حیل و حجت کے کوئی شخص حاضر کر دے گا تو غلہ کا ایک اونٹ انعام پائے گا، میں اس کا ذمہ دار ہوں۔

قَالُوا تَاللَّهِ لَقَدْ عَلِمْتُم مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كُنَّا سَارِقِينَ ﴿٧٣﴾

بولے قسم اللہ کی تم کو معلوم ہے ہم شرارت کرنے کو نہیں آئے ملک میں اور نہ ہم کبھی چور تھے ۱؎

قَالُوا فَمَا جَزَاؤُهُ إِن كُنتُمْ كَاذِبِينَ ﴿٧٤﴾

بولے پھر کیا سزا ہے اس کی، اگر تم نکلے جھوٹے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** یہ لوگ کہنے لگے کہ بخدا! تم کو خوب معلوم ہے کہ ہم ملک میں فساد پھیلانے (جس میں چوری بھی داخل ہے) نہیں آئے اور ہم لوگ چوری کرنے والے نہیں (یعنی ہمارا یہ شیوہ نہیں ہے) ان (ڈھونڈنے والے) لوگوں نے کہا اچھا اگر تم جھوٹے نکلے (اور تم میں سے کسی پر چوری ثابت ہوگئی) تو اس (چور) کی کیا سزا ہے؟۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی مصر میں ہمارا چال چلن عام طور پر معلوم ہے کیا کوئی بتلا سکتا ہے کہ ہم نے یہاں کبھی کچھ شرارت کی؟ نہ ہم شرارتوں کے لیے یہاں آئے، اور نہ چوروں کے خاندان سے ہیں۔

**فائدہ:** ۲ محافظین نے کہا کہ تم فضول حجتیں کر رہے ہو، اگر مال مسروقہ تمہارے پاس سے برآمد ہو گیا تو کیا کرو گے۔

قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۵﴾

کہنے لگے اس کی سزا یہ کہ جس کے اسباب میں سے ہاتھ آئے وہی اس کے بدلے میں جائے، ہم یہی سزا دیتے ہیں ظالموں کو

**خلاصہ تفسیر:** انہوں نے (یعقوب علیہ السلام کی شریعت کے مطابق) جواب دیا کہ اس کی سزا یہ ہے کہ وہ جس شخص کے اسباب میں ملے پس وہی شخص اپنی سزا ہے (یعنی چوری کی عوض میں خود اس کی ذات کو صاحب مال اپنا غلام بنا لے) ہم لوگ ظالموں (یعنی چوروں) کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں (یعنی ہماری شریعت میں یہی مسئلہ اور عمل ہے)۔

* * *

**فائدہ:** یہ شریعت ابراہیمی میں چور کی سزا تھی، یعنی جس کے پاس سے چوری نکلے وہ ایک سال تک غلام ہو کر رہے، برادران یوسف نے اپنے قانون شرعی کے موافق بے تامل سزا کا ذکر کر دیا، کیونکہ انھیں پورا یقین تھا کہ ہم چور نہیں، نہ چوری کا مال ہمارے پاس سے برآمد ہو سکتا ہے، اس طرح اپنے اقرار سے خود پکڑے گئے۔

فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدْنَا

پھر شروع کیں یوسف نے ان کی خرجیاں دیکھنی اپنے بھائی کی خرجی سے پہلے آخر کو وہ برتن نکالا اپنے بھائی کی خرجی سے ۱ یوں داؤ بتا دیا ہم نے

لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ

یوسف کو ۲ وہ ہرگز نہ لے سکتا تھا اپنے بھائی کو دین (قانون) میں اس بادشاہ کے مگر جو چاہے اللہ ۳ ہم درجے بلند کرتے ہیں جس کے چاہیں ۴

وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۶﴾

اور ہر جاننے والے سے اوپر ہے ایک جاننے والا ۵

**خلاصہ تفسیر:** (غرض یہ امور باہم ٹھہرنے کے بعد سامان اتروایا گیا) پھر (تلاشی کے وقت) یوسف (علیہ السلام) نے (خود یا کسی معتمد کے ذریعہ) اپنے بھائی کے (سامان کے) تھیلے سے قبل تلاشی کی ابتداء اول دوسرے بھائیوں کے (سامان کے) تھیلوں سے کی، پھر (اخیر میں) اس (برتن) کو اپنے بھائی کے (سامان کے) تھیلے سے برآمد کیا، ہم نے یوسف (علیہ السلام) کی خاطر سے اس طرح (بنیامین کے رکھنے کی) تدبیر فرمائی (وجہ اس تدبیر کی یہ ہوئی کہ) یوسف اپنے بھائی کو اس بادشاہ (مصر) کے قانون کی رو سے نہیں لے سکتے تھے (کیونکہ اس کے قانون میں چوری کی سزا کچھ تادیب و جرمانہ تھا) مگر یہ ہے کہ اللہ ہی کو منظور تھا (اس لئے یوسف علیہ السلام کے دل میں یہ تدبیر آئی، اور ان لوگوں کے منہ سے خود یہ

فتویٰ نکلا اور اس طرح تدبیر راست آ گئی اور اگر چہ یوسف علیہ السلام بڑے عالم و عاقل تھے، مگر پھر بھی ہماری تدبیر سکھانے کے محتاج تھے، بلکہ ) ہم جس کو چاہتے ہیں ( علم میں ) خاص درجوں تک بڑھا دیتے ہیں، اور تمام علم والوں سے بڑھ کر ایک بڑا علم والا ہے ( یعنی اللہ تعالیٰ کہ اس کا علم کسی کا دیا ہوا نہیں اور تمام چیزوں کو محیط بھی ہے، اس میں یہ دونوں کمال ہیں، پس جب مخلوق کا علم ناقص ٹھہرا اور خالق کا علم کامل تو لامحالہ مخلوق اپنے علم اور تدبیر میں خالق کی تعلیم وتلقین کی محتاج ہوگی، اس لئے کِدْنَا اور اِلَّآ اَنْ یشآء اللہ کہا گیا )۔

**كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ**: چونکہ حقیقۃً بنیامین کو غلام نہ بنایا گیا تھا، بلکہ بنیامین کی خوشی سے غلامی کی محض صورت اختیار کی تھی اس لئے یہ شبہ لازم نہیں آتا کہ آزاد شخص کو غلام کیسے بنالیا، اس سے معلوم ہوا کہ کسی شرعی مصلحت کی بناء پر معاملہ کی صورت میں کوئی ایسی تبدیلی اختیار کرنا جس سے احکام بدل جائیں جس کو فقہاء کی اصطلاح میں "حیلہ شرعیہ" کہا جاتا ہے یہ شرعاً جائز ہے، شرط یہ ہے کہ اس سے شرعی احکام کا ابطال لازم نہ آتا ہو ورنہ ایسے حیلے باتفاق فقہاء حرام ہیں جیسے زکوٰۃ سے بچنے کے لئے کوئی حیلہ کرنا یا رمضان سے پہلے کوئی غیر ضروری سفر صرف اس لئے اختیار کرنا کہ روزہ نہ رکھنے کی گنجائش نکل آئے یہ باتفاق حرام ہے، ایسے ہی حیلے کرنے پر بعض اقوام پر عذاب الٰہی آیا ہے اور رسول کریم ﷺ نے ایسے حیلوں سے منع فرمایا ہے اور باتفاق امت حرام ہیں، ان پر عمل کرنے سے کوئی کام جائز نہیں ہوجاتا، بلکہ دوہرا گناہ لازم آتا ہے، ایک تو اصل ناجائز کام کا، دوسرے یہ ناجائز حیلہ جو ایک حیثیت سے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ چالبازی کا مرادف ہے۔

یہاں ایک سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بنیامین کو اپنے پاس روکنے کا یہ حیلہ بھی کیوں کیا جبکہ ان کو معلوم تھا کہ والد ماجد پر خود ان کی مفارقت کا صدمہ ناقابل برداشت تھا، اب دوسرے بھائی کو روک کر ان کو دوسرا صدمہ دینا کیسے گوارا کیا؟ دوسرا سوال اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ بے گناہ بھائیوں پر چوری کا الزام لگانا اور اس کے لئے یہ جعلسازی کہ ان کے سامان میں خفیہ طور سے کوئی چیز رکھ دی اور پھر علانیہ ان کی رسوائی ظاہر ہو، یہ سب کام ناجائز ہیں، اللہ کے نبی یوسف علیہ السلام نے ان کو کیسے گوارا کیا؟

بعض مفسرین قرطبی وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ بیان کیا ہے کہ جب بنیامین نے یوسف علیہ السلام کو پہچان لیا اور وہ مطمئن ہو گئے تو بھائی سے یہ درخواست کی کہ اب آپ مجھے ان بھائیوں کے ساتھ واپس نہ بھیجئے، مجھے اپنے پاس رکھئے، یوسف علیہ السلام نے اول یہی عذر کیا کہ اگر تم یہاں رک گئے تو والد کو صدمہ شدید ہوگا دوسرے تمہیں اپنے پاس روکنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ میں تم پر چوری کا الزام لگاؤں اور اس الزام میں گرفتار کر کے اپنے پاس رکھ لوں، بنیامین ان بھائیوں کی معاشرت سے کچھ ایسے دل تنگ تھے کہ ان سب باتوں کے لئے تیار ہو گئے، لیکن یہ واقعہ صحیح بھی ہو تو والد کی دل آزاری اور سب بھائیوں کی رسوائی اور ان کو چور کہنا صرف بنیامین کے راضی ہوجانے سے تو جائز نہیں ہوسکتا، اور بعض حضرات کی یہ توجیہ کہ منادی کا ان کو چور کہنا یوسف علیہ السلام کے علم واجازت سے نہ ہوگا ایک بے دلیل دعویٰ اور صورت واقعہ کے لحاظ سے بے جوڑ بات ہے، اسی طرح یہ تاویل کہ ان بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو والد سے چرایا اور فروخت کیا تھا، اس لئے ان کو چور کہا گیا یہ بھی ایک تاویل ہے، اس لئے ان سب سوالوں کا صحیح جواب وہی ہے جو قرطبی اور مظہری وغیرہ نے دیا ہے کہ اس واقعہ میں جو کچھ کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے وہ نہ بنیامین کی خواہش کا نتیجہ تھا نہ یوسف علیہ السلام کی اپنی تجویز کا، بلکہ یہ سب کام بامر الٰہی اسی کی حکمت بالغہ کے مظاہر تھے جن میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے ابتلاء وامتحان کی تکمیل ہو رہی تھی، اس جواب کی طرف خود قرآن کی اس آیت میں اشارہ موجود ہے: كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ یعنی ہم نے اسی طرح تدبیر کی یوسف علیہ السلام کے لئے اپنے بھائی کو روکنے کی، اس آیت میں واضح طور پر اس حیلہ وتدبیر کو حق تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے کہ یہ سب کام جب کہ بامر خداوندی ہوئے تو ان کو ناجائز کہنے کے کوئی معنی نہیں رہتے، ان کی مثال ایسی ہی ہوگی جیسے حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے واقعہ میں کشتی توڑنا، لڑکے کو قتل کرنا وغیرہ جو بظاہر گناہ تھے اسی لئے موسیٰ علیہ السلام نے ان پر نکیر کیا، مگر خضر علیہ السلام یہ سب کام باذن خداوندی خاص مصالح کے تحت کر رہے تھے اس لئے ان کا کوئی گناہ تھا۔

**كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ**: اس عنوان میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ کامل کے افعال، افعال حق کے مظاہر ہوتے ہیں، یعنی جب کوئی مؤمن صحیح معنوں میں دین کے مطابق زندگی گزارنا شروع کر دیتا ہے تو اس کا شمار کاملین میں ہوتا ہے، اس سے جو عمل بھی ظاہر ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ہی منشا

اور مرضی کا ہوتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ: یعنی اس گفتگو کے بعد محافظین ان کو ''عزیز مصر'' (یوسف علیہ السلام) کے پاس لے گئے اور سب ماجرا کہہ سنایا، انہوں نے تفتیش کا حکم دیا، پہلے دوسرے بھائیوں کی خرجیاں (زنبیلیں اور بیگ وغیرہ) دیکھے گئے، پیالہ برآمد نہ ہوا، اخیر میں بنیامین کے اسباب کی تلاشی ہوئی، چنانچہ پیالہ اس میں سے نکل آیا۔

**فائدہ:** ۲ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ: یا یوں تدبیر کی ہم نے یوسف کے لیے۔

**فائدہ:** ۳ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ: یعنی بھائیوں کی زبان سے آپ ہی نکلا کہ جس کے پاس مال نکلے غلام بنا لو، اس پر پکڑے گئے ورنہ حکومت مصر کا قانون یہ نہ تھا، اگر ایسی تدبیر نہ کی جاتی کہ وہ خود اپنے اقرار میں بندھ جائیں تو ملکی قانون کے موافق کوئی صورت بنیامین کو روک لینے کی نہ تھی۔

**فائدہ:** ۴ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ: یعنی جسے چاہیں حکمت و تدبیر سکھلائیں، یا اپنی تدبیر لطیف سے سربلند کریں، دیکھو وہ ہی لوگ جنہوں نے باپ کی چوری سے یوسف کو چند درہم میں بیچ ڈالا تھا، آج یوسف کے سامنے چوروں کی حیثیت میں کھڑے ہیں، شاید اس طرح ان کی پچھلی غلطیوں کا کفارہ کرنا ہوگا۔

**فائدہ:** ۵ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ: یعنی دنیا میں ایک آدمی سے زیادہ دوسرا، دوسرے سے زیادہ تیسرا جاننے والا ہے مگر سب جاننے والوں کے اوپر ایک جاننے والا اور ہے جسے ''عالم الغیب والشہادۃ'' کہتے ہیں۔

**تنبیہ:** واضح ہو کہ اس تمام واقعہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کی زبان سے کوئی لفظ خلاف واقعہ نہیں نکلا، نہ کوئی حرکت خلاف شرع ہوئی، زیادہ سے زیادہ انہوں نے ''توریہ'' کیا ''توریہ'' کا مطلب ہے ایسی بات کہنا یا کرنا جس سے دیکھنے سننے والے کے ذہن میں ایک ظاہری اور قریبی مطلب آئے، لیکن متکلم کی مراد دوسری ہو جو ظاہری مطلب سے بعید ہے، اگر یہ ''توریہ'' کسی نیک اور محمود مقصد کے لیے کیا جائے تو اس کے جائز بلکہ محمود ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اور کسی مذموم و قبیح غرض کے لیے ہو تو وہ ''توریہ'' نہیں دھوکہ اور فریب ہے، یہاں حق تعالیٰ کو منظور تھا کہ یعقوب علیہ السلام کے ابتلاء و امتحان کی تکمیل کر دی جائے، یوسف کے بعد بنیامین بھی ان سے جدا ہوں، ادھر مدت کے بچھڑے ہوئے دو عینی بھائی آپس میں مل کر رہیں، یوسف کو امتحان کی گھاٹیوں سے نکالنے کے بعد اول علاتی بھائیوں پھر عینی بھائی والد بزرگوار اور سب کنبہ سے بتدریج ملائیں، دوسری طرف برادران یوسف سے جو غلطیاں ہوئی تھیں کچھ ٹھوکریں کھا کر وہ بھی عفو و رحم کے دروازہ پر پہنچ جائیں، اور نہ معلوم کیا کیا حکمتیں ہوں گی جن کی وجہ سے یوسف علیہ السلام کو تھوڑا سا ''توریہ'' کرنے کی ہدایت ہوئی، انہوں نے پیالہ اپنے بھائی کے اسباب میں رکھا، پھر نہ کسی پر اس کی چوری کا الزام لگایا نہ یہ کہا کہ ہم فلاں کو چوری کی سزا میں پکڑتے ہیں، صورتیں ایسی پیدا ہوتی چلی گئیں جن سے آخر میں بنیامین کے لیے اپنے بھائی کے پاس عزت و راحت کے ساتھ رہنے کی سبیل نکل آئی، مصلحتاً بعض ایسے الفاظ بیشک استعمال کیے جن کے معنی متبادر مراد نہ تھے یا بعض چیزوں پر سکوت کیا جن کی نسبت اگر کچھ بولتے تو راز فاش ہو کر اصل مقصد فوت ہو جاتا، واللہ اعلم۔

قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ

کہنے لگے اگر اس نے چرایا تو چوری کی تھی اسکے ایک بھائی نے بھی اس سے پہلے ۱ تب آہستہ سے کہا یوسف نے اپنی جی میں اور انکو نہ جتایا

قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ﴿۷۷﴾

کہا جی میں کہ تم بدتر ہو درجہ میں، اور اللہ خوب جانتا ہے جو تم بیان کرتے ہو ۲

**خلاصه تفسیر:** (حاصل یہ کہ جب بنیامین کے سامان سے وہ برتن برآمد ہوگیا اور بنیامین روک لئے گئے تو وہ سب بڑے شرمندہ ہوئے) کہنے لگے کہ (صاحب!) اگر اس نے چوری کی تو (تعجب نہیں کیونکہ) اس کا ایک بھائی (تھا، وہ) بھی (اسی طرح) اس سے پہلے چوری کر چکا ہے، پس یوسف نے اس بات کو (جو آگے آتی ہے) اپنے دل میں پوشیدہ رکھا اور اس کو ان کے سامنے (زبان سے) ظاہر نہیں کیا یعنی (دل میں) یوں کہا کہ اس (چوری کے) درجہ میں تم تو اور بھی زیادہ برے ہو (یعنی ہم دونوں بھائیوں سے تو حقیقت میں چوری سرزد نہیں ہوئی، اور تم نے تو اتنا بڑا کام کیا کہ کوئی مال غائب کرتا ہے تم نے آدمی غائب کر دیا کہ مجھے باپ سے بچھڑا دیا اور ظاہر ہے کہ آدمی کی چوری مال کی چوری سے زیادہ سخت ہے) اور جو کچھ تم (ہم دونوں بھائیوں کے متعلق) بیان کر رہے ہو (کہ ہم چور ہیں) اس (کی حقیقت) کا اللہ ہی کو خوب علم ہے (کہ ہم چور نہیں ہیں)۔

**فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ:** وہ قصہ درمنثور میں اس طرح لکھا ہے کہ یوسف علیہ السلام کی ان کی پھوپھی پرورش کرتی تھیں، جب ہوشیار ہوئے تو یعقوب علیہ السلام نے لینا چاہا، وہ ان کو بہت چاہتی تھیں، پھوپھی نے ان کو اپنے پاس رکھنا چاہا اس لئے انہوں نے ان کی کمر میں ایک پٹکا کپڑوں کے اندر باندھ کر مشہور کر دیا کہ پٹکا گم ہو گیا اور سب کی تلاشی لی تو ان کی کمر میں نکلا اور اس شریعت کے قانون کے موافق ان کو پھوپھی کے قبضہ میں رہنا پڑا، یہاں تک کہ ان کی پھوپھی نے وفات پائی پھر یعقوب علیہ السلام کے پاس آ گئے، اور ممکن ہے کہ یہ صورت بھی یوسف علیہ السلام کی رضامندی سے ہوئی ہو، اس لئے یہاں بھی آزاد کا غلام بنانا لازم نہیں آیا اور ہر چند کہ بھائیوں کو یوسف علیہ السلام کے اخلاق نیز دیگر قرائن میں ذرا تامل کرنے سے اس فعل سے آپ کی برأت یقیناً معلوم تھی، مگر بنیامین پر جو بھائیوں کو غصہ تھا اس میں یہ بات بھی کہہ دی۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یہ اشارہ یوسف علیہ السلام کی طرف تھا، اپنی پاکبازی جتانے کے لیے محض ناحق کوشی اور عناد سے بنیامین کے جرم کو پختہ کر دیا اور اتنی مدت کے بعد بھی یوسف معصوم پر جھوٹی تہمت لگانے سے نہ شرمائے مفسرین نے اس موقع پر کئی قصے بیان کئے ہیں جن کی طرف برادرانِ یوسف نے چوری کے لفظ میں اشارہ کیا تھا، ان کے نقل کی یہاں حاجت نہیں۔

**فائدہ:** ۲ یعنی ایسا سخت لفظ سن کر بھی یوسف بے قابو نہیں ہوئے، کیونکہ مصلحت خداوندی افشائے راز کو مقتضی نہ تھی، یوسف نے بات کو دل میں رکھا، جواب دے کر ان کے اتہام کی حقیقت نہ کھولی، اپنے جی میں کہا: اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ یعنی الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے، مجھے چور بناتے ہو؟ حالانکہ تم نے ایسی چوری کی کہ بھائی کو باپ سے چرا کر بیچ ڈالا، باقی میری چوری کا حال اللہ کو معلوم ہے، بعض مفسرین نے: اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ کا مطلب یہ لیا ہے کہ یوسف نے ان کو خطاب کر کے کہا کہ تم بڑے ہی بدترین لوگ ہو، ابھی تو کہہ رہے تھے: وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ہم چوروں میں کے نہیں، جب ایک بھائی کے اسباب میں سے مال برآمد ہوا تو اس کے ساتھ دوسرے غیر حاضر بھائی کو بھی ملوث کرنے لگے گویا چوری کرنا تمہارا خاندانی پیشہ ہے (العیاذ باللہ) خدا خوب جانتا ہے کہ تم اپنے بیان میں کہاں تک سچے ہو، وہ ہی تم کو غلط بیانیوں کی سزا دے گا۔

قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۷۸﴾

کہنے لگے اے عزیز اس کا ایک باپ ہے بوڑھا بڑی عمر کا سو رکھ لے ایک کو ہم میں سے اس کی جگہ، ہم دیکھتے ہیں تو ہے احسان کرنے والا

**خلاصہ تفسیر:** (جب بھائیوں نے دیکھا کہ انہوں نے بنیامین کو لے لیا اور اس پر قابض ہو گئے تو براہ خوشامد) کہنے لگے اے عزیز! اس (بنیامین) کا ایک بہت بوڑھا باپ ہے (اور اس کو بہت چاہتا ہے، اس کے غم میں خدا جانے کیا حال ہو، اور ہم سے اس قدر محبت نہیں) سو آپ (ایسا کیجئے کہ) اس کی جگہ ہم میں سے ایک کو رکھ لیجئے (اور اپنا مملوک بنا لیجئے) ہم آپ کو نیک مزاج دیکھتے ہیں (امید ہے کہ اس درخواست کو منظور فرمالیں گے)۔

شبہ ہوتا ہے کہ اس فیصلہ میں صرف برتن کے سامان میں پائے جانے کو سزا کا سبب قرار دیا گیا حالانکہ اس میں بھی یہ احتمال ہوسکتا تھا کہ کسی اور

نے رکھ دیا ہو، جواب اس کا یہ ہے کہ جب وہ متہم شخص خود یہ احتمال پیش نہ کرے تو ظاہرا چوری کو اس نے تسلیم کرلیا اس لیے سزا مرتب ہوگئی۔

* * *

**فائدہ:** یعنی بوڑھے باپ کو بڑا صدمہ پہنچے گا، وہ ہم سب سے زیادہ اس کو اور اس کے بھائی یوسف کو چاہتے تھے، یوسف کے بعد اب اسی سے اپنے دل کو تسلی دیتے ہیں، آپ اگر اس کی جگہ ہم میں سے کسی ایک کو رکھ لیں تو بڑی مہربانی ہوگی، آپ ہمیشہ مخلوق پر احسانات کرتے ہیں اور ہم پر خصوصی احسان فرماتے رہے ہیں، امید ہے ہم کو اپنے کرم سے مایوس نہ فرمائیں گے۔

ع قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ﴿۷۹﴾

بولا اللہ پناہ دے کہ ہم کسی کو پکڑیں مگر جس کے پاس پائی ہم نے اپنی چیز ۱؎ تو تو ہم ضرور بے انصاف ہوئے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** یوسف (علیہ السلام) نے کہا ایسی (بے انصافی کی) بات سے خدا بچائے کہ جس کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہے اس کے سوا دوسرے شخص کو پکڑ کر لیں (اگر ہم ایسا کریں تو) اس حالت میں تو ہم بڑے بے انصاف سمجھے جائیں گے (کیونکہ دوسرے آزاد آدمی کو غلام بنالینا اور غلاموں کا معاملہ کرنا اس کی رضامندی سے بھی حرام ہے ہم ایسا نہ کریں گے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی خدا اپنا پناہ میں رکھے، کہ ہم کسی کو بے سبب دوسرے کے بدلے میں پکڑنے لگیں، ہم تو صرف اسی شخص کو روکیں گے جس کے پاس سے اپنی چیز ملی ہے، (وہ بنیامین ہے جو عینی بھائی ہونے کی حیثیت سے ہمارے پاس رہے گا) یہاں بھی اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ کی جگہ اِلَّا مَنْ سَرَقَ نہیں فرمایا جو مختصر تھا، کیونکہ واقعہ کے خلاف ہوتا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی مجرم کے بدلہ میں بے قصور کو پکڑیں تو تمہارے خیال اور قانون کے موافق ہم بے انصاف ٹھہریں گے۔

فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ؕ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ

پھر جب ناامید ہوئے اس سے اکیلے ہو بیٹھے مشورہ کرنے کو، بولا ان میں بڑا کیا تم کو معلوم نہیں کہ تمہارے باپ نے لیا ہے تم سے

مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ

عہد اللہ کا اور پہلے جو قصور کر چکے ہو یوسف کے حق میں، سو میں تو ہرگز نہ سرکوں گا اس ملک سے جب تک کہ حکم دے مجھ کو باپ میرا

اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۰﴾

یا قضیہ چکا دے اللہ میری طرف، اور وہ ہے سب سے بہتر چکانے والا

**خلاصہ تفسیر:** پھر جب ان کو یوسف (علیہ السلام) سے تو (ان کے صاف جواب کے سبب) بالکل امید نہ رہی (کہ بنیامین کو دیں گے) تو (اس جگہ سے) علیحدہ ہو کر باہم مشورہ کرنے لگے (کہ کیا کرنا چاہیے؟ پھر زیادہ کی یہ رائے ہوئی کہ مجبوری ہے، ہم سب کو واپس چلنا چاہیے، مگر) ان سب میں جو بڑا تھا اس نے کہا کہ (تم جو سب کے سب واپس چلنے کی صلاح کر رہے ہو تو) کیا تم کو معلوم نہیں کہ تمہارے باپ تم سے خدا کی قسم کھلا کر پکا قول لے چکے ہیں (کہ تم بنیامین کو اپنے ہمراہ لانا، لیکن اگر سب ہی گھر جاؤ تو مجبوری ہے، سو ہم سب کے سب تو گھرے نہیں کہ تدبیر کی گنجائش نہ رہتی، اس لئے حتی الامکان کچھ تدبیر کرنا چاہئے) اور اس سے پہلے یوسف کے بارے میں کس قدر کوتاہی کر چکے ہو (کہ ان کے ساتھ جو کچھ برتاؤ ہوا اس سے باپ کے حقوق بالکل ضائع ہوئے، سو وہ پرانی شرمندگی ہی کیا کم ہے جو ایک نئی شرمندگی لے کر جائیں) سو میں تو اس زمین سے نکلتا

نہیں تاوقتیکہ میرے باپ مجھ کو (حاضری کی) اجازت نہ دیں، یا اللہ تعالیٰ اس مشکل کو سلجھا دے، اور وہی خوب سلجھانے والا ہے (یعنی کسی تدبیر سے بنیامین چھوٹ جائے، غرض میں تو یا اس کو لے کر جاؤں گا یا بلایا ہوا جاؤں گا، سو مجھ کو تو یہیں چھوڑ و)۔

* * *

**فائدہ:** جب حضرت یوسف کا جواب سن کر مایوس ہو گئے تو مجمع سے ہٹ کر آپس میں مشورہ کرنے لگے، اکثروں کی رائے ہوئی کہ وطن واپس جانا چاہیے، ان میں جو عمر یا عقل وغیرہ کے اعتبار سے بڑا تھا اس نے کہا کہ باپ کے سامنے کیا منہ لے کر جائیں گے، جو عہد ہم سے لیا تھا اس کا کیا جواب دیں گے، ایک تقصیر تو پہلے یوسف کے معاملہ میں کر چکے ہیں جس کا اثر آج تک موجود ہے، اب بنیامین کو چھوڑ کر سب کا چلا جانا سخت بے حمیتی ہوگی، سو واضح رہے کہ بندہ تو کسی حال یہاں سے ٹلنے والا نہیں، الا یہ کہ خود والد بزرگوار مجھ کو یہاں سے چلے جانے کا حکم دیں یا اس درمیان میں قدرت کی طرف سے کوئی فیصلہ ہو جائے، مثلاً تقدیر سے میں یہیں مر جاؤں یا کسی تدبیر سے بنیامین کو چھڑا لوں۔

**تنبیہ:** یہ کہنے والا غالباً وہی بھائی تھا جس نے یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں بھی نرم مشورہ دیا تھا: لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ۔

اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا

پھر جاؤ اپنے باپ کے پاس اور کہو اے باپ تیرے بیٹے نے تو چوری کی، اور ہم نے وہی کہا تھا جو ہم کو خبر تھی اور ہم کو

لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴿٨١﴾ وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ۭ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿٨٢﴾

غیب کی بات کا دھیان نہ تھا ۱ اور پوچھ لے اس بستی سے جس میں ہم تھے اور اس قافلہ سے جس میں ہم آئے ہیں اور ہم بیشک سچ کہتے ہیں ۲

**خلاصہ تفسیر:** (اور) تم واپس اپنے باپ کے پاس جاؤ اور (جا کر ان سے) کہو کہ اے ابا! آپ کے صاحبزادے (بنیامین) نے چوری کی (اس لئے گرفتار ہوئے) اور ہم تو وہی بیان کرتے ہیں جو ہم کو (مشاہدہ سے) معلوم ہوا ہے اور ہم (قول وقرار دینے کے وقت) غیب کی باتوں کے تو حافظ تھے نہیں (کہ یہ چوری کرے گا ورنہ ہم کبھی قول نہ دیتے) اور (اگر ہمارے کہنے کا یقین نہ ہو تو) اس بستی (یعنی مصر) والوں سے (کسی اپنے معتمد کے ذریعہ) پوچھ لیجئے جہاں ہم (اس وقت) موجود تھے (جب چوری برآمد ہوئی ہے) اور اس قافلہ والوں سے پوچھ لیجئے جن میں ہم شامل ہو کر (یہاں) آئے ہیں (معلوم ہوتا ہے کنعان کے یا آس پاس کے اور لوگ بھی غلہ لینے گئے ہوں گے) اور یقین جانئے ہم بالکل سچ کہتے ہیں (چنانچہ سب نے بڑے کو وہیں چھوڑا اور خود آ کر سارا ماجرا بیان کیا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی مجھے چھوڑ دو اور تم سب جا کر باپ سے عرض کرو کہ ایسا واقعہ پیش آیا، جس کی کوئی توقع نہ تھی، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی تم کو قول دیا تھا کہ اپنی دانست پر، یہ کیا خبر تھی کہ بنیامین چوری کر کے پکڑا جائے گا، یا ہم نے چور کو پکڑ رکھنا بتایا اپنے دین کے موافق، یہ نہ معلوم تھا کہ ''بھائی چور ہے''۔

**فائدہ:** ۲ یعنی آپ معتبر آدمی بھیج کر اس بستی والوں سے تحقیق کر لیں جہاں یہ واقعہ پیش آیا، نیز دوسرے قافلہ والوں سے دریافت فرما لیں جو ہمارے ساتھ رہے اور واپس آئے ہیں، آپ کو ثابت ہو جائے گا کہ ہم اپنے بیان میں بالکل سچے ہیں۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ۭ

بولا کوئی نہیں بنالی ہے تمہارے جی نے ایک بات، اب صبر ہی بہتر (کام آئے) ہے، شاید اللہ لے آئے میرے پاس ان سب کو

إِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿٨٣﴾

وہی ہے خبردار حکمتوں والا

**خلاصہ تفسیر:** یعقوب (علیہ السلام یوسف کے معاملہ میں ان سے غیر مطمئن ہو چکے تھے تو پہلے کی طرح اس وقت بھی قیاس کر کے) فرمانے لگے (کہ بنیامین چوری میں نہیں پکڑا گیا) بلکہ تم نے اپنے دل سے ایک بات بنالی ہے، سو (خیر میں پہلے کی طرح) صبر ہی کروں گا جس میں شکایت کا نام نہ ہوگا (مجھ کو) اللہ سے امید ہے کہ ان سب کو (یعنی یوسف، بنیامین اور جو بڑا بھائی اب مصر میں رہ گیا ہے ان تینوں کو) مجھ تک پہنچادے گا (کیونکہ) وہ (حقیقت حال سے) خوب واقف ہے (اس لئے اس کو سب کی خبر ہے کہ کون کہاں اور کس حال میں ہے، اور وہ) بڑی حکمت والا ہے (جب ملانا چاہے گا تو ہزاروں اسباب وتدابیر درست کردے گا)۔

**بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا:** یعنی تم نے اپنے دل سے ایک بات بنالی ہے، اس واقعہ میں یعقوب علیہ السلام کا یہ فرمانا بظاہر واقع کے مطابق معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ اس واقعہ میں بیٹوں نے کچھ بناوٹ نہ کی تھی، لیکن چونکہ یعقوب علیہ السلام نے اپنے اجتہاد سے یہ بات فرمائی اور اجتہاد میں خطا ہو جانا عصمت نبوت کے خلاف نہیں، اس لیے کوئی اشکال نہیں، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مجتہد جو بات اپنے اجتہاد سے کہتا ہے اس میں غلطی بھی ہو سکتی ہے، یہاں تک کہ پیغمبر بھی جو بات اپنے اجتہاد سے کہیں اس میں ابتداءً غلطی ہو جانا ممکن ہے، جیسے اس معاملہ میں پیش آیا کہ بیٹوں کے سچ کو جھوٹ قرار دے دیا مگر انبیاء علیہم السلام کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کو من جانب اللہ غلطی پر متنبہ کر کے اس سے ہٹا دیا جاتا ہے اور انجام کار وہ حق کو پالیتے ہیں۔

اگر یہ شبہ ہو کہ اجتہاد سے کسی پر تہمت لگانا کب جائز ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جو شخص پہلے سے متہم یا مشتبہ ہو اس کو گمان سے متہم اور مشتبہ سمجھنا گناہ کا سبب نہیں کہ اس میں آدمی طبعاً بھی مجبور ہوتا ہے، البتہ یقین کرنا جائز نہیں، اور اس جگہ یعقوب علیہ السلام کا یقین کے ساتھ متہم سمجھنا منقول نہیں اور ان الفاظ: بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا سے اگرچہ بظاہر یقین معلوم ہوتا ہے، لیکن ممکن ہے کہ ان کا مقصود اس سے واقعہ کی تفتیش اور تحقیق کرنا ہو جیسا کہ تفتیش کے موقع پر یہ عادت ہے کہ ایسے الفاظ بولا کرتے ہیں جن سے دوسرا یہ سمجھے کہ ان کو پوری خبر ہے اور اس وجہ سے انکار نہ کر سکے، پس یعقوب علیہ السلام کی ان الفاظ سے یہ مراد نہ تھی کہ میں یقین کرتا ہوں کہ تم نے یہ بات بنائی ہے، بلکہ مقصود یہ تھا کہ اس طریقہ سے گفتگو کر کے واقعہ کی تفتیش ہو جائے گی۔

دوسرے اگر غور سے دیکھا جائے تو یعقوب علیہ السلام کی یہ بات واقع کے مطابق بھی ہے، کیونکہ حقیقت میں بنیامین نے چوری نہ کی تھی، تو حقیقت کے لحاظ سے بنیامین کی نسبت چوری کا الزام بالکل غلط تھا، یعنی یعقوب علیہ السلام کے ذہن میں ''بات بنانے'' سے مراد وہ بات بنانا ہو جو مصر میں بنائی گئی کہ ایک خاص غرض کے ماتحت جعلی چوری دکھلا کر بنیامین کو گرفتار کیا گیا جس کا انجام آئندہ بہترین صورت میں کھل جانے والا تھا، اس آیت کے اگلے جملے سے اس طرف اشارہ بھی ہو سکتا ہے جس میں فرمایا: عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا یعنی قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو مجھ سے ملا دے گا، اور ممکن ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو نورانیت قلب سے یہ بات منکشف ہوگئی ہو کہ بنیامین پر چوری کا الزام غلط ہے، خلاصہ یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس مرتبہ جو صاحبزادوں کی بات کو تسلیم نہیں کیا اس کا حاصل یہ تھا کہ درحقیقت نہ کوئی چوری ہوئی ہے اور نہ بنیامین گرفتار ہوئے ہیں بات کچھ اور ہے، یہ اپنی جگہ صحیح تھا، مگر صاحبزادوں نے اپنی دانست کے مطابق جو کچھ کہا تھا وہ بھی غلط نہ تھا۔

**عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا:** اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بقیہ اولاد کے ساتھ بھی یعقوب علیہ السلام کو محبت تھی اور اس کہنے کا سبب ممکن ہے کہ یوسف علیہ السلام کا خواب ہو جس کو وہ سچا اور صحیح سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ اس خواب کی تعبیر ظاہر ہوگی اور اس کا واقع ہونا اس پر موقوف تھا کہ یوسف علیہ السلام بھی زندہ ہوں اور دوسرے بھی صحیح سالم اور ہم سب ایک جگہ جمع ہوں۔

* * *

**فائدہ:** پہلی بار کی بے اعتباری سے اس مرتبہ بھی حضرت یعقوب نے بیٹوں کا اعتبار نہ کیا، لیکن نبی کا کلام جھوٹ نہیں، بیٹوں کی بنائی بات تھی، حضرت یوسف بھی بیٹے تھے، کذا فی الموضح، گویا لَکُمْ کا خطاب جنس ابناء کی طرف ہوا، واللہ اعلم، بعض مفسرین نے یہ مطلب لیا ہے کہ تم یہاں سے حفاظت کے کیسے وعدے کر کے اصرار کے ساتھ لے گئے وہاں پہنچ کر اتنا بھی نہ کہا کہ اس کے اسباب میں سے پیالہ برآمد ہونے سے چوری کیسے ثابت ہوگئی، شاید کسی نے چھپا دیا ہو، مدافعت تو کیا کرتے یہ کہہ کر کہ پہلے اس کے بھائی نے بھی چوری کی تھی اس کے جرم کو پختہ کر دیا، تمہارے دل میں کھوٹ نہ ہوتو یہ طرز عمل اختیار نہ کرتے، اب باتیں بنانے کے لیے آئے ہو، بہر حال میں تو اس پر بھی صبر ہی کروں گا کوئی حرف شکایت زبان پر نہ لاؤں گا، خدا کی قدرت ورحمت سے کیا بعید ہے کہ یوسف، بنیامین، اور وہ بھائی جو بنیامین کی وجہ سے رہ گیا ہے سب کو میرے پاس جمع کر دے، وہ سب کے احوال سے خبردار ہے اور ہر ایک کے ساتھ اپنی حکمت کے موافق معاملہ کرتا ہے، اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ہر قسم کے یاس انگیز احوال اور مرور دھور کے بعد بھی انبیاء کے قلوب مایوس نہیں ہوسکتے، وہ ہمیشہ خدا کی رحمت واسعہ پر اعتماد کرتے اور الطاف ومنن کے امیدوار رہتے ہیں۔

وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰٓاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾

اور الٹا پھرا ان کے پاس سے اور بولا اے افسوس یوسف پر ۱؎ اور سفید ہوگئیں آنکھیں اس کی غم سے ۲؎ سو وہ آپ کو گھونٹ رہا تھا ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (یہ جواب دے کر اولاد سے رنج پہنچنے کی وجہ سے) ان سے دوسری طرف رخ کر لیا اور (اس وجہ سے کہ اس نئے غم سے وہ پرانا غم اور تازہ ہوگیا، اس لیے یوسف علیہ السلام کو یاد کر کے) کہنے لگے ہائے یوسف افسوس! اور غم سے (روتے روتے) ان کی آنکھیں سفید پڑ گئیں (کیونکہ زیادہ رونے سے اکثر آنکھوں کی سیاہی کم ہوجاتی ہے اور آنکھیں بے رونق یا بالکل بے نور ہوجاتی ہیں) اور وہ (غم سے جی ہی جی میں) گھٹا کرتے تھے (کیونکہ شدت غم کے ساتھ جب کامل ضبط ہوگا جیسا کہ صابرین کی شان ہے تو گھٹن کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے)۔

**يٰٓاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ:** شبہ ہوتا ہے کہ یہاں صرف اکیلے یوسف کا ذکر کیوں کیا، حالانکہ اس وقت دوسرے بھائی بنیامین کا غم بھی تھا؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ غالب غم یوسف کا ہی تھا اور غم کا قاعدہ ہے کہ نئے غم سے پرانے غم کا اثر تازہ ہوجاتا ہے اس لیے اس تازہ واقعہ نے یوسف کے فراق کا غم اور زیادہ کر دیا اور اس کے غلبہ میں یہ کلمہ فرمایا، اور بنیامین کا غم مغلوب تھا، غالب کے روبرو مغلوب کا ذکر نہیں کیا۔

اس مقام پر حضرت یعقوب علیہ السلام کی یوسف علیہ السلام کے ساتھ غیر معمولی محبت اور ان کے گم ہونے پر اتنا اثر کہ اس مفارقت کی ساری مدت میں جو بعض روایات کی بناء پر چالیس سال اور بعض کی بناء پر اسی سال بتلائی جاتی ہے مسلسل روتے رہنا، یہاں تک کہ بینائی جاتی رہی، بظاہر ان کی پیغمبرانہ شان کے شایاں نہیں کہ اولاد سے اتنی محبت کریں جب کہ قرآن کریم نے اولاد کو فتنہ قرار دیا ہے، ارشاد ہے: اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ، اور انبیاء علیہم السلام کی شان قرآن کریم نے یہ بتلائی ہے کہ: اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ یعنی ہم نے انبیاء علیہم السلام کو ایک خاص صفت کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے وہ صفت ہی دار آخرت کی یاد، اس مجموعہ سے یہ اشکال قوی ہو کر سامنے آتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا اولاد کی محبت میں ایسا مشغول ہونا کس طرح صحیح ہوا؟ جواب یہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام کا اولاد کی محبت میں اس قدر رونا موجب وسوسہ نہ ہو کیونکہ محبت ایک اضطراری امر ہے، اور یہ رونا دل کی نرمی ورحم دلی پر بھی دلالت کرتا ہے خاص کر جبکہ محبت کا سبب کوئی دینی امر ہو، دوسری بات یہ بھی ہے کہ بلاشبہ دنیا اور متاع دنیا کی محبت مذموم ہے، قرآن وحدیث کی بے شمار نصوص اس پر شاہد ہیں، مگر دنیا میں جو چیزیں آخرت سے متعلق ہیں ان کی محبت درحقیقت آخرت ہی کی محبت میں داخل ہے، یوسف علیہ السلام کے کمالات صرف حسن صورت ہی نہیں، بلکہ پیغمبرانہ عفت اور حسن سیرت بھی ہیں، اس مجموعہ کی وجہ سے ان کی محبت کسی دنیاوی سامان کی محبت نہ تھی، بلکہ درحقیقت آخرت ہی کی محبت تھی، ایک جواب یہ بھی ہے کہ طبعی محبت (بیوی بچوں کی محبت) محبت حق کے خلاف نہیں، دونوں محبت قلب مؤمن میں جمع ہوسکتی ہیں، البتہ عارفین وکاملین کو طبعی محبت رضائے الٰہی سے غافل نہیں کرتی، سو یہ شبہ کرنا غلط ہے کہ اللہ کی محبت کے ساتھ مخلوق کی محبت کو جمع کرنا نبوت اور بزرگی کے خلاف ہے، حالانکہ یہ دونوں نہ صرف جمع ہوسکتی ہیں بلکہ اللہ کے ساتھ تعلق کے بڑھنے

اور اس کی رضا حاصل کرنے میں انتہائی مفید اور مددگار ہیں، کیونکہ مخلوق اللہ کی عیال ہے جو کوئی محض اللہ کے لیے ان سے محبت کرے گا اسے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوگی۔

شبہ ہوتا ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے جب **فصبر جمیل** فرمادیا تھا کہ میں ایسا صبر کروں گا جس میں شکایت کا نام نہ ہوگا تو پھر اب شکایت کیوں زبان پر لائے؟ اس کا جواب آگے خود قرآن میں موجود ہے: اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ مطلب یہ ہے کہ مخلوق سے شکایت کرنا صبر جمیل کے خلاف ہے نہ کہ خالق سے شکایت کرنا، کیونکہ وہ تو عین دعا والتجا ہے جو کہ مطلوب ہے، یعنی صبر جمیل یہی ہے کہ ہر تکلیف اللہ سے عرض کی جائے۔

**وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ:** اس کے خلاصہ تفسیر میں جو بے رونق یا بے نور دو لفظ لائے گئے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی بالکل گم ہوگئی تھی یا کم ہوگئی تھی، دوسرے قول والوں نے **فارتد بصیرا** کے معنی یہ کہے ہیں کہ خوشی سے توانائی آئی اور آنکھوں کی کمزوری بھی جاتا رہا۔

* * *

**فائدہ:** [1] نیا زخم کھا کر پرانا زخم ہرا ہوگیا، بے اختیار پکار اٹھے: يٰٓاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ (ہائے افسوس یوسف)

**فائدہ:** [2] یعنی بے رونق یا بے نور ہوگئیں، علی اختلاف القولین۔

**فائدہ:** [3] حدیث میں ہے: "نَحْنُ مَعَاشِرَ الْاَنْبِيَآءِ اَشَدُّ بَلاءً ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ" یعنی انبیاء کی جماعت حق تعالیٰ کی طرف سے سخت ترین امتحانوں میں مبتلاء کی جاتی ہے، پھر امتحان کی اقسام ہیں، ہر نبی کو حق تعالیٰ اپنی حکمت اور اس کی استعداد کے موافق جس قسم کے امتحان میں چاہے مبتلا کرتا ہے، یعقوب علیہ السلام کے قلب میں یوسف کی فوق العادت محبت ڈال دی پھر ایسے محبوب اور ہونہار بیٹے کو جو خاندانِ ابراہیمی کا چشم و چراغ تھا، ایسے دردناک طریقے سے جدا کیا گیا، غمزدہ اور زخم خوردہ یعقوب کے جگر کو اس روح فرسا صدمہ نے کھالیا تھا، وہ کسی مخلوق کے سامنے نہ حرف شکایت زبان پر لاتے تھے نہ کسی سے انتقام لیتے، نہ غصہ نکالتے، غم کی بات منہ سے نہ نکلتی، ہاں جب اپنے کو بہت گھونٹتے تو دل کا بخار آنکھوں کی راہ سے ٹپک پڑتا، بیسیوں برس تک چشم گریاں اور سینہ بریاں کے باوجود ادائے فرائض وحقوق میں کوئی خلل نہ پڑنے دیا، ان کا دل جتنا یوسف کے فراق میں روتا تھا، اتنا ہی خدا کے حضور میں زیادہ گڑگڑاتا تھا، درد وغم کی شدت اور اشکباری کی کثرت جس قدر ان کی بصارت کو ضعیف کرتی اسی قدر نور بصیرت کو بڑھا رہی تھی، بے تابی واضطراب کا کیسا ہی طوفان اٹھتا، دل پکڑ کر اور کلیجہ مسوس کر رہ جاتے زبان سے اف نہ نکالتے، بنیامین کی جدائی سے جب پرانے زخم میں نیا چرکا لگا تو اس وقت بے اختیار یا **اسفی علی یوسف** صرف اتنا لفظ زبان سے نکلا، بقول حضرت شاہ صاحبؒ: "ایسا درد اتنی مدت دبا رکھنا پیغمبر کے سوا کس کا کام ہوسکتا ہے"۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾

کہنے لگے قسم اللہ کی تو نہ چھوڑے گا یوسف کی یاد کو جب تک کہ گھل جائے یا ہوجائے مردہ

قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾

بولا میں تو کھولتا ہوں اپنا اضطراب اور غم اللہ کے سامنے اور جانتا ہوں اللہ کی طرف سے جو تم نہیں جانتے

**خلاصہ تفسیر:** بیٹے کہنے لگے بخدا! (معلوم ہوتا ہے) تم ہمیشہ ہمیشہ یوسف کی یادگاری میں لگے رہو گے یہاں تک کہ گھل گھل کر جاں بہ لب ہوجاؤ گے یا یہ کہ بالکل مر ہی جاؤ گے (تو اتنے غم سے فائدہ کیا) یعقوب (علیہ السلام) نے فرمایا (کہ تم کو میرے رونے سے کیا بحث) میں تو اپنے رنج وغم کی صرف اللہ تعالیٰ سے شکایت کرتا ہوں (تم سے تو کچھ نہیں کہتا) اور اللہ کی باتوں کو جتنا میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے (باتوں سے مراد یا تو

لطف وکرم ورحمت خداوندی ہے یا ان سب سے ملنے کا جو الہام ہوا تھا وہ مراد ہے، اور وہ الہام بلا واسطہ ہو یا یوسف علیہ السلام کے خواب کے واسطہ سے، جس کی تعبیر اب تک واقع نہیں ہوئی تھی اور اس کا واقع ہونا ضروری تھا)۔

* * *

**فائدہ:** موضح القرآن میں ہے، یعنی کیا تم مجھ کو صبر سکھاؤ گے؟ بے صبر وہ ہے جو مخلوق کے آگے خالق کے بھیجے ہوئے درد کی شکایت کرے، میں تو اسی سے کہتا ہوں جس نے درد دیا اور یہ بھی جانتا ہوں کہ (یوسف زندہ ہے ضرور ملے گا اور اس کا خواب پورا ہو کر رہے گا) یہ مجھ پر آزمائش ہے دیکھوں کس حد پر پہنچ کر بس ہو۔

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ

اے بیٹو جاؤ اور تلاش کرو یوسف کی اور اس کے بھائی کی اور ناامید مت ہو اللہ کے فیض سے، بیشک ناامید نہیں ہوتے

مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾

اللہ کے فیض سے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں

**خلاصہ تفسیر:** اے میرے بیٹو! (اظہار غم تو صرف اللہ کی جناب میں کرتا ہوں، اسباب کا مہیا کرنے والا وہی ہے، لیکن ظاہری تدبیر تم بھی کرو کہ ایک بار پھر سفر میں) جاؤ اور یوسف (علیہ السلام) اور ان کے بھائی کی تلاش کرو (یعنی اس فکر و تدبیر کی جستجو کرو جس سے یوسف علیہ السلام کا نشان ملے اور بنیامین کو رہائی ہو) اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید مت ہو، بیشک اللہ کی رحمت سے وہی لوگ ناامید ہوتے ہیں جو کافر ہیں۔

**يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ:** حضرت یعقوب علیہ السلام نے اتنے عرصہ کے بعد صاحبزادوں کو یہ حکم دیا کہ جاؤ یوسف اور ان کے بھائی کو تلاش کرو اور ان کے ملنے سے مایوس نہ ہو، اس سے پہلے کبھی اس طرح کا حکم نہ دیا، یہ سب چیزیں تقدیر الٰہی کے تابع تھیں، اس سے پہلے ملنا مقدر نہ تھا، اس لئے ایسا کوئی کام بھی نہیں کیا گیا اور اب ملاقات کا وقت آ چکا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے مناسب تدبیر دل میں ڈالی۔

شبہ ہوتا ہے کہ تیسرے بھائی بھی اس وقت غائب ہیں یعقوب علیہ السلام نے ان کا ذکر کیوں نہ کیا؟ وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے اختیار سے رہ گئے تھے، کسی آفت میں تو مبتلا نہیں ہوئے تھے سو ان کی تلاش کی کیا ضرورت ہے، وہ جب موقع پائیں گے خود آ جائیں گے، دوسری بات یہ کہ وہ تیسرے تو ان بھائیوں کے ساتھ متفق ہی ہیں ان کو تو یہ خود ہی ڈھونڈیں گے، بخلاف یوسف اور بنیامین کے کہ ان دونوں سے یہ بھائی رنج رکھتے تھے اس لیے شاید ان دونوں کی تلاش میں کمی کریں اس لیے بطور خاص یوسف اور بنیامین کا ذکر کیا۔

* * *

**فائدہ:** یعنی حق تعالیٰ کی مہربانی اور فیض سے ناامید ہونا کافروں کا شیوہ ہے، جنہیں اس کی رحمت واسعہ اور قدرت کاملہ کی صحیح معرفت نہیں ہوتی، ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ اگر پہاڑ کی چٹانوں اور سمندر کی موجوں کے برابر مایوس کن حالات پیش آئیں تب بھی خدا کی رحمت کا امیدوار رہے اور امکانی کوشش میں پست ہمتی نہ دکھلائے، جاؤ کوشش کر کے یوسف کا کھوج لگاؤ اور اس کے بھائی بنیامین کے چھڑانے کا کوئی ذریعہ تلاش کرو، کچھ بعید نہیں کہ حق تعالیٰ ہم سب کو پھر جمع کر دے، تیسرے بھائی کا ذکر شاید اس لیے نہیں کیا کہ وہ باختیار خود محض بنیامین کی وجہ سے رکا ہے، بنیامین چھوٹ جائے تو وہ کیوں پڑا رہے گا۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ

پھر جب داخل ہوئے اس کے پاس بولے اے عزیز پڑی ہم پر اور ہمارے گھر پر سختی اور لائے ہیں ہم پونجی ناقص

فَأَوۡفِ لَنَا ٱلۡكَيۡلَ وَتَصَدَّقۡ عَلَيۡنَآۖ إِنَّ ٱللَّهَ يَجۡزِي ٱلۡمُتَصَدِّقِينَ ﴿٨٨﴾

سو پوری دے ہم کو بھرتی اور خیرات کر ہم پر، اللہ بدلہ دیتا ہے خیرات کرنے والوں کو

**خلاصہ تفسیر:** پھر (حضرت یعقوب علیہ السلام کے حکم کے مطابق یہ لوگ مصر کو چلے، کیونکہ بنیامین کو مصر ہی میں چھوڑا تھا، یہ خیال ہوا ہوگا کہ جس کا نشان معلوم ہے پہلے اس کے لانے کی تدبیر کریں اور اس کو بادشاہ سے مانگیں، پھر یوسف بے نشان کا پتہ لگائیں گے، غرض مصر پہنچ کر) جب یوسف (علیہ السلام) کے پاس (جس کو عزیز سمجھ رہے تھے) پہنچے (اور غلہ کی بھی حاجت تھی، اس لیے خیال ہوا کہ غلہ کے بہانے سے عزیز کے پاس چلیں اور خریدنے کے ضمن میں خوشامد کی باتیں کریں، جب اس کی طبیعت میں نرمی دیکھیں اور مزاج خوش پائیں تو بنیامین کی درخواست کریں اس لئے پہلے غلہ لینے کے متعلق گفتگو شروع کی اور) کہنے لگے اے عزیز! ہم کو اور ہمارے گھر والوں کو (قحط کی وجہ سے) بڑی تکلیف پہنچ رہی ہے، اور (چونکہ ہمیں ناداری نے بھی گھیر رکھا ہے اس لئے غلہ خریدنے کے واسطے کھرے دام بھی میسر نہیں ہوئے) ہم کچھ یہ نکمی چیز لائے ہیں، سو آپ (اس کے نکمہ ناقص ہونے سے قطع نظر کرکے) پورا غلہ دے دیجیے (اور نکمے ناقص ہونے کی وجہ سے غلہ کی مقدار میں کمی نہ کیجئے) اور (ہمارا کچھ استحقاق نہیں) ہم کو خیرات (سمجھ کر) دے دیجیے، بیشک اللہ تعالیٰ خیرات دینے والوں کو (خواہ حقیقۃً خیرات دیں، خواہ سہولت و رعایت کریں کہ وہ بھی خیرات ہی کی طرح ہے) جزا (ئے خیر) دیتا ہے (اگر مومن ہے تو آخرت میں بھی، اور اگر کافر ہے تو صرف دنیا ہی میں)۔

**وَتَصَدَّقۡ عَلَيۡنَا:** اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ برادران یوسف علیہ السلام اولاد انبیاء ہیں، ان کے لئے صدقہ و خیرات کیسے حلال تھا؟ دوسرے اگر صدقہ حلال بھی ہو تو سوال کرنا کیسے جائز تھا؟ برادران یوسف اگر انبیاء بھی نہ ہوں تو بھی یوسف علیہ السلام تو پیغمبر تھے انہوں نے اس غلطی پر کیوں متنبہ نہیں فرمایا؟ اس کا ایک واضح جواب تو یہ ہے کہ یہاں لفظ صدقہ سے حقیقی صدقہ مراد نہیں، بلکہ معاملے میں رعایت کرنے کو صدقہ و خیرات کرنے سے تعبیر کر دیا ہے، کیونکہ بالکل مفت غلہ کا سوال تو انہوں نے کیا ہی نہ تھا، بلکہ کچھ نکمی چیزیں پیش کی تھیں اور درخواست کا حاصل یہ تھا کہ ان کم قیمت چیزوں کو رعایت کرکے قبول فرمالیں، اس کے علاوہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اولاد انبیاء کے لئے صدقہ و خیرات کی حرمت صرف امت محمدیہ کے ساتھ مخصوص ہو جیسا کہ ائمہ تفسیر میں سے مجاہدؒ کا یہی قول ہے۔

**إِنَّ ٱللَّهَ يَجۡزِي ٱلۡمُتَصَدِّقِينَ:** یعنی اللہ تعالیٰ صدقہ و خیرات کرنے والوں کو جزائے خیر دیتے ہیں، خلاصہ تفسیر میں یہاں دو احتمال اس لیے بیان کیے گئے کیونکہ صدقہ و خیرات کی ایک جزاء تو عام ہے جو ہر مومن کافر کو دنیا میں ملتی ہے وہ ہے رَدِّ بلا اور دفع مصائب اور ایک جزاء آخرت کے ساتھ مخصوص ہے یعنی جنت وہ صرف اہل ایمان کا حصہ ہے، یہاں چونکہ مخاطب عزیز مصر ہے اور برادران یوسف کو ابھی تک یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ مومن ہے یا نہیں اس لئے ایسا عام جملہ اختیار کیا جس میں دنیا و آخرت دونوں کی جزاء شامل ہے، اس کے علاوہ بظاہر موقع تو اس جگہ اس کا تھا کہ چونکہ عزیز مصر سے خطاب تھا، اس لئے اس جملہ میں بھی خطاب ہی کے صیغہ سے یہ کہا جاتا کہ تم کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دیں گے، لیکن چونکہ ان کا تو مومن ہونا معلوم نہ تھا اس لئے عام عنوان اختیار کیا اور خصوصی طور پر ان کو جزا ملنے کا ذکر نہیں کیا۔

* * *

**فائدہ:** باپ کے فرمانے پر مصر کو پھر روانہ ہوئے، کیونکہ یوسف کا پتہ معلوم نہ تھا، یہ خیال کیا ہوگا کہ جس کا پتہ معلوم ہے (بنیامین) پہلے اس کی فکر کریں اور قحط کی وجہ سے غلہ کی ضرورت سے، عزیز کو ادھر بھی توجہ دلائیں، اگر دینے لینے کے معاملہ میں کچھ نرم پایا تو بنیامین کے متعلق گفت و شنید کریں گے، چنانچہ پہلی بات انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام سے یہ ہی کہی کہ اے عزیز مصر! آجکل قحط و ناداری کی وجہ سے ہم پر اور ہمارے گھر پر بڑی سختی گزر رہی ہے، سب اسباب گھر کا بک گیا، کچھ نکمی اور حقیر سے پونجی رہ گئی ہے وہ غلہ خریدنے کے لیے ساتھ لائے ہیں آپ کے مکارم اخلاق اور گزشتہ مہربانیوں سے امید ہے کہ ہماری ناقص چیزوں کا خیال نہ فرمائیں گے اور تھوڑی قیمت میں غلہ کی مقدار گزشتہ کی طرح پوری دلوا دیں گے، یہ

رعایت حقیقت میں ایک طرح کی خیرات ہوگی جو آپ ہم پر کریں گے یا اس کے علاوہ ہم کو بطور خیرات ہی کچھ دے دیجئے خدا آپ کا بھلا کرے گا، حضرت یوسف علیہ السلام یہ حال سن کر رو پڑے، شفقت و رحم دلی کا چشمہ دل میں جوش مار کر آنکھوں سے ابل پڑا، اس وقت حق تعالیٰ کے حکم سے اپنے تئیں ظاہر کیا کہ میں کون ہوں اور تم نے میرے ساتھ جو معاملہ کیا تھا، اس کے بعد میں کس مرتبہ پر پہنچا ہوں، اگلی آیت میں اسی اظہار کی تمہید ہے۔

**تنبیہ:** بعض نے تصدق کے معنی مطلق احسان کرنے کے لیے ہیں، جیسے ''قصر صلوٰۃ'' کی حدیث میں: ''صَدَقَةٌ تَصَدَّقَ اللّٰهُ بِهَا عَلَيْكُمْ''.

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ﴿٨٩﴾

کہا کچھ تم کو خبر ہے کہ کیا کیا تم نے یوسف سے اور اس کے بھائی سے ۱؎ جب تم کو سمجھ نہ تھی ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** یوسف (علیہ السلام) نے (جو اُن کے یہ مسکنت آمیز الفاظ سنے تو رہا نہ گیا اور بے اختیار چاہا کہ اب ان سے کھل جاؤں اور عجب نہیں کہ نور قلب سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو کہ اب کی بار ان کو میری تلاش بھی مقصود ہے اور یہ بھی منکشف ہو گیا ہو کہ اب جدائی کا زمانہ ختم ہو چکا، پس تعارف کے لیے تمہید کے طور پر) فرمایا (کہو) وہ بھی تم کو یاد ہے جو کچھ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ (برتاؤ) کیا تھا جب کہ تمہاری جہالت کا زمانہ تھا (اور برے بھلے کی سوچ نہ تھی)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی دونوں میں جدائی ڈالی اور دونوں سے بیر رکھا۔

**فائدہ:** ۲؎ اللہ اکبر! صبر اور مروت و اخلاق کی حد ہوگئی کہ تمام عمر بھائیوں کی شکایت کا ایک حرف زبان پر نہ لائے، اتنا سوال بھی اس لیے کیا کہ وہ لوگ اپنے ذہنوں میں بیسیوں برس پہلے کے حالات کو ایک مرتبہ مستحضر کر لیں تا کہ ماضی و حال کے موازنہ سے خدا تعالیٰ کے احسانات کی حقیقت روشن ہو، جو یوسف پر ان مصائب و حوادث کے بعد ہوئے جن کی طرف آگے: قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا (یوسف: ۹۰) میں اشارہ ہے، پھر سوال کا پیرایہ ایسا نرم اختیار کیا، جس میں ان کے جرم سے زیادہ معذرت کا پہلو نمایاں ہے یعنی جو حرکت اس وقت تم سے صادر ہوئی ناسمجھی اور بیوقوفی سے ہوگئی، تمہیں کیا معلوم تھا کہ یوسف کا خواب پورا ہو کر اور ہلال ایک روز بدر بن کر رہے گا۔

قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ ؗ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ؕ

بولے کیا سچ تو ہی ہے یوسف ۱؎ کہا میں یوسف ہوں اور یہ ہے میرا بھائی ۲؎ اللہ نے احسان کیا ہم پر ۳؎

اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٩٠﴾

البتہ جو کوئی ڈرتا ہے اور صبر کرتا ہے تو اللہ ضائع نہیں کرتا حق نیکی والوں کا ۴؎

**خلاصہ تفسیر:** (یہ سن کر پہلے تو چکرائے کہ عزیز مصر کو یوسف کے قصہ سے کیا واسطہ، ادھر اس شروع زمانہ کے خواب سے غالب بھی احتمال تھا کہ شاید یوسف کسی بڑے رتبہ کو پہنچیں کہ ہم سب کو ان کے سامنے گردن جھکانا پڑے اس لئے اس کلام سے شبہ ہوا اور غور کیا تو کچھ کچھ پہچانا اور مزید تحقیق کے لیے) کہنے لگے کیا سچ مچ تم ہی یوسف ہو؟ انہوں نے فرمایا (ہاں) میں یوسف ہوں اور یہ (بنیامین) میرا (حقیقی) بھائی ہے (یہ اس لئے بڑھا دیا کہ اپنے یوسف ہونے کی زیادہ تاکید ہو جائے یا ان کی تفتیش کی کامیابی کی بشارت ہے کہ جن کو تم ڈھونڈنے نکلے ہو ہم دونوں ایک جگہ جمع ہیں) ہم پر اللہ تعالیٰ نے احسان کیا (کہ ہم دونوں کو اول صبر و تقویٰ کی توفیق عطا فرمائی، پھر اس کی برکت سے ہماری تکلیف کو راحت سے اور جدائی کو اجتماع سے اور مال و جاہ کی کمی کو کثرت سے تبدیل فرما دیا) واقعی جو شخص گناہوں سے بچتا ہے اور (مصائب پر) صبر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے نیک کام

کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتا۔

اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ: یہاں بظاہر یہ دعویٰ معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام اپنے متقی اور صابر ہونے کا ادعاء کررہے ہیں کہ ہمارے صبر وتقویٰ کی وجہ سے ہمیں مشکلات سے نجات اور درجات عالیہ نصیب ہوئے، مگر کسی کو خود اپنے تقوے کا دعویٰ کرنا بنص قرآن ممنوع ہے: فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى یعنی اپنی پاکی نہ جتلاؤ، اللہ ہی زیادہ جانتا ہے کہ کون متقی ہے، مگر یہاں درحقیقت دعویٰ نہیں بلکہ تحدیث بالنعمۃ اور اللہ تعالیٰ کے احسانات کا ذکر ہے کہ اس نے اول ہم کو صبر وتقویٰ کی توفیق عطا فرمائی پھر اس کے ذریعہ تمام نعمتیں عطا فرمائیں، گویا قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا میں یہ بھی داخل ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ: ممکن ہے اس سوال سے گھبرائے ہوں کہ اتنی مدت کے بعد یہ کون گھر کا بھیدی نکل آیا، پھر عزیز مصر کو یوسف کے قصہ سے کیا مطلب، غیر معمولی مہربانیاں اور بنیامین کے ساتھ خصوصی برتاؤ پہلے سے دیکھ ہی رہے تھے، اس سوال نے دفعتاً ان کا ذہن ادھر منتقل کردیا ہو کہ کہیں یوسف جسے ہم نے مصری قافلہ کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا یہ ہی تو نہیں ہے، جب ادھر توجہ ہوئی تو بغور دیکھا ہوگا اور ممکن ہے یوسف نے خود بھی اپنے کو اس دفعہ زیادہ واضح طور پر پیش کیا ہو، یا تصریحاً کہہ دیا ہو کہ میں یوسف ہوں، غرض وہ سخت متعجب وحیرت زدہ ہو کر بول اٹھے، اِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ (سچ بتاؤ کیا تم ہی یوسف ہو؟)

فائدہ: ۲؎ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ: یعنی جس سے مجھ کو جدا کیا تھا آج میرے پاس بیٹھا ہے۔

فائدہ: ۳؎ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا: جدائی کو ملاپ سے، ذلت کو عزت سے، تکلیف کو راحت سے، تنگی کو عیش سے بدل دیا، جو غلام بنا کر چند دراہم میں فروخت کیا گیا تھا، آج خدا نے اسے ملک مصر کی حکومت بخشی۔

فائدہ: ۴؎ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ: حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''جس پر تکلیف پڑے اور وہ شرع سے باہر نہ ہو اور گھبرائے نہیں تو آخر بلاء سے زیادہ عطاء ہو''۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـــِٕيْنَ ﴿91﴾

بولے قسم اللہ کی، البتہ پسند کرلیا تجھ کو اللہ نے ہم سے اور ہم تھے چوکنے والے

خلاصہ تفسیر: وہ (تمام گذشتہ قصہ کو یاد کر کے نادم ہوئے اور معذرت کے طور پر) کہنے لگے کہ بخدا! کچھ شک نہیں تم کو اللہ تعالیٰ نے ہم پر فضیلت عطا فرمائی (اور تم اسی لائق تھے) اور (ہم نے جو کچھ کیا) بیشک ہم (اس میں) خطاوار تھے (للہ! معاف کردو)۔

* * *

فائدہ: یعنی تجھ کو ہر حیثیت سے ہم پر فضیلت دی اور تو اسی لائق تھا، ہماری غلطی اور بھول تھی کہ تیری قدر نہ پہچانی، آخر تیرا خواب سچا اور ہمارا حسد بیکار ثابت ہوا۔

قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۭ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۡ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿92﴾

کہا کچھ الزام نہیں تم پر آج، بخشے اللہ تم کو ۱؎ اور وہ ہے سب مہربانوں سے مہربان ۲؎

خلاصہ تفسیر: یوسف (علیہ السلام) نے فرمایا کہ نہیں تم پر آج (میری طرف سے) کوئی الزام نہیں (بے فکر رہو، میرا دل صاف ہوگیا) اللہ تعالیٰ تمہارا قصور معاف کرے اور وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے (توبہ کرنے والے کا قصور معاف کرہی دیتا ہے، اسی دعاء سے یہ بھی

سمجھا گیا کہ میں نے بھی میں معاف کردیا)۔

لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ : روح المعانی میں شاہ کرمانیؒ سے منقول ہے کہ جو شخص مخلوق کو حق تعالیٰ کی نگاہ سے دیکھے گا تو وہ ان کی مخالفت کی پروانہ کرے گا، اور جو شخص مخلوق کو اپنی نظر سے دیکھے گا اپنی ساری عمران کی بحث وتکرار میں ختم کردے گا، دیکھیے یوسف علیہ السلام کو چونکہ اس کا علم تھا، انہوں نے اپنے بھائیوں کا عذر کس طرح قبول کرلیا۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یوسف علیہ السلام بھائیوں سے اتنا بھی سننا نہیں چاہتے تھے فرمایا، یہ تذکرہ مت کرو آج میں تمہیں کوئی الزام نہیں دیتا، تمہاری سب غلطیاں معاف کرچکا ہوں، جو لفظ میں نے کہے محض حق تعالیٰ کا احسان اور صبر وتقویٰ کا نتیجہ ظاہر کرنے کی نیت سے کہے آج کے بعد تمہاری تقصیر کا ذکر بھی نہ ہوگا، میں دعا کرتا ہوں کہ تم نے جو خطائیں خدا تعالیٰ کی کی ہیں، وہ بھی معاف کردے۔

**فائدہ:** ۲ میری مہربانی بھی اس کی مہربانی کا ایک پرتو ہے۔

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۳﴾ ع

لے جاؤ یہ کرتہ میرا اور ڈالو اس کو منہ پر میرے باپ کے کہ چلا آئے آنکھوں سے دیکھتا ہوا، اور لے آؤ میرے پاس گھر اپنا سارا

**خلاصہ تفسیر:** اب تم (میرے باپ کو جا کر بشارت دو اور بشارت کے ساتھ) میرا یہ کرتہ (بھی) لیتے جاؤ اور اس کو میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو (اس سے) ان کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی (اور یہاں تشریف لے آئیں گے) اور اپنے (باقی) گھر والوں کو (بھی) سب کو میرے پاس لے آؤ (کہ سب ملیں اور خوش ہوں، کیونکہ موجودہ حالت میں میرا جانا مشکل ہے، اس لئے گھر والے ہی چلے آئیں)۔

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا: یہ کرتا صحیح روایت کے مطابق کوئی خاص کرتا نہ تھا، عام معمولی لباس تھا، یوسف علیہ السلام کو معلوم ہوگیا تھا کہ یعقوب علیہ السلام کی بصارت میں خلل آگیا ہے اس لیے اپنا کرتا بھیجا کہ اس کو چہرہ پر ڈال دیا جائے اس کے بعد انکا بینا ہونا معجزہ کے طور پر ہو۔

وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ: یعنی تم سب بھائی اپنے سب اہل وعیال کو میرے پاس مصر لے آؤ، اصل مقصد تو والد محترم کو بلانے کا تھا، مگر یہاں والد کی صراحت کے بجائے خاندان کو لانے کا ذکر کیا، شاید اس لئے کہ والد کو یہاں لانے کے لئے کہنا ادب کے خلاف سمجھا، اور یہ یقین تھا ہی کہ جب والد کی بینائی عود کر آئے گی اور یہاں آنے سے کوئی عذر مانع نہیں رہے گا تو وہ خود ہی ضرور تشریف لائیں گے، وہ تو آئے بغیر رہ ہی نہیں سکتے، ان کا تشریف لانا یقینی تھا۔

* * *

**فائدہ:** یعنی میں بحالت موجودہ شام کا سفر نہیں کرسکتا، تم جاؤ والدین اور اپنے سب متعلقین کو یہاں لے آؤ، چونکہ والد بزرگوار کی نسبت وحی سے یا بھائیوں کی زبانی معلوم ہوا ہوگا کہ بینائی نہیں رہی یا نگاہ میں فرق آگیا ہے، اس لیے اپنا قمیص دے کر فرمایا کہ یہ ان کی آنکھوں کو لگا دینا بینائی بحال ہو جائے گی، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''ہر مرض کی اللہ کے ہاں دوا ہے، آنکھیں گئی تھیں ایک شخص کے فراق میں، اسی کے بدن کی چیز ملنے سے چنگی ہوئیں، یہ کرامت تھی حضرت یوسف علیہ السلام کی''، اور کرامت نہ کہیں تب بھی آج کل واقعات ومشاہدات کی بنا پر یہ بات مان لی گئی ہے کہ کسی سخت صدمہ یا غیر معمولی خوشی کے اثر سے بعض نابینا دفعتاً بینا ہو گئے ہیں۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ﴿۹۴﴾

اور جب جدا ہوا قافلہ کہا ان کے باپ نے میں پاتا ہوں بو یوسف کی ۱ اگر نہ کہو مجھ کو بوڑھا بہک گیا ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور جب (یوسف علیہ السلام سے بات چیت ہو چکی اور آپ کے فرمانے کے مطابق کرتہ لے کر چلنے کی تیاری کی

اور) قافلہ (شہر مصر سے) چلا (جس میں یہ لوگ بھی تھے) تو ان کے باپ نے (پاس والوں سے) کہنا شروع کیا کہ اگر تم مجھ کو بڑھاپے میں بہکی باتیں کرنے والا نہ سمجھو تو ایک بات کہوں کہ مجھ کو تو یوسف کی خوشبو آ رہی ہے (یہ یعقوب علیہ السلام کا معجزہ تھا کہ اس کرتہ میں جو یوسف علیہ السلام کے بدن کا اثر تھا وہ محسوس ہوگیا، معلوم ہوا کہ معجزہ اختیاری نہیں ہوتا، اس لئے اس سے پہلے یہ ادراک نہ ہوا)۔

**وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ**: چونکہ یوسف علیہ السلام سے ملاقات کا خدائی وعدہ قریب آ چکا تھا، یہ خوشبو سینکڑوں میل کے فاصلہ سے یعقوب علیہ السلام کو محسوس ہونے لگی، لیکن یوسف جب کنویں میں گھر کے قریب تھے، چونکہ وقت نہیں آیا تھا، تو اس وقت یہ خوشبو محسوس نہ ہوئی، یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی معجزہ پیغمبر کے اختیار میں نہیں ہوتا بلکہ درحقیقت معجزہ پیغمبر کا اپنا فعل و عمل بھی نہیں ہوتا یہ براہ راست فعل اللہ ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتے ہیں تو معجزہ ظاہر کردیتے ہیں اور جب اذن خداوندی نہیں ہوتا تو قریب سے قریب بھی بعید ہوجاتا ہے، (اور یہی معاملہ اولیاء اللہ کے مکاشفات کا ہے، کبھی قریبی شے کے ادراک سے لاعلم رہتے ہیں اور بعض دفعہ سینکڑوں میل دور کی خبر دے دیتے ہیں):

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

* * *

**فائدہ**: ۱؎ خدا کی قدرت یوسف مصر میں موجود ہیں کبھی نہ کہا کہ یوسف کی خوشبو آتی ہے، کیونکہ خدا کو امتحان پورا کرنا تھا، اب بلانے کی ٹھری تو ادھر قافلہ یوسف کا قمیص لے کر مصر سے نکلا ادھر پیراہن یوسفی کی خوشبو یعقوب کے مشام جان کو معطر کرنے لگی، ایک یہ کیا پورا واقعہ ہی عجائب قدرت کا ایک مرقع ہے یعقوب جیسے مشہور و معروف پیغمبر شام میں رہیں اور یوسف جیسی جلیل القدر شخصیت مصر میں بادشاہت کرے، یوسف کے بھائی کئی مرتبہ مصر آئیں، خود یوسف کے مہمان بنیں اس کے باوجود خداوند قدوس کی حکمت غامضہ اور مشیت قاہرہ کا ہاتھ باپ کو بیٹے سے بیسیوں برس تک علیحدہ رکھے اور خون کے آنسو رلا کر امتحان کی تکمیل کرائے: "جَلَّتْ قُدْرَتُه، وَعَزَّ سُلْطَانُه".

**فائدہ**: ۲؎ یعنی یہ بات کہتے ہوئے جھجکتا ہوں، کیونکہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی کہہ دوگے، بڑھا سٹھیا گیا ہے۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ ﴿۹۵﴾ ربع

لوگ بولے قسم اللہ کی تو تو اپنی اسی قدیم غلطی میں ہے

**خلاصہ تفسیر**: وہ (پاس والے) کہنے لگے کہ بخدا! آپ تو اپنے اسی پرانے غلط خیال میں مبتلا ہیں (کہ یوسف زندہ ہیں اور ملیں گے اسی خیال کے غلبہ سے اب خوشبو کا وہم ہوگیا اور واقع میں نہ خوشبو ہے نہ اور کچھ ہے، یعقوب علیہ السلام خاموش ہو رہے)۔

* * *

**فائدہ**: یعنی یوسف کی محبت اس کے زندہ ہونے اور دوبارہ ملنے کا یقین تیرے دل میں جاگزیں ہے، وہ ہی پرانے خیالات ہیں جو یوسف کی خوشبو بن کر دماغ میں آتے ہیں۔

فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِیْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِیْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ

پھر جب پہنچا خوشخبری والا ڈالا اس نے وہ کرتہ اس کے منہ پر پھر لوٹ کر ہوگیا دیکھنے والا ۱؎ بولا میں نے نہ کہا تھا تم کو کہ میں جانتا ہوں

مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾

اللہ کی طرف سے جو تم نہیں جانتے ۲؎

**خلاصہ تفسیر**: پس جب (یوسف علیہ السلام کے صحیح سلامت ہونے کی) خوش خبری لانے والا (کرتہ کے ساتھ یہاں) آ پہنچا تو

(آتے ہی) اس نے وہ کرتہ ان کے منہ پر لاکر ڈال دیا، پس (آنکھوں کو لگنا تھا اور دماغ میں خوشبو پہنچنا کہ) فوراً ہی ان کی آنکھیں کھل گئیں (اور انہوں نے سارا ماجرا آپ سے بیان کیا) آپ نے (بیٹوں سے) فرمایا کیوں میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ اللہ کی باتوں کو جتنا میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے (اور اس لئے میں نے تم کو یوسف کی تلاش کے لئے بھیجا تھا، دیکھو آخر اللہ تعالیٰ میری امید راست لایا، ان کا یہ قول اس سے اوپر کے رکوع میں آچکا ہے)۔

**قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ**: جن لوگوں نے یعقوب علیہ السلام کے معجزہ کا انکار کیا تھا ان سے آپ نے کچھ نہیں فرمایا، اس کی چند وجہ ہیں: ایک یہ کہ ایسی بات سے ان کا جواب بھی خود نکل آیا، یا دوسرے ان کی غلطی فوراً ظاہر ہوگئی، جتلانے کی کوئی ضرورت نہ تھی، اور بیٹوں سے یہ بات بہت زمانہ پہلے فرمائی تھی کہ میں خدا کی باتوں کو تم سے زیادہ جانتا ہوں، اس پر ایک مدت گزر گئی تھی، تیسرے ان انکار کرنے والوں سے زیادہ معاملہ بھی نہ تھا جتنا اپنے بیٹوں سے تھا۔

* * *

**فائدہ**: ۱؎ یعنی بینائی واپس آگئی، دوبارہ حسب سابق نظر آنے لگا۔

**فائدہ**: ۲؎ یعنی میں نے کہا تھا یوسف کی خوشبو آرہی ہے، آخر سچ ہوا، یا بیٹوں کو کہا تھا کہ یوسف کو تلاش کرو، اللہ کی رحمت سے کیا بعید ہے کہ ہم سب کو پھر اکٹھا کردے، دیکھ لو وہ ہی صورت ہوئی۔

## قَالُوۡا يٰۤاَبَانَا اسۡتَغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا خٰطِـئِيۡنَ ﴿۹۷﴾

بولے اے باپ بخشوا ہمارے گناہوں کو بیشک ہم تھے چوکنے والے

**خلاصہ تفسیر**: (اس وقت) سب بیٹوں نے کہا کہ اے ہمارے باپ! ہمارے لئے (خدا سے) ہمارے گناہوں کی دعاء مغفرت کیجئے (ہم نے آپ کو یوسف کے معاملہ میں بہت تکلیف دی) ہم بیشک خطاوار تھے (مطلب یہ ہے کہ آپ بھی معاف کردیجئے، کیونکہ عادۃً کسی کے لئے استغفار وہی کرتا ہے جو خود بھی مواخذہ کرنا نہیں چاہتا)۔

**يٰۤاَبَانَا اسۡتَغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَاۤ**: سوال ہوتا ہے کہ بیٹوں نے یعقوب علیہ السلام سے صراحۃً یوں کیوں نہیں کہا کہ آپ معاف کردیجیے؟ بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کے ذمہ دو قسم کے حقوق تھے: ① حقوق اللہ یعنی خدا کا حق ② حقوق العباد یعنی بندوں کا حق، اس لیے ایسا جامع عنوان اختیار کیا جس میں یہ دونوں مضمون آگئے، ورنہ حقوق اللہ کے لیے پھر الگ کہنا پڑتا، اور غالباً اسی وجہ سے یعقوب علیہ السلام نے بھی استغفار ہی کا وعدہ کیا کہ اسی سے خود ان کا معاف کردینا بھی معلوم ہوگیا جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے **یغفر اللہ لکم** کہا کہ خدا تم کو معاف کرے، یہ بھی دونوں حقوق کو جامع ہے، ان کا معاف کرنا بھی اسی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔

* * *

**فائدہ**: یعنی توجہ اور دعا کرکے خدا سے ہمارے گناہ معاف کرائیے ہم سے بڑی بھاری خطائیں ہوئی ہیں، مطلب یہ تھا کہ پہلے آپ معاف کردیں، پھر صاف دل ہوکر بارگاہ رب العزت سے معافی دلوائیں کیونکہ جو خود نہ بخشے وہ خدا سے کہاں بخشوائے گا۔

## قَالَ سَوۡفَ اَسۡتَغۡفِرُ لَكُمۡ رَبِّىۡ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ ﴿۹۸﴾

کہا دم لو بخشواؤں گا تم کو اپنے رب سے، وہی ہے بخشنے والا مہربان

**خلاصہ تفسیر**: یعقوب (علیہ السلام) نے فرمایا عنقریب تمہارے اپنے رب سے دعائے مغفرت کروں گا بیشک وہ غفور رحیم ہے (اور اسی سے ان کا معاف کردینا بھی معلوم ہوگیا، عنقریب کا مطلب یہ ہے کہ تہجد کا وقت آنے دو جو کہ قبولیت کی ساعت ہے)۔

سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّیْ: حضرت یعقوب علیہ السلام نے صاحبزادوں کی درخواست معافی و دعائے مغفرت پر جو یہ فرمایا کہ عنقریب تمہارے لئے دعائے مغفرت کروں گا اور فوراً دعا نہیں کی، اس تاخیر کی ایک وجہ بعض حضرات نے یہ بھی بیان کی ہے کہ منظور یہ تھا کہ یوسف علیہ السلام سے مل کر پہلے یہ تحقیق ہو جائے کہ انہوں نے ان کی خطا معاف کر دی ہے یا نہیں؟ کیونکہ جب تک مظلوم معافی نہ دے عند اللہ بھی معافی نہیں ہوتی، ایسی حالت میں دعائے مغفرت بھی مناسب نہ تھی، یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح اور اصولی ہے کہ حقوق العباد کی توبہ بغیر اس کے نہیں ہوتی کہ صاحب حق اپنا حق وصول کر لے یا معاف کر دے محض زبانی توبہ و استغفار کافی نہیں۔

* * *

**فائدہ:** یعنی قبول کی گھڑی آنے دو، اس وقت اپنے مہربان خدا کے آگے تمہارے لئے ہاتھ اٹھاؤں گا کہتے ہیں جمعہ کی شب یا تہجد کے وقت کا انتظار تھا۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰی یُوْسُفَ اٰوٰٓی اِلَیْهِ اَبَوَیْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ ﴿۹۹﴾

پھر جب داخل ہوئے یوسف کے پاس جگہ دی اپنے پاس اپنے ماں باپ کو، اور کہا داخل ہو مصر میں اللہ نے چاہا تو دل جمعی سے

**خلاصہ تفسیر:** (غرض سب تیار ہو کر مصر کو چل دیئے اور یوسف علیہ السلام خبر سن کر استقبال کے لئے مصر سے باہر تشریف لائے اور باہر ہی ملاقات کا سامان کیا گیا) پھر جب سب کے سب یوسف (علیہ السلام) کے پاس پہنچے تو انہوں نے (سب سے مل کر ملا کر) اپنے والدین کو اپنے پاس (تعظیماً) جگہ دی اور (بات چیت سے فارغ ہو کر) کہا سب مصر میں چلیے (اور) ان شاء اللہ تعالیٰ (وہاں) امن چین سے رہیے (جدائی کا غم اور قحط کا الم سب کافور ہو گئے)۔

* * *

**فائدہ:** شہر سے باہر استقبال کو نکلے، ماں باپ کو اپنے قریب جگہ دی (اس میں مفسرین کا اختلاف ہے، بعض کا قول ہے کہ حضرت یوسف کی والدہ پیشتر وفات پا چکی تھیں، جیسا کہ سابق فوائد میں گزر چکا یہاں خالہ کا ذکر ہے اور بعض کہتے ہیں کہ والدہ حیات تھیں، اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے ساتھ مصر تشریف لائی تھیں) سب کو فرمایا شہر میں چلو، قحط وغیرہ کا اب کچھ اندیشہ مت کرو، ان شاء اللہ بالکل دل جمعی اور راحت و اطمینان سے رہو گے، بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ الفاظ شہر میں پہنچ کر کہے، گویا: وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ کے معنی ہوئے مصر میں قیام کرو بے کھٹکے۔

وَرَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ یٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ مِنْ قَبْلُ ز

اور اونچا بٹھایا اپنے ماں باپ کو تخت پر اور سب گرے اس کے آگے سجدہ میں ۱؎ اور کہا اے باپ یہ بیان ہے میرے اس پہلے خواب کا

قَدْ جَعَلَهَا رَبِّیْ حَقًّا ؕ وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْٓ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ

اس کو میرے رب نے سچ کر دیا ۲؎ اور اس نے انعام کیا مجھ پر جب مجھ کو نکالا قید خانہ سے اور تم کو لے آیا گاؤں سے بعد اس کے

اَنْ نَّزَغَ الشَّیْطٰنُ بَیْنِیْ وَبَیْنَ اِخْوَتِیْ ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴿۱۰۰﴾

کہ جھگڑا ڈال چکا تھا شیطان مجھ میں اور میرے بھائیوں میں، میرا رب تدبیر سے کرتا ہے جو چاہتا ہے، بیشک وہی ہے خبردار حکمت والا ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** (غرض سب مصر میں پہنچے) اور (وہاں پہنچ کر تعظیماً) اپنے والدین کو تخت (شاہی) پر اونچا بٹھایا اور (اس وقت سب کے دلوں پر یوسف علیہ السلام کی ایسی عظمت غالب ہوئی کہ) سب کے سب ان کے سامنے سجدہ میں گر گئے اور (یہ حالت دیکھ کر) وہ کہنے لگے کہ

اے ابا! یہ ہے میرے خواب کی تعبیر جو پہلے زمانہ میں دیکھا تھا (کہ شمس وقمر اور گیارہ ستارے مجھ کو سجدہ کرتے ہیں) میرے رب نے اس (خواب) کو سچا کردیا (اس کی سچائی کو ظاہر کردیا) اور (اس شرف کے سوا میرے رب نے مجھ پر اور انعامات بھی فرمائے چنانچہ) میرے ساتھ (ایک) اس وقت احسان فرمایا جس وقت مجھ کو قید سے نکالا (اور اس رتبہ سلطنت تک پہنچایا) اور (دوسرا یہ انعام فرمایا کہ) بعد اس کے کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان میں فساد ڈلوادیا تھا (جس کا تقاضا تو یہ تھا کہ عمر بھر میں متفق اور جمع نہ ہوتے مگر اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ وہ) تم سب کو (جن میں میرے بھائی بھی ہیں) باہر سے (یہاں) لے آیا (اور سب کو ملادیا) بلاشبہ میرا رب جو چاہتا ہے اس کی تدبیر لطیف کردیتا ہے، بلاشبہ وہ بڑا علم اور حکمت والا ہے (اپنے علم وحکمت سے سب امور کی تدبیر درست کردیتا)۔

**وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا**: رہی یہ بات کہ ملاقات کے شروع میں سجدہ نہ کیا، مصر میں آکر سجدہ کیا، اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ شروع ملاقات کے وقت عظمت پر محبت کا غلبہ تھا اس وقت کے مناسب یہ باتیں تھیں ملنا جلنا، گلے لگنا، بات چیت کرنا، اور مصر آکر محبت پر عظمت کا غلبہ ہوا یا تو اس وجہ سے کہ محبت کے جوش کو سکون ہو گیا اس لیے عظمت کا مشاہدہ ہوا، یا اس وجہ سے کہ مصر میں یوسف علیہ السلام گویا اپنے اجلاس شاہی پر تھے اور باہر اجلاس پر نہ تھے، اور ان دونوں حالتوں میں فرق ہے ظاہر ہے اور یہ سجدہ سلامی کے طور پر تھا جو کہ پہلی امتوں میں جائز تھا۔

اور یہ شبہ نہایت ضعیف اور کمزور شبہ ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین سے اپنی اتنی بڑی تعظیم کو کیونکر گوارا کیا؟ بات یہ ہے کہ ان کو تو خواب سے معلوم تھا کہ ایسا معاملہ ہونے والا ہے، پھر کیا تقدیر کی ہونے والی باتوں میں مزاحمت فرماتے۔

**هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ**: اس سے معلوم ہوا کہ خواب کی تعبیر بعض اوقات زمانہ دراز کے بعد ظاہر ہوتی ہے، جیسے اس واقعہ میں چالیس یا اسی (۸۰) سال کے بعد ظہور ہوا۔

**وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْ اِذْ اَخْرَجَنِيْ**: اس سے ثابت ہوا کہ جو شخص کسی مرض یا مصیبت میں مبتلا ہو پھر اس سے نجات ہو جائے تو سنت پیغمبری یہ ہے کہ نجات پر شکر ادا کرے اور مرض ومصیبت کے ذکر کو بھول جائے۔

* * *

**فائدہ: ۱؎ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا**: یوسف نے اپنی طرف سے والدین کی تعظیم کی، تخت پر بٹھلایا، لیکن خدا کو یوسف کی جو تعظیم کرانی تھی اسے یوسف کب روک سکتے تھے، اس وقت کے دستور کے موافق ماں باپ اور سب بھائی یوسف علیہ السلام کے آگے سجدہ میں گر پڑے، یہ سجدہ تعظیمی تھا، جو بقول حافظ عماد الدین ابن کثیر آدم کے زمانہ سے مسیح علیہ السلام کے عہد تک جائز رہا، البتہ شریعت محمدیہ نے ممنوع وحرام قرار دیا، جیسا کہ احادیث کثیرہ اس پر شاہد ہیں بلکہ حضرت شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا الخ سے حرمت کا اشارہ نکالا ہے، بعض مفسرین نے اس جگہ سجدہ کے معنی متبادر مراد نہیں لیے، محض جھک جانے کے معنی لیے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ یہ سجدہ یوسف کو نہ تھا، بلکہ یوسف کی عزت وعظمت دیکھ کر سب نے خدا کے سامنے سجدہ شکر ادا کیا، اس تقدیر پر وَخَرُّوْا لَهٗ میں لام سببیہ ہوگا، یعنی یوسف کے عروج واقتدار کے سبب سے خدا کے آگے سجدہ میں گر پڑے۔

**تنبیہ**: تعظیم اور عبادت دو الگ الگ چیزیں ہیں، غیر اللہ کی تعظیم کلیۃً ممنوع نہیں، البتہ غیر اللہ کی عبادت شرک جلی ہے، جس کی اجازت ایک لمحہ کے لیے کبھی نہیں ہوئی، نہ ہو سکتی ہے، ''سجود عبادت'' یعنی غیر اللہ کو کسی درجہ میں نفع وضرر کا مستقل مالک سمجھ کر سجدہ کرنا شرک جلی ہے جس کی اجازت کبھی کسی ملت سماوی میں نہیں ہوئی، ہاں ''سجود تعظیم'' یعنی عقیدہ مذکورہ بالا سے خالی ہو کر محض تعظیم وتکریم کے طور پر سربسجود ہونا شرائع سابقہ میں جائز تھا، شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم نے اس کی بھی جڑ کاٹ دی، حضرت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اقسام شرک پر جو دقیق بحث کی ہے اسے دیکھنا چاہیے۔

**فائدہ: ۲؎ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا**: یعنی میرا اس میں کچھ دخل نہیں، خواب کی تعبیر پوری ہوئی تھی وہ خدا نے پوری کر دکھائی۔

**فائدہ: ۳؎ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ**: خدا تعالیٰ کے احسانات ذکر فرمائے اور اس کی تدبیر لطیف کی طرف توجہ دلائی کہ کس طرح مجھ کو

قید سے نکال کر ملک کا حاکم مختار بنا دیا اور اس جھگڑے کے بعد جو شیطان نے ہم بھائیوں میں ڈال دیا تھا جب کہ کوئی امید دوبارہ ملنے کی نہ رہی، کیسے اسباب ہمارے ملاپ کے فراہم کر دیے اس موقع پر اپنی مصائب وتکالیف کا کچھ ذکر نہ کیا، نہ کوئی حرف شکایت زبان پر لائے، بلکہ بھائیوں کے واقعہ کی طرف بھی ایسے عنوان سے اشارہ کیا کہ کسی فریق کی زیادتی یا تقصیر ظاہر نہ ہونے پائے، مبادا بھائی سن کر محجوب ہوں، اللہ اکبر، یہ اخلاق پیغمبروں کے سوا کس میں ہوتے ہیں۔

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۣ

اے رب تو نے دی مجھ کو کچھ حکومت اور سکھایا مجھ کو کچھ پھیرنا باتوں کا ۱ اے پیدا کرنے والے آسمان اور زمین کے

اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۱﴾

تو ہی میرا کارساز ہے دنیا میں اور آخرت میں، موت دے مجھ کو اسلام پر ۲ اور ملا مجھ کو نیک بختوں میں ۳

**خلاصہ تفسیر:** اس کے بعد سب ہنسی خوشی رہتے رہے یہاں تک کہ یعقوب علیہ السلام کی عمر اختتام پر پہنچی اور وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق ملک شام میں لے جا کر اپنے بزرگوں کے پاس دفن کئے گئے، پھر یوسف علیہ السلام کو بھی آخرت کا اشتیاق ہوا اور دعا کی کہ:

اے میرے پروردگار! آپ نے مجھ کو (ہر طرح کی نعمتیں دیں، ظاہری بھی باطنی بھی، ظاہری یہ کہ مثلاً) سلطنت کا بڑا حصہ دیا، اور (باطنی یہ کہ مثلاً) مجھ کو خوابوں کی تعبیر دینا تعلیم فرمایا (جو کہ عظیم علم ہے، خصوصاً جب کہ وہ تعبیر بھی یقینی ہو جو کہ وحی پر موقوف ہے، پس علم تعبیر کا عطا ہونا نبوت عطا ہونے کو بھی مستلزم ہوگا) اے خالق آسمانوں اور زمین کے! آپ میرے کارساز ہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی (پس جس طرح دنیا میں میرے سارے کام بنا دیے کہ سلطنت دی، علم دیا، اسی طرح آخرت کے کام بھی بنا دیجئے کہ) مجھ کو فرمانبرداری کی حالت میں دنیا سے اٹھا لیجئے اور خاص نیک بندوں میں شامل کر دیجئے (یعنی میرے بزرگوں میں جو انبیاء عظام ہوئے ہیں ان میں مجھے بھی پہنچا دیجئے)۔

**رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ:** سلطنت کا حصہ اس لیے کہا کہ ساری دنیا کی سلطنت تو آپ کے پاس نہ تھی، بعض تفاسیر میں لکھا ہے کہ یوسف علیہ السلام کی وفات کے بعد مصر کی بادشاہت سلاطین مصر ہی کی طرف منتقل ہوگئی، کیونکہ یوسف علیہ السلام کو اگرچہ سلطنت کے اختیار حاصل ہو گئے تھے مگر باضابطہ تو پہلا ہی بادشاہ تھا، اسی لیے یوسف علیہ السلام عزیز مصر کہلاتے تھے، چنانچہ ان ہی سلاطین مصر کے سلسلہ میں وہ فرعون ہوا جو موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تھا، اور ان برادران یوسف کی اولاد میں وہ بنی اسرائیل ہوئے جو موسیٰ علیہ السلام کے وقت میں تھے، حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد قوم عمالیق کے فراعنہ مصر پر مسلط ہو گئے اور بنی اسرائیل ان کی حکومت میں رہتے ہوئے دین یوسف پر قائم رہے، مگر ان کو غیر ملکی سمجھ کر طرح طرح کی ایذائیں دی جانے لگیں، یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ اللہ نے انہیں اس عذاب سے نکالا، اور بعض مفسرین نے بلا سند لکھا ہے کہ یہود نے امتحاناً پوچھا تھا کہ یعقوب علیہ السلام تو شام کے رہنے والے تھے ان کی اولاد (بنی اسرائیل) مصر میں فرعون کے ہاتھ کہاں پہنچ گئے؟ تو اس قصہ سے اس کا جواب بھی حاصل ہو گیا، اور شام سے مصر آنے کی وجہ تفصیل سے بیان فرما دی۔

**تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا:** اس سے دو مسئلے ثابت ہوتے ہیں: ① پہلا مسئلہ یہ کہ انبیاء کرام جو گناہ کے ہر اندیشہ سے محفوظ ہیں کفر سے پناہ طلب کر رہے ہیں (معلوم ہوا کہ مسلمان کو کسی بھی حالت میں بے خوف نہیں ہونا چاہیے) ② دوسرا مسئلہ یہ کہ بعض تفاسیر کی بنیاد پر لقاء رب کی خواہش میں موت کی تمنا کرنا جائز ہے۔

* * *

**فائدہ: ۱ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ:** اسی سورت کے پہلے رکوع میں تَاْوِيْلَ الْاَحَادِيْثِ کی تفسیر گزر چکی ہے۔

**فائدہ: ۲ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا:** یا تو لقاء اللہ کے شوق میں فی الحال موت کی تمنا کی یا یہ مطلب ہے کہ جب کبھی موت آئے اسلام (یعنی کامل

تسلیم ورضاء) پر آئے۔

**تنبیہ:** حدیث میں آیا ہے کہ کوئی شخص کسی مصیبت اور تکلیف سے گھبرا کر موت کی تمنا نہ کرے، اس سے مفہوم ہوتا ہے کہ جب لقاء اللہ یا اور کسی غرض صالح کی وجہ سے موت کی تمنا کر سکتا ہے جیسے ساحرین فرعون نے دعا کی تھی: رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّتَوَفَّنَا مُسۡلِمِيۡنَ یا حضرت مریم نے کہا تھا: قَالَتۡ يٰلَيۡتَنِىۡ مِتُّ قَبۡلَ هٰذَا وَكُنۡتُ نَسۡيًا مَّنۡسِيًّا (مریم: ۲۳) اور معاذ کی حدیث میں ہے: "وَ اِذَا أردتَ بِقَوْمٍ فِتْنَةً فَاَقْبِضْنِیْ اِلَیْكَ غَیرَ مَفْتُوْنٍ" اور مسند احمد میں حدیث ہے: "یکرَہُ المُوتَ وَالمَوْتُ خَیْرٌ لِّلْمُؤمِنِ مِنَ الْفِتَنِ" حضرت علی نے ہجوم فتن کے وقت دعا کی: " اللّٰھُمَّ خُذْنِیْ اِلَیْكَ فَقَدْ سَئِمْتُھُمْ وَسَئِمُوْنِی" امام بخاری کو جب امیر خراسان کے ساتھ جھگڑا پیش آیا تو یہ دعا کرنی پڑی: "اللّٰھُمَّ تَوَفَّنِیْ اِلَیْكَ" حدیث میں ہے کہ خروج دجال کے وقت ایک شخص کسی قبر پر گزرے گا اور فتن زلازل کو دیکھ کر کہے گا: "یَا لَیْتَنِیْ مَکَانَكَ" کاش کہ میں تیری جگہ ہوتا۔

**فائدہ:** ۳ وَّاَلۡحِقۡنِىۡ بِالصّٰلِحِيۡنَ: یہ لفظ ایسے ہیں جیسا کہ نبی کریم ﷺ مرض الموت میں فرماتے تھے: "اللّٰھُمَّ فِی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی" حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: "علم کامل پایا، دولت کامل پائی، اب شوق ہوا اپنے باپ دادا کے مراتب کا"، گویا اَلۡحِقۡنِىۡ بِالصّٰلِحِيۡنَ سے یہ غرض ہوئی کہ میرا مرتبہ اسحاق وابراہیم کے مراتب سے ملا دے، حضرت یعقوب کی زندگی تک ملکی انتظامات میں رہے، ان کی وفات کے بعد اپنے اختیار سے چھوڑ دیا، مفسرین لکھتے ہیں کہ حضرت یعقوب نے وصیت فرمائی تھی کہ میری لاش "شام" لے جا کر دفن کرنا، چنانچہ جنازہ وہیں لے گئے، حضرت یوسف نے فرمایا تھا کہ ایک زمانہ آئے گا جب "بنی اسرائیل" مصر سے نکلیں گے، اس وقت میری لاش بھی اپنے ہمراہ لے جائیں، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے، حضرت یوسف کا تابوت بھی ساتھ لے گئے، واللہ اعلم۔

---

ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡۢـبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهِ اِلَيۡكَ‌ ۚ وَمَا كُنۡتَ لَدَيۡهِمۡ اِذۡ اَجۡمَعُوۡۤا اَمۡرَهُمۡ وَهُمۡ يَمۡكُرُوۡنَ ﴿۱۰۲﴾

یہ خبریں ہیں غیب کی ہم بھیجتے ہیں تیرے پاس، اور تو نہیں تھا ان کے پاس جب وہ ٹھہرانے لگے اپنا کام اور فریب کرنے لگے

**خلاصہ تفسیر:** یوسف علیہ السلام کے قصہ میں جس طرح قصہ کے سوال کرنے والوں کا جواب ہے اسی طرح جناب رسالت مآب ﷺ کی نبوت پر بھی دلیل ہے جیسا کہ سورت کے شروع میں گزر چکا، آگے اسی دلیل کی تقریر، کفار کا عناد، مسئلہ رسالت و توحید پر بحث، حضور ﷺ کی تسلی، منکرین کی وعید اور قرآن کی حقایت بیان فرماتے ہیں، چنانچہ اب یہ بتلاتے ہیں کہ یہ قصہ آپ ﷺ کی نبوت کی کس طرح دلیل بنا:

یہ قصہ (جو اوپر بیان کیا گیا آپ کے اعتبار سے) غیب کی خبروں میں سے ہے (کیونکہ آپ کے پاس کوئی ظاہری ذریعہ اس کے جاننے کا نہیں تھا، صرف) ہم (ہی) وحی کے ذریعہ سے آپ کو یہ قصہ بتلاتے ہیں، اور (یہ ظاہر ہے کہ) آپ ان (برادران یوسف) کے پاس اس وقت موجود نہ تھے جبکہ انہوں نے اپنا ارادہ (یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالنے کا) پختہ کر لیا تھا، اور وہ (اس کے متعلق) تدبیریں کر رہے تھے (کہ باپ سے یوں کہیں کہ ان کو یوں لے جائیں وغیرذٰلک، اور اسی طرح یہ امر بھی یقینی ہے کہ آپ نے کسی سے یہ قصہ سنا سنایا بھی نہیں، پس یہ صاف دلیل ہے آپ کی نبوت کی اور صاحب وحی ہونے کی)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی برادران یوسف جب ان کو باپ سے جدا کرنے اور کنوئیں میں ڈالنے کے مشورے اور تدبیریں کر رہے تھے آپ ان کے پاس نہیں کھڑے تھے کہ ان کی باتیں سنتے اور حالات کا معائنہ کرتے، پھر ایسے صحیح واقعات بجز وحی الٰہی کے آپ کو کس نے بتائے، آپ رسمی طور پر پڑھے لکھے نہیں، کسی ظاہری معلم سے استفادہ کی نوبت نہیں آئی پھر یہ حقائق جن کی اس قدر تفصیل بائبل میں بھی نہیں، آپ کو خدا کے سوا کس نے معلوم کرائیں۔

وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٣﴾

اور اکثر لوگ نہیں ہیں یقین کرنے والے اگرچہ تو کتنا ہی چاہے

**خلاصہ تفسیر:** اور (نبوت پر دلائل قائم ہونے کے باوجود عناد کی وجہ سے) اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے گو آپ کا کیسا ہی جی چاہتا ہو۔

* * *

**فائدہ:** باوجودیکہ آپ کی صداقت پر ایسی واضح دلائل موجود ہیں پھر بھی اکثر لوگ وہ ہیں جو کسی طرح ایمان لانے والے نہیں۔

وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٤﴾ ع

اور تو مانگتا نہیں ان سے اس پر کچھ بدلہ، یہ تو اور کچھ نہیں مگر نصیحت سارے عالم کو

**خلاصہ تفسیر:** یہود اور قریش نے امتحاناً آپ ﷺ سے یہ قصہ دریافت کیا تھا، آپ ﷺ نے وحی الٰہی کی مدد سے اس کو صحیح صحیح بیان کر دیا، اس پر بھی ایمان نہ لائے تو آپ ﷺ کو رنج ہوا، اس پر تسلی دی جاتی ہے کہ اے نبی ﷺ!:

اور (ان کے ایمان نہ لانے سے آپ کا تو کوئی نقصان ہی نہیں، کیونکہ) آپ ان سے (قرآن) پر کچھ معاوضہ تو چاہتے نہیں (جس میں یہ احتمال ہو کہ اگر یہ قرآن کو قبول نہ کریں گے تو آپ کا معاوضہ فوت ہو جائے گا) یہ (قرآن) تو صرف تمام جہان والوں کے لئے نصیحت ہے (جو نہ مانے گا اسی کا نقصان ہوگا)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی نہیں مانتے نہ مانیں آپ کا کیا نقصان ہے کچھ تبلیغ کی تنخواہ تو آپ ان سے مانگتے نہ تھے کہ وہ بند کر لیں گے نصیحت اور فہمائش تھی سو ہو گئی اور ہو رہی ہے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿١٠٥﴾

اور بہتیرین نشانیاں ہیں آسمانوں اور زمین میں جن پر گزر ہوتا رہتا ہے ان کا اور وہ ان پر دھیان نہیں کرتے

**خلاصہ تفسیر:** مزید تسلی دیتے ہیں کہ نبوت سے بڑھ کر یہ توحید کے بھی منکر ہیں تو نبوت کے انکار پر کیا تعجب کیا جائے:

اور (جیسے یہ لوگ منکر نبوت ہیں اسی طرح دلائل کے باوجود توحید کے بھی منکر ہیں، چنانچہ) بہت سی نشانیاں ہیں (توحید پر دلالت کرنے والی) آسمانوں میں (جیسے چاند ستارے وغیرہ) اور زمین میں (جیسے عناصر و عنصریات، پانی، مٹی وغیرہ) جن پر ان کا گذر ہوتا رہتا ہے (یعنی ان کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں) اور وہ ان کی طرف (ذرا) توجہ نہیں کرتے (یعنی ان سے استدلال نہیں کرتے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جس طرح آیات تنزیلیہ سن کر آپ پر ایمان نہیں لاتے، ایسے ہی آیات تکوینیہ دیکھ کر خدا کی توحید کا سبق حاصل نہیں کرتے اصل یہ ہے کہ ان کا سننا اور دیکھنا محض سرسری ہے، آیات اللہ میں غور و فکر کرتے تو کچھ فائدہ پہنچتا، جب دھیان نہیں تو ایمان کہاں سے ہو۔

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿١٠٦﴾

اور نہیں ایمان لاتے بہت لوگ اللہ پر مگر ساتھ ہی شریک بھی کرتے ہیں

**خلاصہ تفسیر:** اور اکثر لوگ جو خدا کو مانتے ہیں تو اس طرح کہ شرک بھی کرتے جاتے ہیں (پس توحید کے بغیر خدا کا ماننا نہ ماننے

جیسا ہی ہے، پس یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی کفر کرتے ہیں اور نبوت کے ساتھ بھی کفر کرتے ہیں)۔

**اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ:** شرک سے بعض مفسرین نے ریا کاری مراد لی ہے، بعض نے اسباب کی طرف نظر اور فقط اسباب پر اعتماد کرنا مراد لیا ہے، بعض نے اس سے مخلوق کی اطاعت میں خالق کی نافرمانی کرنا مراد لیا ہے، بعض نے ہر قسم کے شرک کو اس میں داخل کیا ہے اور بعض صوفیہ نے غیر اللہ کی طرف مطلق توجہ والتفات کو شرک کہا ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی زبان سے سب کہتے ہیں کہ خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے مگر اس کے باوجود کوئی بتوں کو خدائی کا حصہ دار بنا رہا ہے چنانچہ مشرکین عرب ''تلبیہ'' میں یہ لفظ کہتے تھے: ''لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ اِلَّا شَرِيْكًا هُوَلَكَ تَمْلِكُهٗ، وَمَا مَلَكَ'' کوئی اس کے لیے بیٹے بیٹیاں تجویز کرتا ہے، کوئی اسے روح و مادہ کا محتاج بتاتا ہے کسی نے احبار و رہبان کو خدائی کے اختیارات دے دیے ہیں بہت سے تعزیہ پرستی، قبر پرستی پیر پرستی کے خس و خاشاک سے توحید کے صاف چشمہ کو مکدر کر رہے ہیں، ریا اور ہوا پرستی سے تو کتنے موحدین ہیں جو پاک ہوں گے، غرض ایمان کا زبانی دعویٰ کرکے بہت کم ہیں جو عقیدہ یا عمل کے درجہ میں شرک جلی یا خفی کا ارتکاب نہیں کرتے (اعاذنا الله من سائر انواع الشرك)

## اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

کیا نڈر ہوگئے اس سے کہ آڈھانکے ان کو ایک آفت اللہ کے عذاب کی یا آپہنچے قیامت اچانک اور ان کو خبر نہ ہو

**خلاصہ تفسیر:** (اب انکار توحید و رسالت پر وعید بیان کی جاتی ہے) سو کیا (اللہ و رسول کے منکر ہو کر) پھر بھی اس بات سے مطمئن ہوئے بیٹھے ہیں کہ ان پر خدا کے عذاب کی کوئی ایسی آفت آپڑے جو ان کو محیط ہو جائے (ہر طرف سے گھیر لے) یا ان پر اچانک قیامت آجائے اور ان کو (پہلے سے) خبر بھی نہ ہو (مطلب یہ ہے کہ ان کے کفر کا نتیجہ عذاب ہے، خواہ دنیا میں نازل ہو جائے یا قیامت کے دن واقع ہو، پھر منکر خدا و رسول ہو کر اطمینان کیسا، ان کو خدا سے ڈرنا اور کفر کو چھوڑ دینا چاہئے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی ایسے بے فکر و بے خوف کیوں ہو رہے ہیں، کیا انہوں نے عذاب الٰہی یا قیامت کے ہولناک حوادث سے محفوظ رہنے کا کچھ انتظام کرلیا ہے؟

## قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ؔ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ

وقف النبی ﷺ

کہہ دے یہ میری راہ ہے بلاتا ہوں اللہ کی طرف، سمجھ بوجھ کر میں اور جو میرے ساتھ ہے، اور اللہ پاک ہے

## وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

اور میں نہیں شریک بتانے والوں میں

**خلاصہ تفسیر:** (اب اتمام حجت کے لیے دوبارہ دعوت دی جاتی ہے) آپ فرما دیجئے کہ یہ (رسالت کا حق ہونا توحید کا حق ہونا یہی) میرا طریق ہے کہ میں خدا کی طرف اس طور پر بلاتا ہوں کہ میں (توحید کی اور اپنے من جانب اللہ رسول ہونے کی) دلیل پر قائم ہوں، میں بھی، اور میرے ساتھ والے بھی (یعنی میرے پاس بھی توحید و رسالت کی دلیل ہے اور میرے ساتھ والے بھی استدلال کے ساتھ مجھ پر ایمان لائے ہیں، میں بے دلیل بات کی طرف کسی کو نہیں بلاتا، دلیل سنو اور سمجھو، پس حاصل طریق کا یہ ہوا کہ خدا واحد ہے اور میں داعی ہوں) اور اللہ (شرک سے) پاک

ہے، اور میں (اس طریق کو قبول کرتا ہوں اور) مشرکین میں سے نہیں ہوں (خلاصہ یہ ہوا کہ نبوت کے دعوی سے میرا مقصود اپنا بندہ بنانا نہیں، بلکہ اللہ کا بندہ بنانا ہے، لیکن اس کا رستہ اللہ کے رسول کے ذریعہ سے بتلایا جاتا ہے، اس لیے مجھے داعی ماننا واجب ہے جبکہ میرے پاس اس کی دلیل بھی ہے)۔

**قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ**: روح المعانی میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ داعی الی اللہ کو طریق ایصال (صراط مستقیم تک پہنچانے) کی مہارت اور اللہ کی ذات وصفات کا عارف ہونا چاہیے۔

* * *

**فائدہ**: یعنی میرا راستہ یہ ہی خالص توحید کا راستہ ہے میں تمام دنیا کو دعوت دیتا ہوں کہ سب خیالات واوہام کو چھوڑ کر ایک خدا کی طرف آئیں، اس کی توحید، اس کی صفات وکمالات اور اس کے احکام وغیرہ کی صحیح معرفت صحیح راستہ سے حاصل کریں، میں اور میرے ساتھی اس سیدھے راستہ پر، حجت وبرہان اور بصیرت ووجدان کی روشنی میں چل رہے ہیں، خدا نے مجھ کو ایک نور دیا جس سے سب ہمراہیوں کے دماغ روشن ہو گئے، یہاں کسی کی اندھی تقلید نہیں، خالص توحید کا راہرو ہر قدم پر اپنے باطن میں معرفت وبصیرت کی خاص روشنی اور عبودیت محضہ کی خاص لذت محسوس کر کے بے ساختہ پکار اٹھتا ہے: وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ؕ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ

اور جتنے بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے وہ سب مرد ہی تھے کہ وحی بھیجتے تھے ہم ان کو بستیوں کے رہنے والے، سو کیا ان لوگوں نے نہیں سیر کی ملک کی

فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ؕ

کہ دیکھ لیتے کیسا ہوا انجام ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے، اور آخرت کا گھر تو بہتر ہے پرہیز کرنے والوں کو

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

کیا اب بھی نہیں سمجھتے

**خلاصہ تفسیر**: نبوت پر ان کا ایک شبہ تھا کہ نبی فرشتہ ہونا چاہیے، اب اس کا جواب دیا جاتا ہے:

اور (یہ جو نبوت پر شبہ کرتے ہیں کہ نبی فرشتہ ہونا چاہئے محض مہمل بات ہے، کیونکہ) ہم نے آپ سے پہلے مختلف بستی والوں میں سے جتنے (رسول) بھیجے سب آدمی ہی تھے جن کے پاس ہم وحی بھیجتے تھے (کوئی بھی فرشتہ نہ تھا، جنہوں نے ان کو نہ مانا اور ایسے ہی مہمل شبہات کرتے رہے ان کو سزائیں دی گئیں، اسی طرح ان کو بھی سزا ہوگی خواہ دنیا میں خواہ آخرت میں، اور یہ لوگ جو بے فکر ہیں) تو کیا یہ لوگ ملک میں (کہیں) چلے پھرے نہیں کہ (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیتے کہ ان لوگوں کا کیسا (برا) انجام ہوا جو ان سے پہلے (کافر) ہو گذرے ہیں، اور (یاد رکھو کہ جس دنیا کی محبت میں منہمک ہو کر تم نے کفر اختیار کر رکھا ہے یہ دنیا محض فانی اور ہیچ ہے) البتہ عالم آخرت ان لوگوں کے لئے نہایت بہبودی (بھلائی اور فائدے) کی چیز ہے جو (شرک وغیرہ سے) احتیاط رکھتے ہیں (اور توحید واطاعت اختیار کرتے ہیں) تو کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے (کہ فانی اور بے حقیقت چیز کا اختیار کرنا اچھا ہے یا باقی اور پائدار چیز کا؟!!)۔

* * *

**فائدہ**: یعنی پہلے بھی ہم نے آسمان کے فرشتوں کو نبی بنا کر نہیں بھیجا انبیائے سابقین ان ہی انسانی بستیوں کے رہنے والے مرد تھے، پھر دیکھ لو ان کے جھٹلانے والوں کا دنیا میں کیا حشر ہوا، حالانکہ دنیا میں کافروں کو بھی بسا اوقات عیش نصیب ہو جاتا ہے اور آخرت کی بہتری تو خالص ان کے لیے ہے جو شرک وکفر سے پرہیز کرتے ہیں، یہ تنبیہ ہے کفار مکہ کو کہ اگلوں کے احوال سے عبرت حاصل کریں۔

**تنبیہ:** اس آیت سے نکلتا ہے کہ کوئی عورت نبی نہیں بنائی گئی، حضرت مریم کو بھی قرآن نے صدیقہ کا مرتبہ دیا ہے، نیز آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل بوادی (جنگلی گنواروں) میں سے کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا۔

حَتّٰۤى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ؕ

یہاں تک کہ جب ناامید ہونے لگے رسول اور خیال کرنے لگے ان سے جھوٹ کہا گیا تھا پہنچی ان کو ہماری مدد، پھر بچا دیا جن کو ہم نے چاہا

وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۰﴾

اور پھرتا نہیں عذاب ہمارا قوم گناہ گار سے

**خلاصہ تفسیر:** اب آپ ﷺ اور اہل ایمان کو تسلی دی جاتی ہے اور کفار کے لیے وعید بیان کی جاتی ہے۔

(اگر تمہیں کفار پر عذاب میں دیر ہونے کی وجہ سے عذاب کے واقع نہ ہونے کا شبہ ہو تو تمہاری غلطی ہے اس لئے کہ پچھلی امتوں کے کفار کو بھی بڑی بڑی مہلتیں دی گئی تھیں) یہاں تک کہ (جب مہلت کی مدت طویل ہوئی اور مقررہ عذاب کے نازل ہونے میں دیر ہوئی تو) پیغمبر (اس بات سے) مایوس ہوگئے (کہ اللہ تعالیٰ کے اجمالی وعدہ سے عذاب کا جو وقت ہم نے اپنے اندازے سے اپنے ذہنوں میں مقرر کر رکھا تھا اس وقت کفار پر عذاب نہ آئے گا اور حق کا غلبہ ظاہر نہ ہوگا، یعنی ہم سے جو ہماری نصرت اور دشمنوں کی ہلاکت کا وعدہ کیا گیا تھا جو اب تک ہمارے اندازہ اور تخمینہ کے مطابق پورا نہیں ہوا شاید وہ عذاب ہماری زندگی میں نہ آئے بلکہ ہمارے بعد آئے) اور ان (پیغمبروں) کو گمان غالب ہوگیا کہ (وعدہ الٰہیہ یعنی نزول عذاب کا اپنے اندازہ سے وقت مقرر کرنے میں) ہمارے فہم نے غلطی کی (کہ ہم نے اپنی فہم و اجتہاد سے محض قرائن سے یا نصرت الہیہ کے جلد آنے کی خواہش میں قریب کا وقت معین کرلیا، حالانکہ اللہ نے جو نزول عذاب کا وعدہ کیا وہ مطلق تھا، اس میں اس میں وقت وغیرہ کی کوئی قید نہ تھی، ایسی مایوسی کی حالت میں) ان کو ہماری مدد پہنچی (وہ مدد یہ کہ کفار پر عذاب آیا) پھر (اس عذاب سے) ہم نے جس کو چاہا وہ بچا لیا گیا (مراد اس سے مؤمنین ہیں) اور (اس عذاب میں کفار ہلاک کئے گئے، کیونکہ) ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے نہیں ہٹتا (بلکہ ان پر ضرور آکر رہتا ہے اگرچہ دیر سے ہی سہی، اس لیے کفار مکہ بھی دیر ہونے سے دھوکہ میں نہ رہیں)۔

**وَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا:** اس آیت میں لفظ كُذِبُوْا مشہور قرات کے مطابق پڑھا گیا ہے اور اس کی جو تفسیر ہم نے اختیار کی ہے وہ سب سے زیادہ اسلم اور بے غبار ہے کہ لفظ كُذِبُوْا کا حاصل اپنے تخمینہ اور خیال کا غلط ہونا ہے جو ایک قسم کی اجتہادی غلطی ہے اور انبیاء علیہم السلام سے کوئی ایسی اجتہادی غلطی ہوسکتی ہے، البتہ انبیاء اور دوسرے مجتہدین میں یہ فرق ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے جب کوئی اجتہادی غلطی ہوجاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو اس غلطی پر قائم نہیں رہنے دیتے، بلکہ ان کو باخبر کر کے حقیقت کھول دیتے ہیں، دوسرے مجتہدین کا یہ مقام نہیں، رسول کریم ﷺ کا واقعہ صلح حدیبیہ اس مضمون کے لئے کافی شاہد ہے، کیونکہ قرآن کریم میں مذکور ہے کہ اس واقعہ کی بنیاد رسول کریم ﷺ کا وہ خواب ہے جو آپ نے دیکھا کہ آپ مع صحابہ بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں اور انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی بحکم وحی ہوتا ہے، اس لئے اس واقعہ کا ہونا یقینی ہوگیا، مگر خواب میں اس کا کوئی خاص وقت اور مدت نہیں بتلائی گئی تھی، آنحضرت محمد ﷺ نے اپنے اندازہ سے خیال فرمایا کہ اسی سال ایسا ہوگا اس لئے صحابہ کرام میں اعلان کر کے ان کی خاصی تعداد کو ساتھ لے کر عمرہ کے لئے مکہ معظمہ کو روانہ ہوگئے، مگر قریش مکہ نے مزاحمت کی اور اس وقت طواف وعمرہ کی نوبت نہ آئی، بلکہ اس کا مکمل ظہور دو سال بعد سن ۸ ہجری میں فتح مکہ کی صورت سے ہوا، اس واقعہ سے معلوم ہوگیا کہ جو خواب آپ ﷺ نے دیکھا تھا وہ حق و یقینی تھا، مگر اس کا وقت جو قرائن یا اندازہ سے رسول کریم ﷺ نے مقرر فرما لیا تھا اس میں غلطی ہوئی، مگر اس غلطی کا ازالہ اسی وقت ہوگیا، اسی طرح آیت مذکورہ میں قَدْ كُذِبُوْا کا بھی یہی مفہوم ہے کہ کفار پر عذاب آنے میں دیر ہوئی اور جو وقت اندازہ سے انبیاء نے اپنے ذہن میں مقرر کیا تھا اس وقت عذاب نہ آیا تو ان کو یہ گمان ہوا کہ

ہم نے وقت متعین کرنے میں غلطی کی ہے، یہ تفسیر حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے۔

اور بعض قراتوں میں یہ لفظ ذال کی تشدید کے ساتھ قَدْ كُذِّبُوْا بھی آیا ہے، جو مصدر تکذیب سے مشتق ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ انبیاء علیہم السلام نے جو اندازہ سے وقت عذاب مقرر کر دیا تھا اس وقت پر عذاب نہ آنے سے ان کو یہ خطرہ ہو گیا کہ اب جو مسلمان ہیں وہ بھی ہماری تکذیب نہ کرنے لگیں کہ جو کچھ ہم نے کہا تھا وہ پورا نہیں ہوا، ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا، منکروں پر عذاب آ پڑا، اور مؤمنین کو اس سے نجات ملی اس طرح ان کا غلبہ ظاہر ہو گیا۔

اسی کے قریب مضمون کی آیت سورہ بقرہ آیت ۲۱۴: اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ گزر چکی ہے، اس کی تفسیر دیکھنے سے یہاں کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔

* * *

**فائدہ:** یعنی تاخیر عذاب سے دھوکہ مت کھاؤ، پہلی قوموں کو بھی لمبی مہلتیں دی گئیں، اور عذاب آنے میں اتنی دیر ہوئی کہ منکرین بالکل بے فکر ہو کر بیش از بیش شرارتیں کرنے لگے، یہ حالات دیکھ کر پیغمبروں کو ان کے ایمان لانے کی کوئی امید نہ رہی، ادھر خدا کی طرف سے ان کو ڈھیل اس قدر دی گئی کہ مدت دراز تک عذاب کے کچھ آثار نظر نہ آتے تھے، غرض دونوں طرف کے حالات وآثار پیغمبروں کے لیے یاس انگیز تھے، یہ منظر دیکھ کر کفار نے یقینی طور پر خیال کر لیا کہ انبیاء سے جو وعدے ان کی نصرت اور ہماری ہلاکت کے کیے گئے تھے سب جھوٹی باتیں ہیں، عذاب وغیرہ کا ڈھکوسلہ صرف ڈرانے کے واسطے تھا، کچھ بعید نہیں کہ ایسی مایوس کن اور اضطراب انگیز حالت میں انبیاء کے قلوب میں بھی یہ خیالات آنے لگے ہوں کہ وعدہ عذاب کو جس رنگ میں ہم نے سمجھا تھا وہ صحیح نہ تھا، یا وساوس وخطرات کے درجہ میں بے اختیار یہ وہم گزرنے لگے ہوں کہ ہماری نصرت اور منکرین کی ہلاکت کے جو وعدے کیے گئے تھے کیا وہ پورے نہ کیے جائیں گے؟ جیسے دوسری جگہ فرمایا: وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ (البقرۃ: ۲۱۴) جب مجرمین کی بے خوفی اور انبیاء کی تشویش اس حد تک پہنچ گئی اس وقت ناگہاں آسمانی مدد آئی، پھر جس کو خدا نے چاہا (یعنی فرمانبردار مؤمنین کو) محفوظ ومصون رکھا، اور مجرموں کی جڑ کاٹ دی۔

**تنبیہ:** ۱۔ اللہ تعالیٰ کی غیر محدود رحمت ومہربانی سے ناامیدی کفر ہے لیکن ظاہری حالات واسباب کے اعتبار سے ناامیدی کفر نہیں، یعنی یوں کہہ سکتے ہیں کہ فلاں چیز کی طرف سے جہاں تک اسباب ظاہری کا تعلق ہے مایوسی ہے، لیکن حق تعالیٰ کی رحمت کاملہ سے مایوسی نہیں، آیت: حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ میں یہی مایوسی مراد ہے جو ظاہری حالات وآثار کے اعتبار سے ہو، ورنہ پیغمبر خدا کی رحمت سے کب مایوس ہو سکتے ہیں۔

**تنبیہ:** ۲۔ کفر کا وسوسہ کفر نہیں، نہ کسی درجہ میں ایمان یا عصمت کے منافی ہے، حدیث میں آیا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم اپنے دلوں میں ایسی چیزیں (بے اختیار) پاتے ہیں جن کے زبان پر لانے سے ہم بہتر سمجھتے ہیں کہ جل کر کوئلہ ہو جائیں، آپ نے فرمایا کیا ایسا پاتے ہو؟ عرض کیا ہاں! فرمایا: "ذَاكَ صَرِيْحُ الْاِيْمَانِ" یہ تو کھلا ہوا ایمان ہے۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ؕ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ

البتہ ان کے احوال سے اپنا حال قیاس کرنا ہے عقل والوں کو ۱۔ کچھ بنائی ہوئی بات نہیں لیکن موافق ہے اس کلام کے جو

بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ ع

اس سے پہلے ہے اور بیان ہر چیز کا اور ہدایت اور رحمت ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں ۲۔

**خلاصہ تفسیر:** اختتام سورت میں انبیاء کے قصوں کی حکمت بیان کی جاتی ہے کہ ان میں عبرت ہے اور تسلی بھی ہے، اور ان واقعات کے بیان سے قرآن کریم کی حقانیت بھی ثابت ہوتی ہے، سورت کے شروع میں بھی یہی مضمون تھا اور اسی پر اختتام کیا گیا۔

ان (گذشتہ امتوں اورانبیاء) کے قصہ میں سمجھدار لوگوں کے لئے (بڑی) عبرت ہے (جواس سے عبرت حاصل کرتے ہیں کہ اطاعت کا یہ انجام ہے اور معصیت کا یہ انجام ہے) یہ قرآن (جس میں یہ قصے ہیں) کوئی تراشی ہوئی بات تو ہے نہیں (کہ اس سے عبرت نہ ہوتی) بلکہ اس سے پہلے جو آسمانی کتابیں (نازل) ہوچکی ہیں یہ ان کی تصدیق کرنے والے ہے اور ہر (ضروری) بات کی تفصیل کرنے والا ہے اور ایمان والوں کے لئے ذریعہ ہدایت ورحمت ہے (پس ایسی کتاب میں جو مضامین عبرت کے ہوں گے ان سے تو عبرت حاصل کرنا لازم ہی ہے)۔

* * *

**فائدہ:** لے یعنی یہ کوئی افسانہ یا ناول نہیں، تاریخی حقائق ہیں، جن سے عقل مندوں کو سبق لینا چاہیے۔

**فائدہ:** ۲ے یعنی قرآن کریم جس میں یہ قصص بیان ہوئے کوئی جھوٹی بنائی ہوئی بات نہیں بلکہ تمام پہلی سچائیوں کی تصدیق کرنے والا اور ہر ضروری چیز کو کھول کر بیان کرنے والا ہے، چونکہ ایماندار اس سے نفع اٹھاتے ہیں اس لحاظ سے ان کے حق میں خاص طور پر ذریعہ ہدایت ورحمت ہے۔

نَفَعَنَا اللهُ بِعُلُوْمِهٖ وَرَزَقَنَا تَلَاوَتَهٗ اٰنَآءَ اللَّيْلِ وَاٰنَآءَ النَّهَارِ وَجَعَلَهٗ حُجَّةً لَّنَا لَا عَلَيْنَا اٰمِيْن

اٰیاتها ٤٣ | ١٣ سُوْرَةُ الرَّعْدِ مَدَنِيَّةٌ ٩٦ | رکوعاتها ٦

**خلاصہ تفسیر:** اس سورت کا حاصل یہ مضامین ہیں: ① قرآن کریم کی حقانیت کا بیان ② توحید یعنی دلائل الوہیت ووحدانیت اور عجائب قدرت کا ذکر ③ آخرت کا اثبات اور وعدہ وعید ④ رسالت ونبوت کا بیان اور منکرین نبوت کے چند شبہات کا جواب ⑤ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی، اور یہی مضامین سورہ یوسف کے آخر میں اجمالا مذکور ہیں، پس اس سورت کا ماقبل سے اور باہمی ربط بھی ظاہر ہو گیا۔

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

الٓمّٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ①

ال م ر۔ یہ آیتیں ہیں کتاب کی، اور جو کچھ اترا تجھ پر تیرے رب سے سو حق ہے لیکن بہت لوگ نہیں مانتے

**خلاصہ تفسیر:** الٓمّٓرٰ (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (جو آپ سن رہے ہیں) آیتیں ہیں ایک بڑی کتاب (یعنی قرآن) کی اور جو کچھ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے یہ بالکل سچ ہے اور (اس کا تقاضا یہ تھا کہ سب ایمان لاتے) لیکن بہت سے آدمی ایمان نہیں لاتے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جو کچھ اس سورت میں پڑھا جانے والا ہے وہ عظیم الشان کتاب کی آیتیں ہیں، یہ کتاب جو آپ پر پروردگار کی طرف سے اتاری گئی یقینا حق وصواب ہے، لیکن جائے تعجب ہے کہ ایسی صاف اور واضح حقیقت کے ماننے سے بھی بہت لوگ انکار کرتے ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ

اللہ وہ ہے جس نے اونچے بنائے آسمان بغیر ستون دیکھتے ہو لے پھر قائم ہوا عرش پر (تک) ۲ے اور کام میں لا دیا سورج اور چاند کو

كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ②

ہر ایک چلتا ہے وقت مقرر پر ۳ے تدبیر کرتا ہے کام کی ظاہر کرتا ہے نشانیاں کہ (تاکہ) شاید تم اپنے رب سے ملنے کا یقین کرو ۴ے

**خلاصہ تفسیر:** اوپر قرآن کی حقانیت کا مضمون تھا، اب توحید کا مضمون ہے جو کہ قرآن کے مقاصد میں سے بڑا مقصود ہے:

اللہ ایسا (قادر) ہے کہ اس نے آسمانوں کو بدون ستون کے اونچا کھڑا کر دیا چنانچہ تم ان (آسمانوں) کو (اسی طرح) دیکھ رہے ہو، پھر عرش پر (جو تخت سلطنت کے مشابہ ہے اس طرح) قائم (اور جلوہ فرما) ہوا (جو کہ اس کی شان کے لائق ہے) اور آفتاب و ماہتاب کو کام میں لگا دیا (ان دونوں میں سے) ہر ایک (اپنے مدار پر) ایک وقت معین میں چلتا رہتا ہے (چنانچہ سورج اپنے منازل کو سال بھر میں پورا کر لیتا ہے اور چاند مہینہ بھر میں) وہی (اللہ) ہر کام کی (جو کچھ عالم میں واقع ہوتا ہے) تدبیر کرتا ہے (اور) دلائل (تکوینی وتشریعی) کو صاف صاف بیان کرتا ہے تاکہ تم اپنے رب کے پاس جانے کا (یعنی قیامت کا) یقین کر لو (قیامت کے امکان کا یقین تو اس طرح کہ جب اللہ تعالیٰ ایسی عظیم چیزوں کی تخلیق پر قادر ہے تو مردوں کو زندہ کرنے پر کیوں قادر نہ ہوگا اور اس کے واقع ہونے کا یقین اس طرح کہ مخبر صادق ﷺ نے ایک ممکن چیز کے واقع ہونے کی خبر دی تو لامحالہ وہ سچ اور صحیح ہے)۔

**رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا:** عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ نیلا رنگ جو ہمیں اوپر نظر آتا ہے یہ آسمان کا رنگ ہے، مگر فلاسفہ کہتے ہیں کہ یہ رنگ روشنی اور اندھیری کی آمیزش سے محسوس ہوتا ہے، کیونکہ نیچے ستاروں کی روشنی اور اس کے اوپر اندھیری ہے تو باہر سے رنگ نیلا محسوس ہوتا ہے، جیسے گہرے پانی پر روشنی پڑتی ہے تو وہ نیلا نظر آتا ہے، قرآن کریم کی چند آیات ایسی ہیں جن میں آسمان کے دیکھنے کا ذکر ہے، جیسے اسی آیت مذکورہ میں تَرَوْنَهَا کے الفاظ ہیں اور دوسری آیت میں وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ کے الفاظ ہیں، فلاسفہ کی یہ تحقیق اول تو اس کے منافی نہیں، کیونکہ ایسا ممکن ہے کہ آسمان کا رنگ بھی نیلگوں ہو یا کوئی دوسرا رنگ ہو، مگر درمیانی روشنی اور اندھیری کے امتزاج سے نیلا نظر آتا ہو، جیسا کہ ظاہر حدیث سے معلوم ہوتا ہے: "ما اظلت الخضراء" جیسے فرض کیجیے کہ ایک سفید کپڑے کے سامنے دو آئینے ہوں ایک سفید ایک سیاہ تو ان دونوں کے اندر سے وہ کپڑا بھی نظر آتا ہے اگرچہ اصلی رنگ پر نہ سہی، پس اس صورت میں حدیث میں آسمان کو خضراء یعنی سبز رنگ ظاہر کے اعتبار سے فرما دیا، اس سے انکار کی کوئی دلیل نہیں کہ اس فضاء کے رنگ میں آسمان کا رنگ بھی شامل ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ قرآن کریم میں جہاں آسمان کے دیکھنے کا ذکر ہے وہ حکمی اور مجازی ہو کہ آسمان کا وجود ایسے یقینی دلائل سے ثابت ہے کہ گویا دیکھ ہی لیا۔

* * *

**فائدہ: ١ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا:** یعنی اس دنیا کی ایسی عظیم الشان، بلند اور مضبوط چھت خدا نے بنائی جسے تم دیکھتے ہو، اور لطف یہ ہے کہ کوئی ستون یا کھمبا یا گاڈر دکھائی نہیں دیتا، جس پر اتنی بڑی ڈاٹ کھڑی کی گئی بجز اس کے کیا کہا جائے کہ محض قدرت کے غیر مرئی ستون کے سہارے اس کا قیام ہے: وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (الحج: ٦٥) کشش اجسام کا نظریہ اگر صحیح ہو تو وہ اس آیت کے منافی نہیں، کیونکہ کشش کو عرفاً عمد نہیں کہتے اور اگر عمد کہا جائے تو مرئی نہیں ہے: "رُوِىَ عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ وَمُجَاهِدٍ وَالحسنِ وَقَتَادَةَ وَغَيْرِ وَاحِدٍ اَنَّهُمْ قَالُوْا لَهَا عُمُدٌ وَلٰكِنْ لَا نَرٰى"، (ابن کثیر) یعنی ان بزرگوں نے فرمایا کہ آسمانوں کے ستون ہیں جو ہم کو نظر نہیں آتے، واللہ اعلم۔

**فائدہ: ٢ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ:** استوىٰ علی العرش، کے متعلق سورہ اعراف (آیت ٥٤) آٹھویں پارہ کے آخر میں کلام کیا گیا ہے، وہاں ملاحظہ کر لیا جائے۔

**فائدہ: ٣ كُلٌّ يَّجْرِىْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى:** یعنی سورج اپنا دورہ ایک سال میں اور چاند ایک ماہ میں پورا کرتا ہے، یا لِاَجَلٍ مُّسَمًّى کے معنی وقت مقرر تک کے لیے جائیں تو یہ مطلب ہوگا کہ چاند سورج اسی طرح چلتے رہیں گے قیامت تک۔

**فائدہ: ٤ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ:** یعنی جس نے ایسی عظیم مخلوقات کو پیدا کیا اسے تمہارا دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے، نیز ایک باخبر، مدبر، بیدار مغز اور طاقتور گورنمنٹ باغیوں اور مجرموں کو ہمیشہ کے لیے یوں ہی آزاد نہیں چھوڑے رکھتی، نہ وفادار امن پسند رعایا کی راحت رسانی سے اغماض کر سکتی ہے پھر کیسے ممکن ہے کہ خداوند قدوس جو زمین و آسمان کے تخت کا تنہا مالک اور اپنی تدبیر و حکمت سے تمام مخلوقات علوی و سفلی کا انتظام باحسن اسلوب قائم رکھنے والا ہے مطیع و عاصی کو یوں ہی مہمل چھوڑے رکھے، ضرور ہے کہ ایک دن وفاداروں کو وفاداری کا صلہ ملے اور مجرم اپنی سزا

کو پہنچیں، پھر جب اس زندگی میں مطیع و عاصی کے درمیان ہم ایسی صاف تفریق نہیں دیکھتے تو یقینا ماننا پڑے گا کہ اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی ہے جس میں سب کو آسمانی عدالت کے سامنے حاضر ہو کر عمر بھر کے اعمال کا پھل چکھنا ہوگا۔

وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا ۭ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا

اور وہی ہے جس نے پھیلائی زمین اور رکھے اس میں بوجھ (پہاڑ) اور ندیاں ۱؎ اور ہر میوے کے رکھے اس میں

زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ③

جوڑے دو دو قسم ۲؎ ڈھانکتا ہے دن پر رات کو ۳؎ اس میں نشانیاں ہیں ان کے واسطے جو کہ دھیان کرتے ہیں

**خلاصہ تفسیر:** اور وہ ایسا ہے کہ اس نے زمین کو پھیلا دیا، اور اس (زمین) میں پہاڑ اور نہریں پیدا کیں، اور اس میں ہر قسم کے پھلوں سے دو دو قسم کے پیدا کئے (مثلاً کھٹے اور میٹھے، یا چھوٹے اور بڑے، کوئی کسی رنگ کا اور کوئی کسی رنگ کا، اور) شب (کی تاریکی) سے دن (کی روشنی) کو چھپا دیتا ہے (رات کی تاریکی سے دن کی روشنی پوشیدہ اور زائل ہو جاتی ہے) ان (مذکورہ) امور میں سوچنے والوں کے (سمجھنے کے) واسطے (توحید پر) دلائل (موجود) ہیں (جس کی تفصیل دوسرے پارہ سیقول کے چوتھے رکوع میں گذری ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی پہاڑ جو ایک جگہ کھڑے ہیں اور دریا جو ہر وقت چلتے رہتے ہیں۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی چھوٹا، بڑا، کھٹا، میٹھا، سیاہ و سفید، گرم سرد اور جدید تحقیق کے موافق ہر ایک میں نر و مادہ بھی پائے جاتے ہیں۔

**فائدہ:** ۳؎ اس کے معنی سورہ اعراف میں آٹھویں پارے کے خاتمہ پر بیان ہو چکے وہاں دیکھ لیا جائے۔

وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ

اور زمین میں کھیت ہیں مختلف ایک دوسرے سے متصل (پاس پاس) اور باغ ہیں انگور کے اور کھیتیاں ہیں اور کھجوریں ہیں

صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَاۗءٍ وَّاحِدٍ ۣ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰي بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ۭ

ایک کی جڑ دوسری سے ملی ہوئی اور بعض بن ملی انکو پانی بھی ایک ہی دیا جاتا ہے، اور ہم ہیں کہ بڑھا دیتے ہیں ان میں ایک کو ایک سے میووں میں

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ④

ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان کو جو غور کرتے ہیں

**خلاصہ تفسیر:** اور (اسی طرح توحید کے اور بھی دلائل ہیں، چنانچہ) زمین میں پاس پاس (اور پھر) مختلف قطعے ہیں (جن کا متصل ہونے کے باوجود مزاج، اثر اور خاصیت میں مختلف ہونا عجیب بات ہے) اور انگوروں کے باغ ہیں، اور (مختلف) کھیتیاں ہیں، اور کھجور (کے درخت) ہیں جن میں بعض تو ایسے ہیں کہ ایک تنہ اوپر جا کر دو تنے ہو جاتے ہیں اور بعضوں میں دو تنے نہیں ہوتے (بلکہ جڑ سے شاخوں تک ایک ہی چلا جاتا ہے اور) سب کو ایک ہی طرح کا پانی دیا جاتا ہے، اور (باوجود اس کے پھر بھی) ہم ایک کو دوسرے پر پھلوں میں فوقیت دیتے ہیں، ان (مذکورہ) امور میں (بھی) سمجھداروں کے (سمجھنے کے) واسطے (توحید کے) دلائل (موجود) ہیں۔

**صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ:** یہاں خاص دو تنوں کو ذکر کرنا مثال کے طور پر ہے، ورنہ بعض میں تین چار تک دیکھے گئے ہیں، پھر ایک میں پتے

الگ الگ نکلتے ہیں اور پھل الگ لگ لگتے ہیں۔

**وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ (الی قولہ) يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ:** اس سے معلوم ہوا کہ اگر فاعل (تربیت کرنے والا) ایک بھی ہو تب بھی قابلیت کی استعداد مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف نتائج واحوال پیدا ہوتے ہیں، اور استعداد مختلف ہونے کی وجہ سے ایسا ہی حال دلوں کا بھی ہے، یعنی ایک ہی ماں باپ کی تربیت یافتہ اولاد، یا ایک ہی استاذ اور شیخ کے شاگرد اور مریدین میں مختلف اوصاف واحوال پیدا ہوتے ہیں، جو کہ مُربی کے اختیار میں نہیں، نہ ہی اس کے بخل کی دلیل ہے، بلکہ یہ قلوب کی مختلف صلاحیتوں کا ثمرہ ہے۔

* * *

**فائدہ:** بلند آسمانوں کے مقابل پست زمین کا ذکر کیا، آسمان کے ساتھ چاند سورج کا بیان ہوا تھا کہ ہر ایک کی رفتار الگ ہے اور ہر ایک کا کام جداگانہ ہے، ایک کی گرم وتیز شعاعیں جو کام کرتی ہیں دوسرے کی ٹھنڈی اور دھیمی چاندنی سے وہ بن نہیں پڑتا، اسی طرح یہاں زمین کے مختلف احوال اور اس سے تعلق رکھنے والی مختلف چیزوں کا ذکر فرمایا، کہیں پہاڑ کھڑے ہیں کہیں دریا رواں ہیں، جو میوے اور پھل پیدا ہوتے ہیں ان میں بھی شکل، صورت، رنگ، مزہ، چھوٹے بڑے بلکہ نر و مادہ کا اختلاف ہے، کبھی زمین دن کے اجالے سے روشن ہو جاتی ہے کبھی رات کی سیاہ نقاب منہ پر ڈال لیتی ہے پھر طرفہ تماشا یہ ہے کہ چند قطعات زمین جو ایک دوسرے سے متصل ہیں، ایک پانی سے سیراب ہوتے ہیں، ایک سورج کی شعاعیں سب کو پہنچتی ہیں ایک ہی ہوا سب پر چلتی ہے اس کے باوجود اس قدر مختلف پھول پھل لاتے ہیں اور باہم پیداوار کی کمی زیادتی کا اتنا فرق ہوتا ہے جو دیکھنے والوں کو حیرت زدہ کر دیتا ہے، غور وفکر کرنے والے ان نشانوں کو دیکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ ایک ہی ابر رحمت کی آبیاری یا ایک ہی آفتاب ہدایت کی موجودگی میں انسانوں کے مادی و روحانی احوال کا اختلاف بھی کچھ مستبعد و مستنکر نہیں ہے، اور یہ کہ لامحدود قدرت کا کوئی زبردست ہاتھ آسمان سے زمین تک تمام مخلوق کے نظام ترکیبی کو اپنے قبضہ میں لیے ہوئے ہے، جس نے ہر چیز کی استعداد کے موافق اس کے دائرۂ عمل واثر کی بہت مضبوط حد بندی کر رکھی ہے، پھر ایسے لامتناہی قدرت واختیار رکھنے والے خدا کو کیا مشکل ہے کہ ہم کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر دے اور اس عالم کے مخلوط عناصر کی کیمیاوی تحلیل کر کے ہر خیر و شر کو اس کے مستقر میں پہنچا دے۔

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۬ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

اور اگر تو عجیب بات چاہے تو عجب ہے ان کا کہنا کہ کیا جب ہو گئے ہم مٹی کیا نئے سرے سے بنائے جائیں گے ۱؎ وہی ہیں جو منکر ہو گئے

بِرَبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۵

اپنے رب سے، اور وہی ہیں کہ طوق ہیں ان کی گردنوں میں، اور وہ ہیں دوزخ والے، وہ اسی میں رہیں گے برابر ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اوپر توحید کا اثبات تھا، اب تین آیتوں میں کفار کے شبہات کا جواب ہے جو نبوت کے متعلق تھے، اس کے ساتھ منکرین کے لیے عذاب کی وعید مذکور ہے، ان کے شبہات تین تھے، ایک شبہ یہ کہ کفار مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے اور حساب کتاب کو محال وخلاف عقل سمجھتے تھے، اسی بنا پر انبیاء کی تکذیب اور ان کی نبوت کا انکار کرتے تھے، اس آیت میں اسی شبہ کا جواب دیا جاتا ہے۔

اور (اے محمد ﷺ!) اگر آپ کو (ان لوگوں کے انکار قیامت سے) تعجب ہو تو (واقعی) ان کا یہ قول تعجب کے لائق ہے کہ جب ہم (مر کر) خاک ہو گئے کیا (خاک ہو کر) ہم پھر (قیامت کو) از سر نو پیدا ہوں گے (تعجب کے لائق اس لئے کہ جو ذات ایسی عظیم اشیاء کے پیدا کرنے پر ابتداءً قادر ہے اس کو دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے!! اور اسی سے جواب ہو گیا قیامت کو بعید ومحال سمجھنے کا بھی اور انکار نبوت کا بھی جس کی بنیاد بھی یہی محال سمجھنا ہی تھا، ایک کے جواب سے دوسرے کا جواب ہو گیا، آگے ان کے لئے وعید ہے کہ) یہ وہ لوگ ہیں کہ انہوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا

(کیونکہقیامت کے انکار سے خدا کی قدرت کا انکار کیا، اور انکار قیامت سے انکار نبوت لازم آتا ہے) اور ایسے لوگوں کی گردنوں میں (دوزخ میں) طوق ڈالے جائیں گے، اور ایسے لوگ دوزخی ہیں (اور) وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

**أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ**: کیونکہ قیامت کے انکار سے خدا کی قدرت کا انکار کیا، اور انکار قیامت سے انکار نبوت لازم آتا ہے، اور انکار نبوت سے حق تعالی کی صفت تائید حق کا انکار کیا، کیونکہ ان کے انکار سے لازم آتا ہے کہ معاذ اللہ خدا نے جھوٹے مدعی کے ہاتھ پر معجزات ظاہر کردیے جو کہ جھوٹ کی تائید اور حق کو مشتبہ کر دینا ہے، حالانکہ حق تعالی ہمیشہ حق کی تائید کرتے ہیں، جھوٹے کے ہاتھ پر معجزات ظاہر نہیں فرماتے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی اس سے زیادہ عجیب بات کیا ہوگی کہ جس نے اول ایک چیز بنائی وہ دوبارہ بنانے پر قادر نہ ہو؟ (العیاذ باللہ)

**فائدہ:** ۲ گویا یہ لوگ ''بعث بعد الموت'' کا انکار کر کے خداوند قدوس کی شہنشاہی سے منکر ہیں، تو ایسے باغیوں کا انجام یہ ہی ہونا ہے کہ گلے میں طوق اور ہاتھ پاؤں میں ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر ابدی جیل خانہ میں ڈال دیے جائیں جو حقیقت میں ایسے مجرموں کے لیے بنایا گیا ہے۔

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلَاتُ ۗ وَإِنَّ رَبَّكَ

اور جلد مانگتے ہیں تجھ سے برائی کو پہلے بھلائی سے ۱ اور گزر چکے ہیں ان سے پہلے بہت سے عذاب (مثالیں)، اور تیرا رب

لَذُو مَغْفِرَةٍ لِلنَّاسِ عَلَىٰ ظُلْمِهِمْ ۖ وَإِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيدُ الْعِقَابِ ⑥

معاف بھی کرتا ہے لوگوں کو باوجود ان کے ظلم کے، اور تیرے رب کا عذاب بھی سخت ہے ۲

**خلاصہ تفسیر:** کفار کا دوسرا شبہ یہ تھا کہ اگر آپ واقعی نبی اور رسول ہیں تو نبی کی مخالفت پر جس عذاب کی وعیدیں آپ سناتے ہیں وہ کیوں نہیں آتا؟ اب اس آیت میں اسی کا جواب دیا جارہا ہے۔

اور یہ لوگ عافیت (کی میعاد ختم ہونے) سے پہلے آپ سے مصیبت (کے نازل ہونے) کا تقاضا کرتے ہیں (کہ اگر آپ نبی ہیں تو جلدی عذاب منگا دیجئے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عذاب کے آنے کو بہت بعید سمجھتے ہیں) حالانکہ ان سے پہلے (اور کفار پر) واقعات عقوبت (سزا وعذاب) گزر چکے ہیں (تو ان پر آجانا کیا بعید ہے) اور (اللہ تعالیٰ کے غفور اور رحیم ہونے کو سن کر یہ لوگ مغرور نہ ہوں کہ اب ہمیں عذاب نہ ہوگا، کیونکہ وہ صرف غفور و رحیم ہی نہیں ہے اور پھر سب کے لئے غفور و رحیم نہیں ہیں، بلکہ ان میں دوسری صفت عذاب دینے کی بھی ہے، اور دونوں باتیں اپنے اپنے موقع پر ظاہر ہوتی ہیں یعنی) یہ بات بھی یقینی ہے کہ آپ کا رب لوگوں کی خطائیں باوجود ان کی (ایک خاص درجہ کی) بے جا حرکتوں کے (کفر کے علاوہ دیگر مصیبتیں اور گناہ) معاف کر دیتا ہے، اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ آپ کا رب سخت سزا دیتا ہے (یعنی اس میں دونوں صفتیں ہیں اور ہر ایک کے ظہور کے لیے کچھ شرطیں اور اسباب ہیں، پس انہوں نے بلا وجہ اپنے کو رحمت و مغفرت کا مستحق کیسے سمجھ لیا، بلکہ کفر کی وجہ سے ان کے لئے تو اللہ تعالی شدید العقاب یعنی سخت عذاب دینے والے ہیں)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی حق کو قبول نہیں کرتے جس سے دنیا و آخرت کی بھلائی ملے کفر اختیار کرتے ہیں اور کہتے ہیں عذاب لے آؤ۔

**فائدہ:** ۲ یعنی پہلے بہتیری قوموں پر عذاب آچکے ہیں، تم پر لے آنا کیا مشکل تھا، بات صرف اتنی ہے کہ تیرا پروردگار اپنی شان حلم وعفو سے ہر چھوٹے بڑے جرم پر فوراً گرفت نہیں کرتا، وہ لوگوں کے ظلم وستم دیکھتا اور درگزر کرتا رہتا ہے حتی کہ جب مظالم اور شرارتوں کا سلسلہ حد سے گزر جاتا ہے اس وقت اس کے تباہ کن عذاب سے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہتی۔

ع وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ⑦

اور کہتے ہیں کافر کیوں نہ اتری اس پر کوئی نشانی اس کے رب سے ۱؎ تیرا کام تو ڈر سنا دینا ہے اور ہر قوم کے لیے ہوا ہے راہ بتانے والا ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** کفار کا تیسرا شبہ یہ تھا کہ اگر چہ رسول کریم ﷺ کے بہت سے معجزات ہم دیکھ چکے ہیں، لیکن جن خاص قسم کے معجزات کا ہم نے مطالبہ کیا ہے وہ کیوں ظاہر نہیں کرتے؟ اب اس شبہ کا جواب دیا جاتا ہے۔

اور یہ کفار (نبوت کے انکار کی غرض سے) یوں (بھی) کہتے ہیں کہ ان پر خاص معجزہ (جو ہم چاہتے ہیں) کیوں نہیں نازل کیا گیا (مگر یہ اعتراض یا ایسی فرمائش محض حماقت ہے، کیونکہ آپ معجزات کے مالک نہیں، بلکہ) آپ صرف (خدا کے عذاب سے کافروں کو) ڈرانے والے (یعنی نبی) ہیں (اور نبی کے لئے مطلق کسی معجزہ کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ ظاہر ہو چکا ہے، خاص معجزہ کی ضرورت نہیں) اور (کوئی آپ انوکھے نبی نہیں ہوئے، بلکہ) ہر قوم کے لیے (گذشتہ امتوں میں) ہادی ہوتے چلے آئے ہیں (ان میں بھی یہی قاعدہ چلا آیا ہے کہ دعوی نبوت کے لئے مطلق دلیل کو کافی قرار دیا گیا، خاص دلیل یعنی معجزہ کا التزام نہیں ہوا)۔

**وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ:** اس آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہے، اس سے ثابت ہوا کہ کوئی قوم اور کوئی خطۂ ملک اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے اور ہدایت کرنے والوں سے خالی نہیں ہوسکتا، خواہ وہ کوئی نبی ہو یا اس کے قائم مقام نبی کی دعوت کو پھیلانے والا ہو جیسا سورہ یاسین میں نبی کی طرف سے کسی قوم کی طرف پہلے دو شخصوں کو دعوت و ہدایت کے لئے بھیجنے کا ذکر ہے جو خود نبی نہیں تھے، اور پھر تیسرے آدمی کو ان کی تائید و نصرت کے لئے بھیجنا مذکور ہے، اس لئے اس آیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہندوستان میں بھی کوئی نبی و رسول پیدا ہوا ہو، البتہ دعوت رسول کے پہنچانے اور پھیلانے والے علماء کا کثرت سے یہاں آنا بھی ثابت ہے اور پھر یہاں بیشمار ایسے ہادیوں کا پیدا ہونا بھی ہر شخص کو معلوم ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی جو نشانی ہم مانگتے ہیں وہ کیوں نہیں اتری جسے دیکھ کر ہم ایمان لانے پر مجبور ہو جاتے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی آیات کا اتارنا آپ کے قبضہ میں نہیں، یہ تو خدا کا کام ہے جو آیت پیغمبر کی تصدیق کے لیے مناسب ہو دکھلائے، آپ کا فرض اسی قدر ہے کہ خیر خواہی کی بات سنا دیں اور برائی کے مہلک انجام سے لوگوں کو آگاہ کر دیں، پہلے بھی ہر قوم کی طرف ہادی "راہ بتانے والا" اور نذیر ڈرانے والے آتے رہے ہیں، ان میں سے کسی کا یہ دعویٰ نہیں ہوا کہ جو نشان معاندین طلب کریں گے ضرور دکھلا کر رہیں گے ہاں خدا کی راہ دکھانا ان کا کام تھا وہ ہی آپ ﷺ کا ہے، البتہ وہ خاص خاص قوم کے لیے ہادی تھے آپ ﷺ دنیا کی ہر قوم کے لیے ہیں۔

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ۭ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ⑧

اللہ جانتا ہے جو پیٹ میں رکھتی ہے ہر مادہ ۱؎ اور جو سکڑتے ہیں پیٹ اور بڑھتے ہیں، اور ہر چیز کا اس کے یہاں اندازہ ہے ۲؎

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ⑨

جاننے والا پوشیدہ اور ظاہر کا سب سے بڑا برتر ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** گذشتہ تین آیتوں میں نبوت کا انکار کرنے والوں کے شبہات کا جواب تھا، اب پھر وہی اصل مضمون توحید مذکور ہے جس کا ذکر اس سورت کی ابتداء سے آ رہا ہے، چنانچہ اب آگے اللہ تعالیٰ اپنا وسیع العلم، حافظ خلق، عظیم الشان اور قادر مطلق ہونا بیان کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ (کا علم ایسا وسیع ہے کہ اس) کو سب خبر رہتی ہے جو کچھ کسی عورت کو حمل رہتا ہے (لڑکا ہے یا لڑکی ہے) اور جو کچھ (ان عورتوں کے) رحم میں کمی بیشی ہوتی ہے (بچہ میں یا مدت میں، مثلاً کبھی ایک بچہ ہوتا ہے، کبھی جڑواں، کبھی جلدی ہو جاتا ہے کبھی دیر میں) اور ہر چیز اللہ کے

نزدیک (اس کے علم میں) ایک خاص انداز سے (مقرر) ہے، وہ تمام پوشیدہ اور ظاہر چیزوں کا جاننے والا ہے، سب سے بڑا (اور) عالی شان ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ کہ مذکر ہے یا مونث، پورا ہے یا ادھورا، اچھا ہے یا برا، وغیر ذلک من الاحوال۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی حاملہ کے پیٹ میں ایک بچہ ہے یا زیادہ، پورا بن چکا ہے یا ناتمام ہے تھوڑی مدت میں پیدا ہوگا یا زیادہ میں، غرض پیٹ کے گھٹنے بڑھنے کے تمام اسرار و اسباب اور اوقات و احوال کو پوری طرح جانتا ہے، اور اپنے علم محیط کے موافق ہر چیز کو ہر حالت میں اس کے اندازہ اور استعداد کے موافق رکھتا ہے، اسی طرح اس نے جو آیات انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کے لیے اتاری ہیں ان میں خاص اندازہ اور مصالح و حکم ملحوظ رہی ہیں، جس وقت جس قدر بنی آدم کی استعداد و صلاحیت کے مطابق نشانات کا ظاہر کرنا مصلحت تھا اس میں کمی نہیں ہوئی، باقی قبول کرنے اور منتفع ہونے کے لحاظ سے لوگوں کا اختلاف ایسا ہی ہے جیسے حوامل کے پیٹ سے پیدا ہونے والوں کے احوال تفاوت استعداد و تربیت کی بناء پر مختلف ہوتے ہیں۔

**فائدہ:** ۳؎ یہ علم الٰہی کی لامحدود وسعت و احاطہ کا بیان ہوا، یعنی دنیا کی کوئی کھلی چھپی چیز اس سے پوشیدہ نہیں اور تمام عالم اس کے زیر تصرف ہے۔

سَوَآءٌ مِّنۡكُمۡ مَّنۡ اَسَرَّ الۡقَوۡلَ وَمَنۡ جَهَرَ بِهٖ وَمَنۡ هُوَ مُسۡتَخۡفٍۢ بِالَّيۡلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ۝۱۰

برابر ہے تم میں جو آہستہ بات کہے اور جو کہے پکار کر اور جو چھپ رہا ہے رات میں اور جو گلیوں میں پھرتا ہے دن کو

**خلاصہ تفسیر:** تم میں سے جو شخص کوئی بات چپکے سے کہے اور جو پکار کر کہے اور جو شخص رات میں کہیں چھپ جائے اور جو دن میں چلے پھرے یہ سب (خدا کے علم میں) برابر ہیں (یعنی سب کو یکساں جانتا ہے)۔

* * *

**فائدہ:** علم الٰہی کا عموم بیان کر کے بلحاظ مناسبت مقام خاص احوال مکلفین کی نسبت بتلاتے ہیں کہ تمہارے ہر قول و فعل کو ہمارا علم محیط ہے، جو بات تم دل میں چھپاؤ یا آہستہ کہو اور جو اعلانیہ پکار کر کہو، نیز جو کام رات کی اندھیری میں پوشیدہ ہو کر کرو اور جو دن دہاڑے برسر بازار کرو، دونوں کی حیثیت علم الٰہی کے اعتبار سے یکساں ہے، بعض مفسرین نے آیت کو تین قسم کے آدمیوں پر مشتمل بتلایا ہے مَنۡ اَسَرَّ الۡقَوۡلَ (جو بات کو چھپائے) مَنۡ جَهَرَ بِهٖ (جو ظاہر کرے) وَمَنۡ هُوَ مُسۡتَخۡفٍۢ بِالَّيۡلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ (جو اپنا کام رات کو چھپائے مثلاً شب کو چوری کرنا اور دن کو ظاہر کرے مثلاً دن میں نمازیں پڑھنا) اللہ تعالیٰ کو سب یکساں طور پر معلوم ہیں۔

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنۡۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَمِنۡ خَلۡفِهٖ يَحۡفَظُوۡنَهٗ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰى

اس کے پہرے والے ہیں بندہ کے آگے سے اور پیچھے سے اسکی نگہبانی کرتے ہیں اللہ کے حکم سے ۱؎ اللہ نہیں بدلتا کسی قوم کی حالت جو جب تک

يُغَيِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ ؕ وَاِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوۡمٍ سُوۡٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ وَّالٍ ۝۱۱

وہ نہ بدلیں جو ان کے جیوں میں ہے، اور جب چاہتا ہے اللہ کسی قوم پر آفت پھر وہ نہیں پھرتی، اور کوئی نہیں ان کا اس کے سوا مددگار ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** توحید کے اثبات کے لیے اللہ اپنا حافظ خلق (مخلوق کی حفاظت کرنے والا) ہونا بیان فرماتے ہیں:

(جیسا تم میں سے ہر شخص کو جانتا ہے اسی طرح ہر ایک کی حفاظت بھی کرتا ہے چنانچہ تم میں سے) ہر شخص (کی حفاظت) کے لئے فرشتے (مقرر) ہیں جن کی بدلی ہوتی رہتی ہے کچھ اس کے آگے اور کچھ اس کے پیچھے کہ وہ بحکم خدا (بہت بلاؤں سے) اس کی حفاظت کرتے ہیں (اور اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ جب فرشتے ہمارے محافظ ہیں تو پھر جو چاہو کرو گناہ یا کفر کسی طرح عذاب نازل ہی نہ ہوگا، یہ سمجھنا بالکل غلط ہے، کیونکہ) واقعی اللہ تعالیٰ

(ابتداء تو کسی کو عذاب دیتا نہیں چنانچہ اس کی عادت ہے کہ وہ) کسی قوم کی (اچھی) حالت میں تغیر نہیں کرتا جب تک وہ لوگ خود اپنی (صلاحیت کی) حالت کو نہیں بدل دیتے (مگر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جب لوگ اپنی صلاحیت میں خلل ڈالنے لگتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر مصیبت و عقوبت تجویز کی جاتی ہے) اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر مصیبت ڈالنا تجویز کر لیتا ہے تو پھر اس کے ہٹنے کی کوئی صورت ہی نہیں (وہ واقع ہو جاتی ہے) اور (ایسے وقت میں) کوئی خدا کے سوا (جن کی حفاظت کا ان کو زعم ہے) ان کا مددگار نہیں رہتا ہے (حتی کہ فرشتے بھی ان کی حفاظت نہیں کرتے اور اگر کرتے بھی تو حفاظت ان کے کام نہ آسکتی)۔

يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ: بعض لوگوں کو وسوسہ ہوتا ہے کہ جب فرشتے حفاظت کے لیے مقرر ہیں تو پھر حادثات کیوں واقع ہوتے ہیں؟ جواب اسی آیت سے ہی ظاہر ہے کہ یہاں آیت میں مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ کی قید لگائی گئی ہے، سو جب کسی بھی حکمت کی وجہ سے (جس کی تعیین کا ہمیں علم ہونا ضروری نہیں) حفاظت کا حکم نہیں ہوتا تو وہ فرشتے اپنا کام نہیں کرتے، رہا یہ شبہ کہ حفاظت تو ویسے بھی ہو سکتی تھی فرشتوں کو مقرر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ جواب یہ ہے کہ ضرورت نہ ہونے سے حکمت کا انکار لازم نہیں آتا، یعنی فرشتوں کو مقرر کرنے کی ضرورت نہ بھی ہو تب بھی دیگر اسباب حکمت کی طرح اس میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہوگی جس تک ہمیں رسائی نہ ہو۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ: اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ بعض اوقات گناہوں کے ارتکاب کے باوجود عافیت اور نعمت زائل نہیں ہوتی، اور بعض دفعہ گناہوں سے بچنے کے باوجود عافیت اور نعمت زائل ہو جاتی ہے، اور یہ دونوں باتیں: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ کے مقتضا کے خلاف نظر آتی ہیں، جواب یہ ہے کہ یہاں: مَا بِقَوْمٍ میں اچھی حالت سے مراد رحمت الٰہی ہے اور اس کے بدلنے سے مراد غضب اور ناراضی ہے جیسا کہ: مَا بِاَنْفُسِهِمْ میں ان کی حالت سے مراد طاعت کی صلاحیت ہے، اور اس کے بدلنے سے معصیت مراد ہے، پس آیت کا حاصل مطلب یہ ہوا کہ بغیر معصیت کے ہم ناراض نہیں ہوتے، سو گناہوں سے بچنے کی صورت میں ناراضی کی نفی یقینی ہے، نعمت اور عافیت دینے کا وعدہ نہیں، اور تکلیف و مصیبت میں مبتلا ہونا ناراضی اور غضب الٰہی کی دلیل نہیں، اس میں اور بہت سی حکمتیں ہوتی ہیں، اور گناہوں کے ارتکاب میں خدا کی ناراضی کسی درجہ میں ضرور مرتب ہو جاتی ہے اگر چہ ظاہری نعمت و عافیت زائل نہ ہو، نعمت و عافیت ہمیشہ خدا کی رضامندی کی دلیل نہیں۔

اس تفسیر سے ایک اور شبہ دور ہو گیا وہ یہ کہ بعض آیات و احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی خاص لوگوں کے گناہوں سے عام مواخذہ بھی ہوتا ہے تو غیر مجرم کا ماخوذ ہونا بظاہر: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ الخ کے خلاف نظر آتا ہے، جواب ظاہر ہے کہ وہ مواخذہ صورتاً غضب ہے، حقیقۃً ناراضی نہیں ہے، اور اگر ان لوگوں نے قدرت کے باوجود دوسروں کو سمجھانے میں سستی کی ہو تب تو وہ بھی ایک گناہ کے مرتکب تھے تو کچھ اشکال ہی نہیں۔

سو یہاں پر مابقوم سے مراد اس قوم کی وہ اچھی حالت اور عافیت و نعمت ہے جس سے اللہ تعالیٰ کسی قوم کو نوازتا اور سرفراز فرماتا ہے "أی من العافية والنعمة" یعنی جب وہ قوم اپنی حالت بدل دے اور شکر نعمت کے بجائے کفران نعمت پر اتر آئے تو اس طرح وہ لوگ اپنے آپ کو نعمت کے استحقاق اور اس کی اہلیت سے خود محروم کر دیتے ہیں، حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کی حفاظت کے لئے فرشتوں کا پہرہ لگا رہتا ہے، لیکن جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر اور اس کی اطاعت چھوڑ کر بد عملی بدکرداری اور سرکشی ہی اختیار کر لے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنا حفاظتی پہرہ اٹھا لیتے ہیں، پھر خدا تعالیٰ کا قہر و عذاب ان پر آتا ہے جس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہتی، یہی مفہوم ہے اس آیت کریمہ کا جو کہ تمام معتبر تفاسیر میں موجود ہے، سو اس کا وہ مطلب جو بعض لوگ یہ لیتے ہیں کہ "اللہ کسی قوم کو نعمت سے اس وقت تک نہیں نوازتا جب تک کہ وہ اپنی حالت کو خود نہ بدلے" یہ غلط ہے، یا اس آیت کا جو عام طور پر یہ مفہوم بیان کیا جاتا ہے کہ کسی قوم میں اچھا انقلاب اس وقت تک نہیں آتا جب تک وہ خود اس اچھے انقلاب کے لئے اپنے حالات کو درست نہ کرے اور اسی مفہوم میں یہ شعر بھی مشہور ہے:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی — نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

یہ مطلب اپنے طور پر کسی حد تک اگر چہ صحیح بھی ہو، تاہم اس آیت کریمہ کا مطلب و مصداق بہر حال نہیں ہے، اور اس کا صحیح ہونا بھی ایک عام

قانون کی حیثیت سے ہے کہ جو شخص خود اپنے حالات کی اصلاح کا ارادہ نہیں کرتا اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اس کی امداد و نصرت کا وعدہ نہیں، بلکہ یہ وعدہ اسی حالت میں ہے جب کوئی خود بھی اصلاح کی فکر کرے جیسا کہ آیت کریمہ: وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ہدایت کے راستے جب ہی کھلتے ہیں جب خود ہدایت کی طلب موجود ہو، لیکن انعامات الٰہیہ اس قانون کے پابند نہیں، بسا اوقات اس کے بغیر بھی عطا ہو جاتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں سے ازخود نوازتا ہے نہ کہ ہماری محنت پر، آخر ہمارا وجود ہمارے کس عمل کا نتیجہ ہے؟ اور پھر وجود کے اندر اور اس کے باہر جو بے شمار نعمتیں ہیں آخر وہ ہماری کس محنت ومشقت یا لیاقت و قابلیت پر ہمیں ملیں؟ ہمارے کسی مطالبہ وسوال کے بغیر ہمیں ان نعمتوں سے نوازا گیا ہے، آخر یہ سب ہمارے کس عمل کا ثمرہ و بدلہ قرار دی جاسکتی ہیں؟ یہ سب کچھ تو محض اس کا کرم وعطا ہے نہ کہ ہماری کسی جدوجہد کا نتیجہ وثمرہ، سو اس ارشاد ربانی میں نعمت سے نوازنے کے بارے میں نہیں بلکہ اس کے چھیننے کے بارے میں اس سنت الٰہی اور دستور خداوندی کا ذکر و بیان ہے جو قوموں کے عذاب سے متعلق قدرت کی طرف سے مقرر ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کے ساتھ اپنی رحمت وعنایت کا معاملہ اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنی روش میں تبدیلی نہ کر لے، سو جب وہ قوم اپنی روش بدل دے اور تنبیہ وانذار کے باوجود وہ نہ سنبھلے اور اپنی روش کی اصلاح نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس پر وہ عذاب بھیج دیتا ہے جس کو کوئی طاقت ٹال نہیں سکتی، البتہ یہ واضح رہے کہ انعامات کا استحقاق اور وعدہ بغیر اپنی سعی وکوشش کے حاصل نہیں ہوتا، اور کسی قوم کو بغیر سعی وعمل کے انعامات کا انتظار کرتے رہنا خود فریبی کے مرادف ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی ہر بندہ کے ساتھ خدا کے فرشتے مامور ہیں جن میں بعض اس کے سب اگلے پچھلے اعمال لکھتے ہیں اور بعضے خدا کے حکم کے موافق ان بلاؤں کے دفع کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں، جن سے حق تعالیٰ بندہ کو بچانا چاہتا ہے جس طرح اس عالم میں خدا کی عام عادت ہے کہ جو چیز پیدا کرنا چاہے اس کے ظاہری اسباب مہیا کر دیتا ہے ایسے ہی اس نے کچھ باطنی اسباب وذرائع پیدا کیے ہیں جن کو ہماری آنکھیں نہیں دیکھتیں لیکن مشیت الٰہی کی تنفیذ ان کے واسطہ سے ہوتی ہے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی نگہبانی اور مہربانی سے جو ہمیشہ اس کی طرف سے ہوتی رہتی ہے کسی قوم کو محروم نہیں کرتا، جب تک وہ اپنی روش اللہ کے ساتھ نہ بدلے، جب بدلتی ہے تو آفت آتی ہے پھر کسی کے ٹالے نہیں ٹلتی، نہ کسی کی مدد اس وقت کام دیتی ہے۔

**تنبیہ:** یہاں قوموں کے عروج وزوال کا قانون بنایا ہے، اشخاص وافراد کا نہیں، قوم کی اچھی بری حالت متعین کرنے میں اکثریت اور غلبہ کا لحاظ ہوتا ہے۔

## هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿۱۲﴾

وہی ہے کہ تم کو دکھلاتا ہے بجلی ڈر کو (ڈرانے کو) اور امید کو اور اٹھاتا ہے بادل بھاری

**خلاصہ تفسیر:** اب توحید کے اثبات کے لیے اللہ اپنا عظیم الشان ہونا بیان فرماتے ہیں:

وہ ایسا (عظیم الشان) ہے کہ تم کو (بارش کے وقت) بجلی (چمکتی ہوئی) دکھلاتا ہے جس سے (اس کے گرنے کا) ڈر بھی ہوتا ہے اور (اس سے بارش کی) امید بھی ہوتی ہے اور وہ بادلوں کو (بھی) بلند کرتا ہے جو پانی سے بھرے ہوتے ہیں (ڈر بجلی گرنے کا، اور امید بارش کی)۔

* * *

**فائدہ:** پہلے بندوں کی حفاظت کا ذکر تھا، پھر بد اعمالیوں سے جو آفت ومصیبت آتی ہے اس کا ذکر ہوا، معلوم ہوا کہ خدا کی ذات شان انعام وانتقام دونوں کی جامع ہے، اسی مناسبت سے یہاں بعض ایسے نشانہائے قدرت کی طرف توجہ دلائی جن میں بیک وقت امید وخوف کی دو متضاد کیفیتیں پیدا کرنے کی صلاحیت ہے یعنی جب بجلی چمکتی ہے تو امید بندھتی ہے کہ بارش آئے گی، اور ڈر بھی لگتا ہے کہ کہیں گر کر ہلاکت کا سبب نہ بن جائے، بھاری بادل پانی کے بھرے ہوئے آتے ہیں تو خوشی ہوتی ہے کہ باران رحمت کا نزول ہوگا، ساتھ ہی فکر رہتی ہے کہ پانی کا طوفان نہ آجائے، ٹھیک اسی طرح

انسان کو چاہیے کہ رحمت الٰہی کا امیدوار رہے مگر اللہ سے مامون اور بے فکر نہ ہو۔

وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ

اور پڑھتا ہے گرجنے والا خوبیاں اس کی اور سب فرشتے اس کے ڈر سے ۱؎ اور بھیجتا ہے کڑک بجلیاں پھر ڈالتا ہے جس پر چاہے

وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ ۚ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ﴿١٣﴾

اور یہ لوگ جھگڑتے ہیں اللہ کی بات میں، اور اس کی آن (پکڑ) سخت ہے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور رعد (فرشتہ) اس کی تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتا ہے، اور (دوسرے) فرشتے بھی اس کے خوف سے (اس کی تحمید وتسبیح کرتے ہیں) اور وہ (زمین کی طرف) بجلیاں بھیجتا ہے، پھر جس پر چاہے گرادیتا ہے اور وہ لوگ اللہ کے بارے میں (یعنی خدا کے ایسے عظیم الشان ہونے کے باوجود اس کی توحید میں) جھگڑتے ہیں حالانکہ وہ بڑا شدید القوت ہے (جس سے ڈرنا چاہئے مگر یہ لوگ ڈرتے نہیں اور اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں)۔

**وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ:** ''رعد'' کا ذکر چونکہ یہاں آیت میں فرشتوں کے ساتھ کیا گیا ہے اس سے بظاہر اور ترمذی کی مرفوع حدیث سے صراحۃً ''رعد'' کا ایک فرشتہ ہونا معلوم ہوتا ہے اور اسی حدیث سے ''برق'' کا اس فرشتہ کے ہاتھ میں آگ کا کوڑا ہونا معلوم ہوتا ہے، اس میں بعض نے ایک اشکال نقل کیا ہے اور ایک عقلی اشکال یہ کہ سورہ بقرہ میں ''رعد'' نکرہ آیا ہے، اگر فرشتہ کا نام ہوتا تو نکرہ نہ آتا، اس کا جواب یہ ہے کہ ''رعد'' جیسے فرشتے کا نام ہے ایسے ہی اس کی آواز کو بھی کہتے ہیں، سورہ بقرہ میں چونکہ آواز مراد ہے اس لیے نکرہ آیا، عقلی اشکال یہ ہے کہ فلاسفہ نے اس کے خلاف ذکر کیا ہے ، اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اس آواز کا ظاہری سبب فلاسفہ کے قول کے مطابق ہو اور حقیقی سبب شریعت کے بیان کے موافق ہو تو اس میں کوئی اشکال نہیں، چنانچہ انسان کی آواز کا ظاہری سبب ہوا کی خاص حرکت ہے اور حقیقی سبب اس کی روح ہے، اور یہ بھی کہنا مضائقہ نہیں کہ کبھی یہ سبب ہو اور کبھی وہ سبب ہو، کیونکہ ایک چیز کے لیے متعدد سبب ہونا جائز ہے، اسی طرح برق کی حقیقت تو وہی ہو جو فلاسفہ کہتے ہیں مگر وہ اس فرشتہ کے قبضہ میں تو اس میں کوئی استبعاد نہیں، یا کبھی یہ اور کبھی وہ، خوب سمجھ لو۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی گرجنے والا بادل یا فرشتہ زبان ''حال'' یا ''قال'' سے حق تعالیٰ کی تسبیح وتحمید کرتا ہے: وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (الاسراء: ۴۴) اور تمام فرشتے ہیبت وخوف کے ساتھ اس کی حمد وثنا اور تسبیح وتمجید میں مشغول رہتے ہیں۔

**تنبیہ:** ''رعد'' و ''برق'' وغیرہ کے متعلق آجکل کی تحقیق یہ ہے کہ بادلوں میں ''قوت کہربائیہ موجبہ'' پائی جاتی ہے اور زمین میں ''کہربائیہ سالبہ'' جو بادل زمین سے زیادہ نزدیک ہو اس میں گاہ بگاہ زمین کی ''سالب کہربائیہ'' سرایت کرجاتی ہے، پھر اس بادل کے اوپر بسا اوقات وہ بادل گزرتے ہیں جن میں ''کہربائیہ موجبہ'' موجود ہے، اور یہ قاعدہ تجربہ سے معلوم ہو چکا ہے کہ مختلف قسم کے ''کہربائیہ'' رکھنے والے دو جسم جب محاذی ہوں تو ہر ایک اپنے اندر دوسرے کی ''کہربائیہ'' کو جذب کرتا ہے تا کہ دونوں کی کہربائیہ متحد ہو جائے، اسی قاعدہ سے اوپر نیچے والے بادل جب ایک دوسرے کی قوت کہربائیہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں تو دونوں کے مل جانے سے شدید حرارت پیدا ہو جاتی ہے، اور اس حرارت شدیدہ سے دونوں بادلوں کے حجم کے مناسب ایک آتشیں شعلہ اٹھتا ہے جو ''صاعقہ'' کہلاتا ہے اسی صاعقہ کی چمک اور روشنی ''برق'' کہلاتی ہے اور ہوا میں اس کے سرایت کرنے سے جو آواز نکلتی ہے وہ ''رعد'' ہے، ''کہربا'' کا یہی آتشیں شرارہ کبھی بادلوں اور ہواؤں کو پھاڑ کر نیچے گرتا ہے جس کے نہایت عجیب وغریب افعال وآثار مشاہدہ کیے گئے ہیں، علاوہ اس کے کہ وہ مکانوں کو گراتا پہاڑوں کو شق کرتا اور جانداروں کی ہلاکت کا سبب بنتا ہے، بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ اس نے نہایت احتیاط سے ایک آدمی کے بدن سے کپڑے اتار کر کسی درخت کی شاخ پر رکھ دیے ہیں مگر پہننے والے کے جسم کو کچھ صدمہ نہیں پہنچا، (دائرۃ المعارف فرید وجدی) جسے دیکھ کر خیال گزرتا ہے

کہ بجلی کی اس آتشیں شعلہ میں کوئی ذی شعور اور ذی اختیار قوت غیر مرئی طریقہ سے کام کر رہی ہے، ہم کو ضرورت نہیں کہ اوپر بیان کیے ہوئے نظریہ کا انکار کریں، لیکن یہ بیان کرنے والے خود اقرار کرتے ہیں کہ ''روح'' کی طرح ''قوت کہربائیہ'' کی اصل حقیقت پر بھی اس وقت تک پردہ پڑا ہوا ہے۔

انبیاء علیہم السلام اور دوسرے ارباب کشف وشہود کا بیان یہ ہی ہے کہ تمام نظام عالم میں ظاہری اسباب کے علاوہ باطنی اسباب کا ایک عظیم الشان سلسلہ کارفرما ہے جو کچھ ہم یہاں دیکھتے ہیں وہ صرف صورت ہے لیکن اس صورت میں جو غیر مرئی حقیقت پوشیدہ ہے اس کے ادراک تک عام لوگوں کی رسائی نہیں، صرف باطنی آنکھ رکھنے والے اسے دیکھتے ہیں، آخر تم جو نظریات بیان کرتے ہو (مثلاً یہ ہی قوت کہربائیہ کا موجبہ سالبہ ہونا وغیرہ) اس کا علم بھی حکمائے طبیعیین کے سوا بلا واسطہ کس کو ہوتا ہے، کم از کم اتنا وثوق انبیاء کے مشاہدات وتجربات پر کر لیا جائے تو بہت سے اختلافات مٹ سکتے ہیں، احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ دوسرے نوامیس طبیعیہ کی طرح بادلوں اور بارشوں کے انتظامات پر بھی فرشتوں کی جماعتیں تعینات ہیں جو بادلوں کو مناسب مواقع پر پہنچانے اور ان سے حسب ضرورت ومصلحت کام لینے کی تدبیر کرتی ہیں، اگر تمہارے بیان کے موافق بادل اور زمین وغیرہ کی ''کہربائیہ'' کا مدبر کوئی غیر مرئی فرشتہ ہو تو انکار کی کون سی وجہ ہے؟ جس کو تم ''شرارہ کہربائیہ'' کہتے ہو چونکہ وہ فرشتہ کے خاص تصرف سے پیدا ہوتا ہے لہٰذا اسے وحی کی زبان میں ''مخاریق من نار'' (فرشتہ کا آتشیں کوڑا) کہہ دیا گیا تو کیا قیامت ہوگئی، اس کی شدت اور سخت اشتعال سے جو گرج اور کڑک پیدا ہوئی اگر حقیقت کا لحاظ کرتے ہوئے اسے فرشتہ کی ڈانٹ سے تعبیر فرمایا تو یہ نہایت ہی موزوں تعبیر ہے، بہرحال ''سائنس'' نے جس چیز کی محض صورت کو سمجھا ''وحی'' نے اس کی روح اور حقیقت پر مطلع کر دیا، کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ دونوں کو ایک دوسرے کا حریف مقابل قرار دے لیا جائے، علامہ محمود آلوسی نے بقرہ کے شروع میں اس پر معقول بحث کی ہے، فلیراجع۔

**فائدہ:** ۲ـ ان جھگڑنے والوں پر عذاب کی بجلی نہ گرادے، حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے عرب کے ایک متکبر رئیس کے پاس آدمی بھیجا کہ اسے بلا لاؤ، قاصد نے اس کو کہا کہ رسول اللہ ﷺ تجھے بلاتے ہیں کہنے لگا رسول اللہ کون ہے؟ اور اللہ کیا چیز ہے؟ سونے کا ہے یا چاندی کا یا تانبے کا؟ (العیاذ باللہ) تین مرتبہ یہ ہی گفتگو کی، تیسری مرتبہ جب وہ یہ گستاخانہ کلمات بک رہا تھا، ایک بادل اٹھا فوراً بجلی گری اور اس کی کھوپڑی سر سے جدا کر دی، بعض روایات میں ہے کہ عامر بن طفیل اور اربد بن ربیعہ نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ ہم اسلام لاتے ہیں بشرطیکہ آپ کے بعد خلافت ہم کو ملے آپ نے انکار فرما دیا، دونوں یہ کہہ کر اٹھے کہ ہم مدینہ کی وادی کو آپ کے مقابلہ میں پیدل اور سواروں سے بھر دیں گے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ اس کو روک دے گا اور انصار مدینہ روکیں گے، وہ دونوں چلے، راستہ میں اربد پر بجلی گری اور عامر طاعون کی گلٹی سے ہلاک ہوا۔

**فائدہ:** رعد کی آواز سن کر کہنا چاہیے: سُبْحَانَ مَنْ يُّسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ، وَالْمَلَآئِكَةُ مِنْ خِيفَتِهٖ، اَللّٰهُمَّ لَا تَقْتُلْنَا بِغَضَبِكَ، وَلَا تُهْلِكْنَا بِعَذَابِكَ، وَعَافِنَا قَبْلَ ذٰلِكَ۔

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ

اسی کا پکارنا سچ ہے، اور جن لوگوں کو یہ پکارتے ہیں اس کے سوا وہ نہیں کام آتے ان کے کچھ بھی مگر جیسے کسی نے پھیلائے دونوں ہاتھ

اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾

پانی کی طرف کہ آپہنچے اس کے منہ تک اور وہ کبھی نہ پہنچے گا اس تک، اور جتنی پکار ہے کافروں کی سب گمراہی ہے

**خلاصہ تفسیر:** اب توحید کے اثبات کے لیے اللہ اپنا مجیب الدعوات (دعائیں قبول کرنے والا) ہونا بیان فرماتے ہیں:

(اور وہ ایسا دعائیں قبول کرنے والا ہے کہ) سچا پکارنا اسی کے لئے خاص ہے (کیونکہ اسے قبول کرنے کی قدرت ہے) اور خدا کے سوا جن کو یہ لوگ (اپنے حوائج ومصائب میں) پکارتے ہیں وہ (قدرت نہ ہونے کی وجہ سے) ان کی درخواست کو اس سے زیادہ منظور نہیں کر سکتے جتنا پانی اس شخص

کی درخواست کو منظور کرتا ہے جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے ہوتا ہو (اور اس کو اشارہ سے اپنی طرف بلا رہا ہو) تا کہ وہ (پانی) اس کے منہ تک (اڑ کر) آ جائے اور وہ (از خود) اس کے منہ تک (کسی طرح) آنے والا نہیں (پس جس طرح پانی ان کی درخواست قبول کرنے سے عاجز ہے اسی طرح ان کے معبود عاجز ہیں، اگر وہ جاندار نہ ہوں تب تو ظاہر ہے، اور اگر وہ جاندار ہوں تب بھی قادر حقیقی کے روبرو تو عاجز ہی ہیں، اس لئے) کافروں کی (ان باطل معبودوں سے) درخواست کرنا محض بے اثر ہے (کیونکہ وہ باطل معبود ان کی درخواست قبول کرنے سے عاجز ہیں)۔

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اللہ کے غیر کے سامنے جھکتے اور ان سے فریادرسی کرتے ہیں اور ان کو اپنا حاجت روا سمجھتے ہیں تو ایسے لوگ بالکل خسارے اور نقصان میں ہیں اور یہ بلا کثرت سے پھیل گئی ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی پکارنا اسی کو چاہیے جو ہر قسم کے نفع وضرر کا مالک ہے عاجز کو پکارنے سے کیا حاصل؟ اللہ کے سوا کون ہے جس کے قبضہ میں اپنا یا دوسروں کا نفع وضرر ہے؟ غیر اللہ کو اپنی مدد کے لیے بلانا ایسا ہے جیسے کوئی پیاسا کنوئیں کی من پر کھڑا ہو کر پانی کی طرف ہاتھ پھیلائے اور خوشامد کرے کہ میرے منہ میں پہنچ جا، ظاہر ہے قیامت تک پانی اس کی فریاد کو پہنچنے والا نہیں، بلکہ اگر پانی اس کی مٹھی میں ہو تب بھی خود چل کر منہ تک نہیں جا سکتا، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ کافر جن کو پکارتے ہیں بعضے محض خیالات واوہام ہیں، بعضے جن اور شیاطین ہیں، اور بعضی چیزیں ہیں کہ ان میں کچھ خواص ہیں، لیکن اپنے خواص کی مالک نہیں، پھر ان کے پکارنے سے کیا حاصل؟ جیسے آگ یا پانی اور شاید ستارے بھی اسی قسم میں ہوں۔

## وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۱۵﴾ سجدہ

اور اللہ کو سجدہ کرتا ہے جو کوئی ہے آسمانوں اور زمین میں خوشی سے اور زور سے اور ان کی پرچھائیاں صبح اور شام

**خلاصہ تفسیر:** اب توحید کے اثبات کے لیے اللہ اپنا قادر مطلق ہونا بیان فرماتے ہیں:

اور اللہ ہی (ایسا قادر مطلق ہے کہ اسی) کے سامنے سب سرخم کئے ہوئے ہیں جتنے آسمانوں میں ہیں اور جتنے زمین میں ہیں (بعض) خوشی سے اور (بعض) مجبوری سے (خوشی سے یہ کہ خود اپنے اختیار سے عبادت کرتے ہیں، اور مجبوری کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ جس مخلوق میں جو تصرف کرنا چاہتے ہیں کوئی اس کی مخالفت نہیں کر سکتا) اور ان (زمین والوں) کے سائے بھی (سرخم کئے ہوئے ہیں) صبح اور شام کے وقتوں میں (یعنی سایہ کو جتنا چاہیں بڑھائیں جتنا چاہیں گھٹائیں، ہر طرح خدا کا مطیع ہے)۔

طَوْعًا وَّ كَرْهًا: طوعاً انقیاد تشریعی ہے اور کرھاً انقیاد تکوینی ہے، واضح رہے کہ حق تعالیٰ کے احکام دو قسم کے ہیں: ① تشریعی: یعنی جن کے آثار انسان کے اختیار میں ہیں، جیسے نماز پڑھنے کا حکم کہ اس کا اثر تعمیل یعنی نماز پڑھنا ہے جو بندہ کے اختیار میں ہے ② تکوینی: یعنی جن پر آثار مرتب ہونا انسان کے اختیار میں نہیں، جیسے زندگی، موت اور بیماری وغیرہ، حاصل مقام یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے تکوینی احکام کے تو سب ہی مسخر ہیں، کوئی اس کے خلاف کر ہی نہیں سکتا، اور کرھاً سے یہی تسخیری اطاعت مراد ہے، اور بہت سے احکام تشریعیہ کے بھی مطیع و پابند ہیں، طوعاً سے تشریعی احکام کی اختیاری اطاعت مراد ہے، تو حکم کی دوسری قسم تکوینی تو سب ہی پر جاری ہے، اور پہلی قسم تشریعی کو بھی بہت سوں نے قبول کر رکھا ہے، جن میں فرشتے ہیں اور انسان وجنات میں سے ایمان والے لوگ ہیں، جس سے حاکم کی عظمت نمایاں ہے۔

وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ: صبح وشام کے وقت چونکہ سایہ کا گھٹنا بڑھنا زیادہ ظاہر ہوتا ہے اس لئے ان اوقات کو خاص طور پر ذکر فرمایا، ورنہ سایہ بھی بایں معنی ہر وقت ہی مطیع ہے۔

* * *

**فائدہ:** حضرت شاہ صاحب: لکھتے ہیں: ''جو اللہ پر یقین لایا خوشی سے سر رکھتا ہے اس کے حکم پر اور جو نہ یقین لایا آخر اس پر بھی بے اختیار

اسی کا حکم جاری ہے اور پرچھائیاں صبح اور شام زمین پر پسر جاتی ہیں یہی ہے ان کا سجدہ''، مطلب یہ ہے کہ جواہر ہوں یا اعراض کوئی چیز اللہ کے حکم تکوینی سے باہر نہیں ہوسکتی، اس کے نفوذ واقتدار کے سامنے سب منقاد اور سربسجود ہیں، سایہ کا گھٹنا بڑھنا دائیں بائیں مائل ہونا سب اسی کے ارادہ اور مشیت سے ہے، صبح شام کا ذکر شاید اس لیے کیا کہ ان وقتوں میں زمین پر سایہ کا پھیلاؤ زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ

پوچھ کون ہے رب آسمان اور زمین کا، کہہ دے اللہ ہے، کہہ پھر کیا تم نے پکڑے ہیں اس کے سوا ایسے حمایتی جو مالک نہیں

لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ اَمْ هَلْ تَسْتَوِى الظُّلُمٰتُ

اپنے بھلے اور برے کے لے کہہ کیا برابر ہوتا ہے اندھا اور دیکھنے والا، یا کہیں برابر ہے اندھیرا

وَالنُّوْرُ ۚ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ؕ

اور اجالا ۲ کیا ٹھہرائے ہیں انہوں نے اللہ کیلئے شریک کہ انہوں نے کچھ پیدا کیا ہے جیسے پیدا کیا اللہ نے پھر مشتبہ ہوگئی پیدائش انکی نظر میں

قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَىْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۶﴾

کہہ اللہ ہے پیدا کرنے والا ہر چیز کا اور وہی ہے اکیلا زبردست ۳

**خلاصہ تفسیر**: اب توحید کے اثبات کے لیے اللہ تعالیٰ اپنا خالق ہونا بیان فرماتے ہیں:

(مذکورہ بالا صفات کے ساتھ اللہ تمام عالم کا خالق بھی ہے اس لیے اس مضمون کو ثابت کرنے کے لیے) آپ (صلی اللہ علیہ وسلم ان سے یوں) کہئے کہ آسمانوں اور زمین کا پروردگار (یعنی پیدا کرنے والا، باقی رکھنے والا، اور نگہبان) کون ہے؟ (اور چونکہ اس کا جواب متعین ہے اس لئے جواب بھی) آپ (ہی) کہہ دیجئے کہ اللہ ہے (پھر) آپ یہ کہئے کہ کیا (یہ دلائل توحید سن کر) پھر بھی تم نے خدا کے سوا دوسرے مددگار (یعنی معبودین) قرار دے رکھے ہیں جو (انتہائی عاجز ہونے کی وجہ سے) خود اپنی ذات کے نفع نقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتے (پھر شرک کو باطل اور توحید کو ثابت کرنے کے بعد اب اہل توحید و اہل شرک اور خود توحید و شرک کے درمیان اظہار فرق کے لئے) آپ یہ (بھی) کہئے کہ کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہوسکتا ہے؟ (یہ مثال ہے مشرک اور موحد کی) یا کہیں تاریکی اور روشنی برابر ہوسکتی ہے؟ (یہ مثال ہے شرک اور توحید کی) یا انہوں نے اللہ کے ایسے شریک قرار دے رکھے ہیں کہ انہوں نے بھی (کسی چیز کو) پیدا کیا ہو جیسا خدا (خود ان کے اعتراف کے مطابق بھی) پیدا کرتا ہے، پھر (اس وجہ سے) ان کو (دونوں کا) پیدا کرنا ایک سا معلوم ہوا ہو (اور اس سے شبہ ہوگیا ہو کہ جب دونوں یکساں خالق ہیں تو معبود بھی یکساں ہوں گے اگر یہ شبہ ہے تو دوسروں کی پیدا کی ہوئی چیزیں دکھلا دیں، سو اس کے متعلق بھی) آپ (ہی) کہہ دیجئے کہ اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے، اور وہی (اپنی ذات وصفات کمال میں) واحد ہے (اور سب مخلوقات پر) غالب ہے۔

* * *

**فائدہ**: ۱ یعنی جب ربوبیت کا اقرار صرف خدا کے لیے کرتے ہو پھر مدد کے لیے دوسرے حمایتی کہاں سے تجویز کر لیے، حالانکہ وہ ذرہ برابر نفع نقصان کا مستقل اختیار نہیں رکھتے۔

**فائدہ**: ۲ یعنی موحد و مشرک میں ایسا فرق ہے جیسے بینا اور نابینا میں اور توحید و شرک کا مقابلہ ایسا سمجھو جیسے نور کا ظلمت سے، تو کیا ایک اندھا مشرک جو شرک کی اندھیریوں میں پڑا اٹامک ٹوئیاں مار رہا ہو اس مقام پر پہنچ سکتا ہے جہاں ایک موحد کو پہنچنا ہے جو فہم وبصیرت اور ایمان وعرفان کی روشنی

میں فطرت انسانی کے صاف راستہ پر چل رہا ہے؟ ہرگز دونوں ایک نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے۔

**فائدہ:** ۳ یعنی جیسی مخلوقات خدا تعالیٰ نے پیدا کی، کیا تمہارے دیوتاؤں نے ایسی کوئی چیز پیدا کی ہے جسے دیکھ کر ان پر خدائی کا شبہ ہونے لگا، وہ تو ایک مکھی کا پر اور ایک مچھر کی ٹانگ بھی نہیں بنا سکتے بلکہ تمام چیزوں کی طرح خود بھی اس اکیلے زبردست خدا کی مخلوق ہیں، پھر ایسی عاجز و مجبور چیزوں کو خدائی کے تخت پر بٹھا دینا کس قدر گستاخی اور شوخ چشمی ہے۔

أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ط

اُتارا اُس نے آسمان سے پانی پھر بہنے لگے نالے اپنی اپنی موافق پھر اوپر لے آیا وہ نالا جھاگ پھولا ہوا

وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ ط كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ

اور جس چیز کو دھونکتے ہیں آگ میں واسطے زیور کے یا اسباب کے اس میں بھی جھاگ ہے ویسا ہی، یوں بیان کرتا (ٹھہراتا) ہے اللہ حق

وَالْبَاطِلَ ۚ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ط

اور باطل کو، سو وہ جھاگ تو جاتا رہتا ہے سوکھ کر، اور وہ جو کام آتا ہے لوگوں کے سو باقی رہتا ہے زمین میں

كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ ﴿١٧﴾

اس طرح بیان کرتا ہے اللہ مثالیں

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے توحید کے حق اور شرک کے باطل ہونے کا بیان تھا، اب اس حق اور باطل کی دو مثالیں مذکور ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی نازل فرمایا، پھر (اس پانی سے) نالے (بھر کر) اپنی مقدار کے موافق چلنے لگے (یعنی چھوٹے نالے میں تھوڑا پانی اور بڑے نالے میں زیادہ پانی بہنے لگا) پھر وہ سیلاب (کا پانی) خس و خاشاک کو بہالایا جو اس (پانی) کی (سطح کے) اوپر (آرہا) ہے (ایک کوڑا کرکٹ تو یہ ہے) اور جن چیزوں کو آگ کے اندر (رکھ کر) زیور یا اور اسباب (ظروف وغیرہ) بنانے کی غرض سے تپاتے ہیں اس میں بھی ایسا ہی میل کچیل (اوپر آجاتا) ہے (ان دو مثالوں میں دو چیزیں ہیں: ایک کارآمد چیز ہے یعنی اصل پانی اور اصل مال، اور ایک ناکارہ بے کار چیز یعنی کوڑا کرکٹ میل کچیل وغیرہ، غرض) اللہ تعالیٰ حق (یعنی توحید و ایمان وغیرہ) اور باطل (یعنی کفر و شرک وغیرہ) کی اسی طرح کی مثال بیان کر رہا ہے (جس کی تکمیل اگلے مضمون سے ہو جائے گی) سو (ان دونوں مذکورہ مثالوں میں) جو میل کچیل تھا وہ تو پھینک دیا جاتا ہے اور جو چیز لوگوں کے کارآمد ہے وہ دنیا میں (نفع رسانی کے ساتھ) رہتی ہے (تاکہ لوگوں کو اس سے نفع پہنچے، اور جس طرح حق و باطل کی مثال بیان کی گئی) اللہ تعالیٰ اسی طرح (ہر ضروری مضمون میں) مثالیں بیان کیا کرتے ہیں۔

حاصل دونوں مثالوں کا یہ ہوا کہ جیسا کہ ان مثالوں میں میل کچیل تھوڑی دیر کے لیے اصلی چیز کے اوپر نظر آتا ہے، لیکن انجام کار وہ پھینک دیا جاتا ہے اور اصلی چیز باقی رہ جاتی ہے، اسی طرح باطل اور ناحق اگرچہ چند روز حق کے اوپر غالب نظر آئے، لیکن آخرکار باطل مٹ مٹا کر مغلوب ہو جاتا ہے اور حق باقی اور ثابت رہتا ہے۔

** ** **

**فائدہ:** آسمان کی طرف سے بارش اتری جس سے ندی نالے بہہ پڑے، ہر نالے میں اس کے ظرف اور گنجائش کے موافق جتنا خدا نے چاہا پانی جاری کر دیا، چھوٹے میں کم بڑے میں زیادہ، پانی جب زمین پر رواں ہوا تو مٹی اور کوڑا کرکٹ ملنے سے گدلا ہو گیا، پھر میل کچیل اور جھاگ پھول

کراوپر آیا، جیسے تیز آگ میں چاندی تانبا، لوہا، اور دوسری معدنیات پگھلاتے ہیں تاکہ زیور، برتن اور ہتھیار وغیرہ تیار کریں اس میں بھی اسی طرح جھاگ اٹھتا ہے مگر تھوڑی دیر بعد خشک یا منتشر ہوکر جھاگ جاتا رہتا ہے اور جو اصلی کارآمد چیز تھی (یعنی پانی یا پگھلی ہوئی معدنیات) وہ ہی زمین میں یا زمین والوں کے ہاتھ میں باقی رہ جاتی ہے، جس سے مختلف طور پر لوگ منتفع ہوتے ہیں۔

یہ ہی مثال حق و باطل کی سمجھ لو، جب وحی آسمانی دین حق کو لے کر اترتی ہے تو قلوب بنی آدم اپنے اپنے ظرف اور استعداد کے موافق فیض حاصل کرتے ہیں، پھر حق اور باطل باہم بھڑ جاتے ہیں تو میل ابھر آتا ہے، بظاہر باطل جھاگ کی طرح حق کو دبا لیتا ہے لیکن اس کا یہ ابال عارضی اور بے بنیاد ہے، تھوڑی دیر بعد اس کے جوش وخروش کا پتہ نہیں رہتا، خدا جانے کدھر گیا، جو اصلی اور کارآمد چیز جھاگ کے نیچے دبی ہوئی تھی (یعنی حق و صداقت) بس وہ ہی رہ گئی دیکھو! خدا کی بیان کردہ مثالیں کیسی عجیب ہوتی ہیں، کیسے موثر طرز میں سمجھایا کہ دنیا میں جب حق و باطل بھڑتے ہیں یعنی دونوں کا جنگی مقابلہ ہوتا ہے تو گو برائے چندے باطل اونچا اور پھولا ہوا نظر آئے، لیکن آخرکار باطل کو منتشر کر کے حق ہی ظاہر و غالب ہوکر رہے گا، کسی مومن کو باطل کی عارضی نمائش سے دھوکا نہ کھانا چاہیے، اسی طرح کسی انسان کے دل میں جب حق اتر جائے کچھ دیر کے لیے اوہام و وساوس زور شور دکھلائیں تو گھبرانے کی بات نہیں تھوڑی دیر میں یہ ابال بیٹھ جائے گا اور خالص حق ثابت و مستقر رہے گا۔

**ربط:** گزشتہ آیات میں چونکہ توحید وشرک کا مقابلہ کیا گیا تھا اس مثال میں حق و باطل کے مقابلہ کی کیفیت بتلا دی آگے دونوں کا انجام بالکل کھول کر بیان کرتے ہیں:

وقف النبی ﷺ　لِلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰی ؕ وَالَّذِیْنَ لَمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ

جنہوں نے مانا اپنے رب کا حکم ان کے واسطے بھلائی ہے [۱] اور جنہوں نے اس کا حکم نہ مانا اگر ان کے پاس ہو جو کچھ کہ زمین میں ہے سارا

جَمِیْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ۙ

اور اتنا ہی اس کے ساتھ اور تو سب دیویں (دے ڈالیں) اپنے بدلہ (چھڑوائی) میں [۲] ان لوگوں کے لیے ہے برا حساب [۳]

ع ۱۱ ۸ النصف　وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۧ ﴿۱۸﴾

اور ٹھکانا ان کا دوزخ ہے، اور وہ بری (برا بچھونا) آرام کی جگہ ہے

**خلاصہ تفسیر:** پچھلی آیتوں میں حق و باطل کو مثالوں کے ذریعہ واضح کیا گیا تھا، اب آگے اہل حق اور اہل باطل کا حال یعنی ان کی ہدایت اور گمراہی، ان کے اچھے اور برے اعمال اور ان کی جزاء سزا کا بیان ہے۔

جن لوگوں نے اپنے رب کا کہنا مان لیا (اور توحید و اطاعت کو اختیار کر لیا) ان کے واسطے اچھا بدلہ (یعنی جنت مقرر) ہے، اور جن لوگوں نے اس کا کہنا نہ مانا (اور کفر و معصیت پر قائم رہے) ان کے پاس (قیامت کے دن) اگر تمام دنیا بھر کی چیزیں (موجود) ہوں اور (بلکہ) اس کے ساتھ اسی کے برابر اور بھی (مال و دولت) ہو تو سب اپنی رہائی کے لئے دے ڈالیں، ان لوگوں کا سخت حساب ہوگا (جس کو دوسری آیت میں "حساب عسیر" فرمایا ہے) اور ان کا ٹھکانا (ہمیشہ کے لئے) دوزخ ہے، اور وہ بری قرارگاہ ہے۔

* * *

**فائدہ:** [۱] یعنی ایمان و عمل صالح اختیار کیا ان کے لیے دنیا و آخرت کی بھلائی ہے، حقیقی خوشی اور قلبی طمانیت و سکون ان کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔

**فائدہ:** [۲] یعنی یہاں تو خیر جس طرح گزرے لیکن آخرت میں ان کی حالت ایسی پریشانی اور گھبراہٹ کی ہوگی کہ اگر تمام دنیا کے خزانے ان

کے ہاتھ میں ہوں بلکہ اسی قدر اور بھی تو تمنا کریں گے کہ ہم یہ سب فدیہ میں دے کر اس پریشانی سے چھوٹ جائیں وَاٰتٰی لَهُمۡ ذٰلِكَ

**فائدہ:** ۳ یعنی حساب میں کسی قسم کی رعایت اور درگزر نہ ہوگی ایک ایک بات پر پوری طرح پکڑے جائیں گے۔

اَفَمَنۡ يَّعۡلَمُ اَنَّمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ الۡحَـقُّ كَمَنۡ هُوَ اَعۡمٰى ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ۝١٩

بھلا جو شخص جانتا ہے کہ جو کچھ اترا تجھ پر تیرے رب سے حق ہے برابر ہو سکتا ہے اس کے جو کہ اندھا ہے۔ سمجھتے وہی ہیں جن کو عقل ہے

**خلاصہ تفسیر:** جو شخص یہ یقین رکھتا ہو کہ جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل ہوا ہے وہ سب حق ہے، کیا ایسا شخص اس کی طرح ہو سکتا ہے جو کہ (اس علم سے محض ناواقف) اندھا ہے (یعنی کافر و مؤمن برابر نہیں) پس نصیحت تو سمجھدار ہی لوگ قبول کرتے ہیں۔

اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ: اولوا الالباب کو آگے اَلَّذِيۡنَ يُوۡفُوۡنَ بِعَهۡدِ اللّٰهِ الخ سے موصوف کرنے سے پتہ چلا کہ عقل مند اور سمجھدار کہلانے کے لائق صرف وہی شخص ہے جو آخرت کو سامنے رکھ کر زندگی گزارے، چاہے اسے دنیاوی امور کا کچھ پتہ نہ ہو یا کم پتہ ہو، اور اس کے برعکس جو آخرت کو پیش نظر نہ رکھے اور نہ اس کی فکر ہو تو ایسا شخص انتہائی بے وقوف اور ناسمجھ ہے چاہے اسے ساری دنیا کی خبر ہو۔

* * *

**فائدہ:** مومن و کافر دونوں کا الگ الگ انجام ذکر فرمانے کے بعد متنبہ کرتے ہیں کہ ایسا ہونا عین عقل و حکمت کے موافق ہے۔ کوئی عقل مند یہ نہیں کہہ سکتا کہ ایک نپٹ اندھا جسے کچھ نظر نہ آئے یوں ہی اناپ شناپ اندھیرے میں پڑا ٹھوکریں کھا رہا ہو، اس شخص کی برابری کر سکتا ہے جس کے دل کی آنکھیں کھلی ہیں اور پوری بصیرت کے ساتھ حق کی روشنی سے مستفید ہو رہا ہے۔

الَّذِيۡنَ يُوۡفُوۡنَ بِعَهۡدِ اللّٰهِ وَلَا يَنۡقُضُوۡنَ الۡمِيۡثَاقَ ۝٢٠ وَالَّذِيۡنَ يَصِلُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ

وہ لوگ جو پورا کرتے ہیں اللہ کے عہد کو اور نہیں توڑتے اس عہد کو ۱ اور وہ لوگ جو ملاتے ہیں جس کو اللہ نے فرمایا

اَنۡ يُّوۡصَلَ وَيَخۡشَوۡنَ رَبَّهُمۡ وَيَخَافُوۡنَ سُوۡٓءَ الۡحِسَابِ ۝٢١

ملانا ۲ اور ڈرتے ہیں اپنے رب سے اور اندیشہ رکھتے ہیں برے حساب کا ۳

**خلاصہ تفسیر:** (اور) یہ (سمجھدار) لوگ ایسے ہیں کہ اللہ سے جو کچھ انہوں نے عہد کیا ہے اس کو پورا کرتے ہیں اور (اس) عہد کو توڑتے نہیں، اور یہ ایسے ہیں کہ اللہ نے جن علاقوں کے قائم رکھنے کا حکم کیا ہے ان کو قائم رکھتے ہیں اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور سخت عذاب کا اندیشہ رکھتے ہیں (جو کفار کے ساتھ خاص ہوگا اس لئے کفر سے بچتے رہتے ہیں)۔

وَالَّذِيۡنَ يَصِلُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنۡ يُّوۡصَلَ: روح المعانی میں ہے کہ اس میں تمام اوامر آگئے، اور اس عموم میں سب اہل حقوق بھی داخل ہیں، یہاں تک کہ حضرت فضیل بن عیاضؒ کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص سب نیک کام کرتا ہو اور اس کے پاس ایک مرغی ہو، لیکن اس کا حق ادا نہ کرے تو وہ نیکوکار نہیں، میں کہتا ہوں کہ جب ایک مرغی کے حق میں یہ کہا گیا ہے تو استاذ، شیخ اور والدین کا کیا کچھ حق وادب ہوگا جس میں سخت کوتاہی کی جاتی ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی اللہ سے جو عہد ازل میں ہو چکا ہے (عہد الست) جس پر انسان کی فطرت خود گواہ ہے اور جو انبیاء کی زبانی عہد لیے گئے ان سب کو پورا کرتے ہیں، کسی کو توڑتے نہیں، نیز بذات خود کسی معاملہ میں خدا سے یا بندوں سے جو عہد و پیمان باندھتے ہیں (بشرطیکہ معصیت نہ ہو) اس کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی صلہ رحم کرتے ہیں، یا ایمان کو عمل کے ساتھ یا حقوق العباد کو حقوق اللہ کے ساتھ ملاتے ہیں، یا اسلامی اخوت کو قائم رکھتے

ہیں، یا انبیاء علیہم السلام میں تفریق نہیں کرتے کہ کسی کو مانیں کسی کو نہ مانیں۔

**فائدہ:** ۳ یعنی حق تعالیٰ کی عظمت وجلال کا تصور کر کے لرزاں وترساں رہتے ہیں اور یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ دیکھئے وہاں جب ذرہ ذرہ کا حساب ہوگا، کیا صورت پیش آئے گی۔

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً

اور وہ لوگ جنہوں نے صبر کیا خوشی کو اپنے رب کی ۱ اور قائم رکھی نماز اور خرچ کیا ہمارے دیئے میں سے پوشیدہ (چھپے) اور ظاہر (کھلے) ۲

وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۲﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ

اور کرتے ہیں برائی کے مقابلہ میں بھلائی ۳ ان لوگوں کیلئے ہے آخرت کا گھر، باغ ہیں رہنے کے ۴ داخل ہوں گے ان میں اور جو نیک ہوئے

مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾

ان کے باپ دادوں میں اور جوروؤں میں اور اولادمیں ۵ اور فرشتے آئیں ان کے پاس ہر دروازے سے

**خلاصہ تفسیر:** اور یہ لوگ ایسے ہیں کہ اپنے رب کی رضامندی کے جویاں (متلاشی) رہ کر (دین حق پر) مضبوط رہتے ہیں اور نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو روزی دی ہے اس میں سے چپکے بھی اور ظاہر کر کے بھی (جیسا موقع ہوتا ہے) خرچ کرتے ہیں اور (لوگوں کی) بدسلوکی کو (جو ان کے ساتھ کی جائے) حسن سلوک سے ٹال دیتے ہیں (یعنی اگر کوئی ان کے ساتھ بدسلوکی کرے تو کچھ خیال نہیں کرتے، بلکہ اس کے ساتھ اچھا سلوک ہی کرتے ہیں) اس جہان میں (یعنی آخرت میں) نیک انجام ان لوگوں کے واسطے ہے، یعنی ہمیشہ رہنے کی جنتیں جن میں وہ لوگ بھی داخل ہوں گے اور ان کے ماں باپ اور بیویوں اور اولادمیں جو (جنت کے) لائق (یعنی مؤمن) ہوں گے (اگرچہ ان لوگوں کے درجہ کے نہ ہوں) وہ بھی (جنت میں ان کی برکت سے انہی کے درجوں میں) داخل ہوں گے اور فرشتے ان کے پاس ہر (سمت کے) دروازہ سے آتے ہوں گے۔

**وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ:** یہ مضمون اس آیت کی تفسیر میں ابن جبیرؒ سے منقول ہے کہ مقربین کی برکت سے ان کے ماں باپ، اولاد وازواج بھی تبعاً ان ہی کے درجہ میں داخل ہوں گے، روایت کے الفاظ یہ ہیں: "يدخل الرجل الجنة فيقول: اين امی اين ولدی اين زوجی ؟ فيقال: لم يعملوا مثل عملك، فيقول: كنت اعمل لی ولهم، ثم قرأ الاية"، یعنی نیک آدمی جنت میں داخل ہوگا تو پوچھے گا کہ میری ماں، میری اولاد، میری بیوی یہ سب کہاں ہیں؟ اس سے کہا جائے گا کہ انہوں نے تیرے جیسے عمل نہیں کیے (اس لیے نیچے کے درجہ میں ہیں) وہ کہے گا کہ میں تو اپنے اور ان سب کے لیے عمل کیا کرتا تھا (آخر کار وہ سب بھی اسی کے درجہ میں آجائیں گے) پھر یہ آیت پڑھی، اور جنت کے لائق ہونے کی تفسیر ابن جبیرؒ نے یہی فرمائی ہے کہ مؤمن ہو، اور ماں باپ اولاد سے مراد وہ ہیں جو بلا واسطہ ہوں، ورنہ تمام اہل جنت کا ایک ہی درجہ میں ہونا لازم آئے گا اور یہ نصوص کے خلاف ہے، اور اگر کسی کو شبہ ہو کہ ان تابعین کے بھی تو بلا واسطہ ماں باپ واولاد کچھ ہوں گے وہ ان کے واسطہ سے اسی درجہ میں داخل ہو جائیں گے وعلیٰ ہذا القیاس تو پھر بلا واسطہ کی سے بھی کوئی نفع نہ ہوا، اس کا جواب یہ ہے کہ جو لوگ تابع ہو کر کسی درجہ میں داخل ہوں گے وہ خود صاحب درجہ نہ ہوں گے، لہٰذا ان کی وجہ سے ان کا تابع ہو کر کوئی دوسرا اس درجہ میں داخل نہ ہو سکے گا، واللہ اعلم۔

حاصل مطلب یہ ہوا کہ اللہ کے مقبول اور نیک بندوں کو خود بھی جنت میں مقام ملے گا اور ان کی رعایت سے ان کے ماں باپ بیوی اور اولاد کو بھی، شرط یہ ہے کہ یہ لوگ صالح یعنی مومن اور مسلمان ہوں، کافر نہ ہوں، اگرچہ اعمال صالحہ میں اپنے بزرگ کے برابر نہ ہوں، مگر اللہ تعالیٰ اس بزرگ کی برکت سے ان لوگوں کو بھی اسی مقام جنت میں پہنچا دیں گے جو اس بزرگ کا مقام ہے، جیسے دوسری آیت میں مذکور ہے **اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ** یعنی

اپنے نیک بندوں کی ذریت اور اولاد کو بھی انہی کے ساتھ کردیں گے، اس سے معلوم ہو کہ بزرگوں کے ساتھ تعلق خواہ نسب اور قرابت کا ہو یا دوستی کا وہ آخرت میں بھی بشرط ایمان نفع دے گا۔

* * *

**فائدہ:** ۱ ـ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ: یعنی مصائب وشدائد اور دنیا کی مکروہات پر صبر کیا، کسی سختی سے گھبرا کر طاعت کے راستہ سے قدم نہیں ہٹایا نہ معصیت کی طرف جھکے اور صبر واستقلال محض حق تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دکھلایا، اس لیے نہیں کہ دنیا انھیں بہت صابر اور مستقل مزاج کہے، نہ اس لیے کہ بجز صبر کے چارہ نہ رہا تھا مجبور ہو گئے تو صبر کر کے بیٹھ رہے۔

**فائدہ:** ۲ ـ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً: پوشیدہ کو شاید اس لیے مقدم رکھا کہ پوشیدہ خیرات کرنا افضل ہے، اِلّا یہ کہ کہیں مصلحت شرعی اعلانیہ دینے میں ہو۔

**فائدہ:** ۳ ـ وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ: یعنی برائی کا جواب بھلائی سے دیتے تھے، سختی کے مقابلہ میں نرمی برتتے ہیں، کوئی ظلم کرتا ہے یہ معاف کرتے ہیں (بشرطیکہ معافی سے برائی کے ترقی کرنے کا اندیشہ نہ ہو)، بدی سے بچ کر نیکی اختیار کرتے ہیں، اگر کبھی کوئی برا کام ہو جاتا ہے تو اس کے مقابلہ میں بھلا کام (یعنی توبہ اور اس گناہ کی تلافی) کرتے ہیں۔

**فائدہ:** ۴ ـ جَنّٰتُ عَدْنٍ: یعنی جن میں ہمیشہ رہیں گے۔

**فائدہ:** ۵ ـ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ: آباء کا لفظ تغلیباً کہا ہے جس میں امہات (مائیں) بھی شامل ہیں، یہ جنت کی بشارت کے ساتھ مزید خوش خبری سنائی کہ ایسے کاملین کو جن کی خصال اوپر بیان ہوئیں جنت میں ایک نعمت ومسرت یہ حاصل ہوگی کہ وہ اور ان کے ماں باپ، اولاد، بیویاں، جو اپنی نیکی کی بدولت دخول جنت کے لائق ہوں سب اکٹھے رہیں گے، حتی کہ ان متعلقین میں سے اگر کوئی کم رتبہ ہوگا تو حق تعالیٰ اپنی نوازش ومہربانی سے درجہ بڑھا کر اس مرد کامل سے نزدیک کر دے گا: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ (الطور: ۲۱) اس سے معلوم ہوا کہ بدون ایمان وعمل صالح کے محض کاملین کی قرابت کافی نہیں ہاں ایمان وعمل صالح موجود ہو تو تعلق قرابت سے کچھ ترقی درجات ممکن ہے، واللہ اعلم۔

---

## سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿٢٤﴾

کہیں گے سلامتی تم پر بدلے اس کے کہ تم نے صبر کیا، سو خوب ملا عاقبت کا گھر

---

**خلاصہ تفسیر:** (اور فرشتے یہ کہتے داخل ہوں گے) کہ تم (ہر آفت اور خطرہ سے) صحیح سلامت رہو گے بدولت اس کے کہ تم (دین حق پر) مضبوط رہے تھے، سو اس جہان میں تمہارا انجام بہت اچھا ہے۔

* * *

**فائدہ:** صحیح حدیث میں جنت کے آٹھ دروازے بیان ہوئے ہیں مطلب یہ ہے کہ ان کاملین کی تعظیم وتکریم کے لیے خدا کے پاک فرشتے ہر طرف سے تحائف وہدایا لے کر حاضر ہوں گے، احادیث میں ہے کہ خلق اللہ میں سے اول وہ فقراء مہاجرین جنت میں داخل ہوں گے جو سختیوں اور لڑائیوں میں سینہ سپر ہوتے اور رخنہ بندی کے وقت کام آتے تھے، جو حکم ان کو ملتا ان کی تعمیل کے لیے ہمیشہ مستعد رہتے، دنیا کی حاجتیں اور دل کے ارمان دل ہی میں لے کر یہاں سے رخصت ہو گئے، قیامت کے دن حق تعالیٰ فرمائے گا میرے وہ بندے کہاں ہیں (حاضر ہوں) جو میرے راستہ میں لڑے، میرے لیے تکلیفیں اٹھائیں اور جہاد کیا، جاؤ جنت میں بے کھٹکے داخل ہو جاؤ، پھر ملائکہ کو حکم ہوگا کہ میرے ان بندوں کے پاس حاضر ہو کر سلام کرو، وہ عرض کریں گے خداوندا! ہم تیری بہترین مخلوق ہیں کیا ہم بارگاہ قرب کے رہنے والوں کو حکم دیتے ہیں کہ ان زمینی باشندوں کے پاس حاضر ہو کر سلام کریں، ارشاد ہوگا، ہاں یہ میرے وہ بندے ہیں جنہوں نے توحید پر جان دی، دنیا کے سب ارمان اپنے سینوں میں لے کر چلے آئے، میرے راستہ میں

جہاد کیا اور ہر تکلیف کو خوشی سے برداشت کرتے رہے، یہ سن کر فرشتے ہر طرف سے ان کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور کہیں گے: سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ ہر سال آغاز میں قبور شہداء پر تشریف لے جاتے اور فرماتے: سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ یہ ہی طرز عمل ابوبکر، عمر، اور عثمان رضی اللہ عنہم کا رہا۔

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ

اور جو لوگ توڑتے ہیں عہد اللہ کا مضبوط کرنے کے بعد اور قطع کرتے ہیں اس چیز کو جس کو فرمایا اللہ نے جوڑنا

وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْۗءُ الدَّارِ ۝٢٥

اور فساد اٹھاتے ہیں ملک میں، ایسے لوگ ان کے واسطے ہے لعنت اور ان کے لیے ہے برا گھر

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے اطاعت کرنے والوں کا عمل اور انجام بیان ہوا، اب ان کی ضد یعنی نافرمانوں کا ذکر کیا جاتا ہے:

اور جو لوگ خدا تعالیٰ کے معاہدوں کو ان کی پختگی کے بعد توڑتے ہیں اور خدا تعالیٰ نے جن علاقوں کے قائم رکھنے کا حکم فرمایا ہے ان کو قطع کرتے ہیں اور دنیا میں فساد کرتے ہیں ایسے لوگوں پر لعنت ہوگی، اور ان کے لئے اس جہان میں خرابی ہوگی۔

* * *

**فائدہ:** سعداء کے مقابل یہاں اشقیاء کی عادت وخصال اور آخری انجام بتلایا ہے، ان کا کام یہ ہے کہ حق تعالیٰ سے بدعہدی کریں، جن چیزوں کے جوڑنے کا حکم تھا، انھیں توڑیں، ملک میں فتنہ وفساد کی آگ بھڑکائیں دوسروں پر اور اپنی جانوں پر ظلم کرنے سے نہ رکیں، یہ ہی لوگ ہیں جو خدا کی رحمت سے دور پھینک دیے گئے اور سب سے زیادہ برے مقام پر پہنچنے والے ہیں۔

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۭ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا

اللہ کشادہ کرتا ہے روزی جس کو چاہے اور تنگ کرتا ہے [1] اور فریفتہ ہیں دنیا کی زندگی پر، اور دنیا کی زندگی کچھ نہیں

ع ۳ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ۝٢٦

آخرت کے آگے مگر متاع (مال) حقیر [2]

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے کفار کا ملعون یعنی رحمت سے دور ہونا ذکر ہوا، چونکہ اکثر کفار دنیاوی مال ودولت کے اعتبار سے خوش حال تھے اس لیے خود انہیں یا دوسرے دیکھنے والوں کو یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ اگر یہ لوگ ملعون ہیں تو آثار رحمت یعنی دولت وثروت کے معاملے میں کیوں کامیاب ہیں؟ اب اسی شبہ کا جواب دیا جاتا ہے:

(ظاہری دولت وثروت کو دیکھ کر یہ دھوکہ نہیں کھانا چاہئے کہ یہ لوگ مورد رحمت ہیں، کیونکہ رزق کی تو یہ کیفیت ہے کہ) اللہ جس کو چاہے زیادہ رزق دیتا ہے (اور جس کے لئے چاہتا ہے) تنگی کردیتا ہے (رحمت وغضب کا یہ معیار نہیں) اور یہ (کفار) لوگ دنیوی زندگانی پر (اور اس کے عیش وعشرت پر) اتراتے ہیں اور (ان کا اترانا بالکل فضول اور غلطی ہے، کیونکہ) یہ دنیوی زندگی (اور اس کی عیش وعشرت) آخرت کے مقابلہ میں بجز ایک متاع قلیل کے اور کچھ بھی نہیں (اس لیے دنیوی عیش وعشرت پر رحمت وغضب کا مدار نہیں، بلکہ رحمت وغضب کا مدار آخرت کے عیش وعشرت پر ہے)۔

* * *

**فائدہ:** [1] یعنی دنیا کے عیش وفراخی کو دیکھ کر سعادت وشقاوت کا فیصلہ نہیں ہوتا، نہ یہ ضروری ہے کہ جس کو دنیا میں خدا نے رزق اور پیسہ

زیادہ دیا ہے وہ اس کی بارگاہ میں مقبول ہو، بہت سے مقبول بندے بطور آزمائش وامتحان یہاں عسرت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور مردود مجرموں کو ڈھیل دی جاتی ہے وہ مزے اڑاتے ہیں، یہ ہی دلیل اس کی ہے کہ اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی ہے جہاں ہر شخص کو اس کے نیک و بد اعمال کا پورا پھل مل کر رہے گا، بہر حال دنیا کی تنگی وفراخی مقبول و مردود ہونے کا معیار نہیں بن سکتا۔

**فائدہ**: ۲؎ یعنی اسی کو مقصود سمجھ کر اتراتے اور اکڑتے ہیں، حالانکہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی محض ہیچ ہے جیسے ایک شخص اپنی انگلی سے سمندر کو چھوئے تو وہ تری جو انگلی کو پہنچی ہے سمندر کے سامنے کیا حقیقت رکھتی ہے، دنیا کی آخرت کے مقابل اتنی بھی حقیقت نہیں، للہذا عقل مند کو چاہیے کہ فانی پر باقی کو مقدم رکھے، حقیقت یہ ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے بذات خود مقصود نہیں، یہاں کے سامانوں سے اس طرح تمتع کرو جو آخرت کی کامیابی کا ذریعہ بنے جیسے صحابہ رضی اللہ عنہم نے کیا۔

**وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ**

اور کہتے ہیں کافر کیوں نہ اتری اس پر کوئی نشانی اس کے رب سے، کہہ دے اللہ گمراہ کرتا (بچلاتا) ہے جس کو چاہے اور راہ دکھلاتا ہے اپنی

**اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۝**

طرف اسکو جو رجوع ہوا ۱؎ وہ لوگ جو ایمان لائے اور چین پاتے ہیں انکے دل اللہ کی یاد سے ۲؎ سنتا ہے! اللہ کی یاد ہی سے چین پاتے ہیں دل ۳؎

**خلاصہ تفسیر**: پیچھے نبوت کے متعلق مضمون تھا، اب پھر اسی مضمون کی طرف رجوع کرتے ہیں اور کافروں کا وہی سابق اعتراض کہ محمد ﷺ پر ہماری فرمائش کے مطابق معجزہ نازل کیوں نہیں ہوتا؟

اور یہ کافر لوگ (آپ کی نبوت میں طعن واعتراض کرنے کے لئے یوں) کہتے ہیں کہ ان (پیغمبر) پر کوئی معجزہ (ہمارے فرمائشی معجزوں میں سے) ان کے رب کی طرف سے کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ آپ (ﷺ) کہہ دیجئے کہ واقعی (تمہاری ان بیہودہ فرمائشوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ) اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں گمراہ کر دیتے ہیں (یعنی تمہاری قسمت میں گمراہی لکھی ہوئی ہے، وجہ صاف ظاہر ہے کہ باوجود کافی معجزات کے جن میں سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے پھر بھی فضول باتیں کرتے ہو، جس سے معلوم ہوا کہ قسمت ہی میں گمراہی لکھی ہے) اور (جس طرح ان معاندین کو قرآن جیسا عظیم معجزہ ہدایت کے لئے کافی نہ ہوا، اور انہیں گمراہی نصیب ہوئی اسی طرح) جو شخص ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے (اور طریق حق کا طالب ہوتا ہے جس کے اوصاف اگلی آیت: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ میں آتے ہیں) اس کو اپنی طرف (رسائی دینے کے لئے) ہدایت کر دیتے ہیں (اور گمراہی سے بچا لیتے ہیں)۔

مراد اس سے وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور اللہ کے ذکر سے (جس کی بڑی فرد قرآن ہے) ان کے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے (اطمینان کی بڑی فرد ایمان ہے، یعنی وہ لوگ قرآن کے اعجاز کو نبوت کے لئے کافی دلیل سمجھتے ہیں اور واہی تباہی فرمائش نہیں کرتے، پھر خدا کی یاد اور اطاعت میں ان کی ایسی رغبت ہوتی ہے کہ کفار کی طرح متاع دنیا سے انہیں رغبت اور فرحت نہیں ہوتی اور) خوب سمجھ لو کہ اللہ کے ذکر (کی ایسی ہی خاصیت ہے کہ اس) سے دل کو اطمینان ہو جاتا ہے (یعنی جس مرتبے کا ذکر ہو اسی درجہ کا اطمینان نصیب ہوتا ہے، چنانچہ قرآن سے ایمان، اور اعمال صالحہ و اطاعات سے حق تعالیٰ کے ساتھ شدید تعلق اور پوری توجہ میسر ہوتی ہے)۔

**اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ**: سورہ انفال میں ذکر اللہ کی خاصیت میں خوف وخشیت کو بیان کیا ہے: **اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم** یعنی جب خدا کا ذکر ہوتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں، جبکہ یہاں اطمینان قلب بیان کیا ہے، سو ان دونوں میں تعارض نہ سمجھا جائے، کیونکہ اطمینان کے جو معنی بیان کیے گئے ہیں کہ دوسری چیز کی طرف رغبت و توجہ کرنے سے کافی ہو جائے تو اس کا خوف کے ساتھ جمع ہونا بھی ممکن ہے۔

روح المعانی میں ہے کہ اس اطمینان کا سبب یہ ہے کہ ذکر الٰہی سے دل میں نور پیدا ہو جاتا ہے جس سے پریشانی اور وحشت دور ہو جاتی ہے،

جہاں روشنی ہوگی وہاں سے تاریکی از خود دور ہو جائے گی۔

* * *

**فائدہ:** ۱ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ: سینکڑوں نشان دیکھتے تھے مگر وہ ہی مرغے کی ایک ٹانگ پکڑی ہوئی تھی کہ جو ہم کہتے جائیں وہ نشان دکھاؤ، مثلاً مکہ کے پہاڑوں کو ذرا اپنی جگہ سے سرکا کر کھیتی باڑی کے لیے زمین وسیع کردو، یا زمین کو پھاڑ کر چشمے اور نہریں نکال دو یا ہمارے پرانے بزرگوں کو دوبارہ زندہ کر کے ہم سے بات چیت کرا دو، غرض کوئی نشان ایسا دکھلاؤ جو ہم کو ایمان لانے پر مجبور کر دے، اس کا جواب دیا کہ بیشک خدا ایسے نشان دکھلانے پر قدرت رکھتا ہے لیکن اس کی حکمت و عادت مقتضی نہیں کہ تمہاری فرمائشیں پوری کیا کرے، پیغمبروں کی تصدیق کے لیے جس قدر ضرورت ہے اس سے زائد نشانات دکھلا چکا اور دکھارہا ہے، دوسرے سینکڑوں معجزات سے قطع نظر کر کے اکیلا قرآن ہی کیسا عظیم الشان نشان پیغمبر کی صداقت کا ہے، جب تم ان نشانوں کو دیکھ کر راہ راست پر نہ آئے اور حق کی طرف رجوع نہ ہوئے تو معلوم ہوا کہ قدیم قانون کے موافق خدا کی مشیت یہ ہی ہے کہ تم کو تمہاری پسند کردہ گمراہی میں چھوڑے رکھے، بلا شبہ اگر تم اتنے بڑے نشان دیکھ کر اس کی طرف رجوع ہوتے تو وہ اپنی عادت کے موافق تم کو آگے بڑھاتا اور حقیقی کامیابی تک پہنچنے کی راہیں دکھاتا، جب تم نے خود یہ نہ چاہا تو اس کی حکمت بھی اسی کو مقتضی ہے کہ تمہیں مجبور نہ کرے، پھر فرمائشی نشان دکھلانے کی کیا ضرورت رہی بلکہ نہ دکھلانے میں تمہارا فائدہ ہے کیونکہ سنت اللہ یہ ہے کہ فرمائشی نشان اسی وقت دکھلائے جاتے ہیں جب کسی قوم کا تباہ کرنا مقصود ہو، حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا، اے محمد ﷺ! اگر تم چاہو تو ہم ان کو فرمائشی نشان دکھلا دیں، اس پر بھی نہ مانیں تو ایسا عذاب بھیجا جائے گا جو دنیا میں کسی پر نہ آیا ہو، اور اگر تم چاہو تو رحمت و توبہ کا دروازہ کھلا رکھیں، آپ ﷺ نے دوسری شق کو اختیار فرمایا چنانچہ یہ ہی معاندانہ فرمائشیں کرنے والے بہت سے بعد کو مسلمان ہو گئے۔

**فائدہ:** ۲ وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ: یہ خدا کی طرف رجوع کرنے والوں کا بیان ہوا، یعنی ان کو دولت ایمان نصیب ہوتی ہے اور ذکر اللہ (خدا کی یاد) سے چین اور اطمینان حاصل کرتے ہیں، کیونکہ سب سے بڑا ذکر تو قرآن ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر: ۹) جسے پڑھ کر انکے دلوں میں یقین کی کیفیت پیدا ہوتی ہے شبہات اور وساوس شیطانیہ دور ہو کر سکون و اطمینان میسر آتا ہے، ایک طرف اگر حق تعالیٰ کی عظمت و مہابت دلوں میں خوف و خشیت پیدا کرتی ہے تو دوسری طرف لامحدود رحمت و مغفرت کا ذکر قلبی سکون و راحت کے سامان بہم پہنچاتا ہے، غرض انکا دل ہر طرف سے لوٹ کر ایک خدا کی طرف جم جاتا ہے اور ذکر اللہ کا نور انکے قلوب سے ہر طرح کی دنیاوی وحشت اور گھبراہٹ کو دور کر دیتا ہے۔

**فائدہ:** ۳ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ: یعنی دولت، حکومت، منصب، جاگیر یا فرمائشی نشانات کا دیکھ لینا، کوئی چیز انسان کو حقیقی سکون و اطمینان سے ہم آغوش نہیں کر سکتی، صرف یاد الٰہی سے جو تعلق مع اللہ حاصل ہوتا ہے وہ ہی ہے جو دلوں کے اضطراب و وحشت کو دور کر سکتا ہے۔

## اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ۲۹

جو لوگ ایمان لائے اور کام کیے اچھے خوشحالی ہے ان کے واسطے اور اچھا ٹھکانا

**خلاصہ تفسیر:** (غرض) جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے (جن کا اوپر ذکر ہوا) ان کے لیے (دنیا میں) خوش حالی اور (آخرت میں) نیک انجامی ہے (جیسے دوسری آیت میں: فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ الخ سے تعبیر فرمایا ہے کہ ہم ان کو دنیا میں پاکیزہ زندگی اور آخرت میں پورا اجر عطا فرمائیں گے)۔

* * *

**فائدہ:** مترجم محقق نے طوبیٰ کے لغوی معنی لیے ہیں اسی کے اندر جنت کا وہ درخت بھی آ گیا جسے حدیث صحیح میں "طوبیٰ" کے نام سے موسوم فرمایا ہے۔

كَذٰلِكَ اَرۡسَلۡنٰكَ فِيۡۤ اُمَّةٍ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهَاۤ اُمَمٌ لِّتَتۡلُوَاۡ عَلَيۡهِمُ الَّذِيۡۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ وَهُمۡ

اسی طرح تجھ کو بھیجا ہم نے ایک امت میں کہ گزر چکی ہیں اس سے پہلے بہت امتیں تا کہ سنا وے تو ان کو جو حکم بھیجا ہم نے تیری طرف ۱؎ اور وہ

يَكۡفُرُوۡنَ بِالرَّحۡمٰنِ ؕ قُلۡ هُوَ رَبِّيۡ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ وَاِلَيۡهِ مَتَابِ ۝۳۰

منکر ہوتے ہیں رحمان سے ۲؎ تو کہہ وہی رب میرا ہے کسی کی بندگی نہیں اسکے سوا، اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف آتا ہوں رجوع کر کے ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے کفار اور مؤمنین کی حالت کا بیان تھا، اس مقام پر اصل مقصود بحث رسالت ہے، اب اسی بحث کا تتمہ ہے، یعنی یہ لوگ جو آپ ﷺ کی رسالت پر شبہات کرتے ہیں تو آپ ﷺ کی رسالت کوئی انوکھی چیز تو ہے نہیں، پہلے بھی رسول ہوتے آئے ہیں۔

(جس طرح ہم نے پہلی امتوں کی طرف رسولوں کو بھیجا) اسی طرح ہم نے آپ (ﷺ) کو ایک ایسی امت میں رسول بنا کر بھیجا ہے کہ اس (امت) سے پہلے اور بہت سی امتیں گذر چکی ہیں (اور آپ ﷺ کو ان کی طرف اس لئے رسول بنا کر بھیجا ہے) تا کہ آپ ان کو وہ کتاب پڑھ کر سنا دیں جو ہم نے آپ کے پاس وحی کے ذریعہ بھیجی ہے اور (ان کو چاہئے تھا کہ اس نعمت عظمیٰ کی قدر کرتے اور اس کتاب پر جو کہ معجزہ بھی ہے ایمان لے آتے مگر) وہ لوگ ایسے بڑے رحمت والے کی ناسپاسی کرتے ہیں (اور قرآن پر ایمان نہیں لاتے) آپ فرما دیجئے کہ (تمہارے ایمان نہ لانے سے میرا کوئی نقصان نہیں، کیونکہ تم زیادہ سے زیادہ میرے ساتھ مخالفت کرو گے، سو اس سے مجھ کو اس لئے اندیشہ نہیں کہ) وہ میرا مربی (اور نگہبان) ہے اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں (پس لامحالہ وہ بخدا تمام صفات میں کامل ہے وہ میری حفاظت کے لیے کافی ہے اس لئے) میں نے اسی پر بھروسہ کر لیا اور اسی کے پاس مجھ کو جانا ہے (خلاصہ یہ کہ میری حفاظت کے لئے تو اللہ تعالیٰ کافی ہے تم مخالفت کر کے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے البتہ تمہارا ہی نقصان ہے)۔

* * *

**فائدہ: ۱؎ عَلَيۡهِمُ الَّذِيۡۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ:** یعنی جس طرح ہم اپنی طرف رجوع ہونے والوں کو کامیابی کی راہ دکھاتے ہیں، اسی طرح اس امت کی راہنمائی کے لیے ہم نے تجھے مبعوث کیا، تا کہ جو کتاب اپنی رحمت کاملہ سے تجھ پر اتاری ہے آپ ان کو پڑھ کر سنا دیں، آپ کا پیغمبر بنا کر بھیجا جانا کوئی انوکھی بات نہیں پہلی امتوں کی طرف بھی پیغمبر بھیجے جا چکے ہیں جو اس وقت تکذیب کرنے والوں کا حشر ہوا ان لوگوں کو بھی پیش نظر رہنا چاہیے۔

**فائدہ: ۲؎ وَهُمۡ يَكۡفُرُوۡنَ بِالرَّحۡمٰنِ:** یعنی رحمان نے اپنی رحمت کاملہ سے قرآن اتارا اَلرَّحۡمٰنُ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ اور آپ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا، مگر انہوں نے سخت ناشکری اور کفران نعمت پر کمر باندھ لی، رحمان کا حق ماننے سے منکر ہو گئے بلکہ اس نام سے ہی وحشت کھانے لگے، اسی لیے حدیبیہ کے صلح نامہ میں بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھنے پر جھگڑا کیا وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اسۡجُدُوۡا لِلرَّحۡمٰنِ ۚ قَالُوۡا وَمَا الرَّحۡمٰنُ (الفرقان: ۶۰)

**فائدہ: ۳؎ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ وَاِلَيۡهِ مَتَابِ:** یعنی جس رحمان سے تم انکار کرتے ہو وہ ہی میرا رب ہے اور وہ ہی اللہ ہے جس کا کوئی شریک نہیں: قُلِ ادۡعُوا اللّٰهَ اَوِ ادۡعُوا الرَّحۡمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدۡعُوۡا فَلَهُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰى (الاسراء: ۱۱۰) میرا آغاز و انجام سب اسی کے ہاتھ میں ہے اسی پر توکل کرتا ہوں، نہ تمہارے انکار و تکذیب سے مجھے ضرر کا اندیشہ ہے نہ اس کی امداد و اعانت سے مایوس ہوں۔

وَلَوۡ اَنَّ قُرۡاٰنًا سُيِّرَتۡ بِهِ الۡجِبَالُ اَوۡ قُطِّعَتۡ بِهِ الۡاَرۡضُ اَوۡ كُلِّمَ بِهِ الۡمَوۡتٰى ؕ

اور اگر کوئی قرآن ہوا ہوتا کہ چلیں اس سے پہاڑ یا ٹکڑے ہووے اس سے زمین یا بولیں (بولنے لگیں) اس سے مردے تو کیا ہوتا

بَلۡ لِّلّٰهِ الۡاَمۡرُ جَمِيۡعًا ؕ اَفَلَمۡ يَايۡـَٔسِ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ لَّوۡ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيۡعًا ؕ

بلکہ سب کام تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں ۱؎ سو کیا خاطر جمع نہیں ایمان والوں کو اس پر اگر چاہے اللہ تو راہ پر لائے سب لوگوں کو ۲؎

وَلَا يَزَالُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا تُصِيۡبُهُمۡ بِمَا صَنَعُوۡا قَارِعَةٌ اَوۡ تَحُلُّ قَرِيۡبًا مِّنۡ دَارِهِمۡ حَتّٰى يَاۡتِىَ

اور برابر پہنچتا رہے گا منکروں کو ان کے کرتوت پر صدمہ (دھڑکا) یا اترے گا ان کے گھر سے نزدیک جب تک کہ پہنچے

وَعۡدُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخۡلِفُ الۡمِيۡعَادَ ﴿۳۱﴾ ع

وعدہ اللہ کا، بیشک اللہ خلاف نہیں کرتا اپنا وعدہ ؀

**خلاصہ تفسیر**: اور (اے پیغمبر اور مسلمانو! ان کافروں کی عناد کی یہ کیفیت ہے کہ موجودہ حالت میں تو قرآن کا اعجاز تدبر و تامل کا محتاج ہے لیکن اس کے بجائے) اگر کوئی قرآن ایسا ہوتا جس کے ذریعہ سے پہاڑ (اپنی جگہ سے) ہٹا دیئے جاتے، یا اس کے ذریعے سے زمین جلدی جلدی طے ہوجاتی، یا اس کے ذریعہ سے مردوں کے ساتھ کسی کو باتیں کرادی جاتیں (یعنی مردہ زندہ ہوجاتا اور کوئی اس سے باتیں کرلیتا، یہ سب وہ معجزے ہیں جن کی فرمائش اکثر کفار کیا کرتے تھے، بعض تو مستقل طور پر، اور بعض اس طرح سے کہ قرآن کو موجودہ حالت میں تو ہم معجزہ مانتے نہیں، البتہ اگر قرآن سے ان باتوں کا ظہور ہو تو ہم اسے معجزہ مان لیں، مطلب یہ کہ اگر ایسے ایسے معجزات بھی قرآن سے ظاہر ہوتے جس سے دونوں طرح کے لوگوں کی فرمائش پوری ہوجاتی، مستقل درخواست کرنے والوں کی بھی، اور ان کی بھی جو قرآن کے ذریعہ سے ان معجزات کا ظہور چاہتے تھے) تب بھی یہ لوگ ایمان نہ لاتے (کیونکہ یہ اسباب مؤثر حقیقی نہیں) بلکہ سارا اختیار اللہ ہی کو ہے (وہ جس کو توفیق عطا فرماتے ہیں وہی ایمان لاتا ہے، اور اللہ کی عادت ہے کہ جو خود چاہے اس کو توفیق دیتے ہیں اور معاند کو محروم رکھتے ہیں)۔

(چونکہ بعض مسلمانوں کا جی چاہتا تھا کہ ان معجزات کا ظہور ہوجائے تو شاید ایمان لے آئیں، اس لئے آگے ان کا جواب ہے کہ) کیا (یہ سن کر کہ یہ لوگ معاند ہیں ایمان نہ لائیں گے اور یہ کہ سب اختیار خدا ہی کو ہے اور یہ کہ معجزات مؤثر حقیقی نہیں ہیں کیا یہ سن کر) پھر بھی ایمان والوں کو اس بات میں دل جمعی نہیں ہوئی کہ اگر خدا تعالیٰ چاہتا تو تمام (دنیا بھر کے) آدمیوں کو ہدایت کردیتا (مگر بعض حکمتوں کی وجہ سے یہ مشیت نہیں ہوئی تو سب ایمان نہ لائیں گے، جس کی بڑی وجہ عناد ہے، پھر ان معاندین کے ایمان لانے کی فکر میں کیوں لگے ہیں!)۔

اور (جب ثابت ہوگیا کہ یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے تو اس بات کا خیال آسکتا ہے کہ پھر ان کو سزا کیوں نہیں دی جاتی؟ اس کے متعلق ارشاد ہے کہ:) یہ (مکہ کے) کافر تو ہمیشہ (آئے دن) اس حالت میں رہتے ہیں کہ ان کے (بد) کرداروں کے سبب ان پر کوئی نہ کوئی حادثہ پڑتا رہتا ہے (کہیں قتل ہوتے ہیں، کہیں قید اور کہیں ہزیمت و شکست ہوتی) یا (بعض دفعہ اگر کوئی حادثہ ان پر نہیں بھی پڑتا مگر) ان کی بستی کے قریب نازل ہوتا رہتا ہے (مثلاً کسی دوسری قوم پر آفت آتی ہے جس سے ان کو خوف پیدا ہوتا ہے کہ کہیں ہم پر بھی یہ بلا نہ آجائے) یہاں تک کہ (اسی حالت میں) اللہ تعالیٰ کا وعدہ آجائے گا (یعنی آخرت کے عذاب کا سامنا ہوجائے گا جو کہ مرنے کے بعد شروع ہوگا، اور) یقیناً اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتے (پس ان پر عذاب کا واقع ہونا یقینی ہے اگرچہ بعض اوقات کچھ دیر سے سہی)۔

* * *

**فائدہ**: اِبَلۡ لِّلّٰهِ الۡاَمۡرُ جَمِيۡعًا: یہاں قرآن سے مراد عام کتاب ہے جیسا کہ ایک حدیث صحیح میں ''زبور'' پر لفظ قرآن کا اطلاق ہوا ہے یعنی اگر کوئی کتاب ایسی اتاری جاتی جس سے تمہارے یہ فرمائشی نشان پورے ہوجاتے تو وہ بجز اس قرآن کے اور کون سی ہوسکتی تھی، یہ ہی قرآن ہے جس نے روحانی طور پر پہاڑوں کی طرح جمے ہوئے لوگوں کو ان کی جگہ سے ہٹا دیا، قلوب بنی آدم کی زمینوں کو پھاڑ کر معرفت الٰہی کے چشمے جاری کردیے، وصول الی اللہ کے راستے برسوں کی جگہ منٹوں میں طے کرائے، مردہ قوموں اور دلوں میں ابدی زندگی کی روح پھونک دی، جب ایسے قرآن سے تم کو شفاو ہدایت نصیب نہ ہوئی تو فرض کرو تمہاری طلب کے موافق اگر یہ قرآن مادی اور حسی طور پر بھی وہ سب چیزیں دکھلا دیتا جن کی فرمائش کرتے ہو، تب ہی کیا

امید تھی کہ تم ایمان لے آتے اور نئی حجتیں اور کج بحثیاں شروع نہ کرتے تم ایسے ضدی اور سرکش واقع ہوئے ہو کہ کسی نشان کو دیکھ کر ایمان لانے والے نہیں، اصل یہ ہے کہ سب کام (ہدایت واضلال) اللہ کے ہاتھ میں ہیں، جسے وہ نہ چاہے قیامت تک ہدایت نہیں ہوسکتی لیکن وہ اسی کو چاہتا ہے جو اپنی طرف سے قبولِ حق کی خواہش اور تڑپ رکھتا ہو۔

**فائدہ:** ۲ اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا: شاید بعض مسلمانوں کو خیال گزرا ہوگا کہ ایک مرتبہ ان کی فرمائش ہی پوری کردی جائے، شاید ایمان لے آئیں، ان کو سمجھایا کہ خاطر جمع رکھو، اگر خدا چاہے تو بدون ایک نشان دکھلائے ہی سب کو راہِ راست پر لے آئے، لیکن یہ اس کی عادت وحکمت کے خلاف ہے، اس نے انسان کو ایک حد تک کسب واختیار کی آزادی دے کر ہدایت کے کافی اسباب فراہم کردیے، جو چاہے ان سے متمتع ہو، کیا ضرورت ہے کہ ان کی فرمائشیں پوری کی جائیں، باوجود کافی سامان ہدایت موجود ہونے کے اگر معاندین نہیں مانتے اور اپنے ایمان کو بیہودہ فرمائشوں پر معلق کرتے ہیں، تو ہم نے یہ ارادہ بھی نہیں کیا ساری دنیا کو ضرور منوا ہی دیا جائے، آخر: لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (ہود:۱۱۹) والی بات بھی تو پوری ہوکر رہے گی۔

**فائدہ:** ۳ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ: یعنی یہ کفارِ مکہ فرمائشی نشانوں سے ماننے والے نہیں، یہ تو اس طرح مانیں گے کہ برابر کوئی آفت ومصیبت خود ان پر یا ان کے آس پاس والوں پر پڑتی رہے گی، جسے دیکھ کر یہ عبرت حاصل کرلیں، مثلاً جہاد میں مسلمانوں کے ہاتھ سے کچھ قتل ہوں گے کچھ قید کیے جائیں گے کچھ دوسری طرح کے مصائب کا شکار ہوں گے، یہ ہی سلسلہ رہے گا، جب تک خدا کا وعدہ پورا ہو یعنی مکہ فتح ہو اور جزیرۃ العرب شرک کی گندگی سے پاک وصاف ہوجائے بیشک خدا کا وعدہ اٹل ہے، پورا ہوکر رہے گا، بعض مفسرین نے اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ میں رسول اللہ ﷺ کی طرف خطاب مانا ہے، یعنی آپ ان کی بستی کے قریب اتریں گے جیسا کہ حدیبیہ میں ہوا، اس وقت قارعہ سے وہ سرایا مراد ہوں گے جن میں آپ بہ نفس نفیس شریک نہ ہوتے تھے، بعض سلف سے منقول ہے کہ آیت تمام کفار کے حق میں عام ہے مکہ والوں کی تخصیص نہیں، واللہ اعلم۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿۳۲﴾

اور ٹھٹھا کر چکے ہیں کتنے رسولوں سے تجھ سے پہلے سو ڈھیل دی میں نے منکروں کو پھر ان کو پکڑ لیا، سو کیسا تھا میرا بدلہ

**خلاصہ تفسیر:** اور (ان لوگوں کا یہ تکذیب واستہزاء کا معاملہ کچھ آپ کے ساتھ خاص نہیں اور اسی طرح ان کے عذاب میں توقف ہونا کچھ ان کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ پہلی امتوں اور پہلے رسولوں کے ساتھ بھی ایسا ہو چکا ہے، چنانچہ) بہت سے پیغمبروں کے ساتھ جو کہ آپ سے قبل ہو چکے ہیں (کفار کی طرف سے) استہزاء ہو چکا ہے، پھر میں ان کافروں کو مہلت دیتا رہا، پھر میں نے ان پر دار وگیر کی، سو (سمجھنے کی بات ہے کہ) میری سزا کس طرح کی تھی (یعنی نہایت سخت تھی)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی سزا ملنے میں دیر ہو تو مت سمجھو کہ چھوٹ گئے، گزشتہ مجرموں کو بھی پہلے ڈھیل دی گئی، پھر جب پکڑا تو دیکھ لو کیا حشر ہوا، آج تک ان کی تباہی کی داستانیں زبانوں پر ہیں۔

اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ ۚ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ قُلْ سَمُّوْهُمْ ؕ

بھلا جو لیے کھڑا ہے ہر کسی کے سر پر جو کچھ اس نے کیا ہے (اوروں کے برابر ہوسکتا ہے)، اور مقرر کرتے ہیں اللہ کیلئے شریک ۱ کہہ انکا نام لو ۲

اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِى الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ؕ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا

یا اللہ کو بتلاتے ہو جو وہ نہیں جانتا زمین میں ۳ یا کرتے ہو اوپر ہی اوپر باتیں ۴ یہ نہیں بلکہ بھلے سجھا دیے ہیں منکروں کو

مَكۡرُهُمۡ وَصُدُّوۡا عَنِ السَّبِيۡلِ ؕ وَمَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ هَادٍ ﴿۳۳﴾

ان کے فریب اور وہ روک دیئے گئے ہیں راہ سے ۵ اور جس کو گمراہ کرے اللہ سو کوئی نہیں اس کو بتانے والا ۶

**خلاصہ تفسیر**: اوپر رسالت کے ضمن میں: بل للہ الامر جمیعا میں توحید کا ذکر آ گیا تھا، اب اس کے مقابلہ میں شرک اور اہل شرک کی برائی بیان فرماتے ہیں۔

(جب اللہ تعالیٰ کی شان معلوم ہوگئی کہ وہی مختار کل ہیں تو یہ معلوم اور ثابت ہونے کے بعد) پھر (بھی) کیا جو (خدا) ہر شخص کے اعمال پر مطلع ہو اور ان لوگوں کے شرکاء برابر ہو سکتے ہیں اور (باوجود اس کے) ان لوگوں نے خدا کے لئے شرکاء تجویز کئے ہیں، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کہئے کہ (ذرا) ان (شرکاء) کے نام تو لو (میں بھی سنو کون ہیں؟ اور کیسے ہیں!) کیا (تم انہیں حقیقت میں شریک سمجھ کر دعوی کرتے ہو تب تو تم پر یہ لازم آتا ہے کہ) تم اللہ تعالیٰ کو ایسی بات کی خبر دیتے ہو کہ دنیا (بھر) میں اس (باطل معبود کے وجود) کی خبر اللہ تعالیٰ کو نہ ہو (کیونکہ اللہ تعالیٰ تو اسی چیز کو موجود جانتے ہیں جو واقع میں موجود ہو، اور معدوم چیز کو وہ موجود نہیں جانتے، ورنہ خدا کے علم کا غلط ہونا لازم آئے گا، تو حق تعالیٰ تو کسی کو بھی اپنا شریک واقع میں نہیں جانتے، تو تم خدا سے بھی زیادہ جاننے والے ہوئے اور یہ محال ہے، پس ان کا حقیقی شریک ہونا بھی محال ہے) یا (یہ کہ ان کو حقیقۃ شریک نہیں کہتے بلکہ) محض ظاہری لفظ کے اعتبار ان کو شریک کہتے ہو (بلکہ یہ لفظ ہی لفظ ہیں جن کا واقعی مصداق کوئی نہیں ہے، اگر یہ دوسری صورت ہے تو تم نے ان کے شریک نہ ہونے کو خود تسلیم کر لیا، پس شرک کا باطل ہونا دونوں صورتوں میں ثابت ہو گیا، پہلی صورت میں دلیل سے، دوسری صورت میں خود تمہارے تسلیم کرنے سے اور یہ تقریر باوجودیکہ اعلیٰ درجہ میں کافی ہے مگر یہ لوگ نہ مانیں گے) بلکہ ان کافروں کو اپنے مغالطہ کی باتیں (جس سے دلیل پکڑ کے شرک میں مبتلا ہیں) مرغوب معلوم ہوتی ہیں، اور (اسی وجہ سے) یہ لوگ راہ (حق) سے محروم رہ گئے ہیں، اور (اصل وہی بات ہے جو اوپر بل للہ الامر جمیعا سے مفہوم ہو چکی ہے کہ سب کام خدا کے قبضہ میں ہیں، یعنی) جس کو خدا تعالیٰ گمراہی میں رکھے اس کو کوئی راہ پر لانے والا نہیں (البتہ وہ گمراہ اسی کو کرتے ہیں جو حق واضح ہونے کے باوجود پھر بھی عناد کرتا رہے)۔

* * *

**فائدہ**: ۱ وَجَعَلُوۡا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ: یعنی جو خدا ہر شخص کے ہر عمل کے ہر وقت نگرانی رکھتا ہے، ایک لحہ کسی سے غافل نہیں، ذرا کوئی شرارت کرے اسی وقت تنبیہ کر سکتا اور سزا دے سکتا ہے کیا مجرم اس سے چھوٹ کر کہیں بھاگ سکتے ہیں؟ یا اس کی مثل پتھر کی وہ مورتیاں ہو سکتی ہیں جو نہ دیکھتی ہیں نہ سنتی ہیں نہ اپنے یا دوسرے کے نفع وضرر کا کچھ اختیار رکھتی ہیں، تعجب ہے کہ ایسے خدا کی موجودگی میں انسان ایسی عاجز وحقیر مخلوق کے آگے سر جھکائے اور اس کو خدائی کے اختیارات تفویض کر دے، اس ظلم کی بھی کوئی انتہا ہے کہ علیم الکل اور ہمہ صفت موصوف خدا کے شریک وہ ہوں جنہیں خود اپنے وجود کی خبر نہیں، خوب سمجھ لو کہ جو کچھ ہم خفیہ یا اعلانیہ کرتے ہیں سب خدا کی آنکھ کے سامنے ہے، لوگوں کی ان مشرکانہ گستاخیوں سے وہ بے خبر نہیں، جلد یا بدیر سزا مل کر رہے گی۔

**فائدہ**: ۲ قُلۡ سَمُّوۡهُمۡ: یعنی ذرا آگے بڑھ کر ان شرکاء کے نام تو لو اور پتے تو بتاؤ، کیا خداوند قدوس کی یہ صفات سن کر جو اوپر بیان ہوئیں کوئی حیادار ان پتھروں کا نام بھی لے سکتا ہے؟ اور بے حیائی سے لات وعزیٰ کے نام لینے لگو تو کیا کوئی عاقل ادھر التفات کر سکتا ہے؟

**فائدہ**: ۳ اَمۡ تُنَبِّـُٔوۡنَهٗ بِمَا لَا يَعۡلَمُ فِى الۡاَرۡضِ: یعنی خدا کو تمام روئے زمین پر اپنی خدائی کا کوئی شریک (حصہ دار) معلوم نہیں (کیونکہ ہے ہی نہیں جو معلوم ہو) کیا تم اسے وہ چیز بتلاؤ گے جسے وہ نہیں جانتا؟ (العیاذ باللہ)

**تنبیہ**: زمین کی قید اس لیے لگائی کہ بت پرستوں کے نزدیک شرکاء (اصنام) کی قیام گاہ یہی زمین تھی، ابوحیان نے لَا يَعۡلَمُ کی ضمیر مَا کی طرف لوٹائی ہے یعنی کیا خدا کو بتلاتے ہو کہ آپ کی خدائی کے حصہ دار وہ بت ہیں جو ادنیٰ سا علم بھی نہیں رکھتے۔

فائدہ: ۴ أَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ: پہلے فرمایا تھا ان شرکاء کا ذرا نام لو، پھر متنبہ فرمایا کہ جس چیز کا واقعہ میں ثبوت ہی نہیں اس کا نام کیا لیا جاسکتا ہے؟ اب بتلاتے ہیں کہ کسی چیز کو خدا کا شریک ٹھہرانا خالی الفاظ اور صورت محض ہے جس کے نیچے کوئی حقیقت نہیں، مجرد ظن وتخمین اور باطل اوہام سے چند بے معنی الفاظ بامعنی نہیں بن جاتے، شاید بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ میں ادھر بھی اشارہ ہو کہ جو مشرکانہ باتیں وہ کر رہے ہیں اگر کورانہ تقلید وتعصب سے خالی ہو کر اپنے ضمیر کی طرف رجوع کریں تو خود ان کا ضمیر بھی ان لغویات سے انکار کرے گا، اس لیے کہنا چاہیے کہ یہ سب اوپر اوپر کی باتیں ہیں، جن کو انسانی ضمیر اور انسانی فطرت دونوں مردود ٹھہرا چکے ہیں۔

فائدہ: ۵ مَكْرُهُمْ وَصُدُّوا عَنِ السَّبِيلِ: یعنی کچھ بھی نہیں، شرک کی حمایت میں ان کی یہ مستعدی اور توحید کے مقابلہ میں اس قدر جدو جہد خالی نفس کا دھوکہ اور شیطان کا فریب ہے، اسی نے ان کو راہ حق سے روک دیا ہے۔

فائدہ: ۶ وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ: یعنی جسے خدا ہدایت کی توفیق نہ دے اسے کون راہ پر لاسکتا ہے اور وہ اسی کو توفیق دیتا ہے جو باختیار خود ہدایت کے دروازے اپنے اوپر بند نہ کر لے۔

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۳۴﴾

ان کو مار پڑتی ہے دنیا کی زندگی میں ۱ اور آخرت کی مار تو بہت ہی سخت ہے، اور کوئی نہیں ان کو اللہ سے بچانے والا ۲

**خلاصہ تفسیر**: پیچھے مشرکین کے طریقہ کی برائی تھی، اب ان کی سزا کا بیان ہے اور مقابلہ میں مؤمنین کی جزا وصلہ کا بھی بیان ہے۔

ان کافروں کے لئے دنیوی زندگانی میں (بھی) عذاب ہے (وہ قتل، قید وذلت یا امراض ومصائب ہیں) اور آخرت کا عذاب اس سے بدرجہا زیادہ سخت ہے (کیونکہ شدید بھی ہے اور دائم بھی ہے) اور اللہ (کے عذاب) سے ان کو کوئی بچانے والا نہیں ہوگا۔

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: دنیاوی عذاب کی تفسیر میں جو امراض ومصائب کا ذکر کیا گیا تو کافروں کے حق میں یہ امور سزا وعقوبت ہوتے ہیں، اور مؤمنین کے لیے مغفرت ورحمت کا باعث ہوتے ہیں، یعنی امراض ومصائب ایمان والوں کے لیے رفع درجات وکفارہ سیئات کا سبب ہوتے ہیں، جیسا کہ احادیث میں بھی آیا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ مجاہدین کے ہاتھوں سے یا بلاواسطہ قدرت کی طرف سے۔

فائدہ: ۲ یعنی بے سزا دیئے چھوڑے گا نہیں، پھر وہاں کی سزا کا کیا پوچھنا۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا ؕ

حال جنت کا جس کا وعدہ ہے پرہیز گاروں سے، بہتی ہیں اس کے نیچے نہریں، میوہ اس کا ہمیشہ ہے ۱ اور سایہ بھی ۲

تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۖ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ﴿۳۵﴾

یہ بدلہ ہے ان کا جو ڈرتے رہے ۳ اور بدلہ منکروں کا آگ ہے ۴

**خلاصہ تفسیر**: (اور) جس جنت کا متقیوں سے (یعنی شرک وکفر سے بچنے والوں سے) وعدہ کیا گیا ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ اس (کی عمارتوں اور درختوں) کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی، اور اس کا پھل اور اس کا سایہ دائم رہے گا، یہ تو انجام ہوگا متقیوں کا، اور کافروں کا انجام دوزخ ہوگا۔

اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا: میووں کے ہمیشہ رہنے سے مراد یہ ہے کہ ان کی نوع ہمیشہ باقی رہے گی اگرچہ اس کے بعض افراد یا اجزاء فنا بھی

ہوجائیں، یعنی اگر ایک بار میوہ کھالیا تو اس کے بدلے دوسرا درخت پر لگ جائے گا، اور سایہ کے دوام کی وجہ یہ ہے کہ وہاں سورج نہ ہوگا، اس سے یہ شبہ نہ ہو کہ پھر وہاں روشنی کیسے ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نور یا روشنی کا وجود فقط سورج میں منحصر نہیں ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ جس کی کوئی نوع کبھی ختم نہ ہوگی اور ہمیشہ وہ ہی ملے گا جسکی خواہش کریں گے: لَّا مَقۡطُوۡعَةٍ وَّلَا مَمۡنُوۡعَةٍ (الواقعہ: ۳۳)

**فائدہ:** ۲ یعنی سایہ بھی ہمیشہ آرام دہ رہے گا، نہ کبھی دھوپ کی تپش ہوگی نہ سردی کی تکلیف: لَا يَرَوۡنَ فِيۡهَا شَمۡسًا وَّلَا زَمۡهَرِيۡرًا

**فائدہ:** ۳ یعنی خدا سے ڈر کر شرک وکفر کو چھوڑے رکھا۔

**فائدہ:** ۴ اہل حق اور اہل باطل کا انجام ایک دوسرے کے بالمقابل بیان فرمایا: وَ بِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الۡاَشۡيَآء

## وَالَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ يَفۡرَحُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ وَمِنَ الۡاَحۡزَابِ مَنۡ يُّنۡكِرُ بَعۡضَهٗ ؕ

اور وہ لوگ جن کو ہم نے دی ہے کتاب خوش ہوتے ہیں اس سے جو نازل ہوا تجھ پر ۱ اور بعضے فرقے نہیں مانتے اس کی بعض بات ۲

## قُلۡ اِنَّمَاۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ اللّٰهَ وَلَاۤ اُشۡرِكَ بِهٖ ؕ اِلَيۡهِ اَدۡعُوۡا وَاِلَيۡهِ مَاٰبِ ۝۳۶

کہہ مجھ کو یہی حکم ہوا ہے کہ بندگی کروں اللہ کی اور شریک نہ کروں اس کا، اسی کی طرف بلاتا ہوں اور اسی کی طرف ہے میرا ٹھکانا ۳

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے نبوت کے متعلق بحث آچکی ہے، اب اسی کے متعلق اہل کتاب کی حالت اور ان کے بعض شبہات کا جواب بیان کیا جاتا ہے۔

اور جن لوگوں کو ہم نے (آسمانی) کتاب (یعنی تورات وانجیل) دی ہے (اور وہ اس کو پورے طور سے مانتے بھی تھے) وہ اس (کتاب) سے خوش ہوئے ہیں جو آپ پر نازل کی گئی ہے (کیونکہ وہ اس کی خبر اپنی کتابوں میں پاتے ہیں اور خوش ہو کر مان لیتے ہیں اور ایمان لے آتے ہیں جیسے یہود میں عبداللہ بن سلامؓ اور ان کے ساتھی اور نصاریٰ میں نجاشی شاہ حبشہ اور ان کے فرستادے جن کا ذکر دوسری آیات میں بھی ہے) اور انہی کے گروہ میں بعض ایسے ہیں کہ اس (کتاب) کے بعض حصہ کا (جس میں ان کی کتاب کے خلاف احکام ہیں) انکار کرتے ہیں (اور کفر کرتے ہیں) آپ (ان سے) فرمائیے کہ (احکام دو قسم کے ہیں: ①اصول اور ②فروع، اگر تم اصول میں مخالفت کرتے ہو تو اصول سب شریعتوں کے یکساں ہیں، چنانچہ) مجھ کو (توحید کے متعلق) صرف یہ حکم ہوا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں، اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤں (اور نبوت کے متعلق یہ بات ہے کہ) میں (لوگوں کو) اللہ ہی کی طرف بلاتا ہوں (یعنی نبوت کا حاصل یہ ہے کہ میں داعی الی اللہ ہوں) اور (آخرت کے متعلق میرا یہ عقیدہ ہے کہ) اسی کی طرف مجھ کو (دنیا سے لوٹ کر) جانا ہے (یعنی عقائد میں یہ تین بڑے اصول ہیں، سو ان میں سے ایک بات بھی انکار کے قابل نہیں، چنانچہ توحید سب کے نزدیک مسلم ہے، جیسا کہ یہی مضمون دوسری آیت میں ہے: **قل تعالوا الی کلمة سواء بیننا وبینکم** الخ، اور رہی نبوت تو میں اپنے لئے مال وجاہ نہیں چاہتا جس پر انکار کی گنجائش ہو، محض اللہ کی طرف بلاتا ہوں، سو ایسے لوگ پہلے بھی ہوئے ہیں جنہیں تم بھی مانتے ہو، جیسا یہی مضمون دوسری جگہ بھی ہے: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ يُّؤۡتِيَهُ اللّٰهُ الۡكِتٰبَ الخ اسی طرح آخرت کا عقیدہ بھی مشترک اور مسلم ہے، اس میں بھی انکار کی گنجائش نہیں)۔

قُلۡ اِنَّمَاۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ اللّٰهَ: اس سے معلوم ہوا کہ احکام وعبادات کسی سے ساقط یا معاف نہیں ہوتیں چاہے وہ عام آدمی ہو یا نبی ہو۔

* * *

**فائدہ:** ۱ جن کو اب قرآن دیا ہے (یعنی مسلمان) اور جن کو پہلے تورات وانجیل" وغیرہ دی گئی یعنی (یہود ونصاریٰ) اس چیز کو سن کر خوش ہوتے ہیں جو آپ ﷺ پر نازل کی گئی مسلمانوں کا خوش ہونا تو ظاہر ہے کہ وہ اس کتاب کو فلاح دارین کی کلید جانتے تھے، باقی یہود ونصاریٰ میں جو

لوگ اہل علم وانصاف اور فی الجملہ حق پرست تھے ان کے لیے بھی ایک طرح مسرت کا موقع تھا کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ قرآن کریم کیسی فراخ دلی سے ان کی اصل کتابوں کی تصدیق اور ان کے انبیاء کی تعریف وتعظیم میں رطب اللسان ہے بلکہ سچے احبار و رہبان کے وجود کو بھی معرض مدح میں پیش کرتا ہے: ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنۡهُمۡ قِسِّيۡسِيۡنَ وَرُهۡبَانًا (المائدہ: ۸۲) چنانچہ اسی قسم کے منصف وحق پرست یہود ونصاریٰ آخر کار مشرف با اسلام ہوئے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی یہود ونصاریٰ یا عرب کے جاہلوں میں وہ جماعتیں بھی ہیں جو قرآن سے اس لیے ناخوش ہیں کہ انھیں اس کی بعض چیزوں سے انکار ہے اور یہ وہی چیزیں ہیں جو ان کی تحریف وتبدیل یا آراء واہواء کے خلاف قرآن نے بیان کی ہیں۔

**فائدہ:** ۳ یعنی کوئی خوش ہو یا ناخوش، میں تو اسی خدائے وحدہ لاشریک لہ کی بندگی کرتا ہوں جس کو سب انبیاء اور ملل بالاتفاق مانتے چلے آئے، اسی کے احکام ومرضیات کی طرف ساری دنیا کو دعوت دیتا ہوں اور خوب جانتا ہوں کہ میرا انجام اسی کے ہاتھ میں ہے، میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں، وہیں میرا اٹھکانہ ہے وہ ہی مجھ کو آخر کار غالب ومنصور اور مخالفین کو مغلوب ورسوا کرے گا، لہٰذا کسی کے خلاف وانکار کی مجھے قطعاً پروا نہیں۔

وَكَذٰلِكَ اَنۡزَلۡنٰهُ حُكۡمًا عَرَبِيًّا ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَهۡوَآءَهُمۡ بَعۡدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ ۙ

اور اسی طرح اتارا ہم نے یہ کلام حکم عربی زبان میں ۱ اور اگر تو چلے ان کی خواہش کے موافق بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچ چکا

مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِىٍّ وَّلَا وَاقٍ ﴿۳۷﴾ ع ۱۱

کوئی نہیں تیرا اللہ سے حمایتی اور نہ بچانے والا ۲

**خلاصہ تفسیر:** (اور اگر تم فروع میں مخالفت کرتے ہو تو اس کا جواب اللہ تعالیٰ یوں دیتے ہیں کہ ہم نے جس طرح اور رسولوں کو خاص خاص زبانوں میں خاص احکام دیئے) اسی طرح ہم نے اس (قرآن) کو اس طور پر نازل کیا کہ وہ خاص حکم ہے عربی زبان میں (عربی کے لفظ سے اشارہ ہو گیا دوسرے انبیاء علیہم السلام کی دوسری زبانوں کی طرف، اور زبانوں کے اختلاف سے امتوں کے اختلاف کی طرف اشارہ ہو گیا) اور (اے محمد ﷺ!) اگر آپ (بفرض محال) ان کے نفسانی خیالات کا (یعنی منسوخ یا محرف احکام کا) اتباع کرنے لگیں بعد اس کے کہ آپ کے پاس (احکام مقصودہ کا) علم (صحیح) پہنچ چکا ہے تو اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں نہ کوئی آپ کا مددگار ہو گا، اور نہ کوئی بچانے والا (اور جب نبی کو ایسا خطاب کیا جا رہا ہے تو اور لوگ انکار کر کے کہاں رہیں گے!! سو اس میں اہل کتاب پر تعریض ہے، غرض دونوں صورتوں پر منکرین ومخالفین کا جواب ہو گیا)۔

پس جواب کا حاصل یہ ہوا کہ جس طرح اور رسولوں کو خاص خاص زبانوں میں خاص امتوں کے لیے مخصوص احکام دیے گئے ہیں تو امتوں میں اختلاف کی وجہ سے فروعی احکام میں اختلاف ہوا، کیونکہ ہر زمانہ میں امتوں کے مصالح جداگانہ ہوتے ہیں، پس شریعتوں کے اختلاف کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اصول کی مخالفت کی جائے، چنانچہ جو شریعتیں تمہاری مسلمہ ہیں ان میں بھی فروعی احکام میں ایسا اختلاف ہوا ہے، پھر تمہاری مخالفت وانکار کی کیا گنجائش ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَنۡزَلۡنٰهُ حُكۡمًا عَرَبِيًّا: اس سے صرف اہل عرب کا آپ ﷺ کی امت ہونا نہ سمجھا جائے، آگے سورہ ابراہیم میں عنقریب اس کی وجہ معلوم ہو جائے گی کہ آپ ﷺ کی نبوت عام ہونے کے باوجود قرآن کی زبان عربی کیوں ہوئی؟؟!۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی جیسے پیشتر دوسری کتابیں اتاری گئیں، اس وقت یہ قرآن اتارا جو عظیم الشان معارف وحکم پر مشتمل اور حق و باطل کا آخری فیصلہ کرنے والا ہے، پھر جس طرح ہر پیغمبر کو اسی زبان میں کتاب دی گئی جو اس کی قومی زبان تھی، ایسے ہی محمد عربی ﷺ کو عربی قرآن دیا گیا، بلاشبہ قرآن جیسی معجز وجامع کتاب ایسی ہی زبان میں نازل ہونی چاہیے تھی، جو نہایت بلیغ، وسیع، جامع، منضبط، واضح، پر مغز اور پر شوکت ہونے کی وجہ سے "ام الالسنہ" اور "ملکۃ اللغات" کہلانے کی مستحق ہے۔

**فائدہ:** ۲ے یعنی کسی کے انکار و ناخوشی کی ذرہ بھر پروانہ کرو، حق تعالیٰ نے جو علم عظیم تم کو دیا ہے اس کی پیروی کرتے رہو اگر بالفرض تم ان لوگوں کی خواہشات کی طرف جھک گئے تو اس کے وبال سے کون بچا سکتا ہے، یہ خطاب ہر طالب حق کو ہے اور اگر حضور ﷺ مخاطب ہیں تو آپ کو سامنے رکھ کر دوسروں کو سنانا مقصود ہے جیسا کہ پہلے متعدد مواضع میں اس کی نظائر گزر چکیں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ؕ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ

اور بھیج چکے ہیں ہم کتنے رسول تجھ سے پہلے اور ہم نے دی تھیں ان کو جوروئیں اور اولاد، اور نہیں ہوا کسی رسول سے کہ وہ لے آئے

بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿۳۸﴾

کوئی نشانی مگر اللہ کے اذن سے، ہر ایک وعدہ ہے لکھا ہوا

**خلاصہ تفسیر:** اہل کتاب میں سے بعضوں کو نبوت پر یہ اعتراض تھا کہ پیغمبر کے پاس متعدد بیویاں ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ:

اور ہم نے یقیناً آپ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے اور ہم نے ان کو بیویاں اور بچے بھی دیئے (یہ کونسا رسالت کے خلاف امر ہے، ایسا ہی مضمون دوسری آیت میں ہے: اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ الخ) اور (چونکہ شریعت کے احکام میں اختلاف کا شبہ دیگر شبہات سے زیادہ مشہور تھا اور اوپر اس کا ذکر اجمالا ہوا ہے اس لئے آگے اس کو مکرر مفصل ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص اختلاف احکام کی وجہ سے نبی پر شبہ کرتا ہے وہ در پردہ نبی کو احکام کا مالک سمجھتا ہے کہ خود جو چاہا حکم کر دیا، حالانکہ) کسی پیغمبر کے اختیار میں یہ امر نہیں کہ ایک آیت (یعنی ایک حکم) بدون خدا کے حکم کے (اپنی طرف سے) لا سکے (بلکہ احکام کا مقرر ہونا خدا تعالیٰ کی اجازت واختیار پر موقوف ہے، اور خدا تعالیٰ کی حکمت ومصلحت کی وجہ سے یہ قاعدہ مقرر ہے کہ) ہر زمانے کے مناسب خاص خاص احکام ہوتے ہیں (پھر دوسرے زمانے میں بعض امور میں دوسرے احکام آتے ہیں اور پہلے احکام موقوف ہو جاتے ہیں اور بعض اپنے حال پر برقرار رہتے ہیں)۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً: روح المعانی میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ کاملین عارفین کو دنیا کے تعلقات اور اہل وعیال کی کثرت نقصان دہ نہیں ہوتی اور نہ ہی کثرت اولاد وعیال تقوی اور پرہیزگاری کے خلاف ہے۔

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ: اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء سے خوارق یا معجزات کا طلب کرنا درست نہیں تو پھر اولیاء اللہ کے بارے میں کرامات کا طلب کرنا کیونکر درست ہوگا!! جب معجزات کا انبیاء کو اختیار نہیں تو اولیاء اللہ کا کیونکر اختیار ہوگا جن کا صاحب خوارق وکرامات ہونا بھی ضروری نہیں ہے!!۔

* * *

**فائدہ:** یعنی پیغمبر عربی ﷺ کوئی کتاب اور نئے احکام دے کر بھیجنا کیا اچنبھے کی بات ہوگئی جو اتنی حجتیں نکالی جاتی ہیں، آخر ان سے پہلے بھی ہم نے جو پیغمبر بھیجے وہ آسمان کے فرشتے نہ تھے اسی دنیا کے رہنے والے آدمی تھے، جو کھانا کھاتے، اپنی ضروریات اپنے ہاتھوں سے انجام دیتے اور بیوی بچے رکھتے تھے، ان میں کسی کو یہ قدرت نہ تھی کہ لوگ جو نشانی مانگتے ضرور دکھلا دیتا، بلکہ موجودہ پیغمبر کی طرح ہر چیز میں خدائی اذن کے منتظر رہتے تھے، وہ ہی نشان دکھاتے اور وہ ہی احکام سناتے تھے جس کا اذن حدا کے یہاں سے ہوتا، خدائی اذن کا حال یہ ہے کہ اس کے یہاں ہر زمانہ اور ہر قرن کے مناسب جداگانہ حکم لکھا ہوا ہے، اور ایک وعدہ ٹھہرا ہوا ہے جس کو نہ کوئی نبی بدل سکتا ہے نہ فرشتہ، پھر جب ہر ایک پیغمبر اپنے زمانہ کے مناسب احکام لائے، اور اپنی صداقت کے نشان دکھانے میں پبلک کی خواہشات کے پابند نہیں رہے، نہ اپنے کو حوائج بشریہ اور تعلقات معاشرت سے پاک اور برتر ظاہر کیا تو ان ہی چیزوں کا محمد رسول ﷺ میں پایا جانا انکار نبوت کی دلیل کیسے بن سکتی ہے؟

يَمۡحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثۡبِتُ ۖ وَعِنۡدَهٗۤ اُمُّ الۡكِتٰبِ ﴿۳۹﴾

مٹاتا ہے اللہ جو چاہے اور باقی رکھتا ہے، اور اسی کے پاس ہے اصل کتاب

**خلاصہ تفسیر:** (پس) خدا تعالیٰ (ہی) جس حکم کو چاہیں موقوف کر دیتے ہیں اور جس حکم کو چاہیں قائم رکھتے ہیں اور اصل کتاب (یعنی لوح محفوظ) انہی کے پاس (رہتی) ہے (اور یہ سب احکام ناسخ و منسوخ و مستمر اس میں درج ہیں، وہ سب کی جامع اور گویا میزان الکل ہے، غرض جہاں سے یہ احکام آتے ہیں وہ اللہ ہی کے قبضہ میں ہے، پس سابقہ احکام کے مطابق یا مخالف احکام لانے کی کسی کو گنجائش اور دسترس ہی نہیں ہوسکتی)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی اپنی حکمت کے موافق جس حکم کو چاہے منسوخ کرے، جسے چاہے باقی رکھے، جس قوم کو چاہے مٹائے جسے چاہے اس کی جگہ جمادے، جن اسباب کی تاثیر چاہے بدل ڈالے جن کی چاہے نہ بدلے، جو وعدہ چاہے شرائط کی موجودگی میں ظاہر کرے جو چاہے شرائط کے نہ پائے جانے کی بنا پر موقوف کر دے، غرض ہر قسم کی تبدیل و تغییر، محو و اثبات، نسخ و احکام اسی کے ہاتھ میں ہے، قضاء و قدر کے تمام دفاتر اسی کے قبضہ میں ہیں اور سب تفصیلات و دفاتر کی جڑ جسے "اُم الکتاب" کہنا چاہیے اسی کے پاس ہے یعنی "علم ازلی محیط" جو ہر قسم کے تبدل و تغیر سے قطعاً منزّہ و مبرّیٰ اور لوح محفوظ کا ماخذ ہے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: "کہ دنیا میں ہر چیز اسباب سے ہے بعضے اسباب ظاہر ہیں بعضے چھپے ہیں، اسباب کی تاثیر کا ایک طبعی اندازہ ہے، جب اللہ چاہے اس کی تاثیر اندازہ سے کم یا زیادہ کر دے جب چاہے ویسی ہی رکھے، آدمی کبھی کنکر سے مرتا ہے اور کبھی گولی سے بچتا ہے اور ایک اندازہ ہر چیز کا اللہ کے علم میں ہے جو ہرگز نہیں بدلتا، اندازے کو تقدیر کہتے ہیں، یہ دو تقدیریں ہوئیں، ایک بدلتی ہے اور ایک نہیں بدلتی"، جو تقدیر بدلتی ہے اس کو "معلق" اور جو نہیں بدلتی اس کو "مبرم" کہتے ہیں، جن احادیث و آثار سے بعض افاضل کو قضائے مبرم کے بدلنے کا شبہ ہوا ہے ان کے متعلق یہاں تفصیل کا موقع نہیں، ان شاء اللہ مستقل تفسیر میں لکھا جائے گا، اگر خدا نے توفیق دی، و هو الموفق و المستعان۔

وَاِنۡ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعۡضَ الَّذِىۡ نَعِدُهُمۡ اَوۡ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيۡكَ الۡبَلٰغُ وَعَلَيۡنَا الۡحِسَابُ ﴿۴۰﴾

اور اگر دکھلائیں ہم تجھ کو کوئی وعدہ جو ہم نے کیا ہے ان سے یا تجھ کو اٹھا لیویں سو تیرا ذمہ تو پہنچا دینا ہے اور ہمارا ذمہ ہے حساب لینا

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے اہل کتاب جو منکر نبوت تھے انکے متعلق کلام تھا، اب دوسرے کفار جو منکرین نبوت تھے انکے متعلق کلام ہے۔

اور (یہ لوگ جو اس بنا پر انکار نبوت کرتے ہیں کہ اگر آپ نبی ہیں تو انکار نبوت پر جس عذاب کا وعدہ کیا جاتا ہے وہ عذاب کیوں نہیں نازل ہوتا؟ تو اس کے متعلق سن لیجئے کہ) جس بات کا (یعنی عذاب کا) ہم ان سے (انکار نبوت پر) وعدہ کر رہے ہیں اس میں کا بعض واقعہ اگر ہم آپ کو دکھلا دیں (یعنی آپ کی حیات میں ان پر کوئی عذاب نازل ہو جائے) خواہ (اس عذاب کے نزول سے پہلے) ہم آپ کو وفات دے دیں (یعنی آپ کے سامنے عذاب نہ بھیجیں، پھر بعد میں وہ عذاب واقع ہو، خواہ دنیا میں بھی یا صرف آخرت میں، تو دونوں حالتوں میں آپ فکر و اہتمام نہ کریں، کیونکہ) بس آپ کے ذمہ تو صرف (احکام کا) پہنچا دینا ہے اور دار و گیر کرنا تو ہمارا کام ہے (آپ اس فکر میں کیوں پڑیں کہ اگر عذاب واقع ہو جائے تو بہتر ہے شاید ایمان لے آئیں)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جو وعدے ان سے کیے گئے ہیں، ہم کو اختیار ہے کہ ان میں سے بعض آپ کے سامنے پورے کر دیں، یا آپ کی وفات کے بعد ظاہر کریں، نہ آپ کو ان کے ظہور کی فکر میں پڑنا چاہیے اور نہ تاخیر و امہال دیکھ کر ان لوگوں کو بے فکر ہونا چاہیے، خدا کے علم میں ہر چیز کا ایک وقت مناسب ہے جس کے پہنچنے پر وہ ضرور ظاہر ہو کر رہے گی، آپ اپنا فرض (تبلیغ) ادا کیے جائیں، تکذیب کرنے والوں کا حساب ہم خود بے باق کر دیں گے۔

اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّا نَاۡتِى الۡاَرۡضَ نَـنۡقُصُهَا مِنۡ اَطۡرَافِهَا‌ ؕ وَاللّٰهُ يَحۡكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكۡمِهٖ‌ ؕ

کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم چلے آتے ہیں زمین کو گھٹاتے اس کے کناروں سے ۱؎ اور اللہ حکم کرتا ہے کوئی نہیں کہ پیچھے ڈالے اس کا حکم ۲؎

وَهُوَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۴۱﴾

اور وہ جلد لیتا ہے حساب ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** اور ان لوگوں پر بھی تعجب ہے کہ کفر کی وجہ سے عذاب واقع ہونے کا کیسے یک لخت انکار کر رہے ہیں حالانکہ:
کیا (مقدمات عذاب میں سے) اس امر کو نہیں دیکھ رہے کہ ہم (فتح اسلام کے ذریعہ سے ان کی) زمین کو ہر چہار طرف سے برابر کم کرتے چلے آتے ہیں (یعنی فتوحات اسلامیہ کی کثرت کی وجہ سے ان کی عملداری روز بروز گھٹتی جارہی ہے، سو یہ بھی تو ایک قسم کا عذاب ہے جو کہ اصلی عذاب کا مقدمہ ہے، جیسا کہ دوسری آیت میں ہے: وَلَنُذِيۡقَنَّهُمۡ مِّنَ الۡعَذَابِ الۡاَدۡنٰى دُوۡنَ الۡعَذَابِ الۡاَكۡبَرِ کہ بڑے عذاب سے پہلے ہم ان کو ادنی عذاب کا مزہ چکھائیں گے) اور اللہ (جو چاہتا ہے) حکم کرتا ہے اس کے حکم کو کوئی ہٹانے والا نہیں (پس خواہ چھوٹا عذاب ہو یا بڑا عذاب جو بھی ہو، اسے ان کے معبودوں وغیرہ میں سے کوئی رد نہیں کر سکتا) اور (اگر ان کو چندے مہلت بھی ہوگئی تو کیا ہے) وہ بڑی جلدی حساب لینے والا ہے (وقت کی دیر ہے، پھر فوراً ہی سزا شروع ہو جائے گی)۔

نَاۡتِى الۡاَرۡضَ نَـنۡقُصُهَا مِنۡ اَطۡرَافِهَا: اگر یہ سورت مکی ہو تو نَـنۡقُصُهَا مِنۡ اَطۡرَافِهَا کی تفسیر پر بظاہر یہ اشکال ہوگا کہ ہجرت سے پہلے تو فتوحات اسلامیہ نہ تھیں تو اس وقت ان کی عملداری کہاں کم تھی؟ اس کے دو جواب ہو سکتے ہیں: ① ایک یہ کہ یہ خاص آیت مدنی ہو ② دوسرے یہ کہ فتوحات سے مراد عام ہے، خواہ خوشی سے ہوں یا جبراً ہوں، پس لوگوں کا اسلام قبول کرنا یہ بھی اسلامی فتح ہے مگر ان کی خوشی سے، اور جہاد کے بعد جو اسلام کا غلبہ ہوا وہ فتح اسلامی جبراً تھی اور یقینی بات ہے کہ ہجرت سے پہلے بھی اسلام پھیل رہا تھا اور قبائل عرب سے گزر کر حبشہ تک پہنچ گیا تھا جس سے کفار کو اندیشہ رہتا تھا کہ اگر اسی طرح اسلام کو ترقی ہوتی رہی تو ایک دن ہم کو بھی مغلوب ہونا پڑے گا، پس اسلامی فتوحات ہجرت سے پہلے شروع ہوگئی تھیں، مگر ان کا ظہور ہجرت کے بعد ہوا، اور یہی جواب ہے اس آیت کا بھی جو سورہ انبیاء میں اسی قسم کی بیان ہوئی ہے اور وہ سورت مشہور قول پر مکی ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی سرزمین مکہ کے آس پاس اسلام کا اثر پھیلتا جاتا اور کفر کی عملداری گھٹتی جاتی ہے، بڑے بڑے قبائل اور اشخاص کے قلوب پر اسلام کا سکہ بیٹھ رہا ہے، اوس وخزرج کے دل حق وصداقت کے سامنے مفتوح ہو رہے ہیں، اس طرح ہم آہستہ آہستہ کفر کی حکومت کو دباتے چلے آرہے ہیں، کیا یہ روشن آثار ان مکذبین کو نہیں بتلاتے کہ خدا کا فیصلہ ان کے مستقبل کے متعلق کیا ہو چکا ہے، ایک عقل مند سمجھ سکتا ہے کہ اسلام آج جس رفتار سے بڑھ رہا ہے وہ کسی طاقت سے رکنے والا نہیں، لہٰذا انجام بینی اسی میں ہے کہ آنے والی چیز کو آئی ہوئی سمجھیں۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی اسکا تکوینی حکم اور فیصلہ اٹل ہے، جب وقت آجائے تو کس کی طاقت ہے کہ ایک منٹ کیلئے ملتوی کر کے پیچھے ڈال دے۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی جہاں حساب کا وقت آن پہنچا پھر دیر نہ لگے گی، یا جو چیز یقیناً آنے والی ہے اسے جلد ہی سمجھو۔

وَقَدۡ مَكَرَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَلِلّٰهِ الۡمَكۡرُ جَمِيۡعًا‌ ؕ يَعۡلَمُ مَا تَكۡسِبُ كُلُّ نَفۡسٍ‌ ؕ

اور فریب کر چکے ہیں جو ان سے پہلے تھے سو اللہ کے ہاتھ میں ہے سب فریب ۱؎ جانتا ہے جو کچھ کماتا ہے ہر ایک جی ۲؎

وَسَيَعۡلَمُ الۡكُفّٰرُ لِمَنۡ عُقۡبَى الدَّارِ ﴿۴۲﴾

اور اب معلوم کیے لیتے ہیں کافر کہ کس کا ہوتا ہے پچھلا گھر ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (یہ لوگ جو رسول کی ایذا یا اسلام کی تنقیص میں طرح طرح کی تدبیریں کرتے ہیں تو ان سے کچھ نہیں ہوتا، چنانچہ) ان سے پہلے جو (کافر) لوگ ہو چکے ہیں انہوں نے (بھی ان ہی اغراض کے لئے بڑی بڑی) تدبیریں کیں، سو (کچھ بھی نہ ہوا، کیونکہ) اصل تدبیر تو خدا ہی کی ہے (اس کے سامنے کسی کی نہیں چلتی، سو اللہ نے ان کو وہ تدبیریں نہ چلنے دیں، اور) اس کو سب خبر رہتی ہے جو شخص جو کچھ بھی کرتا ہے (پھر اس کو وقت پر سزا دیتا ہے) اور (اسی طرح) ان کفار (کے اعمال کی بھی سب اس کو خبر ہے، سو ان) کو (بھی) ابھی معلوم ہوا جاتا ہے کہ اس عالم میں نیک انجامی کس کے حصہ میں ہے (آیا ان کے یا مسلمانوں کے، یعنی عنقریب ان کو اپنی بدانجامی اور اعمال کی سزا معلوم ہو جائے گی)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ وہ نہ چاہے تو سب فریب رکھے رہ جائیں، یا یہ کہ خدا ان کے فریب کا توڑ کرتا ہے مکر اصل میں خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں اگر برائی کے لیے کی جائے بری ہے اور برائی کو دور کرنے کے لیے ہو تو اچھی ہے، یعنی انہوں نے چھپ چھپ کر ناپاک تدبیریں کیں لیکن خدا کی تدبیر سب پر غالب رہی، اس نے وہ تدبیریں ان ہی پر الٹ دیں وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ (فاطر: ۴۳)

**فائدہ:** ۲ یعنی جس سے کوئی حرکت وسکون اور کھلا چھپا کام پوشیدہ نہیں اس کے آگے کسی کا مکر کیا چل سکتا ہے وہ ان مکاروں کو خوب مزا چکھائے گا۔

**فائدہ:** ۳ یعنی جسے اگلوں نے اپنے مکر کا انجام دیکھ لیا، موجودہ کفار کو بھی قدر عافیت معلوم ہوا چاہتی ہے۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا ۚ قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ

کہتے ہیں کافر تو بھیجا ہوا نہیں آیا کہہ دے اللہ کافی ہے گواہ میرے اور تمہارے بیچ میں ۱

وَمَنْ عِندَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ ﴿٤٣﴾ ع ۱۲

اور جس کو خبر ہے کتاب کی ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور یہ کافر لوگ (ان سزاؤں کو بھولے ہوئے) یوں کہہ رہے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپ پیغمبر نہیں، آپ فرما دیجئے کہ (تمہارے بے معنی انکار سے کیا ہوتا ہے) میرے اور تمہارے درمیان (میری نبوت پر) اللہ تعالیٰ اور وہ شخص جس کے پاس کتاب (آسمانی) کا علم ہے (جس میں میری نبوت کی تصدیق ہے) کافی گواہ ہیں (اس سے مراد علماء اہل کتاب ہیں جو کہ منصف تھے اور نبوت کی پیشین گوئی دیکھ کر ایمان لے آئے تھے)۔

خلاصہ یہ ہوا کہ میری نبوت کی دو دلیلیں ہیں: ① عقلی ② نقلی، عقلی دلیل تو یہ کہ حق تعالیٰ نے مجھ کو معجزات عطا فرمائے جو نبوت کی دلیل ہیں اور اللہ تعالیٰ کے گواہ ہونے کا یہی مطلب ہے، اور نقلی دلیل یہ ہے کہ سابقہ آسمانی کتابوں میں پہلے سے اس کی خبر موجود ہے، اگر یقین نہ آئے تو منصف علماء سے پوچھ لو وہ ظاہر کر دیں گے، پس دلائل نقلی وعقلی کے ہوتے ہوئے نبوت کا انکار کرنا بجز بدبختی کے اور کیا ہے! کسی عاقل کو اس میں شبہ نہیں ہونا چاہئے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی تمہارے جھٹلانے سے کچھ نہیں ہوتا جبکہ خداوند قدوس میری صداقت کے بڑے بڑے نشان دکھلا رہا ہے قرآن جو اس کا کلام ہے جیسے اپنے کلام الہٰی ہونے کی شہادت دیتا ہے، اسی طرح میرے پیغمبر برحق ہونے کا گواہ ہے، اگر آنکھیں کھول کر دیکھو تو سخت ناموافق حالات میں سچ کا اس شان سے پھیلتے جانا اور دشمنوں تک کے دلوں میں گھر کرنا اور جھوٹ کا مغلوب ومقہور ہو کر سمٹتے رہنا خدا کی طرف سے کھلی ہوئی گواہی میری حقانیت کی ہے۔

**فائدہ:** ؏ یعنی جن کو قرآن کا علم اور اس کے حقائق کی خبر ہوگئی ہے وہ بھی دل سے گواہ ہیں کہ میں نے کچھ جھوٹ نہیں بنایا، نیز جنھیں پہلی کتب سماویہ اور ان کی پیشین گوئیوں کی اطلاع ہے ان کے دل گواہی دیتے ہیں کہ محمد ﷺ ٹھیک ان پیشین گوئیوں کے مطابق تشریف لائے ہیں جو سینکڑوں برس پیشتر موسیٰ اور مسیح کر چکے تھے۔عَلَيْهِمَا وَعَلٰى نَبِيِّنَا الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ۔اے خدا! تو گواہ رہ کہ جس چیز کی گواہی تو نے اور تیری کتاب والوں نے دی، یہ عاجز خاطی بھی صدق دل سے اس کی گواہی دیتا ہے۔

| ایاتها ۵۲ | ۱۴ سُوْرَةُ اِبْرٰهِيْمَ مَكِّيَّةٌ ۷۲ | رکوعاتها ۷ |
| --- | --- | --- |

**خلاصہ تفسیر:** گذشتہ سورت کی طرح اس سورۃ کے شروع میں بھی رسالت ونبوت اور ان کی کچھ خصوصیات کا بیان ہے، پھر کفار کی سزا کا بیان، اس کے بعد مؤمنین کی جزا کا بیان، یہ دونوں مضمون معاد یعنی آخرت کے متعلق ہو گئے، پھر توحید کا مضمون اور اس کے شواہد کا ذکر ہے، اسی سلسلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ ذکر کیا گیا ہے، اور اسی مناسبت سے سورۃ کا نام سورۃ ابراہیم رکھا گیا ہے، پھر آخر میں دوبارہ آخرت کا مضمون ہے، اور آخری آیت ان سب مضامین کی جامع ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ

الر، یہ ایک کتاب ہے کہ ہم نے اتاری تیری طرف کہ تو نکالے لوگوں کو اندھیروں سے اجالے کی طرف، ان کے رب کے حکم سے ؏

اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝۱ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ

راستہ (راہ) پر (کی طرف) اس زبردست خوبیوں والے اللہ کے جس کا ہے جو کچھ کہ موجود ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں ؏

وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِ ۝۲ الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ

اور مصیبت ہے کافروں کو ایک سخت عذاب سے ؏ جو کہ پسند رکھتے ہیں زندگی دنیا کی آخرت سے

وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ۝۳

اور روکتے ہیں اللہ کی راہ سے اور تلاش کرتے (نکالنا چاہتے) ہیں اس میں کجی، وہ راستہ بھول کر جا پڑے ہیں دور ؏

**خلاصہ تفسیر:** الٓرٰ (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (قرآن) ایک کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر نازل فرمایا ہے تاکہ آپ (اس کے ذریعہ سے) تمام لوگوں کو ان کے پروردگار کے حکم سے (مرتبہ تبلیغ میں کفر کی) تاریکیوں سے نکال کر (ایمان وہدایت کی) روشنی کی طرف یعنی ذات غالب ستودہ صفات (زبردست اور ہر تعریف کی مستحق ذات) کی راہ کی طرف (کہ روشنی سے یہی مراد ہے) لائیں (روشنی میں لانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ راہ بتلادیں)۔

جو ایسا خدا ہے کہ اس کی ملک ہے جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ کہ زمین میں ہے، اور (جب یہ کتاب خدا کا راستہ بتلاتی ہے تو) بڑی خرابی یعنی بڑا سخت عذاب ہے ان کافروں کو جو (اس راہ کو نہ تو خود قبول کرتے ہیں، بلکہ) دنیوی زندگانی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں (اس لئے دین کی

جستجو نہیں کرتے ) اور ( نہ دوسروں کو یہ راہ اختیار کرنے دیتے ہیں، بلکہ ) اللہ کی ( اس ) راہ ( مذکور ) سے روکتے ہیں اور اس میں کجی ( یعنی شبہات ) کے متلاشی رہتے ہیں ( جن کے ذریعہ سے دوسروں کو گمراہ کرسکیں ) ایسے لوگ بڑی دور کی گمراہی میں ہیں ( یعنی وہ گمراہی حق سے بڑی دور ہے )۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ: یعنی اس کتاب کی عظمت شان کا اندازہ اس بات سے کرنا چاہیے کہ ہم اس کے اتارنے والے اور آپ جیسی رفیع الشان شخصیت اس کی اٹھانے والی ہے اور مقصد بھی اس قدر اعلیٰ وارفع ہے جس سے بلند تر کوئی مقصد نہیں ہوسکتا وہ یہ کہ خدا کے حکم و توفیق سے تمام دنیا کے لوگوں کو خواہ عرب ہوں یا عجم، کالے ہوں، یا گورے، مزدور ہوں یا سرمایہ دار، بادشاہ ہوں یا رعایا، سب کو جہالت واوہام کی گھٹاٹوپ اندھیریوں سے نکال کر معرفت و بصیرت اور ایمان وایقان کی روشنی میں کھڑا کرنے کی کوشش کی جائے۔

**فائدہ:** ۲؎ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ: یعنی صحیح معرفت کی روشنی میں اس راستہ پر چل پڑیں جو زبردست وغالب، ستودہ صفات، شہنشاہِ مطلق اور مالک الکل خدا کا بتایا ہوا اور اس کے مقام رضا تک پہنچانے والا ہے۔

**فائدہ:** ۳؎ وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِ: یعنی جو لوگ ایسی کتاب نازل ہونے کے بعد کفروشرک اور جہالت وضلالت کی اندھیری سے نہ نکلے ان کو سخت عذاب اور ہلاکت خیز مصیبت کا سامنا ہے، آخرت میں یا دنیا میں بھی۔

**فائدہ:** ۴؎ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ: یہ کافروں کا حال بیان فرمایا کہ ان کا اوڑھنا بچھونا یہ ہی دنیا ہے آخرت کے مقابلہ میں اسی کو پسند کرتے ہیں اور ترجیح دیتے ہیں، شب وروز اسی کی محبت میں غرق رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی چاہتے ہیں کہ دنیا کی محبت میں پھنسا کر خدا کی خوشنودی کے راستہ سے روک دیں، اسی لیے یہ فکر رہتی ہے کہ خدا کے دین میں کوئی عیب نکالیں اور سیدھے راستہ کو ٹیڑھا ثابت کریں، فی الحقیقت یہ لوگ راستہ سے بھٹک کر بہت ہی دور جا پڑے ہیں جن کے واپس آنے کی توقع نہیں، خدا کی سخت مار پڑے گی تب آنکھیں کھلیں گی۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۭ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ

اور کوئی رسول نہیں بھیجا ہم نے مگر بولی بولنے والا اپنی قوم کی تاکہ ان کو سمجھائے ۱؎ پھر راستہ بھلاتا ( بھٹکاتا ) ہے اللہ جس کو چاہے

وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ④

اور راستہ دکھلاتا ( دیتا ) ہے جس کو چاہے، اور وہ ہے زبردست حکمتوں والا ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور ( اس کتاب کے اللہ کی طرف سے نازل ہونے پر جو بعض کفار کو یہ شبہ ہے کہ یہ قرآن عربی کیوں ہے؟ جس سے احتمال ہوتا ہے کہ شاید پیغمبر ﷺ نے خود تصنیف کرلیا ہوگا، کیونکہ وہ بھی عربی ہیں، عجمی زبان میں کیوں نہیں ہوا؟ تاکہ یہ احتمال ہی نہ ہوتا، نیز قرآن عجمی ہونے میں دوسری آسمانی کتابوں کے ساتھ موافق بھی ہوجاتا تو یہ شبہ محض لغو ہے، کیونکہ ) ہم نے تمام ( پہلے ) پیغمبروں کو ( بھی ) انہی کی قوم کی زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا ہے تاکہ ( ان کی زبان میں ) ان سے ( احکام الٰہیہ کو ) بیان کریں ( کہ اصل مقصود تو احکام کا بیان کرنا ہے، سب کتابوں کا ایک زبان میں ہونا کوئی مقصد نہیں ) پھر ( بیان کرنے کے بعد ) جس کو اللہ تعالیٰ چاہے گمراہ کرتے ہیں ( کہ وہ ان احکام کو قبول نہیں کرتا ) اور جس کو چاہے ہدایت کرتے ہیں ( کہ وہ ان احکام کو قبول کرلیتا ہے ) اور وہی ( سب امور پر ) غالب ہے ( اور ) حکمت والا ہے ( پس غالب ہونے کی وجہ سے وہ سب کو ہدایت کرسکتا تھا، مگر بہت سی حکمتیں اس کو مقتضی نہ ہوئیں )۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ: غرض جب سب پیغمبر اپنی اپنی قوم میں ان ہی کی زبان میں احکام لے کر آئے تو آپ ﷺ کے لیے بھی یہی قاعدہ رکھا گیا کہ آپ کی قوم چونکہ عرب ہیں، اگرچہ امت تمام عالم ہے اس لیے عربی زبان میں یہ کتاب نازل کی گئی، پس وہ شبہ

تو محض لغو ہے، یہ تو حکمت ہوئی قرآن کے عربی زبان ہونے کی اور عجمی نہ ہونے کی، اور سورہ حم السجدہ میں ایک اور وجہ بھی مذکور ہے: **ولو جعلنه قرانا اعجمیا لقالوا لولا فصلت ایتہ ء اعجمی وعربی**، یعنی اگر ہم قرآن کو عجمی زبان میں نازل کرتے تو تب بھی یہ اعتراض کرتے کہ اس کی وضاحت وشرح کیوں نہ کی گئی، قرآن تو عجمی زبان میں ہے جبکہ ہم عرب ہیں۔

رہا یہ احتمال کہ جب قرآن بھی عربی ہے اور رسول بھی عربی ہیں تو شاید آپ نے خود تصنیف کرلیا ہو تو یہ احتمال قرآن کے اعجاز نے ختم کر دیا، حق تعالی فرماتے ہیں: **فاتوا بسورۃ من مثله** کہ اگر رسول پر یہ شبہ ہے کہ اس نے خود تصنیف کرلیا ہے تو تم بھی تو عربی زبان دان ہو، اور عربی میں زیادہ مشاق بھی ہو، اگر عربی زبان والا قرآن کو تصنیف کر سکتا ہے تو تم اس جیسی کوئی ایک ہی سورت بنالاؤ، اور اگر باوجود بڑی غیرت دلانے کے بھی کسی سے قرآن کی مثل ذرا سی سورت بھی نہ بن سکی تو اعجاز قرآنی سے یہ احتمال بالکل جاتا رہا۔

**اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمۡ**: بعض لوگوں کو **بلسان قومه** کے لفظ سے خصوص بعثت کا شبہ ہو گیا اور یہ وہم ہو گیا کہ آپ ﷺ کی نبوت صرف عرب کے لیے تھی، جیسا کہ بعض یہود کہتے تھے کہ آپ ﷺ فقط قوم عرب کے لیے مبعوث ہوئے ہیں، یہ بیان اور خیال قطعاً غلط ہے، اس لئے کہ بے شمار آیات قرآنیہ اور احادیث متواترہ سے یہ امر ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ عرب اور عجم اور تمام عالم کی طرف مبعوث ہوئے، اس کے جواب کی طرف اجمالاً خلاصہ تفسیر میں اشارہ کر دیا گیا ہے، اس آیت میں ''قوم'' سے شہر اور قبیلہ اور خاندان کے لوگ مراد ہیں نہ کہ ''امت'' مراد ہے، اور ''قوم'' اور ''امت'' میں زمین وآسمان کا فرق ہے، قوم خاص ہے اور امت عام ہے، ''قوم'' تو اس قبیلہ اور خاندان کو کہتے ہیں جس میں آپ ﷺ پیدا ہوئے اور عرب اور عجم اور کل عالم آپ ﷺ کی امت ہے، جن کی ہدایت کے لیے آپ ﷺ مبعوث ہوئے، پہلے زمانہ میں ہر نبی صرف اپنی قوم کے لیے مبعوث ہوتا تھا، اس لئے انبیاء سابقین علیہم السلام میں قوم اور امت کا مصداق ایک ہی تھا، اور آنحضرت ﷺ کی بعثت چونکہ عام ہے اس لیے آپ ﷺ کی قوم کا مصداق تو خاص ہے اور امت کا مصداق عام ہے، اور آیت میں جو حصر ہے وہ فقط باعتبار لسان اور زبان کے ہے، یعنی ارسال بزبان قوم مخصوص ہے، اور مطلب یہ ہے کہ نبی کی زبان وہی ہوتی ہے جس قوم میں نبی پیدا ہوا، اور یہ مطلب نہیں کہ نبی کی امت صرف وہی قوم ہے اور جو اس کی ہم زبان ہے، پس حضور ﷺ تمام عالم کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے، مگر سارا عالم آپ کی قوم تو نہیں ہو سکتا، قوم وہی کہلائے گی جن میں آپ پیدا ہوئے، جن کے ساتھ نسب وغیرہ کی شرکت ہو، ہاں! امت آپ کی تمام عالم ہے، پس امت اور قوم ایک چیز نہیں، قوم خاص ہے امت عام ہے، اور یہود کے دعوے کا ایک مستقل عقلی جواب بھی ہے، وہ یہ کہ جب تم آپ ﷺ کو نبی عرب مانتے ہو اور نبی کے لیے سچا ہونا لازم ہے، اور آپ ﷺ عموم بعثت کے مدعی ہیں، پس اس میں دعوے میں بھی سچے ہوں گے، پس یہ شبہ دور ہو گیا۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح پچھلی امتوں کے رسول ان کے ہم زبان بھیجے گئے ان کو ترجمہ کرنے کی محنت کی ضرورت نہ رہی، نیز جب آپ ﷺ کی امت تمام اقوام عرب وعجم ہیں تو رسول کریم ﷺ صرف عرب میں عربی زبان کے ساتھ کیوں مبعوث ہوئے؟ اور آپ کی کتاب قرآن بھی عربی زبان ہی میں کیوں نازل ہوئی؟ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ قرآن سب زبانوں میں نازل ہوتا؟ لیکن غور وفکر سے کام لیا جائے تو جواب صاف ہے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جب رسول کریم ﷺ کی بعثت اور دعوت تمام اقوام دنیا کے لئے عام ہوئی جن میں سینکڑوں زبانیں رائج ہیں تو ان سب کی ہدایت کے لئے دو ہی صورتیں ممکن تھیں، ایک یہ کہ قرآن ہر قوم کی زبان میں جدا جدا نازل ہوتا، اور رسول کریم ﷺ کی تعلیمات وہدایات بھی ہر قوم کی زبان میں جدا جدا ہوتیں، اللہ کی قدرت کاملہ کے سامنے اس کا انتظام کوئی دشوار نہ تھا، لیکن تمام اقوام عالم کے لئے ایک رسول ایک کتاب ایک شریعت بھیجنے کا جو ایک عظیم مقصد ان تمام اقوام عالم میں ہزاروں طرح کے اختلافات کے باوجود دینی، اخلاقی، معاشرتی وحدت اور یک جہتی پیدا کرنا ہے وہ اس صورت سے حاصل نہ ہوتا، اس کے علاوہ جب ہر قوم ہر ملک کا قرآن وحدیث الگ زبان میں ہوتے تو اس میں تحریف قرآن کے بے شمار راستے کھل جاتے، اس صورت میں نزاع اور اختلاف کا دروازہ کھل جاتا اور ہر قوم اپنی زبان کے اعتبار سے ایسے معنی کی مدعی ہوتی جسے دوسری قوم نہ سمجھ سکتی، اور قرآن کریم کے کلام کا محفوظ ہونا جو اس کی ایسی خصوصیت ہے کہ اغیار اور منکرین قرآن بھی اس کے تسلیم کرنے سے گریز نہیں کر سکتے یہ معجزانہ خصوصیت قائم نہ

رہتی اور ایک ہی دین ایک ہی کتاب کے ہوتے ہوئے اس کے ماننے والوں کی اتنی مختلف راہیں ہوجاتیں کہ کوئی نقطہ وحدت ہی باقی نہ رہتا، کوئی ایسی ایک اصل نہ ہوتی جس کی طرف اختلافات میں رجوع کیا جاتا، رہا سمجھنا اور سمجھانا تو وہ تراجم اور تفاسیر سے بھی ہوسکتا ہے اور اس میں اختلاف کے وقت اصل زبان کی تحقیق اختلاف دور ہوسکتا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ کی رسالت و بعثت کا پوری اقوام دنیا کے لئے عام ہونے کی صورت میں ان سب کی تعلیم وہدایت کی یہ صورت کہ قرآن ہر قوم کی زبان میں الگ الگ ہوتا اس کوتو کوئی ادنیٰ سمجھ کا آدمی درست نہیں سمجھ سکتا، اس لئے ضروری ہے کہ قرآن کسی ایک ہی زبان میں آئے اور رسول کی زبان بھی وہی قرآن کی زبان ہو، پھر دوسری ملکی اور علاقائی زبانوں میں اس کے ترجمے پہنچائے اور پھیلائے جائیں، رسول کریم ﷺ کے نائب علماء ہر قوم ہر ملک میں آپ کی دی ہوئی ہدایات کو اپنی قوم وملک کی زبان میں سمجھائیں اور شائع کریں۔

سوال یہ ہوتا ہے کہ پھر حق تعالی نے دنیا کی تمام زبانوں میں سے صرف عربی زبان ہی کا انتخاب کیوں کیا؟ تو اس کی بہت سی وجوہات ہیں: ایک یہ کہ عربی زبان آسمان کی دفتری زبان ہے، فرشتوں کی زبان عربی ہے، لوح محفوظ کی زبان عربی ہے، جیسا کہ آیت قرآن: **بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ** سے معلوم ہوتا ہے اور جنت جو انسان کا وطن اصلی ہے اور جہاں اس کو لوٹ کر جانا ہے اس کی زبان بھی عربی ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ منقول ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "احبو العرب لثلاث: لانی عربی، والقران عربی، و کلام اھل الجنة عربی"، معنی حدیث کے یہ ہیں کہ تم لوگ تین وجہ سے عرب سے محبت کرو، ایک یہ کہ میں عربی ہوں، دوسرے یہ کہ قرآن عربی ہے، تیسرے یہ کہ اہل جنت کی زبان عربی ہے، عربی زبان کے انتخاب کی ایک وجہ خود اس زبان کی ذاتی صلاحیتیں بھی ہیں کہ ایک مفہوم کی ادائیگی کے لئے اس میں بیشمار صورتیں اور طریقے موجود ہیں، ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسلمان کو اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر عربی زبان سے ایک مناسبت عطا فرمائی ہے، جس کی وجہ سے ہر شخص بآسانی عربی زبان بقدر ضرورت سیکھ لیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ جس ملک میں پہنچے تھوڑے ہی عرصہ میں بغیر کسی جبر واکراہ کے پورے ملک کی زبان عربی ہوگئی، مصر، شام، عراق سب میں کسی کی زبان بھی عربی نہ تھی جو آج عربی ممالک کہلاتے ہیں۔

**وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ**: یعنی ایسے کلام سے بیان کرتے ہیں جو ان کی استعداد وعقل کے مناسب ہو، ورنہ ان کی سمجھ میں نہ آتا، اسی بنا پر عوام الناس کے سامنے صوفیا کی اصطلاح میں کلام کرنا مناسب نہیں، بہت سے لوگوں کی گمراہی کا سبب یہی ہوا کہ انہوں نے صوفیا کی کتابیں دیکھیں اور ان کی اصطلاحوں کو نہ جانا، سو ایسے لوگوں کو ایسی کتابیں دیکھنا مناسب نہیں۔

* * *

**فائدہ**: ۱؎ یعنی جس طرح آپ کو ہم نے لوگوں کی ہدایت کے لیے یہ عظیم الشان کتاب عطا فرمائی، پہلے بھی ہر زمانہ میں سامان ہدایت بہم پہنچاتے رہے ہیں، چونکہ طبعی ترتیب کے موافق ہر پیغمبر کے اولین مخاطب اسی قوم کے لوگ ہوتے ہیں جن سے وہ پیغمبر اٹھایا جاتا ہے، اس لیے اسی کی قومی زبان میں وحی بھیجی جاتی رہی کہ احکام الٰہیہ کے سمجھنے سمجھانے میں پوری سہولت رہے، نبی کریم ﷺ کی امت دعوت میں گو تمام جن وانس شامل ہیں، تاہم جس قوم میں سے آپ اٹھائے گئے اس کی زبان عربی تھی اور ترتیب طبعی کے موافق شیوع ہدایت کی یہ ہی صورت مقدر تھی کہ آپ ﷺ کے اولین مخاطب اور مقدم ترین شاگرد ایسی سہولت اور خوبی سے قرآنی تعلیمات وحقائق کو سمجھ لیں اور محفوظ کرلیں کہ ان کے ذریعہ سے تمام اقوام عالم اور آنے والی نسلیں درجہ بدرجہ قرآنی رنگ میں رنگی جاسکیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا، عربوں نے اپنے نبی کی صحبت میں رہ کر اپنی قومی زبان میں جس سے انھیں بے حد شغف تھا، قرآنی علوم پر کافی دسترس پائی، پھر وہ مشرق ومغرب میں پھیل پڑے اور روم وفارس پر چھا گئے، اس وقت قدرت نے عجمی قوموں میں ایسا زبردست جوش اور داعیہ کلام الٰہی کی معرفت اور زبان عربی میں مہارت حاصل کرنے کا پیدا فرمادیا کہ تھوڑی مدت کے بعد وہ قرآنی علوم کی شرح وتبیین میں اپنے معاصر عربوں سے گوئے سبقت لے گئے، بلکہ عموماً علوم دینیہ وادبیہ کا مدار ثریا تک پرواز کرنے والے عجمیوں پر رہ گیا، اس طرح خدا کی حجت بندوں پر تمام ہوتی رہتی اور وقتاً فوقتاً قرآنی ہدایت سے مستفید ہونے کے اسباب فراہم ہوتے رہے، فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ۔ بہرحال خاتم الانبیاء ﷺ کے خاص قوم عرب میں سے اٹھائے جانے کی اگر کچھ وجوہ موجود ہیں (اور یقیناً ہیں) تو ان ہی وجوہ کے نتیجہ میں اس سوال کا جواب بھی آجاتا ہے کہ قرآن

عربی زبان میں اتار کر خداوند عالم نے عربوں کی رعایت کیوں کی؟

**فائدہ:** ۲؎ یعنی تبیین وہدایت کے سامان مکمل کر دیے پھر جس نے ان سامانوں سے منتفع ہونا چاہا اس کی دستگیری فرما کر راہ پر لگا دیا جس نے روگردانی کی اسے گمراہی میں چھوڑے رکھا، وہ زبردست اور غالب ہے چاہے تو سب کو زبردستی راہ ہدایت پر لگا دے لیکن اس کی حکمت مقتضی ہوئی کہ انسان کو کسب واختیار کی ایک حد تک آزادی دے کر رحمت وغضب دونوں کے مظاہر کو دنیا میں باقی رہنے دے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَذَكِّرْهُمْ

اور بھیجا تھا ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر کہ نکال اپنی قوم کو اندھیروں سے اجالے کی طرف، اور یاد دلا ان کو

بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝۵

دن اللہ کے، البتہ اس میں نشانیاں ہیں اس کو جو صبر کرنے والا ہے شکر گزار (حق ماننے والا)

**خلاصہ تفسیر:** اوپر حضور ﷺ کی رسالت کا ذکر تھا، آگے اس کی تائید کے لیے دوسرے انبیاء کا ذکر ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ رسالت کوئی انوکھی چیز نہیں کہ اس کا انکار کیا جائے، پہلے بھی رسول آئے ہیں، مضمون رسالت کے ساتھ ہر مقام پر انکار کا وبال بھی مذکور ہے۔

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی نشانیاں دے کر بھیجا کہ اپنی قوم کو (کفر ومعاصی کی) تاریکیوں سے (نکال کر ایمان واطاعت کی) روشنی کی طرف لاؤ اور ان کو اللہ تعالیٰ کے معاملات (نعمت اور عذاب کے) یاد دلاؤ، بلاشبہ ان معاملات میں عبرتیں ہیں ہر صابر شاکر کے لئے (کیونکہ نعمت کو یاد کر کے شکر کرے گا اور مصیبت کو اور اس کے زوال کو یاد کر کے آئندہ حوادث میں صبر کرے گا)۔

اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ: اگرچہ ظلمت یعنی گناہوں سے روشنی یعنی نیکیوں کی طرف لانے والی ذات اللہ تعالی کی ہے، لیکن اس عمل کو حضرت موسی علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ طالب ومرید کی اصلاح، تربیت اور تکمیل میں استاذ اور شیخ کا بھی دخل ہوتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** ''نشانیاں دے کر'' یعنی معجزات دے کر جو ''آیات تسعہ'' کے نام سے مشہور ہیں یا آیات تورات مراد ہوں، اور ''یاد دلا ان کو دن اللہ کے''، یعنی ان دنوں کے واقعات یاد دلاؤ جب ان پر شدائد ومصائب کے پہاڑ ٹوٹے پھر اللہ تعالی نے ان سے نجات دی اور اپنی مہربانی مبذول فرمائی کیونکہ دونوں قسم کے حالات سننے سے صابر وشاکر بندوں کو عبرت حاصل ہوتی ہے کہ مصیبت کے وقت گھبرانا اور راحت کے وقت اترانا نہیں چاہیے جو لوگ پہلے کامیاب ہوئے ہیں وہ سختیوں پر صبر اور نعمائے الٰہیہ پر شکر کرنے سے ہوئے ہیں: وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ۭ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ (الاعراف ۱۳۷)

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو یاد کرو اللہ کا احسان اپنے اوپر جب چھڑا دیا تم کو فرعون کی قوم سے وہ پہنچاتے تھے تم کو

سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝۶ ع

برا عذاب ۱؎ اور ذبح کرتے تمہارے بیٹوں کو اور زندہ رکھتے تمہاری عورتوں کو، اور اس میں مدد ہوئی تمہارے رب کی طرف سے بڑی ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور اس وقت کو یاد کیجئے کہ جب (ہمارے اس ارشاد بالا کے موافق) موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا

کہ تم اللہ تعالیٰ کا انعام اپنے اوپر یاد کرو جب کہ تم کو فرعون والوں سے نجات دی جو تم کو سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے اور تمہارے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو (یعنی لڑکیوں کو جو کہ بڑی کر عورتیں ہو جاتی تھیں) زندہ چھوڑ دیتے تھے (تاکہ ان سے خدمت اور کام لیں، سو یہ بھی ذبح ہی کی طرح ایک مصیبت اور سزا تھی) اور اس (مصیبت اور نجات دونوں) میں تمہارے رب کی طرف سے ایک بڑا امتحان ہے (یعنی مصیبت میں بلاء تھی اور نجات میں نعمت تھی اور بلاء اور نعمت دونوں بندے کے لئے امتحان ہیں، پس اس میں موسیٰ علیہ السلام نے ایام اللہ یعنی خدائی معاملات کی یعنی نعمت اور مصیبت دونوں کی یاد دہانی فرمادی)۔

**وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ**: اگر ذٰلك کا مشارالیہ سوء العذاب ہو اور بلاء کی تفسیر انعام سے کی جائے تو اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مؤمن کو جب تکالیف و مصائب آگھیرتے ہیں تو یہ دراصل اس کی تربیت کے لیے ہوا کرتے ہیں جس میں اگر یہ صبر کرے تو کندن بن کر نکلتا ہے جو بہرحال نفع سے خالی نہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ مثلاً تم کو غلام بنا رکھا تھا اور سخت بیگاریں لیتے تھے۔

**فائدہ:** ۲ کہ تم کو غلامی کی ذلت سے نکالا اور دولت آزادی سے مالا مال کیا، ''بلاء'' کے اصل معنی آزمائش کے ہیں، تکلیف و راحت دونوں حالتوں میں بندے کے صبر و شکر کی آزمائش ہے **وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً** (الانبیاء:۳۵) **وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ** (الاعراف:۱۶۸) چونکہ فرعونیوں سے نجات دینا بڑی نعمت تھی تو یہاں آزمائش انعام سے ہوئی جیسے مترجم محقق نے بطور حاصل معنی لفظ ''مدد'' سے تعبیر کیا، اس قسم کی آیت سورہ بقرہ اور اعراف میں گزر چکی ہے وہاں کے فوائد ملاحظہ کر لیے جائیں۔

## وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ⑦

اور جب سنا دیا تمہارے رب نے اگر احسان مانو گے تو اور بھی دوں گا تم کو ۱ اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب البتہ سخت ہے ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور موسیٰ (علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا کہ اے میری قوم!) وہ وقت یاد کرو جب کہ تمہارے رب نے (میرے ذریعہ سے) تم کو اطلاع فرمادی کہ اگر (میری نعمتوں کو سن کر) تم شکر کرو گے تو تم کو (خواہ دنیا میں بھی یا آخرت میں تو ضرور) زیادہ نعمت دوں گا، اور اگر تم (ان نعمتوں کو سن کر) ناشکری کرو گے تو (یہ سمجھ رکھو کہ) میرا عذاب بڑا سخت ہے (ناشکری میں سخت عذاب کا احتمال ہے)۔

شکر میں ایمان اور ناشکری میں کفر بھی داخل ہے۔

**لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ**: بعض لوگ اپنے کمالات کو اپنے مجاہدات کی طرف منسوب کیا کرتے ہیں اور اپنے حال کے اعتبار عطاء حق نہیں سمجھتے، چونکہ یہ شکر کے خلاف ہے لہٰذا مذموم ہے اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ کا سبب بھی بن جاتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ موسیٰ علیہ السلام کا مقولہ ہے یعنی وہ وقت بھی یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے اعلان فرمادیا کہ اگر احسان مان کر زبان و دل سے میری نعمتوں کا شکر ادا کرو گے تو اور زیادہ نعمتیں ملیں گی، جسمانی و روحانی اور دنیاوی و اخروی ہر قسم کی۔

**فائدہ:** ۲ موجودہ نعمتیں سلب کر لی جائیں گی اور ناشکری کی مزید سزا الگ رہی، حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ کی خدمت میں ایک سائل آیا آپ ﷺ نے اسے ایک کھجور عنایت فرمائی، اس نے نہ لی یا پھینک دی، پھر دوسرا سائل آیا اسکو بھی ایک کھجور دی وہ بولا سُبْحَانَ اللهِ تَمْرَةٌ مِنْ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ یعنی رسول اللہ کا تبرک ہے، آپ ﷺ نے جاریہ کو حکم دیا کہ ام سلمہ کے پاس جو چالیس درہم رکھے ہیں وہ اس شکر گزار سائل کو دلوا دے۔

وَقَالَ مُوْسٰۤى اِنْ تَكْفُرُوْۤا اَنْتُمْ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِىٌّ حَمِيْدٌ ⑧

اور کہا موسیٰ نے اگر کفر کرو گے (منکر ہو گے) تم اور جو لوگ زمین میں ہیں سارے، تو اللہ بے پروا ہے سب خوبیوں والا

**خلاصہ تفسیر**: اور موسیٰ (علیہ السلام) نے (یہ بھی) فرمایا کہ اگر تم اور تمام دنیا بھر کے آدمی سب کے سب مل کر بھی ناشکری کرنے لگو تو اللہ تعالیٰ (کا کوئی نقصان نہیں، کیونکہ وہ) بالکل بے احتیاج (اور اپنی ذات میں) ستودہ صفات ہیں (یعنی بذات خود قابل تعریف ہے، اپنی ذات وصفات میں کامل ہے، اس کو کسی کے شکر وغیرہ کی احتیاج نہیں، پس اللہ تعالیٰ کا تمہاری ناشکری سے کوئی نقصان نہیں ہوسکتا، اور تم اپنا نقصان سن چکے ہو: اِنَّ عَذَابِىْ لَشَدِيْدٌ کہ عذاب الٰہی بہت سخت ہے اس لئے شکر کرنا، ناشکری مت کرنا)۔

* * *

**فائدہ**: یعنی کفران نعمت کا ضرر تم ہی کو پہنچے گا، خدا کا کچھ نہیں بگڑتا اسے تمہارے شکریوں کی کیا حاجت ہے، کوئی شکر ادا کرے یا نہ کرے، بہرحال اس کے حمید ومحمود ہونے میں کچھ کمی نہیں آتی، صحیح مسلم میں حدیث قدسی ہے جس میں حق تعالیٰ نے فرمایا: ''اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے، جن وانس سب کے سب ایک اعلیٰ درجہ کے متقی شخص کے نمونہ پر ہوجائیں تو اس سے میرے ملک میں کچھ بڑھ نہیں جاتا، اور اگر سب اگلے پچھلے جن وانس مل کے بفرض محال ایک بدترین انسان جیسے ہوجائیں (العیاذ باللہ) تو اس سے میرے ملک میں ذرہ برابر کمی نہیں ہوتی''۔

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۛ وَالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ ۛ

کیا نہیں پہنچی تم کو خبر ان لوگوں کی جو پہلے تھے تم سے قوم نوح کی اور عاد اور ثمود، اور جو ان سے پیچھے ہوئے

لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ۭ جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْۤا اَيْدِيَهُمْ فِىْۤ اَفْوَاهِهِمْ

کسی کو انکی خبر نہیں مگر اللہ کو ۱؎ آئے انکے پاس انکے رسول نشانیاں لے کر پھر لوٹائے (الٹے دے لیے) انہوں نے اپنے ہاتھ اپنے منہ میں ۲؎

وَقَالُوْۤا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَاِنَّا لَفِىْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَاۤ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ⑨ الثلثة

اور بولے ہم نہیں مانتے جو تم کو دے کر بھیجا اور ہم کو تو شبہ ہے اس راہ میں جس کی طرف تم ہم کو بلاتے ہو

**خلاصہ تفسیر**: اب آگے بعض اور انبیاء جیسے نوح اور ہود علیہما السلام کا اجمالی ذکر ہے۔

(اے کفار مکہ!) کیا تم کو ان لوگوں (کے واقعات) کی خبر (اگرچہ اجمالاً سہی) نہیں پہنچی جو تم سے پہلے ہوگذرے ہیں یعنی قوم نوح اور عاد (قوم ہود) اور ثمود (قوم صالح) اور جو لوگ ان کے بعد ہوئے ہیں، جن (کی مفصل حالت) کو بجز اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا (کیونکہ ان کے تفصیلی حالات منضبط ومنقول نہیں ہوئے، اور وہ واقعات یہ ہیں کہ) ان کے پیغمبران کے پاس دلائل لے کر آئے، سو ان قوموں (میں جو کفار تھے انہوں) نے اپنے ہاتھ ان پیغمبروں کے منہ میں دے دیے (یعنی ماننے تو کیا، الٹی یہ کوشش کرتے تھے کہ ان کو بات تک نہ کرنے دیں) اور کہنے لگے کہ جو حکم دے کر تم کو (بزعم تمہارے) بھیجا گیا ہے (یعنی توحید وایمان) ہم ان کے منکر ہیں، اور جس امر کی طرف تم ہم کو بلاتے ہو (یعنی وہی توحید وایمان) ہم تو اس کی جانب سے بہت بڑے شبہ میں ہیں جو (ہمیں) تردد میں ڈالے ہوئے ہے (مقصود اس سے توحید ورسالت دونوں کا انکار ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ تم اپنی رائے سے خود توحید کی دعوت کر رہے ہو اللہ کی طرف سے مامور اور بھیجے ہوئے نہیں ہو)۔

**لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ**: شبہ ہوتا ہے کہ اس آیت کے شروع میں اَلَمْ يَاْتِكُمْ میں اہل مکہ سے جو سوال کیا گیا ہے کہ کیا تم کو ان لوگوں کے واقعات نہیں پہنچے، اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان واقعات کا ان کو علم تھا، اور پھر آگے فرمایا کہ: لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ کہ ان کی صرف اللہ کو خبر ہے،

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل مکہ کو ان کا علم نہ تھا؟ جواب یہ ہے کہ پہلی بات باعتبار اجمال کے ہے یعنی اجمالا ان کو علم تھا، اور دوسری بات باعتبار تفصیل کے ہے، یعنی تفصیل کے ساتھ ان کو علم نہ تھا، جیسا کہ خلاصہ تفسیر سے ظاہر ہے، پس لَا يَعۡلَمُهُمۡ کا مضمون آیت **ومنهم من لم نقصص عليك** کے جیسے ہوا۔

فَرَدُّوٓا اَيۡدِيَهُمۡ فِيٓ اَفۡوَاهِهِمۡ: روح المعانی میں حسن سے منقول ہے کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں کو پیغمبر کے منہ پر رکھ دیا تا کہ ان کو بولنے نہ دیں، میں کہتا ہوں کہ یہاں اصل مقصود کے لیے تو وَقَالُوٓا اِنَّا كَفَرۡنَا کہنا ہی کافی تھا، لیکن اس بات کو بطور خاص ذکر کرنا کہ اپنے ہاتھ پیغمبر کے منہ پر رکھ دیے اس کی وجہ یہ ہے کہ کفر اور انکار کے علاوہ سوء ادب (بے ادبی) بھی ایک مستقل جرم ہے، اسی وجہ سے اہل طریق بے ادبی سے سخت ممانعت کرتے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ے یہ موسیٰ علیہ السلام کے کلام کا تتمہ ہے یا اسے چھوڑ کر حق تعالیٰ نے اس امت کو خطاب فرمایا ہے، بہر حال اس میں بتلایا کہ بیشار قومیں پہلے گزر چکیں ان کے تفصیلی پتے اور احوال بجز خدا کے کسی کو معلوم نہیں، البتہ چند قومیں جو عرب والوں کے یہاں زیادہ مشہور تھیں ان کے نام لے کر اور بقیہ کو وَالَّذِيۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ میں درج کر کے متنبہ فرماتے ہیں کہ ان اقوام کا جو کچھ حشر ہوا کیا وہ تم کو نہیں پہنچا، تعجب ہے اتنی قومیں پہلے تباہ ہو چکیں اور ان کے حال سے ابھی تک تمہیں عبرت حاصل نہ ہوئی۔

**تنبیہ:** ابن عباسؓ نے لَا يَعۡلَمُهُمۡ اِلَّا اللّٰهُ کو پڑھ کر فرمایا" كَذَبَ النَّسَّابُوۡنَ " (یعنی انساب کی پوری معرفت کا دعویٰ رکھنے والے جھوٹے ہیں) عروہ بن الزبیر فرماتے ہیں کہ ہم نے کسی کو نہیں پایا جو معد بن عدنان سے اوپر (تحقیقی طور پر) نسب کا حال بتاتا ہو، واللہ تعالیٰ اعلم۔

**فائدہ:** ۲ے یعنی کفار فرط غیظ سے اپنے ہاتھ کاٹنے لگے جیسے دوسری جگہ ہے: عَضُّوۡا عَلَيۡكُمُ الۡاَنَامِلَ مِنَ الۡغَيۡظِ یا انبیاء کی باتیں سن کر فرط تعجب سے ہاتھ منہ پر رکھ لیے، یا ہاتھ منہ کی طرف لے جا کر اشارہ کیا کہ بس چپ رہیے یا ہماری اس زبان سے اس جواب کے سوا کوئی توقع نہ رکھو جو آگے آرہا ہے، یا پیغمبر کی باتیں سن کر ہنستے تھے اور کبھی ہنسی دبانے کو منہ پر ہاتھ رکھ لیتے تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اَيۡدِيَهُمۡ کی ضمیر کفار کی طرف اور اَفۡوَاهِهِمۡ کی رُسل کی طرف راجع ہو، یعنی ملعونوں نے اپنے ہاتھ پیغمبروں کے منہ میں اڑا دیے کہ وہ بالکل بول نہ سکیں یا دونوں ضمیریں رسل کی طرف ہوں یعنی گستاخانہ طور پر انبیاء کے ہاتھ پکڑ کر انہی کے منہ میں ٹھونس دیے بعض کے نزدیک یہاں ایدی سے مراد نعمتیں ہیں، یعنی جو عظیم الشان نعمتیں انبیاء نے پیش کی تھیں، مثلاً شرائع الٰہیہ وغیرہ وہ ناقدری سے ان ہی کی طرف لوٹا دیں کسی کو قبول نہ کیا جیسے ہمارے محاورات میں کہتے ہیں کہ میں نے فلاں شخص کی چیز اس کے منہ پر ماری، بہر حال کوئی معنی لیے جائیں سب کا حاصل یہ ہے کہ انہوں نے نعمت خداوندی کی ناقدری کی اور انبیاء علیہم السلام کی دعوت قبول نہ کی ان کے ساتھ بڑی بے رخی بلکہ گستاخی سے پیش آئے۔

قَالَتۡ رُسُلُهُمۡ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ يَدۡعُوۡكُمۡ لِيَغۡفِرَ لَكُمۡ

خلجان میں ڈالنے والا بولے ان کے رسول کیا اللہ میں شبہ ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین ۱ے وہ تم کو بلاتا ہے تاکہ بخشے تم کو

مِّنۡ ذُنُوۡبِكُمۡ وَيُؤَخِّرَكُمۡ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ قَالُوۡۤا اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا ؕ تُرِيۡدُوۡنَ

کچھ گناہ تمہارے ۲ے اور ڈھیل دے تم کو ایک وعدہ تک جو ٹھہر چکا ہے ۳ے کہنے لگے تم تو یہی آدمی ہو ہم جیسے، تم چاہتے ہو

اَنۡ تَصُدُّوۡنَا عَمَّا كَانَ يَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاۡتُوۡنَا بِسُلۡطٰنٍ مُّبِيۡنٍ ⑩

کہ روک دو ہم کو ان چیزوں سے جن کو پوجتے رہے ہمارے باپ دادے، سو لاؤ کوئی سند کھلی ہوئی ۴ے

**خلاصہ تفسیر:** ان کے پیغمبروں نے (اس بات کے جواب میں) کہا کیا (تمہیں) اللہ تعالیٰ کے بارے میں (یعنی اس کی توحید میں) شک (وانکار) ہے جو کہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے (یعنی اللہ کا ان چیزوں کو پیدا کرنا خود اس کی ہستی اور وحدانیت کی دلیل ہے، پھر اس دلیل کے ہوتے ہوئے شک کرنا بڑی تعجب کی بات ہے)۔

(اور آگے بتلاتے ہیں کہ تم جو توحید کی دعوت مستقل طور پر ہماری طرف منسوب کرتے ہو کہ ہم خود بخود یعنی خدا کے حکم کے بغیر توحید کی طرف بلاتے ہیں یہ بھی محض غلط ہے، اگر چہ توحید حق ہونے کی وجہ سے اس قابل ہے کہ اگر کوئی اپنی رائے سے بھی اس کی دعوت دے تو بھی زیبا ہے، لیکن اس موقع پر تو ہماری دعوتِ توحید خدا تعالیٰ کے حکم سے ہے، پس) وہ (ہی) تم کو (توحید کی طرف) بلا رہا ہے تا کہ (اسے قبول کرنے کی برکت سے) تمہارے (گذشتہ) گناہ معاف کر دے اور (تمہاری عمر کی) معین مدت تک تم کو (خیر وخوبی کے ساتھ) حیات دے (مطلب یہ کہ توحید فی نفسہ حق ہونے کے علاوہ تمہارے لئے دونوں جہان میں نافع بھی ہے، دنیا میں تو مدت عمر چین کی زندگی نصیب ہوگی اور آخرت میں مغفرت، کیونکہ اسلام سے گزشتہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں، لیکن حقوق العباد اور حدود وقصاص معاف نہیں ہوتے) انہوں نے (پھر دونوں امر کے متعلق گفتگو شروع کی اور) کہا کہ تم (پیغمبر نہیں ہو، بلکہ) محض ایک آدمی ہو جیسے ہم ہیں (اور بشریت رسالت کے منافی ہے، جب تم پیغمبر نہیں ہو تو جو کچھ توحید کے بارے میں کہتے ہو وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے، بلکہ) تم (اپنی رائے ہی سے) یوں چاہتے ہو کہ ہمارے آباء واجداد جس چیز کی عبادت کرتے تھے (یعنی بت) اس سے ہم کو روک دو، سو (اگر تم رسالت کے مدعی ہو تو علاوہ ان دلائل ومعجزات کے جو اب تک نبوت پر قائم ہو چکے ہیں اور) کوئی صاف معجزہ دکھلاؤ (جو ان سب سے زیادہ واضح ہو)۔

**قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ:** اس جواب میں توحید ورسالت دونوں کے متعلق جواب ہو گیا، توحید کے متعلق اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ میں، اور رسالت کے متعلق يَدْعُوْكُمْ میں جیسا کہ خلاصہ تفسیر سے ظاہر ہے، اور كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا میں اشارۃ اپنے آباء واجداد کے مشرک ہونے سے توحید پر بھی اعتراض کر دیا کہ بتوں کی پرستش قدیم سے چلی آ رہی ہے اور توحید نئی چیز ہے۔

* * *

**فائدہ: ۱فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ:** یعنی خدا کی ہستی اور وحدانیت تو ایسی چیز نہیں جس میں شک وشبہ کی ذرا بھی گنجائش ہو، انسانی فطرت خدا کے وجود پر گواہ ہے، علویات وسفلیات کا عجیب وغریب نظام شہادت دیتا ہے کہ اس مشین کے پرزوں کو وجود کے سانچہ میں ڈھالنے والا، پھر انھیں جوڑ کر نہایت محکم ومنظم طریقہ سے چلانے والا بڑا زبردست ہاتھ ہونا چاہیے جو کامل حکمت واختیار سے عالم کی مشین کو قابو میں کئے ہوئے ہے، اسی لیے کفر سے کفر مشرک کو بھی کسی نہ کسی رنگ میں اس بات کے اعتراضات سے چارہ نہیں رہا کہ بڑا خدا جس نے آسمان وزمین وغیرہ کرات پیدا کیے وہ ہی ہو سکتا ہے جو تمام چھوٹے چھوٹے دیوتاؤں سے اونچے مقام پر براجمان ہو، انبیاء کی تعلیم یہ ہے کہ جب انسانی فطرت نے ایک علیم وحکیم قادر وتوانا منبع الکمالات خدا کا سراغ پالیا پھر اوہام وظنون کی دلدل میں پھنس کر اس سادہ فطری عقیدہ کو کھلونا یا چیستاں کیوں بنایا جاتا ہے، وجدان شہادت دیتا ہے کہ ایک قادر مطلق اور عالم الکل خدا کی موجودگی میں کسی پتھر یا درخت یا انسانی تصویر یا سیارہ فلکی یا اور کسی مخلوق کو الوہیت میں شریک کرنا فطرت صحیحہ کی آواز کو دبانے یا بگاڑنے کا مرادف ہے کیا خداوند قدوس کی ذات وصفات میں معاذ اللہ کچھ کمی محسوس ہوئی جس کی مخلوق خداؤں کی جمعیت سے تلافی کرنا چاہتے ہو۔

**فائدہ: ۲لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ:** یعنی ہم نہیں بلاتے، فی الحقیقت ہمارے ذریعہ سے وہ تم کو اپنی طرف بلا رہا ہے کہ توحید وایمان کے راستہ چل کر اس کے مقام قرب تک پہنچو، اگر تم اپنی حرکتوں سے باز آ کر ایمان وایقان کا طریق اختیار کر لو تو ایمان لانے سے پیشتر کے سب گناہ (بجز حقوق وزواجر کے) معاف کر دے گا، پھر ایمان لانے کے بعد جیسا عمل کرو گے اس کے موافق معاملہ ہوگا۔

**فائدہ: ۳وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى:** یعنی کفر وشرارت پر قائم رہنے کی صورت میں جو جلد تباہ کیے جاتے اس سے محفوظ ہو جاؤ گے

اور جتنی مدت دنیا میں رہو گے سکون و اطمینان کی زندگی گزارو گے: یُمَتِّعۡکُمۡ مَّتَاعًا حَسَنًا (ہود: ۳) اور فَلَنُحۡیِیَنَّهٗ حَیٰوۃً طَیِّبَۃً (النحل: ۹۷) وغیرہ نصوص کے موافق۔

**فائدہ:** ۴ فَاۡتُوۡنَا بِسُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ: یعنی اچھا خدا کی بحث کو چھوڑیے، آپ اپنی نسبت کہیں، کیا آپ آسمان کے فرشتے ہیں؟ یا نوع بشر کے علاوہ کوئی دوسری نوع ہیں؟ جب کچھ نہیں ہم ہی جیسے آدمی ہو تو آخر کس طرح آپ کی باتوں پر یقین کر لیں، آپ کی خواہش یہ ہوگی کہ ہم کو قدیم مذہب سے ہٹا کر اپنا تابع بنالیں تو خاطر جمع رکھئے یہ کبھی نہ ہوگا، اگر آپ اپنا امتیاز ثابت کرنا اور اس مقصد میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو کوئی ایسا کھلا ہوا نشان یا خدائی سرٹیفکیٹ دکھلائیے جس کے سامنے خواہی نہ خواہی سب کی گردنیں جھک جائیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہماری فرمائش کے موافق معجزات دکھلائیں۔

قَالَتۡ لَهُمۡ رُسُلُهُمۡ اِنۡ نَّحۡنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ ؕ

ان کو کہا ان کے رسولوں نے ہم تو یہی آدمی ہیں جیسے تم لیکن اللہ احسان کرتا ہے اپنے بندوں میں جس پر چاہے ۱

وَمَا كَانَ لَنَاۤ اَنۡ نَّاۡتِيَكُمۡ بِسُلۡطٰنٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۝۱۱

اور ہمارا کام نہیں کہ لے آئیں تمہارے پاس سند مگر اللہ کے حکم سے، اور اللہ پر بھروسہ چاہیے ایمان والوں کو ۲

**خلاصہ تفسیر:** ان کے رسولوں نے (اس کے جواب میں) کہا کہ (تمہاری تقریر کا خلاصہ تین باتیں ہیں: ① توحید کا انکار، اپنے آباء واجداد کے شرک سے استدلال کر کے ② نبوت کا انکار، بشریت اور رسالت میں منافات کا دعوی کر کے ③ پہلے دلائل و معجزات کے باوجود مزید معجزات کا مطالبہ کرنا، سو توحید کے متعلق تو پیچھے: فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ میں جواب ہو گیا، کیونکہ عقلی دلیل کے سامنے پرانی رسم کوئی چیز نہیں ہوتی، دوسری بات کے متعلق انبیاء نے فرمایا کہ ہم اپنے بشر ہونے کو تسلیم کرتے ہیں کہ واقعی) ہم بھی تمہارے جیسے آدمی ہیں، لیکن (بشریت اور نبوت میں تضاد نہیں، کیونکہ نبوت حق تعالی کا ایک اعلی درجہ کا احسان ہے اور) اللہ (کو اختیار ہے کہ) اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے (وہ) احسان فرمادے (اور اس کی کوئی دلیل نہیں کہ انسان پر خدا تعالی کا احسان نہ ہو سکے) اور (تیسری بات کے متعلق یہ ہے کہ دعوی کے لئے۔ جس میں نبوت کا دعویٰ بھی داخل ہے۔ مطلق دلیل ضروری ہوتی ہے، خاص دلیل لازم نہیں، اور ہم اپنے دعوی نبوت پر گزشتہ معجزات سے دلیل قائم کر چکے، رہا خاص معجزہ جس کو تم صاف دلیل سے تعبیر کرتے ہو وہ ہمارے ذمہ لازم نہیں، اور دوسرا) یہ بات ہمارے قبضہ کی نہیں کہ ہم تم کو کوئی معجزہ دکھلا سکیں بغیر خدا کے حکم کے (پس تمہارے تمام شبہات کا جواب ہو گیا، پھر اگر اس پر بھی تم نہ مانو اور مخالفت کئے جاؤ تو خیر ہم تمہاری مخالفت سے نہیں ڈرتے، بلکہ اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں) اور اللہ ہی پر سب ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہئے (چونکہ ہم بھی باایمان ہیں اور ایمان کا تقاضا ہے توکل کو، اس لئے ہم بھی توکل اختیار کرتے ہیں)۔

قَالُوۡۤا اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا (مع قولہ) وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ: بزرگ و مشائخ کے حق میں ان کے منکرین بھی اسی طرح کہتے ہیں، ان کو بھی یہی جواب دیا جائے گا کہ اللہ تعالی اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے احسان فرمادے۔

وَمَا كَانَ لَنَاۤ اَنۡ نَّاۡتِيَكُمۡ بِسُلۡطٰنٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ: یہی جواب اس شخص کو دیا جائے گا جو اولیاء سے کرامت کا طلبگار رہو۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی تمہارا یہ کہنا درست ہے کہ ہم نہ فرشتے ہیں نہ کوئی اور مخلوق، بلکہ نفس بشریت میں تم ہی جیسے ہیں لیکن نوع بشر کے افراد میں احوال و مدارج کے اعتبار سے کیا زمین و آسمان کا تفاوت نہیں، آخر اتنا تو تم بھی مشاہدہ کرتے ہو کہ حق تعالی نے جسمانی، دماغی، اخلاقی اور معاشی حالات کے اعتبار سے بعض انسانوں کو بعض پر کس قدر فضیلت دی ہے، پھر اگر یہ کہا جائے کہ خدا نے اپنے بعض بندوں کو ان کی فطری قابلیت اور اعلیٰ ملکات کی

بدولت روحانی کمال اور باطنی قرب کے اس بلند مقام پر پہنچا دیا جسے ''مقام نبوت'' یا ''منصب رسالت'' کہتے ہیں تو اس میں کیا اشکال واستبعاد ہے؟ بہر حال دعویٰ نبوت سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم اپنی نسبت بشر کے سوا کوئی دوسری نوع ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں، ہاں اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں میں سے بعض پر ایک خصوصی احسان فرماتا ہے جو دوسروں پر نہیں ہوتا۔

**فائدہ:** ۲ یعنی اب رہا سند اور سرٹیفکیٹ لانے کا قصہ، سو خدا کے حکم سے ہم پہلے ہی اپنی نبوت کی سند اور روشن نشانیاں دکھلا چکے ہیں، کما قال: جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ (الاعراف:۱۰۱) جو آدمی ماننا چاہے اس کے اطمینان کے لیے وہ کافی سے زیادہ ہیں، باقی رہا تمہاری فرمائشیں پوری کرنا، تو یہ چیز ہمارے قبضہ میں نہیں، نہ ہماری تصدیق عقلاً اس پر موقوف ہے، خدا تعالیٰ اپنی حکمت کے موافق جو سند اور نشان چاہے، تم کو دکھلائے گا، فرمائشی نشانات دیکھنے سے ایمان نہیں آتا، اللہ کے دینے سے آتا ہے، لہذا ایک ایمان دار کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے، اگر تم نہ مانو گے اور ہماری عداوت و ایذاء رسانی پر تیار ہو گے تو ہمارا بھروسہ اسی خدا کی مہربانی اور امداد پر رہے گا۔

وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ

اور ہم کو کیا ہوا کہ بھروسہ نہ کریں اللہ پر اور وہ سمجھا چکا ہم کو ہماری راہیں ۱ اور ہم صبر کریں گے ایذاء پر جو تم ہم کو دیتے ہو

ع۱۴ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۱۲﴾

اور اللہ پر بھروسہ چاہیے بھروسے والوں کو ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور ہم کو اللہ پر بھروسہ نہ کرنے کا کون امر باعث ہو سکتا ہے حالانکہ اس نے (ہمارے حال پر بڑا فضل کیا کہ) ہم کو ہمارے (منافع دارین کے) راستے بتلا دیئے (جس کا اتنا بڑا فضل ہو اس پر تو ضرور بھروسہ کرنا چاہئے) اور (خارجی نقصانات سے تو ہم توکل کی برکت سے بے فکر ہو گئے، رہا داخلی نقصان کہ تمہاری مخالفت سے رنج و غم ہوتا سو) تم نے (عناد و خلاف کر کے) جو کچھ ہم کو ایذا پہنچائی ہے ہم اس پر صبر کریں گے (جس کا ہم کو ثواب ملے گا، پس اس سے بھی ہمیں نقصان نہ رہا، اور اس صبر کا حاصل بھی وہی توکل ہے) اور اللہ ہی پر بھروسہ کرنے والوں کو (ہمیشہ) بھروسہ رکھنا چاہیے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی حق تعالیٰ ہم کو جام توحید و عرفان پلا کر حقیقی کامیابی کے راستے بتا چکا، پھر کیسے ممکن ہے کہ ہم اس پر توکل نہ کریں۔

**فائدہ:** ۲ یعنی تم خواہ کتنی ہی ایذاء پہنچاؤ، خدا کے فضل سے ہمارے توکل میں فرق نہیں پڑ سکتا، متوکلین کا یہ کام نہیں کہ سختیاں دیکھ کر توکل اور استقامت کی راہ سے ہٹ جائیں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ

اور کہا کافروں نے اپنے رسولوں کو ہم نکال دیں گے تم کو اپنی زمین سے یا لوٹ آؤ ہمارے دین میں ۱

فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۳﴾

تب حکم بھیجا ان کو ان کے رب نے ہم غارت کریں گے ان ظالموں کو

**خلاصہ تفسیر:** اور (اس تمام تر اتمام حجت کے بعد بھی کفار نرم نہ ہوئے، بلکہ) ان کفار نے اپنے رسولوں سے کہا کہ ہم تم کو اپنی سرزمین سے نکال دیں گے یا یہ کہ تم ہمارے مذہب میں پھر آ جاؤ (پھر آنا اس لئے کہا کہ بعثت سے قبل انبیاء کے خاموش رہنے کی وجہ سے کفار یہی سمجھتے

تھے کہ ان کا اعتقاد بھی ہم ہی جیسا ہوگا) پس ان رسولوں پر ان کے رب نے (تسلی کے لئے) وحی نازل فرمائی کہ (یہ بیچارے تم کو کیا نکالیں گے) ہم (ہی) ان ظالموں کو ضرور ہلاک کردیں گے۔

اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا: ''پھر آنے'' کا یہ مطلب نہیں کہ معاذ اللہ انبیاء علیہم السلام پہلے ان کے مذہب میں تھے، بلکہ نبوت سے پہلے انبیاء کی خاموشی سے وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان کا اعتقاد بھی ہم ہی جیسا ہوگا اس لیے ''پھر آجاؤ'' کہا۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی اپنے توکل وغیرہ کو رہنے دو، زیادہ بزرگی مت جتاؤ، بس اب دو باتوں میں سے ایک بات ہو کر رہے گی، یا تم (بعثت سے پہلے کی طرح) چپ چاپ ہم میں رل مل کر رہو گے اور جن کو تم نے بہکایا ہے وہ سب ہمارے پرانے دین میں واپس آئیں گے، ورنہ تم سب کو ملک بدر اور جلاوطن کیا جائے گا۔

## وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِیْ وَخَافَ وَعِیْدِ۝۱۴

اور آباد کریں گے تم کو اس زمین میں انکے پیچھے ۱؎ یہ ملتا ہے اسکو جو ڈرتا ہے کھڑے ہونے سے میرے سامنے اور ڈرتا ہے میرے عذاب کے وعدہ سے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور ان کے (ہلاک کرنے کے) بعد تم کو اس سرزمین میں آباد رکھیں گے (اور) یہ (وعدہ آباد رکھنے کا کچھ تمہارے ساتھ خاص نہیں بلکہ) ہر اس شخص کے لئے (عام) ہے جو میرے روبرو کھڑے ہونے سے ڈرے اور میری وعید سے ڈرے (مراد یہ کہ جو مسلمان ہو، جس کی علامت قیامت اور وعید سے ڈرنا ہے، ان سب کے لیے عذاب سے نجات دینے اور آباد رکھنے کا یہ وعدہ عام ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی یہ تم کو کیا نکالیں گے ہم ہی ان ظالموں کو تباہ کر کے ہمیشہ کے لیے یہاں سے نکال دیں گے کہ پھر کبھی واپس نہ آسکیں، اور ان کی جگہ تم کو اور تمہارے مخلص وفاداروں کو زمین میں آباد کریں گے، دیکھو کفار مکہ نے نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے مکہ سے نکالنا چاہا، وہ ہی نکلنا آخر اس کا سبب بن گیا کہ وہاں اسلام اور مسلمانوں کا دائمی تسلط ہوا اور کافر کا نشان باقی نہ رہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی مذکورہ بالا کامیابی ان لوگوں کے لیے ہے جو خدا سے ڈرتے ہیں یہ خیال کر کے کہ وہ ہماری تمام حرکتوں کو برابر دیکھ رہا ہے اور ایک دن حساب دینے کے لیے اس کے سامنے کھڑا ہونا ہے جہاں اس کے بے پناہ عذاب سے کوئی بچانے والا نہ ہوگا۔

## وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ۝۱۵

اور فیصلہ (فتح) لگے مانگنے پیغمبر ۱؎ اور نامراد ہوا ہر ایک سرکش ضدی (ضد کرنے والا) ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (پیغمبروں نے کفار کو جو یہ مضمون سنایا کہ تم نے دلائل کے فیصلہ کو نہ مانا، اب عذاب سے فیصلہ ہونے والا ہے، یعنی عذاب آنے والا ہے تو) کفار (چونکہ جہل وعناد میں غرق تھے اس سے بھی نہ ڈرے، بلکہ کمال بے باکی سے وہ) فیصلہ چاہنے لگے (جیسا آیت فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے) اور (جب وہ فیصلہ آیا تو) جتنے سرکش (اور) ضدی لوگ تھے وہ سب (اس فیصلہ میں) بے مراد ہوئے (یعنی ہلاک ہوگئے اور جو ان کی مراد تھی کہ اپنے آپ کو حق پر سمجھ کر فتح وکامیابی چاہتے تھے وہ حاصل نہ ہوئی)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی پیغمبروں نے خدا سے مدد مانگی اور فیصلہ چاہا، چنانچہ نوح علیہ السلام نے کہا تھا: فَافْتَحْ بَیْنِیْ وَبَیْنَهُمْ فَتْحًا وَّنَجِّنِیْ وَمَنْ مَّعِیَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (الشعراء:۱۱۸) لوط علیہ السلام نے کہا: رَبِّ نَجِّنِیْ وَاَهْلِیْ مِمَّا یَعْمَلُوْنَ شعیب علیہ السلام نے عرض کیا: رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ (الاعراف:۸۹) موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی: رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَیْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِیْنَةً وَّاَمْوَالًا فِی الْحَیٰوةِ

الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ( یونس:۸۸) اور کفار نے بھی جب دیکھا کہ اتنی طویل مدت سے عذاب کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں لیکن اس کے آثار کچھ نظر نہیں آتے تو استہزاء اور تمسخر سے کہنے لگے: رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ (ص:۱۶) اور: اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (الانفال:۳۲) یہ تو قریش کے مقولے ہیں، قوم نوح نے کہا تھا: فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ قوم شعیب نے کہا: فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا وغیرہ ذالک، غرض دونوں طرف سے فیصلہ کی جلدی ہونے لگی۔

**فائدہ:** ۲۔ یعنی پیغمبروں کا خدا کو پکارنا تھا کہ مدد آئی اور ہر ایک سرکش اور ضدی نامراد ہو کر رہ گیا، جو کچھ خیالات پکا رکھے تھے، ایک ہی پکڑ میں کافور ہو گئے نہ وہ رہے نہ ان کی توقعات رہیں، ایک لمحہ میں سب کا خاتمہ ہوا۔

مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ

پیچھے اسکے دوزخ ہے اور پلائیں گے اسکو پانی پیپ کا ۱۔ گھونٹ گھونٹ پیتا ہے اس کو اور گلے سے نہیں اتار سکتا ۲۔ اور چلی آتی ہے اس پر موت

كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۭ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ﴿۱۷﴾

ہر طرف (جگہ) سے اور وہ نہیں مرتا، اور اس کے پیچھے عذاب ہے سخت ۳۔

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے منکر رسالت کا دنیوی عذاب بیان ہوا، اب اخروی عذاب بیان کیا جاتا ہے۔

(جس ضدی سرکش کا اوپر ذکر ہوا ہے دنیاوی عذاب کے علاوہ) اس کے آگے دوزخ (کا عذاب آنے والا) ہے اور اس کو (دوزخ میں) ایسا پانی پینے کو دیا جائے گا جو کہ پیپ لہو (کے مشابہ) ہوگا جس کو (شدت پیاس کی وجہ سے) گھونٹ گھونٹ کر کے پیے گا اور (کراہت اور انتہائی گرم ہونے کی وجہ سے) گلے سے آسانی کے ساتھ اتارنے کی کوئی صورت نہ ہوگی اور ہر (چہار) طرف سے اس پر (سامان) موت کی آمد ہوگی اور وہ کسی طرح مرے گا نہیں (بلکہ یوں ہی سسکتا رہے گا) اور (پھر یہ بھی نہیں کہ یہ عذاب ایک حالت پر بدستور رہے جس سے عادت پڑ جانے کا احتمال ہو سکے، بلکہ) اس (شخص) کو اور (زیادہ) سخت عذاب کا سامنا (برابر) ہوا (کرے) گا (جس سے عادت پڑنے کا احتمال ہی نہیں ہو سکتا، بلکہ دن بدن عذاب بڑھتا رہے گا، کقولہ تعالیٰ: كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا)۔

يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ: گھونٹ گھونٹ پینا اور آسانی سے نہ اترنا دونوں صورتوں سے جمع ہو سکتا ہے: ① ایک یہ کہ پھنس کر گلے سے اترے تو اُتر جانے کے اعتبار سے پینا صادق آ گیا، اور پھنسنے کے اعتبار سے نہ اترنا صادق آ گیا ② دوسری صورت یہ کہ پھنس کر گلے ہی میں رہ جائے، اترے نہیں، پس اس صورت میں نہ اترنا تو ظاہر ہے اور پینے کا حکم ارادہ کے اعتبار سے صحیح ہوا کہ پینا چاہے گا مگر پی نہ سکے گا۔

* * *

**فائدہ:** ۱۔ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ: یعنی یہ تو یہاں کا عذاب تھا، اس کے بعد آگے دوزخ کا بھیانک منظر ہے جہاں شدت کی تشنگی کے وقت ان کو پیپ یا پیپ جیسا پانی پلایا جائے گا۔

**فائدہ:** ۲۔ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ: یعنی خوشی سے کہاں پی سکیں گے، حدیث میں ہے کہ فرشتے لوہے کے گرز سر پر مار کر زبردستی منہ میں ڈالیں گے، جس وقت منہ کے قریب کریں گے شدت حرارت سے دماغ تک کی کھال اتر کر نیچے لٹک پڑے گی، منہ میں پہنچ کر گلے میں پھنسے گا، بڑی مصیبت اور تکلیف کے ساتھ ایک ایک گھونٹ کر کے حلق سے نیچے اتاریں گے، پیٹ میں پہنچنا ہوگا کہ آنتیں کٹ کر باہر آ جائیں گی وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ (محمد:۱۵) وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ (الكهف:۲۹) (أعاذنا الله منهما وسائر المؤمنين)۔

**فائدہ:** ۳۔ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ: یعنی اس کا پینا کیا ہوگا ہر طرف سے موت کا سامنا کرنا ہوگا، سر سے پاؤں تک ہر عضو بدن پر

سکرات موت طاری ہوں گے، شش جہت سے مہلک عذاب کی چڑھائی ہوگی، اس زندگی پر موت کو ترجیح دیں گے، لیکن موت بھی نہیں آئے گی، جو سب تکلیفوں کا خاتمہ کر دے، ایک عذاب کے پیچھے دوسرا تازہ عذاب آتا رہے گا: كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ (النساء:٥٦) ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى (الاعلیٰ:١٣) سچ ہے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا.

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ

حال ان لوگوں کا جو منکر ہوئے اپنے رب سے ان کے عمل ہیں جیسے وہ راکھ کہ زور کی چلے اس پر ہوا آندھی کے دن

لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿١٨﴾

کچھ ان کے ہاتھ میں نہ ہوگا اپنی کمائی میں سے، یہی ہے بہک کر دور جا پڑنا

**خلاصہ تفسیر:** اوپر منکر رسالت کے عذاب کا ذکر تھا، چونکہ بعض منکرین رسالت اپنے زعم میں کچھ ثواب کے کام بھی کرتے تھے جن پر نظر کر کے ان کو شبہ ہوسکتا تھا کہ ہمارے یہ اعمال عذاب سے بچالیں گے، نیز یہ بھی شبہ کرتے تھے کہ قیامت میں زندہ ہونا ہی محال ہے، پھر عذاب کی گنجائش کہاں، نیز یہ وسوسہ بھی ممکن تھا کہ ہمارے معبود ہمارے کام آئیں گے، اس لیے اب ان نیک اعمال کا محض بے اثر ہونا، قیامت کا وقوع ممکن ہونا، سرداروں کا کام نہ آنا اور قیامت کے دن شیطان کا صاف جواب دے دینا بیان فرماتے ہیں، خلاصہ یہ کہ نجات کے تمام راستے بند ہیں۔

(ان کافروں کو اگر اپنی نجات کے متعلق یہ زعم ہو کہ ہمارے اعمال ہمیں فائدہ دیں گے تو اس کا قاعدہ کلیہ تو یہ سن لو کہ) جو لوگ اپنے پروردگار کے ساتھ کفر کرتے ہیں ان کی حالت باعتبار عمل کے یہ ہے (یعنی ان کے اعمال کی ایسی مثال ہے) جیسے کچھ راکھ ہو (جو اُڑنے میں بہت ہلکی ہوتی ہے) جس کو تیز آندھی کے دن میں تیزی کے ساتھ ہوا اُڑا لے جائے (کہ اس صورت میں اس راکھ کا نام ونشان بھی نہ رہے گا، اسی طرح) ان لوگوں نے جو کچھ عمل کئے تھے اس کا کوئی حصہ (یعنی اثر وفائدہ کے قبیل سے) ان کو حاصل نہ ہوگا (اس راکھ کی طرح ضائع برباد ہوجائے گا، کیونکہ کفر کی آندھی نے سب اعمال کو راکھ کی طرح اڑا دیا ہے) یہ بھی بڑی دور دراز کی گمراہی ہے (کہ گمان تو یہ ہو کہ ہمارے عمل نیک اور نافع ہیں اور پھر وہ نقصان دہ اور برے ثابت ہوں، جیسے بتوں کو پوجنا، یا غیر نافع ظاہر ہوں جیسے غلام آزاد کرنا، صلہ رحمی اور مہمان نوازی وغیرہ، چونکہ اس گمراہی کو حق سے بہت بُعد ہے اس لئے بعید کہا گیا، پس اس طریق سے تو نجات کا احتمال نہ رہا)۔

* * *

**فائدہ:** بعض کفار کو یہ خیال ہوسکتا تھا کہ آخر ہم نے دنیا میں بہت سے اچھے کام صدقہ خیرات کی مد میں کیے ہماری خوش اخلاقی لوگوں میں مشہور ہوئی، بہتیرے آدمیوں کی مصیبت میں کام آئے اور کسی نہ کسی عنوان سے خدا کی پوجا بھی کی، کیا یہ سب کیا کرایا اور دیا لیا اس وقت کام نہ آئے گا؟ اس کا جواب اس تمثیل میں دیا، یعنی جسے خدا کی صحیح معرفت نہیں، محض فرضی اور وہمی خدا کو پوجتا ہے اس کے تمام اعمال محض بے روح اور بے وزن ہیں، وہ محشر میں اسی طرح اڑ جائیں گے جس طرح آندھی کے وقت جب زور کی ہوا چلے تو راکھ کے ذرات اڑ جاتے ہیں، اس وقت کفار نیک عمل سے بالکل خالی ہاتھ ہوں گے حالانکہ وہ یہی موقع ہوگا جہاں نیک عمل کی سب سے زیادہ ضرورت ہوگی، اللہ اکبر! یہ کیسی حسرت کا وقت ہوگا کہ جن اعمال کو ذریعہ قرب ونجات سمجھے تھے وہ راکھ کے ڈھیر کی طرح عین اس موقع پر بے حقیقت ثابت ہوئے جب دوسرے لوگ اپنی نیکیوں کے ثمر شیریں سے لذت اندوز ہو رہے ہیں۔

کہ بازار چنداں کہ آگندہ تر — تہی دست را دل پراگندہ تر

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ؀ۙ19

تو نے کیا نہیں دیکھا کہ اللہ نے بنائے آسمان اور زمین جیسی چاہیے، اگر چاہے تم کو لے جائے اور لائے کوئی پیدائش (مخلوق) نئی

وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ؀20

اور یہ اللہ کو کچھ مشکل نہیں

**خلاصه تفسیر:** اسی طرح کفار کو یہ شبہ بھی ہوسکتا تھا کہ قیامت میں ہمارا زندہ ہونا ہی محال ہے، پھر عذاب کی گنجائش کہاں؟ چنانچہ اب قیامت کا واقع ہونا اور ان کا دوبارہ زندہ کیا جانا بیان فرماتے ہیں۔

(اور اگر ان کفار کو یہ زعم ہو کہ قیامت کا وجود ہی محال ہے اس لیے عذاب کا احتمال نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ) کیا (اے مخاطب!) تجھ کو یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو اور زمین کو بالکل ٹھیک ٹھیک (یعنی منافع ومصالح پر مشتمل) پیدا کیا ہے (اس سے خدا کا قادر ہونا ظاہر ہے، پس جب وہ قادر مطلق ہے تو) اگر وہ چاہے تو تم سب کو فنا کردے اور ایک دوسری نئی مخلوق پیدا کردے، اور یہ خدا کو کچھ بھی مشکل نہیں (پس جب نئی مخلوق پیدا کرنا آسان ہے تو تم کو دوبارہ پیدا کردینا کیا مشکل ہے، غرض نجات پانے کا یہ راستہ بھی نہیں نکل سکتا)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی شاید کفار کو یہ خیال گزرے کہ جب مٹی میں مل کر مٹی ہوگئے پھر دوبارہ زندگی کہاں، قیامت اور عذاب وثواب وغیرہ سب کہانیاں ہیں، ان کو بتلایا کہ جس خدا نے آسمان وزمین کامل قدرت وحکمت سے پیدا کیے اسے تمہارا ازسرنو دوبارہ پیدا کرنا، یا کسی دوسری مخلوق کو تمہاری جگہ لے آنا کیا مشکل ہے؟ اگر آسمان وزمین کے محکم نظام کو دیکھ کر یہ یقین ہوتا ہے کہ اس کا پیدا کرنے اور قائم رکھنے والا کوئی صانع حکیم ہے جیسا کہ لفظ بالحق میں تنبیہ فرمائی تو کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اس نے اشرف المخلوقات (انسان) کو محض بے نتیجہ پیدا کیا ہوگا اور اس کی تخلیق وایجاد سے کوئی عظیم الشان مقصد متعلق نہ ہوگا یقیناً اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی ہونی چاہیے جس میں آدم کی پیدائش کا مقصد عظیم اکمل واتم طریقہ سے آشکارا ہو۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰۗؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ

اور سامنے کھڑے ہوں گے اللہ کے سارے [1] پھر کہیں گے کمزور بڑائی والوں کو ہم تو تمہارے تابع تھے سو بچاؤ گے

عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ۭ

ہم کو اللہ کے کسی عذاب سے کچھ [2] وہ کہیں گے اگر ہدایت کرتا (راہ پر لاتا) ہم کو اللہ تو البتہ ہم تم کو ہدایت کرتے (راہ پر لاتے)

ع ۱۵ سَوَاۗءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ؀ۧ21

اب برابر ہے ہمارے حق میں ہم بے قراری کریں یا صبر کریں ہم کو نہیں خلاصی [3]

**خلاصه تفسیر:** اسی طرح ان کفار کو یہ وسوسہ ممکن تھا کہ ہم جن بڑوں کے کہنے سے اس طریقہ کو اختیار کیے ہوئے وہ ہمارے کام آجائیں گے، چنانچہ اب ان بڑوں کا کام نہ آنا بیان فرماتے ہیں۔

اور (اگر یہ وسوسہ ہو کہ ہمارے سردار ہم کو بچالیں گے تو اس کی حقیقت سن لو کہ قیامت کے دن) خدا کے سامنے سب پیش ہوں گے پھر چھوٹے درجہ کے لوگ (یعنی عوام وتابعین) بڑے درجہ کے لوگوں سے (یعنی سرداروں سے بطور ملامت وعتاب) کہیں گے کہ ہم (دنیا میں)

تمہارے تابع تھے (حتی کہ دین کی جوراہ تم نے ہمیں بتلائی ہم اسی پر ہولئے اور آج ہم پر عذاب کی مصیبت ہے) تو کیا تم خدا کے عذاب کا کچھ جزو ہم سے مٹا سکتے ہو (یعنی اگر بالکل نہ بچا سکو تو کسی قدر بھی بچا سکتے ہو) وہ (جواب میں) کہیں گے کہ (ہم تم کو کیا بچاتے خود ہی نہیں بچ سکتے ہیں، البتہ) اگر اللہ ہم کو (کوئی) راہ (بچنے کی) بتلاتا تو ہم تم کو بھی (وہ) راہ بتلا دیتے (اور اب تو) ہم سب کے حق میں دونوں صورتیں برابر ہیں خواہ ہم پریشان ہوں (جیسا کہ تمہاری پریشانی فَهَلْ أَنْتُمْ مُّغْنُونَ عَنَّا سے ظاہر ہے اور ہماری پریشانی تو لو هدانا الله سے ظاہر ہی ہے) خواہ ضبط کریں (دونوں حالتوں میں) ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں (پس اس سوال وجواب سے یہ معلوم ہوگیا کہ طریقہ کفر کے سردار بھی اپنے تابع داروں کے کچھ کام نہ آئیں گے، غرض نجات پانے کا یہ راستہ بھی نہیں نکل سکتا)۔

* * *

**فائدہ:** ١ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا: یعنی سب سے بڑی عدالت میں پیشی ہوگی۔

**فائدہ:** ٢ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ: یہ اتباع اپنے متبوعین سے کہیں گے، یعنی دنیا میں تم بڑے بن کر بیٹھے تھے اور ہم نے تمہاری بہت تابعداری کی تھی، آج اس مصیبت کی گھڑی میں کچھ تو کام آؤ، کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ عذاب الٰہی کے کسی حصہ کو ہم سے ذرا ہلکا کردو، یہ دوزخ میں جانے کے بعد کہیں گے یا میدان حشر میں، ابن کثیر نے پہلے احتمال کو ترجیح دی ہے، لقوله تعالیٰ: وَإِذْ يَتَحَآجُّوْنَ فِي النَّارِ فَيَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا إِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا (غافر: ٤٧) وغیر ذالک من الآیات، واللہ اعلم۔

**فائدہ:** ٣ أَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ: یعنی اگر خدا دنیا میں ہم کو ہدایت کی توفیق دیتا تو ہم تم کو بھی اپنے ساتھ سیدھے راستہ پر لے چلتے لیکن ہم نے ٹھوکر کھائی تو تمہیں بھی لے ڈوبے، یا یہ مطلب ہے کہ اس وقت اگر خدا تعالیٰ ہم کو اس عذاب سے نکلنے کی کوئی راہ بتلاتا تو ہم تمہیں وہ ہی راہ بتا دیتے، اب تو تمہاری طرح ہم خود مصیبت میں مبتلا ہیں، اور مصیبت بھی ایسی جس سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں، نہ صبر کرنے اور خاموش رہنے سے فائدہ، نہ گھبرانے اور چلانے سے کچھ حاصل۔

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ إِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَأَخْلَفْتُكُمْ ط

اور بولا شیطان جب فیصل ہو چکا سب کام بیشک اللہ نے تم کو دیا تھا سچا وعدہ اور میں نے تم سے وعدہ کیا پھر (سو) جھوٹا کیا

وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ إِلَّآ أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ج فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا

اور میری تم پر کچھ حکومت نہ تھی مگر یہ کہ میں نے بلایا تم کو پھر تم نے مان لیا میری بات کو، سو الزام نہ دو مجھ کو اور الزام دو

أَنْفُسَكُمْ ط مَآ أَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ أَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ط إِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ أَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ط

اپنے آپ کو، نہ میں تمہاری فریاد کو پہنچوں نہ تم میری فریاد کو پہنچو، میں منکر ہوں (مجھ کو قبول نہیں) جو تم نے مجھ کو شریک بنایا تھا اس سے پہلے

إِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ﴿٢٢﴾

البتہ جو ظالم ہی ان کے لیے ہے عذاب دردناک

**خلاصہ تفسیر:** اسی طرح کفار کو یہ احتمال ہو سکتا تھا کہ اللہ کے علاوہ جو ہمارے معبود ہیں وہ ہمیں بچالیں گے، چنانچہ اب ان غیر اللہ کی معبودیت کی جو اصل بنیاد یعنی شیطان ہے اس کا قیامت کے روز صاف صاف جواب دینا بیان فرماتے ہیں۔

اور (اگر اس کافر کا بھروسہ ہو کہ یہ معبودین غیر اللہ کام آئیں گے تو اس کا حال اس حکایت سے معلوم ہو جائے گا کہ) جب (قیامت میں)

تمام مقدمات فیصل ہوچکیں گے (یعنی اہل ایمان جنت میں اور کفار دوزخ میں بھیج دیئے جائیں گے) تو (اہل دوزخ سب شیطان کے پاس جا کر کہ وہ بھی وہاں ہوگا اس کو ملامت کریں گے کہ کم بخت تو تو ڈوبا ہی تھا ہم کو بھی اپنے ساتھ ڈبویا، اس وقت) شیطان (جواب میں) کہے گا کہ (مجھ پر تمہاری ملامت ناحق ہے، کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے تم سے (جتنے وعدے کئے تھے سب) سچے وعدے کئے تھے (کہ قیامت ہوگی، کفر سے ہلاکت ہوگی اور ایمان سے نجات ہوگی) اور میں نے بھی وعدے تم سے کئے تھے (کہ قیامت نہ ہوگی اور اس طریقہ کفر سے نجات ہوجائے گی) سو میں نے وہ وعدے تم سے خلاف کئے تھے (اور اللہ تعالیٰ کے وعدوں کے حق ہونے پر اور میرے وعدوں کے باطل ہونے پر دلائل قطعی قائم تھے، اس کے باوجود تم نے میرے وعدوں کو صحیح اور خدا تعالیٰ کے وعدوں کو غلط سمجھا تو تم اپنے ہاتھوں ڈوبے)۔

اور (اگر تم یوں کہو کہ آخر خدا کے وعدوں کو جھوٹا سمجھنے اور میرے جھوٹے وعدوں کے سچا سمجھنے کا سبب بھی تو میں ہی ہوا تو بات یہ ہے کہ واقعی میں نے تم کو اغواء ضرور کیا، لیکن یہ دیکھو کہ میرے بہکانے کے بعد تم بااختیار تھے یا مجبور ولاچار ہوگئے تھے؟ سو ظاہر ہے کہ) میرا تم پر اور تو کچھ زور چلتا نہ تھا بجز اس کے کہ میں نے تم کو (گمراہی کی طرف) بلایا تھا، سو تم نے (اپنے اختیار سے) میرا کہنا مان لیا (اگر تم نہ مانتے تو میں جبراً تمہیں گمراہ نہ کرسکتا تھا، جب یہ بات ثابت ہے) تو مجھ پر (ساری) ملامت مت کرو (اس طرح سے کہ اپنے کو بالکل بری سمجھنے لگو) اور (زیادہ) ملامت اپنے آپ کو کرو (کیونکہ عذاب کی اصل علت تمہارا ہی فعل ہے، میرا فعل تو محض ایک بعید سبب ہے، پس ملامت کا تو یہ جواب ہوا)۔

(اور اگر اس بات سے تمہارا مقصود مجھ سے مدد طلب کرنا ہے تو میں کسی کی کیا مدد کروں گا، خود بھی مصیبت میں مبتلا اور مدد کا محتاج ہوں، لیکن جانتا ہوں کہ کوئی میری مدد نہ کرے گا، ورنہ میں بھی تم سے اپنے لئے مدد چاہتا، کیونکہ زیادہ مناسبت تم سے ہے پس اب تو) نہ میں تمہارا مددگار (ہوسکتا) ہوں اور نہ تم میرے مددگار (ہوسکتے) ہو (البتہ اگر میں تمہارے اس طریقہ شرک کو حق سمجھتا جب بھی اس تعلق کی وجہ سے مدد کا مطالبہ کرنے کی کسی درجہ میں تم کو گنجائش تھی، لیکن) میں خود تمہارے اس فعل سے بیزار ہوں (اور اس کو باطل سمجھتا ہوں) کہ تم اس کے قبل (دنیا میں) مجھ کو (خدا کا) شریک قرار دیتے تھے (یعنی بتوں وغیرہ کی عبادت میں میری ایسی اطاعت کرتے تھے کہ ویسی اطاعت خدا تعالیٰ کا حق ہے، پس بتوں کو شریک ٹھہرانا گویا شیطان کو خدا کا شریک ٹھہرانا ہے، سو مجھ سے تمہارا کوئی تعلق نہیں، نہ تم کو مدد طلب کرنے کا کوئی حق ہے پس) یقیناً ظالموں کے لئے دردناک عذاب (مقرر) ہے (سو عذاب میں پڑے رہو، نہ مجھ پر ملامت کرنے سے نفع کی امید رکھو اور نہ مدد چاہنے سے، جو تم نے ظلم کیا تھا تم بھگتو، جو میں نے کیا تھا میں بھگتوں گا، پس گفتگو ختم کرو)۔

یہ ابلیس کے جواب کا حاصل ہوا، اس سے دوسرے معبودوں کا بھی بھروسہ منقطع ہوا، کیونکہ جو ان معبودوں کی عبادت کا اصل بانی اور محرک تھا اور درحقیقت غیر اللہ کی عبادت سے وہی شیطان زیادہ راضی ہوتا ہے، چنانچہ اسی بنا پر قیامت کے دن دوزخ والے اسی سے کہیں گے سنیں گے، کسی دوسرے معبود سے کچھ بھی نہ کہیں گے، جب اس نے صاف جواب دے دیا تو اوروں سے کیا امید ہوسکتی ہے، پس کفار کی نجات کے سب طریقے مسدود ہوگئے اور یہی مضمون مقصود تھا۔

**وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ**: یعنی ابلیس کہے گا کہ میرا تو تم پر زور نہ چلتا تھا، تو یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اس آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ شیطان بجز بہکانے کے اور کچھ نہیں کرسکتا تو پھر آسیب لپٹنا وغیرہ سب غلط ہوا، جواب یہ ہے کہ یہ حصر صرف گمراہ کرنے کے اعتبار سے ہے کہ گمراہ کرنے میں اس سے زیادہ اس کا زور نہیں چلتا کہ بہکائے، جبراً گمراہ نہیں کرسکتا، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ شیاطین کوئی دوسری مضرت انسان کو نہیں پہنچا سکتے، بلکہ نصوص اور مشاہدہ سے ثابت ہے کہ بعض امراض میں شیاطین کو دخل ہوسکتا ہے، وہ بے ہوش کرسکتے ہیں، آدمی کو اٹھا لے جاسکتے ہیں، اینٹ پتھر برسا سکتے ہیں، مگر چونکہ اکثر فرشتے حفاظت کرتے ہیں، اس لیے ایسے واقعات بکثرت نہیں ہوتے، اور شیاطین کا گمراہی کی طرف بلانا بواسطہ اور بلاواسطہ دونوں طرح صحیح ہوسکتا ہے، کبھی خود اغوا کرتا ہے، کبھی دوسرے شیاطین کو اس کا حکم کرتا ہے اور ایک وقت میں بہت سے آدمیوں کو تنہا بھی اغوا کرسکتا ہے اس

کے محال ہونے پر کوئی قوی دلیل قائم نہیں، نیز بعض لوگ جو بے تکلف یہ کہہ دیتے ہیں کہ "کیا کروں کم بخت شیطان نے گناہ کروا ہی دیا، ورنہ میرا ارادہ ہر گز ایسا نہ تھا"، ایسا کہنا خود فریبی ہے، اس آیت سے معلوم ہوا کہ شیطان ابلیس کا سوائے وسوسہ اندازی کے اور کوئی جبر یا زور نہیں۔

**فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ**: محمد ابن حامدؒ نے کہا ہے کہ ہر ملامت کا محل انسان کا اپنا نفس ہے، جو اپنے نفس پر ملامت نہ کرے اور نفس سے ہمیشہ راضی رہے تو اس نے اس کو ہلاک کیا۔

* * *

**فائدہ**: یعنی حساب کتاب کے بعد جب جنتیوں کے جنت میں اور دوزخیوں کے دوزخ میں جانے کا فیصلہ ہو چکے گا اس وقت کفار دوزخ میں جا کر یا داخل ہونے سے پہلے ابلیس لعین کو الزام دیں گے کہ مردود تو نے دنیا میں ہماری راہ ماری اور اس مصیبت میں گرفتار کرایا، اب کوئی تدبیر مثلاً سفارش وغیرہ کا انتظام کر، تا کہ عذاب الٰہی سے رہائی ملے، تب ابلیس ان کے سامنے لیکچر دے گا جس کا حاصل یہ ہے کہ بیشک حق تعالیٰ نے صادق القول پیغمبروں کے توسط سے ثواب وعقاب اور دوزخ وجنت کے متعلق سچے وعدے کیے تھے جن کی سچائی دنیا میں دلائل و براہین سے ثابت تھی اور آج مشاہدے سے ظاہر ہے، میں نے اس کے بالمقابل جھوٹی باتیں کہیں اور جھوٹے وعدے کیے، جن کا جھوٹ ہونا وہاں بھی ادنیٰ فکر وتامل سے واضح ہو سکتا تھا اور یہاں تو آنکھ کے سامنے ہے، میرے پاس نہ حجت وبرہان کی قوت تھی نہ ایسی طاقت رکھتا تھا کہ زبردستی تم کو ایک جھوٹی بات کے ماننے پر مجبور کر دیتا، بلا شبہ میں نے بدی کی تحریک کی اور تم کو اپنے مشن کی طرف بلایا، تم جھپٹ کر خوشی سے آئے اور میں نے جدھر شہ دی ادھر ہی اپنی رضا ورغبت سے چل پڑے، اگر میں نے اغوا کیا تھا تو تم ایسے اندھے کیوں بن گئے کہ نہ دلیل سنی نہ دعوے کو پرکھا آنکھیں بند کر کے پیچھے ہو لیے، انصاف یہ ہے کہ مجھ سے زیادہ تم اپنے نفسوں پر ملامت کرو، میرا جرم اغوا بجائے خود رہا لیکن مجھے مجرم گردان کر تم کیسے بری ہو سکتے ہو، آج تم کو مدد دینا تو درکنار، خود تم سے مدد لینا بھی ممکن نہیں، ہم اور تم دونوں اپنے اپنے جرم کے موافق سزا میں پکڑے ہوئے ہیں، کوئی ایک دوسرے کی فریاد کو نہیں پہنچ سکتا، تم نے اپنی حماقت سے دنیا میں مجھ کو خدائی کا شریک ٹھہرایا (یعنی بعض تو براہ راست شیطان کی عبادت کرنے لگے اور بہتوں نے اس کی باتوں کو ایسی طرح مانا اور اس کے احکام کے سامنے اس طرح سر تسلیم و انقیاد خم کیا جو خدائی احکام کے آگے کرنا چاہیے تھا) بہر حال اپنے جہل وغباوت سے جو شرک تم نے کیا تھا اس وقت میں اس سے منکر اور بیزار ہوں، یا بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ میں بائے سببیت لے کر یہ مطلب ہو کہ تم نے مجھ کو خدائی کا رتبہ دیا اس سبب سے میں بھی کافر بنا، اگر میری بات کوئی نہ پوچھتا تو میں کفر وطغیان کے اس درجہ میں کہاں پہنچتا، اب ہر ایک ظالم اور مشرک کو اپنے کیے کی سزا دردناک عذاب کی صورت میں بھگتنا چاہیے، شور مچانے اور الزام دینے سے کچھ حاصل نہیں، گزشتہ آیت میں ضعفاء ومستکبرین (عوام اور لیڈروں) کی گفتگو نقل کی گئی تھی اسی کی مناسبت سے یہاں دوزخیوں کے مہالیڈر (ابلیس لعین) کی تقریر نقل فرمائی چونکہ عوام کا الزام اور ان کی استدعا دونوں جگہ یکساں تھی شاید اسی لیے شیطان کی گفتگو کے وقت اس کا ذکر ضروری نہیں معلوم ہوا، واللہ اعلم، مقصود ان مکالمات کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ لوگ اس افراتفری کا تصور کر کے شیاطین الانس والجن کے اتباع سے باز رہیں۔

وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا

اور داخل کیے گئے جو لوگ ایمان لائے تھے اور کام کیے تھے نیک باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں ہمیشہ رہیں ان میں

بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۭ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾

اپنے رب کے حکم سے [1] ان کی ملاقات ہے وہاں سلام [2]

**خلاصہ تفسیر**: اوپر کفار کے عذاب کا ذکر تھا، اب مضمون کی تکمیل کے لیے اہل ایمان کے ثواب کا ذکر ہے، کیونکہ پیچھے آیت **وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا** میں لفظ **جَمِيْعًا** سب کو شامل ہے، چنانچہ کفار اور مؤمنین کی تفصیل سے اس کی تکمیل ہوگئی۔

اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے وہ ایسے باغوں میں داخل کئے جائیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی (اور) وہ

ان میں اپنے پروردگار کے حکم سے ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (اور) وہاں ان کو سلام اس لفظ سے کیا جائے گا السلام علیکم (یعنی آپس میں بھی اور فرشتوں کی طرف سے بھی اسی طرح سلام ہوگا جیسا کہ دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے: اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا اور: وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یہ بطور مقابلہ کفار کی سزا کے بعد مومنین کا انجام بیان فرمایا۔

**فائدہ:** ۲ حضرت شاہ صاحب: لکھتے ہیں کہ: "دنیا میں "سلام" دعا ہے سلامتی مانگنے کی، وہاں "سلام" کہنا مبارکباد ہے سلامتی ملنے پر"۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾

تونے دیکھا کیسی بیان کی اللہ نے ایک مثال ۱ بات ستھری ۲ جیسے ایک درخت ستھرا ۳ اسکی جڑ مضبوط ہے اور ٹہنے (شاخیں) ہیں آسمان میں ۴

تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۵﴾

لاتا ہے پھل اپنا ہر وقت پر اپنے رب کے حکم سے ۵ اور بیان کرتا ہے اللہ مثالیں لوگوں کے واسطے تاکہ وہ فکر کریں (سوچیں)

**خلاصہ تفسیر:** شروع سے یہاں تک رسالت اور قیامت کا ذکر ہو چکا، نیز گزشتہ آیات میں کافروں اور مومنوں کے اخروی نتائج کا بیان ہوا، اب یہاں کلمہ ایمان وتوحید اور کلمہ کفر وشرک کی مثال بیان فرماتے ہیں۔

کیا آپ کو معلوم نہیں (اب معلوم ہو گیا) کہ اللہ تعالیٰ نے کیسی (اچھی اور موقع کی) مثال بیان فرمائی ہے کلمہ طیبہ کی (یعنی کلمہ توحید وایمان کی) کہ وہ مشابہ ہے ایک پاکیزہ درخت کے (مراد کھجور کا درخت ہے) جس کی جڑ (زمین کے اندر) خوب گڑی ہوئی ہو اور اس کی شاخیں اونچائی میں جارہی ہوں (اور) وہ (درخت) خدا کے حکم سے ہر فصل میں (یعنی جب اس کی فصل آجائے) اپنا پھل دیتا ہو (یعنی خوب پھلتا ہو کوئی فصل ماری نہ جاتی ہو، اس سے مراد کھجور کا درخت ہے، اسی طرح کلمہ توحید یعنی لا الہ الا اللہ کی ایک جڑ ہے یعنی اعتقاد جو مومن کے دل میں مضبوطی کے ساتھ جگہ جاگزیں ہوتا ہے اور اس کی کچھ شاخیں ہیں، یعنی اعمال صالحہ جو ایمان پر مرتب ہوتے ہیں جو مقبول ہو کر آسمان کی طرف لے جائے جاتے ہیں، پھر ان پر رضائے دائمی کا ثمرہ مرتب ہوتا ہے) اور اللہ تعالیٰ (اس قسم کی) مثالیں لوگوں (کے بتلانے) کے واسطے اس لئے بیان فرماتے ہیں تاکہ وہ (لوگ معانی مقصود کو) خوب سمجھ لیں (کیونکہ مثال سے مقصود کی خوب وضاحت ہو جاتی ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا: یعنی دیکھئے اور غور کیجئے، کیسی با موقع اور معنی خیز مثال ہے عقل مند جس قدر اس میں غور کرے سینکڑوں باریکیاں نکلتی چلی آئیں۔

**فائدہ:** ۲ كَلِمَةً طَيِّبَةً: "ستھری بات" میں کلمہ توحید، معرفت الٰہی کی باتیں، ایمان وایمانیات، قرآن، حمد وثناء، تسبیح وتہلیل، سچ بولنا سب داخل ہے۔

**فائدہ:** ۳ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ: اکثر روایات وآثار میں یہاں "ستھرے درخت" کا مصداق کھجور کو قرار دیا ہے، گو دوسرے ستھرے درخت بھی اس کے تحت میں مندرج ہو سکتے ہیں۔

**فائدہ:** ۴ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ: یعنی اس کی جڑیں زمین کی گہرائیوں میں پھیلی ہوئی ہوں کہ زور کا جھکڑ بھی جڑ سے نہ اکھیڑ سکے اور چوٹی آسمان سے لگی ہو یعنی شاخیں بہت اونچی اور زمینی کثافتوں سے دور ہوں۔

**فائدہ:** ۵ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ: یعنی کوئی فصل پھل سے خالی نہ جائے یا فرض کیجیے بارہ مہینے صبح وشام اس پر تازہ پھل لگا کرے۔

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾

اور مثال گندی بات کی ۱ے جیسے درخت گندا ۲ے اکھاڑ لیا (پھینکا) اس کو زمین کے اوپر سے کچھ نہیں اس کو ٹھہراؤ (جماؤ) ۳ے

**خلاصہ تفسیر**: اب کلمہ خبیثہ کی مثال بیان فرماتے ہیں جو نفسانی شہوات ولذات کا خبیث، گندہ اور بدبودار درخت ہے۔

اور گندہ کلمہ کی (یعنی کلمہ کفر وشرک کی) مثال ایسی ہے جیسے ایک خراب درخت ہو (مراد حنظل کا درخت ہے اور وہ تنہ دار نہیں ہوتا، اس کو مجازا درخت کہا گیا ہے) کہ وہ زمین کے اوپر ہی اوپر سے اکھاڑ لیا جائے (اور) اس کو (زمین میں) کچھ ثبات (قرار) نہ ہو۔

**كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ**: کھجور کا پاکیزہ ہونا تو ظاہر ہے، اور حنظل کو خبیثۃ ''خراب'' کہا گیا اس پھل کی بو، مزہ اور رنگ کے اعتبار سے، اور بعض ان نقصانات کے اعتبار سے جو کتب طب میں مذکور ہیں، یہ صفت طیبۃ کے مقابل ہوئی۔

**اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ**: اوپر سے اکھاڑنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی جڑ دور تک نہیں ہوتی اوپر ہی رکھی ہوتی ہے اور یہ اَصْلُهَا ثَابِتٌ کے مقابلہ میں کہا گیا، اور مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ اسی کی تاکید کے لئے فرمایا اور اس کی شاخوں کا اونچا نہ جانا اور اس کے پھل کا میوہ کے اعتبار سے مطلوب نہ ہونا ظاہر ہے یہی حال کلمہ کفر کا ہے کہ اگرچہ کافر کے دل میں اس کی جڑ ہوتی ہے مگر حق کے سامنے ایسی مضمحل اور کمزور ہوتی ہے کہ گویا اس کی جڑ ہی نہیں، اور شاید مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ کی صراحت سے کفر کا یہی اضمحلال ومغلوبیت ہی بتانا مقصود ہو، چونکہ کافر کے اعمال مقبول نہیں ہوتے اس لئے گویا اس درخت کی شاخیں بھی فضاء میں نہیں پھیلیں، اور چونکہ ان کے اعمال پر رضائے الٰہی مرتب نہیں ہوتی اس لئے پھل کی نفی بھی ظاہر ہے، اور چونکہ کافر کے اعمال میں مقبولیت اور رضا کا بالکل احتمال نہیں شاید اسی لئے اس کی تشبیہ میں شاخوں اور پھل کا ذکر بالکل چھوڑ دیا گیا، بخلاف نفس کفر کے کہ اس کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ اس کا وجود محسوس بھی ہے اور احکام جہاد وغیرہ میں معتبر بھی ہے۔

* * *

**فائدہ**: ۱ے **كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ**: کلمہ کفر، جھوٹی بات اور ہر ایک کلام جو خدا تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو **کلمہ خبیثہ** میں داخل ہے۔

**فائدہ**: ۲ے **كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ**: اکثر نے اس سے حنظل (اندرائن) مراد لیا ہے، گو عموم لفظ میں ہر خراب درخت شامل ہو سکتا ہے۔

**فائدہ**: ۳ے **مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ**: یعنی جڑ کچھ نہ ہو، ذرا اشارہ سے اکھڑ جائے، گویا اس کے بودے پن اور ناپائیداری کو ظاہر فرمایا، دونوں مثالوں کا حاصل یہ ہوا کہ مسلمانوں کا دعوائے توحید وایمان پکا اور سچا ہے جس کے دلائل نہایت صاف وصحیح اور مضبوط ہیں، موافق فطرت ہونے کی وجہ سے اس کی جڑیں قلوب کی پہنائیوں میں اتر جاتی ہیں اور اعمال صالحہ کی شاخیں آسمانِ قبول سے جا لگتی ہیں اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ (فاطر:۱۰) اس کے لطیف وشیریں ثمرات سے موحدین کے کام ودہن ہمیشہ لذت اندوز ہوتے ہیں، الغرض حق وصداقت اور توحید ومعرفت کا سدابہار درخت روز بروز پھولتا پھلتا اور بڑی پائیداری کے ساتھ اونچا ہوتا رہتا ہے اس کے برخلاف جھوٹی بات اور شرک وکفر کے دعوائے باطل کی جڑ بنیاد کچھ نہیں ہوتی، ہوا کے ایک جھٹکے میں اکھڑ کر جا پڑتا ہے، ناحق بات ثابت کرنے میں خواہ کتنے ہی زور لگائے جائیں، لیکن انسانی ضمیر اور فطرت کے مخالف ہونے کی وجہ سے اس کی جڑیں دل کی گہرائی میں نہیں پہنچتیں، تھوڑا دھیان کرنے سے غلط معلوم ہونے لگتی ہے، اسی لیے مشہور ہے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے یعنی سچ کی طرح اپنے پاؤں نہیں چلتا، نہ اس سے دل میں نور پیدا ہوتا ہے، امام فخر الدین رازیؒ نے صوفیاء کے طرز پر ان مثالوں کے بیان میں بہت اطناب سے کام لیا ہے، یہاں اس کے نقل کی گنجائش نہیں۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِينَ اٰمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ

مضبوط کرتا ہے اللہ ایمان والوں کو مضبوط بات سے دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں ۱ے

وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴿٢٧﴾

اور بچلا (راہ بھلا) دیتا ہے اللہ بے انصافوں کو ۲ اور کرتا ہے اللہ جو چاہے ۳

**خلاصه تفسیر:** گذشتہ آیتوں میں کلمہ طیبہ (ایمان وتوحید) اور کلمہ خبیثہ (شرک وکفر) کی مثال بیان کی، اب ان دونوں کے اثر اور ثمر کو بیان کرتے ہیں، تاکہ کلمہ توحید کی فضیلت اور کلمہ کفر کی قباحت ظاہر ہو۔

اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو اس پکی بات (یعنی کلمہ طیبہ ثابت الاصل کی برکت) سے دنیا میں اور آخرت (دونوں جگہوں) میں (دین میں اور امتحان میں) مضبوط رکھتا ہے اور (اس کلمہ خبیثہ کی نحوست سے) ظالموں (یعنی کافروں) کو (دنیا وآخرت دونوں جگہ دین میں اور امتحان میں) بچلا دیتا ہے اور (کسی کو ثابت رکھنے اور کسی کو بچلا دینے میں ہزاروں حکمتیں ہیں پس) اللہ تعالیٰ (اپنی حکمت سے) جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

**فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا:** دنیا میں تو اس طرح ثابت قدم رہتا ہے کہ مومن کلمہ طیبہ کی برکت سے شیاطین انس وجن کے اغواء اور گمراہ کرنے سے محفوظ رہتا ہے اور اصحاب اخدود کی طرح جب کفار کی طرف سے کوئی فتنہ اور ابتلا پیش آتا ہے تو بتوفیق خداوندی ایمان پر ثابت قدم رہتا ہے اور جادۂ توحید سے اس کا قدم نہیں پھسلتا اور کوئی فتنہ پیش آئے تو اس کے پائے استقامت میں تزلزل نہیں آتا اور اسی طرح مرنے تک ایمان پر قائم رہتا ہے اور اسی کلمہ پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے۔

**وَفِي الْاٰخِرَةِ:** اور آخرت میں اس طرح ثابت قدم رہتا ہے کہ قبر میں جو آخرت کی پہلی منزل ہے نکیرین کے سوالات کا صحیح جواب دیتا ہے اور قیامت کے ہوشربا دن حساب وکتاب کے وقت اس کو کوئی اندیشہ نہیں، غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ مومنین کو دنیا اور آخرت میں حق پر مضبوط اور ثابت قدم رکھتا ہے، فی الآخرۃ سے قبر اور عالم برزخ مراد ہے جیسا کہ احادیث مرفوعہ اور اقوال صحابہ سے ثابت ہے کہ فی الآخرۃ سے قبر مراد ہے جو آخرت کی پہلی منزل ہے جہاں حق تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو جواب کی تلقین اور حق اور ثواب پر تمکین عطا فرماتا ہے اور امتحان قبر میں اس کو ثابت قدم رکھتا ہے، صحیح بخاری ومسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ آخرت سے مراد اس آیت میں برزخ یعنی قبر کا عالم ہے۔

**وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ:** یعنی کافر اس کلمہ خبیث کی نحوست سے دونوں جگہ اپنے دین ودنیا اور امتحان میں گمراہ ہو جاتے ہیں، دنیا میں تو ان کی گمراہی ظاہر ہے اور قبر میں ان سے جواب نہ بن پڑے گا، بلکہ حیرت زدہ ہو کر کہیں گے: "ھاھا لا ادری"، ہائے! میں کچھ نہیں جانتا، چنانچہ احادیث میں اس کی تصریح ہے، یہاں ایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ سورت مکی ہے اور جبکہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کو سوال وعذاب قبر کا علم مدینہ منورہ میں ہوا تو اس آیت کی تفسیر سوال قبر سے کرنا کیسے صحیح ہے؟ اس اشکال کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اس سورت کی اس خاص آیت کو مدنی مانا جائے اور سورت کا مکی ہونا اکثر اجزاء کے اعتبار سے ہوگا، دوسرا جواب یہ ہے کہ آیت میں لفظ فی الاخرۃ وارد ہوا ہے، اور یہ آیت سوال قبر اور سوال قیامت دونوں کو عام ہے اور لفظ آخرت دونوں کو شامل ہے، کیونکہ آخرت دو ہیں: ایک آخرت قریبہ یعنی عالم قبر وبرزخ اور ایک آخرت بعیدہ یعنی عالم حشر اور قیامت کبریٰ، سو آیت میں لفظ "آخرت" اپنے عموم کی وجہ سے دونوں کو شامل ہے، لیکن اس کی تفسیر کا ایک جز یعنی قیامت میں سوال کا علم تو حضور ﷺ کو مکہ میں دیا گیا، اور دوسرا جز یعنی قبر کا سوال جو مخفی رکھا گیا وہ مدینہ میں بتلا دیا گیا، اور نصوص سے قیامت کے دن بھی سوال ہونا ثابت ہے مگر کفار سے وہ سوال سخت حساب کے طور پر ہوگا اور اہل ایمان سے وہ سوال آسان حساب کے طور پر ہوگا اور اس میں ان کو ثابت قدم رکھ کر اعانت کی جائے گی، اور یہ جو ایک حدیث میں آیا ہے کہ یہ آیت عذاب قبر کے بارہ میں نازل ہوئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی اس سے مفہوم ہوتا ہے، یہ نہیں کہ صرف اسی کا اس میں بیان ہے اور قیامت کے سوال کا بیان نہیں۔

مرنے اور دفن ہونے کے بعد قبر میں انسان کا دوبارہ زندہ ہو کر فرشتوں کے سوالات کا جواب دینا پھر اس امتحان میں کامیابی اور ناکامی پر ثواب یا عذاب کا ہونا قرآن مجید کی تقریباً دس آیات میں اشارہ اور رسول کریم ﷺ کی ستر احادیث متواترہ میں بڑی صراحت ووضاحت کے ساتھ

مذکور ہے جس میں مسلمان کو شک وشبہ کی گنجائش نہیں، رہے وہ عامیانہ شبہات کہ دنیا میں دیکھنے والوں کو یہ ثواب وعذاب نظر نہیں آتے؟ سو اس کے تفصیلی جوابات کی تو یہاں گنجائش نہیں، اجمالاً اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ کسی چیز کا نظر نہ آنا اس کے موجود نہ ہونے کی دلیل نہیں ہوتی، جنات اور فرشتے بھی کسی کو نظر نہیں آتے مگر موجود ہیں، ہوا نظر نہیں آتی مگر موجود ہے، جس کائناتی فضا کا اس زمانہ میں راکٹوں کے ذریعہ مشاہدہ ہورہا ہے وہ اب سے پہلے کسی کو نظر نہ آتی تھی مگر موجود تھی، خواب دیکھنے والا خواب میں کسی مصیبت میں گرفتار ہو کر سخت عذاب میں بے چین ہوتا ہے مگر پاس بیٹھنے والوں کو اس کی کچھ خبر نہیں ہوتی، اصول کی بات یہ ہے کہ ایک عالم کو دوسرے عالم کے حالات پر قیاس کرنا خود غلط ہے، جب خالق کائنات نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دوسرے عالم میں پہنچنے کے بعد اس عذاب وثواب کی خبر دے دی تو اس پر ایمان واعتقاد رکھنا لازم ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ: یعنی حق تعالیٰ توحید وایمان کی باتوں سے جن کی مضبوطی وپائیداری پچھلی مثال میں ظاہر کی گئی مومنین کو دنیا وآخرت میں مضبوط ثابت قدم رکھتا ہے، رہی قبر کی منزل جو دنیا وآخرت کے درمیان برزخ ہے اس کو ادھر یا ادھر جس طرف چاہیں شمار کر سکتے ہیں، چنانچہ سلف سے دونوں قسم کے اقوال منقول ہیں، غرض یہ ہے کہ مومنین دنیا کی زندگی سے لے کر محشر تک اسی کلمہ طیبہ کی بدولت مضبوط اور ثابت قدم رہیں گے، دنیا میں کیسی ہی آفات وحوادث پیش آئیں، کتنا ہی سخت امتحان ہو، قبر میں نکیرین سے سوال وجواب ہو، محشر کا ہولناک منظر ہوش اڑادینے والا ہو، ہر موقع پر یہ ہی کلمہ توحید ان کی پامردی اور استقامت کا ذریعہ بنے گا۔

**فائدہ:** ۲؎ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ: بے انصافوں سے مراد یہاں کفار ومشرکین ہیں، وہ دنیا میں بھی بچلے اور اخیر تک بچلتے رہیں گے کبھی حقیقی کامیابی کا راستہ ہاتھ نہ لگے گا۔

**فائدہ:** ۳؎ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ: یعنی اپنی حکمت کے موافق جیسا معاملہ جس کے ساتھ مناسب ہوتا ہے کرتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿۲۸﴾

تو نے نہ دیکھا ان کو جنہوں نے بدلہ کیا اللہ کے احسان کا ناشکری اور اتارا اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں ۱؎

جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۭ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۲۹﴾

جو دوزخ ہے، داخل ہوں گے اس میں، اور وہ برا ٹھکانا ہے

**خلاصہ تفسیر:** اب مشرکین کی مذمت اور ان کا برا انجام اس بات پر بیان کیا جارہا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے بجائے ناشکری اور کفر کا راستہ اختیار کیا، اور اشارتاً موحدین کی فضیلت اور ان کو نعمت الہیہ کے شکر کی تاکید پھر توحید کے دلائل مذکور ہیں۔

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا (یعنی ان کا حال عجیب ہے) جنہوں نے بجائے نعمت الٰہی (کے شکر) کے کفر کیا (اس سے مراد کفار مکہ ہیں) اور جنہوں نے اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر یعنی جہنم میں پہنچایا (یعنی دوسروں کو بھی کفر کی تعلیم کی جس سے) وہ اس (جہنم) میں داخل ہوں گے اور وہ رہنے کی بری جگہ ہے (اس میں اشارہ ہوگیا کہ ان کا داخل ہونا قرار اور دوام کے لئے ہوگا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ اس سے کفار ومشرکین کے سردار مراد ہیں، خصوصاً رؤسائے قریش جن کے ہاتھ میں اس وقت عرب کی باگ تھی یعنی حق تعالیٰ نے ان پر کیسے احسان کیے، ان کی ہدایت کے لیے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا، قرآن اتارا، اپنے حرم اور بیت کا مجاور بنایا، عرب کی سرداری دی، انہوں نے ان نعمتوں اور احسانات کا بدلہ یہ کیا کہ خدا کی ناشکری پر کمربستہ ہوگئے، اس کی باتوں کو جھٹلایا، اس کے پیغمبر سے لڑائی کی، آخر اپنی قوم کو لے کر تباہی کے گڑھے میں جا گرے۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ﴿۳۰﴾

اور ٹھہرائے اللہ کے لیے مقابل کہ بہکائیں لوگوں کو اس کی راہ سے ۱ تو کہہ مزا اُڑا لو پھر تم کو لوٹنا ہے طرف آگ کے ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور (اوپر جو کہا گیا کہ ان لوگوں نے شکر نعمت کی جگہ کفر کیا، اور اپنی قوم کو جہنم میں پہنچایا، اب ان دونوں کا بیان ہے کہ) ان لوگوں نے اللہ کے ساجھی قرار دیئے تا کہ (دوسروں کو بھی) اس کے دین سے گمراہ کریں (پس ساجھی قرار دینا کفر ہے اور دوسروں کو گمراہ کرنا جہنم میں پہنچانا ہے) آپ (ان سب سے) کہہ دیجئے کہ چندے عیش کر لو، کیونکہ آخر انجام تمہارا دوزخ میں جانا ہے (عیش سے مراد حالت کفر میں رہنا ہے، کیونکہ ہر شخص کو اپنے مذہب میں لذت ہوتی ہے، یعنی اور کچھ عرصہ کفر کر لو یہ دھمکی کے طور پر ہے اور مطلب یہ ہے کہ چونکہ جہنم میں جانا تو تمہارا ضروری ہے، اس واسطے تمہارا کفر سے باز آنا مشکل ہے، خیر! اور چند دن گذار لو، پھر تو اس مصیبت کا سامنا ہوگا ہی)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی خدا کے احسانات سے متاثر ہو کر منعم حقیقی کی شکر گزاری اور اطاعت شعاری میں لگتے، یہ تو نہ ہوا۔ لٹے بغاوت پر کمر بستہ ہو گئے، خدا کے مقابل دوسری چیزیں کھڑی کر دیں جن پر خدائی اختیارات تقسیم کیے اور عبادت جو خدائے واحد کا حق تھا، وہ مختلف عنوانوں سے ان کے لیے ثابت کرنے لگے، تا کہ اس سلسلہ میں اپنے ساتھ دوسروں کی راہ ماریں اور انھیں بہکا کر اپنے دام سیادت میں پھنسائے رکھیں۔

**فائدہ:** ۲ یعنی بہتر ہے، بیوقوفوں کو جال میں پھنسا کر چند روز جی خوش کر لو اور دنیا کے مزے اڑا لو، مگر تابکے۔ خر دوزخ کی آگ میں ہمیشہ رہنا ہے، کیونکہ اس مزے اڑانے کا یہی نتیجہ ہوگا، گو یا یہ جملہ ایسا ہوا جیسے ایک طبیب کسی بد پرہیز مریض کو خفا ہو کر کہے: "كُلْ مَا تُرِيْدُ فَاِنَّ مَصِيْرَكَ اِلَى الْمَوْتِ" جو تیرا جی چاہے کھا کیونکہ ایک دن یہ مرض تیری جان لے کر رہے گا۔

قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً

کہہ دے میرے بندوں کو جو ایمان لائے ہیں قائم رکھیں نماز اور خرچ کریں ہماری دی ہوئی روزی میں سے پوشیدہ اور ظاہر (چھپے اور کھلے) ۱

مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ ﴿۳۱﴾

پہلے اس سے کہ آئے دن جس میں نہ سودا (خرید و فروخت) ہے نہ دوستی ۲

**خلاصہ تفسیر:** مشرکین کو وعید اور دھمکی سنانے کے بعد اب اپنے خاص بندوں کو بشارتاً فضیلت، انہیں ہدایت یعنی نعم الہیہ کے شکر کی تاکید بیان فرماتے ہیں۔

(اور) جو میرے خاص ایمان والے بندے ہیں (ان کو اس کفر نعمت کے وبال پر متنبہ کر کے اس سے محفوظ رکھنے کے لئے) ان سے کہہ دیجئے کہ وہ (نعمت الٰہی کے اس طرح شکر گذار رہیں کہ) نماز کی پابندی رکھیں اور ہم نے جو کچھ ان کو دیا ہے اس میں سے (شرعی قواعد کے مطابق) پوشیدہ اور آشکارا (جیسا موقع ہو) خرچ کیا کریں ایسے دن کے آنے سے پہلے پہلے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی ہوگی (مطلب یہ کہ عبادات بدنیہ و مالیہ کو ادا کرتے رہیں کہ نعمت الٰہی کے شکر کا طریقہ یہی ہے)۔

**قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا:** اس آیت میں مؤمنین کی کئی طرح مدح کی گئی ہے: ① ایک تو ان کو الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یعنی مؤمن سے تعبیر فرمایا ② دوسرے انہیں عِبَادِيْ یعنی میرے خاص بندے فرمایا ③ پھر انہیں براہ عنایت شکر کی ترغیب دے کر ناشکری کی بڑی آفت سے بچایا، تمہید میں اشارتاً سے یہی مراد ہے۔

**يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ:** اس آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ قیامت کے روز کسی کی دوستی کسی کے کام نہ آئے گی، اس کا مطلب یہ ہے کہ

محض دنیاوی دوستیاں اس روز کام نہ آئیں گی، لیکن جن لوگوں کی دوستی اور تعلقات اللہ کے لئے اور اس کے دین کے کاموں کے لئے ہوں ان کی دوستی اس وقت بھی کام آئے گی کہ اللہ کے نیک اور مقبول بندے دوسروں کی شفاعت کریں گے، جیسا کہ احادیث کثیرہ میں منقول ہے اور قرآن عزیز میں ارشاد ہے: اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَىٕذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ یعنی وہ لوگ جو دنیا میں باہم دوست تھے اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے کہ یہ چاہیں گے کہ دوست پر اپنا گناہ ڈال کر خود بری ہو جائیں، مگر وہ لوگ جو تقوی شعار ہیں، کیونکہ اہل تقوی وہاں بھی ایک دوسرے کی مدد بطریق شفاعت کر سکیں گے، اس کے متعلق مزید کچھ تحقیق تیسرے پارے کے شروع میں بیان کی گئی ہے وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ کفار کے احوال ذکر کرنے کے بعد مومنین مخلصین کو متنبہ فرماتے ہیں کہ وہ پوری طرح بیدار رہیں، وظائف عبودیت میں ذرا فرق نہ آنے دیں، دل و جان سے خالق کی عبادت اور مخلوق کی خدمت کریں کہ وہ بھی بہترین عبادت ہے، نمازوں کو ان کے حقوق و حدود کی رعایت کے ساتھ خشوع وخضوع سے ادا کرتے رہیں، خدا نے جو کچھ دیا ہے اس کا ایک حصہ خفیہ یا اعلانیہ مستحقین پر خرچ کریں، غرض کفار جو شرک اور کفران نعمت پر تلے ہوئے ہیں ان کے بالمقابل مومنین کو جان و مال سے حق تعالیٰ کی طاعت و شکر گزاری میں مستعدی دکھلانا چاہیے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی نماز اور انفاق فی سبیل اللہ وغیرہ نیکیاں اس دن کام آئیں گی، بیع وشراء یا محض دوستانہ تعلقات سے کام نہ نکلے گا، یعنی نہ وہاں نیک عمل کہیں سے خرید کر لا سکو گے نہ کوئی ایسا دوست بیٹھا ہے جو بدون ایمان و عمل صالح کے محض دوستانہ تعلقات کی بنا پر نجات کی ذمہ داری کر لے۔

**ربط:** پہلے کفار کی ناشکری کا ذکر تھا، پھر مومنین کو مراسم طاعت کی اقامت کا حکم دے کر شکر گزاری کی طرف ابھارا، آگے چند عظیم الشان نعمائے الٰہیہ کا ذکر فرماتے ہیں جو ہر مومن و کافر کے حق میں عام ہیں، تاکہ انھیں سن کر مومنین کو شکر گزاری کی مزید ترغیب ہو اور کفار بھی غور کریں تو اپنے دل میں شرمائیں کہ وہ کیسے بڑے منعم و محسن شہنشاہ سے بغاوت کر رہے ہیں، اسی ضمن میں خدا تعالیٰ کی عظمت و وحدانیت کے دلائل بھی بیان ہو گئے، ممکن ہے انھیں سن کر کوئی عاقل منصف شرکیات سے باز آ جائے، یا عظمت و جبروت کے نشانات میں غور کر کے اس کی گرفت اور سزا سے ڈر جائے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ

اللہ وہ ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین اور اتارا آسمان سے پانی ۱؎ پھر اس سے نکالی روزی تمہاری میوے ۲؎

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ﴿۳۲﴾

اور کہنے میں کیا (کام میں دیں) تمہارے کشتی (کشتیاں) کو کہ چلے (چلیں) دریا میں اسکے حکم سے ۳؎ اور کام میں لگایا (لگا دیں) تمہارے ندیوں (ندیاں) کو

**خلاصہ تفسیر:** اب توحید کے دلائل کے طور پر منعم حقیقی کے اوصاف بیان کرتے ہیں، کیونکہ منعم حقیقی اور اس کی ذات وصفات کی معرفت ہی سب سے بڑی نعمت وسعادت ہے، چنانچہ اب منعم حقیقی کے دس اوصاف بیان کرتے ہیں۔

اللہ ایسا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اس پانی سے پھلوں کی قسم سے تمہارے لئے رزق پیدا کیا اور تمہارے نفع کے واسطے کشتی (اور جہاز) کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا تاکہ وہ خدا کے حکم (وقدرت) سے دریا میں چلے (اور تمہاری تجارت اور سفر کی غرض حاصل ہو) اور تمہارے نفع کے واسطے نہروں کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا (تاکہ اسی سے پانی پیو اور آب پاشی کرو اور اس میں کشتی چلاؤ)۔

**وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً:** آسمان سے پانی نازل پر بعض کو یہ شبہ ہوا ہے کہ بعض اوقات اونچے پہاڑوں پر کھڑے ہونے سے نیچے پانی برستا ہوا نظر آتا ہے اور اوپر والا خشک کھڑا رہتا ہے، اگر آسمان سے پانی برستا تو اس کے اوپر بھی برستا، مگر یہ شبہ نہایت لچر ہے، ممکن ہے کہ آسمان سے فرشتوں کی معرفت وہ پانی بادل میں آ جائے، پھر بادل سے برستا ہو، اوپر سے نہ برستا ہو، اور ہم بارش میں بخارات کے دخل ہونے کا انکار نہیں کرتے ممکن ہے کہ ان کو بھی دخل ہو۔

* * *

**فائدہ: ۱؎ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً:** یعنی آسمان کی طرف سے پانی اتارا، یا یہ مطلب ہو کہ بارش کے آنے میں بخارات وغیرہ ظاہری اسباب کے علاوہ غیر مرئی سماوی اسباب کو بھی دخل ہے، دیکھو آفتاب کی شعاعیں تمام اشیاء کی طرح آتشیں شیشہ پر بھی پڑتی ہیں لیکن وہ اپنی مخصوص ساخت اور استعداد کی بدولت انہی شعاعوں سے غیر مرئی طور پر اس درجہ حرارت کا استفادہ کرتا ہے جو دوسری چیزیں نہیں کرتیں، چاند سمندر سے کتنی دور ہے، مگر اس کے گھٹنے بڑھنے سے سمندر کے پانی میں جز رومد پیدا ہو جاتا ہے، اسی طرح اگر بادل بھی کسی سماوی خزانہ سے غیر محسوس طریقہ پر مستفید ہوتا ہو تو انکار کی کون سی وجہ ہے۔

**فائدہ: ۲؎ فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ:** یعنی حق تعالیٰ نے اپنے کمال قدرت وحکمت سے پانی میں ایک قوت رکھی جو درختوں اور کھیتوں کے نشوونما اور بارآور ہونے کا سبب بنتی ہے، اسی کے ذریعہ سے پھل اور میوے ہمیں کھانے کو ملتے ہیں۔

**فائدہ: ۳؎ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ:** یعنی سمندر کی خوفناک لہروں میں ذراسی کشتی پر سوار ہو کر کہاں سے کہاں پہنچتے ہو اور کس قدر تجارتی یا غیر تجارتی فوائد حاصل کرتے ہو، یہ خدا ہی کی قدرت اور حکم سے ہے کہ سمندر کے تھپیڑوں میں ذراسی ڈونگی کو ہم جدھر چاہیں لیے پھرتے ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ﴿٣٣﴾

اور کام میں لگا دیا تمہارے سورج اور چاند کو ایک دستور پر برابر، اور کام میں لگا دیا تمہارے رات اور دن کو

**خلاصہ تفسیر:** اور تمہارے نفع کے واسطے سورج اور چاند کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا جو ہمیشہ چلنے ہی میں رہتے ہیں (تاکہ تمہیں روشنی اور گرمی وغیرہ کا فائدہ ہو) اور تمہارے نفع کے واسطے رات اور دن کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا (تاکہ تمہیں معیشت اور آسائش کا نفع حاصل ہو)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی ندیوں میں پانی کا آنا اور کہیں سے کہیں پہنچنا گو کشتی کی طرح تمہارے کہنے میں نہیں، تاہم تمہارے کام میں وہ بھی لگی ہوئی ہیں، اسی طرح چاند سورج جو ایک معین نظام اور ضابطہ کے موافق برابر چل رہے ہیں، کبھی تھکتے نہیں نہ رفتار میں فرق پڑتا ہے، یا رات اور دن ایک دوسرے کے پیچھے ٹھہری ہوئی عادت کے موافق ہمیشہ چلے آتے ہیں یہ سب چیزیں گو اس معنی سے تمہارے قبضہ میں نہیں کہ تم جب چاہو اور جدھر چاہو ان کی قدرتی حرکت وتاثیر کو پھیر دو تاہم تم بہت سے تصرفات وتدابیر کر کے ان کے اثرات سے بیشمار فوائد حاصل کرتے ہو اور انسانی تصرف وتدبیر سے قطع نظر کر کے بھی وہ قدرتی طور پر ہر وقت تمہاری کسی نہ کسی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، تم سوتے ہو، وہ تمہارا کام کرتے ہیں، تم چین سے بیٹھے ہو، وہ تمہارے لیے سرگرداں ہیں۔

وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿٣٤﴾ ع

اور دیا تم کو ہر چیز میں سے جو تم نے مانگی ۱؎ اور اگر گنو احسان اللہ کے نہ پورے کر سکو ۲؎ بیشک آدمی بڑا بے انصاف ہے ناشکرا ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** اور جو جو چیز تم نے مانگی (بشرطیکہ وہ تمہارے مناسب حال بھی ہوئی) تم کو ہر چیز دی اور (مذکورہ اشیاء ہی پر کیا منحصر ہے) اللہ تعالیٰ کی نعمتیں (تو اس قدر بے شمار ہیں کہ) اگر (ان کو) شمار کرنے لگو تو شمار میں نہیں لا سکتے (مگر) سچ یہ ہے کہ آدمی بہت ہی بے انصاف بڑا ہی ناشکرا ہے (اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر اور شکر نہیں کرتا، بلکہ اس کے برعکس کفر ومعصیت کرنے لگتا ہے جیسا پیچھے گذرا ہے: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا)۔

**وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ:** اس کی وضاحت میں جو قید لگائی کہ "وہ مناسب حال ہو" اس سے یہ شبہ دور ہو گیا کہ بعض دعائیں ہم مانگتے ہیں اور وہ بظاہر قبول نہیں ہوتیں، سو وہ حکمت الٰہیہ میں اس سائل کے مناسب نہیں ہوتی، یعنی عموماً انسان جو کچھ مانگتا اور طلب کرتا ہے اکثر تو اس کو

دے ہی دیا جاتا ہے اور جہاں کہیں اس کا سوال اپنی ظاہری صورت میں پورا نہیں کیا جاتا اس میں اس شخص کے لئے یا پورے عالم کے لئے کوئی مصلحت ہوتی ہے جس کا اس کو علم نہیں ہوتا مگر علیم وخبیر جانتے ہیں کہ اگر اس کا یہ سوال پورا کر دیا گیا تو خود اس کے لئے یا اس کے خاندان کے لئے یا پورے عالم کے لئے وبال جان بن جائے گا ایسی صورت میں سوال کا پورا نہ کرنا ہی بڑی نعمت ہوتی ہے مگر انسان اپنے قصور علم کی وجہ سے اس کو نہیں جانتا اس لئے غمگین ہوتا ہے، اور بعض نے یہ جواب بھی دیا ہے کہ اس آیت میں لفظ ''کل'' کثرت کو بیان کرنے کے لیے ہے نہ کہ عموم کے لیے، یعنی اللہ تعالی نے ہمیں بہت سارے انعامات سے نوازا ہے، جیسا کہ فتحنا علیھم ابواب کل شیئ میں بھی لفظ ''کل'' کثرت کو بیان کرنے کے لیے ہے۔

**وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا:** یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس آیت کے شروع میں پہلے فرمایا: **وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ** کہ تم کو ہر چیز دی تو اس میں تمام نعمتیں آ گئیں، پھر آگے اس کے کیا معنی کہ خدا کی نعمتیں شمار سے باہر ہیں؟ جواب یہ ہے کہ: **كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ** سے فقط وہ نعمتیں مراد ہیں جن کا سوال کیا گیا، غیر مسئولہ نعمتیں تو اس میں داخل نہیں، اس لیے: **وَاِنْ تَعُدُّوْا** میں وہ سب مسئولہ وغیر مسئولہ نعمتیں داخل ہوگئیں۔

**وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا:** اللہ تعالی کی نعمتیں صرف اس کے مطیع اور فرماں بردار کو ہی حاصل نہیں، بلکہ اہل دوزخ پر بھی ان نعمتوں کا اثر ظاہر ہوگا، چنانچہ روح المعانی میں ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ اللہ تعالی کا اہل دوزخ پر بھی احسان ہے، کیونکہ وہ آگ سے بھی زیادہ سخت عذاب دینے پر قادر ہے، یعنی اہل دوزخ جس عذاب میں مبتلا ہوں گے اللہ تعالی اس سے زیادہ عذاب دینے پر قادر ہونے کے باوجود اسی عذاب میں رکھیں گے۔

**اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ:** شبہ ہوتا ہے کہ ہر انسان تو ناشکرا نہیں ہوتا، شکر گذار بھی بہت ہوتے ہیں، جواب یہ ہے کہ یہاں جنس انسان مراد ہے اگر چہ بعض افراد کے اعتبار سے سہی۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی جو چیزیں تم نے زبان قال یا حال سے طلب کیں، ان میں ہر چیز کا جس قدر حصہ حکمت ومصلحت کے موافق تھا مجموعی طور پر تم سب کو دیا۔

**فائدہ:** ۲ یعنی خدا کی نعمتیں اتنی بے شمار بلکہ غیر متناہی ہیں کہ اگر تم سب مل کر اجمالاً ہی گنتی شروع کرو تو تھک کر اور عاجز ہو کر بیٹھ جاؤ، اس موقع پر امام رازی نے نعمائے الٰہیہ کا بیشمار ہونا، اور علامہ ابوالسعود نے ان کا غیر متناہی ہونا ذرا بسط سے بیان فرمایا ہے اور صاحب روح المعانی نے ان کے بیانات پر مفید اضافہ کیا، یہاں اس قدر تطویل کی گنجائش نہیں۔

**فائدہ:** ۳ یعنی جنس انسان میں بہتیرے بے انصاف اور ناسپاس ہیں، جو اتنے بے شمار احسانات دیکھ کر بھی منعم حقیقی کا حق نہیں پہچانتے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝٣٥

اور جس وقت کہا ابراہیم نے ۱ اے رب کر دے اس شہر کو امن والا اور دور رکھ مجھ کو اور میری اولاد کو اس بات سے کہ ہم پوجیں مورتوں کو ۲

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ

اے رب انہوں نے گمراہ کیا (گم راہی میں ڈالا) بہت لوگوں کو ۳ سو (جو کوئی تیرے رستہ پر چلا) جس نے پیروی کی میری سو وہ تو میرا ہے

وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝٣٦

اور جس نے میرا کہنا نہ مانا سو تو بخشنے والا مہربان ہے ۴

**خلاصہ تفسیر:** پچھلی آیات میں عقیدہ توحید کی معقولیت اور اہمیت کا اور شرک کی جہالت اور مذمت کا بیان تھا، توحید کے معاملہ

میں انبیاء علیہم السلام میں سب سے زیادہ کامیاب جہاد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تھا اسی لئے دین ابراہیمی کو خاص طور پر دین حنیف کا نام دیا جاتا ہے، ایک مناسبت یہ بھی ہے کہ چند آیات قبل الَّذِیۡنَ بَدَّلُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ کُفۡرًا میں قریش مکہ کے ان لوگوں کی مذمت بیان کی گئی تھی جنہوں نے تقلید آبائی کی بناء پر ایمان کو کفر سے اور توحید کو شرک سے بدل ڈالا تھا، ان آیات میں ان کو بتلایا گیا کہ تمہارے جد امجد ابراہیم علیہ السلام کا عقیدہ اور عمل کیا تھا تاکہ تقلید آبائی کے خوگر اسی پر نظر کر کے اپنے کفر سے باز آجائیں۔

اور (وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جب کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے (حضرت اسماعیل اور حضرت ہاجرہ کو بحکم الٰہی میدان مکہ میں لاکر رکھنے کے وقت دعاء کے طور پر) کہا کہ اے میرے رب! اس شہر (مکہ) کو امن والا بنا دیجئے (کہ اس کے رہنے والے مستحق امن رہیں یعنی اس کو حرم بنا دیجیے) اور مجھ کو اور میرے خاص فرزندوں کو بتوں کی عبادت سے (جو کہ اس وقت جہلاء میں مشہور ہے) بچائے رکھئے (جیسا اب تک بچائے رکھا)۔

اے میرے پروردگار! (میں بتوں کی عبادت سے بچنے کی دعاء اس لئے کرتا ہوں کہ) ان بتوں نے بہتیرے آدمیوں کو گمراہ کر دیا (یعنی ان کی گمراہی کا سبب ہو گئے، اس لئے ڈر کر آپ کی پناہ چاہتا ہوں اور میں جس طرح اولاد کے بچنے کی دعاء کرتا ہوں اسی طرح ان کو کہتا سنتا بھی رہوں گا) پھر (میرے کہنے سننے کے بعد) جو شخص میری راہ پر چلے گا وہ تو میرا ہے (اور اس کے لئے وعدہ مغفرت ہے ہی) اور جو شخص (اس باب میں) میرا کہنا نہ مانے (سو اس کو آپ ہدایت فرمائیے کیونکہ) آپ تو کثیر المغفرت (اور) کثیر الرحمۃ ہیں (ان کی مغفرت و رحمت کا سامان بھی کر سکتے ہیں کہ ان کو ہدایت دیں، مقصود اس دعاء سے مؤمنین کے لئے شفاعت ہے اور غیر مؤمنین کے لئے طلب ہدایت ہے)۔

رَبِّ اجۡعَلۡ ھٰذَا الۡبَلَدَ اٰمِنًا: مکہ کو امن والا بنانا، چنانچہ پہلی دعا اس طرح قبول ہوئی کہ وہ حرم ہو گیا، جس میں قتل و غارت حتی کہ جانور اور نباتات کا تلف کرنا بھی حرام ہو گیا اور حدیث میں اسی کو فرمایا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم بنوایا، خلاصہ تفسیر میں ''مستحق امن'' سے اس لیے تفسیر کی کہ اگر کوئی امن کو توڑے تب بھی ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا قبول نہ ہونا اس سے لازم نہیں آتا۔

وَّاجۡنُبۡنِیۡ وَبَنِیَّ اَنۡ نَّعۡبُدَ الۡاَصۡنَامَ: دوسری دعا اس طرح قبول ہوئی کہ ان کے خاص صلبی فرزند اس سے محفوظ رہے، باقی بعد والوں کے شرک سے کوئی اشکال لازم نہیں آتا، یہاں ایک شبہ ہوتا ہے کہ **واجنبنی** اپنے لیے کہنے کا کیا مطلب؟ حالانکہ ابراہیم علیہ السلام تو شرک سے ہمیشہ سے منزہ اور بری تھے؟ جواب یہ ہے کہ مقصود بت پرستی سے بچنے کا دوام و استمرار تھا، جیسا کہ خلاصہ تفسیر میں ترجمہ سے ظاہر ہے، اس پر یہ سوال ہوتا ہے کہ ان کے لیے یہ دوام و استمرار بھی تو بوجہ نبوت و عصمت کے یقینی امر تھا، پھر اس کی طلب کا کیا معنی؟ اس کا جواب روح المعانی کی تحقیق کے مطابق یہ ہے کہ عصمت کا لزوم توفیق الٰہی کی وجہ سے ہے، یہ طبعی امر نہیں ہے، اس وجہ سے بچاؤ اور حفاظت کی طلب ضروری ہے، یعنی طبعی خوف کے اثر سے انبیاء علیہم السلام بھی ہر وقت اپنے کو خطرہ میں محسوس کرتے رہتے ہیں، یا یہ کہ اصل مقصود اپنی اولاد کو شرک و بت پرستی سے بچانے کی دعاء کرنا تھا اولاد کو اس کی اہمیت سمجھانے کے لئے اپنے آپ کو بھی دعا میں شامل فرمالیا۔

وَّاجۡنُبۡنِیۡ وَبَنِیَّ اَنۡ نَّعۡبُدَ الۡاَصۡنَامَ: اس میں دلالت ہے کہ انبیاء کرام بھی بے خوف نہیں ہیں، جہاں وہ اپنی اولاد کے لیے شیطان سے پناہ طلب کر رہے ہیں وہاں پہلے خود اپنی ذات کے لیے بھی پناہ طلبی کرتے ہیں، اس کے بعد پھر ان لوگوں کا کیا کہنا جو ہر وقت نفس و شیطان کے پھندوں میں پھنسے رہتے ہیں، سو کسی کو بھی اپنے حال و کمال پر ناز نہیں کرنا چاہیے۔

* * *

**فائدہ: لہ وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰھِیۡمُ**: روسائے قریش جن کی ناشکر گزاری اور شرک و کفر کا بیان اوپر: اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ بَدَّلُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ کُفۡرًا وَّاَحَلُّوۡا قَوۡمَھُمۡ دَارَ الۡبَوَارِ میں ہوا تھا، انھیں ابراہیم علیہ السلام کا قصہ یاد دلا کر متنبہ کرتے ہیں کہ تم جن کی اولاد میں ہونے کی وجہ سے کعبۃ اللہ اور حرم شریف کے مجاور بنے بیٹھے ہو، انہوں نے اس کعبہ کی بنیاد خالص توحید پر رکھی تھی، ان ہی کی دعاؤں سے خدا تعالیٰ نے یہ شہر مکہ آباد کیا اور پتھر یلے ریگستان

میں ظاہری و باطنی نعمتوں کے ڈھیر لگا دیے، وہ دنیا سے یہ ہی دعائیں اور وصیتیں کرتے ہوئے رخصت ہوئے کہ ان کی اولاد شرک کا طریقہ اختیار نہ کرے، اب تم کو سوچنا اور شرمانا چاہیے کہ کہاں تک ان کی وصایا کا پاس کیا یا ان کی دعا سے حصہ پایا اور کس حد تک خدا تعالیٰ کے احسانات پر شکر گزار رہوئے۔

**فائدہ:** ۲ وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ : یعنی مکہ کو "حرم آمن" بنا دے (چنانچہ خدا نے بنا دیا) نیز مجھ کو اور میری اولاد کو ہمیشہ بت پرستی سے دور رکھ، غالباً یہاں "اولاد" سے خاص صلبی اولاد مراد ہے سو آپ کی صلبی اولاد میں یہ مرض نہیں آیا اور اگر عام ذریت مراد ہو تو کہا جائے گا کہ دعا بعض کے حق میں قبول نہیں ہوئی، باوجودیکہ حضرت ابراہیم معصوم پیغمبر تھے، مگر یہ دعا کا ادب ہے کہ دوسروں سے پہلے آدمی اپنے لیے دعا کرے، اس قسم کی دعائیں جو انبیاء سے منقول ہوں ان میں یہ اشارہ ہوتا ہے کہ پیغمبروں کی عصمت بھی خود ان کی پیدا کی ہوئی نہیں بلکہ حق تعالیٰ کی حفاظت وصیانت سے ہے، اس لیے وہ ہمیشہ اسی کی طرف التجا کرتے ہیں جو ان کی عظمت کا ضامن و کفیل ہوا ہے۔

**تنبیہ:** حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ کے نزدیک ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعائیں مکہ کی آبادی اور تعمیر کعبہ کے بعد کی ہیں، سورہ بقرہ میں اول پارہ کے ختم پر جس دعا کا ذکر ہے وہ البتہ بنائے کعبہ کے وقت حضرت اسمٰعیل کی معیت میں ہوئی، یہ دعائیں اسکے بہت زمانہ بعد پیرانہ سالی میں کی گئی۔

**فائدہ:** ۳ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ: یعنی یہ پتھر کی مورتیاں بہت آدمیوں کی گمراہی کا سبب ہوئیں۔

**فائدہ:** ۴ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ : یعنی جس نے توحید خالص کا راستہ اختیار کیا اور میری بات مانی وہ میری جماعت میں شامل ہے، جس نے کہنا نہ مانا اور ہمارے راستہ سے علیحدہ ہو گیا تو آپ اپنی بخشش اور مہربانی سے اس کو توبہ کی توفیق دے سکتے ہیں، آپ کی مہربانی ہو تو وہ ایمان لا کر اپنے کو رحمت خصوصی اور نجات ابدی کا مستحق بنا سکتا ہے، یا یہ مطلب ہو کہ آپ کو قدرت ہے اسے بھی بحالت موجودہ بخش دیں گو آپ کی حکمت سے اسکا وقوع نہ ہو۔

**تنبیہ:** سورہ مائدہ کے آخر میں ہم نے حضرت خلیل علیہ السلام کے اس قول اور مسیح علیہ السلام کے مقولے میں فرق بیان کیا ہے وہاں ملاحظہ کر لیا جائے۔

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا

اے رب میں نے بسایا ہے اپنی ایک اولاد کو میدان میں کہ جہاں کھیتی نہیں تیرے محترم (حرمت والے) گھر کے پاس، اے رب ہمارے تاکہ قائم رکھیں

الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۝۳۷

نماز کو سو رکھ بعضے لوگوں کے دل کہ مائل ہوں (جھکتے رہیں) ان کی طرف اور روزی دے ان کو میووں سے شاید وہ شکر کریں

**خلاصہ تفسیر:** اے ہمارے رب! میں اپنی اولاد (یعنی اسماعیل علیہ السلام اور ان کے واسطے سے ان کی نسل) کو آپ کے معظم گھر (یعنی خانہ کعبہ) کے قریب (جو کہ پہلے سے یہاں بنا ہوا تھا اور ہمیشہ سے لوگ اس کا ادب کرتے آئے تھے) ایک (چھوٹے سے) میدان میں جو (پتھریلا میدان ہونے کی وجہ سے) زراعت کے قابل (بھی) نہیں آباد کرتا ہوں، اے ہمارے رب! (بیت الحرام کے پاس ان کو اس لئے آباد کرتا ہوں) تاکہ وہ لوگ نماز کا (خاص) اہتمام رکھیں (اور چونکہ یہ اس وقت چھوٹا سا میدان ہے) تو آپ کچھ لوگوں کے قلوب ان کی طرف مائل کر دیجئے (کہ یہاں آ کر آباد ہو جائیں، تاکہ آبادی پر رونق ہو جائے) اور (چونکہ یہاں زراعت وغیرہ نہیں ہے اس لئے) ان کو (محض اپنی قدرت سے) پھل کھانے کو دیجئے تاکہ یہ لوگ (ان نعمتوں کا) شکر کریں۔

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ: حق تعالیٰ کی عادت ہے کہ وہ اپنے خاص مقبولین کے بڑے بڑے امتحان لیتا ہے تاکہ اسے سب مخلوق سے یکسو کر دے، اسی لیے حق تعالیٰ نے اپنے خلیل علیہ السلام کو یہ حکم کیا کہ اپنی ذریت کو ایسی وادی میں رکھے جہاں پانی تک نہ ہو، تاکہ خالص اسی پر اعتماد ہو، کیونکہ وہاں ایسے اسباب ہی نہ تھے جس پر نظر ہوتی، بعض متشدد لوگوں نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے اس عمل سے استدلال کیا کہ اپنے بیوی

بچوں کو عبادت وریاضت کی خاطر اللہ پر توکل کر کے ایسی جگہ رکھنا جائز ہے جہاں کھانے پینے کا ساز وسامان نہ ہو، لیکن یہ استدلال بالکل غلط وباطل ہے، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وحی الٰہی کی ہدایت پر عمل کیا تھا، اپنی طرف سے نہیں، لہٰذا اس کی نقل کرنا صحیح نہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ حضرت ہاجرہ نے پوچھا کہ کیا آپ کو خدا تعالیٰ نے حکم دیا ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ہاں! تو حضرت ہاجرہ نے فرمایا کہ پھر وہ اللہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔

**رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ:** تیسری دعا کا قبول ہونا ظاہر ہے کہ آپ کی اولاد میں بہت عابد ہوئے بلکہ آپ سید العابدین ہوئے۔

**اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ:** چوتھی دعا بھی قبول ہوئی، چنانچہ پہلے قبیلہ جرہم نے وہاں آکر سکونت اختیار کی، پھر مختلف زمانوں میں لوگ آفاق عالم سے آکر وہاں بس گئے، اس میں دلالت ہے کہ اپنے اہل وعیال کے لیے بقدر ضرورت مال وجاہ کا طلب کرنا مذموم نہیں، خصوصاً جبکہ دین میں اعانت کے لیے ہو، ابن عطاءؒ نے فرمایا ہے کہ جو شخص مخلوق سے بالکل منقطع ہو جاتا ہے تو حق تعالیٰ لوگوں کے قلوب کو اس کی طرف متوجہ کر دیتا ہے اور اس کی محبت ان کے قلوب میں ڈال دیتا ہے۔

**وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ:** یہ دعا دوطرح قبول ہوئی، ایک طائف میں پیداوار کی کثرت، دوسرے دیگر بلاد وامصار سے آمد۔

* * *

**فائدہ:** یعنی اسماعیل علیہ السلام کو، کیونکہ دوسری اولاد حضرت اسحاق وغیرہ شام میں تھے، خدا تعالیٰ کے حکم سے آپ حضرت اسماعیل کو بحالت شیر خوارگی اور ان کی والدہ ہاجرہ کو یہاں چٹیل میدان میں چھوڑ کر چلے گئے تھے، بعدہ قبیلہ جرہم کے کچھ لوگ وہاں پہنچے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل کو تشنگی اور ہاجرہ کی بیتابی کو دیکھ کر فرشتے کے ذریعہ سے وہاں زمزم کا چشمہ جاری کر دیا، جرہم کے خانہ بدوش لوگ پانی دیکھ کر اتر پڑے اور ہاجرہ کی اجازت سے وہیں بسنے لگے، اسمٰعیل علیہ السلام جب بڑے ہوئے تو اسی قبیلہ میں ان کی شادی ہوئی، اس طرح جہاں آج مکہ ہے ایک بستی آباد ہوگئی، حضرت ابراہیم گاہ بگاہ ملک شام سے تشریف لایا کرتے تھے اور اس شہر اور شہر کے باشندوں کے لیے دعا فرماتے، کہ خداوندا! میں نے اپنی ایک اولاد کو اس بنجر اور چٹیل آبادی میں تیرے حکم سے تیرے معظم ومحترم گھر کے پاس لا کر بسایا ہے تاکہ یہ اور اس کی نسل تیرا اور تیرے گھر کا حق ادا کریں تو اپنے فضل سے کچھ لوگوں کے دل ادھر متوجہ کر دے کہ وہ یہاں آئیں جس سے تیری عبادت ہو اور شہر کی رونق بڑھے، نیز ان کی روزی اور دل جمعی کے لیے غیب سے ایسا سامان فرما دے کہ (غلہ اور پانی جو ضروریات زندگی ہیں ان سے گزر کر) عمدہ میوے اور پھلوں کی یہاں افراط ہو جائے تاکہ یہ لوگ اطمینان قلب کے ساتھ تیری عبادت اور شکر گزاری میں لگے رہیں، حق تعالیٰ نے یہ سب دعائیں قبول فرمائیں، آج تک ہر سال ہزاروں لاکھوں آدمی مشرق ومغرب سے، کھنچ کھنچ کر وہاں جاتے ہیں، اعلیٰ قسم کے میوے اور پھلوں کی مکہ میں وہ افراط ہے جو شاید دنیا کے کسی حصہ میں نہ ہو، حالانکہ خود مکہ میں ایک بھی ثمردار درخت موجود نہ ہوگا، بعض سلف سے منقول ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے دعا میں اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ (کچھ آدمیوں کے دل) کہا تھا، ورنہ سارا جہاں ٹوٹ پڑتا۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ۭ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ ۳۸

اے رب ہمارے تُو تو جانتا ہے جو کچھ ہم کرتے ہیں چھپا کر اور جو کچھ کرتے ہیں دکھا (کھول) کر، اور مخفی نہیں اللہ پر کوئی چیز زمین میں نہ آسمان میں

**خلاصہ تفسیر:** اے ہمارے رب! (یہ دعائیں محض اپنی بندگی اور حاجت مندی کے اظہار کے لئے ہیں آپ کو اپنی حاجات کی اطلاع دینا مقصود نہیں، کیونکہ) آپ کو تو سب کچھ معلوم ہے جو ہم اپنے دل میں رکھیں اور جو ظاہر کر دیں اور (ہمارے ظاہر وباطن پر کیا حصر ہے) اللہ تعالیٰ سے (تو) کوئی چیز بھی مخفی نہیں نہ زمین میں اور نہ آسمان میں۔

* * *

**فائدہ:** یعنی زمین وآسمان کی کوئی چیز آپ سے پوشیدہ نہیں، پھر ہمارا ظاہر وباطن کیسے مخفی رہ سکتا ہے، یہ جو فرمایا: "جو ہم کرتے ہیں چھپا کر اور جو کرتے ہیں دکھا کر"، اس میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں لیکن تخصیص کی کوئی وجہ نہیں، الفاظ عام ہیں جو سب کھلی چھپی چیزوں کو شامل ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ظاہر میں دعا کی سب اولاد کے واسطے اور دل میں دعا منظور تھی پیغمبر آخر الزمان کی۔

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡ وَهَبَ لِیۡ عَلَی الۡکِبَرِ اِسۡمٰعِیۡلَ وَاِسۡحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ لَسَمِیۡعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾

شکر ہے اللہ کا جس نے بخشا مجھ کو اتنی بڑی عمر میں اسماعیل اور اسحاق، بیشک میرا رب سنتا ہے دعا کو

**خلاصہ تفسیر:** (مزید کچھ دعائیں آگے آئیں گی، اب درمیان میں بعض سابقہ نعمتوں پر حمد وشکر کیا تاکہ شکر کی برکت سے یہ دعائیں قبولیت کے قریب ہو جائیں، چنانچہ فرمایا:) تمام حمد (ثناء) خدا کے لئے (سزاوار) ہے جس نے مجھ کو بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق (دو بیٹے) عطا فرمائے، حقیقت میں میرا رب دعاء کا بڑا سننے والا (یعنی قبول کرنے والا) ہے (کہ اولاد کے متعلق میری یہ دعاء: رَبِّ هَبۡ لِیۡ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ قبول کر لی)۔

وَهَبَ لِیۡ عَلَی الۡکِبَرِ اِسۡمٰعِیۡلَ وَاِسۡحٰقَ: اگرچہ ابراہیم علیہ السلام کے اسماعیل واسحاق کے علاوہ اور فرزند بھی تھے، لیکن دعا میں صرف ان دو کا نام لینا اس وجہ سے ہوگا کہ دعا مانگتے وقت صرف یہی دو ہوں، یا اس وجہ سے کہ سب اولاد میں زیادہ معزز ومشرف یہ دو تھے، اور جاننا چاہیے کہ ان سب دعاؤں کا ایک ہی نشست میں ہونا ضروری نہیں، یعنی یہ ضروری نہیں کہ یہ سب دعائیں ایک ہی وقت میں مانگی ہوں، پس یہ اشکال نہ رہا کہ اسماعیل علیہ السلام کے بچپن میں اسحاق علیہ السلام کہاں تھے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی بڑھاپے میں اسحاق سارہ کے اور اسمٰعیل ہاجرہ کے بطن سے غیر متوقع طور پر عنایت کیے، جیسے آپ نے اولاد کے متعلق میری دعا: رَبِّ هَبۡ لِیۡ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ (الصافات: ۱۰۰) سنی یہ دعائیں بھی قبول فرمائیے۔

رَبِّ اجۡعَلۡنِیۡ مُقِیۡمَ الصَّلٰوۃِ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ ٭ۖ رَبَّنَا وَتَقَبَّلۡ دُعَآءِ ﴿۴۰﴾

اے رب میرے کر مجھ کو قائم رکھوں نماز اور میری اولاد میں سے بھی، اے رب میرے [1] اور قبول کر میری دعا [2]

**خلاصہ تفسیر:** (اولاد کی نعمت کا شکر ادا کر کے آگے بقیہ دعائیں پیش کرتے ہیں کہ) اے میرے رب! (جو میری نیت ہے اپنی اولاد کو بیت محرم کے پاس بسانے سے کہ وہ نمازوں کا اہتمام رکھیں اس کو پورا کر دیجئے اور جیسے میرا اُن کے لئے نماز کا اہتمام مطلوب ہے اسی طرح اپنے لئے بھی مطلوب ہے، اس لئے اپنے اور ان کے دونوں کے لئے دعاء کرتا ہوں اور چونکہ مجھے وحی سے معلوم ہو گیا ہے کہ ان میں بعض غیر مومن بھی ہوں گے اس لئے دعاء سب کے لئے نہیں کر سکتا، پس ان مضامین پر نظر کر کے بعضوں کے لیے یہ دعاء کرتا ہوں کہ) مجھ کو بھی نماز کا (خاص) اہتمام کرنے والا رکھئے اور میری اولاد میں بھی بعضوں کو (نماز کا اہتمام رکھنے والا کیجئے) اے ہمارے رب! اور میری (یہ) دعاء قبول کیجئے۔

* * *

**فائدہ:** [1] یعنی میری ذریت میں ایسے لوگ ہوتے رہیں جو نمازوں کو ٹھیک طور پر قائم رکھیں۔

**فائدہ:** [2] یعنی میری سب دعائیں قبول فرمائیے۔

رَبَّنَا اغۡفِرۡ لِیۡ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ یَوۡمَ یَقُوۡمُ الۡحِسَابُ ﴿۴۱﴾ ع ۱۸

اے ہمارے رب بخش مجھ کو اور میرے باپ کو اور سب ایمان والوں کو جس دن قائم ہو حساب

**خلاصہ تفسیر:** (اور) اے ہمارے رب! میری مغفرت کر دیجئے اور میرے ماں باپ کی بھی اور کل مؤمنین کی بھی حساب قائم ہونے کے دن (یعنی قیامت کے روز سب مذکورین کی مغفرت کر دیجئے)۔

**رَبَّنَا اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ:** یہاں ایک اشکال ہے کہ آپ نے والدین کے لیے دعا کی، سواہل سیر وتاریخ نے والدہ کا ایمان تونقل کیا ہے ان کے لیے دعا کرنے میں کوئی اشکال نہیں، اور باپ آپ کے کافر تھے ان کے لیے دعا کرنے کی توجیہ گیارہویں پارہ آیت: **وما کان استغفار ابراھیم** کے ذیل میں گزر چکی ہے کہ آپ کا مقصود ہدایت کی دعا کرنا ہے اور ہدایت کی دعا کافر کے لیے جائز ہے، البتہ ایک وسوسہ باقی ہے وہ یہ ہے کہ یہ دعا بڑھاپے کی حالت میں کی تھی اور ظاہر یہ ہے کہ اس وقت باپ زندہ نہ ہوں گے، پھر دعائے ہدایت بھی نہیں ہوسکتی، سواگر والد کے مرنے کی ان کو خبر پہنچ گئی تو یہ معنی ہوں گے کہ اگر ایمان کی حالت میں انتقال ہوا ہو تو مغفرت کر دیجیے، پھر وحی سے جب اس کا خاتمہ کفر پر ہونا معلوم ہوا تب بیزاری ظاہر کی، واللہ اعلم۔

* * *

**فائدہ:** یہ دعا غالباً اپنے والد کے حالت کفر پر مرنے کی خبر موصول ہونے سے پہلے کی تو مطلب یہ ہوگا کہ اسے اسلام کی ہدایت کر کے قیامت کے دن مغفرت کا مستحق بنا دے اور اگر مرنے کی خبر ملنے کے بعد دعا کی ہے تو شاید اس وقت تک خدا تعالیٰ نے آپ کو مطلع نہیں کیا ہوگا کہ کافر کی مغفرت نہیں ہوگی، عقلاً کافر کی مغفرت محال نہیں، سمعاً ممتنع ہے، سو اس کا علم سمع پر موقوف ہوگا اور قبل از سمع امکان عقلی معتبر رہے گا، بعض شیعہ نے یہ لکھا ہے کہ قرآن کریم میں ابراہیم علیہ السلام کے باپ کو جو کافر کہا گیا ہے وہ ان کے حقیقی باپ نہ تھے بلکہ چچا وغیرہ کوئی دوسرے خاندان کے بڑے تھے، واللہ اعلم۔

**وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۬ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ**

اور ہرگز مت خیال کر کہ اللہ بے خبر ہے ان کاموں سے جو کرتے ہیں بے انصاف [1] ان کو تو ڈھیل دے رکھی (چھوڑ رکھا) ہے

**لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ۝۴۲**

اس دن کے لیے کہ پتھرا (کھلی رہ) جائیں گی آنکھیں [2]

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے **من ورائه جهنم ويسقى من ماء صديد** میں کفار کا عذاب مذکور تھا، اب پھر وہی مضمون ہے، درمیان میں توحید ورسالت کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ اس کے انکار سے عذاب ہوتا ہے، پس مناسبت ظاہر ہے۔

اور (اے مخاطب!) جو کچھ یہ ظالم (کافر) لوگ کر رہے ہیں اس سے خدا تعالیٰ کو (جلدی عذاب نہ دینے کی بنا پر) بے خبر مت سمجھ (کیونکہ) ان کو صرف اس روز تک مہلت دے رکھی ہے جس میں ان لوگوں کی نگاہیں (مارے حیرت اور ہیبت کے) پھٹی رہ جائیں گی۔

* * *

**فائدہ:** [1] ایک رکوع پہلے بہت سے نعمائے عظیمہ کا ذکر کر کے فرمایا تھا: اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (ابراہیم: ۳۴) (انسان بڑا ظالم اور ناشکر گزار ہے) بعدہ حضرت ابراہیم کا قصہ سنا کر کفار مکہ کو بعض خصوصی نعمتیں یاد دلائیں، اور ان کے ظلم وشرک کی طرف اشارہ کیا، اس رکوع میں متنبہ فرماتے ہیں کہ اگر ظالموں کو سزا ملنے میں کچھ دیر ہو تو یہ مت سمجھو کہ خدا ان کی حرکات سے بے خبر ہے، یاد رکھو ان کا کوئی چھوٹا بڑا کام خدا سے پوشیدہ نہیں، البتہ اس کی عادت نہیں ہے کہ مجرم کو فوراً پکڑ کر تباہ کر دے، وہ بڑے بڑے ظالم کو مہلت دیتا ہے کہ یا اپنے جرائم سے باز آ جائے یا ارتکاب جرائم میں اس حد تک پہنچ جائے کہ قانونی حیثیت سے اس کے مستحق سزا ہونے میں کسی طرح کا خفا باقی نہ رہے۔

**تنبیہ:** لَا تَحْسَبَنَّ کا خطاب ہر اس شخص کو ہے جسے ایسا خیال گزر سکتا ہو، اور اگر حضور ﷺ کو خطاب ہے تو آپ ﷺ کو مخاطب بنا کر دوسروں کو سنانا مقصود ہوگا کہ جب حضور ﷺ کو فرمایا کہ ایسا خیال مت کرو، حالانکہ ایسا خیال آپ ﷺ کے قریب بھی نہ آ سکتا تھا تو دوسروں کے حق میں اس طرح کا خیال کس قدر واجب الاحتراز ہونا چاہیے۔

**فائدہ:** [2] یعنی قیامت کے دن ہول اور دہشت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔

مُهۡطِعِيۡنَ مُقۡنِعِىۡ رُءُوۡسِهِمۡ لَا يَرۡتَدُّ اِلَيۡهِمۡ طَرۡفُهُمۡ‌ ۚ وَاَفۡـِٕدَتُهُمۡ هَوَآءٌ ؕ‏ ﴿۴۳﴾

دوڑتے ہوں گے اوپر اٹھائے اپنے سر پھر کر نہیں آئیں گی ان کی طرف ان کی آنکھیں، اور دل ان کے اڑ گئے ہوں گے

**خلاصہ تفسیر:** (اور وہ حساب کی جگہ کی طرف حسب طلب) دوڑتے ہوں گے (اور فرط حیرت سے) اپنے سر اوپر اٹھا رکھے ہوں گے (اور) ان کی نظر ان کی طرف ہٹ کر نہ آئے گی (یعنی ایسی ٹکٹکی بندھے گی کہ آنکھ نہ جھپکیں گے) اور ان کے دل (شدت ہول سے) بالکل بدحواس ہوں گے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی محشر میں سخت پریشانی اور خوف وحیرت سے اوپر کو سر اٹھائے ٹکٹکی باندھے گھبرائے ہوئے چلے آئیں گے، جدھر نظر اٹھ گئی ادھر سے ہٹے گی نہیں، ہکا بکا ہو کر ایک طرف دیکھتے ہوں گے، ذرا پلک بھی نہ جھپکے گی، دلوں کا حال یہ ہوگا کہ عقل وفہم اور بہتری کی توقع سے یکسر خالی اور فرط دہشت وخوف سے اڑے جا رہے ہوں گے، غرض ظالموں کے لیے وہ سخت حسرت ناک وقت ہوگا، رہے مومنین قانتین سو ان کے حق میں دوسری جگہ آ چکا ہے: لَا يَحۡزُنُهُمُ الۡفَزَعُ الۡاَكۡبَرُ وَتَتَلَقّٰٮهُمُ الۡمَلٰٓـئِكَةُ (الانبیاء: ۱۰۳)۔

وَاَنۡذِرِ النَّاسَ يَوۡمَ يَاۡتِيۡهِمُ الۡعَذَابُ فَيَـقُوۡلُ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا رَبَّنَاۤ اَخِّرۡنَاۤ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيۡبٍ ۙ

اور ڈرا دے لوگوں کو اس دن سے کہ آئے گا ان پر عذاب [1] تب کہیں گے ظالم اے رب ہمارے مہلت دے ہم کو تھوڑی مدت تک

نُّجِبۡ دَعۡوَتَكَ وَنَـتَّبِعِ الرُّسُلَ‌ ؕ اَوَلَمۡ تَكُوۡنُوۡۤا اَقۡسَمۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلُ مَا لَكُمۡ مِّنۡ زَوَالٍ ۙ‏ ﴿۴۴﴾

کہ ہم قبول کر لیں تیرے بلانے کو اور پیروی کر لیں رسولوں کی [2] کیا تم پہلے قسم نہ کھاتے تھے کہ تم کو نہیں دنیا سے ٹلنا (کچھ زوال) [3]

**خلاصہ تفسیر:** اور (جب وہ دن آ جائے گا پھر مہلت نہ ہوگی، پس) آپ ان لوگوں کو اس دن (کے آنے) سے ڈرائیے جس دن ان پر عذاب آ پڑے گا، پھر یہ ظالم لوگ کہیں گے کہ اے ہمارے رب! ایک مدت قلیل تک ہم کو (اور) مہلت دیدیجئے (اور دنیا میں پھر بھیج دیجئے) ہم (اس مدت میں) آپ کا سب کہنا مان لیں گے اور پیغمبروں کا اتباع کریں گے (جواب میں ارشاد ہوگا کہ کیا ہم نے دنیا میں تمہیں طویل مہلت نہ دی تھی اور) کیا تم نے (اس دراز مہلت ہی کے سبب) اس کے قبل (دنیا میں) قسمیں نہ کھائی تھیں کہ تم کو (دنیا سے) کہیں جانا ہی نہیں ہے (یعنی قیامت کے منکر تھے اور اس پر قسم کھاتے تھے: وَاَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَيۡمَانِهِمۡ‌ۙ لَا يَبۡعَثُ اللّٰهُ مَنۡ يَّمُوۡتُ)۔

* * *

**فائدہ:** [1] يَوۡمَ يَاۡتِيۡهِمُ الۡعَذَابُ: یا تو قیامت کا دن اور عذاب اخروی مراد ہے یا موت کا وقت اور اس کے سکرات وقبض روح کی شدت یا دنیاوی عذاب سے ہلاک ہونے کا دن ارادہ کیا جائے۔

**فائدہ:** [2] نُّجِبۡ دَعۡوَتَكَ وَنَـتَّبِعِ الرُّسُلَ: اگر یہ کہنا دنیا میں عذاب یا موت کی شدت دیکھ کر ہو تب تو مطلب ظاہر ہے کہ ابھی چند روز کی ہم کو اور مہلت دیجئے، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ اپنا رویہ درست کر لیں گے، یعنی حق کی دعوت کو قبول کر کے انبیاء کی پیروی اختیار کریں گے کما قال تعالیٰ: حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ رَبِّ ارۡجِعُوۡنِ لَعَلِّىۡۤ اَعۡمَلُ صَالِحًا (المومنون: ۹۹-۱۰۰) اور اگر ان کا یہ مقولہ قیامت کے دن ہوگا، تب مہلت طلب کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم کو دوبارہ تھوڑی مدت کے لیے دنیا میں بھیج دیجئے، پھر دیکھئے ہم کیسی وفاداری دکھلاتے ہیں کما قال تعالیٰ: وَلَوۡ تَرٰۤى اِذِ الۡمُجۡرِمُوۡنَ نَاكِسُوۡا رُءُوۡسِهِمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡؕ رَبَّنَاۤ اَبۡصَرۡنَا وَسَمِعۡنَا فَارۡجِعۡنَا نَعۡمَلۡ صَالِحًا (السجدہ: ۱۲)

**فائدہ:** [3] مَا لَكُمۡ مِّنۡ زَوَالٍ: یعنی تم وہ ہی تو ہو جن میں کے بعض مغرور بے باک زبان قال سے اور اکثر زبان حال سے قسمیں

کھاتے تھے کہ ہماری شان وشکوہ کو کبھی زوال نہیں، نہ کبھی مر کر خدا کے پاس جانا ہے: وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ (النحل:۳۸) یہ ان کے جواب میں خدا کی طرف سے کہا جائے گا۔

وَسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا

اور آباد تھے تم بستیوں میں انہی لوگوں کی جنہوں نے ظلم کیا اپنی جان پر اور کھل چکا تھا تم کو کہ کیسا کیا ہم نے ان سے اور بتلائے ہم نے

لَكُمُ الْاَمْثَالَ ﴿۴۵﴾

تم کو سب قصے

**خلاصہ تفسیر:** حالانکہ (انکار سے باز آجانے کے تمام اسباب جمع تھے چنانچہ) تم ان (پہلے) لوگوں کے رہنے کی جگہوں میں رہتے تھے جنہوں نے (کفر وانکار قیامت کرکے) اپنی ذات کا نقصان کیا تھا، اور تم کو (تواتر اخبار سے) یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیونکر معاملہ کیا تھا (کہ ان کے کفر وانکار پر ان کو سزائیں دیں، اس سے تم کو معلوم ہوسکتا تھا کہ انکار کرنا موجب غضب ہے، پس تصدیق کرا واجب ہے اور ان کی جگہ میں رہنا ہر وقت ان کے حالات کی یاد دلانے کا سبب ہوسکتا تھا، پس انکار کی کسی وقت گنجائش نہ تھی) اور (علاوہ ان واقعات کے سننے کے جو کہ عبرت کے لئے کافی تھے) ہم نے (بھی) تم سے مثالیں بیان کیں (یعنی آسمانی کتابوں میں ہم نے بھی ان واقعات کو مثال کے طور پر بیان کیا کہ اگر تم ایسا کروگے تو تم پر بھی غضب نازل ہوگا اور عذاب کے مستحق ہوگے، پس واقعات کا پہلے اخبار سے سننا، پھر ہمارا ان کو بیان کرنا، پھر مماثلت، پھر تنبیہ کردینا یہ سب اسباب مقتضی اس کو تھے کہ قیامت کا انکار نہ کرتے)۔

وَسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا: اس آیت میں ان گزشتہ کفار کو خطاب ہے جن سے پہلے کوئی امت معذب ہوچکی ہو، بلکہ سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ متاخرین میں بھی اسی امت کے کفار مراد ہیں، کیونکہ پیچھے: وَاَنْذِرِ النَّاسَ میں جن لوگوں کے ڈرانے کا آپ کو حکم ہے انہی کو یہاں وَسَكَنْتُمْ میں خطاب کیا گیا ہے، اور اس امت کے کفار کا عذاب والوں کی جگہ میں رہنا بایں معنی ہے کہ ملک شام میں بعض ایسی بستیاں ہیں جن پر عذاب نازل ہوا تھا اور اہل عرب تجارت کے سفر میں آتے جاتے ان کو دیکھتے تھے اور ٹھہرنے کا وقت آجاتا تو ٹھہرتے بھی تھے، یا یہ کہا جائے کہ نوح علیہ السلام کے زمانہ میں سب کفار غرق ہوگئے تھے اور جہاں عرب رہتے تھے یہ بھی اس وقت بعض کفار کے رہنے کی جگہ تھی، پس آیت میں تسلسل لازم نہیں آتا۔

* * *

**فائدہ:** یعنی تمہارے پچھلے ان ہی بستیوں میں یا ان کے آس پاس آباد ہوئے جہاں اگلے ظالم سکونت رکھتے تھے، اور ان ہی کی عادات و اطوار اختیار کیں، حالانکہ یہ تاریخی روایات اور متواتر خبروں سے ان پر روشن ہوچکا تھا کہ ہم اگلے ظالموں کو کیسی کچھ سزا دے چکے ہیں اور ہم نے امم ماضیہ کے یہ قصے کتب سماویہ میں درج کرکے انبیاء علیہم السلام کی زبانی ان کو آگاہ بھی کردیا تھا، مگر انھیں ذرہ بھر عبرت نہ ہوئی، اسی سرکشی، عناد اور عداوت حق پر اڑے رہے: حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ (القمر:۵)

وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿۴۶﴾

اور یہ بنا چکے ہیں اپنا داؤ اور اللہ کے آگے ہے ان کا داؤ لے اور نہ ہوگا ان کا داؤ کہ ٹل جائیں اس سے پہاڑ ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور (ہم نے جن پہلے لوگوں کو ان کے کفر وانکار پر سزائیں دیں) ان لوگوں نے (دین حق کے مٹانے میں) اپنی سی بہت ہی بڑی بڑی تدبیریں کیں تھیں اور ان کی (یہ سب) تدبیریں اللہ کے سامنے تھیں (اس کے علم سے مخفی نہ رہ سکتی تھیں) اور واقعی ان کی تدبیریں

ایسی تھیں کہ (عجب نہیں) ان سے پہاڑ بھی (اپنی جگہ سے) ٹل جائیں (مگر پھر بھی حق ہی غالب رہا اور ان کی ساری تدبیریں لغو و بیکار ہوگئیں اور وہ ہلاک کئے گئے، اس سے بھی معلوم ہوگیا کہ حق وہی ہے جو پیغمبر فرماتے تھے اور اس کے انکار سے غضب اور عذاب ہوا ہے)۔

**وَاِنۡ كَانَ مَكۡرُهُمۡ لِتَزُوۡلَ مِنۡهُ الۡجِبَالُ:** تدبیروں سے پہاڑ کا ٹل جانا یہ ایک مثال ہے کسی شے کی قوت بیان کرنے کے لیے اور فی نفسہ یہ امر کچھ محال بھی نہیں، کیونکہ پہاڑوں کے توڑنے اور اڑانے کی تدبیریں بکثرت استعمال میں آتی ہیں۔

اس میں دلالت ہے کہ مبالغہ جس کی حقیقت ضرب المثل ہے صدق اور سچائی کے خلاف نہیں، خصوصاً غلبہ حال کے وقت جس سے عبارت اپنے ظاہر سے خارج تو ہوجاتی ہے مگر اہل مناسبت کے نزدیک اس کا مدلول ظاہر ہوتا ہے، مطلب یہ کہ اگر کسی بات یا کام کی اہمیت کو بیان کرنا مقصود ہوتا کہ مخاطب بے توجہی نہ کرے تو اس کے لیے مبالغہ کرنا صحیح ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی سب اگلے پچھلے ظالم اپنے اپنے داؤ کھیل چکے ہیں، انبیاء کے مقابلہ میں حق کو دبانے اور مٹانے کی کوئی تدبیر اور سازش انہوں نے اٹھا نہیں رکھی، ان کی سب تدبیریں اور داؤ گھات خدا کے سامنے ہیں اور ایک ایک کر کے محفوظ ہیں وہ ہی انکا بدلہ دینے والا ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی انہوں نے بہتیرے داؤ کر کے دیکھ لیے مگر خدا کی حفاظت کے آگے سب ناکام رہے کیا یہ ہوسکتا ہے کہ ان کی مکاریاں پہاڑوں کو ان کی جگہ سے ٹلا دیں یعنی انبیاء علیہم السلام اور شرائع حقہ جو پہاڑوں سے زیادہ مضبوط و مستقیم ہوتے ہیں ان کی مکاریوں سے ڈگمگا جائیں؟ حاشا وکلا! اس تفسیر کے موافق وَاِنۡ كَانَ مَكۡرُهُمۡ الخ میں اِنۡ نافیہ ہوگا، اور آیت کا مضمون وَلَا تَمۡشِ فِی الۡاَرۡضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنۡ تَخۡرِقَ الۡاَرۡضَ وَلَنۡ تَبۡلُغَ الۡجِبَالَ طُوۡلًا (الاسراء:۳۷) کے مشابہ ہوگا، بعض مفسرین نے اِنۡ شرطیہ اور واؤ وصلیہ لے کر آیت کا مطلب یہ لیا ہے کہ انہوں نے بڑے بڑے داؤ چلے جو حفاظت الٰہی کے سامنے ہیچ ثابت ہوئے، اگرچہ ان کے داؤ فی حد ذاتہ ایسے زبردست تھے جو ایک مرتبہ پہاڑوں کو بھی اپنی جگہ سے ہلا ڈالیں۔

## فَلَا تَحۡسَبَنَّ اللّٰهَ مُخۡلِفَ وَعۡدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ ذُو انۡتِقَامٍ ﴿۴۷﴾

سو خیال مت کر کہ اللہ خلاف کرے گا اپنا وعدہ اپنے رسولوں سے ۱؎ بیشک اللہ زبردست ہے بدلہ لینے والا ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** (جب قیامت میں ان کا مغلوب ہونا معلوم ہوگیا) پس (اے مخاطب!) اللہ تعالیٰ کو اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرنے والا نہ سمجھنا (چنانچہ ان منکرین کے لیے جو عذاب کا وعدہ تھا سو وہ قیامت کے دن پورا ہوگا جیسا اوپر مذکور ہوا) بیشک اللہ تعالیٰ بڑا زبردست (اور) پورا بدلہ لینے والا ہے (کہ اس کو کوئی بدلہ لینے سے نہیں روک سکتا، پس قدرت بھی کامل، اور ہر چیز اس کی مشیت کے ساتھ متعلق ہے، پھر وعدہ خلافی کا کیا احتمال رہا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی وہ وعدہ جو اِنَّا لَنَنۡصُرُ رُسُلَنَا اور كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیۡ وغیرہ آیات میں کیا گیا ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ نہ مجرم اس سے چھوٹ کر بھاگ سکتا ہے نہ وہ خود ایسے مجرموں کو سزا دیے بدون چھوڑ سکتا ہے۔

## يَوۡمَ تُبَدَّلُ الۡاَرۡضُ غَيۡرَ الۡاَرۡضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوۡا لِلّٰهِ الۡوَاحِدِ الۡقَهَّارِ ﴿۴۸﴾

جس دن بدلی جائے اس زمین سے اور زمین اور بدلے جائیں آسمان اور لوگ نکل کھڑے ہوں سامنے اللہ اکیلے زبردست کے

**خلاصہ تفسیر:** (اور یہ بدلہ اس روز ہوگا) جس روز دوسری زمین بدل جائے گی اس زمین کے علاوہ اور آسمان بھی (دوسرے بدل دیے جائیں گے ان آسمانوں کے علاوہ، کیونکہ پہلی بار صور پھونکنے سے سب زمین و آسمان ٹوٹ پھوٹ جائیں گے، پھر دوسری بار میں از سر نو زمین و آسمان

بنیں گے) اور سب کے سب ایک (اور) زبردست اللہ کے روبرو پیش ہوں گے (مراد اس سے قیامت کا دن ہے یعنی قیامت میں بدلہ لیا جائے گا)۔

**یَوۡمَ تُبَدَّلُ الۡاَرۡضُ:** احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان وزمین دوبارہ پیدا ہونے کے علاوہ کوئی اور بھی تغیر ہوگا کہ اس وقت اہل محشر زمین پر نہ ہوں گے، بلکہ پل صراط پر ہوں گے جیسا کہ مسلم کی حدیث میں صراحت ہے، باقی اس تغیر وتبدل کی حکمت اللہ ہی کو معلوم ہے۔

* * *

**فائدہ:** قیامت کو یہ زمین وآسمان بہیئات موجودہ باقی نہ رہیں گے، یا تو ان کی ذوات ہی بدل دی جائیں گی یا صرف صفات میں تغیر ہوگا اور بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ شاید متعدد مرتبہ تبدیل وتغیر کی نوبت آئے گی، واللہ اعلم۔

سامنے کھڑے ہونے کا مطلب: وَبَرَزُوۡا لِلّٰهِ جَمِيۡعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيۡنَ اسۡتَكۡبَرُوۡۤا اِنَّا كُنَّا لَـكُمۡ تَبَعًا فَهَلۡ اَنۡتُمۡ مُّغۡنُوۡنَ عَنَّا مِنۡ عَذَابِ اللّٰهِ مِنۡ شَىۡءٍ (ابراہیم:۲۱) کے تحت میں گزر چکا ہے۔

وَتَرَى الۡمُجۡرِمِيۡنَ يَوۡمَئِذٍ مُّقَرَّنِيۡنَ فِى الۡاَصۡفَادِ ۚ﴿۴۹﴾

اور دیکھے تو گناہ گاروں کو اس دن باہم جکڑے ہوئے زنجیروں میں ۱؎

سَرَابِيۡلُهُمۡ مِّنۡ قَطِرَانٍ وَّتَغۡشٰى وُجُوۡهَهُمُ النَّارُ ۙ﴿۵۰﴾

کرتے ان کے ہیں گندھک کے ۲؎ اور ڈھانکے لیتی ہے ان کے منہ کو آگ ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (اس روز اے مخاطب!) تو مجرموں کو (یعنی کافروں کو) زنجیروں میں جکڑے ہوئے دیکھے گا (اور) ان کے کرتے قطران کے ہوں گے (یعنی سارے بدن کو قطران لپٹی ہوگی کہ اس میں آگ جلدی اور تیزی کے ساتھ لگے، قطران چیڑ کے درخت کا تیل ہوتا ہے) اور آگ ان کے چہروں پر (بھی) لپٹی ہوگی۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی ایک نوعیت کے کئی کئی مجرم اکٹھے زنجیروں میں باندھے جائیں گے کما قال تعالیٰ: اُحۡشُرُوا الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا وَاَزۡوَاجَهُمۡ وَمَا كَانُوۡا يَعۡبُدُوۡنَ (الصافات:۲۲) وقال تعالیٰ: وَاِذَا النُّفُوۡسُ زُوِّجَتۡ (التکویر:۷)

**فائدہ:** ۲؎ جس میں آگ بہت جلد اور تیزی سے اثر کرتی ہے اور سخت بدبو ہوتی ہے، پھر جیسی جہنم کی آگ ویسی ہی وہاں کی گندھک سمجھ لیجئے۔

**فائدہ:** ۳؎ چہرہ چونکہ حواس ومشاعر کا محل اور انسان کے ظاہری اعضاء میں سب سے اشرف عضو ہے اس لیے اس کو خصوصیت سے ذکر فرمایا جیسے دوسری جگہ: تَطَّلِعُ عَلَى الۡاَفۡـئِدَةِ میں قلب کا ذکر کیا ہے۔

لِيَجۡزِىَ اللّٰهُ كُلَّ نَفۡسٍ مَّا كَسَبَتۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۵۱﴾

تا کہ بدلہ دے اللہ ہر ایک جی کو اس کی کمائی کا، بیشک اللہ جلد کرنے والا ہے حساب

**خلاصہ تفسیر:** (یہ سب کچھ اس لئے ہوگا) تا کہ اللہ تعالیٰ ہر (مجرم) شخص کو اس کے کئے کی سزا دے (اور اگرچہ ایسے مجرم بےانتہا ہوں گے مگر) یقیناً اللہ تعالیٰ (کو ان کا حساب وکتاب کچھ دشوار نہیں، کیونکہ وہ) بڑی جلد حساب لینے والا ہے (سب کا فیصلہ شروع کر کے فوراً ہی ختم کر دے گا)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جس بات کا پیش آنا بالکل یقینی ہے، اسے دور مت سمجھو کما قال تعالیٰ: اِقۡتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمۡ وَهُمۡ فِىۡ غَفۡلَةٍ

مُعْرِضُوْنَ (الانبیاء:۱) یا یہ مطلب ہے کہ جس وقت حساب ہوگا پھر دیر نہ لگے گی، تمام اولین وآخرین جن وانس کے ذرہ ذرہ عمل کا حساب بہت جلد ہو جائے گا، کیونکہ نہ خدا پر کوئی چیز مخفی ہے نہ اس کو ایک شان دوسری شان سے مشغول کرتی ہے: مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ (لقمان:۲۸)

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۵۲﴾

یہ خبر پہنچا دینی ہے لوگوں کو اور تاکہ چونک جائیں اس سے اور تاکہ جان لیں کہ معبود وہی ایک ہے اور تاکہ سوچ لے عقل والے

**خلاصہ تفسیر:** شروع سورت سے یہاں تک توحید، رسالت اور قیامت کے مضامین مذکور تھے، اب سورت کو ایسی آیت پر ختم فرماتے ہیں جو قرآن کی مدح کے ساتھ ان سب مضامین کو جامع اور شامل ہے۔

یہ (قرآن) لوگوں کے لئے احکام کا پہنچانا ہے (تاکہ احکام پہنچانے والے مبلغ یعنی رسول کی تصدیق کریں) اور تاکہ اس کے ذریعہ سے (عذاب سے) ڈرائے جائیں اور تاکہ اس بات کا یقین کرلیں کہ وہی ایک معبود برحق ہے اور تاکہ دانش مند لوگ نصیحت حاصل کرلیں۔

بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ میں تصدیق رسالت آگئی، وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ یعنی ڈرائے جانے میں قیامت وآخرت کی تصدیق آگئی، وَلِيَعْلَمُوْٓا یعنی معبود حق کا یقین کرلینے میں توحید کی تصدیق اور وَّلِيَذَّكَّرَ یعنی نصیحت حاصل کرنے میں تمام عبادات بدنیہ ومالیہ آگئیں، اور یہی تمام سورت کا حاصل ہے، سبحان اللہ! کیا اچھا اختتام ہے، اے اللہ! اپنے فضل سے ان ہی عقائد واعمال پر ہمارا خاتمہ فرمایے، آمین۔

* * *

**فائدہ:** یعنی خواب غفلت سے بیدار ہوجائیں اور خدا سے ڈر کر اس کی آیات میں غور کریں جس سے اس کی وحدانیت کا یقین حاصل ہو اور عقل وفکر سے کام لے کر نصیحت پر کاربند ہوں۔

ایاتها ۹۹ | ۱۵ سُوْرَةُ الْحِجْرِ مَكِّيَّةٌ ۵۴ | رکوعاتها ٦

**خلاصہ تفسیر:** اس سورت کا خلاصہ یہ مضامین ہیں: ① قرآن کی حقانیت ② کفار پر عذاب ③ رسالت ونبوت کی حقانیت ④ توحید کا اثبات ⑤ اطاعت کرنے والوں پر انعامات اور خلاف ورزی کرنے والوں کی سزا کا ذکر، اس ضمن میں جزا وسزا کے بطور نمونہ چند واقعات ⑥ قیامت کا حق ہونا ⑦ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی، اس سورت کے شروع اور گزشتہ سورت کے خاتمہ میں ربط ومناسبت بہت ظاہر ہے، کیونکہ دونوں قرآن کی فضیلت پر مشتمل ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ①

الر، یہ آیتیں ہیں کتاب کی ۱ اور واضح قرآن کی ۲

**خلاصہ تفسیر:** الٓرٰ (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ آیتیں ہیں ایک کامل کتاب کی اور قرآن واضح کی (یعنی اس کی دونوں صفتیں ہیں: ① کامل کتاب بھی ہے ② اور قرآن واضح بھی ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی یہ اس جامع اور عظیم الشان کتاب کی آیتیں ہیں جس کے مقابلہ میں کوئی دوسری کتاب "کتاب" کہلانے کی مستحق نہیں۔

**فائدہ:** ۲۔ اور اس قرآن کی آیتیں ہیں جس کے اصول نہایت صاف، دلائل روشن، احکام معقول، وجوہ اعجاز واضح اور بیانات شگفتہ اور فیصلہ کن ہیں، لہذا آگے جو کچھ بیان کیا جانے والا ہے مخاطبین کو پوری توجہ سے سننا چاہیے۔

الجزء ۱۴

## رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ ۞۲

کسی وقت آرزو کریں گے یہ لوگ جو منکر ہیں کیا اچھا ہوتا جو ہوتے مسلمان

**خلاصہ تفسیر:** (قرآن کا کلام حق ہونا واضح کرنے کے بعد ان لوگوں کی حسرت اور عذاب کا بیان ہے جو قرآن پر ایمان نہیں لاتے یا اس کے احکام کی تعمیل نہیں کرتے، چنانچہ جب قیامت کے حشر ونشر کے میدان میں کافروں پر طرح طرح کا عذاب ہوگا تو) کافر لوگ بار بار تمنا کریں گے کہ کیا خوب ہوتا اگر وہ (یعنی ہم دنیا میں) مسلمان ہوتے (بار بار تمنا اس لئے ہوگی کہ جب کوئی نئی شدت ومصیبت دیکھیں گے اور معلوم ہوگا کہ اس کی وجہ کفر ہے تو ہر مرتبہ اپنے اسلام نہ لانے پر حسرت تازہ ہوتی رہے گی)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی آج منکرین نے قرآن واسلام جیسی عظیم الشان نعمت الٰہیہ کی قدر نہیں کی لیکن ایسا وقت آنے والا ہے جب یہ لوگ اپنی محرومی پر ماتم کریں گے اور دست حسرت مل کر کہیں گے کاش ہم مسلمان ہوتے! وہ وقت کب آئے گا؟ اس میں اختلاف ہوا ہے، ہم ابن الانباری کے قول کے موافق اس کو عام رکھتے ہیں، یعنی دنیا وآخرت میں جو مواقع کافروں کی نامرادی اور مسلمانوں کی کامیابی کے پیش آتے رہیں گے ہر موقع پر کفار کو رو رو کر اپنے مسلمان ہونے کی تمنا اور نعمت اسلام سے محروم رہ جانے کی حسرت ہوگی، اس سلسلہ میں پہلا موقع تو جنگ بدر کا تھا جہاں کفار مکہ نے مسلمانوں کی طرف کھلا ہوا غلبہ اور تائید غیبی دیکھ کر اپنے دلوں میں محسوس کیا کہ جس اسلام نے فقراء مہاجرین اور اوس وخزرج کے کاشتکاروں کو اونچی ناک والے قریشی سرداروں پر غالب کیا، افسوس ہم اس دولت سے محروم ہیں، اسی طرح اسلامی فتوحات وترقیات کی ہر ایک منزل پر کفار کو اپنی تہی دستی وحرمان پر پچھتانے اور دل سے اشک حسرت بہانے کا موقع ملتا رہا، انتہائی حسرت وافسوس کا مقام وہ ہوگا جب فرشتہ جان نکالنے کے لیے سامنے کھڑا ہے اور عالم غیب کے حقائق آنکھوں سے نظر آرہے ہیں، اس وقت ہاتھ کاٹیں گے اور آرزو کریں گے کہ کاش ہم نے اسلام قبول کرلیا ہوتا کہ آج عذاب بعد الموت سے محفوظ رہ سکتے، اس سے بھی بڑھ کر یاس انگیز نظارہ وہ ہوگا جو طبرانی کی حدیث میں ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کے بہت سے آدمی اپنے گناہوں کی بدولت جہنم میں جائیں گے اور جب تک خدا چاہے گا وہاں رہیں گے، بعدہ مشرکین ان پر طعن کریں گے کہ تمہارے ایمان وتوحید نے تم کو کیا فائدہ دیا؟ تم بھی آج تک ہماری طرح دوزخ میں ہو، اس پر حق تعالیٰ کسی موحد کو جہنم میں نہ چھوڑے گا، یہ فرما کر نبی کریم ﷺ نے یہ آیت پڑھی: رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ گویا یہ آخری موقع ہوگا جب کفار اپنے مسلمان ہونے کی تمنا کریں گے۔

## ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۞۳

چھوڑ دے ان کو کھالیں اور برت لیں (فائدہ اٹھائیں) اور امید میں (پر بھولے) لگے رہیں سو آئندہ معلوم کرلیں گے

**خلاصہ تفسیر:** آپ (دنیا میں ان کے کفر پر غم نہ کیجئے اور) ان کو ان کے حال پر رہنے دیجئے کہ وہ (خوب) کھالیں اور چین اُڑا لیں اور خیالی منصوبے ان کو غفلت میں ڈالے رکھیں ان کو ابھی (مرنے کے ساتھ ہی) حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے۔

ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا: اس میں ایسے شخص کی مذمت کی طرف اشارہ ہے جسے اپنی زندگی کی بڑی فکر شکم پری اور شہوت رانی کی رہتی ہو، ایسا شخص قرب الٰہی تک پہنچنے سے محروم رہتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جب کوئی نصیحت کارگر نہیں تو آپ ان کے غم میں نہ پڑیے بلکہ چند روز انھیں بہائم کی طرح کھانے پینے دیجئے، یہ خوب دل کھول

کر دنیا کے مزے اڑالیں اور مستقبل کے متعلق لمبی چوڑی امیدیں باندھتے رہیں عنقریب وقت آیا چاہتا ہے جب حقیقت حال کھل جائے گی اور اگلا پچھلا کھایا پیا سب نکل جائیگا، چنانچہ کچھ تو دنیا ہی میں مجاہدین کے ہاتھوں حقیقت کھل گئی، اور پوری تکمیل آخرت میں ہو جائیگی۔

وَمَآ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَرۡيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعۡلُوۡمٌ ۝۴

اور کوئی بستی ہم نے غارت نہیں کی مگر اس کا وقت لکھا ہوا تھا مقرر

**خلاصہ تفسیر:** (اور دنیا میں جو انہیں ان کے کفر اور بدعملی کی فوراً سزا نہیں ملتی اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سزا کا وقت مقرر کر رکھا ہے ابھی وہ وقت نہیں آیا) اور ہم نے جتنی بستیاں (کفر کی وجہ سے) ہلاک کی ہیں ان سب کے لیے ایک معین وقت لکھا ہوا ہوتا رہا ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جس قدر بستیاں اور قومیں پہلے ہلاک کی گئیں، خدا کے علم میں ہر ایک کی ہلاکت کا ایک وقت معین تھا جس میں نہ بھول چوک ہو سکتی تھی نہ غفلت اور نہ خدا کا وعدہ ٹل سکتا تھا جب کسی قوم کی میعاد پوری ہوئی اور تعذیب کا وقت آ پہنچا، ایک دم میں غارت کر دی گئی، موجودہ کفار بھی امہال و تاخیر عذاب پر مغرور نہ ہوں، جب ان کا وقت آئے گا خدائی سزا سے بچ نہ سکیں گے، جو تاخیر کی جا رہی ہے اس میں خدا کی بہت حکمتیں ہیں، مثلاً ان میں سے بعض کا یا بعض کی اولاد کا ایمان لانا مقدر ہے، فوری عذاب کی صورت میں اس کے وقوع کی کوئی صورت نہیں۔

مَا تَسۡبِقُ مِنۡ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسۡتَاۡخِرُوۡنَ ۝۵

نہ سبقت کرتا ہے کوئی فرقہ اپنے وقت مقرر سے اور نہ پیچھے رہتا ہے

**خلاصہ تفسیر:** اور (ہمارا اُصول ہے کہ) کوئی امت اپنی میعاد مقرر سے نہ پہلے ہلاک ہوئی ہے اور نہ پیچھے رہی ہے (بلکہ وقت مقرر پر ہلاک ہوئی ہے، اسی طرح جب ان کا وقت آجائے گا ان کو بھی سزا دی جائے گی)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی امم مہلکہ کی تخصیص نہیں بلکہ ہر قوم کے عروج وزوال یا موت وحیات کی جو میعاد مقرر ہے وہ اس سے ایک سیکنڈ آگے پیچھے نہیں ہو سکتی۔

وَقَالُوۡا يٰۤاَيُّهَا الَّذِىۡ نُزِّلَ عَلَيۡهِ الذِّكۡرُ اِنَّكَ لَمَجۡنُوۡنٌ ۝۶ لَوۡ مَا تَاۡتِيۡنَا بِالۡمَلٰۤـئِكَةِ اِنۡ كُنۡتَ

اور لوگ کہتے ہیں اے وہ شخص کہ تجھ پر اترا ہے قرآن تو بیشک دیوانہ ہے ۱؎ کیوں نہیں لے آتا ہمارے پاس فرشتوں کو اگر تو

مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ۝۷ مَا نُنَزِّلُ الۡمَلٰۤـئِكَةَ اِلَّا بِالۡحَـقِّ وَمَا كَانُوۡۤا اِذًا مُّنۡظَرِيۡنَ ۝۸

سچا ہے ۲؎ ہم نہیں اتارتے فرشتوں کو مگر کام پورا (ٹھیک) کر کے اور اس وقت نہ ملے گی ان کو مہلت

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے کفار کے برے انجام کے بعض حالات کا ذکر تھا، اب رسالت کے متعلق اُن کا انکار مع جواب بیان کیا جاتا ہے:

اور ان کفار (مکہ) نے (رسول کریم ﷺ سے) یوں کہا اے وہ شخص! جس پر (اس کے دعوے کے مطابق) قرآن نازل کیا گیا ہے تم (نعوذ باللہ) مجنون ہو (اور نبوت کا غلط دعوی کرتے ہو، ورنہ) اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو تو ہمارے پاس فرشتوں کو کیوں نہیں لاتے (جو ہمارے سامنے تمہاری سچائی پر گواہی دیں، قولہ تعالیٰ: لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِ مَلَكٌ فَيَكُوۡنَ مَعَهٗ نَذِيۡرًا، اللہ تعالیٰ اس کا جواب دیتے ہیں کہ) ہم فرشتوں کو (جس طریق پر وہ درخواست کرتے ہیں) صرف فیصلہ ہی کے لئے نازل کیا کرتے ہیں اور (اگر ایسا ہوتا تو) اس وقت ان کو مہلت بھی نہ دی جاتی (بلکہ

جب فرشتوں کے آنے پر بھی ایمان نہ لاتے جیسا کہ ان کے حالات سے ہی یہ بات یقینی ثابت ہے تو فوراہلاک کردیئے جاتے جیسا کہ سورۃ انعام کے پہلے رکوع کی اخیر آیتوں میں اس کی وجہ مذکور ہو چکی ہے)۔

**نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ** اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ نکلتا ہے کہ جو شخص اسرار وحقائق کو سمجھتا نہ ہو اسے چاہیے کہ اولیاء اللہ یا ان کے علوم ومعارف یا ان کے احوال پر انکار نہ کرے، جیسے بعض منکرین انہیں جنون کی طرف منسوب کرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ ریاضت کی وجہ سے ان پر فاسد خیالات کا غلبہ ہو گیا ہے، اور اولیاء سے مراد وہ ہیں جنہیں شریعت میں رسوخ و پختگی حاصل ہو، نہ کہ جہلاء بددین، جیسے اس زمانہ میں بکثرت ایسے ہیں۔

**لَوْ مَا تَأْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ:** جس شخص کی صداقت وحقانیت دلائل سے ثابت ہو چکی ہو اس سے معجزات وکرامات کا طلب کرنا ضد وعناد کے سوا اور کچھ نہیں، کیونکہ دین میں کرامات مقصود نہیں، بلکہ شریعت پر عمل کرنا مقصود ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ مشرکین مکہ یہ الفاظ محض بطریق استہزاء واستخفاف کہتے تھے یعنی آپ سب سے آگے بڑھ کر خدا کے یہاں سے قرآن لے آئے، دوسروں کو احمق وجاہل بتلانے لگے بلکہ ساری دنیا کو الٹی میٹم دیا، اس پر یہ دعویٰ ہے کہ آخر میں ہی غالب ہوں گا اور ایک وقت آئے گا کہ منکرین حسرت سے کہیں گے کہ کاش ہم مسلمان ہو جاتے، یہ کون سی عقل وہوش کی باتیں ہیں؟ کھلی ہوئی دیوانگی ہے اور جو پڑھ پڑھ کر سناتے ہو مجنون کی بڑ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ (العیاذ باللہ)

**فائدہ:** ۲ اگر بارگاہ احدیت میں آپ کو ایسا ہی قرب حاصل ہے اور ساری قوم میں سے خدا نے منصب رسالت کے لیے آپ ﷺ کا انتخاب کیا ہے تو فرشتوں کی خدائی فوج آپ ﷺ کے ساتھ کیوں نہ آئی، جو کھلم کھلا آپ ﷺ کی تصدیق کرتی اور ہم سے آپ ﷺ کی بات منواتی، نہ مانتے تو فوراً سزا دیتی۔

## اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ⑨

ہم نے آپ اتاری ہے یہ نصیحت اور ہم آپ اس کے نگہبان ہیں

**خلاصہ تفسیر:** آگے بتلاتے ہیں کہ یہ جو قرآن کے اللہ کی طرف سے نازل ہونے کے منکر ہیں سو یہ انکار بھی محض باطل ہے:

ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور (یہ دعوی بلا دلیل نہیں، بلکہ اس کا معجزہ ہونا اس پر دلیل ہے، پھر اس کے معجزہ ہونے پر ایک دلیل تو دوسری سورتوں میں مذکور ہے کہ کوئی انسان اس کی ایک سورۃ کی مثل نہیں بنا سکتا، دوسری دلیل اس کے معجزہ ہونے پر آگے بتلاتے ہیں کہ) ہم اس (قرآن) کے محافظ (اور نگہبان) ہیں (اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کر سکتا)۔

**وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ:** جیسا اور کتابوں میں ہوتا ہے کہ کسی مخالف کے نہ ہونے کے باوجود ان کے نسخوں میں کمی وبیشی کا اختلاف ہو جاتا ہے، اور اس قرآن میں مخالفین کی کوششوں کے باوجود یہ بات نہیں ہوئی، یہ ایسا صریح معجزہ ہے جس کو ہر عام وخاص سمجھ سکتا ہے، پہلا معجزہ کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت اور جامعیت کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا اس کو تو اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں، مگر کمی بیشی نہ ہونے کو تو ایک ان پڑھ جاہل بھی دیکھ سکتا ہے، پس یہ قرآن کا مستقل معجزہ ہے، بعض نے اس سے نظم یعنی عبارت کا اعجاز سمجھا ہے، پھر اس پر یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ نظم یعنی عبارت کے اعتبار سے قرآن کا بلیغ ہونا اس بات کو تو مستلزم ہے کہ اس میں زیادتی نہ ہو سکے، کیونکہ وہ ایسی بلیغ اور معجز نہ ہوگی، لیکن اگر پوری سورت کم یا ضائع کر دی جائے تو اعجاز بلاغت سے یہ کمی کیونکر معلوم ہو سکتی ہے، لیکن احقر نے مستقل معجزہ قرار دے کر جو تقریر کی ہے اس میں اس وسوسہ کی گنجائش نہیں رہی، کیونکہ ایسی کمی اگر کی جاتی تو تمام دنیا کے نسخوں کا اس میں متفق ہونا عادتاً محال تھا، بلکہ کسی میں وہ کمی ہوتی کسی میں نہ ہوتی، نسخوں میں اختلاف ضرور ہوتا جیسا کہ اور کتابوں میں دیکھا جاتا ہے،

کیونکہ وہ معجزہ نہ تھیں، اگرچہ اصل میں اللہ کی طرف سے تھیں، اور کفار مکہ کے وقت میں اگرچہ نزول قرآن کو تھوڑا زمانہ ہوا تھا، لیکن ایک حیثیت سے حفاظت کے معجزہ کا ظہور اس وقت بھی ہو گیا تھا کہ باوجودیکہ ظاہری حفاظت کا سامان یعنی لکھنا اور مدون کرنا اس وقت کم تھا، پھر عبارت بھی نثر تھی، مگر اس کو یاد رکھنے والوں میں اختلاف نہ تھا، اور اگر اتفاقاً اور سہواً کوئی لفظ کسی کو غلط یاد ہو جاتا تو تنبیہ کے ساتھ ہی اس کی اصلاح ہو جاتی، اور غلط طور پر اگر کوئی یاد کا دعوی کرتا تو وہ دعوی چل نہ سکتا تھا اس لیے اس دلیل اعجاز کا بھی ان کفار کے سامنے بیان کرنا بے فائدہ نہ ہوا، پھر اب تو اس پیشین گوئی کا ظہور اچھی طرح ہو گیا ہے کہ زمانہ دراز گذر جانے پر بھی قرآن کا حرف حرف محفوظ ہے، کوئی دوسری کتاب پوری حفاظت کے باوجود بھی ہرگز اس قدر محفوظ نہیں رہ سکتی کہ اس میں کسی طرح پر کمی بیشی کا احتمال نہ ہو سکے، پس قرآن کی ظاہری حفاظت میں ایسی کامیابی اس کی دلیل ہے کہ اس کی حفاظت من جانب اللہ ہے، اس پر شبہ ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالی ہی قرآن کا محافظ ہے تو پھر صحابہ سے لے کر اس زمانے تک اس کی حفاظت کا سامان کیوں کیا جاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سامان بھی درحقیقت اللہ ہی کی حفاظت کا ظہور ہے۔

اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ اگر کسی دوسری کتاب کی بھی اسی طرح حفاظت و نگہداشت کی جائے تو کیا اس کا من جانب اللہ ہونا پایہ ثبوت کو پہنچ جائے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انتہائی حفاظت کے باوجود بھی وہ ہرگز اس قدر محفوظ نہ رہ سکے گی کہ اس میں کسی طرح پر کمی و بیشی کا احتمال نہ ہو سکے، پس قرآن کی ظاہری حفاظت پر ایسی کامیابی حفاظت غیبی کی دلیل ہے جو کہ اصلاً لَحٰفِظُوْنَ کا مدلول ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی تمہارا استہزاء و تعنت اور قرآن لانے والے کی طرف جنون کی نسبت کرنا، قرآن و حامل قرآن پر قطعاً اثر انداز نہیں ہو سکتا، یاد رکھو اس قرآن کے اتارنے والے ہم ہیں اور ہم ہی نے اس کی ہر قسم کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے جس شان اور ہیئت سے وہ اترا ہے بدون ایک شوشہ یا زبر زیر کی تبدیلی کے چار دانگ عالم میں پہنچ کر رہے گا اور قیامت تک ہر طرح کی تحریف لفظی و معنوی سے محفوظ و مضمون رکھا جائے گا، زمانہ کتنا ہی بدل جائے مگر اس کے اصول و احکام کبھی نہ بدلیں گے، زبان کی فصاحت و بلاغت اور علم و حکمت کی موشگافیاں کتنی ہی ترقی کر جائیں، پر قرآن کی صوری و معنوی اعجاز میں اصلاً ضعف و انحطاط محسوس نہ ہوگا، اور سلطنتیں قرآن کی آواز کو دبانے یا گم کر دینے میں ساعی ہوں گی، لیکن اس کے ایک نقطہ کو گم نہ کر سکیں گی، حفاظت قرآن کے متعلق یہ عظیم الشان وعدہ الٰہی ایسی صفائی اور حیرت انگیز طریقہ سے پورا ہو کر رہا جسے دیکھ کر بڑے بڑے متعصب و مغرور مخالفوں کے سر نیچے ہو گئے، ''میور'' کہتا ہے جہاں تک ہماری معلومات ہیں دنیا بھر میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں جو قرآن کی طرح بارہ صدیوں تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہی ہو، ایک اور یورپین محقق لکھتا ہے کہ ہم ایسے ہی یقین سے قرآن کو بعینہ محمد ﷺ کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سمجھتے ہیں جیسے مسلمان اسے خدا کا کلام سمجھتے ہیں۔

واقعات بتلاتے ہیں کہ ہر زمانہ میں ایک جم غفیر علماء کا جن کی تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے ایسا رہا کیا جس نے قرآن کے علوم و مطالب اور غیر منقضی عجائب کی حفاظت کی، کاتبوں نے رسم الخط کی، قاریوں نے طرزِ ادا کی، حافظوں نے اس کے الفاظ و عبارت کی وہ حفاظت کی کہ نزول کے وقت سے آج تک ایک زیر زبر تبدیل نہ ہو سکا، کسی نے قرآن کے رکوع گن لیے، کسی نے آیتیں شمار کیں، کسی نے حروف کی تعداد بتلائی حتی کہ بعض نے ایک ایک اعراب اور ایک ایک نقطہ کو شمار کر ڈالا، آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک سے آج تک کوئی لمحہ اور کوئی ساعت نہیں بتلائی جا سکتی جس میں ہزاروں لاکھوں کی تعداد حفاظ قرآن کی موجود نہ رہی ہو، خیال کرو آٹھ دس سال کا ہندوستانی بچہ جسے اپنی مادری زبان میں دو تین جزء کا رسالہ یاد کرانا دشوار ہے وہ ایک اجنبی زبان کی اتنی ضخیم کتاب جو متشابہات سے پر ہے، کس طرح فر فر سنا دیتا ہے، پھر کسی مجلس میں ایک بڑے باوجاہت عالم و حافظ سے کوئی حرف چھوٹ جائے یا اعراب کی فروگذاشت ہو جائے تو ایک بچہ اس کو ٹوک دیتا ہے، چاروں طرف سے تصحیح کرنے والے للکارتے ہیں، ممکن نہیں کہ پڑھنے والے کو غلطی پر قائم رہنے دیں، حفظ قرآن کے متعلق یہ ہی اہتمام و اعتناء عہد نبوت میں سب لوگ مشاہدہ کرتے تھے، اسی کی طرف وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ فرما کر اس وقت کے منکرین کو توجہ دلائی۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۰﴾ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۱﴾

اور ہم بھیج چکے ہیں رسول تجھ سے پہلے اگلے فرقوں میں، اور نہیں آتا ان کے پاس کوئی رسول مگر کرتے رہیں ہیں اس سے ہنسی ۱؎

كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۲﴾ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾

اسی طرح بٹھا دیتے ہیں ہم اس کو دل میں گنہگاروں کے ۲؎ یقین نہ لائیں گے اس پر اور ہوتی آئی ہے رسم پہلوں کی ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (اے محمد ﷺ! آپ ان کے جھٹلانے سے غم نہ کیجئے، کیونکہ یہ معاملہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے، چنانچہ) ہم نے آپ سے پہلے بھی پیغمبروں کو اگلے لوگوں کے بہت سے گروہوں میں بھیجا تھا اور (ان کی یہ حالت تھی کہ) کوئی رسول ان کے پاس ایسا نہیں آیا جس کے ساتھ انہوں نے استہزاء نہ کیا ہو (جو کہ تکذیب کی بدترین قسم ہے، پس جس طرح ان لوگوں کے دلوں میں یہ استہزاء پیدا ہوتا تھا) اسی طرح ہم یہ استہزا اُن مجرمین (یعنی کفار مکہ) کے قلوب میں ڈال دیتے ہیں (جس کی وجہ سے) یہ لوگ قرآن پر ایمان نہیں لاتے اور یہ دستور پہلوں سے ہی ہوتا آیا ہے (کہ انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کرتے رہے ہیں، پس آپ غمگین نہ ہوں)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ آپ کو تسلی دی گئی کہ ان کی تکذیب واستہزاء سے دلگیر نہ ہوں، یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہمیشہ منکرین کی عادت رہی ہے کہ جب کوئی پیغمبر آیا اس کی ہنسی اڑائی، کبھی مجنون کہا۔ کبھی محض دق کرنے کے لیے لغو اور دور از کار مطالبے کرنے لگے۔ فرعون نے موسیٰ (علیہ السلام) کی نسبت کہا تھا: اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ (شعراء: ۲۷) اور وہ ہی فرشتوں کی فوج لانے کا مطالبہ کیا جو قریش آپ سے کررہے تھے: فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ (الزخرف: ۵۳)

**فائدہ:** ۲؎ یعنی جو لوگ ارتکاب جرائم سے باز نہیں آتے ہم ان کے دلوں میں اسی طرح استہزاء وتکذیب کی عادت جاگزیں کردیتے ہیں، جب ان کے دل میں کانوں کے راستہ سے وحی الٰہی جاتی ہے تو ساتھ ساتھ تکذیب بھی چلی جاتی ہے۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی ہمیشہ یوں ہی جھٹلاتے اور ہنسی کرتے آئے ہیں اور سنت اللہ یہ رہی ہے کہ متمردین ہلاک ورسوا کیے جاتے رہے اور انجام کار حق کا بول بالا رہا۔

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ﴿۱۴﴾

اور اگر ہم کھول دیں ان پر دروازہ آسمان سے اور سارے دن اس میں چڑھتے رہیں

ع ۱۵ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ﴿۱۵﴾

تو بھی یہی کہیں گے کہ باندھ دیا ہے ہماری نگاہ کو نہیں بلکہ ہم لوگوں پر جادو ہوا ہے ۱؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (ان کے عناد کی یہ کیفیت ہے کہ فرشتوں کا آسمان سے آنا تو در کنار اس سے بڑھ کر) اگر (خود ان کو آسمان پر بھیج دیا جائے اس طرح سے کہ) ہم ان کے لئے آسمان میں کوئی دروازہ کھول دیں پھر یہ دن کے وقت (جس میں نیند اور اونگھ وغیرہ کا بھی شبہ نہ ہو) اس (دروازہ) میں (سے آسمان کو) چڑھ جائیں تب بھی یوں کہہ دیں کہ ہماری نظر بند کردی گئی تھی (کہ ہم آسمان پر چڑھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں مگر واقع میں نہیں چڑھ رہے اور نظر بندی کی کچھ اس واقعہ میں تخصیص نہیں) بلکہ ہم لوگوں پر تو بالکل جادو کر رکھا ہے (اگر ہمیں اس سے بڑھ کر بھی کوئی معجزہ دکھلایا

جائے گا وہ بھی واقع میں معجزہ نہ ہوگا محض نظر بندی ہوگی )۔

**وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ**: جو لوگ اولیاء اللہ کے منکر ہیں وہ بھی ایسی ہی حالت و کیفیت میں مبتلا ہیں کہ کرامت و بزرگی کو جادو، شعبدہ بازی یا نظر بندی کہہ دیتے ہیں۔

**فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ**: کفار کا آسمان پر چڑھنا فرشتوں کے نیچے اترنے سے بڑھ کر اس لیے ہے کہ یہ عروج انسانی عادت کے خلاف ہے، اور فرشتوں کا آسمان سے اترنا ان کی عادت کے خلاف نہیں، کفار بھی ملائکہ کے اترنے کو مانتے تھے اگرچہ حضور کے پاس فرشتوں کے آنے کے منکر تھے۔

* * *

**فائدہ**: ۱ یعنی فرشتوں کا اتارنا تو اس قدر عجیب نہیں، اگر ہم آسمان کے دروازے کھول کر خود انھیں اوپر چڑھا دیں اور یہ دن بھر اسی شغل میں رہیں، تب بھی ضدی اور معاند لوگ حق کو تسلیم نہیں کر سکتے، اس وقت کہہ دیں گے کہ ہم پر نظر بندی یا جادو کیا گیا ہے، یا شاید ابتداء میں نظر بندی سمجھیں اور آخر میں بڑا جادو قرار دیں۔

## وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿١٦﴾

اور ہم نے بنائے ہیں آسمان میں برج ۱ اور رونق دی اس کو دیکھنے والوں کی نظر میں ۲

**خلاصہ تفسیر**: پیچھے رسالت کے مضمون میں منکرین کی ہٹ دھرمی وعناد کا ذکر تھا، اب توحید کا ذکر ہے، کفار اسکے بھی منکر تھے۔ اور بیشک ہم نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے پیدا کئے اور دیکھنے والوں کیلئے آسمان کو (ان ستاروں سے) آراستہ کیا (کہ دیکھنے میں اچھا معلوم ہوتا ہے)۔

**وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا**: ''بروج'' کی تفسیر ستاروں کے ساتھ مجاہد وقتادہ سے اور کواکب عظام کے ساتھ ابو صالح سے درمنثور میں منقول ہے، تشبیہ اور مجاز کے طور پر ان کو ''بروج'' کہہ دیا گیا اور یہ تفسیر بہت سہل اور اسلم ہے۔

* * *

**فائدہ**: ۱ ''برجوں'' سے یہاں بڑے بڑے سیارات مراد ہیں بعض نے منازل شمس وقمر کا ارادہ کیا ہے، بعض کہتے ہیں کہ برج وہ آسمانی قلعے ہیں جن میں فرشتوں کی جماعتیں پہرہ دیتی ہیں۔

**فائدہ**: ۲ یعنی آسمان کو ستاروں سے زینت دی، رات کے وقت جب بادل اور گرد وغبار نہ ہو، بیشمار ستاروں کے قمقموں سے آسمان دیکھنے والوں کی نظر میں کس قدر خوبصورت اور پر عظمت معلوم ہوتا ہے اور غور وفکر کرنے والوں کے لیے اس میں کتنے نشان حق تعالیٰ کی صنعت کاملہ، حکمت عظیمہ اور وحدانیت مطلقہ کے پائے جاتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ آسمان سے فرشتے اتارنے یا ان کو آسمان پر چڑھانے کی ضرورت نہیں، اگر ماننا چاہیں تو آسمان وزمین میں قدرت کے نشان کیا تھوڑے ہیں جنہیں دیکھ کر سمجھدار آدمی توحید کا سبق بہت آسانی سے حاصل کر سکتا ہے، ایسے روشن نشان دیکھ کر انہوں نے کیا معرفت حاصل کی؟ جو آئندہ توقع رکھی جائے۔

## وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿١٧﴾ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٨﴾

اور محفوظ رکھا ہم نے اس کو ہر شیطان مردود سے، مگر جو چوری سے سن بھاگا سو اس کے پیچھے پڑا انگارہ چمکتا ہوا

**خلاصہ تفسیر**: اور اس (آسمان) کو (ستاروں کے ذریعہ) ہر شیطان مردود سے محفوظ فرما دیا (کہ وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہونے پاتی) ہاں! مگر کوئی بات (فرشتوں کی) چوری چھپے سن بھاگے تو اس کے پیچھے ایک روشن شعلہ ہوتا ہے (اور اس کے اثر سے وہ شیطان ہلاک یا بدحواس ہو جاتا ہے، اسی طرح وہ آسمانی خبر کسی اور تک نہیں پہنچتی، آسمان کی حفاظت سے یہی مقصود ہے)۔

**اِلَّا مَنِ اسۡتَرَقَ السَّمۡعَ**: نبی کریم ﷺ کی بعثت سے قبل بھی جنات وشیاطین کا داخلہ آسمانوں میں ممنوع ہی تھا مگر فضاء آسمانی تک پہنچ کر چوری سے کچھ سن لیا کرتے تھے، بعثت نبوی کے بعد حفاظت وحی کا یہ مزید سامان ہوا کہ شیاطین کو اس چوری سے بھی بذریعہ شہاب ثاقب روک دیا گیا، رہا یہ سوال کہ آسمانوں کے اندر فرشتوں کی گفتگو کو آسمانوں سے باہر شیاطین کس طرح سن سکتے تھے؟ سو یہ کوئی ناممکن چیز نہیں کہ فرشتے کسی وقت آسمانوں سے نیچے اتر کر باہم ایسی گفتگو کرتے ہوں جس کو شیاطین سن بھاگتے تھے، صحیح بخاری میں حضرت صدیقہ عائشہؓ کی حدیث سے اسی کی تائید ہوتی ہے کہ فرشتے آسمان سے نیچے جہاں بادل ہوتے ہیں، کبھی کسی وقت یہاں تک اترتے ہیں اور آسمانی خبروں کا باہمی تذکرہ کرتے ہیں شیاطین اسی فضاء آسمانی میں چھپ کر یہ خبریں سنتے تھے جن کو شہاب ثاقب کے ذریعہ بند کیا گیا، خلاصہ یہ کہ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ آسمان میں جا کر سن لیتے ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ آسمان میں تذکرہ ہونے کے بعد سن لیتے ہیں اگرچہ بادل ہی میں سہی، اب یہ اشکال نہ رہا کہ حضور ﷺ کی ولادت یا نبوت کے بعد تو شیاطین آسمانوں سے روک دیے گئے، پھر اس کے کیا معنی؟ جواب ظاہر ہے کہ آسمان سے بالکل روک دیے گئے اور بادل میں کچھ سن لیتے ہیں، پھر شہاب ثاقب سے ہلاک یا بدحواس ہوجاتے ہیں۔

پھر یہ سوال ہوتا ہے کہ جب سننے کا مذکورہ دوسرا ذریعہ موجود ہے تو پھر آسمان سے روک دیے جانے کا فائدہ کیا ہوا؟ جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ آسمانوں میں بڑے بڑے امور کا تذکرہ ہوتا ہو تو ان سے بالکل روک دیے گئے ہوں، تا کہ ان علوم کا انکشاف بغیر وحی کے اور کسی طریقہ سے نہ ہو سکے، اور بادلوں میں جزئی واقعات کا تذکرہ ہوتا ہو کہ وہ علوم مقصودہ نہیں، پس دوسرے مقام پر آیت: **وانهم عن السمع لمعزلون** آسمانوں کے اعتبار سے ہے کہ وہاں کی باتیں سننے سے روکے گئے ہیں، اور یہاں: **الامن استرق السمع** سحاب یعنی بادلوں کے اعتبار سے ہے کہ بادلوں میں چوری چھپے کچھ سن لیتے تھے، اس لیے یہ بندش حضور ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے جس کا منشا غالبا حضور ﷺ کے شرف کا اظہار ہے یا ختم نبوت اس کا سبب ہو، کیونکہ آپ ﷺ سے پہلے نبوت ختم نہ ہوئی تھی، تو اگر کاہن وغیرہ آسمانوں کی خبروں میں خلط ملط کر کے عوام کو گمراہ کرنا چاہتے تھے تو آئندہ نبی کے آنے پر وہ اختلاط دور ہوجاتا تھا، اس لیے شیاطین کی بندش کی ضرورت نہ تھی، جب آپ کے وجود سے نبوت کا سلسلہ ختم ہونے کو ہوا پھر ایسے اختلاط والتباس کا دور ہونا مشکل تھا اس لیے بندش کر دی گئی کہ ایسے علوم کسی کو نہ معلوم ہو سکیں، واللہ اعلم۔

**فَاَتۡبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيۡنٌ**: ایک مسئلہ ان آیات میں شہاب ثاقب کا ہے قرآن کریم کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہاب حفاظت وحی کے لئے شیاطین کو مارنے کے واسطے پیدا ہوتے ہیں ان کے ذریعہ شیاطین کو دفع کیا جاتا ہے تا کہ وہ فرشتوں کی باتیں نہ سن سکیں، اس میں ایک اشکال قوی یہ ہے کہ فضائے آسمانی میں شہابوں کا وجود کوئی نئی چیز نہیں، رسول کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے بھی ستارے ٹوٹنے کا مشاہدہ کیا جاتا تھا اور بعد میں بھی یہ سلسلہ جاری ہے تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ شہاب ثاقب شیاطین کو دفع کرنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں جو کہ عہد نبوی کی خصوصیات ہے، اس سے تو بظاہر اسی بات کی تقویت ہوتی ہے جو فلاسفہ کا خیال ہے کہ شہاب ثاقب کی حقیقت اتنی ہی ہے کہ آفتاب کی تمازت سے جو بخارات زمین سے اٹھتے ہیں ان میں کچھ آتش گیر مادے بھی ہوتے ہیں اوپر جا کر جب ان کو آفتاب یا کسی دوسری وجہ سے مزید گرمی پہنچتی ہے تو وہ سلگ اٹھتے ہیں اور دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ستارا ٹوٹا ہے، اسی لئے محاورات میں اس کو ستارا ٹوٹنے ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے، عربی زبان میں بھی اس کے لئے انقضاض کوکب کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو اسی کا ہم معنی ہے۔

جواب یہ ہے کہ ان دونوں باتوں میں کوئی تعارض واختلاف نہیں، زمین سے اٹھنے والے بخارات مشتعل ہو جائیں یہ بھی ممکن ہے اور یہ بھی کوئی بعید نہیں کہ کسی ستارے یا سیارے سے کوئی شعلہ نکل کر گرے، اور ایسا ہونا عام عادات کے مطابق ہمیشہ سے جاری ہو، مگر بعثت نبوی سے پہلے ان شعلوں سے کوئی خاص کام نہیں لیا جاتا تھا، آنحضرت محمد ﷺ کی بعثت کے بعد ان شہابی شعلوں سے یہ کام لے لیا گیا کہ شیاطین جو فرشتوں کی باتیں چوری سے سننا چاہئیں ان کو اس شعلے سے مارا جائے، خلاصہ کلام یہ ہے کہ شہاب ثاقب کے متعلق جو کچھ فلاسفہ نے کہا ہے وہ بھی قرآن کے منافی نہیں اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ یہ شعلے براہ راست بعض ستاروں سے ٹوٹ کر گرائے جاتے ہوں مقصد قرآن دونوں صورتوں میں ثابت اور واضح ہے۔

جاننا چاہیے کہ قرآن وحدیث میں یہ دعویٰ نہیں کہ بغیر شیاطین کے سننے کے ستارہ کبھی نہیں ٹوٹتا، بلکہ دعویٰ یہ ہے کہ جب وہ سننا چاہتے ہیں اس وقت شہاب سے ان کو رجم کیا جاتا ہے، پس ممکن ہے کہ ستارہ محض طبعی طور پر بھی ٹوٹتا ہو، اس تقریر پر بفضلہ تعالیٰ اس بحث میں کوئی عقلی و نقلی اشکال نہ رہا، اور ستارے دن کو بھی ٹوٹتے ہیں، مگر سورج کی روشنی کی وجہ سے نظر نہیں آتے، پس یہ وسوسہ نہ رہا کہ کیا شیاطین رات ہی کو باتیں سنتے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** یعنی آسمانوں پر شیاطین کا کچھ عمل دخل نہیں چلتا، بلکہ بعثت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے تو ان کا گزر بھی وہاں نہیں ہو سکتا، اب انتہائی کوشش ان کی یہ ہوتی ہے کہ ایک شیطانی سلسلہ قائم کر کے آسمان کے قریب پہنچیں اور عالم ملکوت کے نزدیک ہو کر اخبار غیبیہ کی اطلاعات حاصل کریں، اس پر بھی فرشتوں کے پہرے بٹھا دیئے گئے ہیں کہ جب شیاطین ایسی کوشش کریں اوپر سے آتش باری کی جائے، نصوص قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تکوینی امور کے متعلق آسمانوں پر جب کسی فیصلہ کا اعلان ہوتا ہے اور خداوند قدوس اس سلسلہ میں فرشتوں کی طرف وحی بھیجتا ہے تو وہ اعلان ایک خاص کیفیت کے ساتھ اوپر سے نیچے کو درجہ بدرجہ پہنچتا ہے آخر سماء دنیا پر اور بخاری کی ایک روایت کے موافق ''عنان'' (بادل) میں فرشتے اس کا مذاکرہ کرتے ہیں، شیاطین کی کوشش ہوتی ہے کہ ان معاملات کے متعلق غیبی معلومات حاصل کریں، اسی طرح جیسے آج کوئی پیغام بذریعہ وائرلیس ٹیلیفون جارہا ہوا سے بعض لوگ راستہ میں جذب کرنے کی تدبیر کرتے ہیں، ناگہاں اوپر سے بم کا گولہ (شہاب ثاقب) پھٹتا ہے، اور ان غیبی پیغامات کی چوری کرنے والوں کو مجروح یا ہلاک کر کے چھوڑتا ہے، اسی دوا دوش اور ہنگامہ دار و گیر میں جو ایک آدھ بات شیطان کو ہاتھ لگ جاتی ہے وہ ہلاک ہونے سے پیشتر بڑی عجلت کے ساتھ دوسرے شیاطین کو اور وہ شیاطین اپنے دوست انسانوں کو پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں، کاہن لوگ اسی ادھوری بات میں سینکڑوں جھوٹ اپنی طرف سے ملا کر عوام کو غیبی خبریں بتلاتے ہیں، جب وہ ایک آدھ سماوی بات سچی نکلتی ہے تو ان کے معتقدین اسے ان کی سچائی کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں اور جو سینکڑوں بنائی ہوئی خبریں جھوٹی ثابت ہوتی ہیں ان سے اغماض و تغافل برتا جاتا ہے، قرآن وحدیث نے یہ واقعات بیان کر کے متنبہ کر دیا کہ کسی ادنیٰ اور چھوٹی سے چھوٹی سچائی کا سرچشمہ بھی وہ ہی عالم ملکوت ہے، شیاطین الجن والانس کے خزانہ میں بجز کذب و افتراء کوئی چیز نہیں، نیز یہ کہ آسمانی انتظامات اس قدر مکمل ہیں کہ کسی شیطان کی مجال نہیں وہاں قدم رکھ سکے یا باوجود انتہائی جدوجہد کے وہاں کے انتظامات اور فیصلوں پر معتد بہ دسترس حاصل کر لے، باقی جو ایک آدھ جملہ ادھر ادھر کا فرشتوں سے سن بھاگتا ہے حق تعالیٰ نے ارادہ نہیں کیا کہ اس کی قطعاً بندش کر دی جائے، وہ چاہتا تو اس سے بھی روک دیتا، مگر یہ بات اس کی حکمت کے موافق نہ تھی، آخر شیاطین الجن والانس کو جن کی بابت اسے معلوم ہے کہ کبھی اغواء و اضلال سے باز نہ آئیں گے اتنی طویل مہلت اور مغویانہ اسباب و وسائل پر دسترس دینے میں کچھ نہ کچھ حکمت تو سب کو ماننی پڑے گی، اسی طرح کی حکمت یہاں بھی سمجھ لو۔

**تنبیہ:** شیاطین ہمیشہ شہابوں کے ذریعہ سے ہلاک ہوتے رہتے ہیں، مگر جس طرح قطب جنوبی اور ہمالیہ کی بلند تر چوٹی کی تحقیق کرنے والے مرتے رہتے ہیں اور دوسرے ان کا یہ انجام دیکھ کر اس مہم کو ترک نہیں کرتے، اسی پر شیاطین کی مسلسل جدوجہد کو قیاس کر لو، یہ واضح رہے کہ قرآن و حدیث نے یہ نہیں بتلایا کہ شہب کا وجود صرف رجم شیاطین ہی کے لیے ہوتا ہے، ممکن ہے ان کے وجود سے اور بہت سے مصالح وابستہ ہوں اور حسب ضرورت یہ کام بھی لیا جاتا ہو، واللہ اعلم۔

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ﴿١٩﴾

اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور رکھ دیے اس پر بوجھ (پہاڑ) اور اگائی اس میں ہر چیز اندازے سے

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ﴿٢٠﴾

اور بنا دیے تمہارے واسطے اس میں معیشت کے اسباب اور وہ چیزیں جن کو تم روزی نہیں دیتے

**خلاصہ تفسیر:** اور ہم نے زمین کو پھیلایا اور اس (زمین) میں بھاری بھاری پہاڑ ڈال دیئے اور اس میں ہر قسم کی (ضرورت کی

پیداوار) ایک معین مقدار سے اگائی، اور ہم نے تمہارے واسطے اس (زمین) میں معاش کے سامان بنائے (جس میں ضروریات زندگی کی تمام چیزیں داخل ہیں جو کھانے پینے پہننے اور رہنے سہنے سے متعلق ہیں) اور (یہ سامان معاش اور ضروریات زندگی صرف تم کو ہی نہیں دیا بلکہ) ان کو بھی دیا جن کو تم روزی نہیں دیتے۔

وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ: یعنی وہ تمام مخلوقات جو ظاہر میں بھی تمہارے ہاتھ سے خورد ونوش اور زندگی گذارنے کا سامان نہیں پاتے، ظاہر اس لئے کہا کہ گھر کے پالتو جانور بکری، گائے، بیل، گھوڑا، گدھا وغیرہ بھی اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے اپنی روزی اور ضروریات معاش حقیقتاً اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے پاتے ہیں، مگر ظاہری طور پر ان کے خورد ونوش اور رہائش کا انتظام انسانوں کے ہاتھوں ہوتا ہے، ان کے علاوہ تمام دنیا کے بری اور بحری جانور، پرندے اور درندے ایسے ہیں جن کے سامان معاش میں کسی انسانی ارادے اور عمل کا کوئی دخل اور شائبہ بھی نہیں پایا جاتا اور یہ جانور اتنے بے حد بیشمار ہیں کہ انسان نہ ان سب کو پہچان سکتا ہے نہ شمار کرسکتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی نوکر چاکر حیوانات وغیرہ جن سے کام اور خدمت ہم لیتے ہیں اور روزی ان کی خدا کے ذمہ ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآىِٕنُهٗ ۡ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۱﴾

اور ہر چیز کے ہمارے پاس خزانے ہیں، اور اتارتے ہیں ہم اندازہ معین پر (ٹھہرے ہوئے اندازہ پر)

**خلاصہ تفسیر:** اور جتنی چیزیں (ضروریات زندگی سے متعلق) ہیں ہمارے پاس سب کے خزانے کے خزانے (بھرے پڑے) ہیں اور ہم (اپنی خاص حکمت کے مطابق) اس (چیز) کو ایک معین مقدار سے اتارتے رہتے ہیں۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآىِٕنُهٗ: اس آیت میں اشارہ ہے توکل کی حقیقت کا، اور یہ بھی کہ ظاہری اسباب میں مخلوقات کی طرف نظر نہ ہو، بلکہ ساری نظر اسباب کے خالق یعنی خدا تعالیٰ پر رکھنی چاہیے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جو چیز جتنی مقدار میں چاہے پیدا کردے، نہ کچھ تعب ہوتا ہے نہ تکان، ادھر ارادہ کیا ادھر وہ چیز موجود ہوئی، گویا تمام چیزوں کا خزانہ اس کی لامحدود قدرت ہوئی جس سے ہر چیز حکمت کے موافق ایک معین نظام کے ماتحت ٹھہرے ہوئے اندازہ پر بلاکم وکاست نکلی چلی آتی ہے۔

وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ ۚ وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

اور چلائیں ہم نے ہوائیں اوس بھری (بوجھل کرنے والی ابر کی) پھر اتارا ہم نے آسمان سے پانی پھر تم کو وہ پلایا [1] اور تمہارے پاس نہیں اسکا خزانہ [2]

**خلاصہ تفسیر:** اور ہم ہی ہواؤں کو بھیجتے رہتے ہیں جو بادل کو پانی سے بھر دیتی ہیں پھر ہم ہی آسمان سے پانی برساتے ہیں پھر وہ پانی تم کو پینے کو دیتے ہیں اور تم اس کو ذخیرہ کر کے رکھنے والے نہ تھے (کہ اگلی بارش تک اس ذخیرہ کو استعمال کرتے رہتے، پس اگر بارش نہ ہوتی تو بڑی مصیبت میں پڑتے)۔

وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ: یہ جو فرمایا کہ ہوائیں بادلوں کو پانی سے بھر دیتی ہیں، یہ اس اعتبار سے کہ بخارات جن سے بادل بنتے ہیں ہوا اُن کو سردی کے طبقہ میں اوپر پہنچا دیتی ہے جہاں ان بخارات میں پانی پیدا ہوجاتا ہے تو ہوا بادلوں میں پانی پیدا ہونے کا سبب ہوگئی اور کچھ پانی تو وہاں پیدا ہو چکا ہوتا ہے، پھر حق تعالیٰ حسب عادت آسمان سے بھی کچھ پانی امداد کے واسطے ہمیشہ یا کبھی کبھی بھیج دیتے ہوں گے، اس لیے آگے فرمایا: فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً اس تقریر پر یہ آیتیں مشاہدہ اور تجربہ کے اصلا مخالف نہ رہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی برساتی ہوائیں بھاری بھاری بادلوں کو پانی سے بھر کر لاتی ہیں، ان سے پانی برستا ہے جو نہروں چشموں اور کنوؤں میں جمع ہو کر تمہارے کام آتا ہے، خدا چاہتا تو اسے پینے کے قابل نہ چھوڑتا لیکن اس نے اپنی مہربانی سے کس قدر شیریں اور لطیف پانی تمہارے بارہ مہینہ پینے کے لیے زمین کے مسام میں جمع کر دیا۔

**فائدہ:** ۲ یعنی نہ اوپر بارش کے خزانہ پر تمہارا قبضہ ہے، نہ نیچے چشمے اور کنوئیں تمہارے اختیار میں ہیں، خدا جب چاہے بارش برسائے، نہ تم روک سکتے ہو نہ اپنے حسب خواہش لا سکتے ہو اور اگر کنوؤں اور چشموں کا پانی خشک کر دے یا زیادہ نیچے اتار دے کہ تمہاری دسترس سے باہر ہو جائے تو کیسے قابو حاصل کر سکتے ہو۔

---

وَإِنَّا لَنَحْنُ نُحْيِ وَنُمِيتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ

اور ہم ہی ہیں جلانے والے اور مارنے والے اور ہم ہی ہیں پیچھے رہنے والے ۱ اور ہم نے جان رکھا ہے آگے بڑھنے والوں کو تم میں سے

ع ۲ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِيْنَ ﴿۲۴﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ط إِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾ ع

اور جان رکھا ہے پیچھے رہنے والوں کو ۲ اور تیرا رب وہی اکٹھا کر لائے گا ان کو، بیشک وہی ہے حکمتوں والا خبردار ۳

---

**خلاصہ تفسیر:** اور ہم ہی ہیں کہ زندہ کرتے ہیں اور مارتے ہیں اور (سب کے مرنے کے بعد) ہم ہی (باقی) رہ جائیں گے، اور ہم تمہارے اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور ہم تمہارے پچھلوں کو بھی جانتے ہیں، اور بیشک آپ کا رب ہی ان سب کو (قیامت میں) محشور فرمائے گا (یہ اس لیے فرمایا کہ اوپر توحید ثابت ہوئی ہے، پس اس جگہ منکر توحید کی سزا کی طرف اشارہ کر دیا) بیشک وہ حکمت والا ہے (ہر شخص کو اس کے مناسب بدلہ دے گا اور) علم والا ہے (سب کے اعمال کی اس کو پوری خبر ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی دنیا فنا ہو جائے گی، ایک خدا اپنی کامل صفات کے ساتھ باقی رہے گا، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''ہر کوئی مر جاتا ہے اور اس کی کمائی اللہ کے ہاتھ میں رہتی ہے''۔

**فائدہ:** ۲ یعنی اگلا پچھلا کوئی شخص یا اس کے اعمال ہمارے احاطہ علمی سے باہر نہیں، حق تعالیٰ کو ازل سے ہر چیز کا تفصیلی علم ہے، اسی کے مطابق دنیا میں پیش آتا ہے اور اسی کے موافق آخرت میں تمام مخلوق کا انصاف کیا جائے گا۔

**تنبیہ:** آگے بڑھنا اور پیچھے رہنا عام ہے، ولادت میں ہو یا موت میں، یا اسلام میں، یا نیک کاموں میں، صفوف صلوٰۃ میں آگے پیچھے رہنا بھی نیک کام کے ذیل میں آ گیا۔

**فائدہ:** ۳ یعنی ایک ایک ذرہ اسکے علم میں ہے، جب اسکی حکمت مقتضی ہوگی کہ سب کو بیک وقت انصاف کیلئے اکٹھا کیا جائے تو کچھ دشواری نہ ہوگی، قبر کی مٹی، جانوروں کے پیٹ، سمندر کی تہ، ہوائی فضا میں یا جہاں کہیں کسی چیز کا کوئی جز ہوگا، وہ اپنے علم محیط اور قدرت کاملہ سے جمع کر دے گا۔

---

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۶﴾

اور بنایا ہم نے آدمی کو کھنکھناتے (بجنے والی مٹی سے) سنے ہوئے گارے سے (جو بتی سے سڑے ہوئے گارے سے)

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے مختلف نعمتوں کے پیرائے میں توحید کا ذکر تھا، اس سے قبل کفار پر وبال وعذاب کا ذکر تھا، اب آدم علیہ السلام کے قصہ میں اپنا خالق ہونا بتا کر توحید یعنی ظاہری انعام، اور ملائکہ کو سجدہ کا حکم دینے میں باطنی انعام کا بیان ہے، ابلیس کی نافرمانی اور بدانجامی کے ضمن میں منکرین کے لیے عذاب اور وبال بیان فرماتے ہیں۔

اور ہم نے انسان کو (یعنی اس نوع کی اصل اول آدم علیہ السلام کو) بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے کی بنی ہوئی تھی پیدا کیا (یعنی پہلے گارے کو خوب خمیر کیا کہ اس میں بوآنے لگی، پھر وہ خشک ہوگیا کہ وہ خشک ہونے سے کھن کھن بولنے لگا، جیسے مٹی کے برتن چٹکی مارنے سے بجا کرتے ہیں، پھر اس خشک گارے سے آدم کا پتلا بنایا جو بڑی قدرت کی علامت ہے)۔

* * *

**فائدہ:** آیات آفاقیہ کے بعد بعض آیات انفسیہ کو بیان فرماتے ہیں جس کے ضمن میں شاید یہ تنبیہ بھی مقصود ہے کہ جس ذات منبع الکمالات نے تم کو ایسے انوکھے طریقہ سے اول پیدا کیا، دوبارہ پیدا کر کے ایک میدان میں جمع کر دینا اس کے لیے کیا مشکل ہے۔

**تنبیہ:** آدمی کی پیدائش کے متعلق یہاں دو لفظ فرمائے: صَلْصَال (بجنے والی کھنکھناتی مٹی جو آگ میں پکنے سے اس حالت کو پہنچتی ہے اسی کو دوسری جگہ كَالْفَخَّارِ فرمایا) اور حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ (سڑا ہوا گارا جس سے بوآتی ہو) خیال یہ ہوتا ہے کہ اول سنے ہوئے گارے سے آدم کا پتلا تیار کیا، پھر جب خشک ہو کر اور پک کر کھن کھن بجنے لگا، تب مختلف تصورات کے بعد اس درجہ پر پہنچا کہ انسانی روح پھونکی جائے، روح المعانی میں بعض علماء کا قول نقل کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: "كَاَنَّه، سُبْحَانَه، اَفْرَغَ الْحَمَا فَصَوَّرَ مِنْ ذَلِكَ تِمْثَالَ اِنْسَان اَجْوَفَ فَيبس حَتّٰى اِذَا نقِرَ صَوَّتَ ثُمَّ غَيَّرَه، طَوْرًا بَعْدَ طَوْرٍ حَتّٰى نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُوْحِهٖ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ". حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں مٹی پانی میں تر کی اور خمیر اٹھایا کہ کھن کھن بولنے لگی، وہ ہی بدن ہوا انسان کا، اس کی خاصیتیں سختی اور بوجھ اس میں رہ گئیں اسی طرح گرم ہوا کی خاصیت (حدت و خفت) جن کی پیدائش میں رہی۔

راغب اصفہانیؒ نے ایک طویل مضمون کے ضمن میں متنبہ کیا ہے کہ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ اور طِيْنٍ لَّازِبٍ وغیرہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ مٹی اور پانی ملا کر ہوا سے خشک کیا اور فخّار کا لفظ دلالت کرتا ہے کہ کسی درجہ میں آگ سے پکایا گیا یہ ہی ناری جزء آدمی کی شیطنت کا منشاء ہے، اسی مناسبت سے ایک جگہ فرمایا: خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (الرحمٰن: ۵۴-۵۵) راغبؒ کا مضمون بہت طویل اور دلچسپ ہے، افسوس ہے ہم اس کا خلاصہ بھی یہاں درج نہیں کر سکتے۔

## وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾

اور جان کو بنایا ہم نے اس سے پہلے لو کی آگ سے

**خلاصہ تفسیر:** اور جن کو (یعنی اس نوع کی اصل ابوالجان کو) اس کے قبل (یعنی آدم علیہ السلام سے قبل) آگ سے کہ وہ (انتہائی لطافت کی وجہ سے) ایک گرم ہوا تھی پیدا کر چکے تھے۔

**مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ:** مطلب یہ کہ اس آگ میں دھوئیں کے اجزاء نہ تھے، اس لیے انتہائی لطافت کی وجہ سے وہ ہوا کی طرح نظر نہ آتی تھی، کیونکہ آگ کا نظر آنا کثیف اجزاء کے ملنے سے ہوتا ہے، اس کو دوسری آیت میں اس طرح فرمایا ہے: وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّار، اور غالبا جنوں کو آگ سے پیدا کرنے کا یہ مطلب ہے کہ ان میں غالب حصہ آگ کا ہے، جیسا کہ انسان میں سب عناصر ہیں، مگر غالب حصہ مٹی کا ہے، اگر اس پر یہ شبہ ہو کہ جب دیگر عناصر مل گئے تو خالص آگ کہاں رہی؟ حالانکہ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّار سے خالص آگ ہونا معلوم ہوتا ہے، جواب یہ ہے کہ اول خالص آگ لی گئی ہوگی، پھر دیگر اجزاء کے ملنے سے خالص نہ رہی۔

مختلف دلائل سے جنات کے متعلق اتنی باتیں معلوم ہوتی ہیں: ① آگ سے پیدا ہونا ② ان میں توالد و تناسل ہونا ③ عادتا ان کا نظر نہ آنا ④ مختلف شکلیں بدل سکنا، مگر جن شکلوں سے کوئی التباس دین کے لیے نقصان دہ ہوتا ہو ان پر وہ بحکمت الٰہی قادر نہیں ہوتے، مثلا نبی کی شکل نہیں بنا سکتے، اور جس میں کوئی التباس دنیا کے لیے نقصان دہ ہوتا ہو اس پر وہ کم قادر ہوتے ہیں، اور شیطان بھی جنوں کی قسم سے ہے، جس جن میں شرارت ہو اس کو

شیطان کہتے ہیں، اور یہاں آیت میں: وَالْجَآنَّ جن سے ان کی اصل یعنی جنوں کا باپ مراد ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی لطیف آگ ہوا ملی ہوئی، کما قال: وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (الرحمن:۱۵) یا یوں کہو تیز ہوا جو آگ کی طرح جلانے والی ہو، جسے ہمارے یہاں ''لُو'' کہتے ہیں، بہرحال آدمیوں کا باپ ایسے مادہ سے پیدا کیا گیا جس میں عنصر ترابی غالب تھا اور جنوں کا باپ اس مادہ سے پیدا ہوا جس میں ناری عنصر کا غلبہ تھا، ابلیس بھی اسی قسم میں تھا۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾

اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو میں بناؤں گا ایک بشر کھنکھاتے سنے ہوئے گارے سے

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۲۹﴾

پھر جب ٹھیک کروں اس کو اور پھونک دوں اس میں اپنی جان سے تو گر پڑیو اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے

**خلاصہ تفسیر:** اور وہ وقت یاد کرنے قابل ہے جب آپ کے رب نے ملائکہ سے (ارشاد) فرمایا کہ میں ایک بشر کو (یعنی اس کے پتلے کو) بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے کی بنی ہوگی پیدا کرنے والا ہوں، سو میں جب اس کو (یعنی اس کے اعضائے جسمانیہ کو) پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی (طرف سے) جان ڈال دوں تو تم سب اس کے روبرو سجدہ میں گر پڑنا۔

**وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ:** روح کوئی جسم ہے یا جوہر مجرد؟ اس میں علماء و حکماء کا اختلاف قدیم زمانے سے چلا آتا ہے شیخ عبدالرءوف مناویؒ نے فرمایا کہ اس میں حکماء کے اقوال ایک ہزار تک پہنچے ہیں، مگر سب قیاسات اور تخمینے ہی ہیں، کسی کو یقینی نہیں کہا جا سکتا امام غزالیؒ، امام رازیؒ اور عموماً صوفیہ اور فلاسفہ کا قول یہ ہے کہ وہ جسم نہیں بلکہ جوہر مجرد ہے، امام رازیؒ نے اس کے بارہ دلائل پیش کئے ہیں، مگر جمہور علماء امت روح کو ایک جسم لطیف قرار دیتے ہیں، نفخ کے معنی پھونک مارنے کے ہیں، اگر بقول جمہور روح کو جسم لطیف قرار دیا جائے تب تو روح پھونکنے کے حقیقی معنی مراد ہیں، اور اگر مادہ سے مجرد یعنی جوہر مان لیا جائے تو روح پھونکنے سے بدن کے ساتھ اس کا تعلق پیدا ہو جانا مراد ہے، اور اس تعلق کو مجازاً نفخ روح کہہ دیا۔

روح کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی طرف کی ہے: رُّوْحِيْ یہ اس کی شرافت و منزلت ظاہر کرنے کے لیے ہے، اس لیے کہ روح اسرار الٰہیہ میں سے ایک سر خفی ہے، اسی لیے کہا گیا ہے: "من عرف نفسه فقد عرف ربه"۔

* * *

**فائدہ:** یعنی آدم کا پتلا ٹھیک کر کے اس قابل کر دوں کہ روح انسانی فائض کی جا سکے پھر اس میں جان ڈال دوں جس سے ایک جماد انسان بن جاتا ہے، اس وقت تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ سب سجدہ میں گر پڑو

**تنبیہ:** ''روح'' (جان) کی اضافت جو اپنی طرف کی، یہ محض تشریف و تکریم اور روح انسانی کا امتیاز ظاہر کرنے کے لیے ہے، یعنی وہ خاص ''جان'' جس میں نمونہ ہے میری صفات (علم و تدبیر وغیرہ) کا، اور جو اصل فطرت سے مجھے یاد کرنے والی اور بسبب خصوصی لطافت کے مجھ سے نسبۃً قریبی علاقہ رکھنے والی ہے، امام غزالی رحمہ اللہ نے دوسرے عنوان سے اس اضافت پر روشنی ڈالی ہے فرماتے ہیں اگر آفتاب کو قوت گویائی مل جائے اور وہ کہے کہ میں نے اپنے نور کا فیض زمین کو پہنچایا، تو کیا یہ لفظ (اپنا نور) غلط ہوگا؟ جب یہ کہنا صحیح ہے حالانکہ یہ آفتاب زمین میں حلول کرتا ہے نہ اس کا نور اس سے جدا ہوتا ہے، بلکہ زمین سے لاکھوں میل دور رہ کر بھی روشنی کی باگ اسی کے قبضہ میں ہے، زمین کا کچھ اختیار نہیں چلتا، بجز اس کے کہ اس سے بقدر اپنی استعداد کے نفع حاصل کرتی رہے، تو وراء الوراء خدا کا یہ فرمانا کہ میں نے آدم میں اپنی روح پھونکی، حلول و اتحاد وغیرہ کی دلیل کیسے بن سکتی ہے، ''روح'' کے متعلق مناسب کلام انشاء اللہ آئندہ: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ (الاسراء:۸۵) میں کیا جائے گا۔

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۱﴾

تب سجدہ کیا ان فرشتوں نے سب نے مل کر، مگر ابلیس نے، نہ مانا کہ ساتھ ہو سجدہ کرنے والوں کے

قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ

فرمایا اے ابلیس کیا ہوا تجھ کو کہ ساتھ نہ ہوا سجدہ کرنے والوں کے، بولا میں وہ نہیں کہ سجدہ کروں ایک بشر کو جس کو تو نے بنایا

مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۳۳﴾

کھنکھناتے سنے ہوئے گارے سے

**خلاصہ تفسیر:** سو (جب اللہ تعالیٰ نے اس کو بنالیا تو) سارے کے سارے فرشتوں نے (آدم علیہ السلام کو) سجدہ کیا مگر ابلیس نے کہ اس نے اس بات کو قبول نہ کیا کہ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ شامل کرنے ہو (یعنی سجدہ نہ کیا) اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے ابلیس! تجھ کو کون سا امر باعث ہوا کہ تو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا؟ کہنے لگا کہ میں ایسا نہیں کہ بشر کو سجدہ کروں جس کو آپ نے بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے کی بنی ہے پیدا کیا ہے (یعنی ایسے حقیر وذلیل مادہ سے بنایا گیا ہے، کیونکہ میں نورانی مادہ آتش سے پیدا ہوا ہوں تو نورانی ہو کر ظلمانی کو کیسے سجدہ کروں!)۔

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿۳۴﴾ وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳۵﴾

فرمایا تو تو نکل یہاں سے [1] تجھ پر مار ہے [2] اور تجھ پر پھٹکار ہے اس دن تک کہ انصاف ہو [3]

**خلاصہ تفسیر:** ارشاد ہوا تو (اچھا پھر) آسمان سے نکل کیونکہ بیشک تو (اس حرکت سے) مردود ہوگیا، اور بیشک تجھ پر (میری) لعنت قیامت تک رہے گی (جیسا دوسری آیت میں ہے: عَلَيْكَ لَعْنَتِيْ یعنی قیامت تک تو میری رحمت سے دور رہے گا، مقبولیت اور توبہ کی توفیق نہ ہوگی)۔

**وَاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ:** ظاہر ہے کہ جو قیامت تک رحمت کے قابل نہ ہو تو پھر قیامت میں اس کے مرحوم ہونے کا احتمال ہی نہیں ہوسکتا، پس جس وقت تک رحمت کا احتمال تھا اس کی نفی کردی، اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اس میں تو مہلت مانگنے سے پہلے ہی مہلت دینے کا وعدہ ہوگیا، جواب یہ ہے کہ یہاں مقصود قیامت تک عمر دینا نہیں ہے کہ یہ شبہ ہو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ دنیاوی زندگی میں تو ملعون ہے اگرچہ وہ قیامت تک طویل ہی کیوں نہ ہو۔

**اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ:** بعض لوگوں نے اپنے جہل کے سبب اس سے استدلال کیا ہے کہ ابلیس اس کے بعد ملعون نہ رہے گا، جواب یہ ہے کہ اس سے مراد دوام اور ہمیشگی ہے، کیونکہ جب دار العمل یعنی دنیا ہی میں مقبول نہ ہوا تو دار الجزاء یعنی آخرت میں کیسے مقبول ہوگا۔

* * *

**فائدہ:** [1] یعنی جنت سے یا آسمان سے یا اس مقام عالی سے نکل جہاں اب تک پہنچا ہوا تھا۔

**فائدہ:** [2] یعنی مردود ومطرود ہے یا رجیم سے اشارہ اسی طرف ہے جو پہلے گزرا کہ شہاب سے شیاطین کا رجم کیا جاتا ہے، گویا اس لفظ میں اس کے شبہ کا جواب دیا گیا کہ تیرا سجود سے انکار کرنا شرف عنصری کی بناء پر نہیں، فضل وشرف تو اسی کے لیے ہے جسے خدا تعالیٰ سرفراز فرمائے، ہاں تیرے اباء واستکبار کا منشاء وہ شقاوت وبدبختی ہے جو تیری سوء استعداد کی وجہ سے مقدر ہو چکی ہے۔

**فائدہ:** [3] یعنی قیامت کے دن تک خدا کی پھٹکار اور بندوں کی طرف سے لعنت پڑتی رہے گی، اس طرح آناً فاناً خیر سے بعید تر ہوتا رہے گا، جب قیامت تک توفیق خیر کی نہ ہوگی تو اس کے بعد تو کوئی موقع ہی نہیں کیونکہ آخرت میں ہر شخص وہ ہی کاٹے گا جو یہاں بویا ہے، یا یوں کہو کہ قیامت کے دن تک لعنت رہے گی، اس کے بعد جو بیشمار قسم کے عذاب ہوں گے وہ لعنت سے کہیں زیادہ ہیں، یا اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ کا لفظ دوام سے کنایہ ہو۔

قَالَ رَبِّ فَاَنۡظِرۡنِیۡۤ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ ﴿۳۶﴾ قَالَ فَاِنَّکَ مِنَ الۡمُنۡظَرِیۡنَ ﴿۳۷﴾ اِلٰی یَوۡمِ الۡوَقۡتِ الۡمَعۡلُوۡمِ ﴿۳۸﴾

بولا اے رب تو مجھ کو ڈھیل دے اس دن تک کو مردے زندہ ہوں، فرمایا کہ تو تجھ کو ڈھیل دی، اسی مقرر وقت کے دن تک ۱

**خلاصہ تفسیر:** کہنے لگا (کہ اگر مجھے آدم کی وجہ سے مردود کیا ہے) تو پھر مجھ کو (مرنے سے) مہلت دیجئے قیامت کے دن تک (تا کہ آدم سے اور ان کی اولاد سے خوب بدلہ لوں) ارشاد ہوا (جب تو مہلت مانگتا ہے) تو (جا) تجھ کو معین وقت کی تاریخ تک مہلت دی گئی۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی اس وقت تک تجھے ڈھیل دی جاتی ہے، جی کھول کر ارمان نکال لے، اس واقعہ کی تفصیل ''بقرہ'' اور ''اعراف'' میں گزر چکی ہے، ہم نے ''اعراف'' کے دوسرے رکوع میں اس کے اجزاء پر جو کچھ کلام کیا ہے اسے ملاحظہ کرلیا جائے، اعادہ کی ضرورت نہیں۔

قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَغۡوَیۡتَنِیۡ لَاُزَیِّنَنَّ لَهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَاُغۡوِیَنَّهُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۳۹﴾

بولا اے رب! جیسا تو نے مجھ کو راہ سے کھودیا میں بھی ان سب کو بہاریں دکھلاؤں گا زمین سے اور راہ سے کھودوں گا ان سب کو

اِلَّا عِبَادَکَ مِنۡهُمُ الۡمُخۡلَصِیۡنَ ﴿۴۰﴾

مگر جو تیرے چنے ہوئے بندے ہیں ۱

**خلاصہ تفسیر:** کہنے لگا اے میرے رب! بسبب اس کے کہ آپ نے مجھ کو (بحکم تکوین) گمراہ کیا ہے میں قسم کھاتا ہوں کہ میں دنیا میں ان کی (یعنی آدم اور آدم کی اولاد کی) نظر میں معاصی کو مرغوب کر کے دکھلاؤں گا، اور ان سب کو گمراہ کروں گا بجز آپ کے ان بندوں کے جو ان میں منتخب کئے گئے ہیں (یعنی جس کو آپ نے میرے اثر سے محفوظ رکھا ہے ان کو گمراہ نہ کرسکوں گا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی دنیا کی بہاریں دکھلا کر خواہشات نفسانی کے جال میں پھنساؤں گا اور تیرے مخصوص ومنتخب بندوں کے سوا سب کو راہ حق سے ہٹا کر رہوں گا، یہ کلمات لعین نے جوش انتقام میں کہے، مطلب یہ تھا کہ آپ کا تو کچھ بگاڑ نہیں سکتا، لیکن جس کی وجہ سے میں دور پھینکا گیا ہوں اپنی قدرت اور بساط کے موافق اس کی نسلوں تک سے بدلہ لے کر چھوڑوں گا، سورۂ ''اعراف'' میں اس موضوع پر ہم نے جو کچھ لکھا ہے ملاحظہ کیا جائے۔

قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَیَّ مُسۡتَقِیۡمٌ ﴿۴۱﴾

فرمایا یہ راہ ہے مجھ تک سیدھی

**خلاصہ تفسیر:** ارشاد ہوا کہ (ہاں!) یہ (منتخب ہوجانا جس کا طریقہ نیک اعمال اور پوری اطاعت بجالانا ہے) ایک سیدھا راستہ ہے جو مجھ تک پہنچتا ہے (یعنی اس پر چل کر ہر شخص ہمارا مقرب ہوجاتا ہے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی بیشک بندگی اور اخلاص کی راہ سیدھی میرے تک پہنچتی ہے اور یہ ہی میرا صاف اور سیدھا راستہ ہے جس میں کوئی ہیر پھیر نہیں کہ جو بندے عبودیت و اخلاص کی راہ اختیار کریں گے وہ ہی شیطان لعین کے تسلط سے مامون رہیں گے، بعض مفسرین نے هٰذَا صِرَاطٌ عَلَیَّ مُسۡتَقِیۡمٌ کو تہدید پر حمل کیا، یعنی او ملعون! لوگوں کو صراط مستقیم سے گمراہ کر کے کہاں بھاگے گا وہ کون سا راستہ ہے جو ہماری طرف نہ جاتا ہو، پھر ہماری سزا سے بچ کر کدھر جاسکتا ہے اس وقت کلام ایسا ہوگا جیسے کہتے ہیں: ''اِفۡعَلۡ مَاشِئۡتَ فَطَرِیۡقُکَ عَلَیَّ'' اور قرآن میں دوسری جگہ فرمایا: اِنَّ رَبَّکَ لَبِالۡمِرۡصَادِ (الفجر: ۱۴) واللہ اعلم۔

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ ﴿۴۲﴾

جو میرے بندے ہیں تیرا ان پر کچھ زور نہیں مگر جو تیری راہ چلا بہکے ہوؤں میں

**خلاصہ تفسیر:** واقعی میرے ان (مذکور) بندوں پر تیرا ذرا بھی بس نہ چلے گا ہاں! مگر جو گمراہ لوگوں میں تیری راہ پر چلنے لگے (تو ان پر تیرا بس چلے گا)۔

**إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ:** اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مخصوص اور منتخب بندوں پر شیطانی فریب کا اثر نہیں ہوتا ہے، مگر اسی واقعہ آدم میں یہ بھی مذکور ہے کہ آدم وحوا پر اس کا فریب چل گیا، اسی طرح صحابہ کرام کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے: **إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا** جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ پر بھی شیطان کا کید اس موقع میں چل گیا، اس لیے آیت مذکورہ میں اللہ کے مخصوص بندوں پر شیطان کا تسلط نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے قلوب وعقول پر شیطان کا ایسا تسلط نہیں ہوتا کہ وہ اپنی غلطی پر کسی وقت متنبہ ہی نہ ہوں جس کی وجہ سے ان کو توبہ نصیب نہ ہو، یا کوئی ایسا گناہ کر بیٹھیں جس کی مغفرت نہ ہو سکے، اور مذکورہ واقعات اس کے منافی نہیں کیونکہ آدم وحوا علیہما السلام نے توبہ کی اور یہ توبہ قبول ہوئی، اسی طرح حضرات صحابہ نے بھی توبہ کر لی تھی اور شیطان کے مکر سے جس گناہ میں ابتلاء ہوا وہ معاف کر دیا گیا۔

**إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ:** یہاں جواب میں جو ترتیب بدل گئی کہ پیچھے ابلیس کے قول **ولاغوينهم اجمعين الا عبادك منهم المخلصين** میں گمراہوں کا ذکر پہلے تھا اور مخلصین کا ذکر بعد میں، اور یہاں جواب میں اس کے برعکس ترتیب اختیار کی گئی، اس میں یہ نکتہ ہے کہ جس کا اہتمام زیادہ ہوتا ہے اسے مقدم کیا کرتے ہیں، سو ابلیس کو تو گمراہ کرنے کا اہتمام زیادہ ہوتا ہے اس لیے اس نے گمراہوں کو مقدم کیا، جبکہ حق تعالیٰ کو مخلصین کی حفاظت کا اہتمام زیادہ ہوتا ہے، اس لیے مخلصین کو مقدم کیا، واللہ اعلم۔

* * *

**فائدہ:** یعنی بیشک چنے ہوئے بندوں پر جن کا ذکر اوپر ہوا تیرا کچھ زور نہ چلے گا یا یہ مطلب ہو کہ کسی بندے پر بھی تیری زبردستی نہیں چل سکتی، ہاں جو خود ہی بہک کر اپنی جہالت وحماقت سے تیرے پیچھے ہو لیا وہ اپنے اختیار سے خراب وبرباد ہوا، جیسے پہلے خود شیطان کا مقولہ گزر چکا: **وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلَّا أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي** (ابراہیم: ۲۲)۔

وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۴۳﴾ لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ ط لِكُلِّ بَابٍ مِنْهُمْ جُزْءٌ مَقْسُومٌ ﴿۴۴﴾ ع

اور دوزخ پر وعدہ ہے ان سب کا ۱، اس کے سات دروازے ہیں ہر دروازہ کے واسطے ان میں سے ایک فرقہ ہے بانٹا ہوا ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور (جو لوگ تیری راہ پر چلیں گے) ان سب کا ٹھکانا جہنم ہے، جس کے سات دروازے ہیں، ہر دروازہ (میں سے جانے) کیلئے ان لوگوں کے الگ الگ حصے ہیں (کہ کوئی کسی دروازے سے جائے گا کوئی کسی دروازے سے)۔

**لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ:** اس میں علماء کے مختلف اقوال ہیں: ① بعض نے کہا ہے کہ سات درجے اور طبقے ہیں جن میں مختلف قسم کا عذاب ہے، جو شخص جیسے عذاب کا مستحق ہوگا ویسے ہی طبقے میں داخل ہوگا، اور چونکہ ہر طبقہ کا دروازہ بھی علیحدہ ہوگا اس لیے سات دروازے سے سات طبقوں کو تعبیر کیا ② اور بعض نے کہا ہے کہ سات دروازے ہی مراد ہیں، اور مقصود یہ بتلانا ہے کہ اس میں بہت لوگ داخل ہوں گے کہ ایک دروازہ کافی نہ ہوگا، تاکہ اس کے سننے سے زیادہ ہول پیدا ہو۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی تیرے اور تیرے ساتھیوں کے لیے دوزخ کا جیل خانہ تیار ہے تم سب اسی گھاٹ اتارے جاؤ گے۔

**فائدہ:** ۲ بعض سلف نے **سَبْعَةُ أَبْوَابٍ** سے دوزخ کے سات طبقے اوپر نیچے مراد لیے ہیں، چنانچہ ان کے نام ابن عباس نے یہ بتلائے

ہیں: ① جہنم ② سعیر ③ لظی ④ حطمہ ⑤ سقر ⑥ جحیم ⑦ ہاویہ اور لفظ ''جہنم'' ایک خاص طبقہ اور مجموعہ طبقات دونوں پر اطلاق کیا جاتا ہے، بعض کے نزدیک سات دروازے مراد ہیں، جن سے الگ الگ دوزخی داخل ہوں گے، واللہ اعلم، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''جیسے بہشت کے آٹھ دروازے ہیں نیک عمل والوں پر بانٹے ہوئے، ویسے دوزخ کے سات دروازے ہیں بدعمل والوں پر بانٹے ہوئے، شاید بہشت کا ایک دروازہ زیادہ اس لیے ہے کہ بعضے موحدین نرے فضل سے جنت میں جائیں گے بغیر عمل کے، باقی عمل میں دروازے برابر ہیں''۔

## اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝٤٥ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ۝٤٦

پرہیزگار ہیں باغوں میں اور چشموں میں ۱؎، کہیں گے ان کو جاؤ ان میں سلامتی سے خاطر جمع (بے کھٹکے) سے ۲؎۔

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے آیات کے آخر میں دوزخ والوں کا ذکر تھا، اب اہل جنت کا ذکر ہے جیسا کہ قرآن کی عادت ہے۔

بے شک خدا سے ڈرنے والے (یعنی اہل ایمان) باغوں اور چشموں میں (بستے) ہوں گے (اگر گناہ نہ ہوئے یا معافی ہوگئی تب تو اول ہی سے، ورنہ گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد جنت میں داخل ہوں گے، ان سے کہا جائے گا کہ) تم ان (باغوں اور چشموں) میں سلامتی اور امن کے ساتھ داخل ہو (یعنی اس وقت بھی ہر تکلیف سے سلامتی ہے اور آئندہ بھی کسی شر کا اندیشہ نہیں)۔

* * *

**فائدہ: ۱؎** جو لوگ کفر وشرک اور معاصی وذنوب سے پرہیز کرتے ہیں، وہ حسب مراتب جنت کے باغوں میں رہیں گے جہاں بڑے قرینہ سے چشمے اور نہریں بہتی ہوں گی شیطان کے متبعین کے بعد یہ عبادِ مخلصین کا انجام بیان فرمایا۔

**فائدہ: ۲؎** یعنی فی الحال تمام آفات وعیوب سے صحیح وسالم اور آئندہ ہمیشہ کیلئے ہر قسم کی فکر، پریشانی، گھبراہٹ اور خوف وہراس سے بے کھٹکے۔

## وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ۝٤٧

اور نکال ڈالی ہم نے جو ان کے جیوں میں تھی خفگی بھائی ہوگئے ۱؎ تختوں پر بیٹھے آمنے سامنے ۲؎۔

## لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ۝٤٨

نہ پہنچے گی ان کو وہاں کچھ تکلیف اور نہ ان کو وہاں سے کوئی نکالے ۳؎۔

**خلاصہ تفسیر:** اور (دنیا میں طبعی تقاضے سے) ان کے دلوں میں جو کینہ تھا ہم وہ سب (ان کے دلوں سے جنت میں داخل ہونے سے پہلے ہی) دور کردیں گے کہ سب بھائی بھائی کی طرح (الفت ومحبت سے) رہیں گے تختوں پر آمنے سامنے بیٹھا کریں گے، وہاں ان کو ذرا بھی تکلیف نہ پہنچے گی اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔

* * *

**فائدہ: ۱؎** یعنی جنت میں پہنچ کر اہل جنت میں باہم کوئی گذشتہ کدورت باقی نہ رہے گی، بالکل پاک وصاف کرکے داخل کیے جائیں گے، نہ وہاں ایک کو دوسرے پر حسد ہوگا، بلکہ بھائی بھائی ہوکر انتہائی محبت والفت سے رہیں گے، ہر ایک دوسرے کو دیکھ کر مسرور ومحفوظ ہوگا، اس کا کچھ بیان سورہ اعراف آٹھویں پارہ کے اخیر ربع میں گزر چکا۔

**فائدہ: ۲؎** یعنی عزت وکرامت کے تختوں پر آمنے سامنے بیٹھ کر باتیں کریں گے، ملاقات وغیرہ کے وقت ایسی نشست نہ ہوگی جس میں کوئی آگے کوئی پیچھے ہو۔

**فائدہ: ۳؎** حدیث میں ہے کہ جنتیوں سے کہا جائے گا، اے اہل جنت! اب تمہارے لیے یہ ہے کہ ہمیشہ تندرست رہو، کبھی بیماری نہ

ستائے، ہمیشہ زندہ رہو کبھی موت نہ آئے، ہمیشہ آرام سے مقیم رہو، کبھی سفر کی تکلیف نہ اٹھانی نہ پڑے۔

نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۴۹﴾ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴿۵۰﴾

خبر سنا دے میرے بندوں کو کہ میں ہوں اصل بخشنے والا مہربان، اور یہ بھی کہ میرا عذاب وہی عذاب دردناک ہے

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے جنت اور دوزخ والوں کے وعدہ اور وعید کا ذکر تھا، اب اسی وعدہ اور وعید کی تاکید کے لیے حق تعالیٰ ان پر اپنے لطف وقہر کا اجمالاً بیان فرماتے ہیں۔

(اے محمد ﷺ!) آپ میرے بندوں کو اطلاع دے دیجئے کہ میں بڑا مغفرت اور رحمت والا بھی ہوں اور (نیز) یہ کہ میری سزا (بھی) دردناک سزا ہے (تاکہ اس سے خبردار ہو کر ایمان اور تقویٰ کی رغبت اور کفر و معصیت سے خوف پیدا ہو)۔

**نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ:** اس آیت کے مضمون سے تربیت واصلاح کرنے کا معلوم طریقہ ہوتا ہے، چنانچہ جنت اور جہنم دونوں کے حالات کا تذکرہ کرنا چاہیے، یعنی خوف ورجاء (خوف وامید) دونوں سے تربیت کرنی چاہیے، کیونکہ صرف رجاء یعنی امید کی تعلیم سے تعطل یعنی بدعملی اور صرف خوف کی تعلیم سے مایوسی پیدا ہونے کا احتمال ہوتا ہے تو یک طرفہ تعلیم سے تربیت ناقص ہوگی۔

* * *

**فائدہ:** ''مجرمین'' اور ''متقین'' کا الگ الگ انجام بیان فرما کر یہاں تنبیہ کی ہے کہ ہر ایک صورت میں حق تعالیٰ کی کسی نہ کسی صفت وشان کا ظہور ہے، کوئی شبہ نہیں کہ خدا تعالیٰ اصل سے اپنی تمام مخلوق پر بخشش اور مہربانی کرنا چاہتا ہے اور حقیقت میں اصل مہربانی اسی کی ہے، تمام دنیا کی مہربانیاں اس کی مہربانی کا پرتو ہیں لیکن جو شخص خود شرارت و بدکاری سے مہربانی کے دروازے اپنے اوپر بند کر لے تو پھر اس کی سزا بھی ایسی سخت ہے جس کے روکنے کی کوئی تدبیر نہیں، سعدی نے خوب فرمایا:

بتہدید گر برکشد تیغ حکم — بمانند کروبیاں صم وبکم

وگر در دہد یک صلائے کرم — عزازیل گوید نصیبے برم

**ربط:** آگے ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں جس میں فرشتوں کے اترنے کا ذکر ہے، وہ ہی فرشتے ایک جگہ خوشخبری سناتے اور دوسری جگہ پتھر برساتے تھے، تاکہ معلوم ہو کہ خدا کی دونوں صفتیں (رحمت وغضب) پوری ہیں، بندوں کو چاہیے نہ دلیر ہوں، نہ آس توڑیں۔

وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ ﴿۵۱﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ﴿۵۲﴾ وقف لازم

اور حال سنا دے انکو ابراہیم کے مہمانوں کا ۱۔ جب چلے آئے اسکے گھر میں اور بولے (کہا انہوں نے) سلام، وہ بولا ہم کو تم سے ڈر معلوم ہوتا ہے ۲۔

**خلاصہ تفسیر:** اوپر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور قہر کا ذکر تھا، اب اسی سلسلہ میں انبیاء علیہ السلام کے دو قصوں ذکر فرماتے ہیں تاکہ لوگ اللہ تعالیٰ کے قہر اور اس کی رحمت کو سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت پیغمبروں پر اور ان کے ماننے والوں پر کس طرح نازل ہوئی اور ان کے دشمنوں پر خدا کا قہر کس طرح نازل ہوا تاکہ اطاعت پر راضی ہوں اور معصیت سے نفور اور بیزار ہوں، اس لیے اول ابراہیم علیہ السلام کے لیے بشارت اور اس کے ساتھ لوط علیہ السلام اور ان کے متبعین کی نجات یہ رحمت ہے، اور قوم لوط کی ہلاکت یہ قہر ہے۔

اور (اے محمد ﷺ) آپ ان (لوگوں) کو ابراہم (علیہ السلام) کے مہمانوں (کے قصہ) کی بھی اطلاع دیجئے (وہ قصہ اس وقت واقع ہوا تھا) جب کہ وہ (مہمان جو کہ اصل میں فرشتے تھے اور انسانی شکل ہونے کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں مہمان سمجھا) ان کے (یعنی ابراہیم علیہ السلام کے) پاس آئے، پھر (آ کر) انہوں نے السلام علیکم کہا (ابراہیم علیہ السلام ان کو مہمان سمجھ کر فوراً اُن کے لئے کھانا تیار کر کے لائے، مگر چونکہ وہ فرشتے تھے انہوں نے کھایا نہیں تب) ابراہیم (علیہ السلام دل میں ڈرے کہ یہ لوگ کھانا کیوں نہیں کھاتے؟ کیونکہ وہ فرشتے بشکل بشر تھے ان کو

بشر ہی سمجھا، اور کھانا نہ کھانے سے شبہ ہوا کہ یہ لوگ کہیں مخالف نہ ہوں اور ) کہنے لگے کہ ہم تو تم سے خائف ہیں۔

* * *

**فائدہ:** لہ ''مہمان'' اس لیے کہا کہ ابراہیم ابتداءً انھیں مہمان ہی سمجھے، بعد میں کھلا کہ فرشتے ہیں۔

**فائدہ:** ۲ے دوسری جگہ آیا ہے: وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً یعنی خوف کو دل میں چھپایا تو کہا جائے گا کہ ابتداء میں چھپانے کی کوشش کی، آخر ضبط نہ کرسکے، زبان سے ظاہر کردیا، یا یہ مطلب ہو کہ باوجود چھپانے کے خوف کے آثار چہرہ وغیرہ پر اس قدر عیاں تھے گویا کہہ رہے تھے کہ ہم کو تم سے ڈر معلوم ہوتا ہے، یہ ڈر کس بات کا تھا؟ اس کی تفصیل سورہ ہود میں گزر چکی وہاں ملاحظہ کی جائے، اور اس واقعہ کے دوسرے اجزاء پر بھی جو کلام کیا گیا ہے ضرورت ہے کہ ایک مرتبہ مراجعت کرلی جائے۔

## قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۵۳﴾

بولے ڈر مت ہم تجھ کو خوشخبری سناتے ہیں ایک ہوشیار لڑکے کی

**خلاصہ تفسیر:** انہوں نے کہا کہ آپ خائف نہ ہوں کیونکہ ہم (فرشتے ہیں اللہ کی طرف سے ایک بشارت لے کر آئے ہیں اور) آپ کو ایک فرزند کی بشارت دیتے ہیں جو بڑا عالم ہوگا (مطلب یہ کہ نبی ہوگا، کیونکہ آدمیوں میں سب سے زیادہ علم انبیاء علیہم السلام کو ہوتا ہے)۔

**اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ:** اس فرزند سے مراد اسحاق علیہ السلام ہیں، اور دوسری آیتوں میں حضرت اسحاق علیہ السلام کے ساتھ یعقوب علیہ السلام کی بشارت بھی مذکور ہے، اسی وجہ سے یہاں یعقوب کا ذکر نہیں فرمایا، اسحاق کے بیان پر اکتفا کیا۔

* * *

**فائدہ:** یعنی ڈرنے کی ضرورت نہیں بلکہ خوش ہونے کا موقع ہے، اس بڑھاپے میں ہم تم کو اولاد کی خوشخبری سناتے ہیں، اولاد بھی کیسی؟ لڑکا نہایت ہوشیار، بڑا عالم، جسے پیغمبرانہ علوم دے کر منصب نبوت پر فائز کیا جائے گا: وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (الصافات: ۱۱۲)

## قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ﴿۵۴﴾

بولا کیا خوشخبری سناتے ہو مجھ کو جب پہنچ چکا مجھ کو بڑھاپا اب کاہے پر خوشخبری سناتے ہو

**خلاصہ تفسیر:** ابراہیم (علیہ السلام) کہنے لگے کہ کیا تم مجھ کو اس حالت میں (فرزند کی) بشارت دیتے ہو کہ مجھ پر بوڑھاپا آگیا، سو (ایسی حالت میں مجھ کو) کس چیز کی بشارت دیتے ہو (یہ مطلب نہیں کہ قدرت سے بعید ہے بلکہ یہ مقصود تھا کہ یہ امر فی نفسہ بڑا عجیب ہے)۔

* * *

**فائدہ:** چونکہ غیر متوقع اور غیر معمولی طور پر خوشخبری سنی، تو پیرانہ سالی کو دیکھتے ہوئے کچھ عجیب سی معلوم ہوئی، انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ جب آدمی کوئی مسرت انگیز خبر خلاف توقع غیر معمولی طریقہ سے اچانک سنے تو باوجود یقین آجانے کے اسے خوب کھود کرید کر دریافت کرتا اور لہجہ تعجب کا اختیار کرلیتا ہے، تاخبر دینے والا پوری تاکید وتصریح سے خوشخبری کو دہرائے جس میں نہ کسی قسم کی غلط فہمی کا احتمال رہے نہ تاویل والتباس کا، گویا اظہار تعجب سے بشارت کو خوب واضح اور پختہ کرانا اور تکرار سماع سے لذت حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے، اسی طرز میں حضرت ابراہیم نے اظہار تعجب فرمایا، ابن کثیر کے الفاظ یہ ہیں: ''قال متعجبا من كبره وكبر زوجته ومتحققًا للوعد فأجابوه مؤكدين لما بشروه به تحقيقًا و بشارة بعد بشارة'' چونکہ سطح کلام سے ناامیدی کا توہم ہوسکتا ہے، جو اکابر خصوصاً اولوالعزم پیغمبروں کی شان کے بالکل خلاف ہے، اس لیے ملائکہ نے: فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ کہہ کر تنبیہ کی، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''معلوم ہوا کہ کاملین بھی (کسی درجہ میں) ظاہری اسباب پر خیال رکھتے ہیں''۔

قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ﴿۵۵﴾ قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ﴿۵۶﴾

بولے ہم نے تجھ کو خوشخبری سنائی سچی (پکی) سومت ہو تو ناامیدوں میں، بولا اور کون آس توڑے اپنے رب کی رحمت سے مگر (وہی) جو گمراہ ہیں

**خلاصہ تفسیر:** وہ (فرشتے) بولے کہ ہم آپ کو امر واقعی کی بشارت دیتے ہیں (یعنی بیٹے کی پیدائش یقینا ہونے والی ہے) سو آپ ناامید نہ ہوں (یعنی اپنے بڑھاپے پر نظر نہ کیجئے کہ ایسے ظاہری اسباب پر نظر کرنے سے ناامیدی کے وسوسے غالب ہو جاتے ہیں) ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ بھلا اپنے رب کی رحمت سے کون ناامید ہوتا ہے بجز گمراہ لوگوں کے (یعنی میں نبی ہو کر گمراہوں کی صفت کب اختیار کر سکتا ہوں، میرا مقصود محض اس کا عجیب ہونا ظاہر کرنا تھا، باقی اللہ کا وعدہ سچا اور مجھ کو امید سے بڑھ کر اس کا کامل یقین ہے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی رحمت الٰہیہ سے ناامید تو عام مسلمان بھی نہیں ہو سکتے، چہ جائیکہ انبیاء علیہم السلام کو معاذ اللہ یہ نوبت آئے محض اسباب عادیہ اور اپنی حالت موجودہ کے اعتبار سے ایک چیز عجیب معلوم ہوئی، اس پر میں نے اظہار تعجب کیا ہے کہ خدا کی قدرت اب بڑھاپے میں مجھے اولاد ملے گی، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''عذاب سے نڈر رہنا اور فضل سے ناامید ہونا دونوں کفر کی باتیں ہیں، یعنی آگے کی خبر اللہ کو ہے، ایک بات پر دعویٰ کرنا یقین کر کے یوں نہیں ہو سکتا یہ ہی کفر کی بات ہے باقی محض دل کے خیال و تصور پر پکڑ نہیں جب منہ سے دعویٰ کرے تب گناہ ہوتا ہے''۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۷﴾

بولا پھر کیا مہم ہے تمہاری اے اللہ کے بھیجے ہوؤ

**خلاصہ تفسیر:** (اس کے بعد نبوت کی فراست سے آپ کو معلوم ہوا کہ ان ملائکہ کے آنے سے بشارت کے علاوہ اور بھی کوئی بڑی مہم مقصود ہے، اس لئے) فرمانے لگے کہ (جب قرائن سے مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ تمہارے آنے کا کچھ اور بھی مقصود ہے) تو (یہ بتلاؤ کہ) اب تم کو کیا مہم درپیش ہے اے فرشتو!۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ: اس سوال کی وجہ یہ تھی کہ معمولی وسرسری کام کے لیے مجمع کو نہیں بھیجا جاتا، اور حق تعالیٰ بندوں کے ساتھ ان ہی کی عادات کے موافق معاملہ فرماتے ہیں، اس رعایت سے یہ بھی مستنبط ہوا کہ ہر کام میں مناسب انتظام مستحسن بات ہے اور یہ اہل اللہ کی عادت طبعی ہو جاتی ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی کیا محض یہ بشارت سنانے کے لیے ہی بھیجے گئے ہو، یا کوئی اور مہم ہے جس پر مامور ہو کر آئے ہو، غالباً قرائن سے ابراہیم علیہ السلام سمجھے کہ اصل مقصد تشریف آوری کا کچھ اور ہے، ممکن ہے جو خوف انھیں دیکھ کر پیدا ہوا تھا اسی سے خیال گزر رہا ہو کہ خالص بشارت لانے والوں کو دیکھ کر خوف کیسا ضرور کوئی دوسری خوفناک چیز بھی ان کے ساتھ ہوگی، واللہ اعلم۔

قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ۭ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۹﴾

بولے ہم بھیجے ہوئے آئے ہیں ایک قوم گناہگار پر، مگر لوط کے گھر والے، ہم ان کو بچالیں گے سب کو

ع اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۶۰﴾

مگر ایک اس کی عورت ہم نے ٹھہرالیا، وہ ہے رہ جانے والوں میں

**خلاصه تفسیر:** فرشتوں نے کہا کہ ہم ایک مجرم قوم کی طرف (ان کو سزا دینے کے لئے) بھیجے گئے ہیں (مراد قوم لوط ہے) مگر لوط (علیہ السلام) کا خاندان کہ ہم ان سب کو (عذاب سے) بچالیں گے (یعنی ان کو بچنے کا طریقہ بتلادیں گے کہ ان مجرموں سے علیحدہ ہوجائیں) بجز ان کی (یعنی لوط علیہ السلام کی) بیوی کے کہ اس کی نسبت ہم نے تجویز کر رکھا ہے کہ وہ ضرور اسی قوم مجرم میں رہ جائے گی (اور ان کے ساتھ عذاب میں مبتلا ہوگی)۔

قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ: فرشتوں نے جو اس تجویز کو اپنی طرف منسوب کیا، حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کا فعل تھا، سو اس کی وجہ ملائکہ کا قرب اور ان کی خصوصیت ہے، اس لیے بطور مجاز اپنی طرف نسبت کردی۔

* * *

**فائدہ:** یعنی وہ باقی کفار کے ساتھ عذاب میں مبتلا رہے گی۔

**تنبیہ:** ظاہر ہے کہ: قَدَّرْنَآ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ مقولہ ملائکہ کا ہے جو عذاب لے کر آئے تھے، چونکہ اس وقت وہ قضاوقدر کا فیصلہ نافذ کرنے کے لیے سرکاری ڈیوٹی پر آئے تھے، اس لیے تقدیر (ٹھہرانے) کی نسبت نیابۃً اپنی طرف کردی، اور ممکن ہے: قَدَّرْنَآ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ حق تعالیٰ کا کلام ہو، تب کوئی اشکال نہیں۔

فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ِۨ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿٦١﴾ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿٦٢﴾

پھر جب پہنچے لوط کے گھر وہ بھیجے ہوئے، بولا تم لوگ ہو اوپرے (جن سے کھٹکا ہوتا ہے/اور طرح کے)

**خلاصہ تفسیر:** پھر جب وہ فرشتے خاندان لوط (علیہ السلام) کے پاس آئے (تو چونکہ انسانوں کی شکل میں تھے اس لئے) کہنے لگے تم تو اجنبی آدمی (معلوم ہوتے) ہو (دیکھیے شہر والے تمہارے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں؟ کیونکہ یہ اجنبی لوگوں کو پریشان کیا کرتے ہیں، اور یہ شبہ اس لیے ہوا کہ فرشتے انسانوں کی شکل میں آئے تھے)۔

* * *

**فائدہ:** یا تو یہ مطلب تھا کہ تم مجھے غیر معمولی سے آدمی معلوم ہوتے ہو جنہیں دیکھ کر خواہ مخواہ دل کھٹکتا ہے، یہ شاید ویسا ہی کھٹکا ہوگا جو ابراہیم علیہ السلام کے دل میں پیدا ہوا تھا یا یہ غرض ہو کہ تم اس شہر میں اجنبی ہو، تم کو یہاں کے لوگوں کی خوئے بد معلوم نہیں، دیکھیے وہ تمہارے ساتھ کیسا سلوک کریں، یا یہ اس وقت فرمایا جب لوگوں نے فرشتوں کو حسین لڑکے سمجھ کر لوط کے مکان پر چڑھائی کی، لوط علیہ السلام انھیں مہمان سمجھتے ہوئے امکانی مدافعت کرتے رہے، حتیٰ کہ آخر میں نہایت حسرت سے فرمایا: لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ (ہود: ۸۰) اس وقت تنگ ہوکر اور گھبرا کر ان مہمانوں سے کہنے لگے کہ تم عجیب طرح کے آدمی معلوم ہوتے ہو، میں تمہاری آبرو بچانے کے لیے خون پسینہ ایک کر رہا ہوں لیکن تم میری امداد کے لیے ذرا ہاتھ بھی نہیں ہلاتے۔

قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿٦٣﴾ وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿٦٤﴾

بولے نہیں پر ہم لے کر آئے ہیں تیرے پاس وہ چیز جس میں وہ جھگڑتے تھے ۱ اور ہم لائے ہیں تیرے پاس پکی بات اور ہم سچ کہتے ہیں ۲

**خلاصہ تفسیر:** انہوں نے کہا نہیں (ہم آدمی نہیں) بلکہ ہم (فرشتے ہیں) آپ کے پاس وہ چیز (یعنی وہ عذاب) لے کر آئے ہیں جس میں یہ لوگ شک کیا کرتے تھے اور ہم آپ کے پاس یقینی ہونے والی چیز (یعنی عذاب) لے کر آئے ہیں اور ہم (اس خبر دینے میں) بالکل سچے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی گھبراؤ مت، ہم آدمی نہیں ہیں، ہم تو آسمان سے وہ چیز لے کر آئے ہیں جس میں یہ لوگ تم سے جھگڑا کرتے تھے، یعنی مہلک

عذاب جس کی تم دھمکی دیتے اور یہ انکار کرتے تھے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی اب آپ بالکل مطمئن ہوجایئے، یہ بالکل پکی اور اٹل بات ہے جس میں قطعاً جھوٹ کا احتمال نہیں۔

فَاَسۡرِ بِاَهۡلِكَ بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّيۡلِ وَاتَّبِعۡ اَدۡبَارَهُمۡ وَلَا يَلۡتَفِتۡ مِنۡكُمۡ اَحَدٌ

سو لے نکل اپنے گھر کو کچھ رات رہے سے اور تو چل ان کے پیچھے اور مڑ کر نہ دیکھے تم میں سے کوئی ۱؎

وَّامۡضُوۡا حَيۡثُ تُؤۡمَرُوۡنَ ﴿۶۵﴾

اور چلے جاؤ جہاں تم کو حکم ہے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** سو آپ رات کے کسی حصہ میں اپنے گھر والوں کو لے کر (یہاں سے) چلے جایئے اور آپ سب کے پیچھے ہو لیجئے (تاکہ کوئی رہ نہ جائے یا لٹ نہ جائے اور آپ کے رعب اور ہیبت کی وجہ سے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے جس کی ممانعت اب کی جارہی ہے) اور تم میں سے کوئی پیچھا پھر کر بھی نہ دیکھے (یعنی سب جلدی چلے جائیں) اور جس جگہ (جانے کا) تم کو حکم ہوا ہے اس طرف سب کے سب چلے جاؤ (وہ جگہ ملک شام ہے جس کی طرف ہجرت کرنے کا ان حضرات کو حکم دیا گیا تھا)۔

**وَلَا يَلۡتَفِتۡ مِنۡكُمۡ اَحَدٌ:** اس سے معلوم ہوا کہ غضب الٰہی کے آثار اور جن پر خدائی غضب نازل ہوا اُن کو تفریح کے طور پر بھی نہ دیکھے، اسی ضمن میں آثار کفر و شرک و بدعت کے مجمعوں کا بھی یہی حکم ہوگا۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی جب تھوڑی رات رہے اپنی گھر والوں کو بستی سے لے کر نکل جایئے اور آپ سب کے پیچھے رہیے تاکہ پورا اطمینان رہے کہ کوئی رہ تو نہیں گیا یا راستہ سے واپس تو نہیں ہوا، اس صورت میں آپ کا قلب مطمئن رہے گا اور دل جمعی سے خدا کے ذکر و شکر میں مشغول رہتے ہوئے رفقاء کی دیکھ بھال رکھیں گے، دوسری طرف آپ کے بقیہ پیچھے ہونے کی وجہ سے آگے چلنے والوں کو آپ کا رعب مانع ہوگا کہ پیچھے مڑ کر دیکھیں، اس طرح "وَلَا يَلۡتَفِتۡ مِنۡكُمۡ اَحَدٌ" کا پورا امتثال ہو سکے گا اور وہ لوگ خطرہ کے مقام سے بعید رہیں گے اور آپ کو اپنا ظاہری پشتیبان سمجھیں گے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی ملک شام میں یا اور کہیں امن کی جگہ جو خدا نے ان کے لیے مقرر کی ہوگی۔

وَقَضَيۡنَاۤ اِلَيۡهِ ذٰلِكَ الۡاَمۡرَ اَنَّ دَابِرَ هٰۤؤُلَاۤءِ مَقۡطُوۡعٌ مُّصۡبِحِيۡنَ ﴿۶۶﴾

اور مقرر کر دی ہم نے اس کو یہ بات کہ ان کی جڑ کٹے گی صبح ہوتے

**خلاصہ تفسیر:** (اب اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:) اور ہم نے (ان فرشتوں کے واسطے سے) لوط (علیہ السلام) کے پاس یہ حکم بھیجا کہ صبح ہوتے ہی بالکل ان کی جڑ کٹ جائے گی (یعنی بالکل ہلاک و برباد ہوجائیں گے)۔

فرشتوں کی یہ مذکورہ گفتگو بعد میں ہوئی، اور آگے جو قصہ آتا ہے اس کا وقوع پہلے ہوا ہے، فرشتوں کی اس بعد والی گفتگو کو مقصود کے اہتمام کے لیے پہلے بیان کیا، کیونکہ مقصود اس جگہ رحمت و قہر کا بیان کرنا ہے، یعنی نافرمانوں پر عذاب اور فرمانبرداروں کی نجات و کامیابی پہلے ہی اہتمام کے ساتھ معلوم ہوجائے، نجات و ہلاکت کی خبر کو چونکہ مقصد سے تعلق ہے اس لیے اسے مقدم بیان کیا اور واقعہ پورا کرنے کے لیے اب پہلے حصہ کو اخیر میں بیان کرتے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** یعنی لوط علیہ السلام کو ملائکہ کے توسط سے ہم نے اپنا قطعی فیصلہ سنا دیا کہ عذاب کچھ دور نہیں، ابھی صبح کے وقت اس قوم کا بالکلیہ

استیصال کر دیا جائے گا، شاید یہ مطلب ہو کہ صبح ہوتے ہی عذاب شروع ہو جائے گا اور اشراق تک سب معاملہ ختم کر دیا جائے گا، کیونکہ وہ دوسری جگہ مُصۡبِحِيۡنَ کے بجائے مُشۡرِقِيۡنَ کا لفظ آیا ہے۔

وَجَآءَ اَهۡلُ الۡمَدِيۡنَةِ يَسۡتَبۡشِرُوۡنَ ﴿۶۷﴾

اور آئے شہر کے لوگ خوشیاں کرتے

**خلاصہ تفسیر:** (اگلا قصہ یہ ہے) اور شہر کے لوگ (یہ خبر سن کر کہ لوط علیہ السلام کے یہاں حسین لڑکے آئے ہیں) خوب خوشیاں مناتے ہوئے (اپنی فاسد نیت اور برے ارادہ کے ساتھ لوط علیہ السلام کے گھر) پہنچے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جب سنا کہ لوط کے یہاں بڑے حسین و جمیل لڑکے مہمان ہیں تو اپنی عادت بد کی وجہ سے بڑے خوش ہوئے اور دوڑتے ہوئے ان کے مکان پر آئے اور لوط سے مطالبہ کیا کہ انھیں ہمارے حوالہ کر دو

**تنبیہ:** وَجَآءَ اَهۡلُ الۡمَدِيۡنَةِ يَسۡتَبۡشِرُوۡنَ (الحجر:۶۷) میں ''واؤ'' مطلق جمع کے لیے ہے، یہاں ترتیب واقعات بیان میں ملحوظ نہیں سورہ ہود اور اعراف میں یہ قصہ گزر چکا ہے اسے دیکھ لیا جائے اور وہاں کے فوائد ملاحظہ کیے جائیں۔

قَالَ اِنَّ هٰۤؤُلَاۤءِ ضَيۡفِىۡ فَلَا تَفۡضَحُوۡنِ ﴿۶۸﴾ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخۡزُوۡنِ ﴿۶۹﴾

لوط نے کہا یہ لوگ میرے مہمان ہیں سو مجھ کو رسوا مت کرو ۱؎ اور ڈرو اللہ سے اور میری آبرو مت کھوؤ ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** لوط (علیہ السلام) نے (جو اَب تک فرشتوں کو آدمی اور اپنا مہمان ہی سمجھ رہے تھے قوم کے فاسد ارادوں کا احساس کر کے) فرمایا کہ یہ لوگ میرے مہمان ہیں (ان کو پریشان کر کے) مجھ کو (عام لوگوں میں) رسوا نہ کرو (کیونکہ مہمان کی توہین میزبان کی توہین ہوتی ہے، اگر تمہیں ان مسافروں پر رحم نہیں آتا تو کم از کم میرا خیال کرو کہ میں تمہاری بستی کا رہنے والا ہوں، اس کے علاوہ جو ارادہ تم کر رہے ہو وہ اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب کا سبب ہے) تم اللہ سے ڈرو اور مجھ کو (ان مہمانوں کی نظر میں) رسوا مت کرو (کہ مہمان یہ سمجھیں گے کہ اپنی بستی کے لوگوں میں بھی ان کی کوئی وقعت نہیں)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ کیونکہ مہمان کی فضیحت میزبان کی رسوائی ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی خدا سے ڈر کر یہ بے حیائی کے کام چھوڑ دو اور اجنبی مہمانوں کو دق مت کرو، آخر میں تم میں رہتا ہوں، میری آبرو کا تمہیں کچھ پاس کرنا چاہیے میں مہمانوں کی نظر میں کس قدر حقیر ہوں گا جب یہ سمجھیں گے کہ بستی میں ایک آدمی بھی ان کی عزت نہیں کرتا نہ ان کا کہنا مانتا ہے۔

قَالُوۡۤا اَوَلَمۡ نَنۡهَكَ عَنِ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ هٰۤؤُلَاۤءِ بَنٰتِىۡۤ اِنۡ كُنۡتُمۡ فٰعِلِيۡنَ ﴿۷۱﴾

بولے کیا ہم نے تجھ کو منع نہیں کیا جہان کی حمایت سے ۱؎ بولا یہ حاضر ہیں میری بیٹیاں اگر تم کو کرنا ہے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** وہ کہنے لگے (کہ یہ رسوائی ہماری طرف سے نہیں، آپ نے خود اپنے ہاتھوں خریدی ہے کہ انہیں مہمان بنایا) کیا ہم آپ کو دنیا بھر کے لوگوں (کو اپنا مہمان بنانے) سے (بارہا) منع نہیں کر چکے (نہ آپ ان کو مہمان بناتے، نہ اس رسوائی کی نوبت آتی) لوط (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (یہ تو بتلاؤ کہ اس بیہودہ حرکت کی کیا ضرورت ہے جس کی وجہ سے ہمیں کسی کو مہمان بنانے کی بھی اجازت نہیں دی جاتی قضاء شہوت

کے طبعی تقاضے کے لئے ) یہ میری (بہو) بیٹیاں (جو تمہارے گھروں میں ہیں) موجود ہیں اگر تم میرا کہنا مانو (تو شریفانہ طور پر اپنی عورتوں سے اپنا مطلب پورا کرو، مگر وہ کس کی سنتے تھے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی ہم بے آبرو نہیں کرتے آپ خود بے آبرو ہوتے ہیں، جب ہم منع کر چکے کہ تم کسی اجنبی کو پناہ مت دو نہ اپنا مہمان بناؤ، ہم کو اختیار ہے باہر سے آنے والوں کے ساتھ جس طرح چاہیں پیش آئیں، پھر آپ کو کیا ضرورت پیش آئی کہ خواہ مخواہ ان نوجوانوں کو اپنے یہاں ٹھہرا کر فضیحت ہوئے، اس سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ لوگ ہمیشہ اجنبی مسافروں کو اپنے افعال شنیعہ کا تختہ مشق بناتے ہوں گے اور حضرت لوط علیہ السلام اپنے مقدور کے موافق غریب مسافروں کی حمایت اور ان اشقیاء کو نالائق حرکتوں سے باز رکھتے ہوں گے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی بیشک تم نے مجھ کو اجنبی لوگوں کی حمایت سے روکا لیکن میں پوچھتا ہوں آخر اس روکنے کا منشاء کیا ہے؟ یہی نا کہ میں تمہاری خلاف فطرت شہوت رانی کے راستہ میں حائل ہوتا ہوں، تو خود غور کرو کیا قضائے شہوت کے حلال مواقع تمہارے سامنے موجود نہیں جو ایسی بیہودہ حرام کاری کے مرتکب ہوتے ہو؟ یہ تمہاری بیویاں (جو میری بیٹیوں کے برابر ہیں) تمہارے گھروں میں موجود ہیں، اگر تم میرے کہنے کے موافق عمل کرو اور قضائے شہوت کے مشروع و معقول طریقہ پر چلو، تو حاجت براری کے لیے وہ کافی ہیں، یہ کیا آفت ہے کہ حلال اور ستھری چیز کو چھوڑ کر حرام کی گندگی میں ملوث ہوتے ہو۔

## لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿۷۲﴾

قسم ہے تیری جان کی وہ اپنی مستی (نشے) میں مدہوش ہیں

**خلاصہ تفسیر:** آپ کی جان کی قسم اپنی مستی میں مدہوش تھے۔

**لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ:** اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جو جا بجا مخلوقات کی قسم کھائی ہے تو اس سے ان چیزوں کا کثرت نفع کے اعتبار سے عظیم ہونا یا اللہ کی قدرت پر دلالت ہونے کا اظہار مقصود ہے، اس سے خود ان چیزوں کی قسم کھانا مقصود نہیں، بلکہ وہ چیزیں چونکہ قدرت الٰہیہ پر دلالت کرتی ہیں اس لیے حقیقت میں یہ قدرت الٰہی کی قسم ہے، اس لیے کوئی اشکال ہیں، کسی انسان کے لئے جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے علاوہ کسی اور چیز کی قسم کھائے، کیونکہ قسم اس کی کھائی جاتی ہے جس کو سب سے زیادہ بڑا سمجھا جائے اور ظاہر ہے سب سے زیادہ بڑا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہوسکتا ہے، حدیث میں ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ ''اپنی ماؤں اور باپوں کی اور بتوں کی قسم نہ کھاؤ اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی قسم نہ کھاؤ اور اللہ تعالیٰ کی قسم بھی صرف اس وقت کھاؤ جب تم اپنے قول میں سچے ہو''، لیکن یہ حکم مخلوقات کے لئے ہے، کیونکہ ان کی قسم میں یہ وہم ہوسکتا ہے کہ وہ ان چیزوں کو معظم سمجھتے ہیں اس لیے ان کے ذمہ اس ابہام سے بچنا بھی واجب کیا گیا ہے، اللہ جل شانہ خود اپنی مخلوقات میں سے مختلف چیزوں کی قسم کھاتے ہیں یہ ان کے لئے مخصوص ہے، جس کا مقصد کسی خاص اعتبار سے بندوں کو روکنے کا جو سبب ہے وہ یہاں موجود نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں اس کا کوئی امکان نہیں کہ وہ اپنی کسی مخلوق کو سب سے بڑا اور افضل سمجھیں، کیونکہ علی الاطلاق بڑائی تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات سے مخصوص ہے، اور بندوں کو اس کی ممانعت اس لیے ہے کہ کہیں قسم کھانے والا اس چیز کو ایسا معظم نہ سمجھ جائے جیسا خدا کو معظم سمجھتا ہے، اور اللہ تعالیٰ میں ایسا احتمال ہی نہیں کہ وہ کسی مخلوق کو معظم سمجھیں، یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان اشیاء کی قسم ان کی ذات کے اعتبار سے نہیں، بلکہ اس اعتبار سے ہے کہ یہ اشیاء اللہ کی قدرت پر دلالت کرتی ہیں، سو ان کی قسم سے قدرت الٰہیہ کی قسم مقصود ہے۔

* * *

**فائدہ:** ظاہر یہ ہے کہ یہ خطاب حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے نبی کریم ﷺ کو ہے، یعنی تیری جان کی قسم لوط کی قوم غفلت اور مستی کے نشہ میں بالکل اندھی ہو رہی تھی وہ بڑی لا پروائی سے حضرت لوط کی نصیحت بلکہ لجاجت کو ٹھکرا رہے تھے، ان کو اپنی قوت کا نشہ تھا، شہوت پرستی نے ان کے دل و

دماغ مسخ کردیے تھے، وہ بڑے امن واطمینان کے ساتھ پیغمبر خدا سے جھگڑ رہے تھے، نہیں جانتے تھے کہ صبح تک کیا حشر ہونے والا ہے، تباہی اور ہلاکت کی گھڑی ان کے سر پر منڈلا رہی تھی، وہ لوط کی باتوں پر ہنستے تھے اور موت انھیں دیکھ کر ہنس رہی تھی۔

**تنبیه:** ابن عباس نے فرمایا خدا تعالیٰ نے دنیا میں کوئی جان محمد ﷺ کی جان سے زیادہ اکرم واشرف پیدا نہیں کی، میں نے خدا کو نہیں سنا کہ اس نے محمد ﷺ کی جان عزیز کے سوا کسی دوسری جان کی قسم کھائی ہو، قرآن کریم میں جو قسمیں آئی ہیں ان کے متعلق ہم ان شاء اللہ کسی دوسری جگہ ذرا مفصل کلام کریں گے۔

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ﴿٧٣﴾ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿٧٤﴾

پھر آ پکڑا ان کو چنگھاڑ نے سورج نکلتے وقت (ہی) ۱ پھر کر ڈالی ہم نے وہ بستی اوپر تلے اور برسائے ان پر پتھر کھنگر (کنکر) کے ۲

**خلاصہ تفسیر:** پس سورج نکلتے نکلتے ان کو سخت آواز نے آدبایا (یہ ترجمہ مُشرقین کا ہے) پھر (اس سخت آواز کے بعد) ہم نے ان بستیوں (کی زمین کو الٹ کر ان) کا اوپر کا تختہ (تو) نیچے کر دیا (اور نیچے کا تختہ اوپر کر دیا) اور ان لوگوں پر کنکر کے پتھر برسانا شروع کئے۔

**فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ:** پیچھے بیان ہوا: مُصبحین کہ صبح ہوتے ہی ان کی جڑ کٹ جائے گی، اور یہاں فرمایا: مُشرقین کہ سورج نکلتے وقت ان کو عذاب نے آدبایا، ان دونوں کا اجتماع یا تو اس اعتبار سے ممکن ہے کہ صبح سے عذاب کی ابتدا ہوئی ہو اور اشراق تک خاتمہ ہو گیا ہو، یا صبح سے مراد عام معنی لیے جائیں جو اشراق کو بھی شامل ہوں، اور دوسری جگہ لفظ بکرۃ آیا ہے جس کے معنی شروع دن کے ہیں، پس اگر دن سے عرفی دن مراد لیا جائے تب تو مُشرقین سے موافقت ہوگی، یعنی اشراق کا وقت مراد ہوگا، اور اگر شرعی دن مراد لیا جائے تو مُصبحین کے قریب ہو جائے گا، یعنی بکرۃ سے صبح کا وقت مراد ہوگا۔

* * *

**فائدہ:** ۱ اس کے متعلق ہم قریب ہی: اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ (الحجر:٦٦) کے فائدہ میں کلام کر چکے ہیں، ابن جریج کا قول ہے کہ ہر عذاب جس سے کوئی قوم ہلاک کی جائے "صیحہ" اور "صاعقہ" کہلاتا ہے۔

**فائدہ:** ۲ اس کی تفصیل سورہ ہود وغیرہ میں گزر چکی۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ﴿٧٥﴾ وَاِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ ﴿٧٦﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٧٧﴾

بیشک اس میں نشانیاں ہیں دھیان کرنے والوں کو ۱ اور وہ بستی واقع ہے سیدھی راہ پر ۲ البتہ اس میں نشانی ہے ایمان (یقین کرنے) والوں کو ۳

**خلاصہ تفسیر:** اس واقعہ میں بہت سے نشانات ہیں اہل بصیرت کے لئے، اور یہ بستیاں ایک آباد سڑک پر ملتی ہیں (یعنی عرب سے شام کو جاتے ہوئے ان کے آثار معلوم ہوتے ہیں) ان بستیوں میں اہل ایمان کے لیے بڑی عبرت ہے (کہ مؤمن انہیں دیکھ کر ان مضامین کو ذہن میں حاضر کر لیتا ہے اور جو مؤمن نہیں ہے وہ اسے طبعی اسباب یا نصیب واتفاق پر محمول کرتا ہے، نہ خدا کو قادر سمجھتا ہے، نہ گناہوں کو اسکی سزا سمجھتا ہے)۔

**اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ:** مثلاً: ① ایک تو یہ کہ برے فعل کا نتیجہ آخر کار برا ہوتا ہے، اگر کچھ دن کی مہلت اور ڈھیل مل جائے تو اس سے دھوکہ نہ کھانا چاہئے، ② دوسرے یہ کہ دائمی اور باقی رہنے والی راحت وعزت صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی اطاعت پر موقوف ہے ③ تیسرے یہ کہ اللہ کی قدرت کو انسانی قدرت پر قیاس کر کے فریب میں مبتلا نہ ہوں اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں سب کچھ ہے وہ ظاہری اسباب کے خلاف بھی جو چاہے کر سکتا ہے وغیر ذلک۔

ترمذی شریف میں حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اتقوا فراسة المؤمن فإنه ينظر بنور الله" اور پھر یہ آیت تلاوت

فرمائی، اس بنا پر یہ آیت فراست کے باب میں اصل ہے، اور اس میں ادراک عقلی وکشفی وغیرہ سب آ گئے، اور اس سے ان سب کی قطعیت بھی لازم نہیں آتی، یعنی کشف وتصرف اگر چہ ایک ذریعہ علم ہے مگر اس کی حیثیت ایسی نہیں ہے کہ اس میں شک وشبہ نہ کیا جا سکے اور اس کو حرف آخر سمجھ لیا جائے، جیسے ان فی ذلك لایت لقوم یتفکرون یا یعقلون سے بھی مطلقاً عقل وفکر کی قطعیت لازم نہیں آتی، مقصود صرف یہ بتلانا ہے کہ یہ سب نافع اور مفید ہیں اگر شرعی حدود کی رعایت کے ساتھ ان سے کام لیا جائے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ متوسم اصل میں اس شخص کو کہتے ہیں جو بعض ظاہری علامات وقرائن دیکھ کر محض فراست سے کسی پوشیدہ بات کا پتہ لگا لے، حدیث میں ہے: "اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّه، يَنْظُرُ بِنُوْرِ الله "بعض روایات میں: "وَ بِتَوْفِيْقِ الله" کی زیادت ہے، یعنی مومن کی فراست سے ڈرتے رہو، وہ خدا تعالیٰ کے عطا کیے ہوئے نور توفیق سے دیکھتا ہے، شاید "کشف" اور "فراست" میں بقول امیر عبدالرحمن خاں مرحوم اتنا ہی فرق ہو جتنا ٹیلیفون اور ٹیلیگراف میں ہوتا ہے، بہر حال آیت کا مطلب یہ ہے کہ دھیان کرنے اور پتہ لگانے والوں کے لیے قوم لوط کے قصہ میں عبرت کے بہت نشان موجود ہیں، انسان سمجھ سکتا ہے کہ بدی اور سرکشی کا انجام کیسا ہوتا ہے، خدا کی قدرت عظیمہ کے سامنے ساری طاقتیں ہیچ ہیں، "اس کی لاٹھی میں آواز نہیں"، اس کی مہلت پر آدمی مغرور نہ ہو، نہ پیغمبروں کے ساتھ ضد اور عداوت باندھے، ورنہ ایسا ہی حشر ہوگا، وغیر ذلک۔

**فائدہ:** ۲ مکہ سے شام کو جاتے ہوئے اس الٹی ہوئی بستی کے کھنڈر نظر آتے ہیں: وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ وَبِالَّيْلِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (الصافات: ۱۳۷)

**فائدہ:** ۳ یعنی ان کھنڈرات کو دیکھ کر بالخصوص مومنین کو عبرت ہوتی ہے، کیونکہ وہ ہی سمجھتے ہیں کہ اس قوم کی بدکاری اور سرکشی کی سزا میں یہ بستیاں الٹی گئیں، مومنین کے سوا دوسرے لوگ تو ممکن ہے انھیں دیکھ کر محض بخت واتفاق یا اسباب طبیعہ کا نتیجہ قرار دیں۔

وَاِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۘ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۹﴾

اور تحقیق تھے بن کے رہنے والے گناہ گار ۱ سو ہم نے بدلہ لیا ان سے، اور یہ دونوں بستیاں واقع ہیں کھلے راستہ پر ۲

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب کا ذکر تھا، اب اصحاب ایکہ اور اصحاب حجر پر عذاب کا ذکر ہے، مقصود سب کا مشترک ہے، یعنی دنیا کے قہر کا نمونہ بتلانا ہے تا کہ آخرت کے قہر کا اندازہ کیا جائے، نیز ان عذاب کے قصوں میں مسئلہ رسالت کی حقانیت اور ثبوت پر بھی دلالت ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔

اور بن والے (یعنی شعیب علیہ السلام کی امت بھی) بڑے ظالم تھے، سو ہم نے ان سے (بھی) بدلہ لیا (اور ان کو عذاب سے ہلاک کیا) اور دونوں (قوم کی) بستیاں صاف سڑک پر (واقع) ہیں (اور ملک شام کو جاتے ہوئے راہ میں نظر آتی ہیں)۔

**وَاِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ:** "ایکہ" لغت میں بن یعنی دشت وریگستان کو کہتے ہیں، بعض نے کہا ہے کہ مدین کے پاس ایک بن تھا اسی لیے اہل مدین ہی کا لقب "اصحاب ایکہ" ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ یہ دونوں الگ الگ دو قومیں تھیں، ایک کے ہلاک ہونے کے بعد شعیب علیہ السلام دوسری قوم کی طرف مبعوث ہوئے، روح المعانی میں ابن عساکر سے یہ حدیث مرفوع نقل کی ہے: "ان مدين واصحاب الايكة امتان بعث الله اليهما شعيبا عليه السلام" کہ مدین اور اصحاب ایکہ دو امتیں ہیں جن کی طرح حق تعالیٰ نے شعیب علیہ السلام کو بھیجا تھا۔

**وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ:** قوم لوط کی بستیوں کا سر راہ واقع ہونا اوپر آ چکا ہے، یہاں دوبارہ شاید اس لیے ذکر فرمادیا کہ اصحاب ایکہ کی بستیوں کو ان کی بستیوں سے تشبیہ دینا مقصود ہے کہ جس طرح وہ شارع عام پر ہیں یہ بھی صاف شرک پر ہیں، پس تکرار نہ رہا۔

* * *

**فائدہ:** ۱ "بن" کے رہنے والے یعنی قوم شعیب شہر مدین میں رہتے تھے جس کے نزدیک درختوں کا بن تھا کچھ وہاں رہتے ہوں گے، بعض

کہتے ہیں "اصحاب ایکہ" اور "اصحاب مدین" دو جداگانہ قومیں ہیں، حضرت شعیب دونوں کی طرف مبعوث ہوئے، ان لوگوں کا گناہ شرک و بت پرستی، ڈاکہ زنی اور ناپ تول میں فریب اور دھوکہ کرنا تھا، پہلے سورہ ہود و اعراف میں ان کا مفصل قصہ گزر چکا ہے ملاحظہ کرلیا جائے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی حجاز و شام کے جس راستہ پر قوم لوط کی بستیاں تھیں وہیں ذرا نیچے اتر کر قوم شعیب کا مسکن تھا، دونوں کے آثار راستہ چلنے والوں کو نظر آتے ہیں۔

وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٨٠﴾ وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿٨١﴾

اور بیشک جھٹلایا حجر (کے رہنے) والوں نے رسولوں کو ۱؎ اور دیں ہم نے ان کو اپنی نشانیاں سو رہے ان سے منہ پھیرتے (ان کو ٹالتے) ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور حجر (حجاز اور شام کے درمیان ایک جنگل جہاں قوم ثمود بستی تھی) والوں نے (بھی) پیغمبروں کو جھوٹا بتلایا (کیونکہ جب انہوں نے صالح علیہ السلام کو جھوٹا کہا اور سب پیغمبروں کا اصل دین ایک ہی ہے تو گویا سب کو جھوٹا بتلایا) اور ہم نے ان کو اپنی (طرف سے) نشانیاں دیں (جس سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور حضرت صالح علیہ السلام کی نبوت ثابت ہوتی تھی مثلاً دلائل توحید اور ناقہ جو کہ صالح علیہ السلام کا معجزہ تھا) سو وہ لوگ ان (نشانیوں) سے روگردانی (ہی) کرتے رہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ "حجر والے" فرمایا "ثمود" کو، ان کے ملک کا نام "حجر" تھا جو مدینہ سے شمال کی طرف واقع ہے، ان کی طرف حضرت صالح علیہ السلام مبعوث ہوئے، ایک نبی کا جھٹلانا سب انبیاء کا جھٹلانا ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی اونٹنی جو پتھر سے نکالی گئی اور اس کے علاوہ دوسرے معجزات۔

وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ﴿٨٢﴾

اور تھے کہ تراشتے تھے پہاڑوں کے گھر اطمینان کے ساتھ

**خلاصہ تفسیر:** اور وہ لوگ پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں گھر بناتے تھے کہ (سب آفات سے) امن میں رہیں۔

* * *

**فائدہ:** یعنی دنیاوی زندگی پر مغرور ہو کر تکبر و تجبر کی نمائش کے لیے پہاڑوں کو تراش کر بڑے عالی شان مکان بناتے تھے، گویا کبھی یہاں سے جانا نہیں یہ بھی سمجھتے ہوں گے کہ ایسی مضبوط و مستحکم عمارتوں میں کوئی آفت کہاں پہنچ سکتی ہے۔

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ ﴿٨٣﴾ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٨٤﴾

پھر پکڑا ان کو چنگھاڑ نے صبح (ہوتے) ہونے کے وقت، پھر کام نہ آیا ان کے جو کچھ کمایا تھا

**خلاصہ تفسیر:** سو ان کو صبح کے وقت (خواہ اول ہی صبح میں یا دن چڑھے) سخت آواز نے آ پکڑا، سو ان کے (دنیوی) ہنر ان کے کچھ بھی کام نہ آئے (ان ہی مضبوط گھروں میں عذاب سے کام تمام ہو گیا، اس آفت سے ان کے گھروں نے انہیں نہ بچایا، بلکہ اس آفت کا ان کو احتمال بھی نہ تھا اور اگر ہوتا بھی تو کیا کر لیتے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی مال و دولت، مستحکم عمارات، جسمانی قوت اور دوسرے اسباب و وسائل میں سے کوئی چیز بھی خدا کے عذاب کو دفع نہ کر سکی، ان کا قصہ بھی پہلے گزر چکا، حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ تبوک جاتے ہوئے "وادی حجر" پر سے گزرے، آپ نے سر ڈھانپ لیا، سواری کی رفتار تیز

کردی اور صحابہ کو فرمایا کہ معذب قوم کی بستیوں پر مت داخل ہونا مگر (خدا کے خوف سے) روتے ہوئے اگر رونا نہ آئے تو رونے والوں کی صورت بنالو، خدا نہ کرے وہ چیز تم کو پہنچے جو ان کو پہنچی تھی، یہ آپ نے مسلمانوں کو ادب سکھلایا کہ آدمی اس قسم کے مقامات میں پہنچ کر عبرت حاصل کرے اور خدا کے خوف سے لرزاں و ترساں ہو، محض سیر و تماشا نہ سمجھے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ

اور ہم نے بنائے نہیں آسمان اور زمین اور جو ان کے بیچ میں ہے بغیر حکمت (تدبیر) اور قیامت بیشک آنے والی ہے

فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ۝۸۵ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ۝۸۶

سو کنارہ کر اچھی طرح کنارہ [1] تیرا رب جو ہے وہی ہے پیدا کرنے والا خبردار [2]

**خلاصہ تفسیر:** شروع سورت کفار مکہ کی حضور ﷺ کے ساتھ سخت مخالفت و عناد کا بیان تھا، ساتھ اجمالاً آپ کی تسلی کا مضمون بھی ذکر کیا تھا، اب ختم سورت پر اسی عناد و مخالفت کے بارے میں آپ ﷺ کی تسلی کے لئے تفصیلی مضمون بیان کیا جا رہا ہے۔

اور (اے محمد ﷺ! آپ ان لوگوں کے عناد و مخالفت سے غم نہ کیجئے، کیونکہ اس کا قیامت کے روز فیصلہ ہونے والا ہے، جس کی آمد کے متعلق ہم آپ سے تذکرہ کرتے ہیں کہ) ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور ان کے درمیانی چیزوں کو بغیر مصلحت کے پیدا نہیں کیا (بلکہ اس مصلحت سے پیدا کیا کہ ان کو دیکھ کر صانع عالم کے وجود اور وحدت و عظمت پر استدلال کر کے اس کے احکام کی اطاعت کریں اور اس حجت کے قائم ہونے کے بعد جو ایسا نہ کرے اسے عذاب ہوگا) اور (دنیا میں تو پورا عذاب ہوتا نہیں تو اور کہیں ہونا چاہئے، اس کے لئے قیامت مقرر ہے، پس) ضرور قیامت آنے والی ہے (وہاں سب کو بھگتا یا جائے گا) سو آپ (کچھ غم نہ کیجئے، بلکہ) خوبی کے ساتھ (ان کی شرارتوں سے) درگذر کیجئے (درگذر کا مطلب یہ ہے کہ اس غم میں نہ پڑیئے، اس کا خیال نہ کیجئے اور خوبی یہ کہ شکوہ و شکایت بھی نہ کیجئے، کیونکہ) بلا شبہ آپ کا رب (چونکہ) بڑا خالق (ہے، اس سے ثابت ہوا کہ) بڑا عالم (بھی) ہے (سب کا حال اس کو معلوم ہے، آپ کے صبر کا بھی، ان کی شرارت کا بھی، اس لئے ان سے پورا پورا بدلہ لے لے گا)۔

**وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ:** یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ آپ ﷺ ان کا سزا پانا چاہتے تھے اور یہ تو شفقت کے منافی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ کو اپنے کسی ذاتی معاملہ کی وجہ سے اس کی خواہش نہ تھی، بلکہ وہ لوگ چونکہ خدا کے ساتھ کفر و شرک کرتے تھے اس لیے بغض فی اللہ کا یہ اثر تھا، اور شفقت تو یہ ہے کہ آپ ﷺ ان کی ہدایت میں کوشاں تھے، ایسا نہیں کہ ان کے کفر کے باوجود بھی ان کی نجات کے طالب ہوں۔

**اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ:** خالق ہونے کا ذکر بطور استدلال کیا گیا، کیونکہ خالق ہونا عالم ہونے کی خود دلیل ہے، کیونکہ جس نے پیدا کیا ہے کیا وہ اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کو جانتا ہی نہ ہوگا، چنانچہ ارشاد ہے: الا یعلم من خلق۔

* * *

**فائدہ:** [1] حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''پہلی امتوں کا حال سنا کر فرمایا کہ یہ جہاں یوں ہی خالی نہیں پڑا، سر پر ایک مدبر ہے، ہر چیز کا تدارک کرنے والا، مکمل اور آخری تدارک کا نام قیامت ہے'' اور کفار سے کنارہ کرنے کو فرمایا جب خدا کا حکم پہنچا چکے، تبلیغ کا فرض ادا کر دیا اور کافر ضد پر اڑا رہے، تب حکم ہوا کہ زیادہ جھگڑنے سے فائدہ نہیں اب وعدہ کی راہ دیکھو اور ان کی تکلیف و ایذا پر صبر کرو، حرف شکایت زبان پر نہ لاؤ یہاں تک کہ خدا کا فیصلہ پہنچ جائے۔

**فائدہ:** [2] جس کو تیرے صبر اور ان کی ایذاء کی سب خبر ہے، ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دے گا، اس آیت میں گویا معاد کی تقریر فرما دی، یعنی جس نے ایک مرتبہ پیدا کیا دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے اور جس چیز کے اجزاء منتشر ہو گئے ہوں اس کو ہر جزء کی خبر ہے، جہاں کہیں ہوگا سب کو جمع

کر دے گا، دوسری جگہ فرمایا: اَوَلَیۡسَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنۡ یَّخۡلُقَ مِثۡلَهُمۡ ؕ بَلٰی ٭ وَهُوَ الۡخَلّٰقُ الۡعَلِیۡمُ۔

وَلَقَدۡ اٰتَیۡنٰكَ سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ وَالۡقُرۡاٰنَ الۡعَظِیۡمَ ﴿۸۷﴾

اور ہم نے دی ہیں تجھ کو سات آیتیں وظیفہ اور قرآن بڑے درجہ کا

**خلاصہ تفسیر:** اور (آپ ان کے معاملہ کو نہ دیکھئے کہ اس سے غم ہوگا، بلکہ ہمارا معاملہ اپنے ساتھ دیکھئے کہ ہماری طرف سے آپ کے ساتھ کس قدر لطف وعنایت ہے، چنانچہ) ہم نے آپ کو (ایک بڑی بھاری نعمت یعنی) سات آیتیں دیں جو (نماز میں) مکرر پڑھی جاتی ہیں اور وہ (عظیم مضامین پر مشتمل اور جامع ہونے کی وجہ سے اس قابل ہے کہ اس کے دینے کو یوں کہا جائے کہ) قرآن عظیم دیا۔

**سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ:** اس سے سورۃ فاتحہ مراد ہے جو بڑے بڑے علوم کو جامع ہونے کی وجہ سے اس قابل ہے کہ اس کو ''قرآن عظیم'' کہا جائے، اسی وجہ سے اس کا لقب ''اُمّ القرآن'' ہے، پس اس نعمت اور منعم کی طرف نگاہ رکھئے کہ اس سے آپ کا قلب مسرور و مطمئن ہوگا۔

* * *

**فائدہ:** حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی یہ اتنی بڑی نعمت تجھ کو عطا ہوئی اور کافروں کی ضد سے خفا نہ ہو''۔

**تنبیہ:** سبع مثانی کے مصداق میں اختلاف ہے، صحیح اور راجح یہی ہے کہ اس سے مراد سورہ فاتحہ کی سات آیتیں ہیں جو ہر نماز کی ہر رکعت میں دہرائی جاتی ہیں اور جن کو بطور وظیفہ کے بار بار پڑھا جاتا ہے، حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ نے تورات، انجیل، زبور، قرآن کسی کتاب میں اس کا مثل نازل نہیں فرمایا، احادیث صحیحہ میں تصریح ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سورہ ''فاتحہ'' کو فرمایا کہ یہی سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے جو مجھ کو دیا گیا، اس چھوٹی سی سورت کو قرآن عظیم (بڑا قرآن) فرمانا درجہ کے اعتبار سے ہے، اس سورت کو ''اُم القرآن'' بھی اس لحاظ سے کہتے ہیں کہ گویا یہ ایک خلاصہ اور متن ہے جس کی تفصیل و شرح پورے قرآن کو سمجھنا چاہیے، قرآن کے تمام علوم ومطالب کا اجمالی نقشہ تنہا اس سورت میں موجود ہے یوں مثانی کا لفظ بعض حیثیات سے پورے قرآن پر بھی اطلاق کیا گیا ہے: اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِیۡثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ تَقۡشَعِرُّ مِنۡهُ جُلُوۡدُ الَّذِیۡنَ یَخۡشَوۡنَ رَبَّهُمۡ ۚ ثُمَّ تَلِیۡنُ جُلُوۡدُهُمۡ وَقُلُوۡبُهُمۡ اِلٰی ذِكۡرِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُدَی اللّٰهِ یَهۡدِیۡ بِهٖ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَمَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ هَادٍ (الزمر: ۲۳) اور ممکن ہے دوسری سورتوں کو مختلف وجوہ سے مثانی کہہ دیا جائے، مگر اس جگہ سبع مثانی اور قرآن عظیم کا مصداق یہی سورت (فاتحہ) ہے۔

لَا تَمُدَّنَّ عَیۡنَیۡكَ اِلٰی مَا مَتَّعۡنَا بِهٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡهُمۡ وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَیۡهِمۡ وَاخۡفِضۡ

مت ڈال اپنی آنکھیں ان چیزوں پر جو برتنے کو دیں ہم نے ان میں سے کئی طرح کے لوگوں کو ۱؎ اور نہ غم کھا ان پر اور جھکا

جَنَاحَكَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۸۸﴾

اپنے بازو ایمان والوں کے واسطے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** (ان لوگوں کی مخالفت وعناد کی طرف التفات نہ کیجئے اور) آپ اپنی آنکھ اٹھا کر بھی اس چیز کو نہ دیکھئے (نہ بلحاظ افسوس، نہ بلحاظ ناراضگی) جو کہ ہم نے مختلف قسم کے کافروں کو (مثلاً یہود ونصاریٰ مجوس اور مشرکین کو) برتنے کے لئے دے رکھی ہے (اور بہت جلد ان سے جدا ہو جائے گی) اور ان (کی حالت کفر) پر (کچھ) غم نہ کیجئے اور مسلمانوں پر شفقت رکھئے (یعنی فکر مصلحت اور شفقت کے لئے مسلمان کافی ہیں ان پر شفقت کیجیے کہ ان کو اس سے نفع بھی ہے)۔

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ: مطلب یہ کہ یہود و مشرکین، نصاریٰ و مجوس کو جو کچھ دنیا میں دیا گیا ہے نہ اس پر غصہ کی نظر کیجیے کہ چونکہ وہ اللہ کے دشمن ہیں ان کے پاس یہ نعمتیں نہ ہوتیں تو اچھا ہوتا، اس کے جواب کی طرف متعنا میں اشارہ ہے کہ یہ کوئی بڑی بھاری دولت نہیں جو ان دشمنوں کے پاس نہ ہونی چاہیے، بلکہ فنا ہونے والی چیز ہے جو بہت جلد ان سے جدا ہو جائے گی۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ: اور نہ اس پر رنج کی نظر کیجیے کہ افسوس یہ چیزیں ان کو ایمان سے مانع ہو رہی ہیں، اگر یہ نہ ہوں تو غالباً ایمان لے آئیں، اس کا جواب لا تحزن میں ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ ان لوگوں کی سرشت میں انتہائی درجہ عناد ہے، ان سے کوئی توقع نہیں، اور رنج خلاف توقع پر ہوتا ہے، جب توقع ہی نہیں تو رنج و غم بے وجہ ہے، اور حرص کے ساتھ نظر کرنے کا تو آپ سے احتمال ہی نہیں، غرض یہ کہ آپ کسی بھی طرح ان کفار کے فکر و غم میں نہ پڑیئے۔

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ: اس میں اغیار کی طرف نظر کرنے سے حق تعالیٰ کی غیرت معلوم ہوتی ہے (یعنی اغیار کی طرف نظر کرنا غیرت ایمانی کے خلاف ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی مشرکین، یہود و نصاریٰ اور دوسرے دشمنانِ خدا اور رسول کو دنیا کی چندروزہ زندگی کا جو سامان دیا ہے اس کی طرف نظر نہ کیجئے کہ ان ملعونوں کو یہ سامان کیوں دے دیا گیا جس سے ان کی شقاوت و شرارت زیادہ بڑھتی ہے یہ دولت مسلمانوں کو ملتی تو اچھے راستہ میں خرچ ہوتی، ان کو تھوڑی دیر مزہ اڑا لینے دو، تم کو خدا تعالیٰ نے وہ دولت قرآن دی ہے جس کے آگے سب دولتیں گرد ہیں، روایات میں ہے کہ جس کو خدا تعالیٰ نے قرآن دیا پھر کسی کی اور نعمت دیکھ کر ہوس کرے تو اس نے قرآن کی قدر نہ جانی۔

**فائدہ:** ۲؎ غم نہ کھا کہ مسلمان کیوں نہیں ہوتے، آپ فرض تبلیغ ادا کرتے رہیں، معاندین کے پیچھے اپنے کو زیادہ فکر و غم میں مبتلا نہ کیجئے، آپ کی شفقت و ہمدردی کے مستحق مومنین ہیں ان کے ساتھ ملاطفت، نرم خوئی اور شفقت و تواضع کا برتاؤ رکھیئے۔

**وَقُلْ اِنِّيْٓ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۹﴾ كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ﴿۹۰﴾ الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ﴿۹۱﴾**

اور کہہ کہ میں وہی ہوں ڈرانے والا کھول کر ۱؎ جیسا ہم نے بھیجا ہے ان بانٹنے والوں پر، جنہوں نے کیا ہے قرآن کو بوٹیاں ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (کافروں کے لئے چونکہ فکر کا کوئی نتیجہ نہیں، اس لئے ان کی طرف توجہ بھی نہ کیجئے، البتہ تبلیغ جو آپ کا فرض منصبی ہے اس کو ادا کرتے رہئے اور اتنا) کہہ دیجئے کہ میں کھلم کھلا (تم کو خدا کے عذاب سے) ڈرانے والا ہوں (اور خدا کی طرف سے تم کو یہ مضمون پہنچاتا ہوں کہ وہ عذاب جس سے ہمارا نبی ڈراتا ہے ہم تم پر کسی وقت ضرور نازل کریں گے) جیسا ہم نے (وہ عذاب) ان لوگوں پر (گذشتہ مختلف اوقات میں) نازل کیا ہے جنہوں نے (احکام الٰہی کے) حصے کر رکھے تھے (یعنی آسمانی کتاب کے مختلف اجزا قرار دیئے تھے، ان میں جو مرضی کے موافق ہوا مان لیا، جو مرضی کے خلاف ہوا اس سے انکار کر دیا)۔

الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ: اس سے مراد پہلے زمانہ کے یہود و نصاریٰ ہیں جن پر انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کی وجہ سے عذابوں کا آنا مشہور و معروف تھا، بعض بندر بن گئے، بعض خنزیر کی صورت میں مسخ ہوئے، بعض قتل و قید اور ذلیل ہوئے، مطلب یہ کہ عذاب کا نازل ہونا کوئی بعید بات نہیں، پہلے بھی ہو چکا ہے، اگر تم پر بھی نازل ہو جائے تو تعجب کی کون سی بات ہے، خواہ وہ عذاب دنیا میں ہو یا آخرت میں۔

اور ان کی کتاب کو قرآن کہنے میں یہ نکتہ ہو سکتا ہے کہ اس موجودہ قرآن کے انکار میں آپ ﷺ کو تسلی ہو جائے کہ اس کا انکار کوئی نیا نہیں، پہلے قرآن کا بھی انکار ہو چکا ہے، اور بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر دوسری طرح کی ہے کہ اس کو گذشتہ آیت: **ولقد آتیناك سبعا من المثانی** کے ساتھ مرتبط کیا ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے آپ کو سورہ فاتحہ اور قرآن عظیم اس طرح دیا جس طرح سابق اہل کتاب پر

انبیاء کے واسطے سے کتاب نازل کی تھی، اور مقصود اس سے یہ ہوگا کہ وحی کا نازل ہونا کوئی عجیب بات نہیں، پہلے بھی نزول ہو چکا ہے، رہا یہ کہ کتاب تو انبیاء پر نازل ہوتی ہے، پھر یہ کیوں کہا کہ ان لوگوں پر نازل کی جنہوں نے احکام کے حصے کر دیے تھے؟؟ جواب یہ ہے کہ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ انبیاء پر کتاب نازل کرنے سے مقصود امت کو احکام کا مکلف بنانا ہوتا ہے، پس گویا کہ امت ہی پر کتاب نازل ہوئی۔

* * *

**فائدہ:** لے یعنی کوئی مانے یا نہ مانے میں خدا کا پیام صاف صاف پہنچائے دیتا ہوں اور تکذیب وشرارت کے عواقب سے خوب کھول کر آگاہ کر رہا ہوں، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''تیرا کام دل پھیر دینا نہیں، یہ خدا سے ہو سکتا ہے، جو کوئی ایمان نہ لائے تو غم نہ کھا''۔

**فائدہ:** ۲ اس آیت کے معنی کئی طرح کیے گئے ہیں، بعض نے کہا کہ مُقْتَسِمِیْن (بانٹنے والوں) سے مراد آپ کے زمانہ کے یہود و نصاریٰ وغیرہ ہیں جنہوں نے قرآن کی تقسیم وتحلیل کر رکھی تھی، یعنی جو مضمون قرآنی ان کی تحریفات یا آراء واہواء کے موافق پڑ جائے مان لو، جو خلاف ہو نہ مانو، مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے تجھے **سبع مثانی** اور **قرآن عظیم** دے کر بھیجا جیسے ان لوگوں پر بھی پہلے کتابیں نازل کی تھیں، آپ ﷺ پر کتاب اتارنا یا وحی بھیجنا کوئی انوکھی بات نہیں جس کا انکار کیا جائے۔

بعض نے مُقْتَسِمِیْن سے یہود و نصاریٰ مراد لے کر لفظ قرآن سے کتب سابق مراد لی ہیں، یعنی انہوں نے تحریف کر کے اپنی کتابوں کو پارہ پارہ کر ڈالا بعض نے کہا مشرکین مراد ہیں جو بطور استہزاء وتمسخر قرآن کی تقسیم کرتے تھے، جب سورتوں کے نام سنتے تو ہنس کر آپس میں کہتے، بقرہ یا مائدہ میں لوں گا، عنکبوت تجھ کو دوں گا، ان لوگوں نے ایک اور طرح بھی قرآن کے متعلق خیالات تقسیم کر رکھے تھے کوئی اسے شاعری بتاتا، کوئی کہانت، کوئی جادو، کوئی مجنون کی بڑ، کوئی اساطیر الاولین، ان کو آگاہ کیا کہ میں سب کو عذاب سے ڈرانے والا ہوں، جیسا عذاب یقینا نازل ہونے والا ہے ان ٹھٹھا کرنے والوں پر، اس وقت اَنْزَلْنَا کی تعبیر اس لحاظ سے ہوگی کہ متیقن الوقوع اور قریب الوقوع مستقبل کو گویا ماضی فرض کر لیا گیا۔

ابن کثیرؒ نے مُقْتَسِمِیْن کے معنی قسم کھانے والوں کے لیے ہیں یعنی وہ گزشتہ قومیں جو انبیاء کی تکذیب ومخالفت کے حلف اٹھا چکی تھیں اور جھوٹی باتوں پر قسمیں کھاتی تھیں اور انہوں نے کتب سماویہ کے ٹکڑے کر دیئے تھے، جیسا عذاب ہم نے ان پر اتارا، اسی طرح کے عذاب سے یہ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ تم کو ڈراتا ہے، مُقْتَسِمِیْن کے اس معنی کی تائید میں ابن کثیر: نے ذیل کی آیات پیش کی ہیں: تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ (النمل:۴۹) وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ (النحل:۳۸) اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ (ابراہیم:۴۴) اَهٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ (الاعراف:۴۹)

فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۲﴾ۙ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾ ع

سو قسم ہے تیرے رب کی ہم کو پوچھنا ہے ان سب سے، جو کچھ وہ کرتے تھے لے

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۴﴾

سو سنا دے کھول کر جو تجھ کو حکم ہوا، اور پروا نہ کر مشرکوں کی ۲

**خلاصہ تفسیر:** (اور جب مذکورہ تقریر سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جس طرح پچھلے لوگ انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کی وجہ سے عذاب کے مستحق تھے اسی طرح موجودہ لوگ بھی مستحق عذاب ہو گئے ہیں) سو (اے محمد ﷺ! ہمیں) آپ کے پروردگار کی (یعنی اپنی) قسم! ہم ان سب (اگلوں اور پچھلوں) سے ان کے اعمال کی (قیامت کے روز) ضرور باز پرس کریں گے (پھر ہر ایک کو اس کے مناسب سزا دیں گے)۔

غرض (حاصل کلام یہ کہ) آپ کو جس بات (کے پہنچانے) کا حکم کیا گیا ہے اسکو (تو) صاف صاف سنا دیجئے اور (اگر یہ نہ مانے تو) ان مشرکوں (کے نہ ماننے) کی (مطلق) پروانہ کیجئے (یعنی غم نہ کیجئے، جیسا اوپر آیا ہے لا تحزن اور نہ طبعی طور پر خوف کیجئے)۔

**فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ**: اس میں دلالت ہے کہ حق بات کو بہت صفائی سے یعنی صاف صاف کہنا چاہیے۔

* * *

**فائدہ:** لے یعنی کس کی عبادت کی تھی؟ پیغمبروں کے ساتھ کس طرح پیش آئے تھے؟ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کیوں نہ مانا تھا؟ اس کلمہ کا حق کیوں ادا نہیں کیا تھا؟ یہ اور اسی قسم کے نہ معلوم کتنے سوالات ہوں گے۔

**فائدہ:** ۲ے یعنی کہنے میں کوتاہی نہ کیجئے خوب کھول کر خدائی پیغامات پہنچایئے، یہ مشرکین آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔

**اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿۹۵﴾ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾**

ہم بس (کافی) ہیں تیری طرف سے ٹھٹھے کرنے والوں کو لے جو کہ ٹھہراتے ہیں اللہ کے ساتھ دوسرے کی بندگی سو عنقریب معلوم کرلیں گے ۲ے

**خلاصہ تفسیر:** (مخالف تو بہت سے ہیں، کیونکہ) یہ لوگ جو (آپ کے اور خدا کے مخالف ہیں چنانچہ آپ پر تو) ہنستے ہیں (اور) اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرا معبود قرار دیتے ہیں، ان (کے شر و ایذاء) سے آپ (کو محفوظ رکھنے) کے لئے (اور ان سے بدلہ لینے کے لئے) ہم کافی ہیں، سو ان کو ابھی معلوم ہوا جاتا ہے (کہ استہزاء اور شرک کا کیا انجام ہوتا ہے غرض جب ہم کافی ہیں پھر کاہے کا خوف ہے)۔

* * *

**فائدہ:** لے یعنی دنیا وآخرت میں ہم سب ٹھٹھا کرنے والوں سے نبٹ لیں گے، آپ بے خوف وخطر تبلیغ کرتے رہیے، آپ کا بال بیکا نہ ہوگا۔

**فائدہ:** ۲ے یعنی رسول کے ساتھ استہزاء کرنا اور خدا کے لیے شریک ٹھہرانا، دونوں باتوں کا انجام یہ لوگ دیکھ لیں گے۔

**وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿۹۷﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۹۸﴾**

اور ہم جانتے ہیں کہ تیرا جی رکتا ہے ان کی باتوں سے، سو تو یاد کر خوبیاں اپنے رب کی اور ہو سجدہ کرنے والوں سے

**خلاصہ تفسیر:** اور واقعی ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ جو (کفر و استہزاء کی) باتیں کرتے ہیں اس سے آپ تنگ دل ہوتے ہیں (کہ یہ طبعی بات ہے) سو (اس کا علاج یہ ہے کہ) آپ اپنے پروردگار کی تسبیح وتحمید کرتے رہئے اور نمازیں پڑھنے والوں میں رہئے۔

**وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ**: اس سے معلوم ہوا کہ جب انسان کو دشمنوں کی باتوں سے رنج پہنچے اور دل تنگی پیش آئے تو اس کا روحانی علاج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح وعبادت میں مشغول ہو جائے اللہ تعالیٰ خود اس کی تکلیف کو دور فرما دیں گے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی اگر ان کی ہٹ دھرمی سے دل تنگ ہو تو آپ ان کی طرف سے توجہ ہٹا کر ہمہ تن خدا کی تسبیح وتحمید میں مشغول رہیے۔ خدا کا ذکر، نماز، سجدہ، عبادت الٰہی وہ چیزیں ہیں جن کی تاثیر سے قلب مطمئن ومنشرح رہتا ہے اور فکر وغم دور ہوتے ہیں، اسی لیے نبی کریم ﷺ کی عادت تھی کہ جب کوئی مہم بات فکر کی پیش آتی آپ ﷺ نماز کی طرف جھپٹتے۔

ع ۶
**وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿۹۹﴾**

اور بندگی کیے جا اپنے رب کی جب تک آئے تیرے پاس یقینی بات

**خلاصہ تفسیر:** اور اپنے رب کی عبادت کرتے رہئے یہاں تک کہ (ایسی حالت میں) آپ کو موت آ جائے (یعنی مرتے دم تک ذکر وعبادت میں مشغول رہئے، کیونکہ ذکر اللہ اور عبادت میں آخرت کے اجر وثواب کے علاوہ یہ خاصیت بھی ہے کہ دنیا میں جب انسان اس طرف لگ جاتا ہے تو دنیا کے رنج وغم اور تکلیف ومصیبت ہلکی ہو جاتی ہے)۔

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ: یہاں یقین کی تفسیر موت ہے، تو اس آیت میں ان جاہل صوفیوں کا رد ہے جو یہ کہتے ہیں کہ سلوک میں کوئی مقام ایسا بھی آتا ہے جس میں احکام شریعت معاف ہو جاتے ہیں، یہ اعتقاد رکھنا الحاد و کفر ہے (بے دینی اور جہالت کی وجہ سے انہوں نے یقین کے معنی اردو کا یقین یعنی یقینی کیفیت سمجھ لیا، اس وجہ سے انہیں یہ مغالطہ ہوا جو کہ نری گمراہی ہے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی موت، ''یقین'' کا لفظ دوسری جگہ قرآن نے اسی معنی میں استعمال کیا ہے: وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ حَتّٰىٓ اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ (المدثر:۴۶) حدیث میں ایک میت کی نسبت آپ نے فرمایا: ''اَمَّا هوَ فَقَدْ جَآءَهُ الْيَقِيْنُ وَاِنِّى لَاَرْجُوْلَه اَلْخَيْرَ'' جمہور سلف نے اس آیت میں ''یقین'' کو بمعنی موت لیا ہے یعنی مرتے دم تک خدا کی عبادت میں لگے رہیے:

اندریں رہ میتراش و میخراش　　　　تا دمِ آخر دمے فارغ مباش

جن بعض عارفین نے اس جگہ ''یقین'' کو کیفیت قلبیہ کے معنی میں لیا ہے اس کی توجیہ روح المعانی میں مذکور ہے دیکھ لی جائے۔

ایاتها ۱۲۸ | ۱۶ سُوْرَةُ النَّحْلِ مَكِّيَّةٌ ۷۰ | رکوعاتها ۱۶

**خلاصہ تفسیر:** اس سورت میں زیادہ تر حق تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے جو درحقیقت دلائل توحید کے ضمن میں انعام اور امتنان کے پیرائے میں ہیں، مگر در پردہ ہر نعمت اس کی وحدانیت کی دلیل اور برہان ہے جن سے مقصود شرک کو باطل کرنا ہے، اس سورت کے زیادہ مضامین تو توحید اور ابطال شرک کے ہیں اور کچھ مضامین ایسے بھی ہیں جن میں منکرین نبوت کے شبہات کے جوابات دیئے گئے، اس طرح اخیر سورت تک زیادہ تر توحید کے عقلی دلائل کا بیان چلا گیا اور گاہ بگاہ نبوت و رسالت اور حقانیت قرآن اور قیامت اور حشر و نشر کے منکرین پر وعید اور تہدید کا بیان چلا گیا، اور آخری رکوع میں رسالت محمدیہ ﷺ کی تقویت کے لیے رسالت ابراہیمی کا ذکر فرمایا اور چونکہ کفار اور مشرکین آنحضرت ﷺ کی ایذاء رسانی پر تلے ہوئے تھے اس لیے اس سورت کو صبر اور تقویٰ کے حکم پر ختم فرمایا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

اَتٰٓى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ①

آ پہنچا حکم اللہ کا سو اس کی جلدی مت کرو ۱؎ وہ پاک ہے اور برتر ہے ان کے شریک بتلانے سے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** چونکہ توحید کا مضمون مہتم بالشان ہے جو آگے آرہا ہے اس لیے سورت کا آغاز وعید کے مضمون سے کیا گیا ہے تاکہ اس سے متنبہ ہو کر توجہ کے ساتھ دلائل توحید میں غور کریں۔

خدا تعالیٰ کا حکم (یعنی کفر کی سزا کا وقت قریب) آ پہنچا، سو تم اس میں (منکرانہ) جلدی مت مچاؤ (بلکہ توحید اختیار کرو اور اس کی حقیقت سنو کہ) وہ لوگوں کے شرک سے پاک اور برتر ہے (یعنی اس کا کوئی شریک نہیں)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی خدا کا یہ حکم کہ: ''پیغمبر ﷺ کی جماعت غالب و منصور اور حق کے مخالف مغلوب و ذلیل ہوں گے، جنہیں دنیا میں مسلمان مجاہدین کے ہاتھوں اور آخرت میں براہ راست احکم الحاکمین کے دربار سے شرک و کفر کی سزا ملے گی''، اس حکم کے وقوع کا وقت قریب آ پہنچا، اور قیامت کی گھڑی بھی دور نہیں ہے، جس چیز کا آنا یقینی ہوا سے آئی ہوئی سمجھنا چاہیے پھر جلدی مچانے کی کیا ضرورت ہے، کفار ازراہ تکذیب و استہزاء کہا کرتے تھے کہ جس عذاب یا قیامت کے آنے کا تم وعدہ کرتے ہو، وہ جلد کیوں نہیں آجاتا انھیں متنبہ فرمایا کہ تمہارے ایسا کہنے سے وہ ٹلنے والا نہیں، بلکہ حتمی اور

یقینی طور پر جلد آیا چاہتا ہے جس قدر دیر لگ رہی ہے وہ بھی ایک طرح سے تمہارے حق میں مفید ہے ممکن ہے بعض کو اصلاح وتوبہ کی توفیق مل جائے: وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ (العنکبوت: ۵۳) يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ (الشوری: ۱۸)

**فائدہ:** ۲ یعنی جب حق کا غالب ہونا اور کفر وشرک پر سزا ملنا یقینی ہے تو توحید کی راہ اختیار کرو اور مشرکانہ طور وطریق سے علیحدہ ہو جاؤ، جنہیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو ان میں سے کوئی خدا کے حکم کو ٹال نہیں سکتا نہ عذاب الٰہی کو روک سکتا ہے۔

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ﴿۲﴾

اتارتا ہے فرشتوں کو ۱ بھید دے کر ۲ اپنے حکم سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں ۳ کہ خبردار کر دو کہ کسی کی بندگی نہیں سوا میرے سو مجھ سے ڈرو ۴

**خلاصہ تفسیر:** اب دلیل نقلی سے توحید کو ثابت کیا جاتا ہے، یہاں اَنْذِرُوْٓا سے توحید پر مکرر تنبیہ بھی کی جارہی ہے۔

وہ (اللہ تعالیٰ) فرشتوں (کی جنس یعنی جبرئیل) کو وحی یعنی اپنا حکم دے کر اپنے بندوں میں جس پر چاہیں (یعنی انبیاء علیہم السلام پر) نازل فرماتے ہیں (اور وہ حکم) یہ (ہے) کہ لوگوں کو خبردار کر دو کہ میرے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، سو مجھ سے ہی ڈرتے رہو (یعنی میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ ورنہ سزا ہوگی)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی فرشتوں کی جنس میں سے بعض کو جیسے حضرت جبرائیل علیہ السلام یا حفظۃ الوحی، جن کی طرف: فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا (الجن: ۲۷) میں اشارہ کیا ہے۔

**فائدہ:** ۲ یہاں روح سے مراد وحی الٰہی ہے جو خدا کی طرف سے پیغمبروں کی طرف غیر مرئی طریق پر بطور ایک بھید کے آتی ہے، چنانچہ دوسری جگہ فرمایا: يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (غافر: ۱۵) ایک جگہ قرآن کی نسبت فرمایا: وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (الشوری: ۵۲) قرآن یا وحی الٰہی کو روح سے تعبیر فرمانے میں یہ اشارہ ہے کہ جس طرح مادی اجسام کو نفخ روح سے ظاہری حیات حاصل ہوتی ہے، اسی طرح جو قلوب جہل وضلال کی بیماریوں سے مردہ ہو چکے تھے وہ وحی الٰہی کی روح پا کر زندہ ہو جاتے ہیں۔

**فائدہ:** ۳ وہ بندے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں جن کو خدا تعالیٰ ساری مخلوق میں سے اپنی حکمت کے موافق اپنے کامل اختیار سے چن لیتا ہے: اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (الانعام: ۱۲۴) اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ (الحج: ۷۵)

**فائدہ:** ۴ یعنی توحید کی تعلیم، شرک کا رد اور تقویٰ کی طرف دعوت، یہ ہمیشہ سے تمام انبیاء علیہم السلام کا مشترکہ ومتفقہ نصب العین (مشن) رہا ہے، گویا اثباتِ توحید کی یہ نقلی دلیل ہوئی، آگے عقلی دلیلیں بیان کی جاتی ہیں:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۳﴾

بنائے آسمان اور زمین ٹھیک، وہ برتر ہے ان کے شریک بتلانے سے ۱

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴﴾

بنایا آدمی کو ایک بوند سے پھر جبھی ہو گیا جھگڑا کرنے والا بولنے والا ۲

**خلاصہ تفسیر:** دلیل نقلی کے بعد اب یہاں سے توحید پر دلائل عقلی کا بیان شروع ہوتا ہے جو دور تک چلا گیا ہے، دلائل عقلی کے ضمن

میں اپنے انعامات کا بھی ذکر فرمایا۔

(اللہ تعالیٰ نے) آسمانوں کو اور زمین کو حکمت سے بنایا، وہ ان کے شرک سے پاک ہے (اور) انسان کو نطفہ سے بنایا، پھر وہ اچانک کھلم کھلا (خدا ہی کی ذات وصفات میں) جھگڑنے لگا (یعنی بعض ایسے بھی ہوئے، مطلب یہ ہے کہ ہماری یہ نعمتیں اور انسان کی طرف سے ناشکری)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی زمین و آسمان کا نظام ایسا درست و استوار بنایا ہے جسے دیکھ کر لامحالہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ تمام کائنات کا سلسلہ صرف ایک ہی مالک مختار کے ہاتھ میں ہونا چاہیے، بلکہ کئی آزاد خداؤں کی کشمکش باہمی سرے سے اس نظام عالم کو موجود ہی نہ ہونے دیتی: لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (الانبیاء:۲۲) اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (المؤمنون:۹۱)

**فائدہ:** ۲؎ یعنی علویات وسفلیات کا انتظام درست کر کے تم کو پیدا کیا، تم خود اپنی خلقت میں غور کرو تو حق تعالیٰ کی عجیب وغریب صنعت و قدرت کا سبق ملے گا، تمہاری اصل کیا تھی؟ ایک قطرہ بے جان، جس میں نہ حس وحرکت تھی نہ شعور وارادہ، نہ وہ بات کرنے کے قابل تھا، نہ اس لائق تھا کہ کسی معاملہ میں جھگڑ کر اپنا حق منوا دے یا دوسروں پر غالب آجائے، اب دیکھو حق تعالیٰ نے اسی قطرہ ناچیز کو کیا سے کیا بنا دیا، کیسی عجیب صورت عطا کی، اور کیسی اعلیٰ قوتیں اور کمالات اس پر فائض کیے جو ایک حرف بولنے پر قادر نہ تھا وہ کیسے لیکچر دینے لگا جس میں ادنیٰ حس وحرکت نہ تھی، اب کس طرح بات بات میں جھگڑے کرنے اور حجتیں نکالنے لگا حتیٰ کہ بعض اوقات مخلوق سے گزر کر خالق کے مقابلہ میں خم ٹھونک کر کھڑا ہو گیا، یہ بھی یاد نہ رکھا کہ میری اصل کیا تھی اور کیسے یہ طاقت حاصل ہوئی: اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ (یٰس:۷۷ تا۷۹)

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ⑤

اور چوپائے بنادیے، تمہارے واسطے ان میں جڑاول ہے اور کتنے فائدے اور بعضوں کو کھاتے ہو ۱؎

وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ⑥

اور تم کو ان سے عزت ہے جب شام کو چرا کر لاتے ہو اور جب چرانے لے جاتے ہو ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور اسی نے چوپایوں کو بنایا، ان میں تمہارے جاڑے کا بھی سامان ہے (جانوروں کی بال اور کھال سے انسان کے پوستین اور کپڑے بنتے ہیں) اور بھی بہت سے فائدے ہیں (کسی کا دودھ پیا جاتا ہے، کسی پر سوار ہوتے ہیں، کوئی ہل میں چلایا جاتا ہے وغیرہ) اور ان میں سے (جو کھانے کے قابل ہیں ان کو) کھاتے بھی ہو (جیسے گوشت چربی وغیرہ) اور ان کی وجہ سے تمہاری رونق بھی ہے جب کہ شام کے وقت (جنگل سے گھر) لاتے ہو اور جب کہ (انہیں) صبح کے وقت (گھر سے جنگل کو) چھوڑ دیتے ہو۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری تمہارے لیے پیدا کئے، ان میں سے بعض کے بال یا اون وغیرہ سے کمبل دُسے، ڈیرے، خیمے اور سردی سے بچنے کے لیے مختلف قسم کے لباس تیار کرتے ہیں، اس کے علاوہ کسی کا دودھ پیا جاتا ہے، کسی کو ہل میں چلایا جاتا ہے، گھی مکھن وغیرہ کی ساری افراط ان ہی جانوروں کی بدولت ہے، ان کے چمڑے سے کیسے کیسے عمدہ اور بیش قیمت سامان تیار کیے جاتے ہیں، جن جانوروں کا گوشت کھانے میں کوئی معتد بہ بدنی یا اخلاقی مضرت نہیں ہے ان کا گوشت کھایا جاتا ہے، کتنے غریبوں کی شکم پروری ان سے ہوتی ہے اور جو دوسری غذائیں ہم کھاتے ہیں ان کی تیاری میں بھی ان حیوانات کو کس قدر دخل ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ جب ڈھور ڈنگر گھر میں بندھے کھڑے ہوں یا جنگل میں غائب ہوں اس وقت انعام الٰہی کا ایسا صاف مظاہرہ نہیں ہوتا، ہاں

جب چرنے کے لیے گھر سے نکلتے یا شام کو جنگل سے شکم سیر ہو کر گھر کی طرف لوٹتے ہیں اس وقت ایک عجیب رونق اور چہل پہل ہوتی ہے، مالک خود بھی دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور دوسرے لوگ بھی کہتے ہیں کہ خدا نے فلاں زمیندار کو کیسا دھن دولت دیا ہے۔

وَتَحۡمِلُ اَثۡقَالَكُمۡ اِلٰى بَلَدٍ لَّمۡ تَكُوۡنُوۡا بٰلِغِيۡهِ اِلَّا بِشِقِّ الۡاَنۡفُسِ‌ؕ اِنَّ رَبَّكُمۡ لَرَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ۙ‏ ⑦

اور اٹھالے چلتے ہیں بوجھ تمہارے ان شہروں تک کہ تم نہ پہنچتے وہاں مگر جان مار کر، بیشک تمہارا رب بڑا شفقت کرنے والا مہربان ہے

**خلاصہ تفسیر:** اور وہ تمہارے بوجھ بھی (لادکر) ایسے شہر کو لے جاتے ہیں جہاں تم بدون (بغیر) جان کو محنت میں ڈالے ہوئے (خود بھی) نہیں پہنچ سکتے (اور بوجھ سمیت جانا تو اور بھی مشکل ہے) واقعی تمہارا رب بڑی شفقت و رحمت والا ہے (کہ تمہارے آرام کے لئے کیا کیا سامان پیدا کئے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جہاں تم جریدہ بدون سامان واسباب کے بڑی مشکل سے پہنچ سکتے تھے یہ جانور تم کو اور تمہارے بھاری بھاری سامانوں کو کھینچ کر لے جاتے ہیں، یہ خدا کی کتنی بڑی شفقت اور مہربانی ہے کہ ان حیوانات کو تمہاری خدمت میں لگا دیا اور ان سے کام لینے کی اجازت دی اور بڑی سخت اور مشکل مہمات ان جانوروں کے ذریعہ سے آسان کر دیں: اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّا خَلَقۡنَا لَهُمۡ مِّمَّا عَمِلَتۡ اَيۡدِيۡنَاۤ اَنۡعَامًا فَهُمۡ لَهَا مٰلِكُوۡنَ وَذَلَّلۡنٰهَا لَهُمۡ فَمِنۡهَا رَكُوۡبُهُمۡ وَمِنۡهَا يَاۡكُلُوۡنَ (یس: ۷۱-۷۲)

وَّالۡخَيۡلَ وَالۡبِغَالَ وَالۡحَمِيۡرَ لِتَرۡكَبُوۡهَا وَزِيۡنَةً‌ ؕ وَيَخۡلُقُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ⑧

اور گھوڑے پیدا کیے اور خچریں اور گدھے کہ ان پر سوار ہو اور زینت کے لیے [1] اور پیدا کرتا ہے جو تم نہیں جانتے [2]

**خلاصہ تفسیر:** اور گھوڑے اور خچر اور گدھے بھی پیدا کئے، تاکہ ان پر سوار ہو، اور نیز زینت کے لئے بھی، اور وہ ایسی ایسی چیزیں (تمہاری سواری وغیرہ کے لئے) بناتا ہے جن کی تم کو خبر بھی نہیں (اور ان سے تمہیں فائدہ پہنچ رہا ہے اور ایسی چیزیں بکثرت ہیں)۔

**وَلَكُمۡ فِيۡهَا جَمَالٌ (الی قولہ) لِتَرۡكَبُوۡهَا وَزِيۡنَةً:** اس سے جمال اور زینت کا جواز معلوم ہوتا ہے مگر تفاخر وتکبر حرام ہیں، جمال وزینت اور تفاخر وتکبر میں فرق یہ ہے کہ جمال اور زینت تو اپنا دل خوش کرنے کے لیے یا خدا کی نعمت ظاہر کرنے کے لیے ہوتا ہے، اور دل میں نہ اپنے کو اس نعمت کا مستحق سمجھتا ہے اور نہ دوسروں کو حقیر جانتا ہے، بلکہ ان نعمتوں کا حق تعالی کی طرف سے عطیہ اور انعام ہونا پیش نظر ہوتا ہے، اور تکبر وتفاخر میں اپنے آپ کو اس نعمت کا مستحق سمجھنا اور دوسروں کو حقیر سمجھنا پایا جاتا ہے، یہ حرام ہے۔

**وَلَكُمۡ فِيۡهَا جَمَالٌ (الی قولہ) لِتَرۡكَبُوۡهَا وَزِيۡنَةً:** پیچھے ضروری منافع کو بیان کرنے کے بعد اس کا لانا اس بات پر دلیل ہے کہ زینت وجمال وغیرہ کا قصد وارادہ کرنا نقصان دہ نہیں ہے بشرطیکہ اس میں فخر وتکبر نہ ہو اور اس میں کوئی شرعی مصلحت ہو، جیسے دفع مذلت یا مسرت، البتہ مبتدی کو جس کی ابھی پوری تربیت نہ ہوئی ہو چونکہ وہ اس سے کم خالی ہوتا ہے تو اسے شان وشوکت اختیار کرنے سے پرہیز کرنا بہتر ہے جب تک نفس کی اصلاح نہ ہو جائے اور اس اصلاح کی کامل مربی گواہی نہ دے دے۔

**وَيَخۡلُقُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ:** یعنی وہ ایسی ایسی چیزیں بناتا ہے جن کی تم کو خبر بھی نہیں، مثلا یہ کہ کسی موذی جانور کی نسل بڑھے گی، اللہ تعالی نے زمین میں کوئی ایسا زہریلا مادہ پیدا کر دیا ہے جس سے وہ ہلاک ہو گیا، عام لوگوں کو اس مادہ کی اطلاع تک بھی نہیں ہوتی اور اس سے ان کو نفع پہنچ رہا ہے۔

* * *

**فائدہ:** [1] یعنی سواری کرتے ہو اور عزت وشان ظاہر ہوتی ہے۔

**تنبیہ:** عرب میں گدھے کی سواری معیوب نہیں، وہاں کے گدھے نہایت قیمتی، خوبصورت، تیز رفتار درقدم باز ہوتے ہیں، بعض گدھوں

کے سامنے گھوڑوں کی کچھ حقیقت نہیں رہتی، ایک زندہ دل ہندی نے خوب کہا تھا کہ: حجاز میں ''گدھا'' نہیں ''حمار'' ہوتا ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی جن حیوانات کا اوپر ذکر ہوا، ان کے علاوہ حق تعالیٰ تمہارے انتفاع کے لیے وہ چیزیں پیدا کرتا رہتا ہے اور کرتا رہے گا جن کی تمہیں فی الحال خبر بھی نہیں، اس میں وہ سب سواریاں بھی آگئیں جو قیامت تک بنتی رہیں گی۔

ع
وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ ؕ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹﴾

اور اللہ تک پہنچتی ہے سیدھی راہ اور بعضی راہ کج بھی ہے ۱؎ اور اگر وہ چاہے تو سیدھی راہ دے تم سب کو ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** گذشتہ آیات میں اللہ جل شانہ کی عظیم الشان نعمتوں کا ذکر فرما کر توحید کے عقلی دلائل جمع کئے گئے، آگے بھی ان نعمتوں کا ذکر ہے، اب درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر ان دلائل کا روحانی نعمت ہونا بیان فرماتے ہیں کہ یہ دلائل صراط مستقیم یعنی سیدھے راستہ تک پہنچانے والے اور ٹیڑھے راستہ سے بچانے والے ہیں۔

اور (گذشتہ اور آئندہ آنے والے دلائل سے جو) سیدھا راستہ (دین کا ثابت ہوتا ہے وہ خاص) اللہ تک پہنچتا ہے اور بعض رستے (جو کہ دین کے خلاف ہیں) ٹیڑھے بھی ہیں (کہ ان سے اللہ تک رسائی ممکن نہیں، پس بعض تو سیدھے رستہ پر چلتے ہیں اور بعض ٹیڑھے پر) اور اگر خدا چاہتا تو تم سب کو (منزل) مقصود تک پہنچا دیتا (مگر وہ اسی کو مقصود تک پہنچاتے ہیں جو صراط مستقیم کا طالب بھی ہو: **وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا** اس لئے تم کو چاہئے کہ دلائل میں غور کرو اور ان سے حق کو طلب کرو تا کہ تم کو منزل مقصود تک پہنچنا نصیب ہو)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ پہلے ذکر فرمایا تھا کہ تم حیونات کی پیٹھ پر سوار ہوتے ہو اور وہ تم کو مع سامان و اسباب کے سخت اور کھٹن منزلیں طے کرا کر منزل مقصود پر پہنچا دیتے ہیں، یہ بدنی اور حسی سیر و سفر کا حال ہوا، اسی کی مناسبت سے اب روحانی اور معنوی سیر و سیاحت کی طرف کلام منتقل ہو گیا، یعنی جس طرح زمینی راستے طے کر کے منزل مقصود تک پہنچتے ہو، ایسے ہی خدا تک پہنچنے کا سیدھا راستہ بھی کھلا ہوا ہے، جس کی سمجھ سیدھی ہوگی، وہ مذکورہ بالا دلائل و بصائر میں غور کر کے حق تعالیٰ کی قدرت اور عظمت و جبروت پر ایمان لائے گا اور توحید و تقویٰ کی سیدھی راہ چل کر بے کھٹکے خدا تک پہنچ جائے گا، لیکن جس کی عقل سیدھی نہیں، اسے سیدھی سڑک پر چلنے کی توفیق کہاں ہو سکتی ہے وہ ہمیشہ اہواء و اوہام کی پیچ دار پگڈنڈیوں میں پڑا بھٹکتا رہے گا: **وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ** (الانعام: ۱۵۳)

**فائدہ:** ۲؎ یعنی خدا کچھ اس بات سے عاجز نہیں تھا کہ ساری دنیا کو ایک ہی راہ پر لگا دیتا، لیکن اس کی حکمت مقتضی نہیں ہوئی کہ سب کو ایک ہی ڈھنگ اختیار کرنے پر مجبور کر دے، جیسا کہ ہم پہلے متعدد مواقع میں اس کی تشریح کر چکے ہیں۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ﴿۱۰﴾ يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ

وہی ہے جس نے اتارا آسمان سے تمہارے لیے پانی اس سے پیتے ہو اور اسی سے درخت ہوتے ہیں جس میں چراتے ہو ۱؎ اگاتا ہے تمہارے واسطے

الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۱﴾

اس سے کھیتی اور زیتون اور کھجوریں اور انگور اور ہر قسم کے میوے اس میں البتہ نشانی ہے ان لوگوں کو جو غور کرتے ہیں

**خلاصہ تفسیر:** درمیان میں جملہ معترضہ کو ذکر کرنے کے بعد اب بقیہ دلائل توحید کو بیان فرماتے ہیں۔

وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے تمہارے (فائدہ کے) واسطے آسمان سے پانی برسایا جس سے تم کو پینے کو ملتا ہے اور جس (کے سبب) سے درخت (پیدا ہوتے) ہیں جن میں تم (اپنے مواشی جانوروں کو) چرنے چھوڑ دیتے ہو (آیت میں شجر عام ہے درخت اور گھاس وغیرہ سب کو، اور) اس

(پانی) سے تمہارے (فائدے کے) لئے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل (زمین سے) اگاتا ہے، بیشک اس میں سوچنے والوں کے لئے (توحید کی) دلیل (موجود) ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی پانی پینے کے قابل بنایا اور اسی سے درخت، گھاس وغیرہ نباتات اگائے جس سے تمہارے جانور چرتے ہیں۔

**فائدہ:** ۲ یعنی ایک ہی پانی سے مختلف قسم کے پھل اور میوے اگاتا رہتا ہے جن کی شکل وصورت، رنگ و بو، مزہ اور تاثیر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، اس میں غور کرنے والوں کے لیے خدا کی قدرت کاملہ اور صنعت غریبہ کا بڑا نشان ہے کہ ایک زمین، ایک آفتاب، ایک ہوا، اور ایک پانی سے کیسے رنگ برنگ کے پھول پھل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ

اور تمہارے کام میں لگا دیا رات اور دن، اور سورج اور چاند کو، اور ستارے کام میں لگے ہیں اس کے حکم سے ۱ اس میں نشانیاں ہیں

لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۙ﴿۱۲﴾ وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾

ان لوگوں کو جو سمجھ رکھتے ہیں اور جو چیزیں پھیلائیں تمہارے واسطے زمین میں رنگ برنگ کی اس میں نشانی ہے ان لوگوں کو جو سوچتے ہیں ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور اس (اللہ) نے تمہارے (فائدہ کے) لئے رات اور دن اور سورج اور چاند کو (اپنا) مسخر (قدرت) بنایا اور (اسی طرح اور) ستارے (بھی) اس کے حکم سے مسخر (قدرت) ہیں، بیشک اس میں (بھی) عقلمند لوگوں کے لیے (توحید کی) چند دلیلیں (موجود) ہیں، اور (اسی طرح) ان چیزوں کو بھی مسخر (قدرت) بنایا جن کو تمہارے (فائدہ کے لیے) اس طور پر پیدا کیا ہے کہ ان کے اقسام (یعنی اجناس و انواع واصناف) مختلف ہیں (اس میں تمام حیوانات، نباتات، جمادات، عناصر اور مرکبات سب داخل ہو گئے) بیشک اس میں (بھی) سمجھدار لوگوں کے لئے (توحید کی) دلیل (موجود) ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ رات اور دن برابر ایک دوسرے کے پیچھے لگے چلے آتے ہیں تا کہ دنیا کا کاروبار چلے اور لوگ سکون وآرام حاصل کر سکیں، اسی طرح چاند سورج ایک معین نظام کے ماتحت نکلتے اور چھپتے رہتے ہیں، رات، دن کی آمد وشد اور شمس وقمر کے طلوع وغروب کے ساتھ انسانوں کے بیشمار فوائد وابستہ ہیں، بلکہ غور سے دیکھا جائے تو ان کے بدون انسان کی زندگی محال ہے، خدا تعالیٰ نے اپنے اقتدار کامل سے چاند سورج اور کل ستاروں کو ادنیٰ مزدوروں کی طرح ہمارے کاموں پر لگا رکھا ہے، مجال نہیں کہ ذرا سستی یا سرتابی کر سکیں، لیکن چونکہ رات دن اور چاند سورج سے بالکل صریح طور پر ہمارے کام متعلق ہیں اور دوسرے ستاروں سے ہمارے فوائد ومصالح کی وابستگی اس قدر واضح نہیں ہے، شاید اس لیے ان کو جدا کر کے دوسرے عنوان سے بیان فرمایا، واللہ اعلم۔

**فائدہ:** ۲ یعنی جس بلند و برتر ہستی نے آسمانی چیزوں کو تمہارے کام میں لگایا اسی نے تمہارے فائدہ کے لیے زمین میں مختلف قسم کی مخلوقات پیدا کیں جو ماہیت، شکل وصورت، رنگ و بو اور منافع وخواص میں ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہیں، اس میں سب حیوانات، نباتات، جمادات، بسائط ومرکبات شامل ہو گئے۔

وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ

اور وہی ہے جس نے کام میں لگا دیا دریا کو کہ کھاؤ اس میں سے گوشت تازہ اور نکالو اس میں سے گہنا جو پہنتے ہو

وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۱۴﴾

اور دیکھتا ہے تو کشتیوں کو چلتی ہیں پانی پھاڑ کر اس (دریا) میں ۱ اور اس واسطے کہ تلاش کرو اس کے فضل سے اور تا کہ احسان مانو ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور وہ (اللہ) ایسا ہے کہ اس نے دریا کو (بھی) مسخر (قدرت) بنایا تا کہ اس میں سے تازہ تازہ گوشت (یعنی مچھلی نکال نکال کر) کھاؤ اور (تا کہ) اس میں سے (موتیوں کا) گہنا نکالو جس کو تم (مرد وعورت سب) پہنتے ہو اور (اے مخاطب! اس دریا کا ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ) تو کشتیوں کو (خواہ چھوٹی ہوں یا بڑی جیسے بڑے جہاز تو ان کو) دیکھتا ہے کہ اس (دریا) میں (اس کا) پانی چیرتی ہوئی چلی جا رہی ہیں اور (نیز اس لئے دریا کو مسخر قدرت بنایا) تا کہ تم (اس میں مال تجارت لے کر سفر کرو اور اس کے ذریعہ سے) خدا کی روزی تلاش کرو اور تا کہ (ان سب فائدوں کو دیکھ کر اس کا) شکر (ادا) کرو۔

**وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا:** مشہور یہ ہے کہ موتی مونگا وغیرہ صرف نمکین دریا میں پیدا ہوتا ہے، اگر یہ بات ثابت ہو جائے تو آیت میں ''بحر'' سے خاص دریائے شور ہی مراد ہوگا، ورنہ میٹھے دریا کو بھی عام ہوگا، اور سورہ رحمٰن میں جو **یخرج منهما** آیا ہے کہ دونوں سمندروں سے موتی مونگا نکلتا ہے، سو دوسری صورت پر تو اس میں کسی تاویل کی ضرورت ہی نہ رہی اور پہلی صورت پر یہ کہا جائے جائے گا کہ چونکہ وہاں دونوں سمندروں کے جمع ہونے کا ذکر ہے اس لیے قریب ہونے کی وجہ سے یہ کہہ دیا گیا کہ دونوں میں سے نکلتا ہے جیسا کہ کسی پاس دو آدمی اکٹھے آئیں اور ان میں سے ایک کے پاس مال تجارت ہو تو یوں کہہ دیتے ہیں کہ دو شخص آئے تھے جن کے پاس ایسا مال تھا، حالانکہ مال صرف ایک کے پاس تھا مگر ساتھ آنے کی وجہ سے دونوں کی طرف مجازاً نسبت کر دیا کرتے ہیں، خلاصہ تفسیر میں مرد وعورت سب کو یہ حکم عام اس لیے کیا گیا کہ موتی مونگا پہننا مردوں کو بھی جائز ہے۔

**حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا:** اس سے بھی وہی مسئلہ ظاہر ہوتا ہے جو پیچھے گذر چکا ہے کہ زینت کا لباس اور تجارت وغیرہ جبکہ حق میں رکاوٹ نہ بنے تو طریقت کے خلاف نہیں ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی ایسے ٹھاٹھیں مارنے والے خوفناک سمندر کو بھی جس کے سامنے انسان ضعیف البنیان کی کچھ بساط نہیں تمہارے کام میں لگا دیا کہ اس میں بے تکلف مچھلی کا شکار کر کے نہایت لذیذ اور تر وتازہ گوشت حاصل کرتے ہو، اور اس کے بعض حصوں میں سے موتی اور مونگا نکالتے ہو جس کے قیمتی زیور تیار کیے جاتے ہیں بھلا سمندر کی موجوں کو دیکھو جن کے سامنے بڑے بڑے جہازوں کی ایک تنکہ کے برابر حقیقت نہیں، لیکن ایک چھوٹی سی کشتی کس طرح ان موجوں کو چیرتی پھاڑتی چلی جاتی ہے، یہ خدا تعالیٰ کی قدرت کا نمونہ ہے کہ اس نے انسان کو عقل دی اور ایسی چیزیں تیار کر لینے کی ترکیب سمجھائی جن کے ذریعہ سے گویا سمندروں کو پایاب کر لیا گیا۔

**فائدہ:** ۲ یعنی جہازوں اور کشتیوں پر تجارتی مال لاد کر ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک براعظم سے دوسرے براعظم میں پہنچاؤ، اور خدا کے فضل سے بڑی فراخ روزی حاصل کرو، پھر خدا کا احسان مان کر اس کی نعمتوں کے شکر گزار رہو۔

وَأَلْقَىٰ فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَن تَمِيدَ بِكُمْ وَأَنْهَارًا وَسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۵﴾

اور رکھ دیے زمین پر بوجھ (پہاڑ) کہ کبھی جھک پڑیں تم کو لے کر ۱ اور بنائیں ندیاں ۲ اور راستے تا کہ تم راہ پاؤ ۳

**خلاصہ تفسیر:** اور اس نے زمین میں پہاڑ رکھ دیئے تا کہ وہ (زمین) تم کو لے کر ڈگمگانے (اور ہلنے) نہ لگے اور اس نے (چھوٹی چھوٹی) نہریں اور رستے بنائے تا کہ (ان رستوں کے ذریعہ سے اپنی) منزل مقصود تک پہنچ سکو۔

**وَأَلْقَىٰ فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَن تَمِيدَ بِكُمْ:** لفظ ''مید'' عربی زبان میں اضطرابی حرکت کو کہا جاتا ہے اور مراد آیت کی یہ ہے کہ زمین پر

پہاڑوں کا بوجھ حق تعالیٰ نے اس کا توازن برقرار رکھنے کے لئے ڈال دیا ہے تاکہ وہ اضطرابی حرکت نہ کر سکے جس سے اس کے اوپر بسنے والوں کو نقصان پہنچے، پہاڑوں کی جو حکمت یہاں مذکور ہے کہ ان کے ذریعہ سے زمین ساکن ہے حرکت نہیں کرتی، اس پر ظاہر نظر میں یہ شبہ ہوتا ہے کہ فلاسفہ کے قواعد پر تو زمین طبعی طور پر سکون کو چاہتی ہے، اور متکلمین کے نزدیک اگرچہ وہ طبعاً سکون کو نہیں چاہتی مگر حرکت کو بھی نہیں چاہتی، پھر پہاڑوں کے نہ ہونے کی صورت میں زمین کی حرکت واضطراب کی کیا وجہ ہے جن کے روکنے کے لیے پہاڑ پیدا کیے گئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ زمین کی طبیعت حرکت کو نہیں چاہتی، مگر اللہ تعالیٰ نے کسی حکمت کی وجہ سے اس کو ایسی حالت پر بنایا ہے کہ پانی کے اندر ہونے کی وجہ سے جب پانی کو ہوا سے حرکت ہوتی تو زمین بھی ہلتی جیسا کہ خود حکماء بھی اس کے قائل ہیں کہ بعض دفعہ زمین کے اندر بکثرت بخارات بند ہوجانے سے اس کو حرکت ہوتی ہے، اس کے بند کرنے کے لیے اس پر پہاڑ پیدا کیے تاکہ پانی کی حرکت سے زمین کو حرکت نہ ہو، اس پر یہ سوال نہیں ہوسکتا کہ زمین کو پہلے ہی سے ایسا کیوں بنایا؟ کیونکہ یہ تو ایسا ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو ایسی حالت پر بنایا ہے کہ بغیر غذا کے زندہ نہیں رہ سکتا، پھر غذا پیدا کر کے اس کو زندہ رکھا تو یہ سوال بعینہٖ ایسا ہے کہ کوئی یوں کہنے لگے کہ انسان کو پہلے ہی سے غذا کا محتاج کیوں بنایا؟ اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ ہم خدا تعالیٰ کی حکمتوں کا احاطہ کرنے کا دعویٰ نہیں کرتے، اور جاننا چاہیے کہ بعضوں نے اس آیت سے زمین کے حرکت نہ کرنے پر استدلال کیا ہے، مگر حق یہ ہے کہ جس حرکت میں حکماء کا اختلاف ہے اس کی قرآن میں نہ کسی جگہ نفی ہے نہ اثبات ہے، اس لیے دوسرے دلائل کی ضرورت ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی خدا تعالیٰ نے زمین پر بھاری پہاڑ رکھ دیئے تاکہ زمین اپنی اضطرابی حرکت سے تم کو لے کر بیٹھ نہ جائے، روایات وآثار سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین ابتدائے آفرینش میں مضطربانہ طور پر ہلتی اور کانپتی تھی، خدا تعالیٰ نے اس میں پہاڑ پیدا کیے جن سے اس کی کپکپی بند ہوئی، آجکل جدید سائنس نے بھی اقرار کیا ہے کہ پہاڑوں کا وجود بڑی حد تک زلزلوں کی کثرت سے مانع ہے، بہر حال زمین کی حرکت وسکون کا مسئلہ جو حکماء میں مختلف فیہ رہا ہے اس سے آیت کا نفیاً یا اثباتاً کچھ تعلق نہیں، کیونکہ پہاڑوں کے ذریعہ سے جس حرکت کو بند کیا ہے وہ یہ دائمی حرکت نہیں جس میں اختلاف ہو رہا ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی ندیوں اور نہروں کا سرچشمہ کہیں پہاڑوں میں ہوتا ہے لیکن وہ میدانوں اور پہاڑوں کو قطع کرتی ہوئی سینکڑوں ہزاروں میل کی مسافت پر خدا کے حکم سے ان بستیوں تک پہنچتی ہیں جن کا رزق ان کے پانی سے متعلق کیا گیا ہے۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی ایک ملک سے دوسرے ملک میں جاسکو۔

## وَعَلٰمٰتٍ ۭ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ⑯

اور بنائیں (رکھیں) علامتیں ۱؎ اور ستاروں سے لوگ راہ پاتے ہیں ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (ان رستوں کی پہچان کیلئے) بہت سی نشانیاں بنائیں (جیسے پہاڑ درخت تعمیرات وغیرہ جن سے رستہ پہچانا جاتا ہے، ورنہ اگر تمام زمین کی سطح یکساں حالت پر ہوتی تو رستہ ہرگز نہ پہچانا جاتا) اور ستاروں سے بھی لوگ رستہ معلوم کرتے ہیں (چنانچہ ظاہر ومعلوم ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی پہاڑ، چشمے، درخت، ریت کے ٹیلے غرض مختلف قسم کی علامتیں قائم کردی ہیں جن سے مسافروں کے قافلے ٹھیک راستہ کا سراغ نکال سکیں، میں نے خود بعض اعراب (بدوؤں) کو دیکھا کہ مٹی کو سونگھ کر راستہ کا پتہ لگا لیتے ہیں۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی رات کے وقت دریا اور خشکی کے سفر میں بعض ستاروں کے ذریعہ سے راستہ کا پتہ لگا لیا جاتا ہے، ''قطب نما'' سے جو راہنمائی ہوتی ہے وہ بھی بالواسطہ ستارہ سے تعلق رکھتی ہے۔

أَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۷﴾

بھلا جو پیدا کرے برابر ہے اس کے جو کچھ نہ پیدا کرے، کیا تم سوچتے نہیں

**خلاصہ تفسیر:** یہاں تک توحید کو بذریعہ دلائل ثابت کیا، اب شرک کا باطل ہونا اور مشرکین کی مذمت بیان کرتے ہیں۔ سو (جب اللہ تعالیٰ کا مذکورہ اشیاء کا خالق ہونا اور اس میں اس کا منفرد و یکتا ہونا ثابت ہو چکا تو) کیا جو شخص پیدا کرتا ہو (یعنی اللہ تعالیٰ) وہ اس جیسا ہو جائے گا جو پیدا نہیں کر سکتا (کہ تم دونوں کو معبود سمجھنے لگو تو اس میں اللہ تعالیٰ کی سخت اہانت ہے کہ اس کو بتوں کے برابر کر دیا) پھر کیا تم (اتنا بھی) نہیں سمجھتے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی سوچنا چاہیے یہ کس قدر حماقت ہے کہ جو چیزیں ایک مکھی کا پر اور مچھر کی ٹانگ بلکہ ایک جو کا دانہ یا ریت کا ذرہ پیدا کرنے پر قادر نہ ہوں انھیں معبود و مستعان ٹھہرا کر خداوند قدوس کے برابر کر دیا جائے، جو مذکورہ بالا عجیب و غریب مخلوقات کا پیدا کرنے والا اور ان کے محکم نظام کو قائم رکھنے والا ہے اس گستاخی کو دیکھو اور خدا کے انعامات کو خیال کرو، حقیقت میں انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸﴾

اور اگر شمار کرو (گنو) اللہ کی نعمتوں کو نہ پورا کر سکو گے ان کو [1] بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے [2]

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۱۹﴾

اور اللہ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو [3]

**خلاصہ تفسیر:** اور (اللہ تعالیٰ نے جو اوپر دلائل توحید میں اپنی نعمتیں بتلائی ہیں خدا کی نعمتوں کا انحصار ان ہی میں نہیں ہے، بلکہ وہ تو اس کثرت سے ہیں کہ) اگر تم اللہ تعالیٰ کی (ان) نعمتوں کو گننے لگو تو (کبھی) نہ گن سکو (مگر مشرکین شکر اور قدر نہیں کرتے اور یہ جرم اتنا بڑا تھا کہ نہ معاف کرانے سے معاف ہوتا اور نہ اس پر جمے رہنے سے آئندہ یہ نعمتیں ملتیں لیکن) واقعی اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں (کہ کوئی شرک سے توبہ کر لے تو مغفرت ہو جاتی ہے اور نہ کرے تو جب بھی زندگی بھر یہ تمام نعمتیں منقطع نہیں ہوتیں) اور (یہاں نعمتوں کی کثرت سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ کبھی سزا نہ ہوگی، بلکہ آخرت میں سزا ہوگی، کیونکہ) اللہ تعالیٰ تمہارے پوشیدہ اور ظاہری احوال سب جانتے ہیں (پس ان کے موافق سزا دیں گے یہ توحق تعالیٰ کے خالق اور منعم ہونے کا بیان تھا)۔

* * *

**فائدہ:** [1] یعنی جو نعمتیں اوپر بیان ہوئیں "مشتے نمونہ از خروارے" تھیں، باقی خدا کی نعمتیں تو اس قدر ہیں جن کا تم کسی طرح شمار نہیں کر سکتے۔

**فائدہ:** [2] یعنی ان بیشمار نعمتوں کا شکر پوری طرح کس سے ادا ہو سکتا تھا، لہٰذا ادائے شکر میں جو کوتاہی رہ جاتی ہے خدا اس سے درگزر کرتا اور تھوڑے سے شکر پر بہت سا اجر عطا فرما دیتا ہے، یا یہ کفران نعمت کے بعد جو شخص توبہ کر کے شکر گزار بن جائے حق تعالیٰ اس کی پچھلی کوتاہیوں کو بخشتا اور آئندہ کے لیے رحمت مبذول فرماتا ہے، بلکہ ناشکری کی حالت میں بھی اپنی رحمت واسعہ سے اس کو بالکلیہ محروم نہیں کرتا، ہزاروں طرح کی نعمتیں دنیا میں فائض کرتا رہتا ہے۔

**فائدہ:** [3] یعنی حق تعالیٰ تمام ظاہری و باطنی احوال سے خبردار ہے، وہ خوب جانتا ہے کہ کون شخص اس کی نعمتوں پر کس حد تک دل سے اور کس حد تک جوارح سے شکر گزار بنتا ہے اور کون ایسا ہے جس کا ظاہر و باطن ادائے حق نعمت سے خالی رہتا ہے، یا مذکورہ بالا دلائل و نعم کو سن کر کون ہے جو

سچے دل سے اس پر ایمان لاتا ہے اور کون ہے جو ظاہر میں دلائل سے لاجواب ہو کر بھی حق کو قبول نہیں کرتا، خدا کے علم میں جس کا جو حال ہوگا اسی کے موافق معاملہ کرے گا۔

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿٢٠﴾

اور جن کو پکارتے ہیں اللہ کے سوا کچھ پیدا نہیں کرتے اور وہ خود پیدا کیے ہوئے ہیں ۱؎

ع ۲/۱۲ ۸ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿٢١﴾

مردے ہیں جن میں جان نہیں ۲؎ اور نہیں جانتے کب اٹھائے جائیں گے ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** اور جن کی یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے اور وہ خود ہی مخلوق ہیں (اور اوپر قاعدہ کلیہ ثابت ہو چکا ہے کہ خالق اور غیر خالق برابر نہیں، پس یہ باطل معبود عبادت کے مستحق کیسے ہو سکتے ہیں، اور وہ معبودین) مردے (بے جان) ہیں (خواہ ہمیشہ سے بے جان ہوں جیسے بت، یا اس وقت بے جان ہوں جیسے وہ لوگ جو مر چکے، یا آئندہ بے جان ہونے والے ہیں جیسے وہ معبود جو مریں گے مثلاً فرشتے، جن اور عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ) زندہ (رہنے والے) نہیں (پس خالق تو کیا ہوتے) اور ان (معبودین) کو (اتنی بھی) خبر نہیں کہ (قیامت میں) مردے کب اٹھائے جائیں گے (یعنی بعض کو تو علم ہی نہیں، اور بعض کو تعیین معلوم نہیں)۔

**اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ:** اس تقریر سے یہ معلوم ہو گیا کہ قادیانی جو اس آیت سے عیسیٰ علیہ السلام کے اس وقت زندہ ہونے پر استدلال کرتے ہیں غلط ہے، کیونکہ اس جگہ: غَيْرُ اَحْيَآءٍ کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس وقت زندہ نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ زندہ رہنے والے نہیں، ورنہ لازم آئے گا کہ فرشتے بھی اس وقت زندہ نہ ہوں، کیونکہ کفار عرب ان کو بھی معبود سمجھتے تھے اور یقیناً وہ بھی ان لوگوں میں داخل ہیں جن کی عبادت خدا کو چھوڑ کر کی جاتی ہے۔

**وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ:** یعنی بعض کو تو بالکل ہی علم نہیں جیسے بت، اور بعض کو وقت کی تعیین معلوم نہیں جیسے فرشتے اور عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ کہ ان کو قیامت کے آنے کا تو علم ہے مگر خاص وقت معلوم نہیں جیسا کہ بہت سی آیتوں میں اس کی صراحت ہے، اور معبود ہونے کے لیے ایسا علم ہونا چاہیے جو تمام باتوں کو احاطہ کیے ہوئے ہو، بالخصوص قیامت کا علم تو اس کو ضرور ہونا چاہیے جس میں عبادت کرنے یا نہ کرنے کی جزا و سزا دی جائے گی، پس یہ لوگ علم میں خدا کے برابر کیسے ہو سکتے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ خدا تو وہ ہے جس کے عظیم الشان اور غیر محصور انعامات کا اوپر تذکرہ ہوا، اب مشرکین کی حماقت ملاحظہ ہو کہ ایسے عالم الکل اور خالق الکل خدا کا شریک ان چیزوں کو ٹھہرا دیا جو ایک گھاس کا تنکا پیدا نہیں کر سکتیں، بلکہ خود ان کا وجود بھی خدا کا پیدا کیا ہوا ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی جن چیزوں کو خدا کے سوا پوجتے ہیں سب مردے (بے جان) ہیں، خواہ دواماً مثلاً بت، یا فی الحال مثلاً جو بزرگ مر چکے اور ان کی پوجا کی جاتی ہے یا انجام و مآل کے اعتبار سے مردہ ہیں، مثلاً حضرت مسیح، روح القدس اور ملائکۃ اللہ، جس کی بعض فرقے پرستش کرتے تھے بلکہ جن وشیطان بھی جن کو بعض ممسوخ الفطرت پوجتے ہیں سب پر ایک وقت موت طاری ہونے والی ہے، پس جس چیز کا وجود دوسرے کا عطا کیا ہوا ہو اور وہ جب چاہے چھین لے، اسے خدا کس طرح کہہ سکتے ہیں؟ یا عبادت کے لائق کیسے ہو سکتا ہے؟

**فائدہ:** ۳؎ یعنی یہ عجیب خدا ہیں جنہیں کچھ خبر نہیں کہ قیامت کب آئے گی اور وہ خود یا ان کے پرستار کب حساب و کتاب کے لیے اٹھائے جائیں گے، ایسی بے جان اور بے خبر ہستیوں کو خدا بتلانا انتہا درجہ کی حماقت اور جہل ہے۔

اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۲۲﴾

معبود تمہارا معبود ہے اکیلا، سو جن کو یقین نہیں آخرت کی زندگی کا ان کے دل نہیں مانتے اور وہ مغرور ہیں ۱

لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ﴿۲۳﴾

ٹھیک بات ہے کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے (جتلاتے) ہیں، بیشک وہ نہیں پسند کرتا غرور کرنے والوں کو ۲

**خلاصہ تفسیر:** (گذشتہ تقریر سے ثابت ہوا کہ) تمہارا معبود برحق ایک ہی معبود ہے، تو (حق واضح کردینے کے بعد بھی) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے (اور خدا سے ڈر کر توحید کو قبول نہیں کرتے تو معلوم ہوا کہ) ان کے دل (ہی میں قابلیت نہیں کہ معقول بات کے) منکر ہو رہے ہیں اور (قابلیت نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ) وہ قبول حق سے تکبر کرتے ہیں (اور) ضروری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کے حوال پوشیدہ وظاہر جانتے ہیں (اور یہ بھی) یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے (پس جب ان کا تکبر معلوم ہے تو ان کو بھی ناپسند کریں گے اور سزا دیں گے)۔

**قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ:** اس سے تکبر کی مذمت معلوم ہوتی ہے اور کفر و انکار کی اصل بنیاد یہی تکبر ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی جو دلائل و شواہد اوپر بیان ہوئے ایسے صاف اور واضح ہیں جس میں ادنیٰ غور کرنے سے انسان توحید کا یقین کر سکتا ہے لیکن غور و طلب تو وہ کرے جسے اپنی عاقبت کی فکر اور انجام کا ڈر ہو، جن کو بعد الموت کا یقین ہی نہیں نہ انجام کی طرف دھیان ہے وہ دلائل پر کب کان دھرتے اور ایمان و کفر کے نیک و بد انجام کی طرف کب التفات کرتے ہیں، پھر دلوں میں توحید کا اقرار اور پیغمبر کے سامنے تواضع سے گردن جھکانے کا خیال آئے تو کہاں سے آئے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی خوب سمجھ لو کبر و غرور کوئی اچھی اور پسندیدہ چیز نہیں، اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا، توحید کا انکار جو تم دلوں میں رکھتے ہو اور غرور و تکبر جس کا اظہار تمہاری چال ڈھال اور طور و طریق سے ہو رہا ہے، سب خدا کے علم میں ہے، وہ ہی ہر کھلے چھپے جرم کی سزا تم کو دے گا۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾ لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً

اور جب کہے ان سے کہ کیا اتارا ہے تمہارے رب نے، تو کہیں کہانیاں ہیں پہلوں کی ۱ تاکہ اٹھائیں بوجھ اپنے پورے

يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴿۲۵﴾ ع

دن قیامت کے، اور کچھ بوجھ ان کے جن کو بہکاتے ہیں بلا تحقیق، سنتا ہے برا بوجھ ہے جو اٹھاتے ہیں ۲

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے کفار و مشرکین کی گمراہی کا بیان تھا، اب آگے ان کے دوسروں کو گمراہ کرنے کا اور اس پر وعید کا بیان ہے کہ وہ نبوت اور قرآن کا انکار کر کے لوگوں کو گمراہی میں ڈالتے ہیں اور ان کے گناہ بھی اپنے سر پر لادتے ہیں۔

اور جب ان سے کہا جاتا ہے (یعنی کوئی ناواقف شخص تحقیق کے لئے، یا کوئی واقف شخص امتحان کے لئے ان سے پوچھتا ہے) کہ تمہارے رب نے کیا چیز نازل فرمائی ہے؟ (یعنی قرآن جس کو رسول ﷺ اللہ تعالیٰ کا نازل کیا ہوا بتلاتے ہیں کیا یہ صحیح ہے؟) تو کہتے ہیں کہ (صاحب وہ رب کا نازل کیا ہوا کہاں ہے) وہ تو محض بے سند باتیں ہیں جو پہلوں سے (منقول) چلی آرہی ہیں (یعنی پہلے سے سب مذہب والے توحید و نبوت اور قیامت کا دعویٰ کرتے آئے ہیں، انہی سے یہ بھی نقل کرنے لگے، باقی یہ باتیں خدا کی بتلائی ہوئی نہیں ہیں) نتیجہ اس (کہنے) کا یہ ہوگا کہ ان لوگوں کو قیامت کے

دن اپنے گناہوں کا پورا بوجھ اور جن کو یہ لوگ بے علمی سے گمراہ کر رہے تھے ان کے گناہوں کا بھی کچھ بوجھ اپنے اوپر اٹھانا پڑے گا، خوب یاد رکھو کہ جس گناہ کو یہ اپنے اوپر لاد رہے ہیں وہ برا بوجھ ہے۔

وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ: گمراہ کرنے سے مراد ان کا یہی کہنا: اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ کہ یہ محض بے سند باتیں ہیں جو پہلوں سے منقول چلی آرہی ہیں، کیونکہ اس سے دوسرے آدمی کا اعتقاد خراب ہو جاتا ہے، اور جو شخص کسی کو گمراہ کیا کرتا ہے اس گمراہ ہونے والے کو تو گمراہی کا گناہ ہوتا ہے، اور اس گمراہ کرنے والے کو اس کا گناہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کی گمراہی کا سبب بنا، اسی کو یہاں ''کچھ بوجھ'' سے تعبیر کیا گیا، اور اپنے گناہوں کو کامل طور پر اٹھانا تو ظاہر ہے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یعنی ناواقف اشخاص بغرض تحقیق یا واقف لوگ از راہ امتحان جب ان مکذبین سے کہتے ہیں یا وہ مکذبین خود آپس میں ایک دوسرے سے از راہ تمسخر واستہزاء سوال کرتے ہیں کہ: ''کہو تمہارے رب نے کیا چیز اتاری ہے''؟ مطلب یہ کہ قرآن جسے پیغمبر ﷺ خدا کا اتارا ہوا بتلاتے ہیں تمہارے نزدیک کیا چیز ہے اور محمد ﷺ اس دعوے میں کہاں تک سچے ہیں؟ تو کہتے ہیں کہ (معاذ اللہ) قرآن میں رکھا ہی کیا ہے۔ بجز اس کے کہ کتب سابقہ اور ملل سابقہ کی کچھ پرانی بے سند باتیں (توحید، نبوت، جنت و دوزخ وغیرہ) اور چند قصے کہانیاں نقل کر دی گئی ہیں۔

فائدہ: ۲۔ یعنی اس کہنے سے غرض یہ ہے کہ (معاذ اللہ) قرآن عزیز کو بے وقعت ٹھہرا کر اپنے ساتھ دوسروں کو گمراہ کریں اور اس طرح اپنے کفر وضلال کی پوری پوٹ کے ساتھ کچھ بوجھ ان لوگوں کے اضلال واغواء کا بھی سر پر رکھیں، جنہیں اپنی نادانی اور جہالت سے گمراہ کر رہے ہیں، خیال کرو کیسی بدی کی پوٹ سر پر رکھ رہے ہیں، حدیث میں ہے: ''وَمَنْ دَعَا اِلٰى ضَلَالَةٍ كَانَ عَلَيْهِ مِنَ الْاِثْمِ مِثْلُ اٰثَامِ مَنِ اتَّبَعَه، لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ اٰثَامِهِمْ شَيْئًا''، قال الله تعالىٰ: وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ (العنکبوت: ۱۳)

قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ

البتہ دغا بازی کر چکے ہیں جو تھے ان سے (اگلے) پہلے پھر پہنچا حکم اللہ کا ان کی عمارات پر بنیادوں سے پھر گر پڑی ان پر چھت

مِنْ فَوْقِهِمْ وَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ۞۲۶

اوپر سے اور آیا ان پر عذاب جہاں سے ان کو خبر نہ تھی

خلاصہ تفسیر: (اور انہوں نے جو گمراہ کرنے کی یہ تدبیر نکالی ہے کہ دوسروں کو ایسی باتیں کر کے بہکاتے ہیں، سو حق کے مقابلہ میں یہ تدبیریں نہ چلیں گی، بلکہ خود انہی پر ان کا وبال و نکال ٹوٹے گا، چنانچہ) جو لوگ ان سے پہلے ہو گذرے ہیں انہوں نے (انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ اور مخالفت میں) بڑی بڑی تدبیریں کیں، سو اللہ تعالیٰ نے ان (کی تدبیروں) کا بنا بنایا گھر جڑ بنیاد سے ڈھا دیا پھر (وہ ایسے ناکام ہوئے جیسے گویا) اوپر سے ان پر (اس گھر کی) چھت آپڑی (ہو، یعنی جس طرح چھت کے آپڑنے سے سب دب کر رہ جاتے ہیں اسی طرح وہ لوگ بالکل ناکام ہوئے) اور (علاوہ ناکامی کے) ان پر (خدا کا) عذاب ایسی طرح آیا کہ ان کو خیال بھی نہ تھا (کیونکہ اس تدبیر میں تو کامیابی کی توقع تھی، خلاف توقع ان پر ناکامی سے بڑھ کر عذاب آ گیا جو ان کے ذہن میں دور دور تک نہ تھا، چنانچہ پہلے کفار پر عذابوں کا آنا مشہور و معروف ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی لوگوں کو گمراہ کرنے اور پیغام حق کو پست کرنے کی جو تدبیریں آج کی جا رہی ہیں ان سے پہلے دوسری قومیں بھی انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں ایسی تدبیریں کر چکی ہیں، انہوں نے مکر و تلبیس کے بڑے اونچے محل کھڑے کر دیے، پھر جب خدا کا حکم پہنچا تو اس نے پکڑ کر بنیادیں ہلا دیں، آخر عذاب الٰہی کے ایک جھٹکا میں ان کے تیار کیے ہوئے محل ان ہی پر آپڑے جن کی چھتوں کے نیچے سب دب کر رہ گئے، مطلب یہ ہے

کہ ان کی تدبیریں خود ان ہی پر الٹ دی گئیں، اور جو سامان غلبہ وحفاظت کا کیا تھا وہ فنا و ہلاکت کا سبب بن گیا، بلکہ بعض اقوام کی بستیاں حسی طور پر بھی تہ وبالا کردی گئیں۔

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ

پھر قیامت کے دن رسوا کرے گا ان کو اور کہے گا کہاں ہیں میرے شریک جن پر تم کو بڑی ضد تھی ۱؎ بولیں گے جن کو

اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۷﴾ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ

دی گئی تھی خبر بیشک رسوائی آج کے دن اور برائی منکروں پر ہے ۲؎ جن کی جان نکالتے ہیں فرشتے

ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۪ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ

اور وہ برا کر رہے ہیں اپنے حق میں ۱؎ تب ظاہر کریں گے اطاعت کہ ہم تو کرتے نہ تھے کچھ برائی ۲؎ کیوں نہیں اللہ خوب جانتا ہے جو تم

تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۲۹﴾

کرتے تھے ۳؎ سو داخل ہو دروازوں میں دوزخ کے رہا کرو سدا اسی میں، سو کیا برا ٹھکانا ہے غرور کرنے والوں کا

**خلاصہ تفسیر:** (پیچھے مذکورہ حالت تو ان کی دنیا میں ہوئی) پھر قیامت کے دن (ان کے واسطے یہ ہوگا کہ) اللہ تعالیٰ ان کو رسوا کرے گا اور (اس میں سے ایک رسوائی یہ ہوگی کہ ان سے) یہ کہے گا کہ (تم نے جو) میرے شریک (بنا رکھے تھے) جن کے بارے میں تم (انبیاء اور اہل ایمان سے) لڑائی جھگڑا کرتے تھے (وہ اب) کہاں ہیں (اس حالت کو دیکھ کر حق کے) جاننے والے کہیں گے کہ آج پوری رسوائی اور عذاب کافروں پر ہے، جن کی جان فرشتوں نے حالت کفر پر قبض کی تھی (یعنی آخر وقت تک کافر رہے، شاید ان اہل علم کا قول بیچ میں اس لیے بیان فرمایا ہو کہ کفار کی رسوائی کا عام اور علانیہ ہونا معلوم ہوجائے) پھر کافر لوگ (اپنے شرکاء کے جواب میں) صلح کا پیغام ڈالیں گے (اور کہیں گے) کہ (شرک جو اعلیٰ درجہ کی برائی اور حق تعالیٰ کی مخالفت ہے ہماری کیا مجال تھی کہ ہم اس کے مرتکب ہوتے) ہم تو کوئی برا کام (جس میں حق تعالیٰ کی ادنیٰ مخالفت بھی ہو) نہ کرتے تھے (اس کو صلح کا مضمون اس لئے کہا گیا کہ دنیا میں تو وہ شرک وکفر اور انبیاء کی مخالفت کا بڑے جوش وخروش سے اقرار کرتے تھے جیسا کہ دوسری جگہ ہے: وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا، وہاں ان سب باتوں کا انکار کریں گے گویا کہ اب صلح پر آمادہ ہوئے، اور یہ انکار ایسا ہے جیسا کہ دوسری آیت میں ہے: وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ حق تعالیٰ ان کی اس بات کو رد فرمائیں گے کہ) کیوں نہیں! (بلکہ واقعی تم نے بڑے مخالفت کے کام کئے) بیشک اللہ کو تمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے۔

سو (اچھا) جہنم کے دروازوں میں (سے جہنم میں) داخل ہوجاؤ (اور) اس میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہو، غرض (حق سے) تکبر (اور مخالفت اور مقابلہ) کرنے والوں کا وہ برا ٹھکانا ہے (یہ عذاب آخرت کا ذکر ہوگیا، پس حاصل یہ ہوا کہ تم نے اپنے سے پہلے کافروں کا دنیا وآخرت کے خسارہ وعذاب کا حال سن لیا، اسی طرح جو تدبیر ومکر دین حق کے مقابلہ میں تم کر رہے ہو اور خلق کو گمراہ کرنا چاہتے ہو یہی انجام تمہارا ہوگا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ: یعنی جن شرکاء کی حمایت میں ہمارے پیغمبروں سے ہمیشہ لڑتے جھگڑتے تھے آج وہ کہاں ہیں، تمہاری مدد کو کیوں نہیں آتے: هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ (الشعرآء:۹۳) فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ (الطارق:۱۰) یہ کہنا ہی

ان کورسوا کرنا ہے، یا رسوائی سے مراد جہنم میں داخل کرنا اور ان کی خفیہ مکاریوں کا پردہ فاش کرنا ہے: اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ (آل عمران: ۱۹۲)

**فائدہ:** ۲ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ: یعنی وہ تو کیا جواب دے سکتے، البتہ انبیاء علیہم السلام اور دوسرے باخبر لوگ اس وقت ان مکار دغابازوں کو سنا کر کہیں گے کہ دیکھ لیا جو ہم کہا کرتے تھے، آج کے دن ساری برائی اور رسوائی صرف منکرین حق کے لیے ہے۔

**فائدہ:** ۳ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ: یعنی شرک و کفر اختیار کر کے اپنے حق میں برا کرتے رہے، آخر اسی حالت میں موت کے فرشتے جان نکالنے کو آ گئے، خلاصہ یہ کہ خاتمہ حالت کفر و شرک پر ہوا، العیاذ باللہ۔

**فائدہ:** ۴ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ: یعنی اس وقت ساری فوں فاں نکل جائے گی، جو شرارت و بغاوت دنیا میں کرتے تھے سب کا انکار کر کے اطاعت و وفاداری کا اظہار کریں گے کہ ہم نے کبھی کوئی بری حرکت نہیں کی ہمیشہ نیک چلن رہے: يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ (المجادلہ: ۱۸)

**فائدہ:** ۵ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: یعنی کیا جھوٹ بول کر خدا کو فریب دینا چاہتے ہو؟ جس کے علم میں تمہاری ساری حرکات ہیں آج تمہارا کوئی مکر اور جھوٹ خدائی سزا سے نہیں بچا سکتا، وقت آ گیا ہے کہ اپنی کرتوت کا مزہ چکھو۔

وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۭ قَالُوْا خَيْرًا ۭ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا

اور کہا پرہیزگاروں کو کیا اتارا تمہارے رب نے، بولے نیک بات، جنہوں نے بھلائی کی اس دنیا میں ان کو

حَسَنَةٌ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ۭ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ۝۳۰

بھلائی ہے ۱ اور آخرت کا گھر بہتر ہے، اور کیا خوب گھر ہے پرہیزگاروں کا ۲

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے قرآن و رسالت کے متعلق کفار کی گمراہ کن باتوں کا بیان تھا، اب اس کے مقابلہ میں ایمانداروں کی دینی و دنیوی فلاح و کامیابی اور ان کے دینی اور دنیوی مدارج اور مراتب کا بیان ہے۔

اور جو لوگ شرک سے بچتے ہیں ان سے (جو قرآن کے بارے میں) کہا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے کیا چیز نازل فرمائی ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ بڑی خیر (اور برکت کی چیز) نازل فرمائی ہے، جن لوگوں نے نیک کام کئے ہیں (جس میں ان کا یہ قول بھی داخل ہے اور دوسرے تمام اعمال صالحہ بھی) ان کے لئے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے (وہ بھلائی ثواب کا وعدہ و بشارت ہے) اور عالم آخرت تو (اس وجہ سے کہ وہاں اس وعدہ کا ظہور ہو جائے گا) اور زیادہ بہتر (اور موجب سرور) ہے، اور واقعی وہ شرک سے بچنے والوں کا اچھا گھر ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یہ مستکبرین کے مقابلہ میں متقین (پرہیزگاروں) کا حال بیان فرمایا کہ جب ان سے قرآن کے متعلق دریافت کیا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے کیا چیز اتاری تو نہایت عقیدت و ادب سے کہتے ہیں کہ "نیک بات جو سراپا خیر و برکت ہے" ایسے لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ جس نے بھلائی کی دنیا میں اسے بھلائی کا خوشگوار پھل مل کر رہے گا، خدا کے یہاں کسی کی محنت اور ذرہ برابر نیکی ضائع نہیں جاتی۔

**فائدہ:** ۲ یعنی آخرت کی بھلائیوں اور نعمتوں کا تو پوچھنا ہی کیا ہے، دنیا و مافیہا کی نعمتیں وہاں کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَاۗءُوْنَ ۭ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ

باغ میں ہمیشہ رہنے کے جن میں وہ جائیں گے بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں ان کے واسطے وہاں ہے جو چاہیں ۱ ایسا بدلہ دے گا اللہ

الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۱﴾ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ

پرہیزگاروں کو ۲؎ جن کی جان قبض کرتے ہیں فرشتے اور وہ ستھری ہیں ۱؎ کہتے ہیں فرشتے سلامتی تم پر، جاؤ بہشت میں ۲؎

بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۲﴾

بدلہ ہے اس کا جو تم کرتے تھے ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** وہ گھر (کیا ہے) ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں جن میں یہ داخل ہوں گے ان باغوں کے (درختوں اور عمارتوں کے) نیچے سے نہریں جاری ہوں گی جس چیز کو ان کا جی چاہے گا وہاں ان کو ملے گی (اور خاص انہی لوگوں کی کیا تخصیص ہے جن کا یہاں ذکر ہے بلکہ) اسی طرح کا عوض اللہ تعالیٰ سب شرک سے بچنے والوں کو دے گا، جن کی روح فرشتے اس حالت میں قبض کرتے ہیں کہ وہ (شرک سے) پاک (صاف) ہوتے ہیں (مطلب یہ کہ مرتے دم تک توحید پر قائم رہتے ہیں اور) وہ (فرشتے) کہتے جاتے ہیں السلام علیکم! تم (قبض روح کے بعد) جنت میں چلے جانا اپنے اعمال کے سبب۔

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے دنیا کی زندگی میں غیر نبی کے ساتھ بھی کلام کرتے ہیں، اور اس سے نیکیوں کے بعض ثمرات کا دنیا میں حاصل ہونا بھی معلوم ہوتا ہے۔

سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ: روح قبض ہونے کے بعد جنت میں جانا روحانی طور پر ہے، اور جسمانی طور پر جنت میں جانا قیامت میں ہوگا، اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ قیامت میں تم جنت میں چلے جانا، بہرصورت مقصود بشارت سنانا ہے کہ تم جنتی ہو۔

ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: یہاں اعمال کو جنت میں داخل ہونے کا سبب فرمایا یہ بطور عادت کے ہے، ورنہ حقیقی سبب تو خدا کی رحمت ہے جیسا کہ حدیث میں بھی آیا ہے، پس آیت میں اور حدیث میں کوئی تعارض نہیں، کیونکہ آیت میں اعمال کو ظاہر کے اعتبار سے سبب کہا گیا اور حدیث میں حقیقی سبب مراد ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ: یعنی جنتی جس قسم کی جسمانی راحت اور روحانی مسرت چاہیں گے وہاں حاصل ہوگی: **وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ** (الزخرف: ۷۱)

**فائدہ:** ۲؎ كَذٰلِكَ يَجْزِى اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ: یعنی ان تمام لوگوں کو جو کفر و شرک اور فسوق و عصیان سے پرہیز کرتے ہیں ایسا اچھا بدلہ ملے گا۔

**فائدہ:** ۱؎ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ: یعنی ان کی جانیں موت کے وقت تک کفر و شرک کی نجاست سے پاک اور فسق و فجور کے میل کچیل سے صاف رہیں، اور حق تعالیٰ کی صحیح معرفت و محبت کی وجہ سے نہایت خوشدلی اور انشراح بلکہ اشتیاق کے ساتھ اپنی جان جاں آفریں کے حوالہ کی۔

**فائدہ:** ۲؎ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ: ایک حیثیت سے روحانی طور پر تو انسان مرنے کے بعد ہی جنت یا دوزخ میں داخل ہو جاتا ہے، ہاں جسمانی حیثیت سے پوری طرح دخول حشر کے بعد ہوگا، ممکن ہے اس بشارت میں دونوں قسم کے دخول کی طرف اشارہ ہو۔

**فائدہ:** ۳؎ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: یعنی تمہارا عمل سبب عادی ہے دخول جنت کا، باقی سب حقیقی رحمت الٰہیہ ہے، جیسا کہ حدیث میں آیا: "اِلاَّ اَنْ يَّتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِرَحْمَتِهٖ".

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ

کیا کافر اب اس کے منتظر ہیں کہ آئیں ان پر فرشتے یا پہنچے حکم تیرے رب کا[1] اسی طرح کیا تھا ان سے اگلوں نے

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۳۳﴾

اور اللہ نے ظلم نہ کیا ان پر لیکن وہ خود اپنا برا کرتے رہے

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے مؤمنین کے ذکر سے پہلے مشرکین وکفار کی گمراہی کا بیان تھا، اس کے بعد مقابلہ کے طور پر ایمان والوں کا ذکر درمیان میں آ گیا تھا، اب پھر آگے کفار کی ہٹ دھرمی اور عناد وسرکشی پر وعید بیان فرماتے ہیں۔

یہ لوگ (جو اپنے کفر وعناد وجہالت پر جمے ہوئے ہیں اور حق واضح ہو جانے کے باوجود ایمان نہیں لاتے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف) اسی بات کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس (موت کے) فرشتے آ جائیں یا آپ کے پروردگار کا حکم (یعنی قیامت) آ جائے (یعنی یہ موت یا قیامت کے منتظر ہیں تو کیا اس وقت ایمان لائیں گے جبکہ ایمان قبول نہ ہوگا اگرچہ اُس وقت تمام کفار حقیقت ظاہر ہو جانے کی وجہ سے توبہ کریں گے، مگر سب بے سود ہوگا، اور جیسے کفر پر اصرار یہ لوگ کر رہے ہیں) ایسا ہی ان سے پہلے جو لوگ تھے انہوں نے بھی (کفر پر اصرار) کیا تھا اور (اس ہٹ دھرمی کی بدولت سزا یاب ہوئے، سو) ان پر اللہ تعالیٰ نے ذرا ظلم نہیں کیا لیکن وہ آپ ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے (کہ جان جان کر سزا کے کام کرتے تھے)۔

* * *

**فائدہ:** [1] جنت کی خوبیاں اور اس کا تفوق وامتیاز بیان فرمانے کے بعد ان غافلوں کو تنبیہ کی جاتی ہے جو محض دنیاوی سامانوں پر مست ہو کر آخرت کو بھلائے بیٹھے ہیں اور اپنا انجام سدھارنے کی کوئی فکر نہیں کرتے، یعنی کیا یہ لوگ اس کے منتظر ہیں کہ جس وقت فرشتے جان نکالنے کو آ جائیں گے یا خدا کے حکم کے موافق قیامت قائم ہو جائے گی، یا مجرموں کی سزا دہی کا حکم پہنچ جائے گا اور جوتا سر پر پڑنے لگے گا، تب ایمان لا کر اپنی حالت درست کریں گے، حالانکہ اس وقت کا ایمان یا توبہ ورجوع کچھ نافع نہ ہوگا، ضرورت تو اس کی ہے کہ موت سے پہلے بعد الموت کی تیاری کی جائے اور عذاب آنے سے پیشتر بچاؤ کی تدبیر کر لیں۔

ع ۴/۹/۱۰ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۴﴾

پھر پڑے ان کے سر ان کے برے کام اور کٹ پڑا ان پر جو ٹھٹھا کرتے تھے

**خلاصہ تفسیر:** آخر ان کے اعمال بد کی ان کو سزائیں ملیں اور جس عذاب (کی خبر پانے) پر وہ ہنستے تھے ان کو اسی (عذاب) نے آ گھیرا (پس ایسا ہی تمہارا حال ہوگا)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی اگلے معاندین بھی اسی طرح غرور وغفلت کے نشے میں پڑے رہے تھے، باطل پرستی میں تمادی ہوتی رہی، توبہ کے وقت توبہ نہ کی، اخیر تک انبیاء کی تکذیب ومخالفت پر تلے رہے اور ان کی باتوں کی ہنسی اڑاتے رہے، آخر جو کیا تھا سامنے آیا اور عذاب الٰہی وغیرہ کی جن خبروں سے ٹھٹھا کیا کرتے تھے وہ آنکھوں سے دیکھ لیں، ان کا استہزاء وتمسخر انہی پر الٹ پڑا، بھاگ کر جان بچانے کی کوئی سبیل نہ رہی اپنی شرارتوں کا خمیازہ بھگتنا پڑا، جو بویا تھا سو کاٹا، خدا کو ان سے کوئی بیر نہ تھا نہ اس کے یہاں ظلم وتعدی کا امکان ہے، ان لوگوں نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماری کسی کا کیا بگڑا انہی کا نقصان ہوا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا

اور بولے شرک کرنے والے اگر چاہتا اللہ نہ پوجتے ہم اس کے سوا کسی چیز کو اور نہ ہمارے باپ اور نہ حرام ٹھہرا لیتے ہم

مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۳۵﴾

بدون اس کے حکم کے کسی چیز کو لے اسی طرح کیا ان سے اگلوں نے، سو رسولوں کے ذمہ نہیں مگر پہنچا دینا صاف صاف ع

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے کفار کو ان کے کفر پر عذاب قیامت سے ڈرایا تھا، اس پر کفار کو دو شبہ تھے: ① ایک شبہ یہ کہ ہمارا یہ طریقہ جسے تم کفر کہتے ہو حق تعالی کے نزدیک ناپسندیدہ نہیں کہ اس کی وجہ سے ہم عذاب کے مستحق ہوں ② دوسرا شبہ یہ کہ خود قیامت ہی کوئی چیز نہیں کہ عذاب واقع ہو، اب ان شبہات کو جواب کے ساتھ بیان فرماتے ہیں، چونکہ ایسے شبہات محض عناد کی وجہ سے ہوتے تھے اور اس وجہ سے رسول ﷺ کو شدید غم ہوتا تھا، اس لیے درمیان میں تسلی کا مضمون بھی ہے، پہلے شبہ کا مکمل جواب سورہ اعراف آیت ۱۴۸: سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا میں گزر چکا ہے، چونکہ وہاں اس کی تفسیر کر دی گئی ہے اس لیے یہاں اجمالی جواب پر اکتفا کیا گیا۔

اور مشرک لوگ یوں کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالی کو (رضا کے طور پر یہ امر) منظور ہوتا (کہ ہم غیر اللہ کی عبادت نہ کریں جو ہمارے طریقہ کے اصول میں سے ہے اور بعض چیزوں کو حرام سمجھنا اس کی فروع میں سے ہے، مطلب یہ کہ اگر اللہ ہمارے موجودہ اصول وفروع کو ناپسند کرتے) تو خدا کے سوا کسی چیز کی نہ ہم عبادت کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا، اور نہ ہم اس کے بدون (حکم کے) کسی چیز کو حرام کہہ سکتے (اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالی کو ہمارا طریقہ پسند ہے، ورنہ ہم کو یہ کام کیوں کرنے دیتے؟ اے محمد ﷺ آپ ان سے مغموم نہ ہوں، کیونکہ یہ بیہودہ بحث کوئی نئی بات نہیں، بلکہ) جو (کافر) ان سے پہلے ہوئے ہیں ایسی ہی حرکت انہوں نے بھی کی تھی (یعنی بیہودہ بحث ومباحثے اپنے پیغمبروں سے کئے تھے) سو پیغمبروں (کا اس سے کیا بگڑا، اور وہ جس دین حق کی طرف بلاتے ہیں اس کو کیا نقصان پہنچا، ان) کے ذمہ تو (احکام کا) صرف صاف صاف پہنچا دینا ہے (صاف صاف یہ کہ دعوی واضح ہو اور اس پر صحیح دلیل قائم ہو، اسی طرح آپ کے ذمہ بھی یہی کام تھا جو آپ کر رہے ہیں، پھر اگر عناد کی وجہ سے کوئی دعوی اور دلیل میں غور نہ کریں تو آپ کی بلا سے)۔

لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ: اس کا ایک ظاہر جواب یہ ہے کہ اس دلیل سے تو یہ لازم آتا ہے کہ دنیا میں کوئی کام بھی برا نہ ہو، کیونکہ ہر شخص اپنے کام کی نسبت یہی کہہ سکتا ہے کہ اگر خدا کو یہ ناپسند ہوتا تو مجھے کیوں کرنے دیتا، اس سے معلوم ہوا کہ یہ کام خدا کو پسند ہے، حالانکہ دنیا میں بہت سے کام ایسے ہیں جن کو ہر شخص یقینا برا سمجھتا ہے جیسے چوری، زنا، ناحق خون کرنا اور ظلم کرنا وغیرہ وغیرہ، معلوم ہوا کہ یہ دلیل غلط ہے، اور کسی کا کوئی کام کر لینا خدا کی رضامندی کی دلیل نہیں ہو سکتی، کیونکہ خدا نے انسان کی آزمائش کے لیے اس کو اچھے برے دونوں طرح کے کاموں کی قدرت دی ہے کہ دیکھیں وہ اپنے اختیارات سے کیسے کام کرتا ہے، پس ہر کام کے اچھے یا برے ہونے کی دلیل خدا اور رسول کا حکم کرنا یا منع کرنا ہے۔

* * *

**فائدہ:** لے یہاں سے ان باطل اعذار اور لچر پوچ دلائل کا رد شروع کرتے ہیں جو مشرکین اپنے شرک اور اعمال شرکیہ کا جواز واستحسان ثابت کرنے کے لیے پیش کرتے تھے، خلاصہ یہ ہے کہ اگر غیر اللہ کی پرستش یا بعض جانوروں (مثلاً بحیرہ سائبہ وغیرہ) کو حرام ٹھہرا لینا برے اور بے سند کام ہوتے جنہیں خدا پسند نہ کرتا تو ہم کو کرنے کیوں دیتا، ضرور تھا کہ جب ہم اس کی مرضی کے خلاف کام کریں تو اس سے روک دے نہ رکیں تو فوراً سزا دے، اگر ایسا نہیں ہوا تو یہ دلیل ہے کہ خدا کو وہ کام ناپسند نہیں، آٹھویں پارہ کے دوسرے ربع آیت: سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَیْءٍ (الانعام: ۱۴۸) کی جو تقریر ہم نے کی ہے اس میں مشرکین کا یہ شبہ اور اس کا مفصل جواب بیان کیا گیا

ہے وہاں ملاحظہ کرلیا جائے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی مشرکین کا یہ کہنا غلط ہے کہ خدا کی طرف سے روکا نہیں گیا ابتدائے آفرینش سے آج تک حسب ضرورت مصلحت حق تعالی انبیاء کو بھیجتا رہا ہے جن کا کام ہی یہ تھا کہ لوگوں کو شرک و اعمالِ شرکیہ سے روکیں، اور صاف صاف اعلان کریں کہ خدا تعالیٰ کو کیا کام پسند ہیں کیا ناپسند، اور ان میں سے ہر ایک کا انجام کیا ہے، باقی یہ کہ لوگوں کو تکوینی طور پر مجبور کیوں نہ کر دیا گیا کہ وہ بدی کا راستہ اختیار ہی نہ کر سکتے تو یہ بات اس کی حکمت کے منافی تھی جیسا کہ ہم پہلے متعدد مواضع میں لکھ چکے ہیں، رہی یہ چیز کہ جو انبیاء کا کہنا نہ مانیں انھیں فوراً سزا دی جاتی تو بہت سی قوموں کو دنیا میں عبرتناک سزائیں بھی دی گئیں، جیسا کہ اگلی آیت میں مذکور ہے، ہاں عقلاً ونقلاً یہ ضروری نہیں کہ ارتکاب جرم کے ساتھ انہیں فوراً سزا دی جائے، مجرم کو ایک منٹ کی مہلت نہ ملے نہ اس کے لیے توبہ واصلاح کا کوئی موقع باقی چھوڑا جائے، حضرت شاہ صاحب ؒ لکھتے ہیں کہ: "یہ نادانوں کی باتیں ہیں کہ اللہ کو یہ کام برا لگتا تو کیوں کرنے دیتا"، (کیا ان کے روکنے سے خدا عاجز تھا؟) یہاں جواب مجمل فرمایا کہ ہمیشہ رسول منع کرتے آئے ہیں، جس کی قسمت میں ہدایت تھی اس نے پائی، جو خراب ہونا تھا خراب ہوا، اللہ کو یہی منظور ہے (کہ انسان کو فی الجملہ کسب واختیار کی قوت دے کر آزاد رکھے، اینٹ پتھر کی طرح مجبور یا حیوانات کی طرح اس کا دائرہ عمل محدود نہ کرے بلکہ ہر طرف بڑھنے اور ترقی کرنے کا موقع دے)۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ

اور ہم نے اٹھائے (بھیجے) ہیں ہر امت میں رسول ۱ کہ بندگی کرو اللہ کی اور بچو سرکشوں (جھوٹے معبودوں) سے ۲ پھر کسی کو ان میں سے

هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ۭ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ

ہدایت کی (راہ سجھائی) اللہ نے اور کسی پر ثابت ہوئی گمراہی، سو سفر کرو ملکوں میں پھر دیکھو کیسا ہوا

عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝۳۶

انجام جھٹلانے والوں کا

**خلاصہ تفسیر:** اور (جس طرح ان کا آپ سے مباحثہ کرنا کوئی نئی بات نہیں، اسی طرح آپ کا ان کو توحید و دین حق کی طرف بلانا بھی کوئی نئی بات نہیں، بلکہ اس کی تعلیم بھی ہمیشہ سے چلی آئی ہے، چنانچہ) ہم ہر امت میں (سابقہ امتوں میں) کوئی نہ کوئی پیغمبر (اس بات کی تعلیم کے لئے) بھیجتے رہے ہیں کہ تم (خاص) اللہ کی عبادت کرو اور شیطان (کے رستہ) سے (کہ وہ شرک وکفر ہے) بچتے رہو (اس میں حلال چیزوں کو حرام کرنا بھی داخل ہے جو مشرکین اپنی رائے سے کیا کرتے تھے، کیونکہ وہ بھی شرک وکفر کا ایک شعبہ ہے) سو ان میں بعض وہ ہوئے جن کو اللہ نے ہدایت دی (کہ انہوں نے حق کو قبول کرلیا) اور بعض ان میں وہ ہوئے جن پر گمراہی کا ثبوت ہوگیا (کہ وہ ناحق پر جمے رہے، مطلب یہ کہ کفار اور انبیاء علیہم السلام میں یہ معاملہ اسی طرح چلا آرہا ہے، کفار کا انبیاء سے بیہودہ مباحثے کرنا بھی ہمیشہ سے ہے، اور انبیاء کی تعلیم بھی ہمیشہ سے ہے اور سب کا ہدایت نہ پانا بھی ہمیشہ سے ہے، پھر آپ کیوں غم کرتے ہیں؟ یہاں تک تسلی فرمائی گئی جس میں اخیر کے مضمون میں ان کے شبہ کا اجمالی جواب بھی ہوگیا کہ ایسی باتیں کرنا گمراہی ہے آگے اس جواب کی تائید اور مزید وضاحت کے لیے فرماتے ہیں کہ اگر انبیاء کے ساتھ بحث وجدال کا گمراہی ہونا تم کو معلوم نہ ہو) تو (اچھا) زمین میں چلو پھرو، پھر (آثار سے) دیکھو کہ (پیغمبروں کے) جھٹلانے والوں کا کیسا (برا) انجام ہوا (پس اگر وہ گمراہ نہ تھے تو ان پر عذاب کیوں نازل ہوا؟ اور انہیں اتفاقی واقعات اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ وہ عادت کے خلاف عجیب طور سے ہوئے، اور انبیاء علیہم السلام کی پیشین گوئی کے بعد ہوئے، اور مؤمنین اس سے بچے رہے، پھر اس کے عذاب ہونے میں کیا شک ہے)۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا: اس آیت سے نیز دوسری آیت: وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ برصغیر والوں کے لیے بھی قدیم زمانہ میں کچھ رسول مبعوث ہوئے ہیں خواہ وہ ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے اور یہیں رہے ہوں، یا کسی اور ملک میں رہتے ہوں اور یہاں ان کے نائب تبلیغ کے لیے آئے ہوں، اگر یہ شبہ ہو کہ آیت: لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اٰتٰـهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں حضور ﷺ سے پہلے کوئی رسول نہیں آیا تو ان دونوں آیتوں میں تعارض ہوا، جواب یہ ہے کہ یا تو پہلی آیت میں ہر رسول بھیجنے سے مراد یہ ہے کہ اکثر امتوں میں بھیجے گئے اگرچہ بعض میں نہ بھیجے گئے ہوں اور اس لیے ہم نے ہندوستان میں رسول آنے کو یقین کے ساتھ بیان نہیں کیا، بلکہ یہ کہا ہے کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے، یا یہ کہ ہر امت اور ہر قوم کے لیے شروع میں ایک رسول آ گئے ہوں، کیونکہ ضرورت ایک سے بھی پوری ہو سکتی ہے، اگر وہ اس شریعت کا سلسلہ باقی رکھنا چاہتے تو ممکن تھا اور آخر میں رسول آنے کی ضرورت نہیں رہتی، پس ہر امت میں رسول بھیجنے کا مطلب یہ ہوگا کہ شروع میں رسول ضرور بھیجے گئے، اور حضور ﷺ سے پہلے عرب میں رسول نہ آنے کا مطلب یہ ہوگا کہ آخر میں کوئی رسول ان کے پاس نہیں آیا، اور اس صورت میں یہ بھی احتمال ہے کہ بعض پہاڑوں اور جزیروں میں تبلیغ نہ ہوئی ہو۔

اس شبہ کا ایک جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد بظاہر وہ قوم عرب ہے جو آپ کی بعثت و نبوت کی سب سے پہلے مخاطب ہوئی کہ ان میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد سے کوئی رسول نہیں آیا تھا، اسی لئے ان لوگوں کا لقب قرآن کریم میں اُمِّيِّيْنَ رکھا گیا ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ باقی دنیا میں بھی آپ سے پہلے کوئی رسول نہ آیا ہو، واللہ اعلم۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی اپنے اپنے وقت پر، پھر آخر میں پیغمبر عربی ﷺ کو رسول الثقلین بنا کر بھیجا۔

**تنبیہ:** اس آیت سے لازم نہیں آتا کہ ہر قوم اور بستی میں رسول بلا واسطہ بھیجا گیا ہو، ہو سکتا ہے کہ ایک نبی کسی قوم میں اٹھایا جائے اور اس کے نائب جنہیں "ہادی" و "نذیر" کہا جا سکتا ہے دوسری اقوام میں بھیجے جائیں، ان کا بھیجنا گویا بالواسطہ اسی پیغمبر کا بھیجنا ہے، واللہ اعلم۔

**فائدہ:** ۲ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: "سرکش وہ جو ناحق سرداری کا دعویٰ کرے کچھ سند نہ رکھے، ایسے کو "طاغوت" کہتے ہیں بت، شیطان اور زبردست ظالم سب اس میں داخل ہیں"۔

اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۳۷﴾

اگر تو طمع کرے ان کو راہ پر لانے کی تو اللہ راہ نہیں دیتا جس کو بچلاتا ہے اور کوئی نہیں ان کا مددگار

**خلاصہ تفسیر:** (چونکہ رسول کریم ﷺ کو امت کے کسی فرد کی گمراہی سے بھی سخت صدمہ پہنچتا تھا، اس لئے آگے آپ ﷺ کی زیادہ تسلی کے لیے فرماتے ہیں کہ جیسے پہلے بعض لوگ ایسے ہوئے ہیں کہ جن پر گمراہی ثابت ہو چکی تھی اسی طرح یہ لوگ بھی ہیں، سو) ان کے راہ راست پر آنے کی اگر آپ کو تمنا ہو تو (کچھ نتیجہ نہیں، کیونکہ) اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو ہدایت نہیں کیا کرتا جس کو (اس کے عناد کے سبب) گمراہ کرتا ہے (البتہ اگر وہ ہٹ دھرمی اور عناد کو چھوڑ دے تو ہدایت کر دیتا ہے، لیکن یہ عناد کو چھوڑیں گے نہیں، اس لئے ان کو ہدایت بھی نہ ہوگی) اور (اگر ان کو یہ گمان ہو کہ ہمارے معبود اس حالت میں بھی عذاب سے بچالیں گے تو وہ سمجھ لیں کہ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں) ان کا کوئی حمایتی نہ ہوگا۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جس کو قصورِ استعداد اور سوء اختیار کی بناء پر خدا گمراہ کرے اسے کوئی ہدایت نہیں کر سکتا نہ اسے خدائی سزا سے کوئی بچا سکتا ہے، آپ کا ان کی ہدایت پر حریص ہونا بھی کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتا، پھر آپ ان کے غم میں اپنے کو اس قدر کیوں گھلاتے ہیں۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ؕ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ

اور قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی سخت قسمیں کہ نہ اٹھائے گا اللہ جو کوئی مر جائے ۱ے کیوں نہیں (بیشک اٹھائے گا) وعدہ ہو چکا ہے اس پر پکا لیکن اکثر

النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ

لوگ نہیں جانتے ۲ے اٹھائے گا تاکہ ظاہر کر دے ان پر جس بات میں کہ جھگڑتے ہیں اور تاکہ معلوم کرلیں کافر کہ وہ

ع كَانُوْا كٰذِبِيْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۰﴾

جھوٹے تھے ۳ے ہمارا کہنا کسی چیز کو جب ہم اس کو کرنا چاہیں یہی ہے کہ کہیں اس کو ہو جا تو وہ ہو جائے ۴ے

**خلاصہ تفسیر:** یہاں تک ان کے پہلے شبہ کے جواب کی تقریر تھی، اب دوسرے شبہ کے متعلق کلام ہے:

اور یہ لوگ بڑے زور لگا لگا کر اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ جو مر جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو دوبارہ زندہ نہ کرے گا (اور قیامت نہ آئے گی، آگے جواب ہے) کیوں نہیں زندہ کرے گا (یعنی ضرور زندہ کرے گا) اس وعدہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لازم کر رکھا ہے لیکن اکثر لوگ (صحیح دلیل قائم ہونے کے باوجود اس پر) یقین نہیں لاتے (اور یہ دوبارہ زندہ کرنا اس لئے ہوگا) تاکہ (دین کے متعلق) جس چیز میں یہ لوگ (دنیا میں) اختلاف کیا کرتے تھے (اور انبیاء کے فیصلہ سے بھی دنیا میں راستہ پر نہ آتے تھے) ان کے روبرو اس (کی حقیقت) کا (بطور معائنہ کے) اظہار کر دے اور تاکہ (اس اظہار حقیقت کے وقت) کافر لوگ (پورا) یقین کرلیں کہ واقعی وہی جھوٹے تھے (اور انبیاء ومؤمنین سچے تھے، پس قیامت کا آنا یقینی اور عذاب سے فیصلہ ہونا ضروری ہے، یہ جواب ہو گیا ان کے اس قول: لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ کا کہ خدا مرنے والوں کو زندہ نہ کرے گا)۔

(اور چونکہ وہ لوگ قیامت کا انکار اس لئے کرتے تھے کہ مر کر زندہ ہونا ان کے خیال میں کسی کے بس میں نہ تھا، اس لئے اب اپنی قدرت کاملہ کو ثابت کر کے اس شبہ کو دور فرماتے ہیں کہ ہماری قدرت ایسی عظیم ہے کہ) ہم جس چیز کو (پیدا کرنا) چاہتے ہیں (ہمیں اس میں کچھ محنت مشقت کرنا نہیں پڑتی) بس اس سے ہمارا اتنا ہی کہنا (کافی) ہوتا ہے کہ تو (پیدا) ہو جا، بس وہ (موجود) ہو جاتی ہے (تو اتنی بڑی کامل قدرت والے کے سامنے بے جان چیزوں میں دوبارہ جان ڈال دینا کونسا دشوار ہے جیسے پہلی بار ان میں جان ڈال چکے ہیں، پس دونوں شبہوں کا جواب ہو گیا، وللہ الحمد)۔

كُنْ فَيَكُوْنُ: اس کے متعلق سورہ بقرہ آیت ۱۱۷: بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں تفسیر گزر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمایے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ے لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ: یعنی موت کے بعد دوسری زندگی ہی نہیں پھر عذاب کا کیا ڈر، سب ڈھکوسلے ہیں۔

**فائدہ:** ۲ے وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ: یعنی تمہارے انکار اور اٹکل پچو قسمیں کھانے سے خدا کا پکا وعدہ ٹل نہیں سکتا، وہ تو ہو کر رہے گا، البتہ تم ایسی حقائق ثابتہ کا انکار کر کے اپنے جہل کا ثبوت دے رہے ہو، جو شخص خدا کے علم محیط اور شؤن قدرت وحکمت، تکوین کے راز اور اس کی غرض وغایت سے آگاہ ہوگا وہ کبھی بعث بعد الموت کا انکار نہیں کر سکتا، سچ ہے: "الناس اعداء ماجھلوا"

**فائدہ:** ۳ے اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ: یعنی معاد (قیامت وغیرہ کا آنا) عین حکمت ہے، اگر موت کے بعد دوسری زندگی نہ ہو تو دنیا میں جو مختلف اعمال واحوال پائے جاتے ہیں ان کے صاف اور مکمل نتائج کیسے ظاہر ہوں گے، یہاں کے جھگڑوں کا دوٹوک فیصلہ تو وہیں ہوگا اور اس وقت منکرین معلوم کرلیں گے کہ قسمیں کھا کر جن باتوں کا انکار کرتے تھے وہ سچی تھیں، اور قسم کھانے والے جھوٹے تھے، حضرت شاہ صاحب ؒ لکھتے ہیں: "یعنی اس جہان میں بہت باتوں کا شبہ رہا اور کسی نے اللہ کو مانا کوئی منکر رہا تو دوسرا جہان ہونا لازم ہے کہ جھگڑے تحقیق ہوں، سچ اور جھوٹ جدا ہو اور مطیع ومنکر اپنا کیا پائیں"۔

**فائدہ:** ۳؎ كُنْ فَيَكُوْنُ: پھر مردوں کو دوبارہ زندہ کر دینا کیا مشکل ہے۔

**تنبیہ:** كُنْ فَيَكُوْنُ کی بحث پارہ الم رکوع وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ الخ میں ملاحظہ کر لی جائے غرض صرف اس قدر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارادے سے ایک سیکنڈ کے لیے بھی مراد کا تخلف نہیں ہوسکتا، ارادہ کے بعد مراد کا نہایت سہولت وسرعت سے فوراً واقع ہونا اور کسی مانع وعائق کا مزاحمت نہ کرسکنا یہی خلاصہ اس جملہ کا ہے۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ

اور جنہوں نے گھر چھوڑا اللہ کے واسطے بعد اس کے کہ ظلم اٹھایا البتہ ان کو ہم ٹھکانا دیں گے دنیا میں اچھا

وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۴۲﴾ وقف لازم

اور ثواب آخرت کا تو بہت بڑا ہے، اگر ان کو معلوم ہوتا ۱؎، جو ثابت قدم رہے اور اپنے رب پر بھروسہ کیا ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے منکرین آخرت کا ذکر تھا، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی تھی کہ آپ کفار کی گفتگو سے غمگین نہ ہوں، اب مسلمانوں کو تسلی دی جاتی ہے کہ تم کو جو کفار نے تکلیفیں دے کر وطن سے نکال دیا اس پر غم نہ کرنا، تمہارے لیے دونوں جہاں میں بشارت ہے، یہاں آیت میں ہجرت سے مراد حبشہ کی ہجرت ہے، مدینہ کی ہجرت مراد نہیں، کیونکہ یہ سورت مکی ہے، ہجرت مدینہ سے پہلے نازل ہوئی ہے، اس وقت کچھ مسلمانوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی۔

اور جن لوگوں نے اللہ کے واسطے اپنا وطن (مکہ) چھوڑ دیا (اور حبشہ چلے گئے) بعد اس کے کہ ان پر (کفار کی طرف سے) ظلم کیا گیا (کیونکہ ایسی مجبوری میں وطن چھوڑنا بڑا شاق گذرتا ہے) ہم ان کو دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانا دیں گے (یعنی ان کو مدینہ پہنچا کر خوب امن وراحت دیں گے) اور آخرت کا ثواب (اس سے) بدرجہا بڑا ہے (کہ بہتر بھی یہی ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والا بھی ہے) کاش (اس اجر آخرت کی) ان (بے خبر کافروں) کو (بھی) خبر ہوتی (اور اس کے حاصل کرنے کی رغبت سے مسلمان ہوجاتے) وہ (مہاجرین ان وعدوں کے اس لئے مستحق ہیں کہ وہ) ایسے ہیں جو (ناگوار واقعات پر) صبر کرتے ہیں (چنانچہ وطن کا چھوڑنا اگرچہ ان کو ناگوار ہے، مگر چونکہ اس کے بغیر دین پر عمل نہیں کر سکتے تھے اس لیے دین کے لئے وطن چھوڑا اور صبر کیا) اور (وہ ہر حال میں) اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں (وطن چھوڑنے کے وقت یہ خیال نہیں کرتے کہ کھائیں پئیں گے کہاں سے)۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ: گناہوں کو ترک کر دینے والے کو بھی ''مہاجر'' کہا جاتا ہے، جیسا کہ حدیث میں تارک منہیات کو ''مہاجر'' کہا گیا ہے تو اس آیت میں گناہوں سے بچنے والے کے لیے بھی حسنات دارین کی بشارت ہے۔

لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً: چنانچہ کچھ عرصہ بعد اللہ تعالیٰ نے ان میں سے اکثر لوگوں کو مدینہ پہنچا دیا اور اس کو وطن اصلی قرار دیا گیا، اس لئے اسے ٹھکانا کہا، اگرچہ بعض کا حبشہ ہی میں انتقال ہوگیا مگر اصل مطلب تو پریشانی کا دور کرنا ہے، سو یہ بات سب کو نصیب ہوگئی تھی، کیونکہ حبشہ میں بھی ان کو بہت راحت ملی، اور چونکہ مدینہ مہاجرین کا اصلی وطن قرار دیا گیا اس لیے اس کو ٹھکانا کہا اور وہاں ہر طرح کی ترقی ہوئی اس لیے اس کو اچھا ٹھکانہ کہا، اور حبشہ کا قیام عارضی تھا اس لیے اس کو ٹھکانا نہیں فرمایا۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی سلسلہ مجازات (طاعت ومعصیت کا پورا نتیجہ ظاہر کرنے) کے لیے بعث بعد الموت ضروری ہے، بہت سے خدا کے وفادار بندے مصائب وشدائد جھیلتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں، کیا ان کی قربانیاں ضائع کی جاسکتی ہیں؟ ہرگز نہیں جن لوگوں نے حق کی حمایت اور خدا

کی رضاجوئی کے لیے ظالموں کی سختیاں برداشت کیں اور انواع واقسام کے ظلم وستم اٹھائے حتی کہ مجبور ہو کر گھر بار، خویش واقارب اور عزت وراحت سب چیزوں کو خدا کے راستہ میں تج دیا، ان کی محنت و وفاداری کا صلہ یقیناً مل کر رہے گا، اول تو ان میں سے جو جیتے بچیں گے دنیا ہی میں اپنی قربانیوں کا تھوڑا سا پھل چکھ لیں گے، یعنی گھر چھوڑنے والوں کو بہترین ٹھکانہ دیا جائے گا، گھر سے اچھا گھر وطنی بھائیوں سے بڑھ کر دردمند بھائی، روزی سے بہتر روزی، عزت سے زیادہ عزت ملے گی، بلکہ وطن سے نکالنے والوں پر غالب، دنیا کے حاکم اور پرہیزگاروں کے امام بن جائیں گے، پھر اس سب کے بعد جو بلند مقامات اور عظیم الشان مدارج آخرت میں ملیں گے ان کا تو اندازہ بھی نہیں کیا جاسکتا، اگر وہاں کے اجر وثواب کا پورا یقین ہو جائے تو دوسرے لوگ بھی جو ہجرت کی سعادت سے محروم ہیں تمام گھر بار چھوڑ کر خدا کے راستہ میں نکل کھڑے ہوں۔

**تنبیه:** آیت کے عموم الفاظ پر نظر کرتے ہوئے ہم نے یہ تقریر کی ہے (وهو منقول فی روح المعانی عن بعضهم) عامہ مفسرین نے اس کو ان اسی صحابہ رضی اللہ عنہم کے حق میں رکھا ہے جو کفار مکہ کی زیادتیوں سے تنگ آ کر ابتداءً احبشہ کو ہجرت کر گئے تھے، کیونکہ اکثر کے نزدیک آیت مکی ہے جو ہجرت الی المدینہ سے پہلے نازل ہوئی ہے، ان ہجرت کرنے والوں کو آخر کار خدا تعالیٰ نے اچھا ٹھکانہ مدینہ میں دیا، رَضِیَ اللهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ۔

**فائدہ:** ۲ یعنی کسی ظلم اور سختی سے نہیں گھبرائے، وطن محبوب اور خویش واقارب کے چھوٹنے کی پروانہ کی، رضائے الٰہی کے راستہ میں ذرا قدم نہیں ڈگمگایا، ہر طرف سے ٹوٹ کر ایک خدا کے ہو رہے، خالص اسی کی امداد اور اٹل وعدوں پر بھروسہ کیا، یہاں تک کہ دیکھ لیا کہ جو خدا کا ہو رہتا ہے کس طرح خدا اس کا ہو جاتا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۳﴾

اور تجھ سے پہلے بھی ہم نے یہی مرد بھیجے تھے کہ حکم بھیجتے تھے ہم ان کی طرف سو پوچھو یاد رکھنے والوں سے اگر تم کو معلوم نہیں ۱

بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ؕ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ

بھیجا تھا ان کو نشانیاں دے کر اور ورقے (اوراق) ۲ اور اتاری ہم نے تجھ پر یہ یادداشت کہ تو کھول دے لوگوں کے سامنے

النصف

مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۴﴾

وہ چیز جو اتری ان کے واسطے ۳ تاکہ وہ غور (دھیان) کریں ۴

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے کفار کے بعض کفریہ شبہات کا جواب تھا، اب رسالت کے متعلق ان کے ایک کفریہ شبہ کا جواب دیا جاتا ہے۔

اور (یہ منکر لوگ جو آپ کی رسالت ونبوت کا اس بناء پر انکار کر رہے ہیں کہ آپ بشر یعنی آدمی ہیں اور نبی ورسول ان کے نزدیک کوئی انسان و بشر نہیں ہونا چاہئے، یہ ان کا جاہلانہ خیال ہے، کیونکہ) ہم نے آپ سے پہلے بھی صرف آدمی ہی رسول بنا کر معجزات اور کتابیں دے کر بھیجے ہیں کہ ان پر وحی بھیجا کرتے تھے (تو اے مکہ والو منکرین) اگر تم کو علم نہیں تو دوسرے اہل علم سے پوچھ دیکھو (جن کو انبیاء سابقین کے حالات کا علم ہو اور وہ تمہارے خیال میں مسلمانوں کی طرفداری بھی نہ کریں، اور اسی طرح آپ کو بھی رسول بنا کر) آپ پر بھی یہ قرآن اتارا ہے تاکہ جو ہدایات (آپ کے واسطے سے) لوگوں کے پاس بھیجی گئی ہیں وہ ہدایات آپ ان کو واضح کر کے سمجھا دیں اور تاکہ وہ ان میں غور وفکر کیا کریں (یعنی آپ اپنا کام کریں اور وہ اپنا کام کریں تاکہ ہدایت ہو، غرض یہ کہ جب آپ کی رسالت بھی قدیم سنت کے مطابق ہے تو پھر انکار کی کیا وجہ اور نبوت وبشریت میں تضاد ہونے کی کیا دلیل ہے)۔

**فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ:** اگر کوئی یہ کہے کہ مسئلہ رسالت میں تو مشرکین اہل کتاب کے بھی مخالف تھے پھر ان کا قول مشرکین پر کیسے حجت

ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ یہ امر نقل سے تعلق رکھتی ہے، اس میں مذہبی حیثیت سے قطع نظر کر کے تواتر کی وجہ سے اہل کتاب کا قول مشرکین پر حجت ہوگا اور تواتر میں راوی کا معتبر ہونا شرط نہیں، پس اہل کتاب کا غیر معتبر ہونا اس حجت کے لیے مضر نہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ: یعنی پیغمبر کے مظلوم ساتھیوں کو جب وہ صبر و توکل کی راہ میں ثابت قدم ہوں، دارین میں غالب و منصور کرنا ہماری کوئی نئی عادت نہیں، پہلے بھی ہم نے انسانوں میں سے رسول بھیجے جن کا کام یہ تھا کہ خدا کے احکام اور نیکی بدی کے انجام سے لوگوں کو خبردار کر دیں، اب اگر تمہیں معلوم نہیں تو جاننے والوں سے جو امم سابقہ اور ان کے پیغمبروں کے تاریخی واقعات کا علم رکھتے ہیں تحقیق کر لو کہ فی الواقع پہلے کچھ آدمی پیغمبری کے منصب پر بینات وزبر (معجزے اور کتابیں) دے کر بھیجے گئے یا نہیں، اور یہ کہ ان کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کا کیا حشر ہوا، اہل حق صبر و توکل کی بدولت کس طرح منصور و کامیاب ہوئے، اور ظالم معاندین اتمام حجت کے بعد کیسے تباہ کیے گئے: وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ (الاعراف: ۷ ۱۳۷) ہم نے اہل الذکر سے خاص اہل کتاب مراد نہیں لیے بلکہ عموم لفظ کی رعایت کی ہے جس میں اہل کتاب بھی شامل ہیں، روح المعانی میں ہے: " قَالَ الرُّمَّانِيُّ وَالزَّجَّاجُ وَالْاَزْهَرِيُّ اَلْمُرَادُ بِاَهْلِ الذِّكْرِ عُلَمَاءُ اَخْبَارِ الْاُمَمِ السَّالِفَةِ كَائِناً مَنْ كَانَ فَالذِّكْرُ بِمَعْنَى الْحِفْظِ"، مترجم محقق رحمۃ اللہ نے بھی اھل الذ کر کا ترجمہ "یاد رکھنے والوں" سے کر کے شاید اسی طرف اشارہ کیا ہے، بہر حال عموم آیت سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ غیر اہل علم کو اہل الذکر سے دریافت کر کے عمل کرنا چاہیے، بہت سے علماء اس کو تقلید ائمہ کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں، واللہ اعلم۔

**فائدہ:** ۲؎ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ: یعنی معجزات اور وہ علوم جو اوراق میں لکھے جاتے ہیں۔

**فائدہ:** ۳؎ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ: "یادداشت" سے مراد ہے قرآن کریم جو اگلی امتوں کے ضروری احوال و شرائع کا محافظ، انبیائے سابقین کے علوم کا جامع، اور ہمیشہ کے لیے خدائی احکام اور فلاح دارین کے طریقوں کو یاد دلانے والا اور خواب غفلت سے بیدار کرنے والا ہے، مطلب یہ ہوا کہ جس طرح پہلے رسول بھیجے گئے، کتابیں اتاری گئیں، آج تم کو (اے محمد ﷺ) ہم نے ایسی کتاب دے کر بھیجا جو تمام کتب سابقہ کا خلاصہ اور انبیائے سابقین کے علوم کی مکمل یادداشت ہے، آپ کا کام یہ ہے کہ تمام دنیا کے لوگوں کے لیے اس کتاب کے مضامین خوب کھول کر بیان فرمائیں اور اس کی مشکلات کی شرح اور مجملات کی تفصیل کر دیں، اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کا مطلب وہ ہی معتبر ہے جو احادیث رسول اللہ ﷺ کے موافق ہو۔

**فائدہ:** ۴؎ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ: یعنی حضور ﷺ کا کام مضامین قرآن کو کھول کر بیان کرنا اور لوگوں کا کام اس میں غور و فکر کرنا۔

اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ

سو کیا نڈر ہو گئے وہ لوگ جو برے فریب (داؤ) کرتے ہیں اس سے کہ دھنسا دیوے اللہ ان کو زمین میں یا آ پہنچے ان پر عذاب

مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۴۵﴾ اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۴۶﴾

جہاں سے خبر نہ رکھتے ہوں ۱؎ یا پکڑ لے ان کو چلتے پھرتے سو وہ نہیں ہیں عاجز کرنے والے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** چند آیات قبل کفار کو عذاب آخرت سے ڈرایا گیا تھا، اب دنیاوی عذاب سے ڈراتے ہیں۔

جو لوگ (دین حق کے باطل کرنے کو) بری بری تدبیریں کرتے ہیں (کہ کہیں اس میں شبہات و اعتراض نکال کر اور حق کا انکار کر کے خود گمراہ ہوتے ہیں جو کہ ضلال ہے، کہیں دوسروں کو حق سے روک کر گمراہ کرتے ہیں جو کہ اضلال ہے) کیا ایسے لوگ (یہ کفر کی کارروائیاں کر کے) پھر بھی اس بات سے بے فکر (بیٹھے ہوئے) ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو (ان کے کفر کے وبال میں) زمین میں غرق کر دے، یا ان پر ایسے موقع سے عذاب آ پڑے جہاں ان کو گمان بھی نہ ہو (جیسے جنگ بدر میں ایسے بے سروسامان مسلمانوں کے ہاتھ سے ان کو سزا ملی کہ کبھی انہیں اس کا عقلی احتمال بھی نہ ہوتا کہ یہ

مسلمان،ہم پر غالب آسکیں گے) یاان کو چلتے پھرتے (کسی آفت میں) پکڑ لے (جیسے کوئی مرض ہی اچانک آکھڑا ہو) سو (اگر ان امور میں سے کوئی امر ہوجائے تو) یہ لوگ خدا کو ہرا (بھی) نہیں سکتے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی اگلے انبیاء اور ان کی قوموں کا حال سننے اور قرآن ایسی مکمل یادداشت پہنچ جانے کے بعد بھی کیا کفار مکہ حق کے مقابلہ میں اپنی مکاریوں اور داؤ فریب سے باز نہیں آتے، کیا یہ امکان نہیں کہ خدا انھیں قارون کی طرح زمین میں دھنسا دے، یا ایسی طرف سے کوئی آفت بھیج دی جدھر سے انھیں وہم و گمان بھی نہ ہو، چنانچہ بدر میں مسلمان غازیوں کے ہاتھوں سے ایسی سزا دلوائی جو اپنی قوت و جمعیت اور مسلمانوں کے ضعف و قلت کو دیکھتے ہوئے ان کے تصور میں بھی نہ آسکتی تھی۔

**فائدہ:** ۲ یعنی یہ بھی ضروری نہیں کہ پہلے سے کچھ اہتمام کیا جائے یا فوجیں مقابلہ کے لیے روانہ کی جائیں، خدا تو اس پر بھی قادر ہے کہ تمہیں چلتے پھرتے کام کاج کرتے یا بستروں پر کروٹیں بدلتے ہوئے ایک دم پکڑ لے اور بالکل عاجز و بے بس کر دے، اس کو سب قدرت ہے وہ تم کو عاجز کرسکتا ہے تم اسے نہیں تھکا سکتے۔

## اَوۡ يَاۡخُذَهُمۡ عَلٰى تَخَوُّفٍ ؕ فَاِنَّ رَبَّكُمۡ لَرَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۴۷﴾

یا پکڑ لے ان کو ڈرانے کے بعد (ڈرا کر ڈرانے کو) ۱ سو تمہارا رب بڑا نرم ہے مہربان ۲

**خلاصہ تفسیر:** یا ان کو گھٹاتے گھٹاتے پکڑے (جیسے قحط اور وباء پڑے جس سے آہستہ آہستہ خاتمہ ہوجائے، یعنی نڈر نہیں ہونا چاہئے، خدا کو سب قدرت ہے مگر مہلت جو دی رکھی ہے) سو (اس کی وجہ یہ ہے کہ) تمہارا رب شفیق مہربان بڑا ہے (اس لئے مہلت دی ہے کہ اب بھی سمجھ جاؤ اور فلاح اور نجات کا طریق اختیار کرلو)۔

آفت کی مختلف اقسام ہیں:

۲ غیبی آفت جو غیر معمولی ہو اور وہ کبھی کبھی آیا کرتی ہے، اَنۡ يَّخۡسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الۡاَرۡضَ میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

۱ وہ آفت جو انسان کے واسطے سے ہو، اَوۡ يَاۡتِيَهُمُ الۡعَذَابُ مِنۡ حَيۡثُ میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

۳ وہ غیبی آفت جو معمولی ہو اور خاص شخص کی حالت کے اعتبار سے ہو، اَوۡ يَاۡخُذَهُمۡ فِىۡ تَقَلُّبِهِمۡ میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

۴ وہ غیبی آفت جو معمولی ہو اور عام حالت کے اعتبار سے ہو، اَوۡ يَاۡخُذَهُمۡ عَلٰى تَخَوُّفٍ میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی اچانک نہ پکڑے، بلکہ آگاہ کرنے اور مبادئ عذاب بھیجنے کے بعد ایسی حالت میں پکڑ لے جب کہ لوگ اطلاع پا کر اور آثار عذاب دیکھ کر طبعاً خوف کھا رہے ہوں یا آس پاس کے لوگوں کو آفات سماویہ میں مبتلا دیکھ کر ڈر رہے ہوں لیکن یہ خوف محض طبعی ہو، ندامت اور توبہ کے ساتھ نہ ہو جو دافع عذاب ہوسکتا ہے، بعض نے تخوف کے معنی "تنقص" (آہستہ آہستہ کم کرنے) کے لیے ہیں، یعنی یہ بھی ممکن ہے کہ دفعتاً ہلاک نہ کرے آہستہ آہستہ تم کو گھٹائے اور پست کرتا رہے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی خدا سب کچھ کرسکتا ہے مگر کیوں نہیں کرتا، اس کی نرمی اور مہربانی مانع ہے کہ مجرمین پر فوراً عذاب نازل کر دے، اس کی رافت و رحمت مقتضی ہے کہ مجرمین کو مہلت اور اصلاح کا مواقع دیا جائے یا یہ جملہ صرف: يَاۡخُذَهُمۡ عَلٰى تَخَوُّفٍ سے متعلق ہے، بحالیکہ تخوف کو بمعنی "تنقص" لیا جائے، تو مطلب یہ ہوگا کہ آہستہ آہستہ کم کرنا اور دفعۃً ہلاک نہ کرنا اس کی رحمت و شفقت کی وجہ سے ہے، ورنہ ایک آن میں نیست و نابود کر دیتا۔

اَوَلَمۡ يَرَوۡا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنۡ شَىۡءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الۡيَمِيۡنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ

کیانہیں دیکھتے وہ جو کہ اللہ نے پیدا کی ہے کوئی چیز کہ ڈھلتے ہیں سائے ان کے داہنی طرف سے اور بائیں طرف سے سجدہ کرتے ہوئے اللہ کو

وَهُمۡ دٰخِرُوۡنَ ﴿۴۸﴾

اور وہ عاجزی میں ہیں (کرتے ہیں)

**خلاصہ تفسیر**: شروع سورت سے دور تک توحید کا مضمون تھا، اب پھر اسی کو بیان کرتے ہیں۔

کیا (ان) لوگوں نے اللہ کی ان پیدا کی ہوئی چیزوں کو نہیں دیکھا (اور دیکھ کر توحید پر استدلال نہیں کیا) جن کے سائے کبھی ایک طرف کو کبھی دوسری طرف کو اس طور پر جھکتے جاتے ہیں کہ (بالکل) خدا کے (حکم کے) تابع ہیں (یعنی سائے کے اسباب جو کہ سورج کا نورانی ہونا اور سایہ دار جسم کا کثیف ہونا، اور سایہ کی حرکت کا سبب آفتاب کی حرکت ہے اور پھر سایہ کے خواص یہ سب خدا کے حکم سے ہے) اور وہ (سایہ دار) چیزیں بھی (اللہ کے رو برو) عاجز (اور تابع حکم) ہیں۔

* * *

**فائدہ**: یعنی جب تکوینی طور پر ہر چیز خدا کے سامنے عاجز اور مطیع ومنقاد ہے، حتی کہ سایہ دار چیزوں کا سایہ بھی اسی کے حکم اور قانون قدرت کے موافق گھٹتا بڑھتا اور ادھر یا ادھر رہتا ہے پھر ایسے قدرت والے خدا کو عذاب بھیجنے سے کون سی طاقت روک سکتی ہے، آدمی کو چاہیے کہ باختیار خود اس کے احکام تشریعیہ کے سامنے گردن جھکا دے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''ہر چیز ٹھیک دوپہر میں کھڑی ہے اس کا سایہ بھی کھڑا ہے، جب دن ڈھلا، سایہ جھکا، پھر جھکتے جھکتے شام تک زمین پر پڑ گیا، جیسے نماز میں کھڑے سے رکوع، رکوع سے سجدہ اسی طرح ہر چیز آپ کھڑی ہے اپنے سایہ سے نماز کرتی ہے، کسی ملک میں کسی موسم میں داہنی طرف جھکتا ہے کہیں بائیں طرف''۔

وَلِلّٰهِ يَسۡجُدُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ مِنۡ دَآبَّةٍ وَّالۡمَلٰٓئِكَةُ وَهُمۡ لَا يَسۡتَكۡبِرُوۡنَ ﴿۴۹﴾

اور اللہ کو سجدہ کرتا ہے جو آسمان میں ہے اور جو زمین میں ہے جانداروں سے اور فرشتے اور وہ تکبر نہیں کرتے [1]

السجدۃ ۳　يَخَافُوۡنَ رَبَّهُمۡ مِّنۡ فَوۡقِهِمۡ وَيَفۡعَلُوۡنَ مَا يُؤۡمَرُوۡنَ ﴿۵۰﴾ السجدة　ع

ڈر رکھتے ہیں اپنے رب کا اپنے اوپر سے اور کرتے ہیں جو حکم پاتے ہیں [2]

**خلاصہ تفسیر**: اور (جس طرح سایہ وغیرہ جو کہ اپنے ارادہ سے حرکت نہیں کرتے خدا کے حکم کے تابع ہیں اسی طرح) اللہ ہی کے مطیع (حکم ہیں) جتنی چیزیں (ارادہ سے حرکت کرتی ہیں) چلنے والی آسمانوں میں (جیسے فرشتے) اور زمین میں (جیسے حیوانات) موجود ہیں اور (بالخصوص) فرشتے (بھی) اور وہ (فرشتے علو مکان اور رفعت شان کے باوجود اطاعت خداوندی سے) تکبر نہیں کرتے (اور اسی لئے بالخصوص ان کا ذکر کیا گیا باوجودیکہ وہ مافی السموت میں داخل تھے) وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں جو کہ ان پر بالا دست ہے اور ان کو جو کچھ (خدا کی طرف سے) حکم کیا جاتا ہے وہ اس کو کرتے ہیں۔

* * *

**فائدہ**: [1] پہلے کھڑی چیزوں کا جو سایہ دار ہوں سجدہ بیان ہوا تھا، یہاں عام جانداروں بالخصوص فرشتوں کا سجدہ بیان کر کے متنبہ فرمایا کہ ایسی مقرب ومعظم ہستیاں بھی اس کے آگے سربسجود ہیں کوئی شیخی یا غرور ان میں نہیں، جو اپنے مالک کے سامنے سر جھکانے سے رکے، حضرت شاہ

صاحب" لکھتے ہیں: "مغرور لوگوں کو سر رکھنا زمین پر مشکل ہوتا ہے، نہیں جانتے کہ بندہ کی بڑائی اسی میں ہے" مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ۔

**فائدہ:** ۲ یعنی فرشتے باوجود اس قدر قرب و وجاہت کے اپنے رب کے جلال سے ڈرتے رہتے ہیں اور جو حکم پاتے ہیں فوراً بجالاتے ہیں ،موضح القرآن میں ہے کہ: "ہر بندہ کے دل میں ہے کہ میرے اوپر اللہ ہے اپنے آپ کو نیچے سمجھتا ہے، یہ سجدہ فرشتوں کا بھی ہے اور سب کا"۔

## وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰـهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۵۱﴾

اور کہا ہے اللہ نے مت پکڑو معبود دو، وہ معبود ایک ہی ہے، سو مجھ سے ڈرو

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے توحید کا اثبات تھا، اب شرک کا باطل ہونا بیان کیا جاتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے (تمام مکلفین کو انبیاء و رسل کے واسطہ سے) فرمایا ہے کہ دو (یا زیادہ) معبود مت بناؤ، پس ایک معبود ہی ہے (اور جب یہ بات ہے) تو تم لوگ خاص مجھ ہی سے ڈرا کرو (کیونکہ جب معبود ہونے کی صفت میرے ساتھ خاص ہے تو کمال قدرت وغیرہ جو اس کے لوازم ہیں وہ بھی میرے ہی ساتھ خاص ہوں گے تو سزا و عذاب کا خوف مجھ ہی سے ہونا چاہئے اور شرک سے عذاب ہوتا ہے، پس شرک نہیں کرنا چاہئے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جب تمام آسمانی و زمینی مخلوق ایک خدا کے سامنے بے اختیار سربسجود اور عاجز و مقہور ہے، پھر عبادت میں کوئی دوسرا شریک کہاں سے آ گیا، جو سارے جہان کا مالک و مطاع ہے تنہا اسی کی عبادت ہونی چاہیے اور اسی سے ڈرنا چاہیے۔

## وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ۭ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ﴿۵۲﴾

اور اسی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور اسی کی عبادت ہے ہمیشہ، سو کیا سوائے اللہ کے کسی سے ڈرتے ہو

**خلاصہ تفسیر:** اور اسی کی (ملک) ہیں سب چیزیں جو کچھ کہ آسمانوں میں اور زمین میں ہیں، اور لازمی طور پر اطاعت بجالانا اسی کا حق ہے (یعنی وہی اس بات کا مستحق ہے کہ سب اس کی اطاعت بجالائیں جب یہ بات ثابت ہے) تو کیا پھر بھی اللہ کے سوا اوروں سے ڈرتے ہو (اور ان سے ڈر کر ان کو پوجتے ہو)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی تکوینی طور پر ہر چیز خالص اسی کی عبادت اور اطاعت پر مجبول ہے: اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (آل عمران: ۸۳) یا یہ مطلب ہے کہ ہمیشہ اسی کی عبادت کرنا لازم ہے: اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ (الزمر: ۳) اور بعض نے "دین" کو "جزاء" کے معنی میں لیا ہے، یعنی نیک و بد کا دائمی بدلہ اسی ایک خدا کی طرف سے ملے گا۔ واللہ اعلم۔

## وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور جو کچھ تمہارے پاس ہے نعمت سو اللہ کی طرف سے پھر جب پہنچتی ہے تم کو سختی تو اسی کی طرف چلاتے ہو (اسی سے فریاد کرتے ہو)

**خلاصہ تفسیر:** اور (جیسا ڈرنے کے قابل سوائے خدا کے کوئی نہیں ایسا ہی نعمت دینے والا اور امید کے قابل بجز خدا کے کوئی نہیں، چنانچہ) تمہارے پاس جو کچھ (کسی قسم کی) بھی نعمت ہے وہ سب اللہ ہی کی طرف سے ہے پھر جب تم کو (ذرا) تکلیف پہنچتی ہے تو (اس کے دور ہونے کے لئے) اسی (اللہ) سے فریاد کرتے ہو (اور کوئی بت وغیرہ اس وقت یاد نہیں آتا جس سے توحید کا حق ہونا اس وقت تمہاری حالت کے اقرار سے بھی معلوم ہوجاتا ہے)۔

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ: اس سے ایک مسئلہ تصوف کی اصل نکلتی ہے جسے "مسئلہ مظہریت" کہا جاتا ہے، یعنی اگرچہ بعض نعمتیں

اسباب ومخلوقات سے ملتی ہیں تاہم ساری نعمتوں کو اللہ نے اپنی طرف منسوب کر کے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ نعمتوں کے سارے اسباب اور واسطے اللہ ہی کے عطا کردہ ہیں، یہ اشیاء تو صرف ذرائع اور وسائل ہیں۔

* * *

**فائدہ:** یعنی سب بھلائیاں اور نعمتیں اسی کی طرف سے ہیں اور ہر ایک برائی یا سختی کا دفع کرنا بھی اسی کے قبضہ میں ہے، چنانچہ جب کوئی سخت مصیبت انسان کو چھو جاتی ہے تو کٹر سے کٹر مشرک بھی اس وقت سب سہارے چھوڑ کر خدا کو پکارنے لگتا ہے، گویا فطرت انسانی شہادت دیتی ہے کہ مصائب اور سختیوں سے بچانا خدائے واحد کے سوا کسی کا کام نہیں ہوسکتا، پھر جس کے قبضہ میں ہر ایک نعمت ونقمت اور ہر قسم کا نفع وضرر ہے، دوسرا کون ہے جو اس کی الوہیت میں حصہ دار بن سکے، یا جس سے انسان خوف کھائے اور امیدیں باندھے۔

ثُمَّ إِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنكُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنكُم بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ ﴿٥٤﴾

پھر جب کھول دیتا ہے سختی تم سے اسی وقت ایک فرقہ تم میں سے اپنے رب کے ساتھ لگتا ہے شریک بتانے

لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ ۚ فَتَمَتَّعُوا ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿٥٥﴾

تاکہ منکر ہو جائیں اس چیز سے جو کہ ہم نے ان کو دی ہے، سو مزے اڑا لو، آخر معلوم کر لو گے

**خلاصہ تفسیر:** (لیکن) پھر جب (اللہ تعالیٰ) تم سے اس تکلیف کو ہٹا دیتا ہے تو تم میں ایک جماعت (اور وہی بڑی جماعت ہے) اپنے رب کے ساتھ (بدستور سابق) شرک کرنے لگتی ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہماری دی ہوئی نعمت کی (کہ وہ تکلیف کا دور کرنا ہے) ناشکری کرتے ہیں (جو کہ عقلاً بھی قبیح ہے) خیر چند روزہ عیش اڑا لو (دیکھو) اب جلدی (مرتے ہی) تم کو خبر ہوئی جاتی ہے ("ایک جماعت" اس لئے کہا گیا کہ بعض اس حالت کو یاد رکھ کر توحید وایمان پر قائم ہو جاتے ہیں جیسا کہ دوسری آیت میں ہے: فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جہاں سختی دور ہوئی منعم حقیقی کو بھلا بیٹھے اور نہایت بے حیائی سے خدائی کے حصے بخرے کرنے لگے، شرم نہ آئی کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے عاجز ہو کر کسے پکار رہے تھے، نہ محسن حقیقی کا احسان مانا نہ یہ اندیشہ کیا کہ ناشکری کی سزا میں پکڑے جائیں گے، یا کم از کم کفران نعمت سلب نعمت کا موجب ہو جائے گا، گویا خدائے وحدہ لاشریک لہ نے جو انعام فرمایا تھا بالکل اس کے انکار پر تل گئے، بہتر ہے چند روز کی انھیں مہلت دی جاتی ہے، خوب دنیا کے مزے اڑا لیں آخر معلوم ہو جائے گا کہ اس مشرکانہ کفران نعمت کی کیسی سزا ملتی ہے۔

وَيَجْعَلُونَ لِمَا لَا يَعْلَمُونَ نَصِيبًا مِّمَّا رَزَقْنَاهُمْ ۗ تَاللَّهِ لَتُسْأَلُنَّ عَمَّا كُنتُمْ تَفْتَرُونَ ﴿٥٦﴾

اور ٹھہراتے ہیں ان کیلئے جنکی خبر نہیں رکھتے (جنکو خبر نہیں) ایک حصہ ہماری دی ہوئی روزی میں سے [1] قسم اللہ کی تم سے پوچھنا ہے جو تم بہتان باندھتے ہو [2]

**خلاصہ تفسیر:** اور (من جملہ ان کے شرک کے ایک یہ ہے کہ) یہ لوگ ہماری دی ہوئی چیزوں میں ان (معبودوں) کا حصہ لگاتے ہیں جن کے (معبود ہونے کے) متعلق ان کو کچھ علم (اور ان کے معبود ہونے کی کوئی دلیل وسند) نہیں (جیسا اس کی تفصیل سورہ انعام آیت ۱۳۶: وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ الخ میں گذری ہے) قسم ہے خدا کی! تم سے تمہاری ان افتراء پردازیوں کی (قیامت میں) ضرور باز پرس ہوگی۔

* * *

**فائدہ:** [1] یہ ان کو فرمایا جو اپنے کھیت میں، مویشی میں، تجارت میں اللہ کے سوا کسی دوسرے کی نیاز ٹھہراتے ہیں (موضح القرآن) جیسا کہ مشرکین عرب کا دستور تھا جس کا ذکر آٹھویں پارہ کے تیسرے رکوع میں گزر چکا، مالا یعلمون سے مراد وہی اصنام وغیرہ ہیں جنہیں مشرکین جہالت

اور بے خبری سے معبود یا مالک نفع وضرر سمجھتے تھے، حالانکہ اس کی کوئی دلیل یا سند ان کے پاس نہ تھی، پھر شرکاء بھی تجویز کیے گئے پتھر کے بت جو ہر قسم کے علم وشعور سے کورے ہیں اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ۔

**فائدہ:** ٢ یعنی قیامت میں ان افتراء پردازیوں کی تم سے ضرور باز پرس ہوگی، خدا کے دیے ہوئے مال میں کیا حق تھا کہ دوسروں کو شریک وسہیم بناؤ، (باقی کسی کو ثواب پہنچانے کا مسئلہ جداگانہ ہے وہ اس آیت کے تحت میں داخل نہیں)۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿٥٧﴾

اور ٹھہراتے ہیں اللہ کے لیے بیٹیاں وہ اس سے پاک ہے (اس لائق نہیں) ١ اور اپنے لیے جو دل چاہتا ہے ٢

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿٥٨﴾

اور جب خوشخبری ملے ان میں کسی کو بیٹی کی سارے دن رہے منہ اس کا سیاہ اور جی میں گھٹتا رہے ٣

**خلاصہ تفسیر:** اور (ایک شرک ان کا یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ کے لئے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں سبحان اللہ! (کیسی مہمل بات ہے) اور (اس پر یہ طرہ کہ) اپنے لئے چاہتی چیز (یعنی بیٹے پسند کرتے ہیں) اور جب ان میں کسی کو بیٹی (پیدا ہونے) کی خبر دی جائے (جسے اللہ کے لئے تجویز کرتے ہیں) تو (اس قدر ناراض ہو کہ) سارے دن اس کا چہرہ بے رونق رہے اور وہ دل ہی دل میں گھٹتا رہے۔

* * *

**فائدہ:** ١ یعنی وہ اس سے پاک ہے کہ اس کے لیے اولاد ثابت کی جائے، خاص کر بیٹیاں، تعجب ہے یہ لوگ حق تعالیٰ کی نسبت ایسی جرأت کس طرح کرتے ہیں، اس آیت میں "بنوخزاعہ" کا رد ہوا جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے (العیاذ باللہ)

**فائدہ:** ٢ یعنی خود اپنے لیے بیٹیاں دیے جانے پر رضامند نہیں جب مانگیں گے بیٹا مانگیں گے۔

**فائدہ:** ٣ یعنی ان میں سے کسی کو اگر خبر دی جائے کہ تیرے گھر میں لڑکی پیدا ہوئی ہے تو نفرت وغم سے تیوری چڑھ جائے اور دن بھر ناخوشی سے چہرہ بے رونق اور دل گھٹتا رہے کہ یہ ناشدنی مصیبت کہاں سے سر پر آئی۔

يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ؕ

چھپتا پھرے لوگوں سے مارے برائی اس خوشخبری کے جو سنی ١ اس کو رہنے دے ذلت قبول کر کے یا اس کو داب دے مٹی میں ٢

اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿٥٩﴾

سنتا ہے برا فیصلہ کرتے ہیں ٣

**خلاصہ تفسیر:** (اور) جس چیز کی اس کو خبر دی گئی ہے (یعنی بیٹی کی پیدائش) اس کی عار سے لوگوں سے چھپا چھپا پھرے (اور دل میں ادھیڑ بن کرے کہ) آیا اس (نومولود) کو ذلت (کی حالت) پر لئے رہے یا اس کو (زندہ یا مار کر) مٹی میں گاڑ دے، خوب سن لو ان کی یہ تجویز بہت بری ہے (کہ اول تو خدا کے لئے اولاد ثابت کرنا یہی کس قدر بری بات ہے، پھر اولاد بھی وہ جسے خود اس قدر ذلیل اور موجب عار سمجھیں)۔

* * *

**فائدہ:** ١ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ: یعنی رسمی ننگ و عار کے تصور سے کہ لڑکی زندہ رہی تو کسی کو داماد بنانا پڑے گا، لوگوں کو منہ دکھانا نہیں چاہتا ادھر ادھر چھپتا پھرتا ہے۔

**فائدہ:** ۲ **اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ:** یعنی شب و روز ادھیڑ بن میں لگا ہوا ہے اور تجویزیں سوچتا ہے کہ دنیا کی عار قبول کر کے لڑکی کو زندہ رہنے دے یا زمین میں اتار دے، یعنی ہلاک کر ڈالے، جیسا کہ جاہلیت میں بہت سے سنگدل لڑکیوں کو مار ڈالتے تھے یا زندہ زمین میں گاڑ دیتے تھے، اسلام نے آ کر اس قبیح رسم کو مٹایا اور ایسا قلع قمع کیا کہ اسلام کے بعد سارے ملک میں اس بے رحمی کی ایک مثال بھی پیش نہیں کی جا سکتی، بعض نے اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ کے معنی یوں کیے ہیں: ''روکے رکھے لڑکی کو ذلیل و خوار کر کے''، یعنی زندہ رہنے کی صورت میں ایسا ذلیل معاملہ کرے گویا وہ اس کی اولاد ہی نہیں بلکہ آدمی بھی نہیں۔

**فائدہ:** ۳ **اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ:** لڑکیوں کے متعلق جو ظالمانہ فیصلہ ان کا تھا اس سے زیادہ برا فیصلہ یہ ہے کہ خدا کے لیے اولاد تجویز کریں، پھر اولاد بھی ''اناث''، جس سے خود اتنا گھبراتے ہیں، گویا اچھی چیز ان کے لیے اور ناقص خدا کے لیے ہے۔ (العیاذ باللہ)

لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۰﴾

جو نہیں مانتے آخرت کو ان کی بری مثال ہے، اور اللہ کی مثال (شان) سب سے اوپر ۱ اور وہی ہے زبردست حکمت والا ۲

**خلاصہ تفسیر:** (پس) جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے ان کی بری حالت ہے (دنیا میں بھی کہ ایسی جہالت میں مبتلا ہیں اور آخرت میں اس لیے کہ وہ عذاب اور ذلت میں مبتلا ہوں گے) اور اللہ تعالیٰ کے لئے تو بڑے اعلیٰ درجہ کے صفات ثابت ہیں (نہ کہ وہ صفات جو یہ مشرکین بکتے ہیں) اور وہ بڑے زبردست ہیں (اگر ان کو دنیا میں شرک کی سزا دینا چاہیں تو کچھ مشکل نہیں، لیکن ساتھ ہی) بڑی حکمت والے (بھی ہیں، حکمت کی وجہ سے موت کے بعد تک سزا کو مؤخر فرما دیا ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی مشرکین جنہیں اپنے ظلم اور گستاخیوں کے انجام پر یقین نہیں، بری مثال یا بری صفت و حالت ان ہی کی ہے وہ ہی اولاد کے محتاج ہیں، دکھ اور ضعیفی وغیرہ میں کام آنے کے لیے ان کو لڑکوں کا سہارا چاہیے، دفع عار یا افلاس وغیرہ کے ڈر سے لڑکیوں کو ہلاک کرنا ان کا شیوہ ہے، آخر میں ظلم و شرک وغیرہ کا جو برا انجام ہونا چاہیے اس سے بھی وہ بچ نہیں سکتے، غرض ہر نہج سے بری مثال اور نقص و عیب کی نسبت ان ہی کی طرف ہونی چاہیے، حق تعالیٰ کی طرف ان صفات کی نسبت کرنا جو مخلوق کا خاصہ ہیں اور (معاذ اللہ) بیٹے بیٹیاں تجویز کر کے حقیر اور پست مثالیں دینا اس کی شان عظیم و رفیع کے منافی ہے، اس کے لیے تو وہ ہی مثالیں اور صفات ثابت کی جا سکتی ہیں جو اعلیٰ سے اعلیٰ اور ہر بلند چیز سے بلند تر ہوں۔

**فائدہ:** ۲ یعنی زبردست تو ایسا ہے کہ تمہاری گستاخیوں کی سزا ہاتھوں ہاتھ دے سکتا ہے، لیکن فوراً سزا دینا اس کی حکمت کے مناسب نہیں، لہذا ڈھیل دی جاتی ہے کہ اب بھی باز آ جائیں اور اپنا رویہ درست کر لیں۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ

اور اگر پکڑے اللہ لوگوں کو ان کی بے انصافی پر نہ چھوڑے زمین پر ایک چلنے والا لیکن ڈھیل رہتا ہے ان کو ایک وقت موعود تک

فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۶۱﴾

پھر جب آ پہنچے گا ان کا وعدہ نہ پیچھے سرک سکیں گے ایک گھڑی اور نہ آگے سرک سکیں گے

**خلاصہ تفسیر:** گزشتہ آیات میں شرک کا رد مذکور تھا، اب ان آیات میں یہ بتلاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بڑے حلیم و کریم ہیں باوجود شرک جیسے بڑے جرم کے مؤاخذہ اور گرفت میں جلدی نہیں کرتے، بلکہ حلم کی وجہ سے مجرمین کو مہلت دیتے ہیں۔

اور اگر اللہ تعالیٰ (ظالم) لوگوں پر ان کے ظلم (یعنی شرک و کفر) کے سبب (فی الفور دنیا میں پوری) دار و گیر (پکڑ) فرماتے تو سطح زمین پر

کوئی (حس) وحرکت کرنے والا نہ چھوڑتے (بلکہ سب کو ہلاک کر دیتے) لیکن (فی الفور پکڑ نہیں فرماتے، بلکہ) ایک میعاد معین تک مہلت دے رہے ہیں (تاکہ اگر کوئی توبہ کرنا چاہے تو گنجائش ہو) پھر جب ان کا (وہ) وقت معین (نزدیک) آ پہنچے گا اس وقت ایک ساعت نہ (اس سے) پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے (بلکہ فوراً سزا ہو جائے گی)۔

**مَّا تَرَكَ عَلَيۡهَا مِن دَآبَّةٖ:** ظالموں کو تو ان کے ظلم کی وجہ سے ہلاک کیا جاتا، اور جو ظالم نہیں ان کو اس لیے کہ حق تعالیٰ کی حکمت اس عالم میں ''اکثر اوقات'' کے اعتبار سے مسلمان و کافر، نیک و بد دونوں کو آباد کرنے کو مقتضی ہے، ورنہ زمین پر نیک آدمیوں کی آبادی بغیر ظالموں کے ایسی ہوتی جیسی فرشتوں کی آبادی آسمان پر ہے، پھر زمین کی آبادی کو جدا کیوں جاتا، اور اس مضمون کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں ارشاد ہے: "لو لم تذنبوا لذهب الله بكم" الخ، یعنی: "لو لم يكن فيكم مذنبون" مطلب یہ کہ اگر تم میں گناہ گار نہ ہوں تو حق تعالیٰ تم کو ہلاک کر کے دوسری قوم کو پیدا کر دیں گے، اس لیے دنیا میں نیک بھی نہ رہتے اور چونکہ حیوانات انسان ہی کے نفع کے لیے پیدا کیے گئے ہیں جب یہ نہ ہوتے وہ بھی نہ ہوتے اور یہاں ''اکثر اوقات'' کی قید اس لیے لگائی کہ بعض اوقات میں دنیا میں صرف نیک بندے ہی رہیں گے جیسے عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں۔

* * *

**فائدہ:** یعنی اگر خدا تعالیٰ لوگوں کی گستاخی اور ناانصافی پر دنیا میں فوراً پکڑنا اور سزا دینا شروع کر دے تو چند گھنٹے بھی زمین کی یہ آبادی نہیں رہ سکتی، کیونکہ دنیا میں بڑا حصہ ظالموں اور بدکاروں کا ہے، اور چھوٹی چھوٹی خطا و قصور سے تو کوئی خالی ہوگا؟ (كُلُّكُمْ خَطَّاءُوْنَ) جب خاطی و بدکار فوراً ہلاک کر دیے گئے تو صرف معصوم انبیاء کے زمین پر بھیجنے کی بھی ضرورت نہیں رہتی، بلکہ ان کا ملائکہ معصومین کے ساتھ رہنا موزوں ہے، جب نیک و بد انسان دونوں زمین پر نہ رہے تو دوسرے حیوانات کا رکھنا بے فائدہ ہوگا، کیونکہ وہ سب بنی آدم کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، نیز فرض کیجیے خدا نے انسانوں کے ظلم وعدوان پر بارش بند کر دی تو کیا آدمیوں کے ساتھ جانور نہیں مریں گے، بہرحال خدا اگر بات بات پر دنیا میں پکڑے اور فوراً سزا دے تو اس دنیا کا سارا قصہ منٹوں میں تمام ہو جائے، مگر وہ اپنے حلم وحکمت سے ایسا نہیں کرتا، بلکہ مجرموں کو توبہ واصلاح کا موقع دیتا ہے اور وقت موعود تک انھیں ڈھیلا چھوڑتا ہے، جب وقت آ پہنچا، پھر ایک سیکنڈ اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتا۔

**تنبیہ:** بعض مفسرین نے مَّا تَرَكَ عَلَيۡهَا مِن دَآبَّةٖ سے خاص ''دابہ ظالمہ'' مراد لیا ہے، اگر یہ صحیح ہو تو مطلب واضح ہے کوئی اشکال نہیں، واللہ اعلم۔

وَيَجۡعَلُونَ لِلَّهِ مَا يَكۡرَهُونَۚ وَتَصِفُ أَلۡسِنَتُهُمُ ٱلۡكَذِبَ أَنَّ لَهُمُ ٱلۡحُسۡنَىٰۖ

اور کرتے (ٹھہراتے) ہیں اللہ کے واسطے جس کو اپنا جی نہ چاہے [1] اور بیان کرتی ہیں زبانیں ان کی جھوٹ کہ ان کے واسطے خوبی ہے [2]

لَا جَرَمَ أَنَّ لَهُمُ ٱلنَّارَ وَأَنَّهُم مُّفۡرَطُونَ ﴿٦٢﴾

آپ ثابت (محقق ہو گیا) ہے کہ ان کے واسطے آگ ہے اور وہ بڑھائے جا رہے ہیں [3]

**خلاصہ تفسیر:** اب پھر شرک اور مشرکین کی مذمت بیان کی جاتی ہے، جس سے زیادہ مقصود اس بات کی مذمت ہے کہ وہ لوگ شرک کے باوجود اپنی نجات کا دعویٰ کرتے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کے لئے وہ امور تجویز کرتے ہیں جن کو خود (اپنے لئے) ناپسند کرتے ہیں (جیسا اوپر آیا ہے: وَيَجۡعَلُونَ لِلَّهِ ٱلۡبَنَٰتِ) اور (پھر) اس پر اپنی زبان سے جھوٹے دعوے کرتے جاتے ہیں کہ ان کے (یعنی ہمارے) لئے (قیامت واقع ہونے کی صورت میں) ہر طرح کی بھلائی ہے (اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بھلائی کہاں سے آئی تھی، بلکہ) لازمی بات ہے کہ ان کے لئے (قیامت کے دن) دوزخ ہے اور بیشک وہ لوگ (دوزخ میں) سب سے پہلے بھیجے جائیں گے۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ: بظاہر یہاں تکرار کا شبہ ہوتا ہے، کیونکہ پیچھے: وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ گزر چکا اور یہاں: وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ فرمایا اور بظاہر يَكْرَهُوْنَ کا مصداق بیٹیاں معلوم ہوتی ہیں، اس کے دو جواب ہیں: ایک یہ کہ پیچھے خاص عنوان تھا، اور یہاں عام عنوان ہے، چنانچہ اپنی ریاست میں کسی اور کی شرکت کا ناپسند ہونا بھی اس میں داخل ہے یعنی اپنی ریاست میں کسی اور کی شرکت ناگوار سمجھتے ہو اور خدا تعالیٰ کے لیے شرکت کو گوارا کر لیتے ہو، سو تکرار نہ رہا، دوسرا یہ کہ یہاں زیادہ مقصود: وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ کا رد کرنا ہے کہ ایسی تو باتیں کرتے ہیں اور پھر اپنے لیے قیامت میں بھلائی کی امید بھی رکھتے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ: یعنی جو چیزیں بری سمجھ کر اپنے لیے پسند نہیں کرتے مثلاً بیٹیاں یا اپنے ملک میں کسی اجنبی کی شرکت یا استہزاء واستخفاف کا معاملہ، وہ خداوند قدوس کے لیے ثابت کرتے ہیں۔

**فائدہ:** ۲ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى: یعنی باوجود ایسی گستاخیوں کے زبان پر یہ جھوٹا دعویٰ ہے کہ ہم تو دنیا میں بھی بھلی چیزوں کے لائق ہیں اور اگر آخرت وغیرہ کے قصے سچے ہوئے تو وہاں بھی خوب چین اڑائیں گے: وَلَىِٕنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآىِٕمَةً وَّلَىِٕنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى (فصلت: ۵۰)

**فائدہ:** ۳ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ: یعنی ان گستاخیوں کے ساتھ ایسی باطل آرزوئیں رکھنا ہی اس کی دلیل ہے کہ ان کے لیے کوئی خوبی اور بھلائی تو کیا ہوتی، البتہ دوزخ تیار ہے جس کی طرف وہ بڑھائے جا رہے ہیں اور جہاں پہنچ کر گویا بالکل بھلا دیے جائیں گے، یعنی ابدالآباد تک کبھی مہربانی کی نظر ان پر نہ ہوگی، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ یہ ان کو فرمایا جو ناکارہ چیزیں اللہ کے نام دیں اور اس پر یقین کریں کہ ہم کو بہشت ملے گی، حالانکہ وہ روز بروز دوزخ کی طرف بڑھتے ہیں۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ

قسم اللہ کی ہم نے رسول بھیجے مختلف فرقوں میں تجھ سے پہلے پھر اچھے کر کے دکھلائے ان کو شیطان نے ان کے کام سو وہی رفیق ان کا ہے آج

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾

اور ان کے واسطے عذاب دردناک ہے

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے کفار کی جہالت وکفریات کا ذکر تھا، چونکہ رسول اللہ ﷺ کو ان سے صدمہ پہنچتا تھا، اس لیے اب آپ کو تسلی دی جاتی ہے اور اس کے ضمن میں رسالت کا اثبات اور قرآن کی حقانیت بھی ہے۔

(اے محمد ﷺ! آپ ان کے کفر وجہالت پر کچھ غم نہ کیجئے، کیونکہ) بخدا! آپ (کے زمانہ) سے پہلے جو امتیں ہو گذری ہیں ان کے پاس بھی ہم نے رسولوں کو بھیجا تھا (جیسا کہ آپ کو ان کے پاس بھیجا ہے) سو (جس طرح یہ لوگ اپنی کفریات کو پسند کرتے ہیں اور اس پر قائم ہیں اسی طرح) ان کو شیطان نے ان کے اعمال (کفریہ) مستحسن کر کے دکھلائے، پس وہ (شیطان) آج (یعنی دنیا میں) ان کا رفیق ہے (یعنی رفیق تھا کہ ان کو بہکاتا سکھاتا تھا، پس دنیا میں تو ان کو یہ خسارہ ہوا) اور (پھر قیامت میں) ان کے واسطے دردناک سزا (مقرر) ہے (غرض یہ بعد والے کافر بھی ان پچھلوں کی طرح کفر کر رہے ہیں اور انہی کی طرح ان کو بھی سزا ہوگی، آپ ان کی جہالت وکفر پر کچھ غم نہ کیجیے)۔

* * *

**فائدہ:** کفار مکہ کی گستاخیوں اور لغو وبیہودہ دعاوی کا ذکر کر کے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تسلی دیتے ہیں کہ آپ ان کی حرکتوں سے دلگیر اور رنجیدہ نہ ہوں، ہم نے آپ سے پہلے بھی مختلف امتوں کی طرف پیغمبر بھیجے ہیں لیکن ہمیشہ یہ ہی ہوا کہ شیطان لعین مکذبین کو ان کے عمل اچھے کر کے دکھاتا

رہا، اور وہ برابر شرارت میں بڑھتے رہے، آج وہ سب خدائی عذاب کے نیچے ہیں، اور شیطان جوان کا رفیق ہے کچھ کام نہیں آتا، نہ ان کی فریاد کو پہنچ سکتا ہے، یہی انجام آپ کے مکذبین کا ہوگا، بعض نے فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ کا یہ مطلب لیا ہے کہ شیطان جس نے اگلوں کو بہکایا تھا وہی آج ان کفار مکہ کا رفیق بنا ہوا ہے، لہذا جو حشر ان کا ہوا ان کا بھی ہوگا۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ

اور ہم نے اتاری تجھ پر کتاب اسی واسطے کہ کھول کر سنا دے تو ان کو وہ چیز کہ جس میں جھگڑ رہے ہیں ۱ؔ

وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۶۴﴾

اور سیدھی راہ سجھانے کو اور واسطے بخشش (رحمت ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے) ایمان لانے والوں کے ۲ؔ

**خلاصہ تفسیر:** اور ہم نے آپ پر یہ کتاب (جس کا نام قرآن ہے اس واسطے نازل نہیں کی کہ سب کا ہدایت پر لانا آپ کے ذمہ ہو تا حتی کہ بعض کے ہدایت پر نہ آنے سے آپ مغموم ہوں، بلکہ) صرف اس واسطے نازل کی ہے کہ جن امور (دین) میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں (مثلاً توحید، آخرت اور حلال وحرام کے احکام) آپ (عام) لوگوں پر اس کو ظاہر فرما دیں (یہ فائدہ تو قرآن کا عام ہے) اور ایمان والوں کی ہدایت (خاصہ) اور رحمت کی غرض سے (نازل فرمایا ہے، سو یہ امور بفضلہ تعالیٰ حاصل ہیں)۔

* * *

**فائدہ: ۱ؔ** یعنی قرآن صرف اس لیے اتارا گیا ہے کہ جن سچے اصولوں میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں اور جھگڑے ڈال رہے ہیں (مثلاً توحید و معاد اور احکام حلال وحرام وغیرہ) ان سب کو وضاحت وتحقیق کے ساتھ بیان کر دے، کوئی اشکال وخفا باقی نہ رہے، گویا نبی کریم ﷺ بذریعہ قرآن تمام نزاعات کا دوٹوک فیصلہ سنا دیں اور بندوں پر خدا کی حجت تمام کر دیں، آگے ماننا نہ ماننا خود مخاطبین کا کام ہے جسے توفیق ہوگی قبول کرے گا، آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

**فائدہ: ۲ؔ** یعنی فیصلہ اور بیان تو سب کے لیے ہے لیکن اس کی ہدایت سے منتفع ہونا اور رحمت الہی کی آغوش میں آنا انہی کا حصہ ہے جو اس فیصلہ کو صدق دل سے تسلیم کرتے ہیں اور بطوع ورغبت ایمان لاتے ہیں۔

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۵﴾ ع

اور اللہ نے اتارا آسمان سے پانی پھر اس سے زندہ کیا زمین کو اس کے مرنے کے پیچھے ۱ؔ اس میں نشانی ہے ان لوگوں کو جو سنتے ہیں ۲ؔ

**خلاصہ تفسیر:** سورت کے شروع سے انعامات کے پیرایہ میں دلائل توحید کا ذکر چلا آ رہا ہے، اب آگے بھی اسی طرح سے انعامات کے پیرایہ میں دلائل توحید کو بیان فرماتے ہیں اور یہ دلائل آخرت بھی ہیں، دلائل قدرت بھی ہیں، دلائل ہدایت بھی ہیں اور دلائل رحمت بھی ہیں، دور تک سلسلہ کلام اسی طرح چلا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے قسم قسم کے انعامات کو ذکر فرمایا جو علاوہ نعمت ہونے کے اس کے کمال علم اور کمال قدرت اور حکمت کے دلائل بھی ہیں، ختم آیات پر تسلی کا مضمون ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس سے زمین کو اسکے مردہ ہونے کے بعد زندہ کیا (یعنی اسکی قوت نامیہ کو جو اسکے خشک ہو جانے سے کمزور ہوگئی تھی بڑھا دیا) اس (امر مذکور) میں ایسے لوگوں کے لئے (توحید کی اور منعم ہونے کی) بڑی دلیل ہے جو (جی سے ان باتوں کو) سنتے ہیں۔

* * *

**فائدہ: ۱ؔ** یعنی خشک زمین کو آسمانی بارش سے سرسبز کر دیا گویا خشک ہونا زمین کی موت اور سرسبز وشاداب ہونا حیات ہے۔

**فائدہ: ۲ؔ** یعنی اسی طرح قرآن سے جاہلوں کو عالم اور مردہ دلوں کو زندہ کر دے گا، اگر توجہ قلبی اور انصاف سے سنیں گے۔

وَاِنَّ لَكُمۡ فِي الۡاَنۡعَامِ لَعِبۡرَةً ؕ نُسۡقِيۡكُمۡ مِّمَّا فِيۡ بُطُوۡنِهٖ مِنۡۢ بَيۡنِ فَرۡثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا

اور تمہارے واسطے چوپاؤں میں سوچنے کی جگہ ہے، پلاتے ہیں تم کو اسکے پیٹ کی چیزوں میں سے گوبر اور لہو کے بیچ میں (درمیان) سے دودھ

خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيۡنَ ﴿۶۶﴾

ستھرا ۱؎ خوشگوار پینے والوں کے لیے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (نیز) تمہارے لئے مواشی میں بھی غور درکار ہے (دیکھو) ان کے پیٹ میں جو گوبر اور خون (کا مادہ) ہے اس کے درمیان میں سے (دودھ کا مادہ جو کہ خون کا ایک حصہ ہے ہضم کے بعد جدا کر کے تھن کے مزاج سے ان کا رنگ بدل کر اس کو) صاف اور گلے میں آسانی سے اترنے والا دودھ (بنا کر) ہم تم کو پینے کو دیتے ہیں۔

**مِنۡۢ بَيۡنِ فَرۡثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا:** آیت سے یہ مراد نہیں کہ پیٹ میں ایک طرف گوبر ہوتا ہے اور ایک طرف خون اور دونوں کے درمیان دودھ رہتا ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ پیٹ میں جو غذا ہوتی ہے اس میں دو اجزا ہوتے ہیں، وہ اجزا جو آگے چل کر دودھ بنیں گے، اور وہ اجزا جو گوبر بن جائیں گے، سب ملے ہوئے ہوتے ہیں، اللہ تعالی ان کو جدا جدا کرتے ہیں کچھ تو گوبر بن کر دفع ہو جاتا ہے، اور کچھ جگر میں ہضم ہو کر اخلاط بنتے ہیں، جن میں خون بھی ہے، پھر اس خون میں وہ حصہ جو آگے چل کر دودھ بنے گا اور وہ حصہ جو دودھ نہ بنے گا دونوں مخلوط ہوتے ہیں، اللہ تعالی ایک حصہ جدا کر کے پستان تک پہنچا تا ہے جو دودھ بن جاتا ہے، اور ایک حصہ منی ہو جاتا ہے، اور باقی خون رگوں کے ذریعہ سے بدن میں پھیلتا ہے، اور یہ امتیاز کرنا اللہ تعالی ہی کا کام ہے، اور انعام سے خاص مواشی مراد ہیں گائے، بھینس، بھیڑ، بکری اور اونٹ وغیرہ۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی اونٹ گائے، بھینس وغیرہ جانور جو گھاس چارہ کھاتے ہیں، وہ پیٹ میں پہنچ کر تین چیزوں کی طرف مستحیل ہو جاتا ہے، قدرت نے ان حیوانات کے جسم کے اندرونی حصہ میں ایسی مشین لگادی ہے جو غذا کے کچھ اجزاء کو تحلیل کر کے فضلہ (گوبر) کی شکل میں باہر پھینک دیتی ہے اور کچھ اجزاء کو خون بنا کر عروق میں پھیلا دیتی ہے جو ان کی حیات و بقا کا سبب بنتا ہے، اور اسی مادہ میں سے جس کے بعض اجزاء گوبر اور بعض خون بن گئے، ان دو گندی چیزوں کے درمیان ایک تیسری چیز (دودھ) تیار کرتی ہے جو نہایت پاک طیب اور خوشگوار چیز ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ پہلے کتاب اتارنے کی مناسبت سے پانی اتارنے کا ذکر فرمایا تھا ان آیات میں پانی کی مناسبت سے باقی انواع مشروبات کا تذکرہ ہوا ہے یعنی دودھ، شراب و نبیذ اور شہد، ایک دوسرے موقع پر جہاں جنت کی نہروں کا ذکر آیا ہے مشروبات کی یہ ہی چار قسمیں مذکور ہوئی ہیں: فِيۡهَاۤ اَنۡهٰرٌ مِّنۡ مَّآءٍ غَيۡرِ اٰسِنٍ ۚ وَاَنۡهٰرٌ مِّنۡ لَّبَنٍ لَّمۡ يَتَغَيَّرۡ طَعۡمُهٗ ۚ وَاَنۡهٰرٌ مِّنۡ خَمۡرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيۡنَ ۚ وَاَنۡهٰرٌ مِّنۡ عَسَلٍ مُّصَفًّى (محمد: ۱۵) یہاں اس قسم کی چیزوں کے ذکر سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں کے خیال میں جو بڑی بڑی نعمتیں ہیں وہ سب خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں، پھر تعجب ہے کہ آدمی کس طرح منعم حقیقی کے احسانات بھلا کر دوسروں کا غلام بن جاتا ہے، گویا شرک کے رد کی طرف اشارہ ہوا اور یہ بھی کہ جس طرح تمہاری جسمانی زندگی کے لیے خدا نے طرح طرح کے انتظامات اور مناسب سامان کیے ہیں ضرور ہے کہ روحانی زندگی اور باطنی ترقی کے وسائل و ذرائع بھی کافی مقدار میں مہیا کیے ہوں گے۔

وَمِنۡ ثَمَرٰتِ النَّخِيۡلِ وَالۡاَعۡنَابِ تَتَّخِذُوۡنَ مِنۡهُ سَكَرًا وَّرِزۡقًا حَسَنًا ؕ

اور میووں سے کھجور کے اور انگور کے بناتے ہو اس سے نشہ اور روزی خاصی ۱؎

اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۷﴾

اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے واسطے جو سمجھتے (سوچتے) ہیں ۲؎

**خلاصه تفسیر:** اور (نیز) کھجور اور انگوروں (کی حالت میں غور کرنا چاہئے کہ ان) کے پھلوں سے تم لوگ نشہ کی چیز اور عمدہ کھانے کی چیزیں (جیسے خشک کھجور و کشمش اور شربت اور سرکہ) بناتے ہو، بیشک اس میں (بھی توحید اور منعم ہونے کی) ان لوگوں کے لئے بڑی دلیل ہے جو عقل (سلیم) رکھتے ہیں۔

**وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ:** اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ کھجور اور انگور کے پھلوں سے اپنی غذاء اور منفعت کی چیزیں بنانے میں انسانی صنعت کا بھی کچھ دخل ہے، اور اسی دخل کے نتیجہ میں دو طرح کی چیزیں بنائی گئیں: ① ایک نشہ آور چیز جس کو خمر یا شراب کہا جاتا ہے ② دوسری رزق حسن یعنی عمدہ رزق کہ کھجور اور انگور کو تر و تازہ کھانے میں استعمال کریں، یا خشک کر کے ذخیرہ کر لیں، مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے کھجور اور انگور کے پھل انسان کو دیدیئے اور اس سے اپنی غذا وغیرہ بنانے کا اختیار بھی دے دیا، اب یہ اس کا انتخاب ہے کہ اس سے کیا بنائے، نشہ آور چیز بنا کر عقل کو خراب کرے یا غذا بنا کر قوت حاصل کرے۔

**تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا:** یہاں جو نشہ کی چیز کو انعام کے مقام کے پر ذکر فرمایا ہے اس میں دو قول ہیں: ① ایک یہ کہ اس آیت کے نازل ہونے کے وقت نشہ کی چیزیں حرام نہ تھیں، اس لیے اس کو احسان جتلانے کے لیے بیان فرمایا ② دوسرا قول یہ ہے کہ اگرچہ اس وقت شراب بھی حرام کی گئی ہو، لیکن یہاں ظاہری احسان مقصود نہیں، بلکہ عقلی احسان بیان کرنا منظور ہے، وہ یہ کہ شراب کی حالت سے توحید پر استدلال ہوسکتا ہے، اور وہ شراب کے حرام ہونے پر بھی صحیح ہے، کیونکہ یہ بھی قدرت کی ایک دلیل ہے کہ تازہ شیرہ میں نشہ کی صفت نہ تھی، پھر ایک نئی کیفیت اس میں پیدا ہوگئی جس کی وجہ سے وہ حرام ہوگیا، اور بعض نے کہا ہے کہ یہاں احسان جتلانا منظور ہی نہیں، بلکہ عتاب مقصود ہے کہ ہمارا تو یہ انعام اور تم ایسی بے جا حرکت کرتے ہو کہ ان چیزوں سے شراب بناتے ہو، چنانچہ اس آیت سے نشہ آور چیز یعنی شراب کے حلال ہونے پر کوئی استدلال نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہاں مقصود قدرت کے عطیات اور ان کے استعمال کی مختلف صورتوں کا بیان ہے جو ہر حال میں نعمت خداوندی ہے، جیسے تمام غذائیں اور انسانی منفعت کی چیزیں کہ ان کو بہت سے لوگ ناجائز طریقوں پر بھی استعمال کرتے ہیں، مگر کسی کے غلط استعمال سے اصل نعمت تو نعمت ہونے سے نہیں نکل جاتی، اس لئے یہاں یہ تفصیل بتلانے کی ضرورت نہیں کہ ان میں کون سا استعمال حلال ہے کون سا حرام؟! تاہم ایک لطیف اشارہ اس میں بھی اس طرف کر دیا گیا کہ ''سکر'' کے مقابل ''رزق حسن'' رکھا جس سے معلوم ہوا کہ سکر اچھا رزق نہیں ہے، سکر کے معنی جمہور مفسرین کے نزدیک نشہ آور چیز کے ہیں، یہ آیات باتفاق امت مکی ہیں اور شراب کی حرمت اس کے بعد مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی، نزول آیت کے وقت اگرچہ شراب حلال تھی اور مسلمان عام طور پر پیتے تھے، مگر اس وقت بھی اس آیت میں اشارہ اس طرف کر دیا گیا کہ اس کا پینا اچھا نہیں، بعد میں صراحۃ شراب کو شدت کے ساتھ حرام کرنے کے لئے قرآنی احکام نازل ہوگئے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی ان میووں سے نشہ لانے والی شراب کشید کرتے ہو، اور کھانے پینے کی دوسری عمدہ چیزیں مثلاً شربت، نبیذ، سرکہ اور خشک خرما یا کشمش وغیرہ ان سے حاصل کرتے ہو۔

**تنبیہ:** یہ آیت مکی ہے شراب مکہ میں حرام نہ ہوئی تھی، پینے والے اس وقت تک بے تکلف پیتے تھے، ہجرت کے بعد حرام ہوئی پھر کسی مسلمان نے ہاتھ نہیں لگایا، تاہم اس مکی آیت میں بھی سکرًا کے بعد ورزقاً حسنًا فرما دیا کہ جو چیز آئندہ حرام ہونے والی ہے اس پر ''رزقِ حسن'' کا اطلاق کرنا موزوں نہیں۔

**فائدہ:** ۲ یہاں يَعْقِلُوْنَ کا لفظ جو عقل سے مشتق ہے سکرًا کے تذکرہ سے خاص مناسبت رکھتا ہے، چونکہ نشہ عقل کو زائل کر دیتا ہے، اس لیے اشارہ فرما دیا کہ آیات کا سمجھنا عقل والوں کا کام ہے نشہ پینے والوں کا نہیں۔

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِىْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ﴿٦٨﴾

اور حکم دیا تیرے رب نے شہد کی مکھی کو کہ بنا لے پہاڑوں میں گھر اور درختوں میں اور جہاں ٹٹیاں باندھتے ہیں ۱؎

ثُمَّ كُلِىْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِىْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ

پھر کھا ہر طرح کے میووں سے ۲؎ پھر چل راہوں (رستوں) میں اپنے رب کی صاف پڑے ہیں ۳؎ نکلتی ہے ان کے پیٹ میں سے پینے کی چیز

مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿٦٩﴾

جس کے مختلف رنگ ہیں ۴؎ اس میں مرض اچھے ہوتے ہیں لوگوں کے ۵؎ اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو دھیان کرتے ہیں ۶؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (یہ بات بھی غور کے قابل ہے کہ) آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے جی میں یہ بات ڈالی کہ تو پہاڑوں میں گھر (یعنی چھتہ) بنا لے اور درختوں میں (بھی) اور لوگ جو عمارتیں بناتے ہیں ان میں (بھی چھتہ لگا لے، چنانچہ ان سب جگہوں پر وہ چھتہ لگاتی ہے) پھر ہر قسم کے (مختلف) پھلوں سے (جو تجھے مرغوب ہوں) چوستی پھر، پھر (چوس کر چھتہ کی طرف واپس آنے کے لئے) اپنے رب کے راستوں میں چل جو (تیرے لئے چلنے اور یاد رہنے کے اعتبار سے) آسان ہیں (چنانچہ بڑی دور سے راستہ بھولے بغیر اپنے چھتے کو لوٹ آتی ہے، پھر جب چوس کر اپنے چھتہ کی طرف لوٹتی ہے تو) اس کے پیٹ میں سے پینے کی ایک چیز نکلتی ہے (یعنی شہد) جس کی رنگتیں مختلف ہوتی ہیں اس میں لوگوں (کی بہت سی بیماریوں) کے لئے شفاء ہے، اس میں (بھی) ان لوگوں کے لئے (توحید کی اور منعم ہونے کی) بڑی دلیل ہے جو سوچتے ہیں۔

**يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا:** شہد کے متعلق اختلاف ہے کہ یہ منہ کی رطوبت ہے یا معدہ کی؟ اگر پہلا قول ثابت ہے تو اس سے مراد چوسنا ہے اور بطن سے مراد منہ ہے، کیونکہ منہ بھی پیٹ کے مشابہ ہے، اور اگر دوسرا قول صحیح ہو تو دونوں لفظ اپنے ظاہری معنی پر رہیں گے۔

**فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ:** شہد کا شفا ہونا بعض امراض کے اعتبار سے ہے، رہا یہ کہ اس میں شہد کی کیا تخصیص ہے، یہ خاصیت تو اکثر دواؤں میں ہے کہ وہ بعض امراض کے لیے مفید ہوتی ہیں، سو اس کی وجہ یہ ہے کہ شہد کی مکھی ایک زہریلا جانور ہے، چنانچہ اس کے کاٹنے سے سخت تکلیف ہونا اس کی ظاہری دلیل ہے، پس زہر کی جگہ سے تریاق و شفا کا پیدا کرنا یہ قدرت کے عجائب میں سے ہے۔

**يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ:** روح المعانی میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ حق تعالی کبھی ظاہری حقیر چیز میں کوئی عزیز قیمتی چیز رکھ دیتے ہیں، اس لیے صورت پر نظر نہیں کرنی چاہیے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ بہت میلے کچیلے ایسے مقبول ہوتے ہیں کہ اگر خدا کے بھروسہ پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ تعالی ان کی قسم پوری کر دیتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ **وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ:** یعنی انگور کی بیل چڑھانے کو جو ٹٹیاں باندھتے ہیں یا جو عمارتیں لوگ تیار کرتے ہیں، شہد کی مکھی کو حکم دینے کا یہ مطلب ہے کہ اس کی فطرت ایسی بنائی جو باوجود ادنیٰ حیوان ہونے کے نہایت کاریگری اور باریک صنعت سے اپنا چھتہ پہاڑوں، درختوں اور مکانوں میں تیار کرتی ہے، ساری مکھیاں ایک بڑے مکھی کے ماتحت رہ کر پوری فرمانبرداری کے ساتھ کام کرتی ہیں، ان کے سردار کو "یعسوب" کہا جاتا ہے، جس کے ساتھ مکھیوں کا جلوس چلتا ہے، جب کسی جگہ مکان بناتی ہیں تو سب خانے "مسدس متساوی الاضلاع" کی شکل پر ہوتے ہیں بدون مسطر و پرکار وغیرہ کے اس قدر صحت و انضباط کے ساتھ ٹھیک ایک ہی شکل پر تمام خانوں کا رکھنا آدمی کو حیرت زدہ کر دیتا ہے، حکماء کہتے ہیں کہ مسدس کے علاوہ کوئی دوسری شکل اگر اختیار کی جاتی تو لامحالہ درمیان میں کچھ جگہ فضول خالی رہتی، فطرت نے ایسی شکل کی طرف راہنمائی کی

جس میں ذرا سا فرجہ بھی بیکار نہ رہے۔

**فائدہ: ۲؎ كُلِي** اور **فَاسْلُكِي** سب اوامر تکوینیہ ہیں، یعنی فطرۃً اس کو ہدایت کی کہ اپنی خواہش اور استعداد و مزاج کے مناسب ہر قسم کے پھلوں اور میووں میں سے اپنی غذا حاصل کرے، چنانچہ مکھیاں اپنے چھتہ سے نکل کر رنگ برنگ کے پھول پھل چوستی ہیں جس سے شہد اور موم وغیرہ حاصل ہوتا ہے۔

**فائدہ: ۳؎ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا:** یعنی غذا حاصل کرنے اور کھا پی کر چھتہ کی طرف واپس آنے کے راستے صاف کھلے پڑے ہیں، کوئی روک ٹوک نہیں، چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ مکھیاں غذا کی تلاش میں بعض اوقات بہت دور نکل جاتی ہیں پھر بے تکلف اپنے چھتہ میں واپس جاتی ہیں، ذرا راستہ نہیں بھولتیں، بعض نے: فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا کا مطلب یہ لیا ہے کہ قدرت نے تیرے عمل و تصرف کے جو فطری راستے مقرر کر دیے ہیں ان پر مطیع و منقاد بن کر چلتی رہ، مثلاً پھول پھل چوس کر فطری قویٰ و تصرفات سے شہد وغیرہ تیار کر۔

**فائدہ: ۴؎ شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ:** یعنی مختلف رنگ کا شہد نکلتا ہے، سفید، سرخ، زرد، کہتے ہیں کہ رنگوں کا اختلاف موسم، غذا اور مکھی کی عمر وغیرہ کے اختلاف سے پیدا ہوتا ہے، واللہ اعلم۔

**فائدہ: ۵؎ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ:** یعنی بہت سی بیماریوں میں صرف شہد خالص یا کسی دوسری دوا میں شامل کر کے دیا جاتا ہے جو باذن اللہ مریضوں کی شفایابی کا ذریعہ بنتا ہے، حدیث صحیح میں ہے کہ ایک شخص کو دست آ رہے تھے اس کا بھائی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے شہد پلانے کی رائے دی، شہد پینے کے بعد اسہال میں ترقی ہوگئی، اس نے پھر حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضرت دست زیادہ آنے لگے فرمایا: "صَدَقَ اللّٰهُ وَ كَذَبَ بَطْنُ اَخِيْكَ" (اللہ سچا ہے اور تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے) پھر پلاؤ، دوبارہ پلانے سے بھی وہی کیفیت ہوئی، آپ نے پھر وہی فرمایا، آخر تیسری مرتبہ پلانے سے دست بند ہو گئے اور طبیعت صاف ہو گئی، اطباء نے اپنے اصول کے موافق کہا ہے کہ بعض اوقات پیٹ میں "کیموس" فاسد ہوتا ہے جو پیٹ میں پہنچنے والی ہر ایک غذا اور دوا کو فاسد کر دیتا ہے اس لیے دست آتے ہیں، اسکا علاج یہی ہے کہ مسہلات دی جائیں تاکہ وہ "کیموس فاسد" خارج ہو، شہد کے مسہل ہونے میں کسی کو کلام نہیں گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مشورہ اس طبی اصول کے موافق تھا، مامون رشید کے زمانہ میں ثمامہ عباسی کو جب اسی قسم کا مرض لاحق ہوا تو اس زمانہ کے شاہی طبیب یزید بن یوحنا نے مسہل سے اسکا علاج کیا اور یہی وجہ بتلائی، آج کل کے اطباء شہد کے استعمال کو استطلاق بطن کے علاج میں بیحد مفید بتلاتے ہیں۔

**فائدہ: ۶؎ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ:** حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے اوپر کی آیتوں میں برے میں سے بھلا نکلنے کے تین پتے بتلائے، جانور کے پیٹ اور خون گوبر کے مادہ سے دودھ، نشے کے مادہ (انگور، کھجور وغیرہ) سے پاک روزی اور مکھی کے پیٹ سے شہد، تینوں میں اشارہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس قرآن کی بدولت جاہلوں کی اولاد میں عالم پیدا کرے گا، حضرت کے وقت میں یہی ہوا کہ کافروں کی اولاد عارف کامل ہوئی۔

---

**وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ ۙ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ**

اور اللہ نے تم کو پیدا کیا پھر تم کو موت دیتا ہے، اور کوئی تم میں سے پہنچ جاتا ہے نکمی عمر کو

ع۹ **لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝۷۰**

کہ سمجھنے کے پیچھے اب کچھ نہ سمجھے اللہ خبردار ہے قدرت والا

---

**خلاصہ تفسیر:** اور (تمہاری اپنی حالت بھی سوچنے کے قابل ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے تم کو (اول) پیدا کیا، پھر (عمر ختم ہونے پر)

تمہاری جان قبض کرتا ہے (جن میں بعض تو ہوش وحواس میں چلتے ہاتھ پاؤں اٹھ جاتے ہیں) اور بعض تم میں وہ ہیں جو ناکارہ عمر تک پہنچائے جاتے ہیں (جن میں نہ قوت جسمانی رہے نہ قوت عقلی رہے) جس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ ایک چیز سے باخبر ہو کر پھر بے خبر ہو جاتا ہے (جیسا کہ اکثر ایسے بوڑھوں کو دیکھا جاتا ہے کہ ابھی ان کو ایک بات بتلائی اور ابھی بھول گئے اور پھر اس کو پوچھتے ہیں) بیشک اللہ تعالیٰ بڑے علم والے بڑی قدرت والے ہیں (علم سے ہر ایک مصلحت جانتے ہیں اور قدرت سے ویسا ہی کر دیتے ہیں، اس لئے حیات و وفات کی حالتیں مختلف کر دیں پس یہ بھی دلیل ہے توحید کی)۔

* * *

**فائدہ:** قدرت کے بہت سے خارجی نشان بیان فرما کر انسان کو متنبہ کرتے ہیں کہ خود اپنے اندرونی حالات پر غور کرے، وہ کچھ نہ تھا، خدا نے وجود بخشا پھر موت بھیجی اور دی ہوئی زندگی واپس لے لی یہ کچھ نہ کر سکا اور بعضوں کو موت سے پہلے ہی پیرانہ سالی کے ایسے درجہ میں پہنچا دیا کہ ہوش و حواس ٹھکانے نہ رہے، نہ ہاتھ پاؤں میں طاقت رہی، بالکل نکما ہو گیا، نہ کوئی بات سمجھی ہوئی یاد رکھ سکتا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ علم وقدرت اسی خالق و مالک کے خزانہ میں ہے، جب اور جس قدر چاہے دے اور جب چاہے واپس کر لے، حضرت شاہ صاحبؒ کے نزدیک آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ" اس امت میں کامل پیدا ہو کر پھر ناقص پیدا ہونے لگیں گے"، واللہ اعلم۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا

اور اللہ نے بڑائی دی تم میں ایک کو ایک پر روزی میں، سو جن کو بڑائی دی وہ نہیں پہنچا دیتے اپنی روزی ان کو جن کے

مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ۭ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿71﴾

مالک ان کے ہاتھ ہیں کہ وہ سب اس میں برابر ہو جائیں، کیا اللہ کی نعمت کے منکر ہیں

**خلاصہ تفسیر:** اور (توحید کے اثبات کے ساتھ شرک کی قباحت ایک باہمی معاملہ کے ضمن میں سنو کہ) اللہ تعالیٰ نے تم میں بعضوں کو بعضوں پر رزق (کے باب) میں فضیلت دی ہے (مثلاً کسی کو غنی اور غلاموں کا مالک بنایا کہ ان کے ہاتھ سے ان غلاموں کو بھی رزق پہنچتا ہے، اور کسی کو غلام بنا دیا کہ اسے مالک ہی کے ہاتھ سے رزق پہنچتا ہے، اور کسی کو نہ ایسا غنی بنایا کہ دوسرے غلاموں کو دے، نہ غلام بنایا کہ اس کو کسی مالک کے ہاتھ سے پہنچے) سو جن لوگوں کو (رزق میں خاص) فضیلت دی گئی ہے (کہ ان کے پاس مال بھی ہے اور غلام بھی ہیں) وہ (لوگ) اپنے حصہ کا مال اپنے غلاموں کو اس طرح کبھی دینے والے نہیں کہ وہ (مالک ومملوک) سب اس میں برابر ہو جائیں (کیونکہ اگر ان کو غلام رکھ کر کچھ دیا تو وہ مال ان کی ملک ہی نہ ہوگا، بلکہ بدستور وہی مالک رہیں گے، اور اگر آزاد کر کے دیا تو برابری ممکن ہے، مگر اس صورت میں وہ غلام نہ رہیں گے، پس غلامی کی حالت میں برابری ممکن نہیں، اسی طرح یہ بت وغیرہ جب مشرکین کے اقرار سے خدا تعالیٰ کے مملوک ہیں تو مملوک ہونے کے باوجود معبودیت میں خدا کے برابر کیسے ہو جائیں گے؟! اس مثال سے شرک کی انتہائی درجہ قباحت معلوم ہوگئی کہ جب تمہارے غلام رزق میں تمہارے شریک نہیں ہو سکتے تو اللہ تعالیٰ کے غلام اس کی خدائی میں کیسے شریک ہو جائیں گے) کیا (یہ مضامین سن کر) پھر بھی (خدائے تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے ہیں جس سے عقلاً یہ لازم آتا ہے کہ) خدا تعالیٰ کی نعمت کا (یعنی اس بات کا کہ خدا نے نعمت دی ہے) انکار کرتے ہیں۔

حالانکہ مشرکین کو اس بات کا اقرار ہے کہ یہ سب نعمتیں خدا تعالیٰ ہی نے عطا کی ہیں اور اتنا نہیں سمجھتے کہ جو انعام میں یکتا ہے وہ معبود ہونے میں بھی یکتا ہوگا، اور اس کے ساتھ عبادت میں کسی کو شریک کرنے سے اس کی نعمتوں کا انکار لازم آئے گا، اور منعم کے انعام کا انکار کرنا عقلاً قبیح ہے، پس شرک کی قباحت دوسرے عنوان سے بھی ثابت ہوگئی جس کا قبیح ہونا ان کو بھی مسلم ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی خدا کی دی ہوئی روزی اور بخشش سب کے لیے برابر نہیں، بلحاظ تفاوتِ استعداد و احوال کے اس نے اپنی حکمت بالغہ سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، کسی کو مالدار اور با اقتدار بنایا جس کے ہاتھ تلے بہت سے غلام اور نوکر چاکر ہیں، جن کو اسی کے ذریعہ سے روزی پہنچتی ہے، ایک وہ غلام ہیں جو بذات خود ایک پیسہ یا ادنیٰ اختیار کے مالک نہیں، ہر وقت آقا کے اشاروں کے منتظر رہتے ہیں، پس کیا دنیا میں کوئی آقا گوارا کرے گا کہ غلام یا نوکر چاکر جو بہرحال اسی جیسے انسان ہیں بدستور غلامی کی حالت میں رہتے ہوئے اس کی دولت، عزت، بیوی وغیرہ میں برابر کے شریک ہوجائیں، غلام کا حکم تو شرعاً یہ ہے کہ بحالت غلامی کسی چیز کا مالک بنایا جائے تب بھی نہیں بنتا آقا ہی مالک رہتا ہے اور فرض کرو آقا غلامی سے آزاد کر کے اپنی دولت وغیرہ میں برابر کا حصہ دار بنالے تو مساوات بیشک ہوجائے گی، لیکن اس وقت غلام غلام نہ رہا، بہرکیف غلامی اور مساوات جمع نہیں ہوسکتی، جب دو ہم جنس اور متحد النوع انسانوں کے اندر مالک و مملوک میں شرکت و مساوات نہیں ہوسکتی، پھر غضب ہے کہ خالق و مخلوق کو معبودیت وغیرہ میں برابر کردیا جائے اور ان چیزوں کو جنہیں خدا کی مملوک سمجھنے کا اقرار خود مشرکین بھی کرتے تھے اِلَّاشَرِيْكًا هُوَلَكَ تَمْلِكُهُ وَمَامَلَكَ مالک حقیقی کا شریک و سہیم ٹھہرادیا جائے، کیا منعم حقیقی کی نعمتوں کا یہی شکر یہ ہے کہ جس بات کے قبول کرنے سے خود ناک بھوں چڑھاتے ہوں اس سے زیادہ قبیح و شنیع صورت اس کے لیے تجویز کی جائے، نیز جس طرح روزی وغیرہ میں حق تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی، سب کو ایک درجہ میں نہیں رکھا، اگر علم و عرفان اور کمالات نبوت میں کسی ہستی کو دوسروں سے فائق کردیا تو خدا کی اس نعمت سے انکار کرنے کی بجز ہٹ دھرمی کے کیا وجہ ہوسکتی ہے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ

اور اللہ نے پیدا کیں تمہارے واسطے تمہاری ہی قسم سے عورتیں [1] اور دیے تم کو تمہاری عورتوں سے بیٹے اور پوتے [2] اور کھانے کو دیں تم کو

مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۲﴾

ستھری چیزیں [3] سو کیا جھوٹی باتیں مانتے ہیں اور اللہ کے فضل کو نہیں مانتے [4]

**خلاصہ تفسیر:** اور (قدرت کے دلائل اور نعمت کی اقسام میں سے اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی دلیل اور نعمت خود تمہارا شخصی وجود اور نوعی بقا کا تحفظ ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے تم ہی میں سے (یعنی تمہاری جنس اور نوع سے) تمہارے لئے بیویاں بنائیں اور (پھر) ان بیویوں سے تمہارے بیٹے اور پوتے پیدا کئے (کہ یہ نوعی بقاء ہے) اور تم کو اچھی اچھی چیزیں کھانے (پینے) کو دیں (کہ یہ شخصی بقاء ہے، اور چونکہ بقاء موقوف ہے وجود پر اس میں اس کی طرف بھی اشارہ ہوگیا کہ جس نے تمہاری بقا کا یہ سامان کیا وہی تمہارا اور ان سب چیزوں کا پیدا کرنے والا ہے) کیا (یہ سب دلائل و نعمتیں سن کر) پھر بھی بے بنیاد چیز پر (یعنی بتوں وغیرہ پر جن کے معبود ہونے کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ خلاف دلیل ہے) ایمان رکھیں گے اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری (بےقدری) کرتے رہیں گے۔

* * *

**فائدہ:** [1] یعنی نوع انسان ہی سے تمہارا جوڑا پیدا کیا تاکہ الفت و موانست قائم رہے، اور تخلیق کی غرض پوری ہو: وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً (الروم:۲۱)

**فائدہ:** [2] جو تمہاری بقائے نوعی کا ذریعہ ہیں۔

**فائدہ:** [3] جو بقائے شخصی کا سبب ہے۔

**فائدہ:** [4] یعنی بتوں کا احسان مانتے ہیں کہ بیماری سے چنگا کیا، یا روزی دی، اور یہ سب جھوٹ اور وہ جو سچ دینے والا ہے اس کے شکر گزار نہیں، کذا فی الموضح، اور شاید یہ بھی اشارہ ہو کہ فانی و زائل زندگانی کی بقائے نوعی و شخصی کے اسباب کو تو مانتے ہو اور خدا کی سب سے بڑی نعمت (پیغمبر ﷺ

کی ہدایات) کو جو بقائے ابدی اور حیات جاودانی کا واحد ذریعہ ہے، تسلیم نہیں کرتے اَلاَ کُلُّ شَیْءٍ مَاخَلَا اللّٰہَ بَاطِلٌ،

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۷۳﴾

اور پوجتے ہیں اللہ کے سوا ایسوں کو جو مختار نہیں ان کی روزی کے آسمان اور زمین میں سے کچھ بھی ۱ے اور نہ قدرت رکھتے ہیں ۲ے

**خلاصہ تفسیر:** اور (اس ناشکری کا مطلب یہ ہے کہ) اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے رہیں گے جو ان کو نہ آسمان میں سے رزق پہنچانے کا اختیار رکھتی ہیں اور نہ زمین میں سے (یعنی نہ بارش برسانے کا ان کو اختیار ہے، نہ زمین سے کچھ پیدا کرنے کا) اور نہ (اختیار حاصل کرنے کی) قدرت رکھتے ہیں۔

**وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ:** مطلب یہ کہ نہ اختیار حاصل کرنے کی قدرت رکھتے ہیں، اس کی نفی سے ان کی عاجزی کا اور زیادہ مبالغہ ہو گیا، کیونکہ بعض دفعہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک شخص اس وقت تو با اختیار نہیں ہے، لیکن کوشش کر کے بعد میں اختیارات حاصل کر لیتا ہے، اس لئے اس کی بھی نفی فرمادی کہ ان کو اختیار حاصل کرنے کی قدرت بھی نہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ے یعنی نہ آسمان سے مینہ برسانے کا خدائی اختیار رکھتے ہیں نہ زمین سے غلہ اگانے کا، پھر قادر مطلق کے شریک معبودیت میں کس طرح بن گئے؟

**فائدہ:** ۲ے یعنی نہ فی الحال اختیار ہے نہ آئندہ حاصل کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۴﴾

سومت چسپاں کرو (بٹھلاؤ) اللہ پر مثالیں ۱ے بیشک اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ۲ے

**خلاصہ تفسیر:** سو (جب شرک کا باطل ہونا ثابت ہو گیا تو) تم اللہ تعالیٰ کے لئے مثالیں مت گھڑو (یعنی یہ مت کہو کہ اللہ کی مثال دنیا کے بادشاہوں کی سی ہے کہ ہر شخص ان سے اپنی حاجت عرض نہیں کر سکتا، اس لئے اس کے نائب ہوتے ہیں تاکہ عام لوگ ان سے عرض کریں، پھر وہ نائب سلاطین سے عرض کرتے ہیں، خدا کا ایسا نائب کوئی نہیں) اللہ تعالیٰ (خوب) جانتے ہیں (کہ ایسی مثالیں محض مہمل ہیں) اور تم (تدبر غور وفکر نہ کرنے کی وجہ سے) نہیں جانتے (اس لئے جو چاہتے ہو بک ڈالتے ہو)۔

**فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ:** اس میں دلالت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں اپنی رائے وقیاس سے کلام نہیں کرنا چاہیے، قرآن وحدیث میں جتنا بتایا گیا اسی پر اکتفا کرنا چاہیے، اس سے اسماء الٰہیہ کا توقیفی (قیاس وگمان سے ماوراء) ہونا بھی ظاہرا معلوم ہوتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ے مشرک کہتے تھے کہ مالک اللہ ہی ہے، یہ لوگ اس کی سرکار میں مختار ہیں، ہمارے کام ان ہی سے پڑتے ہیں، بڑی سرکار تک براہِ راست رسائی نہیں ہو سکتی، سو یہ مثال غلط ہے جو بارگاہ احدیت پر چسپاں نہیں، اللہ ہر چیز آپ کرتا ہے خواہ بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ، کوئی کام کسی کو اس طرح سپرد نہیں کر رکھا جیسے سلاطین دنیا اپنے ماتحت حکام کو اختیارات تفویض کر دیتے ہیں کہ تفویض تو ارادہ واختیار سے کیا لیکن بعد تفویض ان اختیارات کے استعمال میں ماتحت آزاد ہیں، کسی مجسٹریٹ کے فیصلہ کے وقت بادشاہ یا پارلیمنٹ کو اس واقعہ اور فیصلہ کی مطلق خبر نہیں ہوتی، نہ اس وقت جزئی طور پر بادشاہ کی مشیت وارادہ کو فیصلہ صادر کرنے میں قطعاً دخل ہے یہ صورت حق تعالیٰ کے یہاں نہیں، بلکہ ہر ایک چھوٹا بڑا کام اور ادنیٰ سے ادنیٰ جزئی خواہ بواسطہ اسباب یا بالواسطہ اس کے علم محیط اور مشیت وارادہ سے وقوع پذیر ہوتی ہے، اسی لیے لازم ہے کہ آدمی ہر کلی جزئی کا فاعل اور موثر حقیقی اعتقاد کر کے

تنہا اسی کو معبود و مستعان سمجھے۔

**تنبیہ:** ابن عباس وغیرہ سلف سے فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ کا یہ مطلب منقول ہے، کہ خدا کا مماثل کسی کو مت ٹھہراؤ۔

**فائدہ:** ۲ یعنی تم نہیں جانتے کہ خدا کے لیے کس طرح مثال پیش کرنی چاہیے جو اصل حقیقت اور صحیح مطلب کی تفہیم میں معین ہو اور اس کی عظمت و نزاہت کے خلاف شبہ پیدا نہ کرے۔

**ربط:** اگر صحیح مثال چاہو تو آگے دو مثالیں بیان فرمائیں، انھیں غور سے سنو اور تمثیل کی غرض کو سمجھو۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا

اللہ نے بتلائی ایک مثال ایک بندہ (غلام) پرایا مال نہیں قدرت (اختیار) رکھتا کسی چیز پر اور ایک جس کو ہم نے روزی دی اپنی طرف سے خاصی روزی

فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ؕ هَلْ يَسْتَوٗنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

سو وہ خرچ کرتا ہے اس میں سے چھپا کر اور سب کے روبرو، کہیں برابر ہوتے ہیں، سب تعریف اللہ کو ہے، پر بہت لوگ نہیں جانتے

**خلاصہ تفسیر:** اللہ تعالیٰ (شرک کا باطل ہونا ظاہر کرنے کے لئے) ایک مثال بیان فرماتے ہیں کہ (فرض کرو) ایک (تو) غلام ہے (کسی کا) مملوک کہ (اموال و تصرفات میں سے) کسی چیز کا (مالک یعنی آقا کی اجازت کے بغیر) اختیار نہیں رکھتا، اور (دوسرا) ایک شخص ہے جس کو ہم نے اپنے پاس سے خوب روزی دے رکھی ہے تو اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ (جس طرح چاہتا ہے جہاں چاہتا ہے) خرچ کرتا ہے (اس کو کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں) کیا اس قسم کے شخص آپس میں برابر ہو سکتے ہیں (ہرگز نہیں، سو جب مجازی مالک یعنی آقا اور مجازی مملوک یعنی غلام برابر نہیں ہو سکتے تو حقیقی مالک و غلام کب برابر ہو سکتے ہیں اور عبادت کا مستحق ہونا برابری پر موقوف ہے اور وہ ہے نہیں، حقیقت میں) ساری تعریفیں اللہ ہی کے لائق ہیں (کیونکہ ذات وصفات کے اعتبار سے وہی کامل ہے، پس معبود بھی وہی ہو سکتا ہے، مگر پھر بھی مشرکین غیر اللہ کی عبادت نہیں چھوڑتے) بلکہ ان میں اکثر تو (تدبر غور و فکر نہ کرنے کی وجہ سے) جانتے ہی نہیں (اور چونکہ علم نہ ہونے کا سبب خود ان کا تدبر نہ کرنا ہے، اس لئے وہ معذور نہ ہوں گے)۔

**لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ:** اس کے خلاصہ تفسیر میں "آقا کی اجازت کے بغیر" کی قید سے فقہی شبہات دور ہو گئے، کیونکہ آقا کی اجازت کے بعد غلام مال میں تصرف کر سکتا ہے، اور کوئی یہ وسوسہ نہ کرے کہ شاید باطل معبودوں کو بھی اجازت ہو گئی ہو، جواب یہ ہے کہ معبود بننے کی کسی کو اجازت نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے۔

* * *

**فائدہ:** ایک شخص وہ ہے جو آزاد نہیں، دوسرے کا مملوک غلام ہے کسی طرح کی قدرت و اختیار نہیں رکھتا، ہر ایک تصرف میں مالک کی اجازت کا محتاج ہے، بدون اجازت اس کے سب تصرفات غیر معتبر ہیں دوسرا آزاد اور بااختیار شخص ہے جسے خدا نے اپنے فضل سے بہت کچھ مقدرت اور روزی عنایت فرمائی جس میں سے دن رات سرًا وعلانیۃً بے دریغ خرچ کرتا ہے، کوئی اس کا ہاتھ نہیں روک سکتا، کیا یہ دونوں شخص برابر ہو سکتے ہیں؟ اسی طرح سمجھ لو کہ حق تعالیٰ ہر چیز کا مالک حقیقی ہے، سب تعریفیں اور خوبیاں اس کے خزانہ میں ہیں جس کو چاہے دے، کوئی مزاحمت کرنے والا نہیں، ذرہ ذرہ پر کلی اختیار اور کامل قبضہ رکھتا ہے، یہ کس قدر ظلم ہوگا کہ ایک پتھر کے بت کو اس کے برابر کر دیا جائے جو کسی چیز کا مالک نہیں بلکہ خود پرایا مال ہے، اگر مالک مجازی اور مملوک مجازی برابر نہیں ہو سکتے تو کوئی مملوک محض مالک حقیقی کا شریک کیسے بن سکتا ہے، یہاں سے یہ بھی سمجھ لو کہ خدائے واحد کا پرستار جسے مالک نے علم و ایمان کی دولت بخشی اور لوگوں میں شب و روز روحانی نعمتیں تقسیم کرنے کا ذریعہ بنایا، کیا ایک پلید مشرک کو جو بت کا مملوک، اہواء و اوہام کا غلام اور عمل مقبول سے محض تہی دست ہے اس مومن موحد کے ساتھ برابر کھڑا کیا جا سکتا ہے؟ کلاّ و اللہ۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيۡنِ اَحَدُهُمَاۤ اَبۡكَمُ لَا يَقۡدِرُ عَلٰى شَىۡءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوۡلٰٮهُ ۙ اَيۡنَمَا

اور بتائی اللہ نے ایک دوسری مثال دو مرد ہیں ایک گونگا ۱ کچھ کام نہیں کر سکتا ۲ اور وہ بھاری ہے اپنے صاحب (مالک) پر، جس طرف

يُوَجِّهْهُّ لَا يَاۡتِ بِخَيۡرٍ ؕ هَلۡ يَسۡتَوِىۡ هُوَ ۙ وَمَنۡ يَّاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ ۙ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۷۶﴾

اس کو بھیجے نہ کر کے لائے کچھ بھلائی ۳ کہیں برابر ہے وہ، اور ایک وہ شخص جو حکم کرتا ہے انصاف سے، اور ہے سیدھی راہ پر ۴

**خلاصہ تفسیر:** اور اللہ تعالیٰ (اس کی وضاحت کے لئے) ایک مثال بیان فرماتے ہیں کہ (فرض کرو) دو شخص ہیں جن میں ایک تو (غلام ہونے کے علاوہ) گونگا (بہرا بھی) ہے (اور بہرہ، اندھا اور بے عقل ہونے کی وجہ سے) کوئی کام نہیں کر سکتا اور (اس وجہ سے) وہ اپنے مالک پر وبال جان ہے (کہ خود مالک ہی اس کے سارے کام کرتا ہے اور) وہ (مالک) اس کو جہاں بھیجتا ہے کوئی کام درست نہیں لاتا (یعنی خود تو کیا کرتا دوسروں بتلانے سمجھانے سے بھی اس سے کوئی کام درست نہیں ہوتا، سو) کیا یہ شخص اور ایسا شخص باہم برابر ہو سکتے ہیں جو اچھی باتوں کی تعلیم کرتا ہو (جس سے اس کی گویائی، عقل مندی اور قوت علمی معلوم ہوتی ہے) اور خود بھی (ہر معاملہ میں) معتدل طریقہ پر (چلتا) ہو (جس سے اس کی عملی قوت اور انتظامی قابلیت ثابت ہوتی ہے، سو جب مخلوق مخلوق میں یہ فرق ہے باوجودیکہ ان کی ماہیت اور بہت سے اوصاف مشترک ہیں تو خالق اور مخلوق میں تو کیسا کچھ فرق اور تفاوت ہوگا، پھر دونوں کو برابر کر دینا بڑا غضب ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ اَحَدُهُمَاۤ اَبۡكَمُ: گونگا ہے تو لازمی طور پر بہرا بھی ہوگا، گویا نہ اپنی کہہ سکے نہ دوسرے کی سن سکے۔

**فائدہ:** ۲ لَا يَقۡدِرُ عَلٰى شَىۡءٍ: کیونکہ نہ حواس رکھتا ہے نہ عقل، اور اپاہج ہے جو چل پھر بھی نہیں سکتا۔

**فائدہ:** ۳ لَا يَاۡتِ بِخَيۡرٍ: یعنی مالک کے کسی کام کا نہیں۔ جدھر اسے بھیجنا چاہے یا متوجہ کرے کچھ بھلائی اور فلاح نہ پہنچا سکے۔

**فائدہ:** ۴ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ: یعنی خود سیدھی راہ پر قائم رہ کر دوسروں کو بھی اعتدال و انصاف کے راستہ پر لے جا رہا ہے، جب یہ دونوں شخص برابر نہیں ہو سکتے تو ایک خود تراشیدہ پتھر کی مورتی کو (العیاذ باللہ) خدائی کا درجہ کیونکر دیا جا سکتا ہے، یا ایک اندھا بہرا مشرک جو خدا کی پیدا کی ہوئی روزی کھاتا ہے اور چھدام کا کام کر کے نہیں دیتا اس مومن قانت کی ہمسری کیسے کر سکتا ہے جو خود سیدھی راہ پر ہو اور دوسروں کو اپنے ساتھ ترا لے جائے، حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں یعنی: ''خدا کی دو مخلوق ایک بت نکما، نہ ہل سکے، نہ چل سکے، جیسے گونگا غلام، دوسرا رسول جو اللہ کی راہ بتا دے ہزاروں کو اور آپ بندگی پر قائم ہے، اُس کے تابع ہونا بہتر یا اِس کے تابع ہونا بہتر ہے''۔

وَلِلّٰهِ غَيۡبُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَمَاۤ اَمۡرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمۡحِ الۡبَصَرِ اَوۡ هُوَ اَقۡرَبُ ؕ

اور اللہ ہی کے پاس ہیں بھید آسمانوں اور زمین کے ۱ اور قیامت کا کام تو ایسا ہے جیسے لپک نگاہ کی یا اس سے بھی قریب ۲

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۷۷﴾

اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۳

**خلاصہ تفسیر:** اور آسمانوں اور زمین کی تمام پوشیدہ باتیں (جو کسی کو معلوم نہیں علم کے اعتبار سے) اللہ ہی کے ساتھ خاص ہیں (تو صفت علم میں وہ کامل ہیں) اور (قدرت میں ایسے کامل ہیں کہ ان غیبی باتوں میں سے جو ایک عظیم بات ہے یعنی) قیامت (اس) کا معاملہ بس ایسا

(جھٹ پٹ) ہوگا جیسے آنکھ جھپکنا، بلکہ اس سے بھی جلدی (قیامت کے معاملہ سے مُردوں میں جان پڑنا مراد ہے اور جان کا پڑنا ایک آن میں ہوتا ہے اور اس کا آنکھ جھپکنے سے بھی جلدی ہونا ظاہر ہے، کیونکہ آنکھ جھپکنا حرکت ہے اور حرکت کے لیے ایک آن کافی نہیں، بلکہ زمانہ کی ضرورت ہے، اور اس پر تعجب نہ کیا جائے، کیونکہ) یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں (اور قدرت ثابت کرنے کے لئے قیامت کی تخصیص شاید اس وجہ سے ہو کہ قیامت بھی خاص غیبی امور میں سے ہے، اس لئے وہ علم اور قدرت دونوں کی دلیل ہے، کیونکہ آنے سے پہلے وہ سب سے مخفی ہے، خدا کے سوا کسی کو علم نہیں، اس لیے کمال علم کی دلیل ہے، اور واقع ہونے کے بعد کمال قدرت کی دلیل ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ **وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ:** یعنی ساری مخلوق یکساں نہ ہوئی، ایک آدمی کا حال دوسرے سے بے انتہا مختلف ہوا، سب چیزیں ایک سطح مستوی پر کھڑی نہیں کی گئیں، اس کا بھید اور ہر ایک کی پوشیدہ استعداد اور مخفی حالت کا علم خدا ہی کے پاس ہے، چنانچہ وہ اپنے علم محیط کے موافق قیامت میں ہر ایک کے ساتھ جداگانہ معاملہ کرے گا، اور مختلف احوال پر مختلف نتائج مرتب فرمائے گا۔

**فائدہ:** ۲ **اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ:** یعنی قیامت کے آنے کو مستبعد مت سمجھو، خدا کے آگے کوئی چیز مشکل نہیں، تمام لوگوں کو جب دوبارہ پیدا کرنا چاہے گا تو پلک جھپکنے کی دیر بھی نہ لگے گی، ادھر سے ارادہ ہوتے ہی چشم زدن میں ساری دنیا دوبارہ موجود ہوجائے گی۔

**تنبیہ:** **كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ** کا مطلب یہ ہے کہ عام لوگوں کے محسوسات کے موافق تو اس کی سرعت کو آنکھ جھپکنے سے تعبیر کر سکتے ہیں، لیکن واقعی اس سے بھی کم میں قیامت قائم ہوجائے گی، کیونکہ "لمح بصر" بہرحال زمانی چیز ہے اور ارادہ خداوندی پر مراد کا ترتب آنی ہوگا۔

**فائدہ:** ۳ **اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ:** یعنی جس کے علم محیط کا وہ حال ہو کہ آسمان و زمین کے سارے بھید اس کے سامنے حاضر ہیں اور جس کی قدرت کاملہ ذرہ ذرہ پر محیط ہو، بھلا اس کا ہمسر کون ہوسکتا ہے؟ اور اس کی پوری مثال کہاں سے لا سکتے ہیں۔

**وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ**

اور اللہ نے تم کو نکالا تمہاری ماں کے پیٹ سے نہ جانتے تھے تم کسی چیز کو، اور دیے تم کو کان اور آنکھیں

**وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۷۸**

اور دل، تا کہ تم احسان مانو

**خلاصہ تفسیر:** اور (قدرت کے دلائل واسباب نعمت میں سے ایک یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے اس حالت میں نکالا کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے اور اس نے تم کو کان دیئے اور آنکھ اور دل تا کہ تم شکر کرو۔

چنانچہ ظاہر ہے کہ پیدائش کے وقت انسان کسی چیز کو نہیں جانتا، اور اگر حکماء کا یہ دعویٰ ثابت ہوجائے کہ اس وقت نفس کو اپنا علم ہوتا ہے تو اس کو آیت سے عقلی طور پر مستثنیٰ کرلیا جائے گا، ورنہ آیت اپنے ظاہر پر عام رہے گی اور اس مرتبہ کا نام فلسفہ کی اصطلاح میں عقل ہیولانی ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی پیدائش کے وقت تم کچھ جانتے اور سمجھتے نہ تھے، خدا تعالیٰ نے علم کے ذرائع اور سمجھنے والے دل تم کو دیے، جو بذات خود بھی بڑی نعمتیں ہیں اور لاکھوں نعمتوں سے متمتع ہونے کے وسائل ہیں، اگر آنکھ، کان، عقل وغیرہ نہ ہو تو ساری ترقیات کا دروازہ ہی بند ہوجائے، جوں جوں آدمی کا بچہ بڑا ہوتا ہے اس کی علمی و عملی قوتیں بتدریج بڑھتی جاتی ہیں، اس کی شکرگزاری یہ تھی کہ ان قوتوں کو مولیٰ کی طاعت میں خرچ کرتے، اور حق شناسی میں سمجھ بوجھ سے کام لیتے، نہ یہ کہ بجائے احسان ماننے کے الٹے بغاوت پر کمربستہ ہوجائیں، اور منعم حقیقی کو چھوڑ کر اینٹ پتھروں کی پرستش کرنے لگیں۔

اَلَمۡ یَرَوۡا اِلَی الطَّیۡرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیۡ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا یُمۡسِکُہُنَّ اِلَّا اللّٰہُ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ

کیا نہیں دیکھے اڑتے جانور حکم کے باندھے ہوئے آسمان کی ہوا میں۔ کوئی نہیں تھام رہا ان کو سوائے اللہ کے ۱؎ اس میں نشانیاں ہیں

لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۷۹﴾

ان لوگوں کو جو یقین لاتے ہیں ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** (قدرت پر استدلال کے لئے) کیا لوگوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا کہ آسمان کے (تلے) فضاء میں (قدرت کے) مسخر ہو رہے ہیں (یعنی) ان کو (اس جگہ) کوئی نہیں تھامتا بجز اللہ کے (ورنہ پرندوں کے بدن کا بھاری ہونا اور ہوا جو ان کو گرنے سے روکتی ہے اس کا ہلکا اور لطیف ہونا طبعی طور پر اس کا تقاضہ کرتا ہے وہ نیچے گر پڑیں، اس لئے اس مذکورہ بات میں) ایمان والوں کے لئے (قدرت الٰہیہ کی) چند دلیلیں (موجود) ہیں۔

**اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ:** ''چند دلیلیں'' اس لئے فرمایا کہ پرندوں کو خاص ہیئت پر پیدا کرنا جس سے وہ اڑنے کے قابل ہیں یہ ایک دلیل ہے، پھر فضا یعنی آسمان و زمین کی درمیانی مسافت کو ایسے طرز پر پیدا کرنا جس میں اڑنا ممکن ہو یہ دوسری دلیل ہے، پھر پرندوں کے بدن بھاری ہونے کے باوجود ہلکی اور لطیف ہوا پر تھمے رہتے ہیں یہ تیسری دلیل ہے، اور جن اسباب کو اڑنے میں دخل ہے وہ سب اللہ ہی کے پیدا کئے ہوئے ہیں، پھر ان اسباب پر مسبب یعنی اڑان کا مرتب ہو جانا یہ بھی مشیت الٰہی ہے، ورنہ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی چیز کے اسباب موجود ہوتے ہوئے بھی وہ وجود میں نہیں آتی، اس لئے مَا یُمۡسِکُہُنَّ اِلَّا اللّٰہُ فرمایا گیا۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی جیسے آدمی کو اس کے مناسب قویٰ عنایت فرمائے، پرندوں میں ان کے حالات کے مناسب فطری قوتیں ودیعت کیں، ہر ایک پرندہ اپنی اڑان میں قانون قدرت کا تابع اور خدا تعالیٰ کے تکوینی احکام سے وابستہ ہے، اسے کسی درسگاہ میں اڑنے کی تعلیم نہیں دی گئی، قدرت نے اس کے پر اور بازو اور دم وغیرہ کی ساخت ایسی بنائی ہے کہ نہایت آسانی سے آسمانی فضا میں اڑتے رہتے ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ ان کا جسم ثقیل ہوائے لطیف کو چیر پھاڑ کر بے اختیار نیچے آ پڑے، یا زمین کی عظیم الشان کشش انھیں اپنی طرف کھینچ لے اور طیران سے منع کر دے، کیا خدا کے سوا کسی اور کا ہاتھ ہے جس نے ان کو بے تکلف فضائے آسمانی میں روک رکھا ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی ایمان لانے میں بعضے اٹکتے ہیں، معاش کی فکر سے، سو فرمایا کہ ماں کے پیٹ سے کوئی کچھ نہیں لاتا، کمائی کے اسباب کہ آنکھ، کان، دل وغیرہ ہیں، اللہ ہی دیتا ہے اور اڑتے جانور ادھر میں آخر کس کے بھروسہ رہتے ہیں''۔ اھ

وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡۢ بُیُوۡتِکُمۡ سَکَنًا وَّجَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ جُلُوۡدِ الۡاَنۡعَامِ بُیُوۡتًا تَسۡتَخِفُّوۡنَہَا

اور اللہ نے بنا دیے تم کو تمہارے گھر بسنے کی جگہ ۱؎ اور بنا دیے تم کو چوپاؤں کی کھال سے ڈیرے جو ہلکے رہتے ہیں تم پر

یَوۡمَ ظَعۡنِکُمۡ وَ یَوۡمَ اِقَامَتِکُمۡ ۙ وَ مِنۡ اَصۡوَافِہَا وَ اَوۡبَارِہَا وَ اَشۡعَارِہَاۤ اَثَاثًا

جس دن سفر میں ہو اور جس دن گھر میں ۲؎ اور بھیڑوں کی اون سے اور اونٹوں کی ببریوں سے ۳؎ اور بکریوں کے بالوں سے کتنے اسباب

وَّمَتَاعًا اِلٰی حِیۡنٍ ﴿۸۰﴾

اور استعمال کی چیزیں وقت مقرر تک ۴؎

**خلاصه تفسیر:** اور (قدرت کے دلائل واسباب نعمت میں سے ایک یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے تمہارے واسطے (حالت حضر میں) تمہارے گھروں میں رہنے کی جگہ بنائی (اور حالت سفر میں) تمہارے لئے جانوروں کی کھال کے گھر (یعنی خیمے) بنائے جن کو تم اپنے کوچ کے دن اور مقام (کرنے) کے دن ہلکا (پھلکا) پاتے ہو (اور اس وجہ سے اس کا لادنا اور نصب کرنا سب آسان معلوم ہوتا ہے) اور ان (جانوروں) کے اون اور ان کے روؤں اور ان کے بالوں سے (تمہارے) گھر کا سامان اور فائدے کی چیزیں ایک مدت تک کے لئے بنائیں (مدت تک اس لئے فرمایا کہ عادۃ یہ سامان بہ نسبت روئی کے کپڑوں کے دیر پا ہوتا ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ **مِّنۡۢ بُيُوۡتِكُمۡ سَكَنًا**: یعنی اینٹ، پتھر، لکڑی وغیرہ کے مکان۔

**فائدہ:** ۲؎ **يَوۡمَ ظَعۡنِكُمۡ وَيَوۡمَ اِقَامَتِكُمۡ**: یعنی اینٹ پتھر کے مکانوں کو کہیں منتقل نہیں کر سکتے تھے، اس لیے چمڑے اور اون وغیرہ کے ڈیرے خیمے بنانے سکھا دیے جو بسہولت منتقل کیے جا سکتے ہیں، سفر وحضر میں جہاں چاہو نصب کر لو اور جب چاہو لپیٹ کر رکھ دو، بعض نے: **يَوۡمَ ظَعۡنِكُمۡ وَيَوۡمَ اِقَامَتِكُمۡ** کا یہ مطلب لیا ہے کہ چلنے کے وقت اٹھانے میں اور کسی جگہ اترتے وقت نصب کرنے میں ہلکے رہتے ہیں۔

**فائدہ:** ۳؎ **وَاَوۡبَارِهَا**: یعنی اونٹ کی پشم سے۔

**فائدہ:** ۴؎ **اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيۡنٍ**: یعنی ان چیزوں سے کتنے سامان رہائش اور آسائش کے تیار کئے جاتے ہیں جو ایک وقت معین یا مدتِ دراز تک کام دیتے ہیں، اگر خدا تعالیٰ آنکھ، کان اور ترقی کرنے والے دل ودماغ نہ دیتا، کیا یہ سامان میسر آ سکتے تھے۔

**وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمۡ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمۡ مِّنَ الۡجِبَالِ اَكۡنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمۡ سَرَابِيۡلَ**

اور اللہ نے بنا دیے تمہارے واسطے اپنی بنائی ہوئی چیزوں کے سائے ۱؎ اور بنا دیں تمہارے واسطے پہاڑوں میں چھپنے کی جگہیں ۲؎ اور بنا دیے تم کو کرتے

**تَقِيۡكُمُ الۡحَرَّ وَسَرَابِيۡلَ تَقِيۡكُمۡ بَاۡسَكُمۡ ؕ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعۡمَتَهٗ عَلَيۡكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تُسۡلِمُوۡنَ﴿۸۱﴾**

جو بچاؤ ہیں گرمی میں ۳؎ اور کرتے جو بچاؤ ہیں لڑائی میں ۴؎ اسی طرح پورا کرتا ہے اپنا احسان تم پر تاکہ تم حکم مانو ۵؎

**خلاصه تفسیر:** اور (قدرت کے دلائل واسباب نعمت میں سے ایک یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اپنی بعض مخلوقات کے سائے بنائے (جیسے درخت ومکانات وغیرہ) اور تمہارے لئے پہاڑوں میں پناہ کی جگہیں بنائیں (یعنی غار وغیرہ جس میں گرمی، سردی، بارش، موذی دشمن جانور آدمی سے محفوظ رہ سکتے ہو) اور تمہارے لئے ایسے کرتے بنائے جو گرمی سے تمہاری حفاظت کریں اور ایسے کرتے (بھی) بنائے جو تمہاری آپس کی لڑائی (میں زخم لگنے) سے تمہاری حفاظت کریں (مراد زرہ ہے جس سے لڑائی میں زخم لگنے سے حفاظت رہتی ہے) اللہ تعالیٰ تم پر اسی طرح کی اپنی نعمتیں پوری کرتا ہے تاکہ تم (ان نعمتوں کے شکریہ میں) فرمانبردار رہو (اور اگرچہ ان نعمتوں میں بعض انسانوں کی بنائی ہوئی مصنوعات بھی ہیں مگر ان کا مادہ اور ان کے بنانے کا سلیقہ تو اللہ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے، اس لئے حقیقی منعم تو وہی ہیں)۔

**سَرَابِيۡلَ تَقِيۡكُمُ الۡحَرَّ**: یہاں انسان کو کرتے کی غرض صرف گرمی سے بچانے کو فرمایا ہے حالانکہ کرتہ انسان کو گرمی اور سردی دونوں سے بچاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم نے اسی سورۃ کے شروع میں **لَكُمۡ فِيۡهَا دِفۡءٌ** فرما کر لباس کے ذریعہ سردی سے بچنے اور گرمی حاصل کرنے کا ذکر پہلے کر دیا تھا، اس لئے یہاں صرف گرمی دور کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ **مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا**: مثلاً بادل، درخت، مکان اور پہاڑ وغیرہ کا سایہ قانون قدرت کے موافق زمین پر پڑتا ہے جس میں مخلوق آرام پاتی ہے۔

**فائدہ:** ۲ **وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا**: جہاں سر چھپا کر بارش، دھوپ یا دشمن وغیرہ سے اپنی حفاظت کر سکتے ہو۔

**فائدہ:** ۳ **سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ**: حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''جن کرتوں میں گرمی کا بچاؤ ہے، سردی کا بھی بچاؤ ہے، پر اس ملک میں گرمی زیادہ تھی اس کا ذکر خصوصیت سے فرمایا''۔

**فائدہ:** ۴ **وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَأْسَكُمْ**: یعنی زرہیں جو لڑائی میں زخمی ہونے سے بچاتی ہیں۔

**فائدہ:** ۵ **يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ**: یعنی دیکھو! کس طرح تمہاری ہر قسم کی ضروریات کا اپنے فضل سے انتظام فرمایا اور کیسی علمی و عملی قوتیں مرحمت فرمائیں جن سے کام لے کر انسان عجیب و غریب تصرفات کرتا رہتا ہے، پھر کیا ممکن ہے کہ جس نے مادی اور جسمانی دنیا میں اس قدر احسانات فرمائے، روحانی ترتیب و تکمیل کے سلسلے میں ہم پر اپنا احسان پورا نہ کرے گا، بیشک پورا کر چکا: **اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا** (المائدہ: ۳) ضروری ہے کہ سب لوگ اس کے احسان کے آگے گردنیں جھکا دیں اور اس منعم حقیقی اور محسن اعظم کے مطیع و منقاد ہو کر رہیں۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۲﴾ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا

پھر اگر پھر جائیں تو تیرا کام تو یہی ہے کھول کر سنا دینا ۱ پہچانتے ہیں اللہ کا احسان پھر منکر ہو جاتے ہیں

وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۳﴾ ع ۱۱

اور بہت ان میں ناشکر ہیں ۲

**خلاصہ تفسیر:** پھر (ان نعمتوں کے بعد بھی) اگر یہ لوگ ایمان سے اعراض کریں (تو آپ غم نہ کریں، آپ کا کوئی نقصان نہیں، کیونکہ) آپ کے ذمہ تو صرف صاف صاف پہنچا دینا ہے (اور ان کے اعراض کی وجہ یہ نہیں کہ وہ ان نعمتوں کو پہچانتے نہیں، بلکہ وہ لوگ) خدا کی نعمتوں کو تو پہچانتے ہیں مگر پہچان کر پھر (برتاؤ میں) اس کے منکر ہوتے ہیں (کہ جو برتاؤ منعم کے ساتھ کرنا چاہئے تھا یعنی عبادت و طاعت وہ برتاؤ دوسروں کے ساتھ کرتے ہیں) اور زیادہ ان میں (ایسے ہی) ناشکرے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی اگر اس قدر احسانات سن کر بھی خدا کے سامنے نہ جھکیں تو آپ کچھ غم نہ کھائیے، آپ اپنا فرض ادا کر چکے، کھول کھول کر تمام ضروری باتیں سنا دیں گئیں، آگے ان کا معاملہ خدا کے سپرد کیجئے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی بیشک بعضے بندے شکر گزار بھی ہیں: **وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ** (سبا: ۱۳) لیکن اکثروں کا حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات کو دیکھتے اور اس کے احسانات کو سمجھتے ہیں، مگر جب شکر گزاری اور اظہار اطاعت کا وقت آتا ہے تو سب بھول جاتے ہیں، گویا دل سے سمجھتے ہیں اور عمل سے انکار کرتے ہیں۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۸۴﴾

اور جس دن کھڑا کریں ہم ہر فرقہ میں ایک بتلانے والا پھر حکم (اجازت) نہ ملے منکروں کو اور نہ ان سے توبہ لی جائے

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے توحید اور نعمت کا ذکر کرتے ہوئے کفار کے شرک اور انکار نعمت کا بیان تھا، اب اس پر قیامت کے دن عذاب کی وعید سناتے ہیں:

اور (وہ دن یاد کرنے کے قابل ہے) جس دن ہم ہر ہر امت میں سے ایک ایک گواہ (کہ اُس امت کا پیغمبر ہوگا) قائم کریں گے (جو ان

کے برے اعمال کی گواہی دیں گے ) پھر ان کافروں کو (عذر و معذرت کرنے کی ) اجازت نہ دی جائے گی اور نہ ان سے حق تعالیٰ کے راضی کرنے کی فرمائش کی جائے گی (یعنی ان سے یوں نہ کہا جائے گا کہ تم توبہ یا کوئی عمل کر کے اللہ کو خوش کرلو، وجہ اس کی ظاہر ہے کہ آخرت دار الجزاء ہے دار العمل نہیں )۔

* * *

**فائدہ:** یہاں سے کفرو ناشکری کا انجام بتلاتے ہیں، یہ یاد رکھو! وہ دن بھی آنے والا ہے جب تمام اگلی پچھلی امتیں احکم الحاکمین کی آخری عدالت میں کھڑی ہوں گی اور ہر امت کا نبی بطور گواہ کھڑا کیا جائے گا تا کہ اپنی امت کے نیک و بد اور مطیع و عاصی کی نسبت شہادت دے کہ کس نے کیسا معاملہ حق کے پیغام اور پیغامبر کے ساتھ کیا ہے، اس وقت منکروں کو اجازت نہ ہوگی کہ کچھ لب کشائی کر سکیں یا اب بعد از وقت توبہ کر کے سزا سے چھوٹ جائیں اور لب کشائی کا ہے میں کریں گے، درآنحالیکہ انھیں اپنے مجرم ہونے اور کسی کی معذرت نہ چل سکنے کا پورا انکشاف ہو جائے گا، وہ یہ بھی سمجھ لیں گے کہ یہ "دار جزاء" ہے "دار عمل" نہیں جواب توبہ کر کے خطائیں معاف کرالیں۔

وَإِذَا رَاَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿٨٥﴾

اور جب دیکھیں گے ظالم عذاب کو پھر ہلکا نہ ہوگا ان سے اور نہ ان کو ڈھیل ملے

**خلاصہ تفسیر:** اور جب ظالم (یعنی کافر) لوگ عذاب کو دیکھیں گے (یعنی اس میں پڑیں گے ) تو وہ عذاب نہ ان سے ہلکا کیا جائے گا اور نہ وہ (اس میں ) کچھ مہلت دیئے جائیں گے ( کہ چندروز کے بعد وہ عذاب جاری کیا جائے )۔

* * *

**فائدہ:** یعنی نہ عذاب کی سختی میں کمی ہوگی اور نہ درمیان میں وقفہ ہوگا کہ تھوڑی دیر مہلت مل جائے، پھر از سرنو عذاب شروع ہو، بعض نے وَلَا يُنْظَرُوْنَ سے یہ مراد لیا ہے کہ جہنم کو دیکھنے کے بعد ایک منٹ کی ڈھیل نہ ملے گی، جہنم فوراً مجرمین کو اس طرح اچک لے گی جیسے پرند ایک دم دانہ اٹھا کر نگل جاتا ہے، گویا سرعت دخول کی طرف اشارہ ہوا۔

وَإِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ

اور جب دیکھیں مشرک اپنے شریکوں کو بولیں اے رب یہ ہمارے شریک ہیں جن کو ہم پکارتے تھے

دُوْنِكَ ۚ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿٨٦﴾

تیرے سوا۱ تب وہ ان پر ڈالیں گے بات کہ تم جھوٹے ہو ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور جب مشرک لوگ اپنے شریکوں کو (جن کو خدا کے سوا پوجتے تھے ) دیکھیں گے تو (جرم کے اقرار کے طور پر ) کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! وہ ہمارے شریک یہی ہیں کہ آپ کو چھوڑ کر ہم ان کی پوجا کرتے تھے، سو وہ (شرکاء ڈریں گے کہ کہیں ہماری کم بختی نہ آجائے اس لئے ) وہ ان کی طرف کلام کو متوجہ کریں گے کہ تم جھوٹے ہو (اصل مطلب ان کا یہ ہوگا کہ ہمارا تمہارا کوئی تعلق نہیں، جس سے مقصود ان کی اپنی حفاظت ہے، اب خواہ ان کا یہ مطلب صحیح ہو جیسا کہ اگر فرشتے، انبیاء علیہم السلام اور دوسرے مقبول بندے یہ بات کہیں تو صحیح ہے جیسا کہ ایک جگہ ارشاد ہے: بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اور خواہ یہ مطلب غلط ہو جیسا کہ اگر خود شیاطین ایسا کہنے لگیں اور یا ان کو صحیح اور غلط ہونے کی خبر ہی نہ ہو جیسے اگر بت اور درخت وغیرہ کہنے لگیں )۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی ہم تو ان کی بدولت مارے گئے، شاید یہ مطلب ہو کہ ہم بذات خود بے قصور ہیں، یا یہ کہ انھیں دہری سزا دیجئے۔

**فائدہ: ۲** یعنی جھوٹے ہو جو ہم کو خدا کا شریک ٹھہرالیا، ہم نے کب کہا تھا کہ ہماری عبادت کرو، فی الحقیقت تم محض اپنے اوہام وخیالات کو پوجتے تھے جس کے نیچے کوئی حقیقت نہ تھی، یا جن وشیاطین کی پرستش کرتے تھے، مگر وہاں شیطان بھی یہ کہہ کر الگ ہو جائے گا: **وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ** (ابراہیم: ۲۲) غرض جن چیزوں کو مشرکین نے معبود بنا رکھا تھا، سب اپنی علیحدگی اور بیزاری کا اظہار کریں گے، کوئی سچ کوئی جھوٹ، پتھر کے بتوں کو تو سرے سے کچھ خبر ہی نہ تھی، ملائکہ اور بعض انبیاء وصالحین ہمیشہ شرک سے سخت نفرت و بیزاری اور اپنی خالص بندگی کا اظہار کرتے رہے، رہ گئے شیاطین سو ان کا اظہار نفرت گو جھوٹ ہوگا، تاہم اس سے مشرکین کو کلی طور پر مایوسی ہو جائے گی کہ آج بڑے سے بڑا رفیق بھی کام آنے والا نہیں۔

**وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَىِٕذِ ِالسَّلَمَ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۸۷﴾**

اور آ پڑیں اللہ کے آگے اس دن عاجز ہو کر اور بھول جائیں (جائے گی ان سے) جو جھوٹ باندھتے تھے ۱

**اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ﴿۸۸﴾**

جو لوگ منکر ہوئے ہیں اور روکتے ہیں اللہ کی راہ سے ان کو ہم بڑھا دیں گے عذاب پر عذاب بدلہ اس کا جو شرارت کرتے تھے ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور یہ (مشرک اور کافر) لوگ اس روز اللہ تعالیٰ کے سامنے اطاعت کی باتیں کرنے لگیں گے، اور جو کچھ (دنیا میں) افتراء پردازیاں کرتے تھے (اس وقت) وہ سب گم ہو جائیں گی (اور ان میں) جو لوگ (خود بھی) کفر کرتے تھے اور (دوسروں کو بھی) اللہ کی راہ (یعنی دین) سے روکتے تھے ان کے لئے ہم ایک سزا پر (جو کہ کفر کے مقابلہ میں ہوگی) دوسری سزا بمقابلہ ان کے فساد کے (کہ راہ خدا سے روکتے تھے) بڑھا دیں گے (یعنی ایک سزا کفر کے مقابلہ میں ہوگی، اور دوسری سزا خدا کے دین سے دوسروں کو روکنے کے مقابلہ میں ہوگی)۔

* * *

**فائدہ: ۱** یعنی ساری طمطراق اور افتراء پردازیاں اس وقت غائب ہو جائیں گی سب عاجز ومقہور ہو کر خدا کے سامنے اپنی اطاعت وانقیاد کا اظہار کریں گے: **اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ** (مریم: ۳۸)

**فائدہ: ۲** یعنی ایک عذاب تو انکار حق پر، دوسرا اس پر کہ اوروں کو خدا کی راہ سے روکا، یا ایک عذاب صدور جرم پر دوسرا اس کی عادت ڈالنے پر، بہر حال آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح جنت میں اہل جنت کے منازل ومدارج متفاوت ہوں گے، جہنمیوں کا عذاب بھی کمّاً وکیفاً ونوعاً متفاوت ہوگا۔

**وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ**

اور جس دن کھڑا کریں گے ہم ہر فرقہ میں ایک بتلانے والا ان پر انہی میں کا اور تجھ کو لائیں بتلانے کو ان لوگوں پر ۱

**وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۸۹﴾**

اور اتاری ہم نے تجھ پر کتاب کھلا بیان ہر چیز کا ۲ اور ہدایت اور رحمت اور خوشخبری حکم ماننے والوں کے لیے ۳

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے وعید کے بیان میں انبیاء کا اپنی اپنی امت کے اعمال پر گواہی دینے کا ذکر تھا، اب جناب رسول ﷺ کا اپنی امت پر گواہی دینے کا ذکر فرماتے ہیں اور چونکہ یہ گواہی انبیاء کے لیے مخصوص ہے اس وجہ سے حضور ﷺ کی رسالت بھی اس سے معلوم ہوگئی، اس لیے یہاں **وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ** الخ سے رسالت پر استدلال فرماتے ہیں۔

اور (وہ دن بھی یاد کرنے اور لوگوں کے ڈرنے کا ہے) جس دن ہم ہر ہر امت کے ایک ایک گواہ جو انہی میں سے ہوگا ان کے مقابلہ میں قائم

کریں گے (مراد اس امت کا نبی ہے، اور انہی میں سے ہونا عام ہے، خواہ نسب میں بھی شریک ہوں یا صرف سکونت میں شریک ہوں) اور ان لوگوں کے مقابلہ میں آپ کو گواہ بنا کر لائیں گے (اور اس گواہی کی خبر دینے سے جو آپ کی رسالت مفہوم ہوتی ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ) ہم نے آپ پر قرآن اتارا ہے جو (کہ خود معجزہ بھی ہے، پھر رسالت کے ثبوت کا مدار ہے اور اس کے علاوہ ان خوبیوں کا جامع ہے:) کہ تمام (دین کی) باتوں کا (بواسطہ یا بلاواسطہ عام لوگوں کے لئے) بیان کرنے والا ہے اور (خاص) مسلمانوں کے واسطے بڑی ہدایت اور بڑی رحمت اور (ایمان پر) خوشخبری سنانے والا ہے۔

**وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ**: اس میں کتاب یعنی قرآن کو ''تمام باتوں کا بیان ہے'' فرمایا گیا، اس پر شبہ ہوتا ہے کہ قرآن میں تمام باتیں کہاں؟ سو خلاصہ تفسیر میں ''دین'' کی قید بڑھانے سے یہ شبہ ختم ہوجاتا ہے، یعنی مراد اس سے دین کی سب چیزیں اور باتیں ہیں، کیونکہ وحی ونبوت کا مقصد انہی چیزوں سے متعلق ہے، اس لئے معاشی فنون اور ان کے مسائل کو قرآن میں ڈھونڈنا ہی غلط ہے، اگر کہیں کوئی ضمنی اشارہ آجائے تو وہ اس کے منافی نہیں۔

رہا یہ سوال کہ قرآن کریم میں دین کے بھی تو سب مسائل مذکور نہیں تو تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ کہنا کیسے درست ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم میں اصول تو تمام مسائل کے موجود ہیں، انہی کی روشنی میں احادیث رسول ﷺ ان مسائل کا بیان کرتی ہیں اور کچھ تفصیلات کو اجماع وقیاس شرعی کے سپرد کردیا جاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ احادیث رسول کریم ﷺ اور اجماع وقیاس سے جو مسائل نکلے ہیں وہ بھی ایک حیثیت سے قرآن ہی کے بیان کئے ہوئے ہیں، خلاصہ یہ کہ دین کی جو بعض باتیں حدیث، اجماع اور قیاس سے ثابت ہیں وہ بھی قرآن ہی کے واسطہ سے ثابت ہیں، اس لیے کہ قرآن سے ان تینوں کا حجت ہونا ثابت ہے۔

* * *

**فائدہ: ۱ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ**: یعنی وہ ہولناک دن یاد رکھنے کے قابل ہے جب ہر ایک پیغمبر اپنی امت کے معاملات کے متعلق بارگاہ احدیت میں بیان دے گا، اور آپ (نبی کریم ﷺ) اس امت کی حالت بتلائیں گے بلکہ بعض مفسرین کے قول کے موافق آپ ان تمام شہداء کے لیے شہادت دیں گے کہ بیشک انہوں نے اپنا فرض منصبی بخوبی ادا کیا، حدیث میں آیا ہے کہ امت کے اعمال ہر روز حضور ﷺ کے روبرو پیش کیے جاتے ہیں، آپ اعمال خیر کو دیکھ کر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں اور بداعمالیوں پر مطلع ہو کر نالائقوں کے لیے استغفار فرماتے ہیں۔

**فائدہ: ۲ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ**: یعنی قرآن کریم میں تمام علوم ہدایت اور اصول دین اور فلاح دارین سے متعلق ضروری امور کا نہایت مکمل اور واضح بیان ہے، اس میں قیامت کے یہ واقعات بھی آگئے جن کا ذکر اوپر ہوا، اندریں صورت جس پیغمبر پر ایسی جامع کتاب اتاری گئی اس کی مسؤلیت اور ذمہ داری بھی بہت بھاری ہوگی گویا شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ کے بعد وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ فرما کر حضور ﷺ کے عظیم مرتبہ اور اسی مرتبہ کے مناسب مسؤلیت کی طرف لطیف اشارہ فرمادیا: فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ (الاعراف:٦) ابن کثیرؒ نے اس کو ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے۔

**فائدہ: ۳ وَهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ**: یعنی یہ کتاب سارے جہان کے لیے سرتاپا ہدایت اور مجسم رحمت ہے فرمانبردار بندوں کو شاندار مستقبل کی خوشخبری سناتی ہے۔

**اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ**

اللہ حکم کرتا ہے انصاف کرنے کا اور بھلائی کرنے کا اور قرابت والوں (کو) کے دینے کا ۱ اور منع کرتا ہے بے حیائی سے اور نامعقول کام سے

**وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿٩٠﴾**

اور سرکشی سے ۲ تم کو سمجھاتا ہے تاکہ تم یاد رکھو ۳

**خلاصه تفسیر:** گزشتہ آیت کے آخر میں یہ بتلایا تھا کہ یہ قرآن ہر شے کا بیان اور ایک جامع کتاب ہے، اور اہل ایمان کے لیے ہدایت، رحمت اور بشارت ہے، اب اس آیت میں اسی پر تنبیہ فرماتے ہیں، کیونکہ کسی کتاب کا ایسی تعلیمات پر مشتمل ہونا اس کی صاف دلیل ہے کہ وہ ان بیان کردہ اوصاف پر ضرور مشتمل ہے، گویا یہ آیت گزشتہ جملہ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى کی دلیل اور برہان ہے۔

بیشک اللہ تعالیٰ (قرآن میں) اعتدال اور احسان اور اہل قرابت کو دینے کا حکم فرماتے ہیں اور کھلی برائی اور مطلق برائی اور (کسی پر) ظلم (اور زیادتی) کرنے سے منع فرماتے ہیں (اس میں تمام اچھے اور برے اعمال سب آ گئے، اس جامع کلام سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ قرآن دین کی تمام باتوں کا بیان کرنے والا ہے، اور) اللہ تعالیٰ تم کو (مذکورہ باتوں کی) اس لئے نصیحت فرماتے ہیں کہ تم نصیحت قبول کرو (اور عمل کرو، کیونکہ قرآن کا ہدایت، رحمت اور بشارت ہونا اسی پر موقوف ہے)۔

**اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ:** اعتدال کی تین قسمیں ہیں: ① وہ عدل جو بندہ کے اور خدا کے درمیان ہے کہ تمام ممنوعات سے بچے اور احکام کو بجالائے اور خدا کی رضا کو اپنی خواہش پر مقدم کرے ② وہ عدل جو بندہ کے اور اس کے نفس کے درمیان ہے کہ نفس کو اس کی ہلاکت کے مقامات سے بچائے ③ وہ عدل جو بندہ کے اور مخلوق کے درمیان ہے کہ مخلوق کا خیر خواہ رہے، قول، فعل اور ارادہ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچائے، پس اس جگہ اعتدال قوت علمی و عملی کو عام ہے، اس میں سارے عقائد، ظاہری و باطنی اعمال غرض تمام شرعی احکام داخل ہو گئے، پھر ان میں سے ''احسان'' کو خاص طور پر ذکر کیا گیا، کیونکہ اس کا نفع دوسروں کو پہنچتا ہے، پھر احسان میں سے ''قرابت'' والوں کے ساتھ احسان کرنا زیادہ فضیلت و اہمیت رکھتا ہے، اس لیے احسان کے بعد اسے لائے۔

**وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ:** اسی طرح منہیات یعنی جن چیزوں سے منع کیا گیا ان میں لفظ ''منکر'' ہر برائی کو عام ہے، اس میں خلاف شرع تمام باتیں آ گئیں، پھر فحشاء یعنی بے حیائی کو زیادہ سخت قبیح ہونے کی وجہ سے بطور خاص سب سے پہلے ذکر فرمایا، اسی طرح ان منکرات میں سے بغی یعنی ظلم کو بطور خاص ذکر کیا گیا، کیونکہ اس کا نقصان دوسروں تک پہنچتا ہے، غرض اس طرح اس آیت میں تمام اچھے اور برے کام داخل ہو گئے، یہ آیت اصول اخلاق کے لیے جامع ترین ہے۔

* * *

**فائدہ: ۱بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى:** قرآن کو تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ فرمایا تھا، یہ آیت اس کا ایک نمونہ ہے، ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے ہر ایک خیر و شر کے بیان کو اس آیت میں اکٹھا کر دیا ہے، گویا کوئی عقیدہ، خلق، نیت، عمل، معاملہ اچھا یا برا ایسا نہیں جو امراً و نہیاً اس کے تحت میں داخل نہ ہو گیا ہو، بعض علماء نے لکھا ہے کہ اگر قرآن میں کوئی دوسری آیت نہ ہوتی تو تنہا یہ ہی آیت تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ کا ثبوت دینے کے لیے کافی تھی، شاید اسی لیے خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے خطبہ جمعہ کے آخر میں اس کو درج کر کے امت کے لیے اسوہ حسنہ قائم کر دیا، اس آیت کی جامعیت سمجھانے کے لیے تو ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے، تاہم تھوڑا سا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ آیت میں تین چیزوں کا امر فرمایا ہے: ① عدل ② احسان ③ ایتاء ذی القربیٰ۔

''عدل'' کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے تمام عقائد، اعمال، اخلاق، معاملات، جذبات، اعتدال و انصاف کے ترازو میں تلے ہوں، افراط و تفریط سے کوئی پلہ جھکنے یا اٹھنے نہ پائے، سخت سے سخت دشمن کے ساتھ بھی معاملہ کرے تو انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے، اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو جو بات اپنے لیے پسند نہ کرتا ہو اپنے بھائی کے لیے بھی پسند نہ کرے۔

''احسان'' کے معنی یہ ہیں کہ انسان بذات خود نیکی اور بھلائی کا پیکر بن کر دوسروں کا بھلا چاہے، مقام عدل و انصاف سے ذرا اور بلند ہو کر فضل و عفو اور تلطف و ترحم کی خو اختیار کرے، فرض ادا کرنے کے بعد تطوع کی طرف قدم بڑھائے انصاف کے ساتھ مروت کو جمع کرے، اور یقین رکھے کہ جو کچھ بھلائی کرے گا خدا اسے دیکھ رہا ہے، ادھر سے بھلائی کا جواب ضرور بھلائی کی صورت میں ملے گا: ''اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ

تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهٗ يَرَاكَ" (صحیح بخاری) هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (الرحمن: ۶۰)

یہ دونوں خصلتیں (یعنی عدل واحسان یا بالفاظ دیگر انصاف ومروت) تو اپنے نفس اور ہر ایک خویش وبیگانہ اور دوست ودشمن سے متعلق تھیں، لیکن اقارب کا حق اجانب سے کچھ زائد ہے، جو تعلقات قرابت قدرت نے باہم رکھ دیئے ہیں انھیں نظر انداز نہ کیا جائے، بلکہ اقارب کی ہمدردی اور ان کے ساتھ مروت واحسان اجانب سے کچھ بڑھ کر ہونا چاہیے، صلہ رحم ایک مستقل نیکی ہے جو اقارب ذوی الارحام کے لیے درجہ بدرجہ استعمال ہونی چاہیے، گویا "احسان" کے بعد "ذوی القربیٰ" کا بالتخصیص ذکر کر کے متنبہ فرما دیا کہ عدل وانصاف تو سب کے لیے یکساں ہے، لیکن مروت واحسان کے وقت بعض مواقع بعض سے زیادہ رعایت واہتمام کے قابل ہیں، فرق مراتب کو فراموش کرنا ایک طرح قدرت کے قائم کیے ہوئے قوانین کو بھلا دینا ہے، اب ان تینوں لفظوں کو ہمہ گیری کو پیش نظر رکھتے ہوئے سمجھ دار آدمی فیصلہ کر سکتا ہے کہ وہ کون سی فطری خوبی، بھلائی اور نیکی دنیا میں ایسی رہ گئی ہے جو ان تین فطری اصولوں کے احاطہ سے باہر ہو، فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ۔

**فائدہ: ۲۔ وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ:** منع بھی تین چیزوں سے کیا: ① فحشاء ② منکر ③ بغی، کیونکہ انسان میں تین قوتیں ہیں، جن کے بے موقع اور غلط استعمال سے ساری خرابیاں اور برائیاں پیدا ہوتی ہیں: ① قوت بہیمیہ شہوانیہ ② قوت وہمیہ شیطانیہ ③ قوت غضبیہ سبعیہ، غالباً **فحشاء** سے وہ بے حیائی کی باتیں مراد ہیں جن کا منشاء شہوت وبہیمیت کی افراط ہو۔

**منکر** معروف کی ضد ہے، یعنی نامعقول کام جن پر فطرت سلیمہ اور عقل صحیح انکار کرے، گویا قوت وہمیہ شیطانیہ کے غلبہ سے قوت عقلیہ ملکیہ دب جائے۔

تیسری چیز بغی ہے، یعنی سرکشی کر کے حد سے نکل جانا، ظلم وتعدی پر کمر بستہ ہو کر درندوں کی طرح کھانے پھاڑنے کو دوڑنا، اور دوسروں کے جان ومال یا آبرو وغیرہ لینے کے واسطے ناحق دست درازی کرنا، اس قسم کی تمام حرکات قوت سبعیہ غضبیہ کے بے جا استعمال سے پیدا ہوتی ہیں، الحاصل آیت میں تنبیہ فرما دی کہ انسان جب تک ان تینوں قوتوں کو قابو میں نہ رکھے اور قوت عقلیہ ملکیہ کو ان سب پر حاکم نہ بنائے، مہذب اور پاک نہیں ہو سکتا۔

**فائدہ: ۳۔ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ:** اکثم بن صفیؒ نے اس آیت کریمہ کو سن کر اپنی قوم سے کہا میں دیکھتا ہوں کہ یہ پیغمبر تمام عمدہ اور اعلیٰ اخلاق کا حکم دیتے ہیں اور کمینہ اخلاق واعمال سے روکتے ہیں، تو تم اس کے ماننے میں جلدی کرو، فَكُوْنُوْا فِيْ هٰذَا الْاَمْرِ رُءُوْسًا وَّ لَا تَكُوْنُوْا فِيْهِ اَذْنَابًا (یعنی تم اس سلسلہ میں سر بنو، دم نہ بنو) حضرت عثمان بن مظعونؓ فرماتے ہیں کہ اسی آیت کو سن کر میرے دل میں ایمان راسخ ہوا، اور محمد ﷺ کی محبت جاگزین ہوئی۔

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ

اور پورا کرو عہد اللہ کا جب آپس میں عہد کرو اور نہ توڑو قسموں کو پکا کرنے کے بعد اور تم نے کیا ہے (کر کے) اللہ کو

عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۹۱﴾

اپنا ضامن، اللہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو

**خلاصہ تفسیر:** گزشتہ آیت میں عدل کا حکم تھا، عدل کے مفہوم میں ایفاء عہد بھی داخل ہے، چنانچہ اب عدل میں سے ایک خاص امر یعنی عہد کی پابندی کی تاکید فرماتے ہیں جس پر تمام دینی اور دنیاوی کاموں کا دار ومدار ہے، خاص اس حکم کے ذکر کرنے کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ ابتدائے اسلام میں عہد کے پورا کرنے اور توڑنے کا اسلام پر ایک خاص اثر تھا، کیونکہ اسلام پر باقی رہنا یہ بھی وفائے عہد ہے، نیز صلح وجنگ میں اعتبار کا مدار بھی اسی پر تھا، نیز اس سے اسلام لانے والوں کو اپنے حقوق کے بارے میں پورا اطمینان ہوتا تھا جو اسلام کی قوت وترقی کا سبب تھا، اسی طرح عہد کے توڑنے میں اس کے برعکس نقصانات مرتب ہوتے تھے جس کا اسلام کو نقصان پہنچتا تھا۔

اورتم اللہ کے عہد کو (یعنی جس عہد کے پورا کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اسے) پورا کرو (اس سے وہ عہد نکل گیا جو خلاف شرع ہو، باقی سب جائز عہد خواہ حقوق اللہ کے متعلق ہوں یا حقوق العباد کے متعلق ہوں اس میں داخل ہو گئے) جبکہ تم اس کو (خاص طور پر یا عام طور پر) اپنے ذمہ کرلو (خاص طور پر یہ کہ صراحۃً کسی کام کا ذمہ لے لیا، اور عام طور پر یہ کہ ایمان لائے تو تمام ضروری احکام کو اس کے ضمن میں اپنے ذمہ لازم کرلیا) اور (بالخصوص جس عہد میں قسم بھی کھائی ہو وہ زیادہ قابل اہتمام ہیں، سو ان میں) قسموں کو ان کے مستحکم کرنے کے بعد (یعنی اللہ کا نام لے کر قسم کھانے کے بعد) مت توڑو اور تم (ان قسموں کی وجہ سے ان عہد میں) اللہ تعالیٰ کو گواہ بھی بنا چکے ہو (یہ قیدیں بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا اور قَدْ جَعَلْتُم قید واقعی ہیں، وفاء عہد پر تنبیہ کے لئے تصریح کی گئی) بیشک اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے جو کچھ تم کرتے ہو (اگر عہد پورا کرلیا تو ثواب ملے گا ورنہ سزا ہوگی)۔

* * *

**فائدہ:** اوپر کی آیت میں جن چیزوں کے کرنے یا چھوڑنے کا حکم تھا ان کے بعض افراد کو بالتخصیص بیان فرماتے ہیں، یعنی ایفائے عہد کی تاکید اور غدر و بدعہدی سے ممانعت کی یہ چیز علاوہ فی نفسہ مہتم بالشان ہونے کے اس وقت مخاطبین کے بہت زیادہ مناسب حال تھی جس کا مسلم قوم کے عروج و ترقی اور مستقبل کی کامیابی پر بے انتہاء اثر پڑنے والا تھا، اسی لیے حکم دیا کہ جب خدا کا نام لے کر اور قسمیں کھا کر معاہدے کرتے ہو تو خدا کے نام پاک کی حرمت قائم رکھو، کسی قوم سے یا کسی شخص سے معاہدہ ہو (بشرطیکہ خلاف شرع نہ ہو) مسلمان کا فرض ہے کہ اسے پورا کرے، خواہ اس میں کتنی ہی مشکلات اور صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑے، "قول مرداں جان دارد" خصوصاً جب خدا کا نام لے کر اور حلف کر کے ایک معاہدہ کیا ہے تو سمجھنا چاہیے کہ قسم کھانا گویا خدا کو اس معاملہ کا گواہ یا ضامن بنانا ہے، وہ جانتا ہے جب تم اسے گواہ بنا رہے ہو، اور یہ بھی جانتا ہے کہ کہاں تک اس گواہی کا لحاظ رکھتے ہو، اگر تم نے خیانت اور بدعہدی کی، وہ اپنے علم محیط کے موافق پوری سزا دے گا، کیونکہ تمہاری کسی قسم کی کھلی چھپی دغابازی اس سے مخفی نہیں رہ سکتی۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ؕ تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ

اور مت رہو جیسے وہ عورت کہ توڑا اُس نے اپنا سوت کاتا ہوا محنت (مضبوط کرنے) کے بعد ٹکڑے ٹکڑے ۱؎ کہ ٹھہراؤ اپنی قسموں کو

دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ؕ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ؕ

دخل دینے کا بہانہ ایک دوسرے میں (آپس میں) اس واسطے کہ ایک فرقہ ہو چڑھا ہوا دوسرے سے ۲؎ یہ تو اللہ پرکھتا ہے تم کو اس سے ۳؎

وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۲﴾

اور آئندہ کھول دے گا اللہ تم کو قیامت کے دن جس بات میں تم جھگڑ رہے تھے ۴؎

**خلاصہ تفسیر:** اور تم (عہد توڑ کر) اس (مکہ میں رہنے والی پاگل) عورت کے مشابہ مت بنو جس نے اپنا سوت کاتے پیچھے بوٹی بوٹی کر کے نوچ ڈالا کہ (اس کی طرح) تم (بھی) اپنی قسموں کو (توڑ کر ان کو) آپس میں فساد ڈالنے کا ذریعہ بنانے لگو (کیونکہ قسم اور عہد توڑنے سے موافقین کو بے اعتباری اور مخالفین کو برانگیختگی پیدا ہوتی ہے اور یہی اصل ہے فساد کی، اور توڑنا بھی محض اس وجہ سے کہ) ایک گروہ دوسرے گروہ سے (کثرت یا ثروت میں) بڑھ جائے (یعنی مثلاً کفار کی دو جماعتوں میں باہم مخالفت ہو اور تمہاری ایک سے صلح ہو جائے، پھر دوسری طرف پلہ جھکتا ہوا دیکھ کر صلح والی جماعت سے بدعہدی کر کے دوسری جماعت سے سازش کرنے لگو، یا مثلاً کوئی مسلمان ہو کر مسلمانوں میں شامل ہوا اور پھر کافروں کی طرف زور دیکھا تو عہد اسلام کو توڑ کر کافروں سے جا ملے، اور یہ جو ایک جماعت دوسری جماعت سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے یا دوسری کسی جماعت کے شامل ہو جانے سے بڑھ جاتی ہے تو) بس اس (زیادہ ہونے) سے اللہ تعالیٰ تمہاری آزمائش کرتا ہے (کہ دیکھیں عہد پورا کرتے ہو یا جھکتا پلہ دیکھ کر ادھر ڈھل جاتے ہو)

اور جن چیزوں میں تم اختلاف کرتے رہے (اور مختلف راہیں چلتے رہے) قیامت کے دن ان سب (کی حقیقت) کو تمہارے سامنے (عملا) ظاہر کر دے گا (کہ حق والوں کو ثواب اور باطل والوں کو سزا ہو جائے گی)۔

**فائدہ: ۱۔ غَزۡلَهَا مِنۢ بَعۡدِ قُوَّةٍ اَنۡكَاثًا:** یعنی عہد باندھ کر توڑ ڈالنا ایسی حماقت ہے جیسے کوئی عورت دن بھر سوت کاتے، پھر کتا کتایا سوت شام کے وقت توڑ کر پارہ پارہ کر دے، چنانچہ مکہ میں ایک دیوانی عورت ایسا ہی کیا کرتی تھی، مطلب یہ ہے کہ معاہدات کو محض کچے دھاگے کی طرح سمجھ لینا کہ جب چاہا کاتا اور جب چاہا انگلیوں کی ادنیٰ حرکت سے بے تکلف توڑ ڈالا سخت ناعاقبت اندیشی اور دیوانگی ہے، بات کا اعتبار نہ رہے تو دنیا کا نظام مختل ہو جائے، قول و قرار کی پابندی ہی سے عدل کی ترازو سیدھی رہ سکتی ہے، جو قومیں قانون عدل و انصاف سے ہٹ کر محض اغراض و خواہشات کی پوجا کرنے لگتی ہیں، ان کے یہاں معاہدات صرف توڑنے کے لیے رہ جاتے ہیں جہاں معاہد قوم کو اپنے سے کمزور دیکھا، سارے معاہدات ردی کی ٹوکری میں پھینک دیے گئے۔

**فائدہ: ۲۔ اَنۡ تَكُوۡنَ اُمَّةٌ هِىَ اَرۡبٰى مِنۡ اُمَّةٍ:** یعنی معاہدوں اور قسموں کو فریب و دغا، مکاری اور حیلہ سازی کا آلہ مت بناؤ، جس طرح اہل جاہلیت کی عادت تھی کہ ایک جماعت کو اپنے سے طاقتور دیکھ کر معاہدہ کر لیا پھر جس وقت کوئی جماعت اس سے بڑھ کر معزز اور طاقتور سامنے آئی، پہلا معاہدہ توڑ کر نئی جماعت سے عہد و پیمان گانٹھ لیے، پھر چند روز بعد ان خلفاء کو کمزور بنانے اور اپنے کو بڑھانے کا موقع پایا تو فوراً معاہدات توڑ ڈالے اور سب قسمیں اور حلف بالائے طاق رکھ دیئے، بعینہ جس طرح آجکل یورپین اقوام کا معمول ہے۔

**فائدہ: ۳۔ اِنَّمَا يَبۡلُوۡكُمُ اللّٰهُ بِهٖ:** یعنی قوت و ضعف میں اقوام کا اختلاف ان میں سے کسی کو اوپر چڑھانا کسی کو نیچے گرانا، خدا تعالیٰ نے تمہاری آزمائش کے لیے رکھا ہے اور ایفائے عہد کا حکم دینے میں بھی تمہارا امتحان ہے، دیکھتے ہیں کون ثابت قدم رہتا ہے کہ اپنا عہد پورا کرنے میں حلفاء کی قوت و ضعف کی کچھ پروا نہیں کرتا، باقی اِقبال و اِدبار کسی کے بدلے سے بدلا نہیں جاتا، ادبار کی جگہ اقبال اور ضعف کی جگہ قوت خدا ہی لائے تو آئے، ہاں! بدعہدی کا خیال آنا اس کی علامت ہے کہ اِدبار آنے والا ہے۔

**فائدہ: ۴۔ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ مَا كُنۡتُمۡ فِيۡهِ تَخۡتَلِفُوۡنَ:** یعنی یہاں امتحان ہے نتیجہ امتحان قیامت کے دن کھل جائے گا، جس وقت ضعف و طاقت کے سب جھگڑے چکا دیئے جائیں گے۔

وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنۡ يُّضِلُّ مَنۡ يَّشَآءُ وَيَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ

اور اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی فرقہ کر دیتا لیکن راہ بھلاتا ہے جس کو چاہے اور سجھاتا ہے جس کو چاہے ۱۔

وَلَتُسۡـَٔلُنَّ عَمَّا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۳﴾

اور تم سے پوچھ ہوگی جو کام تم کرتے تھے ۲۔

**خلاصہ تفسیر:** (اب اس اختلاف کی حکمت جملہ معترضہ کے طور پر اجمالا بیان فرماتے ہیں) اور (اگرچہ اللہ تعالیٰ کو یہ بھی قدرت تھی کہ اختلاف نہ ہونے دیتے، چنانچہ) اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو تم سب کو ایک ہی طریقہ کا بنا دیتا لیکن (حکمت کا تقاضا تھا جس کی تفصیل و تعیین یہاں ضروری نہیں) جس کو چاہتے ہیں بے راہ کر دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں راہ پر ڈال دیتے ہیں (چنانچہ ہدایت میں سے عہد کا پورا کرنا بھی ہے، اور گمراہی میں سے عہد کا توڑنا بھی ہے) اور (یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ جیسے دنیا میں گمراہوں کو پوری سزا نہیں ہوتی ایسے ہی آخرت میں مطلق العنان رہیں گے، ہرگز نہیں! بلکہ قیامت میں) تم سے تمہارے سب اعمال کی ضرور باز پرس ہوگی۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً: ایک حکمت کی طرف تو آیت :لو یؤاخذ الله الناس میں اشارہ ہو چکا ہے کہ اگر اس عالم میں سب نیک ہی لوگ ہوتے تو ان کی آبادی فرشتوں جیسی ہوتی، پھر آسمان کی آبادی سے جدا زمین کی آبادی کی کیا ضرورت رہتی، غرض زمین کی آبادی میں ہدایت اور گمراہی دونوں کا ہونا حکمت کا تقاضہ ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی اسے قدرت تھی کہ اختلاف نہ رہنے دیتا، مگر حکمت اس کو مقتضی نہ تھی جیسا کہ کئی مواقع میں ہم اس کی تقریر کر چکے ہیں۔

**فائدہ:** ۲ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''اس سے معلوم ہوا کہ کافر سے بھی غدر اور بدعہدی نہ کرے، کفران باتوں سے ہٹتا نہیں، اور اپنے اوپر وبال آتا ہے''۔

وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَتَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۹۴﴾

اور نہ ٹھہراؤ اپنی قسموں کو دھوکا (فریب) آپس میں کہ ڈگ (پھسل) نہ جائے کسی کا پاؤں جمنے کے پیچھے اور تم چکھو سزا اس بات پر کہ تم نے روکا اللہ کی راہ سے، اور تم کو بڑا عذاب ہو

**خلاصہ تفسیر:** اور (جیسے عہد وقسم توڑنے سے ظاہری نقصان ہوتا ہے جس کا اوپر بیان تھا اسی طرح اس سے باطنی نقصان بھی ہوتا ہے، آگے اسی کا ذکر ہے، یعنی) تم اپنی قسموں کو آپس میں فساد ڈالنے کا ذریعہ مت بناؤ (یعنی قسموں اور عہدوں کو مت توڑو) کبھی (اسے دیکھ کر) کسی اور کا قدم جمنے کے بعد نہ پھسل جائے (یعنی دوسرے بھی تمہاری تقلید کریں اور عہد توڑنے لگیں) پھر تم کو اس سبب سے کہ تم (دوسروں کے لئے) راہ خدا سے مانع ہوئے تکلیف بھگتنا پڑے (کیونکہ عہد کا پورا کرنا خدا کا حکم ہے، تم دوسروں کے لیے بھی اس کے توڑنے کا سبب بن گئے اور یہی ہے وہ باطنی نقصان کہ تم نے دوسروں کو بھی عہد توڑنے کی جرات دلائی) اور (وہ تکلیف یہ ہوگی کہ اس حالت میں) تم کو بڑا عذاب ہوگا۔

* * *

**فائدہ:** یعنی عہد شکنی کر کے اور قسمیں توڑ کر بدعہدی کی راہ مت نکالو، اور مسلمان قوم کو بدنام نہ کرو کہ تمہارے خراب اور پست کیرکٹر کو دیکھ کر یقین لانے والے شک میں پڑ جائیں اور غیر مسلم قومیں اسلام میں داخل ہونے سے رکنے لگیں، اور تم پر خدا کی راہ سے روکنے کا گناہ چڑھے جس کی سزا بڑی سخت ہوگی۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۵﴾

اور نہ لو اللہ کے عہد پر مول (مال) تھوڑا سا، بیشک جو اللہ کے یہاں ہے وہی بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم جانتے ہو

**خلاصہ تفسیر:** (اور جس طرح غالب جماعت میں شامل ہو کر عزت وجاہ حاصل کرنے کی غرض سے عہد توڑنا ممنوع ہے جس کا اوپر ذکر ہوا، اسی طرح مال حاصل کرنے کی غرض سے جو عہد توڑا ہو اس کی ممانعت فرماتے ہیں کہ) اور تم لوگ عہد خداوندی کے عوض میں (دنیا کا) تھوڑا سا فائدہ مت حاصل کرو (عہد خداوندی کے معنی تو پیچھے معلوم ہوئے اور تھوڑے فائدہ سے مراد دنیا ہے کہ باوجود زیادہ ہونے کے بھی قلیل ہی ہے، چنانچہ دنیا کی حقیقت اس طرح بیان فرمائی کہ) پس اللہ کے پاس جو چیز ہے (یعنی ذخیرہ آخرت) وہ تمہارے لئے (متاع دنیوی سے) بدرجہا بہتر ہے اگر تم سمجھنا چاہو (پس متاع آخرت زیادہ ہوئی اور متاع دنیا خواہ کتنی بھی ہو کم ہوئی)۔

* * *

**فائدہ:** پہلے مذکور تھا آپس میں قول توڑنے کا، اب اللہ سے قول توڑنے کا ذکر ہے یعنی مال کی طمع سے خلاف شرع حکم مت کرو، انجام کار ایسا مال وبال لائے گا، جو موافق شرع ہاتھ لگے، تمہارے حق میں وہ ہی بہتر ہے، (موضح القرآن) یا ایفائے عہد کا جو اجر خدا کے یہاں ملے گا وہ اس ثمن قلیل سے کہیں بہتر ہے، ثمن کو قلیل اس لیے کہا کہ اگر ساری دنیا بھی مل جائے تب بھی آخرت کے مقابلہ میں قلیل وحقیر ہے۔

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ۗ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ

جو تمہارے پاس ہے ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے کبھی ختم نہ ہوگا (سو رہنے والا ہے) ۱؎ اور ہم بدلے میں دینگے صبر کرنے والوں کو انکا حق

بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٦﴾

اچھے (بہتر) کاموں پر جو کرتے تھے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** (قلت وکثرت کے فرق کے علاوہ دوسرا فرق یہ بھی ہے کہ) جو کچھ تمہارے پاس (دنیا میں) ہے وہ (ایک روز) ختم ہو جائے گا (یا تو وہی زائل ہو جائے یا تم کو موت آجائے) اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ دائم رہے گا، اور جو لوگ (وفائے عہد اور دیگر احکام دین پر) ثابت قدم ہیں ہم ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر (یعنی مذکورہ باقی رہنے والی نعمت) ان کو ضرور دیں گے (پس عہد پورا کر کے بے شمار اور لازوال دولت کو حاصل کرو، اور تھوڑی سی فنا ہونے والی دنیا کے لئے عہد مت توڑا کرو)۔

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ: اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دی جانی چاہیے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ پھر باقی ودائم کو چھوڑ کر فانی وزائل کا پسند کرنا کہاں کی عقل مندی ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی جو لوگ خدا کے عہد پر ثابت قدم رہیں گے اور تمام مشکلات اور صعوبتوں کو صبر کے ساتھ برداشت کریں گے، ان کا اجر ضائع ہونے والا نہیں، ایسے بہترین عمل کا بدلہ ضرور ہمارے یہاں سے مل کر رہے گا۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ

جس نے کیا نیک کام مرد ہو یا عورت ہو اور وہ ایمان پر ہے تو اس کو ہم زندگی دیں گے ایک اچھی زندگی

وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٧﴾

اور بدلے میں دیں گے ان کو حق ان کا بہتر کاموں پر جو کرتے تھے

**خلاصہ تفسیر:** گذشتہ آیات میں ایفاء عہد کی تاکید اور عہد شکنی کی مذمت کا بیان تھا جو ایک خاص عمل ہے، آگے تمام اعمال صالحہ اور نیک کام کرنے والوں کی فضیلت کا عمومی بیان ہے خواہ عمل کرنے والے مرد ہوں یا عورتیں۔

(آخرت کا اجر وثواب اور دنیا کی برکات صرف ایفائے عہد میں منحصر نہیں، اور نہ کسی خاص شخص کی تخصیص ہے، بلکہ قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ) جو شخص بھی کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحب ایمان ہو (کیونکہ کافر کے نیک اعمال مقبول نہیں) تو ہم اس شخص کو (دنیا میں تو) بالطف زندگی دیں گے اور (آخرت میں) ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر دیں گے۔

فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً: حیات طیبہ سے یہ مراد نہیں کہ اسے فقر یا مرض کبھی نہ ہوگا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اطاعت کی برکت سے اس کے دل میں ایسا نور پیدا ہوگا جس سے وہ ہر حال میں شاکر، صابر اور رضا وتسلیم سے رہے گا، اطمینان اور سکون قلب کی اصل یہی ہے۔

روح المعانی میں بعض کا قول نقل کیا ہے کہ حیات طیبہ وہ ہے جو محبوب کے ساتھ ہو، اور اولیاء کو یہ دنیا میں بھی میسر ہو جاتا ہے۔

***

**فائدہ:** اوپر کی آیت میں صابرین اور ایفائے عہد کرنے والوں کے اجر کا ذکر تھا، یہاں تمام اعمالِ صالحہ کے متعلق عام ضابطہ بیان فرماتے ہیں، حاصل یہ ہے کہ جو کوئی مرد یا عورت نیک کاموں کی عادت رکھے، بشرطیکہ وہ کام صرف صورۃً نہیں بلکہ حقیقۃً نیک ہوں، یعنی ایمان اور معرفت صحیحہ کی روح اپنے اندر رکھتے ہوں تو ہم اس کو ضرور پاک، ستھری اور مزیدار زندگی عنایت کریں گے، مثلاً دنیا میں حلال روزی، قناعت و غنائے قلبی، سکون و طمانیت، ذکر اللہ کی لذت، حب الٰہی کا مزہ، ادائے فرض عبودیت کی خوشی، کامیاب مستقبل کا تصور، تعلق مع اللہ کی حلاوت جس کا ذائقہ چکھ کر ایک عارف نے کہا تھا:

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد　　در دل اگر بود ھوس ملک سنجرم

زانگه که یافتم خبر از ملك نیم شب　　من ملك نیم روز بیك جو نمی خرم

سچ ہے: "اَهْلُ اللَّيْلِ فِيْ لَيْلِهِمْ اَلَذُّ مِنْ اَهْلِ اللَّهْوِ فِيْ لَهْوِهِمْ" اسی لیے ایک بزرگ نے فرمایا کہ اگر سلاطین کو خبر ہو جائے کہ شب بیداروں کو رات کے اٹھنے میں کیا لذت و دولت حاصل ہوتی ہے، تو اس کے چھیننے کے لیے اسی طرح لشکر کشی کریں جیسے ملک گیری کے لیے کرتے ہیں، بہر حال مومن قانت کی پاک اور مزیدار زندگی یہیں سے شروع ہو جاتی ہے، قبر میں پہنچ کر اس کا رنگ اور زیادہ نکھر جاتا ہے، آخر انتہاء اس حیات طیبہ پر ہوتی ہے جس کے متعلق کہا ہے: حَيَاةٌ بِلَا مَوْتٍ، وَّغِنًى بِلَافَقْرٍ، وَصِحَّةٌ بِلَاسُقْمٍ، وَمُلْكٌ بِلَاهُلْكٍ، وَسَعَادَةٌ بِلَاشَقَاوَةٍ، رَزَقَنَا اللّٰهُ تَعَالٰى بِفَضْلِهٖ وَمَنِّهٖ اِيَّاهَا۔

**تنبیہ:** اس آیت نے بتلا دیا کہ قرآن کی نظر میں عورت اور مرد کی نیکی اور کامیابی کا ایک ہی ضابطہ ہے، یعنی عورت اور مرد بلا امتیاز اپنے اپنے حسب حال نیکی کر کے پاک زندگی حاصل کر سکتے ہیں۔

## فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۹۸﴾

سو جب تو پڑھنے لگے قرآن تو پناہ لے اللہ کی شیطان مردود سے

**خلاصہ تفسیر:** گذشتہ آیات میں پہلے ایفاء عہد اور پھر اعمال صالحہ کی تاکید و ترغیب کا بیان آیا، انسان کو شیطان کے بہکانے سے ان احکام میں غفلت پیدا ہوتی ہے، اس لیے اب حضور ﷺ کو اور آپ کے واسطہ سے سب مسلمانوں کو شیطان کے شر سے بچنے کا طریقہ بتلاتے ہیں۔

(جب عمل صالح کی فضیلت معلوم ہوگئی اور کبھی کبھی شیطان ان میں خلل ڈالتا ہے، کبھی وفائے عہد میں اور کبھی دوسرے عمل مثل قرآت قرآن میں بھی) تو (اے محمد ﷺ!) آپ اور آپ کے واسطہ سے آپ کی امت سن لیں کہ) جب آپ (کیسا ہی نیک کام کرنا چاہیں حتی کہ) قرآن پڑھنا چاہیں تو شیطان مردود (کے شر) سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کریں (پناہ مانگنے کی جو اصل حقیقت ہے یعنی دل سے خدا پر نظر رکھنا وہ تو واجب اور قراءت کے وقت زبان سے بھی پڑھ لینا مسنون ہے)۔

**فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ:** اس آیت میں شیطان رجیم سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے جس کی ضرورت ہر نیک عمل میں ہے، مگر اس آیت میں اس کو خاص طور سے قراءت قرآن کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، اس تخصیص کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ تلاوت قرآن ایک ایسا عمل ہے جس سے خود شیطان بھاگتا ہے، اسی لیے مشہور ہے: "دیو بگریزد ازاں قوم کہ قرآن خوانند" بعض خاص آیات اور سورتیں بالخاصہ شیطانی اثرات کو زائل کرنے کیلئے مجرب ہیں جن کا مؤثر و مفید ہونا نصوص شرعیہ سے ثابت ہے، اس کے باوجود جب تلاوت قرآن کے ساتھ شیطان سے تعوذ کا حکم دیا گیا تو دوسرے اعمال کے ساتھ اور بھی زیادہ ضروری ہوگیا، اس کے علاوہ خود تلاوت قرآن میں شیطانی وساوس کا بھی خطرہ رہتا ہے کہ تلاوت کے آداب میں کمی ہو جائے تدبر و تفکر اور خشوع خضوع نہ رہے تو اس کے لئے بھی وساوس شیطانی سے پناہ مانگنا ضروری سمجھا گیا۔

***

**فائدہ:** حدیث میں ہے: "خَیْرُ کُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرآنَ وَ عَلَّمَہ" (تم میں بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھلائے) معلوم ہوا کہ مومن کے لیے قرأتِ قرآن بہترین کام ہے، اور پچھلی آیات میں دو مرتبہ بہتر کاموں پر اجر ملنے کا ذکر تھا، اس لیے یہاں قرأتِ قرآن کے بعض آداب کی تعلیم فرماتے ہیں تاکہ آدمی بے احتیاطی سے اس بہتر کام کا اجر ضائع نہ کر بیٹھے، شیطان کی کوشش ہمیشہ یہ رہتی ہے کہ لوگوں کو نیک کاموں سے روکے خصوصاً قرأتِ قرآن جیسے کام کو جو تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے، کب ٹھنڈے دل سے گوارا کر سکتا ہے، ضرور اس کی کوشش ہوگی کہ مومن کو اس سے باز رکھے، اور اس میں کامیاب نہ ہو تو ایسی آفات میں مبتلا کر دے جو قرأتِ قرآن کا حقیقی فائدہ حاصل ہونے سے مانع ہوں، ان سب مغویانہ تدبیروں اور پیش آنے والی خرابیوں سے حفاظت کا یہی طریقہ ہو سکتا ہے کہ جب مومن قرأتِ قرآن کا ارادہ کرے، پہلے صدق دل سے حق تعالیٰ پر بھروسہ کرے اور شیطان مردود کی زد سے بھاگ کر خداوند قدوس کی پناہ میں آجائے، اصلی استعاذہ (پناہ میں آنا) تو دل سے ہے، مگر زبان و دل کو موافق کرنے کے لیے مشروع ہے کہ ابتدائے قرأت میں زبان سے بھی اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ پڑھے۔

اِنَّہٗ لَیْسَ لَہٗ سُلْطٰنٌ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ﴿۹۹﴾

اس کا زور نہیں چلتا پر جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں ۱؎

ع ۱۳/۱۹ اِنَّمَا سُلْطٰنُہٗ عَلَی الَّذِیْنَ یَتَوَلَّوْنَہٗ وَالَّذِیْنَ ھُمْ بِہٖ مُشْرِکُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

اس کا زور تو انہی پر ہے جو اس کو رفیق سمجھتے ہیں اور جو اس کو شریک مانتے ہیں ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** (شیطان کے شر سے پناہ مانگنے کا ہم اس لیے حکم دیتے ہیں کہ) یقیناً اس کا قابو ان لوگوں پر نہیں چلتا (یعنی شیطان کا وسوسہ ان پر مؤثر نہیں ہوتا) جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر (دل سے) بھروسہ رکھتے ہیں، بس اس کا قابو تو صرف ان ہی لوگوں پر چلتا ہے جو اس سے تعلق رکھتے ہیں اور ان لوگوں پر (قابو چلتا ہے) جو کہ اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔

**اِنَّہٗ لَیْسَ لَہٗ سُلْطٰنٌ:** اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کا مؤمن پر ذرا بھی زور نہیں چلتا، اس وقت جب مؤمن شیطان پر غالب آنا چاہے اور یہ امر مشاہد ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے شیطان کو ایسی قوت نہیں دی کہ وہ کسی بھی انسان کو برائی پر مجبور و بے اختیار کر دے، انسان خود اپنے اختیار وقدرت کو غفلت یا کسی غرض نفسانی سے استعمال نہ کرے تو یہ اس کا قصور ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی جس نے خدا پر بھروسہ کیا اور اس کی پناہ ڈھونڈی اس پر شیطان زور سے حاوی نہیں ہو سکتا، اگر ایسا شخص کسی وقت محض تھوڑی دیر کے لیے بمقتضائے بشریت شیطان کے چکمہ میں آیا بھی تب بھی شیطان اپنا قبضہ اور تسلط اس پر نہیں جما سکتا، بہت جلد اس کی آنکھ کھل جائے گی اور غفلت میں تمادی نہ ہوگی: اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّھُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَا ھُمْ مُّبْصِرُوْنَ وَ اِخْوَانُھُمْ یَمُدُّوْنَھُمْ فِی الْغَیِّ ثُمَّ لَا یُقْصِرُوْنَ (الاعراف:۲۰۱-۲۰۲)

**فائدہ:** ۲؎ یعنی جو لوگ از خود شیطان کو اپنا رفیق بنالیں اور بجائے ایک خدا پر بھروسہ کرنے کے اس پر بھروسہ رکھیں، گویا اس کو خدائی کا شریک ٹھہرالیں یا اس کے اغواء سے دوسری چیزوں کو خدا کا شریک مانیں، انہی پر شیطان کا پورا قبضہ اور تسلط ہے کہ جس طرح چاہتا ہے انگلیوں پر نچاتا ہے۔

وَإِذَا بَدَّلْنَآ ءَايَةً مَّكَانَ ءَايَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوٓا إِنَّمَآ أَنتَ مُفْتَرٍ ۭ

اور جب ہم بدلتے ہیں ایک آیت کی جگہ دوسری آیت، اور اللہ خوب جانتا ہے جو اتارتا ہے تو کہتے ہیں تو تو بنا لاتا ہے

بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٠١﴾

یہ بات نہیں پر اکثروں کو ان میں خبر نہیں

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے توحید کا، اور تمام احکام شرعیہ کا اجمالا اور بعض احکام کا تفصیلا ذکر تھا، آگے رسالت کے متعلق مخالفین کے شبہات کا جواب وعید کے ساتھ بیان فرماتے ہیں۔

اور جب ہم کسی آیت کو بجائے دوسری آیت کے بدلتے ہیں (یعنی ایک آیت کو لفظا یا معنا منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم بھیج دیتے ہیں) اور حالانکہ اللہ تعالیٰ جو حکم (پہلی مرتبہ یا دوسری مرتبہ) بھیجتا ہے (اس کی مصلحت و حکمت کو) وہی خوب جانتا ہے (کہ جن کو یہ حکم دیا گیا ہے ان کے حالات کے اعتبار سے ایک وقت میں مصلحت کچھ تھی، پھر حالت بدل جانے سے مصلحت اور حکمت دوسری ہوگئی) تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ (معاذ اللہ) آپ (خدا پر) افتراء کرنے والے ہیں (کہ اپنے کلام کو اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں، ورنہ اللہ کا حکم ہوتا تو اس کے بدلنے کی کیا ضرورت تھی، کیا اللہ تعالیٰ کو پہلے علم نہ تھا، جو لوگ نسخ کی حقیقت سے واقف نہیں وہ شیطان کے بہکاوے سے نسخ کا انکار کرنے لگتے ہیں، اسی لئے اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے فرمایا کہ رسول کریم ﷺ مفتری نہیں) بلکہ انہی میں اکثر لوگ جاہل ہیں (کہ وہ بلا دلیل نسخ کو کلام الٰہی کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں)۔

وَإِذَا بَدَّلْنَآ ءَايَةً مَّكَانَ ءَايَةٍ: نسخ دو طرح ہوتا ہے: ① ایک یہ کہ بعد میں پہلے حکم کا غلط ہونا ثابت ہو جائے، یہ تو خدا کے کلام میں نہیں ہوسکتا ② دوسرے یہ کہ پہلا حکم پہلی حالت کے مناسب تھا بعد میں حالت بدل گئی تو دوسرا حکم اس حالت کے مناسب بھیج دیا گیا، اس طرح کا نسخ کلام الٰہی میں ہوسکتا ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے طبیب ڈاکٹر ایک دوا تجویز کرتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ اس کے استعمال سے حالت بدلے گی اور پھر دوا دوسری دی جائے گی، مگر مریض کو ابتداء میں سب تفصیل نہیں بتلاتا، یہی حقیقت احکام کے نسخ کی ہے جو قرآن و سنت میں ہوتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** پہلے حکم دیا تھا کہ قرآن پڑھتے وقت شیطان رجیم کے کید سے پناہ ڈھونڈو، کہیں وہ اس بہترین کام میں رکاوٹ اور خرابی نہ ڈالے، یہاں اس کی بعض رکاوٹوں کا ذکر کرتے ہیں جو قرآن کے متعلق پیدا کرتا تھا، واقعہ یہ ہے کہ پورا قرآن ایک مرتبہ تو نازل ہوا نہیں، موقع بموقع آیات نازل ہوتی تھیں، ان میں بعض وقتی احکام بھی آتے تھے، پھر دوسرے وقت حالات کے تبدیل ہونے پر دوسرا حکم آجاتا تھا مثلاً ابتداء میں قتال سے ممانعت اور ہاتھ روکے رکھنے کا حکم تھا، ایک زمانہ کے بعد اجازت دی گئی، یا ابتداء میں حکم تھا: قُمِ الَّيْلَ إِلَّا قَلِيْلًا ۙ نِّصْفَهُ أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا (المزمل: ۲-۳) تھوڑی مدت کے بعد مکہ ہی میں یہ آیات نازل ہوئیں: عَلِمَ أَن لَّن تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (المزمل: ۲۰) کفار ایسی چیزوں کو سن کر اعتراض کرتے کہ یہ خدا کا کلام کیسے ہوسکتا ہے؟ کیا خدا تعالیٰ نے (معاذ اللہ) پہلے بے خبری سے ایک بات کا حکم دے دیا تھا؟ پھر خبر ہوئی تو دوسرا حکم اتارا؟ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام آپ خود بنا لاتے ہیں، ورنہ خدا کے احکام ایسے نہیں ہوسکتے ایک دن کچھ دوسرے دن کچھ، اس طرح کے شبہات و وساوس ممکن تھا شیطان بعض مسلمانوں کے دلوں میں القا کرے، اس کا جواب دیتے ہیں کہ تمہارا یہ اعتراض محض جہالت سے ہے، تم کو اگر ''نسخ'' کی حقیقت معلوم ہوتی تو کبھی ایسا لفظ زبان سے نہ نکالتے ''نسخ'' کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ ایک میعادی حکم کی میعاد پوری ہونے پر دوسرا حکم بھیجا جائے، کیا طبیب منضج کا نسخہ دس بیس دن پلا کر اگر مسہل تجویز کرے تو اسے طبیب کی کم علمی یا بے خبری پر محمول کیا جاسکتا ہے؟ جو ایسا کہے وہ خود جاہل اور بے خبر کہلائے گا، حق تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ جس وقت جو حکم اتارا گیا یعنی جو روحانی غذا یا دوا تجویز کی گئی وہ کہاں تک مریضوں کے مزاج اور حالات کے مناسب ہے۔

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

تو کہہ اسکو اتارا ہے پاک فرشتے نے تیرے رب کی طرف سے بلاشبہ ۱؎ تا کہ ثابت کرے ایمان والوں کو اور ہدایت اور خوشخبری مسلمانوں کے واسطے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** آپ (ان کے جواب میں) فرما دیجئے (کہ یہ کلام میرا بنایا ہوا نہیں، بلکہ اس کو) روح القدس (یعنی جبرئیل علیہ السلام) آپ کے رب کی طرف سے حکمت کے موافق لائے ہیں (اس لئے یہ اللہ کا کلام ہے، اور اس میں احکام کی تبدیلی حکمت و مصلحت کی وجہ سے ہوتی ہے، اور یہ کلام اس لئے بھیجا گیا ہے) تا کہ ایمان والوں کو (ایمان پر) ثابت قدم رکھے اور ان مسلمانوں کے لئے ہدایت اور خوش خبری (کا ذریعہ) ہو جائے (ان فوائد کے بڑھانے سے اس طرف اشارہ ہو گیا کہ ایسی نافع چیز سے یہ مخالفین فائدہ نہیں اٹھاتے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی میرا یا کسی بشر کا بنایا ہوا کلام نہیں، یہ تو وہ کلام ہے جو بلاشبہ میرے رب نے روح القدس (پاک فرشتہ جبرائیل امین) کے ذریعہ سے عین حکمت و مصلحت کے موافق مجھ پر نازل فرمایا گویا مِنْ رَّبِّكَ کہہ کر متنبہ فرما دیا کہ اس کی نازل کرنے والی وہ ہستی ہے جس نے خود محمد ﷺ کی اس قدر حیرت انگیز طریقہ سے ایسے اعلیٰ و اکمل اخلاق پر تربیت فرمائی جو تمہارے سامنے ہے، اور **روح القدس** کا واسطہ بیان فرما کر شاید اس طرف اشارہ کرنا ہو کہ جس کلام کا حامل **روح القدس** بنایا گیا، وہ روحانیت، پاکیزگی اور ملکوتی خصال کا پیکر ہونا چاہیے، چنانچہ دیکھ لو ان اوصاف میں اس شان کا کیا کوئی دوسرا کلام آسمان کے نیچے نظر آتا ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی موقع بموقع اور بتدریج احکام و آیات کا نزول دیکھ کر ایمان والوں کے دل قوی اور اعتقاد پختہ ہوتے ہیں کہ ہمارا رب ہمارے ہر حال اور زندگی کے ہر ایک دور سے پورا خبردار ہے اور نہایت حکمت سے ہماری تربیت کرتا ہے، جیسے حالات پیش آئیں ان کے موافق ہدایت و راہنمائی کرتا اور ہر کام پر اس کے مناسب خوشخبری سناتا ہے۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ

اور ہم کو خوب معلوم ہے کہ وہ کہتے ہیں اس کو تو سکھلاتا ہے ایک آدمی ۱؎ جس کی طرف تعریض کرتے ہیں اس کی زبان ہے عجمی

وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۳﴾

اور یہ قرآن زبان عربی ہے صاف ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** (اب کفار کے ایک اور لغو شبہ کا جواب ہے) اور ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ (ایک دوسری غلط بات) یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کو تو آدمی سکھلاتا ہے (اس سے مراد ایک عجمی رومی لوہار ہے جس کا نام بلعام یا مقیس تھا، وہ حضور ﷺ کی باتیں جی لگا کر سنتا تھا تو حضور بھی کبھی اس کے پاس جا بیٹھتے، اور وہ کچھ انجیل وغیرہ کو بھی جانتا تھا، اس پر کافروں نے یہ بات نکالی کہ یہی شخص حضور کو قرآن کا کلام سکھاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ قرآن مجید تو الفاظ و معانی کے مجموعہ کا نام ہے، تم لوگ اگر قرآن کریم کے معانی اور معارف کو نہیں پہچان سکتے تو کم از کم عربی زبان کی معیاری فصاحت و بلاغت سے تو ناواقف نہیں ہو تو اتنا تو تمہیں سمجھنا چاہئے کہ اگر بالفرض قرآن کے معانی اس شخص نے سکھلا دیئے ہوں تو کلام کے الفاظ اور ان کی ایسی فصاحت و بلاغت جس کا مقابلہ کرنے سے پورا عرب عاجز ہو گیا یہ کہاں سے آ گئی، کیونکہ) جس شخص کی طرف اس کی نسبت کرتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے اور یہ قرآن صاف عربی ہے (کوئی بیچارہ ایسی عبارت کیسے بنا سکتا ہے)۔

لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ: اور اگر کہا جائے کہ ممکن ہے کہ مضامین تو وہ شخص سکھلا دیتا ہو اور آپ ﷺ اپنے الفاظ میں ان کو

ادا کردیتے ہوں، سواس کا واضح جواب اس تحدی (چیلنج) سے پوری طرح ہو چکا ہے جو سورۃ بقرہ میں آچکا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے باذن خداوندی اپنی نبوت اور قرآن کی حقانیت کا معیار اسی کو قرار دے دیا تھا کہ اگر تمہارے کہنے کے مطابق یہ انسان کا کلام ہے تو تم بھی انسان ہو اور بڑی فصاحت و بلاغت کے مدعی ہو تو تم اس جیسا کلام زیادہ نہیں تو ایک آیت ہی کی برابر لکھ لاؤ، مگر سارا عرب باوجودیکہ آپ کے مقابلہ میں اپنا سب کچھ جان و مال قربان کرنے کو تیار تھا مگر اس چیلنج کو قبول کرنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی۔

* * *

**فائدہ: ۱۔ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ**: مشرکین کا اعتراض یہ تھا کہ قرآن شریف نہ خدا کا کلام ہے، ورنہ نسخ اس میں نہ ہوتا اور نہ یہ آپ کا کلام ہوسکتا ہے، کیونکہ آپ کا اُمی ہونا سب کو معلوم و مسلم تھا، ایک امی جس نے نہ کبھی کوئی کتاب چھوئی ہو نہ قلم ہاتھ میں پکڑا ہو، بلکہ باوجود اعلیٰ درجہ کے قریشی ہونے کے چالیس برس تک ایک شعر بھی زبان سے نہ کہا ہو، جس میں عرب کی چھوکریاں تک فطری سلیقہ اور ملکہ رکھتی تھیں، کیسے گمان کیا جاسکتا ہے کہ وہ بدون تعلیم و تعلم کے دفعتاً ایسی کتاب بنالائے جو اس قدر عجیب و غریب، علوم و حکم، موثر ہدایات اور کایا پلٹ کر دینے والے قوانین و احکام پر مشتمل ہو، ناگزیر کہنا پڑے گا کہ کوئی دوسرا شخص انھیں یہ باتیں سکھلاتا اور ایسا کلام بنا کر دے دیتا ہے، وہ شخص کون تھا جس کی بے اندازہ قابلیت سے قرآن جیسی کتاب تیار ہوئی اس کے نام میں اختلاف تھا جبر یسار عائش لعیش کئی عجمی غلاموں کے نام لیے گئے ہیں جن میں کوئی یہودی تھا کوئی نصرانی، بلکہ بعض کی نسبت کہا گیا ہے کہ وہ نصرانیت چھوڑ کر مذہب اسلام قبول کر چکے تھے، کہتے ہیں حضور گاہ بگاہ آتے جاتے ان میں سے کسی ایک کے پاس بیٹھتے تھے یا وہ حضور ﷺ کی خدمت میں کبھی حاضر ہوا کرتا تھا، مگر تعجب ہے اتنے بڑے قابل انسانوں کا تو نام بھی تاریخ نے پورے تیقن و تعین کے ساتھ یاد نہ رکھا، اور جو ان سے سیکھ کر محض نقل کر دیا کرتے تھے، دنیا ان کے قدموں پر گر پڑی ہے، حتیٰ کہ جنھوں نے ان کو نبی نہ مانا، دنیا کا سب سے بڑا مصلح اور کامل انسان ان کو بھی تسلیم کرنا پڑا، بہرحال مشرکین کے اس سفیہانہ اعتراض سے یہ ضرور ثابت ہو گیا کہ دعوائے بعثت سے پہلے آپ کا اُمی ہونا ان کے نزدیک ایسا مسلم تھا کہ قرآنی علوم و معارف کو آپ کی اُمیت مسلمہ سے تطبیق نہ دے سکتے تھے، اسی لیے کہنا پڑتا تھا کہ کوئی دوسرا شخص آپ کو یہ باتیں سکھلا جاتا ہے، بلاشبہ آپ سکھلائے ہوئے تھے، لیکن سکھلانے والا کوئی بشر نہ تھا، وہ رب قدیر تھا جس نے فرمایا: اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْآن

**فائدہ: ۲۔ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ**: یعنی اگر قرآن کے علوم خارقہ اور دوسری وجوہِ اعجاز کو اپنی غباوت کی وجہ سے تم نہیں سمجھ سکتے تو اس کی زبان کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کا ادراک تو کر سکتے ہو، جس کے متعلق بار بار چیلنج دیا جا چکا اور اعلان کیا جا چکا ہے کہ تمام جن و انس مل کر بھی اس کلام کا مثل پیش نہ کرسکیں گے، پھر جس کا مثل لانے سے عرب کے تمام فصحاء و بلغاء بلا استثناء احدے عاجز و درماندہ ہوں ایک گمنام عجمی بازاری غلام سے کیونکر امید کی جاسکتی ہے کہ ایسا کلام معجز تیار کر کے پیش کر دے، اگر تمام عرب میں کوئی شخص بالفرض ایسا کلام بنا سکتا تو وہ خود حضرت محمد ﷺ ہوتے، مگر قرآن کے سوا آپ کے دوسرے کلام کا ذخیرہ قرآن کے بیان کردہ موضوعات پر موجود ہے، جو باوجود انتہائی فصاحت کے کسی ایک چھوٹی سے چھوٹی سورتِ قرآنی کی ہمسری نہیں کرسکتا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾

وہ لوگ جن کو اللہ کی باتوں پر یقین نہیں، ان کو اللہ راہ نہیں دیتا اور ان کے لیے عذاب دردناک ہے ۱۔

اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

جھوٹ تو وہ لوگ بناتے ہیں جن کو یقین نہیں اللہ کی باتوں پر، اور وہی لوگ جھوٹے ہیں ۲۔

**خلاصہ تفسیر**: (اب منکرین نبوت اور قرآن پر ایسے اعتراضات کرنے والوں کو دھمکی ہے کہ) جو لوگ اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے (جیسے یہ لوگ قرآن کی آیتوں کے منکر ہیں) ان کو اللہ تعالیٰ کبھی راہ پر نہ لائیں گے اور ان کے لئے دردناک سزا ہوگی (اور یہ لوگ جو نعوذ باللہ

آپ کو مفتری کہتے ہیں سو) بس جھوٹ افتراء کرنے والے تو یہی لوگ ہیں جو اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں رکھتے (چنانچہ نبی کو مفتری کہنا کتنا بڑا بہتان ہے) اور یہ لوگ ہیں پورے جھوٹے (کیونکہ مخلوق پر جھوٹ اور بہتان لگانے سے خالق پر بہتان باندھنا زیادہ سخت ہے، جب ان لوگوں نے کلام اللہ کا انکار کیا تو خدا پر جھوٹ باندھا کہ ان کی کہی ہوئی بات کو یوں کہا کہ خدا نے نہیں کہی)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی کھلے دلائل کے باوجود جو شخص یہ ہی دل میں ٹھان لے کہ یقین نہیں کروں گا، خدا تعالیٰ بھی اس کو مقصد پر پہنچنے کی راہ نہیں دیتا، جتنا سمجھایئے کبھی نہ سمجھے گا، بداعتقاد آدمی ہدایت سے محروم رہ کر آخر سخت سزا کا مستحق ہوتا ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی آپ کو کہتے ہیں: اِنَّمَآ اَنۡتَ مُفۡتَرٍ حالانکہ آپ کی امانت وراستبازی پہلے سے مسلم اور ہر ایک چال ڈھال سے ظاہر تھی، کیا جھوٹ بنانے والوں کا چہرہ اور طور وطریق ایسا ہوتا ہے؟ جھوٹ بنانا تو ان اشقیاء کا شیوہ ہے جو خدا کی باتیں سن کر اور اس کے نشانات دیکھ کر بھی یقین نہ کریں، اس سے بڑا جھوٹ کیا ہوگا کہ آدمی خدا کی باتوں کو جھوٹا کہے۔

مَنۡ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ اِيۡمَانِهٖۤ اِلَّا مَنۡ اُكۡرِهَ وَقَلۡبُهٗ مُطۡمَئِنٌّۢ بِالۡاِيۡمَانِ

جو کوئی منکر ہوا اللہ سے یقین لانے کے پیچھے مگر وہ نہیں جس پر زبردستی کی گئی اور اس کا دل برقرار ہے ایمان پر ۱؎

وَلٰكِنۡ مَّنۡ شَرَحَ بِالۡكُفۡرِ صَدۡرًا فَعَلَيۡهِمۡ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۰۶﴾

ولیکن جو کوئی دل کھول کر منکر ہوا سو ان پر غضب ہے اللہ کا، اور ان کو بڑا عذاب ہے

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے منکرین توحید ورسالت کے حق میں وعیدیں تھیں، اب خاص ان لوگوں کے لیے وعید مذکور ہے جو ایمان لا کر کافر ہو جائیں، ہاں! اگر کوئی کسی کے اکراہ اور زبردستی سے کلمہ کفر کہنے پر مجبور ہو جائے وہ اس سے مستثنیٰ ہے، اِلَّا مَنۡ اُكۡرِهَ میں اسی کا بیان ہے۔

جو شخص ایمان لانے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کرے (اس میں رسول کے ساتھ کفر کرنا اور انکار قیامت وغیرہ سب داخل ہیں) مگر جس شخص پر (کافروں کی طرف سے) زبردستی کی جائے (کہ اگر تو کفر کی فلاں بات یا فلاں کام نہ کرے گا تو ہم تجھے قتل کر دیں گے مثلا اور حالات سے اس کا اندازہ بھی ہو کہ وہ ایسا کر سکتے ہیں) بشرطیکہ اس کا قلب ایمان پر مطمئن ہو (یعنی عقیدے میں کوئی فتور نہ آئے اور اس قول وفعل کو سخت گناہ اور برا سمجھتا ہو تو وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہے کہ اس کو ظاہر میں کفر کا ارتکاب کر لینا عذر کی بناء پر جائز ہے، اس لئے ارتداد کی جو وعید آ رہی ہے وہ ایسے شخص کے لئے نہیں) لیکن ہاں جو جی کھول کر (یعنی اس کفر کو صحیح اور اچھا سمجھ کر) کفر کرے تو ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوگا اور ان کو بڑی سزا ہوگی۔

**وَلٰكِنۡ مَّنۡ شَرَحَ بِالۡكُفۡرِ صَدۡرًا:** چونکہ کسی بھی وسوسہ میں شرح صدر یعنی دل کا ارادہ شامل نہیں ہوتا اور نہ اختیار ہوتا ہے، بلکہ وسوسہ کی بے اختیاری تو اکراہ کی بے اختیاری سے بھی زیادہ ہوتی ہے اس لیے وسوسہ آنے پر کوئی گناہ نہیں (البتہ وسوسہ اختیار وارادہ سے لانا اور اس میں مشغول ہو جانا برا ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ ایک تو وہ مجرم ہیں جو سینکڑوں دلائل وآیات سن کر بھی یقین نہ لائیں، مگر ان سے بڑھ کر مجرم وہ ہیں جو یقین لانے اور تسلیم کرنے کے بعد شیطانی شبہات ووساوس سے متاثر ہو کر صداقت سے منکر ہو جائیں، جیسا کہ عبداللہ بن ابی سرح نے کیا تھا کہ ایمان لانے کے بعد مرتد ہو گیا، العیاذ باللہ، ایسے لوگوں کی سزا آگے بیان فرمائی ہے، درمیان میں اِلَّا مَنۡ اُكۡرِهَ الخ سے ایک ضروری استثناء کر دیا گیا، یعنی اگر کوئی مسلمان صدق دل سے برابر ایمان پر قائم ہے ایک لمحہ کے لیے بھی ایمانی روشنی اور قلبی طمانیت اس کے قلب سے جدا نہیں ہوئی صرف کسی خاص حالت میں بہت ہی سخت دباؤ اور زبردستی سے مجبور ہو کر شدید ترین خوف کے وقت گلوخلاصی کے لیے محض زبان سے منکر ہو جائے یعنی کوئی کلمہ اسلام کے خلاف نکال دے بشرطیکہ اس

وقت بھی قلب میں کوئی تر دد نہ ہو، بلکہ زبانی لفظ سے سخت کراہیت ونفرت ہو، ایسا شخص مرتد نہیں بلکہ مسلمان ہی سمجھا جائے گا، ہاں اس سے بلند مقام وہ ہے کہ آدمی مرنا قبول کرے مگر منہ سے بھی ایسا لفظ نہ نکالے جیسا کہ حضرت بلال حضرت یاسر حضرت سمیہ، حضرت خبیب بن زید انصاری اور حضرت عبد اللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہم وغیرہ کے واقعات تاریخوں میں موجود ہیں، بنظر اختصار ہم یہاں درج نہیں کر سکتے ابن کثیر میں دیکھ لیے جائیں۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝١٠٧

یہ اس واسطے کہ انہوں نے عزیز رکھا دنیا کی زندگی کو آخرت سے، اور اللہ راستہ نہیں دیتا منکر لوگوں کو

**خلاصہ تفسیر:** (اور) یہ (غضب اور عذاب) اس سبب سے ہوگا کہ انہوں نے دنیوی زندگی کو آخرت کے مقابلہ میں عزیز رکھا، اور اس سبب سے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ایسے کافر لوگوں کو (جو دنیا کو ہمیشہ آخرت پر ترجیح دیں) ہدایت نہیں کیا کرتا (یہ دو سبب الگ الگ نہیں، بلکہ دونوں مل کر ایک سبب ہیں)۔

**ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا:** حاصل یہ ہے کہ بندہ کی طرف سے کسی فعل کے ارادہ کے بعد عادۃ اللہ یوں جاری ہے کہ حق تعالیٰ اس فعل کو پیدا کر دیتے ہیں، اور وہ فعل بندہ کے ہاتھوں صادر ہو جاتا ہے، پس جب کفار نے دنیا کو آخرت کے مقابلہ میں عزیز رکھا اور ہدایت سے بے رخی کی (یہ ان کا ارادہ ہوا) تو حق تعالیٰ نے بھی ان کو ہدایت نہ کی (یعنی ان کے ارادہ کو پورا کر دیا)۔

اس آیت میں حب دنیا کی مذمت کی صراحت ہے، دنیا کی وہ محبت بری ہے جو دنیا کو آخرت پر ترجیح وفضیلت دے، رہی وہ محبت جو طبعی وفطری ہے وہ بری نہیں، تقاضہ بشریت کے مطابق ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی ایسے منکروں کو جو حیاتِ دنیا ہی کو کعبۂ مقصود ٹھہرالیں، کامیابی کا راستہ کہاں ملتا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ”جو کوئی ایمان سے پھرا ہے تو دنیا کی غرض کو، جان کے ڈر سے یا برادری کی خاطر سے یا زر کے لالچ سے جس نے دنیا عزیز رکھی اس کو آخرت کہاں؟ اگر جان کے ڈر سے لفظ کہے تو چاہیے جب ڈر کا وقت جا چکے پھر توبہ واستغفار کر کے ثابت ہو جائے“۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝١٠٨

یہ وہی ہیں کہ مہر کر دی اللہ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر اور آنکھوں پر، اور یہی ہیں بیہوش [1]

لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝١٠٩

خود ظاہر ہے کہ آخرت میں یہی لوگ خراب ہیں [2]

**خلاصہ تفسیر:** یہ وہ لوگ ہیں کہ (دنیا میں ان کے کفر پر اصرار کی حالت یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر اور آنکھوں پر مہر لگا دی ہے، اور یہ لوگ (انجام سے) بالکل غافل ہیں (اس لئے) لازمی بات ہے کہ آخرت میں یہ لوگ بالکل گھاٹے میں رہیں گے۔

* * *

**فائدہ:** [1] یعنی دنیا طلبی اور ہوا پرستی کے نشہ میں ایسے مست وبیہوش ہیں جن کے ہوش میں آنے کی کوئی امید نہیں، خدا کی دی ہوئی قوتیں انہوں نے سب بیکار کر دیں، آخر کانوں سے حق کی آواز سننے، آنکھوں سے حق کے نشان دیکھنے، اور دلوں سے حق بات سمجھنے اور سوچنے کی توفیق سلب ہوگئی، مہر کرنے کا مطلب پہلے سورہ بقرہ وغیرہ میں گزر چکا ہے۔

**فائدہ:** [2] یعنی جو لوگ اپنی بے اعتدالیوں اور غلط کاریوں سے خدا کی بخشی ہوئی قوتیں تباہ کر ڈالیں اور دنیا ہی کو قبلہ مقصود بنالیں، ان سے

بڑھ کر خراب انجام کس کا ہوگا۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۙ

پھر بات یہ ہے کہ تیرا رب ان لوگوں پر کہ انہوں نے وطن چھوڑا ہے بعد اسکے کہ مصیبت اٹھائی (بچلائے گئے) پھر جہاد کرتے رہے اور قائم رہے

ع ۱۴ ۲۰ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾

بیشک تیرا رب ان باتوں کے بعد بخشنے والا مہربان ہے

**خلاصہ تفسیر:** پچھلی آیت میں کفر پر وعید کا ذکر تھا، خواہ کفر اصلی ہو یا ارتدادی، اب فرماتے ہیں کہ ایمان ایسی دولت ہے کہ جو کافر یا مرتد سچا ایمان لے آئے تو اس کے پچھلے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

پھر (اگر کفر کے بعد یہ لوگ ایمان لے آئیں تو) بیشک آپ کا رب ایسے لوگوں کے لئے کہ جنہوں نے مبتلاء کفر ہونے کے بعد (ایمان لا کر) ہجرت کی، پھر جہاد کیا، اور (ایمان پر) قائم رہے تو آپ کا رب (ایسے لوگوں کے لئے) ان (اعمال) کے بعد بڑی مغفرت کرنے والا بڑی رحمت کرنے والا ہے (یعنی ایمان اور اعمال صالحہ کی برکت سے سب پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے، اور اللہ تعالی کی رحمت سے ان کو جنت میں بڑے بڑے درجے ملیں گے)۔

زمانہ کفر کے گناہ صرف ایمان لانے سے معاف ہو جاتے ہیں جہاد و دیگر اعمال صالحہ معافی کے لیے شرط نہیں، لیکن اعمال صالحہ جنت کے بڑے درجات ملنے کے اسباب ہیں، اس لئے اعمال صالحہ کا ذکر ساتھ کر دیا گیا، اور ''رحمت'' سے مراد رحمت کاملہ ہے یعنی بلند درجات، جس کے لیے عادۃً ایمان کے بعد مزید اعمال کی بھی ضرورت ہوتی ہے، ورنہ نفس مغفرت و رحمت تو صرف ایمان لانے ہی سے ہو جاتی ہے، اور اگر آیت میں نفس رحمت مراد لی جائے تب بھی مغفرت و رحمت کے لیے مجموعہ ایمان و اعمال کے سبب ہونے سے شرط ہونا لازم نہیں آتا خوب سمجھ لو۔

* * *

**فائدہ:** مکہ میں بعضے لوگ کافروں کے ظلم سے بچل گئے تھے، یا صرف زبانی لفظ کفر کہہ لیا تھا، اس کے بعد جب ہجرت کی، جہاد کیا، اور بڑے استقلال و پامردی سے اسلام پر قائم رہے، اتنے کام ایمان کے کیے، وہ تقصیر بخشی گئی اور خدا کی مہربانی مبذول ہوئی ایک بزرگ تھے عمار، ان کے باپ تھے یاسر اور ماں سمیہ دونوں ظلم اٹھاتے مر گئے، پر لفظ کفر نہ کہا، یہ مسلمانوں کا پہلا خون تھا جو خدا کی راہ میں گرا، بیٹے (عمار) نے خوف جان سے لفظ کہہ دیا پھر روتے ہوئے حضرت کے پاس آئے، تب یہ آیتیں اتریں، رضی اللہ عنہم اجمعین۔

يَوْمَ تَاْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

جس دن آئے گا ہر جی جواب سوال کرتا اپنی طرف سے ۱؎ اور پورا ملے گا ہر کسی کو جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہ ہوگا ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے کفار کے حق میں وعید اور مؤمنین کے حق میں وعدہ مذکور ہے، اب اس وعدہ اور وعید کے ظاہر ہونے کا وقت بیان فرماتے ہیں کہ یہ جزا و سزا سب قیامت کے دن ہی ہونے والی ہے۔

(اور یہ جزا و سزا اُس روز واقع ہوگی) جس روز ہر شخص اپنی اپنی طرف داری میں گفتگو کرے گا (اور دوسروں کو نہ پوچھے گا) اور ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا بدلہ ملے گا (یعنی نیکی کے بدلے میں کمی نہ ہوگی، اگرچہ اللہ کی رحمت سے اضافہ ہو جانے کا امکان ہے اور بدی کے بدلے میں زیادتی نہ ہوگی، ہاں! یہ ممکن ہے کہ رحمت سے اس میں کچھ کمی ہو جائے) اور (یہی مطلب ہے اس کا کہ) ان پر ظلم نہ کیا جائے گا۔

**كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا:** اس سے شفاعت یعنی سفارش کی نفی کا شبہ نہیں ہوتا، کیونکہ سفارش اپنی رائے سے نہیں ہوگی بلکہ حق تعالی

کی اجازت کے بعد ہوگی، پس گویا کہ وہ سفارش کرنے والے کی طرف منسوب ہی نہیں ہے اور یہاں اس گفتگو کا ذکر ہے جو اپنی رائے سے ہو۔

* * *

**فائدہ: ۱** یعنی ایک کی طرف سے دوسرا نہ بول سکے گا، ماں، باپ، بہن، بھائی، بیوی، اولاد، احباب واقارب کوئی کام نہ دے گا، ہر شخص اپنی فکر میں پڑا ہوگا کہ کس طرح خدا کے عذاب سے مخلصی حاصل کرے، طرح طرح کے جھوٹے سچے عذر برأت کے لیے تراشے گا جواب وسوال کر کے چاہے گا رستگاری حاصل کرے۔

**فائدہ: ۲** یعنی نیکی کے ثواب میں کمی نہ ہوگی اور بدی کی سزا استحقاق سے زائد نہ دی جائے گی۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ

اور بتلائی اللہ نے ایک مثال (مثل) ایک بستی تھی چین امن سے ۱ چلی آتی تھی اس کو روزی فراغت کی ہر جگہ سے ۲ پھر ناشکری کی

بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

اللہ کے احسانوں کی پھر چکھایا اس کو اللہ نے مزہ کہ ان کے تن کے کپڑے ہو گئے بھوک اور ڈر بدلہ اس کا جو وہ کرتے تھے ۳

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے کفر پر اخروی عذاب کی وعید بیان تھی، اب اس کے بعد یہ بتلاتے ہیں کہ اگرچہ کفر اور گناہوں کی اصلی سزا تو قیامت کے دن ہی ملے گی، مگر کبھی دنیا میں بھی بعض گناہوں کی سزا کچھ مل جاتی ہے۔

اور اللہ تعالیٰ (کفر کے وبال پر متنبہ کرنے کے لیے) ایک بستی والوں کی حالت عجیبہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ (بڑے) امن واطمینان میں (رہتے) تھے (اور) ان کے کھانے پینے پہننے کی چیزیں بڑی فراغت سے ہر چار طرف سے ان کے پاس پہنچا کرتی تھیں، سو (ان لوگوں نے اس حالت میں منعم حقیقی یعنی اللہ کا احسان ماننے اور اطاعت کرنے کے بجائے) انہوں نے خدا کی نعمتوں کی بے قدری کی (یعنی کفر وشرک کے گناہ میں مبتلا ہو گئے) اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کی حرکتوں کے سبب سے ایک محیط قحط اور خوف کا مزہ چکھایا (کہ مال ودولت کی فراوانی سلب ہو کر قحط اور بھوک میں مبتلا ہو گئے اور دشمنوں کا خوف مسلط کر کے ان کی بستیوں کا امن واطمینان بھی سلب کر لیا)۔

غرض یہ کہ شرک وکفر کے گناہ پر دنیوی آفت کا نازل ہونا بھی بعید نہیں اگرچہ لازم اور ضروری بھی نہیں، کیونکہ بعض اوقات دنیا میں کفر پر کھلی سزا نہیں ہوتی، اور یوں تو خدا کا قہر اور ناراضی خود بڑی سزا ہے، مگر وہ پوشیدہ ہے، اور چونکہ آیت میں یہ دعویٰ نہیں کیا گیا کہ دنیا میں ہمیشہ سزا ہوتی ہے اس لیے کوئی شبہ نہیں ہو سکتا، مقصود ڈرانا ہے اور ڈرانے کے لیے سزا کا احتمال بھی کافی ہے، البتہ آخرت کی سزا یقینی اور لازم ہے۔

**وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً:** اس کی تفسیر میں دو تقریریں بیان کی گئی ہیں: ایک یہ کہ مکہ والوں کو یہ مضمون سنانا ہے اور بستی سے کوئی خاص بستی مراد نہیں، کیونکہ گزشتہ کفار میں بہت سی بستیوں کی بری حالت ہو چکی ہے کہ ان کے پاس ظاہری نعمت امن اور رزق بھی تھا، اور پیغمبر کے آنے سے باطنی انعام بھی ہوا، پھر بھی انہوں نے کفر کیا اور سزا کے مستحق ہوئے، پس مکہ والوں کو سناتے ہیں کہ اگر تم ایسا کرو گے تو یہی حال تمہارا ہوگا، چنانچہ جب وہ کفر سے باز نہ آئے تو کچھ عرصہ کے بعد قحط بھی پڑا، اور مسلمانوں کے لشکروں کا ہر وقت اندیشہ بھی ان کے لیے گلے کا ہار ہو گیا، اور بعض نے کہا ہے کہ بستی سے مراد مکہ ہے، اور مدینہ والوں کو یہ مضمون سنانا مقصود ہے کہ تم ایسے مت ہونا، اور ان علماء نے اس آیت کو مدنی کہا ہے۔

**كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً:** امن اور اطمینان میں فرق یہ ہے کہ دشمن وغیرہ کے خوف نہ ہونے کو ''امن'' کہتے ہیں، اور ''اطمینان'' اس کا اثر ہے، یعنی دل کا سکون، سو جب خوف نہ ہوگا تو دل کو سکون رہے گا۔

**فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ:** اسی کے قریب بہت سے مدعیان زہد مبتلا ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو حقیر سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو تارک لذات سمجھ

بیٹھے ہیں، کیااللہ کا یہ ارشاد نہیں سنتے کہ: وما بکم من نعمة الله اور فکلوا مما رزقکم الله۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی نہ باہر سے دشمن کا کھٹکا نہ اندر سے کسی طرح کی فکر و تشویش، خوب امن چین سے زندگی گزرتی تھی۔

**فائدہ:** ۲ یعنی کھانے کے لیے غلے اور پھل وغیرہ کھنچے چلے آتے تھے ہر چیز کی افراط تھی، گھر بیٹھے دنیا کی نعمتیں ملتی تھیں۔

**فائدہ:** ۳ اس بستی کے رہنے والوں نے خدا کے انعامات کی قدر نہ پہچانی، دنیا کے مزوں میں پڑ کر ایسے غافل اور بدمست ہوئے کہ منعم حقیقی کا دھیان بھی نہ آیا، بلکہ اس کے مقابلہ میں بغاوت کی ٹھان لی، آخر خدا تعالیٰ نے ان کی ناشکری اور کفران نعمت کا مزہ چکھایا، یعنی امن چین کی جگہ خوف و ہراس نے اور فراخ روزی کی جگہ بھوک اور قحط کی مصیبت نے ان کو اس طرح گھیر لیا جیسے کپڑا پہننے والے کے بدن کو گھیر لیتا ہے، ایک دم کو بھوک اور ڈر ان سے جدا نہ ہوتا تھا۔

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

اور ان کے پاس پہنچ چکا رسول انہی میں کا پھر اس کو جھٹلایا پھر آ پکڑا ان کو عذاب نے اور وہ گناہ گار تھے

**خلاصہ تفسیر:** اور (اس سزا میں حق تعالیٰ کی طرف سے کچھ جلدی نہیں کی گئی اول ان کی تنبیہ و اصلاح کے واسطے) ان کے پاس انہی میں کا ایک رسول بھی (من جانب اللہ) آیا (جس کے صدق و دیانت کا حال ان کو پوری طرح معلوم تھا، کیونکہ وہ رسول انہی میں کا ایک آدمی تھا) سو اس (رسول) کو (بھی) انہوں نے جھوٹا بتلایا تب ان کو عذاب نے آ پکڑا جب کہ وہ بالکل ہی ظلم پر کمر باندھنے لگے۔

* * *

**فائدہ:** ظاہری نعمتوں کے علاوہ جو اوپر مذکور ہوئیں ایک بڑی بھاری باطنی نعمت بھی ان کو دی گئی تھی، یعنی انہی کی قوم ونسب میں سے ایک رسول بھیجا گیا، جس کا اتباع کر کے وہ خدا کی خوشنودی کے بڑے اونچے مقامات حاصل کر سکتے تھے انہوں نے اتباع و تصدیق کی جگہ اس کی تکذیب و مخالفت پر کمر باندھ لی اور اس طرح پستی میں گرتے چلے گئے، آخر قدیم سنت اللہ کے موافق ظالموں اور گنہگاروں کو عذاب نے آ پکڑا پھر کسی کی کوئی تدبیر پیش نہ گئی، بعض مفسرین کہتے ہیں کہ ان آیات میں کسی معین بستی کا تذکرہ نہیں، محض بطور تمثیل کسی تباہ شدہ بستی کا لاعلی التعیین حوالہ دے کر یا ایک ایسی بستی کا وجود فرض کر کے کفار مکہ کو آگاہ کیا گیا ہے کہ تم نے ایسا کیا تو تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہوسکتا ہے، کفران نعمت اور تکذیب و عداوت رسول کی سزا سے بےفکر نہ ہوں۔

بعض علماء کے نزدیک اس مثال میں بستی سے مراد مکہ معظّمہ ہے جہاں ہر قسم کا امن چین تھا اور باوجود وادی غیر ذی زرع ہونے کے طرح طرح کے پھل اور میوے کھنچے چلے آتے تھے: اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (القصص: ۵۷) اہل مکہ نے ان نعمتوں کی کچھ قدر نہ جانی، شرک و عصیان، بےحیائی اور اوہام پرستی میں منہمک ہوگئے، پھر خدا تعالیٰ نے سب سے بڑی نعمت محمد رسول اللہ ﷺ کی صورت میں بھیجی، اس کے انکار و تکذیب میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا: (اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ (ابراہیم: ۲۸) آخر خدا تعالیٰ نے امن و اطمینان کے بجائے مسلمان مجاہدین کا خوف اور فراخ روزی کی جگہ سات سال کا قحط ان پر مسلط کر دیا، جس میں کتے اور مردار تک کھانے کی نوبت آ گئی، پھر بدر کے معرکہ میں غازیان اسلام کے ہاتھوں خدا کا عذاب ان پر ٹوٹ پڑا، ادھر تو یہ ہوا دوسری طرف جو لوگ ان ظالموں کے جور وستم سے تنگ آ کر گھر بار چھوڑ بھاگے تھے ان کو خدا نے بہتر ٹھکانہ دیا، دشمنوں کے خوف سے مامون و مصؤن بنایا، روزی کے دروازے کھول دیے، زبردست دشمنوں پر فتح عنایت کی، بلکہ اقلیموں کا بادشاہ اور متقیوں کا امام بنا دیا، شاید اسی لیے ان آیات میں مکہ والوں کا حال سنا کر اگلی آیت: فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (النحل: ۱۱۴) میں مسلمانوں کو خطاب فرمایا ہے، کہ تم اس قسم کی حرکات سے بچتے رہنا جن کی بدولت مکہ والوں پر مصیبت ٹوٹی۔

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿١١٤﴾

سو کھاؤ جو روزی دی تم کو اللہ نے حلال اور پاک، اور شکر کرو اللہ کے احسان کا اگر تم اسی کو پوجتے ہو

**خلاصہ تفسیر:** پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر کفار کی ناشکری اور اس کے عذاب کا ذکر تھا، آگے نتیجہ کے طور پر شرک وکفر کی بعض رسوم جیسے حلال چیزوں کو اپنی خواہش سے حرام کرنا وغیرہ سے وعید کے بیان کے ساتھ منع فرماتے ہیں اور یہ خطاب خواہ مسلمانوں کو ہو کہ تم کافروں جیسے کام یعنی ناشکری وغیرہ مت کرنا، یا یہ خطاب کفار کو ہو کہ تم ان برے کاموں کو چھوڑ دو۔

(جب کفروشرک کا برا ہونا معلوم ہوگیا) سو جو چیزیں تم کو اللہ نے حلال اور پاک دی ہیں ان کو (حرام نہ سمجھو کہ یہ مشرکین کی جاہلانہ رسم ہے، بلکہ) ان کو کھاؤ اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر کرو اگر تم (اپنے دعوے کے مطابق) اسی کی عبادت کرتے ہو (جیسے مسلمان تو واقع میں خدا کی عبادت کرتے تھے اور کفار بھی اس کے مدعی تھے، کہتے تھے: مانعبدهم الا ليقربونا، کہ ہمارا مقصود اصلی خدا ہی کی عبادت ہے، سو چاہے یہ خطاب مسلمانوں کو ہو یا کفار کو دونوں صورتوں میں آیت کے معنی واضح ہو گئے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جس کو خدا کی پرستش کا دعویٰ ہو اسے لائق ہے کہ خدا کی دی ہوئی حلال وطیب روزی سے تمتع کرے اور اس کا احسان مان کر شکر گزار بندہ بنے، حلال کو حرام نہ سمجھے اور نعمتوں سے منتفع ہوتے وقت منعم حقیقی کو نہ بھولے، بلکہ اس پر اور اس کے بھیجے ہوئے پیغمبروں پر ایمان لائے اور اسی کے احکام وہدایت کی پابندی کرے۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ

اللہ نے یہی حرام کیا ہے تم پر مردار اور لہو اور سور کا گوشت اور جس پر نام پکارا اللہ کے سوا کسی اور کا، پھر جو کوئی ناچار ہو جائے

غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١١٥﴾

نہ زور کرتا ہو نہ زیادتی تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے

**خلاصہ تفسیر:** تم پر تو (ان چیزوں میں سے جن میں تم گفتگو کرتے ہو) صرف مردار کو حرام کیا ہے، اور خون کو، اور خنزیر کے گوشت (وغیرہ) کو، اور جس چیز کو غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو، پھر جو شخص کہ (فاقہ کے مارے) بالکل بے قرار ہو جائے بشرطیکہ طالب لذت نہ ہو اور نہ حد (ضرورت) سے تجاوز کرنے والا ہو تو اللہ تعالیٰ (اس کے لئے اگر وہ ان چیزوں کو کھالے) بخش دینے والا مہربانی کرنے والا ہے۔

**اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ:** اس آیت میں لفظ انما سے معلوم ہوتا ہے کہ حرام چیزیں صرف یہی چار ہیں جو آیت میں مذکور ہیں اور اس سے زیادہ صریح طور پر: قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں کے سوا کوئی چیز حرام نہیں، حالانکہ قرآن وسنت کی تصریحات کے مطابق باجماع امت اور بھی بہت سی چیزیں حرام ہیں، اس اشکال کا جواب خود انہی آیات کے سیاق وسباق پر غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس جگہ عام حرام وحلال کا بیان کرنا مقصود نہیں، بلکہ مشرکین جاہلیت نے جو بہت سی چیزوں کو اپنی طرف سے حرام کر لیا تھا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حرمت کا حکم نہیں دیا تھا، ان کا بیان کرنا مقصود ہے کہ تمہاری حرام کردہ اشیاء میں سے اللہ کے نزدیک صرف یہی چیزیں حرام ہیں، اس آیت کی مکمل تفسیر اور ان چاروں محرمات کے احکام کا مفصل بیان سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۱۷۳ میں آچکا ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔

* * *

**فائدہ.** اس آیت کی تفسیر سورہ بقرہ اور انعام وغیرہ میں گزر چکی وہاں دیکھ لی جائے، یہاں غرض یہ ہے کہ جس طرح پہلی آیت میں اشارہ تھا

کہ حلال کو اپنے اوپر حرام نہ کرے، اس آیت میں تنبیہ کی گئی کہ حرام چیزوں کو حلال نہ ٹھہرائے، خلاصہ یہ کہ کسی چیز کو حلال یا حرام ٹھہرانا اسی کا حق ہے جس نے یہ چیزیں پیدا کی ہیں، چنانچہ آئندہ آیات میں نہایت وضاحت سے یہ مضمون بیان ہوا ہے:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ

اور مت کہو اپنی زبانوں کے جھوٹ بنا لینے سے کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے کہ اللہ پر بہتان باندھو ۱؎

اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ مَتَاعٌ قَلِیْلٌ ۪ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۱۷﴾

بیشک جو بہتان باندھتے ہیں اللہ پر ان کا بھلا نہ ہوگا، تھوڑا سا (کچھ) فائدہ اٹھالیں، اور ان کے واسطے عذاب دردناک ہے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور جن چیزوں کے متعلق محض تمہارا جھوٹا زبانی دعوی ہے (اور اس پر کوئی صحیح دلیل قائم نہیں) ان کے متعلق یوں نہ کہہ دیا کرو کہ فلاں چیز حلال اور فلاں حرام ہے (جیسا کہ سورہ انعام آیت ۱۳۶: وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ میں ان کے ایسے جھوٹے دعوے آچکے ہیں) جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اللہ پر جھوٹی تہمت لگاؤ گے (کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو ایسا نہیں کہا، بلکہ اس کے خلاف فرمایا ہے) بلاشبہ جو لوگ اللہ پر جھوٹ لگاتے ہیں وہ فلاح نہ پائیں گے (خواہ دنیا و آخرت دونوں میں، یا صرف آخرت میں) یہ (دنیا میں) چندروزہ عیش ہے (اور آگے مرنے کے بعد) ان کے لئے دردناک سزا ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ: اس سے معلوم ہوا کہ طریقت کے احکام شریعت کے خلاف نہیں کہ شریعت کا حلال طریقت میں حرام ہو یا اس کے برعکس۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی بدون کسی سند شرعی کے کسی چیز کے متعلق منہ اٹھا کر کہہ دینا کہ حلال ہے یا حرام بڑی سخت جسارت اور کذب و افتراء ہے، حلال و حرام تو وہ ہی ہوسکتا ہے جسے خدا تعالیٰ نے حلال یا حرام کہا ہو، اگر کوئی شخص محض اپنی رائے سے کسی چیز کو حلال یا حرام ٹھہراتا ہے اور خدا کی طرف اس کی نسبت کرتا ہے، جیسے مشرکین مکہ کرتے تھے، جس کا ذکر سورہ انعام میں گزر چکا وہ فی الحقیقت خدا پر بہتان باندھتا ہے، مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ کبھی ایسا رویہ اختیار نہ کریں، جس چیز کو خدا نے حلال اور جس کو حرام کیا حرام سمجھیں، بدون ماخذ شرعی کے حلت و حرمت کا حکم نہ لگائیں۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی مشرکین مکہ جو حضور کو معاذ اللہ مفتری کہتے تھے یاد رکھیں کہ وہ خود مفتری ہیں، از راہِ کذب و افتراء جس چیز کو چاہیں حلال یا حرام کہہ کر خدا کی طرف منسوب کر دیتے ہیں ان کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ یہ روش اختیار کر کے کسی بھلائی کو نہیں پہنچ سکتے، تھوڑے دن اور دنیا کا مزہ اڑالیں، پھر دائمی جیل خانہ تیار ہے۔

وَعَلَى الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَیْكَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ

اور جو لوگ یہودی ہیں ان پر ہم نے حرام کیا تھا جو تجھ کو پہلے سنا چکے، اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا پر

كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

وہ اپنے اوپر آپ ظلم کرتے تھے

**خلاصہ تفسیر:** اور (یہ مشرکین تو ملت ابراہیمی کی اتباع کا دعوی کرتے ہیں، حالانکہ ان کی شریعت میں تو یہ چیزیں حرام نہ تھیں جن کو انہوں نے حرام قرار دے دیا ہے، البتہ بہت زمانے کے بعد ان اشیاء میں سے) صرف یہودیوں پر ہم نے وہ چیزیں حرام کردی تھیں جن کا بیان ہم

اس کے قبل (سورۃ انعام میں) آپ سے کر چکے ہیں (اور ان کو حرام کرنے میں بھی) ہم نے ان پر (صورتاً بھی) کوئی زیادتی نہیں کی لیکن وہ خود ہی اپنے اوپر (انبیاء کی مخالفت کر کے) زیادتی کیا کرتے تھے۔

معلوم ہوا کہ حلال اور پاکیزہ چیزیں قصداً کبھی حرام نہیں ہوتیں، بلکہ کسی عارض کی وجہ سے بعض چیزیں خاص قوم کے لیے حرام ہوئی ہیں، اور ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں تو کسی عارض یا وقتی ضرورت کی وجہ سے بھی حرام نہیں ہوئیں، پھر تم نے بعض حلال چیزوں کی حرمت کہاں سے گھڑ لی۔

* * *

**فائدہ:** سورہ انعام آیت: وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۭ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ڮ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (الانعام:۱۴۶) کے فوائد میں اس کا بیان گزر چکا، ملاحظہ کر لیا جائے یہاں مقصد یہ ہے کہ جو چیز خدا تعالیٰ نے سب کے لیے یا کسی خاص قوم کے لیے معین وقت تک حرام کی ہے، عین حکمت ہے کسی بشر کو حق نہیں کہ اس میں تصرف کر کے حرام کو حلال یا حلال کو حرام بنائے۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْۗءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْٓا ۙ

پھر بات یہ ہے کہ تیرا رب ان لوگوں پر جنہوں نے برائی کی نادانی سے [1] پھر توبہ کی اس کے پیچھے اور سنوارا اپنے کام کو

اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١١٩﴾ ع ۱۵/۲۱

سو تیرا رب ان باتوں کے پیچھے بخشنے والا مہربان ہے [2]

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے اللہ پر افتراء یعنی بہتان کی مذمت اور اس پر وعید بیان ہوئی، آگے ایمان اور توبہ سے ان کا معاف ہو جانا بیان فرماتے ہیں جیسا کہ پیچھے بھی ایسی ہی ایک آیت اسی مناسبت سے آ چکی ہے۔

پھر آپ کا رب ایسے لوگوں کے لئے جنہوں نے جہالت سے برا کام (خواہ کچھ بھی ہو) کر لیا، پھر اس کے بعد توبہ کر لی (جو توبہ کا طریقہ مقرر ہے) اور (آئندہ کے لئے) اپنے اعمال درست کر لئے تو آپ کا رب اس (توبہ) کے بعد بڑی مغفرت کرنے والا بڑی رحمت کرنے والا ہے۔

**لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْۗءَ بِجَهَالَةٍ:** اس آیت میں لفظ ''جہل'' نہیں بلکہ لفظ ''جہالت'' استعمال فرمایا ہے، اور ''جہل'' تو ''علم'' کے بالمقابل آتا ہے اور بے علمی بے سمجھی کے معنی میں ہے، اور ''جہالت'' کا لفظ ''جاہلانہ حرکت'' کے لئے بولا جاتا ہے اگرچہ جان بوجھ کر کرے، اس سے معلوم ہو گیا کہ توبہ سے گناہ کی معافی بے سمجھی یا بے اختیاری کے ساتھ مقید نہیں۔

''جہالت'' معنی سورہ نساء آیت ۱۷: اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ کے خلاصہ تفسیر میں گزر چکے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ گناہ ہمیشہ جہالت و حماقت ہی سے ہوتا ہے، پس یہ شبہ نہ کیا جائے کہ گناہ تو جان بوجھ کر بھی کیا جاتا ہے، تو کیا وہ توبہ سے معاف نہ ہو گا؟ جواب یہ ہے کہ وہ بھی جہالت و حماقت ہی کی وجہ سے ہوتا ہے، اس سے بڑھ کر اور کیا حماقت ہو گی کہ اپنے نفع و نقصان کی بھی پرواہ نہ ہو۔

**ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْٓا:** اعمال کی درستی کامل مغفرت اور کامل رحمت کے لیے شرط ہے، ورنہ مغفرت تو صرف توبہ ہی سے ہو جاتی ہے۔

* * *

**فائدہ:** [1] مثلاً حرام کو حلال یا حلال کو حرام بنایا، ''نادانی سے'' اس لیے فرمایا کہ خدا کی جو نافرمانی اور گناہ آدمی کرتا ہے خواہ جان بوجھ کر کرے، وہ فی الحقیقت نادان اور بے عقل بن کر کرتا ہے، اگر ذرا عقل سے کام لے اور گناہ کے بدنتائج کا تصور کرے تو ہرگز معصیت پر اقدام نہیں کر سکتا: اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْۗءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰۗىِٕكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا

حَكِيْمًا (النساء:۱۷) کے تحت میں جو اس کے متعلق لکھا گیا ہے اسے بھی ایک مرتبہ ملاحظہ کرلیا جائے۔

**فائدہ: ۲** یعنی کفریات سے توبہ کر کے مسلمان ہو جانے اور آئندہ کے لیے اپنی حالت درست کر لینے پر حق تعالیٰ تمام گذشتہ گناہ معاف فرما دیتا ہے خواہ کتنے ہی سخت کیوں نہ ہوں:

باز آ باز آ ھر آنچہ کردی باز آ     گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

این درگہ ما درگہ نومیدی نیست     صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

اصل میں تو ابراہیم تھا راہ ڈالنے والا فرمانبردار اللہ کا سب سے ایک طرف ہو کر، اور نہ تھا شرک والوں میں

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے شرک و کفر کے اصول و فروع یعنی توحید و رسالت کے انکار کرنے اور حلال چیزوں کے حرام سمجھنے کو باطل کیا گیا، چونکہ مشرکین مکہ جو ان قرآن کریم کے سب سے پہلے اور بلا واسطہ مخاطب ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں تھے اور کفر و بت پرستی کے باوجود خود کو ان کے طریقہ پر بتلاتے تھے، اس لیے آگے ان مضامین کی تقویت کے لیے ابراہیم علیہ السلام کا تمام اقوام عالم میں مقتدی اور پیشوا یعنی رسول ہونا اور مشرک نہ ہونا بیان فرماتے ہیں، جس سے ملت ابراہیمی میں توحید و رسالت کا ثبوت ہوتا ہے۔

بیشک ابراہیم (علیہ السلام جن کو تم بھی مانتے ہو) بڑے مقتدا (یعنی اولوالعزم نبی تھے اور ایک بڑی امت کے پیشوا) تھے (پھر مسئلہ نبوت میں بحث کا کیا مطلب، اور) اللہ تعالیٰ کے (پورے) فرمانبردار تھے (ان کا کوئی عقیدہ یا عمل اپنی خواہش نفسانی سے نہ تھا، پھر تم لوگ اس کے خلاف محض اپنے نفس کی پیروی سے اللہ کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کیوں ٹھہراتے ہو، اور وہ) بالکل ایک (خدا) کی طرف ہو رہے تھے (اور مطلب ایک طرف ہونے کا یہ ہے کہ) وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے (تو پھر تم شرک کیسے کرتے ہو)۔

* * *

**فائدہ:** مشرکین عرب کی شرکیات کا رد کر کے امام الموحدین ابو الانبیاء حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا طریقہ یاد دلاتے ہیں، کیونکہ عرب کے لوگ ان کی نسل سے تھے اور دین ابراہیمی پر ہونے کا دعویٰ رکھتے تھے، حالانکہ ملت ابراہیمی سے انھیں دور کی نسبت بھی نہ رہی تھی، انھیں بتلایا گیا کہ ابراہیم علیہ السلام موحدین کے امام، نیکی کے معلم، تمام دنیا کے مشرکین کے مقابلہ میں تن تنہا ایک امت عظیم کے برابر تھے جن کی ذاتِ واحد میں حق تعالیٰ نے وہ سب خوبیاں اور کمالات جمع کر دیے تھے جو کسی بڑے مجمع میں متفرق طور پر پائے جاتے ہیں:

لَيْسَ عَلَى اللّٰهِ بِمُسْتَنْكَرٍ     اَنْ يَّجْمَعَ الْعَالَمَ فِيْ وَاحِدٍ

ابراہیم خدا کا کامل مطیع و فرمانبردار بندہ تھا جو ہر طرف سے ٹوٹ کر ایک خدا کا ہو رہا تھا، ممکن نہ تھا کہ بدون حکم الٰہی کسی چیز کو محض اپنی طرف سے حلال یا حرام ٹھہرا دے، وہ خود تو معاذ اللہ شرک کا ارتکاب کہاں کر سکتا، مشرکین کی جماعت اور بستی میں رہنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا، پھر جو لوگ آپ کو ''حنیف'' کہتے اور دین ابراہیمی پر بتاتے ہیں انھیں شرم کرنی چاہیے کہ خدا پر افتراء باندھ کر حلال کو حرام یا حرام کو حلال کہنا اور شرک کی حمایت میں پیغمبروں سے لڑنا، کیا ایک ''حنیف'' اور ابراہیمی کی شان ہو سکتی ہے؟ یاد رکھو! حلال و حرام کے بیان اور اصول دین میں اصل ملت ابراہیمی ہے، محمد رسول اللہ ﷺ اسی ملت کی اقامت و اشاعت اور بسط و تفصیل کے لیے تشریف لائے ہیں اگر اصلی دین ابراہیم پر چلنا چاہو تو آپ ﷺ کا طریقہ اختیار کرو۔

شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۲۱﴾

حق ماننے والا اس کے احسانوں کا ۱؎ اس کو اللہ نے چن لیا اور چلایا سیدھی راہ پر ۲؎

وَاٰتَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ؕ

اور دی ہم نے دنیا میں اس کو خوبی ۳؎ اور وہ آخرت میں اچھے لوگوں میں ہے ۴؎

**خلاصہ تفسیر:** (اور وہ) اللہ کی نعمتوں کے (بڑے) شکر گزار تھے (پھر تم شرک وکفر کر کے ناشکری کیوں کرتے ہو جیسا کہ پیچھے گزرا: **فكفرت بانعم الله**، غرض ابراہیم علیہ السلام کی یہ شان اور یہ طریقہ تھا اور وہ ایسے مقبول تھے کہ) اللہ تعالیٰ نے ان کو منتخب کرلیا تھا اور ان کو سیدھے راہ پر ڈال دیا تھا، اور ہم نے ان کو دنیا میں بھی خوبیاں (مثلاً نبوت ورسالت میں منتخب ہونا اور ہدایت پر ہونا وغیرہ) دی تھیں اور وہ آخرت میں بھی (اعلیٰ درجہ کے) اچھے لوگوں میں ہوں گے (اس لئے تم سب کو انہی کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے)۔

**وَاٰتَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً**: اس میں دلالت ہے کہ دنیا میں نعمتوں کا مل جانا آخرت کے مقام ودرجات کو کم نہیں کرتا، اور بعض لوگوں نے جو کہا ہے کہ مشہور ولی کا مقام غیر مشہور سے کم ہے تو اس سے مراد وہ ولی ہے جس میں شہرت کی آفت پیدا ہوگئی ہوں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی ابراہیم خدا کا شکر گزار بندہ تھا، تم سخت ناسپاس اور کفران نعمت کرنے والے ہو جیسا کہ: **وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ** (النحل: ۱۱۲) کے فوائد میں لکھا جا چکا ہے، پھر اس کی راہ پر کیونکر ہوئے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی توحید کامل اور تسلیم ورضا کی سیدھی راہ پر چلایا۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی نبوت، فراخ روزی، اولاد، اور وجاہت ومقبولیت عامہ کہ تمام اہل ادیان بالاتفاق ان کی تعظیم کرتے ہیں، اور ہر فرقہ چاہتا ہے کہ اپنا سلسلہ ابراہیم علیہ السلام سے ملائے۔

**فائدہ:** ۴؎ یعنی اس نے اپنی حق میں جو دعا کی تھی: **وَّاَلْحِقْنِىْ بِالصّٰلِحِيْنَ** (الشعراء: ۸۳) قبول ہوئی، بیشک وہ آخرت میں صالحین کے اعلیٰ طبقہ میں شامل ہوں گے، جو انبیاء علیہم السلام کا طبقہ ہے۔

ثُمَّ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۲۳﴾

پھر حکم بھیجا ہم نے تجھ کو کہ چل دین ابراہیم پر جو ایک طرف کا تھا، نہ تھا وہ شرک والوں میں

**خلاصہ تفسیر:** اب رسول کریم ﷺ کی نبوت ورسالت کے اثبات کے ساتھ آپ ﷺ کا ملت ابراہیم علیہ السلام کا صحیح پابند ہونا بیان فرما کر یہ ہدایت دی جارہی ہے کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو رسول کریم ﷺ پر ایمان اور آپ کی اطاعت کے بغیر یہ دعویٰ صحیح نہیں ہوسکتا۔

(حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ مقبول تھا، اور وہ طریقہ اب منحصر ہے طریقہ محمدیہ میں جس کا بیان یہ ہے کہ) پھر ہم نے آپ کے پاس وحی بھیجی کہ آپ ابراہیم (علیہ السلام) کے طریقہ پر جو کہ بالکل ایک (خدا) کی طرف ہو رہے تھے (اس حیثیت سے کہ وہی آپ کی شریعت ہے اس پر) چلیے اور (چونکہ مشرکین کی طرح یہود ونصاریٰ بھی ابراہیم علیہ السلام کی اتباع کا دعوی کرتے تھے اور وہ بھی کچھ نہ کچھ شرک میں مبتلا تھے، اس لئے یہ مضمون مکرر فرمادیا کہ) وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے (تاکہ بت پرستوں کے ساتھ یہود ونصاریٰ کے موجودہ طریقہ کا غلط ہونا بھی معلوم

ہوجائے جوکہ شرک سے خالی نہ تھا)۔

فائدہ: اس کا بیان :دِيۡنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ حَنِيۡفًا‌ ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ (الانعام:۱۶۱) کے تحت میں گزر چکا وہاں ملاحظہ کیا جائے مقصد یہ ہے کہ حلال وحرام اور دین کی باتوں میں اصل ملت ابراہیم ہے، درمیان میں یہود و نصاریٰ کو ان کے حالات کے مناسب بعض مخصوص احکام دیے گئے، آخر آپ کو خاتم الانبیاء بنا کر بھیجا، تاکہ اصل ملت ابراہیمی کو جو غفلت اور تحریف وتصرف بیجا کی دستبرد سے ضائع ہو چکی تھی، از سر نو زندہ اور روشن کیا جائے، اور شرک کی تمام رگیں کاٹ دی جائیں حدیث میں ہے: "بُعِثْتُ بِالسَّمْحَةِ الْحَنَفِيَّةِ الْبَيْضَآءِ" اس کی پوری شرح و تفصیل حضرت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں کی ہے جو قابل دید ہے۔

اِنَّمَا جُعِلَ السَّبۡتُ عَلَى الَّذِيۡنَ اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ‌ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَحۡكُمُ بَيۡنَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ

ہفتہ کا دن جو مقرر (لازم) کیا سو انہی پر جو اس میں اختلاف کرتے تھے، اور تیرا رب حکم کرے گا ان میں قیامت کے دن

فِيۡمَا كَانُوۡا فِيۡهِ يَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۱۲۴﴾

جس بات میں اختلاف کرتے تھے

خلاصہ تفسیر: (اسی طرح اہل کتاب حلال چیزوں کے حرام سمجھنے میں بھی مبتلا تھے اس کی طرف بھی اشارہ فرمادیا کہ یہ باتیں ملت ابراہیم میں نہ تھیں) پس ہفتہ کی تعظیم (یعنی ہفتہ کے روز مچھلی کے شکار کی ممانعت وہ تو) صرف انہی لوگوں پر لازم کی گئی تھی جنہوں نے اس میں (عملا) خلاف کیا تھا (کہ کسی نے مانا اور عمل کیا، کسی نے اسکے خلاف کیا، مراد ان لوگوں سے یہود ہیں، مطلب یہ کہ حلال چیزوں کی ممانعت کی یہ صورت بھی یہودیوں ہی کے ساتھ مخصوص تھی، ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں نہ تھی، آگے احکام الہیہ میں اختلاف کرنے کے متعلق فرماتے ہیں کہ) بیشک آپ کا رب قیامت کے دن ان میں باہم (عملا) فیصلہ کردے گا جس بات میں یہ (دنیا میں) اختلاف کیا کرتے تھے۔

فائدہ: یعنی اصل ملت ابراہیمی میں ہفتہ کا حکم نہ تھا، اس امت پر بھی نہیں ہے، البتہ درمیان میں یہود نے اپنے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام کے ارشادات سے اختلاف کر کے جب اپنے لیے یہ دن انتخاب کیا تو حکم ہوا کہ اچھا اسی کی تعظیم کرو اور مچھلی کا شکار اس روز مت کرو! یہ حکم کسی نے مانا کسی نے نہ مانا، نہ ماننے والے دنیا میں بندر اور سور بنائے گئے اور آخرت میں جو فیصلہ ہو گا وہ الگ رہا، ایک اسی پر کیا منحصر ہے وہاں تو سارے اختلافات اور جھگڑے چکا دیے جائیں گے، مثلاً حضرت ابراہیم کی نسبت کوئی "یہودی" بتلاتا تھا کوئی "نصرانی" حالانکہ حق تعالیٰ نے آگاہ کردیا کہ وہ "حنیف مسلم" تھے، بہرحال آخرت میں سب اختلافات کا فیصلہ ہو جائے گا اور ہر شخص آنکھوں سے دیکھ لے گا کہ کون غلطی پر تھا کون راستی پر۔

اُدۡعُ اِلٰى سَبِيۡلِ رَبِّكَ بِالۡحِكۡمَةِ وَالۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ‌ وَجَادِلۡهُمۡ بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ‌ ؕ

بلا اپنے رب کی راہ پر پکی باتیں سمجھا کر اور نصیحت سنا کر بھلی طرح اور الزام دے ان کو جس طرح بہتر ہو[1]

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِيۡلِهٖ‌ وَهُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِيۡنَ ﴿۱۲۵﴾

تیرا رب ہی بہتر جانتا ہے ان کو جو بھول گیا (بچلا) اس کی راہ اور وہی بہتر جانتا ہے ان کو جو راہ پر ہیں[2]

خلاصہ تفسیر: پیچھے آیت :ثُمَّ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ میں حضور ﷺ کی نبوت و رسالت ثابت کرنے سے مقصود یہ تھا کہ جن کی

طرف آپ بھیجے گئے ہیں وہ رسالت کے حقوق ادا کریں، یعنی آپ کی تصدیق اور اتباع کریں، آگے خود رسول اللہ ﷺ کو رسالت ادا کرنے کے حقوق اور آداب کی تعلیم ہے جس کے عموم میں تمام مؤمنین شریک ہیں۔

آپ اپنے رب کی راہ (یعنی دین اسلام) کی طرف (لوگوں کو) علم کی باتوں اور اچھی نصیحتوں کے ذریعہ سے (جن سے دل نرم کرنا مقصود ہوتا ہے) بلائیے اور (اگر بحث کی نوبت آجائے تو) ان کے ساتھ اچھے طریقہ سے (کہ جس میں سختی اور خشونت نہ ہو) بحث کیجئے (بس آپ کا اتنا کام ہے، پھر اس تحقیق میں نہ پڑیئے کہ کس نے مانا کس نے نہیں مانا، کیونکہ یہ کام خدا تعالیٰ کا ہے، پس) آپ کا رب خوب جانتا ہے اس شخص کو بھی جو اس کے راستہ سے گم ہو گیا اور وہی راہ پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے۔

**بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ:** حکمت یعنی "علم کی باتوں" سے وہ دلائل مراد ہیں جن سے مدعا کا ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے، اور "نصیحت" وہ ہے جس سے ترغیب وترہیب اور دلوں کا نرم کرنا مقصود ہوتا ہے، یہ تفسیر عربیت سے زیادہ قریب ہے، بعض مفسرین نے ان الفاظ کی منطقی اصطلاح پر تفسیر کی ہے جیسا کہ تفسیر کبیر میں ہے، آیت مذکورہ میں دعوت کے تین طریقوں کا ذکر ہے: ① حکمت ② موعظہ حسنہ ③ مجادلہ، بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہ تین چیزیں مخاطبین کی تین قسموں کی بنا پر ہیں: دعوت بالحکمۃ اہل علم وفہم کے لئے، دعوت بالموعظۃ عوام کے لئے، مجادلہ ان لوگوں کے لئے جن کے دلوں میں شکوک وشبہات ہوں یا جو عناد اور ہٹ دھرمی کے سبب بات ماننے سے منکر ہوں، لیکن ان تین طریقوں کے مخاطب الگ الگ تین قسم کی جماعتیں ہونا سیاق آیت کے لحاظ سے بعید معلوم ہوتا ہے۔

اہل علم کو جاننا چاہیے کہ حکمت میں اصل تو قطعی دلائل ہیں جنہیں "برہان" کہتے ہیں، اور بظاہر قرآن میں بکثرت خطابی، عادی اور ظنی دلائل کا استعمال کیا گیا ہے، سو اصل یہ ہے کہ قرآن میں ایسے کسی بھی مدعیٰ پر ظنی استدلال نہیں کیا گیا جس پر دلیل برہانی قائم نہ ہو، بلکہ وہ سب دعوے برہانی ہیں لیکن مخاطبین کے فہم کی رعایت اور ان کی آسانی کے لیے ایسے عنوانات اختیار کیے گئے ہیں جو ان کی فہم کے قریب ہیں، لیکن اس سے کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ قرآن نے استقراء وغیرہ کو حجت سمجھا ہے اور اسی بنا پر مسلمانوں کو اپنے مخالفین کے ایسے استدلالات پر بے تکلف کلام کرنے کا حق ہے جب تک کہ وہ کوئی برہانی دلیل پیش نہ کریں۔

**اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ:** اس میں اللہ والوں کے دعوت کے طرز وطریقہ کی تفصیل ہے اور یہ بھی کہ تبلیغ کے بعد اصرار کی ضرورت نہیں اور اللہ والوں کا ذوق ومزاج بھی یہی ہے۔

* * *

**فائدہ: ا۔ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ:** اوپر کی آیتوں میں مخاطبین کو آگاہ کرنا تھا کہ یہ پیغمبر اصل ملت ابراہیمی لے کر آئے ہیں، اگر کامیابی چاہتے ہو اور "حنیف" ہونے کے دعوے میں سچے ہو تو اس راستہ پر چل پڑو، اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ الخ سے خود پیغمبر ﷺ کو تعلیم دی جا رہی ہے کہ لوگوں کو راستہ پر کس طرح لانا چاہیے، اس کے تین طریقے بتلائے: ① حکمت ② موعظت حسنہ ③ جدال بالتی ھی احسن

"حکمت" سے مراد یہ ہے کہ نہایت پختہ اور اٹل مضامین مضبوط دلائل وبراہین کی روشنی میں حکیمانہ انداز سے پیش کیے جائیں، جن کو سن کر فہم وادراک اور علمی ذوق رکھنے والا طبقہ گردن جھکا سکے، دنیا کے خیالی فلسفے ان کے سامنے ماند پڑ جائیں اور کسی قسم کی علمی ودماغی ترقیات وحی الٰہی کی بیان کردہ حقائق کا ایک شوشہ تبدیل نہ کرسکیں۔

"موعظت حسنہ" موثر اور رقت انگیز نصیحتوں سے عبارت ہے جن میں نرم خوئی اور دلسوزی کی روح بھری ہو، اخلاص، ہمدردی اور شفقت وحسن اخلاق سے خوبصورت اور معتدل پیرایہ میں جو نصیحت کی جاتی ہے، بسا اوقات پتھر کے دل بھی موم ہو جاتے ہیں، مردوں میں جانیں پڑ جاتی ہیں، ایک مایوس و پژمردہ قوم جھرجھری لے کر کھڑی ہو جاتی ہے، لوگ ترغیب وترہیب کے مضامین سن کر منزل مقصود کی طرف بیتابانہ دوڑنے لگتے ہیں، اور بالخصوص جو زیادہ عالی دماغ اور ذکی وفہیم نہیں ہوتے، مگر طلب حق کی چنگاری سینے میں رکھتے ہیں، ان میں موثر وعظ وپند سے عمل کی ایسی اسٹیم بھری جا سکتی

ہے جو بڑی اونچی عالمانہ تحقیقات کے ذریعہ سے ممکن نہیں، ہاں! دنیا میں ہمیشہ سے ایک ایسی جماعت بھی موجود رہی ہے جن کا کام ہر چیز میں الجھنا اور بات بات میں حجتیں نکالنا اور کج بحثی کرنا ہے، یہ لوگ نہ حکمت کی باتیں قبول کرتے ہیں نہ وعظ ونصیحت سنتے ہیں، بلکہ چاہتے ہیں کہ ہر مسئلہ میں بحث و مناظرہ کا بازار گرم ہو، بعض اوقات اہل فہم وانصاف اور طالبین حق کو بھی شبہات گھیر لیتے ہیں اور بدون بحث کے تسلی نہیں ہوتی اس لیے **وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ** فرما دیا کہ اگر ایسا موقع پیش آئے تو بہترین طریقہ سے تہذیب، شائستگی، حق شناسی اور انصاف کے ساتھ بحث کرو، اپنے حریف مقابل کو الزام دو تو بہترین اسلوب سے دو، خواہی نخواہی دل آزار اور جگر خراش باتیں مت کرو، جن سے قضیہ بڑھے اور معاملہ طول کھینچے، مقصود تفہیم اور احقاق حق ہونا چاہیے، خشونت، بداخلاقی، سخن پروری اور ہٹ دھرمی سے کچھ نتیجہ نہیں۔

**فائدہ:۲ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ:** یعنی طریق دعوت وتبلیغ میں تم کو خدا کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنا چاہیے، اس فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ کس نے مانا کس نے نہیں مانا، نتیجہ کو خدا کے سپرد کرو، وہ ہی راہ پر آنے والوں اور نہ آنے والوں کے حالات کو بہتر جانتا ہے جیسا مناسب ہوگا ان سے معاملہ کرے گا۔

**وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ؕ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۲۶﴾**

اور اگر بدلہ لو تو بدلہ لو اس قدر جس قدر کہ تم کو تکلیف پہنچائی جائے (پہنچے)، اور اگر صبر کرو تو یہ بہتر ہے صبر والوں کو

**خلاصہ تفسیر:** اور (اگر وہ لوگ کبھی علمی بحث ومباحثہ کی حد سے بڑھ کر عملی جھگڑے تک پہنچ جائیں اور ہاتھ یا زبان سے ایذاء پہنچانے لگیں تو اس میں آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو بدلہ لینا بھی جائز ہے جو کہ رخصت ہے، اور صبر کرنا بھی جائز ہے جو کہ عزیمت ہے، پس) اگر (پہلی صورت اختیار کرو یعنی) بدلہ لینے لگو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنا تمہارے ساتھ برتاؤ کیا گیا ہے (اس سے زیادتی نہ کرو) اور اگر (دوسری صورت یعنی ایذاؤں پر) صبر کرو تو وہ (صبر کرنا) صبر کرنے والوں کے حق میں بہت ہی اچھی بات ہے (کہ اس کا مخالف پر بھی اچھا اثر پڑتا ہے، اور دیکھنے والوں پر بھی، اور آخرت میں اجر عظیم ملتا ہے)۔

**وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ:** اللہ والوں کی صفات میں سے صبر کا ہونا ظاہر ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی دعوت وتبلیغ کی راہ میں اگر تم کو سختیاں اور تکلیفیں پہنچائی جائیں تو قدرت حاصل ہونے کے وقت برابر کا بدلہ لے سکتے ہو، اجازت ہے، لیکن صبر کا مقام اس سے بلند تر ہے، اگر صبر کرو گے تو اس کا نتیجہ تمہارے حق میں اور دیکھنے والوں کے بلکہ خود زیادتی کرنے والوں کے حق میں بہتر ہوگا۔

**وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾**

اور تو صبر کر اور تجھ سے صبر ہو سکے اللہ ہی کی مدد سے اور ان پر غم نہ کھا اور تنگ (خفا) مت ہو ان کے فریب سے ۱؎

**اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴿۱۲۸﴾** ع ۱۶

اللہ ساتھ ہے ان کے جو پرہیز گار ہیں اور جو نیکی کرتے ہیں ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (اگرچہ ایسے وقت صبر کرنا عموم سب کے لئے بہتر ہے، مگر آپ ﷺ کی عظمت شان کے لحاظ سے آپ کو خصوصیت کے ساتھ حکم ہے کہ آپ انتقام کی صورت اختیار نہ کریں، بلکہ) آپ صبر کیجئے اور (چونکہ) آپ کا صبر کرنا خدا ہی کی (خاص) توفیق سے ہے

(اس لیے آپ اطمینان رکھیں کہ صبر میں آپ کو دشواری نہ ہوگی) اور ان لوگوں (کی مخالفت) پر غم نہ کیجئے اور جو کچھ یہ (مخالفت میں) تدبیریں کیا کرتے ہیں اس سے تنگدل نہ ہو جایئے (ان کی مخالف تدبیروں سے آپ کا کوئی نقصان نہ ہوگا، کیونکہ آپ کو احسان اور تقوی کی صفات حاصل ہیں، اور) اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے (یعنی ان کا مدد گار رہتا ہے) جو پرہیزگار ہوتے ہیں اور جو نیک کردار ہوتے ہیں۔

**وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ:** پیچھے انتقام کے وقت عدل کی رعایت کرنے کے حکم میں مسلمانوں کو بھی شامل کیا گیا، کیونکہ انتقام میں عادتاً اپنے ساتھیوں اور متبعین کا شریک ہونا بھی ضروری ہے، بخلاف تبلیغ اور دعوت اسلام وغیرہ دوسرے احکام کے کہ وہ نبی سے تنہا بھی صادر ہو سکتے ہیں اس لیے ان میں صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو خطاب کیا گیا۔

خلاصہ تفسیر میں ''توفیق'' کو ''خاص'' کے ساتھ اس لیے مقید کیا گیا ہے کہ خدا کی توفیق کے بغیر تو کوئی شخص بھی صبر نہیں کر سکتا، بلکہ کوئی بھی نیک عمل نہیں کر سکتا، پھر سوال ہوگا کہ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا خصوصیت ہوگی؟ اس قید کے بڑھانے سے خصوصیت کی وجہ معلوم ہوگئی کہ توفیق کے مختلف درجے ہیں، نفس توفیق تو سب کے لیے مشترک ہے، لیکن انبیاء علیہم السلام کے لیے خاص عنایت اور توجہ زیادہ ہوتی ہے اور وہ ان کے اعمال میں مؤثر ہوتی ہے۔

**إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَّالَّذِينَ هُمْ مُّحْسِنُونَ:** محققین عارفین نے تزکیہ وسلوک کا خلاصہ یہی دو اخلاق بیان کیے ہیں: ① ایک تقوی ② دوسرے مخلوق الٰہی کے ساتھ حسن سلوک وشفقت، بعض صوفیاء نے اس بات کو اس طرح ادا کیا ہے: ① حق تعالی کے ساتھ ''معاملہ صدق'' ② اور مخلوق کے ساتھ ''معاملہ خُلق'' یہی دو باتیں تزکیہ وطریقت کی معراج ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی مظالم وشدائد پر صبر کرنا، سہل کام نہیں، خدا ہی مدد فرمائے تو ہو سکتا ہے کہ آدمی ظلم سہتا رہے اور اُف نہ کرے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی انسان جس قدر خدا سے ڈر کر تقوی، پرہیزگاری اور نیکی اختیار کرے گا، اسی قدر خدا کی امداد واعانت اس کے ساتھ ہوگی، سو ایسے لوگوں کو کفار کے مکر وفریب سے تنگ دل اور غمگین ہونے کی کوئی وجہ نہیں حق تعالیٰ اس عاجز ضعیف کو بھی متقین ومحسنین کے ساتھ اپنے فضل ورحمت سے محشور فرمائے۔

آیاتھا ۱۱۱ ۱۷ سُوْرَۃُ بَنِیٓ اِسْرَآءِیْلَ مَکِّیَّۃٌ ۵۰ رکوعاتھا ۱۲

**خلاصہ تفسیر:** گزشتہ سورت میں زیادہ تر دلائل توحید کا بیان تھا اور اس سورت میں زیادہ تر دلائل نبوت اور احکام شریعت کا بیان ہے، نیز گزشتہ سورت کے آخر میں اہل سبت کی تعدی اور زیادتی کا ذکر تھا اور اس سورت کے آغاز میں بنی اسرائیل کے فساد اور فتنہ پردازی اور پھر ان کی تباہی اور بربادی کا ذکر ہے تاکہ اہل مکہ سن کر ہوشیار ہو جائیں اور اپنا انجام سوچ لیں، اہل مکہ نے نبی کریم ﷺ کو اور آپ کے اصحاب کو مکہ سے نکلنے پر مجبور کیا جس طرح فرعون نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کے اصحاب کو مصر سے نکلنے پر مجبور کیا اور اس کا انجام یہ ہوا کہ فرعون اور اس کا لشکر غرق ہوا، اور بنی اسرائیل ان کے مکانات اور محلات کے وارث ہوئے اسی طرح اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو مکہ اور سرزمین عرب کا وارث اور مالک بنائے گا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ

پاک ذات ہے[۱] جو لے گیا اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک[۲] جس کو

بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ①

گھیر رکھا ہے ہماری برکت نے تاکہ دکھلائیں اس کو کچھ اپنی قدرت کے نمونے[۳] وہی ہے سننے والا دیکھنے والا[۴]

**خلاصہ تفسیر:** یہ سورت زیادہ تر انعامات اور رسالت کے مضامین پر مشتمل ہے، چنانچہ قصہ معراج سے جو کہ بڑا معجزہ ہے اس کی ابتداء کی گئی جو کہ حق تعالیٰ کی تنزیہہ اور پاکی کے ساتھ ساتھ رسالت پر بھی دلالت کرتا ہے۔

وہ ذات پاک ہے جو اپنے بندہ (محمد ﷺ) کو رات کے وقت مسجد حرام (یعنی مسجد کعبہ) سے مسجد اقصی (یعنی بیت المقدس) تک جس کے آس پاس (کہ ملک شام ہے) ہم نے (دینی اور دنیوی) برکتیں کر رکھی ہیں (دینی برکت یہ ہے کہ وہاں بکثرت انبیاء علیہم السلام مدفون ہیں، اور دنیوی برکت یہ ہے کہ وہاں باغات، نہروں، چشموں اور پیداوار کی کثرت ہے، غرض اس مسجد اقصی تک عجیب طور پر اس واسطے) لے گیا تاکہ ہم ان کو اپنے کچھ عجائبات قدرت دکھلا دیں (جن میں بعض تو خود وہاں کے متعلق ہیں، مثلاً اتنی بڑی مسافت کو بہت تھوڑے سے وقت میں طے کر لینا اور سب انبیاء علیہم السلام سے ملاقات کرنا اور ان کی باتیں سننا وغیرہ اور بعض آگے کے متعلق ہیں مثلاً آسمانوں پر جانا اور وہاں عجائبات کا مشاہدہ کرنا) بیشک اللہ تعالیٰ بڑے سننے والے بڑے دیکھنے والے ہیں (چونکہ رسول کریم ﷺ کے اقوال کو سنتے اور احوال کو دیکھتے تھے اس کے مناسب ان کو یہ خاص امتیاز اور اعزاز بخشا اور اپنے قرب خاص کا وہ مقام عطا کیا جو کسی کو نہیں ملا)۔

**سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ:** لفظ ''سبحان'' تنزیہ و تعجب کے لیے استعمال ہوتا ہے، تنزیہ یہ کہ خدا تعالیٰ ہر قسم کے عیب، نقص اور عجز سے پاک ہے، اسے ایک رات میں اپنے بندہ کا مکہ سے بیت المقدس لے جانا کچھ مشکل نہیں، جو لوگ اسے بعید سمجھتے ہیں وہ خدا کو عجز اور نقص کا عیب لگاتے ہیں جبکہ خدا تعالیٰ ہر عیب سے منزہ اور پاک ہے، چونکہ یہ لے جانا عجیب تھا اور عجیب ہونے کی وجہ سے اس کی عظیم قدرت پر دلالت کرتا ہے اس لیے اس سے شروع کرنا مناسب ہوا، اسی لیے خلاصہ تفسیر میں لفظ ''عجیب طور پر'' کو ظاہر کر دیا، اور یہ جانا براق پر تھا جس کی برق رفتاری بھی عجیب ہے۔

**اَسْرٰى:** ''اسراء'' رات کے چلنے کو ہی کہتے ہیں، لیلاً کا لفظ اس کے بعد صرف اس لیے لایا گیا کہ پوری رات اس سفر میں صرف نہ ہوئی،

بلکہ اس کا ایک قلیل حصہ صرف ہوا، اور یہ قدرت پر زیادہ دلالت کرتا ہے کہ تھوڑی ہی رات میں اتنا بڑا کام کرلیا گیا، مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے جانے کو ''اسراء'' کہتے ہیں، اور مسجد اقصیٰ سے لے کر آگے آسمانوں پر جانے کو ''معراج'' کہتے ہیں، اور بسا اوقات دونوں سفروں کے مجموعہ پر لفظ "اسراء" یا لفظ "معراج" کا بھی اطلاق کردیا جاتا ہے۔

**اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ:** یہاں بِعَبْدِہٖ یعنی حضور ﷺ کو بندہ کہنے سے دو فائدے ہیں:

① ایک تو آپ ﷺ کے قرب اور قبولیت کے اظہار کا فائدہ، یعنی ایک خاص محبوبیت کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ حق تعالیٰ کسی کو خود فرمادیں کہ یہ میرا بندہ ہے، اس سے بڑھ کر کسی بشر کا بڑا اعزاز نہیں ہوسکتا، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اللہ کا عبد کامل بن جائے، اس لیے کہ خصوصی اعزاز کے مقام پر آپ کی بہت سی صفات کمال میں سے صفت عبدیت کو اختیار کیا گیا۔

② دوسرا فائدہ یہ کہ اس عجیب معجزہ کی وجہ سے کوئی آپ ﷺ پر الوہیت کا شبہ نہ کرسکے اس لیے ''عبد'' کا لفظ لایا گیا، کیونکہ اس حیرت انگیز سفر سے جس میں اول سے آخر تک سب فوق العادت معجزات ہی ہیں کسی کو خدائی کا وہم نہ ہوجائے، جیسے عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے سے عیسائیوں کو دھوکہ لگا ہے، اس لیے لفظ ''عبد'' کہہ کر یہ بتلادیا کہ ان تمام صفات وکمالات اور معجزات کے باوجود آنحضرت ﷺ اللہ کے بندے ہی ہیں خدا نہیں۔

**لَيْلًا:** رات کی تخصیص میں یہ حکمت لکھی ہے کہ عادتاً رات کا وقت خلوت کا ہوتا ہے، اس میں بلوانا زیادہ خصوصیت کی دلیل ہے۔

**مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ:** مسجد حرام اس مسجد کا نام ہے جو بیت اللہ کے گرد بنی ہوئی ہے اور بعض اوقات پورے حرم کو بھی مسجد حرام سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہاں دونوں معنی صحیح ہوسکتے ہیں خواہ مسجد حرام مراد ہو یا حرم مراد ہو، البتہ دوسرے معنی کے اعتبار سے دو روایتوں کا تعارض بھی دور ہوجاتا ہے، کیونکہ بعض روایات میں آپ کا اسراء کے لئے تشریف لے جانا حضرت ام ہانی ؓ کے مکان سے منقول ہے اور بعض میں حطیم بیت اللہ سے، اور دونوں حدیثوں میں مطابقت بہت آسان ہے، اگر مسجد حرام کے عام معنی لئے جائیں تو یہ کوئی بعید بات نہیں کہ پہلے آپ ام ہانی کے مکان میں ہوں، پھر وہاں سے چل کر حطیم کعبہ میں تشریف لائے اور پھر وہاں سے سفر اسراء کی ابتدا ہوئی، واللہ اعلم۔

**اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا:** بیت المقدس کو ''مسجد اقصیٰ'' اس لیے کہتے ہیں کہ ''اقصیٰ'' کے معنی ''دورتر'' کے ہیں اور مسجد بیت المقدس خانہ کعبہ سے بہت دور ہے، اور زمانہ نزول وحی میں مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ کے سوا روئے زمین پر اور کوئی مسجد نہ تھی اور روئے زمین پر اُس وقت مسجد اقصیٰ سے زیادہ کوئی مسجد دور نہ تھی، یہاں مسجد اقصیٰ تک جانا مذکور ہے، اندر جانے کی احادیث میں صراحت ہے کہ آپ ﷺ اندر تشریف لے گئے اور انبیاء علیہ السلام سے ملے اور آپ نماز میں ان کے امام بنے، آگے آسمانوں کی طرف جانے کی یہاں صراحت نہیں ہے، اگرچہ اس کی طرف اشارہ ہے، اس سے زیادہ صراحت کے قریب اشارہ سورۃ النجم میں ہے: **ولقد راٰہ نزلۃ اخری عند سدرۃ المنتھی**، یعنی آپ نے جبرائیل علیہ السلام کو دوسری بار سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا ہے اور پہلی بار کا دیکھنا اس سے پہلے: **وھو بالافق الاعلی** میں بیان ہوا ہے، سو اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آپ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے تھے۔

یہاں مسجد اقصیٰ سے صرف اس مسجد کی زمین مراد ہے کہ حقیقت میں مسجد اصل زمین ہی ہوتی ہے اور عمارت تبعاً مسجد ہوتی ہے، اور یہ اس لیے کہا گیا کیونکہ تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اور حضور ﷺ کے درمیانی زمانہ میں اس کی عمارت منہدم کردی گئی تھی، چنانچہ عنقریب آیت وقضینا الی بنی اسرائیل کی تفسیر میں آئے گا، پس زمین مراد لینے سے یہ شبہ جاتا رہا کہ مسجد اقصیٰ کا جب اس وقت وجود ہی نہ تھا تو وہاں تک لے جانے کے کیا معنی، اور اگر حدیث سے شبہ ہو کہ کفار نے آپ ﷺ سے بیت المقدس کی کیفیت وہیئت دریافت کی تھی، اس کے کیا معنی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو منہدم عمارت کی ہیئت دریافت کرنا بھی ممکن ہے، علاوہ اس کے زمین کے آس پاس لوگوں نے کچھ عمارتیں بیت المقدس کے نشان کے طور پر بنالی تھی ان کی کیفیت دریافت کرنا بھی ممکن ہے۔

**الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ:** یہ تعریف کے طور پر بڑھایا ہے، اس سے خود اس مسجد کا مبارک ہونا بدرجہ اولی مفہوم ہوگیا، کیونکہ جب اس کے آس پاس انبیاء کے مدفون ہونے کی وجہ سے برکت ہے تو جہاں انبیاء نے عبادتیں کی ہوں اور وہ انبیاء کا قبلہ بھی رہا ہو وہ جگہ خود کیسی مبارک ہوگی، کیونکہ دفن ہونے میں صرف جسم کا تعلق ہے، جبکہ عبادت اور قبلہ کا محل ہونے میں جسم اور روح دونوں کا تعلق ہے، پس اس طرح مسجد کے مبارک تر ہونے پر دلالت ہوگئی۔

**لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا:** اگرچہ آپ ﷺ کو لے جائے بغیر بھی عجائبات کا مشاہدہ ممکن تھا، لیکن اس انداز اور طریقہ سے لے جانے میں زیادہ اکرام واظہار شان ہے اس لیے آپ ﷺ کو اس طرح لے گئے۔

**اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ:** کے بڑھانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مکذبین کو وعید ہے کہ ہم تمہاری تکذیب مخالفت کو دیکھتے سنتے ہیں خوب سزا دیں گے، اور لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا کے بعد اس کے بڑھانے سے اس طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ رسول مقبول ﷺ کو عجائبات کی رؤیت ہوئی مگر اس سے وہ علم میں ہمارے (اللہ تعالی کے) برابر نہیں ہوگئے، کیونکہ انہیں ہم نے ہی دکھلایا اور ہم بالذات سمیع بصیر ہیں، دوسرے انہوں نے بعض آیات کو دیکھا اور ہم علی الاطلاق سمیع بصیر ہیں۔

قرآن مجید کے ارشادات، احادیث متواترہ اور اجماع امت سے ثابت ہے کہ اسراء ومعراج کا تمام سفر صرف روحانی نہیں تھا، بلکہ بحالت بیداری روح اور جسم دونوں کے ساتھ تھا جیسے عام انسان سفر کرتے ہیں۔

① قرآن کریم کے پہلے ہی لفظ سُبْحٰنَ میں اس طرف اشارہ موجود ہے، کیونکہ یہ لفظ تعجب اور کسی عظیم الشان امر کے لئے استعمال ہوتا ہے، اگر معراج صرف روحانی بطور خواب کے ہوتی تو اس میں کون سی عجیب بات ہے، خواب تو ہر مسلمان بلکہ ہر انسان دیکھ سکتا ہے کہ میں آسمان پر گیا، فلاں فلاں کام کئے۔

② دوسرا اشارہ لفظ بِعَبْدِهٖ سے اسی طرف ہے، کیونکہ ''عبد'' صرف روح نہیں، بلکہ جسم وروح کے مجموعہ کا نام ہے، قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی یہ لفظ آیا ہے ہر جگہ اس سے مراد روح مع الجسد ہے اور نیز ''جاءنی عبد فلان'' کہا جائے تو اس کے معنی یہی ہیں کہ فلاں بیداری میں دھڑ اور جان سمیت آیا۔

③ اس کے علاوہ واقعہ معراج آنحضرت محمد ﷺ نے حضرت ام ہانی کو بتلایا تو انہوں نے حضور ﷺ کو یہ مشورہ دیا کہ آپ اس کا کسی سے ذکر نہ کریں، ورنہ لوگ اور زیادہ تکذیب کریں گے، اگر معاملہ خواب کا ہوتا تو اس میں تکذیب کی کیا بات تھی۔

④ پھر جب آنحضرت محمد ﷺ نے لوگوں پر اس کا اظہار کیا تو کفار مکہ نے تکذیب کی اور مذاق اڑایا، یہاں تک کہ بعض نومسلم اس خبر کو سن کر مرتد ہوگئے، اگر معاملہ خواب کا ہوتا تو ان معاملات کا کیا امکان تھا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ ﷺ خواب کے مدعی نہ تھے، اگر آپ خواب کے مدعی ہوتے تو کافروں کے جھٹلانے کے کوئی معنی نہ تھے۔

⑤ اگر معراج خواب کی حالت میں یا روحانی طور پر ہوتی تو جس وقت کفار ومشرکین نے اس واقعہ کو سن کر آپ ﷺ کی تکذیب کی اور آپ ﷺ کا مذاق اڑایا اور تالیاں بجائیں، بیت المقدس کی علامات دریافت کیں اور اپنے قافلہ کے حالات پوچھے، اگر یہ واقعہ کوئی خواب یا کشف ہوتا تو مشرکین آپ ﷺ سے بیت المقدس کی علامتیں نہ پوچھتے، خواب بیان کرنے والے سے نہ کوئی علامت پوچھتا ہے اور نہ مذاق اڑاتا ہے، آپ اس وقت بہت سہولت سے جواب دے دیتے کہ میں نے اس کے بیداری میں ہونے کا کب دعوی کیا ہے جو تم ایسی باتیں کرتے ہو، اور بیت المقدس کی ہیئت وکیفیت بیان کرنے کے متعلق فکر میں نہ پڑتے، جیسا کہ احادیث میں ہے کہ آپ ﷺ کو فکر ہوئی، حق تعالی نے بیت المقدس آپ ﷺ کے سامنے کردیا، اور آپ ﷺ نے اس کو دیکھ دیکھ کر ان کی باتوں کا جواب دیا۔

معراج جسمانی کے بعض منکرین نے اسی سورت کی ایک آیت یعنی: **وما جعلنا الرؤيا التي اريناك الا فتنة للناس** سے استدلال کیا ہے کہ معراج کا یہ واقعہ خواب کا تھا۔

① جواب یہ ہے کہ اس آیت میں الرُّءۡیَا سے معراج کا خواب مراد نہیں، بلکہ واقعہ بدر یا حدیبیہ کے متعلق حضور ﷺ نے جو خواب دیکھا تھا وہ مراد ہے، جیسا بعض مفسرین اس طرف گئے ہیں، جن کا ذکر اجمالاً اذ یریکھم اللہ فی منامك قلیلا اور لقد صدق اللہ رسوله الرؤیا بالحق میں آیا ہے۔

② اگر بالفرض معراج ہی کا واقعہ مراد لیا جائے تو الرُّءۡیَا بمعنی ''رؤیت'' ہے، کیونکہ ''رأی'' کے دونوں مصدر ہیں، قربی اور قرابت کی طرح۔

③ یا بقول بعض رات کی رؤیت کو الرُّءۡیَا کہتے ہیں اگرچہ بیداری میں ہو۔

④ نیز صحیح بخاری میں ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آیت میں الرُّءۡیَا سے مراد رؤیتِ چشم ہے، خواب میں دیکھنا مراد نہیں، یعنی آنحضرت ﷺ نے شب معراج میں جو دیکھا وہ بچشم سر دیکھا وہ خواب نہ تھا۔

⑤ یا اس آیت میں الرُّءۡیَا سے مراد ''رؤیت'' ہے مگر اس کو بلفظ الرُّءۡیَا (جو اکثر خواب دیکھنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس معاملہ کو تشبیہ کے طور پر الرُّءۡیَا کہا گیا ہو کہ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی خواب دیکھ لے، یعنی تشبیہ کی وجہ یا تو قدرت کے عجائبات کا دیکھنا ہے اور یا رات کے وقت واقع ہونا ہے۔

⑥ اور اگر الرُّءۡیَا کے معنی خواب ہی کے لئے جائیں تو یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ واقعہ معراج جسمانی کے علاوہ اس سے پہلے یا بعد میں یہ معراج روحانی بطور خواب بھی ہوئی ہو، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ معراج جسمانی نہ ہوئی ہو، کیونکہ علماء نے لکھا ہے کہ عروج روحانی آپ کو کئی بار ہوا ہے، یعنی اس معراج سے پہلے بھی خواب میں عروج ہوا ہے، جس کی حکمت یہ لکھی ہے تاکہ تدریجاً اس معراج اعظم کی استعداد اور برداشت ہوسکے۔

بعض کو حضرت معاویہؓ اور حضرت عائشہؓ کے اقوال سے شبہ پڑ گیا ہے، حضرت معاویہؓ اس وقت تک اسلام بھی نہ لائے تھے، خدا جانے کسی سے سن کر کہا ہے یا کسی دوسرے واقعہ کی نسبت کہا ہے: إذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال، یعنی جب دیگر احتمالات بھی ہوں تو استدلال باطل ہوجاتا ہے، اسی طرح حضرت عائشہؓ کی طرف یہ نسبت کرنا کہ وہ معراج جسمانی کی قائل نہ تھیں بالکل غلط ہے، جو لوگ معراج کو روحانی یا خواب قرار دیتے ہیں اور معراج کے منکر ہیں وہ اپنے اس باطل دعوے کی تائید میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کا نام بھی لیتے ہیں اور بطور استدلال یہ روایت پیش کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ فرمایا کرتی تھیں: ''ما فقد جسد محمد ﷺ'' یعنی شب معراج میں آنحضرت ﷺ کا جسم غائب نہیں ہوا، اس کا جواب یہ ہے کہ اس روایت کا صحیح ہونا نہایت دشوار ہے، کیونکہ واقعہ معراج بالاجماع ہجرت سے تین سال یا پانچ سال پہلے کا ہے، اس وقت اگر عائشہ صدیقہؓ پیدا بھی ہوچکی تھیں تو سن شعور کو نہ پہنچی تھیں اور آنحضرت ﷺ کے نکاح میں نہ آئی تھیں، تو جو واقعہ ان سے پہلے گزر چکا ہے اس کی نسبت وہ کیسے فرما سکتی ہیں کہ آپ ﷺ کا جسم موجود تھا یا غائب تھا، لہٰذا ان کا یہ کہنا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے جسم کو اپنے پاس سے مفقود اور غائب نہیں پایا کیسے صحیح ہوسکتا ہے خاص کر جب حضرت عائشہ صدیقہؓ خود یہ روایت کرتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے جب واقعہ معراج بیان کیا تو کچھ لوگ مرتد ہوگئے اور حضرت ابوبکرؓ کو بوجہ تصدیق کے ''صدیق'' کا لقب ملا، اگر حضرت عائشہ صدیقہؓ کے نزدیک یہ معراج جسمانی نہ ہوتی تو اس بات کی تصریح فرما دیتیں کہ ارتداد اور استبعاد کی کیا ضرورت ہے یہ واقعہ تو خواب کا ہے یا روحانی واقعہ ہے، کفار نے غلط سمجھ کر خواہ مخواہ آپ کی تکذیب کی اور آپ کا مذاق اڑایا، حضرت عائشہ کی یہ حدیث جس میں کفار کی تکذیب اور لوگوں کا مرتد ہونا اور تصدیق کی وجہ سے ابوبکر صدیقؓ کو صدیق کا لقب مذکور ہونا یہ حدیث مرفوع اور صحیح ہے اور ما فقدت جسده والی روایت موقوف اور غیر صحیح ہے۔

علاوہ ازیں حضرت عائشہؓ کے قول ''ما فقد جسد محمد ﷺ'' کی یہ توجیہ بھی ہوسکتی ہے کہ فقدان کے معنی تلاش کرنے کے ہیں، جیسا کہ سورہ یوسف کی آیت: قالوا واقبلوا علیهم ماذا تفقدون [أی تطلبون] قالوا نفقد [أی نطلب] الخ کے تحت تفسیر ابن عباسؓ میں فقدان کا ترجمہ طلب وتلاش سے کیا ہے، مطلب یہ کہ معراج کی واپسی اس قدر جلد ہوئی کہ کسی کو آپ ﷺ کے جسد کے غائب ہونے کی اطلاع بھی نہ ہوئی جو تلاش کی نوبت آتی کہ آپ ﷺ کہاں تشریف لے گئے، اگرچہ اس بات کو ''ما فقد محمد ﷺ'' سے بھی تعبیر کرسکتے تھے، لیکن جسد کی

طرف نسبت کرنا اشارہ ہے معراج جسمانی کی طرف، یعنی آپ کی غیر موجودگی ایسی تھی کہ اگر تلاش ہوتی تو ظاہری بات ہے کہ تلاش کا متعلق جسد ہوتا، سو اس صورت میں تو معراج جسمانی کی اور بھی زیادہ تائید ہوجاتی ہے نہ کہ نفی۔

اور اگر "ما فقد جسد محمد ﷺ" میں فقدان کے مشہور معنی ہی مراد لیے جائیں تب بھی معراج جسمانی کے خلاف نہیں، کیونکہ فقدان کے معنی محض غائب اور گم ہونے کے نہیں، بلکہ اس کے معنی گم کرنا ہے، جس کے لیے ایک کا فاقد اور دوسرے کا مفقود ہونا ضروری ہے، پس مطلب یہ ہوا کہ آنحضرت ﷺ کو اس رات کسی نے گھر سے غائب اور گم نہیں پایا اور یہ درست بات ہے، کیونکہ جب آپ ﷺ تشریف لے گئے، اس وقت سب گھر والے سو رہے تھے اور ان کی بیداری سے قبل واپسی ہوگئی، غرض اس کی نوبت نہیں آئی کہ کسی نے حضور ﷺ کو گھر میں نہ دیکھا ہو۔

اس میں اختلاف ہے کہ شب معراج میں آپ ﷺ نے حق تعالیٰ کو دیکھا یا نہیں؟ اس میں سلف اور خلف سب کا اختلاف ہے، اور تمام روایات میں تاویل کا احتمال ہے، کیونکہ جن روایات سے رؤیت ثابت ہوتی ہے اس میں احتمال ہے کہ رؤیت سے رؤیت قلبی مراد ہو، اور جن روایات سے رؤیت کی نفی معلوم ہوتی ہے اس سے کسی خاص رؤیت کی نفی مراد ہو، مثلاً قیامت کے روز جنت میں جو رؤیت ہوگی معراج کی رؤیت اُس سے کم درجہ کی ہو، اگرچہ رؤیت اس پر بھی صادق آتی ہے، جیسے بغیر عینک کے دیکھنا بھی دیکھنا ہے لیکن عینک سے دیکھنے میں اور زیادہ انکشاف ہوتا ہے، غرض اس مسئلہ میں توقف بہتر ہے۔

* * *

**فائدہ: ۱۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ:** یعنی اس کی ذات نقص وقصور اور ہر قسم کے ضعف وعجز سے پاک ہے جو بات ہمارے خیال میں بے انتہا عجیب معلوم ہو اور ہماری ناقص عقلیں اسے بے حد مستبعد سمجھیں، خدا کی قدرت ومشیت کے سامنے وہ کچھ بھی مشکل نہیں۔

**فائدہ: ۲۔ مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا:** یعنی صرف ایک رات کے محدود حصہ میں اپنے مخصوص ترین اور مقرب ترین بندہ (محمد رسول اللہ ﷺ) کو حرم مکہ سے بیت المقدس تک لے گیا، اس سفر کی غرض کیا تھی؟ آگے لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے، حاصل یہ ہے کہ خود اس سفر میں یا "بیت المقدس" سے آگے کہیں اور لے جا کر اپنی قدرت کے عظیم الشان نشان اور حکیمانہ انتظامات کے عجیب و غریب نمونے دکھلانے منظور تھے، سورہ نجم میں ان آیات کا کچھ ذکر کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ "سدرۃ المنتہٰی" تک تشریف لے گئے اور نہایت عظیم الشان آیات کا مشاہدہ فرمایا: وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى۔

علماء کی اصطلاح میں مکہ سے بیت المقدس تک کے سفر کو "اسراء" اور وہاں سے اوپر سدرۃ المنتہٰی تک کی سیاحت کو "معراج" کہتے ہیں اور بسا اوقات دونوں سفروں کے مجموعہ کو ایک ہی لفظ اسراء یا معراج سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔

معراج کی احادیث تیس صحابہ سے منقول ہیں جن میں معراج واسراء کے واقعات بسط وتفصیل سے بیان ہوئے ہیں، جمہور سلف وخلف کا عقیدہ یہ ہے کہ حضور پرنور ﷺ کو حالت بیداری میں بجسدہ الشریف معراج ہوئی، صرف دو تین صحابہ وتابعین سے منقول ہے کہ واقعہ اسراء ومعراج کو منام (نیند) کی حالت میں بطور ایک عجیب وغریب خواب کے مانتے تھے، چنانچہ اسی سورہ میں آگے چل کر جو لفظ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ آتا ہے اس سے یہ حضرات استدلال کرتے ہیں، سلف میں سے یہ کسی کا قول نہیں کہ معراج حالت بیداری میں محض روحانی طور پر ہوئی ہو، جیسا کہ بعض حکماء وصوفیہ کے مذاق پر تجویز کیا جاسکتا ہے، روح المعانی میں ہے: "وَلَيْسَ مَعْنَى الْاِسْرَاءِ بِالرُّوْحِ الذَّهَابُ يَقْظَةً كَالْاِنْسِلَاخِ الَّذِيْ ذَهَبَ اِلَيْهِ الصُّوْفِيَّةُ وَالْحُكَمَاءُ فَاِنَّهٗ وَاِنْ كَانَ خَارِقًا لِّلْعَادَةِ وَمَحَلًّا لِّلتَّعَجُّبِ اَيْضًا اِلَّا اَنَّهٗ اَمْرٌ لَا تَعْرِفُهُ الْعَرَبُ وَلَمْ يَذْهَبْ اِلَيْهِ اَحَدٌ مِّنَ السَّلَفِ" بیشک ابن قیم نے زاد المعاد میں عائشہ صدیقہ، معاویہ اور حسن بصری رضی اللہ عنہم کے مسلک کی اس طرح توجیہ کی ہے، لیکن اس پر کوئی نقل پیش نہیں کی، محض ظن وتخمین سے کام لیا ہے، ابن اسحاق وغیرہ نے جو الفاظ ان بزرگوں کے نقل کیے ہیں ان میں کہیں حالت بیداری کی تصریح نہیں۔

بہرحال قرآن کریم نے جس قدر اہتمام اور ممتاز درخشاں عنوان سے واقعہ اسراء کوذکر فرمایا اور جس قدر جدّ و مستعدی سے مخالفین اس کے انکار وتکذیب پر تیار ہوکر میدان میں نکلے، حتیٰ کہ بعض موافقین کے قدم بھی لغزش کھانے لگے، یہ اس کی دلیل ہے کہ واقعہ کی نوعیت محض ایک عجیب وغریب خواب یا سیر روحانی کی نہ تھی، روحانی سیر وانکشاف کے رنگ میں آپ کے جو دعاوی ابتدائے بعثت سے رہے ہیں، دعوائے اسراء کفار کے لیے کچھ ان سے بڑھ کر تعجب خیز وحیرت انگیز نہ تھا جو خصوصی طور پر اس کو تکذیب وتردید اور استہزاء وتمسخر کا نشانہ بناتے اور لوگوں کو دعوت دیتے کہ آؤ! آج مدعی نبوت کی ایک بالکل انوکھی بات سنو، نہ آپ کو خاص اس واقعہ کے اظہار پر اس قدر متفکر ومشوش ہونے کی ضرورت تھی جو بعض روایات صحیحہ میں مذکور ہے، بعض احادیث میں صاف لفظ ہیں " ثُمَّ اَصْبَحْتُ بِمَكَّةَ يَاثُمَّ اَتَيْتُ مَكَّةَ " (پھر صبح کے وقت میں مکہ پہنچ گیا) اگر معراج محض کوئی روحانی کیفیت تھی تو آپ مکہ سے غائب ہی کہاں ہوئے، اور شداد بن اوس وغیرہ کی روایت کے موافق بعض صحابہ کا یہ دریافت کرنا کیا معنی رکھتا ہے کہ " رات میں قیام گاہ پر تلاش کیا، حضور کہاں تشریف لے گئے تھے"؟۔

ہمارے نزدیک اسرى بعبده کے یہ معنی لینا کہ " خدا اپنے بندہ کو خواب میں یا محض روحانی طور پر مکہ سے بیت المقدس لے گیا"، اس کے مشابہ ہے کہ کوئی شخص فَاَسْرِ بِعِبَادِي کے یہ معنی لینے لگے کہ " اے موسیٰ میرے بندوں (بنی اسرائیل) کو خواب میں یا محض روحانی طور پر لے کر مصر سے نکل جاؤ"، یا سورہ کہف میں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات کے لیے جانا اور ان کے ہمراہ سفر کرنا جس کے لیے کئی جگہ فَانْطَلَقَا کا لفظ آیا ہے، اس کا مطلب یہ لے لیا جائے کہ یہ سب کچھ محض خواب میں یا بطور روحانی سیر کے واقع ہوا تھا۔

باقی لفظ "رؤیا" جو قرآن میں آیا، اس کے متعلق ابن عباس رضی اللہ عنہ فرما چکے ہیں: "رُؤْ يَا عَيْنٍ اُرِ يَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ" مفسرین نے کلام عرب سے اس کے شواہد پیش کیے ہیں کہ "رؤیا" کا لفظ گاہ بگاہ مطلق رویت (دیکھنے) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لہٰذا اگر اس سے مراد یہی اسراء کا واقعہ ہے تو مطلق نظارہ کے معنی لیے جائیں جو ظاہری آنکھوں سے ہوا، تا کہ ظاہر نصوص اور جمہور امت کے عقیدہ کی مخالفت نہ ہو۔

ہاں! شریک کی روایت میں بعض الفاظ ضرور ایسے آئے ہیں جن سے "اسراء" کا بحالت نوم واقع ہونا معلوم ہوتا ہے، مگر محدثین کا اتفاق ہے کہ شریک کا حافظہ خراب تھا، اس لیے بڑے بڑے حفاظِ حدیث کے مقابلہ میں ان کی روایت قابل استناد نہیں ہوسکتی، حافظ ابن حجر نے فتح الباری کے اواخر میں حدیث شریک کے اغلاط شمار کرائے ہیں اور یہ بھی بتلایا ہے کہ ان کی روایت کا مطلب ایسا لیا جاسکتا ہے جو عام احادیث کے مخالف نہ ہو، اس قسم کی تفاصیل ہم یہاں درج نہیں کرسکتے، شرح صحیح مسلم میں یہ مباحث پوری شرح وبسط سے درج کیے ہیں، یہاں صرف یہ بتلانا ہے کہ مذہب راجح یہی ہے کہ معراج واسراء کا واقعہ حالت بیداری میں بجسدہ الشریف واقع ہوا، ہاں! اگر اس سے پہلے یا بعد خواب میں بھی اس طرح کے واقعات دکھلائے گئے ہوں تو انکار کرنے کی ضرورت نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ایک شب میں اتنی لمبی مسافت زمین وآسمان کی کیسے طے کی ہوگی؟ یا کرہ نار وزمہریر میں سے کیسے گزرے ہوں گے؟ یا اہل یورپ کے خیال کے موافق جب آسمانوں کا وجود ہی نہیں تو ایک آسمان سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے پر اس شان سے تشریف لے جانا جو روایات میں مذکور ہے کیسے قابل تسلیم ہوگا؟ لیکن آج تک کوئی دلیل اس کی پیش نہیں کی گئی کہ آسمان واقع میں کوئی شے موجود نہیں، اگر ان لوگوں کا یہ دعویٰ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ یہ نیلگونی چیز جو ہم کو نظر آتی ہے فی الحقیقت آسمان نہیں ہے تب بھی اس کا کیا ثبوت ہے کہ اس نیلگونی رنگ کے اوپر آسمانوں کا وجود نہیں ہوسکتا، رہا ایک رات میں اتنا طویل سفر طے کرنا تو تمام حکماء تسلیم کرتے ہیں کہ سرعت حرکت کے لیے کوئی حد نہیں ہے، اب سے سو برس پیشتر تو کسی کو یہ بھی یقین نہیں آسکتا تھا کہ تین سو میل فی گھنٹہ چلنے والی موٹر تیار ہوجائے گی، یا دس ہزار فٹ کی بلندی تک ہم ہوائی جہاز کے ذریعہ پرواز کرسکیں گے، "اسٹیم" اور "قوت کہربائیہ" کے یہ کرشمے کس نے دیکھے تھے، کرہ نار تو آج کل ایک لفظ بے معنی ہے، ہاں! اوپر جاکر ہوا کی سخت برودت وغیرہ کا مقابلہ کرنے والے آلات طیاروں میں لگا دیئے گئے ہیں جو اڑنے والوں کی زمہریر سے حفاظت کرتے ہیں، یہ تو مخلوق کی بنائی ہوئی مشینوں کا حال تھا، خالق کی بلاواسطہ پیدا کی ہوئی مشینوں کو دیکھتے ہیں تو عقل دنگ رہ جاتی ہے، زمین یا سورج چوبیس گھنٹہ میں کتنی مسافت طے کرتے ہیں، روشنی کی شعاع

ایک منٹ میں کہاں سے کہاں پہنچتی ہے، بادل کی بجلی مشرق میں چمکتی اور مغرب میں گرتی ہے اور اس سرعت سیر وسفر میں پہاڑ بھی سامنے آجائے تو پرکاہ کے برابر حقیقت نہیں سمجھتی، جس خدا نے یہ چیزیں پیدا کیں کیا وہ قادر مطلق اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے براق میں ایسی برق رفتاری کی کلیں اور حفاظت و آسائش کے سامان نہ رکھ سکتا تھا جن سے حضور بڑی راحت وتکریم کے ساتھ چشم زدن میں ایک مقام سے دوسرے مقام کو منتقل ہو سکیں، شاید اسی لیے واقعہ ''اسراء'' کا بیان لفظ ''سبحان الذی'' سے شروع فرمایا، تاکہ جو لوگ کوتاہ نظری اور تنگ خیالی سے حق تعالیٰ کی لامحدود قوت کو اپنے وہم وتخمین کی چہار دیواری میں محصور کرنا چاہتے ہیں، کچھ اپنی گستاخیوں اور عقلی ترک تازیوں پر شرمائیں:

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن　　که جاہا سپر باید انداختن

**فائدہ:** ۳؎ **لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا**: یعنی جس ملک میں مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) واقع ہے وہاں حق تعالیٰ نے بہت سی ظاہری و باطنی برکات رکھی ہیں، مادی حیثیت سے چشمے، نہریں، غلے، پھل اور میووں کی افراط، اور روحانی اعتبار سے دیکھا جائے تو کتنے انبیاء ورسل کا مسکن ومدفن اور ان کے فیوض وانوار کا سرچشمہ رہا ہے، شاید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں لے جانے میں یہ بھی اشارہ ہوگا کہ جو کمالات انبیاء بنی اسرائیل وغیرہ پر تقسیم ہوئے تھے آپ کی ذات مقدس میں وہ سب جمع کر دیے گئے، جو نعمتیں بنی اسرائیل پر مبذول ہوئی تھیں، ان پر اب بنی اسمٰعیل کو قبضہ دلایا جانے والا ہے، ''کعبہ'' اور ''بیت المقدس'' دونوں کے انوار وبرکات کی حامل ایک ہی امت ہونے والی ہے۔

احادیث معراج میں تصریح ہے کہ بیت المقدس میں تمام انبیاء علیہم السلام نے آپ کی اقتداء میں نماز پڑھی، گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو سیادت و امامت انبیاء کا منصب دیا گیا تھا اس کا حسی نمونہ آپ کو اور مقربین بارگاہ کو دکھلایا گیا۔

**فائدہ:** ۴؎ **اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ**: یعنی اصل سننے والا اور دیکھنے والا خدا ہے، وہ جسے اپنی قدرت کے نشان دکھلانا چاہے دکھلا دیتا ہے، اس نے اپنے حبیب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مناجات کو سنا اور احوال رفیعہ کو دیکھا، آخر معراج شریف میں ''بِیْ یُبْصِرُ'' والی آنکھ سے وہ آیات عظام دکھلائیں، جو آپ کی استعدادِ کامل اور شان رفیع کے مناسب تھیں۔

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ۝۲

اور دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور کیا اس کو ہدایت بنی اسرائیل کے واسطے ۱؎ کہ نہ ٹھہراؤ میرے سوا کسی کو کار ساز ۲؎

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ۝۳

تم جو اولاد ہو ان لوگوں کی جن کو چڑھا یا (لادلیا) ہم نے نوح کے ساتھ، بیشک وہ تھا بندہ حق ماننے والا ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** گذشتہ آیت میں حق تعالیٰ نے اپنی تنزیہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیل بیان فرمائی تھی، آگے موسیٰ علیہ السلام کا صاحب کتاب ہونا بیان کرتے ہیں جس سے نبوت محمدیہ کی بھی تائید ہوتی ہے، درمیان اس کتاب کے ہادی ہونے کا ذکر ہے، پھر اس کتاب کے ایک اہم مضمون کو بیان فرماتے ہیں جس سے حق تعالیٰ کی توحید وتنزیہ ثابت ہوتی ہے، اور مخاطبین کو اولاد نوح کے عنوان سے پکار کر نوح علیہ السلام کا شاکر ہونا بیان فرماتے ہیں، اور نوح علیہ السلام کے ذکر سے بھی نبوت محمدیہ کی تائید کی جاتی ہے۔

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب (یعنی توریت) دی، اور ہم نے اس کو بنی اسرائیل کے لئے (آلہ) ہدایت بنایا (جس میں اور احکام کے ساتھ توحید کا عظیم الشان حکم بھی تھا) کہ تم میرے سوا (اپنا) کوئی کارساز مت قرار دو۔

اے ان لوگوں کی نسل جن کو ہم نے نوح (علیہ السلام) کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا (ہم تم سے خطاب کر رہے ہیں، تاکہ اس نعمت کو یاد کرو کہ اگر ہم ان کو کشتی پر سوار کر کے نہ بچاتے تو آج تم ان کی نسل کہاں ہوتے، اور نعمت کو یاد کر کے اس کا شکر کرو جس کی بڑی فرد توحید ہے اور) وہ نوح

(علیہ السلام) بڑے شکر گذار بندہ تھے (پس جب انبیاء علیہم السلام شکر کرتے رہے تو تم کیسے اس کو چھوڑ سکتے ہو)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ نبی کریم ﷺ کا فضل وشرف بیان فرما کر سلسلہ کلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر کی طرف منتقل کر دیا گیا، چونکہ ''اسراء'' کے ذیل میں مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک جانا مذکور ہوا تھا، آگے مسجد اقصیٰ اور اس کے قدیم متولیوں (بنی اسرائیل) پر جو مختلف دور گزرے، مسلمانوں کی عبرت اور خود بنی اسرائیل کی نصیحت کے لیے ان کا بیان کیا جاتا ہے، یہ آیت اسی کی تمہید ہے، واقعہ اسراء میں اشارہ تھا کہ حجازی پیغمبر کی امت ہی آئندہ اس امانت الٰہی کی مالک بننے والی ہے جو شام کی مبارک سرزمین میں ودیعت کی گئی تھی، ان آیات میں بنی اسرائیل کو متنبہ کرنا ہے کہ اگر خیریت چاہتے ہیں تو اب پیغمبر عربی ﷺ کی پیروی کرو، حق تعالیٰ ان کے حال پر مہربانی فرمائے گا ورنہ پہلے کی طرح پھر شرارتوں پر سزا ملے گی اور مسجد اقصیٰ کی تولیت سے محروم کر دیئے جائیں گے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی تورات میں یہ ہدایت کی گئی تھی کہ خالص توحید پر قائم رہیں اور خدا کے سوا کسی کو کارساز نہ سمجھیں ہمیشہ اسی پر بھروسہ اور توکل کریں۔

**فائدہ:** ۳ یعنی تم ان کی اولاد ہو جو نوح کے ساتھ کشتی پر سوار ہو کر عذاب الٰہی سے بچے تھے، جو احسان تمہارے بڑوں پر کیا گیا اسے فراموش مت کرو، دیکھو نوح علیہ السلام جن کی اولاد میں تم ہو کیسے احسان شناس اور شکر گذار بندے تھے، تم کو بھی ان ہی کی راہ پر چلنا چاہیے۔

| |
|---|
| وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِى الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِى الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ④ |
| اور صاف کہہ سنایا ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں کہ تم خرابی کرو گے ملک میں دوبار اور سرکشی کرو گے بڑی سرکشی |

**خلاصہ تفسیر:** گذشتہ آیت جَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ میں ہدایت کی اتباع اور احکام الٰہیہ کی اطاعت کی ترغیب تھی، اب آگے آیات میں احکام خداوندی کی مخالفت کرنے والوں کے برے انجام کو بیان کرتے ہیں تاکہ لوگ عبرت پکڑیں کہ جو شخص اللہ سے باغی ہو جاتا ہے اللہ دنیا ہی میں اس کے دشمن کو اس پر مسلط کر دیتا ہے، یہاں آیات میں بنی اسرائیل کے دو واقعے عبرت ونصیحت کے لئے اجمالاً ذکر کئے گئے کہ انہوں نے ایک مرتبہ گناہوں میں انہماک کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمنوں کو ان پر مسلط کر دیا، جنہوں نے ان کو تباہ کیا، پھر ان کو کچھ تنبیہ ہوگئی اور شرارت کم کر دی تو سنبھل گئے، مگر کچھ عرصہ کے بعد پھر وہی شرارتیں اور بداعمالیاں ان میں پھیل گئیں تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے دشمن کے ہاتھ سے سزا دلائی، تاریخ سے ان لوگوں پر چھ حادثوں کا واقع ہونا معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں (خواہ توریت میں یا بنی اسرائیل کے دیگر انبیاء کے صحیفوں میں) یہ بات (پیشین گوئی کے طور پر) بتلا دی تھی کہ تم سرزمین (شام) میں دو مرتبہ (گناہوں کی کثرت سے) خرابی کرو گے (ایک بار شریعت موسویہ کی مخالفت، اور دوسری بار شریعت عیسویہ کی مخالفت) اور (دوسروں پر بھی) بڑا زور چلانے لگو گے (یعنی ظلم وزیادتی کرو گے، اس طرح لَتُفْسِدُنَّ میں حقوق اللہ کے ضائع کرنے کی طرف اور لَتَعْلُنَّ میں حقوق العباد ضائع کرنے کی طرف اشارہ ہے، اور یہ بھی بتلا دیا تھا کہ دونوں مرتبہ سخت سزاؤں میں مبتلا کئے جاؤ گے)۔

* * *

**فائدہ:** تورات میں یا کسی دوسری آسمانی کتاب میں یہ پیشین گوئی کی گئی تھی کہ یہ قوم (بنی اسرائیل) دو مرتبہ ملک میں سخت خرابی پھیلائے گی اور ظلم وتکبر کا شیوہ اختیار کر کے سخت تمرد وسرکشی کا مظاہرہ کرے گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ہر مرتبہ خدا تعالیٰ کی طرف سے دردناک سزا کا مزہ چکھنا پڑا جس کا ذکر آگے آتا ہے:

فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ اُوۡلٰٮہُمَا بَعَثۡنَا عَلَيۡكُمۡ عِبَادًا لَّنَاۤ اُولِىۡ بَاۡسٍ شَدِيۡدٍ فَجَاسُوۡا خِلٰلَ الدِّيَارِ‌ ؕ

پھر جب آیا پہلا وعدہ بھیجے ہم نے تم پر اپنے بندے ۱؎ سخت لڑائی والے پھر پھیل پڑے شہروں کے بیچ

وَكَانَ وَعۡدًا مَّفۡعُوۡلًا ۝۵ ثُمَّ رَدَدۡنَا لَـكُمُ الۡكَرَّةَ عَلَيۡهِمۡ وَاَمۡدَدۡنٰكُمۡ بِاَمۡوَالٍ وَّبَنِيۡنَ

اور وہ وعدہ ہونا ہی تھا ۲؎ پھر ہم نے پھیر دی تمہاری باری ان پر اور قوت دی تم کو مال سے اور بیٹوں سے

وَجَعَلۡنٰكُمۡ اَكۡثَرَ نَفِيۡرًا ۝۶

اوراس سے زیادہ کر دیا تمہارا لشکر ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** پھر جب ان دو مرتبہ میں سے پہلی بار (شرارت کی سزا) کی میعاد آئے گی (تو) ہم (تمہاری سزا کے لیے) تم پر اپنے ایسے بندوں کو مسلط کر دیں گے جو بڑے جنگجو ہوں گے، پھر وہ (تمہارے) گھروں میں گھس پڑیں گے (اور تم کو قتل وقید اور غارت کر دیں گے )اور یہ (وعدہ سزا) ایک وعدہ ہے جو ضرور ہو کر رہے گا، پھر (جب تم اپنے کئے پر نادم وتائب ہوگے تو) ہم پھر ان پر تمہارا غلبہ کر دیں گے (وہ غلبہ اگر چہ بواسطہ سہی کہ جو قوم ان پر غالب آئے گی وہ تمہاری حامی ہو جائے گی، اس طرح تمہارے وہ دشمن اس قوم سے اور تم سے دونوں سے مغلوب ہو جائیں گے )اور مال اور بیٹوں سے (جو کہ قید اور غارت کئے گئے تھے) ہم تمہاری امداد کریں گے (یعنی یہ چیزیں تم کو واپس ملیں گی اور ان سے تمہیں قوت پہنچے گی )اور ہم تمہاری جماعت (یعنی تابعین) کو بڑھا دیں گے (پس جاہ، مال، اولاد اور متبعین سب میں ترقی ہوگی)۔

**بَعَثۡنَا عَلَيۡكُمۡ عِبَادًا لَّنَاۤ:** اس جگہ قرآن کریم نے لفظ عِبَادًا لَّنَاۤ فرمایا ہے عِبَادَنَا نہیں کہا، حالانکہ مختصر یہ تھا، حکمت یہ ہے کہ کسی بندہ کی اضافت ونسبت اللہ کی طرف ہو جانا اس کے لئے سب سے بڑا اعزاز ہے، جیسا کہ اسی سورۃ کے شروع میں اَسۡرٰى بِعَبۡدِهٖ کے تحت میں یہ بتلایا جا چکا ہے کہ انسان کا آخری کمال اور انتہائی اونچا مقام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنا بندہ کہہ کر نوازیں، آیت مذکورہ میں جن لوگوں سے بنی اسرائیل کی سزاء کا کام لیا گیا یہ خود بھی کافر تھے، اس لئے حق تعالیٰ نے ان کو عِبَادَنَا کے لفظ سے تعبیر فرمانے کے بجائے اضافت ونسبت کو توڑ کر عِبَادًا لَّنَاۤ فرمایا، جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ تکوینی طور پر تو سارے ہی انسان اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، مگر بغیر ایمان کے مقبول بندے نہیں ہوتے جن کی نسبت واضافت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جاسکے۔

***

**فائدہ:** ۱؎ یعنی جن کو ہم نے سزا دینے کے لیے تم پر مسلط کیا تھا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی بستی میں مکانوں کے اندر گھس کر خوب کشت وخون اور لوٹ کھسوٹ کی، اس طرح خدا نے سزا ہی کا جو وعدہ کیا تھا پورا ہو کر رہا۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی جب تم ہماری طرف رجوع ہوئے اور توبہ وانابت کا طریقہ اختیار کیا ہم نے پھر ایک مرتبہ تم کو دشمنوں پر غالب کیا۔

اِنۡ اَحۡسَنۡتُمۡ اَحۡسَنۡتُمۡ لِاَنۡفُسِكُمۡ‌ وَاِنۡ اَسَاۡتُمۡ فَلَهَا‌ ؕ فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ الۡاٰخِرَةِ لِيَسُوۡٓءٗا

اگر بھلائی کی تم نے تو بھلا کیا اپنا، اور اگر برائی کی تو اپنے لیے ۱؎ پھر جب پہنچا وعدہ دوسرا بھیجے اور بندے کہ اداس کر دیں

وُجُوۡهَكُمۡ وَلِيَدۡخُلُوا الۡمَسۡجِدَ كَمَا دَخَلُوۡهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوۡا مَا عَلَوۡا تَتۡبِيۡرًا ۝۷

تمہارے منہ اور گھس جائیں مسجد میں جیسے گھس گئے تھے پہلی بار اور خراب کر دیں جس جگہ غالب ہوں پوری خرابی ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** (اور اس کتاب میں بطور نصیحت یہ بھی لکھا تھا کہ) اگر (اب آئندہ) اچھے کام کرتے رہو گے تو اپنے ہی نفع کے لئے اچھے کام کرو گے (یعنی دنیا و آخرت میں اس کا نفع حاصل ہوگا) اور اگر (پھر) تم برے کام کرو گے تو بھی اپنے ہی لئے (برائی کرو گے، یعنی پھر سزا ہوگی، چنانچہ ایسا ہی ہوا، جس کا آگے بیان ہے کہ:) پھر جب (مذکورہ دو مرتبہ کے فساد میں سے) آخری مرتبہ کا وقت آئے گا (اور اس وقت تم شریعت عیسویہ کی مخالفت کرو گے) تو پھر ہم دوسروں کو تم پر مسلط کر دیں گے تا کہ (وہ تمہیں مار مار کر) تمہارا چہرہ بگاڑ دیں اور جس طرح وہ (پہلے) لوگ مسجد (بیت المقدس) میں (لوٹ مار کے ساتھ) گھسے تھے یہ (پچھلے) لوگ بھی اس میں گھس پڑیں گے، اور جس جس چیز پر ان کا زور چلے سب کو (ہلاک) و برباد کر ڈالیں۔

**وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ:** اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ کیا اللہ تعالیٰ کو یہ مقصود تھا کہ مسجد ویران اور تباہ ہو جائے، جواب یہ ہے کہ مقصود ہونے سے اگر راضی ہونا مراد ہے تو وہ لازم نہیں آتا، کیونکہ شرعی طور پر حق تعالیٰ نے مسجد کی ویرانی کا قصد نہیں کیا، اور خوشی و رضا تو ارادہ تشریعی میں ہوتی ہے، ہاں تکوینی طور پر ارادہ کیا، اور ارادہ تکوینی میں خوشی و رضا لازم نہیں، کیونکہ عالم میں جو کچھ ہوتا ہے سب حق تعالیٰ کے ارادہ ہی سے ہوتا ہے حتیٰ کہ کفر و معصیت بھی، لیکن خوشی و رضا ان ہی کاموں میں ہوتی ہے جو احکام شرعیہ کے موافق ہوں، پس کوئی اشکال نہیں۔

یہ آیت اس بارے میں نص ہے کہ شرور و فتن بھی بے کار نہیں، بلکہ ان میں تکوینی طور پر بھی مصلحتیں ہوا کرتی ہیں، اور چونکہ یہاں کفار ان مصالح کے واسطے بنائے گئے اس لیے انہیں عبادا لنا فرمایا، جیسا کہ پیچھے گذر چکا۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی بھلائی برائی کا جو کچھ نفع نقصان پہنچنا تھا تم ہی کو پہنچتا تھا، سو پہنچا۔

**فائدہ:** ۲ یعنی مار مار کر تمہارے منہ بگاڑ دیئے اور ''مسجد اقصیٰ'' (بیت المقدس) میں گھس کر پہلے کی طرح اودھم مچائی، ہیکل وغیرہ کو تباہ کر دیا، اس طرح ''بنی اسرائیل'' کی قوت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

وقف لازم عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ⑧

بعید نہیں تمہارے رب سے کہ رحم کرے تم پر، اور اگر پھر وہی کرو گے تو ہم پھر وہی کریں گے، اور کیا ہے ہم نے دوزخ کو کافروں کا قید خانہ

**خلاصہ تفسیر:** (اور اس کتاب میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگر اس دوسری سزا کے بعد جب شریعت محمدیہ کا دور آئے گا اگر اس وقت تم مخالفت و معصیت سے باز آ کر شریعت محمدیہ کا اتباع کر لو تو) عجب نہیں (مطلب امید یعنی وعدہ ہے) کہ تمہارا رب تم پر رحم فرمائے (اور تم کو ادبار و ذلت سے نکال دے) اور اگر تم پھر وہی (شرارت) کرو گے تو ہم بھی وہی (سزا کا برتاؤ) کریں گے (چنانچہ آنحضرت محمد ﷺ کے عہد میں انہوں نے آپ کی مخالفت کی تو پھر قتل و قید اور ذلیل ہوئے، یہ تو دنیا کی سزا ہوگئی) اور (آخرت میں) ہم نے جہنم کو (ایسے) کافروں کا جیل خانہ بنا ہی رکھا ہے۔

واضح رہے کہ یہاں قرآن کریم میں دو واقعوں کا ذکر ہے مگر تاریخ میں اس طرح کے چھ واقعات مذکور ہیں:

① پہلا واقعہ: حضرت سلیمان علیہ السلام بانی مسجد اقصیٰ کی وفات کے کچھ عرصہ کے بعد پیش آیا کہ بیت المقدس کے حاکم نے بے دینی اور بدعملی اختیار کر لی تو مصر کا ایک بادشاہ اس پر چڑھ آیا اور بیت المقدس کا سامان سونے چاندی کا لوٹ کر لے گیا مگر شہر اور مسجد کو منہدم نہیں کیا۔

② دوسرا واقعہ: اس سے تقریباً چار سو سال بعد کا ہے کہ بیت المقدس میں بسنے والے بعض یہودیوں نے بت پرستی شروع کر دی اور باقیوں میں نا اتفاقی اور باہمی جھگڑے ہونے لگے، اس نحوست سے پھر مصر کے کسی بادشاہ نے ان پر چڑھائی کر دی اور کسی قدر شہر اور مسجد کی عمارت کو بھی نقصان پہنچایا، پھر ان کی حالت کچھ سنبھل گئی۔

③ تیسرا واقعہ: اس کے چند سال بعد جب بخت نصر شاہ بابل نے بیت المقدس پر چڑھائی کر دی اور شہر کو فتح کر کے بہت سا مال لوٹ لیا اور

بہت سے لوگوں کو قیدی بنا کر لے گیا اور پہلے بادشاہ کے خاندان کے ایک فرد کو اپنے قائمقام کی حیثیت سے اس شہر کا حاکم بنا دیا۔

④ چوتھا واقعہ: اس نئے بادشاہ نے جو بت پرست اور بدعمل تھا بخت نصر سے بغاوت کی تو بخت نصر دوبارہ چڑھ آیا اور کشت وخون اور قتل و غارت کی کوئی حد نہ رہی، شہر میں آگ لگا کر میدان کر دیا، یہ حادثہ تعمیر مسجد سے تقریبا چارسو پندرہ سال کے بعد پیش آیا، اس کے بعد یہود یہاں سے جلاوطن ہو کر بابل چلے گئے، جہاں نہایت ذلت وخواری سے رہتے ہوئے ستر سال گذر گئے، اس کے بعد شاہ ایران نے شاہ بابل پر چڑھائی کر کے بابل فتح کرلیا، پھر شاہ ایران کو ان جلاوطن یہودیوں پر رحم آیا اور ان کو واپس ملک شام میں پہنچا دیا اور ان کا لوٹا ہوا سامان بھی واپس کر دیا، اب یہود اپنے اعمال بد اور معاصی سے تائب ہو چکے تھے، یہاں نئے سرے سے آباد ہوئے تو شاہ ایران کے تعاون سے پھر مسجد اقصی کو سابق نمونہ کے مطابق بنا دیا۔

⑤ پانچواں واقعہ: یہ پیش آیا کہ جب یہود کو یہاں اطمینان اور آسودگی دوبارہ حاصل ہوگئی تو اپنے ماضی کو بھول گئے اور پھر بدکاری اور بداعمالی میں منہمک ہو گئے تو حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے ایک سو ستر سال پہلے یہ واقعہ پیش آیا کہ جس بادشاہ نے انطاکیہ آباد کیا تھا اس نے چڑھائی کر دی اور چالیس ہزار یہودیوں کو قتل کیا، چالیس ہزار کو قیدی اور غلام بنا کر اپنے ساتھ لے گیا اور مسجد کی بھی بہت بے حرمتی کی مگر عمارت مسجد کی بچ گئی، مگر پھر اس بادشاہ کے جانشینوں نے شہر اور مسجد کو بالکل میدان کر دیا، اس کے کچھ عرصہ کے بعد بیت المقدس پر سلاطین روم کی حکومت ہوگئی، انہوں نے مسجد کو پھر درست کیا اور اس کے آٹھ سال بعد حضرت عیسٰی علیہ السلام پیدا ہوئے۔

⑥ چھٹا واقعہ: حضرت عیسٰی علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے چالیس برس بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ یہودیوں نے اپنے حکمران سلاطین روم سے بغاوت اختیار کر لی، رومیوں نے پھر شہر اور مسجد کو تباہ کر کے وہی حالت بنا دی جو پہلے تھی، اس وقت کے بادشاہ کا نام طیطس تھا، جو نہ یہودی تھا نہ نصرانی، کیونکہ اس کے بہت روز کے بعد قسطنطین اول عیسائی ہوا ہے اور اس کے بعد سے حضرت عمر بن خطابؓ کے زمانہ تک یہ مسجد ویران پڑی رہی، یہاں تک کہ آپؓ نے اس کی تعمیر کرائی۔

اب یہ بات کہ قرآن کریم نے جن دو واقعوں کا ذکر کیا ہے وہ ان میں سے کون سے ہیں؟ اس کی قطعی تعیین تو مشکل ہے، لیکن ظاہر یہ ہے کہ ان میں جو واقعات زیادہ سنگین اور بڑے ہیں جن میں یہود کی شرارتیں بھی زیادہ ہوئیں اور سزا بھی سخت ملی ان پر محمول کیا جائے، اور وہ چوتھا اور چھٹا واقعہ ہے۔

یہ بھی کہنا ممکن ہے کہ لتفسدن فی الارض مرتین میں مَرَّتَیۡنِ سے مراد دو شریعتوں کی مخالفت ہو یعنی " لتخالفن شریعتین " اگر چہ ہر شریعت کی مخالفت کئی کئی بار ہو، پس اس طرح اس میں سب واقعات داخل ہو جائیں گے، یعنی بعض حوادث شریعت موسویہ کی مخالفت کی سزا تھے، اور بعض شریعت عیسویہ کی مخالفت کی سزا، پھر ان کے بعد وَاِنۡ عُدۡتُّمۡ میں شریعت محمدیہ کی مخالفت پر وعید ہے اور اس طرح کلام نہایت جامع اور متناسق ہو جائے گا، اور بعض مفسرین نے خوب کہا ہے کہ قرآن کا جو اصل مقصود ہے کہ جب جب معاصی کی کثرت ہوئی سزا دی گئی، اس کے لیے واقعات کی تعیین کی کوئی ضرورت نہیں۔

* * *

**فائدہ:** حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں تورات میں کہہ دیا تھا کہ بنی اسرائیل دوبار شرارت کریں گے، اس کی جزا میں دشمن ان کے ملک پر غالب ہوں گے، اسی طرح ہوا ہے، ایک بار جالوت غالب ہوا، پھر حق تعالیٰ نے اس کو حضرت داؤد کے ہاتھ سے ہلاک کیا، پیچھے بنی اسرائیل کو اور قوت زیادہ دی حضرت سلیمان کی سلطنت میں، دوسری بار فارسی لوگوں میں بخت نصر غالب ہوا، تب سے ان کی سلطنت نے قوت نہ پکڑی، اب فرمایا کہ اللہ مہربانی پر آیا ہے اگر اس نبی کے تابع ہو تو وہی سلطنت اور غلبہ پھر کر دے اور اگر پھر وہی شرارت کرو گے تو ہم وہی کریں گے، یعنی مسلمانوں کو ان پر غالب کیا اور آخرت میں دوزخ تیار ہے۔

بعض علماء نے پہلے وعدہ سے بخت نصر کا حملہ جو ولادت مسیح سے ۵۸۷ سال پہلے اور دوسرے وعدے سے طیطوس رومی کا حملہ جو رفع مسیح سے ستر سال بعد ہوا مراد لیا ہے، کیونکہ ان دونوں حملوں میں یہود پر پوری تباہی آئی اور مقدس ہیکل کو برباد کیا گیا، واللہ اعلم۔

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ

یہ قرآن بتلاتا ہے وہ راہ جو سب سے سیدھی ہے اور خوشخبری سناتا ہے (بشارت دیتا ہے) ایمان والوں کو جو عمل کرتے ہیں اچھے

أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيرًا ﴿٩﴾ وَأَنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٠﴾ ع

کہ ان کے لیے ہے ثواب بڑا[1] اور یہ کہ جو نہیں مانتے آخرت کو ان کے لیے تیار کیا ہے ہم نے عذاب دردناک

**خلاصہ تفسیر:** شروع سورت میں معجزہ معراج سے رسول ﷺ کی رسالت پر استدلال تھا، اب قرآن کریم کی مدح ہے جو کہ رسالت کی بہت بڑی دلیل ہے۔

بلاشبہ یہ قرآن ایسے طریقہ کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے (یعنی اسلام) اور (اس طریقہ کے ماننے اور نہ ماننے والوں کی جزاء وسزا بھی بتلاتا ہے کہ) ان ایمان والوں کو جو نیک کام کرتے ہیں یہ خوشخبری دیتا ہے کہ ان کو بڑا بھاری ثواب ملے گا، اور یہ بھی بتلاتا ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے ان کے لئے ایک دردناک سزا تیار کر رکھی ہے۔

أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيرًا: اگر "اجر کبیر" سے مراد مطلق جنت ہے تو اعمال صالحہ کی قید شرط کے طور پر نہیں، بلکہ محض سبب کے طور پر ہے، کیونکہ اس کے لیے صرف ایمان بھی کافی ہے، اور اگر "اجر کبیر" سے جنت کے بڑے درجے مراد ہیں تو اعمال صالحہ کا شرط ہونا بھی صحیح ہے۔

* * *

**فائدہ:** [1] یعنی یوں تو تورات بھی بنی اسرائیل کو راہ بتانے والی تھی جیسا کہ پہلے فرمایا: هُدًى لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ لیکن یہ قرآن ساری دنیا کو سب سے زیادہ اچھی، سیدھی اور مضبوط راہ بتاتا ہے، تمام "قویم راہیں" اس "اقوم" کے تحت میں مندرج ہو گئی ہیں، لہذا اگر کامیابی اور نجات چاہتے ہو تو خاتم الانبیاء کی پیروی میں اسی سیدھی سڑک پر چلو، جو لوگ قلب و جوارح یعنی ایمان و عمل صالح سے اس صاف و کشادہ راہ پر چلیں گے قرآن اُن کو دنیا میں حیاتِ طیبہ کی اور آخرت میں جنت کی عظیم الشان بشارت سناتا ہے، باقی جنہیں انجام کا کچھ خیال نہیں، اندھا دھند دنیا کی لذات و شہوات میں غرق ہیں، آخرت کی اصلاً فکر نہیں رکھتے، ان کا انجام اگلے جملہ میں بیان کیا گیا ہے:

وَيَدْعُ الْإِنسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ ۖ وَكَانَ الْإِنسَانُ عَجُولًا ﴿١١﴾

اور مانگتا ہے آدمی برائی جیسے مانگتا ہے بھلائی، اور ہے انسان جلد باز

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے توحید و رسالت اور قرآن کی حقانیت کا اثبات اور کفار کا مستحق عذاب ہونا مذکور تھا، اس پر کفار کو یہ شبہ تھا کہ اگر توحید و رسالت اور قرآن حق ہیں اور ان کا انکار موجب عذاب ہے تو ہم پر دنیا ہی میں عذاب کیوں نہیں آجاتا، چنانچہ اب اس شبہ کے جواب سے پہلے کفار کی عجلت پسندی کو ذکر فرماتے ہیں۔

اور (بعض) انسان (جیسے کفار ہیں) برائی (یعنی عذاب) کی ایسی دعا کرتا ہے جس طرح بھلائی کی دعاء (کی جاتی ہے) اور انسان کچھ (کچھ طبعاً ہی) جلد باز (ہوتا) ہے (مگر جنہوں نے اپنی اصلاح کر لی وہ ایسی جلد بازی سے بچتے ہیں، اور جو گمراہ ہیں وہ انجام کا نہیں سوچتے اور عذاب مانگتے ہیں اور عذاب کے نہ آنے سے اس کا انکار کرتے ہیں)۔

وَيَدْعُ الْإِنسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ: اس میں بعض آداب دعا کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالی سے مانگنے میں عجلت پسندی کا مظاہرہ نہ کرے (یعنی یہ نہ کہے کہ بار بار دعا کرتا ہوں لیکن قبول نہیں ہوتی) اسی طرح بعض مدعیان تصوف غصہ میں مسلمانوں کے لیے بد دعا کر دیتے ہیں اور خیال

کرتے ہیں کہ ضرور قبول ہوگی، گویا خدائی ان کے قبضہ میں ہے۔

* * *

**فائدہ**: یعنی قرآن تو لوگوں کو سب سے بڑی بھلائی کی طرف بلاتا، اجر کبیر کی بشارتیں سناتا اور بدی کے مہلک نتائج سے آگاہ کرتا ہے لیکن حضرت انسان کا حال یہ ہے کہ وہ سب کچھ سننے کے بعد بھی اپنے لیے برائی کو اسی اشتیاق والحاح سے طلب کرتا ہے جس طرح کوئی بھلائی مانگتا ہو، یا جیسے بھلائی طلب کرنا چاہیے، وہ انجام کی طرف سے آنکھیں بند کر کے بڑی تیزی کے ساتھ گناہوں اور برائیوں کی طرف لپکتا ہے بلکہ بعض بدبخت تو صاف لفظوں میں زبان سے کہہ اٹھتے ہیں: اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (خداوندا! اگر پیغمبر اپنے دعوے میں سچے ہیں تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دیجئے یا اور کوئی سخت عذاب نازل کیجئے) بعض بیوقوف غصہ سے جھنجھلا کر اپنے حق میں یا اپنی اولاد وغیرہ کے حق میں بے سوچے سمجھے بددعا کر بیٹھتے ہیں، بعض دنیا کے نفع عاجل کو معبود بنا کر ہر ایک حلال وحرام طریقہ سے اس کی طرف دوڑتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ اس لہلہاتے پودے کے نیچے سانپ بچھو بھی چھپے ہوئے ہیں، جو انجام کار ہلاکت کے گڑھے میں پہنچا کر رہیں گے، حقیقت یہ ہے کہ آدمی اپنی جلد بازی سے کسی چیز کی ظاہری ٹیپ ٹاپ کو دیکھ لیتا ہے، بدی کے دوررس نتائج پر غور نہیں کرتا، بس جو بات کسی وقت سانح ہوئی فوراً کہہ ڈالی یا ایک دم کر گزرا، جدھر قدم اٹھ گیا بے سوچے سمجھے ادھر ہی بڑھتا چلا گیا، اگر جلد بازی چھوڑ کر متانت، تدبر اور انجام بینی سے کام لے تو کبھی ایسی غلطیاں نہ کرے۔

وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا

اور ہم نے بنائے رات اور دن دو نمونے[1] پھر مٹا دیا رات کا نمونہ[2] اور بنا دیا دن کا نمونہ دیکھنے کو تاکہ تلاش کرو

فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ؕ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ﴿۱۲﴾

فضل اپنے رب کا[3] اور تاکہ معلوم کرو گنتی برسوں کی اور حساب[4] اور سب چیز سنائی ہم نے کھول کر[5]

**خلاصہ تفسیر**: درمیان میں تخلیق لیل ونہار کی حکمت جو کہ وقت کی تحدید ہے بیان کر کے اس طرف اشارہ کیا کہ جس طرح معمولی واقعات بھی وقت کے حساب سے پیش آتے ہیں اسی طرح عذاب وغیرہ کے واقعات بھی دنیا میں اپنے وقت پر ہو جائیں گے اور آخرت میں تو یقینی، گویا اس سے بھی ان کے شبہ کا جواب ہو گیا، ممکن ہے کہ درمیان میں یہ آیت توحید کے اثبات کے لیے ہو۔

اور (ہم نے جس طرح تمام واقعات کا حساب وقت پر رکھا ہے، اسی طرح عذاب بھی اپنے وقت پر ہوگا، آخرت میں تو ضرور اور ممکن ہے کہ کچھ دنیا میں بھی ہو جائے، چنانچہ دنیا کے واقعات کا وقت کے حساب سے ہونا دیکھو کہ) ہم نے رات اور دن کو (اپنی قدرت کی) دو نشانیاں بنایا، سو رات کی نشانی (یعنی خود رات) کو ہم نے دھندلا بنا دیا اور دن کی نشانی کو روشن بنایا (کہ اس میں سب چیزیں بے تکلف دکھائی دیں) تاکہ (دن میں) اپنے رب کی روزی تلاش کرو اور تاکہ (رات اور دن کے آنے جانے اور دونوں کے درمیان اختلاف وامتیاز کہ ایک روشن دوسرا اندھیرا ہے اور دونوں کی مقداروں میں اختلاف سے) برسوں کا شمار اور (دوسرے چھوٹے چھوٹے) حساب معلوم کر لو (جیسا کہ سورۂ یونس کے پہلے رکوع میں بیان ہوا ہے) اور ہم نے ہر چیز کو خوب تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے (لوح محفوظ میں تو تمام کائنات کی مکمل تفصیل بغیر کسی استثناء کے ہے اور قرآن کریم میں تفصیل بقدر ضرورت ہے اس لئے یہ بیان دونوں کی طرف منسوب ہو سکتا ہے)۔

**وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا**: اس سے یا تو قرآن کریم کی مدح کرنا مقصود ہے نیز یہ مفید اور ضروری مضامین بھی اسی میں بیان ہو رہے ہیں، یا اگر لوح محفوظ مراد ہو تو اس میں ہر چیز کا جدا جدا معین وقت لکھا ہوا ہے، اس صورت میں: كُلَّ شَيْءٍ ہر چیز کو عام ہوگا، اور پہلی صورت میں صرف

ضروری مضامین مراد ہوں گے، کیونکہ قرآن کریم میں دنیا بھر کی باتیں مذکور نہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ: رات کا اندھیرا، دن کا اجالا، دونوں میں سے کبھی اس کا کبھی اس کا چھوٹا بڑا ہونا، پھر رات میں چاند کی آہستہ آہستہ گھٹنے بڑھنے والی ٹھنڈی اور دھیمی چاندنی، دن میں آفتاب عالمتاب کی تیز اور گرم روشنی، یہ سب خداوند قدوس کی قدرت کاملہ کے نمونے ہیں، جن میں سے ہر ایک کا مستقل نظام علیحدہ ہے جس کے ساتھ سینکڑوں فوائد اور مصالح وابستہ ہیں اور سب کا مجموعی نظام الگ ہے جو شروع سے اب تک نہایت مضبوط و محکم قوانین کے ماتحت چل رہا ہے۔

**فائدہ:** ۲ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ: رات کا نمونہ تاریک اور مٹا ہوا ہے، چاند کی روشنی سورج کے اعتبار سے دھیمی اور دھندلی ہوتی ہے بلکہ خود جرم قمر بھی دیکھنے والے کو داغ دار نظر آتا ہے۔

**فائدہ:** ۳ لِتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ: یعنی دن کے وقت سورج کی روشنی میں ہر چیز صاف دکھائی دیتی ہے لوگ تازہ دم ہو کر روزی کی تلاش میں نکلتے اور مختلف قسم کے کاروبار میں مشغول ہو جاتے ہیں، الغرض شب میں جن چیزوں پر تاریکی کی چادر پڑی ہوئی تھی، سورج کی شعاعیں سب کو بے حجاب کر دیتی ہیں اور جو لوگ خواب گراں سے مدہوش تھے آنکھیں کھول کر ادھر ادھر گشت لگانے لگتے ہیں۔

**فائدہ:** ۴ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ: یعنی لیل و نہار کی آمد و شد اور شمس و قمر کے طلوع و غروب سے مہینوں اور سالوں کی گنتی اور بہت طرح کے چھوٹے بڑے حساب متعلق ہیں۔

**فائدہ:** ۵ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا: تم سمجھ لو کہ گھبرانے اور جلدی مچانے سے کچھ فائدہ نہیں، خدا کے یہاں ہر چیز کا خیر ہو یا شر ایک وقت اور انداز مقرر ہے، جیسے رات اور دن، کسی کی جلد بازی اور شتاب کاری سے رات کم نہیں ہو جاتی یا دن بڑھ نہیں جاتا، اپنے وقت پر صبح و شام ہوتی ہے، شر کے بعد خیر اور خیر کے بعد شر کا آنا بھی ایسا ہی سمجھو جیسے رات کے پیچھے دن اور دن کے پیچھے رات برابر لگی چلی آتی ہے، دنیا کے تمام خیر و شر کا سلسلہ ایک معین ضابطہ اور نظام کے ماتحت ہے جس کا توڑ ڈالنا کسی کے امکان میں نہیں، اس دنیا کی مکدر و منغص زندگی کو شب تاریک کے مشابہ سمجھو جس کے اندھیرے میں آدمی کو خیر و شر کے نتائج بالکل صاف دکھائی نہیں دیتے، بیشک حق تعالیٰ نے انبیاء و مرسلین کو بھیجا کہ رات کی اندھیری میں مخلوق کو صحیح راستہ بتلائیں اور ان کی آنکھوں کے سامنے اپنے اپنے درجے کے موافق اجالا کریں جس سے لوگوں کو خیر و شر کی حقیقت اور اس کے نتائج کا انکشاف ہو جائے، لیکن ایسا صریح اور بدیہی انکشاف جس میں کسی فرد بشر کو انکار یا شبہ کی مجال ہی باقی نہ رہے، اس وقت ہوگا جب ہماری دنیاوی زندگی کی رات ختم ہو کر فردائے محشر کا دن نکل آئے گا، انسان کے وہی اعمال جو دنیا کی دھندلی زندگی میں ہر وقت اس کے گلے کا ہار بنے ہوئے تھے، پر غفلت و جہالت وغیرہ کی تاریکی میں صاف نظر نہ آتے تھے قیامت کی صبح ہوتے ہی ایک کھلی کتاب کی شکل میں سامنے آجائیں گے جسے روز روشن کے اجالے میں ہر شخص بے تکلف پڑھ سکے گا: فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ اس وقت اپنے تمام چھوٹے بڑے اعمال کو اصلی رنگ میں دیکھ کر بول اٹھے گا: مال هذا الكتاب لا يغادر صغيرة ولا كبيرة الا احصاها

| |
|---|
| وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا |
| اور جو آدمی ہے لگادی ہے ہم نے اس کی بری قسمت اس کی گردن سے، اور نکال دکھائیں گے اس کو قیامت کے دن ایک کتاب (تحریر) |
| يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۝۱۳ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝۱۴ |
| کہ دیکھے گا اس کو کھلی ہوئی ۱ پڑھ لے کتاب اپنی (لکھا اپنا)، تو ہی بس ہے آج کے دن اپنا حساب لینے والا ۲ |

**خلاصہ تفسیر:** اب یہاں حساب و کتاب اور عذاب کا ایک معین وقت پر واقع ہونا بیان فرماتے ہیں۔

اور ہم نے ہر (عمل کرنے والے) انسان کا عمل (نیک ہو یا بد) اس کے گلے کا ہار بنا رکھا ہے (یعنی ہر شخص کا عمل اس کے ساتھ لازم ہے) اور (پھر) قیامت کے دن اس کا اعمال نامہ اس کے (دیکھنے کے) واسطے نکال کر سامنے کر دیں گے جس کو وہ کھلا ہوا دیکھ لے گا (اور اس سے کہا جائے گا کہ لے) اپنا اعمال نامہ (خود) پڑھ لے، آج تو خود ہی اپنا حساب جانچنے کے لئے کافی ہے (یعنی اس کی ضرورت نہیں کہ تیرے اعمال کو کوئی دوسرا آدمی گنائے، بلکہ تو خود ہی اپنا نامہ اعمال پڑھتا جا اور حساب لگاتا جا کہ تجھے کتنی سزا اور کتنی جزاء ملنی چاہئے)۔

مطلب یہ ہے کہ اگرچہ ابھی عذاب سامنے نہیں آیا مگر وہ ٹلنے والا نہیں، ایک وقت ایسا آنے والا ہے کہ انسان اپنے سب اعمال کو کھلی آنکھوں دیکھ لے گا اور عذاب کی حجت اس پر قائم ہو جائے گی، قتادہؒ سے منقول ہے کہ بے پڑھا آدمی بھی اپنا نامہ اعمال پڑھ لے گا۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی شومئ قسمت اور زشتئ اعمال اس کے گلے کا ہار ہے، بری قسمت کے ساتھ برے عمل ہیں کہ چھوٹ نہیں سکتے، وہ ہی نظر آئیں قیامت میں۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی نامہ اعمال اس کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا کہ خود پڑھ کر فیصلہ کر لے، جو کام عمر بھر میں کیے تھے کوئی رہا تو نہیں یا زیادہ تو نہیں لکھا گیا، ہر آدمی اس وقت یقین کرے گا کہ ذرہ ذرہ عمل بلا کم و کاست اس میں موجود ہے، دنیا میں جو کتاب بھیجی (قرآن کریم) اور چاند سورج وغیرہ سے جو حساب و کتاب کا ذکر فرمایا جو اسی پہلے حساب و کتاب پر بطور نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔

| |
|---|
| مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ |
| جو کوئی راہ پر آیا تو آیا اپنے ہی بھلے کو، اور جو کوئی بہکا رہا تو بہکا رہا اپنے ہی برے کو |
| وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ⑮ |
| اور کسی پر نہیں پڑتا بوجھ دوسرے کا ۱؎ اور ہم نہیں ڈالتے بلا جب تک نہ بھیجیں کوئی رسول ۲؎ |

**خلاصہ تفسیر:** (اور) جو شخص (دنیا میں سیدھی) راہ پر چلتا ہے وہ اپنے ہی نفع کے لئے چلتا ہے اور جو شخص بے راہی اختیار کرتا ہے وہ بھی اپنے ہی نقصان کے لئے بے راہ ہوتا ہے (وہ اس وقت اس کا خمیازہ خود بھگتے گا، کسی دوسرے کا کچھ نقصان نہیں، کیونکہ ہمارا قانون ہے کہ) کوئی شخص کسی (کے گناہ) کا بوجھ نہ اٹھائے گا (اور جس کسی کو کوئی سزا دی جاتی ہے وہ اس پر حجت تمام کرنے کے بعد دی جاتی ہے کیونکہ ہمارا قانون یہ ہے کہ) ہم (کبھی) سزا نہیں دیتے جب تک کسی رسول کو (اس کی ہدایت کے لئے) نہیں بھیج لیتے (یعنی ہمارا قانون اور معمول یہ ہے کہ جب کسی شخص کو بواسطہ یا بلا واسطہ رسول کی خبر پہنچ چکی ہو اور پھر بھی نہ مانے اس وقت سزا تجویز کرتے ہیں)۔

**وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا:** اس آیت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جن قوموں کو رسول کی اصلاح خبر نہیں پہنچی انہیں کفر اور گناہوں کی وجہ سے عذاب نہیں ہوگا، چنانچہ بعض کا یہی مذہب ہے، اور بعض اس کے قائل ہیں کہ جن عقائد اور اعمال کی قباحت اور برائی عقل سے معلوم ہو سکتی ہے اور تامل و غور کا زمانہ بھی ملا اور برائی بھی معلوم ہوگئی، پھر ایسے عقائد و اعمال کے مرتکب ہوں یا قباحت معلوم نہیں ہوئی مگر غور و تامل کا زمانہ ملا اور کسی سبب سے ادراک و تامل کی تحریک ہوئی مگر غور نہ کرنے کی وجہ سے قباحت کا ادراک نہ ہوا تو ان لوگوں کو رسول کے نہ آنے کی صورت میں بھی عذاب ہوگا، وہ فرماتے ہیں کہ یہ صورت بھی رسول آنے کے مشابہ ہے، کیونکہ پیغمبروں کے مبعوث ہونے کا فائدہ بھی اسی قدر ہے کہ ان کے ذریعہ سے عقائد و اعمال کی قباحت اور برائی معلوم ہو جاتی ہے یا غور و تامل کرنے کی تحریک ہو جاتی ہے، تو اگر یہ باتیں رسول کے بغیر حاصل ہو جائیں تو پھر اس کے خلاف عمل کرنے پر عذاب ہوگا، پس آیت کا مطلب ان علماء کے نزدیک یہ ہوا کہ کسی کو عذاب نہیں جب تک کہ عقل یا نقل سے تنبیہ نہیں کر دیتے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی سیدھی راہ خدا نے سب کو بتلا دی اب جو کوئی اس پر چلے یا نہ چلے، اپنا بھلا برا خود سوچ لے، کیونکہ اپنے طریق عمل کا نفع یا نقصان اسی کو پہنچے گا، ایک کے گناہوں کی گٹھڑی دوسرے کے سر پر نہیں رکھی جائے گی۔

**فائدہ:** ۲ یعنی بلاشبہ برے عمل آفت لاتے ہیں، پر حق تعالیٰ بغیر سمجھائے نہیں پکڑتا اسی واسطے رسول بھیجتا ہے کہ لوگوں کو بے خبر اور غافل نہ رہنے دیں، نیک و بد سے پوری طرح آگاہ کر دیں جن باتوں کو آدمی محض عقل وفطرت کی راہنمائی سے سمجھ سکتا ہے (مثلاً وجود باری یا توحید) ان کی مزید تشریح وتوثیق پیغمبروں کی زبانی کر دی جائے اور جن چیزوں کے ادراک میں محض عقل کافی نہ ہو انھیں وحی والہام کی روشنی میں پیش کیا جائے، اسی لیے ابتدائے آفرینش سے حق تعالیٰ نے وحی ورسالت کا سلسلہ جاری رکھا تا آنکہ انبیاء علیہم السلام کے انوار و فیوض نے دنیا میں ایسی فضا پیدا کر دی کہ کوئی معذب قوم دنیا یا آخرت میں جہل و بے خبری کا عذر پیش کر کے عذاب الٰہی سے رستگاری حاصل نہیں کر سکتی۔

**تنبیہ:** مفسرین نے یہاں ''اصحاب فترت'' اور اطفال صغار کی تعذیب پر بحث شروع کر دی ہے، ہم تطویل کے خوف سے درج نہیں کر سکتے۔

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا

اور جب ہم نے چاہا کہ غارت کریں کسی بستی کو حکم بھیج دیا اس کے عیش کرنے والوں کو پھر انہوں نے نافرمانی کی اس میں

فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ﴿۱۶﴾

تب ثابت ہو گئی ان پر (ان کے ذمہ) بات پھر اکھاڑ مارا ہم نے ان کو اٹھا کر

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے اس قانون کا بیان تھا کہ جب تک کسی قوم کے پاس پیغمبر کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات نہ پہنچ جائیں اور پھر بھی وہ اطاعت نہ کریں اس وقت تک ان پر عذاب نہیں بھیجتے، اب اس کے دوسرے رخ کا بیان ہے کہ جب کسی قوم کے پاس رسول اور اللہ کے پیغام پہنچ گئے اور پھر بھی انہوں نے سرکشی سے کام لیا تو اس پر عذاب عام بھیج دیا جاتا ہے، تاکہ سننے والے متنبہ ہوں کہ ہماری طرف رسول مقبول ﷺ مبعوث ہو چکے ہیں، نہ ماننے سے ہم بھی مستحق عذاب ہو جائیں گے۔

اور جب ہم کسی بستی کو (جو اپنے کفر و نافرنی کی وجہ سے بمقتضائے حکمت ہلاک کرنے کے قابل ہو) ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو (اس کو رسول بھیجنے سے پہلے ہلاک نہیں کرتے، بلکہ پہلے کسی رسول کی معرفت) اس (بستی) کے خوش عیش (یعنی امیر و رئیس) لوگوں کو (خصوصا، اور عام لوگوں کو عموما ایمان واطاعت کا) حکم دیتے ہیں، پھر (جب) وہ لوگ (کہنا نہیں مانتے، بلکہ) وہاں شرارت مچاتے ہیں تب ان پر حجت تمام ہو جاتی ہے پھر اس بستی کو تباہ و غارت کر ڈالتے ہیں۔

**وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً:** الفاظ آیت اِذَآ اَرَدْنَآ اور اس کے بعد اَمَرْنَا کے ظاہر سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ ان لوگوں کا ہلاک کرنا ہی مقصود خداوندی تھا اس لئے ان کو اول بذریعہ انبیاء علیہم السلام ایمان واطاعت کا حکم دینا، پھر ان کے فسق و فجور کو عذاب کا سبب بنانا یہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوا تو اس صورت میں یہ بیچارے معذور و مجبور ہوئے، اس کے جواب کی طرف خلاصہ تفسیر کے ضمن میں یہ اشارہ آچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل واختیار دیا اور عذاب وثواب کے راستے متعین کر دیئے، جب کوئی اپنے اختیار سے عذاب ہی کے کام کا عزم کرے تو عادت اللہ یہ ہے کہ وہ اسی عذاب کے اسباب مہیا کر دیتے ہیں تو اصلی سبب عذاب کا خود ان کو عزم اور قصد ہے کفر و معصیت کا، نہ کہ محض ارادہ اس لئے وہ معذور نہیں ہو سکتے۔

**اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا:** لفظ اَمَرْنَا کا مشہور مفہوم وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے، یعنی حکم دیا، ہم نے لیکن اس آیت میں اس لفظ کی قراءتیں مختلف ہیں، ایک قراءت میں جس کو ابوعثمان نہدی ابورجاء ابوالعالیہ اور مجاہد نے اختیار کیا ہے، یہ لفظ میم تشدید کے ساتھ آیا ہے، یعنی اَمَّرْنَا جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم نے امیر و حاکم بنا دیا خوش عیش سرمایہ دار لوگوں کو جو فسق و فجور میں مبتلا ہو گئے اور سب قوم کے لئے عذاب کا سبب بنے۔

اورحضرت علیؓ وابن عباسؓ کی ایک قراءت میں یہ لفظ آمَّرْنَا پڑھا گیا جس کی تفسیر انہیں حضرات سے "أکثرنا" نقل کی گئی ہے، یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر عذاب بھیجتے ہیں تو اس کی ابتدائی علامت یہ ہوتی ہے کہ اس قوم میں خوش عیش سرمایہ دار لوگوں کی کثرت کردی جاتی ہے، امراء کو عدد اور سامان کے اعتبار سے بڑھا دیتے ہیں جسے 'استدراج' کہتے ہیں، یہاں تک کہ وہ خواب غفلت اور دنیا میں ہی منہمک ہوجاتے ہیں اور وہ اپنے فسق و فجور کے ذریعہ پوری قوم کو عذاب میں مبتلا کرنے کا سبب بن جاتے ہیں، جیسا اس آیت میں ہے: حتّٰی اذا فرحوا بما اوتوا اخذنٰھم بغتة۔

ان میں سے پہلی قراءت کا حاصل تو یہ ہوا کہ ایسے خوش عیش سرمایہ داروں کو قوم کا حاکم بنادیا جاتا ہے، اور دوسری قراءت کا حاصل یہ ہے کہ قوم میں ایسے لوگوں کی کثرت کردی جاتی ہے، ان دونوں سے یہ معلوم ہوا کہ عیش پسند لوگوں کی حکومت یا ایسے لوگوں کی قوم میں کثرت کچھ خوشی کی چیز نہیں عذاب الٰہی کی علامت ہے، حق تعالیٰ جب کسی قوم پر ناراض ہوتے ہیں اور اس کو عذاب میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں تو اس کی ابتدائی علامت یہ ہوتی ہے کہ اس قوم کے حاکم ورئیس ایسے ایسے لوگ بنادیئے جاتے ہیں جو عیش پسند عیاش ہوں یا حاکم بھی نہ بنیں تو اس قوم کے افراد میں ایسے لوگوں کی کثرت کردی جاتی ہے، دونوں صورتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ شہوات ولذات میں مست ہوکر اللہ کی نافرمانیاں خود بھی کرتے ہیں دوسروں کے لئے بھی اس کی راہ ہموار کرتے ہیں، بالآخران پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آجاتا ہے۔

یا مطلب یہ ہے کہ یہاں اذا اردنا ان نھلك میں ارادہ سے ارادہ ازلیہ مراد ہے اور امرنا مترفیھا میں امر سے حکم تکوینی اور تقدیری مراد ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تشریعی طور پر کسی کو فحشاء اور منکر کا حکم نہیں دیتے مگر تکوینی اور تقدیری طور پر سعادت اور بدبختی، ہدایت اور گمراہی سب اس کے حکم سے ہے کوئی خیر اور شر اس کی تقدیر وتکوین اور اس کے ارادہ اور مشیت سے باہر نہیں۔

حاصل کلام یہ ہوا کہ ہلاکت سے پہلے اتمام حجت کے لیے رسول بھیجتے اور مہلت دیتے ہیں، اور اگرچہ رسولوں کے آنے سے پہلے وہ لوگ کفر ومعصیت کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے (جس کا معین کرنا اور تفتیش کرنا ضروری نہیں) ہلاکت کے قابل ہوچکتے ہیں، مگر بالفعل ہلاک کرنا رسولوں کے بھیجنے پر موقوف رکھا گیا، پس یہ اشکال نہیں ہوسکتا کہ رسول آنے سے پہلے اگر وہ ہلاکت کے قابل نہیں ہوتے تو گویا ہلاک کرنے کے لیے یہ سلسلہ نکالا؟ جواب یہ ہے کہ وہ ہلاک کرنے کے قابل پہلے سے ہوتے ہیں، مگر اتمام حجت کے بغیر تباہ نہیں کیے جاتے۔

**مُتْرَفِیْھَا**: آیت میں خوش عیش مالداروں کا خصوصیت سے ذکر کرنا اس طرف اشارہ ہے کہ فطری طور پر عوام اپنے مالداروں اور حاکموں کے اخلاق واعمال سے متاثر ہوتے ہیں، جب یہ لوگ بدعمل ہوجائیں تو پوری قوم بدعمل ہوجاتی ہے اس لئے جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے مال ودولت دیا ہے ان کو اس کی زیادہ فکر ہونا چاہئے کہ اپنے اعمال واخلاق کی اصلاح کرتے رہیں، ایسا نہ ہو کہ یہ عیش پرستی میں پڑ کر اس سے غافل ہوجائیں اور پوری قوم ان کی وجہ سے غلط راستے پر پڑ جائے تو قوم کے اعمال بد کا وبال بھی ان پر پڑے گا۔

**وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً**: روح المعانی میں ہے کہ اسی طرح جب کسی نافرمان کا دل گناہوں کے سبب خراب ہوجاتا ہے تو اس پر نفس وشیطان کے لشکر مسلط ہوجاتے ہیں، پھر وہ لذات وشہوات کی اتباع کرکے برباد ہوجاتا ہے۔

* * *

**فائدہ**: یعنی جب بداعمالیوں کی بدولت کسی بستی کو تباہ کرنا ہوتا ہے تو یوں ہی دفعۃً پکڑ کر ہلاک نہیں کردیتے، بلکہ اتمام حجت کے بعد سزا دی جاتی ہے، اول پیغمبر یا اس کے نائبین کی زبانی خدائی احکام ان کو پہنچائے جاتے ہیں، خصوصاً وہاں کے امراء اور بارسوخ لوگوں کو جن کے ماننے نہ ماننے کا اثر جمہور پر پڑتا ہے، آگاہ کیا جاتا ہے، جب یہ بڑی ناک والے سمجھ بوجھ کر خدائی پیغام کو رد کردیتے اور کھلے بندوں نافرمانیاں کرکے تمام بستی کی فضا کو مسموم ومکدر بنادیتے ہیں، اس وقت وہ بستی اپنے کو اعلانیہ مجرم ثابت کرکے عذاب الٰہی کی مستحق ہوجاتی ہے (نَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا)

**تنبیہ**: وَقَالَ بَعْضُ السَّلَفِ اَنَّ الْاَمْرَ فِیْ قَوْلِهٖ تَعَالٰی ﴿اَمَرْنَا مُتْرَفِیْهَا﴾ اَمْرٌ تَكْوِیْنِیٌّ قَدْرِیٌّ بِالْفِسْقِ وَقَوْلُهٗ تَعَالٰی ﴿اِنَّ اللهَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ﴾ مَعْنَاهُ نَفْیُ الْاَمْرِ التَّشْرِیْعِیِّ فَلَا مُنَافَاةَ. فَافْهَمْ۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ⑰

اور بہت غارت کردیے (ہم نے جماعتیں) ہم نے قرن نوح کے (سے) پیچھے ۱ اور کافی ہے تیرا رب اپنے بندوں کے گناہ جاننے والا دیکھنے والا ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور (اسی عادت کے موافق) ہم نے بہت سی امتوں کو نوح (علیہ السلام) کے (زمانہ کے) بعد (ان کے کفر و معصیت کے سبب) ہلاک کیا ہے (جیسے عاد وثمود وغیرہ) اور آپ کا رب اپنے بندوں کے گناہوں کا جاننے والا دیکھنے والا کافی ہے (تو جیسا کسی قوم کا گناہ ہوتا ہے ویسی سزا دیتا ہے)۔

**مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ:** نوح علیہ السلام کی قوم کا غرق ہوکر ہلاک ہونا مشہور و معروف ہے، اس لئے مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ پر اکتفا کیا گیا، خود قوم نوح کا ذکر نہیں کیا، اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ شروع سورت میں آیت ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ میں لفظ حَمَلْنَا سے طوفان نوح کی طرف اشارہ موجود ہے، اس کو قوم نوح کی ہلاکت کا بیان قرار دے کر یہاں مابعد نوح علیہ السلام کا ذکر فرمایا گیا

* * *

**فائدہ:** ۱ آدم و نوح کے درمیانی زمانہ میں سب آدمی اسلام پر رہے، پھر شرک و بت پرستی شروع ہوئی، نوح علیہ السلام ان کی اصلاح کے لیے بھیجے گئے، سینکڑوں برس سمجھایا، نہ مانے، آخر سب ہلاک کئے گئے، اس کے بعد بہت سی قومیں (عاد وثمود وغیرہ) تباہ ہوئیں، حاصل یہ کہ قوموں کے ہلاک کیے جانے کا سلسلہ بعثت نوح کے بعد سے شروع ہوا۔

**فائدہ:** ۲ یعنی کسی کو بے قصور نہیں پکڑتا نہ غیر مناسب سزا دیتا ہے، بلکہ ہر ایک کے گناہوں کو دیکھ کر اور اس کے اوضاع و اطوار کو پوری طرح جان کر موزوں و مناسب برتاؤ کرتا ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ

جو کوئی چاہتا ہو پہلا گھر جلد دے دیں ہم اس کو اسی میں جتنا چاہیں جس کو چاہیں پھر ٹھہرایا ہے ہم نے اس کے واسطے دوزخ

يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ⑱ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ

داخل ہوگا اس میں اپنی برائی سن کر دھکیلا جا کر ۱ اور جس نے چاہا پچھلا گھر اور دوڑ کی اس کے واسطے جو اس کی دوڑ ہے اور وہ یقین پر ہے

فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ⑲

سوا ایسوں کی دوڑ ٹھکانے لگی ہے (کام آئی ہے) ۲

**خلاصہ تفسیر:** کفار کا ایک شبہ یہ تھا کہ اگر ہمارے کچھ برے اعمال عذاب کا سبب ہیں تو ہمارے کچھ اعمال ایسے بھی ہیں جو بالاتفاق نیکی شمار کیے جاتے ہیں، جیسے مہمانداری، مظلوم کی مدد وغیرہ تو یہ اعمال ہماری نجات کا ذریعہ ہوجائیں گے، جواب کا حاصل یہ ہے کہ تمہارے یہ نیک کام دو حال سے خالی نہیں: ① یا تو ان اعمال سے تمہیں محض دنیا کا نفع مقصود ہے اور حقیقت بھی یہی ہے، چنانچہ تمہارا انکار آخرت اس کی دلیل ہے تب تو تم يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ میں داخل ہو، جس کا انجام جہنم ہے، ② اور اگر تمہیں ان نیک اعمال سے آخرت کا نفع مقصود ہے جو کہ محض ایک فرضی صورت ہے تو اس میں وَهُوَ مُؤْمِنٌ یعنی ایمان کی شرط ہے جو تم میں نہیں پائی جاتی، اس لیے وہ بھی نجات کا ذریعہ نہیں ہوسکتا، بہرصورت تم مستحق عذاب ہی ہو، ساتھ ساتھ دنیا کا ذلیل ہونا اور آخرت کا افضل ہونا بھی بیان کیا جاتا ہے۔

جو شخص (اپنے نیک اعمال سے صرف) دنیا (کے نفع) کی نیت رکھے گا (خواہ اس لئے کہ وہ آخرت کا منکر ہے، یا اس لئے کہ آخرت سے

غافل ہے تو) ہم ایسے شخص کو دنیا ہی میں جتنا چاہیں گے (پھر یہ بھی سب کے لیے نہیں بلکہ) جس کے واسطے چاہیں گے فی الحال ہی دے دیں گے (یعنی دنیا ہی میں کچھ جزاءمل جائے گی) پھر (آخرت میں خاک نہ ملے گا، بلکہ وہاں) ہم اس کے لئے جہنم تجویز کردیں گے وہ اس میں بدحال راندہ (درگاہ) ہو کر داخل ہوگا، اور جو شخص (اپنے اعمال میں) آخرت (کے ثواب) کی نیت رکھے گا اور اس کے لئے جیسی کوشش کرنی چاہئے ویسی ہی کوشش بھی کرے گا (مطلب یہ ہے کہ ہر کوشش بھی مفید نہیں، بلکہ کوشش صرف وہی مفید ہے جو شریعت اور سنت کے موافق ہو، کیونکہ حکم ایسی ہی کوشش کا دیا گیا ہے، جو عمل اور کوشش شریعت وسنت کے خلاف ہو وہ مقبول نہیں) بشرطیکہ وہ شخص مومن بھی ہو سو ایسے لوگوں کی یہ سعی مقبول ہوگی۔

**عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ:** سورہ ہود آیت ۱۵: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے اعمال کا بدلہ دنیا میں ضرور ملتا ہے، جبکہ یہاں اس آیت میں خدا کی مشیت کی قید ہے جس سے بظاہر تعارض کا شبہ ہوتا ہے، یہ اشکال سورہ ہود کی اس آیت کے ترجمہ اور خلاصہ تفسیر کے ملاحظہ سے دور ہو جائے گا، ضرور دیکھ لیا جائے۔

غرض اللہ کے یہاں عمل قبول ہونے کی چار شرطیں ہوئیں: ① اول تصحیح نیت یعنی خالص آخرت کے ثواب کی نیت ہونا، جس میں اغراض نفسانی شامل نہ ہوں ② دوسرے اس نیت کے لئے عمل اور کوشش کرنا، صرف نیت وارادہ سے کوئی کام نہیں ہوتا جب تک اس کے لئے عمل نہ کرے ③ تیسرے تصحیح عمل یعنی سعی وعمل کا شریعت اور سنت کے مطابق ہونا، کیونکہ مقصد کے خلاف سمت میں دوڑنا اور کوشش کرنا بجائے مفید ہونے کے مقصد سے اور دور کر دیتا ہے ④ چوتھی شرط جو سب سے اہم اور سب کا مدار ہے وہ تصحیح عقیدہ یعنی ایمان ہے، ان شرائط کے بغیر کوئی عمل اللہ کے نزدیک مقبول نہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱۔ یعنی ضروری نہیں کہ ہر عاشقِ دنیا کو فوراً ہلاک کر دیا جائے، نہیں! ہم ان لوگوں میں سے جو صرف متاعِ دنیا کے لیے سرگرداں ہیں جس کو چاہیں اور جس قدر چاہیں اپنی حکمت ومصلحت کے موافق دنیا کا سامان دے دیتے ہیں تاکہ ان کی جدوجہد اور فانی نیکیوں کا فانی پھل مل جائے اور اگر آخری سعادت مقدر نہیں تو شقاوت کا پیمانہ پوری طرح لبریز ہو کر نہایت ذلت ورسوائی کے ساتھ دوزخ کے ابدی جیل خانہ میں دھکیل دیے جائیں۔

**فائدہ:** ۲۔ یعنی جس کے دل میں ایمان ویقین موجود ہو اور نیک نیتی سے خدا کی خوشنودی اور ثواب اخروی کی خاطر پیغمبر کے بتلائے ہوئے راستہ پر عملی دوڑ دھوپ کرے اس کی کوشش ہرگز ضائع ہونے والی نہیں، یقیناً بارگاہ احدیت میں حسن قبول سے سرفراز ہو کر رہے گی۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ⑳

ہر ایک کو ہم پہنچائے جاتے ہیں ان کو اور اُن کو تیرے رب کی بخشش میں سے، اور تیرے رب کی بخشش کسی نے نہیں روک لی ۱۔

اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ㉑

دیکھ کیسا بڑھا دیا ہم نے ایک کو ایک سے، اور پچھلے گھر میں تو اور بڑے درجے ہیں اور بڑی فضیلت ۲۔

**خلاصہ تفسیر:** (کفار کو دنیا کی نعمتیں حاصل ہونا ان کے اعمال کی مقبولیت کی علامت نہیں، کیونکہ دنیا کی نعمتیں مقبولین ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ) آپ کے رب کی عطاء (دنیوی) میں سے تو ہم ان (مقبولین) کی بھی امداد کرتے ہیں اور ان (غیر مقبولین) کی بھی (امداد کرتے ہیں) اور آپ کے رب کی عطاء (دنیوی کسی پر) بند نہیں (چنانچہ) آپ دیکھ لیجئے کہ ہم نے (اس دنیوی عطاء میں ایمان وکفر کی شرط کے بغیر) ایک کو دوسرے پر کس طرح فوقیت دی ہے (یہاں تک کہ اکثر کفار اکثر مومنین سے زیادہ عیش وعشرت میں ہیں، کیونکہ یہ چیزیں قابل وقعت نہیں) اور البتہ آخرت (جو مقبولین کے ساتھ خاص ہے وہ) درجات کے اعتبار سے بہت بڑی ہے اور فضیلت کے اعتبار سے بھی (اس لئے اسی کا اہتمام کرنا چاہئے)۔

**كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ:** اگر کسی پر دنیاوی نعمتوں کی فراوانی ہو تو یہ حالت اللہ کے ہاں اس انسان کے مقبول ومحبوب

ہونے کی علامت نہیں ہے، کیونکہ مذکورہ آیت کی روشنی میں اللہ تعالی دنیا مقبولین یعنی مؤمنین اور غیر مقبولین یعنی کفار دونوں کو عطا فرماتے ہیں، بعض مدعیان طریقت فخر سے کہتے ہیں کہ جوشخص ہمارے سلسلے میں آجاتا ہے تو اس کو مال وعہدہ کی ترقی ہوجاتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سراسر دھوکہ اور زعم ہے، اللہ کے ہاں مقبولیت کی علامت ایمان اور اعمال صالحہ ہیں، اس میں اس بات کی بھی اصل ہے جو بعض بزرگوں کی عادت رہی ہے کہ وہ نفع پہنچانے میں صرف اہل ایمان کو خاص نہیں کرتے، بلکہ اوروں کو بھی حتی الوسع نفع پہنچاتے ہیں، ان کی یہ فراخ دلی اخلاق الٰہیہ سے مستفاد ہے اور آیت **لیس علیك هداهم** میں اس کی ترغیب بھی ہے، ہاں ہدیہ وغیرہ میں تقوی کی رعایت مناسب ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی حق تعالیٰ اپنی حکمت ومصلحت کے موافق بعض طالبین دنیا کو دنیا اور تمام طالبین آخرت کو آخرت عطا فرماتا ہے، اس کی عطا میں کوئی مانع ومزاحم نہیں ہوسکتا، یا یہ مطلب ہے کہ طالب دنیا ہو یا طالب آخرت دنیاوی امداد سے دونوں کو حسبِ مصلحت حصہ پہنچتا ہے، محض کفر وعصیان کی وجہ سے دنیاوی بخشش کے دروازے بند نہیں کردیے جاتے۔

**فائدہ:** یعنی دنیاوی زندگی میں مال، دولت، عزت، حکومت، اولاد وغیرہ کے اعتبار سے ایک کو دوسرے پر کسی قدر فضیلت ہے، اسی پر قیاس کرلو کہ آخرت میں تفاوتِ اعمال واحوال کے لحاظ سے کس قدر فرقِ مراتب ہوگا، چنانچہ نصوص سے ثابت ہے کہ درجات جنت اور درجات جہنم بے حد متفاوت ہیں، حدیث میں آیا ہے کہ جنت کے درجوں کے درمیان زمین وآسمان کا تفاوت ہوگا، نیچے والے اوپر والوں کو اس طرح دیکھیں گے جیسے ہم زمین پر کھڑے ہوکر افق میں کوئی ستارہ دیکھتے ہیں، پہلے بتایا جاچکا ہے کہ جنت کے یہ درجات انہی کو مل سکتے ہیں جو آخرت کے لیے اسکے لائق دوڑ دھوپ کریں۔

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ﴿۲۲﴾ ع۲

مت ٹھہرا اللہ کے ساتھ دوسرا حاکم پھر بیٹھ رہے گا تو الزام کھا کر بےکس ہوکر

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے قبول اعمال کے لئے چند شرائط بتلائی، آگے ان کی تفصیل ہے اور چونکہ بڑی شرط ایمان وتوحید ہے اس لیے اس تفصیل کو توحید سے شروع کیا اور توحید ہی پر ختم کیا، درمیان میں بعض ضروری اعمال بتلائے ہیں تاکہ طالب آخرت ان کو اختیار کرے، اور چونکہ ان اعمال کے بتلانے سے قانون شرعی کی تعیین بھی ہوگئی اس لیے شریعت وسنت کے مطابق کوشش کا بیان بھی ہوگیا، اور یہ احکام مختلف قسم کے ہیں جو اپنے حسن وخوبی کی وجہ سے اہل بصیرت کے لیے رسالت محمدیہ کے دلائل بھی ہوسکتے ہیں جس پر پیچھے کلام تھا، چونکہ مذکورہ شرائط میں سب سے اہم شرط ایمان کی ہے اس لئے سب سے پہلا حکم بھی توحید کا بیان فرمایا اس کے بعد حقوق العباد سے متعلقہ احکام ہیں۔

(پہلا حکم: اے مخاطب!) اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود مت تجویز کر (شرک نہ کر) ورنہ تو بدحال بے یار ومددگار ہوکر بیٹھ رہے گا۔

* * *

**فائدہ:** یعنی شرک ایسی ظاہر البطلان چیز ہے جس کے اختیار کرنے پر اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے، بلکہ دنیا کے ہر عقلمند کے نزدیک تم مذموم وملزم ٹھہروگے، چنانچہ آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ جن مذاہب میں شرک صریح کی تعلیم تھی وہ بھی دانش مندوں کی سوسائٹی میں جگہ حاصل کرنے کے لیے اپنی ترمیم واصلاح کرکے آہستہ آہستہ توحید کی طرف قدم اٹھارہے ہیں، ہر ایک عاقل یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ اشرف المخلوقات انسان کے لیے یہ چیز سخت ذلت ورسوائی کی موجب ہے کہ اپنے سے کمتر یا کسی عاجز مخلوق کے سامنے سربسجود ہوجائے، خصوصاً ان چیزوں کے سامنے دست سوال دراز کرے جو خود اسی کی تراشی ہوئی ہیں، جو آدمی خدا کو چھوڑ کر غیر اللہ کے سامنے جھکتا ہے، خدائے بے نیاز حقیقی نصرت وبرکت کا دروازہ اس پر بند کرکے کمزوری اور بیکسی کی حالت میں چھوڑ دیتا ہے چنانچہ سخت کٹھن وقت میں جب کہ اسے اعانت وامداد کی بڑی ضرورت ہوگی، کوئی یار ومددگار نہ ملے گا ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ

اور حکم کر چکا تیرا رب کہ نہ پوجو اس کے سوائے اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو ۱؎ اگر پہنچ جائے تیرے سامنے بڑھاپے کو ایک ان میں

اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾

یا دونوں تو نہ کہہ ان کو ہوں اور نہ جھڑک ان کو اور کہہ ان سے بات ادب کی ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** (اب پھر اسی توحید کی تاکید ہے کہ) تیرے رب نے حکم کر دیا ہے کہ بجز اس (معبود برحق) کے کسی کی عبادت مت کر (یہ سعی آخرت کے طریقہ کی تفصیل ہے، دوسرا حکم:) اور تم (اپنے) ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرو، اگر (وہ) تیرے پاس (ہوں اور) ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے (کی عمر) کو پہنچ جائیں (جس کی وجہ سے خدمت کے محتاج ہو جائیں اور جبکہ طبعاً ان کی خدمت کرنا بھاری معلوم ہو) سو (اس وقت بھی اتنا ادب کرو کہ) ان کو کبھی (ہاں سے) ہوں بھی مت کہنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور ان سے خوب ادب سے بات کرنا۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ خدا تو حقیقۃً بچہ کو وجود عطا فرماتا ہے، والدین اس کی ایجاد کا ظاہری ذریعہ ہیں، اس لیے کئی آیتوں میں خدا تعالیٰ کے حقوق کے ساتھ والدین کے حقوق ذکر کیے گئے، حدیث میں آیا ہے کہ وہ شخص خاک میں مل گیا جس نے اپنے والدین کو پایا اور ان کی خدمت کر کے جنت حاصل نہ کی، ایک حدیث میں فرمایا کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے، والدین کے ساتھ بھلائی کرنا یہ ہے کہ زندگی میں ان کی جان و مال سے خدمت اور دل سے تعظیم و محبت کرے، مرنے کے بعد ان کا جنازہ پڑھے، ان کے لیے دعاء و استغفار کرے، ان کے عہد تا مقدور پورے کرے، ان کے دوستوں کے ساتھ تعظیم و حسن سلوک سے اور ان کے اقارب کے ساتھ صلہ رحمی سے پیش آئے وغیرہ ذالک۔

**فائدہ:** ۲؎ بڑھاپے میں خدمت کی احتیاج زیادہ ہوتی ہے جس سے بعض اوقات اہل و عیال بھی اکتانے لگتے ہیں زیادہ پیرانہ سالی میں ہوش و حواس بھی ٹھکانے نہیں رہتے، بڑی سعادت مند اولاد کا کام ہے کہ اس وقت بوڑھے والدین کی خدمت گزاری و فرمانبرداری سے جی نہ ہارے، قرآن نے تنبیہ کی کہ جھڑکنا اور ڈانٹنا تو کجا ان کے مقابلہ میں زبان سے ''ہوں'' بھی مت کر، بلکہ بات کرتے وقت پورے ادب و تعظیم کو ملحوظ رکھو، ابن مسیبؒ نے فرمایا ایسی طرح بات کرو جیسے ایک خطاوار اور غلام سخت مزاج آقا سے کرتا ہے۔

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۴﴾ؕ

اور جھکا دے ان کے آگے کندھے عاجزی کر کر نیازمندی سے اور کہہ اے رب ان پر رحم کر جیسا پالا انہوں نے مجھ کو چھوٹا سا

**خلاصہ تفسیر:** اور ان کے سامنے شفقت سے انکساری کے ساتھ جھکے رہنا، اور (ان کے لئے حق تعالیٰ سے) یوں دعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار! ان دونوں پر رحمت فرمائیے جیسا انہوں نے مجھ کو بچپن (کی عمر) میں پالا پرورش کیا ہے۔

شرعی دلائل سے ثابت ہے کہ یہ دعا ان والدین کے لیے خاص ہے جو ایمان کی حالت میں ہوں، البتہ اگر والدین یا ان میں سے کوئی ایک حالت کفر میں زندہ ہو اور دعائے رحمت بمعنی دعائے ہدایت کی جائے تو جائز ہے۔

**رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا:** دعا کے لیے جو فرمایا ہے تو بظاہر یہ حکم استحبابی ہے، اور بعض نے واجب کہا ہے، لیکن عمر بھر میں ایک بار دعا کرنے سے بھی واجب ادا ہو جائے گا، اور شرعی دلائل سے اس دعا کے لیے والدین کا مؤمن ہونا شرط ہے، البتہ اگر حالت کفر میں زندہ ہوں اور ہدایت کی دعا کی جائے تو جائز ہے، اور اس سے اپنے استاذ و شیخ کے لیے بھی دعا کرنے کا پتہ چلتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جب میں بالکل کمزور و ناتواں تھا انہوں نے میری تربیت میں خون پسینہ ایک کر دیا، اپنے خیال کے موافق میرے لیے ہر ایک راحت و خوبی کی فکر کی، ہزار ہا آفات و حوادث سے بچانے کی کوشش کرتے رہے، بارہا میری خاطر اپنی جان جوکھوں میں ڈالی، آج ان کی ضعیفی کا وقت آیا ہے، جو کچھ میری قدرت میں ہے ان کی خدمت و تعظیم کرتا ہوں لیکن پورا حق ادا نہیں کر سکتا اس لیے تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس بڑھاپے میں اور موت کے بعد ان پر نظر رحمت فرما۔

رَبُّكُمۡ اَعۡلَمُ بِمَا فِىۡ نُفُوۡسِكُمۡ‌ ؕ اِنۡ تَكُوۡنُوۡا صٰلِحِيۡنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلۡاَوَّابِيۡنَ غَفُوۡرًا ﴿۲۵﴾

تمہارا رب خوب جانتا ہے جو تمہارے جی میں ہے، اگر تم نیک ہو گے تو وہ رجوع کرنے والوں کو بخشتا ہے

**خلاصہ تفسیر:** (اور صرف اس ظاہری توقیر و تعظیم پر اکتفاء مت کرنا، دل میں بھی ان کا ادب اور قصد اطاعت رکھنا، کیونکہ) تمہارا رب تمہارے دلوں کی بات کو خوب جانتا ہے (اور اسی وجہ سے تمہارے لئے اس کی تعمیل آسان کرنے کی غرض سے ایک تخفیف کا حکم بھی سناتے ہیں کہ) اگر تم (حقیقت میں دل ہی سے) سعادت مند ہو (اور غلطی یا تنگ مزاجی یا تنگ دلی سے کوئی ظاہری کوتاہی ہو جائے اور پھر نادم ہو کر معذرت کر لو) تو وہ توبہ کرنے والوں کی خطا معاف کر دیتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی والدین کی تعظیم اور ان کے سامنے تواضع و فروتنی صمیم قلب سے ہونی چاہیے، خدا تعالیٰ جانتا ہے کہ کون کیسے دل سے ماں باپ کی خدمت کرتا ہے، اگر فی الواقع تم دل سے نیک اور سعادت مند ہو گے اور خدا کی طرف رجوع ہو کر اخلاص و حق شناسی کے ساتھ ان کی خدمت کرو گے تو وہ تمہاری کوتاہیوں اور خطاؤں سے درگزر فرمائے گا، فرض کرو اگر کسی وقت باوجود نیک نیتی کے تنگ دلی یا تنگ مزاجی سے کوئی فروگزاشت ہوگئی، پھر توجہ و رجوع کیا تو اللہ بخشنے والا ہے۔

**تنبیہ:** والدین کی فرمانبرداری کن چیزوں میں ہے اور کن میں نہیں؟ اس کی تفصیل کتب فقہ وغیرہ میں دیکھنا چاہیے، روح المعانی میں بھی اس پر مفید و مبسوط کلام کیا ہے، فلیراجع۔

وَاٰتِ ذَا الۡقُرۡبٰى حَقَّهٗ وَالۡمِسۡكِيۡنَ وَابۡنَ السَّبِيۡلِ وَلَا تُبَذِّرۡ تَبۡذِيۡرًا ﴿۲۶﴾

اور دے قرابت والے کو اس کا حق اور محتاج کو اور مسافر کو اور مت اڑا بے جا (فضول) [1]

اِنَّ الۡمُبَذِّرِيۡنَ كَانُوۡۤا اِخۡوَانَ الشَّيٰطِيۡنِ‌ ؕ وَكَانَ الشَّيۡطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوۡرًا ﴿۲۷﴾

بے شک اڑانے والے بھائی ہیں شیطانوں کے، اور شیطان ہے اپنے رب کا ناشکرا [2]

**خلاصہ تفسیر:** اب حقوق العباد کے متعلق دو مزید حکم مذکور ہیں: ① اول والدین کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں اور عام مسلمانوں کے حقوق ② دوسرے خرچ کرنے میں فضول خرچی کی ممانعت۔

(تیسرا حکم:) اور قرابت دار کو اس کا حق (مالی وغیر مالی مثلاً حسن معاشرت) دیتے رہنا اور محتاج و مسافر کو بھی (ان کے حقوق) دیتے رہنا (چوتھا حکم:) اور (مال کو) بے موقع مت اڑانا (کیونکہ) بیشک بے موقع مال اڑانے والے شیطان کے بھائی بند ہیں (یعنی اس کے مشابہ ہوتے ہیں) اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے (کہ حق تعالیٰ نے اسے عقل کی دولت دی، مگر اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں اس کو خرچ کیا، اس طرح فضول خرچی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے مال کی دولت دی، مگر وہ اس کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں اس کو خرچ کرتے ہیں)۔

اس آیت میں اہل قرابت اور مسکین و مسافر کو مالی مدد دینے اور صلہ رحمی کرنے کو ان کا حق فرما کر اس طرف اشارہ کردیا کہ دینے والے کو ان پر احسان جتانے کا کوئی موقع نہیں، کیونکہ انکا حق اس کے ذمہ فرض ہے، دینے والا اپنا فرض ادا کر رہا ہے کسی پر احسان نہیں کر رہا۔

**وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا**: فضول خرچی کے معنی کو قرآن حکیم نے دو لفظوں سے تعبیر فرمایا ہے: ① ایک تبذیر اور ② دوسرے اسراف، تبذیر کی ممانعت تو اسی آیت مذکورہ میں واضح ہے، اسراف کی ممانعت آیت: وَلَا تُسْرِفُوْا سے ثابت ہے، بعض حضرات نے فرمایا کہ دونوں لفظ ہم معنی ہیں، کسی معصیت میں یا بے موقع، بے محل خرچ کرنے کو تبذیر و اسراف کہا جاتا ہے، اور بعض حضرات نے یہ تفصیل کی ہے کسی گناہ میں یا بالکل بے موقع بے محل خرچ کرنے کو ''تبذیر'' کہتے ہیں، اور جہاں خرچ کرنے کا جائز موقع تو ہو مگر ضرورت سے زائد خرچ کیا جائے اس کو ''اسراف'' کہتے ہیں، اس لئے تبذیر بہ نسبت اسراف کے زیادہ برا ہے، اور مبذرین کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا ہے۔

**كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ**: اگرچہ ابلیس تو ایک ہی ہے لیکن چونکہ شیاطین بہت سے ہیں اس لیے جمع کا صیغہ لائے، پھر آگے شیطان جو مفرد لایا گیا تو اس سے مراد ابلیس ہی ہے، کیونکہ ناشکری میں اصل وہی ہے، یا اس سے جنس شیطان مراد ہے جو سب شیاطین کو شامل ہے۔

* * *

**فائدہ**: ۱؎ یعنی قرابت والوں کے مالی واخلاقی ہر قسم کے حقوق ادا کرو، محتاج و مسافر کی خبر گیری رکھو اور خدا کا دیا ہوا مال فضول بے موقع مت اڑاؤ، فضول خرچی یہ ہے کہ معاصی اور لغویات میں خرچ کیا جائے یا مباحات میں بے سوچے سمجھے اتنا خرچ کر دے جو آگے چل کر تفویت حقوق اور ارتکاب حرام کا سبب بنے۔

**فائدہ**: ۲؎ یعنی مال خدا کی بڑی نعمت ہے جس سے عبادت میں دل جمعی ہو، بہت سی اسلامی خدمات اور نیکیاں کمانے کا موقع ملے، اس کو بے جا اُڑانا ناشکری ہے جو شیطان کی تحریک و اغواء سے وقوع میں آتی ہے اور آدمی ناشکری کر کے شیطان کے مشابہ ہو جاتا ہے، جس طرح شیطان نے خدا کی بخشی ہوئی قوتوں کو عصیان و اضلال میں خرچ کیا اس نے بھی حق تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کو نافرمانی میں اڑایا۔

## وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ﴿۲۸﴾

اور اگر کبھی تغافل کرے تو ان کی طرف سے انتظار میں اپنے رب کی مہربانی کے جس کی تجھ کو توقع ہے تو کہہ دے ان کو بات نرمی کی

**خلاصہ تفسیر**: اب حقوق العباد سے متعلق پانچواں حکم یہ دیا گیا ہے کہ اگر کسی وقت حاجت مندوں کو ان کی ضرورت کے مطابق دینے کا انتظام نہ ہو سکے تو اس وقت بھی ان کو روکھا جواب نہ دیا جائے، بلکہ ہمدردی کے ساتھ آئندہ سہولت کی امید دلائی جائے۔

(پانچواں حکم:) اور اگر (کسی وقت تمہارے پاس ان لوگوں کو دینے کے لئے مال نہ ہو اور اس لئے) تم کو اس رزق کے انتظار میں جس کی اپنے پروردگار سے توقع ہو (اس کے نہ آنے تک) ان سے پہلو تہی کرنا پڑے تو (اتنا خیال رکھنا کہ) ان سے نرمی کی بات کہہ دینا (یعنی دل جوئی کے ساتھ ان سے وعدہ کر لینا کہ ان شاء اللہ کہیں سے آئے گا تو دیں گے، دل آزار جواب مت دینا)۔

**وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ**: اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جب کسی وقت طالب کو فائدہ پہنچانے سے عذر ہو تو اسے نرم جواب دے۔

* * *

**فائدہ**: یعنی جو کوئی ہمیشہ سخاوت کرتا ہے اور ایک وقت اس کے پاس نہیں ہے تو اللہ کے ہاں امید والے کا محروم جانا خوش نہیں آتا، اس محتاج کی قسمت سے اللہ سخیوں کو بھیج دیتا ہے، سو اس واسطے اگر ایک وقت تو نہ دے سکے تو نرم اور میٹھے طریقہ سے معذرت کر دے، مثلاً یہ کہہ دیا جائے کہ جب خدا ہم کو دے گا ان شاء اللہ ہم تمہاری خدمت کریں گے، سختی اور بد اخلاقی سے جواب دینے میں اندیشہ ہے کہ کہیں اگلی خیراتیں بھی برباد نہ ہو جائیں۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴿٢٩﴾

اور نہ رکھ اپنا ہاتھ بندھا ہوا اپنی گردن کے ساتھ اور نہ کھول دے اس کو بالکل کھول دینا پھر تو بیٹھ رہے الزام کھایا ہارا ہوا ۱؎

اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا ﴿٣٠﴾ ع

تیرارب کھول دیتا ہے روزی جس کے واسطے چاہے اور تنگ بھی وہی کرتا ہے ۲؎ وہی ہے اپنے بندوں کو جاننے والا دیکھنے والا ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** (چھٹا حکم:) اور نہ تو اپنا ہاتھ گردن ہی سے باندھ لو (کہ انتہائی بخل سے بالکل ہاتھ خرچ کرنے سے روک لو) اور نہ بالکل ہی کھول دینا چاہئے (کہ ضرورت سے زیادہ خرچ کر کے اسراف کیا جائے) ورنہ الزام خوردہ (اور) تہی دست (خالی ہاتھ) ہو کر بیٹھ رہو گے۔

(اور محض کسی کے فقر و احتیاج پر اتنا اثر لینا کہ اپنے کو پریشانی میں ڈال لو کوئی معقول بات نہیں، کیونکہ) بلاشبہ تیرا رب جس کو چاہتا ہے زیادہ رزق دیتا ہے، اور وہی (جس پر چاہے) تنگی کر دیتا ہے، بیشک وہ اپنے بندوں (کی حالت اور ان کی مصلحت) کو خوب جانتا ہے دیکھتا ہے۔

سارے عالم کی حاجات پورا کرنا تو رب العالمین ہی کا کام ہے، تم اس فکر میں کیوں پڑے کہ اپنے سے ہو سکے یا نہ ہو سکے اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال کر سب کی حاجتیں پوری ہی کرو، یہ صورت اس لئے بیکار ہے کہ یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی سب کی حاجتیں پوری کر دینا تمہارے بس کی بات نہیں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی کسی کا غم نہ کرے، اس کے لئے تدبیر نہ کرے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ سب کی حاجتیں پوری کرنا کسی انسان کے بس میں نہیں، خواہ وہ اپنے اوپر کتنی ہی مصیبت برداشت کرنے کے لئے تیار بھی ہو کہ یہ کام تو صرف مالک کائنات ہی کا ہے کہ سب کی حاجتوں کو جانتا بھی ہے اور سب کی مصلحتوں سے بھی واقف ہے کہ کس وقت کس شخص کی کس حاجت کو کس مقدار میں پورا کرنا چاہئے، اس لئے انسان کا کام تو صرف اتنا ہی ہے کہ میانہ روی سے کام لے، نہ خرچ کرنے کے موقع میں بخل کرے اور نہ اتنا خرچ کرے کہ کل کو خود ہی فقیر ہو جائے اور اہل وعیال جن کے حقوق اس کے ذمہ ہیں ان کے حقوق ادا نہ ہو سکیں اور بعد میں پچھتانا پڑے۔

**وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ:** اس میں اشارہ ہے کہ استاذ کو اپنے شاگردوں کے ساتھ کس طرح رہنا چاہیے، یعنی حقائق ومعارف ظاہر کرنے میں بخل نہیں کرنا چاہیے اور نہ ایسے اسرار بیان کرنے چاہئیں جن کے وہ متحمل نہ ہوں اور برباد ہو جائے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ سب الزام دیں کہ کنجوس مکھی چوس ہے، یا یہ کہ اتنا کیوں دیا کہ آپ محتاج رہ گیا، غرض ہر معاملہ میں توسط واعتدال مرعی رکھنا چاہیے، نہ ہاتھ اس قدر کھینچے کہ گردن سے لگ جائے اور نہ طاقت سے بڑھ کر خرچ کرنے میں ایسی کشادہ دستی دکھلائے کہ پھر بھیک مانگنی پڑے اور ہاتھ کھلے کا کھلا رہ جائے، ابن کثیر لکھتے ہیں: "فَتُعْطِيْ فَوْقَ طَاقَتِكَ وَتُخْرِجَ اَكْثَرَ مِنْ دَخْلِكَ" یعنی طاقت سے بڑھ کر یا آمدنی سے زائد خرچ کرنا بھی **ولا تبسطها كل البسط** کے تحت میں داخل ہے، حدیث میں ہے: "مَا عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ" (جس نے میانہ روی اختیار کی محتاج نہیں ہوا)۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی تمہارے ہاتھ روکنے سے تم غنی اور دوسرا فقیر نہیں ہو جاتا، نہ تمہاری سخاوت سے وہ غنی اور تم فقیر بن سکتے ہو، فقیر و غنی بنانا اور روزی کا کم و بیش کرنا محض خدا کے قبضہ میں ہے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کہ افسوس آج ہمارے پاس نہیں ہے، یہ فقیر جو امید لے کر آیا تھا کیا کہے گا، فقر و غنی کے مختلف احوال بھیجنا اسی مالک علی الاطلاق کے قبضہ میں ہے، تمہارا کام میانہ روی سے امتثال حکم کرنا ہے، حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: "یعنی محتاج کو دیکھ کر بالکل بیتاب نہ ہو جا، اس کی حاجت روائی تیرے ذمہ نہیں، اللہ کے ذمہ پر ہے، لیکن یہ باتیں پیغمبر ﷺ کو فرمائی ہیں جو بے حد سخی واقع ہوئے تھے، باقی جس کے جی سے مال نہ نکل سکے اس کو پابند کیا ہے دینے کا، حکیم بھی گرمی والے کو سردی دوا دیتا ہے اور سردی والے کو گرم"۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی ہر ایک بندے کے ظاہری و باطنی احوال و مصالح سے خبردار ہے، اسی کے موافق معاملہ کرتا ہے، حدیث قدسی میں فرمایا کہ

میرے بعض بندے وہ ہیں جن کی درستی حال فقیر رہنے میں ہے، اگر میں اس کو غنی کر دیتا تو اس کا دین تباہ ہو جاتا، اس کے برعکس بعض بندے ہیں جن کو غنی بنایا، اگر فقیر بنا دیا جاتا تو دین پر قائم نہ رہ سکتے، اس کے علاوہ بعض اشقیاء کے حق میں غنائے ظاہری محض امہال واستدراج کے طور پر یا فقر وتنگدستی عقوبت اور سزا کے طریقہ سے ہے (عیاذا باللہ من ھذا و ھذا) ہم پہلے کئی جگہ اس کی تقریر کر چکے ہیں۔

## وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴿۳۱﴾

اور نہ مار ڈالو اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے، ہم روزی دیتے ہیں ان کو اور تم کو ۱؎ بیشک ان کا مارنا بڑی خطا ہے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** (ساتواں حکم:) اور اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشہ سے قتل نہ کرو (کیونکہ سب کے رازق ہم ہیں) ہم ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی (البتہ اگر رازق تم ہوتے تو ایسی باتیں سوچتے) بیشک ان کا قتل کرنا بڑا بھاری گناہ ہے۔

**وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ:** جاہلیت میں بعض لوگ اپنی بیٹیوں کو فقر کے خوف سے مار ڈالتے تھے، پس ''اولاد'' سے مراد بیٹیاں ہیں، ان کو اولاد کے عنوان سے اس لیے تعبیر کیا تا کہ تعلق کا اظہار ہو اور رحمت کا جوش ہو، قرآن کریم کے اس ارشاد سے اس معاملے پر بھی روشنی پڑتی ہے جس میں آج کی دنیا گرفتار ہے کہ کثرت آبادی کے خوف سے ''ضبط تولید'' اور ''منصوبہ بندی'' کو رواج دے رہی ہے، اس کی بنیاد بھی اسی جاہلانہ فلسفہ پر ہے کہ رزق کا ذمہ دار اپنے آپ کو سمجھ لیا گیا ہے، یہ معاملہ قتل اولاد کی برابر گناہ نہ سہی، مگر اس کے مذموم ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ بعض کافر اولاد کو مار ڈالتے تھے کہ ان کا خرچ کہاں سے لائیں گے، سورہ انعام میں اسی مضمون کی آیت گزر چکی تفصیل وہاں ملاحظہ کر لی جائے۔

**فائدہ:** ۲؎ کیونکہ یہ بے رحمی کی حرکت نسل انسانی کے قطع کرنے کا موجب ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ ایسا کرنے والے کو حق تعالیٰ کی رزاقی پر اعتماد نہیں۔

## وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ﴿۳۲﴾

اور پاس نہ جاؤ زنا کے ۱؎ وہ ہے بے حیائی، اور بری راہ ہے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** (آٹھواں حکم:) اور زنا کے پاس بھی مت پھٹکو (یعنی اسکے مبادی اور مقدمات سے بھی بچو) بلاشبہ وہ (خود بھی) بڑی بے حیائی کی بات ہے اور (دوسرے مفاسد کے اعتبار سے بھی) بری راہ ہے (کیونکہ اس سے عداوتیں، فتنے اور نسب کی بربادی ہوتی ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی زنا کرنا تو بڑی چیز ہے، اس کے پاس بھی مت جاؤ، گویا **لا تقربوا** میں مبادی زنا سے بچنے کی ہدایت کر دی گئی، مثلاً اجنبی عورت کی طرف بدون عذر شرعی نظر کرنا یا بوس وکنار وغیرہ۔

**فائدہ:** ۲؎ کیونکہ زنا سے انساب میں گڑبڑ ہوتی ہے اور بہت طرح کی لڑائیاں اور جھگڑے کھڑے ہوتے ہیں اور سب کے لیے بری راہ نکلتی ہے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی اگر یہ راہ نکلی تو ایک شخص دوسرے کی عورت پر نظر کرے، کوئی دوسرا اس کی عورت پر کرے گا''، مسند امام احمد میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے زنا کی اجازت دے دیجئے، حاضرین نے اسے ڈانٹ بتلائی کہ (پیغمبر خدا کے سامنے ایسی گستاخی؟) خبردار چپ رہو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو فرمایا کہ میرے قریب آؤ، وہ قریب آ کر بیٹھا تو آپ نے فرمایا کہ کیا تو یہ حرکت اپنی ماں، بیٹی، بہن، پھوپھی، خالہ میں سے کسی کی نسبت پسند کرتا ہے؟ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! خدا مجھ کو آپ پر قربان کرے ہرگز نہیں! فرمایا دوسرے لوگ بھی اپنی ماؤں، بیٹیوں، بہنوں، پھوپھیوں اور خالاؤں کے لیے یہ فعل گوارا نہیں کرتے، پھر آپ نے دعا فرمائی کہ الٰہی اس کے گناہ کو معاف فرما اور اس کے

دل کو پاک اور شرمگاہ کو محفوظ کردے، ابواُمامہ فرماتے ہیں کہ اس دعا کے بعد اس شخص کی یہ حالت ہوگئی کہ کسی عورت وغیرہ کی طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھتا تھا، اللهم صل على سيدنا محمد و بارك وسلم

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ

اور نہ مارو اس جان کو جس کو منع کردیا ہے اللہ نے مگر حق پر ۱؎ اور جو مارا گیا ظلم سے تو دیا ہم نے اس کے وارث کو

سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴿۳۳﴾

زور سو حد سے نہ نکل جائے قتل کرنے میں ۲؎ اس کو مدد ملتی ہے ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** (نواں حکم:) اور جس شخص (کے قتل کرنے) کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ہے اس کو قتل مت کرو، ہاں! مگر حق پر (قتل کرنا درست ہے، یعنی جب کسی شرعی حکم سے قتل کرنا واجب یا جائز ہوجائے تو اس وقت وہ حرام میں داخل نہیں) اور جو شخص ناحق قتل کیا جائے تو ہم نے اس کے وارث (حقیقی یا حکمی) کو اختیار دیا ہے (قصاص لینے کا) سو اس کو قتل کے بارے میں حد (شرع) سے تجاوز نہ کرنا چاہئے (یعنی قاتل پر قتل کا یقینی ثبوت ملے بغیر قتل نہ کرے اور اس کے اعزہ و اقارب وغیرہ کو جو قتل میں شریک نہیں ہیں محض جوش انتقام سے قتل نہ کرے، اور قاتل کو بھی صرف قتل کرے، ناک کان یا ہاتھ پاؤں وغیرہ کاٹ کر مثلہ نہ کرے، کیونکہ) وہ شخص (قصاص میں حد سے تجاوز نہ کرنے کی صورت میں تو شرعاً) مدد کے قابل ہے (اور اس نے زیادتی کی تو پھر فریق ثانی مظلوم ہوکر اللہ کی مدد کا مستحق ہوجائے گا، اس لئے مقتول کے ولی کو چاہئے کہ وہ زیادتی نہ کرے، اور اپنے منصور حق ہونے کی قدر کرے، حد سے بڑھ کر اس نعمت حق کو ضائع نہ کرے)۔

**فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطٰنًا:** مذکورہ آیت میں بتلایا گیا ہے کہ یہ حق مقتول کے ولی کا ہے، یعنی ''ولی'' سے مراد وہ شخص ہے جسے حق قصاص حاصل ہو، اگر نسبی ولی کوئی موجود نہیں تو اسلامی حکومت کے سربراہ کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ بھی ایک حیثیت سے سب مسلمانوں کا ولی ہے، اسی لئے خلاصہ تفسیر میں ''ولی حقیقی'' یا ''حکمی'' لکھا گیا ہے۔

**فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطٰنًا:** اس میں قدرت کے وقت ضبط نفس کی تعلیم ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ صحیحین میں ہے کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں مگر تین صورتوں میں، جان کے بدلے جان، یا زانی محصن یا جو شخص دین کو چھوڑ کر جماعت سے علیحدہ ہوجائے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی اولیائے مقتول کو اختیار ہے کہ حکومت سے کہہ کر خون کا بدلہ لیں، لیکن بدلہ لیتے وقت حد سے نہ گزریں، مثلاً قاتل کی جگہ غیر قاتل کو سزا دلوانے لگیں یا قاتل کے ساتھ دوسرے بے گناہوں کو بھی شامل کرلیں، یا قاتل کے ناک، کان وغیرہ کو کاٹنے اور مثلہ کرنے لگیں۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی خدا نے اس کی مدد کی کہ بدلہ لینے کا حق دیا اور حکام کو امر فرمایا کہ حق دلوانے میں کمی نہ کریں، بلکہ ہر کسی کو لازم ہے کہ خون کا بدلہ دلانے میں مدد کرے، نہ یہ کہ الٹا قاتل کی حمایت کرنے لگے اور وارث کو بھی چاہیے کہ ایک کے بدلے دو نہ مارے، یا قاتل ہاتھ نہ لگا تو اس کے بیٹے بھائی کو نہ مار ڈالے جیسے جاہلیت میں رواج تھا۔

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۪ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ

اور پاس نہ جاؤ یتیم کے مال کے مگر جس طرح کہ بہتر ہو جب تک کہ وہ پہنچے اپنی جوانی کو ۱؎ اور پورا کرو عہد کو

## اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۴﴾

بیشک عہد کی پوچھ ہوگی ۲

**خلاصہ تفسیر:** (دسواں حکم:) اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ (یعنی اس میں تصرف نہ کرو) مگر ایسے طریقہ سے جو کہ (شرعاً) مستحسن ہے یہاں تک کہ وہ اپنے سن بلوغ کو پہنچ جائے (گیارہواں حکم:) اور عہد (جائز) کو پورا کیا کرو، بیشک عہد کی قیامت میں باز پرس ہونے والی ہے۔

**وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ:** خلاصہ تفسیر میں ''عہد'' کے ساتھ جائز کی قید لگائی گئی اس سے تمام ناجائز عہد نکل گئے، ''عہد'' میں تمام احکام الٰہیہ اور تمام وہ معاملات جو بندوں کے درمیان ہوتے ہیں وہ بھی داخل ہیں، اور خازن میں ایسی تفسیر کی ہے جو وعدہ کو بھی شامل ہے، مگر وعدہ کا وجوب دیانتاً یعنی عنداللہ ہوتا ہے، ظاہراً نہیں ہوتا اور وعدہ کا پورا کرنا واجب ہونے میں دوسرے دلائل سے عذر نہ ہونے کی بھی قید ہے، عذر کی صورت میں وعدہ واجب نہیں رہتا۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی یتیم کے مال کو ہاتھ نہ لگاؤ، ہاں! اگر اس کی حفاظت و نگہداشت اور خیر خواہی مقصود ہو تو مضائقہ نہیں، جس وقت جوان ہو جائے اور اپنے نفع نقصان کو سمجھنے لگے، مال اس کے حوالہ کر دو۔

**فائدہ:** ۲ اس میں سب عہد داخل ہیں خواہ اللہ سے کیے جائیں یا بندوں سے، بشرطیکہ غیر مشروع نہ ہوں، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ کسی کو قول و قرار صلح کا دے کر بدعہدی کرنا، اس کا وبال ضرور پڑتا ہے۔

## وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۳۵﴾

اور پورا بھر دو ناپ جب ناپ کر دینے لگو اور تو لو سیدھی ترازو سے ۱ یہ بہتر ہے اور اچھا ہے اس کا انجام ۲

**خلاصہ تفسیر:** (بارہواں حکم:) اور (ناپنے کی چیزوں کو) جب ناپ کر دو تو پورا ناپو (تیرہواں حکم:) اور (تولنے کی چیزوں کو) صحیح ترازو سے تول کر دو، یہ (فی نفسہ بھی) اچھی بات ہے اور انجام بھی اس کا اچھا ہے (آخرت میں تو ثواب اور دنیا میں نیک نامی کی شہرت اور اعتبار جو تجارت میں ترقی کا ذریعہ ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی جھونک نہ مارو، ناپ تول میں کمی کرنے سے معاملات کا نظام مختل ہو جاتا ہے، قوم شعیب کی ہلاکت کا قصہ پہلے کئی جگہ آچکا ہے ان کا بڑا عملی گناہ یہی بیان کیا گیا ہے، روایات میں ہے کہ جو شخص کسی حرام پر قدرت پا کر محض خدا کے خوف سے رک جائے تو خدا تعالیٰ اسی دنیا میں آخرت سے پہلے اس کو نعم البدل عطا فرمائے گا۔

**فائدہ:** ۲ یعنی دغا بازی اول چلتی ہے پھر لوگ خبردار ہو کر اس سے معاملہ نہیں کرتے اور پورا حق دینے والا سب کو بھلا لگتا ہے، اللہ اس کی تجارت خوب چلاتا ہے۔

## وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۶﴾

اور نہ پیچھے پڑ جس بات کی خبر نہیں تجھ کو، بیشک کان اور آنکھ اور دل ان سب کی اس سے پوچھ ہوگی

**خلاصہ تفسیر:** (چودہواں حکم:) اور جس بات کی تجھ کو تحقیق نہ ہو اس پر عمل مت کیا کرو (کیونکہ) کان اور آنکھ اور دل ہر شخص

سے ان سب کی (قیامت کے دن) پوچھ ہوگی (کہ آنکھ اور کان کا استعمال کس کس کام میں کیا؟ وہ کام اچھے تھے یا برے؟ اور دل میں بے دلیل بات کا خیال کیوں جمایا؟)۔

**وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ**: علم اصول وکلام میں ہر امر کی تحقیق کا درجہ علیحدہ اور جدا ثابت ہو چکا ہے، سو جس امر میں جس درجہ کی تحقیق ضروری ہے اس درجہ کی تحقیق کے بغیر اس پر عمل درآمد جائز نہیں، چنانچہ یہ بات سامنے رکھنا ضروری ہے کہ تحقیق کے درجات مختلف ہوتے ہیں: ① ایک ایسی تحقیق جو کہ قطعی اور یقین کامل کے درجہ کو پہنچ جائے کہ مخالف جانب کا کوئی شبہ بھی نہ رہے ② ایسی تحقیق جو کہ گمان غالب کے درجہ میں آجائے اگرچہ جانب مخالف کا احتمال بھی موجود ہو، اس طرح احکام میں بھی دو قسم ہیں: ① ایک قطعیات اور یقینیات ہیں، جیسے عقائد اور اصول دین، ان میں پہلے درجہ کی تحقیق مطلوب ہے، یعنی دلیل قطعی ہو، اس کے بغیر عمل کرنا جائز نہیں ② دوسرے ظنیات جیسے فروعی اعمال سے متعلق احکام، یعنی دلیل ظنی ہو، اس تفصیل کے بعد آیت مذکورہ کا مقتضیٰ یہ ہے کہ یقینی اور قطعی احکام میں تحقیق بھی درجہ اول کی ہو، یعنی قطعیت اور یقین کامل کے درجہ کو پہنچ جائے، اور جب تک ایسا نہ ہو عقائد اور اصول اسلام میں اس تحقیق کا اعتبار نہیں، اس کے مقتضیٰ پر عمل جائز نہیں، اور ظنی فروعی امور میں دوسرے درجہ یعنی ظن غالب کے درجہ کی تحقیق کافی ہے، پس اس سے قیاس شرعی کی نفی لازم نہیں آتی، کیونکہ قیاس ظنیات میں ہوتا ہے اور ظنیات میں تحقیق کا درجہ یہی ہے کہ دلیل ظنی مل جائے، اور قیاس شرعی بھی دلیل ظنی ہے، غرض جس امر میں جس درجہ کی تحقیق ضروری ہے اس درجہ کی تحقیق کے بغیر اس پر عمل درآمد نہ قولاً جائز ہے کہ اس کی حکایت یا نقل کردی جائے یا فتویٰ دے دیا جائے، نہ عملاً جائز ہے کہ اس کام کو کیا جائے، خوب سمجھ لو۔

**وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ**: اس سے الٰہیات ونبوت کے بارے میں تخمین ورائے سے کلام کرنے سے ممانعت سمجھ میں آتی ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی بے تحقیق بات زبان سے مت نکال، نہ اس کی اندھا دھند پیروی کر، آدمی کو چاہیے کہ کان، آنکھ اور دل ودماغ سے کام لے کر اور بقدر کفایت تحقیق کر کے کوئی بات منہ سے نکالے یا عمل میں لائے، سنی سنائی باتوں پر بے سوچے سمجھے یوں ہی اٹکل پچو سے کوئی قطعی حکم نہ لگائے یا عملدرآمد شروع نہ کرے، اس میں جھوٹی شہادت دینا، غلط تہمتیں لگانا، بے تحقیق چیزیں سن کر کسی کے درپے آزار ہونا یا بغض وعداوت قائم کرلینا، باپ دادا کی تقلید یا رسم ورواج کی پابندی میں خلاف شرع اور ناحق باتوں کی حمایت کرنا، ان دیکھی یا ان سنی چیزوں کو دیکھی یا سنی ہوئی بتلانا، غیر معلوم اشیاء کی نسبت دعویٰ کرنا کہ میں جانتا ہوں یہ سب صورتیں اس آیت کے تحت میں داخل ہیں، یاد رکھنا چاہیے کہ قیامت کے دن تمام قویٰ کی نسبت سوال ہوگا کہ ان کو کہاں کہاں استعمال کیا تھا، بے موقع تو خرچ نہیں کیا؟۔

## وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝۳۷

اور مت چل زمین پر اتراتا ہوا، تو پھاڑ نہ ڈالے گا زمین کو اور نہ پہنچے گا پہاڑوں تک لمبا ہو کر۔[1]

## كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ۝۳۸

یہ جتنی باتیں ہیں ان سب میں بری چیز ہے تیرے رب کی بیزاری۔[2]

**خلاصہ تفسیر:** (پندرہواں حکم:) اور زمین پر اتراتا ہوا مت چل (کیونکہ) تو (اس زمین پر زور سے پاؤں رکھ کر) نہ زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ (اپنے بدن کو تان کر) پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتا ہے (پھر اترانا بے کار) یہ سارے (مذکورہ) برے کام تیرے رب کے نزدیک (بالکل) ناپسند ہیں۔

**اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ**: یعنی زور سے پاؤں رکھنے کے لیے کم از کم اتنی قوت ہونی چاہیے کہ زمین کو پیر مار کر پھاڑ سکے اور اکڑنے اور تننے

کے لیے کم از کم اتنی قوت تو ضروری ہے کہ پہاڑ کے برابر لمبا ہو جائے، جب اس سے عاجز ہے پھر قوت اور قدرت کی صورت بنانا اور اترانا بے کار ہے، اور جن چیزوں پر انسان قادر ہی ہے ان پر بھی حقیقۃً قدرت نہیں رکھتا، پس تکبر ہر کام میں برا ہے، اب یہ شبہ نہیں رہا کہ اس علت سے اختیاری باتوں میں تکبر کا جائز ہونا معلوم ہوتا ہے۔

**عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا:** مذکورہ پندرہ احکام میں جو حرام اور ممنوع ہیں یعنی جن سے روکا گیا ہے ان کا برا اور ناپسند ہونا تو ظاہر ہے، مگر ان میں کچھ احکام ایسے بھی ہیں جو امر کی صورت میں ہیں یعنی جن کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے جیسے والدین اور اقرباء کے حقوق ادا کرنا اور وفائے عہد وغیرہ ان میں بھی چونکہ مقصود ان کی ضد سے بچنا ہے کہ والدین کی ایذاء، رشتہ داروں کی قطع رحمی اور نقض عہد سے پرہیز کرو، یہ چیزیں بھی سب حرام و ناپسند ہیں، اس لئے مجموعہ کو "مکروہ" فرمایا گیا ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی متکبروں کی چال چلنا انسان کو زیبا نہیں، نہ تو زور سے پاؤں مار کر وہ زمین کو پھاڑ سکتا ہے نہ گردن ابھارنے اور سینہ تاننے سے اونچا ہو کر پہاڑوں کے برابر ہو سکتا ہے، پھر ایسے ضعف و عجز اور اس بساط پر اپنے کو اس قدر لمبا کھینچنے سے کیا فائدہ؟

**فائدہ:** ۲؎ یعنی جن باتوں کو اوپر منع کیا ان کے کرنے میں رب کی بیزاری ہے اور جن کا حکم کیا ان کے نہ کرنے میں بیزاری ہے۔

**ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ**

یہ ہے ان باتوں میں سے جو وحی بھیجی تیرے رب نے تیری طرف عقل کے کاموں سے ۱؎ اور نہ ٹھہرا اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی

**فَتُلْقٰى فِىْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۳۹﴾**

پھر پڑے تو دوزخ میں الزام کھا کر دھکیلا جا کر ف ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** گذشتہ آیات میں احکامات بیان فرما کر اب ان پر عمل کرنے کی ترغیب کے لیے ان احکامات کا عین علم و حکمت ہونا بیان فرماتے ہیں، اور ان مضامین کو اسی توحید کے مضمون پر ختم کرتے ہیں جس سے ان کو شروع فرمایا تھا۔

(اے محمد ﷺ!) یہ باتیں (یعنی مذکورہ احکام) اس حکمت میں کی ہیں جو خدا تعالیٰ نے آپ پر وحی کے ذریعہ بھیجی ہیں (اور اے مخاطب!) اللہ برحق کے ساتھ کوئی اور معبود تجویز نہ کرنا ورنہ تو الزام خوردہ اور راندہ ہو کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا (احکام مذکورہ کو شروع بھی توحید کے مضمون سے کیا گیا تھا ختم بھی اسی پر کیا گیا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی اوپر جو پر مغز اور بیش بہا نصیحتیں کی گئیں، یہ وہ علم و حکمت اور تہذیب اخلاق کی باتیں ہیں جنہیں عقل سلیم قبول کرتی ہے، اور جو وحی کے ضمن میں نبی امی ﷺ کی طرف بلا واسطہ اور امت اُمیہ کی طرف بواسطہ حضور ﷺ بھیجی گئیں۔

**فائدہ:** ۲؎ مذکورہ بالا نصائح کا بیان توحید سے شروع کیا گیا تھا لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا خاتمہ پر بھی توحید یاد دلا دی گئی تا کہ قاری سمجھ سکے کہ تمام حسنات کا آغاز و انجام خالص توحید کو ہونا چاہیے۔

**اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾** ع

کیا تم کو چن کر دے دیے تمہارے رب نے بیٹے اور اپنے لیے کر لیا فرشتوں کو بیٹیاں، تم کہتے ہو بھاری بات

**خلاصہ تفسیر:** (اب آگے بھی اسی مضمون توحید کا بیان ہے کہ جب اوپر شرک کا قبیح اور باطل ہونا سن لیا) تو کیا (پھر بھی ایسی

باتوں کے قائل ہوتے ہو جو توحید کے خلاف ہیں، مثلاً یہ کہ) تمہارے رب نے تم کو تو بیٹوں کے ساتھ خاص کیا ہے اور خود فرشتوں کو (اپنی) بیٹیاں بنائی ہیں (جیسا کہ عرب کے جاہل فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہا کرتے تھے جو دو وجہ سے باطل ہے: ایک تو اللہ کے لئے اولاد قرار دینا، پھر اولاد بھی لڑکیاں جن کو یہ لوگ اپنے لئے پسند نہیں کرتے، ناکارہ سمجھتے ہیں، اس سے اللہ تعالیٰ کی طرف ایک اور نقص کی نسبت ہوتی ہے) بیشک تم بڑی (سخت) بات کہتے ہو۔

* * *

**فائدہ:** یعنی ایک تو خدا کیلئے اولاد تجویز کرنا اور اولاد بھی بیٹیاں جنہیں تم نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو یہ بڑی بھاری گستاخی ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ؕ وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴿۴۱﴾

اور پھیر پھیر کر سمجھایا ہم نے اس قرآن میں تا کہ وہ سوچیں، اور ان کو زیادہ ہوتا (ان کا بڑھتا جاتا) ہے وہی بدکنا (نفرت کرنا)

**خلاصہ تفسیر:** اور (افسوس تو یہ ہے کہ اس مضمون توحید اور شرک کے باطل کرنے کو) ہم نے اس قرآن میں طرح طرح سے بیان کر دیا ہے تا کہ اچھی طرح سمجھ لیں (کیونکہ بار بار اور مختلف طریقوں سے بیان کرنے کا تقاضہ یہی ہوتا ہے کہ سمجھ میں آ جائے) اور (اس کے باوجود) ان کو (توحید سے) نفرت ہی بڑھتی جاتی ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی قرآن کریم مختلف عنوانوں اور رنگ برنگ کے دلائل وشواہد سے ان مشرکین کو فہمائش کرتا ہے لیکن بجائے نصیحت حاصل کرنے کے یہ بدبخت اور زیادہ بدکتے اور وحشت کھا کر بھاگتے ہیں۔

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾

کہہ اگر ہوتے اس کے ساتھ اور حاکم جیسا یہ بتلاتے ہیں[1] تو نکالتے صاحب عرش کی طرف راہ[2]

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ﴿۴۳﴾

وہ پاک ہے اور برتر (بالا) ہے ان کی باتوں سے بے نہایت (بہت دور)

**خلاصہ تفسیر:** آپ (شرک کو باطل کرنے کے لئے ان سے) فرمایئے کہ اگر اس (معبود برحق) کے ساتھ اور معبود بھی (شریک) ہوتے جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں تو اس حالت میں عرش والے (حقیقی خدا) تک انہوں نے (یعنی دوسرے معبودوں نے کبھی کا) راستہ ڈھونڈ لیا ہوتا (یعنی جن کو تم اللہ کے ساتھ خدائی کا شریک قرار دیتے ہو اگر وہ واقعی شریک ہوتے تو عرش والے خدا پر چڑھائی کر دیتے اور راستہ ڈھونڈ لیتے اور جب خداؤں میں جنگ ہو جاتی تو دنیا کا نظام کس طرح چلتا جس کا ایک خاص نظام محکم کے ساتھ چلنا ہر شخص مشاہدہ کر رہا ہے، اس لئے نظام عالم کا صحیح طور پر چلتے رہنا خود اس کی دلیل ہے کہ ایک خدا کے سوا کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں ہے، اس سے ثابت ہوا کہ) یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے پاک اور اس سے بہت زیادہ بالا و برتر ہے۔

اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ: توحید کی جو دلیل آیت اِذًا لَّابْتَغَوْا میں بیان فرمائی ہے کہ اگر تمام کائنات عالم کا خالق مالک اور متصرف صرف ایک ذات اللہ کی نہ ہو، بلکہ اس خدائی میں اور بھی شریک ہوں تو ضرور ہے کہ ان میں کبھی اختلاف بھی ہوگا اور اختلاف کی صورت میں سارا نظام عالم برباد ہو جائے گا، کیونکہ ان سب میں دائمی صلح ہونا اور ہمیشہ باقی رہنا عادۃً ممتنع ہے، یہ دلیل یہاں اگرچہ امتناعی انداز میں بیان کی گئی ہے، مگر علم کلام کی کتابوں میں اس دلیل کا برہانی اور منطقی ہونا بھی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے، اہل علم وہاں دیکھ سکتے ہیں، یہاں عام فہم کرنے کے لیے یہ تقریر اختیار کی

گئی، یہ تقریر بظاہر ایک امر عادی پر مبنی ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی اصنام وغیرہ جنہیں خدائی کا شریک اور الوہیت کا حصہ دار بتلایا جاتا ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی پرایا محکوم رہنا کیوں پسند کرتے، سب مل کر خدا تعالیٰ کے تخت سلطنت کو الٹ ڈالتے،، اگر کہا جائے کہ صاحب عرش کے مقابلہ میں ان کی کچھ چلتی نہیں تو ایک عاجز مخلوق کی عبادت کرنا پرلے درجہ کی حماقت ہے یا اگر وہ معبود خود رب العرش کو خوش رکھنا اور اس کا قرب حاصل کرنا اپنے لیے ضروری سمجھتے ہیں تو ان کے پوجنے والوں کے لیے اور بھی زیادہ ضروری ہوا کہ خدائے اکبر کو خوش رکھنے کی فکر کریں، لیکن خدائے بزرگ تمام انبیاء کی زبانی اور فطرتِ انسانی کی معرفت شرک سے اپنی کامل بیزاری کا اظہار فرما چکا، پھر تعجب ہے کہ یہ احمق کس راستہ پر اندھا دھند چلے جا رہے ہیں۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ

اس کی پاکی بیان کرتے ہیں ساتوں آسمان اور زمین اور جو کوئی ان میں ہے، اور کوئی چیز نہیں جو نہیں پڑھتی خوبیاں اس کی

وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۴﴾

لیکن تم نہیں سمجھتے ان کا پڑھنا ۱؎ بیشک وہ ہے تحمل والا بخشنے والا ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** (وہ ایسا پاک ہے کہ) تمام ساتوں آسمان اور زمین اور جتنے (فرشتے آدمی اور جن) ان میں (موجود) ہیں (سب کے سب زبان سے یا حال سے) اس کی پاکی بیان کر رہے ہیں (چنانچہ فرشتے اور مؤمن جن و انسان زبان سے بھی پاکی بیان کرتے ہیں، اسی طرح بے جان اور بے عقل چیزیں اور کفار صرف زبان حال سے) اور (یہ تسبیح صرف عقل والے انسان اور جن کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ زمین و آسمان کی) کوئی چیز ایسی نہیں جو تعریف کے ساتھ اس کی پاکی (زبان سے یا حال سے) بیان نہ کرتی ہو، لیکن (اے مشرکین!) تم لوگ ان کی تسبیح (پاکی بیان کرنے) کو سمجھتے نہیں ہو (قرینہ مقام کی وجہ سے یہ خطاب مشرکین کو ہے، اور ان کا نہ سمجھنا ہر تسبیح کے اعتبار سے ہے اور یہی قابل ملامت بھی ہے، ورنہ بعض قسم کی تسبیح کا نہ سمجھنا قابل ملامت نہیں، اور کفار کی اس غفلت پر جو عذاب نہیں ہوتا اس سے وہ توحید کے حق ہونے میں شبہ نہ کریں، کیونکہ عذاب کے توقف کی وجہ یہ ہے کہ) بیشک وہ بڑا حلیم ہے (ورنہ تمہارا عقیدہ ضرور موجب عذاب ہے، البتہ اگر توبہ کرلو تو وہ) بڑا غفور (بھی) ہے (سب معاف کردے گا)۔

**وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ:** بعض کو یہ وسوسہ ہوا ہے کہ تسبیح کے لیے ''علم'' اور علم کے لیے ''حیات'' ضروری ہے اور یہ جمادات میں نہیں پائی جاتی، جواب یہ ہے کہ اگر کسی قدر علم اور کسی قدر حیات حاصل ہو اور ہمیں محسوس نہ ہو تو اس میں کیا محال ہے، نیز بعض آثار اس پر دلالت کرتے ہیں کہ جمادات تسبیح زبانی کرتے ہیں اور اس کے لیے شعور لازم ہے اگرچہ ضعیف ہی سہی۔

**وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ:** کفار تسبیح حالی کو تو اس لیے نہیں سمجھتے کہ اس کی حقیقت استدلال ہے، یعنی مخلوق کے عجز سے خالق کی ہستی پر استدلال کیا جائے، اور یہ تامل غور و فکر پر موقوف ہے، اور کفار تامل کرتے نہیں، اور بے جان و بے عقل چیزوں کی زبانی تسبیح کو اس لیے نہیں سمجھتے کہ ان کا تعلق کشف سے ہے، اور مؤمنین کی زبانی تسبیح کو اس لیے نہیں سمجھتے کہ سننے کے باوجود اس کے معنی اور اس کی حقیقت میں تدبر نہیں کرتے، پس کفار پر ملامت اس لیے ہے کہ وہ کسی کی تسبیح کو نہیں سمجھتے، بخلاف مؤمنین کے کہ وہ ہر ایک کی تسبیح کو سمجھتے ہیں، عام مؤمنین اگرچہ بعض اشیاء کی زبانی تسبیح کو نہیں سمجھتے جو کشف سے متعلق ہے لیکن حالی تسبیح کو تو سمجھتے ہیں کہ ان کے وجود سے وجود صانع پر استدلال کرتے ہیں اور جو اہل کشف ہیں وہ ہر قسم کی تسبیح کو سمجھتے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی ہر ایک مخلوق زبان سے یا حال سے اس کی پاکی اور خوبیاں بیان کرتی ہے لیکن تم اسے سمجھتے نہیں، خواہ فکر و تامل نہ کرنے کی وجہ سے یا اس قوت کے فقدان کی وجہ سے جس کے ذریعہ بعض مخلوقات کی تسبیح قالی سنی اور سمجھی جاسکتی ہے، اور اگر کوئی شخص باوجود سمجھنے کے قبول نہ کرے یا اس کے مقتضیٰ پر عمل نہ کرے، تو یہ سمجھنا نہ سمجھنے ہی کے حکم میں ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی تمام مخلوقات جس کی پاکی بیان کریں تم اس کے لیے شرکاء، اولاد اور بیٹیاں تجویز کرو، یہ ایسی گستاخی تھی کہ تم کو فوراً ہلاک کر دیا جاتا لیکن وہ اپنے حلم سے شتاب نہیں پکڑتا اور توبہ کرلو تو بخش دیتا ہے۔

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿۴۵﴾

اور جب تو پڑھتا ہے قرآن کر دیتے ہیں ہم بیچ میں تیرے اور ان لوگوں کے جو نہیں مانتے آخرت کو ایک پردہ چھپا ہوا ۱؎

وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ

اور ہم رکھتے ہیں ان کے دلوں پر پردہ کہ اس کو نہ سمجھیں ۲؎ اور ان کے کانوں میں بوجھ ۳؎ اور جب ذکر کرتا ہے تو

فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓي اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ﴿۴۶﴾

قرآن میں اپنے رب کا اکیلا کر کے بھاگتے ہیں اپنی پیٹھ پر بدک کر ۴؎

**خلاصہ تفسیر:** سابقہ آیات میں یہ ذکر تھا کہ توحید کا مضمون قرآن مجید میں مختلف عنوانات اور مختلف دلائل کے ساتھ بار بار ذکر ہونے کے باوجود یہ بدنصیب مشرکین اس کو نہیں مانتے، ان آیات میں ان کے نہ ماننے کی وجہ بتلائی گئی ہے کہ یہ ان آیات میں غور و فکر ہی نہیں کرتے، بلکہ ان سے نفرت اور تمسخر کرتے ہیں اس لئے ان کو علم حقیقت سے اندھا کر دیا گیا ہے۔

اور جب آپ (تبلیغ کے لئے) قرآن پڑھتے ہیں تو ہم آپ کے اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے درمیان میں ایک پردہ حائل کر دیتے ہیں (اور وہ پردہ یہ ہے کہ) ہم ان کے دلوں پر حجاب ڈال دیتے ہیں اس سے کہ وہ اس (قرآن کے مقصود) کو سمجھیں، اور ان کے کانوں میں بوجھ ڈال دیتے ہیں (اس سے کہ وہ ان کو ہدایت حاصل کرنے کے لئے سنیں، یعنی وہ پردہ یہ ہے کہ یہ لوگ نہ سمجھتے ہیں نہ سمجھنے کا ارادہ کرتے ہیں، اس لیے وہ آپ کی شان نبوت کا ادراک نہیں کر سکتے) اور جب آپ قرآن میں صرف اپنے رب (کے اوصاف و کمالات) کا ذکر کرتے ہیں (اور یہ لوگ جن معبودوں کی عبادت کرتے ہیں ان میں وہ اوصاف ہیں نہیں) تو وہ لوگ (اپنی نافہمی بلکہ کج فہمی کے سبب اس سے) نفرت کرتے ہوئے پشت پھیر کر چل دیتے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا: جو شخص آخرت کو نہ مانے اور اپنے بھلے برے انجام کی کچھ فکر نہ رکھے وہ نصیحت کی طرف کیوں دھیان کرنے لگا، جب اسے نجات ہی کی فکر نہیں تو نجات دلانے والے پیغمبر کے احوال و اقوال میں غور کرنے اور بارگاہ رسالت تک پہنچنے کی کیا ضرورت ہوگی، بس یہی عدم ایمان بالآخرت اور انجام کی طرف سے بے فکری وہ معنوی پردہ ہے جو اس شخص کے اور نبی (من حیث ھو نبی) کے درمیان لٹکا دیا جاتا ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ: پہلے پیغمبر کی صداقت تک نہ پہنچ سکنے کا ذکر کیا تھا، یہاں فہم قرآن تک رسائی حاصل نہ کر سکنے کا بیان ہے یعنی اس قرآن میں ایسی قوی تاثیر ہے، اور کافروں پر اثر نہیں ہوتا، یہ سبب ہے کہ اوٹ میں ہیں، آفتاب سے سارا جہان روشن ہے لیکن اگر کوئی شخص تہ خانہ میں تمام دروازے اور تابدان بند کر کے بیٹھ جائے بلکہ آنکھیں بھی بند کر لے تو اس کے اعتبار سے آفتاب کی روشنی کہیں بھی نہیں۔

**فائدہ:** ۳؎ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا: یعنی جب بہ نیت انتفاع و استفادہ سننا نہیں چاہتے تو گویا سنتے ہی نہیں۔

**تنبیه:** خدا تعالیٰ نے جو حجاب اور پردے وغیرہ ڈالے یہ وہ ہی ہیں جن کا وجود انہوں نے خود اپنے لیے بڑی خوشی اور فخر سے ثابت کیا تھا: وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ آخرت پر ایمان نہ رکھنا اور انجام سے بےفکر رہنا، خدائے واحد کے ذکر سے چڑنا، پیغمبروں کے ساتھ تمسخر کرنا، وہ چیزیں ہیں جو حجاب، کنان اور وقر کی صورت اختیار کر لیتی ہیں، اور چونکہ خالق ہر چیز کا خدا تعالیٰ ہے اس لیے ان کے خلق کی نسبت بھی اس کی طرف کی جاتی ہے۔

**فائدہ:** ؎ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا: یعنی خدائے واحد کے ذکر سے چڑتے، بدکتے اور پیٹھ پھیر کر بھاگتے ہیں، ہاں ان کے معبودوں کا تذکرہ آئے تو بہت خوش ہوتے ہیں: وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ وَاِذْ هُمْ نَجْوٰٓى اِذْ يَقُوْلُ

ہم خوب جانتے ہیں جس واسطے وہ سنتے ہیں ؎ جس وقت کان رکھتے ہیں تیری طرف اور جب وہ مشاورت کرتے ہیں جب کہ کہتے ہیں

الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۴۷﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ

یہ بےانصاف جس کے کہے پر تم چلتے ہو وہ نہیں ہے مگر ایک مرد جادو کا مارا (سحر زدہ) ؎ دیکھ لے کیسے جماتے ہیں تجھ پر

ع ۵

الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۴۸﴾

مثلیں (مثالیں) اور بہکتے پھرتے ہیں سو راہ نہیں پا سکتے ؎

**خلاصہ تفسیر:** (اب ان کے اس باطل عمل پر وعید ہے کہ) جس وقت یہ لوگ آپ کی طرف کان لگاتے ہیں تو ہم خوب جانتے ہیں جس غرض سے یہ (قرآن کو) سنتے ہیں (کہ ان کی غرض محض طعن و اعتراض اور نکتہ چینی ہے) اور جس وقت یہ لوگ (قرآن سننے کے بعد) آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں (ہم اس کو بھی خوب جانتے ہیں) جبکہ یہ ظالم یوں کہتے ہیں کہ تم لوگ (یعنی ان کی برادری میں سے جو لوگ رسول کریم ﷺ کے ساتھ لگ گئے ہیں) محض ایسے شخص کا ساتھ دے رہے ہو جس پر جادو کا (خاص) اثر (یعنی جنون) ہو گیا ہے (یعنی یہ جو کچھ عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں یہ سب مالیخولیا ہے، اے محمد ﷺ ذرا) آپ دیکھئے تو یہ لوگ آپ کے لئے کیسے کیسے القاب تجویز کرتے ہیں، سو یہ لوگ (بالکل ہی) گمراہ ہو گئے تو (اب حق کا) راستہ نہیں پا سکتے (کیونکہ ایسی ہٹ دھرمی اور ضد اور پھر اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ ایسا معاملہ اس سے انسان کی استعداد فہم و ہدایت سلب ہو جاتی ہے، جب قرآن کے ساتھ بھی استہزا ہو اور رسول کے ساتھ بھی گستاخی ہو پھر اس سے بڑھ کر کیا گمراہی ہوگی)۔

اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا: صحیح احادیث میں آیا ہے کہ ایک دفعہ آپ ﷺ پر جادو چل گیا تھا، جبکہ بعض لوگوں نے اس آیت سے اس حدیث کا انکار کیا ہے کہ یہ تو کفار آپ کی نسبت کہا کرتے تھے کہ ان پر جادو کا اثر ہو گیا ہے اور کفار کا یہ قول غلط تھا، حق تعالیٰ نے اس کی تکذیب فرما دی ہے، اس کا جواب خلاصہ تفسیر سے ظاہر ہو گیا کہ کفار کا مسحور یعنی جادو زدہ کہنے سے مقصود مجنون کہنا تھا، جس کے تمام خیالات اور باتیں محض ہذیان اور وہم ہوتے ہیں، وحی کو وہ ایسا ہی سمجھتے تھے، اس کی بےشک قرآن میں نفی کی گئی ہے، اور آپ ﷺ پر جو سحر ہوا تھا اس سے بعض روزمرہ کی عادت کے کاموں میں کسی قدر ذہول اور نسیان ہو گیا تھا، باقی دنیا کے سب کاموں میں ذہول نہیں ہوا، اور دینی کاموں میں تو ذرا بھی ذہول نہیں ہوا، اگر کچھ ہوا ہوتا تو اس اثر کے زائل ہونے کے بعد حق تعالیٰ ان امور پر تنبیہ فرماتے جیسا کہ اجتہادی خطا میں تنبیہ ہوا کرتی ہے، پس آیت میں سحر کے ایک خاص اثر یعنی جنون کی نفی کی گئی ہے، اور حدیث میں مطلق جادو کا اثبات آیا ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ پر سحر کا ذرا بھی اثر کسی وقت نہیں ہو سکتا تھا، پس

آیت وحدیث میں کچھ تعارض نہیں، اور یہ مسلمہ اصول ہے کہ خاص کی نفی سے عام کی نفی لازم نہیں آتی، کسی نبی اور پیغمبر پر جادو کا اثر ہوجانا ایسا ہی ممکن ہے جیسا بیماری کا اثر ہوجانا، اس لئے کہ انبیاء علیہم السلام بشری خواص سے الگ نہیں ہوتے، جیسے ان کو زخم لگ سکتا ہے بخار اور درد ہوسکتا ہے ایسے ہی جادو کا اثر بھی ہوسکتا ہے، کیونکہ وہ بھی خاص اسباب طبعیہ وغیرہ کے اثر سے ہوتا ہے اور حدیث میں ثابت بھی ہے کہ ایک مرتبہ رسول کریم ﷺ پر سحر کا اثر ہوگیا تھا ،اس آیت میں جو کفار نے آپ کو ''مسحور'' کہا اور قرآن نے اس کی تردید کی اس کا حاصل وہ ہے جس کی طرف خلاصہ تفسیر میں اشارہ کردیا گیا ہے کہ ان کی مراد درحقیقت مسحور کہنے سے مجنون کہنا تھا اسی کی تردید قرآن نے فرمائی ہے، اس لئے حدیث سحر اس کے خلاف اور متعارض نہیں۔

* * *

**فائدہ:** ١؎ یعنی سننے سے استفادہ مقصود نہیں ہوتا محض استخفاف واستہزاء مقصود ہوتا ہے جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

**فائدہ:** ٢؎ یعنی قرآن اور آپ ﷺ کی باتیں سن کر گئے، پھر آپس میں مشورہ کیا کہ محمد ﷺ کی نسبت کیا کہنا چاہیے، آخر کہنے لگے کہ یہ شخص جادو کا مارا ہوا معلوم ہوتا ہے، یعنی جادو کے اثر سے مجنون ہوگیا، دماغ ٹھکانے نہیں رہا (العیاذ باللہ العظیم) بعض نے ''مسحور'' کو یہاں ''ساحر'' کے معنی میں لیا ہے گویا اس کی باتوں میں جادو کا اثر ہے۔

**تنبیه:** لفظ ''مسحور'' سے جو مطلب وہ لیتے تھے اس کی نفی سے یہ لازم نہیں آتا کہ نبی پر کسی قسم کے سحر کا کسی درجہ میں عارضی طور پر بھی اثر نہ ہوسکے یہ آیت مکی ہے، مدینہ میں آپ پر یہود کے جادو کرانے کا واقعہ صحاح میں مذکور ہے جس کا اثر چند روز تک صرف اتنا رہا کہ بعض دنیاوی کاموں میں کبھی کبھی ذہول ہوجاتا تھا۔

**فائدہ:** ٣؎ یعنی کبھی شاعر کہتے، کبھی جادوگر، کبھی کاہن، کبھی مسحور یا مجنون، غرض بہکی بہکی باتیں کرتے رہتے ہیں کسی ایک بات پر جماؤ نہیں جس وقت جو منہ میں آیا بک دیا، حقیقت یہ ہے کہ باوجود جدوجہد کے طعن وتشنیع کا کوئی ایسا راستہ انھیں نہیں مل سکتا جس پر چل کر وہ اپنے مقصد اغواء و اضلال میں کامیاب ہوسکیں۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿٤٩﴾

اور کہتے ہیں کیا جب ہم ہوجائیں ہڈیاں اور چورا چورا پھر اٹھیں گے نئے بن کر

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے کفار کے توحید ورسالت اور قرآن کے انکار کا جواب تھا، اب ان کے انکار آخرت کا بیان کیا جاتا ہے، نیز وہ آخرت کی باتیں سن کر رسالت ونبوت پر بھی شبہ کرتے تھے کہ ایسی بعید باتوں کی خبر دینے والا رسول کس طرح ہوسکتا ہے، اب آگے آیات میں آخرت اور رسالت دونوں کے متعلق شبہات کا جواب بیان کیا جاتا ہے۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم (مرکر) ہڈیاں اور (ہڈیوں کا بھی) چورا (یعنی ریزہ ریزہ) ہوجائیں گے تو کیا (اس کے بعد قیامت میں) ہم ازسرنو پیدا اور زندہ کئے جائیں گے (یعنی اول تو مرکر زندہ ہونا ہی مشکل ہے کہ جسم میں زندگی کی صلاحیت نہیں رہی، پھر جبکہ وہ جسم بھی ریزہ ریزہ ہوکر اس کے اجزاء منتشر ہوجائیں تو اس کے زندہ ہونے کو کون مان سکتا ہے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی آپ پر مسحور ومجنون یا شاعر وکاہن وغیرہ کی مثالیں چسپاں کرنا تو تعجب انگیز تھا ہی، اس سے زیادہ قابل تعجب وہ دلیل ہے جو (معاذ اللہ) مسحور ومجنون ثابت کرنے کے لیے پیش کرتے تھے جس کا خلاصہ یہ تھا کہ موت کے بعد ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ آدمی کا بدن گل سڑ کر سفید ہڈیاں رہ جاتی ہیں تھوڑے دنوں بعد وہ بھی ریزہ ریزہ ہوکر مٹی میں مل جاتی ہیں، کیا کوئی ذی ہوش یہ تجویز کرسکتا ہے کہ یہ ہڈیوں کا چورہ اور خاک کے ریزے دوبارہ جی اٹھیں گے؟ اور انسانی حیات ان منتشر ذرات میں عود کرآئے گی؟ اگر پیغمبر ایسی ناممکن بات کی خبر دیتے ہیں تو ثابت ہوتا ہے کہ (العیاذ باللہ) ان کی دماغی صحت بحال نہیں ہے۔

قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ﴿۵۰﴾ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ قُلِ الَّذِيْ

تو کہہ تم ہو جاؤ پتھر یا لوہا، یا کوئی خلقت جس کو مشکل سمجھو اپنے جی میں ۱؎ پھر اب کہیں گے کون لوٹا کر لائے گا ہم کو، کہہ جس نے

فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ۭ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ﴿۵۱﴾

پیدا کیا تم کو پہلی بار ۲؎ پھر اب مٹکائیں گے تیری طرف اپنے سر اور کہیں گے کب ہوگا یہ ۳؎ تو کہہ شاید نزدیک ہی ہوگا ۴؎

**خلاصہ تفسیر:** آپ (ان کے جواب میں) فرما دیجئے کہ (تم تو ہڈیوں ہی سے زندہ ہونے کو دشوار سمجھتے ہو اور ہم کہتے ہیں کہ) تم پتھر یا لوہا یا اور کوئی ایسی مخلوق ہو کر دیکھ لو جو تمہارے ذہن میں (زندگی کی صلاحیت سے) بہت ہی بعید ہو (پھر دیکھو کہ زندہ کئے جاؤ گے یا نہیں، پتھر اور لوہے کا حیات سے بعید ہونا ظاہر ہے کہ ان میں کبھی حیوانوں کی سی زندگی آئی ہی نہیں، بخلاف انسان کے اجزاء کے کہ ان میں ایک مرتبہ تو حیات رہ چکی ہے، تو جب پتھر لوہے کا زندہ کرنا اللہ کے لئے مشکل نہیں تو اعضائے انسانی کو دوبارہ زندگی بخش دینا کیا مشکل ہوگا، اور آیت میں لفظ **کونوا** جو صیغہ امر ہے اس سے مراد یہاں امر نہیں، بلکہ یہ کلام شرط کے معنی میں ہے کہ اگر تم بالفرض پتھر اور لوہا بھی ہو جاؤ تب بھی اللہ تعالیٰ تمہیں دوبارہ زندہ کر دینے پر قادر ہے) اس پر (یعنی جب ہر چیز میں دوبارہ پیدا ہونے کی قابلیت ثابت ہوگئی تو اب وہ فاعل یعنی خالق کی تحقیق کرنے کے لیے آپ سے) پوچھیں گے کہ وہ کون ہے جو دوبارہ ہم کو زندہ کرے گا؟ آپ فرما دیجئے کہ وہ وہ ہے جس نے تم کو اول بار میں پیدا کیا تھا (جب قابلیت و فاعلیت دونوں کا سوال حل ہو گیا تو اب یہ لوگ وقوع کے زمانہ کی تحقیق کے لئے) آپ کے آگے سر ہلا ہلا کر کہیں گے کہ (اچھا یہ بتلایئے کہ) یہ (زندہ ہونا) کب ہوگا؟ آپ فرما دیجئے کہ عجب نہیں کہ یہ قریب ہی آپہنچا ہو۔

اصل بات یہ ہے کہ کسی چیز کے وجود میں آنے کے لئے دو چیزیں درکار ہیں: ① ایک مادہ اور محل میں وجود کی قابلیت ② دوسرے اس کو وجود میں لانے کے لئے قوت فاعلہ، کفار کا پہلا سوال محل کی قابلیت کے متعلق تھا کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندگی کے قابل نہیں رہا، اس کا جواب دے کر محل کی قابلیت ثابت کر دی گئی تو پھر دوسرا سوال فاعلیت کے متعلق کیا گیا کہ ایسا کون سا قوت وقدرت والا ہے جو اپنی قوت فاعلیت سے یہ عجیب کام کر سکے، اس کے جواب میں فرمادیا گیا کہ جس نے پہلے تمہیں ایسے مادے سے پیدا کیا تھا جس میں قابلیت حیات کا کسی کو گمان بھی نہ تھا تو اس کو دوبارہ پیدا کر دینا کیا مشکل ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ **اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ:** یعنی یہ ریزے اور چورا تو بہر حال انسانی لاش کا ہے جس میں پیشتر زندگی رہ چکی ہے اور خود مٹی کے ذرات میں بھی آثار حیات کا پیدا ہو جانا چنداں مستبعد نہیں، میں اس سے بڑھ کر تم کو اجازت دیتا ہوں کہ ہڈیوں کا چورا نہیں، اگر ممکن ہو تو پتھر یا لوہا بن جاؤ، جو آثار حیات کے قبول کرنے سے بالکل محروم نظر آتے ہیں، بلکہ کوئی ایسی سخت چیز بن کر تجربہ کر لو جس کا زندہ ہونا لوہے اور پتھر سے بھی زیادہ مشکل معلوم ہو حتیٰ کہ مجسم موت بن کر دیکھ لو کہ پھر بھی اس قادر مطلق کو تمہارا زندہ کر دینا کس قدر آسان ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ **قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ:** جس نے پہلی بار تم کو مٹی یا نطفہ سے پیدا کیا اور جماد لایعقل پر روح انسانی فائض کر دی، کیا اب اس میں قدرت نہیں رہی کہ خاک کے ذرات اور مردہ لاش کے اجزاء کو جمع کر کے دوبارہ زندگی عنایت کر دے۔

**فائدہ:** ۳؎ **وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ:** یعنی استہزاء و تمسخر سے سر ہلا کر کہتے ہیں کہ ہاں صاحب! بوسیدہ ہڈیوں کے ریزوں میں کب جان پڑے گی اور کب مردے قبروں سے حساب کے لیے اٹھائے جائیں گے۔

**فائدہ:** ۴؎ **قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا:** یعنی قیامت کا ٹھیک وقت حق تعالیٰ نے کسی کو نہیں بتلایا، ہاں اس کے مستقبل قریب میں آنے

کی تم امید ظاہر کر سکتے ہو، گویا دنیا کی بقیہ عمر اس سے کم ہے جتنی گزر چکی ہے۔

يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهِ وَتَظُنُّونَ إِن لَّبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٥٢﴾

جس دن تم کو پکارے گا پھر چلے آؤ گے اس کی تعریف کرتے ہوئے ۱؎ اور اٹکل کرو گے کہ دیر نہیں لگی تم کو مگر تھوڑی ۲؎

**خلاصہ تفسیر**: (آگے اس کے وقوع کے وقت کی حالت کا بیان ہے کہ) یہ اس روز ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تم کو (زندہ کرنے اور میدان حشر میں جمع کرنے کے لئے فرشتہ کے ذریعہ) پکارے گا اور تم (باضطرار) اس کی حمد کرتے ہوئے حکم کی تعمیل کرو گے (یعنی زندہ بھی ہو جاؤ گے اور میدان حشر میں جمع بھی ہو جاؤ گے) اور (اس روز کی ہول اور ہیبت دیکھ کر تمہارا یہ حال ہو جائے گا کہ دنیا کی ساری عمر اور قبر میں رہنے کی ساری مدت کی نسبت) تم یہ خیال کرو گے کہ تم بہت ہی کم (مدت دنیا میں) رہے تھے (کیونکہ پہلے دنیا اور پھر قبر میں آج قیامت کے دن کی ہولناکی کے مقابلہ میں پھر کچھ نہ کچھ راحت تھی اور انسان کو راحت کا زمانہ شدت و مصیبت کے سامنے بہت کم معلوم ہوتا ہے)۔

**فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهِ**: اس آیت کے ظاہر سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مومن و کافر سب کا یہی حال ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے ہوئے اٹھیں گے، کیونکہ اس آیت میں اصل خطاب کفار ہی کو ہے، انھیں کے متعلق یہ بیان ہو رہا ہے کہ سب حمد کرتے ہوئے اٹھیں گے، ائمہ تفسیر میں حضرت سعید بن جبیرؒ نے فرمایا کہ کفار بھی اپنی قبروں سے نکلتے وقت سبحانك وبحمدك کے الفاظ کہتے ہوئے نکلیں گے، مگر اس وقت کا حمد و ثناء کرنا ان کو کوئی نفع نہیں دے گا، کیونکہ یہ لوگ جب مرنے کے بعد زندگی دیکھیں گے تو غیر اختیاری طور پر ان کی زبان سے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے الفاظ نکلیں گے وہ کوئی ایسا عمل نہیں ہوگا جس پر جزاء و مرتب ہو، بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ کنایہ ہے انقیاد و اطاعت سے یعنی "تنقادون له انقیاد الحامدين"۔

* * *

**فائدہ**: ۱؎ یعنی جس وقت خدا کی طرف سے آواز دی جائے گی ایک ڈانٹ میں سب مردے زمین سے نکل کر میدان حشر میں جمع ہو جائیں گے کسی کو سرتابی کی مجال نہ ہوگی، ہر ایک انسان اس وقت مطیع و منقاد ہو کر خدا کی حمد و ثنا کرتا ہوا حاضر ہوگا، گو کافر کو اس وقت کی اضطراری حمد و ثنا سے کچھ فائدہ نہیں، بعض روایات میں ہے کہ مومنین کی زبان پر یہ الفاظ ہوں گے: الحمد لله الذی اذهب عنا الحزن

**فائدہ**: ۲؎ یعنی اب شتابی کرتے ہو، اس وقت اندازہ کرو گے کہ دنیا میں کچھ زیادہ دیر نہیں رہے تھے، پچاس سو برس ان ہزاروں برسوں کے سامنے کیا معلوم ہوں (موضح القرآن) بعض نے کہا کہ شدتِ ہول و خوف سے دنیا کی زندگی تھوڑی معلوم ہوگی، یا نفخہ اول اور نفخہ ثانی کے درمیان چونکہ عذاب نہ رہے گا، اس درمیانی مدت کو قلیل خیال کر کے کہیں گے: مَن بَعَثَنَا مِن مَّرْقَدِنَا

وَقُل لِّعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنزَغُ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ

اور کہہ دے میرے بندوں کو کہ بات وہی کہیں جو بہتر ہو، شیطان جھڑپ کرواتا ہے ان میں، شیطان ہے

لِلْإِنسَانِ عَدُوًّا مُّبِينًا ﴿٥٣﴾ رَّبُّكُمْ أَعْلَمُ بِكُمْ ۖ إِن يَشَأْ يَرْحَمْكُمْ أَوْ إِن يَشَأْ يُعَذِّبْكُمْ ۚ

انسان کا دشمن صریح ۱؎ تمہارا رب خوب جانتا ہے تم کو، اگر چاہے تم پر رحم کرے اور اگر چاہے تم کو عذاب دے ۲؎

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ﴿٥٤﴾

اور تجھ کو نہیں بھیجا ہم نے ان پر ذمہ لینے والا ۳؎

**خلاصہ تفسیر**: پیچھے کفار کی جہالتوں کا ذکر تھا جس پر مسلمانوں کے غصہ آنے کا احتمال تھا، اس لیے آگے جواب میں نرمی برتنے کی

تعلیم فرماتے ہیں۔

اور آپ میرے (مسلمان) بندوں سے کہہ دیجئے کہ (اگر کفار کو جواب دیں تو) ایسی بات کہا کریں جو (اخلاق کے اعتبار سے) بہتر ہو (یعنی اس میں سب وشتم، تشدد اور اشتعال انگیزی نہ ہو، کیونکہ) شیطان (سخت بات کہلوا کر) لوگوں میں فساد ڈلوا دیتا ہے، واقعی شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے (اور سختی کا فائدہ اس لیے نہیں کیونکہ ہدایت وگمراہی تو مشیت الٰہی کے تابع ہے، سو) تم سب کا حال تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے (کہ کون کس قابل ہے بس) اگر وہ چاہے تو تم (میں سے جس) پر (چاہے) رحمت فرما دے (یعنی ہدایت کر دے) یا اگر وہ چاہے تو تم (میں سے جس) کو (چاہے) عذاب دینے لگے (یعنی اس کو توفیق اور ہدایت نہ دے) اور ہم نے آپ (تک) کو ان (کی ہدایت) کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا (اور جب باوجود نبی ہونے کے آپ ذمہ دار نہیں بنائے گئے تو دوسروں کی کیا مجال ہے، اس لئے کسی کے درپے ہونا اور سختی کرنا بے فائدہ ہے)۔

**یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ**: اس آیت میں جو مسلمانوں کو کافروں کے ساتھ سخت کلامی سے منع کیا گیا ہے اس کی مراد یہ ہے کہ بے ضرورت سختی نہ کی جائے، جیسا اکثر مناظرہ ومجادلہ میں ہو جاتی ہے، ورنہ ضرورت اور مصلحت ہو تو قتل تک کرنے کی اجازت ہے:

که بے حکم شرع آب خوردن خطاست  وگر خون بفتوی بریزی رواست

قتل وقتال کے ذریعہ کفر کی شوکت اور اسلام کی مخالفت کو دبایا جا سکتا ہے اس لئے اس کی اجازت ہے، گالی گلوچ اور سخت کلامی سے نہ کوئی قلعہ فتح ہوتا ہے نہ کسی کو ہدایت ہوتی ہے اس لئے اس سے منع کیا گیا ہے، اس میں اس بات کی تعلیم ہے کہ بحث وگفتگو کے وقت مخالفین کے ساتھ نرمی وحسن اخلاق اختیار کیا جائے۔

**وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ وَكِیْلًا**: اس میں دلالت ہے کہ پیغام پہنچانے کے بعد اصلاح میں کسی کے زیادہ پیچھے نہ لگے۔

* * *

**فائدہ**: ۱ مشرکین کی جہالت اور طعن وتمسخر کو سن کر ممکن تھا کوئی مسلمان نصیحت وفہمائش کرتے وقت تنگ دلی برتنے لگے اور سختی پر اتر آئے اس لیے مسلمانوں کو نصیحت فرمائی کہ مذاکرہ میں کوئی سخت دل آزار اور اشتعال انگیز پہلو اختیار نہ کریں کیونکہ اس سے بجائے فائدہ کے نقصان ہوتا ہے، شیطان دوسرے کو ابھار کر لڑائی کرا دیتا ہے، پھر مخاطب کے دل میں ایسی ضد وعداوت قائم ہو جاتی ہے کہ سمجھتا ہو تب بھی نہ سمجھے۔

**فائدہ**: ۲ یعنی رحم کرے ایمان کی توفیق دے کر، یا عذاب دے حالت کفر پر مار کر۔

**فائدہ**: ۳ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''مذاکرہ میں حق والا جھنجھلانے لگتا ہے کہ دوسرا صریح حق کو نہیں مانتا، سو فرما دیا کہ تم ان کی ہدایت کے ذمہ دار نہیں، اللہ بہتر جانتا ہے جس کو چاہے راہ سجھائے''۔

| |
|---|
| وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِیّٖنَ عَلٰی بَعْضٍ |
| اور تیرا رب خوب جانتا ہے ان کو جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں اور ہم نے افضل کیا ہے بعضے پیغمبروں کو بعضوں سے |
| وَّاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۵۵﴾ |
| اور دی ہم نے داؤد کو زبور |

**خلاصہ تفسیر**: پیچھے کفار کے انکار رسالت کا بیان تھا، ان کے انکار رسالت کے اسباب ووجوہ میں سے ایک شبہ یہ بھی تھا کہ رسول فرشتہ ہونا چاہیے، یا اگر بشر ہو تو کوئی رئیس امیر ہو، اب اس شبہ کا جواب دیا جاتا ہے، نیز حضرت داود علیہ السلام کے ذکر سے آپ ﷺ کی رسالت کی تائید اور رسولوں میں سے آپ کے افضل ہونے کی طرف اجمالی اشارہ بھی فرماتے ہیں۔

اور آپ کا رب خوب جانتا ہے ان کو (بھی) جو کہ آسمانوں میں ہیں اور (ان کو بھی جو کہ) زمین میں ہیں (آسمان والوں سے مراد فرشتے، اور زمین والوں سے مراد انسان اور جنات ہیں، مطلب یہ ہے کہ ہم خوب واقف ہیں کہ ان میں سے کس کو نبی اور رسول بنانا مناسب ہے کس کو نہیں؟ اس لئے اگر ہم نے آپ کو نبی بنا دیا تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے!) اور (اسی طرح اگر ہم نے آپ کو دوسروں پر فضیلت دے دی تو تعجب کیا ہے! کیونکہ) ہم نے (پہلے بھی) بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی ہے (اور اسی طرح اگر ہم نے آپ کو قرآن دیا تو تعجب کی کیا بات ہے! کیونکہ آپ سے پہلے) ہم داؤد کو زبور دے چکے ہیں۔

**وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا**: یہاں بطور خاص زبور کو ذکر کرنے میں یہ نکتہ ہے کہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحب ملک وسلطنت ہونے کی دی گئی ہے جیسا کہ ارشاد ہے: ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون، چنانچہ تفسیر حقانی میں زبور کے مضامین کا حوالہ نقل کیا گیا ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی ہم اپنے علم محیط کے موافق ہر ایک کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں، جس کو مناسب جانا آدمیوں میں سے پیغمبر بنایا، پھر جس پیغمبر کو چاہا دوسرے پیغمبروں پر کلی یا جزئی فضیلت عنایت کی، حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''یعنی بعضے نبی تھے کہ (امت کی حد سے زیادہ شرارتوں پر آخر کار) جھنجھلا گئے، آپ کا حوصلہ ان سے زیادہ رکھا ہے (اور سب پر فضیلت دی ہے، لہذا آپ کی خوش اخلاقی اپنے مرتبہ عالی کے موافق ہونی چاہیے) اور خصوصیت سے داؤد کا ذکر کیا، کیونکہ دونوں چیزیں رکھتے تھے، جہاد بھی اور زبور بھی، سمجھانے کو (وفی الحدیث کَانَ لَا یَفِرُّ اِذَا لَاقٰی) وہ دونوں باتیں یہاں بھی ہیں قرآن اور جہاد''۔

بعض نے کہا کہ یہاں ''زبور'' کا ذکر کر کے حضور کی فضیلت کلیہ اور امت محمدیہ کے فضل وشرف کی طرف اشارہ فرما دیا، کیونکہ حضور کے خاتم الانبیاء اور اس امت کے اشرف الامم ہونے پر زبور شریف کے مضامین مشتمل تھے: وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ یعنی محمدًا وامۃ المرحومہ۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ﴿۵۶﴾

کہہ پکارو جن کو تم سمجھتے ہو سوائے اس کے سو وہ اختیار نہیں رکھتے کہ کھول دیں تکلیف کو تم سے اور نہ بدل دیں

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ

وہ لوگ جن کو یہ پکارتے ہیں وہ خود ڈھونڈتے ہیں اپنے رب تک وسیلہ کہ کونسا بندہ بہت نزدیک ہے ۱ اور امید رکھتے ہیں

رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ۭ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ﴿۵۷﴾

اس کی مہربانی کی اور ڈرتے ہیں اس کے عذاب سے، بیشک تیرے رب کا عذاب ڈرنے کی چیز ہے ۲

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے چند آیتوں میں شرک کو باطل کیا تھا، آگے بعض خاص صورتوں کا رد کیا جاتا ہے، وہ خاص صورت یہ ہے کہ بعض لوگ ملائکہ اور جنات کی پرستش کرتے تھے، پھر وہ جنات مسلمان ہو گئے اور فرشتے تو مؤمن ہی ہیں، لیکن یہ لوگ پھر بھی ان کی پرستش کرتے رہے، اس بارے میں یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

آپ (ان لوگوں سے) فرما دیجئے کہ جن کو تم خدا کے سوا (معبود) قرار دے رہے ہو (جیسے فرشتے اور جنات) ذرا ان کو (اپنی تکلیف دور کرنے کے لئے) پکارو تو سہی، سو وہ نہ تم سے تکلیف کو دور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ اس کے بدل ڈالنے کا (مثلاً تکلیف کو بالکل دور نہ کر سکیں کچھ ہلکا

ہی کر دیں تو یہ بھی ان کو اختیار نہیں ) یہ لوگ کہ جن کو مشرکین (اپنی حاجت روائی یا مشکل کشائی کے لئے) پکار رہے ہیں وہ خود ہی اپنے رب کی طرف (پہنچنے کا) ذریعہ ڈھونڈ رہے ہیں کہ ان میں کون زیادہ مقرب بنتا ہے (یعنی وہ خود ہی اطاعت وعبادت میں مشغول ہیں، تا کہ اللہ تعالیٰ کا قرب میسر ہوجائے اور چاہتے ہیں کہ زیادہ قرب ہوجائے) اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے (نافرمانی کی صورت میں) ڈرتے ہیں ،واقعی آپ کے رب کا عذاب ہے بھی ڈرنے کی چیز (مطلب یہ ہے کہ جب وہ خود عابد ہیں تو معبود کیسے ہو سکتے ہیں؟! اور جب وہ خود ہی اپنی ضروریات میں اور تکلیف کے دور کرنے میں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں تو وہ دوسروں کی حاجت روائی اور مشکل کشائی کیا کر سکتے ہیں؟!)۔

**فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ**: وجہ اس کی ظاہر ہے کہ اگر چہ جنات اور فرشتوں میں کسی قدر اختیار کی صفت ہے، مگر وہ اپنے اختیار میں حق تعالیٰ کے محتاج ہیں، پس جس چیز کا اختیار ان کو عطا نہیں ہوا اس پر اختیار نہیں رکھتے۔

**يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ**: لفظ ''وسیلہ'' کے معنی ہر وہ چیز جس کو کسی دوسرے تک پہنچنے کا ذریعہ بنایا جائے، اور اللہ کے لئے وسیلہ یہ ہے کہ علم وعمل میں اللہ تعالیٰ کی مرضی کی ہر وقت رعایت رکھے اور احکام شرعیہ کی پابندی کرے، مطلب یہ ہے کہ یہ سب حضرات اپنے عمل صالح کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے تقرب کی طلب میں لگے ہوئے ہیں۔

* * *

**فائدہ**: ۱؎ یعنی خدا تو وہ ہے کہ جس کو چاہے عذاب دے جس پر چاہے مہربانی فرمائے، جس کو جس قدر چاہے دوسروں پر فضیلت عطا کرے، اس کی قدرت کاملہ اور علم محیط ہے، اب ذرا مشرکین ان ہستیوں کو پکاریں جن کو انہوں نے خدا سمجھ رکھا یا بنا رکھا ہے، کیا ان میں ایک بھی ایسا مستقل اختیار رکھتا ہے کہ ذرا سی تکلیف کو تم سے دور کر سکے یا ہلکی کر دے یا تم سے اٹھا کر کسی دوسرے پر ڈال دے، پھر ایسی ضعیف وعاجز مخلوق کو معبود ٹھہرا لینا کیسے روا ہوگا۔

**فائدہ**: ۲؎ بخاری میں روایت ہے کہ کچھ لوگ جاہلیت میں جنات کی عبادت کرتے تھے، وہ جن مسلمان ہوگئے اور یہ پوجنے والے اپنی جماعت پر قائم رہے، ان کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی، بعض کہتے ہیں کہ جن، ملائکہ، مسیح وعزیر وغیرہ کے پوجنے والے سب اس میں شامل ہیں، مطلب یہ ہے کہ جن ہستیوں کو تم معبود ومستعان سمجھ کر پکارتے ہو، وہ خود اپنے رب کا بیش از بیش قرب تلاش کرتے ہیں، ان کی دوا دوش صرف اس لیے ہے کہ خدا کی نزدیکی حاصل کرنے میں کون آگے نکلتا ہے، ان میں جو زیادہ مقرب ہیں وہ ہی زیادہ قرب الٰہی کے طالب رہتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ کسی سب سے زیادہ مقرب بندہ کی دعاء وغیرہ کو حصول قرب کا وسیلہ بنائیں، پس جب تمہارے تجویز کیے ہوئے معبودوں کا خدا کے سامنے یہ حال ہے تو اپنے تئیں خود فیصلہ کرلو کہ خدا تعالیٰ کو خوش رکھنا کہاں تک ضروری ہے، غیر اللہ کی پرستش سے نہ خدا خوش ہوتا ہے نہ وہ جنہیں تم خوش رکھنا چاہتے ہو۔

**تنبیہ**: ''توسل'' اور ''تعبد'' میں فرق ظاہر ہے، پھر توسل بھی اسی حد تک مشروع ہے جہاں تک شریعت نے اجازت دی۔

**فائدہ**: ۳؎ یعنی باوجود غایت قرب کے ان کی امیدیں محض حق تعالیٰ کی مہربانی سے وابستہ ہیں اور اسی کے عذاب سے ہمیشہ لرزاں وترساں رہتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ہر قسم کا نفع پہنچانا، یا ضرر کو روکنا ایک خدا کے قبضہ میں ہے۔

| |
|---|
| وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ |
| اور کوئی بستی نہیں جس کو ہم خراب نہ کر دیں گے قیامت سے پہلے یا آفت ڈالیں گے اس پر سخت آفت ۱؎ |
| كَانَ ذٰلِكَ فِى الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴿۵۸﴾ |
| یہ ہے کتاب میں لکھا گیا ۲؎ |

**خلاصہ تفسیر**: پیچھے عذاب اور عذاب سے بچنے کا ذکر تھا، اب اس کے وقوع کا یقینی ہونا بیان کرتے ہیں، بعض پر دنیا میں بھی اور بعض پر آخرت میں، مقصود یہ کہ عذاب ٹلے گا نہیں، اگر دنیا میں نہیں تو آخرت میں ضرور ہوگا۔

اور (کفار کی) ایسی کوئی بستی نہیں جس کو ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہ کریں (یا قیامت کے روز) اس کے رہنے والوں کو (دوزخ کا) سخت عذاب نہ دیں، یہ بات کتاب (یعنی لوح محفوظ) میں لکھی ہوئی ہے (پس اگر کوئی کافر یہاں کسی آفت میں ہلاک ہونے سے بچ گیا تو قیامت کے روز کی بڑی آفت سے نہ بچے گا)۔

آفت کی قید اس لیے لگائی کیونکہ طبعی موت سے ہلاک ہونا تو کفار کے ساتھ مخصوص نہیں سبھی مرتے ہیں، اس لئے بستیوں کے ہلاک ہونے سے اس جگہ مراد یہ ہے کہ کسی عذاب اور آفت کے ذریعہ ہلاک کیا جائے تو خلاصہ یہ ہوا کہ کفار پر کبھی تو دنیا میں عذاب بھیج دیا جاتا ہے اور آخرت کا عذاب اس کے علاوہ ہوگا، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دنیا میں کوئی عذاب نہ آیا تو آخرت کے عذاب سے بہر حال نجات نہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ اس آیت کا مطلب کئی طرح لیا جاسکتا ہے:

(الف) دنیا کی ہر ایک بستی کو عظیم الشان گناہوں کی پاداش میں قیامت سے پہلے پہلے عذاب مستاصل بھیج کر بالکلیہ تباہ و خراب کر دیا جائے گا، یا اگر گناہ انتہائی درجہ کے نہ ہوں گے تو درجہ دوئم کے جرائم کی سزا میں عام ہلاکت سے کم کوئی سخت آفت اس بستی پر نازل کی جائے گی، باقی ایسی بستی کہاں ہے جو ازل سے ابد تک نہ گناہ کرے نہ کسی آفت میں پھنسے۔

(ب) قیامت سے پیشتر ضروری ہے کہ ہر ایک بستی طبعی موت بھیج کر ویران کی جائے یا کسی سخت آفت و بلا میں مبتلا ہو، طبعی موت پر جو تعذیب کے رنگ سے خالی ہو، لفظ ''ہلاک'' کا اطلاق قرآن وحدیث سے ثابت ہے: حَتّٰۤى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ یَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا وفی الحدیث: ''كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ جَآءَ نَبِيٌّ اٰخَرُ''.

(ج) کفار کی ہر ایک بستی یا قیامت سے پہلے اپنے سنگین جرائم کی پاداش میں نابود و تباہ کر دی جائے گی یا کسی نہ کسی وقت (یعنی قیامت سے پہلے یا بعد) سخت عذاب کا مزہ چکھے گی، بہر حال کوئی معنی لیے جائیں، مقصود اس آیت سے تحذیر ہے، گویا پہلے جو فرمایا تھا اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا یہاں اس کے وقوع کی خبر دی گئی۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی یہ فیصلہ بالکل حتمی اور اٹل ہے، جو علم الٰہی میں طے ہو چکا اور لوح محفوظ میں لکھا گیا، کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی، حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''ہر شہر کے لوگ ایک بزرگ کو پوجتے ہیں کہ ہم اس کی رعیت ہیں اور اس کی پناہ میں ہیں، سو وقت آنے پر کوئی پناہ نہیں دے سکتا''، لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ

| |
|---|
| وَمَا مَنَعَنَاۤ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰیٰتِ اِلَّاۤ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ؕ وَاٰتَیْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ |
| اور ہم نے اس لیے موقوف کیں نشانیاں بھیجنی کہ اگلوں (پہلوں) نے ان کو جھٹلایا ۱؎ اور ہم نے دی ثمود کو اونٹنی |
| مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ؕ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰیٰتِ اِلَّا تَخْوِیْفًا ﴿۵۹﴾ |
| ان کے سمجھانے کو پھر ظلم کیا اس پر ۲؎ اور نشانیاں جو ہم بھیجتے ہیں سو ڈرانے کو ۳؎ |

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے رسالت کے متعلق کلام تھا، اب یہاں بھی رسالت ہی کے متعلق ان کے ایک شبہ کا جواب دیا ہے، شبہ کی وجہ بعض خاص فرمائشی معجزات کا واقع نہ ہونا تھا، چنانچہ معجزات کے واقع نہ ہونے کی حکمت بیان کی جاتی ہے۔

اور ہم کو خاص (فرمائشی) معجزات کے بھیجنے سے صرف یہی بات مانع ہے کہ پہلے لوگ ان (کے ہم جنس فرمائشی معجزات) کی تکذیب کر چکے ہیں (اور طبیعت و مزاج سب کافروں کے ملتے جلتے ہیں تو ظاہر یہ ہے کہ یہ بھی تکذیب کریں گے) اور (نمونے کے طور پر ایک قصہ بھی سن لو کہ) ہم نے

قوم ثمود کو (ان کی فرمائش کے مطابق حضرت صالح علیہ السلام کے معجزہ کے طور پر) اونٹنی دی تھی (جو عجیب طور پر پیدا ہوئی اور) جو کہ (معجزہ ہونے کے سبب فی نفسہ) بصیرت کا ذریعہ تھی، سو ان لوگوں نے (اس سے بصیرت حاصل نہ کی، بلکہ) اس کے ساتھ ظلم کیا (کہ اسے قتل کر ڈالا اسی طرح اگر موجودہ لوگوں کو فرمائشی معجزے دکھلائے گئے تو یہ بھی بصیرت حاصل نہ کریں گے) اور ہم ایسے معجزات کو صرف (اس بات سے) ڈرانے کے لئے بھیجا کرتے ہیں (کہ اگر یہ فرمائشی معجزہ دیکھ کر بھی ایمان نہ لاؤ گے تو فوراً ہلاک کر دیے جاؤ گے)۔

فرمائشی معجزات سے اصل مقصود یہ ہوتا ہے کہ اگر ایمان نہ لائے تو ابھی ہلاک کر دیے جائیں گے جیسے ثمود اور اصحاب مدین کے ساتھ ہوا، پس اگر فرمائشی معجزات کا ظہور ہوتا تو یہ ایمان نہ لاتے اور ہم اپنے وعدہ کو پورا کرتے تو یہ ہلاک ہوتے، اور ابھی بہت سی حکمتوں کی وجہ سے ان کی ہلاکت کا وقت نہیں آیا۔

* * *

**فائدہ:** ۱ حدیث میں ہے کہ اہل مکہ نے حضور سے چند نشانیاں طلب کیں مثلاً یہ کہ کوہ صفا کو سونا بنا دیجئے یا پہاڑوں کو ہمارے گرد و پیش سے ہٹا کر زراعت کے قابل زمین ہموار کر دیجئے وغیر ذالک، ایسا کرو تو ہم آپ کو مان لیں گے، اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی، یعنی ایسے فرمائشی نشان دکھلانا خدا تعالیٰ کو کچھ دشوار نہ تھا، لیکن پہلے لوگوں کو ان کی فرمائش کے مطابق نشان دکھلائے گئے تب بھی نہ مانے، بلکہ سرکشی میں اور ترقی کر گئے، آخر سنت اللہ کے موافق اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ بالکل نیست و نابود کر دیئے گئے، اب اگر تمہاری سب فرمائشیں پوری کر دی جائیں اور خدا کے علم میں ہے بلکہ تمہارے احوال سے بھی ظاہر ہے کہ تم پھر بھی ماننے والے نہیں تو سنت اللہ کے موافق اس کا نتیجہ وہ ہی استیصال و ہلاکِ کلی ہونا چاہیے جو اس امت کے حق میں خلاف مصلحت و رحمت ہے، خدا تعالیٰ کا ارادہ اس آخری امت کی نسبت یہ نہیں کہ گذشتہ اقوام و امم کی طرح عذاب مستاصل بھیج کر بالکلیہ تباہ کی جائے، پہلی امتوں کو فرمائشی نشان دکھلانا اس بناء پر جائز رکھا گیا کہ ان کی بالکلیہ تباہی خدا کے نزدیک اس قدر لائق التفات نہ تھی اور آخر میں آنے والی امت کو کچھ نمونے دکھلانے تھے کہ فرمائشی نشان مانگنے والوں کا حشر ایسا ہوتا ہے، چنانچہ اس آیت میں ان ہی تاریخی نظائر کی طرف اجمالی اشارہ فرما دیا کہ اگر فرمائشی نشان دیکھنے کے بعد تکذیب کی (اور یقیناً کرو گے) تو جو حشر پہلوں کا ہوا وہ ہی تمہارا ہوگا، لیکن حکمت الٰہیہ مقتضی نہیں کہ تم کو اس طرح تباہ کیا جائے، لہٰذا فرمائشی نشانات کا بھیجنا موقوف کیا گیا۔

**فائدہ:** ۲ قوم ثمود نے حضرت صالح سے درخواست کی تھی کہ پہاڑ کی فلاں چٹان میں سے اونٹنی نکال دیجئے، خدا نے نکال دی، مگر بجائے اس کے کہ ایسا فرمائشی معجزہ دیکھ کر آنکھیں کھلتیں اور قلبی بصیرت حاصل ہوتی الٹے ظلم و عداوت پر کمربستہ ہو گئے، چنانچہ اونٹنی کو مار ڈالا اور حضرت صالح کے قتل کے منصوبے باندھنے لگے، آخر جو انجام ہوا وہ سب کو معلوم ہے کہنے کی ضرورت نہیں، یہ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ کا ایک نمونہ پیش کر دیا۔

**فائدہ:** ۳ یعنی ہدایت نشانیاں دیکھنے پر موقوف نہیں، غیر معمولی نشانات بھیجنے سے تو مقصود یہ ہے کہ قدرت قاہرہ کو دیکھ کر لوگ خدا سے ڈریں اور ڈر کر اس کی طرف جھکیں، اگر یہ مقصود حاصل نہ ہو اور فی الحال اس قوم کو تباہ کرنا بھی مصلحت نہیں تو محض فرمائشیں پورا کرنے سے کیا حاصل ہے، باقی عام تخویف و انذار کے لیے جن آیات و نشانات کا بھیجنا مصلحت ہے وہ برابر بھیجے جاتے ہیں۔

وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ

اور جب کہہ دیا ہم نے تجھ سے کہ تیرے رب نے گھیر لیا ہے لوگوں کو ۱ اور وہ دکھلاوا جو تجھ کو دکھلایا ہم نے سو جانچنے کو لوگوں کے ۲

وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ؕ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ۶۰ ع ۶/۸

اور ایسے ہی وہ درخت جس پر پھٹکار ہے قرآن میں ۳ اور ہم ان کو ڈراتے ہیں، تو ان کو زیادہ ہوتی ہے بڑی شرارت ۴

**خلاصہ تفسیر:** حکمت الٰہیہ کا تقاضہ یہ ہے کہ یہ لوگ ابھی ہلاک نہ کئے جائیں اس لئے ان کے فرمائشی معجزات نہیں دکھلائے

جاتے، اس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے جو ان لوگوں کو پہلے پیش آچکا ہے، جس کا ذکر یہ ہے کہ:

اور (ہم جو کہتے ہیں کہ یہ ایمان نہ لائیں گے تو وجہ یہ ہے کہ ہمیں یہ بات پہلے سے معلوم ہے اور اس سے قبل ہم آپ کو اپنے اس علم کی اطلاع بھی دے چکے ہیں چنانچہ) آپ وہ وقت یاد کر لیجئے جبکہ ہم نے آپ سے کہا تھا کہ آپ کا رب (اپنے علم سے) تمام لوگوں (کے ظاہری و باطنی احوال ظاہری و باطنی، موجود و مستقبل) کو محیط ہو رہا ہے (اور مستقبل کے احوال میں ان کا ایمان نہ لانا بھی اللہ کو معلوم ہے، سو اللہ تعالیٰ کو وہ بھی معلوم ہے) اور (جس طرح پہلے لوگوں کے واقعات پر قیاس کرنا ان کے ایمان نہ لانے کی دلیل ہے، اسی طرح خود ان کے بھی بعض واقعات پر قیاس کر کے یہ بات معلوم ہو سکتی ہے، چنانچہ) ہم نے (واقعہ معراج میں) جو تماشا (بحالت بیداری) آپ کو دکھلایا تھا اور جس درخت کی قرآن میں مذمت کی گئی ہے (یعنی زقوم جو کفار کی غذا ہے) ہم نے ان دونوں چیزوں کو ان لوگوں کے لئے موجب گمراہی کر دیا (یعنی ان لوگوں نے ان دونوں کو سن کر جھٹلایا، معراج کی نسبت کہنے لگے کہ ایک رات میں اتنی دور جانا بالخصوص آسمان پر جانا کسی طرح بھی ممکن نہیں، اور زقوم کے درخت کے بارے میں کہتے تھے کہ اسے دوزخ کے اندر بتلایا جاتا ہے، آگ سے تو درخت جل جاتا ہے، آگ میں کوئی درخت کیسے رہ سکتا ہے؟ اگر ہو بھی تو جل جائے گا، حالانکہ ایک رات میں اتنا طویل سفر طے کرنا عقلاً محال نہیں اور آسمان پر جانا ممکن ہے اور آگ کے اندر درخت کا وجود ان کی سمجھ میں نہ آیا، حالانکہ کوئی محال بات نہیں کہ کسی درخت کا مزاج ہی اللہ تعالیٰ ایسا بنا دیں کہ وہ پانی کے بجائے آگ سے پرورش پائے، پھر فرمایا) اور ہم ان کو (عذاب آخرت سے) ڈراتے رہتے ہیں لیکن ان کی بڑی سرکشی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے (اور ہدایت سے محرومی رہتی ہے)۔

خلاصہ یہ کہ ان لوگوں نے آخر ان باتوں کو جھٹلایا، پس اس قیاس سے عام لوگ جلدی سمجھ سکتے ہیں کہ اگر فرمائشی معجزات آتے تو یہ ان کو بھی ضرور جھٹلاتے، اور یہ دونوں قیاس سامعین کو سمجھانے کے لیے بیان کیے گئے ہیں، ورنہ اصل دلیل تو وہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ بات معلوم ہے کہ یہ ایمان نہ لائیں گے، زقوم کے درخت کے انکار کے ساتھ یہ لوگ استہزاء بھی کرتے تھے جس کا بیان دیگر تحقیق کے ساتھ سورۃ صافات میں آئے گا۔

**وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ:** یعنی شب معراج میں جو تماشا ہم نے آپ کو دکھلایا تھا وہ لوگوں کے لئے ایک فتنہ تھا، لفظ ''فتنہ'' عربی زبان میں بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس کے ایک معنی وہ ہیں جو خلاصہ تفسیر میں لئے گئے یعنی گمراہی، ایک معنی آزمائش کے بھی آتے ہیں، ایک معنی کسی ہنگامہ وفساد کے برپا ہونے کے بھی آتے ہیں، یہاں ان سب معانی کا احتمال ہے حضرت عائشہؓ اور معاویہؓ اور حسن اور مجاہد وغیرہ ائمہ تفسیر نے اس جگہ فتنہ سے مراد یہی آخری معنی لئے ہیں اور فرمایا کہ یہ فتنہ ارتداد کا تھا کہ جب رسول کریم ﷺ نے شب معراج میں بیت المقدس اور وہاں سے آسمانوں پر جانے اور صبح سے پہلے واپس آنے کا ذکر کیا تو بہت سے نو مسلم لوگ جن میں ایمان راسخ نہ ہوا تھا اس کلام کی تکذیب کر کے مرتد ہو گئے۔

**الرُّءْيَا:** اسی واقعہ سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ لفظ الرُّءْيَا عربی زبان میں اگرچہ خواب کے معنی میں بھی آتا ہے، لیکن اس جگہ مراد خواب کا قصہ نہیں، کیونکہ ایسا ہوتا تو لوگوں کے مرتد ہو جانے کی کوئی وجہ نہیں تھی، خواب تو ہر شخص ایسے دیکھ سکتا ہے، بلکہ اس جگہ مراد الرُّءْيَا سے ایک واقعہ عجیبہ کا بحالت بیداری دکھلانا ہے، آیت مذکورہ کی تفسیر میں بعض حضرات نے اس کو واقعہ معراج کے سوا دوسرے واقعات پر بھی محمول کیا ہے، مگر مجموعی اعتبار سے یہاں منطبق نہیں ہوتے، اس لئے جمہور نے واقعہ معراج ہی کو اس آیت کا محمل قرار دیا ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱۔ **اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ:** شاید آپ کو خیال ہوا ہو گا کہ فرمائشی نشان نہ دکھلانے پر کفار کو ہنسنے اور طعن کرنے کا موقع ملے گا کہ اگر سچے پیغمبر ہوتے تو ہماری طلب کے موافق نشان دکھلاتے، اس لیے آپ کو مطمئن کیا کہ سب لوگوں کو تیرے رب کے علم و قدرت نے گھیر رکھا ہے نہ کوئی اس کے علم سے باہر ہے نہ قدرت کے نیچے سے نکل کر جا سکتا ہے سب اس کے قبضہ میں ہیں آپ ان کے طعن و تشنیع کی طرف قطعاً التفات نہ کریں، وہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، اپنا کام کیے جائیے اور ان کے فیصلوں کو بالکلیہ ہم پر چھوڑ دیجئے، ہم جانتے ہیں کہ فرمائشی نشان دیکھ کر بھی یہ لوگ آپ کی بات

ماننے والے نہیں تھے اور اس کے بعد ہماری سزا سے چھوٹ کر نکل بھاگنا بھی ممکن نہ تھا اور یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ لوگوں میں سے کون فی الحال تباہ کر ڈالنے کے لائق ہیں اور کن لوگوں کا باقی رکھنا مصلحت ہے، لہٰذا آپ اس جھنجھٹ میں نہ پڑیں، یہ سب ہمارے محاصرہ میں ہیں آخر مسلمان ہو کر رہیں گے۔

**فائدہ:** ۲؎ **الرُّءۡیَا الَّتِیۡۤ اَرَیۡنٰکَ اِلَّا فِتۡنَۃً لِّلنَّاسِ:** ''دکھاوے'' سے مراد شب معراج کا نظارہ ہے جس کے بیان سے لوگ جانچے گئے، سچوں نے سن کر مانا اور کچوں نے جھوٹ جانا۔

**فائدہ:** ۳؎ **وَالشَّجَرَۃَ الۡمَلۡعُوۡنَۃَ فِی الۡقُرۡاٰنِ:** یعنی ''زقوم'' کا درخت جسے قرآن میں فرمایا کہ دوزخ والے کھائیں گے، ایمان والے یقین لائے اور منکروں نے کہا کہ دوزخ کی آگ میں سبز درخت کیونکر ہوگا؟ یہ بھی جانچنا تھا، ان دو مثالوں سے اندازہ کرلو کہ تصدیق خوارق کے باب میں ان کی طبائع کا کیا حال ہے۔

**فائدہ:** ۴؎ **فَمَا یَزِیۡدُہُمۡ اِلَّا طُغۡیَانًا کَبِیۡرًا:** یعنی جن کے دل خدا کے خوف سے خالی ہوں، ڈرانے سے ڈریں نہیں، بلکہ اور زیادہ شرارت میں ترقی کریں ان سے فرمائشی نشان دیکھنے پر قبول حق کی امید رکھنا بے موقع ہے۔

---

وَاِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ قَالَ ءَاَسۡجُدُ لِمَنۡ خَلَقۡتَ طِیۡنًا ﴿۶۱﴾

اور جب ہم نے کہا فرشتوں کو سجدہ کرو آدم کو تو سجدہ میں گر پڑے مگر ابلیس، بولا کیا میں سجدہ کروں ایک شخص کو جس کو تو نے بنایا مٹی کا ۱؎

قَالَ اَرَءَیۡتَکَ ہٰذَا الَّذِیۡ کَرَّمۡتَ عَلَیَّ ۫ لَئِنۡ اَخَّرۡتَنِ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ لَاَحۡتَنِکَنَّ ذُرِّیَّتَہٗۤ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۶۲﴾

کہنے لگا بھلا دیکھ تو یہ شخص جس کو تو نے مجھ سے بڑھا دیا، اگر تو مجھ کو ڈھیل دیوے قیامت کے دن تک تو میں اسکی اولاد کو ڈھانٹی دے لوں مگر تھوڑے سے ۲؎

---

**خلاصہ تفسیر:** گزشتہ آیات میں کافروں کی سرکشی اور عناد اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی مخالفت اور دشمنی کا ذکر تھا، آگے حضرت آدم علیہ السلام اور شیطان کا قصہ ذکر فرماتے ہیں جس سے مقصود یہ ہے کہ شیطان تمہارا پرانا دشمن ہے، اس کے بہکانے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت نہ کرنا، شیطان کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کے شبہات ڈالتا ہے تاکہ لوگ اللہ کے حکم سے برگشتہ ہو جائیں، ساتھ ساتھ تسلی بھی کہ جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی شیطان سے حفاظت کرتے ہیں اسی طرح کفار کے شر سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچالیں گے۔

اور (وہ وقت یاد رکھنے کے قابل ہے) جبکہ ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ان سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے (نہ کیا اور) کہا کہ کیا میں ایسے شخص کو سجدہ کروں جس کو آپ نے مٹی سے بنایا ہے (اس پر مردود ہو گیا، اس وقت) کہنے لگا کہ اس شخص (آدم) کو جو آپ نے مجھ پر فوقیت دی ہے (اسی بناء پر اسے سجدہ کرنے کا مجھے حکم دیا ہے) تو بھلا بتلایئے تو (اس میں کیا فضیلت ہے) خیر (اس کی وجہ سے میں مردود ہوا) اگر آپ نے (میری درخواست کے مطابق) مجھ کو قیامت کے زمانے تک (موت سے) مہلت دے دی تو میں (بھی) بجز قدر قلیل لوگوں کے (جو مخلصین ہوں گے باقی) اس کی تمام اولاد کو اپنے قابو میں کرلوں گا (یعنی گمراہ کردوں گا)۔

**قَالَ ءَاَسۡجُدُ لِمَنۡ خَلَقۡتَ طِیۡنًا:** ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے کے وقت دو باتیں کہی تھیں: اول یہ کہ آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا کئے گئے اور میں آگ کی مخلوق ہوں، آپ نے مٹی کو آگ پر کیوں فوقیت اور فضیلت دے دی؟ یہ سوال امر الٰہی کے مقابلہ میں حکم کی حکمت معلوم کرنے سے متعلق تھا جس کا کسی مامور کو حق نہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کو تو طلب حکمت کا حق کیا ہوتا دنیا میں خود انسان اپنے نوکر کو اس کا حق نہیں دیتا کہ وہ کسی کام کو کہے تو خادم وہ کام کرنے کے بجائے آقا سے پوچھے کہ اس کام میں کیا حکمت ہے؟! اس لئے اس کا یہ سوال ناقابل جواب قرار دے کر یہاں اس کا جواب نہیں دیا گیا، اس کے علاوہ جواب ظاہر یہی ہے کہ کسی چیز کو کسی دوسری چیز پر فوقیت دینے کا حق اسی ذات کو ہے جس نے ان کو پیدا کیا اور پالا ہے، وہ جس وقت جس چیز کو دوسری چیز پر فضیلت دیدے وہی افضل ہو جائے گی۔

لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا: رہا یہ معاملہ کہ شیطان کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ اولاد آدم کو بہکا کر گمراہ کرنے پر قادر ہو جائے گا، جس کی بناء پر اس نے یہ دعویٰ کیا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ انسان کے اجزا ترکیبی کو دیکھ کر اس نے یہ سمجھ لیا ہو کہ اس کے اندر نفسانی خواہشات کا غلبہ ہوگا، اس لئے بہکانے میں آجانا دشوار نہیں، اور اس میں بھی کچھ بعد نہیں کہ یہ دعویٰ بھی محض جھوٹ ہی ہو۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یہ قصہ کئی جگہ گزر چکا ہے، یہاں اس پر متنبہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کا بے چون و چرا ماننا فرشتوں کا اور اس میں شبہات نکالنا شیطان کا کام ہے، یہ کافر بھی اس کی چال چل رہے ہیں، جو بات بات میں کج بحثیاں کرتے ہیں، مگر یاد رہے کہ ان کا انجام بھی وہی ہونے والا ہے جو ان کے امام ابلیس لعین کا ہوگا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی تھوڑے سے چھوڑ کر باقی سب کو اپنا مسخر کرلوں جیسے گھوڑے کو لگام دے کر قابو کر لیا جاتا ہے، پھر جو میرے سامنے اتنا کمزور ہے اسے مجھ پر فضیلت دینا کس طرح جائز ہوگا؟

قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴿۶۳﴾ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ

فرمایا جا پھر جو کوئی تیرے ساتھ ہوا اُن میں سے سو دوزخ ہے تم سب کی سزا بدلہ پورا ۱؎ اور گھبرا لے

اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ

ان میں جس کو تو گھبرا سکے اپنی آواز سے ۲؎ اور لے آ (چڑھا لا) ان پر اپنے سوار اور پیادے ۳؎ اور ساجھا کر ان سے مال

وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۶۴﴾

اور اولاد میں ۴؎ اور وعدے دے ان کو، اور کچھ نہیں وعدہ دیتا ان کو شیطان مگر دغابازی ۵؎

**خلاصہ تفسیر:** ارشاد ہوا: جا! (جو تجھ سے ہو سکے کرلے) جو شخص ان میں سے تیرے ساتھ ہولے گا تو تم سب کی سزا جہنم ہے پوری سزا، اور ان میں سے جس پر تیرا قابو چلے اپنی چیخ پکار سے (یعنی اغوا اور وسوسہ سے) اس کا قدم (راہ راست سے) اکھاڑ دینا اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لانا (کہ تیرا سارا لشکر مل کر گمراہ کرنے میں خوب زور لگائے) اور ان کے مال اور اولاد میں اپنا ساجھا کرلینا (یعنی مال و اولاد کو گمراہی کا ذریعہ بنا دینا جیسا کہ اس کا مشاہدہ بھی ہے) اور ان سے (جھوٹے جھوٹے) وعدے کرنا (کہ قیامت میں گناہ پر مواخذہ نہ ہوگا، یہ سب باتیں شیطان کو بطور زجر و تنبیہ کے کہی گئی ہیں) اور (جملہ معترضہ کے طور پر فرماتے ہیں کہ) شیطان ان لوگوں سے بالکل جھوٹے وعدے کرتا ہے۔

وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ: یہاں جو شیطانی لشکر کے سوار اور پیادوں کا ذکر ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقع میں بھی شیطان کے کچھ افراد سوار ہوں کچھ پیادے، بلکہ یہ محاورہ پورے لشکر اور پوری طاقت استعمال کرنے کے لئے بولا جاتا ہے اور اگر واقع میں ایسا ہو کہ کچھ شیطان سوار ہوتے ہوں کچھ پیادہ تو اس میں بھی کوئی وجہ انکار نہیں اور حضرت ابن عباس ؓ نے فرمایا کہ جتنے افراد بھی کفر و معصیت کی حمایت کے لئے لڑنے کو چلتے ہیں وہ سوار اور پیادے سب شیطان ہی کا سوار اور پیادہ لشکر ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا: یعنی جا! جتنا زور لگا سکتا ہے لگالے، یہاں بھی تیرے اور تیرے ساتھیوں کے واسطے جیل خانہ تیار ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ: یعنی وہ آواز جو خدا کے عصیان کی طرف بلاتی ہو، مراد اس سے وسوسہ ڈالنا ہے اور مزامیر (باجا گاجا) بھی اس میں داخل ہو سکتا ہے۔

**فائدہ:** ۳ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ: یعنی ساری طاقت صرف کر ڈال! اور پوری قوت سے لشکر کشی کر! خدا کی معصیت میں لڑنے والے سب شیطان کے سوار اور پیادے ہیں، جن ہوں یا انس۔

**فائدہ:** ۴ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ: یعنی دل میں ارمان نہ رکھ، ان کو ہر طرح ابھار، کہ مال واولاد میں تیرا حصہ لگائیں، یعنی یہ چیزیں ناجائز طریقہ سے حاصل کریں اور ناجائز کاموں میں صرف کریں۔

**فائدہ:** ۵ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا: یعنی شیطان جو سبز باغ دکھاتا ہے اس سے فریب کھانا احمق کا کام ہے اس کے سب وعدے دغابازی اور فریب سے ہیں، چنانچہ وہ خود اقرار کرے گا: وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ﴿۶۵﴾

وہ جو میرے بندے ہیں ان پر نہیں تیری حکومت، اور تیرا رب کافی ہے کام بنانے والا

**خلاصہ تفسیر:** (اب پھر شیطان کو خطاب ہے) میرے خاص بندوں پر تیرا قابو نہ چلے گا، اور (اے محمد ﷺ اس کا مخلصین پر قابو کیونکر چلے کہ) آپ کا رب (ان کا) کارساز کافی ہے۔

وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا: روح المعانی میں ہے کہ اس میں دلالت ہے کہ حق تعالی کی حفاظت کے بغیر گمراہی کے مواقع سے انسان خود نہیں بچ سکتا جب تک اللہ کی توفیق شامل حال نہ ہو۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جو خدا پر اعتماد وتوکل کریں وہ ان کا کام بناتا ہے اور شیطان کے جال سے نکالتا ہے۔

رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۶۶﴾

تمہارا رب وہ ہے جو چلاتا ہے تمہارے واسطے کشتی دریا میں ۱ تاکہ تلاش کرو اس کا فضل ۲ وہی ہے تم پر مہربان

وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ

اور جب آتی ہے تم پر آفت دریا میں بھول جاتے ہو جن کو پکارا کرتے تھے اللہ کے سوائے، پھر جب بچا لایا تم کو خشکی میں پھر (ٹال) جاتے ہو

وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴿۶۷﴾

اور ہے انسان بڑا ناشکرا ۳

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے توحید کا اثبات اور شرک کا ابطال تھا، آگے ایک خاص طرز پر پھر اس کی طرف رجوع ہے، اور وہ خاص طرز توحید ثابت کرنے کے لیے اپنی نعمتوں کا بیان کرنا ہے جن سے توحید کے اثبات کے ساتھ ساتھ منعم یعنی اللہ کے حقوق ادا کرنے کی ترغیب بھی ہے، اور شرک کو باطل کرنے میں وہ خاص طرز ان کے اقرار کو ظاہر کرنا ہے کہ مصیبت کے وقت خدا کے سوا کسی سے نہیں مانگتے۔

تمہارا رب ایسا (منعم) ہے کہ تمہارے (نفع کے) لئے کشتی کو دریا میں لے چلتا ہے تاکہ تم اس کے ذریعہ رزق تلاش کرو (اس میں اشارہ ہے کہ بحری سفر تجارت کے لئے عموماً بڑے نفع کا سبب ہوتا ہے) بیشک وہ تمہارے حال پر بڑا مہربان ہے (کہ تمہارے نفع کے لیے ایسا سامان بنایا)۔

اور جب تم کو دریا میں کوئی تکلیف پہنچتی ہے (مثلاً دریا کی موج اور ہوا کے طوفان سے غرق ہونے کا خطرہ) تو بجز خدا کے اور جس جس کی تم عبادت کرتے تھے سب غائب ہو جاتے ہیں (کہ نہ تمہیں خود ہی اس وقت ان کا خیال آتا ہے نہ ان کو پکارتے ہو اور پکارو بھی تو ان سے کسی امداد کی ذرہ

برابر توقع نہیں، یہ خود عملی طور پر تمہاری طرف سے توحید کا اقرار اور شرک کا باطل ہونا لازم آتا ہے) پھر جب تم کو خشکی کی طرف بچا لاتا ہے تو تم پھر اس سے رخ پھیر لیتے ہو، اور (واقعی) انسان ہے بڑا ناشکر (کہ اتنی جلدی اللہ کے انعام اور اپنی الحاح وزاری کو بھول جاتا ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یہ خدا کی کارسازی کا ایک نمونہ پیش کیا ہے، جس میں ایک مشرک کو بھی اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اس کے سوا کوئی کارساز نہیں:

کہ ہیں عارضی زور کمزور سارے

**فائدہ:** ۲؎ یعنی روزی، روزی کو اکثر قرآن میں "فضل" فرمایا ہے، "فضل" کے معنی زیادہ کے ہیں، سو مسلمان کی بندگی ہے آخرت کے واسطے اور دنیا لبھاؤ میں ملتی ہے۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی مصیبت سے نکلتے ہی محسن حقیقی کو بھول جاتا ہے چند منٹ پہلے دریا کی موجوں میں خدا یاد آرہا تھا کنارہ پر قدم رکھا اور بے فکر ہو کر سب فراموش کر بیٹھا، اس سے بڑھ کر ناشکر گذاری کیا ہوگی۔

اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا

سو کیا تم بے ڈر (مطمئن) ہو گئے اس سے کہ دھنسا دے تم کو جنگل (خشکی) کے کنارے یا بھیج دے تم پر آندھی پتھر برسانے والی پھر نہ پاؤ

لَكُمْ وَكِيْلًا ﴿٦٨﴾ اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ

اپنا کوئی نگہبان (بچانے والا) ۱؎ یا بے ڈر ہو گئے ہو اس سے کہ پھر لے جائے تم کو دریا میں ۲؎ دوسری بار پھر بھیجے تم پر ایک سخت جھونکا ہوا کا

فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا ﴿٦٩﴾

پھر ڈبا دے تم کو بدلے میں اس ناشکری کے، پھر نہ پاؤ اپنی طرف سے ہم پر اس کا کوئی باز پرس (پیچھا) کرنے والا ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** (اور تم جو خشکی میں پہنچ کر اس سے اپنا رخ پھیر لیتے ہو) تو کیا تم اس بات سے بے فکر ہو گئے کہ خدا تعالیٰ پھر تم کو خشکی میں لا کر ہی زمین میں دھنسا دے (مطلب یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک دریا اور خشکی میں کوئی فرق نہیں، وہ جیسے دریا میں غرق کر سکتا ہے ایسا ہی خشکی میں بھی زمین میں دھنسا کر غرق کر سکتا ہے) یا تم پر کوئی ایسی سخت ہوا بھیج دے جو کنکر پتھر برسانے لگے (جیسا کہ قوم عاد ایسے ہی ہوا کے طوفان سے ہلاک کی گئی تھی) پھر تم کسی کو اپنا کارساز خدا کے سوا نہ پاؤ۔

یا تم اس سے بے فکر ہو گئے کہ خدا تعالیٰ پھر تم کو دریا ہی میں دوبارہ لے جائے، پھر تم پر ہوا کا طوفان بھیج دے، پھر تم کو تمہارے کفر کے سبب غرق کر دے (یعنی اگر خشکی میں غرق ہونا سمجھ میں نہ آئے تو اچھا یہ بھی تو احتمال ہے کہ تم کو ایسا کام نکلے کہ پھر سمندر کا سفر کرنا پڑے اور وہاں غرق کر دے) پھر اس بات پر (یعنی غرق کر دینے پر) کوئی ہمارا پیچھا کرنے والا بھی تم کو نہ ملے (جو ہم سے تمہارا بدلہ لے سکے)۔

یہاں شبہ ہو سکتا ہے کہ حق تعالیٰ نے انہیں ماضی کی حالت یاد دلائی اور اہل اللہ ماضی کی یاد کو "حجاب" کہتے ہیں، "حجاب" ان امور کو کہا جاتا ہے جو حق تعالیٰ کے وصل یعنی اس تک پہنچنے سے مانع بن جائیں، یعنی وہ امور جو تجلیات باری کے قبول سے مانع ہوں، جواب یہ ہے کہ اہل اللہ کا خطاب ان لوگوں کے لیے ہے جن کی غفلت زائل ہوگئی ہو اور وہ اللہ کی طرف لوٹ گئے ہوں، اور یہاں آیت میں خطاب اہل غفلت کو ہے، تاکہ ان کی سرکشی وغفلت دور ہو جائے، تو دونوں خطاب میں مشترک امر حق تعالیٰ کی طرف رجوع ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی سمندر کے کنارے خشکی پر دھنسا دے، مثلاً زلزلہ آجائے اور زمین شق ہو کر قارون کی طرح اس میں دھنس جاؤ۔ خلاصہ یہ

کہ ہلاک کرنا کچھ دریا کی موجوں پر موقوف نہیں۔

**فائدہ:** ۲ یعنی کوئی ضرورت کھڑی کردے جس کے لیے ناچار دریائی سفر کرنا پڑے۔

**فائدہ:** ۳ خدا سے کون باز پرس کرسکتا ہے یا کسی کی مجال ہے کہ پیچھا کر کے اس سے مجرمین کا خون بہا وصول کرے؟

| |
|---|
| وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ |
| اور ہم نے عزت دی ہے آدم کی اولاد کو اور سواری دی ان کو جنگل اور دریا میں اور روزی دی ہم نے ان کو ستھری چیزوں سے |
| وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝ |
| اور بڑھا دیا ان کو بہتوں سے جن کو پیدا کیا ہم نے بڑائی دے کر |

ع

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے بعض انعامات کے پیرایہ میں توحید کا ذکر تھا، آگے دوسرے انعامات کے ضمن میں توحید کا ذکر ہے۔

اور ہم نے اولاد آدم کو (مخصوص صفات دے کر) عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور دریا میں (جانوروں اور کشتیوں پر) سوار کیا اور پاکیزہ نفیس چیزیں ان کو عطا فرمائیں اور (ان امور میں) ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فوقیت دی (کیونکہ اور حیوانات ان صفات سے خالی ہیں، پس اس نعمت کی قدر کریں اور توحید و اطاعت بجا لائیں)۔

**وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ:** حق تعالیٰ نے بنی آدم کو مختلف حیثیتوں سے ایسی خصوصیات عطا فرمائی ہیں جو دوسری مخلوقات میں نہیں، مثلاً حسن صورت، جسم اور مزاج میں اعتدال، قد و قامت میں اعتدال جس میں سیدھا قد بھی داخل ہے، یہ چیزیں صرف انسان کو دی گئیں، کسی دوسرے حیوان میں نہیں، اس کے علاوہ عقل و شعور میں اس کو خاص امتیاز بخشا گیا ہے جس کے ذریعہ وہ تمام کائنات علویہ اور سفلیہ سے اپنے کام نکالتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے اس کی قدرت بخشی ہے کہ مخلوقات الٰہیہ سے ایسے مرکبات اور مصنوعات تیار کرے جو اس کے رہنے سہنے اور نقل و حرکت اور طعام و لباس میں اس کے مختلف کام آئیں۔

اور یہ نعمتیں سب کو عام ہیں، پس بنی آدم سے مراد سب بنی آدم ہیں، اور چونکہ ابتداء آیت: كَرَّمْنَا میں اجمال تھا جس سے شبہ ہوسکتا تھا کہ ان صفات میں یہ سب سے افضل ہے، حالانکہ فرشتوں سے افضل ہونے کے لیے یہ امور مدار نہیں ہوسکتے، اور جو صفات فرشتوں سے افضل ہونے کی مدار ہیں وہ سب بنی آدم میں نہیں پائی جاتیں، اس لیے پھر بعد میں: فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ میں اس شبہ کو دور کردیا کہ مراد عزت دینے سے بعض مخلوقات پر فضیلت دینا ہے، یعنی حیوانات اور جو اُن سے بھی کم رتبہ ہیں، پس اس آیت سے انسان کے فرشتوں سے افضل ہونے پر استدلال نہیں ہوسکتا، آیت اس مسئلہ سے ساکت ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی آدمی کو حسن صورت، نطق، تدبیر اور عقل و حواس عنایت فرمائے جن سے دنیاوی و اخروی مضار و منافع کو سمجھتا اور اچھے برے میں تفریق کرتا ہے، ہر طرف ترقی کی راہیں اس کے لیے کھلی ہیں دوسری مخلوقات کو قابو میں لا کر اپنے کام میں لگاتا ہے، خشکی میں جانوروں کی پیٹھ پر یا دوسری طرح طرح کی گاڑیوں میں سفر کرتا اور سمندروں کو کشتیوں اور جہازوں کے ذریعہ بے تکلف طے کرتا چلا جاتا ہے، قسم قسم کے عمدہ کھانے، کپڑے، مکانات اور دنیاوی آسائش و رہائش کے سامانوں سے منتفع ہوتا ہے، ان ہی آدمیوں کے سب سے پہلے باپ آدم علیہ السلام کو خدا تعالیٰ نے مسجود ملائکہ اور ان کے آخری پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کل مخلوقات کا سردار بنایا، غرض نوع انسانی کو حق تعالیٰ نے کئی حیثیت سے عزت اور بڑائی دے کر اپنی بہت بڑی مخلوق پر فضیلت دی، اوپر کے رکوع میں آدم کی نسبت شیطان کا هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ کہنا اور ملائکہ کا آدم کو سجدہ کرنا، پھر بنی آدم کو کشتی کے ذریعہ دریائی سفر طے کرانا مذکور تھا، اس آیت کا مضمون مضامین مذکورہ بالا سے صاف طور پر مربوط ہے۔

**تنبیہ:** مفسرین نے اس آیت کے تحت میں یہ بحث چھیڑ دی ہے کہ ملائکہ اور بشر میں کون افضل ہے کون مفضول؟ لیکن انصاف یہ ہے کہ آیت سے اس مسئلہ کا فیصلہ نہیں ہوتا، حنفیہ کی رائے یہ نقل کی ہے کہ ''رسل بشر''، ''رسل ملائکہ'' سے افضل ہیں اور رسل ملائکہ (باستثنائے رسل بشر کے) باقی تمام فرشتوں اور آدمیوں سے افضل ہیں، اور عام فرشتوں کو عام آدمیوں پر فضیلت حاصل ہے، واللہ اعلم۔

يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ ۖ فَمَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَأُولَٰئِكَ يَقْرَءُونَ كِتَابَهُمْ

جس دن ہم بلائیں گے ہر فرقہ کو ان کے سرداروں کے ساتھ سو جس کو ملا اسکا اعمالنامہ اسکے داہنے ہاتھ میں سو وہ لوگ پڑھیں گے اپنا لکھا لے

وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا ﴿٧١﴾ وَمَنْ كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلًا ﴿٧٢﴾

اور ظلم نہ ہوگا ان پر ایک تاگے کا ۲ے اور جو کوئی رہا اس جہان میں اندھا سو وہ پچھلے جہان میں بھی اندھا ہے اور بہت دور پڑا ہوا راہ سے ۳ے

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے قیامت کا مضمون تھا، آگے اس کے بعض واقعات کا ذکر ہے جس سے مخالفت پر وعید بھی معلوم ہو جائے گی۔

(اس دن کو یاد کرنا چاہئے) جس روز ہم تمام آدمیوں کو ان کے نامہ اعمال سمیت (میدان حشر میں) بلائیں گے (اور وہ نامہ اعمال اڑا دیئے جائیں گے، پھر کسی کے داہنے ہاتھ اور کسی کے بائیں ہاتھ میں آجائیں گے) پھر جس کا نامہ اعمال اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا (اور یہ اہل ایمان ہوں گے) تو ایسے لوگ اپنا نامہ اعمال (خوش ہو کر) پڑھیں گے اور ان کا ذرا نقصان نہ کیا جائے گا (یعنی ان کے ایمان اور اعمال کا ثواب پورا پورا ملے گا ذرا کم نہ ہوگا چاہے زیادہ ہو جائے، اور ان کو عذاب سے نجات بھی ملے گی خواہ شروع ہی میں یا گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد) اور جو شخص دنیا میں (راہ نجات دیکھنے سے) اندھا رہا تو وہ آخرت میں بھی (منزل نجات تک پہنچنے سے) اندھا رہے گا، اور (بلکہ وہاں دنیا سے بھی) زیادہ گم کردہ راہ ہوگا (کیونکہ دنیا میں تو گمراہی کا علاج ممکن تھا، وہاں یہ بھی نہ ہو سکے گا، یہ وہ لوگ ہوں گے جن کا نامہ اعمال ان کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا)۔

فَمَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ: قرآن کریم میں نامہ اعمال داہنے یا بائیں ہاتھ میں دیئے جانے کی کیفیت مذکور نہیں، لیکن بعض احادیث میں ''تطایر الکتب'' کا لفظ آیا ہے، اور بعض روایات حدیث میں ہے کہ سب نامہ اعمال عرش کے نیچے جمع ہوں گے، پھر ایک ہوا چلے گی جو سب کو اڑا کر لوگوں کے ہاتھ میں پہنچا دے گی کسی کے داہنے ہاتھ میں اور کسی کے بائیں ہاتھ میں۔

قرآن مجید کی متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بائیں ہاتھ میں نامہ اعمال صرف کفار کو دیا جائے گا، جیسا کہ ایک آیت میں ہے: إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ اور ایک دوسری آیت میں ہے: إِنَّهُ ظَنَّ أَنْ لَنْ يَحُورَ پہلی آیت میں صراحۃً ایمان کی نفی کی گئی ہے اور دوسری آیت میں انکار آخرت مذکور ہے وہ بھی کفر ہی ہے، اس کے مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ داہنے ہاتھ میں نامہ اعمال اہل ایمان کو دیا جائے گا خواہ وہ گناہ گار ہوں یا نیک، مومن اپنے نامہ اعمال کو خوشی کے ساتھ لے گا بلکہ دوسروں کو بھی پڑھوائے گا، یہ خوشی ایمان کی ہوگی جس کی وجہ سے ہمیشہ کے عذاب سے اس کو نجات لازم ہے اگرچہ بعض اعمال پر سزا بھی ہوگی۔

* * *

**فائدہ:** لے یہاں یہ بتلانا ہے کہ دنیا میں فطری حیثیت سے انسان کو جو عزت و فضیلت بخشی تھی اس نے کہاں تک قائم رکھی اور کتنے ہیں جنہوں نے انسانی عز و شرف کو خاک میں ملا دیا، خلاصہ یہ ہے کہ قیامت کے دن ہر فرقہ اس چیز کی معیت میں حاضر ہوگا جس کی پیروی اور اتباع کرتا تھا، مثلاً مومنین کے نبی، کتاب، دینی پیشوا، یا کفار کے مذہبی سردار، بڑے شیطان اور جھوٹے معبود، جنہیں فرمایا ہے وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ اور حدیث میں ہے: ''لتتبع کل امۃ ماکانت تعبد'' اس وقت تمام آدمیوں کے اعمالنامے ان کے پاس پہنچا دیے جائیں گے، کسی کا اعمالنامہ سامنے سے داہنے ہاتھ میں اور کسی کا پیچھے سے بائیں ہاتھ میں پہنچ جائے گا، گویا یہ ایک حسی علامت ان کے مقبول یا مردود ہونے کی سمجھی جائے گی، ''اصحاب یمین'' (داہنے ہاتھ میں اعمالنامہ پکڑنے والے) وہ ہوں گے جنہوں نے دنیا میں حق کو قبول کر کے اپنی فطری شرافت اور انسانی کرامت کو باقی رکھا، جس طرح

دنیا میں انہوں نے دیکھ بھال کر اور سوچ سمجھ کر کام کیے، آخرت میں ان کی وہ احتیاط کام آئی، اس دن وہ خوشی سے پھولے نہ سمائیں گے، بڑے سرور و انبساط سے اپنا اعمالنامہ پڑھیں گے اور دوسروں کو کہیں گے هَآؤُمُ اقۡرَءُوۡا كِتٰبِيَهۡ کہ آؤ میری کتاب پڑھ لو، باقی دوسرے لوگ یعنی ''اصحاب شمال'' ان کا کچھ حال اگلی آیت میں بیان فرمایا ہے (بعض نے لفظ ''امام'' سے خود اعمالنامہ مراد لیا ہے کیونکہ وہاں لوگ اس کے پیچھے چلیں گے)۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی کھجور کی گٹھلی کے درمیان جو ایک باریک دھاگا سا ہوتا ہے، اتنا ظلم بھی وہاں نہ ہوگا، ہر ایک کی محنت کا پورا بلکہ پورے سے زیادہ پھل ملے گا۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی یہاں ہدایت کی راہ سے اندھا رہا، ویسا ہی آخرت میں بہشت کی راہ سے اندھا ہے اور بہت دور پڑا ہے، (موضح القرآن) یہ ''اصحاب یمین'' کے بالمقابل ''اصحابِ شمال'' کا ذکر ہوا، بعض نے وَاَضَلُّ سَبِيۡلًا کا مطلب یہ لیا ہے کہ دنیا میں تو تلافیٔ مافات کا امکان تھا، آخرت میں اس سے بھی دور جا پڑا، کیونکہ اب تدارک وتلافی کا امکان ہی نہیں رہا۔

وَاِنۡ كَادُوۡا لَيَفۡتِنُوۡنَكَ عَنِ الَّذِىۡۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ لِتَفۡتَرِىَ عَلَيۡنَا غَيۡرَهٗ ‌ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوۡكَ

اور وہ لوگ چاہتے تھے کہ تجھ کو بچلا دیں اس چیز سے کہ جو وحی بھیجی ہم نے تیری طرف تاکہ جھوٹ بنا لائے تو ہم پر وحی کے سوا، اور تب تو بنا لیتے تجھ کو

خَلِيۡلًا ﴿۷۳﴾ وَلَوۡلَاۤ اَنۡ ثَبَّتۡنٰكَ لَقَدۡ كِدْتَّ تَرۡكَنُ اِلَيۡهِمۡ شَيۡـًٔا قَلِيۡلًا ﴿۷۴﴾ اِذًا لَّاَذَقۡنٰكَ ضِعۡفَ

دوست ۱؎ اور اگر یہ نہ ہوتا کہ ہم نے تجھ کو سنبھالے رکھا تو تو لگ جاتا جھکنے ان کی طرف تھوڑا سا ۲؎ تب تو ضرور چکھاتے ہم تجھ کو دونا مزہ

الۡحَيٰوةِ وَضِعۡفَ الۡمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيۡنَا نَصِيۡرًا ﴿۷۵﴾

زندگی میں، اور دونا مرنے میں، پھر نہ پاتا تو اپنے واسطے ہم پر مدد کرنے والا ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے بعض آیات میں کفار کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تکذیب واستہزا سے پیش آنا بیان ہوا، آگے آپ کے ساتھ دین و دنیا دونوں کے اعتبار سے ان کا عداوت کرنا بیان فرماتے ہیں، سو اس مضمون کا رسالت سے تعلق ہے، بلکہ آخر سورت تک زیادہ تر رسالت ہی کے متعلق مضمون چلا گیا ہے۔

اور یہ کافر لوگ (اپنی قوی تدبیروں کے ذریعہ) آپ کو اس چیز سے بچلانے (اور ہٹانے) ہی لگے تھے جو ہم نے آپ پر بذریعہ وحی بھیجی ہے (یعنی اس کوشش میں لگے تھے کہ آپ حکم خداوندی کے خلاف عمل کر دیں، ان کی یہ کوشش اس لیے تھی) تاکہ آپ اس (حکم وحی) کے سوا ہماری طرف (عملاً) غلط بات کی نسبت کر دیں (کیونکہ نبی کا کوئی عمل حکم خداوندی کے خلاف نہیں ہوتا تو نعوذ باللہ اگر آپ سے کوئی عمل خلاف شریعت ہو جاتا تو یہ لازم آتا کہ اس خلاف شرع عمل کو گویا اللہ کی طرف منسوب کر رہے ہیں اور یہ خدا پر افتراء ہوتا) اور ایسی حالت میں آپ کو خالص دوست بنا لیتے۔

اور (ان کی یہ تدبیر اور شرارت ایسی سخت تھی کہ) اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ بنایا ہوتا (یعنی معصوم نہ کیا ہوتا) تو آپ ان کی طرف کچھ کچھ جھکنے کے قریب جا پہنچتے (مگر خدا نے آپ کو بچایا کیونکہ نبوت کے لیے عصمت لازم ہے)۔

(اور) اگر ایسا ہو جاتا (کہ آپ کا کچھ میلان ان کی طرف ہوتا) تو ہم آپ کو (اس وجہ سے کہ مقربین کا مقام بہت بلند ہے) حالت حیات میں بھی اور بعد موت کے بھی دوہرا عذاب چکھاتے، پھر آپ ہمارے مقابلہ میں کوئی مددگار بھی نہ پاتے (مگر چونکہ آپ کو ہم نے معصوم اور ثابت قدم بنایا ہے، اس لئے ان کی طرف ذرا بھی میلان نہ ہوا، اور اس عذاب سے بچ گئے)۔

لَيَفۡتِنُوۡنَكَ عَنِ الَّذِىۡۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ: قصہ یہ ہوا کہ قریش مکہ کے چند سردار آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور

عرض کیا کہ اگر آپ واقعی ہماری طرف بھیجے گئے ہیں تو پھر اپنی مجلس سے ان غریب شکستہ حال لوگوں کو ہٹا دیجئے جن کے ساتھ بیٹھنا ہمارے لئے توہین ہے تو پھر ہم آپ کے اصحاب اور دوست ہوجائیں گے، اور قبیلہ بنی ثقیف نے آپ ﷺ سے درخواست کی کہ ہم کو اسلام لانے کے لیے ایک سال کی مہلت دیجیے، ذرا اس سال بتوں کے چڑھاوے کی آمدنی ہم وصول کرلیں، پہلا قصہ مکہ کا، دوسرا مدینہ کا ہے، اگر یہ آیتیں مکی ہیں تو پہلا قصہ مراد ہے، اور اگر مدنی ہیں تو دوسرے قصہ کی طرف اشارہ ہے، مطلب یہ کہ یہ لوگ اس کوشش میں تھے کہ آپ ہمارے حکم کے خلاف کریں کہ مسلمانوں کو ہٹادیں، یا اسلام لانے کے لیے ایک سال کی مہلت دیں اور یہ دونوں باتیں ہی خلاف شریعت ہیں۔

**لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا:** یعنی اگر ہماری طرف سے آپ کی تربیت اور ثابت قدم رکھنے کا اہتمام نہ ہوتا تو کچھ بعید نہیں تھا کہ آپ ان کی بات کی طرف میلان کے تھوڑے سے قریب ہوجاتے، اس آیت سے یہ بات واضح طور پر سمجھی جاتی ہے کہ کفار قریش کی لغویات کی طرف رسول کریم ﷺ کے میلان کا تو کوئی احتمال ہی نہ تھا، ہاں میلان کے قریب ہوجانے کا وہ بھی بہت قدر قلیل حد میں امکان تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے معصوم بنا کر اس سے بھی بچالیا، غور کیا جائے تو یہ آیت انبیاء علیہم السلام کی اعلیٰ ترین پاکیزہ خلقت وطبیعت پر بڑی دلیل ہے، کیونکہ اول تو کچھ کچھ میلان ایک خفیف وسوسہ کا درجہ ہے جو مذموم نہیں، پھر اس کے قریب ہونا یہ اور بھی ادنی درجہ ہے، مگر آپ سے یہ بھی صادر نہیں ہوا، یعنی اگر پیغمبرانہ عصمت بھی نہ ہوتی تب بھی نبی کی فطرت ایسی تھی کہ کفار کی لغوبات کی طرف میلان ہوجانا اس سے ممکن نہ تھا، ہاں میلان کے کچھ قریب بقدر قلیل کا احتمال تھا جو پیغمبرانہ عصمت نے ختم کردیا، یہ ارشاد بطور عتاب نہیں بلکہ آپ کی محبوبیت کا اظہار ہے کہ آپ ایسے محبوب ہیں کہ ہم نے ذرا سے میلان کے قریب ہونے سے بھی آپ کو بچایا۔

**وَلَوْلَاۤ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ:** اس سے پتہ چلتا ہے کہ انبیاء کی حفاظت کرنے والا بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے، اس کی مدد کے بغیر نبی کی قوت قدسیہ کافی نہیں تو دوسروں کو اپنے تقوی، تقدس اور نسبت باطنی پر ناز کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور ممکن ہے کہ خود وہ نسبت بھی موہومہ ہی ہو۔

* * *

**فائدہ: ۱ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خليلا:** یعنی بعض اندھے ایسے شریر ہیں کہ خود تو راہ پر کیا آتے بڑے بڑے سوانکھوں کو بچلانا چاہتے ہیں ، چنانچہ کفار مکہ کی اس بے حیائی اور جسارت کو دیکھئے کہ آپ پر ڈورے ڈالتے ہیں کہ خدا نے جو احکام دیے اور وحی بھیجی اس کا ایک حصہ ان کی خاطر سے آپ (معاذ اللہ) چھوڑ دیں یا بدل ڈالیں، کبھی حکومت، دولت اور حسین عورتوں کا لالچ دیتے ہیں، کبھی کہتے ہیں کہ ہم آپ کے تابع ہوجائیں گے، قرآن میں سے صرف وہ حصہ نکال دیجئے جو شرک و بت پرستی کے رد میں ہے، اگر آپ (العیاذ باللہ) بفرض محال ایسا کر گزرتے تو بیشک وہ آپ کو گاڑھا دوست بنالیتے، لیکن آپ کا جواب یہ تھا کہ خدا کی قسم اگر تم چاند اتار کر میری ایک مٹھی میں اور سورج اتار کر دوسری مٹھی میں رکھ دو تب بھی محمد ﷺ اس چیز کو چھوڑنے ، الا نہیں جس کے لیے خدا نے اسے کھڑا کیا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنا کام پورا کرے یا اس راستہ سے گزر جائے۔

دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید   پا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن برآید

**فائدہ: ۲ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا:** تَرْكَنُ ''رکون'' سے ہے جو ادنیٰ جھکاؤ، اور خفیف میلان قلب کو کہتے ہیں اس کے ساتھ **شَيْـًٔا قَلِيْلًا** بڑھایا گیا تو ادنیٰ سے ادنیٰ ترین مراد ہوگا، پھر **لَقَدْ كِدْتَّ** فرما کر اس کے وقوع کو اور بھی گھٹا دیا، یعنی اگر یہ بات نہ ہوتی کہ آپ معصوم پیغمبر ہیں جن کی عصمت کی سنبھال حق تعالیٰ اپنے فضل خصوصی سے کرتا ہے تو ان چالاک شریروں کی فریب بازیوں سے بہت ہی تھوڑا سا ادھر جھکنے کے قریب ہوجاتے مگر انبیاء کی عصمت کا تکفل ان کا پروردگار کرچکا ہے اس لیے اتنا خفیف جھکاؤ بھی نہ پایا گیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ میں تقویٰ کی فطری قوت کس قدر مضبوط اور ناقابل تزلزل تھی۔

**فائدہ: ۳ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا:** اس سے بھی حضور ﷺ کے فضل وشرف کا نہایت لطیف پیرایہ میں اظہار مقصود ہے، مقربین کے لیے جیسے انعامات بہت بڑے ہیں ''نزدیکاں را بیش بود حیرانی'' کے قاعدہ سے ان کی چھوٹی سے چھوٹی غلطی یا کوتاہی پر عتاب بھی کہیں زیادہ ہوتا ہے جیسے

ازواجِ مطہرات کوفرمایا: يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ تو بتلادیا کہ آپ کا مرتبہ معمولی نہیں، اگر بفرضِ محال ادنیٰ سے ادنیٰ غلطی ہوتو دنیا میں اور برزخ وآخرت میں دوگنا مزہ چکھنا پڑے، مومن کو چاہیے کہ ان آیات کوتلاوت کرتے وقت دو زانو بیٹھ کرانتہائی خوف وخشیت کے ساتھ حق تعالیٰ کی شان جلال و جبروت میں غور کرے اور وہ ہی کہے جو حضور ﷺ نے فرمایا: "اَللّٰهُمَّ لَا تَكِلْنِيْ اِلٰى نَفْسِيْ طَرْفَةَ عَيْنٍ" خداوندا! چشم زدن کے لیے بھی مجھ کو میرے نفس کے حوالہ نہ کیجیے یعنی ہمیشہ اپنی حفاظت وکفالت میں رکھیے (آمین)۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۷۶﴾

اور وہ تو چاہتے تھے کہ گھبرادیں تجھ کو اس زمین سے تاکہ نکال دیں تجھ کو یہاں سے اور اس وقت نہ ٹھہریں گے وہ بھی تیرے پیچھے مگر تھوڑا

سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ﴿۷۷﴾ ع ۸

دستور چلا آتا ہے ان رسولوں کا جو تجھ سے پہلے بھیجے ہم نے اپنے پیغمبر اور نہ پائے گا تو ہمارے دستور میں تفاوت

**خلاصہ تفسیر:** اور یہ (کافر) لوگ اس سرزمین (مکہ یا مدینہ) سے آپ کے قدم ہی اکھاڑنے لگے تھے (خواہ جبر سے یا دھوکہ سے) تاکہ آپ کو اس سے نکال دیں اور اگر ایسا ہوجاتا تو آپ کے (جانے کے) بعد یہ بھی بہت کم (یہاں) ٹھہرنے پاتے، جیسا ان انبیاء (علیہم السلام) کے بارے میں (ہمارا) قاعدہ رہا ہے جن کو آپ سے پہلے رسول بنا کر بھیجا تھا (کہ جب ان کی قوم نے ان کو وطن سے نکالا تو پھر اس قوم کو بھی وہاں رہنا نصیب نہیں ہوا) اور آپ ہمارے قاعدے میں تغیر (تبدل) نہ پائیں گے۔

**لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا:** اہل مکہ نے مشورہ کیا تھا کہ آپ کو مکہ سے جبرا نکال دینا چاہیے، یہ تو مکہ کا قصہ ہے، اور مدینہ میں پہنچنے کے بعد یہودیوں نے براہ شرارت آپ سے عرض کیا کہ اگر آپ نبی ہیں تو ملک شام میں جا کر رہیے جو اکثر انبیاء کا مسکن رہا ہے، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں، پس یہ آیت اگر مکی ہے تو پہلا قصہ مراد ہے، اور اگر مدنی ہے تو دوسرے قصہ کی طرف اشارہ ہے، اس میں کفار کو تنبیہ فرمائی کہ اگر وہ رسول ﷺ کو نکال دیں گے تو پھر خود بھی دیر تک چین سے نہ بیٹھ سکیں گے۔

**وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا:** اس پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ آپ مکہ سے تو نکل گئے پھر آپ کے بعد وہاں کفار کیسے رہے؟ اس کے دو جواب ہیں: ایک یہ کہ مکہ سے آپ کا اخراج نہیں ہوا، بلکہ آپ اللہ کے حکم سے خود ہی تشریف لے گئے، جبکہ یہاں وعید نکالنے کی صورت پر تھی، دوسرے یہ کہ بدر میں بڑے بڑے کفار مکہ مارے گئے جو آپ کو نکالنے کی کوشش میں تھے اور وہ بجائے کل ساکنان مکہ کے تھے اور مدینہ سے تو آپ کا نکلنا ہوا ہی نہیں اس لیے یہود کے وہاں رہنے پر کوئی اشکال نہیں، اگرچہ بعد میں مستقل حکم سے وہ لوگ بھی وہاں سے نکال دیے گئے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی چاہتے ہیں کہ تجھے تنگ کر کے اور گھبرا کر مکہ سے نکال دیں، لیکن یاد رکھیں کہ ایسا کیا تو وہ خود زیادہ دنوں تک یہاں نہ رہ سکیں گے چنانچہ اسی طرح واقع ہوا، ان کے ظلم وستم حضور ﷺ کی ہجرت کا سبب بنے، آپ ﷺ کا مکہ سے تشریف لے جانا تھا کہ تقریباً ڈیڑھ سال بعد مکہ کے بڑے بڑے نامور سردار گھروں سے نکل کر میدان بدر میں نہایت ذلت کے ساتھ ہلاک ہوئے، اور اس کے پانچ چھ سال بعد مکہ پر اسلام کا قبضہ ہوگیا، کفار کی حکومت وشوکت تباہ ہوگئی اور بالآخر بہت قلیل مدت گزرنے پر مکہ بلکہ پورے جزیرۃ العرب میں پیغمبر ﷺ کا ایک مخالف بھی باقی نہ رہا۔

**فائدہ:** یعنی ہمارا یہی دستور رہا ہے کہ جب کسی بستی میں پیغمبر خدا کو نہ رہنے دیا تو بستی والے خود نہ رہے۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴿۷۸﴾

قائم رکھ نماز کو ۱ سورج ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک ۲ اور قرآن پڑھنا فجر کا ۳ بیشک قرآن پڑھنا فجر کا ہوتا ہے روبرو ۴

**خلاصہ تفسیر**: پیچھے کفار کی مخالفت اور دشمنی کا ذکر تھا جو آپ کے لیے بوجھ کا سبب ہوسکتا تھا، آگے عبادت میں مشغول ہونے اور سب معاملات خدا کے حوالہ کرنے کا حکم ہے تا کہ ان میں مشغول ہونے سے وہ غم نہ ہو، ساتھ میں بعض اخروی بشارتوں کا صراحۃً اور بعض دنیوی بشارتوں کا اشارتاً ذکر ہے۔

آفتاب ڈھلنے کے بعد سے رات کے اندھیرے ہونے تک نمازیں ادا کیجئے (اس میں ظہر عصر مغرب عشاء چار نمازیں آ گئیں، جیسا کہ حدیث سے اس اجمال کی تفصیل ہوگئی ہے) اور صبح کی نماز بھی (ادا کریں) بیشک صبح کی نماز (فرشتوں کے) حاضر ہونے کا وقت ہے۔

**اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا**: صبح کا وقت چونکہ نیند سے بیدار ہونے کا وقت ہے جس میں سستی کا خطرہ تھا اس لئے اس کو الگ کر کے اہتمام کے ساتھ بیان فرمایا اور اس کی ایک مزید فضیلت بھی یہ بیان کر دی کہ اس وقت میں فرشتے جمع ہوتے ہیں، اس کی تفصیل حدیث سے یہ معلوم ہوئی کہ انسان کی حفاظت اور اس کے اعمال کو لکھنے والے فرشتے دن کے الگ اور رات کے الگ ہیں، صبح کی نماز میں دونوں جماعتیں فرشتوں کی جمع ہوتی ہیں، رات کے فرشتے اپنا کام ختم کر کے اور دن کے فرشتے اپنا کام سنبھالنے کے لئے مجتمع ہو جاتے ہیں، اسی طرح شام کو عصر کی نماز میں دونوں جماعتیں جمع ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ فرشتوں کا اجتماع باعث برکات ہے۔

* * *

**فائدہ**: ۱ **اَقِمِ الصَّلٰوةَ**: یعنی ان کی منصوبہ بازیوں کی کچھ فکر نہ کیجئے، آپ اپنے مالک کی طرف متوجہ رہیں اور نمازوں کو ٹھیک قائم رکھیں، تعلق مع اللہ وہ چیز ہے جو انسان کو تمام مشکلات ونوائب پر غالب کر دیتی ہے: **وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ**

**فائدہ**: ۲ **لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ**: اس میں چار نمازیں آ گئیں ظہر، عصر، مغرب، عشاء، جمع بین الصلوٰتین کے مسئلہ سے اس کا کچھ تعلق نہیں، اور اگر جمع کا اشارہ نکالا جائے تو دو نہیں چار نمازوں کے جمع کرنے کی مشروعیت اس سے نکلے گی، ہاں بشرط ذوق صحیح یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ ظہر میں تعجیل اور عشاء میں تاخیر مستحب ہونی چاہیے الاّ لعارض۔

**فائدہ**: ۳ **قُرْاٰنَ الْفَجْرِ**: یعنی نماز فجر میں شاید "قرآن الفجر" سے تعبیر کرنے میں یہ اشارہ ہو کہ تطویل قرأت فجر میں مطلوب ہے۔

**فائدہ**: ۴ **اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا**: حدیث میں ہے کہ فجر وعصر کے وقت دن اور رات کے فرشتوں کی بدلی ہوتی ہے، لہٰذا ان دو وقتوں میں لیل ونہار کے فرشتوں کا اجتماع ہوتا ہے تو ہماری قرأت اور نماز ان کے روبرو ہوئی جو مزید برکت وسکینہ کا موجب ہے، اور اس وقت اوپر جانے والے فرشتے خدا کے ہاں شہادت دیں گے کہ جب گئے تب بھی ہم نے تیرے بندوں کو نماز پڑھتے دیکھا اور جب آئے تب بھی، اس کے علاوہ صبح کے وقت یوں بھی آدمی کا دل حاضر اور مجتمع ہوتا ہے۔

**وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿٧٩﴾**

اور کچھ رات جاگتا رہ قرآن کیساتھ (اسمیں) یہ زیادتی (بڑھوتری) ہے تیرے لیے ۱ قریب ہے کہ کھڑا کر دے تجھ کو تیرا رب مقام محمود (تعریف کے مقام) میں ۲

**خلاصہ تفسیر**: اور کسی قدر رات کے حصے میں بھی (نماز ادا کریں) یعنی اس میں نماز تہجد پڑھا کریں جو کہ آپ کے لئے (پانچ نمازوں کے علاوہ) ایک زائد چیز ہے (اس "زائد" سے مراد بعض کے نزدیک ایک زائد فرض ہے جو خاص رسول کریم ﷺ پر فرض کیا گیا اور بعض نے زائد سے نفل مراد لی ہے) امید (یعنی وعدہ) ہے کہ آپ کا رب آپ کو مقام محمود میں جگہ دے گا ("مقام محمود" سے مراد شفاعت کبری کا مقام ہے جو محشر میں تمام بنی آدم کے لئے رسول اللہ ﷺ کو عطا ہوگا، یہ تو عبادت کا حکم اور اخروی بشارت کا وعدہ ہوا)۔

**فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ**: لفظ "نفل" اور "نافلہ" کے لغوی معنی "زائد" کے ہیں، اسی لئے اس نماز اور صدقہ خیرات وغیرہ کو نفل کہتے ہیں جو شرعاً واجب اور ضروری نہ ہو، جس کے کرنے میں ثواب ہے اور نہ کرنے میں نہ کوئی گناہ ہے اور نہ کسی قسم کی برائی، اس آیت میں نماز تہجد کے ساتھ **نَافِلَةً لَّكَ**

کے الفاظ سے ظاہرا یہ سمجھا جاتا ہے کہ نماز تہجد خصوصیت کے ساتھ آنحضرت محمد ﷺ کے لئے نفل ہے، حالانکہ اس کے نفل ہونے میں آنحضرت محمد ﷺ اور پوری امت سب ہی شریک ہیں، اسی لئے بعض حضرات مفسرین نے اس جگہ ''نافلہ'' کو ''فریضہ'' کی صفت قرار دے کر معنی یہ قرار دیئے ہیں کہ عام امت پر تو صرف پانچ وقت کی نماز فرض ہے مگر رسول کریم ﷺ پر تہجد بھی ایک زائد فرض ہے تو یہاں لفظ ''نافلہ'' بمعنی ''فرض زائد'' کے ہے نفل کے عام معنی میں نہیں، صحیح تحقیق اس معاملہ کی یہ ہے کہ ابتداء اسلام میں جب سورۃ مزمل نازل ہوئی تو اس وقت پانچ نمازیں فرض نہ ہوئی تھیں، صرف تہجد کی نماز سب پر فرض تھی، اسی فرض کا ذکر سورۃ مزمل میں ہے، پھر شب معراج میں پانچ نمازیں فرض کردی گئیں تو تہجد کی فرضیت عام امت سے تو باتفاق منسوخ ہوگئی اور اس میں اختلاف رہا کہ آنحضرت محمد ﷺ سے بھی فرضیت منسوخ ہوئی یا یہ خصوصی طور پر آپ کے ذمہ فرض رہا؟ روایات کا حاصل یہی ہے کہ عام امت اور خود رسول کریم ﷺ پر پانچ نمازوں کے سوا کوئی اور نماز فرض نہیں ہے، ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نَافِلَةً لَّكَ کا لفظ اگر اس جگہ فریضہ زائد کے معنی میں ہوتا تو اس کے بعد لفظ لَّكَ کے بجائے عَلَيك ہونا چاہئے تھا جو وجوب پر دلالت کرتا ہے، لفظ لَّكَ تو صرف جواز اور اجازت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

اسی طرح جب تہجد کی فرضیت امت سے منسوخ ہوئی تو رسول کریم ﷺ سے بھی منسوخ ہوگئی اور سب کے لئے نفل رہ گیا، مگر اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس میں آنحضرت محمد ﷺ کی خصوصیت کیا ہے؟ نفل ہونا تو سب ہی کے لئے ثابت ہے، پھر نَافِلَةً لَّكَ فرمانے کا کیا حاصل ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ حسب تصریح احادیث تمام امت کی نوافل اور تمام نفلی عبادات ان کے گناہوں کا کفارہ اور فرض نمازوں میں جو کوتاہی کمی رہ جائے اس کی تکمیل کا کام دیتی ہیں مگر رسول کریم ﷺ گناہوں سے بھی معصوم ہیں اور نماز کے آداب میں کوتاہی سے بھی، اس لئے آپ کے حق میں نفلی عبادت بالکل زائد ہی ہے جو کسی کوتاہی کا تدارک نہیں، بلکہ محض زیادت تقرب کا ذریعہ ہے۔

**مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا:** ''مقام محمود'' شفاعت کبری کا مقام ہے اور شفاعت کبری وہ ہے جس میں تمام مخلوق کے حساب وکتاب شروع ہونے کی شفاعت ہوگی، صحاح میں مقام محمود کی یہی تفسیر آئی ہے، اور بعض روایات میں جو اس کی تفسیر میں "شفاعة لأمّتي" آیا ہے کہ مقام محمود میری امت کی شفاعت ہے تو اس سے امت کے سوا کی نفی مقصود نہیں ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں یعنی نیند سے جاگ کر (تہجد میں) قرآن پڑھا کر، یہ حکم سب سے زیادہ تجھ پر کیا ہے کہ تجھ کو مرتبہ (سب سے) بڑا دینا ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ ''مقام محمود'' شفاعت عظمیٰ کا مقام ہے، جب کوئی پیغمبر نہ بول سکے گا تب آنحضرت ﷺ اللہ تعالیٰ سے عرض کر کے خلقت کو تکلیف سے چھڑائیں گے، اس وقت ہر شخص کی زبان پر آپ کی حمد (تعریف) ہوگی اور حق تعالیٰ بھی آپ کی تعریف کرے گا، گویا شان محمدیت کا پورا پورا ظہور اس وقت ہوگا۔

**تنبیہ:** ''مقام محمود'' کی یہ تفسیر صحیح حدیثوں میں آئی ہے اور بخاری ومسلم اور دیگر کتب حدیث میں شفاعت کبریٰ کا نہایت مفصل بیان موجود ہے، شارحین نے حضور ﷺ کے لیے دس قسم کی شفاعتیں ثابت کی ہیں، فتح الباری میں ملاحظہ کرلیا جائے۔

وَقُلۡ رَّبِّ اَدۡخِلۡنِیۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّاَخۡرِجۡنِیۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ وَّاجۡعَلۡ لِّیۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ سُلۡطٰنًا نَّصِيۡرًا ﴿۸۰﴾

اور کہہ اے رب! داخل کر مجھ کو سچا داخل کرنا اور نکال مجھ کو سچا نکالنا ۱؎ اور عطا کر دے مجھ کو اپنے پاس سے حکومت کی مدد ۲؎

وَقُلۡ جَآءَ الۡحَـقُّ وَزَهَقَ الۡبَاطِلُ ؕ اِنَّ الۡبَاطِلَ كَانَ زَهُوۡقًا ﴿۸۱﴾

اور کہہ آیا سچ اور نکل بھاگا جھوٹ، بیشک جھوٹ ہے نکل بھاگنے والا ۳؎

**خلاصہ تفسیر**: اور (اب تفویض کا حکم ہے کہ اپنے سب کام خدا کے حوالہ کرو) آپ یہ دعا کیجیے کہ اے میرے رب! (مکہ سے جانے کے بعد) مجھ کو (جہاں لے جانا ہو) خوبی (یعنی راحت) کے ساتھ پہنچانا اور (جب مکہ سے لے جانا ہو تو) مجھ کو خوبی (یعنی راحت) کے ساتھ لے جانا اور مجھ کو اپنے پاس سے (ان کفار پر) ایسا غلبہ دے جس کے ساتھ (آپ کی) نصرت (اور مدد) ہو (جس سے وہ غلبہ بڑھتا ہی جائے، ورنہ عارضی غلبہ تو کبھی کفار کو بھی ہو جاتا ہے مگر اس کے ساتھ اللہ کی نصرت نہیں ہوتی اس لئے پائدار نہیں ہوتا، اس میں تفویض کا حکم ہو گیا) اور (پیچھے آیت: عسٰی ان یبعثك ربك میں اخروی بشارت کا وعدہ تھا، اب دنیوی بشارتوں کا وعدہ اشارتاً فرماتے ہیں کہ ان دعاؤں کے قبول ہونے کی خبر دینے کے طور پر یہ بھی) کہہ دیجئے کہ (بس اب دین) حق (غالب ہونے کو) آیا، اور باطل گیا گذرا ہوا، واقعی باطل چیز تو یوں ہی آتی جاتی رہتی ہے (یعنی آپ ان مضامین میں نظر کیجیے اور مغموم نہ ہوں)۔

**رَّبِّ اَدۡخِلۡنِیۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ**: اسی طرح حالات کی تبدیلی میں ہر وقت اس دعا کی ضرورت و حاجت ہے، کیونکہ کسی کو کچھ خبر نہیں کہ کون سی حالت اس کے لیے نفع بخش ہے اور کونسی حالت نقصان دہ ہے، اسی لیے بعض علماء نے فرمایا کہ یہ دعا ہر مسلمان کو اپنے تمام مقاصد کے شروع میں یاد رکھنی چاہیے اور ہر مقصد کے لیے یہ دعا مفید ہے۔

**وَقُلۡ جَآءَ الۡحَقُّ**: اس میں مکہ فتح ہونے کی طرف اشارہ ہے، حدیث شیخین میں آیا ہے کہ آپ فتح مکہ میں یہ آیت پڑھ کر بتوں کو گرا رہے تھے، چنانچہ ہجرت کے بعد مکہ فتح ہوا تو یہ سب وعدے پورے ہو گئے۔

**اِنَّ الۡبَاطِلَ كَانَ زَهُوۡقًا**: باطل کو جو مٹنے والا فرمایا مراد اس سے عام ہے کہ باطل ابھی جاتا رہے یا پھر کسی وقت، یا یہ کہ وہ فی نفسہ مٹنے والی چیز ہے، چنانچہ باطل کو اگر چہ کسی وقت دولت و شوکت حاصل ہو جائے تو وہ چند روزہ ہے، جیسے خس و خاشاک بظاہر اگر چہ پانی کے اوپر نظر آئے تو اس کا اعتبار نہیں وہ عارضی ہے، سو باطل کا کچھ عرصہ رہ جانا موجب شبہ نہیں ہے۔

اس آخری جملہ کا بطور علت بیان ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آیت ہر حق اور باطل کو عام ہے، اس میں باطنی نور و ظلمت بھی داخل ہو گئے اور اللہ کی محبت اور مخلوق کی محبت بھی آ گئی۔

* * *

**فائدہ**: ۱؎ یعنی جہاں مجھے پہنچانا ہے (مثلاً مدینہ میں) نہایت آبرو اور خوبی و خوش اسلوبی سے پہنچا کہ حق کا بول بالا رہے اور جہاں سے نکالنا یعنی علیحدہ کرنا ہو (مثلاً مکہ سے) تو وہ بھی آبرو اور خوبی و خوش اسلوبی سے ہو کہ دشمن ذلیل و خوار اور دوست شاداں و فرحاں ہوں اور بہرصورت سچائی کی فتح اور جھوٹ کا سر نیچا ہو۔

**فائدہ**: ۲؎ یعنی غلبہ اور تسلط عنایت فرما جس کے ساتھ تیری مدد و نصرت ہو تا کہ حق کا بول بالا رہے اور معاندین ذلیل و پست ہوں، دنیا میں کوئی قانون ہو سماوی یا ارضی اس کے نفاذ کے لیے ایک درجہ میں ضروری ہے کہ حکومت کی مدد ہو، جو لوگ دلائل و براہین سننے اور آفتاب کی طرح حق واضح ہو چکنے کے بعد بھی ضد و عناد پر قائم رہیں ان کے ضرر و فساد کو حکومت کی مدد ہی روک سکتی ہے، اسی لیے سورہ حدید میں فرمایا: لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَيِّنٰتِ وَاَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡمِيۡزَانَ لِيَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ۚ وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِيۡدَ فِيۡهِ بَاۡسٌ شَدِيۡدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

**فائدہ**: ۳؎ یہ عظیم الشان پیشگوئی مکہ میں کی گئی جہاں بظاہر کوئی سامان غلبہ حق کا نہ تھا، یعنی کہہ دو قرآن کریم مومنین کو بشارتیں سناتا ہوا اور باطل کو کچلتا ہوا آ پہنچا، بس سمجھ لو کہ اب دین حق غالب ہوا اور کفر بھاگا، نہ صرف مکہ سے بلکہ سارے عرب سے، حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ جب مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے اس وقت کعبہ کے گرد تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے، آپ ایک چھڑی سے سب پر ضرب لگاتے اور فرماتے تھے: جَآءَ الۡحَقُّ وَزَهَقَ الۡبَاطِلُ ؕ اِنَّ الۡبَاطِلَ كَانَ زَهُوۡقًا. جَآءَ الۡحَقُّ وَمَا يُبۡدِئُ الۡبَاطِلُ وَمَا يُعِيۡدُ ہر ایک اوندھے منہ گر جاتا تھا، اس طرح قرآن کی ایک پیشگوئی پوری ہوئی اور دوسری کا اعلان کیا گیا کہ جو کفر کعبہ سے نکل بھاگا ہے آئندہ کبھی واپس نہ آئے گا، والحمد للہ علیٰ ذلک۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾

اور ہم اتارتے ہیں قرآن میں سے جس سے روگ دفع ہوں اور رحمت ایمان والوں کے واسطے، اور گناہ گاروں کو تو اس سے نقصان ہی بڑھتا ہے

**خلاصہ تفسیر:** اب مزید تسلی کے لیے نبوت کے استدلال کے ساتھ کفار کی بداستعدادی بیان کی جاتی ہے، تا کہ ان کے ایمان سے مایوسی غم کے کم ہونے کا سبب ہوجائے۔

اور (مزید تسلی کے لیے یوں سمجھیے کہ) ہم ایسی چیز یعنی قرآن نازل کرتے ہیں کہ وہ ایمان والوں کے حق میں تو شفا اور رحمت ہے (کیونکہ وہ اس کو مانتے اور اس پر عمل کرتے ہیں جس سے ان پر رحمت ہوتی اور باطل عقائد وفاسد خیالات سے شفا ہوتی ہے) اور ظالموں کو اس سے اور الٹا نقصان بڑھتا ہے (کہ جب وہ اس کو نہیں مانتے تو اللہ تعالیٰ کے قہر وعذاب کے مستحق ہوجاتے ہیں، جبکہ ان کی یہ حالت ہے تو پھر ان سے قبول کرنے کی امید اور مخالفت پر غم کرنا بے فائدہ ہے)۔

**مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ:** روح المعانی میں ہے کہ لفظ ''شفاء'' سے تخلیہ کی طرف اور لفظ ''رحمت'' سے تحلیہ کی طرف اشارہ ہے۔

تخلیہ: باطل عقائد اور برے اعمال و برے اخلاق سے نجات کا نام ہے، جسے آیت میں ''شفاء'' کہا گیا ہے۔

تحلیہ: اچھے اعمال اور تقوی وطہارت کا نام ہے، جسے آیت میں ''رحمت'' کہا گیا ہے۔

قرآن کریم انسانوں کو باطل عقائد اور برے اخلاق سے بچا کر اچھے عقائد اور نیک اعمال و نیک اخلاق کی تعلیم دیتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جس طرح حق کے آنے سے باطل بھاگ جاتا ہے، قرآن کی آیات سے جو بتدریج اترتی رہتی ہیں روحانی بیماریاں دور ہوتی ہیں، دلوں سے عقائد باطلہ، اخلاق ذمیمہ اور شکوک وشبہات کے روگ مٹ کر صحت باطنی حاصل ہوتی ہے، بلکہ بسا اوقات اس کی مبارک تاثیر سے بدنی صحت بھی حاصل کی جاتی ہے جیسا کہ ''روح المعانی'' اور ''زاد المعاد'' وغیرہ میں اس کا فلسفہ اور تجربہ بیان کیا گیا ہے، بہرحال جو لوگ ایمان لائیں یعنی اس نسخہ شفا کو استعمال کریں گے، تمام قلبی وروحانی امراض سے نجات پا کر خدا تعالیٰ کی رحمت خصوصی اور ظاہری و باطنی نعمتوں سے سرفراز ہوں گے، ہاں جو مریض اپنی جان کا دشمن طبیب اور علاج سے دشمنی ہی کی ٹھان لے تو ظاہر ہے کہ جس قدر علاج ودوا سے نفرت کر کے دور بھاگے گا اسی قدر نقصان اٹھائے گا، کیونکہ مرض امتداد زمانہ سے مہلک ہوتا جائے گا جو آخر جان لے کر چھوڑے گا، تو یہ آفت قرآن کی طرف سے نہیں، خود مریض ظالم کی طرف سے آئی کما قال تعالیٰ: وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَئُوْسًا ﴿۸۳﴾

اور جب ہم آرام بھیجیں انسان پر تو ٹال جائے اور بچائے اپنا پہلو، اور جب پہنچے اس کو برائی تو رہ جائے مایوس ہوکر (آس توڑ کر)

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے کفار کی مخالفت اور قرآن سے فائدہ نہ اٹھانے کا بیان اور مؤمنین کا قرآن سے فائدہ اٹھانے کا ذکر تھا، اب کفار کی اس مخالفت اور قبول نہ کرنے کا سبب بیان کرتے ہیں کہ اس کا سبب تکبر، سنگ دلی اور حق تعالی سے بے تعلقی ہے۔

اور (بعض) آدمی (یعنی کافر ایسا ہوتا ہے کہ اس) کو جب ہم نعمت عطاء کرتے ہیں تو (ہم سے اور ہمارے احکام سے) منہ موڑ لیتا ہے، اور کروٹ پھیر لیتا ہے، اور جب اس کو کوئی تکلیف پہونچتی ہے تو (بالکل رحمت سے) ناامید ہوجاتا ہے (اور یہ دونوں حالتیں اللہ تعالیٰ سے بے تعلقی کی دلیل ہیں اور یہی بے تعلقی ہر کفر وگمراہی کا بنیادی سبب ہے اسی سے کفر وغیرہ پیدا ہوتا ہے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی انسان کا عجیب حال ہے خدا تعالیٰ اپنے فضل سے نعمتیں دیتا ہے تو احسان نہیں مانتا، جتنا عیش وآرام ملے اسی قدر منعم حقیقی کی

طرف سے اس کی غفلت واعراض بڑھتا ہے اور فرائض بندگی سے پہلو بچا کر کھسکنا چاہتا ہے، پھر جب سخت اور برا وقت آیا تو ایک دم آس توڑ کر اور ناامید ہو کر بیٹھ رہتا ہے، گویا دونوں حالتوں میں خدا سے بے تعلق رہا، کبھی غفلت کی بناء پر، کبھی مایوسی کی (نعوذ باللہ من کلا الحالین)، یہ مضمون غالباً اس لیے بیان فرمایا کہ قرآن جو سب سے بڑی نعمت الٰہی ہے، بہت لوگ اس کی قدر نہیں پہچانتے بلکہ اس کے ماننے سے اعراض و پہلوتہی کرتے ہیں، پھر جب اس کفران نعمت اور اعراض وانکار کا برا نتیجہ سامنے آئے گا اس وقت قطعاً مایوسی ہوگی کسی طرف امید کی جھلک نظر نہ پڑے گی۔

قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ﴿۸۴﴾ ع

تو کہہ ہر ایک (کوئی) کام کرتا ہے اپنے ڈھنگ پر، سو تیرا رب خوب جانتا ہے کس نے خوب پالیا ہے راستہ

**خلاصہ تفسیر:** اب عموم کے ساتھ کفار اور مؤمنین دونوں کے اعمال واقوال کے فرق کی علت اور جزا اجمالا بیان کرتے ہیں۔
آپ فرمادیجئے کہ (مومنین اور کفار، اچھے اور بروں میں سے) ہر شخص اپنے طریقہ پر کام کر رہا ہے (یعنی اپنی اپنی عقل صحیح یا جہل قبیح کی بنیاد پر مختلف طرح کے کام کر رہے ہیں) تو آپ کا رب خوب جانتا ہے اس کو جو زیادہ ٹھیک اور درست راستہ پر ہو (اسی طرح جو ٹھیک راستہ پر نہ ہوا سے بھی جانتا ہے، اور ہر ایک کو اس کے عمل کے موافق جزاء یا سزا دے گا، یہ نہیں کہ جس کا دل چاہے بلا کسی دلیل کے اپنے کو ٹھیک راستہ پر سمجھنے لگے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی ہر ایک کافر و مومن اور معرض و مقبل اپنے اپنے طریقے، نیت، طبیعت اور مذہب پر چلتا اور اسی میں مگن رہتا ہے، لیکن یاد رہے کہ خدا کے علم محیط سے کسی شخص کا کوئی عمل باہر نہیں ہو سکتا وہ ہر ایک کے طریق عمل اور حرکات وسکنات کو برابر دیکھ رہا ہے اور بخوبی جانتا ہے کہ کون کتنا سیدھا چلتا ہے اور کس میں کس قدر کجروی اور کجراہی ہے ہر ایک کے ساتھ اسی کے موافق برتاؤ کرے گا۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۵﴾

اور تجھ سے پوچھتے ہیں روح کو، کہہ دے روح ہے میرے رب کے حکم سے اور تم کو علم دیا ہے تھوڑا سا (خبر دی ہے تھوڑی سی) ۳ﻉ

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے سے چند آیات میں رسالت کی بحث سے متعلق رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کفار کا معاملہ بیان ہوتا چلا آرہا ہے، آگے بھی رسالت کے امتحان کے لیے جو کفار نے آپ سے سوال کیا تھا اس کا جواب ہے، صحیحین میں ہے کہ یہود نے آپ سے بطور امتحان روح کا سوال کیا، اور ترمذی وغیرہ میں ہے کہ یہود سے مشورہ کر کے قریش نے یہ سوال پیش کیا تھا۔

اور یہ لوگ آپ سے (امتحاناً) روح (کی حقیقت) کو پوچھتے ہیں، آپ (جواب میں) فرمادیجئے کہ روح (کے متعلق بس اتنا اجمالاً سمجھ لو کہ وہ ایک چیز ہے جو) میرے رب کے حکم سے بنی ہے اور (باقی اس کی تفصیلی حقیقت سو) تم کو بہت تھوڑا علم (تمہاری فہم اور ضرورت کے بقدر) دیا گیا ہے (اور روح کی حقیقت کا معلوم کرنا کوئی ضرورت کی چیز نہیں اور نہ اس کی حقیقت عام طور پر سمجھ میں آسکتی ہے اس لئے قرآن اس کی حقیقت کو بیان نہیں کرتا)۔

**وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ:** بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُسی روح کے متعلق سوال تھا جس سے انسان زندہ ہے، کیونکہ جب مطلق روح بولتے ہیں تو یہی مفہوم ہوتی ہے، اور جواب سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ نصوص میں اس کی حقیقت ظاہر نہیں کی گئی، البتہ اس کے حادث ہونے کا ضروری عقیدہ ظاہر کر دیا گیا ہے، قرآن کریم نے اس سوال کا جواب مخاطب کی ضرورت اور فہم کے مطابق دے دیا، حقیقت روح کو بیان نہیں فرمایا، اب یہ امر کہ کسی دوسرے طریقہ سے روح کی حقیقت کا انکشاف ہو سکتا ہے یا ہوتا ہے؟ تو یہ آیت اس کے اثبات ونفی دونوں سے ساکت ہے، پس دونوں باتوں کا احتمال ہے ان میں سے کوئی بھی صورت نص کے مخالف نہیں، قرآن کے اس جواب میں دلالت ہے کہ غیر ضروری اسرار کی طلب وجستجو مذموم ہے۔

**وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا:** یہاں جو علم کو "قلیل" فرمایا تو یہ علم الٰہی کے مقابلہ میں قلیل ہے، اور دوسرے مقام پر جو علم کو "خیر

کثیر'' فرمایا تو یہ دنیاوی متاع کے مقابلہ میں خیر کثیر ہے، دونوں میں کوئی تعارض نہیں، اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے قلت علم کی صفت ہے، اور کثرت خیر کی صفت ہے، اور علم اگر چہ قلیل ہو تو وہ بھی خیر کثیر ہے، تو اس صورت میں تعارض کا شبہ ہی نہیں ہو سکتا۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی روح انسانی کیا چیز ہے؟ اس کی ماہیت وحقیقت کیا ہے؟ یہ سوال صحیحین کی روایت کے موافق یہود مدینہ نے آنحضرت ﷺ کے آزمانے کو کیا تھا، اور سیر کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں قریش نے یہود کے مشورہ سے یہ سوال کیا، اسی لیے آیت کے مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے، ممکن ہے نزول مکرر ہوا ہو، واللہ اعلم۔

یہاں اس سوال کے درج کرنے سے غالباً یہ مقصود ہوگا کہ جن چیزوں کے سمجھنے کی ان لوگوں کو ضرورت ہے ادھر سے تو اعراض کرتے ہیں اور غیر ضروری مسائل میں از راہِ تعنت وعناد جھگڑتے رہتے ہیں، ضرورت اس کی تھی کہ وحی قرآنی کی روح سے باطنی زندگی حاصل کرتے اور اس نسخہ شفا سے فائدہ اٹھاتے: وَ کَذٰلِکَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا، یُنَزِّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃَ بِالرُّوۡحِ مِنۡ اَمۡرِہٖ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖۤ مگر انھیں دور از کار اور معاندانہ بحثوں سے فرصت کہاں، ''روح'' کیا ہے؟ جوہر ہے یا عرض؟ مادی ہے یا مجرد؟ بسیط ہے یا مرکب؟ اس قسم کے غامض اور بے ضرورت مسائل کے سمجھنے پر نہ نجات موقوف ہے نہ یہ بحثیں انبیاء کے فرائض تبلیغ سے تعلق رکھتی ہیں، بڑے بڑے حکماء اور فلاسفہ آج تک خود ''مادہ'' کی حقیقت پر مطلع نہ ہو سکے، روح جو بہر حال مادہ سے کہیں زیادہ لطیف وخفی ہے اس کی اصل ماہیت وکنہ تک پہنچنے کی پھر کیا امید کی جاسکتی ہے، مشرکین مکہ کی جہالات اور یہود مدینہ کی اسرائیلیات کا مطالعہ کرنے والوں کو معلوم ہے کہ جو قوم موٹی موٹی باتوں اور نہایت واضح حقائق کو نہیں سمجھ سکتی، وہ روح کی حقائق پر دسترس پانے کی کیا خاک استعداد واہلیت رکھتی ہوگی؟

تو کار زمین رانکو ساختی کہ با آسماں نیز پرداختی

**فائدہ:** ۲؎ موضح القرآن میں ہے کہ ''حضرت کے آزمانے کو یہود نے پوچھا، سواللہ نے (کھول کر) نہ بتایا کیونکہ ان کو سمجھنے کا حوصلہ نہ تھا، آگے پیغمبروں نے بھی مخلوق سے ایسی باتیں نہیں کیں، اتنا جاننا کافی ہے کہ اللہ کے حکم سے ایک چیز بدن میں آپڑی، وہ جی اٹھا، جب نکل گئی مر گیا''۔

**تنبیہ:** حق تعالیٰ کا کلام اپنے اندر عجیب وغریب اعجاز رکھتا ہے، روح کے متعلق یہاں پر جو کچھ فرمایا اس کا سطحی مضمون عوام اور قاصر الفہم یا کج رو معاندین کے لیے کافی ہے، لیکن اسی سطح کے نیچے، ان ہی مختصر الفاظ کی تہہ میں روح کے متعلق وہ بصیرت افروز حقائق مستور ہیں جو بڑے سے بڑے عالی دماغ نکتہ بیں فلسفی اور ایک عارف کامل کی راہ طلب وتحقیق میں چراغ ہدایت کا کام دیتے ہیں، روح کے متعلق عہد قدیم سے جو سلسلہ تحقیقات کا جاری ہے وہ آج تک ختم نہیں ہوا، اور نہ شاید ہو سکے، روح کی اصلی کنہ وحقیقت تک پہنچنے کا دعویٰ تو بہت ہی مشکل ہے، کیونکہ ابھی تک کتنی ہی محسوسات ہیں جن کی کنہ وحقیقت معلوم کرنے سے ہم عاجز رہے ہیں، تاہم میرے نزدیک آیت قرآنیہ سے روح کے متعلق ان چند نظریات پر صاف روشنی پڑتی ہے۔

① انسان میں اس مادی جسم کے علاوہ کوئی اور چیز موجود ہے جسے ''روح'' کہتے ہیں، وہ ''عالم امر'' کی چیز ہے اور خدا کے حکم وارادہ سے فائض ہوتی ہے: قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ، خَلَقَہٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ، ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰہُ خَلۡقًا اٰخَرَ، اِنَّمَا قَوۡلُنَا لِشَیۡءٍ اِذَاۤ اَرَدۡنٰہُ اَنۡ نَّقُوۡلَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ روح کی صفات علم وشعور وغیرہ بتدریج کمال کو پہنچتی ہیں اور ارواح میں حصول کمال کے اعتبار سے بے حد تفاوت وفرق مراتب ہے، حتی کہ خدا تعالیٰ کی تربیت سے ایک روح ایسے بلند اور اعلیٰ مقام پر پہنچ جاتی ہے جہاں دوسری ارواح کی قطعاً رسائی نہ ہو سکے، جیسے روح محمدی ﷺ، یشیر الیه اضافة الامر الی الرب والرب الی یاء المتکلم المراد به ههنا محمد وقوله، تعالیٰ فیما بعد قُلۡ لَّئِنِ اجۡتَمَعَتِ الۡاِنۡسُ وَالۡجِنُّ عَلٰۤی اَنۡ یَّاۡتُوۡا بِمِثۡلِ ھٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لَا یَاۡتُوۡنَ بِمِثۡلِہٖ۔

② مگر اس کے یہ کمالات ذاتی نہیں، وہابِ حقیقی کے عطا کیے ہوئے ہیں اور محدود ہیں، یدل علیه قوله تعالیٰ: وَمَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِیۡلًا فان العلم قداتاه من مفیض آخر و هو قلیل فی جنب علم الله تعالیٰ کما قال تعالیٰ: قُلۡ لَّوۡ کَانَ الۡبَحۡرُ مِدَادًا لِّکَلِمٰتِ رَبِّیۡ لَنَفِدَ الۡبَحۡرُ قَبۡلَ اَنۡ تَنۡفَدَ کَلِمٰتُ رَبِّیۡ . وَلَوۡ اَنَّ مَا فِی الۡاَرۡضِ مِنۡ شَجَرَۃٍ اَقۡلَامٌ وَّالۡبَحۡرُ یَمُدُّہٗ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ

سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ و یدل علی تحدید القدرۃ قوله تعالیٰ فیما بعد ردا لقولهم حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا . قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا روح انسانی خواہ علم وقدرت وغیرہ صفات میں کتنی ہی ترقی کر جائے حتی کہ اپنے تمام ہم جنسوں سے سبقت لے جائے، پھر بھی اس کی صفات محدود رہتی ہیں، صفات باری کی طرح لامحدود نہیں ہو جاتیں اور یہ ہی بڑی دلیل اس کی ہے کہ آریوں کے عقیدہ کے موافق روح خدا سے علیحدہ کوئی قدیم وغیر مخلوق ہستی نہیں ہوسکتی ورنہ تحدید کہاں سے آئی۔

④ کتنی ہی بڑی کامل روح ہو، حق تعالیٰ کو یہ قدرت حاصل ہے کہ جس وقت چاہے اس سے کمالات سلب کر لے، گو اس کے فضل ورحمت سے کبھی ایسا کرنے کی نوبت نہ آئے، یدل علیه قوله تعالیٰ :وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا .

یہ چند اصول جو ہم نے بیان کیے اہل فہم کو نسق آیات میں ادنیٰ تأمل کرنے سے معلوم ہو سکتے ہیں۔

صرف ایک ''عالم امر'' کا لفظ ہے جس کی مناسب تشریح ضروری ہے اور جس کے سمجھنے سے امید ہے روح کی معرفت حاصل کرنے میں بہت مدد ملے گی، لفظ ''امر'' قرآن کریم میں بیسیوں جگہ آیا اور اس کے معنی کی تعیین میں علماء نے کافی کلام کیا ہے لیکن میری غرض اس وقت سورہ اعراف کی آیت: اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ کی طرف توجہ دلانا ہے جہاں ''امر'' کو ''خلق'' کے مقابل رکھا ہے جس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ خدا کے یہاں دونوں بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں ①ایک ''خلق'' ②دوسرا ''امر''، دونوں میں کیا فرق ہے؟ اس کو ہم سیاقِ آیات سے بسہولت سمجھ سکتے ہیں، پہلے فرمایا: اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ یہ تو ''خلق'' ہوا، درمیان میں ''استواء علی العرش'' کا ذکر کر کے جو شان حکمرانی کو ظاہر کرتا ہے فرمایا: يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا ۙ وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ یعنی ان مخلوقات کو ایک معین ومحکم نظام پر چلاتے رہنا جسے تدبیر وتصریف کہہ سکتے ہیں یہ ''امر'' ہوا، اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ۭ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ گویا دنیا کی مثال ایک بڑے کارخانہ کی سمجھو جس میں مختلف قسم کی مشینیں لگی ہوں، کوئی کپڑا بن رہی ہے کوئی آٹا پیس رہی ہے، کوئی کتاب چھاپتی ہے، کوئی شہر میں روشنی پہنچا رہی ہے، کسی سے پنکھے چل رہے ہیں وغیر ذالک، ہر ایک مشین میں بہت سے کل پرزے ہیں جو مشین کی غرض و غایت کا لحاظ کر کے ایک معین اندازے سے ڈھالے جاتے اور لگائے جاتے ہیں، پھر سب پرزے جوڑ کر مشین کو فٹ کیا جاتا ہے، جب تمام مشینیں فٹ ہو کر کھڑی ہو جاتی ہیں، تب الیکٹرک (بجلی) کے خزانہ سے ہر مشین کی طرف جدا جدا راستہ سے کرنٹ چھوڑ دیا جاتا ہے، آنِ واحد میں ساکن وخاموش مشینیں اپنی اپنی ساخت کے موافق گھومنے اور کام کرنے لگ جاتی ہیں، بجلی ہر مشین اور ہر پرزہ کو اس کی مخصوص ساخت اور غرض کے مطابق گھماتی ہے، حتی کہ جو قلیل وکثیر کہربائیہ روشنی کے لیمپوں اور قمقموں میں پہنچتی ہے، وہاں پہنچ کر ان ہی قمقموں کی ہیئات اور رنگ اختیار کر لیتی ہے۔

اس مثال میں یہ بات واضح ہوگئی کہ مشین کا ڈھانچہ تیار کرنا، اس کے کل پرزوں کا ٹھیک اندازہ پر رکھنا، پھر فٹ کرنا، ایک سلسلہ کے کام ہیں، جس کی تکمیل کے بعد مشین کو چالو کرنے کے لیے ایک دوسری چیز (بجلی یا اسٹیم) اس کے خزانے سے لانے کی ضرورت ہے، اسی طرح سمجھ لو حق تعالیٰ نے اول آسمان وزمین کی تمام مشینیں بنائیں جس کو ''خلق'' کہتے ہیں، ہر چھوٹا بڑا پرزہ ٹھیک اندازہ کے موافق تیار کیا جسے ''تقدیر'' کہا گیا: "فقدرہ تقدیرًا" سب کل پرزوں کو جوڑ کر مشین کو فٹ کیا جسے ''تصویر'' کہتے ہیں: "خلقنا کم ثم صورنا کم" یہ سب افعال خلق کی مد میں تھے، اب ضرورت تھی کہ جس مشین کو جس کام میں لگانا ہے لگا دیا جائے، آخر مشین کو چالو کرنے کے لیے ''امر الٰہی'' کی بجلی چھوڑ دی گئی، شاید اس کا تعلق اسم ''باری'' سے ہے: الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ وفی الحدیث "فَلَقَ الْحَبَّةَ وَبَرَأَ النَّسَمَةَ" و فی سورۃ الحدید "مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا" ای النفوس کماھو مروی عن ابن عباس و قتادۃ والحسن غرض ادھر سے حکم ہوا ''چل'' فوراً چلنے لگی، اسی ''امر الٰہی'' کو فرمایا: اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ دوسری جگہ نہایت وضاحت کے ساتھ امر ''کن'' کو خلق جسد پر مرتب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ بلکہ تتبع سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں كُنْ فَيَكُوْنُ کا مضمون جتنے مواضع میں آیا عموماً خلق وابداع کے ذکر کے بعد آیا

ہے، جس سے خیال گزرتا ہے کہ کلمہ "کُن" کا خطاب "خلق" کے بعد تدبیر وتصریف وغیرہ کے لیے ہوتا ہوگا، واللہ اعلم۔

بہرحال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہاں "امر" کے معنی "حکم" کے ہیں اور وہ حکم یہ ہی ہے جسے لفظ "کن" سے تعبیر کیا گیا، اور "کن"، جنسِ کلام سے ہے جو حق تعالیٰ کی صفت قدیمہ ہے، جس طرح ہم اس کی تمامی صفات (مثلاً حیات، سمع، بصر وغیرہ) کو بلا کیف تسلیم کرتے ہیں، کلام اللہ وکلمۃ اللہ کے متعلق بھی یہ ہی مسلک رکھنا چاہیے، خلاصہ مطلب یہ ہوا کہ "روح" کے ساتھ اکثر جگہ قرآن میں "امر" کا لفظ استعمال ہوا ہے مثلاً: قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ . وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا . يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ . يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ. اور پہلے گزر چکا کہ "امر" عبارت ہے کلمہ "کن" سے یعنی وہ کلام انشائی جس سے مخلوقات کی تدبیر وتصریف اس طریقہ پر کی جائے جس پر غرض ایجاد وتکوین مرتب ہو، لہٰذا ثابت ہوا کہ "روح" کا مبدأ حق تعالیٰ کی صفت کلام ہے جو صفت علم کے ماتحت ہے، شاید اسی لیے :وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ میں اسے اپنی طرف منسوب کیا "کلام" اور "امر" کی نسبت متکلم اور آمر سے "صادر" و "مصدور" کی ہوتی ہے، "مخلوق" و "خالق" کی نہیں ہوتی، اسی لیے اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ میں "امر" کو "خلق" کے مقابل رکھا، ہاں یہ امر "کن" باری تعالیٰ شانہ سے صادر ہوکر ممکن ہے جو ہر مجرد کے لباس میں یا ایک "ملک اکبر" اور "روح اعظم" کی صورت میں ظہور پکڑے، جس کا ذکر بعض آثار میں ہوا ہے اور جسے ہم "کہربائیہ روحیہ" کا خزانہ کہہ سکتے ہیں، گویا یہیں سے روح حیات کی لہریں دنیا کی ذوی الارواح پر تقسیم کی جاتی ہیں اور اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَةٌ الخ کے بیشمار تاروں کا یہیں کنکشن ہوتا ہے، اب جو کرنٹ چھوٹی بڑی بیشمار مشینوں کی طرف چھوڑا جاتا ہے وہ مشین سے اس کی بناوٹ اور استعداد کے موافق کام لیتا اور اس کی ساخت کے مناسب حرکت دیتا ہے بلکہ جن لیمپوں اور قمقموں میں یہ بجلی پہنچتی ہے ان ہی کے مناسب رنگ وہیئت اختیار کرلیتی ہے۔

رہی یہ بات کہ "کن" کا حکم جو قسم کلام سے ہے، جوہر مجرد یا جسم نورانی لطیف کی شکل کیونکر اختیار کرسکتا ہے؟ اسے یوں سمجھ لو کہ تمام عقلاء اس پر متفق ہیں کہ ہم خواب میں جو اشکال وصور دیکھتے ہیں، بعض اوقات وہ محض ہمارے خیالات ہوتے ہیں جو دریا، پہاڑ، شیر، بھیڑیے وغیرہ کی شکلوں میں نظر آتے ہیں، اب غور کرنے کا مقام ہے کہ خیالات جو اعراض ہیں اور دماغ کے ساتھ قائم ہیں وہ جواہر واجسام کیونکر بن گئے اور کس طرح ان میں اجسام کے لوازم وخواص پیدا ہوگئے، یہاں تک کہ بعض دفعہ خواب دیکھنے والے سے بیدار ہونے کے بعد بھی ان کے آثار جدا نہیں ہوتے، فی الحقیقت خدا تعالیٰ نے ہر انسان کو خواب کے ذریعہ سے بڑی بھاری ہدایت کی ہے کہ جب ایک آدمی کی قوت مصورہ میں اس نے اس قدر طاقت رکھی ہے کہ وہ اپنی بساط کے موافق غیر مجسم خیالات کو جسمی سانچہ میں ڈھال لے اور ان میں وہ ہی خواص وآثار باذن اللہ پیدا کرے جو عالم بیداری میں اجسام سے وابستہ تھے، پھر تماشہ یہ ہے کہ وہ خیالات خواب دیکھنے والے کے دماغ سے ایک منٹ کو علیحدہ بھی نہیں ہوئے، ان کا ذہنی وجود بدستور قائم ہے تو کیا اس حقیر سے نمونہ کو دیکھ کر ہم اتنا نہیں سمجھ سکتے کہ ممکن ہے قادر مطلق اور مصور برحق جل وعلا کا امر بیکیف (کن) باوجود صفت قائمہ بذاتہ تعالیٰ ہونے کے کسی ایک یا متعدد صورتوں میں جلوہ گر ہوجائے، ان صورتوں کو ہم ارواح یا فرشتے یا کسی اور نام سے پکاریں، وہ ارواح وملائکہ وغیرہ سب حادث ہوں اور "امر الٰہی" بحالہ قدیم رہے، امکان وحدوث کے آثار واحکام ارواح وغیرہ تک محدود رہیں اور "امرِ الٰہی" ان سے پاک وبرتر ہو، جیسے جو صورت خیالیہ بحالت خواب آگ کی صورت میں نظر آتی ہے اس صورت ناریہ میں احراق، سوزش، گرمی وغیرہ سب آثار ہم محسوس کرتے ہیں حالانکہ اسی آگ کا تصور سالہا سال بھی دماغوں میں رہے تو ہمیں ایک سیکنڈ کے لیے یہ آثار محسوس نہیں ہوتے، پس کوئی شبہ نہیں کہ روح انسانی (خواہ جوہر مجرد ہو یا جسم لطیف نورانی) "امر ربی" کا مظہر ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ مظہر کے سب احکام وآثار ظاہر پر جاری ہوں کما ہو الظاہر، واضح رہے کہ جو کچھ ہم نے لکھا اور جو کچھ مثالیں پیش کیں ان سے مقصود محض تسہیل وتقریب الی الفہم ہے، ورنہ ایسی کوئی مثال دستیاب نہیں ہوسکتی جو ان حقائق غیبیہ پر پوری طرح منطبق ہو۔

اے بروں از وہم وقال وقیل من　　خاک بر فرق من و تمثیل من

رہا یہ مسئلہ کہ روح جوہر مجرد ہے جیسا کہ اکثر حکمائے قدیم اور صوفیہ کا مذہب ہے یا جسم نورانی لطیف جیسا کہ جمہور اہل حدیث وغیرہ کی رائے ہے، اس میں میرے نزدیک قول فیصل وہی ہے جو بقیۃ السلف بحر العلوم علامہ سید انور شاہ صاحب اطال اللہ بقاء نے فرمایا کہ بالفاظ عارف جامی یہاں

تین چیزیں ہیں: ① وہ جواہر جن میں مادہ اور کمیت دونوں ہوں جیسے ہمارے ابدان مادیہ۔
② جواہر جن میں مادہ نہیں صرف کمیت ہے جنہیں صوفیہ اجسام مثالیہ کہتے ہیں۔
③ وہ جواہر جو مادہ اور کمیت دونوں سے خالی ہوں جن کو صوفیہ ''ارواح'' یا حکماء جواہر مجردہ کے نام سے پکارتے ہیں۔

جمہور اہل شرع جس کو ''روح'' کہتے ہیں وہ صوفیہ کے نزدیک ''بدن مثالی'' سے موسوم ہے جو بدن مادی میں حلول کرتا ہے، اور بدن مادی کی طرح آنکھ، ناک، کان، ہاتھ، پاؤں وغیرہ اعضاء رکھتا ہے، یہ روح بدن مادی سے کبھی جدا ہوجاتی ہے اور اس جدائی کی حالت میں بھی ایک طرح کا مجہول الکیفیت علاقہ بدن کے ساتھ قائم رکھ سکتی ہے جس سے بدن پر حالت موت طاری ہونے نہیں پاتی، گویا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے قول کے موافق جو بغوی نے اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا کی تفسیر میں نقل کیا، اس وقت روح خود علیحدہ رہتی ہے مگر اس کی شعاع جسد میں پہنچ کر بقائے حیات کا سبب بنتی ہے، جیسے آفتاب لاکھوں میل سے بذریعہ شعاعوں کے زمین کو گرم رکھتا ہے، یا جیسے آج ہی میں نے ایک اخبار میں ایک تار پڑھا کہ ''حال ہی میں فرانس کے محکمہ پرواز نے ہوابازوں کے بغیر طیارے چلا کر خفیہ تجربے کیے ہیں اور تعجب انگیز نتائج رونما ہوئے ہیں، اطلاع موصول ہوئی ہے کہ حال میں ایک خاص بم پھینکنے والا طیارہ بھیجا گیا تھا، جس میں کوئی شخص سوار نہ تھا، لیکن لاسلکی کے ذریعہ سے وہ منزل مقصود پر پہنچایا گیا، اس طیارہ میں بم بھر کر وہاں گرائے گئے اور پھر وہ مرکز میں واپس لایا گیا، دعویٰ کیا جاتا ہے کہ لاسلکی کے ذریعہ سے ہوائی جہاز نے خود بخود جو کام کیا وہ ایسا مکمل ہے جیسا کسی ہواباز کی مدد سے عمل میں آتا''۔

آج کل یورپ میں جو سوسائٹیاں روح کی تحقیقات کر رہی ہیں انہوں نے بعض ایسے مشاہدات بیان کیے ہیں کہ ایک روح جسم سے علیحدہ تھی، اور روح کی ٹانگ پر حملہ کرنے کا اثر جسم مادی کی ٹانگ پر ظاہر ہوا، بہرحال اہل شرع جو روح ثابت کرتے ہیں صوفیہ کو اس کا انکار نہیں، بلکہ وہ اس کے اوپر ایک اور روح مجرد مانتے ہیں جس میں کوئی استحالہ نہیں، بلکہ اگر اس روح مجرد کی بھی کوئی اور روح ہو اور آخر میں کثرت کا سارا سلسلہ سمٹ کر ''امر ربی'' کی وحدت پر منتہی ہوجائے تو انکار کی ضرورت نہیں، شیخ فریدالدین عطار رحمہ اللہ نے ''منطق الطیر'' میں کیا خوب فرمایا:

| | |
|---|---|
| ہم ز جملہ بیش و ہم پیش از ہمہ | جملہ از خود دیدہ وخویش از ہمہ |
| جاں نہاں در جسم و او در جاں نہاں | اے نہاں اندر نہاں اے جان جاں |

مذکورہ بالا تقریر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر چیز میں جو ''کن'' کی مخاطب ہوئی، روح حیات پائی جائے، بیشک میں یہ ہی سمجھتا ہوں کہ ہر مخلوق کی ہر ایک نوع کو اس کی استعداد کے موافق قوی یا ضعیف زندگی ملی ہے یعنی جس کام کے لیے وہ چیز پیدا کی گئی، ڈھانچہ تیار کر کے اس کو حکم دینا ''کن'' (اس کام میں لگ جا) بس یہ ہی اس کی روح حیات ہے جب تک اور جس حد تک یہ اپنی غرض ایجاد کو پورا کرے گی اسی حد تک زندہ سمجھی جائے گی، اور جس قدر اس سے بعید ہوکر معطل ہوتی جائے گی اسی قدر موت سے نزدیک یا مردہ کہلائے گی۔

هذا ماعندی ، وعندالناس ماعند هم ، والله سجانه وتعالیٰ هو الملهم للصواب

| |
|---|
| وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ۟ۙ(۸۶) |
| اور اگر ہم چاہیں تو لے جائیں اس چیز کو جو ہم نے تجھ کو وحی بھیجی پھر تو نہ پائے اپنے واسطے اس کے لادینے کو ہم پر کوئی ذمہ دار |
| اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ۟(۸۷) |
| مگر مہربانی سے تیرے رب کی، اس کی بخشش تجھ پر بڑی ہے[1] |

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے فرمایا کہ جس قدر علم تم کو دیا ہے وہ بہت ہی تھوڑا ہے، روح کی حقیقت اور ماہیت کے سمجھنے کے لیے کافی نہیں، اب یہاں بیان فرماتے ہیں کہ وہ قلیل علم جو ہم نے تم کو عطا کیا ہے اس کے متعلق ہم کو اختیار ہے کہ جب چاہیں تو وہ قلیل علم بھی تم سے واپس لے لیں، پس

علوم وحی کے باقی رکھنے سے فضل واحسان اور تسلی کے ساتھ نبوت ورسالت کے اثبات پر بھی دلالت ہے۔

اور اگر ہم چاہیں تو جس قدر آپ پر ہم نے وحی بھیجی ہے (اور اسکے ذریعہ آپ کو علم دیا ہے) سب سلب کرلیں، پھر اس (وحی) کے (واپس لانے کیلئے) آپ کو ہمارے مقابلہ میں کوئی حمایتی بھی نہ ملے گا مگر (یہ) آپ کے رب ہی کی رحمت ہے (کہ ایسا نہیں کیا) بیشک آپ پر اسکا بڑا فضل ہے۔

**وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ:** مطلب یہ ہے کہ انسان کو روح وغیرہ ہر چیز کی حقیقت کا تو کیا علم ہوتا اس کو جو تھوڑا سا علم بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا گیا ہے وہ بھی اس کی کوئی جاگیر نہیں، اللہ تعالیٰ چاہے تو دینے کے بعد بھی سلب کرسکتا ہے، مگر وہ اپنی رحمت سے ایسا کرتا نہیں وجہ یہ ہے کہ آپ پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے، آپ نبوت کے متعلق اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کو یاد کر کے خوش رہیے اور کسی کی مخالفت کا غم نہ کیجیے۔

اس آیت میں خطاب اگرچہ نبی ﷺ کو ہے مگر اصل سنانا امت کو مقصود ہے کہ جب رسول کا علم بھی ان کے اختیار میں نہیں تو دوسروں کا کیا کہنا، اسی طرح اہل نسبت کو کو سلب نسبت سے ڈرتے رہنا چاہیے، کیونکہ مخلوقات میں رسول اللہ ﷺ سے زیادہ باعظمت کوئی نہیں ہوسکتا، جب آپ ﷺ سے یہ خطاب ہے تو دوسرے کس شمار میں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی قرآن کا جو علم تم کو دیا ہے خدا چاہے تو ذرا سی دیر میں چھین لے پھر کوئی واپس نہ لاسکے، لیکن اس کی مہربانی آپ پر بہت بڑی ہے اسی لیے یہ نعمت عظمیٰ عنایت فرمائی، اور چھیننے کی کوئی وجہ نہیں، صرف قدرت عظیمہ کا اظہار مقصود ہے اور یہ کہ کیسی ہی کامل روح ہو اس کے سب کمالات موہوب و مستعار ہیں ذاتی نہیں۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ

کہہ اگر جمع ہوں آدمی اور جن اس پر کہ لائیں ایسا قرآن ہرگز نہ لائیں گے ایسا قرآن اور پڑے

بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿۸۸﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۡ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ

مدد کیا کریں ایک دوسرے کی ۱؎ اور ہم نے پھیر پھیر کر سمجھائی لوگوں کو اس قرآن میں ہر مثل، سو نہیں رہتے بہت

النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۸۹﴾

لوگ بن ناشکری کیئے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے خاص مضمون سے رسالت کا اثبات تھا، اب اعجاز قرآن کے مضمون میں بھی اسی کی تقریر ہے۔

آپ فرما دیجئے کہ اگر انسان اور جنات سب اس بات کے لئے جمع ہو جائیں کہ ایسا قرآن بنا لائیں تب بھی وہ ایسا نہ کرسکیں گے اگرچہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائے (یعنی ان میں سے ہر ایک الگ الگ کوشش کر کے تو کیا کامیاب ہوتا، سب کے سب ایک دوسرے کی مدد سے کام کر کے بھی قرآن کا مثل نہیں بنا سکتے، آگے آپ ﷺ کی رسالت کے اثبات کے لیے قرآن کا کافی شافی ہونا اور کفار کے عناد کا بیان ہے:) اور ہم نے لوگوں کے (سمجھانے کے) لئے اس قرآن میں ہر قسم کے عمدہ مضمون طرح طرح سے بیان کیے ہیں پھر بھی اکثر لوگ بے انکار کیئے نہ رہے۔

**لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ:** جن کا ذکر شاید اس لیے کیا ہو کہ وہ جنات کی عبادت کرتے تھے، مطلب یہ ہوگا کہ اگر تمہارے خدا بھی آجائیں تب بھی قرآن کا مثل نہ بنا سکو گے، یا یوں کہا جائے کہ چونکہ جن بھی مکلف ہیں اس لیے ان کا ذکر بھی کیا گیا۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ اعجاز قرآن کے متعلق پہلے متعدد مواضع میں کلام کیا جا چکا ہے اور اس موضوع پر ہمارا مستقل رسالہ ''اعجاز القرآن'' چھپا ہوا ہے

اسے ملاحظہ کرلیا جائے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی ان کی خیر خواہی کے لیے عجیب وغریب مضامین بار بار مختلف پیرایوں میں قسم قسم کے عنوانوں سے بیان کیے جاتے ہیں، لیکن اکثر احمقوں کو اس کی قدر نہیں بجائے احسان ماننے کے ناشکری پر تلے ہوئے ہیں۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ﴿٩٠﴾ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ

اور بولے ہم نہ مانیں گے تیرا کہا جب تک تو نہ جاری کر دے ہمارے واسطے زمین میں ایک چشمہ ۱؎ یا ہو جائے تیرے واسطے ایک باغ کھجور

وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ﴿٩١﴾ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا

اور انگور کا، پھر بہائے تو اس کے بیچ نہریں چلا کر، یا گرا دے آسمان ہم پر جیسا کہ تو کہا کرتا ہے ٹکڑے ۲؎

اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ﴿٩٢﴾

یا لے آ اللہ کو اور فرشتوں کو سامنے (ضامن) ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** گذشتہ آیات میں کفار کے چند سوالات اور ان کے جوابات ذکر کئے گئے، اب رسالت سے متعلق ان کے چند معاندانہ سوالات اور بے سروپا فرمائشوں کا ذکر اور ان کا جواب دیا جاتا ہے۔

اور یہ لوگ (باوجود اس کے کہ اعجاز قرآنی کے ذریعے آپ کی نبوت ورسالت کا کافی اور واضح ثبوت ان کو مل چکا، پھر بھی از راہ عناد ایمان نہیں لاتے اور بہانہ کرتے ہوئے یہ) کہتے ہیں کہ ہم آپ پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک آپ ہمارے لئے (مکہ کی) زمین سے کوئی چشمہ جاری نہ کردیں، یا خاص آپ کے لئے کھجور اور انگور کا کوئی باغ نہ ہو پھر اس باغ کے بیچ بیچ میں جگہ جگہ بہت سی نہریں آپ جاری کردیں، یا جیسا آپ کہا کرتے ہیں آپ آسمان کے ٹکڑے ہم پر نہ گرادیں (جیسا کہ اس آیت قرآن میں ارشاد ہے: اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ یعنی ہم چاہیں تو ان کو زمین کے اندر دھنسا دیں یا ان پر آسمان کے ٹکڑے گرا دیں) یا آپ اللہ کو اور فرشتوں کو (ہمارے) سامنے نہ لا کھڑا کردیں (کہ ہم کھلم کھلا دیکھ لیں)۔

لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا: اس سے پتہ چلتا ہے کہ اہل حق سے خوارق (کرامات) کا طلب کرنا مذموم مطالبہ ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی مکہ کی سرزمین سے، قرآن کے اعجاز سے عاجز ہو کر ایسی دور از کار فرمائشیں کرنے لگتے ہیں، غرض استفادہ وانتفاع مقصود نہ تھا محض تعنت وعناد سے کام تھا۔

**فائدہ:** ۲؎ یہ اسکی طرف اشارہ ہے جو دوسری جگہ ارشاد ہوا: اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی معاذ اللہ خدا خود ہمارے سامنے آ کر کہہ دے اور فرشتے کھلم کھلا شہادت دیں کہ تم سچے ہو۔

اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ

یا ہو جائے تیرے لئے ایک گھر سنہرا ۱؎ یا چڑھ جائے تو آسمان میں، اور ہم نہ مانیں گے (نہ یقین کریں گے) تیرے چڑھ جانے کو

حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۭ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿٩٣﴾ ع

جب تک نہ اتار لائے ہم پر ایک کتاب (نوشتہ) جس کو ہم پڑھ لیں ۲؎ تو کہہ سبحان اللہ میں کون ہوں مگر ایک آدمی ہوں بھیجا ہوا ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** یا آپ کے پاس کوئی سونے کا بنا ہوا گھر نہ ہو یا آپ آسمان پر (ہمارے سامنے) نہ چڑھ جائیں اور ہم تو آپ کے (آسمان پر) چڑھنے کا کبھی بھی یقین نہ کریں گے جب تک کہ (وہاں سے) آپ ہمارے پاس ایک کتاب نہ لائیں جس کو ہم پڑھ بھی لیں (یعنی اس میں آپ کے آسمان پر پہنچنے کی تصدیق رسید کے طور پر لکھی ہوئی ہو) آپ (ان سب خرافات کے جواب میں) فرما دیجئے کہ سبحان اللہ! میں بجز اس کے کہ آدمی ہوں (مگر) پیغمبر ہوں اور کیا ہوں (کہ ان فرمائشوں کو پورا کرنا میری قدرت میں ہو، یہ قدرت مطلقہ تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی صفت ہے)۔

**هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا:** کیونکہ بشریت جو کہ خود اپنی ذات میں عاجز و بے اختیار ہونے کو چاہتی ہے مجھ میں وہ موجود ہے، اور رسالت اگرچہ میری صفت ہے مگر وہ اس کا یہ تقاضہ نہیں کہ اللہ کے رسول کو ہر چیز پر مکمل قدرت و اختیار ہو، اور اگر رسالت کے لیے ایسی قدرت کو لازم سمجھا جائے تو محض غلط ہے، کیونکہ رسالت کے لئے تو اتنی بات کافی ہے کہ رسالت کی کوئی صاف واضح دلیل آجائے جس پر اہل عقل کو اعتراض نہ ہو سکے اور وہ دلیل اعجاز قرآنی اور دوسرے معجزات کی صورت میں کئی بار تم لوگوں کے سامنے پیش کر چکا ہوں، اور اب تک کوئی اس کو نہیں توڑ سکا، پس ان باتوں کا بشر یا رسول ہونے سے کوئی تعلق نہ رہا، اب رہ گئی یہ بات کہ حق تعالیٰ خود ہی ظاہر کر دیں اگرچہ ضرورت نہ سہی، سو اس کی حکمت وہ جانیں، کسی کو اس فرمائش کا حق نہیں، اور بعض حکمتیں معلوم ہوگئی ہیں کہ فرمائش کے پورا ہونے پر ایمان نہ لائے تو ان کو ہلاک کر دیا جائے گا جیسا کہ کئی بار گزر چکا۔

**سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا:** اس میں دلالت ہے کہ مقبولین یعنی اہل اللہ کو یہ قدرت نہیں کو جو کچھ بھی ان سے درخواست کی جائے اس کو وہ پورا کر دیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱۔ یعنی سونے کا نہ ہو تو کم از کم سونے کا ملمع ہو۔

**فائدہ:** ۲۔ یعنی جیسے آپ معراج کا ذکر کرتے ہیں ہمارے سامنے آسمان پر چڑھیے پھر وہاں سے ایک کتاب لکھی ہوئی لے کر آیئے جسے ہم خود پڑھ سکیں اور سمجھ سکیں۔

**فائدہ:** ۳۔ جیسے پہلے پیغمبر آئے اور وہ آدمی تھے، کسی پیغمبر کو خدائی کے اختیارات حاصل نہیں نہ اس کی یہ شان ہے کہ اپنے رب سے ایسی بےضرورت فرمائشیں کرے، ان کا کام یہ ہے کہ جو ادھر سے ملے پہنچا دیں اور اپنے ہر ایک کام کو خدائے واحد کے سپرد کر دیں، سو میں اپنا فرض رسالت ادا کر رہا ہوں، فرمائشی نشان دکھلانے یا نہ دکھلانے اس کی حکمت بالغہ پر محمول ہیں اور پہلے اسی سورت میں فرمائشی نشانات دکھلانے کی بعض حکمتیں گزر چکی ہیں۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۴﴾

اور لوگوں کو روکا نہیں ایمان لانے سے جب پہنچی ان کو ہدایت مگر اسی بات نے کہ کہنے لگے کیا اللہ نے بھیجا آدمی کو پیغام دے کر ۱

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿۹۵﴾

کہہ اگر ہوتے زمین میں فرشتے پھرتے بستے تو ہم اتارتے ان پر آسمان سے کوئی فرشتہ پیغام دے کر ۲

**خلاصہ تفسیر:** اب رسالت کے متعلق کفار کے ایک اور شبہ اور اس کا جواب بیان کیا جاتا ہے، شبہ یہ تھا کہ رسول بشر نہیں بلکہ فرشتہ ہونا چاہیے، جواب کا حاصل یہ ہے کہ رسول اور جن کی طرف رسول کو بھیجا گیا ہے ان میں مناسبت ہونا ضروری ہے۔

اور جس وقت ان لوگوں کے پاس ہدایت (یعنی رسالت کی صحیح دلیل مثلاً اعجاز قرآنی) پہنچ چکی اس وقت ان کو ایمان لانے سے بجز اس کے اور کوئی (قابل توجہ) بات مانع نہیں ہوئی کہ انہوں نے (بشریت کو رسالت کے خلاف سمجھا اس لئے کہا) کیا اللہ تعالیٰ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے (یعنی ایسا نہیں ہو سکتا) آپ (جواب میں ہماری طرف سے) فرما دیجئے کہ اگر زمین پر فرشتے (رہتے) ہوتے کہ اس پر (دیگر رہنے والوں کی طرح)

چلتے بستے (اور وہ آسمان پر بھی نہ جاسکتے، کیونکہ آسمان پر جانے کی اگر ان کو اجازت ہوتی تو رسول بھیجنے کی ضرورت کیا ہوتی) تو ہم البتہ ان پر آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے۔

**قُل لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَٰئِكَةٌ**: شبہ ہوتا ہے کہ جب مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے انسان فرشتہ سے فیض حاصل نہیں کرسکتا تو پھر رسول کے پاس فرشتہ کیسے آتا ہے، اور رسول انسان ہونے کے باوجود کس طرح فرشتہ سے وحی کا فیض حاصل کرتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہ اصلاح اور رشد و ہدایت کا فائدہ صرف اسی صورت میں ہوتا ہے کہ اللہ کا رسول ہوتا تو بشر کی جنس میں سے ہے جو تمام انسانی جذبات اور طبعی خواہشات کا خود بھی حامل ہوتا ہے مگر ساتھ ہی اس کو ''ملکیت'' کی شان بھی حاصل ہوتی ہے، اسے فرشتہ اور بشر دونوں سے مناسبت ہوتی ہے اور وہ عام انسانوں اور فرشتوں کے درمیان واسطہ اور رابطہ کا کام کرتا ہے، وحی لانے والے فرشتوں سے وحی حاصل کر کے اپنے ہم جنس انسانوں تک پہنچاتا ہے، بخلاف عام انسانوں کے کہ ان میں ملکیت کی شان نہیں ہوتی، اس پر یہ سوال ہوسکتا ہے کہ اگر فرشتہ آدمی کی شکل میں آجاتا تو عوام کو بھی فرشتہ سے مناسبت ہو ہی جاتی؟ اس کے دو جواب ہیں: ① ایک جواب یہ ہے کہ شکل بدلنے سے بھی فرشتہ کی خاصیت نہیں بدلتی تو پھر بھی مناسبت نہ ہوتی ② دوسرا جواب وہ ہے جو سورہ انعام کی آیت: **ولو جعلنٰہ ملکا لجعلنٰہ رجلا** میں گذر چکا ہے کہ اگر آدمی کی شکل میں فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے تو پھر وہی اشکال باقی رہتا کہ رسول انسان کیوں ہوا؟ فرشتہ کیوں نہ ہوا؟

رہا یہ شبہ کہ جب رسول اور امت میں ہم جنس ہونا شرط ہے تو پھر رسول کریم ﷺ کی بعثت اور رسالت جنات کی طرف کیسے ہوئی؟ جنوں کو آدمیوں سے کہاں مناسبت؟ جنات تو انسان کے ہم جنس نہیں ہوتے، اس کے دو جواب ہیں: ① ایک جواب تو یہی ہے کہ رسول صرف انسان نہیں، بلکہ اس میں ''ملکیت'' کی شان بھی ہوتی ہے، اس کی وجہ سے رسول کو جنات سے بھی مناسبت ہوسکتی ہے ② دوسرا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ میں ''جامعیت'' کی صفت تھی، اس لیے جنات کو بھی آپ سے فیض حاصل کرنا ممکن ہے۔

***

**فائدہ:** ۱؎ یعنی نور ہدایت پہنچنے کے بعد آنکھیں نہ کھلیں یہ ہی کہتے رہے کہ آدمی ہو کر رسول کیسے ہوسکتا ہے، اگر خدا کو پیغمبر بھیجنا تھا تو آسمان سے کوئی فرشتہ اتارتا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی اگر یہ زمین آدمیوں کے بجائے فرشتوں کی بستی ہوتی تو بیشک موزوں ہوتا کہ ہم فرشتہ کو پیغمبر بنا کر بھیجتے، آدمیوں کی طرف اگر فرشتہ اس کی اصلی صورت میں بھیجا جائے تو آنکھیں اور دل تحمل بھی نہ کرسکیں، فائدہ اٹھانا تو الگ رہا، اور آدمی کی صورت میں آئے تو اشتباہ میں پڑے رہیں اس کی تقریر سورہ انعام کے پہلے رکوع میں گزر چکی۔

قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا ﴿٩٦﴾

کہہ اللہ کافی ہے حق ثابت کرنے والا میرے اور تمہارے بیچ میں، وہ ہے اپنے بندوں سے خبردار دیکھنے والا

**خلاصہ تفسیر:** گذشتہ آیات میں رسالت سے متعلق شبہات کے جواب بیان ہوئے، اور پیچھے آیت: **قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنسُ وَالْجِنُّ** میں رسالت کی قطعی دلیل بیان ہو چکی، معاندین اس پر بھی نہ مانے، اس لیے آگے آخری خطاب اور اس کے ساتھ قیامت کے روز عذاب کی وعید اور اس کے ضمن میں قیامت کے متعلق شبہ کا جواب ارشاد فرماتے ہیں۔

(جب یہ لوگ رسالت و نبوت کے واضح دلائل آجانے اور تمام شبہات دور ہوجانے کے بعد بھی نہیں مانتے تو) آپ (آخری بات) کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ میرے تمہارے درمیان (کے اختلاف میں) کافی گواہ ہے (یعنی خدا جانتا ہے کہ میں واقع میں اللہ کا رسول ہوں، تم نہیں مانتے مت مانو ایک روز بھگتو گے، کیونکہ) وہ اپنے بندوں (کے احوال) کو خوب جانتا خوب دیکھتا ہے (تمہارے عناد کو بھی دیکھتا ہے، اس کی سزا دے گا)۔

***

**فائدہ:** وہ جو کہتے تھے اَوْ تَاْتِیَ بِاللّٰہِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ قَبِیْلًا یعنی خدا سامنے آکر تصدیق کردے تب مانیں، تو فرمایا کہ خدا اب بھی اپنے فعل سے میری تصدیق کر رہا ہے، آخر وہ مجھ کو دیکھتا ہے کہ میں نبوت کا دعویٰ کر رہا ہوں اور میرے ظاہری و باطنی احوال سے پورا خبردار ہے، اس پر بھی میرے ہاتھ اور زبان پر برابر وہ علمی و عملی نشانات ظاہر فرماتا رہتا ہے، جو خارق عادت اور اس کے عام قانون قدرت سے کہیں بلند و برتر ہیں، میرے مقاصد کو یوماً فیوماً کامیاب اور وسیع الاثر بناتا ہے اور تکذیب کرنے والوں کو قدم قدم پر متنبہ کرتا ہے کہ اس رفتار سے تم فلاح نہیں پا سکتے کیا یہ خدا کی طرف سے کھلی ہوئی فعلی شہادت نہیں کہ میں اپنے دعوے میں سچا ہوں؟ کیا ایک مفتری کے ساتھ ایسا معاملہ خدا کا ہوسکتا تھا؟

وَمَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَنَحْشُرُهُمْ یَوْمَ

اور جسکو راہ دکھلائے (سجھائے) اللہ وہی ہے راہ پانے والا اور جسکو بھٹکائے پھر تو نہ پائے انکے واسطے کوئی رفیق اللہ کے (اسکے) سوا لے اور اٹھائیں گے ہم انکو دن

الْقِیٰمَةِ عَلٰی وُجُوْهِهِمْ عُمْیًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ؕ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِیْرًا ﴿۹۷﴾

قیامت کے چلیں گے منہ کے بل اندھے اور گونگے اور بہرے ۲ ٹھکانا ان کا دوزخ ہے، جب لگے گی بجھنے اور بھڑکا دیں گے ان پر ۳

**خلاصہ تفسیر:** اور (واقعی بات یہ ہے کہ) اللہ جس کو راہ پر لائے وہ ہی راہ پر آتا ہے اور جس کو بے راہ کردے تو خدا کے سوا (جتنے ہیں، جن کی مدد کا انہیں بھروسہ ہے، ان میں سے) آپ کسی کو بھی ایسوں کا مددگار نہ پائیں گے (اور کفر کی وجہ سے یہ خدا کی مدد سے محروم ہیں، غرض جب تک خدا تعالیٰ کی طرف سے دست گیری نہ ہو نہ ہدایت ہوسکتی ہے نہ کوئی عذاب سے بچ سکتا ہے، چنانچہ یہ لوگ اسباب ہدایت جمع ہونے کے باوجود خدا کی مدد نہ ہونے کی وجہ سے ہدایت تک نہ پہنچ سکے) اور ہم قیامت کے روز ان کو اندھا گونگا بہرہ کر کے منہ کے بل چلائیں گے، ان کا ٹھکانا دوزخ ہے (جس کی یہ کیفیت ہوگی کہ) وہ (یعنی دوزخ کی آگ) جب ذرا دھیمی ہونے لگے گی اس وقت ہم ان کے لئے اور زیادہ بھڑکا دیں گے۔

**وَنَحْشُرُهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عَلٰی وُجُوْهِهِمْ:** حدیث شیخین میں صراحت ہے کہ کفار منہ کے بل چلیں گے، اس لیے یہاں: عَلٰی وُجُوْهِهِمْ میں تو مجازی معنی یقیناً نہیں، اور اسی کے قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بوڑھے بہرے گونگے سے بھی حقیقی معنی مراد ہیں مجازی نہیں، رہا یہ کہ دوسری آیتوں سے ان کا دیکھنا سننا اور سر اونچا کرنا معلوم ہوتا ہے جیسا کہ آیت: **اسمع بهم و ابصر** اور آیت: **مقنعی رؤوسهم** تو اس کے متعدد جواب ہوسکتے ہیں، آسان جواب یہ ہے کہ عین حشر کے وقت تو ذلت کی وجہ سے یہ حالت ہوگی کہ منہ کے بل چلیں گے، اندھے بہرے گونگے ہوں گے، پھر بعد میں سننا دیکھنا سر اونچا کرنا بھی واقع ہوگا۔

**كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِیْرًا:** اس میں اس قول کا رد ہے جو بعض کی طرف منسوب ہے جو کہتے ہیں کہ طویل مدت کے بعد جہنم میں آگ کا عذاب منقطع ہوجائے گا۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی خدا کی توفیق و دستگیری ہی سے آدمی راہ حق پر چل کر منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے، جس کی بدبختی اور تعنت کی وجہ سے خدا دستگیری نہ فرمائے اسے کون ہے جو ٹھیک راستہ پر لگا سکے۔

**فائدہ:** ۲ یہ قیامت کے بعض مواطن میں ہوگا کہ کافر منہ کے بل اندھے گونگے کر کے چلائے جائیں گے، حدیث میں ہے صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ! منہ کے بل کس طرح چلیں گے فرمایا جس نے آدمی کو پاؤں سے چلایا وہ قادر ہے کہ سر سے چلا دے، باقی فرشتوں کا جہنمیوں کو منہ کے بل گھسیٹنا، وہ دوزخ میں داخل ہونے کے بعد ہوگا: یَوْمَ یُسْحَبُوْنَ فِی النَّارِ عَلٰی وُجُوْهِهِمْ

**فائدہ:** ۳ یعنی عذاب معین اندازہ سے کم نہیں ہونے دیں گے، اگر بدن جل کر تکلیف میں کمی ہونے لگے گی تو پھر نئے چمڑے چڑھا دیئے

جائیں گے: كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۹۸﴾

یہ ان کی سزا ہے اس واسطے کہ منکر ہوئے ہماری آیتوں سے اور بولے کیا جب ہم ہو گئے ہڈیاں اور چورا چورا کیا ہم کو اٹھائیں گے نئے بنا کر ۱؎

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ

کیا نہیں دیکھ چکے کہ جس اللہ نے بنائے آسمان اور زمین وہ بنا سکتا ہے ایسوں کو ۲؎ اور مقرر کیا ہے

لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۹۹﴾

ان کے واسطے ایک وقت بے شبہ ۳؎ سو نہیں رہا جاتا بے انصافوں سے بن ناشکری کئے ۴؎

**خلاصہ تفسیر:** یہ ہے ان کی سزا اس سبب سے کہ انہوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا تھا اور یوں کہا تھا کہ کیا ہم ہڈیاں اور (وہ بھی) بالکل ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم ازسرنو پیدا کر کے (قبروں سے) اٹھائے جائیں گے؟ کیا ان لوگوں کو اتنا معلوم نہیں کہ جس اللہ نے آسمان اور زمین پیدا کئے وہ اس بات پر (بدرجہ اولی) قادر ہے کہ وہ ان جیسے آدمی دوبارہ پیدا کر دے، اور (منکرین کو شاید یہ وسوسہ ہو کہ ہزاروں لاکھوں مر گئے، مگر اب تک تو یہ دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنے کا وعدہ پورا ہوا نہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ) ان کے (دوبارہ پیدا کرنے کے) لئے ایک میعاد معین کر رکھی ہے کہ اس میعاد (معین کے آنے کے وقت دوبارہ پیدا کرنے میں) میں ذرا شک نہیں، اس پر بھی ظالم لوگ بے انکار کئے نہ رہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی دنیا میں دلیل سے تو نہ مانا تھا، اب آنکھ سے بار بار دیکھ لو کہ کس طرح جل جل کر ازسرنو تیار کیے جا رہے ہو۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی جس نے اتنے بڑے اجسام پیدا کیے، اسے تم جیسی چھوٹی سی چیز کا پیدا کر دینا کیا مشکل ہے: لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ بیشک وہ تم کو اور تمہارے جیسے سب آدمیوں کو بے تکلف پیدا کر سکتا ہے۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی شاید یہ کہو کہ آخر اتنے آدمی مر چکے ہیں وہ اب تک کیوں نہیں اٹھائے گئے، تو فرما دیا کہ سب کے واسطے قبروں سے اٹھنے اور دوبارہ زندہ ہونے کا ایک وقت مقرر ہے وہ ضرور آکر رہے گا، تاخیر دیکھ کر انکار کرنا حماقت ہے: وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ

**فائدہ:** ۴؎ یعنی ایسے واضح مضامین و دلائل سن کر بھی ناانصافوں کے کفر و ضلال اور ناشکری میں ترقی ہی ہوتی ہے، ذرا نہیں پسیجتے۔

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ۭ

اگر تمہارے ہاتھ میں ہوتے میرے رب کی رحمت کے خزانے تو ضرور بند کر رکھتے اس ڈر سے کہ خرچ نہ ہو جائیں

وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ﴿۱۰۰﴾ ع

اور ہے انسان دل کا تنگ

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے کفار کا انکار نبوت اور آپ سے دشمنی کرنا بیان ہوا، اب نتیجہ کے طور پر فرماتے ہیں کہ اگر کسی کو نبی بنانا تمہارے اختیار میں ہوتا تو تم رسول اللہ ﷺ کو کبھی نبوت نہ دیتے، مگر وہ فضل خاص خدا کے ہاتھ میں ہے اس لیے تمہاری کراہت و دشمنی مانع نہیں ہو سکتی۔

آپ فرما دیجئے کہ اگر تم لوگ میرے رب کی رحمت (یعنی نبوت) کے خزانوں (یعنی کمالات) کے مختار ہوتے (کہ جسے چاہتے دیتے، جسے

چاہتے نہ دیتے جیسا کہ تمہاری بے باتوں سے جھلکتا ہے کہ تم اپنے آپ کو نبوت کا مالک اور مختار بنانا چاہتے ہو، اس لیے کبھی کہتے ہو کہ یہ قرآن کسی رئیس پر نازل ہونا چاہیے تھا، کبھی کہتے ہو کہ رسول فرشتہ ہونا چاہیے تھا، کبھی بے جا فرمائشی معجزات کی درخواست کرتے ہو) تو اس صورت میں تم (اس کے) خرچ ہو جانے کے اندیشے سے ضرور ہاتھ روک لیتے (یعنی کبھی کسی کو نبوت نہ دیتے، حالانکہ یہ چیز کسی کو دینے سے گھٹتی بھی نہیں، مگر جب بھی تم کسی کو نہ دیتے، جیسا کہ بعض لوگ انتہائی بخل کی وجہ سے علم وحکمت کی بات نہیں بتلایا کرتے) اور آدمی ہے بڑا تنگدل (کہ ایسی ختم نہ ہونے والی چیز کو بھی دینے سے کنجوسی کرتا ہے جس کی وجہ رسول سے عداوت اور بخل کے علاوہ شاید یہ اندیشہ بھی ہو کہ اگر کسی کو نبی اور رسول بنالیا تو پھر اس کے احکام کی پابندی کرنا پڑے گی، جیسے کوئی قوم باہم اتفاق کر کے کسی کو اپنا بادشاہ بنالے تو اگرچہ بنایا انہوں نے ہے، مگر جب وہ بادشاہ بن گیا تو اس کی اطاعت کرنی پڑتی ہے)۔

**لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ**: اس جگہ ''رحمت رب'' سے مراد ''نبوت و رسالت'' اور ''خزائن رحمت'' سے مراد ''کمالات نبوت'' لئے گئے ہیں، اس آیت کی یہ تفسیر خدا کے انعامات میں سے ہے اور مقام کے ساتھ نہایت چسپاں ہے، اس میں ''نبوت'' کو ''رحمت'' کے ساتھ تعبیر کرنا ایسا ہی ہوگا جیسا کہ آیت: اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ میں بالاجماع ''رحمت'' سے مراد ''نبوت'' ہی ہے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

**اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ**: اس سے ان لوگوں کی مذمت کا اشارہ بھی نکلتا ہے جو طریق ہدایت کو لوگوں سے چھپاتے ہیں اور طریق کی حقیقت وکیفیت ان چند ملفوظات کو سمجھتے ہیں جو اپنے مشائخ سے سن لیے ہیں، انہیں خدا جانے کیا خزائن و دفائن سمجھتے ہیں، البتہ کشفی علوم طریق ہدایت نہیں، سو انہیں ظاہر نہیں کرنا چاہیے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی گذشتہ رکوع میں فرمایا تھا: اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓي اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ الخ (خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت سے آپ پر بہت بڑا فضل کیا ہے کہ قرآن جیسی بے مثال دولت عطا فرمائی) درمیان میں مخالفین کے تعنت وعناد، دور از کار مطالبات، اعراض وتکذیب اور ان کے نتائج کا ذکر کر کے یہاں پھر اسی پہلے مضمون کی طرف عود کیا گیا ہے، یعنی ایک بندہ کو ایسی عظیم الشان رحمت اور عدیم النظیر دولت سے سرفراز فرمانا، اسی جوادِ حقیقی اور وہابِ مطلق کی شان ہو سکتی ہے جس کے پاس رحمت کے غیر متناہی خزانے ہوں، اور کسی مستحق کو زیادہ سے زیادہ دینے میں نہ اس کو اپنے تہی دست رہ جانے کا خوف ہو، نہ اس کا اندیشہ کہ دوسرا ہم سے لے کر کہیں مدمقابل نہ بن جائے یا آگے چل کر ہمیں دبانہ لے، خداوند قدوس تھڑ دلے انسان کی طرح (العیاذ باللہ) تنگ دل واقع نہیں ہوا، جیسے اگر فرض کرو خزائن رحمت کا مالک مختار بنادیا جائے تب بھی اپنی طبیعت سے بخل وتنگ دلی نہ چھوڑے اور کسی مستحق کو دینے سے اس لیے گھبرائے کہ کہیں سارا خرچ نہ ہو جائے اور میں خالی ہاتھ نہ رہ جاؤں یا جس پر آج خرچ کرتا ہوں کل میری ہمسری نہ کرنے لگے، بہرحال اگر رحمت الٰہیہ کے خزانے تمہارے قبضہ میں ہوتے تو تم کسے دینے والے تھے اور کہاں گوارا کر سکتے تھے کہ مکہ وطائف کے بڑے بڑے متکبر دولت مندوں کو چھوڑ کر وحی ونبوت کی یہ بیش بہا دولت ''بنی ہاشم'' کے ایک دریتیم کو مل جائے، یہ حق تعالیٰ کا فیض ہے کہ جس میں جیسی استعداد وقابلیت دیکھی اس کے مناسب کمالات وانعامات کے خزانے انڈیل دیے، تمہارے تعنت وتعصب سے خدا کا فضل رکنے والا نہیں، محمد ﷺ کے طفیل میں جو خزائن آپ کے اتباع کو ملنے والے ہیں مل کر رہیں گے اور پیغمبر ﷺ اور ان کے پیرو دریا دلی سے اس دولت کو بنی نوع انسان پر خرچ کریں گے تمہاری طرح تنگ دلی نہیں دکھائیں گے۔

| |
|---|
| وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِذْ جَاۗءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ |
| اور ہم نے دیں موسیٰ کو نو نشانیاں صاف پھر پوچھ بنی اسرائیل سے جب آیا وہ ان کے پاس۱ تو کہا اس کو فرعون نے |
| اِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ﴿۱۰۱﴾ |
| میری اٹکل میں تو موسیٰ تجھ پر جادو ہوا۲ |

**خلاصہ تفسیر:** گزشتہ آیات میں رسالت محمدیہ اور دلیل رسالت یعنی اعجاز قرآن اور کفار کے عناد کا بیان تھا، آگے نظیر کے طور پر موسیٰ علیہ السلام کی رسالت اور ان کے معجزات اور فرعون کے عناد کا بیان ہے، جس سے فرمائشی معجزات کے ظاہر نہ ہونے کی حکمت بھی معلوم ہو جائے گی کہ یہ لوگ بھی فرعون کی طرح ضرور انکار کرتے اور عذاب کے مستحق ہوتے، اور تسلی کے لیے فرعون کے عناد اور بنی اسرائیل کے صبر کا انجام مذکور ہے، اس کے بعد پھر اصلی مدعا یعنی اثبات رسالت اور دلیل رسالت کا بیان ہوگا۔

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کھلے ہوئے نو معجزے دیئے (جن کا ذکر سورہ اعراف آیت ۱۳۰ تا ۱۳۳ میں گزر چکا ہے) جبکہ وہ بنی اسرائیل کے پاس آئے تھے، سو آپ بنی اسرائیل سے (بھی چاہے) پوچھ دیکھئے (اور چونکہ آپ فرعون کی طرف بھی بھیجے گئے تھے اور فرعون و آل فرعون کے ایمان نہ لانے سے وہ عجائبات معجزات ظاہر ہوئے تھے اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دوبارہ ایمان لانے کے لئے یاددہانی کی اور ان آیات بینات سے ڈرایا) تو فرعون نے ان سے کہا کہ اے موسیٰ میرے خیال میں تو ضرور تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے (جس سے تمہاری عقل مخبوط ہوگئی کہ ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو)۔

ترمذی کی حدیث میں یہود کا نو آیات کی بابت سوال کرنا اور آپ ﷺ کا جواب میں نو احکام بیان فرمانا مذکور ہے، لیکن آیت میں بظاہر معجزات میں کلام ہے، اس لیے احکام مراد لینا سیاق کلام سے بعید ہے، پس حدیث کے معنی احقر کے نزدیک یہ ہیں کہ حضور ﷺ نے ان معجزات کو بیان کر کے احکام بھی حکیمانہ جواب کے طریقہ پر بیان فرما دیے، راوی نے احکام کو ضروری سمجھ کر معجزات کا مضمون کلام سے حذف کر دیا، واللہ اعلم۔
چونکہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے متبوع اور پیشوار ہے اس لیے إِذْ جَآءَهُمْ میں بنی اسرائیل کی تخصیص کی۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی جیسے آپ ﷺ کو فضل و رحمت سے قرآن عظیم دیا اور بہت کچھ مہربانیاں آپ ﷺ پر فرمائیں، ہم پہلے موسیٰ علیہ السلام کو صداقت کے نو کھلے ہوئے نشانات (معجزات) ان کے مناسب حال عنایت فرما چکے ہیں جب کہ وہ ''بنی اسرائیل'' کے پاس فرعون کے مظالم سے نجات دلانے کے لیے تشریف لائے تھے، اگر چاہو تو ''بنی اسرائیل'' کے باخبر اور منصف مزاج علماء سے پوچھ دیکھو کہ یہ واقعہ یہاں تک صحیح ہے۔

**تنبیہ:** وہ نو معجزات یہ ہیں: ① ید بیضا ② عصا ③ سنین ④ نقص ثمرات ⑤ طوفان ⑥ جراد ⑦ قمل ⑧ ضفادع ⑨ دم، سورہ اعراف آیت فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ آيَاتٍ مُّفَصَّلَاتٍ کے فوائد میں ہم اس کی تفصیل کر چکے ہیں ملاحظہ کر لی جائے۔

مسند احمد اور ترمذی وغیرہ کی ایک حدیث میں ہے کہ یہود نے آپ ﷺ سے ''تسع آیات'' کے متعلق سوال کیا آپ ﷺ نے فرمایا وہ یہ احکام ہیں: ① شرک نہ کرو ② چوری نہ کرو ③ زنا نہ کرو ④ ناحق خون مت کرو ⑤ جادو نہ کرو ⑥ سود مت کھاؤ ⑦ بے گناہ کو مت پکڑ واؤ کہ حاکم اسے قتل کر دے ⑧ عفیف عورتوں پر تہمت نہ لگاؤ ⑨ جہاد میں سے مت بھاگو، نو حکم تو یہ ہوئے جن کے سب لوگ مخاطب ہو سکتے ہیں ⑩ دسواں حکم (اے یہود!) تمہارے لیے مخصوص تھا کہ سبت (شنبہ) کے دن حد سے نہ گزرو، یہود نے سن کر آپ ﷺ کی تصدیق کی۔

حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں نکارت ہے جو غالباً اس کے راوی عبداللہ بن سلمہ کی طرف سے آئی ہے، قرآن کا نظم و سیاق ہرگز اس کو نہیں چاہتا کہ: وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ تِسْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ الخ سے مراد یہ نو احکام لیے جائیں، آگے فرعون اور موسیٰ کا مکالمہ جو "**فقال له**" سے نقل فرمایا، مقتضی ہے کہ "آیات" سے وہ نشانات مراد ہوں جو بطور دلائل و حجج کے فرعونیوں کو دکھلائے گئے تھے، چنانچہ لفظ **بصآئر** بھی انہی پر زیادہ چسپاں ہوتا ہے اور پہلے سے اہل مکہ کے تعنت اور آیات طلب کرنے کا جو ذکر آ رہا ہے اس کے مناسب بھی یہ ہی ہے کہ یہاں فرعونیوں کا تعنت آیات کونیہ کے متعلق دکھلایا جائے، بہر حال ابن کثیرؒ کا خیال یہ ہے کہ یہود نے سوال شاید ''تسع آیات'' کی نسبت نہیں بلکہ ان دس آیات کی نسبت کیا ہوگا جو تورات کے شروع میں بطور وصایا لکھے جاتے تھے، چنانچہ حدیث میں دس ہی چیزیں مذکور ہیں، راوی حدیث کو التباس و اشتباہ ہو گیا، اس نے ''کلمات عشر'' کی جگہ ''تسع آیات'' کو ذکر کر دیا، اور ممکن ہے سوال ''آیات تسعہ'' سے کیا گیا ہو، لیکن آپ ﷺ نے جواب علی اسلوب الحکیم دیا، گویا تنبیہ کر دی

کہ نو معجزات کا معلوم کرنا تمہارے حق میں چنداں مفید اور اہم نہیں بلکہ ان دس احکام کا یاد رکھنا زیادہ اہم ہے، واللہ اعلم۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی کسی نے تجھ پر جادو کر دیا ہے جس سے معاذ اللہ عقل خراب ہوگئی، اسی لیے بہکی بہکی باتیں کرتا ہے دوسری جگہ ہے: اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِیْٓ اُرْسِلَ اِلَیْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ گویا مسحور سے مراد مجنون ہے اور بعض نے مسحور کو بمعنی ساحر لیا ہے، واللہ اعلم۔

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ وَاِنِّیْ لَاَظُنُّكَ

بولا تو جان چکا ہے کہ یہ چیزیں کسی نے نہیں اتاریں مگر آسمان اور زمین کے مالک نے سجھانے کو (سمجھانے کے واسطے) اور میری اٹکل میں

یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۲﴾ فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِیْعًا ﴿۱۰۳﴾

فرعون تو غارت ہوا چاہتا ہے ۱؎ پھر چاہا کہ بنی اسرائیل کو چین نہ دے اس زمین میں پھر ڈبا دیا ہم نے اس کو اور اسکے ساتھ والوں کو سب کو ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا تو (دل میں) خوب جانتا ہے (اگرچہ عار کی وجہ سے زبان سے اقرار نہیں کرتا) کہ یہ عجائبات خاص آسمان اور زمین کے پروردگار ہی نے بھیجے ہیں جو کہ بصیرت کے لئے (کافی) ذرائع ہیں، اور میرے خیال میں ضرور تیری کم بختی کے دن آگئے ہیں (یا تو فرعون کی یہ حالت تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کی درخواست پر بھی بنی اسرائیل کو مصر سے جانے کی اجازت نہ دیتا تھا اور) پھر (یہ ہوا کہ) اس نے (اس احتمال سے کہ کہیں بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کے اثر سے قوت نہ پکڑ جائیں خود ہی) چاہا کہ بنی اسرائیل کا اس سرزمین سے قدم اکھاڑ دے (یعنی ان کو شہر بدر کر دے) سو ہم نے (قبل اس کے کہ وہ کامیاب ہو خود) اس (ہی) کو اور جو اس کے ساتھ تھے سب کو غرق کر دیا۔

وَاِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا: اگر یہ شفقت کے لہجے میں کہا ہو تو ''قول لیّن'' کے خلاف نہیں ہے، اس میں دلالت ہے کہ ترکی بہ ترکی جواب دینا اخلاق کے خلاف نہیں، البتہ یہ ضروری ہے کہ اس وقت چشم پوشی میں مصلحت نہ ہو (ورنہ چشم پوشی اختیار کر لی جائے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی گو زبان سے انکار کرتا ہے مگر تیرا دل خوب جانتا ہے کہ یہ عظیم الشان نشان تیری آنکھیں کھولنے کے لیے اسی خدائے قادر و توانا نے دکھلائے ہیں جو آسمان و زمین کا سچا مالک ہے، اب جو شخص جان بوجھ کر محض ظلم و تکبر کی راہ سے حق کا انکار کرے اس کی نسبت بجز اس کے کیا خیال کیا جا سکتا ہے کہ تباہی کی گھڑی اس کے سر پر آپہنچی، یہاں سے معلوم ہوا کہ ''ایمان'' جاننے کا نام نہیں، ماننے کا نام ہے: وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَیْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا

**فائدہ:** ۲؎ جب فرعون نے دیکھا کہ موسیٰ کا اثر بڑھتا جاتا ہے، سمجھا کہ بنی اسرائیل کہیں زور نہ پکڑ جائیں اس لیے ان کو اور زیادہ ستانا شروع کیا کہ یہ مصر میں امن چین سے رہنے نہ پائیں، آخر ہم نے اسی کو نہ رہنے دیا اور بحر قلزم میں سب ظالموں کا بیڑہ غرق کر دیا۔

وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِیْفًا ﴿۱۰۴﴾

اور کہا ہم نے اس کے پیچھے بنی اسرائیل کو آباد رہو تم زمین میں پھر جب آئے گا وعدہ آخرت کا لے آئیں گے ہم تم کو سمیٹ کر

**خلاصہ تفسیر:** اور اس (کے غرق کرنے) کے بعد ہم نے بنی اسرائیل کو کہہ دیا کہ (اب) تم اس سرزمین (کے مالک ہو جہاں سے فرعون تم کو نکالنا چاہتا تھا، تم ہی اس) میں رہو سہو (خواہ بالقوہ یا بالفعل، مگر یہ ملکیت دنیا کی زندگی تک ہے) پھر جب آخرت کا وعدہ آجائے گا تو ہم سب کو جمع کر کے (قیامت کے میدان میں بطور محکوم و مملوک) لا کر حاضر کریں گے (یہ ابتدا میں ہوگا، پھر مومن و کافر اور نیک و بد کو الگ الگ کر دیا جائے گا)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی خدا نے ظالم کی جڑ کاٹ دی اور تم کو غلامی سے نجات دی، اب مصر وشام میں جہاں چاہو آزادی سے رہو، جب قیامت آئے گی پھر ایک مرتبہ تم سب کو اور تمہارے تباہ شدہ دشمنوں کو اکٹھا کر کے شقی وسعید اور ہالک وناجی کا دائمی فیصلہ کر دیا جائے گا۔

وقف لازم

وَبِالْحَقِّ أَنْزَلْنَٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ۗ وَمَآ أَرْسَلْنَٰكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ﴿١٠٥﴾

اور سچ کے ساتھ اتارا ہم نے قرآن اور سچ کے ساتھ اترا۔ اور تجھ کو جو بھیجا ہم نے سو خوشی اور ڈر سنانے کو ۲۔

**خلاصہ تفسیر:** اور (جس طرح ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو معجزے دیئے، اسی طرح آپ کو بھی بہت سے معجزات دیئے جن میں عظیم الشان معجزہ قرآن ہے کہ) ہم نے اس قرآن کو راستی ہی کے ساتھ تو نازل کیا، اور وہ راستی ہی کے ساتھ (آپ پر) نازل ہو گیا (یعنی جیسا کاتب کے پاس سے چلا تھا اسی طرح مکتوب الیہ تک پہنچ گیا، درمیان میں کوئی تغیر وتبدل نہیں ہوا، پس وہ سراسر راستی ہی راستی ہے) اور (جس طرح ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر بنایا تھا اور ہدایت ان کے اختیار میں نہ تھی اسی طرح) ہم نے آپ کو (بھی) صرف (ایمان پر ثواب کی) خوشی سنانے والا اور (کفر پر عذاب سے) ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے (اگر کوئی ایمان نہ لائے تو کچھ غم نہ کیجئے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ موسیٰ علیہ السلام کے معجزات وغیرہ کا ذکر فرما کر روئے سخن پھر قرآن کریم کی طرف پھیر دیا گیا، یعنی معجزات موسوی بجائے خود تھے، لیکن محمد ﷺ کو جو معجزات باہرہ عطا ہوئے ان میں سب سے بڑا علمی معجزہ یہ قرآن کریم ہے جو ہم نے عین حکمت کے موافق، اپنے علم عظیم اور اعلیٰ درجہ کی سچائی پر مشتمل کر کے اتارا ہے اور ٹھیک اسی سچائی کے ساتھ وہ آپ تک پہنچ گیا، درمیان میں ادنیٰ ترین تغیر وتبدل بھی نہیں ہوا: فَاعْلَمُوٓا أَنَّمَآ أُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَأَنْ لَّآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ فَهَلْ أَنْتُمْ مُّسْلِمُونَ

**فائدہ:** ۲ یعنی ماننے والوں کو خوشخبری اور نہ ماننے والوں کو عذاب الٰہی کی دھمکی سنا دیجئے۔

وَقُرْآنًا فَرَقْنَٰهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَىٰ مُكْثٍ وَنَزَّلْنَٰهُ تَنْزِيلًا ﴿١٠٦﴾

اور پڑھنے کا وظیفہ کیا ہم نے قرآن کو جدا جدا کر کے پڑھے تو اس کو لوگوں پر ٹھہر ٹھہر کر اور اس کو ہم نے اتارتے اتارتے اتارا

**خلاصہ تفسیر:** اور قرآن (میں صفت راستی کے ساتھ اور بھی ایسی صفات کی رعایت کی گئی ہے کہ اس سے ہدایت زیادہ آسان ہو جائے، چنانچہ ایک صفت تو یہ کہ اس) میں ہم نے (آیات وغیرہ کا) جا بجا فصل رکھا تا کہ آپ اس کو لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں (جس میں وہ اچھی طرح سمجھ سکیں، کیونکہ مسلسل طویل تقریر بعض اوقات ضبط میں نہیں آتی) اور (دوسری صفت یہ کہ) ہم نے اس کو اتارنے میں بھی (حسب واقعات اور ضرورت کے موافق) تدریجاً اتارا (یعنی تھوڑا تھوڑا نازل کیا تا کہ معانی کا خوب انکشاف ہو)۔

* * *

**فائدہ:** انزالِ قرآن سے مقصود اصلی مطلب سمجھ کر اس پر عمل کرنا ہے جسے تدبر وتذکر کہتے ہیں، لیکن اس کے نفس الفاظ وحروف بھی نور وبرکت سے خالی نہیں: كِتَٰبٌ أَنْزَلْنَٰهُ إِلَيْكَ مُبَٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوٓا آيَٰتِهِۦ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُوا الْأَلْبَٰبِ اسی لیے سورتیں اور آیتیں جدا جدا رکھیں تا کہ وظیفہ کے طور پر تلاوت کرنا بھی سہل ہو اور سننے والوں کے لیے حفظ وفہم میں بھی آسانی رہے، اور آہستہ آہستہ اس لیے اتارا کہ جیسے حالات پیش آئیں ان کے مناسب ہدایات حاصل کرتے رہیں، تا کہ وہ جماعت جسے آگے چل کر تمام دنیا کا معلم بننا تھا ہر آیت وحکم کے موقع محل کو بخوبی ذہن نشین کر کے یاد رکھ سکے اور آنے والی نسلوں کے لیے کسی آیت کے بے موقع استعمال کرنے کی گنجائش نہ چھوڑے۔

قُلۡ اٰمِنُوۡا بِهٖۤ اَوۡ لَا تُؤۡمِنُوۡا ؕ اِنَّ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ مِنۡ قَبۡلِهٖۤ اِذَا يُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ يَخِرُّوۡنَ

کہہ تم اس کو مانو یا نہ مانو، جن کو علم ملا ہے اس کے پہلے سے جب ان کے پاس اس کو پڑھیے گرتے ہیں

لِلۡاَذۡقَانِ سُجَّدًا ۙ ﴿۱۰۷﴾ وَّيَقُوۡلُوۡنَ سُبۡحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنۡ كَانَ وَعۡدُ رَبِّنَا لَمَفۡعُوۡلًا ﴿۱۰۸﴾ وَيَخِرُّوۡنَ لِلۡاَذۡقَانِ

ٹھوڑیوں پر سجدہ میں، اور کہتے ہیں پاک ہے ہمارا رب بیشک ہمارے رب کا وعدہ ہو کر رہے گا (ہونے والا ہے) ۱؎ اور گرتے ہیں ٹھوڑیوں پر

يَبۡكُوۡنَ وَيَزِيۡدُهُمۡ خُشُوۡعًا ۩ ﴿۱۰۹﴾

السجدۃ ۳

روتے ہوئے اور زیادہ ہوتی ہے ان کو عاجزی ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** (اب مذکورہ سب باتوں کا تقاضا یہ تھا کہ یہ لوگ ایمان لے آتے، لیکن اس پر بھی ایمان نہ لائیں تو آپ کچھ پروانہ کیجئے، بلکہ صاف) کہہ دیجئے کہ تم اس قرآن پر خواہ ایمان لاؤ یا ایمان نہ لاؤ (مجھے کوئی پرواہ نہیں دو وجہ سے: ① اول تو یہ کہ میرا کیا نقصان ② دوسرے یہ کہ تم ایمان نہ لائے تو کیا ہوا دوسرے لوگ ایمان لے آئے ہیں، چنانچہ) جن لوگوں کو قرآن (کے نزول) سے پہلے (دین کا) علم دیا گیا تھا (یعنی اہل کتاب کے منصف علماء) یہ قرآن جب ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں، اور کہتے ہیں ہمارا رب (وعدہ خلافی سے) پاک ہے بیشک ہمارے رب کا وعدہ ضرور پورا ہی ہوتا ہے (سو جس کتاب کا جس نبی پر نازل کرنے کا وعدہ کتب سابقہ میں کیا تھا اس کو پورا فرما دیا) اور ٹھوڑیوں کے بل (جو) گرتے ہیں (تو) روتے ہوئے (گرتے ہیں) اور یہ قرآن (یعنی اس کا سننا) ان کا (دلی) خشوع اور بڑھا دیتا ہے (کیونکہ ظاہر و باطن کی موافقت سے دلی کیفیت قوی ہو جاتی ہے)۔

**يَخِرُّوۡنَ لِلۡاَذۡقَانِ سُجَّدًا:** یہ سجدہ میں گرنا شکر کے طور پر ہے کہ سابقہ کتب میں آخری پیغمبر کی بابت جو وعدہ کیا تھا وہ پورا ہوا، یا یہ سجدہ تعظیم کے لیے ہے کہ قرآن سن کر ہیبت طاری ہوتی ہے، یا مجازاً سجدہ سے کمال اور خشوع مراد ہے، اور سجدہ چہرہ کے بل ہوتا ہے مگر ٹھوڑی کے بل کہنا مبالغہ کے لیے ہے کہ اپنے چہرے کو زمین اور خاک سے اس قدر لگا دیتے ہیں کہ ٹھوڑی زمین سے لگنے کے قریب ہو جاتی ہے۔

**وَيَخِرُّوۡنَ لِلۡاَذۡقَانِ يَبۡكُوۡنَ:** اس میں خشیت حق تعالیٰ کی وجہ سے رونے کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی مانو یا نہ مانو، قرآن کی حقانیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق وہ منصف مزاج اہل علم کر رہے ہیں جنہیں کتب سابقہ کی بشارات سے آگاہی ہے، وہ اس کلام کو سن کر ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں کہ سبحان اللہ کیا عجیب و غریب کلام ہے، بیشک خدا کا وعدہ پورا ہونا تھا جو موسیٰ علیہ السلام کی زبانی تورات کتاب استثناء میں کیا گیا تھا کہ (اے بنی اسرائیل!) میں تمہارے بھائیوں (بنی اسماعیل) میں سے ایک نبی اٹھاؤں گا جس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا، بلاشبہ وہ یہی کلام ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک میں ڈالا گیا، جب اہل علم کو قرآن کی تصدیق سے چارہ نہیں رہا، تب انکار کرنا جاہل کا کام ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی قرآن کو سن کر رقت طاری ہوتی ہے سجدہ کرتے ہیں تو اور عاجزی بڑھتی ہے، اذقان (ٹھوڑیوں) کے لفظ میں شاید اس طرف اشارہ ہو کہ سجود میں بہت زیادہ مبالغہ کرتے ہیں گویا ٹھوڑیاں بھی زمین سے ملا دیتے ہیں، یا محض سجود علی الوجہ سے کنایہ ہو، واللہ اعلم۔

قُلِ ادۡعُوا اللّٰهَ اَوِ ادۡعُوا الرَّحۡمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدۡعُوۡا فَلَهُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰى ۚ

کہہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمان کہہ کر، جو کہہ کر پکارو گے سو اسی کے ہیں سب نام خاصے ۱؎

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلًا ﴿١١٠﴾

اور پکار کر مت پڑھ اپنی نماز اور نہ چپکے پڑھ اور ڈھونڈ لے اس کے بیچ میں راہ ؏

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے متعدد آیات میں توحید کی تقریر تھی، اب سورت کے اختتام پر پھر اسی کے متعلق کچھ تحقیقات اور تعلیمات ہیں، چونکہ اس سورت کے شروع میں بھی حق تعالیٰ کی تنزیہہ اور توحید کا بیان تھا، سو اسی مضمون پر سورت کا اختتام ہونا لطافت وحسن کو دوبالا کر دیتا ہے، اس آیت کا نزول چند واقعات کی بناء پر ہوا، اول یہ کہ آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز دعا میں ''یا اللہ'' اور ''یا رحمن'' کہہ کر پکارا، مشرکین نے اعتراض کیا کہ ہمیں تو دو معبودوں کے پکارنے سے منع کرتے ہیں اور خود دُو معبودوں کو پکارتے ہیں، اس کا جواب آیت کے پہلے حصہ میں دیا گیا، دوسرا قصہ یہ ہے کہ جب مکہ مکرمہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں بلند آواز سے تلاوت قرآن فرماتے تو مشرکین تمسخر واستہزاء کرتے اور قرآن، جبرائیل امین اور خود حق تعالیٰ کی شان میں گستاخانہ باتیں کہتے تھے، اس کے جواب میں اسی آیت کا آخری حصہ نازل ہوا۔

آپ فرما دیجئے کہ خواہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمن کہہ کر پکارو جس نام سے بھی پکارو گے (تو بہتر ہے کیونکہ) اس کے بہت سے اچھے اچھے نام ہیں (اور اس کا شرک سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ ایک ہی ذات کے کئی نام ہونے سے اس کی توحید میں کوئی فرق نہیں آتا، شرک جب ہوتا کہ ذات بھی متعدد ہوتی) اور اپنی جہری نماز میں نہ تو بہت پکار کر پڑھیے (کہ مشرکین سنیں اور خرافات بکیں اور نماز میں دل پریشان ہو) اور نہ بالکل ہی آہستہ پڑھیے (کہ مقتدی نمازیوں کو بھی سنائی نہ دے، کیونکہ اس سے ان کی تعلیم وتربیت میں کمی آتی ہے) اور دونوں کے درمیان ایک (متوسط) طریقہ اختیار کر لیجئے (تاکہ مصلحت فوت نہ ہو اور مضرت پیش نہ آئے)۔

**وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ:** خلاصہ تفسیر میں نماز کے ساتھ ''جہری'' کی قید لگائی، اس کی وجہ ظاہر ہے، کیونکہ اس میں جہر سے مشرکین کے سننے اور بکنے کا احتمال تھا، اور **وَلَا تَجْهَرْ** کی وضاحت میں جو یہ کہا کہ ''نماز میں دل پریشان ہو'' اس کی وجہ یہ ہے کہ تبلیغ کے وقت اس نقصان کا اعتبار نہیں، کیونکہ وہاں بغیر سنائے غرض حاصل نہیں ہوتی، پس تبلیغ کے وقت تو سنانا ضروری ہے، اور اس ضرورت کے لیے اس نقصان کو برداشت کیا جائے گا، بخلاف نماز کے کہ یہاں سنانے سے غرض یعنی حضور قلب ہوتا ہے اس لیے منع کیا گیا۔

* * *

**فائدہ:** ؎ سجود وخشوع وغیرہ کی مناسبت سے یہاں دعا، (خدا کو پکارنے) کا اور دعاء کی مناسبت سے اگلی آیت میں صلوٰۃ کا ذکر کیا گیا، واقعہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے ناموں میں سے مشرکین عرب کے یہاں اسم ''اَللّٰہ'' کا استعمال زیادہ تھا، اسم ''رحمن'' سے چنداں مانوس نہ تھے، البتہ یہود کے یہاں اسم ''رحمن'' بکثرت مستعمل ہوتا تھا، عبرانی میں بھی یہ نام اسی طرح تھا جیسے عربی میں، دوسری طرف مسیلمہ کذاب نے اپنا لقب ''رحمان الیمامہ'' رکھ چھوڑا تھا، غرض مشرکین حق تعالیٰ پر اسم ''رحمن'' اطلاق کرنے سے بدکتے اور وحشت کھاتے تھے، چنانچہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ''رحمان'' سنتے تو کہتے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو تو دو خداؤں کا پکارنے سے منع کرتے ہیں اور خود اللہ کے سوا دوسرے خدا (رحمان) کو پکارتے ہیں، یہود کو یہ شکایت تھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں ''رحمان'' کا ذکر ایسی کثرت سے کیوں نہیں ہوتا جس طرح ہمارے یہاں ہوتا ہے، دونوں کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے کہ ''اَللّٰہ'' اور ''رحمن'' ایک ہی ذات منبع الکمالات کے دو نام ہیں، صفات واسماء کے تعدد سے ذات کا تعدد لازم نہیں ہوتا، جو یہ چیز توحید کے منافی سمجھی جائے، رہی یہ بات کہ کسی ایک نام کا ذکر کثرت سے کیوں نہیں ہوتا تو سمجھ لو کہ اللہ کے جس قدر اسمائے حسنیٰ ہیں ان میں سے کوئی نام لے کر پکار و مقصود ایک ہی ہے، عنوانات وتعبیرات کے تنوع سے معنون نہیں بدلتا، ہاں یہ ضرور ہے کہ ''ہر سخن وقتے وہر نکتہ مکانے دارد'' عِبَارَاتُنَا شَتّٰی وَحُسْنُكَ وَاحِدٌ وَكُلٌّ اِلٰی ذَاكَ الْجَمَالِ يُشِيْرُ۔

**فائدہ:** ؎ یعنی جہری نماز میں (اور اسی طرح دعاء وغیرہ میں) بہت زیادہ چلانا بھی نہیں اور بالکل دبی آواز بھی نہیں بیچ کی چال پسند ہے (موضح القرآن) احادیث میں ہے کہ مکہ میں جب قرأت زور سے کی جاتی تو مشرکین سن کر قرآن اور اس کے بھیجنے والے اور لانے والے کی شان میں

بدزبانی کرتے تھے، اس لیے آپ نے بہت آہستہ پڑھنا شروع کر دیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، یعنی نہ اس قدر زور سے پڑھو کہ مشرکین اپنی مجالس میں سنیں (تبلیغ کا وقت مستثنیٰ ہے، کیونکہ وہاں تو سنانا ہی مقصود ہے) اور نہ اتنا آہستہ کہ خود تمہارے ساتھی بھی سن کر مستفید نہ ہو سکیں، افراط و تفریط چھوڑ کر میانہ روی اختیار کرو، اس سے قلب متاثر ہوتا ہے اور تشویش نہیں ہوتی۔

| |
|---|
| وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ |
| اور کہہ سب تعریفیں (خوبیں) اللہ کو جو نہیں رکھتا اولاد اور نہ کوئی اس کا ساجھی سلطنت میں |
| ع ١٢ ١١ ١٢ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴿١١١﴾ |
| اور نہ کوئی اس کا مددگار ذلت کے وقت پر اور اس کی بڑائی کر بڑا جان کر |

**خلاصہ تفسیر:** یہود و نصاریٰ اللہ کیلئے اولاد قرار دیتے تھے، عرب بتوں کو اللہ کا شریک کہتے تھے، مجوسی اور صائبین کہتے تھے کہ اگر اللہ کے لیے مخصوص مقرب نہ ہوں تو نعوذ باللہ اس کی قدر و عزت کم ہو جائے گی ان تینوں فرقوں کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔

اور (کفار پر رد کرنے کے لئے علی الاعلان) کہہ دیجئے کہ تمام خوبیاں اسی اللہ کے لئے (خاص) ہیں جو نہ اولاد رکھتا ہے، نہ اس کا کوئی شریک سلطنت ہے، اور نہ کمزوری کی وجہ سے کوئی اس کا مددگار ہے، اور اس کی خوب بڑائی بیان کیا کیجئے۔

الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا: دنیا میں جس سے مخلوق کو کسی قدر قوت پہنچا کرتی ہے وہ کبھی تو اپنے سے چھوٹا ہوتا ہے جیسے اولاد، اور کبھی اپنے برابر ہوتا ہے جیسے شریک، اور کبھی اپنے سے بڑا ہوتا ہے جیسے حامی، مددگار و ناصر، حق تعالیٰ نے ترتیب وار سب کی نفی فرمادی، کیونکہ یہاں اصل ہی کی گنجائش نہیں، یعنی وہ خود ایسے قوی ہیں کہ کسی سے قوت حاصل کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا: اس سورت کو تسبیح یعنی سبحٰن الذی سے شروع کیا اور تحمید و تکبیر پر ختم کیا، پس **سبحان اللہ والحمد للہ واللہ اکبر** کے معانی پر افتتاح اور اختتام ہوا، واللہ اعلم۔

* * *

**فائدہ:** نماز کے بعد توحید خالص کا ذکر فرما کر سورت کو ختم کیا، یعنی ساری خوبیاں اور تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو اپنی ہر صفت و کمال میں یگانہ ہے اور ہر قسم کے عیب و قصور اور نقص و فتور سے بکلی منزہ ہے، یا مساوی سے جیسے ایک شریک کو دوسرے شریک سے مدد پہنچتی ہے، یا بڑے سے، جس طرح کمزور آدمی ذلت و مصیبت کے وقت بڑے آدمیوں سے مدد لیتے ہیں، اس آیت میں تینوں کی نفی کر دی، گویا لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا میں پہلے احتمال کی لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ میں دوسرے کی، اور لَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ میں تیسرے کی نفی کرنے کے بعد كَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا میں اس کی عظمت و کبریائی کی طرف متوجہ فرمادیا، یعنی انسان کو چاہیے کہ حق تعالیٰ کی بڑائی کا زبان و دل سے اقرار کرے اور ہر طرح کی کمزوریوں سے رفیع و برتر سمجھے۔

اور لطف یہ ہے کہ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا میں نصاریٰ کا، لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ میں مشرکین کا اور وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ میں ان یہود کا رد ہو گیا جن کے یہاں خدا تعالیٰ کشتی میں یعقوب علیہ السلام کے مقابلہ کی تاب نہیں لاسکا (العیاذ باللہ)۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''کوئی مددگار نہیں ذلت کے وقت، یعنی اس پر کبھی ذلت ہی نہیں کہ مددگار چاہے، بادشاہوں کے ہاں امیر زیر پڑ جاتے ہیں اس لیے کہ برے وقت ان کی رفاقت کیے ہوتے ہیں وہاں یہ قصہ ہی نہیں''۔

(ایاتھا ۱۱۰) (۱۸ سُوْرَةُ الْكَهْفِ مَكِّيَّةٌ ٦٩) (رکوعاتھا ۱۲)

**خلاصہ تفسیر:** گذشتہ سورت کا اختتام اور اس سورت کا آغاز حمد باری تعالی سے ہونا دونوں میں مناسبت کے لیے کافی ہے، اس سورت میں یہ مضامین ہیں: مباحث توحید و رسالت، دنیا کا فانی و حقیر ہونا، آخرت میں جزا و سزا، تکبر اور بحث وجدال کی مذمت، شرک کا باطل ہونا، رسالت، توحید اور بعث کے اثبات پر دلالت کرنے والے بعض قصے اور واقعات، اور ان سب کے درمیان باہمی ربط ظاہر ہے کہ ان سب مضامین کو ایمان کے حصول میں دخل ہے۔

حافظ ابن جریر طبریؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے اس سورت کا شان نزول یہ نقل کیا ہے کہ مکہ مکرمہ کے کچھ سرداروں نے دو آدمی مدینہ منورہ کے یہودی علماء کے پاس یہ معلوم کرنے کے لیے بھیجے کہ تورات اور انجیل کے یہ علماء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ یہودی علماء نے ان سے کہا کہ آپ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین سوالات کیجیے، اگر وہ ان کا صحیح جواب دے دیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ واقعی اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں اور اگر وہ صحیح جواب نہ دے سکے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کا نبوت کا دعوی صحیح نہیں ہے، ① پہلا سوال یہ تھا کہ ان نو جوان کا وہ عجیب واقعہ بیان کریں جو کسی زمانے میں شرک سے بچنے کے لیے اپنے شہر سے نکل کر کسی غار میں چھپ گئے تھے ② دوسرے اس شخص کا حال بتائیں جس نے مشرق سے مغرب تک پوری دنیا کا سفر کیا تھا ③ تیسرے ان سے پوچھیں کہ روح کی حقیقت کیا ہے؟ چنانچہ یہ دونوں شخص مکہ مکرمہ واپس آئے، اور اپنی برادری کے لوگوں کو ساتھ لے کر انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ تین سوال پوچھے، تیسرے سوال کا جواب تو پچھلی سورت کی آیت نمبر ۸۵ میں آچکا ہے، اور پہلے دو سوالات کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی جس میں غار میں چھپنے والے نو جوانوں کا واقعہ تفصیل سے بیان فرمایا گیا ہے، انہی کو ''اصحاب کہف'' کہا جاتا ہے، ''کہف'' عربی میں غار کو کہتے ہیں، اصحاب کہف کے معنی ہوئے غار والے، اور اسی غار کے نام پر سورت کو ''سورۃ الکہف'' کہا جاتا ہے، دوسرے سوال کے جواب میں اسی سورت کے آخر میں ذوالقرنین کا واقعہ بیان فرمایا گیا ہے، جنہوں نے مشرق و مغرب کا سفر کیا تھا۔

سورۃ کہف کی تلاوت کے فضائل احادیث میں آئے ہیں، خاص طور پر جمعہ کے دن اس کی تلاوت کی بڑی فضیلت آئی ہے، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی مسند احمد میں حضرت ابوالدرداءؓ سے ایک روایت ہے کہ جس نے سورۃ کہف کی پہلی دس آیتیں یاد کر لیں وہ دجال کے فتنہ سے محفوظ ہو گیا، اور کتب مذکورہ میں حضرت ابوالدرداء ہی سے ایک دوسری روایت میں یہی مضمون سورہ کہف کی آخری دس آیتیں یاد کرنے کے متعلق منقول ہے، اور ایک روایت میں ہے کہ جس نے جمعہ کے دن سورۃ کہف پڑھ لی وہ آٹھ دن تک ہر فتنہ سے محفوظ رہے گا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۜ ①

سب تعریف اللہ کو جس نے اتاری اپنے بندہ پر کتاب اور نہ رکھی اس میں کچھ کجی

**خلاصہ تفسیر:** تمام خوبیاں اس اللہ کے لئے ثابت ہیں جس نے اپنے (خاص) بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر یہ کتاب نازل فرمائی، اور اس (کتاب) میں (کسی قسم کی) ذرا بھی کجی نہیں رکھی (نہ لفظی کجی ہے کہ مثلاً الفاظ تو ٹھیک ہوں مگر فصاحت و بلاغت میں کمی ہو، اور نہ معنوی خرابی ہے کہ مثلاً کلام میں تناقض ہو یا حکمت کے خلاف کوئی بات ہو)۔

**اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ:** اس میں دلالت ہے اس پر کہ انسان کے لیے مقام عبدیت سے بلند اور کوئی مقام نہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم مقام عبدیت کے اعلی مرتبہ میں ہیں، اگر اس سے بڑا درجہ کسی صفت کا ہوتا تو اللہ تعالی عبدیت کے بجائے اس کو ذکر فرما دیتے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی اعلیٰ سے اعلیٰ تعریف اور شکر کا مستحق وہ ہی خدا ہوسکتا ہے جس نے اپنے مخصوص ومقرب ترین بندے محمد رسول اللہ ﷺ پر سب سے اعلیٰ واکمل کتاب اتاری اور اس طرح زمین والوں کو سب سے بڑی نعمت سے مشرف وممتاز فرمایا، بیشک اس کتاب میں کوئی ٹیڑھی ترچھی بات نہیں، عبارت انتہائی سلیس وفصیح، اسلوب بیان نہایت موثر وشگفتہ، تعلیم نہایت متوسط ومعتدل جو ہر زمانہ اور ہر طبیعت کے مناسب اور عقل سلیم کے بالکل مطابق ہے، کسی قسم کی افراط وتفریط کا اس میں شائبہ نہیں۔

| |
|---|
| قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ |
| ٹھیک اتاری تا کہ ڈر سناوے ایک سخت آفت کا اللہ کی طرف سے ۱؎ اور خوشخبری دے ایمان لانے والوں کو جو کرتے ہیں نیکیاں |
| اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۝٢ مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ۝٣ |
| کہ ان کے لیے اچھا بدلہ ہے، جس میں رہا کریں ہمیشہ ۲؎ |

**خلاصہ تفسیر:** (بلکہ اس کتاب کو) بالکل استقامت کے ساتھ موصوف بنایا (اور نازل اس لئے کیا) تا کہ وہ (کتاب کافروں کو عموماً) ایک سخت عذاب سے جو من جانب اللہ (ان کو آخرت میں) ہوگا ڈرائے، اور اہل ایمان کو جو نیک کام کرتے ہیں یہ خوشخبری دے کہ ان کو (آخرت میں) اچھا اجر ملے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

**وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ:** نیک اعمال سے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی مقصود ہونی چاہیے، اور ایسے اعمال پر خوش خبری دینے کو کہا گیا ہے اور یہ بھی کہ نیک اعمال کا فائدہ اور ثمرہ تمہیں ہی ملے گا، اس میں اللہ تعالیٰ کا کوئی نفع نہیں، اسی لیے فرمایا کہ تمہارے اعمال صالحہ کی تمہیں ہی خوش خبری ہو۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی تکذیب کرنے والوں پر جو سخت آفت دنیا یا آخرت میں خداوند قہار کی طرف سے آنے والی ہے اس سے یہ کتاب آگاہ کرتی ہے۔

**تنبیہ:** قَيِّمًا کو بعض نے بمعنی مستقیم لے کر محض مضمون سابق کی تاکید قرار دی ہے یعنی کتنا ہی غور کرو ایک بال برابر کجی نہیں پاؤ گے مگر فراء نے اس لفظ کے معنی کیے ہیں: " قیماً علی سائر الکتب السماویہ" یعنی تمام کتب سماویہ کی صحت وتصدیق پر مہر کرنے والی اور ان کی اصولی تعلیمات کو دنیا میں قائم رکھنے والی، ابومسلم نے کہا " قیمًا بمصالح العباد" بندوں کی تمام مصالح کی متکفل اور ان کی معاش ومعاد کو درست کرنے والی، بہر حال جو معنی بھی لیے جائیں اس کی صداقت میں شبہ نہیں۔

**فائدہ:** ۲؎ بظاہر اس سے مراد آخرت کا بدلہ یعنی جنت ہے جہاں مومنین قانتین کو دائمی خوشی اور ابدی راحت ملے گی۔

| |
|---|
| وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝٤ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ ۭ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ |
| اور ڈر سناوے ان کو جو کہتے ہیں اللہ رکھتا ہے اولاد ۱؎ کچھ خبر نہیں ان کو اس بات کی اور نہ ان کے باپ دادوں کو، کیا بڑی بات نکلتی ہے |
| مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۭ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝٥ |
| ان کے منہ سے، سب جھوٹ ہے جو کہتے ہیں ۲؎ |

**خلاصہ تفسیر:** اور تا کہ (کفار میں سے بالخصوص) ان لوگوں کو (عذاب سے) ڈرائے جو یوں کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) اللہ

تعالیٰ اولاد رکھتا ہے (اور اولاد کا عقیدہ رکھنے والے کافروں کو عام کافروں سے الگ کر کے اس لئے بیان کیا کہ اس باطل عقیدہ میں عرب کے عام لوگ مشرکین، یہود، نصاریٰ سب ہی مبتلا تھے) نہ تو اس کی کوئی دلیل ان کے پاس ہے، اور نہ ان کے باپ دادوں کے پاس تھی، بڑی بھاری بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے (اور) وہ لوگ بالکل (ہی) جھوٹ بکتے ہیں (جو عقلا بھی ناممکن ہے، کوئی ادنیٰ عقل والا بھی اس کا قائل نہیں ہوسکتا)۔

* * *

**فائدہ:** لہ خدا کے لیے اولاد تجویز کرنے میں سب سے زیادہ مشہور اور پیش پیش تو نصاریٰ ہیں اور جیسا کہ احادیث سے ظاہر ہوتا ہے، ان ہی سے حاملین قرآن کو قیامت تک زیادہ سابقہ پڑنا ہے، تاہم عموم الفاظ میں بعض فرق یہود جو عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا، یا بعض مشرکین جو ملائکۃ اللّٰہ کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے وہ بھی داخل ہو گئے، گویا اس جگہ اولاد تجویز کرنے والے کافروں کو بالخصوص اور نصاریٰ کو اخص خصوص کے طور پر متنبہ کیا گیا ہے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی کوئی تحقیق اور علمی اصول ان کے ہاتھ میں نہیں نہ ان کے باپ دادوں کے ہاتھ میں تھا، جن کی اندھی تقلید میں ایسی بھاری بات زبان سے نکال رہے ہیں، گویا خداوند تعالیٰ کی شان قدوسیت وسبوحیت کی ان لوگوں کو کچھ خبر نہیں جو اس کی جناب میں ایسی گستاخیاں کرتے ہوئے ذرا نہیں شرماتے، دلائل و براہین کی جگہ ان کے ذخیرہ میں یہ ہی باقی رہ گیا ہے کہ زبان سے ایک جھوٹی اور بدیہہ البطلان بات کہتے چلے جائیں اور جب ثبوت مانگو تو کہہ دیں کہ یہ مذہب کا ایک راز ہے جس کے ادراک تک عقل انسانی کی رسائی نہیں۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ⑥

سو کہیں تو گھونٹ ڈالے گا اپنی جان کو ان کے پیچھے اگر وہ نہ مانیں گے اس بات کو پچھتا پچھتا کر

**خلاصہ تفسیر:** (اور آپ جو ان لوگوں کے کفر و انکار پر اتنا غم کرتے ہیں) سو (معلوم ہوتا ہے کہ) شاید آپ ان کے پیچھے اگر یہ لوگ اس مضمون (قرآنی) پر ایمان نہ لائے تو غم سے اپنی جان دے دیں گے (یعنی اتنا غم نہ کیجئے کہ ہلاکت کے قریب کر دے، وجہ یہ ہے کہ دنیا عالم امتحان ہے، اس میں ایمان و کفر اور خیر و شر دونوں کا مجموعہ ہی رہے گا، سبھی مومن ہو جائیں گے ایسا نہ ہوگا)۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ: اس میں اشارہ ہے حضور ﷺ کی مزید شفقت اور مخالفین کو موافق بنانے کے اہتمام کی طرف۔

* * *

**فائدہ:** یعنی اگر یہ کافر قرآن کی باتوں کو نہ مانیں تو آپ ان کے غم میں اپنے کو بالکل گھلائیے نہیں، آپ تبلیغ و دعوت کا فرض ادا کر چکے اور کر رہے ہیں، کوئی نہ مانے تو آپ کو اس قدر دل میں گھٹنے اور غمگین ہونے کی ضرورت نہیں، نہ پچھتانا مناسب ہے، کہ ہم نے ایسی کوشش کیوں کی جو کامیاب نہ ہو سکی، آپ تو بہر حال کامیاب ہیں، دعوت و تبلیغ اور شفقت و ہمدردی خلائق کے جو کام کرتے ہیں وہ آپ کے رفع مراتب اور ترقی مدارج کا ذریعہ ہیں، اشقیاء اگر قبول نہ کریں تو ان ہی کا نقصان ہے۔

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ⑦

ہم نے بنایا ہے جو کچھ زمین پر ہے اس کی رونق تا کہ جانچیں لوگوں کو کون ان میں اچھا کرتا ہے کام لہ

وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ⑧

اور ہم کو کرنا ہے جو کچھ اس پر ہے میدان چھانٹ (کاٹ چھانٹ) کر ۲

**خلاصہ تفسیر:** (چنانچہ اسی امتحان کے لئے) ہم نے زمین پر کی چیزوں کو اس (زمین) کے لئے باعث رونق بنایا، تا کہ ہم (اس کے ذریعہ) لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں سے زیادہ اچھا عمل کون کرتا ہے (اور کون اچھا عمل نہیں کرتا، اور ان کے کفر کا نتیجہ دنیا ہی میں ظاہر ہو جانے

کا انتظار نہ کیجئے کیونکہ وہ ہمارا کام ہے، ایک مقررہ وقت پر ہوگا، چنانچہ ایک روز وہ آئے گا کہ ) ہم زمین کی تمام چیزوں کو ایک صاف میدان (یعنی فنا) کردیں گے (نہ اس پر کوئی بسنے والا رہے گا، نہ کوئی درخت اور پہاڑ، اور نہ کوئی مکان وتعمیر، خلاصہ یہ ہے کہ آپ اپنا کام تبلیغ کا کرتے رہئے، منکرین کے انجام بد کا غم نہ کیجئے، یہ کام ہمارے متعلق ہے)۔

**مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ**: امتحان یہ ہے کہ کون اس دنیا کی زینت اور رونق پر مفتون ہو کر اللہ سے آخرت سے غافل ہو جاتا ہے اور کون اس پر فریفتہ نہ ہو کر حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے، غرض یہ کہ یہ عالم ابتلا وامتحان ہے، پس تکوینا ضروری ہوا کہ کوئی کفر میں مبتلا ہو اور کوئی مشرف بالایمان ہو، پھر غم بے کار ہے، آپ اپنا کام کیے جایئے اور ان کے کفر کے نتیجہ کی فکر میں نہ پڑیے، کیونکہ نتیجہ مرتب کرنا ہمارا کام ہے۔

**لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا**: اس ''حسن عمل'' میں یہ بھی داخل ہے کہ: ① ان اشیاء یعنی زمین، دریا، نہر، سمندر، درخت، پہاڑ اور معدنیات کو حق سبحانہ وتعالیٰ کے انوار جلال و جمال کے مشاہدہ کا آئینہ بنائے، یعنی آسمان وزمین کی تمام چھوٹی بڑی اشیا کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی صفات کا استحضار کرے ② ابن عطاءؒ نے فرمایا ہے کہ ''حسن عمل'' یہ ہے کہ تمام (حوادث) سے بے التفاتی کی جائے، یعنی ہر چیز سے نظر ہٹا کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائے حتی کہ مصائب وحوادث سے بھی متاثر نہ ہو ③ بعض نے کہا ہے کہ اہل معرفت ومحبت ''زمین کی زینت'' ہیں، اور ''حسن عمل'' ان کی طرف احترام کے ساتھ نظر کرنا ہے، یعنی روئے زمین پر جتنے اہل اللہ بستے ہیں ان کے ساتھ احترام ومحبت سے پیش آنا ''حسن عمل'' ہے۔

* * *

**فائدہ**: لے یعنی اس کی رونق پر دوڑتا ہے یا اسے چھوڑ کر آخرت کو پکڑتا ہے، بعض روایات میں ہے کہ ابن عمر نے سوال کیا یا رسول اللہ! ''اَحْسَنُ عَمَلًا'' کون لوگ ہیں؟ فرمایا: ''اَحْسَنُكُمْ عَقْلًا وَّاَوْرَعُكُمْ عَنْ مَحَارِمِ اللهِ وَاَسْرَعُكُمْ فِيْ طَاعَتِهٖ سُبْحَانَهٗ'' (جس کی سمجھ اچھی ہو، حرام سے زیادہ پرہیز کرے اور خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری کی طرف زیادہ جھپٹے)۔

**فائدہ**: ٢ یعنی ایک روز سب گھاس پھونس درخت وغیرہ چھانٹ کر زمین کو چٹیل میدان بنا دیا جائے گا، جو لوگ اس کے بناؤ سنگار پر ریجھ رہے ہیں وہ خوب سمجھ لیں کہ یہ زرق برق کوئی باقی رہنے والی چیز نہیں، دنیا کے زمینی سامان خواہ کتنے ہی جمع کرلو اور مادی ترقیات سے ساری زمین کو لالہ وگلزار بنا دو، جب تک آسمانی اور روحانی دولت سے تہی دست رہو گے، حقیقی سرور وطمانیت اور ابدی نجات وفلاح سے ہم آغوش نہیں ہو سکتے، آخری اور دائمی کامیابی انہی کے لیے ہے جو مولائے حقیقی کی خوشنودی پر دنیا کی ہر ایک زائل وفانی خوشی کو قربان کر سکتے ہیں اور راہ حق کی جادہ پیمائی میں کسی صعوبت سے نہیں گھبراتے نہ دنیا کے بڑے بڑے طاقتور جباروں کی تخویف وترہیب سے ان کا قدم ڈگمگاتا ہے، اسی سلسلہ میں آگے اصحاب کہف کا قصہ بیان فرمایا اور نبی کریم ﷺ کی تسلی بھی کر دی کہ آپ ان بدبختوں کے غم میں اپنے کو نہ گھلایئے، جس دنیا کی زندگی اور عیش وبہار پر مغرور ہو کر یہ حق کو ٹھکراتے ہیں وہ سب کاٹ چھانٹ کر برابر کر دی جائے گی اور آخر کار سب کو خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہوگا، اس وقت سارے جھگڑے چکا دیئے جائیں گے۔

| اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ⑨ |
| --- |
| کیا تو خیال کرتا ہے کہ غار اور کھوہ کے رہنے والے، ہماری قدرتوں میں عجب اچنبھا تھے |

**خلاصہ تفسیر**: پیچھے رسالت کے متعلق ذکر تھا، اب ایک قصہ بیان کیا جاتا ہے جس میں اصحاب کہف کا واقعہ مذکور ہے، یہ قصہ بھی رسالت کے دلائل میں سے ایک دلیل ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے کسی سے یہ مضامین نہیں سنے تھے اور پھر پورا جواب بھی دے دیا، چنانچہ قریش نے یہود کے سکھلانے سے امتحان نبوت ہی کے لیے تین سوال کیے تھے، ایک روح کے متعلق جس کا جواب گذشتہ سورت میں گزر چکا، دوسرا اصحاب کہف کا قصہ جو آگے بیان ہوتا ہے، تیسرا ذوالقرنین کا قصہ جو اس سورت کے آخر میں آئے گا، اب یہاں پہلے اصحاب کہف کے قصہ کی اجمالا تمہید ہے، پھر اس قصہ کا تفصیلی بیان ہے۔

کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ غار والے اور پہاڑ والے (یہ دونوں ایک ہی جماعت کے لقب ہیں) ہماری عجائبات (قدرت) میں سے کچھ تعجب کی چیز تھے۔

**اَصۡحٰبَ الۡكَهۡفِ وَالرَّقِيۡمِ**: یہ دونوں ایک ہی جماعت کے لقب ہیں، ''رقیم'' لغت میں پہاڑ کو بھی کہتے ہیں، چونکہ وہ غار پہاڑ میں تھا اس لیے ان کو ''اصحاب کہف'' اور ''اصحاب رقیم'' دونوں کہتے ہیں، اور بعض نے ''رقیم'' بمعنی مرقوم لیا ہے اور کہا ہے کہ لوگوں نے ان کے دوبارہ غار میں جانے کے وقت ان کے نام لکھ کر غار کے دہانہ پر لٹکا دیے تھے اس لیے ان کو اصحاب الرقیم کہتے ہیں، مگر کسی قوی روایت سے یہ بات ثابت نہیں، اس لیے قرآن کی تفسیر کو اس پر مبنی نہیں کیا گیا، البتہ ''رقیم'' بمعنی مرقوم کی یہ وجہ کہی جائے کہ ان کا واقعہ عجیب ہونے کی وجہ سے کتابوں میں لکھ لیا گیا تھا تو یہ وجہ پہلے سے زیادہ قریب ہے۔

**كَانُوۡا مِنۡ اٰيٰتِنَا عَجَبًا**: جیسا کہ یہود نے کہا تھا کہ ان کا واقعہ عجیب ہے، یا خود ہی سوال کرنے والے کفار قریش نے اپنی رائے وقیاس سے اس کو عجیب سمجھ کر سوال کیا تھا، غرض اس میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب بنا کر دوسروں کو سنانا مقصود ہے کہ یہ واقعہ بھی اگرچہ عجیب ضرور ہے مگر اللہ تعالیٰ کی دوسری عجائبات قدرت کے مقابلہ میں ایسا قابل تعجب نہیں جیسا ان لوگوں نے سمجھا ہے، کیونکہ زمین وآسمان اور چاند وسورج اور تمام کائنات زمین وآسمان کو عدم سے وجود میں لانا اصل عجائب میں سے ہے، چند نوجوانوں کا زمانہ دراز تک سوتے رہنا پھر بیدار ہونا اس کے مقابلہ میں کچھ عجیب نہیں، بلکہ تعجب تو ان مخالفین پر ہے جو اس واقعہ کو تو عجیب سمجھتے ہیں لیکن قدرت کی دیگر بڑی بڑی نشانیوں سے عبرت نہیں پکڑتے کہ صانع عالم کی کامل اطاعت بجالائیں جس کے لوازم میں سے رسالت کی تصدیق بھی ہے۔

* * *

**فائدہ**: یعنی حق تعالیٰ کی قدرت عظیمہ کے لحاظ سے اصحاب کہف کا قصہ جو آگے مذکور ہے کوئی اچنبھا نہیں جسے حد سے زیادہ عجیب سمجھا جائے، زمین، آسمان، چاند، سورج وغیرہ کا پیدا کرنا، ان کا محکم نظام قائم رکھنا، انسان ضعیف البنیان کو سب پر فضیلت دینا، انسانوں میں انبیاء کا بھیجنا، ان کی قلیل وبے سروسامان جماعتوں کو بڑے بڑے متکبرین کے مقابلہ میں کامیاب بنانا، خاتم الانبیاء اور رفیق غار حضرت ابوبکر صدیق کو دشمنوں کے نرغہ سے نکال کر ''غار ثور'' میں تین روز ٹھہرانا، کفار کا غار کے منہ تک تعاقب کرنا پھر انکو بے نیل ومرام واپس لوٹانا آخر گھر بار چھوڑنے والے مٹھی بھر بے سروسامانوں کو تمام جزیرۃ العرب بلکہ مشرق ومغرب میں اس قدر قلیل مدت کے اندر غالب ومنصور کرنا، کیا یہ اور اس قسم کی بیشمار چیزیں اصحاب کہف کے قصہ سے کم عجیب ہیں؟!، اصل یہ ہے کہ یہود نے قریش کو مشورہ دیا تھا کہ محمد ﷺ سے آزمائش کے لیے تین سوال کریں: ① روح کیا ہے؟ ② اصحاب کہف کا قصہ کیا تھا؟ ③ اور ذوالقرنین کی سرگزشت کیا تھی؟ اصحاب کہف کے قصہ کو عجیب ہونے کی حیثیت سے انہوں نے خاص اہمیت دی تھی، اسی لیے اس آیت میں بتلایا گیا کہ وہ اتنا عجیب نہیں جیسے تم سمجھتے ہو، اس سے کہیں بڑھ کر عجیب وغریب نشاناتِ قدرت موجود ہیں، آگے اصحاب کہف کا قصہ اول مجملاً پھر مفصلاً بیان فرمایا ہے۔

کہتے ہیں کہ یہ چند نوجوان روم کے کسی ظالم وجابر بادشاہ کے عہد میں تھے، جس کا نام بعض نے ''دقیانوس'' بتلایا ہے، بادشاہ سخت غالی بت پرست تھا اور جبر واکراہ سے بت پرستی کی اشاعت کرتا تھا، عام لوگ سختی اور تکلیف کے خوف اور چند روزہ دنیاوی منافع کی طمع سے اپنے مذاہب کو چھوڑ کر بت پرستی اختیار کرنے لگے اور اس وقت چند نوجوانوں کے دلوں میں جن کا تعلق عمائدین سلطنت سے تھا، خیال آیا کہ ایک مخلوق کی خاطر خالق کو ناراض کرنا ٹھیک نہیں، ان کے دل خشیت الٰہی اور نور تقویٰ سے بھرپور تھے، حق تعالیٰ نے انھیں صبر واستقلال اور توکل وتبتل کی دولت سے انھیں مالا مال کیا تھا، بادشاہ کے روبرو جا کر بھی انہوں نے لَنۡ نَّدۡعُوَا۟ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدۡ قُلۡنَاۤ اِذًا شَطَطًا کا نعرہ مستانہ لگایا اور ایمانی جرأت واستقلال کا مظاہرہ کر کے دیکھنے والوں کو مبہوت وحیرت زدہ کر دیا، بادشاہ کو کچھ ان کی نوجوانی پر رحم آیا اور کچھ دوسرے مشاغل ومصالح مانع ہوئے کہ انھیں فوراً قتل کر دے، چند روز کی مہلت دی کہ وہ اپنے معاملہ میں غور ونظر ثانی کر لیں، انہوں نے مشورہ کر کے طے کیا کہ ایسے فتنہ کے وقت جب کہ جبر وتشدد سے عاجز ہو کر قدم ڈگمگا

جانے کا بہرحال خطرہ ہے مناسب ہوگا کہ شہر کے قریب کسی پہاڑ میں روپوش ہوجائیں (اور واپسی کے لیے مناسب موقع کا انتظار کریں) دعا کی کہ خداوندا تو اپنی خصوصی رحمت سے ہمارا کام بنادے اور رشد و ہدایت کی جادہ پیمائی میں ہمارا سب انتظام درست کردے، آخر شہر سے نکل کر کسی قریبی پہاڑ میں پناہ لی اور اپنے میں سے ایک کو مامور کیا کہ بھیس بدل کر کسی وقت شہر میں جایا کرے تاکہ ضروریات خرید کر لاسکے اور شہر کے احوال واخبار سے سب کو مطلع کرتا رہے، جو شخص اس کام پر مامور تھا اس نے ایک روز اطلاع دی کہ آج شہر میں سرکاری طور پر ہماری تلاش ہے اور ہمارے اقارب واعزہ کو مجبور کیا جارہا ہے کہ ہمارا پتہ بتلائیں، یہ مذاکرہ ہورہا تھا کہ حق تعالیٰ نے ان سب پر دفعۃً نیند طاری کردی، کہا جاتا ہے کہ سرکاری آدمیوں نے بہت تلاش کیا پتہ نہ لگا، تھک کر بیٹھ رہے اور بادشاہ کی رائے سے ایک سیسہ کی تختی پر ان نوجوانوں کے نام اور مناسب حالات لکھ کر خزانہ میں ڈال دیئے گئے تاکہ آنے والی نسلیں یاد رکھیں کہ ایک جماعت حیرت انگیز طریقہ سے لاپتہ ہوگئی ہے، ممکن ہے آگے چل کر اس کا کچھ سراغ نکلے، اور بعض عجیب واقعات کا انکشاف ہو، یہ نوجوان کس مذہب پر تھے؟ اس میں اختلاف ہوا ہے بعض نے کہا کہ نصرانی یعنی اصل دین مسیحی کے پیرو تھے، لیکن ابن کثیرؒ نے قرائن سے اس کو ترجیح دی ہے کہ اصحاب کہف کا قصہ حضرت مسیح علیہ السلام سے پہلے کا ہے واللہ اعلم

**تنبیہ:** ''رقیم'' پہاڑی کی کھوہ کو کہتے ہیں اور بمعنی ''مرقوم'' بھی آتا ہے یعنی لکھی ہوئی چیز، مسند عبد بن حُمید کی ایک روایت میں جسے حافظ نے علیٰ شرط البخاری کہا ہے، ابن عباس سے ''رقیم'' کے دوسرے معنی منقول ہیں، یعنی ''اصحاب کہف'' اور ''اصحاب رقیم'' ایک ہی جماعت کے دولقب ہیں، غار میں رہنے کی وجہ سے ''اصحاب کہف'' کہلاتے ہیں اور چونکہ ان کے نام وصفت وغیرہ کی تختی لکھ کر رکھ دی گئی تھی، اس لیے ''اصحاب رقیم'' کہلائے، مگر مترجم محقق رحمہ اللہ نے پہلے معنی لیے ہیں اور بہرصورت ''اصحاب کہف'' و ''اصحاب رقیم'' کو ایک ہی قرار دیا ہے، بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ ''اصحاب رقیم'' کا قصہ قرآن میں مذکور نہیں ہوا، محض عجیب ہونے کے لحاظ سے اصحاب کہف کے تذکرہ میں اس کا حوالہ دے دیا گیا، اور فی الحقیقت اصحاب رقیم (کھوہ والے) وہ تین شخص ہیں جو بارش سے بھاگ کر ایک غار میں پناہ گزیں ہوئے تھے، اوپر سے ایک بڑا پتھر آپڑا، جس نے غار کا منہ بند کردیا اس وقت ان میں سے ہر شخص نے اپنی عمر کے مقبول ترین عمل کا حوالہ دے کر حق تعالیٰ سے فریاد کی اور بتدریج غار کا منہ کھل گیا، امام بخاری نے اصحاب کہف کا ترجمہ منعقد کرنے کے بعد ''حدیث الغار'' کا مستقل عنوان قائم کیا ہے اور اس میں ان تین شخصوں کا قصہ مفصل درج کرکے شاید اسی طرف اشارہ کردیا ہے کہ ''اصحاب رقیم'' یہ لوگ ہیں، طبرانی اور بزار نے باسنادِ حسن نعمان بن بشیر سے مرفوعاً روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ''رقیم'' کا ذکر فرماتے تھے اور یہ قصہ تین شخصوں کا بیان کیا، واللہ اعلم۔

| |
|---|
| اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ⑩ |
| جب جا بیٹھے وہ جوان پہاڑ کی کھوہ میں پھر بولے اے رب دے ہم کو اپنے پاس سے بخشش اور پوری کردے (بنادے) ہمارے کام کی درستی |
| فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ⑪ |
| پھر تھپک دیے ہم نے ان کے کان اس کھوہ میں چند برس گنتی کے |

**خلاصہ تفسیر:** (تمہید کے بعد اصحاب کہف کا قصہ اجمالاً اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ) وہ وقت قابل ذکر ہے جبکہ ان نوجوانوں نے (ایک بے دین بادشاہ کی پکڑ سے بھاگ کر) اس غار میں (جس کا قصہ آگے آتا ہے) جاکر پناہ لی، پھر (اللہ تعالیٰ سے اس طرح دعا مانگی) کہا کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو اپنے پاس سے رحمت کا سامان عطا فرمایئے، اور ہمارے (اس) کام میں درستی کا سامان مہیا کردیجئے (غالباً ''رحمت'' سے مراد حصول مقصود ہے، اور ''درستی'' کے سامان سے مراد وہ اسباب ومقدمات ہیں جو حصول مقصد کے لئے عادۃً ضروری ہوتے ہیں)۔

سو (اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول فرمایا، اور ان کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ان کی تمام پریشانیوں کو اس طرح دور کیا کہ) ہم نے اس غار

میں ان کے کانوں پر سالہا سال تک نیند کا پردہ ڈال دیا (یعنی ایسی گہری نیند سوئے کہ کوئی آواز ان کے کان میں نہ پہنچتی تھی، اس میں زیادہ مبالغہ ہے، کیونکہ آنکھوں کی بصارت تو نیند کے بغیر محض آنکھ بند کر لینے سے بھی معطل ہو جاتی ہے)۔

فَضَرَبْنَا عَلٰٓی اٰذَانِهِمْ: اس کے لفظی معنی کانوں کو بند کر دینے کے ہیں، گہری نیند کو ان الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، کیونکہ نیند کے وقت سب سے پہلے آنکھ بند ہوتی ہے، مگر کان اپنا کام کرتے رہتے ہیں، آواز سنائی دیتی ہے، جب نیند مکمل اور غالب ہو جاتی ہے تو کان بھی اپنا کام چھوڑ دیتے ہیں، اور پھر بیداری میں سب سے پہلے کان اپنا کام شروع کرتے ہیں کہ آواز سے سونے والا چونکتا ہے پھر بیدار ہوتا ہے، اگر یوں فرماتے کہ آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تو اس میں زیادہ مبالغہ نہ ہوتا، کیونکہ آنکھ تو معمولی نیند میں بھی دیکھنے سے معطل ہو جاتی ہے اور کانوں پر پردہ پڑنا بہت ہی گہری نیند میں ہوتا ہے۔

فَضَرَبْنَا عَلٰٓی اٰذَانِهِمْ فِی الْكَهْفِ: ان کی یہ حالت مشابہ تھی فنا و استغراق کے (یعنی اللہ کی یاد اور خیال میں غرق ہو کر سب کچھ بھول جانے کی کیفیت، خدا کی صفات و اسماء کے ذکر و فکر میں بے خودی کا عالم)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی ایسی تھپکی دی کہ برسوں غار میں پڑے سوتے رہے، ادھر ادھر کی کوئی خبر ان کے کانوں میں نہیں پڑتی تھی۔

ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ﴿۱۲﴾ ع

پھر ہم نے ان کو اٹھایا کہ معلوم کریں دو فرقوں میں کس نے یاد رکھی ہے جتنی مدت وہ رہے

**خلاصہ تفسیر:** پھر (کئی سال کے بعد) ہم نے ان کو (نیند سے) اٹھایا تا کہ ہم (ظاہری طور پر بھی) معلوم کر لیں کہ (غار میں رہنے کی مدت میں بحث و اختلاف کرنے والوں میں سے) کونسا گروہ ان کے رہنے کی مدت سے زیادہ واقف تھا۔

اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا: نیند سے بیدار ہونے کے بعد ان میں ایک گروہ کا قول تو یہ تھا کہ ہم پورا دن یا ایک دن کا کچھ حصہ سوئے ہیں، دوسرے گروہ نے کہا: ربکم اعلم کہ اللہ ہی جانتا ہے کہ تم کتنے دن سوتے رہے، آیت میں اشارہ اسی طرف ہے کہ یہ دوسرا گروہ ہی زیادہ حقیقت شناس تھا، کیونکہ اس نے لمبی مدت ہونا تو بتلا دیا اگرچہ اجمالاً ہی سہی، اور مدت کی تعیین کو اللہ کے حوالہ کیا، کیونکہ کوئی دلیل نہ تھی، یہ تفسیر مجاہدؒ سے منقول ہے اور یہ اس پر موقوف ہے کہ ہر قول کا کہنے والا جدا ہو۔

ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ: اس میں اشارہ ہے خلوت کے بعد جلوت اور سکر کے بعد صحو کی طرف، خلوت کے بعد جلوت کا یہ مطلب ہے کہ حق تعالیٰ کی مشغولیت سے فارغ ہونے کے بعد مخلوق کے ساتھ مشغول ہو جانا، اور سکر کے بعد صحو کا یہ مطلب ہے کہ یادِ الٰہی کی غشی و بے خودی کے بعد عام حالت کا لوٹ آنا، ''سکر'' غشی و بے خودی کا نام ہے اور ''صحو'' انسان کی عام طبعی حالت کو کہا جاتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** سالہا سال کے بعد حق تعالیٰ نے ان کو جگا دیا، تا کہ ظاہر ہو جائے کہ اختلاف کرنے والوں میں سے کسی نے ان کی مدتِ نوم کا زیادہ صحیح اندازہ رکھا، ظاہر ہے کہ ایسی نوم طویل کے بعد جب بیدار ہوئے تو قدرتی طور پر خود سونے والوں میں اور دوسرے دیکھنے والوں میں بھی اختلافات اور چہ میگوئیاں ہوں گی کوئی کم مدت بتلائے گا کوئی زیادہ، کوئی اقرار کرے گا، کوئی مستبعد سمجھ کر انکار کر دے گا تو انہیں جگا کر یہ دیکھنا تھا کہ کون سی جماعت ٹھیک حقیقت پر پہنچتی ہے اور اس حقیقت پر پہنچ کر ''بعث بعد الموت'' کا عقدہ حل کرتی ہے جس میں اس وقت لوگ جھگڑ رہے تھے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّهُمْ فِتْیَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنٰهُمْ هُدًی ﴿۱۳﴾

ہم سنا دیں تجھ کو ان کا حال تحقیقی، وہ کئی جوان ہیں کہ یقین لائے اپنے رب پر اور زیادہ دی ہم نے ان کو سوجھ

**خلاصہ تفسیر:** اب اجمال کے بعد اس قصہ کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

ہم ان کا واقعہ آپ سے ٹھیک ٹھیک بیان کرتے ہیں (یہ اس لیے کہا کیونکہ لوگوں نے اس واقعہ کو مختلف طور پر مشہور کیا ہوا تھا اس لیے فرمایا کہ ٹھیک وہ ہے جو قرآن میں ہے) وہ لوگ (اصحاب کہف) چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر (اس زمانے کے دین عیسوی کے مطابق) ایمان لائے تھے، اور ہم نے ان کی ہدایت میں اور ترقی کردی (کہ ایمان لانے کے بعد صفات ایمان یعنی ثابت قدمی، صبر وتوکل، دنیا سے اعراض اور آخرت کی فکر وغیرہ بھی عطا کردیں)۔

اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى: سوال ہوتا ہے کہ مذہب عیسوی تو محرف ہو چکا تھا، پھر اصحاب کہف کے قبول کے لیے وہ کیسے کافی ہوا؟ جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ اس زمانہ کے بعض بعض علماء کے پاس صحیح طور پر محفوظ ہو اس لیے ان کا یہ ایمان معتبر سمجھا گیا۔

ایک مسئلہ اس جگہ خود اس قصے کی تفصیلات کا ہے جس کے دو حصے ہیں: ① ایک وہ جو اس قصہ کی روح اور اصل مقصود ہے، جس سے یہود کے سوال کا جواب بھی ملتا ہے اور مسلمانوں کے لئے ہدایات ونصائح بھی ② دوسرا حصہ وہ ہے جس کا تعلق اس قصہ کی صرف تاریخی اور جغرافیائی حیثیت سے ہے، بیان مقصود میں اس کا کوئی خاص دخل نہیں، مثلاً یہ قصہ کس زمانے میں اور کس شہر اور بستی میں پیش آیا، جس کافر بادشاہ سے بھاگ کر ان لوگوں نے غار میں پناہ لی تھی وہ کون تھا، اس کے کیا عقائد وخیالات تھے، اور اس نے ان لوگون کے ساتھ کیا معاملہ کیا جس سے یہ بھاگنے اور غار میں چھپنے پر مجبور ہو گئے، پھر یہ کہ ان لوگوں کی تعداد کیا تھی، اور زمانہ دراز تک سونے رہنے کا کل زمانہ کتنا تھا، اور پھر یہ لوگ اب تک زندہ ہیں یا مر گئے۔

قرآن حکیم نے اپنے حکیمانہ اصول اور اسلوب خاص کے تحت سارے قرآن میں ایک قصہ یوسف علیہ السلام کے سوا کسی قصے کو پوری تفصیل اور ترتیب سے بیان نہیں کیا، جو عام تاریخی کتابوں کا طریقہ ہے، بلکہ ہر قصے کے صرف وہ اجزا موقع بموقع بیان فرمائے ہیں جن سے انسانی ہدایات اور تعلیمات کا تعلق تھا، قصہ یوسف علیہ السلام کو اس اسلوب سے مستثنیٰ کرنے کی وجہ سورۃ یوسف کی تفسیر میں گزر چکی ہے، قصہ اصحاب کہف میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ قرآن میں اس کے صرف وہ اجزاء بیان کئے گئے جو مقصود اصلی سے متعلق تھے، باقی اجزا جو خالص تاریخی یا جغرافیائی تھے ان کا کوئی ذکر نہیں فرمایا، اصحاب کہف کی تعداد اور سونے کے زمانے کی مدت کے سوالات کا ذکر تو فرمایا اور جواب کی طرف اشارہ بھی فرمایا، مگر ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کردی کہ ایسے مسائل میں زیادہ غور وفکر اور بحث وتکرار مناسب نہیں ان کو حوالہ بخدا تعالیٰ کرنا چاہئے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جن کا فرض منصبی معانی قرآن کو بیان کرنا ہے آپ نے بھی کسی حدیث میں ان اجزاء قصہ کو بیان نہیں فرمایا، اور اکابر صحابہ وتابعین نے اسی قرآنی اسلوب کی بنا پر ایسے معاملات میں ضابطہ کار یہ قرار دیا کہ: ''اَبْهِمُوْا مَآ اَبْهَمَه الله'' یعنی جس غیر ضروری چیز کو اللہ تعالیٰ نے مبہم رکھا تم بھی اسے مبہم رہنے دو (کہ اس میں بحث وتحقیق کچھ مفید نہیں)۔

اکابر صحابہ وتابعین کے اس طرز عمل کا مقتضی یہ تھا کہ اس تفسیر میں بھی ان اجزاء قصہ کو نظر انداز کر دیا جائے جن کو قرآن اور حدیث نے نظر انداز کیا ہے، لیکن یہ زمانہ وہ ہے جس میں تاریخی اور جغرافیائی انکشافات ہی کو سب سے بڑا کمال سمجھ لیا گیا ہے، اور متاخرین علمائے تفسیر نے اسی لیے کم و بیش ان اجزا کو بھی بیان فرما دیا ہے، اس لئے زیر نظر تفسیر میں قصے کے وہ اجزا جو خود قرآن میں مذکور ہیں ان کا بیان تو آیات قرآن کی خلاصہ تفسیر کے تحت آجائے گا، باقی تاریخی اور جغرافیائی اجزائے قصہ کو یہاں بقدر ضرورت بیان کیا جاتا ہے، اور بیان کرنے کے بعد بھی آخری نتیجہ وہی رہے گا کہ ان معاملات میں کوئی قطعی فیصلہ ناممکن ہے، کیونکہ اسلامی اور پھر مسیحی تاریخوں میں اس کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ خود اس قدر مختلف اور متضاد ہے کہ ایک مصنف اپنی تحقیق ورائے کے پیش نظر مقدمات وقرائن کی مدد سے کسی ایک چیز کو متعین کرتا ہے تو دوسرا اسی طرح دوسری صورت کو ترجیح دیتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی ایمان سے زیادہ . . . یہ دیا اولیاء کا۔

وَّرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۟ مِنْ دُوْنِهٖۤ

اور گرہ دی ان کے دل پر ۱؎ جب کھڑے ہوئے پھر بولے ہمارا رب ہے رب آسمان اور زمین کا نہ پکاریں گے ہم اس کے سوا

اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا ﴿۱۴﴾ هٰۤؤُلَاۤءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ

کسی کو معبود نہیں (ورنہ) تو کہی ہم نے بات عقل سے دور ۲؎ یہ ہماری قوم ہے ٹھہرا لیے انہوں نے اللہ کے سوا اور معبود، کیوں نہیں لاتے ان پر

بِسُلْطٰنٍۭ بَيِّنٍ ؕ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ﴿۱۵﴾ؕ

کوئی سند کھلی، پھر اس سے بڑا گناہ گار کون جس نے باندھا اللہ پر جھوٹ ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (انہی صفات ایمان وہدایت میں ترقی ہونے کی ایک بات یہ تھی کہ) ہم نے ان کے دل مضبوط کردیئے جبکہ وہ (دین میں) پختہ ہوکر (آپس میں یا بادشاہ اور سب لوگوں کے سامنے) کہنے لگے کہ ہمارا رب تو وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے ہم تو اس کو چھوڑ کر کسی معبود کی عبادت نہ کریں گے کیونکہ (اگر خدانخواستہ ہم نے ایسا کیا تو) اس صورت میں ہم نے یقینا بڑی ہی بے جا بات کہی (کیونکہ دوسرے معبودوں کی عبادت میں لامحالہ ان کی معبودیت کا اقرار ہوتا ہے، یا خود ان کے سامنے عاجزی اور احتیاج کے کلمات زبان سے بھی صادر ہوتے ہیں)۔

یہ جو ہماری قوم ہے انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اور معبود قرار دے رکھے ہیں (کیونکہ ان کی قوم اور بادشاہ وقت سب بت پرست تھے، سو) یہ لوگ اپنے معبودوں (کے معبود ہونے) پر کوئی کھلی دلیل کیوں نہیں لاتے (جیسا کہ موحدین توحید پر واضح اور یقینی دلیل رکھتے ہیں) تو (توحید کے دلیل سے ثابت ہونے کے باوجود) اس سے زیادہ کون غضب ڈھانے والا ہوگا جو اللہ پر جھوٹی تہمت لگادے (کہ اس کے کچھ ساجھی اور شریک بھی ہیں)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی مضبوط وثابت قدم رکھا کہ اپنی بات صاف کہہ دی۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی جب "رب" وہ ہی ہے تو معبود کسی اور کو ٹھہرانا حماقت ہے، "ربوبیت" و"الوہیت" دونوں اسی کے لیے مخصوص ہیں۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی جیسے موحدین توحید پر صاف صاف دلیلیں پیش کرتے ہیں، اگر مشرکین اپنے دعوے میں سچے ہیں تو کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے، لائیں کہاں سے؟ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، اس سے بڑا جھوٹ کیا ہوگا کہ خدا کے شریک ٹھہرائے جائیں۔

وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ

اور جب تم نے کنارہ کرلیا ان سے اور جن کو وہ پوجتے ہیں اللہ کے سوائے تو اب جا بیٹھو اس کھوہ میں پھیلا دے تم پر رب تمہارا

مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ﴿۱۶﴾

کچھ اپنی رحمت سے اور بنا دیوے تمہارے واسطے تمہارے کام میں آرام

**خلاصہ تفسیر:** اور پھر (آپس میں کہا کہ) جب تم ان لوگوں سے (عقیدہ ہی میں) الگ ہوگئے اور ان کے معبودوں (کی عبادت) سے بھی (الگ ہوگئے ہو) مگر اللہ سے (الگ نہیں ہوئے، بلکہ اسی کی وجہ سے سب کو چھوڑا ہے) تو اب (مصلحت یہ ہے کہ) تم (فلاں) غار میں (جو مشورے سے طے ہوا ہوگا) چل کر پناہ لو (تا کہ امن اور بے فکری کے ساتھ اللہ کی عبادت کرسکو) تم پر تمہارا رب اپنی رحمت پھیلا دے گا

اور تمہارے لئے تمہارے اس کام میں کامیابی کے سامان درست کردے گا (اللہ تعالیٰ سے اسی امید اور توقع پر غار میں جانے کے وقت انہوں نے سب سے پہلے یہ دعا کی جو پیچھے گذر چکی: رَبَّنَآ اٰتِنَا من لدنك رحمة وهيء لنا من امرنا رشدا)۔

**فَأْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ:** اصحاب کہف کا مقام کونسا تھا؟ سو تفسیر حقانی میں اس کا قدیم نام افسوس اور اسلامی نام طرسوس ایشیائے کوچک کا ایک شہر لکھا ہے، اس شہر کا ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل پر ہونا اہل تاریخ کے نزدیک مسلم ہے، یہ اب ویران قصبہ کی شکل میں ہے، اور آبادی سے تین کوس دور یہ کئی میل کا غار ہے۔

**فَأْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ:** یعنی اپنے محبوب کے ساتھ خلوت کرو اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی رحمت ومنفعت یعنی معرفت وتجلیات کو ظاہر اور مہیا فرمادے گا، یعنی جب تک اللہ کے سامنے خلوت وتنہائی اختیار نہیں کرے گا اس وقت تک تعلق مع اللہ حاصل نہیں ہوگا، بعض عارفین نے کہا ہے کہ غیر اللہ سے عزلت یعنی علیحدگی وصل حق کا سبب ہوا کرتی ہے، بلکہ بغیر عزلت (علیحدگی) کے وصل نہیں ہوتا، یہی سنت ہے تمام انبیاء کی کہ ایسے مقامات سے ہجرت کر کے وہ جگہ اختیار کرتے ہیں جہاں یک سوئی سے عبادت کی جا سکے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جب مشرکین کے دین سے ہم علیحدہ ہیں تو ظاہری طور پر بھی ان سے علیحدہ رہنا چاہیے اور جب ان کے باطل معبودوں سے کنارہ کیا تو ہر طرف سے ٹوٹ کر تنہا اپنے معبود کی طرف جھکنا اور اسی سے رحمت وتلطف کا امیدوار رہنا چاہیے، آپس میں یہ مشورہ کر کے پہاڑی کی کھوہ میں جا بیٹھے۔

وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ

اور تو دیکھے دھوپ جب نکلتی ہے بچ کر جاتی ہے ان کی کھوہ سے داہنے کو اور جب ڈوبتی ہے کترا جاتی ہے ان سے

الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ

بائیں کو اور وہ میدان میں ہیں اس کے، یہ ہے اللہ کی قدرتوں سے ۱، جس کو راہ دیوے اللہ وہی آئے راہ پر

ع ۲/۵ ۱۴ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿١٧﴾

اور جس کو وہ بچلائے پھر تو نہ پائے اس کا کوئی رفیق راہ پر لانے والا ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور اے مخاطب! (وہ غار ایسی وضع پر واقع ہوا ہے کہ) جب دھوپ نکلتی ہے تو تو اس کو دیکھے گا کہ وہ غار سے داہنی جانب کو بچی رہتی ہے (یعنی غار کے دروازے سے داہنی طرف الگ ہو کر رہتی ہے) اور جب وہ چھپتی ہے تو (غار کے) بائیں طرف ہٹی رہتی ہے (یعنی اس وقت بھی غار کے اندر دھوپ نہیں جاتی تا کہ انہیں دھوپ کی تپش سے تکلیف نہ پہونچے) اور وہ لوگ اس غار کے ایک فراخ موقع میں تھے (یعنی ایسے طویل لمبے غاروں میں جو عادۃ کہیں تنگ کہیں کشادہ تو وہ اس غار کے ایسے موقع پر تھے جو کشادہ تھا تا کہ ہوا بھی پہنچے اور جگہ کی تنگی سے جی بھی نہ گھبرائے) یہ (ان لوگوں کا کمزور اور تعداد میں کم ہونا اور مخالفین کی قوت وکثرت کے باوجود ہدایت پانا) اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے (کہ اس نے کس طرح اپنے بندوں کو ظاہری اسباب کے خلاف ہمت واستقلال دیا اور ان کے لیے آرام کا سامان مہیا کر دیا، پس معلوم ہوا کہ) جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پاتا ہے اور جس کو وہ گمراہ کر دیں تو آپ اس کے لئے کوئی مددگار راہ بتانے والا نہ پائیں گے۔

**اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ:** غار کی جو ہیئت بتلائی گئی ہے کہ اس میں نہ طلوع کے وقت صبح کو دھوپ اندر جاتی نہ شام

کوغروب کے وقت، یہ اس صورت میں ہوسکتا ہے جبکہ غار شمال رویہ ہوگا یا جنوب رویہ، کیونکہ شرق رویہ ہونے میں طلوع کے وقت ان پر دھوپ پڑتی اور غرب رویہ ہونے میں غروب کے وقت، مقصود اس سے اس جگہ کا دھوپ وغیرہ کی تکلیف سے محفوظ ہونا ہے۔

غار کی اس مذکورہ کیفیت کی حکمت یہ ہے تا کہ غار میں روشنی زیادہ نہ ہو، کیونکہ اس سے جمعیت قلب یعنی یک سوئی میں خلل پڑتا ہے، کیونکہ کم روشنی سے فکر اور یک سوئی میں اعانت ہوتی ہے، اسی لیے اہل خلوت صوفیا کو دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنی خلوت وتنہائی کے لیے ایسی ہی جگہ تجویز کرتے ہیں جس میں روشنی کم ہو اور اس کے باوجود بھی مراقبہ کے وقت وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں تا کہ دل کو یک سوئی حاصل ہو۔

مَنۡ يَّهۡدِ اللّٰهُ فَهُوَ الۡمُهۡتَدِ: اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے جو اس کو توفیق نہیں دی تو یہ دوسروں کو گمراہ کرنے کی وجہ سے ہے، اور یہ توفیق اس لیے نہ ملی کہ اس کی استعداد صالح نہ تھی، اور جس میں استعداد صالح نہ ہو تو ظاہر ہے کہ اس کی رہنمائی اور رہبری سخت دشوار بلکہ عادتاً ممتنع ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی خدا تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے انھیں ایسے ٹھکانے کی طرف راہنمائی کی جہاں مامون و مطمئن ہو کر آرام کرتے رہیں نہ جگہ کی تنگی سے جی گھٹے، نہ کسی وقت دھوپ ستائے، غار اندر سے کشادہ اور ہوادار تھا اور جیسا کہ ابن کثیرؒ نے لکھا شمال رویہ ہونے کی وجہ سے ایسی وضع و ہیئت پر واقع تھا جس میں دھوپ بقدر ضرورت پہنچتی اور بدون ایذاء دیئے نکل جاتی تھی۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی ظاہری و باطنی راہنمائی سب اسی کے قبضہ میں ہے، دیکھ لو جب دنیا بچل رہی تھی کس طرح اصحاب کہف کو راہِ ہدایت پر ثابت قدم رکھا اور ظاہری طور پر بھی کیسے عجیب غار کی راہ بتلائی۔

| |
|---|
| وَتَحۡسَبُهُمۡ اَيۡقَاظًا وَّهُمۡ رُقُوۡدٌ ۖۗ وَّنُقَلِّبُهُمۡ ذَاتَ الۡيَمِيۡنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَكَلۡبُهُمۡ بَاسِطٌ |
| اور تو سمجھے وہ جاگتے ہیں اور وہ سو رہے ہیں، اور کروٹیں دلاتے ہیں ہم ان کو داہنے اور بائیں، اور کتا ان کا پسار رہا ہے |
| ذِرَاعَيۡهِ بِالۡوَصِيۡدِ ؕ لَوِ اطَّلَعۡتَ عَلَيۡهِمۡ لَوَلَّيۡتَ مِنۡهُمۡ فِرَارًا وَّلَمُلِئۡتَ مِنۡهُمۡ رُعۡبًا ⑱ |
| اپنی باہیں چوکھٹ پر، اگر تو جھانک کر دیکھے ان کو تو پیٹھ دے کر بھاگے ان سے اور بھر جائے تجھ میں ان کی دہشت |

**خلاصہ تفسیر:** اور اے مخاطب! (تو اگر اس وقت جبکہ وہ لوگ غار میں گئے اور ہم نے ان پر نیند مسلط کر دی ان کو دیکھتا تو) ان کو جاگتا ہوا خیال کرتا حالانکہ وہ سوتے تھے (کیونکہ اللہ کی قدرت نے ان کو نیند کے آثار وعلامات سے محفوظ رکھا تھا، جیسے سانس کا متغیر ہو جانا، بدن کا ڈھیلا پڑ جانا وغیرہ کچھ نمودار نہ تھے، صرف آنکھیں اگر بند بھی ہوں تو سونے کی یقینی علامت نہیں) اور (اس نیند کے زمانہ دراز میں) ہم ان کو (کبھی) داہنی طرف اور (کبھی) بائیں طرف کروٹ دے دیتے تھے، اور (اس حالت میں) ہم ان کا کتا (جو کسی وجہ سے ان کے ساتھ آ گیا تھا غار کی) دہلیز پر اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے (بیٹھا) تھا (اور ان کے خداداد رعب وجلال کی یہ حالت تھی کہ) اگر (اے مخاطب!) تو ان کو جھانک کر دیکھتا تو ان سے پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑا ہوتا اور تیرے اندر ان کی دہشت سما جاتی۔

وَتَحۡسَبُهُمۡ اَيۡقَاظًا وَّهُمۡ رُقُوۡدٌ: یہ تمام سامان حق تعالیٰ نے ان لوگوں کی حفاظت کے لئے جمع کر دیئے تھے، کیونکہ جاگتے ہوئے آدمی پر حملہ کرنا آسان نہیں ہوتا اور نیند کے طویل زمانے میں کروٹیں دینے سے ان کا بدن مٹی کے کھانے سے محفوظ رہا، اسی طرح کتا بھی اجنبی آدمی کو آنے جانے سے روکتا ہے، اگر کتا سوتا بھی ہو تو اجنبی آدمی کے آنے کے وقت اکثر اس کی آنکھ کھل جاتی ہے، اسی طرح ان کی صورتوں کو ہیبت ناک بنا دینا یہ بھی حفاظت کے واسطے تھا کہ ہر شخص کو وہاں جانے کی ہمت نہ ہو۔

وَتَحۡسَبُهُمۡ اَيۡقَاظًا وَّهُمۡ رُقُوۡدٌ: یہ مثال ہے ان لوگوں کی جن کے جسم تو مخلوق کے ساتھ مشغول ہیں اور اور دل حق تعالیٰ کے ساتھ مشغول

ہیں جسے ”خلوت در انجمن“ کہتے ہیں۔

**وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ**: اس میں ان لوگوں کی تسلیم وفنا کی مثال ہے جیسے مردہ غسال کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

**وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ**: یہ کتا کسی ضرورت سے ان کے پاس تھا، یا ساتھ ہولیا تھا اور دہلیز پر پڑا رہنا یہ اس جانور کی عادت ہے کہ پہرہ کے واسطے اکثر دروازہ پر پڑ جاتا ہے، یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ جس گھر میں کتا یا تصویر ہو اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے، اس بنا پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان اللہ والوں نے کتا کیوں ساتھ لیا؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہوسکتا ہے کہ یہ حکم کتا پالنے کی ممانعت شریعت محمد یہ کا حکم ہے، ممکن ہے کہ دین مسیح علیہ السلام میں ممنوع نہ ہو، دوسرے یہ بھی قرین قیاس ہے کہ یہ لوگ صاحب جائداد صاحب مویشی تھے ان کی حفاظت کے لئے کتا پالا ہو، اور جیسے کتے کی وفاشعاری مشہور ہے یہ جب شہر سے چلے تو وہ بھی ساتھ لگ لیا۔

**وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ**: ابوبکر وراق کا قول ہے کہ صالحین کی صحبت غنیمت ہے اگر چہ ہم جنس بھی نہ ہو، دیکھیے حق تعالی نے اصحاب کہف کے ساتھ ان کے کتے کا کس طرح ذکر فرمایا ہے صرف اس وجہ سے کہ وہ ان کے ساتھ تھا۔

**لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا**: ظاہر یہ ہے کہ اس میں خطاب عام لوگوں کو ہے، اس لیے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اصحاب کہف کا رعب رسول اللہ ﷺ پر بھی چھا سکتا تھا، عام مخاطبین کو فرمایا گیا ہے اگر تم ان کو جھانک کر دیکھو تو ہیبت کھا کر بھاگ جاؤ اور ان کا رعب وہیبت تم پر طاری ہو جائے۔

**لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا**: اس رعب اور فرار کی وجہ یہ ہے کہ میں نے انہیں اپنے قہر ربوبیت اور سطوت وعظمت کا لباس پہنا رکھا ہے، چنانچہ اسی ہیبت وعظمت کی وجہ سے یہ فرار اور رعب ہے، جیسا میں نے جب عصا پر اپنا ہیبت کا لباس پہنا دیا تو موسیٰ علیہ السلام کو فرار ہوا، اور یہ درحقیقت ہماری عظمت کا رعب ہے جو اس آئینہ میں ظاہر ہوئی، اور اہل اللہ کو جو شان ہیبت عطا ہوتی ہے وہ بھی اسی کی مثال ہے۔

* * *

**فائدہ**: کہتے ہیں سوتے میں ان کی آنکھیں کھلی رہتی تھیں اور اس قدر طویل نیند کا اثر ان کے ابدان پر ظاہر نہیں ہوا، اس سے کوئی دیکھے تو سمجھے جاگتے ہیں اور حق تعالیٰ نے ان لوگوں میں شان ہیبت وجلال اور اس مکان میں دہشت رکھی تا کہ لوگ تماشہ نہ بنائیں کہ وہ بے آرام ہوں، ان کے ساتھ ایک کتا بھی لگ گیا تھا، اس پر بھی صحبت کا کچھ اثر پہنچا اور صدیوں تک زندہ رہ گیا، اگر چہ کتا رکھنا برا ہے لیکن لاکھ بروں میں ایک بھلا بھی ہے، و للہ دَرُّ السعدی الشیرازی:

پسرِ نوح با بداں بنشست　　خاندان نبوتش گم شد
سگِ اصحاب کھف روزے چند　　پئے نیکاں گرفت مردم شد

وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ۗ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۗ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا

اور اسی طرح انکو جگا دیا ہم نے کہ آپس میں پوچھنے لگے (تا کہ پوچھیں ایک دوسرے سے)، ایک بولا انمیں کتنی دیر ٹھہرے تم، بولے ہم ٹھہرے ایک دن

اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۗ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ۗ فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ

یا ایک دن سے کم، بولے تمہارا رب ہی خوب جانے جتنی دیر تم رہے ہو، اب بھیجو اپنے میں سے ایک کو یہ روپیہ دے کر اپنا اس شہر میں

فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ⑲

پھر دیکھے کونسا کھانا ستھرا ہے سو لائے تمہارے پاس اس میں سے کھانا اور نرمی سے جائے اور جتا نہ دے تمہاری خبر کسی کو

اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ۝۲۰

وہ لوگ اگر خبر پالیں تمہاری پتھروں سے مار ڈالیں تم کو یا لوٹا لیں تم کو اپنے دین میں اور تب تو بھلا نہ ہوگا تمہارا کبھی

**خلاصہ تفسیر**: اور (جس طرح ہم نے اپنی قدرت کاملہ سے ان کو اتنے زمانہ دراز تک سلایا) اسی طرح (اس طویل نیند کے بعد اپنی قدرت سے) ہم نے ان کو جگا دیا تا کہ وہ آپس میں پوچھ پاچھ کریں (تا کہ باہمی سوال و جواب کے بعد ان کو حق تعالیٰ کی قدرت اور حکمت منکشف ہو جائے، چنانچہ) ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ (اس نیند کی حالت میں) تم کس قدر رہے ہو گے؟ (جواب میں) بعض نے کہا کہ (غالبا) ایک دن یا ایک دن سے بھی کچھ کم رہے ہوں گے (اس اندازہ کے لیے سورج وغیرہ کے دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں، اکثر لوگ جب سو کر اٹھتے ہیں تو وقت کا اندازہ رائے سے کیا کرتے ہیں) دوسرے بعض نے کہا کہ (اس کی تفتیش کی کیا ضرورت ہے) یہ تو (ٹھیک ٹھیک) تمہارے رب ہی کو خبر ہے کہ تم کس قدر (سوتے) رہے، اب (اس فضول بحث کو چھوڑ کر ضروری کام کرنا چاہئے وہ یہ کہ) اپنے میں سے کسی کو یہ روپیہ (جو کہنے والے کے پاس ہوگا، کیونکہ یہ لوگ کچھ خرچ کے لئے رقم بھی لے کر چلے تھے، غرضیکہ کسی کو یہ روپیہ) دے کر شہر کی طرف بھیجو پھر (وہ وہاں پہنچ کر) تحقیق کرے کہ کونسا کھانا حلال ہے؟ (اس جگہ لفظ ازکیٰ کی تفسیر حضرت سعید بن جبیرؒ سے یہی منقول ہے کہ اس سے مراد حلال کھانا ہے، اور اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ان کی بت پرست قوم اپنے بتوں کے نام پر ذبح کیا کرتی تھی اور بازار میں بکثرت یہی حرام گوشت بکتا تھا) تو وہ اس میں سے تمہارے پاس کچھ کھانا لے آئے اور کام خوش تدبیری سے کرے (کہ ایسی ہیئت اور وضع سے جائے کہ کوئی اس کو پہچانے نہیں، اور کھانے کی تحقیق کرنے میں بھی یہ ظاہر نہ ہونے دے کہ بت کے نام کے ذبیحہ کو حرام سمجھتا ہے) اور کسی کو تمہاری خبر نہ ہونے دے۔

(کیونکہ) اگر وہ لوگ (یعنی اہل شہر جن کو اپنے خیال میں اپنے زمانے کے مشرکین سمجھے ہوئے تھے) کہیں تمہاری خبر پا جائیں گے تو تم کو یا پتھراؤ کر کے مار ڈالیں گے (مراد مطلق قتل کر دینا ہے یا اس زمانہ میں سخت سزا کی یہی صورت ہوگی، غرض تم کو ہلاک کر دیں گے) یا (جبرا) تم کو اپنے مذہب میں پھر داخل کر لیں گے اور ایسا ہوا تو تم کو کبھی فلاح نہ ہوگی۔

**فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ**: اس میں اشارہ ہے کہ طالبان حق کی شان کے لائق یہی ہے کہ وہ مخلوق سے سوال کرنا ترک کر دیں، اور اپنی ہمت بلند رکھیں، جیسا کہ اصحاب کہف نے اپنے داموں سے کھانا خریدنا پسند کیا، یہ نہیں کیا کہ کسی سے مانگ لائیں، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ضروری نفقہ و خرچ کا اہتمام کرنا زہد و توکل کے خلاف نہیں۔

**فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا**: لفظ ''ازکیٰ'' کے لفظی معنی پاک صاف کے ہیں، مراد اس سے حسب تفسیر ابن جبیرؒ حلال کھانا ہے، اور اس کی ضرورت اس لئے محسوس کی کہ جس زمانے میں یہ لوگ شہر سے نکلے تھے وہاں بتوں کے نام کا ذبیحہ ہوتا، اور وہی بازاروں میں فروخت ہوتا تھا، اس لئے جانے والے کو یہ تاکید کی کہ اس کی تحقیق کر کے کھانا لائے کہ یہ کھانا حلال بھی ہے یا نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ جس شہر یا جس بازار، ہوٹل میں اکثریت حرام کھانے کی ہو وہاں کا کھانا بغیر تحقیق کے کھانا جائز نہیں۔

اس میں دلالت ہے کہ طالب حق کو ورع کا عمل اختیار کرنا چاہیے جیسے اصحاب کہف نے حلال کو طلب کیا، اسی لیے حضرت ذوالنون مصریؒ کا قول ہے کہ عارف وہ ہے جس کا نور معرفت اس کے نور ورع کو نہ بجھا دے (مطلب یہ ہے کہ نور معرفت سے تو وہ سب چیزوں کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف کرتا ہے تو اس میں ناقص کو یہ دھوکا ہو جاتا ہے کہ جب خدا کے سامنے کوئی مالک نہیں تو پھر ہر حرام مال جائز ہے، کیونکہ اس میں بندہ کا حق تو ہے ہی نہیں، اور کامل اسی نسبت کے ساتھ یہ بھی دیکھ رہا ہے کہ آخر کسی درجہ میں حق تعالیٰ نے اس مال کی نسبت بندہ کی طرف بھی کی ہے، اگرچہ ضعیف ناقص اور مجازا ہی سہی اور اسی نسبت کے کچھ حقوق و احکام بھی ہیں، سو ان میں سے حرام بھی ہے، پس یہ شخص جو عارف کامل ہے اس لیے ورع کو بھی نہیں چھوڑے گا)۔

بعض نے ازکی کی تفسیر اطیب بمعنی لذیذ کے ساتھ کی ہے تو اس کا حاصل یہ ہوگا کہ لذیذ ولطیف طعام لائے ، جس میں یہ مصلحت تھی کہ انہوں نے مدت سے نہیں کھایا تھا، تو غیر لطیف طعام انہیں بھاری اور نقصان دہ ہوتا ، اسی طرح بعض دینی مصالح کی وجہ سے بھی بعض بزرگوں نے جیسے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے لطیف طعام اور لطیف لباس کو استعمال فرمایا ہے اور ان مصالح کی تفصیل طویل ہے۔

**وَلْيَتَلَطَّفْ**: بعض نے اس کی تفسیر معاملہ میں لطف ومہربانی کے ساتھ کی ہے ، سو اس سے معلوم ہوا کہ جس کے ساتھ بھی معاملہ کرے حسن اخلاق اور نرمی سے پیش آئے۔

**وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا**: یعنی اغیار کو اطلاع نہ ہو، اسی طرح اسرار حق کو ان اغیار پر ظاہر نہ کرے جو معرفت وانوار کے مطالعہ اور اسرار کی واقفیت سے محجوب (یعنی غفلت برتنے والے) ہوں۔

**وَلَنْ تُفْلِحُوْۤا اِذًا اَبَدًا**: یعنی ''ایسا ہوا تو تم کو کبھی فلاح نہ ہوگی''، کیونکہ اگر چہ زبردستی اور اکراہ کی حالت میں زبان سے کفر کی بات کہہ دینا بشرطیکہ دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو جائز ہے، لیکن بکثرت ایسا بھی ہوتا ہے کہ اول اول جبراً زبردستی سے کفر کیا تھا، پھر شیطان کے بہکانے سے سے دنیاوی مصالح پر نظر کر کے اس میں سستی ہوگئی، رفتہ رفتہ کفر کی برائی دل سے نکل جاتی ہے اور دل کھول کر کفر کرنے لگتا ہے، چنانچہ ایسے واقعات ہوئے ہیں کہ کوئی شخص نیا مسلمان ہوا مگر اس پر دباؤ ڈال کر کفار نے پھر اپنے میں شامل کر لیا، نعوذ باللہ من ذلک، یا ''فلاح'' سے پوری کامیابی مراد ہو کہ اکراہ میں کفر کرنا رخصت کے طور پر جائز ہے، لیکن عزیمت کے ثواب سے جو کہ فلاح کامل ہے محرومی ہو جائے گی۔

* * *

**فائدہ**: جس طرح اپنی قدرت سے اتنی لمبی نیند سلایا تھا، اسی طرح بروقت جگا دیا، اٹھے تو آپس میں مذاکرہ کرنے لگے کہ ہم کتنی دیر سوئے ہوں گے؟ بعض نے کہا ''ایک آدھ دن''، یعنی بہت کم، دوسرے بولے کہ (اس بے فائدہ بحث میں پڑنے سے کیا فائدہ؟) یہ تو خدا ہی کے علم میں ہے کہ ہم کتنی مدت سوئے، اب تم اپنا کام کرو، ایک آدمی کو یہ روپیہ دے کر شہر بھیجو کہ وہ کسی دکان سے حلال اور ستھرا کھانا دیکھ کر خرید لائے، یہ ضروری ہے کہ اسے نہایت ہوشیاری سے جانا آنا اور نرمی وتدبیر سے معاملہ کرنا چاہیے کہ کسی شہر والے کو ہمارا پتہ نہ لگے، ورنہ بڑی سخت خرابی ہوگی، اگر ظالم بادشاہ کو پتہ چل گیا تو ہم کو یا سنگسار کیا جائے گا یا بجبر واکراہ دین حق سے ہٹایا جائے گا، العیاذ باللہ، ایسا ہوا تو جو اعلیٰ کامیابی وفلاح ہم چاہتے ہیں، وہ کبھی حاصل نہ ہو سکے گی، کیونکہ دین حق سے پھر جانا گو بجبر واکراہ ہو اولوالعزم مومنین کا کام نہیں ہو سکتا۔

**تنبیہ**: میرے نزدیک يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ محض تقلیل مدت سے کنایہ ہے، نیند سے اٹھ کر اتنی طویل مدت بھی ان کو قلیل محسوس ہوئی، سچ ہے ''مردہ اور سوتا برابر ہے'' يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ کا حرف اَوْ کے ساتھ استعمال ایسا سمجھو جیسے سورہ مؤمنون میں ہے: كَمْ لَبِثْتُمْ فِى الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ

وَ كَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْۤا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ

اور اسی طرح خبر ظاہر کر دی ہم نے ان کی تا کہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے اور قیامت کے آنے میں دھوکہ نہیں

اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ؕ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ؕ

جب جھگڑ رہے تھے آپس میں اپنی بات پر ا پھر کہنے لگے بناؤ ان پر ایک عمارت، ان کا رب خوب جانتا ہے ان کا حال

قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰۤى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ﴿۲۱﴾

بولے وہ لوگ جن کا کام غالب تھا ہم بنائیں گے ان کی جگہ پر عبادت خانہ ۲

**خلاصہ تفسیر**: غرض ان میں سے ایک شخص کھانا لینے چلا، روپیہ جو بازار میں دکھلایا تو کئی سو برس قبل کا سکہ تھا، دوکاندار کو چوری کا شبہ ہوا، تب مجبور ہوکر انہوں نے اپنا پورا قصہ سنایا حتی کہ اس کا چرچا ہوگیا، اس وقت پرانے لوگوں نے کہا کہ ہاں ہم نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ چند نوجوان اس طرح غائب ہوگئے تھے، واقعی وہ لوگ یہی ہیں، چنانچہ اللہ تعالی اسی مطلع ہونے کے قصہ کو ایک حکمت کے ساتھ بیان فرماتے ہیں۔

اور (ہم نے جس طرح اپنی قدرت سے ان کو سلایا اور جگایا) اسی طرح ہم نے (اپنی قدرت وحکمت سے اس زمانے کے) لوگوں کو ان (کے حال) پر مطلع کردیا تاکہ (من جملہ دیگر فوائد کے ایک فائدہ یہ بھی ہو کہ) وہ لوگ (اس واقعہ سے استدلال کرکے) اس بات کا یقین (یا زیادہ یقین) کرلیں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے، اور (وہ وعدہ) یہ کہ قیامت میں کوئی شک نہیں (یہ لوگ اگر پہلے سے قیامت میں زندہ ہونے پر ایمان رکھتے تھے تو زیادہ یقین اس واقعہ سے ہوگیا، اور اگر قیامت کے منکر تھے تو اب یقین حاصل ہوگیا، یہ واقعہ تو اصحاب کہف کی زندگی میں پیش آیا، پھر انہوں نے وہیں غار میں وفات پائی، تو ان کے متعلق اہل عصر میں اختلاف ہوا جس کو آگے بیان فرمایا ہے کہ:) وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب کہ اس زمانے کے لوگ ان کے معاملے میں باہم جھگڑ رہے تھے (اور وہ معاملہ اس غار کا منہ بند کرنا تھا، تاکہ ان کی لاشیں محفوظ رہیں، یا ان کی یادگار قائم کرنا مقصود تھا) سو ان لوگوں نے کہا کہ ان کے (غار کے) پاس کوئی عمارت بنوادو (پھر اختلاف ہوا کہ وہ عمارت کیا ہو؟ اس میں بھی مختلف رائیں ہوئیں، تو اختلاف کے وقت) ان کا رب ان (کے مختلف احوال) کو خوب جانتا تھا (بالآخر) جو لوگ اپنے کام پر غالب تھے (یعنی اپنی مراد کے پورا کرنے پر قادر تھے، اس سے اہل حکومت مراد ہیں جو کہ اس وقت دین حق پر تھے) انہوں نے کہا کہ ہم تو ان کے پاس ایک مسجد بنادیں گے (تاکہ مسجد اس بات کی بھی علامت رہے کہ یہ لوگ خود عابد تھے معبود نہ تھے، کوئی ان کو معبود نہ بنالے، اور دوسری عمارتوں میں یہ احتمال تھا کہ آگے آنے والے انھی کو معبود بنالیں گے، پس مسجد بنانا اس مصلحت کے لیے اور دوسرے مفاسد بند کرنے کے لیے تھا)۔

**لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ**: یعنی لوگوں کے مطلع ہونے میں دیگر فوائد کے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ کافروں کو قیامت کا یقین اور مسلمانوں کو زیادہ یقین ہوگیا، اور یقین حاصل ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ انبیاء علیہم السلام ہمیشہ سے قیامت کی خبر دیتے آئے ہیں اور اس پر دلائل بھی قائم ہیں، غرض یقین آنے کی ساری شرائط موجود تھیں، مگر صرف ایک مانع کی وجہ سے کفار کو یقین نہ آتا تھا، وہ یہ کہ ان کے خیال میں دوبارہ زندہ ہونا خلاف عادت اور مستبعد ہے، اس واقعہ سے ثابت ہوگیا کہ خلاف عادت ہوجانا بھی ممکن ہے، بالخصوص اس دراز نینداور بیداری کو موت کے بعد زندہ ہونے سے ایک گونہ مشابہت بھی ہے، پس وہ مانع اور رکاوٹ دور ہوگئی اور یقین آگیا کہ واقعی انبیاء کا فرمانا سچ ہے، پس یہ شبہ نہ رہا کہ اس واقعہ سے قیامت کا امکان تو معلوم ہوسکتا ہے لیکن اس کا یقینا واقع ہونا معلوم نہیں ہوسکتا، جواب یہ ہے کہ اس تقریر سے معلوم ہوگیا کہ یقین پیدا ہونے کی شرائط پہلے سے موجود تھیں، انبیاء کے دلائل کان میں پڑے ہوئے تھے، صرف ایک مانع کی وجہ سے یقین نہ ہوتا تھا، جب وہ مانع دور ہوگیا تو امکان کے ساتھ واقع ہونے کا یقین بھی ہوگیا۔

**لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا**: مسجد بنانا ایک خاص مصلحت کے لیے تھا اور دوسرے مفاسد کا دروازہ بند کرنے کے لیے، سو اگر کسی زمانہ میں مسجد بنانے میں بھی کوئی مفسدہ ہونے لگے وہ بھی ناجائز ہوگی جیسا کہ قواعد شرعیہ شاہد ہیں، سو آیت فی نفسہ جواز سے زیادہ پر دلالت نہیں کرتی، شاید اس تنازع کے ذکر کرنے سے بھی ان کی نعشوں کی حفاظت اور پھر مسجد کی تعمیر سے ان کی حفاظت معبودیت بیان فرمانا مقصود ہو تاکہ معلوم ہوجائے کہ انہوں نے ہم پر توکل کیا اور اطاعت کی تو ہم نے ہر طرح سے کیسی حفاظت کی۔

اس مسجد کے بنانے سے وہ قصد نہ تھا جو جاہل نادانوں کا قبروں کے پاس مسجد بنانے سے ہوتا ہے، بلکہ اس سے مقصود یہ تھا کہ جو لوگ اس مقام پر آئیں وہ نماز بھی ادا کرلیں، اور **علیھم** بمعنی "عندھم" ہوگا، اور اس مسجد کی نسبت اس غار کی طرف ایسی ہوگی جیسے مسجد نبوی کی نسبت مرقد مبارک کی طرف، مثلا یوں کہا جاتا ہے کہ روضہ شریف کی مسجد، سو اس میں قبر پرستوں کے لیے کوئی حجت نہیں ہے۔

اس سے اتنا معلوم ہوا کہ اولیاء صلحاء کی قبور کے پاس نماز کے لئے مسجد بنا دینا کوئی گناہ نہیں، اور جس حدیث میں قبور انبیاء کو مسجد بنانے والوں

پر لعنت کے الفاظ آئے ہیں، اس سے مراد خود قبور کو سجدہ گاہ بنا دینا ہے، جو باتفاق شرک و حرام ہے۔

* * *

**فائدہ:** لہ ایک ان میں سے روپیہ لے کر شہر میں داخل ہوا، وہاں سب چیز اوپری دیکھی، اس مدت میں کئی قرن بدل چکے تھے، شہر کے لوگ اس روپیہ کا سکہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ کس بادشاہ کا نام ہے اور کس عہد کا ہے، سمجھے کہ اس شخص نے کہیں سے پرانا گڑا ہوا مال پالیا ہے، شدہ شدہ معاملہ بادشاہ تک پہنچا، اس نے وہ پرانی تختی طلب کی جس پر چند نام اور پتے لکھے تھے کہ یہ لوگ دفعۃً نامعلوم طریقے سے فلاں سنہ میں غائب ہو گئے ہیں، تحقیق سے ثابت ہو گیا کہ یہ وہی مفقود الخبر جماعت ہے، اس وقت شہر میں "بعث بعد الموت" کے متعلق بڑا جھگڑا ہو رہا تھا کوئی کہتا تھا کہ مرنے کے بعد جینا نہیں کوئی کہتا تھا کہ محض روحانی بعث ہے جسمانی نہیں، کوئی معاد روحانی و جسمانی دونوں کا قائل تھا، بادشاہ وقت حق پرست اور منصف تھا، چاہتا تھا کہ ایک طرف کی کوئی ایسی نظیر ہاتھ لگے جس سے سمجھانے میں آسانی رہے اور استبعادِ عقلی کم ہو، اللہ تعالیٰ نے یہ نظیر بھیج دی، آخر منکرین آخرت بھی یہ حیرت انگیز ماجرا دیکھنے سنے کے بعد آخرت پر یقین لائے، یہ نظارہ خاص طور پر ان کی طبائع پر اثر انداز ہوا سمجھے کہ حق تعالیٰ نے ہم کو تنبیہ کی ہے کہ یہ قصہ بھی دوسری بار جینے سے کم نہیں۔

**تنبیہ:** بعض نے اِذْ یَتَنَازَعُوْنَ بَیْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَیْهِمْ بُنْیَانًا کا مطلب یہ لیا ہے کہ حق تعالیٰ نے اصحاب کہف کے حال سے لوگوں کو اس وقت آگاہ کیا جب کہ اصحاب کہف کے متعلق چرچے اور جھگڑے ہو رہے تھے کہ وہ چند نوجوان جنہیں مدت دراز سے سنتے آئے ہیں کہ یک بیک غائب ہو گئے تھے پھر کچھ پتہ نہ چلا کہاں گئے ہوں گے؟ کہاں ان کی نسل پھیلی ہوگی؟ اب تک زندہ تو کیا ہوتے، سب مر گل کر برابر ہو گئے ہوں گے؟ اس مسئلہ میں کوئی کچھ کہتا تھا دوسرا کچھ خیال ظاہر کرتا تھا کہ دفعۃً حق تعالیٰ نے حقیقت سے پردہ اٹھا دیا، اور سب اختلافات ختم کر دیے۔

**فائدہ:** ۲ یہ پتہ نہیں کہ اس کے بعد اصحاب کہف زندہ رہے یا انتقال کر گئے؟ انتقال ہوا تو کب ہوا، زندہ رہے تو کب تک رہے یا کب تک رہیں گے، بہر حال اہل شہر نے ان کے عجیب و غریب احوال پر مطلع ہو کر فرط عقیدت سے چاہا کہ اس غار کے پاس کوئی مکان بطور یادگار تعمیر کر دیں جس سے زائرین کو سہولت ہو، اس میں اختلاف رائے ہوا ہوگا کہ کس قسم کا مکان بنایا جائے، اس اختلاف کی تفاصیل تو خدا ہی کو معلوم ہیں اور یہ بھی اس کے علم میں ہے کہ یہ تجویز ان کی موت کے بعد ہوئی یا اس سے قبل دوبارہ نیند طاری ہونے کی حالت میں اور لوگوں کو غار تک پہنچ کر ان کی ملاقات میسر ہو سکی یا نہیں، تاہم جو بارسوخ اور ذی اقتدار لوگ تھے ان کی رائے یہ قرار پائی کہ غار کے پاس عبادت گاہ تعمیر کر دی جائے، اصحاب کہف کی نسبت بجز اس کے پکے موحد اور متقی تھے، یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ کس نبی کی شریعت کے پیرو تھے، لیکن جن لوگوں نے معتقد ہو کر وہاں مکان بنایا وہ نصاریٰ تھے، ابو حیان نے "بحر محیط" میں اصحاب کہف کا مقام متعین کرنے کے لیے متعدد اقوال نقل کیے ہیں، من شاء فلیراجعه۔

سَیَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَیَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَیْبِ ۚ

اب یہی کہیں گے وہ تین ہیں چوتھا ان کا کتا، اور یہ بھی کہیں گے وہ پانچ ہیں چھٹا ان کا کتا بدون نشانہ دیکھے پتھر چلانا لہ

وَیَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ؕ قُلْ رَّبِّیْۤ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا یَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِیْلٌ ۬

اور یہ بھی کہیں گے وہ سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتا، تو کہہ میرا رب خوب جانتا ہے ان کی گنتی ان کی خبر نہیں رکھتے مگر تھوڑے لوگ

ع ۳ فَلَا تُمَارِ فِیْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۪ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِیْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾

سو مت جھگڑ ان کی بات میں مگر سرسری جھگڑا، اور مت تحقیق کر ان کا حال ان میں (ان سب میں) کسی سے ۲

**خلاصہ تفسیر:** اصحاب کہف کا قصہ مقام کی ضرورت اور تقاضا کے مطابق مکمل ہوا، گذشتہ آیت میں لوگوں کے نزاع اور اختلاف کا ذکر تھا، چونکہ اس قصہ کے بعض اجزاء کے متعلق بھی لوگ اختلاف رکھتے تھے، جیسے یہ کتنے نوجوان تھے؟ یہ بات مبہم تھی، چنانچہ اب اس کی وضاحت

ہے، ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ کو اختلاف کے وقت طرز گفتگو کی تعلیم فرماتے ہیں۔

(جس وقت اصحاب کہف کا قصہ بیان کریں گے تو) بعض لوگ تو کہیں گے وہ تین ہیں چوتھا ان کا کتا ہے، اور بعض کہیں گے کہ وہ پانچ ہیں چھٹا ان کا کتا ہے (اور) یہ لوگ بے تحقیق بات کو ہانک رہے ہیں اور بعض کہیں گے کہ وہ سات ہیں آٹھواں ان کا کتا ہے، آپ (ان اختلاف کرنے والوں سے) کہہ دیجئے کہ میرا رب ان کی تعداد خوب (صحیح صحیح) جانتا ہے (کہ ان مختلف اقوال میں کوئی قول صحیح بھی ہے یا سب غلط ہیں) ان (کی تعداد) کو (صحیح صحیح) بہت کم لوگ جانتے ہیں (اور چونکہ تعداد متعین کرنے میں کوئی خاص فائدہ نہیں تھا، اس لئے آیت میں کوئی صریح فیصلہ نہیں فرمایا) سو (اس پر بھی اگر وہ لوگ اختلاف سے باز نہ آئیں تو) آپ اس معاملہ میں بجز سرسری بحث کے زیادہ بحث نہ کیجئے (یعنی مختصر طور پر تو ان کے خیالات کا ردقرآن کی آیات میں آ ہی چکا ہے جو رجماً بالغیب اور قل ربی اعلم سے بیان کر دیا گیا ہے، پس سرسری بحث یہی ہے کہ اس پر اکتفا کریں، ان کے اعتراض کے جواب میں اس سے زیادہ مشغول ہونا اور اپنے دعوے کے اثبات میں زیادہ کاوش کرنا مناسب نہیں کہ یہ بحث ہی کوئی خاص فائدہ نہیں رکھتی) اور آپ ان (اصحاب کہف) کے بارے میں ان لوگوں میں سے کسی سے بھی کچھ نہ پوچھئے (جس طرح آپ کو ان کے اعتراض و جواب میں زیادہ کاوش سے منع کیا گیا، اسی طرح اس کی بھی ممانعت فرما دی کہ اب اس معاملہ کے متعلق کسی سے سوال یا تحقیق کریں، کیونکہ جتنی بات ضروری تھی وہ وحی میں آ گئی، غیر ضروری سوالات اور تحقیقات شان انبیاء کے خلاف ہے)۔

**مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ**: یعنی ان کی صحیح تعداد بہت کم لوگ جانتے ہیں، روایات میں حضرت ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ سے یہ منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: "انا من القليل ، كانوا سبعة "یعنی میں بھی ان قلیل لوگوں میں داخل ہوں جن کے بارے میں قرآن نے فرمایا کہ کم لوگ جانتے ہیں اور وہ سات تھے، آیت میں بھی اس قول کی صحت کا اشارہ پایا جاتا ہے، کیونکہ اس قول کو نقل کر کے اس کو رد نہیں فرمایا، بخلاف پہلے دونوں قول کے کہ ان کے تردید میں رجماً بالغیب فرمایا گیا ہے، واللہ اعلم۔

**فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا**: اس میں رسول اللہ ﷺ کو جو تعلیم دی گئی ہے وہ درحقیقت علماء امت کے لئے اہم رہنما اصول ہیں کہ جب کسی مسئلہ میں اختلاف پیش آئے تو جس قدر ضروری بات ہے اس کو واضح کر کے بیان کر دیا جائے اس کے بعد بھی لوگ غیر ضروری بحث میں الجھیں تو ان کے ساتھ سرسری گفتگو کر کے بحث ختم کر دی جائے، اپنے دعوے کے اثبات میں کاوش اور ان کی بات کی تردید میں بہت زور لگانے سے گریز کیا جائے کہ اس کا کوئی خاص فائدہ تو ہے نہیں، مزید بحث و تکرار میں وقت کی اضاعت بھی ہے اور باہم تلخی پیدا ہونے کا خطرہ بھی۔

**وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا**: دوسری ہدایت دوسرے جملے میں یہ دی گئی ہے کہ وحی الٰہی کے ذریعہ سے قصہ اصحاب کہف کی جتنی معلومات آپ کو دے دی گئی ہیں ان پر قناعت فرمائیں کہ وہ بالکل کافی ہیں، زائد کی تحقیقات اور لوگوں سے سوال وغیرہ میں نہ پڑیں، اور دوسروں سے سوالات کا ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی جہالت یا ناواقفیت ظاہر کرنے اور ان کو رسوا کرنے کے لئے سوال کیا جائے یہ بھی اخلاق انبیاء کے خلاف ہے، اس لئے دوسرے لوگوں سے دونوں طرح کے سوال کرنا ممنوع کر دیا گیا، یعنی تحقیق مزید کے لئے ہو یا مخاطب کی تجہیل و رسوائی کے لئے ہو۔

* * *

**فائدہ**: ۱۔ یعنی سامعین "اصحاب کہف" کا قصہ سن کر جیسا کہ لوگوں کی عادت ہے، اٹکل کے تیر چلائیں گے، کوئی کہے گا کہ وہ تین تھے چوتھا کتا تھا، کوئی پانچ بتلا کر چھٹا کتے کو شمار کرے گا، لیکن یہ سب اقوال ایسے ہیں جیسے کوئی بے نشانہ دیکھے پتھر چلاتا رہے، ممکن ہے مختلف باتیں کہنے سے جہل کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کا امتحان کرنا بھی مقصود ہو کہ دیکھیں یہ اس معاملہ میں کیا کہتے ہیں، کیونکہ احتمال ہے کہ یہود نے ان کو صحیح تعداد سات کی بتلائی ہو جس کی طرف آگے قرآن نے اشارہ کیا ہے۔

**فائدہ**: ۲۔ یعنی اس قسم کی غیر معتد بہ باتوں میں زیادہ جھگڑنا لاحاصل ہے، عدد کے معلوم ہونے سے کوئی اہم مقصد متعلق نہیں، جتنی بات خدا نے بتلا دی اس سے زیادہ تحقیق کے درپے ہونا یا جس قدر تردید خدا تعالیٰ کر چکا اس سے زیادہ جھگڑنا اور تردید کرنا فضول ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہ

نے فرمایا میں ان قلیل لوگوں میں سے ہوں (جنہوں نے سیاق قرآنی سے معلوم کرلیا کہ) اصحاب کہف سات ہی تھے، کیونکہ حق تعالیٰ نے پہلے دو قول کو رجماً بالغیب فرمایا، تیسرے قول کے ساتھ نہیں فرمایا، اس کے علاوہ وہ اسلوب بیان بھی بدلا ہوا ہے، پہلے دونوں جملوں میں "واوعطف" نہ تھا، تیسرے میں وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ عطف کے ساتھ لانے سے گویا اس پر زور دینا ہے کہ اس قول کا قائل پوری بصیرت و وثوق کے ساتھ واقعہ کی تفصیل سے واقف ہے، بعض نے اس کی تائید میں یہ بھی کہا ہے کہ پہلے قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ سے ایک قائل کا ہونا اور قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا الخ سے اس کے سوا کم ازکم تین قائلین کا پھر دوسرے قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ الخ سے ان کی علاوہ تین اور قائلین کا ثبوت ملتا ہے، اس طرح کم ازکم سات آدمی ہونے چاہئیں، کتا ان کے علاوہ رہا۔

| |
|---|
| وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۡ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ |
| اور نہ کہنا کسی کام کو کہ میں یہ کروں گا کل کو، مگر یہ کہ اللہ چاہے، اور یاد کر لے اپنے رب کو جب بھول جائے |
| وَقُلْ عَسٰۤى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾ |
| اور کہہ امید ہے کہ میرا رب مجھ کو دکھلائے (سجھائے) اس سے زیادہ نزدیک راہ نیکی کی |

**خلاصہ تفسیر**: پیچھے طرز گفتگو کے متعلق ہدایت دی گئی تھی، گفتگو میں سوال وجواب کی نوبت بھی پیش آجاتی ہے، چنانچہ اب اسی بارے میں فرماتے ہیں کہ ان کا سوال جب کہ اس کا جواب وحی میں منقول نہ ہو اور وہ سوال قابل جواب بھی ہو تو اس بنا پر جواب کا وعدہ کرلیا جائے اور ساتھ ہی اسے مشیت الٰہی پر معلق کرنے کا عام حکم بھی فرمایا۔

اور (اگر لوگ آپ سے کوئی جواب کے قابل بات دریافت کریں اور آپ جواب کا وعدہ کریں تو اس کے ساتھ ان شاءاللہ یا اس کے ہم معنی کوئی بات ضرور ملالیا کریں، بلکہ وعدہ کی بھی تخصیص نہیں، ہر ہر کام میں اس کا لحاظ رکھیں کہ) آپ کسی کام کی نسبت یوں نہ کہا کیجئے کہ میں اس کو (مثلاً) کل کردوں گا مگر خدا کے چاہنے کو (اس کے ساتھ) ملا دیا کیجئے (یعنی ان شاءاللہ وغیرہ بھی ساتھ کہہ دیا کیجئے، اور آئندہ ایسا نہ ہو جیسا اس واقعہ میں پیش آیا کہ آپ سے لوگوں نے روح، اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے متعلق سوالات کئے، آپ نے بغیر ان شاءاللہ کہے ان سے کل جواب دینے کا وعدہ کرلیا، پھر پندرہ روز تک وحی نازل نہ ہوئی اور آپ کو بڑا غم ہوا، اس کے بعد جواب کے ساتھ یہ حکم بھی نازل ہوا) اور جب آپ (اتفاقاً ان شاءاللہ کہنا) بھول جائیں (اور پھر کبھی یاد آئے) تو (اسی وقت ان شاءاللہ کہہ کر) اپنے رب کا ذکر کرلیا کیجئے اور (ان لوگوں سے یہ بھی) کہہ دیجئے کہ مجھ کو امید ہے کہ میرا رب مجھ کو (نبوت کی دلیل بننے کے اعتبار سے) اس (قصہ) سے بھی نزدیک تر بات بتلائے۔

**وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ**: اس میں خالص تجرید وتفرید کا ارشاد ہے ("تجرید" کا مطلب ہے کہ کسی بھی چیز کی نسبت اپنی طرف نہ کرنا اور حق کی خودی میں مل جانا، اور "تفرید" کا مطلب ہے غیرحق کو اپنی نظر وفکر سے دور کردینا")۔

**وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ**: ان شاءاللہ زبان سے کہنا مستحب ہے، لیکن خواص کی پھر اخص الخواص حضور ﷺ کی شان ارفع ہوتی ہے اس لیے مستحب کے چھوڑنے پر بھی وحی میں دیر ہوگئی، اس سے ذکر کا مطلوب ہونا بھی ظاہر ہوتا ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر بھولے سے یہ کلمہ کہنے سے رہ جائے تو جب یاد آئے اسی وقت کہہ لے، یہ حکم ان مخصوص معاملات کے لئے ہے جس کے متعلق یہ آیات نازل ہوئی ہیں، یعنی محض تبرک اور اقرار عبدیت کے لئے بطور تفویض یہ کلمہ کہنا مقصود ہوتا ہے، کوئی تعلیق اور شرط لگانا مقصود نہیں ہوتا، اس لئے اس سے لازم نہیں آتا کہ خرید وفروخت کے معاملات اور معاہدات میں جہاں شرطیں لگائی جاتی ہیں، اور شرط لگانا طرفین کے لئے معاہدہ کا مدار ہوتا ہے وہاں بھی اگر معاہدہ کے وقت کوئی شرط لگانا بھول جائے تو پھر کبھی جب یاد آجائے جو چاہے شرط لگالے، اس مسئلے میں بعض فقہا کا اختلاف بھی

ہے،جس کی تفصیل کتب فقہ میں ہے۔

عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا : مطلب یہ ہے کہ کفار سے کہہ دیجیے کہ تم نے میری نبوت کا امتحان لینے کے لئے اصحاب کہف وغیرہ کے قصے دریافت کئے، جو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی مجھے بتلا کر تمہارا اطمینان کر دیا، مگر اصل بات یہ ہے کہ ان قصوں کے سوال وجواب اثبات نبوت کے لئے کوئی بہت بڑی دلیل نہیں ہوسکتی، یہ کام تو کوئی غیر نبی بھی جو تاریخ عالم سے زیادہ واقف ہو وہ بھی کر سکتا ہے، مگر مجھے تو اللہ تعالیٰ نے میری نبوت کے اثبات کے لئے اس بھی بڑے قطعی دلائل اور معجزات عطا فرمائے ہیں، جن میں سب سے بڑی دلیل تو خود قرآن ہے، جس کی ایک آیت کی بھی ساری دنیا مل کر نقل نہیں اتار سکی، اس کے علاوہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک کے وہ واقعات بذریعہ وحی مجھے بتلا دیئے گئے ہیں جو زمانے کے اعتبار سے بھی بہ نسبت واقعہ اصحاب کہف وذوالقرنین کے زیادہ بعید ہیں، اور ان کا علم بھی کسی کے لئے بجز وحی کے ممکن نہیں ہوسکتا، خلاصہ یہ ہے کہ تم نے تو اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے واقعات کو سب سے زیادہ عجیب سمجھ کر اسی کو امتحان نبوت کے سوال میں پیش کیا، مگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے بھی زیادہ عجیب عجیب چیزوں کے علوم عطا فرمائے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** اصحاب کہف کا قصہ تاریخی کتابوں میں نادرات میں لکھا تھا، ہر کسی کو کہاں خبر ہوسکتی، مشرکین نے یہود کے سکھانے سے حضرت سے پوچھا، مقصود آپ ﷺ کی آزمائش تھی، حضور اکرم ﷺ نے وعدہ کیا کہ کل بتاؤں گا، اس بھروسہ پر کہ جبرائیل آئیں گے تو دریافت کر دوں گا، جبرائیل پندرہ دن تک نہ آئے حضرت نہایت غمگین ہوئے، مشرکین نے ہنسنا شروع کیا، آخر یہ قصہ لے کر آئے اور پیچھے نصیحت کی کہ آئندہ کی بات کے متعلق بغیر ''ان شاء اللہ'' کے وعدہ نہ کرنا چاہیے، اگر ایک وقت بھول جائے تو پھر یاد کر کے کہہ لے، اور فرمایا کہ امید رکھ کہ تیرا درجہ اللہ اس سے زیادہ کرے یعنی کبھی نہ بھولے (موضح القرآن) یا اصحاب کہف کے واقعہ سے زیادہ عجیب طور پر آپ کی حفاظت فرمائے اور کامیاب کرے جیسا کہ غار ثور کے قصہ میں ہوا، یا واقعہ کہف سے زیادہ عجیب واقعات وشواہد آپ کی زبان سے بیان کرائے۔

**وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿٢٥﴾**

اور مدت گزر چکی ان پر اپنی کھوہ میں تین سو برس اور ان کے اوپر نو

**خلاصہ تفسیر:** اور (جس طرح اصحاب کہف کی تعداد میں لوگوں کو اختلاف تھا، اسی طرح ان کے سوتے رہنے کی مدت میں بھی بہت اختلاف ہے، ہم اس میں صحیح بات بتلاتے ہیں کہ) وہ لوگ اپنے غار میں (نیند کی حالت میں) تین سو برس تک رہے اور نو برس اوپر اور رہے۔

وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ : تفسیر حقانی میں تاریخ سے نقل کیا ہے کہ ظالم بادشاہ جس کے خوف سے بھاگ کر اصحاب کہف نے غار میں پناہ لی تھی اس کا زمانہ ۲۵۰ء تھا، پھر تین سو سال تک یہ لوگ سوتے رہے، تو مجموعہ ۵۵۰ء ہو گیا، اور رسول اللہ ﷺ کی ولادت ۵۷۰ء میں ہوئی، تو اس حساب سے ان کی بیداری آپ ﷺ کی پیدائش سے بیس برس پہلے ہوئی، رہی یہ بات کہ اب زندہ ہیں یا مر گئے تو اکثر روایات سے یہی ثابت ہے کہ اسی زمانہ کے قریب انتقال کر گئے، واللہ اعلم۔

اس آیت میں جو غار میں سونے کی مدت تین سو نو سال بتلائے ہیں، ظاہر نسق قرآن سے یہی ہے کہ یہ بیان مدت حق تعالیٰ کی طرف سے ہے، ابن کثیرؒ نے اسی کو جمہور مفسرین سلف، خلف کا قول قرار دیا ہے، ابوحیان اور قرطبی وغیرہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، مگر حضرت قتادہ وغیرہ سے اس میں ایک دوسرا قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ یہ تین سو نو سال کا قول بھی انہی اختلاف کرنے والوں میں سے بعض کا قول ہے، اور اللہ تعالیٰ کا قول صرف وہ ہے جو اگلی آیت میں فرمایا یعنی: اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا کیونکہ پہلا قول تین سو نو کے متعین کرنے کا اگر اللہ کا کلام ہوتا تو اس کے بعد اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا کہنے کا موقع نہ تھا، مگر جمہور مفسرین نے فرمایا کہ یہ دونوں جملے حق تعالیٰ کا کلام ہیں، پہلے میں حقیقت واقعہ کا بیان ہے اور دوسرے میں اس سے اختلاف کرنے والوں

کو تنبیہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدت کا بیان آ گیا تو اب اس کو تسلیم کرنا لازم ہے، وہی جاننے والا ہے، محض تخمینوں اور رایوں سے اس کی مخالفت بے عقلی ہے۔

جو لوگ معجزات اور خوارق عادات کے منکر ہیں یا کم از کم آج کل کے مستشرقین یہود و نصاریٰ کے اعتراضات سے مرعوب ہو کر ان میں تاویلیں کرنے کے خوگر ہو گئے ہیں انہوں نے اس آیت میں بھی حضرت قتادہ کی تفسیر کا سہارا لے کر تین سے نو سال کی مدت انہی لوگوں کا قول قرار دے کر رد کرنا چاہا ہے، مگر اس پر غور نہیں کیا کہ قرآن کے ابتدائی جملے میں جو لفظ سِنِيْنَ عَدَدًا کا آیا ہے اس کو تو سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کا قول نہیں کہا جا سکتا، خرق عادت اور کرامت کے ثبوت کے لئے اتنا بھی کافی ہے کہ سالہا سال کوئی سوتا رہے اور پھر صحیح، تندرست زندہ اٹھ کر بیٹھ جائے، واللہ اعلم۔

**ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا**: ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اصحاب کہف کے معاملے میں خود ان کے زمانے میں، پھر عہد نبوی کے اندر یہود و نصاریٰ میں دو باتیں زیر اختلاف تھیں: ① ایک اصحاب کہف کی تعداد ② دوسری غار میں ان کے سوتے رہنے کی مدت، قرآن نے ان دونوں کو بیان تو کر دیا، مگر اس فرق کے ساتھ ان کی تعداد کا بیان صریح الفاظ میں نہیں آیا، اشارے کے طور پر آیا، کہ جو قول صحیح تھا اس کی تردید نہیں کی اور مدت کی تعیین کو صاف و صریح الفاظ میں بتلایا: ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا وجہ یہ ہے کہ قرآن نے اپنے اس اسلوب سے اس طرف اشارہ فرمایا کہ تعداد کی بحث تو بالکل ہی فضول ہے، اس سے کسی دنیوی دینی مسئلہ کا تعلق نہیں، البتہ مدت دراز تک خلاف عادت انسانی سوتے رہنا اور بغیر غذا کے صحیح تندرست رہنا، پھر اتنے عرصہ کے بعد صحت مند اور قوی اٹھ کر بیٹھ جانا ایک نظیر حشر و نشر کی ہے، چنانچہ اتنی لمبی نیند کا واقعہ قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے سے مشابہت رکھتا ہے تو نمونہ قدرت ہونے کی وجہ سے یہ واقعہ قیامت و آخرت کے امکان پر بہت دلالت کرتا ہے اور اس کی اہل مکہ کو ضرورت تھی، اس لیے اس کو صراحت کے ساتھ بیان کر دیا اور سونے والوں کی تعداد بتلانے کی زیادہ ضرورت نہ تھی اس پر صرف اشارہ کر دیا۔

**وَازْدَادُوْا تِسْعًا**: یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے بیان مدت میں پہلے تین سو سال بیان کئے، اس کے بعد فرمایا کہ ان تین سو پر نو اور زیادہ ہو گئے، پہلے ہی تین سو نو نہیں فرمایا؟ اس کا سبب حضرات مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ یہود و نصاریٰ میں چونکہ شمسی سال کا رواج تھا اس کے حساب سے تین سو سال ہی ہوتے ہیں، اور اسلام میں رواج قمری سال کا ہے اور قمری حساب میں ہر سو سال پر تین سال بڑھ جاتے ہیں، اس لئے تین سو سال شمسی پر قمری حساب سے نو سال مزید ہو گئے، ان دونوں سالوں کا امتیاز بتانے کے لئے عنوان تعبیر یہ اختیار کیا گیا۔

* * *

**فائدہ**: یعنی شمسی حساب سے پورے تین سو سال کھوہ میں سوتے رہے اور قمری حساب سے نو سال زیادہ ہوئے (مہینوں اور دنوں کی کسور محسوب نہیں کی گئیں) یا تین سو سال کے بعد ممکن ہے قدرے نیند سے چونکے ہوں پھر سو گئے اور نو سال تک سوتے رہے، بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ تین سو نو سال جاگنے کے بعد سے عہد نبوی ﷺ تک کی مدت بیان فرمائی، یعنی لوگوں سے مل ملا کر پھر سو رہے جس کو آپ ﷺ کے زمانہ تک اتنا عرصہ گزرا، واللہ اعلم۔

**لطیفہ**: ہمارے زمانہ میں صوبہ زیشوان میں ایک شخص دو سو باون سال کی عمر رکھتا ہے، چوبیسویں شادی ابھی حال میں کی ہے۔

| |
|---|
| قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ ؕ |
| تو کہہ اللہ خوب جانتا ہے جتنی مدت ان پر گزری، اسی کے پاس ہیں چھپے بھید آسمانوں اور زمین کے، کیا عجیب دیکھتا اور سنتا ہے۔[1] |
| مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ۫ وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ﴿٢٦﴾ |
| کوئی نہیں بندوں پر اس کے سوائے مختار، اور نہیں شریک کرتا اپنے حکم میں کسی کو۔[2] |

**خلاصہ تفسیر**: (اور اگر اس صحیح بات کو سن کر بھی وہ اختلاف کرتے رہے تو) آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ ان کے (سوتے) رہنے

کی مدت کو ( توتم سے ) زیادہ جانتا ہے (اس لئے جو اس نے بتلا دیا وہی صحیح ہے اور اس واقعہ کی کیا خاصیت ہے اس کی شان تو یہ ہے کہ ) تمام آسمانوں اور زمین کا علم غیب اسی کو ہے وہ کیسا کچھ دیکھنے والا کیسا کچھ سننے والا ہے (اس لیے انہیں چاہیے کہ ایسے محیط علم والے کے ساتھ اپنے ناقص علم کے ذریعہ مقابلہ نہ کریں ورنہ مستحق سزا ہوں گے اور سزا کے وقت ) ان کا خدا کے سوا ( جتنے ہیں ان میں سے ) کوئی بھی مددگار نہیں، اور نہ اللہ کسی کو اپنے حکم میں شریک ( کیا) کرتا ہے ( خلاصہ یہ ہے کہ نہ اس کا کوئی مزاحم ہے نہ کوئی شریک، ایسی ذات عظیم کی مخالفت سے بہت ڈرنا چاہئے )۔

**قُلِ اللهُ اَعۡلَمُ بِمَا لَبِثُوۡا**: اصحاب کہف سے متعلق جو دیگر تاریخی اور جغرافیائی تفصیلات منقول ہیں نہ قرآن کی کسی آیت کا سمجھنا ان پر موقوف ہے نہ اس مقصد کا کوئی ضروری حصہ ان سے متعلق ہے جس کے لئے قرآن کریم نے یہ قصد بیان کیا ہے، پھر روایات وحکایات اور ان کے آثار و قرائن اس درجہ مختلف ہیں کہ ساری تحقیق وکاوش کے بعد بھی اس کا کوئی قطعی فیصلہ ممکن نہیں، صرف ترجیحات اور رجحانات ہی ہو سکتے ہیں، لیکن آج کل تعلیم یافتہ طبقہ میں تاریخی تحقیقات کا ذوق بہت بڑھا ہوا ہے، اس کی تسکین کے لئے کچھ تفصیلات نقل کر دی گئی ہیں، واللہ اعلم، اور حقیقت یہ ہے کہ ان تمام تحقیقات کے بعد بھی ہم وہیں کھڑے ہیں جہاں سے چلے تھے کہ مقام متعین کرنے کی نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ اس کی تعیین کسی یقینی ذریعہ سے کی جاسکتی ہے، اس تاریخی قصے کے وہ اجزاء جن کو نہ قرآن نے بیان کیا نہ حدیث رسول اللہ ﷺ نے، اور نہ اس واقعہ کا کوئی خاص مقصد یا قرآن کی کسی آیت کا سمجھنا اس پر موقوف ہے، اور نہ تاریخی روایات سے ان چیزوں کا کوئی قطعی فیصلہ کیا جاسکتا ہے، باقی رہے قصے کے وہ اجزا جن کا خود قرآن کریم نے ذکر فرمایا ہے ان کی تفصیل انہی آیات کے تحت بیان کر دی گئی ہے۔

**مَا لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ وَّلِيٍّ**: پوری کائنات میں تصرف کرنے والی ذات اور قادر حقیقی خدا تعالی کی ذات ہے، اس لیے وہی کامل اختیار رکھنے والا ہے اور دوسری تمام مخلوقات چونکہ فاعل مجازی ہیں اس لیے مکمل اختیار بھی نہیں رکھتی۔

* * *

**فائدہ**: ۱؎ جتنی مدت سوکر وہ جاگے تھے، تاریخ والے کئی طرح بتاتے تھے، سب سے ٹھیک وہ ہی ہے جو اللہ بتائے، آسمان و زمین کے تمام پوشیدہ راز اس کے علم میں ہیں، کوئی چیز اس کی آنکھ سے اوجھل نہیں۔

**فائدہ**: ۲؎ یعنی جس طرح اس کا علم محیط ہے، اس کی قدرت و اختیار بھی سب پر حاوی ہے، جیسے غیوب سموات وارض کے علم میں اس کا کوئی شریک نہیں، اختیارات وقدرت میں بھی کوئی سہیم وشریک نہیں ہوسکتا۔

**وَاتۡلُ مَاۤ اُوۡحِىَ اِلَيۡكَ مِنۡ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَلَنۡ تَجِدَ مِنۡ دُوۡنِهٖ مُلۡتَحَدًا ﴿۲۷﴾**

اور پڑھ جو وحی ہوئی تجھ کو تیرے رب کی کتاب سے، کوئی بدلنے والا نہیں اسکی باتیں، اور کہیں نہ پائے گا تو اسکے سوائے چھپنے کو جگہ ( پناہ کی جگہ )

**خلاصہ تفسیر**: پیچھے سے رسالت کی بحث چلی آرہی ہے اور اسی کو ثابت کرنے کے لیے اصحاب کہف کا قصہ بیان کیا گیا، اب یہاں بھی منصب رسالت کے حقوق وآداب بیان کیے جاتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ استغنا کے ساتھ تبلیغ کی جائے اور شکستہ حال مسلمانوں کو خوش حال کافروں پر ترجیح دی جائے، چنانچہ ان آیات کا شان نزول بھی یہی ہے کہ بعض رؤساء مشرکین نے آپ ﷺ سے درخواست کی تھی کہ ہمارے آنے کے وقت ان فقراء کو ہٹا دیا کیجیے جس کی کچھ تفصیل سورہ انعام آیت ۵۲: **وَلَا تَطۡرُدِ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ** میں گزر چکی ہے۔

اور ( آپ کا کام صرف اس قدر ہے کہ ) آپ کے پاس جو آپ کے رب کی کتاب وحی کے ذریعہ آئی ہے وہ (لوگوں کے سامنے ) پڑھ دیا کیجئے (اس سے زیادہ اس کی فکر میں نہ پڑیں کہ رئیس لوگ اگر اسلام کی مخالفت کرتے رہے تو دین کو ترقی کس طرح ہوگی؟! کیونکہ اس کا اللہ تعالیٰ نے خود وعدہ فرمالیا ہے اور ) اس کی باتوں کو ( یعنی وعدوں کو ) کوئی نہیں بدل سکتا (یعنی ساری دنیا کے مخالف بھی مل کر اللہ کو وعدہ پورا کرنے سے نہیں روک سکتے

اور اللہ تعالیٰ خود اگر چہ تبدیلی پر قدرت رکھتے ہیں مگر وہ تبدیل نہیں کریں گے، پھر کسی کی مخالفت سے کیا نقصان ) اور (اگر آپ نے ان کفار رئیس لوگوں کی دل جوئی اس طرح کی جس سے احکام الٰہی فوت ہوجائیں تو پھر ) آپ خدا کے سوا کوئی پناہ نہ پائیں گے (اگر چہ رسول ﷺ سے احکام الٰہیہ کا فوت ہونا یقیناً محال ہے، لیکن یہاں مبالغہ کے ساتھ اس فعل کا اثر بیان کرنا مقصود ہے اور تاکید کے لیے بفرض محال یہ کہا گیا)۔

* * *

**فائدہ:** پہلے اصحاب کہف کے قصہ پر فرمایا تھا: فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۖ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا مطلب یہ ہے کہ بیکار چیزوں میں زیادہ الجھنے اور کاوش کرنے کی ضرورت نہیں، آپ ﷺ اپنے فرض منصبی کی انجام دہی میں مشغول رہیے، یعنی جو جامع و مانع اور کافی وشافی کتاب تیرے رب نے مرحمت فرمائی اسے پڑھ کر سناتے رہیے، خدا نے جو باتیں اس میں سنائیں اور جو وعدے کیے کوئی طاقت نہیں جو انھیں بدل یا ٹال سکے یا غلط ثابت کر سکے، اگر کوئی ان باتوں کو بدلنے کے درپے ہوگا یا اس کتاب کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرے گا وہ خوب سمجھ لے کہ خدا کے مجرم کے لیے کہیں پناہ نہیں، ہاں وفاداروں کو پناہ دینے کے لیے اس کی رحمت وسیع ہے، دیکھ لو ''اصحاب کہف'' کو جو خدا کی باتوں پر جمے رہے کیسی اچھی جگہ اپنے فضل سے عنایت فرمائی۔

| |
|---|
| وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ |
| اور روکے رکھ اپنے آپ کو ان کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح اور شام طالب ہیں اس کے منہ (رضا) کے ۱ اور نہ دوڑیں |
| عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا |
| تیری آنکھیں ان کو چھوڑ کر، تلاش میں رونق زندگانی دنیا کی ۲ اور نہ کہا مان (مت سن) اس کا جس کا دل غافل کیا ہم نے اپنی یاد سے |
| وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾ |
| اور پیچھے پڑا ہوا ہے اپنی خوشی کے اور اس کا کام ہے حد پر (سے نکل جانا) نہ رہنا ۳ |

**خلاصہ تفسیر:** اور (جیسا کہ کفار کے امیر سرداروں سے آپ کو مستغنی رہنے کا حکم دیا گیا ہے اسی طرح غریب مسلمانوں کے حال پر زیادہ توجہ کا آپ کو حکم ہے، پس) آپ اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ (بیٹھنے میں) مقید رکھا کیجئے جو صبح وشام (یعنی ثابت قدمی اور مستقل مزاجی سے) اپنے رب کی عبادت محض اس کی رضا جوئی کے لئے کرتے ہیں (ان کی کوئی دنیوی غرض نہیں ہے) اور دنیوی زندگی کی رونق کے خیال سے آپ کی آنکھیں (یعنی توجہات) ان سے ہٹنے نہ پائیں (رونق دنیا کے خیال سے مراد یہ ہے کہ یہ رئیس لوگ مسلمان ہوجائیں تو اسلام کی زیادہ شان اور ترقی ہوجائے گی، اس آیت میں بتلا دیا گیا کہ اسلام کی شان ظاہری مال ومتاع سے نہیں بلکہ اخلاص واطاعت سے ہے، وہ غریب فقیر لوگوں میں ہو تو بھی اسلام کی رونق بڑھے گی) اور ایسے شخص کا کہنا (غریبوں کو مجلس سے ہٹا دینے کے متعلق) نہ مانئے جس کے قلب کو ہم نے (اس کے عناد کی سزا میں) اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے (کہ دین حق کو قبول نہیں کرتا) اور وہ اپنی نفسانی خواہش پر چلتا ہے، اور اس کا یہ حال (یعنی اتباع ہوی) حد سے گزر گیا ہے۔

**وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ:** یعنی آپ اپنے نفس کو ان لوگوں کے ساتھ باندھ کر رکھیں، اس کا یہ مفہوم نہیں کہ کسی بھی وقت جدا نہ ہوں، بلکہ مراد یہ ہے کے تعلقات اور توجہات سب ان لوگوں کے ساتھ وابستہ رہیں، معاملات میں انہی سے مشورہ لیں، انہی کی امداد واعانت سے کام کریں، دیر تک بیٹھنے کو مقید رکھنا فرما دیا، اور اس کی وجہ اور حکمت ان الفاظ سے بتلا دی گئی کہ یہ لوگ صبح شام یعنی ہر حال میں اللہ کو پکارتے اور اسی کا ذکر کرتے ہیں، ان کا جو عمل ہے وہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ہے، اور یہ سب حالات وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نصرت وامداد کو کھینچتے ہیں، اللہ کی مدد ایسے ہی لوگوں

کے لئے آیا کرتی ہے، چندروز کی کس مپرسی سے گھبرائیں نہیں، انجام کار فتح ونصرت انہی کو حاصل ہوگی۔

بعض لوگوں کو وسوسہ ہوا ہے کہ ان سرداروں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر ہمارے لیے خاص مجلس بن جائے تو ہم مسلمان ہوجائیں گے تو یہ درخواست تو منظوری کے قابل تھی کہ ان کے لئے ایک مجلس علیحدہ کردی جاتی، تاکہ ان کو اسلام کی دعوت پہنچانے میں اور ان لوگوں کو قبول کرنے میں سہولت ہوتی پھر کیوں قبول نہ کی گئی؟ جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ یہ لوگ پھر بھی ایمان نہ لائیں گے، ایک جواب یہ بھی ہے کہ اس طرح کی تقسیم میں سرکش مالداروں کا ایک خاص اعزاز تھا، جس سے غریب مسلمانوں کی دل شکنی یا حوصلہ شکنی ہوسکتی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کو گوارا نہ فرمایا، اور اصول دعوت وتبلیغ یہی قرار دے دیا کہ اس میں کسی کا کوئی امتیاز نہ ہونا چاہیے، تیسری بات یہ کہ اگر کوئی کافر اسلام لانے میں جائز شرط بھی لگائے تو اس کا پورا کرنا بھی کسی کے ذمہ ضروری نہیں چہ جائیکہ ناجائز شرط ہو، مثلاً اگر کوئی کافر کہے کہ مجھے ہزار روپے دو تو میں اسلام لے آؤں گا تو اس شرط کا پورا کرنا کسی مسلمان کے ذمہ بھی ضروری نہیں۔

**وَاصۡبِرۡ نَفۡسَكَ**: اس آیت میں حکم ہے کہ فقراء مؤمنین کے ساتھ صحبت ومجالست رکھی جائے، اگر چہ آپ ﷺ جو اُن فقراء سے صحبت رکھتے تھے تو اس کا فائدہ ان فقراء کو پہنچتا تھا مگر دوسرے لوگ بھی اس صحبت سے خود مستفید ہوں گے، کیونکہ یہ فقراء ایسی قوم ہے کہ ان کا ہم نشین محروم نہیں رہتا۔

**وَلَا تَعۡدُ عَيۡنٰكَ عَنۡهُمۡ**: اس میں اساتذہ ومشائخ کو حکم ہے کہ طالبین پر توجہ رکھیں اور ان سے نہ اکتائیں (عالم شریعت اور شیخ طریقت پر لازم ہے کہ فقراء کی صحبت اور مجالست کو نعمت سمجھے اور اپنی مجلس کو عام رکھے، امراء اور اغنیاء کی رعایت سے اپنی مجلس سے فقراء کو نہ اٹھائے، ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مذموم ہے، فقراء اور مساکین کے پاس بیٹھنے سے دنیا نظروں میں خوار ہوتی ہے)۔

**تُرِيۡدُ زِيۡنَةَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا**: اس میں اغنیاء اور مال داروں کی طرف جھکاؤ اور ان کی خاطر مدارات وآؤ بھگت ان کی مالداری کے سبب کرنے کی مذمت ہے۔

**وَلَا تُطِعۡ مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَهٗ**: اس میں غافلین کی اطاعت سے منع کیا گیا ہے اور اسی اطاعت میں خاطر مدارات اور آؤ بھگت بھی داخل ہے، کیونکہ وہ اپنے حال سے اسی کا طالب ہے اگر چہ زبان سے ظاہر نہیں کرتا۔

* * *

**فائدہ: ۱ يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ**: یعنی اس کے دیدار اور خوشنودی حاصل کرنے کے شوق میں نہایت اخلاص کے ساتھ دائماً عبادت میں مشغول رہتے ہیں، مثلاً ذکر کرتے ہیں، قرآن پڑھتے ہیں، نمازوں پر مداومت رکھتے ہیں، حلال وحرام میں تمیز کرتے ہیں، خالق ومخلوق دونوں کے حقوق پہچانتے ہیں گو دنیاوی حیثیت سے معزز اور مالدار نہیں، جیسے صحابہ میں اس وقت عمار، صہیب، بلال، ابن مسعود وغیرہ رضی اللہ عنہم تھے، ایسے مومنین مخلصین کو اپنی صحبت ومجالست سے مستفید کرتے رہیے، اور کسی کے کہنے سننے پر ان کو اپنی مجلس سے علیحدہ نہ کیجئے۔

**فائدہ: ۲ تُرِيۡدُ زِيۡنَةَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا**: یعنی ان غریب شکستہ حال مخلصین کو چھوڑ کر موٹے موٹے متکبر دنیاداروں کی طرف اس غرض سے نظر نہ اٹھائیے کہ ان کے مسلمان ہوجانے سے دین اسلام کو بڑی رونق ہوگی، اسلام کی اصلی عزت ورونق مادی خوشحالی اور چاندی سونے کے سکوں سے نہیں مضبوط ایمان وتقویٰ اور اعلیٰ درجہ کی خوش اخلاقی سے ہے، دنیا کی ٹیپ ٹاپ محض فانی اور سایہ کی طرح ڈھلنے والی ہے، حقیقی دولت تقویٰ اور تعلق مع اللہ کی ہے جسے نہ شکست ہے، نہ زوال، چنانچہ اصحاب کہف کے واقعہ میں خدا کو یاد کرنے والوں اور دنیا کے طالبوں کا انجام معلوم ہو چکا۔

**فائدہ: ۳ وَكَانَ اَمۡرُهٗ فُرُطًا**: یعنی جن کے دل دنیا کے نشہ میں مست ہوکر خدا کی یاد سے غافل اور ہر وقت نفس کی خوشی اور خواہش کی پیروی میں مشغول رہتے ہیں، خدا کی اطاعت میں پیچھے اور ہوا پرستی میں آگے رہنا ان کا شیوہ ہے، ایسے بدمست غافلوں کی بات پر آپ ﷺ کان نہ دھریں خواہ وہ بظاہر کیسے ہی دولت مند اور جاہ وثروت والے ہوں، روایات میں ہے کہ بعض صنادید قریش نے آپ ﷺ سے کہا کہ ان رذیلوں کو اپنے پاس سے اٹھا دیجئے تاکہ سردار آپ ﷺ کے پاس بیٹھ سکیں، رذیل کہا غریب مسلمانوں کو اور سردار دولت مند کافروں کو، ممکن ہے آپ ﷺ کے

قلب مبارک میں یہ خیال گزرا ہو کہ ان غرباء کو تھوڑی دیر علیحدہ کر دینے میں کیا مضائقہ ہے، وہ تو پکے مسلمان ہیں مصلحت پر نظر کر کے رنجیدہ نہ ہوں گے اور یہ دولت منداس صورت میں اسلام قبول کرلیں گے، اس پر یہ آیت اتری کہ آپ ہرگز ان متکبرین کا کہنا نہ مانیے کیونکہ یہ بیہودہ فرمائش ہی ظاہر کرتی ہے کہ ان میں حقیقی ایمان کا رنگ قبول کرنے کی استعداد نہیں، پھر محض موہوم فائدہ کی خاطر مخلصین کا احترام کیوں نظر انداز کیا جائے، نیز امیروں اور غریبوں کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کرنے سے احتمال ہے کہ عام لوگوں کے قلوب میں پیغمبر کی طرف سے معاذ اللہ نفرت اور بدگمانی پیدا ہو جائے جس کا ضرر اس ضرر سے کہیں زائد ہوگا جو ان چند متکبرین کے اسلام قبول نہ کرنے کی صورت میں تصور کیا جا سکتا ہے۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ قف فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ لا اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ

اور کہہ سچی بات ہے تمہارے رب کی طرف سے، پھر جو کوئی چاہے مانے اور جو کوئی چاہے نہ مانے ۱؎ ہم نے تیار کر رکھی ہے گناہ گاروں کے واسطے

نَارًا لا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ط وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ط

آگ کہ گھیر رہی ہیں ان کو اس کی قناتیں ۲؎ اور اگر فریاد کریں گے تو ملے گا پانی جیسے پیپ بھون ڈالے منہ کو

بِئْسَ الشَّرَابُ ط وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿٢٩﴾

کیا برا پینا ہے، اور کیا برا آرام ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** اور آپ (ان رؤسا کفار سے صاف) کہہ دیجئے کہ (یہ دین) حق تمہارے رب کی طرف سے (آیا) ہے، سو جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کافر رہے (ہمارا کوئی نفع نقصان نہیں، بلکہ نفع نقصان خود اس کا ہے، جس کا بیان یہ ہے کہ) بیشک ہم نے ایسے ظالموں کے لیے (دوزخ کی) آگ تیار کر رکھی ہے کہ اس آگ کی قناتیں ان کو گھیرے ہوں گی (یعنی وہ قناتیں بھی آگ ہی کی ہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ یہ لوگ اس گھیرے سے نہ نکل سکیں گے) اور اگر (پیاس سے) فریاد کریں گے تو ایسے پانی سے ان کی فریاد رسی کی جائے گی جو (مکروہ صورت ہونے میں تو) تیل کی تلچھٹ کی طرح ہوگا (اور تیز گرم ایسا ہوگا کہ پاس لاتے ہی) چہروں کو بھون ڈالے گا (یہاں تک کہ چہرے کی کھال اتر کر گر پڑے گی جیسا کہ حدیث میں ہے) کیا ہی برا پانی ہوگا، اور وہ دوزخ بھی کیا ہی بری جگہ ہوگی۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی خدا کی طرف سے سچی باتیں سنا دی گئیں، کسی کے ماننے نہ ماننے کی اسے کچھ پروا نہیں، جو کچھ نفع نقصان ہوگا تمہارا ہوگا، ماننے اور نہ ماننے والے دونوں اپنا اپنا انجام سوچ لیں جو آگے بیان کیا جاتا ہے، دنیا کی چہل پہل محض ہیچ اور فانی ہے، اس کا لطف جب ہی ہے کہ فلاح آخرت کا ذریعہ بنے، وہاں محض دنیا کا تمول کام نہ دے گا، بلکہ جو یہاں شکستہ حال تھے بہت سے وہاں عیش و آرام میں ہوں گے۔

**فائدہ:** ۲؎ وہ قناتیں بھی آگ کی ہوں گی۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی گرمی کی شدت سے پیاس لگے گی تو "العطش" پکاریں گے، تب تیل کی تلچھٹ یا پیپ کی طرح کا پانی دیا جائے گا جو سخت حرارت اور تیزی کی وجہ سے منہ کو بھون ڈالے گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ﴿٣٠﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ

بے شک جو لوگ یقین لائے اور کیں نیکیاں ہم نہیں کھوتے بدلہ اس کا جس نے بھلا کیا کام، ایسوں کے واسطے باغ ہیں

عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا

بسنے کے بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں پہنائے جائیں گے ان کو وہاں کنگن سونے کے ۱؎ اور پہنیں گے کپڑے سبز باریک

ع مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَاۗىِٕكِ ۭ نِعْمَ الثَّوَابُ ۭ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ﴿31﴾

(لاہی اور تافتے کے) اور گاڑھے ریشم کے ۲؎ تکیہ لگائے ہوئے ان میں تختوں پر، کیا خوب بدلہ ہے، اور کیا خوب آرام ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** گذشتہ آیت میں تو ایمان نہ لانے کا نقصان بیان ہوا، اور ایمان لانے کا نفع یہ ہے کہ:

بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے تو ہم ایسوں کا اجر ضائع نہ کریں گے جو اچھی طرح کام کو کرے (پس) ایسے لوگوں کے لئے ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں، ان کے (مساکن کے نیچے) نہریں بہتی ہوں گی، ان کو وہاں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے، اور سبز رنگ کے کپڑے باریک اور دبیز ریشم کے پہنیں گے (اور) وہاں مسہریوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے، کیا ہی اچھا صلہ ہے، اور (جنت) کیا ہی اچھی جگہ ہے۔

**يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ:** اس پر یہ سوال ہوسکتا ہے کہ زیور پہننا تو مردوں کے لئے نازیبا ہے، نہ کوئی جمال اور زینت، جنت میں اگر ان کو کنگن پہنائے گئے تو وہ ان کو بدہیئت کر دیں گے؟ جواب یہ ہے کہ زینت و جمال عرف و رواج کے تابع ہے، ایک ملک اور خطے میں جو چیز زینت و جمال سمجھی جاتی ہے دوسرے ملکوں اور خطوں میں بسا اوقات وہ قابل نفرت قرار دی جاتی ہے، اور ایسا ہی اس کے برعکس بھی ہے، اسی طرح ایک زمانہ میں ایک خاص چیز زینت ہوتی ہے دوسرے زمانے میں وہ عیب ہوجاتا ہے، جنت میں مردوں کے لئے بھی زیور اور ریشمی کپڑے زینت و جمال قرار دئے جائیں گے تو وہاں اس سے کسی کو اجنبیت کا احساس نہ ہوگا، یہ صرف دنیا کا قانون ہے کہ یہاں مردوں کو سونے کا کوئی زیور یہاں تک کہ انگوٹھی اور گھڑی کی چین بھی سونے کی استعمال کرنا جائز نہیں، اسی طرح ریشمی کپڑے مردوں کے لئے جائز نہیں، جنت کا یہ قانون نہ ہوگا، وہ اس سارے جہان سے الگ ایک عالم ہے اس کو اس بنا پر کسی چیز میں بھی قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

**مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ:** یہاں سندس اور استبرق کو مطلق فرمایا، جبکہ سورہ رحمٰن میں فرمایا ہے: **بطائنها من استبرق** یعنی استر دبیز ریشمی کپڑے کا ہوگا، اس سے اشارۃً سمجھ میں آتا ہے کہ ابرہ سندس یعنی باریک ریشمی کپڑے کا ہوگا جیسے دنیا میں بھی اکثر ایسی ہی عادت ہے۔

**وَّيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا:** یہ جو فرمایا کہ سبز لباس ہوگا، اس سے حصر مقصود نہیں، یعنی یہ مطلب نہیں کہ صرف سبز رنگ کے ہی لباس ہوں گے، بلکہ دیگر آیات میں تصریح ہے کہ جس چیز کو دل چاہے گا وہ ملے گی۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی ادنیٰ سے ادنیٰ نیکی بھی کم نہ ہوگی، پورا بدلہ دیا جائے گا۔

**فائدہ:** ۲؎ تاکہ دکھلا دیا جائے کہ اصلی اور دائمی دولت مند کون لوگ ہیں، کنگن یا ریشمی کپڑوں اور اسی طرح جنت کی تمام نعمتوں کی خاص کیفیت کو ہم دنیا میں نہیں سمجھ سکتے، کیونکہ ہماری محسوسات میں اس موطن کی کوئی پوری مثال موجود نہیں۔

**فائدہ:** ۳؎ شاید ابرا باریک ریشم کا اور استر دبیز ریشم کا ہو، کما يفهم من قوله تعالىٰ: **مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰي فُرُشٍۢ بَطَاۗىِٕنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ** یا دونوں قسمیں الگ الگ استعمال کی جائیں، واللہ اعلم۔

موضح القرآن میں ہے حضرتؒ نے فرمایا: "سونا اور ریشمی کپڑا مردوں کو ملنا ہے بہشت میں جو کوئی یہاں یہ چیزیں پہنے وہاں نہ پہنے گا"۔

**فائدہ:** ۴؎ یعنی مسہریوں پر تکیہ لگائے نہایت عزت و آرام سے بیٹھے ہوں گے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا

اور بتلا ان کو مثل (قصہ) دو مردوں کی (کا) ۱؎ کر دیے (بنا دیے) ہم نے ان میں سے ایک کیلئے دو باغ انگور کے اور گرد انکے کھجوریں اور رکھی

بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴿۳۲﴾ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ﴿۳۳﴾

دونوں کے بیچ میں کھیتی ۲؎ دونوں باغ لاتے ہیں اپنا میوہ اور نہیں گھٹاتے اس میں سے کچھ ۳؎ اور بہادی ہم نے ان دونوں کے بیچ نہر ۴؎

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے کفار کی اس درخواست کو رد فرمایا جو اپنے مال و دولت کے نشہ میں چور تھے اور غریب مسلمانوں کو حقیر سمجھتے اور ان کے ساتھ بیٹھنے میں عار محسوس کرتے تھے اور اپنے مال و دولت پر تکبر کرتے تھے، آگے ان متکبرین کو سنانے اور دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری بتلانے کے لئے بنی اسرائیل کے دو دوستوں کی ایک مثال ذکر فرماتے ہیں جن میں سے ایک مالدار کافر اور آخرت کا منکر تھا، اپنے مال و دولت پر مغرور تھا، اور دوسرا دوست ایک مومن، درویش، غریب، متواضع اور آخرت پر کامل ایمان رکھنے والا تھا، خلاصہ کلام یہ کہ ایک طالب دنیا اور ایک طالب آخرت کا قصہ بیان فرماتے ہیں تاکہ معلوم ہوجائے کہ اموال کی کثرت اور اعوان انصار کی قوت قابل فخر چیز نہیں ہوسکتی، ہوسکتا ہے کہ دم کے دم میں تو انگر فقیر ہوجائے اور فقیر تو انگر ہوجائے، قابل فخر تو ایمان اور عمل صالح اور تقویٰ ہے، اس طرح مسلمانوں کی تسکین و تسلی بھی اس قصہ سے ہوجائے گی کہ ناداری کا غم نہ کریں۔

اور آپ (دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی پائیداری ظاہر کرنے کے لئے) دو شخصوں کا حال (جن میں باہم دوستی یا قرابت کا تعلق تھا) بیان کیجئے (تاکہ کفار کا خیال باطل ہوجائے اور مسلمانوں کو تسلی ہو، سو) ان دو شخصوں میں سے ایک کو (جو کہ بد دین تھا) ہم نے دو باغ انگور کے دے رکھے تھے، اور دونوں (باغوں) کا کھجور کے درختوں سے احاطہ بنا رکھا تھا (کھجور کے درختوں کی باڑھ تھی) اور ان دونوں (باغوں) کے درمیان میں کھیتی بھی لگا رکھی تھی (اور) دونوں باغ اپنا پورا پھل دیتے تھے، اور کسی کے پھل میں ذرا بھی کمی نہ رہتی تھی (بخلاف عام باغوں کے کہ کبھی کسی درخت میں اور کسی سال پورے باغ میں پھل کم آتا ہے) اور ان دونوں (باغوں) کے درمیان نہر چلا رکھی تھی۔

**وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ:** یہ قصہ قرآن میں بہت اجمال کے ساتھ مذکور ہے جس میں قصہ والوں کا نام و نشان نہیں بتلایا، اسی لیے بعض نے اس کو فرضی قصہ کہا ہے، لیکن درمنثور میں منقول ہے کہ اس قصہ میں جس نہر کا ذکر ذکر ہے وہ ملک شام کے شہر رملہ کی نہر ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ واقعی اور حقیقی ہے، چونکہ قصہ سے اصل مقصود ان تفصیلات پر موقوف نہ تھا اس لیے اس اجمال میں بھی کوئی نقصان نہیں، اور جیسا اس قصہ سے کفار کے خیال کو غلط قرار دیا اسی طرح مؤمنین کی تسکین اور تسلی بھی ہوگئی کہ غربت اور ناداری کا غم نہ کریں اور حصول عقبیٰ پر شکر کریں۔

**وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ:** اس میں اللہ پر بھروسہ کرنے والے فقراء کو تسلی اور مغرور مالداروں کو تنبیہ کی گئی ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یہ کافر غنی اور مومن فقیر کی مثال بیان فرمائی، جس کے ضمن میں دنیا کی بے ثباتی، کفر و تکبر کی بدانجامی اور ایمان و تقویٰ کی مقبولیت پر متنبہ کرنا ہے، یہ دو شخص جن کی مثال بیان ہوئی واقعی موجود تھے؟ یا محض تفہیم کے لیے مثال فرض کر لی گئی؟ علماء کے اس میں دونوں قول ہیں اور تمثیل کا فائدہ بہر حال حاصل ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی باغوں کے گرد باڑھ کھجور کی لگائی اور دونوں باغوں کے درمیان میں زمین چھوڑی جس میں زراعت ہوتی تھی تاکہ غلے اور پھل (قوت اور فواکہ) سب تیار ملیں۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی یہ نہیں کہ ایک باغ پھلا دوسرا نہ پھلا، یا ایک درخت زیادہ آیا دوسرا کم۔

**فائدہ:** ۴؎ یعنی باغوں کے درمیان نہر کا پانی قرینہ سے پھر رہا تھا کہ منظر فرحت بخش رہے اور بارش نہ ہو تب بھی باغ وغیرہ خشکی سے خراب نہ ہونے پائے۔

وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾

اور ملا اس کو پھل ۱ پھر بولا اپنے ساتھی سے جب باتیں کرنے لگا اس سے میرے پاس زیادہ ہے تجھ سے مال اور آبرو کے لوگ ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور اس شخص کے پاس اور بھی مال داری کا سامان تھا، سو (ایک دن) اپنے اس (دوسرے) ساتھی سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے کرتے کہنے لگا کہ میں تجھ سے مال میں بھی زیادہ ہوں اور مجمع بھی میرا زبردست ہے (یعنی تو جو اپنے طریقہ کو حق اور اللہ کے نزدیک پسندیدہ کہتا ہے اور میرے طریقہ کو غلط اور خدا کے نزدیک ناپسندیدہ بتاتا ہے دونوں کا ثمرہ نتیجہ دیکھ لے، اگر تیرا دعوی سچ ہوتا تو معاملہ برعکس ہوتا، کیونکہ دشمن کو کوئی نہیں نوازتا اور دوست کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی جو خرچ کیا یا کمائی کی اس کا پھل خوب ملا اور ہر قسم کے سامان عیش و رفاہیت جمع ہو گئے نکاح کیا تو اس کا پھل بھی اچھا پایا اولاد کثرت سے ہوئی۔

**فائدہ:** ۲ یعنی مال و دولت اور جتھا میرے پاس تجھ سے کہیں زائد ہے، اگر میں مشرکانہ اطوار اختیار کرنے میں باطل پر ہوتا تو اس قدر آسائش اور فراخی کیوں ملتی، اس کے مشرک ہونے کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ آفت آنے کے بعد پچتا کر کہتا تھا: يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا غریب ساتھی جو پکا موحد تھا شرک کے باطل ہونے کا اظہار اور شرک سے تائب ہونے کی نصیحت کر رہا ہوگا، جس کے جواب میں یہ کہا کہ میں تجھ سے مال میں، جتھے میں، ہر چیز میں زیادہ ہوں کس طرح یقین کر لوں کہ میں باطل پر ہوں اور تجھ جیسا مفلس قلاش حق پر ہو۔

وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ﴿۳۵﴾ وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ

اور گیا اپنے باغ میں اور وہ برا کر رہا تھا اپنی جان پر، بولا نہیں آتا مجھ کو خیال کہ خراب ہووے یہ باغ کبھی ۱ اور نہیں خیال کرتا ہوں میں کہ قیامت

قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿۳۶﴾

ہونے والی ہے، اور اگر کبھی پہنچا دیا گیا (کہیں پہنچ گیا) میں اپنے رب کے پاس پاؤں گا بہتر اس سے وہاں پہنچ کر ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور وہ (اپنے اس ساتھی کو ساتھ لے کر) اپنے اوپر جرم (کفر) قائم کرتا ہوا اپنے باغ میں پہنچا (اور) کہنے لگا کہ (بقاء و نشو و نما کے اعتبار سے) میرا تو خیال نہیں ہے کہ یہ باغ (میری زندگی میں) کبھی بھی برباد ہوگا (اس سے معلوم ہوا کہ وہ خدا کے وجود اور ہر چیز پر اس کی قدرت کا قائل نہ تھا، بس ظاہری سامان حفاظت کو دیکھ کر اس نے یہ گفتگو کی) اور (اسی طرح) میں قیامت کو نہیں خیال کرتا کہ آئے گی اور اگر (بفرض محال قیامت آ بھی گئی اور) میں اپنے رب کے پاس پہنچایا گیا (جیسا تیرا عقیدہ ہے) تو ضرور اس باغ سے بھی بہت زیادہ اچھی جگہ مجھ کو ملے گی (کیونکہ جنت کی جگہوں کا دنیا سے اچھا اور بہتر ہونے کا تو تجھے بھی اقرار ہے، اور یہ بھی تجھے تسلیم ہے کہ جنت اللہ کے مقبول بندوں کو ملے گی، اور میرے مقبول ہونے کی یہی دلیل ہے کہ یہاں کیسی راحت و عزت سے ہوں، پس اگر بالفرض قیامت آئی بھی جیسا کہ تو کہا کرتا ہے تو مجھے کو وہاں بھی جنت ہی ملے گی، اگر میں اللہ کے نزدیک مقبول نہ ہوتا تو باغات کیوں ملتے، اس لئے تمہارے اقرار و تسلیم کے مطابق بھی مجھے وہاں یہاں سے اچھے باغ ملیں گے)۔

گویا اس شخص نے چار دعوے کیے: ① کفر کا مذموم اور برا نہ ہونا انا اکثر منک میں ② توحید کا انکار ما اظن ان تبید ھذہ میں ③ قیامت کا انکار ما اظن الساعۃ میں ④ اللہ کے ہاں اپنا معزز و مکرم ہونا ولئن رددت الی ربی میں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی شرک میں مبتلا تھا، کبر وغرور کا نشہ دماغ میں بھرا ہوا تھا، دوسروں کو حقیر جانتا تھا، اور خدا کی قدرت وجبروت پر نظر نہ تھی، نہ یہ سمجھتا تھا کہ آگے کیا انجام ہونے والا ہے، بس یہ ہی باغ اس کی جنت تھی جس کو آپ خیر سے ابدی سمجھتے تھے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی اب تو آرام سے گزرتی ہے اور میں نے اب انتظامات ایسے مکمل کر لیے ہیں کہ میری زندگی تک ان باغوں کے تباہ ہونے کا بظاہر کوئی کھٹکا نہیں، رہا بعد الموت کا قصہ، سو اول تو مجھے یقین نہیں کہ مرنے کے بعد ہڈیوں کے ریزوں کو دوبارہ زندگی ملے گی؟ اور ہم خدا کے سامنے پیش کیے جائیں گے، لیکن اگر ایسا ہوا تو یقینا مجھے یہاں سے بہتر سامان وہاں ملنا چاہیے، اگر ہماری حرکات خدا کو ناپسند ہوتیں تو دنیا میں اتنی کشائش کیوں دیتا، گویا یہاں کی فراخی علامت ہے کہ وہاں بھی ہم عیش اڑائیں گے۔

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ

کہا اس کو دوسرے نے جب بات کرنے لگا کیا تو منکر ہوگیا اس سے جس نے پیدا کیا تجھ کو مٹی سے پھر قطرہ سے

ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ﴿٣٧﴾ لٰكِنَّا۟ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿٣٨﴾

پھر پورا کر دیا تجھ کو مرد، پھر میں تو یہی کہتا ہوں وہی اللہ ہے میرا رب اور نہیں مانتا شریک اپنے رب کا کسی کو

**خلاصہ تفسیر:** اس (کی یہ باتیں سن کر اس) سے اس کے ملاقاتی نے (جو کہ دیندار مگر غریب آدمی تھا) جواب کے طور پر کہا کیا تو (توحید اور قیامت سے انکار کر کے) اس ذات (پاک) کے ساتھ کفر کرتا ہے جس نے تجھ کو (پہلے) مٹی سے (جو کہ تیرا مادہ بعیدہ ہے آدم علیہ السلام کے واسطہ سے) پیدا کیا، پھر (تجھ کو) نطفہ سے (جو کہ تیرا مادہ قریبہ ہے ماں کے رحم میں بنایا) پھر تجھ کو صحیح سالم آدمی بنایا (اس کے باوجود توحید اور قیامت سے انکار اور کفر کرتا ہے تو کیا کر) لیکن میں تو یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ وہ (یعنی) اللہ تعالیٰ میرا رب (حقیقی) ہے اور میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔

اس جواب سے توحید کا بھی اثبات ہوگیا جیسا کہ لا اشرك میں صراحت ہے، اور قیامت کا اثبات بھی دلالت ہے جیسا کہ بربی کے لفظ سے معلوم ہوا، کیونکہ رب ہونے کے لیے قدرت کاملہ ہونا ضروری ہے اور جس کو دوبارہ زندہ کرنے کی بھی قدرت نہ ہو وہ عاجز ہے اور عاجز رب نہیں ہوسکتا تو جب خدا تعالیٰ رب ہے تو وہ دوبارہ زندہ کرنے پر بھی یقینا قادر ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جس خدا نے تیری اصل (آدم علیہ السلام) کو بے جان مٹی سے پھر تجھ کو زمینی پیداوار کے خلاصہ اور ایک قطرہ ناچیز سے پیدا کر کے زندگی بخشی اور جسمانی وروحانی قوتیں دے کر ہٹا کٹا مرد بنایا، کیا تجھے انکار ہے کہ وہ تیرے مرے پیچھے دوبارہ زندہ نہیں کرسکتا؟ یا دی ہوئی نعمت چھین نہیں سکتا؟ میرا تو یہ عقیدہ نہیں، بلکہ یقین رکھتا ہوں کہ وہ تنہا ہمارا رب ہے، اس کی خدائی میں کوئی حصہ دار نہیں، پھر بھلا اس کے حکم واختیار کے سامنے کون دم مار سکتا ہے۔

وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاۗءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ

اور جب تو آیا تھا اپنے باغ میں کیوں نہ کہا (ہوتا) تو نے جو چاہے اللہ سو ہو (ہوتا ہے) طاقت نہیں مگر جو دے اللہ ۱؎ اگر تو دیکھتا ہے مجھ کو کہ میں کم ہوں

مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿٣٩﴾ فَعَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا

تجھ سے مال اور اولاد میں تو امید ہے کہ میرا رب دیوے مجھ کو تیرے باغ سے بہتر ۲؎ اور بھیج دے اس (تیرے باغ) پر (گرم) لو کا ایک جھونکا

مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصۡبِحَ صَعِيۡدًا زَلَقًا ۟ۙ اَوۡ يُصۡبِحَ مَآؤُهَا غَوۡرًا فَلَنۡ تَسۡتَطِيۡعَ لَهٗ طَلَبًا ۟

آسمان سے پھر صبح کو رہ جائے میدان صاف، یا صبح کو ہو رہے اس کا پانی خشک پھر نہ لا سکے تو اس کو ڈھونڈ کر ۔ ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور (جب اللہ تعالیٰ کی توحید اور قدرت کاملہ ہر چیز پر ثابت ہے تو اس سے خود یہ لازم آ گیا کہ تیرے یہ ظاہری اسباب وسامان سب کسی وقت بھی بیکار اور معطل ہو جائیں اور باغ برباد ہو جائے، اس لئے تجھ پر لازم تھا کہ ان اسباب سے آگے بڑھ کر مسبب الاسباب یعنی خالق پر نظر کرتا) تو جس وقت اپنے باغ میں پہنچا تھا تو تو نے یوں کیوں نہ کہا کہ جو اللہ کو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے (اور) بدون خدا کی مدد کے (کسی میں) کوئی قوت نہیں (جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا یہ باغ قائم رہے گا اور جب چاہے گا ویران ہو جائے گا، اس کی مشیت کے سامنے سب تدبیر واسباب بیکار ہیں، اس کی مدد کے بغیر کوئی اسباب کام نہیں آسکتے، اس سے بھی توحید کی تائید ہوگئی)۔

(اب دو باتیں رہ گئیں: ایک کفر کا برانہ ہونا جس پر مال واولاد کی کثرت سے استدلال کیا تھا، اور دوسری جو اسی کی فرع ہے یعنی اس دلیل سے عند اللہ اپنے کو مقبول سمجھنا، تو اب آگے اسی کا جواب دیا جاتا ہے کہ) اگر تو مجھ کو مال واولاد میں کمتر دیکھتا ہے (اس سے تجھ کو اپنے مقبول ہونے کا شبہ پڑ گیا ہے) تو مجھ کو وہ وقت نزدیک معلوم ہوتا ہے کہ میرا رب مجھ کو تیرے باغ سے اچھا باغ دیدے (خواہ دنیا ہی میں یا آخرت میں جس میں ہر طرح کا عیش ولذت کا سامان ہو، اس میں مال واولاد کی زیادتی کا جواب بھی آ گیا جس پر اس نے فخر کیا تھا، کیونکہ اولاد وغیرہ سے قلب کی راحت مقصود ہوتی ہے، سو اس اچھے باغ میں راحت کا سب سامان ہوگا، خواہ اولاد وغیرہ کے ذریعہ سے یا کسی ایسی چیز کے ذریعہ سے جو اولاد سے بھی زیادہ ہو) اور اس (تیرے باغ) پر کوئی تقدیری آفت آسمان سے (یعنی غیبی حکم سے کسی ظاہری سبب کے بغیر) بھیج دے (کیونکہ غیر معمولی طریقہ سے آفت نازل ہونے میں ظاہری اسباب کا بے کار ہونا معلوم ہو جائے گا تو اس سے توحید کی مزید تائید ہوگی) جس سے وہ باغ دفعۃً ایک صاف (چٹیل) میدان ہو کر رہ جائے، یا اس سے اس کا پانی (جو نہر میں جاری ہے) بالکل اندر (زمین میں) اتر (کر خشک ہو) جائے پھر تو اس (کے دوبارہ لانے اور نکالنے) کی کوشش بھی نہیں کر سکے (ملنا تو بہت دور کی بات ہے)۔

یہاں اس دیندار ساتھی نے اس بے دین کے باغ کا تو جواب دے دیا، مگر اولاد کے متعلق کچھ جواب نہیں دیا، شاید وجہ یہ ہے کہ اولاد کی کثرت جبھی بھلی معلوم ہوتی ہے جب اس کی پرورش کے لئے مال موجود ہو، ورنہ وہ الٹا وبال جان بن جاتی ہے، اور کھیت کا بھی لفظوں میں ذکر نہیں، کیونکہ اس کا مدار پانی پر ہے، جب وہی نہ رہے گا تو کھیت بھی اجڑ جائے گا، حاصل اس کلام کا یہ ہوا کہ تیرے بدعقیدہ ہونے کا سبب یہ تھا کہ تجھے دنیا میں اللہ نے دولت دے دی، اس کو تو نے اپنی مقبولیت کی علامت سمجھ لیا، اور میرے پاس دولت نہ ہونے سے مجھ کو غیر مقبول سمجھ لیا، تو دنیا کی دولت وثروت کو مقبولیت عند اللہ کا مدار سمجھ لینا ہی بڑا دھوکا اور غلطی ہے، دنیا کی نعمتیں تو رب العالمین سانپوں، بچھوؤں اور بھیڑوں اور بدکاروں سبھی کو دیتے ہیں، اصل مدار مقبولیت کا آخرت کی نعمتوں پر ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں اور دنیا کی نعمتیں سب زوال پذیر ہیں۔

**وَيُرۡسِلَ عَلَيۡهَا حُسۡبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ:** حُسۡبَانًا اس لفظ کی تفسیر حضرت قتادہؒ نے مطلق عذاب سے کی ہے، اور حضرت ابن عباسؓ نے آگ سے اور بعض نے پتھراؤ سے، اس کے بعد اگلی آیت میں جو آیا ہے: **واحیط بثمرہ** اس میں ظاہر یہ ہے کہ اس کے باغ اور تمام مال وزر اور سامان عیش پر کوئی بڑی آفت آ پڑی، جس نے سب کو برباد کر دیا، قرآن نے صراحۃً کسی خاص آفت کا ذکر نہیں کیا، ظاہر یہ ہے کہ کوئی آسمانی آگ آئی جس نے سب کو جلا دیا، جیسا کہ لفظ حسبان کی تفسیر حضرت ابن عباسؓ سے بھی "آگ" منقول ہے، واللہ اعلم۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی مال تو اللہ کی نعمت ہے پر اترانے اور کفر بکنے سے آفت آتی ہے، چاہیے تھا کہ باغ میں داخل ہوتے وقت: مَآ اَظُنُّ اَنۡ تَبِيۡدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا کی جگہ: مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کہتا، یعنی خدا جو چاہے عطا فرمائے، ہم میں جو کچھ زور وقوت ہے اسی کی امداد واعانت سے ہے،

وہ چاہے تو ایک دم میں سلب کر لے، روایات میں ہے کہ جب آدمی کو اپنے گھر بار میں آسودگی نظر آئے تو یہی لفظ کہے: مَاشَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ

**فائدہ:** ۲ دنیا میں یا آخرت میں۔

**فائدہ:** ۳ یعنی ایک گرم بگولا اٹھے یا اور کوئی آفت سماوی نازل ہو جو تیرے تکبر و تجبر کی سزا میں باغ کو تہس نہس کر کے صاف چٹیل میدان بنا دے، یا نہر کا پانی خشک ہو کر رہ جائے، پھر باوجود کوشش کے جاری نہ ہو۔

وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ

اور سمیٹ لیا گیا اسکا سارا پھل پھر صبح کو رہ گیا ہاتھ نچاتا ۱ اس مال پر جو اس میں لگایا تھا اور وہ گرا پڑا تھا اپنی چھتریوں (ٹٹیوں) پر ۲ اور کہنے لگا

يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿۴۲﴾ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ

کیا خوب ہوتا اگر میں شریک نہ بناتا اپنے رب کا کسی کو ۳ اور نہ ہوئی اس کی جماعت کہ مدد کریں اس کی اللہ کے سوائے اور نہ ہوا وہ

مُنْتَصِرًا ﴿۴۳﴾ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ؕ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ﴿۴۴﴾ ع ۱۷

کہ خود بدلہ لے سکے ۴ یہاں (وہاں) سب اختیار ہے اللہ سچے کا، اسی کا انعام بہتر ہے اور اچھا ہے اسی کا دیا ہوا بدلہ ۵

**خلاصہ تفسیر:** اور (اس گفتگو کے بعد واقعہ یہ پیش آیا کہ) اس شخص کے سامان کو تو آفت نے آگھیرا پس اس نے جو کچھ باغ پر خرچ کیا تھا اس پر ہاتھ ملتا رہ گیا اور وہ باغ اپنی ٹٹیوں پر گرا ہوا پڑا تھا، اور کہنے لگا کیا خوب ہوتا کہ میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا (مطلب یہ کہ کفر نہ کرتا اس میں قیامت کا انکار وغیرہ سب داخل ہے، چونکہ توحید سب سے اہم اور اعظم ہے اس لیے اس کو خاص طور پر ذکر فرمایا) اور اس کے پاس ایسا کوئی مجمع نہ ہوا جو خدا کے سوا اس کی مدد کرتا (اس کو اپنے مجمع اور اولاد پر ناز تھا وہ بھی ختم ہوا) اور نہ وہ خود (ہم سے) بدلہ لے سکا۔

ایسے موقع پر مدد کرنا تو اللہ برحق ہی کا کام ہے (اور آخرت میں بھی) اسی کا ثواب سب سے اچھا ہے اور (دنیا میں بھی) اسی کا نتیجہ سب سے اچھا ہے (یعنی مقبولین کا کوئی نقصان ہو جاتا ہے تو دونوں جہاں میں اس کا ثمرہ نیک ملتا ہے، بخلاف کافر کے کہ بالکل خسارہ میں رہ جاتا ہے)۔

**وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ:** معلوم نہیں وہ کیا آفت تھی، لیکن بظاہر ابہام کے ساتھ بیان کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بڑی آفت تھی، پس عجب نہیں کہ کوئی آفت خلاف عادت غیر معمولی آئی ہو، چنانچہ خازن میں لکھا ہے کہ ایک آگ تھی جو آسمان سے آئی اور کھیت کو جلا دیا، پانی خشک کر دیا، اور اگر آسمانی آفت خلاف عادت نہ بھی ہو تب بھی کچھ خرابی نہیں، کیونکہ بہت سے، بہت یہ اس مؤمن کا ایک خیال تھا کہ غیر معمولی آفت آئے جس کا پورا ہونا ضروری نہیں۔

**يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا:** ہلاک ہونے پر حسرت کا ذکر نہیں کیا کیونکہ وہ تو ظاہر ہی ہے، اور خرچ کا ذکر اس لیے فرمایا کہ اس پر دوہری حسرت تھی، موجودہ حالت کی بھی، اور گذشتہ کی بھی، اور بطور خاص باغ پر حسرت اس لیے کی کیونکہ اس میں زیادہ خرچ کیا تھا اور وہ محبوب بھی بہت تھا۔

**يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا:** اس سے معلوم ہوا کہ باغ پر آفت آنے سے وہ یہ سمجھ گیا تھا کہ یہ وبال کفر شرک کے سبب سے آیا ہے، اس لیے اس پر نادم ہوا کہ اگر کفر نہ کرتا تو اول تو یہ آفت ہی شاید نہ آتی یا آ بھی جاتی تو اس کا بدلہ آخرت میں ملتا، اب دنیا و آخرت دونوں میں خسارہ ہی خسارہ ہے، مگر صرف اتنی حسرت و افسوس سے اس کا ایمان ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ یہ حسرت، ندامت تو دنیا کے نقصان کے وجہ سے ہوئی، کفر کو برا سمجھنے کی وجہ سے ندامت ہونا ثابت نہیں، اللہ کی توحید اور قیامت کا اقرار جب تک ثابت نہ ہو اس کو مومن نہیں کہہ سکتے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی کف افسوس ملتا رہ گیا۔

**فائدہ:** ۲ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں آخراس کے باغ پر وہ ہی ہوا جواس مردنیک کی زبان سے نکلا تھا، رات کو آفت سماوی آگ کی صورت میں آئی، سب جل کر ڈھیر ہو گیا، مال خرچ کیا تھا پونجی بڑھانے کو وہ اصل بھی کھو بیٹھا۔

**فائدہ:** ۳ مگر اب پچتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت، اور یہ افسوس وندامت بھی خدا سے ڈر کر نہیں محض دنیاوی ضرر پہنچنے کی بنا پر تھی۔

**فائدہ:** ۴ یعنی نہ جتھا کام آیا، نہ اولاد، نہ فرضی معبود جنہیں خدائی کا شریک ٹھہرا رکھا تھا، اور نہ خود اپنی ذات میں اتنی طاقت تھی کہ خدا کے عذاب کو روک دیتا یا بدلہ لے سکتا۔

**فائدہ:** ۵ یعنی جس عمل کا جو بدلہ کسی کو دے وہ ہی ٹھیک ہے، یہاں اور وہاں ہر جگہ اختیار اسی کا چلتا ہے، کسی کی مجال نہیں کہ اس کے فیصلہ میں دخل دے سکے۔

وَاضۡرِبۡ لَهُمۡ مَّثَلَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا كَمَآءٍ اَنۡزَلۡنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخۡتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الۡاَرۡضِ

اور بتلادے ان کو مثل دنیا کی زندگی کے جیسے پانی اتارا ہم نے آسمان سے پھر رلا ملا (رل مل کر) نکلا اس کی وجہ سے زمین کا سبزہ

فَاَصۡبَحَ هَشِيۡمًا تَذۡرُوۡهُ الرِّيٰحُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ مُّقۡتَدِرًا ﴿۴۵﴾

پھر کل کو ہو گیا چورا چورا ہوا میں اڑتا ہوا ۱ اور اللہ کو ہے ہر چیز پر قدرت ۲

**خلاصہ تفسیر:** اس سے پہلے دنیوی زندگی اور اس کے سامان کی ناپائیداری ایک شخصی اور جزوی مثال سے بطور قصہ بیان فرمائی تھی، اب یہی مضمون عام اور کلی مثال سے واضح کیا جاتا ہے۔

اور آپ ان لوگوں سے دنیوی زندگی کی حالت بیان فرمائیے کہ وہ ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا ہو پھر اس (پانی) کے ذریعے زمین کی نباتات خوب گنجان ہو گئی ہوں پھر وہ (بعد اس کے کہ سرسبز وتر وتازہ تھی خشک ہو کر) ریزہ ریزہ ہو جائے کہ اس کو ہوا اُڑائے لئے پھرتی ہو (یہی حال دنیا کا ہے کہ آج ہری بھری نظر آتی ہے کل اس کا نام ونشان بھی نہ رہے گا) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں (جب چاہیں ایجاد کریں ترقی دیں، اور جب چاہیں فنا کر دیں)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی دنیا کی عارضی بہار اور فانی وسریع الزوال تروتازگی کی مثال ایسی سمجھو کہ خشک اور مردہ زمین پر بارش کا پانی پڑا، وہ یک بیک جی اٹھی، گنجان درخت اور مختلف اجزاء سے رلا ملا سبزہ نکل آیا، لہلہاتی کھیتی آنکھوں کو بھلی معلوم ہونے لگی، مگر چند روز ہی گزرے کہ زرد ہو کر سوکھنا شروع ہو گئی، آخر ایک وقت آیا کہ کاٹ چھانٹ کر برابر کر دی گئی، پھر ریزہ ریزہ ہو کر ہوا میں اڑا ئی گئی، یہ ہی حال دنیا کے دیدہ زیب وابلہ فریب بناؤ سنگار کا سمجھو، چند روز کے لیے خوب ہری بھری نظر آتی ہے، آخر میں چورہ ہو کر ہوا میں اڑ جائے گی، اور کٹ چھٹ کر سب میدان صاف ہو جائے گا جیسا کہ آگے: وَيَوۡمَ نُسَيِّرُ الۡجِبَالَ وَتَرَى الۡاَرۡضَ بَارِزَةً میں اشارہ کیا ہے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی جب چاہے پھر جلادے (موضح القرآن) یا یہ کہ اگانا اور چورا کر کے اڑا دینا سب اسی کے دست قدرت میں ہے۔

اَلۡمَالُ وَالۡبَنُوۡنَ زِيۡنَةُ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ وَالۡبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيۡرٌ عِنۡدَ رَبِّكَ

مال اور بیٹے رونق ہیں دنیا کی زندگی میں، اور باقی رہنے والی نیکیوں کا بہتر ہے تیرے رب کے یہاں

ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾

بدلہ اور بہتر ہے توقع

**خلاصہ تفسیر:** (اور جب دنیا کی زندگی کی یہ حالت ہے تو) مال واولاد حیاتِ دنیا کی ایک رونق (اور اس کے توابع میں سے) ہے (تو خود یہ مال واولاد تو اس سے بھی زیادہ جلدی زائل ہونے والی ہیں) اور جو اعمال صالحہ (ہمیشہ ہمیشہ کو) باقی رہنے والے ہیں وہ آپ کے رب کے نزدیک (یعنی آخرت میں اس دنیا سے) ثواب کے اعتبار سے بھی (ہزار درجہ) بہتر ہے اور امید کے اعتبار سے بھی (ہزار درجہ) بہتر ہے۔

یعنی اعمال صالحہ سے جو امیدیں وابستہ ہوتی ہیں وہ آخرت میں ضرور پوری ہوں گی، اور اس کی امید سے بھی زیادہ ثواب ملے گا، بخلاف متاع دنیا کے کہ اس سے دنیا میں بھی انسانی امیدیں پوری نہیں ہوتیں، اور آخرت میں تو کوئی احتمال ہی نہیں، اس لیے دنیا سے دل چسپی یا اس پر فخر نہیں کرنا چاہیے، بلکہ آخرت کا اہتمام کرنا چاہیے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی مرنے کے بعد مال واولاد وغیرہ کام نہیں آتے صرف وہ نیکیاں کام آتی ہیں جن کا اثر یا ثواب آئندہ باقی رہنے والا ہو، حدیث میں: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ان کلمات کو باقیات صالحات فرمایا، یہ محض مثال کے طور پر ہے، ورنہ تمامی اعمال حسنہ اس میں داخل ہیں، موضح القرآن میں ہے: ”رہنے والی نیکیاں یہ کہ علم سیکھا جائے جو جاری رہے یا کوئی نیک رسم چلا جائے یا مسجد، کنواں، سرائے، کھیت وقف کر جائے یا اولاد کو تربیت کر کے صالح چھوڑ جائے، اسی قسم کے کام ہیں جن پر خدا کے ہاں بہترین بدلہ مل سکتا ہے اور انسان عمدہ توقعات قائم کر سکتا ہے، دنیا کی فانی وزائل خوشحالی پر لمبی چوڑی امیدیں باندھنا عقلمندی نہیں“۔

وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ﴿۴۷﴾ وَعُرِضُوْا

اور جس دن ہم چلائیں پہاڑ اور تو دیکھے زمین کو کھلی ہوئی ۱؎ اور گھیر بلائیں ہم ان کو پھر نہ چھوڑیں ان میں سے ایک کو ۲؎ اور سامنے آئیں تیرے

عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ۭ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍۢ ۡ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ﴿۴۸﴾

رب کے صف (قطار) باندھ کر، آ پہنچے تم ہمارے پاس جیسا ہم نے بنایا تھا تم کو پہلی بار نہیں تم تو کہتے تھے کہ نہ مقرر کریں گے ہم تمہارے لیے کوئی وعدہ ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** اور اس دن کو یاد کرنا چاہیے جس دن ہم پہاڑوں کو (ان کی جگہ سے) ہٹا دیں گے (یہ ابتدا میں ہوگا، پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے) اور آپ زمین کو دیکھیں گے کہ ایک کھلا میدان پڑا ہے (کیونکہ پہاڑ درخت، مکان کچھ باقی نہ رہے گا) اور ہم ان سب کو (قبروں سے اٹھا کر میدان حساب میں) جمع کر دیں گے اور ان میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑیں گے (کہ وہاں نہ لایا جائے اور بچ جائے)۔

اور سب کے سب آپ کے رب کے روبرو (یعنی موقف حساب میں) برابر کھڑے کر کے پیش کئے جائیں گے (یہ احتمال نہ رہے گا کہ کوئی کسی کی آڑ میں چھپ جائے، اور ان میں جو لوگ قیامت کا انکار کرتے تھے ان سے کہا جائے گا کہ) دیکھو آخر تم ہمارے پاس (دوبارہ پیدا ہو کر) آئے بھی جیسا ہم نے تم کو پہلی بار (یعنی دنیا میں) پیدا کیا تھا (مگر تم پہلی پیدائش کا مشاہدہ دنیا میں کر لینے کے باوجود پھر اس دوبارہ پیدائش کے قائل نہ ہوئے) بلکہ تم یہی سمجھتے رہے کہ ہم تمہارے (دوبارہ پیدا کرنے کے) لئے کوئی وقت موعود نہ لائیں گے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی جب قیامت آئے گی پہاڑ جیسی سخت مخلوق بھی اپنی جگہ سے چلائی جائے گی، بلکہ اس کی بھاری بھاری چٹانیں دھنی ہوئی

اون کی طرح فضا میں اڑتی پھریں گی، غرض زمین کے سارے ابھار مٹا کر سطح ہموار اور کھلی ہوئی رہ جائے گی۔

**فائدہ:** ۲ یعنی کوئی شخص خدائی عدالت سے غیر حاضر نہ ہو سکے گا۔

**فائدہ:** ۳ منکرین بعث کو تقریع و توبیخ کے طور پر یہ کہا جائے گا کہ تم تو قیامت وغیرہ کو محض ڈھکوسلہ سمجھتے تھے، آج سب جتھا اور اثاثہ چھوڑ کر ننگ دھڑنگ کہاں آپہنچے، اور ''جیسا بنایا تھا پہلی بار'' میں یہ بھی داخل ہے کہ بدن میں کچھ زخم و نقصان وغیرہ نہ رہے گا، حدیث میں ہے کہ محشر میں کل ایک سو بیس صفیں ہوں گی جن میں اسی امت محمدیہ کی ہیں۔

| |
|---|
| وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ |
| اور رکھا جائے گا حساب کا کاغذ پھر تو دیکھے گناہ گاروں کو ڈرتے ہیں اس سے جو اس میں لکھا ہے ۱ اور کہتے ہیں ہائے خرابی کیسا ہے یہ کاغذ |
| لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿٤٩﴾ |
| نہیں چھوٹی اس سے چھوٹی بات اور نہ بڑی بات جو اس میں نہیں آ گئی (گھیر لی) اور پائیں گے جو کچھ کیا ہے سامنے ۲ اور تیرا رب ظلم نہ کرے گا کسی پر ۳ |

**خلاصہ تفسیر:** اور نامہ عمل (خواہ داہنے ہاتھ میں یا بائیں ہاتھ میں دے کر اس کے سامنے کھلا ہوا) رکھ دیا جائے گا (جیسا کہ دوسری آیت میں ہے: وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا) تو آپ مجرموں کو دیکھیں گے کہ اس میں جو کچھ (لکھا) ہوگا (اس کو دیکھ کر) اس سے (یعنی اس کی سزا سے) ڈرتے ہوں گے اور کہتے ہوں گے کہ ہائے ہماری کم بختی اس نامہ اعمال کی عجیب حالت ہے کہ بے قلمبند کئے ہوئے نہ کوئی چھوٹا گناہ چھوڑا نہ بڑا گناہ (چھوڑا) اور جو کچھ انہوں نے (دنیا میں) کیا تھا وہ سب (لکھا ہوا) موجود پائیں گے اور آپ کا رب کسی پر ظلم نہیں کرے گا (کہ نہ کیا ہوا گناہ لکھ لے، یا کی ہوئی نیکی جو شرائط کے ساتھ کی جائے اس کو نہ لکھے)۔

خلاصہ یہ کہ رؤسا مشرکین جس چیز پر فخر کرتے ہیں انہوں نے اس کا حال اور انجام سن لیا اور جن غرباء کو حقیر سمجھتے ہیں ان کے باقیات صالحات کا لازوال دولت ہونا معلوم ہو گیا، اب بھی عقل نہ آئے تو انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیجیے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی اعمالنامہ ہر ایک کے ہاتھ میں دیا جائے گا، اس میں اپنے گناہوں کی فہرست پڑھ کر مجرم خوف کھائیں گے کہ دیکھئے آج کیسی سزا ملتی ہے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی ذرہ ذرہ عمل آنکھوں کے سامنے ہوگا اور ہر ایک چھوٹی بڑی بدی یا نیکی اعمالنامہ میں مندرج پائیں گے۔

**فائدہ:** ۳ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں ظلم کا بایں معنی تو امکان ہی نہیں کہ وہ غیر کی ملک میں تصرف کرے، کیونکہ تمام مخلوق اسی کی ملک ہے، لیکن ظاہر میں جو ظلم نظر آئے اور بے موقع کام سمجھا جائے، وہ بھی نہیں کرتا، نہ کسی کو بے قصور پکڑتا ہے نہ کسی کی ادنیٰ نیکی کو ضائع ہونے دیتا ہے، بلکہ اپنی حکمت بالغہ سے نیکی و بدی کے ہر ایک درخت پر وہ ہی پھل لگاتا ہے جو اس کی طبیعت نوعیہ کا اقتضاء ہو:

گندم از گندم بروید جو از جو　　　از مکافاتِ عمل غافل مشو

کفر و ایمان اور طاعت و معصیت میں خالق الکل نے اسی طرح کے علیحدہ علیحدہ خواص و تاثیرات رکھ دی ہیں جیسے زہر اور تریاق میں، آخرت میں خیر و شر کے یہ تمام خواص و آثار اعلانیہ ظاہر ہو جائیں گے۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ۭ

اور جب کہا ہم نے فرشتوں کو سجدہ کرو آدم کو تو سجدہ میں گر پڑے مگر ابلیس، تھا جن کی قسم سے سو نکل بھاگا اپنے رب کے حکم سے

اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۭ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝50

سو کیا اب تم ٹھہراتے ہو اس کو اور اس کی اولاد کو رفیق میرے سوا اور وہ تمہارے دشمن ہیں، برا ہاتھ لگا بے انصافوں کے بدلہ

**خلاصہ تفسیر:** گزشتہ آیات میں عام الفاظ سے کفار کے سرداروں کی اخلاقی خرابی، فخر وتکبر، عقائد کا فساد اور کفر کا بیان ہوا، اب آگے یہ بتلاتے ہیں کہ تمام خرابیوں کی جڑ یہی تکبر ہے جس کا آغاز ابلیس لعین سے ہوا، تکبر کے سبب ابلیس کا برا انجام اور ان کفار ومشرکین کا ابلیس کے تابع ہونا اور قیامت کے دن اس اتباع کا کچھ کام نہ آنا بلکہ عذاب کا مستحق ہونے کا بیان ہے، اخیر میں حضور ﷺ کی تسلی کے لیے ان کے ایمان سے ناامیدی ظاہر کی گئی، اور عذاب کی تاخیر کی حکمت بتائی گئی۔

اور (وہ وقت بھی قابل ذکر ہے) جبکہ ہم نے ملائکہ کو حکم دیا کہ آدم (علیہ السلام) کے سامنے سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے کہ وہ جنات میں سے تھا، اس نے اپنے رب کے حکم سے عدول کیا (جیسا کہ اس کے آگ سے پیدا ہونے کا تقاضہ تھا، لیکن اس عنصری تقاضے کی وجہ سے ابلیس معذور نہ سمجھا جائے گا، کیونکہ یہ تقاضہ مغلوب بھی ہوسکتا تھا، جیسا کہ اکثر آدمی کی طبیعت گناہ کی طرف مائل ہوتی ہے مگر اس تقاضے کو خدا کے خوف سے مغلوب کیا جاسکتا ہے) تو کیا پھر بھی تم اس کو اور اس کے چیلے چانٹوں (اولاد اور توابع) کو دوست بناتے ہو مجھ کو چھوڑ کر (یعنی میری اطاعت چھوڑ کر اس کے اور اس کی اولاد وتوابع کے کہنے پر چلتے ہو جو کہ محض شرک ہے) حالانکہ وہ (ابلیس اور اس کی جماعت) تمہارے دشمن ہیں (کہ ہر وقت تمہیں نقصان پہنچانے کی فکر میں رہتے ہیں) یہ (ابلیس اور اس کی ذریت کی دوستی) ظالموں کے لئے بہت برا بدل ہے (بدل اس لئے کہا کہ دوست تو بنانا چاہئے تھا خدا کو، لیکن انہوں نے خدا کے بدلے اپنے دشمن شیطان کو دوست بنالیا، حالانکہ ابلیس کی دشمنی خود دوستی سے مانع ہے اور کوئی دوسرا سبب بھی ایسا موجود نہیں جس کی وجہ سے اس کو دوست بنایا جائے)۔

* * *

**فائدہ:** راجح یہ ہی ہے کہ ابلیس نوع جن سے تھا، عبادت میں ترقی کر کے گروہ ملائکہ میں شامل ہوگیا، اسی لیے فرشتوں کو جو حکم سجود ہوا اس کو بھی ہوا، اس وقت اس کی اصل طبیعت رنگ لائی، تکبر کر کے خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری سے بھاگ نکلا، آدم کے سامنے سر جھکانے میں کسر شان سمجھی، تعجب ہے کہ آج آدم کی اولاد اپنے رب کی جگہ اسی دشمن ازلی اور اس کی اولاد واتباع کو اپنا رفیق وخیر خواہ اور مددگار بنانا چاہتی ہے اس سے بڑھ کر بے انصافی اور ظلم کیا ہوگا، یہ قصہ پہلے کئی جگہ مفصل گزر چکا ہے، یہاں اس پر متنبہ کرنے کے لیے لائے ہیں کہ دنیائے فانی کی ٹیپ ٹاپ پر مغرور ہو کر آخرت سے غافل ہوجانا شیطان کی تحریک وتسویل سے ہے، چاہتا ہے کہ ہم اپنے اصلی وآبائی وطن (جنت) میں واپس نہ جائیں، اس کا مطمح نظر یہ ہے کہ دوست بن کر ہم سے پرانی دشمنی نکالے، آدمی کو لازم ہے کہ ایسے چالاک دشمن سے ہوشیار رہے، جو لوگ دنیاوی متاع پر مغرور ہو کر ضعفاء کو حقیر سمجھتے اور اپنے کو بہت لمبا کھینچتے ہیں، وہ تکبر وتفاخر میں شیطان لعین کی راہ پر چل رہے ہیں۔

**تنبیہ:** ابن کثیرؒ نے بعض روایات نقل کر کے جن میں ابلیس کی اصل نوع ملائکہ میں سے بتلائی گئی ہے، لکھا ہے کہ ان روایات کا غالب حصہ اسرائیلیات میں سے ہے جنہیں بہت نظر وفکر کے بعد احتیاط کے ساتھ قبول کرنا چاہیے اور ان میں بعض چیزیں یقیناً جھوٹ ہیں کیونکہ قرآن ان کی صاف تکذیب کرتا ہے، آگے ابن کثیر نے بہت وزن دار الفاظ میں اسرائیلیات کے متعلق جو کچھ کلام کیا ہے، دیکھنے اور یاد رکھنے کے قابل ہے، یہاں بخوف تطویل ہم درج نہیں کر سکتے۔

مَآ اَشۡهَدۡتُّهُمۡ خَلۡقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلَا خَلۡقَ اَنۡفُسِهِمۡ ۖ

دکھلا نہیں لیا تھا میں نے ان کو بنانا آسمانوں اور زمین کا اور نہ بنانا خود ان کا

وَمَا كُنۡتُ مُتَّخِذَ الۡمُضِلِّيۡنَ عَضُدًا ﴿۵۱﴾

اور میں وہ نہیں کہ بناؤں بہکانے والوں کو اپنا مددگار

**خلاصہ تفسیر:** (ابلیس اور اس کی ذریت کو دوست ہی نہیں بلکہ خدائی کا شریک بھی مان لیا حالانکہ) میں نے ان کو نہ تو آسمان و زمین کے پیدا کرنے کے وقت (اپنی مدد یا مشورے کے لئے) بلایا اور نہ خود ان کے پیدا کرنے کے وقت (بلایا، یعنی ایک کے پیدا کرنے کے وقت دوسرے کو نہیں بلایا) اور میں ایسا (عاجز) نہ تھا کہ (کسی کو بالخصوص) گمراہ کرنے والوں (یعنی شیاطین کو) اپنا (دوست و) بازو بناتا (یعنی مدد کی ضرورت تو اس کو ہوتی ہے جو خود قادر نہ ہو، خدا کو کسی کیا ضرورت)۔

حاصل یہ ہے کہ خدا کا شریک اگر مستقل مخلوق نہ پیدا کرتا تو کم از کم مددگار تو ہوتا، اور اگر دوسری مخلوقات میں اس کی شرکت نہ ہوتی تو کم از کم خود ان کی پیدائش وغیرہ کے بارے میں تو ان کی کچھ پوچھ ہوتی، جب یہ بھی نہیں تو ان کو شریک قرار دینا محض حماقت ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی زمین و آسمان پیدا کرتے وقت ہم نے ان شیاطین کو بلایا نہ تھا کہ ذرا آ کر دیکھ جائیں، ٹھیک بنا ہے یا کچھ اونچ نیچ رہ گئی، غرض نہ ان سے تکوین و ایجاد عالم میں کچھ مشورہ لیا گیا نہ مدد طلب کی گئی بلکہ زمین و آسمان کی پیدائش کے وقت تو سرے سے یہ موجود ہی نہ تھے، خود ان کو پیدا کرتے وقت بھی نہیں پوچھا گیا کہ تمہیں کیسا بنایا جائے، یا تمہارے دوسرے ہم جنسوں کو کس طرح پیدا کروں ذرا آ کر میری مدد کرو، اور بفرض محال مدد بھی لیتا اور قوت بازو بھی بناتا تو کیا ان بد بخت اشقیاء کو؟ جنہیں جانتا ہوں کہ لوگوں کو میری راہ سے بہکانے والے ہیں، پھر خدا جانے آدمیوں نے ان کو خدائی کا درجہ کیسے دے دیا اور اپنے رب کو چھوڑ کر انھیں کیوں رفیق و مددگار بنانے لگے: سُبۡحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوۡلُ الظّٰلِمُوۡنَ عُلُوًّا كَبِيۡرًا

وَيَوۡمَ يَقُوۡلُ نَادُوۡا شُرَكَآءِىَ الَّذِيۡنَ زَعَمۡتُمۡ فَدَعَوۡهُمۡ فَلَمۡ يَسۡتَجِيۡبُوۡا لَهُمۡ وَجَعَلۡنَا بَيۡنَهُمۡ

اور جس دن فرمائے گا پکارو میرے شریکوں کو ۱؎ جن کو تم مانتے تھے پھر پکاریں گے سو وہ جواب نہ دیں گے ان کو اور کر دیں گے ہم انکے اور

مَّوۡبِقًا ﴿۵۲﴾ وَرَاَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ النَّارَ فَظَنُّوۡۤا اَنَّهُمۡ مُّوَاقِعُوۡهَا وَلَمۡ يَجِدُوۡا عَنۡهَا مَصۡرِفًا ﴿۵۳﴾ ع ۱۹

انکے بیچ مرنے کی جگہ (موت کا سامان) ۲؎ اور دیکھیں گے گناہ گار آگ کو پھر سمجھ لیں گے کہ انکو پڑنا ہے اس میں اور نہ بدل سکیں گے اس سے راستہ ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (تم یہاں ان کو شریک خدائی سمجھتے ہو، قیامت میں حقیقت معلوم ہوگی سو) اس دن کو یاد کرو کہ حق تعالیٰ (مشرکین سے) فرمائے گا کہ جن کو تم ہمارا شریک سمجھا کرتے تھے ان کو (اپنی امداد کے لئے) پکارو تو وہ پکاریں گے تو وہ ان کو جواب ہی نہ دیں گے اور ہم ان کے درمیان میں ایک آڑ کر دیں گے (جس سے بالکل ہی مایوسی ہو جائے ورنہ بغیر آڑ کے بھی ان کا مدد کرنا ممکن نہ تھا) اور مجرم لوگ دوزخ کو دیکھیں گے پھر یقین کریں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں، اور اس سے بچنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی جن کو میرا شریک بنا رکھا تھا، بلاؤ! تاکہ اس مصیبت کے وقت تمہاری مدد کریں۔

**فائدہ:** ۲؎ اس وقت رفاقت اور دوستی کی ساری قلعی کھل جائے گی، ایک دوسرے کے نزدیک بھی نہ جا سکیں گے، کام آنا تو درکنار دونوں

کے بیچ میں عظیم و وسیع خندق آگ کی حائل ہوگی (اعاذ نا اللہ منہا)

**فائدہ:** ۳ یعنی شروع شروع میں شاید کچھ معافی کی امید ہوگی لیکن جہنم کو دیکھتے ہی یقین ہو جائے گا کہ اب اس میں گرنا ہے اور فرار کا کوئی راستہ نہیں۔

| |
|---|
| وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿۵۴﴾ |
| اور بیشک پھیر پھیر کر سمجھائی ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو ہر ایک مثل، اور ہے انسان سب چیز سے زیادہ جھگڑالو |

**خلاصہ تفسیر:** اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں (کی ہدایت) کے واسطے ہر قسم کے عمدہ مضامین طرح طرح سے بیان فرمائے ہیں، اور (اس پر بھی منکر) آدمی (کا یہ حال ہے کہ وہ ناحق) جھگڑنے میں سب سے بڑھ کر ہے (جنات اور حیوانات میں اگرچہ شعور و ادراک ہے مگر وہ ایسا جدال اور جھگڑا نہیں کرتے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی قرآن کریم کس کس طرح مختلف عنوانات اور قسم قسم کے دلائل و امثلہ سے سچی باتیں سمجھاتا ہے مگر انسان کچھ ایسا جھگڑالو واقع ہوا ہے کہ صاف اور سیدھی باتوں میں بھی کٹ حجتی کیے بغیر نہیں رہتا، جب دلائل کا جواب بن نہیں پڑتا تو مہمل اور دور از کار فرمائشیں شروع کر دیتا ہے کہ فلاں چیز دکھاؤ تو مانوں گا۔

| |
|---|
| وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ |
| اور لوگوں کو جو روکا اس بات سے کہ یقین لے آئیں جب پہنچی ان کو ہدایت اور گناہ بخشوائیں اپنے رب سے سوا اسی انتظار نے کہ پہنچے ان پر |
| سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿۵۵﴾ |
| رسم پہلوں کی یا آ کھڑا ہو ان پر عذاب سامنے کا |

**خلاصہ تفسیر:** اور لوگوں کو بعد اس کے کہ ان کو ہدایت پہنچ چکی (جس کا تقاضا تھا کہ ایمان لے آتے) ایمان لانے سے اور اپنے پروردگار سے (کفر وغیرہ کی) مغفرت مانگنے سے اور کوئی امر مانع نہیں رہا بجز اس کے کہ ان کو اس کا انتظار ہو کہ اگلے لوگوں کا سا معاملہ (ہلاکت اور عذاب کا) ان کو بھی پیش آ جائے، یا یہ کہ عذاب ان کے روبرو ان کے سامنے آ کھڑا ہو۔

مطلب یہ کہ کیا اس لیے ایمان نہیں لاتے کہ ایسی باتیں واقع ہو تب ایمان لائیں گے جیسا کہ ان کی حالت سے جھلکتا ہے، اور کبھی زبان سے کہہ بھی ڈالتے تھے کہ ایسی باتیں کیوں نہیں واقع ہوتی، یعنی ان حالات سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ عذاب ہی کا انتظار ہے ورنہ اور سب حجتیں تو تمام ہو چکیں۔

* * *

**فائدہ:** یعنی ان کے ضد و عناد کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ قرآن ایسی عظیم الشان ہدایت پہنچ جانے کے بعد ایمان نہ لانے اور توبہ نہ کرنے کا کوئی معقول عذر انکے پاس باقی نہیں، آخر قبول حق میں اب کیا دیر ہے اور کا ہے کا انتظار ہے، بجز اس کے کہ پہلی قوموں کی طرح خدا تعالیٰ ان کو بکلی تباہ کر ڈالے، یا اگر تباہ نہ کیے جائیں تو کم از کم مختلف صورتوں میں عذاب الٰہی آنکھوں کے سامنے آ کھڑا ہو، ھکذا یفھم من تفسیر ابن کثیر وغیرہ، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ”یعنی کچھ اور انتظار نہیں رہا مگر یہی کہ پہلوں کی طرح ہلاک ہو دیں یا قیامت کا عذاب آنکھوں سے دیکھیں“۔

وَمَا نُرۡسِلُ الۡمُرۡسَلِيۡنَ اِلَّا مُبَشِّرِيۡنَ وَمُنۡذِرِيۡنَ ۚ وَيُجَادِلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِالۡبَاطِلِ

اور ہم جو رسول بھیجتے ہیں سو خوشخبری اور ڈر سنانے کو ۱؎ اور جھگڑا کرتے ہیں کافر جھوٹا جھگڑا

لِيُدۡحِضُوۡا بِهِ الۡحَقَّ وَاتَّخَذُوۡۤا اٰيٰتِىۡ وَمَاۤ اُنۡذِرُوۡا هُزُوًا ۝٥٦

کہ ٹلادیں اس سے سچی بات کو ۲؎ اور ٹھہرالیا انہوں نے میرے کلام کو اور جو ڈر سنائے گئے ٹھٹھا ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (اگر وہ رسول کے ماننے کو ایسے ہی واقعات کے ظاہر ہونے پر معلق کرتے ہیں تو اسے مسئلہ رسالت سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ) رسولوں کو تو صرف بشارت دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجا کرتے ہیں (اور اس کو ثابت کرنے کے لئے معجزات وغیرہ کے ذریعہ کافی دلائل ان کے ساتھ کردیئے جاتے ہیں، اس سے زائد کوئی فرمائش کرنا جہالت ہے) اور کافر لوگ ناحق کی باتیں پکڑ پکڑ کر جھگڑے نکالتے ہیں، تا کہ اس کے ذریعہ سے حق بات کو بچلادیں (ہٹادیں) اور انھوں نے میری آیتوں کو اور جس (عذاب) سے ان کو ڈرایا گیا تھا اس کو دل لگی بنا رکھا ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ ان کو یہ اختیار نہیں کہ جب تم مانگو یا جب وہ چاہیں عذاب لا کھڑا کریں۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی جھوٹے جھگڑے اٹھا کر اور کٹ حجتی کر کے چاہتے ہیں کہ حق کی آواز پست کر دیں اور جھوٹ کے زور سے سچائی کا قدم ڈگمگا دیں۔ ایسا کبھی نہ ہوگا۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی کلام اللہ سے ٹھٹھا کرتے ہیں اور جس عذاب سے ڈرایا جاتا ہے اس کی ہنسی اڑاتے ہیں۔

وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعۡرَضَ عَنۡهَا وَنَسِىَ مَا قَدَّمَتۡ يَدٰهُ ؕ

اور اس سے زیادہ ظالم کون جسکو سمجھایا اسکے رب کے کلام سے پھر منہ پھیر لیا اسکی طرف سے اور بھول گیا جو کچھ آگے بھیج چکے ہیں اسکے ہاتھ ۱؎

اِنَّا جَعَلۡنَا عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ اَكِنَّةً اَنۡ يَّفۡقَهُوۡهُ وَفِىۡۤ اٰذَانِهِمۡ وَقۡرًا ؕ وَاِنۡ تَدۡعُهُمۡ اِلَى الۡهُدٰى

ہم نے ڈال دیے ہیں ان کے دلوں پر پردے کہ اس کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں ہے بوجھ، اور اگر تو ان کو بلائے راہ پر

فَلَنۡ يَّهۡتَدُوۡۤا اِذًا اَبَدًا ۝٥٧

تو ہرگز نہ آئیں راہ پر اس وقت کبھی ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور اس سے زیادہ کون ظالم ہوگا جس کو اس کے رب کی آیتوں سے نصیحت کی جائے پھر وہ اس سے روگردانی کرے اور جو کچھ اپنے ہاتھوں (گناہ) سمیٹ رہا ہے اس (کے نتیجہ) کو بھول جائے، ہم نے اس (حق بات) کے سمجھنے سے ان کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں (اور اس کے سننے سے) ان کے کانوں میں ڈاٹ دے رکھی ہے اور (اس وجہ سے ان کا حال یہ ہے کہ) اگر آپ ان کو راہ راست کی طرف بلائیں تو ایسی حالت میں ہرگز بھی راہ پر نہ آئیں (کیونکہ کانوں سے دعوت حق سنتے نہیں، دلوں سے سمجھتے نہیں، اس لئے آپ غم نہ کریں)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی کبھی بھول کر بھی خیال نہ آیا کہ تکذیب حق اور استہزاء و تمسخر کا جو ذخیرہ آگے بھیج رہا ہے اس کی سزا کیا ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی ان کے جدال بالباطل اور استہزاء بالحق کی وجہ سے ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے اور کانوں میں ڈاٹ ٹھونک

دی، اب نہ حق کو سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں بالکل مسخ ہو گئے، پھر حق کی طرف متوجہ ہوں تو کیسے ہوں اور انجام کا خیال کریں تو کیسے کریں، ایسے بدبختوں کے راہ پر آنے کی کبھی توقع نہیں۔

| |
|---|
| وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ؕ |
| اور تیرا رب بڑا بخشنے والا ہے رحمت والا، اگر ان کو پکڑے ان کے کئے پر تو جلد ڈالے ان پر عذاب ۱؎ |
| بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ﴿۵۸﴾ |
| پر ان کے لیے ایک وعدہ ہے کہیں نہ پائیں گے اس سے ورے سرک جانے کو جگہ ۲؎ |

**خلاصہ تفسیر:** اور (عذاب میں تاخیر کی وجہ سے جو ان کو یہ خیال ہو رہا ہے کہ عذاب آئے گا ہی نہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ) آپ کا رب بڑا مغفرت کرنے والا بڑا رحمت والا ہے (اس لئے مہلت دے رکھی ہے کہ انہیں خود ہوش آ جائے اور ایمان لے آئیں تو ان کی مغفرت کر دی جائے، دوسرے خود رحمت کا بھی تقاضہ ہے کہ ایمان نہ لانے پر بھی دنیا میں عذاب سے مہلت دی جائے، ورنہ ان کے اعمال تو ایسے ہیں کہ) اگر ان سے ان کے اعمال پر دارو گیر کرنے لگتا تو ان پر فوراً ہی عذاب واقع کر دیتا (مگر ایسا نہیں کرتا) بلکہ ان کے (عذاب کے) واسطے ایک معین وقت (ٹھہرا رکھا) ہے (یعنی روز قیامت) کہ اس سے اس طرف (یعنی پہلے) کوئی پناہ کی جگہ نہیں پا سکتے (یعنی اس وقت کے آنے سے پہلے کسی پناہ کی جگہ میں جا چھپیں اور اس سے محفوظ رہیں)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی کرتوت تو ان کے ایسے کہ عذاب پہنچنے میں ایک گھنٹہ کی تاخیر نہ ہو، مگر حق تعالیٰ کا حلم و کرم فوراً تباہ کر ڈالنے سے مانع ہے، اپنی رحمت عامہ سے خاص حد تک درگزر فرماتا ہے اور سخت سے سخت مجرم کو موقع دیتا ہے کہ چاہے تو اب بھی توبہ کر لے پچھلی خطائیں بخشوا لے، اور ایمان لا کر رحمت عظیمہ کا مستحق بن جائے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی یہ تاخیر عذاب ایک وقت معین تک ہے، یہ ممکن نہیں کہ کوئی مجرم سزا کا وعدہ آنے سے پیشتر کہیں ادھر ادھر کھسک جائے، جب وقت آئے گا سب بندھے چلے آئیں گے، مجال نہیں کوئی روپوش ہو سکے۔

ع ۲۰

| |
|---|
| وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ﴿۵۹﴾ |
| اور یہ سب بستیاں ہیں جن کو ہم نے غارت کیا جب وہ ظالم ہو گئے اور مقرر کیا تھا ہم نے ان کی ہلاکت کا ایک وعدہ |

**خلاصہ تفسیر:** اور (یہی قاعدہ پہلے کفار کے ساتھ بھی برتا گیا، چنانچہ) یہ بستیاں (جن کے قصے مشہور و مذکور ہیں) جب انہوں نے (یعنی ان کے بسنے والوں نے) شرارت کی تو ہم نے ان کو ہلاک کر دیا اور ہم نے ان کے ہلاک ہونے کے لئے وقت معین کیا تھا (اسی طرح ان موجودہ لوگوں کے لئے بھی وقت معین ہے، دیر ہونے سے یہ کیسے لازم آیا کہ عذاب ہونے کا ہی نہیں)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی عاد و ثمود کی بستیاں جن کے واقعات مشہور و معروف ہیں دیکھ لو جب ظلم کیے کس طرح اپنے وقت معین پر تباہ و برباد کر دی گئیں، اسی طرح تم کو ڈرتے رہنا چاہیے کہ وقت آنے پر عذاب الٰہی سے کہیں پناہ نہ ملے گی۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَاۤ اَبْرَحُ حَتّٰۤى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا ﴿٦٠﴾

اور جب کہا موسیٰ نے اپنے جوان کو میں نہ ہٹوں گا جب تک نہ پہنچ جاؤں جہاں ملتے ہیں دو دریا یا چلا جاؤں قرنوں

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے کفار ومشرکین کے سرداروں کی اس درخواست کی مذمت تھی کہ ہماری مجلس میں غریب مسلمان نہ رہنے پائیں، اب موسیٰ علیہ السلام کے ایک قصہ سے اس کو زیادہ وضاحت سے بیان کیا جاتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے تو اپنے سے چھوٹے کو بعض خاص علوم میں استاذ بنانے سے بھی عار نہیں کیا، اور تمہیں ان غریبوں کے ساتھ تعلیم میں شریک ہونے سے بھی عار آتی ہے، نیز اس مقصود کے ساتھ ساتھ اس قصہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر بھی دلالت ہوگئی جس کی وجہ ظاہر ہے۔

اور وہ وقت یاد کرو جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے خادم سے (جن کا نام یوشع تھا) فرمایا کہ میں (اس سفر میں) برابر چلا جاؤں گا یہاں تک کہ اس موقع پر پہنچ جاؤں جہاں دو دریا آپس میں ملے ہیں یا یوں ہی زمانہ دراز تک چلتا رہوں گا۔ (یہ مضمون ایسا ہی ہے جیسا کسی شاعر نے کہا ہے:)

دست از طلب ندارم تا کام من برآید یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

**وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ:** اس سفر کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ ایک بار موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل میں وعظ فرمایا تو کسی نے پوچھا کہ اس وقت آدمیوں میں سب سے بڑا عالم کون شخص ہے؟ آپ نے فرمایا کہ "میں"، مطلب آپ کا یہ تھا کہ جن علوم کو قرب الٰہی حاصل ہونے میں دخل ہے ان میں میرے برابر کوئی نہیں، اور آپ کا یہ فرمانا صحیح تھا، کیونکہ کہ آپ اولوالعزم نبی تھے، آپ کے برابر دوسرے کو یہ علم نہیں تھا، مگر بظاہر چونکہ الفاظ عام اور مطلق تھے جن سے یہ بھی مفہوم ہوسکتا تھا کہ ہر علم میں سب سے بڑا میں ہوں، اس لیے اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہوا کہ آپ کو گفتگو میں احتیاط کی تعلیم دی جائے ،غرض ارشاد ہوا کہ مجمع البحرین کے مقام پر ہمارا ایک بندہ تم سے بھی زیادہ علم رکھتا ہے، مطلب یہ تھا کہ بعض علوم میں وہ زیادہ ہے، اگرچہ ان علوم کو قرب الٰہی میں دخل نہ، لیکن ایسی حالت میں اپنے آپ کو مطلق طور پر ہر ایک سے تو زیادہ عالم نہیں کہنا چاہیے تھا،، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام ان کے ملنے کے مشتاق ہوئے، اور پوچھا کہ ان تک پہنچنے کی کیا صورت ہے؟ ارشاد ہوا کہ ایک بے جان مچھلی اپنے ساتھ لے کر سفر کرو، جہاں وہ مچھلی گم ہوجائے وہ شخص وہیں ہے ،چنانچہ اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے یوشع علیہ السلام کو ساتھ لیا اور یہ بات فرمائی۔

**لَاۤ اَبْرَحُ حَتّٰۤى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ:** بعض اہل کتاب کہتے ہیں کہ یہ مشہور قصہ پیغمبر موسیٰ علیہ السلام کا نہیں ہے ورنہ ہماری کتابوں میں ہوتا، مگر حدیث میں تصریح ہے کہ صاحب واقعہ وہی مشہور موسیٰ ہیں اور اہل کتاب کی بعض کتابیں گم ہوگئی ہیں، ممکن ہے کہ ان گمشدہ کتابوں میں ہو، اور اگر نہ بھی ہو تو مثبت نافی پر مقدم ہوتا ہے، بعض نے یہ خدشہ ظاہر کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے یہ سفر کب کیا ہے کہ بنی اسرائیل میں مشہور نہ ہو، جواب یہ ہے کہ یا تو ان کو علم ہوا ہو اور عار کی وجہ سے اس کا چرچا ختم کر دیا ہو، یا خود موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کی غباوت کی وجہ سے ان کو اطلاع نہ کی ہو کہ کسی فتنہ میں مبتلا نہ ہوجائیں اور بنی اسرائیل یوں سمجھے ہوں کہ حسب عادت کہیں تشریف لے گئے ہوں گے۔

**مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ:** "مجمع البحرین" کے لفظی معنی ہر وہ جگہ ہے جہاں دو دریا ملتے ہوں اور یہ ظاہر ہے کہ ایسے مواقع دنیا میں بیشمار ہیں، اس جگہ "مجمع البحرین" سے کونسی جگہ مراد ہے چونکہ قرآن وحدیث میں اس کو معین طور پر نہیں بتلایا اس لئے آثار وقرائن کے اعتبار سے مفسرین کے اقوال اس میں مختلف ہیں، لیکن اس کی تعیین پر کوئی ضروری امر موقوف بھی نہیں ہے۔

**لَاۤ اَبْرَحُ حَتّٰۤى اَبْلُغَ:** اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شیخ کامل کی تلاش میں ممکنہ کوشش کرنی چاہیے، خواہ اس کے لیے دور دراز سفر کی ضرورت پیش آئے، جب تک اس سے زیادہ کوئی حق واجب فوت نہ ہوجائے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ طلب علم کے لیے سفر مستحب ہے، نیز یہ جملہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رفیق سفر یوشع بن نون سے کہا جس کا مطلب اپنے سفر کا رخ اور منزل مقصود رفیق کو بتانا تھا، اس میں بھی حسن ادب ہے کہ سفر کی ضروری باتوں سے اپنے رفیق اور خادم کو بھی باخبر کر دینا چاہئے، متکبر لوگ اپنے خادموں اور نوکروں کو نہ قابل خطاب سمجھتے ہیں نہ اپنے سفر کے متعلق ان کو کچھ

بتاتے ہیں، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ سفر میں کسی کو ہمراہ لینا چاہیے اگر چہ وہ سفر کسی بزرگ ہی کی خدمت میں ہو۔

* * *

**فائدہ:** اوپر ذکر ہوا تھا کہ مغرور کافر مفلس مسلمانوں کو حقیر سمجھ کر آنحضرت ﷺ سے کہتے تھے کہ ان کو پاس نہ بٹھائیں تو ہم بیٹھیں، اسی پر دو شخصوں کی کہاوت سنائی، پھر دنیا کی مثال اور ابلیس کا کبر و غرور سے خراب ہونا بیان کیا، اب موسیٰ اور خضر کا قصہ ذکر کرتے ہیں کہ اللہ والے اگر سب سے افضل اور بہتر بھی ہوں تو اپنے آپ کو بہتر نہیں کہتے، اور کبھی بھول چوک سے کہہ گزریں تو حق تعالیٰ کی طرف سے تادیب و تنبیہ کی جاتی ہے۔

حدیث میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو نہایت موثر اور بیش بہا نصیحتیں فرما رہے تھے ایک شخص نے پوچھا، اے موسیٰ! کیا روئے زمین پر آپ اپنے سے بڑا عالم کسی کو پاتے ہیں؟ آپ نے فرمایا نہیں، یہ جواب واقع میں صحیح تھا کیونکہ موسیٰ اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کے زمانہ میں اسرار شرعیہ کا علم ان سے زیادہ کس کو ہوسکتا تھا، لیکن حق تعالیٰ کو ان کے الفاظ پسند نہ آئے، گو مراد صحیح تھی، تاہم عنوان جواب کے عموم سے ظاہر ہوتا تھا کہ روئے زمین پر من کل الوجوہ اپنے کو اعلم الناس خیال کرتے ہیں، خدا کی مرضی یہ تھی کہ جواب کو اس کے علم محیط پر محمول کرتے، مثلاً یہ کہتے کہ اللہ کے مقرب و مقبول بندے بہت سے ہیں، سب کی خبر اسی کو ہے، تب وحی آئی کہ جس جگہ دو دریا ملے ہیں اس کے پاس ہمارا ایک بندہ ہے جو تم سے زیادہ علم رکھتا ہے۔

دو دریا سے کون سے دریا مراد ہیں؟ بعض نے کہا کہ بحر فارس اور بحر روم لیکن یہ دونوں ملتے نہیں، شاید ملاپ سے مراد قرب ہوگا یعنی جہاں دونوں کا فاصلہ کم سے کم رہ جائے، بعض افریقہ کے دو دریا مراد لیتے ہیں، بعض علماء کے نزدیک ''مجمع البحرین'' وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر دجلہ اور فرات خلیج فارس میں گرتے ہیں، (واللہ اعلم) بہر حال موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی کہ مجھے اس کا پورا پتہ نشان بتایا جائے تاکہ میں وہاں جا کر کچھ علمی استفادہ کروں، حکم ہوا کہ اس کی تلاش میں نکلو تو ایک مچھلی تل کر ساتھ رکھ لو، جہاں مچھلی گم ہو وہیں سمجھنا کہ وہ بندہ موجود ہے گویا ''مجمع البحرین'' سے جو ایک وسیع قطعہ مراد ہوسکتا تھا اس کی پوری تعیین کے لیے یہ علامت مقرر فرمائی دی، موسیٰ علیہ السلام نے اسی ہدایت کے موافق اپنے خادم خاص حضرت یوشع کو ہمراہ لے کر سفر شروع کر دیا، اور یوشع کو کہہ دیا کہ مچھلی کا خیال رکھنا، میں برابر سفر کرتا رہوں گا یہاں تک کہ منزل مقصود پر پہنچ جاؤں، اگر فرض کرو برس اور قرن بھی گزر جائیں گے بدون مقصد حاصل کیے سفر سے نہ ہٹوں گا۔

**تنبیہ:** جوان سے مراد حضرت یوشع ہیں جو ابتداء موسیٰ علیہ السلام کے خادم خاص تھے، پھر ان کے روبرو پیغمبر اور ان کے بعد خلیفہ ہوئے۔

| فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿٦١﴾ |
|---|
| پھر جب پہنچے دونوں دریا کے ملاپ تک بھول گئے اپنی مچھلی پھر اس نے اپنی راہ کر لی دریا میں سرنگ بنا کر |

**خلاصہ تفسیر:** پس جب (چلتے چلتے) دونوں دریاؤں کے جمع ہونے کے موقع پر پہنچے (وہاں کسی پتھر سے لگ کر سو رہے تھے اور وہ مچھلی اللہ کے حکم سے زندہ ہو کر دریا میں جا پڑی، یوشع علیہ السلام نے بیدار ہو کر مچھلی کو نہ پایا ارادہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام جب جاگیں گے تو اس کا ذکر کروں گا، مگر ان کو مطلق یاد نہ رہا، اور موسیٰ علیہ السلام کو بھی پوچھنے کا خیال نہ رہا، اس طرح سے) اس اپنی مچھلی کو دونوں بھول گئے اور مچھلی نے (اس سے پہلے زندہ ہو کر) دریا میں اپنی راہ لی اور چل دی۔

**نَسِيَا حُوْتَهُمَا:** شاید اہل و عیال اور وطن وغیرہ کے خیالات کا ہجوم ہوا ہوگا جو یوشع اس بات کا ذکر کرنا بھول گئے، ورنہ ایسی عجیب بات کا بھول جانا کم ہوتا ہے، لیکن جو شخص ہر وقت خلاف عادت باتوں کو دیکھتا رہتا ہو اس کے ذہن سے کسی ادنیٰ درجہ کی عجیب بات کا نکل جانا کسی خیال کے غلبہ میں عجیب بھی نہیں۔

* * *

**فائدہ:** وہاں پہنچ کر ایک بڑے پتھر کے قریب جس کے نیچے آب حیات کا چشمہ جاری تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام سو رہے، یوشع علیہ السلام

نے دیکھا کہ بھنی ہوئی مچھلی باذن اللہ زندہ ہوکر زنبیل سے نکل پڑی اور عجیب طریقہ سے دریا میں سرنگ بناتی چلی گئی، وہاں پانی میں خدا کی قدرت سے ایک طاق سے کھلا رہ گیا، یوشع کو دیکھ کر تعجب آیا، چاہا کہ موسیٰ بیدار ہوں تو ان سے کہوں، وہ بیدار ہوئے تو دونوں آگے چل کھڑے ہوئے، یوشع نہ معلوم کن خیالات میں پڑ کر کہنا بھول گئے، روایات میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جب ان کو مچھلی کی خبر گیری کے لیے کہا تھا تو ان کی زبان سے نکلا کہ یہ کوئی بڑا کام نہیں، لہٰذا متنبہ کیا گیا کہ چھوٹے سے چھوٹے کام میں بھی آدمی کو محض اپنے نفس پر بھروسہ نہیں چاہیے۔

فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا ۡ لَقَدۡ لَقِيۡنَا مِنۡ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿۶۲﴾

پھر جب آگے چلے کہا موسیٰ نے اپنے جوان کو لا ہمارے پاس ہمارا کھانا، ہم نے پائی اپنے اس سفر میں تکلیف

**خلاصہ تفسیر:** پھر جب دونوں (وہاں سے) آگے بڑھ گئے (اور دور نکل گئے) تو موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے خادم سے فرمایا کہ ہمارا ناشتہ تو لاؤ ہم کو تو اس سفر (یعنی آج کی منزل) میں بڑی تکلیف پہنچی (اس سے قبل کی منزلوں میں نہیں تھکے تھے، جس کی وجہ بظاہر منزل مقصود سے آگے بڑھ جانا تھا)۔

اٰتِنَا غَدَآءَنَا: اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ سفر میں زادراہ (توشہ وغیرہ) رکھنا توکل کے خلاف نہیں۔

لَقَدۡ لَقِيۡنَا مِنۡ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا: یہ اس بات پر دلیل ہے کہ اپنی حالت مرض یا تھکن وغیرہ کا اظہار کمال کے خلاف نہیں ہے۔

* * *

**فائدہ:** حضرت موسیٰ علیہ السلام پہلے نہیں تھکے جب مطلب چھوٹ رہا تھا اس وقت چلنے سے تکان محسوس کیا۔

قَالَ اَرَءَيۡتَ اِذۡ اَوَيۡنَاۤ اِلَى الصَّخۡرَةِ فَاِنِّىۡ نَسِيۡتُ الۡحُوۡتَ ۡ وَمَاۤ اَنۡسٰنِيۡهُ اِلَّا الشَّيۡطٰنُ

بولا وہ دیکھا تو نے جب ہم نے جگہ پکڑی اس پتھر کے پاس سو میں بھول گیا مچھلی، اور یہ مجھ کو بھلا دیا شیطان ہی نے

اَنۡ اَذۡكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيۡلَهٗ فِى الۡبَحۡرِ ۖ عَجَبًا ﴿۶۳﴾

کہ اس کا ذکر کروں، اور اس نے کر لیا اپنا راستہ (وہ کر گئی اپنا راستہ) دریا میں عجیب طرح

**خلاصہ تفسیر:** خادم نے کہا کہ لیجئے دیکھئے (عجیب بات ہوئی) جب ہم اس پتھر کے قریب ٹھہرے تھے (اور سو گئے تھے اس وقت اس مچھلی کا ایک قصہ ہوا، اور میرا ارادہ آپ سے ذکر کرنے کا تھا لیکن میں کسی دوسرے دھیان میں لگ گیا) سو میں اس مچھلی (کے تذکرہ) کو بھول گیا اور مجھ کو شیطان ہی نے بھلا دیا کہ میں اس کو ذکر کرتا اور (وہ قصہ یہ ہوا کہ) اس مچھلی نے (زندہ ہونے کے بعد) دریا میں عجیب طور پر اپنی راہ لی۔

فَاِنِّىۡ نَسِيۡتُ الۡحُوۡتَ: شبہ ہوتا ہے کہ جب مجمع البحرین یعنی دو دریاؤں کے ملنے کا مقام انہیں بتلا دیا گیا تھا تو وہاں پہنچ کر پھر کیوں آگے بڑھ گئے اگر چہ مچھلی کے زندہ ہونے کا قصہ معلوم نہ ہوا تھا، لیکن یہ تو معلوم تھا کہ مجمع البحرین آ گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مجمع البحرین سے کوئی خاص مقام مراد ہونا ضروری نہیں، بلکہ اس کے قرب وجوار کو دور تک مجمع البحرین کہا جا سکتا ہے اور اسی وسعت کی وجہ سے مچھلی میں جان پڑ جانا علامت مقرر کی گئی تھی، اس علامت کو سن کر مخاطب ضرور اس مقام کو وسیع سمجھے گا اگر چہ متکلم کے نزدیک متعین ہو، اور دو دریاؤں کے ملنے مقام متعدد ہوں گے، ان میں سے ایک موقع یہ بھی ہوگا جس کی تعیین پر کوئی ضرور امر موقوف نہیں۔

وَمَاۤ اَنۡسٰنِيۡهُ اِلَّا الشَّيۡطٰنُ: اگر شبہ ہو کہ یوشع علیہ السلام نبی تھے پھر ان پر شیطان کا تصرف نسیان اور بھول کے بارے میں کیسے ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جو تصرف گناہ کی طرف لے جانے والا ہو اس سے انبیاء کرام کا محفوظ ہونا ثابت ہے، باقی دوسرے تصرفات ایسے ہیں جیسے کوئی کافر

کسی نبی کے پتھر مار دے اور چوٹ لگ جائے۔

اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ وسوسہ یا بھول شیطانی اثر سے پیدا ہوتا ہے اور اس کا پیش آنا ولایت بلکہ نبوت کے بھی خلاف نہیں، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بھول اور دیگر مکروہ امور کو شیطان کی طرف منسوب کرنا چاہیے اور ان کی نسبت اللہ کی طرف کرنے سے بچنا چاہیے۔

**وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ عَجَبًا**: ایک عجیب بات تو خود اس کا زندہ ہو جانا ہے، اور دوسرا عجیب واقعہ بطور خرق عادت یہ کہ وہ مچھلی دریا میں جہاں گزری تھی وہاں کا پانی خلاف عادت اسی طرح سرنگ کے طور پر ہو گیا تھا، غالبا پھر مل گیا ہوگا، اور اس مچھلی کا زندہ ہونا بظاہر محض قدرت الٰہی سے ہوا، کیونکہ وہی علامت بتلائی گئی تھی اگرچہ پانی لگنے کے وقت حیات ہوئی ہو مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پانی کا لگنا سبب تھا

* * *

**فائدہ**: ؎ یعنی مطلب کی بات بھول جانا اور عین موقع یادداشت پر ذہول ہونا، شیطان کی وسوسہ اندازی سے ہوا۔

| قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿٦٤﴾ |
|---|
| کہا یہی ہے جو ہم چاہتے تھے پھر الٹے پھرے اپنے پیر پہچانتے |

**خلاصہ تفسیر**: موسیٰ (علیہ السلام) نے (یہ حکایت سن کر) فرمایا کہ یہی وہ موقع ہے جس کی ہم کو تلاش تھی (وہاں ہی لوٹنا چاہئے) سو دونوں اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے الٹے لوٹے (غالباً وہ راستہ سڑک کا نہ ہوگا اس لئے نشان دیکھنے پڑھے)۔

* * *

**فائدہ**: غالباً راستہ بنا ہوا نہ ہوگا، اس لیے اپنے نقش قدم دیکھتے ہوئے الٹے پاؤں پھرے۔

| فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿٦٥﴾ |
|---|
| پھر پایا ایک بندہ ہمارے بندوں میں کہ جس کو دی تھی ہم نے رحمت اپنے پاس سے اور سکھلایا تھا اپنے پاس سے ایک علم |

**خلاصہ تفسیر**: سو (وہاں پہنچ کر) انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے (یعنی خضر) کو پایا جن کو ہم نے اپنی خاص رحمت (یعنی مقبولیت) دی تھی (مقبولیت کے معنی میں ولایت اور نبوت دونوں کا احتمال ہے) اور ہم نے ان کو اپنے پاس سے (یعنی بغیر کسی سبب اور بغیر کسی محنت کے) ایک خاص طور پر علم سکھلایا تھا (اس سے مراد علم اسرار کونیہ ہے یعنی واقعات عالم کا علم جیسا کہ آئندہ کلام سے معلوم ہوگا اور اس علم کو قرب الٰہی حاصل ہونے میں کچھ دخل نہیں، اور جس علم کو قرب میں دخل ہے وہ اسرار الٰہی کا علم ہے جس میں موسیٰ علیہ السلام بڑھے ہوئے تھے)۔

**فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ**: جمہور علماء کے نزدیک حضرت خضر علیہ السلام کا نبی ہونا خود قرآن کریم میں ذکر کئے ہوئے واقعات سے ثابت ہے، کیونکہ خضر علیہ السلام سے اس سفر میں جتنے واقعات ثابت ہیں ان میں بعض تو قطعی طور پر خلاف شرع ہیں اور حکم شریعت سے کوئی استثناء بجز وحی الٰہی کے ہو نہیں سکتا جو نبی اور پیغمبر ہی کے ساتھ مخصوص ہے، ولی کو بھی کشف یا الہام سے کچھ چیزیں معلوم ہو سکتی ہیں، مگر وہ کوئی حجت نہیں ہوتی، ان کی بناء پر ظاہر شریعت کے کسی حکم کو بدلا نہیں جا سکتا، اس لئے یہ متعین ہو جاتا ہے کہ خضر علیہ السلام اللہ کے نبی اور پیغمبر تھے، ان کو بذریعہ وحی الٰہی بعض خاص احکام وہ دیئے گئے تھے جو ظاہر شریعت کے خلاف تھے، انہوں نے جو کچھ کیا اس استثنائی حکم کے ماتحت کیا، خود ان کی طرف سے اس کا اظہار بھی قرآن کے اس جملے میں ہو گیا: **وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ** (یعنی میں نے جو کچھ کیا اپنی طرف سے نہیں کیا بلکہ امر الٰہی سے کیا ہے) جمہور امت کے نزدیک حضرت خضر علیہ السلام بھی ایک نبی اور پیغمبر ہیں، مگر کچھ تکوینی خدمتیں من جانب اللہ ان کے سپرد کی گئی تھیں انہی کا علم دیا گیا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کی اطلاع نہ تھی، اسی لئے اس پر اعتراض کیا۔

**اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا:** یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ بہت سے جاہل غلط کار تصوف کو بدنام کرنے والے صوفی جو کہنے لگے کہ شریعت اور چیز ہے اور طریقت اور ہے بہت سی چیزیں شریعت میں حرام ہوتی ہیں مگر طریقت میں جائز ہیں اس لئے کسی ولی کو صریح گناہ کبیرہ میں مبتلا دیکھ کر بھی اس پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا یہ کھلا ہوا زندقہ اور باطل ہے، حضرت خضر علیہ السلام پر کسی دنیا کے ولی کو قیاس نہیں کیا جاسکتا اور نہ ظاہر شریعت کے خلاف اس کے کسی فعل کو جائز کہا جاسکتا ہے۔

**وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا:** یہ تعلیم ممکن ہے کہ وحی کے واسطہ سے ہو یا الہام کے واسطہ سے، اور یہ الہام انبیاء وغیر انبیاء سب کو ہوتا ہے، یہ آیت علم لدنی کے اثبات میں اصل ہے، اس علم لدنی کو علم حقیقت وعلم باطن بھی کہتے ہیں، اگرچہ اس قصہ میں ان مذکورہ جزئی واقعات کا علم اس قسم میں داخل تو نہیں لیکن حضرت خضر علیہ السلام کو علم لدنی بھی عطا کیا گیا۔

* * *

**فائدہ:** وہ بندہ حضرت خضر علیہ السلام تھے، جن کو حق تعالیٰ نے رحمت خصوصی سے نوازا اور اسرار کونیہ کے علم سے وافر حصہ عطا فرمایا تھا، اس میں اختلاف ہے کہ حضرت خضر کو رسول مانا جائے یا نبی یا محض ولی کے درجہ میں رکھا جائے، ایسے مباحث کا فیصلہ یہاں نہیں ہوسکتا، تاہم احقر کا رجحان اسی طرف ہے کہ ان کو نبی تسلیم کیا جائے اور جیسا کہ بعض محققین کا خیال ہے کہ جو انبیاء جدید شریعت لے کر نہیں آتے ان کو بھی اتنا تصرف واختیار عطاء ہوتا ہے کہ مصالح خصوصیہ کی بناء پر شریعت مستقلہ کے کسی عام کی تخصیص یا مطلق کی تقیید یا عام ضابطہ سے بعض جزئیات کا استثناء کرسکیں، اسی طرح جزئی تصرفات حضرت خضر کو بھی حاصل تھے، واللہ اعلم، بہرحال موسیٰ علیہ السلام خضر سے ملے، علیک سلیک کے بعد خضر نے پوچھا، موسیٰ نے آنے کا سبب بتلایا، خضر نے کہا اے موسیٰ! بلاشبہ اللہ نے تمہاری تربیت فرمائی، پر بات یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے ایک علم (جزئیات کونیہ کا) مجھ کو ملا ہے جو (اتنی مقدار میں) تم کو نہیں ملا، اور ایک علم (اسرار تشریع کا) تم کو دیا گیا ہے جو (اتنی بہتات سے) مجھ کو نہیں دیا گیا، اس کے بعد ایک چڑیا دکھا کر جو دریا میں سے پانی پی رہی تھی، کہا کہ میرا، تمہارا بلکہ کل مخلوقات کا سارا علم اللہ کے علم میں سے اتنا ہے جتنا دریا کے پانی میں سے وہ قطرہ جو چڑیا کے منہ کو لگ گیا ہے (یہ بھی محض تفہیم کے لیے تھا ورنہ متناہی کو غیر متناہی سے قطرہ اور دریا کی نسبت بھی نہیں)۔

| |
|---|
| قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿٦٦﴾ |
| کہا اس کو موسیٰ نے کہے تو تیرے ساتھ رہوں اس بات پر کہ مجھ کو سکھلا دے کچھ جو تجھ کو سکھلائی ہے بھلی راہ |

**خلاصہ تفسیر:** (غرض) موسیٰ (علیہ السلام) نے (انہیں سلام کیا اور) ان سے فرمایا کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں (یعنی آپ مجھے اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دیجئے) اس شرط سے کہ جو مفید علم آپ کو (من جانب اللہ) سکھلایا گیا ہے اس میں سے آپ مجھ کو بھی سکھلا دیں۔

**هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ:** اس اسلوب کلام میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے باوجود نبی ورسول اور اولو العزم پیغمبر ہونے کے حضرت خضر علیہ السلام سے تعظیم وتکریم کے ساتھ درخواست کی کہ میں آپ سے آپ کا علم سیکھنے کے لئے ساتھ چلنا چاہتا ہوں، اس سے معلوم ہوا علماء ومشائخ کے ساتھ ادب کا برتاؤ کرنا چاہیے کہ تحصیل علم کا ادب یہی ہے کہ شاگرد اپنے استاذ کی تعظیم وتکریم اور اتباع کرے اگرچہ شاگرد اپنے استاذ سے افضل واعلیٰ بھی ہو۔

* * *

**فائدہ:** یعنی اجازت ہو تو چند روز آپ کے ہمراہ رہ کر اس مخصوص علم کا کچھ حصہ حاصل کروں۔

قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٦٧﴾ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿٦٨﴾

بولا تو نہ ٹھہر سکے گا میرے ساتھ، اور کیونکر ٹھہرے گا دیکھ کر ایسی چیز کو کہ تیرے قابو میں نہیں اس کا سمجھنا

**خلاصہ تفسیر:** ان بزرگ نے جواب دیا آپ سے میرے ساتھ رہ کر (میرے افعال پر) صبر نہ ہو سکے گا (یعنی آپ مجھ پر روک ٹوک کریں گے اور متعلم یعنی سیکھنے والا جب تعلیم کے وقت معلم کو روک ٹوک کرے تو اس صورت میں ساتھ رہنا مشکل ہے) اور (بھلا) ایسے امور پر (روک ٹوک کرنے سے) آپ کیسے صبر کریں گے جو آپ کے احاطہ واقفیت سے باہر ہیں (یعنی ظاہر میں وہ باتیں سبب اور منشاء معلوم نہ ہونے کی وجہ سے خلاف شرع نظر آئیں گے اور آپ خلاف شرع امور پر خاموش نہ رہ سکیں گے)۔

اس سے بعض لوگوں کو یہ دھوکہ ہوا کہ پیر اگر خلاف شریعت کام کرے تو مرید اس پر انکار نہ کرے، چنانچہ اس قصہ میں حدیث میں آیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اگر صبر کرتے تو خوب ہوتا، اس کا جواب یہ ہے کہ خضر علیہ السلام کا کمال اور ان کی مقبولیت خدا تعالیٰ کے ارشاد سے معلوم ہو چکی تھی، اس لیے سکوت جائز تھا، کسی دوسرے کو ان پر قیاس کرنا غلط ہے، بعض کو دھوکہ ہوا ہے کہ خلاف شریعت الہام پر عمل کرنا جائز ہے، جواب یہ ہے کہ خضر علیہ السلام یا تو نبی ہوں گے، پس ان واقعات میں جو کچھ کیا وحی سے کیا، یا یہ پہلی شریعت کا حکم ہوگا، شریعت محمدیہ میں یہ جائز نہیں۔

* * *

**فائدہ:** حضرت خضر نے موسیٰ علیہ السلام کے مزاج وغیرہ کا اندازہ کر کے سمجھ لیا کہ میرے ساتھ ان کا نباہ نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ وہ مامور تھے کہ واقعات کونیہ کو جزئی علم پا کر اسی کے موافق عمل کریں اور موسیٰ علیہ السلام جن علوم کے حامل تھے ان کا تعلق تشریعی قوانین وکلیات سے تھا بنابریں جن جزئیات میں عوارض وخصوصیات خاصہ کی وجہ سے بظاہر عام ضابطہ پر عمل نہ ہوگا حضرت موسیٰ اپنی معلومات کی بناء پر ضرور روک ٹوک کریں گے اور خاموشی کا مسلک دیر تک قائم نہ رکھ سکیں گے، آخری نتیجہ یہ ہوگا کہ جدا ہونا پڑے گا۔

قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ﴿٦٩﴾

کہا تو پائے گا اگر اللہ نے چاہا مجھ کو ٹھہرنے والا اور نہ ٹالوں گا تیرا کوئی حکم

**خلاصہ تفسیر:** موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (نہیں) ان شاء اللہ آپ مجھ کو صابر (یعنی ضابط) پائیں گے اور میں کسی بات میں آپ کے خلاف حکم نہ کروں گا (یعنی مثلاً اگر روک ٹوک سے منع کر دیں گے میں روک ٹوک نہ کروں گا، اسی طرح اور کسی بات میں بھی خلاف نہ کروں گا)۔

**سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا:** حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چونکہ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے پاس جانے اور ان سے علم سیکھنے کا حکم ہوا تھا اس لئے یہ اطمینان تھا کہ ان کا کوئی فعل درحقیقت خلاف شرع نہیں ہوگا گو ظاہر میں سمجھ میں نہ آئے، اس لئے صبر کرنے کا وعدہ کر لیا، ورنہ ایسا وعدہ کرنا بھی کسی عالم دین کے لئے جائز نہیں، لیکن پھر شریعت کے بارے میں دینی غیرت کے جذبہ سے مغلوب ہو کر اس وعدہ کو بھول گئے۔

* * *

**فائدہ:** یہ وعدہ کرتے وقت غالباً موسیٰ علیہ السلام کو اس کا تصور بھی نہ ہو سکتا تھا کہ ایسے مقرب ومقبول بندہ سے کوئی ایسی حرکت دیکھنے میں آئے گی جو اعلانیہ ان کی شریعت بلکہ عام شرائع واخلاق کے خلاف ہو، غنیمت ہوا کہ انہوں نے ''ان شاء اللہ'' کہہ لیا تھا، ورنہ ایک قطعی وعدہ کی خلاف ورزی کرنا اولوالعزم پیغمبر کی شان کے لائق نہ ہوتا۔

قَالَ فَاِنِ اتَّبَعۡتَنِیۡ فَلَا تَسۡـَٔلۡنِیۡ عَنۡ شَیۡءٍ حَتّٰۤی اُحۡدِثَ لَکَ مِنۡهُ ذِکۡرًا ﴿۷۰﴾

بولا پھر اگر میرے ساتھ رہنا ہے تو مت پوچھیو مجھ سے کوئی چیز جب تک میں شروع نہ کروں تیرے آگے اس کا ذکر

**خلاصہ تفسیر:** ان بزرگ نے فرمایا کہ (اچھا) تو اگر آپ میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو (اتنا خیال رہے کہ) مجھ سے کسی بات کی نسبت کچھ پوچھنا نہیں جب تک کہ اس کے متعلق میں خود ہی ابتداً ذکر نہ کردوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ استاذ اور شیخ کو طالب علم اور مرید سے مناسب قواعد ضوابط اور شرائط لگانے کا حق حاصل ہے، یعنی متبوع کو تابع سے کچھ شرطیں لگالینا جائز اور درست ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی کوئی بات اگر بظاہر ناحق نظر آئے تو مجھ سے فوراً باز پرس نہ کرنا جب تک میں خود اپنی طرف سے کہنا شروع نہ کروں۔

فَانۡطَلَقَا ۥ وقفة حَتّٰۤی اِذَا رَکِبَا فِی السَّفِیۡنَةِ خَرَقَهَا ؕ قَالَ اَخَرَقۡتَهَا لِتُغۡرِقَ اَهۡلَهَا ۚ

پھر دونوں چلے، یہاں تک کہ جب چڑھے کشتی میں اس کو پھاڑ ڈالا، موسیٰ بولا کیا تو نے اس کو پھاڑ ڈالا کہ ڈبا دے اس کے لوگوں کو

لَقَدۡ جِئۡتَ شَیۡـًٔا اِمۡرًا ﴿۷۱﴾

البتہ تو نے کی ایک چیز بھاری (عجیب، انوکھی)

**خلاصہ تفسیر:** (غرض باہم قول و قرار ہوگیا) پھر دونوں (کسی طرف) چلے (غالباً ان کے ساتھ یوشع علیہ السلام بھی ہوں گے مگر وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تابع تھے اس لئے اصل کا ذکر کرکے تابع کے ذکر کی ضرورت نہ رہی،) یہاں تک کہ (چلتے چلتے کسی ایسے مقام پر پہنچے جہاں کشتی پر سوار ہونے کی ضرورت ہوئی، سو) جب دونوں کشتی میں سوار ہوئے تو ان بزرگ نے اس کشتی (کا ایک تختہ نکال کر اس) میں سوراخ کردیا (شاید پھر بعد میں مرمت کردی ہو، اور غالباً کشتی والے ان کے معتقد ہوں گے اس لیے نہ روکا) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کیا آپ نے اس کشتی میں اس لئے سوراخ کیا ہے کہ اس کے بیٹھنے والوں کو غرق کردیں؟ (اور بظاہر کوئی مصلحت معلوم نہیں ہوتی) آپ نے بڑی بھاری (خطرہ کی) بات کی۔

**خَرَقَهَا ؕ قَالَ اَخَرَقۡتَهَا:** اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں: ① پہلی بات یہ کہ اکابر سے کبھی ایسے امور صادر ہو سکتے ہیں جن کی ظاہری شکل وصورت خلاف شریعت معلوم ہوتی ہو، لیکن حقیقت میں وہ خلاف شریعت نہیں ہوتے ② دوسری بات یہ کہ اولیاء اللہ میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو اللہ کے کشف والہام سے تکوینات (امور دنیا) میں تصرف کردیتے ہیں، صوفیاء کی اصطلاح میں ایسے اولیاء کو قطب التکوین یا صاحب خدمت کہا جاتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** جب اس کشتی پر چڑھنے لگے ناؤ والوں نے خضر کو پہچان کر مفت سوار کرلیا، اس احسان کے بدلہ یہ نقصان دیکھ کر موسیٰ کو اور زیادہ تعجب ہوا، لیکن کشتی پوری طرح کنارہ کے قریب پہنچ کر توڑی، لوگ ڈوبنے سے بچ گئے اور توڑنا یہ تھا کہ ایک تختہ نکال ڈالا، گویا عیب دار کردی۔

قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ اِنَّکَ لَنۡ تَسۡتَطِیۡعَ مَعِیَ صَبۡرًا ﴿۷۲﴾ قَالَ لَا تُؤَاخِذۡنِیۡ بِمَا نَسِیۡتُ

بولا میں نے نہ کہا تھا تو نہ ٹھہر سکے گا میرے ساتھ، کہا مجھ کو نہ پکڑ میری بھول پر

وَلَا تُرۡهِقۡنِیۡ مِنۡ اَمۡرِیۡ عُسۡرًا ﴿۷۳﴾

اور مت ڈال مجھ پر میرا کام مشکل

**خلاصہ تفسیر:** ان بزرگ نے کہا کہ کیا میں نے کہا نہیں تھا کہ آپ سے میرے ساتھ صبر نہ ہو سکے گا (آخر وہی ہوا، آپ اپنے قول پر نہ رہے) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (میں بھول گیا تھا، سو) آپ میری بھول چوک پر گرفت نہ کیجئے اور میرے اس معاملہ (متابعت) میں مجھ پر زیادہ تنگی نہ ڈالئے (کہ بھول چوک بھی معاف نہ ہو)۔

اس سے معلوم ہوا کہ نسیان اور بھول پر مواخذہ نہیں ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی اگر بھول چوک پر بھی گرفت کرو گے تو میرا تمہارے ساتھ رہنا مشکل ہو جائے گا، یہ پہلا پوچھنا حضرت موسیٰ سے بھول کر ہوا، اور دوسرا اقرار کرنے کو اور تیسرا رخصت ہونے کو۔

| |
|---|
| فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰۤى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ؕ |
| پھر دونوں چلے، یہاں تک کہ جب ملے ایک لڑکے سے تو اس کو مار ڈالا ۱؎ موسیٰ بولا کیا تو نے مار ڈالی ایک جان ستھری ۲؎ بغیر عوض کسی جان کے |
| لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا نُّكْرًا ﴿۷۴﴾ |
| بیشک تو نے کی ایک چیز نامعقول ۳؎ |

**خلاصہ تفسیر:** (بات گئی گذری ہو گئی) پھر دونوں (کشتی سے اتر کر آگے) چلے یہاں تک کہ جب ایک (کم سن) لڑکے سے ملے تو ان بزرگ نے اس کو مار ڈالا، موسیٰ (علیہ السلام گھبرا کر) کہنے لگے آپ نے ایک بے گناہ جان کو ہلاک کر دیا (اور وہ بھی) بغیر بدلے کسی جان کے، بیشک آپ نے بڑی بے جا حرکت کی (کہ اول تو یہ نابالغ کو قتل کیا جس کو قصاص میں بھی قتل نہیں کیا جاتا، پھر اس نے تو کسی کو قتل بھی نہیں کیا، اس وجہ سے یہ قتل کا فعل پہلے کشتی میں سوراخ والے فعل سے بھی زیادہ سخت بڑھ کر ہے، کیونکہ وہاں مال کا نقصان تو یقینی ہوا، مگر جان کے نقصان کا احتمال تھا، اور یہاں جان کا نقصان یقینی ہوا اور وہ بھی معصوم بچے کا)۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حکم ظاہر پر ہی لگایا جائے گا جب تک کہ اس کے خلاف معلوم نہ ہو، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے اسی بنا پر انکار فرمایا۔ مسلم کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لڑکا نابالغ تھا، نیز اگر وہ بالغ اور ڈاکو ہوتا جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا ہے تو خضر علیہ السلام آگے چل کر اس کے قتل کے عذر میں یہ نہ فرماتے کہ اس کے والدین کے بگڑنے کا اندیشہ تھا، بلکہ ڈاکو ہونے کا عذر فرماتے جو جلد ہی سمجھ میں آ سکتا تھا۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ ایک گاؤں کے قریب چند لڑکے کھیل رہے تھے، ان میں سے ایک کو جو زیادہ خوبصورت اور سیانا تھا پکڑ کر مار ڈالا، اور چل کھڑے ہوئے بعض روایات میں اس کا نام جیسور آیا ہے، وہ لڑکا بالغ تھا یا نہیں؟ بعض کا قول ہے کہ بالغ تھا اور لفظ غلام عدم بلوغ پر دلالت نہیں کرتا، لیکن جمہور مفسرین اس کو نابالغ ہی بیان کرتے ہیں، واللہ اعلم۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی بے گناہ، جب تک لڑکا بالغ نہ ہو اس پر کچھ گناہ نہیں، یہ لفظ بظاہر اس کے نابالغ ہونے کی تائید کرتا ہے، اگرچہ دوسروں کے لیے تاویل کی گنجائش ہے۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی اول تو نابالغ قصاص میں بھی قتل نہیں کیا جا سکتا، اس پر مزید یہ کہ یہاں قصاص کا بھی کوئی قصہ نہ تھا، پھر اس سے بڑھ کر معقول بات کون سی ہوگی۔

قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكَ اِنَّكَ لَنۡ تَسۡتَطِيۡعَ مَعِىَ صَبۡرًا ۝٧٥ قَالَ اِنۡ سَاَلۡتُكَ عَنۡ شَىۡءٍۢ بَعۡدَهَا

بولا میں نے تجھ کو نہ کہا تھا کہ تو نہ ٹھہر سکے گا میرے ساتھ ؎ کہا اگر تجھ سے پوچھیں کوئی چیز اس کے بعد

فَلَا تُصٰحِبۡنِىۡ‌ۚ قَدۡ بَلَغۡتَ مِنۡ لَّدُنِّىۡ عُذۡرًا‏ ۝٧٦

تو مجھ کو ساتھ نہ رکھیو، تو اُتار چکا میری طرف سے الزام ؎

**خلاصہ تفسیر:** ان بزرگ نے فرمایا کہ کیا میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ آپ سے میرے ساتھ صبر نہ ہو سکے گا، موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا (کہ خیر اس مرتبہ اور درگذر کیجئے، لیکن) اگر اس مرتبہ کے بعد میں آپ سے کسی امر کے متعلق پوچھوں تو آپ مجھ کو اپنے ساتھ نہ رکھئے بیشک آپ میری طرف سے عذر (کی انتہا) کو پہنچ چکے ہیں (یعنی آپ نے بہت درگذر کی، اگر اب ساتھ نہ رکھیں گے تو آپ معذور ہیں)۔

موسیٰ علیہ السلام نے اس مرتبہ نسیان اور بھول کا عذر نہیں کیا، اس سے معلوم ہوا کہ اب کی بار بھولے سے سوال نہ کیا تھا، یعنی موسیٰ علیہ السلام نے یہ سوال قصداً اپنی پیغمبرانہ حیثیت کے مطابق کیا تھا، شبہ ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے پہلے وعدہ کیا پھر اب اعتراض فرمایا، یہ تو وعدہ کی خلاف ورزی ہوئی، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ وعدہ اگرچہ بظاہر بلا قید تھا مگر معنوی اعتبار سے اس کے ساتھ یہ قید ملحوظ تھی کہ جب تک شریعت کی مخالفت نہ ہو، اور شریعت کے موافق کام کرتے رہو، میں نہ بولوں گا، پس وعدہ کے خلاف کرنا لازم نہ آیا۔

* * *

**فائدہ:** ؎ کیونکہ ایسے حالات وواقعات دیکھنے میں آئیں گے جن پر تم خاموشی کے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے، آخر وہی ہوا۔

**فائدہ:** ؎ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اندازہ ہو گیا کہ حضرت خضر علیہ السلام کے تحیر خیز حالات وواقعات کا چپ چاپ مشاہدہ کرتے رہنا بہت ٹیڑھی کھیر ہے، اس لیے آخری بات کہہ دی کہ اس مرتبہ اگر سوال کروں تو آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیں ایسا کرنے میں آپ معذور ہوں گے اور میری طرف سے کوئی الزام آپ پر عائد نہیں ہو سکتا، کیونکہ تین مرتبہ موقع دے کر آپ حجت تمام کر چکے۔

فَانْطَلَقَا ۘ حَتّٰٓى اِذَاۤ اَتَيَاۤ اَهۡلَ قَرۡيَةِ ۨاسۡتَطۡعَمَاۤ اَهۡلَهَا فَاَبَوۡا اَنۡ يُّضَيِّفُوۡهُمَا فَوَجَدَا

پھر دونوں چلے، یہاں تک کہ جب پہنچے ایک گاؤں کے لوگوں تک کھانا چاہا وہاں کے لوگوں سے انہوں نے نہ مانا کہ ان کو مہمان رکھیں پھر پائی

فِيۡهَا جِدَارًا يُّرِيۡدُ اَنۡ يَّنۡقَضَّ فَاَقَامَهٗ‌ ؕ قَالَ لَوۡ شِئۡتَ لَـتَّخَذۡتَ عَلَيۡهِ اَجۡرًا‏ ۝٧٧

وہاں (اس میں) ایک دیوار جو گرا چاہتی تھی اس کو سیدھا کر دیا ؎ بولا موسیٰ اگر تو چاہتا تو لے لیتا اس پر مزدوری ؎

**خلاصہ تفسیر:** پھر دونوں (آگے) چلے یہاں تک کہ جب ایک گاؤں والوں پر گذر ہوا تو گاؤں والوں سے کھانے کو مانگا (کہ ہم مہمان ہیں) تو انہوں نے ان کی مہمانی کرنے سے انکار کر دیا اتنے میں ان کو وہاں ایک دیوار ملی جو گرا ہی چاہتی تھی تو ان بزرگ نے اس کو (ہاتھ کے اشارے سے بطور خرق عادت کے) سیدھا کر دیا، موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ اگر آپ چاہتے تو اس (کام) پر اجرت ہی لے لیتے (کہ اس وقت کام بھی چلتا اور ان لوگوں کے اخلاق کی اصلاح بھی ہوتی، کیونکہ ایسوں کے ساتھ رعایت کرنے سے ان کی بدخلقی زیادہ بڑھتی ہے)۔

**اسۡتَطۡعَمَاۤ اَهۡلَهَا:** اس سے معلوم ہوا کہ فوری ضرورت کے لیے سوال کرنا جائز ہے مگر سوال کی عادت نہ بنائے، بعض اہل طریق نے باطن کی ضرورت کے لیے اسے کبھی کبھی اختیار کیا ہے۔

لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا: اس سے معلوم ہوا کہ کسب معیشت اور اس کے اسباب کا اختیار کرنا بزرگی اور تقویٰ کے خلاف نہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی ایک بستی میں پہنچ کر وہاں کے لوگوں سے ملے اور چاہا کہ بستی والے مہمان سمجھ کر کھانا کھلائیں، مگر یہ سعادت ان کی قسمت میں نہ تھی، انہوں نے موسیٰ علیہ السلام وخضر علیہ السلام جیسے مقربین کی مہمانی سے انکار کر دیا، یہ معاملہ دیکھ کر چاہیے تھا کہ ایسے تنگ دل اور بے مروت لوگوں پر غصہ آتا، مگر حضرت خضر علیہ السلام نے غصہ کے بجائے ان پر احسان کیا، بستی میں ایک بڑی بھاری دیوار جھکی ہوئی تھی قریب تھا کہ زمین پر آ رہے، لوگ اس کے نیچے گزرتے ہوئے خوف کھاتے تھے، حضرت خضر علیہ السلام نے ہاتھ لگا کر سیدھی کر دی اور منہدم ہونے سے بچالیا۔

**تنبیہ:** حتی اذآ اتیآ اھل قریۃ میں ''اہل'' کا لفظ شاید اس لیے لائے کہ بستی میں ان کا آنا محض مرور وعبور کے طور پر نہ تھا، نہ یہ صورت تھی کہ باشندگان شہر سے علیحدہ کسی سرائے وغیرہ میں جا اترے ہوں، بلکہ قصد کر کے شہر والوں سے ملے، اور اِسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا میں دوبارہ لفظ ''اہل'' کی تصریح ان کی مزید تقبیح کے لیے ہے یعنی جن سے مہمانی چاہی تھی وہ اہل قریہ تھے کوئی پردیسی مسافر نہ تھے جو یہ عذر کر سکیں کہ ہمارا گھر یہاں نہیں مہمانداری کیسے کریں۔

**فائدہ:** ۲ یعنی بستی والوں نے مسافر کا حق نہ سمجھا کہ مہمانی کریں ان کی دیوار مفت بنا دینے کی کیا ضرورت تھی، اگر کچھ معاوضہ لے کر دیوار سیدھی کرتے تو ہمارے کھانے پینے کا کام چلتا اور ان تنگ دل بخیلوں کو ایک طرح کی تنبیہ ہو جاتی، شاید اپنی بداخلاقی اور بے مروتی پر شرماتے۔

قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿۷۸﴾

کہا اب جدائی ہے میرے اور تیرے بیچ، اب جتائے دیتا ہوں تجھ کو پھیر ان باتوں کا جس پر تو صبر نہ کر سکا

**خلاصہ تفسیر:** ان بزرگ نے کہا یہ وقت ہماری اور آپ کی علیحدگی کا ہے (جیسا کہ آپ نے خود شرط کی تھی) اب میں ان چیزوں کی حقیقت بتلائے دیتا ہوں جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکا (چنانچہ آگے آیات میں اس کا بیان آتا ہے)۔

**سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ:** عجب نہیں کہ ان اسرار کے بتلانے سے اس درخواست کا پورا کرنا بھی منظور ہو جو موسیٰ علیہ السلام نے کی تھی: **ھل اتبعك علی ان تعلمن مما علمت** کہ مجھے اپنا علم سکھلا دیجیے، اگرچہ اس وقت نمونہ ہی کے طور پر سہی اور زیادہ ساتھ رہنے میں غالباً وہ مناسب موقعہ پر خود ہی بتلاتے اور ہر واقعہ پر بتلاتے تو یہ علم زیادہ حاصل ہوتا، اور اگرچہ یہ موسیٰ علیہ السلام کے علم کے برابر مفید نہیں، کیونکہ اتباع کے قابل نہیں، تاہم اس اعتبار سے خاص لوگوں کو مفید ضرور ہے کہ خدا تعالیٰ کی بعض حکمتیں تفصیل سے منکشف ہوتی ہیں، اگرچہ قرب کے لیے یہ اجمالی عقیدہ کافی ہے کہ ہر واقعہ میں خدا کی حکمتیں ہوتی ہیں۔

**هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ:** یہ اصل ہے اس بات کی کہ جب کسی شاگرد یا مرید سے بار بار خلاف ونزاع ظاہر ہونے لگے اور مناسبت وموافقت کی امید باقی نہ رہے تو پھر ایسے شاگرد ومرید کو جدا کر دینا درست ہے، یعنی عالم کو طالب علم سے ایسے فن کی تعلیم نہ کرنے میں معذرت کر لینی چاہیے جس کا وہ متحمل نہیں ہو سکے گا، اس سے معلوم ہوا کہ علماء مشائخ اور اساتذہ پر اعتراضات نہیں کرنے چاہئیں اور ان کے افعال وحرکات واقوال میں سے جو بظاہر سمجھ نہ آئے تو اس کی تاویل کر لینی چاہیے اور ان کے ساتھ جو عہد کیا ہے اسے پورا کرنا چاہیے اور اگر ان کے خلاف کچھ ہو جائے تو اس کی معذرت کرنی چاہیے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی حسب وعدہ اب مجھ سے علیحدہ ہو جائیے، آپ کا نباہ میرے ساتھ نہیں ہو سکتا لیکن جدا ہونے سے پہلے چاہتا ہوں کہ ان واقعات کے پوشیدہ اسرار کھول دوں جن کے چکر میں پڑ کر آپ صبر وضبط کی شان قائم نہ رکھ سکے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''اس مرتبہ موسیٰ علیہ السلام نے جان کر پوچھا رخصت ہونے کو، سمجھ لیا کہ یہ علم میرے ڈھب کا نہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا علم وہ تھا جس کی خلقت پیروی کرے تو ان کا بھلا

ہو، حضرت خضر علیہ السلام کا علم وہ تھا کہ دوسروں سے اس کی پیروی بن نہ آوے''۔

| |
|---|
| اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا |
| وہ جو کشتی تھی سو چند محتاجوں کی جو محنت کرتے تھے دریا میں ۱؎ سو میں نے چاہا کہ اس میں عیب ڈال دوں |
| وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ﴿۷۹﴾ |
| اور ان کے پرے تھا ایک بادشاہ جو لے لیتا تھا ہر کشتی کو چھین کر ۲؎ |

**خلاصہ تفسیر:** وہ جو کشتی تھی سو چند غریب آدمیوں کی تھی (جو اس کے ذریعہ) دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے (اسی پر ان کی گذر اوقات تھی) سو میں نے چاہا کہ اس میں عیب ڈال دوں، اور (وجہ اس کی یہ تھی کہ) ان لوگوں سے آگے کی طرف ایک (ظالم) بادشاہ تھا جو ہر (اچھی) کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا (اگر میں کشتی میں عیب ڈال کر بظاہر بیکار نہ کر دیتا تو یہ کشتی بھی چھین لی جاتی، اسی پر ان کی گزر اوقات تھی، اور ان غریبوں کی مزدوری کا سہارا بھی ختم ہو جاتا اس لئے توڑنے میں یہ مصلحت تھی)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی دریا میں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے تھے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی جدھر کشتی جانے والی تھی اس طرف ایک ظالم بادشاہ جو اچھی کشتی دیکھتا چھین لیتا، یا بیگار میں پکڑ لیتا تھا میں نے چاہا کہ عیب دار کر دوں، تا کہ اس ظالم کی دستبرد سے محفوظ رہے اور ٹوٹی ہوئی خراب کشتی سمجھ کر کوئی تعرض نہ کرے، بعض آثار میں ہے کہ خطرہ کے مقام سے آگے نکل کر پھر حضرت خضر نے کشتی اپنے ہاتھ سے درست کر دی۔

| |
|---|
| وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ﴿۸۰﴾ |
| اور جو لڑکا تھا سو اس کے ماں باپ تھے ایمان والے پھر ہم کو اندیشہ ہوا کہ ان کو عاجز کر دے زبردستی اور کفر کر کر ۱؎ |
| فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا ﴿۸۱﴾ |
| پھر ہم نے چاہا کہ بدلہ دے ان کو ان کا رب بہتر اس سے پاکیزگی میں اور نزدیک تر شفقت میں ۲؎ |

**خلاصہ تفسیر:** اور رہا وہ لڑکا سو اس کے ماں باپ ایمان دار تھے (اور اگر وہ بڑا ہوتا تو کافر ظالم ہوتا اور ماں باپ کو اس سے محبت بہت تھی) سو ہم کو اندیشہ ہوا کہ یہ ان دونوں پر سرکشی اور کفر کا اثر نہ ڈال دے (یعنی بیٹے کی محبت کے سبب والدین بھی بے دینی میں بیٹے کا ساتھ نہ دینے لگیں) پس ہم کو یہ منظور ہوا کہ (اس کا تو قصہ تمام کر دیا جائے پھر) اس کے بدلے ان کا پروردگار ان کو ایسی اولاد دے (خواہ لڑکا ہو یا لڑکی) جو کہ پاکیزگی (یعنی دین) میں اس سے بہتر ہو، اور (ماں باپ کے ساتھ) محبت کرنے میں اس سے بڑھ کر ہو۔

فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا: اس واقعہ میں خَشِيْنَآ اور اَرَدْنَآ میں جمع متکلم کا صیغہ استعمال فرمایا، اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ ارادہ اور خشیت خضر علیہ السلام نے اپنی اور اللہ تعالیٰ دونوں کی طرف منسوب کیا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود اپنی ہی طرف منسوب کیا ہو تو پھر اَرَدْنَا کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے اللہ سے دعا کی، کیونکہ کسی لڑکے کے بدلے میں اس سے بہتر اولاد دینے کا معاملہ خالص حق تعالیٰ کا فعل ہے اس میں خضر علیہ السلام یا کوئی دوسرا انسان شریک نہیں ہو سکتا۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ گو اصل فطرت سے ہر بچہ مسلمان پیدا ہوتا ہے مگر آگے چل کر خارجی اثرات سے بچپن ہی میں بعض کی بنیاد بری پڑ جاتی ہے جس کا پورا یقینی علم تو خدا تعالیٰ کو ہوتا ہے تاہم کچھ آثار اہل بصیرت کو بھی نظر آنے لگتے ہیں، اس لڑکے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر علیہ السلام کو آگاہ فرمادیا کہ اس کی بنیاد بری پڑی تھی، بڑا ہوتا تو موذی اور بدراہ ہوتا اور ماں باپ کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبتا، وہ اس کی محبت میں کافر بن جاتے، اس طرح لڑکے کا مارا جانا والدین کے حق میں رحمت اور ان کی حفاظت کا ذریعہ بن گیا، خدا کو منظور تھا کہ اس کے ماں باپ ایمان پر قائم رہیں، حکمت الٰہیہ ہوئی کہ آنے والی رکاوٹ ان کی راہ سے دور کردی جائے، حضرت خضر علیہ السلام کو حکم دیا کہ لڑکے کو قتل کردو، انہوں نے خدا کی وحی پا کر امتثال امر کیا۔

اب یہ سوال کرنا کہ لڑکے کو پیدا ہی نہ کرتے یا کرتے تو اس کو اس قدر شریر نہ ہونے دیتے یا جہاں لاکھوں کافر دنیا میں موجود ہیں اس کے والدین کو بھی کافر بن جانے دیتے یا جن بچوں کی بنیاد ایسی پڑے کم از کم پیغمبروں کو ان سب کی فہرست دے کر قتل کرادیا کرتے، ان باتوں کا اجمالی جواب تو یہ ہے: لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ اور تفصیلی جواب کے لیے مسئلہ ''خلق خیر وشر'' پر مبسوط کلام کرنے کی ضرورت ہے جو ان مختصر فوائد میں سما نہیں سکتا، ہاں اتنا یاد رہے کہ دنیا میں ہر شخص سے جو اللہ کو ''خالق الکل'' اور ''علیم'' و ''خبیر'' مانتا ہو، تکوینیات کے متعلق اسی قسم کے ہزاروں سوالات کیے جاسکتے ہیں جن کا جواب کسی کے پاس بجز اعتراف عجز وقصور کے کچھ نہیں، یہاں خضر کے ذریعہ سے اسی کا ایک نمونہ دکھلانا تھا کہ خدا تعالیٰ کی حکمتوں اور مصالح تکوینیہ کا کوئی احاطہ نہیں کرسکتا، کبھی صورت واقعہ بظاہر دیکھنے میں خراب اور قبیح یا بے موقع معلوم ہوتی ہے، لیکن جسے واقعہ کی اندرونی گہرائیوں کا علم ہو وہ سمجھتا ہے کہ اس میں بہت سی حکمتیں پوشیدہ ہیں، حضرت خضر علیہ السلام نے مسکینوں کی کشتی کا تختہ توڑ دیا، حالانکہ انہوں نے احسان کیا تھا کہ بلا اجرت دونوں کو سوار کرلیا، ایک کھیلتے ہوئے بچہ کو مار ڈالا جو بظاہر نہایت قبیح حرکت نظر آتی تھی، دیوار سیدھی کرکے اس بستی والوں پر احسان کیا جو نہایت بے مروتی سے پیش آئے تھے، اگر حضرت خضر علیہ السلام آخر میں اپنے ان افعال کی توجیہات بیان نہ کرتے تو ساری دنیا آج تک ورطہ حیرت میں پڑی رہتی، یا خضر علیہ السلام کو ہدف طعن وتشنیع بنائے رکھتی، (العیاذ باللہ) ان ہی مثالوں سے حق تعالیٰ کے افعال اور ان کی حکمتوں کا اندازہ کرلو۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی لڑکے کے مارے جانے سے اس کے والدین کا ایمان محفوظ ہوگیا اور جو صدمہ ان کو پہنچا، حق تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کی تلافی ایسی اولاد سے کردے جو اخلاق یا کیزگی میں مقتول لڑکے سے بہتر ہو، ماں باپ اس پر شفقت کریں، وہ ماں باپ کے ساتھ محبت وتعظیم اور حسن سلوک سے پیش آئے، کہتے ہیں اس کے بعد خدا تعالیٰ نے نیک لڑکی دی جو ایک نبی سے منسوب ہوئی اور ایک نبی اس سے پیدا ہوئے جس سے ایک امت چلی۔

وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا

اور وہ جو دیوار تھی سو دو یتیم لڑکوں کی تھی اس شہر میں اور اس کے نیچے مال گڑا تھا ان کا اور ان کا باپ تھا

صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ

نیک، پھر چاہا تیرے رب نے کہ وہ پہنچ جائیں اپنی جوانی کو اور نکالیں اپنا مال گڑا ہوا ۱؎ مہربانی سے تیرے رب کی

ع ۱۲ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ۭ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ۸۲

اور میں نے یہ نہیں کیا اپنے حکم سے ۲؎ یہ ہے پھیر ان چیزوں کا جن پر تو صبر نہ کرسکا

**خلاصہ تفسیر:** اور رہی دیوار سو وہ دو یتیم لڑکوں کی تھی جو اس شہر میں (رہتے) ہیں اور اس دیوار کے نیچے ان کا کچھ مال مدفون تھا (جو ان کے باپ سے میراث میں پہنچا ہے) اور ان کا باپ (جو مر گیا ہے وہ) ایک نیک آدمی تھا (اس کے نیک ہونے کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اس کی اولاد کے مال کو محفوظ کرنا چاہا اگر دیوار ابھی گرجاتی تو لوگ یہ مال لوٹ لے جاتے، اور غالباً جو شخص ان یتیم لڑکوں کا سرپرست تھا اس کو اس خزانے کا علم ہوگا وہ یہاں موجود نہ ہوگا جو انتظام کرلیتا) اس لئے آپ کے رب نے اپنی مہربانی سے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی (کی عمر) کو پہنچ جائیں اور اپنا دفینہ نکال

پس اور (یہ سارے کام میں نے اللہ کے حکم سے کئے ہیں، ان میں سے) کوئی کام میں نے اپنی رائے سے نہیں کیا (لیجیے صاحب) یہ ہے حقیقت ان باتوں کی جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکا (جس کو میں حسب وعدہ بتلا چکا ہوں، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خضر علیہ السلام سے رخصت ہو گئے)۔

**وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا**: اس میں بزرگوں کی اولاد کی رعایت کی اصل ہے اور یہ امر اہل سلوک کے لیے امر طبعی کی طرح ہے۔

**وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ**: اس سے ان لوگوں کا استدلال ساقط ہو گیا جو کاملین کے لیے خلاف شریعت امور کو جائز سمجھتے ہیں کہ جو بزرگ ہیں ان کے لیے غیر شرح کام کرنا جائز ہیں، اور وہ شریعت کے مکلف نہیں اور دلیل کے طور پر خضر علیہ السلام کے واقعہ کو پیش کرتے ہیں، حالانکہ حضرت خضر علیہ السلام کے یہ سب افعال اللہ کے حکم سے تھے اور ان کے لیے یہ بمنزلہ شریعت کے تھا اور شریعت محمدیہ میں یہ تمام افعال ناجائز ہیں۔

**ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا**: اس سے معلوم ہوا کہ غیب کی باتوں پر مطلع ہو جانا مقاصد دین میں شامل نہیں ہے، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جو اولوالعزم نبی اور صاحب کتاب رسول ہیں، ایسے مغیبات پر مطلع نہ تھے، اس کے باوجود وہ حضرت خضر علیہ السلام سے افضل واکمل تسلیم کیے جاتے ہیں۔

حدیث میں جو امر موسیٰ علیہ السلام کے خضر علیہ السلام کے پاس جانے کے سبب کے بارے میں آیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصلاح کا کامل طریقہ فعل یعنی عمل ہے نہ کہ محض قول اور باتیں۔

اس قصہ سے بعض لوگوں کو دھوکہ ہو گیا ہے کہ علم باطن علم شریعت سے افضل ہے، حالانکہ ایسی بات نہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ علم باطن کے دو شعبے ہیں: ① مرضیات الٰہی کا علم جو کہ نفس کے متعلق ہے کہ برے اخلاق سے اس کی اصلاح کرنا اور اچھے اخلاق سے آراستہ ہونا، سو یہ تو شریعت کا ایک جز ہی ہے اور جز کبھی کل سے افضل نہیں ہو سکتا ② دوسرا حصہ علم اسرار کونیہ یعنی واقعات عالم کے اسرار ہیں، چونکہ وہ قرب الٰہی میں کچھ دخل نہیں رکھتے اس لیے اس کی فضیلت کا احتمال ہی نہیں۔

دوسرا دھوکہ لوگوں کو یہ ہوا کہ خضر علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام سے افضل ہیں، گزشتہ تفصیل سے یہ معلوم ہو گیا کہ خضر علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام سے افضل نہیں، کیونکہ خضر علیہ السلام کو علم باطن کا دوسرا شعبہ حاصل ہونا اسی قصہ سے ثابت ہے، اور ابھی پیچھے گذر چکا ہے کہ علم باطن کا وہ دوسرا شعبہ اس علم شریعت سے افضل نہیں جو کہ موسیٰ علیہ السلام کو حاصل تھا، رہا موسیٰ علیہ السلام کا ان کے پاس بھیجنا تو یہ افضلیت کی بنیاد پر نہیں، بلکہ تعلیم و تادیب کی بنیاد پر تھا تاکہ آئندہ گفتگو میں احتیاط رکھیں اور مقید کی جگہ مطلق نہ بولا کریں۔

یہاں طبعی طور پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ خضر علیہ السلام کی تصریح کے مطابق ان کو جو علم عطا ہوا تھا اس کی نوعیت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علم سے مختلف تھی مگر جب کہ یہ دونوں علم حق تعالیٰ ہی کی طرف سے عطا ہوئے تھے تو ان دونوں کے احکام میں تضاد و اختلاف کیوں ہوا؟ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ جن حضرات کو اپنی وحی اور نبوت سے سرفراز فرماتے ہیں وہ عموماً تو وہی حضرات ہوتے ہیں جن کے سپرد اصلاح خلق کی خدمت ہوتی ہے ان پر کتاب اور شریعت نازل کی جاتی ہے جن میں خلق خدا کی ہدایت اور اصلاح کے اصول و قواعد ہوتے ہیں، جتنے انبیاء علیہم السلام کا ذکر قرآن کریم میں بتصریح نبوت و رسالت آیا ہے وہ سب کے سب ایسے ہی تھے جن کے سپرد تشریعی اور اصلاحی خدمات تھیں، ان پر جو وحی آتی تھی وہ بھی سب اسی سے متعلق تھی، مگر دوسری طرف کچھ تکوینی خدمات بھی ہیں جن کے لئے عام طور سے ملائکۃ اللہ مقرر ہیں، مگر زمرہ انبیاء علیہم السلام میں بھی حق تعالیٰ نے بعض کو اسی قسم کی تکوینی خدمات کے لئے مخصوص کر لیا ہے، حضرت خضر علیہ السلام اسی زمرہ میں سے ہیں، تکوینی خدمات واقعات جزئیہ سے متعلق ہوتی ہیں کہ فلاں شخص ڈوبنے والے کو بچا لیا جائے، یا فلاں کو ہلاک کر دیا جائے، فلاں کو ترقی دی جائے، فلاں کو زیر کیا جائے، ان معاملات کا نہ عام لوگوں سے کوئی تعلق ہوتا ہے نہ ان کے احکام عوام سے متعلق ہوتے ہیں، ایسے واقعات جزئیہ میں بعض وہ صورتیں بھی پیش آتی ہیں کہ ایک شخص کو ہلاک کرنا تشریعی قانون کے خلاف ہے مگر تکوینی قانون میں اس خاص واقعہ کو عام تشریعی قانون سے مستثنیٰ کر کے اس شخص کے لئے جائز کر دیا گیا جس کو اس تکوینی خدمت پر مامور فرمایا گیا ہے، ایسے حالات میں شرعی قوانین کے علماء اس استثنائی حکم سے واقف نہیں ہوتے اور وہ اس کو حرام کہنے پر مجبور ہوتے ہیں اور جو شخص تکوینی طور

پر اس قانون سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے وہ اپنی جگہ حق پر ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جہاں یہ تضاد نظر آتا ہے وہ درحقیقت تضاد نہیں ہوتا، بعض واقعات جزئیہ کا عام قانون شریعت سے استثناء ہوتا ہے، اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ یہ استثناء بذریعہ وحی نبوت ہو کسی ولی کا کشف والہام ایسا استثناء کرنے کے لئے ہرگز کافی نہیں، اسی لئے حضرت خضر علیہ السلام کا لڑکے کو بظاہر ناحق قتل کرنا ظاہر شریعت میں حرام تھا لیکن حضرت خضر تکوینی طور پر اس قانون سے مستثنیٰ کر کے مامور کئے گئے تھے، ان پر کسی غیر نبی کے کشف والہام کو قیاس کر کے کسی حرام کو حلال سمجھنا جیسے بعض جاہل صوفیوں میں مشہور ہے بالکل بے دینی اور اسلام سے بغاوت ہے، حضرت خضر علیہ السلام کو تو بذریعہ وحی نبوت اس کا علم ہوا تھا، وہ اب کسی کو ہو نہیں سکتا، کیونکہ نبوت ختم ہو چکی ہے، آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا جس کو بذریعہ وحی اس قسم کے واقعات کے متعلق کسی حکم خداوندی سے کسی خاص شخص کو مستثنیٰ کرنے کا علم ہو سکے، اس واقعہ سے بھی یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ کسی شخص کو کسی حکم شرعی سے مستثنیٰ قرار دینے کا نبی صاحب وحی کے سوا کسی کو حق نہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ وَيَسْتَخْرِجَا كَنزَهُمَا: یعنی اگر دیوار گر پڑتی تو یتیم بچوں کا جو مال وہاں گڑا ہوا تھا ظاہر ہو جاتا اور بدنیت لوگ اٹھا لیتے، بچوں کا باپ مرد صالح تھا اس کی نیکی کی رعایت سے حق تعالیٰ کا ارادہ ہوا کہ بچوں کے مال کی حفاظت کی جائے میں نے اس کے حکم سے دیوار سیدھی کر دی کہ بچے جوان ہو کر باپ کا خزانہ پا سکیں، کہتے ہیں اس خزانہ میں دوسرے اموال کے علاوہ ایک سونے کی تختی تھی جس پر ''محمد رسول اللہ'' ﷺ لکھا ہوا تھا۔

**فائدہ:** ۲؎ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي: یعنی جو کام خدا کے حکم سے کرنا ضروری ہوا اس پر مزدوری لینا مقربین کا کام نہیں۔

**تنبیہ:** اس قصہ کے شروع میں حضرت خضر علیہ السلام کی نبوت و ولایت کے متعلق جو کچھ ہم لکھ چکے ہیں اس کو بیک نظر پھر مطالعہ کر لیا جائے، آگے ذوالقرنین کا قصہ آتا ہے، یہ بھی ان تین چیزوں میں سے تھا جن کی نسبت یہود کے مشورہ سے قریش نے سوالات کیے تھے، ''روح'' کے متعلق جواب سورہ ''بنی اسرائیل'' میں گزر چکا، اصحاب کہف کا قصہ اسی سورہ کہف میں آ چکا، تیسری چیز آگے مذکور ہے:

| |
|---|
| وَيَسْـَٔلُونَكَ عَن ذِي ٱلْقَرْنَيْنِ ۖ قُلْ سَأَتْلُوا۟ عَلَيْكُم مِّنْهُ ذِكْرًا ﴿٨٣﴾ إِنَّا مَكَّنَّا لَهُۥ فِى ٱلْأَرْضِ |
| اور تجھ سے پوچھتے ہیں ذوالقرنین کو، کہہ اب پڑھتا ہوں تمہارے آگے اس کا کچھ احوال۔ ہم نے اس کو جمایا تھا ملک میں |
| وَءَاتَيْنَٰهُ مِن كُلِّ شَىْءٍ سَبَبًا ﴿٨٤﴾ |
| اور دیا تھا ہم نے اس کو ہر چیز کا سامان ۱؎ |

**خلاصہ تفسیر:** اصحاب کہف کے قصہ کی طرح ذوالقرنین کے قصہ کا بھی نبوت کے امتحان کی غرض سے سوال ہوا تھا، اب اس کا جواب مذکور ہے، جس میں ذوالقرنین کے تین سفروں کا بھی بیان ہے۔

اور یہ لوگ آپ سے ذوالقرنین کا حال پوچھتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ میں اس کا ذکر ابھی تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں (آگے حق تعالیٰ کی طرف سے اس کی حکایت شروع ہوئی کہ ذوالقرنین ایک ایسے جلیل القدر بادشاہ گذرے ہیں کہ) ہم نے ان کو روئے زمین پر حکومت دی تھی اور ہم نے ان کو ہر قسم کا سامان (کافی) دیا تھا (جس سے وہ اپنے شاہی منصوبوں کو پورا کر سکیں)۔

**وَيَسْـَٔلُونَكَ عَن ذِي ٱلْقَرْنَيْنِ:** اس پوچھنے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ ان کی تاریخ قریب قریب گم تھی، اسی لئے اس قصہ کے وہ امور قرآن میں مذکور نہیں جو کہ اصل قصہ سے زائد تھے، اور ان امور کے متعلق آج تک اہل تاریخ میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں، اسی وجہ سے قریش مکہ نے یہود مدینہ کے مشورہ سے اس قصہ کا سوال کے لئے انتخاب کیا تھا، اس لئے اس قصہ کی تفصیلات جو قرآن میں مذکور ہیں وہ نبی کریم ﷺ کی نبوت کی واضح دلیل ہے، ذوالقرنین کوئی بزرگ مقبول بادشاہ ہیں، خواہ نبی ہوں یا ولی ہوں، پھر ولایت کی صورت میں حق تعالیٰ کی گفتگو بطور الہام کے ہوئی ہو یا کسی نبی

کے ذریعہ سے، اور ''ذوالقرنین'' ان لقب اس لیے ہو کہ ''قرن'' جانب کو کہتے ہیں، چونکہ انہوں نے زمین کی تمام جانبوں پر تسلط حاصل کیا تھا اس لیے ذوالقرنین لقب ہو گیا۔

اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ: اس سے معلوم ہوا کہ مال کا حاصل ہونا حتی کہ خزائن تک اور جاہ کا حاصل ہونا حتی کہ سلطنت تک یہ کمال و بزرگی کے خلاف نہیں۔

* * *

**فائدہ:** لے اس بادشاہ کو ''ذوالقرنین'' اس لیے کہتے ہیں کہ دنیا کے دونوں کناروں (مشرق و مغرب) پر پھر گیا تھا، بعض کہتے ہیں کہ یہ لقب اسکندر رومی کا ہے اور بعض کے نزدیک کوئی مقبول خدا پرست اور دیندار بادشاہ اس سے پہلے گزرا ہے، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں متعدد وجوہ دلائل سے اسی دوسرے قول کو ترجیح دی ہے، مجموعہ روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذوالقرنین حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر تھا اور ان کی دعا کی برکت سے حق تعالیٰ نے خارقِ عادت سامان و وسائل عطا فرمائے تھے، جن کے ذریعہ سے اس کو مشرق و مغرب کے سفر اور محیر العقول فتوحات پر قدرت حاصل ہوئی، حضرت خضر علیہ السلام اس کے وزیر تھے، شاید اسی لیے قرآن نے حضرت خضر علیہ السلام کے قصہ کے ساتھ اس کا قصہ بیان فرمایا، قدیم شعرائے عرب نے اپنے اشعار میں ''ذوالقرنین'' کا نام بڑی عظمت سے لیا ہے اور اس کے عرب ہونے پر فخر کرتے رہے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذوالقرنین عہد تاریخی سے پہلے کا کوئی جلیل القدر عرب بادشاہ ہے، شاید اسکندر کو بھی اسی کی ایک گونہ مشابہت سے ذوالقرنین کہنے لگے ہوں، حال میں یورپ کے ماہرین آثار قدیمہ نے قدیم سامی عربوں کی متعدد عظیم الشان سلطنتوں کا سراغ لگایا ہے جن کا تاریخی اوراق میں کوئی مفصل تذکرہ موجود نہیں، بلکہ بعض ممتاز و مشہور سلاطین کا نام تک کتب تاریخ میں نہیں ملتا، مثلاً بادشاہ حمورابی جو اغلباً حضرت ابراہیم کے عہد میں ہوا ہے اور جس کو کہا گیا ہے کہ دنیا کا سب سے پہلا مقنن تھا، اس کے قوانین منارہ بابل پر کندہ ملے ہیں، جن کا ترجمہ انگریزی میں شائع ہو گیا ہے، پرانے کتبات سے اس کی عجیب و غریب عظمت ثابت ہوتی ہے، بہر حال ذوالقرنین ان ہی میں کا کوئی بادشاہ ہوگا۔

| |
|---|
| فَاَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٨٥﴾ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ |
| پھر پیچھے پڑا ایک سامان کے لے، یہاں تک کہ جب پہنچا سورج ڈوبنے کی جگہ پایا کہ وہ ڈوبتا ہے ایک دلدل کی ندی میں ٢ے اور پایا |
| عِنْدَهَا قَوْمًا ۬ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ﴿٨٦﴾ |
| اس کے پاس لوگوں کو (ایک قوم کو)، ہم نے کہا اے ذوالقرنین یا تو تو لوگوں کو تکلیف دے اور یا رکھ ان میں خوبی ٣ے |

**خلاصہ تفسیر:** (پہلا سفر) چنانچہ وہ (مغربی علاقوں کے فتوحات کے ارادہ سے) ایک راہ پر ہو لئے (اور سفر کرنا شروع کیا) یہاں تک کہ جب (سفر کرتے کرتے درمیانی شہروں کو فتح کرتے ہوئے) غروب آفتاب کے موقع (یعنی مغرب کی سمت میں آبادی کی انتہا) پر پہنچے تو آفتاب ان کو ایک سیاہ پانی میں ڈوبتا ہوا دکھائی دیا (مراد اس سے غالباً سمندر ہے کہ اس کا پانی اکثر جگہ سیاہ نظر آتا ہے اور اگرچہ آفتاب حقیقۃً سمندر میں غروب نہیں ہوتا لیکن جہاں سمندر سے آگے نگاہ نہ جاتی ہو تو ظاہر نظر میں سمندر ہی میں غروب ہوتا معلوم ہوگا) اور اس موقع پر انہوں نے ایک قوم دیکھی (جن کے کافر ہونے پر اگلی آیت اما من ظلم دلالت کرتی ہے) ہم نے (بصورت الہام یا اس زمانے کے پیغمبر کے واسطے سے) یہ کہا کہ اے ذوالقرنین! (اس قوم کے بارے میں تم کو دو اختیار ہیں) خواہ (ان کو ابتداء ہی سے قتل وغیرہ کے ذریعہ) سزا دو اور خواہ ان کے بارے میں نرمی کا معاملہ اختیار کرو (یعنی پہلے ان کو ایمان کی دعوت دو، پھر نہ مانیں تو قتل کر دو)۔

اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ: بغیر دعوت و تبلیغ کے ابتداء ہی قتل کرنے کا اختیار شاید اس لئے دیا گیا ہو کہ اس قوم کو اس سے پہلے کسی ذریعہ سے دعوت

ایمان پہنچ چکی ہوگی، لیکن دوسری صورت یعنی پہلے دعوت پھر قتل کا بہتر ہونا اشارہ سے بیان کر دیا کہ اس دوسری صورت کو اتخاذ حسن سے تعبیر فرمایا۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی سرانجام کرنے لگا ایک سفر کا۔

**فائدہ:** ۲ یعنی یوں نظر آیا جیسے سمندر میں سفر کرنے والوں کو معلوم ہوتا ہے کہ سورج پانی میں سے نکل رہا ہے اور پانی ہی میں ڈوبتا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''ذوالقرنین کو شوق ہوا کہ دیکھے دنیا کی آبادی کہاں تک بسی ہے، سو مغرب کی طرف اس جگہ پہنچا کہ دلدل تھی، نہ گزر آدمی کا نہ کشتی کا، اللہ کے ملک کی حد نہ پا سکا''۔

**فائدہ:** ۳ یعنی ذوالقرنین کو ان لوگوں پر ہم نے دونوں بات کی قدرت دی جیسا کہ ہر بادشاہ ہر حاکم کو نیک و بد کی قدرت ملتی ہے، چاہے خلق کو ستا کر بدنام ہو، چاہے عدل و انصاف اور نیکی اختیار کر کے اپنا ذکر خیر جاری رکھے یا یہ مطلب ہے کہ وہ لوگ کافر تھے ہم نے ذوالقرنین کو اختیار دیا کہ چاہے ان کو قتل کر دے یا پہلے اسلام کی طرف دعوت دے، ذوالقرنین نے دوسری شق اختیار کی۔

| |
|---|
| قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ﴿۸۷﴾ |
| بولا جو کوئی ہوگا بے انصاف سو ہم اس کو سزا دیں گے پھر لوٹ جائے گا اپنے رب کے پاس وہ عذاب دے گا اس کا برا عذاب |
| وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ِۨ الْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ﴿۸۸﴾ |
| اور جو کوئی یقین لایا اور کیا اس نے بھلا کام سو اس کا بدلہ بھلائی ہے، اور ہم حکم دیں گے اس کو اپنے کام میں آسانی ۱ |

**خلاصہ تفسیر:** ذوالقرنین نے عرض کیا کہ (میں دوسری ہی صورت اختیار کر کے پہلے ان کو دعوت ایمان دوں گا) لیکن (دعوت ایمان کے بعد) جو ظالم (یعنی کافر) رہے گا سو اس کو تو ہم لوگ (قتل وغیرہ کی) سزا دیں گے (اور یہ سزا تو دنیا میں ہوگی) پھر وہ (مرنے کے بعد) اپنے مالک حقیقی کے پاس پہنچا دیا جائے گا پھر وہ اس کو (دوزخ کی) سخت سزا دے گا، اور جو شخص (دعوت ایمان کے بعد) ایمان لے آئے گا اور نیک عمل کرے گا تو اس کے لئے (آخرت میں بھی) بدلے میں بھلائی ملے گی اور ہم بھی (دنیا میں) اپنے برتاؤ میں اس کو آسان (اور نرم) بات کہیں گے (یعنی ان پر کوئی عملی سختی تو کیا کی جاتی زبانی اور قولی بھی کوئی سختی نہیں کی جائے گی)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی آخرت میں بھلائی ملے گی اور دنیا میں ہم اس پر سختی نہ کریں گے بلکہ اپنے کام کیلئے جب کوئی بات اس سے کہیں گے سہولت اور نرمی کی کہیں گے، فی الحقیقت جو بادشاہ عادل ہو اسکی یہی راہ ہوتی ہے، بروں کو سزا دے اور بھلوں سے نرمی کرے، ذوالقرنین نے یہی چال اختیار کی۔

| |
|---|
| ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۹﴾ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ |
| پھر لگا ایک سامان کے پیچھے ۱، یہاں تک کہ جب پہنچا سورج نکلنے کی جگہ پایا اس کو کہ نکلتا ہے ایک قوم پر کہ نہیں بنا دیا ہم نے |
| لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ﴿۹۰﴾ كَذٰلِكَ ۭ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿۹۱﴾ |
| ان کے لیے آفتاب سے ورے کوئی حجاب ۲ یونہی ہے، اور ہمارے قابو میں آ چکی ہے اس کے پاس کی خبر ۳ |

**خلاصہ تفسیر:** (دوسرا سفر) پھر (مغربی ممالک فتح کر کے مشرقی ممالک فتح کرنے کے ارادہ سے مشرق کی طرف) ایک راہ پر ہو لئے یہاں تک کہ جب طلوع آفتاب کے موقع پر (یعنی مشرق کی سمت میں آبادی کی انتہا پر) پہنچے تو آفتاب کو ایک ایسی قوم پر طلوع ہوتے دیکھا جن

کے لئے ہم نے آفتاب کے ادھر کوئی آڑ نہیں رکھی تھی (یعنی اس جگہ ایک ایسی قوم آباد تھی جو دھوپ سے بچنے کے لئے کوئی مکان یا خیمہ وغیرہ بنانے کے عادی نہ تھے بلکہ شاید لباس بھی نہ پہنتے ہوں جانوروں کی طرح کھلے میدان میں رہتے تھے) یہ قصہ اسی طرح ہے اور ذوالقرنین کے پاس جو کچھ (سامان وغیرہ) تھا ہم کو اس کی پوری خبر ہے (اس میں امتحان نبوت کے لئے ذوالقرنین کے متعلق سوال کرنے والوں کو اس پر تنبیہ ہے کہ ہم جو کچھ بتلا رہے ہیں وہ علم کی بنیاد پر ہے، عام تاریخی کہانیوں کی طرح نہیں تا کہ نبوت محمدی کی حقانیت واضح ہو جائے)۔

پہلے سفر میں تو سزا میں اختیار دینے کا مضمون تھا، لیکن آئندہ دو سفروں میں سزا میں اختیار دینے کا مضمون ذکر نہیں ہوا، شاید ایک جگہ ذکر کر کے سننے والوں کے قیاس پر چھوڑ دیا ہو اور ان کے متعلق بھی یہی گفتگو ہوئی، اگلے دو سفروں میں اس کے بیان کرنے کی اس لیے ضرورت نہیں سمجھی کہ پچھلے واقعہ پر قیاس کر کے اس کا بھی علم ہو سکتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی مغربی سفر سے فارغ ہو کر مشرقی سفر کا سامان درست کرنے لگا، قرآن وحدیث میں یہ تصریح نہیں کہ ذوالقرنین کے یہ سب سفر فتوحات اور ملک گیری کے لیے تھے ممکن ہے محض سیر وسیاحت کے طور پر ہوں، اثنائے سفر میں ان اقوام پر بھی گزر رہا ہو جو اس کے زیر حکومت آ چکی تھی اور بعض اقوام نے ایک طاقتور بادشاہ سمجھ کر ظالموں کے مقابلہ میں فریاد کی ہو جس کا ذوالقرنین نے اپنی غیر معمولی قوت سے سدباب کر دیا، جیسا کہ آگے ''یاجوج ماجوج'' کے قصہ میں آتا ہے، واللہ اعلم۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی انتہائے مشرق میں ایک ایسی قوم دیکھی جن کو آفتاب کی شعاعیں بے روک ٹوک پہنچتی تھیں یہ لوگ وحشی جانگلو ہوں گے گھر بنانے اور چھت ڈالنے کا ان میں دستور نہ ہوگا جیسے اب بھی بہت سی خانہ بدوش وحشی اقوام میں رواج نہیں ہے۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی ذوالقرنین کے سفر مشرق ومغرب کی جو کیفیت بیان کی گئی واقعہ میں اسی طرح ہے جو وسائل اس کے پاس تھے اور جو حالات وہاں پیش آئے ان سب پر ہمارا علم محیط ہے، تاریخ والے شاید اس جگہ کچھ اور کہتے ہوں گے اور فی الحقیقت اتنا ہے جو فرما دیا، بعض مفسرین نے کذلك کا مطلب یہ لیا ہے کہ ذوالقرنین نے مغربی قوم کے متعلق جو روش اختیار کی تھی ویسی ہی اس مشرقی قوم کے ساتھ اختیار کی، واللہ اعلم۔

| |
|---|
| ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۹۲﴾ حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ بَیْنَ السَّدَّیْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ |
| پھر لگا ایک سامان کے پیچھے ۱؎، یہاں تک کہ جب پہنچا دو پہاڑوں کے بیچ پائے ان سے ورے ایسے لوگ |
| لَّا یَكَادُوْنَ یَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ﴿۹۳﴾ |
| جو لگتے نہیں کہ سمجھیں ایک بات ۲؎ |

**خلاصہ تفسیر:** (تیسرا سفر) پھر (مغرب ومشرق فتح کر کے) ایک اور راہ پر ہو لئے (قرآن میں اس سمت کا نام نہیں لیا مگر چونکہ آبادی شمالی حصہ میں زیادہ ہے اس لئے مفسرین نے اس سفر کو شمالی ممالک کا سفر قرار دیا، تاریخی شہادتیں بھی اس کی مؤید ہیں) یہاں تک کہ جب (ایسے مقام پر جو) دو پہاڑوں کے درمیان میں (تھا) پہنچے تو ان پہاڑوں سے اس طرف ایک قوم کو دیکھا جو (زبان اور لغت سے ناواقف وحشیانہ زندگی کی وجہ سے) کوئی بات سمجھنے کے قریب بھی نہیں پہنچتے تھے (ان الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف زبان سے ناواقفیت نہ تھی، کیونکہ سمجھ بوجھ ہو تو غیر زبان والے کی باتیں بھی کچھ اشارے کنائے سے سمجھی جا سکتی ہیں، بلکہ وحشیانہ زندگی نے سمجھ بوجھ سے بھی دور رکھا تھا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یہ تیسرا سفر مشرق ومغرب کے سوا کسی تیسری جہت میں تھا مفسرین عموماً اس کو شمالی سفر کہتے ہیں قرآن وحدیث میں یہ تصریح نہیں۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی ذوالقرنین اور اس کے ساتھیوں کی بولی وہ لوگ نہیں سمجھتے تھے، آگے جو گفتگو نقل کی گئی ہے غالباً کسی ترجمان کے ذریعہ سے

ہوئی ہوگی، اور ترجمان کسی درمیانی قوم کا ہوگا جو دونوں کی زبان قدرے سمجھتا ہو

**تنبیہ:** اس قوم اور ''یاجوج ماجوج'' کے ملک میں یہ دو پہاڑ حائل تھے جن پر چڑھائی ممکن نہ تھی البتہ دونوں پہاڑوں کے بیچ میں ایک درہ کھلا ہوا تھا اسی سے یاجوج ماجوج آتے اور ان لوگوں کو لوٹ مار کر چلے جاتے تھے۔

| |
|---|
| قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ |
| بولے اے ذوالقرنین یہ یاجوج و ماجوج دھوم اٹھاتے ہیں (خرابی کرتے ہیں) ملک میں سو تو کہے تو ہم مقرر کر دیں تیرے واسطے |
| خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿٩٤﴾ |
| کچھ محصول اس شرط پر کہ بنا دے تو ہم میں ان میں ایک آڑ |

**خلاصہ تفسیر:** (مگر پھر شاید کسی ترجمان کے واسطے سے) انہوں نے عرض کیا اے ذوالقرنین! قوم یاجوج وماجوج (جو اس گھاٹی کے اُس طرف رہتے ہیں ہماری) اِس سرزمین میں (کبھی کبھی آ کر) بڑا فساد مچاتے ہیں (یعنی قتل و غارتگری کرتے ہیں اور ہم میں ان کے مقابلے کی طاقت نہیں) سو کیا (آپ اجازت دیتے ہیں کہ) ہم لوگ آپ کے لئے چندہ کر کے کچھ رقم جمع کر دیں اس شرط پر کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی روک بنا دیں (کہ وہ اس طرف نہ آنے پائیں)۔

* * *

**فائدہ:** ذوالقرنین کے غیر معمولی اسباب و وسائل اور قوت و حشمت کو دیکھ کر انھیں یہ خیال ہوا کہ ہماری تکالیف و مصائب کا سد باب اس سے ہو سکے گا، اس لیے گذارش کی کہ یاجوج ماجوج نے ہمارے ملک میں اودھم مچا رکھی ہے، یہاں آکر قتل و غارت اور لوٹ مار کرتے رہتے ہیں، آپ اگر ہمارے اور ان کے درمیان کوئی مضبوط روک تھام کر دیں جس سے ہماری حفاظت ہو جائے تو جو کچھ اس پر خرچ آئے ہم ادا کرنے کو تیار ہیں، چاہے آپ ٹیکس لگا کر ہم سے وصول کر لیں۔

**تنبیہ:** یاجوج ماجوج کون ہیں؟ کس ملک میں رہتے ہیں؟ ذوالقرنین کی بنائی ہوئی سد (آہنی دیوار) کہاں ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے متعلق مفسرین و مؤرخین کے اقوال مختلف رہے ہیں، میرا خیال یہ ہے (واللہ اعلم) کہ یاجوج ماجوج کی قوم عام انسانوں اور جنات کے درمیان ایک برزخی مخلوق ہے اور جیسا کہ کعب بن احبار نے فرمایا اور نووی نے فتاویٰ میں جمہور علماء سے نقل کیا ہے، ان کا سلسلہ نسب باپ کی طرف سے آدم علیہ السلام پر منتہی ہوتا ہے مگر ماں کی طرف سے حواء تک نہیں پہنچتا گویا وہ عام آدمیوں کے محض باپ شریک بھائی ہوئے کیا عجیب ہے کہ دجالِ اکبر جسے تمیم داری نے کسی جزیرہ میں مقید دیکھا تھا، اسی قوم میں کا ہو، جب حضرت مسیح علیہ السلام جو محض ایک آدم زاد خاتون (مریم صدیقہ) کے بطن سے بتوسط نفخہ ملکیہ پیدا ہوئے، نزول من السماء کے بعد دجال کو ہلاک کر دیں گے، اس وقت یہ قوم یاجوج ماجوج دنیا پر خروج کرے گی اور آخر کار حضرت مسیح کی دعاء سے غیر معمولی موت مرے گی۔

اس وقت یہ قوم کہاں ہے؟ اور ذوالقرنین کی دیوار آہنی کس جگہ واقعہ ہے؟ سو جو شخص ان سب اوصاف کو پیش نظر رکھے گا جن کا ثبوت اس قوم اور دیوار آہنی کے متعلق قرآن کریم اور احادیث صحیحہ میں ملتا ہے، اس کو کہنا پڑے گا کہ جن قوموں، ملکوں اور دیواروں کا لوگوں نے رائے سے پتہ دیا ہے، یہ مجموعہ اوصاف ایک میں بھی پایا نہیں جاتا، لہٰذا وہ خیالات صحیح معلوم نہیں ہوتے، اور احادیث صحیحہ کا انکار یا نصوص کی تاویلاتِ بعیدہ دین کے خلاف ہے۔

رہا مخالفین کا یہ شبہ کہ ہم نے تمام زمین کو چھان ڈالا مگر کہیں اس کا پتہ نہیں ملا، اور اسی شبہ کے جواب کے لیے ہمارے مؤلفین نے پتہ بتلانے کی کوشش کی ہے، اس کا صحیح جواب وہی ہے جو علامہ آلوسی بغدادیؒ نے دیا ہے کہ ہم کو اس کا موقع معلوم نہیں اور ممکن ہے کہ ہمارے اور اس کے درمیان

بڑے بڑے سمندر حائل ہوں اور یہ دعویٰ کرنا کہ ہم تمام خشکی وتری پر محیط ہو چکے ہیں، واجب التسلیم نہیں، عقلاً جائز ہے کہ جس طرح اب سے پانچ سو برس پہلے تک ہم کو چوتھے براعظم (امریکہ) کے وجود کا پتہ نہ چلا، اب بھی کوئی پانچواں براعظم ایسا موجود ہو جہاں تک ہم رسائی حاصل نہ کر سکے ہوں اور تھوڑے دنوں بعد ہم وہاں تک یا وہ لوگ ہم تک پہنچ سکیں، سمندر کی دیوار اعظم جو آسٹریلیا کے شمالی مشرقی ساحل پر واقع ہے آجکل برطانوی سائنس دان ڈاکٹر سی ایم ینگ کے زیر ہدایات اس کی تحقیقات جاری ہے، یہ دیوار ہزار میل سے زیادہ لمبی اور بعض بعض مقامات پر بارہ بارہ میل تک چوڑی اور ہزار فٹ اونچی ہے، جس پر بیشمار مخلوق بستی ہے، جومہم اس کام کے لیے روانہ ہوئی تھی حال میں اس نے اپنی یک سالہ تحقیق ختم کی ہے جس سے سمندر کے عجیب وغریب اسرار منکشف ہوتے ہیں اور انسان کو حیرت واستعجاب کی ایک نئی دنیا معلوم ہو رہی ہے، پھر کیسے دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ہم کو خشکی وتری کی تمام مخلوق کے مکمل انکشافات حاصل ہو چکے ہیں، بہر حال مخبر صادق نے جس کا صدق دلائل قطعیہ سے ثابت ہے، جب اس دیوار کی مع اس کے اوصاف کے خبر دی تو ہم پر واجب ہے کہ تصدیق کریں اور ان واقعات کے منتظر رہیں جو مشککین ومنکرین کے علی الرغم پیش آ کر رہیں گے:

سَتُبْدِیْ لَکَ الْأَیَّامُ مَاکُنْتَ جَاهِلاً وَ یَأْتِیْکَ بِالْأَخْبَارِ مَالَمْ تُزَوِّدِ

قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ﴿٩٥﴾ اٰتُوْنِيْ زُبَرَ

بولا جو مقدور دیا مجھ کو میرے رب نے وہ بہتر ہے سو مدد کرو میری محنت میں بنا دوں تمہارے ان کے بیچ ایک دیوار موٹی ا لا دو مجھ کو تختے

الْحَدِيْدِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِيْۤ

لوہے کے، یہاں تک کہ جب برابر کر دیا دونوں پھانکوں تک پہاڑ کی کہا دھونکو، یہاں تک کہ جب کر دیا اس کو آگ، کہا لاؤ میرے پاس

اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ﴿٩٦﴾ فَمَا اسْطَاعُوْۤا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿٩٧﴾

کہ ڈالوں اس پر پگھلا ہوا تانبا ۲ پھر نہ چڑھ سکیں اس پر اور نہ کر سکیں اس میں سوراخ ۳

**خلاصہ تفسیر:** ذوالقرنین نے جواب دیا کہ جس مال میں میرے رب نے مجھ کو (تصرف کرنے کا) اختیار دیا ہے وہ بہت کچھ ہے (اس لئے چندہ جمع کرنے اور مال دینے کی تو ضرورت نہیں، البتہ) ہاتھ پاؤں کی طاقت (یعنی محنت مزدوری) سے میری مدد کرو تو میں تمہارے اور ان کے درمیان خوب مضبوط دیوار بنا دوں گا۔

(اچھا تو) تم لوگ میرے پاس لوہے کی چادریں لاؤ (قیمت ہم دیں گے، سب سامان جمع ہو جانے پر دونوں پہاڑوں کے درمیان آہنی دیوار کی تعمیر کا کام شروع کیا گیا) یہاں تک کہ جب (لوہے کی چٹانوں کے ردّے ملاتے ملاتے) ان (دونوں پہاڑوں) کے دونوں سروں کے بیچ (کے خلاء) کو (پہاڑوں کے) برابر کر دیا تو حکم دیا کہ دھونکو (دھونکنا شروع ہو گیا) یہاں تک کہ جب (دھونکتے دھونکتے) اس کو لال انگارا کر دیا تو حکم دیا کہ اب میرے پاس پگھلا ہوا تانبا لاؤ (جو پہلے سے تیار کرا لیا ہوگا) کہ اس پر ڈال دوں (چنانچہ یہ پگھلا ہوا تانبا لایا گیا اور آلات کے ذریعہ اوپر سے چھوڑ دیا گیا کہ دیوار کی تمام درزوں میں گھس کر سب چادریں یکجان ہو کر ایک سپاٹ لوہے کی دیوار بن گئی، اس کا طول وعرض خدا کو معلوم ہے) سو (اس کی بلندی اور چکناہٹ کے سبب) نہ تو یاجوج وماجوج اس پر چڑھ سکتے اور نہ اس میں (انتہائی مضبوطی واستحکام کے سبب کوئی) نقب لگا سکتے تھے۔

**اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ:** ظاہر یہ ہے کہ اس آہنی دیوار بنانے کے لئے ضرورت کی اور بھی چیزیں منگوائی ہوں گی مگر یہاں وحشی ملک میں سب سے زیادہ کم یاب چیز لوہے کی چادریں تھیں اس لئے یہاں خاص اس کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا۔

* * *

**فائدہ:** ۱. یعنی مال میرے پاس بہت ہے مگر ہاتھ پاؤں سے ہمارے ساتھ تم بھی محنت کرو۔

**فائدہ:** ۲. یعنی اول لوہے کے بڑے بڑے تختوں کے اوپر نیچے تہیں جمائیں، جب ان کی بلندی دونوں پہاڑوں کی چوٹی تک پہنچ گئی، لوگوں کو حکم دیا کہ خوب آگ دھونکو، جب لوہا آگ کی طرح سرخ ہو کر تپنے لگا اس وقت پگھلا ہوا تانبا اوپر سے ڈالا جو لوہے کی درزوں میں بالکل پیوست ہو کر جم گیا اور سب مل کر پہاڑ سا بن گیا، یہ سب کام اس زمانہ میں بظاہر خارقِ عادت طریقہ سے انجام پائے ہوں گے جسے ذوالقرنین کی کرامت سمجھنا چاہیے، یا ممکن ہے اس وقت اس قسم کے آلات واسباب پائے جاتے ہوں جن کا ہمیں اب علم نہیں۔

**فائدہ:** ۳. یعنی حق تعالیٰ نے یاجوج ماجوج کو فی الحال یہ قدرت نہیں دی کی دیوار پھاند کر یا توڑ کر ادھر نکل آئیں۔

| |
|---|
| قَالَ هٰذَا رَحۡمَةٌ مِّنۡ رَّبِّىۡ‌ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ رَبِّىۡ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ‌ ۚ وَكَانَ وَعۡدُ رَبِّىۡ حَقًّا ؕ ۹۸ |
| بولا یہ ایک مہربانی ہے میرے رب کی، پھر جب آئے وعدہ میرے رب کا گرادے اس کو ڈھا کر، اور ہے وعدہ میرے رب کا سچا |

**خلاصہ تفسیر:** ذوالقرنین نے (جب اس دیوار کو تیار دیکھا جس کا تیار ہونا کوئی آسان کام نہ تھا تو شکر کے طور پر) کہا کہ یہ میرے رب کی ایک رحمت ہے (مجھ پر بھی کہ میرے ہاتھوں یہ کام ہو گیا اور اس قوم کے لئے بھی جن کو یاجوج وماجوج ستاتے تھے) پھر جس وقت رب کا وعدہ آئے گا (یعنی اس کی فنا کا وقت آئے گا) تو اس کو ڈھا کر (زمین کے) برابر کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے (اور اپنے وقت پر ضرور واقع ہوتا ہے)۔

**فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ رَبِّىۡ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ:** یہ بات حضرت ذوالقرنین نے شاید اس وجہ سے فرمادی ہو کہ اجمالی طور پر ہر چیز کا فانی ہونا معلوم ہے، یا ممکن ہے کہ ان کو الہام یا وحی کے ذریعہ سے اس کے منہدم ہونے کا مفصل حال معلوم ہو گیا ہو جو کہ قیامت کے قریب ٹوٹے گی جیسا کہ احادیث میں بھی آیا ہے، اور ذوالقرنین کا مقصود اس بات سے یہ تھا کہ آدمی کسی بھی حال میں حق تعالیٰ سے غافل نہ ہو، اور نہ ہی کسی سامان پر غرور کرے، بلکہ ہمیشہ نعمت پر شکر کرے اور فنا کو پیش نظر رکھے۔

جاننا چاہیے کہ مصنفین نے اس سد یاجوج وماجوج کی تعیین کے متعلق اپنی اپنی باتیں اور خیالات جمع کیے ہیں اور اپنی رائے سے اس کا مصداق متعین کرنا چاہا ہے، لیکن قرآن وحدیث سے جو اس کے چند اوصاف معلوم ہوتے ہیں: ① ایک یہ کہ اس کا بانی کوئی مقبول بندہ ہے ② دوسرے یہ کہ وہ جلیل القدر بادشاہ ہے ③ تیسرے یہ کہ وہ دیوار لوہے کی ہے ④ چوتھے یہ کہ اس کے دونوں سرے دو پہاڑوں سے ملے ہیں ⑤ پانچویں یہ کہ اس دیوار کے اُس طرف یاجوج ماجوج ہیں، وہ ابھی باہر نہیں نکل سکتے ⑥ چھٹے یہ کہ حضور ﷺ کے وقت میں اس میں تھوڑا سا سوراخ ہو گیا ہے ⑦ ساتویں یہ کہ وہ لوگ ہر روز اس دیوار کو چھیلتے ہیں اور پھر وہ اللہ کے حکم سے ویسی ہی دبیز ہو جاتی ہے اور قرب قیامت میں جب چھیلیں گے تو یوں کہیں گے کہ ان شاء اللہ کل بالکل آر پار کر دیں گے، چنانچہ اس روز پھر وہ دبیز نہ ہوگی اور اگلے روز اسے توڑ کر نکل پڑیں گے ⑧ آٹھویں یہ کہ یاجوج وماجوج کی قوت باوجود آدمی ہونے کے عام انسانوں سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے اور شمار میں بہت زیادہ ہیں ⑨ نویں یہ کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کے وقت نکلیں گے اور اس وقت عیسیٰ علیہ السلام وحی الٰہی سے اپنے خاص خاص لوگوں کو لے کر کوہ طور پر چلے جائیں گے، باقی لوگ اپنے اپنے طور پر قلعہ بند اور محفوظ مکانوں میں بند ہو جائیں گے ⑩ دسویں یہ کہ وہ دفعۃً غیر معمولی موت سے مر جائیں گے، پہلے پانچ اوصاف قرآن میں اور اخیر کے پانچ اوصاف صحیح احادیث میں ہیں، مذکورہ اوصاف کو پیش نظر رکھ کر معلوم ہوگا کہ جتنی دیواروں کا لوگوں نے رائے سے پتہ دیا ہے یہ تمام اوصاف کسی ایک میں بھی موجود نہیں، پس وہ خیالات صحیح نہیں، اور حدیثوں کا انکار یا آیات میں دور کی تاویل کرنا خود دین کے خلاف ہے۔

رہا مخالفین کا یہ کہنا کہ ہم نے تمام زمین کو چھان ڈالا کہیں اس کا پتہ نہیں ملا تو اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ ہمارے اور اس کے درمیان بڑے بڑے سمندر حائل ہوں اور یہ دعویٰ کرنا کہ ہم تمام خشکی اور بحری کا احاطہ کر چکے ہیں قابل تسلیم نہیں، بلکہ عقلاً ممکن ہے کہ امریکہ کی طرح سمندر کے

درمیان میں کوئی حصہ زمین کا ایسا ہو جہاں اب تک رسائی نہ ہوئی ہو، کسی کے نہ پانے سے اس کا نہ ہونا لازم نہیں آتا، پس جب مخبر صادق نے جس کا سچا ہونا قطعی دلائل سے ثابت ہے اس دیوار کی اور اس کے اوصاف کی خبر دی ہے تو ہم پر واجب ہے کہ اس کی تصدیق کریں، اور ایسے بددینوں کے فضول کلام کی طرف التفات کرنا دین کی کمزوری اور یقین کی کمی کے سوا کچھ نہیں۔

قرآن کریم میں جنوب کی طرف سفر کا ذکر یا تو اس لیے نہیں کیا گیا کہ اس سفر کا اتفاق نہ ہوا ہو، یا کسی اور وجہ سے اس کا ذکر نہیں کیا۔

* * *

**فائدہ:** یعنی محض خدا کی مہربانی سے یہ روک قائم ہوگئی اور میعادِ معین تک قائم رہے گی، احادیث صحیحہ سے معلوم ہوا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے نزول اور قتل دجال کے بعد قیامت کے قریب یاجوج ماجوج کے نکلنے کا وعدہ ہے اس وقت یہ روک ہٹا دی جائے گی، دیوار توڑ کر اتنی کثیر تعداد میں نکل پڑیں گے جس کا شمار اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں، دنیا ان کے مقابلے میں عاجز ہوگی، حضرت مسیح کو حکم ہوگا کہ میرے خاص بندوں کو لے کر "طور" پر چلے جائیں، آنحضرت مسیح علیہ السلام بارگاہ احدیت کی طرف دست دعا دراز کریں گے، اس کے بعد یاجوج ماجوج پر ایک غیبی وبا مسلط ہوگی، سب ایک دم مرجائیں گے، مزید تفصیل کتب حدیث باب "امارات الساعۃ" میں دیکھنی چاہیے۔

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴿٩٩﴾

اور چھوڑ دیں گے ہم خلق کو اس دن ایک دوسرے میں گھستے اور پھونک ماریں گے صور میں پھر جمع کر لائیں گے ہم ان سب کو

وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضًا ﴿١٠٠﴾

اور دکھلا دیں ہم دوزخ اس دن کافروں کو سامنے ۱؎

الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ﴿١٠١﴾ ع ۱۱

جن کی آنکھوں پر پردہ پڑا تھا میری یاد سے اور نہ سن سکتے تھے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** گزشتہ آیات میں ذوالقرنین کے قول سے اس دیوار کے فنا ہونے اور یاجوج و ماجوج کے نکلنے کی طرف اشارہ تھا، آگے حق تعالیٰ اس وقت کی خاص حالت اور دنیا کا فنا ہو کر دوبارہ پیدا ہونا بیان کرتے ہیں، اس کے بعد جزا و سزا کا معاملہ اجمالاً بیان فرماتے ہیں۔

اور ہم اس روز (یعنی جب اس دیوار کے منہدم ہونے کا وقت آئے گا اور یاجوج و ماجوج کا خروج ہوگا تو اس روز ہم) ان کی یہ حالت کریں گے کہ ایک میں ایک گڈمڈ ہو جائیں گے (کیونکہ یہ کثرت سے ہوں گے اور ایک دم سے نکل پڑیں گے اور سب ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں ہوں گے) اور (یہ قیامت کے قریب زمانہ میں ہوگا، پھر کچھ دن کے بعد قیامت کا سامان شروع ہوگا ایک بار اول صور پھونکا جائے گا جس سے تمام عالم فنا ہو جائے گا پھر) صور (دوبارہ) پھونکا جائے گا (جس سے سب زندہ ہو جائیں گے) پھر ہم سب کو ایک ایک کر کے (میدان حشر میں) جمع کر لیں گے، اور دوزخ کو اس روز کافروں کے سامنے پیش کر دیں گے، جن کی آنکھوں پر (دنیا میں) ہماری یاد سے (یعنی دین حق کے دیکھنے سے) پردہ پڑا ہوا تھا اور (جس طرح یہ حق کو دیکھتے نہ تھے اسی طرح اس کو) وہ سن بھی نہ سکتے تھے (یعنی حق کو معلوم کرنے کے ذرائع دیکھنے اور سننے کے سب راستے بند کر رکھے تھے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی یاجوج ماجوج سمندر کی موجوں کی طرح بیشمار تعداد میں ٹھاٹھیں مارتے ہوئے نکلیں گے، یا یہ مطلب ہے کہ شدت ہول و اضطراب سے ساری مخلوق رَل گڈھ ہو جائے گی، جن و انس ایک دوسرے میں گھسنے لگیں گے پھر قیامت کا بگل ہوگا یعنی صور پھونکا جائے گا، اس کے بعد سب خدا کے سامنے میدان حشر میں اکٹھے کیے جائیں گے اور دوزخ کافروں کی آنکھوں کے سامنے ہوگا، شاید کافروں کی تخصیص اس لیے کی کہ اصل میں

دوزخ ان ہی کے لیے تیار کیا گیا ہے اور ان کی آنکھوں پر دنیا میں پردہ پڑا ہوا تھا، اب وہ پردہ اٹھ گیا۔

**فائدہ: ۲** یعنی خود اپنی عقل کی آنکھ برابر نہ تھی کہ قدرت کے نشان دیکھ کر یقین لاتے اور خدا کو یاد کرتے اور ضد سے کسی کی بات نہ سنی جو دوسرے کے سمجھائے سمجھ لیتے۔

| |
|---|
| اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ ؕ |
| اب کیا سمجھتے ہیں منکر کہ ٹھہرائیں میرے بندوں کو میرے سوا حمایتی ۱ |
| اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾ |
| ہم نے تیار کیا ہے دوزخ کو کافروں کی مہمانی ۲ |

**خلاصہ تفسیر**: (سو جب یہ بات ثابت ہے کہ کفر پر ایسے سخت عذاب کے مستحق ہوں گے تو) کیا پھر بھی ان کافروں کا خیال ہے کہ مجھ کو چھوڑ کر میرے بندوں کو (یعنی جو میرے مملوک ومحکوم ہیں اپنے اختیار سے یا مجبوراً ان کو) اپنا کارساز (یعنی معبود اور حاجت روا) قرار دیں (جو شرک اور کھلا کفر ہے) ہم نے کافروں کی دعوت کے لئے دوزخ کو تیار کر رکھا ہے (دعوت بطور تحقیر وتحکم کے فرمایا)۔

* * *

**فائدہ: ۱** یعنی کیا منکرین یہ گمان کرتے ہیں کہ میرے خاص بندوں (مسیح، عزیر، روح القدس، فرشتوں) کی پرستش کر کے اپنی حمایت میں کھڑا کر لیں گے: كَلَّا ۭ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا (ہرگز نہیں! وہ خود تمہاری حرکات سے بیزاری کا اظہار فرمائیں گے اور تمہارے مقابل مدعی بن کر کھڑے ہوں گے)۔

**فائدہ: ۲** یعنی اس دھوکہ میں مت رہنا! وہاں تم کو کوئی نہیں پوچھے گا، ہاں ہم تمہاری مہمانی کریں گے، دوزخ کی آگ اور قسم قسم کے عذاب سے (اعاذنا اللّٰہ منہا)۔

| |
|---|
| قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا |
| تو کہہ ہم بتائیں تم کو کن کا کیا ہوا گیا بہت اکارت، وہ لوگ جن کی کوشش بھٹکتی رہی دنیا کی زندگی میں |
| وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾ |
| اور وہ سمجھتے رہے کہ خوب بناتے ہیں کام |

**خلاصہ تفسیر**: (اور اگر ان کو اپنے ان اعمال پر ناز ہو جن کو وہ اپنے نزدیک اعمال حسنہ سمجھتے ہیں اور اس وجہ سے وہ اپنے آپ کو نجات یافتہ اور عذاب سے محفوظ سمجھتے ہیں تو اس بارے میں) آپ (ان سے) کہئے کہ کیا ہم تم کو ایسے لوگ بتائیں جو اعمال کے اعتبار سے بالکل خسارے میں ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کی دنیا میں کری کرائی محنت (جو اعمال حسنہ میں کی تھی، آخرت میں) سب گئی گذری ہوئی اور وہ (اپنی جہالت کی وجہ سے) اسی خیال میں ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** یعنی قیامت کے دن سب سے زیادہ خسارہ میں وہ لوگ ہوں گے جن کی ساری دوڑ دھوپ دنیا کے لیے تھی آخرت کا کبھی خیال نہ آیا، محض دنیا کی ترقیات اور مادی کامیابیوں کو بڑی معراج سمجھتے رہے (کذا یفہم من الموضح) یا یہ مطلب ہے کہ دنیاوی زندگی میں جو کام انہوں

نے اپنے نزدیک اچھے سمجھ کر کئے تھے خواہ واقع میں اچھے تھے یا نہیں وہ سب کفر کی نحوست سے وہاں بیکار ثابت ہوئے اور تمام محنت برباد گئی۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ

وہی ہیں جو منکر ہوئے اپنے رب کی نشانیوں سے اور اس کے ملنے سے ۱؎ سو برباد گیا ان کا کیا ہوا پھر نہ کھڑی کریں گے ہم

لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا ﴿۱۰۵﴾ ذَٰلِكَ جَزَاؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوا وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَرُسُلِي هُزُوًا ﴿۱۰۶﴾

ان کے واسطے قیامت کے دن تول ۲؎ یہ بدلہ ان کا ہے دوزخ اس پر کہ منکر ہوئے اور ٹھہرایا میری باتوں اور میرے رسولوں کو ٹھٹھا ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** (اب ان لوگوں کا مصداق ایسے عنوان سے بتلاتے ہیں جس سے ان کی محنت ضائع ہونے کی وجہ بھی معلوم ہوتی ہے اور پھر اس حبط اعمال کی تصریح بھی نتیجہ کے طور پر فرماتے ہیں یعنی) یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کی آیتوں کا اور اس سے ملنے کا (یعنی قیامت کا) انکار کر رہے ہیں سو (اس لئے) ان کے سارے (نیک) کام غارت گئے تو قیامت کے روز ہم ان (کے نیک اعمال) کا ذرا بھی وزن قائم نہ کریں گے۔ (بلکہ) ان کی سزاء وہی ہوگی (جو اوپر مذکور ہوئی) یعنی دوزخ اس لئے کہ انہوں نے کفر کیا تھا اور (اس کفر کا ایک شعبہ یہ بھی تھا کہ) میری آیتوں اور پیغمبروں کا مذاق بنایا تھا۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ خدا یعنی نہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کو مانا، نہ خیال کیا کہ کبھی اس کے سامنے حاضر ہونا ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ کافر کی حسنات مردہ ہیں اس ابدی زندگی میں کسی کام کی نہیں، اب محض کفریات وسیئات رہ گئیں، سو ایک پلہ کیا تلے، تولنا تو موازنہ کیلئے تھا، موازنہ متقابل چیزوں میں ہوتا ہے، یہاں سیئات کے بالمقابل حسنہ کا وجود ہی نہیں پھر تولنے کا کیا مطلب۔

**فائدہ:** ۳؎ جو ٹھٹھا کرتے تھے اب اس کا مزہ چکھو۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿۱۰۷﴾

جو لوگ ایمان لائے ہیں اور کئے ہیں بھلے کام ان کے واسطے ہے ٹھنڈی چھاؤں کے باغ مہمانی

خَالِدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿۱۰۸﴾

رہا کریں ان میں نہ چاہیں وہاں سے جگہ بدلنی ۱؎

**خلاصہ تفسیر:** (اب ان کے مقابلے میں اہل ایمان کا حال بیان فرماتے ہیں کہ) بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے ان کی مہمانی کے لئے فردوس (یعنی بہشت) کے باغ ہوں گے جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے (نہ ان کو کوئی نکالے گا) اور نہ وہ وہاں سے کہیں اور جانا چاہیں گے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی ہمیشہ رہنے سے اکتائیں گے نہیں، ہر دم تازہ بتازہ نعمتیں ملی گی، کبھی خواہش نہ کریں گے کہ ہم کو یہاں سے منتقل کر دیا جائے۔

قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي

تو کہہ اگر دریا سیاہی ہو کر لکھے میرے رب کی باتیں بیشک دریا خرچ ہو چکے ابھی نہ پوری ہوں میرے رب کی باتیں

وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا﴿۱۰۹﴾

اور اگر چہ دوسرا بھی لائیں ہم ویسا ہی اس کی مدد کو

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے توحید ورسالت کے انکار پر عذاب کی دھمکی اور تصدیق واطاعت پر ثواب کا وعدہ مذکور تھا، اب یہاں اس آیت میں توحید کو اور اگلی آیت میں رسالت کو ثابت کیا جاتا ہے، آخر میں مؤمن کا ثواب صراحۃً اور منکر کا عذاب دلالۃً بیان کیا جاتا ہے، اسی پر سورت کا اختتام ہے، اور بعینہ یہی مضمون سورت کے شروع میں بھی تھا۔

آپ (ان لوگوں سے) فرما دیجئے کہ اگر میرے رب کی باتیں (یعنی وہ کلمات وعبارات جو اللہ تعالیٰ کے اوصاف وکمالات پر دلالت کرتے ہوں اور ان سے اللہ کے کمالات واوصاف کو کوئی بیان کرنے لگے تو ایسے کلمات کو) لکھنے کے لیے سمندر (کا پانی) روشنائی (کی جگہ) ہو (اور اس سے لکھنا شروع کرے) تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے گا (اور سب باتیں احاطہ میں نہ آئیں گی) اگر چہ اس سمندر کے مثل ایک دوسرا سمندر (اس کی) مدد کے لئے ہم لے آئیں (تب بھی وہ باتیں ختم نہ ہوں اور دوسرا سمندر بھی ختم ہو جائے)۔

سو اس کے کمالات تو غیر متناہی ہیں اور کوئی تراشیدہ معبود ایسا ہے نہیں، پس معبودیت اور ربوبیت کا خدا کے ساتھ ہونا ثابت ہو گیا، اور کمالات میں علم بھی داخل ہے تو اس سے خدا کے علم کا غیر متناہی ہونا بھی ثابت ہو گیا، سو اس یہود کی اس بات کا جواب بھی ہو گیا جو انہوں نے: وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا سن کر کہا تھا یعنی تم کو جو علم دیا گیا وہ قلیل ہے، یہودیوں نے یہ سن کر کہا کہ ہمارا علم تو بہت ہے، کیونکہ آپ خود اس بات کے مقر ہیں کہ ہم کو توریت دی گئی جو کتاب حکمت ہے اور حکمت خیر کثیر ہے تو پھر یہ کیسے کہا گیا کہ تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور مطلب یہ ہے کہ توریت اگر چہ خیر کثیر ہے لیکن اللہ کے کلمات حکمت کے مقابلہ میں کم ہے، تمام مخلوقات کا علم اللہ تعالیٰ کے دریائے علم کے سامنے ایک قطرہ ہے، بلکہ یہ بھی نہیں اللہ کا علم قدیم اور غیر متناہی ہے اور مخلوق کا علم حادث اور متناہی ہے، جواب کا حاصل یہ ہوا کہ خدا کے علم کے مقابلہ میں سب تھوڑا ہی ہے۔

اس آیت کی تفسیر لکھنے کے وقت مجھے اپنے ایک بزرگ جناب ماموں منشی شوکت علی صاحب مرحوم کا ایک مخمس یاد آیا جو گویا اس آیت کا ترجمہ ہے، دلچسپی کے لیے اس کو نقل کرتا ہوں، واقعی خوب کہا ہے:

اگر جملہ دریا شود روشنائی — کند کلک اشجار مدحت سرائی
محال از ثنائے تو عہدہ برائی — ازل تا ابدائے تو فرمانروائی
کرا جز تو در ملک تو بادشاہی

* * *

**فائدہ:** قریش نے یہود کے اشارہ سے روح، اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے متعلق سوال کیا تھا، سورہ ہذا کی ابتداء میں اصحاب کہف کا اور آخر میں ذوالقرنین کا قصہ جہاں تک موضع قرآن سے متعلق تھا بیان فرمایا اور روح کے متعلق سورہ بنی اسرائیل میں فرما دیا: وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا اب خاتمہ سورت پر بتلاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علم وحکمت کی باتیں بے انتہا ہیں جو باتیں تمہاری طرف واستعداد اور ضرورت کے لائق بتلائی گئیں، حق تعالیٰ کی معلومات میں سے اتنی بھی نہیں جتنا سمندر میں سے ایک قطرہ، فرض کرو اگر پورے سمندر کا پانی سیاہی بن جائے جس سے خدا کی باتیں لکھنی شروع کی جائیں، اس کے بعد دوسرا اور تیسرا ویسا ہی سمندر اس میں شامل کرتے رہو تو سمندر ختم ہو جائیں گے، پر خدا کی باتیں ختم نہ ہوں گی، یہیں سے سمجھ لو کہ قرآن اور دوسری کتب سماویہ کے ذریعہ سے خواہ کتنا ہی وسیع علم بڑی سے بڑی مقدار میں کسی کو دے دیا جائے، علم الٰہی کے سامنے وہ بھی قلیل ہے، گویا فی حد ذاتہ اسے کثیر کہہ سکیں۔

قُلْ إِنَّمَآ أَنَا۠ بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰٓ إِلَىَّ أَنَّمَآ إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَٰحِدٌ ۖ فَمَن كَانَ يَرْجُوا۟ لِقَآءَ رَبِّهِۦ

تو کہہ میں بھی ایک آدمی ہوں جیسے تم، حکم آتا ہے مجھ کو کہ معبود تمہارا ایک معبود ہے، سو پھر جس کو امید ہو ملنے کی اپنے رب سے

فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَٰلِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِۦٓ أَحَدًۢا ﴿١١٠﴾

سو وہ کرے کچھ کام نیک اور شریک نہ کرے اپنے رب کی بندگی میں کسی کو

**خلاصہ تفسیر:** (گذشتہ آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے کلمات غیر متناہی ہیں، اس کے سوا جن چیزوں کو کافروں نے اللہ کا شریک مانا ہے ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں اس لئے الوہیت و ربوبیت یعنی خدا ہونا اور رب ہونا اسی کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے، اس لئے ان لوگوں سے) آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ میں تو تم سب کی طرح بشر ہوں (نہ خدائی کا دعوے دار ہوں نہ فرشتہ ہونے کا، ہاں!) میرے پاس (اللہ کی طرف سے) وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود (برحق) ایک ہی معبود ہے (سو نہ وحی کا آنا کچھ عجیب ہے اور نہ وہ مضمون کچھ عجیب ہے جو وحی کیا جاتا ہے، بلکہ توحید خود عقلی دلائل سے بھی ثابت ہے) سو (جب توحید و رسالت ثابت ہوگئی) تو جو شخص اپنے رب سے ملنے کی آرزو رکھے (اور اس کا محبوب و مقرب بننا چاہے) تو (مجھے رسول مان کر میری شریعت کے موافق) نیک کام کرتا رہے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

**فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَٰلِحًا:** یعنی توحید و رسالت کا اعتقاد رکھے کیونکہ نفس نجات اسی پر موقوف ہے، اور اعمال صالحہ اختیار کرے کیونکہ کامل نجات بھی اکثر اسی پر موقوف ہے۔

**وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِۦٓ أَحَدًۢا:** اس جگہ شرک کے عموم میں شرک خفی یعنی ریا کاری بھی حدیث کی رو سے شامل ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی میں بھی تمہاری طرح بشر ہوں، خدا نہیں، جو خود بخود ذاتی طور پر تمام علوم و کمالات حاصل ہوں، ہاں اللہ تعالیٰ علوم حقہ اور معارف قدسیہ میری طرف وحی کرتا ہے جن میں اصل اصول علم توحید ہے، اسی کی طرف میں سب کو دعوت دیتا ہوں، جس کسی کو اللہ تعالیٰ سے ملنے کا شوق یا اس کے سامنے حاضر کیے جانے کا خوف ہو اسے چاہیے کہ کچھ بھلے کام شریعت کے موافق کر جائے اور اللہ تعالیٰ کی بندگی میں ظاہراً و باطناً کسی کو کسی درجہ میں بھی شریک نہ کرے، یعنی شرک جلی کی طرح ریا وغیرہ شرک خفی سے بھی بچتا رہے، کیونکہ جس عبادت میں غیر اللہ کی شرکت ہو وہ عابد کے منہ پر ماری جائے گی: اَللّٰهُمَّ اَعِذْنَا مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا اس آیت میں اشارہ کر دیا کہ نبی کا علم بھی متناہی اور عطائی ہے، علم خداوندی کی طرح ذاتی اور غیر متناہی نہیں۔

## ایاتها ۹۸ ‏ ۱۹ سُوْرَةُ مَرْيَمَ مَكِّيَّةٌ ٤٤ ‏ رکوعاتها ٦

**خلاصہ تفسیر:** اس سورت کا خلاصہ تین مضمون ہیں:

① اول توحید کا اثبات، چنانچہ حضرت عیسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے واقعات اور بعض دیگر آیات اسی پر دلالت کرتی ہیں۔

② دوم نبوت کا اثبات، اس کی تقریر دو طرح ہے، ایک تو بعض انبیاء علیہم السلام کے قصے اور واقعات بیان فرمانے سے اس طرف اشارہ ہوگیا کہ نبوت کوئی عجیب و غریب چیز نہیں، آپ سے پہلے اور حضرات کو بھی یہ دولت عطا ہوئی، دوسرے یہ کہ کسی بشر سے علم حاصل نہ کرنے کے باوجود آپ نے گذشتہ خبروں کو کس طرح صحیح صحیح بیان فرمایا ہے جو کہ صاحب وحی ہونے کی دلیل ہے۔

③ سوم قیامت کا اثبات جن میں جزا و سزا کے ذکر کے ساتھ منکرین آخرت کے بعض شبہات کا بھی جواب ہے، گذشتہ سورت میں بھی بڑا حصہ ان ہی مضامین کا تھا، گذشتہ سورت کے اختتام پر جس طرح آپ کی رسالت کا ذکر ہے اس سورت کے اختتام پر بھی بعض گذشتہ انبیاء کی نبوت کا

مضمون ہے، جیسے سورہ کہف بہت سے عجیب واقعات پر مشتمل تھی اسی طرح سورہ مریم بھی ایسے عجیب وغریب واقعات پر مشتمل ہے، اس تقریر سے اس سورت کا گذشتہ کے ساتھ نیز اس کے اجزا میں بھی خود باہم ربط معلوم ہو گیا۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

كٓهٰيٰعٓصٓ ① ذِكۡرُ رَحۡمَتِ رَبِّكَ عَبۡدَهٗ زَكَرِيَّا ② اِذۡ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ③

کھیعص، یہ مذکور ہے تیرے رب کی رحمت (مہربانی) کا اپنے بندہ زکریا پر ۱، جب پکارا اُس نے اپنے رب کو چھپی آواز سے ۲

**خلاصہ تفسیر:** اس سورت میں انبیاء علیہم السلام کے کئی قصے مذکور ہیں، پہلا قصہ حضرت زکریا و حضرت یحییٰ علیہما السلام کا ہے۔

**کھیعص** (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں، پہلا قصہ) یہ (جو آگے قصہ آتا ہے) تذکرہ ہے آپ کے پروردگار کے مہربانی فرمانے کا اپنے (مقبول) بندہ (حضرت) زکریا (علیہ السلام کے حال) پر، جبکہ انہوں نے اپنے پروردگار کو پوشیدہ طور پر پکارا۔

**اِذۡ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا:** دعا خفی اس لیے کی گئی کہ یہ قبولیت کے زیادہ قریب ہوتی ہے، اور نادٰی کے لفظ سے اعلان کا شبہ نہ ہو، کیونکہ نداء بمعنی ''دعاء'' عام ہے، نداء خفی سے ذکر خفی کا فی نفسہ افضل ہونا معلوم ہوتا ہے اگرچہ کسی عارض کی وجہ سے جہر کو ترجیح بھی دی جاسکتی ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ حضرت زکریا علیہ السلام ''بنی اسرائیل'' کے جلیل القدر انبیاء میں سے ہیں، نجاری (بڑھئی) کا پیشہ کرتے تھے اور اپنے ہاتھ سے محنت کر کے کھاتے تھے، ان کا قصہ پہلے سورہ آلِ عمران میں گزر چکا، وہاں کے فوائد ملاحظہ کر لیے جائیں۔

**فائدہ:** ۲ کہتے ہیں رات کی تاریکی اور خلوت میں پست آواز سے دعاء کا اصل قاعدہ ہے: **اُدۡعُوۡا رَبَّكُمۡ تَضَرُّعًا وَّخُفۡيَةً** ایسی دعاء ریا سے دور اور کمال اخلاص سے معمور ہوتی ہے، شاید یہ بھی خیال ہو کہ بڑھاپے کی عمر میں بیٹا مانگتے تھے، اگر نہ ملے تو سننے والے ہنسیں، اور ویسے بھی عموماً بڑھاپے میں آواز پست ہو جاتی ہے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ وَهَنَ الۡعَظۡمُ مِنِّیۡ وَاشۡتَعَلَ الرَّاۡسُ شَيۡبًا وَّلَمۡ اَكُنۡۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ④

بولا اے میرے رب بوڑھی ہو گئیں میری ہڈیاں اور شعلہ نکلا (بھڑکا) سر سے (میں) بڑھاپے کا ۱ اور تجھ سے مانگ کر اے رب میں کبھی محروم نہیں رہا ۲

**خلاصہ تفسیر:** (دعا میں یہ) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! میری ہڈیاں (بڑھاپے کی وجہ سے) کمزور ہو گئیں اور (میرے) سر میں بالوں کی سفیدی پھیل پڑی (یعنی تمام بال سفید ہو گئے، اس حالت کا تقاضا یہ ہے کہ میں اس حالت میں اولاد کی درخواست نہ کروں مگر چونکہ آپ کی قدرت و رحمت بڑی کامل ہے) اور (میں اس قدرت و رحمت کے ظہور کا ہمیشہ عادی رہا ہوں، چنانچہ اس سے قبل کبھی) آپ سے (کوئی چیز) مانگنے میں اے میرے رب ناکام نہیں رہا ہوں (اس بنا پر بعید سے بعید مقصود کو بھی طلب کرنے میں مضائقہ نہیں)۔

**قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ وَهَنَ الۡعَظۡمُ مِنِّیۡ:** اس سے دعا میں الحاح وزاری کی فضیلت معلوم ہوتی ہے (یعنی دعا میں اپنی طلب، بے چینی، بے قراری اور بے بسی کا اظہار کرنا چاہیے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی بظاہر موت کا وقت قریب ہے، سر کے بالوں میں بڑھاپے کی سفیدی چمک رہی ہے اور ہڈیاں تک سوکھنے لگیں۔

**فائدہ:** ۲ یعنی آپ نے اپنے فضل و رحمت سے ہمیشہ میری دعائیں قبول کیں اور مخصوص مہربانیوں کا خوگر بنائے رکھا اس آخری وقت اور

ضعف و پیرانہ سالی میں کیسے گمان کروں کہ میری دعا ءرد کر کے مہربانی سے محروم رکھیں گے، بعض مفسرین نے وَلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا کے معنی یوں کیے ہیں کہ اے پروردگار آپ کی دعوت پر میں کبھی شقی ثابت نہیں ہوا یعنی جب آپ نے پکارا برابر امتثال امر اور طاقت وفرمانبرداری کی سعادت حاصل کی۔

وَاِنِّىۡ خِفۡتُ الۡمَوَالِىَ مِنۡ وَّرَآءِىۡ وَكَانَتِ امۡرَاَتِىۡ عَاقِرًا فَهَبۡ لِىۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ وَلِيًّا ۝٥

اور میں ڈرتا ہوں بھائی بندوں سے اپنے پیچھے اور عورت میری بانجھ ہے سو بخش تو مجھ کو اپنے پاس سے ایک کام اٹھانے والا

يَّرِثُنِىۡ وَيَرِثُ مِنۡ اٰلِ يَعۡقُوۡبَ ‌ۖ وَاجۡعَلۡهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝٦

جو میری جگہ بیٹھے اور یعقوب کی اولاد کی ۲ اور کر اُس کو اے رب من مانتا (جی چاہتا) ۳

**خلاصہ تفسیر:** اور (اولاد کی طلب کی اس دعا کو خاص اس وجہ سے ترجیح حاصل ہے کہ) میں اپنے (مرنے کے) بعد (اپنے) رشتہ داروں (کی طرف) سے (یہ) اندیشہ رکھتا ہوں (کہ وہ میری مرضی کے موافق شریعت اور دین کی خدمت نہ بجالائیں گے، اس لیے ایسی اولاد طلب کی ہے جس میں خاص خاص اوصاف پائے جائیں جن کی خدمت دین میں توقع کی جاتی ہے) اور (چونکہ میری پیرانہ سالی کے ساتھ) میری بیوی (بھی) بانجھ ہے (جس کے میرے مزاج کی صحت کے باوجود کبھی اولاد ہی نہیں ہوئی اور اب میرا بڑھاپا آ گیا، اس لئے اولاد ہونے کے ظاہری اسباب بھی کچھ نہیں) سو (اس صورت میں) آپ مجھ کو خاص اپنے پاس سے (یعنی ظاہری اسباب کے واسطہ کے بغیر) ایک ایسا وارث (یعنی بیٹا) دے دیجئے کہ وہ (میرے علوم خاصہ میں) میرا وارث بنے اور (میرے جد) یعقوب (علیہ السلام) کے خاندان (کے علوم متوارثہ میں ان) کا وارث بنے (یعنی گذشتہ و آئندہ علوم اسے حاصل ہوں) اور (باعمل ہونے کی وجہ سے) اس کو اے میرے رب! (اپنا) پسندیدہ (ومقبول) بنائیے (یعنی عالم بھی ہو اور عامل بھی ہو)۔

**وَاِنِّىۡ خِفۡتُ الۡمَوَالِىَ مِنۡ وَّرَآءِىۡ:** سوال ہوتا ہے کہ اولاد کی طلب کے بجائے رشتہ داروں کی اصلاح کی دعا کیوں نہ کی جبکہ یہ بھی حفاظت دین کا ہی ایک طریقہ تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شاید یہ اس لیے ہو کہ جو ابتدا ہی سے نیک ہو عوام پر اس کے وعظ کا اثر زیادہ ہوتا ہے، سورہ آل عمران میں حضرت زکریا علیہ السلام کی اس طلب اولاد کی دعا کا سبب حضرت مریم علیہا السلام سے عادت کے خلاف خوارق کا ظاہر ہونا بیان ہوا ہے اور یہاں دوسرا سبب مذکور ہے، تو وہ اس مقام کے خلاف نہیں اور ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں، ممکن ہے کہ اصل رغبت حضرت مریم علیہا السلام کے ان واقعات کی وجہ سے ہوئی ہو اور اس رغبت کے اظہار کا سبب اور وجہ یہ ہو جسے یہاں آیت میں ذکر کیا گیا۔

**يَّرِثُنِىۡ وَيَرِثُ مِنۡ اٰلِ يَعۡقُوۡبَ:** یہاں مالی وراثت مراد نہیں جس کی نقلی دلیل تو خود لفظ: مِنۡ اٰلِ يَعۡقُوۡبَ ہے، کیونکہ یحییٰ علیہ السلام تمام خاندان یعقوب کے اموال کے وارث کس طرح ہو سکتے ہیں؟ اور عقلی دلیل یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی نظر میں مال ومتاع ذرا بھی اہمیت نہیں رکھتا، کیا وہ اس لیے دعا مانگتے کہ میرا روپیہ پیسہ میرے رشتہ داروں کو نہ ملے، اگر یہ کہا جائے کہ ہاں دوسروں کو ملنا اس لیے نہ چاہتے تھے کہ وہ اس کو گناہوں میں صرف کرتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پھر اس سے مورث پر مواخذہ نہیں ہوتا جو اس سے بچنے کی فکر ہو، اور لفظ میراث صرف مال میراث ہی کے ساتھ خاص نہیں، آیت: ثمّ اورثنا الكتب الذين اصطفينا من عبادنا میں کتاب اور علوم کو بھی میراث کہا گیا ہے، اور اس مسئلہ میں اہل سنت کی تائید خود اہل تشیع کی کتابوں میں موجود ہے، کافی میں کلینی نے ابی البختری کی روایت سے امام جعفر صادقؒ کا قول نقل کیا ہے: "ان العلماء ورثة الانبياء، وذلك ان الانبياء لم يورثوا درهما ولا دينارا، وانما ورثوا احاديث من احاديثهم، فمن اخذ بشيئ منها فقد اخذ بحظ وافر" کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ انبیاء کی میراث روپے اشرفیاں نہیں ہوتیں، بلکہ علماء ان کی احادیث اور علم کے

وارث ہوتے ہیں، سو جس نے ان احادیث میں سے کچھ حاصل کرلیا اس سے پورا حصہ لے لیا، نیز دوسری روایت امام جعفرؒ سے کافی میں ہے: "قال ان سلیمان ورث داود، وان محمدا ﷺ ورث سلیمان علیه السلام" کہ سلیمان علیہ السلام حضرت داود کے وارث ہوئے اور حضور ﷺ حضرت سلیمان علیہ السلام کے وارث ہوئے، اور ظاہر ہے کہ حضور ﷺ کی وراثت حضرت سلیمان علیہ السلام سے مالی ہو ہی نہیں سکتی۔

ایک شبہ یہاں یہ ہوتا ہے کہ زکریا علیہ السلام کی دعا میں یہ بھی ہے کہ وہ لڑکا میرا وارث ہو جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ میرے بعد بھی باقی رہے، اور سورہ انبیاء میں آیت: فاستجبنا له سے اس دعا کا قبول ہونا بھی معلوم ہو گیا، حالانکہ یحییٰ علیہ السلام ان سے پہلے قتل کر دیے گئے؟ جواب یہ ہے کہ اول تو یحییٰ علیہ السلام کے پہلے قتل ہونے کا قصہ ثابت نہیں، دوسرے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ: فاستجبنا له کے معنی ہوں کہ اس دعا کے بعض اجزاء کو ہم نے قبول کر لیا تو اگر وہ پہلے ہی قتل ہوئے تب بھی اشکال نہیں۔

حضرت زکریا علیہ السلام کی اس سے دو مسئلے بھی معلوم ہوتے ہیں: ① ایک یہ کہ نیک اولاد کا طلب کرنا زہد کے خلاف نہیں ② دوسرے یہ کہ کسی ایسی چیز کا مانگنا جو اسباب بعیدہ سے تعلق رکھتی ہو تو ایسی دعا ادب کے خلاف نہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ وَإِنِّي خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَرَآءِي: یعنی ان کے بھائی بند قرابت دار نااہل ہوں گے، ڈر یہ ہوا کہ وہ لوگ ان کے بعد اپنی بد اعمالیوں اور غلط کاریوں سے راہ نیک نہ بگاڑ دیں اور جو دینی و روحانی دولت یعقوب علیہ السلام کے گھرانے میں منتقل ہوتی ہوئی حضرت زکریا علیہ السلام تک پہنچی تھی اسے اپنی شرارت اور بدتمیزی سے ضائع نہ کر دیں۔

**فائدہ:** ۲ يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ: یعنی میں بوڑھا ہوں، بیوی بانجھ ہے، ظاہری سامان اولاد ملنے کا کچھ نہیں لیکن تو اپنی لامحدود قدرت و رحمت سے اولاد عطا فرما جو دینی خدمات کو سنبھالے اور تیری مقدس امانت کا بوجھ اٹھا سکے، میں اس ضعف و پیروی میں کیا کر سکتا ہوں، جی یہ چاہتا ہے کہ کوئی بیٹا اس لائق ہو جو اپنے باپ دادوں کی پاک گدی پر بیٹھ سکے، ان کے علم و حکمت کے خزانوں کا مالک اور کمالات نبوت کا وارث بنے۔

**تنبیہ:** احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے مال میں وراثت جاری نہیں ہوتی، ان کی وراثت دولت علم میں چلتی ہے، خود شیعوں کی مستند کتاب "کافی کلینی" سے بھی "روح المعانی" میں اس مضمون کی روایات نقل کی ہیں، لہٰذا متعین ہے کہ يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ میں وراثت مالی مراد نہیں، جس کی تائید خود لفظ "آل یعقوب" سے ہو رہی ہے، کیونکہ ظاہر ہے تمام "آل یعقوب" کے اموال و املاک کا وارث تنہا حضرت زکریا علیہ السلام کا بیٹا کیسے ہو سکتا تھا، بلکہ نفس وراثت کا ذکر ہی اس موقع پر ظاہر کرتا ہے کہ مالی وراثت مراد نہیں، کیونکہ یہ تو تمام دنیا کے نزدیک مسلم ہے کہ بیٹا باپ کے مال کا وارث ہوتا ہے، پھر دعاء میں اس کا ذکر کرنا محض بیکار تھا، یہ خیال کرنا کہ حضرت زکریا علیہ السلام کو اپنے مال و دولت کی فکر تھی کہ کہیں میرے گھر سے نکل کر بنی اعمام اور دوسرے رشتہ داروں میں نہ پہنچ جائے، نہایت پست اور ادنیٰ خیال ہے، انبیاء علیہم السلام کی شان یہ نہیں ہوتی کہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت دنیا کی متاع حقیر کی فکر میں پڑ جائیں کہ ہائے یہ کہاں جائے گی اور کس کے پاس رہے گی، اور لطف یہ ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام بڑے دولت مند بھی نہ تھے، بڑھئی کا کام کر کے محنت سے پیٹ پالتے تھے بھلا ان کو بڑھاپے میں کیا غم ہو سکتا تھا کہ چار پیسے رشتہ داروں کے ہاتھ نہ پڑ جائیں، العیاذ باللہ۔

**فائدہ:** ۳ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا: یعنی ایسا لڑکا دیجئے جو اپنے اخلاق و اعمال کے لحاظ سے میری اور تیری اور اچھے لوگوں کی پسند کا ہو۔

يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ۨاسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ⑦

اے زکریا ہم تجھ کو خوشخبری سناتے ہیں ایک لڑکے کی جس کا نام ہے یحییٰ نہیں کیا ہم نے پہلے اس نام کا کوئی

**خلاصہ تفسیر:** (حق تعالیٰ کا ملائکہ کے واسطہ سے ارشاد ہوا کہ) اے زکریا! ہم تم کو ایک فرزند کی خوشخبری دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ

ہوگا کہ اس سے قبل (خاص اوصاف میں) ہم نے کسی کو اس کا ہم صفت نہ بنایا ہوگا (یعنی جس علم وعمل کی تم دعا کرتے ہو وہ تو اس فرزند کو ضرور ہی عطا کریں گے اور اس سے زیادہ کچھ خاص اوصاف بھی عنایت کئے جائیں گے، مثلاً خشیت الٰہی سے خاص درجہ کی رقت قلب وغیرہ)۔

***

**فائدہ:** ۱؎ یعنی دعاء قبول ہوئی اور لڑکے کی بشارت پہنچی جس کا نام (یحییٰ) قبل از ولادت حق تعالیٰ نے تجویز فرمادیا، نام بھی ایسا انوکھا جو ان سے پہلے کسی کا نہ رکھا گیا تھا، بعض سلف نے یہاں "سمی" کے معنی "شبیہ" کے لیے ہیں، یعنی اس شان وصفت کا کوئی شخص ان سے پہلے نہیں ہوا تھا، شاید یہ مطلب ہو کہ بوڑھے مرد اور بانجھ عورت سے کوئی ایسا لڑکا اس وقت تک پیدا نہیں کیا گیا تھا، یا بعض خاص احوال وصفات (مثلاً رقت قلب اور غلبہ بکا وغیرہ) میں ان کی مثال پہلے نہ گزری ہوگی، واللہ اعلم۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ﴿٨﴾

بولا اے رب کہاں سے ہوگا مجھ کو (میرے) لڑکا اور میری عورت بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہوگیا یہاں تک کہ اکڑ گیا (سوکھ گیا)

**خلاصہ تفسیر:** (چونکہ اس دعا قبول کرنے میں بچہ پیدا ہونے کی کوئی خاص کیفیت نہیں بتلائی گئی تھی اس لیے اس کیفیت کو پوچھنے کے لیے) زکریا (علیہ السلام) نے عرض کیا کہ اے میرے رب! میرے اولاد کس طرح ہوگی حالانکہ میری بیوی بانجھ ہے اور (ادھر) میں بڑھاپے کے انتہائی درجہ کو پہنچ چکا ہوں (پس معلوم نہیں کہ ہم جوان ہوجائیں گے، یا مجھ کو دوسرا نکاح کرنا ہوگا، یا اسی موجودہ حالت میں اولاد ہوگی)۔

***

**فائدہ:** آدمی کا قاعدہ ہے کہ جب غیر متوقع اور غیر معمولی خوشخبری سنے تو مزید طمانیت واستلذاذ کے لیے بار بار پوچھتا اور کھود کرید کیا کرتا ہے، اس تحقیق وتفحص سے لذت تازہ حاصل ہوتی اور بات خوب پکی ہوجاتی ہے، یہ ہی منشاء حضرت زکریا علیہ السلام کے سوال کا تھا، حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: "انوکھی چیز مانگتے تعجب نہ آیا، جب سنا کہ ملے گی تب تعجب کیا"۔

قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا ﴿٩﴾

کہا یونہی ہوگا ۱؎ فرمادیا تیرے رب نے وہ مجھ پر آسان ہے اور تجھ کو پیدا کیا میں نے پہلے سے اور نہ تھا تو کوئی چیز ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** ارشاد ہوا کہ حالت (موجودہ) یوں ہی رہے گی (اور پھر اولاد ہوگی، اے زکریا!) تمہارے رب کا قول ہے کہ یہ (امر) مجھ کو آسان ہے اور (یہ کیا اس سے بڑا کام کرچکا ہوں مثلاً) میں نے تم کو (ہی) پیدا کیا ہے حالانکہ (پیدائش سے قبل) تم کچھ بھی نہ تھے (اسی طرح خود ظاہری اسباب بھی کوئی چیز نہ تھے، جب معدوم کو موجود کرنا مجھے آسان ہے تو ایک موجود سے دوسرے کو موجود کردینا کیا مشکل ہے، یہ سب ارشاد امید کی مضبوط کرنے کے لئے تھا نہ کہ شبہ دور کرنے کے لئے، کیونکہ زکریا علیہ السلام کو کوئی شبہ نہ تھا)۔

***

**فائدہ:** ۱؎ تعجب کی کوئی بات نہیں، ان ہی حالات میں اولاد مل جائے گی اور مشیت ایزدی پوری ہوکر رہے گی۔

**فائدہ:** ۲؎ یہ فرشتہ نے کہا، یعنی تمہارے نزدیک ظاہری اسباب کے اعتبار سے ایک چیز مشکل ہو تو خدا کے یہاں مشکل نہیں، اس کی قدرت عظیمہ کے سامنے سب آسان ہے، انسان اپنی ہستی ہی کو دیکھ لے، ایک زمانہ تھا کہ یہ کوئی چیز نہ تھی اس کا نام ونشان بھی کوئی نہ جانتا تھا، حق تعالیٰ اس کو پردہ عدم سے وجود میں لایا، پھر جو قادر مطلق لاشیٔ محض کو شیٔ بنادے کیا وہ بوڑھے مرد اور بانجھ عورت سے بچہ پیدا نہیں کرسکتا، اس پر تو بطریق اولیٰ قدرت ہونی چاہیے۔

قَالَ رَبِّ اجۡعَلۡ لِّیۡۤ اٰیَةً ؕ قَالَ اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا ﴿۱۰﴾

بولا اے رب ٹھہرا دے میرے لیے کوئی نشانی، فرمایا تیری نشانی یہ کہ بات نہ کرے تو لوگوں سے تین رات تک صحیح تندرست (چنگا بھلا)

**خلاصہ تفسیر:** (جب) زکریا (علیہ السلام کو قوی امید ہوگئی تو انہوں) نے عرض کیا کہ اے میرے رب! (وعدہ پر تو اطمینان ہوگیا، اب اس وعدہ کے واقع ہونے یعنی حمل قرار پانے کی بھی) کوئی علامت میرے لئے مقرر فرما دیجئے (تاکہ زیادہ شکر کروں اور خود وقوع تو ظاہری محسوسات ہی میں سے ہے) ارشاد ہوا کہ تمہاری (وہ) علامت یہ ہے کہ تم تین رات (اور تین دن تک) آدمیوں سے بات (چیت) نہ کرسکو گے حالانکہ تندرست ہوگے (کوئی بیماری وغیرہ نہ ہوگی اور اسی وجہ سے ذکر اللہ کے ساتھ کلام کرنے پر قدرت رہے گی)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی باوجود تندرست ہونے کے جب کامل تین رات دن لوگوں کے ساتھ زبان سے بات چیت نہ کرسکے اس وقت سمجھ لینا کہ حمل قرار پاگیا ہے، اس کے متعلق مفصل کلام ''آل عمران'' کے فوائد میں گزر چکا، ملاحظہ کرلیا جائے۔

فَخَرَجَ عَلٰی قَوۡمِهٖ مِنَ الۡمِحۡرَابِ فَاَوۡحٰۤی اِلَیۡهِمۡ اَنۡ سَبِّحُوۡا بُكۡرَةً وَّعَشِیًّا ﴿۱۱﴾

پھر نکلا اپنے لوگوں کے پاس حجرہ سے تو اشارہ سے کہا ان کو کہ یاد کرو (تسبیح پڑھو) صبح اور شام

**خلاصہ تفسیر:** (چنانچہ اللہ کے حکم سے زکریا علیہ السلام کی بیوی حاملہ ہوئیں اور علامت کے مطابق زکریا علیہ السلام کی زبان بند ہوگئی) پس حجرے میں سے اپنی قوم کے پاس برآمد ہوئے اور ان کو ارشارہ سے فرمایا (کیونکہ زبان سے تو بول نہ سکتے تھے) کہ تم لوگ صبح اور شام خدا کی پاکی بیان کیا کرو۔

اَنۡ سَبِّحُوۡا بُكۡرَةً وَّعَشِیًّا: یہ تسبیح کا حکم یا تو حسب معمول تھا کہ ہمیشہ زبان سے ان کی یاددہانی کرتے تھے، یا اس نئی نعمت کے شکر میں خود بھی تسبیح کی زیادتی فرمائی اور دوسروں کو بھی اس کا حکم دیا۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جب وہ وقت آیا تو زبان گفتگو کرنے سے رک گئی، حجرہ سے باہر نکل کر لوگوں کو اشارہ سے کہا کہ صبح وشام اللہ کو یاد کرو، نمازیں پڑھو، تسبیح وتہلیل میں مشغول رہو، یہ کہنا یا تو حسب معمول سابق وعظ ونصیحت کے طور پر ہوگا یا نعمت الٰہیہ کی خوشی محسوس کرکے چاہا کہ دوسرے بھی ذکر وشکر میں ان کے شریک حال ہوں، کیونکہ جیسا ''آل عمران'' میں گزرا حضرت زکریا کو حکم تھا کہ ان تین دن میں خدا کو بہت کثرت سے یاد کریں، اور خاص تسبیح کا لفظ شاید اس لیے اختیار کیا ہو کہ اکثر عجیب وغریب سماں دیکھنے پر آدمی ''سبحان اللہ'' کہا کرتا ہے۔

یٰیَحۡیٰی خُذِ الۡكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ وَاٰتَیۡنٰهُ الۡحُكۡمَ صَبِیًّا ﴿۱۲﴾ وَّحَنَانًا مِّنۡ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ؕ وَكَانَ تَقِیًّا ﴿۱۳﴾

اے یحییٰ! اٹھالے کتاب زور سے [1] اور دیا ہم نے اس کو حکم کرنا لڑکپن میں [2] اور شوق دیا اپنی طرف سے اور ستھرائی، اور تھا پرہیزگار [3]

وَّبَرًّۢا بِوَالِدَیۡهِ وَلَمۡ یَكُنۡ جَبَّارًا عَصِیًّا ﴿۱۴﴾

اور نیکی کرنے والا اپنے ماں باپ سے اور نہ تھا زبردست خودسر [4]

**خلاصہ تفسیر:** (غرض پھر یحییٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اور سن شعور کو پہنچے تو انہیں حکم ہوا کہ) اے یحییٰ! کتاب کو (یعنی توریت کو کیونکہ اس وقت وہی شریعت کی کتاب تھی، انجیل کا نزول بعد میں ہوا) مضبوط ہو کر لو (یعنی خاص کوشش کی ساتھ عمل کرو) اور ہم نے ان کو (ان کے)

لڑکپن ہی میں (دین کی) سمجھ اور خاص اپنے پاس سے رقت قلب (کی صفت) اور (اخلاق کی) پاکیزگی عطا فرمائی تھی (''حکم'' میں علم کی طرف، اور ''حنان وزکوٰۃ'' میں اخلاق کی طرف اشارہ ہوگیا) اور (آگے ظاہری اعمال کی طرف اشارہ فرمایا کہ) وہ بڑے پرہیزگار اور اپنے والدین کے خدمت گزار تھے (اس میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی طرف اشارہ ہوگیا) اور وہ (خلق کے ساتھ) سرکشی کرنے والے (یا حق تعالیٰ کی) نافرمانی کرنے والے نہ تھے۔

**وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا:** اس میں اس قول کی اصل ہے جو اکثر لوگوں کی زبان پر جاری ہوتا ہے کہ فلاں شخص مادرزاد یعنی پیدائشی ولی ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی تورات اور دوسرے آسمانی صحیفوں کو جو تم پر یا دوسرے انبیاء پر نازل کیے گئے ہوں، خوب مضبوطی اور کوشش سے تھامے رکھو، ان کی تعلیمات پر خود عمل کرو اور دوسروں سے کراؤ، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی علم کتاب لوگوں کو سکھلانے لگا زور سے، یعنی باپ ضعیف تھے اور یہ جوان''۔

**فائدہ:** ۲؎ لڑکپن ہی میں ان کو حق تعالیٰ نے فہم ودانش علم وحکمت فراست صادقہ احکام کتاب اور آداب عبودیت وخدمت کی معرفت عطا فرمادی تھی لڑکوں نے ایک مرتبہ انھیں کھیلنے کو بلایا کہا ہم اس واسطے نہیں بنائے گئے، بہت سے علماء کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے عام عادت کے خلاف ان کو لڑکپن ہی میں نبوت بھی عطا فرمادی۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو شوق وذوق، رحمت وشفقت، رقت ونرم دلی، محبت اور محبوبیت عنایت فرمائی تھی، اور صاف ستھرا، پاکیزہ رُو، پاکیزہ خو، مبارک وسعید متقی و پرہیزگار بنایا، حدیث میں ہے کہ یحییٰ نے نہ کبھی گناہ کیا نہ گناہ کا ارادہ کیا، خدا کے خوف سے روتے روتے رخساروں پر آنسوؤں کی نالیاں سی بن گئی تھیں، علیہ وعلی نبینا الصلوٰۃ والسلام۔

**فائدہ:** ۴؎ یعنی متکبر، سرکش اور خودسر نہ تھا، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی آرزو کے لڑکے اکثر ایسے ہوا کرتے ہیں وہ ویسا نہ تھا''۔

| |
|---|
| وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿۱۵﴾ |
| اور سلام ہے اس پر جس دن پیدا ہوا اور جس دن مرے اور جس دن اٹھ کھڑا ہو زندہ ہو کر |

**خلاصہ تفسیر:** اور (وہ عند اللہ ایسے وجیہ اور مکرم تھے کہ ان کے حق میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ) ان کو (اللہ تعالیٰ کا) سلام پہنچے جس دن کہ وہ پیدا ہوئے اور جس دن کہ وہ انتقال کریں گے اور جس دن (قیامت میں) زندہ ہو کر اٹھائے جائیں گے۔

* * *

**فائدہ:** اللہ جو بندہ پر سلام بھیجے محض تشریف وعزت افزائی کے لیے ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس پر کچھ گرفت نہیں، یہاں **يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا** سے غرض تعمیم اوقات واحوال ہے، یعنی ولادت سے لے کر موت تک اور موت سے قیامت تک کسی وقت اس پر خوردہ گیری نہیں، خدا کی پکڑ سے ہمیشہ مامون ومصؤن ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ﴿۱۶﴾ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ

اور مذکور کر کتاب میں مریم کا، جب جدا ہوئی اپنے لوگوں سے ایک شرقی مکان میں ۱؎ پھر پکڑ لیا (کرلیا) ان سے ورے

حِجَابًا ۫ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿۱۷﴾

ایک پردہ، پھر بھیجا ہم نے اس کے پاس اپنا فرشتہ پھر بن کر آیا اس کے آگے آدمی پورا ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** (دوسرا قصہ) اور (اے محمد ﷺ!) اس کتاب (یعنی قرآن کی اس خاص سورت) میں (حضرت) مریم (علیہا السلام) کا قصہ بھی ذکر کیجئے (کیونکہ زکریا علیہ السلام کے قصہ کے ساتھ یہ خاص مناسبت رکھتا ہے اور وہ اس وقت واقع ہوا) جب کہ وہ اپنے گھر والوں سے علیحدہ (ہوکر) ایک ایسے مکان میں جو مشرق کی جانب میں تھا (غسل کے لئے) گئیں، پھر ان (گھر والے) لوگوں کے سامنے سے انھوں نے (درمیان میں) پردہ ڈال لیا (تا کہ اس کی آڑ میں غسل کر سکیں) پس (اس حالت میں) ہم نے اپنے فرشتہ (جبرئیل علیہ السلام) بھیجا اور وہ (فرشتہ) ان کے سامنے (ہاتھ پاؤں اور صورت وشکل میں) ایک پورا آدمی بن کر ظاہر ہوا۔

**اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا:** حضرت مریم کا رہن سہن پہلے مسجد کے متصل مکانات میں تھا، پس اس وقت اگر یہ جوان تھیں تب تو اپنی خالہ یعنی حضرت زکریا کی زوجہ کے پاس ان کے گھر میں آ رہی ہوں گے، اور اگر جوان نہ تھیں جیسا کہ بعض کا قول ہے تو غسل کے لیے گھر آئی ہوں گی اور غسل کو مفسرین نے روایات سے بھی نقل کیا ہے، اور ان کا پردہ ڈالنا بھی اس پر دلالت کرتا ہے، اس مکان کا شرقی ہونا قصداً وارادتاً نہیں تھا بلکہ ایک اتفاقی امر تھا۔

**فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا:** شاید اصلی صورت میں فرشتہ کے نہ آنے کی یہ حکمت ہو کہ حضرت مریم ڈر نہ جائیں اور خاص انسان کی صورت میں اس لیے آئے ہوں کہ جنس کو جنس سے انس ہوتا ہے، اس سے مسئلہ تمثل ثابت ہوتا ہے، "تمثل" کہتے ہیں کہ اپنی حقیقت کو باقی رکھتے ہوئے کسی دوسری شکل میں ظاہر ہونا، اس دوسری شکل کو "صورت مثالی" بھی کہا جاتا ہے، تمثل میں حقیقت زائل نہیں ہوتی، صرف صورت بدل جاتی ہے، جبرائیل امین اپنی حقیقت کے لحاظ سے فرشتہ ہی تھے، لیکن انسانی شکل میں سیدہ مریم کے پاس آئے، یعنی ملکی صورت تبدیل ہوگئی بشری صورت میں، چنانچہ صورت بدلنے سے فرشتہ کی حقیقت کا بدل جانا بھی لازم نہیں آتا، یہ صورتیں ان کی حقیقت کے اعتبار سے ایسی ہیں جیسے ہمارے اعتبار سے مختلف لباس، اور فرشتوں کے صورت بدل لینے پر یہ شبہ نہیں ہوسکتا کہ پھر ہر شخص میں یہ احتمال ہے کہ شاید کوئی دوسری مخلوق اس شخص کی شکل میں ظاہر ہوئی ہو، وجہ یہ ہے کہ ایسے امور شاذ ونادر واقع ہوتے ہیں، سو بغیر دلیل کے یہ احتمال محض فضول ہے جو عقلاً بالکل معتبر نہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱۔ یعنی غسل حیض کرنے کو یہ ہی پہلا حیض تھا، ۱۳ برس کی عمر تھی یا ۱۵ برس کی، شرم کے مارے مجمع سے الگ ہوکر ایک مکان میں چلی گئیں جو بیت المقدس سے مشرق کی طرف تھا اس لیے نصاری نے مشرق کو اپنا قبلہ بنالیا۔

**فائدہ:** ۲۔ حضرت جبرائیل نوجوان خوبصورت مرد کی شکل میں پہنچے، جیسا کہ فرشتوں کی عادت ہے کہ عموماً خوش منظر صورتوں میں متمثل ہوتے ہیں، اور ممکن ہے یہاں حضرت مریم علیہا السلام کی انتہائی عفت و پاکبازی کا امتحان بھی مقصود ہو کہ ایسے زبردست دواعی ومحرکات بھی اس کے جذبات عفاف وتقویٰ کو ادنیٰ ترین جنبش نہ دے سکے۔

قَالَتْ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ﴿۱۸﴾

بولی مجھ کو رحمان کی پناہ تجھ سے اگر ہے تو ڈر رکھنے والا

**خلاصہ تفسیر:** (چونکہ حضرت مریم نے ان کو انسان سمجھا، اس لئے گھبرا کر) کہنے لگیں کہ میں تجھ سے اپنے خدا کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو (کچھ) خدا ترس ہے (تو یہاں سے ہٹ جائے گا)۔

* * *

**فائدہ:** مریم نے اول وہلہ میں سمجھا کہ کوئی آدمی ہے، تنہائی میں دفعتاً ایک مرد کے سامنے آجانے سے قدرتی طور پر خوفزدہ ہوئیں اور اپنی حفاظت کی فکر کرنے لگیں، مگر معلوم ہوتا ہے کہ فرشتہ کے چہرہ پر تقویٰ وطہارت کے انوار چمکتے دیکھ کر اسی قدر کہنا کافی سمجھا کہ میں تیری طرف سے رحمان کی پناہ میں آتی ہوں، اگر تیرے دل میں خدا کا ڈر ہوگا (جیسا کہ پاک ونورانی چہرہ سے روشن تھا) تو میرے پاس سے چلا جائے گا اور مجھ سے کچھ تعرض نہ کریگا۔

قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ⑲

بولا میں تو بھیجا ہوا ہوں تیرے رب کا، کہ دے جاؤں تجھ کو ایک لڑکا ستھرا

**خلاصہ تفسیر:** فرشتہ نے کہا کہ (میں بشر نہیں کہ تم مجھ سے ڈرتی ہو، بلکہ) میں تو تمہارے رب کا بھیجا ہوا (فرشتہ) ہوں (اس لئے آیا ہوں) تاکہ تم کو ایک پاکیزہ لڑکا دوں (یعنی تمہارے منہ میں یا گریبان میں دَم کر دوں جس کے اثر سے بحکم الٰہی حمل رہ جائے اور لڑکا پیدا ہو)۔

لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا: اس میں عطاءِ فرزند کو جبرئیل علیہ السلام نے اپنی طرف اس لئے منسوب کیا کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لئے بھیجا تھا کہ ان کے گریبان میں پھونک ماردیں، یہ پھونک عطاءِ فرزند کا ذریعہ بن جائے گی، اگرچہ یہ عطاء دراصل فعلِ الٰہی ہے، اور اس خاص غرض کے لیے فرشتہ کے آنے اور کلام کرنے سے حضرت مریم کا نبی ہونا لازم نہیں آتا۔

* * *

**فائدہ:** یعنی گھبراؤ نہیں میری نسبت کوئی برا خیال آیا ہو تو دل سے نکال دو، میں آدمی نہیں، تیرے اس رب کا (جس کی تو پناہ ڈھونڈتی ہے) بھیجا ہوا فرشتہ ہوں، اس لیے آیا ہوں کہ خداوند قدوس کی طرف سے تجھ کو ایک پاکیزہ، صاف ستھرا اور مبارک و مسعود لڑکا عطا کروں، غُلٰمًا زَكِيًّا (پاکیزہ لڑکا) کہنے میں اشارہ ہو گیا کہ وہ حسب و نسب اور اخلاق وغیرہ کے اعتبار سے بالکل پاک و صاف ہوگا۔

قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ⑳

بولی کہاں سے ہوگا میرے لڑکا اور چھوا نہیں مجھ کو آدمی نے اور میں بدکار کبھی نہیں تھی

**خلاصہ تفسیر:** وہ (تعجب سے) کہنے لگیں (نہ کہ انکار سے) کہ (بھلا) میرے لڑکا کس طرح ہو جائے گا حالانکہ (اس کی ظاہری شرائط میں سے مرد کے ساتھ قربت بھی ایک شرط ہے اور وہ بالکل مفقود ہے، کیونکہ) مجھ کو کسی بشر نے ہاتھ تک نہیں لگایا (یعنی نہ میرا تو نکاح ہوا) اور نہ میں بدکار ہوں۔

یہ شبہ نہیں ہوسکتا کہ حضرت مریم نے فرشتہ کا نرا دعوی کیسے قبول کرلیا؟ کیونکہ پہلے پہلے اگرچہ حضرت مریم نے فرشتہ کو نہیں پہچانا تھا مگر ان کی تقریر سن کر فراست اور نور ولایت سے پہچان لیا اور یقین آ گیا۔

* * *

**فائدہ:** مریم علیہ السلام کے دل میں خدا نے یقین ڈال دیا کہ بیشک یہ فرشتہ ہے، مگر تعجب ہوا کہ جس عورت کا شوہر نہیں جو اس کو حلال طریقہ سے چھو سکتا، اور بدکار بھی نہیں کہ حرام طریقہ سے بچہ حاصل کر لے، اس کو بحالت راہنہ پاکیزہ اولاد کیونکر مل جائے گی، جیسا کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے اس سے کم عجیب بشارت پر سوال کیا تھا۔

قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ

بولا یونہی ہے، فرما دیا تیرے رب نے وہ مجھ پر آسان ہے [1] اور اس کو ہم کیا چاہتے ہیں لوگوں کے لیے نشانی اور مہربانی اپنی طرف سے

وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ㉑

اور ہے یہ کام مقرر ہو چکا [2]

**خلاصہ تفسیر:** فرشتہ نے کہا کہ (بس بغیر کسی آدمی کے چھونے کے) یوں ہی (لڑکا) ہو جائے گا (اور میں اپنی طرف سے نہیں کہتا،

بلکہ) تمہارے رب نے ارشاد فرمایا ہے کہ یہ بات (یعنی ظاہری اسباب کے بغیر پیدا کردینا) مجھ کو آسان ہے، اور (یہ بھی فرمایا کہ ہم ظاہری اسباب کے بغیر) اسے خاص طور پر اس لئے پیدا کریں گے تا کہ ہم اس فرزند کو لوگوں کے لئے (قدرت الہیہ کی) ایک نشانی بنادیں اور (نیز اس کے ذریعہ لوگوں کو ہدایت پانے کے لئے) اس کو باعث رحمت بنادیں، اور یہ (بغیر باپ کے اس بچہ کا پیدا ہونا) ایک طے شدہ بات ہے (جو ضرور ہو کر رہے گی)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یہ وہی جواب ہے جو حضرت زکریا علیہ السلام کو دیا گیا تھا، گذشتہ رکوع میں دیکھ لیا جائے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی یہ کام ضرور ہو کر رہے گا، پہلے سے طے شدہ ہے، تخلف نہیں ہوسکتا، ہماری حکمت اسی کو مقتضی ہے کہ بدون مس بشر کے محض عورت کے وجود سے بچہ پیدا کیا جائے، اور وہ دیکھنے اور سننے والوں کے لیے ہماری قدرت عظیمہ کی ایک نشانی ہو کیونکہ تمام انسان مرد و عورت کے ملنے سے پیدا ہوتے ہیں، آدم علیہ السلام دونوں کے بدون پیدا ہوئے اور حوا کو صرف مرد کے وجود سے پیدا کیا گیا، چوتھی صورت یہ ہے کہ جو حضرت مسیح میں ظاہر ہوئی کہ مرد کے بدون صرف عورت کے وجود سے ان کا وجود ہوا، اس طرح پیدائش کی چاروں صورتیں واقع ہوگئیں، پس حضرت مسیح علیہ السلام کا وجود قدرت الٰہیہ کا ایک نشان اور حق تعالیٰ کی طرف سے دنیا کے لیے بڑی رحمت کا سامان ہے۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ

پھر پیٹ میں لیا اس کو ۱ پھر یکسو ہوئی اس کو لے کر ایک بعید مکان میں ۲ پھر لے آیا اس کو درد زہ ایک کھجور کی جڑ میں

قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿۲۳﴾

بولی کسی طرح میں مرچکتی اس سے پہلے اور ہو جاتی بھولی بسری ۳

**خلاصہ تفسیر:** پھر (اس گفتگو کے بعد جبرئیل علیہ السلام نے ان کے گریبان میں پھونک ماردی جس سے) ان کے پیٹ میں لڑکا رہ گیا، پھر (جب اپنے وقت پر حضرت مریم کو بچہ کی پیدائش کے آثار محسوس ہوئے تو) اس حمل کو لئے ہوئے (اپنے گھر سے) کسی دور جگہ (جنگل پہاڑ میں) الگ چلی گئیں، پھر (جب درد شروع ہوا تو) درد زِہ کی وجہ سے کھجور کے درخت کی طرف آئیں (کہ اس کے سہارے بیٹھیں اٹھیں، اب حالت یہ تھی کہ نہ کوئی انیس نہ جلیس، درد سے بے چین، ایسے وقت جو سامان راحت وضرورت کا ہونا چاہیے وہ ندارد، ادھر بچہ ہونے پر بدنامی کا خیال، آخر گھبرا کر) کہنے لگیں کاش میں اس (حالت) سے پہلے مرگئی ہوتی اور ایسی نیست و نابود ہو جاتی کہ کسی کو یاد بھی نہ رہتی۔

يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا: موت کی تمنا اگر دنیا کے غم سے تھی تب تو غلبہ حال کی وجہ سے حضرت مریم علیہا السلام کو معذور کہا جائے گا، کیونکہ ایسی حالت میں انسان پوری طرح مکلف نہیں رہتا، اور اگر دین کے غم سے تھی کہ لوگ مجھے بدنام کریں گے اور شاید مجھ سے اس پر صبر نہ ہو سکے تو بے صبری کے گناہ میں مبتلا ہوں گی، یا لوگ ملامت کی وجہ سے گناہ میں مبتلا ہوں گے تو موت کی وجہ سے اس گناہ سے حفاظت رہے گی تو ایسی تمنا ممنوع نہیں ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ کہتے ہیں فرشتہ نے پھونک ماری حمل ٹھہر گیا، وفی البحر: وَذَكَرُوْا اَنَّ جِبْرَءِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ نَفَخَ فِيْ جَيْبِ دَرْعِهَا اَوْفِيْهِ وَفی كُمِّهَا والظاهر ان المسند اليه لنفخ هو الله تعالىٰ لقوله فنفخنا (ص۱۸۱/۶) کما قال فی ادم ونفخت فيه من روحی والله اعلم۔

**فائدہ:** ۲ یعنی جب وضع حمل کا وقت قریب آیا شرم کے مارے سب سے علیحدہ ہو کر کسی بعید مکان میں چلی گئی، شاید وہ ہی جگہ ہو جسے ''بیت اللحم'' کہتے ہیں، یہ مقام ''بیت المقدس'' سے آٹھ میل ہے ذکرہ ابن کثیر عن وهب۔

**فائدہ:** ۳ یعنی دردزہ کی تکلیف سے ایک کھجور کی جڑ کا سہارا لینے کے لیے اس کے قریب جا پہنچی، اس وقت درد کی تکلیف، تنہائی و بیکسی،

سامان ضرورت وراحت کا فقدان، اور سب سے بڑھ کر ایک مشہور پاکباز عفیفہ کو دینی حیثیت سے آئندہ بدنامی اور رسوائی کا تصور سخت بے چین کیے ہوئے تھا، حتیٰ کہ اسی کرب واضطراب کے غلبہ میں کہہ اٹھی: يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا (کاش میں اس وقت کے آنے سے پہلے ہی مرچکی ہوتی کہ دنیا میں میرا نام ونشان نہ رہتا اور کسی کو بھولے سے بھی یاد نہ آتی) شدت کرب واضطراب میں گذشتہ بشارات بھی جو فرشتہ سے سنی تھیں یاد نہ آئیں۔

| |
|---|
| فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿٢٤﴾ |
| پس آواز دی اس کو اس کے نیچے سے کہ غمگین مت ہو کر دیا تیرے رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ |
| وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿٢٥﴾ |
| اور ہلا اپنی طرف کھجور کی جڑ اس سے گریں گی تجھ پر پکی کھجوریں [1] |

**خلاصہ تفسیر:** پس (اسی وقت خدا تعالیٰ کے حکم سے حضرت) جبرئیل (علیہ السلام پہنچے اور ان کے احترام کی وجہ سے سامنے نہیں گئے، بلکہ جس جہاں حضرت مریم تھی اس سے نیچے کسی جگہ آڑ میں آئے اور انھوں) نے ان کے (اس) پائیں (مکان) سے ان کو پکارا (جس کو حضرت مریم نے پہچانا کہ یہ اسی فرشتہ کی آواز ہے جو پہلے ظاہر ہوا تھا) کہ تم (بے سروسامانی سے یا بدنامی کے خوف سے) مغموم مت ہو (کیونکہ بے سروسامانی کا تو یہ انتظام ہوا ہے کہ) تمہارے رب نے تمہارے پائیں (مکان) میں ایک نہر پیدا کردی ہے، اور اس کھجور کے تنہ کو (پکڑ کر) اپنی طرف کو ہلاؤ اس سے تم پر تروتازہ کھجوریں جھڑیں گی (کہ اس سے پھل کھانے میں جسمانی لذت اور اس کھجور کے درخت پر خلاف عادت کرامت کے طور پر پھل آجانے سے روحانی لذت تھی)۔

قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا: نہر کے دیکھنے اور پانی پینے سے طبعی فرحت ہوتی ہے، نیز روح المعانی کی روایت کے مطابق انہیں اس وقت پیاس بھی لگی تھی اور اگر وہ پانی گرم بھی ہو جیسا کہ بعض چشموں میں دیکھا جاتا ہے تو مزاج کے بھی بہت موافق ہوگا، کیونکہ طبی مسئلہ کی رو سے گرم چیزوں کا استعمال بچہ پیدا ہونے سے پہلے ولادت کو آسان کردیتا ہے اور ولادت کے بعد فضلات کو دور کرتا ہے اور طبیعت کو قوت دیتا ہے، نیز طبعی قوت کے علاوہ خلاف عادت کرامت کے طور پر اس نہر کا پیدا ہونا چونکہ عنداللہ مقبول ہونے کی علامت تھی اس لیے روحانی مسرت بھی اس سے حاصل تھی۔

بِجِذْعِ النَّخْلَةِ: دردزہ میں پانی اور کھجور کا استعمال طبی طور پر بھی مفید ہے، کھجور بھرپور غذا ہے جس سے خون اور صحت مندی حاصل ہوتی ہے، گردہ، کمر اور جوڑوں کے لیے مقوی ہونے کی وجہ سے زچہ کے لئے سب غذاؤں اور دواؤں سے بہتر ہے، اور کھجور میں حرارت وگرمی ہونے کی وجہ سے جو اس کے نقصان کا احتمال ہے سو اوّل تو تازہ کھجور میں گرمی کم ہوتی ہے، دوسرے پانی سے اس کی اصلاح ہوسکتی ہے، تیسرے نقصان جب ظاہر ہوتا ہے کہ اعضا میں کمزوری ہو، ورنہ کوئی چیز بھی کچھ نہ کچھ نقصان سے خالی نہیں ہوتی۔

وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو کھجور کا درخت ہلانے کا حکم دیا، حالانکہ اس کی قدرت میں یہ بھی تھا کہ بغیر ان کے ہلانے کے خود ہی کھجوریں ان کی گود میں گر جاتیں، مگر حکمت یہ ہے کہ اس میں حصول رزق کے لئے کوشش کرنے کا سبق ملتا ہے اور یہ بھی بتلانا ہے کہ اسباب کے درجہ میں رزق کے حاصل کرنے میں کوشش اور محنت کرنا توکل کے خلاف نہیں۔

* * *

**فائدہ:** [1] وہ مقام جہاں حضرت مریم علیہا السلام کھجور کے نیچے تشریف رکھتی تھیں قدرے بلند تھا، اس کے نیچے سے پھر اسی فرشتہ کی آواز سنائی دی کہ غمگین و پریشان مت ہو، خدا کی قدرت سے ہر قسم کا ظاہری و باطنی اطمینان حاصل کر، نیچے کی طرف دیکھ، اللہ تعالیٰ نے کیسا چشمہ یا نہر جاری کر

دی ہے، یہ تو پینے کے لیے ہوا، کھانے کے لیے اسی کھجور کو ہلاؤ، پکی اور تازہ کھجوریں ٹوٹ کر گریں گی۔

**تنبیہ:** بعض سلف نے ”سری“ کے معنی ”عظیم الشان سردار“ کے لیے ہیں، یعنی خدا تعالیٰ تجھ سے ایک بڑا سردار پیدا کرنے والا ہے، جنہوں نے ”سری“ کے معنی چشمہ یا نہر کے لیے ظاہر یہ ہے کہ وہ چشمہ بطور خرق عادت نکالا گیا اور کھجوریں بھی خشک درخت پر بے موسم لگ گئیں، ان خوارق کا دیکھنا مریم کی تسکین واطمینان اور تفریح کا سبب تھا، اور جیسا کہ مفسرین نے لکھا ہے اس حالت میں یہ چیزیں مریم علیہا السلام کے لیے مفید تھیں اور انھیں ضرورت بھی ہوگی۔

| |
|---|
| فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ |
| اب کھا اور پی اور آنکھ ٹھنڈی رکھ۔ پھر اگر تو دیکھے کوئی آدمی، تو کہیو میں نے مانا ہے رحمان کا |
| صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ﴿٢٦﴾ |
| روزہ سو بات نہ کروں گی آج کسی آدمی سے ۲ |

**خلاصہ تفسیر:** پھر (اس پھل کو) کھاؤ اور (وہ پانی) پیو اور آنکھیں ٹھنڈی کرو (یعنی بچہ کے دیکھنے سے، کھانے پینے سے اور عنداللہ مقبول ہونے کی علامت سے خوش رہو) پھر (جب بدنامی کے احتمال کا موقع آئے یعنی کوئی آدمی اس قصہ پر مطلع ہو اور تہمت لگائے تو اس کا یہ انتظام ہوا ہے کہ) اگر تم آدمیوں میں سے کسی کو بھی (آتا اور اعتراض کرتا) دیکھو تو (تم کچھ مت بولنا، بلکہ اشارہ سے اس سے) کہہ دینا کہ میں نے تو اللہ کے واسطے (ایسے) روزہ کی منت مان رکھی ہے (جس میں بولنے کی بندش ہے) سو (اس وجہ سے) میں آج (دن بھر) کسی آدمی سے نہیں بولوں گی (اور خدا کے ذکر و دعا میں مشغول ہونا اور بات ہے، بس تم اتنا جواب دے کر بے فکر ہو جانا، پھر اللہ تعالیٰ معجزہ کے طور پر اس بچہ کو بولتا کر دے گا جو تمہاری عصمت ونزاہت کی دلیل ہو جائے گی، غرض ہر غم کا علاج ہو گیا)۔

**فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ:** یہاں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ پیچھے حضرت مریم کی تسلی کے اسباب ذکر کرنے کے وقت تو پہلے پانی کا ذکر فرمایا پھر کھانے کی چیز کھجور کا، اور یہاں جب استعمال کا ذکر آیا تو ترتیب بدل کر پہلے کھانے کا حکم فرمایا پھر پانی پینے کا، وجہ غالباً یہ ہے کہ انسان کی فطری عادت ہے کہ پانی کا اہتمام کھانے سے پہلے کرتا ہے، خصوصاً ایسی غذا جس کے بعد پیاس لگنا یقینی ہو اس کے کھانے سے پہلے پانی مہیا کرتا ہے مگر استعمال کی ترتیب یہ ہوتی ہے کہ پہلے غذا کھاتا ہے پھر پانی پیتا ہے۔

**اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا:** اگر شبہ ہو کہ حضرت مریم کو جو یہ کہا گیا کہ ”تم کہہ دینا کہ میں نے نذر کی ہے“ سو انہوں نے نذر تو نہ کی تھی، جواب یہ ہے کہ اسی سے یہ حکم بھی سمجھا گیا کہ تم نذر بھی کر لینا اور اس کو ظاہر کر دینا۔

**فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا:** اگر جھوٹے الزام اور بہتان کا سامنا ہو یا کہیں ضدی اور جاہل انسانوں سے سابقہ پڑے تو سکوت اختیار کر لینا چاہیے، اللہ کی غیبی تائید اس کا علاج کر دیتی ہے۔

بغیر مرد کے تنہا عورت سے بچہ پیدا ہو جانا خلاف عقل نہیں، مرد کے واسطہ کے بغیر حمل قرار پانا اور بچہ پیدا ہونا یہ معجزہ ہے، اور معجزات میں خواہ کتنا ہی استبعاد ہو مضائقہ نہیں، بلکہ معجزہ کا اور زیادہ ظہور ہے، لیکن اس واقعہ میں تو کچھ بہت زیادہ استبعاد بھی نہیں، کیونکہ طب کی کتابوں میں لکھا ہے کہ تنہا عورت کی منی سے بھی اعضا بن سکتے ہیں، اس لیے رجا کی بیماری میں کچھ نا تمام اعضا کی صورت بن جاتی ہے، قانون میں اس کی صراحت ہے، پس اگر یہی قوت کچھ اور بڑھ جائے کہ پوری صورت عورت ہی کی منی سے بن جائے تو کیا مشکل ہے۔

* * *

**فائدہ:** لـ یعنی یعنی تازہ کھجوریں کھا کر چشمہ کے پانی سے سیراب ہو، اور پاکیزہ بیٹے کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کر، آگے کا غم نہ کھا، خدا تعالیٰ سب مشکلات کو دور کرنے والا ہے۔

**فائدہ:** ٢ یعنی اگر کوئی آدمی سوال کرے تو اشارہ وغیرہ سے ظاہر کر دینا کہ میں روزہ سے ہوں، مزید گفتگو نہیں کرسکتی، ان کے دین میں یہ نیت درست تھی کہ نہ بولنے کا بھی روزہ رکھتے تھے، ہماری شریعت میں ایسی نیت درست نہیں، اور ''کہیو میں نے مانا ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ روزہ کی نذر کر کے ایسا کہہ دینا، انسیا کی قید شاید اس لیے لگائی کہ فرشتہ سے بات کرنا منع نہ تھا۔

فَاَتَتۡ بِهٖ قَوۡمَهَا تَحۡمِلُهٗ ؕ قَالُوۡا يٰمَرۡيَمُ لَقَدۡ جِئۡتِ شَيۡـًٔـا فَرِيًّا ﴿۲۷﴾

پھر لائی اس کو اپنے لوگوں کے پاس گود میں، وہ اس کو کہنے لگے اے مریم تو نے کی یہ چیز طوفان کی لـ

يٰۤاُخۡتَ هٰرُوۡنَ مَا كَانَ اَبُوۡكِ امۡرَاَ سَوۡءٍ وَّمَا كَانَتۡ اُمُّكِ بَغِيًّا ۖ ﴿۲۸﴾

اے بہن ہارون کی! نہ تھا تیرا باپ برا آدمی اور نہ تھی تیری ماں بدکار ٢

**خلاصہ تفسیر:** (غرض مریم علیہا السلام کی اس کلام سے تسلی ہوگئی اور عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے) پھر وہ ان کو گود میں لیے ہوئے (وہاں سے بستی کو چلیں اور) اپنی قوم کے پاس لائیں، لوگوں نے (جو دیکھا کہ ان کی شادی تو ہوئی نہ تھی یہ بچہ کیسا، بدگمان ہو کر) کہا اے مریم! تم نے بڑے غضب کا کام کیا (یعنی نعوذ باللہ بدکاری کی، یوں تو بدکاری کوئی بھی کرے بڑا گناہ ہے، لیکن تم سے ایسا فعل ہونا زیادہ غضب کی بات ہے، کیونکہ) اے ہارون کی بہن! (تمہارے خاندان میں کبھی کسی نے ایسا نہیں کیا، چنانچہ) تمہارے باپ کوئی برے آدمی نہ تھے (کہ ان سے یہ اثر تم میں آیا ہو) اور نہ تمہاری ماں بدکار تھیں (کہ ان سے یہ اثر تم میں آیا ہو، پھر ہارون جو تمہارے رشتہ کے بھائی ہیں جن کا نام پیغمبر ہارون کے نام پر رکھا گیا ہے وہ تو کیسے کچھ نیک شخص ہیں، غرض جس کا خاندان کا خاندان پاک صاف ہو اس سے یہ حرکت ہونا کتنا بڑا غضب ہے)۔

＊ ＊ ＊

**فائدہ:** لـ یعنی جب بچہ کو گود میں اٹھائے ہوئے اپنی قوم کے سامنے آئی تو لوگ ششدر رہ گئے، کہنے لگے ''مریم تو نے غضب کر دیا، یہ بناوٹ کی چیز کہاں سے لے آئی، اس سے زیادہ جھوٹ طوفان کیا ہوگا کہ ایک لڑکی کنواری رہتے ہوئے دعویٰ کرے کہ میرے بچہ پیدا ہوا ہے''۔

**فائدہ:** ٢ یعنی بدگمان ہو کر کہنے لگے کہ تیرے ماں باپ اور خاندان والے ہمیشہ سے نیک رہے ہیں، تجھ میں یہ بری خصلت کدھر سے آئی؟ بھلوں کی اولاد کا برا ہونا محل تعجب ہے۔

**تنبیہ:** مریم علیہا السلام کو اخت ہارون اس لیے کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل سے تھی، گویا اخت ہارون سے مراد اخت قوم ہارون ہوئی، جیسے وَاذۡكُرۡ اَخَا عَادٍ میں ہود علیہ السلام کو ''عاد'' کا بھائی کہا ہے، حالانکہ ''عاد'' ان کی قوم کے مورث اعلیٰ کا نام تھا اور ممکن ہے اخت ہارون کے ظاہری معنی لیے جائیں جیسا کہ بعض احادیث صحیحہ سے ظاہر ہوتا ہے یعنی مریم کے بھائی کا نام ہارون تھا جیسے ہمارے زمانہ میں رواج ہے، اس وقت بھی لوگ انبیاء وصالحین کے ناموں پر نام رکھتے تھے، کہتے ہیں کہ مریم کا وہ بھائی ایک مرد صالح تھا، تو حاصل کلام یہ ہوا کہ تیرا باپ پاکباز تھا، ماں پارسا تھی، بھائی ایسا نیک ہے اور پر جا کر تیرا نسب ہارون علیہ السلام پر منتہی ہوتا ہے، پھر یہ حرکت تجھ سے کیونکر سرزد ہوئی۔

فَاَشَارَتۡ اِلَيۡهِ ؕ قَالُوۡا كَيۡفَ نُكَلِّمُ مَنۡ كَانَ فِى الۡمَهۡدِ صَبِيًّا ﴿۲۹﴾

پھر ہاتھ سے بتلایا اس لڑکے کو لـ بولے ہم کیونکر بات کریں اس شخص سے کہ وہ ہے گود میں لڑکا ٢

**خلاصہ تفسیر:** پس مریم (علیہا السلام) نے (یہ ساری تقریر سن کر خود کوئی جواب نہ دیا، بلکہ) بچہ کی طرف اشارہ کر دیا (کہ جو

کچھ کہنا ہو اس سے کہو، یہ جواب دیگا) وہ لوگ (سمجھے کہ یہ ہمارے ساتھ تمسخر کرتی ہیں) کہنے لگے کہ بھلا ہم ایسے شخص سے کیونکر باتیں کریں جو ابھی گود میں بچہ ہی ہے (کیونکہ بات اس شخص سے کی جاتی ہے جو خود بھی بولتا ہو، سو جب یہ بچہ ہے اور بات چیت پر قادر نہیں تو اس سے کیا بات کریں)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی یعنی مریم علیہا السلام نے ہاتھ سے بچہ کی طرف اشارہ کیا کہ خود اس سے دریافت کرو۔

**فائدہ:** ۲ یعنی اس شرمناک حرکت پر یہ ستم ظریفی کہ بچہ سے پوچھ لو، بھلا ایک گود کے بچہ سے ہم کیسے سوال و جواب کر سکتے ہیں۔

**تنبیہ:** مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا میں كَانَ کا لفظ اس پر دلالت نہیں کرتا کہ تکلم کے وقت وہ صبی نہیں رہا تھا، قرآن میں بہت جگہ مثلاً وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا یا وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً یا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ میں ''کان'' کا استعمال ایسے مضمون کے لیے ہوا ہے جس کا سلسلہ زمانہ ماضی کے گزرنے کے ساتھ منقطع نہیں ہوا، اور یہاں مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا سے تعبیر کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ کہنے والوں نے نفی تکلم کو ایک ضابطہ کے رنگ میں پیش کیا، یعنی نہ صرف عیسیٰ بلکہ ہر اس شخص سے جو گود میں بچہ ہو کلام کرنا عادۃً محال ہے۔

قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۗ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ﴿٣٠﴾

وہ بولا میں بندہ ہوں اللہ کا، مجھ کو اس نے کتاب دی ہے اور مجھ کو اس نے نبی کیا ۱

وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۠ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ﴿٣١﴾

اور بنایا مجھ کو برکت والا جس جگہ میں ہوں، اور تاکید کی مجھ کو نماز کی اور زکوٰۃ کی جب تک میں رہوں زندہ ۲

**خلاصہ تفسیر:** (اتنے میں) وہ بچہ (خود ہی) بول اٹھا میں اللہ کا (خاص) بندہ ہوں (نہ تو خدا ہوں جیسا کہ جہلا نصاریٰ سمجھیں گے، اور نہ غیر مقبول ہوں جیسا یہود سمجھیں گے، اور بندہ ہونے اور پھر خاص بندہ ہونے کی علامتیں یہ ہیں کہ) اس نے مجھ کو کتاب (انجیل) دی (یعنی اگرچہ آئندہ دے گا مگر یقینی ہونے کی وجہ سے ایسا ہی ہے جیسا کہ ابھی دے دی) اور اس نے مجھ کو نبی بنایا (یعنی بنائے گا) اور مجھ کو برکت والا بنایا (یعنی مجھ سے مخلوق کو دین کا نفع پہنچے گا) میں جہاں کہیں بھی ہوں (گا مجھ سے برکت پہنچے گی، وہ نفع تبلیغ دین ہے، خواہ کوئی قبول کرے یا نہ کرے، انہوں نے تو نفع پہنچا ہی دیا) اس نے مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا جب تک میں (دنیا میں) زندہ رہوں (اور ظاہر ہے کہ آسمان پر جانے کے بعد مکلف نہیں رہے، یہ دلیل ہے بندہ ہونے کی جیسا کہ خصوصیت کے اور دلائل بھی ہیں)۔

**وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ:** اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ انبیاء علیہم السلام پر زکوۃ فرض نہیں ہوتی تو مطلب یہ ہوگا کہ میری شریعت میں زکوۃ فرض کی گئی ہے اگرچہ امت ہی کے لیے ہو۔

**مَا دُمْتُ حَيًّا:** اس تفسیر سے اہل قادیان کو استدلال کی گنجائش نہیں رہی، وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کو زندگی بھر کے لیے نماز اور زکوۃ کا حکم تھا، سو اگر وہ آسمان پر اٹھا لیے گئے ہوں تو لازم آتا ہے کہ وہاں بھی نماز وغیرہ کے مکلف ہوں گے؟ جواب ظاہر ہے کہ اس جگہ زندگی سے دنیوی زندگی مراد ہے، آسمان پر جانے کے بعد وہ اس کے مکلف نہیں رہے، پھر جب دنیا میں آئیں تو مکلف ہو جائیں گے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ قوم کی طرف سے یہ ہی گفتگو ہو رہی تھی کہ خود مسیح علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے گویا کر دیا، آپ نے اس وقت جو کچھ فرمایا اس میں تمام غلط اور فاسد خیالات کا رد تھا جو آئندہ ان کی نسبت قائم ہونے والے تھے، ''میں بندہ ہوں اللہ کا''، یعنی خود اللہ یا اللہ کا بیٹا نہیں جیسا کہ اب نصاریٰ کا عقیدہ ہے، چنانچہ اسی عقیدہ کی تردید کے لیے پہلے حضرت مسیح کی ولادت وغیرہ کے تفصیلی حالات بیان فرمائے، اور ''مجھ کو خدا نے نبی بنایا''، یعنی مفتری اور کاذب نہیں جیسا کہ یہود گمان کرتے ہیں۔

**تنبیہ:** سورہ آلِ عمران اور مائدہ میں حضرت مسیح کے تکلم فی المہد کے متعلق کلام کیا جاچکا ہے، وہاں دیکھ لیا جائے، صحیح بخاری کی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن تین بچوں کے مہد میں کلام کرنے کا ذکر فرمایا ہے ان میں ایک حضرت مسیح ابن مریم ہیں، آج جو لوگ قرآن و حدیث کے خلاف حضرت مسیح کے تکلم فی المہد کا انکار کرتے ہیں ان کے ہاتھ میں نصاریٰ کی کورانہ تقلید کے سوا کچھ نہیں۔

**فائدہ:** ۲ یعنی جب تک زندہ ہوں، جس وقت اور جس جگہ کے مناسب جس قسم کی صلوٰۃ وزکوٰۃ کا حکم ہو، اس کی شروط وحقوق کی رعایت کے ساتھ برابر ادا کرتا رہوں، جیسے دوسری جگہ مومنین کی نسبت فرمایا: اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر آن اور ہر وقت نمازیں پڑھتے رہتے ہیں، بلکہ یہ مراد ہے کہ جس وقت جس طرح کی نماز کا حکم ہو ہمیشہ پابندی سے تعمیل حکم کرتے ہیں اور اس کی برکات وانوار ہمہ وقت ان کو محیط رہتی ہیں، کوئی شخص کہے کہ ہم جب تک زندہ ہیں، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج وغیرہ کے مامور ہیں کیا اس کا مطلب یہ لیا جائے گا کہ ہر ایک مسلمان مامور ہے کہ ہر وقت نماز پڑھتا ہے، ہر وقت زکوٰۃ دیتا ہے (خواہ نصاب کا مالک ہو یا نہ ہو) ہر وقت روزے رکھتا ہے، ہر وقت حج کرتا ہے، حضرت مسیح کے متعلق بھی مَا دُمْتُ حَيًّا کا ایسا ہی مطلب سمجھنا چاہیے۔

یاد رہے کہ لفظ "صلوٰۃ" کچھ اصطلاحی نماز کے ساتھ مخصوص نہیں، قرآن نے ملائکہ اور بشر سے گزر کر تمام جہان کی طرف صلوٰۃ کی نسبت کی ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ اور یہ بھی بتلا دیا کہ ہر چیز کی تسبیح وصلوٰۃ کا حال اللہ ہی جانتا ہے کہ کس کی صلوٰۃ وتسبیح کس رنگ کی ہے، اسی طرح زکوٰۃ کے معنی بھی اصل میں طہارت، نماز، برکت ومدح کے ہیں، جن میں سے ہر ایک معنی کا استعمال قرآن وحدیث میں اپنے اپنے موقع پر ہوا ہے، اسی رکوع میں حضرت مسیح کی نسبت غُلٰمًا زَكِيًّا کا لفظ گزر چکا جو زکوٰۃ سے مشتق ہے، اور یحییٰ علیہ السلام کو فرمایا: وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً سورہ کہف میں ہے: خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا اسی طرح کے عام معنی یہاں بھی زکوٰۃ کے لیے جاسکتے ہیں اور ممکن ہے: وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ سے اَوْصَانِيْ بِاَنْ اٰمُرَ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مراد ہو جیسے اسماعیل علیہ السلام کی نسبت فرمایا: وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ پھر لفظ اوصانی اپنے مدلول لغوی کے اعتبار سے اس کو مقتضی نہیں کہ وقت ایصاء ہی سے اس پر عمل درآمد شروع ہو جائے، نیز بہت ممکن ہے کہ مَا دُمْتُ حَيًّا سے یہ ہی زمینی حیات مراد لے لی جائے، جیسے ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ جابر رضی اللہ کے والد کو اللہ نے شہادت کے بعد زندہ کر کے فرمایا کہ مجھ سے کچھ مانگ، اس نے کہا مجھے دوبارہ زندہ کر دیجئے کہ دوبارہ تیرے راستہ میں قتل کیا جاؤں، اس زندگی سے یقیناً زمینی زندگی مراد ہے ورنہ شہداء کے لیے نفس حیات کی قرآن میں اور خود اسی حدیث میں تصریح موجود ہے، یہ ہی مطلب حیات کا لَوْ كَانَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى حَيَّيْنِ الخ میں سمجھو اگر بالفرض اس کا حدیث ہونا ثابت ہو جائے، "بالفرض" ہم نے اس لیے کہا کہ اس کی اسناد کا کتب حدیث میں کہیں پتہ نہیں، واللہ اعلم۔

---

وَّبَرًّاۢ بِوَالِدَتِيْ ۫ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿۳۲﴾

اور سلوک کرنے والا اپنی ماں سے ۱ اور نہیں بنایا مجھ کو زبردست بدبخت ۲

---

وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ﴿۳۳﴾

اور سلام ہے مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن مروں اور جس دن اٹھ کھڑا ہوں زندہ ہو کر ۳

---

**خلاصہ تفسیر:** اور مجھ کو میری والدہ کا خدمت گذار بنایا (چونکہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے ہیں، اس لئے صرف والدہ کا ذکر فرمایا) اور اس نے مجھ کو سرکش بدبخت نہیں بنایا (کہ خدا کے حق یا والدہ کے حق کی ادائیگی سے سرکشی کروں، یا ان حقوق واعمال کو ترک کر کے بدبختی خرید لوں) اور مجھ پر (اللہ کی جانب سے) سلام ہے جس روز میں پیدا ہوا اور جس روز مروں گا (کہ وہ آسمان سے اترنے کے بعد قرب قیامت کا زمانہ ہوگا) اور جس

روز میں (قیامت میں) زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا (اور اللہ کا سلام خاص بندہ ہونے کی دلیل ہے)۔

ان آیات میں حضرت عیسی علیہ السلام کے مذکورہ تمام اقوال، احوال اور اوصاف سے حضرت مریم علیہا السلام کی نزاہت اور عصمت ثابت ہوگئی جو خلاف عادت بالکل ہی بچپن میں عیسی علیہ السلام کے بولنے سے ظاہر ہے جس میں سب سے بڑھ کر اس مقصود کو ثابت کرنے والا وصف نبوت ہے، کیونکہ نبوت کے ساتھ نسب کی خرابی جمع نہیں ہوسکتی جو کہ اعلی درجہ میں عار کا سبب ہے، اور نبوت کا ثبوت اس معجزہ سے ہوگیا کہ آپ نے خرق عادت کے طور پر کلام کیا، کیونکہ بے گناہ سے خارق کا صادر ہونا اس کے مقبول ہونے کی دلیل ہے اور مقبول ہونا جھوٹا ہونے کے خلاف ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ چونکہ باپ کوئی نہ تھا اس لیے صرف ماں کا نام لیا۔

**فائدہ:** ۲ یہ سب جملے جو بصیغہ ماضی لائے گئے بیشک اس کے معنی ماضی ہی کے لیے جائیں گے، لیکن اس طرح کہ مستقبل متقین الوقوع کو گویا ماضی فرض کرلیا گیا، جیسے: اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ میں، اس طرح مسیح علیہ السلام نے بچپن میں ماضی کے صیغے استعمال کر کے متنبہ کر دیا کہ ان سب چیزوں کا آئندہ پایا جانا ایسا قطعی اور یقینی ہے کہ اسے یہ ہی سمجھنا چاہیے کہ گویا پائی جاچکی، حضرت مسیح علیہ السلام کی اس خارق عادت گفتگو سے اور ان اوصاف وخصال سے جو بیان کیے نہایت بلاغت کے ساتھ اس ناپاک تہمت کا رد ہوگیا جو ان کی والدہ ماجدہ پر لگائی جاتی تھی، اول تو ایک بچہ کا بولنا، اور ایسا جامع وموثر کلام طبعاً دشمنوں کو خاموش کرنے والا تھا پھر جس ہستی میں ایسی پاکیزہ خصال پائی جائیں، ظاہر ہے، وہ العیاذ باللہ ولد الزنا کیسے ہوسکتی ہے جیسا کہ خود ان کے اقرار مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فروع کو اصول کے موافق دیکھنا چاہتے تھے۔

**فائدہ:** ۳ اس جملہ کے ہم معنی جملہ پہلے حضرت یحیی کے ذکر میں گزر چکا، فرق اتنا ہے کہ وہاں خود حق تعالیٰ کی طرف سے کلام تھا یہاں حق تعالیٰ نے مسیح کی زبان سے وہ ہی بات فرمائی، نیز سَلٰمٌ اور اَلسَّلٰمُ کا فرق بھی قابل لحاظ ہے۔

ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿۳۴﴾ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ

یہ ہے عیسیٰ مریم کا بیٹا، سچی بات جس میں لوگ جھگڑتے ہیں۱ اللہ ایسا نہیں کہ رکھے اولاد

سُبْحٰنَهٗ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۳۵﴾

وہ پاک ذات ہے، جب ٹھہرا لیتا ہے کسی کام کا کرنا سو یہی کہتا ہے اس کو کہ ہو وہ ہو جاتا ہے ۲

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے حضرت عیسی علیہ السلام کا قصہ بیان ہوا، اب اس قصہ کے مضمون پر نتیجہ کے طور توحید کا بیان ہے اور اس کے ساتھ قیامت کے ذکر سے منکرین توحید کو تنبیہ ہے۔

یہ ہیں عیسیٰ بن مریم (جن کے اقوال واحوال سے ان کا مقبول بندہ ہونا معلوم ہوتا ہے، نہ ایسے ہیں جیسے کہ عیسائیوں نے ان کو بندگی سے خارج کر کے خدائی تک پہنچا دیا ہے، اور نہ ویسے جیسا کہ یہودیوں نے ان کو مقبول بندہ بھی نہ مانا، بلکہ طرح طرح کی تہمتیں ان پر لگائی ہیں) میں (بالکل) سچی بات کہہ رہا ہوں جس میں یہ (افراط وتفریط کرنے والے) لوگ جھگڑ رہے ہیں (چنانچہ یہود ونصاریٰ کے اقوال اوپر معلوم ہوئے)۔

(چونکہ یہود کا قول تو ظاہر میں بھی نبی کی تنقیص کا سبب تھا جو کہ بالکل باطل ہے اس لیے اس مقام پر اس کے رد کی طرف توجہ نہیں فرمائی، بخلاف نصاری کے قول کے کہ اس سے بظاہر کمال ثابت ہوتا تھا کہ وہ نبوت کے ساتھ ان کو خدا کا بیٹا بھی ثابت کرتے تھے اس لیے اس کو خاص اہتمام سے رد فرمایا، جس کا حاصل یہ ہے کہ نصاری کے اس قول میں توحید کے انکار کی وجہ سے حق تعالیٰ کی تنقیص لازم آتی ہے، حالانکہ) اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ (کسی کو) اولاد بنائے، وہ (بالکل) پاک ہے (کیونکہ اس کی یہ شان ہے کہ) وہ جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو بس اس کو اتنا فرما دیتا ہے کہ ہو جا،

سووہ ہوجاتا ہے (اور ایسے کمال کے واسطے اولاد کا ہونا عقلاً نقص ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کی شان وصفت یہ ہے جو اوپر بیان ہوئی، ایک سچی اور کھلی ہوئی بات میں لوگوں نے خواہ مخواہ جھگڑے ڈال لیے اور طرح طرح کے اختلافات کھڑے کر دیے، کسی نے ان کو خدا بنا دیا کسی نے خدا کا بیٹا، کسی نے کذاب ومفتری کہا، کسی نے نسب وغیرہ پر طعن کیا، سچی بات وہ ہی ہے جو ظاہر کر دی گئی کہ خدا نہیں، خدا کے مقرب بندے ہیں، جھوٹے مفتری نہیں، سچے پیغمبر ہیں، ان کا حسب نسب سب سے پاک و صاف ہے، خدا نے ان کو **کلمۃ اللہ** فرمایا ہے اور ممکن ہے **قول الحق** کے معنی بھی یہاں **کلمۃ اللہ** کے ہوں۔

**فائدہ:** ۲ جس کے ایک کُنْ (ہوجا) کہنے میں ہر چیز موجود ہو، اسے بیٹے پوتوں کی کیا ضرورت لاحق ہوگی، کیا (العیاذ باللہ) اولاد ضعیفی میں سہارا دے گی؟ یا مشکلات میں ہاتھ بٹائے گی؟ یا اس کے بعد نام چلائے گی؟ اور اگر شبہ ہو کہ عموماً آدمی ماں باپ سے پیدا ہوتا ہے، پھر حضرت مسیح علیہ السلام کا باپ کسے کہیں؟ اس کا جواب بھی اسی جملہ کُنْ فَیَکُوْنُ میں آگیا، یعنی ایسے قادر مطلق کے لیے کیا مشکل ہے کہ ایک بچہ کو بن باپ پیدا کر دے، اگر عیسائی خدا کو باپ اور مریم کو ماں کہتے ہیں تو کیا (معاذ اللہ) دوسرے تعلقاتِ زناشوئی کا بھی اقرار کریں گے؟ باپ مان کر بھی بہرحال تخلیق کا طریقہ وہ تو نہ ہوگا جو عموماً والدین میں ہوتا ہے، پھر بدون باپ کے پیدا ہونے میں کیا اشکال ہے۔

وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۳۶﴾ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ

اور کہا بیشک اللہ ہے رب میرا اور رب تمہارا سو اس کی بندگی کرو، یہ ہے راہ سیدھی، پھر جُدی جُدی راہ اختیار کی فرقوں نے

بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۳۷﴾ اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ ۙ يَوْمَ

ان میں سے، سو خرابی ہے منکروں کو جس وقت دیکھیں گے ایک دن بڑا ۱ کیا خوب سنتے اور دیکھتے ہوں گے جس دن

يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾

آئیں گے ہمارے پاس، پر بے انصاف آج کے دن صریح بہک رہے ہیں ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور (آپ توحید ثابت کرنے کے لیے لوگوں سے فرما دیجئے تاکہ مشرکین بھی سن لیں کہ) بیشک اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے سو (صرف) اسی کی عبادت کرو (اور) یہی (خالص خدا کی عبادت کرنا یعنی توحید اختیار کرنا دین کا) سیدھا راستہ ہے، سو (توحید پر ان عقلی اور نقلی دلائل قائم ہونے کے باوجود پھر بھی) مختلف گروہوں نے (اس بارہ میں) باہم اختلاف ڈال دیا (یعنی توحید کا انکار کر کے طرح طرح کے مذاہب ایجاد کر لئے) سو ان کافروں کے لئے ایک بڑے (بھاری) دن کے آجانے سے بڑی خرابی (ہونے والی) ہے (مراد اس سے قیامت کا دن ہے کہ یہ دن ایک ہزار سال لمبا اور ہولناک ہونے کی وجہ سے بہت عظیم ہوگا) جس روز یہ لوگ (حساب وجزا کے لئے) ہمارے پاس آئیں گے (اس روز) کیسے کچھ شنوا اور بینا (سننے اور دیکھنے والے) ہوجائیں گے (کیونکہ قیامت میں تمام حقائق پیش نظر ہوجائیں گے اور تمام تر غلطیاں رفع ہوجائیں گی) لیکن یہ ظالم آج (دنیا میں کیسی) صریح غلطی میں (مبتلا ہو رہے) ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یہ کس نے کہا؟ بعض کے نزدیک یہ حضرت مسیح علیہ السلام کا مقولہ ہے، گویا پیشتر حضرت مسیح کی جو گفتگو قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا سے نقل کی گئی تھی، یہ اس کا تکملہ ہوا، درمیان میں مخاطبین کی تنبیہ کے لیے: ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ سے حق تعالیٰ کا کلام تھا، میرے نزدیک بہتر یہ ہے کہ اس کو: وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ الخ کے ساتھ لگایا جائے، یعنی (اے محمد ﷺ) کتاب میں

مریم ومسیح کا حال سنا کر جو مذکور ہو چکا، کہہ دو کہ میرا اور تمہارا سب کا رب اللہ ہے، تنہا اسی کی بندگی کرو، بیٹے، پوتے مت بناؤ، سیدھی راہ توحید خالص کی ہے جس میں کچھ اینچ پینچ نہیں، سب انبیاء اسی کی طرف ہدایت کرتے آئے لیکن لوگوں نے بہت سے فرقے بنا لیے اور جدا جدا راہیں نکال لیں، سو جو لوگ توحید کا انکار کر رہے ہیں، انھیں بڑے ہولناک دن (روز قیامت) کی تباہی سے خبردار رہنا چاہیے جو یقینا پیش آنے والی ہے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی آج تو جبکہ سننا اور دیکھنا مفید تھا، بالکل اندھے، بہرے بنے ہوئے ہیں اور قیامت کے دن جب دیکھنا سننا کچھ فائدہ نہ دے گا، آنکھیں اور کان خوب کھل جائیں گے اس وقت وہ باتیں سنیں گے جن سے جگر پھٹ جائیں اور وہ منظر دیکھیں گے جس سے چہرے سیاہ ہو جائیں، نعوذ باللہ منہ۔

وقف لازم

وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۹﴾

اور ڈر سنا دے ان کو اس پچھتاوے کے دن کا جب فیصل ہو چکے گا کام ۱ اور وہ بھول رہے ہیں اور وہ یقین نہیں لاتے ۲

اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴿۴۰﴾ ع ۵

ہم وارث ہوں گے زمین کے اور جو کوئی ہے زمین پر اور وہ ہماری طرف پھر آئیں گے ۳

**خلاصہ تفسیر:** اور آپ لوگوں کو حسرت کے دن سے ڈرائیے جبکہ (جنت دوزخ کا) اخیر فیصلہ کر دیا جائے گا (جس کا ذکر حدیث میں ہے کہ جنت اور دوزخ والوں کو موت دکھلا کر اس کو ذبح کر دیا جائے گا اور دونوں کو خلود یعنی ہمیشہ ہمیشہ اسی حال میں زندہ رہنے کا حکم سنا دیا جائے گا، اور اس وقت بے حد حسرت کا ہونا ظاہر ہے) اور وہ لوگ (آج دنیا میں) غفلت میں (پڑے) ہیں اور وہ لوگ ایمان نہیں لاتے (لیکن آخر ایک دن مریں گے) اور تمام زمین اور زمین پر رہنے والوں کے وارث (یعنی آخر مالک) ہم ہی رہ جائیں گے اور یہ سب ہمارے ہی پاس لوٹائے جائیں گے (پھر اپنے کفر وشرک کی سزا بھگتیں گے)۔

**وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ:** حسرتیں تو مذکورہ وقت سے پہلے بھی بہت ہوں گی لیکن اس وقت کی حسرت سب سے بڑی ہوگی۔

* * *

**فائدہ:** ۱ کافروں کو پچھتانے کے بہت مواقع پیش آئیں گے، آخری موقع وہ ہوگا جب موت کو مینڈھے کی صورت میں لاکر بہشت و دوزخ کے درمیان سب کو دکھا کر ذبح کیا جائے گا اور ندا آئے گی کہ بہشتی بہشت میں اور دوزخی دوزخ میں ہمیشہ کے لیے رہ پڑے، اس کے بعد کسی کو موت آنے والی نہیں، اس وقت کافر بالکل ناامید ہو کر حسرت سے ہاتھ کاٹیں گے، لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

**فائدہ:** ۲ یعنی اس وقت انھیں یقین نہیں کہ واقعی ایسا دن آنے والا ہے وہ غفلت کے نشہ میں مخمور ہیں اور بڑی بھاری بھول میں پڑے ہیں، کاش اس وقت آنکھیں کھولتے اور اپنے نفع نقصان کو سمجھتے اس دن پچھتانے سے حسرت و افسوس کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا: "اَلْئٰنَ قَدْ نَدِمْتَ وَمَایَنْفَعُ النَّدَمُین"

**فائدہ:** ۳ یعنی کسی کا مُلک یا مِلک باقی نہ رہے گی، ہر چیز براہ راست مالک حقیقی کی طرف لوٹ جائے گی، وہی بلا واسطہ حاکم ومتصرف علی الاطلاق ہوگا، جس چیز میں جس طرح چاہے گا اپنی حکمت کے موافق تصرف کرے گا، دنیا کے جن سامانوں نے تم کو غفلت میں ڈال رکھا ہے سب کا ایک ہی وارث باقی رہ جائے گا، مُلک و مِلک کے لمبے چوڑے دعوے رکھنے والے سب فنا کے گھاٹ اتار دیے جائیں گے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۴۱﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ

اور مذکور کر کتاب میں ابراہیم کا ۱ بیشک تھا وہ سچا نبی ۲ جب کہا اپنے باپ کو اے باپ میرے کیوں پوجتا ہے اس کو

مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ﴿۴۲﴾

جو نہ سنے اور نہ دیکھے اور نہ کام آئے تیرے کچھ ۳

**خلاصہ تفسیر:** (تیسرا قصہ) اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اس کتاب (یعنی قرآن) میں (لوگوں کے سامنے حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) کا (قصہ) ذکر کیجئے (تاکہ ان لوگوں کو توحید و رسالت کا مسئلہ زیادہ منکشف ہو جائے) وہ (ہر قول فعل میں) بڑے راستی والے (تھے اور) پیغمبر تھے (اور وہ قصہ جس کا ذکر کرنا اس جگہ مقصود ہے اس وقت ہوا تھا) جب کہ انہوں نے اپنے باپ سے (جو کہ مشرک تھا) کہا کہ اے میرے باپ! تم ایسی چیز کی کیوں عبادت کرتے ہو جو نہ کچھ سنے اور نہ کچھ دیکھے اور نہ تمہارے کچھ کام آسکے (مراد بت ہیں، حالانکہ اگر کوئی دیکھتا سنتا کچھ کام بھی آتا ہو وہ بھی اگر واجب الوجود اور کامل قدرت والا نہ ہو تب بھی عبادت کے لائق نہیں، تو جس میں یہ اوصاف بھی نہ ہوں یعنی بت وغیرہ تو وہ تو بدرجہ اولی عبادت کے لائق نہ ہوگا)۔

**اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ:** اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے طریقہ دعوت میں حسن ادب و اخلاق اختیار کیا تاکہ مخاطب مکابرہ اور فساد پر آمادہ نہ ہو جائے اور سنجیدگی سے سنے (اس میں ہر داعی اور مبلغ کے لیے عظیم درس ہے)۔

* * *

**فائدہ: ۱** یہ گذشتہ رکوع میں حضرت مسیح و مریم کا قصہ بیان فرما کر نصاریٰ کا رد کیا گیا تھا جو ایک آدمی کو خدا بنا رہے ہیں، اس رکوع میں مشرکین مکہ کو شرمانے کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ سنایا گیا ہے کہ انہوں نے اپنے باپ تک کو کس طرح شرک و بت پرستی سے روکا، اور آخر کار وطن و اقارب کو چھوڑ کر خدا کے واسطے ہجرت اختیار کی، مشرکین مکہ کا دعویٰ تھا کہ وہ ابراہیم کی اولاد ہیں اور اسی کے دین پر ہیں، انھیں بتلایا گیا کہ بت پرستی کے متعلق تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کا رویہ کیا رہا ہے، اگر آباؤ اجداد کی تقلید کرنا چاہتے ہو تو ایسے باپ کی تقلید کرو، اور مشرک باپ دادوں سے اسی طرح بیزار ہو جاؤ، جیسے ابراہیم علیہ السلام ہو گئے تھے۔

**فائدہ: ۲** صدیق کے معنی ہیں "بہت زیادہ سچ کہنے والا" جو اپنی بات کو عمل سے سچا کر دکھائے، یا وہ راست باز پاک طینت جس کے قلب میں سچائی کو قبول کرنے کی نہایت اعلیٰ و اکمل استعداد موجود ہو، جو بات خدا کی طرف سے پہنچے بلا توقف اس کے دل میں اتر جائے، شک و تردد کی گنجائش ہی نہ رہے، ابراہیم علیہ السلام ہر ایک معنی سے صدیق تھے اور چونکہ صدیقیت کے لیے نبوت لازم نہیں اس لیے آگے صِدِّيْقًا کے ساتھ نَّبِيًّا فرما کر نبوت کی تصریح کر دی، یہیں سے معلوم ہو گیا کہ کذبات ثلاثہ کی حدیث اور نَحْنُ اَحَقُّ بِالشَّكِّ مِنْ اِبْرَاهِيْمَ وغیرہ روایات میں کذب و شک کے وہ معنی مراد نہیں جو سطح کلام سے مفہوم ہوتے ہیں۔

**فائدہ: ۳** یعنی جو چیز دیکھتی سنتی ہو اور مشکلات میں کچھ کام آسکے مگر واجب الوجود نہ ہو، اس کی عبادت بھی جائز نہیں، چہ جائیکہ ایک پتھر کی بے جان مورتی جو نہ سنے نہ دیکھے نہ ہمارے کسی کام آئے، خود ہمارے ہاتھ کی تراشی ہوئی، اس کو معبود ٹھہرا لینا کسی عاقل اور خود دار کا کام نہیں ہو سکتا۔

يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿۴۳﴾ يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ

اے باپ میرے مجھ کو آئی ہے خبر ایک چیز کی جو تجھ کو نہیں آئی سو میری راہ چل دکھلا دوں تجھ کو راہ سیدھی ۱ اے باپ میرے مت پوج

الشَّيْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ﴿۴۴﴾ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ

شیطان کو، بیشک شیطان ہے رحمان کا نافرمان ۲ اے باپ میرے ڈرتا ہوں کہیں آ لگے تجھ کو ایک آفت

مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ﴿٤٥﴾

رحمان سے پھر تو ہو جائے شیطان کا ساتھی ۳؎

**خلاصہ تفسیر**: اے میرے باپ! میرے پاس ایسا علم پہنچا ہے جو تمہارے پاس نہیں آیا (مراد اس سے وحی ہے جس میں غلطی کا احتمال ہو ہی نہیں سکتا، پس میں جو کچھ کہہ رہا ہوں یقیناً حق ہے، جب یہ بات ہے) تو تم میرے کہنے پر چلو میں تم کو سیدھا رستہ بتلاؤں گا (اور وہ توحید ہے) اے میرے باپ! تم شیطان کی پرستش مت کرو (یعنی شیطان کو اور اس کی عبادت کو تو تم بھی برا سمجھتے ہو اور بت پرستی میں شیطان کی عبادت یقیناً لازم آتی ہے کہ وہی یہ حرکت کراتا ہے، تم اس کا کہنا مانتے ہو اور کسی کی ایسی اطاعت کرنا کہ حق تعالیٰ کے مقابلے میں بھی اس کی بات کو حق سمجھے یہی عبادت ہے، پس بت پرستی میں شیطان پرستی ضرور ہوئی اور) بیشک شیطان (حضرت) رحمان کا نافرمانی کرنے والا ہے (تو وہ کب اطاعت کے لائق ہوگا)۔

اے میرے باپ! میں اندیشہ کرتا ہوں (اور وہ اندیشہ یقینی ہے) کہ تم پر رحمان کی طرف سے کوئی عذاب نہ آپڑے (خواہ دنیا میں یا آخرت میں) پھر تم (عذاب میں) شیطان کے ساتھی ہو جاؤ (یعنی جب اطاعت میں شیطان کا ساتھ دو گے تو عذاب میں بھی اس کا ساتھ ہوگا اگرچہ شیطان کو صرف آخرت ہی میں ہوگا مگر سزا پانے میں تو سب برابر ہوں گے، اور بھلائی چاہنے والا شیطان کے ساتھ کو کبھی پسند نہ کرے گا)۔

**عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ**: عذاب کے ساتھ من الرحمن کہنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ حق تعالیٰ اگرچہ رحمان ہیں مگر یہ نہ سمجھنا کہ کفر پر سزا نہ دیں گے، بلکہ رحمن ہونے کے باوجود بھی کفر پر جزا و سزا دیں گے۔

* * *

**فائدہ: ۱؎** یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھ کو توحید و معاد وغیرہ کا صحیح علم دیا اور حقائق شریعت سے آگاہ کیا ہے، اگر تم میری پیروی کرو گے تو سیدھی راہ پر لے چلوں گا جو رضائے حق تک پہنچانے والی ہے، اس کے سوا سب راستے ٹیڑھے ترچھے ہیں جن پر چل کر کوئی شخص نجات حاصل نہیں کرسکتا۔

**فائدہ: ۲؎** بتوں کو پوجنا شیطان کے اغواء سے ہوتا ہے اور شیطان اس حرکت کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے، اس لحاظ سے بتوں کی پرستش گویا شیطان کی پرستش ہوئی اور نافرمان کی پرستش رحمان کی انتہائی نافرمانی ہے، شاید لفظ عصی میں ادھر بھی توجہ دلائی ہو کہ شیطان کی پہلی نافرمانی کا اظہار اس وقت ہوا تھا جب تمہارے باپ آدم کے سامنے سربسجود ہونے کا حکم دے دیا گیا، لہٰذا اولاد آدم کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ رحمٰن کو چھوڑ کر اپنے اس قدیم ازلی دشمن کو معبود بنالیں۔؟

**فائدہ: ۳؎** یعنی رحمان کی رحمت عظیمہ تو چاہتی ہے کہ تمام بندوں پر شفقت و مہربانی ہو، لیکن تیری بداعمالیوں کی شامت سے ڈر ہے کہ ایسے حلیم و مہربان خدا کو غصہ نہ آجائے اور تجھ پر کوئی سخت آفت نازل نہ کردے جس میں پھنس کر تو ہمیشہ کے لیے شیطان کا ساتھی بن جائے یعنی کفر و شرک کی مزاولت سے آئندہ ایمان و توبہ کی توفیق نصیب نہ ہو اور اولیاء الشیطان کے گروہ میں شامل کر کے دائمی عذاب میں دھکیل دیا جائے، عموماً مفسرین نے یہی معنی لیے ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی کفر کے وبال سے کچھ آفت آئے اور تو مدد مانگنے لگے شیطان سے یعنی بتوں سے، اکثر لوگ ایسے ہی وقت شرک کرتے ہیں''، واللہ اعلم۔

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ﴿٤٦﴾

وہ بولا کیا تو پھرا ہوا ہے میرے ٹھاکروں (معبودوں) سے اے ابراہیم، اگر تو باز نہ آئیگا تو تجھ کو سنگسار (پتھراؤ) کرونگا اور دور ہو جا میرے پاس سے ایک مدت

**خلاصہ تفسیر**: (ابراہیم علیہ السلام کی یہ تمام تر نصائح سن کر) باپ نے جواب دیا کہ کیا تم میرے معبودوں سے پھرے ہوئے ہو اے ابراہیم! (اور اس لئے مجھے بھی منع کرتے ہو، یاد رکھو) اگر تم (اب بتوں کی برائی سے اور مجھے ان کی عبادت سے منع کرنے سے) باز نہ آئے تو میں

ضرور تم کو مار پتھروں کے سنگسار کردوں گا (پس تم اس سے باز آجاؤ) اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مجھ (کو کہنے سننے) سے برکنار (علیحدہ) رہو۔

* * *

**فائدہ:** باپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تقریر سن کر کہا "معلوم ہوتا ہے کہ تو ہمارے معبودوں سے بدعقیدہ ہے، بس اپنی بداعتقادی اور وعظ ونصیحت کو رہنے دے، ورنہ تجھ کو کچھ اور سننا پڑے گا بلکہ میرے ہاتھوں سنگسار ہونا پڑے گا، اگر اپنی خیر چاہتا ہے تو میرے پاس سے ایک مدت (عمر بھر) کے لیے دور ہو جا، میں تیری صورت دیکھنا نہیں چاہتا، اس سے پہلے کہ میں تجھ پر ہاتھ اٹھاؤں یہاں سے روانہ ہو جا"۔

قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ﴿۴۷﴾

کہا تیری سلامتی رہے [۱] میں گناہ بخشواؤں گا تیرے اپنے رب سے، بیشک وہ ہے مجھ پر مہربان [۲]

**خلاصہ تفسیر:** ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا (بہتر!) میرا سلام لو (اب تم سے کہنا سننا بے سود ہے) اب میں تمارے لئے اپنے رب سے مغفرت کی (اس طرح) درخواست کروں گا (کہ تم کو ہدایت کرے جس پر مغفرت مرتب ہوتی ہے) بیشک وہ مجھ پر بہت مہربان ہے (اس لئے اسی سے عرض کروں گا جس کا قبول کرنا یا نہ کرنا ہر ایک میں رحمت اور مہربانی ہے)۔

**قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ:** اس میں بتایا ہے کہ برائی کا مقابلہ بھلائی سے کیا جائے، یعنی جب کوئی برا سلوک کرے تو جواب میں اس سے اچھا برتاؤ کیا جائے۔

**سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ:** یہاں بھی یہ اشکال ہے کہ کسی کافر کے لئے استغفار کرنا شرعاً ممنوع و ناجائز ہے، حضرت رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا ابوطالب سے فرمایا تھا کہ: "والله لاستغفرن لك مالم انه عنه" (یعنی بخدا میں آپ کے لئے اس وقت تک ضرور استغفار یعنی دعا مغفرت کرتا رہوں گا جب تک اللہ کی طرف سے مجھے منع نہ فرما دیا جائے) اس پر یہ آیت نازل ہوئی: مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ (یعنی نبی اور ایمان والوں کے لئے جائز نہیں ہے کہ مشرکین کے لئے استغفار کریں) اس آیت کے نازل ہونے پر آپ نے چچا کے لئے استغفار کرنا چھوڑ دیا، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیسے اپنے والد کے لیے استغفار کا وعدہ کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ سے وعدہ کرنا کہ آپ کے لئے استغفار کروں گا یہ ممانعت سے پہلے کا واقعہ ہے، اس کے بعد ممانعت کر دی گئی سورۃ ممتحنہ میں حق تعالیٰ نے خود اس واقعہ کو بطور استثنیٰ ذکر فرما کر اس کی اطلاع دے دی ہے: اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ اور اس سے زیادہ واضح سورۃ توبہ میں آیت مذکورہ: مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا کے بعد دوسری آیت میں فرمایا: وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ جس سے معلوم ہوا کہ یہ استغفار اور اس کا وعدہ باپ کے کفر پر جمے رہنے اور خدا کا دشمن ثابت ہونے سے پہلے کا تھا، جب یہ حقیقت واضح ہو گئی تو انہوں نے بھی براءت کا اعلان کر دیا۔

* * *

**فائدہ:** [۱] یعنی یہ رخصت یا متارکت کا سلام ہے، جیسے ہمارے محاورات میں ایسے موقع پر کہہ دیتے ہیں کہ "فلاں بات یوں ہے تو ہمارا سلام لو"، دوسری جگہ فرمایا: وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۡ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۡ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: "معلوم ہوا اگر دین کی بات سے ماں باپ ناخوش ہوں اور گھر سے نکالنے لگیں اور بیٹا ماں باپ کو میٹھی بات کہہ کر نکل جائے، وہ بیٹا عاق نہیں"۔

**فائدہ:** [۲] امید ہے اپنی مہربانی سے میرے باپ کے گناہ معاف فرما دے گا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے استغفار کا وعدہ ابتداء کیا تھا، چنانچہ استغفار کرتے رہے جب اللہ کی مرضی نہ دیکھی تب موقوف کیا، یہ بحث سورہ توبہ (براۃ) میں مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ کے تحت میں گزر چکی ہے، ملاحظہ کر لی جائے۔

وَاَعۡتَزِلُكُمۡ وَمَا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَاَدۡعُوۡا رَبِّیۡ ۖ عَسٰۤی اَلَّاۤ اَكُوۡنَ بِدُعَآءِ رَبِّیۡ شَقِیًّا ۝۴۸

اور چھوڑتا ہوں تم کو اور جن کو تم پُوجتے ہو اللہ کے سوا اَور میں بندگی کروں گا اپنے رب کی، امید ہے کہ نہ رہوں گا اپنے رب کی بندگی کر کے محروم

**خلاصہ تفسیر**: اور (تم اور تمہارے ہم مذہب جب میری حق بات کو بھی نہیں مانتے تو تم میں رہنا بھی فضول ہے اس لئے) میں تم لوگوں سے اور جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کر رہے ہو ان سے (جسمانی طور پر بھی) کنارہ کرتا ہوں (یعنی دل سے تو جدا ہو ہی گیا ظاہر سے بھی علیحدہ ہوتا ہوں، یعنی یہاں رہتا بھی نہیں) اور (اطمینان سے علیحدہ ہو کر) اپنے رب کی عبادت کروں گا (کیونکہ یہاں رہ کر اس میں بھی مزاحمت ہوگی) امید (یعنی یقین) ہے کہ اپنے رب کی عبادت کر کے محروم نہ رہوں گا (جیسا کہ بت پرست اپنے جھوٹے معبودوں کی عبادت کر کے محروم رہتے ہیں، غرض اس گفتگو کے بعد ان سے اس طرح علیحدہ ہوئے کہ ملک شام کی طرف ہجرت کر کے چلے گئے)۔

* * *

**فائدہ**: یعنی میری نصیحت کا جب کوئی اثر تم پر نہیں، بلکہ الٹا مجھے دھمکیاں دیتے ہو، تو اب میں خود تمہاری بستی میں رہنا نہیں چاہتا، تم کو اور تمہارے جھوٹے معبودوں کو چھوڑ کر وطن سے ہجرت کرتا ہوں تا کہ یکسو ہو کر اطمینان سے خدائے واحد کی عبادت کر سکوں، حق تعالیٰ کے فضل و رحمت سے کامل امید ہے کہ اس کی بندگی کر کے میں محروم و ناکام نہیں رہوں گا، غربت و بیکسی میں جب اس کو پکاروں گا، ادھر سے ضرور اجابت ہوگی، میرا خدا پتھر کی مورتی نہیں کہ کتنا ہی چیخو چلاؤ سن ہی نہ سکے۔

فَلَمَّا اعۡتَزَلَهُمۡ وَمَا یَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبۡنَا لَهٗۤ اِسۡحٰقَ وَیَعۡقُوۡبَ ؕ

پھر جب جُدا ہوا ان سے اور جن کو وہ پوجتے تھے اللہ کے سوا، بخشا ہم نے اس کو اسحاق اور یعقوب

وَكُلًّا جَعَلۡنَا نَبِیًّا ۝۴۹ وَوَهَبۡنَا لَهُمۡ مِّنۡ رَّحۡمَتِنَا وَجَعَلۡنَا لَهُمۡ لِسَانَ صِدۡقٍ عَلِیًّا ۝۵۰ ع

اور دونوں کو نبی کیا۱ اور دیا ہم نے ان کو اپنی رحمت سے اور کیا ان کے واسطے سچا بول (قول) اونچا۲

**خلاصہ تفسیر**: پس ان لوگوں سے اور جن کی وہ لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے ان سے (اس طرح) علیحدہ ہو گئے (تو) ہم نے ان کو اسحاق (بیٹا) اور یعقوب (پوتا) عطا فرمایا (جو کہ رفاقت اور ساتھ دینے کے لئے اس بت پرست قوم سے بدرجہا بہتر تھے) اور ہم نے (ان دونوں میں) ہر ایک کو نبی بنایا، اور ان سب کو ہم نے (طرح طرح کے کمالات دے کر) اپنی رحمت کا حصہ دیا اور (آئندہ نسلوں میں) ہم نے ان کا نام نیک اور بلند کیا (کہ سب تعظیم اور ثناء کے ساتھ ان کا ذکر کرتے ہیں، اور اسحٰق سے پہلے اسماعیل بھی ان ہی صفات کے ساتھ عطا ہو چکے تھے)۔

**فَلَمَّا اعۡتَزَلَهُمۡ وَمَا یَعۡبُدُوۡنَ**: اس سے پہلے جملے میں ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول آیا ہے کہ ”میں امید کرتا ہوں کہ میں اپنے پروردگار سے دعا کرنے میں ناکام و نامراد نہیں ہوں گا“، ظاہر یہ ہے کہ گھر اور خاندان سے جدائی کے بعد تنہائی کی وحشت وغیرہ کے اثرات سے بچنے کی دعا مراد تھی، مذکورہ جملہ میں اس دعا کی قبولیت اس طرح بیان فرمائی گئی ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے لئے اپنے گھر، خاندان اور ان کے معبودوں کو چھوڑ دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی مکافات اس طرح فرمائی کہ ان کو صاحبزادہ اسحٰق علیہ السلام عطا فرمایا اور ساتھ ہی اس کا عمر دراز پانا اور صاحب اولاد ہونا بھی لفظ یعقوب بڑھا کر ذکر فرما دیا اور صاحبزادہ کا عطا ہونا اس کی دلیل ہے کہ اس سے پہلے نکاح ہو چکا تھا، تو اس کا حاصل یہ ہوا کہ باپ کے خاندان سے بہتر ایک مستقل خاندان دے دیا جو انبیاء صلحاء پر مشتمل تھا۔

**وَهَبۡنَا لَهٗۤ اِسۡحٰقَ وَیَعۡقُوۡبَ**: حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر اس جگہ نہ فرمانا اس وجہ سے ہے کہ اول تو وہ اوروں سے پہلے عطا ہو چکے

تھے، بعد والوں کے ذکر سے پہلے والے کا ذکر خود ہی سمجھ میں آجاتا ہے، دوسرے ان کا ذکر مستقل طور پر آئندہ قریب آنے والا ہے، تیسرے ابراہیم علیہ السلام کے ذکر سے جیسے اہل عرب کو متوجہ کیا اسحاق و یعقوب علیہما السلام کے ذکر سے اہل کتاب کو متوجہ کرنا مناسب تھا، اسی نکتہ کی وجہ سے اس کے فوراً بعد موسیٰ علیہ السلام کا ذکر آتا ہے، پھر ان کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر آئے گا، واللہ اعلم۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی اللہ کی راہ میں ہجرت کی اور اپنوں سے دور پڑے، اللہ تعالیٰ نے ان سے بہتر اپنے دیے تاکہ غریب الوطنی کی وحشت دور ہو اور انس و سکون حاصل کریں، شاید یہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ وہ ان کے پاس نہیں رہے، بچپن ہی میں جدا کر دیے گئے تھے، نیز ان کا مستقل تذکرہ آگے آنے والا ہے۔

**تنبیہ:** حضرت اسحاق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے اور حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے ہیں، ان ہی سے سلسلہ بنی اسرائیل کا چلا جن میں سینکڑوں نبی ہوئے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی اپنی رحمت خاصہ سے ان کو بڑا حصہ عنایت فرمایا اور دنیا میں بول بالا کیا اور ہمیشہ کے لیے ان کا ذکر خیر جاری رکھا۔ چنانچہ تمام مذاہب و ملل ان کی تعظیم و توصیف کرتے ہیں اور امت محمدیہ دائماً اپنی نمازوں میں پڑھتی ہے: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ فی الحقیقت یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ کی مقبولیت کا ثمرہ ہے۔

| وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰىٓ ۡ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۱﴾ |
|---|
| اور مذکور کر کتاب میں موسیٰ کا ۱؎ بیشک وہ تھا چُنا ہوا اور تھا رسول نبی ۲؎ |

**خلاصہ تفسیر:** (چوتھا قصہ) اور اس کتاب (یعنی قرآن) میں موسیٰ (علیہ السلام) کا بھی ذکر کیجئے (یعنی لوگوں کو سنائیے، ورنہ کتاب میں ذکر کرنے والا تو فی الحقیقت اللہ تعالیٰ ہے) وہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے خاص کئے ہوئے (بندے) تھے اور وہ رسول بھی تھے، نبی بھی تھے۔

**وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا:** یہاں اور آئندہ چند آیات میں "رسول" اور "نبی" کے الفاظ ایک ساتھ آئے ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر "رسول" اور "نبی" کی تعریف میں فرق اور باہمی نسبت بیان کر دی جائے، "رسول" وہ ہے جو لوگوں کو نئی شریعت پہنچائے خواہ وہ شریعت اس رسول کے اعتبار سے بھی نئی ہو کہ پہلے پہل اسی کو ملی ہو جیسے تورات، یا صرف ان لوگوں کے اعتبار سے نئی ہو جن کی طرف وہ رسول مبعوث ہوا ہے، جیسے اسماعیل علیہ السلام کی شریعت ابراہیم علیہ السلام ہی کی شریعت تھی، لیکن قوم جرہم کے اعتبار سے وہ نئی شریعت تھی، کیونکہ ان کو اس کا علم اسماعیل علیہ السلام ہی سے حاصل ہوا، اس معنی کے اعتبار سے رسول کے لیے نبی ہونا ضروری نہیں، جیسے فرشتے کہ وہ رسول تو ہیں مگر نبی نہیں ہیں، اور انبیاء کے قاصدوں کو بھی سورہ یاسین میں رسول کہا گیا ہے حالانکہ وہ نبی نہیں تھے: اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ۔

"نبی" وہ ہے جو صاحب وحی ہو خواہ نئی شریعت کی تبلیغ کرے یا پہلی شریعت کی، جیسے اکثر انبیاء بنی اسرائیل شریعت موسویہ کی تبلیغ کرتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ ایک اعتبار سے لفظ "رسول" نبی سے عام ہے، اور دوسرے اعتبار سے لفظ "نبی" بہ نسبت رسول کے عام ہے، پس رسول اور نبی یہ دونوں وصف ایک شخص میں بھی جمع ہو سکتے ہیں، یعنی جس جگہ یہ دونوں لفظ ایک ساتھ استعمال کئے گئے جیسا کہ یہاں آیات میں کئی جگہ ایک ہی پیغمبر کے لیے رسولاً نبیاً آیا ہے تو کوئی اشکال نہیں کہ خاص اور عام دونوں جمع ہو سکتے ہیں، کوئی تضاد نہیں، البتہ جہاں رسول اور نبی کو مقابلہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے وہاں نبی کے یہ معنی ہوں گے کہ جو پہلی شریعت کی تبلیغ کرے، اور رسول کے معنی وہی ہیں جو جدید شریعت کی تبلیغ کرے، اب ان دونوں میں مقابلہ صحیح ہو جائے گا، جیسے: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ مطلب یہ ہے کہ ہم نے آپ سے پہلے نہ کوئی جدید شریعت والا بھیجا تھا نہ قدیم

شریعت کی تبلیغ کرنے والا بھیجا، اس جگہ مقام کے قرینہ سے لفظ ''نبی'' کو خاص اس شخص کے معنی میں لیا جائے گا جو شریعت سابقہ کی تبلیغ کرتا ہے، پس معنی یہ ہوں گے: "ما أرسلنا من قبلك من صاحب شرع جديد و لا صاحب شرع غير جديد"، لیکن اب چونکہ لفظ رسول سے صاحب نبوت ہونا سمجھا جاتا ہے اس لیے نبی کے سوا کسی کو رسول کہنا جائز نہیں، کیونکہ اس سے وہم پیدا ہوگا جیسا کہ بعض گمراہ لوگ اپنے لیے وحی اور رسالت بلکہ نبوت کا دعوی کرتے ہیں اور ان الفاظ کے استعمال کو اپنے واسطے جائز رکھتے ہیں اور تفسیر بھی ان الفاظ کی بدل ڈالی ہے، نعوذ باللہ۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی قرآن کریم میں جو حال موسیٰ علیہ السلام کا بیان کیا جا رہا ہے لوگوں کے سامنے ذکر کیجئے کیونکہ اسحاق و یعقوب علیہما السلام کی نسل سے اسرائیلی سلسلہ کے اولوالعزم پیغمبر اور مشرّع اعظم ہوئے ہیں، اور جس طرح حضرت یحیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کے تذکرہ میں خصوصیت کے ساتھ عیسائیوں کی اصلاح اور ابراہیم علیہ السلام کے ذکر میں مشرکین مکہ کو متنبہ کرنا مقصود تھا، حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے تذکرہ سے شاید یہود کو بتانا ہو کہ قرآن کس قدر کشادہ دلی سے ان کے مقتدائے اعظم کے واقعی کمالات و محاسن کا اعلان کرتا ہے، یہود کو چاہیے کہ وہ بھی اپنے اس جلیل القدر پیغمبر کی صریح پیشین گوئی کے موافق اسمٰعیلی نبی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت و نبوت کا کھلے دل سے اعتراف کریں شاید اسی لیے حضرت موسیٰ کے بعد روئے سخن حضرت اسماعیل کی طرف پھیر دیا گیا۔

**فائدہ:** ۲؎ جس آدمی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئے وہ ''نبی'' ہے انبیاء میں سے جن کو خصوصی امتیاز حاصل ہو، یعنی مکذبین کے مقابلہ پر جداگانہ امت کی طرف مبعوث ہوں یا نئی کتاب اور مستقل شریعت رکھتے ہوں وہ ''رسول نبی'' یا ''نبی رسول'' کہلاتے ہیں، شرعیات میں جزئی تصرف مثلاً کسی عام کی تخصیص یا مطلق کی تقیید وغیرہ رسول کے ساتھ مخصوص نہیں عام انبیاء بھی کر سکتے ہیں، باقی غیر انبیاء پر رسول یا مرسل کا اطلاق جیسا کہ قرآن کے بعض مواضع میں پایا جاتا ہے وہ اس معنی مصطلح کے اعتبار سے نہیں، وہاں دوسری حیثیات معتبر ہیں۔ واللہ اعلم۔

وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿۵۲﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴿۵۳﴾

اور پکارا ہم نے اسکو داہنی طرف سے طور پہاڑ کی اور نزدیک بلایا اسکو بھید کہنے کو ۱؎ اور بخشا ہم نے اسکو اپنی مہربانی سے بھائی اسکا ہارون نبی (بنا کر) ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور ہم نے ان کو کوہ طور کی داہنی جانب سے آواز دی، اور ہم نے ان کو راز کی باتیں کرنے کیلئے مقرب بنایا، اور ہم نے ان کو اپنی رحمت (اور عنایت) سے ان کے بھائی ہارون کو نبی بنا کر عطا کیا (یعنی ان کی درخواست کے موافق ان کو نبی کیا کہ ان کی مدد کریں)۔

**وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا:** موسیٰ علیہ السلام کی وحی کو ''راز'' اس وجہ سے کہا کہ اس وقت اس کے سننے میں کوئی بشر شریک نہ تھا، اگرچہ بعد میں دوسروں کو بھی موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے اس کی اطلاع ہوگئی۔

**اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا:** ہارون علیہ السلام کا موسیٰ علیہ السلام کو عطا کیا جانا اس سے مراد یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی مدد اور معاونت عطا کی، یعنی موسیٰ علیہ السلام کی درخواست کے موافق ہارون علیہ السلام کو نبی بنایا تاکہ ان کی مدد کریں، اور ہارون علیہ السلام عمر میں بڑے تھے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی موسیٰ علیہ السلام جب آگ کی چمک محسوس کر کے ''طور'' پہاڑ کی اس مبارک و میمون جانب میں پہنچ گئے جو ان کے داہنے ہاتھ مغرب کی طرف واقع تھی، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو پکارا اور ہم کلامی کا شرف بخشا، تفصیل سورہ طٰہٰ میں آئے گی، کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام اس وقت ہر جہت اور ہر بن مُو سے خدا کا کلام سن رہے تھے جو بدون توسط فرشتے کے ہو رہا تھا، اور روحانی طور پر اس قدر قرب و علو حاصل تھا کہ غیبی قلموں کی آواز سنتے تھے جس سے تورات نقل کی جا رہی تھی، وحی کو ''بھید'' اس لیے فرمایا کہ اس وقت کوئی بشر استماع میں شریک نہ تھا، گو بعد میں اوروں کو بھی خبر کر دی گئی، واللہ اعلم۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ کے کام میں مددگار ہوئے جیسے کہ انہوں نے خود درخواست کی تھی: وَاَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِيْٓ اور وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ هٰرُوْنَ اَخِي حق تعالیٰ نے درخواست قبول فرمائی اور ہارون

علیہ السلام کو نبی بنا کر ان کی اعانت وتقویت کے لیے دے دیا، ویسے عمر میں حضرت ہارون علیہ السلام بڑے تھے، کہتے ہیں کہ دنیا میں کسی نے اپنے بھائی کے لیے اس سے بڑی شفاعت نہیں کی جو موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کے لیے کی تھی۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۚ﴿۵۴﴾

اور مذکور کر کتاب میں اسماعیل کا، وہ تھا وعدہ کا سچا اور تھا رسول نبی ۱

وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۠ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴿۵۵﴾

اور حکم کرتا تھا اپنے گھر والوں کو نماز کا اور زکوٰۃ کا ۲ اور تھا اپنے رب کے یہاں پسندیدہ ۳

**خلاصہ تفسیر:** اور اس کتاب میں اسماعیل (علیہ السلام) کا بھی ذکر کیجئے، بلاشبہ وہ وعدے کے (بڑے) سچے تھے اور وہ رسول بھی تھے نبی بھی تھے، اور اپنے متعلقین کو نماز اور زکوٰۃ کا (خصوصا، دیگر احکام کا عموما) حکم کرتے رہتے تھے اور وہ اپنے پروردگار کے نزدیک پسندیدہ تھے۔

**اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ:** اسماعیل علیہ السلام کے کمالات میں صدق وعدہ کو خاص طور پر اس لیے ذکر فرمایا کہ یہ صفت خصوصیت کے ساتھ آپ پر غالب تھی، چنانچہ مشہور ہے جس میں سے ایک بڑی بات تو یہی ہے کہ بچپن میں اپنے ذبح کے متعلق ایسا سخت وعدہ کیا تھا: ستجدنی ان شاء اللہ من الصّٰبرین کہ ان شاءاللہ آپ مجھے مستقل مزاج پائیں گے اور اس کو سچا کر دیا جس کا قرآن میں بھی ذکر ہے۔

**وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ:** یہاں ''اہل'' سے مراد اگر امت ہے تب تو سب کے واسطے یہ حکم عام ہونا ثابت ہی ہے، اور اگر گھر والے مراد ہیں تو مطلب یہ ہے کہ ان کو دوسروں سے پہلے حکم کیا اور انبیاء کی یہی شان ہوتی ہے کہ پہلے اپنے قرابت داروں کو تبلیغ کرتے ہیں پھر دوسروں کو، تاکہ دوسرے لوگ ان کی اقتدا کریں، پھر یہاں بطور خاص صرف نماز اور زکوٰۃ کا ذکر اہتمام کی وجہ سے ہے انحصار مقصود نہیں، پس یہ لازم نہیں آتا ہے دیگر باتوں کا حکم نہ کرتے تھے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کام تو ہر مومن مسلمان کے ذمہ واجب ہے کہ اپنے اہل وعیال کو نیک کاموں کی ہدایت کرتا رہے، قرآن حکیم میں عام مسلمانوں کو خطاب ہے: قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا یعنی بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے، پھر اس میں حضرت اسماعیل کی خصوصیت کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہ حکم اگرچہ عام ہے اور سبھی مسلمان اس کے مکلف ہیں، لیکن حضرت اسماعیل علیہ السلام اس کے اہتمام وانتظام میں امتیازی کوشش فرماتے تھے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی یہ خصوصی ہدایت ملی تھی کہ: وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ یعنی اپنے خاندان کے قریبی رشتہ داروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرایئے، آپ نے اس کی تعمیل میں اپنے خاندان کو جمع کر کے خصوصی خطاب فرمایا۔

* * *

**فائدہ:** ۱ اس سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی فضیلت حضرت اسحاق علیہ السلام پر ظاہر ہوتی ہے کیونکہ ان کو صرف نبی فرمایا اور اسماعیل علیہ السلام کو رسول نبی کہا گیا ہے، صحیح مسلم میں حدیث ہے: ''اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى مِنْ وُّلْدِ اِبْرَاهِيْمَ اِسْمَاعِيْلَ'' (ابراہیم کی اولاد میں سے اللہ نے اسماعیل کو چن لیا) حضرت اسماعیل علیہ السلام عرب حجاز کے مورث اعلیٰ اور ہمارے پیغمبر ﷺ کی اجداد میں سے ہیں جو ابراہیمی شریعت دے کر ''بنی جرہم'' کی طرف مبعوث ہوئے، ان کا ''صادق الوعد'' ہونا مشہور تھا، خدا سے یا بندوں سے جو وعدہ کیا پورا کر کے دکھلایا، ایک شخص سے وعدہ کیا کہ جب تک تو آئے میں اسی جگہ رہوں گا، کہتے ہیں وہ ایک برس نہ آیا، یہ وہیں رہے، نبی کریم ﷺ سے بھی منقول ہے کہ ''قبل از بعثت آپ ﷺ سے عبداللہ بن ابی الحمساء نے کہا کہ آپ یہاں ٹھہریے میں ابھی آتا ہوں، آپ ﷺ تین دن تک اسی جگہ رہے، جب وہ واپس آیا تو فرمایا کہ تو نے ہم کو تکلیف دی، میں حسب وعدہ تین دن سے یہیں ہوں''، حضرت اسماعیل علیہ السلام کے وعدہ کی انتہائی سچائی اس وقت ظاہر ہوئی جب اپنے باپ ابراہیم سے کہا تھا: يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ اور اسی طرح کر کے دکھایا۔

**فائدہ:** ۲ کیونکہ گھر والے قریب ہونے کی وجہ سے ہدایت کے اول مستحق ہیں، ان سے آگے کو سلسلہ چلتا ہے، اسی لیے دوسری جگہ فرمایا :وَأْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا اور يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا خود نبی کریم ﷺ کو بھی یہ ہی ارشاد ہوا :وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ. بعض کہتے ہیں کہ یہاں ''اہل'' سے ان کی ساری قوم مراد ہے، چنانچہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ کے مصحف میں **اَهْلَه** کی جگہ **قَوْمَه** تھا۔ واللہ اعلم۔

**فائدہ:** ۳ یعنی دوسروں کو ہدایت کرنا اور خود اپنے اقوال وافعال میں پسندیدہ مستقیم الحال اور مرضی الخصال تھا۔

| |
|---|
| وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۫ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۵۶﴾ۙ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿۵۷﴾ |
| اور مذکور کر کتاب میں ادریس کا ،وہ تھا سچا نبی ۱ اور اٹھا لیا ہم نے اس کو ایک اونچے مکان پر ۲ |

**خلاصہ تفسیر:** اور اس کتاب میں ادریس (علیہ السلام) کا بھی ذکر کیجئے ، بیشک وہ بڑی راستی والے نبی تھے، اور ہم نے ان کو (کمالات میں) بلند رتبہ تک پہنچا دیا۔

**وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا:** یہاں رفعت اور علو اور مکان ان سب الفاظ سے مرتبہ کی بلندی مراد لی گئی ہے، بعض روایات میں جوان کا آسمان پر اٹھائے جانا منقول ہے ان کے متعلق ابن کثیرؒ نے فرمایا: "هذا من اخبار كعب الأحبار الإسرائيليات وفى بعضه نكارة" یعنی یہ کعب احبار کی اسرائیلی روایات میں سے ہے اور ان میں سے بعض میں نکارت واجنبیت ہے، اور قرآن کریم کے الفاظ مذکورہ بہرحال اس معاملہ میں صریح نہیں کہ یہاں رفعت درجہ مراد ہے یا زندہ آسمان میں اٹھانا مراد ہے؟ اگر یہ صحیح بھی ہو تب بھی تفسیر قرآن اس پر موقوف نہیں، اور لفظ ''مکان'' کا استعمال مرتبہ کے معنی میں عرب کے اشعار ومحاورات میں موجود ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ راجح یہ ہے کہ ادریس علیہ السلام حضرت آدم اور نوح علیہما السلام کے درمیانی زمانہ میں گزرے ہیں، کہا جاتا ہے کہ دنیا میں نجوم وحساب کا علم، قلم سے لکھنا، کپڑا سینا، ناپ تول کے آلات اور اسلحہ کا بنانا اول ان سے چلا، واللہ اعلم، شب معراج میں نبی کریم ﷺ کی چوتھے آسمان پر ان سے ملاقات ہوئی۔

**فائدہ:** ۲ یعنی قرب وعرفان کے بہت بلند مقام اور اونچی جگہ پر پہنچا، بعض کہتے ہیں کہ حضرت مسیح کی طرح وہ بھی زندہ آسمان پر اٹھائے گئے اور اب تک زندہ ہیں، بعض کا خیال ہے کہ آسمان پر لے جا کر روح قبض کی گئی، ان کے متعلق بہت سی اسرائیلیات مفسرین نے نقل کی ہیں، ابن کثیرؒ نے ان پر تنقید کی ہے، واللہ اعلم۔

| |
|---|
| اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۗ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۡ |
| یہ وہ لوگ ہیں جن پر انعام کیا اللہ نے پیغمبروں میں آدم کی اولاد میں، اور ان میں جن کو سوار کر لیا ہم نے نوح کے ساتھ |
| وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ ۡ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ؕ |
| اور ابراہیم کی اولاد میں اور اسرائیل کی ۱ اور ان میں جن کو ہم نے ہدایت کی اور پسند کیا ۲ |
| اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ﴿۵۸﴾ |
| جب ان کو سنائے آیتیں رحمان کی گرتے ہیں سجدہ میں (گر پڑتے ہیں، سجدہ کرتے ہوئے) اور روتے ہوئے ۳ |

السجدۃ

**خلاصه تفسیر:** (یہ حضرات جن کا شروع سورت سے یہاں تک ذکر ہوا، یعنی زکریا علیہ السلام سے ادریس علیہ السلام تک) یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے (خاص) انعام فرمایا ہے (چنانچہ نبوت سے بڑھ کر کون سی نعمت ہوگی) من جملہ (دیگر) انبیاء (علیہم السلام) کے (یہ وصف تمام انبیاء میں مشترک ہے، اور یہ سب) آدم (علیہ السلام) کی نسل سے (تھے) اور بعض ان میں ان لوگوں کی نسل سے (تھے) جن کو ہم نے نوح (علیہ السلام) کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا (چنانچہ ادریس علیہ السلام کے سوا کہ وہ تو نوح علیہ السلام کے اجداد میں سے ہیں باقی سب میں یہ وصف ہے) اور (بعض ان میں) ابراہیم (علیہ السلام) اور یعقوب (علیہ السلام) کی نسل سے (تھے چنانچہ حضرت زکریا و یحییٰ و عیسیٰ و موسیٰ علیہم السلام دونوں کی اولاد میں تھے اور اسحاق و اسماعیل و یعقوب علیہم السلام صرف حضرت ابراہیم کی اولاد میں تھے) اور (یہ سب حضرات) ان لوگوں میں سے (تھے) جن کو ہم نے ہدایت فرمائی اور ان کو مقبول بنایا (اور اس مقبولیت و خصوصیت کے باوجود ان سب حضرات کی عبدیت، انکساری اور اطاعت کی یہ کیفیت تھی کہ) جب ان کے سامنے (حضرت) رحمٰن کی آیتیں پڑھی جاتی تھیں تو (انتہائی احتیاج، انکسار اور انقیاد کے اظہار کے لئے) سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے (زمین پر) گر جاتے تھے۔

سابقہ آیات میں چند اکابر انبیاء علیہم السلام کا ذکر خاص طور سے کیا گیا ہے جس میں ان کی عظمت شان کو بیان کیا گیا ہے، چونکہ انبیاء کرام کی عظمت میں عوام سے غلو کرنے کا خطرہ تھا جیسے یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا ہی بنا دیا، اس لئے اس مجموعہ کے بعد ان سب کا اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ گزار اور خوف وخشیت سے بھرپور ہونا اس آیت میں ذکر فرما دیا گیا تا کہ افراط و تفریط کے درمیان رہیں، چونکہ بعض انبیاء علیہم السلام کی شان میں بعض بد دین مبالغہ یا توہین کرتے تھے، اس لیے حق تعالیٰ نے ان سب حضرات کے دو قسم کے اوصاف بیان فرمائے: ① ایک ان کا مقبول اور صاحب کمال ہونا، یہ تو گستاخی کا جواب ہے ② ان کا خدا کے سامنے عاجز و منکسر ہونا، یہ مبالغہ کا علاج ہے، پس افراط و تفریط دونوں کا علاج ہو گیا۔

**وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا:** اس میں وصول الی اللہ کے دونوں طریقوں کا ذکر ہے، ''سلوک'' کا بھی جسے ہدایت کہتے ہیں اور ''جذب'' کا بھی جسے اجتباء (انتخاب) کہتے ہیں (سلوک اس ہدایت کا نام ہے جو شریعت کی ہدایات و رہنمائی سے حاصل کیا جاتا ہے، اور جذب اجتباء یعنی انتخاب کا نام ہے کہ اللہ تعالیٰ براہ راست ہدایت و کامرانی کا فیصلہ کر دیں جیسا کہ انبیاء کرام کے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے، انہیں براہ راست ہدایت و کامیابی دے دی جاتی ہے)۔

* * *

**فائدہ: ۱۔ وَمِنْ ذُرِّيَّةِ إِبْرٰهِيمَ وَإِسْرَآءِيلَ:** یعنی جن انبیاء کا ابتدائی سورت سے یہاں تک ذکر ہوا، اسی قسم کے لوگوں پر حق تعالیٰ نے اپنے انعامات کی بارش کی ہے، یہ سب آدم کی اولاد ہیں اور ادریس علیہ السلام کے سوا باقی سب ان کی اولاد بھی ہیں جنہیں نوح علیہ السلام کے ساتھ ہم نے کشتی پر سوار کیا تھا، اور بعض ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں ہیں، مثلاً اسحق، یعقوب، اسماعیل علیہم السلام اور بعض اسرائیل (یعقوب) علیہ السلام کی نسل سے ہیں، مثلاً موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ علیہم السلام۔

**فائدہ: ۲۔ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا:** یعنی طریق حق کی طرف ہدایت کی اور منصب نبوت و رسالت کے لیے پسند کر لیا۔

**فائدہ: ۳۔ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا:** یعنی باوجود اس قدر علو مقام اور معراج کمال پر پہنچنے کے شان عبودیت و بندگی میں کامل ہیں، اللہ کا کلام سن کر اور اس کے مضامین سے متاثر ہو کر نہایت عاجزی اور خشوع کے ساتھ سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور اس کو یاد کر کے روتے ہیں، اسی لیے علماء کا اجماع ہے کہ اس آیت پر سجدہ کرنا چاہیے، تا کہ ان مقربین کے طرز عمل کو یاد کر کے ایک طرح کی مشابہت ان سے حاصل ہو جائے، روایات میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سورہ مریم پڑھ کر سجدہ کیا اور فرمایا: هذا السجود فأين البكى؟ (یہ تو سجدہ ہوا، آگے بکاء کہاں ہے؟) بعض مفسرین نے یہاں آیات الرحمن سے خاص آیات سجود اور سُجَّدًا سے سجود تلاوت مراد لیا ہے، مگر ظاہر وہ ہی ہے جو تقریر ہم پہلے کر چکے ہیں، حدیث میں ہے کہ قرآن کی تلاوت کرو اور روؤ، اگر رونا نہ آئے تو (کم از کم) رونے کی صورت بنالو۔

فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ أَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا ﴿٥٩﴾

پھر ان کی جگہ آئے ناخلف کھو بیٹھے نماز اور پیچھے پڑگئے مزوں کے سو آگے دیکھ لیں گے گمراہی کو لے

إِلَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولٰٓئِكَ يَدۡخُلُونَ الۡجَنَّةَ وَلَا يُظۡلَمُونَ شَيۡـًٔا ﴿٦٠﴾

مگر جس نے توبہ کی اور یقین لایا اور کی نیکی سو وہ لوگ جائیں گے بہشت میں اور ان کا حق ضائع نہ ہوگا کچھ ٢

**خلاصہ تفسیر:** گزشتہ آیات میں انبیاء کرام علیہم السلام کا ذکر کر کے آگے ان کی اتباع کرنے والوں اور بدعت ایجاد کرنے والوں کا حال اور انجام بیان فرماتے ہیں، تاکہ رسول ﷺ کے متبعین اور ساتھ دینے والوں کو رغبت اور مخالفت کرنے والوں کو خوف ہو، نیز اس میں آخرت کا ثبوت بھی ہے جو توحید و نبوت کے ساتھ اکثر جگہ قرآن کریم میں بیان ہوتا ہے۔

پھر ان (مذکورہ انبیاء) کے بعد (بعض) ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنہوں نے نماز کو برباد کیا (تا تو اعتقاد سے کہ نماز کا انکار کیا، یا عمل سے کہ اس کے ادا کرنے میں یا ضروری حقوق و آداب میں کوتاہی کی) اور (نفسانی ناجائز) خواہشوں کی پیروی کی (جو ضروری طاعت سے غافل کرنے والی تھیں) سو یہ لوگ عنقریب (آخرت میں) خرابی دیکھیں گے (خواہ ہمیشہ کے لیے ہو جیسے کافر، یا کچھ عرصہ کے لیے گناہ گار مؤمنین) ہاں مگر جس نے (کفر و معصیت سے) توبہ کرلی (اور کفر سے توبہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ) ایمان لے آیا اور (معصیت سے توبہ کرنا یہ ہے کہ) نیک کام کرنے لگا، سو یہ لوگ (بلا خرابی دیکھے) جنت میں جائیں گے اور (جزا ملنے کے وقت) ان کا ذرا نقصان نہ کیا جائے گا (یعنی ہر نیک عمل کی جزا ملے گی)۔

* * *

**فائدہ:** لے وہ تو اگلوں کا حال تھا یہ پچھلوں کا ہے کہ دنیا کے مزوں اور نفسانی خواہشات میں پڑ کر خدا تعالیٰ کی عبادت سے غافل ہو گئے، نماز جو اہم العبادات ہے اسے ضائع کر دیا، بعض تو فرضیت ہی کے منکر ہو گئے، بعض نے فرض جانا مگر پڑھی نہیں، بعض نے پڑھی تو جماعت اور وقت وغیرہ شروط و حقوق کی رعایت نہ کی ان میں سے ہر ایک درجہ بدرجہ اپنی گمراہی کو دیکھ لے گا کہ کیسے خسارہ اور نقصان کا سبب بنتی ہے اور کس طرح کی بدترین سزا میں پھنساتی ہے، حتی کہ ان میں سے بعض کو جہنم کی اس بدترین وادی میں دھکیلا جائے گا جس کا نام ہی غیّ ہے۔

**فائدہ:** ٢ یعنی توبہ کا دروازہ ایسے مجرموں کے لیے بھی بند نہیں جو گناہ گار سچے دل سے توبہ کر کے ایمان و عمل صالح کا راستہ اختیار کر لے اور اپنا چال چلن درست رکھے بہشت کے دروازے اس کے لیے کھلے ہوئے ہیں، توبہ کے بعد جو نیک اعمال کرے گا سابق جرائم کی بنا پر اس کے اجر میں کچھ کمی نہیں کی جائے گی نہ کسی قسم کا حق ضائع ہوگا، حدیث میں ہے: اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنۡبِ كَمَنۡ لَّا ذَنۡبَ لَه، (گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے گویا اس نے گناہ کیا ہی نہ تھا) اَللّٰهُمَّ تُبۡ عَلَيۡنَا إِنَّكَ أَنۡتَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ۔

جَنّٰتِ عَدۡنِ الَّتِيۡ وَعَدَ الرَّحۡمٰنُ عِبَادَهٗ بِالۡغَيۡبِ ؕ إِنَّهٗ كَانَ وَعۡدُهٗ مَأۡتِيًّا ﴿٦١﴾

باغوں میں بسنے کے جن کا وعدہ کیا ہے رحمان نے اپنی بندوں سے ان کے بن دیکھے، بیشک ہے اس کے وعدہ پر پہنچنا

لَا يَسۡمَعُوۡنَ فِيۡهَا لَغۡوًا إِلَّا سَلٰمًا ؕ وَلَهُمۡ رِزۡقُهُمۡ فِيۡهَا بُكۡرَةً وَّعَشِيًّا ﴿٦٢﴾

، نہ سنیں گے وہاں بک بک سوائے سلام لے، اور ان کے لئے ہے ان کی روزی وہاں صبح اور شام ٢

تِلۡكَ الۡجَنَّةُ الَّتِيۡ نُوۡرِثُ مِنۡ عِبَادِنَا مَنۡ كَانَ تَقِيًّا ﴿٦٣﴾

یہ وہ بہشت ہے جو میراث دیں گے ہم اپنے بندوں میں جو کوئی ہوگا پرہیزگار

**خلاصہ تفسیر:** (یعنی) ان ہمیشہ رہنے کے باغوں میں (جائیں گے) جن کا رحمٰن نے اپنے بندوں سے غائبانہ وعدہ فرمایا ہے (اور) اس کے وعدہ کی ہوئی چیز کو یہ لوگ ضرور پہنچیں گے، اس (جنت) میں وہ لوگ کوئی فضول بات نہ سننے پائیں گے (کیونکہ وہاں فضول بات ہی نہ ہوگی) بجز (فرشتوں اور ایک دوسرے کے) سلام (کرنے) کے (اور ظاہر ہے کہ سلام سے بہت ہی خوشی اور راحت ہوتی ہے تو وہ فضول نہیں) اور ان کو کھانا صبح و شام ملا کرے گا (یعنی یہ تو معین طور پر ہوگا اور یوں دوسرے وقت بھی اگر چاہیں گے ملے گا) یہ جنت (جس کا ذکر ہوا) ایسی ہے کہ ہم اپنے بندوں میں سے اس کا مالک ایسے لوگوں کو بنائیں گے جو کہ خدا سے ڈرنے والے ہوں (جو بنیاد ہے ایمان اور عمل صالح کی)۔

**لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا:** صرف سلام کا بطور خاص ذکر مثال کے طور پر ہے، یہ مطلب نہیں کہ جنت میں سلام کے علاوہ اور کچھ بات نہ کریں گے۔

**بُكْرَةً وَّعَشِيًّا:** صبح و شام سے مراد صبح و شام کی مقدار ہے، ورنہ جنت میں اندھیرا نہ ہوگا جس پر صبح و شام کا وجود موقوف ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ جب یہ بندے اَن دیکھی چیزوں پر پیغمبروں کے فرمانے سے ایمان لائے، بن دیکھے خدا کی عبادت کی، تو اللہ نے ان سے جنت کی اَن دیکھی نعمتوں کا وعدہ فرمالیا، جو ضرور بالضرور پورا ہو کر رہے گا، کیونکہ خدا کے وعدے بالکل حتمی اور اٹل ہوتے ہیں۔

**فائدہ:** ۲ یعنی جنت میں لغو بیکار اور بیہودہ شور و شغب نہ ہوگا، ہاں فرشتوں اور مومنین کی طرف سے سَلَامٌ عَلَيْكَ کی آوازیں بلند ہوں گی۔

**فائدہ:** ۳ صبح و شام سے جنت کی صبح و شام مراد ہے، وہاں دنیا کی طرح طلوع و غروب نہ ہوگا جس سے رات دن اور صبح شام مقرر کی جائے، بلکہ خاص قسم کی انوار کا توارُد و تنوع ہوگا، جس کے ذریعہ سے صبح و شام کی تحدید و تعیین کی جائے گی، حسب عادت و معمول صبح و شام جنت کی روزی پہنچے گی، ایک منٹ کے لیے بھوک کی تکلیف نہیں ستائے گی، وہ روزی کیا ہوگی؟ اس کی کیفیت خدا ہی جانے، حدیث میں ہے: يُسَبِّحُوْنَ اللّٰهَ بُكْرَةً وَّعَشِيًّا (اجنبی صبح و شام حق تعالیٰ کی تسبیح کہیں گے) گویا جسمانی غذا کے ساتھ روحانی غذا بھی ملتی رہے گی۔

**فائدہ:** ۴ یعنی میراث آدم کی کہ اول ان کو بہشت ملی ہے، اور شاید لفظ میراث اس لیے اختیار فرمایا کہ اقسام تملیک میں یہ سب سے زیادہ اتم و احکم قسم ہے جس میں نہ فسخ کا احتمال نہ لوٹائے جانے کا نہ ابطال و اقالہ کا۔

| |
|---|
| وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ |
| اور ہم نہیں اترتے مگر حکم سے تیرے رب کے، اسی کا ہے جو ہمارے آگے ہے اور جو ہمارے پیچھے اور جو اس کے بیچ میں ہے |
| وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿٦٤﴾ |
| اور تیرا رب نہیں ہے بھولنے والا |

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے اہل ایمان کی فضیلت اور ثواب کے بیان کرنے میں اطاعت کی ترغیب تھی، آگے اس کی تاکید کے لیے فرشتوں کا انتہائی درجہ حکم الٰہی کا تابع ہونا اور تمام عالم کا خدا کی قدرت سے مسخر ہونا بیان فرما کر اطاعت کا حکم فرماتے ہیں، اس آیت کا شان نزول بخاری وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت جبریل علیہ السلام سے یہ آرزو ظاہر فرمائی تھی کہ ذرا زیادہ آیا کرو، اس پر جبریل علیہ السلام کی جانب سے بطور جواب یہ آیت نازل ہوئی، جس سے ان کا انتہائی درجہ حکم الٰہی کا تابع ہونا ظاہر ہے اور اس سے اطاعت کی تاکید اور ترغیب ظاہر ہے کہ جب فرشتوں کی یہ کیفیت ہے تو دوسرے کیوں نہ اطاعت کریں۔

اور (ہم آپ کی درخواست کا جبرئیل علیہ السلام کی طرف سے جواب دیتے ہیں، سنیے وہ یہ ہے کہ) ہم (یعنی فرشتے) بدون آپ کے رب

کے حکم کے وقتاً فوقتاً نہیں آسکتے ،اسی کی (ملک ) ہیں ہمارے آگے کی سب چیزیں (مکان ہو یا زمان، مکانی ہو یا زمانی) اور (اسی طرح) ہمارے پیچھے کی سب چیزیں اور جو چیزیں ان کے درمیان میں ہیں (یعنی جو مکان ہمارے سامنے ہے اور جو ہماری پشت کی طرف ہے اور جس مکان میں ہم رہتے ہیں اسی طرح جو زمانہ آئندہ آنے والا ہے اور جو گزر گیا اور جو زمانہ اب موجود ہے) اور آپ کا رب بھولنے والا نہیں (چنانچہ یہ سب امور آپ کو پہلے سے معلوم ہیں، مطلب یہ ہے کہ ہم ہر طرح سے حکم کے تابع ہیں، اپنی رائے سے ایک مکان سے دوسرے مکان میں یا جس زمانہ میں ہم چاہیں کہیں آجا نہیں سکتے ،لیکن جب ہمارا بھیجنا مصلحت ہوتا ہے تو حق تعالیٰ بھیج دیتے ہیں، یہ احتمال نہیں کہ شاید کسی مصلحت کے وقت بھیجنا بھول جاتے ہوں)۔

**وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ:** بعض لوگوں نے جن کو احادیث سے اعتقاد نہیں اس آیت کو اہل جنت کا قول بتایا ہے کہ وہ جنت میں جا کر کہیں گے کہ ہمارا یہ جنت میں اترنا خدا کے حکم سے ہوا ہے،لیکن اول تو یہ بات صحیح شان نزول کے خلاف ہے، دوسرے ''تنزل'' کے معنی بار بار اترنے کے ہیں، سو یہ جنت میں کہاں ہوگا، جنت میں تو ایک بار ہی پہنچنا ہوگا، پھر وہیں رہیں گے، وہاں سے نکل کر بار بار تو نہ جائیں گے، تیسرے اس صورت میں بجائے بامر ربك کے بامر ربنا کہنا زیادہ مناسب وقرین بلاغت تھا۔

* * *

**فائدہ:** ایک مرتبہ جبرائیل علیہ السلام کئی روز تک نہ آئے، آپ منقبض تھے، کفار نے کہنا شروع کیا کہ محمد ﷺ کو اس کے رب نے خفا ہو کر چھوڑ دیا ہے، اس طعن سے آپ اور زیادہ دل گیر ہوئے، آخر جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے، آپ نے اتنے روز تک نہ آنے کا سبب پوچھا، اور ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا: مَا يَمْنَعُكَ اَنْ تَزُوْرَنَا اَكْثَرَ مِمَّا تَزُوْرُنَا (جتنا تم آتے ہو اس سے زیادہ کیوں نہیں آتے؟) اللہ تعالیٰ نے جبرائیل کو سکھلایا کہ جواب میں یوں کہو: وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ یہ کلام ہوا اللہ کا جبرائیل کی طرف سے، جیسا اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں ہم کو سکھلایا ہے، حاصل جواب یہ ہے کہ ہم خالص عبد مامور ہیں، بدون حکم الٰہی ایک پر نہیں ہلا سکتے، ہمارا چڑھنا اترنا سب اس کے حکم واذن کے تابع ہے، وہ جس وقت اپنی حکمت کاملہ سے مناسب جانے ہم کو نیچے اترنے کا حکم دے، کیونکہ ہر زمانہ (ماضی، مستقبل، حال) اور ہر مکان (آسمان زمین اور ان کے درمیان) کا علم اسی کو ہے اور وہ ہی ہر چیز کا مالک وقابض ہے، وہ ہی جانتا ہے کہ فرشتوں کو پیغمبر کے پاس کس وقت بھیجنا چاہیے، مقرب ترین فرشتہ اور معظم ترین پیغمبر کو بھی یہ اختیار نہیں کہ جب چاہے کہیں چلا جائے یا کسی کو اپنے پاس بلالے خدا کا ہر کام برمحل اور بروقت ہے، بھول چوک یا نسیان وغفلت کی اس کی بارگاہ میں رسائی نہیں، مطلب یہ ہے کہ جبرائیل کا جلد یا بدیر آنا بھی اس کی حکمت ومصلحت کے تابع ہے۔

**تنبیہ اول:** ''ہمارے آگے پیچھے'' کہا آسمان وزمین کو، اترتے ہوئے زمین آگے، آسمان پیچھے، چڑھتے ہوئے وہ پیچھے یہ آگے، اور اگر ''آگے پیچھے'' سے تقدم وتاخر زمانی مراد ہو تو زمانہ مستقبل آگے آنے والا اور زمانہ ماضی پیچھے گزر چکا ہے اور زمانہ حال دونوں کے بیچ میں واقع ہے۔

**تنبیہ دوم:** پہلے فرمایا تھا کہ جنت کے وارث اتقیاء (خدا سے ڈرنے والے پرہیزگار) ہیں، اس آیت میں بتلا دیا کہ ڈرنے کے لائق وہ ہی ذات ہو سکتی ہے جس کے قبضہ میں تمام زمان ومکان ہیں، اور جس کے حکم واجازت کے بدون بڑے سے بڑا فرشتہ بھی پر نہیں ہلا سکتا، انسان کو چاہیے اگر وہ جنت کی میراث لینا چاہتا ہے کہ فرشتوں کی طرح حکم الٰہی کا مطیع ومنقاد بن جائے اور ادھر بھی اشارہ ہو گیا کہ جو خدا اپنے مخلص بندوں کو یہاں نہیں بھولتا، وہاں بھی نہیں بھولے گا، ضرور جنت میں پہنچا کر چھوڑے گا، ہاں ہر چیز کا ایک وقت ہے جنت میں ہر ایک کا نزول بھی اپنے اپنے وقت پر ہوگا، اور جیسے یہاں پیغمبر کے پاس فرشتے حکم الٰہی کے موافق وقت معین پر آتے ہیں، جنت میں جنتیوں کی غذائے روحانی وجسمانی بھی صبح وشام اوقات مقررہ پر آئے گی۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ۭ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿۶۵﴾ ع

رب آسمانوں کا اور زمین کا اور جو ان کے بیچ ہے سو اسی کی بندگی کر اور قائم رہ اس کی بندگی پر ۱؎ کسی کو پہچانتا ہے تو اس کے نام کا ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اب تمام عالم کا باری تعالیٰ کی قدرت اور ان کا مسخر ہونا بیان فرما کر بطور نتیجہ اطاعت کا حکم دیتے ہیں۔

وہ رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان سب چیزوں کا جو ان دونوں کے درمیان میں ہیں، سو (جب وہ ایسا حاکم و مالک ہے تو اے مخاطب!) تو اس کی عبادت (اور اطاعت) کیا کر اور (ایک آدھ بار نہیں، بلکہ) اس کی عبادت پر قائم رہ (اور اگر اس کی عبادت نہ کرے گا تو کیا دوسرے کی عبادت کرے گا) بھلا تو کسی کو اس کا ہم صفت جانتا ہے (یعنی جب اس کا ہم صفت کوئی نہیں تو عبادت کے لائق بھی کوئی نہیں، پس اسی کی عبادت کرنا ضروری ہوا)۔

**وَاصۡطَبِرۡ لِعِبَادَتِهٖ**: اس میں اخلاق وسلوک کے مجاہدات کی جانب اشارہ ملتا ہے اور اس پر صبر وثبات کی تلقین بھی معلوم ہوتی ہے (اخلاق وسلوک کے مجاہدات وہی ہیں جو شریعت میں جائز ہوں) اور یہی "رجعنا من الجهاد الأصغر إلى الجهاد الأكبر" کا حاصل ہے، اور ان مجاہدات میں قبض بھی آ گیا، اس پر بھی صبر کرنا چاہیے، یعنی اگر کسی مصلحت کی بنا پر فوائد کا ورود منقطع ہو جائے تو اس پر دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے۔

* * *

**فائدہ**: ۱ یعنی کسی کے کہنے سننے کی پرواہ مت کر، اپنے دل کو خدا کی بندگی پر جمائے رکھ جو سارے جہان کا رب ہے اور سب سے نرالی صفات رکھتا ہے۔

**فائدہ**: ۲ اللہ کے نام اس کی صفات ہیں، یعنی کوئی ہے اس کی صفت کا؟ جس میں اس جیسی صفات موجود ہوں؟ جب کوئی نہیں تو بندگی کے لائق اور کون ہو سکتا ہے؟

## وَيَقُوۡلُ الۡاِنۡسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوۡفَ اُخۡرَجُ حَيًّا ﴿۶۶﴾

اور کہتا ہے آدمی کیا جب میں مر جاؤں تو پھر نکلوں گا زندہ ہو کر ۱

## اَوَلَا يَذۡكُرُ الۡاِنۡسَانُ اَنَّا خَلَقۡنٰهُ مِنۡ قَبۡلُ وَلَمۡ يَكُ شَيۡـًٔا ﴿۶۷﴾

کیا یاد نہیں رکھتا آدمی کہ ہم نے اس کو بنایا ہے پہلے سے اور وہ کچھ چیز نہ تھا ۲

**خلاصہ تفسیر**: پیچھے اطاعت ومعصیت کرنے والوں کا دنیوی حال اور آخرت کا انجام اجمالی طور پر بیان ہوا، آگے اس کی کسی قدر تفصیل ہے، نیز اس میں دوبارہ قیامت میں ہونے کی بھی تفصیل ہے جو پیچھے اجمال کے ساتھ مذکور تھی، سورت کے آخر تک یہی ربط جاری ہے۔

اور انسان (منکر آخرت) یوں کہتا ہے کہ میں جب مر جاؤں گا تو کیا پھر زندہ کر کے قبر سے نکالا جاؤں گا؟ (اللہ تعالیٰ جواب دیتے ہیں کہ) کیا (یہ) انسان اس بات کو نہیں سمجھتا کہ ہم اس کو اس کے قبل (عدم سے) وجود میں لا چکے ہیں، اور یہ (اس وقت) کچھ بھی نہ تھا (جب ایسی حالت سے حیات کی طرف لانا آسان ہے تو دوبارہ حیات دینا تو بدرجہ اولیٰ آسان ہے، یہ جواب ہوا منکر قیامت کے لیے)۔

* * *

**فائدہ**: ۱ گذشتہ رکوع میں نیکوں اور بدوں کا انجام فرمایا تھا جو مرنے کے بعد ہوگا، جو لوگ مر کر زندہ ہونے کو محال یا مستبعد سمجھتے ہیں یہاں ان کے شبہات کا جواب دیا جاتا ہے، یعنی آدمی انکار وتعجب کی راہ سے کہتا ہے کہ مر گل کر جب ہماری ہڈیاں ریزہ ریزہ ہوگئیں اور مٹی میں مل کر مٹی بن گئے، کیا اس کے بعد پھر ہم قبروں سے زندہ کر کے نکالے جائیں گے اور پردۂ عدم سے نکل کر پھر منصۂ وجود پر جلوہ گر ہوں گے۔

**فائدہ**: ۲ یعنی آدمی ہو کر اتنی موٹی بات بھی نہیں سمجھتا کہ چند روز پہلے وہ کوئی چیز نہ تھا، حق تعالیٰ نے نابود سے بود کیا، کیا وہ ذات جو لاشئ کو شئ اور معدوم محض کو موجود کر دے، اس پر قادر نہیں کہ ایک چیز کو فنا کر کے دوبارہ پیدا کر سکے، آدمی کو اپنی پہلی ہستی کی کیفیت یاد نہیں رہی جو دوسری ہستی کا مذاق اڑاتا ہے: وَهُوَ الَّذِيۡ يَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ يُعِيۡدُهٗ وَهُوَ اَهۡوَنُ عَلَيۡهِ

فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ۞ ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ

سو قسم ہے تیرے رب کی ہم گھیر بلائیں گے انکو اور شیطانوں کو ۱ پھر سامنے لائیں گے گرد دوزخ کے گھٹنوں پر گرے ہوئے ۲ پھر جدا کر لیں گے ہم

كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ۞ ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا ۞

ہر ایک فرقہ میں سے جونسا ان میں سے سخت رکھتا تھا رحمان سے اکڑ پھر ہم کو خوب معلوم ہے جو بہت قابل ہیں اس میں داخل ہونے کے (جھونکنے کے) ۳

**خلاصہ تفسیر:** سو قسم ہے آپ کے رب کی ہم ان کو (قیامت میں زندہ کر کے میدان حساب میں) جمع کریں گے اور (ان کے ساتھ) شیاطین کو بھی (جو دنیا میں ان کے ساتھ رہ کر بہکاتے سکھاتے تھے جیسا دوسری آیت میں ہے: قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ) پھر ان (سب) کو دوزخ کے اردگرد اس حالت سے حاضر کریں گے کہ (ہیبت کے مارے) گھٹنوں کے بل گرے ہوں گے۔

پھر (ان کفار کے) ہر گروہ میں سے (جیسے یہود و نصاریٰ و مجوس بت پرست) ان لوگوں کو جدا کریں گے جو ان میں سب سے زیادہ اللہ سے سرکشی کیا کرتے تھے (تا کہ ایسوں کو دوسروں سے پہلے دوزخ میں داخل کریں) پھر (یہ نہیں کہ اس جدا کرنے میں ہمیں کسی تحقیقات کی ضرورت پڑے، کیونکہ) ہم (خود) ایسے لوگوں کو خوب جانتے ہیں جو دوزخ میں جانے کے زیادہ (یعنی اول) مستحق ہیں (پس اپنے علم سے ایسے سرکشوں کو الگ کر کے پہلے ان کو، پھر دوسرے کفار کو دوزخ میں داخل کریں گے)۔

یہ ترتیب صرف پہلے داخل ہونے میں ہے، اور داخل ہونے کے بعد پھر کوئی کافر نکالا نہ جائے گا، سب اسی میں ہمیشہ رہیں گے، اس حالت میں سب برابر ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی یہ منکرین ان شیاطین کی معیت میں قیامت کے دن خدا کے سامنے حاضر کیے جائیں گے جو اغواء کر کے انھیں گمراہ کرتے تھے، ہر مجرم کا شیطان اس کے ساتھ پکڑا ہوا آئے گا۔

**فائدہ:** ۲ یعنی مارے دہشت کے کھڑے سے گر پڑیں گے اور چین سے بیٹھ بھی نہ سکیں گے، یہ ہی ہوا گھٹنوں پر گرنا۔

**فائدہ:** ۳ یعنی منکرین کے ہر فرقہ میں جو زیادہ بدمعاش، سرکش اور اکڑ باز تھے، انھیں عام مجرموں سے علیحدہ کر لیا جائے گا، پھر ان میں بھی جو بہت زیادہ سزا کے لائق اور دوزخ کا حقدار ہوگا وہ خدا کے علم میں ہے اس کو دوسرے مجرموں سے پہلے آگ میں جھونکا جائے گا۔

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۞

اور کوئی نہیں تم میں جو نہ پہنچے گا اس پر، ہو چکا یہ وعدہ تیرے رب پر لازم مقرر

ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ۞

پھر بچائیں گے ہم ان کو جو ڈرتے رہے اور چھوڑ دیں گے گناہ گاروں کو اس میں اوندھے گرے ہوئے

**خلاصہ تفسیر:** (جہنم کا وجود ایسا یقینی ہے کہ اس کا معائنہ ہر مؤمن و کافر کو کرایا جائے گا اگرچہ ہر ایک کے معائنہ کی صورت اور غرض مختلف ہوگی، کفار کا معائنہ داخل ہونے کے لیے اور ہمیشہ عذاب پانے کے لیے ہوگا اور مؤمنین کو پل صراط پر گزرتے ہوئے معائنہ ہوگا تا کہ جہنم کو دیکھنے کے بعد جب جنت میں پہنچیں گے تو زیادہ شکر کریں اور خوش ہوں) اور (بعض گنہگاروں کو جو دوزخ میں بھیجا جائے گا تو اس سے ان کی پاکی

اور صفائی مقصود ہوگی نہ کہ عذاب دینا، اسی عام معائنہ کی خبر دی جاتی ہے کہ ) تم میں سے کوئی بھی نہیں جس کا اس پر گزر نہ ہو ( کسی کا داخل ہونے کے لیے اور کسی کا فقط گزرنے کے لیے ) یہ ( وعدہ کے موافق ) آپ کے رب کے اعتبار سے ( بطور ) لازم ( مؤکد کے ) ہے جو ( ضرور ) پورا ہوکر رہے گا۔

پھر ( اس جہنم پر سب کے گزرنے سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس میں مؤمن وکافر برابر ہوں گے، بلکہ ) ہم ان لوگوں کونجات دے دیں گے جو خدا سے ڈرکر ( ایمان ) لاتے تھے ( خواہ فوراً ہی نجات ہوجائے کہ اسی وقت پل صراط سے گزر کر جنت میں پہنچ جائیں، جیسا کہ مؤمنین کاملین کے لیے ہوگا، یا کسی قدر تکلیف کے بعد نجات ہوجائے جیسا کہ ناقص مسلمانوں کو پیش آئے گا اور ظالموں کو ( یعنی کافروں کو ) اس میں ( ہمیشہ کے لئے ) ایسی حالت میں رہنے دیں گے کہ ( رنج وغم کے مارے ) گھٹنوں کے بل گر پڑیں گے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی ہر نیک وبد، مجرم وبری، اور مومن وکافر کے لیے حق تعالیٰ قسم کھا چکا اور فیصلہ کر چکا ہے کہ ضرور بالضرور دوزخ پر اس کا گزر ہوگا، کیونکہ جنت میں جانے کا راستہ ہی دوزخ کو گیا ہے جسے عام محاورات میں ''پل صراط'' کہتے ہیں، اس پر لامحالہ سب کا گزر ہوگا خدا سے ڈرنے والے مومنین اپنے اپنے درجہ کے موافق وہاں سے صحیح سلامت گزر جائیں گے اور گنہگار الجھ کر دوزخ میں گر پڑیں گے، ( العیاذ باللہ ) پھر کچھ مدت کے بعد اپنے اپنے عمل کے موافق، نیز انبیاء ملائکہ اور صالحین کی شفاعت سے، اور آخر میں براہِ راست ارحم الراحمین کی مہربانی سے وہ سب گنہگار جنہوں نے سچے اعتقاد کے ساتھ کلمہ پڑھا تھا، دوزخ سے نکالے جائیں گے، صرف کافر باقی رہ جائیں گے اور دوزخ کی آگ میں ہر شخص کو داخل کیا جائے گا مگر صالحین پر وہ آگ بردوسلام بن جائے گی، وہ بے کھٹکے اس میں سے گزر جائیں گے، واللہ اعلم۔

امام فخر الدین رازیؒ نے اپنی تفسیر میں اس دخول کی بہت سی حکمتیں بیان کی ہیں، فلیراجع۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَيُّ الْفَرِيقَيْنِ

اور جب سنائے ان کو ہماری آیتیں کھلی ہوئی کہتے ہیں جو لوگ کہ منکر ہیں ایمان والوں کو دونوں فرقوں میں کس کا

خَيْرٌ مَّقَامًا وَأَحْسَنُ نَدِيًّا ﴿٧٣﴾ وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّن قَرْنٍ هُمْ أَحْسَنُ أَثَاثًا وَرِئْيًا ﴿٧٤﴾

مکان بہتر ہے اور کس کی اچھی لگتی ہے مجلس ۱ے اور کتنی ہلاک کر چکے ہم پہلے ان سے جماعتیں وہ ان سے بہتر تھے سامان میں اور نمود میں ۲ے

**خلاصہ تفسیر:** اور جب ان منکر لوگوں کے سامنے ہماری ( وہ ) کھلی کھلی آیتیں پڑھی جاتی ہیں ( جن میں مومنین کا حق پر اور کفار کا باطل پر ہونا مذکور ہوتا ہے ) تو یہ کافر لوگ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ ( یہ بتلاؤ ہم ) دونوں فریقوں میں ( یعنی ہم میں اور تم میں دنیا میں ) مکان کس کا زیادہ اچھا ہے اور محفل کس کی اچھی ہے؟ ( یعنی ظاہر ہے کہ خانگی سامان اور مجلس کی آرائش اور اہل وعیال اور خادم میں ہم زیادہ بڑھے ہوئے ہیں، یہ مقدمہ تو ظاہری ہے اور اس کے ساتھ دوسرا مقدمہ عرفی یہ ملالو کہ محبوب ہی کو نعمت، احسان اور انعام دیا جاتا ہے، ان دونوں مقدموں سے ثابت ہوا کہ ہم اللہ کے محبوب ومقبول ہیں اور تم سے خدا ناراض ہے، آگے اللہ تعالیٰ دو جواب دیتے ہیں، ایک الزامی، دوسرا واقعی، پہلا الزامی جواب تو یہ ہے کہ یہ لوگ ایسی بات کہتے ہیں ) اور ( یہ نہیں دیکھتے کہ ) ہم نے ان سے پہلے بہت سے ایسے ایسے گروہ ( ہیبت ناک سزاؤں سے جو کہ بالیقین عذاب تھے ) ہلاک کئے ہیں جو سامان اور نمود میں ان سے بھی ( کہیں زیادہ ) اچھے تھے ( اس سے معلوم ہوا کہ یہ ساز وسامان مقبولیت کی دلیل نہیں، بلکہ کسی حکمت اور مصلحت کی وجہ سے یہ دنیوی نعمت مبغوض ومردود کو بھی دی جاسکتی ہے )۔

آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ: آیتوں کا بینات ہونا یا تو اعجاز کے اعتبار سے ہے یا اپنے مطالب کے اثبات کے اعتبار سے یا دونوں کے اعتبار سے ہے۔

* * *

**فائدہ:** اے یعنی کفار قرآن کی آیتیں سن کر جن میں ان کا برا انجام بتلایا گیا ہے ہنستے ہیں اور بطور استہزاء وتفاخر غریب مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تمہارے زعم کے موافق آخرت میں جو کچھ پیش آئے گا دونوں فریق کی موجودہ حالت اور دنیاوی پوزیشن پر منطبق نہیں ہوتا، کیا آج ہمارے مکانات، فرنیچر، اور بود و باش کے سامان تم سے بہتر نہیں اور ہماری مجلس (یا سوسائٹی) تمہاری سوسائٹی سے معزز نہیں یقیناً ہم جو تمہارے نزدیک باطل پر ہیں، تم اہل حق سے زیادہ خوشحال اور جتھے والے ہیں، جو لوگ آج ہم سے خوف کھا کر کوہ صفا کی گھاٹی میں نظر بند ہوں، کیا گمان کیا جا سکتا ہے کہ کل وہ چھلانگ مار کر جنت میں جا پہنچیں گے؟ اور ہم دوزخ میں پڑے جلتے رہیں گے؟

**فائدہ:** ۲ یہ ان کی بات کا جواب دیا کہ پہلے ایسی بہت قومیں گزر چکی ہیں جو دنیا کے ساز و سامان اور شان و نمود میں تم سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں، لیکن جب انہوں نے انبیاء کے مقابلہ میں سرکشی کی اور تکبر و تفاخر کو اپنا شعار بنا لیا، خدا تعالیٰ نے ان کی جڑ کاٹ دی اور دنیا کے نقشہ میں ان کا نشان بھی باقی نہ رہا، پس آدمی کو چاہیے کہ دنیا کی فانی ٹیپ ٹاپ اور عارضی بہار سے دھوکہ نہ کھائے، عموماً متکبر دولت مند ہی حق کو ٹھکرا کر نہنگ ہلاکت کا لقمہ بنا کرتے ہیں، مال اولاد یا دنیاوی خوشحالی مقبولیت اور حسن انجام کی دلیل نہیں۔

قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰٓى إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ

تو کہہ جو رہا بھٹکتا (گمراہی میں) سو چاہیے اس کو کھینچ لے جائے رحمان لمبا اے یہاں تک کہ جب دیکھیں گے جو وعدہ ہوا تھا ان سے

إِمَّا الْعَذَابَ وَإِمَّا السَّاعَةَ ۖ فَسَيَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّأَضْعَفُ جُنْدًا ﴿۷۵﴾

یا آفت اور یا قیامت، سو تب معلوم کرلیں گے کس کا برا ہے مکان اور کس کی فوج کمزور ہے ۲

**خلاصہ تفسیر:** (اب دوسرا واقعی جواب ہے کہ اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ فرما دیجئے کہ جو لوگ گمراہی میں ہیں (یعنی تم) اللہ تعالیٰ ان کو ڈھیل دیتا چلا جا رہا ہے (یعنی تم کو یہ دنیاوی نعمت دینے میں یہ حکمت ہے کہ مہلت دے کر تم پر حجت تمام کر دے، جیسا کہ دوسری آیت میں ہے: أَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَنْ تَذَكَّرَ الخ اور یہ مہلت چند روزہ ہے) یہاں تک کہ جس چیز کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے جب اس کو دیکھ لیں گے خواہ عذاب کو (دنیا میں) خواہ قیامت کو (دوسرے عالم میں) سو (اس وقت) ان کو معلوم ہو جائے گا کہ برا مکان کس کا ہے اور کمزور مددگار کس کے ہیں (یعنی دنیا میں جو اپنے مجلس والوں کو اپنا مددگار سمجھتے ہیں اور فخر کرتے ہیں وہاں معلوم ہوگا کہ ان میں کتنا زور ہے، وہاں تو زور میں اتنی کمی ہوگی کہ ذرا بھی زور نہ ہوگا، یہاں ضعف سے یہی انتہائی درجہ مراد ہے)۔

**قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ:** اس کے عموم میں اہل باطل کے اعمال کی بقاء بھی داخل ہے، سو احوال پر مغرور نہیں ہونا چاہیے۔

**وَّأَضْعَفُ جُنْدًا:** اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ قیامت میں کافروں کے پاس لشکر ہوگا مگر کمزور ہوگا، کیونکہ یہاں لشکر سے مراد مجلس والے ہیں آخرت میں ان کی کمزوری بیان کرنا مقصود ہے، اور یہ شبہ بھی نہ کیا جائے کہ اس لشکر میں وہاں قوت تو ہوگی مگر کم ہوگی، کیونکہ ضعف کی انتہا یہ ہے کہ بالکل قوت نہ رہے، تو قوت سے خالی ہونے پر بھی اضعف صادق آتا ہے، چنانچہ احقر کے خلاصہ تفسیر سے یہ دونوں شبہ دور ہو گئے۔

* * *

**فائدہ:** اے یعنی جو خود گمراہی میں جا پڑا اسے گمراہی میں جانے دے، کیونکہ دنیا جانچنے کی جگہ ہے، یہاں ہر ایک کو عمل کی فی الجملہ آزادی دی گئی ہے، خدا تعالیٰ کی عادت اور حکمت کا اقتضاء یہ ہے کہ جو اپنے کسب و ارادہ سے کوئی راستہ اختیار کر لے اس کو نیک و بد سے خبردار کر دینے کے بعد اسی راستہ پر چلنے کے لیے ایک حد تک آزاد چھوڑ دے، اسی لیے جو بدی کی راہ چل پڑا اس کے حق میں دنیا کی مرفہ الحالی اور درازئی عمر وغیرہ تباہی کا پیش خیمہ سمجھنا چاہیے، نیک و بد یہاں رلے ملے ہیں آخرت میں پوری طرح جدا ہوں گے، اصلی بھلائی برائی وہاں ملے گی۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی کفار مسلمانوں کو ذلیل و کمزور اور اپنے کو معزز و طاقتور سمجھتے ہیں، اپنے عالیشان محلات اور بڑی بڑی فوجوں اور جتھوں پر اتراتے ہیں، کیونکہ خدا نے ابھی ان کی باگ ڈھیلی چھوڑ رکھی ہے جس وقت گلا دبایا جائے گا خواہ دنیاوی عذاب کی صورت میں یا قیامت کے بعد، تب پتہ لگے گا کہ کس کا مکان برا ہے اور کس کی جمعیت کمزور ہے، اس موقع پر تمہارے سامان اور لشکر کچھ کام نہ آئیں گے۔

وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ط

اور بڑھاتا جاتا ہے اللہ سوجھنے والوں کو (سوجھے ہوؤں کو، سجھائے ہوؤں کو) سُوجھ ۱؎

وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا ﴿۷۶﴾

اور باقی رہنے والی نیکیاں بہتر رکھتی ہیں تیرے رب کے یہاں بدلہ اور بہتر پھر جانے کو جگہ ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ) اللہ تعالیٰ ہدایت والوں کو (دنیا میں تو) ہدایت بڑھاتا ہے (یعنی اصل سرمایہ یہ ہے کہ اگر اس کے ساتھ مال و دولت نہ ہو تو مضر نہیں) اور (آخرت میں ظاہر ہوگا کہ) جو نیک کام ہمیشہ باقی رہنے والے ہیں وہ تمہارے رب کے نزدیک ثواب میں بھی بہتر ہیں اور انجام میں بھی بہتر ہیں (پس ان کو ثواب میں بڑی بڑی نعمتیں ملیں گی جن میں مکان اور باغات سب کچھ ہوں گے اور ان اعمال کا انجام یہ ہے کہ وہ نعمتیں ہمیشہ رہیں گی، آخر کار مقدار میں بھی اور کیفیت میں بھی مسلمانوں ہی کی حالت بہتر ہوگی، اور اخیر ہی کا اعتبار بھی ہے)۔

وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى: اس میں ہدایت کی کوئی حد مقرر نہ ہونے سے سمجھ آتا ہے کہ ترقی کی کوئی حد و انتہا نہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی جیسے گمراہوں کو گمراہی میں لمبا چھوڑ دیتا ہے، ان کے بالمقابل جو سوجھ بوجھ کی راہ ہدایت اختیار کرلیں ان کی سوجھ بوجھ اور فہم و بصیرت کو اور زیادہ تیز کر دیتا ہے جس سے وہ حق تعالیٰ کی خوشنودی کے راستوں پر بگٹٹ اڑے چلے جاتے ہیں۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی دنیا کی رونق رب کے ہاں کام کی نہیں، نیکیاں سب رہیں گی اور دنیا نہ رہے گی، آخرت میں ہر نیکی کا بہترین بدلہ اور بہترین انجام ملے گا۔

اَفَرَءَيْتَ الَّذِىْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿۷۷﴾ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ

بھلا تو نے دیکھا اس کو جو منکر ہوا ہماری آیتوں سے اور کہا مجھ کو مل کر رہے گا مال اور اولاد ۱؎ کیا جھانک آیا ہے غیب کو یا لے رکھا ہے

عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۷۸﴾ كَلَّا ط سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿۷۹﴾ وَّنَرِثُهٗ

رحمان سے عہد ۲؎ یہ نہیں، ہم لکھ رکھیں گے جو وہ کہتا ہے اور بڑھاتے جائیں گے اس کو عذاب میں لمبا ۳؎ اور ہم لے لیں گے اس کے مرنے پر

مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ﴿۸۰﴾

جو کچھ وہ بتلا رہا ہے اور آئیگا ہمارے پاس اکیلا ۴؎

**خلاصہ تفسیر:** آگے بھی بعض منکروں کے قول کا رد ہے، اس کا قصہ یہ ہے کہ خباب بن ارت صحابی لوہار کا کام کرتے تھے ان کا کچھ قرض عاص بن وائل کے ذمہ رہ گیا تھا، خباب نے ایک بار تقاضا کیا تو عاص نے جواب دیا کہ جب تک تو محمد کے ساتھ کفر نہ کرے گا تیرے دام نہ دوں گا، انہوں نے کہا کہ اگر تو مر کر بھی زندہ ہوگا جب بھی کفر نہ کروں گا، کہنے لگا بس جب یہ بات ہے کہ میں مر کر پھر زندہ ہونے والا ہوں تو میرے پاس

جبھی آنا اس وقت میرے پاس مال واولاد سب کچھ ہوگا تیرے دام بھگتا دوں گا اس پر یہ آیات نازل ہوئی۔

(اے محمد ﷺ) بھلا آپ نے اس شخص (کی حالت) کو بھی دیکھا جو ہماری آیتوں کے ساتھ (جن کا حق یہ ہے کہ ان پر ایمان لایا جاتا جن میں قیامت کے متعلق بھی آیات ہیں) کفر کرتا ہے اور (استہزاء کے طور پر) کہتا ہے کہ مجھ کو (آخرت میں) مال اور اولاد ملیں گے (مطلب یہ کہ اس شخص کی حالت بھی قابل تعجب ہے، اب اسکا رد ہے کہ) کیا یہ شخص غیب پر مطلع ہوگیا ہے یا اس نے اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد (اس بات کا) لے لیا ہے۔

ہرگز نہیں (محض غلط کہتا ہے اور) ہم اس کا کہا ہوا بھی لکھ لیتے ہیں (اور وقت پر یہ سزا دیں گے کہ) اس کے لئے عذاب بڑھاتے چلے جائیں گے، اور اس کی کہی ہوئی چیزوں کے ہم مالک رہ جائیں گے (یعنی وہ تو دنیا سے مرکر چلا جائے گا اور مال واولاد پر اس کا کوئی اختیار نہ رہے گا، ہم ہی سب کے مالک رہیں گے اور قیامت میں ہم اس کو کچھ نہ دیں گے، بلکہ) وہ ہمارے پاس (مال واولاد سے) تنہا ہوکر آئے گا۔

**اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ:** یعنی یہ دعوی کہاں سے کررہا ہے، کوئی دلیل بھی اس کے پاس ہے یا محض زبانی جمع خرچ ہے، اگر کوئی دلیل ہے تو بیان کرے، سو یہ دعوی عقلی تو ہے نہیں محض نقلی ہے جس کی دلیل خداوند تعالی کا قول ہوسکتا ہے، سو کیا خدا تعالی نے اس سے خود یہ بات کہی ہے، یا علم غیب کے ذریعہ سے اس نے معلوم کرلیا، دونوں طریقے اس کے پاس نہیں، دوسرے یہ دعوی عقلاً بھی ممتنع ہے اور واقع کے بھی خلاف ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی کفر کے باوجود آپ نے یہ جرأت دیکھی، ایک کافر مالدار ایک مسلمان لوہار کو کہنے لگا تو مسلمانی سے منکر ہو تو تیری مزدوری دوں، اس نے کہا اگر تو مرے اور پھر جئے تو بھی میں منکر نہ ہوں، اس نے کہا اگر مرکر پھر جیوں گا تو یہ ہی مال واولاد بھی ہوگا، تجھ کو مزدوری وہاں دے دوں گا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، یعنی وہاں دولت ملتی ہے ایمان سے، کافر چاہے کہ یہاں کی دولت وہاں ملے، یا کفر کے باوجود اخروی عیش وتنعم کے مزے اڑائے یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی ایسے یقین ووثوق سے جو دعویٰ کررہا ہے کیا غیب کی خبر پالی ہے؟ یا خدا سے کوئی وعدہ لے چکا ہے؟ ظاہر ہے کہ دونوں میں سے ایک بات بھی نہیں، ایک گندے کافر کی کیا بساط کہ وہ اس طرح کی غیبیات تک رسائی حاصل کرلے؟ رہا خدا کا وعدہ، وہ ان لوگوں سے ہوسکتا ہے جنہوں نے اپنا عہد پورا کرکے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللہ اور عمل صالح کی امانت خدا کے پاس رکھ دی ہے۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی یہ قول بھی شامل مسل کرلیا جائے گا۔ اور مال واولاد کی جگہ اس کی سزا بڑھادی جائے گی۔

**فائدہ:** ۴؎ ''جو بتلارہا ہے'' یعنی مال اور اولاد، چنانچہ اس کافر کے دونوں بیٹے مسلمان ہوئے (کذافی الموضح) یا یہ مطلب ہے کہ یہ چیزیں اس سے الگ کرلی جائیں گی، قیامت میں اکیلا حاضر ہوگا نہ مال کام آئے گا نہ اولاد ساتھ دے گی۔

| |
|---|
| وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿٨١﴾ |
| اور پکڑ رکھا ہے لوگوں نے اللہ کے سوا اوروں کو معبود تا کہ وہ ہوں ان کے لیے مدد |
| كَلَّا ؕ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿٨٢﴾ ع ۵ / ۸ |
| ہرگز نہیں ۱؎، وہ منکر ہوں گے ان کی بندگی سے اور ہوجائیں گے ان کے مخالف ۲؎ |

**خلاصہ تفسیر:** اب منکرین کے بعض دیگر احوال کی مذمت بیان کرتے ہیں۔

اور ان لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر اور معبود تجویز کر رکھے ہیں تا کہ ان کے لئے وہ (اللہ کے ہاں) باعث عزت ہوں (جیسا کہ اس آیت میں ہے: هٰؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ سوایسا) ہرگز نہیں ہوگا، بلکہ وہ تو (قیامت میں خود) ان کی عبادت ہی کا انکار کربیٹھیں گے (جیسا کہ سورہ یونس میں

گزر چکا: قَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ) اور (الٹے) ان کے مخالف ہوجائیں گے (بات سے بھی اور حالت سے بھی)۔
مخالفت کی بات تو پیچھے گزر چکی اور حالت سے اس طرح مخالفت کریں گے کہ بجائے عزت کے ان کی ذلت کا سبب ہو جائیں گے، اور ان معبودوں میں اصنام یعنی بت بھی ہوں گے، سوان کا بولنا کوئی عجیب یا بعید بات نہیں، بالکل ایسے ہی جیسے اس دن انسانی اعضاو جوارح بولنے لگیں گے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی مال واولاد سے بڑھ کر اپنے جھوٹے معبودوں کی مدد کے امیدوار ہیں کہ وہ ان کو خدا کے ہاں بڑے بڑے درجے دلائیں گے، حالانکہ ہرگز ایسا ہونے والا نہیں محض سودائے خام ہے جو اپنے دماغوں میں پکار رہے ہیں۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی وہ معبود مدد تو کیا کرتے، خود ان کی بندگی سے بیزار ہوں گے، اور ان کے مدمقابل ہو کر بجائے عزت بڑھانے کے اور زیادہ ذلت ورسوائی کا سبب بنیں گے، جیسا کہ پہلے گزر چکا: وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ

اَلَمْ تَرَ اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴿۸۳﴾

تو نے نہیں دیکھا کہ ہم نے چھوڑ رکھے ہیں شیطان منکروں پر اچھالتے ہیں ان کو ابھار کر (ابھار ابھار)

فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿۸۴﴾

سو تو جلدی نہ کر ان پر، ہم تو پوری کرتے ہیں ان کی گنتی ۱؎

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے کفار کی گمراہی اور آخرت میں ان کی رسوائی کا بیان ہوا، اب حضور ﷺ کی تسلی کے لیے ان کی گمراہی کا سبب بیان کرتے ہیں کہ ان پر شیاطین کا تسلط ہے، پھر ان کا انجام جو کہ سخت عذاب ہے اور عذاب کا وقت جو کہ قیامت کا دن ہے بیان فرماتے ہیں۔

(آپ جو ان کی گمراہی سے غم کرتے ہیں تو) کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہم نے شیاطین کو کفار پر (بطور آزمائش) چھوڑ رکھا ہے کہ وہ ان کو (کفر وگمراہی پر) خوب ابھارتے (اور اکساتے) رہتے ہیں (پھر جو خود ہی اپنے اختیار سے اپنے دشمن بدخواہ کے بہکانے میں آجائے اس کا کیوں غم کیا جائے) سو (جب شیاطین کا مسلط ہونا بھی آزمائش وامتحان کے لیے اور مستحق عذاب پر جلدی سزا دینے کی صورت میں ابتلا نہیں رہتا تو) آپ ان کے لئے جلدی (عذاب ہونے کی درخواست) نہ کیجئے، ہم ان کی باتیں (جن پر سزا ہوگی) خود شمار کر رہے ہیں۔

**فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ:** ان کے ایمان لانے سے مایوس ہونے کے بعد حضور ﷺ کا جلدی عذاب چاہنا شاید اس وجہ سے ہو کہ ان کے کفر کا نقصان دوسروں تک نہ پہنچنے لگے، چنانچہ ایسا ہوتا بھی تھا، پس یہ جلدی طلب کرنا شان رحمت کے خلاف نہیں ہے، اس میں بھی دوسروں پر رحمت تھی تاکہ وہ ان کے کفر کے نقصان سے محفوظ رہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی شیطان انہی بدبختوں کو گمراہی کا بڑھاوا دیتا اور انگلیوں پر نچاتا ہے جنہوں نے خود کفر وانکار کا شیوہ اختیار کر لیا، اگر ایسے اشقیاء شیطان کی تحریص واغواء سے گمراہی میں لپے جائیں تو جانے دیجئے، آپ ان کی سزادہی میں جلدی نہ کریں، اللہ تعالیٰ نے ان کی باگ ڈھیلی چھوڑ رکھی ہے تاکہ ان کی زندگی کے گنے ہوئے دن پورے ہو جائیں، ان کی ایک ایک سانس، ایک ایک لمحہ اور ایک ایک عمل ہمارے یہاں گنا جا رہا ہے، ادنیٰ سے ادنیٰ حرکت بھی ہمارے احاطہ علمی اور دفاتر اعمال سے باہر نہیں ہو سکتی، تمام عمر کے اعمال ایک ایک کر کے ان کے سامنے رکھ دیے جائیں گے۔

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴿۸۵﴾ وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ

جس دن ہم اکٹھا کر لائیں گے پرہیزگاروں کو رحمان کے پاس مہمان بلائے ہوئے، اور ہانک لے جائیں گے گناہ گاروں کو دوزخ کی طرف

وقف لازم وِرْدًا ﴿٨٦﴾ لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِندَ الرَّحْمَٰنِ عَهْدًا ﴿٨٧﴾ وقف لازم

پیاسے ۱؎ نہیں اختیار رکھتے لوگ سفارش کا مگر جس نے لے لیا رحمان سے وعدہ ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** (اور وہ سزا اس روز واقع ہوگی) جس روز ہم متقیوں کو رحمٰن (کے دار النعیم) کی طرف مہمان بنا کر جمع کریں گے اور مجرموں کو دوزخ کی طرف پیاسا ہانکیں گے (اور کوئی ان کا سفارشی بھی نہ ہوگا، کیونکہ وہاں) کوئی سفارش کا اختیار نہ رکھے گا مگر ہاں جس نے رحمان کے پاس سے اجازت لی ہے (وہ انبیاء وصلحاء ہیں، اور اجازت خاص ہے مومنین کے ساتھ، پس کفار محل شفاعت نہ ہوئے)۔

بظاہر ''مجرمین'' سے مراد کفار ہیں تو اس کے مقابل ''متقین'' سے مراد مؤمنین ہیں، پھر اس حشر سے اگر جنت کی طرف لے جانا مراد ہے تب تو مطلقا مسلمان مراد ہیں، اور اگر قبر سے میدان حساب کی طرف لے جانا مراد ہے تو مؤمن کامل مراد ہیں، کیونکہ شروع سے اخیر تک اکرام وتعظیم ان ہی کے ساتھ خاص ہے اور ناقص مسلمانوں کا حال قیاس سے سمجھ لیا جائے گا کہ وہ بین بین ہوں گے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ جس طرح ڈھور ڈنگر پیاس کی حالت میں گھاٹ کی طرف جاتے ہیں اسی طرح مجرموں کو دوزخ کے گھاٹ اتارا جائے گا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی جن کو اللہ تعالیٰ نے شفاعت کا وعدہ دیا مثلاً ملائکہ، انبیاء، صالحین وغیرہم، وہ ہی درجہ بدرجہ سفارش کریں گے، بدون اجازت کسی کو زبان ہلانے کی طاقت نہ ہوگی، اور سفارش بھی ان ہی لوگوں کی کرسکیں گے جن کے حق میں سفارش کیے جانے کا وعدہ دے چکے ہیں، کافروں کے لیے شفاعت نہ ہوگی۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَٰنُ وَلَدًا ﴿٨٨﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا ﴿٨٩﴾ تَكَادُ السَّمَاوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ

اور لوگ کہتے ہیں رحمان رکھتا ہے اولاد ۱؎ بے شک تم آپھنسے ہو بھاری چیز میں، ابھی آسمان پھٹ پڑیں اس بات سے

وَتَنشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿٩٠﴾ أَن دَعَوْا لِلرَّحْمَٰنِ وَلَدًا ﴿٩١﴾ وَمَا يَنبَغِي لِلرَّحْمَٰنِ

اور ٹکڑے ہو زمین اور گر پڑیں پہاڑ ڈھے کر، اس پر کہ پکارتے ہیں رحمان کے نام پر اولاد ۲؎ اور نہیں پھبتا رحمان کو

أَن يَتَّخِذَ وَلَدًا ﴿٩٢﴾ إِن كُلُّ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي الرَّحْمَٰنِ عَبْدًا ﴿٩٣﴾

کہ رکھے اولاد ۳؎ کوئی نہیں آسمانوں اور زمین میں جو نہ آئے رحمان کا بندہ ہو کر ۴؎

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے کفار کی بعض گمراہیوں اور ان کے عذاب کا بیان تھا، آگے بھی ایک خاص گمراہی اور اس کے باطل ہونے کا ذکر فرماتے ہیں اور ساتھ ہی اس کی وعید کا بھی بیان ہے۔

اور یہ (کافر) لوگ کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ نے اولاد (بھی) اختیار کر رکھی ہے (چنانچہ نصاری کثرت سے اور یہود کم، اور مشرکین عرب وغیرہ اس فاسد عقید میں مبتلا تھے، اللہ تعالیٰ رد فرماتے ہیں کہ) تم نے (جو) یہ (بات کہی تو) ایسی سخت حرکت کی ہے کہ اس کے سبب کچھ بعید نہیں کہ آسمان پھٹ پڑیں اور زمین کے ٹکڑے اڑ جائیں اور پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑیں اس بات سے کہ یہ لوگ خدا تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرتے ہیں، حالانکہ خدا تعالیٰ کی شان نہیں کہ وہ اولاد اختیار کرے (کیونکہ) جتنے کچھ بھی آسمانوں اور زمینوں میں ہیں سب خدا تعالیٰ کے روبرو غلام ہو کر حاضر ہوتے ہیں۔

**تَكَادُ السَّمَاوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ:** اس غلط بات کی وجہ سے آسمان وزمین کا ٹوٹ پھوٹ جانا اس کا مطلب یہ ہے کہ اس غلط بات کا جواثر

عقل پر ہوتا ہے وہ اگر محسوس ہوتا تو عالم میں اس کے یہ آثار ہوتے۔

* * *

**فائدہ:** ١ ﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا﴾: بہت آدمیوں نے تو غیر اللہ کو معبود ہی ٹھہرایا تھا، لیکن ایک جماعت وہ ہے جس نے خدا تعالیٰ کیلئے اولاد تجویز کی، مثلاً نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کو، بعض یہود نے عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا اور بعض مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے، العیاذ باللہ۔

**فائدہ:** ٢ ﴿اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا﴾: یعنی یہ ایسی بھاری بات کہی گئی اور ایسا سخت گستاخانہ کلمہ منہ سے نکالا گیا جسے سن کر اگر آسمان زمین اور پہاڑ مارے ہول کے پھٹ پڑیں اور ٹکڑیں ٹکڑے ہو جائیں تو کچھ بعید نہیں، اس گستاخی پر اگر غضب الٰہی بھڑک اٹھے تو عالم تہ و بالا ہو جائے اور آسمان و زمین تک کے پرخچے اڑ جائیں، محض اس کا حلم مانع ہے کہ ان بیہودگیوں کو دیکھ کر دنیا کو ایک دم تباہ نہیں کرتا، جس خداوند قدوس کی توحید پر آسمان، زمین، پہاڑ، غرض ہر علوی و سفلی چیز شہادت دے رہی ہے، انسان کی یہ جسارت کہ اس کے لیے اولاد کی احتیاج ثابت کرنے لگے، العیاذ باللہ۔

**فائدہ:** ٣ ﴿وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا﴾: اس کی شان تقدیس و تنزیہ اور کمال غنا کے منافی ہے کہ وہ کسی کو اولاد بنائے، نصاریٰ جس غرض کے لیے اولاد کے قائل ہوئے ہیں یعنی کفارہ کے مسئلہ، خدا تعالیٰ کو "رحمان" مان کر اس کی ضرورت نہیں رہتی۔

**فائدہ:** ٤ ﴿اِلَّآ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا﴾: یعنی سب خدا کی مخلوق اور اس کے بندے ہیں اور بندے ہی بن کر اس کے سامنے حاضر ہوں گے پھر بندہ بیٹا کیسے ہوسکتا ہے؟ اور جس کے سامنے سب محکوم و محتاج ہوں اسے بیٹا بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

---

لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿٩٤﴾ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿٩٥﴾

اس کے پاس ان کی شمار ہے اور گن رکھی ہے ان کی گنتی، اور ہر ایک ان میں آئے گا اس کے سامنے قیامت کے دن اکیلا ١

---

**خلاصہ تفسیر:** (اور) اس نے سب کو (اپنی قدرت میں) احاطہ کر رکھا ہے اور (اپنے علم سے) سب کو شمار کر رکھا ہے (یہ حالت تو ان کی فی الحال ہے) اور قیامت کے روز سب کے سب اس کے پاس تنہا حاضر ہوں گے (کہ ہر شخص خدا ہی کا محتاج اور محکوم ہوگا)۔

اگر خدا کی اولاد ہو تو اس کو بھی خدا ہی کی طرح صفات کمال سے موصوف ہونا چاہیے، اور خدا کی صفات پیچھے مذکور ہوئیں یعنی قدرت کا عام ہونا، علم عام ہونا اور خدا کے سوا سب کی یہ صفات ہیں: محتاج اور تابع دار ہونا جو کمال کے خلاف ہے، پھر خدا کے ایسی ناقص اولاد کب ہوسکتی ہے، لہذا ثابت ہوا کہ خدا کے لیے اولاد ہونا محال ہے۔

* * *

**فائدہ:** ١ یعنی ایک فرد بشر بھی اس کی بندگی سے باہر نہیں ہوسکتا، سب کو خدا کے سامنے جریدہ حاضر ہونا ہے اس وقت تمام تعلقات اور ساز و سامان علیحدہ کر لیے جائیں گے فرضی معبود اور بیٹے، پوتے کام نہ دیں گے۔

---

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿٩٦﴾

البتہ جو یقین لائے ہیں اور کی ہیں انہوں نے نیکیاں ان کو دے گا رحمان محبت

---

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے کفار کو عذاب آخرت کی وعید اور نیک بندوں کو جنت کا وعدہ سنایا تھا، آگے مسلمانوں کو بشارت یعنی دنیوی نعمت کا وعدہ اور کفار کو انذار یعنی دنیوی سزا کی وعید سنا کر بشارت اور انذار کے مضمون پر سورت کا اختتام ہے جو کہ قرآن کے نزول اور بعثت نبوی کا عظیم ترین مقصد ہے، چونکہ پیچھے آیات میں زیادہ روئے سخن کفار کی طرف ہے اس لیے سورت کو انذار یعنی وعید پر ختم فرماتے ہیں، سورت کا رحمت سے شروع ہونا اور انذار پر ختم ہونا ایک خاص لطف دیتا ہے۔

بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے اللہ تعالیٰ (ان کو مذکورہ اخروی نعمتوں کے علاوہ دنیا میں یہ نعمت دے گا کہ) ان کے لئے (مخلوق کے دل میں) محبت پیدا کر دے گا۔

**سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا:** یہ تفسیر حدیث میں آئی ہے، اور اس کا نعمت ہونا بلکہ عظیم نعمت ہونا ظاہر ہے، کیونکہ نعمت کا حاصل راحت اور چین ہے اور ظاہر ہے کہ محبوب ہو جانا اس کا بڑا سبب ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمان سے کسی کو عداوت نہ ہوگی، بلکہ مقصود یہ ہے کہ متبع شریعت مسلمان سے عام مخلوق جن کا کوئی خاص نفع ونقصان اس کی ذات سے وابستہ نہ ہو وہ اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، چنانچہ اس کا مشاہدہ ہے، اور جن کو اس سے نفع پہنچتا ہو ان کا محبت کرنا یا جن کو نقصان پہنچا ہو ان کا بغض کرنا یہ قابل اعتبار نہیں، کیونکہ درحقیقت یہ محبت وعداوت اپنے نفع ونقصان کی وجہ سے ہے، چنانچہ نفع پہنچانے والے کفار سے بھی لوگوں کو محبت ہوتی ہے، اگر نفع ونقصان سے قطع نظر کر لیا جائے اس وقت بھی مؤمن کی صفات میں یہ اثر ہے کہ اس کی طرف عام قلوب کو کشش ہوتی ہے، یعنی مخلوق کے دلوں میں محبت ان کے ایمان کے سبب ہے، پس یہ ولایت و بزرگی کی علامت اور دلیل ہے، اس سے وہ قلوب مراد ہیں جن میں اللہ کی محبت موجود ہو، پس یہ اشکال نہ رہا کہ بہت سے مؤمنین و صالحین بعض لوگوں کے دلوں میں مبغوض ہوتے ہیں، کیونکہ ایسے لوگ بد باطن ہوتے ہیں، اسی سے معلوم ہوا کہ صلحاء سے بغض باطنی خبث کی علامت ہے (اور اقرب یہ ہے کہ وہ قلوب مراد ہوں جن کا نہ کوئی نفع ان صلحاء سے وابستہ ہے اور نہ کوئی نقصان)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی ان کو اپنی محبت دے گا، یا خود ان سے محبت کرے گا، یا خلق کے دل میں ان کی محبت ڈالے گا، احادیث میں ہے کہ جب حق تعالیٰ کسی بندہ کو محبوب رکھتا ہے تو اول جبرائیل کو آگاہ کرتا ہے کہ میں فلاں بندہ سے محبت کرتا ہوں تو بھی کر، وہ آسمانوں میں اس کا اعلان کرتے ہیں، آسمانوں سے اترتی ہوئی اس کی محبت زمین پر پہنچ جاتی ہے اور زمین والوں میں اس بندہ کو حسن قبول حاصل ہوتا ہے، یعنی بے تعلق لوگ جن کا کوئی خاص نفع وضرر اس کی ذات سے وابستہ نہ ہو اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، اس قسم کے حسن قبول کی ابتداء مومنین صالحین اور خدا پرست لوگوں سے ہوتی ہے، ان کے قلوب میں اول اس کی محبت ڈالی جاتی ہے، بعدہ قبول عام حاصل ہو جاتا ہے، ورنہ ابتداءً محض طبقہ عوام میں حسن قبول حاصل ہونا اور بعد میں بعض خدا پرست صالحین کا بھی کسی غلط فہمی وغیرہ سے اس کی طرف جھکنا، مقبولیت عند اللہ کی دلیل نہیں، خوب سمجھ لو۔

**تنبیہ:** یہ آیت مکی ہے اور مکہ میں جن مسلمانوں سے یہ وعدہ کیا گیا تھا، تھوڑے دنوں بعد اسی طرح پورا ہوا کہ دنیا حیرت زدہ ہوگئی، حق تعالیٰ نے ان کی وہ محبت والفت اپنے بندوں کے دلوں میں پیدا کر دی جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾

سو ہم نے آسان کر دیا یہ قرآن تیری زبان میں اسی واسطے کہ خوشخبری سنا دے تو ڈرنے والوں کو اور ڈرا دے جھگڑالو لوگوں کو۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ۭ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿۹۸﴾ ع

اور بہت ہلاک کر چکے ہم ان سے پہلے جماعتیں، آہٹ پاتا ہے تو ان میں کسی کی یا سنتا ہے ان کی بھنک۔

**خلاصہ تفسیر:** سو (آپ ان کو یہ بشارت دے دیجئے کیونکہ) ہم نے اس قرآن کو آپ کی زبان (عربی) میں اس لئے آسان کیا ہے کہ آپ اس سے متقیوں کو خوش خبری سنا دیں اور (نیز) اس سے جھگڑالو آدمیوں کو خوف دلائیں اور (ان خوف کی چیزوں میں سے ایک دنیاوی عذاب وسزا کا یہ بھی مضمون ہے کہ) ہم نے ان کے قبل بہت سے گروہوں کو (عذاب وقہر سے) ہلاک کر دیا ہے (سو) کیا آپ ان میں سے کسی کو دیکھتے ہیں یا ان (میں سے کسی) کی کوئی آہستہ آواز سنتے ہیں (یہ کنایہ ہے بے نام ونشان ہونے سے، سو کفار اس دنیاوی عذاب وسزا کے بھی مستحق ہیں اگرچہ کسی

مصلحت سے کسی کافر کے لئے اس کا ظہور نہ ہو مگر اندیشہ کے قابل تو ہے)۔

**وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ**: پہلے لوگوں کے ہلاک کرنے کا مضمون اس سے پہلے رکوع میں بھی آیا ہے، مگر وہاں مقصود دوسرا تھا، یعنی کفار کے اس قول کا جواب دینا تھا کہ ہم میں اور مسلمانوں میں ساز وسامان اور مجلس کے اعتبار سے کون اچھا ہے، پس تکرار نہ رہا۔

**اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا**: آہستہ آواز کی نفی اس لیے فرمادی کیونکہ مواخذہ اور داروگیر کے وقت مجرم خوف زدہ ہوتا ہے، دلیری سے بات کرنے کی تو مجال ہی نہیں ہوتی، البتہ چپکے چپکے باتیں کر سکتا ہے، یہاں اس کی بھی نفی فرمادی کہ ان کی آہستہ آواز بھی نہ نکل سکے گی زور سے تو کیا بولتے۔

**لطیفہ**: اس سورت میں لفظ ''رحمت'' کا مادہ بکثرت لایا گیا ہے، چنانچہ لفظ رحمان پندرہ سولہ جگہ آیا ہے، اور لفظ ''رحمت'' سورت کے شروع میں نیز اور بھی چند جگہ میں آیا ہے، اس میں یہ نکتہ ہوسکتا ہے کہ اس سورت میں کفار ومؤمنین کا حال زیادہ بیان کیا گیا ہے، پس جہاں مؤمنین کے ذکر میں یہ لفظ آیا ہے وہاں تو اشارہ اس طرف ہے کہ ان پر بڑی رحمت ہوگی، اور جہاں کفار کے ذکر میں یہ لفظ آیا ہے وہاں اس طرف اشارہ ہے کہ کفار ایسے بڑے رحمت والے کی مخالفت کرتے ہیں اور اس کے احسانات وانعامات سے بھی نہیں شرماتے، واللہ اعلم۔

* * *

**فائدہ**: ۱؎ یعنی قرآن کریم نہایت سہل وصاف زبان میں کھول کھول کر پرہیزگاروں کو بشارت سناتا اور جھگڑالو لوگوں کو بدکرداریوں کے خراب نتائج سے خبردار کرتا ہے۔

**فائدہ**: ۲؎ یعنی کتنی ہی بدبخت قومیں اپنے جرائم کی پاداش میں ہلاک کی جاچکیں، جن کا نام ونشان صفحۂ ہستی سے مٹ گیا، آج ان کے پاؤں کی آہٹ یا ان کی لن ترانیوں کی ذرا سی بھنک بھی سنائی نہیں دیتی، پس جو لوگ اس وقت نبی کریم ﷺ سے برسر مقابلہ ہوکر آیات اللہ کا انکار و استہزاء کر رہے ہیں، وہ بے فکر نہ ہوں، ممکن ہے ان کو بھی کوئی ایسا ہی تباہ کن عذاب آگھیرے جو چشم زدن میں تہس نہس کر ڈالے۔

ایاتها ۱۳۵ | ۲۰ سُوْرَةُ طٰـهٰ مَكِّيَّةٌ ٤٥ | رکوعاتها ۸

**خلاصہ تفسیر**: گذشتہ سورت میں توحید، رسالت اور آخرت کا بیان تھا، اس سورت میں بھی یہی مضامین ہیں، چنانچہ شروع میں رسالت اور وحی اس کے بعد توحید کے متعلق مضمون ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ سے توحید ورسالت دونوں کی تقریر ہوگئی اور موسیٰ علیہ السلام کی رسالت سے حضور ﷺ کی رسالت کی وضاحت ہے، اور درمیان درمیان میں رسالت کی تصدیق وتکذیب کرنے والوں کی جزا وسزا کے ساتھ معاد کی تفصیل ہے اور چونکہ گذشتہ سورت قرآن کے ذکر پر ختم ہوئی تھی اور یہ سورت بھی قرآن کے ذکر سے شروع ہوئی ہے اس لیے گذشتہ سورت کے اختتام اور اس سورت کی ابتدا میں بھی خاص مناسبت حاصل ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

طٰهٰ (۱) مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى (۲) اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى (۳)

طہ، اس واسطے نہیں اتارا ہم نے تجھ پر قرآن کہ تو محنت میں پڑے، مگر نصیحت کے واسطے اس کی جو ڈرتا ہے

**خلاصہ تفسیر**: سورت کا آغاز توحید ورسالت کے مضمون سے ہے۔

طٰہٰ (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) ہم نے آپ پر قرآن (مجید) اس لئے نہیں اتارا کہ آپ تکلیف اٹھائیں، بلکہ ایسے شخص کی نصیحت کے لئے (اتارا ہے) جو (اللہ سے) ڈرتا ہو۔

مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى: تکلیف اٹھانے کی چند صورتیں ہوسکتی ہیں: ① ایک یہ کہ ہم نے آپ پر قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ آپ کفار کے ایمان نہ لانے سے افسوس اور حسرت کر کے تعب اور مشقت میں پڑیں، بلکہ تبلیغ کے لیے نازل کیا ہے، سو وہ آپ کر چکے، جس کی قسمت میں ڈرنا اور ماننا ہے وہ قبول کرے گا، آپ غم نہ کیجیے، اس صورت میں یہ آیت اصل ہوگی اہل قلوب پر سکینہ کے نزول کی ② دوسری تفسیر یہ کہ مشکل اور صعب مجاہدہ کی مشقت اور تعب میں نہ پڑیں، چونکہ آپ ﷺ رات کو نماز میں لمبا قیام فرماتے اور اتنا قرآن پڑھتے کہ تھک جاتے تھے اس لیے آسانی کا حکم دیا جیسے ارشاد ہے: فاقرءوا ماتیسّر من القراٰن کہ جس قدر آسانی سے قرآن پڑھا جائے اتنا پڑھ لیا کرو، کیونکہ آپ کو آسان شریعت حنیفہ دی گئی ہے، اس صورت میں مجاہدہ میں اعتدال وتوازن کی تعلیم ہے ③ تیسرے اس لیے قیام پر کفار نے طعن کیا تھا کہ قرآن کی وجہ سے محمد (ﷺ) مصیبت میں پڑ گئے اس کی نفی کر دی۔

* * *

**فائدہ:** یعنی قرآن کریم اس لیے اتارا گیا ہے کہ جن کے دل نرم ہوں اور خدا سے ڈرتے ہوں، وہ اس کے بیانات سے نصیحت حاصل کریں اور روحانی فیوض و برکات سے محروم نہ رہیں، یہ غرض نہیں کہ قرآن نازل کر کے خواہ مخواہ تم کو کسی محنت شاقہ اور تکلیف شدت میں مبتلا کیا جائے، نہ وہ ایسی چیز ہے جس کا حامل و عامل کبھی محروم و ناکام رہے، آپ تکذیب کرنے والوں کی باتیں سن کر ملول اور تنگدل نہ ہوں، نہ ان کے پیچھے پڑ کر زیادہ تکلیف اٹھائیں، حق کا علمبردار ہی آخر کامیاب ہو کر رہے گا، آپ توسط کے ساتھ عبادت کرتے رہیے، بعض روایات میں ہے کہ ابتداء نبی کریم ﷺ شب کو نماز میں کھڑے ہو کر بہت زیادہ قرآن پڑھتے تھے، کفار آپ کی محنت و ریاضت دیکھ کر کہتے کہ قرآن کیا اترا بیچارے محمد ﷺ سخت تکلیف اور محنت میں پڑ گئے، اس کا جواب ان آیات میں دیا گیا کہ فی الحقیقت قرآن محنت وشقاء نہیں، رحمت و نور ہے، جس کو جتنا آسان ہو اسی قدر نشاط کے ساتھ پڑھنا چاہیے، فَاقۡرَءُوۡا مَا تَيَسَّرَ مِنۡهُ۔

تَنۡزِيۡلًا مِّمَّنۡ خَلَقَ الۡاَرۡضَ وَالسَّمٰوٰتِ الۡعُلٰى ④ اَلرَّحۡمٰنُ عَلَى الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰى ⑤

اتارا (ہے اس نے) ہوا ہے اس کا جس نے بنائی زمین اور آسمان اونچے ۱؎ وہ بڑا مہربان عرش پر قائم ہوا ۲؎

لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا وَمَا تَحۡتَ الثَّرٰى ⑥

اسی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں اور زمین میں اور ان دونوں کے درمیان اور نیچے گیلی زمین کے ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** یہ اس (ذات) کی طرف سے نازل کیا گیا ہے جس نے زمین کو اور بلند آسمانوں کو پیدا کیا ہے (اور) وہ بڑی رحمت والا عرش پر (جو تخت سلطنت کے مشابہ ہے اس طرح) قائم (اور جلوہ فرما) ہے (جو کہ اس کی شان کے لائق ہے، اور وہ ایسا ہے کہ) اسی کی ملک ہیں جو چیزیں آسمانوں میں اور جو چیزیں زمین میں ہیں اور جو چیزیں ان دونوں کے درمیان میں ہیں (یعنی آسمان سے نیچے اور زمین سے اوپر) اور جو چیزیں تحت الثریٰ میں ہیں۔

اَلرَّحۡمٰنُ عَلَى الۡعَرۡشِ: آیات و روایات کے مطابق عرش ایک جسم عظیم ہے، اس کے پائے بھی ہیں فرشتے اس کو اٹھائے ہوئے ہیں اور وہ ساکن ہے، کبھی اس کو حرکت بھی ہو جاتی ہے۔

وَمَا تَحۡتَ الثَّرٰى: یعنی زمین کے اندر جو تر مٹی ہے جس کو ''ثریٰ'' کہتے ہیں اس کے نیچے بھی تو چیزیں ہیں، غرض یہ کہ زمین کی تہہ میں بھی جو کچھ ہے خدا ہی کی ملک ہے۔

* * *

**فائدہ:** لہ اس لیے ضروری ہے کہ مخلوق نہایت خوشی کے ساتھ اس کو اپنے سر آنکھوں پر رکھے اور شہنشاہانہ احکام کی خلاف ورزی نہ کرے۔

**فائدہ:** ۲ہ استواء علی العرش کا مفصل بیان سورہ اعراف کے فوائد میں دیکھ لیا جائے، ''عرش'' کے متعلق نصوص سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ اس کے پائے ہیں اور خاص فرشتے اٹھانے والے ہیں اور آسمان کے اوپر قبہ کی طرح ہے، صاحب روح المعانی نے ''عرش'' اور ''استواء علی العرش'' پر اس آیت کے تحت میں نہایت مبسوط کلام کیا ہے، من شاء فلیر اجعہ۔

**فائدہ:** ۳ہ یعنی وہ ہی ایک خدا بلا شرکت غیرے آسمانوں سے زمین تک اور زمین سے تحت الثریٰ تک تمام کائنات کا مالک و خالق ہے، اسی کی تدبیر و انتظام سے کل سلسلے قائم ہیں۔

**تنبیہ:** آسمان وزمین کی درمیانی مخلوق سے یا تو کائنات جو (فضا) مراد ہیں جو دائماً دونوں کے درمیان ہی رہتی ہیں، مثلاً ہوا، بادل وغیرہ اور یا وہ چیزیں بھی اس میں شامل ہوں جو اکثر ہوا میں پرواز کرتی ہیں جیسے پرند جانور اور ''ثریٰ'' (گیلی زمین) سے زمین کے نیچے کا طبقہ مراد ہے جو پانی کے قرب واتصال کی وجہ سے تر رہتا ہے۔

---

وَاِنۡ تَجۡهَرۡ بِالۡقَوۡلِ فَاِنَّهٗ يَعۡلَمُ السِّرَّ وَاَخۡفٰى ۝۷ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰى ۝۸

اور اگر تو بات کہے پکار کر تو اسکو تو خبر ہے چھپی ہوئی بات کی اور اس سے بھی چھپی ہوئی کی لہ اللہ ہے جسکے سوا بندگی نہیں کسی کی، اسی کے ہیں سب نام خاصے ۲ہ

**خلاصہ تفسیر:** (گذشتہ آیت میں تو اللہ تعالیٰ کی قدرت وسلطنت بیان ہوئی) اور (علم کی یہ شان ہے کہ) اگر تم (اے مخاطب!) پکار کر بات کہو تو (اس کے سننے میں تو کیا شبہ ہے) وہ تو (ایسا ہے کہ) چپکے سے کہی بات کو اور (بلکہ) اس سے بھی زیادہ خفی بات کو (یعنی جو ابھی دل میں ہے) جانتا ہے (وہ) اللہ ایسا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود (ہونے کا مستحق) نہیں، اس کے (بڑے) اچھے اچھے نام ہیں (جو کہ اوصاف و کمالات پر دلالت کرتے ہیں، سو قرآن ایسے جامع کمالات خدا کا نازل کیا ہوا ہے اور یقینی حق ہے)۔

* * *

**فائدہ:** لہ پہلے عموم قدرت وتصرف کا بیان تھا، اس آیت میں علم الٰہی کی وسعت کا تذکرہ ہے، یعنی جو بات زور سے پکار کر کہی جائے، وہ اس علام الغیوب سے کیونکر پوشیدہ رہ سکتی ہے، جس کو ہر کھلی چھپی بلکہ چھپی سے زیادہ چھپی ہوئی باتوں کی خبر ہے، جو بات تنہائی میں آہستہ کہی جائے، اور جو دل میں گزرے ابھی زبان تک نہ آئی ہو اور جو ابھی دل میں بھی نہیں گزری آئندہ گزرنے والی ہو، حق تعالیٰ کا علم ان سب کو محیط ہے، اسی لیے بلاضرورت بہت زور سے چلا کر ذکر کرنے کو بھی علمائے شریعت نے منع کیا ہے، جن مواقع میں ذکر با آواز بلند منقول ہے یا بعض مصالح معتبرہ کی بناء پر تجربہ کاروں کے نزدیک نافع سمجھا گیا ہے، وہ عموم نہی سے مستثنیٰ ہوں گے۔

**فائدہ:** ۲ہ آیات بالا میں جو صفات حق تعالیٰ کی بیان ہوئی ہیں، (یعنی اس کا خالق الکل، مالک علی الاطلاق، رحمان، قادر مطلق اور صاحب علم محیط ہونا) انکا اقتضاء یہ ہے کہ الوہیت بھی تنہا اسی کا خاصہ ہو، بجز اس کے کسی دوسرے کے آگے سر عبودیت نہ جھکایا جائے، کیونکہ نہ صرف صفات مذکورہ بالا بلکہ کل عمدہ صفات اور اچھے نام اسی کی ذات منبع الکمالات کے لیے مخصوص ہیں، کوئی دوسری ہستی اس شان وصفت کی موجود نہیں جو معبود بن سکے، نہ ان صفتوں اور ناموں کے تعدد سے اس کی ذات میں تعدد آتا ہے، جیسا کہ بعض جہال عرب کا خیال تھا کہ مختلف ناموں سے خدا کو پکارنا دعوائے توحید کے مخالف ہے۔

---

وَهَلۡ اَتٰٮكَ حَدِيۡثُ مُوۡسٰى ۝۹ اِذۡ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهۡلِهِ امۡكُثُوۡۤا اِنِّىۡۤ اٰنَسۡتُ نَارًا لَّعَلِّىۡۤ

اور پہنچی ہے تجھ کو بات موسیٰ کی لہ جب اس نے دیکھی ایک آگ تو کہا اپنے گھر والوں کو ٹھہرو میں نے دیکھی ہے ایک آگ شاید

اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ⑩

لے آؤں تمہارے پاس اس میں سے سلگا کر

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے توحید و رسالت کا ذکر تھا، اب موسیٰ علیہ السلام کے قصہ سے دونوں کو ثابت کیا جاتا ہے۔

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) کیا آپ کو موسیٰ (علیہ السلام کے قصہ) کی خبر پہنچی ہے (یعنی وہ سننے کے قابل ہے کہ اس میں توحید و نبوت کے متعلق علوم ہیں جن کی تبلیغ نافع ہوگی، وہ قصہ یہ ہے کہ) جب کہ انہوں نے (مدین سے آتے ہوئے ایک رات جس میں سردی بھی تھی اور رستہ بھی بھول گئے تھے کوہ طور پر) ایک آگ دیکھی (جو واقع میں نور تھا مگر شکل آگ کی تھی) سو اپنے گھر والوں سے (جو صرف بیوی تھی یا خادم وغیرہ بھی) فرمایا کہ تم (یہاں ہی) ٹھہرے رہو (یعنی میرے پیچھے پیچھے مت آنا، کیونکہ یہ تو احتمال ہی نہ تھا کہ ان کے بغیر آگے سفر کرنے لگیں گے) میں نے ایک آگ دیکھی ہے (میں وہاں جاتا ہوں) شاید میں اس میں سے تمہارے پاس کوئی شعلہ (کسی لکڑی وغیرہ میں لگا کر) لاؤں (تاکہ سردی کا علاج ہو) یا (وہاں) آگ کے پاس رستہ کا پتہ (جاننے والا کوئی آدمی بھی) مجھ کو مل جائے۔

**اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا:** اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات ممکن ہے کہ صاحب کشف کو اپنے کشف کی حقیقت معلوم نہ ہو، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کو نور الٰہی محسوس نہ ہوا، وہ اس کو متعارف آگ ہی سمجھے۔

* * *

**فائدہ:** لے یہاں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بہت بسط و تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے تاکہ سامعین سمجھ جائیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف قرآن کی وحی بھیجنا کوئی انوکھی بات نہیں، جس طرح پیشتر موسیٰ علیہ السلام کو وحی مل چکی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ملی، جیسے موسیٰ علیہ السلام کی وحی توحید وغیرہ کی تعلیم پر مشتمل تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی میں بھی ان ہی اصول پر زور دیا گیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تبلیغ حق میں جو صعوبات و شدائد برداشت کیں، آپ کو بھی برداشت کرنی پڑیں گی اور جس طرح ان کو آخر کار کامیابی اور غلبہ نصیب ہوا اور دشمن مقہور و مخذول ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی یقیناً غالب و منصور ہوں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن تباہ و ذلیل کیے جائیں گے چونکہ سورت کا آغاز انزال قرآن کے ذکر سے کیا گیا تھا اس کے مناسب نبوتِ موسوی کے آغاز کا قصہ بیان فرماتے ہیں۔

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ⑪ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ⑫

پھر جب پہنچا آگ کے پاس آواز آئی اے موسیٰ! لے میں ہوں تیرا رب سو اتار ڈال اپنی جوتیاں، تو ہے پاک میدان طویٰ میں ۲

**خلاصہ تفسیر:** سو وہ جب اس (آگ) کے پاس پہنچے تو (ان کو من جانب اللہ) آواز دی گئی کہ اے موسیٰ! میں تمہارا رب ہوں، پس تم اپنی جوتیاں اتار ڈالو (کیونکہ) تم ایک پاک میدان یعنی طویٰ میں ہو (یہ اس میدان کا نام ہے)۔

**نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى:** اس آواز کی کیفیت وصفت نہ منصوص میں مذکور ہے اور نہ قیاس سے معلوم ہو سکتی ہے، اس لیے تخمین و گمان سے بیان کرنا اندھیرے میں تیر چلانا ہے، البتہ یہ بات یقینی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو یقین کے ساتھ یہ معلوم ہو گیا تھا کہ یہ آواز من جانب اللہ ہے، خواہ یہ یقین علم ضروری (بدیہی) سے حاصل ہوا ہو یا کسی علم استدلالی سے حاصل ہوا ہو۔

**فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ:** جوتے اتارنے کا حکم یا تو اس لئے دیا گیا کہ مقام ادب ہے اور جوتا اتار کر ننگے پاؤں ہو جانا مقتضائے ادب ہے، اور یا اس لئے کہ جوتے غیر طاہر تھے جیسا کہ بعض روایات میں ہے، یا جوتا اتارنے کی مصلحت یہ ہے تاکہ آپ کے قدم اس مبارک وادی کی مٹی سے لگ کر اس کی مزید برکت حاصل کریں، اور بعض نے فرمایا کہ یہ حکم خشوع اور تواضع کی صورت بنانے کے لئے ہوا جیسا کہ سلف صالحین طواف بیت اللہ کے وقت

ایسا ہی کرتے تھے، اور انّک بالواد المقدّس ہر حال میں علت ہوسکتا ہے جیسا کہ ظاہر ہے، نیز اس جوتے اتارنے کے حکم سے مقامات مقدسہ کا ادب واحترام بھی ثابت ہوتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** لہ اس قصہ کے مختلف اجزاء سورہ قصص، سورہ طٰہٰ اور سورہ اعراف میں سے جمع کیے جاسکتے ہیں، یہاں مدین سے مصر کی طرف واپسی کا واقعہ مذکور ہے، مدین میں حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نکاح ہوگیا تھا، کئی سال وہاں مقیم رہنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مصر جانے کا ارادہ کیا، حاملہ بیوی ہمراہ تھی رات اندھیری تھی، سردی کا شباب تھا، بکریوں کا گلہ بھی ساتھ لے کر چلے تھے، اس حالت میں راستہ بھول گئے، بکریاں متفرق ہوگئیں اور بیوی کو درد زہ شروع ہوگیا، اندھیرے میں سخت پریشان تھے سردی میں تاپنے کے لیے آگ موجود نہ تھی، چقماق مارنے سے بھی آگ نہ نکلی، ان مصائب کی تاریکیوں میں دفعتاً دور سے ایک آگ نظر آئی، وہ حقیقت میں دنیاوی آگ نہ تھی، اللہ کا نور جلال تھا یا حجاب ناری تھا (جس کا ذکر مسلم کی حدیث میں آیا ہے) موسیٰ علیہ السلام نے ظاہری آگ سمجھ کر گھر والوں سے کہا کہ تم یہیں ٹھہرو، میں جاتا ہوں شاید اس آگ کا ایک شعلہ لاسکوں، یا وہاں پہنچ کر کوئی راستہ کا پتہ بتلانے والا مل جائے، کہتے ہیں کہ اس پاک میدان میں پہنچ کر عجیب نظارہ دیکھا، ایک درخت میں زور شور سے آگ لگ رہی ہے، اور آگ جس قدر زور سے بھڑکتی ہے درخت اسی قدر زیادہ سرسبز ہوکر لہلہاتا ہے، اور جوں جوں درخت کی سرسبزی وشادابی بڑھتی ہے آگ کا اشتعال تیز ہوتا جاتا ہے، موسیٰ علیہ السلام نے آگ کے قریب جانے کا قصد کیا کہ درخت کی کوئی شاخ جل گرے تو اٹھالائیں لیکن جتنا وہ آگے سے نزدیک ہونا چاہتے آگ دور ہٹتی جاتی اور جب گھبرا کر ہٹنا چاہتے تو آگ تعاقب کرتی، اسی حیرت وحشت کی حالت میں آواز آئی اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّكَ الخ گویا وہ درخت بلاتشبیہ اس وقت غیبی ٹیلیفون کا کام دے رہا تھا، امام احمد نے وہب سے نقل کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جب **یاموسیٰ** سنا تو کئی بار "لبیک" کہا اور عرض کیا کہ میں تیری آواز سنتا ہوں اور آہٹ پاتا ہوں مگر یہ نہیں دیکھتا کہ تو کہاں ہے، آواز آئی: "میں تیرے اوپر ہوں، تیرے ساتھ ہوں، تیرے سامنے ہوں، تیرے پیچھے ہوں، اور تیری جان سے زیادہ تجھ سے نزدیک ہوں"، کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام ہر جہت سے اور اپنے ایک ایک بال سے اللہ کا کلام سنتے تھے۔

**فائدہ:** ۲ "طویٰ" اس میدان کا نام ہے، شاید وہ میدان پہلے سے متبرک تھا یا اب ہوگیا، موسیٰ علیہ السلام کی جوتیاں ناپاک تھیں اس لیے اتروادی گئیں، باقی موزہ یا جوتا پاک ہو تو اس میں نماز پڑھ سکتے ہیں پورا مسئلہ فقہ میں دیکھنا چاہیے۔

وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ﴿۱۳﴾ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ

اور میں نے تجھ کو پسند کیا ہے سو تو سنتا رہ جو حکم ہو لہ میں جو ہوں اللہ ہوں کسی کی بندگی نہیں سوا میرے سو میری بندگی کر

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴿۱۴﴾

اور نماز قائم رکھ میری یادگاری کو ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور میں نے تم کو (نبی بنانے کے لئے دیگر تمام مخلوق میں سے) منتخب فرمایا ہے، سو (اس وقت) جو کچھ وحی کی جارہی ہے اس کو غور سے سن لو (وہ وحی یہ ہے کہ) میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود (ہونے کے لائق) نہیں (اور جب میں ہی معبود ہونے کے لائق ہوں) تو تم میری ہی عبادت کیا کرو، اور میری ہی یاد کے لئے نماز پڑھا کرو۔

عقائد میں بڑے مسئلے تین ہیں: توحید، نبوت اور آخرت، سو توحید ونبوت کی تعلیم تو ہوچکی، آخرت سے متعلق آگے آتی ہے، اور عبادات میں تمام فرعی احکام آگئے اور نماز کو شرف کی وجہ سے مستقل طور پر بھی ذکر فرمایا۔

**وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ:** بعض تفاسیر کے قول پر اس میں ظاہری اعمال میں باطنی اسرار کا اثبات ہے (یعنی انسان کے ظاہری اعمال اس کے باطنی کیفیات کی عکاسی کرتے ہیں، مثال کے طور پر جس یقین واستحضار اور حضورِ قلبی سے کوئی نماز ادا کرے گا اتنا ہی ظاہر میں اس کی نماز میں خشوع وخضوع اور سکون ہوگا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ "پسند کیا ہے" یعنی تمام جہان میں سے نبوت و رسالت اور شرف مکالمہ کے لیے چھانٹ لیا، اس لیے آگے جو احکام دیے جائیں انھیں غور و توجہ سے سنو۔

**فائدہ:** ۲؎ اس میں خالص توحید اور ہر قسم کی بدنی و مالی عبات کا حکم دیا، نماز چونکہ اہم العبادات تھی اس کا ذکر خصوصیت سے کیا گیا اور اس پر بھی متنبہ فرمادیا گیا کہ نماز سے مقصودِ اعظم خدا تعالیٰ کی یادگاری ہے، گویا نماز سے غافل ہونا خدا کی یاد سے غافل ہونا ہے اور ذکر اللہ (یادِ خدا) کے متعلق دوسری جگہ فرمادیا: وَاذۡکُرۡ رَّبَّکَ اِذَا نَسِیۡتَ یعنی کبھی بھول چوک ہوجائے تو جب یاد آجائے اسے یاد کرو، یہی حکم نماز کا ہے کہ وقت پر غفلت ونسیان ہوجائے تو یاد آنے پر قضا کرلے فَلۡیُصَلِّهَا اِذَا ذَکَرَهَا.

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخۡفِيۡهَا لِتُجۡزٰى كُلُّ نَفۡسٍۢ بِمَا تَسۡعٰى ﴿۱۵﴾

قیامت بیشک آنے والی ہے میں مخفی رکھنا چاہتا ہوں اس کو ۱؎ تاکہ بدلہ ملے ہر شخص کو جو اس نے کمایا ہے ۲؎

فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنۡهَا مَنۡ لَّا يُؤۡمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرۡدٰى ﴿۱۶﴾

سو کہیں تجھ کو نہ روک دے اس سے وہ شخص جو یقین نہیں رکھتا اس کا اور پیچھے پڑ رہا ہے اپنے مزوں کے پھر تو بھی ٹپکا جائے

**خلاصہ تفسیر:** (دوسری بات یہ سنو کہ) بلاشبہ قیامت آنے والی ہے میں اس کو (تمام مخلوق سے) پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں (اور قیامت اس لئے آئے گی) تاکہ ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ مل جائے، سو (جب قیامت کا آنا یقینی ہے تو) تم کو قیامت (کے لیے مستعد و تیار رہنے) سے ایسا شخص باز نہ رکھنے پائے جو اس پر ایمان نہیں رکھتا اور (اس وجہ سے) اپنی (نفسانی) خواہشوں پر چلتا ہے (یعنی تم ایسے شخص کے اثر سے قیامت کے لئے تیاری کرنے سے بےفکر نہ ہوجانا) کہیں تم (اس بےفکری کی وجہ سے) تباہ نہ ہوجاؤ۔

**فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنۡهَا:** اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کرکے تنبیہ کی گئی ہے کہ ایسا نہ ہونا چاہیے کہ آپ کافروں اور بےایمانوں کے کہنے سے قیامت کے معاملے میں غفلت برتنے لگیں اور وہ آپ کی ہلاکت کا سبب بن جائے، ظاہر ہے کہ کسی نبی و رسول سے جو معصوم ہے یہ غفلت نہیں ہوسکتی، اس کے باوجود ایسا خطاب کرنا دراصل ان کی امت اور عام مخلوق کو سنانا ہے کہ جب اللہ کے پیغمبروں کو بھی ایسی تاکید کی جاتی ہے تو ہمیں اس کا کتنا اہتمام کرنا چاہیے، یعنی جب خاص لوگوں کو یہ احکام سنائے جاتے ہیں تو دوسرے تو کس شمار میں ہیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ منتہی کامل سے بھی احکام شرعیہ ساقط نہیں ہوتے (یعنی کوئی آدمی چاہے کتنا ہی ولی بزرگ بن جائے شرعی احکام بہرحال ادا کرنے پڑتے ہیں، بلکہ سنن و مستحبات کی پابندی بھی ضروری ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی اس کے آنے کا وقت سب سے مخفی رکھنا چاہتا ہوں، حتیٰ کہ اگر خود اپنے سے چھپانا ممکن ہوتا تو اپنے سے بھی مخفی رکھتا، لیکن یہ ممکن ہی نہیں، وفیه من المبالغة كما في الحديث "لا تعلم شماله ما تنفق يمينه" وكما قال الشاعر :

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن نہ دہم ۔۔۔ گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ دہم

اور اگر بہت سی مصالح باعث اظہار نہ ہوتیں تو جتنا اجمالی اظہار کیا گیا یہ بھی نہ کیا جاتا۔

**فائدہ:** ۲ یعنی قیامت کا آنا اس لیے ضروری ہے کہ ہر شخص کو اس کے نیک و بد کا بدلہ ملے اور مطیع و عاصی میں کوئی التباس و اشتباہ باقی نہ رہے یہ توحید و عبادت کے بعد عقیدہ معاد کی تعلیم ہوئی۔

**فائدہ:** ۳ "نہ روک دے اس سے" یعنی قیامت پر یقین رکھنے سے یا نماز سے، اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو برے کی صحبت سے منع کیا تو اور کوئی کس شمار میں ہے، کذافی الموضح۔غرض یہ ہے کہ دنیا پرست کافر کی چاپلوسی یا زیادہ نرمی اور مداہنت اختیار نہ کی جائے، ورنہ اندیشہ ہے کہ آدمی بلند مقام سے نیچے پٹک دیا جائے، العیاذ باللہ۔

| |
|---|
| وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ⑰ قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ |
| اور یہ کیا ہے تیرے داہنے ہاتھ میں اے موسیٰ ۱ بولا یہ میری لاٹھی ہے، اس پر ٹیک لگاتا ہوں اور پتے جھاڑتا ہوں اس سے اپنی بکریوں پر |
| وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ⑱ |
| اور میرے اس میں چند کام ہیں اور بھی ۲ |

**خلاصہ تفسیر:** اور (حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے یہ بھی فرمایا کہ) یہ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا چیز ہے اے موسیٰ! انہوں نے کہا کہ یہ میری لاٹھی ہے، میں (کبھی) اس پر سہارا لگاتا ہوں اور (کبھی) اس سے اپنی بکریوں پر (درختوں کے) پتے جھاڑتا ہوں اور اس میں میرے اور بھی کام (نکلتے) ہیں (مثلاً کندھے پر رکھ کر اسباب وغیرہ لٹکا لینا، یا اس سے موذی جانوروں کو دور کرنا وغیرہ وغیرہ)۔

**وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى:** اللہ تعالیٰ کا یہ پوچھنا اس لیے تھا کہ اس وقت اس لاٹھی کے منافع اور اس کی حقیقت کہ یہ ایک لاٹھی ہے ذہن میں خوب حاضر ہو جائے پھر جو سانپ بن جائے گا تو ذات اور صفات دونوں کے بدل جانے سے قدرت خداوندی پر زیادہ دلالت ہوگی، اس لیے موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں اس کی حقیقت اور منافع دونوں عرض کر دیے، پس سوال و جواب دونوں بالکل مطابق ہیں۔

**اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا:** اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کاملین بھی ظاہری اسباب اختیار کرتے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یہاں سے منصب رسالت کی تمہید شروع ہوتی ہے، چونکہ معجزات دے کر فرعون کی طرف بھیجے جانے والے تھے اس لیے اولاً معجزہ عصا کا ذکر فرماتے ہیں، یہ سوال کہ تیرے ہاتھ میں کیا چیز ہے، اس غرض سے تھا کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی لاٹھی کی حقیقت اور اس کے منافع کو خوب مستحضر کر لیں تاکہ جو خارق عادت چیز پیش آنے والی تھی اس کا معجزہ ہونا پوری طرح واضح، مستحکم اور اوقع فی النفس ہو، یعنی اس وقت خوب دیکھ بھال کر اور جانچ تول کر بتلاؤ، تمہارے ہاتھ میں کیا چیز ہے؟ مبادا سانپ بن جانے پر وہم کرنے لگو کہ شاید میں غلطی سے ہاتھ میں لاٹھی نہ لایا ہوں کچھ اور لے آیا ہوں۔

**فائدہ:** ۲ یعنی اس میں شبہ کیا ہے، وہ لاٹھی ہے جسے ہمیشہ ہاتھ میں رکھتا ہوں، اس پر ٹیک لگاتا ہوں، بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں، دشمن کو اور موذی جانوروں کو دفع کرتا ہوں اور بہت سی ضرورتوں میں لاٹھی کا کام لیتا ہوں۔

| |
|---|
| قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ⑲ فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ⑳ |
| فرمایا ڈال دے اس کو اے موسیٰ، تو اس کو ڈال دیا پھر اسی وقت وہ تو سانپ ہو گیا دوڑتا ہوا ۱ |
| قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ٚ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ㉑ |
| فرمایا پکڑ لے اس کو اور مت ڈر، ہم ابھی پھیر دیں گے اس کو پہلی حالت پر ۲ |

**خلاصہ تفسیر:** ارشاد ہوا کہ اس (عصا) کو (زمین پر) ڈال دو اے موسیٰ! سو انہوں نے اس کو (زمین پر) ڈال دیا تو یکا یک وہ (خدا کی قدرت سے) ایک دوڑتا ہوا سانپ بن گیا (جس سے موسیٰ علیہ السلام ڈر گئے) ارشاد ہوا کہ اس کو پکڑ لو اور ڈرو نہیں، ہم ابھی (پکڑتے ہی) اس کو اس کی پہلی حالت پر کر دیں گے (یعنی یہ پھر عصا بن جائے گا اور تم کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا، ایک معجزہ تو یہ ہوا)۔

**قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ:** بعض مفسرین نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا ڈر جانا طبعی بات ہے جو کسی بھی طرح آپ کی عظمت اور جلالت شان کے خلاف نہیں، اور بعض نے کہا ہے کہ جو حادثہ مخلوق کی طرف سے پیش آئے اس میں تو نہ ڈرنا کمال ہے، جیسے ابراہیم علیہ السلام نمرود کی آگ سے نہیں ڈرے، اور جو امر خدا کی طرف سے ہو تو اس میں ڈرنا ہی کمال ہے، کیونکہ وہ فی الحقیقت اللہ تعالیٰ سے ڈرنا ہے، جیسے ہوا تیز ہونے کے وقت جناب رسول اللہ ﷺ کا گھبرا جانا احادیث میں آیا ہے، سو چونکہ اس تبدیلی میں مخلوق کا واسطہ ہی نہ تھا اس لیے ڈر گئے کہ یہ کوئی قہر الٰہی نہ ہو، دوسرے مقام پر انك من الامنين فرمانے سے تسلی دینا اسی طرف مشیر ہے، اس میں اس بات پر بھی دلالت ہے کہ کاملین میں بھی طبعی امور ہوتے ہیں، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کو طبعی خوف پیدا ہوا، یہ کمال کے خلاف نہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی لاٹھی کا زمین پر ڈالنا تھا کہ لاٹھی کی جگہ ایک اژدہا نظر آیا جو پتلے سانپ کی طرح تیزی سے دوڑتا تھا، موسیٰ علیہ السلام ناگہاں یہ انقلاب دیکھ کر بمقتضائے بشریت خوفزدہ ہو گئے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی ہاتھ میں آ کر پھر لاٹھی ہو جائے گی، کہتے ہیں ابتداء میں موسیٰ علیہ السلام کو پکڑنے کی ہمت نہ ہوتی تھی آخر کپڑا ہاتھ میں لپیٹ کر پکڑنے لگے، فرشتہ نے کہا "موسیٰ کیا خدا اگر بچانا نہ چاہے تو یہ چیتھڑا تجھے بچا سکتا ہے؟" موسیٰ نے کہا "نہیں، لیکن میں کمزور مخلوق ہوں، اور ضعف سے پیدا کیا گیا ہوں"، پھر حضرت موسیٰ نے ہاتھ سے کپڑا ہٹا کر اژدھے کے منہ میں دے دیا، ہاتھ ڈالنا تھا کہ وہی لاٹھی ہاتھ میں دیکھی۔

**وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ آيَةً أُخْرَىٰ ﴿٢٢﴾**

اور ملا لے اپنا ہاتھ اپنی بغل سے کہ نکلے سفید ہو کر بلا عیب یہ نشانی دوسری ۱

**لِنُرِيَكَ مِنْ آيَاتِنَا الْكُبْرَى ﴿٢٣﴾ اذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ﴿٢٤﴾** ع ۱۰

تا کہ دکھاتے جائیں ہم تجھ کو اپنی نشانیاں بڑی ۲ جا طرف فرعون کے کہ اس نے بہت سر اٹھایا

**خلاصہ تفسیر:** اور (دوسرا معجزہ یہ دیا جاتا ہے کہ) تم اپنا (داہنا) ہاتھ اپنی (بائیں) بغل میں دے لو (پھر نکالو) وہ بلا کسی عیب (یعنی بلا کسی مرض برص وغیرہ) کے (نہایت) روشن ہو کر نکلے گا کہ یہ دوسری نشانی (ہماری قدرت اور تمہاری نبوت کی) ہوگی (اور یہ حکم لاٹھی کے ڈال دینے اور ہاتھ کو گریبان میں دینے کا اس لئے ہے) تا کہ ہم تم کو اپنی (قدرت کی) بڑی نشانیوں میں سے بعض نشانیاں دکھلائیں (تو اب یہ نشانیاں لے کر) تم فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت حد سے نکل گیا ہے (کہ خدائی کا دعویٰ کرتا ہے تم اس کو توحید کی تبلیغ کرو اور اگر نبوت میں شبہ کرے تو یہی معجزے دکھلا دو)۔

**وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ:** اس دوسرے معجزے کے سوال وجواب میں پہلے معجزے کی طرح اہتمام نہ فرمانا شاید اس لیے ہو کہ لاٹھی کا معجزہ زیادہ عظیم ہے، کیونکہ اُس میں ذات اور صفت دونوں میں تبدیلی ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی ہاتھ گریبان میں ڈال کر اور بغل سے ملا کر نکالو گے تو نہایت روشن سفید چمکتا ہوا نکلے گا، اور یہ سفیدی برص وغیرہ کی نہ ہوگی جو عیب سمجھی جائے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی عصا اور ید بیضا کے معجزے ان بڑی نشانیوں میں سے دو ہیں جن کا دکھلانا تم کو منظور ہے۔

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿٢٥﴾ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٢٦﴾ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿٢٧﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿٢٨﴾

بولا اے رب! کشادہ کر میرا سینہ ۱؎ اور آسان کر میرا کام ۲؎ اور کھول دے گرہ میری زبان سے، کہ سمجھیں میری بات ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** (جب موسیٰ علیہ السلام کو معلوم ہوا کہ مجھے پیغمبر بنا کر فرعون کو سمجھانے کے لئے بھیجا جا رہا ہے تو اس وقت اس عظیم الشان منصب کی مشکلات آسان کرنے کی درخواست کی اور) عرض کیا کہ اے میرے رب! میرا حوصلہ (اور زیادہ) فراخ کر دیجئے (تاکہ احکام پہنچانے میں انقباض یا تکذیب ومخالفت سے تنگی اور پریشانی نہ ہو) اور میرا (یہ) کام (تبلیغ کا) آسان فرما دیجئے (کہ تبلیغ کے اسباب جمع ہو جائیں اور رُکاوٹیں دور ہو جائیں) اور میری زبان پر سے بستگی (لکنت کی) ہٹا دیجئے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔

**وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ:** جس گرہ کے کھولنے کی دعا کی ہے وہ یا تو پیدائشی لکنت تھی جیسا کہ بعض کہتے ہیں، یا بچپن میں ایک چنگاری اٹھا کر منہ میں رکھ لی تھی اس سے زبان کی روانی کم ہوگئی تھی، اور یہ اشکال کہ ہاتھ تو پہلے جلا ہوگا، پھر منہ تک چنگاری کیسے لے گئے؟ ممکن ہے کہ شاید اس کوئلہ کا کچھ حصہ جلا ہوا نہ ہو، اسے پکڑ کر جلتا ہوا حصہ منہ میں رکھ لیا ہو، یا جلدی سے منہ میں ڈال لیا ہو جس سے ہاتھ نہ جلا اور زبان جل گئی۔

پہلی دو دعائیں تو عام تھیں سب کاموں میں اللہ تعالیٰ سے مدد حاصل کرنے کے لئے، تیسری دعا میں اپنی ایک محسوس کمزوری کے ازالہ کی درخواست کی گئی کہ رسالت ودعوت کیلئے زبان کی طلاقت اور فصاحت بھی ایک ضروری چیز ہے، آگے ایک آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی یہ سب دعائیں قبول کرلی گئیں، جس کا ظاہر یہ ہے کہ زبان کی یہ لکنت بھی ختم ہوگئی ہوگی، مگر خود موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون کو اپنے ساتھ رسالت میں شریک کرنے کی جو دعا کی ہے اس میں یہ بھی فرمایا ہے کہ: **هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا** یعنی ہارون علیہ السلام زبان کے اعتبار سے بہ نسبت میرے زیادہ فصیح ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لکنت کا اثر کچھ باقی تھا، نیز فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو عیوب لگائے ان میں یہ بھی کہا کہ: **وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ** یعنی یہ اپنی بات کو صاف بیان نہیں کر سکتے، اس دعا سے آپ کا مقصود یہ تھا کہ رکاوٹ بالکل دور ہو جائے یا یہ تھا کہ بقدر ضرورت بات سمجھانے کے قابل کم ہو جائے، دونوں احتمال ہیں، اور دوسرے احتمال پر اگر کچھ رکاوٹ باقی بھی رہی ہو تو وہ ایسا عیب نہیں جس سے نبی کا مبرا ہونا ضروری ہو، البتہ اتنی رکاوٹ جس سے بات سمجھانے میں خلل پڑتا ہو اور سننے والے کو نفرت ہوتی ہو اس سے نبی کا مبرا ہونا ضروری ہے، اور جب یہ خرابی نہ ہو تو ذرا سی رکاوٹ کا عیب ہونا مسلم نہیں، بہرحال آگے آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی درخواست جو کچھ بھی ہو منظور ہوئی، بعض حضرات نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود اپنی دعا میں اتنی ہی بات مانگی تھی کہ زبان کی بندش اتنی کھل جائے کہ لوگ میری بات سمجھ لیا کریں، اتنی لکنت دور کر دی گئی، کچھ معمولی اثر بھی رہا تو وہ اس دعا کی قبولیت کے منافی نہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ **رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ:** یعنی حلیم وبردبار اور حوصلہ مند بنا دے کہ خلاف طبع دیکھ کر جلد خفا نہ ہوں اور ادائے رسالت میں جو سختیاں پیش آئیں ان سے نہ گھبراؤں بلکہ کشادہ دلی اور خندہ پیشانی سے برداشت کروں۔

**فائدہ:** ۲؎ **وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ:** یعنی ایسا سامان فراہم کر دے کہ یہ عظیم الشان کام آسان ہو جائے۔

**فائدہ:** ۳؎ **يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ:** زبان لڑکپن میں جل گئی تھی (جس کا قصہ تفاسیر میں ہے) صاف نہ بول سکتے تھے، اس لیے یہ دعا کی۔

وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿٢٩﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿٣٠﴾ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ﴿٣١﴾ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٣٢﴾

اور دے مجھ کو ایک کام بٹانے والا میرے گھر کا، ہارون میرا بھائی ۱؎، اس سے مضبوط کر میری کمر اور شریک کر اس کو میرے کام میں ۲؎

كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٣﴾ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٤﴾ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ﴿٣٥﴾

کہ تیری پاک ذات کا بیان کریں ہم بہت سا اور یاد کریں ہم تجھ کو بہت سا ۳؎ تو تو ہے ہم کو خوب دیکھتا ۴؎

**خلاصہ تفسیر:** اور میرے واسطے میرے کنبے میں سے ایک معاون مقرر کر دیجئے یعنی ہارون کو جو میرے بھائی ہیں ان کے ذریعہ سے میری قوت کو مستحکم کر دیجئے، اور ان کو میرے (اس تبلیغ کے) کام میں شریک کر دیجئے (یعنی ان کو بھی نبی بنا کر احکام کی تبلیغ پر مقرر کر دیجیے کہ ہم دونوں تبلیغ کریں اور میرے قلب کو ان سے قوت پہنچے) تا کہ ہم دونوں (مل کر تبلیغ و دعوت کے وقت) آپ کی خوب کثرت سے پاکی (شرک و نقائص سے) بیان کریں اور آپ (کے اوصاف و کمال) کا خوب کثرت سے ذکر کریں (کیونکہ اگر دو شخص مبلغ ہوں گے تو ہر شخص کا بیان دوسرے کی تائید سے قوی اور وافر ہو جائے گا) بیشک آپ ہم کو (اور ہمارے حال کو) خوب دیکھ رہے ہیں (آپ کو معلوم ہے کہ اس حالت میں ہمیں اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک دوسرے کے معاون ہوں)۔

**وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ:** اس دعا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو وزیر طلب فرمایا اس کے ساتھ ایک قید مِّنْ اَهْلِيْ کی بھی لگا دی کہ یہ وزیر میرے خاندان و اقارب میں سے ہو، کیونکہ اپنے خاندان کے آدمی کے عادات و اخلاق دیکھے بھالے اور طبائع میں باہم الفت و مناسبت ہوتی ہے جس سے اس کام میں اضافی مدد ملتی ہے بشرطیکہ اس کو کام کی صلاحیت میں دوسروں سے فائق دیکھ کر لیا گیا ہو، محض اقربا پروری کا داعیہ نہ ہو، اس دعا سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ کاملین بھی ظاہری اسباب کو اختیار کرتے ہیں (یہ نہ بزرگی کے خلاف ہے اور نہ توکل کے خلاف ہے)۔

**وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ:** خلاصہ تفسیر میں جو کہا کہ "ان کو نبی بنا کر" یہ اس لیے چونکہ ہارون علیہ السلام کو معاون بنانے کی یہ درخواست موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے کی ہے، اس لیے معلوم ہوا کہ ان کو نبی بنوانا مقصود ہے، کیونکہ بغیر نبوت کے تو موسیٰ علیہ السلام خود ہارون علیہ السلام سے بھی مدد کی درخواست کر سکتے تھے، سو معلوم ہوا کہ نبی بنوانا مقصود ہے۔

**كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا:** اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں مل کر خلوت میں بہت ذکر کیا کریں گے، کیونکہ ایک دوسرے کی تقویت سے طبیعت کو نشاط ہوگا اور نشاط زیادہ ہونے سے کام بھی زیادہ ہوتا ہے، اس میں اس پر بھی دلالت ہے کہ اسباب اختیار کرنے میں بھی کاملین کا اصل مقصود دین اور دینی کاموں میں تعاون اور مدد کا حصول ہوا کرتا ہے۔

* * *

**فائدہ: ۱** هٰرُوْنَ اَخِي: یہ عمر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے۔

**فائدہ: ۲** وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ: یعنی دعوت و تبلیغ کے کام میں ایک دوسرے کا معین و مددگار رہوں۔

**فائدہ: ۳** وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا: یعنی دونوں مل کر دعوت و تبلیغ کے موقع پر بہت زور شور سے تیری پاکی اور کمالات بیان کریں اور مواضع دعوت سے قطع نظر جب ہر ایک کو دوسرے کی معیت سے تقویت قلب حاصل ہوگی، تو اپنی خلوتوں میں نشاط و طمانیت کے ساتھ تیرا ذکر بکثرت کر سکیں گے۔

**فائدہ: ۴** اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا: یعنی ہمارے تمام احوال کو خوب دیکھ رہا ہے اور جو دعاء میں کر رہا ہوں یہ بھی تجھے خوب معلوم ہے کہ اس کا قبول فرمانا ہمارے لیے کہاں تک مفید ہوگا، اگر تجھے ہمارے حال و استعداد کی پوری خبر نہ ہوتی تو نبوت و رسالت کے لیے ہم کو منتخب ہی کیوں کرتا اور ایسے سخت دشمن (فرعون) کی طرف کیوں بھیجتا، یقیناً جو کچھ آپ نے کیا خوب دیکھ بھال کر کیا ہے۔

قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴿۳۶﴾ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ﴿۳۷﴾ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ

فرمایا ملا تجھ کو تیرا سوال اے موسیٰ ۱ اور احسان کیا تھا ہم نے تجھ پر ایک بار اور بھی ۲ جب حکم بھیجا ہم نے تری ماں کو

مَا يُوْحٰٓى ﴿۳۸﴾ اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَاْخُذْهُ

جو آگے سناتے ہیں ۳ کہ ڈال اس کو صندوق میں پھر اس کو ڈال دے دریا میں پھر دریا اس کو لے ڈالے کنارے پر اٹھالے اس کو

وقف لازم

عَدُوٌّ لِّيْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ ؕ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ﴿۳۹﴾

ایک دشمن میرا اور اس کا ۴ اور ڈال دی میں نے تجھ پر محبت اپنی طرف سے ۵ اور تا کہ پرورش پائے تو میری آنکھ کے سامنے ۶

**خلاصہ تفسیر:** ارشاد ہوا کہ تمہاری (ہر) درخواست (جو کہ پیچھے رب اشرح لی الخ میں مذکور ہے) منظور کی گئی اے موسیٰ! (یہ دعا تو تمہاری خود درخواست کی ہوئی تھی) ہم تو اور دفعہ اور بھی (اس سے قبل بغیر درخواست ہی) تم پر احسان کر چکے ہیں۔

جبکہ ہم نے تمہاری ماں کو وہ بات الہام سے بتلائی جو (مہتم بالشان ہونے کی وجہ سے) الہام سے بتلانے کے (قابل) تھی (وہ) یہ کہ موسیٰ کو (جلاّدوں کے ہاتھ سے بچانے کے لئے) ایک صندوق میں رکھو، پھر ان کو (صندوق کے ساتھ) دریا میں (جس کی ایک شاخ فرعون کے محل تک بھی گئی تھی) ڈال دو، پھر دریا ان کو (صندوق کے ساتھ) کنارہ (کے پاس) تک لے آئے گا (آخرکار) ان کو ایک ایسا شخص پکڑے گا جو (کافر ہونے کی وجہ سے) میرا بھی دشمن ہے اور ان کا بھی دشمن ہے (یا تو اس وقت بھی دشمن تھا کہ سب بچوں کو قتل کرتا تھا یا یہ مطلب ہے کہ آئندہ چل ان کا خاص طور پر دشمن ہو جائے گا) اور (جب صندوق پکڑا گیا اور تم اس میں سے نکالے گئے تو) میں نے تمہارے (چہرے کے) اوپر اپنی طرف سے ایک اثر محبت ڈال دیا (تا کہ جو تم کو دیکھے پیار کرے) اور تا کہ تم میری (خاص) نگرانی میں پرورش پاؤ۔

**اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى:** اس الہام میں اس دشمن کی تعیین نہیں فرمائی تھی کہ وہ کون ہے؟ اور یہ الہام اگر فرشتہ کے ذریعہ سے بھی ہوا ہو تب بھی موسی علیہ السلام کی والدہ کی نبوت لازم نہیں آتی، کیونکہ نبوت کے لیے تبلیغ احکام کا ہونا بھی لازم ہے صرف فرشتہ کا بات کرنا کافی نہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر انبیاء کو بھی اللہ کی جانب سے الہام ہوسکتا ہے۔

**وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ:** اللہ تعالی نے موسی علیہ السلام پر اپنی صفات میں سے صفت محبت ظاہر فرمادی تھی، جس کی وجہ سے جو بھی انہیں دیکھتا محبت کرنے لگ جاتا، اس میں موسی علیہ السلام کا ذاتی کمال نہ تھا، ایسے ہی تمام اشیا پر اللہ تعالی کی صفات کا ظہور ہے، کہیں جمالی کہیں جلالی، اس سے وہ مسئلہ ثابت ہوتا ہے جو ''مسئلہ مظہریت'' کے نام سے معروف ہے، مظہریت کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اللہ تعالی کی بے حد و بے حساب صفات میں ایک ''صفت محبت'' بھی ہے کہ وہ **الودود** یعنی محبت کرنے والا ہے، اللہ تعالی اپنی اس صفت کی کیفیت کو اپنے کسی بندے کی شکل وصورت پر پیدا کر دیتے ہیں تو وہ بندہ محبوب خلائق ہو جاتا ہے، اسے مسئلہ مظہریت کہا جاتا ہے کہ یہ بندہ اللہ کی صفت محبت کا مظہر و نمونہ ہے، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس خاص انعام و اکرام کے باوجود بندہ، بندہ ہی ہے، نہ اللہ کی ذات میں شریک ہوا، نہ اس کی صفات میں شریک ہوا۔

* * *

**فائدہ:** ۱ **قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى:** یعنی جو کچھ تم نے مانگا، خدا تعالیٰ کی طرف سے تم کو دیا گیا۔

**فائدہ:** ۲ **مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى:** یعنی ہم تو پہلے ایک مرتبہ بے مانگے تجھ پر بڑا بھاری احسان کر چکے ہیں، پھر اب ایک مناسب چیز مانگنے پر کیوں نہ دیں گے۔

**فائدہ:** ۳ **اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى:** یعنی خواب میں یا بیداری میں بطور الہام کے، یا اس زمانہ کے کسی نامعلوم الاسم نبی کی زبانی تیری ماں کو وہ حکم بھیجا، جس کا بھیجا جانا مناسب تھا (اس کی تفصیل آگے مذکور ہے: اَنِ اقْذِفِيْهِ الخ)

**تنبیہ:** لفظ ''ایحاء'' سے حضرت موسیٰ کی والدہ کا نبیہ ہونا ثابت نہیں ہوتا جیسا کہ تقریر بالا سے ظاہر ہے، نبی وہ ہے جس کی طرف احکام کی وحی آئے اور ان کی تبلیغ کا مامور ہو، یہاں یہ تعریف صادق نہیں آتی۔

**فائدہ:** ۴ **يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ:** یعنی موسیٰ کو (جو اس وقت نوزائیدہ بچہ تھے) صندوق میں رکھ کر صندوق کو دریا میں چھوڑ دے، دریا کو ہمارا حکم ہے کہ اسے بحفاظت تمام ایک خاص کنارہ پر لگائے گا جہاں سے اس کو وہ شخص اٹھا لے گا جو میرا بھی دشمن ہے اور اس بچہ کا بھی، واقعہ یہ ہے

کہ فرعون اس سال نجومیوں کے کہنے سے بنی اسرائیل کے بیٹوں کو چن چن کر قتل کر رہا تھا، جب موسیٰ پیدا ہوئے ان کی والدہ کو خوف ہوا کہ فرعون کے سپاہی خبر پائیں گے تو بچہ کو مار ڈالیں گے اور والدین کو بھی ستائیں گے کہ ظاہر کیوں نہیں کیا، اس وقت حق تعالیٰ کی طرف سے یہ تدبیر الہام ہوئی، موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے صندوق نہر میں ڈال دیا، دریا کی ایک شاخ فرعون کے باغ میں گزرتی تھی اس میں سے ہو کر صندوق کنارے جا لگا، فرعون کی بیوی حضرت آسیہ نے (جو نہایت پاکباز اسرائیلی خاتون تھی) بچہ کو اٹھا کر فرعون کے سامنے پیش کیا کہ آؤ ہم تم اسے بیٹا بنا لیں، فرعون کو بھی دیکھ کر محبت آئی، گو اس نے بیٹا بنانے سے انکار کیا (جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے) مگر آسیہ کی خاطر اسے بیٹوں کی طرح پرورش کیا اور اس طرح حق تعالیٰ کی عجیب وغریب قدرت کا ظہور ہوا۔

**تنبیہ:** فرعون کو خدا کا دشمن اس لیے کہا کہ وہ حق کا دشمن تھا اور خدا کے بالمقابل خدائی کا دعویٰ کرتا تھا اور موسیٰ کا دشمن اس لیے فرمایا کہ فی الحال تمام اسرائیلی بچوں کے ساتھ سخت دشمنی کر رہا تھا، اور آئندہ چل کر خاص موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اعلانیہ دشمنی کا اظہار کرنے والا تھا۔

**فائدہ:** ۵ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ: یعنی ہم نے اپنی طرف سے اس وقت مخلوق کے دلوں میں تیری محبت ڈال دی کہ جو دیکھے محبت اور پیار کرے یا اپنی ایک خاص محبت تجھ پر ڈال دی کہ تو محبوب خدا بن گیا، پھر جس سے خدا محبت کرے بندے بھی محبت کرنے لگتے ہیں۔

**فائدہ:** ۶ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ: یعنی لوگوں کے دلوں میں تیری محبت ڈال دینا اس غرض سے تھا کہ ہماری نگرانی وحفاظت میں تیری پرورش کی جائے، ایسے سخت دشمن کے گھر میں تربیت پاتے ہوئے بھی کوئی تیرا بال بیکا نہ کر سکے۔

اِذْ تَمْشِيْٓ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ يَّكْفُلُهٗ ؕ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ

جب چلنے لگی تیری بہن اور کہنے لگی میں بتاؤں تم کو ایسا شخص جو اس کو پالے، پھر پہنچا دیا ہم نے تجھ کو تیری ماں کے پاس کہ ٹھنڈی رہے

عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ؕ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۟

اس کی آنکھ اور غم نہ کھائے ۱ اور تو نے مار ڈالا ایک شخص کو پھر بچا دیا (نکالا) ہم نے تجھ کو اس غم سے ۲ اور جانچا ہم نے تجھ کو ایک ذرا جانچنا ۳

فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ۙ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ۝۴۰

پھر ٹھہرا رہا تو کئی برس مدین والوں میں، پھر آیا تو تقدیر سے اے موسیٰ ۴

**خلاصہ تفسیر:** (یہ اس وقت کا قصہ ہے) جبکہ تمہاری بہن (تمہاری تلاش میں فرعون کے گھر) چلتی ہوئی آئیں، پھر (تم کو دیکھ کر اجنبی بن کر) کہنے لگیں (جبکہ تم کسی انا کا دودھ نہ پیتے تھے) کیا تم لوگوں کو ایسے شخص کا پتہ دوں جو اس کو (اچھی طرح) پالے رکھے (چنانچہ ان لوگوں نے منظور کیا، کیونکہ ان کی تلاش تھی اور تمہاری بہن تمہاری ماں کو بلا کر لائیں) پھر (اس تدبیر سے) ہم نے تم کو تمہاری ماں کے پاس پھر پہنچا دیا تاکہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور ان کو غم نہ رہے (کیونکہ تھوڑے عرصہ تک فراق سے غمگین رہیں تھیں) اور (بڑے ہونے کے بعد ایک اور احسان کیا کہ) تم نے (غلطی سے) ایک شخص (قبطی) کو جان سے مار ڈالا (جس کا قصہ سورۃ قصص میں ہے اور مار کر غم ہوا، سزا کے خوف سے بھی اور انتقام کے خوف سے بھی) پھر ہم نے تم کو اس غم سے نجات دی (سزا کے خوف سے تو اس طرح کہ استغفار کی توفیق دی اور اس کو قبول کیا، اور انتقام کے خوف سے اس طرح کہ مصر سے مدین پہنچا دیا) اور (مدین پہنچنے تک) ہم نے تم کو خوب خوب محنتوں میں ڈالا (اور پھر ان سے خلاصی دی کہ خلاصی دینا بھی احسان تھا، اور خود یہ آزمائش بھی ایک مستقل نعمت تھی، کیونکہ آزمائش سے اخلاق حمیدہ اور اچھے ملکات حاصل ہوتے ہیں جو کہ خود مستقل احسان ہے) پھر (مدین پہنچے اور) مدین والوں میں کئی سال رہے، پھر ایک خاص وقت پر (جو میرے علم میں تمہاری نبوت اور ہم کلامی کے لئے مقدر تھا) تم (یہاں) آئے اے موسیٰ!

وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ: اس سے پتہ چلتا ہے کہ کاملین سے بھی لغزش ہو سکتی ہے، لیکن ان کی یہ لغزش چونکہ نفسانی یا ہیجانی خواہشات سے متاثر ہو کر نہیں ہوتی اس لیے قابل مواخذہ بھی نہیں، مگر اس کے باوجود ان پر افسوس اور پشیمانی کی کیفیت غالب ہوتی ہے اور یہ حضرات اس پر بھی توبہ واستغفار کیا کرتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱۔ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ: پورا قصہ دوسری جگہ آئے گا، حضرت موسیٰ کی والدہ صندوق نہر میں چھوڑنے کے بعد بمقتضائے بشریت، بہت غمگین اور پریشان تھیں کہ بچہ کا کیا حشر ہوا ہوگا، معلوم نہیں زندہ ہے یا جانوروں نے کھالیا، حضرت موسیٰ کی بہن کو کہا کہ خفیہ طور پر پتہ لگا، ادھر مشیت ایزدی سے یہ سامان ہوا کہ حضرت موسیٰ کسی عورت کا دودھ نہیں پیتے تھے، بہت سی انائیں بلائی گئیں، کامیابی نہ ہوئی، موسیٰ کی بہن جو تاک میں لگی ہوئی تھی بولی کہ میں ایک عورت کو لاسکتی ہوں، امید ہے کہ کسی طرح دودھ پلا کر بچہ کو پال سکے گی، حکم ہوا بلاؤ، وہ موسیٰ کی والدہ کو لے کر پہنچی، چھاتی سے لگاتے ہی، بچہ نے دودھ پینا شروع کر دیا، فرعون کے گھر بڑی خوشیاں منائی جانے لگیں، موسیٰ کی والدہ نے کہا کہ میں یہاں نہیں رہ سکتی اجازت دو کہ اپنے گھر میں لے جاؤں اور پوری حفاظت واہتمام سے بچہ کو پرورش کروں، آخر فرعون کی طرف سے بطور دایہ کے بچہ کی تربیت پر مامور ہو کر اپنے گھر لے آئیں اور شاہانہ اعزاز واکرام کے ساتھ موسیٰ کی تربیت میں لگی رہیں۔

فائدہ: ۲۔ فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ: یہ پورا قصہ سورہ قصص میں آئے گا، خلاصہ یہ ہے کہ جوان ہونے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے ایک قبطی مارا گیا تھا، موسیٰ علیہ السلام ڈرے کہ دنیا میں پکڑا جاؤں گا اور آخرت میں بھی ماخوذ ہوں گا، دونوں قسم کی پریشانی سے خدا تعالیٰ نے نجات دی، اخروی پریشانی سے اس طرح کہ توبہ کی توفیق بخشی جو قبول ہوگئی اور دنیاوی سے اس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام کو مصر سے نکال کر مدین پہنچا دیا جہاں حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی سے ان کا نکاح ہوگیا، پورا قصہ دوسری جگہ آئے گا۔

فائدہ: ۳۔ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا: یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو کئی طرح جانچا، جس میں تم کھرے ثابت ہوئے۔

تنبیہ: اس موقع پر مفسرین نے حدیث الفتون کے عنوان سے ایک نہایت طویل روایت ابن عباس رضی اللہ کی نقل کی ہے جس کے متعلق حافظ ابن کثیرؒ کے الفاظ یہ ہیں: "وهو موقوف من كلام ابن عباس، وليس فيه مرفوع الا قليل منه، وكانه تلقاه ابن عباس رضى الله عنه مما ابيح نقله من الاسرائيليات من كعب بن الاحبار وغيره والله اعلم، وسمعت شيخنا الحافظ ابا الحجاج المزى يقول ذلك ايضًا"۔

فائدہ: ۴۔ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى: یعنی اب مدین سے نکل کر راستہ بھولا اور تقدیر سے یہاں پہنچ گیا جس کا تجھے وہم وگمان بھی نہ تھا، سچ ہے:

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال　کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ﴿۴۱﴾ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ﴿۴۲﴾

اور بنایا میں نے تجھ کو خاص اپنے واسطے ۱۔ جا تو اور تیرا بھائی میری نشانیاں لے کر اور سستی نہ کریو میری یاد میں ۲۔

خلاصہ تفسیر: اور (یہاں آنے پر) میں نے تم کو اپنے (نبی بنانے کے) لئے منتخب کیا (سو اب) تم اور تمہارے بھائی دونوں میری نشانیاں (یعنی معجزات جو کہ اصل دو معجزے ہیں عصا اور ید بیضا اور ہر ایک میں اعجاز کی وجوہ متعدد ہیں) لے کر (جس موقع کے لئے حکم ہوتا ہے) جاؤ اور میری یادگاری میں (خواہ خلوت میں خواہ تبلیغ کے وقت) سستی مت کرنا۔

بِاٰيٰتِيْ: چونکہ ان میں کئی طرح سے اعجاز تھا اس لیے ان کو معجزات کہا گیا، اور وہ کئی طرح یہ ہے کہ لاٹھی کا اژدھا بن جانا ایک معجزہ تھا، پھر اس کا

لاٹھی بن جانا دوسرا معجزہ تھا، اسی طرح ہاتھ کا روشن ہو جانا ایک معجزہ تھا، پھر اصلی حالت پر آ جانا دوسرا معجزہ تھا۔

**وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ**: یہ اہتمام کے لیے فرمایا، ورنہ انبیاء میں اس کا احتمال نہیں، اور دونوں کو حکم فرمانے کے لیے ہارون علیہ السلام کا وہاں تشریف رکھنا ضروری نہیں، یا تو موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا ہو کہ ان سے بھی کہہ دیں، یا ان کو ان کی جگہ وحی ہوئی ہو، یا یہ وحی طور سے واپس آنے کے بعد دونوں کے اجتماع کے وقت ہوئی ہو، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی تعلیم دینے والا یہ چاہتا ہے کہ اس کی تعلیم و تعلم میں برکت اور عمل کا شوق پیدا ہو تو اسے چاہیے کہ اپنے آپ کو ذکر الٰہی کا عادی اور پابند بنائے۔

* * *

**فائدہ**: ۱؎ یعنی اپنی وحی و رسالت کے لیے تیار کر کے اپنے خواص و مقربین میں داخل کیا اور جس طرح خود چاہا تیری پرورش کرائی۔

**فائدہ**: ۲؎ یعنی جس کام کے لیے بنائے گئے ہو، وقت آ گیا ہے کہ اپنے بھائی ہارون کو ساتھ لے کر اس کے لیے نکل کھڑے ہو اور جو دلائل و معجزات تم کو دیے گئے ہیں ضرورت کے وقت ظاہر کرو، چونکہ موسیٰ علیہ السلام پیشتر دعا کرتے وقت کہہ چکے تھے: كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا یہاں وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ کہہ کر وہ بات یاد دلا دی، یعنی اللہ کے نام کی تبلیغ میں پوری مستعدی دکھلاؤ اور تمام احوال و اوقات میں عموماً اور دعوت تبلیغ کے وقت خصوصاً اللہ کو کثرت سے یاد کرو کہ اہل اللہ کے لیے کامیابی کا بڑا ذریعہ اور دشمن کے مقابلہ میں بہترین ہتھیار یہی ہے، حدیث میں ہے: "وان عبدی کل عبدی الذی یذکرنی وھو مناجز قرنہ"

| اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿٤٣﴾ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿٤٤﴾ |
| --- |
| جاؤ طرف فرعون کے اس نے بہت سر اٹھایا ۱؎، سو کہو اس سے بات نرم شاید (تاکہ) وہ سوچے یا ڈرے ۲؎ |

**خلاصہ تفسیر**: (اب جانے کا موقع بتلایا جاتا ہے کہ) دونوں فرعون کے پاس جاؤ، وہ بہت نکل چلا ہے، پھر (اس کے پاس جا کر) اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید وہ (رغبت سے) نصیحت قبول کر لے یا (عذاب الٰہی سے) ڈر جائے (اور اس سے مان جائے)۔

**فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا**: اس میں اصل ہے دعوت و ارشاد میں نرمی اختیار کرنے کی اور اس میں اس بات پر بھی دلالت ہے کہ ہر شخص سے اس کے مقام و رتبہ کے موافق پیش آیا جائے اور یہ اہل اللہ کے اخلاق میں سے ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے ساتھ جو نرم گفتگو کا حکم ہوا، سو اس موقع کے مناسب نرمی ہی تھی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین کے بارے میں جو وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ارشاد فرمایا سو منافقین کے ساتھ سخت برتاؤ ہی مناسب تھا، یہ توجیہ بالکل بے غبار ہے، بعض لوگ اس اختلاف حکم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج مبارک پر محمول کرتے ہیں تو یہ سوء ادب سے خالی نہیں، واللہ اعلم۔

**لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى**: "شاید" کا لفظ دوسرے لوگوں کے اعتبار سے فرمایا، ورنہ علم الٰہی میں شک و احتمال نہیں ہوا کرتا۔

* * *

**فائدہ**: ۱؎ پہلے جانے کا حکم دیا تھا، اب مقام بتلا دیا کہ کہاں کس کے پاس جانا ہے اور یہ جملہ آگے آنے والے کلام کی تمہید ہے۔

**فائدہ**: ۲؎ یعنی دعوت و تبلیغ وعظ و نصیحت کے وقت نرم، آسان، رقت انگیز اور بلند بات کہو، گو اس کے تمرد و طغیان کو دیکھتے ہوئے قبول کی امید نہیں، تاہم تم یہ خیال کر کے کہ ممکن ہے کہ وہ کچھ سوچ سمجھ کر نصیحت حاصل کر لے یا اللہ کے جلال و جبروت کو سن کر ڈر جائے اور فرمانبرداری کی طرف جھک پڑے، گفتگو نرمی سے کرو، اس سے دعاۃ و مبلغین کے لیے بہت بڑا دستور العمل معلوم ہوتا ہے، چنانچہ دوسری جگہ صاف ارشاد ہے: اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ۔

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ﴿۴۵﴾ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴿۴۶﴾

بولے اے رب ہمارے ہم ڈرتے ہیں کہ بھبک پڑے ہم پر یا جوش میں آ جائے [1] فرمایا نہ ڈرو میں ساتھ ہوں تمہارے سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں [2]

**خلاصہ تفسیر:** (جب یہ حکم دونوں صاحبوں کو پہنچ چکا تو) دونوں نے عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار! (ہم تبلیغ کے لئے حاضر ہیں لیکن) ہم کو اندیشہ ہے کہ (کہیں) وہ ہم پر (تبلیغ سے پہلے ہی) زیادتی نہ کر بیٹھے (کہ تبلیغ ہی رہ جائے) یا یہ کہ (عین تبلیغ کے وقت اپنے کفر میں) زیادہ شرارت نہ کرنے لگے (کہ اپنی بک بک میں تبلیغ نہ سنے نہ سننے دے جس سے تبلیغ کا ہونا اور نہ ہونا برابر ہو جائے) ارشاد ہوا کہ (اس بات سے بالکل) اندیشہ نہ کرو (کیونکہ) میں تم دونوں کے ساتھ ہوں سب سنتا دیکھتا ہوں (میں تمہاری حفاظت کرونگا اور اس کو مرعوب کر دوں گا جس سے پوری تبلیغ کر سکو گے جیسا کہ دوسری آیت میں ہے: وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا کہ ہم تم دونوں کو غلبہ اور شوکت عطا کریں گے)۔

**رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ:** یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابتداء کلام میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو منصب نبوت و رسالت عطا فرمایا گیا اور انہوں نے حضرت ہارون کو اپنے ساتھ شریک کرنے کی درخواست کی اور یہ درخواست قبول ہوئی تو اسی وقت حق تعالیٰ نے ان کو یہ بتلا دیا تھا کہ: سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا نیز یہ بھی اطمینان دلا دیا گیا تھا کہ آپ کی درخواست میں جو جو چیزیں طلب کی گئی ہیں وہ سب ہم نے آپ کو دیدیں قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ان مطلوب چیزوں میں شرح صدر بھی جس کا حاصل یہی تھا کہ مخالف سے کوئی دل تنگی اور خوف و ہراس پیدا نہ ہو، اللہ تعالیٰ کے ان وعدوں کے بعد پھر یہ خوف اور اس کا اظہار کیسا ہے؟

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ آیت: سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا میں اگرچہ غلبہ دینے کا وعدہ ہارون علیہ السلام کی نبوت کے وعدہ کے ساتھ مذکور ہے، مگر دونوں کے ایک ساتھ مذکور ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ دونوں وعدے ایک ساتھ ہی کیے گئے تھے، ممکن ہے کہ یہ دونوں وعدے مختلف اوقات میں ہوئے ہوں اور کسی مصلحت سے آیت میں ایک ساتھ ذکر کر دیا ہو، دوسرا جواب یہ ہے کہ پہلا وعدہ کہ ہم آپ کو غلبہ عطا کریں گے اور وہ لوگ آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے یہ ایک مبہم وعدہ ہے کہ مراد غلبہ سے حجت و دلیل کا غلبہ بھی ہو سکتا ہے اور مادی غلبہ بھی، نیز یہ خیال بھی ہو سکتا ہے کہ ان پر غلبہ تو جب ہوگا کہ وہ ان کے دلائل سنیں معجزات دیکھیں، مگر خطرہ یہ ہے کہ وہ کلام سننے سے پہلے ہی ان پر حملہ کر بیٹھے اور شرح صدر کے لئے یہ لازم نہیں کہ طبعی خوف بھی جاتا رہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ خوف کی چیزوں سے طبعی خوف تو تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے جو وعدوں پر پورا ایمان و یقین ہونے کے باوجود بھی ہوتا ہے، خود حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی ہی لاٹھی کے سانپ بن جانے کے بعد اس کے پکڑنے سے ڈرنے لگے تو حق تعالیٰ نے فرمایا: لَا تَخَفْ ڈرو نہیں اور دوسرے تمام مواقع خوف میں ایسا ہی ہوتا رہا کہ طبعی اور بشری خوف لاحق ہوا پھر اللہ تعالیٰ نے بشارت کے ذریعہ اس کو زائل فرمایا، حقیقت یہ ہے کہ مواعید ربانی سے یقین تو ان سب کو پورا حاصل تھا مگر طبعی خوف جو بمقتضائے بشریت انبیاء میں بھی ہوتا ہے وہ اس کے منافی نہیں۔

اور اگر یہ شبہ ہو کہ آیت: يسر لى امرى میں موسیٰ علیہ السلام نے تبلیغ کی آسانی کی درخواست کی تھی اور: اوتيت سؤلك ياموسى میں وہ درخواست منظور ہو چکی تھی پھر یہ خوف کیوں ہوا؟ جواب یہ ہے کہ اس میں آسانی کی درخواست کا مطلب یہ تھا کہ جو موانع میرے اندر ہیں لکنت و کمزوری وغیرہ وہ دور کر دیے جائیں، اس درخواست کے قبول ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مخاطب کی جانب میں جو رکاوٹیں ہیں وہ بھی ختم ہو گئیں ہوں۔

**اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى:** اس کی دو تفسیریں ہیں: پہلی تفسیر تو یہ کہ اگر اَسْمَعُ وَاَرٰى تفسیر ہو اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ کی تو قرب صفاتی پر دلیل ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اپنی صفات کے اعتبار سے ان کے ساتھ تھے، مطلب یہ ہوگا کہ میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں اور سن رہا ہوں، خلاصہ یہ کہ میری صفت سمع و بصر تم دونوں کے ساتھ ہے۔

دوسری تفسیر یہ کہ دونوں جملوں کو مستقل قرار دیا جائے، مطلب یہ ہوگا کہ میں تم دونوں کے ساتھ ہوں اور دیکھ رہا ہوں اور سن بھی رہا ہوں، یعنی

میری ذات تم دونوں کے ساتھ ہے، اس صورت میں قرب ذاتی پر دلیل ہوگا، یعنی اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے ساتھ تھے۔

* * *

**فائدہ:** لے یعنی اس کے ڈرنے کی امید تو بعد کو ہوگی، فی الحال اپنی بے سروسامانی اور اس کے جاہ وجلال پر نظر کرتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ وہ ہماری بات سننے کے لیے بھی آمادہ ہوگا یا نہیں، ممکن ہے ہماری پوری بات سننے سے پہلے ہی وہ بھبک پڑے یا سننے کے بعد غصہ میں بپھر جائے اور تیری شان میں زیادہ گستاخی کرنے لگے، یا ہم پر دست درازی کرے جس سے اصل مقصد فوت ہو جائے۔

**تنبیہ:** موسیٰ علیہ السلام کے اس خوف اور شرح صدر میں کچھ منافات نہیں، کاملین بلاء کے نزول سے پہلے ڈرتے ہیں اور استعاذہ کرتے ہیں لیکن جب آ پڑتی ہے اس وقت پورے حوصلہ اور کشادہ دلی سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔

**فائدہ:** ۲ے یعنی جو باتیں تمہارے اور اس کے درمیان ہوں گی یا جو معاملات پیش آئیں گے وہ سب میں سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں میں کسی وقت تم سے جدا نہیں، میری حمایت ونصرت تمہارے ساتھ ہے، گھبرانے اور فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

فَأْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ؕ

سو جاؤ اس کے پاس اور کہو ہم دونوں بھیجے ہوئے ہیں تیرے رب کے سو بھیج دے ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو، اور مت ستا ان کو لے

قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ؕ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴿٤٧﴾

ہم آئے ہیں تیرے پاس نشانی لے کر تیرے رب کی ۲ے اور سلامتی ہو اس کی جو مان لے راہ کی بات

اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿٤٨﴾

ہم کو حکم ملا ہے کہ عذاب اس پر ہے جو جھٹلائے اور منہ پھیر لے ۳ے

**خلاصہ تفسیر:** سو تم (بے خوف وخطر) اس کے پاس جاؤ اور (اس سے) کہو کہ ہم دونوں تیرے پروردگار کے فرستادے ہیں (کہ ہم کو نبی بنا کر بھیجا ہے) سو (تو ہماری اطاعت کر عقیدہ کی اصلاح میں بھی کہ توحید کی تصدیق کر اور اخلاق کی بھی اصلاح کر کہ ظلم وغیرہ سے باز آ، اور) بنی اسرائیل کو (جن پر تو ناحق ظلم کرتا ہے اپنے پنجۂ ظلم سے رہا کر کے) ہمارے ساتھ جانے دے (کہ جہاں چاہیں اور جس طرح چاہیں رہیں) اور ان کو تکلیفیں مت پہنچا (اور) ہم (جو دعویٰ نبوت کا کرتے ہیں تو خالی خولی نہیں بلکہ ہم) تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے (اپنی نبوت کا) نشان (یعنی معجزہ بھی) لائے ہیں اور (تصدیق اور حق قبول کرنے کا ثمرہ اس قاعدہ کلیہ سے معلوم ہوگا کہ) ایسے شخص کے لئے (عذاب الٰہی سے) سلامتی ہے جو (سیدھی) راہ پر چلے (تکذیب اور حق بات کو رد کرنے کے بارے میں) ہمارے پاس یہ حکم پہنچا ہے کہ (اللہ کا) عذاب (قہر کا) اس شخص پر ہوگا جو (حق کو) جھٹلائے اور (اس سے) روگردانی کرے (غرض یہ سارا مضمون جا کر اس سے کہو)۔

**اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ:** اس میں بھی وہی مسئلہ ہے جو پیچھے قولا لینا میں گذر چکا ہے، چنانچہ خاص مخاطب کر کے ان العذاب علیك نہیں فرمایا گیا، بلکہ عمومی قاعدہ بتا دیا گیا کہ جو کوئی بھی جھٹلائے گا اسی پر عذاب نازل ہوگا، چاہے فرعون ہو یا کوئی اور، تاکہ فرعون کا دل بگڑ نہ جائے اور فرق مراتب کا بھی خیال رہے، نیز عذاب کے خلاصہ تفسیر میں ''قہر'' کی قید بڑھانے سے یہ شبہ جاتا رہا کہ عذاب تو گناہ گاروں کو بھی ہوگا، جواب یہ ہے کہ وہ ان کے حق میں قہر نہ ہوگا، بلکہ ان کی پاکی اور صفائی کے لیے ہوگا۔

* * *

**فائدہ:** لے اس میں تین چیزوں کی طرف دعوت دی گئی: ① فرعون کا اور سب مخلوقات کا کوئی رب ہے جو رسول بھیجتا ہے ② ہم دونوں اس

کے رسول ہیں لہذا ہماری اطاعت اور رب کی عبادت کرنی چاہیے، گویا اس جملہ میں اصل ایمان کی دعوت دی گئی اس کو ''نازعات'' میں اس طرح ادا کیا ہے: فَقُلۡ هَلۡ لَّكَ اِلٰۤى اَنۡ تَزَكّٰىۙ وَاَهۡدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخۡشٰى آگے ③ تیسری چیز وہ ہے جس کی اس وقت خاص ضرورت تھی، یعنی بنی اسرائیل کو فرعونیوں کی ذلت آمیز اور درد انگیز غلامی سے نجات دلانا، مطلب یہ ہے کہ اس شریف و نجیب الاصل خاندان پر ظلم وستم مت توڑ اور ذلیل ترین غلامی سے آزادی دے کر ہمارے ساتھ کردے، جہاں چاہیں آزادانہ زندگی بسر کریں۔

**فائدہ:** ۲ یعنی ہمارا دعویٰ رسالت بے دلیل نہیں بلکہ اپنی صداقت پر خدائی نشان لے کر آئے ہیں۔

**فائدہ:** ۳ یعنی جو ہماری بات مان کر سیدھی راہ چلے گا اس کے لیے دونوں جہان میں سلامتی ہے، اور جو تکذیب یا اعراض کرے گا اس کے لیے عذاب یقینی ہے، خواہ صرف آخرت میں یا دنیا میں بھی، اب تم اپنا انجام سوچ کر جو راستہ چاہو اختیار کرلو۔

قَالَ فَمَنۡ رَّبُّكُمَا يٰمُوۡسٰى ۞ قَالَ رَبُّنَا الَّذِىۡۤ اَعۡطٰى كُلَّ شَىۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۞

بولا پھر کون ہے رب تم دونوں کا اے موسیٰ ۱، کہا رب ہمارا وہ ہے جس نے دی ہر چیز کو اس کی صورت پھر راہ سجھائی ۲

**خلاصہ تفسیر:** (چنانچہ دونوں حضرات تشریف لے گئے اور جا کر فرعون سے یہ سب کہہ دیا) وہ کہنے لگا کہ پھر (یہ تو بتلاؤ کہ) تم دونوں کا رب کون ہے (جس کے تم اپنے کو فرستادہ بتاتے ہو) اے موسیٰ! (جواب میں) موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا کہ ہمارا (دونوں کا بلکہ سب کا) رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کے مناسب بناوٹ عطا فرمائی، پھر (ان میں جو جاندار چیزیں تھیں ان کو ان کے منافع ومصالح کی طرف) رہنمائی فرمائی (چنانچہ ہر جانور اپنی متناسب غذا اور جوڑہ اور رہنے کی جگہ وغیرہ سب ڈھونڈ لیتا ہے، پس وہی ہمارا بھی رب ہے)۔

**فَمَنۡ رَّبُّكُمَا يٰمُوۡسٰى:** فرعون کا صرف موسیٰ علیہ السلام کو مخاطب بنانا یا تو اس لیے ہے کہ قرائن سے اس کو معلوم ہو گیا کہ یہی اصل ہیں، یا قدیم تعلق کی وجہ سے ہو، یا اس لیے ہو کہ گفتگو موسیٰ علیہ السلام ہی نے کی تھی، ہارون علیہ السلام صرف مؤید تھے، واللہ اعلم۔

**قَالَ رَبُّنَا الَّذِىۡۤ اَعۡطٰى كُلَّ شَىۡءٍ خَلۡقَهٗ:** ہر چیز کو مناسب بناوٹ عطا کرنے پر یہ شبہ نہ ہو کہ بعض چیزیں ناقص الخلقت بھی ہوتی ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ وہاں ایسا ہی مناسب ہوتا ہے، اگرچہ اس کی مصلحت مخفی ہو، موسیٰ علیہ السلام کے اس جواب میں یہ رہنمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتی معرفت (معرفت بالکنہ) بیان کرنا محال ہے، البتہ صفات وافعال کے ذریعے تعریف کرنا جائز ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی تم اپنے کو جس رب کا بھیجا ہوا بتلاتے ہو وہ رب کون ہے اور کیسا ہے (اس سوال سے مترشح ہوتا ہے کہ فرعون دہری عقیدہ کی طرف مائل ہوگا یا محض دق کرنے کے لیے ایسا سوال کیا ہو)۔

**فائدہ:** ۲ یعنی ہر چیز کو اس کی استعداد کے موافق شکل صورت، قویٰ، خواص وغیرہ عنایت فرمائے، اور کمال حکمت سے جیسا بنانا چاہیے تھا بنایا، پھر مخلوقات میں سے ہر چیز کے وجود و بقاء کے لیے جن سامانوں کی ضرورت تھی، مہیا کیے اور ہر چیز کو اپنی مادی ساخت اور روحانی قوتوں اور خارجی سامانوں سے کام لینے کی راہ سجھائی، پھر ایسا محکم نظام دکھلا کر ہم کو بھی ہدایت کردی کہ مصنوعات کے وجود سے صانع کے وجود پر کسی طرح استدلال کرنا چاہیے فللہ الحمد والمنہ، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی کھانے پینے کو ہوش دیا، بچہ کو دودھ پینا وہ نہ سکھائے تو کوئی نہ سکھا سکے''۔

قَالَ فَمَا بَالُ الۡقُرُوۡنِ الۡاُوۡلٰى ۞ قَالَ عِلۡمُهَا عِنۡدَ رَبِّىۡ فِىۡ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّىۡ وَلَا يَنۡسَى ۞

بولا پھر کیا حقیقت ہے ان پہلی جماعتوں کی، کہا ان کی خبر میرے رب کے پاس لکھی ہوئی ہے، نہ بہکتا ہے میرا رب اور نہ بھولتا ہے ۱

**خلاصہ تفسیر:** فرعون نے (موسیٰ علیہ السلام کے ارشاد: اَنَّ الۡعَذَابَ عَلٰى مَنۡ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى پر شبہ کیا اور) کہا کہ اچھا تو

پہلے لوگوں کا کیا حال ہوا؟ (جو انبیاء کی تکذیب کرتے تھے ان پر کون سا عذاب نازل ہوا؟) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا (کہ میں نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ عذاب دنیا ہی میں آنا ضرور ہے، بلکہ کبھی دنیا میں بھی آجاتا ہے اور آخرت میں تو ضرور ہی ہوگا، چنانچہ) ان لوگوں (کی بداعمالیوں) کا علم میرے پروردگار کے اس دفتر (اعمال) میں (محفوظ) ہے (اگرچہ انہیں دفتر کی حاجت نہیں، مگر بعض حکمتوں کی وجہ سے ایسا کیا گیا ہے، غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے اعمال معلوم ہیں، اور) میرا رب (ایسا جاننے والا ہے کہ) نہ غلطی کرتا ہے اور نہ بھولتا ہے (پس ان کے اعمال کا صحیح صحیح علم اس کو حاصل ہے، مگر عذاب کے لئے وقت مقرر کر رکھا ہے، جب وہ وقت آئے گا وہ عذاب ان پر جاری کر دیا جائے گا، پس دنیا میں عذاب نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ کفر اور تکذیب پر بالکل عذاب نہ ہوگا، یہاں تک موسیٰ علیہ السلام کی تقریر ہو چکی)۔

اگرچہ جواب کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ گذشتہ امتوں کے عذاب اور ان کے واقعات کو ذکر فرما دیتے، لیکن اس طریقہ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس لیے اختیار نہیں فرمایا کہ اس میں احتمال تھا کہ فرعون ان واقعات کو اتفاق پر محمول کر کے ان کے بطور عذاب ہونے کا انکار کر دیتا اور اپنی غباوت سے قہر الٰہی اور اتفاق میں فرق نہ سمجھ سکتا۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی اگر خدا تعالیٰ کے وجود پر ایسی روشن دلیلیں قائم ہو چکی ہیں اور جس چیز کی طرف تم بلاتے ہو، وہ حق ہے تو گذشتہ اقوام کے تفصیلی حالات تم کو ضرور معلوم ہونے چاہئیں یہ سب لایعنی اور دور از کار قصے فرعون نے اس لیے چھیڑے کہ حضرت موسیٰ کے مضامین ہدایت کو ان فضول باتوں میں رلا دے، حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ پیغمبر کو تمام چیزوں کا تفصیلی علم ہونا ضروری نہیں، ہر قوم کے حالات کا تفصیلی علم حق تعالیٰ کو ہے جو بعض مخفی مصالح کی بناء پر کتاب (لوح محفوظ) میں ثبت بھی کر دیا گیا، اللہ کے علم سے نہ کوئی چیز ابتداء غائب ہو سکتی ہے اور نہ علم میں آئی ہوئی چیز کو ایک سیکنڈ کے لیے بھول سکتا ہے، جو اعمال کسی قوم نے کسی وقت کیے ہیں سب کا ذرہ ذرہ حساب لکھا ہوا موجود ہے جو وقت پر پیش کر دیا جائے گا۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخْرَجْنَا

وہ ہے جس نے بنا دیا تمہارے واسطے زمین کو بچھونا اور چلائیں تمہارے لئے اس میں راہیں ۱؎ اور اُتارا آسمان سے پانی، پھر نکالی ہم نے

بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ﴿۵۳﴾ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰى ﴿۵۴﴾ ع ۱۱

اس سے طرح طرح کی سبزی ۲؎ کھاؤ اور چراؤ اپنے چوپایوں کو ۱؎ البتہ اس میں نشانیاں ہیں عقل رکھنے والوں کو ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اب اللہ تعالیٰ اپنی شان ربوبیت کی کچھ تفصیل بیان فرماتے ہیں جس کا ذکر پیچھے موسیٰ علیہ السلام کے کلام: رَبُّنَا الَّذِیْۤ اَعْطٰی الخ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ الخ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ الخ میں اجمالاً تھا، چنانچہ ارشاد ہے کہ:

وہ (رب) ایسا ہے جس نے تم لوگوں کے لئے زمین کو (مثل) فرش (کے) بنایا (کہ اس پر آرام کرتے ہو) اور اس (زمین) میں تمہارے (چلنے کے) واسطے رستے بنائے اور آسمان سے پانی برسایا، پھر ہم نے اس (پانی) کے ذریعہ سے مختلف اقسام کے نباتات پیدا کئے (اور تمہیں اجازت دی کہ) خود (بھی) کھاؤ اور اپنے مواشی کو (بھی) چراؤ، ان سب (مذکورہ) چیزوں میں اہل عقل کے (استدلال کے) واسطے (قدرت الٰہیہ کی) نشانیاں ہیں۔

**فَاَخْرَجْنَا بِهٖ:** اس سے ثابت ہوا کہ ہر شیٔ کے مؤثر حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہی ہیں، اس لیے یہاں ''اس نے پیدا کیا'' یعنی غائب کے بجائے فَاَخْرَجْنَا یعنی ''ہم نے پیدا کیا''، یعنی حاضر کا خطاب اختیار کیا، البتہ فاخرجنا بہ (یعنی ہم نے یہ سب پانی سے پیدا کیا) پانی کے ذکر سے اَسباب کا ثبوت بھی نکلتا ہے، یعنی فاعل حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہی ہیں، البتہ اسباب کا اختیار کرنا بھی جائز ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی وادیوں دریاؤں اور پہاڑوں کے بیچ میں سے زمین پر راہیں نکال دیں جن پر چل کر ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچ سکتے ہو۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی پانی کے ذریعہ سے طرح طرح کی سبزیاں، غلے اور پھل پھول پیدا کر دیئے۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی عمدہ غذائیں تم کھاتے ہو، جو تمہارے کام کی نہیں وہ اپنے مویشیوں کو کھلاتے ہو جنکی محنت سے ساری پیداوار حاصل ہوئی ہے۔

**فائدہ:** ۴؎ یہ فرمایا ہے دہریوں کی آنکھ کھولنے کو یعنی اس کی تدبیریں اور قدرتیں دیکھو، اگر عقل ہے تو سمجھ لوگے کہ یہ مضبوط و محکم انتظامات یوں ہی بخت واتفاق سے قائم نہیں ہو سکتے، گویا ان آیات میں وجود باری اور توحید کی طرف توجہ دلائی، آگے معاد کا ذکر ہے:

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴿۵۵﴾

اسی زمین سے ہم نے تم کو بنایا اور اسی میں تم کو پھر پہنچا (لوٹا) دیتے ہیں اور اسی سے نکالیں گے تم کو دوسری بار

**خلاصہ تفسیر:** (جس طرح ہم نباتات کو زمین سے نکالتے ہیں اسی طرح) ہم نے تم کو اسی زمین سے (ابتدا میں) پیدا کیا (چنانچہ آدم علیہ السلام مٹی سے بنائے گئے، سو ان کے واسطے سے سب کی اصل خاک ہی ہے) اور اسی میں ہم تم کو (موت کے بعد) لے جائیں گے (چنانچہ کوئی مردہ کسی حالت میں ہو لیکن آخر کار اگرچہ مدتوں کے بعد سہی مگر مٹی میں ضرور ملے گا) اور (قیامت کے روز) پھر دوبارہ اسی سے ہم تم کو نکال لیں گے (جیسا پہلی بار اس سے پیدا کر چکے ہیں)۔

شاید اللہ تعالی نے یہ بات اس لیے بڑھادی ہو کہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی اور کفار مکہ توحید وقیامت کے منکر تھے اور اس میں دونوں پر دلالت ہے۔

* * *

**فائدہ:** سب کے باپ آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا کیے گئے، پھر جن غذاؤں سے آدمی کا بدن پرورش پاتا ہے وہ بھی مٹی سے نکلتی ہیں، مرنے کے بعد بھی عام آدمیوں کو جلد یا بدیر مٹی میں مل جانا ہے، اسی طرح حشر کے وقت بھی ان اجزاء کو جو مٹی میں مل گئے تھے دوبارہ جمع کر کے از سر نو پیدا کر دیا جائے گا اور جو قبروں میں مدفون تھے وہ ان سے باہر نکالے جائیں گے۔

وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى ﴿۵۶﴾

اور ہم نے فرعون کو دکھلا دیں اپنی سب نشانیاں پھر اس نے جھٹلایا اور نہ مانا ۱؎

قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۵۷﴾

بولا کیا تو آیا ہے ہم کو نکالنے ہمارے ملک سے اپنے جادو کے زور سے اے موسیٰ ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور ہم نے اس (فرعون) کو اپنی (وہ) سب ہی نشانیاں دکھلائیں (جو کہ موسیٰ علیہ السلام کو عطا ہوئی تھیں) سو وہ (جب بھی) جھٹلایا ہی کیا اور انکار ہی کرتا رہا (اور) کہنے لگا کہ اے موسیٰ! تم ہمارے پاس (یہ دعوی لے کر) اس واسطے آئے ہو (گے) کہ ہم کو ہمارے ملک سے اپنے جادو (کے زور) سے نکال باہر کرو (اور خود عوام کو فریفتہ اور تابع بنا کر رئیس بن جاؤ)۔

اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا: یہ بات فرعون نے شاید اس لیے کہی ہو کہ سننے والوں کو موسی علیہ السلام پر غصہ آجائے، کیونکہ اپنے ملک وطن کا چھوڑنا اکثر طبیعتوں کے لیے مشکل ہوتا ہے تو اس غصہ کی وجہ سے موسی کی طرف میلان نہ ہونے پائے اور نہ معجزات میں غور کر سکیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ؕ یعنی جو آیات اس کو دکھلانا منظور تھیں، سب دکھلا دیں مثلاً القائے عصاء اور ید بیضا وغیرہ مع اپنے متعلقات وتفاصیل کے، اس پر بھی بد بخت نہ مانا اور جحود وتکذیب پر اڑا رہا۔

**فائدہ:** ۲ؕ فرعون نے یہ بات اپنی قوم "قبط" کو موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے نفرت اور اشتعال دلانے کے لیے کہی، یعنی موسیٰ علیہ السلام کی غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ جادو کے زور سے ہم کو نکال باہر کرے اور ساحرانہ ڈھونگ بنا کر عوام کی جمعیت اپنے ساتھ کر لے اور اس طرح قبطیوں کے تمام املاک واموال پر قابض ہو جائے۔

فَلَنَاْتِیَنَّكَ بِسِحۡرٍ مِّثۡلِهٖ فَاجۡعَلۡ بَیۡنَنَا وَبَیۡنَكَ مَوۡعِدًا لَّا نُخۡلِفُهٗ نَحۡنُ وَلَاۤ اَنۡتَ

سو ہم بھی لائیں گے تیرے مقابلہ میں ایک ایسا ہی جادو سو ٹھہرا لے ہمارے اور اپنے بیچ میں ایک وعدہ نہ ہم خلاف کریں اسکا اور نہ تو

مَكَانًا سُوًى ﴿۵۸﴾

ایک میدان صاف میں

**خلاصہ تفسیر:** سو اب ہم بھی تمہارے مقابلے میں ایسا ہی جادو لاتے ہیں تو ہمارے اور اپنے درمیان میں ایک وعدہ مقرر کر لو جس کے نہ ہم خلاف کریں اور نہ تم خلاف کرو کسی ہموار میدان میں (تا کہ سب دیکھ لیں)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی تو اس ارادہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا ہمارے یہاں بھی بڑے بڑے ماہر جادوگر موجود ہیں، بہتر ہوگا کہ ان سے مقابلہ ہو جائے، پس جس دن اور جس جگہ مقابلہ کرنا چاہے تجھے اس کی تعیین کا اختیار دیا جاتا ہے، ضرورت اس کی ہے کہ جو وقت معین ہو جائے اس سے کوئی فریق گریز نہ کرے اور جگہ ایسی ہو جہاں فریقین کو آنے اور بیٹھنے میں یکساں سہولت حاصل ہو، نشست وغیرہ میں راعی ورعایا یا حاکم ومحکوم اور بڑے چھوٹے کا کوئی سوال نہ ہو، ہر ایک فریق آزادی سے اپنی قوت کا مظاہرہ کر سکے اور میدان بھی کھلا، ہموار اور صاف ہو کہ تماشا دیکھنے والے سب بے تکلف مشاہدہ کر سکیں۔

قَالَ مَوۡعِدُكُمۡ یَوۡمُ الزِّیۡنَةِ وَاَنۡ یُّحۡشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿۵۹﴾

کہا وعدہ تمہارا ہے جشن کا دن اور یہ کہ جمع ہوں (کرلیں لوگوں کو، کر لیے جائیں) لوگ دن چڑھے ۱ؕ

فَتَوَلّٰى فِرۡعَوۡنُ فَجَمَعَ كَیۡدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿۶۰﴾

پھر الٹا پھرا فرعون پھر جمع کئے اپنے سارے داؤ پھر آیا ۲ؕ

**خلاصہ تفسیر:** موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا تمہارے (مقابلہ کے) وعدہ کا وقت وہ دن ہے جس میں (تمہارا) میلا ہوتا ہے، اور (جس میں) دن چڑھے لوگ جمع ہوتے ہیں () غرض (یہ سن کر) فرعون (دربار سے اپنی جگہ) لوٹ گیا، پھر اپنا مکر کا (یعنی جادو کا) سامان جمع کرنا شروع کیا، پھر (سب کو لے کر اس میدان میں جہاں وعدہ ٹھہرا تھا) آیا۔

یَوۡمُ الزِّیۡنَةِ: یعنی میلے کے دین، اور ظاہر ہے کہ میلے کا موقع اکثر ہموار ہی زمین میں ہوتا ہے، اس سے وہ شرط بھی پوری ہوگئی جو پیچھے فرعون نے لگائی تھی یعنی: مَكَانًا سُوًى کہ ہموار زمین میں مقابلہ ہو۔

* * *

**فائدہ:** ۱ؕ پیغمبروں کے کام میں کوئی تلبیس وتلمیع نہیں ہوتی، ان کا معاملہ کھلم کھلا صاف صاف ہوتا ہے، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ بہتر

ہے جو بڑا میلہ اور جشن تمہارے یہاں ہوتا ہے اسی روز جب دن چڑھ جائے اس وقت میدان مقابلہ قائم ہو، یعنی میلہ میں جہاں زیادہ سے زیادہ مخلوق جمع ہوگی اور دن کے اجالے میں یہ کام کیا جائے، تاکہ دیکھنے والے بکثرت ہوں اور روز روشن میں کسی کو اشتباہ والتباس نہ ہو، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''دنگل میں مقابلہ کرنے سے دونوں کی غرض تھی، وہ چاہے کہ ان کو ہرادے سب کے روبرو، یہ چاہیں کہ وہ ہارے، جشن کا دن سارے مصر کے شہروں میں مقرر تھا فرعون کی سالگرہ کا''۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی یہ طے کر کے فرعون مجلس سے اٹھ گیا اور ساحروں کو جمع کرنے اور مہم کو کامیاب بنانے کے لیے ہر قسم کی تدبیریں اور داؤ گھات کرنے لگا، اور آخر کار مکمل تیاری کے بعد پوری طاقت کے ساتھ وقت معین پر میدان مقابلہ میں حاضر ہوگیا، ساحروں کی بڑی فوج اس کے ہمراہ تھی، انعام واکرام کے وعدے ہور ہے تھے اور ہر طرح موسیٰ کو شکست دینے اور حق کو مغلوب کر لینے کی فکر تھی۔

قَالَ لَهُمْ مُّوسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ

کہا ان کو موسیٰ نے کم بختی تمہاری جھوٹ نہ بولو اللہ پر پھر غارت کر دے تم کو کسی آفت سے ، اور مراد کو نہیں پہنچا

مَنِ افْتَرٰى ﴿٦١﴾ فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿٦٢﴾

جس نے جھوٹ باندھا ۱؎ پھر جھگڑے اپنے کام پر آپس میں اور چھپ کر کیا مشورہ ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** (اس وقت) موسیٰ (علیہ السلام) نے ان (جادوگر) لوگوں سے فرمایا کہ ارے کمبختی مارو! اللہ تعالیٰ پر جھوٹ افترا مت کرو (کہ خدا کے وجود یا توحید کا انکار کرنے لگو، یا اس کے ظاہر کئے ہوئے معجزات کو جادو بتلانے لگو) کبھی خدا تعالیٰ تم کو کسی قسم کی سزا سے بالکل نیست ونابود ہی کر دے، اور جو جھوٹ باندھتا ہے وہ (آخر کو) ناکام رہتا ہے، پس جادوگر (یہ بات سن کر ان دونوں حضرات کے بارہ میں) باہم اپنی رائے میں اختلاف کرنے لگے اور خفیہ گفتگو کرتے رہے۔

**وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا:** موسیٰ علیہ السلام نے ایسا انداز فرعون کے ساتھ اختیار نہیں کیا، بلکہ جادوگروں سے کہا، اس سے حفظ مراتب کا ثبوت ملتا ہے (یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے ایسا ترش لہجہ اختیار نہیں، بلکہ نرمی اور خیر خواہی سے گفتگو کی اور ساحروں سے ترش لہجہ اختیار کیا، یہ اسلوب فرق مراتب کا درس دیتا ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ معلوم ہوتا ہے کہ اس مجمع میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہر شخص کو اس کے حسبِ حال نصیحت فرمائی، چونکہ جادوگر حق کا مقابلہ جادو سے کرنے والے تھے، ان کو تنبیہ کر دی کہ دیکھو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو، خدا کے نشانوں اور انبیاء کے معجزات کو سحر بتلانا اور بے حقیقت کی چیزوں کو ثابت شدہ حقائق کے مقابلہ میں پیش کرنا گویا اللہ پر جھوٹ باندھنا ہے، جھوٹ باندھنے والوں کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوتا، بلکہ اندیشہ ہے کہ ایسے لوگوں پر کوئی آسمانی آفت آپڑے، جو ان کی بیخ وبنیاد تک نہ چھوڑے۔

**فائدہ:** ۲؎ موسیٰ علیہ السلام کی تقریر نے ساحروں کی جماعت میں کھلبلی ڈال دی، آپس میں جھگڑنے لگے کہ اس شخص کو کیا سمجھا جائے، اس کی باتیں ساحروں جیسی معلوم نہیں ہوتیں، غرض باہم بحث ومناظرہ کرتے رہے اور سب سے الگ ہو کر انہوں نے مشورہ کیا، آخر اختلاف ونزاع کے بعد فرعون کے اثر سے متاثر ہو کر وہ کہا جو آگے مذکور ہے:

قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا

بولے مقرر یہ دونوں جادوگر ہیں چاہتے ہیں کہ نکال دیں تم کو تمہارے ملک سے اپنے جادو کے زور سے اور موقوف کرادیں

بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿۶۳﴾ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ﴿۶۴﴾

تمہارے اچھے خاصے چلن کو ۱ سو مقرر کر لو اپنی تدبیر پھر آؤ قطار (صف) باندھ کر، اور جیت گیا آج جو غالب رہا ۲

**خلاصہ تفسیر:** (بالاخر سب متفق ہوکر) کہنے لگے کہ بیشک یہ دونوں جادوگر ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ اپنے جادو (کے زور) سے تم کو تمہاری سرزمین سے نکال باہر کریں اور تمہارے عمدہ (مذہبی) طریقہ کا دفتر ہی اٹھادیں، تو اب تم مل کر اپنی تدبیر کا انتظام کرو اور صفیں آراستہ کر کے (مقابلہ میں) آؤ اور آج وہی کامیاب ہے جو غالب ہو۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی تمہارا جو دین اور رسوم پہلے سے چلی آتی ہیں ان کو مٹا کر اپنا دین اور طور وطریق رائج کردیں اور جادو کے فن کو بھی جس سے ملک میں تمہاری عزت اور کمائی ہے، چاہتے ہیں کہ دونوں بھائی تم سے لے اڑیں اور تن تنہا خود اس پر قابض ہوجائیں۔

**فائدہ:** ۲ یعنی موقع کی اہمیت کو سمجھو، وقت کو ہاتھ سے نہ جانے دو، پوری ہمت وقوت سے سب مل کر ان کے گرانے کی تدبیر کرو، اور دفعتاً ایسا متفقہ حملہ کردو کہ پہلے ہی وار میں ان کے قدم اکھڑ جائیں کہ آج کا معرکہ فیصلہ کن معرکہ ہے، آج کی کامیابی دائمی کامیابی ہے، جو فریق آج غالب رہے گا وہ ہمیشہ کے لیے منصور و مفلح سمجھا جائے گا۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ﴿۶۵﴾ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ

بولے اے موسیٰ! یا تو تو ڈال اور یا ہم ہوں پہلے ڈالنے والے کہا نہیں تم ڈالو ۱ پھر تب ہی ان کی رسیاں

وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿۶۶﴾ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ﴿۶۷﴾

اور لاٹھیاں اس کے خیال میں آئیں ان کے جادو سے کہ دوڑ رہی ہیں ۲ پھر پانے لگا اپنے جی میں ڈر موسیٰ ۳

**خلاصہ تفسیر:** (پھر) انہوں نے (موسیٰ علیہ السلام سے) کہا کہ اے موسیٰ! (کہئے) آپ (اپنا عصا) پہلے ڈالیں گے یا ہم پہلے ڈالنے والے بنیں؟ آپ نے (نہایت بے پروائی سے) فرمایا نہیں تم ہی پہلے ڈالو (چنانچہ انہوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالیں اور نظر بندی کردی) پس یکا یک ان کی رسیاں اور لاٹھیاں ان کی نظر بندی سے موسیٰ (علیہ السلام) کے خیال میں ایسی معلوم ہونے لگیں جیسے (سانپ کی طرح) چلتی دوڑتی ہوں، سو موسیٰ (علیہ السلام) کے دل میں تھوڑا سا خوف ہوا۔

**يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ:** اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعونی جادوگروں کا جادو ایک قسم کی نظر بندی تھی جو مسمریزم کے ذریعہ بھی ہوجاتی ہے کہ دیکھنے والوں کو یہ لاٹھیاں اور رسیاں سانپ بن کر دوڑتی ہوئی دکھائی دینے لگیں، وہ حقیقتاً سانپ نہ بنی تھیں اور اکثر جادو اسی قسم کے ہوتے ہیں۔

**فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى:** جب دیکھنے میں یہ رسیاں اور لاٹھیاں بھی سانپ معلوم ہوتی ہیں اور میرا عصا بھی بہت سے بہت سانپ بن جائے گا تو دیکھنے والے تو دونوں چیزوں کو ایک ہی سا سمجھیں گے تو حق و باطل میں امتیاز کس طرح کریں گے؟ اور یہ خوف طبعی تقاضہ کی وجہ سے تھا، ورنہ حضرت موسیٰ علیہ السلا کو یقین تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے تو اس کے تمام نشیب وفراز کا بھی انتظام کردے گا اور اپنے پیغمبر کی کافی مدد کرے گا اور ایسا طبعی خوف جو وسوسہ کے درجہ میں تھا شان کمال کے خلاف نہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابتداءً خوف زدہ ہونا اس بات کی علامت ہے کہ آپ مدعی کمال نہ تھے، کیونکہ مدعی خوف زدہ نہیں ہوتا، بلکہ اسے ایک زعم و پندار رہا کرتا ہے، اور وہ اس نشہ میں اپنی شکست کا تصور نہیں کرتا، اس سے

یہ بھی معلوم ہوا کہ باکمال آدمی اپنے آپ کو باکمال نہیں سمجھتا۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ موسیٰ علیہ السلام نے نہایت بے پروائی سے جواب دیا کہ نہیں، تم پہلے اپنے حوصلے نکال لو اور اپنے کرتب دکھالو، تاکہ باطل کی زورآزمائی کے بعد حق کا غلبہ پوری طرح نمایاں ہو، یہ قصہ سورہ اعراف میں گزر چکا وہاں کے فوائد ملاحظہ کر لیے جائیں۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی ساحرین کی نظر بندی سے موسیٰ علیہ السلام کو یوں خیال ہونے لگا گو یا رسیاں اور لاٹھیاں سانپوں کی طرح دوڑ رہی ہیں، اور واقعہ میں ایسا نہ تھا۔

**فائدہ:** ۳؎ کہ جادوگروں کا یہ سوانگ دیکھ کر کہیں بیوقوف لوگ دھوکہ میں نہ پڑ جائیں اور سحر و معجزہ میں فرق نہ کر سکیں، ایسی صورت میں حق کا غلبہ واضح نہ ہوگا، خوف کا یہ مطلب آگے جواب سے ظاہر ہوتا ہے۔

قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ﴿۶۸﴾ وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ؕ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ

ہم نے کہا تو مت ڈر مقرر تو ہی رہیگا غالب ۱؎ اور ڈال جو تیرے داہنے ہاتھ میں ہے کہ نگل جائے جو کچھ انہوں نے بنایا ۲؎ انکا بنایا ہوا تو فریب

سٰحِرٍ ؕ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴿۶۹﴾ فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ﴿۷۰﴾

ہے جادوگر کا، اور بھلا نہیں ہوتا جادوگر کا جہاں ہو (آئے) ۳؎ پھر گر پڑے جادوگر سجدہ میں بولے ہم یقین لائے رب پر ہارون اور موسیٰ کے ۴؎

**خلاصہ تفسیر:** (جب یہ خوف ہوا اُس وقت) ہم نے کہا کہ تم ڈرو نہیں، تم ہی غالب رہو گے، اور (اس کی صورت یہ ہے کہ) یہ تمہارے داہنے ہاتھ میں جو (عصا) ہے اس کو ڈال دو، ان لوگوں نے جو کچھ (سانگ) بنایا ہے یہ (عصا) سب کو نگل جائے گا، یہ جو کچھ بنایا ہے جادوگروں کا سانگ ہے، اور جادوگر کہیں جائے (معجزے کے مقابلے میں کبھی) کامیاب نہیں ہوتا (موسیٰ علیہ السلام کو تسلی ہوگئی کہ اب حق و باطل میں امتیاز خوب ہوسکتا ہے، چنانچہ انہوں نے عصا ڈالا اور واقعی وہ سب کو نگل گیا) سو جادوگر (وں نے جو یہ جادو سے بھی بڑھ کر دیکھا تو سمجھ گئے کہ یہ بیشک معجزہ ہے، اور فوراً ہی سب) سجدہ میں گر گئے (اور با آواز بلند) کہا کہ ہم تو ایمان لے آئے ہارون اور موسیٰ (علیہما السلام) کے پروردگار پر۔

**فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا:** اس میں دلالت ہے کہ اختیاری عمل اللہ تعالیٰ کے توفیق دینے پر موقوف ہے، یعنی جن اعمال پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیار دیا ہے ان پر عمل کرنے کے لیے توفیق الٰہی کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی ڈر کو دل سے نکال دو، اس قسم کے وسوسے مت لاؤ، اللہ تعالیٰ حق کو غالب اور سربلند رکھنے والا ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی اپنی لاٹھی زمین پر ڈال دو جوان کے بنائے ہوئے سوانگ کا ایک دم لقمہ کر جائے گی۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی جادوگر کے ڈھکوسلے چاہے کہیں ہوں اور کسی حد تک پہنچ جائیں، حق کے مقابل کامیاب نہیں ہو سکتے نہ جادوگر کبھی فلاح پا سکتا ہے، اسی لیے حدیث میں ساحر کے قتل کا حکم دیا گیا ہے۔

**فائدہ:** ۴؎ ساحرین فن کے جاننے والے تھے، اصول فن کے اعتبار سے فوراً سمجھ گئے کہ یہ سحر نہیں ہوسکتا یقیناً سحر سے اوپر کوئی اور حقیقت ہے، دل میں ایمان آیا اور سجدہ میں گر پڑے، یہ قصہ سورہ اعراف میں گزر چکا۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ؕ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ

بولا فرعون تم نے اس کو مان لیا میں نے ابھی حکم نہ دیا تھا، وہ ہی تمہارا بڑا ہے جس نے تم کو سکھایا جادو ۱؎

فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيۡدِيَكُمۡ وَاَرۡجُلَكُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمۡ فِىۡ جُذُوۡعِ النَّخۡلِ

سو اب میں کٹواؤں گا تمہارے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں ۲ اور سولی دوں گا تم کو کھجور کے تنہ پر ۳

وَلَتَعۡلَمُنَّ اَيُّنَاۤ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبۡقٰى ﴿۷۱﴾

اور جان لو گے ہم میں کس کا عذاب سخت ہے اور دیر تک رہنے والا ۴

**خلاصہ تفسیر:** فرعون نے (یہ واقعہ دیکھ کر جادوگروں کو دھمکایا اور) کہا کہ بدون اس کے کہ میں تم کو اجازت دوں (یعنی میری مرضی کے خلاف) تم موسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لے آئے، واقعی (معلوم ہوتا ہے کہ) وہ (جادو میں) تمہارے بھی بڑے (اور استاذ) ہیں کہ انہوں نے تم کو سحر سکھلایا ہے (اور استاد شاگردوں نے سازش کر کے دکھاوے کی جنگ کی ہے تا کہ تم کو ریاست وحکومت حاصل ہو) سو (اب حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے) میں تم سب کے ہاتھ پاؤں کٹواتا ہوں ایک طرف کا ہاتھ اور ایک طرف کا پاؤں اور تم سب کو کھجوروں کے درختوں پر ٹنگواتا ہوں (تا کہ سب دیکھ کر عبرت حاصل کریں) اور یہ بھی تم کو معلوم ہوا جاتا ہے کہ ہم دونوں میں (یعنی مجھ میں اور موسیٰ کے رب میں) کس کا عذاب زیادہ سخت اور دیرپا ہے۔

اِنَّهٗ لَكَبِيۡرُكُمُ الَّذِىۡ عَلَّمَكُمُ السِّحۡرَ: فرعون کا یہ کہنا عوام کو فریب دینے کے لیے تھا، ورنہ موسی علیہ السلام سے جادوگروں کی بے تعلقی وہ خود بھی جانتا تھا۔

وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمۡ فِىۡ جُذُوۡعِ النَّخۡلِ: اس کی کہیں صراحت نہیں دیکھی کہ فرعون نے ان نومسلموں کو یہ سزا دی یا نہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی ہم سے بے پوچھے ہی ایمان لے آئے، ہمارے فیصلہ کا بھی انتظار نہ کیا، معلوم ہو گیا کہ یہ تمہاری اور موسیٰ کی ملی بھگت ہے، جنگ زرگری کر کے عوام کو دھوکہ دینا چاہتے ہو جیسا کہ سورہ اعراف میں گزرا۔

**فائدہ:** ۲ یعنی داہنا ہاتھ بایاں پاؤں، یا بایاں ہاتھ داہنا پاؤں۔

**فائدہ:** ۳ تا کہ تمہارا حال دیکھ کر سب عبرت حاصل کریں۔

**فائدہ:** ۴ یعنی تم ایمان لا کر سمجھے ہو کہ ہم ہی ناجی ہیں اور دوسرے لوگ (یعنی فرعون اور اس کے ساتھی) سب ابدی عذاب میں مبتلا رہیں گے، سو ابھی تم کو معلوم ہوا چاہتا ہے کہ کس کا عذاب زیادہ سخت اور زیادہ دیر تک رہنے والا ہے۔

قَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الۡبَيِّنٰتِ وَالَّذِىۡ فَطَرَنَا فَاقۡضِ مَاۤ اَنۡتَ قَاضٍ

وہ بولے ہم تجھ کو زیادہ نہ سمجھیں گے اس چیز سے جو پہنچی ہم کو صاف دلیل اور اس سے جس نے ہم کو پیدا کیا سو تو کر گزر جو تجھ کو کرنا ہے

اِنَّمَا تَقۡضِىۡ هٰذِهِ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا ﴿۷۲﴾ اِنَّاۤ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغۡفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَاۤ اَكۡرَهۡتَنَا

تو یہی کرے گا اس دنیا کی زندگی میں، ہم یقین لائے ہیں اپنے رب پر تا کہ بخشے ہم کو ہمارے گناہ اور جو تو نے زبردستی کروایا ہم سے

عَلَيۡهِ مِنَ السِّحۡرِ ؕ وَاللّٰهُ خَيۡرٌ وَّاَبۡقٰى ﴿۷۳﴾

یہ جادو ۱ اور اللہ بہتر ہے اور سدا باقی رہنے والا ۲

**خلاصہ تفسیر:** ان لوگوں نے صاف جواب دے دیا کہ ہم تجھ کو کبھی ترجیح نہ دیں گے بمقابلہ ان دلائل کے جو ہم کو ملے ہیں اور بمقابلہ اس ذات کے جس نے ہم کو پیدا کیا ہے تجھ کو جو کچھ کرنا ہو (دل کھول کر) کر ڈال، تو بجز اس کے کہ اس دنیوی زندگانی میں کچھ کرلے اور کر ہی کیا سکتا ہے بس ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان لا چکے تا کہ ہمارے (پچھلے) گناہ (کفر وغیرہ) معاف کردیں، اور تو نے جو جادو (کے مقدمہ) میں ہم پر زور ڈالا اس کو بھی معاف کردیں اور اللہ تعالیٰ (ذات وصفات کے اعتبار سے بھی تجھ سے) بدر جہا اچھے ہیں اور (باعتبار ثواب وعقاب کے بھی) زیادہ بقا والے ہیں (اور تجھ کو نہ کچھ خیر نصیب ہے نہ بقا، تو تیرا کیا انعام جس کا وعدہ تو نے ہم سے کیا تھا، اور تیرا کیا عذاب جس کی اب دھمکی سناتا ہے)۔

**قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا:** اس سے پتہ چلتا ہے کہ استعداد کا کامل ہونا اور فطرت کا مسخ نہ ہونا مبتدی کو منتہی کے مقام پر پہنچادیتا ہے، چنانچہ جادوگروں کا یہ جواب ان کے منتہی ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

**وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ:** یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ یہ جادوگر تو خود اپنے اختیار سے مقابلہ کرنے کے لئے آئے تھے اور اس مقابلہ کی سودا بازی بھی فرعون سے کر چکے تھے کہ ہم غالب آئیں تو کیا ملے گا، پھر انکار فرعون پر یہ الزام لگانا کہ تو نے ہمیں جادو کرنے پر مجبور کر رکھا تھا یہ کیسے صحیح ہوگا؟ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ یہ جادوگر شروع میں تو شاہی انعام واکرام کے لالچ میں مقابلہ کے لئے تیار تھے، بعد میں ان کو کچھ احساس ہوا کہ ہم معجزہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اس وقت فرعون نے ان کو مجبور کیا، دوسری وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ فرعون نے اپنے ملک میں جادوگری کی تعلیم کو جبری بنایا ہوا تھا اس لئے ہر شخص جادو سیکھنے پر مجبور تھا، تیسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ شاہی حکم کے بعد آزادی سے رائے قائم کرنے کی گنجائش نہیں رہتی۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی ہم ایسے صاف دلائل کو تیری خاطر سے نہیں چھوڑ سکتے اور اپنے خالق حقیقی کی خوشنودی کے مقابلہ میں تیری کچھ پروا نہیں کر سکتے، اب جو تو کر سکتا ہے کر گزر، تیرا بڑا زور یہ ہی چل سکتا ہے کہ ہماری اس فانی زندگی کو ختم کردے، سو کچھ مضائقہ نہیں، ہم پہلے ہی دار الفناء کے مقابلہ میں دار القرار کو اختیار کر چکے ہیں، ہم کو اب یہاں کے رنج و راحت کی فکر نہیں، تمنا صرف یہ ہے کہ ہمارا مالک ہم سے راضی ہو جائے اور ہمارے عام گناہوں کو خصوصاً اس گناہ کو جو تیری حکومت کے خوف سے زبردستی کرنا پڑا (یعنی حق کا مقابلہ جادو سے) معاف فرمادے، کہتے ہیں کہ جادوگر حضرت موسیٰ کے نشان دیکھ کر سمجھ گئے تھے کہ یہ جادو نہیں، مقابلہ نہ کرنا چاہیے، پھر فرعون کے ڈر سے کیا۔

**فائدہ:** ۲ یعنی جو انعام واکرام تو ہم کو دیتا اس سے کہیں بہتر اور پائدار اجر مومنین کو خدا کے ہاں ملتا ہے۔

اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ؕ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴿۷۴﴾ وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا

بات یہی ہے کہ جو کوئی آیا اپنے رب کے پاس گناہ لے کر سو اسکے واسطے دوزخ ہے، نہ مرے اس میں نہ جیئے ۱ اور جو آیا اسکے پاس ایمان لیکر

قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ﴿۷۵﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

نیکیاں کر کے سو ان لوگوں کے لئے ہیں درجے بلند، باغ ہیں بسنے کے بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ﴿۷۶﴾ ع ۱۲

ہمیشہ رہا کریں گے ان میں ۲ اور یہ بدلہ ہے اس کا جو پاک ہوا ۳

**خلاصہ تفسیر:** (اور اللہ تعالیٰ کے جس ثواب اور عذاب کو بقا ہے اس کا قانون یہ ہے کہ) جو شخص (بغاوت کا) مجرم ہو کر (یعنی کافر ہو کر) اپنے رب کے پاس حاضر ہوگا اس کے لئے دوزخ (مقرر) ہے اس میں نہ ہی مرے گا اور نہ ہی جیے گا (نہ مرنا تو ظاہر ہے اور نہ جینا یہ کہ آرام سے

جینا نصیب نہ ہوگا) اور جو شخص اس کے پاس مومن ہو کر حاضر ہوگا جس نے نیک کام بھی کئے ہوں، سوایسوں کے لئے بڑے اونچے درجے ہیں، یعنی ہمیشہ رہنے کے باغات جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے، اور جو شخص (کفر و معصیت سے) پاک ہو اس کا یہی انعام ہے (پس اس قانون کے موافق ہم نے کفر کو چھوڑ کر ایمان اختیار کرلیا)۔

اور جو مؤمن نیک اعمال نہ کرے اس کا یہاں ذکر نہیں، اس کا حال دوسرے دلائل سے معلوم ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی انسان کو چاہیے کہ اول آخرت کی فکر کرے، لوگوں کا مطیع بن کر خدا کا مجرم نہ بنے، اس کے مجرم کا ٹھکانہ بہت برا ہے جس سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں، دنیا کی تکلیفیں کتنی ہی شاق ہوں موت آ کر سب کو ختم کر دیتی ہے، لیکن کافر کو دوزخ میں موت بھی نہیں آئے گی جو تکالیف کا خاتمہ کر دے، اور جینا بھی جینے کی طرح کا نہ ہوگا، زندگی ایسی ہوگی کہ موت کو ہزار درجہ اس پر ترجیح دے گا، العیاذ باللہ۔

**فائدہ:** ۲ اوپر مجرمین کے بالمقابل یہ مطیعین کا انجام بیان فرمادیا۔

**فائدہ:** ۳ یعنی پاک ہوا، گندے خیالات، فاسد عقائد، رذیل اخلاق، اور برے اعمال سے۔

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ

اور ہم نے حکم بھیجا موسیٰ کو کہ لے نکل میرے بندوں کو رات سے پھر ڈال دے ان کے لئے سمندر میں راستہ سوکھا، نہ خطرہ کر

دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ﴿٧٧﴾ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ﴿٧٨﴾

آ پکڑنے کا اور نہ ڈر ڈوبنے سے، پھر پیچھا کیا ان کا فرعون نے اپنے لشکروں کو لے کر پھر ڈھانپ لیا انکو پانی نے جیسا کہ ڈھانپ لیا ۱

وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ﴿٧٩﴾

اور بہکایا فرعون نے اپنی قوم کو اور نہ سمجھایا ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور (جب فرعون اس پر بھی ایمان نہ لایا اور ایک عرصہ تک مختلف معاملات و واقعات ہوتے رہے اس وقت) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس وحی بھیجی کہ ہمارے (ان) بندوں کو (یعنی بنی اسرائیل کو مصر سے) راتوں رات (باہر) لے جاؤ (اور دور چلے جاؤ، تاکہ فرعون کے ظلم و شدائد سے ان کو نجات ہو) پھر (راہ میں جو دریا ملے گا تو) ان کے لئے دریا میں (عصا مار کر) خشک راستہ بنا دینا (یعنی عصا مارنا کہ اس سے خشک راستہ بن جائے گا) نہ تو تم کو کسی کے تعاقب کا اندیشہ ہوگا (کیونکہ اہل تعاقب کامیاب نہ ہوں گے اگرچہ تعاقب کریں) اور نہ اور کسی قسم کا (مثلاً غرق وغیرہ کا) خوف ہوگا (بلکہ امن و اطمینان سے پار ہو جاؤ گے)۔

(چنانچہ موسیٰ علیہ السلام حکم کے موافق راتوں رات بنی اسرائیل کو نکال لے گئے اور صبح مصر میں خبر مشہور ہوئی) پس فرعون اپنے لشکروں کو لے کر ان کے پیچھے چلا (اور بنی اسرائیل وعدہ الٰہیہ کے موافق دریا سے پار ہو گئے اور ابھی تک وہ دریائی راستے اسی طرح اپنی حالت پر تھے کہ فرعونیوں نے جلدی میں کچھ آگے پیچھے سوچا نہیں، ان رستوں پر ہو لئے، جب سب اندر آ گئے) تو (اس وقت چاروں طرف سے) دریا (کا پانی سمٹ کر) ان پر جیسا ملنے کو تھا آ ملا (اور سب غرق ہو کر رہ گئے) اور فرعون نے اپنی قوم کو بری راہ پر لگایا اور نیک راہ ان کو نہ بتلائی (جس کا اس کو دعویٰ تھا: وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ کہ میں نیک راہ کے سوا تمہیں کچھ نہیں بتاتا، اور بری راہ ہونا ظاہر ہے کہ دنیا کا بھی نقصان ہوا کہ سب ہلاک ہوئے اور آخرت کا بھی، کیونکہ جہنم میں گئے، جیسا کہ آیت میں ہے: اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ)۔

* * *

**فائدہ:** لہ وہاں جب فرعونیوں نے میدان مقابلہ میں شکست کھائی، ساحرین مشرف بایمان ہو گئے، بنی اسرائیل کا پلہ بھاری ہونے لگا، اور موسیٰ علیہ السلام نے سالہا سال تک اللہ تعالیٰ کی آیات باہرہ دکھلا کر ہر طرح حجت تمام کر دی، اس پر بھی فرعون حق کو قبول کرنے اور بنی اسرائیل کو آزادی دینے پر آمادہ نہ ہوا، تب حق تعالیٰ نے حکم دیا کہ سب بنی اسرائیل کو ہمراہ لے کر رات کے وقت مصر سے ہجرت کر جاؤ تا کہ اس طرح بنی اسرائیل کی مظلومیت اور غلامی کا خاتمہ ہو، راستہ میں سمندر (بحر قلزم) حائل ہو گا لیکن تم جیسے اولوالعزم پیغمبر کے راستہ میں سمندر کی موجیں حائل نہیں ہونی چاہئیں، ان ہی کے اندر سے اپنے لیے خشک راستہ نکال لو، جس سے گزرتے ہوئے نہ غرق ہونے کا اندیشہ کرو اور نہ اس بات کا کہ شاید دشمن پیچھے سے تعاقب کرتا ہوا آ پکڑے، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے اسی ہدایت کے موافق سمندر میں لاٹھی ماری جس سے پانی پھٹ کر راستہ نکل آیا، خدا نے ہوا کو حکم دیا کہ زمین کو فوراً خشک کر دے، چنانچہ آناً فاناً سمندر کے بیچ خشک راستہ تیار ہو گیا جس کے دونوں طرف پانی کے پہاڑ کھڑے ہوئے تھے: **فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ** بنی اسرائیل اس پر سے بے تکلف گزر گئے، پیچھے سے فرعون اپنے عظیم الشان لشکر کو لیے تعاقب کرتا آ رہا تھا، خشک راستہ دیکھ کر ادھر ہی گھس پڑا، جس وقت بنی اسرائیل عبور کر گئے اور فرعونی لشکر راستہ کے بیچوں بیچ پہنچا، خدا تعالیٰ نے سمندر کو ہر طرف سے حکم دیا کہ ان سب کو اپنی آغوش میں لے لے، پھر کچھ نہ پوچھو کہ سمندر کی موجوں نے کس طرح ان سب کو ہمیشہ کے لیے ڈھانپ لیا۔

**فائدہ:** ۲ے یعنی دعوے تو زبان سے بہت کیا کرتا تھا: **وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ** لیکن اس نے اپنی قوم کو کیسا اچھا راستہ بتلایا، وہ ہی مثال سچی کر دی کہ ''ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے''، جو حال دنیا میں ہوا تھا وہ ہی آخرت میں ہوگا، یہاں سب کو لے کر سمندر میں ڈوبا تھا وہاں سب کو ساتھ لے کر جہنم میں گرے گا: **يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ**

**يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ**

اے اولاد اسرائیل چھڑا لیا ہم نے تم کو تمہارے دشمن سے اور وعدہ ٹھہرایا تم سے داہنی طرف پہاڑ کی اور اتارا تم پر

**الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۞٨٠ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ**

من اور سلویٰ، کھاؤ ستھری چیزیں جو روزی دی ہم نے تم کو اور نہ کرو اس میں زیادتی لہ پھر تو اترے گا تم پر میرا غصہ

**وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ۞٨١ وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ۞٨٢**

اور جس پر اترا میرا غصہ سو وہ پڑکا گیا ۲ے اور میری بڑی بخشش ہے اس پر جو توبہ کرے اور یقین لائے اور کرے بھلا کام پھر راہ پر رہے ۳ے

**خلاصہ تفسیر:** اس نجات کے بعد بنی اسرائیل کو اور بھی نعمتیں عطا ہوئیں، مثلاً توراۃ عطا ہوئی، من وسلوی وغیرہ دیا گیا، یہ نعمتیں عطا کر کے حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو خطاب فرمایا کہ:

اے بنی اسرائیل! (دیکھو) ہم نے (تم کو کیسی کیسی نعمتیں دیں کہ) تم کو تمہارے (ایسے بڑے) دشمن سے نجات دی اور ہم نے تم سے (یعنی تمہارے پیغمبر سے تمہارے نفع کے واسطے) کوہ طور کی داہنی جانب آنے کا (اور وہاں آنے کے بعد توراۃ دینے کا) وعدہ کیا (اور وادی تیہ میں) ہم نے تم پر من وسلوی نازل فرمایا۔

(اور اجازت دی کہ) ہم نے جو نفیس چیزیں (کہ وہ شرعاً بھی حلال ہیں اور طبعاً بھی کہ لذیذ ہیں) تم کو دی ہیں ان کو کھاؤ اور اس (کھانے) میں حد (شرعی) سے مت گزرو (مثلاً یہ کہ حرام طریقہ سے حاصل کیا جائے، یا کھا کر معصیت کی جائے) کہیں میرا غضب تم پر واقع ہو جائے اور جس شخص پر میرا غضب واقع ہوتا ہے وہ بالکل گیا گزرا ہوا، اور (نیز اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ) میں ایسے لوگوں کے لئے بڑا بخشنے والا بھی ہوں جو (کفرو

معصیت سے ) توبہ کرلیں اور ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں پھر (اسی راہ پر ) قائم ( بھی ) رہیں (یعنی ایمان وعمل صالح پر مداومت کریں، غرض یہ مضمون ہم نے بنی اسرائیل سے کہا تھا، کیونکہ نعمت کی یاد دہانی، شکر کا حکم اور معصیت کی ممانعت اور وعدہ وعید یہ خود بھی دینی نعمت ہے )۔

**وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَیْمَنَ**: اسکو داہنی جانب اس لیے فرمایا کہ وہ جانب اس طرف جانے والے کے داہنے ہاتھ پڑتی تھی، اور بعض نے ''ایمن'' کے معنی مبارک لیے ہیں، اس کی توجیہ ظاہر ہے، کیونکہ وحی کی جگہ کے مبارک ہونے میں کیا شبہ ہے، چنانچہ پہلے اسکو مقدس بھی کہا ہے۔

* * *

**فائدہ**: ۱؎ یہ حق تعالیٰ بنی اسرائیل کو نصیحت فرماتے ہیں کہ دیکھو ہم نے تم پر کیسے کیسے احسان وانعام کیے، چاہیے کہ ان کا حق ادا کرو، کیا یہ تھوڑی بات ہے کہ ایسے سخت جابر وقاہر دشمن کے ہاتھوں سے تم کو نجات دی اور اس کو کیسے عبرتناک طریقہ سے تمہاری آنکھوں کے سامنے ہلاک کیا، پھر بتوسط حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تم سے وعدہ ٹھہرا کہ مصر سے شام کو جاتے ہوئے کوہ طور کا جو مبارک ومیمون حصہ داہنے ہاتھ پڑتا ہے وہاں آؤ تم کو تورات عطا کی جائے گی، ''تیہ'' کے لق ودق میدان میں تمہارے کھانے کے لیے من وسلویٰ اتارا گیا (جس کا ذکر سورہ بقرہ میں گزر چکا ہے) ان احسانات کا حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حلال طیب لذیذ اور ستھری چیزیں عنایت فرمائیں ہیں انھیں شوق سے استعمال کرو، لیکن اس معاملہ میں حد سے نہ گزرو مثلاً ناشکری یا فضول خرچی کرنے لگو، یا اس فانی تنعم پر اترانے لگو، یا اس میں سے حقوق واجبہ ادا نہ کرو، یا اللہ کی دی ہوئی دولت معاصی میں خرچ کرنے لگو، یا جہاں اور جس وقت جوڑ کر رکھنے کی ممانعت ہے وہاں جوڑنے کے پیچھے پڑ جاؤ، غرض خدا کی نعمتوں کو طغیان وعصیان کا آلہ نہ بناؤ۔

**فائدہ**: ۲؎ یعنی زیادتی کرو گے تو اللہ کا غضب تم پر نازل ہوگا اور ذلت وعذاب کے تاریک غاروں میں پٹک دیئے جاؤ گے۔

**فائدہ**: ۳؎ غالباً مغضوبین کے بالمقابل یہ مغفورین کا بیان ہوا، یعنی کتنا ہی بڑا مجرم ہو اگر سچے دل سے تائب ہو کر ایمان وعمل صالح کا راستہ اختیار کرلے اور اسی پر موت تک مستقیم رہے تو اللہ کے یہاں بخشش اور رحمت کی کمی نہیں۔

| |
|---|
| وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۸۳﴾ قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ |
| اور کیوں جلدی کی تو نے اپنی قوم سے اے موسیٰ، بولا وہ یہ آ رہے ہیں میرے پیچھے اور میں جلدی آیا تیری طرف |
| رَبِّ لِتَرْضٰى ﴿۸۴﴾ قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿۸۵﴾ |
| اے میرے رب تا کہ تو راضی ہو ۱؎، فرمایا ہم نے تو بچلا دیا تیری قوم کو تیرے پیچھے اور بہکایا ان کو سامری نے ۲؎ |

**خلاصہ تفسیر**: اور (جب اللہ تعالیٰ کو توراۃ دینا منظور ہوا تو موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر آنے کا حکم فرمایا اور قوم میں سے بعضوں کو ساتھ آنے کا حکم ہوا، موسیٰ علیہ السلام شوق میں سب سے آگے تنہا جا پہنچے، اور دوسرے لوگ اپنی جگہ رہ گئے، طور کا ارادہ ہی نہیں کیا، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ) اے موسیٰ! آپ کو اپنی قوم سے آگے جلدی آنے کا کیا سبب ہوا؟ انہوں نے (اپنے گمان کے موافق) عرض کیا کہ وہ لوگ یہی تو ہیں میرے پیچھے پیچھے (آرہے ہیں) اور میں (سب سے پہلے) آپ کے پاس (یعنی اس جگہ جہاں مکالمہ وگفتگو کا آپ نے وعدہ فرمایا) جلدی سے اس لئے چلا آیا کہ آپ (زیادہ) خوش ہوں گے ( کیونکہ حکم کی تعمیل میں پیش قدمی کرنا زیادہ خوشنودی کا سبب ہے ) ارشاد ہوا کہ تمہاری قوم کو تو ہم نے تمہارے ( چلے آنے کے ) بعد ایک بلا میں مبتلا کر دیا اور ان کو سامری نے گمراہ کر دیا (جس کا بیان آگے آرہا ہے)۔

**وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى**: ظاہر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گفتگو طور پر پہنچتے ہی ہوئی، اور اس گفتگو سے پہلے گوسالہ کا فتنہ واقع ہو چکا تھا، پس غالب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے پہنچنے میں جو دن لگے ان دنوں میں یہ واقعہ ہو گیا، اور اگر کسی صحیح روایت سے یہ ثابت ہو جائے کہ اس سے زیادہ مدت میں یہ واقعہ ہوا تو آیت میں یہ تاویل کی جائے گی کہ اس فتنہ اور گمراہی کا سامان شروع ہو گیا، سامری نے لوگوں کی رائے بدلنا اور اس کا

منصوبہ سوچنا شروع کیا، واللہ اعلم۔

**فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ:** حق تعالیٰ نے اس فتنہ کو اپنی طرف منسوب فرمایا کہ ہم نے مبتلا کر دیا یہ تخلیق کے اعتبار سے ہے، کیونکہ تمام اچھے برے افعال کے خالق اللہ تعالیٰ ہی ہیں جس میں کوئی قباحت نہیں، ورنہ اصل نسبت اس فعل کی سامری کی طرف ہے جس کو اَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ میں ظاہر فرمایا ہے اور سامری کا گمراہ ہونا تو ظاہر ہے۔

---

**فائدہ:** ۱؎ حضرت موسیٰ علیہ السلام حسب وعدہ نہایت اشتیاق کے ساتھ کوہ طور پر پہنچے، شاید قوم کے بعض نقباء کو بھی ہمراہ لے جانے کا حکم ہوگا وہ ذرا پیچھے رہ گئے، حضرت موسیٰ شوق میں آگے بڑھے چلے گئے، حق تعالیٰ نے فرمایا موسیٰ! ایسی جلدی کیوں کی کہ قوم کو پیچھے چھوڑ آئے، عرض کیا کہ اے پروردگار! تیری خوشنودی کے لیے جلد حاضر ہو گیا، اور قوم بھی کچھ زیادہ دور نہیں یہ میرے پیچھے چلی آ رہی ہے، کذا فی التفاسیر و یحتمل غیر ذلك، و الله اعلم۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی تم تو ادھر آئے اور ہم نے تیری قوم کو ایک سخت آزمائش میں ڈال دیا، جس کا سبب عالم اسباب میں سامری بنا ہے کیونکہ اس کے اغواء و اضلال سے بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کی غیبت میں بچھڑا پوجنا شروع کر دیا تھا جس کا قصہ سورہ اعراف میں گزر چکا ہے۔

**تنبیہ:** سامری کا نام بھی بعض کہتے ہیں موسیٰ تھا، بعض کے نزدیک یہ اسرائیلی تھا، بعض کے نزدیک قبطی، بہر حال جمہور کی رائے یہ ہے کہ یہ شخص حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد کا منافق تھا، اور منافقین کی طرح فریب اور چالبازی سے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی فکر میں رہتا تھا، ابن کثیر کی روایت کے موافق کتب اسرائیلیہ میں اس کا نام ہارون ہے۔

فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۬

پھر الٹا پھرا موسیٰ اپنی قوم کے پاس غصہ میں بھرا پچتاتا ہوا، کہا اے قوم کیا تم سے وعدہ نہ کیا تھا تمہارے رب نے اچھا وعدہ

اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ﴿۸۶﴾

کیا طویل ہوگئی تم پر مدت یا چاہا تم نے کہ اترے تم پر غضب تمہارے رب کا اس لئے خلاف کیا تم نے میرا وعدہ

**خلاصہ تفسیر:** غرض موسیٰ (علیہ السلام میعاد پوری ہونے کے بعد) غصہ اور رنج میں بھرے ہوئے اپنی قوم کی طرف واپس آئے (اور) فرمانے لگے کہ اے میری قوم! کیا تم سے تمہارے رب نے ایک اچھا (اور سچا) وعدہ نہیں کیا تھا (کہ ہم تم کو ایک کتاب احکام کی دیں گے تو اس کتاب کا انتظار تو تم کو واجب تھا) کیا تم پر (مقررہ میعاد سے بہت) زیادہ زمانہ گزر گیا تھا (کہ اس کے ملنے سے ناامیدی ہوگئی، اس لئے اپنی طرف سے ایک عبادت ایجاد کر لی) یا (باوجود ناامیدی نہ ہونے کے) تم کو یہ منظور ہوا کہ تم پر تمہارے رب کا غضب واقع ہو اس لئے تم نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا (کہ آپ کی واپسی تک کوئی نیا کام نہ کریں گے اور آپ کے نائب ہارون علیہ السلام کی اطاعت کریں گے) اس کے خلاف کیا۔

---

**فائدہ:** یعنی میری اتباع میں تم کو دینی و دنیاوی ہر طرح کی بھلائی پہنچے گی، چنانچہ بہت سی عظیم الشان بھلائیاں ابھی ابھی تم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو اور جو باقی ہیں وہ بھی عنقریب ملنے والی ہیں، کیا اس وعدہ کو بہت زیادہ مدت گزر گئی تھی کہ تم پچھلے احسانات کو بھول گئے اور اگلے انعامات کا انتظار کرتے کرتے تھک گئے ہو؟ یا جان بوجھ کر تم نے مجھ سے وعدہ خلافی کی؟ اور دین توحید پر قائم نہ رہ کر خدا کا غضب مول لیا (کذا فسرہ ابن کثیر رحمہ اللہ) یا یہ مطلب لیا جائے کہ تم سے حق تعالیٰ نے تیس چالیس روز کا وعدہ کیا تھا کہ اتنی مدت موسیٰ علیہ السلام ''طور'' پر معتکف رہیں گے، تب تورات شریف ملے گی، تو کیا بہت زیادہ مدت گزر گئی کہ تم انتظار کرتے کرتے تھک گئے؟ اور گوسالہ پرستی اختیار کر لی، یا عمداً یہ حرکت کی ہے تا کہ غضب الٰہی کے

مستحق بنو، اور اَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِي سے مراد وہ وعدہ ہے جو بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کیا تھا کہ آپ ہم کو خدا کی کتاب لا دیجئے ہم اسی پر عمل کیا کریں گے، اور آپ کے اتباع پر مستقیم رہیں گے۔

قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ

بولے ہم نے خلاف نہیں کیا تیرا وعدہ اپنے اختیار سے لیکن اٹھوایا ہم نے بھاری بوجھ قوم فرعون کے زیور کا

فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ﴿٨٧﴾

سو ہم نے اس کو پھینک دیا پھر اس طرح ڈالا سامری نے

**خلاصہ تفسیر:** وہ کہنے لگے کہ ہم نے جو آپ سے وعدہ کیا تھا اس کو اپنے اختیار سے خلاف نہیں کیا (یہ مطلب نہیں کہ کسی نے ان سے زبردستی یہ فعل کرالیا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس رائے کو ہم خود اپنی طبیعت سے خالی الذہن اختیار کرتے سامری کے اس فعل سے ہم کو اس میں اشتباہ ہو گیا جس سے ہم نے وہ پہلی رائے یعنی توحید اختیار نہ کی بلکہ رائے بدل گئی اگر چہ اس پر بھی عمل اختیار ہی سے ہوا، خلاصہ یہ کہ یہ رائے ہماری ذاتی رائے نہ تھی بلکہ سامری نے ہم کو دھوکہ میں ڈال دیا، چنانچہ آئندہ کہا گیا) ولیکن قوم (قبط) کے زیور میں سے ہم پر بوجھ لد رہا تھا سو ہم نے اس کو (سامری کے کہنے سے آگ میں) ڈال دیا پھر اسی طرح سامری نے (بھی اپنے ساتھ کا زیور) ڈال دیا۔

**اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ:** زیور لینے کا قصہ پارہ ۹ سورہ اعراف آیت ۱۴۸: **واتخذ قوم موسی** میں گذر چکا ہے، اس زیور کو تصرف میں نہ لانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ مال کفار کی رضامندی کے بغیر لیا تھا، اس کا حکم شریعت موسویہ میں اب تک معلوم نہ ہوا تھا، اس لیے سامری نے جمع کرنے کی رائے دی تاکہ محفوظ رہے، پھر حکم کی تحقیق کر لیں گے، سامری منسوب ہے سامرہ کی طرف جو کہ شام میں ایک بستی کا نام ہے اور یہ شخص منافق تھا۔

* * *

**فائدہ:** یعنی ہم نے اپنے اختیار سے از خود ایسا نہیں کیا، یہ حرکت ہم سے سامری نے کرائی، صورت یہ ہوئی کہ قوم فرعون کے زیورات کا جو بوجھ ہم پر لدا ہوا تھا اور سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے کیا کریں؟ وہ ہم نے باہمی مشورہ کے بعد اپنے سے اتار پھینکا، اس کو آگ میں پگھلا کر سامری نے ڈھال لیا اور بچھڑے کی صورت بنا کر کھڑی کر دی، یہ قصہ سورہ اعراف میں گزر چکا ہے وہاں اس کے فوائد دیکھ لیے جائیں۔

**تنبیہ:** قوم فرعون کے یہ زیورات کس طرح بنی اسرائیل کے ہاتھ آئے تھے؟ یا ان سے مستعار لیے تھے، یا مال غنیمت کے طور پر ملے یا اور کوئی صورت ہوئی، اس میں مفسرین کا اختلاف ہے، کوئی صورت بھی ہو، بنی اسرائیل ان کا استعمال اپنے لیے جائز نہیں سمجھتے تھے، لیکن غضب ہے کہ اس کا بت بنا کر پوجنا جائز سمجھا۔

فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰـهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۥ

پھر بنا (کھڑا کیا) نکالا ان کے واسطے ایک بچھڑا ایک دھڑ (بدن) جسمیں آواز گائے کی پھر کہنے لگے یہ معبود ہے تمہارا اور معبود ہے موسیٰ کا

فَنَسِيَ ﴿٨٨﴾ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۙ وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴿٨٩﴾ ع

سو وہ بھول گیا۔ بھلا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ وہ جواب تک نہیں دیتا ان کو کسی بات کا، اور اختیار نہیں رکھتا ان کے برے کا اور بھلے کا۔

**خلاصہ تفسیر:** (آگے اللہ تعالیٰ قصہ کی تکمیل فرماتے ہیں) پھر اس (سامری) نے ان لوگوں کے لیے ایک بچھڑا (بنا کر) ظاہر کیا کہ وہ ایک قالب (کمالات سے خالی سانچہ) تھا جس میں ایک (بے معنی) آواز تھی، سو (اس کی نسبت وہ احمق) لوگ (ایک دوسرے سے) کہنے لگے

کہ تمہارا اور موسیٰ کا بھی معبود تو یہ ہے (اس کی عبادت کرو) موسیٰ تو بھول گئے (کوہ طور پر خدا کی طلب میں گئے ہیں، حق تعالیٰ ان کی احمقانہ جسارت پر فرماتے ہیں کہ) کیا وہ لوگ اتنا بھی نہیں دیکھتے تھے کہ وہ (بواسطہ یا بلاواسطہ) نہ تو ان کی کسی بات کا جواب دے سکتا ہے اور نہ ان کے کسی ضرر یا نفع پر قدرت رکھتا ہے (تو ایسا عاجز و ناکارہ خدا کیا ہوگا، کیونکہ حقیقی معبود تو انبیاء کے ذریعہ سے خطاب وکلام فرماتا ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی موسیٰ سے بھول ہوئی کہ خدا تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کے لیے طور پر گئے، خدا تو یہاں موجود ہے، یعنی یہ ہی بچھڑا العیاذ باللہ، شاید یہ قول ان میں سے سخت غالیوں کا ہوگا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی اندھوں کو اتنی موٹی بات بھی نہیں سوجھتی کہ جو مورتی نہ کسی سے بات کر سکے نہ کسی کو ادنیٰ ترین نفع نقصان پہنچانے کا اختیار رکھے، وہ معبود یا خدا کس طرح بن سکتی ہے۔

وَلَقَدۡ قَالَ لَهُمۡ هٰرُوۡنُ مِنۡ قَبۡلُ يٰقَوۡمِ اِنَّمَا فُتِنۡتُمۡ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحۡمٰنُ فَاتَّبِعُوۡنِىۡ

اور کہا تھا ان کو ہارون نے پہلے سے اے قوم بات یہی ہے کہ تم بہک گئے اس بچھڑے سے، اور تمہارا رب تو رحمان ہے سو میری راہ چلو

وَاَطِيۡعُوۡۤا اَمۡرِىۡ ۞۹۰ قَالُوۡا لَنۡ نَّبۡرَحَ عَلَيۡهِ عٰكِفِيۡنَ حَتّٰى يَرۡجِعَ اِلَيۡنَا مُوۡسٰى ۞۹۱

اور مانو بات میری ۱؎ بولے ہم برابر اسی پر لگے بیٹھے رہیں گے جب تک لوٹ کر آئے ہمارے پاس موسیٰ ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور ان لوگوں سے ہارون (علیہ السلام) نے (موسیٰ علیہ السلام کے لوٹنے سے) پہلے بھی کہا تھا کہ اے میری قوم! تم اس (گوسالہ) کے سبب گمراہی میں پھنس گئے ہو (یعنی اس کی پرستش کسی طرح درست نہیں ہوسکتی، یہ کھلی گمراہی ہے) اور تمہارا رب (حقیقی) رحمان ہے (نہ کہ یہ گوسالہ) سو تم (دین کے بارے میں) میری راہ پر چلو اور (اس بات میں) میرا کہنا مانو (یعنی میرے قول و فعل کی اقتدا کرو) انہوں نے جواب دیا کہ ہم تو جب تک موسیٰ (علیہ السلام) واپس (ہوکر) آئیں اسی (کی عبادت) پر برابر جمے بیٹھے رہیں گے (غرض ہارون علیہ السلام کا کہنا نہیں مانا، یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام بھی آ گئے)۔

حَتّٰى يَرۡجِعَ اِلَيۡنَا مُوۡسٰى: یہ مطلب نہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد چھوڑ دیں گے، بلکہ مقصود یہ تھا کہ دیکھیں وہ آ کر کیا کہتے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی حضرت ہارون نرمی سے زبانی فہمائش کر چکے تھے کہ جس بچھڑے پر تم مفتون ہو رہے ہو، وہ خدا نہیں ہوسکتا، تمہارا پروردگار اکیلا رحمان ہے، جس نے اب تک خیال کرو کس قدر رحمتوں کی بارش تم پر کی ہے، اسے چھوڑ کر کدھر جا رہے ہو، میں موسیٰ کا جانشین ہوں اور خود نبی ہوں اگر اپنا بھلا چاہتے ہو تو لازم ہے کہ میری راہ چلو اور میری بات مانو، سامری کے اغواء میں مت آؤ۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی موسیٰ کے واپس آنے تک تو ہم اس سے ٹلتے نہیں انکے آنے پر دیکھا جائے گا جو کچھ مناسب معلوم ہوگا کریں گے۔

قَالَ يٰهٰرُوۡنُ مَا مَنَعَكَ اِذۡ رَاَيۡتَهُمۡ ضَلُّوۡۤا ۞۹۲ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَيۡتَ اَمۡرِىۡ ۞۹۳

کہا موسیٰ نے اے ہارون کس چیز نے روکا تجھ کو جب دیکھا تھا تو نے کہ وہ بہک گئے، کہ تو میرے پیچھے نہ آیا، کیا تو نے رد کیا میرا حکم ۱؎

**خلاصہ تفسیر:** (موسیٰ علیہ السلام نے آنے کے بعد پہلے قوم سے خطاب کیا جو پیچھے گزر چکا اس کے بعد ہارون علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے اور) کہا اے ہارون! جب تم نے (ان کو) دیکھا تھا کہ یہ (بالکل) گمراہ ہو گئے (اور نصیحت بھی نہیں سنی) تو (اس وقت) تم کو میرے پاس چلے آنے سے کون امر مانع ہوا تھا (یعنی اس وقت میرے پاس چلا آنا چاہئے تھا، تاکہ ان لوگوں کو اور زیادہ یقین ہوتا کہ تم ان کے فعل کو نہایت ناپسند

کرتے ہو اور نیز ایسے باغیوں سے جس قدر قطع تعلق زیادہ ہو بہتر ہے) سو کیا تم نے میرے کہنے کے خلاف کیا (کہ میں نے کہا تھا: وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ کہ مفسدوں کا طریقہ اختیار نہ کرنا، جس کے عموم میں یہ بھی داخل ہے کہ مفسدین سے الگ ہو جائیں، کیونکہ ان کے ساتھ رہنا یہ بھی ایک طرح ان کی موافقت تھی)۔

**مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا**: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اشرار کی اصلاح اور تعلیم و تربیت سے مایوسی ہو جائے تو ان سے علیحدگی کر لینی چاہیے، اور ہارون علیہ السلام کا علیحدگی اختیار نہ کرنا اجتہاد کے سبب تھا جیسا کہ انہوں نے اگلی آیت انی خشیت میں خود بیان فرمایا۔

**اَلَّا تَتَّبِعَنِ ۭ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ**: اس جگہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد کہ تمہیں میرا اتباع کرنے سے کس چیز نے روکا؟ اس اتباع کا ایک مفہوم تو وہی ہے جو خلاصہ تفسیر میں اختیار کیا گیا کہ اتباع سے مراد موسیٰ علیہ السلام کے پاس طور پر چلا جانا ہے اور بعض مفسرین نے اتباع کی مراد یہ قرار دی کہ جب یہ لوگ گمراہ ہو گئے تو آپ نے ان کا مقابلہ کیوں نہ کیا، کیونکہ میری موجودگی میں ایسا ہوتا تو میں یقیناً اس شرک و کفر پر قائم رہنے والوں سے جہاد اور مقاتلہ کرتا تم نے ایسا کیوں نہ کیا؟ دونوں صورتوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے ہارون علیہ السلام پر الزام یہ تھا کہ ایسی گمراہی کی صورت میں یا تو ان سے مقاتلہ اور جہاد کیا جاتا یا پھر ان سے برات اور علیحدگی اختیار کر کے میرے پاس آ جاتے، ان کے ساتھ رہتے بستے رہنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نزدیک ان کی خطا اور غلطی تھی۔

* * *

**فائدہ**: ۱؎ یعنی تم کو اپنا خلیفہ بنا کر اور حکم کر کے گیا تھا کہ میری غیبت میں ان کی اصلاح کرنا اور مفسدین کے راستہ پر نہ چلنا، پھر تم نے کیا اصلاح کی؟ کیوں اپنے موافقین کو ساتھ لے کر ان گوسالہ پرستوں کا سختی سے مقابلہ نہ کیا؟ اگر یہ نہ ہو سکتا تھا تو ان سے منقطع ہو کر میرے پاس کیوں نہیں چلے آئے؟ غرض تم نے ایسی صریح گمراہی کو دیکھ کر میرے طریق کار کی پیروی کیوں نہیں کی؟

قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ

وہ بولا اے میری ماں کے جنے نہ پکڑ میری داڑھی اور نہ سر ۱؎ میں ڈرا کہ تو کہے گا پھوٹ ڈال دی تو نے

بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ﴿۹۴﴾

بنی اسرائیل میں اور یاد نہ رکھی میری بات ۲؎

**خلاصہ تفسیر**: ہارون (علیہ السلام) نے کہا کہ اے میرے ماں جائے (یعنی میرے بھائی) تم میری داڑھی مت پکڑو اور نہ سر (کے بال) پکڑو (اور میرا عذر سن لو، میرے تمہارے پاس نہ آنے کی یہ وجہ تھی کہ) مجھ کو یہ اندیشہ ہو گیا کہ (اگر میں آپ کی طرف چلا تو میرے ساتھ وہ لوگ بھی چلیں گے جنہوں نے گوسالہ کی عبادت نہیں، تو اس صورت میں بنی اسرائیل کی جماعت کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے، کیونکہ گوسالہ کی پرستش کو برا سمجھنے والے میرے ساتھ ہوں گے اور دوسرے لوگ اس کی عبادت پر ہی جمے رہیں گے اور اس حالت میں) تم کہنے لگو کہ تم نے بنی اسرائیل کے درمیان تفریق ڈال دی (جو بعض اوقات ایک جگہ رہنے سے زیادہ مضر ہوتی ہے، کیونکہ مفسد لوگ میدان خالی پا کر بے خوف و خطر فساد میں ترقی کرتے ہیں) اور تم نے میری بات کا پاس نہ کیا (کہ میں نے کہا تھا اَصْلِحْ، یعنی اس صورت میں آپ مجھے یہ الزام دیتے کہ میں نے تمہیں اصلاح کرنے کا حکم دیا تھا اور تم نے بنی اسرائیل میں تفریق ڈال کر فساد کھڑا کر دیا)۔

**قَالَ يَبْنَؤُمَّ**: حضرت ہارون علیہ السلام نے اس معاملے کے باوجود ادب کی پوری رعایت کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کو نرم کرنے کے لئے خطاب يَبْنَؤُمَّ کے الفاظ سے کیا، یعنی میری ماں کے بیٹے، اس خطاب میں ایک خاص اشارہ سختی کا معاملہ نہ کرنے کی طرف تھا کہ میں آپ کا بھائی ہی تو

ہوں کوئی مخالف تونہیں، اس لئے آپ میرا اعذر سنیں، پھرعذر یہ بیان کیا کہ مجھے خطرہ یہ پیدا ہوگیا کہ اگر میں نے ان لوگوں سے مقابلہ اور مقاتلہ کرنے پر آپ کے آنے سے پہلے اقدام کیا یا ان کو چھوڑ کر خود بارہ ہزار بنی اسرائیل کے ساتھ آپ کے پاس چلا گیا، تو بنی اسرائیل میں تفرقہ پیدا ہوجائے گا اور آپ نے جو چلتے وقت مجھے یہ ہدایت فرمائی کہ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ میں اس اصلاح کا مقتضا یہ سمجھا تھا کہ ان میں تفرقہ نہ پیدا ہونے دوں (ممکن ہے کہ آپ کے واپس آنے کے بعد یہ سب ہی سمجھ جائیں اور ایمان وتوحید پر واپس آجائیں) اور دوسری جگہ قرآن کریم میں ہارون علیہ السلام کے عذر میں یہ قول بھی ہے کہ: اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ یعنی قوم بنی اسرائیل نے مجھے ضعیف و کمزور سمجھا، کیونکہ میرے ساتھی دوسروں کے مقابلہ میں بہت کم تھے اس لئے قریب تھا کہ وہ مجھے قتل کر ڈالتے، خلاصہ عذر کا یہ ہے کہ میں ان کی گمراہی کا ساتھی نہیں تھا، جتنا سمجھانا اور ہدایت پر رکھنا میرے بس میں تھا وہ میں نے پورا کیا، ان لوگوں نے میری بات نہ مانی اور میرے قتل کرنے کے درپے ہوگئے، ایسی صورت میں ان سے مقاتلہ کرتا یا ان کو چھوڑ کر آپ کے پاس جانے کا ارادہ کرتا تو صرف یہ بارہ ہزار بنی اسرائیل میرے ساتھ ہوتے باقی سب مقاتلہ اور مقابلہ پر آجاتے اور باہمی معرکہ گرم ہوجاتا، میں نے اس سے بچنے کے لئے آپ کی واپسی تک کے لئے کچھ مساہلت کی صورت اختیار کی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ عذر سنا تو ہارون علیہ السلام کو چھوڑ دیا اور اصل بانی فساد سامری کی خبر لی، قرآن میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کی رائے کو صحیح مان لیا یا محض ان کی خطاء اجتہادی سمجھ کر چھوڑ دیا۔

اس واقعہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رائے از روئے اجتہاد یہ تھی کہ اس حالت میں ہارون علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو اس مشرک قوم کے ساتھ نہیں رہنا چاہیئے تھا ان کو چھوڑ کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آجاتے جس سے ان کے عمل سے مکمل بیزاری کا اظہار ہوجاتا، حضرت ہارون علیہ السلام کی رائے از روئے اجتہاد یہ تھی کہ اگر ایسا کیا گیا تو ہمیشہ کے لئے بنی اسرائیل کے ٹکڑے ہوجائیں گے اور تفرقہ قائم ہوجائے گا اور چونکہ ان کی اصلاح کا یہ احتمال موجود تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی واپسی کے بعد ان کے اثر سے پھر یہ سب ایمان اور توحید کی طرف لوٹ آئیں اس لئے کچھ دنوں کے لئے ان کے ساتھ مساہلت اور مساکنت (ساتھ رہنے) کو ان کی اصلاح کی توقع تک گوارا کیا جائے، دونوں کا مقصد اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل، ایمان وتوحید پر لوگوں کو قائم کرنا تھا، مگر ایک نے مفارقت اور مقاطعہ کو اس کی تدبیر سمجھا، دوسرے نے اصلاح حال کی امید تک ان کے ساتھ مساہلت اور نرمی کے معاملہ کو اس مقصد کے لئے نافع سمجھا، دونوں جانبین اہل عقل وفہم اور فکر ونظر کے لئے محل غور وفکر ہیں، کسی کو خطا کہنا آسان نہیں، مجتہدین امت کے اجتہادی اختلافات عموماً اسی طرح کے ہوتے ہیں، ان میں کسی کو گناہگار یا نافرمان نہیں کہا جاسکتا۔

* * *

**فائدہ:** ۱۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرطِ جوش میں ہارون علیہ السلام کی داڑھی اور سر کے بال پکڑ لیے تھے، اس کی مفصل بحث سورہ اعراف [آیت ۱۵۰] کے فوائد میں گزر چکی۔

**فائدہ:** ۲۔ یعنی میری سمجھ میں یہ ہی آیا کہ تمہارے آنے کا انتظار کرنا اس سے بہتر ہے کہ تمہارے پیچھے کوئی ایسا کام کروں جس سے بنی اسرائیل میں پھوٹ پڑ جائے، کیونکہ ظاہر ہے اگر مقابلہ یا انقطاع ہوتا تو کچھ لوگ میرے ساتھ ہوتے اور بہت سے مخالف رہتے، مجھے ڈر ہوا کہ تم آکر یہ الزام نہ دو کہ میرا انتظار کیوں نہ کیا؟ اور قوم میں ایسا تفرقہ کیوں ڈال دیا۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''چلتے وقت موسیٰ ہارون کو نصیحت کر گئے تھے کہ سب کو متفق رکھیو، اس لیے انہوں نے بچھڑا پوجنے والوں کا مقابلہ نہ کیا، زبان سے البتہ سمجھایا وہ نہ سمجھے بلکہ ان کے قتل پر تیار ہونے لگے وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ''

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿۹۵﴾ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً

کہا موسیٰ نے اب تیری کیا حقیقت ہے اے سامری ۱۔ بولا میں نے دیکھ لیا جو اوروں نے نہ دیکھا پھر بھر لی میں نے ایک مٹھی

مِنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَ كَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿٩٦﴾

پاؤں کے نیچے سے اس بھیجے ہوئے کے پھر میں نے وہی ڈال دی اور یہی صلاح دی مجھ کو میرے جی نے ؎

**خلاصه تفسیر**: (پھر موسیٰ علیہ السلام سامری کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے) کہا کہ اے سامری! تیرا کیا معاملہ ہے؟ (یعنی تو نے یہ حرکت کیوں کی؟) اس نے کہا کہ مجھ کو ایسی چیز نظر آئی تھی جو اوروں کو نظر نہ آئی تھی (یعنی جبرئیل علیہ السلام گھوڑے پر چڑھے ہوئے جس روز دریا سے پار اترے ہیں جو ایمان والوں کی مدد اور کفار کو ہلاک کرنے کی وجہ سے آئے ہوں گے اور تاریخ طبری میں منقول ہے کہ حضرت جبرئیل موسیٰ علیہ السلام کے پاس گھوڑے پر سوار یہ حکم لے کر آئے تھے کہ آپ طور پر جائیں تو اس وقت سامری نے دیکھا تھا) پھر میں نے اس فرستادہ (خداوندی کی سواری) کے نقش قدم سے ایک مٹھی (بھر کر خاک) اٹھالی تھی (اور خود بخود میرے دل میں یہ بات آئی کہ اس میں زندگی کے اثرات ہوں گے، جس چیز پر ڈالی جائے گی اس میں زندگی پیدا ہو جائے گی) سو میں نے وہ مٹھی (خاک اس بچھڑے کے قالب کے اندر) ڈال دی اور میرے جی کو یہی بات (بھائی اور) پسند آئی۔

**بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ**: (یعنی وہ چیز دیکھی جو دوسروں نے نہیں دیکھی) اس سے مراد جبرئیل امین ہیں اور ان کے دیکھنے کے واقعہ میں ایک روایت تو یہ ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعجاز سے دریائے قلزم میں خشک راستے بن گئے اور بنی اسرائیل ان راستوں سے گزر گئے اور فرعونی لشکر دریا میں داخل ہو رہا تھا تو جبرئیل امین گھوڑے پر سوار یہاں موجود تھے، دوسری روایت یہ ہے کہ دریا سے پار ہونے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر آنے کی دعوت دینے کے لئے جبرئیل امین گھوڑے پر سوار تشریف لائے تھے، ان کو سامری نے دیکھ لیا دوسرے لوگوں کو معلوم نہ ہو سکا، اس کی وجہ حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت میں یہ ہے کہ سامری کی پرورش خود جبرئیل امین کے ذریعہ ہوئی تھی، جس وقت اس کی ماں نے اس کو غار میں ڈال دیا تھا تو جبرئیل امین روزانہ اس کو غذا دینے کے لئے آتے تھے، اس کی وجہ سے وہ جبرئیل علیہ السلام کو اس صورت سے مانوس تھا اور پہچانتا تھا دوسرے لوگ نہیں پہچان سکے۔

**بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ**: اس میں کشف و تصرف پر ناز کرنے کی نفی ہے اور یہ دونوں (کشف و تصرف) اہل حق کے ساتھ خاص نہیں ہیں (یعنی پوشیدہ اشیاء کا ظاہر ہو جانا اور عجیب و غریب تصرف کرنا اولیاء اللہ ہی کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ بعض اوقات فاسق و فاجر حتیٰ کہ کفار کو بھی یہ صورت پیش آسکتی ہے اس لیے اس سے متاثر نہیں ہونا چاہیے)۔

**فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ**: رسول سے مراد اس جگہ فرستادہ خداوندی حضرت جبرئیل ہیں، سامری کے دل میں شیطان نے یہ بات ڈالی کہ جبرئیل امین کے گھوڑے کا قدم جس جگہ پڑتا ہے وہاں کی مٹی میں حیات و زندگی کے خاص اثرات ہوں گے یہ مٹی اٹھالی جائے، اس نے نشان قدم کی مٹی اٹھالی، یہ بات حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے: "القی فی روعه انه لا یلقیها علی شیئ فیقول کن کذا إلا کان"، یعنی سامری کے دل میں خود بخود یہ بات پیدا ہوئی کہ نشان قدم کی اس مٹی کو جس چیز پر ڈال کر یہ کہا جائے گا کہ فلاں چیز بن جا تو وہ وہی چیز بن جائے گی اور بعض حضرات نے فرمایا کہ سامری نے گھوڑے کے نشان قدم کا یہ اثر مشاہدہ کیا کہ جس جگہ قدم پڑتا وہیں سبزہ فوراً نمودار ہو جاتا تھا، جس سے یہ استدلال کیا کہ اس مٹی میں آثار حیات ہیں، اسی تفسیر کو روح المعانی میں صحابہ و تابعین اور جمہور مفسرین سے منقول کہا ہے اور اس میں آج کل ظاہر پرست لوگوں نے جو شبہات نکالے ہیں ان سب کا جواب دیا ہے، فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔

یہاں یہ شبہ نہ ہو کہ خلاف عادت امور تو نبوت کی دلیل ہوتے ہیں تو جھوٹے کے ہاتھ پر اس کا ظہور کیسے ہو گیا؟ جواب یہ ہے کہ خارق عادت ہمیشہ نبوت کی دلیل نہیں، بلکہ جب مدعی رسالت کے ہاتھ پر اس کا ظہور ہو اس وقت رسالت کی دلیل ہے، پس اگر وہ رسالت کا دعویٰ کرتا تو عادت الٰہی کے موافق اس کے ہاتھ پر اس خارق کا ظہور نہ ہوتا، مگر اس نے ایسا دعویٰ کیا جو عقلاً بھی غلط تھا، یعنی گوسالہ کا خدا ہونا، اس صورت میں تو کسی عاقل کے شبہ

میں پڑنے کا احتمال ہی نہیں، لہذا اخلاف عادت کام کا اس سے ظاہر ہو جانا محال ہے، اور امام جعفر صادقؒ سے منقول ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کے قتل کا ارادہ کیا تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے سخی ہونے کے سبب قتل سے منع فرما دیا۔

***

**فائدہ:** لہ ادھر سے فارغ ہو کر موسیٰ علیہ السلام نے سامری کو ڈانٹ پلائی اور فرمایا کہ اب تو اپنی حقیقت بیان کر، یہ حرکت تو نے کس وجہ سے کی؟ اور کیا اسباب پیش آئے کہ بنی اسرائیل تیری طرف جھک پڑے؟۔

**فائدہ:** ٢ہ سامری نے کہا کہ مجھ کو ایک ایسی چیز نظر پڑی جو اوروں نے نہیں دیکھی تھی، یعنی خدا کے بھیجے ہوئے فرشتہ (جبرائیل) کو گھوڑے پر سوار دیکھا، شاید یہ اس وقت ہوا ہو جب بنی اسرائیل دریا میں گھسے اور پیچھے پیچھے فرعون کا لشکر گھسا اس حالت میں جبرائیل دونوں جماعتوں کے درمیان میں کھڑے ہو گئے تا کہ ایک کو دوسرے سے ملنے نہ دیں، بہرحال سامری نے کسی محسوس دلیل سے یا وجدان سے یا کسی قسم کے تعارف سابق کی بناء پر سمجھ لیا کہ یہ جبرائیل ہیں ان کے پاؤں یا ان کے گھوڑے کے پاؤں کے نیچے سے مٹھی بھر مٹی اٹھالی، وہ ہی اب سونے کے بچھڑے میں ڈال دی، کیونکہ اس کے جی میں یہ بات آئی کہ روح القدس کی خاک پا میں یقیناً کوئی خاص تاثیر ہوگی۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: "سونا تھا کافروں کا مال لیا ہوا فریب سے، اس میں مٹی پڑی برکت کی، حق اور باطل مل کر ایک کرشمہ بن گیا کہ جاندار کی طرح کی روح اور آواز اس میں ہوگئی"، ایسی چیزوں سے بہت بچنا چاہیے، اسی سے بت پرستی بڑھتی ہے۔

**تنبیہ:** آیت کی جو تفسیر اوپر بیان ہوئی، صحابہ و تابعین اور علمائے مفسرین سے یہ ہی منقول ہے، بعض زائغین نے اس پر جو طعن کیے ہیں اور آیت کی دور از صواب تاویلیں کی ہیں، ان کا کافی جواب صاحب روح المعانی نے دیا ہے، یہاں اس قدر بسط کا موقع نہیں من شآء فلیراجعہ۔

قَالَ فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۠ وَإِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ

کہا موسیٰ نے دور ہو تیرے لئے زندگی بھر تو اتنی سزا ہے کہ کہا کرے مت چھیڑو (ہاتھ نہ لگانا) لہ اور تیرے واسطے ایک وعدہ ہے وہ ہرگز

تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۭ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ﴿٩٧﴾

تجھ سے خلاف نہ ہوگا ٢ہ اور دیکھ اپنے معبود کو جس پر تمام دن تو معتکف رہتا تھا، ہم اس کو جلا دیں گے پھر بکھیر دیں گے دریا میں اڑا کر ٣ہ

اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿٩٨﴾

تمہارا معبود تو وہی اللہ ہے جس کے سوا کسی کی بندگی نہیں، سب چیز سما گئی ہے اس کے علم میں ٤ہ

**خلاصہ تفسیر:** آپ نے فرمایا تو بس تیرے لئے اس (دنیوی) زندگی میں یہ سزا (تجویز کی گئی) ہے کہ تو یہ کہتا پھرے گا کہ مجھ کو کوئی ہاتھ نہ لگانا، اور تیرے لئے (اس سزا کے علاوہ) ایک اور وعدہ (حق تعالیٰ کے عذاب کا) ہے جو تجھ سے ٹلنے والا نہیں (یعنی آخرت میں الگ عذاب ہوگا) اور تو اپنے اس معبود (باطل) کو دیکھ جس (کی عبادت) پر تو جما ہوا بیٹھا تھا (دیکھ) ہم اس کو جلا دیں گے، پھر اس (کی راکھ) کو دریا میں بکھیر کر بہا دیں گے (تا کہ اس کا نام و نشان نہ رہے) بس تمہارا (حقیقی) معبود تو صرف اللہ ہے جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ (اپنے) علم سے تمام چیزوں کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔

اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کے لئے دنیا کی زندگی میں یہ سزا تجویز کی کہ سب لوگ اس سے قطع تعلق کریں، کوئی اس کے پاس نہ جائے اور اس کو بھی یہ حکم دیا کہ کسی کو ہاتھ نہ لگائے اور زندگی بھر اسی طرح وحشی جانوروں کی طرح سب سے الگ رہے، یہ سزا ہو سکتا ہے کہ ایک قانون کی صورت میں ہو جس کی پابندی اس پر اور دوسرے سب بنی اسرائیل پر منجانب موسیٰ علیہ السلام لازم کر دی گئی ہو اور یہ بھی ممکن

ہے کہ قانونی حیثیت کی سزا سے آگے خود اس کی ذات میں بقدرت خداوندی کوئی ایسی بات پیدا کر دی گئی ہو کہ نہ وہ دوسروں کو چھو سکے نہ کوئی دوسرا اس کو چھو سکے، جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی بد دعا سے اس میں یہ کیفیت پیدا ہو گئی تھی کہ اگر یہ کسی کو ہاتھ لگا دے یا کوئی اس کو ہاتھ لگا دے تو دونوں کو بخار چڑھ جاتا تھا، اس ڈر کے مارے وہ سب سے الگ بھاگا پھرتا تھا اور جب کسی کو قریب آتا دیکھتا تو دور سے پکارتا تھا **لامساس** یعنی کوئی مجھے نہ چھوئے اور دوسرے اس سے بچتے تھے۔

**لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ:** یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بچھڑا سونے چاندی کے زیورات سے گھڑا ہوا تھا تو اس کے آگ میں جلانے کی کیا صورت ہوگی؟ سونا چاندی پگھلنے والی چیز ہے جلنے والی نہیں، جواب یہ ہے کہ اول تو خود اس میں اختلاف ہے کہ بچھڑے میں آثار حیات پیدا ہونے کے بعد بھی وہ چاندی سونے ہی کا رہا یا اس کی حقیقت تبدیل ہو کر گوشت اور خون بن گیا، اگر وہ گوشت اور لحم و دم بن گیا تھا تو ظاہر ہے کہ اس کو جلانے کا مطلب یہ ہوگا کہ پہلے ذبح کر کے پھر جلا دیا جائے گا، اور اگر دوسرا قول لیا جائے تو اس کے جلانے کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کو سوہان سے ریت کر ذرہ ذرہ کر دیا جائے گا، یا کسی کیمیاوی ترکیب سے جلا دیا جائے گا، اور یہ بھی کوئی بعید بات نہیں کہ یہ جلانا بطور خرق عادت و معجزہ ہو، واللہ اعلم۔

یہاں ایک شبہ ہے وہ یہ کہ بنی اسرائیل نے قبطیوں سے جو زیور لیا تھا اگر وہ اس کے مالک نہ تھے تو واپس کیوں نہ کیا؟ اور اگر مالک ہو گئے تھے تو یہ احادیث کے خلاف ہے، کیونکہ احادیث غنیمت کا حلال ہونا امت محمدیہ کی خصوصیات سے معلوم ہوتا ہے، پہلی امتوں کے لیے مال غنیمت حلال نہ تھا، جواب یہ ہے کہ وہ لوگ فرعونیوں کے غرق ہونے کے بعد یا پہلے ہی اس کے مالک ہو گئے تھے، اور غنیمت کا حلال ہونا جو امت محمدیہ کے لیے خاص ہے اس سے شاید وہ غنیمت مراد ہے جو لڑائی کے وقت حاصل ہو، اور جو غنیمت بغیر لڑائی کے حاصل ہو وہ غالباً سب امتوں کے لیے حلال تھی، اور یہی جواب ہے اس کا کہ بنی اسرائیل قبطیوں کے باغات و املاک کے کیونکر مالک ہو گئے تھے جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: **واورثناها بنی اسرائیل**، رہا یہ شبہ کہ جب بنی اسرائیل مالک تھے تو جب موسیٰ علیہ السلام نے اس چاندی سونے کے گوسالہ کو ضائع کیا ان کے ذمہ ضمان کیوں نہ واجب ہوا؟ جواب یہ ہے کہ جو چیز گناہ کا ذریعہ ہو اس کے تلف کرنے سے امام پر ضمان نہیں ہوتا۔

* * *

**فائدہ: ۱۔ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ:** یعنی مجھے ہاتھ مت لگاؤ مجھ سے علیحدہ رہو، چونکہ اس نے بچھڑا کا ڈھونگ بنایا تھا حُبِ جاہ و ریاست سے کہ لوگ اس کے ساتھ ہوں اور سردار مانیں اس کے مناسب سزا ملی کہ کوئی پاس نہ پھٹکے، جو قریب جائے وہ خود دور رہنے کی ہدایت کر دے، اور دنیا میں بالکل ایک ذلیل، اچھوت اور وحشی جانور کی طرح زندگی گزارے۔

**فائدہ: ۲۔ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ:** حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ”دنیا میں اس کو یہ ہی سزا ملی کہ لشکر بنی اسرائیل سے باہر الگ رہتا، اگر وہ کسی سے ملتا یا کوئی اس سے تو دونوں کو تپ چڑھتی، اسی لیے لوگوں کو دور دور کرتا، اور یہ جو فرمایا کہ ایک وعدہ ہے جو خلاف نہ ہوگا، شاید مراد عذاب آخرت ہے اور شاید دجال کا نکلنا، وہ بھی یہود میں سامری کے فساد کی تکمیل کرے گا، جیسے ہمارے پیغمبر مال بانٹتے ہیں، ایک شخص نے کہا انصاف سے بانٹو، فرمایا ”اس کی جنس کے لوگ نکلیں گے“ وہ خارجی نکلے کہ اپنے پیشواؤں پر لگے اعتراض پکڑنے، جو کوئی دین کے پیشواؤں پر طعن کرے ایسا ہی ہے“۔

**فائدہ: ۳۔ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا:** یعنی تیری سزا تو یہ ہوئی، اب تیرے جھوٹے معبود کی قلعی بھی کھولے دیتا ہوں، جس بچھڑے کو تو نے خدا بنایا اور دن بھر وہاں دل جمائے بیٹھا رہتا تھا ابھی تیری آنکھوں کے سامنے توڑ پھوڑ کر اور جلا کر راکھ کر دوں گا، پھر راکھ کو دریا میں بہا دوں گا، تاکہ اسکے پجاریوں کو خوب واضح ہو جائے کہ وہ دوسروں کو تو کیا نفع نقصان پہنچا سکتا، خود اپنے وجود کی بھی حفاظت نہیں کر سکتا۔

**فائدہ: ۴۔ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا:** باطل کو مٹانے کے ساتھ ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کو حق کی طرف بلاتے جاتے ہیں یعنی بچھڑا تو کیا چیز ہے کوئی بڑی سے بڑی چیز بھی معبود نہیں بن سکتی، سچا معبود تو وہ ہی ایک ہے جس کے سوا کسی کی بندگی عقلاً و نقلاً و فطرۃً روا نہیں اور جس کا لامحدود علم ذرہ ذرہ کو محیط ہے۔

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ﴿٩٩﴾ مَنْ اَعْرَضَ

یوں سناتے ہیں ہم تجھ کو ان کے احوال جو پہلے گزر چکے ۱؎ اور ہم نے دی تجھ کو اپنے پاس سے پڑھنے کی (کو) کتاب ۲؎ جو کوئی منہ پھیر لے

عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ﴿١٠٠﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ۭ وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ﴿١٠١﴾

اس سے سو وہ اٹھائے گا دن قیامت کے ایک بوجھ، سدا رہیں گے اس میں، اور برا ہے ان پر قیامت میں وہ بوجھ اٹھانے کا ۳؎

**خلاصہ تفسیر**: سورۃ طٰہٰ میں اصل بیان توحید، رسالت اور آخرت کے اصولی مسائل کا ہے، انبیاء علیہم السلام کے واقعات اسی سلسلہ میں بیان ہوئے اور موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بڑی تفصیل سے ذکر ہوا ہے اور اس کے ضمن میں رسالت محمدیہ کا اثبات بھی ہے، آگے اجمالاً دوسرے قصوں سے اور قرآن کے نازل کرنے سے بھی رسالت کو ثابت کیا جاتا ہے کہ ان واقعات کا اظہار ایک نبی امی کی زبان سے رسالت اور وحی کی دلیل ہے اور ان سب کا سرچشمہ قرآن ہے، اور قرآن کی حقانیت کے ضمن میں کچھ قیامت کی بھی تفصیل ہے۔

(جس طرح ہم نے موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بیان کیا) اسی طرح ہم آپ سے اور واقعات گزشتہ کی خبریں (اور حکایتیں) بھی بیان کرتے رہتے ہیں (تاکہ نبوت کے دلائل زیادہ ہوتے چلے جائیں) اور ہم نے آپ کو اپنے پاس سے ایک نصیحت نامہ دیا ہے (یعنی قرآن جس میں وہ خبریں مذکور ہیں اور وہ خود بھی اپنے اعجاز کی وجہ سے نبوت کی مستقل دلیل ہے، اور وہ نصیحت نامہ ایسا ہے کہ) جو لوگ اس (کے مضامین ماننے) سے روگردانی کریں گے سو وہ قیامت کے روز بڑا بھاری بوجھ (عذاب کا) لادے ہوں گے (اور) وہ اس (عذاب) میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بوجھ قیامت کے روز ان کے لئے بڑا (بوجھ) ہوگا۔

* * *

**فائدہ**: ۱؎ یعنی موسیٰ و فرعون کی طرح اور بہت سی گذشتہ اقوام کے واقعات ہم تجھ کو اور تیرے ذریعہ سے تمام دنیا کو سناتے رہتے ہیں جس میں بہت سے فوائد ہیں مثلاً علم کی توقیر، معجزات کی تکثیر، پیغمبر اور مسلمانوں کی تسلی، عقلمندوں کے لیے عبرت و تذکیر اور معاندین کے حق میں تہدید و ترہیب کا سامان ہوتا ہے۔

**فائدہ**: ۲؎ یعنی قرآن کریم جو ان عبرت آموز واقعات و حقائق پر مشتمل ہے۔

**فائدہ**: ۳؎ یعنی اعراض و تکذیب سے جو گناہوں کا بوجھ قیامت کے دن ان پر لادا جائے گا، کبھی ہلکا نہ ہوگا، ہمیشہ اس کے نیچے دبے رہیں گے پھر اس کا اٹھانا کوئی ہنسی کھیل نہیں جب اٹھائیں گے تو پتہ چلے گا کہ کیسے برے اور سخت بوجھ کے نیچے دبائے گئے ہیں۔

يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ زُرْقًا ﴿١٠٢﴾ يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ

جس دن پھونکیں گے صور میں اور گھیر لائیں گے ہم گناہ گاروں کو اس دن نیلی آنکھیں ۱؎ چپکے چپکے کہتے ہوں گے آپس میں تم نہیں رہے

اِلَّا عَشْرًا ﴿١٠٣﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ﴿١٠٤﴾

مگر دس دن ۲؎ ہم کو خوب معلوم ہے جو کچھ کہتے ہیں ۳؎ جب بولے گا ان میں اچھی راہ روش والا تم نہیں رہے مگر ایک دن ۴؎

**خلاصہ تفسیر**: جس روز صور میں پھونک ماری جائے گی (جس سے مردے زندہ ہوجائیں گے) اور ہم اس روز مجرم (یعنی کافر) لوگوں کو (میدان قیامت میں) اس حالت سے جمع کریں گے کہ (نہایت بدصورت ہوں گے کہ آنکھوں سے) کرنجے ہوں گے (جو آنکھوں کا بدترین

رنگ شمار ہوتا ہے، اور خوفزدہ اس قدر ہوں گے کہ) چپکے چپکے آپس میں باتیں کرتے ہوں گے (اور ایک دوسرے سے کہتے ہوں گے) کہ تم لوگ (قبروں میں) صرف دس روز رہے ہوگے (حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ) جس (مدت) کی نسبت وہ بات چیت کریں گے اس کو ہم خوب جانتے ہیں (کہ وہ کس قدر رہے) جبکہ ان سب میں کا زیادہ صائب الرائے یوں کہتا ہوگا کہ نہیں تم تو ایک ہی روز (قبر میں) رہے ہو۔

**اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا:** مطلب یہ کہ ہم تو یوں سمجھے تھے کہ مر کر پھر زندہ نہ ہوں گے، یہ گمان تو بالکل غلط نکلا، نہ زندہ ہونا تو درکنار یہ بھی تو نہ ہوا کہ دیر ہی میں زندہ ہوتے، بلکہ بہت ہی جلدی زندہ ہوگئے کہ وہ مدت دس روز کے برابر معلوم ہوتی ہے، اور دس روز کے برابر مدت معلوم ہونے کی یہ ہے کہ قیامت کے دن کی درازی، ہولناکی اور پریشانی کے سامنے قبر میں رہنے کی مدت بہت کم معلوم ہوگی۔

**اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً:** اسے صائب الرائے اس لئے فرمایا کہ اس دن کی درازی اور ہول کے اعتبار سے یہی نسبت زیادہ قریب ہے، پس اس شخص کو اس دن کی شدت کا زیادہ احساس ہوا، یہ مقصود نہیں کہ قبر میں رہنے کی مدت اس نے صحیح بیان کی، کیونکہ ظاہر ہے کہ واقع میں دونوں مقداریں صحیح نہیں اور نہ ان کا یہ مقصود تھا۔

* * *

**فائدہ:** [1] شرک یعنی محشر میں لائے جانے کے وقت اندھے ہوں گے، یا شاید یوں ہی آنکھیں نیلی ہوں بدنمائی کے واسطے، بہر حال اگر پہلے معنی لیے جائیں تو یہ ایک خاص وقت کا ذکر ہے، پھر آنکھیں کھول دی جائیں گی تا کہ دوزخ وغیرہ کو دیکھ سکیں: وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا - اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ

**فائدہ:** [2] یعنی آخرت کا طول اور وہاں کے ہولناک احوال کی شدت کو دیکھ کر دنیا میں یا قبر میں رہنا اتنا کم نظر آئے گا کہ گویا ہفتہ عشرہ سے زیادہ نہیں رہے، بڑی جلدی دنیا ختم ہوگئی، یہاں کے مزے اور لمبی چوڑی امیدیں سب بھول جائیں گے، بیہودہ عمر ضائع کرنے پر ندامت ہوگی، یا شاید معذرت کے طور پر ایسا کہیں گے، یعنی دنیا میں بہت ہی کم ٹھہرنا ہوا، موقع نہ ملا کہ آخرت کے لیے کچھ سامان کرے جیسے دوسری جگہ فرمایا: وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ

**فائدہ:** [3] یعنی چپکے کہنا ہم سے نہیں چھپتا، وہ آپس میں جو سرگوشیاں کریں گے ہم کو خوب معلوم ہیں۔

**فائدہ:** [4] یعنی جوان میں زیادہ عقلمند، صاحب الرائے اور ہوشیار ہوگا وہ کہے گا کہ یہاں دس دن بھی کہاں؟ صرف ایک ہی دن سمجھو، اس کو زیادہ عقلمند اور اچھی راہ روش والا اس لیے فرمایا کہ دنیا کے زوال وفنا اور آخرت کی بقاء ودوام اور شدتِ ہول کو اس نے دوسروں سے زیادہ سمجھا۔

| |
|---|
| وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ﴿۱۰۵﴾ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿۱۰۶﴾ |
| اور تجھ سے پوچھتے ہیں پہاڑوں کا حال سو تو کہہ ان کو بکھیر دے گا میرا رب اڑا کر، پھر کر چھوڑے گا زمین کو صاف (چٹیل) میدان |
| لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ﴿۱۰۷﴾ |
| نہ دیکھے گا تو اس میں موڑ (کجی) اور نہ ٹیلا (اونچان) |

**خلاصہ تفسیر:** اور (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! قیامت کا حال سن کر بعض) لوگ آپ سے پہاڑوں کی نسبت پوچھتے ہیں (کہ قیامت میں ان کا کیا حال ہوگا؟) سو آپ (جواب میں) فرما دیجئے کہ میرا رب ان کو (ریزہ ریزہ کر کے) بالکل اڑا دے گا، پھر زمین کو ایک میدان ہموار کر دے گا کہ جس میں تو (اے مخاطب!) نہ ناہمواری دیکھے گا اور نہ کوئی (پہاڑ ٹیلہ وغیرہ کی) بلندی دیکھے گا۔

* * *

**فائدہ:** یعنی قیامت کے ذکر پر منکرین حشر استہزاء کہتے ہیں کہ ایسے ایسے سخت اور عظیم الشان پہاڑوں کا کیا حشر ہوگا؟ کیا یہ بھی ٹوٹ پھوٹ جائیں گے؟ اس کا جواب دیا کہ حق تعالیٰ کی لامحدود قدرت کے سامنے پہاڑوں کی کیا حقیقت ہے ان سب کو ذرا سی دیر میں کوٹ پیس کر ریت کے ذرات اور دھنی ہوئی روئی کی طرح ہوا میں اڑا دیا جائے گا اور زمین بالکل صاف و ہموار کر دی جائے گی جس میں کچھ اونچ نیچ اور اونچ نیچ نہ رہے گی، پہاڑوں کی رکاوٹیں ایک دم میں صاف کر دی جائیں گی۔

يَوْمَئِذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ

اس دن پیچھے دوڑیں گے پکارنے والے کے ٹیڑھی نہیں جس کی بات ۱؎ اور دب جائیں گی آوازیں رحمان کے ڈر سے پھر تو نہ سنے گا

اِلَّا هَمْسًا ﴿۱۰۸﴾ يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾

مگر کھس کھسی آواز ۲؎ اس دن کام نہ آئے گی سفارش مگر جس کو اجازت دی رحمان نے اور پسند کی اس کی بات ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** اس روز سب کے سب (خدائی) بلانے والے (یعنی صور پھونکنے والے فرشتہ) کے کہنے پر ہو لیں گے (یعنی وہ اپنی صور پھونکنے کی آواز سے سب کو قبروں سے بلائے گا تو سب نکل پڑیں گے) اس کے سامنے (کسی کا) کوئی ٹیڑھا پن نہ رہے گا (کہ قبر سے زندہ ہو کر نہ نکلے، جیسے دنیا میں انبیاء علیہم السلام کے سامنے ٹیڑھے رہتے تھے کہ تصدیق نہ کرتے تھے) اور (مارے ہیبت کے) تمام آوازیں اللہ تعالیٰ کے سامنے دب جائیں گی، سو (اے مخاطب!) تو بجز پاؤں کی آہٹ کے (کہ میدان حشر کی طرف چپکے چپکے چل رہے ہوں گے) اور کچھ (آواز) نہ سنے گا (خواہ اس وجہ سے کہ اس وقت بولتے ہی نہ ہوں گے اگرچہ دوسرے موقع پر آہستہ آہستہ بولیں، جیسا کہ اوپر آیا ہے: يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ یا اس وجہ سے کہ بہت آہستہ بولتے ہوں گے کہ جو ذرا فاصلے پر ہو وہ نہ سن سکے) اس روز (کسی کو کسی کی) سفارش نفع نہ دے گی مگر ایسے شخص کو (انبیاء و صلحاء کی سفارش نفع دے گی) کہ جس (کی سفارش کرنے) کے واسطے اللہ تعالیٰ نے (سفارش کرنے والوں کو) اجازت دے دی ہو اور اس شخص کے واسطے (سفارش کرنے والے کا) بولنا پسند کر لیا ہو۔

**لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ:** مراد اس سے مومن ہے کہ سفارش کرنے والوں کو مومن کی سفارش کے لئے اجازت ہوگی اور اس کے بارہ میں شفاعت کرنے والے کا بولنا خدا کو پسند ہوگا اور کفار کے لیے سفارش کی کسی کو اجازت نہ ہوگی تو شفاعت کا ان کے واسطے نافع نہ ہونا اس اعتبار سے ہے کہ شفاعت ہی نہ ہوگی، اس میں کفار کو دھمکی ہے کہ تم شفاعت سے بھی محروم رہو گے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ شرک یعنی جدھر فرشتہ آواز دے گا یا جہاں بلائے جائیں گے سیدھے تیر کی طرح ادھر دوڑے جائیں گے، نہ بلانے والے کی بات ٹیڑھی ہوگی اور نہ دوڑنے والوں میں کچھ ٹیڑھا ترچھا پن رہے گا، کاش یہ لوگ دنیا میں اللہ کے داعی کی آواز پر اسی طرح سیدھے جھپٹتے تو وہاں کام آتا، پر یہاں اپنی بدبختی اور کجروی سے ہمیشہ ٹیڑھی چال چلتے رہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی محشر کی طرف چلنے کی کھسکھساہٹ کے سوا اس وقت رحمان کے خوف و ہیبت کے مارے کسی کی آواز نہ سنائی دے گی، اگر کوئی کچھ کہے گا بھی تو اس قدر آہستہ جیسے کانا پھوسی کرتے ہوں۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی اس کی سفارش چلے گی جس کو خدا تعالیٰ کی طرف سے سفارش کی اجازت ملے، اس کا بولنا خدا کو پسند ہو اور بات ٹھکانے کی کہے اور ایسے شخص کی سفارش کرے جس کی بات (لا الہ الا اللہ) خدا کو پسند آ چکی ہے کافر کے حق میں کوئی سعی سفارش نہیں چلے گی۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ

وہ جانتا ہے جو کچھ ہے ان کے آگے اور پیچھے اور یہ قابو میں نہیں لا سکتے اس کو دریافت کر کے ا؎ اور رگڑتے ہیں منہ آگے اس جیسے ہمیشہ

الْقَيُّوْمِ ط وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ

رہنے والے کے ۲؎ اور خراب ہوا جس نے بوجھ اٹھایا ظلم کا ۳؎ اور جو کوئی کرے کچھ بھلائیاں اور وہ ایمان بھی رکھتا ہو سو اس کو ڈر نہیں

ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ﴿۱۱۲﴾

بے انصافی کا اور نہ نقصان پہنچنے کا ۴؎

**خلاصہ تفسیر:** وہ (اللہ تعالیٰ) ان سب کے آگے پیچھے احوال کو جانتا ہے اور اس (کے معلومات) کو ان کا علم احاطہ نہیں کرسکتا، اور (اس روز) تمام چہرے اس حی وقیوم کے سامنے جھکے ہوں گے (اور سب متکبرین اور منکرین کا تکبر وانکار ختم ہوجائے گا) اور (اس وصف میں تو سب مشترک ہوں گے، پھر آگے ان میں یہ فرق ہوگا کہ) ایسا شخص تو (ہر طرح) ناکام رہے گا جو ظلم (یعنی شرک) لے کر آیا ہوگا، اور جس نے نیک کام کئے ہوں گے اور وہ ایمان بھی رکھتا ہوگا سو اس کو (کامل ثواب ملے گا) نہ کسی زیادتی کا اندیشہ ہوگا اور نہ کمی کا۔

**وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا:** یعنی ایسا تو کوئی امر نہیں جو مخلوق کو معلوم ہو اور اللہ تعالیٰ کو معلوم نہ ہو، اور ایسے امور بہت ہیں جو اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں اور مخلوق کو معلوم نہیں، پس مخلوقات کے وہ احوال بھی اس کو معلوم ہیں جن سے وہ شفاعت کے قابل یا ناقابل ہوتے ہیں، سو جو اس کا اہل ہوگا اس کے واسطے سفارش کرنے کی اجازت ہوگی اور جو اہل نہ ہوگا اس کے لئے اجازت نہ ہوگی۔

**فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا:** یعنی یہ نہ ہوگا کہ کوئی گناہ اس کے نامہ اعمال میں زیادہ لکھ دیا جائے یا کوئی نیکی کم لکھ دی جائے، پس زیادتی کمی نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ پورا ثواب ملے گا، تو اس کے مقابلہ میں کفار کے لیے ثواب کا انکار مقصود ہوگا، کیونکہ ان میں ثواب کی علت ہی موجود نہیں، پس کفار کے لیے بھی کمی زیادتی نہ ہوگی، اور کفار کے نیک اعمال کا حساب میں نہ لکھا جانا یہ کوئی ظلم نہیں، بلکہ اس لئے ہے کہ ان میں قبولیت کی شرط یعنی ایمان نہیں ہے اس وجہ سے وہ کالعدم ہو گئے، اور اس کو کمی زیادتی نہیں کہہ سکتے۔

* * *

**فائدہ:** ا؎ یعنی خدا کا علم سب کو محیط ہے لیکن بندوں کا علم اس کو یا اس کی معلومات کو محیط نہیں، اس لیے وہ ہی اپنے علم محیط سے جانتا ہے کہ کس کو کس کے لیے شفاعت کا موقع دینا چاہیے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی اس روز بڑے بڑے سرکش متکبروں کے سر بھی اعلانیہ اسی حیّ وقیّوم کے سامنے ذلیل قیدیوں کی طرح جھکے ہوں گے، جنہوں نے کبھی خدا کے آگے پیشانی نہ ٹیکی تھی اس وقت بڑی عاجزی سے گردن جھکائے چلے آئیں گے۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی ظالم کا حال کچھ نہ پوچھو کیسا خراب ہوگا، ظلم کے لفظ میں شرک اور دوسرے معاصی بھی داخل ہیں، جیسے فرمایا: ان الشرك لظلم عظيم اور وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ہر ایک ظالم کی خرابی اس کے درجہ ظلم کے موافق ہوگی۔

**فائدہ:** ۴؎ بے انصافی یہ کہ کوئی نیکی ضائع کردی جائے یا ناکردہ گناہ پکڑا جائے اور نقصان پہنچنا یہ کہ استحقاق سے کم بدلہ دیا جائے۔

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ

اور اسی طرح اتارا ہم نے قرآن عربی زبان کا اور پھیر پھیر کر سنائی ہم نے اس میں ڈرانے کی باتیں تاکہ وہ پرہیز کریں (ڈریں)

اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿۱۱۳﴾

یا ڈالے ان کے دل میں سوچ

**خلاصہ تفسیر:** اور ہم نے (جس طرح یہ مذکورہ مضامین صاف صاف ارشاد کئے ہیں) اسی طرح اس (سارے) کو عربی قرآن کر کے نازل کیا ہے (جس کے الفاظ واضح ہیں) اور اس میں ہم نے طرح طرح سے وعید (قیامت وعذاب کی) بیان کی ہے (جس سے معنی بھی واضح ہو گئے، مطلب یہ کہ سارے قرآن کے مضامین ہم نے صاف صاف بتلائے ہیں) تاکہ وہ (سننے والے) لوگ (اس کے ذریعہ سے بالکل) ڈر جائیں (اور فی الحال ایمان لے آئیں) یا (اگر بالکل نہ ڈریں تو یہی ہو کہ) یہ قرآن ان کے لیے کسی قدر (تو) سمجھ پیدا کردے (یا اگر بالکل نہ ڈریں اور پورا اثر نہ ہو تو تھوڑا ہی ہو، اور اسی طرح چند بار تھوڑا تھوڑا اثر جمع ہو کر کافی مقدار ہو جائے اور کسی وقت مسلمان ہو جائیں)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جیسے یہاں محشر کے احوال اور نیک و بد کے نتائج صاف صاف سنا دیے، اسی طرح ہم نے پورا قرآن صاف زبان عربی میں نازل کیا تھا جو لوگ اس کے اولین مخاطب ہیں اس کو پڑھ کر خدا سے ڈریں، اور تقویٰ کی راہ اختیار کریں، اور اتنا نہ ہو تو کم از کم ان کے دلوں میں اپنے انجام کی طرف سے کچھ سوچ تو پیدا ہو جائے، ممکن ہے یہی سوچ اور غور وفکر آگے بڑھتے بڑھتے ہدایت پر لے آئے اور ان کے ذریعہ سے دوسروں کو ہدایت ہو۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۫

سو بلند درجہ اللہ کا اس سچے بادشاہ کا ۱؎ اور تو جلدی نہ کر قرآن کے لینے میں جب تک پورا نہ ہو چکے (نہ ہو جایا کرے) اس کا اترنا

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾

اور کہہ اے رب زیادہ کر میری سمجھ ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** سو اللہ تعالیٰ جو بادشاہ حقیقی ہے عالی شان ہے (کہ ایسا نافع کلام نازل فرمایا) اور (جس طرح عمل کرنا اور نصیحت ماننا قرآن کے حقوق میں سے ہے جن کا ادا کرنا سب مسلمانوں پر فرض ہے اسی طرح نزول قرآن کے متعلق بھی کچھ آداب ہیں جن کا تعلق حضور ﷺ کی ذات سے ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ) قرآن (پڑھنے) میں قبل اس کے کہ آپ پر اس کی وحی پوری نازل ہو چکے عجلت نہ کیا کیجئے (کہ اس میں آپ کو تکلیف ہوتی ہے کہ جبرئیل علیہ السلام سے سننا اور اس کو پڑھنا پھر ساتھ ساتھ یاد کرنا پڑتا ہے، سو ایسا نہ کیجئے اور اس کا اندیشہ نہ کیجئے کہ شاید یاد نہ رہے، یاد کرانا ہمارے ذمہ ہے) اور آپ (بھی یاد ہونے کے لئے ہم سے) یہ دعا کیجئے کہ اے میرے رب! میرا علم بڑھا دے۔

**رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا:** اس دعا میں یہ بھی درخواست ہے کہ جو علم حاصل ہو گیا وہ یاد رہے، اور جو حاصل نہیں ہوا وہ حاصل ہو جائے، اور جو حاصل ہونے والا ہی نہیں اس کے حاصل نہ ہونے کو بہتر سمجھا جائے، اور سب علوم میں صحیح طور پر سمجھنا نصیب ہو، تو لا تعجل کے بعد اس کا آنا نہایت ہی مناسب ہوا، حاصل یہ ہے کہ یاد کرنے کی یہ خاص تدبیر یعنی ساتھ ساتھ پڑھنا اور جلدی جلدی یاد کرنا چھوڑ دیجیے اور دعا کی تدبیر کو اختیار کیجیے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ جس نے ایسا عظیم الشان قرآن اتارا، اور اپنی رعایا کو ایسی سچی اور کھری باتیں ان کے فائدہ کے لیے سنائیں۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی جب قرآن ایسی مفید و عجیب چیز ہے تو جس طرح ہم اس کو بتدریج آہستہ آہستہ اتارتے ہیں، تم بھی اس کو جبرائیل سے لینے میں جلدی نہ کیا کرو، جس وقت فرشتہ وحی پڑھ کر سنائے، تم عجلت کر کے اس کے ساتھ ساتھ نہ پڑھو، ہم ذمہ لے چکے ہیں کہ قرآن تمہارے سینے سے نکلنے نہ پائے گا، پھر اس فکر میں کیوں پڑتے ہو کہ کہیں بھول نہ جاؤں اس فکر کے بجائے یوں دعا کیا کرو کہ اللہ تعالیٰ قرآن کی اور زیادہ سمجھ اور بیش از بیش علوم و معارف عطا فرمائے، دیکھو آدم نے ایک چیز میں بے موقع تعجیل کی تھی اس کا انجام کیا ہوا، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''جبرائیل جب قرآن لاتے تو حضرت محمد ﷺ ان کے پڑھنے کے ساتھ آپ بھی پڑھنے لگتے کہ بھول نہ جاؤں، اس کو پہلے منع فرمایا تھا سورہ قیامۃ میں: لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ اور تسلی کر دی تھی کہ اس کا یاد رکھوانا اور لوگوں تک پہنچوانا ہمارے ذمہ ہے، لیکن بندہ بشر ہے، شاید بھول گئے ہوں اس لیے پھر اس آیت سے تقید کیا اور بھولنے پر آگے مثل بیان فرمائی آدم کی''۔

ع وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾

اور ہم نے تاکید کر دی تھی آدم کو اس سے پہلے پھر بھول گیا اور نہ پائی ہم نے اس میں کچھ ہمت (پختگی)

**خلاصہ تفسیر:** چند آیات قبل مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ میں احکام سے اعراض کرنے والوں پر وعید تھی، آگے اسی مضمون کی تاکید کے لیے آدم علیہ السلام کا قصہ بیان فرماتے ہیں کہ دیکھو جب ایسے مقرب اور مقبول بندہ کو ایک احتیاط کے چھوڑنے سے ان کی شان کے مناسب نقصان پہنچا تو عام لوگ تو کس شمار میں ہیں، ان کو احکام سے اعراض کرنے پر سزا ہونا کیا بعید ہے، اور شیطان کا قصہ سے یہ معلوم ہو جائے کہ اعراض اور تکبر کس درجہ قبیح ہے، نیز اس قصہ کے ذکر سے اولاد آدم کو تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ اپنے اور اپنے باپ کے قدیم دشمن سے ہشیار رہیں مبادا غفلت سے اس کے دھوکہ میں آجائیں، اولاد آدم کو چاہئے کہ اگر کسی وقت شیطان کے وسوسہ سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو باپ کی طرح توبہ اور استغفار سے اس کی تلافی اور تدارک کریں شیطان کی طرح اپنے قصور کی تاویلیں نہ کریں۔

اور اس سے (بہت زمانہ) پہلے ہم آدم (علیہ السلام) کو ایک حکم دے چکے تھے (جس کا بیان آگے آتا ہے) سو ان سے غفلت (اور بے احتیاطی) ہو گئی اور ہم نے (اس حکم کے اہتمام میں) ان میں پختگی (اور ثابت قدمی) نہ پائی۔

**فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا:** یہاں دو لفظ آئے ہیں ایک ''نسیان'' دوسرے ''عزم''، ''نسیان'' کے معنی مشہور ہیں بھول جانا، غفلت میں پڑ جانا اور ''عزم'' کے لفظی معنی کسی کام کے لئے اپنے ارادے کو مضبوط باندھنے کے ہیں، ان دونوں لفظوں سے مراد اس جگہ کیا ہے؟ اس کے سمجھنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں اور پیغمبر سب کے سب گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں۔

پہلے لفظ میں حضرت آدم علیہ السلام پر نسیان اور بھول طاری ہو جانے کا ذکر ہے اور چونکہ بھول اور نسیان غیر اختیاری امر ہے، اس لئے اس کو گناہ ہی میں شمار نہیں کیا گیا، جیسا کہ حدیث صحیح میں ہے: ''رفع عن امتی الخطا و النسیان'' یعنی میری امت سے خطا اور نسیان کا گناہ معاف کر دیا گیا ہے، اور قرآن کریم کا ارشاد عام ہے: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو ایسا حکم نہیں دیتے جو اس کے اختیار و قدرت سے باہر ہو، لیکن یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ حق تعالیٰ نے اس عالم میں ایسے اسباب بھی رکھے ہیں کہ ان کو پوری احتیاط کے ساتھ استعمال کیا جائے تو انسان بھول اور خطا سے بچ سکتا ہے، انبیاء علیہم السلام چونکہ حق تعالیٰ کے مقربین خاص ہیں ان سے اتنی بات پر بھی مواخذہ ہو سکتا ہے کہ ان اسباب اختیاریہ سے کیوں کام نہ لیا جن کے ذریعہ اس بھول سے بچ سکتے تھے، بسا اوقات ایک وزیر سلطنت کے لئے وہ کام قابل مواخذہ سمجھا جاتا ہے جو عام نوکروں کے لئے قابل انعام ہوتا ہے، اسی کو حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا ہے: ''حسنات الابرار سیات المقربین''، یعنی امت کے صالحین اور نیک لوگوں کے بہت سے نیک عمل مقربان بارگاہ الٰہی کے حق میں سیات اور لغزش قرار دی جاتی ہے، حضرت آدم علیہ السلام کا یہ واقعہ اول تو نبوت و رسالت سے پہلے کا ہے جس میں کسی گناہ کا صدور انبیاء سے بعض علمائے اہل سنت کے نزدیک عصمت کے خلاف نہیں، دوسرے درحقیقت یہ بھول ہے جو گناہ نہیں مگر حضرت آدم

علیہ السلام کے مقام بلند اور تقرب حق سبحانہ وتعالیٰ کے لحاظ سے اس کو بھی ان کے حق میں ایک لغزش قرار دی گئی جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عتاب ہوا اور ان کو متنبہ کرنے کے لئے اس لغزش کو ''عصیان'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا جیسا کہ آگے آتا ہے۔

دوسرا لفظ ''عزم'' ہے اور اسی آیت میں یہ فرمایا کہ آدم علیہ السلام میں عزم نہ پایا گیا، اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ عزم کے معنی کسی کام کے ارادہ پر مضبوطی سے قائم رہنے کے ہیں، حضرت آدم علیہ السلام حکم ربانی کی تعمیل کا مکمل فیصلہ اور قصد کئے ہوئے تھے مگر شیطانی وساوس سے اس قصد کی مضبوطی میں فرق آ گیا اور بھول نے اس پر قائم نہ رہنے دیا، واللہ اعلم۔

**فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا:** اس میں اس پر دلالت ہے کہ طبعی ضعف اور کمال میں منافات نہیں (یعنی ممکن ہے کہ ایک شخص با کمال ہو اور اس میں کوئی کمزوری یعنی بھول چوک وغیرہ بھی ہو)۔

* * *

**فائدہ:** وہ ہی جو دانہ کھالیا تھا، بھول گئے، یعنی قائم نہ رہے، آگے اس قصہ کی قدرے تفصیل ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾

اور جب کہا ہم نے فرشتوں کو سجدہ کرو آدم کو تو سجدہ میں گر پڑے مگر نہ مانا ابلیس نے

فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾

پھر کہہ دیا ہم نے اے آدم یہ دشمن تیرا ہے اور تیرے جوڑے (عورت) کا سو نکلوا نہ دے تم کو بہشت سے پھر تو پڑ جائے تکلیف میں

**خلاصہ تفسیر:** اور (اس اجمال کی تفصیل اگر مطلوب ہو تو) وہ وقت یاد کرو جبکہ ہم نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا کہ آدم (علیہ السلام) کے سامنے سجدہ (تحیۃ یعنی تعظیم و تسلیم) کرو سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے (کہ) اس نے انکار کیا، پھر ہم نے (آدم سے) کہا کہ اے آدم! (یاد رکھو) یہ بلاشبہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا (اس وجہ سے) دشمن ہے (کہ تمہارے معاملہ میں مردود ہوا) سو کہیں تم دونوں کو جنت سے نہ نکلوا دے (یعنی اس کے کہنے سے کوئی ایسا کام مت کر بیٹھنا کہ جنت سے باہر کئے جاؤ) پھر (کسب معاش کی) مصیبت میں پڑ جاؤ (اور ساتھ میں تمہاری بیوی بھی، مگر مصیبت کا زیادہ حصہ تم کو بھگتنا پڑے)۔

**مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى:** اس میں آدم علیہ السلام کو خاص کیا، یعنی لفظ فتشقی کو مفرد استعمال فرمایا، بیوی کو اس میں شریک نہیں کیا، ورنہ سیاق سباق کے اعتبار سے فتشقیا کہنا چاہیے تھا، وجہ اس کی یہ ہے کہ اکثر معاش کی مشقت مرد پر ہی زیادہ ہوتی ہے، حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ کی تفصیل اور مضامین کی توجیہ سورہ بقرہ (آیت ۳۴ تا ۳۸) اور سورہ اعراف (آیت ۱۱ تا ۲۵) میں گذر چکی ہے، وہاں ملاحظہ فرما لیا جائے۔

* * *

**فائدہ:** ظاہر ہے بہشت کا آرام دوسری جگہ کہاں مل سکتا ہے، آخر کھانے پہننے، رہنے سہنے کی تدبیریں کرنی پڑیں گی۔

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾

تجھ کو یہ ملا ہے کہ نہ بھوکا ہو تو اس میں اور نہ ننگا، اور یہ کہ نہ پیاس کھینچے (جھیلے) تو اس میں اور نہ دھوپ ۱؎

**خلاصہ تفسیر:** (اور) یہاں جنت میں تو تمہارے لئے یہ (آرام) ہے کہ تم نہ کبھی بھوکے ہو گے (جس سے تکلیف ہو یا اس کی تدبیر میں دیر اور پریشانی ہو) اور نہ ننگے ہو گے (کہ کپڑا نہ ملے، یا ضرورت کے بعد اتنی دیر میں ملے کہ تکلیف ہونے لگے) اور نہ یہاں پیاسے ہو گے (کہ پانی نہ ملے یا دیر ہونے سے تکلیف ہو) اور نہ دھوپ میں تپو گے (کیونکہ جنت میں دھوپ ہی نہیں اور مکان بھی ہر طرح پناہ کے ہیں، بخلاف اس

حالت کے کہ اگر جنت سے نکل کر دنیا میں گئے تو ساری مصیبتیں پیش آئیں گی، اس لئے ان امور کو پیش نظر رکھ کر خوب ہی ہوشیاری و بیداری سے رہنا)۔

**اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا (الى قوله) وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا**: جنت میں بھوک نہ لگنے سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب تک بھوک نہ لگے کھانے کا ذائقہ اور لذت ہی نہیں آسکتی، اسی طرح جب تک پیاس نہ ہو ٹھنڈے پانی کی لذت و راحت نہیں محسوس ہو سکتی، وجہ یہ ہے کہ جنت میں بھوک پیاس نہ لگنے کا مطلب یہ ہے کہ بھوک پیاس کی تکلیف نہیں اٹھانی پڑتی کہ بھوک کے وقت کھانے کو اور پیاس کے وقت پینے کو نہ ملے یا دیر میں ملے، بلکہ ہر وہ چیز جس کو اس کا دل چاہے گا فوراً حاضر موجود ملے گی۔

* * *

**فائدہ**: [۱] انسان کی یہ ہی بڑی ضرورتیں ہیں، کھانا، پینا، پہننا اور رہنے کے لیے مکان جس میں دھوپ بارش کا بچاؤ ہو، جنت میں اس طرح کی کوئی تکلیف نہیں، ہر طرح راحت ہی راحت ہے ''بہشت آنجا کہ آزارے نباشد'' یہاں راحت کا ذکر نہیں کیا، صرف تکلیفوں کی نفی کی شاید متنبہ کرنے کے لیے کہ یہاں سے نکلے تو ان سب چیزوں کی تکلیف اٹھاؤ گے۔

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾

پھر جی میں ڈالا اس کے شیطان نے کہا اے آدم !میں بتاؤں تجھ کو درخت سدا زندہ رہنے کا اور بادشاہی جو پرانی نہ ہو

**خلاصہ تفسیر**: پھر ان کو شیطان نے (جھانسہ دیا یعنی) بہکایا، کہنے لگا کہ اے آدم! کیا میں تم کو ہمیشگی (کی خاصیت) کا درخت بتلادوں (کہ اس کے کھانے سے ہمیشہ شاد و آباد رہو) اور ایسی بادشاہی جس میں کبھی ضعف نہ آئے۔

**قَالَ يٰاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ**: اس سے معلوم ہوا کہ غیر مقصود ثمرات کی طلب نقصان دہ ہوتی ہے (شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کو جنت کا دوام اور اس کی بادشاہت کی ترغیب دی، دوام اور بادشاہت کا نہ حکم تھا نہ مطلوب تھے، ظاہر ہے یہ غیر مقصود ثمرات تھے، جس کی طلب میں سیدنا آدم علیہ السلام سے تجاوز ہو گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جنت جیسی آرام گاہ سے زمین پر آنا پڑا، غیر مقصود ثمرات کی طلب میں نقصان ہوا)۔

* * *

**فائدہ**: یعنی ایسا درخت بتاؤں، جس کے کھانے سے کبھی موت نہ آئے اور لازوال بادشاہت ملے۔

فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۫ وَعَصٰٓى اٰدَمُ

پھر دونوں نے کھالیا اس میں سے پھر کھل گئیں ان پر انکی بری چیزیں (شرمگاہ) اور لگے گانٹھنے اپنے اوپر پتے بہشت کے [۱] اور حکم ٹالا آدم نے

رَبَّهٗ فَغَوٰى ۖ﴿۱۲۱﴾ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿۱۲۲﴾

اپنے رب کا پھر راہ سے بہکا پھر نواز دیا اس کے رب نے پھر متوجہ ہوا اس پر اور راہ پر لایا [۲]

**خلاصہ تفسیر**: سو (اس کے بہکانے سے) دونوں نے اس درخت سے کھالیا (جس سے ممانعت ہوئی تھی اور شیطان نے اس کو شجرۃ الخلد کہہ کر بہکایا تھا) تو (اس کے کھاتے ہی) ان دونوں کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے اور (اپنا بدن ڈھانکنے کو) دونوں اپنے (بدن کے) اوپر جنت (کے درختوں) کے پتے چپکانے لگے اور آدم سے اپنے رب کا قصور ہو گیا، سو (جنت میں ہمیشہ آباد رہنے کا مقصد حاصل کرنے میں) غلطی میں پڑ گئے، پھر (جب انہوں نے معذرت کی تو) ان کے رب نے (زیادہ) مقبول بنالیا سو ان پر (مہربانی سے) توجہ فرمائی اور راہ (راست) پر ہمیشہ قائم رکھا (کہ پھر ایسی خطا نہیں ہوئی)۔

**وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى**: اس آیت میں جو حضرت آدم علیہ السلام کی نسبت صاف لفظوں میں عصی اور پھر غوی فرمایا گیا ہے، ان

دونوں میں فرق خلاصہ تفسیر سے ظاہر ہو گیا، اس کی وجہ سورۃ بقرہ میں بھی بیان ہو چکی ہے کہ اگرچہ آدم علیہ السلام کا یہ عمل شرع قانون کی رو سے گناہ میں داخل نہیں تھا لیکن حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے رسول اور مقربین خاص میں سے ہیں، اس لئے ان کی ادنیٰ لغزش کو بھی بھاری لفظوں سے ''عصیان'' کہہ کر تعبیر کیا گیا اور اس پر عتاب کیا گیا، اور لفظ ''غوی'' دو معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے: ① ایک معنی زندگی تلخ ہو جانے اور عیش خراب ہو جانے کے ہیں ② دوسرے معنی گمراہ ہو جانے یا غافل ہو جانے کے، ائمہ تفسیر نے اس جگہ لفظ ''غوی'' کے پہلے معنی ہی کو اختیار کیا ہے اور مراد یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جو عیش جنت میں حاصل تھا وہ نہ رہا زندگی تلخ ہو گئی۔

انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ایک اہم ہدایت ان کے ادب واحترام کی حفاظت، قاضی ابوبکر ابن عربیؒ نے احکام القرآن میں آیت مذکورہ میں جو الفاظ عصیٰ وغیرہ آدم علیہ السلام کے بارے میں ہیں اس سلسلہ میں انہوں نے ایک اہم بات ارشاد فرمائی ہے وہ انہیں کے الفاظ میں یہ ہے: ''ہم میں سے کسی کے لئے آج یہ جائز نہیں کہ آدم علیہ السلام کی طرف یہ لفظ عصیان منسوب کرے بجز اس کے کہ قرآن کی اس آیت کے یا کسی حدیث نبوی کے ضمن میں آیا ہو وہ بیان کرے، لیکن یہ کہ اپنی طرف سے یہ لفظ منسوب کرنا ہمارے اپنے قریبی آباؤ واجداد کے لئے بھی جائز نہیں، پھر ہمارے سب سے پہلے باپ جو ہر حیثیت میں ہمارے آباء سے مقدم اور اعظم واکرام میں اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبر معزز ہیں جن کا عذر اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا اور معافی کا اعلان کر دیا ان کے لئے تو کسی حال میں جائز نہیں''، آدم علیہ السلام کے قصہ کی تفصیل اور مضامین کی توجیہ سورہ بقرہ اور سورہ اعراف میں گذر چکی ہے۔

**ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ:** اجتباء جذب ہے اور ہدایت سلوک ہے، اجتباء کو پہلے ذکر کرنے سے معلوم ہوا کہ جذب افضل ہے سلوک سے (حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ پر اللہ تعالیٰ نے مزید مقبول بنا دیا، اس کیفیت کو جذب کہا جاتا ہے، ہدایت اور رہنمائی کو سلوک کہا جاتا ہے، الغرض اجتباء کا حاصل جذب اور ہدایت کا حاصل سلوک قرار پاتا ہے، اللہ تعالیٰ کا خود اپنے بندے کو اپنے لیے چن لینا اور اسے اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت بخشنا یہ زیادہ افضل ہے بہ نسبت اس کے کہ بندہ خود اپنی محنت سے بارگاہ الٰہی تک پہنچے، اس لیے جذب افضل ہے سلوک سے، کیونکہ جذب اللہ تعالیٰ کا عمل ہے اور سلوک بندے کا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ے یہ سب قصہ سورہ اعراف وغیرہ میں مفصل گزر چکا ہے وہاں کے فوائد میں ہم اسکے اجزاء پر نہایت کافی وشافی کلام کر چکے ہیں۔

**فائدہ:** ۲ے یعنی جب حکم الٰہی کے امتثال میں غفلت وکوتاہی ہوئی تو اپنی شان کے موافق عزم واستقامت کی راہ پر ثابت قدم نہ رہے، اسی کو غوایت وعصیان سے تغلیظاً تعبیر فرمایا ہے بقاعدہ حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ اس کی بحث بھی پہلے گزر چکی، یعنی شیطان کا تسلط نہیں ہونے دیا، بلکہ فوراً توبہ کی توفیق بخشی، خلعت قبول سے نوازا، اور بیش از بیش مہربانی سے اس کی طرف متوجہ ہوا اور اپنی خوشنودی کے راستہ پر قائم کر دیا۔

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ

فرمایا اترو یہاں سے دونوں اکٹھے (ایک ساتھ) رہو ایک دوسرے کے دشمن ۱ے پھر اگر پہنچے تم کو میری طرف سے ہدایت ۲ے پھر جو چلا

هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾

میری بتلائی راہ پر سو نہ وہ بہکے گا اور نہ وہ تکلیف میں پڑے گا ۳ے

**خلاصہ تفسیر:** (جب وہ درخت کھالیا تو) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دونوں کے دونوں جنت سے اترو (اور دنیا میں) ایسی حالت سے جاؤ کہ (تمہاری اولاد میں) ایک کا دشمن ایک ہوگا، پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت (کا ذریعہ یعنی رسول یا کتاب) پہنچے تو (تم میں) جو شخص میری اس ہدایت کا اتباع کرے گا تو وہ نہ (دنیا میں) گمراہ ہوگا اور نہ (آخرت میں) شقی ہوگا۔

* * *

**فائدہ:** ۱ اگر یہ خطاب صرف آدم وحوا کو ہے تو یہ مراد ہوگی کہ ان کی اولاد آپس میں ایک دوسرے کی دشمن رہے گی، جیسا رفاقت کر کے گناہ کیا تھا، اس رفاقت کا بدلہ یہ ملا کہ اولاد آپس میں دشمن ہوئی اور اگر خطاب آدم وابلیس کو ہے تو یہ مطلب ہوگا کہ دونوں کی ذریت میں یہ دشمنی برابر قائم رہے گی، شیاطین ہمیشہ بنی آدم کو ضرر پہنچانے کی کوشش کریں گے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی نبیوں اور کتابوں کے ذریعہ سے۔

**فائدہ:** ۳ یعنی نہ جنت کے راستہ سے بہکے گا نہ اس سے محروم ہو کر تکلیف اٹھائے گا، جس وطن اصلی سے نکل کر آیا تھا بے کھٹکے پھر وہیں جا پہنچے گا۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾

اور جس نے منہ پھیرا میری یاد سے تو اس کو ملنی ہے گزران تنگی کی ۱ اور لائیں گے ہم اس کو دن قیامت کے اندھا ۲

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿۱۲۵﴾

وہ کہے گا اے رب کیوں اٹھا لایا تو مجھ کو اندھا اور میں تو تھا دیکھنے والا ۳

**خلاصہ تفسیر:** اور جو شخص میری اس نصیحت سے اعراض کرے گا تو اس کے لئے (قیامت سے پہلے دنیا اور قبر میں) تنگی کا جینا ہوگا اور قیامت کے روز ہم اس کو اندھا کر کے (قبر سے) اٹھائیں گے، وہ (تعجب سے) کہے گا کہ اے میرے رب! آپ نے مجھ کو اندھا کر کے کیوں اٹھایا میں تو (دنیا میں) آنکھوں والا تھا (مجھ سے ایسی کیا خطا ہوئی؟)۔

**فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا:** قبر میں تنگی تو ظاہر ہے کہ قبر کافر پر تنگ ہوگی اور طرح طرح سے اس پر عذاب ہوگا اور دنیا میں تنگی قلب کے اعتبار سے ہے کہ ہر وقت دنیا کی حرص میں، ترقی کی فکر میں، کمی کے اندیشہ میں بے آرام رہتا ہے اگرچہ کوئی کافر بے فکر بھی ہو لیکن اکثر کی یہی حالت ہے اور آیت میں مطلق تنگی کا ذکر ہے، اگر کسی کو صرف قبر ہی میں تنگی ہو جب بھی یہ حکم صادق ہے، خوب سمجھ لو۔

یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ دنیا میں معیشت کی تنگی تو کفار و فجار کے لئے مخصوص نہیں، مؤمنین صالحین کو بھی پیش آتی ہے، بلکہ انبیاء علیہم السلام کو سب سے زیادہ شدائد و مصائب اس دنیا کی زندگی میں اٹھانے پڑتے ہیں، صحیح بخاری اور دیگر کتب حدیث میں یہ حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دنیا کی بلائیں اور مصیبتیں سب سے زیادہ انبیاء پر سخت ہوتی ہیں، ان کے بعد جو جس درجہ کا صالح اور ولی ہے اسی کی مناسبت سے اس کو یہ تکلیفیں پہنچتی ہیں، اس کے بالمقابل عموماً کفار و فجار کو خوشحال اور عیش و عشرت میں دیکھا جاتا ہے تو پھر یہ ارشاد قرآنی کہ ان کی معیشت تنگ ہوگی آخرت کے لئے تو ہو سکتا ہے دنیا میں خلاف مشاہدہ معلوم ہوتا ہے۔

اس کا صاف بے غبار جواب تو یہ ہے کہ یہاں دنیا کے عذاب سے قبر کا عذاب مراد ہے کہ قبر میں ان کی معیشت تنگ کر دی جائے گی، خود قبر جو ان کا مسکن ہوگا وہ ان کو ایسا دبائے گا کہ ان کی پسلیاں ٹوٹنے لگیں گی، جیسا کہ بعض احادیث میں اس کی تصریح ہے اور حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود اس آیت کے لفظ مَعِيْشَةً ضَنْكًا کی تفسیر یہ فرمائی ہے کہ اس سے مراد قبر کا عالم ہے۔

اور حضرت سعید بن جبیر نے تنگی معیشت کا یہ مطلب بھی بیان کیا ہے کہ ان سے قناعت کا وصف سلب کر لیا جائے گا اور حرص دنیا بڑھا دی جائے گی، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے پاس کتنا ہی مال و دولت جمع ہو جائے کبھی قلبی سکون اس کو نصیب نہیں ہوگا، ہمیشہ مال بڑھانے کی فکر اور اس میں نقصان کا خطرہ اس کو بے چین رکھے گا، اور یہ بات عام اہل تمول میں مشاہد و معروف ہے جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے پاس سامان راحت تو بہت جمع ہو جاتا ہے مگر جس کا نام راحت ہے وہ نصیب نہیں ہوتی، کیونکہ وہ قلب کے سکون و اطمینان کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔

**فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا:** اس میں قبض (انقباض) کا ذکر ہے جو گناہ یا غفلت کے سبب دل میں ایک تنگی پیدا ہو جاتی ہے، جس کا ظاہری

اثر عبادات کا ذوق وشوق، لطف وچین گم ہوجاتا ہے، اور حقیقی انقباض یہی ہے، دیگر اقسام محض صورتاً قبض ہیں۔

**وَّنَحۡشُرُهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اَعۡمٰى**: کافر کا قیامت میں اندھا اٹھنا قبر سے نکلنے کے وقت ہوگا، پھر یہ اندھا پن زائل ہوجائے گا، پس جن آیتوں میں کافروں کا جہنم کو دیکھنا اور باتیں سننا آیا ہے ان سے اسے کوئی تعارض نہیں۔

* * *

**فائدہ: ۱۔ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيۡشَةً ضَنۡكًا**: جو آدمی اللہ کی یاد سے غافل ہوکر محض دنیا کی فانی زندگی ہی کو قبلہ مقصود سمجھ بیٹھا ہے، اس کی گزران مکدر اور تنگ کردی جاتی ہے گو دیکھنے میں اس کے پاس بہت کچھ مال و دولت اور سامان عیش وعشرت نظر آئیں، مگر اس کا دل قناعت وتوکل سے خالی ہونے کی بناء پر ہروقت دنیا کی مزید حرص، ترقی کی فکر اور کمی کے اندیشہ میں بے آرام رہتا ہے، کسی وقت ننانوے کے پھیر سے قدم باہر نہیں نکلتا، موت کا یقین اور زوالِ دولت کے خطرات الگ سوہان روح رہتے ہیں، یورپ کے اکثر متنعّمین کو دیکھ لیجئے کسی کو رات دن میں دو گھنٹے اور کسی خوش قسمت کو تین چار گھنٹے سونا نصیب ہوتا ہوگا، بڑے بڑے کروڑ پتی دنیا کے مخمصوں سے تنگ آکر موت کو زندگی پر ترجیح دینے لگتے ہیں، اس نوع کی خودکشی کی بہت مثالیں پائی گئی ہیں، نصوص اور تجربہ اس پر شاہد ہیں کہ اس دنیا میں قلبی سکون اور حقیقی اطمینان کسی کو بدون یاد الٰہی کے حاصل نہیں ہوسکتا: اَلَا بِذِكۡرِ اللّٰهِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ لیکن "ذوق این بادہ ندانی بخدا تانہ چشی"۔

① بعض مفسرین نے **معیشۃ ضنك** کے معنی لیے ہیں وہ زندگی جس میں خیر داخل نہ ہوسکے، گویا خیر کو اپنے اندر لینے سے تنگ ہوگئی، ظاہر ہے کہ ایک کافر جو دنیا کے نشہ میں بدمست ہے اس کا سارا مال و دولت اور سامان عیش وتنعم آخر کار اس کے حق میں وبال بننے والا ہے، جس خوشحالی کا انجام چندروز کے بعد دائمی تباہی ہو، اسے خوشحالی کہنا کہاں زیبا ہے ② بعض مفسرین نے **مَعِيۡشَةً ضَنۡكًا** سے قبر کی برزخی زندگی مراد لی ہے، یعنی قیامت سے پہلے اس پر سخت تنگی کا ایک دور آئے گا جبکہ قبر کی زمین بھی اس پر تنگ کردی جائے گی، **معیشۃ ضنك** کی تفسیر عذاب قبر سے بعض صحابہ نے کی ہے بلکہ بزار نے باسناد جید ابوہریرہ رضی اللہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے، بہرحال **معیشۃً ضنکًا** کے تحت میں یہ سب صورتیں داخل ہوسکتی ہیں، واللہ اعلم۔

**فائدہ: ۲۔ وَّنَحۡشُرُهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اَعۡمٰى**: یعنی آنکھوں سے اندھا کرکے محشر کی طرف لایا جائے گا، اور دل کا بھی اندھا ہوگا کہ کسی حجت کی طرف راستہ نہ پائے گا، یہ ابتدائے حشر کا ذکر ہے پھر آنکھیں کھول دی جائیں گی، تاکہ دوزخ وغیرہ احوالِ محشر کا معائنہ کرے۔

**فائدہ: ۳۔ وَقَدۡ كُنۡتُ بَصِيۡرًا**: یعنی جو کافر دنیا میں ظاہری آنکھیں رکھتا تھا تعجب سے سوال کرے گا کہ آخر مجھ سے کیا قصور ہوا جو آنکھیں چھین لی گئیں۔

## قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتۡكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيۡتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الۡيَوۡمَ تُنۡسٰى ﴿۱۲۶﴾ وَكَذٰلِكَ نَجۡزِىۡ مَنۡ

فرمایا نہیں پہنچی تھیں تجھ کو ہماری آیتیں پھر تو نے ان کو بھلا دیا، اور اسی طرح آج تجھ کو بھلا دیں گے اور اسی طرح بدلہ دیں گے ہم اس کو جو

## اَسۡرَفَ وَلَمۡ يُؤۡمِنۡۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ؕ وَلَعَذَابُ الۡاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبۡقٰى ﴿۱۲۷﴾

حد سے نکلا اور یقین نہ لایا اپنے رب کی باتوں پر ۱۔ اور آخرت کا عذاب سخت ہے اور بہت باقی رہنے والا ۲۔

**خلاصہ تفسیر**: ارشاد ہوگا کہ (جیسی تجھ کو سزا ہوئی ہے) ایسا ہی (تجھ سے عمل ہوا تھا، وہ یہ کہ) تیرے پاس (انبیاء اور علماء کے واسطے سے) ہمارے احکام پہنچے تھے پھر تو نے انکا کچھ خیال نہ کیا اور ایسا ہی آج تیرا کچھ خیال نہ کیا جائے گا (جیسا تو نے خیال نہ کیا تھا) اور (جس طرح یہ عمل کے مناسب سزا دی گئی) اسی طرح (ہر) اس شخص کو ہم (عمل کے مناسب) سزا دیں گے جو حد (اطاعت) سے گزر جائے اور اپنے رب کی آیتوں پر ایمان نہ لائے، اور واقعی آخرت کا عذاب ہے بڑا سخت اور بڑا دیرپا (کہ اس کی کہیں انتہا ہی نہیں تو اس سے بچنے کا بہت ہی اہتمام واجب ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی دنیا میں ہماری آیات دیکھ سن کر یقین نہ لایا نہ ان پر عمل کیا، ایسا بھولا رہا کہ سب سنی ان سنی کر دی، آج اسی طرح تجھ کو بھلایا جارہا ہے، جیسے وہاں اندھا بنا رہا تھا، یہاں اسی کے مناسب سزا ملنے اور اندھا کر کے اٹھائے جانے پر تعجب کیوں ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی اسی طرح ہر ایک مجرم کو اس کے مناسب حال سزا دی جائے گی۔

**فائدہ:** ۳؎ اس لیے بڑی حماقت ہوگی کہ یہاں کی تکلیف سے گھبرائیں اور وہاں کے عذاب سے بچنے کی فکر نہ کریں، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی یہ عذاب اندھا ہونے کا حشر میں ہے اور دوزخ میں اور زیادہ''۔

| |
|---|
| اَفَلَمْ یَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ یَمْشُوْنَ فِیْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ |
| سو کیا ان کو سمجھ نہ آئی اس بات سے کہ کتنی غارت کر دیں ہم نے ان سے پہلی جماعتیں یہ لوگ پھرتے ہیں ان کی جگہوں میں |
| اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰى ﴿۱۲۸﴾ ع |
| اس میں خوب نشانیاں ہیں عقل رکھنے والوں کو |

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے آدم علیہ السلام کے قصہ کے ذریعہ اعراض کرنے والوں کو تنبیہ تھی، اس کے بعد اعراض اور غفلت کرنے والوں کے انجام کا ذکر تھا، آگے بھی انہی کے اقوال واحوال کی قباحت بیان کرتے ہیں اور ان کے اقوال واحوال سے جو حضور ﷺ کو رنج ہوتا تھا درمیان میں اس کا ازالہ اور آپ ﷺ کی تسلی کا مضمون ہے، اس مضمون کو شروع سورت کے مضمون سے بھی خاص مناسبت ہے، چنانچہ وہاں پہلی آیت میں آپ کے اوپر سے مشقت ختم کرنے کا مضمون تھا جو کفار کی باتوں سے غمگین ہونے کو بھی شامل ہے، دوسرے وہاں فرمایا کہ یہ قرآن ڈرنے والوں کے لیے نصیحت ہے، اس سے نہ ڈرنے والوں کا نصیحت نہ ماننا بھی معلوم ہوگیا، پس وہاں جو مضمون مجمل ہے یہاں اس کی تفصیل ہے۔

(یہ اعراض کرنے والے جو اعراض پر اصرار کر رہے ہیں تو) کیا ان لوگوں کو (اب تک) اس سے بھی ہدایت نہیں ہوئی کہ ہم ان سے پہلے بہت سے گروہوں کو (اس اعراض ہی کے سبب عذاب سے) ہلاک کر چکے ہیں کہ ان (میں سے بعض) کے رہنے کے مقامات میں یہ لوگ بھی چلتے (پھرتے) ہیں (کیونکہ شام کو جاتے ہوئے اہل مکہ کے رستہ میں بعض ان قوموں کے مکانات آتے تھے) اس (مذکورہ امر) میں تو اہل فہم کے (سمجھنے کے) لئے (کافی) دلائل موجود ہیں (جن سے اعراض کا برا ہونا معلوم ہوسکتا ہے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی آخرت میں جو سزا ملے گی اگر اس پر یقین نہیں آتا تو کیا تاریخی واقعات سے بھی سبق حاصل نہیں کرتے، ان ہی مکہ والوں کے آس پاس کتنی قومیں اپنے کفر وطغیان کی بدولت تباہ کی جا چکی ہیں جن کے افسانے لوگوں کی زبان پر باقی ہیں اور جن میں سے بعض کے کھنڈرات پر ملک شام وغیرہ کا سفر کرتے ہوئے خود ان کا گزر بھی ہوتا ہے، جنہیں دیکھ کر ان غارت شدہ قوموں کی یاد تازہ ہو جانا چاہیے کہ کس طرح انہی مکانوں میں چلتے پھرتے ہلاک کر دیے گئے۔

| |
|---|
| وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿۱۲۹﴾ ؕ |
| اور اگر نہ ہوتی ایک بات کہ نکل چکی تیرے رب کی طرف سے تو ضرور ہو جاتی مٹھ بھیڑ (گھمسان) اور اگر نہ ہوتا وعدہ مقرر کیا گیا |

**خلاصہ تفسیر:** اور (ان پر فوری عذاب نہ آنے سے جو ان کو اپنے طریقہ کے برا نہ ہونے کا شبہ ہوتا ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ) اگر آپ کے رب کی طرف سے ایک بات پہلے سے فرمائی ہوئی نہ ہوتی (وہ یہ کہ بعض مصلحتوں کی وجہ سے ان کو مہلت دی جائے گی) اور (عذاب کے لئے)

ایک میعاد معین نہ ہوتی ( کہ وہ قیامت کا دن ہے ) تو (ان کے کفر واعراض کی وجہ سے ) عذاب لازمی طور پر ہوتا ( خلاصہ یہ کہ کفر تو عذاب کو چاہتا ہے،لیکن ایک مانع کی وجہ سے توقف ہو رہا ہے، پس عذاب نہ ہونے سے ان کا وہ شبہ بالکل غلط ہے،غرضیکہ اِمہال [ مہلت ] ہے اِہمال [ غفلت ] نہیں )۔

* * *

**فائدہ:** یعنی حق تعالیٰ کی رحمت غضب پر سابق ہے، اسی لیے مجرم کو دیر تک اصلاح کا موقع دیتے ہیں اور پوری طرح اتمام حجت کے بدون ہلاک نہیں کرتے ، بلکہ اس امت کے متعلق تو یہ بھی فرما دیا ہے:وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ اور اپنی خاص مہربانی سے عذاب عام مستأصل کو اس امت سے اٹھالیا ہے، یہ بات ہے جو تیرے رب کی طرف سے نکل چکی اگر یہ نہ ہوتی اور ہر ایک مجرم قوم کے عذاب کا ایک خاص وقت مقرر نہ ہوتا تو لازمی طور پر ان کو عذاب آ گھیرتا، کیونکہ ان کا کفر وشرارت اسی کو مقتضی ہے کہ فوراً ہلاک کر دیے جائیں،صرف مصالح مذکورہ بالا مانع ہیں جن سے اس قدر توقف ہو رہا ہے، آخر قیامت میں عذاب عظیم کا مزا چکھنا پڑے گا،اور جب وقت آئے گا تو دنیا میں بھی اس گھمسان کا نمونہ دیکھ لیں گے، چنانچہ بدر میں مسلمانوں سے مڈبھیڑ ہوئی تو تھوڑا سا نمونہ دیکھ لیا۔

| |
|---|
| فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ |
| سو تو سہتا رہ جو وہ کہیں ۱؎ اور پڑھتا رہ خوبیاں اپنے رب کی سورج نکلنے سے پہلے اور غروب ہونے (ڈوبنے) سے پہلے ۲؎ |
| وَمِنْ اٰنَاۗئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ۝١٣٠ |
| اور کچھ گھڑیوں میں رات کی پڑھا کر ۳؎ اور دن کی حدوں پر ۴؎ شاید ( تا کہ ) تو راضی ہو ۵؎ |

**خلاصہ تفسیر:** سو (جب عذاب کا آنا یقینی ہے تو) آپ ان کی ( کفر آمیز ) باتوں پر صبر کیجئے ( اور بغض فی اللہ کی وجہ سے جوان پر غصہ آتا ہے اور تاخیر عذاب سے اضطراب ہوتا ہے اس اضطراب کو چھوڑ دیجیے ) اور اپنے رب کی حمد ( وثناء ) کے ساتھ ( اس کی ) تسبیح ( وتقدیس ) کیجئے ( اس میں نماز بھی آ گئی ) آفتاب نکلنے سے پہلے ( مثلاً نماز فجر ) اور اس کے غروب سے پہلے ( مثلاً نماز ظہر وعصر ) اور اوقات شب میں ( بھی ) کیا کیجئے ( مثلاً نماز مغرب وعشاء ) اور دن کے اول وآخر میں ( تسبیح کرنے کے واسطے اہتمام کے لئے مکرر کہا جاتا ہے جس سے نماز فجر ومغرب کے ذکر کا بھی اہتماماً تکرار ہو گیا ) تا کہ ( آپ کو ثواب ملے ) آپ ( اس سے ) خوش ہوں ( مطلب یہ کہ آپ اپنی توجہ معبود حقیقی کی طرف رکھئے کفار کی فکر نہ کیجئے )۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غیظ کی جو وجہ خلاصہ تفسیر میں بیان کی گئی ہے اس سے شفقت نہ ہونے کا شبہ جاتا رہا، نیز اس تقریر پر یہ آیت حکم جہاد سے منسوخ نہ ہو گی، کیونکہ اضطراب چھوڑ دینے سے لڑائی کا چھوڑنا لازم نہیں آتا۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ: یعنی عذاب اپنے وقت پر ہو کر رہے گا، تاخیر وامہال کو دیکھ کر یہ لوگ جو کچھ بکیں بکنے دو، آپ فی الحال ان کی باتوں کو سہتے رہیے اور صبر وسکون سے آخری نتیجہ کا انتظار کیجئے، ان کے کلمات کفر پر حد سے زیادہ مضطرب ہونے کی ضرورت نہیں۔

**فائدہ:** ۲؎ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا: یہ فجر اور عصر کی نمازیں ہوئیں، یعنی احمقوں اور شریروں کی باتوں پر دھیان نہ کرو، صبر وسکون کے ساتھ اپنے رب کی عبادت میں لگے رہو، کیونکہ خدا کی مدد صبر وصلوٰۃ دو چیزوں سے حاصل ہوتی ہے:وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ۔

**فائدہ:** ۳؎ وَمِنْ اٰنَاۗئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ: اس میں مغرب وعشاء بلکہ بعض تفاسیر کے موافق نماز تہجد بھی داخل ہے۔

**فائدہ:** ۴؎ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ: یہ ظہر کی نماز ہوئی، کیونکہ اس وقت دن کے نصف اول اور نصف آخر کی حدیں ملتی ہیں، بلکہ صحاح وقاموس وغیرہ میں تصریح کی ہے کہ "طرف طائفة من الشئی" یعنی کسی شئے کے حصہ کو کہتے ہیں، خاص حد اور کنارہ کے معنی نہیں اس صورت میں نہار کو جنس مان کر ہر دن کا ایک خاص حصہ مراد ہو سکتا ہے، جہاں دن کی تنصیف ہوتی ہے۔

**فائدہ:** ﴿لَعَلَّكَ تَرْضٰی﴾: یعنی ایسا طرزِ عمل رکھو گے تو ہمیشہ دنیا وآخرت میں راضی رہو گے، اس عمل کا بڑا بھاری اجر ملے گا اور امت کی مدد ہوگی دنیا میں اور بخشش ہوگی آخرت میں آپ کی سفارش سے جسے دیکھ کر آپ خوش ہوں گے۔

| |
|---|
| وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ |
| اور مت پسار اپنی آنکھیں اس چیز پر جو فائدہ اٹھانے (برتنے) کو دی ہم نے ان طرح طرح کے لوگوں کو رونق دنیا کی زندگی کی |
| لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿۱۳۱﴾ |
| ان کے جانچنے کو، اور تیرے رب کی دی ہوئی روزی بہتر ہے اور بہت باقی رہنے والی |

**خلاصہ تفسیر:** اور ہرگز ان چیزوں کی طرف آپ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھئے (جیسا کہ اب تک بھی نہیں دیکھا) جس سے ہم نے کفار کے مختلف گروہوں کو (مثلاً یہود ونصاریٰ ومشرکین کو) ان کی آزمائش کے لئے متمتع کر رکھا ہے کہ وہ (محض) دنیوی زندگی کی رونق ہے (مطلب اوروں کو سنانا ہے کہ جب معصوم نبی کے لئے یہ ممانعت ہے جن میں احتمال بھی نہیں تو غیر معصوم کو تو اس کا اہتمام کیونکر ضروری نہ ہوگا، ''آزمائش'' یہ کہ کون احسان مانتا ہے اور کون سرکشی کرتا ہے) اور آپ کے رب کا عطیہ (جو آخرت میں ملے گا) بدرجہا (اس سے) بہتر اور دیر پا ہے (کہ کبھی فنا ہی نہ ہوگا، خلاصہ کلام کا یہ ہوا کہ نہ ان کے اِعراض [بکسر الہمزہ] یعنی روگردانی کی پرواہ کیجیے، اور نہ ان کے اَعراض [بفتح الہمزہ] یعنی اسباب عیش کی طرف نظر کیجیے، سب کا انجام عذاب ہے)۔

﴿وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا﴾: اس میں دلالت ہے کہ جو چیز بھی اللہ کی یاد وفکر سے غافل کرنے والی ہو اس سے آنکھیں بند کر لینی چاہیے، یہ اصل ہے اہل اللہ کے ایک خصوصی عمل کی جسے ''نظر بر قدم'' کہا جاتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی دنیا میں قسم قسم کے کافروں مثلاً یہود، نصاریٰ، مشرکین، مجوسی وغیرہ کو ہم نے عیش وتنعم کے جو سامان دیے ہیں ان کی طرف آپ کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھئے (جیسے اب تک نہیں دیکھا) یہ محض چند روزہ بہار ہے جس کے ذریعہ سے ہم ان کا امتحان کرتے ہیں کہ کون احسان مانتا ہے اور کون سرکشی کرتا ہے، جو عظیم الشان دولت حق تعالیٰ نے (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے لیے مقدر کی ہے مثلاً قرآن کریم، منصب رسالت، فتوحاتِ عظیمہ، رفع ذکر اور آخرت کے اعلیٰ ترین مراتب اس کے سامنے ان فانی اور حقیر سامانوں کی کیا حقیقت ہے، آپ کے حصہ میں جو دولت آئی وہ ان کی دولتوں سے کہیں بہتر ہے اور بذاتِ خود یا اپنے اثر کے اعتبار سے ہمیشہ باقی رہنے والی ہے، بہرحال آپ نہ ان کی تکذیب واعراض سے مضطرب ہوں نہ ان کے ساز وسامان اور مال ودولت کی طرف نظر التفات اٹھائیں۔

| |
|---|
| وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ؕ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ؕ |
| اور حکم کر اپنے گھر والوں کو نماز کا اور خود بھی قائم رہ اس پر، ہم نہیں مانگتے تجھ سے روزی، ہم روزی دیتے ہیں تجھ کو |
| وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴿۱۳۲﴾ |
| انجام بھلا ہے پرہیزگاری کا۔ |

**خلاصہ تفسیر:** اور اپنے متعلقین کو (یعنی اہل خاندان کو یا مؤمنین کو) بھی نماز کا حکم کرتے رہئے اور خود بھی اس کے پابند رہئے

(یعنی زیادہ توجہ کے قابل یہ امور ہیں) ہم آپ سے اور (اسی طرح دوسروں سے ایسے) معاش (کموانا) نہیں چاہتے (جو طاعات ضروری میں رکاوٹ ہوں) معاش تو آپ کو (اور اسی طرح اوروں کو) ہم دیں گے (یعنی مقصود اصلی کسب معاش نہیں، بلکہ دین اور طاعت ہے، کسب معاش کی اسی حالت میں اجازت یا امر ہے جبکہ اس سے ضروری اطاعت میں خلل نہ ہوتا ہو) اور بہتر انجام تو پرہیزگاری ہی کا ہے (اس لئے ہم حکم دیتے ہیں لَا تَمُدَّنَّ اور وَأْمُرْ أَهْلَكَ الخ)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی اپنے متعلقین اور اتباع کو بھی نماز کی تاکید فرماتے رہیے، حدیث میں آپ نے فرمایا کہ بچہ جب سات برس کا ہو جائے تو (عادت ڈالنے کے لیے) نماز پڑھواؤ، جب دس برس کا ہو تو مار کر پڑھاؤ۔

**فائدہ:** ۲ دنیا میں مالک غلاموں سے روزی کمواتے ہیں، وہ مالک بندگی چاہتا ہے اور غلاموں کو روزی آپ دیتا ہے (کذا فی الموضح) غرض ہماری نماز سے اس کا کچھ فائدہ نہیں، البتہ ہمارا فائدہ ہے کہ نماز کی برکت سے بے غائلہ روزی ملتی ہے: وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَّهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ اسی لیے اگر فرض نماز اور کسب معاش میں تعارض ہو تو اللہ تعالیٰ اجازت نہیں دیتا کہ کسب معاش کے مقابلہ میں نماز ترک کردو، نماز بہرحال ادا کرنی ہے، روزی پہنچانے والا وہ خدا ہے جس کی نماز پڑھتے ہیں، الحاصل کسب معاش کے ان ذرائع کا خدا تعالیٰ نے حکم نہیں دیا جو ادائے فرائض عبودیت میں مخل و مزاحم ہوں، انسان کو چاہیے کہ پرہیزگاری اختیار کرے، انجام کار دیکھ لے گا کہ خدا کس طرح اس کی مدد کرتا ہے۔

وَقَالُوا لَوْلَا يَأْتِينَا بِآيَةٍ مِّن رَّبِّهِ ۚ أَوَلَمْ تَأْتِهِم بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ ﴿١٣٣﴾

اور لوگ کہتے ہیں یہ کیوں نہیں لے آتا ہمارے پاس کوئی نشانی اپنے رب سے ۱ کیا پہنچ نہیں چکی ان کو نشانی اگلی کتابوں میں کی ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور (معترضین کے بعض احوال واقوال جو پیچھے بیان ہوئے اسی طرح ان کی ایک اور بات بھی مذکور ہوتی ہے کہ) وہ لوگ (عناداً) یوں کہتے ہیں کہ یہ رسول ہمارے پاس کوئی نشانی (اپنی نبوت کی) کیوں نہیں لاتے؟ (آگے جواب ہے کہ) کیا ان کے پاس پہلی کتابوں کے مضمون کا ظہور نہیں پہنچا (مراد اس سے قرآن ہے کہ اس کے ذریعہ پہلی کتابوں کی پیشین گوئی کا سچا ہونا ظاہر ہوگیا، مطلب یہ ہے کہ کیا ان کے پاس قرآن نہیں پہنچا جس کی پہلے سے شہرت تھی اور وہ نبوت پر کافی دلیل ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی کوئی ایسی کھلی نشانی کیوں نہیں دکھلاتے جس کے بعد ہم کو انکار کی گنجائش ہی نہ رہے، ورنہ اس روز روز کی تہدید وتخویف سے کیا فائدہ۔

**فائدہ:** ۲ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی اگلی کتابوں میں خبر ہے رسول آخر الزماں ﷺ کی، یا یہ معنی کہ پہلے پیغمبروں کی نشانی کافی ہے، یہ پیغمبر بھی اصولاً ان ہی باتوں کی تقید کرتا ہے کوئی انوکھی بات نہیں کہتا، یا یہ نشانی کی اگلی کتابوں کے موافق واقعات بیان کرتا ہے''، اور بہترین تفسیر میرے نزدیک وہ ہے جو ابن کثیر وغیرہ نے اختیار کی، یعنی یہ لوگ ہٹ دھرمی سے کہتے ہیں کہ کوئی نشانی کیوں نہیں لایا، کیا اور سینکڑوں نشانات کے علاوہ سب سے بڑا عظیم الشان یہ قرآن ان کے پاس نہیں آچکا جو اگلی کتابوں کے ضروری مضامین کا محافظ اور ان کی صداقت کے لیے بطور حجت اور گواہ کے ہے اور جس کا اعجاز آفتاب سے زیادہ روشن ہے: وَقَالُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَاتٌ مِّن رَّبِّهِ ۖ قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِندَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَرَحْمَةً وَذِكْرَىٰ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ

وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ

اور اگر ہم ہلاک کر دیتے ان کو کسی آفت میں اس سے پہلے تو کہتے اے رب کیوں نہ بھیجا ہم تک کسی کو پیغام دے کر کہ ہم چلتے

اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى ﴿١٣٤﴾ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ

تیری کتاب پر ذلیل اور رسوا ہونے سے پہلے، تو کہہ ہر کوئی راہ دیکھتا ہے سو تم بھی راہ دیکھو، آئندہ جان لو گے کون ہیں

الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى ﴿١٣٥﴾ ع

سیدھی راہ والے اور کس نے راہ پائی ۱ے

**خلاصہ تفسیر**: اور اگر ہم ان کو قبل قرآن آنے کے (کفر کی سزا میں) کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے (اور پھر قیامت کے روز کفر کی اصلی سزا دی جاتی کہ وہ لازم ہی تھی) تو یہ لوگ (عذر کے طور پر) یوں کہتے کہ اے ہمارے رب! آپ نے ہمارے پاس کوئی رسول (دنیا میں) کیوں نہ بھیجا تھا کہ ہم آپ کے احکام پر چلتے قبل اس کے کہ ہم (یہاں خود) بے قدر ہوں اور (دوسروں کی نگاہ میں) رسوا ہوں (سو اب اس عذر کی بھی گنجائش نہیں رہی، اور اگر وہ یوں کہیں کہ وہ عذاب کب ہوگا تو) آپ کہہ دیجئے کہ (ہم) سب انتظار کر رہے ہیں، سو (چندے) اور انتظار کر لو، اب عنقریب تم کو (بھی) معلوم ہو جائے گا کہ راہ راست والے کون ہیں اور وہ کون ہے جو (منزل) مقصود تک پہنچا (یعنی وہ فیصلہ عنقریب موت یا حشر کے بعد ظاہر ہو جائے گا)۔

* * *

**فائدہ**: ۱ے یعنی ایسا عظیم الشان نشان دیکھنے کے بعد تو کہتے ہیں کہ کوئی نشان کیوں نہ لایا، اور فرض کرو ہم یہ نشان نہ دکھاتے، یعنی قرآن نازل نہ کرتے، بس انزال کتاب اور ارسال رسول سے پہلے ہی کفر و شرک کی سزا میں ان کو دھر گھسیٹتے، تو شور مچاتے کہ صاحب! سزا دینے سے بیشتر ہمارے پاس کوئی کتاب اور سمجھانے والا تو بھیجنا تھا کہ ہم کو ذلت و رسوائی اٹھانے سے قبل آگاہ کر دیتا، پھر دیکھتے کہ ہم آپ کے کہنے پر کیسا چلتے، غرض قرآن نہ آتا تو یوں کہتے، اب آیا تو اسے چھوڑ کر دوسری من گھڑت نشانیوں کا مطالبہ کرنے لگے، ان کا مقصود ہدایت حاصل کرنا ہی نہیں، فضول حیلے بہانے تراشتے رہتے ہیں، سو خیر ان سے کہہ دو کہ ہم اور تم دونوں انتظار کرتے ہیں کہ عنقریب پردہ غیب سے کیسا مستقبل سامنے آتا ہے، اس وقت سب حقیقت آشکارا ہو جائے گی کہ کس جماعت کا راستہ سیدھا ہے؟ اور کون اس راستہ پر ٹھیک چل رہا ہے؟

ایاتها ۱۱۲ ۲۱ سُوْرَةُ الْاَنْبِيَآءِ مَكِّيَّةٌ ٧٣ رکوعاتها ۷

**خلاصه تفسیر:** اس سورت میں یہ مضامین ہیں: تحقیق آخرت، تحقیق نبوت، تحقیق توحید اورتوحید ورسالت کی تائید کے لیے بعض انبیاءعلیہم السلام کے قصے بیان ہوئے اور یہ مضامین بھی خصوصا قصوں کا مضمون سورہ طہ کے ساتھ مناسب رکھتا ہے، سورہ طہ کے ختم پر کہا گیا کہ عنقریب حقیقت کا انکشاف ہوجائے اوراس سورت کے شروع میں حساب کے قریب ہونے کا ذکر ہے، یہ مناسبت ہے گذشتہ سورت کے اختتام اوراس کے آغاز میں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

| |
|---|
| اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ① |
| نزدیک آگیا لوگوں کے ان کے حساب کا وقت، اور وہ بے خبر ٹلا رہے ہیں |

**خلاصه تفسیر:** ان (منکر) لوگوں سے ان کا (وقت) حساب نزدیک آپہنچا (یعنی قیامت وقتاً فوقتاً نزدیک ہوتی جاتی ہے) اور یہ (ابھی) غفلت (ہی) میں (پڑے) ہیں (اوراس کے یقین کرنے اوراس کے لئے تیاری کرنے سے) اعراض کئے ہوئے ہیں۔

**وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ:** اس میں اس مذموم غفلت کی طرف اشارہ ہے کہ جس میں اعراض ہو (یعنی جان بوجھ کر سب کچھ جانتے ہوئے ہوئے انکار، بغاوت اور آخرت سے منہ موڑے ہوئے ہو) مطلق غفلت مراد نہیں جس سے عادتا کوئی بھی خالی نہیں (یعنی وہ لوگ مراد نہیں جو کبھی کبھی غفلت کا شکار ہوجاتے ہیں)۔

* * *

**فائده:** یعنی حساب وکتاب اور مجازات کی گھڑی سر پر کھڑی ہے لیکن یہ لوگ (مشرکین وغیرہ) سخت غفلت و جہالت میں پھنسے ہوئے ہیں ،کوئی تیاری قیامت کی جوابدہی کے لیے نہیں کرتے اور جب آیات اللہ سنا کر خواب غفلت سے چونکائے جاتے ہیں تو نصیحت سن کر نہایت لاپرواہی کے ساتھ ٹلا دیتے ہیں، گویا کبھی ان کو خدا تعالیٰ کے حضور پیش ہونا اور حساب دینا ہی نہیں، سچ ہے: "اَلنَّاسُ فِيْ غَفَلَاتِهِمْ وَ رَحَى الْمَنِيَّةِ تَطْحَنُ".

| |
|---|
| مَا يَأْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ② لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاَسَرُّوا |
| کوئی نصیحت نہیں پہنچتی اُن کو اُن کے رب سے نئی، مگر اُس کو سنتے ہیں کھیل میں لگے ہوئے۔ کھیل میں پڑے ہیں دل ان کے اور چھپا کر |
| النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ③ |
| مصلحت کی بے انصافوں نے، یہ شخص کون ہے ایک آدمی ہے تم ہی جیسا، پھر کیوں پھنستے ہو اس کے جادو میں آنکھوں دیکھتے ۲ |

**خلاصه تفسیر:** (ان کی غفلت یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ) ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے جو نصیحت تازہ (ان کے حسب حال) آتی ہے (بجائے اس کے کہ خبردار ہوتے) یہ اس کو ایسے طور سے سنتے ہیں کہ (اس کے ساتھ) ہنسی کرتے ہیں (اور) ان کے دل (اصلاً ادھر) متوجہ نہیں ہوتے، اور یہ لوگ یعنی ظالم (اور کافر) لوگ (آپس میں) چپکے چپکے سرگوشی کرتے ہیں (اس لئے نہیں کہ ان کو اہل اسلام کا خوف تھا، کیونکہ مکہ میں کفار کمزور نہ تھے، بلکہ اس لئے کہ اسلام کے خلاف خفیہ سازش کر کے اس کو مٹائیں) کہ یہ (یعنی محمد ﷺ) محض تم جیسے ایک (معمولی) آدمی ہیں

(یعنی نبی نہیں اور یہ جو ایک دلکش ودلربا کلام سناتے ہیں اس پر معجزہ ہونے کا شبہ اور اس معجزے سے ان کی نبوت کا خیال نہ کرنا، کیونکہ وہ حقیقت میں سحر آمیز کلام ہے) تو کیا (باوجود اس بات کے) پھر بھی تم جادو کی بات سننے کو (ان کے پاس) جاؤ گے حالانکہ تم (اس بات کو خوب) جانتے (بوجھتے) ہو۔

**وَاَسَرُّوا النَّجْوَى**: یہ باتیں چھپا کر اس لیے نہ کرتے تھے کہ اہل اسلام کا کچھ خوف تھا، کیونکہ مسلمان تو مکہ میں کمزور تھے، بلکہ اسلام کی اشاعت روکنے کے لیے تدبیر اور تمہید کرتے تھے اور عام طور پر ایسی باتوں کو خفیہ ہی کیا جاتا ہے۔

* * *

**فائدہ: ۱**۔ یعنی قرآن کی بڑی بیش قیمت نصیحتوں کو محض ایک کھیل تماشہ کی حیثیت سے سنتے ہیں جن میں اگر اخلاص کے ساتھ غور کرتے تو سب دین و دنیا درست ہو جاتی، لیکن جب دل ہی ادھر سے غافل ہیں اور کھیل تماشہ میں پڑے ہیں تو غور کرنے کی نوبت کہاں سے آئے۔

**فائدہ: ۲**۔ جب نصیحت سنتے سنتے تنگ آ گئے تو چند بے انصافوں نے خفیہ میٹنگ کر کے قرآن اور پیغمبر کے متعلق کہنا شروع کیا کہ یہ پیغمبر تو ہمارے جیسے ایک آدمی ہیں، نہ فرشتہ ہیں، نہ ہم سے زیادہ کوئی ظاہری امتیاز رکھتے ہیں، البتہ ان کو جادو آتا ہے، جو کلام پڑھ کر سناتے ہیں وہ ہو نہ ہو جادو کا کلام ہے، پھر تم کو کیا مصیبت نے گھیرا کہ آنکھوں دیکھتے ان کے جادو میں پھنستے ہو، لازم ہے کہ ان کے قریب نہ جاؤ، قرآن کو جادو شاید اس کی قوت تاثیر اور حیرت انگیز تصرف کو دیکھ کر کہا اور خفیہ میٹنگ اس لیے کی کہ آئندہ حق کے خلاف جو تدابیر کرنے والے تھے یہ اس کی تمہید تھی اور ظاہر ہے کہ ہوشیار دشمن اپنی معاندانہ کارروائیوں کو قبل از وقت طشت از بام کرنا پسند نہیں کرتا اندر ہی اندر آپس میں پروپیگنڈا کیا کرتا ہے۔

| |
|---|
| قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۡ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ④ |
| اس (پیغمبر) نے کہا میرے رب کو خبر ہے بات کی، آسمان میں ہو یا زمین میں، اور وہ ہے سننے والا جاننے والا |

**خلاصہ تفسیر**: پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب دینے کا حکم ہوا، اور انہوں) نے (حکم کے موافق جواب میں) فرمایا کہ میرا رب ہر بات کو (خواہ) آسمان میں ہو اور (خواہ) زمین میں ہو (خواہ ظاہر ہو یا خفی ہو خوب) جانتا ہے، اور وہ خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے (سو تمہارے ان اقوال کفریہ کو بھی جانتا ہے اور تم کو خوب سزا دے گا)۔

* * *

**فائدہ**: پیغمبر نے فرما دیا کہ تم کتنے ہی چھپا کر مشورے کرو، اللہ کو سب خبر ہے، وہ تو آسمان و زمین کی ہر بات کو جانتا ہے، پھر تمہارے راز اور سازشیں اس سے کہاں پوشیدہ رہ سکتی ہیں۔

| |
|---|
| بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚۖ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ⑤ |
| اسکو چھوڑ کر کہتے ہیں بیہودہ (پریشان) خواب ہیں، نہیں جھوٹ باندھ لیا ہے، نہیں شعر کہتا ہے، پھر چاہیے لے آئے ہمارے پاس کوئی نشانی، جیسے پیغام لیکر آئے ہیں پہلے |

**خلاصہ تفسیر**: (انہوں نے قرآن کو صرف جادو کہنے پر اکتفا نہیں کیا) بلکہ یوں (بھی) کہا کہ یہ (قرآن) پریشان خیالات ہیں (کہ واقع میں دلکش بھی نہیں) بلکہ (اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ) انہوں نے (یعنی پیغمبر نے) اس کو (قصداً و اختیاراً اپنے دل سے) تراش لیا ہے (اور پریشان خیالات میں تو انسان کسی قدر بے اختیار اور معذور بھی ہوتا ہے، کیونکہ شبہ میں مبتلا ہوتا ہے، اور یہ تراشیدہ ہونا کچھ قرآن ہی کے ساتھ خاص نہیں) بلکہ یہ تو ایک شاعر شخص ہیں (ان کی تمام باتیں ایسی ہی تراشیدہ اور خیالی ہوتی ہیں، خلاصہ یہ کہ رسول نہیں ہیں اور اگر رسالت کے بڑے مدعی ہیں) تو ان کو چاہئے کہ ہمارے پاس ایسی کوئی (بڑی) نشانی لائیں جیسا پہلے لوگ رسول بنائے گئے (اور انہوں نے بڑے بڑے معجزات ظاہر کئے، یہ اگر ویسے ہی معجزے لائیں تو اس وقت ہم رسول مانیں اور ایمان لائیں، یہ کہنا بھی ایک بہانہ تھا ورنہ وہ پہلے انبیاء کو بھی نہ مانتے تھے)۔

* * *

**فائدہ:** قرآن سن کر ضد اور ہٹ دھرمی سے ایسے بدحواس ہو جاتے تھے کہ کسی ایک رائے پر قرار نہ تھا، کبھی اسے جادو بتاتے، کبھی پریشان خوابیں کہتے، کبھی دعویٰ کرتے کہ آپ اپنے جی سے کچھ باتیں جھوٹ گھڑ لائے ہیں جن کا نام قرآن رکھ دیا ہے، نہ صرف یہ ہی بلکہ آپ ایک عمدہ شاعر ہیں اور شاعروں کی طرح تخیل کی بلند پروازی سے کچھ مضامین موثر اور مسجع عبارت میں پیش کر دیتے ہیں، اگر واقع میں ایسا نہیں تو چاہیے کہ آپ کوئی ایسا کھلا معجزہ دکھلائیں جیسے معجزات پہلے پیغمبروں نے دکھلائے تھے، یہ کہنا بھی محض عناد سے دق کرنے کے لیے تھا، کیونکہ اول تو مکہ کے یہ جاہل مشرک پہلے پیغمبروں اور ان کے معجزات کو کیا جانتے تھے، دوسرے آپ کے بیسیوں کھلے کھلے نشان دیکھ چکے تھے جو انبیائے سابقین کے نشانات سے کسی طرح کم نہ تھے جن میں سب سے بڑھ کر یہ ہی قرآن کا معجزہ تھا، وہ دل میں سمجھتے تھے کہ نہ یہ جادو کی مہمل عبارتیں ہیں، نہ بیہودہ خواب ہیں، نہ شاعری ہے، اسی لیے جب کوئی ایک بات چسپاں نہ ہوتی تو اسے چھوڑ کر دوسری بات کہنے لگتے تھے، اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا (الفرقان:۴۵)۔

| مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ⑥ |
|---|
| نہیں مانا ان سے پہلے کسی بستی نے جن کو غارت کر دیا ہم نے، کیا اب یہ مان لیں گے |

**خلاصہ تفسیر:** (حق تعالیٰ جواب میں فرماتے ہیں کہ) ان سے پہلے کوئی بستی والے جن کو ہم نے ہلاک کیا ہے (ان کے فرمائشی معجزات ظاہر ہو جانے کے باوجود) ایمان نہیں لائے، سو کیا یہ لوگ (ان معجزات کے ظاہر ہونے پر) ایمان لے آئیں گے (اور ایسی حالت میں ایمان نہ لانے پر عذاب نازل ہو جائے گا، اس لئے ہم وہ فرمائشی معجزات ظاہر نہیں کرتے اور قرآن معجزہ کافی ہے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی پہلی قوموں کو فرمائشی نشان دکھلائے گئے، وہ انھیں دیکھ کر بھی نہ مانے، آخر سنت اللہ کے موافق ہلاک کیے گئے، اگر ان مشرکین مکہ کی فرمائشیں پوری کی جائیں تو ظاہر ہے یہ ماننے والے تو ہیں نہیں، لامحالہ حق تعالیٰ کی عام عادت کے موافق تباہ کیے جائیں گے اور ان کی بالکلیہ تباہی مقصود نہیں، بلکہ حکمت الٰہیہ فی الجملہ ان کے باقی رکھنے کو مقتضی ہے۔

| وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ⑦ |
|---|
| اور پیغام نہیں بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے مگر یہی مردوں کے ہاتھ وحی (حکم) بھیجتے تھے ہم ان کو، سو پوچھ لو یاد رکھنے والوں سے اگر تم نہیں جانتے |

**خلاصہ تفسیر:** اور (رسالت کے متعلق جو ان کا یہ شبہ ہے کہ رسول آدمی نہیں ہونا چاہئے، اس کا جواب یہ ہے کہ) ہم نے آپ سے قبل صرف آدمیوں ہی کو پیغمبر بنایا ہے جن کے پاس ہم وحی بھیجا کرتے تھے، سو (اے منکرو!) اگر تم کو (یہ بات) معلوم نہ ہو تو اہل کتاب سے دریافت کر لو (کیونکہ یہ لوگ اگرچہ کافر ہیں مگر خبر متواتر میں راوی کا مسلمان یا ثقہ ہونا شرط نہیں، وہ اس کے بغیر بھی حجت ہے، پھر تم انہیں اپنا دوست سمجھتے ہو تو تمہارے نزدیک ان کی بات معتبر ہونی چاہئے)۔

**وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا:** اس آیت سے جمہور نے استدلال کیا ہے مردوں کے ساتھ رسالت کے خاص ہونے پر، میں کہتا ہوں کہ اگر بالفرض یہ تخصیص بھی مسلّم نہ ہو تو غالب کا تو انکار ہو ہی نہیں سکتا (یعنی نبوت و رسالت ہمیشہ مردوں کو ہی دی گئی ہے) اور یہ اہل طریق کی اس عادت کی اصل ہے کہ خلافت مردوں کو ہی دیتے ہیں۔

**فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ:** اس سے معلوم ہوا کہ جاہل آدمی جس کو احکام شریعت معلوم نہ ہوں اس پر عالم کی تقلید واجب ہے کہ عالم سے دریافت کر کے اس کے مطابق عمل کرے۔

* * *

**فائدہ:** یہ ان کے قول هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کا جواب ہوا، یعنی پہلے بھی جو پیغمبر آئے جن کی مانند نشانیاں دکھلانے کا آنحضرت ﷺ سے مطالبہ کرتے ہو، وہ آنحضرت ﷺ کی طرح بشر تھے، فرشتے نہ تھے، اگر اتنی مشہور و مستفیض بات کی بھی اپنی جہالت کی وجہ سے تم کو خبر نہیں، تو خبر رکھنے والوں سے دریافت کرلو، آخر یہود ونصاریٰ اہل کتاب سے تمہارے تعلقات ہیں، اتنی موٹی بات ان سے ہی پوچھ لینا کہ پہلے زمانوں میں جو انبیاء ورسل تشریف لائے وہ بشر تھے یا آسمان کے فرشتے۔

وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ۝۸

اور نہیں بنائے تھے ہم نے ان کے ایسے بدن کہ وہ کھانا نہ کھائیں اور نہ تھے وہ ہمیشہ رہ جانے والے ۱؎

ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ۝۹

پھر سچا کر دیا ہم نے ان سے وعدہ، سو بچا دیا ان کو، اور جس کو ہم نے چاہا، اور غارت کر دیا حد سے نکلنے والوں کو ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (وہ لوگ رسالت کے متعلق اس شبہ کو دوسرے عنوان سے تعبیر کرتے تھے کہ رسول فرشتہ ہونا چاہئے، اس کا جواب یہ ہے کہ) ہم نے ان رسولوں کے (جو کہ گذر چکے ہیں) ایسے بدن نہیں بنائے تھے جو کھانا نہ کھاتے ہوں (یعنی فرشتہ نہ بنایا تھا) اور (یہ لوگ جو آپ کی وفات کے انتظار میں خوشیاں منا رہے ہیں یہ وفات بھی نبوت کے منافی نہیں، کیونکہ) وہ (گزشتہ) حضرات (بھی دنیا میں) ہمیشہ رہنے والے نہیں ہوئے (پس اگر آپ کی بھی وفات ہوجائے تو اس سے نبوت میں کیا اعتراض لازم آیا، غرض جیسے پہلے رسول تھے ویسے ہی آپ بھی ہیں، اور یہ لوگ جس طرح آپ کی تکذیب کرتے ہیں اسی طرح ان حضرات کی بھی اس زمانے کے کفار نے تکذیب کی) پھر ہم نے جو ان سے وعدہ کیا تھا (جھٹلانے والوں کو عذاب سے ہلاک کریں گے، تمہیں اور مؤمنین کو محفوظ رکھیں گے ہم نے) اس (وعدہ) کو سچا کیا، ان کو اور جن جن کو (نجات دینا) منظور ہوا (اس عذاب سے) ہم نے نجات دی اور (اس عذاب سے) حد (اطاعت) سے گزرنے والوں کو ہلاک کیا (سو ان لوگوں کو ڈرنا چاہئے)۔

**وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ:** یہ آیت دلیل ہے اس پر کہ کھانا وغیرہ نہ کھانا کمالات وفضائل اور مقبولیت کی علامات میں شامل نہیں ہے، جیسا کہ عام لوگ بلکہ بعض خاص لوگ بھی ایسا خیال کرتے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی بشری خصائص ان میں موجود تھیں، نہ فرشتوں کی طرح ان کا بدن ایسا تھا کہ کبھی کھانا نہ کھا سکتے، نہ وہ خدا تھے کہ کبھی موت اور فنا نہ آئے ہمیشہ زندہ رہا کریں۔

**فائدہ:** ۲؎ ان کا امتیاز دوسرے بندوں سے یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخلوق کی ہدایت واصلاح کیلئے کھڑے کیے گئے تھے، خدا اُن کی طرف وحی بھیجتا، اور باوجود بے سروسامانی کے مخالفین کے مقابلہ میں ان کی حمایت ونصرت کے وعدے کرتا تھا، چنانچہ اللہ نے اپنے وعدے سچے کر دکھائے، ان کو مع رفقاء کے محفوظ رکھا اور بڑے بڑے متکبر دشمن جو ان سے ٹکرائے تباہ وغارت کر دیئے گئے، بیشک محمد ﷺ بھی بشر ہیں، لیکن اسی نوع کے بشر ہیں جن کی اعانت وحمایت ساری دنیا کے مقابلہ میں کی جاتی ہے، ان کے مخالفین کو چاہیے کہ اپنا انجام سوچ رکھیں اور پہلی قوموں کی مثالوں سے عبرت حاصل کریں، کہیں آخرت کے حساب سے پہلے دنیا ہی میں حساب شروع نہ کر دیا جائے۔

ع لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۰

ہم نے اتاری ہے تمہاری طرف کتاب کہ اس میں تمہارا ذکر ہے، کیا تم سمجھتے نہیں

**خلاصہ تفسیر:** (اے منکرو! اس تکذیب کے بعد تم پر دنیا و آخرت میں عذاب آئے تو تعجب نہیں کیونکہ) ہم تمہارے پاس ایسی

کتاب بھیج چکے ہیں کہ اس میں تمہاری نصیحت (کافی) موجود ہے، کیا (ایسی تبلیغ و نصیحت کے باوجود) پھر بھی تم نہیں سمجھتے (اور نہیں مانتے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی قرآن کے ذریعہ سے تم کو ہر قسم کی نصیحت و فہمائش کردی گئی اور سب برا بھلا انجام سمجھا دیا گیا، اگر کچھ بھی عقل ہوگی تو عذاب الٰہی سے اپنے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرو گے اور قرآن کی قدر پہچانو گے جو فی الحقیقت تمہارے مجد و شرف کی ایک بڑی دستاویز ہے، کیونکہ تمہاری زبان میں اور تمہاری قوم کے ایک فرد کامل پر اترا اور دنیا میں تم کو شہرت دائمی عطا کی، اگر اپنے ایسے محسن کو نہ مانو گے تو دنیا میں ذلیل ہوگے اور آخرت کا عذاب الگ رہا۔

**ربط:** آگے ان قوموں کا دنیاوی انجام بیان فرماتے ہیں جنہوں نے انبیاء سے دشمنی کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیے تھے:

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ﴿۱۱﴾ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا

اور کتنی پیس ڈالیں ہم نے بستیاں جو تھیں گناہ گار، اور اُٹھا کھڑے کیے ان کے پیچھے اور لوگ ۱؎ پھر جب آہٹ پائی انہوں نے

بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ﴿۱۲﴾ لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ

ہماری آفت کی تب لگے وہاں سے ایڑ کرنے (بھاگنے)، ایڑ مت کرو (مت بھاگو) اور لوٹ جاؤ جہاں تم نے عیش کیا تھا

وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ﴿۱۳﴾

اور اپنے گھروں میں، شاید کوئی تم کو (تمہاری بات) پوچھے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** گذشتہ آیات میں منکرین کی مذمت اور ان کا عذاب الٰہی سے ہلاک ہونا اجمالا بیان کیا گیا، آگے بھی اسی کی کسی قدر تفصیل ہے۔

اور ہم نے بہت سی بستیاں جن کے رہنے والے ظالم (یعنی کافر) تھے تباہ کر ڈالیں اور ان کے بعد دوسری قوم پیدا کردی، سو جب ان ظالموں نے ہمارا عذاب آتا دیکھا تو اس بستی سے بھاگنا شروع کیا (تاکہ عذاب سے بچ جائیں، حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ) بھاگو مت اور اپنے سامان عیش اور اپنے مکانات کی طرف واپس چلو شاید تم سے کوئی پوچھے پاچھے (کہ تم پر کیا گزری، مقصود اس سے تعریض کے طور پر ان کی احمقانہ جسارت پر تنبیہ ہے کہ جس سامان اور مکان پر تم کو ناز تھا اب نہ وہ سامان رہا، نہ مکان، نہ کسی دوست ہمدرد کا نام و نشان رہا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی یہ نہیں کہ ان کے نیست و نابود کر دینے سے اللہ کی زمین اجڑ گئی، وہ گئے، دوسروں کو ان کی جگہ بسا دیا گیا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی جب عذاب الٰہی سامنے آ گیا تو چاہا کہ وہاں سے نکل بھاگیں اور بھاگ کر جان بچالیں، اس وقت تکوینی طور پر کہا گیا کہ بھاگتے کہاں ہو، ٹھہرو، اور ادھر ہی واپس چلو جہاں عیش کیے تھے اور جہاں بہت سے سامان تنعم جمع کر رکھے تھے، شاید وہاں کوئی تم سے پوچھے کہ حضرت! وہ مال و دولت اور زور و قوت کا نشہ کیا ہوا؟ وہ سامان کدھر گئے؟ اور جو نعمتیں خدا نے دے رکھی تھیں ان کا شکر کہاں تک ادا کیا تھا؟ یا یہ کہ آپ بڑے آدمی تھے جن کی ہر موقع پر پوچھ ہوتی تھی، اب بھی وہیں چلیے، بھاگنے کی ضرورت نہیں تاکہ لوگ اپنے مہمات میں آپ سے مشورے کر سکیں اور آپ کی رائیں دریافت کر سکیں؟ (یہ سب باتیں تحکما کہی گئی ہیں)۔

قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ﴿۱۴﴾ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ﴿۱۵﴾

کہنے لگے ہائے! خرابی ہماری، ہم تھے بیشک گنہگار، پھر برابر یہی رہی ان کی فریاد، یہاں تک کہ ڈھیر کر دیے گئے کاٹ کر، بجھے پڑے ہوئے

**خلاصہ تفسیر:** وہ لوگ (نزول عذاب کے وقت) کہنے لگے کہ ہائے ہماری کم بختی بیشک ہم لوگ ظالم تھے، سو ان کا یہی شور و غل

رہا یہاں تک کہ ہم نے ان کو ایسا (نیست ونابود) کر دیا جس طرح کھیتی کٹ گئی ہو یا آگ بجھ گئی ہو۔

يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ: یہ اعتراف اور ندامت ان کو اس لیے نافع نہ ہوئی کہ عذاب کے فرشتوں کو دیکھنے کے بعد ہوئی، جیسا کہ فرعون نے ڈوبتے ہوئے کہا تھا کہ میں اب ایمان لاتا ہوں، واللہ اعلم۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جب عذاب آنکھوں سے دیکھ لیا تب اپنے جرموں کا اعتراف کیا، اور برابر یہی چلاتے رہے کہ بیشک ہم ظالم اور مجرم ہیں، لیکن "اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت" یہ وقت قبول توبہ کا نہ تھا، اعتراف وندامت اس وقت سب بیکار چیزیں تھیں، آخر اس طرح ختم کر دیئے گئے جیسے کھیتی ایک دم میں کاٹ کر ڈھیر کر دی جاتی ہے، یا آگ میں جلتی ہوئی لکڑی بجھ کر راکھ رہ جاتی ہے، العیاذ باللہ۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿١٦﴾ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ

اور ہم نے نہیں بنایا آسمان اور زمین کو، اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے کھیلتے ہوئے [1] اگر ہم چاہتے کہ بنالیں کچھ کھلونا، تو بنا لیتے ہم

مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿١٧﴾

اپنے پاس سے، اگر ہم کو کرنا ہوتا [2]

**خلاصہ تفسیر:** شروع سورت سے یہاں تک نبوت کا مضمون تھا، اب توحید کا اثبات اور شرک کا ابطال فرماتے ہیں۔

اور (ہمارے یکتا ہونے پر ہماری مصنوعات دلالت کر رہی ہیں کیونکہ) ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اس کو اس طور پر نہیں بنایا کہ ہم فعل عبث کرنے والے ہوں (بلکہ ان میں بہت سی حکمتیں ہیں جن میں بڑی حکمت توحید پر دلالت ہے، اور) اگر ہم کو (آسمان اور زمین کے بنانے سے کوئی حکمت مقصود نہ ہوتی بلکہ ان کو محض) مشغلہ ہی بنانا منظور ہوتا (جس میں کوئی خاص فائدہ مقصود نہیں ہوتا محض دل بہلانا منظور ہوتا ہے) تو ہم خاص اپنے پاس کی چیز کو مشغلہ بناتے (مثلاً اپنی صفات کمال کے مشاہدہ کو مشغلہ بنالیتے) اگر ہم کو یہ کرنا ہوتا۔

لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ: یعنی اگر ہم مشغلہ ہی بنانا ہوتا تو ہم خاص اپنے پاس کی چیز کو مشغلہ بناتے، کیونکہ مشغلہ کو شغل کرنے والے کی شان سے مناسبت ہونی چاہیے، تو ان حادث فانی مخلوقات کو خدا کی قدیم ذات سے کیا مناسبت، البتہ خدا کی صفات چونکہ قدیم ہیں اور اس کی ذات کے ساتھ لازم ہیں ان کو تاہم مناسبت ہے، لیکن جب عقلی دلائل سے اور تمام اہل مذاہب کے اتفاق سے صفات ہی کا مشغلہ ہونا محال ہے تو حادث فانی مخلوقات میں بدرجہ اولی یہ احتمال نہیں ہوسکتا، پس ثابت ہوا کہ ہم نے فضول پیدا نہیں کیا، بلکہ ہم نے ان کو توحید ثابت کرنے اور شرک باطل کرنے کے لیے پیدا کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی تخلیق خود مخلوق کے نفع و مصلحت کے لیے کی گئی ہے (آیت میں اس طفل خیالی کی تردید کی جارہی ہے کہ اگر کائنات اللہ کی لیلا ہوتی تو اللہ تعالی اس مردود و فانی جہاں کو اپنا تماشہ گاہ کیوں بناتا، اللہ کے ہاں اعلی سے اعلی تر چیزیں ہیں)۔

* * *

**فائدہ: [1]** یعنی جس میں کوئی معتد بہ حکمت اور غرض صحیح نہ ہو، اس لیے عقلمند کو چاہیے کہ آفرینش عالم کی غرض کو سمجھے اور دنیا کو محض کھیل تماشا سمجھ کر انجام سے غافل نہ ہو، بلکہ خوب سمجھ لے کہ دنیا آخرت کے لیے پیدا کی گئی ہے، ہر نیک و بد کی جزا ملنا اور ذرہ ذرہ کا حساب ہونا ہے۔

**فائدہ: [2]** یعنی اگر ایسے لہو ولعب کے کام بالفرض ہماری شان کے لائق ہوتے اور ہم ارادہ بھی کرتے کہ یوں ہی کوئی مشغلہ اور کھیل تماشا بنا کر کھڑا کر دیں تو یہ چیز ہم بذات خود اپنی قدرت سے کر گزرتے، تمہاری دار و گیر اور پکڑ دھکڑ سے اس کو کچھ سروکار نہ ہوتا۔

**تنبیہ:** لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا الخ کی تقریر کئی طرح کی گئی ہے، ہمارے نزدیک سباق ولحاق کے اعتبار سے جو معنی زیادہ قریب اور صاف تھے وہ اختیار کیے ہیں، اور مِنْ لَّدُنَّآ اور اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ کی قیود کے فوائد کی طرف لطیف اشارے کر دیے ہیں، واللہ اعلم۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۚ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ ⑱

یوں نہیں پر ہم پھینک مارتے ہیں سچ کو جھوٹ پر، پھر وہ اسکا سر پھوڑ ڈالتا ہے، پھر وہ جاتا رہتا ہے، اور تمہارے لیے خرابی ہے ان باتوں سے جو تم بتلاتے ہو

**خلاصہ تفسیر:** بلکہ (کائنات کو توحید ثابت کرنے اور شرک باطل کرنے کے لئے پیدا کیا ہے اور) ہم (اس) حق بات کو (جس کے ثبوت پر مصنوعات دلالت کرتی ہیں اس) باطل بات پر (اس طرح غالب کر دیتے ہیں جیسے یوں سمجھو کہ ہم اس کو اس پر) پھینک مارتے ہیں سو وہ (حق) اس (باطل) کا بھیجا نکال دیتا ہے (یعنی اس کو مغلوب کر دیتا ہے) سو وہ (باطل مغلوب ہو کر) دفعتاً جاتا رہتا ہے (یعنی ان مصنوعات سے جو توحید کے دلائل حاصل ہوتے ہیں وہ شرک کی بالکل نفی کر دیتے ہیں جس کے بعد شرک کا احتمال ہی باقی نہیں رہتا) اور (تم جو ان مضبوط دلائل کے باوجود شرک کرتے ہو تو) تمہارے لئے اس بات سے بڑی خرابی ہے جو تم (حق کے خلاف) گھڑتے ہو۔

* * *

**فائدہ:** لیکن واقعہ یہ ہے کہ دنیا محض کھیل تماشا نہیں بلکہ میدان کارزار ہے، جہاں حق و باطل کی جنگ ہوتی ہے، حق حملہ آور ہو کر باطل کا سر کچل ڈالتا ہے، اسی سے تم اپنی مشرکانہ اور سفیہانہ باتوں کا انجام سمجھ لو کہ حق و صداقت کا گولا جب پوری قوت سے تم پر گرے گا اس وقت کیسی خرابی اور بربادی تمہارے لیے ہوگی۔ اور کون سی طاقت بچانے آئے گی۔

وَلَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَمَنْ عِنْدَهُ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَلَا يَسْتَحْسِرُونَ ⑲

اور اسی کا ہے جو کوئی ہے آسمان اور زمین میں [1] اور جو اس کے نزدیک رہتے ہیں سرکشی نہیں کرتے اس کی عبادت سے، اور نہیں کرتے کاہلی

يُسَبِّحُونَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ ⑳ أَمِ اتَّخَذُوا آلِهَةً مِّنَ الْأَرْضِ هُمْ يُنْشِرُونَ ㉑

یاد کرتے ہیں رات اور دن نہیں تھکتے [2] کیا ٹھہرائے ہیں انہوں نے اور معبود زمین میں کے (سے) کہ وہ جلا اٹھائیں گے انکو [3]

**خلاصہ تفسیر:** اور (حق تعالیٰ کی وہ شان ہے کہ) جتنے کچھ آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اسی کے (مملوک) ہیں اور (ان میں سے) جو اللہ کے نزدیک (بڑے مقبول و مقرب) ہیں (ان کی بندگی کی یہ کیفیت ہے کہ) وہ اس کی عبادت سے عار نہیں کرتے اور نہ تھکتے ہیں (بلکہ) شب و روز (اللہ کی) تسبیح (و تقدیس) کرتے ہیں (کسی وقت) موقوف نہیں کرتے (جب ان کی یہ حالت ہے تو عام مخلوق تو کس شمار میں ہے، پس عبادت کے لائق وہی ہے، جب کوئی دوسرا ایسا نہیں تو پھر اس کا شریک سمجھنا کتنی بے عقلی ہے) کیا (ان دلائل توحید کے باوجود) ان لوگوں نے خدا کے سوا اور معبود بنا رکھے ہیں (بالخصوص) زمین کی چیزوں میں سے (جو کہ اور بھی حقیر اور کمتر ہیں جیسے پتھر یا چاندی سونے وغیرہ کے بت) جو کسی کو زندہ کرتے ہیں (یعنی جو جان بھی نہ ڈال سکتا ہو، ایسا عاجز کب معبود ہونے کے قابل ہوگا)۔

**يُسَبِّحُونَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ:** فرشتوں کے ہمیشہ تسبیح کرنے پر یہ شبہ کیا گیا ہے کہ بات چیت اور کام کے وقت تسبیح کیسے ممکن ہے؟ جواب یہ ہے کہ کام کے ساتھ تسبیح کا جمع ہونا تو کچھ موجب اشکال نہیں، رہا بات چیت کے وقت تسبیح تو ممکن ہے اگرچہ ذکر قلبی کی طرح جاری رہتی ہو یا بات چیت کا وقت مستثنیٰ ہو۔

* * *

**فائدہ:** [1] پھر وہ تباہ کرنا چاہے تو کون بچا سکتا ہے اور کہاں پناہ مل سکتی ہے۔

**فائدہ:** [2] یعنی فرشتے باوجود مقربین بارگاہ ہونے کے ذرا شیخی نہیں کرتے، اپنے پروردگار کی بندگی اور غلامی کو فخر سمجھتے ہیں، وظائف

عبودیت کے ادا کرنے میں کبھی سستی یا کاہلی کو راہ نہیں دیتے، شب و روز اس کی تسبیح اور یاد میں لگے رہتے ہیں، نہ جھکتے ہیں نہ اکتاتے ہیں، بلکہ تسبیح و ذکر ہی ان کی غذا ہے، جس طرح ہم ہر وقت سانس لیتے ہیں اور دوسرے کام بھی کرتے رہتے ہیں، یہی کیفیت ان کی تسبیح و ذکر کی سمجھو، وہ کسی کام پر مامور ہوں، کسی خدمت کو بجا لا رہے ہوں ایک منٹ ادھر سے غافل نہیں ہوتے، جب معصوم و مقرب فرشتوں کا یہ حال ہے تو خطا کار انسان کو کہیں زیادہ اپنے رب کی طرف جھکنے کی ضرورت ہے۔

**فائدہ:** ۳ یعنی آسمان والے فرشتے تو اس کی بندگی سے کتراتے نہیں بلکہ ہمہ وقت اس کی یاد اور بندگی میں مشتغل رہتے ہیں، پھر کیا زمین میں کچھ ایسی ہستیاں ہیں جن کو خدا کے بالمقابل معبود ٹھہرایا جاسکتا ہے؟ اور جب خدا اُن کے پجاریوں کو اپنے عذاب سے مار ڈالے تو وہ ان کو پھر جلا اٹھائیں یا ہلاکت سے بچالیں؟ ہرگز نہیں۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ

اگر ہوتے ان دونوں میں اور معبود (حاکم) سوائے اللہ کے تو دونوں خراب ہوجاتے سو پاک ہے اللہ عرش کا مالک

عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۲۲﴾ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿۲۳﴾

ان باتوں سے جو یہ بتلاتے ہیں ۱ اُس سے پوچھا نہ جائیگا جو وہ کرے اور اُن سے پوچھا جائے ۲

**خلاصہ تفسیر:** (اور) زمین (میں یا) آسمان میں اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور معبود (واجب الوجود) ہوتا تو دونوں (کبھی کے) درہم برہم ہوجاتے (کیونکہ عادۃً دونوں کے ارادوں اور افعال میں مزاحمت ہوتی، ایک کچھ چاہتا دوسرا کچھ کرتا، اور اس صورت میں فساد ہونا لازم ہے لیکن واقع میں فساد نہیں ہے، اس لیے ثابت ہوا کہ معبود بھی متعدد نہیں ہوسکتے) سو (ان تقریرات سے ثابت ہوا کہ) اللہ تعالیٰ جو کہ مالک ہے عرش کا ان امور سے پاک ہے جو کچھ یہ لوگ بیان کررہے ہیں (کہ نعوذ باللہ کوئی اس کا شریک بھی ہے، حالانکہ اس کی ایسی عظمت ہے کہ) وہ جو کچھ کرتا ہے اس سے کوئی باز پرس نہیں کرسکتا اور اوروں سے باز پرس کی جاسکتی ہے (یعنی اللہ تعالیٰ باز پرس کرسکتا ہے، پس کوئی عظمت میں اس کا شریک نہیں ہوا، پھر معبودیت میں کوئی کیسے شریک ہوسکتا ہے)۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا: یہ توحید کی عادی دلیل ہے جو بظاہر عام عادت کے اعتبار پر مبنی ہے اور دلیل عقلی کی طرف بھی اشارہ ہے جس کی مختلف تقریریں علم کلام کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ تعدد آلہہ کے ابطال پر یہ نہایت پختہ اور واضح دلیل ہے جو قرآن کریم نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کی، اس کو یوں سمجھو کہ عبادت نام ہے کامل تذلل کا، اور کامل تذلل صرف اسی ذات کے سامنے اختیار کیا جاسکتا ہے جو اپنی ذات وصفات میں ہر طرح کامل ہو، اسی کو ہم ''اللہ'' یا ''خدا'' کہتے ہیں، ضروری ہے کہ خدا کی ذات ہر قسم کے عیوب ونقائص سے پاک ہو، نہ وہ کسی حیثیت سے ناقص ہو نہ بیکار، نہ عاجز ہو نہ مغلوب، نہ کسی دوسرے سے دَبے، نہ کوئی اس کے کام میں روک ٹوک کرسکے، اب اگر فرض کیجئے آسمان وزمین میں دو خدا ہوں تو دونوں اسی شان کے ہوں گے، اس وقت دیکھنا یہ ہے کہ عالم کی تخلیق اور علویات وسفلیات کی تدبیر دونوں کے کلی اتفاق سے ہوتی ہے یا گاہ بگاہ باہم اختلاف بھی ہوجاتا ہے، اتفاق کی صورت میں دو احتمال ہیں: یا تو اکیلے ایک سے کام نہیں چل سکتا تھا اس لیے دونوں نے مل کر انتظام کیا تو معلوم ہوا کہ دونوں میں سے ایک بھی کامل قدرت والا نہیں ،اور اگر تنہا ایک سارے عالم کا کامل طور پر انجام کرسکتا تھا تو دوسرا بیکار ٹھہرا، حالانکہ خدا کا وجود اسی لیے ماننا پڑا ہے کہ اس کے مانے بدون چارہ ہی نہیں ہو سکتا اور اگر اختلاف کی صورت فرض کریں تو لامحالہ مقابلہ میں ایک مغلوب ہوکر اپنے ارادہ اور تجویز کو چھوڑ بیٹھے گا، وہ خدا نہ رہا، اور یا دونوں بالکل مساوی و

متوازی طاقت سے ایک دوسرے کے خلاف اپنے ارادہ اور تجویز کو عمل میں لانا چاہیں گے، اول تو (معاذ اللہ) خداؤں کی اس رسہ کشی میں سرے سے کوئی چیز موجود ہی نہ ہوسکے گی اور موجود چیز پر زور آزمائی ہونے لگی تو اس کشمکش میں ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہوجائے گی، یہاں سے یہ نتیجہ نکلا کہ اگر آسمان و زمین میں دو خدا ہوتے تو آسمان وزمین کا یہ نظام کبھی کا درہم برہم ہوجاتا۔ ورنہ ایک خدا کا بیکار یا ناقص و عاجز ہونا لازم آتا ہے جو خلاف مفروض ہے۔

جو عرش (تخت شاہی) کا اکیلا مالک ہے، اس کے ملک میں شرکت کی گنجائش ہی نہیں، دو خود مختار بادشاہ جب ایک اقلیم میں نہیں سما سکتے جن کی خود مختاری بھی محض مجازی ہے تو دو مختار کل اور قادر مطلق خدا ایک قلمرو میں کیسے شریک ہوسکتے ہیں۔

**فائدہ:** ۲۔ یعنی ''خدا'' تو اس ہستی کا نام ہے جو قادر مطلق ہے، جو قادر مطلق اور مختار کل ہو اس کی قدرت و مشیت کو روکنا تو کجا کوئی پوچھ پاچھ بھی نہیں کرسکتا کہ آپ نے فلاں کام اس طرح کیوں کیا، ہاں! اس کو حق ہے کہ وہ ہر شخص سے مواخذہ اور باز پرس کرسکتا ہے۔

| |
|---|
| اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ؕ |
| کیا ٹھہرائے ہیں انہوں نے اس سے ورے اور معبود، تو کہہ لاؤ اپنی سند، یہی بات ہے میرے ساتھ والوں کی، اور یہی بات ہے مجھ سے پہلوں کی، |
| بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۴﴾ |
| کوئی نہیں! پر وہ بہت لوگ نہیں سمجھتے سچی بات سو ٹلا رہے ہیں۔ |

**خلاصہ تفسیر:** یہاں تک تو شرک کے باطل اور محال ہونے کے اعتبار سے کلام تھا آگے سوال اور منع کے طور پر کلام ہے کہ:

کیا خدا کو چھوڑ کر انہوں نے اور معبود بنا رکھے ہیں؟ (ان سے) کہئے کہ تم (اس دعویٰ پر) اپنی دلیل پیش کرو (یہاں تک تو دلیل عقلی اور سوال کے طریقہ سے شرک کو باطل کیا تھا، آگے نقلی دلیل سے استدلال کرتے ہیں کہ) یہ میرے ساتھ والوں کی کتاب (یعنی قرآن) اور مجھ سے پہلے لوگوں کی کتابیں (یعنی توراۃ، انجیل و زبور) موجود ہیں (جن کا سچا اور خدا کی طرف سے نازل ہونا عقلی دلائل سے ثابت ہے، اور دوسری کتابوں میں اگرچہ تحریف بھی ہوئی ہے مگر قرآن میں تو تحریف کا احتمال نہیں، پس جو مضمون ان کتابوں کا قرآن کے مطابق ہوگا وہ یقیناً صحیح ہے، ان سب دلائل کا تقاضہ یہ تھا کہ یہ لوگ توحید کے قائل ہوجاتے لیکن پھر بھی قائل نہ ہوئے) بلکہ ان میں زیادہ وہی ہیں جو امر حق کا یقین نہیں کرتے، سو (اس وجہ سے) وہ (اس کے قبول کرنے سے) اعراض کر رہے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** پہلے توحید پر دلیل عقلی قائم کی گئی تھی، اب مشرکین سے ان کے دعوے پر دلیل صحیح کا مطالبہ ہے یعنی خدا کے سوا جو معبود تم نے تجویز کیے ہیں ان کا اثبات کس دلیل عقلی یا نقلی سے ہوا، اگر موجود ہو تو پیش کرو، ظاہر ہے ان کے پاس بجز اوہام وظنون اور باپ دادوں کی کورانہ تقلید کے کیا رکھا تھا، شرک کی تائید میں نہ کوئی دلیل عقلی مل سکتی ہے، نہ نقلی جسے پیش کرسکتے، کذا قال المفسرون۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ پہلے ان معبودوں کو فرمایا تھا کہ جن کو خدا کے برابر کوئی سمجھے کہ ایسے وہ حاکم ہوتے تو جہاں خراب ہوجاتا، اب ان کا ذکر فرماتے ہیں جو خدا تعالیٰ کے نیچے چھوٹے چھوٹے خدا بطور نائبین اور ماتحت حکام کے ٹھہراتے ہیں، سو ان کو مالک کی سند چاہیے، سند بغیر نائب کیونکر بن سکتے ہیں، اگر سند ہے تو پیش کرو۔

**فائدہ:** هذا ذکر من معی وذکر من قبلی یعنی میری امت اور پہلی خدا پرست امتوں کی یہ ہی ایک بات ہے کہ اس رب العرش کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں جس کی عقلی دلیل پہلے بیان ہوچکی، تم اگر ملل سماویہ کے اس اجماعی عقیدہ کے خلاف کوئی دلیل رکھتے ہو تو پیش کرو، میرا دعویٰ یہ ہے کہ یہ امت اور پہلی امتیں، اس امت کی کتاب (قرآن کریم) اور پہلی امتوں کی آسمانی کتابیں (تورات، انجیل وغیرہ) سب اس میں دعوائے توحید پر متفق رہی ہیں، چنانچہ آج بھی باوجود بیشمار تحریفات کے پہلی کتابوں کی ورق گردانی کرو توحید کا اعلان اور شرک کا ردصاف صاف پاؤ گے، مگر یہ جاہل اس بات کو کیا سمجھیں، اگر سمجھ ہوتی تو حق بات کو سن کر ہرگز نہ ٹلاتے۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ﴿۲۵﴾

اور نہیں بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول، مگر اس کو یہی حکم بھیجا کہ بات یوں ہے کہ کسی کی بندگی نہیں سوائے میرے، سو میری بندگی کرو

**خلاصہ تفسیر:** اور (یہ توحید کوئی نئی بات نہیں جس سے توحش یا اجنبیت ہو، بلکہ قدیم شریعت ہے چنانچہ) ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا جس کے پاس ہم نے یہ وحی نہ بھیجی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود (ہونے کے لائق) نہیں، پس میری (ہی) عبادت کیا کرو۔

* * *

**فائدہ:** یعنی تمام انبیاء و مرسلین کا اجماع عقیدہ توحید پر رہا ہے، کسی پیغمبر نے کبھی ایک حرف اس کے خلاف نہیں کہا، ہمیشہ یہی تلقین کرتے آئے کہ ایک خدا کے سوا کسی کی بندگی نہیں، تو جس طرح عقلی اور فطری دلائل سے توحید کا ثبوت ملتا ہے اور شرک کا رد ہوتا ہے ایسے ہی نقلی حیثیت سے انبیاء علیہم السلام کا اجماع دعوائے توحید کی حقیقت پر قطعی دلیل ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحۡمٰنُ وَلَدًا سُبۡحٰنَهٗ ؕ بَلۡ عِبَادٌ مُّكۡرَمُوۡنَ﴿۲۶﴾ۙ لَا يَسۡبِقُوۡنَهٗ بِالۡقَوۡلِ

اور کہتے ہیں رحمان نے کر لیا کسی کو بیٹا، وہ ہرگز اس لائق نہیں [1] لیکن وہ بندے ہیں جن کو عزت دی ہے اس سے بڑھ کر نہیں بول سکتے

وَهُمۡ بِاَمۡرِهٖ يَعۡمَلُوۡنَ﴿۲۷﴾ يَعۡلَمُ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ وَلَا يَشۡفَعُوۡنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ

اور وہ اسی کے حکم پر کام کرتے ہیں [2] اس کو معلوم ہے جو ان کے آگے ہے اور پیچھے [3] اور وہ سفارش نہیں کرتے مگر اس کی جس سے

ارۡتَضٰى وَهُمۡ مِّنۡ خَشۡيَتِهٖ مُشۡفِقُوۡنَ﴿۲۸﴾

اللہ راضی ہو [4] اور وہ اس کی ہیبت سے ڈرتے ہیں [5]

**خلاصہ تفسیر:** اور یہ (مشرک) لوگ (جو ہیں ان میں بعض) یوں کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ نے (فرشتے) اولاد بنا رکھی ہے (توبہ توبہ) وہ (اللہ تعالیٰ اس سے) پاک ہے (اور فرشتے خدا کی اولاد نہیں ہیں) بلکہ (اس کے) بندے ہیں (ہاں) معزز (بندے ہیں، اسی سے جاہلوں کو اشتباہ ہو گیا، فرشتوں کی غلامی، محکومی اور ادب کی تو یہ کیفیت ہے کہ) وہ اس سے آگے بڑھ کر بات نہیں کر سکتے (بلکہ حکم کے منتظر رہتے ہیں) اور وہ اسی کے حکم کے موافق عمل کرتے ہیں (اس کے خلاف نہیں کر سکتے، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ ان کے اگلے پچھلے احوال کو (خوب) جانتا ہے (پس جو حکم ہوگا اور جب حکم ہوگا حکمت کے موافق ہوگا، اس لئے نہ عملی مخالفت کرتے ہیں اور نہ بات کرنے میں اللہ تعالیٰ سے آگے بڑھتے ہیں) اور (ان کے ادب کی یہ کیفیت ہے کہ) وہ بجز اس (شخص) کے جس کے لئے (سفارش کرنے کی) اللہ تعالیٰ کی مرضی ہو اور کسی کی سفارش نہیں کر سکتے، اور وہ سب اللہ تعالیٰ کی ہیبت سے ڈرتے رہتے ہیں۔

**لَا يَسۡبِقُوۡنَهٗ بِالۡقَوۡلِ:** اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بڑوں کا ایک ادب یہ بھی ہے کہ جب مجلس میں کوئی بات آئے تو جو اس مجلس کا بڑا ہے اس کے کلام کا انتظار کیا جائے، پہلے ہی کسی اور کا بول پڑنا خلاف ادب ہے۔

**وَهُمۡ مِّنۡ خَشۡيَتِهٖ مُشۡفِقُوۡنَ:** اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوف افضل ہے جو عظمت الٰہی سے پیدا ہوتا ہے، نہ کہ عذاب الٰہی کے اندیشے سے، اگرچہ یہ بھی خوف الٰہی ضرور ہے، لیکن بندگان خاص کا خوف عظمت الٰہی سے متعلق ہوا کرتا ہے (یعنی اللہ کے نیک بندے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور گناہوں کے قریب نہیں جاتے وہ اس لیے نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب انتہائی سخت اور دردناک ہے، بلکہ یہ خوف اللہ کی عظمت و کبریائی اور جاہ وجلال کی وجہ سے ہوتا ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ: عرب کے بعض قبائل ملائکۃ اللہ کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے، سو بتلا دیا کہ یہ خدا کی شان رفیع کے لائق نہیں کہ بیٹے بیٹیاں بنائے، اسی میں نصاریٰ کا رد بھی ہو گیا جو حضرت مسیح علیہ السلام کو "ابن اللہ" کہتے ہیں نیز یہود کے اس فرقہ کا بھی جو حضرت عزیر کو خدا کا بیٹا کہتا تھا۔

فائدہ: ۲ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ: یعنی جن برگزیدہ ہستیوں کو تم خدا کی اولاد بتلاتے ہو وہ اولاد نہیں، ہاں! اس کے معزز بندے ہیں اور باوجود انتہائی معزز و مقرب ہونے کے ان کے ادب و اطاعت کا حال یہ ہے کہ جب تک اللہ کی مرضی اور اجازت نہ پائیں اس کے سامنے خود آگے بڑھ کر لب نہیں ہلا سکتے اور نہ کوئی کام اس کے حکم کے بدون کر سکتے ہیں، گویا کمال عبودیت و بندگی ہی ان کا طغرائے امتیاز ہے۔

فائدہ: ۳ وَمَا خَلْفَهُمْ: حق تعالیٰ کا علم ان کے تمام ظاہری و باطنی احوال کو محیط ہے، ان کی کوئی حرکت اور کوئی قول و فعل اس سے پوشیدہ نہیں، چنانچہ وہ مقرب بندے اسی حقیقت کو سمجھ کر ہمہ وقت اپنے احوال کا مراقبہ کرتے رہتے ہیں کہ کوئی حالت اس کی مرضی کے خلاف نہ ہو۔

فائدہ: ۴ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى: یعنی اس کی مرضی معلوم کیے بدون کسی کی سفارش بھی نہیں کرتے چونکہ مومنین موحدین سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے اس لیے ان کے حق میں دنیا و آخرت میں استغفار کرنا ان کا وظیفہ ہے۔

فائدہ: ۵ وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ: پھر ان کو خدا کیسے کہا جا سکتا ہے، جب خدا نہیں تو خدا کے بیٹے یا بیٹیاں بھی نہیں بن سکتے، کیونکہ صحیح اولاد جنس والدین سے ہونی چاہیے۔

| |
|---|
| ۲۹ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْۤ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ۲۹ |
| اور جو کوئی ان میں کہے کہ میری بندگی ہے اس سے ورے، سو اس کو ہم بدلہ دیں گے دوزخ، یونہی ہم بدلہ دیتے ہیں بے انصافوں کو |

خلاصہ تفسیر: اور (یہ تو فرشتوں کی محکومیت اور مغلوبیت کا بیان تھا، اب اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور غلبہ کا بیان ہے، اگرچہ حاصل دونوں کا قریب ایک ہی ہے، یعنی) ان میں سے جو شخص (بالفرض) یوں کہے کہ (نعوذ باللہ) میں علاوہ خدا کے معبود ہوں، سو ہم اس کو سزائے جہنم دیں گے (اور) ہم ظالموں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں (یعنی خدا کا ان پر پورا قبضہ اور تسلطہے جیسا کہ دوسری مخلوقات پر ہے، پھر وہ خدا کی اولاد کیسے ہو سکتے ہیں جس کے لئے خدا جیسا ہونا ضروری ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی جن کو تم خدا کی اولاد یا خدا بنا رہے ہو، اگر بفرض محال ان میں سے کوئی اپنی نسبت (معاذ اللہ) ایسی بات کہہ گزرے تو وہ ہی دوزخ کی سزا جو حد سے گزرنے والے ظالموں کو ملتی ہے ہم ان کو بھی دیں گے، ہمارے لامحدود اقتدار و جبروت سے وہ بھی باہر نہیں جا سکتے، پھر بھلا خدا کیسے ہو سکتے ہیں۔

| |
|---|
| اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ |
| اور کیا نہیں دیکھا ان منکروں نے کہ آسمان اور زمین منہ بند تھے، پھر ہم نے ان کو کھول دیا ۱ |
| وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ؕ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ۳۰ |
| اور بنائی ہم نے پانی سے ہر ایک چیز جس میں جان ہے ۲، پھر کیا یقین نہیں کرتے ۳۔ |

خلاصہ تفسیر: گزشتہ آیات میں ان مصنوعات کا توحید پر دلالت کرنا اجمالاً مذکور تھا، آگے بھی اسی کی تفصیل ہے۔

کیاان کافروں کو یہ معلوم نہیں ہوا کہ آسمان اور زمین (پہلے) بند تھے (یعنی نہ آسمان سے بارش ہوتی تھی نہ زمین سے کچھ پیداوار، اسی کو بند ہونا فرمایا جیسا کہ اب بھی اگر کسی جگہ یا کسی زمانے میں آسمان سے بارش اور زمین سے پیداوار نہ ہوتو اس جگہ یا اس زمانے کے اعتبار سے ان کو بند کہا جاسکتا ہے) پھر ہم نے دونوں کو (اپنی قدرت سے) کھول دیا (کہ آسمان سے بارش ہونے لگی اور زمین سے نباتات اگنے لگیں) اور (بارش سے صرف نباتات ہی کا نشوونمو نہیں ہوتا، بلکہ) ہم نے (بارش کے) پانی سے ہر جاندار چیز کو بنایا ہے (یعنی ہر زندہ جاندار کے وجود اور بقاء میں پانی کا دخل ضرور ہے خواہ بلاواسطہ ہو یا کسی واسطہ سے) کیا (ان باتوں کو سن کر) پھر بھی ایمان نہیں لاتے۔

**كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا**: آسمان وزمین کا کھل جانا تو مشاہد ہے، اور بند ہونا جو اس وقت ہوتا ہے وہ بھی مشاہد ہے، رہا ابتدا میں بند ہونا وہ دلیل عقلی سے معلوم ہوتا ہے، کیونکہ بارش وغیرہ ہونا یہ حالت نئی اور حادث ہے، تو کسی وقت میں یہ ضرور معدوم تھی، اور آسمانی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے نیز اس بات کے سچے ہونے پر عقلی دلیل بھی قائم ہو چکی ہے کہ ایک زمانہ میں آسمان وزمین موجود تھی اور بارش وغیرہ بند تھی۔

**وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ**: یعنی ہم نے پانی سے ہر جاندار چیز کو بنایا ہے، مطلب یہ کہ پانی پر ان کا بقا موقوف ہے خواہ بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ، سو اس سے شاید ہی کوئی شاذ ونادر جاندار خارج رہا ہو، اور اگر رہ بھی گیا ہو تو "النادر كالمعدوم وللأكثر حكم الكل" کے اعتبار سے اس کے خلاف لازم نہیں آتا، پس کسی ایک دو کے رہ جانے سے قاعدہ کلیہ پر اعتراض نہیں ہوسکتا، کیونکہ جو حالت اکثر کی ہوتی ہے وہی سب کی سمجھی جاتی ہے، اور محاورات میں بھی "کل" بمعنی "اکثر" استعمال ہوتا ہے جیسا کہ دوسری آیت میں ہے: **يجبى اليه ثمرات كل شيئ**۔

* * *

**فائدہ: ۱** **كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا** "رتق" کے اصل معنی ملنے اور ایک دوسرے میں گھسنے کے ہیں، ابتداءً زمین وآسمان دونوں ظلمت عدم میں ایک دوسرے سے غیر متمیز پڑے تھے، پھر وجود کے ابتدائی مراحل میں دونوں خلط ملط رہے، بعدہ قدرت کے ہاتھ نے دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کیا، اس تمیز کے بعد ہر ایک کے طبقات الگ الگ بنے، اس پر بھی منہ بند تھے، نہ آسمان سے بارش ہوتی تھی نہ زمین سے روئیدگی، آخر خدا تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے فائدہ کے لیے دونوں کے منہ کھول دیے، اوپر سے پانی کا دہانہ کھلا، نیچے سے زمین کے مسام کھل گئے، اسی زمین میں سے حق تعالیٰ نے نہریں اور کانیں اور طرح طرح کے سبزے نکالے، آسمان کو کتنے بیشمار ستاروں سے مزین کر دیا جن میں سے ہر ایک کا گھر جدا اور چال جدا رکھی۔

**فائدہ: ۲** پانی یعنی عموماً جاندار چیزیں جو تم کو نظر آتی ہیں بالواسطہ پانی سے بنائی گئیں، پانی ہی ان کا مادہ ہے، الا کوئی ایسی مخلوق جس کی نسبت ثابت ہو جائے کہ اس کی پیدائش میں پانی کو دخل نہیں وہ مستثنیٰ ہوگی، تاہم للاکثر حکم الکل کے اعتبار سے یہ کلیہ صادق رہے گا۔

**فائدہ: ۳** یعنی قدرت کے ایسے کھلے نشان اور محکم انتظامات کو دیکھ کر بھی کیا لوگوں کو خدا کے وجود اور اسکی وحدانیت پر یقین نہیں آتا۔

**وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ ۖ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿٣١﴾**

اور رکھ دیے ہم نے زمین میں بھاری بوجھ کبھی ان کو لے کر جھک پڑے ۱، اور رکھیں اس میں (ان میں) کشادہ راہیں تا کہ وہ راہ پائیں ۲

**خلاصہ تفسیر**: اور ہم نے (اپنی قدرت سے) زمین میں پہاڑ اس لئے بنائے کہ زمین ان لوگوں کو لے کر ہلنے نہ لگے، اور ہم نے اس (زمین) میں کشادہ کشادہ رستے بنائے تا کہ لوگ (ان کے ذریعہ) منزل (مقصود) کو پہنچ جائیں۔

* * *

**فائدہ: ۱** اس کی تقریر "سورہ نحل" [آیت ۱۵] میں گزر چکی۔

**فائدہ: ۲** یعنی ایک ملک کے لوگ دوسرے ملک والوں سے مل سکیں، اگر پہاڑ ایسے ڈھب پر پڑتے کہ راہیں بند ہو جاتیں تو یہ بات کہاں ہوتی (کذا فی الموضح)، ان ہی کشادہ راہوں کو دیکھ کر انسان حق تعالیٰ کی قدرت وحکمت اور توحید کی طرف راہ پا سکتا ہے۔

وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۖ وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۳۲﴾

اور بنایا ہم نے آسمان کو چھت محفوظ، اور وہ آسمان کی نشانیوں کو دھیان میں نہیں لاتے۔

**خلاصہ تفسیر:** اور ہم نے (اپنی قدرت سے) آسمان کو (زمین کے مقابلہ میں اس کے اوپر مثل) ایک چھت (کے) بنایا جو (ہر طرح سے) محفوظ ہے (یعنی گرنے سے بھی ٹوٹنے پھوٹنے سے بھی اور اس سے بھی کہ شیطان وہاں تک پہنچ کر آسمان کی باتیں سن سکیں، مگر یہ آسمان کا محفوظ و مضبوط ہونا بھی ہمیشہ کے لیے نہیں ایک معین زمانہ یعنی قیامت تک ہے) اور یہ لوگ اس (آسمان) کے (اندر کی موجودہ) نشانیوں سے اعراض کئے ہوئے ہیں (یعنی ان میں غور و فکر اور تدبر نہیں کرتے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی نہ گرے، نہ ٹوٹے پھوٹے، نہ بدلی جائے، اور شیاطین کے استراق سمع سے بھی محفوظ ہے، اور چھت اس لیے کہا کہ دیکھنے میں چھت کی طرح معلوم ہوتی ہے، کہ کیسی مضبوط و محکم اور وسیع و بلند چھت اتنی مدت سے بدون ستون اور کھمبے کے کھڑی ہے، ذرا سا رنگ و روغن اور پلاسٹر بھی نہیں جھڑتا۔

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴿۳۳﴾

اور وہ ہی ہے جس نے بنائے رات اور دن اور سورج اور چاند ۱؎ سب اپنے اپنے گھر (چکر) میں پھرتے ہیں ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور وہ ایسا (قادر) ہے کہ اس نے رات اور دن اور سورج اور چاند بنائے (وہ نشانیاں آسمان کی یہی ہیں اور شمس و قمر میں سے) ہر ایک، ایک دائرے میں (اس طرح چل رہے ہیں کہ گویا) تیر رہے ہیں۔

**كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ:** تیرنا جو سورج و چاند کی طرف منسوب کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود حرکت کرتے ہیں، کیونکہ اصل یہی ہے کہ اسناد حقیقی مراد لی جائے، اور لفظ "فلک" دراصل ہر دائرے اور گول چیز کو کہا جاتا ہے، اسی وجہ سے چرخے میں جو گول چمڑا لگا ہوتا ہے اس کو "فلكة المغزل" کہتے ہیں، چونکہ سورج و چاند کی حرکت متدیر ہے اس لیے اس کے گھومنے کی جگہ یعنی آسمان کو بھی "فلک" فرمادیا، یہاں مراد سورج و چاند کی وہ مداریں ہیں جن پر وہ حرکت کرتے ہیں، الفاظ قرآن میں اس کی کوئی تصریح نہیں ہے یہ مداریں آسمان کے اندر ہیں یا باہر فضاء میں، حالیہ خلائی تحقیقات نے واضح کردیا ہے کہ یہ مداریں خلاء اور فضاء میں آسمان سے بہت نیچے ہیں، ہر حال میں اس سے آسمان کا متدیر ہونا ثابت نہیں ہوتا، اس آیت کے ظاہر سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ آفتاب بھی ایک مدار پر حرکت کرتا ہے، جدید فلاسفہ پہلے اس کے منکر تھے، اب وہ بھی اس کے قائل ہوگئے ہیں، مزید تفصیلات کی یہ جگہ نہیں، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یہ ان ہی آسمانی نشانیوں کی قدرے تفصیل ہوئی۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی سورج چاند بلکہ ہر سیارہ اپنے مدار پر پڑا چکر کھا رہا ہے، "يَسْبَحُوْنَ" کے لفظ سے ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیارات اللہ کے حکم سے بذات خود چلتے ہیں۔ واللہ اعلم

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ﴿۳۴﴾

اور نہیں دیا ہم نے تجھ سے پہلے کسی آدمی کو ہمیشہ کے لیے زندہ رہنا (جینا)، پھر کیا اگر تو مر گیا تو وہ رہ جائیں گے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۵﴾

ہر جی کو چکھنی ہے موت ۱؎ ،اور ہم تم کو جانچتے ہیں برائی سے اور بھلائی سے آزمانے کو ۲؎ ،اور ہماری طرف پھر کر آجاؤ گے ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** سورت کے شروع میں رسالت کے انکار پر ملامت اور اس پر عذاب کا مستحق ہونا مذکور ہوا تھا، آگے بھی دوسرے عنوان اسی کا بیان ہے۔

اور (یہ لوگ جو آپ کی وفات کی خوشیاں منا رہے ہیں جیسا کہ ارشاد ہے: نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ، یہ وفات بھی نبوت کے منافی نہیں، کیونکہ) ہم نے آپ سے پہلے بھی کسی بشر کے لئے (خواہ وہ نبی ہو یا غیر نبی دنیا میں) ہمیشہ رہنا تجویز نہیں کیا (جیسا کہ ارشاد ہے: وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ، پس جیسے آپ سے پہلے انبیاء کو موت آئی اس سے ان کی نبوت میں کسی کو شبہ نہیں ہوا، اسی طرح آپ کی وفات سے آپ کی نبوت میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا، خلاصہ یہ ہے کہ نبوت اور موت دونوں ایک شخص میں جمع ہوسکتی ہیں) پھر (یہ کہ) اگر آپ کا انتقال ہوجائے تو کیا یہ لوگ (دنیا میں) ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے (آخر یہ بھی مریں گے، پھر خوشی کا کیا مقام ہے؟)۔

(اور موت تو ایسی چیز ہے کہ تم میں) ہر جاندار موت کا مزا چکھے گا، اور (یہ چند روزہ زندگی جو ہم نے تم کو دے رکھی ہے تو اس سے مقصود محض یہ ہے کہ) ہم تم کو بری بھلی حالتوں سے اچھی طرح آزماتے ہیں (کوئی ایمان اور اطاعت بجالاتا ہے اور کوئی کفر و معصیت کرتا ہے، مطلب یہ کہ زندگی اس لئے دے رکھی ہے کہ دیکھیں کیسے کیسے عمل کرتے ہو) اور (اس زندگی کے ختم پر) پھر تم سب ہمارے پاس چلے آؤ گے (اور ہر ایک کو اسکے مناسب سزا و جزا دیں گے، سو اہم معاملہ تو موت اور موت کے بعد کا ہی ہوا، اور یہ زندگی محض عارضی، پھر یہ لوگ اس پر کیسے اتراتے ہیں اور پیغمبر کی وفات پر خوشیاں مناتے ہیں، یہ نہ ہوا کہ اس مستعار زندگی میں دولت ایمان و اطاعت کما لیتے جو ان کے کام آتی، الٹا نامہ اعمال سیاہ اور آخرت کو برباد کر رہے ہیں ڈرتے نہیں)۔

**وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ:** مطلب یہ کہ آپ کی وفات خوشی اگر اس لیے ہے کہ اس سے نبوت کو باطل کرنا چاہتے ہیں تب تو اس کا جواب یہ ہے کہ: مَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ یعنی آپ سے پہلے بھی انبیاء کو موت کا سامنا ہوا، اور اگر یہ خوشی ذاتی بغض اور دشمنی کی وجہ سے تو اس کا جواب یہ ہے کہ: اَفَاۡئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ یعنی کیا یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے، غرض ہر حالت میں یہ انتظار مہمل، لغو اور بے کار ہے۔

اس آیت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر زندہ ہونے کی نفی نہیں ہوسکتی، کیونکہ یہاں دنیاوی زندگی کی گفتگو ہو رہی ہے، مطلب یہ ہے کہ ہم نے دنیا میں کسی بشر کے لیے ہمیشہ رہنا تجویز نہیں کیا، اسی لیے خلاصہ تفسیر میں لفظ ''دنیا'' کی قید بڑھادی ہے، باقی قیامت سے پہلے وہ بھی مرنے والے ہیں۔

**كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ:** یہاں مراد ''ہر نفس'' سے نفوس ارضیہ یعنی زمینی جاندار ہیں، ان سب کو موت آنا لازمی ہے، پس نفخ صور کے وقت نفوس فرشتوں کی موت یا عدم موت سے یہ آیت خاموش ہے، اس میں اختلاف ہے کہ قیامت کے روز فرشتوں کو بھی موت آئے گی یا نہیں؟ بعض حضرات نے فرمایا کہ ایک لحظہ کے لئے تو سب پر موت طاری ہوجائے گی خواہ انسان اور نفوس ارضیہ ہوں یا فرشتے اور نفوس سماویہ، بعض حضرات نے فرمایا کہ فرشتے اور جنت کے حور و غلمان موت سے مستثنیٰ ہیں، واللہ اعلم۔

**وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً:** بری حالت سے مراد وہ حالات ہیں جو خلاف مزاج پیش آتے ہیں جیسے بیماری اور فقر، اور اچھی حالت سے مراد وہ جو مزاج کے موافق ہو جیسے صحت اور غنا، زندگی میں یہی حالتیں مختلف طور پر پیش آتی ہیں، آیت میں امتحان و آزمائش کا ذکر ہونا اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں وہ نفس مراد ہے جو احکام کا مکلف ہو، اس کے لیے موت ضروری ہے، اور فرشتے جو کہ مکلف نہیں ان کا مرنا یا نہ مرنا اس آیت میں مذکور نہیں۔

یہ ہر ناگوار اور مرغوب چیز کو شامل ہے، تو اس میں قبض بھی داخل ہوگیا، پس اس پر دلالت ہوئی کہ قبض میں حکمتیں اور اسرار ہوتے ہیں، اہل اللہ اسی بات سے تسلی لیتے اور دیتے ہیں (طبعی انقباض کو برا نہیں سمجھتے، یعنی جب کبھی قبض یعنی طبیعت میں تنگی کی کیفیت ہو تو پریشان نہیں ہونا

چاہیے، کیونکہ اس کیفیت سے بھی ان شاءاللہ خیر ہی حاصل ہوگی جو ترقی منازل کا سبب بنے گی)۔

* * *

فائدہ: ۱ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ: یعنی جس طرح مذکورہ بالا مخلوقات کا وجود حق تعالیٰ کی ایجاد سے ہوا، تمام انسانوں کی زندگی بھی اسی کی عطا کردہ ہے جس وقت چاہے گا چھین لے گا، موت ہر ایک پر ثابت کردے گی کہ تمہاری ہستی تمہارے قبضہ میں نہیں، چند روز کی چہل پہل تھی جو ختم ہوئی، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ''کافر حضور کی باتیں سن کر کہتے تھے کہ یہ ساری دھوم محض اس شخص کے دم تک ہے یہ دنیا سے رخصت ہوئے پھر کچھ نہیں''، اس سے اگر ان کی غرض یہ تھی کہ موت آنا نبوت کے منافی ہے تو اس کا جواب دیا وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ یعنی انبیاء ومرسلین میں سے کون ایسا ہے جس پر کبھی موت طاری نہ ہو ہمیشہ زندہ رہے، اور اگر محض آپ کی موت کے تصور سے اپنا دل ٹھنڈا کرنا ہی مقصود تھا تو اس کا جواب اَفَاۡئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ میں دے دیا، یعنی خوشی کا ہے کی؟ کیا آپ کا انتقال ہوجائے تو تم کبھی نہیں مرو گے؟ قیامت کے بورے سمیٹو گے؟ جب تم کو بھی آگے پیچھے مرنا ہے تو پیغمبر کی وفات پر خوش ہونے کا کیا موقع ہے، اس راستہ سے تو سب کو گزرنا ہے، کون ہے جس کو کبھی موت کا مزہ چکھنا نہیں پڑے گا، گویا توحید اور دلائل قدرت بیان کرنے کے بعد اس آیت میں مسئلہ نبوت کی طرف روئے سخن پھیر دیا گیا۔

فائدہ: ۲ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً: یعنی دنیا میں سختی، نرمی، تندرستی، بیماری، تنگی، فراخی اور مصیبت وعیش وغیرہ مختلف احوال بھیج کر تم کو جانچا جاتا ہے تاکہ کھرا کھوٹا الگ ہوجائے اور اعلانیہ ظاہر ہوجائے کہ کون سختی پر صبر اور نعمتوں پر شکر ادا کرتا ہے اور کتنے لوگ ہیں جو مایوسی یا شکوہ شکایت اور ناشکری کے مرض میں مبتلا ہیں۔

فائدہ: ۳ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ: جہاں تمہارے صبر وشکر اور ہر نیک وبد عمل کا پھل دیا جائے گا۔

| |
|---|
| وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ |
| اور جہاں تجھ کو دیکھا منکروں نے تو کوئی کام نہیں ان کو تجھ سے مگر ٹھٹھا کرنا، کیا یہی شخص ہے جو نام لیتا ہے تمہارے معبودوں کا، |
| وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝۳۶ |
| اور وہ رحمان کے نام سے منکر ہیں |

خلاصہ تفسیر: اور (ان منکرین کی یہ حالت ہے کہ) یہ کافر لوگ جب آپ کو دیکھتے ہیں تو بس آپ سے ہنسی مذاق کرنے لگتے ہیں (اور آپس میں کہتے ہیں) کہ کیا یہی (صاحب) ہیں جو تمہارے معبودوں (کا برائی سے) ذکر کیا کرتے ہیں (سو آپ پر تو بتوں کے انکار کا بھی اعتراض ہے) اور (خود) یہ لوگ (حضرت) رحمان (جل شانہ) کے ذکر پر انکار (اور کفر) کیا کرتے ہیں (تو اعتراض کی بات تو درحقیقت یہ ہے، اس لئے ان کو اپنی اس حالت پر استہزاء کرنا چاہئے تھا)۔

اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا: اہل اللہ اور صالحین کی بے قدری بھی اسی بداخلاقی میں آجاتی ہے (یعنی اس میں ان لوگوں پر تشنیع ہے جو اللہ اہل اللہ کی بے قدری کرتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: یعنی انجام سے بالکل بے فکر ہو کر یہ لوگ پیغمبر ﷺ کی ہنسی اڑاتے ہیں اور ان سے ٹھٹھا کرتے ہیں، چنانچہ استہزاء وتحقیر سے کہتے ہیں: اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ کیا یہ ہی شخص ہے جو تمہارے معبودوں کا برائی سے ذکر کرتا ہے، انھیں شرم نہیں آتی کہ خود حقیقی معبود کے ذکر اور ''رحمن'' کے نام تک سے چڑتے ہیں، اس کی سچی کتاب کے منکرین، اور جھوٹے معبودوں کی برائی سن کر چیں بجبیں ہوتے ہیں، اندریں صورت ہنسی کے قابل ان کی حالت ہوئی یا فریق مقابل کی؟

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۳۷﴾

بنا ہے آدمی جلدی کا، اب دکھلاتا ہوں تم کو اپنی نشانیاں، سو مجھ سے جلدی مت کرو۔ [۱]

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾

اور کہتے ہیں کب ہوگا یہ وعدہ اگر تم سچے ہو۔ [۲]

**خلاصہ تفسیر:** (ان کی یہ حالت ہے کہ جب کفر کی سزا کا مضمون سنتے ہیں تو جھٹلانے کی غرض سے سزا کا تقاضا کرتے ہیں کہ یہ سزا جلد آجائے، اور جلدی کرنا کچھ انسان کی طبیعت کا اکثری خاصہ بھی ہے، پس اس کا طبعی ہونا ایسا ہے جیسے گویا) انسان جلدی ہی (کے خمیر) کا بنا ہوا (ہے یعنی عجلت اور جلدی گویا اس کے اجزائے ترکیبی میں ہے، اسی واسطے یہ لوگ عذاب جلدی جلدی مانگتے ہیں اور تاخیر ہونے کو عذاب کے واقع نہ ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں، لیکن اے کافرو! یہ تمہاری غلطی ہے، کیونکہ اس کا وقت معین ہے، سو ذرا صبر کرو) ہم عنقریب (اس کے وقت آنے پر) تم کو اپنی نشانیاں (قہر کی یعنی سزائیں) دکھائے دیتے ہیں، پس تم مجھ سے جلدی مت مچاؤ (کیونکہ عذاب وقت سے پہلے آتا نہیں اور وقت پر ٹلتا نہیں) اور یہ لوگ (جب یہ مضمون سنتے ہیں کہ مقررہ وقت پر عذاب آئے گا تو رسول اور اہل ایمان سے یوں) کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کس وقت آئے گا اگر تم (عذاب کے واقع ہونے کی خبر میں) سچے ہو (تو توقف کا ہے کا، جلدی سے کیوں نہیں واقع کر دیا جاتا)۔

**خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ:** اس کے خلاصہ تفسیر میں ''اکثر'' کی قید سے یہ اشکال دور ہوگیا کہ بعض افراد ایسے جلد باز نہیں ہوتے۔

چونکہ اس میں استعجال یعنی جلد بازی سے منع کیا گیا ہے تو اس سے جلد بازی کو چھوڑ دینے کا حکم بھی لازم آیا جس میں تزکیہ وسلوک بھی داخل ہے، طریق تزکیہ میں جو تشویش اور پریشانی پیش آتی ہیں وہ اسی عجلت پسندی کی وجہ سے ہوا کرتی ہیں۔

* * *

**فائدہ:** [۱] شاید کفار کے سفیہانہ استہزاء وتمسخر کو سن کر بعضوں کا جی چاہا ہوگا کہ ان بے حیاؤں پر فوراً عذاب آجائے تو اچھا ہو، اور خود کفار بھی بطور استہزاء جلدی مچایا کرتے تھے کہ اگر واقعی ہم تمہارے نزدیک مستحق عذاب ہیں تو وہ عذاب فوراً کیوں نہیں لے آتے، دونوں کو بتلایا کہ انسان بڑا جلد باز ہے، گویا اس کے خمیر میں جلدی پڑی ہے، چاہیے کہ تھوڑا سا صبر کرو، عنقریب میں اپنے قہر وانتقام کی نشانیاں تم کو دکھلا دوں گا۔

**فائدہ:** [۲] یعنی کہتے رہتے ہو کہ قیامت آئے گی اور سب کافر ہمیشہ کے لیے دوزخ میں جلیں گے، آخر یہ وعدہ کب پورا ہوگا، اگر سچے ہو تو قیامت اور جہنم کو ابھی کیوں نہیں بلا لیتے۔

لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَلَا هُمْ

اگر جان لیں یہ منکر اس وقت کو کہ نہ روک سکیں گے اپنے منہ سے آگ، اور نہ اپنی پیٹھ سے، اور نہ ان کو

يُنْصَرُوْنَ ﴿۳۹﴾ بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۴۰﴾

مدد پہنچے گی، کچھ نہیں وہ آئے گی ان پر ناگہاں، پھر ان کے ہوش کھو دے گی، پھر نہ پھیر سکیں گے اس کو، اور نہ ان کو فرصت ملے گی۔ [۱]

**خلاصہ تفسیر:** (اصل یہ ہے کہ ان کو اس مصیبت کی خبر نہیں جو ایسی بے فکری کی باتیں کرتے ہیں) کاش ان کافروں کو اس وقت کی خبر ہوتی جبکہ (ان کو سب طرف سے دوزخ کی آگ گھیرے گی اور) یہ لوگ (اس) آگ کو نہ اپنے سامنے سے روک سکیں گے اور نہ اپنے پیچھے سے اور نہ ان کی کوئی حمایت کرے گا (یعنی اگر اس مصیبت کا علم ہوتا تو ایسی باتیں نہ بناتے، اور یہ جو دنیا ہی میں دوزخ کے عذاب کی فرمائش کر رہے ہیں سو یہ

ضروری نہیں کہ ان کی فرمائش کے موافق دوزخ ہی کا عذاب آجائے ) بلکہ وہ آگ ( تو ) ان کو ایک دم سے آلے گی سوان کو بدحواس کردے گی، پھر نہ اس کے ہٹانے کی ان کو قدرت ہوگی اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔

* * *

**فائدہ:** لہ یعنی اگر ان پر حقیقت منکشف ہوجائے اور اس ہولناک گھڑی کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لیں تو کبھی ایسی درخواست نہ کریں، یہ باتیں اس وقت بے فکری میں سوجھ رہی ہیں، جب وہ وقت سامنے آجائے گا کہ آگے پیچھے ہر طرف سے آگ گھیرے ہوگی تو نہ کسی طرف سے اس کو دفع کرسکیں گے، نہ کہیں سے مدد پہنچے گی، نہ مہلت ملے گی، نہ پہلے سے اس کا کامل اندازہ ہوگا، اس کے اچانک سامنے آجانے سے ہوش باختہ ہوجائیں گے تب پتہ چلے گا کہ جس چیز کی ہنسی کرتے تھے وہ حقیقت ثابتہ تھی۔

ع ٣ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٤١﴾

اور ٹھٹھے ہو چکے ہیں رسولوں سے تجھ سے پہلے، پھر الٹ پڑی ٹھٹھا کرنے والوں پر ان میں سے وہ چیز جس کا ٹھٹھا کرتے تھے

**خلاصہ تفسیر:** اور (اگر وہ یوں کہیں کہ اگر آخرت میں عذاب کا وعدہ ہونے کی وجہ سے دنیا میں نہیں ہوتا تو اچھا دنیا میں اس کا کوئی نمونہ تو دکھلا دو اگرچہ مناظرہ کے قاعدہ سے نمونہ دکھلانا ضروری نہیں لیکن تبرعاً نمونہ کا پتہ بھی دیا جاتا ہے وہ یہ کہ ) آپ سے پہلے جو پیغمبر گزرے ہیں ان کے ساتھ بھی ( کفار کی طرف سے ) تمسخر کیا گیا، سو جن لوگوں نے ان سے تمسخر کیا تھا ان پر وہ عذاب واقع ہوگیا جس کے ساتھ وہ استہزاء کرتے تھے ( کہ عذاب کہاں ہے!! اس سے معلوم ہوا کہ کفر کی وجہ سے عذاب ہوا ہے پس اگر دنیا میں نہ ہوا تو آخرت میں ہوگا )۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جس چیز سے ٹھٹھا کرتے تھے اس کی سزا نے گھیر لیا اور ان کی ہنسی ان پر ہی الٹ دی گئی۔

قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ؕ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٤٢﴾ اَمْ لَهُمْ

تو کہہ! کون نگہبانی کرتا ہے تمہاری رات میں اور دن میں رحمن سے لہ کوئی نہیں وہ اپنے رب کے ذکر سے منہ پھیرتے ہیں ٢ یا ان کے واسطے

اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ؕ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ﴿٤٣﴾

کوئی معبود ہیں کہ ان کو بچاتے ہیں ہمارے سوا، وہ اپنی بھی مدد نہیں کرسکتے اور نہ ان کی ہماری طرف سے رفاقت ہو ( کوئی حفاظت کرے ) ٣

**خلاصہ تفسیر:** (اور یہ بھی ان سے ) کہہ دیجئے ( کہ دنیا میں جو تم عذاب سے محفوظ ہو سو یہ حفاظت بھی حضرت رحمٰن ہی کر رہا ہے، اس میں بھی اسی کا احسان اور توحید کی دلیل ہے، اگر تم اس کو تسلیم نہیں کرتے تو پھر بتلاؤ ) کہ وہ کون ہے جو رات اور دن میں رحمٰن ( کے عذاب ) سے تمہاری حفاظت کرتا ہو ( اور اس مضمون کا مسلمہ تقاضا تو یہ تھا کہ توحید کے قائل ہوجاتے مگر وہ اب بھی قائل نہ ہوئے ) بلکہ وہ لوگ ( اب بھی بدستور ) اپنے رب ( حقیقی ) کے ذکر ( توحید کے قبول کرنے ) سے روگرداں ( ہی ) ہیں ( ہاں اس حفاظت کے مضمون کو واضح کرنے کے لیے ہم صراحۃً دریافت کرتے ہیں کہ ) کیا ان کے پاس ہمارے سوا اور ایسے معبود ہیں کہ ( مذکورہ عذاب سے ) ان کی حفاظت کرلیتے ہوں ( وہ بیچارے ان کی تو کیا حفاظت کرتے، خود ان کی بیچارگی اور عاجزی کی تو یہ حالت ہے کہ ) وہ خود اپنی حفاظت کی قدرت نہیں رکھتے ( مثلاً کوئی ان کو توڑنے پھوڑنے لگے تو اس کو دفع بھی نہیں کرسکتے، پس نہ وہ ان کی حفاظت کرسکتے ہیں ) اور نہ ہمارے مقابلہ میں کوئی ان کا ساتھ دے سکتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی رحمان کے غصہ اور عذاب سے تمہاری حفاظت کرنے والا دوسرا کون ہے، محض اس کی رحمت واسعہ ہے جو فوراً عذاب نازل نہیں کرتا لیکن ایسے رحمت والے حلیم و بردبار کے غصہ سے ڈرنا بھی بہت چاہیے نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ غَضَبِ الْحَلِيْمِ۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی رحمان کی حفاظت کا ان کو احساس و اعتراف نہیں، عیش و تنعم اور پر امن زندگی نے پروردگارِ حقیقی کی یاد سے غافل کر رکھا ہے، اسی لیے جب اس کی طرف سے کوئی نصیحت کی جاتی ہے تو منہ پھیر لیتے ہیں کہ یہ کہاں کی باتیں شروع کر دیں۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی کیا اپنے فرضی معبودوں کی نسبت خیال ہے کہ وہ ان کی حفاظت کرتے ہیں؟ اور موقع آنے پر خدا تعالیٰ کے غضب سے بچا لیں گے؟ سو وہ مسکین ان کی مدد اور حفاظت تو درکنار خود اپنے وجود کی حفاظت بھی نہیں کر سکتے، اگر ان کو کوئی توڑنے پھوڑنے لگے یا کچھ چیز ان کے پاس سے چھین کر لے جائے تو اتنی قدرت نہیں کہ مدافعانہ تحفظ کے لیے خود ہاتھ پاؤں ہلا سکیں یا اپنے بچاؤ کی خاطر ہماری امداد و رفاقت حاصل کر لیں۔

بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ؕ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ

کوئی نہیں پر ہم نے عیش دیا انکو، اور انکے باپ دادوں کو، یہاں تک کہ بڑھ گئی ان پر زندگی ۱؎، پھر کیا نہیں دیکھتے کہ ہم چلے آتے ہیں زمین کو

نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾

گھٹاتے اس کے کناروں سے، اب کیا وہ جیتنے والے ہیں ۲؎۔

**خلاصہ تفسیر:** (اور یہ لوگ ان واضح دلائل کے باوجود حق کو قبول نہیں کرتے تو اس کی یہ وجہ نہیں کہ دعوی یا دلیل میں کوئی خلل ہے) بلکہ (اصل وجہ اس کی یہ ہے کہ) میں نے ان کو اور ان کے باپ دادوں کو (دنیا کا) خوب سامان دیا، یہاں تک کہ ان پر (اسی حالت میں) ایک عرصہ دراز گزر گیا (کہ نسلوں سے عیش آرام کرتے آ رہے ہیں، پس کھا کھا کے غرانے لگے اور آنکھیں پتھرا گئیں، مطلب یہ کہ ان ہی میں غفلت کا خلل ہے، لیکن شرعی اور تکوینی تنبیہات کے بعد اتنی غفلت بھی نہیں ہونی چاہیے، چنانچہ ایک تنبیہ کی بات ذکر کی جاتی ہے وہ یہ کہ) کیا ان کو یہ نظر نہیں آتا کہ ہم (ان کی) زمین کو (فتوحات اسلامیہ کے ذریعہ سے) ہر چہار طرف سے برابر گھٹاتے چلے جاتے ہیں، سو کیا یہ لوگ (یہ توقع رکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور مؤمنین پر) غالب آئیں گے (حالانکہ ظاہری قرائن اور قرآنی دلائل ان کے مغلوب اور اہل حق کے غالب ہوتے جانے پر متفق ہیں تاوقتیکہ مسلمان اطاعت خداوندی سے منہ نہ موڑیں اور حمایت اسلام نہ چھوڑیں، پس اس بات میں تامل کرنا بھی تنبیہ کے لئے کافی ہے)۔

**اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ:** اس کی ایک تفسیر یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان لوگوں پر تعجب ہے جو کفر پر عذاب واقع ہونے کا یک لخت انکار کر رہے ہیں) کیا (مقدمات عذاب میں سے) اس امر کو نہیں دیکھ رہے ہیں کہ ہم (فتوحات اسلامیہ کے ذریعہ سے ان کی) زمین کو ہر چار طرف سے برابر کم کرتے چلے آتے ہیں، سو کیا یہ لوگ (مسلمانوں پر) غالب آ رہے ہیں (نہیں! بلکہ مغلوب ہوتے جا رہے ہیں، سو یہ بھی تو ایک قسم کا عذاب ہے جو عذاب اکبر کا مقدمہ ہے: ولنذیقنھم من العذاب الادنی دون العذاب الاکبر)۔

**اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ:** یعنی ظاہری قرائن اور قرآنی دلائل اس پر متفق ہیں کہ جب تک اسلام کی کامل اشاعت نہ ہو جائے اس وقت تک یہ لوگ مغلوب اور اہل حق غالب ہوتے جائیں گے، کیونکہ ابتداء میں اسلام کا مغلوب ہو جانا اس کی اشاعت میں مخل تھا، ہاں! جب اس کی تبلیغ و اشاعت کافی ہو چکے گی اس وقت مغلوب ہونے سے اسلامی اشاعت کو نقصان نہ پہنچے گا چنانچہ مشاہد ہے، اس تقریر سے یہ اشکال دور ہو گیا کہ بعد میں تو مسلمان مغلوب ہوئے ہیں چنانچہ جواب ظاہر ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی رحمان کی کلاءت و حفاظت اور بتوں کا عجز و بیچارگی ایسی چیز نہیں جس کو یہ لوگ سمجھ نہ سکیں، بات یہ ہے کہ پشت ہا پشت سے

یہ لوگ بے فکری کی زندگی گزار رہے ہیں، کوئی جھٹکا عذاب الٰہی کا نہیں لگا، اس پر مغرور ہو گئے اور غفلت کے نشہ میں چور ہو کر حق تعالیٰ کا پیغام اور پیغمبروں کی نصیحت قبول کرنے سے منہ موڑ لیا۔

**فائدہ:** ۲ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ یعنی عرب کے ملک میں اسلام پھیلنے لگا ہے اور کفر گھٹنے لگا، آہستہ آہستہ وہاں کی زمین کافروں پر تنگ ہوتی جا رہی ہے، ان کی حکومتیں اور سرداریاں ٹوٹتی جا رہی ہیں، کیا ایسے کھلے ہوئے آثار و قرائن دیکھ کر بھی انھیں اپنا انجام نظر نہیں آتا، اور کیا ان مشاہدات کے باوجود وہ اسی کے امیدوار ہیں کہ پیغمبر ﷺ اور مسلمانوں پر ہم غالب ہوں گے، اگر چشم عبرت ہے تو چاہیے کہ عقل سے کام لیں اور قرائن و احوال سے مستقبل کا اندازہ کریں، کیا ان کو معلوم نہیں کہ ان کے گرد و پیش کی بستیاں انبیاء کی تکذیب و عداوت کی سزا میں تباہ کی جا چکی ہیں اور ہمیشہ آخر کار خدا کے وفاداروں کا مشن کامیاب رہا ہے، پھر سید المرسلین اور مومنین کاملین کے مقابلہ میں غالب آنے کی ان کو کیا توقع ہو سکتی ہے **وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ**۔

**تنبیہ:** اس مضمون کی آیت سورہ رعد کے آخر [آیت ۴۱] میں گزر چکی وہاں کے فوائد ملاحظہ کیے جائیں۔

قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۖ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ﴿۴۵﴾

تو کہہ میں جو تم کو ڈراتا (سناتا) ہوں سو حکم کے موافق، اور سنتے نہیں بہرے پکارنے کو جب کوئی ان کو ڈر کی بات سنائے ۱؎

وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۴۶﴾

اور کہیں پہنچ جائے ان تک ایک بھاپ تیرے رب کے عذاب کی، تو ضرور کہنے لگیں ہائے کم بختی ہماری بیشک ہم تھے گنہگار ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** (اگر اس پر بھی جہالت اور سرکشی کی وجہ سے عذاب ہی کی فرمائش کریں تو) آپ کہہ دیجئے کہ میں تو صرف وحی کے ذریعہ سے تم کو ڈراتا ہوں (عذاب کا آنا میرے بس سے باہر ہے) اور (اگرچہ حق کی طرف دعوت کا یہ طریقہ اور یہ انداز کافی ہے، مگر) یہ بہرے جس وقت (حق کی طرف بلائے جانے کے واسطے عذاب سے) ڈرائے جاتے ہیں سنتے ہی نہیں (اور حق کے ظاہر ہونے کے طریقہ میں تامل ہی نہیں کرتے، بلکہ وہی مرغی کی ایک ٹانگ عذاب ہی مانگے جاتے ہیں) اور (ان کی عالی ہمتی کی کیفیت یہ ہے کہ) اگر ان کو آپ کے رب کے عذاب کا ایک جھونکا بھی ذرا لگ جائے تو (ساری بہادری ختم ہو جائے اور) یوں کہنے لگیں کہ ہائے ہماری کم بختی! (کیسی ہمارے سامنے آئی) واقعی ہم خطاوار تھے (بس اس ہمت پر عذاب کی فرمائش ہے، واقعی ان کی اس شرارت کا تو یہی تقاضہ تھا کہ دنیا ہی میں فیصلہ کر دیتے، مگر ہم بہت سی حکمتوں کی وجہ سے دنیا میں آخرت کا عذاب دینا نہیں چاہتے، بلکہ آخرت کے لئے اٹھا رکھا ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی ہمارا کام وحی الٰہی کے موافق نصیحت سنا دینا اور انجام سے آگاہ کر دینا ہے، دل کے بہرے اگر اس پکار کو نہ سنیں تو ہمارا قصور نہیں، وہ خود اپنے بہرے پن کا خمیازہ بھگتیں گے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی یہ لوگ جو بہرے بنے ہوئے ہیں، صرف اس وقت تک ہے کہ ذرا زور سے کھٹکھٹائے نہ جائیں، اگر عذاب الٰہی کی ذرا سی بھنک کان میں پڑ گئی یا خدا کے قہر و انتقام کی ادنیٰ بھاپ بھی ان کو چھو گئی تو آنکھ کان سب کھل جائیں گے اس وقت بدحواس ہو کر چلائیں گے کہ بیشک ہم بڑے بھاری مجرم تھے جو ایسی کم بختی آئی۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ؕ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ

اور رکھیں گے ہم ترازوئیں انصاف کی قیامت کے دن، پھر ظلم نہ ہوگا کسی جی پر ایک ذرہ، اور اگر ہوگا برابر

حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴿۴۷﴾

رائی کے دانہ کے تو ہم لے آئیں گے اس کو ۱، اور ہم کافی ہیں حساب کرنے کو ۲۔

**خلاصہ تفسیر:** اور (وہاں) قیامت کے روز ہم میزان عدل قائم کریں گے (اور سب کے اعمال کا وزن کریں گے) سو کسی پر اصلاً ظلم نہ ہوگا، اور (ظلم نہ ہونے کا یہ ثمرہ ہوگا کہ) اگر (کسی کا کوئی) عمل رائی کے دانے کے برابر بھی ہوتو ہم اس کو (وہاں) حاضر کردیں گے (اور اس کا بھی وزن کریں گے) اور ہم حساب لینے والے کافی ہیں (ہمارے وزن اور حساب کے بعد پھر کسی حساب و کتاب کی ضرورت نہ رہے گی بلکہ اسی پر سب فیصلہ ہوجائے گا، پس وہاں ان لوگوں کی شرارتوں کی بھی مناسب اور کافی سزا جاری کردی جائے گی)۔

**وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ:** لفظ مَوَازِيْن میزان کی جمع ہے جو ترازو کے معنی میں آتا ہے، اس جگہ میزان کے لئے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، اس سے بعض حضرات مفسرین نے یہ قرار دیا ہے کہ وزن اعمال کے لئے بہت سی میزانیں استعمال کی جائیں گی، خواہ ہر شخص کے لئے الگ الگ میزان ہو یا خاص خاص اعمال کے لئے الگ الگ میزانیں ہوں، مگر جمہور علماء اس پر متفق ہیں کہ میزان ایک ہی ہوگی، اس کو بصیغہ جمع اس لئے تعبیر کردیا ہے کہ وہ بہت سی موازین کا کام دے گی کیونکہ ساری مخلوقات آدم علیہ السلام سے قیامت تک جن کی تعداد اللہ ہی جانتا ہے ان سب کے اعمال کو یہی ترازو تولے گی، میزان کی تحقیق سورہ اعراف کے پہلے رکوع آیت ۸-۹ میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمایے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی رائی کے دانہ کے برابر کسی کا عمل ہوگا وہ بھی میزان میں تلے گا، ادھر ادھر ضائع نہ ہوگا نہ کسی پر ظلم وزیادتی کی جائے گی، رتی رتی کا حساب برابر کردیا جائے گا۔

**فائدہ:** ۲ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ یعنی ہمارا حساب آخری اور فیصلہ کن ہوگا جس کے بعد کوئی دوسرا حساب نہیں، نہ ہم کو ساری مخلوق کا حساب لینے میں کسی مددگار کی ضرورت ہے۔

**تنبیہ:** "مَوَازِيْن" میزان کی جمع ہے، شاید بہت سی ترازوئیں ہوں، یا ایک ہی ہو، مگر مختلف اعمال وعمال کے اعتبار سے کئی قرار دے دی گئیں واللہ اعلم، وزن اعمال اور میزان کے متعلق سورہ "اعراف" [آیت ۸ اور ۹] میں کلام کیا جاچکا ہے اسے دیکھ لیا جائے۔

**ربط:** آگے بتلایا کہ انذار وتخویف کا سلسلہ پہلے سے چلا آتا ہے، آج جن باتوں سے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ڈراتے ہیں انبیائے سابقین بھی ان سے ڈراتے چلے آئے ہیں۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ

اور ہم نے دی تھی موسیٰ اور ہارون کو فیصلے چکانے والی کتاب اور روشنی اور نصیحت ڈرنے والوں کو ۱ جو ڈرتے ہیں اپنے رب سے

بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ؕ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع ۴

بن دیکھے اور وہ قیامت کا خطرہ رکھتے ہیں ۲ اور یہ ایک نصیحت ہے برکت کی جو ہم نے اتاری، سو کیا تم اس کو نہیں مانتے ۳

**خلاصہ تفسیر:** شروع سورت سے یہاں تک توحید ورسالت کا زیادہ اور اس کے تعلق سے انبیاء کے مخالفین کا آخرت میں مستحق

عذاب ہونا اور بعض کا دنیا میں بھی ہلاک ہونا مذکور تھا، آگے بعض انبیاء علیہم السلام کے قصے بیان فرمانے سے ان ہی مضامین کی تائید فرماتے ہیں، رسالت کی تائید تو ان کے رسول ہونے سے ظاہر ہے، توحید کی تائید ان انبیاء کے توحید کی طرف داعی ہونے سے اور مخالفین کے مستحق عذاب ہونے کی تائید گذشتہ اقوام کی ہلاکت سے ہوتی ہے۔

اور ہم نے (آپ سے قبل) موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کو ایک فیصلہ کی اور روشنی کی اور متقیوں کے لئے نصیحت کی چیز (یعنی توریت) عطا فرمائی تھی، جو (متقی) اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں، اور (خدا ہی سے ڈرنے کے سبب) وہ لوگ قیامت سے (بھی) ڈرتے ہیں (کیونکہ قیامت میں اس کا خوف ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور سزا نہ ہونے لگے) اور (جیسے ان کو وہ کتاب ہم نے دی تھی اسی طرح) یہ (قرآن بھی) ایک کثیر الفائدہ نصیحت (کی کتاب) ہے جس کو ہم نے نازل کیا، سو کیا (اس کے بعد جبکہ یہ معلوم ہو گیا کہ کتابوں کا نازل کیا جانا اللہ کا طریقہ ہے، اور خود اس کا اللہ کی طرف سے اتارا جانا دلیل سے ثابت ہے) پھر بھی تم اس کے (منزل من اللہ ہونے کے) منکر ہو۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی تورات شریف جو حق و باطل، ہدایت و ضلالت اور حلال و حرام کے قضیے چکانے والی اور جہل و غفلت کی اندھیریوں میں روشنی پہنچانے والی اور خدا سے ڈرنے والوں کو نصیحت سنانے والی کتاب تھی۔

**فائدہ:** ۲ قیامت کا خطرہ بھی اسی لیے رکھتے ہیں کہ ان کے دل میں خدا کا ڈر ہے، ہر وقت دل میں کھٹکا لگا رہتا ہے کہ دیکھئے وہاں کیا صورت پیش آئے گی، کہیں العیاذ باللہ! حق تعالیٰ کی ناراضی اور عذاب کے مورد نہ بن جائیں، ظاہر ہے ایسے ہی لوگ نصیحت سے منتفع ہوتے ہیں۔

**فائدہ:** ۳ یعنی ایک نصیحت کی کتاب یہ قرآن تمہارے سامنے موجود ہے جس کا جلیل القدر عظیم النفع اور کثیر الخیر ہونا، تورات سے بھی زیادہ روشن ہے، کیا ایسی واضح اور روشن کتاب کے تم منکر ہوتے ہو جہاں انکار کی گنجائش ہی نہیں۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ

اور آگے دی تھی ہم نے ابراہیم کو اس کی نیک راہ ۱ اور ہم رکھتے ہیں (تھے) اس کی خبر ۲ جب کہا اس نے اپنے باپ کو اور اپنی قوم کو

مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿۵۲﴾

یہ کیسی مورتیں ہیں جن پر تم مجاور بنے بیٹھے ہو ۳

**خلاصہ تفسیر:** اور ہم نے اس (زمانہ موسوی) سے پہلے ابراہیم (علیہ السلام) کو ان کی (شان کے مناسب) خوش فہمی عطا فرمائی تھی اور ہم ان (کے علمی و عملی کمالات) کو خوب جانتے تھے (یعنی وہ بڑے کامل تھے، یعنی خوش فہمی عطا ہونے سے پہلے ان میں قابلیت اور استعداد بہت تھی اور عطا ہونے کے بعد بالفعل کامل ہو گئے، ان کا وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے) جبکہ انہوں نے اپنے باپ سے اور اپنی برادری سے (ان کو بت پرستی میں مشغول دیکھ کر) فرمایا کہ کیا (واہیات) مورتیں ہیں جن (کی عبادت) پر تم جمے بیٹھے ہو (یعنی یہ ہرگز قابل عبادت نہیں)۔

**مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ:** چونکہ تماثیل کا لفظ بتوں کے ساتھ خاص نہیں، اسی طرح لفظ عکوف بھی پرستش کے ساتھ خاص نہیں، چنانچہ حضرت علیؓ نے شطرنج کھیلنے والوں پر اسی آیت سے رد فرمایا، اس لیے اس آیت سے مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ نے تصور شیخ کے منکر ہونے پر استدلال فرمایا ہے، جو غالی (شدت پسند) صوفیوں میں معروف ہے، باقی جس میں مقصود مستقل نہ ہو اور نہ اس کی پرستش ہو، بلکہ دیگر محبوب چیزوں کی طرح غلبہ محبت کے وقت اس کا خیال کرنے لگے اور جب وہ ذہن سے غائب ہونے لگے تو اس کو باقی رکھنے کا اہتمام نہ کرے تو کوئی حرج نہیں۔

**اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ:** روح المعانی میں من قبل کی تفسیر قبل بلوغ سے کی ہے، یعنی بلوغ سے پہلے خوش فہمی عطا فرمائی تھی، اور

بقول بعض ولادت سے بھی پہلے جبکہ آدم علیہ السلام کی صلب میں تھے، اس سے معلوم ہوا کہ کسی بھی کام کے کرنے کے لیے انسان پہلے اس کام کو سیکھتا ہے اور پھر تجربہ حاصل کرتا ہے تو یہ ثانوی حیثیت ہے، اول اساس اور بنیاد اس کام کے کرنے کی وہ فطری استعداد اور صلاحیت ہے جو اس کو ودیعت کی جاتی ہے اور اس فطری استعداد کو استعمال کرتے ہوئے وہ یہ کام کرتا ہے اور یہ اس درجہ کی قوت رکھتی ہے کہ استعداد دینے کو عطا سے تعبیر فرما دیا۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اور حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام سے پیشتر ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اسکی اعلیٰ قابلیت وشان کے مناسب رشد وہدایت دی تھی، بلکہ جوانی سے پہلے ہی بچپن میں اسے نیک راہ پر ڈال دیا تھا جو ایسے اولوالعزم انبیاء کے شایان شان ہو۔

**فائدہ:** ۲؎ وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ یعنی اس کی استعداد و اہلیت اور کمالات علمیہ کی پوری خبر ہم ہی رکھتے ہیں، اسی لیے جو رشد و ہدیٰ اس کے حسب حال تھی ہم نے عطا کر دی۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی ذرا اُن کی اصلیت اور حقیقت تو بیان کرو، آخر پتھر کی خود تراشیدہ مورتیاں خدا کسی طرح بن گئیں۔

قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ﴿۵۳﴾ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴿۵۴﴾

بولے ہم نے پایا اپنے باپ دادوں کو انہی کی پوجا کرتے ۱؎ بولا مقرر رہے ہو تم اور تمہارے باپ دادے صریح گمراہی (غلطی) میں ۲؎

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ﴿۵۵﴾

بولے تو ہمارے پاس لایا ہے سچی بات یا تو کھلاڑیاں کرتا ہے ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** وہ لوگ (جواب میں) کہنے لگے کہ ہم نے اپنے بڑوں کو ان کی عبادت کرتے ہوئے دیکھا ہے (اور وہ لوگ عقلمند تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مورتیں عبادت کے لائق ہیں) ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا کہ بیشک تم اور تمہارے باپ دادے (ان کو لائق عبادت سمجھنے میں) صریح غلطی میں (مبتلا) ہو (یعنی خود ان ہی کے پاس بتوں کی معبودیت کی کوئی دلیل اور سند نہیں، وہ تو اس لئے گمراہی میں ہیں اور تم ایسوں کی تقلید کرتے ہو جن کا دلیل پر ہونا ثابت نہیں اس لیے تم گمراہی میں ہو، چونکہ ان لوگوں نے ایسی بات سنی نہ تھی، نہایت متعجب ہو کر) وہ لوگ کہنے لگے کہ کیا تم (اپنے نزدیک) سچی بات (سمجھ کر) ہمارے سامنے پیش کر رہے ہو یا (یوں ہی) دل لگی کر رہے ہو۔

لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ: یہ آیت ان لوگوں کی بدحالی کا اظہار کرتی ہے جو غلط کاموں میں بغیر کسی دلیل وسند کے اپنے دنیاوی یا دینی بڑوں بزرگوں کی اتباع میں غلو کرتے ہیں، جیسا کہ کثرت سے جہلاء کا شعار ہے (یعنی اپنے بڑوں کی دینی یا دنیاوی اعتبار سے پیروی وہاں تک کرنی ہے جہاں تک شریعت اجازت دے، جاہلوں کی طرح ہر غلط سلط بات کی پیروی نہیں کرنی) جو لوگ ایسی آیات سے تقلید شرعی کا انکار کرتے ہیں ان کا استدلال باطل ہے، کیونکہ تقلید شرعی دلیل اور سند کے ساتھ ہوتی ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی عقل وفطرت اور نقل معتد بہ کی کوئی شہادت ہماری تائید میں نہیں ہے نہ سہی، لیکن بڑی بھاری دلیل بت پرستی کے حق و صواب ہونے کی یہ ہے کہ اوپر سے ہمارے باپ دادا ان ہی کی پوجا کرتے چلے آئے ہیں، پھر ہم اپنے بڑوں کا طریقہ کیسے چھوڑ دیں۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی اس دلیل سے تمہاری حقانیت اور عقلمندی ثابت نہ ہوئی، ہاں! یہ ثابت ہوا کہ تمہارے باپ دادا بھی تمہاری طرح گمراہ اور بیوقوف تھے جن کی کورانہ تقلید میں تم تباہ ہو رہے ہو۔

**فائدہ:** ۳؎ تمام قوم کے عقیدہ کے خلاف ابراہیم علیہ السلام کی ایسی سخت گفتگو سن کر ان میں اضطراب پیدا ہو گیا، کہنے لگے کیا سچ مچ تیرا خیال اور عقیدہ یہی ہے یا محض ہنسی اور دل لگی کرتا ہے۔

قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِیْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ﴿۵۶﴾

بولا نہیں رب تمہارا وہی ہے رب آسمان اور زمین کا جس نے ان کو بنایا ، اور میں اسی بات کا قائل ہوں ۱ے

وَتَاللّٰهِ لَاَكِیْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِیْنَ ﴿۵۷﴾

اور قسم اللہ کی ! میں علاج کروں گا تمہارے بتوں کا جب تم جا چکو گے پیٹھ پھیر کر ۲ے

**خلاصہ تفسیر:** ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ نہیں (دل لگی نہیں ، بلکہ سچی بات ہے اور صرف میرے ہی نزدیک نہیں ، بلکہ واقع میں بھی سچی بات یہی ہے کہ یہ مورتیں عبادت کے قابل نہیں ) بلکہ تمہارا رب ( حقیقی جو لائق عبادت ہے ) وہ ہے جو تمام آسمانوں کا اور زمین کا رب ہے جس نے ( تربیت کے علاوہ ) ان سب ( آسمانوں اور زمین اور ان میں جو مخلوق ہے جس میں یہ اصنام وغیرہ بھی داخل ہیں سب ) کو پیدا کیا ، اور میں اس ( دعوی ) پر دلیل بھی رکھتا ہوں ( تمہاری طرح کورانہ تقلید سے کام نہیں لیتا ) اور خدا کی قسم ! میں تمہارے ان بتوں کی گت بناؤں گا جب تم ( ان کے پاس سے ) چلے جاؤ گے ( تا کہ ان کا عاجز و لاچار ہونا زیادہ مشاہدے میں آجائے ) ۔

کورانہ تقلید سے وہی بے دلیل و بے سند تقلید مراد ہے جس کی نفی ایک آیت قبل کی گئی ۔

* * *

**فائدہ:** ۱ے یعنی میرا عقیدہ ہی یہ ہے اور پورے یقین وبصیرت سے اس کی شہادت دیتا ہوں کہ میرا تمہارا سب کا رب وہ ہی ایک خدا ہے جس نے آسمان زمین پیدا کیے اور ان کی دیکھ بھال رکھی ، کوئی دوسری چیز اس کی خدائی میں شریک نہیں ہوسکتی ۔

**فائدہ:** ۲ے یہ بات ذرا آہستہ کہی کہ بعض نے سنی ، بہتوں نے نہ سنی ، جنہوں نے سنی اس کی کچھ پروا نہ کی ، کیونکہ وہ سمجھ رہے تھے کہ تنہا ایک نوجوان ساری قوم کے معبودوں کا کیا بگاڑ سکتا ہے ۔

فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِیْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَیْهِ یَرْجِعُوْنَ ﴿۵۸﴾

پھر کر ڈالا اُن کو ٹکڑے ٹکڑے مگر ایک بڑا اُن کا کہ شاید ( تا کہ ) اس کی طرف رجوع کریں

**خلاصہ تفسیر:** ( ان لوگوں نے یہ سمجھ کر کہ ابراہیم اکیلے ہمارے خلاف کارروائی کیا کر سکتے ہیں کچھ التفات نہ کیا ہوگا اور چلے گئے ) تو ( ان کے چلے جانے کے بعد ) انہوں نے ان بتوں کو ( کلہاڑی وغیرہ سے توڑ پھوڑ کر ) ٹکڑے ٹکڑے کر دیا بجز ان کے ایک بڑے بت کے ( جو جثہ میں یا ان لوگوں کی نظر میں قابل تعظیم ہونے کی وجہ سے بڑا تھا اس کو چھوڑ دیا ، غرض ایک کو مصلحت کی وجہ سے چھوڑ کر باقی سب کو توڑ دیا ) کہ شاید وہ لوگ ابراہیم کی طرف ( دریافت کرنے کے طور پر ) رجوع کریں ( اور پھر ابراہیم جواب کی تقریر سے دوبارہ پوری طرح حق کو ثابت کر سکیں ) ۔

**فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِیْرًا لَّهُمْ** :اس سے ایک قسم کا استہزاء مقصود تھا کہ ایک کو صحیح سالم رہنے اور دوسروں کے ٹوٹے پھوٹے ہونے سے اشتباہ ہوتا ہے کہ کہیں اسی نے تو باقی سب کو نہیں توڑا ، پس ابتداءً تو ان کو شبہ اور وہم میں ڈالنا مقصود ہے ، پھر جب وہ لوگ توڑنے والے کی تحقیق کریں گے اور اس بڑے بت پر احتمال بھی نہ کریں گے تو ان کی طرف سے اس کے عاجز ہونے کا اقرار بھی ہو جائے گا ، اور دوسروں کا عاجز ہونا تو خود ٹوٹنے پھوٹنے سے معلوم ہو جائے گا تو حجت تمام ہو جائے گی ، اور آخر کار یہ الزام ان پر قائم ہو جائے گا ۔

* * *

**فائدہ:** جب وہ لوگ شہر سے باہر ایک میلہ میں گئے تب ابراہیم علیہ السلام نے بت خانہ میں جا کر بتوں کو توڑ ڈالا ، صرف ایک بت کو باقی رہنے دیا جو باعتبار جثہ کے ، یا تعظیم و تکریم کے ان کے نزدیک سب سے بڑا تھا ، اور جس کلہاڑی سے توڑا تھا وہ اس بڑے کے گلے میں لٹکا دی ، تا کہ وہ لوگ

جب واپس آ کر یہ صورت حال دیکھیں تو قدرتی طور پر ان کا خیال اس بڑے بت کی طرف ہو یا الزاماً اس کی طرف رجوع کرایا جا سکے۔

قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِیْنَ﴿۵۹﴾ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى یَّذْكُرُهُمْ

کہنے لگے کس نے کیا یہ کام ہمارے معبودوں کے ساتھ وہ تو کوئی بے انصاف ہے ۱۔ وہ بولے ہم نے سنا ہے ایک جوان بتوں کو کچھ کہا کرتا ہے

یُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِیْمُ﴿۶۰﴾ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْیُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَشْهَدُوْنَ﴿۶۱﴾

اس کو کہتے ہیں ابراہیم ۲۔ وہ بولے اس کو لے آؤ لوگوں کے سامنے شاید (تاکہ) وہ دیکھیں ۳

**خلاصہ تفسیر:** (غرض وہ لوگ جو بت خانہ میں آئے تو بتوں کی بری گت بنی دیکھی آپس میں) کہنے لگے کہ یہ (بے ادبی کا کام) ہمارے بتوں کے ساتھ کس نے کیا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے بڑا ہی غضب کیا (یہ بات ایسے لوگوں نے پوچھی جن کو ابراہیم کے اس قول کی اطلاع نہ تھی کہ میں ان بتوں کی گت بناوں گا، یا تو اس وجہ سے کہ وہ لوگ اس وقت موجود نہ ہوں گے، کیونکہ اس مناظرہ کے وقت تمام قوم کا موجود ہونا ضروری نہیں، یا موجود ہوں مگر سنا نہ ہو، اور بعض نے سن لیا ہو) بعضوں نے کہا (جن کو اس قول کا علم تھا) کہ ہم نے ایک نوجوان آدمی کو جس کو ابراہیم کر کے پکارا جاتا ہے ان بتوں کا (برائی کے ساتھ) تذکرہ کرتے سنا ہے (پھر) وہ (سب) لوگ (یا جنہوں نے اول پوچھا تھا) بولے کہ (جب یہ بات ہے) تو اچھا اس کو سب آدمیوں کے سامنے حاضر کرو تاکہ (شاید وہ اقرار کر لے اور) وہ لوگ (اس کے اقرار کے) گواہ ہو جائیں (پھر اتمام حجت کے بعد سزا دی جائے جس پر کوئی ملامت نہ کر سکے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱۔ یعنی یہ گستاخی اور بے ادبی کی حرکت ہمارے معبودوں کے ساتھ کس نے کی، یقیناً جس نے یہ کام کیا بڑا ظالم اور شریر ہے (استغفر اللہ)، یہ شاید ان لوگوں نے کہا ہوگا جن کے کان تک وَتَاللّٰهِ لَاَكِیْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ کی آواز نہ پہنچی تھی۔

**فائدہ:** ۲۔ یہ کہنے والے وہ لوگ ہوں گے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جملے سن چکے تھے، یعنی وہ ہی ایک شخص ہے جو ہمارے معبودوں کا ذکر برائی سے کیا کرتا ہے، یقیناً یہ کام اسی نے کیا ہوگا۔

**فائدہ:** ۳۔ یعنی اس کو بلا کر برملا مجمع عام میں بیان لیا جائے، تاکہ معاملہ کو سب لوگ دیکھ کر خود اس کی باتیں سن کر گواہ رہیں کہ جو سزا اُس کو قوم کی طرف سے دی جائے گی بیشک وہ اس کا مستحق تھا، یہ تو ان کی غرض تھی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقصود بھی یہ ہی ہوگا کہ مجمع عام میں ان کو موقع ملے کہ مشرکین کو عاجز و مبہوت کریں اور علیٰ رؤس الاشہاد غلبہ حق کا اظہار ہو۔

قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا یٰٓاِبْرٰهِیْمُ﴿۶۲﴾

بولے کیا تو نے کیا ہے یہ ہمارے معبودوں کے ساتھ اے ابراہیم!

قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِیْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا یَنْطِقُوْنَ﴿۶۳﴾

بولا نہیں پر یہ کیا ہے ان کے اس بڑے نے، سو ان سے پوچھ لو اگر وہ بولتے ہیں ۱۔

**خلاصہ تفسیر:** (غرض ابراہیم علیہ السلام سب کے روبرو آئے اور ان سے) ان لوگوں نے کہا کہ کیا ہمارے بتوں کے ساتھ تم نے یہ حرکت کی ہے اے ابراہیم؟! انہوں نے (جواب میں) فرمایا کہ (تم یہ احتمال کیوں نہیں فرض کرتے کہ یہ حرکت میں نے) نہیں کی، بلکہ ان کے

اس بڑے (گرو) نے کی (اور جب اس بڑے بت میں ایسی حرکت کرنے کا احتمال ہوسکتا ہے تو ان دیگر چھوٹے بتوں میں بولنے اور بات کرنے کا احتمال بھی ہوگا) سوان (ہی) سے پوچھ لو (نا) اگر یہ بولتے ہوں (اور اگر بڑے بت میں توڑنے پھوڑنے کی قدرت اور چھوٹوں میں بولنے کی طاقت نہیں ہے تو تمہارے نزدیک ان کا عاجز ہونا مسلّم ہوگیا، پھر ان کو معبود اعتقاد کرنے کی کیا وجہ ہے؟!!)۔

**قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا:** یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کام تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود کیا تھا، پھر اس سے انکار اور ان کے بڑے کی طرف منسوب کرنا بظاہر خلاف واقعہ ہے جس کو جھوٹ کہا جاتا ہے، حضرت خلیل اللہ کی شان اس سے بالا و برتر ہے، اس کے جواب میں حضرات مفسرین نے بہت سے احتمالات بیان فرمائے ہیں، ان میں سے ایک جواب یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول بطور فرض کے تھا، یعنی تم یہ کیوں نہیں فرض کر لیتے کہ یہ کام بڑے بت نے کیا ہوگا اور بطور فرض کے کوئی خلاف واقعہ بات کہنا جھوٹ میں داخل نہیں جیسے خود قرآن میں ہے: اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ یعنی اگر اللہ رحمن کے کوئی لڑکا ہوتا تو میں سب سے پہلے اس کی عبادت کرنے والوں میں داخل ہوتا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس واقعہ کے متعلق صحیح بخاری وغیرہ میں ایک حدیث آئی ہے، اس کا مطلب سمجھ لینا چاہئے، وہ حدیث یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوائے تین مرتبہ کے کبھی جھوٹ نہیں بولا، ایک تو اس وقت کہ جب ان کی قوم نے دریافت کیا کہ ان بتوں کو کس نے توڑا؟ تو ابراہیم علیہ السلام نے کہا: بل فعله كبيرهم یعنی ان کے بڑے نے توڑا، دوسرے اس وقت جبکہ ان کی قوم نے ان کو اپنے ساتھ عید میں چلنے کو کہا تو انہوں نے کہا: انی سقیم یعنی میں بیمار ہوں، تیسرے اس وقت کہ جب مصر کے ایک ظالم بادشاہ نے ان کی بیوی سارہ کو گرفتار کیا تو انہوں نے کہا: هذا اختی یہ میری بہن ہے، اس حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بظاہر جھوٹ بولنا مذکور ہوا، حالانکہ حضرات انبیاء کرام علیہ السلام تو قطعی طور پر معصوم ہوتے ہیں، اسی خیال کی بناء پر بعض لوگوں نے اس حدیث کی صحت سے انکار کر دیا مگر یہ صحیح نہیں، اس لیے کہ یہ حدیث صحیح بخاری میں ہے اور حدیث کی بیشمار معتبر اور مستند کتابوں میں اسانید صحیحہ اور جیدہ سے مذکور ہے جس کی صحت میں آج تک کسی امام حدیث نے کلام نہیں کیا اور نہ کلام کی گنجائش ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں کذب (جھوٹ) سے تعریض اور کنایہ مراد ہے، یعنی ایسی ذو معنی بات کہنا کہ جو حقیقت اور واقع کے اعتبار سے تو صحیح اور واقع کے مطابق ہو، اور ظاہری معنی اور سرسری مطلب کے لحاظ سے سننے والا ایسے معنی سمجھے کہ اس کی سمجھ کے اعتبار سے خلاف واقع ہو، اس سے مقصود الزام اور اتمام حجت ہے، حضرات انبیاء کی زبان مبارک سے جو کلمہ نکلتا ہے وہ فی الحقیقت ہرگز خلاف واقع نہیں ہوتا، البتہ مخاطب اور سامع کے فہم اور ادراک کے لحاظ سے کبھی خلاف واقع ہوتا ہے، "توریہ" کے معنی اخفاء یعنی چھپانے کے ہیں، متکلم نے کسی مصلحت کی بنا پر حقیقت حال کے چھپانے کے لئے ایسا لفظ بولا جس کو متعدد پہلو تھے، سامع اپنے قصور فہم کی وجہ سے اس کو پوری طرح نہ سمجھ سکا، سامع کی نظر اس کلام کے ظاہری پہلو پر گئی اور متکلم کی نظر اس کے خفی اور پوشیدہ پہلو پر تھی، سو یہ توریہ ہے جھوٹ نہیں، چونکہ حضرات انبیاء کرام علیہ السلام کا مرتبہ بہت بلند ہے اس لیے یہ امر بھی ان کی شان بلند کے مناسب نہیں کہ ان کے کلام میں کوئی پہلو خلاف توقع نکل سکے، توریہ اور کنایہ اگر بر بنائے مصلحت وضرورت جائز ہے مگر درجہ رخصت میں، مقام عزیمت یہ ہے کہ بلا کسی توریہ اور کنایہ کے امر حق کو صراحتاً واضح کیا جائے اور کھول کر صاف بیان کیا جائے، ان تین باتوں میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کوئی بھی بات بھی خلاف واقع نہ تھی، البتہ ایک دینی اور شرعی ضرورت کی بنا پر تعریض اور کنایہ کے باب سے تھی، عقلا و شرعا یہ امر مسلّم ہے کہ تعریض اور توریہ جھوٹ نہیں اور وہ فی حد ذاتہ جائز ہے، نہ عصمت کے منافی ہے اور نہ نبوت کے منافی ہے، بعض مرتبہ خود حق تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو اس کی اجازت دی ہے: ایتها العیر انكم لسارقون۔

دوسری بات یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ تینوں باتیں محض دینی مصلحت کے لیے اور خالص اللہ کے لیے تھیں، اور یہ وجہ تو خود حدیث کے الفاظ میں صراحتاً مذکور ہے، جس سے معلوم ہوا کہ یہ درحقیقت کذب نہ تھا، بلکہ ایک توریہ تھا، اسی وجہ سے حدیث میں ہے: "کل ذلك فی ذات الله" یعنی اپنی ذاتی غرض اور دنیوی مصلحت مدنظر نہ تھی جیسا کہ ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: "ما منها كذبة إلا ماحل بها عن دين الله" یعنی ابراہیم علیہ السلام کا ہر کذب (تعریض) محض اللہ کے دین کی حمایت اور مدافعت کے لئے تھا اپنے ذاتی فائدہ اور غرض کے لیے نہ تھا، خلاصہ کلام یہ

کہ جن احادیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق تین باتوں میں کذب کی نسبت کی گئی ہے سو یہ اطلاق محض ظاہر اور صورت کے اعتبار سے کیا گیا ہے اور "لم یکذب إلا فی ثلاث "میں إلا استثنا منقطع کے لیے ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام تو صدیق معظم اور صدق مجسم تھے ان کی زبان سے کبھی کوئی کذب نکلا ہی نہیں، مگر ساری عمر میں تین باتیں ان کی زبان سے ایسی نکلیں کہ مخاطب نے سن کر ان سے جو سمجھا وہ خلاف واقع تھا، مخاطب کے اعتبار سے ان الفاظ کی صورت دوسری تھی۔

مرزا قادیانی اور کچھ دوسرے مستشرقین سے مغلوب مسلمانوں نے اس حدیث کو باوجود صحیح السند ہونے کے اس لئے غلط اور باطل کہہ دیا کہ اس سے حضرت خلیل اللہ کی طرف جھوٹ کی نسبت ہوتی ہے اور سند کے سارے راویوں کو جھوٹا کہہ دینا اس سے بہتر ہے کہ خلیل اللہ کو جھوٹا قرار دیا جائے، کیونکہ وہ قرآن کے خلاف ہے اور پھر اس سے ایک کلیہ قاعدہ یہ نکال لیا کہ جو حدیث قرآن کے خلاف ہو خواہ وہ کتنی ہی قوی اور صحیح اور معتبر اسانید سے ثابت ہو وہ غلط قرار دی جائے، یہ بات اپنی جگہ تو بالکل صحیح اور ساری امت کے نزدیک بطور فرض محال کے مسلم ہے، مگر علماء امت نے تمام ذخیرہ احادیث میں اپنی عمریں صرف کر کے ایک ایک حدیث کو چھان لیا ہے جس حدیث کا ثبوت قوی اور صحیح اسانید سے ہو گیا، ان میں ایک بھی ایسی نہیں ہو سکتی کہ جس کو قرآن کے خلاف کہا جا سکے، بلکہ وہ اپنی کم فہمی یا کج فہمی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ جس حدیث کو رد اور باطل کرنا چاہا اس کو قرآن سے ٹکرا دیا اور یہ کہہ کر فارغ ہو گئے کہ یہ حدیث خلاف قرآن ہونے کے سبب غیر معتبر ہے، جیسا کہ اسی حدیث میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ الفاظ کذبات سے توریہ مراد ہونا خود حدیث کے اندر موجود ہے، رہا یہ معاملہ کہ پھر حدیث میں توریہ کو "کذبات" کے لفظ سے کیوں تعبیر کیا گیا؟ تو اس کی وجہ وہی ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کی بھول اور لغزش کو عصیٰ اور غویٰ کے الفاظ سے تعبیر کرنے کی ابھی سورۃ طٰہٰ میں موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں گزر چکی ہے کہ مقربان بارگاہ حق تعالیٰ کے لئے ادنیٰ کمزوری اور محض رخصت اور جائز پر عمل کر لینا اور عزیمت کو چھوڑ دینا بھی قابل مواخذہ سمجھا جاتا ہے اور ایسی چیزوں پر قرآن میں حق تعالیٰ کا عتاب انبیاء کے بارے میں بکثرت منقول ہے۔

* * *

**فائدہ:** [1] یعنی مجھ سے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ یہ فرض کر لیا جائے کہ اس بڑے گروگھنٹال نے جو صحیح سالم کھڑا ہے اور توڑنے کا آلہ بھی اس کے پاس موجود ہے یہ کام کیا ہوگا، لیجئے بحث و تحقیق کے وقت بطور الزام و تبکیت میں یہ دعویٰ کیے لیتا ہوں کہ بڑے بت نے سب چھوٹوں کو توڑ ڈالا، اب آپ کے پاس کیا دلیل ہے کہ ایسا نہیں ہوا، کیا دنیا میں ایسا ہوتا نہیں کہ بڑے سانپ چھوٹے سانپوں کو، بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل جاتی ہے، اور بڑے بادشاہ چھوٹی سلطنتوں کو تباہ کر ڈالتے ہیں، اس لیے بہترین صورت میرے تمہارے درمیان فیصلہ کی یہ ہے کہ تم خود اپنے ان معبودوں ہی سے دریافت کر لو کہ یہ ماجرا کس طرح ہوا، اگر یہ کچھ بول سکتے ہیں تو کیا ایسے اہم معاملہ میں بول کر میرے جھوٹ سچ کا فیصلہ نہ کر دیں گے؟

**تنبیہ:** ہماری تقریر سے ظاہر ہو گیا کہ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا کہنا خلاف واقعہ خبر دینے کے طور پر نہ تھا جسے حقیقۃً جھوٹ کہا جائے، بلکہ ان کی تحمیق و تجہیل کے لیے ایک فرضی احتمال کو بصورت دعویٰ لے کر بطور تعریض والزام کلام کیا گیا تھا جیسا کہ عموماً بحث و مناظرہ میں ہوتا ہے، اس کو جھوٹ نہیں کہہ سکتے، ہاں بظاہر صورت جھوٹ کی معلوم ہوتی ہے، اسی لیے بعض احادیث میں اس پر لفظ کذب کا اطلاق صورۃً کیا گیا ہے، مفسرین نے اس کی توجیہ میں اور بھی کئی محمل بیان کیے ہیں، مگر ہمارے نزدیک یہی تقریر زیادہ صاف بے تکلف اور اقرب الی الروایات ہے، واللہ اعلم۔

فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾

پھر سوچے اپنے جی میں، پھر بولے، لوگو تم ہی بے انصاف ہو [1]

ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۵﴾

پھر اوندھے ہو گئے سر جھکا کر [2] تو تو جانتا ہے جیسا یہ بولتے ہیں [3]

**خلاصہ تفسیر:** اس پر وہ لوگ اپنے جی میں سوچے، پھر (آپس میں) کہنے لگے کہ حقیقت میں تم ہی لوگ ناحق پر ہو (اور ابراہیم حق پر ہیں، جو ایسا عاجز ہو وہ کیا معبود ہوگا) پھر (شرمندگی کے مارے) اپنے سروں کو جھکا لیا (اور ابراہیم علیہ السلام سے نہایت مغلوبانہ لہجہ میں بولے کہ) اے ابراہیم! تم کو تو معلوم ہی ہے کہ یہ بت (کچھ) بولتے نہیں (ہم ان سے کیا پوچھیں اور اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بڑے بت میں بھی کسی کام کی قدرت نہیں)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ے یعنی سمجھے کہ بیکار پتھر پوجنے سے کیا حاصل، یا یہ مطلب ہو کہ تم نے خود اپنے او پر ظلم کیا کہ باوجود ابراہیم علیہ السلام کی دھمکی سننے کے یوں ہی لا پروائی سے بت خانہ کھلا چھوڑ کر چلے گئے اپنے معبودوں کی حفاظت کا کوئی سامان کر کے نہ گئے کذا قال ابن کثیر۔

**فائدہ:** ۲ے یعنی شرمندگی سے آنکھ نہیں ملا سکے تھے۔

**فائدہ:** ۳ے یعنی جان بوجھ کر ہم سے ایسی ناممکن بات کا مطالبہ کیوں کرتا ہے، کہیں پتھر بھی بولے ہیں؟۔

قَالَ اَفَتَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنۡفَعُكُمۡ شَيۡـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمۡ ؕ‏ ﴿۶۶﴾

بولا کیا پھر تم پوجتے ہو اللہ سے ورے ایسے کو جو تمہارا کچھ بھلا کرے نہ برا

اُفٍّ لَّكُمۡ وَلِمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۷﴾

بیزار ہوں میں تم سے، اور جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوائے، کیا تم کو سمجھ نہیں ۱ے

**خلاصہ تفسیر:** (اس وقت) ابراہیم (علیہ السلام) نے (خوب خبر لی اور) فرمایا کہ (افسوس جب یہ ایسے ہیں) تو کیا خدا کو چھوڑ کر تم ایسی چیز کی عبادت کرتے ہو جو تم کو نہ کچھ نفع پہنچا سکے اور نہ کچھ نقصان پہنچا سکے (یعنی خود کچھ نقصان اپنے ہاتھوں سے نہیں دے سکتے اور یہ بات یقینی ہے کہ وہ نقصان کا سبب بنتے ہیں، کیونکہ ان کی عبادت کفر اور عذاب کا سبب ہے) تف ہے تم پر (کہ حق واضح ہونے کے باوجود باطل پر مصر ہو) اور ان پر (بھی) جن کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو، کیا تم (اتنا بھی) نہیں سمجھتے (اس تمام تقریر سے اور خصوصاً اس بات سے کہ توڑنے پھوڑنے سے انکار نہیں فرمایا باوجودیکہ انکار کا احتمال تھا برادری والوں کو ثابت ہو گیا کہ یہ کام ابراہیم ہی کا ہے)۔

**اُفٍّ لَّكُمۡ وَلِمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ:** بعض بزرگوں کی عادت ہے کہ بغض فی اللہ کی وجہ سے ایسوں کے ساتھ سختی سے پیش آتے ہیں تو یہ آیت اس کی اصل ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ے یعنی پھر تم کو ڈوب مرجانا چاہیے کہ جو مورتی ایک لفظ نہ بول سکے، کسی آڑے وقت کام نہ آسکے، ذرہ برابر نفع و نقصان اس کے اختیار میں نہ ہو، اسے خدائی کا درجہ دے رکھا ہے، کیا اتنی موٹی بات بھی تم نہیں سمجھ سکتے۔

قَالُوۡا حَرِّقُوۡهُ وَانۡصُرُوۡۤا اٰلِهَتَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ فٰعِلِيۡنَ ﴿۶۸﴾

بولے اس کو جلاؤ اور مدد کرو اپنے معبودوں کی اگر کچھ کرتے ہو

**خلاصہ تفسیر:** (حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تقریر کا کچھ جواب بن نہ پایا تو اس قول کے مطابق کہ: ''چو حجت نماند جفا جوئے را، بہ پرخاش درہم کشد روئے را'' یعنی جب جاہل جواب نہ رکھتا ہو اور قدرت رکھتا ہو تو ظلم پر کمر باندھ لیتا ہے، آپس میں) وہ لوگ کہنے لگے کہ ان (ابراہیم) کو آگ میں جلا دو اور اپنے معبودوں کا (ان سے) بدلا لو اگر تم کو کچھ کرنا ہے (تو یہ کام کرو، ورنہ بالکل ہی بات ڈوب جائے گی)۔

**فائدہ:** یعنی بحث ومناظرہ میں تو اس سے جیت نہیں سکتے، اب صرف ایک ہی صورت ہے کہ (جومعبود ہماری بلکہ خود اپنی مدد نہیں کر سکتے) ہم ان کی مدد کریں اور ان کے دشمن کو سخت ترین سزا دیں، اگر ایسا نہ کر سکے تو ہم نے کچھ کام نہ کیا، چنانچہ اس مشورہ کے موافق حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں جلانے کی سزا تجویز ہوئی، گویا جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے بت توڑ کر ان کے دل جلائے تھے، یہ ان کو آگ میں جلا ڈالیں، آخر ظالموں نے جمع ہو کر نہایت اہتمام اور بے رحمی کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سخت بھڑکتی ہوئی آگ کی نذر کر دیا۔

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿٦٩﴾ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ﴿٧٠﴾

ہم نے کہا اے آگ! ٹھنڈک ہو جا اور آرام ابراہیم پر ۱؎ اور چاہنے لگے اس کا برا پھر انہی کو ہم نے ڈالا نقصان میں ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** (غرض سب نے متفق ہو کر اس کا سامان کیا اور ان کو جلتی ہوئی آگ میں ڈال دیا اس وقت) ہم نے (آگ کو) حکم دیا کہ اے آگ! تو ٹھنڈی اور بے گزند (غیر مضر) ہو جا، ابراہیم کے حق میں (یعنی نہ ایسی گرم رہ جس سے جلنے کی نوبت آئے اور نہ بہت ٹھنڈی برف ہو جا کہ اس کی ٹھنڈک سے تکلیف پہنچے، بلکہ معتدل ہوا کی طرح بن جا، چنانچہ ایسا ہی ہو گیا) اور ان لوگوں نے ان کے ساتھ برائی کرنا چاہا تھا (کہ ہلاک ہو جائیں گے) سو ہم نے ان ہی لوگوں کو ناکام کر دیا (کہ ان کا مقصود حاصل نہ ہوا بلکہ اور برعکس ابراہیم علیہ السلام کی حقانیت کا زیادہ ثبوت ہو گیا)۔

**يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا:** ابراہیم علیہ السلام جس آگ میں ڈالے گئے تھے اس کے ٹھنڈا ہو جانے میں چند احتمال ہیں: ① ایک یہ کہ اس میں گرمی اور جلانے کی خاصیت نہ رہی ہو، روشنی اور چمک رہی ہو ② دوسرے یہ کہ ہیئت آگ ہی کی رہی ہو لیکن اس کی حقیقت بدل گئی ہو، مثلاً ہوا بن گئی ہو ③ تیسرے یہ کہ آگ ہی رہی ہو مگر تکلیف دہ نہ رہی ہو اور یہاں عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ کی قید سے بظاہر تیسرا ہی احتمال ہے۔

بعض بزرگوں سے بھی ایسی کرامتیں منقول ہیں تو ایسے واقعات اسی قصہ کی نظیر ہیں۔

**فائدہ:** ۱؎ یعنی تکویناً آگ کو حکم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام پر ٹھنڈی ہو جا، لیکن اس قدر ٹھنڈی نہیں کہ برودت سے تکلیف پہنچنے لگے، ایسی معتدل ٹھنڈی ہو جو جسم وجان کو خوشگوار معلوم ہونے لگے۔

**تنبیہ:** آگ کا ابراہیم علیہ السلام پر ٹھنڈا ہو جانا ان کا معجزہ تھا، معجزہ کی حقیقت یہ ہی ہے کہ حق تعالیٰ اپنی عام عادت کے خلاف سبب عادی کو مسبب سے یا مسبب کو سبب سے جدا کر دے، یہاں احراق کا سبب (آگ) موجود تھی، مگر مسبب اس پر مرتب نہ ہوا، معجزہ وغیرہ کے متعلق مفصل کلام ہم نے ایک مستقل تحریر میں کیا ہے جو رسالہ ''المحمود'' کے کئی نمبروں میں چھپ چکی۔ فلیراجع۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی ابراہیم علیہ السلام کا برا چاہتے تھے، لیکن خود ناکامی، ذلت اور خسارہ میں پڑ گئے حق کی صداقت برملا ظاہر ہوئی اور اللہ کا کلمہ بلند ہوا، قال فی البحر المحيط "قد اكثر الناس فی حكايته ماجرىٰ لابراهيم عليه السلام والذى صح هو ما ذكره الله تعالىٰ من انه عليه السلام القى فی النار فجعلها الله عليه برداً وسلماً"

وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿٧١﴾

اور بچا نکالا ہم نے اس کو اور لوط کو اس زمین کی طرف جس میں برکت رکھی ہے ہم نے جہاں کے واسطے ۱؎

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ ۭ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ﴿٧٢﴾

اور بخشا ہم نے اس کو اسحاق، اور یعقوب دیا انعام میں ۲؎ اور سب کو نیک بخت کیا ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** اور ہم نے ابراہیم کو اور (ان کے برادر زادہ یعنی بھتیجے) لوط (علیہ السلام) کو (کہ انہوں نے ساری قوم کے برخلاف ابراہیم علیہ السلام کی تصدیق کی تھی چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا: فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ اور اسی وجہ سے لوگ ان کے بھی مخالف اور درپے تھے) ایسے ملک (یعنی شام) کی طرف بھیج کر (کافروں کے شر و ایذا سے) بچالیا جس میں ہم نے دنیا جہاں والوں کے واسطے (خیر و) برکت رکھی ہے (دنیوی بھی کہ ہر قسم کے عمدہ پھل پھول بکثرت پیدا ہوتے ہیں اور دوسرے لوگ بھی اس سے منتفع ہوتے ہیں اور دینی برکت بھی کہ وہاں بکثرت انبیاء علیہم السلام ہوئے جن کی برکت دور دور عالم میں پھیلی، یعنی ابراہیم نے ملک شام کی طرف باذن الٰہی ہجرت فرمائی) اور (ہجرت کے بعد) ہم نے ان کو اسحاق (بیٹا) اور یعقوب پوتا عطا کیا، اور ہم نے ان سب (باپ بیٹے پوتے) کو (اعلیٰ درجہ کا) نیک کیا (اعلیٰ درجہ کی نیکی کا مصداق معصوم بنانا ہے جو انسان میں نبوت سے حاصل ہوتی ہے ، پس مراد یہ ہے کہ ان سب کو نبی بنایا)۔

وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا: اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مخالف فریق سے ہجرت کر کے موافق کی طرف جاملنا انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے اور یہ توکل کے خلاف نہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مع حضرت لوط علیہ السلام کے صحیح سالم ملک شام میں لے گئے جہاں بہت سی ظاہری و باطنی برکات ودیعت کی گئی ہیں۔

**فائدہ:** ۲ یعنی بڑھاپے میں بیٹا مانگا تھا، ہم نے پوتا بھی دے دیا یعنی یعقوب علیہ السلام۔

**فائدہ:** ۳ یعنی ابراہیم، لوط، اسحاق، یعقوب علیہم السلام اعلیٰ درجہ کے نیک بندوں میں ہیں، کیونکہ سب نبی ہوئے اور انبیاء سے بڑھ کر نیکی کس میں ہوسکتی ہے۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ

اور ان کو کیا ہم نے پیشوا راہ بتلاتے تھے ہمارے حکم سے ۱ اور کہلا بھیجا ہم نے ان کو کرنا نیکیوں کا اور قائم رکھنی نماز

وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴿۷۳﴾

اور دینی زکوٰۃ ۲ اور وہ تھے ہماری بندگی میں لگے ہوئے ۳

**خلاصہ تفسیر:** اور ہم نے ان (سب) کو مقتدا بنایا (جو کہ نبوت کے لیے لازم ہے) کہ ہمارے حکم سے (خلق کو) ہدایت کیا کرتے تھے (جو کہ نبوت کے مناصب میں سے ہے) اور ہم نے ان کے پاس نیک کاموں کے کرنے کا اور (خصوصاً) نماز کی پابندی کا اور زکوۃ ادا کرنے کا حکم بھیجا (یعنی یہ حکم بھیجا کہ ان کاموں کو کیا کرو) اور وہ (حضرات) ہماری (خوب) عبادت کیا کرتے تھے (یعنی ان کو جو حکم ہوا تھا اس کو اچھی طرح بجالاتے تھے)

پس صٰلحین میں کمال نبوت کی طرف، اور نیک کاموں کی وحی بھیجنے یعنی اَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ میں کمال علم کی طرف، كَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ میں کمال عمل کی طرف اور مقتدا و پیشوا یعنی اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ میں دوسروں کی ہدایت و تربیت کی طرف پورا اشارہ ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی ایسے کامل تھے کہ دوسروں کی تکمیل بھی کرتے تھے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی ان کی طرف وحی بھیجی جس میں ان امور کی تاکید تھی، یہ ان کا کمال علمی ہوا۔

**فائدہ:** ۳ یعنی شب و روز ہماری بندگی میں لگے رہتے تھے کسی دوسری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے، یہ ہی انبیاء کی شان ہوتی ہے

کہ ان کا ہر کام خدا کی بندگی کا پہلو لیے ہوتا ہے، یہ عملی کمال ہوا۔

وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ ط

اور لوط کو دیا ہم نے حکم اور سمجھ ۱ے اور بچا نکالا اس کو اس بستی سے جو کرتے تھے گندے کام ۲ے

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ﴿۷۴﴾ وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ط اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾ ع

وہ تھے لوگ بڑے (برے) نافرمان، اور اس کو لے لیا ہم نے اپنی رحمت میں، وہ ہے نیک بختوں میں ۳ے

**خلاصہ تفسیر:** اور لوط (علیہ اسلام) کو ہم نے حکمت اور علم (انبیاء کی شان کے مناسب) عطا فرمایا، اور ہم نے ان کو اس بستی سے نجات دی جس کے رہنے والے گندے گندے کام کیا کرتے تھے (جن میں سے سب سے بدتر مرد کا مرد کے ساتھ شہوت پورا کرنا تھا اور بھی بہت سے بیہودہ اور برے افعال کے یہ لوگ عادی تھی، شراب خوری، گانا بجانا، داڑھی کٹانا، مونچھیں بڑھانا، کبوتر بازی، ڈھیلے پھینکنا، سیٹی بجانا، ریشمی لباس پہننا) بلاشبہ وہ لوگ بڑے بدذات بدکار تھے، اور ہم نے لوط کو اپنی رحمت میں (یعنی جن بندوں پر رحمت ہوتی ہے ان میں) داخل کیا (کیونکہ) بلاشبہ وہ بڑے (درجہ کے) نیکوں میں سے تھے (بڑے درجہ کے نیک سے مراد معصوم ہے جو نبی کی خصوصیت ہے)۔

**وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ:** اگر چہ ان کی کئی بستیاں تھیں، لیکن چونکہ ان میں اصل پرگنہ ایک تھا اور باقی اس کے تابع تھے اس لیے اسی کے ذکر پر اکتفا فرمایا، اور ''خبائث'' خبیثہ کی جمع ہے، بہت سی خبیث اور گندی عادتوں کو ''خبائث'' کہا جاتا ہے، یہاں ان کی سب سے بڑی خبیث اور گندی عادت جس سے جنگلی جانور بھی پرہیز کرتے ہیں بدفعلی تھی، یعنی مرد کا مرد کے ساتھ شہوت پوری کرنا، یہاں اسی ایک عادت کو اس کے بڑے جرم ہونے کے سبب خبائث کہہ دیا گیا ہو تو یہ بھی بعید نہیں جیسا کہ بعض مفسرین نے فرمایا ہے، اس کے علاوہ دوسری خبیث عادتیں ان میں ہونا بھی روایات میں مذکور ہے جیسا کہ خلاصہ تفسیر میں بحوالہ روح المعانی گزر چکا ہے، اس لحاظ سے مجموعہ کو خبائث کہنا تو ظاہر ہی ہے واللہ اعلم۔

بعض نے خبائث کی تفسیر صرف بدفعلی سے کی ہے اور جمع لانا اس لیے ہوگا کہ متعدد فاعل کے افعال متعدد ہوں گے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ے یعنی حکمت وحکومت اور علم وفہم جو انبیاء کی شان کے لائق ہو۔

**فائدہ:** ۲ے بستی سے مراد ''سدوم'' اور اس کے ملحقات ہیں، وہاں کے لوگ خلاف فطرت افعال کے مرتکب اور بہت سے گندے کاموں میں مبتلا تھے، ان کا قصہ پہلے کئی جگہ گزر چکا۔

**فائدہ:** ۳ے یعنی جب لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب بھیجا تو لوط علیہ السلام اور اس کے ساتھیوں کو ہم نے اپنی مہربانی اور رحمت کی چادر میں ڈھانپ لیا، تاکہ نیکوں کا اور بدوں کا انجام الگ الگ ظاہر ہو جائے۔

وَنُوْحًا اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾

اور نوح کو جب اُس نے پکارا اِس سے پہلے ۱ے پھر قبول کر لی ہم نے اس کی دعا سو بچا دیا اس کو اور اس کے گھر والوں کو بڑی گھبراہٹ سے

وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ط اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۷۷﴾

اور مدد کی اس کی ان لوگوں پر جو جھٹلاتے تھے ہماری آیتیں، وہ تھے برے لوگ پھر ڈبا دیا ہم نے ان سب کو ۲ے

**خلاصہ تفسیر:** اور نوح (علیہ السلام کے قصہ) کا تذکرہ کیجئے جبکہ اس (زمانہ ابراہیمی) سے پہلے انہوں نے (اللہ تعالیٰ سے)

دعا کی (کہ ان کافروں سے میرا بدلہ لے لیجئے) سو ہم نے ان کی دعا قبول کی اور ان کو اور ان کے متبعین کو بڑے بھاری غم سے نجات دی (یہ غم کفار کی تکذیب اور طرح طرح کی ایذائیں پہنچانے کی وجہ ان کو سے پیش آتا تھا) اور (نجات اس طرح دی کہ) ہم نے ایسے لوگوں سے ان کا بدلہ لیا جنہوں نے ہمارے حکموں کو (جو کہ نوح علیہ السلام لائے تھے) جھوٹا بتلایا تھا، بلاشبہ وہ لوگ بہت برے تھے اس لئے ہم نے ان سب کو غرق کر دیا۔

**وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا:** اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ حق تعالیٰ اپنے مقبول بندوں کا بدکاروں سے انتقام لیتے ہیں، چنانچہ اللہ کے نیک بندوں تکلیف وایذا نہیں دینی چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ پھر ان کی طرف سے بدلہ لیتے ہیں، اس سے زیادہ واضح اس مضمون میں یہ آیت ہے: جزاء لمن کان کفر۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام سے پہلے۔

**فائدہ:** ۲؎ نوح علیہ السلام ساڑھے نو سو برس تک قوم کو سمجھاتے رہے، اتنی طویل مدت میں سخت زہرہ گداز سختیاں اٹھائیں، آخر دعا کی فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ اور وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا حق تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی، کافروں کو طوفان سے غرق کر دیا اور نوح علیہ السلام کو مع ہمراہیوں کے طوفان کی گھبراہٹ اور کفار کی ایذا دہی سے بچالیا، ان کا مفصل قصہ پہلے گزر چکا۔

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ

اور داؤد اور سلیمان کو، جب لگے فیصل کرنے کھیتی کا جھگڑا، جب روند گئیں اس کو رات میں ایک قوم کی بکریاں، اور سامنے تھا ہمارے ان کا

شٰهِدِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۡ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ

فیصلہ، پھر سمجھا دیا ہم نے وہ فیصلہ سلیمان کو، اور دونوں کو دیا تھا ہم نے حکم اور سمجھ ۱؎ اور تابع کیے ہم نے داؤد کے ساتھ پہاڑ

يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ۭ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۷۹﴾

تسبیح پڑھا کرتے اور اڑتے جانور ۲؎ اور یہ سب کچھ ہم نے کیا ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** اور داؤد اور سلیمان (علیہما السلام کے قصہ) کا تذکرہ کیجئے جبکہ دونوں (حضرات) کسی کھیت کے بارے میں (جس میں غلہ تھا یا انگور کے درخت تھے) فیصلہ کرنے لگے جبکہ اس (کھیت میں کچھ لوگوں) کی بکریاں رات کے وقت جا پڑیں (اور اس کو چر گئیں) اور ہم اس فیصلہ کو جو (مقدمہ والے) لوگوں کے متعلق ہوا تھا دیکھ رہے تھے، سو ہم نے اس فیصلہ (کی آسان صورت) کی سمجھ سلیمان کو دے دی، اور (یوں) ہم نے دونوں (ہی) کو حکمت اور علم عطا فرمایا تھا (یعنی داؤد علیہ السلام کا فیصلہ بھی خلاف شرع نہ تھا) اور (یہاں تک تو عام کرامت کا ذکر تھا جو دونوں حضرات میں مشترک تھی، آگے دونوں کی خاص خاص کرامتوں کا بیان ہے) ہم نے داؤد (علیہ السلام) کے ساتھ تابع کر دیا تھا پہاڑوں کو کہ (ان کی تسبیح کے ساتھ) وہ (بھی) تسبیح کیا کرتے تھے اور (اسی طرح) پرندوں کو بھی (جیسا سورۃ سبا میں ہے: يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ) اور (کوئی اس بات پر تعجب نہ کرے، کیونکہ ان کاموں کے) کرنے والے ہم تھے (اور ہماری قدرت کا عظیم ہونا ظاہر ہے پھر ان معجزات میں تعجب ہی کیا ہے)۔

**اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ:** مقدمہ کی صورت یہ تھی کہ جس قدر کھیت کا نقصان ہوا تھا اس کی لاگت بکریوں کی قیمت کے برابر تھی، داؤد علیہ السلام نے ضمان میں کھیت والے کو وہ بکریاں دلوادیں اور شرعی قانون کا اصل تقاضا بھی یہی تھا جس میں مدعی یا مدعا علیہ کی رضا کی شرط نہیں، مگر چونکہ اس میں بکری والوں کا بالکل ہی نقصان ہوتا تھا اس لئے سلیمان علیہ السلام نے مصالحت کے طور پر جو کہ فریقین کی باہمی رضامندی پر موقوف تھی

یہ صورت تجویز فرمائی جس میں دونوں کی سہولت اور رعایت تھی وہ یہ کہ چندروز کے لئے بکریاں تو کھیت والے کو دی جائیں کہ ان کے دودھ وغیرہ سے اپنا گزر کرے اور بکری والوں کو وہ کھیت سپرد کیا جائے کہ اس کی خدمت آب پاشی وغیرہ سے کریں، جب کھیت پہلی حالت پر آ جائے کھیت اور بکریاں اپنے اپنے مالکوں کو دے دی جائیں، اس سے معلوم ہو گیا کہ دونوں فیصلوں میں کوئی تعارض نہیں، کیونکہ ایک فیصلہ کے صحیح ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرا فیصلہ غلط ہو، اس لئے: **كُلًّا اٰتَيۡنَا حُكۡمًا وَّعِلۡمًا** بڑھا دیا گیا۔

اس جیسا واقعہ اگر اب واقع ہو تو یہ ضروری نہیں کہ داؤد علیہ السلام کی شریعت کا جو فیصلہ ہو وہی شریعت محمدیہ میں رہے، اس لئے اس مسئلے میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے، امام اعظم ابوحنیفہؒ اور فقہاء کوفہ کا مسلک یہ ہے کہ جس وقت جانوروں کے ساتھ ان کا چرانے والا یا حفاظت کرنے والا کوئی آدمی موجود ہو، اس نے غفلت کی اور جانوروں نے کسی کے باغ یا کھیت کو نقصان پہنچا دیا، اس صورت میں تو جانور کے مالک پر ضمان آتا ہے خواہ یہ معاملہ رات میں ہو یا دن میں، اور اگر مالک یا محافظ جانوروں کے ساتھ نہ ہوں جانور خود ہی نکل گئے اور کسی کے کھیت کو نقصان پہنچا دیا تو جانور کے مالک پر ضمانت نہیں، معاملہ دن اور رات کا اس میں بھی برابر ہے، اور چونکہ کھیتی ذات القیم کی قسم سے ہے اس لیے جتنا نقصان ہوگا اس کی قیمت لازم آئے گی، البتہ اگر رضامندی سے قیمت کے بدلے کوئی خاص چیز لے لی جائے تو جائز ہے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

**وَسَخَّرۡنَا مَعَ دَاوٗدَ الۡجِبَالَ يُسَبِّحۡنَ وَالطَّيۡرَ**: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشیاء تسبیح قالی (زبان سے تسبیح) کرتی تھیں، ورنہ داود علیہ السلام کا بطور خاص ذکر نہ کیا جاتا، کیونکہ تسبیح حالی تو عام ہے، اگر کہا جائے کہ جو لوگ تسبیح قالی کے قائل ہیں وہ اس کو بھی عام ہی کہتے ہیں تو پھر تخصیص کا کیا مطلب ہوا؟ جواب یہ ہے کہ تخصیص اس اعتبار سے ہے کہ داود علیہ السلام تسبیح سنتے بھی تھے۔

* * *

**فائدہ: ۱** حضرت داؤد علیہ السلام اللہ کے پیغمبر تھے، حضرت سلیمان علیہ السلام اُن کے صاحبزادے ہیں، اور خود نبی ہیں دونوں کو اللہ تعالیٰ نے حکومت، قوت فیصلہ اور علم وحکمت عنایت فرمائے تھے، حضرت سلیمان بچپن ہی میں اس قدر غیر معمولی سمجھ کی باتیں کرتے تھے کہ سننے والے حیران رہ جائیں، حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں ایک مقدمہ پیش ہوا کہ ایک شخص کے کھیت میں رات کے وقت دوسرے لوگوں کی بکریاں آ گھسیں، کھیتی کا نقصان ہوا، حضرت داؤد علیہ السلام نے یہ دیکھ کر کہ بکریوں کی قیمت اس مالیت کے برابر ہے جس کا کھیت والے نے نقصان اٹھایا تھا، یہ فیصلہ کیا کہ بکریاں کھیتی والے کو دے دی جائیں، حضرت سلیمان نے فرمایا کہ میرے نزدیک کھیتی والا بکریاں اپنے پاس رکھے اور دودھ پیئے اور بکریوں والے کھیت کی آبپاشی اور تردد کریں، جب کھیتی جیسی تھی ویسی ہو جائے تو بکریاں لوٹا دیں اور کھیتی لے لیں، اس میں دونوں کا نقصان نہ ہوگا، حضرت داؤد نے بھی یہ فیصلہ سن کر تحسین فرمائی اور اپنے اجتہاد سے رجوع کیا، گویا اصول فقہ کی اصطلاح میں سلیمان علیہ السلام کے استحسان کو اپنے قیاس کے مقابلہ میں قبول فرما لیا، باپ بیٹے دونوں نے جو فیصلہ شرکائے مقدمہ کے حق میں کیا وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے تھا اور دونوں ہی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے فیصلہ کرنے کی قوت اور سمجھ عنایت کی تھی، لیکن اصل گر کی بات اس نے سلیمان علیہ السلام کو سجھا دی وہ اس نتیجہ پر پہنچے جو اللہ کے نزدیک اصلح واصوب تھا، اور جسے آخر کار داؤد علیہ السلام نے بھی قبول کیا، اس واقعہ سے ظاہر ہوا کہ انبیاء علیہم السلام بادشاہ ہو کر بھی مخلوق کے چھوٹے چھوٹے معاملات کی طرف اسی قدر توجہ فرماتے ہیں جیسے بڑے مہم کاموں کی طرف۔

**فائدہ: ۲** حضرت داؤد علیہ السلام بے انتہا خوش آواز تھے اس پر پیغمبرانہ تاثیر، حالت یہ ہوتی تھی کہ جب جوش میں آ کر زبور پڑھتے یا خدا کی تسبیح وتحمید کرتے تو پہاڑ اور پرند جانور بھی ان کے ساتھ آواز سے تسبیح پڑھنے لگتے تھے۔

**فائدہ: ۳** یعنی تعجب نہ کرو کہ پتھر اور جانور کیسے بولتے اور تسبیح پڑھتے ہوں گے، یہ سب کچھ ہمارا کیا ہوا تھا، بھلا ہماری لامحدود قوت کے لحاظ سے یہ باتیں کیا مستبعد سمجھی جا سکتی ہیں۔

**وَعَلَّمۡنٰهُ صَنۡعَةَ لَبُوۡسٍ لَّكُمۡ لِتُحۡصِنَكُمۡ مِّنۡۢ بَاۡسِكُمۡ‌ۚ فَهَلۡ اَنۡتُمۡ شٰكِرُوۡنَ ۸۰**

اور اس کو سکھلایا ہم نے بنانا ایک تمہارا لباس کہ بچاؤ ہو تم کو تمہاری لڑائی میں ۱ سو کچھ تم شکر کرتے ہو ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور ہم نے ان (داود) کو زرہ (بنانے) کی صنعت تم لوگوں کے (نفع کے) واسطے سکھلائی (یعنی) تاکہ وہ (زرہ) تم کو (لڑائی میں) ایک دوسرے کی زد سے بچائے (اور اس نفع عظیم کا تقاضہ یہ ہے کہ تم شکر کرو) سوتم (اس نعمت کا) شکر کرو گے بھی (یا نہیں)۔

**وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ** :اگر زرہ سب سے پہلے داود علیہ السلام کے ہاتھوں ایجاد ہوئی جیسا کہ جلالین میں ہے اور آپ سے پہلے تختیاں بھی ہوتی تھیں تب تو آیت کا مطلب ظاہر ہے تم لوگ اس ایجاد سے منتفع ہو رہے ہو، اور اگر ثابت ہو جائے کہ پہلے بھی زرہ بنتی تھی تو خوبی صنعت اور ہر قسم کی رعایت میں داود علیہ السلام کی زرہ بڑھی ہوئی کہی جائے گی، اس اعتبار سے اس کو راحت ونفع میں زیادہ دخل ہوگا، چنانچہ سورہ سبا میں ہے: **وَقَدِّرْ فِي السَّرْدِ** کہ جوڑنے میں پورا اندازہ رکھو، تو اگر پہلے سے بھی جوڑنے میں اندازہ چلا آتا ہوتا تو بظاہر اس کہنے کی ضرورت نہ ہوتی۔

اس سے دو مسئلے ثابت ہوتے ہیں: ① ایک یہ کہ دستکاری سے معاش حاصل کرنا (حدیث میں ہے حلال ترین روزی اپنے ہاتھ کی کمائی ہے) ② دوسرا یہ کہ اسباب کا اختیار کرنا توکل کے خلاف نہیں ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ حق تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ میں لوہا موم کر دیا تھا، اسے موڑ کر نہایت ہلکی، مضبوط، جدید قسم کی زرہیں تیار کرتے تھے جو لڑائی میں کام دیں۔

**فائدہ:** ۲ یعنی تمہارے فائدہ کے لیے ہم نے داؤد علیہ السلام کے ذریعہ سے ایسی عجیب صنعت نکال دی، سوچو کہ تم اس قسم کی نعمتوں کا کچھ شکر ادا کرتے ہو۔

**وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ﴿٨١﴾**

اور سلیمان کے تابع کی ہوا زور سے چلنے والی کہ چلتی اسکے حکم سے اس زمین کی طرف جہاں برکت دی ہے ہم نے ۱ اور ہم کو سب چیز کی خبر ہے ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور ہم نے سلیمان (علیہ السلام) کا تیز ہوا کو تابع بنا دیا تھا کہ وہ ان کے حکم سے اس سرزمین کی طرف کو چلتی جس میں ہم نے برکت کر رکھی ہے (مراد ملک شام ہے جو ان کا مسکن تھا، یعنی جب ملک شام سے کہیں جاتے اور پھر آتے تو یہ آنا اور اسی طرح جانا بھی ہوا کے ذریعہ سے ہوتا تھا) اور ہم ہر چیز کو جانتے ہیں (ہمارے علم میں سلیمان کو یہ چیزیں دینے میں حکمت تھی اس لئے عطا فرمائی)۔

**وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً**: درمنثور میں حضرت ابن عباسؓ سے اس کی کیفیت مروی ہے کہ سلیمان علیہ السلام اپنے وزراء کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھ جاتے، پھر ہوا کو حکم دیتے وہ سب کو اٹھا کر تھوڑی دیر میں ایک ایک مہینہ کی مسافت قطع کرتی، بعضوں جو ہوا کے تابع ہونے میں خواہ مخواہ تاویل کی ہے کہ اس سے جہاز چلانا مراد ہے تو قرآنی الفاظ اس کی تردید کرتے ہیں: **فسخرنا له** یعنی ہم نے ہوا کو ان کے تابع کر دیا، **تجری بامرہ** یعنی ہوا ان کے حکم سے چلتی تھی، نیز ابن عباسؓ کی مذکورہ روایت جسے حاکم نے صحیح کہا ہے یہ سب ان بیہودہ تاویلوں کو دفع کرتی ہے۔

یہاں آیت میں ہوا کو عاصف یعنی تیز ہوا فرمایا، جبکہ آگے سورہ ص میں رخاء یعنی نرم ہوا فرمایا تو بظاہر تعارض لگتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ یا تو سلیمان علیہ السلام کے ارادہ پر ہوا کا تیز اور نرم ہونا موقوف تھا، یا نرم، سبک رفتار اور سواری کو حرکت نہ ہونے کے اعتبار سے نرم کی صفت رکھتی تھی، اور سرعت رفتار اور جلدی مسافت قطع کرنے کے اعتبار سے وہ تیز ہوا کی طرح تھی۔

* * *

**فائدہ:** ۱ حضرت سلیمان علیہ السلام نے دعاء کی تھی **رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ** اللہ تعالیٰ نے ہوا اور جن ان کے لیے مسخر کر دیے، حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک تخت تیار کرایا تھا جس پر مع اعیان دولت بیٹھ جاتے اور ضروری سامان بھی بار کر لیا جاتا، پھر ہوا آتی، زور سے اس کو زمین سے اٹھاتی، پھر اوپر جا کر نرم ہوا اُن کی ضرورت کے مناسب چلتی جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا، **رُخَاۗءً حَيْثُ اَصَابَ** یمن سے

شام کو اور شام سے یمن کو مہینہ کی راہ دو پہر میں پہنچا دیتی، تعجب ہے کہ آج عجیب وغریب ہوائی جہازوں کے زمانہ میں بہت سے زائغین اس قسم کے واقعات کا انکار کرتے ہیں، کیا یورپ جو کام اسٹیم اور الیکٹرک سے کرسکتا ہے خدا تعالیٰ ایک پیغمبر کی خاطر اپنی قدرت سے نہیں کرسکتا۔

**فائدہ: ۲** کہ کس کو کس قسم کا امتیاز دینا مناسب ہے، اور ہوا وغیرہ عناصر سے کس طرح کام لیا جاسکتا ہے۔

وَ مِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَ كُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۲﴾

اور تابع کیے کتنے شیطان جو غوطہ لگاتے اس کے واسطے اور بہت سے کام بناتے اس کے سوا۱ اور ہم نے ان کو تھام رکھا تھا۲

**خلاصہ تفسیر:** اور بعضے بعضے شیطان (یعنی جن) ایسے تھے کہ سلیمان (علیہ السلام) کے لئے (دریاؤں میں) غوطے لگاتے تھے (تاکہ موتی نکال کر ان کے پاس لائیں) اور وہ اور کام بھی اس کے علاوہ (سلیمان کے لئے) کیا کرتے تھے، اور (اگرچہ وہ جن بڑے سرکش اور شریر تھے مگر) ان کے سنبھالنے والے ہم تھے (اس لئے وہ چوں نہیں کرسکتے تھے)۔

**وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ:** جنات وہ آگ کے بنے ہوئے اجسام لطیفہ ہیں جو عقل وشعور رکھتے ہیں اور انسان کی طرح احکام شرع کے مکلف ہیں، اس نوع کے لئے اصل لفظ جن یا جنات استعمال ہوتا ہے، ان میں جو ایمان قبول نہ کریں کافر رہیں ان کو شیاطین کہا جاتا ہے، ظاہر یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے مسخر تو سبھی جنات تھے خواہ مومن یا کافر، مگر مومنین تو تسخیر کے بغیر بھی سلیمان علیہ السلام کے احکام کی تعمیل ایک مذہبی فریضہ کی حیثیت سے کرتے تھے ان کے لئے تسخیر کے ذکر کی ضرورت نہیں، اس لئے تسخیر میں صرف شیاطین یعنی کفار جنات کا ذکر فرمایا کہ وہ باوجود اپنے کفر وسرکشی کے زبردستی حضرت سلیمان کے تابع فرمان رہتے تھے، اور شاید اسی لئے آیت کے آخر میں یہ جملہ بڑھایا گیا کہ ہم ہی ان کے محافظ تھے، ورنہ کفار جنات سے تو ہر وقت یہ خطرہ تھا کہ وہ کوئی نقصان نہ پہنچا دیں، مگر حفاظت خداوندی کا پہرہ ان پر لگا ہوا تھا اس لئے کوئی گزند نہ پہنچا سکتے تھے، اس سے اس جانب بھی اشارہ ملتا ہے کہ جو کوئی اللہ سے ڈرتا ہے اور تقوی اختیار کرتا ہے تو اس سے جن وانس اور ہر مخلوق ڈرتی ہے:

ہر کہ ترسید از حق وتقوی گزید　　ترسد از وے جن وانس وہر کہ دید

اگر کہیں اس کے خلاف ہو تو وہ کسی عارض کی وجہ سے ہوتا ہے۔

**وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ:** اور اس کے علاوہ دوسرے کام بھی کرتے تھے جن میں سے بعض کا ذکر دوسری آیات میں آیا ہے: **يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ**، یعنی بناتے ہیں سلیمان علیہ السلام کے لئے محرابیں اور شاندار مکانات اور مورتیں اور پتھر کے بڑے بڑے پیالے جو حوض کی طرح کام دیں، ان سے سلیمان بڑی مشقت کے کام بھی لیتے تھے اور عجیب وغریب صنعتوں کے بھی۔

* * *

**فائدہ: ۱** شیاطین سے مراد سرکش جن ہیں، ان سے حضرت سلیمان علیہ السلام دریا میں غوطہ لگواتے تاکہ موتی اور جواہر اس کی تہ میں سے نکالیں اور عمارات میں بھاری کام کرواتے اور حوض کے برابر تانبے کے لگن اور بڑی عظیم الشان دیگیں جو اپنی جگہ سے ہل نہ سکیں بنوا کر اٹھواتے تھے اور سخت سخت کام ان سے لیتے، معلوم ہوتا ہے کہ جس قسم کے حیرت انگیز کام اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے مادی قوتوں سے کرائے ہیں اس وقت مخفی اور روحی قوتوں سے کرائے جاتے تھے۔

**فائدہ: ۲** یعنی ہم نے اپنے اقتدار کامل سے ان شیاطین کو سلیمان کی قید میں اس طرح تھام رکھا تھا کہ جو چاہتے ان سے بیگار لیتے تھے۔ اور وہ کوئی ضرر سلیمان علیہ السلام کو نہیں پہنچا سکتے تھے، ورنہ آدمی کی کیا بساط ہے کہ ایسی مخلوق کو اپنے قبضہ میں لے کر اور زنجیروں میں جکڑ کر رکھ چھوڑے **وَاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ**

وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿٨٣﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا

اور ایوب کو جس وقت پکارا اُس نے اپنے رب کو کہ مجھ پر پڑی ہے تکلیف، اور تو ہے سب رحم والوں سے رحم والا، پھر ہم نے سن لی اسکی فریاد، سو دور کر دی

مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ ذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ﴿٨٤﴾

جو اس پر تھی تکلیف، اور عطا کیے اسکو اسکے گھر والے، اور اتنے ہی اور انکے ساتھ ۱؎ رحمت اپنی طرف سے اور نصیحت بندگی کرنے والوں کو ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور ایوب (علیہ السلام کے قصے) کا تذکرہ کیجئے جب کہ انہوں نے (شدید مرض میں مبتلا ہونے کے بعد) اپنے رب کو پکارا کہ مجھ کو یہ تکلیف پہنچ رہی ہے اور آپ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہیں (تو اپنی مہربانی سے میری یہ تکلیف دور کر دیجئے) تو ہم نے ان کی دعا قبول کی اور ان کو جو تکلیف تھی اس کو دور کر دیا، اور (ان کی درخواست کے بغیر) ہم نے ان کا کنبہ (یعنی اولاد جو ان سے غائب ہو گئے تھے، یا مر گئے تھے) عطا فرمایا (اس طرح سے کہ وہ ان کے پاس آ گئے، یا جو مر گئی تھی اتنے ہی اور پیدا ہو گئے) اور ان کے ساتھ (گنتی میں) ان کے برابر اور بھی (دیئے، یعنی جتنی اولاد پہلے تھی اس کے برابر اور بھی دے دیے، خواہ خود اپنی صلب سے یا اولاد کی اولاد ہونے کی حیثیت سے) اپنی رحمت خاصہ کے سبب سے اور عبادت کرنے والوں کے لئے ایک یادگار رہنے کے سبب سے (یعنی عابدین یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کیسی جزا دیتے ہیں، اور صابرین کی جزا عام ہے خواہ دنیا میں بھی ہو یا صرف آخرت میں ہو)۔

**وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ:** حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری میں بھی کئی قول ہیں، بہر حال کوئی سخت بیماری تھی اور اولاد کے گم ہو جانے کا الگ صدمہ تھا، بعض کہتے ہیں کہ غائب ہو گئے تھے اور بعض نے کہا ہے کہ مر گئے تھے، ان سب پر ایوب علیہ السلام نے صبر کیا، جیسا کہ دوسری آیت میں ہے: اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا، یعنی بیشک ہم نے ان کو صابر پایا، اور یہ دعا خواہ مرض کے شروع ہی میں کی ہو اور دعا کی قبولیت یا جلدی ہوئی ہو یا کسی مصلحت کی وجہ سے دیر میں ہوئی، یا دعا چند روز کے بعد کی ہو جیسا کہ ابن عباسؓ کا قول ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کو دعا کرنا بھلا دیا، جب بیماری کی مدت پوری ہو گئی اس وقت دعا کی اجازت دی اور آسان کر دی اور ہر حال میں دعا صبر کے منافی نہیں اور دعا صرف مرض کے زائل ہونے کی غالبا اس لیے کی کہ مرض کی تکلیف مستقل ہوتی ہے اور اولاد کے مرنے یا گم ہونے پر جو غم ہوتا ہے بعض اوقات غائب ہو جاتا ہے۔

**وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ:** اس میں دو مسئلے ہیں: ① ایک یہ کہ دعا کرنا توکل کے خلاف نہیں ② دوسرا یہ کہ ضرورت و حاجت کے غلبہ کے وقت حق تعالیٰ سے شکوہ کرنا رضا بالقضاء کے خلاف نہیں، یعنی ایسے وقت میں یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ اللہ کی رضا پر راضی نہیں۔

* * *

**فائدہ: ۱؎** حضرت ایوب علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے دنیا میں سب طرح آسودہ رکھا تھا، کھیت، مواشی، لونڈی، غلام، اولاد صالح اور عورت مرضی کے موافق عطا کی تھی۔ حضرت ایوب علیہ السلام بڑے شکر گزار بندے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو آزمائش میں ڈالا، کھیت جل گئے، مویشی مر گئے، اور اولاد اکٹھی دب مری، دوست آشنا الگ ہو گئے، بدن میں آبلے پڑ کر کیڑے پڑ گئے ایک بیوی رفیق رہی، آخر وہ بیچاری بھی اکتانے لگی، مگر حضرت ایوب علیہ السلام جیسے نعمت میں شاکر تھے ویسے ہی بلا میں صابر رہے، جب تکلیف واذیت اور دشمنوں کی شماتت حد سے گزر گئی، بلکہ دوست بھی کہنے لگے کہ یقینا ایوب علیہ السلام نے کوئی ایسا سخت گناہ کیا ہے جس کی سزا ایسی ہی سخت ہو سکتی تھی تب دعا کی اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ رب کو پکارنا تھا کہ دریائے رحمت امنڈ پڑا، اللہ تعالیٰ نے مری ہوئی اولاد سے دگنی اولاد دی، زمین سے چشمہ نکالا، اسی سے پانی پی کر اور نہا کر تندرست ہوئے، بدن کا سارا روگ جاتا رہا، اور جیسا کہ حدیث میں ہے سونے کی ٹڈیاں برسائیں، غرض سب طرح درست کر دیا۔

**فائدہ: ۲؎** یعنی ایوب علیہ السلام پر یہ مہربانی ہوئی اور تمام بندگی کرنے والوں کے لیے ایک نصیحت اور یادگار قائم ہو گئی کہ جب کسی بندے پر

دنیا میں براوقت آئے تو ایوب علیہ السلام کی طرح صبر واستقلال دکھلانا اور صرف اپنے پروردگار سے فریاد کرنا چاہیے، حق تعالیٰ اس پر نظرعنایت فرمائے گا اور محض ایسے ابتلاء کو دیکھ کر کسی شخص کی نسبت یہ گمان نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اللہ کے یہاں مبغوض ہے۔

وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِدۡرِيۡسَ وَذَا الۡكِفۡلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيۡنَ ۚ﴿۸۵﴾

اور اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل کو، یہ سب ہیں صبر والے ۱؎

وَاَدۡخَلۡنٰهُمۡ فِىۡ رَحۡمَتِنَا ؕ اِنَّهُمۡ مِّنَ الصّٰلِحِيۡنَ ﴿۸۶﴾

اور لے لیا ہم نے ان کو اپنی رحمت میں، وہ ہیں نیک بختوں میں

**خلاصہ تفسیر**: اور اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل (کے قصہ) کا تذکرہ کیجئے، یہ سب (احکام الٰہی، شرعی ہوں یا تکوینی ان پر) ثابت قدم رہنے والے لوگوں میں سے تھے، اور ہم نے ان (سب) کو اپنی رحمت (خاصہ) میں داخل کرلیا تھا، بیشک یہ (سب) کمال صلاحیت والوں میں تھے۔

**ذَاالۡكِفۡلِ**: حضرت ذوالکفل کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا یہ نبی تھے یا نیک شخص تے، پھر پہلے سے نیک تھے یا توبہ کے بعد نیک ہوئے جیسا کہ ترمذی کی روایت میں مرفوعاوارد ہے: "لا يتورع من ذنب.... قال والله لا اعصى الله بعدها ابدا" کہ اول وہ گناہ سے نہ بچتے تھے پھر توبہ کی اور قسم کھائی کہ اب کبھی خدا کی نافرمانی نہ کروں گا، بظاہر قرآن کے طرز سے نبی ہونے کا گمان غالب ہوتا ہے، اس صورت میں وہ توبہ کرنے والے دوسرے شخص ہوں گے، اور یہ ممکن ہے کہ ذوالکفل کئی شخصوں کا نام ہو۔

* * *

**فائدہ**: ۱؎ یعنی ان سب نیک بندوں کو یاد کرو، اسماعیل اور ادریس علیہما السلام کا ذکر پہلے سورہ "مریم" میں گزر چکا، ذوالکفل کی نسبت اختلاف ہے کہ نبی تھے جیسا کہ انبیاء کے ذیل میں تذکرہ فرمانے سے ظاہر ہوتا ہے، یا محض ایک مرد صالح تھے، کہتے ہیں کہ ایک شخص کے ضامن ہو کر کئی برس قید رہے اور للّٰہ یہ محنت اٹھائی۔

**تنبیہ**: مسند امام احمد اور جامع ترمذی میں ایک شخص کا قصہ آتا ہے جو پہلے سخت بدکار اور فاسق وفاجر تھا، بعدہٗ تائب ہوا، اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت کی بشارت اسی دنیا میں لوگوں کو سنادی، اس کا نام حدیث میں "کفل" آیا ہے، بظاہر یہ وہ "ذوالکفل" نہیں جس کا ذکر قرآن کریم نے کیا، واللہ اعلم، ہمارے زمانے کے بعض مصنفین کا خیال ہے کہ "ذوالکفل" وہ ہی ہیں جن کو "حزقیل" کہا جاتا ہے، واللہ اعلم۔

وَذَا النُّوۡنِ اِذۡ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنۡ لَّنۡ نَّقۡدِرَ عَلَيۡهِ فَنَادٰى فِى الظُّلُمٰتِ اَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ

اور مچھلی والے کو جب چلا گیا غصہ ہو کر ۱؎ پھر سمجھا کہ ہم نہ پکڑ سکیں گے اس کو ۲؎ پھر پکارا اُن اندھیروں میں ۳؎ کہ کوئی حاکم نہیں

اِلَّاۤ اَنۡتَ سُبۡحٰنَكَ ۖ اِنِّىۡ كُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ ۚ﴿۸۷﴾ فَاسۡتَجَبۡنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيۡنٰهُ مِنَ الۡغَمِّ ؕ

سوائے تیرے، تو بےعیب ہے، میں تھا گنہگاروں سے ۴؎ پھر سن لی ہم نے اس کی فریاد، اور بچا دیا اس کو اس گھٹنے (گھٹن) سے

وَكَذٰلِكَ نُـۨجِى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۸۸﴾

اور یونہی ہم بچا دیتے ہیں ایمان والوں کو ۵؎

**خلاصہ تفسیر:** اور مچھلی والے (پیغمبر یعنی یونس علیہ السلام کے قصہ) کا تذکرہ کیجئے جب وہ (اپنی قوم سے جبکہ وہ ایمان نہ لائی) خفا ہوکر چل دیئے (پیچھے ان پر عذاب آنے کو ہوا لیکن ان کی توبہ وآہ وزاری کی وجہ سے ٹل گیا، اور قوم پر سے عذاب ٹلنے کے بعد بھی خود واپس نہ آئے اور اس سفر کے لئے ہمارے حکم کا انتظار نہیں کیا) اور انہوں نے (اپنے اجتہاد سے) یہ سمجھا کہ ہم (اس چلے جانے میں) ان پر کوئی دارو گیر نہ کریں گے (یعنی چونکہ اس فرار کو انہوں نے اپنے اجتہاد سے جائز سمجھا اس لئے وحی کا انتظار نہ کیا لیکن جب تک وحی کی امید رہے اس وقت تک انبیاء کو وحی کا انتظار مناسب ہے، اجتہاد نہ کرنا چاہیے، اس مناسب صورت کے چھوڑنے پر ان کو یہ ابتلا پیش آیا کہ راستہ میں ان کو کوئی دریا ملا اور وہاں کشتی میں سوار ہوئے، کشتی چلتے چلتے رک گئی، یونس علیہ السلام سمجھ گئے کہ میرا یہ بلا اجازت چلے آنا ناپسند ہوا، اس کی وجہ سے یہ کشتی رکی، کشتی والوں سے فرمایا کہ مجھ کو دریا میں ڈال دو، وہ راضی نہ ہوئے غرض قرعہ پر اتفاق ہوا تو ان ہی کا نام نکلا، آخر ان کو دریا میں ڈال دیا اور خدا کے حکم سے ان کو ایک مچھلی نے نگل لیا) پس انہوں نے اندھیروں میں پکارا (ایک اندھیرا مچھلی کے پیٹ کا، دوسرا دریا کے پانی کا، تیسرا اندھیرا رات کا، غرض ان تاریکیوں میں دعا کی) کہ آپ کے سوا کوئی معبود نہیں (یہ توحید ہے) آپ (سب نقائص سے) پاک ہیں (یہ تنزیہ ہے) میں بیشک قصوروار ہوں (یہ استغفار ہے، جس سے مقصود یہ ہے کہ میرا قصور معاف کرکے اس شدت سے نجات دیجئے) سو ہم نے ان کی دعا قبول کی اور ان کو اس گھٹن سے نجات دی (جس کا قصہ سورۃ صافات: فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ الخ میں مذکور ہے) اور ہم اسی طرح (اور) ایمان والوں کو (بھی کرب اور غم سے) نجات دیا کرتے ہیں (جبکہ چندے غم میں رکھنا مصلحت نہ ہو)۔

**وَذَا النُّوْنِ:** حضرت یونس علیہ السلام سے اس واقعہ میں کسی حکم کی مخالفت نہیں ہوئی صرف اجتہاد میں غلطی ہوئی جو امت کے لیے تو معاف ہے، بلکہ ایک ثواب بھی ملتا ہے مگر انبیاء علیہم السلام کی تربیت وتہذیب زیادہ مقصود ہوتی ہے اس لیے یہ ابتلاء ہوا، یونس علیہ السلام کا قصہ سورہ یونس (آیت ۹۸) میں گذر چکا ہے اور کچھ آگے سورہ صافات میں آئے گا۔

**اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا:** یعنی چلے گئے غصہ میں آکر، ظاہر ہے کہ مراد اس سے اپنی قوم پر غصہ ہے، حضرت ابن عباس ؓ سے یہی منقول ہے اور جن حضرات نے مُغَاضِبًا کا مفعول رب کو قرار دیا ہے ان کی مراد بھی مُغَاضِبًا لر بہ ہے، یعنی اپنے رب کے لئے غصہ میں بھر کر چل دیئے اور کفار فجار سے اللہ کے لئے غصہ کرنا عین علامت ایمان ہے۔

**لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ:** توبہ واستغفار سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا یعنی توحید وتنزیہ کو مقدم کیا، اس میں توبہ کے آداب کی تعلیم ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی جائے پھر اس کے بعد توبہ واستغفار کیا جائے۔

* * *

**فائدہ:** [1] **اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا:** "مچھلی والا" فرمایا حضرت یونس علیہ السلام کو، ان کا مختصر قصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو شہر نینویٰ کی طرف (جو موصل کے مضافات میں سے ہے) مبعوث فرمایا تھا، یونس علیہ السلام نے ان کو بت پرستی سے روکا اور حق کی طرف بلایا، وہ ماننے والے کہاں تھے، روز بروز ان کا عناد وتمرد ترقی کرتا رہا، آخر بددعا کی اور قوم کی حرکات سے خفا ہوکر غصہ میں بھرے ہوئے شہر سے نکل گئے، حکم الٰہی کا انتظار نہ کیا اور وعدہ کر گئے کہ تین دن کے بعد تم پر عذاب آئے گا، ان کے نکل جانے کے بعد قوم کو یقین ہوا کہ نبی کی بددعا خالی نہیں جائے گی، کچھ آثار بھی عذاب کے دیکھے ہوں گے، گھبرا کر سب لوگ بچوں اور جانوروں سمیت باہر جنگل میں چلے گئے اور ماؤں کو بچوں سے جدا کر دیا، میدان میں پہنچ کر سب نے رونا چلانا شروع کیا، بچے اور مائیں، آدمی اور جانور سب شور مچا رہے تھے، کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی، تمام بستی والوں نے سچے دل سے توبہ کی، بت توڑ ڈالے، خدا تعالیٰ کی اطاعت کا عہد باندھا اور حضرت یونس علیہ السلام کو تلاش کرنے لگے کہ ملیں تو ان کے ارشاد پر کاربند ہوں، حق تعالیٰ نے آنے والا عذاب ان پر سے اٹھالیا **فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ۭ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ** ادھر یونس علیہ السلام بستی سے نکل کر ایک جماعت کے ساتھ کشتی پر سوار ہوئے وہ کشتی غرق ہونے لگی، کشتی والوں نے بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ارادہ کیا کہ ایک آدمی کو نیچے پھینک دیا جائے (یا اپنے مفروضات کے موافق یہ سمجھے کہ کشتی میں کوئی غلام مولا سے بھاگا ہوا ہے) بہرحال اس آدمی کی تعیین کے لیے قرعہ ڈالا، وہ یونس

علیہ السلام کے نام نکلا، دو تین مرتبہ قرعہ اندازی کی ہر دفعہ یونس علیہ السلام کے نام پر نکلتا رہا، یہ دیکھ کر یونس علیہ السلام دریا میں کود پڑے، فوراً ایک مچھلی آ کر نگل گئی، اللہ تعالیٰ نے مچھلی کو حکم دیا کہ یونس علیہ السلام کو اپنے پیٹ میں رکھ، اس کا ایک بال بیکا نہ ہو، یہ تیری روزی نہیں بلکہ تیرا پیٹ ہم نے اس کا قید خانہ بنایا ہے، اس کو اپنے اندر حفاظت سے رکھنا، اس وقت یونس علیہ السلام نے اللہ کو پکارا: لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ اپنی خطا کا اعتراف کیا کہ بیشک میں نے جلدی کی کہ تیرے حکم کا انتظار کیے بدون بستی والوں کو چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا، گو یونس علیہ السلام کی یہ غلطی اجتہادی تھی جو امت کے حق میں معاف ہے، مگر انبیاء کی تربیت وتہذیب دوسرے لوگوں سے ممتاز ہوتی ہے، جس معاملہ میں وحی آنے کی امید ہو، بدون انتظار کیے قوم کو چھوڑ کر چلا جانا ایک نبی کی شان کے لائق نہ تھا، اسی مناسب بات پر داروگیر شروع ہوگئی، آخر توبہ کے بعد نجات ملی، مچھلی نے کنارہ پر آ کر اگل دیا، اور اس بستی کی طرف صحیح سالم واپس کیے گئے۔

**فائدہ:** ۲ فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ: یعنی یہ خیال کرلیا کہ ہم اس حرکت پر کوئی داروگیر نہ کریں گے، یا اسی طرح نکل کر بھاگ جیسے کوئی یوں سمجھ کر جائے کہ اب ہم اس کو پکڑ کر واپس نہیں لاسکیں گے، گویا بستی سے نکل کر ہماری قدرت سے ہی نکل گیا، یہ مطلب نہیں کہ معاذ اللہ یونس علیہ السلام فی الواقع ایسا سمجھتے تھے، ایسا خیال تو ایک ادنیٰ مومن بھی نہیں کر سکتا، بلکہ غرض یہ ہے کہ صورت حال ایسی تھی جس سے یوں مترشح ہوسکتا تھا، حق تعالیٰ کی عادت ہے کہ وہ کاملین کی ادنیٰ ترین لغزش کو بہت سخت پیرایہ میں ادا کرتا ہے، جیسا کہ ہم پہلے کئی جگہ لکھ چکے ہیں اور اس سے کاملین کی تنقیص نہیں ہوتی بلکہ جلالت شان ظاہر ہوتی ہے کہ اتنے بڑے ہو کر ایسی چھوٹی سی فروگذاشت بھی کیوں کرتے ہیں۔

**فائدہ:** ۳ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ: یعنی دریا کی گہرائی، مچھلی کے پیٹ اور شب تاریک کے اندھیروں میں۔

**فائدہ:** ۴ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ: یعنی میری خطا کو معاف فرمایئے بیشک مجھ سے غلطی ہوئی۔

**فائدہ:** ۵ وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ: یعنی یونس علیہ السلام کے ساتھ مخصوص نہیں، جو ایماندار لوگ ہم کو اسی طرح پکاریں گے ہم ان کو بلاؤں سے نجات دیں گے، احادیث میں اس دعا کی بہت فضیلت آئی ہے اور امت نے شدائد ونوائب میں ہمیشہ اس کو مجرب پایا ہے۔

وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿٨٩﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۡ

اور زکریا کو جب پکارا اُس نے اپنے رب کو اے رب! نہ چھوڑ مجھ کو اکیلا ۱ اور تو ہے سب سے بہتر وارث ۲ پھر ہم نے سن لی اس کی دعا

وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا

اور بخشا اس کو یحییٰ، اور اچھا (درست) کر دیا اس کی عورت کو ۳ وہ لوگ دوڑتے تھے بھلائیوں پر اور پکارتے تھے ہم کو توقع سے

وَّرَهَبًا ۭ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ﴿٩٠﴾

اور ڈر سے ۴ اور تھے ہمارے آگے عاجز

**خلاصہ تفسیر:** اور زکریا (علیہ السلام کے قصہ) کا تذکرہ کیجئے جب کہ انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ اے میرے رب! مجھ کو لاوارث نہ رکھیو (یعنی مجھ کو فرزند دیجئے جو میرا وارث ہو) اور (یوں تو) سب وارثوں سے بہتر (یعنی حقیقی وارث) آپ ہی ہیں (اس لئے فرزند بھی وارث حقیقی نہ ہوگا، بلکہ ایک وقت وہ بھی فنا ہوجائے گا، لیکن اس ظاہری وارث سے بعض دینی فوائد حاصل ہوجائیں گے اس لئے اس کی طلب ہے) سو ہم نے ان کی دعا قبول کرلی اور ہم نے ان کو یحییٰ (فرزند) عطا فرمایا اور ان کی خاطر سے ان کی بیوی کو بھی (جو بانجھ تھیں انہیں) اولاد کے قابل کر دیا، یہ سب (انبیاء جن کا اس سورت میں ذکر ہوا ہے) نیک کاموں میں دوڑتے تھے اور امید وبیم کے ساتھ ہماری عبادت کیا کرتے تھے، اور ہمارے سامنے دب کر رہتے تھے (جس سے ان حضرات کی کامل عبدیت اور ہمارا معبود کامل ہونا ثابت ہوتا ہے، پس رسالت اور توحید دونوں مسئلوں کی ان قصوں سے

تقویت ہوتی ہے جو اس سورت کا بڑا مقصود ہے)۔

**وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ:** روح المعانی میں اس کی ایک تفسیر یہ نقل کی ہے کہ ان کی بیوی کو جوانی لوٹا دی، اس بنا پر اس سے یہ ثابت ہوا کہ جو چیزیں عادتاً اسباب کی طرف منسوب کی جاتیں ہیں ان میں دعا کی قبولیت کے متعلق اکثر عادت الٰہیہ یہ ہے کہ اس کے اسباب مہیا فرما دیتے ہیں، اگرچہ وہ اسباب کے بغیر بھی تکوین پر قادر ہیں۔

**اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ:** چونکہ یہ سابقہ جملہ کی علت کے موقع پر آیا ہے، اس سے یہ ثابت ہوا کہ طاعات وعبادات دنیاوی نعمتوں کا بھی سبب ہوجاتی ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی اولاد دے جو میرے بعد قوم کی خدمت کر سکے اور میری تعلیم کو پھیلائے جیسا کہ سورہ ''مریم'' کے فوائد میں لکھا جا چکا ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ وارث طلب کر رہے تھے يَرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ اسی کے مناسب نام سے اللہ کو یاد کیا۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی بانجھ عورت کو ولادت کے قابل کر دیا۔

**فائدہ:** ۴؎ بعض متصوفین کہا کرتے ہیں کہ جو کوئی اللہ کو پکارے توقع سے یا ڈر سے وہ اصلی محب نہیں، یہاں سے ان کی غلطی ظاہر ہوئی، انبیاء سے بڑھ کر خدا کا محب کون ہو سکتا ہے۔

وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۱﴾

اور وہ عورت جس نے قابو میں رکھی اپنی شہوت ۱؎ پھر پھونک دی ہم نے اس عورت میں اپنی روح ۲؎ اور کیا اسکو، اسکے بیٹے کو نشانی جہان والوں کے واسطے ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** اور ان بی بی (مریم کے قصہ) کا بھی تذکرہ کیجئے جنہوں نے اپنے ناموس کو (مردوں سے) بچایا (نکاح سے بھی اور ناجائز سے بھی) پھر ہم نے ان میں (جبرئیل علیہ السلام کے واسطہ سے) اپنی روح پھونک دی (جس سے ان کو بغیر شوہر کے حمل رہ گیا) اور ہم نے ان کو اور ان کے فرزند (عیسیٰ علیہ السلام) کو دنیا جہان والوں کے لئے (اپنی قدرت کاملہ کی) نشانی بنا دیا (کہ ان کو دیکھ کر سن کر سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، وہ بغیر باپ کے بھی اولاد پیدا کر سکتا ہے اور بغیر ماں اور باپ کے بھی جیسا کہ آدم علیہ السلام)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی حلال وحرام دونوں طریقوں سے محفوظ تھی۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو جو ''روح اللہ'' کے لقب سے ملقب ہیں اس کے پیٹ میں پرورش کیا۔

**فائدہ:** ۳؎ ان کا ''نشانی'' ہونا سورہ آل عمران اور سورہ مریم میں بیان ہو چکا ہے۔

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۹۲﴾

یہ لوگ ہیں تمہارے دین کے سب ایک دین پر اور میں ہوں رب تمہارا سو میری بندگی کرو ۱؎

وَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ۭ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ﴿۹۳﴾ ع

اور ٹکڑے ٹکڑے بانٹ لیا لوگوں نے آپس میں اپنا کام ۲؎ سب ہمارے پاس پھر آئیں گے ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** یہاں تک انبیاء علیہم السلام کے واقعات اور ان کے ضمن میں بہت سے اصولی اور فروعی مسائل کا بیان تھا، چونکہ یہ سب انبیاء موحد اور توحید کی طرف بلانے والے تھے، چنانچہ پیچھے بعض جگہ صراحۃً اور بعض جگہ اشارۃً یہ بات معلوم ہو چکی ہے، نیز توحید میں سب انبیا کا

متفق ہونا مشہور و معروف بھی ہے اس لیے آگے ان قصوں کے نتیجہ کے طور پر توحید کا اثبات اور شرک کی مذمت اور اس کی تاکید کے لیے آخرت کی تفصیل ہے جس میں اہل حق کو جزا، اور اہل باطل کو سزا ہوگی بیان فرماتے ہیں۔

اے لوگو! (پیچھے جو انبیاء علیہم السلام کا طریقہ اور توحید کا عقیدہ معلوم ہو چکا ہے) یہ تمہارا طریقہ ہے (جس پر تم کو رہنا واجب ہے) کہ وہ ایک ہی طریقہ ہے (جس میں کسی نبی اور کسی شریعت کو اختلاف نہیں ہوا) اور (حاصل اس طریقہ کا یہ ہے کہ) میں تمہارا رب ہوں تو تم میری عبادت کیا کرو، اور (لوگوں کو چاہئے تھا کہ جب یہ ثابت ہو چکا کہ تمام انبیاء، تمام آسمانی کتابیں اور شریعتیں اسی ایک طریقہ کی داعی ہیں تو وہ بھی اسی طریقہ پر رہتے مگر ایسا نہ کیا، بلکہ) ان لوگوں نے اپنے دین میں اختلاف پیدا کر لیا (مگر اس کی سزا دیکھیں گے کیونکہ) سب ہمارے پاس آنے والے ہیں (اور آنے کے بعد ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ ملے گا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی خدا بھی ایک اور تمہارا اصل دین بھی ایک ہے، تمام انبیاء اصول میں متحد ہوتے ہیں، جو ایک کی تعلیم ہے وہ ہی دوسروں کی ہے، رہا فروع کا اختلاف وہ زمان و مکان کے اختلاف کی وجہ سے عین مصلحت و حکمت ہے، اختلاف مذموم وہ ہے جو اصول میں ہو، پس لازم ہے کہ سب مل کر خدا کی بندگی کریں اور جن اصول میں تمام انبیاء متفق رہے ہیں ان کو متحدہ طاقت سے پکڑیں۔

**فائدہ:** ۲؎ ہم نے تو اصول کے اعتبار سے ایک دین دیا تھا، لوگوں نے خود اختلاف ڈال کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر لیے اور آپس میں پھوٹ ڈال دی۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی ہمارے پاس آ کر تمام اختلافات کا فیصلہ ہو جائے گا جب ہر ایک کو اسکے کیے کی جزاء ملے گی، آگے اس جزاء کی تفصیل ہے:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴿۹۴﴾

سو جو کوئی کرے کچھ نیک کام اور وہ رکھتا ہو ایمان سو اکارت نہ کریں گے اسکی سعی کو اور ہم اسکو لکھ لیتے ہیں ۱؎

**خلاصہ تفسیر:** سو جو شخص نیک کام کرتا ہوگا اور وہ ایمان والا بھی ہوگا (جو کہ توحید پر موقوف ہے) تو اس کی محنت اکارت جانے والی نہیں اور ہم اس کو لکھ لیتے ہیں (جس میں بھول اور خطا کا امکان نہیں رہتا، اس لکھے ہوئے کے مطابق اسے ثواب ملے گا)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی کسی کی محنت اکارت نہ جائے گی، نیکی کا میٹھا پھل مومن کو مل کر رہے گا، کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ نیکی بھی ضائع نہ ہوگی، ہر چھوٹا بڑا عمل ہم اس کے اعمال نامہ میں ثبت کر دیتے ہیں جو قیامت کے دن کھول دیئے جائیں گے۔

وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۹۵﴾

اور مقرر ہو چکا ہر بستی پر جس کو غارت کر دیا ہم نے کہ وہ پھر کر نہیں آئیں گے

**خلاصہ تفسیر:** اور (ہم نے جو یہ کہا ہے کہ سب کے سب ہمارے پاس آنے والے ہیں اس میں منکرین یہ شبہ کرتے ہیں کہ دنیا کی اتنی عمر گزر چکی ہے اب تک تو ایسا ہوا نہیں کہ مردے زندہ ہوئے ہوں اور ان کا حساب ہوا ہو، ان کا یہ شبہ اس لئے غلط ہے کہ اللہ کی طرف لوٹنے کے لئے ایک دن قیامت کا مقرر ہے، اس سے پہلے کوئی نہیں لوٹتا، یہی وجہ ہے کہ) ہم جن بستیوں کو (عذاب یا موت سے) فنا کر چکے ہیں ان کے لئے یہ بات (شرعاً ممنوع ہونے کی وجہ سے) ناممکن ہے کہ وہ (دنیا میں حساب کتاب کے لئے) پھر لوٹ کر آئیں (مگر یہ نہ لوٹنا دائمی نہیں، بلکہ خاص وقت یعنی قیامت تک ہے)۔

البتہ مرنے کے بعد نبی کے معجزہ سے اگر کوئی زندہ ہوجائے تو یہ محال نہیں، کیونکہ وہ لوٹنا حساب وکتاب کے لیے نہیں، پس اس تقریر سے ان لوگوں کا استدلال باطل ہوگیا جو ایسے معجزات کے انکار پر اس آیت سے دلیل لاتے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** پہلے نجات پانے والے مومنین کا ذکر تھا اس کے بالمقابل اس آیت میں ہلاک ہونے والے کافروں کا مذکور ہے یعنی جن کے لیے ہلاک اور غارت ہونا مقدر ہو چکا وہ کبھی اپنے کفر وعصیان کو چھوڑ کر اور توبہ کر کے خدا کی طرف رجوع ہونے والے نہیں، نہ وہ کبھی دنیا میں اس غرض سے واپس کیے جاسکتے ہیں کہ دوبارہ یہاں آ کر گذشتہ زندگی کی تقصیرات کی تلافی کرلیں، پھر ان کو نجات وفلاح کی توقع کدھر سے ہوسکتی ہے، ان کے لیے تو صرف ایک ہی وقت ہے جب وہ دوبارہ زندہ ہوکر خدا کی طرف رجوع کریں گے اور اپنی زیادتیوں کے معترف ہوکر پشیماں ہوں گے، مگر اس وقت پشیمانی کچھ کام نہ آئے گی، وہ وقت قیامت کا ہے جس کے مبادی قریبہ میں سے ہے خروج ''یاجوج وماجوج'' آگے اس کو بیان فرماتے ہیں:

حَتّٰٓی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ ﴿۹۶﴾

یہاں تک کہ جب کھول دیے جائیں یاجوج وماجوج، اور وہ ہر اونچان سے پھسلتے چلے آئیں

**خلاصہ تفسیر:** یہاں تک کہ جب (وہ مقررہ وقت آ پہنچے گا جس کا ابتدائی سامان یہ ہوگا کہ) یاجوج ماجوج (جن کا راستہ ابھی سد ذوالقرنین کے ذریعہ بند ہے وہ) کھول دیئے جائیں گے اور وہ (انتہائی کثرت کے سبب) ہر بلندی (ٹیلہ اور پہاڑ) سے نکلتے (معلوم) ہوں گے (یعنی جدھر دیکھو وہی نظر آئیں گے، سو ہموار زمین میں تو نظر پڑتے ہی دکھلائی دیں گے، اور بلندی کی آڑ میں اول وہلہ میں نہ دکھائی دیں گے لیکن تھوڑی دیر میں وہاں سے وہی نکلتے معلوم ہوں گے)۔

**حَتّٰٓی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ:** آیت سابقہ میں یہ کہا گیا تھا کہ جو لوگ کفر پر مر چکے ہیں ان کا دوبارہ دنیا میں زندہ ہوکر لوٹنا ناممکن ہے، اس عدم امکان کی انتہا یہ بتلائی گئی کہ دوبارہ زندہ ہوکر لوٹنا ناممکن اس وقت تک ہے جب تک کہ یہ واقعہ یاجوج ماجوج کا پیش نہ آجائے جو قیامت کی قریبی علامت ہے، قیامت کی علامتیں اگرچہ اور بھی ہیں مگر یاجوج ماجوج کے واقعہ کو یہاں اس لیے خاص طور پر بیان کیا گیا کہ اس کے بعد قیامت بہت ہی نزدیک ہوگی جیسا کہ احادیث میں ہے، دوسرے یہ واقعہ بہت زیادہ ہولناک ہے۔

آیت میں یاجوج ماجوج کے لئے لفظ فُتِحَتْ یعنی کھولنا استعمال فرمایا گیا ہے جس کے ظاہری معنے یہی ہیں کہ اس وقت سے پہلے وہ کسی بندش اور رکاوٹ میں رہیں گے، قرب قیامت کے وقت جب اللہ تعالیٰ کو ان کا نکلنا منظور ہوگا تو یہ بندش راستے سے ہٹادی جائیں گی اور ظاہر قرآن کریم سے یہ ہے کہ یہ رکاوٹ سد ذوالقرنین ہے جو قرب قیامت میں ختم ہوجائے گی خواہ اس سے پہلے بھی وہ ٹوٹ چکی ہو مگر ان کے لئے بالکل راستہ ہموار اسی وقت ہوگا، سورۃ کہف کے آخر میں یاجوج ماجوج، سد ذوالقرنین اور دوسرے متعلقہ مسائل پر بحث ہوچکی ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی قیامت کے قریب نزول عیسیٰ علیہ السلام کے بعد سدّ ذوالقرنین توڑ کر ''یاجوج ماجوج'' کا لشکر ٹوٹ پڑے گا، یہ لوگ اپنی کثرت و ازدحام کی وجہ سے تمام بلندی وپستی پر چھا جائیں گے، جدھر دیکھو ان ہی کا ہجوم نظر آئے گا، ان کا بے پناہ سیلاب ایسی شدت اور تیز رفتار سے آئے گا کہ کوئی انسانی طاقت روک نہ سکے گی، یہ معلوم ہوگا کہ ہر ایک ٹیلہ اور پہاڑ سے ان کی فوجیں پھسلتی اور لڑھکتی چلی آرہی ہیں، سورہ ''کہف'' کے آخر میں اس قوم کے متعلق ہم جو کچھ لکھ چکے ہیں اس کا ایک مرتبہ مطالعہ کرلیا جائے۔

وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِیَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ یٰوَیْلَنَا قَدْ كُنَّا فِیْ

اور نزدیک آ لگے سچا وعدہ پھر اس دم اوپر لگی رہ جائیں منکروں کی آنکھیں، ہائے !کم بختی ہماری ہم

غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿٩٧﴾

بے خبر رہے اس سے ا نہیں پر ہم تھے گناہ گار ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور (اللہ کی طرف لوٹنے کا سچا وعدہ) نزدیک آ پہنچا ہوگا تو بس پھر یکا یک یہ حالت ہو جائے گی کہ منکروں کی نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی (اور وہ یوں کہتے نظر آئیں گے) کہ ہائے ہماری کم بختی ہم اس سے غفلت میں تھے (پھر کچھ سوچ کر کہیں گے کہ اس کو غفلت تو جب کہا جا سکتا کہ کسی نے ہمیں آگاہ نہ کیا ہوتا) بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) ہم ہی قصوروار تھے (حاصل یہ ہوا کہ جو لوگ قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے کے منکر تھے وہ بھی اس وقت اس کے قائل ہو جائیں گے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی جزاء و سزا کا وعدہ جب نزدیک آ لگے گا اس وقت منکروں کی آنکھیں مارے شدتِ ہول کے پھٹی رہ جائیں گی اور اپنی غفلت پر دست حسرت ملیں گے کہ افسوس آج کے دن ہم کیسے بے خبر رہے جو ایسی کم بختی آئی، کاش! ہم دنیا میں اس آفت سے بچنے کی فکر کرتے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی بے خبری بھی کیسے کہیں، آخر انبیاء علیہم السلام نے کھول کھول کر آگاہ کر دیا تھا، لیکن ہم نے خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کیا کہ ان کا کہنا نہ مانا اور برابر شرارتوں اور گناہوں پر اصرار کرتے رہے۔

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ۭ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴿٩٨﴾ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَاۗءِ اٰلِهَةً

تم اور جو کچھ تم پوجتے ہو اللہ کے سوا ایندھن ہے دوزخ کا، تم کو اس پر پہنچنا ہے ۱ اگر ہوتے یہ بت معبود

مَّا وَرَدُوْهَا ۭ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٩٩﴾ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿١٠٠﴾

تو نہ پہنچتے اس پر، اور سارے اس میں سدا پڑے رہیں گے ۲ ان کو وہاں چلّانا ہے اور وہ اس میں کچھ نہ سنیں گے ۳

**خلاصہ تفسیر:** (اب مشرکین کے لئے وعید ہے) بلاشبہ تم اور جس کو تم خدا کے سوا پوج رہے ہو سب جہنم میں جھونکے جاؤ گے (اور) تم سب اس میں داخل ہو گے (اس میں وہ انبیاء اور فرشتے داخل نہیں ہو سکتے جن کو دنیا میں بعض مشرکین نے خدا اور معبود بنا لیا تھا، کیونکہ ان میں ایک شرعی مانع موجود ہے کہ وہ اس کے مستحق نہیں، اور نہ ان کا اس میں کوئی قصور ہے، آگے آیت سے بھی اس شبہ کو دور کیا گیا ہے، اور یہ بات سمجھنے کی ہے کہ) اگر (یہ تمہارے معبود) واقعی معبود ہوتے، تو اس (جہنم) میں کیوں جاتے اور (جانا بھی ایسا کہ چند روزہ نہیں، بلکہ) سب (عابدین اور معبودین) اس میں ہمیشہ کو رہیں گے (اور) ان کا اس میں شور و غل ہوگا، اور وہاں (اپنے شور و غل میں) کسی کی کوئی بات سنیں گے بھی نہیں (یہ تو دوزخیوں کا حال ہوا)۔

**وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ:** اگر کسی معبود میں کوئی بات جہنم میں جانے سے مانع ہو تو وہ جہنم میں نہ جائے گا، مثلاً انبیاء یا فرشتوں کو کسی نے معبود بنا لیا تو خود ان کی مقبولیت اس سے مانع ہوگی، چنانچہ یہ بات خود عقلی بھی ہے اور اس کی تائید کے لیے آگے آیت بھی ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ پس اس وعید میں اصنام اور شیاطین داخل رہ گئے، یہ سب جہنم میں جائیں گے، اور اصنام کا دوزخ میں جانا اس لیے نہیں کہ ان کو عذاب ہوگا بلکہ اس لیے تا کہ کفار پر خوب حجت قائم ہو جائے اور وہ حجت یہ ہے: لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَاۗءِ اٰلِهَةً کہ اگر یہ واقعی معبود ہوتے تو جہنم میں کیوں جاتے؟ اور تا کہ کفار کو زیادہ حسرت ہو کہ جس سے خیر کی توقع تھی وہی شر کا سبب ہو گیا، اور تا کہ اپنی حماقت ظاہر ہو کہ جب یہ خود نہ بچ سکے تو ہم کو کیا بچاتے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یہ خطاب مشرکین مکہ کو ہے جو بت پوجتے تھے، یعنی تم اور تمہارے یہ معبود سب دوزخ کا ایندھن بنیں گے وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اس کے معنی یہ نہیں کہ اصنام (بت) معذب ہوں گے، بلکہ غرض یہ ہے کہ بت پرستوں پر حجت زیادہ لازم ہو، جیسا کہ آگے فرمایا: لَوْ كَانَ

هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا اوران کی حسرت بڑھے اورحماقت زیادہ واضح ہو کہ جن سے خیر کی توقع رکھتے تھے وہ آج خود اپنے کو نہ بچا سکے پھر ہماری حفاظت کیا کر سکتے ہیں۔

**تنبیه:** وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ سے مراد یہاں صرف اصنام ہیں، کیونکہ خطاب ان ہی کے پرستاروں سے ہے، لیکن اگر ''ما'' کو عام رکھا جائے تو ''بشرطِ عدم المانع'' کی قید معتبر ہوگی، یعنی جن فرضی معبودوں میں کوئی مانع دخول نار سے نہ ہو وہ اپنے عابدین کے ساتھ دوزخ کا ایندھن بنائے جائیں گے مثلاً شیاطین واصنام، باقی حضرت مسیح وعزیر اور ملائکۃ اللہ جن کو بہت لوگوں نے معبود ٹھہرالیا، ان حضرات کی مقبولیت ووجاہت مانع ہے کہ (معاذ اللہ) اس عموم میں شامل رکھے جائیں، اسی لیے آگے تصریحاً فرمادیا: اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ۔

**فائده:** ۲؎ یعنی سب عابد ومعبود ہمیشہ دوزخ میں پڑے رہیں گے۔

**فائده:** ۳؎ یعنی شدتِ ہول اور عذاب کی سخت تکلیف اور اپنے چلانے کے شور سے کچھ سنائی نہ دے گا، ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک وقت آئے گا جب ہر دوزخی کو ایک لوہے کے صندوق میں بند کر کے اوپر میخیں ٹھونک دی جائیں گی اور جہنم کی تہہ میں چھوڑ دیے جائیں گے، شاید کچھ نہ سن سکنا اس وقت کا حال ہو۔

| |
|---|
| اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ |
| جن کے لیے پہلے سے ٹھہر چکی ہماری طرف سے نیکی، وہ اس سے دور رہیں گے ۱؎ |
| لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ |
| نہیں سنیں گے اس کی آہٹ، اور وہ اپنے جی کے مزوں میں سدا رہیں گے ۲؎ |

**خلاصه تفسير:** (اور) جن کے لئے ہماری طرف سے بھلائی مقدر ہو چکی ہے (اور اس کا ظہور ان کے اعمال وافعال میں ہوا) وہ لوگ اس (دوزخ) سے (اس قدر) دور رکھے جائیں گے کہ اس کی آہٹ بھی نہ سنیں گے (کیونکہ یہ لوگ جنت میں ہوں گے اور جنت دوزخ میں بہت بڑا فاصلہ ہے) اور وہ لوگ اپنی جی چاہی چیزوں میں ہمیشہ رہیں گے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى: اس آیت کا شان نزول اس طرح ہے کہ ابن عباس ؓ نے فرمایا کہ قرآن کی ایک آیت ایسی ہے جس میں لوگ شبہات کرتے ہیں مگر عجیب اتفاق ہے کہ اس کے متعلق لوگ مجھ سے سوال نہیں کرتے، معلوم نہیں کہ شبہات کا جواب ان لوگوں کو معلوم ہو گیا ہے اس لئے سوال نہیں کرتے، یا انہیں شبہ اور جواب کی طرف التفات ہی نہیں ہوا، لوگوں نے عرض کیا وہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ وہ آیت: اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ الآیۃ ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو کفار قریش کو سخت ناگوار ہوا اور کہنے لگے کہ اس میں تو ہمارے معبودوں کی سخت توہین کی گئی ہے، یہ لوگ (عالم اہل کتاب) ابن الزبعری کے پاس گئے اور اس کی شکایت کی، اس نے کہا کہ اگر میں وہاں موجود ہوتا تو ان کو اس کا جواب دیتا، ان لوگوں نے پوچھا کہ آپ کیا جواب دیتے؟ اس نے کہا کہ میں ان سے کہتا کہ نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کی اور یہود حضرت عزیر علیہ السلام کی عبادت کرتے ہیں ان کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟ (کیا معاذ اللہ وہ بھی جہنم میں جائیں گے؟) کفار قریش یہ سن کر بڑے خوش ہوئے کہ واقعی یہ بات تو ایسی ہے کہ محمد ﷺ اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ جو ہمارے بندے شرک سے بیزار اور کفر سے منع کرنے والے تھے ان کو بھلا دوزخ سے کیا نسبت وہ اس سے بالکل دور رہیں گے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ: اس میں مؤمنین اور فرشتے دونوں داخل ہیں، اور: وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ مؤمنین بشر کے ساتھ خاص ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی ایک بار پل صراط پر سے گزر کر پھر ہمیشہ دور رہیں گے اور اس پر سے گزرتے ہوئے بھی دوزخ کی تکلیف والم سے قطعاً دوری ہوگی۔

**فائدہ:** ۲؎ جنتیوں کو دوزخ سے اس قدر بُعد ہوگا کہ اس کی آہٹ تک محسوس نہ کریں گے اور نہایت عیش وآرام کے ساتھ ہمیشہ جنت کے مزے لوٹیں گے۔

| |
|---|
| لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ |
| نہ غم ہوگا ان کو اس بڑی گھبراہٹ میں ۱؎ اور لینے آئیں گے ان کو فرشتے ،آج دن تمہارا ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا ۲؎ |

**خلاصہ تفسیر:** (اور) ان کو بڑی گھبراہٹ (یعنی قیامت میں زندہ ہونے اور محشر کے ہولناک مناظر دیکھنے کی حالت) غم میں نہ ڈالے گی، اور (قبر سے نکلتے ہی) فرشتے ان کا استقبال کریں گے (اور کہیں گے) یہ ہے تمہارا وہ دن جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا (یہ اکرام کا معاملہ اور بشارت ان کے لئے زیادہ خوشی ومسرت کا سبب ہوجائے گا)۔

**لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ:** اگر کسی روایت سے قیامت کے خوف اور ہول کا سب کے لیے عام ہونا ثابت ہوجائے تو چونکہ اہل ایمان کا زمانہ بہت ہی قلیل ہوگا اس لیے وہ کالعدم ہے، پس اس آیت سے کوئی تعارض نہ ہوگا۔

**لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ:** اس سے وہ مقولہ ثابت ہوتا ہے کہ اہل اللہ کو دائمی خوشی میسر ہوتی ہے، اور انہیں جو خوف ہوتا ہے وہ اس کے خلاف نہیں، کیونکہ یہ خوف بھی عبدیت ہی کا تقاضا ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی اس دن جب خلقت کو سخت گھبراہٹ ہوگی اللہ تعالیٰ ان کو رنج وغم سے محفوظ رکھے گا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی قبروں سے اٹھنے یا جنت میں داخل ہونے کے وقت فرشتے ان کا استقبال کریں گے اور کہیں گے کہ جس دائمی مسرت وراحت کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا آج اس کے پورا ہونے کا وقت آگیا ہے۔

| |
|---|
| يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ؕ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ |
| جس دن ہم لپیٹ لیویں آسمان کو جیسے لپیٹتے ہیں طومار میں کاغذ ۱؎، جیسا سرے سے بنایا تھا ہم نے پہلی بار پھر اس کو دہرائیں گے، |
| وَعْدًا عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ |
| وعدہ ضرور ہوچکا ہے ہم پر، ہم کو پورا کرنا ہے ۲؎ |

**خلاصہ تفسیر:** اور وہ دن (بھی) یاد کرنے کے قابل ہے جس روز ہم (پہلی بار صور پھونکنے کے بعد) آسمانوں کو اس طرح لپیٹ دیں گے جس طرح لکھے ہوئے مضامین کا کاغذ لپیٹ دیا جاتا ہے (پھر لپیٹنے کے بعد خواہ بالکل نیست ونابود اور معدوم کردیا جائے، یا دوسری بار صور پھونکنے تک اسی حالت پر رہے دونوں باتیں ممکن ہیں، اور) ہم نے جس طرح اول بار پیدا کرنے کے وقت (ہر چیز کی) ابتداء کی تھی اسی طرح (آسانی سے) اس کو دوبارہ پیدا کردیں گے یہ ہمارے ذمہ وعدہ ہے ہم ضرور (اس کو پورا) کریں گے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی جب قیامت آئے گی تو آسمانوں کی صفیں لپیٹ دی جائیں گی جس طرح دستاویز کا لکھا ہوا کاغذ لپیٹ کر رکھ دیا جاتا ہے

وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ بعض روایات میں جو نبی کریم ﷺ کے ایک کاتب کا نام ''سجل'' بتلایا گیا ہے، اس کو حفاظ حدیث کی ایک جماعت نے ضعیف بلکہ موضوع قرار دیا ہے کما صرح ابن کثیر فلا یعتبر بتخریج ابی داؤد والنسائی فی سننهما۔

**فائدہ:** ۲۔ یعنی جیسی سہولت سے دنیا کو پہلی بار پیدا کیا تھا اسی طرح دوبارہ پیدا کر دی جائے گی، یہ حتمی وعدہ ہے جو یقیناً پورا ہو کر رہے گا۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ۝۱۰۵

اور ہم نے لکھ دیا ہے زبور میں نصیحت کے پیچھے کہ آخر زمین پر مالک ہوں گے میرے نیک بندے

**خلاصہ تفسیر:** اور (اوپر جو نیک بندوں سے ثواب و نعمت کا وعدہ ہوا ہے وہ بہت قدیم اور پختہ وعدہ ہے چنانچہ) ہم (سب آسمانی) کتابوں میں لوح محفوظ (میں لکھنے) کے بعد لکھ چکے ہیں کہ اس زمین (جنت) کے مالک میرے نیک بندے ہوں گے (قدامت تو اس وعدہ کی اس سے ظاہر ہے کہ اول لوح محفوظ میں یہ وعدہ لکھا گیا ہے اور تاکید و پختگی اس بات سے کہ کوئی آسمانی کتاب اس مضمون سے خالی نہیں)۔

اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ: اگر ارض سے یہاں جنت کے بجائے مطلق زمین مراد لی جائے تو شبہ ہوتا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ زمین کے مالک کفار ہو گئے؟ جواب یہ ہے کہ یہ قضیہ دائمہ مطلقہ نہیں، بلکہ محض قضیہ مطلقہ عامہ ہے یعنی کسی ایک زمانہ میں خدا کے نیک بندے زمین کے وارث ہوں گے، اب کچھ شبہ نہیں رہا، حاصل جواب کا یہ ہوا کہ آیت میں یہ نہیں کہا گیا کہ زمین کے مالک ہمیشہ نیک ہی بندے ہوں گے، کفار کبھی مالک نہ ہوں گے، بلکہ اس میں اطلاق کے ساتھ یہ وعدہ ہے کہ میرے نیک بندے زمین کے وارث ہوں گے اور اطلاق کے ثابت ہونے کے لئے ایک بار واقع ہونا کافی ہے، چنانچہ بحمد اللہ حضرات صحابہ کرام روئے زمین کے مالک بن چکے ہیں، زمانہ عروج اسلام میں کوئی سلطنت مسلمانوں کے مقابلہ کی تاب نہ رکھتی تھی، یہ جواب اس تقدیر پر ہے کہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آیت میں ان الارض سے مراد یہی دنیا کی زمین ہے، ورنہ ظاہراً آیت کے سیاق وسباق سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد ارض جنت ہے، جنت کی زمین کے مالک نیک بندے ہوں گے، اس پر کچھ بھی اشکال نہیں خوب سمجھ لو۔

* * *

**فائدہ:** کامل وفادار بندوں سے حق تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ان کو دنیا و آخرت کی کامیابی اور اس زمین اور جنت کی زمین کا وارث بنائے گا چنانچہ فرمایا: اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ اور اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ اور وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ یہ ایسا حتمی اور قطعی وعدہ ہے جس کی خبر اس نے اپنی کتب شرعیہ اور کتب قدریہ میں دی، ''لوح محفوظ'' اور ''ام الکتاب'' میں یہ وعدہ درج کیا اور انبیاء علیہم السلام کی زبانی بار بار اعلان کرایا، داؤد علیہ السلام کی کتاب ''زبور'' ۳۷۔ ۲۹ میں ہے کہ ''صادق زمین کے وارث ہوں گے''، چنانچہ اس امت میں کے کامل وفادار اور صادق بندے مدت دراز تک زمین کے وارث رہے، شرق و غرب میں انہوں نے آسمانی بادشاہت قائم کی، عدل و انصاف کے جھنڈے گاڑ دیے، دین حق کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بجا دیا، اور نبی کریم ﷺ کی یہ پیشین گوئی ان کے ہاتھوں پر پوری ہوئی: ''اِنَّ اللّٰهَ تعالٰی زَوٰی لِيَ الْاَرْضَ فَرَاَيْتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا وَاِنَّ اُمَّتِيْ سَيَبْلُغُ مُلْكُهَا مَازَوٰی لِيْ مِنْهَا'' اور اسی قسم کی دوسری پیشین گوئی امام مہدی علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں پوری ہو کر رہے گی۔

اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ۝۱۰۶ۭ

اس میں مطلب کو پہنچتے ہیں لوگ بندگی والے

**خلاصہ تفسیر:** اب سورت اختتام پر پہنچی، یہاں تک سورت کے زیادہ حصہ میں توحید و نبوت کی تحقیق اور منکرین کے لیے وعید مذکور ہوئی، چنانچہ ان مفید مضامین پر مشتمل ہونے کی وجہ سے آگے قرآن کی صراحۃً مدح ہے اور اس کے بعد ان مضامین کو لانے والے یعنی حضور ﷺ

کی اشارتا مدح ہے، پھر سابقہ مضمون کے خلاصہ کے طور پر توحید واسلام کی طرف دوبارہ دعوت ہے، پھر فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ سے آخر تک خلاصہ کے طور پر انکارتوحید پر دوبارہ وعیداوراس کے مناسب دیگر مضامین ارشادفرماتے ہیں، پس خاتمہ کا مضمون بمنزلہ خلاصہ مقصوداور حاصل کلام کے ہے۔

بلاشبہ اس ( قرآن، یااس کے جز، یعنی مذکورہ سورت ) میں کافی مضمون ہے ان لوگوں کے لئے جوعبادت کرنے والے ہیں (اور جوعبادت اوراطاعت سے سرکشی کرنے والے ہیں یہ ہدایت توان کے لئے بھی ہے مگران میں ہدایت کی طلب نہیں، اس لئے اس کے فائدے سے محروم ہیں، اسی وجہ سے عابدین کوخصوصیت کے ساتھ ذکر کیا کہ وہی اس سے نفع حاصل کرتے ہیں)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی اس قسم کی بشارات سن کر خدائے واحد کی بندگی کرنے والے اپنے مطلب کو پہنچتے ہیں، یا اس قرآن کریم میں جو ایسی عظیم بشارات وہدایت پر مشتمل ہے بندگی کرنے والوں کے لیے کافی منفعت اور کامیابی ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٧﴾

اور تجھ کو جو ہم نے بھیجا سو مہربانی کر جہان کے لوگوں پر

**خلاصہ تفسیر:** اور ہم نے آپ کو کسی اور بات کے واسطے (رسول بناکر) نہیں بھیجا مگر دنیا جہان کے لوگوں پر (اپنی) مہربانی کرنے کے لئے (وہ مہربانی یہی ہے کہ لوگ رسول سے ان مضامین کوقبول کریں اور ہدایت کے ثمرات حاصل کریں اور جوقبول نہ کرے وہ اس کا قصور ہے، اس سے اس مضمون کی صحت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، آیت کی اس تفسیر پر کوئی اشکال متوجہ نہیں ہوتا)۔

**وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ:** اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مقبولین کی برکات ان کے قصد وارادہ کے بغیر تمام عالم کو پہنچتی ہیں، جیسے سورج کی شعاعیں اس کے ارادہ وعلم کے بغیر سب کو پہنچتی ہیں۔

* * *

**فائدہ:** یعنی آپ تو سارے جہان کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں، اگر کوئی بدبخت اس رحمت عامہ سے خود ہی منتفع نہ ہو تو یہ اس کا قصور ہے، آفتاب عالمتاب سے روشنی اور گرمی کا فیض ہر طرف پہنچتا ہے، لیکن کوئی شخص اگر اپنے اوپر تمام دروازے اور سوراخ بند کر لے تو یہ اس کی دیوانگی ہوگی، آفتاب کے عموم فیض میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا اور یہاں تو رحمۃ للعالمین کا حلقہ فیض اس قدر وسیع ہے کہ جو محروم القسمت مستفید ہونا نہ چاہے اس کو بھی کسی نہ کسی درجہ میں بے اختیار رحمت کا حصہ پہنچ جاتا ہے، چنانچہ دنیا میں علوم نبوت اور تہذیب وانسانیت کے اصول کی عام اشاعت سے ہر مسلم وکافر اپنے اپنے مذاق کے موافق فائدہ اٹھاتا ہے، نیز حق تعالیٰ نے وعدہ فرمالیا ہے کہ پہلی امتوں کے برخلاف اس امت کے کافروں کو اپنے اپنے مذاق کے موافق فائدہ اٹھانا ہے، نیز حق تعالیٰ نے وعدہ فرمالیا ہے کہ پہلی امتوں کے برخلاف اس امت کے کافروں کو عام ومستاصل عذاب سے محفوظ رکھا جائے گا، میں تو یہ کہتا ہوں کہ حضور ﷺ کے عام اخلاق کے علاوہ جن کافروں پر آپ ﷺ جہاد کرتے تھے وہ بھی مجموعہ عالم کے لیے سراسر رحمت تھا کیونکہ اس کے ذریعہ سے اس رحمت کبریٰ کی حفاظت ہوتی تھی جس کے آپ ﷺ حامل بن کر آئے تھے اور بہت سے اندھے جو آنکھیں بنوانے سے بھاگتے تھے اس سلسلہ میں ان کی آنکھوں میں بھی خواہ مخواہ ایمان کی روشنی پہنچ جاتی تھی، ایک حدیث میں ہے: ”وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَاُ قَتِّلَنَّهُمْ وَلَاُ صَلِّبَنَّهُمْ وَلَاُ هْدِيَنَّهُمْ وَهُمْ كَارِهُوْنَ اِنِّيْ رَحْمَةٌ بَعَثَنِيَ اللّٰهُ وَلَا يَتَوَفَّانِيْ حَتّٰى يُظْهِرَ اللّٰهُ دِيْنَه“، (ابن کثیر) ان الفاظ سے آپ کے ”رحمۃ للعالمین“ ہونے کا مطلب زیادہ وسعت کے ساتھ سمجھ میں آسکتا ہے۔

قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿١٠٨﴾

تو کہہ مجھ کو تو حکم یہی آیا ہے کہ معبود تمہارا ایک معبود ہے، پھر کیا ہو تم حکم برداری کرنے والے

**خلاصہ تفسیر:** آپ ان لوگوں سے (بطور خلاصہ کلام کے مکرر) فرما دیجئے کہ میرے پاس تو (موحدین اور مشرکین کے باہمی اختلاف کے بارے میں) صرف یہ وحی آئی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے تو (اس کی حقانیت ثابت ہو جانے کے بعد) اب بھی تم مانتے ہو (یا نہیں؟ یعنی اب تو مان لو)۔

* * *

**فائدہ:** یہ رسالت کے ساتھ توحید کا بیان ہوا، یعنی جو رحمت عظیمہ لے کر آپ ﷺ تشریف لائے ہیں اس کا لب لباب توحید کامل ہے اور یہ ایسا صاف و واضح مضمون ہے جس کے قبول کرنے میں آدمی کو کچھ پس و پیش نہ ہونا چاہیے، پس کیا تم حکم ماننے اور حق کے سامنے گردن ڈال دینے کے لیے تیار ہو؟ اگر ہو تو فبہا ونعمت، ورنہ میں تبلیغ کر کے بری الذمہ ہو چکا، تم اپنا انجام سوچ لو۔

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ وَإِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

پھر اگر وہ منہ موڑیں تو تو کہہ دے میں نے خبر دی تم کو دونوں طرف برابر ۱ اور میں نہیں جانتا نزدیک ہے یا دور ہے جو تم سے وعدہ ہوا ۲

**خلاصہ تفسیر:** پھر بھی اگر یہ لوگ (اس کے قبول کرنے سے) سرتابی کریں تو آپ (اتمام حجت کے طور پر) فرما دیجئے کہ میں تم کو نہایت واضح اطلاع کر چکا ہوں (جس میں ذرہ برابر خفاء پوشیدگی نہیں رہی، خود توحید اور حقانیت اسلام کی اطلاع بھی اور اس کے انکار پر جو سزا ملے گی وہ بھی صاف صاف بیان ہو چکی ہے، اب نہ مجھ پر تبلیغ حق کی کوئی ذمہ داری باقی رہی، نہ تمہارا کوئی عذر باقی رہا) اور اگر (اس کے حق ہونے میں تم کو اس وجہ سے شبہ ہو کہ جو سزا بتلائی گئی ہے وہ مل کیوں نہیں جاتی تو سمجھ لو کہ سزا کا ملنا تو یقینی ہے مگر) میں یہ نہیں جانتا کہ جس (سزا) کا تم سے وعدہ ہوا ہے آیا وہ قریب (واقع ہونے والی) ہے یا دُور دَراز (زمانے میں واقع ہونے والی) ہے۔

**وَإِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ:** اس آیت میں علم کامل کی نفی جب رسول اکرم اور اشرف الانبیاء ﷺ سے کی جا رہی ہے تو پھر کسی پیر، بزرگ یا ولی میں غیب دانی کا اعتقاد رکھنا کیسی کھلی نادانی اور جہالت ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل اللہ کو غیب کا علم نہیں جیسے بعض جہلاء اپنے پیروں کی نسبت اعتقاد کر بیٹھتے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی اس قدر اتمام حجت کے بعد بھی نہ مانو، تو میں تم کو خبر کر چکا کہ اب میں تم سے بیزار اور تم مجھ سے علیحدہ، تمہارا عمل تمہارے ساتھ اور میرا عمل میرے ساتھ، ہر ایک کا جو نتیجہ ہوگا سامنے آ جائے گا، حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''دونوں طرف برابر یعنی ابھی تم دونوں بات کر سکتے ہو (قبول کرو یا رد کرو) ایک طرف کا زور نہیں آیا''۔

**فائدہ:** ۲ یعنی تمہارے نہ ماننے پر جو عذاب کا وعدہ ہے وقوع تو اسکا ضرور بالضرور ہو کر رہے گا، لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ جلد ہوگا یا بدیر۔

اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

وہ رب جانتا ہے جو بات پکار کر کرو اور جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو ۱

وَإِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۱۱﴾

اور میں نہیں جانتا شاید تاخیر میں تم کو جانچنا ہے اور فائدہ دینا ہے ایک وقت تک ۲

**خلاصہ تفسیر:** (البتہ اس سزا کا واقع ہونا ضروری ہے، کیونکہ) اللہ تعالیٰ کو (تمہاری) پکار کر کہی ہوئی بات کی بھی خبر ہے اور جو تم

دل میں رکھتے ہو اس کی بھی خبر ہے (جب اس کو سب احوال وافعال کی اطلاع ہے اور کفر یہ اعمال واحوال پر سزا کا وعدہ ہے تو لامحالہ سزا واقع ہوگی) اور (عذاب میں تاخیر کی وجہ سے اس کے واقع نہ ہونے کے دھوکے میں نہ رہنا، یہ تاخیر کسی مصلحت وحکمت سے ہو رہی ہے) میں نہیں جانتا (کہ وہ مصلحت کیا ہے؟ ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ) شاید (یہ تاخیر عذاب) تمہارے لئے (صورتا) امتحان ہو (کہ شاید متنبہ ہو کر ایمان لے آئیں) اور ایک وقت (محدود یعنی موت کے وقت) تک (زندگی سے) فائدہ پہنچانا ہو (کہ خوب غفلت بڑھے اور عذاب بڑھتا چلا جائے، پہلی صورت یعنی امتحان رحمت ہے اور دوسری صورت یعنی عمر درازی اور اس کی سہولتیں دینا یہ عقوبت وسزا ہے)۔

امتحان میں صورتا کی قید اس لیے بڑھادی کیونکہ حقیقی امتحان کی حق تعالیٰ کی جناب میں گنجائش ہی نہیں، کیونکہ وہ تو عالم الغیب ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ وہ ہی ہر ایک کھلی چھپی بات کو جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ کس بات کی کیا جزاء ملنی چاہیے اور کب ملنی چاہیے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی تاخیر عذاب میں ممکن ہے تم کو جانچنا ہو کہ اس مدت میں کچھ سمجھ لو اور شرارتوں سے باز آجاؤ، یا محض ڈھیل دینا ہو کہ ایک مدت تک دنیا میں پھنس کر شقاوت کا پیمانہ پوری طرح لبریز کر لو۔

قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ۭ وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰي مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ ع ۱۹

رسول نے کہا اے رب فیصلہ کر انصاف کا ۱؎ اور رب ہمارا رحمان ہے اسی سے مدد مانگتے ہیں ان باتوں پر جو تم بتلاتے ہو ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** (اور جب ان سب مضامین سے ہدایت نہ ہوئی تو) پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے (باذن الٰہی) کہا کہ اے میرے رب! (ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان میں) فیصلہ کر دیجئے (جو کہ ہمیشہ) حق کے موافق (ہوا کرتا ہے، کیونکہ خدائی فیصلہ کا حق ہونا لازم ہے، مطلب یہ ہے کہ عملی فیصلہ فرما دیجئے جس سے حق پوری طرح واضح ہو جائے، یعنی مسلمانوں کے لیے جس فتح ونصرت اور غلبہ کی پیشین گوئی کی گئی ہے اس غلبہ کو واقع کر دیجیے تا کہ حجت اور زیادہ پوری ہو جائے) اور (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار سے یہ بھی فرمایا کہ) ہمارا رب (ہم پر) بڑا مہربان ہے جس سے ان باتوں کے مقابلے میں مدد چاہی جاتی ہے جو تم بنایا کرتے ہو۔

**وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰي مَا تَصِفُوْنَ:** وہ لوگ یہ باتیں بناتے تھے کہ اسلام اور مسلمان جلد نیست ونابود ہو جائیں گے، اس کے مقابلہ میں پیغمبر نے خدا سے مدد چاہی، یعنی ہم اسی مہربان رب سے تمہارے مقابلہ میں مدد چاہتے ہیں، چنانچہ بدر میں وہ پیشین گوئی واقع ہوگئی۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی جیسے ہر معاملہ کا فیصلہ انصاف کے ساتھ کرنا آپ کی شان ہے، اسی کے موافق میرے اور میری قوم کے درمیان جلدی فیصلہ فرما دیجئے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی اسی سے ہم فیصلہ چاہتے ہیں اور کافروں کی خرافات کے مقابلہ میں اسی سے مدد مانگتے ہیں، اسی طرح کی دعاء انبیاء علیہم السلام کیا کرتے تھے: رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ کیونکہ انھیں اپنی حقانیت وصداقت اور حق تعالیٰ کے عدل وانصاف پر پورا وثوق واعتماد ہوتا تھا۔

ایاتها ۷۸ ۲۲ سُوْرَةُ الْحَجِّ مَدَنِيَّةٌ ۱۰۳ رکوعاتها ۱۰

**خلاصہ تفسیر:** اس سورت کا خلاصہ یہ مضامین ہیں: ①اول آخرت وحساب کتاب جس سے سورت شروع ہوئی ہے، درمیان میں فصل یوم قیامت وجنت وجہنم کا ذکر موقع موقع پر آیا ہے②دوم نبوت اور اس کے متعلق شبہات کا جگہ جگہ جواب اور نبوت ہی کے متعلق وعدہ نصرت، جہاد کی اجازت اور اسی کے متعلق مجادلین کی مذمت خواہ وہ جدال قولی ہو یا فعلی، جیسے حج یا عمرہ سے روکنا جس کے ضمن میں احکام حج مذکور ہوئے③سوم توحید، چنانچہ آیات میں تامل کرنے والے پر سب ظاہر ہے، گذشتہ سورت کے اختتام اور اس سورت کے شروع میں مناسبت یہ ہے کہ دونوں جگہ ڈرانے کا مضمون ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ① يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ

لوگو ڈرو اپنے رب سے، بیشک بھونچال قیامت کا ایک بڑی چیز ہے، جس دن اس کو دیکھو گے بھول جائے گی ہر

مُرْضِعَةٍ عَمَّاۤ اَرْضَعَتْ وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَ مَا هُمْ

دودھ پلانے والی اپنے دودھ پلائے کو، اور ڈال دے گی ہر پیٹ والی اپنا پیٹ، اور تو دیکھے لوگوں پر نشہ اور ان پر

بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ②

نشہ نہیں، پر آفت اللہ کی سخت ہے۔

**خلاصہ تفسیر:** اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو (اور ایمان واطاعت اختیار کرو، کیونکہ) یقیناً قیامت کا زلزلہ بڑی بھاری چیز ہوگی (جس کا آنا ضروری ہے، اس روز کے شدائد سے بچنے کی اب فکر کرو جس کا طریقہ تقویٰ ہے، اب اس زلزلہ کی شدت کا بیان ہے) جس روز تم لوگ اس (زلزلہ) کو دیکھو گے اس روز (یہ حال ہوگا کہ) تمام دودھ پلانے والیاں (ہیبت ودہشت کی وجہ سے) اپنے دودھ پیتے (بچہ) کو بھول جائیں گی اور تمام حمل والیاں اپنا حمل (دن پورے ہونے سے پہلے) ڈال دیں گی اور تجھ کو (اے مخاطب!) لوگ نشہ کی سی حالت میں دکھائی دیں گے حالانکہ وہ نشہ میں نہ ہوں گے (کیونکہ وہاں کسی نشہ کی چیز استعمال کرنے کا کوئی امکان واحتمال ہی نہیں) لیکن اللہ کا عذاب ہی سخت چیز ہے (جس کے خوف کی وجہ سے ان کی حالت نشہ والے کی سی ہو جائے گی)۔

اتَّقُوْا رَبَّكُمْ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ: جب قیامت کا زلزلہ ایسا شدید ہوگا جو کہ بہت سے واقعات میں سے ایک واقعہ ہے تو سارے واقعات مل کر کیا کچھ سخت اور شدید ہوں گے تو ان مصائب سے خیر وعافیت سے گزرنے کے لیے سامان چاہیے اور وہ تقوی ہے، پس خدا سے ڈرو اور ایمان وتقوی اختیار کرو، احادیث سے عین قیامت کے دن اور اس سے پہلے بھی زلزلہ کا واقع ہونا ثابت ہے، لیکن جس زلزلہ کا آیت میں ذکر ہے حدیث سے قیامت کے دن اس کا واقع ہونا معلوم ہوتا ہے، چنانچہ ترمذی وحاکم وغیرہ نے عمران بن حصین سے روایت کیا ہے اور اس حدیث کو دونوں نے صحیح کہا ہے کہ حضور ﷺ نے دریافت فرمایا کہ جنت ہو کہ یہ کونسا دن ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: اللہ ورسولہ اعلم، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ وہ دن ہے جس میں حق تعالی آدم علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ جہنم کا لشکر جہنم میں بھیجو، الخ۔

یہ ہیبت ودہشت اگر سب کے لیے عام کہی جائے تو پیچھے آیت: لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ سے اس کو تعارض نہیں، کیونکہ وہاں جو فرمایا

کہ خاص بندوں کو بڑی گھبراہٹ غم میں نہ ڈالے گی، اس کا مطلب یہ ہے کہ اکثر حالات میں ان کو بڑی گھبراہٹ نہ ہوگی، اگرچہ کسی وقت ہو جائے، چنانچہ جس وقت کا اس آیت میں ذکر ہے ممکن ہے اس قلیل ساعت میں خاص بندوں کو بھی گھبراہٹ ہو جائے، اور اگر اس کو عام نہ لیا جائے بلکہ اکثر لوگوں کے اعتبار سے کہا جائے تو اصل سے اشکال ہی نہ ہوگا۔

**تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ أَرْضَعَتْ:** ظاہر الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے کہ قیامت کے روز بھی عورتیں بچوں کو دودھ پلائیں گی، سو یا تو اس کو مان لیا جائے اور کہا جائے کہ جو جس حالت میں مرا ہے اسی حالت میں اٹھے گا، سو ممکن ہے کہ جو عورتیں دودھ پلانے کی حالت میں مری ہیں ان کی وہاں بھی یہی حالت ہو، یا اس کلام کو مثال کے طور پر سمجھا جائے، یعنی مطلب یہ ہے کہ اگر بالفرض کوئی عورت اپنے بچہ کو دودھ پلاتی ہو تو اس دن کی شدت ہول سے دودھ پلاتے ہوئے بچہ کو بھول جائے اور یہی دو احتمال حاملہ عورتوں کے حمل گرنے میں بھی ہیں، لیکن دودھ پلانے کے بارے میں غالب دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ بطور مثال کے کہا گیا ہے، اور حمل کے بارہ میں غالب پہلا احتمال ہے، کیونکہ حمل والیوں کا حمل کی حالت میں قیامت کو اٹھنا بظاہر زیادہ قرین قیاس ہے۔

**وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى:** اس میں نشہ کے علاوہ کی کیفیت کو بطور تشبیہ سکر یعنی نشہ فرمادینے سے تصوف کی اس اصطلاح کی اصل نکل آئی کہ بعض باطنی حالات کو اسی مشابہت کی وجہ سے ''سکر'' کہہ دیا جاتا ہے (یعنی بعض باطنی حالات کے اتار چڑھاؤ کے باعث حالت سکر پیش آتی ہے حالانکہ وہ سکر (نشہ) نہیں ہوتا بلکہ اس جیسی کیفیت ہوتی ہے جو لذت ذکر یا عظمت الٰہی سے بے خود کر دیتی ہے، چنانچہ بعض مرتبہ ذکر و شغل میں کثرت مجاہدہ کی وجہ سے کچھ ایسی کیفیات حاصل ہوتی ہیں، لیکن یہ سکر نہیں ہوتا، بلکہ ان اعمال و وظائف کا ثمرہ ہوتا ہے)۔

**وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ:** مقصود یہ نہیں کہ بس اس زلزلہ کی ہیبت اتنی ہی ہوگی جتنی یہاں ذکر ہوئی، بلکہ مخاطبین کے ذہنوں میں چونکہ یہ ہیبت بھی بڑی ہے جس پر مذکورہ آثار مرتب ہوں اس لیے اسے ذکر کر دیا، پس زیادہ کی نفی مقصود نہیں ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ قیامت کے عظیم الشان زلزلے (بھونچال) دو ہیں: ① ایک عین قیام قیامت کے وقت یا نفخہ ثانیہ کے بعد ② دوسرا قیامت سے کچھ پیشتر جو علامات قیامت میں سے ہے، اگر یہاں دوسرا مراد ہو تو آیت اپنے ظاہر معنی پر رہے گی اور پہلا مراد ہو تو دونوں احتمال ہیں، حقیقتاً زلزلہ آئے اور دودھ پلانے والی یا حاملہ عورتیں اپنی اسی ہیئت پر محشور ہوں، یا زلزلہ سے مراد وہاں کے احوال و شدائد ہوں اور **يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ** الخ کو تمثیل پر حمل کیا جائے یعنی اس قدر گھبراہٹ اور سختی ہوگی کہ اگر دودھ پلانے والی عورتیں موجود ہوں تو مارے گھبراہٹ اور شدتِ ہول کے اپنے بچوں کو بھول جائیں اور حاملہ عورتوں کے حمل ساقط ہو جائیں، اس وقت لوگ اس قدر مدہوش ہوں گے کہ دیکھنے والا شراب کے نشہ کا گمان کرے حالانکہ وہاں نشہ کا کیا کام، خدا کے عذاب کا تصور اور احوال و شدائد کی سختی ہوش گم کر دے گی۔

**تنبیہ:** اگر یہ گھبراہٹ سب کو عام ہو تو **لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ** میں نفی باعتبار اکثر احوال کے اور یہاں اثبات باعتبار ساعت قلیلہ کے لیا جائے گا، اور اگر آیت حاضرہ اکثر ناس کے حق میں ہو، سب کے حق میں نہ ہو تو سرے سے اشکال ہی نہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ③

اور بعضے لوگ وہ ہیں جو جھگڑتے ہیں اللہ کی بات میں بے خبری سے ۱؎ اور پیروی کرتا ہے ہر شیطان سرکش کی ۲؎

كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ④

جس کے حق (قسمت) میں لکھ دیا گیا ہے کہ جو کوئی اس کا رفیق ہو سو وہ اس کو بہکائے اور لے جائے عذاب میں دوزخ کے ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** گزشتہ آیات میں تقویٰ کی تاکید کے لیے قیامت کے بعض احوال اور سختیوں کا ذکر فرمایا تھا، چونکہ بعض کفار دیگر

حق باتوں کے انکار کے ساتھ ساتھ قیامت کے بھی منکر تھے، چنانچہ نضر بن حارث بڑا جھگڑالو تھا، کہتا تھا کہ۔نعوذ باللہ۔ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں، قرآن تو پچھلوں کا افسانہ ہے، اللہ تعالیٰ اس شخص کو زندہ کرنے پر قادر نہیں جو گل سڑ کر مٹی ہو گیا، اس لیے اب آگے ان پر رد فرماتے ہیں۔

اور بعضے آدمی ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں (یعنی اس کی ذات یا صفات یا افعال کے متعلق) بے جانے بوجھے جھگڑا کرتے ہیں اور ہر شیطان سرکش کے پیچھے ہو لیتے ہیں (یعنی اس میں گمراہی کی ایسی قابلیت ہے کہ جو شیطان جس طرح بہکائے اس کے بہکانے میں آجاتا ہے، پس اس شخص میں انتہائی درجہ کی گمراہی ہوئی کہ اس پر ہر شیطان کا قابو چل جاتا ہے) جس کی نسبت (خدا کے یہاں سے) یہ بات لکھی جا چکی ہے (اور طے ہو چکی ہے) کہ جو شخص اس سے تعلق رکھے گا (یعنی اس کا اتباع کرے گا) تو اس کا کام ہی یہ ہے کہ وہ اس کو (راہ حق سے) بے راہ کر دے گا اور اس کو عذاب دوزخ کا راستہ دکھلا دے گا۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی اللہ تعالیٰ جن باتوں کی خبر دیتا ہے ان میں یہ لوگ جھگڑتے اور کج بحثیاں کرتے ہیں اور جہل و بے خبری سے عجیب احمقانہ شبہات پھیلاتے ہیں، چنانچہ قیامت، بعث بعد الموت اور جزاء و سزا وغیرہ پر ان کا بڑا اعتراض یہ ہے کہ جب آدمی مر کر گل سڑ گیا اور ہڈیاں تک ریزہ ریزہ ہو گئیں تو یہ کیسے سمجھ میں آئے کہ وہ پھر زندہ ہو کر اپنی اصلی حالت پر لوٹ آئے گا۔

**فائدہ:** ۲ یعنی جن یا آدمیوں میں کا جو شیطان اس کو اپنی طرف بلائے یہ فوراً اسی کے پیچھے چل پڑتا ہے، گویا گمراہ ہونے کی ایسی کامل استعداد رکھتا ہے کہ کوئی شیطان کسی طرف پکارے یہ اس پر لبیک کہنے کے لیے تیار رہتا ہے۔

**فائدہ:** ۳ یعنی شیطان مَرید کے متعلق یہ طے شدہ امر ہے کہ جو اس کی رفاقت اور پیروی کرے وہ اپنے ساتھ اسے بھی لے ڈوبتا ہے اور گمراہ کر کے دوزخ سے ورے نہیں چھوڑتا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ

اے لوگوں! اگر تم کو دھوکا ہے جی اٹھنے میں تو ہم نے تم کو بنایا ۱ مٹی سے پھر قطرہ سے ۲ پھر

مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۭ وَنُقِرُّ

جمے ہوئے خون سے، پھر گوشت کی بوٹی نقشہ بنی ہوئی سے اور بدون نقشہ بنی ہوئی سے ۳ اس واسطے کہ تم کو کھول کر سنا دیں ۴ اور ٹھہرا رکھتے ہیں

فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَاۗءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ

ہم پیٹ میں جو کچھ چاہیں ایک وقت معین تک ۵ پھر تم کو نکالتے ہیں لڑکا، پھر جب تک کہ پہنچو اپنی جوانی کے زور کو، اور کوئی تم میں سے

مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـــًٔا ۭ وَتَرَى

قبضہ کر لیا جاتا ہے، اور کوئی تم میں سے پھر چلایا جاتا ہے نکمی عمر تک تاکہ سمجھنے کے پیچھے کچھ نہ سمجھنے لگے ۶ اور تو دیکھتا ہے

الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاۗءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ⑤

زمین خراب (دبی) پڑی ہوئی، پھر جہاں ہم نے اتارا اس پر پانی تازی ہو گئی اور ابھری اور اگائیں ہر قسم قسم رونق کی چیزیں ۷

**خلاصہ تفسیر:** (اب ان جھگڑنے والوں کو خطاب ہے کہ) اے لوگو! اگر تم (قیامت کے روز) دوبارہ زندہ ہونے (کے امکان)

سے شک میں ہو تو (ذرا آئندہ مضمون میں غور کر لو تا کہ شک ختم ہو جائے اور وہ یہ کہ) ہم نے (اول بار) تم کو مٹی سے بنایا (کیونکہ غذا جس سے نطفہ بنتا ہے اول عناصر سے پیدا ہوتی ہے جس میں ایک جز مٹی بھی ہے) پھر نطفہ سے (جو کہ غذا سے پیدا ہوتا ہے) پھر خون کے لوتھڑے سے (جو نطفہ میں گاڑھا پن اور سرخی آنے سے حاصل ہوتا ہے) پھر بوٹی سے (جو خون کے لوتھڑے میں سختی آ جانے سے بنتی ہے) کہ (بعض) پوری ہوتی ہے (کہ اس میں پورے اعضاء بن جاتے ہیں) اور (بعض) ادھوری بھی (ہوتی ہے کہ بعض اعضاء ناقص رہ جاتے ہیں، یہ اس طرح کی ساخت، ترتیب اور فرق سے اس لئے بنایا) تا کہ ہم تمہارے سامنے (اپنی قدرت) ظاہر کر دیں (اور اسی سے ظاہر ہے کہ وہ دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے)۔

اور (اس مضمون کا تتمہ یہ ہے جس سے اور زیادہ قدرت ظاہر ہوتی ہے کہ) ہم (ماں کے) رحم میں جس (نطفہ) کو چاہتے ہیں ایک مدت معین (یعنی وضع حمل کے وقت تک) ٹھہرائے رکھتے ہیں (اور جس کو ٹھہرانا نہیں چاہتے ہیں وہاں اسقاط ہو جاتا ہے) پھر (اس معین مدت کے بعد) ہم تم کو بچہ بنا کر (ماں کے پیٹ سے) باہر لاتے ہیں، پھر (اس کے بعد تین قسمیں ہو جاتی ہیں: ایک قسم یہ کہ تم میں سے بعض کو جوانی تک مہلت دیتے ہیں) تا کہ تم اپنی بھری جوانی (کی عمر) تک پہنچ جاؤ اور بعض تم میں وہ بھی ہیں جو (جوانی سے پہلے ہی) مر جاتے ہیں (یہ دوسری قسم ہوئی) اور بعض تم میں وہ ہیں جو نکمی عمر (یعنی زیادہ بڑھاپے) تک پہنچا دیئے جاتے ہیں جس کا اثر یہ ہے کہ ایک چیز سے باخبر ہو کر پھر بے خبر ہو جاتے ہیں (جیسا اکثر بوڑھوں کو دیکھا جاتا ہے کہ ابھی ایک بات بتلائی اور ابھی پھر پوچھ رہے ہیں، یہ تیسری قسم ہوئی، یہ سب حالتیں بھی اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کی نشانیاں ہیں، ایک دلیل تو یہ تھی)۔

اور (آگے دوسری دلیل یہ ہے کہ) اے مخاطب! تو زمین کو دیکھتا ہے کہ خشک (پڑی) ہے پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ ابھرتی ہے اور پھولتی ہے اور ہر قسم (یعنی انواع واقسام) کی خوشنما نباتات اگاتی ہے (سو یہ بھی کامل قدرت کی دلیل ہے)۔

* * *

**فائدہ: ۱۔ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ:** یعنی اگر یہ دھوکا لگ رہا ہے کہ ریزہ ریزہ ہو کر دوبارہ کیسے جی اٹھیں گے تو خود اپنی پیدائش میں غور کرو کس طرح ہوئی ہے۔

**فائدہ: ۲۔ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ:** یعنی اول تمہارے باپ آدم کو مٹی سے، پھر تم کو قطرہ منی سے بنایا، یا یہ مطلب ہے کہ مٹی سے غذا نکالی جس سے کئی منزلیں طے ہو کر نطفہ بنا، پھر نطفہ سے کئی درجے طے کر کے تمہاری تشکیل وتخلیق ہوئی۔

**فائدہ: ۳۔ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ:** یعنی نطفہ سے جما ہوا خون اور خون سے گوشت کا لوتھڑا بنتا ہے، جس پر ایک وقت آتا ہے کہ آدمی کا پورا نقشہ (ہاتھ، پاؤں، آنکھ، ناک وغیرہ) بنا دیا جاتا ہے، اور ایک وقت ہوتا ہے کہ ابھی تک نہیں بنایا گیا، یا یہ مطلب ہے کہ بعض کی پیدائش مکمل کر دی جاتی ہے اور بعض یونہی ناقص صورت میں گر جاتا ہے، یا یوں کہا جائے کہ بعض بے عیب ہوتا ہے، بعض عیب دار۔

**فائدہ: ۴۔ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ:** کہ خود تمہاری اصل کیا تھی اور کتنے روز گزرنے کے بعد آدمی بنے ہو، اسی کو سمجھ کر بہت سے حقائق کا انکشاف ہو سکتا ہے، اور بعث بعد الموت کا امکان بھی سمجھ میں آ سکتا ہے۔

**فائدہ: ۵۔ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى:** یعنی جتنی مدت جس کو رحم مادر میں ٹھہرانا مناسب ہوتا ہے ٹھہراتے ہیں، کم از کم چھ مہینے اور زیادہ سے زیادہ دو برس یا چار برس علیٰ اختلاف الاقوال۔

**فائدہ: ۶۔ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا:** یعنی جس طرح اندر رہ کر بہت سے مدارج طے کیے ہیں، باہر آ کر بھی تدریجاً بہت منازل میں سے گزرنا پڑتا ہے، ایک بچپن کا زمانہ ہے جب آدمی بالکل کمزور و ناتواں ہوتا ہے اور اس کی تمام قوتیں چھپی رہتی ہیں، پھر ایک وقت آتا ہے کہ کامن (پوشیدہ) قوتیں ظاہر ہوتی ہیں، جسمانی حیثیت سے ہر چیز کمال شباب کو پہنچ جاتی ہے، پھر بعض تو جوانی ہی میں مر جاتے ہیں اور بعض اس عمر کو پہنچتے ہیں جہاں پہنچ کر آدمی کے اعضاء وقویٰ جواب دے دیتے ہیں، وہ سمجھدار بننے کے بعد ناسمجھ اور کارآمد ہونے کے بعد نکما ہو جاتا ہے، یاد کی ہوئی

چیزیں بھول جاتا ہے اور جانی ہوئی چیزوں کو کچھ نہیں جانتا، گویا بوڑھا ہو کر پھر بچہ بن جاتا ہے۔

**فائدہ:** ے وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ: یعنی زمین مردہ پڑی تھی، رحمت کا پانی پڑتے ہی جی اٹھی اور تروتازہ ہو کر لہلہانے لگی، قسم قسم کے خوش منظر، فرحت بخش اور نشاط افزا پودے قدرت نے اگا دیے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۙ﴿۶﴾

یہ سب کچھ اس واسطے کہ اللہ وہی ہے محقق اور وہ جلاتا ہے مردوں کو اور وہ ہر چیز کر سکتا ہے

وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿۷﴾

اور یہ کہ قیامت آنی ہے اس میں دھوکا نہیں، اور یہ کہ اللہ اٹھائے گا قبروں میں پڑے ہوؤں کو لے

**خلاصہ تفسیر:** اب دلیل کو مزید واضح کرنے کے لئے مذکورہ تمام تصرفات کی علت اور حکمت بیان فرماتے ہیں یعنی:

یہ (جو کچھ پیچھے دونوں دلیلوں کے ضمن میں اشیاء کا ایجاد و اظہار بیان ہوا یہ سب) اس سبب سے ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہی ہستی میں کامل ہے (یہ تو اس کا ذاتی کمال ہے) اور وہ ہی بے جانوں میں جان ڈالتا ہے (یہ اس کا فعلی کمال ہے) اور وہی ہر چیز پر قادر ہے (یہ اس کا وصفی کمال ہے اور یہ تینوں مل کر گذشتہ آیت میں مذکور تصرفات کی علت ہیں، کیونکہ اگر ان تینوں کمالات میں سے ایک بھی نہ ہوتا تو ایجاد نہ پایا جاتا، موجد عالم وہی ہوسکتا ہے جو ذات، صفات اور فعل سب میں کامل ہو جیسا کہ ظاہر ہے) اور (نیز اس سبب سے ہوا کہ) قیامت آنے والی ہے اس میں ذرا شبہ نہیں اور اللہ تعالیٰ (قیامت میں) قبر والوں کو دوبارہ پیدا کرے گا (یہ گذشتہ آیت میں مذکور تصرفات کی حکمت ہے، یعنی ہم نے وہ تصرفات اس لئے ظاہر کئے کہ ان میں من جملہ اور حکمتوں کے ایک حکمت اور غایت یہ تھی کہ ہم کو قیامت کا لانا اور مردوں کو زندہ کرنا منظور ہے، تو ان تصرفات سے اس کا ممکن ہونا لوگوں پر ظاہر ہو جائے گا، کہ جو خدا ایسے ایسے تصرفات کرتا ہے وہ دوبارہ بھی زندہ کر سکتا ہے، پس مذکورہ چیزوں کی ایجاد کی تین علتیں اور دو حکمتیں بیان ہوئیں اور سبب بالمعنی الاعم سب کو عام ہوا، اس لئے بِاَنَّ اللہ کی باء سببیت سب پر داخل ہوگئی)۔

**ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ:** حق تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے مخلوقات کی تخلیق کا سبب اپنی موجود اور کامل الذات والصفات ہونے کو فرمایا، اس میں قریب قریب اس کی تصریح ہوگئی جو صوفیہ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی صفات اپنے جمیل ہونے کی وجہ سے ظہور کو متقاضی ہوئیں، اس سے اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا، لیکن اس مقام پر دو باتیں سمجھنے کے قابل ہیں، ایک یہ کہ تخلیق کا سبب صرف یہی ظہور کا تقاضا نہیں بلکہ اس میں دیگر کئی حکمتیں اور مصلحتیں بھی ہیں اور انہ یحیی الموتی میں اسی طرف اشارہ ہے، دوسرے یہ کہ یہ تقاضا درجہ اضطرار میں نہیں، بلکہ حق تعالیٰ کے افعال اختیار کے اظہار کا داعی ہے۔

* * *

**فائدہ:** لے انسان کی پیدائش اور کھیتی کی مثالوں سے جو اوپر مذکور ہوئیں چند باتیں ثابت ہوتی ہیں:

① یہ کہ یقیناً اور بالتحقیق اللہ موجود ہے ورنہ ایسی منظم متقن اور حکیمانہ صنعتیں کہاں سے ظاہر ہوئیں۔

② یہ کہ خدا تعالیٰ مردہ اور بے جان چیزوں کو زندہ اور جان دار بنا دیتا ہے، چنانچہ مشتِ خاک یا قطرہ آب سے انسان بنا دینا اور افتادہ زمین میں روح نباتی پھونک دینا اس پر شاہد ہے، پھر دوبارہ پیدا کر دینا اس کو کیا مشکل ہے۔

③ یہ کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے، اگر ہر چیز اس کی قدرت کے نیچے نہ ہوتی تو ہرگز یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔

④ یہ کہ قیامت ضرور آنی چاہیے اور اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی ضرور ملنی چاہیے کیونکہ اتنے بڑے انتظامات یوں ہی لغو اور بیکار نہیں ہو سکتے۔

جس حکیم مطلق اور قادر علی الاطلاق نے اپنی حکمت بالغہ اور قدرت کاملہ سے انسان کو ایسی عجیب وغریب صفت کے ساتھ پیدا کیا، کیا خیال کیا جاسکتا ہے کہ اس نے اس کی زندگی بیکار بنائی ہوگی؟ ہرگز نہیں یقینا انسان کی یہ محدود زندگی جس میں سعادت وشقاوت نیکی بدی اور رنج وراحت باہم مخلوط رہتے ہیں اور امتحان وانتقام کی صورتیں ایک دوسرے سے مکمل اور نمایاں طور پر متمیز نہیں ہوتیں، اس کو مقتضی ہے کہ کوئی دوسری زندگی ہو، جہاں سعید وشقی، مجرم ووفادار صاف طور پر الگ الگ ہوں اور ہر ایک اس مقام پر پہنچایا جائے جہاں پہنچنے کے لیے بنایا گیا ہے اور جس کی استعداد اپنے اندر رکھتا ہے، مادی حیثیت سے منی کے جن اجزاء میں نطفہ بننے کی استعداد تھی ان سے نطفہ بنا، اسی طرح نطفہ کی پوشیدہ قوتیں علقہ میں، علقہ کی مضغہ میں، مضغہ کی طفل میں آئیں اور جوانی کے وقت ان کا پورا ظہور ہوا، یا زمین کی پوشیدہ قوتیں بارش کا چھینٹا پڑنے سے ظہور پذیر ہوئیں، اسی طرح ضروری ہے کہ انسان میں سعادت وشقاوت کی جو روحانی قوتیں ودیعت کی گئیں یا نیکی اور بدی میں پھولنے پھلنے کی جو زبردست استعداد رکھی ہے وہ اپنے پورے شباب کو پہنچے اور کامل ترین اشکال وصورتیں ظاہر ہوں، اس کا نام بعث بعد الموت ہے جو دنیا کی زندگی کا موجودہ دور ختم کرنے کے بعد وقوع پذیر ہوگا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يُّجَادِلُ فِى اللّٰهِ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيۡرٍ ۙ‏ ﴿۸﴾ ثَانِىَ عِطۡفِهٖ

اور بعض شخص وہ ہے جو جھگڑتا ہے اللہ کی بات میں بغیر جانے اور بغیر دلیل اور بدون روشن کتاب کے [1] اپنی کروٹ موڑ کر [2]

لِيُضِلَّ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ؕ لَهٗ فِى الدُّنۡيَا خِزۡىٌ‌ وَّنُذِيۡقُهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ عَذَابَ الۡحَرِيۡقِ‏ ﴿۹﴾

تاکہ بہکائے اللہ کی راہ سے، اس کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور چکھائیں گے ہم اس کو قیامت کے دن جلن کی مار (جلنے کا عذاب) [3]

ع ۸ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتۡ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَـيۡسَ بِظَلَّامٍ لِّـلۡعَبِيۡدِ‏ ﴿۱۰﴾

یہ اس کی وجہ سے جو آگے بھیج چکے تیرے دو ہاتھ، اور اس وجہ سے کہ اللہ نہیں ظلم کرتا بندوں پر [4]

**خلاصہ تفسیر:** یہاں تک تو جھگڑنے والوں کی گمراہی اور اس کے رد میں دلیل مذکور تھی، اب ان کا دوسروں کو گمراہ کرنا، اور دونوں [ضلال واضلال کا] یعنی گمراہ ہونے اور گمراہ کرنے کا سخت وبال بیان فرماتے ہیں۔

اور بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں (یعنی اس کی ذات یا صفات یا افعال کے مقدمہ میں) بدون واقفیت (یعنی علم ضروری) اور بدون دلیل (یعنی علم استدلالی عقلی) اور بدون کسی روشن کتاب (یعنی علم استدلالی نقلی) کے (اور دوسرے محقق کی اتباع وتقلید سے) تکبر کرتے ہوئے جھگڑا کرتے ہیں تاکہ (دوسرے لوگوں کو بھی) اللہ کی راہ سے (یعنی دین حق سے) بے راہ کردیں، ایسے شخص کے لئے دنیا میں رسوائی ہے (خواہ کسی قسم کی رسوائی ہو، چنانچہ بعض گمراہ قتل وقید وغیرہ سے ذلیل ہوتے ہیں، بعض مناظرہ اہل حق میں مغلوب ہوکر عقلاء کی نظر میں بے عزت ہوتے ہیں) اور قیامت کے دن ہم اس کو جلتی آگ کا عذاب چکھائیں گے (اور اس سے کہا جائے گا) کہ یہ تیرے ہاتھ کے کئے ہوئے کاموں کا بدلہ ہے اور یہ بات ثابت ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ (اپنے) بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں (پس تجھ کو بلا جرم سزا نہیں دی گئی)۔

* * *

**فائدہ:** [1] یعنی ایسے واضح دلائل وشواہد سننے کے بعد بھی بعض کج رو اور ضدی لوگ اللہ کی باتوں میں یوں ہی بے سند جھگڑے کرتے رہتے ہیں، ان کے پاس نہ کوئی علم ضروری ہے، نہ دلیل عقلی، نہ دلیل سمعی محض اوہام وظنون کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔

**فائدہ:** [2] یعنی اعراض وتکبر کے ساتھ۔

**فائدہ:** [3] یعنی جو شخص بدون حجت ودلیل محض عناد سے خدا کی باتوں میں جھگڑتا ہے اور غرض یہ ہو کہ دوسرے لوگوں کو ایمان ویقین کی راہ سے ہٹادے اس کو دنیا میں خدا تعالیٰ ذلیل کرے گا اور آخرت کا عذاب رہا سوا لگ۔

**فائدہ:** ؎ یعنی جب سزا دیں گے تو کہا جائے گا کہ خدا کی طرف سے کسی پر ظلم وزیادتی نہیں، تیرے ہاتھوں کی کرتوت ہے جس کا مزہ آج چکھ رہا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨاطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ

اور بعضا شخص وہ ہے کہ بندگی کرتا ہے اللہ کی کنارے پر، پھر اگر پہنچی اس کو بھلائی تو قائم ہوگیا اس عبادت پر، اور اگر پہنچ گئی اس کو

فِتْنَةُ ِۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۗ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ⑪

جانچ پھر گیا اُلٹا اپنے منہ پر، گنوائی دنیا اور آخرت، یہی ہے ٹوٹا صریح

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے انکار اور جھگڑے پر اصرار کرنے والوں کی مذمت تھی، آگے ان کی مذمت ہے جو بعض احوال میں ظاہری اسلام کے باوجود دل سے اخلاص نہ رکھتے تھے، اور بعض احوال میں کفر وانکار کی طرف لوٹ کر مرتد ہوجاتے تھے، چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ بعض لوگ مدینہ آکر مسلمان ہوجاتے، جب اپنے گھر جاکر مال واولاد میں برکت وترقی دیکھتے تو کہتے دین اسلام بہت اچھا دین ہے، اور اگر کچھ اس کے خلاف ہوتا تو کہتے دین اسلام بہت برا دین ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس میں متزلزل اور متذبذب لوگوں کا حال بیان کیا کہ ایسوں کے لیے دنیا وآخرت دونوں میں خسارہ ہے، ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کا اسلام پر رہنا بھی دین کی حقانیت کی وجہ سے نہ ہوگا، کیونکہ ان کے نزدیک حقانیت کا معیار دنیاوی نفع ہے، سو عین اسلام کی حالت میں بھی ان کے عقیدہ اور غرض میں فساد تھا، اس لیے اخلاص نہ ہونے کی وجہ سے ایسا اسلام معتبر نہیں، بلکہ نفاق کی قسم ہے۔

اور بعض آدمی اللہ کی عبادت (ایسے طور پر) کرتا ہے (جیسے کوئی کسی چیز کے) کنارہ پر (کھڑا ہو اور موقع پاکر چل دینے پر تیار ہو) پھر اگر اس کو کوئی (دنیاوی) نفع پہنچ گیا تو اس کی وجہ سے (ظاہری) قرار پالیا، اور اگر اس پر کچھ آزمائش ہوگئی تو منہ اٹھا کر (کفر کی طرف) چل دیا (جس سے) دنیا وآخرت دونوں کو کھو بیٹھا، یہی کھلا نقصان (کہلاتا) ہے (دنیا کا نقصان تو دنیاوی آزمائش جو کسی مصیبت سے ہوتی وہ ظاہر ہی ہے)۔

فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨاطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ: روح المعانی میں ہے کہ اس میں وہ شخص بھی داخل ہوگیا جو خدا تعالیٰ کی عبادت کرامات اور مخلوق کی طرف سے تعریف وغیرہ کی توقع اور امید پر کرتا ہے، اگر اس کو حاصل ہوتا ہوا دیکھے تو عبادت میں نشاط اور چستی ہوتی ہے، ورنہ بے دلی اور سستی کرتا ہے، کیونکہ ''خیر'' اور ''فتنہ'' کا لفظ اپنے مطلق ہونے کی وجہ سے اسے بھی شامل ہے (یعنی جو لوگ اللہ کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں تاکہ لوگ ان کی تعریف وتوصیف کریں اور اگر اس کا یہ مقصد حاصل نہ ہو تو عبادت سے اکتاہٹ پیدا ہوجاتی ہے، ان کا یہ عمل انتہائی نقصان دہ ہے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی بعض آدمی محض دنیا کی غرض سے دین کو اختیار کرتا ہے اور اس کا دل مذبذب رہتا ہے، اگر دین میں داخل ہوکر دنیا کی بھلائی دیکھے، بظاہر بندگی پر قائم رہے اور تکلیف پائے تو چھوڑ دے، اُدھر دنیا گئی اِدھر دین گیا، کنارے پر کھڑا ہے، یعنی دل ابھی اس طرف ہے نہ اس طرف، جیسا کوئی مکان کے کنارے کھڑا ہو جب چاہے نکل بھاگے۔

يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ۗ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ⑫

پکارتا ہے اللہ کے سوا ایسی چیز کو کہ نہ اس کا نقصان کرے اور نہ اس کا فائدہ کرے، یہی ہے دور جا پڑنا گمراہ ہوکر ؎

يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ۗ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ⑬

پکارے جاتا ہے اس کو جس کا ضرر پہلے پہنچے نفع سے ؎ بیشک برا دوست ہے اور برا رفیق ؎

**خلاصہ تفسیر:** (اور آخرت کا نقصان یہ ہوا کہ اسلام اور) خدا کو چھوڑ کر ایسی چیز کی عبادت کرنے لگا جو (اس قدر عاجز اور بے بس ہے کہ) نہ اس کو نقصان پہنچا سکتی ہے نہ نفع پہنچا سکتی ہے (یعنی اس کی عبادت نہ کرو تو کوئی نقصان پہنچانے کی اور عبادت کرو تو نفع پہنچانے کی کوئی قدرت نہیں، ظاہر ہے کہ قادر مطلق کو چھوڑ کر ایسی بے بس چیز کو اختیار کرنا خسارہ ہی خسارہ ہے) یہ انتہا درجہ کی گمراہی ہے (صرف یہی نہیں کہ اس کی عبادت سے کوئی نفع نہ پہنچے، بلکہ الٹا نقصان ہے، کیونکہ) وہ ایسے کی عبادت کر رہا ہے کہ اس (کی عبادت) کا ضرر (واقعی عذاب کا سبب بنتا ہے) بہ نسبت اس کے نفع سے زیادہ قریب ہے (اور) ایسا کارساز بھی برا اور ایسا رفیق بھی برا (جو کسی طرح کسی حال کسی کے کام نہ آئے کہ اس کو مولیٰ اور آقا بنالو یا دوست اور ساتھی بنالو، کسی حال اس سے کچھ نفع نہیں)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی خدا کی بندگی چھوڑی، دنیا کی بھلائی نہ ملنے کی وجہ سے اب پکارتا ہے ان چیزوں کو جن کے اختیار میں نہ ذرہ برابر بھلائی ہے نہ برائی، کیا خدا نے جو چیز نہیں دی تھی وہ پتھروں سے حاصل کرے گا؟ اس سے بڑھ کر کھلی حماقت کیا ہوگی۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی بتوں سے نفع کی تو امید موہوم ہے (بت پرستوں کے زعم کے موافق) لیکن ان کو پوجنے کا جو ضرر ہے وہ قطعی اور یقینی ہے اس لیے فائدہ کا سوال تو بعد کو دیکھا جائے گا، نقصان ابھی ہاتھوں ہاتھ پہنچ گیا۔

**فائدہ:** ۳؎ جب قیامت میں بت پرستی کے نتائج سامنے آئیں گے تو بت پرست بھی یہ کہیں گے لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ یعنی جن سے بڑی امداد و رفاقت کی توقع تھی وہ بہت ہی برے رفیق اور مددگار ثابت ہوئے کہ نفع تو کیا پہنچاتے الٹا ان کے سبب سے نقصان پہنچ گیا۔

| |
|---|
| اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ |
| اللہ داخل کرے گا ان کو جو ایمان لائے اور کیں بھلائیاں باغوں میں، بہتی ہیں نیچے ان کے نہریں ۱؎، |
| اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۱۴﴾ |
| اللہ کرتا ہے جو چاہے ۲؎ |

**خلاصہ تفسیر:** گزشتہ آیات میں کفار کی متعدد جماعتوں اور پھر ان لوگوں کا حال بیان ہوا جو ایمان اور اسلام میں متذبذب اور متزلزل تھے، اب ان کے مقابلہ میں ان مؤمنین کا حال ذکر کرتے ہیں جو ایمان اور اعمال صالحہ پر ثابت قدم ہیں۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے (جنت کے) ایسے باغوں میں داخل فرمائیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی (اور پیچھے جو کفار کی سزا اور مؤمنین کی جزا کا بیان کیا گیا اس کے واقع ہونے میں ذرا شبہ نہیں، کیونکہ) اللہ تعالیٰ (قادر مطلق ہے) جو ارادہ کرتا ہے کر گزرتا ہے (اس کے ساتھ کوئی مزاحمت نہیں کر سکتا اور وہ اس جزا و سزا کا ارادہ کر چکا ہے، پس ضرور ایسا ہی واقع ہوگا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ منکرین مجادلین اور مذبذبین کے بعد یہاں مومنین مخلصین کا انجام نیک بیان فرمایا۔

**فائدہ:** ۲؎ جس کو مناسب جانے سزا دے اور جس پر چاہے انعام فرمائے، اس کا کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔

| |
|---|
| مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ |
| جس کو یہ خیال ہو کہ ہرگز نہ مدد کرے گا اس کی اللہ دنیا میں اور آخرت میں تو تان لے ایک رسی آسمان کو، |

ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ⑮

پھر کاٹ ڈالے، اب دیکھے کچھ جاتا رہا اُس کی اِس تدبیر سے اُس کا غصہ

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے ان کفار کا ذکر ہوا جو دین کے بارے میں جھگڑتے تھے، چونکہ اس سے ان کی غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دین اسلام کو مغلوب اور کمزور کرنا تھا، اس لیے اب ان کی ناکامی اور محرومی کا بیان فرماتے ہیں۔

جو شخص (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخالفت اور مخاصمت کر کے) اس بات کا خیال رکھتا ہو کہ (میں غالب آ جاؤں گا اور آپ کے دین کی ترقی کو روک دوں گا اور یہ کہ) اللہ تعالیٰ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی (اور آپ کے دین کی) دنیا و آخرت میں مدد نہ کرے گا تو اس کو چاہئے کہ ایک رسی آسمان تک تان لے (اور آسمان سے باندھے) پھر (اس رسی کے ذریعہ اگر آسمان پر پہنچ سکے تو پہنچ جائے، تا کہ) اس وحی کو موقوف کرا دے (اور ظاہر ہے کہ ایسا کوئی نہیں کر سکتا) تو پھر (اب) غور کرنا چاہئے آیا اس کی (یہ) تدبیر (جس سے بالکل عاجز ہے) اس کے غیظ و غضب کی چیز کو (یعنی وحی کو) موقوف کر سکتی ہے (یعنی ہرگز نہیں کر سکتی)۔

**فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ:** کیونکہ اس خیال کے بغیر دین اسلام کے مقابلہ میں مخالفانہ تقریریں اور تدبیریں کرنا خلاف عقل ہے، اس لیے کہ کوشش سے مقصود اپنی کامیابی اور مخالف کی ناکامی ہوتی ہے، اور ناکام وہ ہوتا ہے جس کی خدا مدد نہ کرے، پس رسول کے مقابلہ میں یہ کوشش کرنا کہ آپ مغلوب ہو جائیں گے اور آپ کی اور دین اسلام کی ترقی رک جائے اس قاعدہ کے موافق اس خیال کو ضرور مستلزم ہوگی، اس مضمون کو ایک فرض محال کے عنوان سے اس طرح تعبیر کیا ہے، حاصل یہ ہوا کہ امداد الٰہی آپ کے ساتھ نبوت اور وحی کی وجہ سے ہے، سو آپ کی ناکامی میں کوشش اس وقت مفید ہو سکتا ہے جبکہ نبوت اور وحی کے قصہ کو پاک کر دیا جائے اور یہ ہو نہیں سکتا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وحی کو منقطع کرنے کا کام کرنا چاہتا ہے تو کسی طرح آسمان پر پہنچے وہاں جا کر اس سلسلہ وحی کو ختم کر دے، اور ظاہر ہے کہ نہ کسی کا اس طرح آسمان پر جانا ممکن، نہ اللہ تعالیٰ سے قطع وحی کو کہنا ممکن، تو پھر جب تدبیر کوئی کارگر نہیں تو اسلام و ایمان کے خلاف غیظ و غضب کا کیا نتیجہ؟ پس دین کی مخالفت میں کوشش کرنا سراسر حماقت ہے، یہ تفسیر بعینہ درمنثور میں ابن زید سے روایت کی ہے اور میرے نزدیک یہ سب سے بہتر اور صاف تفسیر ہے۔

مجاہدؒ کے ایک قول کے مطابق معنی یہ ہے کہ جو شخص یہ گمان کر کے ناخوش ہو کہ حق تعالیٰ اس کی مدد نہ کرے گا تو تدبیر میں جان کھپا کر دیکھ لے کہ کیا اس سے اس کی ناگوار چیز جاتی رہے گی، سو اس میں تقدیر پر راضی رہنے کی ترغیب ہے۔

* * *

**فائدہ:** "لَنْ يَّنْصُرَهُ" میں ضمیر مفعول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہے جن کا تصور قرآن پڑھنے والے کے ذہن میں گویا ہمہ وقت موجود رہتا ہے، کیونکہ آپ ہی قرآن کے اولین مخاطب ہیں، گویا مومنین کا انجام ذکر کرنے کے بعد یہ انکے پیغمبر کے مستقبل کا بیان ہوا، حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ اپنے رسول سے دنیاوی اور اخروی فتح و نصرت کے جو وعدے کر چکا ہے وہ ضرور پورے ہو کر رہیں گے، خواہ کفار و حاسدین کتنا ہی غیظ کھائیں اور نصرتِ ربانی کے روکنے کی کیسی ہی تدبیریں کر لیں، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت و کامیابی کسی طرح رک نہیں سکتی یقیناً آ کر رہے گی، اگر ان کفار و حاسدین کو اس پر زیادہ غصہ ہے اور سمجھتے ہیں کہ ہم کسی کوشش سے خدا کی مشیت کو روک سکیں گے تو اپنی انتہائی کوشش صرف کر کے دیکھ لیں، حتی کہ ایک رسی اوپر چھت میں لٹکا کر گلے میں ڈال لیں اور خود پھانسی لے کر غیظ سے مر جائیں، یا ہو سکتا ہو تو آسمان میں رسی تان کر اوپر چڑھیں اور وہاں سے آسمانی امداد کو منقطع کر آئیں، پھر دیکھیں کہ ان تدبیروں سے وہ چیز آنی بند ہو جاتی ہے جس پر انھیں اس قدر غصہ اور پیچ و تاب ہے۔

اکثر مفسرین نے آیت کی تفسیر اسی طرح کی ہے لیکن حضرت شاہ صاحبؒ نے آیت کو وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ الخ کے مضمون سے مربوط کر کے نہایت لطیف تقریر فرمائی ہے، ان کے نزدیک مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ الخ میں ضمیر مفعول مَنْ کی طرف لوٹتی ہے،

مطلب یہ ہے کہ دنیا کی تکلیف میں جو کوئی خدا سے ناامید ہو کر اس کی بندگی چھوڑ دے اور جھوٹی چیزیں پوجنے لگے، وہ اپنے دل کے ٹھہرانے کو یہ قیاس کر لے جیسے ایک شخص اونچی لٹکتی رسی سے لٹک رہا ہے، اگر چڑھ نہیں سکتا توقع تو ہے کہ رسی اوپر کھینچے تو چڑھ جائے، جب رسی توڑ دی تو کیا توقع رہی، کیا خدا کی رحمت سے ناامید ہو کر کامیابی حاصل کر سکے گا؟ گویا ''رسی'' کہا اللہ کی امید کو، اس کا کاٹ دینا ناامید ہو جانا، اور آسمان سے مراد بلندی ہے۔ واللہ اعلم۔

| |
|---|
| وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴿١٦﴾ |
| اور یوں اتارا ہم نے یہ قرآن کھلی باتیں، اور یہ ہے کہ اللہ سمجھا دیتا ہے جس کو چاہے |

**خلاصہ تفسیر:** گزشتہ آیت میں یہ بیان کیا تھا کہ سلسلہ وحی کو منقطع کرنے پر کوئی بھی قادر نہیں، اب اسی کی تاکید کے لیے بیان فرماتے ہیں کہ وحی نازل کرنے والے حق تعالیٰ ہیں، نیز گزشتہ آیت کے آخر میں غور و فکر کا حکم تھا جس کا تقاضا یہ ہے کہ سامع کو ضرور ہدایت ہو جاتی، چنانچہ اب اس آیت کے اختتام پر ہدایت کا مشیت الٰہی پر موقوف ہونا مذکور ہے۔

اور ہم نے اس (قرآن) کو اسی طرح اتارا ہے (کہ اس میں ہمارے ارادے اور قدرت کے سوا کسی کا دخل نہیں) جس میں کھلی کھلی دلیلیں (تعیین حق کی) ہیں، اور (جن میں ہم نظر اور فکر کا بھی حکم کرتے رہتے ہیں، مگر اس کے باوجود) بات یہ (ہی) ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی جس کو چاہتا ہے (حق کی) ہدایت کرتا ہے (البتہ انسان کی کوشش اور طلب کے بعد اللہ تعالیٰ ارادہ کر ہی لیتے ہیں)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی کیسی صاف صاف مثالیں اور کھلی باتیں ہیں، مگر سمجھتا وہ ہی ہے جسے خدا سمجھ دے۔

| |
|---|
| اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۖ |
| جو لوگ مسلمان ہیں اور جو یہود ہیں اور صابئین اور نصاریٰ اور مجوس [1] اور شرک کرتے ہیں، |
| اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿١٧﴾ |
| مقرر اللہ فیصلہ کرے گا ان میں قیامت کے دن، اللہ کے سامنے ہے ہر چیز [2] |

**خلاصہ تفسیر:** گزشتہ آیت میں کفار کا دین اسلام اور اہل ایمان کے ساتھ اختلاف اور اس اختلاف کا قولی فیصلہ پختہ دلائل سے واضح طور پر بیان فرمایا تھا، مگر چونکہ کفار عناد کی وجہ سے اس پر اکتفا نہیں کرتے اس لیے آگے قیامت کے عملی فیصلہ کا ذکر فرماتے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان اور یہود اور صابئین اور نصاریٰ اور مجوس اور مشرکین، اللہ تعالیٰ ان سب کے درمیان میں قیامت کے روز (عملی) فیصلہ کر دے گا (کہ مسلمانوں کو جنت میں اور کافروں کی سب اقسام کو جہنم میں داخل کرے گا) بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے (پس اسے ہر ایک کے کفر و ایمان کی بھی اطلاع ہے، ہر ایک کو مناسب بدلہ دے گا)۔

* * *

**فائدہ:** [1] مجوس آگ پوجتے ہیں اور دو خالق مانتے ہیں، ایک خیر کا خالق جس کا نام ''یزدان'' ہے، دوسرا شر کا جس کو ''اہرمن'' کہتے ہیں اور کسی نبی کا نام بھی لیتے ہیں، معلوم نہیں یہ پیچھے بگڑے ہیں یا سرے سے غلط ہیں، شہرستانیؒ نے ''ملل و نحل'' میں ان کے مذہب پر جو کلام کیا ہے اسے دیکھا جائے، ''صابئین'' وغیرہ کا ذکر پہلے [سورہ بقرہ، آیت: ۶۲ میں] گزر چکا۔

**فائدہ:** [2] یعنی تمام مذاہب و فرق کے نزاعات کا عملی اور دو ٹوک فیصلہ حق تعالیٰ کی بارگاہ سے قیامت کے دن ہو گا، سب جدا کر کے اپنے اپنے ٹھکانے پر پہنچا دیئے جائیں گے، اللہ ہی جانتا ہے کہ کون کس مقام یا کس سزا کا مستحق ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ

تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ کو سجدہ کرتا ہے جو کوئی آسمان میں ہے اور جو کوئی زمین میں ہے اور سورج اور چاند اور تارے

وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِیْرٌ حَقَّ عَلَیْهِ الْعَذَابُ ؕ

اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت آدمی [1] اور بہت ہیں کہ ان پر ٹھہر چکا عذاب [2]

وَمَنْ یُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ ؕ۝۱۸ السجدة ۱۴

اور جس کو اللہ ذلیل کرے اسے کوئی نہیں عزت دینے والا، اللہ کرتا ہے جو چاہے [3]

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے مؤمنین وکفار کے درمیان قیامت کے روز فیصلہ فرمانے کا بیان تھا، چونکہ عام طور پر فیصلہ کے لیے اس اختلاف کا باوقعت ہونا ضروری ہے، اس لیے آگے اپنی اطاعت کا باعظمت اور باوقعت ہونا تمام مخلوقات کے عاجز، مطیع اور منقاد ہونے سے بتلاتے ہیں اور ایسے ظاہری معاملہ میں بے جا اختلاف کا برا ہونا بیان کرتے ہیں، اس کے بعد مکلفین یعنی بنی نوع انسان کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں، ایک مطیع وفرمانبردار سجدہ میں سب کے ساتھ شریک اور دوسرا سرکش باغی سجدہ سے منحرف۔

اے مخاطب! کیا تجھ کو (عقل یا مشاہدہ سے) یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے (اپنی اپنی حالت کے مناسب) سب عاجزی کرتے ہیں جو کہ آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور (تمام مخلوقات کے مطیع و فرمانبردار ہونے کے باوجود انسان جو خاص درجہ کی عقل بھی رکھتا ہے وہ سب کے سب مطیع وفرمانبردار نہیں بلکہ) بہت سے (تو) آدمی بھی (اطاعت اور عاجزی کرتے ہیں) اور بہت سے ایسے ہیں جن پر (اطاعت نہ ہونے کی وجہ سے) عذاب (کا استحقاق) ثابت ہو گیا ہے، اور (سچ یہ ہے کہ) جس کو خدا ذلیل کرے (کہ اس کو ہدایت کی توفیق نہ ہو) اس کا کوئی عزت دینے والا نہیں (اور) اللہ تعالیٰ (کو اختیار ہے اپنی حکمت سے) جو چاہے کرے۔

یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ: تمام کائنات ومخلوقات کا اپنے خالق کے زیرحکم اور تابع مشیت ہونا ایک تو تکوینی اور تقدیری طور پر غیر اختیاری ہے جس سے کوئی بھی مخلوق مومن یا کافر زندہ یا مردہ، جمادات یا نباتات مستثنیٰ نہیں، اس حیثیت میں سب کے سب یکساں طور پر حق تعالیٰ کے زیرحکم ومشیت ہیں، جہان کا کوئی ذرہ یا پہاڑ اس کے اذن ومشیت کے بغیر کوئی ادنیٰ حرکت نہیں کرسکتا، دوسری اطاعت وفرمانبرداری اختیاری ہے کہ کوئی مخلوق اپنے قصد واختیار سے اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کرے، چنانچہ یہاں تابع وفرمان ہونے کو سجدہ کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے جس کا ترجمہ خلاصہ تفسیر میں عاجزی کرنے سے کیا ہے، تاکہ مخلوقات کی ہر نوع اور ہر قسم کے سجدہ کو شامل ہوجائے، کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا سجدہ اس کے مناسب حال ہوتا ہے، انسان کا سجدہ زمین پر پیشانی رکھنے کا نام ہے دوسری مخلوقات کا سجدہ اپنی اپنی خدمت جس کے لئے ان کو پیدا کیا گیا ہے اس کو انجام دینے کا اور خدمت کا حق ادا کرنے کا نام ہے، اسی لیے یَسْجُدُ لَهٗ کی تفسیر میں اپنی اپنی حالت کے مناسب کی قید لگا دینے سے یہ اشکال دور ہو گیا کہ اس سے مراد اگر اختیاری اطاعت ہے تو تمام مخلوقات کی طرف اس کا منسوب کرنا مشکل ہے، کیونکہ جمادات اور حیوانات میں ارادہ اور اختیار کہاں؟ اور اگر غیر اختیاری اطاعت مراد ہے تو وَكَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ کی تخصیص مشکل ہے، یعنی یہ کیوں فرمایا کہ بہت سے آدمی بھی، کیونکہ غیر اختیاری اطاعت تو سبھی کرتے ہیں مؤمن بھی اور کافر بھی، خدا جس کو چاہے زندہ کرے جسے چاہے مار دے، جسے چاہے صحت وغنا دے، جس کو چاہے بیماری وفقر میں مبتلا کر دے، ان باتوں میں تو کوئی بھی خدا کے خلاف نہیں کرسکتا؟ جواب یہ ہے کہ ہر چیز کے مناسب جیسی اطاعت ہے وہ مراد ہے، پس جو مخلوقات مکلف نہیں ہیں ان کے مناسب غیر اختیاری اطاعت ہے، اور انسان چونکہ عقل کی بنا پر مکلف ہے اس لیے اس غیر اختیاری اطاعت کے علاوہ اس سے

اختیاری اطاعت بھی مطلوب ہے، اور وہ ساری نوع انسان میں نہیں پایا جاتا، اس لیے یہاں انسان کے مطیع ہونے کو بطور کلیہ نہیں بلکہ محض بطور اکثریت کے ارشاد فرمایا گیا کہ: وَ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ، آیت میں مذکور انسان کے علاوہ دیگر مخلوقات چونکہ مکلف نہیں ہیں اس لیے ان کے مناسب صرف غیر اختیاری اطاعت ہے اور وہ ان سب میں پائی جاتی ہے، اس لیے یسجد میں مناسب کی قید لگانے سے سجدہ کا تحقق دیگر مخلوقات کے لیے عام ہو گیا اور انسان کے لیے صرف بعض افراد کے اعتبار سے ہوا، پس نہ یسجد مکرر نکالنے کی ضرورت اور نہ یسجد کو سب مخلوقات کی طرف منسوب ہونے میں کوئی قباحت، اور نہ اس اشکال کے وارد ہونے کی گنجائش رہی کہ یسجد اگر اختیاری اطاعت مراد ہے تو انسان کے علاوہ دیگر مخلوقات کی طرف نسبت مشکل، اور اگر بے اختیاری اطاعت مراد ہے تو پھر وَ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ کی تخصیص مشکل، سو بحمد اللہ مذکورہ تقریر سے سب اشکال دور ہو گئے اور کسی تکلف کی حاجت نہ رہی۔

* * *

**فائدہ:** ۱ ایک سجدہ ہے جس میں آسمان و زمین کی ہر ایک مخلوق شامل ہے وہ یہ کہ اللہ کی قدرت کے آگے تکوینا سب مطیع و منقاد اور عاجز و بے بس ہیں، خواہی نخواہی سب کو اس کے سامنے گردن ڈالنا اور سر جھکانا پڑتا ہے، دوسرا سجدہ ہے ہر چیز کا جدا، وہ یہ کہ جس چیز کو جس کام کے لیے بنایا اس کام میں لگے، یہ بہت آدمی کرتے ہیں بہت نہیں کرتے، مگر آدمیوں کو چھوڑ کر اور ساری خلقت کرتی ہے، بناءً علیہ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ الخ میں ہر چیز کا اپنی شان کے لائق سجدہ مراد ہوگا یا مَنْ فِي الْاَرْضِ کے بعد دوسرا يَسْجُدُ مقدر نکالا جائے گا

**تنبیہ:** پہلی آیت سے ربط یہ ہوا کہ مختلف مذاہب کے لوگ آپس میں اختلاف رکھتے ہیں حالانکہ دوسری تمام مخلوق خدا کی مطیع و منقاد ہے، انسان جو ساری مخلوق سے زائد عاقل ہے، چاہیے تھا کہ اس کے کل افراد اوروں سے زیادہ متفق ہوتے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی سجدہ سے انکار و اعراض کرنے کی بدولت عذاب کے مستحق ہوئے۔

**فائدہ:** ۳ یعنی خدا تعالیٰ جس کو اسکی شامت اعمال سے ذلیل کرنا چاہے اسے ذلت کے گڑھے سے نکال کر عزت کے مقام پر کون پہنچا سکتا ہے؟

هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ۫ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ؕ يُصَبُّ مِنْ

یہ دو مدعی ہیں جھگڑے ہیں اپنے رب پر ۱ سو جو منکر ہوئے ان کے واسطے بیونتے (کاٹے) ہیں کپڑے آگ کے ۲ ڈالتے ہیں

فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ﴿۱۹﴾ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَ الْجُلُوْدُ ﴿۲۰﴾ وَ لَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴿۲۱﴾

ان کے سر پر جلتا پانی گل کر نکل جاتا ہے اس سے جو کچھ ان کے پیٹ میں ہے اور کھال بھی، اور ان کے واسطے ہتھوڑے ہیں لوہے کے

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے مؤمنین اور کفار کی قسمیں تفصیلی اور ان کا عملی فیصلہ اجمالی طور پر مذکور تھا، آگے ان اقسام کو بطور میزان الکل کے اجمالی طور پر اور فیصلہ کی وضاحت کو تفصیلی طور پر ارشاد فرماتے ہیں۔

(جن کا ذکر پیچھے آیت: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا الخ میں ہوا ہے) یہ دو فریق ہیں (ایک مومن دوسرا کافر، پھر کافر گروہ کی کئی قسمیں ہیں: یہود، نصاریٰ، صابئین، مجوس اور بُت پرست) جنہوں نے اپنے رب کے (دین کے) بارے میں (عقیدتاً اور کبھی کبھی بحث مباحثہ کر کے بھی) باہم اختلاف کیا، سو (اس اختلاف کا عملی فیصلہ قیامت میں اس طرح ہوگا کہ) جو لوگ کافر تھے ان کے (پہننے کے لئے) آگ کے کپڑے قطع کئے جائیں گے (یعنی آگ ان کے پورے بدن پر اس طرح محیط ہوگی جیسے لباس، اور) ان کے سر کے اوپر سے تیز (کھولتا ہوا) گرم پانی چھوڑا جائے گا جس سے ان کے پیٹ کی چیزیں (یعنی آنتیں) اور کھالیں سب گل جائیں گی (یعنی یہ کھولتا ہوا تیز پانی کچھ پیٹ کے اندر چلا جائے گا جس سے آنتیں اور پیٹ کے اندر کے سب اجزاء اعضاء گل جائیں گے کچھ اوپر بہے گا جس سے کھال گل جائے گی) اور ان کے (مارنے کے لئے) لوہے کے گرز ہوں گے۔

يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَ الْجُلُوْدُ: اگر کسی کو شبہ کہ جب آنتیں، پیٹ اور کھال وغیرہ سب گل گئے تو پھر عذاب کا محل ہی نہ رہا، پھر عذاب کیسے ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ حدیث میں ہے کہ یہ سب اپنی حالت پر دوبارہ ہو جائے گا، دوسری آیت میں ہے: كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ

جُلُوْدًا غَيْرَهَا۔

فائدہ: ۱؎ یعنی پہلے اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا الیٰ آخرہ میں جن فرقوں کا ذکر ہوا اُن سب کو حق و باطل پر ہونے کی حیثیت سے دو فریق کہہ سکتے ہیں: ایک مومنین کا گروہ جو اپنے رب کی سب باتوں کو من وعن تسلیم کرتا اور اس کے احکام کے آگے سربسجود رہتا ہے، دوسرے کفار کا مجمع جس میں یہود، نصاریٰ، مجوس، مشرکین، صابئین وغیرہ ہم سب شامل ہیں، جو ربانی ہدایات کو قبول نہیں کرتے اور اس کی اطاعت کے لیے سر نہیں جھکاتے، یہ دونوں فریق دعاوی میں، بحث ومناظرہ میں اور جہاد وقتال کے مواقع میں بھی ایک دوسرے کے مدمقابل رہتے ہیں۔ جیسا کہ ''بدر'' کے میدان مبارزہ میں حضرت علی، حضرت حمزہ اور عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہم تین کافروں (عتبہ ابن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ) کے مقابلہ پر نکلے تھے، آگے دونوں فریق کا انجام بتلاتے ہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جس طرح لباس آدمی کے بدن کو ڈھانپ لیتا ہے، جہنم کی آگ اسی طرح ان کو محیط ہوگی، یا کسی ایسی چیز کے کپڑے پہنائے جائیں گے جو آگ کی گرمی سے بہت سخت اور بہت جلد تپنے والے ہوں۔

فائدہ: دوزخیوں کے سر ہتھوڑے سے کچل کر کھولتا ہوا پانی اوپر سے ڈالا جائے گا جو دماغ کے راستہ سے پیٹ میں پہنچے گا جس سے سب انتڑی اوجھڑی کٹ کٹ کر نکل پڑے گی اور بدن کی بالائی سطح کو جب پانی مس کرے گا تو بدن کا چمڑا گل کر گر پڑے گا، پھر اصلی حالت کی طرف لوٹائے جائیں گے اور بار بار یہی عمل ہوتا رہے گا: كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ، اللّٰهم اعذنا من غضبك و عذابك.

| |
|---|
| كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ق وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿٢٢﴾ ع ۱۲ |
| جب چاہیں کہ نکل پڑیں دوزخ سے گھٹنے کے مارے پھر ڈال دیے جائیں اس کے اندر، اور چکھتے رہو جلنے کا عذاب |

خلاصہ تفسیر: (اس مصیبت سے کبھی نجات نہ ہوگی، چنانچہ) وہ لوگ جب (دوزخ میں) گھٹے گھٹے (گھبرا جائیں گے اور) اس سے باہر نکلنا چاہیں گے (اور کنارہ کی طرف کو بڑھیں گے، اگرچہ دروازوں کے بند ہونے کی وجہ سے نکل نہ سکیں گے) تو پھر اسی میں دھکیل دیئے جائیں گے اور (ان کو) کہا جائے گا کہ جلنے کا عذاب (ہمیشہ کے لئے) چکھتے رہو (کبھی نکلنا نصیب نہ ہوگا)۔

كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا: اگرچہ دوزخ کی گہرائی اور اس کے دروازے بند ہونے کی وجہ سے دوزخ سے نکلنا ناممکن ہوگا لیکن گھبراہٹ کے وقت یہ حرکت طبعی ہوتی ہے کہ انسان دروازہ کی طرف بھاگا کرتا ہے۔

فائدہ: یعنی دوزخ میں گُھٹ گُھٹ کر چاہیں گے کہ کہیں کو نکل بھاگیں، آگ کے شعلے ان کو اوپر کی طرف اٹھائیں گے، پھر فرشتے آہنی گرز مار کر نیچے دھکیل دیں گے اور کہا جائے گا کہ دائمی عذاب کا مزہ چکھتے رہو جس سے نکلنا کبھی نصیب نہ ہوگا، العیاذ باللہ۔

| |
|---|
| اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ |
| بیشک اللہ داخل کرے گا ان کو جو یقین لائے اور کیں بھلائیاں باغوں میں بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں |
| يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ط وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿٢٣﴾ |
| گہنا پہنائیں گے ان کو وہاں کنگن سونے کے اور موتی ۱؎ اور ان کی پوشاک ہے وہاں ریشم کی ۲؎ |

**خلاصه تفسیر:** (اور) اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے (جنت کے) ایسے باغوں میں داخل کرے گا جس کے نیچے نہریں جاری ہوں گی ان کو وہاں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور پوشاک ان کی وہاں ریشم ہوگی۔

**يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا:** یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ کنگن ہاتھوں میں پہننا عورتوں کا کام اور انہیں کا زیور ہے، مردوں کے لئے معیوب سمجھا جاتا ہے، جواب یہ ہے کہ دنیا کے بادشاہوں کی یہ امتیازی شان رہی ہے کہ سر پر تاج اور ہاتھوں میں کنگن استعمال کرتے تھے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سراقہ بن مالک کو جبکہ وہ مسلمان نہیں تھے اور سفر ہجرت میں آپ کو گرفتار کرنے کے لئے تعاقب میں نکلے تھے، جب ان کا گھوڑا باذن خداوندی زمین میں دھنس گیا اور اس نے توبہ کی تو آنحضرت ﷺ کی دعا سے گھوڑا نکل گیا، اس وقت سراقہ بن مالک سے وعدہ فرمایا تھا کہ کسریٰ شاہ فارس کے کنگن مال غنیمت میں مسلمانوں کے پاس آئیں گے وہ تمہیں دیئے جائیں گے اور جب فاروق اعظم کے زمانے میں فارس کا ملک فتح ہوا اور ایران کے یہ کنگن دوسرے اموال غنیمت کے ساتھ آئے تو سراقہ بن مالک نے مطالبہ کیا اور ان کو دے دیے گئے، خلاصہ یہ ہے کہ جیسے سر پر تاج پہننا عام مردوں کا رواج نہیں، شاہی اعزاز ہے، اسی طرح ہاتھوں میں کنگن بھی شاہی اعزاز سمجھے جاتے ہیں، اس لئے اہل جنت کو کنگن پہنائے جائیں گے۔

**وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ:** اگر کسی کو شبہ ہو کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ سب اہل جنت کا لباس ریشم کا ہوگا، جبکہ حدیث میں آیا ہے کہ جو مرد دُنیا میں ریشم پہنے گا اس کو جنت میں ریشم نہ ملے گا اگر چہ وہ جنت میں بھی چلا جائے؟ جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ ایسے لوگوں کو اول داخل ہوتے ہی ریشم نہ ملے پھر بعد میں مل جائے، اس پر اگر یہ شبہ ہو کہ اس کے نہ ملنے سے اگر حسرت نہ ہوگی تو پھر سزا ہی کیا ہوئی، اور اگر حسرت ہوگی تو جنت میں حسرت ہونا لازم آتا ہے اور جنت حسرت وافسوس کی جگہ نہیں؟ جواب یہ ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے حسرت ہونے میں سزا بھی ہوگئی اور کوئی اشکال بھی نہیں، کیونکہ اس کے بعد جو دائمی راحت ہوگی اس کے سامنے تھوڑی دیر کی حسرت کچھ بھی نہیں، پس تھوڑی دیر کے لیے بھی جنت میں حسرت نہ ہونا اس پر کوئی دلیل نہیں، اس کا ایک اچھا جواب یہ بھی ہے کہ اہل جنت کے جس طرح مقامات اور درجات مختلف اور متفاوت اعلیٰ وادنیٰ ہوں گے، ان کے تفاوت کا احساس بھی سب کو ہوگا، مگر اس کے ساتھ ہی حق تعالیٰ شانہ اہل جنت کے قلوب ایسے بنا دے گا کہ ان میں حسرت وافسوس کسی چیز کا نہ رہے گا، واللہ اعلم۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی بڑی آرائش اور زیب وزینت سے رہیں گے اور ہر ایک عنوان سے تجمل وتنعم کا اظہار ہوگا۔

**فائدہ:** ۲ پہلے قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ میں دوزخیوں کا لباس مذکور ہوا تھا، اس کے بالمقابل یہاں جنتیوں کا پہناوا بیان فرماتے ہیں کہ ان کی پوشاک ریشم کی ہوگی، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں" یہ جو فرمایا کہ وہاں گہنا اور وہاں پوشاک، معلوم ہوا یہ دونوں (چیزیں مردوں کے لیے) یہاں نہیں، اور گہنوں میں سے کنگن اس واسطے کہ غلام کی خدمت پسند آتی ہے تو کڑے ہاتھ میں ڈالتے ہیں"۔

**تنبیہ:** احادیث میں ہے کہ جو مرد یہاں ریشم کا لباس پہنے گا آخرت میں نہیں پہنے گا، اگر وہ پہننے والا کافر ہے تب تو ظاہر ہے کہ وہ جنت میں داخل ہی نہ ہوگا کہ جنتیوں کا لباس پہنے، ہاں! اگر مومن ہے تو شاید کچھ مدت تک اس لباس سے محروم رکھا جائے پھر ابدالآباد تک پہنتا رہے اور اس لا متناہی مدت کے مقابلہ میں یہ قلیل زمانہ غیر معتد بہ سمجھا جائے۔

وَهُدُوٓا إِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۖ وَهُدُوٓا إِلَىٰ صِرَاطِ الْحَمِيدِ ﴿٢٤﴾

اور راہ پائی انہوں نے ستھری بات کی ۱، اور پائی اس تعریفوں (خوبیوں) والے کی راہ ۲۔

**خلاصہ تفسیر:** اور (یہ سب انعام واکرام ان کے لئے اس سبب سے ہے کہ دنیا میں ان کو) کلمہ طیب (کے اعتقاد) کی ہدایت ہوگئی تھی اور ان کو اس (خدا) کے رستہ کی ہدایت ہوگئی تھی جو لائق حمد ہے (وہ راستہ اسلام ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ے دنیا میں بھی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا، قرآن پڑھا، خدا کی تسبیح وتحمید کی اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کیا اور آخرت میں بھی کہ فرشتے ہر طرف سے سلام کریں گے اور جنتی آپس میں ایک دوسرے سے ستھری باتیں کرتے ہوں گے، بک بک جھک جھک نہ ہوگی اور نعمائے جنت پر شکر خداوندی بجالائیں گے، مثلاً کہیں گے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْجَنَّةَ. سورہ فاطر میں ہے: یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِیْهَا حَرِیْرٌ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اس سے آیت حاضرہ کی تفسیر ہوتی ہے، نبّہ علیه فی الروح۔

**فائدہ:** ۲ے یعنی اللہ کی راہ پائی جس کا نام اسلام ہے، یہ راہ خود بھی حمید ہے اور راہ والا بھی حمید ہے، یا راہ پائی اس جگہ کی جہاں پہنچ کر آدمی کو خداتعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا ہوتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِیْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ

جو لوگ منکر ہوئے اور روکتے ہیں اللہ کی راہ سے اور مسجد حرام سے جو ہم نے بنائی سب لوگوں کے واسطے،

ع سَوَآءَ ۨالْعَاكِفُ فِیْهِ وَالْبَادِ ؕ وَمَنْ یُّرِدْ فِیْهِ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۲۵﴾

برابر ہے اس میں رہنے والا اور باہر سے آنے والا ۱ے، اور جو اس میں چاہے ٹیڑھی راہ شرارت سے اسے ہم چکھائیں گے ایک عذاب دردناک ۲ے

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے بعض کفار کا دین میں جھگڑنا اور لوگوں کو اپنی باتوں سے گمراہ کرنا مذکور تھا، اسی سلسلہ میں یہاں تک کلام چلا آیا، آگے ان کے عملی جدال اور بعض احکام دینی کے عملاً باطل ہونے کا وعید کے ساتھ ذکر ہے، جیسا کہ حدیبیہ کے سال میں کفار قریش نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام کو عمرہ کے لیے مکہ میں جانے سے روکا تھا، اس پر شدید وعید کے ساتھ ایسی جگہ میں شرک کرنے کی قباحت و مذمت کا بھی بیان ہوا ہے کہ جو لوگ اس مقام اور خاص ایام کے مناسب عبادت کرنے آئے ان کو تو روکا اور خود ایسے مقام میں شرکیہ اور کفریہ اعمال کرتے ہیں اور وعید کی تاکید کے لیے مقدس مکان اور اس کے متعلق بعض افعال وغیرہ کی عظمت وفضیلت کا مضمون بھی ارشاد فرمایا ہے۔

بیشک جو لوگ کافر ہوئے اور (مسلمانوں کو) اللہ کے راستہ سے (یعنی دین کے کام سے جس میں سے ایک عمرہ بھی ہے) اور (چونکہ عمرہ کے ارکان خاص حرم میں ادا ہوتے ہیں اس لیے) مسجد حرام (یعنی حرم) سے (بھی) روکتے ہیں (تاکہ مسلمان عمرہ ادا نہ کرسکیں، حالانکہ حرم کی حیثیت یہ ہے کہ اس میں کسی کی خصوصیت نہیں، بلکہ) اس کو ہم نے تمام آدمیوں کے واسطے مقرر کیا ہے کہ اس میں (یعنی تمام حرم میں بجز ان مقامات کے جن پر کسی کا استحقاق صحیح طور پر ثابت ہے اور دلیل سے وہ کسی خاص شخص کی ملکیت ہیں، باقی تمام اجزاء حرم میں) سب برابر ہیں اس (حرم کے داخل حدود) میں رہنے والا بھی (یعنی جو لوگ وہاں مقیم ہیں) اور باہر سے آنے والا (مسافر) بھی (کیونکہ جن مقامات سے ان کفار نے روکا ہے یعنی مسجد اور اس کے متعلقات جہاں طواف اور سعی وغیرہ کرتے ہیں، اور وہ سڑکیں جن سے وہاں پہنچتے ہیں یہ سب مقام ان کفار کی ملکیت نہیں تھے) یہ (روکنے والے) لوگ (اس روکنے کی وجہ سے) معذب ہوں گے اور (پھر اس سے روکنے میں تو چند گناہ تھے ہی اس کے ساتھ کفر بھی ملا ہوا ہے، اس پر عذاب کیسے نہ ہوتا، یہ مقام حرم تو ایسا معظم ومحترم ہے کہ) جو کوئی اس میں (یعنی حرم شریف میں) کوئی خلاف دین کام (خواہ وہ اس مذکورہ جرم سے کم ہی ہو) قصداً (و ارادتاً خاص طور پر جبکہ وہ) ظلم (یعنی شرک وکفر) کے ساتھ (بھی ملا ہو) کرے گا (جیسا کہ یہ لوگ ہیں) تو ہم اس کو عذاب دردناک (کا مزہ) چکھا دیں گے۔

وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِیْ: مسجد حرام اصل میں اس مسجد کا نام ہے جو بیت اللہ کے گرد بنائی ہوئی ہے، یہ حرم مکہ کا ایک اہم جزو ہے، لیکن بعض مرتبہ مسجد حرام بول کر پورا حرم مکہ بھی مراد لیا جاتا ہے، جیسے خود اسی واقعہ یعنی مسلمانوں کو عمرہ کے لئے حرم میں داخل ہونے سے روکنے کی جو صورت پیش آئی وہ یہی تھی کہ کفار مکہ نے آپ کو صرف مسجد میں جانے سے نہیں بلکہ حدود حرم مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا تھا جو احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اور قرآن کریم نے اس واقعہ میں مسجد حرام کا لفظ بمعنی مطلق حرم استعمال فرمایا ہے، تفسیر درمنثور میں اس جگہ مسجد حرام کی تفسیر میں پورا حرم مراد ہونا حضرت

ابن عباسؓ سے روایت ہے، اور آیت میں بھی اس کے قرائن موجود ہیں، حنفیہ نے اسی تفسیر کو اختیار کر کے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ تمام حرم کی زمین وقف کے مثل ہے، کسی کو اس میں ملک کا دعوی یا کسی کو نفع سے روکنا یا زمین کا کرایہ لینا جائز نہیں، اور اس بارہ میں کچھ احادیث بھی ہیں، لیکن خود امام صاحبؒ سے بھی ایک قول جواز کا منقول ہے اور اسی پر فتوی ہے، اور جو تفسیر احقر نے کی وہ کسی مذہب کو مضر نہیں۔

**وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ**: اگرچہ گناہ کرنا ہر جگہ سبب عذاب ہے، لیکن حرم کے اندر زیادہ عذاب کا سبب ہے، باقی اس پر کوئی دلیل قائم نہیں کہ حرم کے اندر صغیرہ گناہ کبائر میں ہیں یا ایک گناہ کی وجہ سے کئی گناہ لکھے جاتے ہیں، البتہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ دوسری جگہ صغائر و کبائر کا جو اثر ہے حرم میں دونوں کا اثر کیفیت اور شدت میں زیادہ ہے، لیکن صغیرہ گناہ کا اثر کبیرہ گناہ کے برابر یا ایک گناہ کا کئی گناہ کے برابر ہونا ثابت نہیں۔

''ارادہ'' سے مراد وہ مرتبہ نہیں جو دوسری جگہ معاف ہوتا ہے، بلکہ ارادہ کے معنی عزم اور کوشش کے ہیں جیسا کہ آیت: **ومن ارادہ الاخرۃ** میں کوشش اور طلب کے معنی ہیں، اور اس قید کا فائدہ یہ ہوگا کہ نسیان وخطا کا معاف ہونا معلوم ہو جائے گا، باقی جس درجہ کا ارادہ ہر جگہ معاف ہے حرم میں بھی معاف ہے، حرم میں ان کا سبب عتاب ہونا ثابت نہیں۔

''ظلم''، یعنی شرک کی قید اس لیے نہیں بڑھائی گئی کہ شرک کے علاوہ دوسرے گناہ سبب عذاب نہ ہوں گے، بلکہ اس کا یہ فائدہ ہے کہ جو شخص شرک کے ساتھ موصوف ہوگا وہ تو یقیناً عذاب کا مستحق ہوگا، اور جو شخص مؤمن ہو ممکن ہے کہ ایمان کی برکت سے بلا عذاب ہی معاف کر دیا جائے۔

* * *

**فائدہ**: لے پہلے **هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ** میں مومنین اور کفار کے اختصام (جھگڑے) کا ذکر تھا، اس اختصام کی بعض صورتوں کو یہاں بیان فرمایا ہے، یعنی ایک وہ لوگ ہیں جو خود گمراہ ہونے کے ساتھ دوسروں سے مزاحم ہوتے ہیں، چاہتے ہیں کہ کوئی شخص اللہ کے راستہ پر نہ چلے، حتی کہ جو مسلمان اپنے پیغمبر کی معیت میں عمرہ ادا کرنے کے لیے مکہ معظمہ جا رہے تھے ان کا راستہ روک دیا، حالانکہ مسجد حرام (یا حرم شریف کا وہ حصہ جس سے لوگوں کی عبادات ومناسک کا تعلق ہے) سب کے لیے یکساں ہے، جہاں مقیم ومسافر اور شہری و پردیسی کو ٹھہرنے اور عبادت کرنے کے مساویانہ حقوق حاصل ہیں، ہاں! وہاں سے نکالے جانے کے قابل اگر ہیں تو وہ لوگ جو شرک اور شرارتیں کر کے اس بقعہ مبارکہ کی بے تعظیمی کرتے ہیں۔

**تنبیہ**: بیوت مکہ کی ملکیت اور بیع وشراء وغیرہ کا مسئلہ ایک مستقل مسئلہ ہے جس کی کافی تفصیل روح المعانی وغیرہ میں کی گئی ہے، یہاں اس کے بیان کا موقع نہیں۔

**فائدہ**: ۲ے یعنی جو شخص حرم شریف میں جان بوجھ کر بالارادہ بے دینی اور شرارت کی کوئی بات کرے گا اس کو اس سے زیادہ سخت سزا دی جائے گی جو دوسری جگہ ایسا کام کرنے پر ملتی ہے، اسی سے ان کا حال معلوم کر لو جو ظلم وشرارت سے مومنین کو یہاں آنے سے روکتے ہیں۔

**وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآىِٕفِيْنَ**

اور جب ٹھیک کر دی ہم نے ابراہیم کو جگہ اس گھر کی لے کہ شریک نہ کرنا میرے ساتھ کسی کو ۲ے اور پاک رکھ میرا گھر طواف کرنے والوں کے واسطے

**وَالْقَآىِٕمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۲۶﴾**

اور کھڑے رہنے والوں کے اور رکوع وسجدہ والوں کے ۳ے

**خلاصہ تفسیر**: گذشتہ آیت میں مسجد حرام اور حرم سے روکنے والوں پر عذاب شدید کی وعید آئی ہے، اب اسی کی مناسبت سے بیت اللہ کے خاص فضائل اور عظمت کا بیان ہے جس سے ان کے فعل کی قباحت اور زیادہ واضح ہو جائے۔

اور (اس محترم مقام کی جو کہ بیت اللہ کو مشتمل ہے عظمت ظاہر کرنے کے لیے تاکہ بے حرمتی کرنے والوں کی خرابی زیادہ ظاہر ہو ان لوگوں کے سامنے اس قصہ کا تذکرہ کیجئے) جب کہ ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو خانہ کعبہ کی جگہ بتلا دی (کیونکہ اس وقت خانہ کعبہ بنا ہوا نہ تھا اور حکم

دیا) کہ (اس مکان کو عبادت کے لئے تیار کرو اور اس عبادت میں) میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرنا (یہ دراصل ان کے بعد والے لوگوں کو سنانا ہے) اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے اور (نماز میں) قیام اور رکوع وسجود کرنے والوں کے واسطے (ظاہری اور باطنی نجاست یعنی کفر وشرک سے) پاک رکھنا (جیسا کہ تم نے اب تک اس کو پاک رکھا ہے، یہ بھی دراصل دوسروں کو سنانا تھا، ابراہیم علیہ السلام سے تو اس کے خلاف کا احتمال ہی نہ تھا)۔

**مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ:** بیت اللہ کے ذکر کے ساتھ شرک کی ممانعت کا ذکر اس لیے نہایت ہی مناسب ہوا کہ کسی ناواقف کو بیت اللہ کی تعظیم اور اس کے عبادت گاہ ہونے کی وجہ سے اس کے معبود ہونے کا وہم نہ ہو جائے۔

**وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ:** یہ بھی بعد والوں کو سنانا مقصود ہے، کیونکہ ابراہیم علیہ السلام سے تو اس کے خلاف کا احتمال بھی نہ تھا، جب اہتمام کے طور پر ان کو پاک رکھنے کا حکم دیا گیا تو دوسروں کو جو کہ حقیقۃً کھلم کھلا اس میں بت رکھے ہوئے ہیں کیونکر معاف کر دیا جائے گا، اس سے معلوم ہوا کہ طالب کے لیے بعض ایسی خدمتیں جو ترتیب کے مناسب ہوں استاذ وشیخ کے ذمہ بھی ہوتی ہیں۔

* * *

**تنبیه:** مسجد حرام کا ذکر پہلے آیا تھا اس کی مناسبت سے کعبہ کی بنا کا حال اور اسکے متعلق بعض احکام دور تک بیان کیے گئے ہیں۔

**فائده:** ۱ کہتے ہیں کعبہ شریف کی جگہ پہلے سے بزرگ تھی، پھر مدتوں کے بعد نشان نہ رہا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ بیت اللہ تعمیر کرو، اس معظم جگہ کا نشان دکھلایا گیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے اسماعیل کو ساتھ لے کر خانہ کعبہ تعمیر کیا۔

**فائده:** ۲ یعنی اس گھر کی بنیاد خالص توحید پر رکھو، کوئی شخص یہاں آکر اللہ کی عبادت کے سوا کوئی مشرکانہ رسوم نہ بجالائے، کفار مکہ نے اس پر ایسا عمل کیا کہ وہاں تین سو ساٹھ بت لاکر کھڑے کر دیئے۔ العیاذ باللہ۔ جن کی گندگی سے ہمیشہ کے لیے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے گھر کو پاک کیا، فللہ الحمد والمنہ۔

**فائده:** ۳ یعنی خالص ان ہی لوگوں کے لیے رہے اور سب سے پاک کیا جائے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں "پہلی امتوں میں رکوع نہ تھا، یہ خاص اسی امت محمدیہ کی نماز میں ہے، تو خبر دی کہ آگے لوگ ہوں گے اس کے آباد کرنے والے" وفیہ نظر فتامل"۔

**وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ﴿٢٧﴾**

اور پکار دے لوگوں میں حج کے واسطے کہ آئیں تیری طرف پیروں چل کر اور سوار ہو کر دبلے دبلے اونٹوں پر چلے آئیں راہوں دور سے

**خلاصه تفسیر:** اور (ابراہیم علیہ السلام سے یہ بھی کہا گیا کہ) لوگوں میں حج (کے فرض ہونے) کا اعلان کر دو (اس اعلان سے) لوگ تمہارے پاس (یعنی تمہاری اس مقدس عمارت کے پاس) چلے آئیں گے پیادہ بھی اور (لمبے سفر کی وجہ سے دبلی ہو جانے والی) اونٹنیوں پر بھی جو کہ دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی (یا جو سواری بھی کسی کو میسر ہو اس پر آئیں گے، اونٹنی کا خاص طور پر ذکر مثال یا غلبہ استعمال کی بنا پر ہے)۔

**وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ:** حاکم وبیہقی نے ابن عباسؓ سے اس اعلان کا قصہ نقل کیا ہے کہ جب وہ بیت اللہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو انہیں اس اعلان کا حکم دیا گیا تو عرض کیا کہ میری آواز کہاں تک پہنچے گی؟ حق تعالیٰ نے پہنچانے کا وعدہ فرمایا تو ان کی آواز اور اعلان کو سب نے سنا۔

* * *

**فائده:** جب کعبہ تعمیر ہو گیا تو ایک پہاڑ پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پکارا کہ لوگو! تم پر اللہ نے حج فرض کیا ہے حج کو آؤ، حق تعالیٰ نے یہ آواز ہر طرف ہر ایک روح کو پہنچادی (بلا تشبیہ جیسے آجکل ہم امریکہ یا ہندوستان میں بیٹھ کر لندن کی آوازیں سن لیتے ہیں) جس کے لیے حج مقدر تھا اس کی روح نے لبیک کہا، وہ ہی شوق کی دبی ہوئی چنگاری ہے کہ ہزاروں آدمی پا پیادہ تکلیفیں اٹھاتے ہوئے حاضر ہوتے ہیں اور بہت سے اتنی دور سے سوار ہو کر آتے ہیں کہ چلتے چلتے اونٹنیاں تھک جاتی اور دبلی ہو جاتی ہیں، بلکہ عموماً حاجیوں کو عمدہ سانڈنیاں کہاں ملتی ہیں ان ہی سوکھے دبلے اونٹوں پر منزلیں قطع کرتے ہیں، یہ گویا اس دعا کی مقبولیت کا اثر ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی: **فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ**۔

لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ

تاکہ پہنچیں اپنے فائدے کی جگہوں پر ا، اور پڑھیں اللہ کا نام کئی دن جو معلوم ہیں

عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ﴿۲۸﴾

ذبح پر چوپایوں مواشی کے جو اللہ نے دیے ہیں ان کو ۲، سو کھاؤ اس میں سے اور کھلاؤ برے حال کے محتاج کو ۳

**خلاصہ تفسیر:** (اب غرض بتلاتے ہیں کہ لوگ اس لیے حرم آئیں گے) تاکہ اپنے (اپنے دینی اور دنیاوی) فوائد کے لیے حاضر ہوجائیں (دینی فوائد مثلاً حج، ثواب اور رضا حق، دنیاوی فوائد مثلاً قربانی کا گوشت کھانا اور تجارت وغیرہ، دنیاوی فوائد کا مقصود اور اصلی ہونا برا ہے وہ تابع ہونے چاہئیں) اور (اس لئے آئیں گے) تاکہ ایام مقررہ میں (جو قربانی کے ایام دسویں سے بارہویں ذی الحجہ تک ہیں) ان مخصوص چوپاؤں پر (یعنی قربانی کے جانوروں پر ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیں جو خدا تعالیٰ نے ان کو عطا کئے ہیں (ابراہیم علیہ السلام کے خطاب کا مضمون ہو چکا، جس سے حج اور قربانی کا اس وقت بھی مقرر ہونا معلوم ہوگیا، اب آگے امت محمدیہ کو خطاب ہے) سو (اے امت محمدیہ! تمہارے لیے بھی یہ حکم ہے کہ) ان (قربانی کے) جانوروں میں سے تم بھی کھایا کرو (کہ یہ جائز ہے اور مستحب یہ ہے کہ) مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھلایا کرو (بلکہ غنی کو بھی کھلاؤ تو کوئی مضائقہ نہیں)۔

* * *

**فائدہ:** ۱۔ اصل مقصد تو دینی واخروی فوائد کی تحصیل ہے مثلاً حج وعمرہ اور دوسری عبادات کے ذریعہ حق تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا اور روحانی ترقیات کے بلند مقامات پر فائز ہونا، لیکن اس عظیم الشان اجتماع کے ضمن میں بہت سے سیاسی، تمدنی اور اقتصادی فوائد بھی حاصل کیے جاسکتے ہیں، کما لا یخفی۔

**فائدہ:** ۲۔ **ایام معلومات** سے بعض کے نزدیک ذی الحجہ کا پہلا عشرہ اور بعض کے نزدیک تین دن قربانی کے مراد ہیں، بہرحال ان ایام میں ذکر اللہ کی بڑی فضیلت آتی ہے۔ اسی ذکر کے تحت میں خصوصیت کے ساتھ یہ بھی داخل ہے کہ قربانی کے جانوروں کو ذبح کرتے ہوئے اللہ کا نام لیا جائے اور بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَر کہا جائے، ان دنوں میں بہترین عمل یہی ہے اللہ کے نام پر ذبح کرنا۔

**فائدہ:** ۳۔ بعض کفار کا خیال تھا کہ قربانی کا گوشت خود قربانی کرنے والے کو نہ کھانا چاہیے، اس کی اصلاح فرمادی کہ شوق سے کھاؤ، دوستوں کو دو اور مصیبت زدہ محتاجوں کو کھلاؤ۔

ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۲۹﴾

پھر چاہیے کہ ختم کر دیں اپنا میل کچیل اور پوری کریں اپنی منتیں اور طواف کریں اس قدیم گھر کا

**خلاصہ تفسیر:** پھر (قربانی کے بعد) لوگوں کو چاہئے کہ اپنا میل کچیل دور کریں (یعنی احرام کھول ڈالیں، سر منڈالیں) اور اپنے واجبات کو (خواہ نذر سے قربانی وغیرہ واجب کرلی ہو، یا بلا نذر، جو افعال حج کے واجب ہیں ان سب کو) پورا کریں اور (انہی ایام معلومات میں) اس مامون ومحفوظ گھر (یعنی بیت اللہ) کا طواف کریں (یہ طواف زیارت کہلاتا ہے جو کہ فرض ہے)۔

**وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ:** اس آیت سے پہلے بھی اعمال حج قربانی اور احرام کھولنے وغیرہ کا ذکر ہوا ہے اور آگے بھی طواف زیارت کا بیان ہے، درمیان میں ایفاء نذر کا ذکر کس مناسبت سے ہوا؟ جبکہ ایفائے نذر ایک مستقل حکم ہے، حج میں ہو یا حج کے بغیر اور حرم شریف میں ہو یا باہر کسی ملک میں، اسکا جواب یہ ہے کہ اگرچہ ایفاء نذر ایک مستقل حکم شرعی ہے ایام حج اور افعال حج یا حرم کے ساتھ مخصوص نہیں، لیکن اس کا ذکر یہاں افعال حج کے

ضمن میں شاید اس وجہ سے ہے کہ انسان جب حج کے لئے نکلتا ہے تو دل کا داعیہ ہوتا ہے کہ اس سفر میں زیادہ سے زیادہ نیک کام اور عبادات ادا کرے ،اس میں بہت سی چیزوں کی نذر بھی کر لیتا ہے، خصوصاً جانوروں کی قربانی کی نذر کرنے کا تو عام رواج ہے، حضرت ابن عباسؓ نے یہاں نذر سے مراد قربانی ہی کی نذر قرار دی ہے، اور ایک مناسبت نذر کی احکام حج سے یہ بھی ہے کہ جس طرح نذر اور قسم سے انسان پر بہت سی چیزیں جو اصل شرع کی رو سے واجب نہیں تھیں واجب ہو جاتی ہیں اور بہت سی چیزیں جو اصل احکام کی رو سے حرام نا جائز نہیں تھیں وہ اس شخص پر نا جائز وحرام ہو جاتی ہیں، احرام کے تمام احکام تقریباً ایسے ہی ہیں کہ سلے ہوئے کپڑے، خوشبو کا استعمال، بال مونڈنا، ناخن تراشنا وغیرہ فی نفسہ کوئی نا جائز کام نہ تھے مگر اس نے احرام باندھ کر یہ سب کام اپنے اوپر حرام کر لئے، اسی طرح حج کے دوسرے اعمال وافعال جو فرض تو عمر میں ایک ہی مرتبہ ہوتے ہیں مگر بعد میں حج وعمرہ کے لئے احرام باندھ کر یہ سب کام اس کے لئے فرض ہو جاتے ہیں، اسی لئے حضرت عکرمہؒ نے اس جگہ نذور کی تفسیر میں یہی فرمایا کہ اس سے مواجب حج مراد ہیں جو حج کی وجہ سے اس پر لازم ہو گئے ہیں۔

**بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ**: ترمذی کی حدیث سے بیت اللہ کے مامون ومحفوظ ہونے کے یہ معنی معلوم ہوتے ہیں کہ جبار لوگوں میں سے جس نے بھی اسکی بے ادبی کا ارادہ کیا وہ غارت ہوا، اور اکثر کا تو حوصلہ ہی نہیں ہوا، اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے جو حجاج بن یوسف لڑا اسکا مقصود بیت اللہ کی اہانت نہ تھا۔

* * *

**فائدہ:** جہاں سے لبیک شروع کرتے ہیں حجامت نہیں بنواتے، ناخن نہیں لیتے، بالوں میں تیل نہیں ڈالتے، بدن پر میل اور گرد وغبار چڑھ جاتا ہے، زیادہ مل دَل کر غسل نہیں کرتے، ایک عجیب عاشقانہ ومستانہ حالت ہوتی ہے، اب دسویں تاریخ کو سب قصے تمام کرتے ہیں، حجامت بنوا کر غسل کر کے سلے ہوئے کپڑے پہن کر طواف زیارت کو جاتے ہیں، جس کو ذبح کرنا ہو پہلے ذبح کر لیتا ہے، اور اپنی منتیں پوری کرنے سے یہ مراد ہے کہ اپنی مرادوں کے واسطے جو منتیں مانی ہوں ادا کریں، اصل منت اللہ کی ہے اور کسی کی نہیں، بعض کے نزدیک ''نذور'' کے لفظ سے مناسک حج یا واجبات حج مراد ہیں اور یہ ہی اقرب معلوم ہوتا ہے، واللہ اعلم۔

**تنبیہ:** ''عتیق'' کے معنی قدیم پرانے کے ہیں، اور بعض کے نزدیک ''بیت عتیق'' اس لیے کہا کہ اس گھر کو برباد کرنے کی غرض سے جو طاقت اٹھے گی حق تعالیٰ اس کو کامیاب نہ ہونے دے گا تا آنکہ خود اس کا اٹھالینا منظور ہو۔

ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا

یہ سن چکے، اور جو کوئی بڑائی رکھے اللہ کی حرمتوں کی سو وہ بہتر ہے اسکے لیے اپنے رب کے پاس ۱، اور حلال ہیں تم کو چوپائے ۲ مگر جو

يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۝۳۰ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ

تم کو سناتے ہیں ۳ سو بچتے رہو بتوں کی گندگی سے ۴ اور بچتے رہو جھوٹی بات سے ۵ ایک اللہ کی طرف کے ہو کر

غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ

نہ کہ اس کے ساتھ شریک بنا کر ۶ اور جس نے شریک بنایا اللہ کا سو جیسے گر پڑا آسمان سے پھر اچکتے ہیں اس کو اُڑنے والے مردار خوار یا جا ڈالا

بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۝۳۱

اس کو ہوا نے کسی دور مکان میں ۷

**خلاصہ تفسیر:** یہ بات تو ہو چکی (جو حج کے خاص احکام کے متعلق تھی) اور (اب دیگر احکام کے متعلق دوسرے مسائل بھی ہیں

سنو کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کے محترم احکام کی (خواہ وہ حج کے متعلق ہوں یا اس کے علاوہ دیگر احکام ہوں، سو جو شخص ان احکام کی) وقعت (تعظیم و احترام) کرے گا (احکام کی وقعت وعظمت میں یہ بھی داخل ہے کہ ان کا علم بھی حاصل کرے اور یہ بھی کہ ان پر عمل کا اہتمام کرے، ان کے خلاف نہ کرے) سو یہ اس کے حق میں اس کے رب کے نزدیک بہتر ہے (کیونکہ وہ عذاب سے نجات اور دائمی راحت کا سامان ہیں) اور (پیچھے جو خاص چوپاؤں کے کھانے کی اجازت دی ہے اس پر کوئی شبہ نہ کرے کہ احرام میں شکار تو حرام ہو جاتا ہے پھر یہ جانور کیوں حلال رہے؟ اصل یہ ہے کہ) ان مخصوص چوپاؤں کو باستثنائے ان (بعض بعض) کے جو تم کو (قرآن کی بعض آیات میں) پڑھ کر سنا دیئے گئے ہیں (یعنی سورۃ انعام وغیرہ کی آیت: قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا میں حرام جانوروں کی تفصیل بتلا دی گئی ہے ان کے سوا دوسرے چوپاؤں کو) تمہارے لئے حلال کر دیا گیا ہے (اور حلت وحرمت کا مدار اللہ تعالیٰ کے حکم پر ہے، جب ان کے متعلق اللہ کا حکم حلت کے ساتھ ہو چکا تو ان کا حلال سمجھنا بھی احکام خداوندی کی تعظیم میں داخل ہے، اور جب دین و دنیا کی بھلائی احکام خداوندی کی تعظیم ہی میں منحصر ہے) تو تم لوگ گندگی سے یعنی بتوں (کو حق تعالیٰ کے ساتھ شریک کرنے) سے کنارہ کش رہو (کیونکہ بتوں کو خدا کے ساتھ شریک کرنا تو حکم الٰہی سے کھلی بغاوت ہے، اس جگہ شرک سے بچنے کی ہدایت خاص طور پر اس لئے کی گئی کہ مشرکین مکہ اپنے حج میں جو تلبیہ یعنی لبیک پڑھتے تھے اس میں "الا شریکا هو لك تملكه وما ملك" ملا دیتے تھے، یعنی اے اللہ! آپ کا کوئی شریک نہیں بجز اس شریک کے جو آپ ہی کا ہے کہ آپ ہی اس کے اور اس کی مملوکات کے مالک ہیں) اور (مطلقاً) جھوٹی بات سے بچتے رہو (خواہ وہ عقائد کا جھوٹ ہو جیسے مشرکین کا اعتقاد شرک یا دوسری قسم کا جھوٹ جیسے جھوٹی گواہی وغیرہ)۔

اس طور سے کہ اللہ کی طرف جھکے رہو (اور) اس کے ساتھ (کسی کو) شریک مت ٹھہراؤ، اور (شرک تو ایسی بری چیز ہے کہ) جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے تو (اس کی حالت ایسی ہوگی جیسے) گویا وہ آسمان سے گر پڑا پھر پرندوں نے اس کی بوٹیاں نوچ لیں یا (اگر پرندوں سے بچ بھی گیا تو) اس کو ہوا نے کسی دور دراز جگہ لے جا کر پٹک دیا (غرض ہر طرح ہلاک ہوا، اسی طرح جو شرک کرتا ہے یا تو کسی کے ہاتھ سے مارا گیا، یا کسی وقت طبعی موت سے مر گیا، ہر حالت میں جہنم میں پہنچے گا اور ہوا کے جھونکوں کے بغیر بھی ضرور ہی گرتا، لیکن اس صورت میں اور زیادہ تکلیف ہوگی)۔

* * *

**فائدہ: ۱** فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ: یعنی حرام چیزوں کو بھاری سمجھ کر چھوڑ دینا یا اللہ نے جن چیزوں کو محترم قرار دیا ہے ان کا ادب و تعظیم قائم رکھنا بڑی خوبی اور نیکی کی بات ہے جس کا انجام نہایت اچھا ہوگا، محترم چیزوں میں قربانی کا جانور، بیت اللہ، صفا مروہ، منیٰ، عرفات، مسجدیں، قرآن، بلکہ تمام احکام الٰہیہ آجاتے ہیں، خصوصیت سے یہاں مسجد حرام اور ہدی کے جانور کی تعظیم پر زور دینا ہے کہ خدائے واحد کے پرستاروں کو وہاں آنے سے نہ روکیں، نہ قربانی کے آئے ہوئے جانوروں کو واپس جانے پر مجبور کریں بلکہ قیمتی اور موٹے تازے جانور قربان کریں۔

**فائدہ: ۲** وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ: یعنی ان کے ذبح کرنے کا حکم تعظیم حرمات اللہ کے خلاف نہیں، کیونکہ جس مالک نے ایک چیز کی حرمت بتلائی تھی اسی کی اجازت سے اور اسی کے نام پر وہ قربان کی جاتی ہے۔

**فائدہ: ۳** اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ: یعنی جن جانوروں کا حرام ہونا وقتاً فوقتاً تم کو سنایا جاتا رہا ہے جیسا کہ سورہ "انعام" میں تفصیلاً گزر چکا وہ حلال نہیں۔

**فائدہ: ۴** فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ: یعنی جانور اللہ کی مخلوق و مملوک ہیں، اس کی اجازت سے اسی کے نام پر ذبح کیے جاسکتے ہیں اور اسی کے کعبہ کی نیاز ہو سکتے ہیں، جو جانور کسی بت یا دیوی دیوتا کے استھان پر ذبح کیا گیا وہ مردار ہوا، ایسی شرکیات اور گندے کاموں سے بچنا ضروری ہے۔

**فائدہ: ۵** وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ: جھوٹی بات زبان سے نکالنا، جھوٹی شہادت دینا، اللہ کے پیدا کیے ہوئے جانور کو غیر اللہ کے نامزد

کر کے ذبح کرنا، کسی چیز کو بلا دلیل شرعی حلال و حرام کہنا، سب قَوْلَ الزُّوْرِ میں داخل ہے، قَوْلَ الزُّوْرِ کی برائی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کو یہاں شرک کے ساتھ ذکر فرمایا ہے اور دوسری جگہ ارشاد ہوا: وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَالَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ احادیث میں بڑی تاکید و تشدید سے آپ ﷺ نے اس کو منع فرمایا ہے۔

**فائدہ: ٦ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ:** یعنی ہر طرف سے ہٹ کر ایک اللہ کے ہو کر رہو، تمہارے تمام افعال و نیات بالکلیہ بلا شرکت غیرے خالص خدا کے لیے ہونے چاہئیں۔

**فائدہ: ٧ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ:** یہ شرک کی مثال بیان فرمائی، خلاصہ یہ ہے کہ توحید نہایت اعلیٰ اور بلند مقام ہے، اس کو چھوڑ کر جب آدمی کسی مخلوق کے سامنے جھکتا ہے تو خود اپنے کو ذلیل کرتا اور آسمان توحید کی بلندی سے پستی کی طرف گراتا ہے، ظاہر ہے کہ اس قدر اونچے سے گر کر زندہ بچ نہیں سکتا، اب یا تو اہواء و افکار ردیہ کے مردار خوار جانور چاروں طرف سے اس کی بوٹیاں نوچ کر کھائیں گے، یا شیطان لعین ایک تیز ہوا کے جھکڑ کی طرح اس کو اڑا لے جائے گا اور ایسے گہرے کھڈ میں پھینکے گا جہاں کوئی ہڈی پسلی نظر نہ آئے۔

یا یوں کہو کہ مثال میں دو قسم کے مشرکوں کا الگ الگ حال بیان ہوا ہے، جو مشرک اپنے شرک میں پوری طرح پکا نہیں، مذبذب ہے، کبھی ایک طرف جھک جاتا ہے کبھی دوسری طرف، وہ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ کا، اور جو مشرک اپنے شرک میں پوری طرح پکا اٹل ہو، وہ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ کا مصداق ہے یا تَخْطَفُهُ الطَّيْرُ سے مراد لوگوں کے ہاتھوں مارا جانا اور تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ سے طبعی موت مرنا مراد ہو، اکثر مفسرین نے وجہ تشبیہ کے بیان میں اسی طرح کے احتمالات ذکر کیے ہیں، لیکن حضرت شاہ صاحب ؒ لکھتے ہیں کہ ''جس کی نیت ایک اللہ پر ہے وہ قائم ہے اور جہاں نیت بہت طرف گئی وہ سب اس کو (پریشان کر کے) راہ میں سے اچک لیں گی، یا سب سے منکر ہو کر دہری ہو جائے گا''۔

| |
|---|
| ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴿٣٢﴾ |
| یہ سن چکے، اور جو کوئی ادب رکھے اللہ کے نام لگی چیزوں کا، سو وہ دل کی پرہیزگاری کی بات ہے |

**خلاصہ تفسیر:** یہ بات بھی (جو بطور قاعدہ کلیہ کے تھی) ہو چکی، اور (اب قربانی کے جانوروں کے متعلق ایک ضروری بات اور سن لو کہ) جو شخص دین خداوندی کی ان (مذکورہ) یادگاروں کا پورا لحاظ رکھے گا تو اس کا یہ لحاظ رکھنا دل کے ساتھ خدا سے ڈرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

**وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ:** یادگاروں کا لحاظ رکھنے سے مراد احکام الٰہیہ کی پابندی ہے جو قربانی کے متعلق ہیں، خواہ ذبح سے پہلے کے احکام ہوں یا ذبح کے وقت ہوں، جیسا اس پر اللہ کا نام لینا، یا ذبح کے بعد ہوں جیسے اس کا کھانا یا نہ کھانا وغیرہ کہ جس کا کھانا جس کے لئے حلال ہے وہ کھائے جس کا کھانا جس کے لئے حلال نہیں وہ نہ کھائے، اور تعظیم کے ترجمہ میں جو ''پورا لحاظ رکھنا'' کہا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ نا تمام لحاظ تو بغیر خوف کے بھی ہوسکتا ہے۔

**شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ:** اس میں دو باتوں پر دلالت ہے: ① ایک یہ کہ تقویٰ کا اصل محل قلب ہے (پرہیزگاری اور تقویٰ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جس سے تمام اعضاء شریعت کے مطابق صحیح کام کرتے ہیں) ② دوسری بات یہ کہ شعائر اللہ (معالم دین) کی تعظیم میں انبیاء اور اولیاء کے آثار بھی داخل ہیں اور یہ جائز ہے بشرطیکہ شرعی حدود کے اندر ہو (ایسی جگہیں یا اشیاء جن کی نسبت انبیاء یا اولیاء کی طرف منسوب ہو شریعت میں رہتے ہوئے ان کی تعظیم کرنا مستحسن عمل ہے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی شعائر اللہ کی تعظیم شرک میں داخل نہیں، جس کے دل میں پرہیزگاری کا مضمون اور خدائے واحد کا ڈر ہوگا وہ اس کے نام لگی چیزوں کا ادب ضرور کرے گا، یہ ادب کرنا شرک نہیں بلکہ عین توحید کے آثار میں سے ہے کہ خدا کا عاشق ہر اس چیز کی قدر کرتا ہے جو بالخصوص اس کی

طرف منسوب ہو جائے۔

لَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴿٣٣﴾ ع ۴ ۸ ۱۱

تمہارے واسطے چوپایوں میں فائدے ہیں ایک مقرر وعدہ تک پھر ان کو پہنچنا اس قدیم گھر تک

**خلاصہ تفسیر:** (ان احکام میں کچھ تو پہلے بھی ذکر کئے جا چکے اور کچھ یہ ہیں کہ) تم کو ان سے ایک معین وقت تک فوائد حاصل کرنا جائز ہے (یعنی جب تک وہ قواعد شرعیہ کے مطابق ہدی نہ بنائے جائیں تو ان سے دودھ یا سواری بار برداری وغیرہ کا فائدہ اٹھانا جائز ہے، مگر جب ان کو بیت اللہ اور حج یا عمرہ کے لئے ہدی بنا دیا تو پھر ان سے کوئی نفع اٹھانا جائز نہیں) پھر (یعنی ہدی بننے کے بعد) اس کے ذبح حلال ہونے کا موقع بیت عتیق کے قریب ہے (مراد پورا حرم ہے یعنی حرم سے باہر ذبح نہ کریں)۔

''ہدی'' اس جانور کو کہتے ہیں جو حج یا عمرہ کرنے والا اپنے ساتھ کوئی جانور لے جائے کہ اسے حرم شریف میں ذبح کیا جائے گا، جب اس کو ہدی حرم کے لیے نامزد اور مقرر کر دیا تو پھر اس سے کسی قسم کا نفع اٹھانا بغیر کسی خاص مجبوری کے جائز نہیں۔

* * *

**فائدہ:** قدیم گھر بیت اللہ شریف ہے اور یہاں شاید توسعاً سارا حرم مراد ہو، یعنی اونٹ، گائے، بکری وغیرہ سے تم بہت فوائد حاصل کر سکتے ہو، مثلاً سواری کرو، دودھ پیو، نسل چلاؤ، اُون وغیرہ کو کام میں لاؤ، مگر یہ اس وقت کہ ان کو ہدی نہ بناؤ، ''ہدی'' بننے کے بعد اس قسم کا انتفاع (بدون شدید ترین ضرورت کے) نہیں کر سکتے، اب تو اس کا عظیم الشان اخروی فائدہ یہ ہی ہے کہ کعبہ کے پاس لے جا کر خدا تعالیٰ کے نام پر قربان کر دو۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۗ فَإِلَٰهُكُمْ

اور ہر امت کے واسطے ہم نے مقرر کر دی ہے قربانی کہ یاد کریں اللہ کے نام ذبح پر چوپایوں کے جو اُن کو (اللہ نے) دیے سو اللہ تمہارا

إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ ﴿٣٤﴾ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ

ایک اللہ ہے سو اسی کے حکم میں رہو ۱؎ اور بشارت سنا دے عاجزی کرنے والوں کو ۲؎ وہ کہ جب نام لیجیے اللہ کا ڈر جائیں ان کے دل

وَالصَّابِرِينَ عَلَىٰ مَا أَصَابَهُمْ وَالْمُقِيمِي الصَّلَاةِ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴿٣٥﴾

اور سہنے والے اس کو جو ان پر پڑے ۳؎ اور قائم رکھنے والے نماز کے اور ہمارا دیا ہوا کچھ خرچ کرتے رہتے ہیں ۴؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (پیچھے جو قربانی کا حرم میں ذبح کرنے کا حکم ہے اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اصل مقصود حرم کی تعظیم ہے، بلکہ اصل مقصود اللہ ہی کی تعظیم، ذبیحہ جانور اور ذبح کی جگہ یہ اس کے ذرائع ہیں، جگہ اور وقت وغیرہ کی تخصیص بعض حکمتوں کی وجہ سے ہے، اگر یہ مقصود اصلی ہوتیں تو کسی شریعت میں نہ بدلتیں، مگر ان کا ہر شریعت میں بدلتا رہنا ظاہر ہے، البتہ تقرب الی اللہ جو اصل مقصود تھا وہ سب شریعتوں میں محفوظ رہا، چنانچہ) ہم نے (جتنے اہل شرائع گزرے ہیں ان میں سے) ہر امت کے لئے قربانی کرنا اس غرض سے مقرر کیا تھا کہ وہ ان مخصوص چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو عطا فرمایا تھا (پس اصلی مقصود یہ نام لینا تھا) سو (اس سے یہ بات نکل آئی کہ) تمہارا معبود (حقیقی) ایک ہی خدا ہے (جس کا ذکر کر کے سب کو تقرب کا حکم ہوتا رہا) تو تم ہمہ تن اسی کے ہو کر رہو (یعنی موحد خالص رہو، کسی مکان وغیرہ کو قابل تعظیم سمجھنے سے ذرہ برابر شرک کا شائبہ اپنے عمل میں نہ ہونے دو) اور (اے محمد ﷺ جو لوگ ہماری اس تعلیم پر عمل کریں) آپ (ایسے احکام الٰہیہ کے سامنے) گردن جھکا دینے والوں کو (جنت وغیرہ کی) خوشخبری سنا

دیجئے جو (اس توحید خالص کی برکت سے) ایسے ہیں کہ جب (ان کے سامنے) اللہ (کے احکام وصفات اور وعدہ وعید) کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جوان مصیبتوں پر کہ ان پر پڑتی ہیں صبر کرتے ہیں، اور جو نماز کی پابندی کرتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے (حکم اور توفیق کے بقدر) خرچ کرتے ہیں (یعنی توحید خالص ایسی بابرکت چیز ہے کہ اس کی بدولت نفسانی، بدنی اور مالی کمالات حاصل ہو جاتے ہیں)۔

**وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا:** اس کی تفسیر ابن عرفہ نے "أي مذهب من طاعة" سے کی ہے، اس کے عموم میں تزکیہ واحسان کے مختلف طریقے بھی داخل ہیں، یعنی جس طرح سابقہ تمام امتوں کے مسالک مختلف ہونے کے باوجود مقصد ایک ہونے کی وجہ سے قربانی کا حکم دیا گیا اور وہ مقصد اللہ کا ذکر کرنا ہے ایسے ہی تزکیہ واحسان کا مقصد ایک ہونے کے باوجود مختلف طریقے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی اللہ کی نیاز کے طور پر مویشی قربان کرنا ہر دین سماوی میں عبادت قرار دی گئی ہے، اگر یہ عبادت غیر اللہ کی نیاز کے طور پر کرو گے تو شرک ہو جائے گا جس سے بہت پرہیز کرنا چاہیے، موحد کا کام یہ ہے کہ قربانی اکیلے اسی خدا کے لیے کرے جس کے نام پر قربان کرنے کا تمام شرائع میں حکم رہا ہے، اس کے حکم سے باہر نہ ہو۔

**فائدہ:** ۲ یعنی ان لوگوں کو رضائے الٰہی کی بشارت سنا دیجئے جو صرف اسی ایک خدا کا حکم مانتے ہیں اسی کے سامنے جھکتے ہیں اسی پر ان کا دل جمتا ہے اور اسی کے جلال وجبروت سے ڈرتے رہتے ہیں۔

**فائدہ:** ۳ یعنی مصائب وشدائد کو صبر واستقلال سے برداشت کریں، کوئی سختی اٹھا کر راہ حق سے قدم نہ ڈگمگائے۔

**فائدہ:** ۴ بیت اللہ تک پہنچنے میں بہت مصائب وشدائد پیش آتے ہیں، سفر میں اکثر نمازوں کے فوت ہونے یا قضا ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، مال بھی خرچ کرنا پڑتا ہے، شاید اسی مناسبت سے ان اوصاف وخصال کا یہاں ذکر فرمایا۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ

اور کعبہ کے چڑھانے کے اونٹ ٹھہرائے ہیں ہم نے تمہارے واسطے نشانی اللہ کے نام کی تمہارے واسطے اس میں بھلائی ہے

فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ

سو پڑھو ان پر نام اللہ کا قطار باندھ کر، پھر جب گر پڑے ان کی کروٹ تو کھاؤ اس میں سے ۱ اور کھلاؤ صبر سے بیٹھے کو

وَالْمُعْتَرَّ ۚ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٣٦﴾

اور بے قراری کرتے کو ۲ اسی طرح تمہارے بس میں کر دیا ہم نے ان جانوروں کو تا کہ تم احسان مانو ۳

**خلاصہ تفسیر:** اور (اسی طرح پیچھے جو قربانی کے جانوروں سے بعض منافع حاصل کرنے کی ممانعت معلوم ہوئی ہے اس سے ان قربانیوں کی تعظیم کا شبہ نہ کیا جائے، کیونکہ اس سے بھی اللہ تعالیٰ کی اور اس کے دین کی تعظیم اصل مقصود ہے اور یہ خاص قیود اس کا ایک طریقہ ہے، پس) قربانی کے اونٹ اور گائے کو (اور اسی طرح بکری بھیڑ کو بھی) ہم نے اللہ (کے دین) کی یادگار بنایا ہے (کہ اس کے متعلق احکام جاننے اور ان پر عمل کرنے سے اللہ کی عظمت اور دین کی وقعت ظاہر ہوتی ہے کہ اس کے نام کی چیز سے فائدہ اٹھانے میں مالک مجازی کی رائے کی رائے کا اعتبار نہیں رہتا جس سے اس کی پوری عبدیت اور مالک حقیقی کی معبودیت ظاہر ہوتی ہے اور اس دینی حکمت کے علاوہ) ان جانوروں میں تمہارے (اور بھی) فائدے ہیں (مثلاً دنیوی فائدہ کھانا اور کھلانا اور اخروی فائدہ ثواب ہے) سو (جب اس میں یہ حکمتیں ہیں تو) تم ان پر کھڑے کر کے (ذبح کرنے کے وقت)

اللہ کا نام لیا کرو (یہ صرف اونٹوں کے اعتبار سے فرمایا کہ انہیں ذبح اور روح کے نکلنے میں آسانی کی وجہ سے کھڑا کر کے ذبح کرنا بہتر ہے، پس اس سے تو اخروی فائدہ یعنی ثواب حاصل ہوا، نیز اللہ کی عظمت ظاہر ہوئی کہ اس کے نام پر ایک جان قربان ہوئی جس سے اس کا خالق اور اس کا مخلوق ہونا ظاہر کر دیا گیا) پس جب وہ (کسی) کروٹ کے بل گر پڑیں (اور ٹھنڈے ہو جائیں) تو تم خود بھی کھاؤ اور بے سوال اور سوالی (محتاج) کو (جو کہ بائس فقیر کی دو قسمیں ہیں) بھی کھانے کو دو (کہ یہ دنیاوی فائدہ بھی ہے اور) ہم نے ان جانوروں کو اس طرح تمہارے زیر حکم کر دیا (کہ تمہاری کمزوری اور ان کی قوت کے باوجود تم اس طرح اس کے ذبح پر قادر ہو گئے) تا کہ تم (اس تسخیر پر اللہ تعالیٰ کا) شکر کرو (کہ ان جانوروں کو تمہارے تابع کر دیا، یہ حکمت مطلق ذبح میں ہے، خواہ وہ قربانی ہو یا نہ ہو)۔

**فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ:** صواف بمعنے مصفوفہ ہے یعنی صف بستہ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس کی تفسیر یہ بیان فرمائی ہے کہ جانور تین پاؤں پر کھڑا ہوا اور ایک بندھا ہوا ہو، یہ صورت اونٹ کے ساتھ مخصوص ہے، اس کی قربانی کھڑے ہونے کی حالت میں سنت اور بہتر ہے، اور اگر ایسا نہ کیا جائے تب بھی درست ہے، باقی جانوروں کو لٹا کر ذبح کرنا سنت ہے۔

**وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ:** پچھلی آیت میں جن لوگوں کو قربانی کا گوشت دینا چاہئے ان کو ''بائس فقیر'' کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے جس کے معنے ہیں مصیبت زدہ محتاج، اس آیت میں اس کی جگہ قانع اور معتر کے دو لفظوں میں اس کی تفسیر و توضیح کی گئی ہے، ''قانع'' سے مراد وہ محتاج فقیر ہے جو لوگوں سے سوال نہیں کرتا، اپنی غربت و فقر کے باوجود اپنی جگہ بیٹھ کر جو مل جائے اس پر قناعت کرتا ہے، اور ''معتر'' جو ایسے مواقع پر جائے جہاں سے کچھ ملنے کی امید ہو خواہ زبان سے سوال کرے یا نہ کرے۔

* * *

**فائدہ:** لہ پہلے مطلق شعائر اللہ کی تعظیم کا حکم تھا، اب تصریحاً بتلا دیا کہ اونٹ وغیرہ قربانی کے جانور بھی شعائر اللہ میں سے ہیں، جن کی ذوات میں اور جن کو ادب کے ساتھ قربانی کرنے میں تمہارے لیے بہت سی دنیاوی و اخروی بھلائیاں ہیں تو عام ضابطہ کے موافق چاہیے کہ اللہ کا نام پاک لے کر ان کو ذبح کرو، بالخصوص اونٹ کے ذبح کا بہترین طریقہ نحر ہے کہ اس کو قبلہ رخ کھڑا کر کے اور ایک ہاتھ داہنا یا بایاں باندھ کر سینہ پر زخم لگائیں جب سارا خون نکل چکا وہ گر پڑا تب ٹکڑے کر کے استعمال کریں اور بہت اونٹ ہوں تو قطار باندھ کر کھڑا کر لیں۔

**فائدہ:** ۲ یہ محتاج کی دو قسمیں بتلائیں: ① ایک جو صبر سے بیٹھا ہے، سوال نہیں کرتا، تھوڑا مل جائے تو اسی پر قناعت کرتا ہے۔
② دوسرا جو بے قرار ہو کر سوال کرتا پھرتا ہے کچھ مل جائے تب بھی قرار نہیں۔

**فائدہ:** ۳ یعنی ایسے بڑے بڑے جانور جو تم سے جثہ میں اور قوت میں کہیں زیادہ ہیں، تمہارے قبضہ میں کر دیے کہ تم ان سے طرح طرح کی خدمات لیتے ہو اور کیسی آسانی سے ذبح کر لیتے ہو، یہ خدا تعالیٰ کا بڑا احسان ہے جس کا شکر ادا کرنا چاہیے نہ یہ کہ شرک کر کے الٹی ناشکری کرو۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ۭ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ

اللہ کو نہیں پہنچتا ان کا گوشت اور نہ ان کا لہو لیکن اس کو پہنچتا ہے تمہارے دل کا ادب لہ اسی طرح ان کو بس میں کر دیا تمہارے

لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ۭ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۷﴾

کہ اللہ کی بڑائی پڑھو اس بات پر کہ تم کو راہ سجھائی، اور بشارت سنا دے نیکی والوں کو ۲

**خلاصہ تفسیر:** (اب ایک عقلی قاعدہ سے یہ بات بیان کرتے ہیں کہ ذبح کی یہ خاص قید خود مقصود نہیں، دیکھو ظاہر بات ہے کہ) اللہ تعالیٰ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون (اور جو چیز خود مقصود ہو اس کا مقبول ہونا اور خدا تعالیٰ تک پہنچنا لازم تھا، جب یہ چیزیں خدا

تک نہیں پہنچتیں تو یہ اصل مقصود بھی نہیں ) ولیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ ( کہ تقرب کی نیت کرنا اور اخلاص اس کے شعبوں میں سے ہے، البتہ ) پہنچتا ہے ( پس تعظیم الٰہی کا مقصود ہونا ثابت ہو گیا، اور جیسے پیچھے جانوروں کی عام تسخیر کی حکمت مذکور تھی آگے خاص قربانی کے لیے ان کو مسخر کرنے کی حکمت بیان فرماتے ہیں کہ ) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کو تمہارا زیر حکم کر دیا کہ تم ( اللہ کی راہ میں ان کو قربان کر کے ) اس بات پر اللہ کی بڑائی ( بیان ) کرو کہ اس نے تم کو ( اس طرح قربانی کرنے کی ) توفیق دی ( ورنہ اگر توفیق الٰہی رہبر نہ ہوتی تو یا تو ذبح ہی میں شبہات نکال کر اس عبادت سے محروم رہتے، یا غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنے لگتے ) اور ( اے محمد ﷺ! ) اخلاص والوں کو خوش خبری سنا دیجئے ( اس سے پہلے خوشخبری اخلاص کے شعبوں پر تھی یہ خاص اخلاص پر ہے )۔

* * *

**فائدہ:** ۱ اس میں قربانی کا اصل فلسفہ بیان فرمایا، یعنی جانور کو ذبح کر کے محض گوشت کھانے کھلانے یا اس کا خون گرانے سے تم اللہ کی رضا کبھی حاصل نہیں کر سکتے، نہ گوشت اور خون اٹھ کر اس کی بارگاہ تک پہنچتا ہے، اس کے یہاں تو تمہارے دل کا تقویٰ اور ادب پہنچتا ہے کہ کیسی خوش دلی اور جوشِ محبت کے ساتھ ایک قیمتی اور نفیس چیز اس کی اجازت سے اس کے نام پر اس کے بیت کے پاس لے جا کر قربان کی، گویا اس قربانی کے ذریعہ سے ظاہر کر دیا کہ ہم خود بھی تیری راہ میں اسی طرح قربان ہونے کے لیے تیار ہیں، بس یہ ہی وہ تقویٰ ہے جس کا ذکر وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ میں کہا گیا تھا اور جس کی بدولت خدا کا عاشق اپنے محبوب حقیقی کی خوشنودی حاصل کر سکتا ہے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُمَّ لَكَ وَمِنْكَ کہہ کر ذبح کرو اور اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے اپنی محبت و عبودیت کے اظہار کی کیسی اچھی راہ سجھا دی، اور ایک جانور کی قربانی کو گویا خود تمہاری جان قربان کرنے کے قائم مقام بنا دیا۔

| |
|---|
| اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ﴿۳۸﴾ ع |
| اللہ دشمنوں کو ہٹا دے گا ایمان والوں سے ۱ اللہ کو خوش نہیں آتا کوئی دغاباز ناشکر ۲ |

**خلاصہ تفسیر:** سابقہ آیات میں ذکر تھا کہ مشرکین نے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کو حرم شریف اور مسجد حرام میں جانے اور عمرہ ادا کرنے سے روک دیا تھا، مسلمانوں کو خیال ہو سکتا تھا کہ ہمیں موجودہ حالت میں ان احکام پر کہاں عمل نصیب ہوگا، وہاں تک رسائی تو ہے ہی نہیں، اس لیے اب اس آیت میں مسلمانوں کو بطور پیشین گوئی اس وعدہ کے ساتھ تسلی دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ عنقریب ان مشرکین کی اس قوت کو توڑ دے گا جس کے ذریعہ وہ مسلمانوں پر ظلم کرتے ہیں یہ واقعہ ۶ ہجری میں پیش آیا تھا، اس کے بعد سے مسلسل کفار مشرکین کی طاقت کمزور اور ہمت پست ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ ۸ ھ میں مکہ مکرمہ فتح ہو گیا، آگے آیات میں اس کی تفصیل آ رہی ہے۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ ( ان مشرکین کے غلبہ اور ایذا رسانی کی قدرت کو ) ایمان والوں سے ( عنقریب ) ہٹا دے گا ( کہ پھر حج وغیرہ سے روک ہی نہ سکیں گے ) بیشک اللہ تعالیٰ کسی دغاباز کفر کرنے والے کو نہیں چاہتا ( بلکہ ایسے لوگوں سے ناراض ہے، اس لئے انجام کار ان لوگوں کو مغلوب اور مخلص مسلمانوں کو غالب کر دے گا، اس نصرت کا طریقہ اگلی آیت میں مذکور ہے )۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اس میں حق تعالیٰ کی عادت کا بیان ہے کہ وہ اپنے مقبول بندوں کے لیے انتقام لیتے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الخ میں ان کفار کا ذکر تھا جو مسلمانوں کو حرم شریف کی زیارت اور حج و عمرہ وغیرہ سے روکتے تھے درمیان میں مسجد حرام اور اس کے متعلقات کی تعظیم و ادب کے احکام بیان فرمائے، اب پھر مضمون سابق کی طرف عود کیا گیا ہے، یعنی مسلمان مطمئن رہیں اللہ تعالیٰ عنقریب دشمنوں سے ان کا راستہ صاف کر دے گا، مسجد حرام تک پہنچنے اور اس کے متعلق احکام کی

تعمیل کرنے میں کوئی مخالفانہ رکاوٹ باقی نہ رہے گی، بے خوف وخطر حج وعمرہ ادا کریں گے، گویا وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ میں جو بشارت دینے کا امر تھا اس کا ایک فرد یہ خوشخبری ہوئی۔

**فائدہ: ۲** یعنی دغاباز ناشکر گذاروں کو اگر ایک خاص میعاد تک مہلت دی جائے تو یہ مت خیال کرو کہ وہ اللہ تعالیٰ کو خوش آتے ہیں، یہ مہلت بعض مصالح اور حکمتوں کی بناء پر ہے، آخری انجام یہی ہوتا ہے کہ اہل حق غالب ہوں اور باطل پرستوں کو راستہ سے چھانٹ دیا جائے۔

أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ ﴿۳۹﴾

حکم ہوا ان لوگوں کو جن سے کافر لڑتے ہیں اس واسطے کہ ان پر ظلم ہوا ۱ اور اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے ۲

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے مؤمنین سے نصرت کا وعدہ تھا، اب اس کے طریقہ کا بیان ہے، وہ یہ کہ جہاد کی اجازت مل چکی ہے جس پر نصرت کا وعدہ کیا گیا ہے، اگر چہ یہ آیت واقعہ حدیبیہ سے پہلے نازل ہو چکی تھی، کیونکہ یہ آیت جہاد کی آیتوں میں سب سے پہلی ہے، اور واقعہ حدیبیہ چند غزوات کے بعد ہوا ہے، لیکن تلاوت کی ترتیب خدا تعالیٰ کی بتلائی ہوئی ہے اور اس میں یہ آیت اسی جگہ ہے، اس لیے تقریر یہ ہوگی کہ اس نصرت کا طریقہ یہ ہے کہ جہاد کی اجازت ہو ہی چکی ہے جس پر مدد کا وعدہ ہے، پس جب مکہ والوں کا وقت آئے گا اسی جہاد سے ان پر غالب آجاؤ گے، اور اس وقت اس خاص نصرت کا بھی ظہور ہو جائے گا۔

(اگر چہ اب تک چند مصالح کی وجہ سے کفار سے لڑنے کی ممانعت تھی لیکن اب) لڑنے کی ان لوگوں کو اجازت دے دی گئی جن سے (کافروں کی طرف سے) لڑائی کی جاتی ہے اس وجہ سے کہ ان پر (بہت) ظلم کیا گیا ہے (یہ علت ہے جہاد کے مشروع ہونے کی) اور (اس اجازت کی صورت میں مسلمانوں کی قلت اور کفار کی کثرت پر نظر نہیں کرنی چاہئے، کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کے غالب کر دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔

**بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا:** اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب کفار کا ظلم کرنا جہاد کے جائز ہونے کی علت ہے تو جو کفار ظالم نہ ہوں مگر اسلام کے زیر فرمان بھی نہ ہوں تو ان سے جہاد جائز نہ ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ اس ایک علت میں منحصر ہونے کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ یکون الدین للہ سے جہاد کی دوسری علت یہ بھی معلوم ہوئی کہ کوئی کافر زیر فرمان اسلام نہ ہو تو اس وقت بھی جہاد کرنا چاہیے اور اس میں یہ راز ہے کہ ایسی صورت میں پھر کسی وقت اہل حق پر ظلم کی نوبت پہنچے گی، پس جیسے بالفعل مظلوم ہونا جہاد کی علت ہے اسی طرح آئندہ مظلومیت کا اندیشہ بھی جہاد کی علت ہے۔

* * *

**فائدہ: ۱** جب تک آنحضرت ﷺ مکہ میں تھے حکم تھا کہ کفار کی سختیوں پر مسلمان صبر کریں اور ہاتھ روکے رکھیں، چنانچہ انہوں نے کامل تیرہ سال تک سخت زہرہ گداز مظالم کے مقابلہ میں بے مثال صبر واستقامت کا مظاہرہ کیا، جب مدینہ ''دارالاسلام'' بن گیا اور مسلمانوں کی قلیل سی جمعیت ایک مستقل مرکز پر جمع ہو گئی تو مظلوم مسلمانوں کو جن سے کفار برابر لڑتے رہتے تھے اجازت ہوئی بلکہ حکم ہوا کہ ظالموں کے مقابلہ پر تلوار اٹھائیں اور اپنی جماعت اور مذہب کی حفاظت کریں، اسی قسم کی کئی آیتیں اسی زمانہ میں نازل ہوئی ہیں۔

**فائدہ: ۲** یعنی اپنی قلت اور بے سروسامانی سے نہ گھبرائیں، اللہ تعالیٰ مٹھی بھر فاقہ مستوں کو دنیا کی فوجوں اور سلطنتوں پر غالب کر سکتا ہے، فی الحقیقت یہ ایک شہنشاہانہ طرز میں مسلمانوں کی نصرت وامداد کا وعدہ تھا، جیسے دنیا میں بادشاہ اور بڑے لوگ وعدہ کے موقع پر اپنی شان وقار واستغناء دکھلانے کے لیے کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہاں تمہارا افلاس کام ہم کر سکتے ہیں، شاید یہ عنوان اس لیے اختیار کیا جاتا ہے کہ مخاطب سمجھ لے کہ ہم ایسا کرنے میں کسی سے مجبور نہیں ہیں جو کچھ کریں گے اپنی قدرت واختیار سے کریں گے۔

الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ

وہ لوگ جن کو نکالا ان کے گھروں سے اور دعویٰ کچھ نہیں سوائے اس کے کہ وہ کہتے ہیں ہمارا رب اللہ ہے ۱ اور اگر نہ ہٹایا کرتا اللہ لوگوں کو

بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ

ایک کو دوسرے سے تو ڈھائے جاتے تکیے اور مدرسے اور عبادت خانے اور مسجدیں جن میں نام پڑھا جاتا ہے اللہ کا بہت

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝۴۰

اور اللہ مقرر مدد کرے گا اس کی جو مدد کرے گا اس کی، بیشک اللہ زبردست ہے زور والا ؁

**خلاصہ تفسیر:** (اب ان کی مظلومیت کا بیان ہے کہ) جو (بیچارے) اپنے گھروں سے بے وجہ نکالے گئے محض اتنی بات پر کہ یوں کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے (یعنی کفار کا یہ تمام تر غیظ وغضب عقیدہ توحید پر تھا کہ اس کی وجہ سے مسلمانوں کو اس قدر پریشان کیا کہ وطن چھوڑنا پڑا، آگے جہاد کی حکمت ہے) اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ (ہمیشہ سے) لوگوں کا ایک دوسرے (کے ہاتھ) سے زور نہ گھٹواتا رہتا (یعنی اہل حق کو اہل باطل پر وقتاً فوقتاً غالب نہ کرتا رہتا) تو (اپنے اپنے زمانوں میں) نصاریٰ کے خلوت خانے اور عبادت خانے اور یہود کے عبادت خانے اور (مسلمانوں کی) وہ مسجدیں جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے سب منہدم (اور ختم) ہو گئے ہوتے (آگے جہاد میں اخلاص پر غلبہ کی بشارت ہے) اور بیشک اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا جو کہ اللہ (کے دین) کی مدد کرے گا (یعنی اس کے لڑنے میں خالص اعلاء کلمۃ اللہ کی نیت ہو) بیشک اللہ تعالیٰ قوت والا (اور) غلبہ والا ہے (وہ جس کو چاہے قوت وغلبہ دے سکتا ہے)۔

**وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ:** جہاد کی اس حکمت پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھار اہل حق بھی تو مغلوب ہو جاتے ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ اتنا غلبہ جس میں حق بالکل مٹ نہ جائے مقصود بالحکمت ہے سو یہ حاصل رہا ہے۔

**لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ:** اس کے خلاصہ تفسیر میں ''اپنے اپنے زمانوں'' کی قید بڑھانے سے ایک شبہ دور کر دیا، شبہ یہ ہوتا ہے کہ اس آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب عبادت گاہیں اب بھی حق تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہیں؟ جواب یہ ہے کہ جتنے دین و مذہب دنیا میں ایسے ہوئے ہیں کہ کسی زمانے میں ان کی اصل بنیاد اللہ کی طرف سے اور وحی کے ذریعہ سے قائم ہوئی تھی پھر وہ منسوخ ہو گئے اور ان میں تحریف ہو کر کفر وشرک میں تبدیل ہو گئے مگر اپنے اپنے وقت میں وہی حق تھے ان سب کی عبادت گاہوں کا اس آیت میں ذکر فرمایا ہے، کیونکہ اپنے اپنے وقت میں ان کی عبادت گاہوں کا احترام اور حفاظت فرض تھی، چنانچہ ان مذاہب کے عبادت خانوں کا یہاں ذکر ہی نہیں فرمایا جن کی بنیاد کسی وقت بھی نبوت اور وحی الٰہی پر نہیں تھی، جیسے آتش پرست مجوس یا بت پرست ہندو، کیونکہ ان کے عبادت خانے کسی وقت بھی قابل احترام نہ تھے۔

**صَوَامِعُ وَبِيَعٌ:** نصاریٰ کے دو عبادت خانوں کا ذکر کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں رہبانیت کی رسم بھی جاری تھی، پس ان کا خاص خلوت کا عبادت خانہ ''صومعہ'' ہے اور عام عبادت خانہ جس کو گرجا گھر کہتے ہیں ''بیعہ'' ہے۔

**وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ:** اس پر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ بعض اوقات حق کے مددگار بھی تو مغلوب ہو جاتے ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ آزمائش اور الٹ پلٹ کے بعد بشرط ثابت قدمی انجام کار حق کے مددگاروں کو ہی غلبہ حاصل ہوتا ہے، جیسا کہ صحیح حدیث میں بھی ہے جس میں ہرقل کی حکایت مذکور ہے اور اگلی آیت کے آخر: وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ میں بھی اسی طرف لطیف اشارہ ہے، ہر کام میں انجام ہی کا اعتبار ہوتا ہے، جیسے علاج کے دوران مریض کی مختلف حالتیں ہوتی ہیں، مگر انجام اگر صحت ہے تو علاج کو نافع کہیں گے۔

* * *

**فائدہ:** ؁ یعنی مسلمان مہاجرین جو اپنے گھروں سے نکالے گئے ان کا کوئی جرم نہ تھا نہ ان پر کسی کا کوئی دعویٰ تھا، بجز اس کے کہ وہ اکیلے ایک خدا کو اپنا رب کیوں کہتے ہیں، اینٹ پتھروں کو کیوں نہیں پوجتے، گویا ان پر سب سے بڑا اور سنگین الزام اگر لگایا جا سکتا ہے تو یہی کہ ہر طرف سے

ٹوٹ کر ایک خدا کے کیوں ہو رہے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی اگر کسی وقت اور کسی حالت میں بھی ایک جماعت کو دوسری سے لڑنے بھڑنے کی اجازت نہ ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ فطرت کی سخت خلاف ورزی ہوگی، اس نے دنیا کا نظام ہی ایسا رکھا ہے کہ ہر چیز یا ہر شخص یا ہر جماعت دوسری چیز یا شخص یا ہر جماعت کے مقابلہ میں اپنی ہستی برقرار رکھنے کے لیے جنگ کرتی رہے، اگر ایسا نہ ہوتا اور نیکی کو اللہ تعالیٰ اپنی حمایت میں لے کر بدی کے مقابلہ میں کھڑا نہ کرتا تو نیکی کا نشان زمین پر باقی نہ رہتا، بددین اور شریر لوگ جن کی ہر زمانہ میں کثرت رہی ہے تمام مقدس مقامات اور یادگاریں ہمیشہ کے لیے صفحہ ہستی سے مٹا دیتے، کوئی عبادت گاہ، تکیہ، خانقاہ، مسجد، مدرسہ محفوظ نہ رہ سکتا، بناءعلیہ ضروری ہوا کہ بدی کی طاقتیں خواہ کتنی ہی مجتمع ہو جائیں قدرت کی طرف سے ایک وقت آئے جب نیکی کے مقدس ہاتھوں سے بدی کے حملوں کی مدافعت کرائی جائے اور حق تعالیٰ اپنے دین کی مدد کرنے والوں کی خود مدد فرما کر ان کو دشمنان حق وصداقت پر غالب کرے، بلاشبہ وہ ایسا قوی اور زبردست ہے کہ اس کی اعانت و امداد کے بعد ضعیف سے ضعیف چیز بڑی بڑی طاقتور ہستیوں کو شکست دے سکتی ہے، بہرحال اس وقت مسلمانوں کو ظالم کافروں کے مقابلہ میں جہاد وقتال کی اجازت دینا اسی قانونِ قدرت کے ماتحت تھا اور یہ وہ عام قانون ہے جس کا انکار کوئی عقلمند نہیں کر سکتا، اگر مدافعت وحفاظت کا یہ قانون نہ ہوتا تو اپنے اپنے زمانہ میں نہ عیسائی راہبوں کے صومعے (کوٹھڑے) قائم رہتے نہ نصاریٰ کے گرجے، نہ یہود کے عبادت خانے نہ مسلمانوں کی وہ مسجدیں جن میں اللہ کا ذکر بڑی کثرت سے ہوتا ہے، یہ سب عبادت گاہیں گرا کر اور ڈھا کر برابر کر دی جاتیں، پس اس عام قانون کے ماتحت کوئی وجہ نہیں کہ مسلمانوں کو ایک وقت مناسب پر اپنے دشمنوں سے لڑنے کی اجازت نہ دی جائے۔

| |
|---|
| اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ |
| وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو قدرت دیں ملک میں تو وہ قائم رکھیں نماز اور دیں زکوۃ اور حکم کریں بھلے کام کا |
| وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾ |
| اور منع کریں برائی سے ۱ اور اللہ کے اختیار میں ہے آخر ہر کام ۲ |

**خلاصہ تفسیر:** (آگے ان کی فضیلت ہے) یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دیدیں تو یہ لوگ خود بھی نماز کی پابندی کریں اور زکوۃ دیں اور (دوسروں کو بھی) نیک کاموں کے کرنے کو کہیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام تو خدا ہی کے اختیار میں ہے (پس مسلمانوں کی موجودہ حالت دیکھ کر یہ کوئی کیونکر کہہ سکتا ہے کہ ان کا انجام بھی یہی رہے گا، بلکہ ممکن ہے کہ اس کا عکس ہو جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا)۔

اس آیت سے صحابہ کرام کی فضیلت اور خلفائے راشدین کی حقانیت ثابت ہوتی ہے، کیونکہ ان حضرات کا دنیا میں صاحب حکومت ہونا متواتر اخبار سے معلوم ہے، اور حکومت کی صورت میں ان کا نماز وزکوۃ کی پابندی کرنا اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنا خود اس نص قطعی سے ثابت ہے، پس ان حضرات کا کامل ومکمل ہونا ثابت ہو گیا۔

**اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ:** روح المعانی میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے اہل تمکین کے حال کی طرف کہ وہ خود ہدایت یافتہ ہوتے ہیں اور دوسروں کے لیے بھی ہدایت کا سبب بنتے ہیں، ان کے ہاں شطحیات نہیں ہوتیں، اور نہ ان کے اقوال واعمال سے کوئی گمراہ ہوتا ہے (شطحیات ایسے کلام کو کہا جاتا ہے جو غلبہ حال میں بے قصد وارادہ زبان سے نکل جائے اور بظاہر شریعت کے خلاف معلوم ہوتا ہو، ایسے کلام کی نقل وتبلیغ جائز نہیں)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یہ ان ہی مسلمانوں کا بیان ہے جن پر ظلم ہوئے اور جن کو گھروں سے نکالا گیا، یعنی خدا ان کی مدد کیوں نہ کرے گا جب کہ وہ ایسی قوم ہے کہ اگر ہم اسے زمین کی سلطنت دے دیں تب بھی خدا سے غافل نہ ہوں، بذات خود بدنی ومالی نیکیوں میں لگے رہیں اور دوسروں کو بھی اسی راہ پر

ڈالنے کی کوشش کریں، چنانچہ حق تعالیٰ نے ان کو زمین کی حکومت عطاء کی اور جو پیشین گوئی کی تھی حرف بحرف سچی ہوئی۔ فللّٰہ الحمد علیٰ ذالك۔ اس آیت سے صحابہ رضی اللہ عنہم خصوصاً مہاجرین اور ان میں اخص خصوص کے طور پر حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی حقانیت اور مقبولیت و منقبت ثابت ہوئی۔

**فائدہ: ۲** یعنی گو آج مسلمان کمزور اور کافر غالب وقوی نظر آتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے کہ آخر کار انھیں منصور و غالب کر دے، یا یہ مطلب کہ یہ امت خدا کا دین قائم کرے گی ایک مدت تک، آخر اللہ ہی جانے کیا ہوگا۔

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ ﴿۴۲﴾ وَقَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ﴿۴۳﴾

اور اگر تجھ کو جھٹلائیں تو ان سے پہلے جھٹلا چکی ہے نوح کی قوم اور عاد اور ثمود، اور ابراہیم کی قوم اور لوط کی قوم

وَّاَصْحٰبُ مَدْيَنَ ۚ وَكُذِّبَ مُوْسٰى فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۴﴾

اور مدین کے لوگ ۱ اور موسیٰ کو جھٹلایا ۲ پھر میں نے ڈھیل دی منکروں کو پھر پکڑ لیا ان کو تو کیسا ہوا میرا انکار ۳

**خلاصہ تفسیر:** گزشتہ آیات میں کفار کے جدال وقتال اور ان کی ایذاء رسانی کی بناء پر مسلمانوں کو قتال کی اجازت دی گئی، چونکہ اس بحث وجدال سے کفار کا مقصود آپ ﷺ کی تکذیب تھی جو آپ ﷺ کے لیے غم کا سبب تھا، اس لیے اب آپ ﷺ کی تسلی فرماتے ہیں، چونکہ پیچھے کفار کو عذاب کی وعید دی گئی تھی اور عذاب کے جلدی نہ آنے سے وہ اپنے حق پر ہونے اور نعوذ باللہ حضور ﷺ کے ناحق پر ہونے کی دلیل پکڑتے تھے اس لیے تسلی کے بعد ان شبہات کا بھی جواب ہے۔

اور یہ (بحث وجھگڑا کرنے والے لوگ) اگر (نبوت کے بارہ میں) آپ کی تکذیب کرتے ہوں تو (آپ مغموم نہ ہوں، کیونکہ) ان لوگوں سے پہلے قوم نوح اور عاد وثمود اور قوم ابراہیم اور قوم لوط اور اہل مدین بھی (اپنے اپنے انبیاء علیہم السلام کی) تکذیب کر چکے ہیں اور موسیٰ (علیہ السلام) کو بھی کاذب قرار دیا گیا، سو (تکذیب کے بعد) میں نے ان کافروں کو (چندروز) مہلت دی (جیسے آج کے منکروں کو مہلت دے رکھی ہے) پھر میں نے ان کو (عذاب میں) پکڑ لیا تو (دیکھو) میرا عذاب کیسا ہوا۔

* * *

**فائدہ: ۱** جن کی طرف حضرت شعیب علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔

**فائدہ: ۲** یعنی مصر کے قبطیوں نے۔

**فائدہ: ۳** یعنی مسلمانوں کے غلبہ ونصرت کے جو وعدے کیے جا رہے ہیں، کفار اپنی موجودہ کثرت وقوت کو دیکھتے ہوئے ان کی تکذیب نہ کریں، یہ خدا کی ڈھیل ہے، پہلی قوموں نے بھی خدا کی چندروزہ ڈھیل سے دھوکہ کھا کر اپنے پیغمبروں کو جھٹلایا تھا، آخر جب پکڑے گئے تو دیکھ لو ان کا حشر کیسا ہوا، اور خدا نے اپنے عذاب سے ڈرا کر ان کی شرارتوں پر جو انکار فرمایا تھا وہ کس طرح سامنے آ گیا، اگلی آیت میں اسی کی تفصیل ہے:

فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴿۴۵﴾

سو کتنی بستیاں ہم نے غارت کر ڈالیں اور وہ گناہ گار تھیں اب وہ گری پڑی ہیں اپنی چھتوں پر ۱ اور کتنے کنوئیں نکمے پڑے اور کتنے محل گچکاری کے ۲

**خلاصہ تفسیر:** غرض کتنی بستیاں ہیں جن کو ہم نے (عذاب سے) ہلاک کیا جن کی یہ حالت تھی کہ وہ نافرمانی کرتی تھیں سو (اب ان کی یہ کیفیت ہے کہ) وہ اپنی چھتوں پر گری پڑی ہیں (یعنی ویران ہیں، کیونکہ عادۃً اول چھت گرتی ہے، پھر اس پر دیواریں آ پڑتی ہیں) اور (اس

طرح ان بستیوں میں ) بہت سے بیکار کنویں ( جو پہلے آباد تھے ) بہت سے پختہ قلعی چونے کے محل ( جو اَب شکستہ ہوگئے، یہ سب ان بستیوں کے ساتھ تباہ ہوئے، پس اسی طرح مقررہ وقت پر اس زمانے کے لوگ بھی عذاب میں پکڑے جائیں گے )۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی بنیادیں ہلنے سے اول چھتیں گر پڑیں پھر دیواریں اور سارا مکان گر کر چھت کے ڈھیر پر آ رہا۔ یہ ان کے تہ و بالا ہونے کا نقشہ کھینچا ہے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی کنویں جن پر پانی کھینچنے والوں کی بھیڑ رہتی تھی۔ آج ان میں کوئی ڈول پھانسنے والا نہ رہا۔ اور بڑے بڑے پختہ، بلند عالیشان، قلعی چونے کے محل ویران کھنڈر بن کر رہ گئے۔ جن میں کوئی بسنے والا نہیں۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ

کیا سیر نہیں کی ملک کی جو ان کے دل ہوتے جن سے سمجھتے یا کان ہوتے جن سے سنتے ۱

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ۝٤٦

سو کچھ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں پر اندھے ہو جاتے ہیں دل جو سینوں میں ہیں ۲

**خلاصہ تفسیر:** تو کیا یہ ( سن کر ) لوگ ملک میں چلے پھرے نہیں جس سے ان کے دل ایسے ہو جائیں کہ ان سے سمجھنے لگیں یا ان کے کان ایسے ہو جائیں کہ ان سے سننے لگیں، بات یہ ہے کہ ( نہ سمجھنے والوں کی کچھ ) آنکھیں اندھی نہیں ہو جایا کرتیں، بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں ( ان موجودہ منکرین کے بھی دل اندھے ہوگئے ورنہ پچھلی امتوں کے حالات سے سبق سیکھ لیتے کہ کفر ناپسندیدہ ہے )۔

**وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ:** اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح آدمی سر کی آنکھوں سے ظاہری نفع ونقصان کو دیکھتا ہے اور پھر اس کے مطابق کوشش کرتا ہے اسی طرح دل کی آنکھوں سے گذشتہ امتوں کے واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ سوچے کہ کس راستہ میں نجات ہے اور کس میں ہلاکت، کفر اور برے کاموں میں ہلاکت اسی کو نظر آئے گی جس کی دل کی آنکھیں زندہ ہوں گی۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی ان تباہ شدہ مقامات کے کھنڈر دیکھ کر کبھی غور وفکر نہ کیا، ورنہ ان کو سچی بات کی سمجھ آجاتی اور کان کھل جاتے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی آنکھوں سے دیکھ کر اگر دل سے غور نہ کیا تو وہ نہ دیکھنے کے برابر ہے، گو اس کی ظاہری آنکھیں کھلی ہوں پر دل کی آنکھیں اندھی ہیں اور حقیقت میں زیادہ خطرناک اندھا پن وہی ہے جس میں دل اندھے ہو جائیں۔ ( العیاذ باللہ )

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ۭ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ

اور تجھ سے جلدی مانگتے ہیں عذاب اور اللہ ہرگز نہ ٹالے گا اپنا وعدہ ۱ اور ایک دن تیرے رب کے یہاں

كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝٤٧

ہزار برس کے برابر ہوتا ہے جو تم گنتے ہو ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور یہ لوگ ( نبوت میں شبہ ڈالنے کے لئے ) آپ سے عذاب کا تقاضا کرتے ہیں ( اور عذاب کے جلدی نہ آنے

سے یہ دلیل پکڑتے ہیں کہ عذاب آنے والا ہی نہیں) حالانکہ اللہ تعالیٰ کبھی اپنا وعدہ خلاف نہ کرے گا (یعنی وعدہ کے وقت ضرور عذاب واقع ہوگا) اور آپ کے رب کے پاس کا ایک دن (جس میں عذاب واقع ہوگا، یعنی قیامت کا دن اپنے طویل یا سخت ہونے میں) ایک ہزار سال کے برابر ہے تم لوگوں کی شمار کے مطابق (تو یہ بڑے بیوقوف ہیں کہ ایسی مصیبت کا تقاضا کرتے ہیں)۔

**كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ**: اس میں دو احتمال ہیں: ① ایک یہ کہ اس دن سے مراد قیامت کا دن لیا جائے اور اس کا ایک ہزار سال کے برابر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس دن کے ہولناک واقعات اور ہیبت ناک حالات کی وجہ سے یہ دن اتنا دراز محسوس ہوگا جیسے ایک ہزار سال، خلاصہ تفسیر مذکور میں اسی کو اشتداد (سخت) کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، بہت سے حضرات مفسرین نے اس کے یہی معنی قرار دیئے ہیں ② دوسرا یہ کہ واقع میں عالم آخرت کا ایک دن ہمیشہ کے لئے دنیا کے ایک ہزار سال ہی کے برابر ہو، بعض روایات حدیث سے اسی معنی کی شہادت ملتی ہے۔

سورۃ معارج میں جو آخرت کے دن کو پچاس ہزار سال کے برابر قرار دیا ہے: **كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ** اس میں بھی دونوں تفسیریں اشتداد اور امتداد کی ہوسکتی ہیں، اور ہر شخص کی شدت و مصیبت چونکہ دوسروں سے مختلف اور کم وبیش ہوگی اس لئے وہ دن کسی کو ایک ہزار سال کا محسوس ہوگا، کسی کو پچاس ہزار سال کا، اور اگر دوسرے معنے لئے جائیں کہ حقیقۃً آخرت کا دن پچاس ہزار سال کا ہوگا تو ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہوتا ہے کہ ایک میں ایک ہزار سال اور دوسری میں پچاس ہزار سال کا ذکر ہے تو اس کی تطبیق یہ ہے کہ یہ تفاوت ایک ہزار سال سے پچاس ہزار سال تک اختلاف آفاق کے اعتبار سے ہو، جس طرح دنیا میں معدل النہار کی حرکت کہیں دولابی ہے کہیں حمائلی کہیں رحوی اور اسی وجہ سے خط استواء پر ایک رات دن چوبیس گھنٹے کا ہوتا ہے اور عرض تسعین (قطب شمالی) پر ایک سال کا اور ان دونوں کے درمیان مختلف مقادیر پر مختلف ہوتا چلا جاتا ہے، اسی طرح ممکن ہے کہ اول شمس کی حرکت جو معدل کے ساتھ ہے بطور خرق عادت و اعجاز اس قدر سست ہو جائے کہ ایک افق پر ایک ہزار سال کا دن ہو اور جو افق اس سے پچاس حصے ہٹا ہوا ہو اس پر پچاس ہزار برس کا ہو اور درمیان میں اسی نسبت سے متفاوت ہو، واللہ اعلم۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی عذاب اپنے وقت پر یقیناً آکر رہے گا، استہزاء وتکذیب کی راہ سے جلدی مچانا فضول ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی تمہارے ہزار برس اس کے یہاں ایک دن کے برابر ہیں، جیسے مجرم آج اس کے قبضہ میں ہے ہزار برس گزرنے کے بعد بھی اسی طرح اس کے قبضہ واقتدار کے نیچے ہے، کہیں بھاگ کر نہیں جاسکتا، یا یہ مطلب کہ ہزار برس کا کام وہ ایک دن میں کرسکتا ہے، مگر کرتا وہی ہے جو اس کی حکمت ومصلحت کے موافق ہو، کسی کے جلدی مچانے سے وہاں کچھ اثر نہیں ہوتا۔

یا یوں کہا جائے کہ اخروی عذاب کا وعدہ ضرور آکر رہے گا، یعنی قیامت آئے گی اور تم کو پوری سزا ملے گی، آگے قیامت کے دن کا بیان ہوا کہ وہ ایک دن اپنی شدت وہول کے لحاظ سے ہزار سال کے برابر ہوگا پھر ایسی مصیبت کو بلانے کے لیے کیوں جلدی مچاتے ہو۔

| |
|---|
| وَكَأَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ أَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ أَخَذْتُهَا ۚ وَإِلَيَّ الْمَصِيرُ ﴿٤٨﴾ ع ۱۳ |
| اور کتنی بستیاں ہیں کہ میں نے ان کو ڈھیل دی اور وہ گناہ گار تھیں پھر میں نے ان کو پکڑا، اور میری طرف پھر کر آنا ہے |

**خلاصہ تفسیر:** اور (مذکورہ جواب کا خلاصہ پھر سن لو کہ) بہت سی بستیاں ہیں جن کو میں نے (ان کی طرح) مہلت دی تھی اور وہ (انہی کی طرح) نافرمانی کرتی تھیں (یعنی وہ عذاب میں جلدی اور اس کے ساتھ مذاق کرتے تھے) پھر میں نے ان کو (عذاب میں) پکڑ لیا اور سب کو میری ہی طرف لوٹنا ہوگا (اس وقت پوری سزا ملے گی)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی کیا ڈھیل دینے سے وہ کہیں نکل کر بھاگ گئیں آخر سب کو لوٹ کر ہماری ہی طرف آنا پڑا اور ہم نے انکو پکڑ کر تباہ کر دیا۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَاۤ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝٤٩ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ

تو کہہ اے لوگوں میں تو ڈر سنا دینے والا ہوں تم کو کھول کر ۱؎ سو جو لوگ یقین لائے اور کیں بھلائیاں ان کے گناہ بخش دیتے ہیں

وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝٥٠ وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْۤ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝٥١

اور ان کو روزی ہے عزت کی ۲؎ اور جو دوڑے ہماری آیتوں کے ہرانے کو وہی ہیں دوزخ کے رہنے والے

**خلاصہ تفسیر:** (اور) آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں تو تمہارے لئے ایک صاف ڈرانے والا ہوں (عذاب واقع کرنے نہ کرنے میں میرا ذرا بھی دخل نہیں، نہ کبھی میں نے اس کا دعویٰ کیا ہے تو عذاب کے واقع نہ ہونے سے میری تکذیب نہ کی جائے) تو جو لوگ (اس ڈر کو سن کر) ایمان لے آئے اور اچھے کام کرنے لگے ان کے لئے مغفرت اور عزت کی روزی (یعنی جنت) ہے، اور جو لوگ ہماری آیتوں کے متعلق (ان کے انکار اور ابطال کی) کوشش کرتے رہتے ہیں (نبی کو اور اہل ایمان کو) ہرانے (یعنی عاجز کرنے) کے لیے ایسے لوگ دوزخ میں (رہنے والے) ہیں (بس یہ میرا دعوی ہے اور اس پر دلائل بھی رکھتا ہوں، اور عذاب سے ڈرانا میرا فرض منصبی ہے جس کا واقع ہونا بھی اپنے وقت پر خدا تعالیٰ کے اختیار سے ہوگا، اس سے میرا کوئی تعلق جو مجھ سے درخواست کرتے ہو)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی میرا کام آگاہ و ہوشیار کر دینا ہے، عذاب کا لے آنا میرے قبضہ میں نہیں خدا ہی کے قبضہ میں ہے کہ سب مطیع و عاصی کا فیصلہ کرے گا اور ہر ایک کو اس کے مناسب حال جگہ پر پہنچائے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی جنت میں میوے پھل اور عمدہ عمدہ الوانِ نعمت اور حق تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا۔

وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْۤ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ

اور جو رسول بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے یا نبی سو جب لگا خیال باندھنے شیطان نے ملا دیا اس کے خیال میں

فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝٥٢

پھر اللہ مٹا دیتا ہے شیطان کا ملایا ہوا پھر پکی کر دیتا ہے اپنی باتیں، اور اللہ سب خبر رکھتا ہے حکمتوں والا

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے شیاطین انسانی کے نزاع و مخالفت اور بے جا کوشش کے مقابلہ میں دین حق اور اہل حق کی مدد کا ذکر تھا، آگے شیاطین جن کے بہکانے گمراہ کرنے اور وسوسہ ڈالنے کے مقابلہ میں حق کی مدد اور ان کے کید و مکر کے دور ہونے کا بیان ہے، اس کے ضمن میں حق کے قبول کرنے والوں کی جزاء اور نہ قبول کرنے والوں کی سزا مذکور ہے۔

اور (اے محمد ﷺ! یہ لوگ جو شیطان کے ورغلانے سے آپ سے مجادلہ کرتے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں، بلکہ) ہم نے آپ سے قبل کوئی رسول اور کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کو یہ قصہ پیش نہ آیا ہو کہ جب اس نے (اللہ تعالیٰ کے احکام میں سے) کچھ پڑھا (تب ہی) شیطان نے اس کے پڑھنے میں (کفار کے دلوں میں) شبہ (اور اعتراض) ڈالا (اور کفار انہی شبہات اور اعتراضات کو پیش کر کے انبیاء سے جھگڑتے تھے) پھر اللہ تعالیٰ شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات کو (مضبوط حتمی جواب اور واضح دلائل سے) نیست و نابود کر دیتا ہے (جیسا کہ ظاہر ہے کہ صحیح جواب کے بعد اعتراض ختم ہو جاتا ہے) پھر اللہ تعالیٰ اپنی آیات (کے مضامین) کو زیادہ مضبوط کر دیتا ہے (اگرچہ وہ پہلے سے بھی مستحکم تھیں، لیکن اعتراضات کے جواب سے ان کا

استحکام اور مضبوطی خوب ظاہر ہوگئی) اور اللہ تعالیٰ (ان اعتراضات کے متعلق) خوب علم والا ہے (اور ان کے جواب کے تعلیم میں) خوب حکمت والا ہے۔

**مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ**: رسول اور نبی کے معانی کی تحقیق سورہ مریم [آیت ۵۱] میں گذر چکی ہے، وہاں ملاحظہ فرمایے۔

**اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ**: اس جیسا مضمون دوسری آیت میں بھی آچکا ہے: **وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا - وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـِٕهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ**، اور بعض کتب حدیث میں اس جگہ ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے جو ''غرانیق'' کے نام سے معروف ہے، یہ واقعہ جمہور محدثین کے نزدیک ثابت نہیں ہے، بعض حضرات نے اس کو موضوع ملحدین وزنادقہ کی ایجاد قرار دیا ہے اور جن حضرات نے اس کو معتبر بھی قرار دیا ہے تو اس کے ظاہری الفاظ سے جو شبہات قرآن وسنت کے قطعی اور یقینی احکام پر عائد ہوتے ہیں ان کے مختلف جوابات دیئے ہیں، لیکن اتنی بات بالکل واضح ہے کہ اس آیت قرآن کی تفسیر اس واقعہ پر موقوف نہیں، بلکہ اس کا سیدھا سادہ مطلب وہ ہے جو اوپر بیان ہو چکا ہے، بلا وجہ اس کو اس آیت کی تفسیر کا جزء بنا کر شکوک وشبہات کا دروازہ کھولنا اور پھر جوابدہی کی فکر کرنا کوئی مفید کام نہیں اس لئے اس کو ترک کیا جاتا ہے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

**فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ**: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی عادت جاری ہے کہ شیطانی وساوس خود بخود کمزور اور ختم ہو جاتے ہیں، اس کے لیے مستقل تدبیر کی ضرورت نہیں۔

* * *

**فائدہ:** آیت کی تفسیر میں اختلاف ہے، مترجم محقق قدس اللہ روحہ، نے اپنے پیشرو حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کی روش اختیار فرمائی ہے جس کی طرف حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے بھی ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے آخر میں اشارہ کیا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ ''موضح القرآن'' میں لکھتے ہیں: ''نبی کو ایک حکم (یا ایک خبر) اللہ کی طرف سے آتی ہے، اس میں ہرگز ذرہ بھر تفاوت نہیں ہوسکتا، اور ایک اپنے دل کا خیال (اور رائے کا اجتہاد) وہ کبھی ٹھیک پڑتا ہے کبھی نہیں، جیسے حضرت ﷺ نے خواب میں دیکھا (اور نبی کا خواب وحی ہوتا ہے) کہ آپ مدینہ سے مکہ تشریف لے گئے اور عمرہ کیا، خیال میں آیا کہ شاید امسال ایسا ہوگا (چنانچہ عمرہ کی نیت سے سفر شروع کیا لیکن درمیان میں احرام کھولنا پڑا) اور اگلے سال خواب کی تعبیر پوری ہوئی، یا وعدہ ہوا کہ کافروں پر غلبہ ہوگا، خیال آیا کہ اب کی لڑائی میں، اس میں نہ ہوا، بعد کو ہوا، پھر اللہ جتلا دیتا ہے کہ جتنا حکم یا وعدہ تھا اس میں سرمو تفاوت نہیں''، ہاں! نبی کے ذاتی خیال واجتہاد میں تفاوت ہوسکتا ہے، گو نبی اصل پیشین گوئی کے ساتھ ملا کر اپنے ذاتی خیال کی اشاعت نہیں کرتا بلکہ دونوں کو الگ رکھتا ہے، باقی اس صورت میں ''القاء'' کی نسبت شیطان کی طرف ویسی ہوگی جیسے **وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ** میں ''انساء'' کی نسبت اس کی طرف کی گئی ہے، واللہ اعلم۔

احقر کے نزدیک بہترین اور سہل ترین تفسیر وہ ہے جس کی مختصر اصل سلف سے منقول ہے۔ یعنی ''تمنّیٰ'' کو بمعنی ''قرأت'' و''تلاوت'' یا ''تحدیث'' کے اور ''اُمْنِيَّت'' کو بمعنی ''متلو'' یا ''حدیث'' کے لیا جائے، مطلب یہ ہے کہ قدیم سے یہ عادت رہی ہے کہ جب کوئی نبی یا رسول کوئی بات بیان کرتا یا اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے، شیطان اس بیان کی ہوئی بات یا آیت میں طرح طرح کے شبہات ڈال دیتا ہے، یعنی بعض باتوں کے متعلق بہت لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کر کے شکوک وشبہات پیدا کر دیتا ہے، مثلاً نبی نے آیت **اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ** پڑھ کر سنائی، شیطان نے شبہ ڈالا کہ دیکھو اپنا مارا ہوا تو حلال اور اللہ کا مارا ہوا حرام کہتے ہیں، یا آپ نے **اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ** پڑھا، اُس نے شبہ ڈالا کہ **مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ** میں حضرت مسیح وعزیر اور ملائکۃ اللہ بھی شامل ہیں، یا آپ نے حضرت مسیح کے متعلق پڑھا **وَكَلِمَتُهٗٓ اَلْقٰىهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ** شیطان نے سجھایا کہ اس سے حضرت مسیح کی ابنیت والوہیت ثابت ہوتی ہے، اس لقاء شیطانی کے ابطال ورد میں پیغمبر ﷺ اللہ تعالیٰ کی وہ آیات سناتے ہیں جو بالکل صاف اور محکم ہوں اور ایسی پکی باتیں بتلاتے ہیں جن کو سن کر شک وشبہ کی قطعاً گنجائش نہ رہے، گویا ''متشابہات'' کی ظاہری سطح کو لے کر شیطان جو اغواء کرتا ہے ''آیات محکمات'' اس کی جڑ کاٹ دیتی ہیں جنہیں سن کر تمام شکوک و

شبہات ایک دم کافور ہو جاتے ہیں۔

یہ دو قسم کی آیتیں کیوں اتاری جاتی ہیں؟ شیاطین کو اتنی وسوسہ اندازی اور تصرف کا موقع کیوں دیا جاتا ہے؟ اور آیات کا جو احکام بعد کو کیا جاتا ہے ابتداء ہی سے کیوں نہیں کر دیا جاتا؟ یہ سب امورِ حق تعالیٰ کی غیر محدود علم و حکمت سے ناشی ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو علماً وعملاً دار امتحان بنایا ہے، چنانچہ اس قسم کی کارروائی میں بندوں کی جانچ ہے کہ کون شخص اپنے دل کی بیماری یا سختی کی وجہ سے پادر ہوا شکوک وشبہات کی دلدل میں پھنس کر رہ جاتا ہے اور کون سمجھ دار آدمی اپنے علم وتحقیق کی قوت سے ایمان وجنّات کے مقام بلند پر پہنچ کر دم لیتا ہے، سچ تو یہ ہے کہ آدمی نیک نیتی اور ایمانداری سے سمجھنا چاہے تو اللہ تعالیٰ دستگیری فرما کر اس کو سیدھی راہ پر قائم فرما دیتے ہیں، رہے منکرین و مشککین ان کو قیامت تک اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا: ''ہر چہ گیرد علتی علت شود''۔

ہماری اس تقریر میں دور تک کئی آیتوں کا مطلب بیان ہو گیا، سمجھ دار آدمی اس کے اجزاء کو آیات کے اجزاء پر بے تکلف منطبق کر سکتا ہے، یہ آیات جیسا کہ ہم نے سورہ ''آل عمران'' کے شروع میں بیان کیا تھا: هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ سے بہت مشابہ ہیں، اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ میں ''متشابہات'' کا اور ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ میں ''محکمات'' کا ذکر ہوا، اور لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ میں زائغین کی دو قسمیں مذکور ہوئیں: جن میں اَلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ کا کام ابتغاء تاویل، اور اَلْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ کی غرض ابتغاء فتنہ ہے، آگے وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ کو آیت وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ کی جگہ سمجھو اور وہاں جو دعاء رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا سے کی تھی یہاں اس کی اجابت کا ذکر وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ میں کیا گیا اور رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ کے مناسب وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ہوئی۔

**تنبیہ:** آیت حاضرہ کے تحت مفسرین نے جو قصہ غرانیق کا ذکر کیا ہے اس پر بحث کا یہاں موقع نہیں، شاید سورہ نجم میں کچھ لکھنے کی نوبت آئے، ہم نے شرح صحیح مسلم میں بہت بسط سے اس پر کلام کیا ہے، بہرحال آیت کا مطلب سلف کی تفسیر کے موافق بالکل صاف ہے، گویا یہ تفصیل اس کی ہوئی جو اوپر وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ میں ابطالِ آیات اللہ کی سعی کا ذکر تھا۔

لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ

اس واسطے کہ جو کچھ شیطان نے ملایا اس سے جانچے ان کو کہ جن کے دل میں روگ ہیں اور جن کے دل سخت ہیں، اور

الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۵۳﴾ وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ

گنہگار تو ہیں مخالفت میں دور جا پڑے، اور اس واسطے کہ معلوم کر لیں وہ لوگ جن کو سمجھ ملی ہے کہ یہ تحقیق ہے تیرے رب کی طرف سے

فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۴﴾

پھر اس پر یقین لائیں اور نرم ہو جائیں اس کے آگے ان کے دل، اور اللہ سمجھانے والا ہے یقین لانے والوں کو راہ سیدھی ۔

**خلاصہ تفسیر:** (یہ سارا قصہ اس لئے بیان کیا ہے) تاکہ اللہ تعالیٰ شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات کو ایسے لوگوں کے لئے آزمائش (کا ذریعہ) بنا دے جن کے دل میں (شک کا) مرض ہے اور جن کے دل (بالکل ہی) سخت ہیں (کہ وہ شک سے بڑھ کر غلط باتوں کا یقین کئے ہوئے ہیں، سو ان کی آزمائش ہوتی ہے کہ دیکھیں جواب کے بعد اب بھی شبہات کا اتباع کرتے ہیں یا جواب کو سمجھ کر حق کو قبول کرتے ہیں) اور واقعی

(یہ) ظالم لوگ (یعنی اہل شک بھی اور باطل پر یقین کرنے بھی) بڑی مخالفت میں ہیں (کہ حق کو واضح ہونے کے باوجود محض عناد کے سبب قبول نہیں کرتے، شیطان کو وسوسہ ڈالنے کا تصرف تو اس لئے دیا گیا تھا کہ آزمائش ہو) اور (ان صحیح جوابات اور نورِ ہدایت سے ان شبہات کو اس لئے باطل کیا جاتا ہے) تاکہ جن لوگوں کو فہم (صحیح) عطا ہوا ہے وہ (ان جوابات اور نور ہدایت سے) اس امر کا زیادہ یقین کرلیں کہ یہ (جو نبی نے پڑھا ہے وہ) آپ کے رب کی طرف سے حق ہے سو ایمان پر زیادہ قائم ہوجائیں، پھر (زیادہ یقین کی برکت سے) اس (پر عمل کرنے) کی طرف ان کے دل اور بھی جھک جائیں اور واقعی ان ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ ہی راہ راست دکھلاتا ہے (پھر کیونکر ان کو ہدایت نہ ہو)۔

* * *

**فائدہ:** لہ ''موضح القرآن'' میں ہے: ''یعنی اس میں گمراہ بہکتے ہیں، سو انکا کام ہے بہکنا، اور ایمان والے اور زیادہ مضبوط ہوتے ہیں کہ اس کلام میں بندہ کا دخل نہیں، اگر ہوتا تو یہ بھی بندہ کے خیال کی طرح کبھی صحیح کبھی غلط نکلتا، اور جس کی نیت اعتقاد پر ہو اللہ اس کو یہ بات سجھاتا ہے''۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ فائدہ اپنے مذاق کے موافق لکھا ہے، ہمارا جو خیال ہے اس کی تقریر گذشتہ فائدہ میں گزر چکی، واللہ اعلم۔

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ ۵۵

اور منکروں کو ہمیشہ رہے گا اس میں دھوکا جب تک کہ آپہنچے ان پر قیامت بے خبری میں یا آپہنچے ان پر آفت ایسے دن کی جس میں راہ نہیں خلاصی کی

**خلاصہ تفسیر:** (پیچھے تو ایمان والوں کی کیفیت بیان ہوئی) اور (رہ گئے) کافر لوگ (سووہ) ہمیشہ اس (پڑھے ہوئے حکم) کی طرف سے شک ہی میں رہیں گے (جو ان کے دل میں شیطان نے ڈالا تھا) یہاں تک کہ ان پر دفعۃً قیامت آجائے (جس کی ہول ہی کافی ہے اگرچہ عذاب نہ بھی ہوتا) یا (اس سے بڑھ کر یہ کہ) ان پر کسی بے برکت دن کا (جو کہ قیامت کا دن ہے) عذاب آپہنچے (اور واقع میں یہ دونوں باتیں جمع ہوں گی تو ان کا جمع ہونا یہ اور بھی سخت مصیبت ہے، مطلب یہ کہ یہ لوگ عذاب دیکھے بغیر کفر سے باز نہ آئیں گے، مگر عذاب دیکھنے کے بعد نفع نہ ہوگا)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی نفس قیامت کا ہولناک حادثہ اچانک آپہنچے یا اسی قیامت کے دن کا عذاب مراد ہو۔ یعنی دنیا ہی میں سزا مل جائے جس سے کوئی رستگاری کی شکل نہیں۔

اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۵۶

راج اس دن اللہ کا ہے، ان میں فیصلہ کرے گا، سو جو یقین لائے اور کیں بھلائیاں نعمت کے باغوں میں ہیں لہ

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۵۷ ع

اور جو منکر ہوئے اور جھٹلائیں ہماری باتیں سو ان کے لیے ہے ذلت کا عذاب

**خلاصہ تفسیر:** بادشاہی اس روز اللہ ہی کی ہوگی، وہ ان سب (مذکورین) کے درمیان (عملی) فیصلہ فرمادے گا، سو جو لوگ ایمان لائے ہوں گے اور اچھے کام کئے ہوں گے وہ چین کے باغوں میں ہوں گے اور جنہوں نے کفر کیا ہوگا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہوگا تو ان کے لئے ذلت کا عذاب ہوگا۔

**فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ:** اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ حقیقی عذاب اللہ تعالیٰ کے ہاں مردود اور ذلیل ہوجانا ہے اگرچہ ظاہری طور پر نعمتوں میں ہو، عارف شیرازیؒ کے اس قول کے بھی یہی معنی ہیں:

حدیث ہول قیامت کہ گفت واعظ شہر کنا یتے ست کہ از روز گار ہجران گفت

فائدہ: ا؎ یعنی قیامت کے دن اکیلے خدا کی بادشاہت کام کرے گی، کسی کی ظاہری ومجازی حکومت برائے نام بھی باقی نہ رہے گی، اس وقت سب دنیا کا بیک وقت عملی فیصلہ ہوجائے گا، جس کی تفصیل آگے مذکور ہے۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ

اور جو لوگ گھر چھوڑ آئے اللہ کی راہ میں پھر مارے گئے یا مر گئے البتہ ان کو دے گا اللہ روزی خاصی، اور اللہ ہے

لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝58 لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۝59

سب سے بہتر روزی دینے والا، البتہ پہنچائے گا ان کو ایک جگہ جس کو پسند کریں گے، اور اللہ سب کچھ جانتا ہے تحمل والا

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے جہاد کی اجازت اور نصرت کی بشارت، اس کے بعد مظلوم مسلمانوں کی ہجرت کا بیان تھا، یہاں تک اسی سلسلہ میں مضمون چلا آیا تھا، چونکہ ہجرت اور جہاد کے دوران بعض کو قتل یا طبعی موت کی نوبت آجاتی ہے، اور یہ وعدہ نصرت کے خلاف نہیں، کیونکہ غالب اور منصور ہونا قوم کی صفت ہوتی ہے، ہر ہر شخص کی صفت نہیں ہوتی، لیکن پھر بھی اس صورت میں اس میت یا مقتول کی حسرت کا احتمال ہوسکتا ہے کہ ہم نے اس وعدہ کے پورا ہونے کا معائنہ نہ کیا، نہ اس سے فائدہ اٹھایا اس لیے ان مقتولین یا مرنے والوں کو نصرت کی بشارت سے بڑھ کر بشارت سناتے ہیں۔

اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں (یعنی دین کی حفاظت کے لئے) اپنا وطن چھوڑا (جن کا ذکر پیچھے: اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ کے الفاظ سے آچکا ہے) پھر وہ لوگ (کفار کے مقابلہ میں) قتل کئے گئے یا (ویسے ہی طبعی موت سے) مرگئے (وہ ناکام ومحروم نہیں، اگرچہ دنیا میں ان کو فتح ونصرت اور دیگر فوائد نہ ملے، مگر آخرت میں) اللہ تعالیٰ ان کو ضرور ایک عمدہ رزق دے گا (یعنی جنت کی بیشمار نعمتیں) اور یقیناً اللہ تعالیٰ سب دینے والوں سے اچھا (دینے والا) ہے (اور اس اچھے رزق کے ساتھ) اللہ تعالیٰ ان کو (مسکن بھی اچھا دے گا، یعنی) ایسی جگہ لے جا کر داخل کرے گا جس کو وہ (بہت ہی) پسند کریں گے (رہی یہ بات کہ بعض مہاجرین اس طرح دنیاوی فتح ونصرت اور اس کے فوائد سے محروم کیوں ہوئے اور ان کے مقابلے کے کفار ان کے قتل کرنے پر قادر کیوں ہوگئے؟ وہ پہلے ہی قہر الٰہی سے کیوں نہ ہلاک کردیئے گئے کہ مسلمانوں کے قتل کی نوبت ہی نہ آتی؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ (ہر کام کی حکمت ومصلحت کو) خوب جاننے والا ہے (ان کی اس ظاہری ناکامی میں بھی بہت سی مصلحتیں اور حکمتیں ہیں، اور) بہت حلم والا ہے (اس لئے دشمنوں کو فوراً سزا نہیں دیتا)۔

فائدہ: مومنین کا انجام پہلے بتلایا تھا، یہاں ان میں سے ایک ممتاز جماعت کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا، یعنی جو لوگ خدا کے راستہ میں گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے، خواہ وہ لڑائی میں شہید ہوں، یا طبعی موت سے مریں، دونوں صورتوں میں اللہ کے ہاں ان کی خاص مہمانی ہوگی، کھانا پینا، رہنا سہنا سب ان کی مرضی کے موافق ہوگا، اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ کس چیز سے راضی ہوں گے اور یہ بھی جانتا ہے کہ کن لوگوں نے خالص اس کے راستہ میں اپنا گھر بار ترک کیا ہے، ایسے مہاجرین ومجاہدین کی فروگذاشتوں پر حق تعالیٰ تحمل کرے گا اور شان عفو سے کام لے گا یا "علیم"، و "حلیم" کی صفات اس غرض سے ذکر کیں کہ اللہ سب کو جانتا ہے ان کو بھی جنہوں نے ایسے مخلص بندوں کو تکلیفیں دے کر گھر چھوڑنے پر مجبور کیا، لیکن اپنی بردباری کی وجہ سے فوراً سزا نہیں دیتا۔

ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ﴿۶۰﴾

یہ سن چکے، اور جس نے بدلہ لیا جیسا کہ اسکو دکھ دیا تھا پھر اس پر کوئی زیادتی کرے تو البتہ اسکی مدد کرے گا اللہ ا بیشک اللہ درگزر کرنے والا بخشنے والا ہے ۲

**خلاصہ تفسیر:** چند آیات پہلے یہ ذکر ہوا کہ اللہ تعالیٰ مظلوم کی مدد فرماتے ہیں، مگر مظلوم کی دو قسم ہیں: ① ایک تو وہ جس نے دشمن سے ظلم کا کوئی انتقام اور بدلہ لیا ہی نہیں، بلکہ معاف کر دیا یا چھوڑ دیا ② دوسرا وہ شخص جس نے اپنے دشمن سے برابر سرابر بدلہ اور انتقام لے لیا اور اس انتقام کی وجہ سے پھر اس کو تکلیف پہنچائی جائے، پس مظلومیت پر جو مدد کا وعدہ کیا گیا ہے وہ اگر چہ دونوں صورتوں کو شامل ہے، لیکن دوسری صورت میں چونکہ مظلوم کی طرف سے ظالم کو سزا مل چکی ہے، اس کے بعد ظالم نے پھر ایذا پہنچائی، اس لیے اس صورت میں اس مظلوم کا مظلوم ہونا پہلی صورت کی طرح ظاہر نہ تھا، تو احتمال ہوسکتا تھا کہ کوئی اس کو مظلومیت میں شامل ہی نہ سمجھے، اس لیے آگے صراحۃً اس صورت پر بھی مدد کا وعدہ فرماتے ہیں، رہا مظلوم کی طرف سے ظالم کو سزا پہنچانا یہ تو پہلے ظلم کا بدلہ ہونے کی وجہ سے کالعدم ہے، گویا دونوں برابر تھے، پس اب یہ دوبارہ کا ظلم پہلی صورت جیسا ہی ہوا۔

یہ (مضمون تو) ہو چکا، اور (آگے یہ سنو کہ) جو شخص (دشمن کو) اسی قدر تکلیف پہنچا دے جس قدر (دشمن کی طرف سے) اس کو تکلیف پہنچائی گئی تھی پھر (اس برابر سرابر ہوجانے کے بعد اگر اس دشمن کی طرف سے دوبارہ) اس شخص پر زیادتی کی جائے تو اللہ تعالیٰ اس شخص کی ضرور امداد کرے گا (اگر یہ شخص بدلہ لینا چاہے تو دنیا میں اس کی شرعی مدد یقینی ہے، یعنی انتقام کی اس کو اجازت ہے، اور اگر دنیا میں بدلہ نہ لے تو آخرت میں مدد ضروری ہے یعنی ظالم کو عذاب ہوگا، اور یہ جو پیچھے قید لگائی ہے کہ دشمن کو اسی قدر تکلیف پہنچائے جس قدر ظالم کی طرف سے پہنچی ہے سو اس برابری کی رعایت کرنا مظلوم کی رائے اور اجتہاد پر بشرطیکہ اس نے حتی الامکان اپنی طاقت برابری کرنے میں خرچ کر دی ہو، اس پر بھی اگر برابری سے کچھ زیادتی ہوجائے تو انتہائی باریک اور پوشیدہ ہونے کی وجہ سے سمجھ نہ آسکے تو اس پر مواخذہ نہیں، اور نہ اس کی وجہ سے مدد کے وعدہ میں کچھ خلل ہوگا، بلکہ معاف ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ بہت معاف کرنے والا بہت مغفرت کرنے والا ہے (وہ ایسی باریک باریک باتوں پر مواخذہ نہیں فرماتا)۔

**وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ:** یہ مماثلت اور برابری کی رعایت معاشرتی معاملات میں واجب ہے، نہ کہ جہاد میں، چنانچہ شرعی دلائل سے یہ بات ظاہر ہے، اور نیز جو افعال ہر حال میں حرام ہیں وہ بھی اس حکم میں داخل نہیں، ان میں برابری کرنا جائز نہیں، مثلاً کوئی کسی کے والدین کو برا کہتے تو اس کے بدلہ میں اس کے والدین کو برا کہنا جائز نہ ہوگا۔

* * *

**فائدہ:** ا یعنی مظلوم اگر ظالم سے واجبی بدلہ لے لے پھر از سر نو ظالم اس پر زیادتی کرے تو وہ پھر مظلوم ٹھہر گیا، حق تعالیٰ پھر مدد کرے گا جیسا کہ اس کی عادت ہے کہ مظلوم کی آخر حمایت کرتا ہے: وَاتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ فَاِنَّهٗ، لَيْسَ بَيْنَهَا وَ بَيْنَ اللّٰهِ حِجَابٌ:

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

**فائدہ:** ۲ یعنی بندوں کو بھی چاہیے کہ اپنے ذاتی اور معاشرتی معاملات میں عفو و درگزر کی عادت سیکھیں، ہر وقت بدلہ لینے کے درپے نہ ہوں، حضرت شاہ صاحب ؒ لکھتے ہیں: ''یعنی واجبی بدلہ لینے والے کو خدا عذاب نہیں کرتا اگر چہ بدلہ نہ لینا بہتر تھا، ''بدر'' کی لڑائی میں مسلمانوں نے بدلہ لیا کافروں کی ایذا کا ''احد'' و ''احزاب'' میں زیادتی کرنے کو آئے پھر اللہ نے پوری مدد کی''۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۶۱﴾

یہ اس واسطے کہ اللہ لے لیتا ہے رات کو دن میں اور دن کو رات میں ا اور اللہ سنتا دیکھتا ہے ۲

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے مومنین کے غالب اور کفار کے مغلوب ہونے کا بیان تھا، چونکہ مسلمانوں کی موجودہ بے سروسامانی اور کفار کے ساز و سامان اور جمعیت کی کثرت کو دیکھتے ہوئے یہ بات ایک گونہ دشوار معلوم ہوتی تھی، اس لئے اب اپنی قدرت کاملہ کا بیان فرماتے ہیں، اور چونکہ جاہل

کفار کو ایسے موقع پر اپنے معبودوں کی طرف سے مدد کی امید ہوتی تھی اس لیے ان کا ناکارہ ہونے بتلاتے ہیں۔

یہ (مومنین کا غالب کر دینا) اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ (کی قدرت بڑی کامل ہے، چنانچہ وہ) رات (کے اجزاء) کو دن میں اور دن (کے اجزاء) کو رات میں داخل کر دیتا ہے (یہ کائناتی انقلاب ایک قوم کو دوسری پر غالب کرنے والے انقلاب سے زیادہ عجیب ہے) اور اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ (ان سب کے اقوال واحوال کو) خوب سننے والا اور خوب دیکھنے والا ہے (وہ کفار کے ظلم اور مومنین کی مظلومیت کو سنتا دیکھتا ہے، اس لئے وہ سب حالات سے باخبر بھی ہے اور قوت وقدرت بھی اس کی سب سے بڑی ہے، یہ مجموعہ سبب ہو گیا کمزوروں کو غالب کرنے کا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی وہ اتنی بڑی قدرت والا ہے کہ رات دن کا الٹ پلٹ کرنا اور گھٹانا بڑھانا اسی کے ہاتھ میں ہے، اسی کے تصرف سے کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں بڑی ہوتی ہیں، پھر کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ ایک مظلوم قوم یا شخص کو امداد دے کر ظالموں کے پنجہ سے نکال دے بلکہ ان پر غالب و مسلط کر دے، پہلے مسلمان مہاجرین کا ذکر تھا اس آیت میں اشارہ فرمادیا کہ عنقریب حالات رات دن کی طرح پلٹا کھانے والے ہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ رات کو دن میں لے لیتا ہے اسی طرح کفر کی سرزمین کو اسلام کی آغوش میں داخل کر دے گا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی مظلوم کی فریاد سنتا اور ظالم کے کرتوت دیکھتا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۶۲﴾

یہ اس واسطے کہ اللہ وہی ہے صحیح اور جس کو پکارتے ہیں اس کے سوا وہی ہے غلط اور اللہ وہی ہے سب سے اوپر بڑا

**خلاصہ تفسیر:** (اور نیز) یہ (نصرت) اس سبب سے (یقینی) ہے کہ (کسی طاقت کی مجال نہیں جو اس میں اللہ تعالیٰ کی مزاحمت کرے، کیونکہ) اللہ ہی ہستی میں کامل ہے اور جن چیزوں کی اللہ کے سوا یہ لوگ عبادت کر رہے وہ بالکل ہی لچر ہیں (کہ وہ خود اپنے وجود میں محتاج بھی ہیں، کمزور بھی، وہ کیا اللہ کی مزاحمت کر سکتے ہیں) اور اللہ ہی عالیشان سب سے بڑا ہے (اس میں غور کرنے سے توحید کا حق ہونا اور شرک کا باطل ہونا ہر شخص سمجھ سکتا ہے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی اللہ کے سوا ایسے عظیم الشان انقلابات اور کس سے ہو سکتے ہیں، واقع میں صحیح اور سچا خدا تو وہی ایک ہے باقی اس کو چھوڑ کر خدائی کے جو دوسرے پاکھنڈ پھیلائے گئے ہیں سب غلط جھوٹ اور باطل ہیں، اسی کو خدا کہنا اور معبود بنانا چاہیے جو سب سے اوپر اور سب سے بڑا ہے اور یہ شان بالاتفاق اسی ایک اللہ کی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۡ فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴿۶۳﴾

تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے اتارا آسمان سے پانی، پھر زمین ہو جاتی ہے سرسبز ۱؎ بیشک اللہ جانتا ہے چھپی تدبیریں خبردار ہے ۲؎

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۶۴﴾ ع ۱۵

اسی کا ہے جو کچھ ہے آسمان اور زمین میں، اور اللہ وہی ہے بے پروا تعریفوں والا ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** (اے مخاطب! اس مضمون میں غور کر کے توحید کا حق اور شرک کا باطل ہونا سمجھنا چاہیے، اس کے علاوہ اور بھی حق تعالیٰ کے کمالات اور نعمتیں ہیں جن سے توحید اور شکر واجب ہونے پر استدلال کیا جا سکتا ہے، چنانچہ) کیا تجھ کو یہ خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی

برسایا جس سے زمین سرسبز ہوگئی، بیشک اللہ تعالیٰ بہت مہربان سب باتوں کی خبر رکھنے والا ہے (اس لئے بندوں کی ضرورتوں پر مطلع ہے اور ان کے مناسب مہربانی فرماتا ہے) سب اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے (یعنی وہ سب کا مالک ہے) اور بیشک اللہ تعالیٰ ہی ایسا ہے جو کسی کا محتاج نہیں (اور) ہر طرح کی تعریف کے لائق ہے۔

* * *

**فائدہ: ۱** اسی طرح کفر کی خشک وویران زمین کو اسلام کی بارش سے سبزہ زار بنادے گا۔

**فائدہ: ۲** وہ ہی جانتا ہے کہ کس طرح بارش کے پانی سے سبزہ اُگ آتا ہے، قدرت اندر ہی اندر ایسی تدبیر وتصرف کرتی ہے کہ خشک زمین پانی وغیرہ کے اجزاء کو اپنے اندر جذب کر کے سرسبز وشاداب ہوجائے، اسی طرح وہ اپنی مہربانی، لطیف تدبیر وتربیت، اور کمال خبرداری وآگاہی سے قلوب بنی آدم کو فیوض اسلام کا مینہ برسا کر سرسبز وشاداب بنادے گا۔

**فائدہ: ۳** یعنی آسمان وزمین کی تمام چیزیں جب اسی کی مملوک مخلوق ہیں اور سب کو اس کی احتیاج ہے وہ کسی کا محتاج نہیں تو ان میں جس طرح چاہے تصرف اور ادل بدل کرے، کوئی مانع ومزاحم نہیں ہوسکتا، البتہ باوجود غنائے تام اور اقتدارِ کامل کے کرتا وہ ہی ہے جو سراپا حکمت ومصلحت ہو، اس کے تمام افعال محمود ہیں اور اس کی ذات تمام خوبیوں اور صفاتِ حمیدہ کی جامع ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِىْ فِى الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۭ وَيُمْسِكُ السَّمَاۗءَ

تونے نہ دیکھا کہ اللہ نے بس میں کر دیا تمہارے جو کچھ ہے زمین میں اور کشتی کو جو چلتی ہے دریا میں اس کے حکم سے، اور تھام رکھتا ہے آسمان کو

اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿٦٥﴾ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ۡ

اس سے کہ گر پڑے زمین پر مگر اس کے حکم سے، بیشک اللہ لوگوں پر نرمی کرنے والا مہربان ہے ۱ اور اسی نے تم کو جلایا

ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ﴿٦٦﴾

پھر مارتا ہے پھر زندہ کرے گا ۲ بے شک انسان ناشکرا ہے ۳

**خلاصہ تفسیر:** (اور اے مخاطب!) کیا تجھ کو یہ خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے کام میں لگا رکھا ہے زمین کی چیزوں کو اور کشتی کو (بھی) کہ وہ دریا میں اس کے حکم سے چلتی ہے، اور وہی آسمانوں کو زمین پر گرنے سے تھامے ہوئے ہے ہاں! مگر یہ کہ اسی کا حکم ہوجائے (تو یہ سب کچھ ہوسکتا ہے اور بندوں کے گناہ اور برے اعمال اگرچہ ایسا حکم ہوجانے کے متقاضی ہیں مگر پھر بھی جو ایسا حکم نہیں دیتا تو وجہ یہ ہے کہ) بالیقین اللہ تعالیٰ لوگوں (کے حال) پر بڑی شفقت اور رحمت فرمانے والا ہے، اور وہی ہے جس نے تم کو زندگی دی، پھر (مقررہ وقت پر) تم کو موت دے گا، پھر (قیامت میں) تم کو زندہ کرے گا (ان انعامات واحسانات کا تقاضا تھا کہ لوگ توحید اور اللہ کے شکر کو اختیار کرتے مگر) واقعی انسان ہے بڑا ناشکر (کہ اب بھی کفر وشرک سے باز نہیں آتا، مراد سب انسان نہیں، بلکہ وہی جو اس ناشکری میں مبتلا ہوں)۔

**سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ:** یعنی زمین کی سب چیزوں کو انسان کا مسخر بنادیا، مسخر بنانے کے ظاہری اور عام معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ وہ اس کے حکم کے تابع چلے، اس معنی کے لحاظ سے یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ زمین کے پہاڑ اور دریا اور درندے پرندے اور ہزاروں چیزیں انسان کے حکم کے تابع تو نہیں چلتے، مگر کسی چیز کو کسی شخص کی خدمت میں لگا دینا جو ہر وقت یہ خدمت انجام دیتی رہے یہ بھی درحقیقت اس کے لئے تسخیر ہی ہے اگرچہ وہ اس کے حکم سے نہیں، بلکہ مالک حقیقی کے حکم سے یہ خدمت انجام دے رہی ہے، اسی لئے یہاں تسخیر کا ترجمہ کام میں لگا دینے سے کیا گیا ہے، اللہ

تعالیٰ کی قدرت میں یہ بھی تھا کہ ان سب چیزوں کو انسان کا تابع حکم بھی بنا دیتے، مگر اس کا نتیجہ خود انسان کے حق میں مضر پڑتا، کیونکہ انسانوں کی طبائع، خواہشات اور ضرورتیں مختلف ہوتی ہیں، ایک انسان دریا کو اپنا رخ دوسری طرف موڑنے کا حکم دیتا اور دوسرا اُس کے خلاف تو انجام بجز فساد کے کیا ہوتا، اللہ تعالیٰ نے اسی لئے ان سب چیزوں کو تابع حکم تو اپنا ہی رکھا مگر تسخیر کا جو اصل فائدہ تھا وہ انسان کو پہنچا دیا۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی اس کو تمہاری یا کسی کی کیا پرواتھی، محض شفقت و مہربانی دیکھو کہ کس طرح خشکی اور تری کی چیزوں کو تمہارے قابو میں کر دیا، پھر اسی نے اپنے دست قدرت سے آسمان، چاند، سورج اور ستاروں کو اس فضائے ہوائی میں بدون کسی ظاہری کھمبے یا ستون کے تھام رکھا ہے جو اپنی جگہ سے نیچے نہیں سرکتے، ورنہ گر گراور ٹکرا کر تمہاری زمین کو پاش پاش کر دیتے، جب تک اس کا حکم نہ ہو یہ کرات یوں ہی اپنی جگہ قائم رہیں گے مجال نہیں کہ ایک انچ سرک جائیں، اِلَّا بِاِذْنِہٖ کا استثناء محض اثبات قدرت کی تاکید کے لیے ہے، یا شاید قیامت کے واقعہ کی طرف اشارہ ہو، واللہ اعلم۔

**فائدہ:** ۲؎ اسی طرح کفر و جہل سے جو قوم روحانی موت مر چکی تھی، ایمان و معرفت کی روح سے اس کو زندہ کر دے گا۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی اتنے احسانات و انعامات دیکھ کر بھی اس کا حق نہیں مانتا منعم حقیقی کو چھوڑ کر دوسروں کے سامنے جھکنے لگتا ہے۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ

ہر امت کے لیے ہم نے مقرر کر دی ایک راہ بندگی کی کہ وہ اسی طرح کرتے ہیں بندگی، سو چاہیے تجھ سے جھگڑا نہ کریں اس کام میں

وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ط اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۶۷﴾ وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ

اور تو بلائے جا اپنے رب کی طرف، بیشک تو ہے سیدھی راہ پر سوجھ والا، اور اگر تجھ سے جھگڑنے لگیں تو تو کہہ اللہ بہتر جانتا ہے

بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۸﴾ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۶۹﴾

جو تم کرتے ہو، اللہ فیصلہ کرے گا تم میں قیامت کے دن جس چیز میں تمہاری راہ جدا جدا تھی

**خلاصہ تفسیر:** سورت کے زیادہ حصے میں کفار کے جھگڑنے کا اور ان کے نزاع کے باطل ہونے کا ذکر تھا، ان جھگڑوں میں سے ایک ذبح کے متعلق تھا جس کا حاصل وہی ہے جو اب بھی بعض کفار کی زبان پر مشہور ہے کہ خدا کا مارا ہوا مردار اور اپنا مارا ہوا حلال، مشرکین کے اس طرز عمل پر اب انہیں زجر و تنبیہ کی جاتی ہے۔

(جتنی اہل شریعت امتیں گزری ہیں) ہم نے (ان میں) ہر امت کے واسطے ذبح کرنے کا طریقہ مقرر کیا ہے کہ وہ اسی طریقہ پر ذبح کیا کرتے تھے تو (اعتراض کرنے والے) لوگوں کو چاہئے کہ اس امر (ذبح) میں آپ سے جھگڑا نہ کریں (کیونکہ ان کے مسلمہ اصول میں سے ہے کہ جو بات قدیم چلا آ رہی ہوا سے صحیح سمجھتے ہیں، جب ان کے نزدیک محض قدیم ہونا ہی حجت ہے چاہے وہ بات صحیح دلیل کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، حتیٰ کہ اپنے عقائد و اعمال کو بھی اسی بنا پر صحیح اور درست سمجھتے ہیں جو کہ واقع میں بالکل غلط ہے، تو پھر ذبح کے معاملہ میں جب قدامت کے ساتھ اس کے قدیم ہونے کی صحیح دلیل بھی ہو تب تو اس کی صحت میں کلام ہی نہیں ہو سکتا، اور یہاں ایسا ہی ہے، کیونکہ ذبح کا طریقہ قدیم بھی ہے اور اس کے صحیح ہونے پر دلیل بھی قائم ہے، اور اگر چہ ان لوگوں کو تو آپ سے بحث اور جھگڑا کرنے کا حق نہیں مگر آپ کو ان سے خطاب کا حق ہے، اس لئے) آپ (ان کو) اپنے رب (یعنی اس کے دین) کی طرف بلاتے رہیے، آپ یقیناً صحیح راستہ پر ہیں (اور صحیح راستہ پر چلنے والے کو حق ہوتا ہے کہ غلط راستے پر چلنے والے کو اپنی طرف بلائے اور غلط راستہ والے کو یہ حق نہیں ہوتا)۔

اور اگر (اس پر بھی) یہ لوگ آپ سے جھگڑا کرتے رہیں تو آپ یہ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب جانتا ہے (وہی تم کو سمجھے گا، کیونکہ جب کوئی شخص معقول جواب کو نہ قبول کرے، نہ اس میں کوئی شبہ معقول شبہ نکال سکے اور خواہ مخواہ بحث کرے تو اس کا جواب یہی ہے کہ خدا تم کو سمجھے گا، آگے اسی کی وضاحت ہے کہ) اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان قیامت کے دن (عملی) فیصلہ فرما دے گا جن چیزوں میں تم اختلاف کرتے تھے۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا: اس جیسی آیت چار رکوع پہلے بھی آ چکی ہے مگر چونکہ دونوں کے مقصود کا علیحدہ علیحدہ ہونا خلاصہ تفسیر کی تقریر سے ظاہر ہے اس لیے تکرار لازم نہیں آیا۔

وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ: اس میں صوفیاء عارفین کی اس عادت کی تائید ملتی ہے کہ جب ان سے کوئی مخالف معاند الجھ جاتا ہے تو وہ اس سے بحث و مباحثہ میں نہیں پڑتے۔

* * *

**فائدہ:** تمام انبیاء اصولِ دین میں متفق رہے ہیں، البتہ ہر امت کے لیے اللہ تعالیٰ نے بندگی کی صورتیں مختلف زمانوں میں مختلف مقرر کی ہیں، جن کے موافق وہ امتیں خدا کی عبادت بجالاتی رہیں، اس امت محمدی کے لیے بھی ایک خاص شریعت بھیجی گئی لیکن اصل دین ہمیشہ سے ایک ہی رہا، بجز اللہ کے کبھی کسی دوسری چیز کی عبادت مقرر نہیں کی گئی، اس لیے توحید وغیرہ کے ان متفق علیہ کاموں میں جھگڑا کرنا کسی کو کسی حال زیبا نہیں، جب ایسی کھلی ہوئی چیز میں بھی حجتیں نکالی جائیں تو آپ کچھ پروانہ کریں، آپ جس سیدھی راہ پر قائم ہیں لوگوں کو اسی طرف بلاتے رہیے اور خواہ مخواہ کے جھگڑے نکالنے والوں کا معاملہ خدائے واحد کے سپرد کیجئے، وہ خود ان کی تمام حرکات سے واقف ہے، قیامت کے دن ان کے تمام اختلافات اور جھگڑوں کا عملی فیصلہ کر دے گا۔ آپ دعوت و تبلیغ کا فرض ادا کر کے ان کی فکر میں زیادہ دردسری نہ اٹھائیں، ایسے ضدی معاندین کا علاج خدا کے پاس ہے

**تنبیہ:** فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جب ہر امت کے لیے اللہ تعالیٰ نے جداگانہ دستور العمل مقرر کیا ہے، پھر اس پیغمبر کی امت کے لیے نئی شریعت آئی تو جھگڑنے کی کیا بات ہے، بعض مفسرین نے ''مَنْسَكٌ'' کے معنی ذبح و قربانی کے لیے ہیں، مگر اقرب وہ ہی ہے جو مترجم محقق قدس اللہ روحہ نے اختیار فرمایا، واللہ اعلم۔

| |
|---|
| اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝٧٠ |
| کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ ہے آسمان اور زمین میں، یہ سب لکھا ہوا ہے کتاب میں، یہ اللہ پر آسان ہے |

**خلاصہ تفسیر:** (آگے اسی کی تائید ہے کہ) اے مخاطب! کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ سب چیزوں کو جانتا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے (اور علم الٰہی میں محفوظ ہونے کے ساتھ یہ بھی) یقینی بات ہے کہ یہ (یعنی ان کے سب اقوال و اعمال) نامہ اعمال میں (بھی محفوظ) ہے (پس) یقیناً (ثابت ہو گیا کہ) یہ (فیصلہ کرنا) اللہ تعالیٰ کے نزدیک (بہت) آسان ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی کچھ ان کے اعمال پر منحصر نہیں، اللہ تعالیٰ کا علم تو زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو محیط ہے اور بعض مصالح اور حکمتوں کی بناء پر اسی علم کے موافق تمام واقعات ''لوح محفوظ'' میں اور بنی آدم کے تمام اعمال ان کے اعمالناموں میں لکھ بھی دیے گئے ہیں، اس کے موافق قیامت کے دن فیصلہ ہوگا، اور اتنی بیشمار چیزوں کا ٹھیک ٹھیک جاننا اور لکھ دینا اور اسی کے مطابق ہر ایک کا فیصلہ کرنا، ان میں سے کوئی بات اللہ کے ہاں مشکل نہیں، جس میں کچھ تکلیف یا دقت اٹھانی پڑے۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴿۷۱﴾

اور پوجتے ہیں اللہ کے سوا اس چیز کو جس کی سند نہیں اتاری اس نے اور جس کی ان کو خبر نہیں ۱؎ اور بے انصافوں کا کوئی نہیں مددگار ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے توحید کا بیان تھا، اب آگے شرک کا رد ہے

اور یہ (مشرک لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جن (کی عبادت کے جواز) پر اللہ تعالیٰ نے کوئی حجت (اپنی کتاب میں) نہیں بھیجی، اور نہ ان کے پاس اس کی کوئی (عقلی) دلیل ہے، اور (قیامت میں جب ان کو شرک پر سزا ہونے لگے گی تو) ان ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا (نہ قول سے کہ ان کے فعل کے اچھے ہونے پر کوئی حجت پیش کر سکے، نہ عمل سے کہ انہیں عذاب سے بچالے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ محض باپ دادوں کی کورانہ تقلید میں ایسا کرتے ہیں، کوئی نقلی یا عقلی دلیل نہیں رکھتے۔

**فائدہ:** ۲؎ سب سے بڑا ظلم اور بے انصافی یہ ہے کہ خدا کا کوئی شریک ٹھہرایا جائے، سو ایسے ظالم اور بے انصاف لوگ خوب یاد رکھیں کہ ان کے شرکاء مصیبت پڑنے پر کچھ کام نہ آئیں گے نہ اور کوئی اس وقت مدد کر سکے گا۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ؕ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ

اور جب سنائیے ان کو ہماری آیتیں صاف تو پہچانے تو منکروں کے منہ کی بُری شکل، نزدیک ہوتے ہیں کہ حملہ کر پڑیں

بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ؕ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ ؕ

ان پر جو پڑھتے ہیں ان کے پاس ہماری آیتیں ۱؎ تو کہہ میں تم کو بتلاؤں ایک چیز اس سے بدتر، وہ آگ ہے

ع ۹/۸ ۱۶ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۲﴾

اس کا وعدہ کر دیا ہے اللہ نے منکروں کو، اور وہ بہت بری ہے پھر جانے کی جگہ ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (ان لوگوں کو اسی گمراہی اور اہل حق سے عناد رکھنے میں یہاں تک غلو ہے کہ) جب ان لوگوں کے سامنے ہماری آیتیں (توحید وغیرہ کے متعلق) جو کہ (اپنے مضامین میں) خوب واضح ہیں (اہل حق کی زبان سے) پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو تم کافروں کے چہروں میں (باطنی ناگواری کی وجہ سے) برے آثار دیکھتے ہو (جیسے چہرے پر بل پڑ جانا، ناک چڑھ جانا، تیور بدل جانا اور ان آثار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) قریب ہے کہ یہ ان لوگوں پر (اب) حملہ کر بیٹھیں (گے) جو ہماری آیتیں ان کے سامنے پڑھ رہے ہیں (یعنی حملہ کا شبہ ہمیشہ ہوتا ہے، اور بسا اوقات اس حملہ کا ثبوت بھی ہوا ہے، پس یَکَادُوْنَ استمرار کے اعتبار سے فرمایا) آپ (ان مشرکین سے) کہیے کہ (تم کو جو یہ آیات قرآنی سن کر ناگواری ہوئی تو) کیا میں تم کو اس (قرآن) سے (بھی) زیادہ ناگوار چیز بتلا دوں؟ وہ دوزخ ہے (کہ) اس کا اللہ تعالیٰ نے کافروں سے وعدہ کیا ہے، اور وہ برا ٹھکانا ہے (یعنی قرآن سے ناگواری کا نتیجہ ناگوار دوزخ ہے، اس ناگواری کا علاج تو غیظ وغضب اور انتقام سے کچھ کر لیتے ہو، مگر اُس ناگواری کا کیا علاج کرو گے جو دوزخ سے ہوگی)۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ: اس سے ان مدعیان تصوف کی مذمت بھی نکلتی ہے کہ جب ان کے سامنے ان کے رد کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو ان کے چہروں پر ناگواری کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں اور ایسے لوگ اس زمانہ میں کثرت سے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی قرآن کی آیتیں (جو توحید وغیرہ کے صاف بیانات پر مشتمل ہیں) سن کر کفار و مشرکین کے چہرے بگڑ جاتے اور مارے ناخوشی کے تیوریاں بدل جاتی ہیں، حتی کہ شدتِ غیظ وغضب سے پاگل ہو کر چاہتے ہیں کہ آیات سنانے والوں پر حملہ کردیں۔ چنانچہ بعض اوقات کر بھی گزرتے ہیں۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی تمہارے اس غیظ وغضب اور ناگواری سے بڑھ کر جو آیات اللہ کے پڑھے جانے پر پیدا ہوتی ہے، ایک سخت بری ناگوار چیز اور ہے جس پر کسی طرح صبر ہی نہ کرسکو گے اور وہ دوزخ کی آگ ہے جس کا وعدہ کافروں سے کیا جاچکا ہے، دونوں کا موازنہ کرکے فیصلہ کرلو کہ کونسا تلخ گھونٹ پینا تم کو نسبۃً آسان ہوگا۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا

اے لوگو ایک مثل کہی ہے سو اس پر کان رکھو۱؎ جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوائے ہرگز نہ بنا سکیں گے ایک مکھی

وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ

اگرچہ سارے جمع ہوجائیں، اور اگر کچھ چھین لے ان سے مکھی چھڑا نہ سکیں وہ اس سے، بودا ہے چاہنے والا

وَالْمَطْلُوْبُ ۝ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝

اور جن کو چاہتا ہے ۲؎ اللہ کی قدر نہیں سمجھے جیسی اس کی قدر ہے، بیشک اللہ زور آور ہے زبردست ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** (اب ایک بدیہی دلیل سے شرک کو باطل کیا جاتا ہے کہ) اے لوگو! ایک عجیب بات بیان کی جاتی ہے اس کو کان لگا کر سنو (وہ یہ ہے کہ) اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جن کی تم لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو وہ ایک (ادنیٰ) مکھی کو تو پیدا کر ہی نہیں سکتے گو سب کے سب بھی (کیوں نہ) جمع ہوجائیں اور (پیدا کرنا تو بڑی بات ہے وہ تو ایسے عاجز ہیں کہ) اگر ان سے مکھی کچھ (ان کے چڑھاوے میں سے) چھین لے جائے تو اس کو (تو) اس سے چھڑا (ہی) نہیں سکتے، ایسا عابد بھی لچر اور ایسا معبود بھی لچر (افسوس ہے) ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی جیسی تعظیم کرنا چاہئے تھی (کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرتے) وہ نہ کی (کہ شرک کرنے لگے، حالانکہ) اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا سب پر غالب ہے (تو عبادت خالص خدا کا حق تھا، نہ اس کا جو کہ قوی اور غالب نہیں جس کا عاجز ہونا واضح طریقہ سے معلوم ہوچکا)۔

**وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا:** اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ مخاطب کی اصلاح میں اس کے فہم واستعداد کی رعایت رکھی جائے، چنانچہ اس مثال سے ظاہر ہے کہ ان کی فہم سمجھ کے مطابق مثال لائی گئی، روح المعانی میں ہے کہ اس میں ان لوگوں کی مذمت کی طرف اشارہ ہے جو اولیاء اللہ کے معاملہ میں غلو کرتے ہیں کہ ان سے مدد مانگتے ہیں اور ان کی منتیں مانتے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یہ توحید کے مقابلہ میں شرک کی شناعت وقبح ظاہر کرنے کے لیے مثال بیان فرمائی جسے کان لگا کر سننا اور غور وفکر سے سمجھنا چاہیے تاکہ ایسی رکیک وذلیل حرکت سے باز رہو۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی مکھی بہت ہی ادنیٰ اور حقیر جانور ہے۔ جن چیزوں میں اتنی بھی قدرت نہیں کہ سب مل کر ایک مکھی پیدا کردیں، یا مکھی ان کے چڑھاوے وغیرہ میں سے کوئی چیز لے جائے تو اس سے واپس لے سکیں ان کو خالق السموات والارضین کے ساتھ معبودیت اور خدائی کی کرسی پر بٹھا دینا کس قدر بے حیائی، حماقت اور شرمناک گستاخی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مکھی بھی کمزور مکھی سے زیادہ ان کے بت کمزور اور بتوں سے بڑھ کر ان کا پوجنے والا کمزور ہے جس نے ایسی حقیر اور کمزور چیز کو اپنا معبود وحاجت روا بنالیا۔

**فائدہ:** ۳؎ سمجھتے تو ایسی گستاخی کیوں کرتے، کیا اللہ کی شان رفیع اور قدر ومنزلت اتنی ہے کہ ایسی کمزور چیزوں کو اس کا ہمسر بنا دیا جائے؟ (العیاذ باللہ) اس کی قوت وعزت کے سامنے تو بڑے بڑے مقرب فرشتے اور پیغمبر بھی مجبور و بےبس ہیں، آگے ان کا ذکر کیا ہے:

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰۗىِٕكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۷۵

اللہ چھانٹ لیتا ہے فرشتوں میں پیغام پہنچانے والے اور آدمیوں میں ۱؎ اللہ سنتا دیکھتا ہے ۲؎

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۷۶

جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے، اور اللہ تک پہنچ ہے ہر کام کی ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے توحید کا بیان تھا اس کے بعد شرک کی تردید کی گئی، اب رسالت کے متعلق مشرکین کے ایک خاص شبہ کا جواب دیا جاتا ہے، مشرکین کہتے تھے کہ رسول کوئی فرشتہ ہونا چاہیے تھا، رسالت کے لیے انسان مناسب نہیں۔

اللہ تعالیٰ (کو اختیار ہے رسالت کے لئے جس کو چاہتا ہے) منتخب کر لیتا ہے فرشتوں میں سے (جن فرشتوں کو چاہے) احکام (الٰہیہ نبیوں کے پاس) پہنچانے والے (مقرر فرما دیتا ہے) اور (اسی طرح) آدمیوں میں سے بھی (جس کو چاہے عام لوگوں کی طرف احکام پہنچانے کے لیے مقرر کر دیتا ہے، یعنی رسالت کا مدار اللہ کے انتخاب پر ہے، اس میں فرشتہ ہونے کی خصوصیت نہیں، بلکہ جس طرح فرشتہ رسول ہو سکتا ہے جس کو مشرکین بھی مانتے ہیں چنانچہ فرشتوں کے رسول ہونے کی وہ خود تجویز کرتے تھے، اسی طرح انسان بھی رسول ہو سکتا ہے، رہا یہ کہ انتخاب کسی ایک شخص کے ساتھ کیوں واقع ہوا؟ اس کا ظاہری سبب تو ان رسولوں کے احوال کی خصوصیات ہیں اور حقیقی سبب خدا کا ارادہ ہے، اور یہ) یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ خوب سننے والا خوب دیکھنے والا ہے (یعنی) وہ ان (سب فرشتوں اور آدمیوں) کی آئندہ اور گزشتہ حالتوں کو (خوب) جانتا ہے (تو موجودہ حالت کو تو بدرجہ اولیٰ جانے گا، غرض سب احوال اس کو معلوم ہیں، ان میں سے بعض کے حالات اس انتخاب کے مقتضی ہو گئے) اور (حقیقی سبب اس کا یہ ہے کہ) تمام کاموں کا مدار اللہ ہی پر ہے (یعنی وہ مالک مستقل بالذات و فاعل مختار ہے، اس کا ارادہ خود ہر چیز کی ترجیح کے لیے کافی ہے، اس ارادہ کے لئے کسی مرجح کی ضرورت نہیں، پس حقیقی سبب خدا تعالیٰ کا ارادہ ہے، اور اس کا سبب پوچھنا لغو ہے جیسا کہ ارشاد ہے: **لا یسئل عما یفعل**، یعنی اللہ تعالیٰ سے اس کے کسی فعل کا سبب دریافت کرنے کا کسی کو حق نہیں)۔

**اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰۗىِٕكَةِ رُسُلًا:** انبیاء علیہم السلام کے پاس پیغام خداوندی لانے والے مشہور قول پر جبریل علیہ السلام ہیں، پھر یہاں فرشتوں میں چند رسول ہونے کا کیا مطلب ہے؟ جواب یہ ہے کہ آیات وروایات سے ثابت ہے کہ بعض پیغاموں کے واسطے دوسرے فرشتے بھی بھیجے گئے ہیں، البتہ قرآن مجید پورا یقینا حضرت جبریل علیہ السلام ہی لائے ہیں، کیونکہ ارشاد ہے: **نزل به الروح الامین**، بلکہ دوسری خدائی کتابیں بھی غالبا حضرت جبریل علیہ السلام ہی لائے ہیں، لیکن وحی قرآن اور مشہور کتابوں ہی میں منحصر نہیں، ان کے علاوہ کسی دوسرے پیغام کے واسطے دوسرے ملائکہ بھی بھیجے گئے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی بعض فرشتوں سے پیغامبری کا کام لیتا ہے (مثلاً جبرائیل علیہ السلام) اور بعض انسانوں سے جن کو خدا اس منصب کے لیے انتخاب فرمائے گا، ظاہر ہے ان کا درجہ دوسری تمام خلائق سے اعلیٰ ہونا چاہیے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی ان کی تمام باتوں کو اور ان کے ماضی و مستقبل کے تمام احوال کو دیکھتا ہے اس لیے وہ ہی حق رکھتا ہے کہ جس کے احوال و استعداد پر نظر کر کے منصب رسالت پر فائز کرنا چاہیے فائز کر دے اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی ساری

خلق میں بہتر وہ لوگ ہیں پیغام پہنچانے والے، فرشتوں میں بھی وہ فرشتے اعلیٰ ہیں، ان کو (یعنی ان کی ہدایات کو) چھوڑ کر بتوں کو مانتے ہو" کس قدر بے تکی بات ہے۔

**فائدہ:** ۳ یعنی وہ بھی اختیار نہیں رکھتے، اختیار ہر چیز میں اللہ کا ہے (کذا فی الموضح)۔

| |
|---|
| يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۷۷﴾ السجدة |
| اے ایمان والو رکوع کرو اور سجدہ کرو اور بندگی کرو اپنے رب کی اور بھلائی کرو تا کہ تمہارا بھلا ہو |

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے اہم اصول یعنی توحید، رسالت اور آخرت کو ثابت کیا اور ہر ایک کے متعلق شبہات کا جواب بیان ہوا، اب سورت کے اختتام پر پہلے فروعی احکام کا حکم دیا، پھر ملت ابراہیمی پر استقامت کا حکم دیا گیا جو کہ اسلام کے اصولی و فروعی احکام کا حاصل ہے، اور اس کی ترغیب کے لئے بعض مضامین ارشاد فرما کر سورت مکمل فرمائی۔

اے ایمان والو! (تم اسلام کے اصولی احکام قبول کرنے کے بعد فروعی احکام کی بھی پابندی رکھو، خصوصاً نماز کی، پس تم) رکوع کیا کرو اور سجدہ کیا کرو اور (عموماً دوسرے فروعی احکام بھی بجالا کر) اپنے رب کی عبادت کیا کرو، اور (جو افعال اپنی ذات سے عبادت نہیں ہیں، بلکہ مباح ہیں لیکن کسی عارض کی وجہ سے مثلاً نیک نیتی یا دوسروں کو مفید ہونے کی وجہ سے عبادت ہوجاتے ہیں تم ایسے) نیک کام (بھی) کیا کرو، امید (یعنی وعدہ) ہے کہ تم فلاح پاؤ گے۔

* * *

**فائدہ:** شرک کی تقبیح اور مشرکین کی تفضیح کے بعد مومنین کو خطاب فرماتے ہیں کہ تم اکیلے اپنے رب کی بندگی پر لگے رہو، اسی کے آگے جھکو، اسی کے حضور میں پیشانی ٹیکو، اور اسی کے لیے دوسرے بھلائی کے کام کرو، تا کہ دنیا اور آخرت میں تمہارا بھلا ہو۔

| |
|---|
| وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ |
| اور محنت کرو اللہ کے واسطے جیسی کہ چاہیے اس کے واسطے محنت ۱ اس نے تم کو پسند کیا ۲ اور نہیں رکھی تم پر دین میں کچھ مشکل ۳ |
| مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ |
| دین تمہارے باپ ابراہیم کا ۴ اسی نے نام رکھا تمہارا مسلمان، پہلے سے اور اس قرآن میں ۵ تا کہ رسول ہو |
| شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۖۚ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ |
| بتانے والا تم پر اور تم ہو بتانے والے لوگوں پر ۶ سو قائم رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ |
| وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۷۸﴾ ع |
| اور مضبوط پکڑو اللہ کو، وہ تمہارا مالک ہے، سو خوب مالک ہے اور خوب مددگار ہے۔ |

**خلاصہ تفسیر:** اور (ان کاموں کو سستی اور بے دلی سے مت کرو، بلکہ) اللہ کے کام میں خوب کوشش کیا کرو جیسا کوشش کرنے کا حق ہے (کیونکہ دین میں کوشش کرنے کے اسباب موجود ہیں اور رکاوٹ کوئی ہے نہیں چنانچہ) اس نے تم کو (دوسری امتوں سے) ممتاز فرمایا (جیسا کہ

آیت: جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا میں مذکور اور احادیث میں مشہور ہے) اور (اس نے) تم پر دین (کے احکام) میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی (چنانچہ فقہ میں احکام رخصت میں نظر کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے، پس اگر تنگی ہوتی تو بھی کسی درجہ میں وہ پوری کوشش میں رکاوٹ بنتی، لیکن اب تو رکاوٹ بھی نہیں)۔

(اور اے ایمان والو! جس اسلام کا تم کو حکم دیا گیا ہے کہ احکام کی پوری بجا آوری ہو اور یہی ملت ابراہیمی بھی ہے) تم اپنے باپ ابراہیم کی (اس) ملت پر (ہمیشہ) قائم (بھی) رہو (پیچھے اسلام لانے کا حکم تھا اور یہاں اس کے باقی رکھنے کا حکم ہے، آگے اس مذکورہ امتیاز کے ایک فرد کا بیان ہے کہ) اس (اللہ) نے تمہارا لقب مسلمان رکھا (قرآن کے نازل ہونے سے) پہلے بھی اور اس (قرآن) میں بھی (چنانچہ ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے: امة مسلمة لك کہلوایا، اور شاید دوسری آسمانی کتابوں میں بھی ہو، اور قرآن میں تو جا بجا آیا ہے، اللہ تعالی کا مقرر کیا ہوا یہ لقب نسبت اور فائدہ سے خالی نہیں ہوسکتا، تو بدیہی طور پر امت محمدیہ میں انقیاد و اتباع کا مادہ زیادہ ہوگا، پس ہم نے تمہارے میں اطاعت کا مادہ اس لیے زیادہ رکھا) تاکہ (تم اس سے کمالات حاصل کرو جس سے دنیا میں شرف و امتیاز حاصل ہونے کے علاوہ آخرت میں بھی تمہارا بڑا اشرف ظاہر ہو کہ جس مقدمہ کا آگے ذکر آتا ہے اس میں) تمہارے (قابل شہادت اور معتبر ہونے کے) لئے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) گواہ ہوں اور (اس شہادت رسول سے قبل) تم (ایک بڑے مقدمہ میں جس میں ایک فریق حضرات انبیاء ہوں گے اور دوسرا فریق ان کی مخالف قومیں ہوں گی، ان مخالف) لوگوں کے مقابلہ میں گواہ (تجویز) ہو (اور رسول کی شہادت سے تمہاری شہادت کی تصدیق ہو اور حضرات انبیاء کے حق میں فیصلہ ہو، اور مخالفین مجرم قرار پا کر سزایاب ہوں، اور اس بات کا اعلی درجہ کی عزت ہونا ظاہر ہے) سو (جب ہم نے تم پر ایسی ایسی عنایتیں کی ہیں تو تم بھی ہمارے احکام کی پوری بجا آوری کرو، پس) تم لوگ (خصوصیت کے ساتھ) نماز کی پابندی رکھو (جو کہ بدنی عبادت میں افضل ہے) اور زکوۃ دیتے رہو (جو کہ مالی عبادت میں افضل ہے) اور (بقیہ تمام احکام میں بھی) اللہ ہی کو مضبوط پکڑے رہو (یعنی عزم و ہمت کے ساتھ دین کے احکام بجالاؤ، دین کے کاموں میں خدا کے سوا کسی کی رضا و ناراضی یا اپنے نفس کے نفع ونقصان کی طرف توجہ مت کرو) وہ تمہارا کارساز ہے (کسی کی مخالفت تمہیں حقیقۃً نقصان نہ دے گی) سو کیسا اچھا کارساز ہے اور کیسا اچھا مددگار ہے۔

ایسی ذات کے ساتھ تو یہ معاملہ رکھنا چاہیے:

مصلحت دید من آن ست کہ یاراں همہ کار بگزارند وخم طرہ یارے گیرند

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ: روح المعانی میں ہے کہ یہ ہر قسم کے مجاہدات کو شامل ہے، مثلاً مجاہدہ نفس، مجاہدہ قلب اور مجاہدہ روح، مجاہدہ نفس سے مراد ہر قسم کے حقوق ادا کرنا جو بندہ پر واجب ہیں اور لذات و شہوات سے اپنے نفس کو پاک رکھنا مجاہدہ قلب سے مراد دل کو اغراض فاسدہ سے پاک کرنا اور اغراض حسنہ سے آراستہ کرنا، مجاہدہ روح سے مراد اپنی ہستی و شخصیت کو فنا کر دینا۔

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ: اسلام کو ملت ابراہیمی کہا گیا اور ابراہیم علیہ السلام تمام امت کے حقیقی معنی میں والد نہیں ہیں اس کے باوجود ابیکم میں تمام امت کو خطاب کیا گیا، ان دونوں باتوں کی تحقیق پہلے پارہ کے آخر میں گذر چکی ہے، وہاں ملاحظہ کر لیا جائے، غرض تمام مسلمان معنی لغوی کے اعتبار سے ذریت ابراہیم تھے، بالخصوص زمانہ نبوی کے مسلمان، چونکہ وہ بقیہ مسلمانوں کے اعتبار سے دین پھیلانے کا اصل سبب ہوئے اس لیے خطاب میں ان کو غالب قرار دے کر تغلیب کا استعمال کیا گیا۔

هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ: اگرچہ لغوی معنی کے اعتبار سے دوسری مؤمن امتیں بھی اسلام کے ساتھ موصوف تھیں مگر خاص لقب کے طور پر یہی امت موصوف ہے اور دوسروں کے القاب یہود، نصاری، قوم نوح، قوم ہود اور قوم صالح وغیرہ ہیں۔

اس میں بعض صوفیا کے اس معمول کی اصل ہے کہ جو شخص ان کے حلقہ میں داخل ہوتا ہے اسے ایک اچھا لقب دیتے ہیں، بشرطیکہ تفاخر اور اہل حق سے انفرادیت مقصود نہ ہو (یعنی بعض حضرات طریقت میں چلنے والوں کو ان کے درجہ کے مطابق مختلف القابات دیتے ہیں، مثلاً کبھی ان کو سالک تو کبھی واصل اور کبھی عارف وغیرہ کہتے ہیں تو یہ صحیح ہے، لیکن ان القابات کو مقصد نہ بنائے اور نہ ان کے ذریعہ نمایاں یا منفرد ہونے کا ارادہ کرے)۔

**وَتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ**: اس کی تحقیق دوسرے پارہ کے شروع سورہ بقرہ آیت: ۱۴۳ میں گذر چکی ہے، وہاں ملاحظہ کرلیا جائے۔

* * *

**فائدہ**: ۱۔ **وَجَاهِدُوا فِي اللهِ حَقَّ جِهَادِهِ**: اپنے نفس کو درست رکھنے اور دنیا کو درستی پر لانے کے لیے پوری محنت کرو جو اتنے بڑے اہم مقصد کے شایان شان ہو، آخر دنیاوی مقاصد میں کامیابی کیلئے کتنی محنتیں اٹھاتے ہو، یہ تو دین کا اور آخرت کی دائمی کامیابی کا راستہ ہے جس میں جس قدر محنت برداشت کی جائے انصافاً تھوڑی ہے

**تنبیہ**: لفظ ''مجاہدہ'' میں ہر قسم کی زبانی، قلمی، مالی، بدنی کوشش شامل ہے۔ اور ''جہاد'' کی تمام قسمیں (جہاد مع النفس، جہاد مع الشیطان، جہاد مع الکفار، جہاد مع البغات، جہاد مع المبطلین) اس کے نیچے مندرج ہیں۔

**فائدہ**: ۲۔ **هُوَ اجْتَبٰىكُمْ**: کہ سب سے اعلیٰ و افضل پیغمبر دیا اور تمام شرائع سے اکمل شریعت عنایت کی، تمام دنیا میں خدا کا پیغام پہنچانے کے لیے تم کو چھانٹ لیا اور سب امتوں پر فضیلت بخشی۔

**فائدہ**: ۳۔ **وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ**: دین میں کوئی ایسی مشکل نہیں رکھی جس کا اٹھانا کٹھن ہو، احکام میں ہر طرح کی رخصتوں اور سہولتوں کا لحاظ رکھا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ تم خود اپنے اوپر ایک آسان چیز کو مشکل بنالو۔

**فائدہ**: ۴۔ **مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ**: ابراہیم علیہ السلام چونکہ حضور ﷺ کے اجداد میں ہیں اس لیے ساری امت کے باپ ہوئے، یا یہ مراد ہو کہ عربوں کے باپ ہیں کیونکہ اولین مخاطب قرآن کے وہ ہی تھے۔

**فائدہ**: ۵۔ **مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا**: یعنی اللہ نے پہلی کتابوں میں اور اس قرآن میں تمہارا نام ''مسلم'' رکھا (جس کے معنی حکم بردار اور وفا شعار کے ہیں) یا ابراہیم نے پہلے تمہارا یہ نام رکھا تھا جب کہ دعاء میں کہا: **وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ** اور اس قرآن میں شاید ان ہی کے مانگنے سے یہ نام پڑا ہو، بہرحال تمہارا نام ''مسلم'' ہے، گو اور امتیں بھی مسلم تھیں مگر لقب یہ تمہارا ہی ٹھہرا ہے سو اسکی لاج رکھنی چاہیے۔

**فائدہ**: ۶۔ **وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ**: یعنی پسند کیا تم کو اس واسطے کہ تم اور امتوں کو سکھاؤ اور رسول تم کو سکھائے اور یہ امت جو سب سے پیچھے آئی یہ ہی غرض ہے کہ تمام امتوں کی غلطیاں درست کرے اور سب کو سیدھی راہ بتائے، گویا جو مجد و شرف اس کو ملا ہے اسی وجہ سے ہے کہ یہ دنیا کے لیے معلم بنے اور تبلیغی جہاد کرے۔

**تنبیہ**: دوسرے مفسرین نے ''شہید'' اور ''شہداء'' کو بمعنی ''گواہ'' لیا ہے، قیامت کے دن جب دوسری امتیں انکار کریں گی کہ پیغمبروں نے ہم کو تبلیغ نہیں کی اور پیغمبروں سے گواہ مانگے جائیں گے تو وہ امت محمدیہ کو بطور گواہ پیش کریں گے، یہ امت گواہی دے گی کہ بیشک پیغمبروں نے دعوت و تبلیغ کر کے خدا کی حجت قائم کر دی تھی، جب سوال ہوگا کہ تم کو کیسے معلوم ہوا؟ جواب دیں گے کہ ہمارے نبی نے اطلاع کی جس کی صداقت پر خدا کی محفوظ کتاب (قرآن کریم) گواہ ہے، گویا یہ فضل و شرف اس لیے دیا گیا کہ تم کو ایک بڑے عظیم الشان مقدمہ میں بطور معزز گواہ کے کھڑا ہونا ہے، لیکن تمہاری گواہی کی سماعت اور وقعت بھی تمہارے پیغمبر کے طفیل میں ہے کہ وہ تمہارا تزکیہ کریں گے۔

**فائدہ**: ۷۔ **فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ**: یعنی انعامات الٰہیہ کی قدر کرو، اپنے نام و لقب اور فضل و شرف کی لاج رکھو، اور سمجھو کہ تم بہت بڑے کام کے لیے کھڑے کیے گئے ہو، اس لیے اول اپنے کو نمونہ عمل بناؤ، نماز، زکوٰۃ (بالفاظ دیگر بدنی و مالی عبادات) میں کوتاہی نہ ہونے پائے، ہر کام میں اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑے رہو، ذرا بھی قدم جادہ حق سے ادھر ادھر نہ ہو، اس کے فضل و رحمت پر اعتماد رکھو، تمام کمزور سہارے چھوڑ دو، تنہا اسی کو اپنا مولیٰ اور مالک سمجھو، اس سے اچھا مالک و مددگار اور کون ملے گا؟

**رَبِّ اجْعَلْنَا مِنْ مُّقِيْمِي الصَّلٰوةِ وَمُؤْتِي الزَّكٰوةِ وَالْمُعْتَصِمِيْنَ بِكَ وَالْمُتَوَكِّلِيْنَ**
**عَلَيْكَ فَاَنْتَ مَوْلَانَا وَنَاصِرُنَا فَنِعْمَ الْمَوْلٰى اَنْتَ وَنِعْمَ النَّصِيْرُ**

ایاتها ۱۱۸ ۲۳ سُوْرَۃُ الْمُؤْمِنُوْنَ مَکِّیَّۃٌ ۷۴ رکوعاتها ٦

**خلاصه تفسیر:** اس سورت کا خلاصہ یہ مضامین ہیں: ①اول فضیلت عبادت جوشروع ہی میں مذکور ہے ②قدرت الٰہی کے آثار کا بیان جو انعام وتوحید دونوں پر دلالت کرتا ہے ③ رسالت ونبوت کی تحقیق اوراس کے متعلق جوشبہات تھےان کا جواب ④عقیدہ آخرت اور حساب وکتاب ⑤کفار کے برے احوال کا ذکر ⑥ان مضامین میں سے اکثر کی تقویت کے لئے بعض قصوں کا بیان ⑦بعض مکارم اخلاق واعمال کی تعلیم جومضمون کے مناسب ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بےحد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

الجزء ١٨

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ① الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِہِمْ خٰشِعُوْنَ ②

کام نکال (لیا ایمان والوں نے) لے گئے ایمان والے، جو اپنی نماز میں جھکنے والے ہیں [1]۔

**خلاصه تفسیر:** گزشتہ سورت کے آخر میں اعمال خیر کے کرنے کا حکم تھا، جس میں فلاح کا وعدہ فرمایا تھا: لعلکم تفلحون اب اس سورت کا آغاز فلاح سے فرماتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ فلاح کا دارومدار ایمان اور ایمان کے شعبوں پر ہے، گزشتہ سورت کے اخیر میں جن اعمال خیر کرنے کا حکم تھا اس سے یہی ایمان کے شعبے مراد ہیں جو ان کو بجالائے گا وہ فلاح پائے گا۔

بالتحقیق ان مسلمانوں نے (آخرت میں) فلاح پائی جو (عقائد کی درستگی کے ساتھ ساتھ آئندہ آنے والی صفات کے ساتھ بھی موصوف ہیں یعنی وہ) اپنی نماز میں (خواہ فرض ہو یا غیر فرض) خشوع کرنے والے ہیں۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ: یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ صفات مذکور کے حامل مومنین کو آخرت کی کامل فلاح ملنا تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن دنیا میں فلاح تو بظاہر کفار فجار کا حصہ بنی ہوئی ہے اور ہر زمانے کے انبیاء اور ان کے بعد صلحا امت عموماً تکلیفوں میں مبتلا رہے ہیں، مگر جواب اس کا ظاہر ہے کہ دنیا میں مکمل فلاح کا تو وعدہ نہیں کہ کوئی تکلیف پیش ہی نہ آئے بلکہ کچھ نہ کچھ تکلیف تو یہاں پر صالح ومتقی کو بھی اور ہر کافر فاجر کو بھی پیش آنا ناگزیر ہے اور یہی حال حصول مراد کا ہے کہ کچھ نہ کچھ یہ مقصد بھی ہر انسان کو خواہ وہ صالح ومتقی ہو خواہ کافر و بدکار ہو حاصل ہوتا ہی ہے، پھر ان دونوں میں فلاح پانے والا کس کو کہا جائے تو اس کا اعتبار عواقب اور انجام پر ہے، دنیا کا تجربہ اور مشاہدہ شاہد ہے کہ جو اہل صلاح یہاں بیان کردہ سات اوصاف کے حامل اور ان سے متصف اور ان پر قائم ہیں گو دنیا میں وقتی تکلیف ان کو بھی پیش آجائے مگر انجام کار ان کی تکلیف جلد دور ہوتی ہے اور مراد حاصل ہوجاتی ہے، ساری دنیا ان کی عزت کرنے پر مجبور ہوتی ہے اور دنیا میں نیک نام انہی کا باقی رہتا ہے، جتنا دنیا کے حالات کا غور وانصاف سے مطالعہ کیا جائے گا ہر دور ہر زمانے ہر خطہ میں اس کی شہادتیں ملتی چلی جائیں گی۔

الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِہِمْ خٰشِعُوْنَ: خشوع کی حقیقت یعنی دل میں غیر خیالات کو ارادہ وقصد سے حاضر نہ کرے، اور دیگر اعضاء سے عبث حرکتیں نہ کرے، اور اس کی فرضیت میں کلام ہے مگر حق یہ ہے کہ نماز کا صحیح ہونا خشوع پر موقوف نہیں اور اس مرتبہ وحیثیت سے یہ فرض نہیں، اور نماز کا قبول ہونا خشوع پر موقوف ہے اور اس مرتبہ وحیثیت سے یہ فرض ہے۔

* * *

**فائدہ:** [1] ''خشوع'' کے معنی ہیں کسی کے سامنے خوف وہیبت کے ساتھ ساکن اور پست ہونا، چنانچہ ابن عباس نے: خَاشِعُوْنَ کی تفسیر ''خائفون ساکنون'' سے کی ہے اور آیت: اَنَّكَ تَرَی الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ (فصلت:۳۹) بھی

دلالت کرتی ہے کہ ''خشوع'' میں ایک طرح کا سکون وتذلل معتبر ہے، قرآن کریم میں ''خشوع'' کو وجوہ، ابصار، اصوات وغیرہ کی صفت قرار دیا ہے اور ایک جگہ آیت: اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ (الحدید:۱۶) میں قلب کی صفت بتلائی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اصل خشوع قلب کا ہے اور اعضائے بدن کا خشوع اس کے تابع ہے، جب نماز میں قلب خاشع وخائف اور ساکن وپست ہوگا تو خیالات ادھر ادھر بھٹکتے نہیں پھریں گے، ایک ہی مقصود پر جم جائیں گے، پھر خوف وہیبت اور سکون وخضوع کے آثار بدن پر بھی ظاہر ہوں گے مثلاً بازو اور سر جھکانا، نگاہ پست رکھنا، ادب سے دست بستہ کھڑا ہونا، ادھر ادھر نہ تاکنا، کپڑے یا ڈاڑھی وغیرہ سے نہ کھیلنا، انگلیاں نہ چٹخانہ، اور اسی قسم کے بہت افعال واحوال لوازم خشوع میں سے ہیں، احادیث میں حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نماز میں ایسے ساکن ہوتے تھے جیسے ایک بیجان لکڑی، اور کہا جاتا تھا کہ یہ نماز خشوع ہے، فقہاء کا اس میں اختلاف ہے کہ آیا نماز بدون خشوع کے صحیح ومقبول ہوتی ہے یا نہیں؟ صاحب روح المعانی نے لکھا ہے کہ خشوع اجزائے صلوٰۃ کے لیے شرط نہیں، ہاں! قبول صلوٰۃ کے لیے شرط ہے، میرے نزدیک یوں کہنا بہتر ہوگا کہ حسن قبول کے لیے شرط ہے، واللہ اعلم، یہاں تفصیل کا موقع نہیں، احیاء العلوم اور اس کی شرح میں تفصیل ملاحظہ کی جائے بہر حال انتہائی فلاح اور اعلیٰ کامیابی ان ہی مومنین کو حاصل ہوگی جو خشوع وخضوع کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں اور ان اوصاف سے موصوف ہیں جو آگے بیان کیے گئے ہیں۔

---

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝۳ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝۴

---

اور جو نکمی بات پر دھیان نہیں کرتے ۱؎ اور جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں ۲؎

---

**خلاصہ تفسیر:** اور جو لغو (یعنی فضول لایعنی) باتوں سے (خواہ قولی ہوں یا فعلی) برکنار رہنے والے ہیں، اور جو (اعمال واخلاق میں) اپنا تزکیہ کرنے والے ہیں۔

**وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ:** لغو کا ادنی درجہ اگرچہ جائز ہو مگر اس کا چھوڑنا بہتر اور قابل تعریف ہے، اور گناہ لغو کا اعلیٰ درجہ ہے سو اس کا چھوڑنا واجب ہے، اس سے ورع وتقوی میں مبالغہ (تقوی کا اعلیٰ ترین اہتمام) ثابت ہوتا ہے جسے اہل اللہ اختیار کرتے ہیں، یہ حضرات ایسے امور کو بھی ترک کردیتے ہیں جس میں نہ نفع ہو نہ نقصان ہو۔

**وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ:** یہاں خلاصہ تفسیر میں زکوۃ کی مشہور تفسیر اس لیے نہیں کی کیونکہ یہ آیات مکی ہیں اور زکوۃ مدینہ میں فرض ہوئی، اور اگر ان آیات کا مدنی ہونا ثابت ہوجائے جیسا کہ بعض اقوال سے سمجھ آتا ہے تو وہ تفسیر بھی صحیح ہوسکتی ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی فضول وبیکار مشغلوں میں وقت ضائع نہیں کرتے کوئی دوسرا شخص لغو اور نکمی بات کہے تو ادھر سے منہ پھیر لیتے ہیں، ان کو وظائف عبودیت سے اتنی فرصت ہی نہیں ہوتی کہ ایسے بے فائدہ جھگڑوں میں اپنے کو پھنسائیں:

چہ خوش گفت بہلول فرخندہ خو | چو بگذشت بر عارف جنگجو

گرایں مدعی دوست بشناختے | بہ پیکار دشمن نہ پرداختے

**فائدہ:** ۲؎ یعنی ان کی عادت ہے کہ ہمیشہ زکوٰۃ ادا کرتے رہتے ہیں، ایسا نہیں کہ کبھی دی کبھی نہ دی، غالباً اسی لیے يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ کی جگہ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ کی ترکیب اختیار فرمائی، گویا بتلا دیا کہ زکوٰۃ ادا کرنا ان کا مستمر کام ہے، مترجم محقق قدس اللہ روحہ نے ''دیا کرتے ہیں'' کہہ کر ادھر اشارہ کردیا، بعض مفسرین نے یہاں زکوٰۃ کو ''طہارت'' (پاکیزگی) یا تزکیہ نفس کے معنی میں لیا ہے، گویا آیت حاضرہ کو قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (الاعلیٰ:۱۴) اور قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (الشمس:۹) کے مشابہ قرار دیا ہے، اگر یہ مراد ہو تو اس کے مفہوم کو عام رکھا جائے جس میں بدن کا، دل کا اور مال کا پاک رکھنا سب داخل ہو، زکوٰۃ وصدقات بھی ایک قسم کی مالی تطہیر ہے: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (التوبہ:۱۰۳)۔ یہ کہنا کہ آیت مکی ہے اور مکہ میں زکوٰۃ فرض نہ ہوئی تھی، ابن کثیرؒ نے اس کا جواب دیا ہے کہ اصل زکوٰۃ کی مشروعیت مکہ میں ہوچکی تھی، ہاں!

مقاد یر ونصب وغیرہ کی تشخیص مدینہ پہنچ کر ہوئی، واللہ اعلم۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝۵ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ

اور جو اپنی شہوت کی جگہ کو تھامتے ہیں، مگر اپنی عورتوں پر یا اپنے ہاتھ کے مال باندیوں پر

فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝۶ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝۷

سوان پر نہیں کچھ الزام، پھر جو کوئی ڈھونڈے اس کے سوا سو وہی ہیں حد سے بڑھنے والے [1]

**خلاصہ تفسیر**: اور جو اپنی شرمگاہوں کی (حرام شہوت رانی سے) حفاظت رکھنے والے ہیں لیکن اپنی بیویوں سے یا اپنی (شرعی) لونڈیوں سے (حفاظت نہیں کرتے) کیونکہ ان پر (اس میں) کوئی الزام نہیں، ہاں! جو اس کے علاوہ (اور جگہ شہوت رانی کا) طلبگار ہو ایسے لوگ حد (شرعی) سے نکلنے والے ہیں۔

**فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ**: اگر یہ آیت مدنی ہو تو متعہ کے حرام ہونے پر بھی اس سے استدلال صحیح ہے، کیونکہ جس عورت سے متعہ کیا جائے وہ بظاہر نہ ازواج میں داخل ہے نہ باندیوں میں، اور مکی ہونے کی صورت میں اگر چہ اس سے استدلال نہیں ہوسکتا، لیکن استدلال کا مدار یہی آیت نہیں ہے، بلکہ مسلم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد صراحۃً مذکور ہے: "كنت اذنت لكم فى الاستمتاع بالنساء قد حرم الله ذلك الى يوم القيامة" میں نے تم کو عورتوں سے متعہ کرنے کی اجازت دے دی تھی، لیکن اب حق تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے حرام کر دیا، اور صحیح مسلم میں متعہ کی حرمت حضرت علیؓ کے واسطے سے بھی مروی ہے اور صحابہ کا اس پر اجماع بھی ہے، اور حضرت ابن عباسؓ نے بھی اس کی طرف رجوع کیا جس پر ابن ہمامؒ نے ان کے اس قول سے استدلال کیا ہے جو ترمذی میں منقول ہے: "انما كانت المتعة فى أول الاسلام .....فكل فرج سواهما حرام" کہ متعہ شروع اسلام میں جائز تھا یہاں تک کہ ارشاد فرمایا کہ اب بیوی اور باندی ان دونوں کے سوا ہر فرج حرام ہے، اس کے متعلق کچھ بحث سورہ نساء آیت ۲۴: وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ کے تحت ملاحظہ فرمایئے۔

* * *

**فائدہ**: [1] یعنی اپنی منکوحہ عورت یا باندی کے سواء کوئی اور راستہ قضائے شہوت کا ڈھونڈے، وہ حلال کی حد سے آگے نکل جانے والا ہے، اس میں زنا، لواطت اور استمناء بالید وغیرہ سب صورتیں آ گئیں، بلکہ بعض مفسرین نے حرمت متعہ پر بھی اس سے استدلال کیا ہے وفيه كلام طويل لا يسعه المقام، راجع روح المعانى تحت هذه الاية الكريمه۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝۸ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝۹

اور جو اپنی امانتوں سے اور اپنے قرار سے خبردار ہیں [1] اور جو اپنی نمازوں کی خبر رکھتے ہیں [2]

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝۱۰ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۱۱

وہ ہی ہیں میراث لینے والے، جو میراث پائیں گے باغ (بہشت) ٹھنڈی چھاؤں کے [3] وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے

**خلاصہ تفسیر**: اور جو اپنی (سپردگی میں لی ہوئی) امانتوں اور اپنے عہد کا (جو کسی عقد کے ضمن میں کیا ہو یا ویسے ہی ابتداءً کیا ہو) خیال رکھنے والے ہیں، اور جو اپنی (فرض) نمازوں کی پابندی کرتے ہیں (بس) ایسے ہی لوگ وارث ہونے والے ہیں، جو فردوس (بریں) کے وارث ہوں گے (اور) وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

أُولَٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ: ''وارث'' کہنے کی وجہ حدیث نبوی میں یہ ہے کہ ہر شخص کے نام پر دو گھر بنے ہوئے ہیں: ایک جنت میں، ایک جہنم میں، جو شخص جہنمی ہوگا اس کا گھر اہل جنت کو مل جائے گا، قرطبی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے، اور اگر کسی کے پاس یہ حدیث ثابت نہ ہو تو ''وارث'' کے معنی مالک ہو سکتے ہیں، یہاں جو حصر ہے کہ یہی لوگ وارث ہوں گے تو یہ فردوس کے مستحق ہونے کے اعتبار سے ہے جو کہ جنت کا اعلیٰ درجہ ہے، ورنہ نفس جنت مؤمنین کے لیے عام ہوگی اگر چہ ان صفات میں کمی ہو۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی امانت اور قول وقرار کی حفاظت کرتے ہیں، خیانت اور بدعہدی نہیں کرتے نہ اللہ کے معاملہ میں نہ بندوں کے۔

**فائدہ:** ۲ نمازیں اپنے اوقات پر آداب وحقوق کی رعایت کے ساتھ ادا کرتے ہیں، بندوں کے معاملات میں پڑ کر عبادت الٰہی سے غافل نہیں ہوتے، یہاں تک مومنین مفلحین کی چھ صفات وخصال بیان کیں: ① خشوع وخضوع سے نمازیں پڑھنا، یعنی بدن اور دل سے اللہ کی طرف جھکنا ② باطل لغو اور نکمی باتوں سے علیحدہ رہنا ③ زکوٰۃ یعنی مالی حقوق ادا کرنا یا اپنے بدن، نفس اور مال کو پاک رکھنا ④ شہوات نفسانی کو قابو میں رکھنا ⑤ امانت وعہد کی حفاظت کرنا گویا معاملات کو درست رکھنا ⑥ اور آخر میں پھر نمازوں کی پوری طرح حفاظت کرنا کہ اپنے وقت پر آداب وشروط کی رعایت کے ساتھ ادا ہوں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نماز کا حق تعالیٰ کے یہاں کیا درجہ ہے اور کس قدر مہتم بالشان چیز ہے کہ اس سے شروع کر کے اسی پر ختم فرمایا۔

**فائدہ:** ۳ جنت کے میراث ہونے پر پہلے کسی جگہ ہم لکھ چکے ہیں۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ⑫ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ⑬

اور ہم نے بنایا آدمی کو چنی ہوئی مٹی سے ۱ پھر ہم نے رکھا اس کو پانی کی بوند کر کے ایک جمے ہوئے ٹھکانہ میں ۲

**خلاصہ تفسیر:** گزشتہ آیات میں کامیاب مومنین کے لیے جنت الفردوس کا وعدہ تھا تو منکرین حشر اس بات کو نہیں مانتے تھے، اس لیے اب آئندہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی ابتدائی پیدائش کا حال ذکر فرمایا تاکہ اس کی کمال قدرت ثابت ہو اور قیامت کے لیے دلیل بنے اور انسان کو اپنا مبداء اور معاد معلوم ہو جائے، تاکہ عابد کو اپنے معبود کی کامل معرفت حاصل ہو اور عبادت کا پورا حق ادا کیا جائے۔

(پہلے انسان کی ایجاد کا بیان ہے) اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ (غذا) سے بنایا (یعنی اول مٹی ہوتی ہے، پھر اس سے نباتات کے ذریعہ غذا حاصل ہوتی ہے) پھر ہم نے اس کو نطفہ سے بنایا جو کہ (ایک معین مدت تک) ایک محفوظ مقام (یعنی رحم) میں رہا (اور وہ غذا سے حاصل ہوا تھا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ کیونکہ سب کے باپ حضرت آدم علیہ السلام منتخب مٹی سے پیدا ہوئے اور ویسے بھی تمام بنی آدم نطفہ سے پیدا ہوتے ہیں اور نطفہ بھی مٹی سے نکلی ہوئی غذاؤں کا خلاصہ ہے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی رحم مادر میں جہاں سے کہیں ہل نہ سکے۔

ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ

پھر بنایا اس بوند سے لہو جما ہوا پھر بنائی اس لہو جمے ہوئے سے گوشت کی بوٹی پھر بنائیں اس بوٹی سے ہڈیاں پھر پہنایا ان ہڈیوں پر

لَحْمًا ۖ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ⑭

گوشت ۱ پھر اٹھا کھڑا کیا اس کو ایک نئی صورت میں ۲ سو بڑی برکت اللہ کی جو سب سے بہتر بنانے والا ہے ۳

**خلاصہ تفسیر:** پھر ہم نے اس نطفہ کو خون کا لوتھڑا بنایا، پھر ہم نے اس خون کے لوتھڑے کو (گوشت کی) بوٹی بنادیا، پھر ہم نے

اس بوٹی (کے بعض اجزاء) کو ہڈیاں بنادیا، پھر ہم نے ان ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا (جس سے وہ ہڈیاں ڈھک گئیں) پھر (ان سب انقلابات کے بعد) ہم نے (اس میں روح ڈال کر) اس کو ایک دوسری ہی (طرح کی) مخلوق بنادیا (جو سابقہ حالات سے نہایت ہی منفرد ہے، کیونکہ اس سے پہلے جماد تھا، پھر نبات ہوا، ان دونوں میں فرق ہے، اور اب یہ ایک ذی حیات زندہ انسان بن گیا) سوکیسی شان ہے اللہ کی جو تمام صناعوں سے بڑھ کر ہے (کیونکہ دوسرے صناع تو اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں صرف جوڑتوڑ ہی کر سکتے ہیں، زندگی پیدا کرنا یہ خاص اللہ ہی کا کام ہے اور نطفہ پر مذکورہ تغیرات اور انقلاب کی تفصیل اسی ترتیب کے ساتھ قانون وغیرہ کی کتب طب میں بھی مذکور ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی کچھ حصہ گوشت کا سخت کر کے ہڈیاں بنادیں، اور ہڈیوں کے ڈھانچے پر پھر گوشت پوست منڈھ دیا، سورہ حج میں اسی کے قریب کیفیت تخلیق انسان کی بیان ہو چکی ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی روح حیات پھونک کر ایک جیتا جاگتا انسان بنادیا، جس پر آگے چل کر بچپن، جوانی، کہولت اور بڑھاپے کے بہت سے احوال وادوار گزرتے ہیں۔

**فائدہ:** ۳؎ جس نے نہایت خوبصورتی سے تمام اعضاء وقویٰ کو بہترین سانچے میں ڈھالا اور اس کی ساخت عین حکمت کے موافق نہایت موزوں متناسب بنائی۔

**ثُمَّ اِنَّكُمۡ بَعۡدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوۡنَ ؕ﴿۱۵﴾ ثُمَّ اِنَّكُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ تُبۡعَثُوۡنَ ﴿۱۶﴾**

پھر تم اس کے بعد مروگے ۱؎ پھر تم قیامت کے دن کھڑے کیے جاؤ گے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** (اب انسان کے آخری انجام یعنی فنا کا بیان ہے) پھر تم اس (تمام عجیب قصہ) کے بعد ضرور ہی مرنے والے ہو (آگے بیان ہے اعادہ کا یعنی) پھر تم قیامت کے روز دوبارہ زندہ کئے جاؤ گے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی تمہارا وجود ذاتی اور خانہ زاد نہیں، مستعار اور دوسرے کا عطیہ ہے، چنانچہ موت آ کر سب نقشہ بگاڑ دیتی ہے، تم اس وقت اس کے زبردست پنجہ سے اپنی ہستی کو نہیں بچا سکتے، یقینا کوئی اور قاہر طاقت تمہارے اوپر ہے جس نے وجود کی باگ اپنے ہاتھ میں تھام رکھی ہے جب چاہے ڈھیلی چھوڑ دے، جب چاہے کھینچ لے۔

**فائدہ:** ۲؎ جس نے پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا وہ ہی دوبارہ بنا کر کھڑا کرے گا، تا کہ پہلے وجود کی مستور قوتیں اور اعمال کے نتائج اپنی کامل ترین صورتوں میں ظاہر ہو کر ثابت کر دیں کہ یہ اتنا بڑا کارخانہ کوئی بیکار اور بے نتیجہ ڈھونگ نہیں بنایا گیا تھا۔

**وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا فَوۡقَكُمۡ سَبۡعَ طَرَآئِقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الۡخَلۡقِ غٰفِلِيۡنَ ﴿۱۷﴾**

اور ہم نے بنائے ہیں تمہارے اوپر سات راستے ۱؎ اور ہم نہیں ہیں خلق سے بے خبر ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (جس طرح ہم نے تمہیں ابتداءً وجود عطا فرمایا، اسی طرح تمہاری بقا کا سامان بھی کیا کہ) ہم نے تمہارے اوپر سات آسمان (جن میں فرشتوں کی آمد و رفت کے لیے راستے ہیں) بنائے (کہ اس سے تمہاری بھی بعض مصلحتیں متعلق ہیں) اور ہم مخلوق (کی مصلحتوں) سے بے خبر نہ تھے (بلکہ ہر مخلوق کو مصالح وحکم کی رعایت کر کے بنایا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ طرائق کے معنی بعض مفسرین ولغویین کے نزدیک طبقات کے ہیں، یعنی آسمان کے ساتھ طبقے اوپر نیچے بنائے فھذا کما

قال: كَيۡفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًاۙ (نوح:۱۵) اور بعض نے طرائق کو راستوں کے معنی میں لیا ہے، یعنی سات آسمان بنائے جو فرشتوں کی گزرگاہیں ہیں، بعض معاصر مصنفین نے سبع طرائق سے سات سیاروں کے مدارات مراد لیے ہیں، واللہ اعلم۔

**فائدہ:** ۲؎ ہر چیز پورے انتظام واحکام اور خبرداری سے بنائی ہے اور اس کی حفاظت وبقاء کے طریقوں سے ہم پورے باخبر ہیں، اجرام سماویہ اور مخلوقاتِ سفلیہ میں کوئی چیز نہیں جو ہمارے احاطہ علم وقدرت سے باہر ہو، ورنہ سارا انتظام ہی درہم برہم ہو جائے: يَعۡلَمُ مَا يَلِجُ فِي الۡاَرۡضِ وَمَا يَخۡرُجُ مِنۡهَا وَمَا يَنۡزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعۡرُجُ فِيۡهَا وَهُوَ مَعَكُمۡ اَيۡنَ مَا كُنۡتُمۡ (الحدید:۴)

وَ اَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسۡكَنّٰهُ فِي الۡاَرۡضِ ۖ وَ اِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوۡنَ ۚ﴿۱۸﴾

اور اتارا ہم نے آسمان سے پانی ناپ کر ۱؎ پھر اس کو ٹھہرا دیا زمین میں ۲؎ اور ہم اس کو لے جائیں تو لے جاسکتے ہیں ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** اور ہم نے (انسان کی بقاء اور نشوونما کے لئے) آسمان سے (مناسب) مقدار کے ساتھ پانی برسایا، پھر ہم نے اس کو (مدت تک) زمین میں ٹھہرایا (چنانچہ کچھ پانی تو زمین کے اوپر رہتا ہے اور کچھ اتر جاتا ہے جو وقتاً فوقتاً نکلتا رہتا ہے) اور ہم (جس طرح اس کے برسانے پر قادر ہیں اسی طرح) اس (پانی) کے معدوم کردینے پر (بھی) قادر ہیں (خواہ اس طرح کہ پانی کو ہوا بنا کر اڑا دیں یا اتنی دور زمین کے اندر اتار دیں تاکہ آلات وغیرہ کے ذریعہ سے نہ نکال سکو مگر ہم نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس کو باقی رکھا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ نہ اس قدر زیادہ کہ دنیا بے وقت اور بے موقع تباہ ہو جائے، اور نہ اتنا کم کہ ضروریات کو کافی نہ ہو۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی بارش کا پانی زمین اپنے اندر جذب کر لیتی ہے جس کو ہم کنواں وغیرہ کھود کر نکالتے ہیں۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی نہ اتارنا چاہیں تو نہ اتاریں اور اتارنے کے بعد تم کو اس سے منتفع ہونے کی دسترس نہ دیں مثلاً اس قدر گہرا کر دیں کہ تم نکالنے میں کامیاب نہ ہوسکو، یا خشک کر کے ہوا میں اڑا دیں، یا کھاری اور کڑوا کر دیں، تو ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔

وقف لازم فَاَنۡشَاۡنَا لَكُمۡ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنۡ نَّخِيۡلٍ وَّاَعۡنَابٍ ۘ لَكُمۡ فِيۡهَا فَوَاكِهُ كَثِيۡرَةٌ وَّمِنۡهَا تَاۡكُلُوۡنَ ۙ﴿۱۹﴾

پھر اگا دیے تمہارے واسطے اس سے باغ کھجور اور انگور کے، تمہارے واسطے ان میں میوے ہیں بہت اور انہی میں سے کھاتے ہو ۱؎

وَشَجَرَةً تَخۡرُجُ مِنۡ طُوۡرِ سَيۡنَآءَ تَنۡۢبُتُ بِالدُّهۡنِ وَصِبۡغٍ لِّلۡاٰكِلِيۡنَ ﴿۲۰﴾

اور وہ درخت جو نکلتا ہے سینا پہاڑ سے لے اگتا ہے تیل اور روٹی ڈبونا (سالن) کھانے والوں کے واسطے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** پھر ہم نے اس (پانی) کے ذریعہ سے باغ پیدا کئے کھجوروں کے انگوروں کے، تمہارے واسطے ان (کھجوروں انگوروں) میں بکثرت میوے بھی ہیں (جبکہ ان کو تازہ تازہ کھایا جائے تو میوہ سمجھا جاتا ہے) اور ان میں سے (جو بچا کر خشک کر کے رکھ لیا جاتا ہے اس کو بطور غذا کے) کھاتے بھی ہو، اور (اسی پانی سے) ایک (زیتون کا) درخت بھی (ہم نے پیدا کیا) جو کہ طور سینا میں (بکثرت) پیدا ہوتا ہے جو اگتا ہے تیل لئے ہوئے اور کھانے والوں کے لئے سالن لئے ہوئے (یعنی اس کے پھل سے دونوں فوائد حاصل ہوتے ہیں، خواہ روشن کرنے کے بعد مالش کرنے کے کام میں لاؤ، خواہ اس میں روٹی ڈبو کر کھاؤ، یہ مذکورہ سامان پانی اور نباتات سے تھا)۔

وَشَجَرَةً تَخۡرُجُ مِنۡ طُوۡرِ سَيۡنَآءَ: جس پہاڑ کا نام طور ہے طور سینا بھی اسی کا نام ہے، کیونکہ وہ جس جگہ ہے اس جگہ کا نام سینا ہے اور سینین بھی، اگرچہ اب کچھ اور نام ہوگیا ہے، اور زیتون کا ذکر بطور خاص طور سینا کے ساتھ کثرت سے پیدا ہونے کی وجہ سے ہے کہ وہاں کثرت سے زیتون پیدا ہوتا ہے۔

**فائدہ:** ۱؎ یعنی ان کی بہار دیکھ کر خوش ہوتے ہو اور بعض کو بطور تفکہ اور بعض کو بطور غذا استعمال کرتے ہو۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی زیتون کا درخت جس میں سے روغن نکلتا ہے جو مالش وغیرہ کے کام آتا ہے اور بہت ملکوں کے لوگ سالن کی جگہ اس کا استعمال کرتے ہیں، اس درخت کا ذکر خصوصیت سے فرمایا کیونکہ اس کے فوائد کثیر ہیں اور خاص فضل وشرف رکھتا ہے، اسی لیے سورہ التین میں اس کی قسم کھائی گئی، جبل طور کی طرف نسبت کرنا بھی اس کی فضیلت وبرکت ظاہر کرنے کے لیے ہے، وہاں اس کی پیداوار زیادہ ہوتی ہوگی۔

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۭ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ

اورتمہارے لیے چوپایوں میں دھیان کرنے کی بات ہے، پلاتے ہیں ہم تم کو انکے پیٹ کی چیز سے اور تمہارے لیے ان میں بہت فائدے ہیں

وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝۲۱ۙ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ۝۲۲ۧ ع ۲۲ ۱

اور بعضوں کو کھاتے ہو ۱؎ اور ان پر اور کشتیوں پر لدے پھرتے ہو ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اب اس سامان اور فوائد کا بیان ہے جو حیوانات کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے:

اور تمہارے لئے مواشی میں (بھی) غور کرنے کا موقع ہے کہ ہم تم کو ان کے جوف میں کی چیز (یعنی دودھ) پینے کو دیتے ہیں اور تمہارے لئے ان میں اور بھی بہت سے فائدے ہیں (کہ ان کے بال اور اون کام آتی ہے) اور (نیز) ان میں سے بعض کو کھاتے بھی ہو، اور ان (مویشیوں میں جو سامان بوجھ اٹھانے کے قابل ہیں ان) پر اور کشتی پر لدے لدے پھرتے (بھی) ہو۔

**فائدہ:** ۱؎ نباتات کے بعد یہ حیوانات کا ذکر ہوا، یعنی جانوروں کا دودھ ہم اپنی قدرت سے تم کو پلاتے ہیں، اور بہت کچھ فائدے تمہارے لیے ان کی ذات میں رکھ دیے ہیں، حتیٰ کہ بعض جانوروں کا گوشت کھانا بھی حلال کر دیا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی خشکی میں جانوروں کی پیٹھ پر اور دریا میں جہازوں اور کشتیوں پر سوار ہو کر کہیں سے کہیں نکل جاتے ہو اور بڑے بڑے وزنی سامان ان پر بار کرتے ہو۔

**ربط:** کشتی کی مناسبت سے آگے نوح علیہ السلام کا قصہ ذکر فرماتے ہیں کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان سے کشتی بنوائی جو طوفان عظیم کے وقت مومنین کی نجات کا ذریعہ بنی، پھر نوح علیہ السلام کی مناسبت سے بعض دوسرے انبیاء کے واقعات بھی ذکر فرما دیئے، شاید یہاں ان قصص کے بیان میں یہ بھی اشارہ ہوگا کہ جس طرح اوپر کی آیات میں تمہاری جسمانی ضروریات کا انتظام مذکور تھا اسی طرح خداوند رحمان نے تمہاری روحانی حوائج و ضروریات کا سرانجام کرنے کے لیے ابتدائے دنیا سے وحی ورسالت کا سلسلہ بھی قائم فرما دیا، یایوں کہہ لو کہ اوپر قدرت کے نشانات بیان فرما کر توحید کی طرف متوجہ کرنا تھا، اس کی تکمیل کے لیے یہاں سے سلسلہ نبوت کا بیان شروع کر دیا، جس کے ضمن میں انبیاء اور ان کے متبعین کی خوش انجامی اور مکذبین و معاندین کی بدانجامی بھی ذہن نشین کر دی گئی۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ

اور ہم نے بھیجا نوح کو اس کی قوم کے پاس تو اس نے کہا اے قوم! بندگی کرو اللہ کی تمہارا کوئی حاکم نہیں اس کے سوا

اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝۲۳ فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ

کیا تم ڈرتے نہیں، تب بولے سردار جو کافر تھے اس کی قوم میں یہ کیا ہے آدمی ہے جیسے تم ۱؎ چاہتا ہے کہ

يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۖۚ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾

بڑائی کرے تم پر، اور اگر اللہ چاہتا تو اتارتا فرشتے ۲؎ ہم نے یہ نہیں سنا اپنے اگلے باپ دادوں میں ۳؎

اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۲۵﴾

اور کچھ نہیں یہ ایک مرد ہے کہ اس کو سودا ہے سو راہ دیکھو اس کی ایک وقت تک

**خلاصہ تفسیر**: پیچھے توحید پر دلائل قائم کیے گئے تھے، آگے اسی کی تاکید کے لیے بعض واقعات بیان کیے جاتے ہیں جو تین طرح سے توحید کی تاکید کرتے ہیں: ① گذشتہ انبیاء نے توحید کا حکم فرمایا اور منکرین توحید کو کافی سمجھایا ② منکرین توحید کا انجام برا ہوا ③ انبیاء علیہم السلام کے معجزات ظاہر ہونے سے توحید کا اثبات ہوا۔

اور ہم نے نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی طرف پیغمبر کر کے بھیجا، سو انہوں نے (اپنی قوم سے) فرمایا کہ اے میری قوم! اللہ ہی کی عبادت کیا کرو اس کے سوا کوئی تمہارے لئے معبود بنانے کے لائق نہیں (اور جب یہ بات ثابت ہے تو) پھر کیا تم (دوسروں کے معبود بنانے سے) ڈرتے نہیں ہو، پس (نوح علیہ السلام کی یہ بات سن کر) ان کی قوم میں جو کافر رئیس تھے (عوام سے) کہنے لگے کہ یہ شخص بجز اس کے کہ تمہاری طرح کا ایک (معمولی) آدمی ہے اور کچھ (رسول وغیرہ) نہیں ہے (اس دعوے سے) ان کا (اصل) مطلب یہ ہے کہ تم سے برتر ہو کر رہے (یعنی اس کا مقصد محض اپنی جاہ وعزت ہے) اور اگر اللہ کا (رسول بھیجنا) منظور ہوتا تو (اس کام کے لئے) فرشتوں کو بھیجتا (پس ان کا دعویٰ غلط ہے، اسی طرح ان کا توحید کی طرف دعوت دینا یہ دوسری غلطی ہے، کیونکہ) ہم نے یہ بات (کہ اور کسی کو معبود مت قرار دو) اپنے پہلے بڑوں میں (کبھی) نہیں سنی، بس یہ ایک آدمی ہے جس کو جنون ہو گیا ہے (اس واسطے ساری دنیا کے خلاف باتیں کرتا ہے کہ میں رسول ہوں اور معبود ایک ہے) سو ایک وقت خاص (یعنی اس کے مرنے کے وقت) تک اس (کی حالت) کا انتظار کر لو (آخر ایک وقت پر پہنچ کر ختم ہو جائے گا اور سب پاپ کٹ جائے گا)۔

اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ: قوم نوح کا پہلے یہ کہنا کہ "یہ سرداری چاہتے ہیں" اور پھر یہ کہنا کہ "ان کو جنون ہو گیا ہے"، اگر جنون سے مراد کسی قدر جنون ہو تب تو دونوں باتوں کا جمع ہونا ممکن ہے، اور اگر کامل جنون مراد ہو تو ان کے اقوال میں تعارض ہوگا، کیونکہ کامل جنون کے ساتھ سرداری کا ارادہ جمع نہیں ہو سکتا تو یہ خود اس قوم کے جنون کی دلیل ہے اور چونکہ کفار کے یہ اقوال صراحۃً باطل تھے اس لیے اس مقام پر ان کے جواب کی ضرورت نہ تھی۔

اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا حال نہایت پسندیدہ اور محمود ہے جسے غافلین جنون سمجھیں، اور یہ کامل فنائیت سے حاصل ہوتا ہے، پس آیت اس کے مطلوب ہونے پر دلالت کرتی ہے (یعنی جس شخص پر ہر وقت یاد الٰہی کی کیفیت طاری رہے اور خدا وحدہ لاشریک کے احکامات کی بجا آوری کا لوگوں کو کہتا رہے تو عام لوگوں کو اس سے ایک قسم کی لاتعلقی اور اجنبیت محسوس ہوتی ہے، یہ پسندیدہ کیفیت ہے)۔

* * *

**فائدہ**: ۱؎ یعنی اس میں اور تم میں فرق کیا ہے جو یہ رسول بن جائے تم نہ بنو۔

**فائدہ**: ۲؎ یعنی بڑا بن کر رہنا چاہتا ہے اس لیے یہ سب ڈھونگ بنایا ہے، ورنہ خدا کسی کو رسول بنا کر بھیجتا تو کیا یہ ہی اس کام کیلئے رہ گیا تھا۔

**فائدہ**: ۳؎ یعنی ہم نے ایسی عجیب بات کبھی نہیں سنی کہ ایک ہماری طرح کا معمولی آدمی خدا کا رسول بن جائے اور تمام دیوتاؤں کو ہٹا کر تنہا ایک خدا کی حکومت منوانے لگے۔

**فائدہ**: ۴؎ معلوم ہوتا ہے کہ اس غریب کا دماغ چل گیا، بھلا ساری قوم کے خلاف اور اپنے باپ دادوں کے خلاف ایسی بات زبان سے نکالنا جو کوئی شخص باور نہ کر سکے کھلا جنون نہیں تو اور کیا ہوگا بہتر ہے چند روز صبر کرو اور انتظار کرو، شاید کچھ دنوں کے بعد اسے ہوش آ جائے اور جنون کے دورہ

سے افاقہ ہو یا یوں ہی مرمرا کر قصہ ختم ہو جائے، (العیاذ باللہ)۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿٢٦﴾ فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا

بولا اے رب! تو مدد کر میری کہ انہوں نے مجھ کو جھٹلایا ۱۔ پھر ہم نے حکم بھیجا اس کو کہ بنا کشتی ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہمارے حکم سے

فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ

پھر جب پہنچے ہمارا حکم اور ابلے تنور تو ڈال لے کشتی میں ہر چیز کا جوڑا دو دو (نر اور مادہ) اور اپنے گھر کے لوگ ۲۔ مگر جس کی قسمت

عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿٢٧﴾

میں پہلے سے ٹھہر چکی ہے بات ۳۔ اور مجھ سے بات نہ کر (نہ کہہ مجھ سے) ان ظالموں کے واسطے، بیشک ان کو ڈوبنا ہے ۴۔

**خلاصہ تفسیر:** نوح (علیہ السلام) نے (ان کے ایمان لانے سے مایوس ہو کر جناب باری تعالیٰ میں) عرض کیا کہ اے میرے رب! (ان سے) میرا بدلہ لے بوجہ اس کے کہ انہوں نے مجھ کو جھٹلایا ہے، پس ہم نے (ان کی دعا قبول کی اور) ان کے پاس حکم بھیجا کہ تم کشتی تیار کرلو ہماری نگرانی میں اور ہمارے حکم سے (کہ اب طوفان آئے گا، تم اور مومنین کشتی کے ذریعہ سے محفوظ رہو گے) پھر جس وقت ہمارا حکم (عذاب کا قریب) آپہنچے اور (علامت اس کی یہ ہے کہ) زمین سے پانی ابلنا شروع ہو جائے تو (اس وقت) ہر قسم (کے جانوروں) میں سے (جو انسان کے کارآمد ہیں اور پانی میں زندہ نہیں رہ سکتے، جیسا بھیڑ، بکری، گائے، بیل، اونٹ، گھوڑا گدھا وغیرہ) ایک ایک نر اور ایک ایک مادہ یعنی دو دو عدد اس (کشتی) میں داخل کرلو اور اپنے گھر والوں کو بھی (سوار کرلو) باستثناء اس کے جس پر ان میں سے (غرق ہونے کا) حکم نافذ ہو چکا ہے (یعنی میں جو کافر ہو اس کو مت سوار کرو) اور (یہ سن لو کہ عذاب آنے کے وقت) مجھ سے کافروں کی (نجات) کے بارے میں کچھ گفتگو مت کرنا (کیونکہ) وہ سب غرق کئے جائیں گے۔

* * *

**فائدہ:** ۱۔ یعنی جب نوح کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہوئیں، ساڑھے نو سو برس سختیاں جھیل کر بھی ان کو راہِ راست پر لانے میں کامیاب نہ ہوئے تو خدا سے فریاد کی کہ اب ان اشقیاء کے مقابلہ میں میری مدد فرمایئے، کیونکہ بظاہر یہ لوگ میری تکذیب سے باز آنے والے نہیں، اوروں کو بھی خراب کریں گے۔

**فائدہ:** ۲۔ "طوفان نوح"، یہ قصہ پہلے سورہ "ھود" وغیرہ میں گزر چکا ہے، وہاں ان الفاظ کی تفسیر ملاحظہ ہو۔

**فائدہ:** ۳۔ یعنی کافروں کو، خواہ تیرے کنبہ کے ہوں سوار مت کر۔

**فائدہ:** ۴۔ یعنی حکم قطعی عذاب کا ہو چکا، یہ فیصلہ اٹل ہے، ضرور ہو کر رہے گا، اب ظالموں میں سے کسی کو بچانے کے لیے ہم سے سعی سفارش نہ کرنا۔

فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٢٨﴾

پھر جب چڑھ چکے تو اور جو تیرے ساتھ ہے کشتی پر تو کہہ شکر اللہ کا جس نے چھڑایا ہم کو گناہ گار لوگوں سے ۱۔

وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿٢٩﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ ﴿٣٠﴾

اور کہہ اے رب! اتار مجھ کو برکت کا اتارنا اور تو ہے بہتر اتارنے والا ۲۔ اس میں نشانیاں ہیں اور ہم ہیں جانچنے والے ۳۔

**خلاصہ تفسیر:** پھر جس وقت تم اور تمہارے ساتھی (مسلمان) کشتی میں بیٹھ چکو تو یوں کہنا کہ شکر ہے خدا کا جس نے ہم کو کافر لوگوں سے (یعنی ان کے افعال اور ان کے وبال سے) نجات دی، اور (جب طوفان تھمنے کے بعد کشتی سے زمین پر آنے لگو تو) یوں کہنا کہ اے میرے رب! مجھ کو (زمین پر) برکت کا اتارنا اتاریو (یعنی ظاہری و باطنی اطمینان کے ساتھ رکھیو) اور آپ سب (اپنے پاس بطور مہمانی کے) اتارنے والوں سے اچھے ہیں (یعنی اور لوگ جو مہمان کو اتار لیتے ہیں وہ اپنے مہمان کی مقصد براری اور مصائب سے نجات پر قدرت نہیں رکھتے اور آپ کو ان سب چیزوں پر قدرت ہے) اس (مذکورہ واقعہ) میں (اہل عقل کے لئے ہماری قدرت کی) بہت سی نشانیاں ہیں اور ہم (یہ نشانیاں معلوم کرا کرا اپنے بندوں کو) آزماتے ہیں (کہ دیکھیں کہ کون ان سے نفع اٹھاتا ہے کون نہیں اٹھاتا، اور نشانیاں یہ ہیں: رسول بھیجنا، ایمان داروں کو بچا لینا، کافروں کو ہلاک کر دینا، دفعۃً طوفان پیدا کر دینا، کشتی کو محفوظ رکھنا وغیرہ وغیرہ)

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی ہم کو ان سے علیحدہ کر کے عذاب سے مامون رکھ۔

**فائدہ:** ۲ یعنی کشتی میں اچھی آرام کی جگہ دے اور کشتی سے جہاں اتارے جائیں وہاں بھی کوئی تکلیف نہ ہو، ہر طرح اور ہر جگہ تیری رحمت و برکت شامل حال رہے۔

**فائدہ:** ۳ کہ کون ان نشانوں کو سن کر عبرت و نصیحت حاصل کرتا ہے کون نہیں کرتا، کما قال تعالیٰ: **وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ** (القمر:۱۵)

**ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۝۳۱ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ**

پھر پیدا کی ہم نے ان سے پیچھے ایک جماعت اور ۱ پھر بھیجا ہم نے ان میں ایک رسول ان میں کا کہ بندگی کرو اللہ کی

**مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝۳۲** ع ۲

کوئی نہیں تمہارا حاکم اس کے سوا، پھر کیا تم ڈرتے نہیں ۲

**خلاصہ تفسیر:** پھر قوم نوح کے بعد ہم نے دوسرا گروہ پیدا کیا (اس سے مراد قوم عاد ہے یا ثمود) پھر ہم نے ان میں ایک پیغمبر کو بھیجا جو ان ہی میں کے تھے (مراد ہود علیہ السلام یا صالح علیہ السلام ہیں، ان پیغمبر نے کہا کہ) تم لوگ اللہ ہی کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا اور کوئی معبود (حقیقی) نہیں، کیا تم (شرک سے) ڈرتے نہیں ہو۔

**ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ:** اس جماعت سے مراد قوم عاد ہے یا ثمود، چونکہ دوسری آیات میں ثمود کا سخت آواز سے ہلاک ہونا آیا ہے، اس قرینہ سے بعض نے تو اس کو قوم ثمود کا قصہ سمجھا ہے، اس صورت میں پیغمبر سے صالح علیہ السلام مراد ہوں گے، اور چونکہ اکثر جگہ قوم نوح کے بعد قوم عاد کا قصہ آیا ہے، اس قرینہ سے بعض نے اس کو عاد کا قصہ سمجھا ہے، اور آگے ''صیحہ'' سے مراد سخت سزا لی ہے، یا ممکن ہے کہ قوم عاد پر ہوا کے ساتھ سخت آواز کا عذاب بھی ہوا ہو، اس صورت میں پیغمبر سے مراد ہود علیہ السلام ہوں گے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یہ ذکر ''عاد'' کا ہے یا ''ثمود'' کا۔

**فائدہ:** ۲ یعنی حضرت ہود یا حضرت صالح علیہما السلام۔

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ

اور بولے سردار اس کی قوم کے جو کافر تھے اور جھٹلاتے تھے آخرت کی ملاقات کو اور آرام دیا تھا ان کو ہم نے دنیا کی زندگی میں ۱؎

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ﴿۳۳﴾

اور کچھ نہیں یہ ایک آدمی ہے جیسے تم، کھاتا ہے جس قسم سے تم کھاتے ہو اور پیتا ہے جس قسم سے تم پیتے ہو ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (ان پیغمبر کی یہ بات سن کر) ان کی قوم میں سے جو رئیس تھے جنہوں نے (خدا اور رسول کے ساتھ) کفر کیا تھا اور آخرت کے آنے کو جھٹلایا تھا اور ہم نے ان کو دنیوی زندگانی میں عیش بھی دیا تھا کہنے لگے کہ بس یہ تو تمہاری طرح ایک (معمولی) آدمی ہیں (چنانچہ) یہ وہی کھاتے ہیں جو تم کھاتے ہو اور وہی پیتے ہیں جو تم پیتے ہو۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی اسکے معتقد نہ تھے کہ مرنے کے بعد ایک دن خدا سے ملنا ہے، بس دنیا کی زندگی اور اسکا عیش و آرام ہی انکا اوڑھنا بچھونا تھا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی بظاہر کوئی بات اس میں تم سے سوا نہیں۔

وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ ۙ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۳۴﴾ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَ كُنْتُمْ تُرَابًا

اور کہیں تم چلنے لگے کہنے پر ایک آدمی کے اپنے برابر کے تو تم بیشک خراب ہوئے ۱؎ کیا تم کو وعدہ دیتا ہے کہ جب تم مر جاؤ اور ہو جاؤ مٹی

وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴿۳۵﴾ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۶﴾

اور ہڈیاں تو تم کو نکلنا ہے، کہاں ہو سکتا ہے کہاں ہو سکتا ہے جو تم سے وعدہ ہوتا ہے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (جب یہ تمہارے ہی جیسے بشر ہیں تو) اگر تم اپنے جیسے ایک (معمولی) آدمی کے کہنے پر چلنے لگو تو بیشک تم (عقل کے) گھاٹے میں ہو (یعنی ان کی اتباع بڑی بے وقوفی ہے) کیا یہ شخص تم سے یہ کہتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے اور (مر کر) مٹی اور ہڈیاں ہو جاؤ گے (چنانچہ مرنے کے بعد گوشت تو پہلے ہی خاک ہو جاتا ہے، صرف ہڈیاں رہ جاتی ہیں پھر کچھ عرصہ بعد وہ بھی خاک ہو جاتی ہیں تو یہ شخص کہتا ہے کہ جب اس حالت پر پہنچ جاؤ گے) تو (پھر دوبارہ زندہ کر کے زمین سے) نکالے جاؤ گے (تو بھلا ایسا شخص کہیں اطاعت و اتباع کے قابل ہو سکتا ہے، اور) بہت ہی بعید اور بہت ہی بعید ہے جو بات تم سے کہی جاتی ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی اس سے بڑی خرابی اور ذلت کیا ہو گی کہ اپنے جیسے ایک معمولی آدمی کو خواہ مخواہ مخدوم و مطاع ٹھہرا لیا جائے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی کس قدر بعید از عقل بات کہتا ہے کہ ہڈیوں کے ریزے مٹی کے ذرات میں مل جانے کے بعد پھر قبروں سے آدمی بن کر اٹھیں گے؟ ایسی مہمل بات ماننے کو کون تیار ہو گا۔

اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۳۷﴾

اور کچھ نہیں یہی جینا ہے ہمارا دنیا کا، مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم کو پھر اٹھنا نہیں ۱؎

إِنْ هُوَ إِلَّا رَجُلٌ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا وَمَا نَحْنُ لَهُ بِمُؤْمِنِينَ ﴿٣٨﴾

اور کچھ نہیں یہ ایک مرد ہے باندھ لایا ہے اللہ پر جھوٹ اور اس کو ہم نہیں ماننے والے ۲

**خلاصہ تفسیر:** بس زندگی تو یہی ہماری دنیوی زندگی ہے کہ ہم میں کوئی مرتا ہے اور کوئی پیدا ہوتا ہے اور ہم دوبارہ زندہ نہ کئے جائیں گے، بس یہ ایک ایسا شخص ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے (کہ اس نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے اور کوئی دوسرا معبود نہیں اور قیامت آئے گی) اور ہم تو ہرگز اس کو سچا نہ سمجھیں گے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی کہاں کی آخرت، اور کہاں کا حساب کتاب، ہم تو جانیں یہ ہی ایک دنیا کا سلسلہ اور یہ ہی ایک مرنا اور جینا ہے جو سب کی آنکھوں کے سامنے ہوتا رہتا ہے، کوئی پیدا ہوا، کوئی فنا ہو گیا آگے کچھ نہیں۔

**فائدہ:** ۲ کہ میں اس کا پیغمبر ہوں اور وہ مردوں کو دوبارہ زندہ کر کے عذاب وثواب دے گا، یہ دونوں دعوے ایسے ہیں جن کو ہم کبھی تسلیم نہیں کر سکتے، خواہ مخواہ جھگڑنے اور دردسری کرنے سے کیا فائدہ؟

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِي بِمَا كَذَّبُونِ ﴿٣٩﴾ قَالَ عَمَّا قَلِيلٍ لَيُصْبِحُنَّ نَادِمِينَ ﴿٤٠﴾

بولا اے رب میری مدد کر کہ انہوں نے مجھ کو جھٹلایا ۱ اب تھوڑے دنوں میں صبح کو رہ جائیں گے پچھتانے ۲

فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنَاهُمْ غُثَاءً ۚ فَبُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٤١﴾

پھر پکڑا ان کو چنگھاڑ (سخت آواز) نے تحقیق ۳ پھر کر دیا ہم نے ان کو کوڑا (خاشاک) ۴ سو دور ہو جائیں گناہ گار لوگ ۵

**خلاصہ تفسیر:** پیغمبر نے دعا کی کہ اے میرے رب! میرا بدلہ لے اس وجہ سے کہ انہوں نے مجھ کو جھٹلایا، ارشاد ہوا کہ یہ لوگ عنقریب پشیمان ہوں گے، چنانچہ ان کو ایک سخت آواز نے (یا سخت عذاب نے) برحق وعدہ کے مطابق (جو کہ لَيُصْبِحُنَّ نَادِمِينَ) آ پکڑا (جس سے وہ سب ہلاک ہو گئے) پھر (ہلاک کرنے کے بعد) ہم نے ان کو خس وخاشاک (کی طرح پامال) کر دیا، سو خدا کی مار کافر لوگوں پر۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی آخر پیغمبر نے کفار کی طرف سے ناامید ہو کر دعا کی۔

**فائدہ:** ۲ یعنی عذاب آیا چاہتا ہے جس کے بعد پچھتائیں گے، اور وہ پچھتانا نفع نہ دے گا۔

**فائدہ:** ۳ اس سے بظاہر مترشح ہوتا ہے کہ یہ قصہ "ثمود" کا ہے کہ وہ چنگھاڑ سے مرے ہیں۔ واللہ اعلم۔

**فائدہ:** ۴ جیسے سیلاب خس وخاشاک کو بہالے جاتا ہے، اس طرح عذاب الٰہی کے سیل میں بہے چلے گئے۔

**فائدہ:** ۵ یعنی خدا کی رحمت سے۔

ثُمَّ أَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قُرُونًا آخَرِينَ ﴿٤٢﴾ مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ ﴿٤٣﴾

پھر پیدا کیں ہم نے ان سے پیچھے جماعتیں، اور نہ آگے جائے کوئی قوم اپنے وعدہ سے اور نہ پیچھے رہے

**خلاصہ تفسیر:** پھر ان (عاد یا ثمود) کے (ہلاک ہونے کے) بعد ہم نے اور امتوں کو پیدا کیا (انبیاء کو جھٹلانے کے سبب وہ بھی ہلاک ہوئے اور ان کے ہلاک ہونے کی جو مدت علم الٰہی میں مقرر تھی) کوئی امت (ان امتوں میں سے) اپنی (اس) مدت معینہ سے (ہلاک ہونے

میں) نہ پیش دستی (پہل) کرسکتی تھی اور نہ (اس مدت سے) وہ لوگ پیچھے ہٹ سکتے تھے (بلکہ عین وقت پر ہلاک کئے گئے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی ہر ایک قوم جس نے پیغمبروں کی تکذیب کی ٹھیک اپنے اپنے وعدہ پر ہلاک کی جاتی رہی، جو میعاد کسی قوم کی تھی ایک منٹ اس سے آگے پیچھے نہ ہوئی۔

ثُمَّ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا تَتۡرَا ؕ كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوۡلُهَا كَذَّبُوۡهُ فَاَتۡبَعۡنَا بَعۡضَهُمۡ بَعۡضًا

پھر بھیجتے رہے ہم اپنے رسول لگا تار، جہاں پہنچا کسی امت کے پاس ان کا رسول اس کو جھٹلا دیا پھر چلاتے گئے ہم ایک کے پیچھے دوسرے

وَّجَعَلۡنٰهُمۡ اَحَادِيۡثَ ۚ فَبُعۡدًا لِّقَوۡمٍ لَّا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۴۴﴾

اور کر ڈالا ان کو کہانیاں لے، سو دور ہو جائیں جو لوگ نہیں مانتے ۲ے

**خلاصہ تفسیر:** (غرض وہ امتیں اول پیدا کی گئیں) پھر (ان کے پاس) ہم نے اپنے پیغمبروں کو یکے بعد دیگرے (ہدایت کے لئے) بھیجا (جس طرح وہ امتیں یکے بعد دیگرے پیدا ہوئیں تھیں، مگر ان کی حالت یہ ہوئی کہ) جب کبھی کسی امت کے پاس اس امت کا (خاص) رسول (خدا کے احکام لے کر) آیا انہوں نے اس کو جھٹلایا، سو ہم نے (بھی ہلاک کرنے میں) ایک کے بعد ایک کا تار (سلسلہ) باندھ دیا اور ہم نے ان کی کہانیاں بنا دیں (یعنی وہ ایسے نیست و نابود ہوئے کہ بجز کہانیوں کے ان کا کچھ نام و نشان نہ رہا) سو خدا کی مار ان لوگوں پر جو (انبیاء کے سمجھانے پر بھی) ایمان نہ لاتے تھے۔

كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوۡلُهَا كَذَّبُوۡهُ: ان امتوں میں سے بعض کا ذکر سورہ اعراف وغیرہ میں ہے، چنانچہ عاد کے بعد ثمود کا اور ثمود کے بعد قوم لوط کا اور قوم لوط کے بعد اہل مدین کا ذکر آیا ہے، اور بعض کی نسبت فرمایا: لا یعلمھم الا اللہ کہ ان کو خدا تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور اگر بعض قوموں کی کچھ نسل باقی رہی تب بھی: وَّجَعَلۡنٰهُمۡ اَحَادِيۡثَ میں کوئی اشکال نہیں، کیونکہ خاص وہ جھٹلانے والے تو نیست و نابود ہو گئے تھے، یا یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے اس کو دوسروں کے لیے عبرت بنا دیا۔

* * *

**فائدہ:** لے یعنی رسولوں کا تانتا باندھ دیا، یکے بعد دیگرے پیغمبر بھیجتے رہے اور مکذبین میں بھی ایک کو دوسرے کے پیچھے چلتا کرتے رہے، ادھر پیغمبروں کی بعث کا اور ادھر ہلاک ہونے والوں کا نمبر لگا دیا، چنانچہ بہت قومیں ایسی تباہ و برباد کی گئیں جن کے قصے کہانیوں کے سوا کوئی چیز باقی نہیں رہی، آج ان کی داستانیں محض عبرت کے لیے پڑھی اور سنی جاتی ہیں۔

**فائدہ:** ۲ے یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے۔

ثُمَّ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوۡنَ ۙ بِاٰيٰتِنَا وَسُلۡطٰنٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۴۵﴾ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاسۡتَكۡبَرُوۡا

پھر بھیجا ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی ہارون کو اپنی نشانیاں دے کر اور کھلی سند فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس پھر لگے بڑائی کرنے اور

وَكَانُوۡا قَوۡمًا عَالِيۡنَ ﴿۴۶﴾ ۚ فَقَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ لِبَشَرَيۡنِ مِثۡلِنَا وَقَوۡمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ ﴿۴۷﴾ ۚ

وہ لوگ زور پر چڑھ رہے (مغرور) تھے لے سو بولے کیا ہم مانیں گے اپنے برابر کے دو آدمیوں کو اور انکی قوم ہمارے تابعدار (خدمتگار) ہیں ۲ے

**خلاصہ تفسیر:** پھر ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے بھائی ہارون (علیہ السلام) کو اپنے احکام اور کھلی دلیل (یعنی صاف اور

صریح معجزے جو نبوت کی دلیل ہیں) دے کر فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس (بھی پیغمبر بنا کر) بھیجا (اور بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہونا تو معلوم ہی ہے) سو ان لوگوں نے (ان کی تصدیق واطاعت سے) تکبر کیا اور وہ لوگ تھے ہی متکبر (یعنی پہلے ہی سے ان کا دماغ سڑا ہوا تھا)۔

چنانچہ وہ (باہم) کہنے لگے کہ کیا ہم ایسے دو شخصوں پر جو ہماری طرح کے آدمی ہیں (اور ان میں کوئی امتیاز کی بات نہیں) ایمان لے آئیں (اور ان کے فرمانبردار بن جائیں) حالانکہ ان کی قوم کے لوگ (تو خود) ہمارے زیر حکم ہیں۔

**اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ:** موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل اور فرعون سب کی طرف مبعوث ہوئے تھے اس کے باوجود فرعون اور فرعون کی قوم میں سے سرداروں کو بطور خاص اس لیے ذکر کیا کہ یہ لوگ انکار میں زیادہ سخت تھے، پس ان کو خاص طور پر زیادہ قباحت ظاہر کرنے کے لیے ذکر فرمایا۔

**اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا:** صاحب روح المعانی نے اس جگہ ایک لطیفہ خوب لکھا ہے کہ یہ منکرین بشر کے لیے تو نبوت کو محال سمجھتے تھے لیکن پتھروں کے لیے معبود ہونے کو جائز جانتے تھے، کس قدر عجیب بات ہے۔

**وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ:** یعنی ہم کو تو خود موسیٰ و ہارون کی قوم پر ریاست حاصل ہے، پھر ان دونوں کے اقتدار اور ریاست کو ہم کیسے تسلیم کر سکتے ہیں، ان لوگوں نے دینی ریاست کو دنیاوی ریاست پر قیاس کیا کہ جب ہم کو ایک ریاست حاصل ہے تو دوسری کے بھی ہم ہی مستحق ہیں، اور جب ان کو ایک حاصل نہیں تو دوسری کیسے ہو سکتی ہے، اور اس قیاس کا غلط ہونا ظاہر ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ اس لیے خدائی پیغام کو خاطر میں نہ لائے، کبر و غرور کے نشہ نے ان کے دماغوں کو بالکل مختل کر رکھا تھا۔

**فائدہ:** ۲ یعنی موسیٰ و ہارون کی قوم (بنی اسرائیل) تو ہماری غلامی کر رہی ہے ان میں کے دو آدمیوں کو ہم اپنا سردار کس طرح بنا سکتے ہیں۔

**فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ﴿۴۸﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۹﴾**

پھر جھٹلایا ان دونوں کو پھر ہو گئے غارت ہونے والوں میں، اور ہم نے دی موسیٰ کو کتاب تا کہ وہ راہ پائیں ۱

**خلاصہ تفسیر:** غرض وہ لوگ ان دونوں کی تکذیب ہی کرتے رہے، پس (اس تکذیب کی وجہ سے) ہلاک کئے گئے، اور (ان کے ہلاک ہونے کے بعد) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب (یعنی توراۃ) عطا فرمائی، تا کہ (اس کے ذریعہ سے) وہ لوگ (یعنی موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل) ہدایت پائیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی فرعونیوں کی ہلاکت کے بعد ہم نے ان کو تورات شریف مرحمت کی تا کہ لوگ اس پر چل کر جنت اور رضائے الٰہی کی منزل تک پہنچ سکیں۔

**وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗٓ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ﴿۵۰﴾**

اور بنایا ہم نے مریم کے بیٹے اور اسکی ماں کو ایک نشانی ۱ اور انکو ٹھکانا دیا ایک ٹیلہ (اونچی زمین) پر جہاں ٹھہرنے کا موقع تھا اور پانی نتھرا (جاری) ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور ہم نے (اپنی قدرت وتوحید پر دلالت کے لیے اور نیز بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے) مریم کے بیٹے (عیسیٰ علیہ السلام) کو اور ان کی ماں (حضرت مریم علیہا السلام) کو بڑی نشانی (اپنی قدرت کی اور ان کے سچا ہونے کی) بنایا (کہ بغیر والد کے پیدا ہونا دونوں کے متعلق عظیم معجزہ ہے) اور (چونکہ ان کو نبی بنانا مقصود تھا اور ایک ظالم بادشاہ بچپن ہی میں ان کے قتل کے درپے ہو گیا تھا اس لئے) ہم نے (اس سے بچا کر) ان دونوں کو ایک ایسی بلند زمین پر لے جا کر پناہ دی جو (غلے اور میوہ جات پیدا ہونے کی وجہ سے) ٹھہرنے کے قابل اور (نہر جاری

ہونے کی وجہ سے ) شاداب جگہ تھی ( یہاں تک کہ وہ امن وامان سے جوان ہوئے اور نبوت عطا ہوئی ، سو توحید و دعویٰ رسالت میں ان کی تصدیق ضروری تھی مگر بعض نے نہ کی ) ۔

یہ ظالم بادشاہ ہیرودس تھا جو بچپن ہی میں عیسی علیہ السلام کے قتل کے درپے ہوگیا تھا، کیونکہ نجومیوں نے اس سے کہا تھا کہ عیسی علیہ السلام کو سرداری نصیب ہوگی، پس الہام ربانی سے حضرت مریم ان کو لے کر ملک مصر چلی گئیں اور اس ظالم کے مرنے کے بعد پھر شام چلی آئیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی قدرت الٰہیہ کی نشانی ہے کہ تنہا ماں سے بن باپ کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا کر دیا، جیسا کہ آل عمران اور سورہ مریم میں اس کی تقریر کی جا چکی۔

**فائدہ:** ۲ شاید یہ وہ ہی ٹیلہ یا اونچی زمین ہو جہاں وضع حمل کے وقت حضرت مریم تشریف رکھتی تھیں ، چنانچہ سورہ مریم کی آیات: فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا (مریم: ۲۴ تا ۲۵) دلالت کرتی ہیں کہ وہ جگہ بلند تھی ، نیچے چشمہ یا نہر بہہ رہی تھی ، اور کھجور کا درخت نزدیک تھا ، (كذا فسره ابن كثير رحمه الله) لیکن عموماً مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ حضرت مسیح کے بچپن کا واقعہ ہے ، ایک ظالم بادشاہ ہیرودس نامی نجومیوں سے سن کر کہ حضرت عیسیٰ کو سرداری ملے گی ، لڑکپن ہی میں ان کا دشمن ہوگیا تھا اور قتل کے درپے تھا ، حضرت مریم الہام ربانی سے ان کو لے کر مصر چلی گئیں اور اس ظالم کے مرنے کے بعد پھر شام واپس چلی آئیں ، چنانچہ ''انجیل متی'' میں بھی یہ واقعہ مذکور ہے اور مصر کا اونچا ہونا باعتبار رودنیل کے ہے ورنہ غرق ہو جاتا اور ''ماء معین'' رودنیل ہے بعض نے ''ربوہ'' (اونچی جگہ ) سے مراد شام یا فلسطین لیا ہے ، اور کچھ بعید نہیں کہ جس ٹیلہ پر ولادت کے وقت موجود تھیں وہیں اس خطرہ کے وقت بھی پناہ دی گئی ہو ، واللہ اعلم۔

بہر حال اہل اسلام میں کسی نے ''ربوہ'' سے مراد کشمیر نہیں لیا ، نہ حضرت مسیح علیہ السلام کی قبر کشمیر میں بتلائی ، البتہ ہمارے زمانہ کے بعض زائغین نے ''ربوہ'' سے کشمیر مراد لیا ہے اور وہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر بتلائی ہے جس کا کوئی ثبوت تاریخی حیثیت سے نہیں ، محض کذب و دروغبافی ہے ، محلہ ''خان یار'' شہر سری نگر میں جو قبر ''یوز آسف'' کے نام سے مشہور ہے اور جس کی بابت ''تاریخ اعظمی'' کے مصنف نے محض عام افواہ نقل کی ہے کہ ''لوگ اس کو کسی نبی کی قبر بتاتے ہیں وہ کوئی شہزادہ تھا اور دوسرے ملک سے یہاں آیا'' اس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر بتانا پرلے درجہ کی بے حیائی اور سفاہت ہے ، ایسی اٹکل پچوں قیاس آرائیوں سے حضرت مسیح علیہ السلام کی حیات کو باطل ٹھہرانا بجز خبط اور جنون کے کچھ نہیں اگر اس قبر کی تحقیق مطلوب ہو اور یہ کہ ''یوز آسف'' کون تھا تو جناب منشی حبیب اللہ صاحب امرتسری کا رسالہ دیکھو جو خاص اس موضوع پر نہایت تحقیق و تدقیق سے لکھا گیا ہے ، اور جس میں اس مہمل خیال کی دھجیاں بکھیر دی گئی ہیں ، فجزاه الله تعالىٰ عنا وعن سائر المسلمين احسن الجزاء۔

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۵۱﴾

اے رسولو! کھاؤ ستھری چیزیں اور کام کرو بھلا ۱ جو تم کرتے ہو میں جانتا ہوں ۲

**خلاصہ تفسیر:** شروع سورت میں عبادت کا واجب ہونا ، اس کے بعد اس کی تاکید اور ترغیب کے لیے معبود کی صفات کمال اور بڑی بڑی نعمتوں کا بیان تھا ، اسی سلسلہ میں چند قصے مذکور ہوئے تھے ، اب آگے ان ہی مضامین کی تجدید ، تاکید اور اجمال کے بعد تفصیل ہے ۔

( ہم نے جس طرح تم کو اپنی نعمتوں کے استعمال کی اجازت دی اور عبادت کا حکم دیا ، اسی طرح سب پیغمبروں کو اور ان کے واسطے سے ان کی امتوں کو بھی حکم دیا کہ ) اے پیغمبرو! تم ( اور تمہاری امتیں ) نفیس چیزیں کھاؤ ( کہ خدا کی نعمت ہیں ) اور ( کھا کر شکر ادا کرو کہ ) نیک کام کرو ( جس کا طریقہ عبادت ہے ، اور ) میں تم سب کے کیے ہوئے کاموں کو خوب جانتا ہوں ( سو عبادت اور نیک کاموں پر ان کی جزا اور ثمرات عطا کروں گا ) ۔

كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ: مسلم اور ترمذی کی مرفوع حدیث میں جو حلال روزی کے بارہ میں اس آیت سے استدلال کیا گیا ہے اس سے یہ شبہ نہ

کیا جائے کہ حدیث سے "طیب" کی تفسیر حلال روزی معلوم ہوتی ہے اور میں نے یہاں لذیذ نفیس کے ساتھ تفسیر کی ہے، جواب یہ ہے کہ جو لذیذ حلال نہ ہوگی وہ گویا حلال ہی نہیں، کیونکہ ان میں معنوی لذت نہیں، خوب سمجھ لو۔

**كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ:** اس میں رہبانیت کو باطل کیا گیا ہے جس میں بعض شدت پسند غالی لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں (دین اسلام میں رہبانیت نہیں ہے، بلکہ جن چیزوں کے استعمال کی اجازت ہے ان کو حد اعتدال کے ساتھ سنن نبوی کی روشنی میں استعمال کرنا جائز ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی سب پیغمبروں کے دین میں یہ ہی ایک حکم رہا کہ حلال کھانا حلال راہ سے کما کر، اور نیک کام کرنا، نیک کام سب خلق جانتی ہے، چنانچہ تمام پیغمبر نہایت مضبوطی اور استقامت کے ساتھ اکل حلال، صدق مقال اور نیک اعمال پر مواظبت اور اپنی امتوں کو اسی کی تاکید کرتے رہے، قرآن کریم میں دوسری جگہ اسی طرح کا حکم جو یہاں رسولوں کو ہوا، عامہ مومنین کو دیا گیا ہے، اس میں نصاریٰ کی رہبانیت کا بھی رد ہو گیا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر سے خاص مناسبت رکھتا ہے، احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جس کا کھانا پینا، حرام کا ہو، اسے اپنی دعاء کے قبول ہونے کی توقع نہیں رکھنا چاہیے، اور بعض احادیث میں ہے کہ جو گوشت حرام سے آگاہ ہو، دوزخ کی آگ اس کی زیادہ حق دار ہے، العیاذ باللہ۔

**فائدہ:** ۲ یعنی حلال کھانے اور نیک کام کرنے والوں کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ان کے تمام کھلے چھپے احوال و افعال سے باخبر ہے، اسی کے موافق ہر ایک سے معاملہ کرے گا، یہ رسولوں کو خطاب کر کے امتوں کو سنایا۔

---

## وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ﴿۵۲﴾

اور یہ لوگ ہیں تمہارے دین کے سب ایک دین پر اور میں ہوں تمہارا رب سو مجھ سے ڈرتے رہو

## فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۳﴾

پھر پھوٹ ڈال کر کر لیا اپنا کام آپس میں ٹکڑے ٹکڑے ۱ ہر فرقہ جو ان کے پاس ہے اس پر ریجھ رہے (نازاں) ہیں ۲

---

**خلاصہ تفسیر:** اور (ہم نے ان سے یہ بھی کہا کہ جو طریقہ تمہیں ابھی بتایا گیا ہے) یہ ہے تمہارا طریقہ (جس پر تم کو چلنا اور رہنا واجب ہے) کہ وہ ایک ہی طریقہ ہے (سب انبیاء اور ان کی امتوں کا، کسی شریعت میں یہ طریقہ نہیں بدلا) اور (حاصل اس طریقہ کا یہ ہے کہ) میں تمہارا رب ہوں تم مجھ سے ڈرتے رہو (یعنی میرے احکام کی مخالفت نہ کرو، کیونکہ رب ہونے کی حیثیت سے تمہارا خالق و مالک بھی ہوں اور منعم ہونے کی حیثیت سے تم کو بیشمار نعمتیں بھی دیتا ہوں، ان سب چیزوں کا تقاضا میری اطاعت و فرمانبرداری ہے) سو (اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ سب ایک ہی طریق پر رہتے مگر ایسا نہ کیا، بلکہ) ان لوگوں نے اپنے دین میں اپنا طریق الگ الگ کر کے اختلاف پیدا کر لیا (چنانچہ ان میں اب بھی جتنے گروہ موجود ہیں ان میں سے) ہر گروہ کے پاس جو دین (یعنی اپنا بنایا ہوا طریقہ) ہے وہ اسی سے خوش ہے (اس کے باطل ہونے کے باوجود اسی کو حق سمجھتا ہے)۔

**فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا:** مراد آیت کی یہ ہے کہ یہ لوگ عقائد اور اصول میں بھی مختلف فرقے بن گئے، لیکن فروعی اختلاف ائمہ مجتہدین کا اس میں داخل نہیں، کیونکہ ان اختلافات سے دین وملت الگ نہیں ہو جاتا اور ایسا اختلاف رکھنے والے الگ الگ فرقے نہیں کہلاتے اور اس اجتہادی اور فروعی اختلاف کو فرقہ واریت کا رنگ دینا خالص جہالت ہے جو کسی مجتہد کے نزدیک جائز نہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی اصول کے اعتبار سے تمام انبیاء کا دین وملت ایک اور سب کا خدا بھی ایک ہے جس کی نافرمانی سے ہمیشہ ڈرتے رہنا چاہیے، لیکن لوگوں نے پھوٹ ڈال کر اصل دین کو پارہ پارہ کر دیا اور جدی جدی راہیں نکال لیں، اس طرح آراء و اہواء کا اتباع کر کے سینکڑوں فرقے اور مذہب بن

گئے، یہ تفریق انبیاء نے نہیں سکھلائی، ان کے یہاں ازمنہ وامکنہ وغیرہ کے اختلاف سے صرف فروعی اختلاف تھا، اصول دین میں سب بالکلیہ متفق رہے ہیں، عموماً مفسرین نے آیت کی تقریر اسی طرح کی ہے، لیکن حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''ہر پیغمبر کے ہاتھ اللہ تعالیٰ نے جو اس وقت کے لوگوں میں بگاڑ تھا، اس کا سنوار فرمایا، پیچھے لوگوں نے جانا ان کا حکم جدا جدا ہے، آخر ہمارے پیغمبر کی معرفت سب بگاڑ کا سنوار (اور سب خرابیوں کا علاج) اکٹھا بتا دیا اب سب دین مل کر ایک دین ہو گیا''، اور سب قومیں ایک جھنڈے تلے جمع کر دی گئیں۔

**فائدہ:** ۲ یعنی سمجھتے ہیں کہ ہم ہی حق پر ہیں اور ہماری ہی راہ سیدھی ہے۔

فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۵۴﴾

سو چھوڑ دے ان کو ان کی بیہوشی (کے گھڑے) میں ڈوبے ایک وقت تک

**خلاصہ تفسیر:** تو (جب یہ بات ہے کہ باطل ہونے کے باوجود اسے حق سمجھ رہے ہیں تو) آپ ان کو ان کی (اسی) جہالت میں ایک خاص وقت تک رہنے دیجئے (یعنی ان کی جہالت پر آپ غم نہ کیجئے جب ان کی موت کا مقرر وقت آ جائے گا تو سب حقیقت کھل جائے گی)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جن لوگوں نے انبیاء کی متفقہ ہدایات میں رخنے ڈال کر الگ الگ فرقے اور ملتیں قائم کر دیں ہر فرقہ اپنے ہی عقائد وخیالات پر دل جمائے بیٹھا ہے، کسی طرح اس سے ہٹنا نہیں چاہتا، خواہ آپ کتنی ہی نصیحت فرمائیں تو آپ بھی ان کے غم میں زیادہ نہ پڑیے بلکہ تھوڑی سی مہلت دیجئے کہ یہ اپنی غفلت و جہالت کے نشہ میں ڈوبے رہیں، یہاں تک کہ وہ گھڑی آ پہنچے جب ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں، یعنی موت یا عذاب الٰہی ان کے سروں پر منڈلانے لگے۔

اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ﴿۵۵﴾ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

کیا وہ خیال کرتے ہیں کہ یہ جو ہم انکو دیے جاتے ہیں مال اور اولاد، سو دوڑ دوڑ کر پہنچا رہے ہیں ہم انکو بھلائیاں ۱ یہ بات نہیں وہ سمجھتے نہیں ۲

**خلاصہ تفسیر:** (اور اب جو فوری طور پر ان پر عذاب نہیں آتا تو) کیا (اس سے) یہ لوگ یوں گمان کر رہے ہیں کہ ہم ان کو جو کچھ مال و اولاد دیتے ہیں تو ہم ان کو جلدی جلدی فائدے پہنچا رہے ہیں (یہ بات ہرگز نہیں) بلکہ یہ لوگ (اس ڈھیل دینے کی وجہ) نہیں جانتے (یعنی یہ ڈھیل تو ان کو بطور استدراج کے دی جا رہی ہے جو انجام کار ان کے لئے اور زیادہ عذاب کا سبب بنے گی، کیونکہ ہماری مہلت اور ڈھیل دینے سے یہ اور مغرور ہو کر سرکشی اور گناہوں میں زیادتی کریں گے تو ادھر عذاب زیادہ ہوگا)۔

**اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ:** ظاہری نعمتوں سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے، اسی پر قیاس کرتے ہوئے عارفین نے کہا ہے کہ باطنی نعمتوں سے بھی دھوکہ نہیں کھانا چاہیے، یعنی اگر کیفیات واحوال حاصل ہو جائیں تو اس پر اترانا اور فخر نہیں کرنا چاہیے، جیسے ذوق وشوق کی کیفیت، طبیعت میں انبساط اور کشادگی کی حالت، کیونکہ یہ بھی کبھی استدراج یعنی ڈھیل ہوتی ہے (ڈرتے رہنا چاہیے کہ کہیں یہ امتحان نہ ہو)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یہ ہی خیال ان کا تھا، چنانچہ کہتے تھے: نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ یعن (سبا: ۳۵) ی ہم اگر خدا کے ہاں مردود ومبغوض ہوتے تو یہ مال ودولت اور اولاد وغیرہ کی بہتات کیوں ہوتی۔

**فائدہ:** ۲ یعنی سمجھتے نہیں کہ مال و اولاد کی یہ افراط ان کی فضیلت و کرامت کی وجہ سے نہیں امہال واستدراج کی بناء پر ہے، جتنی ڈھیل دی جا رہی ہے اسی قدر ان کی شقاوت کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے: سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ (الاعراف: ۱۸۲)

إِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۸﴾

البتہ جو لوگ اپنے رب کے خوف سے اندیشہ رکھتے ہیں ۱ے اور جو لوگ اپنے رب کی باتوں پر یقین کرتے ہیں ۲ے

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾

اور جولوگ اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں مانتے ۳ے

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے یہ مذکور تھا کہ کفار کی موجودہ حالت سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم ان کو جلدی جلدی فائدہ پہنچا رہے ہیں، آگے مقابلہ کے طور پر اہل ایمان کی موجودہ حالت کی بابت فرماتے ہیں کہ چونکہ شریعت کا اتباع کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے حقوق ادا کرتے ہیں وہ البتہ جلدی جلدی فائدے حاصل کر رہے ہیں۔

اس میں کوئی شک (وشبہ) نہیں کہ جو لوگ اپنے رب کی ہیبت سے ڈرتے رہتے ہیں، اور جو لوگ اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں، اور جو لوگ (اس ایمان میں) اپنے رب کے ساتھ شرک نہیں کرتے۔

**وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ:** یہاں يُؤْمِنُوْنَ کے بعد لَا يُشْرِكُوْنَ فرمانے کا یہ فائدہ ہوسکتا ہے کہ مشرکین بھی چونکہ خدا کو مانتے تھے اس لیے ایمان کا دعویٰ کرتے تھے جیسا کہ فرمایا: ولئن سالتهم من خلق السموت والارض ليقولن الله اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان وزمین کو کس نے پیدا کیا وہ بھی کہیں گے کہ اللہ نے، سو اسی بنا پر ارشاد ہوا: وما يؤمن اكثرهم بالله الا وهم مشركون کہ ان میں سے اکثر لوگ خدا پر ایمان نہیں رکھتے مگر اس حالت میں کہ ایمان کے ساتھ شرک بھی کرتے ہیں، تو اس سے مشرکین پر مؤمن ہونے کا شبہ ہوسکتا تھا، اس لیے لَا يُشْرِكُوْنَ بڑھانا مفید ہوا کہ جو ایمان شرک سے خالی ہو وہی معتبر ہے اور جس کے ساتھ شرک کی آمیزش ہو وہ ایمان نہیں ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ے یعنی باوجود ایمان واحسان کے کفار ومغرورین کی طرح "مکر اللہ" سے مامون نہیں ہمہ وقف خوف خدا سے لرزاں وترساں رہتے ہیں کہ نہ معلوم دنیا میں جو انعامات ہو رہے ہیں استدراج تو نہیں، حسن بصری کا مقولہ ہے: "اِنَّ الْمُؤْمِنَ جمع اِحْسَانًا وَّشَفْقَةً وَاِنَّ الْمُنَافِقَ جَمَعَ اِسَاءَةً وَاَمْنًا" (مومن نیکی کرتا اور ڈرتا رہتا ہے اور منافق بدی کرکے بےفکر ہوتا ہے)۔

**فائدہ:** ۲ے یعنی آیات کونیہ وشرعیہ دونوں پر یقین رکھتے ہیں کہ جو کچھ ادھر سے پیش آئے عین حکمت اور جو خبر دی جائے بالکل حق اور جو حکم ملے وہ بہمہ وجوہ صواب ومعقول ہے۔

**فائدہ:** ۳ے یعنی خالص ایمان وتوحید پر قائم ہیں، ہر ایک عمل صدق واخلاص سے ادا کرتے ہیں، شرک جلی یا خفی کا شائبہ بھی نہیں آنے دیتے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ﴿۶۰﴾

اور جو لوگ کہ دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور ان کے دل ڈر رہے ہیں اس لیے کہ ان کو اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے ۱ے

اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴿۶۱﴾

وہ لوگ دوڑ دوڑ کر لیتے ہیں بھلائیاں اور وہ ان پر پہنچے سب سے آگے ۲ے

**خلاصہ تفسیر:** اور جو لوگ (اللہ کی راہ میں) دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور (اللہ کی راہ میں دینے اور خرچ کرنے کے باوجود) ان کے دل اس سے خوفزدہ رہتے ہیں کہ وہ اپنے رب کے پاس جانے والے ہیں (دیکھئے وہاں جا کر ان صدقات کا کیا ثمرہ ظاہر ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ دینا

حکم کے موافق نہ ہو، مثلاً مال حلال نہ ہو، یا نیت اللہ کے لئے خالص نہ ہو، اور نیت میں کامل اخلاص نہ ہونا یا مال کا حرام ہونا ہمیں معلوم نہ ہو تو الٹا اس پر مواخذہ ہونے لگے، تو جن لوگوں میں یہ مذکورہ صفات ہوں) یہ لوگ اپنے فائدے جلدی جلدی حاصل کر رہے ہیں اور وہ ان کی طرف دوڑ رہے ہیں (کفار کے برخلاف)۔

**وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ**: اس میں اس بات کی تعلیم ہے کہ انسان کو اپنے اعمال اور نفس پر کبھی مطمئن نہیں ہونا چاہیے (نفس کی مثال ایک دشمن کی سی ہے، وہ کسی بھی وقت دھوکہ دے سکتا ہے، دشمن سے بے خبر رہنا خطرناک حالت ہے)۔

* * *

**فائدہ**: ۱ یعنی کیا جانے وہاں قبول ہوا یا نہ ہوا، آگے کام آئے یا نہ آئے، اللہ کی راہ میں خرچ کر کے یہ کھٹکا لگا رہتا ہے، اپنے عمل پر مغرور نہیں ہوتے، نیکی کرنے کے باوجود ڈرتے ہیں۔

**فائدہ**: ۲ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، کما قال تعالیٰ: فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ (آل عمران: ۱۴۸) تو درحقیقت اصلی بھلائی اعمال صالحہ، اخلاق حمیدہ اور ملکات فاضلہ میں ہوئی نہ کہ اموال و اولاد میں، جیسے کفار کا گمان تھا۔

**وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝۶۲**

اور ہم کسی پر بوجھ نہیں ڈالتے مگر اس کی گنجائش کے موافق اور ہمارے پاس لکھا ہوا (کتاب) ہے جو بولتا (بولتی) ہے سچ اور ان پر ظلم نہ ہوگا

**خلاصہ تفسیر**: اور (یہ مذکورہ اعمال کچھ سخت بھی نہیں جن کا کرنا مشکل ہو، کیونکہ) ہم کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ کام کرنے کو نہیں کہتے (اس لئے یہ سب کام آسان ہیں اور اس کے ساتھ ان کا اچھا انجام اور ثمرہ یقینی ہے، کیونکہ) ہمارے پاس ایک دفتر (نامہ اعمال کا محفوظ) ہے جو ٹھیک ٹھیک (سب کا حال) بتلا دے گا اور لوگوں پر ذرا ظلم نہ ہوگا (بلکہ ہر ایک کی کوشش کی پوری پوری قدر ہوگی اور ذرہ ذرہ نیکی پر ثواب ملے گا)۔

* * *

**فائدہ**: یعنی اوپر جو اعمال وخصال بیان کیے گئے کوئی ایسے مشکل کام نہیں جن کا اٹھانا انسانی طاقت سے باہر ہو، ہماری یہ عادت نہیں کہ لوگوں کو تکلیف مالا یطاق دی جائے، یہ سب باتیں وہ ہیں جن کو اگر توجہ کرو تو بخوبی حاصل کر سکتے ہو، اور جو لوگ سابقین کاملین کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتے انھیں بھی اپنی وسعت و ہمت کے موافق پوری کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اسی کے مکلف ہیں، ہمارے یہاں صحائف اعمال میں درجہ بدرجہ ہر ایک کے اعمال لکھے ہوئے موجود ہیں جو قیامت کے دن سب کے سامنے کھول کر رکھ دیے جائیں گے اور ان ہی کے موافق جزا دی جائے گی جس پر رتی برابر ظلم نہ ہوگا نہ کسی کی نیکی ضائع ہوگی، نہ اجر کم کیا جائے گا، نہ بے وجہ بے قصور دوسرے کا بوجھ اس پر ڈالا جائے گا۔

**بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ۝۶۳ حَتّٰٓى اِذَآ**

کوئی نہیں ان کے دل بیہوش ہیں اس طرف سے اور ان کو اور کام لگ رہے ہیں اس کے سوا کہ وہ ان کو کر رہے ہیں ۱ یہاں تک کہ جب

**اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْــَٔرُوْنَ ۝۶۴ لَا تَجْــَٔرُوا الْيَوْمَ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ۝۶۵**

پکڑیں گے ہم انکے آسودہ لوگوں کو آفت میں تبھی وہ لگیں گے چلّانے، مت چلّاؤ آج کے دن، تم ہم سے چھوٹ نہ سکو گے (چھڑائے نہ جاؤ گے) ۲

**خلاصہ تفسیر**: پیچھے مخالفین اسلام کی جہالت اور ان کے مستحق عذاب ہونے کا اجمالی بیان تھا، آگے اسی کی تفصیل ہے، اور درمیان میں مقابلہ کے طور پر مؤمنین کا اور ان کے اعمال کا ذکر تھا اور اس تفصیل کے شروع میں کفار کے اعمال کا مؤمنین کے اعمال کے ساتھ مقابلہ بھی کیا گیا ہے کہ:

(پیچھے مسلمانوں کی تو یہ حالت سنی، مگر کفار ایسے نہیں ہیں) بلکہ (برعکس) ان کفار کے قلوب اس دین کی طرف سے (جس کا ذکر: بِاٰيٰتِ

رَبِّهِمْ میں ہے) جہالت (اور شک) میں (ڈوبے ہوئے) ہیں (جن کا حال پیچھے بھی معلوم ہو چکا فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ) اور اس (جہالت وانکار) کے علاوہ ان لوگوں کے اور بھی (برے برے خبیث) عمل ہیں جن کو یہ (مسلسل) کرتے رہتے ہیں (جیسا کہ مسلمان آیات پر ایمان لانے کے علاوہ اور بھی اعمال خیر کرتے تھے اسی طرح یہ لوگ شرک اور برے اعمال کے برابر عادی رہیں گے) یہاں تک کہ جب ہم ان کے خوشحال لوگوں کو (جن کے پاس مال و دولت اور نوکر چاکر سب کچھ ہے، موت کے بعد) عذاب میں دھر پکڑیں گے (اور غریب غرباء تو کس گنتی میں ہیں اور وہ تو عذاب سے کیا بچاؤ کر سکتے ہیں، غرض یہ کہ جب ان سب پر عذاب نازل ہوگا) تو فوراً چلا اٹھیں گے (اور سارا انکار و غرور جس کے اب عادی ہیں کافور ہو جائے گا، اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ) اب مت چلاؤ (کہ کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ) ہماری طرف سے تمہاری مطلق مدد نہ ہوگی (کیونکہ یہ آخرت دار الجزاء ہے، دار العمل نہیں جس میں چلانا اور عاجزی کرنا مفید ہو)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی آخرت کے حساب کتاب سے یہ لوگ غافل ہیں اور دنیا کے دوسرے دھندوں میں پڑے ہیں جن سے نکلنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی جو آخرت کی طرف توجہ کریں، یا یہ مطلب ہے کہ ان کے دل شک و تردد اور غفلت و جہالت کی تاریک موجوں میں غرقاب ہیں، بڑا گناہ تو یہ ہوا، باقی اس سے ورے اور بہت سے گناہ ہیں جن کو وہ سمیٹ رہے ہیں، ایک دم کو ان سے جدا نہیں ہوتے، اور جدا بھی کیونکر ہوں، جو کام ان کی سوء استعداد کی بدولت مقدر ہو چکے ہیں وہ کر کے رہیں گے اور لامحالہ ان کا خمیازہ بھی اٹھانا پڑے گا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی جب دنیاوی یا اخروی عذاب میں پکڑے جائیں گے تو چلائیں گے اور شور مچائیں گے کہ ہمیں اس آفت سے بچاؤ، بھلا وہاں بچانے والا کون؟ حکم ہوگا کہ چلاؤ نہیں، یہ سب چیخ پکار بیکار ہے، آج کوئی تمہاری مدد کو نہیں پہنچ سکتا نہ ہمارے عذاب سے چھڑا سکتا ہے، چنانچہ اس عذاب کا ایک نمونہ کفار مکہ کو بدر میں دکھلایا گیا جہاں ان کے بڑے بڑے سردار مارے گئے یا قید ہو گئے، عورتیں مہینوں تک ان کا نوحہ کرتی رہیں، سر کے بال کٹوا کر ماتم کیے گئے، روئے پیٹے، چیخے چلائے، کچھ بن نہ پڑا، ایک مرتبہ حضور ﷺ نے مظالم سے تنگ آ کر بددعا فرمائی تو سات سال کا قحط مسلط ہوا مردار کی ہڈیاں اور چمڑے کھانے اور خون پینے کی نوبت آ گئی، آخر رحمۃ للعالمین سے رحم کا واسطہ دے کر دعا کی درخواست کی، تب اللہ تعالیٰ نے وہ عذاب اٹھایا، اس وقت نہ ''لات و منات'' کام آئے نہ ہبل و نائلہ۔

قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ﴿٦٦﴾

تم کو سنائی جاتی تھیں میری آیتیں تو تم ایڑیوں پر الٹے بھاگتے تھے

مُسْتَكْبِرِيْنَ ۖ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴿٦٧﴾

اس سے تکبر کر کے ۱؎، ایک قصہ گو کو چھوڑ کر چلے گئے (قصہ کو سمجھ کر [کہہ کر] چھوڑ جاتے) ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** (دنیا جو دار العمل تھا اس میں تو تمہارا یہ حال تھا کہ) میری آیتیں تم کو پڑھ پڑھ کر (رسول کی زبان سے) سنائی جایا کرتی تھیں تو تم الٹے پاؤں بھاگتے تھے تکبر کرتے ہوئے قرآن کا مشغلہ بناتے ہوئے (اس قرآن کی شان) میں بیہودہ بکتے ہوئے (کہ کوئی اس کو جادو کہتا تھا، کوئی شعر کہتا تھا، اور مشغلہ کا یہی مطلب ہے، پس تم نے دار العمل یعنی دنیا میں جیسا کیا آج دار الجزاء یعنی آخرت میں ویسا ہی بھگتو)۔

**مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ:** یہ قریش کی شان میں ہے کہ وہ بیت اللہ کے خادم ہونے پر فخر کرتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ فضائل یعنی کسی نسبت و فضیلت پر فخر کرنا برا ہے، مثلاً یہ کہ ہم فلاں بزرگ کی اولاد ہیں، یا فلاں مزار کے خادم و سجادہ نشین ہیں، یا فلاں فلاں تبرکات کے حامل ہیں، یا فلاں سلسلہ میں داخل ہیں وغیرہ۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی اب کیوں شور مچاتے ہو، وہ وقت یاد کرو جب خدا کے پیغمبر آیات پڑھ کر سناتے تھے تو تم الٹے پاؤں بھاگتے تھے، سننا بھی گوارا نہ تھا، تمہاری شیخی اور تکبر اجازت نہ دیتا تھا کہ حق کو قبول کرو اور پیغمبروں کی بات پر کان دھرو۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی پیغمبر کی مجلس سے ایسے بھاگتے تھے گویا کسی فضول قصہ گو کو چھوڑ کر چلے گئے یا سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ کا مطلب یہ ہے کہ رات کے وقت حرم میں بیٹھ کر پیغمبر ﷺ اور قرآن کریم کی نسبت باتیں بناتے اور طرح طرح کے قصے گھڑتے تھے، کوئی جادو کہتا تھا، کوئی شاعری، کوئی کہانت، کوئی کچھ اور، اسی طرح کی بکواس اور بیہودہ ہذیان کیا کرتے تھے، آج اس کا مزہ چکھو، چیخنے چلانے سے کچھ حاصل نہیں۔

اَفَلَمۡ يَدَّبَّرُوا الۡقَوۡلَ اَمۡ جَآءَهُمۡ مَّا لَمۡ يَاۡتِ اٰبَآءَهُمُ الۡاَوَّلِيۡنَ ۝٦٨

سو کیا انہوں نے دھیان نہیں کیا اس کلام میں ۱؎ یا آئی ہے ان کے پاس ایسی چیز جو نہ آئی تھی ان کے پہلے باپ دادوں کے پاس ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اب ان کی جہالت اور گمراہی کے اسباب کو تفصیل سے بیان کر کے ان کا رد فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جو قرآن اور صاحب قرآن یعنی پیغمبر کی تکذیب کر رہے ہیں تو اس کا کیا سبب ہے؟

کیا ان لوگوں نے اس کلام (الٰہی) میں غور نہیں کیا (جس سے اس کا معجزہ ہونا ظاہر ہو جاتا اور یہ ایمان لے آتے) یا (تکذیب کی یہ وجہ ہے کہ) ان کے پاس کوئی ایسی چیز آئی ہے جو ان کے پہلے بڑوں کے پاس نہیں آئی تھی (مراد اس سے احکام الٰہیہ کا رسولوں کے ذریعہ آنا ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ بات بھی نہیں کہ ان رسولوں پر وحی نئی آئی ہو، کیونکہ احکام الٰہی تو رسولوں کے ذریعہ ہمیشہ سے نازل ہوتے آئے ہیں: قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ یعنی آپ کہہ دیجیے کہ میں کوئی انوکھا رسول نہیں ہوں، پس تکذیب کی یہ وجہ بھی باطل ٹھہری، یہ دو وجہ تو قرآن کے متعلق ہیں)۔

مَّا لَمۡ يَاۡتِ اٰبَآءَهُمُ الۡاَوَّلِيۡنَ: یہ شبہ نہ کیا جائے کہ ایک اور آیت: لتنذر قوما ما انذر اباءهم سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین عرب کے آباء واجداد میں رسول نہیں آئے تھے، اور یہاں اس آیت سے ان کے آباء واجداد کے پاس رسولوں کا آنا معلوم ہوتا ہے، جس سے بظاہر دونوں آیتوں میں تعارض کا شبہ ہوتا ہے، جواب یہ ہے کہ یہاں اس آیت میں دور کے آباء واجداد مراد ہیں جیسا کہ لفظ اوّلین بھی اس کا قرینہ ہے اور دوسری آیت میں نزدیک کے آباء واجداد مراد ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی قرآن کی خوبیوں میں غور وفکر نہیں کرتے، ورنہ حقیقت حال منکشف ہو جاتی کہ بلاشبہ یہ کلام اللہ جل شانہ، کا ہے جس میں ان کی بیماریوں کا صحیح علاج بتلایا گیا ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی نصیحت کرنے والے ہمیشہ ہوتے رہے ہیں، پیغمبر ہوئے یا پیغمبر کے تابع ہوئے، آسمانی کتابیں بھی برابر اترتی رہی ہیں، کبھی کہیں، کبھی کہیں، سو یہ کوئی انوکھی بات نہیں جس کا نمونہ پیشتر سے موجود نہ ہو، ہاں جو اکمل ترین واشرف ترین کتاب اب آئی اس شان ومرتبہ کی پہلے نہ آئی تھی تو اس کا مقتضی یہ تھا کہ اور زیادہ اس نعمت کی قدر کرتے اور آگے بڑھ کر اس کی آواز پر لبیک کہتے، جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہی۔

**تنبیہ:** شاید یہاں آباء اولین سے آباء ابعدین مراد ہوں، اور سورہ یٰس میں جو آیا ہے: لتنذر قوما ما انذر اٰبأوهم وہاں آباء اقربین کا ارادہ کیا گیا ہو، واللہ اعلم۔

اَمۡ لَمۡ يَعۡرِفُوۡا رَسُوۡلَهُمۡ فَهُمۡ لَهٗ مُنۡكِرُوۡنَ ۝٦٩

یا پہچانا نہیں انہوں نے اپنے پیغام لانے والے کو سو وہ اس کو اوپرا سمجھتے (نہیں مانتے) ہیں ۱؎

اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ بَلۡ جَآءَهُمۡ بِالۡحَقِّ وَاَكۡثَرُهُمۡ لِلۡحَقِّ كٰرِهُوۡنَ ۝٧٠

یا کہتے ہیں اس کو سودا ہے، کوئی نہیں وہ تو لایا ہے ان کے پاس سچی بات اور ان بہتوں کو سچی بات بری لگتی ہے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** (اب صاحب قرآن یعنی پیغمبر کے متعلق فرماتے ہیں:) یا (جھٹلانے کی وجہ یہ ہے کہ) یہ لوگ اپنے رسول (کی دیانت، صداقت اور امانت جیسی صفات) سے واقف نہ تھے اس وجہ سے ان کے منکر ہیں (یعنی یہ وجہ بھی باطل ہے، کیونکہ آپ کے صدق و دیانت پر سب کا اتفاق تھا) یا (یہ وجہ ہے کہ) یہ لوگ (نعوذ باللہ) آپ کی نسبت جنون کے قائل ہیں (سو آپ کا اعلیٰ درجہ کا صاحب عقل اور صاحب الرائے ہونا بھی ظاہر ہے، سو واقع میں ان میں سے کوئی وجہ بھی معقول نہیں) بلکہ (جھٹلانے کی اصلی وجہ یہ ہے کہ) یہ رسول ان کے پاس حق بات لے کر آئے ہیں اور ان میں اکثر لوگ حق بات سے نفرت رکھتے ہیں (بس تمام تر وجہ جھٹلانے اور دین حق کے اتباع نہ کرنے کی یہ ہے)۔

**وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ:** لفظ ''اکثر'' اس لیے فرمایا کہ بعض ان میں سے علم الٰہی میں ایمان لانے والے تھے، اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ کراہت صرف بعض کو تھی، اور بعض کے لیے ایمان سے اور موانع تھے جیسے عار یا مال وجاہ کے فوت ہونے کا خوف وغیرہ، اور حق سے کوئی خاص عداوت نہ تھی۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی کیا اس لیے اعراض و تکذیب پر تلے ہوئے ہیں کہ ان کو پیغمبر کے احوال سے آگاہی نہیں، حالانکہ سارا عرب جانتا ہے کہ آپ بچپن سے صادق و امین اور عفیف و پاکباز تھے، چنانچہ حضرت جعفرؓ نے بادشاہ حبشہ کے سامنے، حضرت مغیرہ ابن شعبہ نے نائب کسریٰ کے آگے اور ابوسفیان نے بحالت کفر قیصر روم کے دربار میں اسی چیز کا اظہار کیا، پھر ایسے مشہور و معروف راست باز بندہ کی نسبت کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ (العیاذ باللہ) خدا تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے لگے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی سودائیوں اور دیوانوں کی باتیں کہیں ایسی کھری اور سچی ہوتی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ بھی محض زبان سے کہتے تھے، دل ان کا جانتا تھا کہ بیشک جو کچھ آپ لائے ہیں حق ہے، پر حق بات چونکہ ان کی اغراض و خواہشات کے موافق نہ تھی، اس لیے بری لگتی تھی اور قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوتے تھے۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ

اور اگر سچا رب چلے ان کی خوشی پر تو خراب ہو جائیں آسمان اور زمین اور جو کوئی ان میں ہے ۱

بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ؕ﴿۷۱﴾

کوئی نہیں ہم نے پہنچائی ہے ان کو ان کی نصیحت ۲ سو وہ اپنی نصیحت کو دھیان نہیں کرتے ۳

**خلاصہ تفسیر:** آگے فرماتے ہیں کہ یہ لوگ دین حق کا اتباع تو کیا کرتے یہ تو الٹا یہ چاہتے ہیں کہ وہ دین حق ہی ان کے خیالات کے تابع کر دیا جائے اور جو مضامین قرآن میں ان کے خلاف ہیں ان کو خارج یا ترمیم کر دیا جائے، جیسا کہ سورہ یونس میں ارشاد ہے: قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ

اور (بفرض محال) اگر (ایسا امر واقع ہو جاتا) اور دین حق ان کے خیالات کے تابع (اور موافق) ہو جاتا تو (تمام عالم میں کفر و شرک پھیل جاتا اور اس کا اثر یہ ہوتا کہ حق تعالیٰ کا غضب تمام عالم پر متوجہ ہو جاتا اور اس کا مقتضا یہ تھا کہ) تمام آسمان اور زمین اور جو ان میں (آباد) ہیں سب تباہ ہو جاتے (جیسا کہ قیامت میں گمراہی عام ہو جانے کے سبب اللہ تعالیٰ کا غضب بھی سب پر عام ہوگا اور غضب الٰہی عام ہونے سے سب کی ہلاکت بھی عام ہوگی اور اول تو کسی امر کا حق ہونا خود اس کا تقاضہ کرتا ہے کہ اس کو قبول کیا جائے اگرچہ وہ نافع بھی نہ ہو، اور حق کا قبول نہ کرنا خود عیب ہے، مگر ان لوگوں میں صرف یہی ایک عیب نہیں کہ حق سے کراہت ہو) بلکہ (اس سے بڑھ کر دوسرا عیب اور بھی ہے کہ حق کا اتباع جو انہیں کے نفع کا سامان ہے اس سے

دور بھاگتے ہیں، بس) ہم نے ان کے پاس ان کی نصیحت (اور نفع) کی بات بھیجی، سو یہ لوگ اپنی نصیحت سے بھی روگردانی کرتے ہیں۔

**وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ**: اس میں اہل طریق کے اس معمول کی اصل ہے کہ وہ مریدوں کی خواہشوں اور فرمائشوں کی پیروی نہیں کرتے، بلکہ حکمت ومصلحت کا پاس ولحاظ کرتے ہیں۔

* * *

**فائدہ**: ۱؎ یعنی سچی بات بری لگتی ہے تو لگنے دو، سچائی ان کی خوشی اور خواہش کے تابع نہیں ہوسکتی، اگر سچا خدا ان کی خوشی اور خواہش ہی پر چلا کرے تو وہ خدا ہی کہاں رہے، معاذ اللہ بندوں کے ہاتھ میں ایک کٹ پتلی بن جائے، ایسی صورت میں زمین وآسمان کے یہ محکم انتظامات کیونکر قائم رہ سکتے ہیں، اگر ایک چھوٹے سے گاؤں کا انتظام محض لوگوں کی خواہشات کے تابع کر دیا جائے، وہ بھی چار دن قائم نہیں رہ سکتا چہ جائیکہ زمین وآسمان کی حکومت، کیونکہ عام خواہشات نظام عقلی کے مزاحم اور باہمدگر بھی متناقض واقع ہوئی ہیں، عقل وہوٰی کی کشمکش اور اہوائے مختلفہ کی لڑائی میں سارے انتظامات درہم برہم ہوجائیں گے۔

**فائدہ**: ۲؎ جس کی وہ تمنا کیا کرتے تھے: لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ (الصافات)

**فائدہ**: ۳؎ جب آ گئی اور ایسی آئی جس سے ان کو قومی حیثیت سے عظیم الشان فخر وشرف حاصل ہوا، تو اب منہ پھیرتے ہیں اور ایسے اعلیٰ فضل وشرف کو ہاتھ سے گنوار ہے ہیں۔

## اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۖ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۷۲﴾

یا تو ان سے مانگتا ہے کچھ محصول سو محصول تیرے رب کا بہتر ہے، اور وہ ہے بہتر روزی دینے والا

**خلاصہ تفسیر**: یا (مذکورہ وجوہ واسباب کے علاوہ ان کے جھٹلانے کی یہ وجہ ہے کہ ان کو یہ شبہ ہوا ہو کہ) آپ ان سے کچھ آمدنی چاہتے ہیں تو (یہ بھی غلط ہے، کیونکہ جب آپ جانتے ہیں کہ) آمدنی تو آپ کے رب کی سب سے بہتر ہے اور وہ سب دینے والوں سے اچھا ہے (تو آپ لوگوں سے کیوں مانگتے)۔

**اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا**: جس شخص کی اصلاح وتربیت میں کوشش کی جائے، اس سے مال ونفع طلب کرنا برا ہے، کیونکہ یہ مقصود کے حصول میں مخل ثابت ہوتا ہے۔

* * *

**فائدہ**: یعنی آپ دعوت وتبلیغ اور نصیحت وخیر خواہی کر کے ان سے کسی معاوضہ کے بھی طلبگار نہیں، خدا تعالیٰ نے دارین کی جو دولت آپ کو مرحمت فرمائی ہے وہ اس معاوضہ سے کہیں بہتر ہے۔

ربع

## وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۷۳﴾

اور تو تو بلاتا ہے ان کو سیدھی راہ پر

## وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ﴿۷۴﴾

اور جو لوگ نہیں مانتے آخرت کو راہ سے ٹیڑھے ہو گئے ہیں ۱؎

**خلاصہ تفسیر**: اور (خلاصہ ان کی حالت کا یہ ہے کہ) آپ تو ان کو سیدھے رستہ کی طرف (جس کو اوپر حق کہا ہے) بلا رہے ہیں، اور ان لوگوں کی جو کہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے یہ حالت ہے کہ اس (سیدھے) رستہ سے ہٹے جاتے ہیں (مطلب یہ کہ دین کا حق ہونا اور مستقیم

ہونا اور نافع ہونا یہ سب ایمان لانے کے تقاضے اور اسباب جمع ہیں اور جو وجوہات مانع ہوسکتی تھیں وہ کوئی موجود نہیں، پھر ایمان نہ لانا اشد درجہ کی جہالت اور گمراہی ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی آپ کے صدق و امانت کا حال سب کو معلوم ہے، جو کلام آپ لائے اس کی خوبیاں اظہر من الشمس ہیں، معاذ اللہ آپ ﷺ کو خلل دماغ نہیں، ان سے کسی معاوضہ کے طالب نہیں، جس راستہ کی طرف آپ ﷺ بلاتے ہیں بالکل سیدھا اور صاف راستہ ہے جس کو ہر سیدھی عقل والا بسہولت سمجھ سکتا ہے کوئی اینچ پینچ نہیں ٹیڑھا ترچھا نہیں، ہاں اس پر چلنا ان ہی کا حصہ ہے جو موت کے بعد دوسری زندگی مانتے ہوں اور اپنی بدانجامی سے ڈرتے ہوں، جسے انجام کا ڈر اور عاقبت کی فکر ہی نہیں وہ کب سیدھے راستہ پر چلے گا، یقینا ٹیڑھا رہے گا، اور سیدھی سی بات کو بھی اپنی کجروی سے کج بنالے گا۔

وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَ كَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ۝۷۵ وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ

اور اگر ہم ان پر رحم کریں اور کھول دیں جو تکلیف پہنچی ان کو تو بھی برابر لگے رہیں گے اپنی شرارت میں بہکے ہوئے ۱ اور ہم نے پکڑا تھا ان کو

بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ۝۷۶ حَتّٰۤى اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ

آفت میں پھر نہ عاجزی کی اپنے رب کے آگے نہ گڑگڑائے ۲ یہاں تک کہ جب کھول دیں ہم ان پر دروازہ ایک سخت

شَدِيْدٍ اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ۝۷۷ ع

آفت کا تب اس میں ان کی آس ٹوٹے گی ۳

**خلاصہ تفسیر:** اور (ان کی سنگ دلی اور عناد کی یہ حالت ہے کہ جس طرح یہ لوگ شرعی احکام سے متاثر نہیں ہوتے اسی طرح آیات قہر کی نشانیوں یعنی مصائب و آفات سے بھی متاثر نہیں ہوتے اگرچہ مصیبت کے وقت بھی طبعی طور پر ہم کو پکارتے بھی ہیں، لیکن وہ دفع الوقتی ہوتی ہے، چنانچہ) اگر ہم ان پر مہربانی فرمادیں اور ان پر جو تکلیف ہے اس کو ہم دور بھی کردیں تو وہ لوگ (پھر) اپنی گمراہی میں بھٹکتے ہوئے اصرار کرتے رہیں (اور وہ قول وقرار جو مصیبت میں کئے تھے سب ختم ہوجائیں: وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا الخ اِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ الخ) اور (اس بات کی گواہی یہ ہے کہ بعض اوقات) ہم نے ان کو گرفتار عذاب بھی کیا ہے سو ان لوگوں نے نہ اپنے رب کے سامنے (پورے طور پر) فروتنی کی اور نہ عاجزی اختیار کی (پس جب عین مصیبت میں اور مصیبت بھی ایسی سخت جس کو عذاب کہا جاسکے، جیسے قحط وغیرہ جو مکہ میں حضور ﷺ کی بددعا سے ہوا تھا انہوں نے عاجزی اختیار نہ کی تو مصیبت زائل ہونے کے بعد تو بدرجہ اولیٰ ان سے اس کی توقع نہیں، مگر ان کی یہ ساری بے پروائی و بے باکی ان مصائب تک ہے جن کے عادی ہوچکے ہیں) یہاں تک کہ ہم جب ان پر سخت عذاب کا دروازہ کھول دیں گے (جو کہ خلاف عادۃ ہو خواہ دنیا ہی میں کوئی غیبی قہر آ پڑے، یا موت کے بعد جو کہ ضرور ہی واقع ہوگا) تو اس وقت بالکل حیرت زدہ رہ جائیں گے (کہ یہ کیا ہوگیا اور سب نشہ ہرن ہوجائے گا)۔

**فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ:** یعنی ان لوگوں نے اپنے رب کے سامنے پورے طور پر عاجزی نہ کی، یہاں ''پورے طور'' کی قید اس لیے بڑھائی کہ کسی قدر عاجزی کا ظاہر ہونا تو تھا، لیکن وہ اس لیے ناتمام تھا کہ اس پر کوئی معقول اثر عذاب کی حالت میں بھی مرتب نہ ہوتا تھا جو کہ قبول اسلام ہے، صرف وعدہ ہی وعدہ ہوا کرتا تھا۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی تکلیف سے نکال کر آرام دیں، تب بھی احسان نہ مانیں اور شرارت وسرکشی سے باز نہ آئیں، حضرت کی دعا سے ایک مرتبہ

مکہ والوں پر قحط پڑا تھا، پھر حضرت ہی کی دعا سے کھلا، شاید یہ اسی کو فرمایا، یا یہ مطلب ہے کہ اگر ہم اپنی رحمت سے ان کے نقصان کو دور کر دیں، یعنی قرآن کی سمجھ دے دیں، تب بھی یہ لوگ اپنے ازلی خسران اور سوءِ استعداد کی وجہ سے اطاعت و انقیاد اختیار کرنے والے نہیں: کما قال تعالیٰ: وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ۭ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ (الانفال: ۲۳)

**فائدہ:** ۲ے مثلاً قحط وغیرہ آفات مسلط ہوئیں، تب بھی عاجزی کر کے خدا کی بات نہ مانی۔

**فائدہ:** ۳ے اس سے یا تو آخرت کا عذاب مراد ہے یا شاید وہ دروازہ لڑائیوں کا کھلا جس میں تھک کر عاجز ہوئے۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْــِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾ وَهُوَ الَّذِيْ

اور اسی نے بنا دیے تمہارے کان اور آنکھیں اور دل، تم بہت تھوڑا حق مانتے ہو ۱ے اور اسی نے

ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ

تم کو پھیلا رکھا ہے زمین میں اور اسی کی طرف جمع ہو کر جاؤ گے ۲ے اور وہی ہے جلاتا اور مارتا اور اسی کا کام ہے بدلنا رات

وَالنَّهَارِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۸۰﴾

اور دن کا، سو کیا تم کو سمجھ نہیں ۳ے

**خلاصہ تفسیر:** گزشتہ آیات میں کفار کے اسباب جہالت و گمراہی اور اس کے سبب آخرت میں ان پر عذاب کا بیان تھا، چونکہ یہ عذاب دوبارہ زندہ ہونے پر موقوف ہے اور وہ لوگ اس کے منکر تھے اس لیے آگے آخرت کا اثبات اور ان کے انکار کا جواب ہے، اور آخرت کا اثبات موقوف ہے قدرت کاملہ کے ثابت ہونے پر، اس لیے بعض آیات میں قدرت کے کارناموں کا بھی بیان ہے۔

اور وہ (اللہ) ایسا (قادر اور منعم) ہے جس نے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل بنائے (کہ آرام بھی برتو اور شریعت اور دین کو بھی سمجھو، لیکن) تم لوگ بہت ہی کم شکر کرتے ہو (کیونکہ اصلی شکر یہ تھا کہ اس منعم کے پسند کیے ہوئے دین کو قبول کرتے اور قیامت میں دوبارہ زندہ کرنے کا انکار نہ کرتے) اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں پھیلا رکھا ہے اور تم سب (قیامت میں) اسی کے پاس لائے جاؤ گے (اس وقت اس کفرانِ نعمت کی حقیقت معلوم ہوگی) اور وہ ایسا ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے اور اسی کے اختیار میں ہے رات اور دن کا گھٹنا بڑھنا سو کیا تم (اتنی بات) نہیں سمجھتے (کہ یہ دلائل قدرت توحید پر اور قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے پر دلالت کرتے ہیں مگر پھر بھی مانتے نہیں)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ے کانوں سے اس کی آیات تنزیلیہ کو سنو اور آنکھوں سے آیات تکوینیہ کو دیکھو اور دلوں سے دونوں کو سمجھنے کی کوشش کرو، ان نعمتوں کا شکر یہ تھا کہ اللہ کی دی ہوئی قوتوں کو ان کے کام میں لاتے لیکن ایسا نہ ہوا، اکثر آدمیوں نے اکثر اوقات میں ان قوتوں کو بے جا خرچ کیا۔

**فائدہ:** ۲ے وہاں ہر ایک کو شکر گزاری اور ناشکری کا بدلہ مل جائے گا، اس وقت کوئی شخص یا کوئی عمل غیر حاضر نہ ہو سکے گا، جس نے پھیلایا اس کو سمیٹنا کیا مشکل ہے۔

**فائدہ:** ۳ے زندہ سے مردہ اور مردہ سے زندہ، یا اندھیرے سے اجالا اور اجالے سے اندھیرا کر دیا جس کے قبضہ میں ہے اس کی قدرت عظیمہ کے سامنے کیا مشکل ہے کہ تم کو دوبارہ زندہ کر دے اور آنکھوں کے آگے سے ظلمت جہل کے پردے اٹھا دے، جس کے بعد حقائق اشیاء ٹھیک ٹھیک منکشف ہو جائیں، جیسا کہ قیامت میں ہوگا: فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ۔

بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ ﴿۸۱﴾

کوئی بات نہیں یہ تو وہی کہہ رہے ہیں جیسا کہا کرتے تھے پہلے لوگ

قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۸۲﴾

کہتے ہیں کیا جب ہم مر گئے اور ہو گئے مٹی اور ہڈیاں کیا ہم کو زندہ ہو کر اٹھنا ہے (جلا اٹھائیں گے)

لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۸۳﴾

وعدہ دیا جاتا (چکا) ہے ہم کو اور ہمارے باپ دادوں کو یہی پہلے سے اور کچھ بھی نہیں یہ نقلیں ہیں پہلوں کی ۱؎

**خلاصہ تفسیر:** بلکہ یہ بھی ویسی ہی بات کہتے ہیں جو اگلے (کافر) لوگ کہتے چلے آئے ہیں (یعنی) یوں کہتے ہیں کہ کیا ہم جب مر جائیں گے اور ہم مٹی اور ہڈیاں رہ جائیں گے تو کیا ہم دوبارہ زندہ کئے جائیں گے اس کا تو ہم سے اور (ہم سے) پہلے ہمارے بڑوں سے وعدہ ہوتا چلا آیا ہے یہ کچھ بھی نہیں محض بے سند باتیں ہیں جو اگلوں سے منقول ہوتی چلی آتی ہیں۔

اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ ان کے آباء واجداد کے پاس تو کوئی رسول نہیں آیا تھا کیونکہ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا ہے: **لتنذر قوما ما انذر اباءهم** اس کا جواب یا تو آباء واجداد میں قریب اور بعید لے کر دیا جائے جیسا کہ پیچھے ایک فائدہ میں گزرا ہے، یا یہ کہا جائے کہ انبیاء سابقین کے اس قسم کے اقوال مشہور تھے دوسرے ناقلین کے ذریعہ سے ان کے آباء تک پہنچ گئے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی عقل وفہم کی بات کچھ نہیں محض پرانے لوگوں کی اندھی تقلید کیے چلے جا رہے ہیں، وہ ہی دقیانوسی شکوک پیش کرتے ہیں جو ان کے پیشرو کیا کرتے تھے، یعنی مٹی میں مل کر اور ریزہ ریزہ ہو کر ہم کیسے زندہ کیے جائیں گے؟ ایسی دوراز عقل باتیں جو ہم کو سنائی جا رہی ہیں پہلے ہمارے باپ دادوں سے بھی کہی گئی تھیں، لیکن ہم نے تو آج تک خاک کے ذروں اور ہڈیوں کے ریزوں کو آدمی بنتے نہ دیکھا، ہو نہ ہو یہ سب قصے کہانیاں ہیں جو پہلے لوگ گھڑ گئے تھے، اور اب ان ہی کی نقل کی جا رہی ہے۔

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۴﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۵﴾

تو کہہ کس کی ہے زمین اور جو کوئی اس میں ہے بتاؤ اگر تم جانتے ہو۔ اب کہیں گے سب کچھ اللہ کا ہے، تو کہہ پھر تم سوچتے نہیں

**خلاصہ تفسیر:** چونکہ ان کے اس مذکورہ قول سے قدرت کا انکار لازم آتا ہے اور انکار قدرت سے قیامت کے انکار کے ساتھ توحید کا انکار بھی ہوتا ہے اس لیے اس قول کے جواب میں قدرت کو ثابت کرتے ہوئے توحید کو بھی ثابت کرتے ہیں۔

آپ (جواب میں) یہ کہہ دیجئے کہ (اچھا یہ بتلاؤ کہ) یہ زمین اور جو اس پر رہتے ہیں کس کی ملک ہیں؟ اگر تم کو کچھ خبر ہے، وہ ضرور یہی کہیں گے کہ اللہ کے ہیں (تو) ان سے کہیے کہ پھر کیوں نہیں غور کرتے (تاکہ تمہیں توحید کا اور دوبارہ زندہ کرنے پر قدرت کا ثبوت ہو جائے)۔

* * *

**فائدہ:** کہ جس کا قبضہ ساری زمین اور زمینی چیزوں پر ہے، کیا تمہاری مشت خاک اس کے قبضہ سے باہر ہو گی؟

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۸۶﴾

تو کہہ کون ہے مالک ساتوں آسمان کا اور مالک اس بڑے تخت کا

سَيَقُوۡلُوۡنَ لِلّٰهِ ؕ قُلۡ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ﴿۸۷﴾

اب بتائیں گے اللہ کو، تو کہہ پھر تم ڈرتے نہیں

**خلاصہ تفسیر:** (اور) آپ یہ بھی کہئے کہ (اچھا یہ بتاؤ کہ) ان سات آسمانوں کا مالک اور عالیشان عرش کا مالک کون ہے؟ (اس کا بھی) وہ ضرور یہی جواب دیں گے کہ یہ بھی (سب) اللہ کا ہے، آپ (اس وقت) کہئے کہ پھر تم (اس سے) کیوں نہیں ڈرتے (کہ اس کی قدرت اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار کرتے ہو)۔

* * *

**فائدہ:** کہ اتنا بڑا شہنشاہِ مطلق تمہاری ان گستاخیوں اور نافرمانیوں پر تم کو دھر گھسیٹے، کیا یہ انتہائی گستاخی نہیں کہ اس شہنشاہِ مطلق کو ایک ذرہ بے مقدار سے عاجز قرار دینے لگے۔

قُلۡ مَنۡۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوۡتُ كُلِّ شَىۡءٍ وَّهُوَ يُجِيۡرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيۡهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ﴿۸۸﴾

تو کہہ کس کے ہاتھ میں ہے حکومت ہر چیز کی اور وہ بچا لیتا ہے اور اس سے کوئی بچا نہیں سکتا بتاؤ اگر تم جانتے ہو

سَيَقُوۡلُوۡنَ لِلّٰهِ ؕ قُلۡ فَاَنّٰى تُسۡحَرُوۡنَ﴿۸۹﴾ بَلۡ اَتَيۡنٰهُمۡ بِالۡحَـقِّ وَاِنَّهُمۡ لَـكٰذِبُوۡنَ﴿۹۰﴾

اب بتائیں گے اللہ کو ۱؎ تو کہہ پھر کہاں سے تم پر جادو آپڑتا ہے ۲؎ کوئی نہیں ہم نے ان کو پہنچایا سچ اور وہ البتہ جھوٹے ہیں ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** (اور) آپ (ان سے) یہ بھی کہئے کہ (اچھا) وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں تمام چیزوں کا اختیار ہے اور وہ (جس کو چاہتا ہے) پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلہ میں کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا اگر تم کو کچھ خبر ہے (تب بھی جواب میں) وہ ضرور یہی کہیں گے کہ یہ سب صفتیں بھی اللہ ہی کی ہیں، آپ (اس وقت) کہئے کہ پھر تم کو کیسا خبط ہو رہا ہے! (کہ ان سب مقدمات کو مانتے ہو اور اس کے نتیجہ کو جو کہ توحید اور قیامت کا اعتقاد ہے نہیں مانتے، یہ تو ان کے جواب میں مقصود پر استدلال تھا، اب ان کے اس مقدمہ کی دلیل یعنی: اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ الخ کو باطل کرتے ہیں یعنی یہ جو ان کو بتلایا جا رہا ہے کہ قیامت آئے گی اور مردے زندہ ہوں گے یہ بے سند بات نہیں ہے) بلکہ ہم نے ان کو سچی بات پہنچائی ہے اور یقیناً یہ (خود ہی) جھوٹے ہیں۔

* * *

**فائدہ: ۱؎** یعنی ہر چیز پر اسی کا اختیار چلتا ہے جس کو چاہے وہ پناہ دے سکتا ہے، لیکن کوئی دوسرا اس کے مجرم کو پناہ نہیں دے سکتا۔

**فائدہ: ۲؎** جس سے مسحور ہو کر تم ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہو کہ ایسی موٹی باتیں بھی نہیں سمجھ سکتے جب تمام زمین و آسمان کا مالک وہ ہی ہوا اور ہر چیز اسی کے زیر تصرف و اقتدار ہوئی، تو آخر تمہارے بدن کی ہڈیاں اور ریزے اس کے قبضہ اقتدار سے نکل کر کہاں چلے جائیں گے کہ ان پر وہ قادر مطلق اپنی مشیت نافذ نہ کر سکے گا۔

**فائدہ: ۳؎** یعنی دلائل و شواہد سے ظاہر کر دیا گیا کہ جو کچھ ان سے کہا جا رہا ہے مو بمو صحیح اور حق ہے اور وہ لوگ محض جھوٹے خیالات کی پیروی کر رہے ہیں۔

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنۡ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنۡ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعۡضُهُمۡ

اللہ نے کوئی بیٹا نہیں کیا اور نہ اس کے ساتھ کسی کا حکم چلے یوں ہوتا تو لے جاتا ہر حکم والا اپنی بنائی چیز کو اور چڑھائی کرتا ایک

عَلٰى بَعْضٍ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۹۱﴾ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۹۲﴾

پر ایک ۱؎ اللہ نرالا (پاک) ہے ان کی بتلائی باتوں سے ۲؎ جاننے والا چھپے اور کھلے کا وہ بہت اوپر ہے اس سے جس کو شریک بتلاتے ہیں ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** یہاں تک گفتگو ختم ہو چکی اور توحید و آخرت دونوں ثابت ہو گئے، مگر ان دونوں مسئلوں میں چونکہ توحید کا مسئلہ زیادہ مہتمم بالشان اور حقیقت میں مسئلہ قیامت و آخرت بھی اسی پر مبنی ہے اور وہ محل کلام بھی زیادہ تھا اس لیے تتمہ تقریر میں اس کو مستقلاً ارشاد فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے کسی کو اولاد قرار نہیں دیا (جیسا مشرکین ملائکہ کی نسبت کہتے تھے) اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور خدا ہے، اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو (تقسیم کر کے) جدا کر لیتا اور (پھر دنیا کے بادشاہوں کی عادت کے مطابق دوسرے کی مخلوقات چھیننے کے لئے) ایک دوسرے پر چڑھائی کرتا (پھر مخلوق کی تباہی کی تو کیا انتہا ہے، لیکن اس وقت نظام عالم بدستور قائم ہے، اس سے ثابت ہوا کہ) اللہ تعالیٰ ان (مکروہ) باتوں سے پاک ہے جو یہ لوگ (اس کی نسبت) بیان کرتے ہیں، جاننے والا ہے سب پوشیدہ اور آشکارا کا، غرض ان لوگوں کے شرک سے وہ بالاتر (اور منزہ) ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی زمین و آسمان اور ذرہ ذرہ کا تنہا مالک و مختار وہ ہی ہے نہ اسے بیٹے کی ضرورت نہ مددگار کی، نہ اس کی حکومت و فرمانروائی میں کوئی شریک جسے ایک ذرہ کا مستقل اختیار ہو، ایسا ہوتا تو ہر ایک با اختیار حاکم اپنی رعایا کو لے کر علیحدہ ہو جاتا اور اپنی جمعیت فراہم کر کے دوسرے پر چڑھائی کر دیتا اور عالم کا یہ مضبوط و محکم نظام چند روز بھی قائم نہ رہ سکتا، سورہ انبیاء کی آیت: لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (الانبیاء: ۲۲) کے فوائد میں اس کی تقریر کی جا چکی ہے ملاحظہ کر لی جائے۔

**فائدہ:** ۲؎ کیا خدا کی شان یہ ہوتی ہے کہ اس کے آگے کوئی دم مار سکے یا ایک ذرہ اس کے حکم سے باہر ہو سکے۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی جس کی قدرت عامہ و تامہ کا حال پہلے بیان ہو چکا اور علم محیط ایسا کہ کوئی ظاہر و باطن اور غیب و شہادت اس سے پوشیدہ نہیں، اس کی حکومت میں کیا وہ چیزیں شریک ہوں گی جن کی قدرت اور علم وغیرہ سب صفات محدود و مستعار ہیں؟ استغفر اللہ۔

قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ﴿۹۳﴾ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۴﴾

تو کہہ اے رب اگر تو دکھانے لگے مجھ کو جوان سے وعدہ ہوا ہے، تو اے رب! مجھ کو نہ کریو ان گناہگار لوگوں میں ۱؎

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے آیت: حتی اذا فتحنا علیھم میں کفار کی سرکشی و عناد پر سخت عذاب کی وعید کا بیان تھا، آگے ایک بلیغ عنوان سے اس عذاب کا انتہائی درجہ خوفناک ہونا بیان فرماتے ہیں اور وہ خاص عنوان یہ ہے کہ حضور ﷺ کو وقت کے مناسب ایک دعا کی تعلیم ہے جس میں عظیم رب کی قدرت کا اظہار ہے، اور یقین رکھیں کہ جس عذاب کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے وہ دیر یا سویر ضرور آ کر رہے گا، اس کے بعد قیامت کے احوال اور اہوال بیان کیے کہ اس دن ہماری آیات کے ساتھ ان کے تمسخر کا انجام ان کے سامنے آ جائے گا۔

آپ (حق تعالیٰ سے) دعا کیجئے کہ اے میرے رب! جس عذاب کا ان کافروں سے وعدہ کیا جا رہا ہے (جیسا پیچھے اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ سے بھی معلوم ہوا) اگر آپ مجھ کو دکھا دیں (مثلاً یہ کہ وہ عذاب ان پر میری زندگی میں اس طور سے آئے کہ میں بھی دیکھوں، کیونکہ اس عذاب کا کوئی وقت خاص تو بتلایا نہیں گیا، چنانچہ یہ آیت بھی مبہم ہے جس میں یہ احتمال بھی ہے کہ آپ کی زندگی ہی میں کافروں پر عذاب آ جائے، غرض اگر ایسا ہوا) تو اے میرے رب! مجھ کو ان ظالم لوگوں میں شامل نہ کیجئے۔

اس دعا کی یہ وجہ نہیں کہ نعوذ باللہ آپ کی نسبت اس قسم کا احتمال تھا، بلکہ محض عذاب کی ہولناکی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ جس پر اس کے آنے کا احتمال بھی نہیں، جب اس کو پناہ مانگنے کا حکم ہے تو جو عذاب کے مستحق ہیں ان کو تو بہت ہی ڈرنا چاہیے اور دعا کا صحیح ہونا اس پر موقوف نہیں کہ دعا کرنے

والے پر عذاب کے آنے کا بھی احتمال ہو، بلکہ دعا صحیح ہونے کے لیے محض قدرت بھی کافی ہے۔

***

**فائدہ:** لے یعنی حق تعالیٰ کی جناب میں ایسی گستاخی کی جاتی ہے تو یقینا کوئی سخت آفت آ کر رہے گی، اس لیے ہر مومن کو ہدایت ہوئی کہ اللہ کے عذاب سے ڈر کر یہ دعاء مانگے کہ جب ظالموں پر عذاب آئے تو الٰہی مجھ کو اس کے ذیل میں شامل نہ کرنا، جیسا کہ حدیث میں آیا "وَاِذَآ اَرَدْتَ بِقَوْمٍ فِتْنَـةً فَاقْبِضْنِیْ غَیْرَ مَفْتُوْنٍ" کا مطلب یہ ہے کہ خداوندا! ہم کو ایمان واحسان کی راہ پر مستقیم رکھ، کوئی ایسی تقصیر نہ ہو کہ العیاذ باللہ تیرے عذاب کی لپیٹ میں آجائیں، جیسے دوسری جگہ ارشاد ہوا: وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً (الانفال: ۲۵) یہاں حضور ﷺ کو مخاطب بنا کر دوسروں کو سنانا ہے اور یہ قرآن کریم کی عام عادت ہے۔

## وَاِنَّا عَلٰٓى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ۝۹۵

اور ہم کو قدرت ہے کہ تجھ کو دکھلا دیں جو ان سے وعدہ کر دیا ہے

## اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ؕ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ۝۹۶

بری بات کے جواب میں وہ کہہ جو بہتر ہے، ہم خوب جانتے ہیں جو یہ بتاتے ہیں

**خلاصہ تفسیر:** اور ہم اس بات پر کہ جو ان سے وعدہ کر رہے ہیں آپ کو بھی دکھلا دیں قادر ہیں (باقی جب تک ان پر عذاب نہ آئے) آپ (ان کے ساتھ یہ معاملہ رکھئے کہ) ان کی بدی کا دفعیہ (برائی کا جواب) ایسے برتاؤ سے کر دیا کیجئے جو بہت ہی اچھا (اور نرم) ہو (اور اپنی ذات کے لئے بدلہ نہ لیجئے، بلکہ ہمارے حوالہ کر دیا کیجئے) ہم خوب جانتے ہیں جو جو کچھ یہ (آپ کی نسبت) کہا کرتے ہیں۔

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ: اس آیت کا حکم جہاد سے کوئی تعارض نہیں، کیونکہ جہاد حقوق دین کے لیے ہوتا ہے، اور یہ آیت حقوق نفس کے بارے میں ہے، بے ادبی کی طرف التفات وتوجہ نہ کرنا یہ معاملہ عوام اور اجنبیوں کے ساتھ ہے، جبکہ خواص اور متعلقین کے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ ان کی تادیب کی جائے۔

***

**فائدہ:** یعنی ہم کو قدرت ہے کہ تمہاری آنکھوں کے سامنے دنیا ہی میں ان کو سزا دے دیں لیکن آپ ﷺ کے مقام بلند اور اعلیٰ اخلاق کا مقتضی یہ ہے کہ ان کی برائی کو بھلائی سے دفع کریں جہاں تک اس طرح دفع ہو سکتی ہے، اور ان کی بیہودہ بکواس سے مشتعل نہ ہوں، اس کو ہم خوب جانتے ہیں، وقت پر کافی سزا دی جائے گی، آپ ﷺ کے اغماض اور نرم برتاؤ کا اثر یہ ہوگا کہ بہت سے لوگ گرویدہ ہو کر آپ ﷺ کی طرف جھکیں گے اور دعوت واصلاح کا مقصود حاصل ہوگا۔

## وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ۝۹۷ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ۝۹۸

اور کہہ اے رب میں تیری پناہ چاہتا ہوں شیطان کی چھیڑ سے لے۔ اور پناہ تیری چاہتا ہوں اے رب اس سے کہ میرے پاس آئیں ۲ے

**خلاصہ تفسیر:** اور (اگر آپ کو بشری تقاضے کی وجہ سے غصہ آجایا کرے تو) آپ یوں دعا کیا کیجئے کہ اے میرے رب! میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں شیطانوں کے وسوسوں سے (جو کسی ایسے امر کی طرف پہنچا دیں جو مصلحت کے خلاف ہو اگرچہ خلاف شریعت نہ ہو، کیونکہ شیاطین انبیاء سے خلاف شریعت کام نہیں کرا سکتے) اور اے میرے رب میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ شیطان میرے پاس بھی آئیں (اور وسوسہ ڈالنا تو درکنار پس اس سے وہ غصہ جاتا رہے گا)۔

رَّبِّ اَعُوْذُبِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ: وسوسہ کی تحقیق سورہ اعراف آیت ۲۰۰ میں گذر چکی ہے، اس کے تحت ایک ضروری فائدہ وہاں ملاحظہ فرمالیا جائے، اس کا خلاصہ اشارۃً یہاں بھی اس قول میں مذکور ہے: ''جو کسی ایسے امر کی طرف پہنچادیں'' الخ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کاملین کو بھی وسوسے آتے ہیں تو ایک عام آدمی وسوسوں کے ختم ہونے کی توقع کیسے کرسکتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ پہلے شیاطین الانس کے ساتھ برتاؤ کرنے کے طریقہ بتلایا تھا، لیکن شیاطین الجن اس طریقہ سے متاثر نہیں ہوسکتے، کوئی تدبیر یا نرمی ان کو رام نہیں کرسکتی، اس کا علاج صرف استعاذہ ہے یعنی اللہ کی پناہ میں آجانا، تا وہ قادر مطلق ان کی چھیڑ خانی اور شر سے محفوظ رکھے۔

حضرت شاہ صاحب ؒ لکھتے ہیں کہ: ''شیطان کی چھیڑ یہ ہے کہ دین کے سوال و جواب میں بے موقع غصہ چڑھے اور لڑائی ہو پڑے، اسی پر فرمایا کہ برے کا جواب دے اس سے بہتر''۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی کسی حال میں بھی شیطان کو میرے پاس نہ آنے دیجئے کہ مجھ پر وہ اپنا وار کرسکے۔

حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾ لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا

یہاں تک کہ جب پہنچے ان میں کسی کو موت کہے گا اے رب! مجھ کو پھر بھیج دو، شاید کچھ میں بھلا کام کرلوں اس میں جو

تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

پیچھے چھوڑ آیا ۱؎ ہرگز نہیں، یہ ایک بات ہے کہ وہی کہتا ہے ۲؎ اور ان کے پیچھے پردہ ہے اس دن تک کہ اٹھائے جائیں ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** گذشتہ آیات میں معاد یعنی آخرت کو ثابت کیا گیا، اب آگے سورت کے اختتام تک اسی مضمون کی تفصیل و تکمیل ہے اور اس کے وقت، احوال اور واقعات کا ذکر ہے۔

(یہ کفار اپنے کفر اور آخرت کے انکار سے باز نہیں آتے) یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی (کے سر) پر موت آ (کھڑی ہو) تی ہے (اور آخرت کا معائنہ ہونے لگتا ہے) اس وقت (آنکھیں کھلتی ہیں اور اپنے جہل و کفر پر نادم ہو کر) کہتا ہے کہ اے میرے رب! (مجھ سے موت کو ٹال دیجئے اور) مجھ کو (دنیا میں) پھر واپس بھیج دیجئے تاکہ جس (دنیا) کو میں چھوڑ آیا ہوں اس میں (پھر جا کر) نیک کام کروں (یعنی اطاعت و تصدیق، حق تعالیٰ اس درخواست کو رد فرماتے ہیں کہ) ہرگز (ایسا) نہیں (ہوگا) یہ (اس کی) ایک بات ہی بات ہے جس کو یہ کہے جا رہا ہے (اور پوری ہونے والی نہیں) اور (وجہ اس کی یہ ہے کہ) ان لوگوں کے آگے ایک (چیز) آڑ (کی آنے والی) ہے (کہ جس کا آنا ضروری ہے اور وہی دنیا میں واپس جانے سے مانع ہے مراد اس سے موت ہے کہ اس کا وقوع بھی وقت مقدر پر ضروری ہے: وَلَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا اور موت کے بعد دنیا میں لوٹ کر آنا بھی) قیامت کے دن تک (قانون الٰہی کے خلاف ہے، یہ مصیبت تو انہیں مرنے کے وقت پیش آئی)۔

قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ: بظاہر دنیا میں واپس بھیجنا موت کے بعد بولا جاتا ہے، لیکن موت کے وقت بھی چونکہ عالم آخرت منکشف ہوجاتا ہے، اس لیے اس تعلق و مشابہت کی وجہ سے اس شخص کو فی الجملہ آخرت کی طرف منتقل ہونے والا سمجھا جائے گا، اس لیے موت کے مؤخر کرنے کو **ارجعون** یعنی دنیا میں واپس بھیجنے سے تعبیر کیا، ورنہ بظاہر رجوع کا تعلق تو موت کے بعد ہونا چاہیے۔

وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ: اس سے یہ مقصود نہیں کہ قیامت کے دن دنیا میں واپس آجائیں گے، بلکہ مقصود اس سے ہر طرح مایوس کرنا ہے کہ کبھی واپس نہ آسکیں گے، کیونکہ قیامت میں زندہ ہونا دنیا میں واپس آنا نہیں ہے، بلکہ وہ تو خود آخرت ہی ہے، اور یہی کہہ سکتے ہیں کہ قیامت کے دن اگرچہ بظاہر مکان دنیا کی طرف واپسی ہوگی مگر وہ واپسی عمل کے لیے نہ ہوگی، بلکہ حساب کے لیے ہوگی، سو اس سے تناسخ کا ابطال ہوگیا۔

* * *

**فائدہ:** لہ یعنی آپ ان کفار کی برائیوں کو بھلے طریقہ سے دفع کرتے رہیے، اور جو باتیں یہ بناتے ہیں ان کو ہمارے حوالہ کیجئے یہاں تک کہ ان میں سے بعض کی موت کا وقت آ پہنچے اور نزع کی حالت میں مبادی عذاب کا معائنہ کر کے پچھتاوا شروع ہو، اس وقت تمنا کریں گے کہ اے پروردگار! قبر کی طرف لے جانے کے بجائے ہم کو پھر دنیا کی طرف واپس کر دو، تاکہ گذشتہ زندگی میں جو تقصیرات ہم نے کی ہیں اب نیک عمل سے ان کی تلافی کر سکیں، آئندہ ہم ایسی خطائیں ہرگز نہیں کریں گے، کما قال تعالیٰ: وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (المنافقون:۱۰)

**فائدہ:** ۲ یعنی اجل آجانے کے بعد اس کام کے لیے ہرگز واپس نہیں کیا جاسکتا اور بالفرض واپس کر دیا جائے تو ہرگز نیک کام نہ کرے گا، وہی شرارتیں پھر سوجھیں گی: وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (الانعام:۲۸) یہ محض اس کی بات ہے جو زبان سے بنا رہا ہے اور غلبہ حسرت وندامت کی وجہ سے خاموش نہیں رہ سکتا وہی اپنی طرف سے یہ بات کہتا ہے، کہتا رہے، ہمارے یہاں شنوائی نہیں ہوگی۔

**فائدہ:** ۳ یعنی ابھی کیا دیکھا ہے، موت ہی سے اس قدر گھبرا گیا، آگے اس کے بعد ایک اور عالم برزخ آتا ہے، جہاں پہنچ کر دنیا والوں سے پردہ میں ہوجاتا ہے اور آخرت بھی سامنے نہیں آتی، ہاں عذاب آخرت کا تھوڑا سا نمونہ سامنے آتا ہے جس کا مزہ قیامت تک پڑا چکھتا رہے گا۔

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ

پھر جب پھونک ماریں صور میں تو نہ قرابتیں ہیں ان میں اس دن اور نہ ایک دوسرے کو پوچھے لہ سو جس کی بھاری ہوئی تول

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ

تو وہی لوگ کام لے نکلے، اور جس کی ہلکی نکلی تول سو وہی لوگ ہیں جو ہار بیٹھے اپنی جان

فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

دوزخ ہی میں رہا کریں گے

**خلاصہ تفسیر:** پھر جب (قیامت کا روز ہوگا اور) صور پھونکا جائے گا تو (ایسی ہول وہیبت میں گرفتار ہوں گے کہ) ان میں (جو) باہمی رشتے ناتے (تھے) اس روز (وہ بھی گویا) نہ رہیں گے (یعنی کوئی کسی کی ہمدردی نہ کرے گا، جیسے اجنبی اجنبی ہوتے ہیں) اور نہ کوئی کسی کو پوچھے گا (کہ بھائی تم کس حالت میں ہو، غرض نہ رشتہ ناتا کام آئے گا نہ دوستی اور تعارف، بس وہاں کام کی چیز ایک ایمان ہے جس کی عام شناخت کے لیے تاکہ سب پر ظاہر ہوجائے ایک ترازو کھڑی کی جائے گی اور اس سے اعمال وعقائد کا وزن ہوگا) سو جس شخص کا پلہ (ایمان کا) بھاری ہوگا (یعنی وہ مومن ہوگا) تو ایسے لوگ کامیاب (یعنی نجات پانے والے) ہوں گے (اور یہ مذکورہ مصائب یعنی ایمان لانے کے لیے دنیا میں واپسی کی تمنا اور نسب وتعلقات اور بات چیت کا نافع نہ ہونا ان مؤمنین کے لیے نہیں، چنانچہ ارشاد ہے: لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ) اور جس شخص کا پلہ (ایمان کا) ہلکا ہوگا (یعنی وہ کافر ہوگا) سو یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنا نقصان کرلیا اور جہنم میں ہمیشہ کے لئے رہیں گے،

فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ: انساب یعنی رشتے ناطے کی نفی سے مراد یہ ہے کہ نسب کام نہ آئیں گے، یہ مراد نہیں کہ نسب باقی نہ رہے گا، اسی طرح سوال کی نفی سے بھی یہ مراد نہیں کہ سوال اور بات چیت ہی نہ ہوگی، کیونکہ قرآن کریم میں دوسری: فاقبل بعضهم على بعض يتساءلون سے سوال کا ثبوت ہوتا ہے، چنانچہ ایسا سوال وجواب نہ ہوگا جس سے نفع اور فائدہ ہو، اور یہ سب یعنی نسب اور سوال کا مفید نہ ہونا کفار کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ آیت: الاخلاء يومئذ بعضهم لبعض عدو الا المتقين سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ایمان کی دوستی اور

تعلقات نافع ہوں گے، مگر اہل ایمان کے لیے نسب کے نافع ہوتے کا یہ مطلب نہیں کہ عرفی شرافت نافع ہوگی، بلکہ جو شخص شرعاً شریف ہو یعنی مؤمن ہو اور عند اللہ مقبول ہو اس کے ساتھ ولدیت کی نسبت اس کی اولاد کو نافع ہوگی اگرچہ عرفاً وہ شخص کم قوم سے ہو، چنانچہ ارشاد ہے: **والذین امنوا واتبعتهم ذریتهم بایمان الحقنا بهم ذریتهم**، غرض نہ رشتہ ناطہ کام آئے گا، نہ دوستی اور تعارف۔

علم تفسیر میں یہ قاعدہ معروف ہے کہ وعید وتوبیخ کی آیات میں مفہوم مخالف کا اعتبار کیا جاتا ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل ایمان کو مقبولین کی نسبت نافع ہوگی، بزرگوں نے سلسلہ کے برکات میں اس کی صراحت کی ہے۔

**فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ**: اسی جیسا مضمون سورہ اعراف آیت: ۸-۹ میں گذر چکا ہے، وہاں ملاحظہ فرمالیا جائے۔

**فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ**: ہاں! بعض گناہ گار مسلمانوں سے بعض اعمال کے لیے واپسی کی تمنا صادر ہوگی، چنانچہ ارشاد ہے: **وانفقوا مما رزقنكم من قبل ان ياتي احدكم الموت فيقول رب**، اور ترقی درجات کی امید پر واپسی کی تمنا بعض مقبول بندوں سے بھی ہوسکتی ہے جیسا کہ حدیث میں شہداء کی تمنا مذکور ہے، لیکن ایمان لانے کے لیے واپسی کی تمنا صرف کفار کو ہوگی۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی عالم برزخ کے بعد قیامت کی گھڑی ہے، دوسری مرتبہ صور پھونکنے کے بعد تمام خلائق کو ایک میدان میں لا کھڑا کریں گے، اس وقت ہر ایک شخص اپنی فکر میں مشغول ہوگا، اولاد ماں باپ سے، بھائی بھائی سے اور میاں بیوی سے سروکار نہ رکھے گا، ایک دوسرے سے بیزار ہوں گے، کوئی کسی کی بات نہ پوچھے گا: **يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيْهِ وَأُمِّهٖ وَأَبِيْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُّغْنِيْهِ** (عبس: ۳۴ تا ۳۷) اس کے بعد دوسرے وقت ممکن ہے بعض قرابتوں سے کچھ نفع پہنچ جائے کما قال تعالیٰ: **وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيْمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ أَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ** (الطور: ۲۱)۔

**تنبیہ:** بعض احادیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن سارے نسب اور دامادی کے تعلقات منقطع ہو جائیں گے (یعنی کام نہ دیں گے) "اِلَّا نَسَبِيْ وَصِهْرِيْ" (بجز میرے نسب اور صہر کے) معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کے تعلقات عموم سے مستثنیٰ ہیں، اسی حدیث کو سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ام کلثوم بنت علی بن ابی طالب سے نکاح کیا، اور چالیس ہزار درہم مہر باندھا، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: "وہاں باپ بیٹا ایک دوسرے کو شامل نہیں، ہر ایک سے اس کے عمل کا حساب ہے"۔

**تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ أَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾**

جھلس دے گی ان کے منہ کو آگ اور وہ اس میں بدشکل ہو رہے ہوں گے (ہیں) ۱؎ کیا تم کو سنائی نہ تھیں ہماری آیتیں پھر تم انکو جھٹلاتے تھے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** ان کے چہروں کو (اس جہنم کی) آگ جھلستی ہوگی اور اس (جہنم) میں ان کے منہ بگڑے ہوں گے (اور ان سے حق تعالیٰ بالواسطہ یا بلاواسطہ ارشاد فرمائیں گے کہ) کیوں کیا میری آیتیں (دنیا میں) تم کو پڑھ کر سنائی نہیں جایا کرتی تھیں، اور تم ان کو جھٹلایا کرتے تھے (یہ اس کی سزا مل رہی ہے)۔

**وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ**: اس کی تفسیر حدیث مرفوع میں یہ آئی ہے کہ اوپر کا ہونٹ سکڑ کر منہ کے بیچ تک پہنچ جائے اور نیچے کا ہونٹ لٹک کر ناف تک آجائے گی اور اس ہیئت کے لیے دانتوں کا کھلنا لازمی ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ جلتے جلتے بدن سوج جائے گا، نیچے کا ہونٹ لٹک کر ناف تک اور اوپر کا پھول کر کھوپڑی تک پہنچ جائے گا، اور زبان باہر نکل کر زمین میں لٹکتی ہوگی جسے دوزخی پاؤں سے روندیں گے (اللهم احفظنا منه ومن سائر انواع العذاب)

**فائدہ:** ۲؎ یعنی اس وقت ان سے یوں کہیں گے، گویا جن باتوں کو دنیا میں جھٹلایا کرتے تھے، اب آنکھوں سے دیکھ لو سچی تھیں یا جھوٹی؟

قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ﴿۱۰۶﴾

بولے اے رب! زور کیا ہم پر ہماری کم بختی نے اور رہے ہم لوگ بہکے ہوئے

رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

اے ہمارے رب نکال لے ہم کو اس میں سے اگر ہم پھر کریں تو ہم گناہ گار ۱؎

**خلاصہ تفسیر:** وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب! (واقعی) ہماری بدبختی نے ہم کو (ہمارے ہاتھوں) گھیر لیا تھا اور (بیشک) ہم گمراہ لوگ تھے (یعنی ہم جرم کا اقرار اور اس پر ندامت و معذرت کا اظہار کر کے درخواست کرتے ہیں کہ) اے ہمارے رب! ہم کو اس (جہنم) سے (اب) نکال دیجئے (اور دوبارہ دنیا میں بھیج دیجئے: فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا) پھر اگر ہم دوبارہ (ایسا) کریں تو ہم بیشک پورے قصوروار ہیں (اس وقت ہم کو خوب سزا دیجئے گا اور ابھی چھوڑ دیجئے)۔

**غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا:** اس کے خلاصہ تفسیر میں ''اپنے ہاتھوں'' کی قید اس لیے ظاہر کی گئی کہ بدبختی کا جو اثر عذاب ہے وہ انسان کے اختیار سے وابستہ ہے، مسئلہ اختیار پر عقلی و نقلی دلائل بکثرت قائم ہیں۔

**وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ:** یہ اقرار اس غرض سے کیا گیا کہ بعض اوقات اقرار و اعتراف پر معافی مرتب ہوجاتی ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی اعتراف کریں گے کہ بیشک ہماری بدبختی نے دھکا دیا جو سیدھے راستہ سے بہک کر اس ابدی ہلاکت کے گڑھے میں آپڑے، اب ہم نے سب کچھ دیکھ لیا، از راہ کرم ایک دفعہ ہم کو یہاں سے نکال دیجئے، پھر کبھی ایسا کریں تو گنہگار، جو سزا چاہیے دیجئے گا۔

قَالَ اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿۱۰۸﴾ اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ يَقُوْلُوْنَ

فرمایا پڑے رہو پھٹکارے ہوئے اس میں اور مجھ سے نہ بولو، ایک فرقہ تھا میرے بندوں میں جو کہتے تھے

رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ صلے

اے رب ہمارے ہم یقین لائے، سو معاف کر ہم کو اور رحم کر ہم پر، اور تو سب رحم والوں سے بہتر ہے ۱؎

**خلاصہ تفسیر:** ارشاد ہوگا کہ اسی (جہنم) میں راندے ہوئے پڑے رہو اور مجھ سے بات مت کرو (یعنی ہم نہیں منظور کرتے، کیا تم کو یاد نہیں رہا کہ) میرے بندوں میں ایک گروہ (ایمانداروں کا) تھا جو (بیچارے ہم سے) عرض کیا کرتے تھے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے سو ہم کو بخش دیجئے اور ہم پر رحمت فرمایئے اور آپ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والے ہیں۔

**اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ:** چونکہ یہ ماقبل کی علت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اولیاء اللہ کی بڑی شان ہے اور ان سے دشمنی کا انجام جہنم کا عذاب ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی بک بک مت کرو، جو کیا تھا اب اس کی سزا بھگتو، آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جواب کے بعد پھر فریاد منقطع ہوجائے گی، بجز زفیر و شہیق کے کچھ کلام نہ کرسکیں گے، العیاذ باللہ۔

فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰٓى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ﴿۱۱۰﴾

پھر تم نے ان کو ٹھٹھوں میں پکڑا یہاں تک کہ بھول گئے ان کے پیچھے میری یاد اور تم ان سے ہنستے رہے [1]

اِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا ۙ اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ﴿۱۱۱﴾

میں نے آج دیا ان کو بدلہ ان کے صبر کرنے کا (تحمل کا) کہ وہی ہیں مراد کو پہنچنے والے [2]

**خلاصہ تفسیر:** سو تم نے (محض اس بات پر جو ہر طرح قابل قدر تھی) ان کا مذاق مقرر کیا تھا (اور) یہاں تک (اس کا مشغلہ کیا) کہ ان کے مشغلہ نے تم کو ہماری یاد بھی بھلا دی اور تم ان سے ہنسی کیا کرتے تھے (سو ان کا تو کچھ نہ بگڑا، انہیں چند روز کی کلفت پر صبر کرنا پڑا جس کا یہ نتیجہ ملا کہ) میں نے ان کو آج ان کے صبر کا یہ بدلہ دیا کہ وہی کامیاب ہوئے (اور تم اس ناکامی میں گرفتار ہوئے)۔

مطلب جواب کا یہ ہوا کہ تمہارا قصور اس قابل نہیں کہ سزا کے وقت اقرار کرنے سے معاف کر دیا جائے، کیونکہ تم نے ایسا معاملہ کیا جس سے ہمارے حقوق کو بھی تلف کیا اور بندوں کے حقوق کو بھی، اور بندے بھی کیسے ہمارے مقبول و محبوب، کیونکہ ان سے مسخرہ پن کرنے میں ان کی ایذا تھی جو کہ حق العبد ضائع کرنا ہے، پس اس کی سزا کے لیے سخت اور دائمی عذاب ہی مناسب ہے، اور یہ شبہ نہ ہو کہ آخرت میں تو حقیقت منکشف ہو جائے گی تو دنیا کی طرف واپسی کا محال ہونا بھی معلوم ہو جائے گا، پھر اس کی تمنا کیسے ہوگی؟ جواب یہ ہے کہ یا تو تمنا طبعی ہے، یا یوں کہا جائے کہ اس جواب ہی سے یہ حقیقت منکشف ہوئی، یا یہ کہا جائے کہ جو حقائق شرعاً بالذات مقصود ہیں جیسے توحید و رسالت، آخرت و جنت وغیرہ ان کا انکشاف ضروری ہے، سب کا انکشاف ضروری نہیں، مثل حقائق مقصود بالغیر کے، اور مسلمانوں کو ان کے سامنے جنت کی نعمتوں سے کامیاب کرنا یہ بھی کفار کے لیے ایک سزا ہے، کیونکہ دشمن کی راحت سے روحانی تکلیف ہوتی ہے۔

* * *

**فائدہ:** [1] یعنی دنیا میں مسلمان جب اپنے رب کے آگے دعاء و استغفار کرتے تو تم کو ہنسی سوجھتی تھی، اس قدر ٹھٹھا کرتے اور ان کی نیک خصلتوں کا اتنا مذاق اڑاتے تھے کہ ان کے پیچھے پڑ کر تم نے مجھے بھی یاد نہ رکھا، گویا تمہارے سر پر کوئی حاکم ہی نہ تھا جو کسی وقت ان حرکتوں پر نوٹس لے اور ایسی سخت شرارتوں کی سزا دے سکے۔

**فائدہ:** [2] بے چارے مسلمانوں نے تمہاری زبانی اور عملی ایذاؤں پر صبر کیا تھا، آج دیکھتے ہو تمہارے بالمقابل ان کو کیا پھل ملا، ان کو ایسے مقام پر پہنچا دیا گیا جہاں وہ ہر طرح کامیاب اور ہر قسم کی لذتوں اور مسرتوں سے ہمکنار ہیں۔

قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْئَلِ

فرمایا تم کتنی دیر رہے زمین میں برسوں کی گنتی سے، بولے ہم رہے ایک دن یا کچھ دن سے کم تو پوچھ لے

الْعَآدِّيْنَ﴿۱۱۳﴾ قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴿۱۱۴﴾

گنتی والوں سے [1] فرمایا تم اس میں بہت نہیں تھوڑا ہی رہے ہو اگر تم جانتے ہوتے [2]

**خلاصہ تفسیر:** (پیچھے ان کی درخواستوں کا جواب ہو گیا، اب آگے ان کے عقیدہ و مشرب کے باطل ہونے پر تنبیہ ہے تاکہ ذلت پر ذلت اور حسرت پر حسرت ہونے سے سزا میں شدت ہو، اس لئے) ارشاد ہوگا کہ (اچھا یہ بتلاؤ) تم برسوں کے شمار سے کس قدر مدت زمین میں رہے ہوگے (چونکہ وہاں کے ہول و ہیبت سے ان کے ہوش و حواس گم ہو چکے ہوں گے اور اس دن کا طول بھی پیش نظر ہوگا) وہ جواب دیں گے کہ (برس کیسے؟! بہت

رہے ہوں گے تو) ایک دن یا ایک دن سے بھی کم ہم رہے ہوں گے (اور سچ یہ ہے کہ ہم کو یاد نہیں) سو گننے والوں سے (یعنی فرشتوں سے جو اعمال اور عمر وغیرہ سب کا حساب کرتے تھے) پوچھ لیجئے، ارشاد ہوگا کہ (ایک دن یا کچھ دن تو غلط ہے مگر اتنا تو تمہارے اقرار سے جو کہ صحیح بھی ہے ثابت ہو گیا کہ) تم (دنیا میں) تھوڑی ہی مدت رہے (لیکن) کیا خوب ہوتا کہ تم (یہ بات اس وقت) سمجھتے ہوتے (کہ دنیا کی بقانا قابل اعتبار ہے، اور اس کے سوا اور کوئی دار القرار ہے، یعنی آخرت، مگر وہاں تو بقاء کو دنیا ہی میں منحصر سمجھا اور عالم آخرت کا انکار کرتے رہے: وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ، اور اب جو غلطی ظاہر ہوئی اور صحیح سمجھے تو بیکار)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی فرشتوں سے، جنہوں نے ہر نیکی بدی گن رکھی ہے یہ بھی گنا ہوگا، ''زمین میں رہنا''، یعنی قبر میں رہنا یا دنیا کی عمر، یہ بھی وہاں تھوڑی نظر آئے گی، یہ پوچھنا اس واسطے کہ دنیا میں عذاب کی شتابی کیا کرتے تھے، اب جانا کہ شتاب ہی آیا۔ (کذافی موضح القرآن)

**فائدہ:** ۲ یعنی واقعی دنیا کی عمر تھوڑی ہی تھی، لیکن اگر اس بات کو پیغمبروں کے کہنے سے دنیا میں سمجھ لیتے تو کبھی اس متاع فانی پر مغرور ہو کر انجام سے غافل نہ ہوتے اور وہ گستاخیاں اور شرارتیں نہ کرتے جن کا دنیا کی زائل و فانی لذتوں میں پڑ کر ارتکاب کیا۔

## اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾

سو کیا تم خیال رکھتے ہو کہ ہم نے تم کو بنایا کھیلنے کو اور تم ہمارے پاس پھر کر نہ آؤ گے

**خلاصہ تفسیر:** تنبیہ کے بعد آگے پھر اس اعتقاد پر دھمکی ہے جو بطور خلاصہ مضمون فرد قرار داد جرم کے ہے:

ہاں! تو کیا تم نے یہ خیال کیا تھا کہ ہم نے تم کو یوں ہی مہمل (خالی از حکمت) پیدا کر دیا ہے اور یہ (خیال کیا تھا) کہ تم ہمارے پاس نہیں لائے جاؤ گے۔

**اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا:** مطلب یہ کہ جب ہم نے آیات وکتب میں جن کا سچا ہونا صحیح دلائل سے ثابت ہے قیامت اور قیامت میں جزا و سزا کی خبر دی تھی تو معلوم ہو گیا تھا کہ تمہاری پیدائش کی حکمتوں میں سے ایک بڑی حکمت یہ بھی ہے، سو اس کا منکر ہونا کتنا بڑا جرم تھا، یعنی اگرچہ اس حکمت کی رعایت واجب نہ تھی، مگر جب ہم نے اس حکمت کے واقع ہونے کی خبر دے دی تو پھر اس حکمت کے واقع ہونے کا انکار کیوں کیا، اس تقریر سے یہ شبہ جاتا رہا کہ اگر حق تعالیٰ جزا و سزا نہ مقرر فرماتے تو مکلف کا پیدا ہونا عبث یعنی بے کار ہوتا، اور عبث فعل خدا سے محال ہے تو جزا و سزا خدا کے ذمہ عقلاً واجب ہے، حالانکہ اہل حق کے نزدیک خدا کے ذمہ عقلاً کوئی چیز واجب نہیں، جواب ظاہر ہے کہ اگر جزا و سزا نہ ہوتی تب بھی پیدا کرنا عبث نہ ہوتا، کیونکہ حکمت اسی میں منحصر نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان احکام کا مکلف ہے، اگر مکلف نہ ہوتا تو دنیا میں آنا صرف عیش و آرام کے لیے بالکل بے کار تھا، اور جو لوگ انسان کو مکلف نہیں سمجھتے ان کی اس آیت میں صراحۃً تردید کی گئی ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی دنیا میں تو نیکی بدی کا پورا نتیجہ نہیں ملتا، اگر اس زندگی کے بعد دوسری زندگی نہ ہو تو گویا یہ سب کارخانہ محض کھیل تماشہ اور بے نتیجہ تھا، سو حق تعالیٰ کی جناب اس سے بہت بلند ہے کہ اس کی نسبت ایسا رکیک خیال کیا جائے۔

## فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿۱۱۶﴾

سو بہت اوپر ہے اللہ وہ بادشاہ سچا، کوئی حاکم نہیں اس کے سوائے، مالک اس عزت کے تخت کا

**خلاصہ تفسیر:** تمام سورت میں جو مضامین بیان ہوئے اب سورت کے اختتام پر ان تمام مضامین کے نتیجہ اور خلاصہ کے طور

پر ارشاد فرماتے ہیں اور فَتَعٰلَى پر حرف فا کا آنا نتیجہ اور تفریع کے قصد کا قرینہ ہے، چنانچہ ظاہر ہے کہ عبادت کے حکم سے حق تعالیٰ کا معبود اور بادشاہ ہونا، اور آثار قدرت سے جو کہ توحید کے دلائل ہیں اس کا واحد اور شرک سے منزہ ہونا ثابت ہے اور یہی حاصل ہے: فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ کا، اور انبیاء کے بھیجنے سے بھی اس کا بادشاہ اور فرمانروا ہونا، اسی طرح قیامت اور جزاوسزا کے بیان سے بھی اس کا صاحب حکومت ہونا، اسی طرح جھٹلانے والوں کی ہلاکت کے قصوں سے اور کفار کے احوال کی مذمت سے ان کا مواخذہ اور پکڑ کے قابل ہونا ثابت ہوتا ہے، اور یہی مدلول ہے: فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ کا، اور جو ذات ان صفات کمال وجلال کے ساتھ موصوف ہو وہ اس قابل ہے کہ اس کو اپنا قبلہ حاجات بنایا جائے، یہ بھی ظاہر ہے، چنانچہ بالکل اخیر کی آیت: وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ کے مضمون میں اسی کو ظاہر کیا گیا ہے، اور سورت کے شروع میں: قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ میں مؤمنین کے لیے فلاح ثابت کی گئی ہے اور خاتمہ میں کافروں سے فلاح کی نفی کی گئی ہے: اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ان دونوں میں عجیب مقابلہ ہے۔

(یہ سب مضامین جب معلوم ہو چکے) سو (اس سے یہ کامل طور پر ثابت ہوگیا کہ) اللہ تعالیٰ بہت ہی عالی شان ہے جو کہ بادشاہ (ہے اور بادشاہ بھی) حقیقی ہے اس کے سوا کوئی بھی لائق عبادت نہیں (اور وہ) عرش عظیم کا مالک ہے۔

* * *

**فائدہ:** جب وہ بالا و برتر، شہنشاہ مالک علی الاطلاق ہے تو ہو نہیں سکتا کہ وفاداروں اور مجرموں کو یوں کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ دے۔

وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ

اور جو کوئی پکارے اللہ کے ساتھ دوسرا حاکم، جس کی سند نہیں اس کے پاس، سو اس کا حساب ہے اس کے رب کے نزدیک ۔ل

اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ ع

بیشک بھلا نہ ہوگا منکروں کا اور تو کہہ اے رب! معاف کر اور رحم کر اور تو ہے بہتر سب رحم والوں سے ۔۲

**خلاصہ تفسیر:** اور جو شخص (اس بات پر دلائل قائم ہونے کے بعد) اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور معبود کی بھی عبادت کرے کہ جس (کے معبود ہونے) پر اس کے پاس کوئی بھی دلیل نہیں سو اس کا حساب اس کے رب کے یہاں ہوگا (جس کا نتیجہ لازمی یہ ہے کہ) یقیناً کافروں کو فلاح نہ ہوگی (بلکہ ہمیشہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے) اور (جب حق تعالیٰ کی یہ شان ہے تو) آپ (اور دوسرے لوگ بدرجہ اولیٰ) یوں کہا کریں کہ اے میرے رب! (میری خطائیں) معاف کر اور (ہر حالت میں مجھ پر) رحم کر (معاش میں بھی، توفیق طاعات میں بھی، نجات آخرت میں بھی، عطائے جنت میں بھی) اور تو سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔

**مَعَ اللّٰهِ:** یہ قید واقعی ہے، کیونکہ وہ لوگ خدا کو بھی مانتے تھے، دوسرے اس سے ان لوگوں کا حال بدرجہ اولیٰ معلوم ہوگیا جو خدا کے بالکل ہی منکر ہیں، کیونکہ جب خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنا کفر ہے تو خدا کا بالکل انکار کرنا کیسے کفر نہ ہوگا۔

**لَا بُرْهَانَ لَهٗ:** یہ قید بھی واقعی ہے، کیونکہ خدا کے سوا کسی کی خدائی پر کوئی دلیل نہیں، بلکہ ہر غیر کے معبود نہ ہونے پر دلیل قائم ہے۔

**اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ:** سورت کی ابتداء قد افلح المؤمنون سے فرمائی اور اختتام پر: انه لا يفلح الكفرون فرمایا، یعنی شروع سورت میں اہل ایمان کی فلاح اور کامیابی کی خبر دی اور اخیر سورت میں کافروں کی ناکامی اور فلاح سے محرومی کی خبر دی۔

**وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ:** آپ ﷺ کا مغفرت و رحمت مانگنا یہ آپ کے درجہ کے موافق ہے، پس اس سے حضور کی نسبت معصیت یعنی گناہوں کا شبہ نہیں ہو سکتا۔

**رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ:** یہ دعا کرنے والوں کا مقبول ومحبوب ہونا پیچھے آیت ۱۰۹: اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ

يَفْقَهُوْنَ میں معلوم ہو چکا ہے، اب اس کی تعلیم میں بھی یہ نکتہ ہو گیا کہ جن کی فضیلت پیچھے بیان ہوئی ان میں سے ہونے کی دعا والتجا کرنی چاہیے، اسے بالکل آخر میں لا کر اس طرف بھی اشارہ فرمایا کہ فلاح کا اصل دار و مدار اللہ کی رحمت اور اس کی مغفرت پر ہے، لہٰذا اگر فلاح چاہتے ہو تو توبہ استغفار کی راہ اختیار کرو۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی وہاں حساب ہو کر مقدار جرم کے موافق سزا دی جائے گی۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی ہماری تقصیرات سے درگزر فرما، اور اپنی رحمت سے دنیا و آخرت میں سرفراز کر، تیری رحمت بے نہایت کے سامنے کوئی چیز مشکل نہیں، **افحسبتم** سے ختم سورت تک کی یہ آیتیں بہت بڑی فضیلت اور تاثیر رکھتی ہیں، جس کا ثبوت بعض احادیث سے ہوا ہے اور مشائخ نے تجربہ کیا ہے، چاہیے کہ ان آیات کا ورد رکھا جائے، خاتمہ پر وہ دعا تبرکا وتفاؤلاً نقل کرتا ہوں جو رسول کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق کو تلقین فرمائی کیونکہ اس کے الفاظ ان آیات کے مناسب ہیں: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْمًا كَثِیْرًا وَّاِنَّهٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْ لِیْ مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِیْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ۔

ایاتها ٦٤ | ٢٤ سُوْرَةُ النُّوْرِ مَدَنِيَّةٌ ١٠٢ | ركوعاتها ٩

**خلاصہ تفسیر:** گذشتہ سورت کی آخری آیت افحسبتم انما خلقنٰکم عبثا سے معلوم ہوا تھا کہ انسان کے پیدا کرنے کی حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اسے احکام کا مکلف کیا جائے، اور آخرت میں ان احکام کی اطاعت یا مخالفت پر جزا و سزا ملے، اس سورت میں بعض احکام کی تفصیل ہے، چنانچہ نصف سورت تک تو عملی احکام بیان کیے، خاتمہ کے قریب بھی کچھ احکام ذکر کیے گئے، اس کے ساتھ ساتھ عفت و پاکیزگی کے متعلق بھی احکام ہیں، پچھلی سورت یعنی مومنون کے شروع میں مسلمانوں کی فلاح دنیا و آخرت کو جن اوصاف پر موقوف رکھا گیا ہے ان میں ایک اہم وصف شرمگاہوں کی حفاظت تھی جو خلاصہ ہے ابواب عفت کا، اس سورت میں عفت کے اہتمام کے لئے متعلقہ احکام ذکر کئے گئے ہیں، اسی لئے عورتوں کو اس سورت کی تعلیم کی خصوصی ہدایات آئی ہیں، اس کے علاوہ درمیان سورت میں دلائل توحید بیان کئے، بعد ازاں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم دیا، اس کے بعد ایمان اور اعمال صالحہ کے دنیوی ثمرہ کو بیان کیا کہ ہم مومنین صالحین کو اپنے نبی کا جانشین کریں گے اور روئے زمین کی خلافت اور بادشاہت ان کو عطا کریں گے اور پھر توحید اور آخرت کی یاد دہانی پر سورت کو ختم فرمایا، یہ سورت کا خلاصہ ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا وَاَنْزَلْنَا فِیْهَآ اٰیٰتٍۢ بَیِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ①

یہ ایک سورت ہے کہ ہم نے اتاری اور ذمہ پر لازم کی اور اتاریں اس میں باتیں صاف تا کہ تم یاد رکھو

**خلاصہ تفسیر:** سورت کے مضامین کی اجمالی تمہید سے سورت کو شروع فرمایا۔

یہ ایک سورت ہے جس (کے الفاظ) کو (بھی) ہم (ہی) نے نازل کیا ہے، اور اس (کے معانی یعنی احکام) کو (بھی) ہم (ہی) نے مقرر کیا ہے (خواہ وہ فرض و واجب ہوں یا مندوب مستحب) اور ہم نے (ان احکام پر دلالت کرنے کے لئے) اس (سورت) میں صاف صاف آیتیں نازل کی ہیں تا کہ تم سمجھو (اور عمل کرو)۔

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا: یہ آیت اس سورت کے تمام مضامین کی اجمالی تمہید ہے، اس میں سورت کے الفاظ اور معانی و احکام کو اپنی

طرف منسوب فرما کر پھران سب کی غایت بیان فرما کران احکام پر عمل کرنے کا نہایت مہتم بالشان ہونا بتلادیا، اور شاید یہ خاص اہتمام اس لیے فرمایا گیا ہو کہ اس میں کثرت سے احکام عورتوں کے متعلق ہیں جو اکثر مشکل ہوتے ہیں۔

اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ: آیات کے واضح ہونے کا یہ مطلب ہے کہ جو معانی الفاظ سے مفہوم ہوتے ہیں ان پر یہ آیتیں صاف دلالت کرتی ہیں، یہ مراد نہیں کہ ان سے استدلال کرنے کے تمام طریقے واضح ہیں، کیونکہ استدلال کے دوسرے طریقے ائمہ مجتہدین کے ساتھ مخصوص ہیں، واللہ اعلم۔

* * *

**فائدہ**: یہ سورت بعض نہایت ضروری احکام وحدود، امثال ومواعظ، حقائق توحید اور بہت ہی اہم تنبیہات واصلاحات پر مشتمل ہے اس کا سب سے زیادہ ممتاز اور سبق آموز حصہ وہ ہے جس کا تعلق قصہ ''افک'' سے ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ پر منافقین نے جو جھوٹی تہمت لگائی تھی اس میں بعض سادہ دل اور مخلص مسلمانوں کے پائے استقامت کو بھی قدرے لغزش ہوگئی تھی، جس کا خطرناک اثر نہ صرف عائشہ صدیقہ کی پوزیشن پر پڑتا تھا، بلکہ ایک حیثیت سے خود پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ مجد وشرف تک پہنچتا تھا، اس لیے ضروری ہوا کہ قرآن کریم پورے اہتمام اور قوت سے ایسی خوفناک غلط کاری یا غلط فہمی کی اصلاح کرے اور ہمیشہ کے لیے ایمانداروں کے کان کھول دے کہ آئندہ کبھی دشمنوں کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر ایسی ٹھوکر نہ کھائیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ رفیع یا امہات المومنین کی پاک ومحترم حیثیت ایسی نہیں جس کے سمجھنے اور یادرکھنے میں کوئی مسلمان کسی وقت بھی ذرا سا تساہل روا رکھے، شاید اسی لیے سورت کا آغاز ان الفاظ سے فرمایا: سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا الخ تا مخاطبین سمجھ لیں کہ اس کے مضامین ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں اور بہت زیادہ محفوظ رکھنے اور لازم پکڑنے کے مستحق ہیں، اور جو صاف صاف نصیحتیں اور کھری کھری باتیں اس سورت میں بیان فرمائی گئی ہیں، اس لائق ہیں کہ ہر مسلمان ان کو حرز جان بنائے اور یادرکھے، ایک منٹ کے لیے اس سے غفلت نہ کرے ورنہ دین و دنیا کی تباہی ہے۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۪ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ

بدکاری کرنے والی عورت اور مرد سو مارو ہر ایک کو دونوں میں سے سو سو درے ۱؎ اور نہ آوے تم کو ان پر ترس اللہ کے

اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ②

حکم چلانے میں اگر تم یقین رکھتے ہو اللہ پر اور پچھلے دن پر ۲؎ اور دیکھیں ان کا مارنا (ان کی سزا کو) کچھ لوگ مسلمان ۳؎

**خلاصہ تفسیر**: اجمالی تمہید کے بعد اب احکام کی تفصیل بیان کی جاتی ہے جو مختلف قسم کے ہیں۔

زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والا مرد سو (دونوں کا حکم یہ ہے کہ) ان میں سے ہر ایک کے سو (دُرّے) مارو، اور تم لوگوں کو ان دونوں پر اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں ذرا رحم نہ آنا چاہئے (کہ رحم کھا کر چھوڑ دو یا سزا میں کمی کردو) اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو (کیونکہ ان دونوں پر ایمان رکھنا عمل کے واجب ہونے کا تقاضہ کرتا ہے، کیونکہ اللہ کا تو حکم ہی ہے، اور عمل نہ کرنے والوں کو قیامت کے دن سزا ملے گی) اور دونوں کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت کو حاضر رہنا چاہئے (تا کہ ان کے ذریعہ سے تشہیر ہو اور دیکھنے سننے والوں کو عبرت ہو اور دوسرے لوگ اس سے رکیں)۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا: یہ سزا اس زانی اور زانیہ کی ہے جو آزاد، عاقل، بالغ ہوں اور نکاح کیے ہوئے نہ ہوں یا نکاح کے بعد ہم بستری نہ کر چکے ہوں، اور جو آزاد نہ ہو اس کو پچاس دُرّے لگتے ہیں، اس کا حکم پانچویں پارہ کے شروع میں مذکور ہے، جو عاقل بالغ نہ ہو وہ مکلف ہی نہیں، اور جس مسلمان میں تمام صفتیں ہوں یعنی آزاد، عاقل، بالغ اور شادی شدہ ایسے شخص کو ''محصن'' کہتے ہیں، اس کی سزا رجم ہے۔

قرآن کریم اور احادیث متواترہ نے چار جرائم کی سزا اور اس کا طریقہ خود متعین کردیا ہے، کسی قاضی یا امیر کی رائے پر نہیں چھوڑا، انہیں متعینہ سزاؤں کو اصطلاح شرع میں ''حدود'' کہا جاتا ہے، ان کے علاوہ باقی جرائم کی سزا کو اس طرح متعین نہیں کیا گیا، بلکہ امیر یا قاضی مجرم کی حالت اور جرم کی

حیثیت اور ماحول وغیرہ کے مجموعہ پر نظر کر کے جس قدر سزا دینے کو انسداد جرم کے لئے کافی سمجھے وہ سزا دے سکتا ہے، ایسی سزاؤں کو شریعت کی اصطلاح میں ''تعزیرات'' کہا جاتا ہے، حدود شرعیہ پانچ ہیں: ① چوری ② ڈاکہ ③ کسی پاکدامن عورت پر تہمت رکھنا ④ شراب پینا ⑤ اور زنا کرنا، ان کے ساتھ ارتداد کی سزا کو ملا کر اکثر فقہاء نے حدود کی تعداد چھ بیان کی ہے، ان میں سے ہر جرم اپنی جگہ بڑا سخت اور دنیا کے امن وامان کو برباد کرنے والا اور بہت سی خرابیوں کا مجموعہ ہے، لیکن ان سب میں بھی زنا کے عواقب اور نتائج بد جیسے دنیا کے نظام انسانیت کو تباہ و برباد کرنے والے ہیں وہ شاید کسی دوسرے جرم میں نہیں، حدود وتعزیرات سے متعلق مزید تفصیل سورہ مائدۃ آیت ۳۳۔ ۳۴ کے تحت ملاحظہ فرمایئے۔

**وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ**: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض سزاؤں میں رعایت کرنا نقصان دہ ہوتا ہے، اس سے مشائخ کے اس معمول کی تائید ہوتی ہے کہ وہ مریدین کی بعض غلطیوں میں نرمی یا تسامح نہیں کرتے۔

**وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ**: روح المعانی میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ شیخ یا استاذ جب کسی مرید یا شاگرد کی تادیب کرنا چاہے اور اس کے نفس کو توڑنا مقصود ہو تو مناسب ہے کہ لوگوں کے سامنے کرے (تا کہ اس کا نفس بھی ٹوٹے اور دوسروں کو بھی عبرت ہو)۔

* * *

**فائدہ**: لے یہ سزا اُس زانی اور زانیہ کی ہے جو آزاد، عاقل، بالغ اور نکاح کیے ہوئے نہ ہوں یا نکاح کرنے کے بعد ہم بستری نہ کر چکے ہوں اور جو آزاد نہ ہو اس کے پچاس درے لگتے ہیں، اس کا حکم پانچویں پارہ کے اول رکوع کے ختم پر مذکور ہے، اور جو عاقل یا بالغ نہ ہو وہ مکلف ہی نہیں اور جس مسلمان میں تمام صفتیں موجود ہوں (حریت، بلوغ، عقل، نکاح اور ہم بستری سے فراغ) ایسے شخص کو ''محصن'' کہتے ہیں، اس کی سزا ''رجم'' (سنگسار کرنا) ہے جیسا کہ سورہ مائدہ میں ''تورات'' کے حوالہ سے فرمایا: **وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ** (المائدہ: ۴۳) اور وہ حکم اللہ ''رجم'' تھا جیسا کہ وہاں کے فوائد میں گزر چکا۔

چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اسی کے موافق فیصلہ کیا اور فرمایا: ''اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَوَّلُ مَنْ اَحْيَا اَمْرَكَ اِذَا اَمَاتُوْه'' (خدایا! میں پہلا شخص ہوں جس نے تیرے حکم کو زندہ کیا جبکہ وہ اسے مٹا چکے تھے) پھر نہ صرف ان یہود کو بلکہ جس قدر واقعات اس قسم کے پیش آئے ان سب میں زانی محصن کو آپ ﷺ نے یہی رجم کی سزا دی، اور آپ ﷺ کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل برابر اسی قانونِ رجم پر رہا، بلکہ اہل السنت والجماعت میں کسی ایک شخص نے بھی اس سے اختلاف کی جرأت نہ کی، گویا سنت متواترہ اور اجماع اہل حق نے بتلا دیا کہ اس مسئلہ میں شریعت محمدیہ نے تورات کے حکم کو باقی رکھا ہے جیسا کہ قتل عمد کی سزا قتل ہونا قرآن کریم نے بحوالہ تورات بیان فرمایا تھا: **وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ** (المائدہ: ۴۵) الخ اور مرتدین کے قتل کا بنی اسرائیل کو حکم دینا سورہ بقرہ میں بیان کیا گیا: **فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ** (البقرۃ: ۵۴) پھر ان ہی احکام کو امت محمدیہ کے حق میں بھی قائم رکھا گیا، شاید رجم محصن اور مسئلہ قصاص کو نقل کرنے کے بعد جو بڑی شدت و تاکید سے ترک حکم بما انزل اللہ کی برائی بیان فرمائی اور آخر میں ارشاد ہوا: **وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ** (المائدہ: ۴۸) اس سے یہی غرض ہو کہ تورات کے یہ احکام اب قرآن کے زیر حفاظت ہیں جن کے قائم رکھنے میں پیغمبر کو کسی اہواء وآراء کی پروا نہیں کرنی چاہیے، چنانچہ نہ آپ ﷺ نے پروا کی نہ آپ ﷺ کے خلفاء نے، حتی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب رجم محصن کے متعلق یہ اندیشہ ہوا بلکہ مکشوف ہو گیا کہ آگے چل کر بعض زائغین اس کا انکار کرنے لگیں گے (چنانچہ خوارج نے اور ہمارے زمانے کے ایک ممسوخ فرقہ نے کیا) تو آپ نے منبر پر چڑھ کر صحابہ وتابعین کے مجمع میں اس حکم خداوندی کا بہت شدومد سے اعلان فرمایا اور اس میں قرآن کی ایک آیت کا حوالہ دیا جس میں رجم محصن کا صریح حکم تھا اور جس کی تلاوت گو بعد میں منسوخ ہو گئی مگر حکم برابر باقی رہا۔

**تنبیہ**: کسی آیت کا محض منسوخ التلاوت ہونا اور حکم باقی رہنا یہ ایک مستقل مسئلہ ہے جس کی تحقیق ان مختصر فوائد میں درج نہیں ہو سکتی،

ان شاء اللہ العزیز اگر مستقل تفسیر قرآن لکھنے کی نوبت آئی تو وہاں لکھا جائے گا۔

**فائدہ: ۲** یعنی اگر اللہ پر یقین رکھتے ہو تو اس کے احکام وحدود جاری کرنے میں کچھ پس و پیش نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ مجرم پر ترس کھا کر سزا بالکل روک لو یا اس میں کمی کرنے لگو یا سزا دینے کی ایسی ہلکی اور غیر موثر طرز اختیار کرو کہ سزا سزا نہ رہے، خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ حکیم مطلق اور تم سے زیادہ اپنے بندوں پر مہربان ہے اس کا کوئی حکم سخت ہو یا نرم مجموعہ عالم کے حق میں حکمت ورحمت سے خالی نہیں ہوسکتا، اگر تم اس کے احکام وحدود کے اجراء میں کوتاہی کروگے تو آخرت کے دن تمہاری پکڑ ہوگی۔

**فائدہ: ۳** یعنی سزا تنہائی میں نہیں، مسلمانوں کے مجمع میں دینی چاہیے کیونکہ اس رسوائی میں سزا کی تکمیل وتشہیر اور دیکھنے سننے والوں کے لیے سامان عبرت ہے، اور شاید یہ بھی غرض ہو کہ دیکھنے والے مسلمان اس کی حالت پر رحم کھا کر عفو ومغفرت کی دعا کریں گے، واللہ اعلم۔

اَلزَّانِیْ لَا یَنْكِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِكَةً ۫ وَّالزَّانِیَةُ لَا یَنْكِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ

بدکار مرد نہیں نکاح کرتا مگر عورت بدکار سے یا شرک والی سے، اور بدکار عورت سے نکاح نہیں کرتا مگر بدکار مرد یا مشرک ۱

وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ ۝۳

اور یہ حرام ہوا ہے ایمان والوں پر ۲

**خلاصہ تفسیر:** (زنا ایسی گندی چیز ہے کہ اس سے انسان کی طبیعت کا مزاج ہی بگڑ جاتا ہے، اس کی رغبت بری چیزوں کی طرف ہی ہوجاتی ہے، ایسے آدمی کی طرف رغبت بھی کسی ایسے ہی خبیث النفس کی ہوسکتی ہے جس کا اخلاقی مزاج بگڑ چکا ہو، چنانچہ) زانی (اپنے زانی اور زنا کی طرف رغبت ہونے کی حیثیت سے) نکاح بھی کسی کے ساتھ نہیں کرتا بجز زانیہ یا مشرکہ عورت کے (جس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ ایسے شخص کی بری چیز کی طرف رغبت ہوجاتی ہے) اور (اسی) طرح زانیہ کے ساتھ بھی (اس کے زانیہ اور زنا کی طرف رغبت ہونے کی حیثیت سے) اور کوئی نکاح نہیں کرتا بجز زانی یا مشرک کے (جس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ ایسے شخص کی طرف برے آدمی کو رغبت ہوجاتی ہے) اور یہ (ایسا نکاح جو زانیہ کے زانیہ ہونے کی حیثیت کے ساتھ ہو جس کا نتیجہ آئندہ بھی اس کا زنا میں مبتلا رہنا ہے یا کسی مشرک عورت کے ساتھ ہو) مسلمانوں پر حرام (اور موجب گناہ) کیا گیا ہے (اگرچہ صحت وعدم صحت میں دونوں میں فرق ہو، یعنی زانیہ بحیثیت زانیہ سے کوئی نکاح کر ہی لے تو گناہ ہونے کے باوجود نکاح منعقد اور صحیح ہوجائے گا، اور مشرکہ سے نکاح کیا تو ناجائز وگناہ ہونے کے علاوہ وہ نکاح ہی نہیں ہوگا، بلکہ باطل ہوگا)۔

اَلزَّانِیْ لَا یَنْكِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِكَةً: خلاصہ اس کا یہ ہے کہ آیت کا شروع حصہ کوئی حکم شرعی نہیں، بلکہ ایک عام مشاہدہ اور تجربہ کا بیان ہے جس میں زنا کا فعل خبیث ہونا اور اس کے اثرات کی دوررس مضرتوں کا ذکر ہے، مطلب آیت کا یہ ہے کہ زنا ایک اخلاقی زہر ہے، اس کے زہریلے اثرات سے انسان کا اخلاقی مزاج ہی بگڑ جاتا ہے، اسے بھلے برے کی تمیز نہیں رہتی، بلکہ برائی اور خباثت ہی مرغوب ہوجاتی ہے، حلال حرام کی بحث نہیں رہتی، اور جو عورت اس کو پسند آتی ہے اس کا اصلی مقصود اس سے زنا کرنا اور اس کو زناکاری پر راضی کرنا ہوتا ہے، اگر زنا کے ارادے میں ناکام ہوجائے تو مجبوری سے نکاح پر راضی ہوتا ہے، مگر نکاح کو دل سے پسند نہیں کرتا، کیونکہ نکاح کے جو مقاصد ہیں کہ آدمی عفیف ہوکر رہے اور اولاد صالح پیدا کرے اور اس کے لئے بیوی کے حقوق نفقہ وغیرہ کا ہمیشہ کے لئے پابند ہوجائے یہ ایسے شخص کو وبال معلوم ہوتے ہیں، اور چونکہ ایسے شخص کو دراصل نکاح سے کوئی غرض ہی نہیں اس لئے اس کی رغبت صرف مسلمان عورتوں ہی کی طرف نہیں بلکہ مشرک عورتوں کی طرف بھی ہوتی ہے، اور مشرک عورت اگر اپنے مذہب کی وجہ سے یا کسی برادری کی رسم کی وجہ سے نکاح کی شرط لگالے تو مجبوراً وہ اس سے نکاح پر بھی تیار ہوجاتا ہے، اس کی اس کو کچھ بحث ہی نہیں کہ یہ نکاح حلال اور صحیح ہوگا یا شرعاً باطل ٹھہرے گا، اس لئے اس پر یہ بات صادق آگئی کہ اس کی جس عورت کی طرف اصلی رغبت ہوگی اگر وہ مسلمان ہے تو

زانیہ کی طرف رغبت ہوگی خواہ پہلے سے زنا کی عادی ہو یا اسی کے ساتھ زنا کر کے زانیہ کہلائے، یا پھر کسی مشرک عورت کی طرف رغبت ہوگی جس کے ساتھ نکاح بھی زنا ہی کے حکم میں ہے، یہ معنی ہوئے آیت کے پہلے جملہ کے۔

**وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ:** اسی طرح جو عورت زنا کی خوگر ہو اور اس سے توبہ نہیں کرتی تو سچے مومن مسلمان جن کا مقصود اصلی نکاح اور نکاح کے شرعی فوائد و مقاصد ہیں وہ ایسی عورت سے متوقع نہیں، اس لئے ان کو ایسی عورت کی طرف اصلی رغبت نہیں ہوسکتی، خصوصاً جبکہ یہ بھی معلوم ہو کہ یہ عورت نکاح کے بعد بھی اپنی بری عادت زنا نہ چھوڑے گی، ہاں! ایسی عورت کی طرف رغبت یا تو زانی کو ہوگی جس کا اصلی مقصد اپنی خواہش پوری کرنا ہے نکاح مقصود نہیں، اس میں اگر وہ زانیہ کسی اپنی دنیوی مصلحت سے اس کے ساتھ ملنے کے لئے نکاح کی شرط لگا دے تو بادل نخواستہ نکاح کو بھی گوارا کر لیتا ہے، یا پھر ایسی عورت کے نکاح پر وہ شخص راضی ہوتا ہے جو مشرک ہو، اور چونکہ مشرک سے نکاح بھی شرعاً زنا ہی ہے اس لئے اس میں دو چیزیں جمع ہوگئیں کہ مشرک بھی ہے اور زانی بھی، یہ معنی ہیں آیت کے دوسرے جملے کے۔

مذکورہ تفسیر سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اس آیت میں زانی اور زانیہ سے مراد وہ ہیں جو زنا سے توبہ نہ کریں اور اپنی اس بری عادت پر قائم رہیں، اور اگر ان میں سے کوئی مرد خانہ داری یا اولاد کی مصلحت سے کسی پاکدامن شریف عورت سے نکاح کر لے یا ایسی عورت کسی نیک مرد سے نکاح کر لے تو اس آیت سے اس نکاح کی نفی لازم نہیں آتی، یہ نکاح شرعاً درست ہو جائے گا۔

**وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ:** اس میں بعض حضرات مفسرین نے تو ذٰلك کا اشارہ زنا کی طرف قرار دیا ہے تو معنی جملے کے یہ ہوگئے کہ جب زنا ایسا خبیث فعل ہے تو زنا مومنین پر حرام کر دیا گیا، اس تفسیر پر معنی میں تو کوئی اشکال نہیں رہتا، لیکن ذٰلك سے زنا مراد لینا سیاق آیت سے کسی قدر بعید ضرور ہے، اس لئے دوسرے مفسرین نے ذٰلك کا اشارہ نکاح زانی و زانیہ اور مشرک و مشرکہ کی طرف قرار دیا ہے، اس صورت میں مشرکہ سے مسلمان مرد کا نکاح اور مشرک سے مسلمان عورت کا نکاح حرام ہونا تو دوسری نصوص قرآن سے بھی ثابت ہے اور تمام امت کے نزدیک اجماعی مسئلہ ہے اور زانی مرد سے پاکدامن عورت کا نکاح یا زانیہ عورت سے عفیف مرد کا نکاح حرام ہونا جو اس جملے سے مستفاد ہوگا وہ اس صورت کے ساتھ مخصوص ہے کہ عفیف مرد زانیہ عورت سے نکاح کر کے اس کو زنا سے نہ روکے، بلکہ نکاح کے بعد بھی اس کی زنا کاری پر راضی رہے، کیونکہ اس صورت میں یہ دیوثیت ہوگی جو شرعاً حرام ہے، اسی طرح کوئی شریف پاکدامن عورت زنا کے خوگر شخص سے نکاح کرے اور نکاح کے بعد بھی اس کی زنا کاری پر راضی رہے، یہ بھی حرام ہے، یعنی ان لوگوں کا یہ فعل حرام اور گناہ کبیرہ ہے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کا باہمی نکاح صحیح نہ ہو، باطل ہو جائے۔

لفظ ''حرام'' شریعت کی اصطلاح میں دو معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے: ① ایک یہ کہ وہ گناہ ہے اس کا کرنے والا آخرت میں مستحق سزا ہے اور دنیا میں بھی یہ عمل بالکل باطل کالعدم ہے، اس پر کوئی شرعی ثمرہ احکام دنیا کا بھی مرتب نہیں ہوگا، جیسے کسی مشرک عورت سے یا جو عورتیں ہمیشہ کے لئے حرام ہیں ان میں سے کسی سے نکاح کر لیا تو یہ گناہ عظیم بھی ہے اور ایسا نکاح شرعاً کالعدم ہے زنا میں اور اس میں کوئی فرق نہیں ② دوسرے یہ کہ فعل حرام ہے، یعنی گناہ موجب سزا ہے، مگر دنیا میں اس فعل کے کچھ ثمرات رہتے ہیں، معاملہ صحیح ہو جاتا ہے، جیسے کسی عورت کو دھوکہ دے کر یا اغوا کر کے لے آیا، پھر شرعی قاعدے کے مطابق دو گواہوں کے سامنے اس کی مرضی سے نکاح کر لیا تو یہ فعل تو ناجائز و حرام تھا مگر نکاح صحیح ہوگیا اولاد ثابت النسب ہوگی، اسی طرح زانیہ اور زانی کا نکاح جبکہ ان کا مقصود اصلی زنا ہی ہو، نکاح محض کسی دنیوی مصلحت سے کرتے ہوں اور زنا سے توبہ نہیں کرتے ایسا نکاح حرام ہے، مگر دنیوی احکام میں باطل کالعدم نہیں، نکاح کے ثمرات شرعیہ نفقہ، مہر ثبوت نسب اور میراث سب جاری ہوں گے، اس طرح لفظ حُرِّمَ اس آیت میں مشرکہ کے حق میں پہلے معنی کے اعتبار سے اور زانیہ اور زانی کے حق میں دوسرے معنی کے اعتبار سے صحیح اور درست ہوگیا، اس تفسیر پر آیت کو منسوخ کہنے کی ضرورت نہ رہی جیسا کہ بعض حضرات مفسرین نے فرمایا، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

**اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً:** روح المعانی میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ اخیار یعنی نیکوں کو اشرار یعنی بروں کے ساتھ ضرورت سے زیادہ میل جول نہیں رکھنا چاہیے۔

**فائدہ:** ۱؎ زنا کی سزا ذکر کرنے کے بعد اس فعل کی غایت شناعت بیان فرماتے ہیں، یعنی جو مرد یا عورت اس عادت شنیع میں مبتلا ہیں حقیقت میں وہ اس لائق نہیں رہتے کہ کسی عفیف مسلمان سے ان کا تعلق ازدواج وہمبستری قائم کی جائے ان کی پلید طبیعت اور میلان کے مناسب تو یہ ہے کہ ایسے ہی کسی بدکار و تباہ حال مرد عورت سے یا ان سے بھی بدتر کسی مشرک و مشرکہ سے ان کا تعلق ہو، کما قال تعالیٰ: اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ (النور:۲۶)

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز　　کبوتر با کبوتر، باز با باز

ان کی حرکت کا اصلی اقتضاء تو یہ ہی تھا، اب یہ جداگانہ امر ہے کہ حق تعالیٰ نے دوسری مصالح وحکم کی بنا پر کسی نام نہاد مسلمان کا مشرک ومشرکہ سے عقد جائز نہیں رکھا، یا مثلاً بدکار مرد کا پاکباز عورت سے نکاح ہو جائے تو بالکل باطل نہیں ٹھہرایا۔

**تنبیہ:** آیت کی جو تقریر ہم نے کی وہ بالکل سہل اور بے تکلف ہے اس میں لاینکح کے معنی وہ لیے گئے جو "اَلسُّلْطَانُ لَایَکْذِبُ" وغیرہ محاورات میں لیے جاتے ہیں، یعنی نفی لیاقت فعل کو نفی فعل کی حیثیت دے دی گئی، فَافْهَمْ وَ اسْتَقِمْ۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی زنا مومنین پر حرام ہے، ایک مومن مومن رہتے ہوئے یہ حرکت کیسے کرے گا، حدیث میں ہے: "لَایَزْنِی الزَّانِی حِیْنَ یَزْنِی وَهُوَ مُؤْمِنٌ" یا یہ مطلب ہو کہ زانیہ سے نکاح کرنا ان پاکباز مردوں پر حرام کر دیا گیا ہے جو صحیح اور حقیقی معنوں میں مومنین کہلانے کے مستحق ہیں، یعنی تکوینی طور پر ان کے پاک نفوس کو ایسی گندی جگہ کی طرف مائل ہونے سے روک دیا گیا ہے، اس وقت حرّم کے معنی وہ ہوں گے جو: وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ (القصص:۱۲) میں، یا: وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ (الانبیآء:۹۵) میں لیے گئے ہیں، واللہ اعلم۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً

اور جو لوگ عیب لگاتے ہیں حفاظت والیوں (پاک دامنوں) کو پھر نہ لائیں چار مرد شاہد ۱؎ تو مارو ان کو اسی درے

وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۴ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ

اور نہ مانو ان کی کوئی گواہی کبھی ۲؎ اور وہ ہی لوگ ہیں نافرمان ۳؎ مگر جنھوں نے توبہ کرلی اس کے پیچھے

وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵

اور سنور گئے، تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے ۴؎

**خلاصہ تفسیر:** اور جو لوگ (زنا کی) تہمت لگائیں پاکدامن عورتوں کو (جن کا زانیہ ہونا کسی دلیل یا شرعی قرینہ سے ثابت نہیں) اور پھر چار گواہ (اپنے دعوی پر) نہ لاسکیں تو ایسے لوگوں کو اسّی درّے لگاؤ اور ان کی کوئی گواہی کبھی قبول مت کرو (یہ بھی تہمت لگانے کی سزا ہی کا جزء ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے مردود الشہادت ہو گئے یہ تو دنیا کی سزا کا ذکر تھا) اور یہ لوگ (آخرت میں بھی سزا کے مستحق ہیں، کیونکہ) فاسق ہیں، لیکن جو لوگ اس (تہمت لگانے) کے بعد (خدا کے سامنے) توبہ کرلیں (کیونکہ تہمت لگانے میں انہوں نے اللہ کی نافرمانی کی اور حق اللہ کو ضائع کیا) اور (جس پر تہمت لگائی تھی اس سے معاف کرا کر بھی) اپنی (حالت کی) اصلاح کرلیں (کیونکہ اس کا حق ضائع کیا تھا) سو اللہ تعالیٰ ضرور مغفرت کرنے والا رحمت کرنے والا ہے (یعنی سچی توبہ کرنے سے عذاب آخرت معاف ہو جائے گا، اگرچہ شہادت کا مقبول نہ ہونا جو دنیوی سزا تھی وہ باقی رہے گی، کیونکہ وہ حد شرعی کا جز ہے اور ثبوت جرم کے بعد توبہ کرنے سے حد شرعی ساقط نہیں ہوتی)۔

**وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا:** زنا چونکہ سارے جرائم سے زیادہ معاشرے میں بگاڑ اور فساد کا ذریعہ ہے اس لئے اس کی

سزا شریعت اسلام نے دوسرے سب جرائم سے زیادہ سخت رکھی ہے، اس لئے عدل وانصاف کا تقاضا تھا کہ اس معاملہ کے ثبوت کو بڑی اہمیت دی جائے ،بغیر شرعی ثبوت کے کوئی کسی مرد یا عورت پر زنا کا الزام یا تہمت لگانے کی جرأت نہ کرے، اس لئے شریعت اسلام نے بغیر ثبوت شرعی کے جس کا نصاب چار مرد گواہ عادل ہونا ہے اگر کوئی کسی پر تہمت صریح زنا کی لگائے تو اس تہمت لگانے کو بھی شدید جرم قرار دیا اور اس جرم پر بھی حد شرعی اسّی کوڑے مقرر کی ،جس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ کسی شخص پر زنا کا الزام کوئی شخص اسی وقت لگانے کی جرأت کرے گا جبکہ اس نے اس فعل خبیث کو خود اپنی آنکھ سے دیکھا بھی ہو اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس کو یہ یقین ہو کہ میرے ساتھ اور تین مردوں نے دیکھا ہے اور وہ گواہی دیں گے، کیونکہ اگر دوسرے گواہ ہیں ہی نہیں یا چار سے کم ہیں، یا ان کے گواہی دینے میں شبہ ہے تو اکیلا یہ شخص گواہی دے کر تہمت زنا کی سزا کا مستحق بننا کسی حال گوارا نہ کرے گا۔

رہا یہ معاملہ کہ جب زنا کی شہادت کے لئے ایسی کڑی شرطیں لگا دی گئیں تو مجرموں کو کھلی چھٹی مل گئی نہ کسی کی شہادت کی جرأت ہوگی نہ کبھی ثبوت شرعی بہم پہنچے گا نہ ایسے مجرم کبھی سزایاب ہوسکیں گے، مگر یہ خیال اس لئے غلط ہے کہ زنا کی حد شرعی یعنی سو کوڑے یا رجم وسنگساری کی سزا دینے کیلئے تو یہ شرطیں ہیں، لیکن دو غیر محرم مرد وعورت کو یکجا قابل اعتراض حالت میں یا بے حیائی کی باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر اس کی شہادت دینے پر کوئی پابندی نہیں، اور ایسے تمام امور جو زنا کے مقدمات ہوتے ہیں یہ بھی شرعاً قابل سزائے جرم ہیں، لیکن حد شرعی کی سزا نہیں، بلکہ تعزیری سزا قاضی یا حاکم کی صوابدید کے مطابق کوڑے لگانے کی دی جاتی ہے، اس لئے جس شخص نے دو مرد وعورت کو زنا میں مبتلا دیکھا مگر دوسرے گواہ نہیں ہیں تو صریح زنا کے الفاظ سے تو شہادت نہ دے مگر بے حجابانہ اختلاط کی گواہی دے سکتا ہے اور حاکم قاضی اس پر تعزیری سزا بعد ثبوت جرم جاری کرسکتا ہے۔

**الْمُحْصَنٰتِ**: محصنات کون ہیں؟ یہ لفظ ''احصان'' سے مشتق ہے، اصطلاح شرع میں احصان کی دو قسمیں ہیں: ① ایک وہ جس کا حد زنا میں اعتبار کیا گیا ہے، وہ یہ کہ جس پر زنا کا ثبوت ہوجائے وہ عاقل بالغ آزاد مسلمان ہو اور کسی عورت کے ساتھ نکاح صحیح کرچکا ہو اور اس سے مباشرت بھی ہوچکی ہو تو اس پر سزائے رجم وسنگساری جاری ہوگی ② دوسری قسم وہ ہے جس کا اعتبار حد قذف یعنی تہمت زنا میں کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ جس شخص پر زنا کا الزام لگایا گیا ہے وہ عاقل بالغ آزاد مسلمان ہو اور عفیف ہو، یعنی پہلے کبھی اس پر زنا کا ثبوت نہ ہوا ہو، اس آیت میں یہی معنی محصنت کے ہیں۔

**مسئلہ**: آیت قرآن میں عام معروف عادت کے مطابق یا اس واقعہ کی وجہ سے جو شان نزول اس آیت کا ہے تہمت زنا اور اسکی سزا کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ تہمت لگانے والے مرد ہوں اور جس پر تہمت لگائی گئی وہ پاکدامن عورت ہو، مگر حکم شرعی اشتراک علت کے سبب سے عام ہے، کوئی عورت دوسری عورت پر، یا کسی مرد پر، یا مرد کسی دوسرے مرد پر تہمت زنا لگائے اور ثبوت شرعی موجود نہ ہو تو یہ سب بھی اسی سزائے شرعی کے مستحق ہوں گے۔

**مسئلہ**: یہ حد شرعی جو تہمت زنا پر ذکر کی گئی ہے صرف اسی تہمت کے ساتھ مخصوص ہے، کسی دوسرے جرم کی تہمت کسی شخص پر لگائی جائے تو یہ حد شرعی اس پر جاری نہیں ہوگی، ہاں! تعزیری سزا حاکم کی صوابدید کے مطابق ہر جرم کی تہمت پر دی جاسکتی ہے، الفاظ قرآن میں اگرچہ صراحۃً اس حد کا تہمت زنا کے ساتھ مخصوص ہونا ذکر نہیں، مگر چار گواہوں کی شہادت کا ذکر اس خصوصیت کی دلیل ہے، کیونکہ چار گواہ کی شرط صرف ثبوت زنا ہی کے لئے مخصوص ہے۔

**مسئلہ**: حد قذف میں چونکہ حق العبد یعنی جس پر تہمت لگائی گئی ہے اس کا حق بھی شامل ہے اس لئے یہ حد جبھی جاری کی جائے گی جبکہ مقذوف یعنی جس پر تہمت لگائی گئی وہ حد جاری کرنے کا مطالبہ بھی کرے، ورنہ حد ساقط ہوجائے گی، بخلاف حد زنا کے کہ وہ خالص حق اللہ ہے، اس لئے کوئی مطالبہ کرے یا نہ کرے حد زنا جرم ثابت ہونے پر جاری کی جائے گی، جس پر تہمت لگائی گئی ہے اگر وہ معاف کردے تو حد ساقط ہوجاتی ہے۔

**وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا**: یعنی جس شخص پر زنا کی جھوٹی تہمت لگانے کا جرم ثابت ہوجائے اور مقذوف کے مطالبہ سے اس پر حد قذف جاری ہوجائے تو اس کی ایک سزا تو فوری ہوگئی کہ اسی کوڑے لگائے گئے، دوسری سزا ہمیشہ کے لئے جاری رہے گی وہ یہ ہے کہ اس کی شہادت کسی معاملے میں مقبول نہ کی جائے گی جب تک یہ شخص اللہ تعالیٰ کے سامنے ندامت کے ساتھ توبہ نہ کرے اور مقذوف شخص سے معافی حاصل کرکے توبہ کی تکمیل نہ کرے اس وقت تک تو باجماع امت اس کی شہادت کسی بھی معاملہ میں مقبول نہ ہوگی اور اگر توبہ کرلے تو تب بھی حنفیہ کے نزدیک اس کی شہادت قبول نہیں ہوتی، ہاں گناہ معاف ہوجاتا ہے جیسا کہ خلاصہ تفسیر میں گزرا۔

**اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ**: یہ استثناء امام اعظم ابوحنیفہ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک آیت سابقہ کے صرف آخری جملے کی طرف

راجع ہے، یعنی وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ، تو مطلب اس استثناء کا یہ ہے کہ جس پر حد قذف جاری ہوئی ہے وہ فاسق ہے، لیکن اگر وہ صدق دل سے توبہ کرے اور اپنی حالت کی اصلاح بھی مقذوف سے معافی لے کر کرے تو پھر وہ فاسق نہیں رہے گا اور آخرت کی سزا اس سے معاف ہو جائے گی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں جو اس پر دو سزاؤں کا ذکر اس آیت کے شروع میں ہے یعنی اسی کوڑے لگانا اور مردود الشہادت کر دینا یہ سزائیں توبہ کے باوجود اپنی جگہ رہیں گی، کیونکہ ان میں سے ایک بڑی سزا کوڑے لگانے کی وہ تو جاری ہو ہی چکی ہے، دوسری سزا بھی چونکہ اسی حد شرعی کا جزو ہے، اور یہ سب کے نزدیک مسلم ہے کہ توبہ سے حد شرعی معاف نہیں ہوتی اگر چہ آخرت کا عذاب گناہ معاف ہو کر ٹل جاتا ہے، تو جب مردود الشہادت ہونا بھی حد شرعی کا جزو ہے تو وہ توبہ سے معاف نہ ہوگا، امام شافعی اور بعض دوسرے ائمہ نے استثناء مذکور کو آیت سابقہ کے سب جملوں کی طرف راجع کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ توبہ کر لینے سے جیسا کہ وہ فاسق نہیں رہا اس لئے مردود الشہادت بھی نہیں رہے گا، واللہ اعلم۔

وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا: توبہ کے باوجود ہمیشہ کے لیے شہادت کا قبول نہ ہونا جیسا کہ امام صاحبؒ کا مذہب ہے یہ اصل ہے بعض مشائخ کی اس عادت کی کہ بعض جرائم معاف کر دینے کے بعد ان سے خاص تعلق نہیں رکھتے، ہاں! ان کی خیر خواہی میں جہاں مناسبت کی امید ہو دوسرے شیخ کامل کی طرف رجوع اور وابستگی کا مشورہ دینے میں کوتاہی بھی نہیں کرتے۔

* * *

فائدہ: ١ـ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ: یعنی ایسی پاکدامن عورتوں کو زنا کی تہمت لگائیں جن کا بدکار ہونا کسی دلیل یا قرینہ شرعیہ سے ثابت نہیں، اس کی سزا بیان فرماتے ہیں اور یہی حکم پاکباز مردوں پر تہمت لگانے کا ہے، چونکہ یہ آیات ایک عورت کے قصہ میں نازل ہوئیں اس لیے ان ہی کا ذکر فرمایا، اگر چار گواہ پیش کر دیے اور ان کی شہادت بقاعدہ شریعت پوری اتری تو مقذوف یا مقذوفہ پر حد زنا جاری کی جائے گی۔

فائدہ: ٢ـ وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا: یہ سزا قاذف (تہمت لگانے والے) کی ہوئی کہ (مقذوف کے مطالبہ پر) اَسّی (۸۰) دُرّے لگائے جائیں اور آئندہ ہمیشہ کے لیے (معاملات) میں مردود الشہادت قرار دیا جائے، حنفیہ کے نزدیک توبہ کے بعد بھی اس کی شہادت معاملات میں قبول نہیں کی جاسکتی۔

فائدہ: ٣ـ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ: اگر واقعی جان بوجھ کر جھوٹی تہمت لگائی تھی تب تو ان کا فاسق و نافرمان ہونا ظاہر ہے اور اگر واقعی سچ بیان کیا تھا لیکن جانتے تھے کہ چار گواہوں سے ہم اپنا دعویٰ ثابت نہیں کر سکیں گے تو ایسی بات کا اظہار کرنے سے بجز ایک مسلمان کی آبروریزی اور پردہ دری کے کیا مقصود ہوا جو بجائے خود ایک مستقل گناہ ہے اور علماء نے اس کو کبائر میں شمار کیا ہے۔

فائدہ: ٤ـ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: یعنی توبہ اور اصلاح حال کے بعد اللہ کے نافرمان بندوں میں اس کا شمار نہ رہے گا، گو پچھلے قذف کی سزا میں مردود الشہادت پھر بھی رہے، یہی مذہب سلف میں سے قاضی شریح، ابراہیم نخعی، سعید بن جبیر، مکحول، عبد الرحمن بن زید بن جابر، حسن بصری، محمد بن سیرین اور سعید بن المسیب رحمہم اللہ کا ہے، کما فی الدر المنثور و ابن کثیر۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ

اور جو لوگ عیب لگائیں اپنی جوروؤں کو ١ اور شاہد نہ ہوں ان کے پاس سوائے ان کی جان کے تو ایسے شخص کی گواہی کی یہ صورت ہے کہ چار

شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝٦ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝٧

بار گواہی دے اللہ کی قسم کھا کر، کہ مقرر وہ (یہ) شخص سچا ہے، اور پانچویں بار یہ کہ اللہ کی پھٹکار ہو اس شخص پر اگر ہو وہ جھوٹا

وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝٨ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ

اور عورت سے ٹل جائے گی مار یوں کہ وہ گواہی دے چار گواہی اللہ کی قسم کھا کر کہ مقرر وہ شخص جھوٹا ہے، اور پانچویں یہ کہ

غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ⑨

اللہ کا غضب آئے اس عورت پر اگر وہ شخص سچا ہے ۲۔

**خلاصہ تفسیر:** اور جو لوگ اپنی بیویوں کو (زنا کی) تہمت لگائیں اور ان کے پاس بجز اپنے (ہی دعوے کے) اور کوئی گواہ نہ ہوں (جو عدد میں چار ہونے ضروری ہیں) تو ان کی شہادت (جو کہ دافع حبس یا حد قذف ہو) یہی ہے کہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر یہ کہہ دے کہ بیشک میں سچا ہوں، اور پانچویں مرتبہ یہ کہے کہ مجھ پر خدا کی لعنت ہو اگر میں جھوٹا ہوں، اور (اس کے بعد) اس عورت سے سزا (یعنی قید یا حد زنا) اس طرح ٹل سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ قسم کھا کر کہے کہ بیشک یہ مرد جھوٹا ہے، اور پانچویں بار یہ کہے کہ مجھ پر خدا کا غضب ہو اگر یہ مرد سچا ہو (اس طریق سے دونوں میاں بیوی سزائے دنیوی سے بچ سکتے ہیں البتہ وہ عورت اس مرد پر حرام ہو جائے گی)۔

**وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ**: لعان اور ملاعنت کے معنی ایک دوسرے پر لعنت اور غضب الٰہی کی بد دعا کرنے کے ہیں، اصطلاح شرع میں میاں اور بیوی دونوں کو چند خاص قسمیں دینے کو لعان کہا جاتا ہے جس کی صورت یہ ہے کہ جب کوئی شوہر اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگا دے یا اپنے بچے کو کہے کہ یہ میرے نطفہ سے نہیں ہے اور یہ عورت جس پر الزام لگایا گیا ہے اس کو جھوٹا بتلا دے اور اس کا مطالبہ کرے کہ مجھ پر جھوٹی تہمت لگائی ہے اس لئے شوہر پر تہمت زنا کی سزا اسی کوڑے جاری کی جائے تو اس وقت شوہر سے مطالبہ کیا جائے گا کہ الزام زنا پر چار گواہ پیش کرے، اگر اس نے گواہ پیش کر دیئے تو عورت پر حد زنا لگائی جائے گی، اور اگر وہ چار گواہ نہ لا سکا تو ان دونوں میں لعان کرایا جائے گا، یعنی پہلے مرد سے کہا جاوے گا کہ وہ چار مرتبہ ان الفاظ سے جو قرآن میں مذکور ہیں یہ شہادت دے کہ میں اس الزام میں سچا اور پانچویں مرتبہ یہ کہے کہ اگر میں جھوٹ بولتا ہوں تو مجھ پر اللہ کی لعنت ہو۔

اگر شوہر ان الفاظ کے کہنے سے رکے تو اس کو قید کر دیا جائے گا کہ یا تو اپنے جھوٹے ہونے کا اقرار کرو یا مذکورہ الفاظ کے ساتھ پانچ مرتبہ یہ قسمیں کھاؤ اور جب تک وہ ان دونوں میں سے کوئی کام نہ کرے اس کو قید رکھا جائے گا، اگر اس نے اپنے جھوٹے ہونے کا اقرار کر لیا تو اس پر حد قذف یعنی تہمت زنا کی شرعی سزا جاری ہوگی، اور اگر الفاظ مذکورہ کے ساتھ پانچ مرتبہ قسمیں کھالیں تو پھر اس کے بعد عورت سے ان الفاظ میں پانچ قسمیں لی جائیں گی جو قرآن میں عورت کے لئے مذکور ہیں، اگر وہ قسم کھانے سے انکار کرے تو اس کو اس وقت تک قید رکھا جائے گا جب تک کہ وہ یا تو شوہر کی تصدیق کرے اور اپنے جرم زنا کا اقرار کرے تو اس پر حد زنا جاری کر دی جائے اور یا پھر الفاظ مذکورہ کے ساتھ پانچ قسمیں کھائے، اگر وہ الفاظ مذکورہ سے قسمیں کھانے پر راضی ہو جائے اور قسمیں کھالے تو اب لعان پورا ہو گیا، جس کے نتیجہ میں دنیا کی سزا سے دونوں بچ گئے، آخرت کا معاملہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہی ہے کہ ان میں سے کون جھوٹا ہے، جھوٹے کو آخرت میں سزا ملے گی، لیکن دنیا میں بھی جب دو میاں بیوی میں لعان کا معاملہ ہو گیا تو یہ ایک دوسرے پر ہمیشہ کے لئے حرام ہو جاتے ہیں، شوہر کو چاہئے کہ اس کو طلاق دے کر آزاد کر دے، اگر وہ طلاق نہ دے تو حاکم ان دونوں میں تفریق کر سکتا ہے اگر چہ دونوں رضامند نہ ہوں، یعنی زبان سے کہہ دے کہ میں ان میں تفریق کر دی، اور یہ تفریق طلاق بائن کے حکم میں ہوگی، پھر اس سے کبھی نکاح جائز نہیں، البتہ اگر یہ کہے کہ میں نے جھوٹ کہا تھا تو اس پر حد قذف جاری کی جائے گی اور پھر نکاح جائز ہو جائے گا۔

اب رہا یہ کہ مرد یا عورت کو ایسی قسمیں کھانا جائز ہیں یا نہیں؟ اس کا حکم یہ ہے کہ جو شخص شرعی دلیل کی رو سے یقینا سچا ہو اس کو جائز ہے، مثلاً مرد نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا، یا تین چار سال تک صحبت نہیں کی تھی اور پھر بچہ ہوا تو زنا ثابت کرنا اور بچہ کی اپنے سے نفی کرنا اور اس پر قسم کھانا سب جائز ہے، اسی طرح عورت کو اپنا حال پورا معلوم ہو سکتا ہے، اور عورتیں چونکہ لعنت کا استعمال زیادہ کرتی ہیں اس لیے ان کی جانب میں لفظ غضب مقرر کیا گیا۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی زنا کی تہمت لگائے یا اپنے بچہ کو کہے کہ یہ میرے نطفہ سے نہیں۔

**فائدہ:** ۲ یعنی جو اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائے اولاً اس سے چار گواہ طلب کیے جائیں گے، اگر پیش کر دے تو عورت پر حد زنا جاری کر

دی جائے گی، اگر گواہ نہ لا سکا تو اس کو کہا جائے گا کہ چار مرتبہ قسم کھا کر بیان کرے کہ وہ اپنے دعوے میں سچا ہے (یعنی جو تہمت اپنی بیوی پر لگائی ہے اس میں جھوٹ نہیں بولا) گویا چار گواہوں کی جگہ خود اس کی یہ چار حلفیہ شہادتیں ہوئیں اور آخر میں پانچویں مرتبہ یہ الفاظ کہنے ہوں گے کہ ''اگر وہ اپنے دعوے میں جھوٹا ہو تو اس پر خدا کی لعنت اور پھٹکار'' اگر الفاظ مذکورہ بالا کہنے سے انکار کرے تو حبس کیا جائے گا اور حاکم اس کو مجبور کرے گا کہ یا اپنے جھوٹے ہونے کا اقرار کرے، تو حد قذف لگے گی جو اوپر گزر رہی، اور یا پانچ مرتبہ وہ ہی الفاظ کہے جو اوپر مذکور ہوئے، اگر کہہ لیے تو پھر عورت سے کہا جائے گا کہ وہ چار مرتبہ قسم کھا کر بیان کرے کہ ''یہ مرد تہمت لگانے میں جھوٹا ہے'' اور پانچویں دفعہ یہ الفاظ کہے کہ ''اللہ کا غضب آوے اس عورت پر اگر یہ مرد اپنے دعوے میں سچا ہو'' تا وقتیکہ عورت یہ الفاظ کہے گی اس کو قید میں رکھیں گے اور مجبور کریں گے کہ یا صاف طور پر مرد کے دعوے کی تصدیق کرے تب تو حد زنا اس پر جاری ہوگی، اور یا بالفاظ مذکورہ بالا اس کی تکذیب کرے، اگر اس نے بھی مرد کی طرح یہ الفاظ کہہ دیے اور ''لعان'' سے فراغت ہوئی تو اس عورت سے صحبت اور دواعی صحبت سب حرام ہو گئے، پھر اگر مرد نے اس کو طلاق دے دی فبہا ورنہ قاضی ان میں تفریق کر دے، گو دونوں رضامند نہ ہوں، یعنی زبان سے کہہ دے کہ میں نے ان میں تفریق کی، اور یہ تفریق طلاق بائن کے حکم میں ہوگی۔

**تنبیہ:** زوجین سے اس طرح الفاظ کہلوانے کو شریعت میں ''لعان'' کہتے ہیں اور لعان صرف قذف ازواج کے ساتھ مخصوص ہے، عام محصنات کے قذف کا وہ ہی حکم ہے جو اوپر کی آیات میں مذکور ہو چکا۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰﴾ ع

اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تمہارے اوپر اور اس کی رحمت اور یہ کہ اللہ معاف کرنے والا ہے حکمتیں جاننے والا (تو کیا کچھ نہ ہوتا)

**خلاصہ تفسیر:** اور (اے مردوں اور عورتوں!) اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کا کرم ہے (کہ ایسے ایسے احکام مقرر کئے جس میں انسان کے فطری جذبات کی پوری رعایت ہے) اور یہ کہ اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا حکمت والا ہے (تو تم بڑی مضرتوں میں پڑ جاتے جن کا بیان آگے آتا ہے)۔

**وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ:** لعان کا قانون شریعت اسلام میں شوہر کے جذبات ونفسیات کی رعایت کی بنا پر نافذ ہوا ہے، کیونکہ کسی شخص پر الزام زنا لگانے کا قانون جو پہلی آیات میں گزر چکا ہے اس کی رو سے یہ ضروری ہے کہ الزام زنا لگانے والا چار گواہ عینی پیش کرے اور جو یہ نہ کر سکے تو الٹی اسی پر تہمت زنا کی حد جاری کی جائے گی، عام آدمی کے لئے تو یہ ممکن ہے کہ جب چار گواہ میسر نہ ہوں تو وہ الزام زنا لگانے سے خاموش رہے تاکہ تہمت زنا کی سزا سے محفوظ رہ سکے، لیکن شوہر کے لئے یہ معاملہ بہت سنگین ہے جب اس نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا اور گواہ موجود نہیں اگر وہ بولے تو تہمت زنا کی سزا پائے اور نہ بولے تو ساری عمر خون کے گھونٹ پیتا رہے اور اس کی زندگی وبال ہو جائے اس لئے شوہر کے معاملہ کو عام قانون سے الگ کر کے اس کا مستقل قانون بنا دیا گیا، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ لعان صرف میاں بیوی کے معاملہ میں ہو سکتا ہے دوسروں کا حکم وہی ہے جو پہلی آیات میں گزر چکا ہے، پس ایسے طور پر یہ حکم مقرر ہوا کہ سب کی رعایت ہے، اور یہ حق تعالیٰ کے فضل، رحمت اور حکمت کا اثر ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی اگر یہ حکم لعان مشروع نہ ہوتا تو قذف کے عام قاعدہ کے موافق زوج پر حد قذف آتی اور یا ساری عمر خون کے گھونٹ پیتا، کیونکہ ممکن ہے وہ سچا ہو، بخلاف غیر شوہر کے کہ وہ اظہار میں مضطر نہیں، اس لیے اس کے قانون میں ان امور کی رعایت ضروری نہیں، دوسری طرف اگر محض خاوند کے قسمیں کھانے پر زنا کا ثبوت ہو جایا کرتا تو عورت کی سخت مصیبت تھی، حالانکہ ممکن ہے وہ ہی سچی ہو، اسی طرح اگر عورت کو قسمیں کھانے پر یقیناً بری سمجھ لیا جاتا تو مرد پر حد قذف واجب ہو جاتی باوجود یہ کہ اس کے صادق ہونے کا بھی مساوی احتمال موجود ہے پس ایسے طور پر لعان کا مشروع کرنا کہ سب کی رعایت رہے، یہ اثر ہے حق تعالیٰ کے فضل ورحمت اور حکمت کا کیونکہ فریقین میں سے جو سچا ہو وہ بے محل سزا سے بچ گیا، اور جھوٹے کی دنیا میں

پردہ پوشی کر کے مہلت دی گئی کہ شاید توبہ کرے، پھر اس کی توبہ کا قبول کر لینا یہ اثر صفت توابیت کا ہوا۔

إِنَّ الَّذِينَ جَآءُو بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنكُمْ ۚ لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَّكُم ۖ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ

جو لوگ لائے ہیں یہ طوفان ۱؎ تمہیں میں ایک جماعت ہیں ۲؎ تم اس کو نہ سمجھو برا اپنے حق میں، بلکہ یہ بہتر ہے تمہارے حق میں ۳؎

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُم مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ ۚ وَالَّذِي تَوَلَّىٰ كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١١﴾

ہر آدمی کے لیے ان میں سے وہ ہے جتنا اس نے گناہ کمایا، اور جس نے اٹھایا ہے اس کا بڑا بوجھ اس کے واسطے بڑا عذاب ہے ۴؎

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے مطلق پاکیزہ عفیف خواتین پر تہمت لگانے کا حکم ذکر ہوا تھا، چونکہ ام المؤمنین سیدنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر بھی جھوٹی تہمت لگائی گئی تھی، اور آپ کا رتبہ ام المؤمنین ہونے کی وجہ سے عام پاکیزہ خواتین سے بہت بلند و برتر ہے، اس لیے اب ان آیات میں ام المؤمنین سیدنا عائشہ صدیقہؓ پر تہمت لگانے کی شناعت اور قباحت کے ساتھ ان کی براءت اور نزاہت کو اہتمام کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے، اسی وجہ سے یہ مضمون آگے دو رکوع تک چلا گیا ہے، اس واقعہ کی تفصیل اور سبب نزول آیت کے فوائد میں ملاحظہ فرمایئے۔

(اے مسلمانو! تم جو صدیقہ عائشہ کے متعلق جھوٹی تہمت کی شہرت سے رنجیدہ ہوا س میں خود صدیقہ بھی داخل ہیں تو تم زیادہ غم نہ کرو، کیونکہ) جن لوگوں نے یہ طوفان (حضرت عائشہ صدیقہؓ کی نسبت) برپا کیا ہے وہ تمہارے میں کا ایک (چھوٹا سا) گروہ ہے (کیونکہ تہمت لگانے والے کل چار تھے، ایک اس جھوٹی تہمت کا اصل گھڑنے والا یعنی عبداللہ ابن ابی منافق، اور تین بالواسطہ جو اس کی خبر سے متاثر ہو گئے یعنی حسان، مسطح وحمنہ جو مومن مخلص تھے، مطلب آیت کا تسلی دینا ہے کہ زیادہ غم نہ کرو، اول تو خبر جھوٹی، پھر ناقل بھی کل چار ہی آدمی، اور زیادہ آدمی تو اس کے مخالف ہی ہیں، پس عرفاً بھی یہ زیادہ غم کا سبب نہ ہونا چاہئے، آگے ایک اور طریقہ پر تسلی ہے کہ) تم اس (بہتان بندی) کو اپنے حق میں برا نہ سمجھو (اگرچہ ظاہر میں غم کی بات ہے، مگر واقع میں اس سے تمہارا نقصان نہیں) بلکہ یہ (انجام کے اعتبار سے) تمہارے حق میں بہتر ہی بہتر ہے (کیونکہ اس غم سے تم کو صبر کا ثواب ملا، تمہارے درجے بڑھے، خصوصاً متہم حضرات کی براءت کے لئے نص قطعی آئی اور آئندہ بھی مسلمانوں کے حق میں خیر ہے کہ ایسے مصیبت زدہ اس واقعہ سے تسلی حاصل کیا کریں گے، پس تمہارا تو کوئی نقصان نہ ہوا، البتہ ان چرچا کرنے والوں کا نقصان ہوا کہ) ان میں سے ہر شخص کو جتنا کسی نے کچھ کیا تھا گناہ ہوا (مثلاً زبان سے کہنے والوں کو زیادہ گناہ اور سن کر خاموش رہ جانے والوں کو یا دل سے بدگمانی کرنے والوں کو اس کے موافق گناہ ہوا) اور ان میں جس نے اس (بہتان) میں سب سے بڑا حصہ لیا (کہ اس کو اختراع کیا، مراد اس سے عبداللہ بن ابی منافق ہے) اس کو (سب سے بڑھ کر) سخت سزا ہوگی (اس سے مراد جہنم ہے، کفر، نفاق اور عداوت رسول کی وجہ سے تو پہلے ہی جہنم کا مستحق تھا، مگر اب اور زیادہ سزا کا مستحق ہو گیا)۔

**إِنَّ الَّذِينَ جَآءُو بِالْإِفْكِ:** قصہ کا خلاصہ لکھا جاتا ہے صحیح بخاری وغیرہ میں ہے کہ حضور ﷺ غزوہ بنی المصطلق سے جو کہ ۶ ھ میں ہوا تھا واپس مدینہ تشریف لا رہے تھے، حضرت عائشہؓ بھی آپ کے ہمراہ تھیں، اور ان کی سواری کا اونٹ علیحدہ تھا، اس پر ہودج تھا، یہ ہودج میں پردہ کر کے بیٹھ جاتی، جمال اس ہودج کو اٹھا کر اونٹ باندھ دیتے، ایک روز ایک منزل میں مقام ہوا، کوچ سے ذرا پہلے حضرت عائشہ صدیقہؓ قضائے حاجت کے لیے جنگل کی طرف گئیں، وہاں اتفاق سے ان کا ہار ٹوٹ کر گر گیا اس کی تلاش میں دیر لگ گئی، یہاں پیچھے کوچ ہو گیا، ان کے اونٹ کا قصہ یہ ہوا کہ جب کوچ ہونے لگا تو عادت کے مطابق حضرت صدیقہ عائشہ کا ہودج یہ سمجھ کر اونٹ پر سوار کر دیا گیا کہ حضرت صدیقہ اس میں موجود ہیں، اٹھاتے وقت بھی کچھ شبہ اس لئے نہ ہوا کہ اس وقت حضرت صدیقہ کی عمر کم اور بدن میں نحیف تھیں کسی کو یہ اندازہ ہی نہ ہوا کہ ہودج خالی ہے، چنانچہ اونٹ کو ہانک دیا گیا، حضرت صدیقہ نے اپنی جگہ واپس آ کر قافلہ کو نہ پایا تو بڑی دانشمندی اور وقار و استقلال سے کام لیا کہ قافلہ کے پیچھے دوڑنے یا ادھر ادھر تلاش کرنے کے بجائے اپنی جگہ چادر اوڑھ کر بیٹھ گئیں اور خیال کیا کہ جب آنحضرت ﷺ اور رفقاء کو یہ معلوم ہوگا کہ میں ہودج میں نہیں ہوں تو مجھے تلاش کرنے کے لئے

یہاں پہنچیں گے، اگر میں ادھر ادھر کہیں اور گئی تو ان کو تلاش میں مشکل ہوگی اس لئے اپنی جگہ پر چادر میں لپٹ کر بیٹھ رہیں، آخر رات کا وقت تھا، نیند کا غلبہ ہوا وہیں لیٹ کر آنکھ لگ گئی، دوسری طرف قدرت نے یہ سامان کیا کہ حضرت صفوان بن معطل صحابی جن کو آنحضرت ﷺ نے اسی خدمت کے لئے مقرر کیا ہوا تھا کہ وہ قافلہ کے پیچھے رہیں اور قافلہ روانہ ہونے کے بعد گری پڑی کوئی چیز رہ گئی ہو تو اس کو اٹھا کر محفوظ کرلیں، وہ صبح کے وقت اس جگہ پہنچے، ابھی روشنی پوری نہ تھی اتنا دیکھا کہ کوئی آدمی پڑا سو رہا ہے، قریب آئے تو حضرت صدیقہ عائشہ کو پہچان لیا، کیونکہ انہوں نے پردہ کے احکام نازل ہونے سے پہلے ان کو دیکھا تھا، پہچاننے کے بعد انتہائی افسوس کے ساتھ ان کی زبان سے اناللہ وانا الیہ راجعون نکلا، یہ کلمہ صدیقہ کے کان میں پڑا تو آنکھ کھل گئی اور چہرہ ڈھانپ لیا، حضرت صفوان نے اپنا اونٹ قریب لا کر بٹھا دیا، حضرت صدیقہ اس پر سوار ہوگئیں اور خود اونٹ کی نکیل پکڑ کر پیادہ پا چلنے لگے یہاں تک کہ قافلہ میں مل گئے۔

عبداللہ بن ابی بڑا خبیث منافق، رسول اللہ ﷺ کا دشمن تھا، اس کو ایک بات ہاتھ لگ گئی اور کم بخت نے واہی تباہی بکنا شروع کیا اور بعض بھولے بھالے مسلمان بھی سنی سنائی اس کا تذکرہ کرنے لگے، جیسے حضرت حسان وحضرت مسطح مردوں میں سے اور حضرت حمنہ عورتوں میں سے، تفسیر در منثور میں بحوالہ ابن مردویہ حضرت ابن عباس کا یہی قول نقل کیا ہے کہ: "أعانه أي عبدالله ابن ابی حسان و مسطح و حمنه"، جب اس منافق کے بہتان کا چرچا ہوا تو خود رسول اللہ ﷺ کو اس سے سخت صدمہ پہنچا، صدیقہ عائشہ کو تو انتہائی صدمہ پہنچنا ظاہر ہی ہے، عام مسلمانوں کو بھی اس سے سخت رنج وافسوس ہوا، ایک مہینہ تک یہی قصہ چلتا رہا، آخر اللہ تعالیٰ نے حضرت صدیقہ کی برات اور بہتان باندھنے یا اس میں شریک ہونے والوں کی مذمت میں مذکورہ بالا آیات نازل فرمادیں جن کی تفسیر آگے آتی ہے، قرآنی ضابطہ کے مطابق جس کا ذکر ابھی حد قذف کے تحت میں آچکا ہے تہمت لگانے والوں سے شہادت کا مطالبہ کیا گیا، وہ تو ایک بالکل ہی بے بنیاد خبر تھی گواہ کہاں سے آتے، نتیجہ یہ ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے تہمت لگانے والوں پر شرعی ضابطہ کے مطابق حد قذف جاری کی، ہر ایک کو اسی اسی کوڑے لگائے، بزار اور ابن مردویہ نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ اس وقت رسول اللہ ﷺ نے تین مسلمانوں پر حد قذف جاری فرمائی۔ مسطح، حمنہ، حسان اور طبرانی نے حضرت عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر عبداللہ بن ابی منافق جس نے اصل تہمت گھڑی تھی اس پر دوہری حد جاری فرمائی، پھر مومنین نے توبہ کرلی اور منافقین اپنے حال پر قائم رہے۔

**عُصۡبَةٌ مِّنۡكُمۡ**: ان سب کو قرآن نے منکم میں داخل کیا، یعنی مسلمانوں میں، حالانکہ عبداللہ ابن اُبی تو منافق تھا، اس کی وجہ منافقین کا ظاہری دعویٰ اسلام تھا، ان پر بھی ظاہری احکام مؤمنین کے جاری ہوتے تھے، اس لیے منکم کے لفظ میں اس کو بھی شامل کرلیا گیا، مسلمانوں میں سے دو مرد اور ایک عورت اس میں مبتلا ہوئے جن پر رسول اللہ ﷺ نے آیات نازل ہونے کے بعد حد قذف جاری فرمائی، مؤمنین سب تائب ہوگئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔

**لَا تَحۡسَبُوۡهُ شَرًّا لَّكُمۡ بَلۡ هُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ**: روح المعانی میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ داعیان حق ومشائخ کو اس بات پر غمگین نہیں ہونا چاہیے کہ مخالفین ان کو برا بھلا کہتے ہیں اور بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بلکہ اس سے تو مزید ترقی ہوتی ہے، چنانچہ اس کو نظر انداز کرکے اپنے وعظ ونصیحت میں لگا رہے، کیونکہ اس میں اس کے لیے خیر ہے کہ صبر کرنے کا ثواب، بلندی درجات اور عام لوگوں کا ان مفسدین سے متنفر ہونا وغیرہ، تو نقصان ان چرچا کرنے والے مفسدین کا ہوا نہ کہ اہل اللہ کا۔

* * *

**فائدہ: لِ اِنَّ الَّذِيۡنَ جَآءُوۡ بِالۡاِفۡكِ**: یہاں سے اس طوفان کا ذکر ہے جو حضرت عائشہ صدیقہؓ پر اٹھایا گیا تھا، واقعہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ ٦ھ میں غزوہ بنی المصطلق سے واپس مدینہ تشریف لا رہے تھے، حضرت عائشہ صدیقہؓ بھی ہمراہ تھیں، ان کی سواری کا اونٹ علیحدہ تھا، وہ ہودہ میں پردہ چھوڑ کر بیٹھ جاتیں، حمال ہودے کو اونٹ پر باندھ دیتے، ایک منزل پر قافلہ ٹھہرا ہوا تھا، کوچ سے ذرا پہلے حضرت عائشہؓ کو قضاء حاجت کی ضرورت پیش آئی، جس کیلئے قافلہ سے علیحدہ ہو کر جنگل کی طرف تشریف لے گئیں، وہاں اتفاق سے انکا ہار ٹوٹ کر گر گیا، اسکی تلاش میں دیر لگ گئی، یہاں

پیچھے کوچ ہوگیا، حمال حسب عادت اونٹ پر ہودہ باندھنے آئے، اور اسکے پردے پڑے رہنے سے گمان کیا کہ حضرت عائشہؓ اس میں تشریف رکھتی ہیں، اٹھاتے وقت بھی شبہ نہ ہوا، کیونکہ ان کی عمر تھوڑی تھی اور بدن بہت ہلکا پھلکا تھا، غرض حمالوں نے ہودہ باندھ کر اونٹ کو چلتا کر دیا، حضرت عائشہؓ واپس آئیں تو وہاں کوئی نہ تھا، نہایت استقلال سے انہوں نے یہ رائے قائم کی کہ یہاں سے اب جانا خلاف مصلحت ہے، جب آگے جا کر میں نہ ملوں گی تو یہیں تلاش کرنے آئیں گے، آخر وہیں قیام کیا، رات کا وقت تھا، نیند کا غلبہ ہوا وہیں لیٹ گئیں حضرت صفوان بن معطلؓ گرے پڑے کی خبر گیری کی غرض سے قافلہ کے پیچھے کچھ فاصلہ سے رہا کرتے تھے، وہ اس موقع پر صبح کے وقت پہنچے، دیکھا کوئی آدمی پڑا سوتا ہے، قریب آکر پہچانا کہ حضرت عائشہؓ ہیں (کیونکہ پردہ کا حکم آنے سے پہلے انہوں نے ان کو دیکھا تھا) دیکھ کر گھبرا گئے اور اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْن پڑھا، جس سے ان کی آنکھ کھل گئی فوراً چہرہ چادر سے ڈھانک لیا، حضرت صفوان نے اونٹ ان کے قریب لا کر بٹھلا دیا، یہ اس پر پردہ کے ساتھ سوار ہوگئیں، انہوں نے اونٹ کی نکیل پکڑ کر دوپہر کے وقت قافلہ سے جا ملایا۔

عبداللہ بن ابی بڑا خبیث، بدباطن، اور دشمن رسول اللہ ﷺ کا تھا، اسے ایک بات ہاتھ لگ گئی اور بدبخت نے واہی تباہی بکنا شروع کیا، اور بعض بھولے بھالے مسلمان بھی (مثلاً مردوں میں سے حضرت حسان، حضرت مسطح، اور عورتوں میں سے حضرت حمنہ بنت جحش) منافقین کے مغویان پراپیگنڈا سے متاثر ہو کر اس قسم کے افسوس ناک تذکرے کرنے لگے، عموماً مسلمانوں کو اور خود جناب رسول کریم ﷺ کو اس قسم کے واہیات تذکروں اور شہرتوں سے سخت صدمہ تھا، ایک مہینہ تک یہ ہی چرچا رہا، حضور ﷺ سنتے اور بغیر تحقیق کچھ نہ کہتے، مگر دل میں خفا رہتے، ایک ماہ بعد ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کو اس شہرت کی اطلاع ہوئی شدت غم سے بیتاب ہوگئیں اور بیمار پڑ گئیں، شب و روز روتی تھیں، ایک منٹ کے لیے آنسو نہ تھمتے تھے، اسی دوران میں بہت سے واقعات پیش آئے اور گفتگوئیں ہوئیں جو صحیح بخاری وغیرہ میں مذکور ہیں اور پڑھنے کے قابل ہیں، آخر حضرت صدیقہ کی برأت میں خود حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں سورہ نور کی یہ آیتیں: اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ الخ سے دور تک نازل فرمائیں جس پر عائشہ صدیقہ فخر کیا کرتی تھیں اور بلاشبہ جتنا فخر کریں تھوڑا تھا۔

**فائدہ: ۲ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ :** یعنی طوفان اٹھانے والے خیر سے وہ لوگ ہیں جو جھوٹ یا سچ اسلام کا نام لیتے اور اپنے کو مسلمان بتلاتے ہیں، ان میں سے چند آدمیوں نے مل کر یہ سازش کی اور کچھ لوگ نادانستہ ان کی عیارانہ سازش کا شکار ہوگئے، تاہم خدا کا احسان ہے کہ جمہور مسلمان انکے جال میں نہیں پھنسے۔

**فائدہ: ۳ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ :** یہ خطاب ان مسلمانوں کی تسلی کے لیے ہے، جنہیں اس واقعہ سے صدمہ پہنچا تھا بالخصوص عائشہ صدیقہؓ اور ان کے گھرانا کہ ظاہر ہے وہ سخت غمزدہ اور پریشان تھے، یعنی گو بظاہر یہ چرچا بہت مکروہ، رنجیدہ اور ناخوشگوار تھا، لیکن فی الحقیقت تمہارے لیے اس کی تہ میں بڑی بہتری چھپی ہوئی تھی، آخر اتنی مدت تک ایسے جگر خراش حملوں اور ایذاؤں پر صبر کرنا کیا خالی جا سکتا ہے، کیا یہ شرف تھوڑا ہے کہ خود حق تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں تمہاری نزاہت و برأت اتاری، اور دشمنوں کو رسوا کیا اور قیامت تک کے لیے تمہارا ذکر خیر قرآن پڑھنے والوں کی زبان پر جاری کر دیا، اور مسلمانوں کو پیغمبر ﷺ کی ازواج و اہل بیت کا حق پہچاننے کے لیے ایسا سبق دیا جو کبھی فراموش نہ ہو سکے، فَلِلّٰه الحمد علی ذلک۔

**فائدہ: ۴ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ :** یعنی جس شخص نے اس فتنہ میں جس قدر حصہ لیا اسی قدر گناہ سمیٹا اور سزا کا مستحق ہوا، مثلاً بعض خوش ہو کر اور خوب مزے لے کر ان واہیات باتوں کا تذکرہ کرتے تھے، بعض اظہار افسوس کے طرز میں، بعض چھیڑ کر مجلس میں چرچا اٹھا دیتے آپ ﷺ خود چپکے سنا کرتے، بعض سن کر تردد میں پڑ جاتے، بہت سے خاموش رہتے اور بہت سے سن کر جھٹلا دیتے، ان پچھلوں کو پسند فرمایا اور سب کو درجہ بدرجہ کم و بیش الزام دیا، اور بڑا بوجھ اٹھانے والا منافقوں کا سردار عبداللہ بن ابی تھا جیسا کہ روایات کثیرہ میں تصریح ہے، یہ ہی خبیث لوگوں کو جمع کرتا اور ابھارتا اور نہایت چالاکی سے خود دامن بچا کر دوسروں سے اس کی اشاعت کرایا کرتا تھا، اس کے لیے آخرت میں بڑا عذاب تو ہے ہی، دنیا میں بھی ملعون خوب ذلیل و رسوا ہوا اور قیامت تک اسی ذلت و خواری سے یاد کیا جائے گا۔

لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۲﴾

کیوں نہ جب تم نے اسکو سنا تھا خیال کیا ہوتا ایمان والے مردوں پر اور ایمان والی عورتوں نے اپنے لوگوں پر بھلا خیال، اور کہا ہوتا یہ صریح طوفان ہے

**خلاصہ تفسیر**: (گذشتہ آیت میں غمگین ورنجیدہ دلوں کے نقصان کی نفی اور بہتان باندھنے والوں کے ضرر کا اثبات تھا، اب تہمت لگانے والوں میں جو مومنین تھے ان کو ناصحانہ ملامت ہے کہ) جب تم لوگوں نے یہ بات سنی تھی تو مسلمان مردوں (نے جن میں حسان و مسطح بھی آ گئے) اور مسلمان عورتوں نے (جن میں حمنہ بھی آ گئیں) اپنے آپس والوں کے ساتھ (یعنی حضرت عائشہ صدیقہ اور ان صحابی کے ساتھ دل سے) گمان نیک کیوں نہ کیا اور (زبان سے) یہ کیوں نہ کہا کہ یہ صریح جھوٹ ہے (جیسا کہ حضرت ابوایوبؓ اور ان کی بیوی کا یہی قول مروی ہے، اس میں بہتان باندھنے والوں کے ساتھ وہ بھی شامل ہیں جو سن کر خاموش رہے یا شک میں پڑ گئے ان سب پر بھی ملامت ہے جن میں عام مومنین و مومنات بھی داخل ہو گئے)۔

**لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ**: اس میں اس بات کی صراحۃً تاکید ہے کہ خبروں میں سخت احتیاط وتحقیق سے کام لینا چاہیے، اور یہ اہل اللہ کی لازمی عادت ہے کہ بعید سے بعید احتمال پر بھی حسن ظن سے کام لیتے ہیں۔

**بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا**: بِاَنْفُسِهِمْ کے لفظ سے قرآن کریم نے یہ اشارہ کیا کہ جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو بدنام و رسوا کرتا ہے وہ درحقیقت اپنے آپ ہی کو رسوا کرتا ہے، کیونکہ اسلام کے رشتہ نے سب کو ایک بنا دیا ہے، قرآن کریم نے ایسے تمام مواقع میں یہ اشارہ استعمال فرمایا ہے، جیسا ایک جگہ فرمایا: **وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ** یعنی عیب نہ لگاؤ اپنے آپ کو، مراد اس سے یہ ہے کہ کسی بھائی مسلمان مرد یا عورت کو، دوسری جگہ فرمایا: **وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ**، یعنی اپنے آپ کو قتل نہ کرو، مراد وہی ہے کہ کسی بھائی مسلمان کو قتل نہ کرو، تیسری جگہ فرمایا: **وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ**، یعنی نہ نکالو اپنے آپ کو اپنے گھروں سے، یہاں بھی کسی مسلمان بھائی کو اس کے گھر سے نکالنا مراد ہے، چوتھی جگہ فرمایا: **فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ**، یعنی اپنے آپ کو سلام کرو، مراد وہی بھائی مسلمان کو سلام کرنا ہے، یہ سب آیات قرآن یہ ضمنی ہدایت دیتی ہیں کہ ایک مسلمان جو دوسرے کسی بھی مسلمان پر عیب لگاتا یا اس کو ایذا و نقصان پہنچاتا ہے حقیقت کے اعتبار سے خود اپنے کو عیب دار کرتا ہے اور خود نقصان و تکلیف اٹھاتا ہے، کیونکہ اس کا انجام پوری قوم کی رسوائی اور بدنامی ہوتی ہے۔

**وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ**: اس میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ تقاضا ایمان کا یہ تھا کہ مسلمان اس خبر کو سنتے ہی کہہ دیتے کہ یہ کھلا جھوٹ ہے، اس سے ثابت ہوا کہ کسی مسلمان کے بارے میں جب تک کسی گناہ یا عیب کا علم کسی دلیل شرعی سے نہ ہو جائے اس وقت تک اس کے ساتھ نیک گمان رکھنا اور بلا کسی دلیل کے عیب و گناہ کی بات اس کی طرف منسوب کرنے کو جھوٹ قرار دینا عین تقاضائے ایمان ہے۔

* * *

**فائدہ**: مسلمان کو چاہیے کہ اپنے مسلمان بھائی بہنوں کے ساتھ حسن ظن رکھے، اور جب سنے کہ لوگ ایک نیک شخص پر یوں ہی رجماً بالغیب بری تہمتیں لگاتے ہیں تو اپنے دل میں ایسے خیالات کو راہ نہ دے بلکہ ان کو جھٹلائے، پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی پیٹھ پیچھے بھائی مسلمان کی مدد کرے، اللہ پیٹھ پیچھے اس کی مدد کرے گا، بے تحقیق تہمتیں تراشنا ایمان سے بعید ہے، چاہیے کہ آدمی خود اپنی آبرو پر دوسروں کی آبرو کو قیاس کرلے، جیسا کہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ وغیرہ نے قصہ ''افک'' میں کیا، ایک روز ان کی بیوی نے کہا کہ لوگ عائشہ صدیقہ کی نسبت ایسا کہتے ہیں، انہوں نے فرمایا کہ جھوٹے ہیں، کیا ایسا کام تو کرسکتی ہے؟ بولی ہرگز نہیں! فرمایا پھر (صدیق کی بیٹی اور نبی ﷺ کی بیوی) عائشہ صدیقہ تجھ سے کہیں بڑھ کر پاک وصاف اور طاہر ومطہر ہیں، ان کی نسبت بے وجہ ایسا گمان کیوں کیا جائے۔

لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ

کیوں نہ لائے وہ اس بات پر چار شاہد، پھر جب نہ لائے شاہد

فَأُولَٰٓئِكَ عِندَ ٱللَّهِ هُمُ ٱلۡكَٰذِبُونَ ﴿١٣﴾

تو وہ لوگ اللہ کے یہاں وہی ہیں جھوٹے

**خلاصہ تفسیر:** (اب اس تہمت کو رد کرنے اور حسن ظن یعنی نیک گمان رکھنے کے واجب اور ضروری ہونے کی وجہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:) یہ (بہتان لگانے والے) لوگ اس (اپنے قول) پر چار گواہ کیوں نہ لائے (جو کہ زنا ثابت کرنے کے لئے شرط ہے) سو جس حالت میں یہ لوگ گواہ (قاعدہ کے موافق) نہیں لائے تو بس اللہ کے نزدیک (جو قانون ہے اس کے اعتبار سے) یہ جھوٹے ہیں۔

**فَإِذۡ لَمۡ يَأۡتُواْ بِٱلشُّهَدَآءِ:** کیونکہ اصلی حالت تو ہر مسلمان کی یہی ہے کہ وہ زنا سے پاک ہوتا ہے تو جب تک کوئی یقینی دلیل اس کے خلاف نہ ہو تو اسی پاکی وعفت کا یقین رکھنا شرعاً واجب ہے، کیونکہ شرعی قاعدہ ہے: "لأن اليقين لا يزول إلا بيقين مثله، لا بالشك" یعنی یقین کو اسی جیسے یقین کے ذریعے ہی زائل کیا جا سکتا ہے نہ کہ شک اور گمان کے ذریعے، اس تقریر سے یہ شبہ جاتا رہا کہ چار گواہ نہ لانے سے تہمت لگانے والے کا جھوٹا ہونا اور جس پر تہمت لگائی گئی ہے اس کا یقینا منزہ ہونا کیونکر لازم آ گیا؟ جواب یہ ہے کہ شرعی قانون سے لازم آ گیا اگرچہ واقع میں کچھ ہی ہو اس کی کسی کو کیا خبر ہے، تو جب تک شرعی ثبوت نہ اس وقت تک مسلمان کی براءت کا یقین ہی واجب ہے، اس بنا پر حضرت عائشہ صدیقہؓ کی براءت و پاکیزگی کا یقین ہے اور تہمت کے مقابلہ میں اس یقین کا اعلان و اظہار واجب تھا۔

جاننا چاہیے کہ یقین کے دو معنی ہیں: ① ایک یقین شرعی جس کے لیے اتنا کافی ہے کہ اس کے خلاف پر کوئی دلیل نہ ہو ② ایک یقین اصطلاحی جس کے لیے جانب مخالف کے غلط ہونے پر دلیل قائم ہونے کی ضرورت ہے، یقین شرعی کے ساتھ تردد اور وہم جمع ہو سکتا ہے، اور یقین اصطلاحی میں احتمال کی اصلاً گنجائش نہیں ہوتی، اس تہمت کے واقعہ میں آیات کے نازل ہونے سے پہلے بھی چونکہ اس تہمت پر کوئی دلیل نہ تھی اس وقت براءت و پاکیزگی کا یقین شرعی واجب تھا جس کو اللہ تعالی نے حسن ظن سے تعبیر فرمایا ہے، اور یہی وہ یقین ہے جس کا بندوں کو اس قسم کے امور میں مکلف بنایا گیا ہے، البتہ آیات کے نازل ہونے کے بعد چونکہ اس تہمت کے غلط ہونے قطعی دلیل بھی قائم ہو گئی اس وقت یقین اصطلاحی کا بھی مکلف بنایا گیا، پس اب احتمال مرجوح یعنی وہم بھی کفر ہے، اس سے ثابت ہوا کہ ہر مسلمان مرد و عورت کے ساتھ اچھا گمان رکھنا واجب ہے جب تک کسی دلیل شرعی سے اس کے خلاف ثابت نہ ہو جائے اور جو شخص شرعی دلیل کے بغیر الزام لگاتا ہے اس کی بات کو رد کرنا اور جھوٹا قرار دینا بھی واجب ہے، کیونکہ وہ محض ایک غیبت اور مسلمان کو بلا وجہ رسوا کرنا ہے۔

مذکورہ دونوں آیتوں میں ہر مسلمان کو دوسرے مسلمانوں سے حسن ظن رکھنے کی ہدایت اور اس کے خلاف بے دلیل باتوں کی تردید کو واجب قرار دیا ہے، اس پر کسی کو یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ پھر رسول اللہ ﷺ نے پہلے ہی سے اس خبر کے غلط ہونے پر یقین کیوں نہ فرمایا؟ اور اس خبر کی تردید کیوں نہ کردی؟ اور ایک مہینہ تک تردد کی حالت میں کیوں رہے؟ یہاں تک کہ حضرت صدیقہ عائشہؓ سے فرمایا کہ اگر تم سے کوئی لغزش ہو گئی ہو تو توبہ کر لینا چاہئے، اور آیت سے براءت کا یقین واجب ہونا معلوم ہوتا ہے، پھر تردد میں لازم آتا ہے کہ نبی معصوم نے واجب کو ترک کیا؟ سو جواب ظاہر ہے کہ یہ تردد یقین شرعی کے منافی نہیں، یعنی یہاں ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان پر حسن ظن رکھنے کا جو حکم ہے وہ اس تردد کے منافی نہیں جو آنحضرت ﷺ کو پیش آیا، کیونکہ آپ نے اس خبر کی نہ تصدیق فرمائی اور نہ اس کے مقتضی پر کوئی عمل فرمایا نہ اس کا چرچا کرنا پسند فرمایا، بلکہ صحابہ کرام کے مجمع میں یقین کو آپ نے ان الفاظ سے ظاہر فرمایا کہ "ما علمت على أهلي إلا خيرا" یعنی میں اپنی اہلیہ کے بارے میں بھلائی اور نیکی کے سوا کچھ نہیں جانتا، البتہ تردد ہونا یقین اصطلاحی کے منافی ہے، یہ سب انہیں آیات مذکورہ کے مقتضی پر عمل اور حسن ظن رکھنے کے شواہد ہیں، البتہ قطعی اور یقینی علم جس سے طبعی تردد بھی رفع ہو جائے وہ اس وقت ہوا جب آیات براءت نازل ہو گئیں، اس واقعہ میں تو تہمت لگانے والے واقع میں بھی جھوٹے تھے اور نہ کوئی معائنہ کا مدعی تھا، اور اگر کسی جگہ کوئی شخص معائنہ کر لے اور گواہ نہ لا سکے تو اس کا عند اللہ جھوٹا ہونا اس معنی کر ہے کہ اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جو جھوٹے کے ساتھ کیا جاتا

ہے، یعنی اس پر حد قذف جاری کرنے کا حکم ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دل میں کوئی شک وتردد پیدا ہو جانا اور احتیاطی تدابیر استعمال کرنا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حسن ظن کے منافی نہیں تھا جبکہ اس کے مقتضی پر کوئی عمل نہ کیا گیا ہو، جن مسلمانوں پر اس معاملے میں حد قذف کی سزا جاری کی گئی اور ان دو آیتوں میں ان پر عتاب کیا گیا انہوں نے اس خبر کے مقتضی پر عمل کیا تھا کہ اس کا چرچا کیا اور پھیلایا وہ نزول آیات سے پہلے بھی ناجائز وموجب سزا تھا۔

**فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ**: یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ ایسا ہونا کچھ بعید نہیں کہ ایک شخص نے اپنی آنکھ سے ایک واقعہ دیکھا مگر اس کو اس پر دوسرے گواہ نہیں ملے تو اگر یہ شخص اپنے چشم دید واقعہ کو بیان کرتا ہے تو اس کو جھوٹا کیسے کہا جا سکتا ہے؟ خصوصاً اللہ کے نزدیک جھوٹا کہنا تو کسی طرح سمجھ ہی میں نہیں آتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو تو سب واقعات کے حقائق معلوم ہیں، اور یہ واقعہ وجود میں آنا بھی معلوم ہے تو وہ عند اللہ جھوٹ بولنے والا کیسے قرار پایا؟ اس کے دو جواب ہیں: ① اول یہ کہ یہاں عند اللہ سے مراد حکم اللہ اور قانون الٰہی ہے، یعنی یہ شخص قانون الٰہی اور حکم خداوندی کی رو سے جھوٹا قرار دیا جائے گا اور اس پر حد قذف جاری کی جائے گی، کیونکہ حکم ربانی یہ تھا کہ جب چار گواہ نہ ہوں تو واقعہ دیکھنے کے باوجود اس کو بیان نہ کرو اور جو بغیر چار گواہوں کے بیان کرے گا وہ قانوناً اور حکماً جھوٹا قرار پا کر سزا پائے گا۔

② دوسرا جواب یہ ہے کہ مسلمان کی شان یہ ہے کہ کوئی کام فضول نہ کرے جس کا کوئی فائدہ نتیجہ نہ ہو، خصوصاً ایسا کام جس میں دوسرے مسلمان پر کوئی الزام عائد ہوتا ہو تو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کے خلاف کسی عیب وگناہ کی شہادت صرف اس نیت سے دے سکتا ہے کہ جرم وگناہ کا انسداد مقصود ہو، کسی کو رسوا کرنا یا ایذا دینا مقصود نہ ہو تو جس شخص نے چار گواہوں کے بغیر اس قسم کی شہادت زبان سے نکالی گویا اس کا دعویٰ یہ ہے کہ میں یہ کلام اصلاح خلق اور معاشرہ کو برائی سے بچانے اور انسداد جرائم کی نیت سے کر رہا ہوں مگر جب شریعت کا قانون اس کو معلوم ہے کہ بغیر چار گواہوں کے ایسی شہادت دینے سے نہ اس شخص پر کوئی حد وسزا جاری ہوگی اور نہ ثبوت بہم پہنچے گا، بلکہ الٹی جھوٹ بولنے کی سزا کا میں مستحق ہو جاؤں گا تو اس وقت وہ عند اللہ اپنی اس نیت کے دعویٰ میں جھوٹا ہے کہ میں اصلاح خلق اور انسداد جرائم کی نیت سے یہ شہادت دے رہا ہوں، کیونکہ شرعی ضابطہ کے مطابق شہادت نہ ہونے کی صورت میں یہ نیت ہو ہی نہیں سکتی۔

* * *

**فائدہ:** یعنی اللہ کے حکم اور اس کی شریعت کے موافق وہ لوگ جھوٹے قرار دیے گئے ہیں جو کسی پر بدکاری کی تہمت لگا کر چار گواہ پیش نہ کر سکیں اور بدون کافی ثبوت کے ایسی سنگین بات زبان سے بکتے پھریں۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ

اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اس کی رحمت دنیا اور آخرت میں تو تم پر پڑتی اس چرچا کرنے میں

عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١٤﴾

کوئی آفت بڑی

**خلاصہ تفسیر:** (آگے اس تہمت میں شریک ہونے والے مسلمانوں کے ساتھ اپنی رحمت بیان فرماتے ہیں) اور اگر (اے حسان و مسطح وحمنہ!) تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم نہ ہوتا دنیا میں (بھی کہ توبہ کی مہلت دی) اور آخرت میں (بھی کہ توبہ کی توفیق دی اور اس کو قبول بھی کر لیا اگر یہ نہ ہوتا) تو جس شغل میں تم پڑے تھے اس میں تم پر سخت عذاب واقع ہوتا (جیسا عبداللہ بن ابی کو توبہ نہ کرنے کی وجہ سے عذاب ہوگا اگرچہ اس وقت مہلت دنیا میں اس کو بھی دے دی گئی ہے مگر مجموعہ دارین میں رحمت نہیں ہے، اس سے معلوم ہو گیا کہ صحابہ مقبول التوبہ اور پاک ہو کر آخرت میں مرحوم ہیں)۔

**وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ**: یہاں علیکم میں خطاب مومنین کو ہونے کے چند قرینے ہیں: ① اولاً اوپر کی آیت میں یہ ارشاد ہے: ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ ② ثانیاً یہاں فِي الْاٰخِرَةِ فرمانا کیونکہ منافق تو آخرت میں جہنم کے درک اسفل یعنی نچلے طبقہ کا مستحق ہے وہ یقیناً مرحوم فی الاخرہ نہیں ہوسکتا ③ ثالثاً آگے یَعِظُكُمْ اور اس کے بعد وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ میں طبرانی نے ابن عباسؓ کا قول نقل کیا: "یر ید مسطحا و حمنة و حسانا" یعنی وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ کے مخاطب صرف تین مومن ہیں، یعنی مسطح، حمنہ اور حسان، اور یہاں آیات میں مضارع مخاطب کا صیغہ بھی اسی قرینہ کی تائید کرتا ہے، کیونکہ مسلمان ہی اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کے ساتھ تکلم وتخاطب کیا جائے اور انہی پر توجہ وعنایت فرمائی جائے اس سے مراد یہ صیغے ہیں: تلقّونه، وتقولون، وتحبّون، بخلاف منافقین کے کہ ان کا ذکر غائب کے صیغہ سے ہوا ہے اور وہ اسی کے مستحق تھے، مثلا: والذی تولی کبرہ، ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشة الخ۔

* * *

**فائدہ:** یعنی اللہ تعالیٰ نے اس امت کو پیغمبر کے طفیل دنیا کے عذابوں سے بچایا ہے، نہیں تو یہ بات قابل تھی عذاب کے، (موضح القرآن) نیز تم میں سے مخلصین کو توبہ کی توفیق دے کر خطا معاف کر دی ورنہ منافقین کی طرح وہ بھی قیامت کے دن عذاب عظیم میں گرفتار ہوتے، (العیاذ باللہ)

اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۖ

جب لینے لگے تم اس کو اپنی زبانوں پر اور بولنے لگے اپنے منہ سے جس چیز کی تم کو خبر نہیں اور تم سمجھتے ہو اس کو ہلکی بات

وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ⑮

اور یہ اللہ کے یہاں بہت بڑی ہے

**خلاصہ تفسیر:** (اب اس کا بیان ہے کہ مومنین پر اگر اللہ کا خاص فضل نہ ہوتا کہ ان کو توبہ کی توفیق دی اور توبہ بھی قبول کر لی تو جو کام تم نے کیا تھا اس کی وجہ سے تم عذاب عظیم کے مستحق اس وقت ہو جاتے) جبکہ تم اس (جھوٹ بات) کو اپنی زبان سے نقل در نقل کر رہے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات کہہ رہے تھے جس کی تم کو (کسی دلیل سے) مطلق خبر نہیں (اور ایسی خبر کے ناقل کا جھوٹا ہونا فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ میں بیان ہو چکا ہے) اور تم اس کو ہلکی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بھاری بات (یعنی گناہ عظیم کا سبب) تھی (اول تو کسی پاکدامن عورت پر زنا کی تہمت خود بڑی معصیت ہے، پھر وہ بھی کون، ازواج مطہرات میں سے کہ ان پر تہمت لگانا جناب رسول مقبول ﷺ کی ایذاء کا سبب بنا، پس اس میں بہت سے معصیت کے اسباب جمع تھے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی عذاب عظیم کے مستحق کیوں نہ ہوتے جبکہ تم ایسی بے تحقیق اور ظاہر البطلان بات کو ایک دوسرے کی طرف چلتا کر رہے تھے، اور زبان سے وہ انکل پچو باتیں نکالتے تھے جن کی واقعیت کی تمہیں کچھ خبر نہ تھی، پھر طرفہ یہ ہے کہ ایسی سخت بات کو (یعنی کسی محصنہ خصوصاً پیغمبر ﷺ کی زوجہ مطہرہ اور مومنین کی روحانی والدہ کو متہم کرنا) جو اللہ کے نزدیک بہت بڑا سنگین جرم ہے محض ایک ہلکی اور معمولی بات سمجھنا، یہ اصل جرم سے بھی بڑھ کر جرم تھا۔

وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ⑯

اور کیوں نہ جب تم نے اس کو سنا تھا کہا ہوتا ہم کو نہیں لائق کہ منہ پر لائیں یہ بات، اللہ تو پاک ہے یہ تو بڑا بہتان ہے

**خلاصہ تفسیر:** اور تم نے جب اس (بات) کو (اول) سنا تھا تو یوں کیوں نہ کہا کہ ہم کو زیبا نہیں کہ ایسی بات منہ سے بھی نکالیں، معاذ اللہ! یہ تو بڑا بہتان ہے (جیسا کہ بعض صحابہ نے اسی طرح کہا تھا، جیسا کہ سعد بن معاذؓ، زید بن حارثہؓ اور ابی ایوبؓ سے اسی طرح کا قول منقول

ہے، دیگر کی نفی نہیں ہے، ممکن ہے اور بہت سوں نے بھی کہا ہو، مطلب یہ کہ قاذفین یعنی تہمت لگانے والوں اور ساکتین یعنی خاموش رہنے والوں سب کو یہی کہنا چاہئے تھا)۔

**سُبۡحٰنَكَ هٰذَا بُهۡتَانٌ عَظِيۡمٌ** : اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ جیسے کسی واقعہ کا سچا ہونا بغیر دلیل کے معلوم نہیں ہوتا، اس لئے اس کا زبان سے نکالنا اور چرچا کرنا ناجائز قرار پایا، اسی طرح کسی کلام کا جھوٹا ہونا بھی تو بغیر دلیل کے ثابت نہیں ہوتا کہ اس کو بہتان عظیم کہہ دیا جائے، جواب یہ ہے کہ ہر مسلمان کو گناہوں سے پاک صاف سمجھنا اصل شرعی ہے جو دلیل سے ثابت ہے، اس کے خلاف جو بات بغیر دلیل کے کہی جائے اس کو جھوٹا سمجھنے کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں، صرف اتنا کافی ہے کہ ایک مومن مسلمان پر بغیر کسی دلیل شرعی کے الزام لگایا گیا ہے، لہٰذا یہ بہتان ہے، مزید تفصیل پیچھے آیت ۱۳ کے تحت گذر چکی ہے۔

**وَلَوۡلَاۤ اِذۡ سَمِعۡتُمُوۡهُ قُلۡتُمۡ مَّا يَكُوۡنُ لَنَاۤ** : چونکہ اس قصہ میں تہمت کے گناہ کے علاوہ خاص یہ بات بھی تھی کہ حضور ﷺ کی اہلیہ محترمہ سے تعرض تھا اور زیادہ انکار کا سبب یہی ہے، تو اس بنا پر یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ شیخ اور استاذ کے اہل وعیال کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ ادب واحترام سے پیش آنا چاہیے، انہیں ایذاء پہنچانا دوسروں کی ایذا سے زیادہ قبیح اور برا ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی اول تو حسن ظن کا اقتضاء یہ تھا کہ دل میں بھی یہ خیال نہ گزرنے پائے، جیسا کہ اوپر ارشاد ہوا، لیکن اگر شیطانی اغواء سے فرض کیجئے کسی کے دل میں کوئی برا وسوسہ گزرے تو پھر یہ جائز نہیں کہ ایسی ناپاک بات زبان پر لائی جائے، چاہیے کہ اس وقت مومن اپنی حیثیت اور دیانت کو ملحوظ رکھے اور صاف کہہ دے کہ ایسی بے سروپا بات کا زبان سے نکالنا مجھ کو زیب نہیں دیتا، اے اللہ تو پاک ہے، کسی طرح لوگ ایسی نامعقول بات منہ سے نکالتے ہیں، بھلا جس پاکباز خاتون کو تو نے سید الانبیاء اور راس المتقین کی زوجیت کے لیے چنا، کیا وہ (معاذ اللہ) خود بے آبرو ہو کر پیغمبر کی آبرو کو بٹہ لگائے گی (حاشا ہا ثم حاشا ہا) ہو نہ ہو دشمنوں نے ایک بے قصور پر بہتان باندھا ہے۔

## يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنۡ تَعُوۡدُوۡا لِمِثۡلِهٖۤ اَبَدًا اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۷﴾

اللہ تم کو سمجھاتا ہے کہ پھر نہ کرو ایسا کام کبھی اگر تم ایمان رکھتے ہو ۱؎

## وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الۡاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ﴿۱۸﴾

اور کھولتا ہے اللہ تمہارے واسطے پتے کی باتیں، اور اللہ سب جانتا ہے حکمت والا ہے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** یہاں تک تو ماضی پر ملامت تھی، اب مستقبل کیلئے نصیحت ہے جو کہ ملامت کا اصل مقصود ہے، پس ارشاد ہے کہ: اللہ تعالیٰ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ پھر ایسی حرکت مت کرنا اگر تم ایمان والے ہو (کہ ایسی حرکت کرنا ایمان کے خلاف ہے، آگے احکام ونصائح کے نازل کرنے پر اپنا احسان ظاہر فرماتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ تم سے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے (جس میں نصیحت اور حد قذف اور قبول توبہ سب داخل ہیں) اور اللہ تعالیٰ بڑا جاننے والا حکمت والا ہے (تمہارے دل کی ندامت کا حال بھی اس کو معلوم ہے، اس لئے توبہ قبول کر لی، اور سیاست کی حکمت بھی خوب جانتا ہے، اس لئے تمہیں سیاسۃً دنیا میں سزا دی گئی)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی مومنین کو پوری طرح چوکس اور ہوشیار رہنا چاہیے، بدباطن منافقین کے چکموں میں کبھی نہ آئیں، ہمیشہ پیغمبر ﷺ اور آپ ﷺ کے اہل بیت کی عظمت شان کو ملحوظ رکھیں۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی پتہ اس کا کہ یہ طوفان اٹھایا کس نے، معلوم ہوا کہ منافقین نے جو ہمیشہ چھپے دشمن تھے، اگلی آیت میں پتہ بتلا دیا، (کذافی

الموضح) عموماً مفسرین نے آیات سے مراد احکام، نصائح، حدود اور قبول توبہ وغیرہ کے مضامین لیے ہیں، اس وقت صفات علم وحکمت کے ذکر سے یہ غرض ہوگی کہ اللہ تعالیٰ تم میں سے مخلصین کی ندامت قلبی کا حال خوب جانتا ہے، اس لیے توبہ قبول کی اور چونکہ حکیم مطلق ہے اس لیے نہایت حکمت و دانائی کے ساتھ تمہاری سیاست کی گئی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا

جولوگ چاہتے ہیں کہ چرچا ہو بدکاری کا ایمان والوں میں ۱ ان کے لیے عذاب ہے دردناک دنیا

وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ⑲

اور آخرت میں ۲ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ۳

**خلاصہ تفسیر:** یہاں تک ان لوگوں کا ذکر تھا جو براءت نازل ہونے سے پہلے تذکرہ کرتے تھے، آگے ان کا ذکر ہے جو براءت نازل ہونے کے بعد بھی باز نہ آئیں اور ظاہر ہے کہ ایسا شخص بے ایمان ہی ہوگا، پس ارشاد ہے:

جولوگ (ان آیات کے نزول کے بعد بھی) چاہتے ہیں (یعنی اس کی عملی کوشش کرتے ہیں) کہ بے حیائی کی بات کا مسلمانوں میں چرچا ہو (یعنی یہ خبر شائع ہو کہ ان مسلمانوں میں بے حیائی کی یہ بات ہے، حاصل یہ کہ جو لوگ ان مقدس حضرات کی طرف زنا کی نسبت کرتے ہیں) ان کے لئے دنیا و آخرت میں سزائے دردناک (مقرر) ہے (دنیا میں تو حد قذف اور آخرت میں عذاب جہنم) اور (اس بات پر سزا کا تعجب مت کرو، کیونکہ) اللہ تعالیٰ جانتا ہے (کہ کون سی معصیت کس درجہ کی ہے) اور تم (اس کی حقیقت پوری) نہیں جانتے۔

**لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ:** یعنی دنیا میں حد قذف اور آخرت میں جہنم کا عذاب، دنیا میں تو حد قذف جس کے مستحق ایسے لوگ ہمیشہ ہیں، اور کبھی یہ واقع بھی ہو جاتا ہے جبکہ سب شرطیں پائی جائیں، اور کبھی بعض عوارض کی وجہ سے واقع نہیں ہوتا، ان میں سے حنفیہ کے نزدیک یہ صورت بھی ہے کہ حد قذف کے بعد پھر اسی شخص کو پہلے کی تہمت لگادی جائے تو دوبارہ حد نہیں لگتی، اور آخرت میں جہنم کے عذاب کا مستحق ہونا، ان دونوں سزاؤں کا واقع ہونا یقینی ہے، کیونکہ قطعی سے براءت ہو جانے کے بعد اس کے خلاف زبان سے بات نکالنا کفر ہے، اور اگر زبان سے نہ کہے تو صرف اعتقاد پر بھی عذاب آخرت مرتب ہوگا اگرچہ دنیا میں ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے حد سے بچ جائے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی بدکاری پھیلے یا بدکاری کی خبریں پھیلیں، یہ چاہنے والے منافقین تھے، لیکن ان کا تذکرہ کر کے مومنین کو بھی متنبہ فرما دیا کہ اگر فرض کرو کسی کے دل میں ایک بات کا خطرہ گزرا اور بے پروائی سے کوئی لفظ زبان سے بھی کہہ گزرا تو چاہیے کہ اب ایسی مہمل بات کا چرچا کرتا نہ پھرے، اگر خواہی نہ خواہی کسی مومن کی آبروریزی کرے گا تو خوب سمجھ لے کہ اس کی آبرو بھی محفوظ نہ رہے گی، حق تعالیٰ اسے ذلیل و خوار کر کے چھوڑے گا، کما فی حدیث احمد رحمہ اللہ۔

**فائدہ:** ۲ دنیا میں حد قذف، رسوائی اور قسم قسم کی سزائیں اور آخرت میں دوزخ کی سزا۔

**فائدہ:** ۳ یعنی اسے فتنہ پردازوں کو خدا خوب جانتا ہے گو تم نہ جانتے ہو، اور یہ بھی اسی کے علم میں ہے کہ کس کا جرم کتنا ہے اور کس کی کیا غرض ہے۔

**تنبیہ:** حب شیوع فاحشہ، حسد و کینہ وغیرہ کی طرح اعمال قلبیہ میں سے ہے مراتب قصد میں سے نہیں، اس لیے اس پر ماخوذ ہونے میں اختلاف نہ ہونا چاہیے، فتنبّہ لہ۔

ركوع ۸ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۰﴾

اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اس کی رحمت اور یہ کہ اللہ نرمی کرنے والا ہے مہربان تو کیا کچھ نہ ہوتا

**خلاصہ تفسیر:** اب توبہ کرنے والے مؤمنین پر احسان ظاہر فرماتے ہیں کہ وہ اس وعید سے محفوظ رہے، یعنی ان لوگوں کو خطاب ہے جنہوں نے توبہ کر لی اور اس پر آخرت کے عذاب عظیم سے محفوظ ہو گئے۔

اور (اے تائبین!) اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے (جس نے تم کو توبہ کی توفیق دی) اور یہ کہ اللہ بڑا شفیق بڑا رحیم ہے (جس نے تمہاری توبہ قبول کر لی) تو تم بھی (اس وعید سے) نہ بچتے۔

**وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ:** اس میں صراحت ہے کہ اصل مدار کار فضل ہے نہ کہ سعی و مجاہدہ (یعنی اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور توفیق نہ ہو تو کوئی نیکی نہ کر سکے اور نہ ہی گناہ سے بچ سکے، یہ محض توفیق الٰہی سے ہوتا ہے اور پھر محنت و کوشش سے آگے بڑھتا رہتا ہے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی یہ طوفان تو ایسا اٹھا تھا کہ نہ معلوم کون کون اس کی نذر ہوتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و رحمت اور شفقت و مہربانی سے تم سے تائبین کی توبہ کو قبول فرمایا اور بعض کو حد شرعی جاری کر کے پاک کیا اور جو زیادہ خبیث تھے ان کو ایک گونہ مہلت دی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ

اے ایمان والو نہ چلو قدموں پر شیطان کے، اور جو کوئی چلے گا قدموں پر شیطان کے سو وہ تو یہی بتلائے گا

بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ

بے حیائی اور بری بات [1] اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اس کی رحمت تو نہ سنورتا تم میں ایک شخص بھی کبھی

وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۱﴾

ولیکن اللہ سنوارتا ہے جس کو چاہے، اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے [2]

**خلاصہ تفسیر:** اب آگے مسلمانوں کو بلا تخصیص یعنی تمام گناہوں سے بچنے کا حکم دیتے ہیں، اور ساتھ ہی اہتمام کے طور پر اپنے فضل و احسان کا اظہار فرماتے ہیں کہ توبہ کے ذریعے تمہارا تزکیہ فرمایا، احسان کا مضمون اہتمام کے لیے مختلف عنوانات سے مکرر لایا گیا۔

اے ایمان والو! تم شیطان کے قدم بقدم مت چلو (یعنی اس کے اغواء و اضلال پر عمل مت کرو) اور جو شخص شیطان کے قدم بقدم چلتا ہے تو وہ (ہمیشہ ہر شخص کو) بے حیائی اور نامعقول ہی کام کرنے کو کہے گا (جیسا کہ اس واقعہ تہمت میں تم نے دیکھ لیا) اور (شیطان کے قدم بقدم چل چکنے اور گناہ سمیٹ لینے کے بعد اس کے وبال اور نقصان سے جو کہ ثابت ہو ہی چکا تھا نجات دے دینا یہ بھی ہمارا ہی فضل تھا، ورنہ) اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی کبھی بھی (توبہ کر کے) پاک صاف نہ ہوتا (یا تو توبہ کی توفیق ہی نہ ہوتی، جیسا منافقین کو نہ ہوئی، اور یا توبہ قبول نہ کی جاتی، کیونکہ ہم پر کوئی چیز واجب تو ہے نہیں) ولیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے (توبہ کی توفیق دے کر) پاک و صاف کر دیتا ہے (اور توبہ کے بعد اپنے فضل سے قبولیت کا وعدہ بھی فرما لیا ہے) اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتا سب کچھ جانتا ہے (پس تمہاری توبہ سن لی اور تمہاری ندامت جان لی، اس لئے فضل فرما دیا)۔

* * *

**فائدہ:** [1] یعنی شیطان کی چالوں سے ہوشیار رہا کرو، مسلمان کا یہ کام نہیں ہونا چاہیے کہ شیاطین الانس والجن کے قدم بقدم چلنے لگے، ان

ملعونوں کا تو مشن ہی یہ ہے کہ لوگوں کو بے حیائی اور برائی کی طرف لے جائیں، تم جان بوجھ کر کیوں ان کے بھرے میں آتے ہو، دیکھو شیطان نے ذرا سا چرکا لگا کر کتنا بڑا طوفان کھڑا کر دیا اور کئی سیدھے سادھے مسلمان کس طرح اس کے قدم پر چل پڑے۔

**فائدہ: ۲** یعنی شیطان تو سب کو بگاڑ کر چھوڑتا ایک کو بھی سیدھے راستہ پر نہ رہنے دیتا، یہ تو خدا کا فضل اور اس کی رحمت ہے کہ وہ اپنے مخلص بندوں کی دستگیری فرما کر بہتیروں کو محفوظ رکھتا ہے اور بعض کو مبتلا ہو جانے کے بعد توبہ کی توفیق دے کر درست کر دیتا ہے، یہ بات اسی خدائے واحد کے اختیار میں ہے اور وہ ہی اپنے علم محیط اور حکمت کاملہ سے جانتا ہے کہ کون بندہ سنوارے جانے کے قابل ہے اور کس کی توبہ قبول ہونی چاہیے، وہ سب کی توبہ وغیرہ کو سنتا اور ان کی قلبی کیفیات سے پوری طرح آگاہ ہے۔

**وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي**

اور قسم نہ کھائیں بڑے درجہ والے تم میں سے، اور کشائش والے اس پر (اس سے) کہ دیں قرابتیوں کو اور محتاجوں کو اور وطن چھوڑنے والوں کو

**سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٢٢﴾**

اللہ کی راہ میں، اور چاہیے کہ معاف کریں اور درگزر کریں، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کرے، اور اللہ بخشنے والا ہے مہربان

**خلاصہ تفسیر:** اب اس کا بیان ہے کہ براءت کی آیات نازل ہونے کے بعد بعض صحابہ نے جن میں ابوبکر صدیق اور دوسرے صحابہ بھی ہیں شدت غیظ میں یہ قسم کھالی کہ جس جس نے یہ چرچا کیا ہے جن میں بعض حاجت مند بھی تھے ان کو آئندہ کسی قسم کی مالی امداد نہ دیں گے، اللہ تعالیٰ ان کی خطا معاف کر دینے اور امداد جاری کر دینے کے لئے ارشاد فرماتے ہیں:

اور جو لوگ تم میں (دینی) بزرگی اور (دنیوی) وسعت والے ہیں وہ اہل قرابت کو اور مساکین کو اور اللہ کی راہ میں ہجرت والوں کو دینے سے قسم نہ کھا بیٹھیں (یعنی اس قسم کے مقتضا پر جمے نہ رہیں بلکہ توڑ ڈالیں، ورنہ قسم تو ہو ہی چکی تھی، یعنی ان صفات کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی امداد کی جائے، بالخصوص وہ جس میں یہ سب باتیں موجود ہوں، جیسے حضرت مسطح کہ وہ حضرت ابوبکر کے نزدیک کے رشتہ دار بھی تھے اور مسکین اور مہاجر بھی، آگے اللہ تعالیٰ مزید ترغیب کے لئے فرماتے ہیں کہ) اور چاہئے کہ یہ معاف کر دیں اور درگزر کریں، کیا تم یہ بات نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے قصور معاف کر دے (سو تم بھی اپنے قصورواروں کو معاف کر دو) بیشک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے (سو تم کو بھی تخلق باخلاق الٰہیہ چاہئے)۔

**وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ:** روح المعانی میں ہے کہ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ بڑوں کے لیے مناسب یہ ہے کہ اگر شاگرد یا مرید سے کچھ غلطی ہو جائے تو اس کو اپنے علمی و روحانی فیوض سے محروم نہیں کرنا چاہیے۔

* * *

**فائدہ:** حضرت عائشہ پر طوفان اٹھانے والوں میں بعض مسلمان بھی نادانی سے شریک ہو گئے، ان میں سے ایک حضرت مسطح تھے جو ایک مفلس مہاجر ہونے کے علاوہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بھانجے یا خالہ زاد بھائی ہوتے ہیں، قصہ ''افک'' سے پہلے حضرت صدیق اکبرؓ ان کی امداد اور خبر گیری کیا کرتے، جب یہ قصہ ختم ہوا اور عائشہ صدیقہؓ کی براءت آسمان سے نازل ہو چکی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی کہ آئندہ مسطح کی امداد نہ کروں گا، شاید بعض دوسرے صحابہ کو بھی ایسی صورت پیش آئی ہو، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، یعنی تم میں سے جن کو اللہ تعالیٰ نے دین کی بزرگی اور دنیا کی وسعت دی ہے انھیں لائق نہیں کہ ایسی قسم کھائیں ان کا ظرف بہت بڑا اور ان کے اخلاق بہت بلند ہونے چاہیں، محتاج رشتہ داروں اور خدا کے لیے وطن چھوڑنے والوں کی اعانت سے دست کش ہو جانا بزرگوں اور بہادروں کا کام نہیں، اگر قسم کھالی ہے تو ایسی قسم کو پورا مت کرو، اس کا کفارہ ادا کر دو، تمہاری شان یہ ہونی چاہیے کہ خطا کاروں کی خطا سے اغماض اور درگزر کرو، ایسا کرو گے تو حق تعالیٰ تمہاری کوتاہیوں سے درگزر کرے گا، کیا تم حق تعالیٰ سے عفو درگزر کی امید اور خواہش نہیں رکھتے؟ اگر رکھتے ہو تو تم کو اس کے بندوں کے معاملہ میں یہی خو اختیار کرنی چاہیے، گویا اس میں ''تخلق بِأَخْلَاقِ اللهِ''

کی تعلیم ہوئی، احادیث میں ہے کہ حضرت ابوبکر نے جب سنا: اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ (النور:۲۲) (کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کرے؟) تو فوراً بول اٹھے: "بَلٰى يَارَبَّنَا اِنَّا نُحِبُّ" (بیشک اے پروردگار! ہم ضرور چاہتے ہیں) یہ کہہ کر مسطح کی جو امداد کرتے تھے بدستور جاری فرما دی، بلکہ بعض روایات میں ہے کہ پہلے سے دگنی کر دی، رضی اللہ عنہ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۠ وَلَهُمْ

جو لوگ عیب لگاتے ہیں حفاظت والیوں (پاکدامنوں) بے خبر ایمان والیوں کو ان کو پھٹکار ہے دنیا میں اور آخرت میں، اور ان کے لیے ہے

عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۳﴾ يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۴﴾

بڑا عذاب[۱] جس دن کہ ظاہر کر دیں گی ان کی زبانیں اور ہاتھ اور پاؤں جو کچھ وہ کرتے تھے[۲]

**خلاصہ تفسیر:** آگے منافقین کی وعید کی تفصیل ہے جس کا پیچھے آیت: اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ الخ میں اجمالاً ذکر تھا یعنی:

جو لوگ (نزول آیات کے بعد بدکاری کی) تہمت لگاتے ہیں ان عورتوں کو جو پاکدامن ہیں (اور) ایسی باتوں (کے کرنے اور اس کے ارادے) سے (بھی محض) بے خبر ہیں (اور) ایمان والیاں ہیں (اور جن کی براءۃ قرآن سے ثابت ہو چکی ہے، جمع کا صیغہ اس لیے لائے تاکہ سب ازواج مطہرات کو شامل ہو جائے کیونکہ الطیبات سے سب کی طہارت و نظافت ثابت ہے اور ظاہر ہے کہ جو لوگ ایسی پاکباز مطہرات کو متہم کریں وہ کافر اور منافق ہی ہو سکتے ہیں) ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی جاتی ہے (یعنی خدا تعالیٰ کی رحمت خاصہ سے دونوں جہاں میں کفر کی وجہ سے دور ہوں گے) اور ان کو (آخرت میں) بڑا عذاب ہوگا، جس روز ان کے خلاف ان کی زبانیں گواہی دیں گی اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں بھی (گواہی دیں گے) ان کاموں کی جو کہ یہ لوگ کیا کرتے تھے (مثلاً زبان کہے گی کہ اس نے میرے ذریعہ سے فلاں فلاں کفر کی بات بکی، اور ہاتھ پاؤں کہیں گے کہ اس نے کفر کی باتیں رائج کرنے میں یوں یوں دوڑ دھوپ کی)۔

* * *

**فائدہ:** [۱] صحیحین کی حدیث میں ہے: "اِجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوبِقَات الشِّرْك بالله وَقَتل النَّفْس الَّتِي حَرَّمَ الله اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَكْلَ الرِّبٰوا وَاَكْلَ مَالِ الْيَتِيْم وَالتَّوَلِّيْ يَوْمَ الزَّحْفِ وَقَذْفَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ الْغَافِلَاتِ" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قذف محصنات مطلقاً مہلکات میں سے ہے، پھر ان میں سے بھی ازواج مطہرات بالخصوص ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کا قذف تو کس درجہ کا گناہ ہوگا، علماء نے تصریح کی ہے کہ ان آیات کے نزول کے بعد جو شخص عائشہ صدیقہ یا ازواج مطہرات میں سے کسی کو متہم کرے وہ کافر، مکذب قرآن اور دائرہ اسلام سے خارج ہے اور طبرانی کی ایک حدیث میں ہے: "قَذْفُ الْمُحْصَنَةِ يَهْدِمُ عَمَلَ مِائَةِ سَنَةٍ" (محصنہ پر تہمت لگانا سو برس کے عمل کو ڈھا دیتا ہے)، العیاذ باللہ۔

**فائدہ:** [۲] یعنی مجرم منہ سے بولنا اور ظاہر کرنا نہ چاہے گا، مگر خود زبان اور ہاتھ پاؤں بولیں گے اور ان میں سے ہر عضو اس عمل کو ظاہر کرے گا جو اس کے ذریعہ سے کیا گیا تھا۔

**لطیفہ:** قاذف نے زبان سے تہمت لگائی تھی اور چار گواہوں کا اس سے مطالبہ تھا جو پورا نہ کر سکا، اس کے بالمقابل یہاں یہی پانچ چیزیں ذکر ہوئیں، ایک زبان جو قذف کا اصلی آلہ ہے اور چار ہاتھ پاؤں جو اس کی شرارت کے گواہ ہوں گے۔

يَوْمَئِذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ﴿۲۵﴾

اس دن پوری دے گا ان کو اللہ ان کی سزا جو چاہیے اور جان لیں گے کہ اللہ وہی ہے سچا کھولنے والا

**خلاصہ تفسیر:** اس روز اللہ تعالیٰ ان کو ان کا واجبی بدلہ پورا پورا دے گا اور (اس روز ٹھیک ٹھیک) ان کو معلوم ہوگا کہ اللہ ہی ٹھیک فیصلہ کرنے والا (اور) بات (کی حقیقت) کو کھول دینے والا ہے (یعنی اب تو کفر کی وجہ سے اس بات کا ان کو پوری طرح اعتقاد نہیں، مگر قیامت کے روز معلوم ہو جائے گا اور یہ معلوم کر کے نجات سے بالکل مایوس ہو جائیں گے، کیونکہ ان کے مناسب فیصلہ ابدی عذاب ہے)۔

یہ آیتیں توبہ نہ کرنے والوں کے بارے میں ہیں جو کہ براءت کی آیات کے نزول کے بعد بھی تہمت کے اعتقاد سے باز نہیں آئے، اور توبہ کرنے والوں کو فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ میں مرحوم دارین فرمایا اور توبہ نہ کرنے والوں کو لُعِنُوْا میں ملعون دارین فرمایا، تائبین کو لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ میں عذاب سے محفوظ بتلایا تھا اور غیر تائبین کو لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ میں اور نیز اس سے پہلے وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ الخ میں مبتلائے عذاب بتلایا، تائبین کے لئے فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ میں عفو و رحمت کی بشارت یعنی ستر معصیت فرمائی تھی، اور غیر تائبین کے لئے تَشْهَدُ اور يُوَفِّيْهِمُ میں مغفرت نہ ہونے کی وعید اور فضیحت فرمائی۔

* * *

**فائدہ:** جو رتی رتی عمل کھول کر سامنے رکھ دیتا ہے اور جس کا حساب بالکل صاف ہے اس کے ہاں کسی طرح کا ظلم و تعدی نہیں، یہ مضمون قیامت کے دن سب کو مکشوف و مشہود ہو جائے گا۔

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ

گندیاں (گندی عورتیں) ہیں گندوں کے واسطے اور گندے واسطے گندیوں کے، اور ستھریاں ہیں ستھروں کے واسطے اور ستھرے واسطے

لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿٢٦﴾ ع

ستھریوں کے [1] وہ لوگ بے تعلق (لگاؤ) ہیں ان باتوں سے جو یہ کہتے ہیں [2] ان کے واسطے بخشش ہے اور روزی ہے عزت کی [3]

**خلاصہ تفسیر:** توبہ کرنے والوں کو پیچھے آیت: مَا زَكٰى مِنْكُمْ الخ میں پاک صاف بتلایا تھا، اب اگلی آیت میں توبہ نہ کرنے والوں کو خبیث فرمایا جس میں حضرت صدیقہ کی براءت پر استدلال کر کے قصہ کو ختم فرمایا، یعنی یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ:

گندی عورتیں گندے مردوں کے لائق ہوتی ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لائق ہوتے ہیں اور ستھری عورتیں ستھرے مردوں کے لائق ہوتی ہیں اور ستھرے مرد ستھری عورتوں کے لائق ہوتے ہیں (ایک مقدمہ تو یہ ہوا، اور دوسرا مقدمہ بدیہی یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر چیز آپ کے لائق اور مناسب ہی دی گئی ہے اور وہ ستھری ہی چیزیں ہیں تو اس مقدمہ کے اعتبار سے ضرور آپ کی بیوی بھی ستھری ہیں اور ان کے پاک و منزہ ہونے سے حضرت صفوان رضی اللہ عنہ کا منزہ ہونا بھی لازم آیا، اسی لئے آگے فرماتے ہیں کہ) یہ اس بات سے پاک ہیں جو یہ (منافق) بکتے پھرتے ہیں، ان (حضرات) کے لئے (آخرت میں) مغفرت اور عزت کی روزی (یعنی جنت) ہے (ہر ایک کی مغفرت اس کی حالت کے مناسب ہے، پس اب کوئی اشکال نہیں، اس میں منافقین کے خبث کا بھی بیان ہو گیا)۔

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ: مطلب یہ ہے کہ یہ ایک واقعہ ہے کہ ہم نے خاص جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس قاعدہ کلیہ کی رعایت ضرور ملحوظ رکھی ہے، اگرچہ دوسروں کے بارہ میں کسی خاص حکمت کی بنا پر اس قاعدہ کی رعایت التزاماً ملحوظ نہ رکھی گئی ہو، اور جبکہ مطلب یہ ہے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت ثابت ہو جائے گی، اور یہ لازم نہ ہوگا کہ ہر گندی عورت کا شوہر گندہ اور ہر گندے شوہر کی بیوی گندی، اور ہر پاک عورت کا خاوند پاک اور ہر پاک مرد کی بیوی پاک ہو، پس اس پر یہ اشکال نہ ہوگا کہ بہت سے اچھے مرد ایسے ہیں کہ ان کی بیویاں بری ہیں اور بہت سی اچھی بیویاں ایسی ہیں کہ ان کے خاوند برے ہیں، کیونکہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے یہ تو بتلایا ہے کہ خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے ہیں الخ

مگر یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے ہر جگہ اس قاعدہ کا لحاظ بھی رکھا ہے، بلکہ خاص جناب رسول اللہ ﷺ کے متعلق اس قاعدہ کے ملحوظ رکھنے کا اظہار فرمایا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ جو تمام انبیاء کے سردار ہیں ان کو ازواج مطہرات بھی اللہ تعالیٰ نے پاکی اور صفائی ظاہری اور اخلاقی برتری میں آپ ہی کی مناسب شان عطا فرمائی ہیں اور صدیقہ عائشہ ان سب میں ممتاز ہیں، ان کے بارے میں شک وشبہ وہی کر سکتا ہے جس کو خود رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ ہو اور حضرت نوح وحضرت لوط علیہما السلام کی بیویوں کے بارے میں جو قرآن کریم میں ان کا کافر ہونا مذکور ہے تو ان کے متعلق بھی یہ ثابت ہے کہ کافر ہونے کے باوجود فسق وفجور میں مبتلا نہیں تھیں، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: "ما بغت امراة نبی قط"، یعنی کسی نبی کی عورت نے کبھی زنا نہیں کیا، اس سے معلوم ہوا کہ کسی نبی کی بیوی کا فر ہو جائے اس کا تو امکان ہے مگر بدکار فاحشہ ہو جائے یہ ممکن نہیں، کیونکہ کافر ہونا موجب نفرت نہیں جبکہ زانیہ ہونا نفرت اور عار کا باعث ہے اور انبیاء علیہم السلام نفرت کے اسباب سے منزہ ہوتے ہیں۔

اس واقعہ میں اگر شبہ ہو کہ حضرت علیؓ نے مشورہ میں حضور ﷺ سے کہا تھا کہ اگر آپ طلاق دے دیں تو آپ کے لیے عورتیں بہت ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت علیؓ کو بدگمانی ہرگز نہیں تھی، بلکہ اس مشورے سے حضور ﷺ کی تسکین، قلبی تقویت اور غم ہلکا کرنا مقصود تھا، اور خالی الذہن ہو کر تحقیق کی طرف متوجہ کرنا تھا تاکہ براءت خوب اچھی طرح ثابت ہو جائے، چنانچہ آپؓ کے یہ الفاظ تھے: "یا رسول اللہ ان اللہ لم یضیق علیك والنساء سواها كثیر فاسئل الجاریة تصدقك" رواه البخاری، یعنی حق تعالیٰ نے آپ کے اوپر تنگی نہیں کی اور عورتیں آپ کے لیے بہت ہیں، اور بریرہ باندی سے دریافت کیجیے وہ سچ بیان کریں گی، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا مقصود یہی تھا کہ حضور ﷺ کا غم ہلکا کر کے آپ کو تحقیق کی طرف متوجہ کریں تاکہ براءت ثابت ہو جائے، چنانچہ بریرہ سے دریافت کرنے کا مشورہ حضرت علیؓ نے خود ہی دیا، تو درحقیقت اس مشورے میں براءت کے ثبوت میں اعانت اور مدد تھی۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی بدکار اور گندی عورتیں گندے اور بدکار مردوں کے لائق ہیں، اسی طرح بدکار اور گندے مرد اس قابل ہیں کہ ان کا تعلق اپنے جیسی گندی اور بدکار عورتوں سے ہو، پاک اور ستھرے آدمیوں کا ناپاک بدکاروں سے کیا مطلب، ابن عباس نے فرمایا کہ پیغمبر کی عورت بدکار (زانیہ) نہیں ہوتی، یعنی اللہ تعالیٰ ان کی ناموس کی حفاظت فرماتا ہے، نقلہ فی موضح القرآن۔

**تنبیہ:** آیت کا یہ مطلب تو ترجمہ کے موافق ہوا، مگر بعض مفسرین سلف سے یہ منقول ہے کہ الخبیثات اور الطیبات سے یہاں عورتیں مراد نہیں، بلکہ اقوال وکلمات مراد ہیں، یعنی گندی باتیں گندوں کے لائق ہیں، اور ستھری باتیں ستھرے آدمیوں کے، پاکباز اور ستھرے مرد وعورت ایسی گندی تہمتوں سے بری ہوتے ہیں جیسا کہ آگے: أُولَٰئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ ۖ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ (النور:۲۶) سے ظاہر ہے، یا یوں کہا جائے کہ گندی باتیں گندوں کی زبان سے نکلا کرتی ہیں تو جنہوں نے کسی پاکباز کی نسبت گندی بات کہی، سمجھ لو کہ وہ خود گندے ہیں۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی ستھرے آدمی ان باتوں سے بری ہیں جو یہ گندے لوگ بکتے پھرتے ہیں۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی برا کہنے سے وہ برے نہیں ہو جاتے، بلکہ جب وہ اس پر صبر کرتے ہیں تو یہ چیز ان کی خطاؤں یا لغزشوں کا کفارہ بنتی ہے، اور یہاں مفسد لوگ جس قدر ان کو ذلیل کرنا چاہتے ہیں وہاں اس کے بدلہ میں عزت کی روزی ملتی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا ۚ

اے ایمان والو مت جایا کرو کسی گھر میں اپنے گھروں کے سوائے جب تک بول چال نہ کر لو (اجازت نہ لے لو) اور سلام کر لو ان گھر والوں پر

ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿٢٧﴾

یہ بہتر ہے تمہارے حق میں تاکہ تم یاد رکھو

**خلاصہ تفسیر:** سورۃ نور کے شروع ہی سے فواحش اور بے حیائی کی روک تھام کے لئے ان سے متعلقہ جرائم کی سزاؤں کا ذکر اور بے دلیل کسی پر تہمت لگانے کی مذمت کا بیان تھا، آگے انہی فواحش کے انسداد اور عفت وعصمت کے تحفظ کے لئے ایسے احکام دیئے گئے ہیں جن سے ایسے حالات ہی پیدا نہ ہوں جہاں سے بے حیائی کو راستہ ملے انہی احکام میں سے استیذ ان کے مسائل واحکام ہیں کہ کسی شخص کے مکان میں بغیر اس کی اجازت کے داخل ہونا یا اندر جھانکنا ممنوع کر دیا گیا، جس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ غیر محرم عورتوں پر نظر نہ پڑے، یہاں مختلف قسم کے مکانات کے مختلف احکام بیان کئے گئے ہیں، مکانات کی چار قسمیں ہیں: ① ایک خاص اپنے رہنے کا مکان، جس میں کسی دوسرے کے آنے کا احتمال نہیں ② دوسرے وہ مکان جس میں کوئی اور بھی رہتا ہو خواہ وہ اپنے محارم ہی کیوں نہ ہوں یا کسی اور کے اس میں آجانے کا احتمال ہو ③ تیسری قسم وہ مکان جس میں کسی کا بالفعل رہنا یا نہ رہنا دونوں کا احتمال ہو ④ چوتھی قسم وہ مکان جو کسی خاص شخص کی رہائش کے لئے مخصوص نہ ہو جیسے مسجد مدرسہ، خانقاہ وغیرہ عام لوگوں کے انتفاع اور آمد ورفت کی جگہیں، ان میں قسم اول کا حکم تو ظاہر تھا کہ اس میں جانے کے لئے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں اس لئے اس کا ذکر ان آیات میں صراحۃً نہیں کیا گیا، باقی تین قسموں کے مکانات کے احکام اگلی آیتوں میں بیان فرماتے ہیں۔

اے ایمان والو! تم اپنے (خاص رہنے کے) گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں (جن میں دوسرے لوگ رہتے ہوں خواہ وہ ان کی ملک ہو یا کسی سے عاریۃً رہنے کو لے لئے ہوں یا کرایہ پر لئے ہوں) داخل مت ہو جب تک اجازت حاصل نہ کرلو (اور اجازت لینے سے پہلے) ان کے رہنے والوں کو سلام نہ کرلو (یعنی اول باہر سے سلام کر کے پھر ان سے پوچھو کہ کیا ہمیں اندر آنے کی اجازت ہے؟ اور بغیر اجازت لئے ویسے ہی مت گھس جاؤ، اگرچہ بعض لوگ اجازت لینے کو اپنی شان کے خلاف اور موجب ذلت سمجھتے ہیں، اور اس لیے اجازت نہ لینے کو اچھا سمجھتے ہیں، لیکن واقع میں) یہ ہی تمہارے لئے بہتر ہے (کہ اجازت لے کر جاؤ اور یہ بات تم کو اس لئے بتائی) تاکہ تم خیال رکھو (اور اس پر عمل کرو کہ اس میں بڑی حکمتیں ہیں، یہ تو مکانات کی دوسری قسم کا حکم بیان ہوا)۔

**ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ:** تمہارے لیے بہتر اس وجہ سے ہے کہ بغیر پوچھے چلے جانے میں احتمال ہے ناجائز موقع پر نظر پڑ جانے کا، یا گھر والوں کی ایسی حالت پر مطلع ہونے کا جس پر مطلع ہونا انہیں ناگوار ہے، اسی بنا پر تجسس کی ممانعت ہے، اس لیے یہ حکم عام ہوگا اندھوں اور عورتوں سب کے لیے، اور اجازت مانگنے میں جو وہمی ذلت سمجھی جاتی ہے اس سے یہ مفاسد جو اجازت نہ لینے پر مرتب ہو سکتے ہیں کہیں زیادہ ہیں۔

ان آیات میں يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے خطاب کیا گیا جو مردوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، مگر عورتیں بھی اس حکم میں داخل ہیں جیسا کہ عام احکام قرآنیہ اسی طرح مردوں کو مخاطب کر کے آتے ہیں عورتیں بھی اس میں شامل ہوتی ہیں، بجز مخصوص مسائل کے جن کی خصوصیت مردوں کے ساتھ بیان کردی جاتی ہے، چنانچہ نساء صحابہ کا بھی یہی معمول تھا کہ کسی کے گھر جاتیں تو پہلے ان سے اجازت طلب کرتیں۔

اسی آیت کے عموم سے معلوم ہوا کہ کسی دوسرے شخص کے گھر میں جانے سے پہلے استیذ ان کا حکم عام ہے مرد عورت محرم غیر محرم سب کو شامل ہے، عورت کسی عورت کے پاس جائے یا مرد مرد کے پاس، سب کو اجازت طلب کرنا واجب ہے، اسی طرح ایک شخص اگر اپنی ماں اور بہن یا دوسری محرم عورتوں کے پاس جائے تو بھی استیذ ان یعنی اجازت طلب کرنی چاہئے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی خاص اپنے ہی رہنے کا جو گھر ہو اس کے سوا کسی دوسرے کے رہنے کے گھر میں یوں ہی بے خبر نہ گھس جائے کیا جانے وہ کس حال میں ہو اور اس وقت کسی کا اندر آنا پسند کرتا ہے یا نہیں، لہٰذا اندر جانے سے پہلے آواز دے کر اجازت حاصل کرے اور سب سے بہتر آواز سلام کی، حدیث میں ہے کہ تین مرتبہ سلام کرے اور اجازت داخل ہونے کی لے، اگر تین بار سلام کرنے کے بعد بھی اجازت نہ ملے تو واپس چلا جائے، فی الحقیقت یہ ایسی حکیمانہ تعلیم ہے کہ اگر اس کی پابندی کی جائے تو صاحب خانہ اور ملاقاتی دونوں کے حق میں بہتر ہے، مگر افسوس آج مسلمان ان مفید ہدایات کو ترک کرتے جاتے ہیں، جن کو دوسری قومیں ان ہی سے سیکھ کر ترقی کر رہی ہیں۔

**ربط:** شروع سورت سے احکام زنا وقذف وغیرہ بیان ہوئے تھے، چونکہ بسا اوقات بلا اجازت کسی کے گھر میں چلا جانا ان امور کی طرف مفضی ہو جاتا ہے، اس لیے ان آیات میں مسائل استیذان کو بیان فرمایا۔

فَإِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا

پھر اگر نہ پاؤ اس میں کسی کو تو اس میں نہ جاؤ جب تک کہ اجازت نہ ملے تم کو ۱ اور اگر تم کو جواب ملے کہ پھر جاؤ

فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝۲۸

تو پھر جاؤ اس میں خوب ستھرائی ہے تمہارے لیے ۲ اور اللہ جو تم کرتے ہو اس کو جانتا ہے ۳

**خلاصہ تفسیر:** پھر اگر ان گھروں میں تم کو کوئی آدمی معلوم نہ ہو (خواہ واقع میں وہاں کوئی ہو یا نہ ہو) تو (بھی) ان گھروں میں نہ جاؤ جب تک تم کو اجازت نہ دی جائے (کیونکہ اول تو یہ احتمال ہے کہ اس میں کوئی آدمی موجود ہو اگرچہ تمہیں معلوم نہیں، اور اگر واقع میں کوئی موجود نہ ہو تو دوسرے کے خالی مکان میں بھی بلا اجازت گھس جانا، دوسرے کی ملک میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کرنا ہے جو کہ حرام ہے، یہ حکم ہوا مکانات کی تیسری قسم کا) اور اگر (اجازت طلب کرنے کے وقت) تم سے یہ کہہ دیا جائے کہ (اس وقت) لوٹ جاؤ تو تم لوٹ آیا کرو یہی بات تمہارے لئے بہتر ہے (اس بات سے کہ وہیں جم جاؤ کہ کبھی تو باہر نکلیں گے، کیونکہ اس میں اپنی ذلت ہے، اور دوسرے شخص پر بلا وجہ دباؤ ڈال کر تکلیف پہنچانا ہے اور کسی مسلمان کو ایذاء دینا حرام ہے، اسی طرح بلا وجہ ذلیل ہونا بھی برا ہے، کیونکہ یہ واقعی ذلت ہے اور بلا ضرورت ہے، اور اجازت چاہنے میں وہمی ذلت ہے، نیز اس میں دوسرے کے حقوق کی حفاظت ہے اس لیے دونوں ذلتوں میں فرق ہے) اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی خبر ہے (اگر خلاف حکم کرو گے سزا پاؤ گے اور یہی حکم اس صورت کا ہے کہ گھر والوں نے اگرچہ لوٹ جانے کو کہا نہیں مگر کوئی بولا بھی نہیں، ایسی حالت میں تین مرتبہ طلب اجازت اس احتیاط پر کر لیا جائے کہ شاید سنا نہ ہو، تین مرتبہ تک جب کوئی جواب نہ آئے تو لوٹ آنا چاہئے جیسا کہ حدیث میں اس کی تصریح موجود ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ اگر یہ معلوم ہوا ہو کہ گھر میں کوئی موجود نہیں تب بھی دوسرے کے گھر میں بدون مالک ومختار کی اجازت کے مت جاؤ، کیونکہ ملک غیر میں بدون اجازت تصرف کا کوئی حق نہیں، نہ معلوم بے اجازت چلے جانے سے کیا جھگڑا پیش آ جائے ہاں صراحتاً یا دلالۃً اجازت ہو تو جانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

**فائدہ:** ۲ یعنی ایسا کہے سے برا نہ مانو، بسا اوقات آدمی کی طبیعت کسی سے ملنے کو نہیں چاہتی یا حرج ہوتا ہے یا کوئی ایسی بات کر رہا ہے جس پر غیر کو مطلع کرنا پسند نہیں کرتا تو تم کو کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ اس پر بوجھ ڈالو، اس طرح بارِ خاطر بننے سے تعلقات صاف نہیں رہتے۔

**فائدہ:** ۳ وہ تمہارے تمام اعمال قلبیہ وقالبیہ سے باخبر ہے جیسا کچھ کرو گے اور جس نیت سے کرو گے حق تعالیٰ اس کے مناسب جزا دے گا، اور اس نے اپنے علم محیط سے تمام امور کی رعایت کر کے یہ احکام دیے ہیں۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ۭ

نہیں گناہ تم پر اس میں کہ جاؤ ان گھروں میں جہاں کوئی نہیں بستا اس میں کچھ چیز ہو تمہاری ۱

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ۝۲۹

اور اللہ کو معلوم ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو ۲

**خلاصہ تفسیر:** اورتم کوایسے مکانات میں (بغیر خاص اجازت کے) چلے جانے میں گناہ نہ ہوگا جن میں (گھر کے طور پر) کوئی نہ رہتا ہو (اور) ان میں تمہاری برت ہو (یعنی ان مکانات کے برتنے اور استعمال کرنے کا تمہیں حق ہو، یہ حکم ہے چوتھی قسم کا جو رفاہ عام کے مکانات ہیں اور جن سے عام لوگوں کے منافع متعلق ہیں جیسے مدرسہ، خانقاہ، سرائے تو وہاں جانے کی بظاہر عام اجازت ہوتی ہے، اگر کسی کو اجازت نہ ہو تو اس کو ان مکانات میں بھی جانا جائز نہ ہوگا) اورتم جو کچھ علانیہ کرتے ہو یا پوشیدہ کرتے ہو اللہ تعالیٰ سب جانتا ہے (اس لئے ہر حال میں تقوی اور خوف خدا لازم ہے)۔

خلاصہ یہ کہ مکانات کی چار قسمیں ہیں: ① ایک خاص اپنے حصے کا مکان جس میں کسی دوسرے کے آنے کا احتمال ہی نہیں، اس کا حکم یہ ہے کہ اس میں کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں، کیونکہ اجازت طلب کرنے کی جو علت مذکور ہوئی ہے وہ نہیں پائی جاتی، ② دوسرا وہ گھر جس میں کوئی اور بھی رہتا ہو اگر چہ وہ اپنے محرم ہی کیوں نہ ہوں، یا کسی غیر کے وہاں آجانے کا احتمال ہو، اس کا حکم یہ ہے کہ اس میں اجازت طلب کرنے کی ضرورت ہے ③ تیسرا وہ جس میں اس وقت کسی کے ہونے یا نہ ہونے دونوں کا احتمال ہو، اس کا حکم بھی یہ ہے کہ اس میں اجازت طلب کرنے کی ضرورت ہے ④ چوتھا وہ جس میں کسی شخص کا سکونت کے طور پر نہ رہنا متعین ہو جیسے سرائے وغیرہ، اس میں اجازت لینے کی ضرورت نہیں، البتہ اگر کسی کو روک دیا جائے تو اس کا جانا جائز نہ ہوگا۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی جن مکانوں میں کوئی خاص آدمی نہیں رہتا، نہ کوئی روک ٹوک ہے مثلاً مسجد، مدرسہ، خانقاہ، سرائے وغیرہ، اگر وہاں تمہاری کوئی چیز ہے یا تم کو چندے اس کے برتنے کی ضرورت ہے تو بیشک وہاں جاسکتے ہو اور اس کے لیے استیذان کی ضرورت نہیں، اس طرح کے مسائل کی تفصیل فقہ میں دیکھی جائے۔

**فائدہ:** ۲؎ اس نے تمہارے تمام کھلے چھپے حالات کی رعایت سے یہ احکام مشروع کیے ہیں جن سے مقصود فتنہ وفساد کے مداخل کو بند کرنا ہے، مومن کو چاہیے کہ اپنے دل میں اسی غرض کو پیش نظر رکھ کر عمل کرے۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ

کہہ دے ایمان والوں کو نیچی رکھیں ذرا اپنی آنکھیں ۱؎ اور تھامتے رہیں (تھامے رکھیں) اپنے ستر کو ۲؎ اس میں خوب ستھرائی ہے ان کے لیے

اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝۳۰

بیشک اللہ کو خبر ہے جو کچھ کرتے ہیں ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** آپ مسلمان مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں (یعنی جس عضو کی طرف مطلقاً دیکھنا ناجائز ہے اس کو بالکل نہ دیکھیں، اور جس کو فی نفسہ دیکھنا جائز ہے مگر شہوت سے جائز نہیں اس کو شہوت سے نہ دیکھیں) اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں (یعنی ناجائز محل میں شہوت رانی نہ کریں جس میں زنا اور لواطت سب داخل ہے) یہ ان کے لئے زیادہ صفائی کی بات ہے (اور اس کے خلاف میں آلودگی ہے، زنا یا مقدمہ زنا میں) بیشک اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے جو کچھ لوگ کیا کرتے ہیں (پس خلاف کرنے والے سزا یابی کے مستحق ہوں گے)۔

**وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ:** شرمگاہوں کی حفاظت سے مراد یہ ہے کہ نفس کی خواہش پورا کرنے کی جتنی ناجائز صورتیں ہیں ان سب سے اپنی شرمگاہوں کو محفوظ رکھیں، اس میں زنا، لواطت اور دو عورتوں کا باہمی سحاق جس سے شہوت پوری ہو جائے، ہاتھ سے شہوت پوری کرنا یہ سب ناجائز وحرام چیزیں داخل ہیں، مراد اس آیت کی ناجائز حرام شہوت رانی اور اس کے تمام مقدمات کو ممنوع کرنا ہے جن میں سے ابتدا اور انتہا کو تصریحاً بیان فرما دیا، باقی

درمیانی مقدمات سب اس میں داخل ہو گئے، فتنۂ شہوت کا سب سے پہلا سبب اور مقدمہ نگاہ ڈالنا اور دیکھنا ہے اور آخری نتیجہ زنا ہے، ان دونوں کو صراحۃ ذکر کر کے حرام کر دیا گیا، ان کے درمیانی حرام مقدمات مثلاً باتیں سننا، ہاتھ لگانا وغیرہ یہ سب ضمناً آ گئے۔

**ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ**: یہاں ذلک میں غض بصر یعنی نگاہوں کو نیچے رکھنے کا حکم بھی داخل ہے، کیونکہ نظر بازی یا بدنظری زنا اور فواحش کے مقدمات میں سے ہے، چنانچہ اس سے تمام ناپسندیدہ کاموں کے مقدمات کے انسداد کا پتہ چلتا ہے، اور یہ سلوک کی تعلیم کا ایک عظیم باب ہے۔

* * *

**فائدہ: ۱** بدنظری عموماً زنا کی پہلی سیڑھی ہے، اسی سے بڑے بڑے فواحش کا دروازہ کھلتا ہے، قرآن کریم نے بدکاری اور بے حیائی کا انسداد کرنے کے لیے اول اسی سوراخ کو بند کرنا چاہا، یعنی مسلمان مرد و عورت کو حکم دیا کہ بدنظری سے بچیں اور اپنی شہوات کو قابو میں رکھیں، اگر ایک مرتبہ بے ساختہ مرد کی کسی اجنبی عورت پر یا عورت کی کسی اجنبی مرد پر نظر پڑ جائے تو دوبارہ ارادہ سے اس طرف نظر نہ کرے، کیونکہ یہ دوبارہ دیکھنا اس کے اختیار سے ہوگا، جس میں وہ معذور نہیں سمجھا جا سکتا، اگر آدمی نگاہ نیچی رکھنے کی عادت ڈال لے اور اختیار و ارادہ سے ناجائز امور کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا کرے تو بہت جلد اس کے نفس کا تزکیہ ہو سکتا ہے چونکہ پہلی مرتبہ دفعتاً جو بیساختہ نظر پڑتی ہے از راہ شہوت و نفسانیت نہیں ہوتی، اس لیے حدیث میں اس کو معاف رکھا گیا ہے، شاید یہاں بھی من ابصارھم میں مِنْ کو تبعیضیہ لے کر اسی طرف اشارہ ہو۔

**فائدہ: ۲** یعنی حرام کاری سے بچیں اور ستر کسی کے سامنے نہ کھولیں اِلَّا عِنْدَ مَنْ اَبَاحَه الشَّارِعُ مِنَ الْاَزْوَاجِ وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ۔

**فائدہ: ۳** یعنی آنکھ کی چوری اور دلوں کے بھید اور نیتوں کا حال اس کو سب معلوم ہے لہٰذا اس کا خیال کر کے بدنگاہی اور ہر قسم کی بدکاری سے بچو، ورنہ وہ اپنے علم کے موافق تم کو سزا دے گا: يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ (غافر: ۱۹) حضرت شاہ صاحبؒ نے مایصنعون سے مراد غالباً جاہلیت کی بے اعتدالیاں لی ہیں، یعنی جو بے اعتدالیاں پہلے سے کرتے آ رہے ہو اللہ کو سب معلوم ہے اسی لیے اب اس نے اپنے پیغمبر کے ذریعہ سے یہ احکام جاری کیے تا کہ تمہارا تزکیہ ہو سکے۔

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا

اور کہہ دے ایمان والیوں کو نیچی رکھیں ذرا اپنی آنکھیں اور تھامتی رہیں (تھامے رکھیں) اپنے ستر کو اور نہ دکھلائیں اپنا سنگار مگر جو

ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۪

کھلی چیز ہے اس میں سے ۱ اور ڈال لیں اپنی اوڑھنی اپنے گریبان پر ۲

**خلاصہ تفسیر**: اور (اسی طرح) مسلمان عورتوں سے کہہ دیجئے کہ (وہ بھی) اپنی نگاہیں نیچی رکھیں (یعنی جس عضو کی طرف مطلقاً دیکھنا ناجائز ہے اس کو بالکل نہ دیکھیں، اور جس کو فی نفسہ دیکھنا جائز ہے مگر شہوت سے جائز نہیں اس کو شہوت سے نہ دیکھیں) اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں (یعنی ناجائز محل میں شہوت رانی نہ کریں جس میں زنا اور دو عورتوں کا باہمی سحاق سب داخل ہے) اور اپنی زینت (کے مواقع) کو ظاہر نہ کریں (زینت سے مراد زیور جیسے کنگن، چوڑیاں، پازیب، بازوبند طوق، جھومر، پٹی، بالیاں وغیرہ اور ان کے مواقع سے مراد ہاتھ پنڈلی، بازو، گردن، سر، سینہ، کان، یعنی ان سب مواقع کو سب سے چھپائے رکھیں بلحاظ دو استثناؤں کے، ان میں سے پہلا استثناء مواقع ضرورت کے لحاظ سے ہے کہ روزمرہ کے کام کاج میں جن اعضاء کے کھولنے کی ضرورت ہوتی ہے ان کو مستثنیٰ قرار دیا گیا، اس کی تفصیل یہ ہے) مگر جو اس (موقع زینت) میں سے (غالباً) کھلا (ہی) رہتا ہے (جس کے چھپانے میں ہر وقت حرج ہے، اس موقع زینت سے مراد چہرہ اور ہاتھ کی ہتھیلیاں اور اصح قول کے مطابق دونوں پیر بھی) اور (خصوصاً سر اور سینہ ڈھکنے کا بہت اہتمام کریں اور) اپنے دوپٹے (جو سر ڈھانکنے کے لئے ہیں) اپنے سینوں پر ڈالے رہا کریں (اگر چہ سینہ قمیص سے

ڈھک جاتا ہے، لیکن اکثر قمیص میں سامنے سے گریبان کھلا رہتا ہے اور سینہ کی ہیئت قمیص کے باوجود ظاہر ہوتی ہے اس لئے اہتمام کی ضرورت ہوئی)۔

عورتوں کے لئے حجاب اور پردہ کے احکام کی پہلی آیات وہ ہیں جو سورۃ احزاب میں ام المومنین حضرت زینب بنت جحشؓ کے نبی کریم ﷺ کے عقد نکاح میں آنے کے وقت نازل ہوئیں جس کی تاریخ بعض حضرات نے ۳ ہجری اور بعض نے ۵ ہجری بتلائی ہے، اس پر سب کا اتفاق ہے کہ پہلی آیت حجاب اسی موقع پر نازل ہوئی اور سورۃ نور کی یہ آیات قصہ افک کے ساتھ نازل ہوئی ہیں جو غزوہ بنی المصطلق یا مریسیع سے واپسی میں پیش آیا، یہ غزوہ ۶ ہجری میں ہوا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ سورۃ نور کی آیات پردہ و حجاب نزول کے اعتبار سے بعد میں آئی ہیں، سورۃ احزاب کی چار آیتیں متعلقہ حجاب نزول کے اعتبار سے مقدم ہیں، اور شرعی پردہ کے احکام اسی وقت سے شروع ہوئے جبکہ سورۃ احزاب کی آیات نازل ہوئیں، اس لئے حجاب اور پردہ کی پوری بحث تو ان شاء اللہ تعالیٰ سورۃ احزاب میں آئے گی یہاں صرف ان آیات کی تفسیر لکھی جاتی ہے جو سورۃ نور میں آئی ہیں۔

**وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ**: اس طویل آیت کے ابتدائی حصہ میں تو وہی حکم ہے جو اس سے پہلی آیت میں مردوں کو دیا گیا ہے کہ اپنی نظریں پست رکھیں، یعنی نگاہ پھیر لیں، مردوں کے حکم میں عورتیں بھی داخل تھیں مگر ان کا ذکر علیحدہ تاکید کے لئے کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کو اپنے محارم کے سوا کسی مرد کو دیکھنا حرام ہے، بہت سے علماء کا قول یہ ہے کہ غیر محرم مرد کو دیکھنا عورت کے لئے مطلقاً حرام ہے خواہ شہوت اور بری نیت سے دیکھے یا بغیر کسی نیت و شہوت کے، دونوں صورتیں حرام ہیں، اور دوسرے بعض فقہاء نے کہا کہ بغیر شہوت کے غیر مرد کو دیکھنے میں عورت کے لئے مضائقہ نہیں، اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ نظر شہوت تو حرام ہے اور بلاشہوت نظر کرنا بھی خلاف اولی ہے، ایک عورت کو دوسری عورت کے مواضع ستر کو دیکھنا بغیر خاص ضرورتوں کے یہ بھی اسی آیت کے الفاظ سے حرام ہے، کیونکہ جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے کہ موضع ستر یعنی مردوں کا ناف سے گھٹنوں تک اور عورتوں کا کل بدن سوائے چہرہ اور ہتھیلیوں کے، یہ مواضع ستر ہیں ان کا چھپانا سب سے فرض ہے نہ کوئی مرد دوسرے مرد کا ستر دیکھ سکتا ہے، نہ کوئی عورت دوسری عورت کا ستر دیکھ سکتی ہے اور مرد کسی عورت کا یا عورت کسی مرد کا ستر دیکھے یہ بدرجہ اولی حرام ہے اور آیت مذکورہ کے حکم غض بصر کے خلاف ہے، کیونکہ آیت کا مطلب جو اوپر بیان ہو چکا ہے اس میں ہر ایسی چیز سے نظر پست رکھنا اور ہٹا لینا مراد ہے جس کی طرف دیکھنے کو شرع میں ممنوع کیا گیا ہے اس میں عورت کے لئے عورت کا ستر دیکھنا بھی داخل ہے۔

**وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ**: ''زینت'' لغوی معنی کے اعتبار سے اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے انسان اپنے آپ کو مزین اور خوش منظر بنائے، وہ عمدہ کپڑے بھی ہو سکتے ہیں، زیور بھی، یہ چیزیں جبکہ کسی عورت کے بدن پر نہ ہوں علیحدہ ہوں تو باتفاق امت ان کا دیکھنا مردوں کے لئے حلال ہے، جیسے بازار میں بکنے والے زنانہ کپڑے اور زیور کہ ان کے دیکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں اس لئے جمہور مفسرین نے اس آیت میں ''زینت'' سے مراد محل زینت یعنی وہ اعضاء جن میں زینت کی چیزیں زیور وغیرہ پہنی جاتی ہیں وہ مراد لئے ہیں اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ عورتوں پر واجب ہے کہ وہ اپنی زینت یعنی مواقع زینت کو ظاہر نہ کرے، اس آیت میں جو عورت کے لئے اظہار زینت کو حرام قرار دیا ہے آگے اس حکم سے دو استثناء بیان فرمائے گئے، ایک منظور کے اعتبار سے ہے، یعنی جس کی طرف دیکھا جائے، دوسرا ناظر یعنی دیکھنے والوں کے اعتبار سے۔

اور جب ان مواقع زینت کو اجنبیوں سے پوشیدہ رکھنا واجب ہے جن کا ظاہر کرنا محارم کی روبرو جائز ہے جیسا آگے آتا ہے تو اور مواقع و اعضاء جو بدن کے رہ گئے جیسے کمر و پیٹ وغیرہ جن کا کھولنا محارم کے روبرو بھی جائز نہیں ان کا پوشیدہ رکھنا بدلالۃ النص واجب ہو گیا، حاصل یہ ہوا کہ سر سے پاؤں تک تمام بدن اپنا پوشیدہ رکھیں۔

**اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا**: یعنی چہرہ، ہاتھ اور پیر، کیونکہ چہرہ تو قدرتی طور پر مجمع زینت ہے اور بعض زینتیں قصداً بھی اس میں کی جاتی ہیں مثلاً سرمہ وغیرہ اور ہتھیلیاں اور انگلیاں انگوٹھی، چھلے، مہندی کا موقع ہے اور پیر بھی چھلوں اور مہندی کا موقع ہے، پس ان مواقع کو اس ضرورت سے مستثنیٰ فرمایا ہے کہ ان کو کھولے بغیر کام کاج نہیں ہو سکتا اور مَا ظَهَرَ کی تفسیر چہرہ اور ہاتھوں کے ساتھ حدیث میں آئی ہے اور پیروں کو فقہاء نے اس پر قیاس کر کے اس حکم میں شامل قرار دیا ہے۔

پہلا استثناء مَا ظَهَرَ مِنْهَا کا ہے یعنی عورت کے لئے اپنی زینت کی کسی چیز کو مردوں کے سامنے ظاہر کرنا جائز نہیں بجزان چیزوں کے جوخود بخود ظاہر ہو ہی جاتی ہیں یعنی کام کاج اور نقل وحرکت کے وقت جو چیزیں عادةً کھل ہی جاتی ہیں اور عادةً ان کا چھپانا مشکل ہے وہ مستثنیٰ ہیں ان کے اظہار میں کوئی گناہ نہیں، مراد اس سے کیا ہے؟ اس میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیریں مختلف ہیں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ مَا ظَهَرَ مِنْهَا میں جس چیز کو مستثنیٰ کیا گیا ہے وہ اوپر کے کپڑے ہیں جیسے برقع یا لمبی چادر جو برقع کے قائم مقام ہوتی ہے، یہ کپڑے زینت کے کپڑوں کو چھپانے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں تو مراد آیت کی یہ ہوگئی کہ زینت کی کسی چیز کو ظاہر کرنا جائز نہیں بجزان اوپر کے کپڑوں کے جن کا چھپانا بضرورت باہر نکلنے کے وقت ممکن نہیں جیسے برقع وغیرہ، اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں، کیونکہ جب عورت کسی ضرورت سے باہر نکلنے پر مجبور ہو تو نقل وحرکت اور لین دین کے وقت چہرے اور ہتھیلیوں کو چھپانا مشکل ہے، اس لئے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی تفسیر کے مطابق تو غیر محرم مردوں کے سامنے عورت کو چہرہ اور ہاتھ کھولنا بھی جائز نہیں، صرف اوپر کے کپڑے برقع وغیرہ کا اظہار بضرورت مستثنیٰ ہے اور حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر کے مطابق چہرہ اور ہاتھوں کی ہتھیلیاں بھی غیر محرموں کے سامنے کھولنا جائز ہے، اس لئے فقہاء امت میں بھی اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ چہرہ اور ہتھیلیاں پردے سے مستثنیٰ اور ان کا غیر محرموں کے سامنے کھولنا جائز ہے یا نہیں؟ مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اگر چہرہ اور ہتھیلیوں پر نظر ڈالنے سے فتنہ کا اندیشہ ہو تو ان کا دیکھنا بھی جائز نہیں اور عورت کو ان کا کھولنا بھی جائز نہیں، اسی طرح اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ ستر عورت جو نماز میں اجماعاً اور خارج نماز علی الاصح فرض ہے اس سے چہرہ اور ہتھیلیاں مستثنیٰ ہیں اگر ان کو کھول کر نماز پڑھی تو نماز باتفاق صحیح ودرست ہو جائے گی۔

قاضی بیضاوی اور خازن نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ مقتضا آیت کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے لئے اصل حکم یہ ہے کہ وہ اپنی زینت کی کسی چیز کو بھی ظاہر نہ ہونے دے، بجز اس کے جو نقل وحرکت اور کام کاج کرنے میں عادةً کھل ہی جاتی ہیں ان میں برقع اور چادر بھی داخل ہیں اور چہرہ اور ہتھیلیاں بھی کہ جب عورت کسی مجبوری اور ضرورت سے باہر نکلتی ہے تو برقع چادر وغیرہ کا ظاہر ہونا تو متعین ہی ہے، لیکن دین کی ضرورت میں بعض اوقات چہرہ اور ہاتھ کی ہتھیلیاں بھی کھل جاتی ہیں تو وہ بھی معاف ہیں گناہ نہیں، لیکن اس آیت سے یہ کہیں ثابت نہیں کہ مردوں کو چہرہ اور ہتھیلیاں دیکھنا بھی بلاضرورت جائز ہے، بلکہ مردوں کا تو وہی حکم ہے کہ نگاہ پست رکھیں اگر عورت کہیں چہرہ اور ہاتھ کھولنے پر مجبور ہو جائے تو مردوں کو لازم ہے کہ بلاعذر شرعی اور بلاضرورت کے اس کی طرف نہ دیکھیں اس توجیہ میں دونوں روایتیں اور تفسیریں جمع ہو جاتی ہیں، امام مالک کا مشہور مذہب بھی یہی ہے کہ غیر محرم عورت کے چہرہ اور ہتھیلیوں پر نظر کرنا بھی غیر ضرورت مبیحہ کے جائز نہیں اور زواجر میں ابن حجر مکی شافعی نے امام شافعی کا بھی یہی مذہب نقل کیا ہے کہ اگرچہ عورت کا چہرہ اور ہتھیلیاں ستر عورت کے فرض میں داخل نہیں، ان کو کھول کر بھی نماز ہو جاتی ہے، مگر غیر محرم مردوں کو ان کا دیکھنا بلاضرورت شرعیہ جائز نہیں اور یہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ جن فقہاء نے چہرہ اور ہتھیلیوں کو دیکھنا جائز قرار دیا ہے وہ بھی اس پر متفق ہیں کہ اگر فتنہ کا اندیشہ ہو تو چہرہ وغیرہ دیکھنا بھی ناجائز ہے اور یہ ظاہر ہے کہ حسن اور زینت کا اصل مرکز انسان کا چہرہ ہے اور زمانہ فتنہ وفساد اور غلبہ ہویٰ اور غفلت کا ہے، اس لئے بجز مخصوص ضرورتوں کے مثلاً علاج معالجہ یا کوئی خطرہ شدیدہ وغیرہ عورت کو غیر محارم کے سامنے قصداً چہرہ کھولنا بھی ممنوع ہے اور مردوں کو اس کی طرف قصداً نظر کرنا بھی غیر ضرورت شرعیہ کے جائز نہیں۔

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ: خُمُر، خمار کی جمع ہے اس کپڑے کو کہتے ہیں جو عورت سر پر استعمال کرے اور اس سے گلا اور سینہ بھی چھپ جائے، جیوب، جیب کی جمع ہے جس کے معنی ہیں گریبان، چونکہ زمانہ قدیم سے گریبان سینہ ہی پر ہونے کا معمول ہے اس لئے جیوب کے چھپانے سے مراد سینہ کا چھپانا ہے، شروع آیت میں اظہار زینت کی ممانعت تھی اس جملہ میں اخفاء زینت کی تاکید اور اس کی ایک صورت کا بیان ہے جس کی اصل وجہ ایک رسم جاہلیت کا مٹانا ہے، زمانہ جاہلیت میں عورتیں دوپٹہ سر پر ڈال کر اس کے دونوں کنارے پشت پر چھوڑ دیتی تھیں جس سے گریبان اور گلا اور سینہ اور کان کھلے رہتے تھے، اس لئے مسلمان عورتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ایسا نہ کریں بلکہ دوپٹے کے دونوں پلے ایک دوسرے پر الٹ لیں تاکہ یہ سب اعضاء چھپ جائیں۔

* * *

**فائدہ:** لے ''سنگار'' عرف میں خارجی اور کسبی آرائش کو کہتے ہیں جو مثلاً لباس یا زیور وغیرہ سے حاصل ہو، احقر کے نزدیک یہاں ''زینت'' کا ترجمہ ''سنگار'' کے بجائے ''زیبائش'' کیا جاتا تو زیادہ جامع اور مناسب ہوتا، زیبائش کا لفظ ہر قسم کی خلقی اور کسبی زینت کو شامل ہے، خواہ وہ جسم کی پیدائشی ساخت سے متعلق ہو یا پوشاک وغیرہ خارجی ٹیپ ٹاپ سے، خلاصہ مطلب یہ ہے کہ عورت کو کسی قسم کی خلقی یا کسبی زیبائش کا اظہار بجز محارم کے جن کا ذکر آگے آتا ہے کسی کے سامنے جائز نہیں، ہاں جس قدر زیبائش کا ظہور ناگزیر ہے اور اس کے ظہور کو بسبب عدم قدرت یا ضرورت کے روک نہیں سکتی، اس کے بجبوری یا بضرورت کھلا رکھنے میں مضائقہ نہیں (بشرطیکہ فتنہ کا خوف نہ ہو) حدیث وآثار سے ثابت ہوتا ہے کہ چہرہ اور کفین (ہتھیلیاں) اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا میں داخل ہیں، کیونکہ بہت سی ضروریات دینی و دنیاوی ان کے کھلا رکھنے پر مجبور کرتی ہیں، اگر ان کے چھپانے کا مطلقاً حکم دیا جائے تو عورتوں کے لیے کاروبار میں سخت تنگی اور دشواری پیش آئے گی، آگے فقہا نے قدمین کو بھی ان ہی اعضاء پر قیاس کیا ہے اور جب یہ اعضاء مستثنیٰ ہوئے تو ان کے متعلقات مثلاً انگوٹھی، چھلا یا مہندی، کاجل وغیرہ کو بھی استثناء میں داخل ماننا پڑے گا، لیکن واضح رہے کہ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا سے صاف عورتوں کو بضرورت ان کے کھلا رکھنے کی اجازت ہوئی، نامحرم مردوں کو اجازت نہیں دی گئی کہ وہ آنکھیں لڑایا کریں اور ان اعضاء کا نظارہ کیا کریں، شاید اسی لیے اس اجازت سے پیشتر ہی حق تعالیٰ نے غض بصر کا حکم مومنین کو سنا دیا ہے، معلوم ہوا کہ ایک طرف سے کسی عضو کے کھولنے کی اجازت اس کو مستلزم نہیں کہ دوسری طرف سے اس کو دیکھنا بھی جائز ہو، آخر مرد جن کے لیے پردہ کا حکم نہیں اسی آیت بالا میں عورتوں کو ان کی طرف دیکھنے سے منع کیا گیا، نیز یاد رکھنا چاہیے کہ ان آیات میں محض ستر کا مسئلہ بیان ہوا ہے یعنی اس سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ اپنے گھر کے اندر ہو یا باہر، عورت کو کس حصہ بدن کا کس کے سامنے کن حالات میں کھلا رکھنا جائز ہے، باقی مسئلہ ''حجاب'' یعنی شریعت نے اس کو کن حالات میں گھر سے باہر نکلنے اور سیر وسیاحت کرنے کی اجازت دی، یہاں مذکور نہیں، اس کی کچھ تفصیل ان شاء اللہ سورہ احزاب میں آئے گی، اور ہم نے فتنہ کا خوف نہ ہونے کی جو شرط بڑھائی وہ دوسرے دلائل اور قواعد شرعیہ سے ماخوذ ہے جو ادنیٰ تامل اور مراجعت نصوص سے دریافت ہو سکتی ہیں۔

**فائدہ:** ۲ بدن کی خلقی زیبائش میں سب سے زیادہ نمایاں چیز سینہ کا ابھار ہے، اس کے مزید تستر کی خاص طور پر تاکید فرمائی اور جاہلیت کی رسم کو مٹانے کی صورت بھی بتلا دی، جاہلیت میں عورتیں خمار (اوڑھنی) سر پر ڈال کر اس کے دونوں پلے پشت پر لٹکا لیتی تھیں، اس طرح سینہ کی ہیئت نمایاں رہتی تھی، یہ گویا حسن کا مظاہرہ تھا، قرآن کریم نے بتلا دیا کہ اوڑھنی کو سر پر سے لاکر گریبان پر ڈالنا چاہیے تاکہ اس طرح کان، گردن اور سینہ پوری طرح مستور رہے۔

وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ

اور نہ کھولیں اپنا سنگار مگر اپنے خاوند کے آگے یا اپنے باپ کے لے یا اپنے خاوند کے باپ کے یا اپنے بیٹے کے یا اپنے خاوند کے بیٹے کے

اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ

یا اپنے بھائی کے یا اپنے بھتیجوں کے یا اپنے بھانجوں کے یا اپنی عورتوں کے ۲ یا اپنے ہاتھ کے مال کے ۳ یا کاروبار کرنے والوں کے

غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۪

جو مرد کہ کچھ غرض نہیں رکھتے ۴ یا لڑکوں کے جنہوں نے ابھی نہیں پہچانا عورتوں کے بھید کو ۵

**خلاصہ تفسیر:** اب دوسرا استثناء بیان کیا جاتا ہے جن میں محرم مردوں وغیرہ کو پردہ کے مذکورہ حکم سے مستثنیٰ کیا گیا ہے:

اور اپنی زینت (کے مذکورہ مواقع) کو (کسی پر) ظاہر نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں پر، یا (اپنے محارم پر یعنی) اپنے باپ پر، یا اپنے

شوہر کے باپ پر، یا اپنے بیٹوں پر، یا اپنے شوہر کے بیٹوں پر، یا اپنے (حقیقی، باپ شریک، ماں شریک) بھائیوں پر (نہ کہ چچازاد، ماموں زاد وغیرہ بھائیوں پر) یا اپنے (مذکورہ) بھائیوں کے بیٹوں پر، اپنی (حقیقی و باپ شریک و ماں شریک) بہنوں کے بیٹوں پر (نہ کہ چچازاد خالہ زاد بہنوں کی اولاد پر) یا اپنی (یعنی دین کی شریک) عورتوں پر (مطلب یہ کہ مسلمان عورتوں پر، کیونکہ کافر عورتوں کا حکم اجنبی مرد کی طرح ہے) یا اپنی لونڈیوں پر (مطلقاً اگر چہ وہ کافر ہی ہوں، کیونکہ مرد غلام کا حکم ابوحنیفہ کے نزدیک مثل اجنبی مرد کے ہے، اس سے بھی پردہ واجب ہے) یا ان مردوں پر جو (محض کھانے پینے کے واسطے) طفیلی (کے طور پر رہتے) ہوں اور ان کو (حواس درست نہ ہونے کی وجہ سے عورتوں کی طرف) ذرا توجہ نہ ہو (تابعین یعنی طفیلی کی تخصیص اس لئے ہے کہ اس وقت ایسے لوگ موجود تھے، اور) یا ایسے لڑکوں پر جو عورتوں کے پردہ کی باتوں سے ابھی واقف نہیں ہوئے (مراد وہ بچے ہیں جو ابھی بلوغ کے قریب نہیں پہنچے اور انہیں شہوت کی کچھ خبر نہیں، پس ان سب کے سامنے چہرہ، ہاتھ، پاؤں کے علاوہ زینت کے مواقع مذکورہ کا ظاہر کرنا بھی جائز ہے یعنی سر اور سینہ، اور شوہر کے سامنے کسی جگہ کا بھی چھپانا واجب نہیں، اگر چہ خاص بدن کو دیکھنا خلاف اولی ہے)۔

**وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ**: اب دوسرا استثناء ان مردوں کا بیان کیا گیا ہے جن سے شرعاً پردہ نہیں، جس کے دو سبب ہیں: ① اول تو جن مردوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے ان سے کسی فتنہ کا خطرہ نہیں، وہ محارم ہیں جن کی طبائع کو حق تعالیٰ نے خلقۃً ایسا بنایا ہے کہ وہ ان عورتوں کی عصمت کے محافظ ہوتے ہیں ان سے خود کوئی فتنہ کا احتمال نہیں ② دوسرے ہر وقت ایک جگہ رہنے سہنے کی ضرورت بھی سہولت پیدا کرنے کی مقتضی ہے، یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ شوہر کے سوا دوسرے محارم کو جو مستثنیٰ کیا گیا ہے وہ احکام حجاب و پردہ سے استثناء ہے، ستر عورت سے استثناء نہیں، عورت کا جو بدن ستر میں داخل ہے، اس کا دیکھنا محارم کے لئے بھی جائز نہیں۔

یہاں آٹھ قسم کے محرم مردوں کا اور چار دوسری اقسام کا پردہ سے استثناء کیا گیا ہے اور سورۃ احزاب کی آیت جو نزول میں اس سے مقدم ہے اُس میں صرف سات اقسام کا ذکر ہے، پانچ کا اضافہ یہاں سورۃ نور کی آیت میں کیا گیا ہے جو اُس کے بعد نازل ہوئی ہے، یاد رہے کہ اس جگہ لفظ ''محرم'' عام معنی میں استعمال ہوا ہے جو شوہر پر بھی مشتمل ہے، فقہاء کی اصطلاح میں محرم کی جو خاص تفسیر ہے کہ جس سے کبھی نکاح جائز نہ ہو وہ یہاں مراد نہیں، محرم وہ رشتہ دار ہے جس سے ہمیشہ کے لیے نکاح حرام ہے، خواہ وہ محرم نسب سے ہو، یا سسرالی رشتہ سے، یا رضاعت یعنی دودھ پینے کی وجہ سے، البتہ بعض نے زمانہ کے فتنہ کو دیکھ کر سسرالی رشتہ اور دودھ پینے کی وجہ سے جو محرم ہوں ان کے ساتھ تنہائی میں رہنے بیٹھنے کو منع کیا ہے، تفصیل ان بارہ مستثنیات کی جو سورۃ نور کی مذکورہ آیت میں ہے یہ ہے:

① سب سے پہلے شوہر ہے جس سے بیوی کے کسی عضو کا پردہ نہیں اگر چہ اعضاء مخصوصہ کو بلاضرورت دیکھنا خلاف اولی ہے، حضرت صدیقہ عائشہؓ نے فرمایا: ''ما رأى منى و لا رأيت منه'' یعنی نہ آپ نے میرے خاص عضو کو دیکھا نہ میں نے آپ کے ② دوسرے اپنے باپ ہیں جس میں دادا، پردادا سب داخل ہیں ③ تیسرے شوہر کا باپ ہے اس میں بھی دادا، پردادا سب داخل ہیں ④ چوتھے اپنے لڑکے جو اپنی اولاد میں ہیں ⑤ پانچویں شوہر کے لڑکے جو کسی دوسری بیوی سے ہوں ⑥ چھٹے اپنے بھائی، اس میں حقیقی بھی داخل ہیں اور باپ شریک یعنی علاتی اور ماں شریک یعنی اخیافی بھی، لیکن ماموں، خالہ یا چچا، تایا اور پھوپھی کے لڑکے جن کو عام عرف میں (کزن) بھائی کہا جاتا ہے وہ اس میں داخل نہیں وہ غیر محرم ہیں ⑦ ساتویں بھائیوں کے لڑکے یہاں بھی صرف حقیقی یا علاتی (باپ شریک) یا اخیافی (ماں شریک) بھائی کے لڑکے مراد ہیں، دوسرے عرفی بھائیوں کے لڑکے شامل نہیں ⑧ آٹھویں بہنوں کے لڑکے یعنی بھانجے اس میں بھی بہنوں سے حقیقی، علاتی اور اخیافی بہنیں مراد ہیں، ماموں زاد چچازاد بہنیں داخل نہیں یہ آٹھ قسمیں تو محارم کی ہیں، یہاں عورت کے ماموں اور چچا کا اگر چہ ذکر نہیں فرمایا مگر ان کا حکم بھی یہی ہے کہ ان سے پردہ نہیں۔

⑨ **أَوْ نِسَآئِهِنَّ**: یہ نویں قسم ہے، یعنی اپنی عورتیں جس سے مراد مسلمان عورتیں ہیں کہ ان کے سامنے بھی وہ تمام اعضاء کھولنا جائز ہے جو اپنے باپ بیٹوں کے سامنے کھولے جاسکتے ہیں اور یہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ یہ استثناء احکام حجاب و پردہ سے ہے، احکام ستر سے نہیں، اس لئے جو اعضاء ایک عورت اپنے محرم مردوں کے سامنے نہیں کھول سکتی ان کا کھولنا کسی مسلمان عورت کے سامنے بھی جائز نہیں، علاج معالجہ وغیرہ کی ضرورتیں مستثنیٰ

ہیں، نِسَآئِهِنَّ مسلمان عورتوں کی قید سے یہ معلوم ہوا کہ کافر مشرک عورتوں سے بھی پردہ واجب ہے، وہ غیر محرم مردوں کے حکم میں ہیں، لیکن احادیث صحیحہ میں ایسی روایات موجود ہیں جن میں کافر عورتوں کا ازواج مطہرات کے پاس جانا ثابت ہے، اس لئے اس مسئلہ میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے بعض نے کافر عورتوں کو مثل غیر محرم مردوں کے قرار دیا ہے، بعض نے اس معاملہ میں مسلمان اور کافر دونوں قسم کی عورتوں کا ایک ہی حکم رکھا ہے کہ ان سے پردہ نہیں، امام رازیؒ نے فرمایا کہ اصل بات یہ ہے کہ لفظ نِسَآئِهِنَّ میں تو سبھی عورتیں مسلم اور کافر داخل ہیں اور سلف صالحین سے جو کافر عورتوں سے پردہ کرنے کی روایات منقول ہیں وہ استحباب پر مبنی ہیں، روح المعانی میں مفتی بغداد علامہ آلوسیؒ نے اسی قول کو اختیار فرما کر کہا ہے: "هذا القول اوفق بالناس اليوم فانه لا يكاد يمكن احتجاب المسلمات عن الذميات" یہی قول آج کل لوگوں کے مناسب حال ہے، کیونکہ اس زمانے میں مسلمان عورتوں کا کافر عورتوں سے پردہ تقریباً ناممکن ہوگیا ہے۔

⑩ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ: یہ دسویں قسم ہے، یعنی وہ جو اِن عورتوں کے مملوک ہوں، ان الفاظ کے عموم میں تو غلام اور لونڈیاں دونوں داخل ہیں، لیکن اکثر ائمہ فقہاء کے نزدیک اس سے مراد صرف لونڈیاں ہیں، غلام مرد اس میں داخل نہیں، ان سے عام محارم کی طرح پردہ واجب ہے، حضرت سعید بن مسیبؒ نے اپنے آخری قول میں فرمایا: "لا يغرنكم آية النور فانه في الاناث دون الذكور" یعنی تم لوگ کہیں سورۃ نور کی اس آیت سے مغالطہ میں نہ پڑ جاؤ کہ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ کے الفاظ عام ہیں، مرد غلاموں کو بھی شامل ہیں، لیکن واقعہ ایسا نہیں، یہ آیت صرف عورتوں یعنی کنیزوں کے حق میں ہے، مرد غلام اس میں داخل نہیں، باقی رہا یہ سوال کہ جب لفظ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ سے صرف عورتیں لونڈیاں ہی مراد ہیں تو وہ اس سے پہلے لفظ نسائهن میں یہ داخل ہیں، ان کو علیحدہ بیان کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ لفظ نسائهن اپنے ظاہر کے اعتبار سے صرف مسلمان عورتوں کے لئے ہے اور مملوکہ باندیوں میں اگر کافر بھی ہوں تو ان کو مستثنیٰ کرنے کے لئے یہ لفظ علیحدہ لایا گیا ہے۔

⑪ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِى الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ: یہ گیارہویں قسم ہے، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ مغفل، بدحواس اور پاگل قسم کے لوگ ہیں جنہیں عورتوں کی طرف کوئی رغبت و دلچسپی ہی نہ ہو، اس لئے اس سے مراد وہ مرد ہیں جو عورتوں کی طرف نہ کوئی رغبت و شہوت رکھتے ہوں، نہ ان کے اوصاف حسن اور حالات سے کوئی دلچسپی رکھتے ہوں کہ دوسرے لوگوں سے بیان کردیں، پس اس حکم کا اصل مدار حواس کے درست نہ ہونے پر ہے، تو ہر مجنون اور بدحواس کا یہی حکم ہے خواہ وہ کھانے پینے میں طفیلی ہو یا نہ ہو، طفیلی کی قید اتفاقی ہے، اس کا ذکر صرف اس لیے کیا گیا کہ اس وقت ایسے مغفل قسم کے کچھ مرد ایسے ہی تھے جو طفیلی بن کر کھانے پینے کے لیے گھروں میں جاتے تھے، تو مراد ایسے لوگ ہیں جو مغفل اور پاگل ہوں جنہیں عورتوں کی طرف التفات اور میلان نہ ہوتا ہو، اور جو سمجھ رکھتا ہو تو اس سے پردہ واجب ہے، کیونکہ وہ بہرحال اجنبی مرد ہے اگرچہ بوڑھا، نامرد، مقطوع العضو یا مخنث ہی کیوں نہ ہو۔

⑫ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا: یہ بارہویں قسم ہے، اس سے مراد وہ نابالغ بچے ہیں جو ابھی بلوغ کے قریب بھی نہیں پہنچے اور عورتوں کے مخصوص حالات وصفات اور حرکات وسکنات سے بالکل بے خبر ہوں، پس ان کے سامنے منہ اور ہاتھوں اور قدموں کے سوا زینت کے مواقع کا ظاہر کرنا بھی جائز ہے، اور شوہر کے سامنے کسی جگہ کا بھی چھپانا واجب نہیں، اگرچہ خاص بدن کو دیکھنا اچھا نہیں، اور جو لڑکا ان امور سے دلچسپی لیتا ہو وہ مراہق یعنی قریب البلوغ ہے اس سے پردہ واجب ہے، امام جصاص نے فرمایا کہ یہاں طفل سے مراد وہ بچے ہیں جو مخصوص معاملات کے لحاظ سے عورتوں اور مردوں میں کوئی امتیاز نہ کرتے ہوں، پردہ سے مستثنیات کا بیان ختم ہوا۔

وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ: اسی کی نظیر ہے کہ اسرار کی زینت کو اس کے نامحرم یعنی نااہل سے پوشیدہ رکھنا چاہیے (یعنی اللہ تعالیٰ کی عطا سے پوشیدہ اشیاء میں جو انعامات حاصل ہوئے ہیں انہیں عوام کے سامنے بیان مت کرے کہ وہ اس کے تحمل کے اہل نہیں اور بلا وجہ ذہن منتشر کرلیں گے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ چچا اور ماموں کا بھی یہی حکم ہے اور ان محارم میں پھر فرق مراتب ہے، مثلاً جو زینت خاوند کے آگے ظاہر کر سکتی ہے دوسرے محارم کے سامنے نہیں کر سکتی، ابدائے زینت کے درجات ہیں جن کی تفصیل تفاسیر اور کتب فقہ میں دیکھنی چاہیے، یہاں صرف یہ بتلانا ہے کہ جس قدر تستر کا اہتمام اجنبیوں سے تھا، اتنا محارم سے نہیں، یہ مطلب نہیں کہ ہر ایک عضو کو ان میں سے ہر ایک کے آگے کھول سکتی ہے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی جو عورتیں اس کے پاس اٹھنے بیٹھنے والی ہیں بشرطیکہ نیک چلن ہوں، بدراہ عورتوں کے سامنے نہیں، اور بہت سے سلف کے نزدیک اس سے مسلمان عورتیں مراد ہیں، کافر عورت اجنبی مرد کے حکم میں ہے۔

**فائدہ:** ۳ یعنی اپنی لونڈیاں (باندیاں) اور بعض سلف کے نزدیک مملوک غلام بھی اس میں داخل ہے اور ظاہر قرآن سے اس کی تائید ہوتی ہے، لیکن جمہور ائمہ اور سلف کا یہ مذہب نہیں۔

**فائدہ:** ۴ یعنی کمیرے خدمت گار جو محض اپنے کام سے کام رکھیں اور کھانے سونے میں غرق ہوں، شوخی نہ رکھتے ہوں یا فاتر العقل پاگل جن کے حواس وغیرہ بھی ٹھکانے نہ ہوں، محض کھانے پینے میں گھر والوں کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔

**فائدہ:** ۵ یا جن لڑکوں کو ابھی تک نسوانی سرائر کی کوئی تمیز نہیں، نہ نفسانی جذبات رکھتے ہیں۔

**وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ؕ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا**

اور نہ ماریں زمین پر اپنے پاؤں کو کہ جانا جائے جو چھپاتی ہیں اپنا سنگار ۱ اور توبہ کرو اللہ کے آگے سب مل کر

**اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۱﴾**

اے ایمان والو تا کہ تم بھلائی پاؤ ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور (پردے کا یہاں تک اہتمام رکھیں کہ چلنے میں) اپنے پاؤں زور سے نہ رکھیں کہ ان کا مخفی زیور معلوم ہو جائے (یعنی زیور کی آواز غیر محرموں کے کان تک پہنچے) اور مسلمانو (تم سے جو ان احکام میں کوتاہی ہوگئی ہو تو) تم سب اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو تا کہ تم فلاح پاؤ (ورنہ معصیت فلاح کامل میں مانع ہو جاتی ہے)۔

**وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ:** شروع آیت میں عورتوں کو اپنی زینت غیر مردوں پر ظاہر کرنے سے منع فرمایا تھا، آخر میں اس کی مزید تاکید ہے کہ مواضع زینت سر اور سینہ وغیرہ کا چھپانا تو واجب تھا ہی، اپنے مخفی زینت کا اظہار خواہ کسی ذریعہ سے ہو وہ بھی جائز نہیں، زیور کے اندر خود کوئی چیز ایسی ڈالی جائے جس سے وہ بجنے لگے، یا ایک زیور دوسرے زیور سے ٹکرا کر بجے، یا پاؤں زمین پر اس طرح مارے جس سے زیور کی آواز نکلے اور غیر محرم مرد سنیں، یہ سب چیزیں اس آیت کی رو سے ناجائز ہیں اور اسی وجہ سے بہت سے فقہاء نے فرمایا کہ جب زیور کی آواز غیر محرموں کو سنانا اس آیت سے ناجائز ثابت ہوا تو خود عورت کی آواز کا سنانا اس سے بھی زیادہ سخت اور بدرجہ اولی ناجائز ہوگا، اس لئے عورت کی آواز کو بھی ان حضرات نے ستر میں داخل قرار دیا ہے اور اسی بناء پر نوازل میں فرمایا کہ عورتوں کو جہاں تک ممکن ہو قرآن کی تعلیم بھی عورتوں ہی سے لینا چاہئے، مردوں سے تعلیم لینا بدرجہ مجبوری جائز ہے ،آواز کے متعلق حدیث سے ثابت ہے کہ ازواج مطہرات نزول حجاب کے بعد بھی پس پردہ غیر محارم سے بات کرتی تھیں، اس مجموعہ سے راجح اور صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس موقع اور جس محل میں عورت کی آواز سے فتنہ پیدا ہونے کا خطرہ ہو وہاں ممنوع ہے جہاں یہ نہ ہو جائز ہے، اور احتیاط اسی میں ہے کہ بلاضرورت عورتیں پس پردہ بھی غیر محرموں سے گفتگو نہ کریں، اسی حکم میں یہ بھی داخل ہے کہ عورت جب بضرورت گھر سے باہر نکلے تو خوشبو لگا کر نہ نکلے کیونکہ وہ بھی اس کی مخفی زینت ہے، غیر محرم تک یہ خوشبو پہنچے تو ناجائز ہے، ترمذی میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی حدیث ہے جس میں خوشبو لگا کر باہر جانے والی عورت کو برا کہا گیا ہے، امام جصاصؒ نے فرمایا کہ جب زیور کی آواز کو قرآن نے اظہار زینت میں داخل قرار دے کر ممنوع کیا ہے تو مزین

رنگوں کے کامدار برقعے پہن کر نکلنا بدرجہ اولیٰ ممنوع ہوگا اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت کا چہرہ اگرچہ ستر میں داخل نہیں مگر وہ زینت کا سب سے بڑا مرکز ہے اس لئے اس کا بھی غیر محرموں سے چھپانا واجب ہے الابضرورۃ۔

واضح رہے جس زیور کی آواز پیدا ہو وہ دو قسم کا ہے: ایک وہ جو خود بھی بجتا ہو جیسے گھونگرو یا باجادار جہانو راس کا پہننا تو بالکل ممنوع ہے، کیونکہ حدیث میں گھنٹی اور باجا سے ممانعت آئی ہے، آیت میں یہ مراد نہیں، دوسری قسم وہ جو خود نہیں بجتا مگر دوسری چیز سے لگ کر آواز دیتا ہے، جیسے کڑے وغیرہ اس کا پہننا جائز ہے، اور اسی کی بابت اس آیت میں حکم ہے کہ پاؤں زور سے نہ رکھیں، یعنی پہننا درست ہے مگر ظاہر کرنا خوف فتنہ کی وجہ سے درست نہیں، باقی پردہ کے متعلق مسائل کتب فقہ میں مذکور ہیں اور رسالہ ''القول الصواب'' میں اس کی پوری تحقیق ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی چال ڈھال ایسی نہ ہونی چاہیے کہ زیور وغیرہ کی آواز سے اجانب کو ادھر میلان اور توجہ ہو، بسا اوقات اس قسم کی آواز صورت دیکھنے سے بھی زیادہ نفسانی جذبات کے لیے محرک ہو جاتی ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی پہلے جو کچھ حرکات ہو چکیں ان سے توبہ کرو اور آئندہ کے لیے ہر مرد وعورت کو خدا سے ڈر کر اپنی تمام حرکات وسکنات اور چال چلن میں انابت اور تقویٰ کی راہ اختیار کرنی چاہیے، اس میں دارین کی بھلائی اور کامیابی ہے۔

وَاَنۡكِحُوا الۡاَيَامٰى مِنۡكُمۡ وَالصّٰلِحِيۡنَ مِنۡ عِبَادِكُمۡ وَاِمَآئِكُمۡ ؕ اِنۡ يَّكُوۡنُوۡا فُقَرَآءَ يُغۡنِهِمُ اللّٰهُ

اور نکاح کر دو رانڈوں کا اپنے اندر ۱؎ اور جو نیک ہوں تمہارے غلام اور لونڈیاں ۲؎ اگر وہ ہوں گے مفلس اللہ ان کو غنی کر دے گا

مِنۡ فَضۡلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۳۲﴾ وَلۡيَسۡتَعۡفِفِ الَّذِيۡنَ لَا يَجِدُوۡنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغۡنِيَهُمُ

اپنے فضل سے ۳؎ اور اللہ کشائش والا ہے سب کچھ جانتا ہے ۴؎ اور اپنے آپ کو تھامتے رہیں جن کو نہیں ملتا سامان نکاح کا جب تک مقدور دے

اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ ؕ

ان کو اللہ اپنے فضل سے ۵؎

**خلاصہ تفسیر:** پہلے بیان ہو چکا کہ سورۃ نور میں زیادہ تر وہ احکام ہیں جن کا تعلق عفت وعصمت کی حفاظت اور فواحش وبے حیائی کی روک تھام سے ہے، اس سلسلہ میں زنا اور اس کے متعلقات کی شدید سزاؤں کا ذکر کیا گیا، پھر استیذان کا، پھر عورتوں کے پردے کا، شریعت اسلام چونکہ ایک فطری اور معتدل شریعت ہے اس لئے جب ایک طرف انسان کو ناجائز شہوت رانی سے سختی کے ساتھ روکا گیا تو ضروری تھا کہ فطری جذبات وخواہشات کی رعایت سے اس کا کوئی جائز اور صحیح طریقہ بھی بتلایا جائے، اس کے علاوہ بقاءنسل کا عقلی اور شرعی تقاضا بھی یہی ہے کہ کچھ حدود کے اندر رہ کر مرد وعورت کے اختلاط کی کوئی صورت تجویز کی جائے، اسی کا نام قرآن وسنت کی اصطلاح میں نکاح ہے، چنانچہ اب یہاں نکاح کا حکم دیا جاتا ہے۔

اور تم (آزاد لوگوں) میں جو بے نکاح ہوں (خواہ مرد ہوں یا عورتیں، اور بے نکاح ہونا بھی عام ہے خواہ ابھی تک نکاح ہوا ہی نہ ہو یا نکاح ہونے کے بعد بیوی کی موت یا طلاق کے سبب بے نکاح رہ گئے) تم ان کا نکاح کر دیا کرو اور (اسی طرح) تمہارے غلام اور لونڈیوں میں جو اس (نکاح) کے لائق ہوں (یعنی نکاح کے حقوق ادا کر سکتے ہوں) ان کا بھی (نکاح کر دیا کرو، محض اپنی مصلحت کے خیال سے ان کی خواہش نکاح کی مصلحت کو فوت نہ کیا کرو اور نکاح کا پیغام دینے والے کے فقر وافلاس پر نظر کر کے انکار نہ کر دیا کرو جبکہ اس میں کسب معاش کی صلاحیت موجود ہو، کیونکہ) اگر وہ لوگ مفلس ہوں گے تو اللہ تعالیٰ (اگر چاہے گا) ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا (خلاصہ یہ ہے کہ نہ تو مالدار نہ ہونے کی وجہ سے نکاح سے انکار کرو، اور نہ یہ خیال کرو کہ نکاح ہو گیا تو خرچ بڑھ جائے گا جو موجودہ حالت میں غنی و مالدار ہے وہ بھی نکاح کرنے سے محتاج ومفلس ہو جائے گا، کیونکہ

رزق کا مدار اصل میں اللہ تعالیٰ کی مشیت پر ہے، وہ کسی مالدار کو بغیر نکاح کے بھی فقیر و محتاج کر سکتا ہے، اور کسی غریب نکاح والے کو نکاح کے باوجود فقر و افلاس سے نکال سکتا ہے) اور اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے (جس کو چاہے مالدار کر دے اور سب کا حال) خوب جاننے والا ہے (جس کو غنی کرنا مقتضائے حکمت و مصلحت ہوگا اس کو غنی کر دیا جائے گا اور جس کے محتاج و فقیر رہنے ہی میں اس کی مصلحت ہے تو اس کو فقیر رکھا جائے گا)۔

اور (اگر کسی کو اپنے فقر و افلاس کی وجہ سے نکاح کا سامان میسر نہ ہو تو) ایسے لوگوں کو کہ جن کو نکاح کا مقدور (قوت طاقت) نہیں ان کو چاہئے کہ (اپنے نفس کو) قابو میں رکھیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ (اگر چاہے تو) ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے (پھر اس وقت نکاح کر لیں)۔

**وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ**: یعنی اپنے غلاموں اور کنیزوں میں جو صالح ہوں ان کے نکاح کرا دیا کرو، یہ خطاب ان کے آقاؤں اور مالکوں کو ہے، اس جگہ ''صالحین'' کا لفظ اپنے لغوی معنی میں آیا ہے، یعنی ان میں جو شخص نکاح کی صلاحیت و استطاعت رکھتا ہو اس کا نکاح کرا دینے کا حکم ان کے آقاؤں کو دیا گیا ہے، مراد اس صالحیت سے وہی ہے کہ بیوی کے حقوق زوجیت اور نفقہ و مہر معجّل ادا کرنے کے قابل ہوں اور اگر ''صالحین'' کو معروف یعنی نیک لوگوں کے معنی میں لیا جائے تو پھر ان کی تخصیص بالذکر اس وجہ سے ہوگی کہ نکاح کا اصل مقصد حرام سے بچنے کا وہ صالحین ہی میں ہو سکتا ہے۔

**اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ**: یعنی اگر وہ مفلس ہوں گے تو اللہ انہیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا، اس کے ظاہری مضمون پر یہ وسوسہ ہوتا ہے کہ مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات فقیر غریب کے نکاح پر غنا اور مالداری مرتب نہیں ہوتی، پھر یہاں اس وعدہ غنا کے کیا معنی؟ خلاصہ تفسیر سے اس کا جواب ظاہر ہوگیا کہ غنا و مالداری مشیت باری تعالیٰ کے ساتھ معلق ہے، یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہیں گے تو غنی کر دیں گے، جیسے دوسری جگہ اس کی تشریح ہے: **وان خفتم عیلة فسوف یغنیکم اللہ من فضله ان شاء**، اس جواب پر اگر شبہ ہو کہ پھر اس میں نکاح کی کیا خصوصیت ہوئی؟ بغیر نکاح والے کا غنا بھی اور اسی طرح سب کا فقر بھی مشیت باری تعالیٰ کے ساتھ ہی معلق ہے، اس کا جواب بھی خلاصہ تفسیر سے ظاہر ہوگیا، چونکہ اکثر لوگوں کا خیال یہ ہے کہ فقر کی صورت میں نکاح میں نقصان ہے اس لیے یہاں بطور خاص اسے ذکر کیا گیا۔

**وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا**: اگر کسی کو شبہ ہو کہ آیت کے شروع میں تو فقراء کو نکاح کا حکم دیا، اور پھر آیت کے آخر میں انہیں صبر و ضبط کا حکم دیا، ان دونوں میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ فقر نکاح سے مانع نہیں، لیکن اگر بیوی نہ ملے تو کسی پر جبر تو ہے نہیں، اگر ملے تو نکاح کر لو، نہ ملے تو صبر سے بیٹھے رہو، البتہ ان سب مذکورہ صورتوں میں بالقوت قدرت شرط ہے، جیسا ان **یکونوا فقراء** کے ترجمہ سے پہلے اس طرف اشارہ کیا گیا۔

* * *

**فائدہ: ۱۔ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ**: اوپر استیذان، غض بصر اور تستر وغیرہ کے احکام بیان ہوئے تھے، تاکہ بے حیائی اور بدکاری کی روک تھام کی جائے، اس آیت میں یہ حکم دیا کہ جن کا نکاح نہیں ہوا یا ہو کر بیوہ اور رنڈوے ہو گئے تو موقع مناسب ملنے پر ان کا نکاح کر دیا کرو، حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اے علی! تین کاموں میں دیر نہ کر، نماز فرض کا جب وقت آ جائے، جنازہ جب موجود ہو، اور رانڈ عورت جب اس کا کفول جائے''، جو قومیں رانڈوں کے نکاح پر ناک بھوں چڑھاتی ہیں سمجھ لیں کہ ان کا ایمان سلامت نہیں۔

**فائدہ: ۲۔ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ**: یعنی لونڈی غلام کو اگر اس لائق سمجھو کہ حقوق زوجیت ادا کر سکیں گے اور نکاح ہو جانے پر مغرور ہو کر تمہاری خدمت نہ چھوڑ بیٹھیں گے تو ان کا بھی نکاح کر دو۔

**فائدہ: ۳۔ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ**: بعض لوگ نکاح میں اس لیے پس و پیش کیا کرتے ہیں کہ نکاح ہو جانے کے بعد بیوی بچوں کا بار کیسے اٹھے گا، انھیں سمجھا دیا کہ ایسے موہوم خطرات پر نکاح سے مت رکو، روزی تمہاری اور بیوی بچوں کی اللہ کے ہاتھ میں ہے کیا معلوم ہے کہ خدا چاہے تو ان ہی کی قسمت سے تمہارے رزق میں کشائش کر دے، نہ مجرد رہنا غنا کا موجب ہے اور نہ نکاح کرنا فقر و افلاس کو مستلزم ہے، یہ باتیں حق تعالیٰ کی

مشیت پر ہیں، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ (التوبہ:۲۸) اور ظاہری اسباب کے اعتبار سے بھی یہ چیز معقول ہے کہ نکاح کر لینے یا ایسا ارادہ کرنے سے آدمی پر بوجھ پڑتا ہے اور وہ پہلے سے بڑھ کر کمائی کے لیے جدوجہد کرتا ہے، ادھر بیوی اور اولاد ہو جائے تو وہ بلکہ بعض اوقات بیوی کے کنبہ والے بھی کسب معاش میں اس کا ہاتھ بٹاتے ہیں، بہر حال روزی کی تنگی یا وسعت نکاح یا تجرد پر موقوف نہیں، پھر یہ خیال نکاح سے مانع کیوں ہو۔

**فائدہ:** ٤ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ: جس کے حق میں مناسب جانتا ہے کشایش کر دیتا ہے۔

**فائدہ:** ٥ حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ: یعنی جن کو فی الحال اتنا بھی مقدور نہیں کہ کسی عورت کو نکاح میں لاسکیں تو جب تک خدا تعالیٰ مقدور دے چاہیے کہ اپنے نفس کو قابو میں رکھیں اور عفیف رہنے کی کوشش کریں، کچھ بعید نہیں کہ اسی ضبط نفس اور عفت کی برکت سے حق تعالیٰ انکو غنی کر دے اور نکاح کے بہترین مواقع مہیا فرما دے۔

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖ

اور جو لوگ چاہیں لکھت آزادی کی مال دیکر ان میں سے کہ جو تمہارے ہاتھ کے مال ہیں تو انکو لکھ کر دے دو اگر سمجھو ان میں کچھ نیکی (بھلائی) ١

وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ۭ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَاۗءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا

اور دو ان کو اللہ کے مال سے جو اس نے تم کو دیا ہے ٢ اور نہ زبردستی کرو اپنی چھوکریوں پر بدکاری کے واسطے اگر وہ چاہیں قید سے (بچے) رہنا

لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۳﴾

کہ تم کمانا چاہو اسباب دنیا کی زندگانی کا ٣ اور جو کوئی ان پر زبردستی کرے گا تو اللہ ان کی بےبسی کے پیچھے بخشنے والا مہربان ہے ٤

**خلاصہ تفسیر:** اور تمہارے مملوکوں میں سے (غلام ہوں یا لونڈیاں) جو مکاتب ہونے کے خواہاں ہوں تو (بہتر ہے کہ) ان کو مکاتب بنا دیا کرو اگر ان میں بہتری (کے آثار) پاؤ، اور اللہ کے (دیئے ہوئے) اس مال میں سے ان کو بھی دو جو اللہ نے تم کو دے رکھا ہے (تا کہ جلدی آزاد ہو سکیں) اور اپنی (مملوکہ) لونڈیوں کو زنا کرنے پر مجبور نہ کرو (بالخصوص) جب وہ پاکدامن رہنا چاہیں (اور تمہاری یہ ذلیل حرکت) محض اس لئے کہ دنیوی زندگی کا کچھ فائدہ (یعنی مال) تم کو حاصل ہو جائے، اور جو شخص ان کو مجبور کرے گا (اور وہ بچنا چاہیں گی) تو اللہ تعالیٰ ان کے مجبور کئے جانے کے بعد (ان کے لئے) بخشنے والا مہربان ہے۔

**وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ:** پچھلی آیت میں مملوک غلاموں اور لونڈیوں کو اگر نکاح کرنے کی ضرورت ہو تو آقاؤں کو ہدایت کی گئی تھی کہ ان کو نکاح کی اجازت دے دینی چاہئے، یہ ان کے لئے افضل اور بہتر ہے، خلاصہ اس ہدایت کا اپنے مملوک غلاموں لونڈیوں کے ساتھ حسن معاملہ اور ان کو تکلیف سے بچانا ہے، اس کی مناسبت سے آیت مذکورہ میں ایک دوسری ہدایت ان کے آقاؤں کے لئے یہ دی گئی ہے کہ اگر یہ مملوک غلام یا لونڈی آقاؤں سے معاملہ مکاتبت کا کرنا چاہیں تو ان کی اس خواہش کو پورا کر دینا بھی آقاؤں کے لئے افضل اور مستحب موجب ثواب ہے، مکاتبہ وہ معاہدہ ہے جو آقا اور غلام کے درمیان ہو کہ اس قدر مال ادا کرنے کے بعد غلام آزاد ہو جائے گا، صاحب ہدایہ اور عامہ فقہاء نے اس حکم کو حکم استحباب ہی قرار دیا ہے، یعنی آقا کے ذمہ واجب تو نہیں کہ اپنے مملوک کو مکاتب بنا دے لیکن مستحب اور افضل ہے، اپنے مملوک غلام یا لونڈی کو مکاتب بنا دینے کی ہدایت اور اس کو مستحب اور افضل قرار دینا شریعت اسلام کے ان ہی احکام میں سے ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت اسلام کا مقتضی یہ ہے کہ جو لوگ شرعی حیثیت سے غلام ہیں ان کی آزادی کے زیادہ سے زیادہ راستے کھولے جائیں، تمام کفارات میں ان کے آزاد کرنے کے

احکام دیئے گئے ہیں، ویسے بھی غلام آزاد کرنے میں بہت بڑے ثواب کا وعدہ ہے مکاتبت کا معاملہ بھی اسی کا ایک راستہ ہے اس لئے اس کی ترغیب دی گئی ہے، معاملہ مکاتبت کی مزید وضاحت آگے فائدہ میں آرہی ہے۔

البتہ اس کے ساتھ شرط یہ لگائی گئی کہ اِنۡ عَلِمۡتُمۡ فِيۡهِمۡ خَيۡرًا یعنی مکاتب بنانا جب درست ہوگا جبکہ تم ان میں بہتری کے آثار دیکھو، اکثر حضرات ائمہ نے اس بہتری سے مراد قوت کسب بتلائی ہے، یعنی جس شخص میں یہ دیکھو کہ اگر اس کو مکاتب بنادیا تو کما کر معینہ رقم جمع کرلے گا اس کو مکاتب بناؤ، ورنہ جو اس قابل نہ ہو اس کو مکاتب بنادینے سے غلام کی محنت بھی ضائع ہوگی آقا کا نقصان بھی ہوگا، اور صاحب ہدایہ نے فرمایا کہ خیر اور بہتری سے مراد اس جگہ یہ ہے کہ اس کے آزاد ہونے سے مسلمانوں کو کسی نقصان کے پہنچنے کا خطرہ نہ ہو، مثلاً یہ کہ وہ کافر ہو اور اپنے کافر بھائیوں کی مدد کرتا ہو، اور صحیح بات یہ ہے کہ لفظ خیر اس جگہ دونوں چیزوں پر حاوی ہے کہ غلام میں قوت کسب بھی ہو اور اس کی آزادی سے مسلمانوں کو کوئی خطرہ بھی نہ ہو۔

اِنۡ اَرَدۡنَ تَحَصُّنًا: یہ قید اتفاقی ہے، یعنی اس صورت میں مجبور کرنا تو پوری بے حیائی ہے، چاہیے تو یہ کہ اگر وہ زنا کا قصد کریں تو تم روک دو، نہ کہ الٹا وہ بچنا چاہیں اور تم مجبور کرو، جاہلیت میں بعض لوگ اس بات کی کمائی کرتے تھے اور عبداللہ بن ابی منافق نے بھی اپنی دو لونڈیوں کو اس پر مجبور کیا تھا اور وہ اس سے بچنا چاہتی تھیں، چنانچہ مسلم کی روایت میں ہے کہ ان لونڈیوں نے حضور ﷺ سے اس کی شکایت کی تھی اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں، اور "فتیات" کے اصلی معنی جوان عورتوں کے ہیں، پھر باندیوں کے معنی میں مستعمل ہونے لگا، یہ قید بھی اتفاقی ہے، کیونکہ بوڑھیوں پر کوئی جبر نہیں کرتا تھا، ان سے رغبت ہی کسی کو نہیں ہوتی۔

لِّتَبۡتَغُوۡا عَرَضَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا: ان جبر کروانے والوں کا مقصود مال کمانا ہوا کرتا تھا، اس لیے یہ فرمادیا کہ محض ایسی خسیس غرض کے لیے مجبور کرنا بہت ہی برا ہے، اور یہ قید بھی اتفاقی ہے، ورنہ زنا پر جبر کرنا کسی اور غرض سے بھی جائز نہیں، بلکہ یہ بات کہنا بھی جائز نہیں اگرچہ زبردستی بھی نہ ہو، پس اس تقریر سے تمام شبہات دور ہوگئے۔

فَاِنَّ اللّٰهَ مِنۡۢ بَعۡدِ اِكۡرَاهِهِنَّ غَفُوۡرٌ: جس زبردستی میں عورت پر مواخذہ نہیں وہ وہ ہے جس میں جان یا عضو ضائع ہونے کا خوف ہو کہ دوسرا قتل کی یا ہاتھ پاؤں کاٹنے کی دھمکی دیتا ہو اور غالب گمان یہ ہو کہ وہ ایسا کرہی دے گا، اور چونکہ زنا تو اصل میں گناہ ہی ہے اگرچہ جبر کی وجہ سے عورت کے حق میں گناہ نہ رہا، اس لیے اصل کا لحاظ کر کے مغفرت اور بخشش کا لفظ لایا گیا ہے، ورنہ مغفرت کے لفظ سے گناہ ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔

بے حیائی اور فواحش کے انسداد اور خاتمہ کے لیے سورت کے شروع سے یہاں تک تقریباً دس احکام ذکر ہوئے:

① پہلے حکم (آیت ۲) میں صراحۃً زنا کی قباحت اور اس کی سزا کا بیان ہے ② دوسرے حکم (آیت ۳) میں بھی اسی کی تاکید ہے ③ تیسرے حکم (آیت ۴) میں زنا کی تہمت لگانے کی قباحت اور اس کی سزا کا بیان ہے ④ چوتھے حکم (آیت ۶ تا ۱۰) میں بھی خاص محل یعنی میاں بیوی کے اعتبار سے تہمت (لعان) ہی کے احکام ہیں، اس کے بعد قصہ (آیت ۱۱ تا ۲۶) میں ایسی تہمت کی نہایت سختی کے ساتھ مذمت ہے، کیونکہ جس پر تہمت لگائی گئی تھی ان کی شان بہت بلند تھی ⑤ پانچویں حکم (آیت ۲۷ تا ۲۹) میں گھروں میں داخل ہونے سے قبل طلب اجازت کا حکم دیا ورنہ بلا اجازت گھروں میں چلے جانا بھی بے حیائی کا ذریعہ بن جاتا ہے ⑥ چھٹے حکم (آیت ۲۷ تا ۲۹) میں نگاہوں اور شرمگاہوں کی حفاظت اور پردے کا حکم دے کر مردوں اور عورتوں کے میل جول کو بالکل بند کیا ہے جو کہ زنا کا ذریعہ ہوجاتا ہے ⑦ ساتویں حکم (آیت ۳۲) میں نکاح کا حکم ہے جو زنا سے مانع ہے، ⑧ آٹھویں حکم (آیت ۳۳ کی ابتدا میں) میں جو نکاح پر قدرت نہیں رکھتے انہیں ضبط و صبر کا حکم دیا گیا ⑨ نواں حکم (آیت ۳۳) یعنی غلام و باندی سے مکاتبت کا معاملہ اگرچہ بظاہر زنا سے تعلق نہیں رکھتا، لیکن غور کرنے سے وہ بھی اسی کے متعلق معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس میں یہ قید مذکور ہے کہ اگر غلام میں بہتری کے آثار معلوم ہوں تو اس کو مکاتب کردیا جائے اور بہتری نہ ہونے میں آوارگی بھی داخل ہے تو جس میں ایسا احتمال ہو کہ آزاد ہو کر آوارہ ہوجائے گا تو اس کے لیے غلام رہنا زنا سے مانع ہے، اور جس میں یہ احتمال نہ ہو اس کے لیے آزاد ہونا زنا سے مانع ہے، کیونکہ وہ آزاد ہو کر نکاح کرلے گا، اور غلامی کی حالت میں آقا اپنی خدمت وغیرہ کی مصلحت سے اکثر غلام کو نکاح کی اجازت نہیں دیا کرتا، ⑩ دسویں حکم میں (آیت ۳۳) صراحۃً زنا سے

روکا ہے، پس سب احکام میں تعلق یہ ہوا کہ بے حیائی کے کاموں سے رکنا چاہیے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا: یعنی کسی کا غلام یا لونڈی کہے یا مزید توثیق کے لیے لکھوانا چاہے کہ میں اتنی مدت میں اس قدر مال تجھ کو کما دوں تو مجھے آزاد کر دے، تو مالک کو چاہیے کہ قبول کر لے اور لکھ دے (اس معاملہ کو ''مکاتبت'' کہتے ہیں اور یہ غلاموں کے آزاد کرانے کی ایک خاص صورت ہے) لیکن یہ مالک کو اس وقت قبول کرنا چاہیے جبکہ وہ سمجھے کہ واقعی اس غلام یا لونڈی کے حق میں آزادی بہتر ہوگی، قید غلامی سے چھوٹ کر چوری یا بدکاری یا اور طرح کی بدمعاشیاں کرتا نہ پھرے گا، اگر یہ اطمینان ہو تو بیشک اس کو آزادی کا موقع دینا چاہیے، تا کہ وہ آزاد ہو کر اپنی فلاح کے میدانوں میں خوب ترقی کر سکے اور کہیں نکاح کرنا چاہے تو باختیار خود نکاح کر لے، غلامی کی وجہ سے میدان تنگ نہ ہو۔

**فائدہ:** ۲؎ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ: یہ دولت مند مسلمانوں کو فرمایا کہ ایسی لونڈی غلام کی مالی امداد کرو خواہ زکوٰۃ سے یا عام صدقات و خیرات وغیرہ سے، تا کہ وہ جلدی آزادی حاصل کر سکیں، اور اگر مالک بدلِ کتابت کا کوئی حصہ معاف کر دے، یہ بھی بڑی امداد ہے۔

**تنبیہ:** مصارف زکوٰۃ میں جو وفی الرقاب کا ایک مد رکھا ہے وہ ان ہی غلاموں کے آزاد کرانے کا فنڈ ہے، خلفائے راشدین کے عہد میں بیت المال سے ایسے غلاموں کی امداد ہوتی تھی۔

**فائدہ:** ۳؎ لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: جاہلیت میں بعض لوگ اپنی لونڈیوں سے کسب کراتے تھے، عبد اللہ بن ابی رئیس المنافقین کے پاس کئی لونڈیاں تھیں جن سے بدکاری کرا کر روپیہ حاصل کرتا تھا، ان میں بعض مسلمان ہو گئیں تو اس فعل شنیع سے انکار کیا، اس پر وہ ملعون زدوکوب کرتا تھا، یہ آیت اسی قصہ میں نازل ہوئی، اور اسی شان نزول کی رعایت سے مزید تقبیح کے لیے اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا اور لِتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کی قیود بڑھائی ہیں ورنہ لونڈیوں سے بدکاری کرانا بہر حال حرام ہے اور اس طرح جو کمائی کریں سب ناپاک ہے، خواہ لونڈیاں یہ کام رضاء و رغبت سے کریں یا زبردستی اور ناخوشی سے، ہاں اگر لونڈیاں نہ چاہیں اور یہ محض دنیا کے حقیر فائدے کے لیے زبردستی مجبور کرے تو اور بھی زیادہ وبال اور انتہائی وقاحت اور بے شرمی کی دلیل ہے۔

**فائدہ:** ۴؎ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: یعنی زنا ایسی بری چیز ہے جو جبر و اکراہ کے بعد بھی بری رہتی ہے لیکن حق تعالیٰ محض اپنی رحمت سے ''مکرہہ'' کی بے بسی اور بیچارگی کو دیکھ کر درگزر فرماتا ہے، اس صورت میں مکرِہ (زبرستی کرنے والے) پر سخت عذاب ہوگا اور مکرَہ پر (جس پر زبردستی کی گئی) رحم کیا جائے گا۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ

اور ہم نے اتاریں تمہاری طرف آیتیں کھلی ہوئی اور کچھ حال ان کا جو ہو چکے تم سے پہلے

وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۴﴾ ع ۱۰

اور نصیحت ڈرنے والوں کو

**خلاصہ تفسیر:** شروع سورت سے یہاں تک دس احکام اور ان کے ضمن میں مزید ہدایات کو تفصیل سے بیان فرمایا، اب ان کے خاتمہ پر اس سورت اور پورے قرآن کریم کے نازل کرنے پر اپنا احسان بندوں پر ظاہر فرماتے ہیں۔

اور ہم نے (تم لوگوں کی ہدایت کے واسطے اس سورت میں یا قرآن میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے) تمہارے پاس کھلے کھلے احکام (علمی و عملی) بھیجے ہیں اور جو لوگ تم سے پہلے گزرے ہیں ان کی (یا ان جیسے لوگوں کی) بعض حکایات اور (خدا سے) ڈرنے والوں کے لئے نصیحت کی باتیں (بھیجی ہیں، تا کہ وہ نصیحتوں سے فائدہ اٹھا کر پرہیزگار بن جائیں اور خبیثین کے طریقہ کو چھوڑ کر طیبین کا طریقہ اختیار کریں)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی قرآن میں سب کچھ نصیحتیں، احکام اور گذشتہ اقوام کے عبرتناک واقعات بیان کر دیے گئے ہیں تا کہ خدا کا ڈر رکھنے والے سن کر نصیحت وعبرت حاصل کریں اور اپنے انجام کو سوچیں، یا مثلاً من الذین خلوا سے مراد یہ ہو کہ پہلی امتوں پر بھی اسی طرح کی حدود اور احکام جاری کیے گئے تھے جو اس سورت میں مذکور ہوئے، اور بعض قصے بھی اسی قصہ ''افک'' کے مشابہ پیش آئے جو سورت ہذا میں بیان کیا گیا ہے، پس جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم صدیقہ اور حضرت یوسف صدیق کی دشمنوں کے بہتان سے برأت ظاہر فرمائی، عائشہ صدیقہ بنت الصدیق کی برأت اور بزرگی بھی تا قیام قیامت صادقین کے قلوب میں نقش فی الحجر کر دی، اور دشمنوں کا منہ کالا کیا۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ

اللہ روشنی ہے آسمانوں کی اور زمین کی ۱؎ مثال اس کی روشنی کی جیسے ایک طاق اس میں ہو ایک چراغ، وہ چراغ دھرا ہو ایک شیشہ میں

اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ

وہ شیشہ ہے جیسے ایک تارہ چمکتا ہوا تیل جلتا ہے اس میں ایک برکت کے درخت کا وہ زیتون ہے نہ مشرق کی طرف ہے اور نہ مغرب کی طرف

يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

قریب ہے (لگتا ہے) اس کا تیل کہ روشن ہو جائے اگر چہ نہ لگی ہو اس میں آگ، روشنی پر روشنی، اللہ راہ دکھلا دیتا ہے اپنی روشنی کو جس کو چاہے،

وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۳۵

اور بیان کرتا ہے اللہ مثالیں لوگوں کے واسطے، اور اللہ سب چیز کو جانتا ہے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** ابتداء سورت سے یہاں تک احکام ہدایت اور کلمات حکمت وموعظت کا ذکر ہوا، اور گزشتہ آیت میں یہ فرمایا کہ ہم نے روشن آیتیں نازل کیں جس سے مقصود یہ تھا کہ لوگ گمراہی کی ظلمت سے نکل کر نور ہدایت میں آجائیں، اس لئے اب اول ہدایت کے نور اور گمراہی کی ظلمت کی مثال بیان کرتے ہیں اور پھر اہل ہدایت اور اہل ضلالت کا حال اور انجام بیان کرتے ہیں۔

اللہ نور (ہدایت) دینے والا ہے آسمانوں (میں رہنے والوں) کا اور زمین (میں رہنے والوں) کا (یعنی اہل آسمان وزمین میں جن کو ہدایت ہوئی ہے ان سب کو اللہ ہی نے ہدایت دی ہے، اور مراد آسمان وزمین سے کل عالم ہے، پس جو مخلوقات آسمان وزمین سے باہر ہے وہ بھی داخل ہوگئی جیسے حاملین عرش) اس کے نور (ہدایت) کی حالت عجیبہ ایسی ہے جیسے (فرض کرو) ایک طاق ہے (اور) اس میں ایک چراغ (رکھا) ہے (اور) وہ چراغ (خود طاق میں نہیں رکھا، بلکہ) ایک قندیل میں ہے (اور قندیل طاق میں رکھا ہے اور) وہ قندیل ایسا (صاف شفاف) ہے جیسا کہ ایک چمکدار ستارہ ہو (اور) وہ چراغ ایک نہایت مفید درخت (کے تیل) سے روشن کیا جاتا ہے جو زیتون (کا درخت) ہے جو (کسی آڑ کے) نہ پورب (مشرق) رخ ہے اور نہ (کسی آڑ کے) پچھّم (مغرب) رخ ہے (یعنی نہ اس کی مشرقی جانب میں کسی درخت یا پہاڑ کی آڑ ہے کہ شروع دن میں اس پر دھوپ نہ پڑے اور نہ اس کی غربی جانب میں کوئی آڑ پہاڑ ہے کہ آخر دن میں اس پر دھوپ نہ پڑے، بلکہ کھلے میدان میں ہے جہاں تمام دن دھوپ رہتی ہے، ایسے درخت کا روغن بہت لطیف، صاف اور روشن ہوتا ہے اور) اس کا تیل (اس قدر صاف اور سلگنے والا ہے کہ) اگر اس کو آگ بھی نہ چھوئے تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود جل اٹھے گا (اور جب آگ بھی لگ گئی تب تو) نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ہے (اور) اللہ تعالیٰ اپنے (اس) نور (ہدایت) تک جس کو چاہتا ہے راہ دیتا ہے (یعنی مقصود تک پہنچا دیتا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ کفار معذور ہیں، بلکہ مقصود اہل ہدایت پر احسان ظاہر کرنا ہے کہ اللہ کا احسان مانیں، اسی کی توفیق سے ہدایت پائی ہے، نیز اس طرف اشارہ ہے کہ حق تعالیٰ سے ہدایت کے ملتجی رہیں، اپنی سعی وکوشش کو مدار کار نہ سمجھیں) اور

(ہدایت کی جو یہ مثال دی گئی اسی طرح قرآن میں بہت سی مثالیں بیان کی گئی ہیں تو اس سے بھی لوگوں کی ہدایت ہی مقصود ہے اس لئے) اللہ تعالیٰ لوگوں (کی ہدایت) کے لئے (یہ) مثالیں بیان فرماتا ہے (تاکہ عقلی مضامین محسوس چیزوں کی طرح آسانی سے سمجھ میں آجائیں) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے (اس لئے جو مثال افادہ مقصود کے لئے کافی ہو اور جس میں اغراض و مقاصد کی پوری رعایت ہو اسی کو اختیار کرتا ہے، مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ مثالیں بیان کرتا ہے اور وہ مثال نہایت مناسب ہوتی ہے تاکہ خوب ہدایت ہو)۔

نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ: یعنی ایک تو اس میں خود نور کی قابلیت اعلیٰ درجہ کی تھی، پھر اوپر سے فاعل یعنی آگ کے ساتھ اجتماع ہو گیا، اور پھر اجتماع بھی ان کیفیات کے ساتھ کہ چراغ قندیل (شیشہ کے بنے ہوئے خاص برتن) میں رکھا ہو جس سے بالمشاہدہ چمک بڑھ جاتی ہے، اور پھر وہ ایسے طاق میں رکھا ہو جو ایک طرف سے بند ہو، ایسے موقع پر شعاعیں ایک جگہ سمٹ کر روشنی بہت تیز ہوتی ہے اور پھر تیل بھی زیتون کا جو صاف روشنی اور دھواں کم ہونے میں مشہور ہے تو اس قدر تیز روشنی ہوگی جیسے بہت سی روشنیاں جمع ہوگئی ہوں اس کو نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ فرمایا، یہاں مثال ختم ہوگئی، پس اسی طرح مومن کے قلب میں اللہ تعالیٰ جب نور ہدایت ڈالتا ہے تو روز بروز اسی کا انشراح قبول حق کے لئے بڑھتا چلا جاتا ہے اور ہر وقت احکام پر عمل کرنے کے لئے تیار رہتا ہے، اگرچہ بالفعل بعض احکام کا علم بھی نہ ہوا ہو، کیونکہ علم تدریجاً حاصل ہوتا ہے جیسے وہ روغن زیتون آگ لگنے سے پہلے ہی روشنی کے لئے مستعد تھا، مومن بھی علم احکام سے پہلے ہی ان پر عمل کے لئے مستعد ہوتا ہے اور جب اس کو علم حاصل ہوتا ہے تو نور عمل یعنی عمل کے پختہ ارادہ کے ساتھ نور علم بھی مل جاتا ہے جس سے وہ فوراً ہی قبول کر لیتا ہے، پس عمل و علم جمع ہو کر نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ صادق آجاتا ہے، اور یہ نہیں ہوتا کہ علم احکام کے بعد اس کو کچھ تامل و تردد ہو کہ اگر نفس کے موافق پایا تو قبول کر لیا ورنہ رد کر دیا، اسی انشراح اور نور کو دوسری آیت میں اس طرح بیان فرمایا ہے: اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ، یعنی جس شخص کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا تو وہ اپنے رب کی طرف سے ایک نور پر ہوتا ہے اور ایک جگہ فرمایا: فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ، غرض ہدایت الٰہی کے نور کی یہ مثال ہے۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: امام غزالیؒ نے "نور" کی تفسیر "ظاهر بنفسه و مظهر لغيره" (اپنی ذات سے موجود اور دوسروں کو وجود دینے والا) سے کر کے اس کا مصداق وجود کو ٹھہرایا ہے، اس لحاظ سے **نور السموات والارض** کا مطلب "وجود السماوات والارض" ہے، یعنی آسمان و زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ صرف اللہ کے وجود سے قائم ہے، اور مسئلہ وحدت الوجود کا حاصل بھی یہی ہے۔

مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ: "مشکوٰۃ" سے مومن مخلص کے بطن کی طرف اشارہ ہے، "زجاجہ" سے دل کی طرف، اور "مصباح" سے دل کے نور کی طرف، اور زیتون کے درخت سے وحی و قرآن کی طرف اشارہ ہے جس سے دل منور ہے، جو اپنی اصل کے اعتبار سے عالم غیب سے ہونے کے سبب کسی جہت کے ساتھ مقید نہیں اور وہ انتہائی واضح ہونے کی وجہ سے بغیر وضاحت کے ظاہر ہوا چاہتا ہے اور وضاحت کے بعد تو اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔

* * *

**فائدہ**: ۱؎ یعنی اللہ سے رونق اور بستی ہے زمین اور آسمان کی، اس کی مدد نہ ہو تو سب ویران ہو جائیں (موضح القرآن) سب مخلوق کو نور وجود اسی سے ملا ہے، چاند، سورج، ستارے، فرشتے اور انبیاء و اولیاء میں جو ظاہری یا باطنی روشنی ہے اسی منبع النور سے مستفاد ہے، ہدایت و معرفت کا جو چمکارا کسی کو پہنچتا ہے اسی بارگاہ رفیع سے پہنچتا ہے، تمام علویات و سفلیات اس کی آیات تکوینیہ و تنزیلیہ سے منور ہیں، حسن و جمال یا خوبی و کمال کی کوئی چمک اگر کہیں نظر پڑتی ہے وہ اسی کے وجہ منور اور ذات مبارک کے جمال و کمال کا ایک پرتو ہے۔

سیرت ابن اسحاق میں ہے کہ طائف میں جب لوگوں نے حضور ﷺ کو ستایا تو یہ دعا زبان پر تھی: اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِيْ اَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمَاتُ وَصَلُحَ عَلَيْهِ اَمْرُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ اَنْ يَّحِلَّ بِيْ غَضَبُكَ اَوْ يَنْزِلُ بِيْ سَخَطُكَ لَكَ الْعُتْبٰى حَتّٰى تَرْضٰى وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ، رات کی تاریکی میں آپ ﷺ اپنے رب کو انت نور السموات والارض کہہ کر پکارا کرتے اور اپنے کان، آنکھ، دل، ہر ہر عضو

بلکہ بال بال میں اس سے نور طلب فرماتے تھے اوراخیر میں بطور خلاصہ فرماتے: وَاَعْظِمْ لِی نُوْرًا یاوَاجْعَلْنِی نُوْرًا یعنی میرے نور کو بڑھا بلکہ مجھے نور ہی نور بنا دے، اور ایک حدیث میں ہے:''اِنَّ اللّٰہ خَلَقَ خَلْقَهٗ فِی ظُلْمَةٍ ثُمَّ اَلْقٰی عَلَیْهِمْ مِنْ نُوْرِہٖ فَمَنْ اَصَابَه مِنْ نُوْرِہٖ یَوْمَئِذٍ اهْتَدٰی وَمَنْ اَخْطَاہ ضَلَّ'' (فتح الباری، ص۶/ ۴۳۰) یعنی جس کواس وقت اللہ کے نور (توفیق) سے حصہ ملا وہ ہدایت پرآیا اور جو اس سے چوکا گمراہ رہا، واضح رہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی دوسری صفات مثلاً سمع بصر وغیرہ کی کوئی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی، ایسے ہی صفت نور بھی ہے ممکنات کے نور پر قیاس نہ کیا جائے تفصیل کے لیے امام غزالیؒ کا رسالہ ''مشکٰوۃ الانوار'' دیکھو۔

**فائدہ:** ؀ یعنی یوں تو اللہ تعالیٰ کے نور سے تمام موجودات کی نمود ہے، لیکن مومنین مہتدین کو نور الٰہی سے ہدایت وعرفان کو جو خصوصی حصہ ملتا ہے اس کی مثال ایسی سمجھو گویا مومن قانت کا جسم ایک طاق کی طرح ہے جس کے اندر ایک ستارہ کی طرح چمک دار شیشہ (قندیل) رکھا ہو، یہ شیشہ اس کا قلب ہوا جس کا تعلق عالم بالا سے ہے، اس شیشہ (قندیل) میں معرفت وہدایت کا چراغ روشن ہے، یہ روشنی ایسے صاف وشفاف اور لطیف تیل سے حاصل ہورہی ہے جو ایک نہایت ہی مبارک درخت (زیتون) سے نکل کر آیا ہے اور زیتون بھی وہ جو کسی حجاب سے نہ مشرق میں ہو نہ مغرب میں یعنی کسی طرف دھوپ کی روک نہیں کھلے میدان میں کھڑا ہے جس پر صبح وشام دونوں وقت کی دھوپ پڑتی ہے، تجربہ سے معلوم ہوا کہ ایسے زیتون کا تیل اور بھی زیادہ لطیف وصاف ہوتا ہے، غرض اس کا تیل اس قدر صاف اور چمکدار ہے کہ بدون آگ دکھلائے ہی معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود روشن ہوجائے گا، یہ تیل میرے نزدیک ایک اسی حسن استعداد اور نور توفیق کا ہوا جو نور مبارک کے القاء سے بدءِ فطرت میں مومن کو حاصل ہوا تھا، جیسا کہ اوپر کے فائدہ میں گزر چکا اور جس طرح شجرہ مبارکہ کو لَا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ فرمایا تھا وہ نور ربانی بھی جہت کی قید سے پاک ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ مومن کا شیشہ دل نہایت صاف ہوتا ہے اور خدا کی توفیق سے اس میں قبول حق کی ایسی زبردست استعداد پائی جاتی ہے کہ بدون دیا سلائی دکھائے ہی جل اٹھنے کو تیار ہوتا ہے، اب جہاں ذرا آگ دکھائی یعنی وحی وقرآن کی تیز روشنی نے اس کو مس کیا فوراً اس کی فطری روشنی بھڑک اٹھی، اسی کو نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ فرمایا، باقی یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے، جس کو چاہے اپنی روشنی عنایت فرمائے اور وہ ہی جانتا ہے کہ کس کو یہ روشنی ملنی چاہیے کس کو نہیں، ان عجیب وغریب مثالوں کا بیان فرمانا بھی اسی غرض سے ہے کہ استعداد رکھنے والوں کو بصیرت کی ایک روشنی حاصل ہو، حق تعالیٰ ہی تمثیل کے لیے مناسب موقع ومحل کو پوری طرح جانتا ہے، کسی دوسرے کو قدرت کہاں کہ ایسی موزوں وجامع مثال پیش کرسکے، آگے فرمایا کہ وہ روشنی ملتی ہے اس سے کہ جن مسجدوں میں کامل لوگ صبح وشام بندگی کرتے ہیں وہاں دھیان لگا رہے۔

**تنبیہ:** مفسرین نے تشبیہ کی تقریر بہت طرح کی ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی موضح القرآن میں نہایت لطیف وعمیق تقریر فرمائی ہے مگر بندہ کے خیال میں جو توجیہ آئی وہ درج کردی، وللناس فیما یعشقون مذاهب، واضح رہے کہ یوقد اور وَلَوْلَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ میں جس ''نار'' کی طرف اشارہ ہے میں نے مشبہ میں اس کی جگہ وحی وقرآن کو رکھا ہے، اس کا ماخذ وہ فائدہ ہے جو حضرت شاہ صاحبؒ نے مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا (البقرۃ:۱۷) پر لکھا ہے اور جس کی تائید صحیحین کی ایک حدیث سے ہوتی ہے جس میں آپ نے یہ الفاظ فرمائے ہیں: ''اِنَّمَا مَثَلِی وَمَثَلَ النَّاسِ كَرَجُلِ اسْتَوْقَدَ نَاراً فَلَمَّا اَضَاءَت مَاحَوْلَهٗ جَعَلَ الفَرَاش وَهٰذِہِ الدَّوَابَّ الَّتِی یَقَعْنَ فِیْهَا'' الخ

فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۳۶﴾

ان گھروں میں کہ اللہ نے حکم دیا ان کو بلند کرنے کا ؀ اور وہاں اس کا نام پڑھنے کا ؀ یاد کرتے ہیں اس کی وہاں صبح اور شام ؀

**خلاصہ تفسیر:** (اب اہل ہدایت کا حال بیان فرماتے ہیں کہ) وہ ایسے گھروں میں (جاکر عبادت کرتے) ہیں جن کی نسبت اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ان کا ادب کیا جائے اور ان میں اللہ کا نام لیا جائے (ان گھروں سے مسجدیں مراد ہیں اور ان کا ادب یہ کہ ان میں جنبی وحائض داخل نہ ہوں، ان میں کوئی نجس چیز داخل نہ کی جائے، وہاں شور وغل نہ مچایا جائے، دنیا کے کام اور باتیں کرنے کے لئے وہاں نہ بیٹھیں، بدبو کی چیز کھا کر ان میں نہ

جائیں وغیرہ ذلک، غرض) ان (مسجدوں) میں ایسے لوگ صبح وشام اللہ کی پاکی (نمازوں میں) بیان کرتے ہیں (یعنی پانچوں نمازیں ادا کرتے ہیں)۔

**فِيْ بُيُوْتٍ:** مسجدوں کی قید رجال یعنی مردوں کے اعتبار سے ہے، عورتوں کے لیے نہیں، ان کے لیے صرف یہ اعمال ہی مدار ہیں، اور حدیث میں ان کے لیے گھروں میں نماز پڑھنا افضل آیا ہے، اور ان کے لیے گھر میں نماز ہی مساجد کے حکم میں ہے۔

**فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ:** تفسیر بحر محیط میں ابوحیانؒ نے فرمایا کہ فی بیوت کا لفظ قرآن میں عام ہے جس طرح مساجد اس میں داخل ہیں اسی طرح وہ مکانات جو خاص تعلیم قرآن تعلیم دین یا وعظ ونصیحت یا ذکر وشغل کے لئے بنائے گئے ہوں جیسے مدارس اور خانقاہیں، وہ بھی اس حکم میں داخل ہیں ان کا بھی ادب واحترام لازم ہے اور ان کی تعظیم یہ ہے کہ ان کا حق ادا کیا جائے، یعنی جس غرض کے لیے وہ موضوع ہیں وہ عمل میں لائی جائے۔

**يُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ:** یہاں اللہ کا نام ذکر کرنے میں ہر قسم کا ذکر شامل ہے، تسبیح وتحمید وغیرہ بھی نفلی، نماز بھی، تلاوت قرآن وعظ ونصیحت، تعلیم علم دین، اور علوم دینیہ کے سب مشاغل اس میں داخل ہیں۔

**يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ:** یعنی صبح وشام اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں، یعنی پانچوں نمازیں ادا کرتے ہیں، صبح کی نماز "غدو" میں آگئی اور بقیہ چار نمازیں "آصال" میں آگئیں، کیونکہ "آصال" کہتے ہیں سورج ڈھلنے سے لے کر تمام رات تک کے وقت کو۔

* * *

**فائدہ:** ۱ ان کی تعظیم وتطہیر کا حکم دیا، یعنی ان کی خبر گیری کی جائے اور ہر قسم کی گندگی اور لغو افعال واقوال سے پاک رکھا جائے، مساجد کی تعظیم میں یہ بھی داخل ہے کہ وہاں پہنچ کر دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھے۔

**فائدہ:** ۲ تسبیح وتہلیل اور تلاوت قرآن وغیرہ سب اذکار اس میں شامل ہیں۔

**فائدہ:** ۳ یعنی تمام مناسب اوقات میں خدا کو یاد کرتے ہیں، بعض مفسرین نے کہا کہ: غدو سے صبح کی نماز مراد ہے اور آصال میں باقی چاروں نمازیں داخل ہیں، کیونکہ اصیل زوال شمس سے صبح تک کے اوقات پر بولا جاتا ہے۔

## رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ

وہ مرد کہ نہیں غافل ہوتے سودا کرنے میں اور نہ بیچنے میں اللہ کی یاد سے اور نماز قائم رکھنے سے اور زکوٰۃ دینے سے ۱

## يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۙ﴿۳۷﴾

ڈرتے رہتے ہیں اس دن سے جس میں الٹ جائیں گے دل اور آنکھیں ۲

**خلاصہ تفسیر:** جن کو اللہ کی یاد (یعنی احکام کی بجا آوری) سے (جس وقت کے متعلق جو حکم ہو) اور (بالخصوص) نماز پڑھنے سے اور زکوٰۃ دینے سے (کہ یہ احکام فرعیہ میں سب سے اہم ہیں) نہ خرید غفلت میں ڈالنے پاتی ہے اور نہ فروخت (اور اطاعت وعبادت کے باوجود ان کی خشیت کا یہ حال ہے کہ) وہ ایسے دن (کی دار وگیر حساب وکتاب) سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں بہت سے دل اور آنکھیں الٹ جائیں گی (جیسا دوسری آیت میں ہے: يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ یعنی یہ لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور اس کے باوجود ان کے دل قیامت کی باز پرس سے ڈرتے رہتے ہیں اور مقصود اس سے ہدایت والوں کے اوصاف واعمال کا بیان کرنا ہے)۔

**رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ:** یہ اصل ہے ایک مشہور مقولہ: "خلوت در انجمن" کی (یعنی "دل بیار، دست بکار"، دل تو اللہ سے وابستہ رہے اور ہاتھ پیر کام میں)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی معاش کے دھندے ان کو اللہ کی یاد اور احکام الٰہیہ کی بجا آوری سے غافل نہیں کرتے، بڑے سے بڑا بیوپار یا معمولی

خرید وفروخت کوئی چیز خدا کے ذکر سے نہیں روکتی، صحابہ رضی اللہ عنہم کی یہی شان تھی۔

**فائدہ:** ۲ یعنی اس روز دل وہ باتیں سمجھ لیں گے جو ابھی تک نہ سمجھے تھے اور آنکھیں وہ ہولناک واقعات دیکھیں گی جو کبھی نہ دیکھے تھے، قلوب میں کبھی نجات کی توقع پیدا ہوگی، کبھی ہلاکت کا خوف، اور آنکھیں کبھی داہنے کبھی بائیں دیکھیں گی کہ دیکھئے کس طرف سے پکڑے جائیں، یا کس جانب سے اعمالنامہ ہاتھ میں دیا جائے۔

**لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۸﴾**

تا کہ بدلہ نہ دے ان کو اللہ ان کے بہتر سے بہتر کاموں کا اور زیادتی دے ان کو اپنے فضل سے ۱ اور اللہ روزی دیتا ہے جس کو چاہے بیشمار ۲

**خلاصہ تفسیر:** (اب اہل ہدایت کے انجام کا ذکر ہے کہ) انجام (ان لوگوں کا) یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے اعمال کا بہت ہی اچھا بدلہ دے گا (یعنی جنت) اور (علاوہ جزا کے) ان کو اپنے فضل سے اور بھی زیادہ دے گا (''بدلہ'' وہ ہے جس کا صاف صاف وعدہ ہے اور ''زیادہ'' وہ ہے جس کا صاف وعدہ نہیں اگر چہ اجمالی طور پر وعدہ ہوا ہو) اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے بے شمار (یعنی بہت کثرت سے) دے دیتا ہے (پس ان لوگوں کو جنت میں اسی طرح بے شمار دے گا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی اچھے کاموں کا جو صلہ مقرر ہے وہ ملے گا اور حق تعالیٰ کے فضل سے اور زیادہ دیا جائیگا جسکی تفصیل وتعیین ابھی نہیں کی جا سکتی۔
**فائدہ:** ۲ یعنی اس کے ہاں کیا کمی ہے، اگر جنتیوں کو بے حد وحساب عنایت فرمائے تو کچھ مشکل نہیں۔

**وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ**

اور جو لوگ منکر ہیں ان کے کام جیسے ریت جنگل میں پیاسا جانے اس کو پانی، یہاں تک کہ جب پہنچا اس پر

**لَمْ يَجِدْهُ شَيْــًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۳۹﴾**

اس کو کچھ نہ پایا اور اللہ کو پایا اپنے پاس پھر اس کو پورا پہنچا دیا اس کا لکھا، اور اللہ جلد لینے والا ہے حساب

**خلاصہ تفسیر:** یہاں تک تو ہدایت اور اہل ہدایت کا بیان تھا، اب آگے ضلالت اور اہل ضلالت کا ذکر ہے یعنی:

اور جو لوگ کافر (گمراہ اور نور ہدایت سے دور) ہیں ان کے اعمال (کافروں کی دو قسمیں ہونے کی وجہ سے یہ دو مثالوں کے مشابہ ہیں، کیونکہ ایک قسم تو وہ کفار ہیں جو آخرت اور قیامت کے قائل ہیں اور اپنے بعض اعمال پر جن کو اچھا سمجھتے ہیں آخرت میں ثواب کی امید رکھتے ہیں اور دوسری قسم وہ کفار ہیں جو آخرت اور قیامت ہی کے منکر ہیں، کفار کی پہلی قسم کے اعمال تو) ایسے ہیں جیسے ایک چٹیل میدان میں چمکتا ہوا ریت کہ پیاسا (آدمی) اس کو (دور سے) پانی خیال کرتا ہے (اور اس کی طرف دوڑتا ہے) یہاں تک کہ جب اس کے پاس آیا تو اس کو (جو سمجھ رکھا تھا) کچھ بھی نہ پایا اور (پیاس کی شدت، پھر نہایت مایوسی سے جو جسمانی اور روحانی صدمہ پہنچا اور اس سے تڑپ تڑپ کر مر گیا تو یوں کہنا چاہئے کہ بجائے پانی کے اس نے) قضاء الٰہی (یعنی موت کو وہاں) پایا سو اللہ تعالیٰ نے اس (کی عمر) کا حساب اس کو برابر سرابر چکا دیا (اور بے باق کر دیا، یعنی عمر کا خاتمہ کر دیا) اور اللہ تعالیٰ (جس چیز کی میعاد آ جاتی ہے اس کا) دم بھر میں حساب (فیصل) کر دیتا ہے (اس کو کچھ بکھیڑا نہیں کرنا پڑتا کہ دیر لگے اور میعاد سے کچھ بھی توقف ہو جائے)۔

**اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ:** یہ مضمون ایسا ہی ہے جیسے دوسری جگہ ارشاد ہے: اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ وقولہ: وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا یہ مثال پہلی قسم کے کافروں کی ہے، حاصل اس مثال کا یہ ہوا کہ جیسے پیاسا ریت کو ظاہری چمک سے پانی سمجھا، اسی طرح یہ

کافر اپنے اعمال کو ظاہری صورت سے مقبول، مفید اور نافع آخرت سمجھتے ہیں، جیسا کہ پیاسا دور سے ریت کو پانی سمجھتا ہے، مگر چونکہ ان میں ایمان نہیں جو کہ قبولیت کی شرط ہے اس لیے آخرت میں جا کر ان کو حقیقت معلوم ہوگی، جیسا کہ پیاسے کو ریت کے پاس جا کر حقیقت معلوم ہوتی ہے، اس وقت اپنی امید کے غلط ہونے پر حسرت ہوگی، اور جس طرح یہ پیاسا اپنی توقع اور امید کے غلط ہونے سے حسرت وافسوس میں نا کام ہو کر مر گیا اسی طرح یہ کافر بھی اپنی توقع کے غلط ہونے پر اس وقت حسرت میں اور ہلاکت ابدی یعنی جہنم کے عذاب میں مبتلا ہوگا۔

اَعۡمَالُهُمۡ كَسَرَابٍۢ بِقِيۡعَةٍ: یہی حالت ہے فریب خوردہ صوفیوں کے انجام کی کہ وہ اپنے اعمال واحوال کو حقائق خیال کرتے ہیں، حالانکہ وہ محض خیالات ہیں جن کی حقیقت امتحان یا موت کے وقت معلوم ہو جائے گی۔

* * *

**فائدہ:** کافر دو قسم کے ہیں: ① ایک وہ جو اپنے زعم اور عقیدہ کے موافق کچھ اچھے کام کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مرنے کے بعد کام آئیں گے، حالانکہ اگر کوئی کام بظاہر اچھا بھی ہو تو کفر کی شامت سے وہ عند اللہ مقبول ومعتبر نہیں، ان فریب خوردہ کافروں کی مثال ایسی سمجھو کہ دوپہر کے وقت جنگل میں ایک پیاسے کو دور سے پانی دکھائی دیا اور وہ حقیقت میں چمکتی ہوئی ریت تھی، پیاسا شدت تشنگی سے بیتاب ہو کر وہاں پہنچا، دیکھا تو پانی وانی کچھ نہ تھا، ہاں ہلاکت کی گھڑی سامنے تھی اور اللہ تعالیٰ عمر بھر کا حساب لینے کے لیے موجود تھا، چنانچہ اسی اضطراب وحسرت کے وقت اللہ نے اس کا سب حساب ایک دم میں چکا دیا، کیونکہ وہاں حساب کرتے کیا دیر لگتی ہے، ہاتھوں ہاتھ عمر بھر کی شرارتوں اور غفلتوں کا بھگتان کر دیا گیا۔

② دوسرے [کافر] وہ ہیں جو سر سے پاؤں تک دنیا کے مزوں میں غرق اور جہل وکفر، ظلم وعصیان کی اندھیروں میں پڑے غوطے کھا رہے ہیں ان کی مثال آگے بیان فرمائی، ان کے پاس روشنی کی اتنی بھی چمک نہیں جتنی سراب پر دھوکہ کھانے والے کو نظر آتی تھی، یہ لوگ خالص اندھیریوں اور تہ بر تہ ظلمات میں بند ہیں کسی طرف سے روشنی کی شعاع اپنے تک نہیں پہنچنے دیتے، نعوذ باللہ منہا۔

اَوۡ كَظُلُمٰتٍ فِىۡ بَحۡرٍ لُّجِّىٍّ يَّغۡشٰسهُ مَوۡجٌ مِّنۡ فَوۡقِهٖ مَوۡجٌ مِّنۡ فَوۡقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعۡضُهَا

یا جیسے اندھیرے گہرے دریا میں چڑھی آتی ہے اس پر ایک لہر اس پر ایک اور لہر اس کے اوپر بادل، اندھیرے ہیں ایک

فَوۡقَ بَعۡضٍ ؕ اِذَاۤ اَخۡرَجَ يَدَهٗ لَمۡ يَكَدۡ يَرٰٮهَا ؕ وَمَنۡ لَّمۡ يَجۡعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوۡرًا فَمَا لَهٗ مِنۡ نُّوۡرٍ ۝۴۰ ع

پر ایک ۱؎ جب نکالے اپنا ہاتھ لگتا نہیں کہ اس کو وہ سوجھے ۲؎ اور جس کو اللہ نے نہ دی روشنی اس کے واسطے کہیں نہیں روشنی ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** کافروں کی ایک قسم کی مثال تو گذشتہ آیت میں بیان ہوئی، اب دوسری قسم کے کافروں کے اعمال کی مثال ہے:

یا وہ (اعمال خصوصاً منکرین قیامت کے اعتبار سے) ایسے ہیں جیسے بڑے گہرے سمندر کے اندرونی اندھیرے (جن کا ایک سبب دریا کی گہرائی ہے اور پھر یہ) کہ اس (سمندر کی اصلی سطح) کو ایک بڑی موج نے ڈھانک لیا ہو (پھر وہ موج بھی اکیلی نہیں، بلکہ) اس (موج) کے اوپر دوسری موج (ہو، پھر) اس کے اوپر بادل (ہو جس سے ستارہ وغیرہ کی روشنی بھی نہ پہنچتی ہو، غرض) اوپر تلے بہت سے اندھیرے (ہی اندھیرے) ہیں کہ اگر (ایسی حالت میں کوئی آدمی دریا کی تہہ میں) اپنا ہاتھ نکالے (اور اس کو دیکھنا چاہے) تو (دیکھنا تو درکنار) دیکھنے کا احتمال بھی نہیں اور (آگے ان کفار کے اندھیرے میں ہونے کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ) جس کو اللہ ہی نور (ہدایت) نہ دے اس کو (کہیں سے بھی) نور نہیں (میسر آ سکتا، پس ان لوگوں کو چاہیے تھا کہ احکام الٰہی کی اتباع کا ارادہ کرتے تو اللہ تعالیٰ حسب عادت عزم وارادہ کے بعد فعل پیدا کر دیتا ہے تو ان کو نور ہدایت دے دیتا، مگر انہوں نے احکام سے اعراض کیا تو تاریکیوں میں رہ گئے، کہیں سے بھی سہارا نہ لگا)۔

اَوۡ كَظُلُمٰتٍ فِىۡ بَحۡرٍ لُّجِّىٍّ: اس دوسری مثال کا حاصل یہ ہے کہ ایسے کافر جو آخرت اور قیامت کے اور اس میں جزاء وسزا ہی کے منکر ہیں ان

کے پاس وہمی نور بھی نہیں جیسے پہلی قسم کے کافروں کے پاس ایک وہمی اور خیالی نور تھا، کیونکہ انہوں نے بعض نیک اعمال کو اپنی آخرت کا سامان سمجھا تھا مگر وہ شرط ایمان نہ ہونے کے سبب حقیقی نور نہ تھا ایک وہمی نور تھا، یہ لوگ جو منکر آخرت ہیں انہوں نے اپنے اعتقاد وخیال کے مطابق بھی کوئی کام آخرت کے لئے کیا ہی نہیں جس کے نور کا ان کو وہم وخیال ہو، غرض ان کے پاس ظلمت ہی ظلمت ہے، نور کا وہم وخیال بھی نہیں ہوسکتا جیسا کہ تہہ دریا کی مثال میں ہے، اور نظر نہ آنے میں ہاتھ کو بطور خاص شاید اس لئے ذکر کیا کہ انسانی اعضاء وجوارح میں ہاتھ نزدیک تر ہے، پھر اس کو جتنا نزدیک کرنا چاہو نزدیک آجاتا ہے اور جب ہاتھ ہی نظر نہ آیا تو دوسرے اعضاء کا معاملہ ظاہر ہے، اور مراد ان اعمال سے وہ اعمال ہیں جن کو یہ کرنے والے اپنے خیال میں اچھا سمجھتے ہیں، کیونکہ برے اعمال کے مفید نہ ہونے پر سب کا اتفاق ہے، نفع اور فائدہ کا احتمال اچھے اعمال ہی میں ہوسکتا ہے۔

وَمَنۡ لَّمۡ يَجۡعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوۡرًا: یہ اس بات کی اصل ہے کہ جس میں قبول حق کی استعداد نہیں اس میں فعل نہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی سمندر کی تہ میں خود دریا کا اندھیرا، اس پر طوفانی لہریں جو ایک پر ایک چڑھی آتی ہیں، پھر سب کو اوپر گھٹا بادل کا اندھیرا، اور رات کا وقت فرض کیا جائے تو ان اندھیریوں میں اور اضافہ ہو جائے گا۔

**فائدہ:** ۲ یعنی اپنا ہاتھ اٹھا کر آنکھوں سے قریب کر کے دیکھے تو اندھیرے کی وجہ سے نظر نہ آئے جس کو ہمارے یہاں کہتے ہیں کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں پہنچانتا۔

**فائدہ:** ۳ اوپر مومنین کے ذکر میں جو: يَهۡدِى اللّٰهُ لِنُوۡرِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ (النور: ۳۵) فرمایا تھا، یہ جملہ اس کے مقابل ہوا یعنی جس کو خدا تعالیٰ نور توفیق نہ دے اسے اور کون روشنی پہنچا سکتا ہے، ان کی استعداد خراب تھی توفیق نہ ملی، اور دریا کی تہ میں گر کر انہوں نے سب دروازے روشنی کے اپنے اوپر بند کر لیے، پھر نور آئے تو کدھر سے آئے۔

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالطَّيۡرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ

کیا تو نے نہ دیکھا کہ اللہ کی یاد کرتے ہیں جو کوئی ہیں آسمان وزمین میں اور اڑتے جانور پر کھولے ہوئے ۱

كُلٌّ قَدۡ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسۡبِيۡحَهٗ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌۢ بِمَا يَفۡعَلُوۡنَ ﴿۴۱﴾

ہر ایک نے جان رکھی ہے اپنی طرح کی بندگی اور یاد ۲ اور اللہ کو معلوم ہے جو کچھ کرتے ہیں ۳

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے ہدایت کے نور اور گمراہی کی ظلمت کی مثال تھی اور اس سے پہلے چند عملی احکام کا ذکر تھا، اب توحید اور الوہیت کے دلائل بیان کیے جاتے ہیں جو کہ علمی احکام میں سے ہے، الوہیت بمعنی عبودیت کو اگر اعتقاد وعمل کے لیے عام لیا جائے تو احکام عملی سے بھی اس میں تعرض ہوگا، اور ان سب علمی وعملی احکام کے قبول وعدم قبول کا ہدایت وگمراہی ہونا ظاہر ہے۔

(اے مخاطب!) کیا تجھ کو (دلائل اور مشاہدہ سے) معلوم نہیں ہوا کہ اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں سب جو کچھ آسمانوں اور زمین میں (مخلوقات) ہیں (خواہ زبان سے جو بعض مخلوقات میں مشاہد بھی ہے، خواہ حال سے جس کا بعض مخلوقات میں عقلی دلیل سے ہونا معلوم ہے) اور (بالخصوص) پرند (بھی) جو پر پھیلائے ہوئے (اڑتے پھرتے) ہیں (کہ ان کا خدا کے وجود پر دلالت کرنا اور زیادہ عجیب ہے کہ باوجود اپنے بدن کے بوجھ کے پھر بھی آسمان وزمین کے درمیان فضاء میں رکے ہوئے ہیں اور) سب (پرندوں) کو اپنی اپنی دعا (اور التجاء اللہ سے) اور اپنی تسبیح (وتقدیس کا طریقہ الہام سے) معلوم ہے اور (ان دلائل کے باوجود پھر بھی بعض توحید کو نہیں مانتے تو) اللہ تعالیٰ کو ان لوگوں کے سب افعال کا پورا علم ہے (اس انکار واعراض پر ان کو سزا دے گا)۔

كُلٌّ قَدۡ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسۡبِيۡحَهٗ: جانوروں کا اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا احادیث میں وارد ہے، مثلاً عالم باعمل کے لیے دعا کرنا، نیز ایک

نبی کے قصہ میں آیا ہے کہ انہوں نے ایک چیونٹی کو بارش کی دعا کرتے ہوئے دیکھا تھا، اگر اس کو حقیقت پر محمول کیا جائے جیسا کہ ظاہر یہی ہے تو اس سے جمادات وحیوانات کے لیے بھی ادراک اور دعا و تسبیح کا اثبات ہوتا ہے اور اہل کشف اسے کچھ بعید بھی نہیں سمجھتے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ شاید اڑتے جانوروں کا علیحدہ ذکر اس لیے کیا کہ وہ اس وقت آسمان اور زمین کے بیچ میں معلق ہوتے ہیں، اور ان کا اس طرح ہوا میں اڑتے رہنا قدرت کی بڑی نشانی ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی حق تعالیٰ نے ہر ایک چیز کو اس کے حال کے مناسب جو طریقہ انابت و بندگی اور تسبیح خوانی کا الہام فرمایا اس کو سمجھ کر وہ اپنا وظیفہ ادا کرتی رہتی ہے، لیکن افسوس و تعجب کا مقام ہے کہ بہت سے انسان کہلانے والے غرور و غفلت اور ظلمت جہالت میں پھنس کر مالک حقیقی کی یاد اور ادائے وظیفہ عبودیت سے بے بہرہ ہیں۔

**تنبیہ:** مخلوقات کی تسبیح کے متعلق پندرھویں پارہ [سورہ بنی اسرائیل] میں ربع کے قریب کچھ مضمون گزر چکا، وہاں دیکھ لیا جائے، ایک حدیث میں ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو تسبیح کی وصیت کی اور فرمایا: "وَاِنَّهَا لصلٰوة الْخَلْقِ" (یہ ہی مخلوق کی نماز ہے)

**فائدہ:** ۳؎ یعنی ان کی بندگی اور تسبیح کو خواہ تم نہ سمجھو، لیکن حق تعالیٰ کو سب معلوم ہے کہ کون کیا کرتا ہے۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۴۲﴾

اور اللہ کی حکومت ہے آسمان اور زمین میں، اور اللہ ہی تک پھر جانا ہے

**خلاصہ تفسیر:** اور اللہ ہی کی حکومت ہے آسمانوں اور زمین میں (اب بھی) اور (انتہا میں بھی، چنانچہ) اللہ ہی کی طرف (سب کو) لوٹ کر جانا ہے (اس وقت بھی پوری حکومت اسی کی ہوگی)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جیسے اس کا علم سب کو محیط ہے، اس کی حکومت بھی تمام علویات و سفلیات پر حاوی ہے، اور سب کو آخر کار اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔

**ربط:** آگے اپنے حاکمانہ اور قادرانہ تصرفات کو بیان فرماتے ہیں:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ

تو نے نہ دیکھا کہ اللہ ہانک لاتا ہے بادل کو پھر ان کو ملا دیتا ہے پھر ان کو رکھتا ہے تہ بتہ پھر تو دیکھے مینہ نکلتا ہے اس کے بیچ سے ۱؎

وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ؕ

اور اتارتا ہے آسمان سے اس میں جو پہاڑ ہیں اولوں کے پھر وہ ڈالتا ہے جس پر چاہے اور بچا دیتا ہے جس سے چاہے ۲؎

يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ﴿۴۳﴾ؕ

ابھی اس کی بجلی کی کوند لے جائے آنکھوں کو ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** (چنانچہ اس کی حکومت کا ایک اثر بیان کیا جاتا ہے وہ یہ کہ اے مخاطب!) کیا تجھ کو یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ (ایک) بادل کو (دوسرے بادل کی طرف) چلتا کرتا ہے (اور) پھر اس بادل (کے مجموعہ) کو باہم ملا دیتا ہے، پھر اس کو تہ بہ تہ کرتا ہے، پھر تو بارش کو

دیکھتا ہے کہ اس (بادل) کے بیچ میں سے نکل (نکل کر) آتی ہے اور اسی بادل سے یعنی اس کے بڑے بڑے حصوں میں سے اولے برساتا ہے، پھر ان کو جس (کی جان پر یا مال) پر چاہتا ہے گراتا ہے (جس سے اس کا نقصان ہو جاتا ہے) اور جس سے چاہتا ہے اس کو ہٹا دیتا ہے (اور اس کے جان و مال کو بچا لیتا ہے اور) اس بادل (میں سے بجلی بھی پیدا ہوتی ہے اور ایسی چمکدار کہ اس بادل) کی بجلی کی چمک کی یہ حالت ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس نے اب بینائی کو اچک لیا (یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے تصرفات میں سے ہے)۔

وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ جِبَالٍ: یہاں ''سماء'' کے معنی بادل کے ہیں اور اس کے بڑے بڑے حصوں کو پہاڑ سے تشبیہ دی، چنانچہ محاورہ میں کہتے ہیں کہ فلاں شخص کے پاس سونے کا پہاڑ ہے، یعنی بڑا سونا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ابتداء میں بادل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اٹھتے ہیں پھر مل کر بڑا بادل بن جاتا ہے، پھر بادلوں کی تہ پر تہ جمادی جاتی ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جیسے زمین میں پتھروں کے پہاڑ ہیں، بعض سلف نے کہا کہ اسی طرح آسمان میں اولوں کے پہاڑ ہیں، مترجم رحمہ اللہ نے اسی کے موافق ترجمہ کیا ہے، لیکن زیادہ راجح اور قوی یہ ہے کہ سماء سے بادل مراد ہو، مطلب یہ ہے کہ بادلوں سے جو کثیف اور بھاری ہونے میں پہاڑوں کی طرح ہیں، اولے برساتا ہے جس سے بہتوں کو جانی یا مالی نقصان پہنچ جاتا ہے اور بہت سے محفوظ رکھے جاتے ہیں، مشہور ہے کہ اولے کی چھال بیل کے ایک سینگ پر پڑتی ہے اور دوسرا سینگ خشک رہ جاتا ہے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی بجلی کی چمک اس قدر تیز ہوتی ہے کہ آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں، قریب ہے کہ بینائی جاتی رہے۔

يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰ لِكَ لَعِبۡرَةً لِّاُولِى الۡاَبۡصَارِ ۞۴۴

اللہ بدلتا ہے رات اور دن کو ۱؎ اس میں دھیان کرنے کی جگہ ہے آنکھ والوں کو ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اور نیز) اللہ تعالیٰ رات اور دن کو بدلتا رہتا ہے (یہ تبدیلیاں بھی حق تعالیٰ ہی کے حکم سے ہیں) اس (سب مجموعہ) میں اہل دانش کے لئے استدلال (کا موقع) ہے (جس سے وہ خدا کی توحید اور اس کی حکومت پر استدلال کرتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن اسی کی قدرت سے آتا ہے، وہ ہی کبھی رات کو کبھی دن کو گھٹاتا بڑھاتا رہتا ہے، اور ان کی گرمی کو سردی سے، سردی کو گرمی سے تبدیل کرتا ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی چاہیے کہ قدرت کے ایسے عظیم الشان نشانات دیکھ کر آدمی بصیرت و عبرت حاصل کرے اور اس شہنشاہِ حقیقی کی طرف سچے دل سے رجوع ہو جس کے قبضہ میں ان تمام تصرفات و تقلبات کی باگ ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنۡ مَّآءٍ ۚ فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّمۡشِىۡ عَلٰى بَطۡنِهٖ ۚ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّمۡشِىۡ عَلٰى

اور اللہ نے بنایا ہر پھرنے والے کو ایک پانی سے ۱؎ پھر کوئی ہے کہ چلتا ہے اپنے پیٹ پر ۲؎ اور کوئی ہے کہ چلتا ہے

رِجۡلَيۡنِ ۚ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّمۡشِىۡ عَلٰٓى اَرۡبَعٍ ؕ يَخۡلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ۞۴۵

دو پاؤں پر ۳؎ اور کوئی ہے کہ چلتا ہے چار پر ۴؎ بناتا ہے اللہ جو چاہتا ہے، بیشک اللہ ہر چیز کر سکتا ہے ۵؎

خلاصہ تفسیر: اور اللہ (ہی کا یہ تصرف بھی ہے کہ اس) نے ہر چلنے والے جاندار کو (برّی ہو یا بحری) پانی سے پیدا کیا ہے پھر ان

(جانوروں) میں بعض تو وہ (جانور) ہیں جو اپنے پیٹ کے بل چلتے ہیں (جیسے سانپ اور مچھلی) اور بعض ان میں وہ ہیں جو دو پیروں پر چلتے ہیں (جیسے انسان اور پرندے جبکہ ہوا میں نہ ہوں) اور بعض ان میں وہ جو چار (پیروں) پر چلتے ہیں (جیسے مواشی چوپائے اور بعضوں کے اس سے بھی زیادہ پیر ہیں، اصل یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے بناتا ہے، بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پورا قادر ہے (اس کو کچھ بھی مشکل نہیں)۔

***

**فائدہ:** ۱ اس کے لیے سترھویں پارہ کے تیسرے رکوع میں آیت: وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ کا فائدہ دیکھنا چاہیے۔
**فائدہ:** ۲ جیسے سانپ اور مچھلی۔ **فائدہ:** ۳ جیسے آدمی اور طیور۔ **فائدہ:** ۴ جیسے گائے بھینس وغیرہ۔
**فائدہ:** ۵ یعنی کسی جانور کو چار سے زائد پاؤں دیے ہوں تو بعید نہیں، اس کی لامحدود قدرت ومشیت کو کوئی محصور نہیں کر سکتا۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۶﴾

ہم نے اتاریں آیتیں کھول کھول کر بتلانے والی، اور اللہ چلائے جس کو چاہے سیدھی راہ پر

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے توحید اور وجود خدا کے دلائل مذکور تھے، اب ان کی تعلیم پر عام احسان ظاہر کرتے ہیں، کیونکہ یہ سب کے لیے نازل ہوئے ہیں اور عمل کی توفیق پر خاص احسان جتلاتے ہیں، کیونکہ عمل کرنے والے خاص ہی لوگ ہوتے ہیں۔

ہم نے (حق کے) سمجھانے والے دلائل (عام ہدایت کے لئے) نازل فرمائے ہیں اور (ان عام لوگوں میں سے) جس کو اللہ چاہتا ہے راہ راست کی طرف (خاص) ہدایت فرماتا ہے (کہ وہ حق تعالیٰ کے علمی حقوق یعنی صحیح اعتقاد رکھتے ہیں اور عملی حقوق یعنی اطاعت کو بجالاتے ہیں، ورنہ بہت سے محروم ہی رہتے ہیں)۔

چند آیات قبل بھی ایک ایسی ہی آیت گذر چکی ہے مگر تکرار کچھ نہیں، کیونکہ دونوں جگہ پہلے مضمونوں کی تاکید او آئندہ کی تمہید مقصود ہے۔

***

**فائدہ:** یعنی آیات تکوینیہ وتنزیلیہ تو اس قدر واضح ہیں کہ انھیں دیکھ کر اور سن کر چاہیے کوئی آدمی نہ بہکے لیکن سیدھی راہ پر چلتا وہ ہی ہے جسے خدا تعالیٰ نے ہدایت کی توفیق دی ہو، لاکھوں آدمی یہ کھلی کھلی نشانیاں دیکھتے ہیں پر نتیجہ کے اعتبار سے ان کا دیکھنا نہ دیکھنا برابر ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ

اور لوگ کہتے ہیں ہم نے مانا اللہ کو اور رسول کو اور حکم میں آگئے پھر جاتا ہے ایک فرقہ ان میں سے اس کے پیچھے

وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾

اور وہ لوگ نہیں ماننے والے

**خلاصہ تفسیر:** گذشتہ آیت میں بعض کا ہدایت پر ہونا اور بعض کا ہدایت پر نہ ہونا اجمالاً بیان کیا، اب ان کی تفصیل ہے۔

اور یہ منافق لوگ (زبان سے) دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور رسول پر ایمان لے آئے اور (خدا اور سول کا) حکم (دل سے) مانا پھر اس کے بعد (جب عمل کر کے اپنا دعویٰ ثابت کرنے کا وقت آیا تو) ان میں کا ایک گروہ (جو بہت زیادہ شریر ہے خدا اور سول کے حکم سے) سرتابی کرتا ہے (اس وقت سے وہ صورت مراد ہے کہ جب ان کے ذمہ کسی کا حق چاہتا ہو اور صاحب حق اس منافق سے یہ کہے کہ چلو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مقدمہ لے چلیں اس موقع پر یہ انکار کرتے ہیں، کیونکہ جانتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجلاس میں جب حق ثابت ہو جائے گا تو آپ اسی کے موافق آپ فیصلہ کریں گے جیسا عنقریب آیت وَاِذَا دُعُوْٓا میں بھی اس موقع کا یہی بیان آتا ہے) اور یہ لوگ بالکل ایمان نہیں رکھتے (یعنی دل میں تو کسی منافق کے بھی ایمان

نہیں ،مگر ان کا تو وہ ظاہری ملمع شدہ ایمان بھی نہ رہا جیسا اس آیت میں ہے: وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ اور اس آیت میں ہے: قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ )۔

**ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ**: تمام منافقین ایسے ہی تھے لیکن یہاں بطور خاص ایک فریق کو اس لیے ذکر فرمایا کہ غریب غربا میں اگر چہ دلی نفرت کے باوجود صاف انکار ظاہر کرنے کی جرات و ہمت نہیں ہوا کرتی اور یہ کام وہی لوگ کرتے ہیں جن کو کچھ وجاہت اور قوت حاصل ہو۔

**وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ**: اس میں ان لوگوں کے حال کی طرف بھی اشارہ ہے جو دل سے مشائخ و بزرگوں کا انکار کرتے ہیں اور زبان سے باتیں بناتے ہیں (یعنی ان لوگوں کی طرف جو بزرگان دین اور اولیاء کرام سے ظاہر میں تو بڑی محبت جتاتے ہیں ،لیکن اندر میں بغض چھپائے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی یہ ظاہری محبت بھی ان کے کسی کام نہیں آتی )۔

* * *

**فائدہ**: یہ منافقین کا ذکر ہے، وہ زبان سے دعوے ایمان واطاعت کیا کرتے تھے اور جب عمل کا وقت آتا تو پھر جاتے ،حقیقت یہ ہے کہ ان کے دلوں میں شروع سے ایمان وانقیاد موجود ہی نہ تھا، جو کچھ زبانی جمع خرچ تھا امتحان وابتلاء کے وقت اس کی بھی قلعی کھل جاتی تھی۔

**وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۸﴾**

اور جب ان کو بلائے اللہ اور رسول کی طرف کہ ان میں قضیہ چکائے تبھی ایک فرقہ کے لوگ ان میں منہ موڑتے ہیں

**وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ﴿۴۹﴾**

اور اگر ان کو کچھ پہنچتا ہو ( حق ملتا ہو ) تو چلے آئیں اس کی طرف قبول کر کر

**خلاصہ تفسیر**: اور (ان کے انکار اور سرکشی کا بیان یہ ہے کہ ) یہ لوگ جب اللہ اور اس کے رسول کی طرف اس غرض سے بلائے جاتے ہیں کہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے (اور ان کے خصم یعنی فریق مخالف کے ) درمیان میں فیصلہ کردیں تو ان میں کا ایک گروہ (وہاں حاضر ہونے سے ) پہلو تہی کرتا ہے (اور ٹالتا ہے اور یہ بلانا اگر چہ رسول ہی کی طرف ہے مگر چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ حکم خداوندی کی بناء پر ہوتا ہے،اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف بھی نسبت کردی گئی ،غرض جب ان کے ذمہ کسی کا حق چاہتا ہے تب تو ان کی یہ حالت ہوتی ہے ) اور اگر (اتفاق سے ) ان کا حق (کسی دوسرے کے ذمہ ہو) تو سر تسلیم خم کئے ہوئے (بے تکلف آپ کے بلانے پر ) آپ کے پاس چلے آتے ہیں ( کیونکہ اطمینان ہوتا ہے کہ وہاں حق کا فیصلہ ہوگا اس میں ہمارا فائدہ ہے )۔

* * *

**فائدہ**: یعنی اگر ان کا جھگڑا کسی سے ہوگیا اور سمجھتے ہوں کہ ہم ناحق پر ہیں اس وقت اگر دوسرا فریق کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چل کر اس معاملہ کو طے کرالو تو یہ منافق رضامند نہیں ہوتے ، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر یقیناً بلارورعایت حق کے موافق فیصلہ کریں گے، جو ان کے مفاد کے خلاف پڑے گا، حالانکہ پہلے سے یہ دعویٰ کررہے تھے کہ ہم اللہ ورسول پر ایمان لانے اور ان کا حکم ماننے کو تیار ہیں ،اب وہ دعویٰ کہاں گیا، ہاں فرض کیجئے اگر کسی معاملہ میں حق ان کی جانب ہو تو اس وقت بہت جلدی سے گردن جھکا کر بارگاہ نبوت میں حاضر ہوجائیں اور فیصلہ کا انحصار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک پر کردیں گے، کیونکہ سمجھتے ہیں عدالت سے ہمارے موافق فیصلہ ہوگا، تو یہ ایمان واسلام کیا ہوا، محض ہوا پرستی ہوئی۔

**اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ۭ**

کیا ان کے دلوں میں روگ ہے ۔یا دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں، یا ڈرتے ہیں کہ بے انصافی کرے گا ان پر اللہ اور اس کا رسول

بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۵۰﴾

کچھ نہیں وہ ہی لوگ بے انصاف ہیں ۲۔

**خلاصہ تفسیر:** اب ان لوگوں کے اعراض اور حاضر نہ ہونے کی وجہ واسباب چند احتمالات کے طور پر بیان کرتے ہیں کہ تحقیق کرنی چاہیے کہ اس بے رخی کا سبب کیا ہے؟ سو چند اسباب بیان فرما کر ایک سبب کی تعیین کرتے ہیں۔

آیا (اس اعراض کا سبب یہ ہے کہ) ان کے دلوں میں (کفر یقینی کا) مرض ہے (یعنی ان کو اس کا یقین ہے کہ آپ اللہ کے رسول نہیں) یا یہ (نبوت کی طرف سے) شک میں پڑے ہیں (کہ رسول نہ ہونے کا یقین تو نہیں مگر رسول ہونے کا بھی یقین نہیں) یا ان کو یہ اندیشہ ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ان پر ظلم کرنے لگیں (اور ان کے ذمہ جتنا حق ہے اس سے زائد دلا دیں، سو واقعہ یہ ہے کہ ان اسباب میں سے اس بے رخی کا کوئی بھی سبب) نہیں (ہے) بلکہ (اصلی سبب یہ ہے کہ) یہ لوگ (ان مقدمات میں) برسر ظلم (ہوتے) ہیں (اس لئے حضور نبوی میں مقدمہ لانا پسند نہیں کرتے کہ ہم ہار جائیں گے اور باقی اسباب سابقہ سب منفی ہیں)۔

کیونکہ اگر چہ ان کے دلوں میں کفر اور شک یقینا تھا، لیکن مقدمہ نہ لانے کا یہ سبب نہیں ہوسکتا، اگر یہ سبب ہوتا تو چاہیے تھا کہ جب اپنا حق ہوتا جب بھی مقدمہ نہ لاتے، اور ظلم کا خوف بھی جب نہیں ہوسکتا، کیونکہ حضور ﷺ کا عدل وصدق وامانت وغیرہ مخالفین کے نزدیک بھی مسلم تھا، تو حضور کے پاس اس حالت میں مقدمہ لانا نہیں چاہتے کہ ہم ہار جائیں گے، ہاں! جب خود مظلوم ہوں تو مقدمہ لے آتے ہیں تو اس انکار کا اصلی سبب ظالم ہونا ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ے روگ یہ کہ خدا اور رسول کو سچ مانا لیکن حرص نہیں چھوڑتی کہ کہے پر چلیں جیسے بیمار چاہتا ہے چلے اور پاؤں نہیں اٹھتا۔

**فائدہ:** ۲ے یعنی خدا اور رسول کی بابت کوئی دھوکہ لگا ہوا ہے اور حضور ﷺ کی صداقت یا اللہ کے وعدہ وعید میں کوئی شک وشبہ ہے؟ یا یہ گمان ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ان کے معاملات کا خلاف انصاف فیصلہ کریں گے؟ اس لیے ان کی عدالت میں مقدمہ لے جانے سے کتراتے ہیں، سو یاد رکھو وہاں تو ظلم وبے انصافی کا احتمال ہی نہیں، ہاں خود ان ہی لوگوں نے ظلم پر کمر باندھ رکھی ہے، چاہتے ہیں کہ اپنا حق پورا وصول کرلیں اور دوسروں کا ایک پیسہ نہ دیں، اسی لیے ان معاملات کو خدائی عدالت میں لانے سے گھبراتے ہیں جن میں سمجھتے ہیں کہ رسول کا منصفانہ فیصلہ ہمارے مطلب کے خلاف ہوگا، یہ تو منافقین کا ذکر تھا، آگے ان کے بالمقابل مخلصین کی اطاعت وفرمانبرداری کو بیان فرماتے ہیں۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا

ایمان والوں کی بات یہی تھی (ہے) کہ جب بلائے ان کو اللہ اور رسول کی طرف فیصلہ کرنے کو ان میں تو کہیں

سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵۱﴾

ہم نے سن لیا اور حکم مان لیا، اور وہ لوگ کہ انہی کا بھلا ہے

**خلاصہ تفسیر:** اب مسلمانوں کا حال اور قول مذکور ہے جس سے منافقین پر بھی تعریض ہے کہ دعویٰ ایمان کا تقاضا تو یہ ہے جو مسلمانوں سے ظاہر ہوا، پس ارشاد ہے:

مسلمانوں (کی شان اور ان) کا قول تو جب ان کو (کسی مقدمہ میں) اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے یہ ہے کہ وہ (خوشی خوشی) کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے (تمہارا کلام) سن لیا اور (اس کو) مان لیا (اور پھر بلانے کے بعد فوراً چلے جاتے ہیں، حاضری سے انکار نہیں کرتے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ ان کا ایمان واطاعت کا دعویٰ دنیا میں بھی سچا ہے) اور ایسے (ہی) لوگ (آخرت میں میں بھی) فلاح پائیں گے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی سچے مسلمان کا کام یہ ہوتا ہے اور یہ ہونا چاہیے کہ جب کسی معاملہ میں ان کو خدا اور رسول کی طرف بلایا جائے خواہ اس میں بظاہر ان کا نفع ہو یا نقصان، ایک منٹ کا توقف نہ کریں، فی الفور "سمعاً و طاعة" کہہ کر حکم ماننے کے لیے تیار ہو جائیں، اسی میں ان کی اصلی بھلائی اور حقیقی فلاں کا راز مضمر ہے۔

وَمَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَيَخۡشَ اللّٰهَ وَيَتَّقۡهِ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡفَآئِزُوۡنَ ۝٥٢

اور جو کوئی حکم پر چلے اللہ کے اور اس کے رسول کے اور ڈرتا ہے اللہ سے اور بچ کر چلے اس سے سو وہ ہی لوگ ہیں مراد کو پہنچنے والے

**خلاصہ تفسیر:** اور (ہمارے یہاں کا تو قاعدہ کلیہ ہے کہ) جو شخص اللہ اور اس کے رسول کا کہنا مانے اور اللہ سے ڈرے اور اس کی مخالفت سے بچے بس ایسے لوگ بامراد ہوں گے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جو فی الحال فرمانبردار ہو، گذشتہ تقصیرات پر نادم ہو کر اور خدا سے ڈر کر توبہ کرے اور آئندہ برے راستہ سے بچ کر چلے، اسی کے لیے دنیا و آخرت کی کامیابی ہے۔

وَاَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَيۡمَانِهِمۡ لَـئِنۡ اَمَرۡتَهُمۡ لَيَخۡرُجُنَّ ؕ قُلْ لَّا تُقۡسِمُوۡا ۚ

اور قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی اپنی تاکید کی (سخت) قسمیں کہ اگر تو حکم کرے تو سب کچھ چھوڑ کر نکل جائیں، تو کہہ قسمیں نہ کھاؤ

طَاعَةٌ مَّعۡرُوۡفَةٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ۝٥٣

حکم برداری چاہیے جو دستور (کے موافق) ہے، البتہ اللہ کو خبر ہے جو تم کرتے ہو

**خلاصہ تفسیر:** اور (ان منافقین کی یہ حالت ہے کہ) وہ لوگ بڑا زور لگا کر قسمیں کھایا کرتے ہیں کہ واللہ! (ہم ایسے فرمانبردار ہیں کہ) اگر آپ ان کو (یعنی ہم کو) حکم دیں (کہ گھر بار سب چھوڑ دو یا یہ کہ جہاد کے لیے نکلو) تو وہ (یعنی ہم) ابھی (سب چھوڑ چھاڑ) نکل کھڑے ہوں (یعنی ہم سب کو چھوڑ چھاڑ دیں، یا یہ کہ جہاد کے لیے فورا نکل کھڑے ہوں) آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ بس قسمیں نہ کھاؤ (تمہاری) فرمانبرداری کی حقیقت معلوم ہے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی پوری خبر رکھتا ہے (اور اس نے مجھ کو بتلا دیا ہے جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے: قُلْ لَّا تَعۡتَذِرُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَـكُمۡ قَدۡ نَـبَّاَنَا اللّٰهُ مِنۡ اَخۡبَارِكُمۡ)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی منافقین بڑی سخت تاکیدی قسمیں کھا کر آپ کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ہم کو آپ حکم دیں تو سب گھر بار چھوڑ کر خدا کے راستہ میں نکل جانے کے لیے تیار ہیں ذرا حضور ﷺ اشارہ فرمائیں تو سب مال و دولت اللہ کے راستہ میں لٹا کر الگ ہو جائیں، اس پر فرمایا کہ اس قدر منہ بھر کر لمبی چوڑی قسمیں کھانے کی ضرورت نہیں، تمہاری فرمانبرداری کی حقیقت سب معلوم ہو چکی کہ زبان سے دعوے بہت کیا کرتے ہو، اور عمل کا وقت آئے تو آہستہ سے کھسک جاتے ہو، چاہیے کہ سچے مسلمانوں کے دستور کے موافق حکمبرداری کر کے دکھلاؤ زبانی قسمیں کھانے سے کوئی فائدہ نہیں، فرض کرو تم قسمیں کھا کر بندوں کو اپنی بات کا یقین دلا دو، لیکن اللہ کے آگے کسی کی چالاکی اور فریب نہیں چل سکتا، وہ تو تمام ظاہر اور پوشیدہ باتوں کی خبر رکھتا ہے، آگے چل کر تمہاری مکاری کا پردہ فاش کر دے گا۔

قُلۡ اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَيۡهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيۡكُمۡ مَّا حُمِّلۡتُمۡ ؕ

تو کہہ حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا، پھر اگر تم منہ پھیرو گے تو اس کا (رسول کا) ذمہ ہے جو بوجھ اس پر رکھا اور تمہارا ذمہ ہے جو بوجھ تم پر رکھا

وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۵۴﴾

اور اگر اس کا کہا مانو تو راہ پاؤ، اور پیغام لانے والے کا ذمہ نہیں مگر پہنچا دینا کھول کر

**خلاصہ تفسیر:** (اور) آپ (ان سے) کہئے کہ (باتیں بنانے سے کام نہیں چلتا، کام کرو، یعنی) اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو (آگے اللہ تعالیٰ اس مضمون کے اہتمام کے لیے خود ان لوگوں کو خطاب فرماتے ہے کہ رسول کے اس کہنے کے اور تبلیغ کے بعد) پھر اگر تم لوگ (اطاعت سے) روگردانی کرو گے تو سمجھ رکھو کہ (رسول کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ) رسول کے ذمہ وہی تبلیغ (کا کام) ہے جس کا ان پر بار رکھا گیا ہے (جس کو وہ کر چکے اور سبکدوش ہو گئے) اور تمہارے ذمہ وہ (اطاعت کا کام) ہے جس کا تم پر بار رکھا گیا ہے (جس کو تم نہیں بجالائے، پس تمہارا ہی نقصان ہوگا) اور اگر (روگردانی نہ کی بلکہ) تم نے ان کی اطاعت کر لی (جو عین اللہ ہی کی اطاعت ہے) تو راہ پر جا لگو گے اور (بہرحال) رسول کے ذمہ صرف صاف طور پر پہنچا دینا ہے (آگے تم سے باز پرس ہوگی کہ قبول کیا یا نہیں)۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ: اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ جو شخص خود اعراض کرے تو شیخ و استاذ کو اس کے پیچھے لگ جانا مناسب نہیں، شیخ و استاذ کا کام صرف تبلیغ کر دینا تھا۔

وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا: روح المعانی میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت سے حقائق منکشف ہوجاتے ہیں جو حاصل ہے راہ یاب ہونے کا (کیونکہ تھتدوا کا انجام حقیقت تک پہنچ جانا ہے، یعنی جو کوئی متبع سنت ہوگا دنیا و آخرت کی حقیقتیں اس پر ظاہر ہوجائیں گی)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی پیغمبر ﷺ پر خدا کی طرف سے تبلیغ کا جو بوجھ رکھا گیا ہے، سو اس نے پوری طرح ادا کر دیا، اور تم پر جو بوجھ ڈالا گیا وہ تصدیق و قبول حق کا ہے، اور یہ کہ اس کے ارشاد کے موافق چلو، اگر تم اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے اس کے احکام کی تعمیل کرو گے تو کامیابی دارین کی راہ پاؤ گے اور دنیا و آخرت میں خوش رہو گے ورنہ پیغمبر کا کچھ نقصان نہیں، تمہاری شرارت و سرکشی کا خمیازہ تم کو ہی بھگتنا پڑے گا، پیغمبر تو اپنا فرض ادا کر کے عند اللہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو چکے، آگے اطاعت رسول کے بعض ثمرات بیان فرماتے ہیں جن کا سلسلہ دنیا ہی میں شروع ہوجائے گا۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ

وعدہ کر لیا اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں ایمان لائے ہیں اور کیے ہیں انہوں نے نیک کام، البتہ پیچھے (بعد کو) حاکم کر دے گا ان کو ملک میں

كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ

جیسا حاکم کیا تھا ان سے اگلوں کو، اور جمادے گا ان کے لیے دین ان کا جو پسند کر دیا ان کے واسطے

وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِىْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِىْ شَيْــًٔا ؕ

اور دے گا ان کو ان کے ڈر کے بدلے میں امن، میری بندگی کریں گے شریک نہ کریں گے میرا کسی کو ۱

وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۵۵﴾

اور جو کوئی ناشکری کرے گا اس کے پیچھے سو وہ ہی لوگ ہیں نافرمان ۲

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے ہدایت کی پیروی کرنے پر تعریف اور گمراہی کی پیروی پر مذمت مذکور تھی، اب ہدایت و گمراہی پر بعض

وعدے اور وعیدیں دنیا و آخرت کے متعلق بیان کیے جاتے ہیں۔

(اے مجموعہ امت!) تم میں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں (یعنی اللہ کے بھیجے ہوئے نور ہدایت کا کامل اتباع کریں) ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو (اس اتباع کی برکت سے) زمین میں حکومت عطا فرمائے گا جیسا ان سے پہلے (اہل ہدایت) لوگوں کو حکومت دی تھی (مثلاً بنی اسرائیل کو فرعون اور اس کی قوم قبطیوں پر غالب کیا، پھر ملک شام میں عمالقہ جیسی بہادر قوم پر ان کو غلبہ عطا فرمایا اور مصر و شام کی حکومت کا ان کو وارث بنایا) اور (مقصود اس حکومت دینے سے یہ ہوگا کہ) جس دین کو (اللہ تعالیٰ نے) ان کے لئے پسند کیا ہے (یعنی اسلام جیسا کہ دوسری آیت میں ہے :وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا) اس کو ان کے (نفع آخرت کے) لئے قوت دے گا اور (ان کو جو دشمنوں سے طبعی خوف ہے) ان کے اس خوف کے بعد اس کو امن سے بدل دے گا بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں (اور) میرے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کریں (نہ جلی نہ خفی جس کو ریاء کہتے ہیں، غرض اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ مشروط ہے دین پر پوری طرح ثابت قدم رہنے کے ساتھ اور یہ وعدہ تو دنیا میں ہے اور آخرت میں ایمان اور عمل صالح پر جو جزائے عظیم اور دائمی راحت کا وعدہ ہے وہ اس کے علاوہ ہے) اور جو شخص بعد (ظہور) اس (وعدہ) کے ناشکری کرے گا (یعنی دین کے خلاف راستہ اختیار کرے گا) تو (ایسے شخص کے لئے یہ وعدہ نہیں، کیونکہ) یہ لوگ نافرمان ہیں (اور وعدہ حکم بجالانے والوں اور فرمانبرداروں کے لئے ہے، اس لئے ان سے دنیا میں بھی وعدہ حکومت دینے کا نہیں ہے اور آخرت کا عذاب اس کے علاوہ ہے، غرض کہ ہدایت کی پیروی وہ چیز ہے جس سے دونوں جہاں میں خدا کی معیت نصیب ہوتی ہے اور گمراہی کے اتباع سے دونوں میں خدا سے دوری ہوتی ہے)۔

**وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ** :غرض یہ وعدہ تمام امت سے اس شرط پر ہے کہ دین میں پختہ رہیں اور اس پر جمے رہیں جس کا ظہور زمانہ نبوی سے شروع ہوا، اور خلفائے راشدین کی خلافت تک مستقل طور پر باقی رہا، چنانچہ جزیرہ عرب آپ ﷺ ہی کے زمانہ میں اور دیگر ممالک خلفاء راشدین کے زمانہ میں فتح ہو گئے اور بعد میں بھی وقتاً فوقتاً دوسرے نیک خلفاء اور بادشاہوں کے حق میں اس کا ظہور ہوتا رہا اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ کافروں اور فاسقوں کو سلطنت نہ ملے گی، بلکہ مقصود یہ ہے کہ ایسی حکومت جس سے دین کو قوت ہو اور کفر مغلوب ہو اسی وقت عطا ہوگی جبکہ ایمان اور عمل صالح میں پختگی ہو اور ظاہر ہے کہ فاسقوں کی حکومت سے دین کو کامل غلبہ نہیں ہوا، کیونکہ ان کے ساتھ خدا کی تائید کم تھی، دوسرے فاسق بادشاہوں کے افعال کا رعایا پر بھی خاص اثر پڑتا ہے، جس سے بہت لوگوں میں دینی کمزوری پیدا ہو جاتی ہے اگرچہ تھوڑی بہت دین کی خدمت ان سے بھی ہوئی، کیونکہ حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ اس دین کی خدمت فاسقوں سے بھی لے لیتا ہے: "إن الله ليؤ يد هذا الدين بالرجل الفاجر" پس اس آیت سے خلفاء راشدین کی مدح اور ان کی خلافت کا صحیح ہونا ظاہر ہے، کیونکہ ان کے وقت میں دین کا غلبہ ہونا اور مسلمانوں کا سب اوصاف میں پختہ ہونا آفتاب کی طرح مشہور ہے، اور یہ وعدہ دنیا میں ہے اور آخرت میں ایمان و اعمال صالحہ پر ثواب کا وعدہ ہے وہ الگ ہے۔

* * *

**فائدہ:** لہ یہ خطاب فرمایا حضرت ﷺ کے وقت کے لوگوں کو یعنی جو ان میں اعلیٰ درجہ کے نیک اور رسول کے کامل متبع ہیں رسول کے بعد ان کو زمین کی حکومت دے گا اور جو دین اسلام خدا کو پسند ہے ان کے ہاتھوں سے دنیا میں ان کو قائم کرے گا، گویا جیسا کہ لفظ استخلاف میں اشارہ ہے وہ لوگ محض دنیاوی بادشاہوں کی طرح نہ ہوں گے، بلکہ پیغمبر کے جانشین ہو کر آسمانی بادشاہت کا اعلان کریں گے اور دین حق کی بنیادیں جمائیں گے اور خشکی و تری میں اس کا سکہ بٹھلا دیں گے، اس وقت مسلمانوں کو کفار کا خوف مرعوب نہ کرے گا وہ کامل امن و اطمینان کے ساتھ اپنے پروردگار کی عبادت میں مشغول رہیں گے اور دنیا میں امن و امان کا دور دورہ ہوگا، اور ان مقبول و معزز بندوں کی ممتاز شان یہ ہوگی کہ وہ خالص خدائے واحد کی بندگی کریں گے جس میں ذرہ برابر شرک کی آمیزش نہ ہوگی، شرک جلی کا تو وہاں ذکر کیا ہے شرک خفی کی ہوا بھی ان کو نہ پہنچے گی، صرف ایک خدا کے غلام ہوں گے، اسی سے ڈریں گے اسی سے امید رکھیں گے، اسی پر بھروسہ کریں گے اسی کی رضا میں ان کا جینا اور مرنا ہوگا، کسی دوسری ہستی کا خوف و ہراس ان کے پاس نہ پھٹکے گا، نہ کسی دوسرے کی خوشی ناخوشی کی پروا کریں گے، الحمد للہ، کہ یہ وعدہ الٰہی چاروں خلفاء رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں پر پورا ہوا، اور دنیا نے اس عظیم الشان

پیشین گوئی کے ایک ایک حرف کا مصداق اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، خلفائے اربعہ کے بعد بھی کچھ بادشاہان اسلام وقتاً فوقتاً اس نمونہ کے آتے رہے اور جب اللہ چاہے گا آئندہ بھی آئیں گے، احادیث سے معلوم ہوا کہ آخری خلیفہ حضرت امام مہدی رضی اللہ عنہ ہوں گے جن کے متعلق عجیب وغریب بشارات سنائی گئی ہیں، وہ خدا کی زمین کو عدل وانصاف سے بھر دیں گے اور خارق عبادت جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعہ سے اسلام کا کلمہ بلند کریں گے، اَللّٰهُمَّ احْشُرْنَا فِيْ زُمْرَتِهٖ وَارْزُقْنَا شَهَادَةً فِيْ سَبِيْلِكَ اِنَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ وَذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔

**تنبیه:** اس آیت استخلاف سے خلفائے اربعہ کی بڑی بھاری فضیلت ومنقبت نکلتی ہے، ابن کثیرؒ نے اس کے تحت میں عہد نبوت سے لے کر عہد عثمانی تک کی فتوحات کو درجہ بدرجہ بیان کیا ہے اور آخر میں یہ الفاظ لکھے ہیں: "وَجُبِيَ الْخَرَاجُ مِنَ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ اِلٰى حَضْرَةِ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ عُثْمَانُ بِنْ عَفَانِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ وَذٰلِكَ بِبَرْكَةِ تِلَاوَتِهٖ وَدَرَاسَتِهٖ وَجَمْعه الْاُمَّةِ عَلٰى حِفْظِ الْقُرْاٰنِ وَلِهٰذَا ثَبَتَ فِي الصَّحِيْحِ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ اِنَّ اللهَ زَوٰى لِي الْاَرْضِ فَرَأَيْتُ مَشَارِقِهَا وَمَغَارِبِهَا وَسَيَبْلُغُ مُلْكُ اُمَّتِيْ مَازُوِيَ لِيْ مِنْهَا فَهَا نَحْنُ نَتَقَلَّبُ فِيْمَا وَعَدْنَا اللهُ وَرَسُوْلِهٖ وَصَدَقَ اللهُ وَرَسُوْلُه فَنَسْئَالَ اللهُ الْاِيْمَانَ بِهٖ وَبِرَسُوْلِهٖ وَالْقِيَامَ بِشُكْرِهٖ عَلٰى الْوجْهِ الَّذِيْ يُرْضِيه عَنَّا"۔

**فائده:** ٢ یعنی ایسے انعامات عظیمہ کے بعد ناشکری کرنا بہت ہی بڑے نافرمان اور ہیکڑ مجرم کا کام ہے حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جو کوئی خلفائے اربعہ کی خلافت (اور ان کے فضل وشرف) سے منکر ہوا، ان الفاظ سے اس کا حال سمجھا گیا، رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (الحشر:۱۰)

## وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۵۶﴾

اور قائم رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ اور حکم پر چلو رسول کے تاکہ تم پر رحم ہو

**خلاصه تفسیر:** اور (اے مسلمانو! جب ایمان اور عمل صالح کے دنیوی اور دینی فوائد سن لئے تو تم کو چاہئے کہ خوب) نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیا کرو اور (باقی احکام میں بھی) رسول (ﷺ) کی اطاعت کیا کرو تاکہ تم پر (کامل) رحم کیا جائے۔

* * *

**فائده:** یعنی خدا کی رحمت سے حصہ لینا چاہتے ہو تم بھی ان ہی مقبول بندوں کی روش اختیار کرو۔ اور روش یہ ہی ہے نمازیں قائم کرنا، زکوٰۃ دیتے رہنا اور تمام شعب زندگی میں رسول کے احکام پر چلنا اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا مُتَابِعَةَ رَسُوْلِكَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَتَوَفَّنَا عَلَيْهَا وَاَلْحِقْنَا بِالصَّالِحِيْنَ۔ آمین۔

## لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۵۷﴾ ع ۱۳

نہ خیال کر کہ یہ جو کافر ہیں تھکا دیں گے بھاگ کر ملک میں، اور ان کا ٹھکانا آگ ہے، اور وہ بری جگہ ہے پھر جانے کی

**خلاصه تفسیر:** (آگے کفر ومعصیت کا انجام ذکر کیا گیا ہے کہ اے مخاطب!) کافروں کی نسبت یہ خیال مت کرنا کہ زمین (کے کسی حصہ) میں (بھاگ جائیں گے اور ہم کو) ہرا دیں گے (اور ہمارے قہر سے بچ جائیں گے، نہیں بلکہ وہ خود ہی ہار کر مقہور ومغلوب ہو جائیں گے، یہ تو نتیجہ دنیا میں ہے) اور (آخرت میں) ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

* * *

**فائده:** یہ نیک بندوں کے بالمقابل مردود ومغضوب لوگوں کا انجام بتلایا، یعنی جبکہ نیکوں کو ملک کی حکومت اور زمین کی خلافت عطا کی جاتی ہے، کافروں اور بدکاروں کی ساری مکاریاں اور تدبیریں شکست ہو جاتی ہیں، اللہ کے ارادہ کو کوئی روک نہیں سکتا، اگر تمام خدائی میں ادھر ادھر بھاگتے

پھر یں تب بھی وہ خدائی سزا سے اپنے کو نہیں بچا سکتے، یقیناً ان کو جہنم کے جیل خانہ میں جانا پڑے گا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ

اے ایمان والو اجازت لے کر آئیں تم سے جو تمہارے ہاتھ کے مال ہیں ۱؎ اور جو کہ نہیں پہنچے تم میں عقل (بلوغ) کی حد کو

ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ

تین بار فجر کی نماز سے پہلے اور جب اتار رکھتے ہو اپنے کپڑے دوپہر میں اور عشاء کی نماز سے پیچھے

الْعِشَآءِ ؕ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ

یہ تین وقت بدن کھلنے کے ہیں تمہارے ۲؎ کچھ تنگی نہیں تم پر اور نہ ان پر ان وقتوں کے پیچھے، پھرا ہی کرتے ہو

بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۵۸

ایک دوسرے کے پاس ۳؎ یوں کھولتا ہے اللہ، تمہارے آگے باتیں، اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے

**خلاصہ تفسیر**: پیچھے چوتھے رکوع میں کچھ احکام استیذان (یعنی گھر میں اجازت لے کر جانے) کے اور پردہ کے متعلق بیان ہوئے، ان سے یہ باتیں معلوم ہو چکی ہیں: ① اول گھر میں داخل ہونے سے پہلے اجازت اس لیے ضروری ہے کہ بے پردگی نہ ہو اور کوئی ناگوار حالت کسی کی ظاہر نہ ہو ② دوم پردہ میں یہ تفصیل ہے کہ عورتوں کو غیر محرم مردوں سے تمام بدن کا چھپانا واجب ہے اور محرم مردوں سے چہرہ، ہاتھ، پیر کے علاوہ بقیہ بدن کا چھپانا واجب ہے، اور مردوں کو گھٹنے سے ناف تک مردوں اور عورتوں سب سے چھپانا واجب ہے ③ سوم جو لڑکا بلوغ کے قریب نہیں پہنچا وہ محرموں کے حکم میں ہے، تو عورت کو جن اعضاء کا ظاہر کرنا محرم کے سامنے جائز ہے ایسے بچہ کے سامنے بھی جائز ہے ④ چہارم عورت کی اپنی باندی اگرچہ کافر ہو وہ بھی محرم کے حکم میں ہے، اس سے بھی پردہ نہیں ⑤ پنجم چہرہ اور دونوں ہتھیلیاں ستر نہیں، ضرورت کے وقت نامحرم کے سامنے بھی ان کا کھولنا جائز ہے، چونکہ مختلف اوقات اور اشخاص کے اعتبار سے مختلف صورتیں کچھ اور پیدا ہوتی ہیں اس لیے اب آگے ان دوسری صورتوں کا بیان ہے۔

اے ایمان والو! (تمہارے پاس آنے کے لئے) تمہاری مملوکوں کو اور جو تم میں حد بلوغ کو نہیں پہنچے ان کو تین وقتوں میں اجازت لینا چاہئے (ایک تو) نماز صبح سے پہلے، اور (دوسرے) جب دوپہر کو (سونے لیٹنے کے لیے) اپنے (زائد) کپڑے اتار دیا کرتے ہو، اور (تیسرے) نماز عشاء کے بعد یہ تین وقت تمہارے پردے کے ہیں (یعنی یہ اوقات چونکہ عام عادت کے مطابق تنہائی اور آرام کے ہیں، جس میں آدمی بے تکلفی سے رہنا چاہتا ہے اور تنہائی میں کسی وقت اعضائے مستورہ بھی کھل جاتے ہیں، یا کسی ضرورت سے کھولے جاتے ہیں اس لئے اپنے غلام باندیوں اور نابالغ بچوں کو سمجھاؤ کہ بغیر اطلاع اور بغیر اجازت لئے ہوئے ان اوقات میں تمہارے پاس نہ آیا کریں اور) ان اوقات کے علاوہ نہ (تو بلا اجازت آنے دینے اور منع نہ کرنے میں) تم پر کوئی الزام ہے اور نہ (بلا اجازت چلے آنے میں) ان پر کچھ الزام ہے (کیونکہ) وہ بکثرت تمہارے پاس آتے جاتے رہتے ہیں کوئی کسی کے پاس اور کوئی کسی کے پاس (پس ہر وقت اجازت لینے میں تکلیف ہے اور چونکہ یہ وقت پردے کے نہیں ہیں اس لئے ان میں اپنے اعضاء مستورہ کو چھپائے رکھنا کچھ مشکل نہیں) اسی طرح اللہ تعالیٰ تم سے (اپنے) احکام صاف صاف بیان کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے (پس سب مصالح اور حکمتوں پر اس کی نظر ہے اور احکام میں ان کی رعایت فرماتا ہے)۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ: یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت میں بالغ مرد و عورت کو استیذان کا حکم دینا

تو ظاہر ہے مگر نابالغ بچے جو شرعاً کسی حکم کے مکلف نہیں ان کو بھی اس حکم کا پابند کرنا بظاہر اصول کے خلاف ہے، جواب یہ ہے کہ اس کے مخاطب دراصل بالغ مرد وعورت ہیں کہ وہ چھوٹے بچوں کو بھی سمجھا دیں کہ ایسے وقت میں بغیر پوچھے اندر نہ آیا کرو، تو پہلے جو بتلایا گیا ہے کہ نابالغ بچوں اور باندیوں سے مسلمان عورتوں کا پردہ نہیں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر وقت بے تکلف چلے آیا کریں، کیونکہ ان اوقات میں بعض دفعہ مرد وعورت بے پردہ ہوتے ہیں، یا بے تکلفی کے ساتھ بوس و کنار میں مشغول ہوتے ہیں تو اس وقت بچوں اور باندیوں کا بغیر پوچھے آنا جائز نہیں کہ اس میں بے پردگی ہوگی، یا ایسی بات کا اظہار ہوگا جس کا ظاہر کرنا مناسب نہیں، جیسے حدیث میں ہے کہ بچوں کو جب وہ سات سال کے ہو جائیں تو نماز سکھاؤ اور پڑھنے کا حکم دو اور دس سال کی عمر کے بعد ان کو سختی سے نماز کا پابند کرو، نہ مانیں تو مار کر نماز پڑھاؤ، اسی طرح اس استیذان کا اصل حکم بالغ مرد وعورت کو ہے اور مذکورہ جملے میں جو یہ الفاظ ہیں کہ ''ان وقتوں کے علاوہ دوسرے اوقات میں نہ تم پر جناح ہے کہ ان کو بلا اجازت آنے دو اور نہ ان پر کوئی جناح ہے کہ وہ بلا اجازت آ جائیں'' اس میں اگرچہ لفظ ''جناح'' آیا ہے جو عموماً گناہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، مگر کبھی مطلقاً حرج اور مضائقہ کے معنی میں بھی آتا ہے، یہاں لا جناح کے معنی یہی ہیں کہ کوئی مضائقہ اور تنگی نہیں ہے، اس سے بچوں کے مکلف اور گناہگار ہونے کا شبہ ختم ہوگیا ہے۔

**طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ:** اس کا مطلب مذہب حنفیہ کے مطابق یہ ہے کہ غلام تو مردوں کے پاس آتے رہتے ہیں اور باندیاں اور بچے مردوں اور عورتوں سب کے پاس آتے رہتے ہیں، اور غلام عورتوں کے پاس بکثرت نہیں آسکتے، کیونکہ غلام نامحرم مرد کے حکم میں ہے، غرض کہ غلام اور باندی تو خدمت وغیرہ کے لیے اور بچے طبعی طور پر چونکہ بکثرت آتے رہتے ہیں اور یہ وقت پردہ کے نہیں، اس لیے ان میں ستر چھپائے رکھنا کچھ مشکل نہیں، پس ان کا بغیر اجازت آنا درست ہے، کیونکہ ہر وقت اجازت لینے میں دقت ہے، اور بطور خاص ان تین وقتوں کا ذکر عام عادت کے اعتبار سے ہے، اگر ان اوقات کے علاوہ میں بھی کوئی مانع پیش آ جائے تو اجازت لینا واجب ہے۔

* * *

**فائدہ: ۱** یعنی لونڈی، غلام، چار رکوع پہلے مسئلہ استیذان (اجازت لینے) کا ذکر تھا، یہ اسی کا تتمہ ہے، درمیان میں خاص خاص مناسبتوں سے دوسرے مضامین آ گئے۔

**فائدہ: ۲** ان تین وقتوں میں عموماً زائد کپڑے اتار دیے جاتے ہیں یا سونے جاگنے کا لباس تبدیل کیا جاتا ہے اور بیوی کے ساتھ مصاحبت بھی بیشتر ان ہی اوقات میں ہوتی ہے کبھی فجر سے قبل یا دوپہر کے وقت آدمی غسل کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ کوئی مطلع نہ ہو، اس لیے حکم دیا کہ ان تین وقتوں میں نابالغ لڑکوں اور لونڈی غلام کو بھی اجازت لے کر آنا چاہیے، باقی وقتوں میں ان کو اجانب کی طرح اجازت طلب کرنے کی حاجت نہیں، الا یہ کہ کوئی شخص اپنی مصلحت سے دوسرے اوقات میں بھی استیذان کی پابندی عائد کر دے۔

**فائدہ: ۳** یعنی اوقات مذکورہ بالا کو چھوڑ کر باقی جن اوقات میں عادۃً ایک دوسرے کے پاس بے روک ٹوک آتے جاتے ہیں ان میں نابالغ لڑکوں یا لونڈی غلام کو ہر مرتبہ اجازت لینے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ایسا پابند کرنے میں بہت تنگی اور کاروبار کا تعطل ہے جو حق تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے۔

وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ

اور جب پہنچیں لڑکے تم میں کے عقل (بلوغ) کی حد کو تو ان کو ویسی ہی اجازت لینی چاہیے جیسے لیتے رہے ہیں ان سے اگلے

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۹﴾

یوں کھول کر سناتا ہے اللہ تم کو اپنی باتیں، اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے

**خلاصہ تفسیر:** اور جس وقت تم میں کے (یعنی آزاد لوگوں میں کے) وہ لڑکے (جن کا اوپر حکم آیا ہے) حد بلوغ کو پہنچیں (یعنی

بالغ ہو جائیں یا بلوغت کے قریب ہو جائیں ) تو ان کو بھی اسی طرح اجازت لینا چاہئے جیسا ان سے اگلے (یعنی ان سے بڑی عمر کے ) لوگ اجازت لیتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ تم سے اپنے احکام صاف صاف بیان کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے۔

**وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ**: اس کو مکرر اس لیے لایا گیا کہ قانون استیذان یعنی داخل ہونے سے پہلے اجازت طلب کرنے کی مصلحتیں نہایت واضح اور اس کے احکام نہایت قابل رعایت ہیں، اس تکرار سے مزید اہتمام ظاہر ہو گیا۔

* * *

**فائدہ**: یعنی لڑکا جب تک نابالغ ہے تین وقتوں کے سوا باقی اوقات میں بلا اجازت لیے آ جا سکتا ہے، جس وقت حد بلوغ کو پہنچا پھر اس کا حکم ان ہی مردوں جیسا ہو گیا جو اس سے پہلے بالغ ہو چکے ہیں اور جن کا حکم پیشتر آیت: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا (النور: ۲۷) میں گزر چکا ہے۔

## وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ

اور جو بیٹھ رہی ہیں گھروں میں تمہاری عورتوں میں سے جن کو توقع نہیں رہی نکاح کی ان پر گناہ نہیں کہ اتار رکھیں اپنے کپڑے

## غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِيْنَةٍ ؕ وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۶۰

یہ نہیں کہ دکھاتی پھریں اپنا سنگار، اور اس سے بھی بچیں تو بہتر ہے ان کے لیے [1] اور اللہ سب باتیں سنتا جانتا ہے [2]

**خلاصہ تفسیر**: اور (ایک بات یہ جاننا چاہئے کہ پردہ کے احکام میں شدت فتنہ کے خوف پر مبنی ہے، پیچھے جو یہ بتلایا گیا کہ چہرہ اور ہتھیلیاں ستر نہیں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورتیں کھلی مہار اپنی صورت غیر مردوں کو دکھاتی پھریں، کیونکہ فتنہ کے احتمال سے ان کا چھپانا بھی واجب ہو جاتا ہے، البتہ جہاں فتنہ کا عادۃً احتمال نہ ہو مثلاً جو) بڑی بوڑھی عورتیں جن کو (کسی کے) نکاح (میں آنے) کی امید نہ ہی ہو (یعنی وہ بالکل رغبت کے قابل نہیں رہیں یہ تفسیر ہے بڑی بوڑھی ہونے کی) ان کو اس بات میں کوئی گناہ نہیں کہ وہ اپنے (زائد) کپڑے (جس سے چہرہ وغیرہ چھپا رہتا ہے غیر محرم کے روبرو بھی) اتار رکھیں بشرطیکہ زینت (کے مواقع) کا اظہار نہ کریں (جن کا ظاہر کرنا غیر محرم کے سامنے بالکل ہی ناجائز ہے، پس مراد اس سے چہرہ ہتھیلیاں اور بقول بعض دونوں قدم بھی، بخلاف جوان عورت کے کہ فتنہ کے احتمال کی وجہ سے ان کو چہرہ وغیرہ کا بھی پردہ ضروری ہے) اور (اگرچہ بڑی بوڑھی عورتوں کے لئے غیر محرموں کے سامنے چہرہ کھولنے کی اجازت ہے لیکن) اس سے بھی احتیاط رکھیں تو ان کے لئے اور زیادہ بہتر ہے (کیونکہ اول تو بعض گندی طبیعتیں ایسی بھی ہیں جنہیں بوڑھی معمر خواتین کی طرف بھی رغبت ہوتی ہے، دوسرے بالکل بے پردگی کا سدباب ہی مناسب ہے) اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتا سب کچھ جانتا ہے (یعنی یہ تو پردہ کا انتظام ہے، اب اگر نامحرم مرد و عورت باہم بات چیت کریں یا دلی تعلق رکھیں تو حق تعالیٰ سب سے واقف ہے، اگر ناجائز طریقہ سے ہوگا تو گناہ ہوگا، ممکن ہے کہ سمع اور علم مطلق افعال کے اعتبار سے مراد ہو)۔

* * *

**فائدہ**: [1] حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: "یعنی بوڑھی عورتیں گھر میں تھوڑے کپڑوں میں رہیں تو درست ہے اور پورا پردہ رکھیں تو اور بہتر" اور گھر سے باہر نکلتے وقت بھی زائد کپڑے مثلاً برقع وغیرہ اتار دیں تو کچھ مضائقہ نہیں، بشرطیکہ اس زینت کا اظہار نہ ہو جس کے چھپانے کا حکم آیت: وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ (النور: ۳۱) میں دیا جا چکا ہے، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جوان عورتوں کے تستر کے متعلق قرآن کریم کا منشاء کیا ہے۔

**فائدہ**: [2] یعنی یہ تو فتنہ کی روک تھام کے ظاہری انتظامات ہیں باقی پردہ کے اندر جو باتیں کی جاتی ہیں اور فتنے اٹھائے جاتے ہیں یاد رہے کہ خدا تعالیٰ ان سب کو سنتا اور جانتا ہے، اسی کے موافق ہر ایک سے معاملہ کرے گا۔

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ

نہیں ہے اندھے پر کچھ تکلیف اور نہ لنگڑے پر تکلیف اور نہ بیمار پر تکلیف ا؎ اور نہیں تکلیف تم لوگوں پر

اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ

کہ کھاؤ اپنے گھروں سے یا اپنے باپ کے گھر سے یا اپنی ماں کے گھر سے یا اپنے بھائی کے گھر سے

اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ

یا اپنی بہن کے گھر سے یا اپنے چچا کے گھر سے یا اپنی پھوپھی کے گھر سے یا اپنے ماموں کے گھر سے

اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ اَوْ صَدِيْقِكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا

یا اپنی خالہ کے گھر سے یا جس گھر کی کنجیوں کے تم مالک ہو یا اپنے دوست کے گھر سے ۲؎ نہیں گناہ تم پر کہ کھاؤ

جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ؕ فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً

آپس میں مل کر یا جدا ہو کر، پھر جب کبھی جانے لگو گھروں میں تو سلام کہو اپنے لوگوں پر نیک دعا ہے اللہ کے یہاں سے برکت والی

طَيِّبَةً ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۱﴾ ع ۱۴

ستھری، یوں کھولتا ہے اللہ تمہارے آگے اپنی باتیں تا کہ سمجھ لو ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے استیذ ان یعنی طلب اجازت کا بیان تھا جو گھروں میں جانے سے پہلے مقرر ہے، اب بعض ان باتوں کا ذکر ہے جن کی گھروں میں جانے کے بعد اجازت ہے یا حکم ہے، مثلاً گھر والوں کو سلام کرنا، یا دوسرے کے گھر کھانا پینا، شان نزول یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مدینہ والوں میں اہل عرب کی عادت کے موافق کھانے پینے میں بہت بے تکلفی تھی کہ میں نے تمہارے گھر کھالیا، تم نے میرے گھر کھالیا، بلکہ کبھی کسی غریب محتاج کو بھی ساتھ لے جاتے اور اپنے کسی عزیز یا دوست کے گھر اسے کھانا کھلا دیتے اور یہ بے تکلفی بہت بڑھ گئی تھی جس سے کبھی ظلم اور زیادتی کرنے کی نوبت آجاتی، اس افراط سے روکنے کے لیے آیت نازل ہوئی کہ آپس میں ناحق کسی کا مال نہ کھایا کرو، اس سے صحابہ بہت ڈر گئے اور بہت ہی احتیاط کرنے لگے کہ جہاں یقینی رضامندی بھی معلوم ہوتی وہاں بھی احتیاط کرتے اور کسی کے گھر نہ کھاتے، اسی طرح معذور آدمی اندھے لنگڑے محتاج وغیرہ ایسے موقعوں پر جانے سے پرہیز کرنے لگے کہ پرائے گھر لے جا کر کھلانے کا اس شخص کا کیا حق ہے، اسی طرح اگر کھانا مشترک ہوتا خصوصاً اگر اس میں معذور لوگوں کا حق ہوتا اس کو سب کے ساتھ کھانے میں اس لیے پرہیز کرنے لگے کہ نا معلوم کون زیادہ کھائے کون کم کھائے، تو ایسا نہ ہو کہ اپنے حق سے زیادہ کھالیں، چونکہ اس درجہ احتیاط بھی تکلیف کا سبب تھی، اس لیے اب آئندہ آیت میں اس تنگی کو دور فرماتے ہیں، اور بعض دفعہ معذور آدمی تن دُرستوں کے ساتھ اس لیے نہ کھاتے کہ شاید یہ ہم سے نفرت کریں گے، یہاں اس کا بھی جواب ہو گیا۔

(اگر تم کسی اندھے لنگڑے بیمار غریب کو اپنے کسی عزیز یا ملاقاتی کے گھر لے جا کر کچھ کھلا پلا دو، یا خود کھا پی لو تو جب یہ یقینی طور پر معلوم ہو کہ وہ عزیز ملاقاتی ہمارے کھانے اور کھلانے پر راضی ہوگا اس کو کوئی تکلیف نہ ہوگی تو ان صورتوں میں) نہ تو اندھے آدمی کے لئے کوئی مضائقہ ہے، اور نہ لنگڑے آدمی کے لئے، اور نہ بیمار آدمی کے لئے کچھ مضائقہ ہے، اور نہ خود تمہارے لئے اس بات میں (کچھ مضائقہ ہے) کہ تم (خواہ خود یا ان

معذورین کے ساتھ ) اپنے گھروں سے ( جن میں بیوی، اولاد کے گھر بھی آ گئے ) کھانا کھلاؤ یا (ان گھروں میں جن کا ذکر آگے آتا ہے کھالو، یعنی نہ تم کو خود کھانے میں گناہ ہے اور نہ ان معذوروں کو کھلانے میں، اسی طرح ان معذوروں کو بھی تمہارے کھانے سے کھالینے میں گناہ نہیں جبکہ اس عزیز یا ملاقاتی کی رضامندی یقینی طور پر معلوم ہو جس کے گھر لے جا کر تم ان کو کھلاتے پلاتے ہو، اور وہ گھر یہ ہیں، مثلاً ) اپنے باپ کے گھر سے ( کھالو کھلا دو ) یا اپنی ماؤں کے گھر سے، یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے، یا اپنی بہنوں کے گھروں سے، یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے، یا اپنی پھوپیوں کے گھروں سے، یا اپنے ماموں کے گھروں سے، یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے، یا ان کے گھروں سے جن کی کنجیاں تمہارے اختیار میں ہیں، یا اپنے دوستوں کے گھروں سے ( پھر اس میں بھی ) کہ سب مل کر کھاؤ یا الگ الگ ( کھاؤ ) پھر ( یہ بھی معلوم کر رکھو کہ ) جب تم گھروں میں جانے لگو تو اپنے لوگوں کو ( یعنی وہاں جو مسلمان ہوں ان کو ) سلام کر لیا کرو ( جو کہ ) دعا کے طور پر ( ہے اور ) جو خدا کی طرف سے مقرر ہے اور ( اس پر ثواب ملنے کی وجہ سے ) برکت والی (اور مخاطب کا دل خوش کرنے کی وجہ سے ) عمدہ چیز ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ تم سے ( اپنے ) احکام بیان فرماتا ہے تا کہ تم سمجھو (اور عمل کرو)۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا: یعنی ایسے ضعیف وسوسوں پر شریعت نظر نہیں کرتی کہ شاید میں زیادہ کھاؤں تو پرایا حق کھالیا، اور دوسرا کھائے تو اس کا حق رہ گیا، میل جول میں ایسی باریک باتوں کی تکلیف نہیں، البتہ اگر کسی کے کھانے پر گھر والے کی رضامندی نہ زبان سے معلوم ہو نہ قرائن سے اس وقت جائز نہیں، اسی طرح ساتھ کھانے میں اگر شریک راضی نہ ہو تو اس کی تقسیم ضروری ہے، اور اگر شریک یتیم بالغ ہے وہاں بغیر رضامندی کے بھی ساتھ کھانا جائز ہے بشرطیکہ اس کی مصالح کی رعایت کی جائے، کیونکہ نابالغ کی رضامندی اور ناراضگی معتبر نہیں، اور چونکہ اس حکم کا مدار رضامندی پر ہے، اس لیے نہ ان موقعوں پر ہمیشہ اجازت ہے، نہ دوسرے موقعوں میں ہمیشہ ممانعت ہے، ناگواری کے وقت ان موقعوں پر بھی ممانعت ہے اور رضامندی کے وقت دوسرے موقعوں میں بھی اجازت ہے، ان موقعوں کو خصوصیت سے اس لیے بیان کیا گیا کہ ان میں عادۃً اکثر رضامندی ہوتی ہے، خاص کر عرب میں کہ وہاں ہندوستان کی طرح بخل نہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی جو کام تکلیف کے ہیں وہ ان کو معاف ہیں مثلاً جہاد، حج، جمعہ اور جماعت اور ایسی چیزیں، ( کذا فی الموضح ) یا یہ مطلب ہے کہ ان معذور محتاج لوگوں کو تندرستوں کے ساتھ کھانے میں کچھ حرج نہیں، جاہلیت میں اس قسم کے محتاج و معذور آدمی اغنیاء اور تندرستوں کے ساتھ کھانے سے رکتے تھے انھیں خیال گزرتا تھا کہ شاید لوگوں کو ہمارے ساتھ کھانے سے نفرت ہو اور ہماری بعض حرکات واوضاع سے ایذاء پہنچتی ہو، اور واقعی بعضوں کو نفرت ووحشت ہوتی بھی تھی، نیز بعض مومنین کو غایت اتقاء سے یہ خیال پیدا ہوا کہ ایسے معذوروں اور مریضوں کے ساتھ کھانے میں شاید اصول عدل ومساوات قائم نہ رہ سکے، اندھے کو سب کھانے نظر نہیں آتے لنگڑا ممکن ہے دیر میں پہنچے اور مناسب نشست سے نہ بیٹھ سکے، بیمار کا تو پوچھنا ہی کیا ہے اس بناء پر ساتھ کھلانے میں احتیاط کرتے تھے کہ ان کی حق تلفی نہ ہو، دوسری ایک اور صورت پیش آتی تھی کہ یہ معذور محتاج لوگ کسی کے پاس گئے، وہ شخص استطاعت نہ رکھتا تھا، ازراہ بے تکلفی ان کو اپنے باپ، بھائی، بہن، چچا، ماموں وغیرہ کسی عزیز وقریب کے گھر لے گیا، اس پر ان حاجت مندوں کو خیال ہوتا تھا کہ ہم تو آئے تھے اس کے پاس، یہ دوسرے کے ہاں لے گیا، کیا معلوم وہ ہمارے کھلانے سے کارہ اور ناخوش تو نہیں، ان تمام خیالات کی اصلاح آیت حاضرہ میں کر دی گئی کہ خواہی نہ خواہی اس طرح کے اوہام ووساوس میں مت پڑو، اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ میں وسعت رکھی ہے پھر تم خود اپنے اوپر تنگی کیوں کرتے ہو۔

**فائدہ:** ۲ یعنی تمہارے زیر تصرف دیا گیا ہو، مثلاً کسی نے اپنی چیز کا وکیل یا محافظ بنا دیا اور بقدر معروف اس میں سے کھانے پینے کی اجازت دے دی۔

**فائدہ:** ۳ یعنی اپنایت کے علاقوں میں کھانے کی چیز کو ہر وقت پوچھنا ضروری نہیں، نہ کھانے والا حجاب کرے نہ گھر والا دریغ کرے، مگر عورت کا گھر اگر اس کے خاوند کا ہو، اس کی مرضی حاصل کرنی چاہیے اور مل کر کھاؤ یا جدا یعنی اس کی تکرار دل میں نہ رکھے کہ کسی نے کم کھایا کس نے زیادہ،

سب نے مل کر پکایا سب نے مل کر کھایا، اور اگر ایک شخص کی مرضی نہ ہو تو پھر کسی کی چیز کھانی ہرگز درست نہیں اور تقید فرمایا سلام کا آپس کی ملاقات میں، کیونکہ اس سے بہتر دعا نہیں، جو لوگ اس کو چھوڑ کر اور الفاظ گھڑتے ہیں اللہ کی تجویز سے ان کی تجویز بہتر نہیں ہوسکتی۔

**تنبیہ:** آیت سے تنہا کھانے کا جواز بھی نکلا، بعض حضرات کو لکھا ہے کہ جب تک کوئی مہمان ساتھ نہ ہو کھانا نہ کھاتے تھے، معلوم ہوا یہ غلو ہے، البتہ اگر کئی کھانے والے ہوں اور اکٹھے بیٹھ کر کھائیں تو موجب برکت ہوتا ہے، کماورد فی الحدیث۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا

ایمان والے وہ ہیں جو یقین لائے ہیں اللہ پر اور اسکے رسول پر اور جب ہوتے ہیں اسکے ساتھ کسی جمع ہونے کے کام میں تو چلے نہیں جاتے

حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ

جب تک اس سے اجازت نہ لے لیں، جو لوگ تجھ سے اجازت لیتے ہیں وہ ہی ہیں جو مانتے ہیں اللہ کو اور اس کے رسول کو ۱؎

فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ

پھر جب اجازت مانگیں تجھ سے اپنے کسی کام کے لیے تو اجازت دے جس کو ان میں سے تو چاہے اور معافی مانگ ان کے واسطے اللہ سے،

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۲﴾

اللہ بخشنے والا مہربان ہے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے عام مجالس کے آداب اور عام استیذان کا ذکر تھا، اب سورت کے اختتام کے قریب خاص مجلس نبوی کے آداب بیان کرتے ہیں کہ مجلس نبوی سے جاتے وقت اجازت لینے کی ضرورت ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بلانے کے وقت حاضری واجب ہے، آپ کی مجلس سے بغیر اجازت اٹھ کر چلے جانا یا آپ کے بلانے پر حاضر نہ ہونا یہ منافقین کا شیوہ ہے، اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا وجوب ثابت ہوتا ہے۔

بس مسلمان تو وہی ہیں جو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور جب رسول کے پاس کسی ایسے کام پر جمع ہوتے ہیں جس کے لئے مجمع کیا گیا ہے (اور اتفاقاً وہاں سے کہیں جانے کی ضرورت پڑتی ہے) تو جب تک آپ سے اجازت نہ لیں (اور آپ اس پر اجازت نہ دیدیں مجلس سے اٹھ کر) نہیں جاتے (اے پیغمبر!) جو لوگ آپ سے (ایسے مواقع پر) اجازت لیتے ہیں بس وہی اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں (آگے ایسے لوگوں کو اجازت دینے کا بیان ہے) تو جب یہ اہل ایمان لوگ (ایسے مواقع پر) اپنے کسی کام کے لئے آپ سے (جانے کی) اجازت طلب کریں تو ان میں آپ جس کے لئے (مناسب سمجھیں اور اجازت دینا) چاہیں اجازت دے دیا کریں (اور جس کو مناسب نہ سمجھیں اجازت نہ دیں، کیونکہ یہ ہوسکتا ہے کہ اجازت طلب کرنے والے اس کام کو ضروری سمجھتے ہوں جس کے لئے اجازت طلب کر رہے ہیں اور وہ واقع میں ضروری نہ ہو، یا ضروری بھی ہو مگر اس کے جانے سے اس سے بڑا کوئی نقصان پیدا ہونے کا خطرہ ہو اس لئے اجازت و عدم اجازت کا فیصلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا) اور (اجازت دے کر بھی) آپ ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کیا کیجئے (کیونکہ ان کا یہ رخصت چاہنا اگرچہ قوی عذر ہی کی وجہ سے ہو مگر اس میں دنیا کو دین پر مقدم رکھنے کی صورت تو لازم آتی ہے جس میں ایک کوتاہی کا شائبہ ہے اس کے لئے آپ کی دعا مغفرت درکار ہے، دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ اجازت چاہنے والے نے جس عذر و ضرورت کو قوی سمجھ کر اجازت لی ہے اس میں اس سے خطاء اجتہادی ہوگئی ہو کہ غیر ضروری کو ضروری سمجھ لیا اور یہ خطاء اجتہادی ایسی ہو کہ ذرا غور و تامل سے رفع ہوسکتی ہو تو ایسی صورت میں غور و فکر کی کمی بھی ایک کوتاہی ہے اس سے استغفار کی ضرورت ہوئی) بلاشبہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے (چونکہ ان کی نیت اچھی تھی اس لئے ایسے دقائق پر مواخذہ نہیں فرماتا)۔

سبب نزول اس کا دو امر ہیں: ایک یہ کہ غزوہ احزاب میں جب مدینہ کے گرد خندق کھودی گئی تو مسلمان تو بڑی محنت کرتے تھے اور اگر مدینہ جانے کی ضرورت پڑتی تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے کر جاتے، اور منافقین اول تو کام سے جی چراتے، پھر جب کسی مسلمان کو جاتا ہوا دیکھتے تو اس کی آڑ میں لگے لگے خود بھی بغیر اطلاع کھسک جاتے اس پر یہ آیت نازل ہوئی، دوسرا امر جمعہ وغیرہ میں جب کبھی مسلمانوں کو کوئی ضرورت پیش آتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے کر جاتے اور اگر آپ خطبہ میں ہوتے تو انگلی کے اشارہ سے دریافت کر لیتے اور ان کے جانے کے ساتھ منافقین بھی ان کی آڑ میں چھپ کر کھسک جاتے، کیونکہ منافقین کو نماز اور خطبہ گراں معلوم ہوتا تھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

**وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ**: اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس سے بغیر آپ کی اجازت کے چلے جانا حرام ہے، حالانکہ صحابہ کرام کے بیشمار واقعات ہیں جن میں وہ آپ کی مجلس میں ہوتے اور پھر جب چاہتے چلے جاتے تھے اجازت لینا ضروری نہ سمجھتے تھے؟ جواب یہ ہے کہ یہ عام مجلسوں کا حکم نہیں، بلکہ اس وقت کا ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کسی ضرورت سے جمع کیا ہو جیسا کہ واقعہ خندق میں ہوا تھا اس تخصیص کی طرف خود آیت کے لفظ عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ میں اشارہ موجود ہے۔

باتفاق فقہاء چونکہ یہ حکم ایک دینی اور اسلامی ضرورت کے لئے جاری کیا گیا ہے اور ایسی ضرورتیں ہر زمانے میں ہو سکتی ہیں اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ مسلمانوں کے ہر امام و امیر جس کے قبضہ میں زمام حکومت ہو اس کا اور اس کی ایسی مجلس کا بھی یہی حکم ہے کہ وہ سب کو جمع ہونے کا حکم دیں تو اس کی تعمیل واجب اور واپس جانا بغیر اجازت ناجائز ہے۔

**فَأْذَن لِّمَن شِئْتَ مِنْهُمْ**: اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ شیخ اور استاذ کی خدمت سے دور ہونا اگرچہ اجازت سے ہو مگر قدرے نقصان سے خالی نہیں۔

* * *

**فائدہ**: ۱ اوپر کی آیتوں میں آنے کے وقت استیذان (اجازت طلب کرنے) کا ذکر تھا، یہاں جانے کے وقت استیذان کی ضرورت بتائی ہے یعنی پورے ایمان والے وہ ہیں جو رسول کے بلانے پر حاضر ہوتے ہیں اور جب کسی اجتماعی کام میں شریک ہوں مثلاً جمعہ، عیدین، جہاد اور مجلس مشاورت وغیرہ میں تو بدون اجازت کے اٹھ کر نہیں جاتے، یہی لوگ ہیں جو کامل اور صحیح معنی میں اللہ اور رسول کو مانتے ہیں۔

**فائدہ**: ۲ یعنی غور وفکر کے بعد جس کو مناسب سمجھیں اجازت دے دیں، اور چونکہ اس اجازت پر عمل کرنا بھی فی الجملہ صحبت نبوی سے حرمان اور صورت تقدیم الدنیا علی الدین کا شائبہ اپنے اندر رکھتا ہے اس لیے ان مخلصین کے حق میں استغفار فرمائیں تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے استغفار کی برکت سے اس نقص کا تدارک ہو سکے۔

لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُم بَعْضًا ۚ قَدْ يَعْلَمُ اللَّهُ الَّذِينَ

مت کرلو (سمجھو) بلانا رسول کا اپنے اندر برابر اس کے جو بلاتا ہے تم میں ایک دوسرے کو ۱ اللہ جانتا ہے ان لوگوں کو

يَتَسَلَّلُونَ مِنكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَن تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ

تم میں سے جو سٹک جاتے ہیں آنکھ بچا کر ۲ سو ڈرتے رہیں وہ لوگ جو خلاف کرتے ہیں اس کے حکم کا اس سے کہ آ پڑے ان پر کچھ خرابی

أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٦٣﴾

یا پہنچے ان کو عذاب دردناک ۳

**خلاصہ تفسیر**: گذشتہ آیت میں اجازت نہ لینے کی حرمت بصورت جملہ خبریہ ارشاد فرمائی تھی، اب اس کی اصلی صورت یعنی حکم دے کر (بصورت صیغہ انشائیہ میں) ارشاد ہے کہ:

تم لوگ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بلانے کو (جب وہ کسی اسلامی ضرورت کیلئے تم کو جمع کریں) ایسا (معمولی بلانا) مت سمجھو جیسا تم میں ایک دوسرے کو بلا لیتا ہے (کہ چاہے آیا، یا نہ آیا، پھر آ کر بھی جب تک چاہا بیٹھا جب چاہا اٹھ کر بے اجازت چل دیا، رسول کا بلانا ایسا نہیں، بلکہ ان کے حکم کی تعمیل واجب ہے اور بلا اجازت واپس جانا حرام، اگر کوئی بلا اجازت چلا گیا تو یہ ممکن ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا جانا مخفی رہ جائے، لیکن یہ یاد رکھو کہ) اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو (خوب) جانتا ہے جو (دوسرے کی) آڑ میں ہو کر تم میں سے (مجلس نبوی سے) کھسک جاتے ہیں تو جو لوگ اللہ کے حکم کی (جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے پہنچا ہے) مخالفت کرتے ہیں ان کو اس سے ڈرنا چاہئے کہ ان پر (دنیا میں) کوئی آفت آن پڑے یا ان پر (آخرت میں) کوئی دردناک عذاب نازل ہو جائے (اور یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا آخرت دونوں میں عذاب ہو، کیونکہ حکم کی مخالفت ناراضگی کا سبب ہے)۔

**لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ**: اس کی ایک تفسیر تو وہ ہے جو اوپر خلاصہ تفسیر میں بیان کی گئی ہے کہ دُعَآءَ الرَّسُوْلِ سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لوگوں کو بلانا ہے (جو نحوی قاعدہ سے اضافت الی الفاعل ہے) اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگوں کو بلائیں تو اس کو عام لوگوں کے بلانے کی طرح نہ سمجھو کہ اس میں آنے نہ آنے کا اختیار رہتا ہے، بلکہ اس وقت آنا فرض ہو جاتا ہے اور بغیر اجازت جانا حرام ہو جاتا ہے، آیت کے سیاق وسباق سے یہ تفسیر زیادہ مناسب رکھتی ہے اسی لئے خلاصہ تفسیر میں اس کو اختیار کیا ہے اور اس کی ایک دوسری تفسیر حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ دُعَآءَ الرَّسُوْلِ سے مراد لوگوں کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی کام کے لئے پکارنا اور بلانا ہے (جو نحوی ترکیب میں اضافت الی المفعول ہوگی) اس تفسیر کی بناء پر معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ جب تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی ضرورت سے بلاؤ یا مخاطب کرو تو عام لوگوں کی طرح آپ کا نام لے کر ''یا محمد'' نہ کہو کہ بے ادبی ہے، بلکہ تعظیمی القاب کے ساتھ ''یا رسول اللہ''، ''یا نبی اللہ'' وغیرہ کہا کرو، اس کا حاصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم وتوقیر کا مسلمانوں پر واجب ہونا اور ہر ایسی چیز سے بچنا ہے جو ادب کے خلاف ہو، یا جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچے، یہ حکم ایسا ہوگا جیسے سورۃ حجرات میں اسی طرح کے کئی حکم دیئے گئے ہیں مثلاً، **وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ** یعنی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کرو تو ادب کی رعایت رکھو، ضرورت سے زیادہ اونچی آواز سے باتیں نہ کرو، جیسے لوگ آپس میں کیا کرتے ہیں اور مثلاً یہ کہ جب آپ گھر میں تشریف رکھتے ہوں تو باہر سے آواز دے کر نہ بلاؤ، بلکہ آپ کے باہر تشریف لانے کا انتظار کرو **اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ** میں اسی کا بیان ہے۔

اس دوسری تفسیر میں ایک عام ادب بزرگوں اور بڑوں کا بھی معلوم ہوا کہ اپنے بزرگوں بڑوں کو ان کا نام لے کر پکارنا اور بلانا بے ادبی ہے، تعظیمی لقب سے مخاطب کرنا چاہئے۔

* * *

**فائدہ: ۱** یعنی حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بلانے پر حاضر ہونا فرض ہو جاتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بلانا اوروں کی طرح نہیں کہ چاہے اس پر ''لبیک'' کہے یا نہ کہے، اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بلانے پر حاضر نہ ہو تو آپ کی بددعا سے ڈرنا چاہیے کیونکہ آپ کی دعا معمولی انسانوں جیسی نہیں، نیز مخاطبات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب وعظمت کا پورا خیال رکھنا چاہیے، عام لوگوں کی طرح ''یا محمد'' وغیرہ کہہ کر خطاب نہ کیا جائے ''یا نبی اللہ'' اور ''یا رسول اللہ'' جیسے تعظیمی القاب سے پکارنا چاہیے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بلانے سے فرض ہوتا تھا حاضر ہونا جس کام کو بلائیں، پھر یہ بھی تھا کہ وہاں سے بے اجازت اٹھ کر چلے نہ جائیں، اب بھی سب مسلمان کو اپنے سرداروں کے ساتھ یہ برتاؤ کرنا چاہیے''۔

**فائدہ: ۲** یہ منافقین تھے جن کو مجلس نبوی میں بیٹھنا اور پند ونصیحت سننا شاق گزرتا تھا، وہ اکثر موقع پا کر اور آنکھ بچا کر مجلس سے بلا اجازت کھسک جاتے تھے، مثلاً کوئی مسلمان اجازت لے کر اٹھا، یہ بھی اس کی آڑ میں ہو کر ساتھ ساتھ چل دیئے، اس کو فرمایا کہ تم پیغمبر سے کیا چھپاتے ہو، خدا تعالیٰ کو تمہارا سب کا حال معلوم ہے۔

**فائدہ: ۳** یعنی اللہ ورسول کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ڈرتے رہنا چاہیے کہ کہیں ان کے دلوں میں کفر ونفاق وغیرہ کا فتنہ ہمیشہ کے لیے جڑ نہ پکڑ جائے، اور اس طرح دنیا کی کسی سخت آفت یا آخرت کے دردناک عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں، العیاذ باللہ۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قَدْ يَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ؕ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ

سنتے ہو اللہ ہی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں اور زمین میں، اس کو معلوم ہے جس حال پر تم ہو، اور جس دن پھیرے جائیں گے اس کی طرف

فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۴﴾ ع ۱۵

تو بتائے گا ان کو جو کچھ انہوں نے کیا، اور اللہ ہر ایک چیز کو جانتا ہے

**خلاصہ تفسیر:** (اور یہ بھی) یاد رکھو کہ جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے سب خدا ہی کا ہے (تو خدا کو اختیار بھی پورا ہے، غرض محکوم یعنی بندوں کی طرف سے اس حال میں مخالفت سرزد ہونا کہ حاکم کا علم اور اس کی قدرت کامل ہو بیشک اندیشہ کی بات ہے، اور یہ جو کہا گیا ہے کہ دو چیزوں کا اندیشہ ہے دنیاوی مصیبت کا اور اخروی عذاب کا تو وجہ اس کی یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ اس حالت کو بھی جانتا ہے جس پر تم (اب) ہو (اس سے تو یہ احتمال ہے کہ شاید دنیا ہی میں تم کو سزا دے دے) اور (اللہ) اس دن کو بھی (جانتا ہے) جس میں سب اس کے پاس (دوبارہ زندہ کر کے) لائے جائیں گے تو وہ ان کو سب جتلا دے گا جو جو کچھ انہوں نے کیا تھا (پس آخرت میں سزا دینا بھی کچھ بعید نہیں، غرض جب دونوں جہاں کے ساتھ اس کا علم متعلق ہے تو دونوں جگہ سزا کا احتمال ہے، اور تمہاری موجودہ حالت اور روز قیامت ہی کی کچھ تخصیص نہیں) اللہ تعالیٰ (تو) سب کچھ جانتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی ممکن ہے مخلوق سے آنکھ بچا کر کوئی کام کر گزرو، لیکن حق تعالیٰ سے تمہارا کوئی حال پوشیدہ نہیں رہ سکتا نہ اس کی زمین و آسمان میں سے نکل کر کہیں بھاگ سکتے ہو، وہ جس طرح تمہارے احوال موجودہ سے باخبر ہے ایسے ہی اس دن کی کیفیت مجازات سے بھی پورا آگاہ ہے، جب تمام مخلوق حساب و کتاب کے لیے اس کی طرف لوٹائی جائے گی اور ہر ایک کے سامنے اس کا ذرہ ذرہ عمل کھول کر رکھ دیا جائے گا، ایسے علیم الکل اور مالک الکل کی سزا سے مجرم کس طرح اپنے کو بچا سکتا ہے۔

## ایاتها ۷۷ ۲۵ سُوْرَةُ الْفُرْقَانِ مَكِّيَّةٌ ۴۲ رکوعاتها ۶

**خلاصہ تفسیر:** اس سورت میں یہ مضامین ہیں: ① توحید کا اثبات ② شرک اور مشرکین کی مذمت ③ اثبات رسالت ④ رسالت سے متعلق شبہات کا جواب ⑤ آخرت کا بیان اور اس کی تفصیل میں مکذبین و مصدقین کی سزا و جزا ⑥ مضمون کی مناسبت سے انبیاء کرام کے چند واقعات اور منکرین نبوت کے انجام کا بیان ⑦ توحید و رسالت کے انکار کی مذمت ⑧ اخیر میں اہل ایمان و اطاعت کی تصدیق اور ان کی صفات کا ذکر۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۙ﴿۱﴾

بڑی برکت ہے اس کی جس نے اتاری فیصلہ کی کتاب[1] اپنے بندہ پر[2] تا کہ رہے (ہو) جہان والوں کے لیے ڈرانے والا[3]

**خلاصہ تفسیر:** گذشتہ سورت کے اختتام پر رسول ﷺ کے حقوق کا ذکر تھا، اس سورت کے شروع میں رسالت کا اثبات ہے، دونوں کے اختتام اور شروع میں مناسبت ظاہر ہے، بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت کا زیادہ حصہ رسالت ہی کی بحث پر ہے۔

بڑی عالی شان ذات ہے جس نے یہ فیصلہ کی کتاب (یعنی قرآن) اپنے خاص بندے (محمد ﷺ) پر نازل فرمائی تا کہ وہ تمام دنیا جہاں

والوں (یعنی انسان اور جن سب) کے لئے (ایمان نہ لانے کی صورت میں عذاب الٰہی سے) ڈرانے والا ہو۔

* * *

**فائدہ:** لہ ''فرقان'' (فیصلہ کی کتاب) قرآن کریم کو فرمایا جو حق و باطل کا آخری فیصلہ اور حرام وحلال کو کھلے طور پر ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے، یہی کتاب ہے جس نے اپنے اتارنے والے کی عظمت شان علو صفات اور اعلیٰ درجہ کی حکمت و رافت کو انتہائی مشکل میں پیش کیا اور تمام جہان کی ہدایت و اصلاح کا تکفل اور ان کو خیر کثیر اور غیر منقطع برکت عطا کرنے کا سامان بہم پہنچایا۔

**فائدہ:** ۲ یعنی اپنے اس کامل و اکمل بندہ (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) پر جن کا ممتاز لقب ہی کمال عبودیت کی وجہ سے ''عبداللہ'' ہوگیا۔ صلوات اللہ وسلامہ علیہ۔

**فائدہ:** ۳ یعنی قرآن کریم سارے جہان کو کفر وعصیان کے انجام بد سے آگاہ کرنے والا ہے، چونکہ سورتِ ہذا میں مکذبین ومعاندین کا ذکر بکثرت ہوا ہے، شاید اسی لیے یہاں صفت ''نذیر'' کو بیان فرمایا، ''بشیر'' کا ذکر نہیں کیا، اور ''للعالمین'' کے لفظ سے بتلادیا کہ یہ قرآن صرف عرب کے اُمیوں کے لیے نہیں اترا بلکہ تمام جن وانس کی ہدایت واصلاح کے واسطے آیا ہے۔

الَّذِیۡ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلَمۡ یَتَّخِذۡ وَلَدًا وَّلَمۡ یَكُنۡ لَّهٗ شَرِیۡكٌ فِی الۡمُلۡكِ

وہ کہ جس کی ہے سلطنت آسمان اور زمین میں اور نہیں پکڑا اس نے بیٹا اور نہیں کوئی اس کا ساجھی سلطنت میں

وَخَلَقَ كُلَّ شَیۡءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقۡدِیۡرًا ②

اور بنائی ہر چیز پھر ٹھیک کیا اس کو ناپ کر

**خلاصہ تفسیر:** ایسی ذات جس کے لئے آسمانوں اور زمین کی حکومت حاصل ہے، اور اس نے کسی کو (اپنی) اولاد قرار نہیں دیا، اور نہ کوئی اسکا شریک ہے حکومت میں، اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر سب کا الگ الگ انداز رکھا (کہ کسی چیز کی خاصیتیں اور آثار کچھ ہیں کسی کے کچھ ہیں)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی ہر چیز کو ایک خاص اندازہ میں رکھا کہ اس سے وہی خواص وافعال ظاہر ہوتے ہیں جن کے لیے پیدا کی گئی ہے اپنے دائرہ سے باہر قدم نہیں نکال سکتی نہ اپنی حدود میں عمل وتصرف کرنے سے قاصر رہتی ہے، غرض ہر چیز کو ایسا ناپ تول کر پیدا فرمایا کہ اس کی فطری موزونیت کے لحاظ سے ذرا کمی بیشی یا انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں چھوڑی، بڑے بڑے سائنس داں حکمت کے دریا میں غوطہ لگاتے ہیں اور آخر کار ان کو یہ ہی کہنا پڑتا ہے: صُنۡعَ اللّٰهِ الَّذِیۡۤ اَتۡقَنَ كُلَّ شَیۡءٍ (النمل: ۸۸) اور فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ (المومنون: ۱۴)

وَاتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا یَخۡلُقُوۡنَ شَیۡـًٔا وَّهُمۡ یُخۡلَقُوۡنَ وَلَا یَمۡلِكُوۡنَ لِاَنۡفُسِهِمۡ ضَرًّا

اور لوگوں نے پکڑ رکھے ہیں اس سے ورے کتنے حاکم جو نہیں بناتے کچھ چیز اور وہ خود بنائے گئے ہیں اور نہیں مالک اپنے حق میں برے کے

وَّلَا نَفۡعًا وَّلَا یَمۡلِكُوۡنَ مَوۡتًا وَّلَا حَیٰوةً وَّلَا نُشُوۡرًا ③

اور نہ بھلے کے اور نہیں مالک مرنے کے اور نہ جینے کے اور نہ جی اٹھنے کے

**خلاصہ تفسیر:** اور (حق تعالیٰ کے ایسے باکمال ہونے کے باوجود) ان مشرکین نے خدا کو چھوڑ کر اور ایسے معبود قرار دے لئے ہیں جو (کسی طرح معبود ہونے کے قابل نہیں، کیونکہ وہ) کسی چیز کے خالق نہیں اور بلکہ وہ مخلوق ہیں اور خود اپنے لئے نہ کسی نقصان (کے دور کرنے) کا

اختیار رکھتے ہیں اور نہ کسی نفع (کے حاصل کرنے) کا، اور نہ کسی کے مرنے کا اختیار رکھتے ہیں (کہ کسی جاندار کی جان نکال سکیں) اور نہ کسی کے جینے کا (اختیار رکھتے ہیں کہ کسی بے جان میں جان ڈال دیں) اور نہ کسی کو (قیامت میں) دوبارہ زندہ کرنے کا (اختیار رکھتے ہیں اور معبود ہونے کے لیے ان تصرفات پر مستقل طور سے قادر ہونا لازم ہے، جب ان میں یہ باتیں نہیں تو وہ معبود بننے کے بھی قابل نہیں)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی کس قدر ظلم اور تعجب و حیرت کا مقام ہے کہ ایسے قادر مطلق، مالک الکل، حکیم علی الاطلاق کی زبردست ہستی کو کافی نہ سمجھ کر دوسرے معبود اور حاکم تجویز کر لیے گئے جو گویا خدا کی حکومت میں حصہ دار ہیں، حالانکہ ان بیچاروں کا خود اپنا وجود بھی اپنے گھر کا نہیں، نہ وہ ایک ذرہ کے پیدا کرنے کا اختیار رکھتے ہیں، نہ مارنا جلانا ان کے قبضہ میں ہے، نہ اپنے مستقل اختیار سے کسی کو ادنیٰ ترین نفع نقصان پہنچا سکتے ہیں، بلکہ خود اپنی ذات کے لیے بھی ذرہ برابر فائدہ حاصل کرنے یا نقصان سے محفوظ رہنے کی قدرت نہیں رکھتے ایسی عاجز و مجبور ہستیوں کو خدا کا شریک ٹھہرانا کس قدر سفاہت اور بے حیائی ہے۔

**ربط:** یہ تو قرآن نازل کرنے والے کی صفات و شؤن کا ذکر تھا اور اس کے متعلق مشرکین جو بے تمیزی کر رہے تھے اس کی تردید تھی، آگے خود قرآن اور حامل قرآن کی نسبت سفیہانہ نکتہ چینیوں کا جواب ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُۨ افْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۛ

اور کہنے لگے جو منکر ہیں اور کچھ نہیں ہے یہ مگر طوفان باندھ لایا ہے اور ساتھ دیا ہے اس کا اس میں اور لوگوں نے [1]

فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۚ﴿۴﴾

سو آ گئے بے انصافی اور جھوٹ پر [2]

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے توحید و رسالت کو ثابت کر کے توحید کے انکار پر ملامت کی تھی، اب رسالت و وحی کے انکار کی قباحت اور اس پر کفار کو جو اعتراض و شبہات ہیں ان کا جواب ہے، ہر اعتراض کے بعد اس کا جواب ہے اور یہ سوال و جواب کا مضمون چار رکوع تک چلا گیا ہے، درمیان درمیان میں مناسب مقام پر دوسرے مضامین ہیں۔

اور کافر (مشرک) لوگ (قرآن کے بارے میں) یوں کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) تو کچھ بھی نہیں نرا جھوٹ (ہی جھوٹ) ہے جس کو اس شخص (یعنی پیغمبر) نے گھڑ لیا ہے اور دوسرے لوگوں نے اس (گھڑت) میں اس کی مدد کی ہے (مراد اس سے وہ اہل کتاب ہیں جو مسلمان ہو گئے تھے، یا آپ کی خدمت میں ویسے ہی حاضر ہوا کرتے تھے) سو (ایسی بات کہنے سے) یہ لوگ بڑے ظلم اور جھوٹ کے مرتکب ہوئے (چنانچہ اس کا ظلم اور جھوٹ ہونا دلیل کے ساتھ آگے آئے گا)۔

* * *

**فائدہ: [1]** یعنی یہ سب کہنے کی باتیں ہیں کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے، معاذ اللہ محمد ﷺ نے چند یہودیوں کی مدد سے ایک کلام تیار کر لیا اور اس کو جھوٹ طوفان خدا کی طرف منسوب کر دیا، پھر ان کے ساتھی لگے اس کی اشاعت کرنے، بس کل حقیقت اتنی ہے۔

**فائدہ: [2]** یعنی اس سے بڑھ کر ظلم اور جھوٹ کیا ہو گا کہ ایسے کلام معجز اور کتاب حکیم کو جس کی عظمت و صداقت آفتاب سے زیادہ روشن ہے، کذب و افتراء کہا جائے، کیا چند یہودی غلاموں کی مدد سے ایسا کلام بنایا جا سکتا ہے جس کے مقابلہ میں تمام دنیا کے فصیح و بلیغ عالم و حکیم بلکہ جن و انس ہمیشہ کے لیے عاجز رہ جائیں، اور جس کے علوم و معارف کی تھوڑی سی جھلک بڑے بڑے عالی دماغ عقلاء و حکماء کی آنکھوں کو خیرہ کر دے۔

وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝٥

اور کہنے لگے یہ نقلیں ہیں پہلوں کی جن کو اس نے لکھ رکھا ہے، سو وہ ہی لکھوائی جاتی ہیں اس کے پاس صبح اور شام

**خلاصہ تفسیر:** اور یہ (کافر) لوگ (اپنے اسی اعتراض کی تائید میں) یوں کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) بے سند باتیں ہیں جو اگلے لوگوں سے منقول ہوتی چلی آئی ہیں جن کو اس شخص (پیغمبر) نے (عمدہ عبارت میں سوچ سوچ کر اپنے صحابہ کے ہاتھ سے) لکھوالیا ہے (تاکہ محفوظ رہے) پھر وہی (مضامین) اس کو صبح شام پڑھ کر سنائے جاتے ہیں (تاکہ یاد رہیں، پھر وہی یاد کئے ہوئے مضامین مجمع میں بیان کر کے خدا کی طرف منسوب کر دیتے ہیں)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی محمد ﷺ نے اہل کتاب سے کچھ قصے کہانیاں سن کر نوٹ کر لی ہیں، یا کسی سے نوٹ کرالی ہیں، وہ ہی شب و روز ان کے سامنے پڑھی اور رٹی جاتی ہیں، نئے نئے اسلوب سے ان ہی کا الٹ پھیر رہتا ہے اور کچھ بھی نہیں، حضرت شاہ صاحب: لکھتے ہیں کہ ''اول نماز کے دو وقت مقرر تھے صبح اور شام، مسلمان حضرت کے پاس جمع ہوتے جو نیا قرآن اترا ہوتا لکھ لیتے یاد کرنے کو، اس کو کافر یوں کہنے لگے''۔

قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝٦

تو کہہ اس کو اتارا ہے اس نے جو جانتا ہے چھپے ہوئے بھید آسمانوں میں اور زمین میں ۱ بیشک وہ بخشنے والا مہربان ہے ۲

**خلاصہ تفسیر:** آپ (اس کے جواب میں) کہہ دیجئے کہ اس (قرآن) کو تو اس ذات (پاک) نے اتارا ہے جس کو سب چھپی باتوں کی خواہ وہ آسمانوں میں ہوں یا زمین میں ہوں خبر ہے (خلاصہ جواب کا یہ ہے کہ اس کلام کا اعجاز اس کی کھلی دلیل ہے کہ کفار کا یہ اعتراض غلط اور جھوٹ اور ظلم ہے، کیونکہ اگر قرآن اساطیر الاولین، یعنی پرانے لوگوں کی کہانیاں ہوتا یا کسی دوسرے کی مدد سے تصنیف کیا گیا ہوتا تو ساری دنیا اس کی مثال لانے سے عاجز کیوں ہوتی؟! اور تقاضا تو یہ تھا کہ ان کفریات پر انہیں فوراً سزا ہو جاتی مگر) واقعی اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے (اس لئے ایسے جھوٹ اور ظلم پر فوری سزا نہیں دیتا، یعنی ان کفریات پر ان کو فوراً سزا ہو جاتی مگر اللہ غفور الرحیم ہے اس لیے جب فوراً سزا دینے میں کوئی خاص حکمت نہ ہو تو فوراً مواخذہ نہیں کرتا، پس یہ مغفرت و رحمت خاص وقت تک ہے، پھر مہلت کی مدت ختم ہونے کے بعد عذاب واقع ہوگا)۔

چونکہ اس کا علم ایسا کامل ہے تو اس نے اپنے کلام میں تمام خوبیوں کی پوری رعایت کر کے دوسرے کلاموں سے اسے ممتاز کر دیا ہے، کیونکہ کسی دوسرے کا علم ایسا نہیں ہے تو وہ اپنے کلام میں اس قدر خوبیوں کی رعایت بھی نہیں کر سکتا، پس یہ قرآن معجزہ ہے جس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا اور کسی دوسرے کا کلام معجزہ نہیں ہو سکتا، اگر یہ کلام خود پیغمبر کا بنایا ہوا یا کسی دوسرے کا لکھا ہوا ہوتا تو معجزہ کیسے ہو جاتا اور سارا عالم اس کے مقابلہ سے عاجز کیوں ہو جاتا؟! پس قرآن کا اعجاز اس کی دلیل ہے کہ اسے بے سند باتیں کہنا غلط ہے اور اسی سے ثابت ہو گیا کہ یہ لوگ بڑے ظلم اور جھوٹ کے مرتکب ہوئے ہیں، یہ دو اعتراض تو قرآن پر تھے جن کا جواب گذشتہ تین آیتوں میں تفصیل سے ہو گیا۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی کتاب خود بتلا رہی ہے کہ وہ کسی ایک انسان یا کمیٹی کی بنائی ہوئی نہیں، بلکہ اس خدا کی اتاری ہوئی ہے جس کے احاطہ علمی سے زمین و آسمان کی کوئی چیز باہر نہیں ہو سکتی، اس کلام کی معجزانہ فصاحت و بلاغت، علوم و معارف، اخبار غیبیہ، احکام و قوانین اور وہ اسرار مکنونہ جن کی تہ تک بدون توفیق الٰہی کے عقول و افہام کی رسائی نہیں ہو سکتی صاف ظاہر کرتے ہیں کہ یہ کسی محدود علم والے آدمی یا سازشی جماعت کا کلام نہیں۔

**فائدہ:** ۲ یعنی اپنی بخشش اور مہر سے ہی قرآن اتارا (موضح القرآن) پھر جو لوگ ایسی روشن حقیقت کے منکر ہیں باوجود ان کے جرائم کا

تفصیلی علم رکھنے کے فوراً سزا نہیں دیتا، یہ بھی اس کی بخشش اور مہر ہی کا پرتو ہے۔

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ

اور کہنے لگے یہ کیسا رسول ہے کھاتا ہے کھانا اور پھرتا ہے بازاروں میں ،کیوں نہ اترا اس کی طرف کوئی فرشتہ

فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۝ۙ اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ؕ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ

کہ رہتا اسکے ساتھ ڈرانے کو۔ا یا آ پڑتا اسکے پاس خزانہ یا ہو جاتا اسکے لیے ایک باغ کہ کھایا کرتا اس میں سے ۲ اور کہنے لگے بے انصاف

اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝۸

تم پیروی کرتے ہو اس ایک مرد جادو مارے کی ۳

**خلاصہ تفسیر:** اب ان اعتراضات کا بیان ہے جو رسول پر کرتے تھے۔

اور یہ کافر لوگ (رسول اللہ ﷺ کی نسبت) یوں کہتے ہیں کہ اس رسول کو (یعنی جو بزعم خود رسول ہے) کیا ہوا کہ وہ (ہماری طرح) کھانا (بھی) کھاتا ہے اور (انتظام معاش کے لئے ہماری ہی طرح) بازاروں میں (بھی) چلتا پھرتا ہے (مطلب یہ ہے کہ رسول و پیغمبر انسان کے بجائے فرشتہ ہونا چاہئے جو کھانے پینے وغیرہ کی ضروریات سے مستغنی ہو اور کم از کم اتنا تو ضرور ہی ہونا چاہیے کہ رسول اگر خود فرشتہ نہیں ہے تو اس کا مصاحب و مشیر کوئی فرشتہ ہونا چاہئے اس لئے کہا کہ) اس (رسول) کے پاس کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا گیا کہ وہ اس کے ساتھ رہ کر (لوگوں کو عذاب الٰہی سے) ڈراتا۔

یا (اگر یہ بھی نہ ہوتا تو کم از کم رسول کو اپنے کھانے پینے کی ضروریات سے تو بے فکری ہوتی اس طرح کہ) اس کے پاس (غیب سے) کوئی خزانہ آ پڑتا (کہ معاش کی فکر نہ ہوتی) یا اس کے پاس کوئی باغ ہوتا جس سے یہ کھایا (پیا) کرتا (تاکہ معمولی کھانے اور بازار میں چلنے پھرنے کی ضرورت نہ ہوتی) اور (مسلمانوں سے) یہ ظالم یوں (بھی) کہتے ہیں کہ (جب ان کے پاس نہ کوئی فرشتہ ہے نہ خزانہ نہ باغ اور پھر بھی یہ نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عقل میں فتور ہے اس لئے) تم لوگ ایک مسلوب العقل آدمی کی راہ پر چل رہے ہو۔

**مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ:** اس آیت سے بازار میں چلنا پھرنا بلا کراہت جائز معلوم ہوتا ہے اور حدیثوں سے جو کراہت مفہوم ہوتی ہے تو وہاں بلا ضرورت جانا بازاروں میں گھومنا پھرنا مراد ہے، بلکہ اگر بازار میں نہ جانا تکبر کی وجہ سے ہو تو نہ جانا برا، اور جانا اچھا ہوگا۔

روح المعانی میں ہے کہ اس میں ان لوگوں کی حالت کی کوتاہی کی طرف اشارہ ہے جو اولیاء اللہ کا اس وجہ سے انکار یا ان پر اعتراض و تنقید کرتے ہیں کہ وہ بشری تقاضوں یعنی کھانے پینے وغیرہ میں عام لوگوں جیسے کیوں ہیں (یعنی جتنے بھی اولیاء کرام ہیں وہ انسانی ضروریات سے مستغنی نہیں ہوتے، کیونکہ بہرحال وہ انسان ہیں)۔

**لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ:** اس میں اس شخص پر رد ہے جو کرامات اور غیر معمولی واقعات کو کمال کا معیار قرار دیتا ہوں۔

**اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا:** اس سے آپ ﷺ پر جادو ہونے کی نفی لازم نہیں آتی، کیونکہ کفار کا مقصود نبوت کا انکار تھا جیسا کہ جملہ حصر سے سمجھ آتا ہے، سو کفار کے اس مقصود کی تو قطعاً نفی کی گئی ہے، اور آپ ﷺ پر مطلق جادو کے مؤثر ہونے کے متعلق آیت خاموش ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی جب ہماری طرح کھانا کھائے اور ہماری طرح خرید و فروخت کے لیے بازاروں میں جائے تو ہم میں اس میں فرق کیا رہا، اگر واقعی رسول تھا تو چاہیے تھا کہ فرشتوں کی طرح کھانے پینے اور طلب معاش کے بکھیڑوں سے فارغ ہوتا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی اگر فرشتوں کی فوج نہیں تو کم از کم خدا کا ایک آدھ فرشتہ ان کو سچا ثابت کرنے اور رعب جمانے کے لیے ساتھ رہتا جسے دیکھ کر خواہ مخواہ لوگوں کو جھکنا پڑتا، یہ کیا کہ کس مپرسی کی حالت میں اکیلے دعویٰ کرتے پھر رہے ہیں، یا اگر فرشتے بھی ہمراہ نہ ہوں تو کم از کم آسمان سے سونے چاندی کا کوئی غیبی خزانہ مل جاتا کہ لوگوں کو بے دریغ مال خرچ کر کے ہی اپنی طرف کھینچ لیا کرتے، اور خیر یہ بھی نہ سہی معمولی رئیسوں اور زمینداروں کی طرح انگور کھجور وغیرہ کا ایک باغ تو ان کی ملک میں ہوتا جس سے دوسروں کو نہ دیتے تو کم از کم خود بے فکری سے کھایا پیا کرتے جب اتنا بھی نہیں تو کس طرح یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ نے رسالت کے عہدہ جلیلہ پہ معاذ اللہ ایسی معمولی حیثیت کے آدمی کو مامور کیا ہے۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی میاں کی یہ پوزیشن اور اتنے اونچے دعوے؟ بجز اس کے کیا کہا جائے کہ عقل کھوئی گئی ہے یا کسی نے جادو کے زور سے دماغ مختل کر دیا ہے جو ایسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں۔ (العیاذ باللہ)

ع ۱۶ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ۝۹

دیکھ کیسی بٹھلاتے ہیں تجھ پر مثلیں سو بہک گئے اب پا نہیں سکتے راستہ

**خلاصہ تفسیر:** (اے محمد ﷺ!) دیکھئے تو یہ لوگ آپ کے لئے کیسی عجیب عجیب باتیں بیان کر رہے ہیں، سو (ان خرافات سے) وہ (بالکل) گمراہ ہوگئے، پھر (گمراہی میں شدت کی وجہ سے) وہ (بالکل) راہ نہیں پا سکتے۔

رسول پر انہوں نے دو اعتراض کیے: ① ایک کھانا پینا، بازاروں میں چلنا ② دوسرے عقل میں فتور ہونا، اس آیت میں دونوں کا جواب دیا، چونکہ رسالت پر اس دوسرے اعتراض کا باطل ہونا بالکل ظاہر تھا، کیونکہ حضور ﷺ کا سب سے زیادہ عاقل ہونا مشاہد تھا اس لیے اس کا جواب تو اس آیت میں تفصیل کے ساتھ ہو گیا کہ رسالت کے لیے ان باتوں کا لازم ہونا خود عجیب بات ہے، اور پہلے اعتراض کا جواب اس آیت میں اجمالی طور پر دے دیا کہ جب ان باتوں کا رسالت کے لیے لازم ہونا خود عجیب ہے تو ان کو لازم سمجھنا پوری گمراہی ہے، کیونکہ نبوت کے لیے کسی ایک معجزہ کا ہونا کافی ہے، خاص معجزہ کا ہونا ضروری نہیں، یہ تو اجمالی جواب ہے، تفصیلی جواب آگے آتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی کبھی کہتے ہیں کہ ان کی باتیں محض مفتریات ہیں، کبھی دعوے کرتے ہیں کہ نہیں دوسروں سے سیکھ کر اپنے سانچے میں ڈھال لی ہیں کبھی آپ ﷺ کو مسحور بتلاتے ہیں کبھی ساحر، کبھی کاہن، کبھی شاعر، کبھی مجنوں، یہ اضطراب خود بتلاتا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز آپ ﷺ پر منطبق نہیں ہوتی، اسی لیے کسی ایک بات پر قرار نہیں، اور الزام لگانے کا کوئی راستہ ہاتھ نہیں آتا، جو لوگ انبیاء کی جناب میں اس طرح کی گستاخیاں کر کے گمراہ ہوتے ہیں ان کے راہِ راست پر آنے کی کوئی توقع نہیں۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ

بڑی برکت ہے اس کی جو چاہے تو کر دے تیرے واسطے اس سے بہتر باغ کہ نیچے بہتی ہیں (ہوں) ان کے نہریں

وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ۝۱۰

اور کر دے تیرے واسطے محل

**خلاصہ تفسیر:** رسالت پر ان کے دوسرے اعتراض: اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ کا اجمالی جواب تو پیچھے بیان ہو چکا، اب تفصیلی جواب بیان کیا جاتا ہے۔

وہ ذات بڑی عالی شان ہے کہ اگر وہ چاہے تو آپ کو (کفار کی) اس (فرمائش) سے (بھی) اچھی چیز دے دے یعنی بہت سے (غیبی)

باغات جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں (بہتر اس لئے کہا کہ وہ تو صرف باغ کی فرمائش کرتے تھے اگر چہ ایک ہی ہو اور چند باغوں کا ایک سے بہتر ہونا ظاہر ہے) اور (بلکہ ان باغوں کے ساتھ اور بھی مناسب چیزیں دے دے جن کی کفار نے فرمائش بھی نہیں کی یعنی) آپ کو بہت سے محل دے دے (جو ان باغوں میں بنے ہوں یا باہر ہی ہوں جس سے ان کی فرمائش اور بھی زیادہ نعمتوں کے ساتھ پوری ہو جائے، مطلب یہ کہ جو چیزیں جنت میں ملیں گی اگر اللہ چاہے تو آپ کو دنیا ہی میں دے دے، لیکن بعض حکمتوں کی وجہ سے نہیں چاہا اور نہ کچھ ضرورت تھی، اس لیے شبہ محض بیہودہ ہے)۔

**جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ:** ان باغوں سے غیبی باغات مراد ہونا قتادہؒ کے قول سے اس کی تائید ہوتی ہے جو درمنثور میں ہے، اور چونکہ یہ معجزہ بشریت کے منافی نہیں، اور جو معجزات بشریت کے منافی نہ ہوں وہ انبیاء کے ہاتھ سے ظاہر ہو سکتے ہیں تو سرسری نظر سے اس شبہ کی گنجائش ہو سکتی تھی کہ کفار کی فرمائش کیوں نہ پوری کردی گئی؟ اس لیے پہلے اس کا جواب دیا، اور کھانے پینے اور بازار میں چلنے پر جو اعتراض تھا اس کا منشا یہ تھا کہ رسول فرشتہ کیوں نہ ہوا؟ اور فرشتہ ہونا بشریت کے منافی ہے اور بشریت کے خلاف معجزے انبیاء سے ظاہر نہیں ہوا کرتے تو اس شبہ کی سرسری نظر میں بھی گنجائش نہ تھی، اس لیے اس کے جواب کو مؤخر کر دینے میں مضائقہ نہ ہوا۔

* * *

**فائدہ:** یعنی اللہ کے خزانہ میں کیا کمی ہے، وہ چاہے تو ایک باغ کیا، بہت سے باغ اس سے بہتر عنایت فرما دے جس کا یہ لوگ مطالبہ کرتے ہیں، بلکہ اس کو قدرت ہے کہ آخرت میں جو باغ اور نہریں اور حور وقصور ملنے والے ہیں وہ سب آپ ﷺ کو ابھی دنیا میں عطا کر دے، لیکن حکمت الٰہی بالفعل اس کو مقتضی نہیں، اور معاندین کے سارے مطالبات اور فرمائشیں بھی اگر پوری کر دی جائیں تب بھی یہ حق وصداقت کو قبول کرنے والے نہیں ہیں، باقی پیغمبر ﷺ کی صداقت ثابت کرنے کے لیے جو دلائل و معجزات پیش کیے جا چکے وہ کافی سے زیادہ ہیں۔

## بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ ۣ وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا ⑪

کچھ نہیں وہ جھٹلاتے ہیں قیامت کو، اور ہم نے تیار کی ہے اس کے واسطے کہ جھٹلایا ہے قیامت کو آگ

**خلاصہ تفسیر:** جواب کے مضمون کے درمیان اب یہاں ان کے رسالت پر اعتراض کی علت بیان کی جاتی ہے، اور قیامت کے ذکر کی مناسبت سے کئی آیتوں تک اس کے واقعات کا ذکر ہے۔

(کفار کے ان مذکورہ شبہات کا سبب یہ نہیں ہے کہ ان کو حق کی طلب اور فکر ہے اور تحقیق سے پہلے اس دوران انہیں ایسے شبہات واقع ہو گئے ہوں) بلکہ (اعتراضات کی وجہ محض شرارت اور طلب حق سے بےفکری ہے اور اس بےفکری اور شرارت کا سبب یہ ہے کہ) یہ لوگ قیامت کو جھوٹ سمجھ رہے ہیں (اس لئے انجام کی فکر نہیں ہے جو جی میں آتا ہے کر لیتے ہیں بک دیتے ہیں) اور (انجام اس کا یہ ہوگا کہ) ہم نے ایسے شخص (کی سزا) کے لئے جو کہ قیامت کو جھوٹا سمجھے دوزخ تیار کر رکھی ہے (کیونکہ قیامت کے انکار سے اللہ و رسول کی تکذیب لازم آتی ہے جو دوزخ میں جانے کا اصل سبب ہے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی یہ لوگ جن چیزوں کا مطالبہ کر رہے ہیں، فی الحقیقت طلب حق کی نیت نہیں، محض شرارت اور تنگ کرنے کے لیے ہے، اور شرارت کا سبب یہ ہے کہ انھیں ابھی تک قیامت اور سزا و جزاء پر یقین نہیں آیا، سو یاد رکھنا چاہیے کہ ان کے جھٹلانے سے کچھ نہیں بنتا، قیامت آ کر رہے گی اور ان مکذبین کے لیے آگ کا جو جیل خانہ تیار کیا گیا ہے اس میں ضرور رہنا پڑے گا۔

إِذَا رَأَتْهُم مِّن مَّكَانٍ بَعِيدٍ سَمِعُوا لَهَا تَغَيُّظًا وَزَفِيرًا ﴿١٢﴾ وَإِذَا أُلْقُوا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا

جب وہ دیکھے گی ان کو دور کی جگہ سے سنیں گے اس کا جھنجلانا اور چلانا ۱؎ اور جب ڈالے جائیں گے اس کے اندر ایک جگہ تنگ میں

مُّقَرَّنِينَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُورًا ﴿١٣﴾ لَّا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُورًا وَاحِدًا وَادْعُوا ثُبُورًا كَثِيرًا ﴿١٤﴾

ایک زنجیر میں کئی کئی بندھے ہوئے پکاریں گے اس جگہ موت کو ۲؎ مت پکارو آج ایک مرنے کو اور پکارو بہت سے مرنے کو ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** (اور اس دوزخ کی یہ کیفیت ہوگی کہ) وہ (دوزخ) ان کو دور سے دیکھے گی تو (دیکھتے ہی غضبناک ہو کر اس قدر جوش مارے گی کہ) وہ لوگ (دور ہی سے) اس کا جوش وخروش سنیں گے، اور (پھر) جب وہ اس (دوزخ) کی کسی تنگ جگہ میں ہاتھ پاؤں جکڑ کر ڈال دیئے جائیں گے تو وہاں موت ہی موت پکاریں گے (جیسا کہ مصیبت میں عادت ہے کہ موت کو بلاتے اور اس کی تمنا کرتے ہیں، اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ) ایک موت کو نہ پکارو بلکہ بہت سی موتوں کو پکارو (کیونکہ موت کو مصیبت کی وجہ سے پکارتے ہیں، تو جتنی مصیبتیں ہیں اتنی ہی موتوں کو پکارنا چاہیے، اور وہاں کی مصیبتیں بے انتہا ہیں تو بے انتہا موتوں کو پکارو)۔

**إِذَا رَأَتْهُم مِّن مَّكَانٍ بَعِيدٍ:** اس آیت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ دیکھے گی اور دوسری آیات واحادیث سے بھی جہنم کے لیے شعور وادراک ہونا معلوم ہوتا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: **وتقول هل من مزيد**، یعنی دوزخ کہے گی کہ کچھ اور بھی ہے، بخاری میں ہے کہ دوزخ نے اپنی گرمی کی حق تعالی سے شکایت اور طبرانی سے مرفوعا روایت منقول ہے کہ صحابہ نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ جہنم کی آنکھ بھی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں! ہے، کیا تم نے یہ آیت: إِذَا رَأَتْهُم مِّن مَّكَانٍ بَعِيدٍ نہیں سنی؟ تو کیا بغیر آنکھ ہی کے دیکھ لے گی۔

**مَكَانًا ضَيِّقًا:** اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ جہنم تنگ ہو جائے گی، کیونکہ احادیث سے اسکا بے انتہا وسیع ہونا معلوم ہوتا ہے، بلکہ جس طرح جیل خانہ بڑا ہوتا ہے اور ہر قیدی کیلئے الگ الگ تنگ کوٹھڑی ہوتی ہے، اسی طرح جہنم بے انتہا بڑی ہے، مگر ہر جہنمی کے رہنے کی خاص جگہ بہت تنگ ہوگی۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی دوزخ کی آگ محشر میں جہنمیوں کو دور سے دیکھ کر جوش میں بھر جائے گی اور اس کی غضبناک آوازوں اور خوفناک پھنکاروں سے بڑے بڑے دلیروں کے پتے پانی ہو جائیں گے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی دوزخ میں ہر مجرم کے لیے خاص جگہ ہوگی جہاں سے ہل نہ سکے گا، اور ایک نوعیت کے کئی کئی مجرم ایک ساتھ زنجیروں میں جکڑے ہوں گے، اس وقت مصیبت سے گھبرا کر موت کو پکاریں گے کہ کاش موت آ کر ہماری ان دردناک مصائب کا خاتمہ کر دے۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی ایک بار مریں تو چھوٹ جائیں، دن میں ہزار بار مرنے سے بدتر حال ہوتا ہے۔ (موضح القرآن)

قُلْ أَذَٰلِكَ خَيْرٌ أَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ ۚ كَانَتْ لَهُمْ جَزَاءً وَمَصِيرًا ﴿١٥﴾

تو کہہ بھلا یہ چیز بہتر ہے یا باغ ہمیشہ رہنے کا جس کا وعدہ ہو چکا پرہیزگاروں سے ۱؎ وہ ہوگا ان کا بدلہ اور پھر جانے کی جگہ

لَّهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ خَالِدِينَ ۚ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُولًا ﴿١٦﴾

ان کے واسطے وہاں ہے جو وہ چاہیں ۲؎ رہا کریں ہمیشہ ہو چکا، تیرے رب کے ذمہ وعدہ مانگا ملتا ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** آپ (ان کو یہ مصیبت سنا کر) کہیے کہ (یہ بتلاؤ کہ) کیا یہ (مصیبت کی) حالت اچھی ہے (جو کہ تمہارے کفر وانکار کا تقاضہ ومطالبہ ہے) یا وہ ہمیشہ کے رہنے کی جنت (اچھی ہے) جس کا خدا سے ڈرنے والوں سے (یعنی اہل ایمان سے) وعدہ کیا گیا ہے کہ وہ ان

کے لئے (ان کی اطاعت کا) صلہ ہے اور ان کا (آخری) ٹھکانا (اور) ان کو وہاں وہ سب چیزیں ملیں گی جو کچھ وہ چاہیں گے (اور) وہ (اس میں) ہمیشہ رہیں گے (اے پیغمبر!) یہ ایک وعدہ ہے جو (بطور فضل وعنایت کے) آپ کے رب کے ذمہ ہے اور قابل درخواست ہے (اور ظاہر ہے ہمیشہ کی جنت ہی بہتر ہے، سواس میں دھمکی کے بعد ایمان کی ترغیب ہوگئی)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی مکذبین کا انجام سن لیا، اب خود فیصلہ کرلو کہ یہ پسند ہے یا وہ جس کا وعدہ مومنین متقین سے کیا گیا۔

**فائدہ:** ۲؎ اور چاہیں گے وہی جو ان کے [مقام و] مرتبہ کے مناسب ہوگا۔

**فائدہ:** ۳؎ وَعْدًا مَّسْئُوْلًا سے مراد حتمی وعدہ ہے جو خدا تعالیٰ نے محض فضل وعنایت سے اپنے ذمہ لازم کرلیا، یا یہ مطلب کہ اس وعدہ کے ایفاء کا متقین سوال کریں گے، جو یقیناً پورا کیا جائے گا جیسا کہ دعا میں ہے: رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (آل عمران: ۱۹۴)

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ

اور جس دن جمع کر بلائے گا ان کو اور جن کو وہ پوجتے ہیں اللہ کے سوائے پھر ان سے کہے گا کیا تم نے بہکایا میرے ان بندوں کو

اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ۟ؕ ⑰

یا وہ آپ بہکے راہ سے

**خلاصہ تفسیر:** اور (وہ دن ان کو یاد دلایئے کہ) جس روز اللہ تعالیٰ ان (کافر) لوگوں کو اور جن کو وہ لوگ خدا کے سوا پوجتے تھے (انہوں نے اپنے اختیار سے کسی کو گمراہ نہیں کیا تھا خواہ صرف بت مراد ہوں یا ملائکہ وغیرہ بھی) ان (سب) کو جمع کرے گا، پھر (ان معبودین سے ان عابدین کی رسوائی کے لئے) فرمادے گا کیا تم نے میرے ان بندوں کو (راہ حق سے) گمراہ کیا تھا یا یہ (خود ہی) راہ (حق) سے گمراہ ہوگئے تھے (مطلب یہ کہ انہوں نے تمہاری عبادت جو کہ حقیقت میں گمراہی ہے تمہارے حکم اور تمہاری خوشی سے کی تھی جیسا کہ ان لوگوں کا گمان تھا کہ یہ معبودین ہماری عبادت سے خوش ہوتے ہیں اور خوش ہوکر اللہ تعالیٰ سے شفاعت کریں گے یا خود اپنی فاسد رائے سے یہ تجویز نکالی تھی)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی عابدین کو سنا کر معبودوں سے دریافت کیا جائے گا کہ کیا تم نے ان کو شرک کی اور اپنی پرستش کرانے کی ترغیب دی تھی یا یہ خود اپنی حماقت وجہالت اور غفلت وبے توجہی سے گمراہ ہوئے۔

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَآءَهُمْ

بولیں گے تو پاک ہے ہم سے بن نہ آتا تھا کہ پکڑلیں کسی کو تیرے بغیر رفیق ۱؎ لیکن تو ان کو فائدہ پہنچاتا رہا اور ان کے باپ دادوں کو

حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا قَوْمًۢا بُوْرًا ⑱

یہاں تک کہ بھلا بیٹھے تیری یاد، اور یہ تھے لوگ تباہ ہونے والے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** وہ (معبودین) عرض کریں گے کہ معاذ اللہ ہماری کیا مجال تھی کہ ہم آپ کے سوا اور کارسازوں کو (اپنے اعتقاد

میں) تجویز کریں (خواہ وہ کارساز ہم ہوں یا ہمارے سوااور کوئی ہو، مطلب یہ کہ ہم تو عبادت صرف آپ کا حق سمجھتے ہیں تو ان کو شرک کا حکم کیوں کرتے یا اس پر رضامندی کیوں ظاہر کرتے) ولیکن (یہ خود ہی گمراہ ہوئے اور گمراہ بھی ایسے نامعقول طور پر ہوئے کہ جو باتیں شکر کا سبب تھیں ان کو ناشکری کا سبب بنایا، چنانچہ) آپ نے (تو) ان کو اور ان کے بڑوں کو (خوب) آسودگی دی (جس کا تقاضہ یہ تھا کہ نعمت دینے والے کو پہچانتے اور اس کا شکر و اطاعت کرتے مگر یہ لوگ) یہاں تک (شہوات ولذات میں منہمک ہوئے) کہ (آپ کی) یاد (ہی) کو بھلا بیٹھے اور یہ لوگ خود ہی برباد ہوئے (مطلب جواب کا ظاہر ہے کہ دونوں صورتوں میں سے اس صورت کو اختیار کیا کہ یہ خود ہی گمراہ ہوئے، ہم نے نہیں کیا، اور ان کی گمراہی کو اللہ کی بڑی نعمتیں ان پر مبذول ہونے کا ذکر کر کے اور زیادہ واضح کر دیا)۔

بت اور معبودین وغیرہ کے بولنے کے متعلق سورہ یونس آیت ۲۹ کے خلاصہ تفسیر میں تحقیق گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ کیا جائے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی ہماری کیا مجال تھی کہ تجھ سے ہٹ کر کسی دوسرے کو اپنا رفیق و مددگار سمجھتے، پھر جب ہم اپنے نفس کے لیے تیرے سوا کوئی سہارا نہیں رکھتے تو دوسروں کو کیسے حکم دیتے کہ ہم کو اپنا معبود اور حاجت روا سمجھیں۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی اصل یہ ہے کہ یہ بدبخت اپنی سوء استعداد سے خود ہی تباہ ہونے کو پھر رہے تھے ہلاکت ان کے لیے مقدر ہو چکی تھی، ظاہری سبب اس کا یہ ہوا کہ عیش و آرام میں پڑ کر اور غفلت کے نشہ میں چور ہو کر آپ کی یاد کو بھلا بیٹھے، کسی نصیحت پر کان نہ دھرا، پیغمبروں کی ہدایت وارشاد کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر لیں اور دنیاوی تمتع پر مغرور ہو گئے، آپ نے اپنی نوازش سے جس قدر ان کو اور ان کے باپ دادوں کو دنیا کے فائدے پہنچائے، یہ اسی قدر غفلت ونسیان میں ترقی کرتے گئے، چاہیے تو یہ تھا کہ انعامات الٰہیہ کو دیکھ کر منعم حقیقی کی بندگی اور شکر گزاری اختیار کرتے، الٹے مغرور و مفتون ہو کر فکر و عصیان پر تل گئے، گویا جو امرت تھا، بدبختی سے ان کے حق میں زہر بن گیا۔

فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ ۙ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا ۚ وَمَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ

سو وہ تو جھٹلا چکے تم کو تمہاری بات میں ۱؎ اب نہ تم لوٹا سکتے ہو اور نہ مدد کر سکتے ہو ۲؎ اور جو کوئی تم میں گناہ گار ہے

نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا ⑲

اس کو ہم چکھائیں گے بڑا عذاب ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** (اس وقت اللہ تعالیٰ ان عابدین کو لاجواب کرنے کے لئے جو اصل مقصود تھا مذکورہ سوال سے یہ فرمائیں گے) لو تمہارے ان معبودوں نے تو تم کو تمہاری (سب) باتوں میں جھوٹا (ہی) ٹھہرادیا (اور انہوں نے بھی تمہارا ساتھ نہ دیا اور جرم پوری طرح ثابت ہو گیا) سو (اب) تم نہ تو خود (عذاب کو اپنے اوپر سے) ٹال سکتے ہو اور نہ (کسی دوسرے کی طرف سے) مدد دیئے جا سکتے ہو (حتیٰ کہ جن پر پورا بھروسہ تھا وہ بھی صاف جواب دے رہے ہیں اور تمہاری کھلی مخالفت کر رہے ہیں) اور جو (جو) تم میں ظالم (یعنی مشرک) ہوگا ہم اس کو بڑا عذاب چکھائیں گے (اور اگرچہ اس وقت سارے مخاطب مشرک ہی ہوں گے اور وہ سب ہی ظلم ڈھانے والے ہیں مگر اس عنوان سے فرمانے کی یہ وجہ ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس عذاب کا سبب شرک ہے جو کہ بہت بڑا ظلم ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یہ حق تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوگا کہ لو! جن کی اعانت پر تم کو بڑا بھروسہ تھا وہ خود تمہارے دعاوی کو جھٹلا رہے اور تمہاری حرکات سے اعلانیہ بیزاری کا اظہار کر رہے ہیں۔

**فائدہ:** ۲ یعنی اب نہ عذاب الٰہی کو پھیر سکتے ہو نہ بات کو پلٹ سکتے ہو نہ ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہو، جس کو جو سزا ملنے والی ہے اس کا پڑے مزہ چکھتے رہو۔

**فائدہ:** ۳ شاید ظلم سے مراد یہاں شرک ہو، اور ممکن ہے ہر قسم کا ظلم و گناہ مراد لیا جائے۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَكَ مِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ اِلَّاۤ اِنَّهُمۡ لَيَاۡكُلُوۡنَ الطَّعَامَ وَيَمۡشُوۡنَ فِى الۡاَسۡوَاقِ ؕ

اور جتنے بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے رسول سب کھاتے تھے کھانا اور پھرتے (آتے جاتے) تھے بازاروں میں ۱

وَجَعَلۡنَا بَعۡضَكُمۡ لِبَعۡضٍ فِتۡنَةً ؕ اَتَصۡبِرُوۡنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيۡرًا ﴿۲۰﴾ ع ۱۷

اور ہم نے رکھا ہے تم میں ایک دوسرے کے جانچنے کو، دیکھیں ثابت بھی رہتے ہو ۲ اور تیرا رب سب کچھ دیکھتا ہے ۳

**خلاصہ تفسیر:** اب کھانے پینے اور بازار میں چلنے کے متعلق جو کفار و مشرکین کا اعتراض تھا اس کا جواب ہے۔

اور ہم نے آپ سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے تھے (مطلب یہ کہ نبی ہونے اور کھانے پینے وغیرہ میں کوئی منافات نہیں، چنانچہ جن انبیاء کی نبوت دلائل سے ثابت ہے اگر چہ اعتراض کرنے والے نہ مانیں، وہ سب ایسے ہی ہوتے تھے، پس آپ پر بھی یہ اعتراض غلط ہے، اب حضور ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی دی جاتی ہے:) اور (اے پیغمبر! اور اے تابعین! ان کفار کے ایسے بیہودہ اقوال سے غمگین مت ہو، کیونکہ) ہم نے تم (مجموعہ مکلفین) میں ایک کو دوسرے کے لئے آزمائش بنایا ہے (پس اسی عادت کے موافق انبیاء کی ایسی حالت بنائی جس سے امت کی آزمائش ہو کہ کون ان کے انسانی حالات پر نظر کر کے جھٹلاتا ہے اور کون ان کے نبوت کے کمالات پر نظر کر کے تصدیق کرتا ہے سو جب یہ بات معلوم ہوگئی تو) کیا تم (اب بھی) صبر کرو گے (یعنی صبر کرنا چاہئے) اور (یہ بات یقینی ہے کہ) آپ کا رب خوب دیکھ رہا ہے (تو وقت مقررہ پر ان کو ضرور سزا دے گا، پھر آپ کیوں غم میں پڑیں)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یہ جواب ہوا: مَالِ هٰذَا الرَّسُوۡلِ يَاۡكُلُ الطَّعَامَ (الفرقان: ۷) کا، یعنی آپ سے پہلے جتنے پیغمبر دنیا میں آئے سب آدمی تھے، آدمیوں کی طرح کھاتے پیتے اور معاشی ضروریات کے لیے بازار بھی جاتے تھے، ان کو فرشتہ بنا کر نہیں بھیجا جو کھانے پینے اور حوائج بشریہ سے مستغنی ہوں، اس سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے لیے بازاروں میں پھرنا شان تقدس اور بزرگی کے منافی نہیں، بلکہ اگر بازار نہ جانے کا منشاء کبر و خود بینی ہو تو یہ بزرگی کے خلاف ہے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی پیغمبر ہیں کافروں کا ایمان جانچنے کو، اور کافر ہیں پیغمبروں کا صبر جانچنے کو، اب دیکھیں کافروں کے سفیہانہ طعن و تشنیع اور لغو اعتراضات سن کر تم کس حد تک صبر و استقلال دکھاتے ہو۔

**فائدہ:** ۳ یعنی کافروں کو کفر و ایذاء دہی اور صابروں کا صبر و تحمل سب اس کی نظر میں ہے، ہر ایک کو اس کے کیے کا پھل دے کر رہے گا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا

اور بولے وہ لوگ جو امید نہیں رکھتے کہ ہم سے ملیں گے کیوں نہ اترے ہم پر فرشتے یا ہم دیکھ لیتے اپنے رب کو ۱، بہت بڑائی رکھتے ہیں

فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۱﴾

اپنے جی میں اور سر چڑھ رہے ہیں بڑی شرارت میں ۲

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے کفار کے بعض اعتراضات رسالت کے متعلق بیان ہوئے، ایک اعتراض ان کا یہ تھا کہ ہم سے فرشتے یا خود حق تعالیٰ کھلم کھلا فرمادیں کہ محمد رسول اللہ ہیں، اب اس کا بیان اور پھر اس کا جواب ہے۔

اور جو لوگ ہمارے سامنے پیش ہونے سے اندیشہ نہیں کرتے (کیونکہ وہ قیامت، اس کی پیشی اور حساب کے منکر ہیں) وہ (انکار رسالت کے لئے) یوں کہتے ہیں کہ ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں آتے (کہ اگر فرشتے آکر ہم سے کہیں کہ یہ رسول ہیں) یا ہم اپنے رب کو دیکھ لیں (اور وہ خود ہم سے کہہ دے کہ واقعی یہ رسول ہیں ہم جب مانیں گے، اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ) یہ لوگ اپنے دلوں میں اپنے کو بہت بڑا سمجھ رہے ہیں (کہ اپنے آپ کو اس قابل سمجھتے ہیں کہ فرشتے آکر ان سے خطاب کریں یا خود حق تعالیٰ ان سے ہم کلام ہوں) اور (بالخصوص اللہ تعالیٰ سے دنیا میں ہم کلام ہونے اور اس کے دیدار کی فرمائش میں تو) یہ لوگ حد (انسانیت) سے بہت دور نکل گئے ہیں (کیونکہ فرشتوں اور انسان کی تو بعض چیزوں میں شرکت بھی ہے کہ دونوں اللہ کی مخلوق ہیں، مگر اللہ تعالیٰ اور انسان میں تو کوئی مشارکت اور مشابہت نہیں)۔

**لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ:** حاصل جواب کا یہ ہوا کہ رکاوٹ خود ان کی طرف سے ہے کہ یہ اس لائق نہیں، ورنہ فرشتوں کی ملاقات سے تو انبیاء و اولیاء دنیا ہی میں مشرف ہوتے ہیں، اور خدا کے دیدار سے آخرت میں سب مسلمان مشرف ہوں گے، اگر چہ دنیا میں نہ ہوسکیں، اور اس رکاوٹ کو دور کرنے کا انہوں نے کوئی سامان نہیں کیا، پھر ایسی درخواست اعلیٰ درجہ کا تکبر نہیں تو اور کیا ہے۔

**وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا:** اس میں اس شخص کی مذمت کی طرف اشارہ ہے جو راہ سلوک میں اس لیے قدم رکھتا ہے تاکہ اسے کچھ غیر اختیاری کیفیات و احوال حاصل ہوجائیں جو کہ اپنے اختیار میں قطعاً نہیں ہوتا تو گویا وہ یہ خبر دے رہا ہے کہ میں نے جو وظائف و اعمال کیے ہیں مجھے ان کا صلہ ملنا چاہیے، اور اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اس انتظار کا بڑا سبب حقیقت میں تکبر ہے کہ وہ کیفیات و احوال کو اپنے اعمال و مجاہدہ کا ثمرہ سمجھتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی جن کو یہ امید نہیں کہ ایک روز ہمارے روبرو حاضر ہو کر حساب و کتاب دینا ہے وہ سزا کے خوف سے بالکل بے فکر ہو کر معاندانہ اور گستاخانہ کلمات زبان سے بکتے ہیں، مثلاً کہتے ہیں کہ محمد ﷺ کی طرح ہم پر فرشتے وحی لے کر کیوں نہ اترے، یا خدا تعالیٰ سامنے آکر ہم سے ہم کلام کیوں نہیں ہوگیا، کم از کم فرشتے تمہاری تصدیق ہی کے لیے آجاتے یا خود خداوند رب العزت کو ہم دیکھتے کہ سامنے ہو کر تمہارے دعوے کی تائید و تصدیق کر رہا ہے کما فی موضوع آخر: قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ (الانعام: ۱۲۴) وفی سورة الاسراء: اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا (الاسراء: ۹۲)

**فائدہ:** ۲ یعنی انہوں نے اپنے دل میں اپنے کو بہت بڑا سمجھ رکھا ہے جو وحی اور فرشتوں کے آنے کی تمنا رکھتے ہیں شرارت و سرکشی کی حد ہوگئی کہ باوجود ایسی سیاہ کاریوں کے دنیا میں ان آنکھوں سے خداوند قدوس کو دیکھنے اور شرف ہم کلامی سے مشرف ہونے کا مطالبہ کریں۔

يَوۡمَ يَرَوۡنَ الۡمَلٰٓـئِكَةَ لَا بُشۡرٰى يَوۡمَئِذٍ لِّلۡمُجۡرِمِيۡنَ وَيَقُوۡلُوۡنَ حِجۡرًا مَّحۡجُوۡرًا ﴿۲۲﴾

جس دن دیکھیں گے فرشتوں کو کچھ خوشخبری نہیں اس دن گناہ گاروں کو اور کہیں گے کہیں روک دی جائے کوئی آڑ

**خلاصہ تفسیر:** (اور یہ لوگ خدا کو دیکھنے کے لائق تو کیا ہوتے مگر فرشتے ان کو ایک روز دکھلائی دیں گے مگر جس طرح یہ چاہتے ہیں اس طرح نہیں، بلکہ ان کے لیے عذاب، مصیبت اور پریشانی لے کر) چنانچہ جس روز یہ لوگ فرشتوں کو دیکھیں گے (اور وہ دن قیامت کا ہے) اس روز مجرموں (یعنی کافروں) کے لئے کوئی خوشی کی بات (نصیب) نہ ہوگی اور (فرشتوں کو جب سامان عذاب کے ساتھ آتا دیکھیں گے تو گھبرا کر) کہیں گے پناہ ہے پناہ ہے۔

کیونکہ ان کی موجودہ حالت کا یہی تقاضا ہے کہ اگر ملائکہ ان سے ملیں تو اسی طرح ملیں، اور وہ دن قیامت کا ہوگا، اور دنیا میں بھی اگر ملیں گے تو اسی طرح عذاب لاتے ہوئے ملیں گے تو یہاں جو یہ فرشتوں کی ملاقات کی تمنا کرتے ہیں گویا مصیبت کی درخواست کر رہے ہیں جس سے خود ہی پناہ مانگیں گے، پھر فضول ایسی چیز کو طلب کر رہے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** یعنی گھبراؤ نہیں، ایک دن آنے والا ہے جب فرشتے تم کو نظر پڑیں گے، لیکن ان کے دیکھنے سے تم جیسے مجرموں کو کچھ خوشی حاصل نہ ہوگی، بلکہ سخت ہولناک مصائب کا سامنا ہوگا، حتیٰ کہ جو لوگ اس وقت فرشتوں کے نزول کا مطالبہ کرنے والے ہیں اس وقت حِجۡرًا مَّحۡجُوۡرًا کہہ کر پناہ طلب کریں گے، اور چاہیں گے کہ ان کے اور فرشتوں کے درمیان کوئی سخت روک قائم ہو جائے کہ وہ ان تک نہ پہنچ سکیں لیکن خدا کا فیصلہ کب رک سکتا ہے، فرشتے بھی حِجۡرًا مَّحۡجُوۡرًا کہہ کر بتلادیں گے کہ آج مسرت و کامیابی ہمیشہ کے لیے تم سے روک دی گئی ہے۔

**تنبیہ:** ممکن ہے یہ تذکرہ احتضار (موت) کے وقت کا ہو، کما قال تعالیٰ: وَلَوۡ تَرٰٓى اِذۡ يَتَوَفَّى الَّذِيۡنَ كَفَرُوا ۙ الۡمَلٰٓـئِكَةُ يَضۡرِبُوۡنَ وُجُوۡهَهُمۡ وَاَدۡبَارَهُمۡ (الانفال:۵۰) وقال تعالیٰ: وَلَوۡ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوۡنَ فِىۡ غَمَرٰتِ الۡمَوۡتِ وَالۡمَلٰٓـئِكَةُ بَاسِطُوۡۤا اَيۡدِيۡهِمۡ ۚ اَخۡرِجُوۡۤا اَنۡفُسَكُمُ ؕ اَلۡيَوۡمَ تُجۡزَوۡنَ عَذَابَ الۡهُوۡنِ بِمَا كُنۡتُمۡ تَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ غَيۡرَ الۡحَـقِّ (الانعام:۹۳) گویا یہ کیفیت اس کے بالمقابل ہوگی جو دوسری جگہ مومنین کی بیان ہوئی ہے: اِنَّ الَّذِيۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَيۡهِمُ الۡمَلٰٓـئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَاَبۡشِرُوۡا بِالۡجَـنَّةِ الَّتِىۡ كُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ (فصلت:۳۰) اور ممکن ہے یہاں قیامت کے دن کا ذکر ہو، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

وَقَدِمۡنَاۤ اِلٰى مَا عَمِلُوۡا مِنۡ عَمَلٍ فَجَعَلۡنٰهُ هَبَآءً مَّنۡثُوۡرًا ﴿۲۳﴾

اور ہم پہنچے ان کے کاموں پر جو انہوں نے کیے تھے پھر ہم نے کر ڈالا اس کو خاک اڑتی ہوئی ؎۱

اَصۡحٰبُ الۡجَـنَّةِ يَوۡمَئِذٍ خَيۡرٌ مُّسۡتَقَرًّا وَّاَحۡسَنُ مَقِيۡلًا ﴿۲۴﴾

بہشت کے لوگوں کا اس دن خوب ہے ٹھکانا اور خوب ہے جگہ دوپہر کے آرام کی ؎۲

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے قیامت میں ملائکہ کو دیکھنے اور ان کے اترنے کا بیان تھا، اب اسی مناسبت سے اس ہیبت ناک دن کے دوسرے واقعات کا بیان ہے۔

اور ہم (اس روز) ان کے (یعنی کفار کے) ان (نیک) کاموں کی طرف جو کہ وہ (دنیا میں) کر چکے تھے متوجہ ہوں گے سو ان کو (علانیہ طور پر) ایسا (بیکار) کر دیں گے جیسے پریشان غبار (کہ وہ کسی کام نہیں آتا، اسی طرح ان کفار کے اعمال پر کچھ ثواب نہ ہوگا، البتہ) اہل جنت اس روز قیام گاہ میں بھی اچھے رہیں گے اور آرامگاہ میں بھی خوب اچھے ہوں گے (مراد مستقر اور مقیل سے جنت ہے یعنی جنت ان کے لئے جائے قیام اور آرام کی

جگہ ہوگی اور جنت کا اچھا ہونا ظاہر ہے)۔

**وَقَدِمْنَآ اِلٰی مَا عَمِلُوْا**: اس میں دو مسئلے ہیں: ① پہلا تو یہ کہ بغیر باطن کے محض ظاہری عمل کی حیثیت نہیں (یعنی بغیر اخلاص و ایمان کوئی عمل مفید نہیں) ② دوسرا مسئلہ وہ جو روح المعانی میں ابن عطاء سے مذکور ہے کہ انہوں نے اپنے اعمال کو خود پسندی کی نگاہ سے دیکھا، پس ہماری نگاہ سے گر گئے (یعنی عجب وخود پسندی اعمال کو غارت کر دیتی ہے، یعنی جب بھی عمل کیا جائے تو محض رضائے الٰہی مقصود ہو، دکھلاوے کے لیے ہرگز نہ ہو اور پھر ان اعمال کے کرنے سے عجب پیدا نہ ہو جائے ورنہ سارے اعمال دھرے کے دھرے رہ جائیں گے)۔

* * *

**فائدہ**: ۱ یعنی وہ ہم کو بلاتے تھے تو ہم بھی آ پہنچے، مگر ان کی عزت بڑھانے کو نہیں، بلکہ اس لیے کہ انہوں نے اپنے زعم باطل کے موافق جو بھلے کام کیے تھے جن پر بڑا بھروسہ تھا انھیں ہم قطعاً ملیا میٹ کر دیں اور اس طرح بے حقیقت کر کے اڑا دیں جیسے خاک کے حقیر ذرات ہوا میں ادھر ادھر اڑ جایا کرتے ہیں، کیونکہ وہ اعمال روح اخلاص و ایمان سے یکسر خالی یا طریق حق کے بالکل متضاد واقع ہوئے ہیں، قال تعالیٰ: مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِۨاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ (ابراہیم:18) وغیرہ ذلك من الآيات۔

**فائدہ**: ۲ یعنی یہ لوگ تو اس روز اس مصیبت میں گرفتار ہوں گے اور جن کی ہنسی اڑایا کرتے تھے وہ جنت میں خوب عیش و آرام کے مزے لوٹیں گے۔

وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴿۲۵﴾

اور جس دن پھٹ جائے آسمان بادل سے اور اتارے جائیں فرشتے تار لگا کر ۱

اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ِۨالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ؕ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴿۲۶﴾

بادشاہی اس دن سچی ہے رحمان کی، اور ہے وہ دن منکروں پر مشکل ۲

**خلاصہ تفسیر**: اور جس روز آسمان ایک بدلی پر سے پھٹ جائے گا اور (اس بدلی کے ساتھ آسمان سے) فرشتے (زمین پر) بکثرت اتارے جائیں گے (اور اسی وقت حق تعالیٰ حساب و کتاب کے لئے تجلی فرمائیں گے، اور) اس روز حقیقی حکومت (حضرت) رحمان (ہی) کی ہوگی (یعنی حساب و کتاب، جزا و سزا میں کسی کو دخل نہ ہوگا جیسا کہ دنیا میں ظاہری تصرف تھوڑا بہت دوسروں کو بھی حاصل ہے) اور وہ (دن) کافروں پر بڑا سخت دن ہوگا (کیونکہ ان کے حساب کا انجام جہنم ہی ہے)۔

**وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ**: اس بدلی کا ذکر دوسرے پارہ کے نصف پر گزر چکا ہے، معنی یہ ہیں کہ آسمان شق ہو کر اس میں سے ایک رقیق بادل اترے گا جس میں فرشتے ہوں گے، یہ ابر بشکل سائبان آسمان سے آئے گا اور اس میں حق تعالیٰ کی تجلی ہوگی اور اس کے گرد فرشتے ہوں گے، یہ حساب شروع ہونے کا وقت ہوگا اور اس وقت آسمان کا پھٹنا صرف کھلنے کے طور پر ہوگا، یہ وہ پھٹنا نہیں ہوگا جو پہلی مرتبہ صور پھونکنے کے وقت آسمان زمین کو فنا کرنے کے لئے ہوگا، کیونکہ یہ نزول غمام جس کا ذکر یہاں آیت میں ہے دوبارہ صور پھونکنے کے بعد ہوگا جبکہ سب زمین و آسمان دوبارہ درست ہو چکے ہوں گے۔

* * *

**فائدہ**: ۱ قیامت کے دن آسمانوں کے پھٹنے کے بعد اوپر سے بادل کی طرح کی ایک چیز اترتی نظر آئے گی جس میں حق تعالیٰ کی ایک خاص تجلی ہوگی، اسے ہم چتر شاہی سے تعبیر کیے لیتے ہیں، شاید یہ وہی چیز ہو جسے ابو رزین کی حدیث میں "عَمَاء" سے اور نسائی کی ایک روایت میں جو معراج سے متعلق ہے "غَيَابَه" سے تعبیر کیا ہے، واللہ اعلم۔ اس کے ساتھ بیشمار فرشتوں کا ہجوم ہوگا اور آسمانوں کے فرشتے اس روز لگا تار مقام محشر کی

طرف نزول فرمائیں گے، دوسرے پارہ کے نصف کے قریب آیت :هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ (البقرۃ:۲۱۰) میں بھی اسی طرح کا مضمون گزر چکا ہے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی ظاہراً و باطناً، صورۃً معنیً، من کل الوجوہ اکیلے رحمان کی بادشاہت ہوگی اور صرف اسی کا حکم چلے گا: لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (غافر:۱۶) پھر جب رحمان کی حکومت ہوئی تو جو مستحق رحمت ہیں ان کے لیے رحمت کی کیا کمی، بے حساب رحمتوں سے نوازے جائیں گے مگر باوجود ایسی لامحدود رحمت کے کافروں کے لیے وہ دن بڑی سخت مشکل اور مصیبت کا ہوگا:

که بازار چنداں کہ آگندہ تر — تہی دست رادل پراگندہ تر

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿۲۷﴾ يٰوَيْلَتٰى

اور جس دن کاٹ کاٹ کھائے گا گناہ گار اپنے ہاتھوں کو کہے گا اے کاش کہ میں نے پکڑا ہوتا رسول کے ساتھ راستہ ۱ اے خرابی میری

لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿۲۸﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ

کاش کہ نہ پکڑا ہوتا میں نے فلانے کو دوست ۲ اس نے تو بہکا دیا مجھ کو نصیحت سے مجھ تک پہنچ چکنے کے پیچھے (بعد) اور ہے شیطان

لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿۲۹﴾

آدمی کو وقت پر دغا دینے والا ۳

**خلاصہ تفسیر:** اور جس روز ظالم (یعنی کافر آدمی انتہائی حسرت سے) اپنے ہاتھ کاٹ کاٹ کھائے گا (اور) کہے گا کیا اچھا ہوتا میں رسول کے ساتھ (دین کی) راہ پر لگ لیتا، ہائے میری شامت (کہ ایسا نہ کیا اور) کیا اچھا ہوتا کہ میں فلاں شخص کو دوست نہ بناتا، اس (کم بخت) نے مجھ کو نصیحت آئے پیچھے اس سے بہکا دیا (اور ہٹا دیا) اور شیطان تو انسان کو (عین وقت پر) امداد کرنے سے جواب دے دیتا ہے (چنانچہ اس کافر کی اس حسرت کے وقت اس نے کوئی ہمدردی نہ کی، اگرچہ کرنے سے بھی کچھ نہ ہوتا، صرف دنیا ہی میں بہکانے کو تھا)۔

يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا: مذکورہ تین آیتوں میں ایک قصہ کی طرف اشارہ ہے، وہ یہ کہ عقبہ بن ابی معیط نے ایک بار دعوت کی، مجلس میں حضور اکرم ﷺ کو بلایا، آپ نے فرمایا کہ جب تک تو اسلام نہ لائے میں دعوت نہ مانوں گا، اس نے کلمہ پڑھ لیا، آپ ﷺ دعوت میں شریک ہو گئے، یہ خبر ابی بن خلف کو جو عقبہ کا دوست تھا پہنچی تو اس نے ملامت کی، عقبہ نے جواب دیا کہ میں نے ان کی خاطر سے ظاہر میں کلمہ پڑھ لیا تھا، دل سے اسلام نہیں لایا، غرض وہ کافر کا کافر ہی رہا تو قیامت میں اس کی اس کو حسرت ہوگی، اور اگرچہ اس نے اول بھی دل کلمہ نہ پڑھا تھا، لیکن اگر ابی بن خلف سے دوستی نہ ہوتی تو شاید اس ظاہری اثر سے باطنی اثر بھی ہو جاتا، شیطان کا ذکر اس میں اس لیے کیا گیا کہ ابی بن خلف کا اثر شیطان ہی کے اغواء سے ہوا، بعض مفسرین کا یہ قول ہے کہ ظالم سے مراد ہر کافر ہے اور تفسیر ظاہر ہے۔

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اشرار (بروں) کی صحبت و دوستی سے بچنا چاہیے، شریر اس شخص کو کہتے ہیں جو اللہ کی یاد سے دور ہونے کا سبب ہو جائے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی مارے حسرت و ندامت کے اپنے ہاتھ کاٹے گا اور افسوس کرے گا کہ میں نے کیوں دنیا میں رسول خدا کا راستہ اختیار نہ کیا اور کیوں شیاطین الانس والجن کے بہکائے میں آ گیا جو آج یہ روز بد دیکھنا پڑا۔

**فائدہ:** ۲ یعنی جن کی دوستی اور اغواء سے گمراہ ہوا تھا یا گمراہی میں ترقی کی تھی، اس وقت پچھتائے گا کہ افسوس ایسوں کو میں نے اپنا

دوست کیوں سمجھا، کاش میرے اور ان کے درمیان کبھی دوستی اور رفاقت نہ ہوئی ہوتی۔

**تنبیہ:** مفسرین نے یہاں عقبہ بن ابی معیط اور ابی بن خلف کا جو واقعہ نقل کیا ہے، کچھ ضرورت نہیں کہ آیت کے مدلول کو اس پر مقصود کیا جائے، ہاں جو تقریر ہم نے کی ہے اس میں وہ بھی داخل ہے۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی پیغمبر کی نصیحت مجھ کو نہیں پہنچ چکی تھی جو ہدایت کے لیے کافی تھی، اور امکان تھا کہ میرے دل میں گھر کر لے، مگر اس کم بخت کی دوستی نے تباہ کیا اور دل کو ادھر متوجہ نہ ہونے دیا، بیشک شیطان بڑا دغاباز ہے آدمی کو عین وقت پر دھوکا دیتا اور بری طرح رسوا کرتا ہے۔

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝۳۰

اور کہا رسول نے اے میرے رب میری قوم نے ٹھہرایا ہے اس قرآن کو جھک جھک

**خلاصہ تفسیر:** اور (اس دن) رسول (صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ سے کافروں کی شکایت کے طور پر) کہیں گے اے میرے پروردگار! میری (اس قوم) نے اس قرآن کو (جو کہ واجب العمل تھا) بالکل نظر انداز کر رکھا تھا (کہ یہ لوگ عمل تو کیا کرتے قرآن کی طرف التفات بھی نہ کرتے تھے، مطلب یہ کہ خود کفار بھی اپنی گمراہی کا اقرار کریں گے اور رسول بھی گواہی دیں گے، کقولہ تعالیٰ: وَجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا اور ثبوت جرم کی یہی دو صورتیں عادتاً ہوتی ہیں: ① اقرار ② شہادت اور دونوں کے جمع ہونے سے یہ ثبوت اور بھی پختہ ہو جائے گا اور سزایاب ہوں گے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی ضدی معاندین نے جب کسی طرح نصیحت پر کان نہ دھرا، تب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بارگاہ الٰہی میں شکایت کی کہ خداوند میری قوم نہیں سنتی، انہوں نے قرآن کریم جیسی عظیم الشان کتاب کو (العیاذ باللہ) بکواس قرار دیا ہے، جب قرآن پڑھا جاتا ہے تو خوب شور مچاتے اور بک بک جھک جھک کرتے ہیں، تاکہ کوئی شخص سن اور سمجھ نہ سکے، اس طرح ان اشقیاء نے قرآن جیسی قابل قدر کتاب کو بالکل متروک و مہجور کر چھوڑا ہے۔

**تنبیہ:** آیت میں اگرچہ مذکور صرف کافروں کا ہے تاہم قرآن کی تصدیق نہ کرنا، اس میں تدبر نہ کرنا، اس پر عمل نہ کرنا، اس کی تلاوت نہ کرنا، اس کی صحیح قراءت کی طرف توجہ نہ کرنا، اس سے اعراض کر کے دوسری لغویات یا حقیر چیزوں کی طرف متوجہ ہونا، یہ سب صورتیں درجہ بدرجہ ہجران قرآن کے تحت میں داخل ہو سکتی ہے، فنسأل الله الكريم المنان القادر على ما يشآء ان يخلصنا مما يسخطه و يستعملنا فيما يرضيه من حفظ كتابه و فهمه و القيام بمقتضاه اناء الليل و اطراف النهار على الوجه الذي يحبه و يرضاه انه كريم وهاب، آمین۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ۝۳۱

اور اسی طرح رکھے ہیں ہم نے ہر نبی کے لیے دشمن گناہ گاروں میں سے ۱؎ اور کافی ہے تیرا رب راہ دکھلانے کو اور مدد کرنے کو ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** کفار کے ان اعتراضات سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی دشمنی معلوم ہوتی ہے، اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی فرماتے ہیں کہ اس عداوت سے غمگین نہ ہوں، یہ کوئی نئی بات نہیں جس کا غم کیا جائے۔

اور ہم اسی طرح (یعنی جس طرح یہ لوگ آپ سے عداوت کرتے ہیں) مجرم لوگوں میں سے ہر نبی کے دشمن بناتے رہتے ہیں (یعنی یہ لوگ جو قرآن کا انکار کر کے آپ کی مخالفت کر رہے ہیں کوئی نئی بات نہیں جس کا غم کیا جائے) اور (جس کو ہدایت دینا منظور ہو اس کی) ہدایت کرنے کو اور (جو ہدایت سے محروم ہے اس کے مقابلہ میں آپ) کی مدد کرنے کو آپ کا رب کافی ہے۔

یعنی غم کے دو سبب ہو سکتے ہیں: ① ایک ان کا گمراہ ہونا ② دوسرے تکلیف دینے کے درپے ہونا، سو اللہ تعالیٰ کو اگر کسی کو ہدایت دینا منظور ہوگی اس سے کو ہدایت دے دے گا، اور جب ہدایت نہیں ہوتی تو اس میں بھی حکمت ہے، اور تکلیف دور کرنے کے لیے بھی حق تعالیٰ کافی ہیں، اگر کچھ

دنوں دور نہ کرتے تو اسی میں حکمت ہوگی، غرض نہ اِس سے غم کیجیے اور نہ اُس سے۔

**وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا**: روح المعانی میں ہے کہ اگر اس قول کو آیت کے ساتھ ملا لیا جائے کہ ہر ولی ایک نبی کے قدم پر ہوتا ہے تو اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ ہر ولی کا بھی ایک دشمن ہوتا ہے، اس میں ایسے شخص کی بدحالی کی طرف بھی اشارہ ہے جو اولیاء اللہ سے دشمنی رکھے، اسی واسطے کہا گیا ہے کہ اولیاء اللہ کی دشمنی سوء خاتمہ کی علامت ہے (یعنی چونکہ تمام اولیاء کرام انبیاء کے نقش قدم پر ہوتے ہیں اور ان جیسا فریضہ سرانجام دیتے ہیں تو لامحالہ ان کے بھی دشمن ہوں گے تو اس سے پریشان نہ ہوں، اور اس دشمنی کا نقصان ان غلط لوگوں کو ہی ہوگا جو موت کے وقت سوء خاتمہ کے طور پر سامنے آئے گا)۔

* * *

**فائدہ**: ۱؎ جو نبی کی بات ماننے میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں اور لوگوں کو قبول حق سے روکتے ہیں۔

**فائدہ**: ۲؎ یعنی کافر پڑے بہکایا کریں جس کو اللہ چاہے گا راہ پر لے آئیگا، یا یہ مطلب ہے کہ اللہ جس کو چاہے گا ہدایت کر دیگا اور جن کو ہدایت نصیب نہ ہوگی ان کے سب کے مقابلہ میں تیری مدد کرے گا، یا یہ کہ حق تعالیٰ تیری مدد کر کے مقام مطلوب تک پہنچا دے گا، کوئی رکاوٹ مانع نہ ہو سکے گی۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ

اور کہنے لگے وہ لوگ جو منکر ہیں کیوں نہ اترا اس پر قرآن سارا (اکٹھا) ایک جگہ ہو کر (ایک بار) ۱؎ اسی طرح اتارا تا کہ ثابت رکھیں ہم

فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿۳۲﴾

اس سے تیرا دل اور پڑھ سنایا ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر ۲؎

**خلاصہ تفسیر**: پیچھے کفار کے پانچ اعتراضات جواب کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، بعض اعتراضات کا اب آگے بیان ہے۔

اور کافر لوگ یوں کہتے ہیں کہ ان (پیغمبر) پر قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نازل نہیں کیا گیا (مقصود اس اعتراض سے یہ ہے کہ اگر خدا کا کلام ہوتا تو آہستہ آہستہ نازل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس سے تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ محمد ﷺ خود ہی سوچ سوچ کر تھوڑا تھوڑا بنا لیتے ہیں، اب اس اعتراض کا جواب ہے کہ) اس طرح (آہستہ آہستہ) اس لئے (ہم نے نازل کیا) ہے تا کہ ہم اس کے ذریعے آپ کے دل کو قوی رکھیں اور (اسی لئے) ہم نے اس کو بہت ٹھہرا ٹھہرا کر اُتارا ہے (چنانچہ تیئس سال کے عرصہ میں آہستہ آہستہ پورا ہوا)۔

**كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ**: یہ وہی سلسلہ کفار و مشرکین کے اعتراضات و جوابات کا ہے جو شروع سورۃ سے چلا آ رہا ہے، اس اعتراض کے جواب میں قرآن کو بتدریج نازل کرنے کی حکمت یہاں یہ بیان فرمائی ہے کہ اس کے ذریعہ آپ ﷺ کے دل کو قوی رکھنا مقصود ہے، اس تدریجی نزول میں رسول اللہ ﷺ کے دل کی تقویت چند طریقوں سے ہے: ① اول یہ کہ یاد رکھنے میں آسانی ہے، ایک ضخیم کتاب بیک وقت نازل ہو جاتی تو یہ آسانی نہ رہتی اور آسانی کے ساتھ یاد ہوتے رہنے سے دل میں کوئی پریشانی نہیں رہتی، ورنہ بڑی کتاب جبکہ بغیر لکھے ہو اس کو یاد رکھنا عادتاً دشوار اور اس کو دیکھ کر طبیعت کا پریشان ہو جانا طبعی بات ہے ② دوسرے جب کفار آپ پر کوئی اعتراض یا آپ کے ساتھ کوئی ناگوار معاملہ کرتے تو اسی وقت آپ کی تسلی کے لئے قرآن میں آیت نازل ہو جاتی اور اگر پورا قرآن ایک دفعہ آ گیا ہوتا اور اس خاص واقعہ پر تسلی کا ذکر بھی نازل ہو گیا ہوتا تو بہرحال اس کو قرآن میں تلاش کرنے کی ضرورت پڑتی اور ذہن کا اس طرف متوجہ ہو جانا بھی عادۃً ضروری نہیں تھا ③ تیسرے بار بار خدا کا پیغام آنا اس بات کی گواہی ہے کہ خدا آپ کے ساتھ ہے جو دل کی تقویت کا بڑا مدار ہے، اور آہستہ آہستہ نازل کرنے کی حکمتیں صرف یہی نہیں دوسری حکمتیں بھی ہیں جن میں سے بعض سورۃ بنی اسرائیل کی آیت: **وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ** میں پہلے آ چکی ہے۔

**كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ**: جس طرح دنیا کے تمام کاموں کو اگر درجہ بدرجہ ترتیب کے ساتھ سلیقے سے کیا جائے تو اس کے ثمرات

ومنافع حاصل ہوں گے، اسی طرح عبادات کے ثمرات اور مقامات جب تدریجی طور پر پیدا ہوتے ہیں تو اس میں بھی یہی حکمت ہے کہ رسوخ، پختگی اور دوام کی کیفیت رہتی ہے، جو چیز جلد آتی ہے جلد چلی بھی جاتی ہے، تاخیر ہونے سے پریشان اور تنگ دل نہیں ہونا چاہیے بلکہ صبر کرنا چاہیے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی نبی کے دشمن لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے ایسے ایسے اعتراض چھانٹتے ہیں کہ صاحب! دوسری کتابوں کی طرح پورا قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہ اتارا گیا، برسوں میں جو تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا، کیا اللہ میاں کو کچھ سوچنا پڑتا تھا، اس سے تو شبہ ہوتا ہے کہ خود محمد ﷺ سوچ سوچ کر بناتے ہیں، پھر موقع مناسب دیکھ کر تھوڑا تھوڑا سناتے رہتے ہیں۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی یہ کیا ضروری ہے کہ تھوڑا تھوڑا کر کے اتارنا اس سبب سے ہو جو تم نے سمجھا، اگر غور کرو گے تو اس طرح نازل کرنے میں بہت سے فوائد ہیں جو دفعتاً نازل کرنے کی صورت میں پوری طرح حاصل نہ ہوتے، مثلاً اس صورت میں قرآن کا حفظ کرنا زیادہ آسان ہوا، سمجھنے میں سہولت رہی، کلام پوری طرح منضبط ہوتا رہا اور جن مصالح و حکم کی رعایت اس میں کی گئی تھی، لوگ موقع بہ موقع ان کی تفاصیل پر مطلع ہوتے رہے، ہر آیت کی جداگانہ شان نزول کو دیکھ کر اس کا صحیح مطلب متعین کرنے میں مدد ملی، ہر ضرورت کے وقت ہر بات کا بروقت جواب ملتے رہنے سے پیغمبر اور مسلمانوں کے قلوب تسکین پاتے رہے اور ہر آیت کے نزول پر گویا دعویٰ اعجاز کی تجدید ہوتی رہی، اس سلسلہ میں جبرائیل کا بار بار آنا جانا ہوا جو ایک مستقل برکت تھی، وغیر ذلک من الفوائد، ان ہی میں سے بعض فوائد کی طرف یہاں اشارہ فرمایا۔

وَلَا يَأْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ﴿٣٣﴾

اور نہیں لاتے تیرے پاس کوئی مثل کہ ہم نہیں پہنچا دیتے تجھ کو ٹھیک بات اور اس سے بہتر کھول کر

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے کئی اعتراض وشبہات کے کافی وشافی جواب مذکور ہوئے، اب ان جوابوں کی مدح فرماتے ہیں۔

اور یہ لوگ کیسا ہی عجیب سوال آپ کے سامنے پیش کریں مگر ہم (اس کا) ٹھیک جواب اور وضاحت میں (بھی) بڑھا ہوا آپ کو عنایت کر دیتے ہیں (تاکہ آپ مخالفین کو جواب دے سکیں)۔

اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا: جواب میں دو خوبیاں ہوتی ہیں: ① ایک یہ کہ فی نفسہ شبہ کی جڑ کاٹنے والا ہو ② دوسرے وضاحت کی وجہ سے سمجھنے میں آسان ہو، جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ میں پہلی خوبی اور احسن تفسیرا میں دوسری خوبی کی طرف اشارہ ہے، اس میں حضور ﷺ کی تقویت قلب کا بھی ایک طریقہ بیان ہو گیا ہے تو اس کو گذشتہ آیت سے یہ ربط بھی ہو سکتا ہے کہ قرآن کو آہستہ آہستہ اس لیے نازل کیا گیا تاکہ جب کفار اعتراض کریں اسی وقت جواب نازل ہو جائے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی کفر جب کوئی اعتراض قرآن پر یا کوئی مثال آپ پر چسپاں کرتے ہیں تو قرآن اس کے جواب میں ٹھیک ٹھیک بات بتلا دیتا ہے جس میں کسی قسم کا ہیر پھیر نہیں ہوتا، بلکہ صاف واضح، معتدل اور بے غل وغش بات ہوتی ہے ہاں جن کی عقل اوندھی ہو گئی ہو وہ سیدھی اور صاف بات کو بھی ٹیڑھی سمجھیں، یہ الگ چیز ہے، ایسوں کا انجام اگلی آیت میں بیان فرمایا:

اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ ۙ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿٣٤﴾ ع

جو لوگ کہ گھیر کر لائے جائیں گے اوندھے پڑے ہوئے اپنے منہ پر دوزخ کی طرف، انہی کا برا درجہ ہے اور بہت بہکے ہوئے ہیں راہ سے

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے اعتراضات کا قولی جواب تھا، اب عملی جواب ہے، یعنی اس پر جو سزا ہوگی اس کا بیان ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے چہروں کے بل جہنم کی طرف لے جائے جائیں گے (یعنی گھسیٹ کر) یہ لوگ جگہ میں بھی بدتر ہیں اور طریقہ میں بھی

بہت گمراہ ہیں (جگہ سے مراد دوزخ اور طریقہ سے مراد مذہب ہے، اور یہ سزا ان کے مناسب اس لیے ہے کہ عقل کے اندھے پن کی وجہ سے اعتراضات کرتے تھے تو سزا بھی یہ ہوئی کہ اوندھے منہ چلائے جائیں گے)۔

اَلَّذِیْنَ یُحْشَرُوْنَ عَلٰی وُجُوْهِهِمْ :روح المعانی میں ہے کہ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ لوگ اپنی طبیعت اور ذات کی طرف متوجہ تھے اسی لیے چہروں کے بل سرنگوں اٹھائے جائیں گے۔

* * *

**فائدہ:** یہ وہی لوگ ہیں جن کی عقل اوندھی ہوگئی اور علویات کو چھوڑ کر سفلی خواہشات پر جھک پڑے۔

**ربط:** آگے ایسی چند اقوام کا جو حشر ہوا عبرت کے لیے اس کو بیان فرماتے ہیں:

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِیْرًا ﴿۳۵﴾

اور ہم نے دی موسیٰ کو کتاب اور کر دیا ہم نے اس کے ساتھ اس کا بھائی ہارون کام بٹانے والا

فَقُلْنَا اذْهَبَاۤ اِلَی الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ؕ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِیْرًا ﴿۳۶﴾

پھر کہا ہم نے تم دونوں جاؤ ان لوگوں کے پاس جنہوں نے جھٹلایا ہماری باتوں کو، پھر دے مارا ہم نے ان کو اکھاڑ کر

**خلاصہ تفسیر:** یہاں تک انکار رسالت پر وعید اور قرآن پر اعتراضات کے جواب تھے، آگے اس کی تائید کے لیے زمانہ ماضی کے بعض واقعات نقل کئے گئے ہیں جن میں منکرین رسالت کا انجام اور عبرت انگیز حالات مذکور ہیں اور اس میں بھی آنحضرت ﷺ کے لئے تسلی اور تقویت قلب کا سامان ہے کہ پچھلے انبیاء کی اللہ تعالیٰ نے جس طرح مدد فرمائی اور دشمنوں پر غالب فرمایا وہ آپ کے لئے بھی ہونے والا ہے، اس میں پہلا قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے۔

اور بتحقیق ہم نے موسیٰ کو کتاب (یعنی تورات) دی تھی اور (اس کتاب ملنے سے پہلے) ہم نے ان کے ساتھ ان کے بھائی ہارون کو (ان کا) معین (ومددگار) بنایا تھا، پھر ہم نے (دونوں کو) حکم دیا کہ دونوں آدمی ان لوگوں کے پاس (ہدایت کرنے کے لئے) جاؤ جنہوں نے ہماری (توحید کی) دلیلوں کو جھٹلایا ہے (مراد اس سے فرعون اور اس کی قوم ہے، چنانچہ یہ دونوں حضرات وہاں پہنچے اور سمجھایا مگر انہوں نے نہ مانا) سو ہم نے ان کو (اپنے قہر سے) بالکل ہی غارت کر دیا (یعنی دریا میں غرق کئے گئے)۔

الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا: اس میں قوم فرعون کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ انہوں نے ہماری آیات و دلائل کو جھٹلایا ہے، حالانکہ اس وقت تک تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل بھی نہیں ہوئی تھی، اس لئے اس جھٹلانے سے آیات تورات کی تکذیب تو مراد نہیں ہوسکتی، بلکہ مراد آیات سے یا توحید کے عقلی دلائل ہیں، جو ہر انسان کو اپنی عقل کے مطابق سمجھ میں آسکتے ہیں، ان میں غور نہ کرنے کو تکذیب آیات فرمایا اور یا وہ دلائل مراد ہیں جو پہلے انبیاء سے منقول ہوتے ہوئے ان لوگوں تک پہنچے ہوں گے جیسا کہ: وَلَقَدْ جَآءَكُمْ یُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَیِّنٰتِ سے انبیاء کی تعلیم کا ان تک منقول چلا آنا معلوم ہوتا ہے اور ان کے انکار کا برا ہونا ظاہر ہے۔

اگرچہ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس جانے کے بعد کتاب ملی ہے، لیکن اس کا ذکر پہلے کر دینے میں یہ فائدہ ہوسکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا جلیل القدر نبی ہونا اور فرعون وغیرہ کے انکار کا حماقت پر مبنی ہونا معلوم ہو جائے کہ موسیٰ علیہ السلام ایسے نبی تھے جنہیں بعد میں کتاب بھی ملی تھی تو ان کی تعلیم بوجہ فطرت قوی ہونے کے پہلے ہی سے کامل و مکمل تھی مگر پھر بھی وہ لوگ منکر ہی رہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی آیات تکوینیہ کو جو اللہ کی توحید وغیرہ پر دال ہیں اور انبیائے سابقین کے متفقہ بیانات کو جن کا تھوڑا بہت چرچا پہلے سے چلا آتا

تھا، جھٹلا کر خدائی کے دعوے کرنے لگے تھے۔

وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ۭ وَاَعْتَدْنَا

اور نوح کی قوم کو جب انہوں نے جھٹلایا پیغام لانے والوں کو ۱؎ ہم نے ان کو ڈبا دیا اور کیا ان کو لوگوں کے حق میں نشانی اور تیار کر رکھا ہے ہم نے

لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ۚۖ ۳۷ وَّعَادًا وَّثَمُوْدَا۟ وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ وَقُرُوْنًۢا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ۝ ۳۸

گناہ گاروں کے واسطے عذاب دردناک، اور عاد کو اور ثمود کو اور کنوئیں والوں کو ۲؎ اور اس کے بیچ میں بہت سی جماعتوں کو

وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ۡ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ۝ ۳۹

اور سب کو کہہ سنائیں ہم نے مثالیں اور سب کو کھو دیا ہم نے غارت کر کر ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** اور قوم نوح کو بھی (ان کے زمانہ میں) ہم ہلاک کر چکے ہیں (جن کی ہلاکت اور سبب ہلاکت کا بیان یہ ہے کہ) جب انہوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا تو ہم نے ان کو (طوفان سے) غرق کر دیا اور ہم نے ان (کے واقعہ) کو لوگوں (کی عبرت) کے لئے نشان بنا دیا (یہ تو دنیا میں سزا ہوئی) اور (آخرت میں) ہم نے (ان) ظالموں کے لئے دردناک سزا تیار کر رکھی ہے، اور ہم نے عاد اور ثمود اور اصحاب الرس اور ان کے بیچ بیچ میں بہت سی امتوں کو ہلاک کیا، اور ہم نے (مذکورہ امتوں میں سے) ہر ایک (کی ہدایت) کے واسطے عجیب عجیب (یعنی موثر اور بلیغ) مضامین بیان کئے اور (جب نہ مانا تو) ہم نے سب کو بالکل ہی برباد کر دیا۔

**وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ:** پیغمبروں کو جھٹلانا اس لیے کہا کہ سب پیغمبروں کے دینی اصول ایک ہیں، جب ایک کو جھوٹا کہا تو سب کو جھوٹا کہا، یا یہ کہ نوح علیہ السلام سے پہلے جو انبیاء گزر چکے تھے ان کی تعلیم بھی ان تک پہنچی ہو اور انہوں نے اس کو جھٹلایا ہو۔

**اَصْحٰبَ الرَّسِّ:** لغت میں ''رس'' کنویں کو کہتے ہیں، قوم ثمود کے کچھ لوگ باقی رہ گئے تھے اور کسی کنویں پر آباد تھے وہ ''اصحاب الرس'' ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ ایک پیغمبر کا جھٹلانا سب کا جھٹلانا ہے، کیونکہ اصول دین میں سب انبیاء متحد ہیں۔

**فائدہ:** ۲؎ اصحاب الرس (کنوئیں والے) کون تھے؟ اس میں سخت اختلاف ہوا ہے، روح المعانی میں بہت سے اقوال نقل کر کے لکھا ہے: ''وَمُلَخَّصُ الْاَقْوَالِ اِنَّهُمْ قَوْمٌ اَهْلَكَهُمُ اللهُ بِتَكْذِيْبِ مَنْ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ'' (یعنی خلاصہ یہ ہے کہ وہ کوئی قوم تھی جو اپنے پیغمبر کی تکذیب کی پاداش میں ہلاک ہوئی) حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''ایک امت نے اپنے رسول کو کنوئیں میں بند کیا پھر ان پر عذاب آیا تب وہ رسول خلاص ہوا''۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی پہلے سب کو اچھی طرح سمجھایا، جب کسی طرح نہ مانا تو تختہ الٹ دیا۔

وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْٓ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ۭ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ

اور یہ لوگ ہو آئے ہیں اس بستی کے پاس جن پر برسا بُرا برساؤ (مینہ) ۱؎ کیا دیکھتے نہ تھے اس کو ۲؎

بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ۝ ۴۰

نہیں پر امید نہیں رکھتے جی اٹھنے کی ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** اور یہ (کفار ملک شام کے سفر میں) اس بستی پر ہو کر گزرتے ہیں جس پر بری طرح پتھر برسائے گئے تھے (مراد

قوم لوط کی بستی ہے ) سو کیا یہ لوگ اس کو دیکھتے نہیں رہتے ( پھر بھی عبرت نہیں پکڑتے کہ کفر وتکذیب کو چھوڑ دیں جس کی بدولت قوم لوط ہلاک ہوئی، سو بات یہ ہے کہ عبرت نہ پکڑنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس بستی کو دیکھتے نہ ہوں ) بلکہ (اصل وجہ اس کی یہ ہے کہ ) یہ لوگ مرکر جی اٹھنے کا احتمال ہی نہیں رکھتے (یعنی آخرت کے منکر ہیں، اس لئے کفر کو عذاب کا سبب نہیں سمجھتے اور اسی لئے ان کی ہلاکت کو کفر کی سزا نہیں مانتے، بلکہ ایک اتفاقی بات سمجھتے ہیں، یہ ہے وجہ عبرت نہ پکڑنے کی )۔

* * *

**فائدہ:** ؎ یعنی قوم لوط کی بستیاں جن کے کھنڈرات پر سے مکہ والے ''شام'' کے سفر میں گزرتے تھے۔

**فائدہ:** ؎ یعنی کیا ان کے کھنڈرات کو عبرت کی نگاہ سے نہ دیکھا۔

**فائدہ:** ؎ یعنی عبرت کہاں سے ہوتی جب ان کے نزدیک یہ احتمال ہی نہیں کہ مرنے کے بعد پھر جی اٹھنا اور خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے، عبرت تو وہ ہی حاصل کرتا ہے جس کے دل میں تھوڑا بہت ڈر ہو اور انجام کی طرف سے بالکل بے فکر نہ ہو۔

وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِیْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ﴿۴۱﴾ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ

اور جہاں تجھ کو دیکھیں کچھ کام نہیں ان کو تجھ سے مگر ٹھٹھے کرنے ،کیا یہی ہے جس کو بھیجا اللہ نے پیغام دے کر۔ یہ تو ہم کو بچلا ہی دیتا

اٰلِهَتِنَا لَوْلَاۤ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ؕ وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾

ہمارے معبودوں سے اگر ہم نہ جمے رہتے ان پر ؎ اور آگے جان لیں گے جس وقت دیکھیں گے عذاب کہ کون بہت بچلا ہوا ہے راہ سے ؎

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے کفار کی قباحت اور ملامت مذکور تھی، آگے بھی ان کی بعض قولی اور فعلی قباحتیں بیان کی جاتی ہیں، اور ان کے ایک اعتراض کی طرف بھی اشارہ ہے کہ وہ آپ کے مالدار نہ ہونے کو بھی شان نبوت کے خلاف سمجھتے تھے اس کا جواب ہے کہ یہ اعتراض محض بے دلیل اور صریح گمراہی ہے جس کا منشا خواہش نفس کی پیروی ہے۔

اور جب یہ لوگ آپ کو دیکھتے ہیں تو بس آپ سے تمسخر کرنے لگتے ہیں (اور کہتے ہیں ) کہ کیا یہی (بزرگ ) ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے رسول بنا کر بھیجا ہے (یعنی ایسا غریب آدمی رسول نہیں ہونا چاہئے، اگر رسالت کوئی چیز ہے تو کوئی رئیس مالدار ہونا چاہئے تھا، پس یہ رسول نہیں، البتہ ) اس شخص ( کی جادو بیانی اس غضب کی ہے کہ اس ) نے تو ہم کو ہمارے معبودوں سے ہٹا ہی دیا ہوتا اگر ہم ان پر (مضبوطی سے ) قائم نہ رہتے (یعنی ہم تو ہدایت پر ہیں اور یہ ہم کو اپنی جادو بیانی سے گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی تردید کے لئے فرماتے ہیں کہ یہ ظالم اب تو اپنے آپ کو ہدایت یافتہ اور ہمارے پیغمبر کو گمراہ بتلا رہے ہیں ) اور (مرنے کے بعد ) جلدی ہی ان کو معلوم ہو جائے گا جب عذاب کا معائنہ کریں گے کہ کون شخص گمراہ تھا (آیا وہ خود گمراہ تھے یا نعوذ باللہ پیغمبر )۔

اس میں ان کے بیہودہ اعتراض کے جواب کی طرف بھی اشارہ ہے کہ صحیح دلائل سے ثابت ہو چکا ہے کہ نبوت کے لیے رئیس و مالدار ہونا لازم نہیں، پس اس وجہ سے انکار کرنا کھلی جہالت و گمراہی ہے، مگر یہاں دنیا میں بے توجہی کی وجہ سے اپنا گمراہ ہونا معلوم نہیں ہوتا لیکن وہاں قیامت میں مشاہدہ سے ظاہر ہو جائے گا اور سب حقیقت کھل جائے گی۔

* * *

**فائدہ:** ؎ یعنی بجائے عبرت حاصل کرنے کے ان کا مشغلہ تو یہ ہے کہ پیغمبر سے ٹھٹھا کیا کریں، چنانچہ آپ ﷺ کو دیکھ کر استہزاءً کہتے ہیں کہ کیا یہ بزرگ ہیں جن کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا؟ بھلا یہ حیثیت اور منصب رسالت؟ کیا ساری خدائی میں سے یہ ہی اکیلے رسول بننے کے لیے رہ گئے تھے؟ آخر کوئی بات تو ہو، ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کی تقریر جادو کا اثر رکھتی ہے، قوت فصاحت اور زور تقریر سے رنگ تو ایسا جمایا تھا کہ بڑے بڑوں

کے قدم پھسل گئے ہوتے، قریب تھا کہ اس کی باتیں ہم کو ہمارے معبودوں سے برگشتہ کر دیتیں، وہ تو ہم پکے ہی ایسے تھے کہ برابر جمے رہے ان کی کسی بات کا اثر قبول نہ کیا، ورنہ یہ ہم سب کو کبھی کا گمراہ کر کے چھوڑتے (العیاذ باللہ)

**فائدہ: ۲** یعنی عذاب الٰہی کو آنکھوں سے دیکھیں گے تب ان کو پتہ لگے گا کہ واقع میں کون گمراہی پر تھا۔

**اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَیْهِ وَكِیْلًا ﴿۴۳﴾ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ**

بھلا دیکھ تو اس شخص کو جس نے پوجنا اختیار کیا اپنی خواہش کا، کہیں تو لے سکتا ہے اس کا ذمہ یا تو خیال رکھتا ہے کہ بہت سے ان میں

**یَسْمَعُوْنَ اَوْ یَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِیْلًا ﴿۴۴﴾** ع

سنتے یا سمجھتے ہیں اور کچھ نہیں وہ برابر ہیں چوپایوں کے بلکہ وہ زیادہ بہکے ہوئے ہیں راہ سے

**خلاصہ تفسیر:** اے پیغمبر! آپ نے اس شخص کی حالت بھی دیکھی جس نے اپنا خدا اپنی خواہش نفسانی کو بنا رکھا ہے، سو کیا آپ اس کی نگرانی کر سکتے ہیں (اس میں ان کی گمراہی کا منشا بیان کر دیا کہ کسی دلیل سے ان کو یہ شبہ نہیں پیدا ہوا، بلکہ اس کا سبب خواہش نفس کا اتباع ہے)۔

یا آپ خیال کرتے ہیں کہ ان میں اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں (مطلب یہ کہ آپ ان کی گمراہی سے مغموم نہ ہوں، کیونکہ آپ ان پر مسلط نہیں کہ زبردستی ان کو راہ پر لائیں اور نہ ہدایت کی ان سے توقع کیجئے، کیونکہ نہ یہ حق بات کو سنتے ہیں نہ عقل ہے کہ غور کریں) یہ تو محض چوپایوں کی طرح ہیں (کہ وہ بات کو نہ سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں) بلکہ یہ ان سے بھی زیادہ بے راہ ہیں (کیونکہ جانور احکام دین کے مکلف نہیں، تو ان کا نہ سمجھنا کچھ عیب نہیں، اور یہ مکلف ہیں پھر بھی نہیں سمجھتے، پھر یہ کہ اگر وہ چوپائے ضروریات دین کے معتقد نہیں تو منکر بھی نہیں، اور یہ تو منکر ہیں)۔

**اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ:** اس میں خواہشات نفسانی کے اتباع کی مذمت نکلتی ہے اور صوفیاء کے اس مشہور قول کی تصدیق ہوتی ہے: "کل ما شغلك عن الحق فھو طاغوتك" یعنی جو چیز بھی حق سے غافل کر دے وہ تمہارا باطل معبود ہے۔

**اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ:** اکثر کی تخصیص اس لیے فرمائی کہ بعض کو عنایت خداوندی سے بعد میں ایمان کی توفیق ہوئی اور بعض عقل بھی رکھتے تھے مگر عناد کی وجہ سے ایمان نہ لاتے تھے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی آپ ایسے ہوا پرستوں کو راہ ہدایت پر لے آنے کی کیا ذمہ داری کر سکتے ہیں جن کا معبود ہی محض خواہش ہو کہ جدھر خواہش لے گئی ادھر ہی جھک پڑے جو بات خواہش کے موافق ہوئی قبول کر لی، جو مخالف ہوئی رد کر دی، آج ایک پتھر اچھا معلوم ہوا اسے پوجنے لگے کل دوسرا اس سے خوبصورت مل گیا پہلے کو چھوڑ کر اس کے آگے سر جھکا دیا۔

**فائدہ:** یعنی کیسی ہی نصیحتیں سنائیے، یہ تو چوپائے جانور ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر، انھیں سننے یا سمجھنے سے کیا واسطہ چوپائے تو بہر حال اپنے پرورش کرنے والے مالک کے سامنے گردن جھکا دیتے ہیں، اپنے محسن کو پہچانتے ہیں، نافع و مضر کی کچھ شناخت رکھتے ہیں، کھلا چھوڑ دو تو اپنی چراگاہ اور پانی پینے کی جگہ پہنچ جاتے ہیں، لیکن ان بدبختوں کا حال یہ ہے کہ نہ اپنے خالق و رازق کا حق پہچانا، نہ اس کے احسانات کو سمجھا، نہ بھلے برے کی تمیز کی، نہ دوست دشمن میں فرق کیا، نہ غذائے روحانی اور چشمہ ہدایت کی طرف قدم اٹھایا، بلکہ اس سے کوسوں دور بھاگے اور جو قوتیں خدا تعالیٰ نے عطا کی تھیں ان کو معطل کیے رکھا بلکہ بے موقع صرف کیا، اگر ذرا بھی عقل و فہم سے کام لیتے تو اس کارخانہ قدرت میں بیشمار نشانیاں موجود تھیں جو نہایت واضح طور پر اللہ تعالیٰ کی توحید و تنزیہ اور اصول دین کی صداقت و حقانیت کی طرف رہبری کر رہی ہیں جن میں سے بعض نشانیوں کا ذکر آئندہ آیات میں کیا گیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ

تو نے نہیں دیکھا اپنے رب کی طرف کیسے دراز کیا سایہ کو (پرچھائیں کو)، اور اگر چاہتا تو اس کو ٹھہرا رکھتا، پھر ہم نے مقرر کیا سورج کو

عَلَيْهِ دَلِيْلًا ﴿۴۵﴾ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ﴿۴۶﴾

اس کا راہ بتلانے والا، پھر کھینچ لیا ہم نے اس کو اپنی طرف سہج سہج سمیٹ کر۔[1]

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے دور سے رسالت کے انکار پر دھمکی اور ملامت چلی آ رہی ہے، اب آگے دلائل سے توحید کو ثابت کر کے اس کے انکار پر مذمت اور ملامت ہے اور اس کے ضمن میں انعامات و احسانات کا بھی ذکر ہے جس سے حق تعالیٰ کی توحید اور استحقاق عبادت میں اس کے ساتھ کسی کا شریک نہ ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔

(اے مخاطب!) کیا تو نے اپنے پروردگار (کی اس قدرت) پر نظر نہیں کی کہ اس نے (جب آفتاب افق سے طلوع ہوتا ہے اس وقت کھڑی ہوئی چیزوں کے) سایہ کو کیونکر (دور تک) پھیلایا ہے (کیونکہ طلوع آفتاب کے وقت ہر چیز کا سایہ لمبا ہوتا ہے) اور اگر وہ چاہتا تو اس کو ایک حالت پر ٹھہرایا ہوا رکھتا (یعنی اگر ہم چاہتے تو آفتاب کے بلند ہونے سے بھی سایہ نہ گھٹتا، کیونکہ آفتاب کی شعاعوں کا زمین کے حصوں پر پہنچنا ہمارے ارادہ سے ہے خود بخود نہیں ہے، تو ہم آفتاب کی شعاعوں کو اتنی دور تک نہ پہنچنے دیتے جس سے سایہ ایک ہی حال پر رہتا، مگر ہم نے اپنی حکمت سے اس کو ایک حالت پر نہیں رکھا، بلکہ اس کو گھٹاتے بڑھاتے رہتے ہیں) پھر ہم نے آفتاب کو (یعنی اس کے افق کے قریب ہونے اور پھر افق سے بلند ہونے کو) اس (سایہ کے بڑھنے اور گھٹنے) پر (ایک ظاہری) علامت مقرر کیا (مطلب یہ کہ اگرچہ روشنی اور سایہ اور ان کے گھٹنے بڑھنے کی اصل علت حق تعالیٰ کا ارادہ اور مشیت ہے، آفتاب یا کوئی دوسری چیز موثر حقیقی نہیں ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے دنیا میں پیدا ہونے والی چیزوں کے لئے کچھ ظاہری اسباب بنا دیئے ہیں اور اسباب کے ساتھ ان کے مسببات کا ایسا رابطہ قائم کر دیا کہ سبب کے تغیر سے مسبب میں تغیر ہوتا ہے) پھر (اس ظاہری تعلق کی وجہ سے) ہم نے اس (سایہ) کو اپنی طرف آہستہ آہستہ سمیٹ لیا (یعنی جوں جوں آفتاب اونچا ہوتا ہے سایہ زائل ہوتا جاتا ہے، اور چونکہ اس کا غائب ہونا محض خدا کی قدرت سے ہے، کسی دوسرے کا اس میں دخل نہیں ہے، پھر وہ ظاہر میں غائب ہو جانے کے باوجود خدا کے علم سے غائب نہیں، اس لئے یہ فرمایا کہ ہم نے اسے اپنی طرف سمیٹ لیا، تو سایہ کی یہ عجیب حالت صانع کے کمال اور اس کے تنہا معبود ہونے کی دلیل ہے)۔

* * *

**فائدہ:** [1] صبح سے طلوع شمس تک سب جگہ سایہ رہتا ہے اگر حق تعالیٰ سورج کو طلوع نہ ہونے دیتا تو یہی سایہ قائم رہتا، مگر اس نے اپنی قدرت سے سورج نکالا جس سے دھوپ پھیلنی شروع ہوئی اور سایہ بتدریج ایک طرف کو سمٹنے لگا، اگر دھوپ نہ آتی تو سایہ کو ہم سمجھ بھی نہ سکتے، کیونکہ ایک ضد کے آنے سے ہی دوسری ضد پہچانی جاتی ہے: قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ۭ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ (القصص: ۷۱) حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''اول ہر چیز کا سایہ لمبا پڑتا ہے، پھر جس طرف سورج چلتا ہے اس کے مقابل سایہ ہٹا جاتا ہے جب تک کہ جڑ میں آ لگے''، اپنی طرف کھینچ لیا کا یہ مطلب ہے کہ اپنی اصل کو جا لگتا ہے، سب کی اصل اللہ ہے'' (موضح القرآن) پھر زوال کے بعد سے ایک طرف سے دھوپ سمٹنا شروع ہوتی ہے اور دوسری طرف سایہ لمبا ہونے لگتا ہے حتی کہ آخر نہار میں دھوپ غائب ہو جاتی ہے، یہ ہی مثال دنیا کی ہستی کی سمجھو، اول عدم تھا، پھر نور وجود آیا، پھر آخر کار کتم عدم میں چلی جائے گی، اور اسی جسمانی نور و ظل کے سلسلہ پر روحانی نور و ظلمت کو قیاس کر لو، اگر کفر و عصیان اور جہل و طغیان کی ظلمات میں آفتاب نبوت کی روشنی اللہ تعالیٰ نہ بھیجتا تو کسی کو معرفت صحیحہ کا راستہ ہاتھ نہ آتا۔

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿٤٧﴾

اور وہی ہے جس نے بنادیا تمہارے واسطے رات کو اوڑھنا اور نیند کو آرام اور دن کو بنادیا اٹھ نکلنے کے لیے

**خلاصہ تفسیر:** اور وہ ایسا ہے جس نے تمہارے لئے رات کو پردہ کی چیز اور نیند کو راحت کی چیز بنایا اور دن کو زندہ ہونے کا وقت بنایا (کیونکہ سونا موت کے مشابہ ہے اور جاگنا زندہ ہونے کے مشابہ ہے، اور دن کا وقت جاگنے کا ہے)۔

**وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا:** روح المعانی میں لباسا سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ رات تمہارے باطنی احوال یعنی شوق ووجد، گریہ وزاری کے ساتھ ہے، اور نیند مجاہدہ اور محنت کی تھکن سے تمہارے بدن کی راحت ہے اور دن میں اپنی معاشی ضروریات کے لیے چلتے پھرتے ہو، اس مجموعہ میں کئی فائدے ہیں: ① اپنے باطنی احوال کو مخفی رکھنا چاہیے ② صاحب مجاہدات کو ضرورت کے موافق آرام کر لینا چاہیے ③ طلب معاش کی اجازت ہے، ممنوع نہیں ④ طلب معاش طریقت کے خلاف نہیں۔

* * *

**فائدہ:** یعنی رات کی تاریکی چادر کی طرح سب پر محیط ہو جاتی ہے جس میں لوگ کاروبار چھوڑ کر آرام کرتے ہیں، پھر دن کا اجالا ہوتا ہے تو نیند سے اٹھ کر ادھر ادھر چلنے پھرنے لگ جاتے ہیں، اسی طرح موت کی نیند کے بعد قیامت کی صبح آئے گی جس میں سارا جہان دوبارہ اٹھ کھڑا ہوگا اور یہ حالت اس وقت پیش آتی ہے جب انبیاء علیہم السلام وحی والہام کی روشنی سے دنیا میں اجالا کرتے ہیں، تو جہل وغفلت کی نیند سے سوئی ہوئی مخلوق ایک دم آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھتی ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴿٤٨﴾

اور وہی ہے جس نے چلائیں ہوائیں خوشخبری لانے والیاں اسکی رحمت سے (کے) آگے، اور اتارا ہم نے آسمان سے پانی پاکی حاصل کرنے کا

لِّنُحْیِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا وَّنُسْقِیَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِیَّ كَثِیْرًا ﴿٤٩﴾

کہ زندہ کر دیں اس سے مرے ہوئے دیس کو اور پلائیں اس کو اپنے پیدا کیے ہوئے بہت سے چوپایوں اور آدمیوں کو۔[1]

**خلاصہ تفسیر:** اور وہ ایسا ہے کہ اپنی باران رحمت سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ وہ (بارش کی امید دلا کر دل کو) خوش کر دیتی ہیں، اور ہم آسمان سے پانی برساتے ہیں جو پاک صاف کرنے کی چیز ہے، تاکہ اس کے ذریعہ سے مردہ زمین میں جان ڈال دیں اور اپنی مخلوقات میں سے بہت سے چار پایوں اور بہت سے آدمیوں کو سیراب کریں۔

**وَهُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا:** اسی طرح واصل باللہ ہونے سے پہلے وصول کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں (''وصل'' کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ کثرت ذکر وفکر اور گناہوں سے اجتناب کی وجہ سے بندے کو اللہ کے ساتھ ایک خاص ذوقی تعلق اور حضوری کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور غیر سے غفلت ودوری، یہی تعلق وکیفیت جب پختہ اور دائمی ہو جائے تو اسے ''وصل'' کہا جاتا ہے اور اس نسبت والے کو ''واصل باللہ'' کہتے ہیں)۔

* * *

**فائدہ:** [1] یعنی اول برساتی ہوائیں بارش کی خوشخبری لاتی ہیں، پھر آسمان کی طرف سے پانی برستا ہے جو خود پاک اور دوسروں کو پاک کرنے والا ہے، پانی پڑتے ہی مردہ زمینوں میں جان پڑ جاتی ہے، کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں جہاں خاک اڑ رہی تھی وہاں سبزہ زار بن جاتا ہے، اور کتنے جانور اور آدمی بارش کا پانی پی کر سیراب ہوتے ہیں، اسی طرح قیامت کے دن ایک غیبی بارش کے ذریعہ مردہ جسموں کو جو خاک میں مل چکے تھے زندہ کر دیا جائے گا اور دنیا میں بھی اسی طرح جو دل جہل وعصیان کی موت سے مر چکے تھے، وحی الٰہی کی آسمانی بارش ان کو زندہ کر دیتی ہے جو روحیں پلیدی میں پھنس

گئی تھیں، روحانی بارش کے پانی سے دھل کر پاک وصاف ہو جاتی ہیں اور معرفت ووصول الی اللہ کی پیاس رکھنے والے اس کو پی کر سیراب ہوتے ہیں۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ فَاَبٰىٓ اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿٥٠﴾

اور طرح طرح سے تقسیم کیا ہم نے اس کو ان کے بیچ میں تا کہ دھیان رکھیں، پھر بھی نہیں رہتے بہت لوگ بدون ناشکری کیے

**خلاصہ تفسیر:** اور ہم اس (پانی) کو (بقدر مصلحت) ان لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیتے ہیں تا کہ لوگ غور کریں (کہ یہ کام کسی بڑے قدرت والے کے ہیں اور وہی عبادت کا مستحق ہے) سو (چاہئے تھا کہ غور کر کے اسکا حق ادا کرتے لیکن) اکثر لوگ بغیر ناشکری کئے نہ رہے (جس میں سب سے بڑھ کر کفر وشرک ہے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی بارش کا پانی تمام زمینوں اور آدمیوں کو یکساں نہیں پہنچتا بلکہ کہیں کم کہیں زیادہ، کہیں جلد کہیں بدیر، جس طرح اللہ کی حکمت مقتضی ہو پہنچتا رہتا ہے، تا کہ لوگ سمجھیں کہ اس کی تقسیم کسی قادر مختار وحکیم کے ہاتھ میں ہے، لیکن بہت لوگ پھر بھی نہیں سمجھتے اور نعمت الٰہی کا شکر ادا نہیں کرتے، اسلئے کفر اور ناشکری پر اتر آتے ہیں، یہی حال روحانی بارش کا ہے کہ جس کو اپنے استعداد اور ظرف کے موافق جتنا حصہ ملنا تھا مل گیا اور بہت سے اس نعمت عظمیٰ کا کفران ہی کرتے رہے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ﴿٥١﴾ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿٥٢﴾

اور اگر ہم چاہتے تو اٹھاتے ہر بستی میں کوئی ڈرانے والا، سو تو کہنا مت مان منکروں کا اور مقابلہ کر ان کا اس کے ساتھ بڑے زور سے [1]

**خلاصہ تفسیر:** آگے حضور ﷺ کو خطاب ہے کہ آپ ان کی ناشکری سن کر یا دیکھ کر احکام پہنچانے سے ہمت نہ ہاریئے کہ میں تنہا ان سب سے کیسے عہدہ برآ ہوں گا، بلکہ آپ تنہا ہی اپنا کام کرتے جایئے، کیونکہ آپ کو تنہا نبی بنانے سے خود ہمارا مقصود یہ ہے کہ آپ کا اجر اور قرب بڑھے:

اور اگر ہم چاہتے تو (آپ کے علاوہ اسی زمانہ میں) ہر بستی میں ایک ایک پیغمبر بھیج دیتے (اور تنہا آپ پر تمام کام نہ ڈالتے، لیکن چونکہ آپ کا اجر بڑھانا مقصود ہے اس لئے ہم نے ایسا نہیں کیا تو تنہا آپ ہی کو نبی بنا کر بھیجا تو اس صورت میں اتنا کام آپ کے سپرد کیا جانا خدا تعالیٰ کی نعمت ہے)۔

سو (اس نعمت کے شکریہ میں) آپ کافروں کی خوشی کا کام نہ کیجئے (یعنی کافر تو اس سے خوش ہوں گے کہ تبلیغ نہ ہو یا کمی ہو جائے تا کہ ان کی آزادی میں خلل نہ پڑے تو آپ اس میں کمی نہ کیجیے) اور قرآن (میں جو دلائل حق کے مذکور ہیں جیسا اسی مقام پر توحید کے دلائل ارشاد ہوئے ہیں ان) سے ان کا زور شور سے مقابلہ کیجئے (یعنی عام اور مکمل دعوت وتبلیغ کیجئے، یعنی سب سے کہیے اور بار بار کہیے اور ہمت قوی رکھئے جیسا اب تک آپ کرتے رہے ہیں اس پر قائم رہئے، مقصود اس امر ونہی سے یہ ہے کہ جیسا اب تک رہے ویسے ہی ہمیشہ رہیے، تو اس پر کوئی اشکال لازم نہیں آتا)۔

* * *

**فائدہ:** [1] یعنی نبی کا آنا تعجب کی چیز نہیں، اللہ چاہے تو اب بھی نبیوں کی کثرت کر دے کہ ہر بستی میں علیحدہ نبی ہو، مگر اس کو منظور ہی یہ ہوا کہ اب آخر میں سارے جہان کے لیے اکیلے محمد رسول اللہ ﷺ کو نبی بنا کر بھیجے، سو آپ کافروں کے احمقانہ طعن وتشنیع اور سفیہانہ نکتہ چینیوں کی طرف التفات نہ فرمائیں، اپنا کام پوری قوت اور جوش سے انجام دیتے رہیں اور قرآن ہاتھ میں لے کر ان منکرین کا مقابلہ زور وشور کے ساتھ کرتے رہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو کامیاب کرنے والا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا

اور وہی ہے جس نے ملے ہوئے چلائے دو دریا یہ میٹھا ہے پیاس بجھانے والا اور یہ کھاری ہے کڑوا اور رکھا ان دونوں کے بیچ

بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۵۳﴾

پردہ اور آڑ رُوکی ہوئی

**خلاصہ تفسیر:** (آگے پھر دلائل توحید کا بیان ہے) اور وہ ایسا ہے جس نے دو دریاؤں کو (صورتاً) ملایا جن میں ایک (کا پانی) تو شیریں (میٹھا) تسکین بخش ہے اور ایک (کا پانی) شور تلخ (نمکین کڑوا) ہے اور (ظاہری طور پر ملے ہونے کے باوجود حقیقۃً) ان کے درمیان میں (اپنی قدرت سے) ایک حجاب اور (حقیقۃً ملنے سے) ایک مانع قوی رکھ دیا (جو خود خفی غیر محسوس ہے مگر اس کا اثر یعنی دونوں پانی کے مزہ میں امتیاز محسوس اور مشاہد ہے)۔

**وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ:** مراد ان دو دریاؤں سے وہ مواقع ہیں جہاں شیریں ندیاں اور نہریں بہتے بہتے سمندر میں آ کر گرتی ہیں وہاں باوجود اس کے کہ اوپر سے دونوں کا سطح ایک معلوم ہوتا ہے، لیکن خدا کی قدرت ہے ان میں ایک ایسی حد فاصل ہے کہ جہاں دونوں ملتے ہیں اس کی ایک جانب سے پانی لیا جائے تو میٹھا اور اس کے بالکل قریب دوسری جانب سے پانی لیا جائے تو کڑوا، چنانچہ بنگال میں بھی اراکان سے چاٹگام تک ایسا موقع موجود ہے کہ ایک طرف پانی سفید اور دوسری طرف سیاہ ہے، اور دونوں کے بیچ میں ایک خط معلوم ہوتا ہے، سیاہ پانی میں تلاطم بھی بہت ہوتا ہے اور سفید پانی بالکل ساکن رہتا ہے، اور کشتیاں سفید پانی میں ہی چلتی ہیں، دنیا میں جہاں جس جگہ شیریں پانی کی نہریں چشمے سمندر کے پانی میں گرتے ہیں وہاں اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ میلوں دور تک میٹھا اور کھاری پانی الگ الگ چلتے ہیں، دائیں طرف میٹھا بائیں طرف تلخ کھاری یا اوپر نیچے شیریں اور تلخ پانی الگ الگ پائے جاتے ہیں، آیت کا مطلب بالکل واضح ہے یعنی خدا کی قدرت دیکھو کہ کھارے اور میٹھے دونوں دریاؤں کے پانی کہیں نہ کہیں مل جانے کے باوجود بھی کسی طرح ایک دوسرے سے ممتاز رہتے ہیں۔

**وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ:** بحرین کی اس مثال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے معنوی حیثیت سے بھی دو بحر قرار دیے گئے ہیں: ① بحر روح ② بحر نفس، روح کی صفات شیرین اور حمیدہ ہیں اور نفس کی صفات تلخ اور ذمیمہ (بری) ہیں، یہ دونوں متضاد صفات ایک جسم میں اس طرح جمع کر دی گئی ہیں کہ سطحی نظر میں دونوں ایک دوسرے سے مختلط اور ملتبس (یعنی مشابہ اور ملی ہوئی) معلوم ہوتی ہیں مگر واقع میں دونوں میں امتیاز ہے جسے صاحب بصیرت معلوم کر لیتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** بیان القرآن میں دو معتبر بنگالی علماء کی شہادت نقل کی ہے کہ ''ارکان'' سے ''چاٹگام'' تک دریا کی شان یہ ہے کہ اس کی دو جانبیں بالکل الگ الگ نوعیت کے دو دریا نظر آتے ہیں، ایک کا پانی سفید ہے، ایک کا سیاہ، سیاہ میں سمندر کی طرح طوفانی تلاطم اور تموج ہوتا ہے اور سفید بالکل ساکن رہتا ہے کشتی سفید میں چلتی ہے اور دونوں کے بیچ میں ایک دھاری سی برابر چلی گئی ہے جو دونوں کا ملتقی ہے، لوگ کہتے ہیں کہ سفید پانی میٹھا ہے اور سیاہ کڑوا، اور مجھ سے ''باریسال'' کے بعض طلبہ نے بیان کیا کہ ضلع ''باریسال'' میں دو ندیاں ہیں جو ایک ہی دریا سے نکلی ہیں، ایک کا پانی کھاری بالکل کڑوا، اور ایک کا نہایت شیریں اور لذیذ ہے۔

یہاں گجرات میں راقم الحروف جس جگہ آجکل مقیم ہے (ڈابھیل سملک ضلع سورت) سمندر تقریباً دس بارہ میل کے فاصلہ پر ہے ادھر کی ندیوں میں برابر مد و جزر (جوار بھاٹا) ہوتا رہتا ہے، بکثرت ثقات نے بیان کیا کہ مد کے وقت جب سمندر کا پانی ندی میں آجاتا ہے تو میٹھے پانی کی سطح پر کھاری پانی بہت زور سے چڑھ جاتا ہے لیکن اس وقت بھی دونوں پانی مختلط نہیں ہوتے، اوپر کھاری رہتا ہے، نیچے میٹھا، جزر کے وقت اوپر سے کھاری اتر جاتا اور میٹھا جوں کا توں باقی رہ جاتا ہے واللہ اعلم، ان شواہد کو دیکھتے ہوئے آیت کا مطلب بالکل واضح ہے، یعنی خدا کی قدرت دیکھو کہ کھاری اور میٹھے دونوں دریاؤں کے پانی کہیں نہ کہیں مل جانے کے باوجود بھی کس طرح ایک دوسرے سے ممتاز رہتے ہیں، یا یہ مطلب ہو کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں دریا

الگ الگ اپنے اپنے مجریٰ میں چلائے اور دونوں کے بیچ میں بہت جگہ زمین حائل کردی، اس طرح آزاد نہ چھوڑا کہ دونوں زور لگا کر درمیان سے زمین کو ہٹا دیتے اور اس کی ہستی کو تباہ کر دیتے، پھر دونوں میں ہر ایک کا جو مزہ ہے وہ اسی کے لیے لازم ہے، یہ نہیں کہ میٹھا دریا کھاری، یا کھاری میٹھا بن جائے، گویا باعتبارِ اوصاف کے ہر ایک دوسرے سے بالکل الگ رہنا چاہتا ہے،، وقیل غیر ذالك والراجح عندی هو الاول، واللہ اعلم۔

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ؕ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِیْرًا ﴿۵۴﴾

اور وہی ہے جس نے بنایا پانی سے آدمی پھر ٹھہرایا اس کے لیے نسب (جد) اور سسرال، اور تیرا رب سب کچھ کر سکتا ہے

وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُهُمْ وَلَا یَضُرُّهُمْ ؕ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰی رَبِّهٖ ظَهِیْرًا ﴿۵۵﴾

اور پوجتے ہیں اللہ کو چھوڑ کر وہ چیز جو نہ بھلا کر سکے ان کا نہ برا، اور ہے کافر اپنے رب کی طرف سے پیٹھ (منہ) پھیر رہا (طرف پیٹھ کر رہا) لے

**خلاصہ تفسیر:** اور وہ ایسا ہے جس نے پانی سے (یعنی نطفہ سے) آدمی کو پیدا کیا پھر اس کو خاندان والا اور سسرال والا بنایا (چنانچہ باپ دادا وغیرہ شرعی خاندان اور ماں، نانی وغیرہ عرفی خاندان ہیں جن سے پیدائش کے ساتھ ہی تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں، پھر شادی کے بعد سسرالی رشتے پیدا ہو جاتے ہیں، یہ قدرت کی دلیل بھی ہے کہ نطفہ کیا چیز تھا پھر اس کو کیسا بنا دیا کہ وہ اتنے تعلقات والا ہو گیا اور یہ نعمت بھی ہے کہ ان ہی تعلقات پر تمدن، معاونت اور باہمی امداد کا مدار ہے) اور (اے مخاطب!) تیرا پروردگار بڑی قدرت والا ہے (ربّك سے نعمت کی طرف اور قدیرا سے قدرت کی دلیل کی طرف اشارہ ہے)۔

اور (باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات وصفات میں ایسا کامل ہے جیسا کہ بیان ہوا، اور یہ کمالات تقاضا کرتے ہیں کہ صرف اسی کی عبادت کی جائے مگر) یہ (مشرک) لوگ (ایسے) خدا کو چھوڑ کر ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں (جو عبادت کرنے پر) نہ ان کو کچھ نفع پہنچا سکتی ہیں اور نہ (عبادت نہ کرنے کی صورت میں) ان کو کچھ ضرر پہنچا سکتی ہیں، اور کافر تو اپنے رب کا مخالف ہے (کہ اس کو چھوڑ کر دوسرے کی عبادت کرتا ہے)۔

* * *

**فائدہ:** لے دیکھ لو! کس طرح اپنی قدرت کاملہ سے ایک قطرہ آب کو عاقل و کامل آدمی بنا دیا، پھر آگے اس سے نسلیں چلائیں اور دامادی اور سسرال کے تعلقات قائم کیے، ایک ناچیز قطرہ کو کیا سے کیا کر دیا اور کہاں سے کہاں پہنچا دیا، لیکن یہ حضرت تھوڑی ہی دیر میں اپنی اصل کو بھول گئے اور رب قدیر کو چھوڑ کر عاجز مخلوق کو خدا کہنے لگے، اپنے پروردگار کا حق تو کیا پہچانتے اس سے منہ موڑ کر اور پیٹھ پھیر کر شیطان کی فوج میں جا شامل ہوئے، تاکہ اغواء واضلال کے مشن میں اس کی مدد کریں اور مخلوق کو گمراہ کرنے میں اس کا ہاتھ بٹائیں، نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ﴿۵۶﴾ قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ

اور تجھ کو ہم نے بھیجا یہی خوشی اور ڈر سنانے کے لیے۔ تو کہہ میں نہیں مانگتا تم سے اس پر کچھ مزدوری مگر جو کوئی چاہے

اَنْ یَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّهٖ سَبِیْلًا ﴿۵۷﴾

کہ پکڑ لے اپنے رب کی طرف راہ لے

**خلاصہ تفسیر:** (اب تسلی دی جاتی ہے کہ کفار کی مخالفت معلوم کر کے آپ نہ تو ان کے ایمان نہ لانے سے مغموم ہوں، کیونکہ:) ہم نے آپ کو صرف اس لئے بھیجا ہے کہ (ایمان والوں کو جنت کی) خوشخبری سنائیں اور (کافروں کو دوزخ سے) ڈرائیں (ان کے ایمان نہ لانے سے آپ کا کیا نقصان ہے، پھر آپ کیوں غم کریں، اور نہ آپ اس فکر میں پڑیں کہ جب یہ حق تعالیٰ کے مخالف ہیں تو میں جو حق تعالیٰ کی طرف

دعوت دیتا ہوں اس دعوت کو یہ لوگ خیر خواہی کب سمجھیں گے، بلکہ میری خود غرضی پر محمول کر کے توجہ بھی نہ کریں گے تو ان کے گمان کی کیونکر اصلاح کی جائے تاکہ رکاوٹ دور ہو، سو اگر آپ کو ان کا یہ خیال قرینہ سے یا زبانی گفتگو سے معلوم ہو تو) آپ (جواب میں اتنا) کہہ دیجئے (اور بے فکر ہو جایئے) کہ میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی معاوضہ (مال یا جاہ کی صورت میں) نہیں مانگتا ہاں! جو شخص یوں چاہے کہ اپنے رب تک (پہنچنے کا) رستہ اختیار کر لے (تو البتہ اس کو راستہ بتلانا میں ضرور چاہتا ہوں، چاہے اس کو معاوضہ کہو یا نہ کہو)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی آپ کا کام خدا تعالیٰ کی وفاداری پر بشارات سنانا اور غداروں کو خراب نتائج و عواقب سے آگاہ کر دینا ہے، آگے کوئی مانے یا نہ مانے، آپ کو کچھ نقصان نہیں، آپ ان سے کچھ فیس یا مزدوری تھوڑی طلب کر رہے تھے کہ ان کے نہ ماننے سے اس کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو، آپ تو ان سے صرف اتنا ہی چاہتے ہیں کہ جو کوئی چاہے خدا کی توفیق پا کر اپنے رب کا راستہ پکڑ لے، اسی کو چاہو فیس کہہ لو یا مزدوری۔

وَتَوَكَّلۡ عَلَى الۡحَىِّ الَّذِىۡ لَا يَمُوۡتُ وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِهٖ‌ ؕ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوۡبِ عِبَادِهٖ خَبِيۡرَا ۖۚ ۝۵۸

اور بھروسہ کر اوپر اس زندہ کے جو نہیں مرتا ۱ اور یاد کر اس کی خوبیاں، اور وہ کافی ہے اپنے بندوں کے گناہوں سے خبردار ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور (نہ کفار کی اس مخالفت کو دریافت کر کے کسی کے نقصان پہنچانے کا اندیشہ کیجیے، بلکہ تبلیغ میں) اس حی لایموت پر توکل رکھئے، اور (اطمینان کے ساتھ) اس کی تسبیح و تحمید میں لگے رہیے، اور (آپ اس خیال سے کہ ان کی مخالفت دوسروں کو نقصان نہ پہنچائے ان کے واسطے جلدی عذاب آنے کی بھی تمنا نہ کیجیے، کیونکہ) وہ (خدا) اپنے بندوں کے گناہوں سے کافی (طور پر) خبردار ہے (وہ جب مناسب سمجھے گا سزا دے دے گا، ان جملوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حزن و فکر اور خوف وغیرہ کو زائل فرمایا ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی آپ تنہا خدا پر بھروسہ کر کے اپنا فرض (تبلیغ و دعوت وغیرہ) ادا کیے جایئے، کسی کی مخالفت یا موافقت کی پروا نہ کریں، فانی چیزوں کا کیا سہارا، سہارا تو اسی کا ہے جو ہمیشہ زندہ رہے کبھی نہ مرے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی اسی پر توکل رکھیے اور اسی کی عبادت اور حمد و ثنا کرتے رہیے، ان مجرموں سے وہ خود نبٹ لے گا۔

الَّذِىۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَيۡنَهُمَا فِىۡ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰى عَلَى الۡعَرۡشِ‌ ۛۚ

جس نے بنائے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے چھ دن میں پھر قائم ہوا عرش پر

اَلرَّحۡمٰنُ فَسۡـئَلۡ بِهٖ خَبِيۡرًا‏ ۝۵۹

وہ بڑی رحمت والا سو پوچھ اس سے جو اس کی خبر رکھتا ہو ۲

**خلاصہ تفسیر:** گذشتہ آیات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غم، فکر اور خوف کو زائل کر کے اب آگے پھر توحید کا بیان ہے۔

وہ ایسا ہے جس نے آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے سب چھ روز (کی مقدار) میں پیدا کیا پھر عرش پر (جو تخت سلطنت کے مشابہ ہے اس طرح) قائم (اور جلوہ فرما) ہوا (جو کہ اس کی شان کے لائق ہے جس کا بیان سورۃ اعراف کے ساتویں رکوع کے شروع میں گزر چکا) وہ بڑا مہربان ہے سو اس کی شان کسی جاننے والے سے پوچھنا چاہیے (کہ وہ کیسا ہے، کا فر مشرک کیا جانیں اور اسی نہ جاننے کی وجہ سے یہ لوگ شرک کرتے ہیں، کما قال اللہ تعالیٰ: وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدۡرِهٖۤ)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ اس کا بیان سورہ اعراف میں گزر چکا ہے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی اللہ تعالیٰ کی شانوں اور رحمتوں کو کسی جاننے والے سے پوچھو، یہ جاہل مشرک اسے کیا جانیں: **وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ** (الانعام:۹۱) اپنی شؤن وکمالات کا پوری طرح جاننے والا تو خدا ہی ہے: ''اَنْتَ كَمَآ اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ'' لیکن مخلوق میں سب سے بڑے جاننے والے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں جن کی ذاتِ گرامی میں حق تعالیٰ نے اولین وآخرین کے تمام علوم جمع کر دیئے، خدا تعالیٰ کی شانوں کو کوئی ان سے پوچھے۔

**وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۤ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ﴿۶۰﴾**

اور جب کہیے ان سے (کو) سجدہ کرو رحمان کو کہیں رحمان کیا ہے، کیا سجدہ کرنے لگیں ہم جس کو تو فرمائے اور بڑھ جاتا ہے ان کا بدکنا (چوکنا)

**خلاصہ تفسیر:** اور جب ان (کافروں) سے کہا جاتا ہے کہ رحمن کو سجدہ کرو تو (جہل وعناد کی وجہ سے) کہتے ہیں کہ رحمن کیا چیز ہے (جس کے سامنے ہمیں سجدہ کرنے کو کہتے ہو) کیا ہم اس کو سجدہ کرنے لگیں گے جس کو تم سجدہ کرنے کے لئے ہم کو کہو گے اور اس سے ان کو اور زیادہ نفرت ہوتی ہے۔

**قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ:** رحمن کا لفظ ان میں کم مشہور تھا مگر یہ نہیں کہ جانتے نہ ہوں، خوب جانتے تھے کہ رحمن خدا کا نام ہے، مگر چونکہ اسلامی تعلیم سے مخالفت بڑھی ہوئی تھی تو اس مخالفت کو محاورات اور بول چال میں بھی نباہتے تھے، تو قرآن میں جو یہ لفظ کثرت سے آیا وہ اس کی بھی مخالفت کر بیٹھے، انجان بن کر اس میں گفتگو اور انکار کرنے لگے اگرچہ اس سے خدا ہی کا انکار اور بے ادبی ہو جائے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی یہ جاہل مشرک رحمان کی عظمت شان کو کیا سمجھ سکتے ہیں جن کو اس نام سے بھی چڑ ہے، جب یہ نام سنتے ہیں تو انتہائی جہل یا بے حیائی اور تعنت سے ناواقف بن کر کہتے ہیں کہ رحمان کون ہے جس کو ہم سے سجدہ کراتا ہے کیا محض تیرے کہہ دینے سے ایسی بات مان لیں؟ بس تم نے ایک نام لے دیا اور ہم سجدہ میں گر پڑے، غرض جس قدر انہیں رحمان کی اطاعت وانقیاد کی طرف توجہ دلائے اسی قدر زیادہ بدکتے اور بھاگتے ہیں۔

**تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ﴿۶۱﴾**

بڑی برکت ہے اس کی جس نے بنائے آسمان میں برج ۱ اور رکھا اس میں چراغ ۲ اور چاند اجالا (چاندنا) کرنے والا

**خلاصہ تفسیر:** وہ ذات بہت عالیشان ہے جس نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے بنائے اور (ان ستاروں میں سے دو بڑے نورانی اور فائدہ پہنچانے والے ستارے بنائے یعنی) اس (آسمان) میں ایک چراغ (یعنی آفتاب) اور نورانی چاند بنایا (شاید آفتاب کو شدت اور تیزی کی وجہ سے ''سراج''، یعنی چراغ کے ساتھ تشبیہ دی)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی بڑے بڑے ستارے، یا آسمانی قلعے جن میں فرشتے پہرہ دیتے ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''آسمان کے بارہ حصے، ان کا نام برج، ہر ایک پر ستاروں کا پتہ، یہ حدیں رکھی ہیں حساب کو''۔ (موضح)

**فائدہ:** ۲ یعنی سورج، شاید نور وحرارت کے جمع ہونے اور صفت احراق رکھنے کی وجہ سے اس کو چراغ فرمایا: **وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا** (نوح:۱۶)

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿۶۲﴾

اور وہی ہے جس نے بنائے رات اور دن بدلنے والے (بدلتے سدلتے) ۱؎ اس شخص کے واسطے کہ چاہے دھیان رکھنا یا چاہے شکر کرنا ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور وہ ایسا ہے جس نے رات اور دن ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والے بنائے (اور یہ سب کچھ جو دلائل توحید اور اللہ کی نعمتوں کا ذکر ہوا ہے) اس شخص کے (سمجھنے کے) لئے (ہیں) جو سمجھنا چاہے یا شکر کرنا چاہے (کہ سمجھنے والے کی نظر میں یہ دلائل ہیں اور شکر کرنے والے کی نظر میں انعامات ہیں ورنہ: ''اگر صد باب حکمت پیش ناداں، بخوانی آیدش بازیچہ در گوش'' یعنی نادان کے حق میں حکمت کی ہزار کتابیں بھی کھیل کود اور تماشہ ہیں)۔

**جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً:** یعنی دن اور رات میں ہر ایک دوسرے کا قائم مقام ہے اس بات میں کہ جو عمل ایک کرنے کا تھا اور وہ کسی وجہ سے نہ ہو سکا تو دوسرے میں کرلے، اور بعض نے یہ تفسیر کی ہے کہ دن رات دونوں کے آنے جانے میں تعاقب کا سلسلہ جاری ہے، اس دوسری تفسیر پر یہ قبض و بسط کی نظیر ہے (یعنی انسان پر جو مختلف حالات قبض و بسط (تنگی اور کشادگی) کے آتے ہیں ان میں بھی حکمت ہے کہ جب حالت قبض ہوگی تو آہ وزاری کا موقع ملے گا اور جب قبض یعنی تنگی کی صورت ختم ہو جائے گی اور بسط یعنی کشادگی ہوگی تو شکر کا جذبہ موجزن ہوگا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ گھٹنے بڑھنے یا آنے جانے کو بدلنا سدلنا فرمایا، یا یہ مطلب ہے کہ ایک کو دوسرے کا بدل بنایا ہے، مثلاً دن کا کام رہ گیا، رات کو کرلیا، رات کا وظیفہ رہ گیا، دن میں پورا کر دیا، کما ورد فی الحدیث۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی چاند سورج وغیرہ کا الٹ پھیر اور رات دن کا ادل بدل اس لیے ہے کہ اس میں دھیان کر کے لوگ خداوند قدیر کی معرفت کا سراغ لگائیں کہ یہ سب تصرفات و تقلبات عظیمہ اسی کے دست قدرت کی کارسازیاں ہیں، اور رات دن کے فوائد و انعامات کو دیکھ کر اس کی شکر گزاری کی طرف متوجہ ہوں، چنانچہ رحمان کے مخلص بندے جن کا ذکر آگے آتا ہے، ایسا ہی کرتے ہیں۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾

اور بندے رحمان کے وہ ہیں جو چلتے ہیں زمین پر دبے پاؤں ۱؎ اور جب بات کرنے لگیں ان سے بے سمجھ لوگ تو کہیں صاحب سلامت ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے توحید کے دلائل کے ساتھ ساتھ کفار و مشرکین کا کفر اور مخالفت اور ساتھ ہی ان کی مذمت مذکور تھی، اب مقابلہ میں مؤمنین کی اطاعت، احکام کی بجا آوری اور ان کی فضیلت کا بیان ہے، درمیان میں تبعاً بعض گناہوں کی تفصیل اور توبہ سے ان کا معاف ہو جانا مذکور ہے۔

اور (حضرت) رحمن کے (خاص) بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں (مطلب یہ کہ ان کے مزاج میں تواضع ہے، اور اسی کا اثر تمام امور اور چلنے میں بھی خود بخود ظاہر ہوتا ہے، ورنہ خاص چال کی ہیئت بیان کرنا مقصود نہیں کیونکہ دماغ داری کے ساتھ نرم رفتاری کچھ بھی موجب تعریف نہیں، اور یہ تواضع تو ان کا طرز خاص اپنے اعمال میں ہے) اور (دوسروں کے ساتھ ان کا طرز یہ ہے کہ) جب ان سے جہالت والے لوگ (جہالت کی) بات (چیت) کرتے ہیں تو وہ رفع شر کی بات کہتے ہیں (مطلب یہ کہ اپنی ذات کے لئے قول یا عمل سے انتقام نہیں لیتے اور جو سختی اصلاح اور تعلیم، سیاست شرعیہ یا اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے ہو تو اس کی نفی مقصود نہیں)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی مشرکین کی طرح رحمان کا نام سن کر ناک بھویں نہیں چڑھاتے بلکہ ہر فعل و قول سے بندگی کا اظہار کرتے ہیں، ان کی چال ڈھال سے تواضع، متانت، خاکساری اور بے تکلفی ٹپکتی ہے، متکبروں کی طرح زمین پر اکڑ کر نہیں چلتے، یہ مطلب نہیں کہ ریاء و تصنع سے بیماروں کی طرح

قدم اٹھاتے ہیں، کیونکہ حضور ﷺ کی جو رفتار احادیث میں منقول ہے، اس کی تائید نہیں کرتی۔

**فائدہ:** ۲ یعنی کم عقل اور بے ادب لوگوں کی بات کا جواب عفو وصفح سے دیتے ہیں، جب کوئی جہالت کی گفتگو کرے تو ملائم بات اور صاحب سلامت کہہ کر الگ ہوجاتے ہیں، ایسوں سے منہ نہیں لگتے، نہ ان میں شامل ہوں نہ ان سے لڑیں، انکا شیوہ وہ نہیں جو جاہلیت میں کسی نے کہا تھا:

أَلَا لَا يَجْهَلَنْ أَحَدٌ عَلَيْنَا فَنَجْهَلُ فَوْقَ جَهْلِ الْجَاهِلِيْنَا

یہ تو رحمان کے ان مخلص بندوں کا دن تھا، آگے رات کی کیفیت بیان فرماتے ہیں:

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ﴿۶۴﴾ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ

اور وہ لوگ جو رات کاٹتے ہیں اپنے رب کے آگے سجدہ میں اور کھڑے ۱ اور وہ لوگ کہ کہتے ہیں اے رب! ہٹا ہم سے دوزخ

جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿۶۵﴾ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۶۶﴾

کا عذاب، بیشک اس کا عذاب چمٹنے والا ہے وہ بری جگہ ہے ٹھہرنے کی اور بری جگہ رہنے کی ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور جو (اللہ تعالی کے ساتھ اپنا یہ طرز رکھتے ہیں کہ) راتوں کو اپنے رب کے آگے سجدہ اور قیام (یعنی نماز) میں لگے رہتے ہیں، اور جو (حقوق اللہ وحقوق العباد کی ادائیگی کے باوجود اللہ تعالی سے اس قدر ڈرتے ہیں کہ) دعائیں مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم سے جہنم کے عذاب کو دور رکھئے کیونکہ اس کا عذاب پوری تباہی ہے، بیشک وہ جہنم برا ٹھکانا اور برا مقام ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی رات کو جب غافل بندے نیند اور آرام کے مزے لوٹتے ہیں، یہ خدا کے آگے کھڑے اور سجدہ میں پڑے ہوئے گذارتے ہیں، رکوع چونکہ قیام وسجود کے درمیان واقع ہے، شاید اسی لیے اس کو علیحدہ ذکر نہیں کیا، گویا ان ہی دونوں کے بیچ میں آگیا۔

**فائدہ:** ۲ یعنی اتنی عبادت پر اتنا خوف بھی ہے، یہ نہیں کہ تہجد کی آٹھ رکعت پڑھ کر خدا کے عذاب وقہر سے بےفکر ہوگئے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿۶۷﴾

اور وہ لوگ کہ جب خرچ کرنے لگیں نہ بےجا اڑائیں اور نہ تنگی کریں اور ہے اس کے بیچ ایک سیدھی گزران

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے عباد الرحمان یعنی نیک بندوں کی طاعت بدنی کی حالت بیان ہوئی اب انکی طاعت مالی کا حال بیان کرتے ہیں: اور (طاعات مالیہ میں ان کا یہ طریقہ ہے کہ) وہ جب خرچ کرنے لگتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں (کہ گناہ میں خرچ کرنے لگیں) اور نہ تنگی کرتے ہیں (کہ طاعت ضروریہ میں بھی خرچ کی کوتاہی کریں) ان کا خرچ کرنا اس (افراط وتفریط) کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے (اور یہ حالت مذکورہ تو ان کی طاعات کی ادائیگی سے متعلق تھی)۔

**لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا:** اسراف میں وہ خرچ بھی داخل ہے کہ بلاضرورت طاقت اور استطاعت سے زیادہ جائز کاموں میں یا غیر ضروری طاعات میں خرچ کرے، کیونکہ اس کا انجام اخیر میں بےصبری اور حرص وبدنیتی ہوتی ہے، اور یہ باتیں گناہ ہیں اور جو چیز گناہ کا سبب بنے وہ بھی گناہ ہے، اس لئے وہ بھی انجام کے اعتبار سے گناہ ہی میں خرچ کرنا ہوگیا، اسی طرح طاعات ضروریہ میں بالکل خرچ نہ کرنے کی مذمت **لَمْ يَقْتُرُوْا** سے مفہوم ہوگئی، کیونکہ جب ضروری جگہ میں کم خرچ کرنے کی برائی معلوم ہوگئی تو بالکل خرچ نہ کرنا تو بدرجہ اولی ناجائز ہوگا، پس یہ شبہ نہ رہا کہ خرچ میں کمی کرنے کی تو نفی اور نہی ہوگئی لیکن بالکل ہی خرچ نہ کرنے کی نفی اور نہی نہ ہوئی، غرض وہ خرچ کرنے میں افراط وتفریط دونوں سے پاک ہیں۔

* * *

**فائدہ:** یعنی موقع دیکھ بھال کر میانہ روی کے ساتھ خرچ کرتے ہیں، نہ مال کی محبت نہ اس کی اضاعت، کما قال تعالیٰ: وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا (الاسراء:۲۹)

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا

اور وہ لوگ کہ نہیں پکارتے اللہ کے ساتھ دوسرے حاکم کو اور نہیں خون کرتے جان کا جو منع کر دی اللہ نے مگر جہاں چاہیے ۱ؔ

يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿۶۹﴾

اور بدکاری نہیں کرتے، اور جو کوئی کرے یہ کام وہ جا پڑا گناہ میں ۲ؔ دونا ہوگا اس کو عذاب قیامت کے دن اور پڑا رہے گا اس میں خوار ہو کر ۳ؔ

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے عباد الرحمان کی طاعات بدنی و مالی کا بیان ہوا، اب بتلاتے ہیں کہ گناہوں سے بچنے میں ان کی کیا شان ہے۔

اور جو (گناہ سے بچنے میں یہ شان رکھتے ہیں) کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور معبود کی پرستش نہیں کرتے (کہ یہ گناہ عقیدے کے متعلق ہے) اور جس شخص (کے قتل کرنے) کو اللہ تعالیٰ نے (شرعی قواعد کی رو سے) حرام فرمایا ہے اس کو قتل نہیں کرتے ہیں مگر حق پر (یعنی اگر کسی شرعی سبب سے قتل کرنا واجب یا جائز ہو جائے تو اور بات ہے) اور وہ زنا نہیں کرتے (کہ قتل اور زنا یہ گناہ اعمال کے متعلق ہیں) اور جو شخص ایسے کام کرے گا (کہ شرک کرے یا شرک کے ساتھ قتل ناحق بھی کرے یا زنا بھی کرے جیسے مشرکین مکہ تھے) تو سزا سے اس کو سابقہ پڑے گا کہ قیامت کے روز اس کا عذاب بڑھتا چلا جائے گا (جیسا کفار کے حق میں دوسری آیات میں آیا ہے: زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ) اور وہ اس (عذاب) میں ہمیشہ ہمیشہ ذلیل (وخوار) ہو کر رہے گا (تاکہ جسمانی عذاب کے ساتھ ذلت کا روحانی عذاب بھی ہو اور عذاب کی شدت یعنی تضاعف کے ساتھ مقدار کی زیادتی یعنی ہمیشگی بھی ہو)۔

**وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا:** یہ آیت کفار و مشرکین کے بارہ میں ہے، صحیحین میں ابن عباسؓ سے اس کا شان نزول ان ہی کے بارہ میں منقول ہے اور آیت کے الفاظ بھی اس پر دلالت کرتے ہیں، کیونکہ عذاب کا بڑھتے جانا اور ہمیشہ عذاب ہونا اور ذلیل وخوار ہونا یہ کفار کے لیے مخصوص ہے، اور گناہ گار مسلمانوں کو جو عذاب ہوگا اس میں زیادتی نہ ہوگی، نہ ہمیشہ ہوگا اور نہ وہ عذاب ذلیل وخوار کرنے کے لیے ہوگا، بلکہ پاکی وصفائی کے لیے ہوگا، دوسرا قرینہ یہ ہے کہ آگے فرماتے ہیں: الا من تاب وآمن وعمل صالحا، تو اگر یہ آیت گناہ گار مسلمانوں کے حق میں ہوتی تو اگلی آیت میں صرف توبہ کا ذکر ہوتا، ایمان کا ذکر نہ ہوتا، کیونکہ مسلمان کے لیے گناہ کے بعد توبہ کافی ہے، تجدید ایمان ضروری نہیں۔

**يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ:** یہ شبہ نہ کیا جائے کہ دوسری جگہ تو یہ فرمایا ہے کہ بڑے اعمال کی سزا ان کے برابر ہوگی، زیادہ نہ ہوگی: من جاء بالسيئة فلا يجزى الا مثلها اور جبکہ یہاں زیادہ ہونا معلوم ہوتا ہے تو دونوں میں تعارض ہوا، جواب یہ ہے کہ برابر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایک گناہ کا ایک ہی لکھا جاتا ہے، دو یا زیادہ نہیں لکھے جاتے، اور جس قدر لکھے جاتے ہیں سزا بھی انہی کی دی جاتی ہے، لیکن اگر ان میں ایک گناہ اتنا سخت ہو کہ اس کی سزا اتنی ہو کہ ہمیشہ عذاب زیادہ ہوتا رہے تو یہ برابری کے خلاف نہیں، اس صورت میں سزا جرم کے برابر ہی ہے زیادہ نہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ؔ مثلاً قتل عمد کے بدلہ قتل کرنا، یا بدکاری کی سزا میں زانی محصن کو سنگسار کرنا، یا جو شخص دین چھوڑ کر جماعت سے علیحدہ ہو جائے اس کو مار ڈالنا، یہ سب صورتیں الا بالحق میں شامل ہیں کما ورد فی الحدیث۔

**فائدہ:** ۲ؔ یعنی بڑا سخت گناہ کیا جس کی سزا مل کر رہے گی، بعض روایات میں آیا کہ آثام جہنم کی ایک وادی کا نام ہے جس میں بہت ہی ہولناک عذاب بیان کیے گئے ہیں، اعاذنا اللہ منہا۔

فائدہ: ۳ یعنی اور گناہوں سے یہ گناہ بڑے ہیں، عذاب بھی ان پر بڑا ہوگا اور دم بدم بڑھتا رہے گا۔

إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ ط

مگر جس نے توبہ کی اور یقین لایا اور کیا کچھ کام نیک سو ان کو بدل دے گا اللہ برائیوں کی جگہ بھلائیاں

وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿٧٠﴾

اور ہے اللہ بخشنے والا مہربان

**خلاصہ تفسیر:** مگر جو (شرک و معاصی سے) توبہ کرلے اور (اس توبہ کے قبول ہونے کی شرط یہ ہے کہ) ایمان (بھی) لے آئے اور نیک کام کرتا رہے (یعنی ضروری طاعات کو بجالاتا رہے) تو (وہ جہنم میں ہمیشہ تو کیا رہتا جہنم سے اس کو ذرا بھی لگاؤ نہ ہوگا، بلکہ) اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے (گزشتہ) گناہوں (کو محو کرکے ان) کی جگہ (آئندہ) نیکیاں عنایت فرمائے گا (یعنی چونکہ کفر اور کفر کے زمانے کے سب گناہ اسلام سے معاف ہوگئے اور آئندہ بوجہ نیک اعمال کے نیکیاں لکھی جاتی رہیں گی اور ان پر ثواب ملے گا اس لیے جہنم سے ان کو کوئی تعلق نہ ہوگا) اور (یہ گناہوں کو مٹادینا اور نیکی عنایت فرمانا اس لئے ہوا کہ) اللہ تعالیٰ غفور ہے (اس لئے گناہوں کو مٹادیا اور) رحیم ہے (اور نیک کام ان کی جگہ لکھ دیے)۔

**إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ:** إِلَّا استثناء منقطع ہے اور مَنْ تَابَ کی خبر فَأُولَٰئِكَ الخ ہے اور مقصود بالحکم برائیوں کا بھلائیوں سے بدل جانا ہے جو مجموعہ ایمان، توبہ اور عمل صالح پر مرتب ہے اور جہنم کی آگ سے محفوظ رہنا اس کا لازمی اثر ہے اور جہنم میں دخول ہی نہیں تو خلود نہ ہونا ظاہر ہے، یا إِلَّا استثناء متصل ہو اور عدم خلود کے لئے مجموعہ ایمان و توبہ و عمل صالح شرط نہ ہو مگر مجموعہ کے ساتھ عدم خلود کا پایا جانا اس آیت میں مذکور ہوا، اور صرف ایمان پر عدم خلود کا مرتب ہونا دوسرے دلائل سے ثابت ہو۔

* * *

**فائدہ:** یعنی گناہوں کی جگہ نیکیوں کی توفیق دے گا اور کفر کے گناہ معاف کرے گا، یا یہ کہ بدیوں کو مٹا کر توبہ اور عمل صالح کی برکت سے ان کی تعداد کے مناسب نیکیاں ثبت فرمائے گا کما یظھر من بعض الاحادیث۔

وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا ﴿٧١﴾

اور جو کوئی توبہ کرے اور کرے کام نیک سو وہ پھر آتا ہے اللہ کی طرف پھر آنے کی جگہ

**خلاصہ تفسیر:** گذشتہ آیت میں کفر سے توبہ کرنے والوں کا بیان تھا، اب اس مؤمن کا ذکر ہے جو گناہ سے توبہ کرے تاکہ توبہ کا مضمون پورا ہوجائے، نیز مقبول بندوں کے بقیہ اوصاف کا بیان ہے کہ وہ لوگ ہمیشہ طاعات کے پابند اور سیئات سے پرہیز کے عادی رہتے ہیں، لیکن اگر کبھی گناہ کا صدور ہوجائے تو توبہ کرلیتے ہیں اس لئے توبہ کرنے والوں کا حال ارشاد فرمایا۔

اور جو شخص (جس گناہ سے) توبہ کرتا ہے اور نیک کام کرتا ہے (یعنی آئندہ گناہ سے بچتا ہے) تو وہ (بھی عذاب سے بچا رہے گا، کیونکہ وہ) اللہ تعالیٰ کی طرف خاص طور پر رجوع کر رہا ہے (یعنی خوف و اخلاص کے ساتھ جو کہ توبہ کی شرط ہے)۔

**وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا:** بظاہر یہ اسی مضمون کا تکرار ہے جو اس سے پہلے آیت میں آیا ہے، لیکن یہ توبہ پہلی توبہ سے مختلف اور الگ ہے، کیونکہ پہلا معاملہ کافر و مشرکین کا تھا جو قتل و زنا میں بھی مبتلا ہوئے تھے، پھر ایمان لے آئے تو ان کی سیئات حسنات سے بدل دی گئیں اور یہاں مسلمان گناہگاروں کی توبہ کا ذکر ہے، اسی لئے پہلی توبہ کے ساتھ وَآمَنَ یعنی اس کے ایمان لانے کا ذکر تھا، یہاں دوسری توبہ میں وہ مذکور نہیں جس سے معلوم ہوتا

ہے کہ یہ توبہ ان لوگوں کی ذکر کی گئی ہے جو پہلے سے مومن ہی تھے مگر غفلت سے قتل وزنا میں مبتلا ہو گئے تو ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی کہ ایسے لوگ اگر توبہ کر لینے کے بعد صرف زبانی توبہ پر اکتفانہ کریں، بلکہ آئندہ کے لئے اپنے عمل کو بھی صالح اور درست بنالیں تو ان کا توبہ کرنا صحیح اور درست سمجھا جائے گا، اسی لئے بطور شرط کے توبہ کر لینے کے ابتدائی حال ذکر کرنے کے بعد اس کی جزاء میں پھر یَتُوْبُ کا ذکر کرنا صحیح ہو گیا، کیونکہ شرط میں جس توبہ کا ذکر ہے وہ صرف زبانی توبہ ہے اور جزاء میں جس توبہ کا ذکر ہے وہ عمل صالح پر مرتب ہے، مطلب یہ ہو گیا کہ جس نے توبہ کر لی پھر اپنے عمل سے بھی اس توبہ کا ثبوت دیا تو وہ صحیح طور پر اللہ کی طرف رجوع کرنے والا سمجھا جائے گا، بخلاف اس کے جس نے پچھلے گناہ سے توبہ تو کی مگر آئندہ عمل میں اس کا کوئی ثبوت نہ فراہم کیا تو اس کی توبہ گویا توبہ ہی نہیں، خلاصہ مضمون اس آیت کا یہ ہو گیا کہ جو مسلمان غفلت سے گناہ میں مبتلا ہو گیا پھر توبہ کر لی اور اس توبہ کے بعد اپنے عمل کی بھی ایسی اصلاح کر لی کہ اس کے عمل سے توبہ کا ثبوت ملنے لگا تو یہ توبہ بھی عنداللہ مقبول ہو گی اور بظاہر اس کا فائدہ بھی وہی ہو گا جو پہلی آیت میں بتلایا گیا ہے کہ اس کے سیئات کو حسنات سے بدل دیا جائے گا۔

* * *

**فائدہ:** پہلے ذکر تھا کافر کے گناہوں کا جو پیچھے ایمان لے آیا، یہ ذکر ہے اسلام میں گناہ کرنے کا، وہ بھی جب توبہ کرے یعنی پھر برے کام سے تو اللہ کے یہاں جگہ پائے، معلوم ہوا کہ سورہ نساء میں جو فرمایا: وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا (النساء: ۹۳) وہ غیر تائب کے حق میں ہے، واللہ اعلم۔

## وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿۷۲﴾

اور جو لوگ شامل نہیں ہوتے جھوٹے کام میں ۱؎ اور جب گزرتے ہیں کھیل کی باتوں پر نکل جائیں بزرگانہ ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** عباد الرحمن یعنی اللہ کے مخصوص اور مقبول بندوں کی خاص صفات کا بیان اوپر سے ہو رہا تھا، درمیان میں گناہ کے بعد توبہ کر لینے کے احکام کا بیان آیا، اب اس کے بعد باقی صفات کا بیان ہے۔

اور (ان میں یہ بات ہے کہ) وہ بیہودہ باتوں میں (جیسے خلاف شرع لہو ولعب) شامل نہیں ہوتے اور اگر (اتفاقاً بلا ارادہ) بیہودہ مشغلوں کے پاس کو ہو کر گزریں تو سنجیدگی (وشرافت) کے ساتھ گزر جاتے ہیں (یعنی نہ اس کی طرف مشغول ہوتے ہیں اور نہ ان کے آثار سے گناہگاروں کی تحقیر اور اپنی بڑائی اور تکبر ظاہر ہوتا ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی نہ جھوٹ بولیں نہ جھوٹی شہادت دیں، نہ باطل کاموں اور گناہ کی مجلسوں میں حاضر ہوں۔

**فائدہ:** ۲؎ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی گناہ میں شامل نہیں، اور کھیل کی باتوں کی طرف دھیان نہیں کرتے نہ اس میں شامل نہ ان سے لڑیں''۔

## وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ﴿۷۳﴾

اور وہ لوگ کہ جب ان کو سمجھائے ان کے رب کی باتیں نہ پڑیں ان پر بہرے اندھے ہو کر

**خلاصہ تفسیر:** اور وہ ایسے ہیں کہ جس وقت ان کو اللہ کے احکام کے ذریعہ سے نصیحت کی جاتی ہے تو ان (احکام) پر بہرے اندھے ہو کر نہیں گرتے (بلکہ عقل وفہم کے ساتھ قرآن پر متوجہ ہوتے اور اشتیاق کے ساتھ دوڑتے ہیں)۔

کفار کی طرح نہیں کہ وہ قرآن کو ایک نئی بات سمجھ کر تماشے کے طور پر اور نیز اس میں اعتراضات نکالنے کے لئے اس کے حقائق ومعارف سے بے خبر ہو کر اندھا دھند بے ترتیب ہجوم کر لیتے تھے جیسا کہ دوسری جگہ قرآن کا ارشاد ہے: كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا سو عباد الرحمن ایسا نہیں

کرتے، بلکہ عقل وفہم کے ساتھ قرآن پر متوجہ اور اس کی طرف دوڑتے ہیں جس کا ثمرہ زیادہ ایمان وعمل بالا حکام ہے، پس مقصود آیت میں اندھے بہرے ہونے کی نفی کرنا ہے نہ کہ قرآن کی طرف شوق کے ساتھ متوجہ ہونے اس پر گرنے کی، کیونکہ وہ عین مطلوب ہے، اور اس سے کافر کے لئے بھی قرآن پر گرنا تو ثابت ہوتا ہے مگر وہ مخالفت اور مزاحمت کے طور پر اور اندھے بہروں کی طرح تھا اس لئے وہ مذموم ہے۔

* * *

**فائدہ:** بلکہ نہایت فکر وتدبر اور دھیان سے سنیں اور سن کر متاثر ہوں مشرکین کی طرح پتھر کی مورتیں نہ بن جائیں۔

**وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا**

اور وہ لوگ جو کہتے ہیں اے رب دے ہم کو ہماری عورتوں کی طرف سے اور اولاد کی طرف سے آنکھ کی ٹھنڈک [1] اور کر ہم کو

**لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿٧٤﴾**

پرہیزگاروں کا پیشوا [2]

**خلاصہ تفسیر:** اور وہ ایسے ہیں کہ (خود جیسے دین کے عاشق ہیں اسی طرح اپنے اہل وعیال کے لئے بھی اس کے ساعی اور داعی ہیں، چنانچہ عملی کوشش کے ساتھ حق تعالیٰ سے بھی) دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک (یعنی راحت) عطا فرما (یعنی ان کو دیندار ومتقی بنا دے اور ہم کو دینداری کی کوشش میں کامیاب فرما کہ ان کو دینداری کی حالت میں دیکھ کر راحت اور خوشی ہو) اور (تو نے ہم کو ہمارے خاندان کا افسر تو بنایا ہی ہے مگر ہماری دعا یہ ہے کہ ان سب کو متقی کر کے) ہم کو متقیوں کا افسر بنا دے (تو اصل مقصود افسری مانگنا نہیں ہے اگرچہ اس میں بھی قباحت نہیں، مگر مقام اس پر دلالت نہیں کرتا، بلکہ اصل مقصود اپنے خاندان کے متقی ہونے کی درخواست ہے، یعنی بجائے اس کے کہ ہم صرف خاندان کے افسر ہیں ہم کو متقی خاندان کا افسر بنا دیجئے)۔

* * *

**فائدہ:** [1] یعنی بیوی بچے ایسے عنایت فرما جنہیں دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی اور قلب مسرور ہو اور ظاہر ہے مومن کامل کا دل اسی وقت ٹھنڈا ہوگا جب اپنے اہل وعیال کو طاعت الٰہی کے راستہ پر گامزن اور علم نافع کی تحصیل میں مشغول پائے، دنیا کی سب نعمتیں اور مسرتیں اس کے بعد ہیں۔

**فائدہ:** [2] یعنی ایسا بنا دے کہ لوگ ہماری اقتداء کر کے متقی بن جایا کریں، حاصل یہ کہ ہم نہ صرف بذات خود مہتدی، بلکہ دوسروں کے لیے ہادی ہوں، اور ہمارا خاندان تقویٰ وطہارت میں ہماری پیروی کرے۔

**اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ﴿٧٥﴾**

ان کو بدلہ ملے گا کوٹھوں کے جھروکے اس لیے کہ وہ ثابت قدم رہے اور لینے آئیں گے ان کو وہاں دعا اور سلام کہتے ہوئے [1]

**خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿٧٦﴾**

سدا رہا کریں ان میں، خوب جگہ ہے ٹھہرنے کی اور خوب جگہ رہنے کی [2]

**خلاصہ تفسیر:** یہاں تک عباد الرحمن یعنی نیک بندوں کے اوصاف کا بیان تھا، اب آگے ان کی جزا کا بیان ہے یعنی:

ایسے لوگوں کو (بہشت میں رہنے کو) بالا خانے ملیں گے بوجہ ان کے (دین واطاعت پر) ثابت قدم رہنے کے اور ان کو اس (بہشت) میں (فرشتوں کی جانب سے) بقاء کی دعا اور سلام ملے گا (اور) اس (بہشت) میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، وہ کیسا اچھا ٹھکانا اور مقام ہے (جیسا جہنم

کے بارے میں سَآءَتۡ مُسۡتَقَرًّا وَّمُقَامًا فرمایا ہے)۔

اس مقام پر جس قدر اوصاف بیان ہوئے نجات کا ان پر مدار نہیں ہے، نجات کے لیے صرف ایمان ہی کافی ہے، بلکہ ان اعمال پر بلند درجات کا ملنا موقوف ہے جیسا کہ **یجزون الغرفۃ** کا قرینہ ہے، اور جنت میں سلامتی اور بقاء کی دعا محض تعظیم واکرام کے لیے ہوگی، اس لیے اسے فضول نہیں کہہ سکتے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی جنت میں اوپر کے درجے ملیں گے اور فرشتے دعا وسلام کہتے ہوئے ان کا استقبال کریں گے اور آپس کی ملاقاتوں میں یہ ہی کلمات سلام ودعا ان کی تکریم وعزت افزائی کے لیے استعمال ہوں گے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی ایسی جگہ تھوڑی دیر ٹھہرنا ملے تو بھی غنیمت ہے ان کا تو وہ گھر ہوگا۔

قُلۡ مَا يَعۡبَؤُا بِكُمۡ رَبِّيۡ لَوۡلَا دُعَآؤُكُمۡ ۚ فَقَدۡ كَذَّبۡتُمۡ فَسَوۡفَ يَكُوۡنُ لِزَامًا ﴿۷۷﴾ ع ۶

تو کہہ پروا نہیں رکھتا میرا رب تمہاری اگر تم اس کو نہ پکارا کرو ۱؎ سو تم تو جھٹلا چکے اب آگے کو ہونی ہے مڈبھیڑ ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے **واذا قیل لهم اسجدوا للرحمن** میں عبادت سے انکار کرنے والوں کی مذمت اور **وعباد الرحمن** میں عبادت بجالانے والوں کی فضیلت بیان ہوئی، اب اسی کی تاکید کے لیے فرماتے ہیں کہ بندوں کو حق تعالی سے کوئی ذاتی خصوصیت نہیں کہ خواہ مخواہ ان کی آؤ بھگت کرے، بس عبادت کا تعلق ہے جو تصدیق کو بھی شامل ہے، سو عبادت کروگے تو قدر ہوگی، عبادت نہیں کروگے جس میں تکذیب بھی شامل ہے تو وہ وبال جان ہوگی، چونکہ یہ مضمون اجمالی طور پر سورت کے تمام مضامین کا فیصلہ ہے اس لیے اس پر سورت کا اختتام اعلی درجہ کا حسن ختام ہے۔

(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!) آپ (عام طور پر لوگوں سے) کہہ دیجئے کہ میرا رب تمہاری ذرا بھی پروانہ کرے گا اگر تم عبادت نہ کروگے، سو (اس سے سمجھ لینا چاہئے کہ اے کفار!) تم تو (احکام الہیہ کو) جھوٹا سمجھتے ہو تو عنقریب یہ (جھوٹا سمجھنا تمہارے لئے) وبال (جان) ہو (کر رہے) گا (خواہ دنیا میں جیسے واقعہ بدر میں کفار پر مصیبت آئی یا آخرت میں اور وہ تو ظاہر ہے)۔

قُلۡ مَا يَعۡبَؤُا بِكُمۡ رَبِّيۡ: اس میں اس شخص پر رد ہے جو عمل کے بغیر محض تبرکات یا کسی بزرگ کے انتساب کو اپنی نجات ومقبولیت کے لیے کافی سمجھتے ہیں (یعنی عمل کے بغیر نجات اور مقبولیت ممکن نہیں، صرف تبرکات اور نسبتیں نہ بچاسکیں گی) جیسے بہت سے جاہل صوفی بنے ہوئے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی تمہارے نفع نقصان کی باتیں سمجھادیں، بندہ کو چاہیے مغرور اور بے باک نہ ہو، خدا کو اس کی کیا پروا، ہاں اس کی التجاء پر رحم کرتا ہے، نہ التجا کروگے اور بڑے بنے رہوگے تو مڈبھیڑ کے لیے تیار ہو جاؤ جو عنقریب ہونے والی ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی کافر جو حق کو جھٹلا چکے، یہ تکذیب عنقریب ان کے گلے کا ہار بنے گی، اس کی سزا سے کسی طرح چھٹکارا نہ ہوگا، آخرت کی ابدی ہلاکت تو ہے ہی، دنیا میں بھی اب جلدی مڈبھیڑ ہونے والی ہے، یعنی لڑائی جہاد، چنانچہ غزوہ بدر میں اس مٹھ بھیڑ کا نتیجہ دیکھ لیا۔

ایاتها ۲۲۷ ۲٦ سُوۡرَةُ الشُّعَرَآءِ مَكِّيَّةٌ ٤٧ رکوعاتها ۱۱

**خلاصہ تفسیر:** اس سورت کے سب سے پہلے اور سب سے آخری رکوع میں قرآن کریم اور رسالت کی حقانیت اور صدق اور اس کے مناسب مضامین کا ذکر ہے، سورت کے درمیان میں انبیاء کرام اور احکام الٰہی کو جھٹلانے والوں کے واقعات کا بیان ہے، چنانچہ ہر قصہ کے آخر میں آیت: ان فی ذالك لاٰیة کا تکرار اس عبرت کے مقصود ہونے پر واضح اور صریح طور پر دلالت کرتا ہے، سورت کے پہلے رکوع کے آخر میں منکرین کو دھمکی اور عبرت کے لیے توحید ثابت کرنے والی بعض دلیلیں مذکور ہیں، اور پچھلی سورت کا اختتام بھی منکرین کی وعید پر ہوا تھا، سو دونوں سورتوں کے ختم اور شروع میں مناسبت ظاہر ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

طٰسٓمّٓ ① تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡكِتٰبِ الۡمُبِيۡنِ ② لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ اَلَّا يَكُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِيۡنَ ③

طٰسٓمّٓ، یہ آیتیں ہیں کھلی کتاب کی ۱؎ شاید تو گھونٹ مارے اپنی جان اس بات پر کہ وہ یقین نہیں کرتے

**خلاصہ تفسیر:** طٰسٓمّٓ (اس کے معنی تو اللہ کو معلوم ہیں) یہ (مضامین جو آپ پر نازل ہوتے ہیں) کتاب واضح (یعنی قرآن) کی آیتیں ہیں (اور یہ لوگ جو اس پر ایمان نہیں لاتے تو آپ اتنا غم کیوں کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ) شاید آپ ان کے ایمان نہ لانے پر (رنج وافسوس کرتے کرتے) اپنی جان دے دیں گے۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ: اس میں ان امور پر دلالت ہے: ① آپ ﷺ اپنی امت پر کمال شفقت رکھتے تھے ② کافروں کے ایمان لانے کی حرص وخواہش رکھنا تقدیر کے خلاف نہیں ③ شفقت وخیر خواہی میں اعتدال مناسب ہے کہ جو شخص ہدایت نہ پائے اس پر غم نہ کیا جائے ④ کسی کی اصلاح وتہذیب شیخ کے اختیار، قدرت اور تصرف میں نہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی اس کتاب کا اعجاز کھلا ہوا ہے، احکام واضح ہیں اور حق کو باطل سے الگ کرنے والی ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی اب بدبختوں کے غم میں اپنے کو اس قدر گھلانے کی ضرورت نہیں کیا ان کے پیچھے آپ اپنی جان کو ہلاک کر کے رہیں گے، دل سوزی اور شفقت کی بھی آخر ایک حد ہے۔

اِنۡ نَّشَاۡ نُنَزِّلۡ عَلَيۡهِمۡ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتۡ اَعۡنَاقُهُمۡ لَهَا خٰضِعِيۡنَ ④

اگر ہم چاہیں اتاریں ان پر آسمان سے ایک نشانی پھر رہ جائیں ان کی گردنیں اس کے آگے نیچی

**خلاصہ تفسیر:** (اصل یہ ہے کہ یہ عالم امتحان کی جگہ ہے، اس میں حق ثابت کرنے کے لیے وہی دلائل قائم کئے جاتے ہیں جن کے بعد بھی ایمان لانا بندہ کے اختیار میں رہتا ہے، ورنہ) اگر ہم (جبری واضطراری طور پر ان کو مومن کرنا) چاہیں تو ان پر آسمان سے ایک (ایسی) بڑی نشانی نازل کر دیں (کہ ان کا اختیار ہی بالکل سلب ہو جائے) پھر ان کی گردنیں اس نشانی (کے آنے) سے پست ہو جائیں (اور مجبور ہو کر ایمان لے آئیں، لیکن ایسا کرنے سے آزمائش باقی نہ رہے گی، اس لئے ایسا نہیں کیا جاتا اور معاملہ جبر واختیار کے درمیان رہتا ہے)۔

اِنۡ نَّشَاۡ نُنَزِّلۡ عَلَيۡهِمۡ مِّنَ السَّمَآءِ: روح المعانی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عادت یہ ہے کہ کسی کو ایمان لانے کے لیے مجبور نہ کیا جائے،

احقر کہتا ہے کہ چونکہ باطن میں تصرف کرنا ایک قسم کا اکراہ، جبر اور زبردستی ہے، اس لیے محققین علماء ومشائخ نے طریق سلوک وارشاد میں اس کو پسند نہیں کیا کہ باطنی طور پر تصرف کر کے کسی کو مجبور کیا جائے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی یہ دنیا ابتلاء کا گھر ہے جہاں بندوں کے انقیاد وتسلیم اور سرکشی کو آزمایا جاتا ہے، اسی لیے حکمت الٰہی مقتضی نہیں کہ ان کا اختیار بالکل سلب کرلیا جائے، ورنہ خدا چاہتا تو کوئی ایسا آسمانی نشان دکھلاتا کہ اس کے آگے زبردستی سب کی گردنیں جھک جاتیں، بڑے بڑے سرداروں کو بھی انکار وانحراف کی قدرت باقی نہ رہتی، اللہ تعالیٰ نے ایسا تو نہیں کیا، ہاں وہ نشان بھیجے جنہیں دیکھ کر آدمی حق کو سمجھنا چاہے تو باآسانی سمجھ سکے، اور کبھی کبھی مغلوب ہوکر گردن جھکانے سے مفر بھی نہ ملے۔

وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ إِلَّا كَانُوا عَنْهُ مُعْرِضِينَ ⑤

اور نہیں پہنچتی ان کے پاس کوئی نصیحت رحمان سے نئی جس سے منہ نہیں موڑتے

**خلاصہ تفسیر:** اور (ان کی یہ حالت ہے کہ) ان کے پاس کوئی تازہ فہمائش (حضرت) رحمان (جل شانہ) کی طرف سے ایسی نہیں آتی جس سے یہ بے رخی نہ کرتے ہوں۔

* * *

**فائدہ:** یعنی آپ جن کے غم میں پڑے ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ رحمان اپنی رحمت وشفقت سے جب ان کی بھلائی کے لیے کوئی پند و نصیحت بھیجتا ہے یہ ادھر متوجہ نہیں ہوتے بلکہ منہ پھیر کر بھاگتے ہیں گویا کوئی بہت بری چیز سامنے آگئی۔

فَقَدْ كَذَّبُوا فَسَيَأْتِيهِمْ أَنْبٰٓؤُا مَا كَانُوا بِهٖ يَسْتَهْزِءُونَ ⑥

سو یہ تو جھٹلا چکے اب پہنچے گی ان پر حقیقت اس بات کی جس پر ٹھٹھے کرتے تھے

**خلاصہ تفسیر:** سو (اس بے رخی کی یہاں تک نوبت پہنچی کہ) انہوں نے (دین حق کو) جھوٹا بتلادیا (جو اعراض کا انتہائی درجہ ہے اور صرف اس کے ابتدائی درجہ یعنی بے التفاتی پر اکتفا نہیں کیا اور پھر تکذیب بھی خالی نہیں بلکہ استہزاء کے ساتھ) سو اب عنقریب ان کو اس بات کی حقیقت معلوم ہوجائے گی جس کے ساتھ یہ استہزاء کیا کرتے تھے (یعنی جب موت کے وقت یا قیامت میں عذاب الٰہی کا معائنہ ہوگا، اس وقت قرآن کا اور اس کے مضامین کا یعنی عذاب وغیرہ کے حق ہونے کا انکشاف ہوجائے گا)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی صرف معمولی اعراض ہی نہیں، تکذیب واستہزاء بھی ہے سو عنقریب دنیا اور آخرت میں اپنی کرتوت کی سزا بھگتیں گے، تب اس چیز کی حقیقت کھلے گی جس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الْأَرْضِ كَمْ أَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ ⑦

کیا نہیں دیکھتے وہ زمین کو کتنی اگائیں ہم نے اس میں ہر ایک قسم کی (طرح کی) خاصی چیزیں

**خلاصہ تفسیر:** (پس اگر قرآن کی آیتوں کا یہ لوگ انکار کرتے ہیں تو ان ظاہری دلیلوں کا انکار تو نہیں کرنا چاہیے تھا جو خدا کی توحید پر محض عقلی طور پر دلالت کرتی ہیں، اگر شریعت سے نفرت ہے تو عقل سے تو دور نہیں، سو) کیا انہوں نے زمین کو نہیں دیکھا (جو ان سے بہت قریب اور ہر وقت سامنے ہے) کہ ہم نے اس میں کس قدر عمدہ عمدہ قسم قسم کی بوٹیاں اگائی ہیں (جو دیگر تمام مصنوعات کی طرح اپنے بنانے والے کے وجود اور اس کی

یکتائی اور کمال قدرت پر دلالت کرتی ہیں)۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا کَانَ اَکْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۸﴾ وَاِنَّ رَبَّکَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿۹﴾

اس میں البتہ نشانی ہے، اور ان میں بہت لوگ نہیں ماننے والے ۱؎ اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اس میں (صانع عالم کا ذات، صفات اور افعال میں یکتا ہونا عقلا معلوم ہوتا ہے تو یہ) ایک بڑی نشانی (عقلی) ہے (اور خود یہ بات بھی عقل سے ثابت ہے کہ معبود کے لیے ذات وصفات میں کامل ہونا شرط ہے اور اس کمال کے واسطے یہ ضروری ہے کہ وہ اکیلا معبود ہو) اور (باوجود اس کے) ان میں کے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے (اور شرک کرتے ہیں، غرض شرک کرنا یہ نبوت کے انکار سے بھی بڑھ کر ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ان کے عناد نے ان کی فطرت کو بالکل خراب کر دیا ہے، پھر ایسوں کے پیچھے کیوں جان کھپائی جائے) اور (اگر انہیں جلدی عذاب نہ آنے سے یہ شبہ ہو کہ ہمارا شرک کرنا خدا کے نزدیک برا نہیں، ورنہ جلدی عذاب آجاتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ) بلاشبہ آپ کا رب (باوجود اس کے کہ) غالب (اور کامل القدرت) ہے (مگر اس کے ساتھ ہی) رحیم (بھی) ہے (اور اس کی رحمت عامہ دنیا میں کفار کو بھی شامل ہے جس کا اثر یہ ہے کہ ان کو مہلت دے رکھی ہے ورنہ کفر یقینا برا اور عذاب کا سبب ہے)۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً: ایسی ہی آیت آئندہ قصوں کے اختتام پر بھی آئی ہے، وہاں بھی یہی حاصل ہے کہ جس طرح یہ دلیل عبرت حاصل کرنے کے قابل ہے وہ واقعات بھی اس لائق ہیں کہ ان سے خدا کی قدرت پر استدلال کیا جائے اور خدا سے ڈر کر احکام کی بجا آوری میں مستعد ہونا چاہیے، شرک وانکار نبوت چھوڑ دینا چاہیے، مگر پھر بھی یہ لوگ ایمان نہیں لاتے اور خدا تعالی باوجود عذاب پر قادر ہونے کے رحمت کی وجہ سے مہلت دیتا ہے اور اہتمام کی وجہ سے اس آیت کو بار بار بیان فرمایا ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی یہ مکذبین اگر ایک پیش پا افتادہ زمین ہی کے احوال میں غور کرتے تو مبداء و معاد کی معرفت حاصل کرنے کے لیے کافی ہو سکتی تھی، کیا دیکھتے نہیں کہ اسی کرکری اور حقیر مٹی سے کیسے عجیب وغریب رنگ برنگ پھول پھل اور قسم قسم کے غلے اور میوے ایک مضبوط نظام تکوین کے ماتحت پیدا ہوتے ہیں، کیا یہ اس کی دلیل نہیں کہ کسی لامحدود قوت وحکمت رکھنے والے مانع نے اس پر رونق چمن کی گلکاریاں کی ہیں جس کے قبضہ میں وجود کی باگ ہے اور وہ ہی جب چاہے اسے ویران کر سکتا اور ویرانی کے بعد دوبارہ آباد کر سکتا ہے، پھر ان آیات تکوینیہ کو سمجھ لینے کے بعد آیات تنزیلیہ کی تصدیق میں کیا اشکال رہ جاتا ہے، ہاں ماننا ہی منظور نہ ہو تو الگ بات ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی زبردست تو ایسا ہے کہ نہ ماننے پر فوراً عذاب بھیج سکتا تھا، مگر رحم کھا کر تاخیر کرتا ہے کہ ممکن ہے اب بھی مان لیں۔

**ربط:** آگے عبرت کے لیے مکذبین کے چند واقعات بیان فرمائے ہیں جن سے ظاہر ہوگا کہ خدا نے ان کو کہاں تک ڈھیل دی، جب کسی طرح نہ مانے تو پھر کیسے تباہ و برباد کیا، ان میں پہلا قصہ قوم فرعون کا ہے جو پیشتر سورہ اعراف اور سورہ طٰہٰ وغیرہ میں بالتفصیل گزر چکا، وہاں کے فوائد ملاحظہ کر لیے جائیں۔

وَاِذْ نَادٰی رَبُّکَ مُوْسٰۤی اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۰﴾ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ؕ اَلَا یَتَّقُوْنَ ﴿۱۱﴾

اور جب پکارا تیرے رب نے موسیٰ کو کہ جا اس قوم گناہ گار کے پاس ۱؎ قوم فرعون کے پاس کیا وہ ڈرتے نہیں

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے تکذیب کرنے والوں کی مذمت تھی، اب ان کی دھمکی اور عبرت کے لیے چند قصے بیان کیے جاتے ہیں۔

اور (ان لوگوں سے اس وقت کا قصہ ذکر کیجیے) جب آپ کے رب نے موسیٰ (علیہ السلام) کو پکارا (اور حکم دیا) کہ تم ان ظالم لوگوں کے

یعنی قوم فرعون کے پاس جاؤ (اور اے موسیٰ! دیکھو) کیا یہ لوگ (ہمارے غضب سے) نہیں ڈرتے (یعنی ان کی حالت بہت عجیب اور قابل ملامت ہے اس لئے ان کی طرف تم کو بھیجا جاتا ہے)۔

* * *

**فائدہ:** لہ تم جا کر انھیں خدا کے غصہ سے ڈراؤ۔

قَالَ رَبِّ إِنِّيٓ أَخَافُ أَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿۱۲﴾ وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ فَأَرْسِلْ إِلٰى هٰرُوْنَ ﴿۱۳﴾

بولا اے رب! میں ڈرتا ہوں کہ مجھ کو جھٹلائیں، اور رک جاتا ہے میرا جی اور نہیں چلتی ہے میری زبان سو پیغام دے ہارون کو لہ

**خلاصہ تفسیر:** انہوں نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! (میں اس خدمت کے لئے حاضر ہوں، لیکن اس خدمت کی تکمیل کے لئے ایک مددگار چاہتا ہوں، کیونکہ) مجھ کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ مجھ کو (اپنی پوری بات کہنے سے پہلے ہی) جھٹلانے لگیں، اور (طبعی طور پر ایسے وقت میں) میرا دل تنگ ہونے لگتا ہے اور میری زبان (اچھی طرح) نہیں چلتی (جب سننے والا بات سمجھنے ہی کا ارادہ نہ کرے تو کہنے والے کی طبیعت نہیں کھلتی) اس لئے ہارون کے پاس (بھی وحی) بھیج دیجئے (اور ان کو بھی نبوت عطا فرما دیجئے کہ اگر لوگ مجھے جھٹلائیں تو وہ میری تائید اور تصدیق کرنے لگیں تاکہ میرا دل کھلا رہے اور زبان رواں رہے اور اگر میری زبان کسی وقت رک جائے تو وہ تقریر کرنے لگیں اور اگرچہ یہ غرض ویسے بھی ہارون علیہ السلام کو بلا نبوت عطا ہوئے ساتھ رکھنے سے بھی حاصل ہوسکتی تھی مگر نبوت مل جانے سے اور زیادہ اچھی طرح پوری ہوگئی)۔

**وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ:** حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں لکنت تھی جس کے ازالہ کے لیے دعا کرنا سورہ طٰہٰ میں بیان ہوا: **واحلل عقدة من لسانی**، لیکن یہاں لاینطلق میں یعنی زبان نہ چلنے سے وہ لکنت مراد نہیں ہے، کیونکہ اگر اس لکنت کی وجہ سے ہارون علیہ السلام کے لیے نبوت کی دعا مانگی ہوتی تو پھر لکنت کے ازالہ کی دعا کی ضرورت نہ تھی، واللہ اعلم۔

**وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ:** اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض طبعی نقصانات روحانی کمال کے منافی نہیں ہوتے (یعنی خوف، اندیشہ، خطرہ، زبان کی لکنت وغیرہ بڑے لوگوں میں بھی پائی جاتی ہیں، یہ بڑائی و بزرگی کے لیے عیب نہیں ہیں) اسی طرح اگلی آیت میں موسیٰ علیہ السلام کے فَأَخَافُ فرمانے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

**فَأَرْسِلْ إِلٰى هٰرُوْنَ:** اس میں اشارہ ہے کہ دینی امور میں ایک دوسرے کی مدد کریں، چنانچہ ہارون علیہ السلام کو مدد کے لیے مقرر فرمایا۔

* * *

**فائدہ:** لہ یعنی پوری بات سننے سے پہلے یہ جھٹلانا شروع کر دیں گے اور مجلس میں کوئی تائید کرنے والا نہ ہوگا، ممکن ہے اس وقت ملول اور حزین ہو کر طبیعت رک جائے، دل نہ کھلے، اور زبان میں کچھ لکنت پہلے ہی سے ہے، تنگدل ہو کر بولنے میں زیادہ رکاوٹ پیدا نہ ہو جائے اس لیے میری تقویت و تائید کے لیے اگر ہارون کو جو مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہیں، میرا شریک حال کر دیا جائے تو بڑی مہربانی ہو۔

وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَأَخَافُ أَنْ يَّقْتُلُوْنِ ﴿۱۴﴾

اور ان کو مجھ پر ہے ایک گناہ کا دعویٰ لہ سو ڈرتا ہوں کہ مجھ کو مار ڈالیں ۲ہ

**خلاصہ تفسیر:** اور (ایک قابل عرض بات یہ ہے کہ) میرے ذمہ ان لوگوں کا ایک جرم بھی ہے (کہ میرے ہاتھ سے ایک قبطی قتل ہو گیا تھا جس کا قصہ سورہ قصص میں آئے گا) سو (اس لئے) مجھ کو (ایک) یہ اندیشہ ہے کہ وہ لوگ مجھ کو (تبلیغ رسالت سے پہلے) قتل کر ڈالیں (تب بھی تبلیغ نہ کر سکوں گا تو اس کی بھی کوئی تدبیر فرما دیجئے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ے یعنی ایک قبطی کے خون کا دعویٰ جس کی تفصیل سورہ قصص میں آئے گی۔

**فائدہ:** ۲ے یعنی دعوت وتبلیغ سے پہلے ہی میرا کام تمام نہ کر دیں کہ یہ وہ ہی شخص ہے جو ہمارے آدمی کا خون کر کے بھاگا تھا، ایسی صورت میں فرض تبلیغ کس طرح ادا ہوگا۔

قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ﴿۱۵﴾ فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ

فرمایا کبھی نہیں، تم دونوں جاؤ لے کر ہماری نشانیاں ہم ساتھ تمہارے سنتے ہیں ۱ے سو جاؤ فرعون کے پاس اور کہو

اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۷﴾

ہم پیغام لے کر آئے ہیں پروردگار عالم کا۔ یہ کہ بھیج دے ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو ۲ے

**خلاصہ تفسیر:** ارشاد ہوا کہ کیا مجال ہے (جوایسا کرسکیں اور ہم نے ہارون کو بھی نبوت دی، اب تبلیغ کی دونوں رکاوٹیں دور ہوگئیں) سو (اب) تم دونوں میرے احکام لے کر جاؤ (کہ ہارون بھی نبی ہو گئے اور) ہم (نصرت وامداد سے) تمہارے ساتھ ہیں (ور جو گفتگو تمہاری اوران لوگوں کی ہوگی اسکو) سنتے ہیں، سو تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور (اس) سے کہو کہ ہم رب العالمین کے فرستادہ ہیں (اور دعوت توحید کے ساتھ یہ حکم بھی لائے ہیں) کہ تو بنی اسرائیل کو (اپنے بیگار اور ظلم سے رہائی دے کر ان کے اصلی وطن ملک شام کی طرف) ہمارے ساتھ جانے دے (دونوں باتوں کا حاصل یہ ہے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں حد سے آگے نہ بڑھے، چنانچہ یہ دونوں حضرات گئے اور فرعون سے سب مضامین کہہ دیئے)۔

اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ: اس میں اشارہ ہے کہ گمراہ کے ساتھ الزام حجت میں نرمی وتلطف برتا جائے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے، مزید وضاحت پارہ نو سورہ اعراف آیت ۱۰۵ میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ کیا جائے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ے یعنی کیا مجال ہے کہ ہاتھ لگا سکیں، جاؤ اپنی استدعا کے موافق ہارون کو بھی ساتھ لو اور ہمارے دیے ہوئے معجزات ونشانات لے کر وہاں پہنچو، ان نشانات کے ساتھ ہوتے ہوئے تم کو کیا ڈر، اور نشان کیا ہم خود ہر موقع پر تمہارے ساتھ ہیں اور فریقین کی گفتگو سن رہے ہیں۔

**فائدہ:** ۲ے "بنی اسرائیل" کا وطن حضرت ابراہیم کے زمانہ سے ملک شام تھا، حضرت یوسف کے سبب سے مصر میں آ رہے، وہاں ایک مدت گزری، اب ان کو حق تعالیٰ نے ملک شام دینا چاہا، فرعون ان کو نہ چھوڑتا تھا کیونکہ ان سے غلاموں کی طرح بیگار میں کام لیتا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی آزادی کا مطالبہ فرمایا۔

قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ﴿۱۸﴾

بولا کیا نہیں پالا ہم نے تجھ کو اپنے اندر (یہاں) لڑکا سا ۱ے اور رہا تو ہم میں اپنی عمر میں کئی برس تک (برسوں) ۲ے

وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾

بولا کیا نہیں پالا ہم نے تجھ کو اپنے اندر لڑکا سا ۳ے اور رہا تو ہم میں اپنی عمر میں کئی برس تک ۴ے

**خلاصہ تفسیر:** فرعون (یہ سب باتیں سن کر پہلے موسیٰ علیہ السلام کی طرف ان کو پہچان کر متوجہ ہوا اور) کہنے لگا کہ (آہا تم ہو) کیا ہم نے تم کو بچپن میں پرورش نہیں کیا اور تم اپنی (اُس) عمر میں برسوں ہم میں رہا سہا کئے، اور تم نے اپنی وہ حرکت بھی کی تھی جو کی تھی (یعنی قبطی کو قتل کیا

تھا) اور تم بڑے ناسپاس ہو (کہ میرا ہی کھایا، میرا ہی آدمی قتل کیا اور پھر مجھ کو اپنا تابع بنانے آئے ہو، چاہیے تو یہ تھا کہ تم میرے سامنے دب کر رہتے)

اَلَمۡ نُرَبِّكَ فِيۡنَا وَلِيۡدًا: اس میں اشارہ ہے کہ ایسے شخص سے بے رخی نہ کی جائے جسے تم نے بچپن میں پالا مگر بڑے ہونے کے بعد خدا تعالیٰ نے اسے فضیلت دے دی ہو، جیسے فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے بے رخی کی۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی تو وہی نہیں جس کو ہم نے اپنے گھر میں بڑے ناز و نعم سے پالا پوسا اور پرورش کر کے اتنا بڑا کیا، اب تیرا یہ دماغ ہوگیا کہ ہم ہی سے مطالبات کرتا اور اپنی بزرگی منواتا۔

فائدہ: ۲ اتنے برسوں تک کبھی یہ دعوے نہ کئے، اب یہاں سے نکلتے ہی رسول بن گئے۔

فائدہ: ۳ یعنی تو وہی نہیں جس کو ہم نے اپنے گھر میں بڑے ناز و نعم سے پالا پوسا اور پرورش کر کے اتنا بڑا کیا، اب تیرا یہ دماغ ہوگیا کہ ہم ہی سے مطالبات کرتا اور اپنی بزرگی منواتا۔

فائدہ: ۴ اتنے برسوں تک کبھی یہ دعوے نہ کئے، اب یہاں سے نکلتے ہی رسول بن گئے۔

قَالَ فَعَلۡتُهَاۤ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيۡنَ ؕ﴿۲۰﴾ فَفَرَرۡتُ مِنۡكُمۡ لَمَّا خِفۡتُكُمۡ فَوَهَبَ لِىۡ رَبِّىۡ حُكۡمًا

کہا کیا تو تھا میں نے وہ کام اور میں تھا چوکنے والا ۱ پھر بھاگا میں تم سے جب تمہارا ڈر دیکھا پھر بخشا مجھ کو میرے رب نے حکم

وَّجَعَلَنِىۡ مِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ﴿۲۱﴾

اور ٹھہرایا (مقرر کیا) مجھ کو پیغام پہنچانے والا ۲

خلاصہ تفسیر: موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ (واقعی) اس وقت وہ حرکت میں کر بیٹھا تھا اور مجھ سے غلطی ہوگئی تھی (یعنی عمداً میں نے قتل نہیں کیا، اس کی ظالمانہ روش سے اس کو روکنا مقصود تھا اتفاق سے وہ مر گیا) پھر جب مجھ کو ڈر لگا تو میں تمہارے ہاں سے مفرور ہوگیا، پھر مجھ کو میرے رب نے دانشمندی عطا فرمائی اور مجھ کو پیغمبروں میں شامل کر دیا (اور دانشمندی نبوت کے لیے لازم ہے، خلاصہ جواب یہ ہے کہ میں اس وقت پیغمبر ہی کی حیثیت سے آیا ہوں جس میں دبنے کی کوئی وجہ نہیں اور یہ قتل خطاء کا واقعہ نبوت کے منافی نہیں، کیونکہ قتل خطا سے ہوگیا تھا، اور بھول چوک سے نبوت کی لیاقت پر کوئی دھبہ نہیں آسکتا، یہ تو قتل کے اعتراض کا جواب ہے)۔

قَالَ فَعَلۡتُهَاۤ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيۡنَ: حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے جب فرعون جیسے جبار خدائی کے مدعی کو اس کے دربار میں دعوت حق پہنچائی تو اس نے مخالفانہ بحث کا آغاز اول دو ایسی باتوں سے کیا جن کا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذات سے تھا، جیسا ہوشیار مخالف عموماً جب اصل بات کے جواب پر قادر نہیں ہوتا تو مخاطب کی ذاتی کمزوریاں ڈھونڈا اور بیان کیا کرتا ہے تاکہ وہ کچھ شرمندہ ہو جائے اور لوگوں میں اس کی ہوا اُکھڑ جائے، یہاں بھی فرعون نے دو باتیں کہیں: ① اول تو یہ کہ تم ہمارے پروردہ ہمارے گھر میں پل کر جوان ہوئے ہو، ہم نے تم پر احسانات کئے ہیں، تمہاری کیا مجال ہے کہ ہمارے سامنے بولو ② دوسری بات یہ ہے کہ تم نے ایک قبطی شخص کو بلا وجہ قتل کر ڈالا ہے جو علاوہ ظلم کے حق ناشناسی اور ناشکری بھی ہے کہ جس قوم میں پلے اور جوان ہوئے اسی کے آدمی کو مار ڈالا، اس کے بالمقابل حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیغمبرانہ جواب دیکھئے کہ اول تو جواب میں سوال کی ترتیب کو بدلا، یعنی قبطی کے قتل کا قصہ جو فرعون نے بعد میں بیان کیا تھا اس کا جواب پہلے آیا اور خانہ پروردہ ہونے کے احسان کا ذکر جو پہلے کیا تھا اس کا جواب بعد میں، اس ترتیب بدلنے میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ واقعہ قبطی میں ایک اپنی کمزوری ضرور واقع ہوئی تھی، آج کل کے مناظروں کے طرز پر تو ایسی چیز کے ذکر ہی کو رلا ملا دیا جاتا ہے اور دوسری باتوں کی طرف توجہ پھیرنے کی کوشش کی جاتی ہے مگر اللہ تعالیٰ کے رسول نے اسی کے جواب کو

اولیت دی، اور جواب بھی فی الجملہ اعتراف کمزوری کے ساتھ دیا، اس کی قطعاً پروانہ کی کہ مخالف لوگ کہیں گے کہ انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے ہار مان لی، نبیوں کے اخلاق میں کس قدر صدق وامانت ہوا کرتی ہے کہ کس قدر سادگی و بے تکلفی سے اپنے قصور کا اعتراف کر لیا، ورنہ لوگ عام طور پر اپنے قصور کے اعتراف کو کمزوری اور نقص سمجھتے ہیں اور چھپاتے ہیں یا تاویل کر لیتے ہیں لیکن موسیٰ علیہ السلام نے صاف صاف اقرار فرمالیا، اور سچوں کے اخلاق ایسے ہی ہوتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے جواب میں اس کا تو اعتراف کر لیا کہ اس قتل میں مجھ سے غلطی اور خطا ہوگئی، مگر ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ یہ غلطی قصداً نہیں تھی، ایک صحیح اقدام تھا جو اتفاقاً غلط انجام پر پہنچ گیا کہ مقصد تو قبطی کو اسرائیلی شخص پر ظلم سے روکنا تھا، اسی قصد سے اس کو ایک ضرب لگائی تھی، اتفاقاً وہ اسی سے مرگیا اس لئے یہ فعل خطا ہونے کے باوجود ہمارے اصل معاملہ یعنی نبوت کے دعوے اور اس کی حقانیت پر کوئی اثر نہیں ڈالتا، مجھے اس غلطی پر تنبہ ہوا اور قانونی گرفت کے خوف سے شہر سے نکل گیا، اللہ تعالیٰ نے پھر کرم فرمایا اور نبوت ورسالت سے سرفراز فرمادیا۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی قبطی کا خون میں نے دانستہ نہیں کیا تھا، غلطی سے ایسا ہوگیا مجھے کیا خبر تھی کہ ایک مکا مارنے میں جو تادیب کے لیے تھا اس کا دم نکل جائے گا: فَوَكَزَهُ مُوسَىٰ فَقَضَىٰ عَلَيْهِ (القصص: ۱۵)

**فائدہ:** ۲؎ یعنی بیشک میں خوف کھا کر یہاں سے بھاگا، لیکن اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ مجھے نبوت وحکمت عطا فرمائے، اس نے اپنے فضل سے مجھے سرفراز کیا اور رسول بنا کر تمہاری طرف بھیجا، یہ بجائے خود میری صداقت کی دلیل ہے کہ جو شخص تم سے خوف کھا کر بھاگا ہو، پھر اس طرح بے خوف وخطر تنہا تمہارے سامنے آکر ڈٹ جائے۔

## وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدتَّ بَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿٢٢﴾

اور کیا وہ احسان ہے جو تو مجھ پر رکھتا ہے کہ غلام بنایا تو نے بنی اسرائیل کو

**خلاصہ تفسیر:** اور (رہا پرورش کا احسان جتلانا سو) وہ یہ نعمت ہے جس کا تو مجھ پر احسان رکھتا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو سخت ذلت (اور ظلم) میں ڈال رکھا تھا۔

اب پہلی بات یعنی خانہ پرورده ہونے کے احسان جتلانے کے جواب کی طرف توجہ فرمائی تو اس کے اس ظاہری احسان کی اصل حقیقت کی طرف توجہ دلا دی کہ ذرا سوچو، میں کہاں اور دربار فرعون کہاں؟ میری پرورش تمہارے گھر میں ہونے کے سبب پر غور کرو تو یہ حقیقت کھل جائے گی کہ تم جو پوری قوم بنی اسرائیل پر یہ خلاف انسانیت ظلم توڑ رہے تھے کہ ان کے بے گناہ معصوم لڑکوں کو قتل کر دیتے تھے، بظاہر تو تمہارے اس ظلم وستم سے بچنے کے لئے میری والدہ نے مجھے دریا میں ڈالا اور تم نے اتفاقی طور پر میرا تابوت دریا سے نکال کر گھر میں رکھ لیا اور حقیقۃً یہ اللہ تعالیٰ کا حکیمانہ انتظام اور تمہارے ظلم کی غیبی سزا تھی کہ جس بچے کے خطرہ سے بچنے کے لئے تم نے ہزاروں بچے قتل کر ڈالے تھے، قدرت نے اس بچے کو تمہارے ہی ہاتھوں پلوایا، اب سوچو کہ یہ میری پرورش تمہارا کیا احسان تھا، بلکہ اس سے تو اپنی ناشائستہ حرکتوں کو یاد کر کے شرمانا چاہیے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس جواب سے یہ مقصود نہیں کہ میں احسان نہیں مانتا، بلکہ مقصود یہ ہے کہ تجھے احسان نہیں جتلانا چاہیے، کیونکہ احسان جتلانا ہمیشہ برا ہے، خاص کر جب اس کا سبب احسان کرنے والے کا ظلم ہو۔

**وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ:** اس آیت کی دو توجیہیں ہیں: ① ایک صورت میں یہ فرعون کے احسان جتلانے پر رد ہے ② دوسری صورت میں فرعون کے احسان کا اقرار ہے، کافر کے احسان کے متعلق بزرگوں کی مذکورہ دونوں عادتیں منقول ہیں، لیکن اگر کوئی عارض پیش نہ آئے یعنی وہ اسلام دشمن نہ ہو تو دوسری صورت اصل ہے، اس کی تائید یوسف علیہ السلام کے اس قول سے ہوتی ہے: انہ ربی احسن مثوای اور پہلی صورت غلبہ حال سے ہوتی

ہے کہ جب اس کافر کے عند اللہ مبغوض ہونے کا غلبہ ہوتا ہے تو اس کے احسان کی طرف توجہ نہیں رہتی، خصوصاً جبکہ کوئی عارض بھی پیش آجائے یعنی جبکہ وہ اسلام دشمن ہوتو پھر اس سے اعراض کیا جاتا ہے، جیسا حضرت موسی علیہ السلام کو پیش آیا۔

* * *

**فائدہ:** یعنی بچپن میں میری پرورش کا احسان جتلانا تجھے زیب نہیں دیتا کیا ایک اسرائیلی بچہ کی تربیت سے اس کا جواب ہوسکتا ہے کہ تو نے اس کی ساری قوم کو غلام بنا رکھا ہے، بالخصوص جبکہ اس بچہ کی تربیت بھی خود تیرے زہرہ گداز مظالم کے سلسلہ ہی میں وقوع پذیر ہوئی ہو، نہ تو بنی اسرائیل کے بچوں کو ذبح کرتا، نہ خوف کی وجہ سے میری والدہ تابوت میں رکھ کر مجھے دریا میں چھوڑتی، نہ تیرے محل سرا تک رسائی ہوتی، ان حالات کا تصور کر کے تجھ کو ایسا احسان جتلاتے ہوئے شرمانا چاہیے اور صاف بات یہ ہے کہ جس پروردگار نے تجھ جیسے دشمن کے گھر میں میری پرورش کرائی اسی نے آج تیری خیرخواہی کے لیے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٣﴾ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ط

بولا فرعون کیا معنی پروردگارِ عالم کا ۱؎ کہا پروردگار آسمان اور زمین کا اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے

اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿٢٤﴾

اگر تم یقین کرو ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** فرعون (اس بات پر لاجواب ہوا، گفتگو کا پہلو بدل کر اس) نے کہا کہ (جس کو تم) رب العالمین (کہتے ہو لقولہ تعالیٰ: اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اس) کی ماہیت (اور حقیقت) کیا ہے؟ موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ وہ پروردگار ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ (مخلوقات) ان کے درمیان میں ہے اس (سب) کا اگر تم کو یقین (حاصل) کرنا ہو (تو یہ پتہ بہت ہے، مطلب یہ کہ خدا تعالیٰ کی حقیقت کا ادراک انسان نہیں کرسکتا، اس لئے جب ان کا سوال کرو گے جواب میں خدا کی صفات ہی بیان کی جائیں گی)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے: فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الشعراء:١٦) کے امتثال میں اپنے کو "رب العالمین" کا پیغمبر کہا، اس پر فرعون جحود، تعنت اور ہٹ دھرمی کی راہ سے بولا کہ (العیاذ باللہ) رب العالمین کیا چیز ہوتی ہے، میری موجودگی میں کسی اور رب کا نام لینا کیا معنی رکھتا ہے کیونکہ اس شقی ازلی کا دعویٰ تو اپنی قوم کے روبرو یہ تھا: مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ (میں اپنے سوا تمہارے لیے کوئی معبود نہیں سمجھتا) اور: اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (النازعات:٢٤) (تمہارا بڑا پروردگار میں ہوں) چنانچہ اس کی قوم کے لوگ بعض تو انتہائی جہل و بلادت سے اور بعض خوف یا طمع سے اسی کی پرستش کرتے تھے، گو دل میں اس ملعون کو بھی خدا کی ہستی کا یقین تھا، جیسا کہ: قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ (الاسراء:١٠٢) سے ظاہر ہوتا ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی آسمان و زمین کی سب چیزیں جس کے زیر تربیت ہیں وہ ہی رب العالمین ہے، اگر تمہارے قلوب میں کسی چیز پر بھی یقین لانے کی استعداد موجود ہو تو فطرتِ انسانی سب سے پہلے اس چیز کا یقین دلانے کے لیے کافی ہے۔

قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ﴿٢٥﴾ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٢٦﴾

بولا اپنے گرد والوں سے کیا تم نہیں سنتے ہو ۱؎۔ کہا پروردگار تمہارا اور پروردگار تمہارے اگلے باپ دادوں کا ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** فرعون نے اپنے اردگرد (بیٹھنے) والوں سے کہا کہ تم لوگ (کچھ) سنتے ہو (کہ سوال کچھ جواب کچھ) موسیٰ

(علیہ السلام) نے فرمایا کہ وہ پروردگار ہے تمہارا اور تمہارے پہلے بزرگوں کا (اس جواب میں دوبارہ اسی پہلے مطلب پر تنبیہ کردی کہ تم خدا کو اس کی صفات سے پہچان سکتے ہو، حقیقت نہیں جان سکتے)۔

قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِیْنَ: فرعون نے وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ میں لفظ ''ما'' سے باری تعالیٰ کی ماہیت کے بارے میں سوال کیا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے صفات سے جواب دیا، فرعون نے کئی بار اس جواب پر جرح کیا، موسیٰ علیہ السلام نے ہر بار صفات ہی سے جواب دیا، اس سے وہ مسئلہ صاف ثابت ہوگیا کہ حق تعالیٰ کی صورت اور حقیقت بیان نہیں کی جاسکتی، جسے علم الکلام میں معرفت بالکنہ کہا جاتا ہے، صرف صفات کے ذریعے ہی معرفت حاصل کی جاسکتی ہے جسے علم الکلام میں معرفت بالوجہ کہا جاتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ فرعون جان بوجھ کر بات کو رلانا چاہتا تھا، اپنے حوالی موالی کو ابھارنے اور موسیٰ علیہ السلام کی بات کو خفیف کرنے کے لیے کہنے لگا، سنتے ہو، موسیٰ کیسی دور از کار باتیں کر رہے ہیں، کیا تم میں کوئی تصدیق کرے گا کہ میرے سوا آسمان وزمین میں کوئی اور رب ہے؟

**فائدہ:** ۲ یعنی او احمق! میں جس رب العالمین کا ذکر کر رہا ہوں، وہ ہے جس نے خود تم کو اور تمہارے باپ دادوں کو پیدا کیا، اور جب تمہارا بیج بھی نہ تھا اس وقت زمین وآسمان کی تربیت وتدبیر کر رہا تھا۔

قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِیْۤ اُرْسِلَ اِلَیْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۲۷﴾ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا

بولا تمہارا پیغام لانے والا جو تمہاری طرف بھیجا گیا ضرور باؤلا ہے ۱ کہا پروردگار مشرق کا اور مغرب کا اور جو کچھ

بَیْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالَ لَىِٕنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَیْرِیْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِیْنَ ﴿۲۹﴾

ان کے بیچ میں ہے، اگر تم سمجھ رکھتے ہو ۲ بولا اگر تو نے ٹھہرایا کوئی اور حاکم میرے سوا تو مقرر (ضرور) ڈالوں گا تجھ کو قید میں ۳

**خلاصہ تفسیر:** (موسیٰ علیہ السلام خدا کی قدرتیں بیان کرتے جاتے تھے اور فرعون بیچ میں اپنے درباریوں کو ابھارتا جاتا تھا تاکہ انہیں یقین نہ آجائے کہ دیکھو میں ان سے خدا کی حقیقت پوچھتا ہوں اور یہ ادھر ادھر کی بات کرتے ہیں، چنانچہ:)

فرعون (نہ سمجھا اور) کہنے لگا کہ یہ تمہارا رسول جو (بزعم خود) تمہاری طرف رسول ہو کر آیا ہے مجنون (معلوم ہوتا) ہے، موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ وہ پروردگار ہے مشرق اور مغرب کا اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اس کا بھی اگر تم کو عقل ہو (تو اسی سے مان لو) فرعون (آخر جھلا کر) کہنے لگا کہ اگر تم میرے سوا کوئی اور معبود تجویز کرو گے تو تم کو جیل خانہ بھیج دوں گا۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی (العیاذ باللہ) کس دیوانہ کو رسول بنا کر بھیجا ہے، جو ہماری اور ہمارے باپ دادوں کی خبر لیتا ہے، اور ہماری شوکت وحشمت کو دیکھ کر ذرا نہیں جھجکتا، معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دماغ عقل سے بالکل خالی ہے۔

**فائدہ:** ۲ حضرت موسیٰ نے پھر ایک بات کہی جس طرح کی حضرت ابراہیم نے نمرود کے سامنے آخر میں کہی تھی، یعنی رب العالمین وہ ہے جو مشرق ومغرب کا مالک اور تمام سیارات کے طلوع وغروب کی تدبیر ایک محکم ومضبوط نظام کے موافق کرنے والا ہے، اور تم میں ذرا بھی عقل ہو تو بتلا سکتے ہو کہ اس عظیم الشان نظام کا قائم رکھنے والا بجز خدا کے کون ہوسکتا ہے، کیا کسی کو قدرت ہے کہ اس کے قائم کیے ہوئے نظام کو ایک سیکنڈ کے لیے توڑ دے یا بدل ڈالے، یہ آخری بات سن کر فرعون بالکل مبہوت ہوگیا اور بحث وجدال سے گزر کر دھمکیوں پر اتر آیا، جیسا کہ آگے آتا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''حضرت موسیٰ ایک بات کہے جاتے تھے اللہ کی قدرتیں بتانے کو اور فرعون بیچ میں اپنے سرداروں کو ابھارتا تھا کہ ان کو یقین نہ آجائے''۔

**فائدہ:** ۳ اس مرتبہ فرعون نے اپنا مطلب صاف کہہ دیا کہ یہاں ''مصر'' میں کوئی اور خدا نہیں، اگر میرے سوا کسی اور معبود کی حکومت مانی

تو یاد رکھو قید خانہ تیار ہے۔

قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ﴿٣٠﴾ قَالَ فَأْتِ بِهٖٓ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٣١﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ

کہا اور اگر لے کر آیا ہوں تیرے پاس ایک چیز کھول دینے والی[1] بولا تو وہ چیز لا اگر تو سچ کہتا ہے، پھر ڈال دیا اپنا عصا،

فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿٣٢﴾ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿٣٣﴾ ع

سو اسی وقت وہ اژدہا ہو گیا صریح، اور اندر (بغل) سے نکالا اپنا ہاتھ سو اسی وقت وہ سفید تھا دیکھنے والوں کے سامنے

**خلاصہ تفسیر:** موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کیا اگر کوئی میں صریح دلیل پیش کروں تب بھی (نہ مانے گا) فرعون نے کہا اچھا تو وہ دلیل پیش کرو اگر تم سچے ہو، تو موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی لاٹھی ڈال دی تو دفعۃً ایک نمایاں اژدھا بن گیا اور (دوسرا معجزہ دکھلانے کے لئے) اپنا ہاتھ (گریبان میں دے کر) باہر نکالا تو وہ دفعۃً سب دیکھنے والوں کے روبرو بہت ہی چمکتا ہوا ہو گیا (کہ اس کو بھی کھلی آنکھوں سب نے دیکھا)۔

ثُعْبَان اور لِلنّٰظِرِيْنَ کے متعلق مزید وضاحت پارہ نو سورہ اعراف آیت ۱۰۷-۱۰۸ میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ کر لیا جائے۔

* * *

**فائدہ:** [1] یعنی فیصلہ میں ابھی جلدی نہ کر، یہ تو تیری باتوں کا جواب تھا اب ذرا وہ کھلے ہوئے نشان بھی دیکھ جن سے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور میری صداقت دونوں کا اظہار ہو، اگر ایسے نشان دکھلاؤں تو کیا پھر بھی تیرا فیصلہ یہ ہی رہے گا۔

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗٓ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿٣٤﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿٣٥﴾

بولا اپنے گرد کے سرداروں سے یہ تو کوئی جادوگر ہے پڑھا ہوا، چاہتا ہے کہ نکال دے تم کو تمہارے دیس سے اپنے جادو کے زور سے، سو اب کیا حکم دیتے ہو[1]

**خلاصہ تفسیر:** (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جو یہ معجزات ظاہر ہوئے تو) فرعون نے اہل دربار سے جو اس کے آس پاس (بیٹھے) تھے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بڑا ماہر جادوگر ہے، اس کا (اصل) مطلب یہ ہے کہ اپنے جادو (کے زور) سے (خود رئیس ہو جائے اور) تم کو تمہاری زمین سے باہر کر دے (تاکہ بغیر کسی روک ٹوک کے اپنی قوم کو لے کر حکومت کرے) سو تم لوگ کیا مشورہ دیتے ہو؟۔

* * *

**فائدہ:** [1] یا تو خدائی کے دعوے تھے یا اتنی جلد ایسا حواس باختہ ہو گیا کہ اپنے غلاموں اور پرستاروں کے احکام پر چلنے کیلئے آمادہ ہو گیا۔

قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿٣٦﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ﴿٣٧﴾

بولے ڈھیل دے اس کو اور اس کے بھائی کو اور بھیج دے شہروں میں نقیب، لے آئیں تیرے پاس جو بڑا جادوگر ہو پڑھا ہوا

**خلاصہ تفسیر:** درباریوں نے کہا کہ آپ ان کو اور ان کے بھائی کو (چندے) مہلت دیجئے اور (اپنے ملک کے حدود کے) شہروں میں (گرداوروں کو یعنی) چپڑاسیوں کو (حکم نامے دے کر) بھیج دیجئے کہ وہ (سب شہروں سے) سب ماہر جادوگروں کو (جمع کر کے) آپ کے پاس لا کر حاضر کر دیں۔

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿٣٨﴾ وَّقِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ﴿٣٩﴾

پھر اکٹھے کیے جادوگر وعدہ پر ایک مقرر دن کے[1] اور کہہ دیا لوگوں کو کیا تم بھی اکٹھے ہو گے

لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنۡ كَانُوۡا هُمُ الۡغٰلِبِيۡنَ ۞

شاید ہم راہ قبول کرلیں جادوگروں کی اگر ہوان کو غلبہ ۲

**خلاصہ تفسیر**: غرض وہ جادوگر ایک معین دن کے خاص وقت پر جمع کر لئے گئے (معین دن سے میلہ کا دن مراد ہے اور خاص وقت سے مراد چاشت کا وقت ہے، جیسے سورۂ طٰہٰ کے تیسرے رکوع میں مذکور ہے، یعنی اس وقت کے قریب تک سب لوگ جمع کر لئے گئے اور فرعون کو جمع ہونے کی اطلاع دے دی گئی) اور (فرعون کی جانب سے بطور اعلان عام کے) لوگوں کو یہ اشتہار دیا گیا کہ کیا تم لوگ (فلاں موقع پر واقعہ دیکھنے کے لئے) جمع ہو گے (یعنی جمع ہو جاؤ) تا کہ اگر جادوگر غالب آ جائیں (جیسا کہ غالب توقع ہے) تو ہم انہیں کی راہ پر رہیں (یعنی وہی راہ جس پر فرعون تھا اور دوسروں کو بھی اس پر رکھنا چاہتا تھا، یہ عنوان اس لیے اختیار کیا تا کہ خودغرضی ظاہر نہ ہو، مطلب یہ کہ جمع ہو کر دیکھو، امید ہے کہ جادوگر غالب رہیں گے تو ہم لوگوں کے طریق کا حق ہونا حجت سے ثابت ہو جائے گا)۔

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيۡقَاتِ يَوۡمٍ مَّعۡلُوۡمٍ: وہ میلہ کا دن تھا، اس سے معلوم ہوا کہ اہل باطل کے اجتماعات میں کسی دینی و اسلامی غرض کے لیے شرکت کرنا جائز ہے، جسے بعض غیر مخلص علماء اپنی کسر شان سمجھ کر گوارہ نہیں کرتے (مقصود صرف اصلاح وتبلیغ ہو)۔

لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ: یعنی تا کہ ہم جادوگروں کی راہ پر رہیں، اصل تو فرعون کی اتباع مقصود ہے، لیکن یہ عنوان اس لیے اختیار کیا تا کہ خود غرضی ظاہر نہ ہو۔

* * *

**فائدہ**: ۱ یعنی عید کے دن چاشت کے وقت۔

**فائدہ**: ۲ یعنی سب کو اکٹھا ہونا چاہیے، امید قوی ہے کہ ہمارے جادوگر غالب آئیں گے، اس وقت ہم موسیٰ کی شکست اور مغلوبیت دکھلانے کے لیے اپنے ساحرین ہی کی راہ پر چلیں گے، تو یا یہ ظاہر کرنا تھا کہ اس میں ہماری کوئی خودغرضی نہیں، جب مقابلہ میں ہمارا پلہ بھاری رہے گا تو انصافاً کسی کو ہمارے طریقہ سے منحرف ہونے کی گنجائش نہیں رہ سکتی۔

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوۡا لِفِرۡعَوۡنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجۡرًا اِنۡ كُنَّا نَحۡنُ الۡغٰلِبِيۡنَ ۞ قَالَ نَعَمۡ

پھر جب آئے جادوگر کہنے لگے فرعون سے بھلا کچھ ہمارا حق بھی ہے اگر ہو ہم کو غلبہ ، بولا البتہ (ہاں)

وَاِنَّكُمۡ اِذًا لَّمِنَ الۡمُقَرَّبِيۡنَ ۞

اور تم اس وقت مقربوں (مصاحبوں) میں ہو گے ۱

**خلاصہ تفسیر**: پھر جب وہ جادوگر (فرعون کی پیشی میں) آئے تو فرعون سے کہنے لگے کہ اگر (موسیٰ علیہ السلام پر) ہم غالب آ گئے تو کیا ہم کو کوئی بڑا صلہ (اور انعام) ملے گا، فرعون نے کہا ہاں! (انعام مالی بھی بڑا ملے گا) اور (مزید برآں یہ مرتبہ ملے گا کہ) تم اس صورت میں (ہمارے) مقرب لوگوں میں داخل ہو جاؤ گے۔

* * *

**فائدہ**: ۱ یعنی نہ صرف مالی انعام و اکرام بلکہ تم میرے خاص مصاحبوں میں رہو گے، ان آیات کا مفصل بیان اعراف اور طٰہٰ میں گزر چکا ہے۔

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ۝٤٣ فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَ عِصِيَّهُمْ وَ قَالُوْا

کہا ان کو موسیٰ نے ڈالو جو تم ڈالتے ہو لے پھر ڈالیں انہوں نے اپنی رسیاں اورلاٹھیاں اوربولے

بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ۝٤٤ فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ۝٤٥

فرعون کے اقبال سے ہماری ہی فتح ہے ٢ پھر ڈالا موسیٰ نے اپنا عصا تبھی وہ نگلنے لگا جو سانگ انہوں نے بنایا تھا ٣

**خلاصہ تفسیر:** (غرض اس گفتگو کے بعد عین موقعہ مقابلہ پر آئے اور دوسری طرف موسیٰ علیہ السلام تشریف لائے اور مقابلہ شروع ہوا اور جادوگروں نے موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ آپ اپنا عصا پہلے ڈالئے گا یا ہم ڈالیں) موسیٰ (علیہ السلام) نے ان سے فرمایا کہ تم کو جو کچھ ڈالنا (منظور) ہو (میدان میں) ڈالو، سوانہوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالیں (جو جادو کے اثر سے سانپ معلوم ہوتے تھے) اور کہنے لگے کہ فرعون کے نصیب کی قسم! بیشک ہم ہی غالب آئیں گے، پھر موسیٰ (علیہ السلام) نے (بحکم خداوندی) اپنا عصا ڈالا، ڈالنے کے ساتھ ہی (اژدھا بن کر) ان کے تمام تر بنے بنائے دھندے کو نگلنا شروع کر دیا۔

**قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ:** حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں سے کہا کہ آپ جو کچھ جادو دکھانا چاہتے ہو وہ دکھاؤ، اس پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو جادو کا حکم دے رہے ہیں، لیکن ذرا سے غور سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے جادو دکھانے کا حکم نہیں تھا، بلکہ جو کچھ وہ کرنے والے تھے اس کا ابطال مقصود تھا، لیکن اس کا باطل ہونا بغیر اس کے ظاہر کرنے کے ناممکن تھا، اس لئے آپ نے ان کو اظہار جادو کا حکم دیا، جیسے کہ ایک زندیق کو کہا جائے کہ تم اپنے زندقہ اور بے دینی کے دلائل پیش کروتا کہ میں ان کو باطل ثابت کرسکوں، ظاہر ہے کہ اسے کفر پر رضامندی نہیں کہا جاسکتا، پس بعض مرتبہ منکرات کو دیکھ بعض بزرگ ومشائخ حضرات چشم پوشی کر لیتے ہیں، حقیقت میں یہ چشم پوشی نہیں ہوتی، بلکہ اس کی تہہ میں کوئی دینی مصلحت ہوا کرتی ہے جو اس وقت عام نظروں سے پوشیدہ رہتی ہے لیکن بعد میں اس کا فائدہ ظاہر ہوتا ہے۔

**بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ:** یہ کلمہ ان جادوگروں کے لئے بمنزلہ قسم ہے جو زمانہ جاہلیت میں رائج تھی، افسوس کہ مسلمانوں میں بھی اب ایسی قسمیں رائج ہوگئی ہیں جو اس سے زیادہ شنیع اور قبیح ہیں مثلاً بادشاہ کی قسم، تیرے سر کی قسم، تیری ڈاڑھی کی قسم یا تیرے باپ کی قبر کی قسم، اس قسم کی قسمیں کھانا شرعاً جائز نہیں، بلکہ ان کے متعلق یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ خدا کے نام کی جھوٹی قسم کھانے میں جو گناہ عظیم ہے ان ناموں کی سچی قسم بھی گناہ میں اس سے کم نہیں۔

* * *

**فائدہ:** ١ یعنی جب ساحرین نے کہا کہ موسیٰ پہلے اپنی لاٹھی ڈالتے ہو یا ہم ڈالیں، اسکے جواب میں فرمایا کہ تم ہی اپنی قوت خرچ کر دیکھو۔

**فائدہ:** ٢ بعض نے بِعِزَّةِ فِرْعَوْن کو قسم کے معنی میں لیا ہے، یعنی فرعون کے اقبال کی قسم ہم ہی غالب ہوکر رہیں گے۔

**فائدہ:** ٣ شیخ اکبرؒ نے لکھا ہے کہ خالی رسیاں اور لاٹھیاں رہ گئیں جو سانپوں کی صورتیں انہوں نے بنائی تھیں، موسیٰ کا عصا انکو نگل گیا۔

فَاُلْقِىَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ۝٤٦ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝٤٧ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ۝٤٨

پھر اوندھے گرے جادوگر سجدہ میں، بولے ہم نے مان لیا جہان کے رب کو، جو رب ہے موسیٰ اور ہارون کا

**خلاصہ تفسیر:** سو (یہ دیکھ کر) جادوگر (ایسے متاثر ہوئے کہ) سب سجدہ میں گر پڑے (اور پکار پکار کر) کہنے لگے کہ ہم ایمان لے آئے رب العالمین پر جو موسیٰ اور وہارون (علیہما السلام) کا بھی رب ہے۔

بزرگوں کے کلام میں ''جذب الٰہی'' بکثرت پایا جاتا ہے، وہ اسی جیسی کیفیت کا نام ہے جو انسان کو یکدم اللہ کی طرف متوجہ کر دیتی ہے۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ؕ

بولا تم نے اس کو مان لیا ابھی میں نے حکم نہیں دیا تم کو مقرر (بیشک) وہ تمہارا بڑا ہے جس نے تم کو سکھلایا جادو ۱ سو اب معلوم کر لو گے

لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۹﴾

البتہ کاٹوں گا تمہارے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں اور سولی پر چڑھاؤں گا تم سب کو

**خلاصہ تفسیر:** (فرعون یہ دیکھ کر بڑا گھبرایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ساری رعایا ہی مسلمان ہو جائے تو اس نے ایک مضمون گھڑ کر جادوگروں کو یہ دھمکانا شروع کر دیا) کہنے لگا کہ ہاں تم موسیٰ پر ایمان لے آئے بغیر اس کے کہ میں تم کو اجازت دوں ضرور (معلوم ہوتا ہے کہ) یہ (جادو میں) تم سب کا استاد ہے جس نے تم کو جادو سکھایا ہے (اور تم اس کے شاگرد ہو، اس لئے آپس میں خفیہ سازش کر لی ہے کہ تم یوں کرنا، ہم یوں کریں گے، پھر اس طرح ہار جیت ظاہر کریں گے تا کہ قبطیوں سے سلطنت چھین کر اطمینان سے خود حکومت کرو، کقولہ تعالیٰ: اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا) سو اب تم کو حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے (اور وہ یہ ہے کہ) میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹوں گا اور تم سب کو سولی پر ٹانگ دوں گا (تا کہ اوروں کو عبرت ہو)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی موسیٰ تمہارا بڑا استاد ہے، آپس میں سازش کر کے آئے ہو کہ تم یہ کرنا، ہم یوں کہیں گے اور حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ: ''تمہارا بڑا'' کہا رب کو ''یعنی موسیٰ اور تم ایک استاد کے شاگرد ہو''، واللہ اعلم۔

قَالُوْا لَا ضَيْرَ ۫ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۵۰﴾ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ

بولے کچھ ڈر نہیں ہم کو اپنے رب کی طرف پھر جانا ہے ۱ ہم غرض رکھتے ہیں کہ بخش دے ہم کو رب ہمارا تقصیریں ہماری

اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۱﴾ ع

اس واسطے کہ ہم ہوئے پہلے قبول کرنے والے ۲

**خلاصہ تفسیر:** انہوں نے جواب دیا کہ کچھ حرج نہیں ہم اپنے مالک کے پاس جا پہنچیں گے (جہاں ہر طرح امن و راحت ہے، پھر ایسے مرنے سے نقصان ہی کیا اور) ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمارا پروردگار ہماری خطاؤں کو معاف کر دے اس وجہ سے کہ ہم (اس موقع پر حاضرین میں سے) سب سے پہلے ایمان لائے (پس اس پر یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ ان سے پہلے بھی بعض ایمان لا چکے تھے جیسے آسیہ اور مومن آل فرعون اور بنی اسرائیل، کیونکہ مطلب یہ ہے کہ یہاں حاضر ہونے والوں میں سے ہم پہلے ایمان لائے)۔

قَالُوْا لَا ضَيْرَ: جب بندہ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے مضبوط ہو جاتا ہے تو اس کو دنیا کا کوئی نقصان ڈر و خوف میں مبتلا نہیں کر سکتا، اور اس کے ساتھ ساتھ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا شوق غالب رہتا ہے، چنانچہ جادوگروں کی اس بات میں جس طرح قتل ہو جانے سے بے پرواہی ہے اسی طرح موت کی طرف اشتیاق بھی ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی بہر حال مر کر خدا کے یہاں جانا ہے، اس طرح مریں گے، شہادت کا درجہ ملے گا، یہ سب مضامین سورہ اعراف وغیرہ میں

گزر چکے ہیں وہاں دیکھ لیا جائے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی موسیٰ علیہ السلام کی دعوت وتبلیغ کے بعد بھرے مجمع میں ظالم فرعون کے روبرو سب سے پہلے ہم نے قبول حق کا اعلان کیا، اس سے امید ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ ہماری گذشتہ تقصیرات کو معاف فرمائے گا۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۵۲﴾

اور حکم بھیجا ہم نے موسیٰ کو کہ رات کو لے نکل میرے بندوں کو البتہ تمہارا پیچھا کریں گے

**خلاصہ تفسیر:** اور (جب فرعون کو اس واقعہ سے بھی ہدایت نہ ہوئی اور اس نے بنی اسرائیل کو تکلیف پہنچانا نہ چھوڑا تو) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو حکم بھیجا کہ میرے (ان) بندوں کو (یعنی بنی اسرائیل کو) شبا شب (راتوں رات مصر سے باہر) نکال لے جاؤ (اور فرعون کی جانب سے) تم لوگوں کا تعاقب (بھی) کیا جائے گا (چنانچہ وہ حکم کے موافق بنی اسرائیل کو لے کر رات کو چل دیئے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جب ایک مدت مدید تک سمجھانے اور آیات دکھلاتے رہنے کے بعد بھی فرعون نے حق کو قبول نہ کیا اور بنی اسرائیل کو ستانا نہ چھوڑا، تو ہم نے موسیٰ کو حکم دیا کہ اپنی قوم کو لے کر رات میں یہاں سے ہجرت کر جاؤ، اور دیکھنا یہ فرعونی لوگ تمہارا پیچھا کریں گے (گھبرانا نہیں)۔

فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ﴿۵۴﴾

پھر بھیجے فرعون نے شہروں میں نقیب ۱؎ یہ لوگ جو ہیں سو ایک جماعت ہے تھوڑی سی ۲؎

وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ﴿۵۶﴾

اور وہ مقرر ہم سے دل جلے ہوئے ہیں ۳؎ اور ہم سارے ان سے خطرہ رکھتے ہیں ۴؎

**خلاصہ تفسیر:** (صبح یہ خبر مشہور ہوئی تو) فرعون نے (تعاقب کی تدبیر کرنے کے لئے جا بجا آس پاس کے) شہروں میں چپراسی دوڑا دیئے (اور یہ کہلا بھیجا) کہ یہ لوگ (یعنی بنی اسرائیل ہماری نسبت) تھوڑی سی جماعت ہے (ان کے مقابلہ سے کوئی اندیشہ نہ کرے) اور انہوں نے (اپنی کارروائی سے) ہم کو بہت غصہ دلایا ہے (وہ کارروائی یہ ہے کہ خفیہ چالاکی سے نکل گئے، یا یہ کہ ہمارا بہت سازیور شادی کے بہانے سے مانگ کر لے گئے غرض ہم کو احمق بنا کر گئے، ضرور ان کا تدارک کرنا چاہئے) اور ہم سب ایک مسلح جماعت (اور باقاعدہ فوج) ہیں۔

فرعونیوں کے زیور لینے کے متعلق اگر کسی کو پرایا مال لینے کا شبہ ہو تو اس کا ایک جواب سورہ طٰہٰ آیت ۸۷ میں گذر چکا ہے، اور ایک جواب یہ ہے کہ مصریوں نے خدا جانے ان غریبوں کا ظلم کر کے کتنا نقصان کیا ہوگا اور کتنی مزدوری ان کی مار لی ہوگی اس طور پر تو شاید حساب بھی پورا نہ ہوا ہوگا۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ تمام قبطیوں کو جمع کر کے بنی اسرائیل کا تعاقب کرے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی ان تھوڑے سے آدمیوں نے تم کو تنگ کر رکھا ہے، حالانکہ ان کی ہستی کیا ہے جو تمہارے مقابلہ میں عہدہ برآ ہو سکیں، یہ باتیں قوم کو غیرت اور جوش دلانے کے لیے کہیں۔

**فائدہ:** ۳؎ یا ہم کو غصہ دلا رہے ہیں، معلوم ہوتا ہے ان کی کم بختی نے دھکا دیا ہے۔

**فائدہ:** ۴؎ تو اس روز روز کے خطرہ کا قلع قمع ہی کر دو، بعض مفسرین نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ ہماری بڑی جمعیت ہے جو محتاط یا مسلح ہے تو یہ الفاظ دل بڑھانے کے لیے ہوں گے، واللہ اعلم۔

فَاَخۡرَجۡنٰهُمۡ مِّنۡ جَنّٰتٍ وَّعُيُوۡنٍ ﴿۵۷﴾ وَّكُنُوۡزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيۡمٍ ﴿۵۸﴾

پھر نکال باہر کیا ہم نے ان کو باغوں اور چشموں سے، اور خزانوں اور عمدہ مکانوں سے

كَذٰلِكَ ؕ وَاَوۡرَثۡنٰهَا بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ﴿۵۹﴾

اسی طرح ۱ اور ہاتھ لگا دیں ہم نے یہ چیزیں بنی اسرائیل کے ۲

**خلاصہ تفسیر:** غرض (دو چار روز میں جب سامان اور فوج سے درست ہوگیا تو لاؤ لشکر لے کر بنی اسرائیل کے تعاقب میں چلا اور یہ خبر نہ تھی کہ اب لوٹنا نصیب نہ ہوگا تو اس حساب سے گویا) ہم نے ان کو باغوں سے اور چشموں سے اور خزانوں سے اور عمدہ مکانات سے نکال باہر کیا (ہم نے ان کے ساتھ تو) یوں کیا اور ان کے بعد بنی اسرائیل کو ان کا مالک بنا دیا (یہ درمیان میں بطور جملہ معترضہ تھا)۔

**وَاَوۡرَثۡنٰهَا بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ:** اس میں بظاہر یہ تصریح ہے کہ قوم فرعون کی چھوڑی ہوئی املاک، جائداد، باغات اور خزائن کا مالک فرعون کے غرق ہونے کے بعد بنی اسرائیل کو بنا دیا گیا، لیکن اس میں ایک تاریخی اشکال یہ ہے کہ خود قرآن کی متعدد آیات اس پر شاہد ہیں کہ اس وقت تو بنی اسرائیل مصر کو نہیں لوٹے، بلکہ اپنے اصلی وطن شام کی طرف روانہ ہوئے، پھر ایک کافر قوم سے جہاد کا حکم ملا، جس کی تعمیل سے بنی اسرائیل نے انکار کر دیا، اس پر بطور عذاب کے وادی تیہ کے کھلے میدان میں جس میں بنی اسرائیل موجود تھے ایک قدرتی جیل خانہ بنا دیا گیا کہ وہ اس میدان سے نکل نہیں سکتے تھے، اسی حال میں چالیس سال گذرے اور اسی وادی تیہ میں ان کے دونوں پیغمبروں حضرت موسی وہارون علیہما السلام کی وفات ہوگئی، اس کے بعد بھی کتب تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کسی وقت بنی اسرائیل اجتماعی اور قومی صورت سے مصر میں داخل ہوئے ہوں کہ قوم فرعون کی جائداد اور خزائن پر ان کا قبضہ ہوا ہو، اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں یہ تصریح نہیں ہے کہ فرعون کے ہلاک ہوتے ہی بنی اسرائیل مصر پر قابض ہوگئے، بلکہ صرف اتنا مذکور ہے کہ ان کو مالک بنا دیا، اور مالک بنانا عام ہے، خواہ اسی وقت مالک بنایا ہو، یا کچھ زمانہ کے بعد، سو حکومت مصر میں ایسے انقلابات ہوتے رہے کہ ایک وقت میں وہ بھی بنی اسرائیل کی سلطنت میں شامل ہوگیا، اور یہ زمانہ سلیمان علیہ السلام کا تھا، ایک جواب یہ بھی دیا گیا ہے کہ یہاں مضاف محذوف ہے یعنی: "واورثنا أمثالها بنی اسرائیل"، امثال سے مراد سرزمین شام کے باغات وچشمے ہیں، یعنی بنی اسرائیل کو اسی طرح کے خزائن اور باغات وغیرہ کا مالک بنا دیا گیا جس طرح کے باغات قوم فرعون کے پاس تھے، جس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ ارض مصر ہی میں پہنچ کر حاصل ہوں، بلکہ ارض شام میں بھی حاصل ہو سکتے ہیں اور سورہ اعراف کی آیت میں التی بارکنا فیها کے الفاظ سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ارض شام مراد ہے، کیونکہ قرآن کی متعدد آیات میں بارکنا وغیرہ کے الفاظ اکثر ارض شام ہی کے بارے میں آئے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی اس طرح قبطی گھر بار، مال ودولت، باغ اور کھیتاں چھوڑ کر بنی اسرائیل کے تعاقب میں ایک دم نکل پڑے، جنہیں پھر لوٹنا نصیب نہ ہوا، گویا اس تدبیر سے اللہ تعالیٰ نے ان کو نکال باہر کیا۔

**فائدہ:** ۲ یا تو اس کے بعد ہی یہ چیزیں بنی اسرائیل کے ہاتھ لگیں اور یا ایک مدت بعد سلیمان علیہ السلام کے عہد میں ملک مصر بھی ان کی سلطنت میں شامل ہوا، واللہ اعلم، پہلے اس کے متعلق اختلاف گزر چکا ہے۔

فَاَتۡبَعُوۡهُمۡ مُّشۡرِقِيۡنَ ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا تَرَآءَ الۡجَمۡعٰنِ قَالَ اَصۡحٰبُ مُوۡسٰٓى اِنَّا لَمُدۡرَكُوۡنَ ﴿۶۱﴾

پھر پیچھے پڑے ان کے سورج نکلنے کے وقت۔ پھر جب مقابل ہوئیں دونوں فوجیں کہنے لگے موسیٰ کے لوگ ہم تو پکڑے گئے ۱

قَالَ كَلَّا ۚ إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ ﴿٦٢﴾

کہا ہرگز (کوئی) نہیں، میرے ساتھ ہے میرا رب وہ مجھ کو راہ بتلائے گا ؀

**خلاصہ تفسیر:** (جملہ معترضہ کے بعد اب آگے قصہ ہے) غرض (ایک روز) سورج نکلنے کے وقت ان کو پیچھے سے جالیا (یعنی قریب پہنچ گئے، اس وقت بنی اسرائیل دریائے قلزم سے اترنے کی فکر میں تھے کہ پار ہونے کا کیا سامان کریں) پھر جب دونوں جماعتیں (باہم ایسی قریب ہوئیں کہ) ایک دسرے کو دیکھنے لگیں تو موسیٰ (علیہ السلام) کے ہمراہی (گھبرا کر) کہنے لگے کہ (اے موسیٰ!) بس ہم تو ان کے ہاتھ آ گئے، موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ ہرگز نہیں کیونکہ میرے ہمراہ میرا پروردگار ہے وہ مجھ کو ابھی (دریا سے نکلنے کا) رستہ بتلا دے گا (کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کو روانگی کے وقت ہی کہہ دیا گیا تھا کہ سمندر میں خشک راستہ پیدا ہو جائے گا: فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخَافُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشَىٰ اگرچہ خشک ہونے کی کیفیت اس وقت نہ بتلائی تھی کہ خشک راستہ کس طرح پید ہو جائے گا، پس موسیٰ علیہ السلام اس وعدہ پر مطمئن تھے اور بنی اسرائیل کیفیت معلوم نہ ہونے سے مضطرب تھے)۔

كَلَّا ۚ إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ: اس میں یہ مسئلہ ہے کہ تدبیر اور ترک تدبیر کے مسئلہ میں اعتدال وتوسط کی تعلیم ملتی ہے، اللہ تعالی نے موسی علیہ السلام کو پہلے تدبیر تو یہ بتائی کہ قوم کو لے کر راتوں رات چلے جاؤ، پھر جب قوم نے پکڑے جانے کا اندیشہ ظاہر کیا جس سے مقصود یہ تھا کہ کچھ تدبیر کی جائے تو موسی علیہ السلام نے انہیں: كَلَّا إِنَّ مَعِيَ رَبِّي فرما کر یہ بتلایا کہ حق تعالی کی معیت ہوتے ہوئے ہماری تدبیر کی ضرورت نہیں، عارفین کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ اسباب تو اختیار کرتے ہیں مگر توسط واعتدال کے ساتھ اور اس میں مبالغہ وغلو نہیں کرتے۔

* * *

**فائدہ:** ؁ یعنی بحر قلزم کے کنارہ پہنچ کر بنی اسرائیل پار ہونے کی فکر کر رہے تھے کہ پیچھے سے فرعونی لشکر نظر آیا گھبرا کر موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ اب ان کے ہاتھ سے کیسے بچیں گے، آگے سمندر حائل ہے اور پیچھے سے دشمن دبائے چلا آ رہا ہے۔

**فائدہ:** ؀ یعنی گھبراؤ نہیں، اللہ کے وعدوں پر اطمینان رکھو، اس کی حمایت ونصرت میرے ساتھ ہے، وہ یقیناً ہمارے لیے کوئی راستہ نکال دے گا، ناممکن ہے کہ دشمن ہم کو پکڑ سکے۔

فَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنِ اضْرِب بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ۖ فَانفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ ﴿٦٣﴾

پھر حکم بھیجا ہم نے موسیٰ کو کہ مار اپنے عصا سے دریا کو، پھر دریا پھٹ گیا تو ہوگئی ہر پھانک جیسے بڑا پہاڑ

**خلاصہ تفسیر:** پھر ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو حکم دیا کہ اپنی عصا کو دریا پر مارو، چنانچہ (انہوں نے اس پر عصا مارا جس سے) وہ (دریا) پھٹ (کر کئی حصے ہو) گیا (یعنی پانی کئی جگہ سے ادھر ادھر ہٹ کر بیچ میں چند سڑکیں کھل گئیں) اور ہر حصہ اتنا (بڑا) تھا جیسا بڑا پہاڑ (یہ لوگ امن واطمینان کے ساتھ دریا پار ہو گئے)۔

فَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ: روح المعانی میں ہے کہ اگرچہ حق تعالی اس طریقہ کے بغیر بھی سمندر میں رستے کرنے پر قادر تھے مگر اس طریقہ میں موسی علیہ السلام کی عظمت ظاہر فرمانا تھی، اور اولیاء اللہ کے ہاتھ پر خوارق ظاہر ہونے کی یہی حکمت ہوتی ہے، اسی لیے اسے کرامت کہتے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** پانی بہت گہرا تھا، بارہ جگہ سے پھٹ کر خشک راستے بن گئے، بارہ قبیلے بنی اسرائیل کے الگ الگ ان میں سے گزرے اور بیچ میں پانی کے پہاڑ کھڑے رہ گئے (کذا فی موضح القرآن)۔

وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِیْنَ ﴿۶۴﴾ وَاَنْجَیْنَا مُوْسٰی وَمَنْ مَّعَهٗۤ اَجْمَعِیْنَ ﴿۶۵﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِیْنَ ﴿۶۶﴾

اور پاس پہنچا دیا ہم نے اسی جگہ دوسروں کو، اور بچا دیا ہم نے موسیٰ کو اور جو لوگ تھے اس کے ساتھ سب کو، پھر ڈبا دیا ہم نے ان دوسروں کو ۱

**خلاصہ تفسیر:** اور ہم نے دوسرے فریق کو بھی اس موقع کے قریب پہنچا دیا (یعنی فرعون اور فرعونی بھی دریا کے نزدیک پہنچے اور سابقہ پیشین گوئی کے موافق: وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا دریا اس وقت تک اسی حال پر ٹھہرا ہوا تھا، اس لئے کھلے ہوئے رستہ کو غنیمت سمجھا اور آگے پیچھے کچھ سوچا نہیں، سارا لشکر اندر گھس گیا اور چاروں طرف سے پانی سمٹنا شروع ہوا اور سارے لشکر کا کام تمام ہوا) اور (انجام قصہ کا یہ ہوا کہ) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اور ان کے ساتھ والوں سب کو (غرق ہونے سے) بچا لیا، پھر دوسروں کو (یعنی ان کے مخالفوں کو) غرق کر دیا۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی فرعونی لشکر بھی قریب آ گیا اور دریا میں راستے بنے ہوئے دیکھ کر بنی اسرائیل کے بعد بے سوچے سمجھے گھس پڑا، جب تمام لشکر دریا کی لپیٹ میں آ گیا، فوراً خدا کے حکم سے پانی کے پہاڑ ایک دوسرے سے مل گئے، یہ قصہ پہلے گزر چکا ہے۔

ع اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۶۷﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿۶۸﴾

اس چیز میں ایک نشانی ہے اور نہیں تھے بہت لوگ ان میں ماننے والے ۱ اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا ۲

**خلاصہ تفسیر:** (اور) اس واقعہ میں بھی بڑی عبرت ہے (یعنی اس قابل ہے کہ کفار اس سے استدلال کریں کہ احکام و رسول کی مخالفت عذاب خداوندی کا سبب ہے اور اس کو سمجھ کر مخالفت سے بچیں) اور (باوجود اس کے) ان (کفار مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے اور آپ کا رب بڑا زبردست ہے (اگر چاہتا دنیا میں ہی ان کو عذاب دیتا لیکن) بڑا مہربان (بھی) ہے (اس لئے اپنی رحمت عامہ سے مہلت دے رکھی ہے، پس جلدی عذاب نہ ہونے سے بے فکر نہیں ہونا چاہئے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی جب اکثروں نے حق قبول نہ کیا تو آخر میں قدرت نے یہ نشان دکھلایا، جس سے صادقین اور مکذبین کے انجام کا دنیا ہی میں الگ الگ پتہ چل جاتا ہے۔

**فائدہ:** ۲ یہ سنا دیا ہمارے حضرت ﷺ کو کہ مکہ کے فرعون بھی مسلمانوں کے پیچھے نکلیں گے لڑائی کو، پھر وطن سے باہر تباہ ہوں گے "بدر" کے دن، جیسے فرعون تباہ ہوا، (موضح القرآن)

وقف لازم وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِیْمَ ﴿۶۹﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا

اور سنا دے ان کو خبر ابراہیم کی، جب کہا اپنے باپ کو اور اس کی قوم کو تم کس کو پوجتے ہو ۱ وہ بولے ہم پوجتے ہیں مورتوں کو

فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِیْنَ ﴿۷۱﴾

پھر سارے دن (دن بھر) انہی کے پاس لگے بیٹھے رہتے ہیں ۲

**خلاصہ تفسیر:** (دوسرا قصہ: حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی قوم) اور آپ ان لوگوں کے سامنے ابراہیم (علیہ السلام) کا قصہ بیان کیجئے (تا کہ ان کو شرک کی برائی کے دلائل معلوم ہوں، خصوصاً ابراہیم علیہ السلام سے منقول ہو کر، کیونکہ یہ مشرکین عرب اپنے آپ کو دین

ابراہیمی پر بتلاتے ہیں اور وہ قصہ اس وقت ہوا تھا) جبکہ انہوں نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے (جو کہ بت پرست تھی) فرمایا کہ تم کس (واہیات) چیز کی عبادت کیا کرتے ہو؟ انہوں نے کہا ہم بتوں کی عبادت کیا کرتے ہیں اور ہم انہی (کی عبادت) پر جمے بیٹھے رہتے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی یہ چیز کیا ہے جسے تم پوجتے ہو؟

**فائدہ:** ۲ یعنی تم ہمارے معبودوں کو جانتے نہیں، جو ایسی تحقیر سے سوال کر رہے ہو، ہم ان مورتوں کو پوجتے ہیں اور اس قدر وقعت، عقیدت ہمارے دل میں ہے کہ دن بھر آسن جما کر ان ہی کو لگے بیٹھے رہتے ہیں۔

قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ﴿۷۲﴾ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ﴿۷۳﴾

کہا کچھ سنتے ہیں تمہارا کیا جب تم پکارتے ہو ۱ یا کچھ بھلا کرتے ہیں تمہارا یا برا ۲

قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۴﴾

بولے نہیں پر ہم نے پایا اپنے باپ دادوں کو یہی کام کرتے ۱

**خلاصہ تفسیر:** ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ یہ تمہاری سنتے ہیں جب تم ان کو (اپنی عرض حاجت کے وقت) پکارا کرتے ہو یا (تم جو ان کی عبادت کرتے ہو تو کیا) یہ تم کو کچھ نفع پہنچاتے ہیں یا (اگر تم ان کی عبادت ترک کر دو تو کیا) یہ تم کو کچھ ضرر پہنچا سکتے ہیں (یعنی معبود ہونے کے لئے علم اور کامل قدرت بھی تو ضروری ہے) ان لوگوں نے کہا نہیں (یہ بات تو نہیں ہے کہ یہ کچھ سنتے ہوں یا نفع و نقصان پہنچا سکتے ہوں یعنی ان میں علم اور قدرت کچھ نہیں اور ان کی عبادت کرنے کی یہ وجہ نہیں) بلکہ ہم نے اپنے بڑوں کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے (اس لئے ہم بھی وہی کرتے ہیں)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی اتنا پکارنے پر کبھی تمہاری بات سنتے ہیں؟ اگر نہیں سنتے (جیسا کہ انکے جماد ہونے سے ظاہر ہے) تو پکارنا فضول ہے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی کیا پوجنے پر کچھ نفع یا نہ پوجنے کی صورت میں کچھ نقصان پہنچا سکتے ہیں؟ ظاہر ہے جو اپنے اوپر سے مکھی تک نہ اڑا سکیں وہ دوسرے کو کیا نفع نقصان پہنچا سکیں گے؟ پھر ایسی عاجز و لایعقل چیز کو معبود بنانا کہاں کی عقلمندی ہے۔

**فائدہ:** ۳ یعنی ان منطقی بحثوں اور کج حجتیوں کو ہم نہیں جانتے، نہ ہماری عقیدت اور پرستش کا مدار ان باتوں پر ہے بس سو دلیلوں کی ایک دلیل یہ ہے کہ ہمارے بڑے اسی طرح کرتے چلے آئے، یا ہم ان سب کو احمق سمجھ لیں۔

قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۵﴾ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ﴿۷۶﴾

کہا بھلا دیکھتے ہو جن کو پوجتے رہے ہو، تم اور تمہارے باپ دادے اگلے ۱

فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۷﴾

سو وہ میرے غنیم (دشمن) ہیں ۲ مگر جہان کا رب ۳

**خلاصہ تفسیر:** ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ بھلا تم نے ان (کی حالت) کو (غور سے) دیکھا بھی جن کی تم عبادت کیا کرتے ہو تم بھی اور تمہارے پرانے بڑے بھی کہ یہ (معبودین) میرے (یعنی تمہارے لئے) باعث ضرر ہیں (یعنی اگر ان کی عبادت کی جائے خواہ نعوذ باللہ میں کروں یا تم کرو تو نقصان کے علاوہ اور کوئی نتیجہ نہیں) مگر ہاں رب العالمین (ایسا ہے کہ وہ اپنی عبادت کرنے والوں کا دوست ہے اور اس کی

عبادت ہر حالت میں سراسر نافع ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی ان کا پوجنا ایک پرانی حماقت ہے، ورنہ جس کے اختیار اور قبضہ میں ذرہ برابر نفع نقصان نہ ہو اس کی عبادت کیسی؟

**فائدہ:** ۲ یعنی لو! میں بے خوف وخطر اعلان کرتا ہوں کہ تمہارے ان معبودوں سے میری لڑائی ہے، میں ان کی گت بنا کر رہوں گا: وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ (الانبیاء:۵۷) اگر ان میں کوئی طاقت ہے تو مجھ کو نقصان پہنچا دیکھیں، کما قال تعالیٰ فی موضع آخر: وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ رَبِّيْ شَيْـــًٔا (الانعام:۸۰) وقال نوح علیه السلام: فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَاۗءَكُمْ (یونس:۷۱) وقال هود علیه السلام: فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ (ہود:۵۵) اور بعض مفسرین نے کہا کہ یہ نہایت موثر ولطیف پیرایہ میں مشرکین پر تعریض ہے، یعنی جن کی تم عبادت کر رہے ہو میں ان کو اپنا دشمن سمجھتا ہوں، اگر نعوذ باللہ ان کی پرستش کروں تو سراسر نقصان ہے، اسی سے سمجھ لو کہ تم بھی ان کی عبادت کر کے نقصان اٹھا رہے ہو۔

**فائدہ:** ۳ کہ وہ ہی میرا معبود، دوست اور مددگار ہے۔

## الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ۝۷۸ۙ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ۝۷۹ۙ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۝۸۰ۙ

جس نے مجھ کو بنایا سو وہی مجھ کو راہ دکھلاتا ہے ۱ اور وہ جو مجھ کو کھلاتا ہے اور پلاتا ہے، اور جب میں بیمار ہوں تو وہی شفا دیتا ہے

**خلاصہ تفسیر:** جس نے مجھ کو (اور اسی طرح سب کو) پیدا کیا، پھر وہی مجھ کو (میری مصلحتوں تک) رہنمائی کرتا ہے (یعنی عقل و سمجھ دیتا ہے جس سے نفع ونقصان کو سمجھتا ہوں) اور جو مجھ کو کھلاتا پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہو جاتا ہوں (جس کے بعد شفاء ہو جاتی ہے) تو وہی مجھ کو شفا دیتا ہے۔

**وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ:** اس میں بندگی کی کامل تعلیم اور ادب کا اظہار موجود ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعاؤں میں یہ ظاہر کر دیا کہ جس طرح دینی نعمت (ہدایت) کی مجھے ضرورت ہے، اسی طرح دنیاوی نعمت کھانے پینے کی بھی احتیاج ہے (ہر دو نعمتوں کا محتاج ہوں) بعض زہد وقناعت کے دعوے دار دنیاوی نعمتوں سے بے نیازی اور استغنا برتتے ہیں اور اس کو رضا وتسلیم کے خلاف خیال کرتے ہیں، لیکن ابراہیم علیہ السلام فرما رہے ہیں کہ جس طرح ہدایت ورہنمائی کا میں محتاج ہوں اسی طرح کھانے پینے، صحت اور شفا کا بھی محتاج ہوں۔

**وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ:** الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام یہ نہیں فرما رہے کہ وہی مجھے بیمار کرتا ہے اور وہی شفا دیتا ہے، بلکہ یہ فرما رہے ہیں کہ جب میں بیمار پڑتا ہوں تو وہی شفا دیتا ہے، گویا بیماری اور نقص کی نسبت اپنی طرف کرتے ہیں اور شفا بخشی وصحت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر رہے ہیں، اسی کا نام ادب واحترام اور حق بندگی ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی فلاح دارین کی راہ دکھاتا اور اعلیٰ درجہ کے فوائد ومنافع کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔

## وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ۝۸۱ۙ وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْۗـــَٔــتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ۝۸۲ۭ

اور وہ جو مجھ کو مارے گا پھر جلائے گا ۱ اور وہ جو مجھ کو توقع ہے کہ بخشے میری تقصیر انصاف کے دن ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور جو مجھ کو (وقت پر) موت دے گا پھر (قیامت کے روز) مجھ کو زندہ کرے گا، اور جس سے مجھ کو یہ امید ہے کہ میری غلط کاری کو قیامت کے روز معاف کر دے گا (یہ تمام تر صفات اس لئے سنائیں تاکہ قوم کو خدا تعالیٰ کی عبادت کی رغبت ہو)۔

اَنۡ یَّغۡفِرَ لِیۡ خَطِیۡٓـَٔتِیۡ: غلط کاری سے مراد خلاف اولی امور ہیں، ورنہ انبیاء کرام تو گناہوں سے پاک ہیں۔
اس میں دو ادب ہیں: ① ایک اپنی اجتہادی غلطی کو غلطی سمجھنا اور اسے غلطی تسلیم کرنا، جاہلوں کی طرح نہیں کہ غلطی کی تاویل کی جائے ② دوسرا اپنی معافی ومغفرت کو جزم ویقین کے ساتھ بیان نہ کرنا تا کہ اللہ تعالیٰ پر کسی امر کا واجب نہ ہونا ظاہر ہو (مغفرت کے لیے ایسے الفاظ لائے جس سے درخواست ظاہر ہوتی ہے نہ کہ حکم)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی کھلانا پلانا، مارنا جلانا اور بیماری سے اچھا کرنا، سب اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔
**فائدہ:** ۲ یعنی کسی معاملہ میں بھول چوک یا اپنے درجہ کے موافق خطاء وتقصیر ہو جائے تو اس کی مہربانی سے معافی کی توقع ہو سکتی ہے، کوئی دوسرا معاف کرنے والا نہیں، آگے حق تعالیٰ کے کمالات اور مہربانیوں کا ذکر کرتے کرتے حضرت ابراہیم نے غلبہ حضور سے دعا شروع کر دی جو کمال عبدیت کے لوازم میں سے ہے۔

رَبِّ هَبۡ لِیۡ حُكۡمًا وَّ اَلۡحِقۡنِیۡ بِالصّٰلِحِیۡنَ ﴿۸۳﴾ وَاجۡعَلۡ لِّیۡ لِسَانَ صِدۡقٍ فِی الۡاٰخِرِیۡنَ ﴿۸۴﴾

اے میرے رب! دے مجھ کو حکم اور ملا (شامل کر) مجھ کو نیکوں میں ۱ اور رکھ میرا بول سچا پچھلوں میں ۲

**خلاصہ تفسیر:** پھر صفات کمال بیان فرماتے فرماتے غلبہ حضور سے حق تعالیٰ سے مناجات کرنے لگے کہ:
اے میرے پروردگار! مجھ کو حکمت (یعنی علم وعمل میں پورا کمال) عطا فرما (کیونکہ نفس حکمت تو دعا کے وقت بھی حاصل ہے) اور (مراتب قرب میں) مجھ کو (اعلیٰ درجہ کے) نیک لوگوں کے ساتھ شامل فرما (مراد انبیاء عالیشان ہیں) اور میرا ذکر آئندہ آنے والوں میں جاری رکھ (تا کہ وہ بھی میرے طریقہ پر چلیں جس میں مجھ کو زیادہ ثواب ملے)۔

رَبِّ هَبۡ لِیۡ حُكۡمًا وَّ اَلۡحِقۡنِیۡ بِالصّٰلِحِیۡنَ: اس دعا کے ① پہلے جملہ: رَبِّ هَبۡ لِیۡ حُكۡمًا سے قوت علمیہ کی طرف اشارہ ہے یعنی علم وحکمت میں ترقی ہو ② اور دعا کے دوسرے جملہ: وَّ اَلۡحِقۡنِیۡ بِالصّٰلِحِیۡنَ سے قوت عملیہ کی طرف اشارہ ہے، اور یہ دونوں آپ کو حاصل تھے، پھر ان کے طلب کرنے میں اشارہ ہے کہ انسان کو کسی حد پر ٹھہرنا نہیں چاہیے، بلکہ ہمیشہ طلب اور ترقی میں لگا رہے، اور الحقنی کے عنوان میں تواضع بھی ہے کہ صالح ہونا تو بہت بڑا درجہ ہے صالحین میں شامل ہو جاؤں۔
لِسَانَ صِدۡقٍ فِی الۡاٰخِرِیۡنَ: اس دعا سے بعض بزرگوں کی اُس دعا وتمنا کی اصل ملتی ہے کہ انہوں نے اپنے سلسلہ تعلیم وتربیت کی بقا اور تحفظ کے لیے دعائیں کی ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی مزید علم وحکمت اور درجات قرب وقبول مرحمت فرما، اور اعلیٰ درجہ کے نیکوں کے زمرہ میں (جو انبیاء علیہم السلام ہیں) شامل رکھ، کما قال نبینا ﷺ: "اَللّٰهُمَّ فِی الرَّفِیقِ الۡاَعۡلٰی" اس دعا سے اپنی کامل احتیاج اور حق تعالیٰ کی غناء کا اظہار مقصود ہے یعنی نبی ہو یا ولی، اللہ تعالیٰ کسی کے معاملہ میں مجبور ومضطر نہیں، ہمہ وقت اس کے فضل ورحمت سے کام چلتا ہے۔
**فائدہ:** ۲ یعنی ایسے اعمالِ مرضیہ اور آثارِ حسنہ کی توفیق دے کر پیچھے آنے والی نسلیں ہمیشہ میرا ذکر خیر کریں اور میرے راستہ پر چلنے کی طرف راغب ہوں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آخر زمانے میں میرے گھرانے سے نبی ہو اور امت ہو، اور میرا دین تازہ کریں، چنانچہ یہ ہی ہوا کہ حق تعالیٰ نے ابراہیم کو دنیا میں قبولِ عام عطا فرمایا، ان کی نسل سے خاتم الانبیاء ﷺ کو مبعوث کیا جنہوں نے ملت ابراہیمی کی تجدید کی اور فرمایا کہ میں ابراہیم کی دعا ہوں، آج بھی ابراہیم کا ذکر خیر اہل ملل کی زبانوں پر جاری ہے اور امت محمدیہ تو ہر نماز میں كَمَا صَلَّيۡتَ عَلٰی اِبۡرَاهِیۡمَ اور كَمَا بَارَكۡتَ عَلٰی

اِبْرٰهِيْمَ پڑھتی ہے۔

وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ﴿۸۵﴾ وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۸۶﴾

اور کر مجھ کو وارثوں میں نعمت کے باغ کے ۱؎ اور معاف کر میرے باپ کو وہ تھا راہ بھولے ہوؤں میں ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور مجھ کو جنت النعیم کے مستحقین میں سے کر اور میرے باپ (کو ایمان کی توفیق دے کر اس) کی مغفرت فرما کہ وہ گمراہ لوگوں میں ہے۔

**وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ**: اس دعا کی طلب وحرص سے ان نادان صوفیوں پر رد ہوتا ہے جو جنت سے بے نیازی اور استغنا کا دعوی کرتے ہیں کہ ہمیں جنت کی طلب نہیں، حالانکہ ابراہیم علیہ السلام تو اللہ تعالی سے جنت کی دعا کر رہے ہیں، لیکن اگر کوئی غلبہ حال کی بنا پر کہے تو ایسا شخص معذور و مستثنیٰ ہے۔

**وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ**: خلاصہ تفسیر میں والد کے لیے دعائے مغفرت کی جو توجیہ کی گئی ہے کہ "ایمان کی توفیق دے کر اس کی مغفرت کر دیجیے"، اس سے کافر کے لیے استغفار کرنے کا شبہ نہ رہا، کیونکہ اس کا حاصل ہدایت کے لیے دعا کرنا ہے، اور یہ دعا کافر کے واسطے بھی جائز ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی جنت کا جو آدم کی میراث ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دعا باپ کی موت کے بعد کی، مگر دوسری جگہ تصریح آ گئی کہ جب اس کا دشمن خدا ہونا ظاہر ہو گیا تو برأت اور بیزاری کا اظہار فرمایا، کما قال تعالی: وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (التوبہ: ۱۱۴) اور اگر انہ کان من الضآلین میں "کان" کا ترجمہ "تھا" کے بجائے "ہے" سے کیا جائے، پھر کوئی اشکال نہیں، کیونکہ زندگی میں ایمان لے آنے کا امکان تھا، تو دعاء کا حاصل یہ ہے کہ الٰہی اس کو ایمان سے مشرف فرما کر کفر کے زمانہ کی خطائیں معاف فرما دے، اس کی قدرے مفصل تحقیق پہلے کسی جگہ گزر چکی ہے، فلیراجع۔

وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۸۷﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۹﴾

اور رسوا نہ کر مجھ کو جس دن سب جی کر اٹھیں، جس دن نہ کام آئے کوئی مال اور نہ بیٹے، مگر جو کوئی آیا اللہ کے پاس لیکر دل چنگا (بے روگ) ۱؎

**خلاصہ تفسیر:** اور جس روز سب زندہ ہو کر اٹھیں گے اس روز مجھ کو رسوا نہ کرنا (آگے اس دن کے بعض ہیبت ناک واقعات کا بھی ذکر فرما دیا تاکہ قوم سنے اور ڈرے، یعنی وہ ایسا دن ہوگا) جس دن میں کہ (نجات کے لئے) نہ مال کام آئے گا نہ اولاد مگر ہاں (اس کو نجات ہوگی) جو اللہ کے پاس (کفر و شرک سے) پاک دل لے کر آئے گا۔

**يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ**: اس پر یہ شبہ نہ ہو کہ مسلمانوں کو تو صدقہ کیے ہوئے مال اور نیک اولاد سے یا جو نابالغ ہی مر گئے ہوں ان سے تو نفع ہوتا ہے، جواب یہ ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ مال و اولاد کی ذات خود نافع نہیں، جب تک کہ ان کے ساتھ کوئی نیک عمل نہ ملے اور مؤمن چونکہ مال کو خیرات کرتا ہے، یا اولاد کے مرنے پر صبر کرتا ہے، یا اولاد اس کو محسن سمجھ کر ثواب بخشتی ہے، یا وہ ان کی تعلیم دین کیلئے کوشش کرتا ہے، اس وجہ سے اسکو نفع ہوتا ہے تو یہ نفع اپنے عمل سے ہوا، مال و اولاد کی ذات سے نہیں ہوا، پس اس جواب کی ضرورت نہیں کہ یہ نفع نہ ہونا کفار کے لیے مخصوص ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی بھلا چنگا بے روگ دل جو کفر و نفاق اور فاسد عقیدوں سے پاک ہوگا وہ ہی وہاں کام دے گا، نرے مال و اولاد کچھ کام نہ آئیں گے، اگر کافر چاہے کہ قیامت میں مال و اولاد فدیہ دے کر جان چھڑا لے، تو ممکن نہیں، یہاں کے صدقات و خیرات اور نیک اولاد سے بھی کچھ نفع کی

توقع اسی وقت ہے جب اپنا دل کفر کی پلیدی سے پاک ہو۔

وَاُزۡلِفَتِ الۡجَنَّةُ لِلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۹۰﴾ وَبُرِّزَتِ الۡجَحِيۡمُ لِلۡغٰوِيۡنَ ﴿۹۱﴾

اور پاس لائیں بہشت کو واسطے ڈروالوں کے، اور نکالیں دوزخ کو سامنے بے راہوں کے ۱؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (اس روز) خدا ترسوں (یعنی ایمان والوں) کے لئے جنت نزدیک کردی جائے گی (کہ اس کو دیکھیں اور یہ معلوم کر کے کہ ہم اس میں جائیں گے خوش ہوں) اور ان گمراہوں (یعنی کافروں) کے لئے دوزخ سامنے ظاہر کی جائے گی (کہ اس کو دیکھ کر غمزدہ ہوں کہ ہم اس میں جائیں گے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی محشر میں جنت مع اپنی انتہائی آرائش وزیبائش کے متقین کو قریب نظر آئے گی، جسے دیکھ کر داخل ہونے سے پہلے ہی مسرور و محفوظ ہوں گے، اسی طرح دوزخ کو مجرموں کے پاس لے آئیں گے تاکہ داخل ہونے سے پیشتر ہی خوف کھا کر لرزنے لگیں۔

وَقِيۡلَ لَهُمۡ اَيۡنَ مَا كُنۡتُمۡ تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۹۲﴾ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ؕ هَلۡ يَنۡصُرُوۡنَكُمۡ اَوۡ يَنۡتَصِرُوۡنَ ﴿۹۳﴾

اور کہیں ان کو کہاں ہیں جن کو تم پوجتے تھے۔اللہ کے سوائے، کیا کچھ مدد کرتے ہیں تمہاری یا بدلہ لے سکتے ہیں

**خلاصہ تفسیر:** اور (اس روز) ان (گمراہوں) سے کہا جائے گا کہ وہ معبود کہاں گئے جن کی تم خدا کے سوا عبادت کیا کرتے تھے کیا (اس وقت) وہ تمہارا ساتھ دے سکتے ہیں یا اپنا ہی بچاؤ کر سکتے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** یعنی اب وہ فرضی معبود کہاں گئے کہ نہ تمہاری مدد کر کے اس عذاب سے چھڑا سکتے ہیں نہ بدلہ لے سکتے ہیں بلکہ خود اپنی بھی مدد نہیں کر سکتے۔

فَكُبۡكِبُوۡا فِيۡهَا هُمۡ وَالۡغَاوٗنَ ﴿۹۴﴾ وَجُنُوۡدُ اِبۡلِيۡسَ اَجۡمَعُوۡنَ ﴿۹۵﴾ قَالُوۡا وَهُمۡ فِيۡهَا يَخۡتَصِمُوۡنَ ﴿۹۶﴾

پھر اوندھے ڈالیں اس میں ان کو اور سب بے راہوں کو، اور ابلیس کے لشکر کو سبھوں کو، کہیں گے جب وہ وہاں باہم جھگڑنے لگیں

تَاللّٰهِ اِنۡ كُنَّا لَفِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۹۷﴾ اِذۡ نُسَوِّيۡكُمۡ بِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۹۸﴾ وَمَاۤ اَضَلَّنَاۤ اِلَّا الۡمُجۡرِمُوۡنَ ﴿۹۹﴾

قسم اللہ کی ہم تھے صریح غلطی میں، جب ہم تم کو برابر کرتے تھے پروردگارِ عالم کے، اور ہم کو راہ سے بہکایا سو ان گناہ گاروں نے

فَمَا لَنَا مِنۡ شَافِعِيۡنَ ﴿۱۰۰﴾ وَلَا صَدِيۡقٍ حَمِيۡمٍ ﴿۱۰۱﴾ فَلَوۡ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۰۲﴾

پھر کوئی نہیں ہماری سفارش کرنے والے، اور نہ کوئی دوست محبت کرنے والا ۱؎ سو کسی طرح ہم کو پھر جانا ملے تو ہم ہوں ایمان والوں میں ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** پھر (یہ کہہ کر) وہ (عابدین) اور گمراہ لوگ اور ابلیس کا لشکر سب کے سب دوزخ میں اوندھے منہ ڈال دیئے جائیں گے (بس وہ بت اور شیاطین نہ اپنے کو بچا سکے نہ اپنے عابدین کو) وہ کافر اس دوزخ میں گفتگو کرتے ہوئے (ان معبودین سے) کہیں گے کہ بخدا بیشک ہم صریح گمراہی میں تھے جبکہ تم کو (عبادت میں) رب العالمین کے برابر کرتے تھے اور ہم کو تو بس ان بڑے مجرموں نے (جو کہ بانی ضلالت تھے) گمراہ کیا، سو (اب) نہ کوئی ہمارا سفارشی ہے (کہ چھڑا لے) اور نہ کوئی مخلص دوست (کہ خالی دلسوزی ہی کر لے) سو کیا اچھا ہوتا کہ ہم کو (دنیا

میں) پھر واپس جانا ملتا کہ ہم مسلمان ہو جاتے۔

فائدہ: ا۔ یعنی بت اور بت پرست اور ابلیس کا سارا لشکر، سب کو دوزخ میں اوندھے منہ گرا دیا جائے گا، وہاں پہنچ کر آپس میں جھگڑیں گے، ایک دوسرے کو الزام دے گا اور آخر کار اپنی گمراہی کا اعتراف کریں گے کہ واقعی ہم سے بڑی سخت غلطی ہوئی کہ تم کو (یعنی بتوں کو یا دوسری چیزوں کو جنہیں خدائی کے حقوق و اختیار دے رکھے تھے) رب العالمین کے برابر کر دیا، کیا کہیں یہ غلطی ہم سے ان بڑے شیطانوں نے کرائی، اب ہم اس مصیبت میں گرفتار ہیں نہ کوئی بت کام دیتا ہے نہ شیطان مدد کو پہنچتا ہے، وہ خود ہی دوزخ کے کندے بن رہے ہیں، کوئی اتنا بھی نہیں کہ خدا کے یہاں ہماری سفارش کر دے یا کم از کم اس آڑے وقت میں کوئی دوست دلسوزی و ہمدردی کا اظہار کرے، سچ ہے: (اَلۡاَخِلَّآءُ یَوۡمَئِذٍۭ بَعۡضُهُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الۡمُتَّقِیۡنَ (الزخرف:٦٧)

فائدہ: ۲۔ یعنی اگر ایک مرتبہ ہم کو پھر دنیا کی طرف واپس جانے کا موقع دیا جائے تو اب وہاں سے پکے ایماندار بن کر آئیں لیکن یہ کہنا بھی جھوٹ ہے: وَلَوۡ رُدُّوۡا لَعَادُوۡا لِمَا نُهُوۡا عَنۡهُ وَاِنَّهُمۡ لَكٰذِبُوۡنَ (الانعام:۲۸)

ع ۵ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكۡثَرُهُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۰۳﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۰۴﴾

اس بات میں نشانی ہے اور بہت لوگ ان میں نہیں ماننے والے ا۔ اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا

خلاصہ تفسیر: یہاں تک ابراہیم علیہ السلام کی تقریر ہوگئی، اب آگے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

بیشک اس واقعہ (اس مناظرہ کے مضامین نیز واقعہ قیامت) میں (بھی طالبان حق اور انجام اندیشوں کے لئے) ایک عبرت ہے (کہ اس مناظرہ کے مضامین میں غور کر کے توحید کا اعتقاد کریں اور قیامت کے واقع سے ڈریں اور ایمان لائیں) اور (باوجود اس کے) ان (مشرکین مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے، بیشک آپ کا رب بڑا زبردست رحمت والا ہے (کہ عذاب دے سکتا ہے مگر مہلت دے رکھی ہے)۔

فائدہ: ا۔ یعنی ابراہیم کے اس قصہ میں توحید وغیرہ کے دلائل اور مشرکین کا عبرتناک انجام دکھلایا گیا ہے مگر لوگ کہاں مانتے ہیں۔

كَذَّبَتۡ قَوۡمُ نُوۡحِ ۣالۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۱۰۵﴾ اِذۡ قَالَ لَهُمۡ اَخُوۡهُمۡ نُوۡحٌ اَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۰۶﴾ اِنِّیۡ لَكُمۡ رَسُوۡلٌ

جھٹلایا نوح کی قوم نے پیغام لانے والوں کو، جب کہا ان کو ان کے بھائی نوح نے کیا تم کو ڈر نہیں، میں تمہارے واسطے پیغام لانے والا ہوں

اَمِیۡنٌ ﴿۱۰۷﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیۡعُوۡنِ ﴿۱۰۸﴾ وَمَاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَیۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ ۚ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ

معتبر، سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو ا۔ اور مانگتا نہیں میں تم سے اس پر کچھ بدلہ (حق) میرا بدلہ ہے اسی پروردگار

الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۰۹﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیۡعُوۡنِ ﴿۱۱۰﴾

عالم پر، سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو ۲۔

خلاصہ تفسیر: (تیسرا قصہ: حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم) قوم نوح نے پیغمبروں کو جھٹلایا (کیونکہ ایک پیغمبر کی تکذیب سے سب کی تکذیب لازم آتی ہے) جبکہ ان سے ان کی برادری کے بھائی نوح (علیہ السلام) نے فرمایا کہ کیا تم (خدا سے) نہیں ڈرتے؟ میں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں (کہ بعینہ پیغام خداوندی بلا کمی بیشی کے پہنچا دیتا ہوں) سو (اس کا مقتضی یہ ہے کہ) تم لوگ اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو، اور (نیز)

میں تم سے کوئی (دنیوی) صلہ (بھی) نہیں مانگتا، میرا صلہ تو بس رب العالمین کے ذمہ ہے سو (میری اس بے غرضی کا مقتضیٰ بھی یہ ہے کہ) تم اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی نہایت صدق وامانت کے ساتھ حق تعالیٰ کا پیغام بلاکم وکاست تم کو پہنچاتا ہوں، لہٰذا واجب ہے کہ پیغام الٰہی سن کر خدا سے ڈرو، اور میرا کہا مانو۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی ایک بے غرض اور بے لوث آدمی کی بات ماننی چاہیے۔

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ قَالَ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ اِنْ حِسَابُهُمْ

بولے کیا ہم تجھ کو مان لیں اور تیرے ساتھ (ساتھی) ہو رہے ہیں کمینے ۱؎ کہا مجھ کو کیا جاننا ہے اس کا جو کام وہ کر رہے ہیں، ان کا حساب پوچھنا

اِلَّا عَلٰى رَبِّيْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۵﴾

میرے رب کا ہی کام ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو اور میں ہانکنے والا نہیں ایمان لانے والوں کو ۲؎ میں تو بس یہی ڈر سنا دینے والا ہوں کھول کر ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** وہ لوگ کہنے لگے کہ کیا ہم تم کو مانیں گے حالانکہ رذیل لوگ تمہارے ساتھ ہو لئے ہیں (جن کی موافقت سے شرفاء کو عار آتی ہے، دوسرے اکثر ایسے کم حوصلہ لوگوں کی غرض بھی مال حاصل کرنے یا بڑا بننے کی ہوتی ہے، سو یہ لوگ بھی دل سے ایمان نہیں لائے) نوح (علیہ السلام) نے فرمایا کہ ان کے (پیشہ ورانہ) کام سے مجھ کو کیا بحث (خواہ شریف ہوں یا رذیل ہوں دین میں اس تفاوت کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا، جو ایمان لانا چاہے گا اس کا ایمان قبول کیا جائے گا، رہا یہ احتمال کہ ان کا ایمان دل سے نہیں سو اس پر) ان سے حساب وکتاب لینا بس خدا کا کام ہے کیا خوب ہو کہ تم اس کو سمجھو، اور (تمہارا یہ کہنا کہ ”رذیل پیشہ لوگوں کے ساتھ ہونے سے ہم کو عار آتی ہے اس لیے ایمان نہیں لاتے“ اس سے اشارتاً یہ درخواست نکلتی ہے کہ میں ان کو اپنے پاس سے دور کر دوں سو) میں ایمانداروں کو دور کرنے والا نہیں ہوں (خواہ تم ایمان لاؤ یا نہ لاؤ، میرا کوئی نقصان نہیں، کیونکہ) میں تو صاف طور پر ایک ڈرانے والا ہوں (اور احکام پہنچا دینے سے میرا فرض منصبی پورا ہو جاتا ہے، آگے اپنا نفع ونقصان تم لوگ دیکھ لو)۔

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ: اس آیت میں ان لوگوں کی مذمت ہے جو اہل اللہ سے محض ان کی ذاتی حیثیت وخاندانی وجاہت کم درجہ ہونے کے سبب عار کرتے ہیں اور ان سے استفادہ نہیں کرتے (انہیں ایسے اہل اللہ کے ساتھ بیٹھنے میں اپنی کسر شان نظر آتی ہے اور وہ اسے اپنی توہین خیال کرتے ہیں، اس طرح اہل اللہ کے خیرات وحسنات سے محروم رہتے ہیں)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی تھوڑے سے کمینے اور نیچ قوم کے لوگ اپنی نمود کیلئے تیرے ساتھ ہو گئے ہیں، بھلا یہ کیا اونچے کام کریں گے اور ہمارا فضل وشرف کب اجازت دے سکتا ہے کہ ان کمینوں کے دوش بدوش تمہاری مجلس میں بیٹھا کریں پہلے تو آپ ان کو اپنے یہاں سے کھسکائیے پھر ہم سے بات کرنا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی مجھے ان کا صدق وایمان قبول ہے، ان کے پیشے یا نیت اور اندرونی کاموں کے جاننے سے کیا مطلب، اس کا فیصلہ اور حساب تو پروردگار کے یہاں ہوگا، باقی میں تمہاری خاطر سے غریب ایمانداروں کو اپنے پاس سے دھکے نہیں دے سکتا۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی میرا فرض تم کو آگاہ کر دینا تھا سو کر چکا، تمہاری لغو فرمائشیں پوری کرنا میرے ذمہ نہیں۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُوْنِ ﴿۱۱۷﴾

بولے اگر تو نہ چھوڑے گا (باز رہے گا) اے نوح تو ضرور سنگسار کر دیا جائے گا ۱؎ کہا اے رب میری قوم نے تو مجھ کو جھٹلایا

فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّنَجِّنِيْ وَمَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾

سو فیصلہ کر دے میرے ان کے بیچ میں کس طرح کا فیصلہ ۲ اور بچا لے مجھ کو اور جو میرے ساتھ ہیں ایمان والے ۳

**خلاصہ تفسیر:** وہ لوگ کہنے لگے اگر تم (اس کہنے سننے سے) اے نوح! باز نہ آ ؤ گے تو ضرور سنگسار کر دیئے جاؤ گے (غرض جب سالہا سال اس طرح گزر گئے تب) نوح (علیہ السلام) نے دعا کی کہ اے میرے پروردگار! میری قوم مجھ کو (برابر) جھٹلا رہی ہے سو آپ میرے اور ان کے درمیان ایک (عملی) فیصلہ کر دیجئے (یعنی ان کو ہلاک کر دیجئے) اور مجھ کو اور جو ایماندار میرے ساتھ ہیں ان کو (اس ہلاکت سے) نجات دیجئے۔

**فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا:** اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص دین کو نقصان پہنچائے اس کے لیے بد دعا کرنا صبر و حلم کے خلاف نہیں، اور ان کا دین کو نقصان پہنچانا اس آیت میں مذکور ہے: ان تذرهم يضلوا عبادك۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی بس اب ہم کو اپنی نصیحت سے معاف رکھو، اگر اس روش سے باز نہ آئے تو سنگسار کیے جاؤ گے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی میرے اور ان کے درمیان عملی فیصلہ فرما دیجئے، اب ان کے راہِ راست پر آنے کی توقع نہیں۔

**فائدہ:** ۳ یعنی مجھ کو اور میرے ساتھیوں کو الگ کر کے ان کا بیڑا غرق کر۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۱۹﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

پھر بچا دیا ہم نے اس کو اور جو اس کے ساتھ تھے اس لدی (بھری) ہوئی کشتی میں، پھر ڈبا دیا ہم نے اس کے پیچھے ان باقی رہے ہوؤں کو ۱

ع اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۲﴾

البتہ اس بات میں نشانی ہے اور ان میں بہت لوگ نہیں ہیں ماننے والے۔ اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا

**خلاصہ تفسیر:** تو ہم نے (ان کی دعا قبول کی اور) ان کو اور جو اُن کے ساتھ بھری ہوئی کشتی میں (سوار) تھے ان کو نجات دی پھر اس کے بعد ہم نے باقی لوگوں کو غرق کر دیا، اس (واقعہ) میں (بھی) بڑی عبرت ہے اور (باوجود اس کے) ان (کفار مکہ) میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے، بیشک آپ کا رب زبردست (اور) مہربان ہے (کہ باوجود عذاب پر قادر ہونے کے ان کو مہلت دیئے ہوئے ہے)۔

آئندہ قصوں میں بھی دوسرے انبیاء کی دعوت میں اسی طرح کا مضمون آیا ہے، کیونکہ یہ طرز گفتگو سب میں مشترک ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ اس قصہ کی تفصیل پہلے کئی جگہ گزر چکی۔

كَذَّبَتْ عَادُ ِۨالْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۲۵﴾

جھٹلایا عاد نے پیغام لانے والوں کو، جب کہا ان کو ان کے بھائی ہود نے کیا تم کو ڈر نہیں، میں تمہارے پاس پیغام لانے والا معتبر ہوں

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۲۶﴾ وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۷﴾

سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو، اور نہیں مانگتا میں تم سے اس پر کچھ بدلہ میرا بدلہ ہے اسی جہان کے مالک پر

**خلاصہ تفسیر:** (چوتھا قصہ: حضرت ہود علیہ السلام اور ان کی قوم) قوم عاد نے پیغمبروں کو جھٹلایا جبکہ ان سے ان کی (برادری

کے) بھائی ہود (علیہ السلام) نے کہا کہ کیا تم (خدا سے) ڈرتے نہیں ہو؟ میں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں، سو تم اللہ سے ڈرو، اور میری اطاعت کرو، اور میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی صلہ نہیں مانگتا، بس میرا صلہ تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔

اَتَبۡنُوۡنَ بِکُلِّ رِیۡعٍ اٰیَۃً تَعۡبَثُوۡنَ ﴿۱۲۸﴾ وَ تَتَّخِذُوۡنَ مَصَانِعَ لَعَلَّکُمۡ تَخۡلُدُوۡنَ ﴿۱۲۹﴾

کیا بناتے ہو ہر اونچی زمین پر ایک نشان کھیلنے کو، اور بناتے ہو کاریگریاں شاید (گویا) تم ہمیشہ رہو گے [1]

**خلاصہ تفسیر:** کیا تم (علاوہ شرک کے تکبر اور تفاخر میں بھی اس درجہ منہمک ہو کہ) ہر اونچے مقام پر ایک یادگار (کے طور پر عمارت) بناتے ہو (تاکہ خوب بلند نظر آئے) جس کو محض فضول (بلاضرورت) بناتے ہو اور (اس کے علاوہ جو رہنے کے مکان ہیں جن کی ایک درجہ ضرورت بھی ہے ان میں بھی یہ غلو ہے کہ) بڑے بڑے محل بناتے ہو (حالانکہ اس سے کم میں آرام مل سکتا ہے) جیسے دنیا میں تم کو ہمیشہ رہنا ہے۔

یعنی ایسی توسیع اور ایسے بلند محل اور اتنی مضبوطی اور ایسی یادگار تعمیرات اس وقت مناسب تھیں جبکہ دنیا میں ہمیشہ رہنا ہوتا، تو یہ خیال ہوتا کہ کشادہ مکان بناؤ تاکہ آئندہ نسل میں تنگی نہ ہو کیونکہ ہم بھی رہیں گے اور وہ بھی رہیں گے اور اونچا بھی بناؤ تاکہ اگر نیچے جگہ نہ رہے تو اوپر رہنے لگیں گے اور مضبوط بناؤ تاکہ ہماری طویل عمر کے لئے کافی ہو اور یادگاریں بناؤ تاکہ ہمارے زندہ رہنے سے ہمارا نام بھی زندہ رہے اور اب تو سب فضول ہے، بڑی بڑی یادگاریں بنی ہیں اور بنانے والے کا نام تک معلوم نہیں، موت نے سب کا نام مٹا دیا کسی کا جلدی اور کسی کا دیر میں۔

**اَتَبۡنُوۡنَ بِکُلِّ رِیۡعٍ:** اس سے ہر عبث وفضول کی مذمت معلوم ہوتی ہے خواہ قول ہو یا فعل ہو۔

**لَعَلَّکُمۡ تَخۡلُدُوۡنَ:** عقیدے کے لحاظ سے تو یہ قوم دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے کی قائل نہ تھی، لیکن زبردست اور مضبوط تعمیرات کی ساخت پرداخت کا مشغلہ یہ ظاہر کرتا تھا کہ جیسے انہیں دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے، اس لیے انہیں اس عقیدے کا معتقد قرار دیا گیا، اسی بنا پر جو شخص کافروں کا کام کرے اس کو صوفیہ کے کلام میں کافر کہہ دیا جاتا ہے اور احادیث میں بھی بکثرت موجود ہے۔

* * *

**فائدہ:** [1] ان لوگوں کو بڑا شوق تھا اونچے مضبوط منارے بنانے کا جس سے کچھ کام نہ نکلے، مگر نام ہو جائے اور رہنے کی عمارتیں بھی بڑے تکلف کی بناتے تھے مال ضائع کرنے کو، ان میں بڑی کاریگریاں دکھلاتے گویا یہ سمجھتے تھے کہ ہمیشہ یہیں رہنا ہے اور یہ یادگاریں اور عمارتیں کبھی برباد نہ ہوں گی، (لیکن آج دیکھو تو ان کے کھنڈر بھی باقی نہیں)۔

وَ اِذَا بَطَشۡتُمۡ بَطَشۡتُمۡ جَبَّارِیۡنَ ﴿۱۳۰﴾ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ﴿۱۳۱﴾

اور جب ہاتھ ڈالتے ہو تو پنجہ مارتے ہو ظلم سے، سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو [1]

**خلاصہ تفسیر:** اور (اس تکبر کے سبب تم اپنی طبیعت میں سختی اور بے رحمی اس درجہ رکھتے ہو کہ) جب کسی پر داروگیر کرنے لگتے ہو تو بالکل جابر (اور ظالم) بن کر داروگیر کرتے ہو (ان برے اخلاق کا اس لئے بیان کیا گیا کہ یہ برے اخلاق اکثر ایمان اور اطاعت کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں) سو (چونکہ شرک اور یہ برے اخلاق اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور عذاب کا سبب ہیں اس لئے) تم (کو چاہئے کہ) اللہ سے ڈرو اور (چونکہ میں رسول ہوں اس لئے) میری اطاعت کرو۔

**وَ اِذَا بَطَشۡتُمۡ بَطَشۡتُمۡ:** روح المعانی میں ہے کہ اس گرفت سے مراد ایسی گرفت ہے جس میں نہ رحم ہو، نہ اس سے تادیب کا قصد ہو، اور نہ اس میں انجام پر نظر رہے (ایسی گرفت ظلم وتشدد کہلاتی ہے) اس سے معلوم ہوا کہ جس گرفت میں مذکورہ باتیں نہ ہوں تو وہ اصلاح ہے اور طریقت کے خلاف نہیں، بلکہ اصلاح کا حصہ ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی ظلم وستم سے زیر دستوں اور کمزوروں کو تنگ کر رکھا ہے، گویا انصاف اور نرمی کا سبق ہی نہیں پڑھا، خدا کی ضعیف مخلوق کو جبر و تعدی کا تختہ، مشق بنا رکھا ہے، سو اللہ سے ڈرو، ظلم و تکبر سے باز آؤ، اور میری بات مانو۔

وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ وَّجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۱۳۴﴾

اور ڈرو اس سے جس نے تم کو پہنچائیں وہ چیزیں جو تم جانتے ہو، پہنچائے تم کو چوپائے اور بیٹے، اور باغ اور چشمے،

اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۳۵﴾

میں ڈرتا ہوں تم پر ایک بڑے دن کی آفت سے ۱؎

**خلاصہ تفسیر:** اور اس (اللہ) سے ڈرو (یعنی جس سے ڈرنے کو میں کہتا ہوں وہ ایسا ہے) جس نے تمہاری ان چیزوں سے امداد کی جن کو تم جانتے ہو (یعنی) چوپائے اور بیٹوں اور باغوں اور چشموں سے تمہاری امداد کی (تو منعم ہونے کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کے احکام کی ذرا بھی مخالفت نہ کی جائے) مجھ کو تمہارے حق میں (اگر تم ان حرکات سے باز نہ آئے) ایک بڑے سخت دن کے عذاب کا اندیشہ ہے (یہ ترہیب ہے، اور گذشتہ آیت: اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ الخ میں ترغیب تھی)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی اتنا تو سوچو کہ آخر یہ سامان تم کو کس نے دیے ہیں؟ کیا اس منعم حقیقی کا تمہارے ذمہ کوئی حق نہیں، اگر تمہاری یہ ہی شرارت اور سرکشی رہی تو مجھے اندیشہ ہے کہ پہلی قوموں کی طرح کسی سخت آفت میں گرفتار نہ ہو جاؤ، دیکھو! میں تم کو نصیحت کر چکا، اپنے انجام کو خوب سوچ لو۔

قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳۷﴾

بولے ہم کو برابر ہے تو نصیحت کرے یا نہ بنے تو نصیحت کرنے والا۔ اور کچھ نہیں یہ باتیں عادت ہے اگلے لوگوں کی

وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۱۳۸﴾

اور ہم پر آفت نہیں آنے والی ۱؎

**خلاصہ تفسیر:** وہ لوگ بولے کہ ہمارے نزدیک تو دونوں باتیں برابر ہیں خواہ تم نصیحت کرو اور خواہ ناصح نہ بنو (یعنی ہم دونوں حالتوں میں اپنے کرتوت سے باز نہ آئیں گے اور تم جو کچھ کہہ رہے ہو) یہ تو بس اگلے لوگوں کی ایک (معمولی) عادت (ہے اور رسم) ہے (کہ ہر زمانہ میں کچھ لوگ نبوت کے مدعی بن کر لوگوں کو یوں ہی کہتے سنتے رہے) اور (تم جو ہم کو عذاب سے ڈراتے ہو تو) ہم کو ہرگز عذاب نہ ہوگا۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی تمہاری نصیحت بیکار ہے، یہ جادو ہم پر چلنے والا نہیں، قدیم سے یہ عادت چلی آتی ہے کہ کچھ لوگ نبی بن کر عذاب سے ڈرایا کرتے ہیں اور مرنے جینے کا سلسلہ بھی پہلے سے چلا آتا ہے تو اس سے ہم کو کیا اندیشہ ہو سکتا ہے رہا جو طریقہ ہمارا ہے وہ ہی ہمارے اگلے باپ دادوں کا تھا، ہم اس سے کسی طرح ہٹنے والے نہیں، نہ عذاب کی دھمکیوں کو خاطر میں لا سکتے ہیں۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾

پھر اس کو جھٹلانے لگے تو ہم نے ان کو غارت کر دیا ۱؎ اس بات میں البتہ نشانی ہے، اور ان میں بہت لوگ نہیں ماننے والے

ع

وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿١٤٠﴾

اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا

**خلاصہ تفسیر:** غرض ان لوگوں نے ہود (علیہ السلام) کو جھٹلایا تو ہم نے ان کو (سخت آندھی کے عذاب سے) ہلاک کر دیا، بیشک اس (واقعہ) میں (بھی) بڑی عبرت ہے (کہ احکام کی مخالفت کا کیا انجام ہوا) اور (باوجود اس کے) ان (کفار مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے اور بیشک آپ کا رب زبردست (اور) مہربان ہے (کہ عذاب دینے پر قادر بھی ہے اور رحمت سے مہلت بھی دے رکھی ہے)۔

* * *

**فائدہ:** لے یعنی سخت آندھی بھیج کر، ان کا قصہ بھی پہلے اعراف وغیرہ میں مفصل گزر چکا ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُودُ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٤١﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ صَالِحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٤٢﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٤٣﴾

جھٹلایا ثمود نے پیغام لانے والوں کو، جب کہا ان کو ان کے بھائی صالح نے کیا تم ڈرتے نہیں، میں تمہارے پاس پیغام لانے والا ہوں معتبر

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٤٤﴾ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٤٥﴾

سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو، اور نہیں مانگتا میں تم سے اس پر کچھ بدلہ میرا بدلہ ہے اسی جہان کے پالنے والے پر

**خلاصہ تفسیر:** (پانچواں قصہ: حضرت صالح علیہ السلام اور ان کی قوم) قوم ثمود نے (بھی) پیغمبروں کو جھٹلایا جبکہ ان سے ان کے بھائی صالح (علیہ السلام) نے فرمایا کیا تم (اللہ سے) نہیں ڈرتے، میں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں، سو تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، اور میں تم سے اس پر کچھ صلہ نہیں چاہتا، بس میرا صلہ تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔

أَتُتْرَكُونَ فِي مَا هَاهُنَا آمِنِينَ ﴿١٤٦﴾ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿١٤٧﴾ وَزُرُوعٍ وَنَخْلٍ

کیا چھوڑے رکھیں گے تم کو یہاں کی چیزوں میں بے کھٹکے (بے خوف)، باغوں میں اور چشموں میں، اور کھیتوں میں اور کھجوروں میں

طَلْعُهَا هَضِيمٌ ﴿١٤٨﴾ وَتَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا فَارِهِينَ ﴿١٤٩﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٥٠﴾

جن کا گابھا (خوشہ) ملائم ہے، اور تراشتے ہو پہاڑوں کے گھر تکلف کے، سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو لے

**خلاصہ تفسیر:** (اور تم جو خوشحالی اور عیش و آرام کی وجہ سے اس درجہ اللہ سے غافل ہو تو) کیا تم کو ان ہی چیزوں میں بے فکری سے رہنے دیا جائے گا جو یہاں (دنیا میں) موجود ہیں، یعنی باغوں میں اور چشموں میں اور ان کھجوروں میں جن کے گچھے خوب گوندے ہوئے ہیں (یعنی ان کھجوروں میں خوب کثرت سے پھل آتا ہے) اور کیا (اسی غفلت کی وجہ سے) تم پہاڑوں کو تراش تراش کر اتراتے (اور فخر کرتے) ہوئے مکانات بناتے ہو، سو اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو۔

* * *

**فائدہ:** لے یعنی کیا یہ خیال ہے کہ ہمیشہ اسی عیش و آرام اور باغ و بہار کے مزے لوٹو گے؟ اور پہاڑوں کو تراش کر جو تکلف کے مکان تیار کیے ہیں ان سے کبھی نہ نکلو گے؟ یا یہ مضبوط اور سنگین عمارتیں تم کو خدا کے عذاب سے بچا لیں گی؟ اس سودائے خام کو دل سے نکال ڈالو، اور خدا تعالیٰ سے ڈر کر میرا کہا مانو، میں تمہارے بھلے کی کہتا ہوں۔

وَلَا تُطِيعُوٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝١٥١ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ۝١٥٢

اور نہ مانو حکم بے باک لوگوں کا، جو خرابی کرتے ہیں ملک میں اور اصلاح نہیں کرتے

**خلاصہ تفسیر:** اور ان حدود (بندگی) سے نکل جانے والوں کا کہنا مت مانو جو سرزمین میں فساد کیا کرتے ہیں اور (کبھی) اصلاح (کی بات) نہیں کرتے (اس سے مراد کفار کے سردار ہیں جو گمراہی پر لوگوں کو آمادہ کرتے تھے، فساد اور عدم اصلاح سے یہی مراد ہے)۔

* * *

**فائدہ:** یہ عوام کو فرمایا کہ تم ان بڑے مفسد شیطانوں کے پیچھے چل کر تباہ نہ ہو، یہ تو زمین میں خرابی پھیلانے والے ہیں، اصلاح کرنے والے اور نیک صلاح دینے والے نہیں۔

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۝١٥٣ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝١٥٤

بولے تجھ پر تو کسی نے جادو کیا ہے، تو بھی ایک آدمی ہے جیسے ہم ۱؎ سو لے آ کچھ نشانی اگر تو سچا ہے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** ان لوگوں نے کہا کہ تم پر تو کسی نے بڑا بھاری جادو کر دیا ہے (جس سے عقل میں خلل ہو گیا ہے کہ نبوت کا دعویٰ کرتے ہو حالانکہ) تم بس ہماری طرح کے ایک (معمولی) آدمی ہو (اور آدمی نبی ہوتا نہیں) سو کوئی معجزہ پیش کرو اگر تم (دعویٰ نبوت میں) سچے ہو۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی ہم سے کون سی بات تجھ میں زائد ہے جو نبی بن گیا، معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے جادو کر دیا ہے جس سے تیری عقل ماری گئی (العیاذ باللہ)

**فائدہ:** ۲؎ یعنی اگر نبی ہے اور ہم سے ممتاز درجہ رکھتا ہے تو اللہ سے کہہ کر کوئی ایسا نشان دکھلا جسے ہم بھی تسلیم کر لیں پھر فرمائش کی کہ اچھا پتھر کی اس چٹان میں سے ایک اونٹنی نکال دے جو ایسی اور ایسی ہو، حضرت صالح نے دعا فرمائی، حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے یہ نشان دکھلا دیا۔

قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝١٥٥ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝١٥٦ فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ۝١٥٧

کہا یہ اونٹنی ہے اسکے لیے پانی پینے کی ایک باری اور تمہارے لیے باری ایک دن کی مقرر ۱؎ اور مت چھیڑیو اسکو بری طرح سے پھر پکڑ لے تم کو آفت ایک بڑے دن کی ۲؎ پھر کاٹ ڈالا اس اونٹنی کو (کونچیں کاٹ دی اس اونٹنی کی) پھر کل کو رہ گئے پچھتاتے ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** صالح (علیہ السلام) نے فرمایا کہ یہ ایک اونٹنی ہے (جو خلاف عادت پتھر سے پیدا ہونے کی وجہ سے میرا معجزہ ہے، اور جیسا کہ یہ میری رسالت کی ایک دلیل ہے اسی طرح خود اس کے بھی تم پر کچھ حقوق ہیں، چنانچہ ان میں سے ایک یہ ہے کہ) پانی پینے کے لئے ایک باری اس کی ہے اور ایک مقرر دن میں ایک باری تمہاری (یعنی تمہارے جانوروں کی) اور (ایک یہ ہے کہ) اس کو برائی (اور تکلیف دہی) کے ساتھ ہاتھ بھی مت لگانا کبھی تم کو ایک بھاری دن کا عذاب آ پکڑے، سو انہوں نے (نہ رسالت کی تصدیق کی، نہ اونٹنی کے حقوق ادا کئے، بلکہ) اس اونٹنی کو

مار ڈالا، پھر (جب عذاب کے نشان ظاہر ہوئے تو اپنی حرکت پر) پشیمان ہوئے (مگر اول تو عذاب دیکھنے کے وقت ندامت بیکار، دوسرے جب تک توبہ اور ایمان نہ ہوتو خالی ندامت سے کیا ہوتا ہے، پس یہ ندامت طبعی تھی، اختیاری نہ تھی)۔

**لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ**: پانی کی باری اس طرح تھی کہ ایک دن اونٹنی کا اور ایک دن دوسرے چوپایوں کا، جب اونٹنی کی باری کا دن ہوتا تمام پانی پی جاتی، اس روز نہ دوسرے چوپایوں کو پانی ملتا نہ آدمیوں کو، اور یہی بات ان لوگوں کو ناگوار ہوئی اور اس اونٹنی کے دشمن ہو گئے، احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ایک کنواں تھا جس میں یہ باری تھی۔

**فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ**: قوم کی ندامت اس لیے لاحاصل رہی کیونکہ انہوں نے اپنے جرم کی تلافی ایمان سے نہ کی (یعنی ایمان نہ لائے) اس سے معلوم ہوا کہ توبہ کے لیے طبعی ندامت کافی نہیں، عقلی ندامت ہونی چاہیے، طبعی ندامت تو ہر نقصان پر ہوا کرتی ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ے حضرت شاہ صاحب: لکھتے ہیں: ''اونٹنی پیدا ہوئی پتھر میں سے اللہ کی قدرت سے، حضرت صالح کی دعا سے وہ چھوٹی پھرتی، جس جنگل میں چرنے یا جس تالاب پر پانی پینے جاتی سب مواشی بھاگ کر کنارے ہو جاتے، تب یوں ٹھہرادیا کہ ایک دن اس پانی پر وہ جائے، ایک دن اوروں کے مواشی جائیں''۔

**فائدہ:** ۲ے یعنی اونٹنی کے ساتھ برائی سے پیش نہ آنا ورنہ بڑی سخت آفت ہوگی۔

**فائدہ:** ۳ے ایک بدکار عورت کے گھر مواشی بہت تھے، چارے اور پانی کی تکلیف سے اپنے ایک آشنا کو اکسایا، اس نے اونٹنی کے پاؤں کاٹ کر ڈال دیے، اس کے تین دن بعد عذاب آیا (موضح القرآن) یہ قصہ بھی پہلے مفصل گزر چکا۔

فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۵۸﴾

پھر آ پکڑا ان کو عذاب نے، البتہ اس بات میں نشانی ہے، اور ان میں بہت لوگ نہیں ماننے والے

ع ۸ ۱۹ ۱۲ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۵۹﴾

اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم کرنے والا

**خلاصہ تفسیر:** پھر (آخر) عذاب نے ان کو آلیا، بیشک اس (واقعہ) میں بڑی عبرت ہے، اور (باوجود اس کے) ان (کفار مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے اور بیشک آپ کا رب بڑا زبردست بہت مہربان ہے (کہ باوجود قدرت کے مہلت دیتا ہے)۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِۨالْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۶۰﴾ۚۖ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ۚ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ

جھٹلایا لوط کی قوم نے پیغام لانے والوں کو، جب کہا ان کو ان کے بھائی لوط نے کیا تم ڈرتے نہیں، میں تمہارے لیے پیغام لانے والا ہوں

اَمِیْنٌ ﴿۱۶۲﴾ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۱۶۳﴾ۚ وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۴﴾ؕ

معتبر، سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو، اور مانگتا نہیں میں تم سے اس کا کچھ بدلہ، میرا بدلہ ہے اسی پروردگار عالم پر

**خلاصہ تفسیر:** (چھٹا قصہ: حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی قوم) قوم لوط نے (بھی) پیغمبروں کو جھٹلایا جبکہ ان سے ان کے بھائی لوط (علیہ السلام) نے فرمایا کہ کیا تم (اللہ سے) ڈرتے نہیں ہو؟ میں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں، سو تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو اور میں تم سے اس پر کوئی صلہ نہیں چاہتا، بس میرا صلہ تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔

**إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ**: روح المعانی تفسیر سورہ ق میں ہے کہ یہ لوگ نسبی بھائی نہ تھے، مجازاً بھائی کہہ دیا، سسرالی رشتہ دار تھے، کیونکہ لوط علیہ السلام یہاں ہجرت کر کے تشریف لائے تھے، آپ کی برادری کے لوگ آپ کے ساتھ نہ تھے۔

أَتَأْتُونَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِينَ ﴿١٦٥﴾ وَتَذَرُونَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ أَزْوَاجِكُمْ ط

کیا تم دوڑتے ہو جہان کے مردوں پر ۱، اور چھوڑتے ہو جو تمہارے واسطے بنا دی ہیں تمہارے رب نے تمہاری جوروئیں

بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُونَ ﴿١٦٦﴾

بلکہ تم لوگ ہو حد سے بڑھنے والے ۲

**خلاصہ تفسیر**: کیا تمام دنیا جہان والوں میں سے تم (یہ حرکت کرتے ہو کہ) مردوں سے بدفعلی کرتے ہو اور تمہارے رب نے جو تمہارے لئے بیویاں پیدا کی ہیں ان کو نظر انداز کئے رہتے ہو (یعنی اور کوئی آدمی تمہارے سوا یہ حرکت نہیں کرتا اور یہ نہیں کہ اس کے قبیح ہونے میں کچھ شبہ ہے) بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) تم حد (انسانیت) سے گزر جانے والے لوگ ہو۔

* * *

**فائدہ**: ۱ یعنی سارے جہان میں سے مرد ہی تمہاری شہوت رانی کے لیے رہ گئے، یا یہ کہ سارے جہان میں سے تم ہی ہو جو اس فعل شنیع کے مرتکب ہوتے ہو۔

**فائدہ**: ۲ یعنی یہ خلاف فطرت کام کر کے آدمیت کی حد سے بھی نکل چکے ہو۔

قَالُوا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوطُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِينَ ﴿١٦٧﴾

بولے اگر نہ چھوڑے گا (نہ چپکا رہے گا) تو اے لوط تو تو نکال دیا جائے گا ۱

قَالَ إِنِّي لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِينَ ﴿١٦٨﴾ رَبِّ نَجِّنِي وَأَهْلِي مِمَّا يَعْمَلُونَ ﴿١٦٩﴾

کہا میں تمہارے کام سے البتہ بیزار ہوں ۲ اے رب خلاص کر مجھ کو اور میرے گھر والوں کو ان کاموں سے جو یہ کرتے ہیں ۳

**خلاصہ تفسیر**: وہ لوگ کہنے لگے کہ اے لوط! اگر تم (ہمارے کہنے سننے سے) باز نہیں آؤ گے تو ضرور (بستی سے) نکال دیئے جاؤ گے، لوط (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (میں اس دھمکی پر اپنی بات کہنے سے نہ رکوں گا کیونکہ) میں تمہارے اس کام سے سخت نفرت رکھتا ہوں (تو کہنا کیسے چھوڑ دوں گا، جب کسی طرح ان لوگوں نے نہ مانا اور عذاب آتا ہوا معلوم ہوا تو) لوط (علیہ السلام) نے دعا کی کہ اے میرے رب! مجھ کو اور میرے (خاص) متعلقین کو ان کے اس کام (کے وبال) سے (جو ان پر آنے والا ہے) نجات دے۔

* * *

**فائدہ**: ۱ یعنی یہ وعظ و نصیحت رہنے دو، اگر آئندہ ہمیں تنگ کرو گے تو تم کو بستی سے نکال باہر کریں گے۔

**فائدہ**: ۲ اس لیے ضرور اس پر اظہار نفرت کروں گا اور نصیحت سے باز نہیں آ سکتا۔

**فائدہ**: ۳ یعنی ان کی نحوست اور وبال سے ہم کو بچا اور انھیں غارت کر۔

فَنَجَّيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۷۰﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۷۲﴾

پھر بچادیا ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو سب کو، مگر ایک بڑھیا رہ گئی رہنے والوں میں ۱ پھر اٹھا مارا (اکھاڑا) ہم نے ان دوسروں کو

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۱۷۳﴾

اور برسایا ان پر ایک برساؤ (مینہ) سو کیا بُرا برساؤ تھا ان ڈرائے ہوؤں کا ۲

**خلاصہ تفسیر:** سو ہم نے ان کو اور ان کے متعلقین کو سب کو نجات دی، سوائے ایک بڑھیا کے (اس سے مراد لوط علیہ السلام کی زوجہ ہے) کہ وہ (عذاب کے اندر) رہ جانے والوں میں رہ گئی، پھر ہم نے اور سب کو (جو لوط اور ان کے اہل کے سوا تھے) ہلاک کر دیا اور ہم نے ان پر ایک خاص قسم کا (یعنی پتھروں کا) مینہ برسایا، سو کیا برا مینہ تھا جو ان لوگوں پر برسا جن کو (عذاب الٰہی سے) ڈرایا گیا تھا۔

بیوی کا عذاب میں رہ جانا اس لیے تھا کہ وہ کافرہ تھی اسی لیے رات کو لوط علیہ السلام کے ساتھ بستی سے نہ نکلی۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یہ ان کی بیوی تھی جو ان بدمعاشوں سے مل رہی تھی، جب عذاب آیا تو یہ بھی ہلاک ہوئی۔

**فائدہ:** ۲ یعنی انکی بستیاں الٹ دیں اور آسمان سے پتھروں کا برساؤ کیا سو ڈھیر ہو کر رہ گئے، انکا قصہ مفصل بھی اعراف وغیرہ میں گزر چکا۔

ع ۱۶/۱۲ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۴﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۷۵﴾

البتہ اس بات میں نشانی ہے، اور ان میں بہت لوگ نہیں تھے ماننے والے، اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا

**خلاصہ تفسیر:** بیشک اس (واقعہ) میں (بھی) عبرت ہے اور (باوجود اس کے) ان (کفار مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے، اور بیشک آپ کا رب بڑی قدرت والا بڑی رحمت والا ہے (کہ عذاب دے سکتا تھا مگر ابھی نہیں دیا)۔

كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْــــَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۶﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾

جھٹلایا بن کے رہنے والوں نے پیغام لانے والوں کو ۱ جب کہا ان کو شعیب نے کیا تم ڈرتے نہیں، میں تم کو پیغام پہنچانے والا ہوں معتبر

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۷۹﴾ وَمَآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۰﴾

سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو اور نہیں مانگتا میں تم سے اس پر کچھ بدلہ، میرا بدلہ ہے اسی پروردگار عالم پر

**خلاصہ تفسیر:** (ساتواں قصہ: اصحاب ایکہ) اصحاب الایکہ نے (بھی جن کا ذکر سورۃ حجر کے اخیر میں گزر چکا ہے) پیغمبروں کو جھٹلایا، جبکہ ان سے شعیب (علیہ السلام) نے فرمایا کہ کیا تم اللہ سے ڈرتے نہیں ہو؟ میں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں، سو تم اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو، اور میں تم سے اس پر کوئی صلہ نہیں چاہتا، بس میرا صلہ تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔

ان کا ذکر سورہ حجر کے آخر میں گزر چکا ہے اور وہیں اصحاب ایکہ کی تحقیق بھی مع دیگر ضروری مضامین کے وہاں گزر چکی ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ ''اصحاب ایکہ'' وہی قوم مدین ہے، ''ایکہ'' ایک درخت تھا جسے یہ لوگ پوجتے تھے، اسی نسبت سے ''اصحاب الایکہ'' کہا گیا، اور اسی لیے شعیب کو **اَخُوْهُمْ** سے تعبیر نہیں فرمایا، کیونکہ انبیاء کی اخوت محض قومی و نسبی تعلقات پر مبنی تھی، اگر ''مدین'' کہتے

تو اَخُوهُم کہنا موزوں تھا، جب ''اصحاب الایکہ'' کہہ کر ایک مذہبی نسبت سے ذکر کیا تو اس حیثیت سے اَخُوهُم فرمانا حضرت شعیب کی شان کے مناسب نہ تھا، بہرحال ''مدین'' اور ''اصحاب ایکہ'' ایک قوم ہے اور شعیب اسی قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے پہلے بھی اس کے متعلق کچھ بحث گزر چکی۔

اَوۡفُوا الۡكَيۡلَ وَلَا تَكُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُخۡسِرِيۡنَ ۞181 وَزِنُوۡا بِالۡقِسۡطَاسِ الۡمُسۡتَقِيۡمِ ۞182 وَلَا تَبۡخَسُوا

پورا بھر کر دو ناپ اور مت ہو نقصان دینے والے، اور تولو سیدھی ترازو سے ۱ اور مت گھٹا دو

النَّاسَ اَشۡيَآءَهُمۡ وَلَا تَعۡثَوۡا فِى الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِيۡنَ ۞183 وَاتَّقُوا الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ وَالۡجِـبِلَّةَ الۡاَوَّلِيۡنَ ۞184

لوگوں کو ان کی چیزیں اور مت دوڑو ملک میں خرابی ڈالتے ہوئے ۲ اور ڈرو اس سے جس نے بنایا تم کو اور اگلی خلقت کو

**خلاصہ تفسیر:** تم لوگ پورا ناپا کرو اور (صاحب حق کا) نقصان مت کیا کرو، اور (اسی طرح تولنے کی چیزوں میں) سیدھی ترازو سے تولا کرو (یعنی ڈنڈی نہ مارا کرو، نہ باٹوں میں فرق کیا کرو) اور لوگوں کا ان کی چیزوں میں نقصان مت کیا کرو اور سرزمین میں فساد مت مچایا کرو، اور اس (خدائے قادر) سے ڈرو جس نے تم کو اور تمام اگلی مخلوقات کو پیدا کیا۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی معاملات میں خیانت اور بے انصافی مت کرو جس طرح لینے کے وقت پورا ناپ تول کر لیتے ہو دیتے وقت بھی پورا ناپ تول کر دو۔

**فائدہ:** ۲ یعنی ملک میں ڈاکے مت ڈالو اور لوگوں کے حقوق نہ مارو۔

قَالُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مِنَ الۡمُسَحَّرِيۡنَ ۞185 وَمَاۤ اَنۡتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا وَاِنۡ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الۡكٰذِبِيۡنَ ۞186

بولے تجھ پر تو کسی نے جادو کر دیا ہے، اور تو بھی ایک آدمی ہے جیسے ہم اور ہمارے خیال میں تو تو جھوٹا ہے ۱

فَاَسۡقِطۡ عَلَيۡنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ۞187 قَالَ رَبِّىۡۤ اَعۡلَمُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ۞188

سو گرا دے (ڈال دے) ہم پر کوئی ٹکڑا آسمان کا اگر تو سچا ہے ۲ کہا میرا رب خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو ۳

**خلاصہ تفسیر:** وہ لوگ کہنے لگے کہ بس تم پر تو کسی نے بڑا بھاری جادو کر دیا ہے (جس سے عقل خراب ہوگئی اور نبوت کا دعویٰ کرنے لگے) اور تم تو محض ہماری طرح (کے) ایک (معمولی) آدمی ہو اور ہم تو تم کو جھوٹے لوگوں میں سے خیال کرتے ہیں، سو اگر تم سچوں میں سے ہو تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دو (تا کہ ہم کو معلوم ہو جائے کہ واقعی تم نبی تھے تمہیں جھٹلانے سے ہم کو یہ سزا ہوئی) شعیب (علیہ السلام) بولے کہ (میں عذاب کا لانے والا یا اس کی کیفیت مقرر کرنے والا کون ہوں) تمہارے اعمال کو میرا رب (ہی) خوب جانتا ہے (اور تمہارے اس عمل کا جو تقاضہ ہے کہ کیا عذاب ہو اور کب ہو اس کو بھی خدا ہی جانتا ہے اسی کو اختیار ہے)۔

**وَمَاۤ اَنۡتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا:** اسی طرح آج بھی بعض نادان جاہل لوگ اولیاء اللہ کو ان کے بشری تقاضوں کی بنا پر حقیر سمجھتے ہیں (اور انہیں تسلیم کرنے کو تیار نہیں، کیونکہ ان کی زندگی عام انسانوں کی طرح ہے، یعنی ان لوگوں کی تردید ہے جو یہ خیال و اعتقاد رکھتے ہیں کہ اولیاء اللہ وہ ہوتے ہیں جن کو بشری تقاضے نہ ہوں اور وہ زندگی کی بقا کے لیے ضروری اشیاء کے محتاج نہ ہوں، حالانکہ سب سے بڑے اولیاء یعنی انبیاء زندگی کی بقا کے لیے اشیا کا استعمال کرتے تھے)۔

فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا: اسی طرح آج بھی بعض جہلاء جب کسی بزرگ کا انکار کرتے ہیں، اس کے بعد ان پر کوئی وبال نازل نہیں ہوتا تو اس سے اپنے اس انکار کے برا نہ ہونے پر استدلال کرتے ہیں (یعنی جو لوگ اللہ کے نیک بندوں کو پریشان کرتے ہیں تو ان کے اس عمل پر اللہ تعالی ڈھیل دیتے ہیں اور گرفت نہیں فرماتے تو اس پر یہ لوگ مزید بے باک ہو کر یہ گمان کرتے ہیں کہ ہمارا یہ غلط بالکل صحیح ہے وگرنہ ہم پر عذاب نازل کیا جاتا، جبکہ اللہ تعالی آخرت میں ان کا حساب برابر کر دی گے جو انہوں نے دنیا میں کیا ہوگا)۔

قَالَ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ: اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کشف وخوارق یا کرامات کا ظہور اہل اللہ کے اختیار میں نہیں، بلکہ اللہ تعالی کی اجازت اور ان کے حکم سے ہوتا ہے، کوئی ولی اپنے ذاتی تصرف سے کرامات ظاہر نہیں کر سکتا۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی دعویٰ نبوت میں اور عذاب وغیرہ کی دھمکیوں میں۔

**فائدہ:** ۲؎ اگر سچا ہے تو آسمان کا یا بادل کا کوئی ٹکڑا گروا کر ہم کو ہلاک کیوں نہیں کر دیتا۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی وہ ہی جانتا ہے کہ کس جرم پر کس وقت اور کتنی سزا ملنی چاہیے، عذاب دینا ہمارا کام نہیں، ہمارا کام ہوشیار کر دینا تھا سو کر چکے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۸۹﴾

پھر اس کو جھٹلایا پھر پکڑ لیا ان کو آفت نے سائبان والے دن کی بیشک وہ تھا عذاب بڑے دن کا ۱؎

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۹۱﴾ ع

البتہ اس بات میں نشانی ہے اور ان میں بہت لوگ نہیں ماننے والے، اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا

**خلاصہ تفسیر:** سو وہ لوگ (برابر) ان کو جھٹلاتے رہے پھر ان کو سائبان کے واقعہ (عذاب) نے آ پکڑا، بیشک وہ بڑے سخت دن کا عذاب تھا (اور) اس (واقعہ) میں (بھی) بڑی عبرت ہے اور (باوجود اس کے) ان (کفار مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے اور بیشک آپ کا رب بڑی قدرت والا بڑی رحمت والا ہے (کہ عذاب نازل کر سکتا ہے مگر مہلت دے رکھی ہے)۔

عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ: سائبان کا عذاب یہ تھا جیسا کہ درمنثور میں مروی ہے کہ اول ان لوگوں پر گرمی مسلط ہوئی، پھر ایک ابر نمودار ہوا، جس میں سے ٹھنڈی ہوا آتی تھی، سب لوگ اس کے نیچے جمع ہو گئے، اس میں سے آگ برسنا شروع ہوئی اور سب جل گئے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ سائبان کی طرح ابر آیا، اس میں سے آگ برسی، نیچے سے زمین کو بھونچال آیا اور سخت ہولناک آواز آئی، اس طرح سب قوم تباہ ہوگئی، ان کا قصہ بھی پہلے مفصل گزر چکا ہے، ایک نظر وہاں کے فوائد پر ڈال لی جائے۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۹۲﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾

اور یہ قرآن ہے اتارا ہوا پروردگارِ عالم کا، لے کر اترا ہے اس کو فرشتہ معتبر

عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹۵﴾

تیرے دل پر کہ تو ہو ڈر سنا دینے والا ۱؎، کھلی عربی زبان میں ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اوپر سورت میں قرآن کریم کی حقانیت مع ان مضامین کے جو اس کے متعلق تھے مذکور ہوئے ہیں، اب اختتام

سورت پر پھر اسی کی طرف رجوع ہے اور اس کے متعلق یہ مضامین ہیں: منکرین کی مذمت اور وعید، بعض شبہات کا جواب، تبلیغ کا حکم اور تبلیغ میں توکل کی تعلیم اور اختتام پر منکروں کو سخت دھمکی۔

اور یہ قرآن رب العالمین کا بھیجا ہوا ہے اس کو امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے آپ کے قلب پر صاف عربی زبان میں تا کہ آپ (بھی) من جملہ ڈرانے والوں کے ہو جائیں (یعنی جس طرح اور پیغمبروں نے اپنی اپنی امتوں کو احکام الہیہ پہنچائے آپ بھی پہنچائیں)۔

عَلٰی قَلْبِكَ: یہاں جو قلب یعنی دل پر نزول کا ذکر ہے اس کی تحقیق پارہ اول سورہ بقرہ کی آیت ۹۷ میں گذر چکی ہے، وہاں ملاحظہ فرمالیں۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ عَلٰی قَلْبِكَ: یہاں خاص علی قلبك کو ذکر کرنے کی وجہ روح المعانی میں یہ بیان کی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے قلب مبارک کو ایک ''قوت سامعہ'' (سننے کی قوت) اور ایک ''قوت باصرہ'' (دیکھنے کی قوت) دی گئی تھی، جس کا ذکر سورہ نجم کی آیت: ما کذب الفؤاد ما رأى میں موجود ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جیسے ظاہری سماعت و بصارت ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے قلبی (باطنی) سماعت و بصارت سے بھی نوازا جاتا ہے، جس سے ورود قلبی ہوتا ہے اور اسرار و حکم کو دل کی آنکھوں اور کانوں سے مشاہدہ کرنے اور سننے کے بعد ان کے ایمان میں اور زیادہ ترقی ہوتی ہے، اور اسی سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جب کبھی یہ دونوں (ظاہری سمع و بصر اور باطنی سمع و بصر) مل جاتے ہیں تو ادراک قوی تر ہو جاتا ہے، اس حالت میں ادراک کو کبھی ظاہر کی طرف نسبت کر دیتے ہیں اور کبھی باطن کی طرف نسبت کر دیتے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ آغاز سورت میں قرآن کریم کا ذکر تھا اور اس کی تکذیب پر دھمکی دی گئی تھی، درمیان میں مکذبینِ حق کے واقعات بیان ہوئے، یہاں سے پھر مضمونِ سابق کی طرف عود کیا گیا ہے، یعنی قرآن کریم وہ مبارک اور عظیم الشان کتاب ہے جسے رب العالمین نے اتارا، جبرائیل امین لے کر اترے اور تیرے پاک و صاف قلب پر اتاری گئی کیونکہ یہ ہی قلب تھا جو اللہ کے علم میں اس بھاری امانت کو اٹھانے اور سنبھالنے کے لائق تھا، چنانچہ وحی قرآنی آئی اور سیدھی تیرے دل میں اترتی چلی گئی، تو نے اس کو اپنے سارے دل سے سنا اور سمجھا اور محفوظ رکھا، شاید عَلٰی قَلْبِكَ کے لفظ میں یہ بھی اشارہ ہو کہ نزول وحی کی جو دو کیفیتیں احادیث صحیحہ میں وارد ہوئی ہیں (یعنی کبھی "صلصلة الجرس" کی طرح آنا اور کبھی فرشتہ کا آدمی کی صورت میں سامنے آ کر بات کرنا) ان میں سے قرآن کی وحی اغلبًا پہلی کیفیت کے ساتھ آتی تھی، کیونکہ دونوں حالتوں میں محققین کے نزدیک فرق یہ تھا کہ پہلی حالت میں پیغمبر کو بشریت سے منخلع ہو کر ملکیت کی طرف جانا پڑتا تھا، گویا اس وقت آلاتِ جسدانیہ کو بالکل معطل کر کے صرف روحی قوتوں اور قلبی حواس سے کام لیتے تھے، دل کے کانوں سے وحی کی آواز سنتے تھے اور دل کی آنکھوں سے فرشتہ کو دیکھتے تھے اور دل کی الٰہی قوتوں سے ان علوم کی تلقی کرتے تھے اور محفوظ رکھتے تھے بخلاف دوسری حالت کے کہ اس میں فرشتہ کو ملکیت سے نزول کر کے بشریت کی طرف آنا پڑتا تھا، اس وقت پیغمبر ان ہی ظاہری آنکھوں سے فرشتہ کو دیکھتے اور ان ہی ظاہری کانوں کے توسط سے آواز سنتے تھے، یہ ہی وجہ ہے کہ وحی کی پہلی قسم کو احادیث میں فرمایا کہ: "هُوَ اَشَدُّهٗ عَلَیَّ" (وہ مجھ پر بہت بھاری ہوتی ہے) کیونکہ اس میں آپ ﷺ کو بشریت سے ملکیت کی طرف صعود کرنا پڑتا تھا، واللہ تعالیٰ اعلم۔

**فائدہ:** ۲ یعنی اتارا نہایت فصیح، واضح اور شگفتہ عربی زبان میں، یہاں سے معلوم ہوا کہ عَلٰی قَلْبِكَ سے مراد یہ ہیں کہ صرف مضامین قرآن کے آپ ﷺ کے دل میں اتار دیے، پھر آپ ﷺ نے ان کو اپنے الفاظ میں ادا کر دیا، بلکہ الفاظ اور مضامین سب وحی ربانی سے قلب مبارک پر القاء کیے گئے۔

وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۹۶﴾ اَوَلَمْ یَكُنْ لَّهُمْ اٰیَةً اَنْ یَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۱۹۷﴾

اور یہ لکھا ہے پہلوں کی کتابوں میں ۱ کیا ان کے واسطے نشانی نہیں یہ بات کہ اس کی خبر رکھتے ہیں پڑھے لوگ بنی اسرائیل کے ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور اس (قرآن) کا ذکر پہلی امتوں کی (آسمانی) کتابوں میں (بھی) ہے (کہ ایک ایسی شان کا پیغمبر ہوگا اور

اس پر ایسا کلام نازل ہوگا، چنانچہ تفسیر حقانی کے حواشی میں اس مقام پر چند بشارتیں کتب سابقہ تورات وانجیل کی نقل کی ہیں، آگے اس مضمون: وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ کی توضیح ہے، یعنی) کیا ان لوگوں کے لئے (اس پر) یہ بات دلیل نہیں ہے کہ اس (پیشین گوئی) کو علماء بنی اسرائیل جانتے ہیں۔

اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ: چنانچہ ان میں جو لوگ اسلام لے آئے ہیں وہ تو علی الاعلان اس کا اعتراف کرتے ہیں اور جو اسلام نہیں لائے وہ بھی خاص خاص لوگوں کے سامنے اس کا اقرار کرتے ہیں جیسے کہ پارہ اول کے ربع پر آیت: اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ کی تفسیر میں اس کا بیان آچکا ہے اور ان اقرار کرنے والوں کی تعداد اور کثرت اس وقت اگر خبر واحد تک بھی مان لی جائے تاہم قرائن کی وجہ سے معنوی تواتر حاصل تھا، اور یہ دلیل قائم کرنا ان پڑھ لوگوں کے اعتبار سے ہے ورنہ لکھے پڑھے لوگ خود اصل کتاب سے دیکھ سکتے تھے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پہلی کتابوں میں تحریف نہیں ہوئی، بلکہ مطلب یہ ہے کہ تحریف کے باوجود ایسے مضامین کا باقی رہ جانا جس میں آپ ﷺ کی پیشین گوئی ہے زیادہ حجت ہے، اور یہ احتمال نکالنا کہ شاید یہ مضامین ہی تحریف کا نتیجہ ہوں یعنی کسی نے تحریف کر کے بڑھا دیے ہوں اس لیے غلط ہے کہ اپنے نقصان کے واسطے کوئی تحریف نہیں کیا کرتا، یہ مضامین تو تحریف کرنے والوں کے لیے نقصان دہ ہیں جیسا کہ ظاہر ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی قرآن کی اور اس کے لانے والے کی خبر پہلی آسمانی کتابوں میں موجود ہے، انبیائے سابقین برابر پیشین گوئی کرتے چلے آئے ہیں، چنانچہ باوجود بہت سی تحریف وتبدیلی کے اب تک بھی ایک ذخیرہ اس قسم کی پیشین گوئیوں کا پایا جاتا ہے، اور یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ اس قرآن کے بیشتر مضامین اجمالاً یا تفصیلاً اگلی کتابوں میں پائے جاتے ہیں، خصوصاً قصص، توحید، رسالت، معاد وغیرہ مضامین جن پر تمام کتب سماویہ اور انبیاء ومرسلین کا اتفاق رہا ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی علمائے بنی اسرائیل خوب جانتے ہیں کہ یہ وہ ہی کتاب اور پیغمبر ہے جس کی خبر پہلے سے آسمانی صحیفوں میں دی گئی تھی، چنانچہ ان میں سے بعض نے اعلانیہ اور بعض نے اپنی خصوصی مجلسوں میں امر حق کا اقرار کیا ہے اور بعض انصاف پسند اسی علم کی بناء پر مسلمان ہو گئے، مثلاً حضرت عبداللہ بن سلام وغیرہ، غرض ایک منصف فہیم کے لیے جس کا دل حق کی طلب رکھتا اور خدا سے ڈرتا ہو، اس چیز میں بڑی نشانی ہے کہ دوسرے مذاہب کے علماء بھی اپنے دلوں میں قرآن کی حقانیت کو سمجھتے ہیں، گو کسی وجہ سے بعض اوقات اعلان واقرار کی جرأت نہ کر سکیں۔

## وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ ﴿۱۹۸﴾ فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹۹﴾

اور اگر اتارتے ہم یہ کتاب کسی اوپری زبان والے پر، اور وہ اس کو پڑھ کر سناتا تو بھی اس پر یقین نہ لاتے ۱؎

**خلاصہ تفسیر:** یہاں تک تو دعویٰ: وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ کی دو نقلی دلیلیں بیان فرمائی ہیں، یعنی ① پہلی کتابوں میں ذکر ② اور بنی اسرائیل کا جاننا اور ان میں بھی دوسری پہلی کی دلیل ہے، اب آگے انکار کرنے والوں کے عناد کے بیان کے ضمن میں اسی دعویٰ یعنی اعجاز قرآن کی عقلی دلیل کی طرف اشارہ ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ ایسے معاند ہیں کہ:

اگر (بالفرض) ہم اس (قرآن) کو کسی عجمی (غیر عربی) پر نازل کر دیتے پھر وہ (عجمی) ان کے سامنے اس کو پڑھ بھی دیتا (اور اس صورت میں اس کا معجزہ ہونا بہت ہی زیادہ واضح ہوتا، کیونکہ اب تو رسول عربی پر نازل ہوا ہے جن کو عربی زبان سے کچھ تو واقفیت ہے اگر چہ قرآن جیسی معجز عربی پر قدرت نہیں، مگر نفس عربی پر تو قدرت ہے، اور اس صورت میں تو اس عجمی شخص کو جس پر قرآن نازل کیا جاتا عربی پر ذرا بھی قدرت نہ ہوتی پھر تو سرسری نظر میں بھی شبہ کی گنجائش نہ ہوتی، لیکن) یہ لوگ (بوجہ انتہائی ضد کے) تب بھی اس کو نہ مانتے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی آپ تو فصحائے عرب میں سے ہیں، ممکن ہے مشرکین مکہ یوں کہہ دیں کہ قرآن آپ ﷺ نے خود تصنیف کر لیا ہوگا (حالانکہ قرآن اس حد اعجاز کو پہنچا ہوا ہے جس کا مثل تمام جن وانس بھی بنا کر نہیں لا سکتے) تاہم کہنے کو یہ احتمال پیدا کر سکتے ہیں، لیکن ان کی ہٹ دھرمی، شقاوت اور

بدبختی کا حال تو یہ ہے کہ اگر یہ قرآن فرض کرو ہم کسی غیر فصیح عرب یا عجمی انسان پر اتارتے تو جو ایک حرف عربی کا بولنے پر قادر نہ ہوتا، بلکہ بفرض محال کسی حیوان لایعقل پر اتارا جاتا، تب بھی یہ لوگ اس کے ماننے والے نہ تھے، اس وقت کچھ اور احتمالات پیدا کرتے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: "کافر کہتے تھے کہ قرآن آیا ہے عربی زبان میں، اس نبی کی زبان بھی عربی ہے شاید آپ ہی کہہ لاتا ہو، اگر غیر زبان والے پر عربی قرآن اترتا تو یقین کرتے، فرمایا کہ دھوکہ والے کا جی کبھی نہیں ٹھہرتا، تب اور شبہے نکالتے کہ کوئی سکھا جاتا ہے"۔ (موضح القرآن)

كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٢٠٠﴾ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿٢٠١﴾

اسی طرح گھسا دیا ہم نے اس انکار کو گناہ گاروں کے دل میں، وہ نہ مانیں گے اس کو جب تک نہ دیکھ لیں گے عذاب دردناک [1]

فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٢٠٢﴾ فَيَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ ﴿٢٠٣﴾

پھر آئے ان پر اچانک اور ان کو خبر بھی نہ ہو، پھر کہنے لگیں کچھ بھی ہم کو فرصت ملے گی [2]

**خلاصہ تفسیر:** اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے واسطے ان کے ایمان لانے سے ناامیدی دلاتے ہیں یعنی:

ہم نے اسی طرح (شدت و اصرار کے ساتھ) اس ایمان نہ لانے کو ان نافرمانوں کے دلوں میں ڈال رکھا ہے (یعنی یہ لوگ کفر میں مضبوط اور اس پر جمے ہوئے ہیں، اور اس شدت و اصرار کی وجہ سے) یہ لوگ اس (قرآن) پر ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ سخت عذاب کو (مرنے کے وقت یا برزخ میں یا آخرت میں) نہ دیکھ لیں گے، جو اچانک ان کے سامنے آ کھڑا ہوگا اور ان کو (پہلے سے) خبر بھی نہ ہوگی، پھر (اس وقت جان کو بنے گی تو) کہیں گے کہ کیا (کسی طور پر) ہم کو (کچھ) مہلت مل سکتی ہے (لیکن وہ وقت نہ مہلت کا ہے نہ ایمان قبول ہونے کا ہے)۔

* * *

**فائدہ:** [1] یعنی جو آدمی جرائم اور گناہوں کا خوگر ہو جاتا ہے اور اپنے قویٰ کو شرارت اور سرکشی میں لگا دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنی عادت کے موافق ڈھیل چھوڑ دیتا ہے اور اس کے دل میں انکار و تکذیب کے اثر کو جاگزین کر دیتا ہے، یہ تقریر ترجمہ کے موافق ہوئی، لیکن بہت سے مفسرین نے سلکناہ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع کی ہے، یعنی قرآن کو ہم نے اس طرح مجرمین کے دل میں گھسا دیا ہے کہ وہ دل میں خوب سمجھتے ہیں کہ یہ کلام بشر نہیں ہو سکتا، پھر بھی ہٹ دھرمی سے ایمان نہیں لا سکتے اور تکذیب کیے چلے جاتے ہیں تا آنکہ دنیا یا آخرت میں دردناک عذاب کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیں، اس وقت مانیں گے کہ ہاں پیغمبر سچے تھے اور جو کتاب لائے تھے وہ سچی تھی، مگر اس وقت ماننا کچھ نفع نہ دے گا۔

**فائدہ:** [2] یعنی جب عذاب الٰہی ایک دم سر پر پہنچ جائے گا اس وقت کہیں گے کیا ہمیں تھوڑی سی مہلت دی جا سکتی ہے کہ اب توبہ کر کے اپنا چال چلن درست کر لیں اور پیغمبروں کا اتباع کر کے دکھلائیں، دنیا میں تو عذاب کی جلدی مچا رہے تھے اب مہلت طلب کرنے لگے۔

اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿٢٠٤﴾ اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ ﴿٢٠٥﴾

کیا ہمارے عذاب کو جلد مانگتے ہیں، بھلا دیکھ تو اگر فائدہ پہنچاتے رہیں ہم ان کو برسوں

ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿٢٠٦﴾ مَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ ﴿٢٠٧﴾

پھر پہنچے ان پر جس چیز کا ان سے وعدہ تھا، تو کیا کام آئے گا ان کے جو کچھ فائدہ اٹھاتے رہے [1]

**خلاصہ تفسیر:** اور وہ کفار ایسے وعید و عذاب کے مضامین سن کر عذاب کا تقاضا کیا کرتے تھے جس سے انکار مقصود ہوتا تھا، مثلاً کہتے تھے: عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا اور: اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً یعنی اے اللہ! اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر

پتھروں کی بارش برسا، اور عذاب میں دیر ہونے کو جو درحقیقت ڈھیل کے طور پر ہے، بالکل عذاب نہ آنے کی دلیل سمجھتے تھے آگے اس کا جواب ہے:

کیا (ہماری وعیدوں کو سن کر) یہ لوگ ہمارے عذاب کی تعجیل چاہتے ہیں (جس کا منشاء انکار ہے، یعنی باوجود دلائل قائم ہونے اور سچے مخبر کے خبر دینے کے پھر بھی انکار کرتے ہیں؟ رہا مہلت کو انکار کی وجہ قرار دینا، سو یہ سخت غلطی ہے، کیونکہ) اے مخاطب! ذرا بتلاؤ تو اگر ہم ان کو (چند سال تک) عیش میں رہنے دیں، پھر جس (عذاب) کا ان سے وعدہ ہے وہ ان کے سر آ پڑے تو ان کا وہ عیش کس کام آ سکتا ہے (یعنی یہ عیش و آرام کی جو مہلت انہیں دی گئی ہے اس سے ان کے عذاب میں کوئی تخفیف یا کمی نہیں ہوسکتی)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی سالہا سال کی ڈھیل اور مہلت بھی جو دی گئی تھی اس وقت کچھ کام نہ آئے گی، اس وقت یہ برسوں کی مہلت کالعدم معلوم ہوگی اور سمجھیں گے کہ واقعی بہت ہی جلدی پکڑے گئے: كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا (النازعات:۴۶)

## وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ﴿۲۰۸﴾ ذِكْرٰى ۛ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۰۹﴾

اور کوئی بستی نہیں غارت کی ہم نے جس کے لیے نہیں ہے ڈر سنا دینے والے، یاد دلانے کو اور ہمارا کام نہیں ہے ظلم کرنا ۱؎

**خلاصہ تفسیر:** (اب بتلاتے ہیں کہ حکمت کی وجہ سے چندروزہ مہلت دینا کچھ ان ہی کے واسطے خاص نہیں، بلکہ پہلی امتوں کو بھی مہلت ملی ہیں، چنانچہ:) اور جتنی بستیاں (منکرین کی) ہم نے (عذاب سے) غارت کی ہیں سب میں نصیحت کے واسطے ڈرانے والے (پیغمبر) آئے (جب نہ مانے تو عذاب نازل ہوا) اور ہم (صورۃً بھی) ظالم نہیں ہیں۔

یعنی پیغمبروں کا آنا اور سمجھانا اس لیے بھی تو مدت کی ضرورت ہے، یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ رسول کے آتے ہی جب لوگ انکار کریں تو فوراً عذاب نازل ہوجائے، البتہ کچھ عرصہ کے بعد حجت تمام کر کے اور تمام عذر ختم کر کے پھر ہلاک کیا جاتا ہے، چنانچہ سب امتوں کے ساتھ یہی برتاؤ رہا، پس ان واقعات سے مہلت دینے کی حکمت بھی معلوم ہوگئی، اور مہلت دینے اور عذاب آنے میں تضاد نہ ہونا بھی ثابت ہوگیا، اور صورتاً اس لیے کہا کہ حقیقت میں تو کسی حالت میں بھی ظلم نہ ہوتا۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی کسی قوم کا تختہ یوں ہی ایک دم نہیں الٹ دیا گیا، عذاب بھیجنے سے پہلے کافی مہلت دی گئی اور ہوشیار کرنے والے پیغمبر بھیجے گئے کہ لوگ غفلت میں نہ رہیں، جب کسی طرح نہ مانے آخر غارت کیے گئے العیاذ باللہ۔

## وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۱۰﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۲۱۱﴾ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿۲۱۲﴾

اور اس قرآن کو نہیں لے کر اترے شیطان، اور نہ ان سے بن آئے اور نہ وہ کر سکیں ۱؎ ان کو تو سننے کی جگہ سے دور (برطرف) کر دیا ہے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** آگے پھر مقصود اوّل یعنی مضمون وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الخ کی طرف رجوع کرتے ہیں، اور درمیان کے مضامین منکرین کی حالت کے مناسب ہونے کی وجہ سے مذکور ہوئے تھے، آگے آنے والی آیات کا حاصل مضمون ان شبہات کو دور کرنا ہے جو قرآن کی حقانیت کے متعلق تھے، ایک شبہ تو قرآن کے اللہ کا کلام اور اس کی طرف بھیجا ہوا ماننے پر اس لئے تھا کہ عرب میں پہلے سے کاہن ہوتے آئے تھے وہ بھی کچھ مختلف قسم کے جملے بولا کرتے تھے، نعوذ باللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت بھی بعض کفار یہی کہتے تھے کہ ان کے قبضہ میں کچھ شیاطین ہیں وہ یہ باتیں آ کر کہہ جاتے ہیں، آگے اس کا جواب ہے کہ یہ تو رب العالمین کا نازل کیا ہوا ہے۔

اور اس کو شیاطین (جو کاہنوں کے پاس آیا کرتے تھے) لے کر نہیں آئے (کیونکہ اس کے دو قوی مانع موجود ہیں: ① ایک اس کی صفت شیطنت جس کے سبب) یہ (قرآن) ان (کی حالت) کے مناسب ہی نہیں (کیونکہ قرآن سراپا ہدایت ہے اور شیطان سراپا گمراہی ہے، نہ اس کو ایسے

مضامین سوجھ سکتے ہیں، اور نہ ایسے مضامین شائع کرنے سے اس کی جوغرض ہے یعنی مخلوق کو گمراہ کرنا وہ پوری ہوسکتی ہے، کیونکہ اس میں تو جا بجا شیطان کے فریبوں سے بچنے کی تعلیم ہے، پس شیاطین ایسی تعلیم سے اپنے مقصود میں کس طرح روڑے اٹکا سکتا ہے، ایک مانع تو یہ ہوا) اور (۲ دوسرا مانع یہ کہ وہ) اس پر قادر بھی نہیں، کیونکہ وہ شیاطین (وحی آسمانی) سننے سے روک دیئے گئے ہیں (کیونکہ وہ جب آسمانی باتوں کو سننا چاہتے ہیں تو ایک چمکتا ہوا شعلہ یعنی شہاب ثاقب فوراً ان کا پیچھا کرتا ہے جس سے وہ ہلاک یا مخبوط الحواس ہوجاتے ہیں، چنانچہ کاہنوں اور مشرکوں سے ان کے جنات نے اپنی ناکامی کا خود اعتراف کیا جس کی انہوں نے دوسروں کو بھی خبر دی، چنانچہ بخاری میں ایسے قصے حضرت عمرؓ کے اسلام کے باب میں مذکور ہیں، پس شیطانوں کے سکھانے کا کسی طرح احتمال نہ رہا، اور اس جواب کا پورا ہونا اور ایک دوسرے شبہ کا جواب ختم سورت کے قریب آئے گا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ درمیان میں مکذبین کے احوال بیان فرما کر پھر اصل مضمون: وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ (الشعرآء:۱۹۲) کی تکمیل وتمیم فرماتے ہیں، یعنی یہ کتاب خدا تعالیٰ کے ہاں سے جبرائیل امین لائے ہیں، شیاطین کی سکھلائی ہوئی چیز نہیں، بھلا شیاطین سے کہاں ممکن ہے کہ ایسی کتاب بن آئے، ان کی طبائع کا خاصہ تو گمراہی، فساد، اور ظلمت پھیلانا ہے، اور یہ کتاب اول سے آخر تک رشد وصلاح اور نور ہدایت سے بھری ہوئی ہے جس کی تعلیم سے وہ جماعت تیار ہوئی، جس سے زیادہ آسمان کے نیچے بجز انبیاء کے کوئی پاک باز، صادق، خدا ترس اور خدا پرست جماعت نہیں تو اس کتاب کے علوم اور شیاطین کی طبائع میں کوئی مناسبت نہیں، نہ وہ اس لائق ہیں کہ اس عظیم الشان، متبرک بارِ امانت کو اٹھا سکیں: لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (الحشر:۲۱) روایات میں ہے کہ بعض مشرکین کا خیال تھا کہ محمد ﷺ کے پاس کوئی جن آکر یہ قرآن سکھلا جاتا ہے، بخاری میں ہے کہ ایک مرتبہ وحی آنے میں کچھ دیر ہوئی تو ایک عورت نے حضور ﷺ کو کہا کہ تیرے شیطان نے تجھ کو چھوڑ دیا (نعوذ باللہ) ان آیات میں اسی خیال کی تردید ہے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی نزول قرآن کے زمانہ میں اس کی حفاظت کے لیے ایسے غیبی پہرے بٹھائے گئے ہیں کہ شیاطین پاس بھی نہیں پھٹک سکتے نہ ایک حرف اچک سکتے ہیں کما قال تعالیٰ: وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا (الجن:۹) وقال تعالیٰ: فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا (الجن:۲۷) وقال تعالیٰ: لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (فصلت:۴۲)۔

**تنبیہ:** شیاطین کے غیبی خبریں سننے کی کوشش کرنے اور ناکام رہنے کے متعلق سورہ حجر کے شروع میں مفصل کلام کیا جاچکا ہے وہاں مطالعہ کرنا چاہیے۔

## فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ﴿۲۱۳﴾ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾

سو تو مت پکار اللہ کے ساتھ دوسرا معبود (حاکم) پھر تو پڑے عذاب میں ۱ اور ڈر سنا دے اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ۲

**خلاصہ تفسیر:** اب درمیان میں اس قرآن کے اللہ کی طرف سے نازل ہونے پر بطور تفریع کے ایک مضمون ہے، یعنی جب اس کا خدا کی طرف سے نازل ہونا ثابت ہوگیا تو اس کی تعلیم واجب العمل ہوئی جس میں سب سے بڑی اور مہتم بالشان توحید کی تعلیم ہے۔

سو (اے پیغمبر! ہم توحید کے وجوب کی تاکید ایک خاص طریق سے کرتے ہیں وہ یہ کہ ہم آپ کو مخاطب بنا کر کہتے ہیں کہ) تم خدا کے ساتھ کسی اور معبود کی عبادت مت کرنا کبھی تم کو سزا ہونے لگے (حالانکہ آپ میں نعوذ باللہ نہ شرک کا احتمال ہے نہ عذاب کا، مگر لوگوں کو یہ بات جتلانا مقصود ہے کہ جب غیر اللہ کی عبادت پر آپ کے لئے بھی سزا کا حکم ہے تو اور بیچارے تو کسی شمار میں ہیں؟ شرک سے ان کو کیسے منع نہ کیا جائے گا اور شرک کر کے وہ عذاب سے کیونکر بچیں گے) اور (اسی مضمون سے) آپ (سب سے پہلے) اپنے نزدیک کے کنبہ کو ڈرایئے (چنانچہ آپ ﷺ نے سب کو پکار کر جمع

کیا اور شرک پر عذاب الٰہی سے ڈرایا جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے)۔

فَلَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ: اس میں صراحت ہے کہ ولی کبھی ایسے درجہ پر نہیں پہنچتا کہ جس سے شرعی احکام معاف ہو جائیں، کیونکہ ولی کا درجہ نبی سے بلند نہیں، جب نبی کے لیے یہ جائز نہیں تو پھر ولی کے لیے کیونکر جائز ہوگا!۔

وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ: روح المعانی میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ نسب کے ساتھ جب تک ایمان نہ ہو تو وہ نسب بالکل نافع نہیں، چونکہ قرابت کا حجاب بہت سخت ہوتا ہے، اس لیے اقربین کے انذار کا حکم کیا گیا۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یہ فرمایا رسول کو اور سنایا اوروں کو، یعنی جب یہ کتاب بلاشک وشبہ خدا کی اتاری ہوئی ہے، شیطان کا اس میں ذرہ بھر دخل نہیں تو چاہیے کہ اسکی تعلیم پر چلو جس میں اصل اصول توحید ہے، شرک وکفر اور تکذیب کی شیطانی راہ اختیار مت کرو، ورنہ عذاب الٰہی سے رستگاری کی کوئی سبیل نہیں۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی اوروں سے پہلے اپنے اقارب کو تنبیہ کیجئے کہ خیر خواہی میں ان کا حق مقدم ہے اور ویسے بھی آدمی کی صداقت وحقانیت اقارب کے معاملہ سے پرکھی جاتی ہے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''جب یہ آیت اتری، حضرت ﷺ نے سارے قریش کو پکار کر سنادیا اور اپنی پھوپھی تک اور اپنی بیٹی تک اور چچا تک کہہ سنایا کہ اللہ کے ہاں اپنی فکر کرو، خدا کے ہاں میں تمہارا کچھ نہیں کر سکتا''۔

وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۲۱۵﴾ فَاِنۡ عَصَوۡكَ فَقُلۡ اِنِّىۡ بَرِىۡٓءٌ مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۱۶﴾

اور اپنے بازو نیچے رکھ انکے واسطے جو تیرے ساتھ ہیں ایمان والے ۱؎ پھر اگر تیری نافرمانی کریں تو کہہ دے میں بیزار ہوں تمہارے کام سے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اب آگے اس ڈرانے کے بعد ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے ساتھ معاملہ کا طریقہ بتلاتے ہیں، یعنی:

اور ان لوگوں کے ساتھ (تو مشفقانہ) فروتنی سے پیش آیئے جو مسلمانوں میں داخل ہو کر آپ کی راہ پر چلیں (خواہ آپ کے خاندان کے ہوں یا غیر خاندان کے) اور اگر یہ لوگ (جن کو آپ نے ڈرایا ہے) آپ کا کہنا نہ مانیں (اور کفر پر اڑے رہیں) تو آپ (صاف) کہہ دیجئے کہ میں تمہارے افعال سے بیزار ہوں (ان دونوں مضمونوں یعنی **واخفض** اور **فقل انی** الخ میں حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کی پوری تعلیم ہے)۔

وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ: اس میں شیوخ واساتذہ کو اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ اپنے مخلص تابعین سے نرمی وتواضع کے ساتھ پیش آیا کریں تاکہ وہ مسرور رہوں۔

فَاِنۡ عَصَوۡكَ فَقُلۡ اِنِّىۡ بَرِىۡٓءٌ: اس میں اس پر دلالت ہے کہ جو شخص کسی طریق سے مخالف ہو تو اس سے شیخ یا استاذ کو براءت کر لینی چاہیے اور اس براءت کی اسے اطلاع بھی کر دے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی شفقت میں رکھ ایمان والوں کو، اپنے ہوں یا پرائے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی خلاف حکم خدا جو کوئی کرے اس سے تو بیزار ہو جا، اپنا ہو یا پرایا۔

وَتَوَكَّلۡ عَلَى الۡعَزِيۡزِ الرَّحِيۡمِ ﴿۲۱۷﴾ الَّذِىۡ يَرٰىكَ حِيۡنَ تَقُوۡمُ ﴿۲۱۸﴾

اور بھروسہ کر اس زبردست رحم والے پر ۱؎ جو دیکھتا ہے تجھ کو جب تو اٹھتا ہے

وَتَقَلُّبَكَ فِى السّٰجِدِيۡنَ ﴿۲۱۹﴾ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۲۲۰﴾

اور تیرا پھرنا نمازیوں میں ۲؎ بیشک وہی ہے سننے والا جاننے والا

**خلاصہ تفسیر**: اب آگے ارشاد ہے کہ ان مخالفین کی طرف سے ایذا اور نقصان دینے کا کبھی کوئی خطرہ دل میں نہ لائیے۔
اور خدائے رحیم پر توکل رکھئے جو آپ کو جس وقت کہ آپ (نماز کے لئے) کھڑے ہوتے ہیں اور (نیز نماز شروع کرنے کے بعد) نمازیوں کے ساتھ آپ کی نشست و برخاست کو دیکھتا ہے (اور نماز کے علاوہ بھی وہ دیکھتا بھالتا ہے کیونکہ) وہ خوب سننے والا خوب دیکھنے والا ہے۔

پس جب اس کو علم بھی کامل ہے جیسے یراك اور سمیع، علیم اس پر دلالت کرتے ہیں اور وہ آپ پر مہربان بھی ہے، جیسے الرحیم اس پر دلالت کرتا ہے اور اس کو سب قدرت ہے جیسا العزیز سے مفہوم ہوتا ہے تو وہ ضرور بھروسہ کے لائق ہے، وہ حقیقی نقصان سے آپ کو بچائے گا، اور متوکل کو جو کبھی نقصان پہنچتا ہے تو وہ صرف ظاہر کے اعتبار سے نقصان ہوتا ہے جس کے اندر ہزاروں منافع ہوتے ہیں جن کا کبھی دنیا ہی میں ورنہ آخرت میں تو ضرور ظہور ہوتا ہے۔

* * *

**فائدہ**: ۱؎ یعنی نافرمانی کرنے والے کوئی ہوں اور کتنے ہی ہوں تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، سب سے بیزار ہو کر ایک خدا پر بھروسہ رکھ جو زبردست بھی ہے کسی کی اس کے مقابلہ میں چل نہیں سکتی، اور مہربانی فرمانے والا بھی، چنانچہ اپنی مہربانی سے تیرے حال پر ہر وقت نظر عنایت رکھتا ہے۔

**فائدہ**: ۲؎ یعنی جب تو تہجد کو اٹھتا ہے اور متوسلین کی خبر لیتا ہے کہ خدا کی یاد میں ہیں یا غافل (موضح) یا تو جب نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے، اور جماعت کی نماز میں نقل و حرکت (رکوع و سجود وغیرہ) کرتا ہے، اور مقتدیوں کی دیکھ بھال رکھتا ہے اور بعض سلف نے کہا کہ ساجدین سے آپ ﷺ کے آباء مراد ہیں، یعنی آپ ﷺ کے نور کا ایک نبی کی صلب سے دوسرے نبی کی صلب تک منتقل ہونا اور آخر میں نبی ہو کر تشریف لانا بلکہ بعض مفسرین نے اس لفظ سے حضور ﷺ کے والدین کے ایمان پر استدلال کیا ہے، واللہ اعلم۔

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۲۱﴾ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۲۲﴾

میں بتلاؤں تم کو کس پر اترتے ہیں شیطان، اترتے ہیں ہر جھوٹے گناہ گار پر ۱؎

يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ﴿۲۲۳﴾

لا ڈالتے ہیں سنی ہوئی بات اور بہت ان میں جھوٹے ہیں ۲؎

**خلاصہ تفسیر**: اب کہانت کے شبہ کے جواب کی تکمیل ہے کہ اے پیغمبر! لوگوں سے کہہ دیجئے کہ:

کیا میں تم کو بتلاؤں کس پر شیطان اُترا کرتے ہیں (سنو) ایسے شخصوں پر اُترا کرتے ہیں جو (پہلے سے) دروغ گفتار بڑے بدکردار ہوں اور جو (شیاطین کی خبریں سننے کے لیے ان شیطانوں کی طرف) کان لگا دیتے ہیں اور (لوگوں سے ان چیزوں کے بیان کرنے کے وقت) وہ بکثرت جھوٹ بولتے ہیں۔

یعنی چونکہ وہ باتیں اکثر ناتمام ہوتی ہیں اس لیے ان کو باوقعت اور رنگین بنانے کے لیے کچھ حاشیہ بھی اپنی طرف سے گھڑ کر چڑھا دیتے ہیں، چنانچہ سفلی عاملوں کو اب بھی اسی حالت میں دیکھا جاتا ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ فائدہ لینے اور فائدہ دینے والے یعنی استاذ و شاگرد کے درمیان مناسبت ضروری ہے تو شیطان کا شاگرد بھی وہی ہوگا جو بات میں جھوٹا اور افعال میں گنہگار ہو، پھر شیطان کی طرف دل سے متوجہ بھی ہو کیونکہ بغیر توجہ کے استاذ سے استفادہ نہیں ہو سکتا، پس کاہن کے لئے عادۃً یہ باتیں ضروری ہیں اور یہ ساری باتیں نبی کریم ﷺ میں ہونے کا کوئی دور کا بھی احتمال نہیں، کیونکہ آپ ﷺ کا سب سے زیادہ سچا ہونا، تمام عالم سے بڑھ کر نیک و متقی ہونا اور شیاطین سے سخت متنفر ہونا، خبریں بیان کرنے میں پورا سچا ہونا معروف و مشہور اور مخالفین کے نزدیک بھی مسلم تھا، پھر کہانت کا کب احتمال رہا!!۔

چند آیات قبل: اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ اور مذکورہ آیت: يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ میں بظاہر تعارض کا شبہ ہوتا ہے، اس کی تحقیق اور جواب

سورہ حجر آیت ۱۸ کے ذیل میں ملاحظہ فرمالیں۔

تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ :اس میں اشارہ ہے اس طرف کہ صادق وکامل الایمان متقی پر شیطان ایسا تصرف نہیں کرسکتا جس سے اس کے دین کو نقصان پہنچے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یہاں پھر قرآن کے صدق اور عظمتِ شان پر تنبیہ فرمائی، یعنی ایسے ساجدی اور تہجد گزاروں کے امام کو جو اللہ کے معاملہ میں اپنے اور بیگانے کی کوئی پرواہ نہ کرے اور ساری دنیا سے ٹوٹ کرا کیلے خدا پر بھروسہ رکھے، کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ (معاذ اللہ) شیطان ان پر وحی لاتا تھا؟ آؤ! میں تم کو بتاؤں کہ شیطان کی وحی کس قسم کے لوگوں پر آتی ہے، وہ آتی ہے جھوٹوں پر، بدمعاشوں اور بدکاروں پر، کیونکہ شیطان سچے اور نیک آدمیوں سے بیزار ہے کہ یہ اس کو برا جانتے ہی، جھوٹے دغابازوں سے خوش ہے جو اس کی مرضی کے موافق ہیں، بھلا سب سچوں سے زیادہ سچے اور تمام نیکوں سے بڑھ کر نیک انسان کو شیطانی وحی سے کیا نسبت، حضور ﷺ کا صدق وامانت، اتقاء، پاکبازی، خداترسی تو وہ اوصاف ہیں جو بچپن سے لے کر دعوائے نبوت تک آپ کی ساری قوم کو تسلیم تھے، حتیٰ کہ ''الصادقین الامین'' آپ کا لقب ہی پڑ گیا تھا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی شیاطین کوئی ایک آدھ ناتمام بات امور غیبیہ جزئیہ کے متعلق جو سن بھاگتے ہیں اس میں سو جھوٹ ملا کر اپنے کاہن دوستوں کو پہنچاتے ہیں، یہ حقیقت ان کی وحی کی ہے، برخلاف اس کے انبیاء کی وحی کے کہ ایک حرف اور ایک شوشہ بھی جھوٹ نہیں ہوسکتا، بعض نے "يُلْقُوْنَ السَّمْعَ" کے معنی یہ لیے ہیں، کہ شیاطین ملاء اعلیٰ کی طرف کان لگاتے ہیں کہ کوئی غیبی بھنک کان میں پڑ جائے، یا جھوٹے گنہگار شیاطین کی طرف کان جھکائے رکھتے ہیں کہ کوئی چیز ادھر سے ہاتھ آئے تو چلتی کریں۔

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾

شاعروں کی بات پر چلیں وہی جو بے راہ ہیں ۱؎ تو نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر میدان میں سر مارتے پھرتے ہیں ۲؎

وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾

اور یہ کہ وہ کہتے ہیں جو نہیں کرتے ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** اب شاعری کے شبہ کا جواب ہے، کفار کہتے تھے: بَلْ هُوَ شَاعِرٌ کہ یہ تو شاعر ہیں، یعنی اگرچہ قرآن نظم میں نہیں، مگر اس کے مضامین خیالی ہیں واقعی نہیں، فرماتے ہیں کہ یہ احتمال اس لیے غلط ہے کہ:

اور شاعروں کی راہ تو بے راہ لوگ چلا کرتے ہیں (شاعروں کی راہ سے مراد شعر گوئی ہے، یعنی شاعرانہ خیالی مضامین کہنا خواہ نظم میں ہوں یا نثر میں، یہ ان لوگوں کا شیوہ ہے جو تحقیق کے راستہ سے دور ہوں، چنانچہ خیالی مضامین کہتے ہی اس کو ہیں جو تحقیق کے خلاف ہوں، آگے اس دعویٰ کی وضاحت ہے کہ) اے مخاطب! کیا تم کو معلوم نہیں کہ وہ (شاعر) لوگ (خیالی مضامین) کے ہر میدان میں حیران (ٹکریں مارتے مضامین کی تلاش میں) پھرا کرتے ہیں، اور (جب مضمون مل جاتا ہے تو چونکہ وہ اکثر واقع کے خلاف ہوتا ہے اس لئے) زبان سے وہ باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں

یعنی زبان سے ایسی گپیں ہانکتے ہیں جو کرتے نہیں، چنانچہ شاعرانہ گپیں مشہور ہیں جس کا ایک نمونہ یہ ہے:

اے رشک مسیحا! تری رفتار کے قرباں ٹھوکر سے مری لاش کئی بار جلا دی
اے باد صبا! ہم تجھے کیا یاد کریں گے اس گل کی خبر تو نے کبھی ہم کو نہ لا دی
صبا نے اس کے کوچہ سے اڑا کر خدا جانے ہماری خاک کیا کی

حتیٰ کہ کبھی کفریہ باتیں بھی بکنے لگتے ہیں، حاصل جواب کا یہ ہوا کہ شعری مضامین خیالی ہوتے ہیں، واقعی نہیں ہوتے، اور قرآن کے مضامین

جس مسئلہ کے متعلق ہیں وہ سب کے سب نہایت تحقیقی اور واقعی ہیں، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کہنا یہ خود شاعرانہ جنون ہے، اکثر چونکہ نظم میں ایسے ہی مضامین ہوا کرتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نظم پر قدرت بھی نہیں دی۔

**وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ**: اس آیت میں شعراء پر یہ عیب لگایا گیا ہے کہ ان کے متبعین گمراہ ہیں، یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گمراہ تو ہوئے متبعین، ان کے فعل کا الزام متبوعین یعنی شعراء پر کیسے عائد ہوا؟ وجہ یہ ہے کہ عموماً اتباع کرنے والوں کی گمراہی علامت اور نشانی ہوتی ہے متبوع کی گمراہی کی، صحیح جواب یہ ہے کہ یہ حکم اس وقت ہے جب تابع کی گمراہی میں اس متبوع کے اتباع کا دخل ہو مثلاً متبوع کو جھوٹ اور غیبت سے بچنے بچانے کا اہتمام نہیں ہے، اس کی مجلس میں اس طرح کی باتیں ہوتی ہیں وہ روک ٹوک نہیں کرتا، اس سے تابع کو بھی جھوٹ اور غیبت کی عادت پڑ گئی تو یہ تابع کا گناہ خود متبوع کے گناہ کی علامت قرار دیا جائے گا، لیکن اگر گمراہی متبوع کی ایک وجہ سے اور اتباع کسی دوسری وجہ سے ہو تو یہ تابع کی گمراہی متبوع کی گمراہی کی علامت نہیں ہوگی، مثلاً ایک شخص عقائد و مسائل میں کسی عالم کا اتباع کرتا ہے اور ان میں کوئی گمراہی نہیں، اعمال و اخلاق میں اس عالم کا اتباع نہیں کرتا انہیں میں یہ گمراہ ہے تو اس کی عملی اور اخلاقی گمراہی اس عالم کی گمراہی پر دلیل نہیں ہوگی، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

* * *

**فائدہ: ۱** کافر لوگ پیغمبر کو کبھی کاہن بتاتے کبھی شاعر، سو فرمایا کہ شاعری کی باتیں محض تخیلات ہوتی ہیں تحقیق سے اس کو لگاؤ نہیں ہوتا، اس لیے اس کی باتوں سے بجز گرمی محفل یا وقتی جوش اور واہ واہ کے کسی کو مستقل ہدایت نہیں ہوتی حالانکہ اس پیغمبر کی صحبت میں قرآن سن سن کر ہزاروں آدمی نیکی اور پرہیزگاری پر آتے ہیں۔

**فائدہ: ۲** یعنی جو مضمون پکڑ لیا اسی کو بڑھاتے چلے گئے، کسی کی تعریف کی تو آسمان پر چڑھا دیا، مذمت کی تو ساری دنیا کے عیب اس میں جمع کر دیئے، موجود کو معدوم اور معدوم کو موجود ثابت کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، غرض جھوٹ، مبالغہ اور تخیل کے جس جنگل میں نکل گئے، پھر مڑ کر نہیں دیکھا، اسی لیے شعر کی نسبت مشہور ہے: "اکذب او احسن او"۔

**فائدہ: ۳** یعنی شعر پڑھو تو معلوم ہو کہ رستم سے زیادہ بہادر اور شیر سے زیادہ دلیر ہوں گے، اور جا کر ملو تو پرلے درجہ کے نامرد اور ڈرپوک کبھی دیکھو تو ہٹے کٹے ہیں اور اشعار پڑھو تو خیال ہو کہ نبضیں ساقط ہو چکیں، قبضِ روح کا انتظار ہے، حالی نے مسدس میں ان کے جھوٹ کا خوب نقشہ کھینچا ہے، غرض ایک پیغمبر خدا اور وہ بھی خاتم الانبیاء کو اس جماعت سے کیا لگاؤ، اسی لیے فرمایا: **وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ** (یس:۶۹) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو بات تھی سچی، جچی تلی باون تولے پاؤ رتی، تحقیق کے ترازو میں تلی ہوئی، پھر جو بات زبان مبارک سے سنی جاتی تھی وہ ہی علم میں آنکھوں سے نظر آتی تھی، بھلا شاعر ایسے ہوتے ہیں؟ اور شاعری اسے کہتے ہیں؟ حاشا ثم حاشا۔

ع ۱۱ ۱۵ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ

مگر وہ لوگ جو یقین لائے اور کام کیے اچھے اور یاد کی اللہ کی بہت اور بدلہ لیا اس کے پیچھے کہ ان پر ظلم ہوا ۱

وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۲۲۷

اور اب معلوم کرلیں گے ظلم کرنے والے کہ کس کروٹ الٹتے ہیں ۲

**خلاصہ تفسیر**: پیچھے چونکہ شعر کی مذمت بیان ہوئی ہے وہ بظاہر سب شعراء کو شامل ہے، اگرچہ ان کے مضامین عین حکمت اور واقعی ہوں اس لیے آگے اب ان کو مستثنیٰ فرماتے ہیں کہ:

ہاں مگر جو لوگ (ان شاعروں میں سے) ایمان لائے اور اچھے اچھے کام کئے (یعنی شرع کے خلاف نہ ان کا قول ہے نہ فعل، یعنی ان کے اشعار میں بیہودہ مضامین نہیں ہیں) اور انہوں نے (اپنے اشعار میں) کثرت سے اللہ کا ذکر کیا (یعنی تائید دین اور اشاعت علم میں ان کے اشعار ہیں

کہ یہ سب ذکر اللہ میں داخل ہیں ) اور ( اگر کسی شعر میں بظاہر کوئی نامناسب مضمون بھی ہے جیسے کسی کی ہجو اور مذمت جو بظاہر اخلاق حسنہ کے خلاف ہے تو اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ ) انہوں نے بعد اس کے کہ ان پر ظلم ہو چکا ہے ( اس کا ) بدلہ لیا ( ہے، یعنی کفار یا فساق نے اول ان کو زبانی تکلیف پہنچائی، مثلاً ان کی ہجو کی، یا دین کی یا رسول کی توہین کی جو اپنی ہجو سے بھی بڑھ کر تکلیف کا سبب ہے، یا ان کے مال کو یا جان کو نقصان پہنچایا، یعنی یہ لوگ مستثنیٰ ہیں ، کیونکہ انتقامی طور پر جو شعر کہے گئے ہیں ان میں بعض تو مباح ہیں اور بعض اطاعت و کار ثواب ہیں ) اور ( یہاں تک رسالت کے متعلق شبہات کے جوابات پورے ہوئے اور اس سے پہلے دلائل سے رسالت ثابت ہو چکی تھی ، اب آگے ان لوگوں کی وعید ہے جو اس کے باوجود منکر نبوت رہے اور حضور ﷺ کو ایذاء پہنچاتے ہیں یعنی ) عنقریب ان لوگوں کو معلوم ہو جائے گا جنہوں نے ( حقوق اللہ، حقوق الرسول یا حقوق العباد میں ) ظلم کر رکھا ہے کہ کیسی ( بری اور مصیبت کی ) جگہ ان کو لوٹ کر جانا ہے ( مراد اس سے جہنم ہے )۔

**اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ:** مسلمان شعراء کو جو یہاں مستثنیٰ فرمایا ہے یہ استثنا محض شعر کی صورت کے اعتبار سے ہے، ورنہ ایسے اشعار جن میں شریعت کے حدود کی رعایت ہو اس شعر ہی میں داخل نہیں جس کی مذمت شروع کلام میں مذکور ہے، کیونکہ اس سے مراد خیالی مضامین ہیں، خواہ نظم ہوں یا نثر، پس صرف نظم ہونے کو قباحت میں کوئی دخل نہیں، اور نہ محض نثر ہونا قباحت سے بچا سکتا ہے، جب تک کہ شرعی حدود کی رعایت نہ ہو۔

روح المعانی میں ہے کہ یہ استثنا ان شعراء کا ہے جو مؤمن صالح اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے ہیں، اور ان کے اشعار بھی توحید، آخرت کی ترغیب اور دنیا کی بے ثباتی وغیرہ کے بارے میں ہوتے ہیں، جلیل القدر حضرات سے شعر کی تعریف منقول ہے، چنانچہ حضرت علیؓ کا بھی ارشاد ہے کہ ''شعر عقل کی میزان ہے''، اور کچھ تو بات ہے جو بڑے بڑے عارفین اور عشاق عرب و عجم اکثر مقامات و احوال کو اشعار ہی میں زیادہ ظاہر کرتے ہیں، اور شعر میں جو برانگیختگی اور تاثیر کی کیفیت ہوتی ہے وہ نثر میں نہیں ہوتی، اس کا تو کوئی بھی انکار ہی نہیں کر سکتا، چونکہ یہ تاثیر خود مطلوب ہے اس حیثیت سے اسے نثر پر ترجیح ہوگی اور اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے شعر کو حکمت فرمایا ہے بجز اس نثر کے جس میں یہ تاثیر زیادہ قوی جیسے اللہ تعالیٰ کا یا رسول اللہ ﷺ کا کلام۔

* * *

**فائدہ: ۱** مگر جو کوئی شعر میں اللہ کی حمد کہے یا نیکی کی ترغیب دے، یا کفر کی مذمت یا گناہ کی برائی کرے یا کافر اسلام کی ہجو کریں یہ اس کا جواب دے، یا کسی نے اس کو ایذاء پہنچائی اس کا جواب بحد اعتدال دیا، ایسا شعر عیب نہیں، چنانچہ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ وغیرہ ایسے ہی اشعار کہتے تھے، اسی لیے حضور نے فرمایا کہ ان کافروں کا جواب دے اور روح القدس تیرے ساتھ ہے۔

**فائدہ: ۲** یہ بھی بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا کی مناسبت سے فرمایا کہ ظالموں کو عنقریب اپنا انجام معلوم ہو جائے گا کہ کس کروٹ اونٹ بیٹھتا ہے سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ اللہ کی کتابوں اور پیغمبروں کو کاہن و شاعر کہہ کر جھٹلائے۔

اٰیاتھا ۹۳ ۲۷ سُوْرَۃُ النَّمْلِ مَکِّیَّۃٌ ۴۸ رکوعاتھا ۷

**خلاصہ تفسیر**: اس سورت کا خلاصہ اصل تین مضمون ہیں: ① وحی و رسالت کا اثبات، جس سے سورت شروع ہوئی ہے اور اسی پر گذشتہ سورت ختم ہوئی تھی، اسی مناسبت سے انبیاء علیہم السلام کے بعض قصے بیان ہوئے ② توحید کا بیان، جو آیت قل الحمد سے شروع ہوتا ہے ③ آخرت کا اثبات، قیامت کی علامات، اور جزا و سزا کا بیان جو آیت: قل لا یعلم من فی السموات سے سورت کے اختتام تک چلا گیا ہے، درمیان بعض دیگر مضامین اس کی مناسبت سے آگئے ہیں، اور سورت کے خاتمہ پر انما امرت سے آخر تک یہی تمام مضامین بطور نتیجہ و خلاصہ بیان کرنے کے بعد سورت کو ختم فرمایا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

طٰسٓ قف تِلْكَ اٰیٰتُ الْقُرْاٰنِ وَ كِتَابٍ مُّبِیْنٍ ① هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِیْنَ ② الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ

طٰس ۔ یہ آیتیں ہیں قرآن اور کھلی کتاب کی، ہدایت اور خوش خبری ایمان والوں کے واسطے، جو قائم رکھتے ہیں

الصَّلٰوةَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ ③

نماز کو اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور ان کو آخرت پر یقین ہے

**خلاصہ تفسیر**: اس سورت کو وحی اور رسالت کے ثابت کرنے سے شروع کیا ہے اور اسی مضمون پر گذشتہ سورت ختم ہوئی تھی۔

طٰسٓ (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (آیتیں جو آپ پر نازل کی جاتی ہیں) آیتیں ہیں قرآن کی اور ایک واضح کتاب کی (یعنی اس میں دو صفتیں ہیں: ① قرآن ہونا ② واضح کتاب ہونا) یہ (آیتیں) ایمان والوں کے لئے (موجب) ہدایت اور (اس ہدایت پر جزائے نیک کا) مژدہ سنانے والی ہیں جو (مسلمان) ایسے ہیں کہ (عملاً بھی ہدایت پر چلتے ہیں چنانچہ) نماز کی پابندی کرتے ہیں (جو کہ بدنی عبادات میں سب سے بڑی ہیں) اور زکوٰۃ دیتے ہیں (جو کہ مالی عبادات میں سب سے بڑی ہے) اور (عقیدہ کے لحاظ سے بھی ہدایت یافتہ ہیں، چنانچہ) وہ آخرت پر پورا یقین رکھتے ہیں (یہ تو ایمان والوں کی صفت ہے)۔

وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ: اہل کتاب بھی آخرت کے قائل تھے مگر اس میں بہت سی غلط باتیں ملا دینے سے وہ اقرار معتبر نہ رہا تھا، خلاصہ تفسیر میں لفظ ''پورا'' بڑھا کر اسی کی طرف اشارہ کیا گیا کہ پورا یقین مسلمانوں کے سوا کسی کو نہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَیَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ یَعْمَهُوْنَ ④ ط

جو لوگ نہیں مانتے آخرت کو اچھے دکھلائے ہم نے ان کی نظروں میں ان کے کام سو وہ بہکے پھرتے ہیں ۱ۓ

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ وَ هُمْ فِی الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ⑤

وہی ہیں جن کے واسطے بری طرح کا عذاب ہے اور آخرت میں وہی ہیں خراب ۲ۓ

**خلاصہ تفسیر**: (اور) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں ہم نے ان کے اعمال (بد) ان کی نظر میں مرغوب کر رکھے ہیں، سو

وہ (اپنے جہل مرکب میں حق سے دور) بھٹکتے پھرتے ہیں (چنانچہ نہ ان کے عقائد درست ہیں نہ اعمال، اس لئے وہ قرآن کو بھی نہیں مانتے، اور جیسے قرآن اہل ایمان کو خوش خبری سناتا ہے منکروں کو وعید اور دھمکی بھی سناتا ہے کہ) یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے (دنیا میں مرنے کے وقت بھی) سخت عذاب (ہونے والا) ہے اور وہ لوگ آخرت میں (بھی) سخت خسارہ میں ہیں (کہ کبھی نجات ہی نہ ہوگی)۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ: یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ ہر شخص کے دل کی شہادت معتبر نہیں ہوتی (یعنی اگر کسی آخرت فراموش کا خود اپنا دل کسی عقیدہ پر مطمئن اور پراعتماد ہو تو یہ اسکے حق ہونے کی دلیل نہیں ہوگی، کیونکہ سارے باطل مذاہب والے اپنے مذہب اور عقیدوں کو حق ہی سمجھتے ہیں)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی جن کو انجام کی کوئی فکر اور مستقبل کا خیال نہ ہو، وہ اسی دنیائے فانی کی فکر میں ڈوبے رہتے ہیں، ان کی تمام کوشش کا مرکز یہ ہی چندروزہ زندگی ہے جو کتاب یا پیغمبر ادھر سے ہٹا کر عاقبت کی طرف توجہ دلائے، اس پر کیوں کان دھرنے لگے، وہ دنیا کے عشق میں غرق ہو کر ہادیوں پر آوازیں کستے ہیں، آسمانی صحیفوں کو مردِ طعن بناتے ہیں، پیغمبروں کے ساتھ ٹھٹھا کرتے ہیں، اور یہ ہی کام ہیں، جن کو اپنے نزدیک بہت اچھا سمجھ کر برابر گمراہی میں ترقی کرتے جاتے ہیں۔

**تنبیہ:** تزیین کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف اس حیثیت سے کی کہ خالق ہر چیز کا وہ ہی ہے کسی سبب پر مسبب کا ترتب بدون اس کی مشیت و ارادہ کے نہیں ہوسکتا، جیسا کہ دوسرے مواضع میں اضلال و ختم و طبع وغیرہ کی نسبت اس کی طرف ہوئی ہے، سورہ نمل کی ان ابتدائی آیات کا مضمون سورہ بقرہ کی ابتدائی آیات سے بہت مشابہ ہے ان کو ایک مرتبہ مطالعہ کر لیا جائے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی وہاں سب سے زیادہ خسارہ میں یہ ہی لوگ ہوں گے۔

وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ۝۶

اور تجھ کو تو قرآن پہنچتا ہے ایک حکمت والے خبردار کے پاس سے

**خلاصہ تفسیر:** اور (اگرچہ یہ منکر قرآن کو نہ مانیں مگر) آپ کو بالیقین ایک بڑی حکمت والے علم والے کی طرف سے قرآن دیا جا رہا ہے (آپ اس نعمت کے سرور میں ان کے انکار سے غمگین نہ ہو جایئے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی اب بدبختوں کو تیہ ضلالت میں بھٹکنے دو، جب انہوں نے قرآن مبین کی قدر نہ پہچانی اور اسکی ہدایات و بشارات سے فائدہ نہ اٹھایا تو یہ ہی حشر ہونا تھا، آپ ﷺ تو خدا کا شکر کیجئے کہ اس علیم و حکیم کی سب سے زیادہ عظیم الشان کتاب آپ ﷺ کو مرحمت کی گئی ہے جس سے ہر وقت تازہ با تازہ فوائد پہنچ رہے ہیں جس میں مومنین کے لیے بشارتیں ہیں اور مکذبین کو عبرتناک واقعات سنائے گئے ہیں تاکہ سچوں کا دل مضبوط و قوی ہو اور جھوٹ کی حمایت کرنے والے اپنی بدانجامی پر مطلع ہو جائیں، چنانچہ ان ہی اغراض کے لیے آگے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قصہ سنایا جاتا ہے:

اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖٓ اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا ۭ سَاٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِيْكُمْ

جب کہا موسیٰ نے اپنے گھر والوں کو میں نے دیکھی ہے ایک آگ ۱؎ اب لاتا ہوں تمہارے پاس وہاں سے کچھ خبر یا لاتا ہوں

بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝۷

انگارا سلگا کر شاید (تاکہ) تم سینکو (تاپو) ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے رسالت اور وحی کو ثابت کیا گیا تھا، اب آگے اس کی تائید کے لیے بعض قصے بیان کیے جاتے ہیں جن سے دو

طرح پر اس کی تائید ہوتی ہے: ① اول یہ کہ حضور ﷺ اُمّی تھے، نہ کچھ پڑھا تھا، نہ کسی پڑھے لکھے کی صحبت میں بیٹھے تھے، پھر گذشتہ واقعات کو صحیح صحیح بیان فرمانا آپ ﷺ کے نبی ہونے کی دلیل ہے ② دوسرے کفار آپ ﷺ کی نبوت کو دشوار سمجھتے تھے، انبیاء کے ذکر سے یہ شبہ دور ہو گیا کہ نبوت کوئی انوکھی چیز نہیں، اس کے علاوہ رسالت کے مضمون سے دو تعلق اور بھی ہیں: ① آپ کی تسلی ہے کہ دوسرے انبیاء کی بھی تصدیق و تکذیب ہوتی آئی ہے، آپ اس سے غم نہ کیجیے ② منکرین پر وعید ہے کہ انبیاء کے انکار کا انجام خسارہ ہے تم کو بھی یہ بُرا دن دیکھنا ہے۔

(پہلا قصہ: حضرت موسیٰ علیہ السلام، اس وقت کا قصہ ذکر کیجئے) جبکہ (مدین سے آتے ہوئے کوہ طور کے قریب رات کو سردی کے وقت پہنچے اور اس وقت مصر کی راہ بھی بھول گئے تھے تو) موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ میں نے (طور کی طرف) آگ دیکھی ہے میں ابھی (جا کر) وہاں سے (یا تو راستہ کی) کوئی خبر لاتا ہوں یا تمہارے پاس (وہاں سے) آگ کا شعلہ کسی لکڑی وغیرہ میں لگا ہوا لاتا ہوں تاکہ تم سینک لو۔

لفظ لاهله کا مصداق اور جملہ امکثوا کا حاصل سورہ طٰہٰ آیت ۱۰ کی تفسیر میں گذر چکا ہے، وہاں ملاحظہ فرمالیں۔

اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا: اس سے دو باتوں پر دلالت ہوتی ہے: ① ایک یہ کہ بسا اوقات صاحب کشف کو اپنے کشف کی حقیقت معلوم نہیں ہوتی اور وہ کچھ کا کچھ سمجھ لیتا ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی تجلی کو ایک عام آگ سمجھ لیا، حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نور کی تجلی تھی ② دوسرا مسئلہ تجلی مثالی کا صحیح ہونا۔

سَاٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ: سورہ طہٰ میں موسیٰ علیہ السلام کا قول ہے: لَعَلِّیْٓ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا اور یہاں بطور جزم و یقین کے ہے: سَاٰتِیْكُمْ مِّنْهَا، بظاہر دونوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں بھی مراد امید ہی ہے جو کہ غلبہ ظن کی بنا پر ہے، سو دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس جگہ دو ضرورتیں پیش آئیں: ① ایک راستہ پوچھنا جو آپ بھول گئے تھے ② دوسرا آگ سے گرمی حاصل کرنا کہ سردی کی رات تھی اس کے لئے آپ نے کوہ طور کی طرف جانے کی سعی و کوشش کی، لیکن اس کے ساتھ ہی اس مقصد میں کامیابی پر یقین اور دعویٰ کرنے کے بجائے ایسے الفاظ اختیار فرمائے جس میں اپنی بندگی اور حق تعالیٰ سے امید ظاہر ہوتی ہے، معلوم ہوا کہ ضروریات کے حصول کے لئے جدو جہد توکل کے منافی نہیں، لیکن بھروسہ اپنی کوشش کے بجائے اللہ پر ہونا چاہئے اور آگ آپ کو دکھلائے جانے میں بھی شاید یہی حکمت ہو کہ اس سے آپ کے دونوں مقصود پورے ہو سکتے تھے، راستہ کا مل جانا اور آگ سے گرمی حاصل کرنا۔

* * *

**فائدہ: ۱** یہ مدین سے جاتے ہوئے وادی طوٰی کے قریب پہنچ کر کہا جبکہ سخت سردی کی اندھیری رات میں راستہ بھول گئے تھے مفصل واقعہ سورہ طٰہٰ کے فوائد میں گزر چکا، ملاحظہ کر لیا جائے۔

**فائدہ: ۲** یعنی راستہ کی خبر لاتا ہوں اگر آگ کے پاس کوئی موجود ہو ورنہ کم از کم سینکنے تاپنے کے لیے ایک انگارا لے آؤں گا۔

فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِیَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ط

پھر جب پہنچا اس کے پاس آواز ہوئی کہ برکت ہے اس پر جو کوئی کہ آگ میں ہے اور جو اس کے آس پاس ہے ۱

وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۸﴾

اور پاک ہے ذات اللہ کی جو رب سارے جہان کا ۲

**خلاصہ تفسیر:** سو جب اس (آگ) کے پاس پہنچے تو ان کو (من جانب اللہ) آواز دی گئی کہ وہ جو اس آگ کے اندر ہیں (یعنی فرشتے) ان پر بھی برکت ہو اور جو اس (آگ) کے پاس ہے (یعنی موسیٰ) اس پر بھی (برکت ہو، یہ دعا بطور تحیہ و سلام کے ہے جیسے ملاقاتی آپس میں

سلام کرتے ہیں، چونکہ موسیٰ علیہ السلام جانتے نہ تھے کہ یہ نورِ خدا کے انوار میں سے ہے، اس لئے خود سلام نہیں کر سکے تو من جانب اللہ ان کو مانوس کرنے کے لئے سلام ارشاد ہوا، اور فرشتوں کو ملا لینا شاید اس لئے ہو کہ جس طرح فرشتوں کو سلام حق تعالیٰ کے خاص قرب کی علامت ہوتی ہے یہ سلام بھی موسیٰ علیہ السلام کو خاص قرب کی بشارت ہو گیا) اور (اس امر کے بتلانے کے لئے کہ یہ نور جو آگ کی شکل میں ہے خود حق تعالیٰ کی ذات نہیں، ارشاد فرمادیا کہ) اللہ رب العالمین (رنگ جہات، مقدار اور حد بندی وغیرہ سے) پاک ہے (اور اس نور میں یہ چیزیں پائی جاتی ہیں، پس یہ نور ذات خداوندی نہیں، پس اگر موسیٰ علیہ السلام کا ذہن اس مسئلہ سے خالی ہو تب تو اس کی تعلیم کر دی گئی اور اگر فطرت سلیمہ کے ذریعے سے پہلے سے یہ ان کو معلوم ہو تو زیادہ سمجھانے کے لیے فرمادیا گیا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ دنیا کی آگ نہیں، بلکہ غیبی اور نورانی آگ ہے جس کے اندر نورِ الٰہی ظاہر ہو رہا تھا، یا اس کی بجلی چمک رہی تھی، شاید وہ ہی ہو جس کو حدیث میں فرمایا: "حِجَابُهُ النَّار" یا "حِجَابُهُ النُّوْرُ" پھر غیب سے آواز آئی: اَنْ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا یعنی زمین کا یہ ٹکڑا مبارک، آگ میں جو تجلی ہے وہ بھی مبارک، اور اس کے اندر یا اس کے آس پاس جو ہستیاں ہیں مثلاً فرشتے یا خود موسیٰ علیہ السلام وہ سب مبارک ہیں، یہ غالباً موسیٰ علیہ السلام کو مانوس کرنے کے لیے بطور اعزاز و اکرام کے فرمایا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی مکان، جہت، جسم، صورت اور رنگ وغیرہ سماعت حدوث سے اللہ کی ذات پاک ہے، آگ میں اس کی تجلی کے یہ معنی نہیں کہ معاذ اللہ اس کی ذات پاک آگ میں حلول کر آئی؟ آفتاب عالمتاب قلعی دار آئینہ میں متجلی ہوتا ہے لیکن کون احمق کہہ سکتا ہے کہ اتنا بڑا کرہ شمسی چھوٹے سے آئینہ میں سما گیا؟۔

يٰمُوْسٰٓى اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۙ﴿۹﴾ وَاَلْقِ عَصَاكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَاۗنٌّ

اے موسیٰ وہ میں اللہ ہوں زبردست حکمتوں والا ۱؎ اور ڈال دے لاٹھی اپنی پھر جب دیکھا اسکو پھنپھناتے (پھن ہلاتے) جیسے (سفید پتلا) سانپ

وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ۭ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۣ اِنِّىْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۰﴾

کی سٹک ۲؎ لوٹا پیٹھ پھیر کر اور مڑ کر نہ دیکھا ۳؎ اے موسیٰ مت ڈر، میں جو ہوں تیرے پاس نہیں ڈرتے رسول ۴؎

**خلاصہ تفسیر:** (اس کے بعد ارشاد ہوا کہ) اے موسیٰ بات یہ ہے کہ میں! (جو کہ بے کیف کلام کر رہا ہوں) اللہ ہوں زبردست حکمت والا، اور (اے موسیٰ!) تم اپنا عصا (زمین پر) ڈال دو (چنانچہ انہوں نے ڈال دیا تو وہ اژدھا بن کر لہرانے لگا) سو جب انہوں نے اس کو اس طرح حرکت کرتے دیکھا جیسے سانپ ہو تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگے اور پیچھے مڑ کر بھی تو نہ دیکھا (ارشاد ہوا کہ) اے موسیٰ! ڈرو نہیں (کیونکہ ہم نے تم کو پیغمبری دی ہے) اور ہمارے حضور میں (یعنی پیغمبری کا اعزاز عطا ہونے کے وقت) پیغمبر (ایسی چیزوں سے) نہیں ڈرا کرتے (جو کہ خود ان کی رسالت کی دلیل ہوں، یعنی تم کو بھی ڈرنا نہیں چاہئے)۔

**تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَاۗنٌّ:** اس عصا کے بدل جانے کو قرآن کریم میں کہیں ثعبان اور کہیں جانّ کہنے کی وجہ سورہ اعراف آیت ۱۰۷ کے خلاصہ تفسیر میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمالیں۔

**يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ:** سانپ سے ڈر جانے کا سبب سورہ طٰہٰ میں گذر چکا ہے کہ یہ خوف یا تو طبعی تھا، یا چونکہ اس تغیر میں کسی مخلوق کا واسطہ نہ تھا اس لیے عقلی خوف تھا کہ یہ کہیں خدا کا قہر نہ ہو، اور یہ دونوں خوف شانِ نبوت کے خلاف نہیں، اگر موسیٰ علیہ السلام کا خوف طبعی تھا تب تو اس ارشاد سے اس طرح زائل ہو گیا کہ نبوت عطا ہونے کی خوشی ایسی غالب ہوئی کہ اس خوف کا اثر غالب نہ رہا، کیونکہ قاعدہ ہے کہ ایک طبعی کیفیت پر جب دوسری کیفیت

غالب آجاتی ہے تو پہلی کیفیت زائل ہوجاتی ہے، اور اگر عقلی خوف تھا تو وہ اس طرح زائل ہوگیا کہ ان کو بتلادیا گیا کہ انبیاء علیہم السلام پر بھی اگرچہ مصائب آتے ہیں مگر ہم اپنی عادت سے اطلاع دیتے ہیں کہ خود ان کے معجزہ سے اور خاص کر نبوت عطا ہونے کے وقت ان کو نقصان نہیں ہوا کرتا اور چونکہ انبیاء کو حق تعالیٰ کے بتلانے ہی سے اپنی نبوت کا علم ہوتا ہے اس لیے علم سے پہلے اس خوف کا ہونا موجب اشکال نہیں۔

**اِنِّیۡ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الۡمُرۡسَلُوۡنَ**: لَدَیَّ قرب کے لیے وضع کیا گیا ہے اور مراد حالت قرب یعنی وحی کی حالت ہے، مطلب یہ ہوا کہ وحی کے وقت اس میں مستغرق ہونے کی وجہ سے خوفناک چیزوں سے بھی خوف کا احساس نہیں ہوتا، اور بعض نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ میرے غیر سے خوف نہیں ہونا چاہیے تو اس سے دو باتیں ثابت ہوئیں: ① ایک یہ کہ کسی وقت خوف تو ہوتا ہے مگر مغلوب ہونے کے سبب محسوس نہیں ہوتا ② دوسرا یہ کہ بعض احوال میں مطلقاً خوف بھی زائل ہوجاتا ہے، جیسے موسیٰ علیہ السلام کو پہلے خوف ہوا تھا، پھر اس کے ازالہ کا حکم ہوا۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی اس وقت تجھ سے کلام کرنے والا میں ہوں، یہ سب واقعہ مفصلاً سورہ طٰہٰ میں گزر چکا۔

**فائدہ:** ۲؎ شاید ابتداء میں پتلا ہوگا، یا سرعت حرکت میں تشبیہ ہوگی، صغر جثہ میں نہیں۔

**فائدہ:** ۳؎ یہ خوف طبعی تھا جو منافی نبوت تھا۔

**فائدہ:** ۴؎ یعنی اس مقام حضور واصطفاء میں پہنچ کر ایسی چیزوں سے ڈرنے کا کیا مطلب، مرسلین کو لائق نہیں کہ ہماری بارگاہ قرب میں پہنچ کر لاٹھی یا سانپ یا کسی مخلوق سے ڈریں، وہاں تو دل کو انتہائی سکون وطمانیت حاصل ہونا چاہیے۔

**اِلَّا مَنۡ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسۡنًۢا بَعۡدَ سُوۡٓءٍ فَاِنِّیۡ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ⑪**

مگر جس نے زیادتی کی پھر بدلے میں نیکی کی برائی کے پیچھے تو میں بخشنے والا مہربان ہوں

**خلاصہ تفسیر:** ہاں! مگر جس سے کوئی قصور (لغزش سرزد) ہوجائے (اور وہ اس لغزش کو یاد کر کے ڈرے تو مضائقہ نہیں، لیکن اس کے لیے بھی یہ قاعدہ ہے کہ اگر قصور ہوجائے اور) پھر برائی (ہوجانے) کے بعد برائی کی جگہ نیک کام کرے (توبہ کرے) تو میں (اس کو بھی معاف کر دیتا ہوں، کیونکہ میں) مغفرت والا رحمت والا ہوں (یہ اس لیے فرمادیا کہ عصاء کے معجزہ سے مطمئن ہوجانے کے بعد کہیں قبطی کو قتل کرنے کا قصہ یاد کر کے پریشان نہ ہوں اس لئے اس سے بھی مطمئن کر دیا تاکہ وحشت جاتی رہے)۔

وہ قبطی چونکہ کافر حربی تھا اس کا خون فی نفسہ مباح تھا، اس لیے اس کے قتل کرنے میں کسی بندہ کا حق نہ تھا کہ اس کے ورثہ سے معافی کی ضرورت ہوتی، البتہ ظاہری مصالحت کو توڑنے کی وجہ سے اس کا قتل حق اللہ تھا اس لیے معاف کر دیا گیا، خصوصاً جبکہ وہ قصد وارادہ سے نہ تھا۔

* * *

**فائدہ:** یہ استثناء منقطع ہے یعنی خدا کے حضور میں پہنچ کر خوف واندیشہ صرف اس کو ہونا چاہیے جو کوئی زیادتی یا خطاء وتقصیر کر کے آیا ہو، اس کے متعلق بھی ہمارے ہاں یہ قاعدہ ہے کہ برائی کیے بعد اگر دل سے توبہ کر کے اپنی روش درست کر لی اور نیکیاں کر کے برائی کا اثر مٹادیا تو حق تعالیٰ اپنی رحمت سے معاف فرمانے والا ہے حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''موسیٰ علیہ السلام سے چوک کر ایک کافر کا خون ہوگیا تھا اس کا ڈر تھا ان کے دل میں، ان کو وہ معاف کر دیا''۔

**وَاَدۡخِلۡ یَدَكَ فِیۡ جَیۡبِكَ تَخۡرُجۡ بَیۡضَآءَ مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ ۟ فِیۡ تِسۡعِ اٰیٰتٍ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ**

اور ڈال دے ہاتھ اپنا اپنے گریبان میں کہ نکلے سفید ہو کر بغیر کسی عیب کے (نہ کسی برائی کے) یہ دونوں مل کر نو نشانیاں لے کر جا فرعون

وَقَوْمِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ﴿۱۲﴾

اور اس کی قوم کی طرف، بیشک وہ تھے لوگ نافرمان

**خلاصہ تفسیر:** اور (اے موسیٰ! اس معجزہ عصا کے علاوہ ایک معجزہ آپ کو اور بھی عطا ہوتا ہے وہ یہ کہ) تم اپنا ہاتھ گریبان کے اندر لے جاؤ (اور پھر نکالو تو) وہ بلا کسی عیب (یعنی بغیر کسی مرض برص وغیرہ) کے (نہایت) روشن ہو کر نکلے گا (اور یہ دونوں معجزے ان) نو معجزوں میں (سے ہیں جن کے ساتھ تم کو) فرعون اور اس کی قوم کی طرف (بھیجا جاتا ہے، کیونکہ) وہ بڑے حد سے نکل جانے والے لوگ ہیں۔

فِیْ تِسْعِ اٰیٰتٍ: ان نو معجزات کی فہرست سورہ اعراف آیت ۱۳۳ کے خلاصہ تفسیر میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمالیا جائے۔

* * *

**فائدہ:** نو نشانیوں کا بیان سورہ بنی اسرائیل کی آیت: وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی تِسْعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰمُوْسٰی مَسْحُوْرًا (الاسراء:۱۰۱) کے تحت میں دیکھو۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰیٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۳﴾ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَیْقَنَتْهَآ

پھر جب پہنچیں ان کے پاس ہماری نشانیاں سمجھانے کو بولے یہ جادو ہے صریح، اور ان کا انکار کیا اور ان کا یقین کر چکے تھے

اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِیْنَ ﴿۱۴﴾ ع ۱۶

اپنے جی میں بے انصافی اور غرور سے، سو دیکھ لے کیسا ہوا انجام خرابی کرنے والوں کا ۱؎

**خلاصہ تفسیر:** غرض جب ان لوگوں کے پاس ہمارے (دیئے ہوئے) معجزے پہنچے (جو) نہایت واضح تھے (یعنی پہلے دعوت کی ابتدا میں دو معجزے دکھلائے، پھر وقتاً فوقتاً باقی دکھلائے جاتے رہے) تو وہ لوگ (ان سب کو دیکھ کر بھی) بولے یہ صریح جادو ہے، اور (غضب تو یہ تھا کہ) ظلم اور تکبر کی راہ سے ان (معجزات) کے (بالکل) منکر ہو گئے حالانکہ (اندر سے) ان کے دلوں نے ان کا یقین کر لیا تھا، سو دیکھئے کیسا (برا) انجام ہوا اُن مفسدوں کا (دنیا میں غرق ہوئے اور آخرت میں جلنے کی سزا پائی)۔

وَاسْتَیْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ: یقین قلبی کے باوجود فرعون وغیرہ کا مؤمن نہ ہونا اس لیے ہے کہ یہ یقین اختیار سے نہ تھا، بلکہ مجبوراً خود بخود دل میں پیدا ہوا ہوتا تھا اور اپنے اختیار سے تو وہ لوگ اس کو دفع کرتے تھے، اس کی تفصیل دوسرا پارہ سیقول آیت: **یعرفونہ** کی تفسیر میں گذر چکی ہے۔

ظُلْمًا وَّعُلُوًّا: ظلم اور علو میں فرق یہ ہے کہ "ظلم" سے مراد یہ کہ ان نو معجزات کو ان کے رتبہ سے گھٹایا، اور "تکبر" سے مراد سے یہ ہے کہ اپنے آپ کو اپنے رتبہ سے بڑھایا۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی جب وقتاً فوقتاً ان کی آنکھیں کھولنے کے لیے وہ نشانیاں دکھلائی گئیں تو کہنے لگے کہ یہ سب جادو ہے حالانکہ ان کے دلوں میں یقین تھا کہ موسیٰ علیہ السلام سچے ہیں اور جو نشانیاں دکھلا رہے ہیں یقیناً خدائی نشان ہیں، جادو، شعبدہ اور نظر بندی نہیں مگر محض بے انصافی اور غرور تکبر سے جان بوجھ کر اپنے ضمیر کے خلاف حق کی تکذیب اور سچائی کا انکار کر رہے تھے، پھر کیا ہوا چند روز بعد پتہ لگ گیا کہ ایسے ہٹ دھرم مفسدوں کا انجام کیسا ہوتا ہے، سب کو بحر قلزم کی موجوں نے کھا لیا، کسی کو گور و کفن بھی نصیب نہ ہوا۔

وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا دَاوٗدَ وَ سُلَیۡمٰنَ عِلۡمًا ۚ وَ قَالَا الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ فَضَّلَنَا

اور ہم نے دیا داؤد اور سلیمان کو ایک علم ۱؎ اور بولے شکر اللہ کا جس نے ہم کو بزرگی (فضیلت) دی ۲؎

عَلٰی کَثِیۡرٍ مِّنۡ عِبَادِہِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۵﴾

اپنے بہت سے بندوں ایمان والوں پر ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** (دوسرا قصہ: حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام) اور ہم نے داؤد اور سلیمان (علیہما السلام) کو (شریعت اور حکمرانی کا) علم عطا فرمایا، اور ان دونوں نے (ادائے شکر کے لئے) کہا کہ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے سزاوار ہیں جس نے ہم کو اپنے بہت سے ایمان والے بندوں پر فضیلت دی۔

**وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ فَضَّلَنَا:** یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ غلبہ فنا کے آثار کا قائم اور مستمر رہنا کاملین کے لیے بھی لازم وضروری نہیں ہے، چنانچہ دونوں حضرات فنا کے اعلیٰ مقام پر تھے اور اس کے باوجود انہیں اپنے کمالات کی طرف توجہ ہوئی اور ظاہر ہے کہ یہ توجہ غلبہ فنا کے آثار کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی، دوسری بات اس سے یہ بھی معلوم ہوئی کہ نعمت کا اظہار عجب و کبر میں داخل نہیں، البتہ جو اظہار فخر وشان کے لیے کیا جاتا ہے وہ عجب و کبر کی علامت ہے اور مذموم ہے، یہاں یہ دونوں حضرات اللہ کے احسان کو بطور اظہار نعمت وشکر گذاری بیان کر رہے ہیں (یعنی کاملین بھی ایک حالت پر نہیں رہتے، بلکہ اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے، کبھی تو اپنے آپ کو بالکل معدوم خیال کرتے ہیں، اور کبھی اپنے تمام کمالات گنوادیتے ہیں، اور ان کمالات کا اظہار کسی غرور وفخر کے طور پر نہیں ہوتا، بلکہ اظہار تشکر کے لیے ہوتا ہے)۔

**فَضَّلَنَا عَلٰی کَثِیْرٍ مِّنْ عِبَادِهٖ:** یعنی بہت سے بندوں پر فضیلت دی، یہ اس لیے کہا کہ بعض انبیاء علیہم السلام کو حق تعالیٰ نے ان پر بھی فضیلت دی ہے، جیسے کہ ارشادگرامی ہے: ولقد فضلنا بعض النبیین علی بعض۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ حضرت سلیمان حضرت داؤد علیہ السلام کے صاحبزادہ ہیں، باپ بیٹے میں سے ہر ایک کو اس کی شان کے لائق اللہ تعالیٰ نے علم کا خاص حصہ عطا فرمایا، شرائع واحکام اور اصول سیاست وحکمرانی وغیرہ کے علوم سب اس لفظ کے تحت میں داخل ہوگئے۔

**فائدہ:** ۲؎ حق تعالیٰ نے جو علم داؤد وسلیمان علیہما السلام کو دیا تھا اسی کا اثر یہ تھا کہ حق تعالیٰ کے انعامات کا شکر ادا کرتے تھے، کسی نعمت الٰہی پر شکر ادا کرنا اصل نعمت سے بڑی نعمت ہے۔

**فائدہ:** ۳؎ ''بہت سے'' اس لیے کہا کہ بہت بندگان خدا کو ان پر فضیلت دی گئی ہے، باقی تمام مخلوق پر فضیلت کلی تو سارے جہان میں ایک ہی بندے کو حاصل ہوئی جن کا نام مبارک ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

وَ وَرِثَ سُلَیۡمٰنُ دَاوٗدَ وَ قَالَ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ عُلِّمۡنَا مَنۡطِقَ الطَّیۡرِ وَ اُوۡتِیۡنَا مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ ؕ

اور قائم مقام ہوا سلیمان داؤد کا ۱؎ اور بولا اے لوگوں ہم کو سکھائی ہے بولی اڑتے جانوروں کی ۲؎ اور دیا ہم کو ہر چیز میں سے ۳؎

اِنَّ ہٰذَا لَہُوَ الۡفَضۡلُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۱۶﴾

بیشک یہی ہے فضیلت صریح

**خلاصہ تفسیر:** اور داؤد (علیہ السلام کی وفات کے بعد ان) قائم مقام سلیمان (علیہ السلام) ہوئے (یعنی ان کو سلطنت وغیرہ ملی)

اورانہوں نے (اظہارشکر کیلئے) کہا کہ اے لوگو! ہم کو پرندوں کی بولی (سمجھنے) کی تعلیم کی گئی ہے (جو دوسرے بادشاہوں کو حاصل نہیں) اور ہم کو (سامان سلطنت کے متعلق) ہر قسم کی (ضروری) چیزیں دی گئی ہیں (جیسے فوج، لشکر، مال اور لڑائی کے سامان وغیرہ) واقعی یہ (اللہ تعالیٰ کا) کھلا ہوا فضل ہے۔

**وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ**: وارث ہونے سے مراد اصطلاحی میراث نہیں، بلکہ محض احکام کی اشاعت اور مخلوق کی اصلاح اور ملکی انتظام میں جانشینی مراد ہے، یعنی وراثت علم ونبوت، اور ظاہر ہے کہ یہ مالی میراث نہیں ہے، حدیث میں تصریح ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے ترکہ میں میراث نہیں ہوتی، یعنی انبیاء نہ وارث ہوتے ہیں اور نہ مورث، ترمذی اور ابوداؤد میں حضرت ابوالدرداء سے روایت منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: علماء انبیاء کے وارث ہیں، لیکن انبیاء میں وراثت علم اور نبوت کی ہوتی ہے مال کی نہیں ہوتی، اور شیعہ مسلک کی کتابوں میں بھی یہ مسئلہ موجود ہے، کلینی میں حضرت ابوعبداللہ جعفر صادق کی روایت اس مسئلہ کو اور زیادہ واضح کر دیتی ہے کہ: "إن سليمان ورث داود، و إن محمدا ﷺ ورث سليمان، كذا في الروح" کہ سلیمان علیہ السلام وارث ہوئے داؤد علیہ السلام کے، اور سیدنا محمد ﷺ حضرت سلیمان کے وارث ہوئے، اور ظاہر ہے کہ حضور ﷺ ان کے مال کے وارث نہ ہوئے تھے، پس جیسے آپ سلیمان کے وارث ہوئے ویسے ہی وہ حضرت داؤد علیہ السلام کے وراث ہوئے، عقلی طور پر بھی یہاں وراثت مال مراد نہیں ہوسکتی، کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام کی وفات کے وقت آپ کی اولاد میں انیس بیٹوں کا ذکر آتا ہے، اگر وراثت مال مراد ہو تو یہ بیٹے سب کے سب وارث ٹھہریں گے، پھر وراثت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی تخصیص کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی، اس سے ثابت ہوا کہ وراثت وہ مراد ہے جس میں بھائی شریک نہ تھے، بلکہ صرف حضرت سلیمان علیہ السلام وارث بنے اور وہ صرف علم اور نبوت کی وراثت ہی ہوسکتی ہے، اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کا ملک وسلطنت بھی حضرت سلیمان کو عطا فرما دیا اور اس میں مزید اضافہ اس کا کر دیا کہ آپ کی حکمت جنات اور دحوش وطیور تک عام کر دی، ہوا کو آپ کے لئے مسخر کر دیا، ان دلائل کے بعد طبری کی وہ روایت غلط ہوجائے گی جس میں انہوں نے بعض ائمہ اہل بیت کے حوالے سے مال کی وراثت مراد لی ہے۔

**عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ**: حضرت سلیمان علیہ السلام نے باوجود خودا کیلے ہونے کے اپنے لئے جمع کا صیغہ شاہانہ محاورہ کے طور پر استعمال کیا ہے تاکہ رعایا پر رعب پڑے اور رعایا اطاعت خداوندی اور اطاعت سلیمان علیہ السلام میں سستی نہ کریں، کیونکہ داؤد علیہ السلام کا پرندوں کی بولی سمجھنا ثابت نہیں ہے، بلکہ یہ شاہانہ محاورہ ہے کہ اپنے آپ کو "ہم" کہا کرتے ہیں، اسی طرح امراء، حکام اور افسران کو اپنی رعایا کی موجودگی میں اپنے لئے جمع کا صیغہ استعمال کرنے میں مضائقہ نہیں جبکہ وہ سیاست اور اظہار نعمت کی غرض سے ہو تکبر وتعلیٰ کے لئے نہ ہو۔

یہاں آیت میں منطق الطیر یعنی پرندوں کی بولی کی تخصیص آگے آنے والے ہدہد کے واقعہ کی وجہ سے ہے جو پرندہ ہے، ورنہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو پرند، چرند اور تمام حشرات الارض کی بولیاں سکھائی گئی تھیں جیسا کہ اگلی آیت میں چیونٹی کی بولی سمجھنے کا ذکر موجود ہے۔

**وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ**: لفظ "کل" اصل لغت کے اعتبار سے تمام افراد جنس کو عام ہوتا ہے، مگر بسا اوقات عموم کلی مراد نہیں ہوتا، بلکہ کسی خاص مقصد کی حد تک عموم مراد ہوتا ہے، جیسا یہاں مراد ان اشیاء کا عموم ہے جن کی سلطنت وحکومت میں ضرورت ہوتی ہے ورنہ ظاہر ہے کہ ہوائی جہاز، موٹر، ریل وغیرہ ان کے پاس نہ تھے، اس سے معلوم ہوا کہ مال، دولت ومِلکیت کی کثرت کاملین کے درجہ کمال کے خلاف نہیں (یعنی اگر کوئی شخص ایمان واعمال اور معرفت الٰہی میں کمال درجے پر ہے اور اسے من جانب اللہ مال ودولت کی بھی فراوانی حاصل ہے تو یہ بری چیز نہیں ہے اور نہ ہی اس سے ولایت میں کمی واقع ہوگی)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی داؤد کے بیٹوں میں سے ان کے اصل جانشین حضرت سلیمان علیہ السلام ہوئے جن کی ذات میں اللہ تعالیٰ نے نبوت اور بادشاہت دونوں جمع کر دیں اور وہ ملک عطا فرمایا جوان سے قبل یا بعد کسی کو نہ ملا، جن، ہوا، اور پرندوں کو ان کیلئے مسخر فرما دیا جیسا کہ سورہ سبا میں آئے گا۔

**فائدہ:** ۲؎ اس بات کا انکار کرنا بداہت کا انکار ہوگا کہ پرندے جو بولیاں بولتے ہیں ان میں ایک خاص حد تک افہام وتفہیم کی شان پائی

جاتی ہے، ایک پرند جس وقت اپنے جوڑے کو بلاتا یا دانہ دینے کے لیے اپنے بچوں کو آواز دیتا یا کسی چیز سے خوف کھا کر خبردار کرتا ہے، ان تمام حالات میں اس کی بولی اور لب ولہجہ یکساں نہیں ہوتا چنانچہ اس کے مخاطبین اس فرق کو بخوبی محسوس کرتے ہیں، اسی سے ہم سمجھتے ہیں کہ دوسرے احوال وضروریات کے وقت بھی ان کے چہچہوں میں (گوہمیں کتنے ہی متشابہ ومتقارب معلوم ہوں) ایسا لطیف وخفیف تفاوت ہوتا ہوگا، جسے وہ آپس میں سمجھ لیتے ہوں گے، تم کسی پوسٹ آفس میں چلے جاؤ اور تار کی متشابہ کھٹ کھٹ گھنٹوں سنتے رہو، تمہارے نزدیک محض بے معنی حرکات واصوات سے زیادہ وقعت نہ ہوگی، لیکن ٹیلیگراف ماسٹر فوراً بتادے گا کہ فلاں جگہ سے فلاں آدمی یہ مضمون کہہ رہا ہے یا فلاں لیکچرار کی تقریر انہی تاروں کی کھنکھناہٹ میں صاف سنائی دے رہی ہے، کیونکہ وہ ان ''فقرات تلغرافیہ'' کی دلالت وضعیہ سے پوری طرح واقف ہے، علیٰ ہذا القیاس کیا بعید ہے کہ واضع حقیقی نے نغمات طیور کو بھی مختلف معانی ومطالب کے اظہار کے لیے وضع کیا ہو، اور جس طرح انسان کا بچہ اپنے ماں باپ کی زبان سے آہستہ آہستہ واقف ہوتا رہتا ہے، طیور کے بچے بھی اپنی فطری استعداد سے اپنے بنی نوع کی بولیوں کو سمجھنے لگتے ہوں اور بطور ایک پیغمبرانہ اعجاز کے حق تعالیٰ کسی نبی کو بھی ان کا علم عطا فرمادے، حیوانات کے لیے جزئی ادراکات کا حصول تو پہلے سے مسلم چلا آتا ہے لیکن یورپ کی جدید تحقیقات اب حیوانات کی عاقلیت کو آدمیت کی سرحد سے قریب کرتی جاتی ہے حتی کہ حیوانات کی بولیوں کی ''ابجد'' تیار کی جارہی ہے۔

قرآن کریم نے خبر دی تھی کہ ''ہر چیز اپنے پروردگار کی تسبیح وتحمید کرتی ہے جسے تم سمجھتے نہیں اور ہر پرندہ اپنی صلوٰۃ وتسبیح سے واقف ہے''، احادیث صحیحہ میں حیوانات کا تکلم، بلکہ جمادات محضہ کا بات کرنا اور تسبیح پڑھنا ثابت ہے، اس سے ظاہر ہوا کہ اپنے خالق کی اجمالی مگر صحیح معرفت ہر چیز کی فطرت میں تہ نشین کردی گئی ہے، پس ان کی تسبیح وتحمید یا بعض محاورات وخطابات پر بعض بندگان خدا کا بطور خرق عادت مطلع کردیا جانا از قبیل محالات عقلیہ نہیں، ہاں عام عادت کے خلاف ضرور ہے، سو اعجاز وکرامت اگر عام عادت اور معمول کے موافق ہوا کرے تو اعجاز وکرامت ہی کیوں کہلائے (خوارق عادت پر ہم نے مستقل مضمون لکھا ہے اسے ملاحظہ کرلیا جائے) بہرحال اس رکوع میں کوئی معجزے اس قسم کے مذکور ہیں، جن میں زائغین نے عجیب طرح کی رکیک اور لچر تحریفات شروع کردی ہیں، کیونکہ بعض طیور کا اپنی بولی میں آدمیوں کے بعض علوم کو ادا کرنا، چیونٹیوں کا آپس میں ایک دوسرے کو مخاطب بنانا اور سلیمان پیغمبر کا ان کو سمجھ لینا یہ سب باتیں ان کے نزدیک ایسی لغو اور احمقانہ ہیں جن پر ایک بچہ بھی یقین نہیں کرسکتا لیکن میں کہتا ہوں کہ لاکھوں محققین اور علمائے سلف وخلف کی نسبت خیال کرتا کہ وہ ایسی کچی، لغو اور بدیہی البطلان باتوں کو جنہیں ایک بچہ اور گنوار بھی نہیں مان سکتا تھا، بلا تردید وتکذیب بیان کرتے چلے آئے اور ان اوہام کو ذکر کرکے مضمون آیات کی صحیح حقیقت جو تم پر آج منکشف ہوئی ہے کسی نے بیان نہ کی؟ یہ خیال ان باتوں سے بھی بڑھ کر لغو اور احمقانہ ہے جن کی لغویت کو تم تسلیم کرانا چاہتے ہو، علماء سے ہر زمانہ میں غلط فہمی یا خطاء وتقصیر ہوسکتی ہے، مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ شب وروز کی جن محسوسات اور پیش پا افتادہ حقائق کو انسان کا بچہ بچہ جانتا ہے وہ صدیوں تک بڑے بڑے عقلمند اور محقق علماء کو ایک دن بھی نظر نہ آئی ہوں، یاد رہے کہ ہم اسرائیلی خرافات کی تائید نہیں کررہے، ہاں جس حد تک اکابر سلف نے بلا اختلاف کلام الٰہی کا مدلول بیان کیا ہے اس کو ضرور تسلیم کرتے ہیں خواہ وہ اسرائیلی روایات کے موافق پڑ جائیں یا مخالف۔

**فائدہ:** ۳ یعنی ایسی عظیم الشان سلطنت ونبوت کے لیے جو چیزیں اور سامان درکار تھے وہ عطا فرمائے۔

## وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿١٧﴾

اور جمع کیے گئے سلیمان کے پاس اس کے لشکر جن اور انسان اور اڑتے جانور پھر ان کی جماعتیں بنائی جاتیں

**خلاصہ تفسیر:** اور سلیمان (علیہ السلام کے پاس سامان سلطنت بھی عجیب وغریب تھا چنانچہ ان) کے لئے (جو) ان کا لشکر جمع کیا گیا (تھا، ان میں) جن بھی (تھے) اور انسان بھی اور پرندے بھی (جو کسی بادشاہ کے تابع نہیں ہوتے) اور (پھر تھے بھی اس کثرت سے کہ) ان کو (چلنے کے وقت) روکا (جایا کرتا) تھا (تاکہ متفرق نہ ہوجائیں، پیچھے والوں کا انتظار کریں اور سب ساتھ مل کر چلیں، یہ بات عادۃً زیادہ مجمع میں ہوتی ہے، کیونکہ

تھوڑے مجمع میں تو اگلا آدمی خود ہی ایسے وقت رک جاتا ہے اور بڑے مجمع میں اگلوں کو پچھلوں کی خبر بھی نہیں ہوتی، اس لئے اس کا انتظام کرنا پڑتا ہے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی سلیمان علیہ السلام جب کسی طرف کوچ کرتے تو جن، انس، طیور تینوں قسم کے لشکروں میں سے حسب ضرورت و مصلحت ساتھ لیے جاتے تھے، اوران کی جماعتوں میں خاص نظم وضبط قائم رکھا جاتا تھا، مثلاً پچھلی جماعتیں تیز چل کر یا اڑ کر اگلی جماعتوں سے آگے نہیں نکل سکتی تھیں، نہ کوئی سپاہی اپنے مقام اور ڈیوٹی کو چھوڑ کر جاسکتا تھا، جس طرح آج بری، بحری اور ہوائی طاقتوں کو ایک خاص نظم وترتیب کے ساتھ کام میں لایا جاتا ہے۔

حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰۤاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ

یہاں تک کہ پہنچے چیونٹیوں کے میدان پر ۱ کہا ایک چیونٹی نے اے چیونٹیو! گھس جاؤ اپنے گھروں میں

لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۸﴾

نہ پیس ڈالے تم کو سلیمان اور اس کی فوجیں اور ان کو خبر بھی نہ ہو ۲

**خلاصہ تفسیر:** (چنانچہ ایک بار اپنے لاؤلشکر کے ساتھ تشریف لئے جاتے تھے) یہاں تک کہ جب وہ چیونٹیوں کے ایک میدان میں آئے تو ایک چیونٹی نے (دوسری چیونٹیوں سے) کہا کہ اے چیونٹیوں! اپنے اپنے سوراخوں میں جا گھسو، کہیں تم کو سلیمان اور ان کا لشکر بےخبری میں کچل نہ ڈالے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی سلیمان کا اپنے لاؤلشکر کے ساتھ ایسے میدان کی طرف گزر ہوا جہاں چیونٹیوں کی بڑی بھاری بستی تھی۔

**تنبیہ:** جہاں چیونٹیاں مل کر خاص سلیقہ سے اپنا گھر بناتی ہیں اسے زبان عرب میں "قریۃ النمل" کہتے ہیں، (چیونٹیوں کی بستی) مفسرین نے مختلف بلاد میں کئی ایسی وادیوں کا پتہ بتلایا ہے جہاں چیونٹیوں کی بستیاں بکثرت تھیں، ان میں سے کسی ایک پر حسب اتفاق حضرت سلیمان علیہ السلام کا گزر ہوا۔

**فائدہ:** ۲ یعنی یہ ایسے تو نہیں جو جان بوجھ کر تم کو ہلاک کریں، ہاں ممکن ہے بےخبری میں پس جاؤ، حضرت شاہ صاحب: لکھتے ہیں: ''چیونٹی کی آواز کوئی (آدمی) نہیں سنتا، انھیں (سلیمان علیہ السلام کو) معلوم ہوگئی، یہ ان کا معجزہ ہوا''۔

**تنبیہ:** علمائے حیوانات نے سالہا سال جو تجربے کیے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حقیر ترین جانور اپنی حیاتِ اجتماعی اور نظام سیاسی میں بہت ہی عجیب اور شؤن بشریہ سے بہت قریب واقعہ ہوا ہے، آدمیوں کی طرح چیونٹیوں کے خاندان اور قبائل ہیں ان میں تعاون باہمی کا جذبہ، تقسیم عمل کا اصول اور نظام حکومت کے ادارات نوع انسانی کے مشابہ پائے جاتے ہیں، محققین یورپ نے مدتوں ان اطراف میں قیام کرکے جہاں چیونٹیوں کی بستیاں بکثرت ہیں بہت قیمتی معلومات بہم پہنچائی ہیں، افسوس ہے ان مختصر فوائد میں ان کی گنجائش نہیں، محض مقام کی مناسبت سے "دائرۃ المعارف المصریہ" کے آخری جملے نقل کرتا ہوں: "فَمَتٰى دَاهَمَ عَدُوٌّ قَرْيَةً لِلنَّمْلِ اِخْتَفَتِ النَّمْلَةُ وَخَرَجَتِ الْجُنُوْدُ لِلْقِتَالِ وَالنِّضَالِ فَيَخْرُجُ اَوَّلًا وَاحِدٌ مِّنْهَا لِلْاِسْتِطْلَاعِ ثُمَّ يَعُوْدُ مُخْبِرًا بِمَارَاٰى وَبَعْدَ هُنَيْهَةٍ تَخْرُجُ ثَلَاثَةٌ اَوْ اَرْبَعَةٌ يَتْبَعُهَا عَدَدٌ كَثِيْفٌ مِنَ الْجُيُوْشِ بَادِيَةً عَلَيْهِمْ عَلَائِمُ الْحَنَقِ فَتَلْدَغُ كُلَّ مَاصَادَفَتْهُ وَلَا تَفْلَتُ مَنْ تَلْدَغُه، وَلَوْقَطَعَتْ اَرْبًا اربًا فَاِذَا انْتَهَى الْقِتَالُ رَجَعَ الْفَعَلَةُ فَاَعَادُوْا بِنَاءَ مَاتَهَدَّمَ يَتَخَلَّلُهَا عَدَدٌ مِنَ الْجُنُوْدِ لِلْحِرَاسَةِ لَا لِلْعَمَلِ"، متذکرہ جملوں میں بتلایا ہے کہ خطرہ کی آہٹ پاکر اول ایک چیونٹی باہر نکلتی اور واپس جاکر اپنی قوم کو اپنی معلومات سے آگاہ کرتی ہے، باقی سلیمان علیہ السلام کا پتہ لگالینا اور سلیمان کا اس کی بات پر مطلع ہوجانا بطریق خرق عادت تھا۔

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِيٓ أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيٓ أَنْعَمْتَ عَلَيَّ

پھر مسکرا کر ہنس پڑا اس کی بات سے ۱؎ اور بولا اے میرے رب میری قسمت میں دے کہ شکر کروں تیرے احسان کا جو تو نے کیا مجھ پر

وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَأَدْخِلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٩﴾

اور میرے ماں باپ پر اور یہ کہ کروں کام نیک جو تو پسند کرے اور ملا لے (شامل کر لے) مجھ کو اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** سو سلیمان (علیہ السلام نے اس کی بات سنی اور) اس کی بات سے (آپ کو تعجب ہوا کہ اس ذرا سے چھوٹے جثہ پر یہ ہوشیاری اور احتیاط) مسکراتے ہوئے ہنس پڑے اور (یہ دیکھ کر کہ میں اس کی بولی سمجھ گیا جو کہ معجزہ ہونے کی وجہ سے ایک عظیم نعمت ہے دیگر نعمتیں بھی یاد آ گئیں اور) کہنے لگے کہ اے میرے رب! مجھ کو اس پر ہمیشگی دیجئے کہ میں آپ کی ان نعمتوں کا شکر کیا کروں جو آپ نے مجھ کو اور میرے ماں باپ کو عطا فرمائی ہیں (یعنی ایمان اور علم تو سب کو اور نبوت خود اپنے آپ اور اپنے والد داؤد علیہ السلام کو) اور (اس پر بھی ہمیشگی دیجئے کہ) میں نیک کام کیا کروں جس سے آپ خوش ہوں (یعنی عمل مقبول عنایت ہو، کیونکہ اگر حقیقت میں عمل فی نفسہ اچھا ہو مگر آداب اور شرائط میں کوتاہی و کمی ہونے سے مقبول نہ ہو تو وہ مطلوب نہیں ہے) اور مجھ کو اپنی رحمت (خاصہ) سے اپنے (اعلیٰ درجہ کے) نیک بندوں (انبیاء) میں داخل رکھئے (یعنی قرب کو بعد میں تبدیل نہ کیجئے)۔

**فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا:** اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جانوروں کی بولی سمجھنے میں صرف پرندوں کی خصوصیت نہ تھی، بلکہ پرندوں کے سوا دوسرے جانوروں کی بھی بولی سمجھتے تھے، باقی اس کی تصریح نہیں کہ کوئی قسم جانوروں کی اس سے مستثنیٰ بھی تھی یا نہیں کہ ان کی بولی آپ نہ سمجھتے ہوں، اور ظاہر ہے کہ یہ جانور آدمی کی بولی نہ بولتے تھے، بلکہ وہی آواز جن کو جانور اپنی اغراض کے لیے استعمال کرتے ہیں سلیمان علیہ السلام انہی کو سمجھ جاتے تھے، یہاں چیونٹی اور آگے ہدہد کے قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حیوانات بعض عقلی باتیں بھی سمجھتے ہیں، سو اس کی نفی پر کوئی دلیل نہیں، ممکن ہے کہ ان میں تھوڑی سی عقل ہو، لیکن وہ مکلف ہونے کے لیے کافی نہ ہو، جیسا کہ بچے اور مجنون کو مکلف نہیں کیا گیا، حالانکہ کچھ عقل ان میں بھی ہوتی ہے۔

اس قصہ سے انبیاء علیہم السلام کا ہنسنا ثابت ہے اور حدیث میں جو آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہنستے نہ تھے اس سے مراد یہ ہے کہ آپ کو ہنسنے کی عادت نہ تھی، یہ مطلب نہیں کہ کبھی نہیں ہنسے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ اس چیونٹی کی بات سمجھ کر تعجب ہوا اور فرطِ سرور و نشاط سے ادائے شکر کا جذبہ جوش میں آیا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی حیران ہوں تیرے انعامات عظیمہ کا شکر کس طرح ادا کروں، پس آپ ہی سے التجاء کرتا ہوں کہ مجھے پورا شاکر بنا دیجئے زبان سے بھی اور عمل سے بھی۔ اور اعلیٰ درجہ کے نیک بندوں میں (جو انبیاء و مرسلین ہیں) محشور فرمائیے۔

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ أَرَى الْهُدْهُدَ ۖ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ﴿٢٠﴾

اور خبر لی اڑتے جانوروں کی تو کہا کیا ہے جو میں نہیں دیکھتا ہدہد کو یا ہے وہ غائب ۱؎

لَأُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا أَوْ لَأَاذْبَحَنَّهٗٓ أَوْ لَيَأْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢١﴾

اس کو سزا دوں گا سخت سزا ۲؎ یا ذبح کر ڈالوں گا یا لائے میرے پاس کوئی سند صریح ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (ایک بار یہ قصہ ہوا کہ) سلیمان (علیہ السلام) نے پرندوں کی حاضری لی (یا تو آپ نے پرندوں کو کچھ خدمتیں سپرد کر رکھی ہوں گی اس لیے حاضری لی یا محض انتظام کے لیے ایسا کیا جیسا کہ لشکروں کے سردار کیا کرتے ہیں) تو (ہدہد کو نہ دیکھا) فرمانے لگے

کہ کیا بات ہے کہ میں ہدہد کو نہیں دیکھتا کیا کہیں غائب ہوگیا ہے؟ (پھر جب ثابت ہوگیا کہ واقعی غائب ہے تو فرمانے لگے) میں اس کو (غیر حاضری پر) سخت سزا دوں گا یا اس کو ذبح کر ڈالوں گا یا وہ کوئی صاف دلیل (اور غیر حاضری کا عذر) میرے سامنے پیش کر دے (تو خیر چھوڑ دوں گا)۔

**وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ**: آیت مذکورہ سے ثابت ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی رعایا کے ہر طبقہ پر نظر رکھتے اور ان کے حالات سے اتنے باخبر رہتے تھے کہ ہدہد جو پرندوں میں چھوٹا اور کمزور بھی ہے اور اس کی تعداد بھی دنیا میں بہ نسبت دوسرے پرندوں کے کم ہے وہ بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی نظر سے اوجھل نہیں ہوا، بلکہ خاص ہدہد کے متعلق جو سوال آپ نے فرمایا اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ زمرہ طیور میں کم تعداد اور کمزور ہے، اس لئے اپنی رعیت کے کمزوروں پر نظر رکھنے کا زیادہ اہتمام فرمایا۔

**مَالِيَ لَآ أَرَى الْهُدْهُدَ**: یہاں موقع تو یہ فرمانے کا تھا کہ ہدہد کو کیا ہوگیا کہ وہ مجمع میں حاضر نہیں، عنوان شاید اس لئے بدلا کہ ہدہد اور تمام پرندوں کا مسخر ہونا حق تعالیٰ کا ایک انعام خاص تھا، ہدہد کی غیر حاضری پر ابتداء میں یہ خوف دل میں پیدا ہوا کہ شاید میرے کسی قصور سے اس نعمت میں کمی آئی کہ پرندوں کی ایک قسم یعنی ہدہد غائب ہوگیا، اس لئے اپنے نفس سے سوال کیا کہ ایسا کیوں ہوا؟ جیسا کہ مشائخ صوفیہ کا معمول ہے کہ جب ان کو کسی نعمت میں کمی آئے یا کوئی تکلیف و پریشانی لاحق ہو تو وہ اس کے ازالہ کے لئے مادی اسباب کی طرف توجہ کرنے سے پہلے اپنے نفس کا محاسبہ کرتے تھے کہ ہم سے اللہ تعالیٰ کے حق شکر میں کونسی کوتاہی ہوئی جس کے سبب یہ نعمت ہم سے لے لی گئی، ابن عربیؒ نے بزرگوں کا یہ حال نقل کیا ہے: "اذا فقدوا آمالهم تفقدوا اعمالهم"، یعنی ان حضرات کو جب اپنی مراد میں کامیابی نہیں ہوتی تو یہ اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے ہیں کہ ہم سے کیا قصور سرزد ہوا۔

**لَأُعَذِّبَنَّهُ عَذَابًا شَدِيدًا**: اس سے معلوم ہوا کہ جانوروں کو تعلیم دینے کے لیے سزا دینا جائز ہے، اور اذیت و تکلیف دور کرنے کے لیے قتل بھی جائز ہے، بشرطیکہ تادیب مقصود ہو اور سزا دینے کا کچھ اثر ظاہر ہو اور اس کے قتل سے تکلیف دور ہوتی ہو، ورنہ جائز نہیں، مثلاً اب ہدہد نہ تادیب کے قابل ہے، نہ اس سے کوئی تکلیف پہنچتی ہے، بخلاف اس وقت کے جبکہ غیر حاضری پر سزا دینا مفید تھا اور اس کی نافرمانی سے آپ کو تکلیف پہنچتی تھی۔

* * *

**فائدہ**: ۱؎ کسی ضرورت سے سلیمان علیہ السلام نے اڑنے والی فوج کا جائزہ لیا، ہدہد ان پر نظر نہ پڑا، فرمایا کیا بات ہے ہدہد کو میں نہیں دیکھتا، آیا پرندوں کے جھنڈ میں مجھ کو نظر نہیں آیا، یا حقیقت میں غیر حاضر ہے؟۔

**تنبیہ**: پرندوں سے حضرت سلیمان مختلف کام لیتے تھے مثلاً ہوائی سفر میں ان کا پرے باندھ کر او پر سایہ کرتے ہوئے جانا، یا ضرورت کے وقت پانی وغیرہ کا کھوج لگانا، یا نامہ بری کرنا وغیرہ، ممکن ہے اس وقت ہدہد کی کوئی خاص ضرورت پیش آئی ہو، مشہور ہے کہ جس جگہ زمین کے نیچے پانی قریب ہو ہدہد کو محسوس ہو جاتا ہے اور یہ کچھ مستبعد نہیں کہ حق تعالیٰ کسی جانور کو کوئی خاص حاسہ انسانوں اور دوسرے جانوروں سے تیز عنایت فرما دے، اسی ہدہد کی نسبت معتبر ثقات نے بیان کیا کہ زمین میں جس جگہ مٹی کے نیچے کینچوا ہوا سے محسوس کر کے فوراً نکال لیتا ہے حتیٰ کہ کبھی کبھی ایک دو بالشت زمین کھودتا ہے تب وہاں سے کینچوا نکلتا ہے۔

**فائدہ**: ۲؎ مثلاً اس کے بال و پر نوچ ڈالوں گا۔

**فائدہ**: ۳؎ یعنی اپنی غیر حاضری کا واضح عذر پیش کرے۔

فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ﴿۲۲﴾

پھر بہت دیر نہ کی کہ آ کر کہا میں لے آیا خبر ایک چیز کی کہ تجھ کو اس کی خبر نہ تھی اور آیا ہوں تیرے پاس سبا سے ایک خبر لے کر تحقیقی (یقینی)

**خلاصہ تفسیر**: تھوڑی دیر بعد وہ آ گیا اور (سلیمان علیہ السلام سے) کہنے لگا کہ ایسی بات معلوم کر کے آیا ہوں جو آپ کو معلوم نہیں ہوئی اور (اجمالی بیان اس کا یہ ہے کہ) میں آپ کے پاس قبیلہ سبا کی ایک پختہ خبر لایا ہوں۔

**فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ**: ہدہد کو ایک خاص محسوس واقعہ معلوم ہو جانے سے نبی کے علم پر فضیلت لازم نہیں آتی، کیونکہ نبی کے علوم دوسری قسم کے ہیں، دنیا کے تمام واقعات کا علم ہونا نبی کے لیے ضروری نہیں، اور ہدہد کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ میری غیر حاضری نافرمانی کی وجہ سے نہ تھی، بلکہ ایک درجہ میں اطاعت تھی، کیونکہ میں آپ ہی کے کام میں لگا ہوا تھا۔

**وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍ**: ''سبا'' ایک شخص کا نام تھا، پھر اس کی اولاد کو بھی کہا جانے لگا، پھر ان کے شہر کو بھی سبا کہنے لگے جو صنعاء سے تین دن کے فاصلہ پر ہے، بلقیس اسی خاندان سے ہے، یعرب بن قحطان کی اولاد میں ہونے کی وجہ سے ان کی زبان عربی تھی، اور سلیمان علیہ السلام اگر دنیا بھر کے بادشاہ مان لیے جائیں تو یہ کہنا چاہیے کہ آہستہ آہستہ تمام عالم کے بادشاہ ہو گئے تھے، تاکہ اس وقت تک بلقیس کا ملک آپ کے قبضہ میں نہ آنے سے اشکال نہ ہو۔

* * *

**فائدہ**: حضرت سلیمان کو اس ملک کا حال مفصل نہ پہنچا تھا، اب پہنچا، سبا ایک قوم کا نام ہے ان کا وطن عرب میں تھا یمن کی طرف (موضح القرآن) گویا ہدہد کے ذریعہ سے حق تعالیٰ نے متنبہ فرمادیا کہ بڑے سے بڑے انسان کا علم بھی محیط نہیں ہو سکتا دیکھو جن کی بابت خود فرمایا تھا: **وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا** (النمل: ١٥) ان کو ایک جزئی کی اطلاع ہدہد نے کی۔

## اِنِّیْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ ﴿٢٣﴾

میں نے پایا ایک عورت کو جو اُن پر بادشاہی کرتی ہے اور اس کو ہر ایک چیز ملی ہے [1] اور اس کا ایک تخت ہے بڑا [2]

**خلاصہ تفسیر**: (ہدہد نے تفصیلی واقعہ بیان کیا کہ) میں نے ایک عورت کو دیکھا کہ وہ ان لوگوں پر بادشاہی کر رہی ہے اور اس کو (بادشاہی کے لوازم میں سے) ہر قسم کا سامان حاصل ہے اور اس کے پاس ایک بڑا تخت ہے۔

**اِنِّیْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ**: صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ خبر پہنچی کہ اہل فارس نے اپنے ملک کا بادشاہ کسریٰ کی بیٹی کو بنا دیا ہے تو آپ نے فرمایا: ''لن يفلح قوم ولّوا امرهم امرأة'' یعنی وہ قوم کبھی فلاح نہ پائے گی جس نے اپنے اقتدار کا مالک عورت کو بنا دیا، اسی لئے علماء امت اس پر متفق ہیں کہ کسی عورت کو امامت وخلافت یا سلطنت وحکومت سپرد نہیں کی جاسکتی، بلکہ نماز کی امامت کی طرح امامت کبریٰ بھی صرف مردوں کو سزاوار ہے، رہا بلقیس کا ملکہ سبا ہونا تو اس سے کوئی حکم شرعی ثابت نہیں ہو سکتا جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس سے خود نکاح کیا اور پھر اس کو حکومت وسلطنت پر برقرار رکھا اور یہ کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں جس پر احکام شرعیہ میں اعتماد کیا جاسکے، نیز یہ فعل مشرکین کا تھا، دوسرے اگر سلیمان علیہ السلام نے بھی اس کی بادشاہت کو جائز رکھا ہو تو شریعت محمدی میں اس کے خلاف حکم ہوتے ہوئے ان کا فعل بھی حجت نہیں۔

**وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ**: مراد یہ ہے کہ سب ضروری سامان جو کسی بادشاہ وامیر کو درکار ہوتا ہے اور اپنے زمانے کے مطابق ہو سکتا ہے موجود تھا، جو چیزیں اس زمانے میں ایجاد ہی نہ ہوئی تھیں ان کا نہ ہونا اس آیت کے منافی نہیں۔

**وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ**: تخت کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لیے کیا گیا کہ وہ بہت عجیب اور اس وقت کے بادشاہوں کے اعتبار سے نایاب ہوگا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے قدرت کے باوجود ایسے تخت بنوانے کا اہتمام نہ کیا ہو۔

* * *

**فائدہ**: [1] ہر ایک چیز میں، مال، اسباب، فوج، اسلحہ، اور حسن وجمال سب آ گیا۔

**فائدہ**: [2] یعنی اس ملکہ کے بیٹھنے کا تخت ایسا مکلف ومرصع اور بیش قیمت تھا کہ اس وقت کسی بادشاہ کے پاس نہ تھا، مفسرین ملکہ کا نام ''بلقیس'' لکھتے ہیں، واللہ اعلم۔

وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ

میں نے پایا کہ وہ اور اس کی قوم سجدہ کرتے ہیں سورج کو اللہ کے سوائے اور بھلے دکھلا رکھے ہیں ان کو شیطان نے ان کے کام

فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۲۴﴾ اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ

پھر روک دیا ہے ان کو راستہ سے سو وہ راہ نہیں پاتے ۱؎ کیوں نہ سجدہ کریں اللہ کو جو نکالتا ہے چھپی ہوئی چیز آسمانوں میں

وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۲۵﴾ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۶﴾ السجدۃ

اور زمین میں اور جانتا ہے جو چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو ۲؎ اللہ ہے کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا پروردگار تخت بڑے کا ۳؎

**خلاصہ تفسیر**: (اوران کی مذہبی حالتیہ ہے کہ) میں نے اس (عورت) کواوراس کی قوم کودیکھا کہ وہ خدا (کی عبادت) کو چھوڑ کرآفتاب کوسجدہ کرتے ہیں اور شیطان نے ان کے (ان) اعمال (کفر) کوان کی نظر میں مرغوب کر رکھا ہے (اور ان اعمال بدکومزین کرنے کے سبب) ان کوراہ (حق) سے روک رکھا ہے اس لئے وہ راہ (حق) پر نہیں چلتے، کہ اس خدا کوسجدہ نہیں کرتے جو (ایسا قدرت والا ہے کہ) آسمان اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو (جن میں سے بارش اور زمین کی نباتات بھی ہیں) باہر لاتا ہے اور (ایسا جاننے والا ہے کہ) تم لوگ (یعنی تمام مخلوق) جو کچھ (دل میں) پوشیدہ رکھتے ہو اور جو کچھ (زبان اور جسم کے اعضاء سے) ظاہر کرتے ہو وہ سب کو جانتا ہے (اس لئے) اللہ ہی ایسا ہے کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور وہ عرش عظیم کا مالک ہے۔

ہدہد نے ان لوگوں کا مذہب شاید اس لیے بیان کیا ہو کہ دعوت جہاد کی رغبت دلانا مقصود ہو۔

ذات وصفات باری تعالیٰ کے متعلق بظاہر یہ تمام کلام ہدہد کا ہے، اور پیچھے آیات کی تفسیر میں گذر چکا ہے کہ کسی قدر عقلی قوت کا احتمال جانوروں میں بھی پایا جاتا ہے، ہدہد کی یہ تقریر اس پر دلالت کرتی ہے کہ جانوروں میں بھی بقدر ضرورت علم ومعرفت موجود ہے۔

* * *

**فائدہ**: ۱؎ یعنی وہ قوم مشرک آفتاب پرست ہے، شیطان نے ان کی راہ ماردی، اور مشرکانہ رسوم واطوار کوان کی نظر میں خوبصورت بنادیا، اسی لیے وہ راہ ہدایت نہیں پاتے، ہدہد نے یہ کہہ کر گویا سلیمان علیہ السلام کواس قوم پر جہاد کرنے کی ترغیب دی۔

**فائدہ**: ۲؎ غالباً یہ ہُدہُد کے کلام کا تتمہ ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جانور اپنے خالق کی صحیح معرفت فطرۃً رکھتے ہیں، یا بطور خرق عادت اسی ہدہد کو اس طرح کی تفصیلی معرفت عطا کی گئی ہو، خدا چاہے تو ایسی معرفت ایک خشک لکڑی میں پیدا کردے، باقی جانوروں میں فطری طور پر اس قسم کی عقل و معرفت کا موجود ہونا جسے صدر شیرازی نے ''اسفار اربعہ'' میں ''علم حضوری'' یا ''شعور بسیط'' سے تعبیر کیا ہے اس کو مستلزم نہیں کہ ان کی طرف انبیاء مبعوث ہوں، کیونکہ یہ فطری معرفت کسبی نہیں، جبلی ہے، اور بعث انبیاء کا تعلق کسبیات سے ہوتا ہے نیز یہ صحیح نہیں کہ جس چیز میں کوئی درجہ عقل وشعور کا ہو وہ مکلف بھی ہو، مثلاً شریعت حقہ نے صبی کو مکلف قرار نہیں دیا، حالانکہ قبل از بلوغ اس میں خاصا درجہ عقل کا موجود ہے، اسی سے حیوانات کی عاقلیت کا اندازہ کرلو۔

**تنبیہ**: حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''ہدہد کی روزی ہے ریت سے کیڑے نکال نکال کر کھانا، نہ دانہ کھائے نہ میوہ، اس کو اللہ کی اسی قدرت سے کام ہے''، شاید اسی لیے یُخْرِجُ الْخَبْءَ کا خاص طور پر ذکر کیا، واللہ اعلم۔

**فائدہ**: ۳؎ یعنی اس کے عرش عظیم سے بلقیس کے تخت کو کیا نسبت۔

قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٢٧﴾ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ

سلیمان نے کہا ہم اب دیکھتے ہیں تو نے سچ کہا یا تو جھوٹا ہے [1] لے جا میرا یہ خط اور ڈال دے ان کی طرف پھر

تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ ﴿٢٨﴾

ان کے پاس سے ہٹ آ پھر دیکھ وہ کیا جواب دیتے ہیں [2]

**خلاصہ تفسیر:** سلیمان (علیہ السلام) نے (یہ سن کر) فرمایا کہ ہم ابھی دیکھ لیتے ہیں کہ تو سچ کہتا ہے یا تو جھوٹوں میں سے ہے (اچھا) میرا یہ خط لے جا اور اس کو ان کے پاس ڈال دینا، پھر (ذرا وہاں سے) ہٹ جانا، پھر دیکھنا کہ آپس میں کیا سوال و جواب کرتے ہیں (پھر تو یہاں چلے آنا وہ لوگ جو کچھ کارروائی کریں گے اس سے تیرا سچ جھوٹ معلوم ہو جائے گا)۔

**اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا:** ہدہد ہی کی معرفت خط بھیجنا اس لیے تھا کہ اس سے جھوٹ سچ کا امتحان کرنا تھا، اور پیچھے معلوم ہو چکا ہے کہ بلقیس کی زبان عربی تھی تو سلیمان علیہ السلام کا خط یا تو عربی میں ہوگا اگر چہ وہ خود عربی نہیں ہیں، لیکن جس کو جانوروں کی بولی کا علم تھا اس کو انسانوں کی بولیوں کا علم کیا مشکل ہے، یا اپنی زبان میں لکھا ہوگا اور وہاں ترجمہ کرا لیا گیا ہوگا۔

**ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ:** حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہدہد سے نامہ بری کا کام لیا تو اس کو یہ ادب مجلس بھی سکھایا کہ خط ملکہ سبا کو پہنچا کر وہیں سر پر سوار نہ رہے، بلکہ وہاں سے ذرا ہٹ جائے جو عام شاہی مجلسوں کا طریقہ ہے، اس میں آداب معاشرت اور انسانی اخلاق کا عام مخلوقات کے ساتھ مطلوب ہونا معلوم ہوا۔

**فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ:** اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدہد سلیمان علیہ السلام کے علاوہ دوسروں کی بات بھی سمجھتا تھا، سو یہ بھی سلیمان علیہ السلام کا معجزہ ہوگا۔

* * *

**فائدہ:** [1] یعنی تیرے جھوٹ سچ کا امتحان کرتا ہوں۔

**فائدہ:** [2] یعنی سلیمان نے ایک خط لکھ کر ہدہد کے حوالہ کیا کہ ملکہ ''سبا'' کو پہنچا دے اور جواب لے کر آ، اور دیکھنا خط پہنچا کر وہاں سے ایک طرف ہٹ جانا، کیونکہ قاصد کا وہیں سر پر کھڑا رہنا آدابِ شاہانہ کے خلاف ہے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی آپ کو چھپا، لیکن وہاں کا ماجرا دیکھ، ہدہد خط لے گیا، بلقیس جہاں اکیلی سوتی تھی، روزن میں سے جا کر اس کے سینہ پر رکھ دیا''۔ (موضح)

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْۤ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴿٢٩﴾ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ

کہنے لگی اے دربار والو میرے پاس ڈالا گیا ایک خط عزت کا، وہ خط ہے سلیمان کی طرف سے [1] اور وہ یہ ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿٣٠﴾ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿٣١﴾ ع ٢

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے، کہ زور نہ کرو میرے مقابلہ میں اور چلے آؤ میرے سامنے حکم بردار ہو کر [2]

**خلاصہ تفسیر:** سلیمان علیہ السلام نے ہدہد سے مذکورہ گفتگو کر کے بلقیس کے نام ایک خط لکھا جس کا مضمون آگے قرآن میں مذکور ہے اور ہدہد کے حوالہ کیا، وہ اس کو چونچ میں لے کر چلا اور اکیلے یا مجلس میں بلقیس کے پاس ڈال دیا۔

بلقیس نے (پڑھ کر اپنے سرداروں کو مشورہ کیلئے جمع کیا اور) کہا کہ اے اہل دربار! میرے پاس ایک خط (جس کا مضمون نہایت) باوقعت

(اور عظیم الشان ہے) ڈالا گیا ہے (باوقعت اس لئے کہا کہ حاکمانہ مضمون ہے جس میں باوجود انتہائی اختصار کے اعلی درجہ کی بلاغت ہے اور) وہ سلیمان کی طرف سے ہے اور اس میں یہ (مضمون) ہے (اول) بسم اللہ الرحمن الرحیم (اور اس کے بعد یہ کہ) تم لوگ (یعنی بلقیس اور سب ارکان بادشاہت جن کے ساتھ عوام بھی وابستہ ہیں) میرے مقابلہ میں تکبر مت کرو اور میرے پاس تابعدار ہو کر چلے آؤ (مقصود تمام اہل سبا کو دعوت اسلام دینا ہے)۔

اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ: یہ لوگ سلیمان علیہ السلام کا حال یا تو پہلے سے سن چکے ہوں گے اگرچہ سلیمان علیہ السلام ان لوگوں کو نہ جانتے ہوں، کیونکہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بڑے آدمی چھوٹوں کو نہیں جانتے اور چھوٹے بڑوں کو جانا کرتے ہیں، یا خط آنے کے بعد تحقیق کر لیا ہوگا۔

وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ: آنے سے مراد جسمانی حاضری نہیں، بلکہ اطاعت میں آنا مراد ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ بلقیس نے خط پڑھ کر اپنے مشیروں اور درباریوں کو جمع کیا، کہنے لگی کہ میرے پاس یہ خط عجیب طریقہ سے پہنچا ہے جو ایک بہت بڑے معزز و محترم بادشاہ (سلیمان) کی طرف سے آیا ہے، غالباً حضرت سلیمان کا نام اور ان کی بے مثال حکومت وشوکت کا شہرہ پہلے سے سن چکی ہوگی۔

**فائدہ:** ۲؎ ایسا مختصر جامع اور پر عظمت خط شاید ہی دنیا میں کسی نے لکھا ہو، مطلب یہ تھا کہ میرے مقابلہ میں زور آزمائی سے کچھ نہ ہوگا، خیریت اسی میں ہے کہ اسلام قبول کرو اور حکم بردار ہو کر آدمیوں کی طرح سیدھی انگلیوں میرے سامنے حاضر ہو جاؤ، تمہاری شیخی اور تکبر میرے آگے کچھ نہ چلے گی۔

قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْٓ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ﴿۳۲﴾

کہنے لگی اے درباروالو مشورہ دو مجھ کو میرے کام میں، میں طے نہیں کرتی کوئی کام تمہارے حاضر ہونے تک (ہونے تلک) ۱؎

قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ﴿۳۳﴾

وہ بولے ہم لوگ زور آور ہیں اور سخت لڑائی والے اور کام تیرے اختیار میں ہے سو تو دیکھ لے جو حکم کرے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** (خط کے مضمون کی اطلاع دینے کے بعد) بلقیس نے (یہ) کہا کہ اے اہل دربار! تم مجھ کو میرے اس معاملہ میں رائے دو (کہ مجھ کو سلیمان کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہئے؟) اور میں (کبھی) کسی بات کا قطعی فیصلہ نہیں کرتی جب تک کہ تم میرے پاس موجود نہ ہو (اور اس میں شریک ومشیر نہ ہو) وہ لوگ کہنے لگے کہ ہم (اپنی ذات سے ہر طرح سے حاضر ہیں، اگر مقابلہ اور لڑنا مصلحت سمجھا جائے تو ہم) بڑے طاقتور اور بڑے لڑنے والے ہیں (اور آگے) اختیار تم کو ہے، سو تم ہی (مصلحت) دیکھ لو جو کچھ (تجویز کر کے) حکم دینا ہو۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی مشورہ دو کیا جواب دیا جائے اور کیا کارروائی کی جائے جیسا کہ تمہیں معلوم ہے میں کسی اہم معاملہ کا فیصلہ بدون تمہارے مشورہ کے نہیں کرتی۔

**فائدہ:** ۱؎ یعنی ہمارے پاس زور وطاقت اور سامان حرب کی کمی نہیں، نہ کسی بادشاہ سے دبنے کی ضرورت، تیرا حکم ہو تو ہم سلیمان سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہیں، آگے تو مختار ہے سوچ سمجھ کر حکم دے، ہماری گردن اس کے سامنے خم ہوگی، معلوم ہوتا ہے کہ درباریوں کی صلاح لڑائی کرنے کی تھی مگر ملکہ نے اس میں تعجیل مناسب نہ سمجھی اور ایک بین بین صورت اختیار کی جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ

کہنے لگی بادشاہ جب گھستے ہیں کسی بستی میں اس کو خراب کر دیتے ہیں اور کر ڈالتے ہیں وہاں کے سرداروں کو بے عزت

وَ كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿٣٤﴾ وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿٣٥﴾

اور ایسا ہی کچھ کریں گے، اور میں بھیجتی ہوں ان کی طرف کچھ تحفہ پھر دیکھتی ہوں کیا جواب لے کر پھرتے ہیں بھیجے ہوئے ۱؎

**خلاصہ تفسیر:** بلقیس کہنے لگی کہ (میرے نزدیک لڑنا تو مصلحت نہیں کیونکہ سلیمان بادشاہ ہیں اور) بادشاہوں (کا قاعدہ ہے کہ وہ) جب کسی بستی میں (مخالفانہ طور پر) داخل ہوتے ہیں تو اس کو تہہ وبالا کر دیتے ہیں اور اس کے رہنے والوں میں جو عزت دار ہیں ان کو (ان کا زور گھٹانے کے لئے) ذلیل (وخوار) کیا کرتے ہیں، اور (اگر ان سے لڑائی کی جائے تو ممکن ہے کہ ان ہی کو غلبہ ہو تو پھر) یہ لوگ بھی ایسا ہی کریں گے (تو بےضرورت پریشانی میں پڑنا خلاف مصلحت ہے، لہٰذا جنگ کو تو ابھی ملتوی کیا جائے) اور (سردست یوں مناسب ہے کہ) میں ان لوگوں کے پاس کچھ ہدیہ (کسی آدمی کے ہاتھ) بھیجتی ہوں) پھر دیکھوں گی کہ وہ بھیجے ہوئے (وہاں سے) کیا (جواب) لے کر آتے ہیں (اس وقت دوبارہ غور کیا جائے گا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ معلوم ہوتا ہے کہ مضمونِ خط کی عظمت وشوکت اور دوسرے قرائن وآثار سے بلقیس کو یقین ہو گیا کہ اس بادشاہ پر ہم غالب نہیں آسکتے اور کم از کم اس کا قوی احتمال تو ضرور تھا، اس نے بتلایا کہ ایسی شان وشکوہ رکھنے والے بادشاہ سے لڑنا کھیل نہیں، اگر وہ غالب آگئے (جیسا کہ قوی امکان ہے) تو ملوک وسلاطین کی عام عادت کے موافق تمہارے شہروں کو تہ وبالا کر کے رکھ دیں گے، اور وہ انقلاب ایسا ہو گا جس میں بڑے عزت والے سرداروں کو ذلیل وخوار ہونا پڑے گا، لہٰذا میرے نزدیک بہتر ہے کہ ہم جنگ کرنے میں جلدی نہ کریں بلکہ ان کی طاقت، طبعی رجحانات، نوعیت حکومت اور اس بات کا پتہ لگائیں کہ ان کی دھمکیوں کی پشت پر کون سی قوت کارفرما ہے، اور یہ کہ واقعی طور پر وہ ہم سے کیا چاہتے ہیں، اگر کچھ تحائف وہدایا دے کہ ہم آنے والی مصیبت کو اپنے سر سے ٹال سکیں تو زیادہ اچھا ہو گا ورنہ جو کچھ رویہ معلوم ہو جائے گا ہم اس کے مناسب کارروائی کریں گے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''بلقیس نے چاہا کہ اس بادشاہ کا شوق دریافت کرے کس چیز سے ہے، مال، خوبصورت آدمی، یا نادر سامان، سب قسم کی چیزیں تحفہ میں بھیجی تھی''۔

فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ ۫ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ

پھر جب پہنچا سلیمان کے پاس بولا (بولا سلیمان) کیا تم میری اعانت کرتے ہو مال سے، سو جو اللہ نے مجھ کو دیا (دے رکھا) ہے بہتر ہے

مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴿٣٦﴾

اس سے جو تم کو دیا ہے، بلکہ تم ہی اپنے تحفہ سے خوش رہو

**خلاصہ تفسیر:** (چنانچہ ہدیوں اور تحفوں کا سامان درست ہوا، اور قاصد اس کو لے کر روانہ ہوا) جب وہ قاصد سلیمان (علیہ السلام) کے پاس پہنچا (اور تمام ہدیے پیش کئے) تو سلیمان (علیہ السلام نے) فرمایا کیا تم لوگ (یعنی بلقیس اور بلقیس والے) مال سے میری امداد کر (ناچاہ) تے ہو (اس لئے ہدیئے لائے ہو) سو (سمجھ رکھو کہ) اللہ نے جو کچھ مجھے دے رکھا ہے وہ اس سے کہیں بہتر ہے جو تم کو دے رکھا ہے (کیونکہ تمہارے پاس صرف دنیا ہے اور میرے پاس دین بھی ہے اور دنیا بھی تم سے زیادہ، سو میں تو ان چیزوں کا حریص نہیں ہوں) ہاں! تم ہی اپنے ہدیئے پر فخر کرتے ہو گے (لہٰذا یہ ہدیئے ہم نہ لیں گے)۔

بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ: حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ بلقیس کا ہدیہ قبول نہیں فرمایا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کا ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں یا بہتر نہیں، اور تحقیق اس مسئلے میں یہ ہے کہ کافر کا ہدیہ قبول کرنے میں اگر اپنی یا مسلمانوں کی کسی مصلحت میں خلل آتا ہو، یا ان کے حق

میں رائے کی کمزوری پیدا ہوتی ہو تو ان کا ہدیہ قبول کرنا درست نہیں، ہاں! اگر کوئی دینی مصلحت اس ہدیہ کے قبول کرنے کی داعی ہو، مثلاً اس کے ذریعہ کافر کے مانوس ہو کر اسلام سے قریب آنے پھر مسلمان ہونے کی امید ہو یا اس کے کسی شر و فساد کو اس کے ذریعہ دفع کیا جا سکتا ہو تو قبول کرنے کی گنجائش ہے، رسول اللہ ﷺ کی سنت اس معاملے میں یہی رہی ہے کہ بعض کفار کا ہدیہ قبول فرما لیا، بعض کا رد کر دیا۔

* * *

**فائدہ:** یعنی یہ تحفہ تمہیں ہی مبارک رہے، کیا تم نے مجھے محض ایک دنیاوی بادشاہ سمجھا جو مال و متاع کا لالچ دیتے ہو، تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ حق تعالیٰ نے جو روحانی و مادی دولت مجھے عطا فرمائی ہے وہ تمہارے ملک و دولت سے کہیں بڑھ کر ہے ان سامانوں کی ہمیں کیا پروا۔

## اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

پھر جا (لوٹ) انکے پاس اب ہم پہنچتے ہیں ان پر ساتھ لشکروں کے جنکا مقابلہ نہ ہو سکے ان سے اور نکال دیں گے انکو وہاں سے بے عزت کر کر اور وہ خوار ہونگے

**خلاصہ تفسیر:** تم (ان کو لے کر) ان لوگوں کے پاس لوٹ جاؤ (اگر وہ اب بھی ایمان لے آئیں تو درست ورنہ) ہم ان پر ایسی فوجیں بھیجتے ہیں کہ ان لوگوں سے ان کا ذرا مقابلہ نہ ہو سکے گا اور ہم ان کو وہاں سے ذلیل کر کے نکال دیں گے اور وہ (ذلت کے ساتھ ہمیشہ کے لئے) ماتحت (اور رعایا) ہو جائیں گے (یہ نہیں کہ نکالنے کے بعد آزادی سے چھوڑ دیئے جائیں کہ جہاں چاہیں چلے جائیں بلکہ ہمیشہ کی ذلت ان کے لئے لازمی ہو جائے گی)۔

**اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ:** سلیمان علیہ السلام نے جو ہدیہ لوٹا دیا تو اگر آپ کی شریعت میں جزیہ لینا جائز نہ ہو تب تو ظاہر ہے، اور اگر جائز بھی ہو تو یہ ہدیہ جزیہ کے طور پر نہ تھا جو کہ اطاعت کی علامت ہے، بلکہ بغیر اطاعت کے محض رواداری اور تعلق کا ذریعہ تھا، سو یہ بلا ضرورت جائز نہیں، رہا یہ سوال کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنی نبوت پر دلیل قائم کرنے کے لیے کوئی معجزہ کیوں نہ پیش کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی ضرورت درخواست کے وقت ہوتی ہے، کیونکہ بعض لوگوں کو انبیاء کے باطنی کمالات ہی سے نبوت کا یقین ہو جاتا ہے اور جسے اس سے یقین نہ ہو وہ خود درخواست کر سکتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی قیدی بنیں گے، جلا وطن ہوں گے اور ذلت و خواری کے ساتھ دولت و سلطنت سے دستبردار ہونا پڑے گا، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''اور کسی پیغمبر نے اس طرح کی بات نہیں فرمائی، سلیمان کو حق تعالیٰ کی سلطنت کا زور تھا جو یہ فرمایا''۔

## قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۸﴾

بولا اے دربار والو تم میں کوئی ہے کہ لے آوے میرے پاس اس کا تخت پہلے اس سے کہ وہ آئیں میرے پاس حکم بردار ہو کر

**خلاصہ تفسیر:** غرض وہ قاصد اپنے ہدایا لے کر واپس گیا اور سارا قصہ بلقیس سے بیان کیا تو مجموعی حالات سے اس کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے علم اور نبوت کے کمالات کا یقین ہو گیا اور حاضر ہونے کے ارادہ سے اپنے ملک سے چلی۔

سلیمان (علیہ السلام کو وحی سے یا اور کسی پرندے وغیرہ کے ذریعہ اس کا چلنا معلوم ہوا تو انہوں) نے (اپنے درباروالوں سے) فرمایا کہ اے دربار والو! تم میں کوئی ایسا ہے جو اس (بلقیس) کا تخت پہلے اس کے کہ وہ لوگ میرے پاس مطیع ہو کر آئیں حاضر کر دے (''مسلمین'' کی قید اظہار واقعہ کے لئے ہے، کیونکہ وہ لوگ اسی قصد سے آ رہے تھے)۔

**اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا:** تخت کا منگانا غالباً اس غرض سے ہے کہ وہ لوگ میرا معجزہ بھی دیکھ لیں، کیونکہ اتنا بڑا تخت اور پھر اس کا ایسے سخت پہروں میں اس طور پر اچانک آ جانا کہ اطلاع تک نہ ہو انسانی عادت سے باہر ہے، اگر وہ جنوں کے ذریعہ سے آیا تب بھی ان کا خود بخود تابع ہونا ایک معجزہ ہے، اور اگر کرامت کے کسی ولی کی کرامت سے آیا تو ولی کی کرامت بھی نبی کا معجزہ ہے، اور اگر بغیر کسی واسطہ کے آیا تو پھر معجزہ ہونا ظاہر ہی ہے،

بہرحال ہر صورت میں یہ معجزہ اور نبوت کی دلیل ہے، لہٰذا مقصود یہ ہوگا کہ باطنی کمالات کے ساتھ ساتھ یہ معجزہ کے کمالات بھی دیکھ لیں تا کہ ایمان و اطمینان زیادہ ہو۔

* * *

**فائدہ:** قاصد نے واپس جا کر پیغام جنگ پہنچا دیا، بلقیس کو یقین ہو گیا کہ یہ کوئی معمولی بادشاہ نہیں ان کی قوت خدائی زور سے ہے، جدال وقتال سے کچھ فائدہ نہ ہوگا، نہ کوئی حیلہ اور زور ان کے روبرو چل سکتا ہے آخر اظہار اطاعت وانقیاد کی غرض سے بڑے بڑے ساز وسامان کے ساتھ حضرت سلیمان کی خدمت میں حاضری دینے کے لیے روانہ ہوگئی، جب ملک شام کے قریب پہنچی، حضرت سلیمان نے اپنے درباریوں سے فرمایا: ''کوئی ہے جو بلقیس کا تخت شاہی اس کے پہنچنے سے پیشتر میرے سامنے حاضر کر دے''، اس میں بھی حضرت سلیمان کو کئی طرح بلقیس پر اپنی خداداد عظمت وقوت کا اظہار مقصود تھا، تا کہ وہ سمجھ لے کہ یہ نرے بادشاہ نہیں، کوئی اور فوق العادت باطنی طاقت بھی اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔

**تنبیہ:** قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ سے معلوم ہوا کہ اسلام وانقیاد سے پہلے حربی کا مال مباح ہے۔

قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ﴿۳۹﴾

بولا ایک دیو جنوں میں سے میں لائے دیتا ہوں وہ تجھ کو پہلے اس سے کہ تو اٹھے اپنی جگہ سے ۱؎ اور میں اس پر زور آور ہوں معتبر ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** ایک قوی ہیکل جن نے جواب (میں) عرض کیا کہ میں اس کو آپ کی خدمت میں حاضر کر دوں گا پہلے اس کے کہ آپ اپنے اجلاس سے اٹھیں اور (اگر چہ وہ بہت بھاری ہے مگر) میں اس (کے لانے) پر طاقت رکھتا ہوں (اور اگر چہ بڑا قیمتی اور موتیوں سے مزین ہے مگر میں) امانت دار (بھی) ہوں (اس میں کوئی خیانت نہ کروں گا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ حضرت سلیمان کا دربار روزانہ ایک معین وقت تک لگتا تھا، مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے کہ آپ دربار سے اٹھ کر جائیں، میں تخت کو حاضر کر سکتا ہوں، مگر اس کو پھر کچھ عرصہ لگتا، حضرت سلیمان اس سے بھی زیادہ جلدی چاہتے تھے۔

**فائدہ:** ۲؎ ''زور آور'' ہوں، یعنی اپنی قوت بازو سے بہت جلد اٹھا کر لا سکتا ہوں، اللہ نے مجھ کو قدرت دی ہے اور ''معتبر ہوں''، یعنی اس میں خیانت نہ کروں گا، کہتے ہیں تخت بہت بیش قیمت تھا، سونے چاندی کا اور لعل وجواہر جڑے تھے۔

قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ۭ

بولا وہ شخص جس کے پاس تھا ایک علم کتاب کا میں لائے دیتا ہوں تیرے پاس اس کو پہلے اس سے کہ پھر آئے تیری طرف تیری آنکھ ۱؎

فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۣ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ۭ

پھر جب دیکھا اس کو دھرا ہوا اپنے پاس کہا یہ میرے رب کا فضل ہے ۲؎ میرے جانچنے کو کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری ۳؎

وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ﴿۴۰﴾

اور جو کوئی شکر کرے، سو شکر کرے اپنے واسطے اور جو کوئی ناشکری کرے، سو میرا رب بے پروا ہے کرم والا ۴؎

**خلاصہ تفسیر:** جس کے پاس کتاب (الٰہی یعنی تورات کا یا اور کسی آسمانی کتاب کا جس میں اللہ کے ناموں کی تاثیرات لکھی ہوں اس) کا علم تھا (اقرب یہ ہے کہ اس سے خود سلیمان علیہ السلام مراد ہیں، غرض) اس (علم والے) نے (اس جن سے) کہا کہ (بس تجھ میں تو اتنی ہی

قوت ہے اور) میں اس کو تیرے سامنے تیری آنکھ جھپکنے سے پہلے لا کھڑا کرسکتا ہوں (کیونکہ معجزہ یا کرامت کی طاقت سے لاؤں گا، چنانچہ آپ نے حق تعالیٰ سے دعا کی ویسے ہی یا کسی اسم الٰہی کے ذریعہ سے اور تخت فوراً سامنے آموجود ہوا) جب سلیمان (علیہ السلام) نے اس کو اپنے روبرو رکھا دیکھا تو (خوش ہو کر شکر کے طور پر) کہنے لگے کہ یہ بھی میرے پروردگار کا ایک فضل ہے (کہ میرے ہاتھ سے یہ معجزہ ظاہر کیا) تا کہ وہ میری آزمائش کرے کہ میں شکر کرتا ہوں یا (خدانخواستہ) ناشکری کرتا ہوں، اور ظاہر ہے کہ جو شخص شکر کرتا ہے وہ اپنے ہی نفع کے لئے شکر کرتا ہے (اللہ تعالیٰ کا کوئی نفع نہیں) اور (اسی طرح) جو ناشکری کرتا ہے (وہ بھی اپنا ہی نقصان کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں، کیونکہ) میرا رب غنی ہے کریم ہے۔

**قَالَ الَّذِیْ عِنْدَہٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ:** اس عالم سے خود سلیمان علیہ السلام مراد ہیں، تفسیر کبیر میں چند وجوہ مذکور ہیں جن سے یہی قول راجح معلوم ہوتا ہے، اس صورت میں سلیمان علیہ السلام کا یہ سوال کرنا جنات کے امتحان اور ان کی کمزوری ظاہر کرنے کے لیے ہوگا، اور بعض روایات سیر میں اس عالم کا سلیمان علیہ السلام کے صحابہ میں سے ہونا آیا ہے اور یہ اس صحابی کی کرامت تھی، اور وہ غرض اس صورت میں بھی پوری ہوسکتی ہے کہ آپ کو معلوم ہوگیا ہو کہ اس صحابی سے یہ کرامت ظاہر ہوگی تو سوال کر کے جناب کو سنانا اور دکھلانا منظور ہوا کہ مجھ سے فیض پانے والوں میں وہ قوت ہے کہ تم میں بھی نہیں، اور چونکہ امتی کی کرامت نبی کا معجزہ ہوتا ہے اس لیے آپ نے شکر ادا کیا، اور ہر حال میں اگر کتاب سے مراد تورات ہے تو اس کو تخت کے حاضر کرنے میں کوئی دخل نہ ہوگا محض تعریف کرنا مقصود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح معجزہ میں اسباب طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ براہ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا ہے: **وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی**، اسی طرح کرامت میں بھی اسباب طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا، براہ راست حق تعالیٰ کی طرف سے کوئی کام ہوجاتا ہے اور معجزہ اور کرامت دونوں خود صاحب معجزہ و کرامت کے اختیار میں بھی نہیں ہوتے، ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایسا کوئی خارق عادت کام اگر کسی صاحب وحی نبی کے ہاتھ پر ہو تو معجزہ کہلاتا ہے، غیر نبی کے ذریعہ اس کا ظہور ہو تو کرامت کہلاتی ہے، اس واقعہ میں اگر یہ روایت صحیح ہے کہ یہ عمل حضرت سلیمان علیہ السلام کے اصحاب میں سے آصف بن برخیا کے ذریعہ ہوا تو یہ ان کی کرامت کہلائے گی اور ہر ولی کے کمالات چونکہ ان کے رسول و پیغمبر کے کمالات کا عکس اور انہی سے مستفاد ہوتے ہیں اس لئے امت کے اولیاء اللہ کے ہاتھوں جتنی کرامتوں کا ظہور ہوتا رہتا ہے، یہ سب رسول کے معجزات میں شمار ہوتے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص حضرت سلیمان کا صحابی اور وزیر آصف بن برخیا ہے جو کتب سماویہ کا عالم اور اللہ کے اسماء اور کلام کی تاثیر سے واقف تھا، اس نے عرض کیا کہ میں چشم زدن میں تخت کو حاضر کرسکتا ہوں، آپ کسی طرف دیکھئے، قبل اس کے آپ ادھر سے نگاہ ہٹائیں تخت آپ کے سامنے رکھا ہوگا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی یہ ظاہر کے اسباب سے نہیں آیا اللہ کا فضل ہے کہ میرے رفیق اس درجہ کو پہنچے، جن سے ایسی کرامات ظاہر ہونے لگیں، اور چونکہ ولی کی خصوصاً صحابی کی کرامت اس کے نبی کا معجزہ اور اس کے اتباع کا ثمرہ ہوتا ہے اس لیے حضرت سلیمان پر بھی اس کی شکر گزاری عائد ہوئی۔

**تنبیہ:** معلوم ہوا کہ اعجاز و کرامت فی الحقیقت خدوانِد قدیر کا فعل ہے جو ولی یا نبی کے ہاتھ پر خلاف معمول ظاہر کیا جاتا ہے، پس جس کی قدرت سے سورج یا زمین کا کرہ ایک لمحہ میں ہزاروں میل کی مسافت طے کر لیتا ہے اسے کیا مشکل ہے کہ تخت بلقیس کو پلک جھپکنے میں ''مارب'' سے ''شام'' پہنچادے، حالانکہ تخت بلقیس کو سورج اور زمین سے ذرہ اور پہاڑ کی نسبت ہے۔

**فائدہ:** ۳؎ حضرت سلیمان ہر ہر قدم پر حق تعالیٰ کی نعمتوں کو پہچانتے اور ہمہ وقت شکر گزاری کے لیے تیار رہتے تھے گویا یہ: **اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا** (سبا: ۱۳) کے حکم کی تعمیل تھی۔

**فائدہ:** ۴؎ یعنی شکر گذاری کا نفع شاکر ہی کو پہنچتا ہے کہ دنیا و آخرت میں مزید انعامات مبذول ہوتے ہیں، ناشکری کرے گا تو خدا کا کیا

نقصان، وہ ہمارے شکریوں سے قطعاً بے نیاز اور بذات خود کامل الصفات اور منبع الکمالات ہے، ہمارے کفران نعمت سے اس کی کسی صفت کمالیہ میں کمی نہیں آجاتی، یہ بھی اس کا کرم ہے کہ ناشکروں کو فوراً سزا نہیں دیتا، ایسے کریم کی ناشکری کرنے والا پرلے درجہ کا بے حیا اور احمق ہے۔

قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۱﴾

کہا روپ بدل دکھلاؤ اس عورت کے آگے اس کے تخت کا ہم دیکھیں سمجھ پاتی ہے یا ان لوگوں میں ہوتی ہے جن کو سمجھ نہیں

**خلاصہ تفسیر:** (اس کے بعد) سلیمان (علیہ السلام) نے (بلقیس کی عقل آزمانے کے لئے) حکم دیا کہ اس (کی عقل آزمانے) کے لئے اس کے تخت کی صورت بدل دو (جس کے بہت سے طریقے ہو سکتے ہیں مثلاً موتیوں کی جگہیں بدل دو یا کسی اور طرح) ہم دیکھیں اس کو اس کا پتہ لگتا ہے یا اس کا انہیں میں شمار ہے جن کو (ایسی باتوں کا) پتہ نہیں لگتا (پہلی صورت میں معلوم ہوگا کہ وہ عقلمند ہے اور عقلمند سے حق بات سمجھنے کی زیادہ امید ہے اور اس کے حق کو پہچاننے کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے، اور دوسری صورت میں دونوں باتوں کی امید کم ہے)۔

قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا: اس سے مشائخ کے اس عمل کی تائید ہوتی ہے کہ وہ اپنے سلسلے میں کسی کو داخل کرنے سے پہلے اس کا امتحان لیا کرتے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** یعنی تخت کا رنگ روپ تبدیل کر دو، اور اس کی وضع وہیئت بدل ڈالو، جسے دیکھ کر بلقیس باآسانی نہ سمجھ سکے، اس سے بلقیس کی عقل و فہم کو آزمانا تھا کہ ہدایت پانے کی استعداد اس میں کہاں تک موجود ہے۔

فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ؕ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ ﴿۴۲﴾

پھر جب وہ آپہنچی کسی نے کہا کیا ایسا ہی ہے تیرا تخت بولی گویا یہ وہی ہے [1] اور ہم کو معلوم ہو چکا پہلے سے اور ہم ہو چکے حکم بردار [2]

**خلاصہ تفسیر:** (سلیمان علیہ السلام نے یہ سب سامان کر رکھا تھا، پھر بلقیس پہنچی) سو جب بلقیس آئی تو اس سے (تخت دکھا کر) کہا گیا (خواہ سلیمان علیہ السلام نے خود کہا ہو یا کسی سے کہلوایا ہو) کہ کیا تمہارا تخت ایسا ہی ہے؟ وہ کہنے لگی کہ ہاں! ہے تو ویسا ہی (چونکہ اس تخت کی ہیئت بدل گئی تھی، اصل میں تو وہی تخت تھا مگر صورت وہ نہ تھی اس لیے بلقیس سے اس طرح سے سوال کیا، اور یوں نہیں کہا کہ کیا یہی تمہارا تخت ہے؟ بلکہ یہ کہا کہ کیا ایسا ہی تمہارا تخت ہے؟ اور بلقیس اس کو پہچان گئی اور اس کے بدل دینے کو بھی سمجھ گئی اس لئے جواب بھی مطابق سوال کے دیا جس سے اس کا عاقل ہونا معلوم ہو گیا) اور (یہ بھی کہا کہ) ہم لوگوں کو تو اس واقعہ سے پہلے ہی (آپ کی نبوت کی) تحقیق ہو چکی ہے اور ہم (اسی وقت سے دل سے) مطیع ہو چکے ہیں (جب قاصد سے آپ کے کمالات معلوم ہوئے تھے اس معجزہ کی چنداں حاجت نہ تھی)۔

* * *

**فائدہ:** [1] نہ کہا کہ ہاں وہ ہی ہے اور نہ بالکل نفی کی، جو حقیقت تھی ٹھیک ٹھیک ظاہر کر دی تخت وہ ہی ہے مگر کچھ اوصاف میں فرق آگیا، اور فرق چونکہ متعدبہ نہیں اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ گویا وہ ہی ہے۔

**فائدہ:** [2] یعنی اس معجزہ کی حاجت نہ تھی، ہم کو پہلے ہی یقین ہو چکا تھا کہ سلیمان محض بادشاہ نہیں، اللہ کے مقرب بندہ ہیں اور اسی لیے ہم نے فرمانبرداری اور تسلیم وانقیاد کا راستہ اختیار کیا۔

وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۴۳﴾

اور روک دیا اس کو ان چیزوں سے جو پوجتی تھی اللہ کے سوا، البتہ وہ تھی منکر لوگوں میں

**خلاصہ تفسیر:** چونکہ اس معجزہ سے پہلے ہی تصدیق واعتقاد کر لینا کمال عقل کی دلیل ہے اس لئے اللہ تعالیٰ اس کے عاقل ہونے کو بیان فرماتے ہیں کہ فی الواقع وہ تھی سمجھدار مگر چند روز تک جو ایمان نہ لائی تو وجہ اس کی یہ ہے کہ:

اور اس کو (ایمان لانے سے) غیر اللہ کی عبادت نے (جس کی اس کو عادت تھی) روک رکھا تھا (وروہ عادت اس لئے پڑ گئی تھی کہ) وہ کافر قوم میں کی تھی (پس جو سب کو کرتے دیکھا وہی آپ کرنے لگی اور قومی عادات اکثر اوقات انسان کے سوچنے سمجھنے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں مگر چونکہ عقل مند تھی اس لئے جب تنبیہ کی گئی تو سمجھ گئی)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی حق تعالیٰ نے یا سلیمان علیہ السلام نے حق تعالیٰ کے حکم سے ملکہ بلقیس کو آفتاب وغیرہ کی پرستش سے روک دیا، جس میں وہ بمعیت اپنی قوم کے مبتلا تھی، یا یہ مطلب ہے کہ سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہونے تک جو اعلانیہ اسلام کا اظہار نہیں کیا اس کا سبب یہ ہے کہ جھوٹے معبودوں کے خیال اور قوم کفار کی تقلید وصحبت نے اس کو ایسا کرنے سے روک رکھا تھا، نبی کی صحبت میں پہنچ کر وہ روک جاتی رہی، ورنہ سلیمان علیہ السلام کی صداقت کا اجمالی علم اس کو پہلے ہی ہو چکا تھا۔

قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ؕ

کسی نے کہا اس عورت کو اندر چل محل میں پھر جب دیکھا اس کو خیال کیا کہ وہ پانی ہے گہرا اور کھولیں اپنی پنڈلیاں [1]

قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ؕ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ

کہا یہ تو ایک محل ہے جڑے ہوئے ہیں اسمیں شیشے [2] بولی اے رب میں نے برا کیا ہے اپنی جان کا اور میں حکم بردار ہوئی ساتھ سلیمان کے

ع ۱۸/۳
لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۴﴾

اللہ کے آگے جو رب ہے سارے جہان کا [3]

**خلاصہ تفسیر:** اس کے بعد سلیمان علیہ السلام نے یہ چاہا کہ اعجاز وشان نبوت دکھلانے کے علاوہ اس کو ظاہری سلطنت کی شان بھی دکھلا دی جائے تاکہ اپنے کو دنیا کے اعتبار سے بھی بڑا نہ سمجھے، اس لئے ایک شیش محل بنوا کر اس کے صحن میں حوض بنوایا اور اس میں پانی اور مچھلیاں بھر کر اس کو شیشہ سے پاٹ دیا، اور شیشہ ایسا شفاف تھا کہ سرسری نظر سے نظر نہ آتا تھا، اور وہ حوض ایسے موقع پر تھا کہ اس محل میں جانے والے کو لامحالہ اس پر سے گذرنا پڑے، چنانچہ اس تمام سامان کے بعد:

بلقیس سے کہا گیا کہ اس محل میں داخل ہو (ممکن ہے وہی محل قیام کے لئے تجویز کیا گیا ہو، غرض وہ چلیں راہ میں حوض آیا) تو جب اس کا صحن دیکھا تو اس کو پانی (سے بھرا ہوا) سمجھا، اور (چونکہ قرینہ سے تالاب گمان کیا اس لئے اس کے اندر گھسنے کے لئے دامن اٹھائے اور) اپنی دونوں پنڈلیاں کھول دیں (اس وقت) سلیمان (علیہ السلام) نے فرمایا کہ یہ تو محل ہے جو (سب کا سب مع صحن) شیشوں سے بنایا گیا ہے (اور یہ حوض بھی شیشہ سے پٹا ہوا ہے، دامن اٹھانے کی ضرورت نہیں، ویسے ہی چلی آؤ، اس وقت) بلقیس (کو معلوم ہو گیا کہ یہاں پر دنیوی صنعت کاری بھی ایسی عجیب ہیں جو آج تک میں نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھیں تو ان کے دل میں ہر طرح سے سلیمان علیہ السلام کی عظمت پیدا ہوئی اور بے ساختہ) کہنے لگی کہ اے

میرے پروردگار! میں نے (اب تک) اپنے نفس پر ظلم کیا تھا (کہ شرک میں مبتلا تھی) اور میں (اب) سلیمان (علیہ السلام) کے ساتھ (یعنی ان کے طریق پر) ہوکر رب العالمین پر ایمان لائی۔

وَاَسۡلَمۡتُ مَعَ سُلَیۡمٰنَ لِلّٰهِ: ایمان کا اقرار پیچھے و کنا مسلمین میں بھی تھا، مگر اُس سے خبر دینا مقصود تھا، دل سے ایمان لانا جو کہ مطلوب ہے وہ اِس کلام سے حاصل ہوا ہے، آگے پورے قصہ میں مختلف قول ہیں مگر اس سے کوئی غرض متعلق نہیں اس لیے بیان نہیں کیا گیا، اس قصہ سے چند فائدے حاصل ہوئے، ایک تو حضور ﷺ کا بغیر لکھے پڑھے پہلوں قصوں کو صحیح بیان کر دینا جو کہ نبوت کی دلیل ہے، دوسرے انبیاء کی موافقت کی ترغیب کہ بلقیس باوجود اس شان وشوکت کے جب اس پر حق واضح ہوگیا فوراً ایمان لے آئی، تیسرے انبیاء کی مخالفت سے ڈرانا کہ اگر وہ ایمان نہ لاتی تو وہی ہوتا جو سلیمان علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ ذلیل ہوکر شہر سے نکالی جاتی، نیز اس میں اشارہ کے طور پر حضور ﷺ کی تسلی بھی ہے کہ ہم سلیمان علیہ السلام کے لشکر کی طرح آپ کے لشکر کو بھی ان کفار پر غالب کریں گے اگر یہ ایمان نہ لائے، چنانچہ بعد میں جہاد کی اجازت ہوئی اور مسلمان غالب ہوئے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی پانی میں گھسنے کے لیے پائنچے چڑھا لیے جیسے عام قاعدہ ہے کہ پانی کی گہرائی پوری طرح پر معلوم نہ ہو تو گھسنے والا شروع میں پائنچے چڑھا لیتا ہے۔

فائدہ: ۲؎ حضرت سلیمان علیہ السلام دیوان خانہ میں بیٹھے تھے، اس میں پتھروں کی جگہ شیشے کا فرش تھا، صاف شیشہ دور سے نظر آتا کہ پانی لہرا رہا ہے، اور ممکن ہے شیشہ کے نیچے واقعی پانی ہو، یعنی حوض کو شیشہ سے پاٹ دیا ہو، اس نے پانی میں گھسنے کے لیے پنڈلیاں کھولیں، سلیمان نے پکارا کہ یہ شیشے کا فرش ہے پانی نہیں، اس کو اپنی عقل کا قصور اور ان کی عقل کا کمال معلوم ہوا، سمجھی کہ دین میں بھی جو یہ سمجھتے ہیں وہ ہی صحیح ہوگا، اور یہ بھی پتہ لگ گیا کہ جس ساز وسامان پر اس کی قوم کو ناز تھا، یہاں اس سے بڑھ کر سامان موجود ہے، گویا سلیمان علیہ السلام نے اس کو متنبہ فرمادیا کہ آفتاب وستاروں کی چمک پر مفتون ہوکر انھیں خدا سمجھ لینا ایسا دھوکہ ہے جیسے آدمی شیشہ کی چمک دیکھ کر پانی گمان کرلے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی اے پروردگار! میں تیری حکم بردار ہوکر سلیمان کا راستہ اختیار کرتی ہوں، اب تک میں نے اپنی جان پر بڑا ظلم کیا کہ شرک و کفر میں مبتلا رہی، اب اس سے تائب ہوکر تیری بارگاہ ربوبیت کی طرف رجوع کرتی ہوں۔

## وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰی ثَمُوۡدَ اَخَاهُمۡ صٰلِحًا اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمۡ فَرِیۡقٰنِ یَخۡتَصِمُوۡنَ ﴿۴۵﴾

اور ہم نے بھیجا تھا ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو کہ بندگی کرو اللہ کی پھر وہ تو دو فرقے (جتھے) ہوکر لگے جھگڑنے

خلاصہ تفسیر: (تیسرا قصہ: حضرت صالح علیہ السلام اور ان کی قوم) اور ہم نے (قوم) ثمود کے پاس ان کے (برادری کے) بھائی صالح کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا (یہ پیغام دے کر) کہ تم (شرک کو چھوڑ کر) اللہ کی عبادت کرو (چاہئے تو یہ تھا کہ سب ایمان لے آتے مگر خلاف توقع) اچانک ان میں دو فریق ہو گئے جو دین کے بارے میں باہم جھگڑنے لگے (یعنی ایک فرقہ تو ایمان لایا، اور ایک فرقہ ایمان نہ لایا، ان میں جو جھگڑا اور مباحثہ ہوا کچھ اس کا بیان سورہ اعراف میں ہو چکا ہے: قَالَ الۡمَلَاُ الَّذِیۡنَ اسۡتَكۡبَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِهٖ لِلَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا، اور کچھ کا یہیں آگے ذکر ہے: قَالُوا اطَّیَّرۡنَا بِكَ الخ)۔

* * *

فائدہ: یعنی ایک ایمان والے اور ایک منکر، جیسے مکہ کے لوگ پیغمبر کے آنے سے جھگڑنے لگے، قوم ثمود کے جھگڑنے کی قدرے تفصیل سورہ اعراف کی ان آیات میں گزر چکی: قَالَ الۡمَلَاُ الَّذِیۡنَ اسۡتَكۡبَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِهٖ لِلَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا لِمَنۡ اٰمَنَ مِنۡهُمۡ (الاعراف: ۷۵)

قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۶﴾

کہا اے میری قوم کیوں جلدی مانگتے ہو برائی کو پہلے بھلائی سے، کیوں نہیں گناہ بخشواتے اللہ سے شاید تم پر رحم ہو جائے

**خلاصہ تفسیر:** جب ان لوگوں نے کفر پر اصرار کیا تو صالح علیہ السلام نے انبیاء کرام کی عادت کے موافق ان کو عذاب الٰہی سے ڈرایا جیسا کہ سورۃ اعراف میں ہے: فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ تو انہوں نے کہا کہ لاؤ وہ عذاب کہاں ہے، جیسا کہ سورۃ اعراف میں ہے: وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اس پر:

صالح (علیہ السلام) نے فرمایا کہ ارے بھائیو تم نیک کام (یعنی توبہ و ایمان) سے پہلے عذاب کیوں جلدی مانگتے ہو (یعنی چاہئے تو یہ تھا کہ عذاب کی وعید سن کر ایمان لے آتے نہ، یہ کہ ایمان تو نہ لائے اور الٹا عذاب ہی کی درخواست کرنے لگے، بڑی بے باکی کی بات ہے، عذاب جلد طلب کرنے کے بجائے) تم لوگ اللہ کے سامنے (کفر سے) معافی کیوں نہیں چاہتے جس سے توقع ہو کہ تم پر رحم کیا جائے (یعنی عذاب سے محفوظ رہو)۔

* * *

**فائدہ:** حضرت صالح علیہ السلام نے ان کو بہت سمجھایا، ہر طرح فرمائش کی اور آخر میں عذاب کی دھمکی دی، جس پر وہ کہنے لگے: يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (الاعراف: ۷۷) یعنی سچا ہے تو عذاب الٰہی ہم پر لے آ، دیر کس بات کی ہے، حضرت صالح نے فرمایا کہ کم بختو! ایمان و توبہ اور بھلائی کی راہ تو اختیار نہیں کرتے جو دنیا و آخرت میں کام آئے، الٹے برائی طلب کرنے میں جلدی مچا رہے ہو، برا وقت آ پڑے گا تو ساری طمطراق ختم ہو جائے گی، ابھی موقع ہے کہ گناہوں سے توبہ کر کے محفوظ ہو جاؤ، کیوں توبہ و استغفار نہیں کرتے جو حق تعالیٰ عذاب کی جگہ اپنی رحمتیں تم پر نازل فرمائے۔

قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ۚ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ﴿۴۷﴾

بولے ہم نے منحوس قدم دیکھا تجھ کو اور تیرے ساتھ والوں کو[۱] کہا تمہاری بری قسمت اللہ کے پاس ہے[۲] کچھ نہیں تم لوگ جانچے جاتے ہو[۳]

**خلاصہ تفسیر:** وہ لوگ کہنے لگے کہ ہم تو تم کو اور تمہارے ساتھ والوں کو منحوس سمجھتے ہیں (کہ جب سے تم نے یہ مذہب نکالا ہے اور تمہاری یہ جماعت پیدا ہوئی ہے قوم میں نا اتفاقی ہوگئی اور نا اتفاقی کے جو نقصانات اور خرابیاں ہوتی ہیں وہ سب ظاہر ہونے لگیں، بس ان تمام خرابیوں کے سبب تم لوگ ہو) صالح (علیہ السلام) نے (جواب میں) فرمایا کہ تمہاری (اس) نحوست (کا سبب) اللہ کے علم میں ہے (یعنی تمہارے اعمال کفر یہ اللہ کو معلوم ہیں، یہ خرابیاں ان ہی اعمال پر مرتب ہیں، چنانچہ ظاہر ہے کہ نا اتفاقی بری وہی ہے جو حق کے خلاف کرنے سے ہو تو اس کا الزام ایمان والوں پر نہیں ہو سکتا، بلکہ کافروں پر ہوگا اور بعض تفاسیر میں ہے کہ ان پر قحط پڑا تھا، اور تمہارے کفر کا نقصان انہی مصیبتوں پر ختم نہ ہوگا) بلکہ تم وہ لوگ ہو کہ (اس کفر کی بدولت) عذاب میں مبتلا ہو گئے۔

* * *

**فائدہ:** [۱] یعنی جب سے تیرا منحوس قدم آیا ہے اور یہ باتیں شروع کی ہیں ہم پر قحط وغیرہ کی سختیاں پڑتی جاتی ہیں اور گھر گھر میں لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے۔

**فائدہ:** [۲] یعنی یہ سختیاں یا برائیاں میری وجہ سے نہیں، تمہاری بدقسمتی سے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے تمہاری شرارتوں اور بداعمالیوں کے سبب سے مقدر کی ہیں۔

**فائدہ:** [۳] یعنی کفر کی شامت سے تم پر سختی پڑی ہے کہ دیکھیں سمجھتے ہو یا نہیں۔

وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور تھے اس شہر میں نو شخص کہ خرابی کرتے ملک میں اور اصلاح نہ کرتے

**خلاصہ تفسیر:** اور (یوں تو کافر اس قوم میں بہت تھے لیکن سرغنہ) اس بستی (یعنی حجر) میں نو شخص تھے جو سرزمین (یعنی بستی سے باہر تک بھی) فساد کیا کرتے تھے اور (ذرا) اصلاح نہ کرتے تھے (یعنی بعض مفسد ایسے ہوتے ہیں کہ کچھ فساد کیا کچھ اصلاح کر لی، مگر وہ ایسے نہ تھے بلکہ خالص مفسد تھے)۔

* * *

**فائدہ:** یہ نو شخص شاید نو جماعتوں کے سردار ہوں گے جن کا کام ملک میں فساد پھیلانے اور خرابی ڈالنے کے سوا کچھ نہ تھا، اصلاح و درستی کی طرف ان کا قدم کبھی نہ اٹھتا تھا، مکہ میں بھی کافروں کے نو سردار تھے جو ہمہ وقت اسلام کی بیخ کنی اور پیغمبر کی دشمنی میں ساعی رہتے تھے، بعض مفسرین نے ان کے نام لکھے ہیں۔

قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا

بولے کہ آپس میں قسم کھاؤ اللہ کی کہ البتہ رات کو جا پڑیں ہم اس پر اور اسکے گھر پر پھر کہہ دیں گے اسکے دعویٰ کرنے والے کو ہم نے نہیں دیکھا

مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۰﴾

جب تباہ ہوا اس کا گھر اور ہم بیشک سچ کہتے ہیں [1] اور انہوں نے بنایا ایک فریب اور ہم نے ایک فریب اور ان کو خبر نہ ہوئی [2]

**خلاصہ تفسیر:** (چنانچہ ایک بار یہ فساد کیا کہ) انہوں نے (ایک دوسرے سے) کہا کہ آپس میں سب (اس پر) اللہ کی قسم کھاؤ کہ ہم شب کے وقت صالح اور ان کے متعلقین (یعنی ایمان والوں) کو جا ماریں گے، پھر (اگر تحقیق کی نوبت آئی تو) ہم ان کے وارث سے (جو خون کا دعویٰ کرے گا) کہہ دیں گے کہ ان کے متعلقین کے (اور خود ان کے) مارے جانے میں موجود (بھی) نہ تھے (مارنا تو درکنار) اور (تاکید کے لئے یہ بھی کہہ دیں گے کہ) ہم بالکل سچے ہیں (کیونکہ مشاہدہ کا گواہ تو کوئی ہوگا نہیں، بس بات دب دبا جائے گی) اور (یہ مشورہ کر کے) انہوں نے ایک خفیہ تدبیر کی (کہ رات کے وقت اس کارروائی کے لئے چلے) اور ایک خفیہ تدبیر ہم نے کی اور ان کو خبر بھی نہ ہوئی (وہ یہ کہ ایک پہاڑ پر سے ایک پتھر ان پر لڑھک آیا اور وہ سب وہاں ہی کھیت رہے یعنی ہلاک ہوئے)۔

**ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ:** یہ وارث یا تو مسلمان ہوگا اور اس کی عزت و وجاہت کی وجہ سے اس کے قتل کی رائے نہ ہوئی ہوگی، یا اگر مؤمن نہ ہوگا تو یہ احتمال ہوا ہوگا کہ وہ خاندانی حمیت اور جوش کی وجہ سے شاید بدلہ لینا چاہے۔

* * *

**فائدہ:** [1] یعنی آپس میں معاہدے اور حلف ہوئے کہ سب مل کر رات کو حضرت صالح کے گھر پر ٹوٹ پڑو اور کسی کو زندہ نہ چھوڑو، پھر جب کوئی ان کے خون کا دعویٰ کرنے والا ہو تو کہہ دینا ہمیں خبر نہیں، ہم سچ کہتے ہیں کہ اس کے گھر کی تباہی ہماری آنکھوں نے نہیں دیکھی، گویا ہم خود تو ایسی حرکت کیا کرتے اس وقت موقع پر موجود بھی نہ تھے، اس طرح کی متفقہ سازش اور دروغ گوئی سے ہم میں ایک بھی ملزم نہ ٹھہر سکے گا جس سے ان کے حمایتی خون بہا وصول کریں۔

**فائدہ:** [2] ان کا مکر تو وہ جھوٹی سازش تھی اور خدا کا مکر تھا انکو ڈھیل دینا کہ خوب دل کھول کر اپنی شرارتوں کی تکمیل کر لیں تا کہ مستحق عذاب عظیم

ہونے میں کوئی حجت وعذر باقی نہ رہے، وہ سمجھ رہے تھے کہ ہم حضرت صالح کا قصہ ختم کر رہے ہیں، یہ خبر نہ تھی کہ اندر اندر ان ہی کی جڑ کٹ رہی ہے اور ان ہی کا قصہ ختم ہو رہا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''ان کی ہلاکت کے اسباب پورے ہونے تھے، شرارت جب تک حد کو نہ پہنچے ہلاکت نہیں آتی''۔

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۱﴾

پھر دیکھ لے کیسا ہوا انجام ان کے فریب کا کہ ہلاک کر ڈالا (اکھاڑ مارا) ہم نے ان کو اور ان کی قوم کو سب کو

**خلاصہ تفسیر**: سو دیکھئے ان کی شرارت کا کیا انجام ہوا کہ ہم نے ان کو (بطریق مذکور) اور (پھر) ان کی (باقی) قوم کو (آسمانی عذاب سے) سب کو غارت کر دیا (جس کا قصہ قرآن کریم کی دوسری آیات میں آیا ہے)۔

* * *

**فائدہ**: ان نو اشخاص نے اول اتفاق کر کے اونٹنی کو ہلاک کیا، حضرت صالح نے فرمایا کہ اب تین دن سے زیادہ مہلت نہیں عذاب آکر رہے گا، تب آپس میں ٹھہرایا کہ ہم تو خیر تین دن کے بعد ہلاک کیے جائیں گے ان کا تین دن سے پہلے ہی کام تمام کر دو، چنانچہ شب کے وقت حضرت صالح کے گھر پر چھاپہ مارنے اور ان کو مع اہل وعیال کے قتل کرنے کا ارادہ کیا، یہ نو آدمی اس ناپاک مقصد کے لیے تیار ہو کر نکلے باقی کفار ان کے تابع یا معین تھے، حق تعالیٰ نے حضرت صالح کی حفاظت فرمائی، فرشتوں کا پہرہ لگا دیا، آخر وہ تو عذاب سماوی سے تباہ ہوئے اور اپنے ساتھ قوم کو بھی تباہ کرایا۔

فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۵۲﴾

سو یہ پڑے ہیں ان کے گھر ڈھئے ہوئے سبب ان کے انکار کے ۱؎ البتہ اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو جانتے ہیں ۲؎

وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور بچا دیا ہم نے ان کو جو یقین لائے تھے اور بچتے رہے تھے ۳؎

**خلاصہ تفسیر**: سو یہ ان کے گھر ہیں جو ویران پڑے ہیں ان کے کفر کے سبب سے (جو اہل مکہ کو ملک شام کے سفر میں آتے جاتے ملتے ہیں) بلاشبہ اس (واقعہ) میں بڑی عبرت ہے دانشمندوں کے لئے، اور ہم نے ایمان اور تقوی والوں کو (اس قتل سے بھی جس کا مشورہ کفار نے کیا تھا اور آسمانی عذاب سے بھی جو کہ قہر الٰہی تھا) نجات دی۔

* * *

**فائدہ**: ۱؎ مکہ والے شام کا سفر کرتے تو راستہ پر ''وادی القریٰ'' میں ثمود کی بستیوں کے کھنڈر دیکھتے تھے، فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا میں ان ہی کی طرف اشارہ ہے۔

**فائدہ**: ۲؎ یعنی جاننے والوں کو چاہیئے کہ ان واقعات ہائلہ سے عبرت حاصل کریں۔

**فائدہ**: ۳؎ یعنی حضرت صالح کے رفقاء جو ایمان لائے اور کفر وعصیان سے بچتے تھے، ہم نے ان کو عذاب کی لپیٹ سے بچا دیا، خدا کی قدرت ہے تو چن چن کر کافروں کو ہلاک کرتا ہے مومن کو نہیں چھوتا۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۴﴾

اور لوط کو جب کہا اس نے اپنی قوم کو کیا تم کرتے ہو بے حیائی اور تم دیکھتے ہو ۱؎

أَئِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّن دُونِ النِّسَاءِ ۚ بَلْ أَنتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ ﴿٥٥﴾

کیا تم دوڑتے ہو مردوں پر للچا کر عورتوں کو چھوڑ کر کوئی نہیں تم لوگ بے سمجھ ہو ۲

**خلاصہ تفسیر:** (چوتھا قصہ: حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی قوم) اور ہم نے لوط (علیہ السلام) کو (پیغمبر بنا کر ان کی قوم کے پاس) بھیجا تھا جبکہ انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا کیا تم یہ بے حیائی کا کام کرتے ہو؟! حالانکہ سمجھدار ہو (کیا اس کی برائی نہیں سمجھتے؟! آگے اس بے حیائی کا بیان ہے یعنی) کیا تم مردوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے ہو عورتوں کو چھوڑ کر (اس کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی) بلکہ (اس معاملے میں) تم (محض) جہالت کر رہے ہو۔

**وَأَنتُمْ تُبْصِرُونَ - بَلْ أَنتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ:** لوط علیہ السلام نے پہلے انہیں سمجھدار بھی کہا اور پھر جاہل بھی، سو اس میں کوئی تعارض نہیں، وہ علم کے اعتبار سے سمجھدار تھے اور عمل کے اعتبار سے جاہل تھے، نیز سمجھداری دیگر کاموں میں تھی اور جہالت خاص اس معاملے میں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی دیکھتے ہو کیسا برا اور گندہ کام ہے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی تم سمجھتے نہیں کہ اس بے حیائی کا انجام کیا ہونے والا ہے، پرلے درجہ کے جاہل اور احمق ہو۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَن قَالُوا أَخْرِجُوا آلَ لُوطٍ مِّن قَرْيَتِكُمْ ۖ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ ﴿٥٦﴾

پھر اور کچھ جواب نہ تھا اس کی قوم کا مگر یہی کہ کہتے تھے نکال دو لوط کے گھر کو اپنے شہر سے یہ لوگ ہیں ستھرے رہا (بنا) چاہتے ۱

فَأَنجَيْنَاهُ وَأَهْلَهُ إِلَّا امْرَأَتَهُ قَدَّرْنَاهَا مِنَ الْغَابِرِينَ ﴿٥٧﴾

پھر بچا دیا ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو ۲ مگر اس کی عورت، مقرر کر دیا تھا ہم نے اس کو رہ جانے والوں میں ۳

**خلاصہ تفسیر:** (اس تقریر کا) ان کی قوم سے کوئی (معقول) جواب نہ بن پڑا بجز اس کے کہ آپس میں کہنے لگے کہ لوط (علیہ السلام) کے لوگوں کو (یعنی ان پر ایمان لانے والوں کو مع لوط کے) تم اپنی بستی سے نکال دو (کیونکہ) یہ لوگ بڑے پاک صاف بنتے ہیں، سو (جب یہاں تک نوبت پہنچ گئی تو) ہم نے (اس قوم پر عذاب نازل کیا اور) لوط (علیہ السلام) کو اور ان کے متعلقین کو (اس عذاب سے) بچا لیا بجز ان کی بیوی کے کہ اس کو (ایمان نہ لانے کی وجہ سے) ہم نے انہیں لوگوں میں تجویز کر رکھا تھا جو عذاب میں رہ گئے تھے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی اپنے کو بڑا پاک وصاف بنانا چاہتے ہیں، پھر ہم ناپاکوں میں ان کا کیا کام۔

**فائدہ:** ۲ یعنی انھیں تباہ کر کے انھیں بچا لیا۔

**فائدہ:** ۳ یعنی حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی جوان بدمعاشوں کی اعانت کرتی تھی وہ بھی ہلاک ہونے والوں کے ساتھ ڈھیر ہو گئی۔

وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِم مَّطَرًا ۖ فَسَاءَ مَطَرُ الْمُنذَرِينَ ﴿٥٨﴾ ع

اور برسا دیا ہم نے ان پر برساؤ پھر کیا برا برساؤ تھا ان ڈرائے ہوؤں کا

**خلاصہ تفسیر:** اور (وہ عذاب جو ان پر نازل ہوا یہ تھا کہ) ہم نے ان پر ایک نئی طرح کا مینہ برسایا (کہ وہ پتھروں کی بارش تھی)

سوان لوگوں کا کیسا برا مینہ تھا جو (اول عذاب خدا سے) ڈرائے گئے تھے (جس پر انہوں نے التفات نہ کیا)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی آسمان سے پتھر برسائے اور شہر کا تختہ الٹ دیا، حضرت شاہ صاحبؒ مذکورہ بالا تین قصوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت سلیمان کے قصہ میں فرمایا: ''ہم لائیں گے لشکر جس کا سامنا نہ کر سکیں گے، وہ ہی بات ہوئی رسول میں اور مکہ والوں میں، اور حضرت صالح پر نو شخص متفق ہوئے کہ رات کو جا پڑیں، اللہ نے ان کو بچایا اور ان کو غارت کیا، مکہ کے لوگ بھی یہ ہی چاہ چکے، لیکن نہ بن پڑا، جس رات حضرت ﷺ نے ہجرت کی، کتنے کافر حضرت ﷺ کا گھر گھیرے بیٹھے تھے کہ صبح کو اندھیرے میں نکلیں تو سب مل کر مار لیں (کسی ایک کو خون بہانہ دینا پڑے) حضرت ﷺ صاف بچ کر نکل گئے، ان کو نہ سوجھا، اور قوم لوط نے چاہا کہ پیغمبر کو شہر سے نکال دیں، یہ ہی مکہ والے بھی چاہ چکے، اللہ نے آپ سے نکلنا بتایا کہ خود اپنے اختیار سے شہر چھوڑ کر نکل جاؤ، اور اسی میں کام نکالا''۔

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ؕ آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿59﴾

تو کہہ تعریف ہے اللہ کو اور سلام ہے اس کے بندوں پر جن کو اس نے پسند کیا [1] بھلا اللہ بہتر ہے یا جن کو وہ شریک کرتے ہیں [2]

**خلاصہ تفسیر:** سورت کے شروع سے یہاں تک رسالت کی بحث تھی، آگے توحید کی بحث ہے جس کو ایک بلیغ اور مختصر خطبہ سے شروع فرمایا ہے۔

آپ (بیان توحید کے لئے خطبہ کے طور پر) کہئے کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے سزاوار ہیں اور اس کے ان بندوں پر سلام (نازل) ہو جن کو اس نے منتخب فرمایا ہے (یعنی انبیاء وصلحاء، آگے مضمون ہماری طرف سے بیان کیجئے وہ یہ کہ لوگو یہ بتلاؤ کہ) کیا (کمالات اور احسانات میں) اللہ بہتر ہے یا وہ چیزیں (بہتر ہیں) جن کو (الوہیت میں) شریک ٹھہراتے ہیں (یعنی ظاہر اور مسلم ہے کہ اللہ ہی بہتر ہے پس مستحق عبادت بھی وہی ہوگا)۔

ان باتوں میں تو خدا کا بہتر ہونا علاوہ عقل سے ثابت ہونے کے خود کفار کو بھی مسلم تھا اور اس سے خدا کا تنہا مستحق عبادت ہونا عقلاً لازم آتا ہے، یہ تو اجمالی بیان تھا جو ظاہر و بدیہی ہونے کی وجہ سے بطور اجمال بھی کافی ہے۔

**قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ:** گذشتہ آیت میں کفار پر عذاب کے نزول کا ذکر تھا، روح المعانی میں ہے کہ بعض کے نزدیک اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو حکم ہوا ہے کہ کفار کی ہلاکت کے موقع پر حق تعالیٰ کا شکر اور اس کی حمد فرمائیں، اس سے معلوم ہوا کہ دشمنان دین اسلام کی ہلاکت پر باری تعالیٰ کی تعریف وشکر کرنا جبکہ کسی دنیاوی وجہ سے نہ تو یہ اخلاق فاضلہ کے خلاف نہیں۔

* * *

**فائدہ:** [1] قصص سے فارغ ہو کر آگے آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ سے توحید کا بیان فرمانا ہے، یہ الفاظ بطور خطبہ کے تعلیم فرمائے جو بیان شروع کرنے سے قبل ہونا چاہیے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''اللہ کی تعریف اور پیغمبر پر سلام بھیج کر اگلی بات شروع کرنی لوگوں کو سکھلادی''، (موضح) اور بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے جو کمالات و احسانات اوپر بضمن قصص مذکور ہوئے ہیں ان پر پیغمبر کو حکم ہوا کہ اللہ کی حمد وثنا کریں اور شکر بجالائیں اور اس کے مقبول بندوں پر جن میں سے بعضوں کا اوپر نام لیا گیا ہے، سلام بھیجیں۔

**فائدہ:** [2] یہاں سے توحید کا وعظ شروع کیا گیا ہے یعنی قصص مذکورہ بالا سن کر اور دلائل تکوینیہ وتنزیلیہ میں غور کر کے تم ہی بتلاؤ کہ ایک خدائے وحدہ لاشریک لہ کا ماننا بہتر اور نافع اور معقول ہے یا اس کی خدائی میں اس کی عاجز ترین مخلوق کو شریک ٹھہرانا، یہ مسئلہ اب کچھ ایسا مشکل تو نہیں رہا جس کا فیصلہ کرنے میں کچھ وقت ہو یا دیر لگے، تاہم مزید تذکیر وتنبیہ کی غرض سے آگے اللہ تعالیٰ کی بعض شؤون وصفات بیان کی جاتی ہیں جو توحید پر دال ہیں۔

ربع اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ

بھلا کس نے بنائے آسمان اور زمین اور اتار دیا تمہارے لیے آسمان سے پانی پھر اگائے ہم نے اس سے باغ

ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ﴿٦٠﴾

رونق والے، تمہارا کام نہ تھا کہ اگاتے ان کے درخت ۱؎ اب کوئی اور حاکم ہے اللہ کے ساتھ، کوئی نہیں وہ لوگ راہ سے مڑتے ہیں ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** پچھلی آیت کے آخر میں فرمایا تھا: آللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ، یعنی کیا اللہ بہتر ہے یا وہ بت وغیرہ جن کو یہ لوگ اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں، یہ مشرکین کی بے وقوفی بلکہ کج فہمی پر نکیر تھی، آگے توحید کے دلائل کا بیان ہے، یعنی پیچھے اجمالی بیان تھا جو ظاہر اور بدیہی ہونے کی وجہ سے اجمال کے باوجود بھی کافی ہے مگر زیادہ اہتمام وتنبیہ کے لیے آگے تفصیل ہے کہ:

(اے لوگو! یہ بتلاؤ کہ یہ بت بہتر ہیں:) یا وہ ذات (بہتر ہے) جس نے آسمان اور زمین کو بنایا، اور اس نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعہ ہم نے رونق دار باغ اگائے (ورنہ) تم سے تو ممکن نہ تھا کہ تم ان (باغوں) کے درختوں کو اگا سکو (یہ سن کر اب بتلاؤ کہ) کیا اللہ کے ساتھ (شریک عبادت ہونے کے لائق) کوئی اور معبود ہے (مگر مشرکین پھر بھی نہیں مانتے) بلکہ یہ ایسے لوگ ہیں کہ (دوسروں کو) خدا کے برابر ٹھہراتے ہیں۔

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ: اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ حق تک پہنچنے کے لیے مخلوقات میں نظر کرنا مطلوب ہے یہ توحید کے خلاف نہیں، البتہ مخلوق کو ہی مقصود بنالینا یہ توحید کے خلاف ہے، اسی طرح آگے آیت: قل سیروا فی الارض بھی اسی پر دلالت کرتی ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ سرے سے درختوں کا اگانا تمہارے اختیار میں نہیں، چہ جائیکہ اس کا پھل پھول لانا اور بار آور کرنا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی تمام دنیا جانتی ہے اور خود یہ مشرکین بھی مانتے ہیں کہ زمین وآسمان کا پیدا کرنا، بارش برسانا، درخت اگانا بجز اللہ تعالیٰ کے کسی کا کام نہیں، چنانچہ دوسری جگہ قرآن میں ان کا اقرار واعتراف مذکور ہے پھر یہاں پہنچ کر راستہ سے کیوں کترا جاتے ہیں، جب اللہ کے سوا کوئی ہستی نہیں جو خلق وتدبیر کر سکے یا کسی چیز کا مستقل اختیار رکھے تو اس کی الوہیت ومعبودیت میں وہ کس طرح شریک ہو جائے گی، عبادت انتہائی تذلل کا نام ہے سو وہ اس کی ہونی چاہیے جو انتہائی درجہ میں کامل اور بااختیار ہو، کسی ناقص یا عاجز مخلوق کو معبودیت میں خالق کے برابر کر دینا انتہائی ظلم اور ہٹ دھرمی ہے۔

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ

بھلا کس نے بنایا زمین کو ٹھہرنے کے لائق ۱؎ اور بنائیں اسکے بیچ میں ندیاں اور رکھے اسکے ٹھہرانے کو بوجھ ۲؎ اور رکھا (رکھی) دو دریا میں

حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٦١﴾

پردہ (آڑ) ۳؎ اب کوئی اور حاکم ہے اللہ کے ساتھ، کوئی نہیں بہتوں کو ان میں سمجھ نہیں ۴؎

**خلاصہ تفسیر:** (اچھا پھر اور کمالات سن کر بتلاؤ کہ یہ بت بہتر ہیں) یا وہ ذات جس نے زمین کو (مخلوق کی) قرار گاہ بنایا اور اس کے درمیان درمیان نہریں بنائیں اور اس (زمین) کے (ٹھہرانے کے) لئے پہاڑ بنائے اور دو دریاؤں کے درمیان حد فاصل بنائی (جیسا سورۃ فرقان میں مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ کی تفسیر میں اس کا بیان آچکا ہے، یہ سن کر اب بتلاؤ کہ) کیا اللہ کے ساتھ (خدائی کا شریک ہونے کے لائق) کوئی اور معبود ہے (مگر مشرکین نہیں مانتے) بلکہ ان میں زیادہ تو (اچھی طرح) سمجھتے بھی نہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی آدمی اور جانوروں کی قیام گاہ ہے۔ آرام سے اس پر زندگی بسر کرتے اور اس کے محاصل سے منتفع ہوتے ہیں۔

**فائدہ:** ۲ یعنی پہاڑ رکھ دیے تاکہ ٹھہری رہے کپکپائے نہیں۔

**فائدہ:** ۳ اس کی تحقیق قریب ہی سورہ فرقان میں گزر چکی، آیت: وَهُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَجَعَلَ بَیْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا (الفرقان: ۵۳) کا فائدہ ملاحظہ کر لیا جائے۔

**فائدہ:** ۴ یعنی کوئی اور با اختیار ہستی ہے جس سے یہ کام بن پڑیں اور اس بناء پر وہ معبود بننے کے لائق ہو، جب نہیں تو معلوم ہوا کہ یہ مشرکین محض جہالت اور ناسمجھی سے شرک و مخلوق پرستی کے غار عمیق میں گرتے چلے جا رہے ہیں۔

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَیَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ

بھلا کون پہنچتا ہے بے کس (بے بس) کی پکار (فریاد) کو جب اسکو پکارتا ہے اور دور کر دیتا ہے سختی ۱ اور کرتا ہے تم کو نائب اگلوں کا زمین پر ۲

ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾

اب کوئی حاکم ہے اللہ کے ساتھ، تم بہت کم دھیان کرتے ہو ۳

**خلاصہ تفسیر:** (اچھا پھر اور کمالات سن کر بتلاؤ کہ یہ بت بہتر ہیں) یا وہ ذات جو بے قرار آدمی کی دعا سنتا ہے جب وہ اس کو پکارتا ہے اور (اس کی) مصیبت کو دور کر دیتا ہے اور تم کو زمین میں صاحب تصرف بناتا ہے (یہ سن کر اب بتلاؤ کہ) کیا اللہ کے ساتھ (شریک عبادت ہونے کے لائق) کوئی اور معبود ہے (مگر) تم لوگ بہت ہی کم یاد رکھتے ہو۔

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ: یہاں دائمی حکم نہیں کہ ہمیشہ دعا کے بعد مصیبت زائل ہو جاتی ہے، سو کوئی اشکال نہیں، اور چونکہ غیر اللہ سے تو دعا یا پکار کا قبول کرنا یا مصیبت کا دور کرنا مطلق طور پر ناممکن ہی ہے لہٰذا استدلال بھی صحیح اور مکمل ہے۔

اگر کسی مضطر یا مظلوم یا مسافر وغیرہ کو کبھی یہ محسوس ہو کہ اس کی دعا قبول نہیں ہوئی تو بدگمان اور مایوس نہ ہو بعض اوقات دعا قبول تو ہو جاتی ہے مگر کسی حکمت و مصلحت ربانی سے اس کا ظہور دیر میں ہوتا ہے، یا پھر وہ اپنے نفس کو ٹٹولے کہ اس کے اخلاص اور توجہ الی اللہ میں کمی کوتاہی رہی ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی جب اللہ چاہے اور مناسب جانے تو بے کس اور بیقرار کی فریاد سن کر سختی کو دور کر دیتا ہے، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: فَیَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَیْهِ اِنْ شَآءَ (الانعام: ۴۱) گویا اسی نے دعا کو بھی اسباب عادیہ میں سے ایک سبب بنایا ہے، جس پر مسبب کا ترتب بمشیت الٰہی استجماع شروط اور ارتفاع موانع کے بعد ہوتا ہے اور علامہ طیبی وغیرہ نے کہا کہ آیت میں مشرکین کو تنبیہ ہے کہ سخت مصائب و شدائد کے وقت تو تم بھی مضطر ہو کر اسی کو پکارتے ہو اور دوسرے معبودوں کو بھول جاتے ہو، پھر فطرت اور ضمیر کی اس شہادت کو امن و اطمینان کے وقت کیوں یاد نہیں رکھتے۔

**فائدہ:** ۲ یعنی ایک قوم یا نسل کو اٹھا لیتا اور اس کی جگہ دوسری کو آباد کرتا ہے جو زمین میں مالکانہ اور بادشاہانہ تصرف کرتے ہیں۔

**فائدہ:** ۳ یعنی پوری طرح دھیان کرتے تو دور جانے کی ضرورت نہ پڑتی انہی اپنی حوائج و ضروریات اور قوموں کے ادل بدل کو دیکھ کر سمجھ سکتے تھے جس کے ہاتھ میں ان امور کی باگ ہے تنہا اسی کی عبادت کرنی چاہیے۔

اَمَّنْ یَّهْدِیْكُمْ فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ یُّرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًاۢ بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ؕ

بھلا کون راہ بتاتا ہے تم کو اندھیروں میں جنگل کے اور دریا کے ۱ اور کون چلاتا ہے ہوائیں خوشخبری لانے والیاں اس کی رحمت سے پہلے ۲

ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ﴿۶۳﴾

اب کوئی حاکم ہے اللہ کے ساتھ، اللہ بہت اوپر ہے اس سے جس کو شریک بتلاتے ہیں ۳۔

**خلاصہ تفسیر:** (اچھا پھر اور کمالات سن کر بتلاؤ کہ یہ بت بہتر ہیں) یا وہ ذات جو تم کو خشکی اور دریا کی تاریکیوں میں رستہ سوجھاتا ہے اور جو ہواؤں کو بارش سے پہلے بھیجتا ہے جو (بارش کی امید دلا کر دلوں کو) خوش کر دیتی ہیں (یہ سن کر اب بتلاؤ) کیا اللہ کے ساتھ (شریک عبادت ہونے کے لائق) کوئی اور معبود ہے (ہرگز نہیں) بلکہ اللہ تعالیٰ ان کے شرک سے برتر ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱۔ یعنی خشکی اور دریا کی اندھیریوں میں ستاروں کے ذریعہ سے تمہاری راہنمائی کرتا ہے، خواہ بلا واسطہ یا بالواسطہ قطب نما وغیرہ آلات کے۔

**فائدہ:** ۲۔ یعنی باران رحمت سے پہلے ہوائیں چلاتا ہے جو بارش کی آمد آمد کی خوشخبری سناتی ہیں۔

**فائدہ:** ۳۔ یعنی کہاں وہ قادر مطلق اور حکیم برحق اور کہاں عاجز و ناقص مخلوق، جسے اس کی خدائی کا شریک بتلایا جا رہا ہے۔

اَمَّنۡ یَّبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ وَمَنۡ یَّرۡزُقُکُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ ؕ ءَاِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ ؕ

بھلا کون سرے سے بناتا ہے پھر اس کو دہرائے گا ۱۔ اور کون روزی دیتا ہے تم کو آسمان سے اور زمین سے ۲۔ اب کوئی حاکم ہے اللہ کے ساتھ

قُلۡ ہَاتُوۡا بُرۡہَانَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۶۴﴾

تو کہہ لاؤ اپنی سند اگر تم سچے ہو ۳۔

**خلاصہ تفسیر:** (اچھا پھر دوسرے کمالات و احسانات سن کر بتلاؤ کہ یہ بت بہتر ہیں) یا وہ ذات جو مخلوقات کو اول بار پیدا کرتا ہے (جو کہ مسلم ہے) پھر اس کو دوبارہ پیدا کر دے گا (اس پر قطعی دلیل قائم ہے) اور جو آسمان اور زمین سے (پانی برسا کر اور نباتات نکال کر) تم کو رزق دیتا ہے (یہ سن کر اب بتلاؤ کہ) کیا اللہ کے ساتھ (شریک عبادت ہونے کے لائق) کوئی اور معبود ہے (اور اگر وہ یہ سن کر بھی کہیں کہ ہاں اور معبود بھی عبادت کے مستحق ہیں تو) آپ کہئے کہ (اچھا) تم (ان کے مستحق عبادت ہونے پر) اپنی دلیل پیش کرو اگر تم (اس دعویٰ میں) سچے ہو۔

* * *

**فائدہ:** ۱۔ ابتداء پیدا کرنا تو سب کو مسلم ہے کہ اللہ کا کام ہے، موت کے بعد دوبارہ پیدا کرنے کو بھی اس سے سمجھ لو، منکرین ''بعث بعد الموت'' بھی اتنا سمجھتے تھے کہ اگر بالفرض دوبارہ پیدا کیے گئے تو یہ کام اسی کا ہوگا جس نے اول پیدا کیا تھا۔

**فائدہ:** ۲۔ کون ہے جو آسمانی اور زمینی اسباب کے ذریعہ سے اپنی حکمت کے موافق تم کو روزی پہنچاتا ہے۔

**فائدہ:** ۳۔ یعنی اگر اتنے صاف نشانات اور واضح دلائل سننے کے بعد بھی تم خدا تعالیٰ کی وحدانیت اور شرک کی قباحت کو تسلیم نہیں کرتے تو جو کوئی دلیل تم اپنے دعوے باطل کے ثبوت میں رکھتے ہو پیش کرو، ابھی تمہارا جھوٹ سچ کھل جائے گا، مگر وہاں دلیل و برہان کہاں محض اندھی تقلید ہے:

وَمَنۡ یَّدۡعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرۡہَانَ لَہٗ بِہٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُہٗ عِنۡدَ رَبِّہٖ (المومنون:۱۱۷)

قُلۡ لَّا يَعۡلَمُ مَنۡ فِي السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ الۡغَيۡبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَمَا يَشۡعُرُوۡنَ اَيَّانَ يُبۡعَثُوۡنَ ﴿۶۵﴾

تو کہہ خبر نہیں رکھتا جو کوئی ہے آسمان اور زمین میں چھپی ہوئی چیز کی مگر اللہ ۱؎ اور ان کو خبر نہیں کب جی اٹھیں گے (جلائے جائیں گے) ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اوپر نبوت کے بعد توحید کا ذکر ہو چکا، آگے معاد یعنی قیامت اور آخرت کا ذکر ہے جس کی طرف اجمالی اشارہ پیچھے دلائل توحید میں اس قول میں ہو چکا ہے: ثُمَّ يُعِيۡدُهٗ کہ وہ پھر پیدا کرے گا، چونکہ کفار قیامت کی تکذیب کی ایک وجہ یہ بھی قرار دیتے تھے کہ ہم کو قیامت کا معین وقت پوچھنے پر بھی نہیں بتلایا جاتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کوئی چیز ہے ہی نہیں، یعنی وہ وقت معلوم نہ ہونے کو قیامت کے نہ آنے کی دلیل سمجھتے تھے، اس لئے اس مضمون کو علم غیب کے بیان سے شروع کیا ہے کہ علم غیب اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے، جس میں ان کے شبہ کا جواب بھی ہو گیا۔

(یہ لوگ جو قیامت کا وقت نہ بتلانے سے اس کے واقع نہ ہونے پر استدلال کرتے ہیں اس کے جواب میں) آپ کہہ دیجئے کہ (یہ استدلال غلط ہے کیونکہ اس سے زیادہ سے زیادہ اتنا لازم آیا کہ مجھے اور تمہیں اس کا خاص وقت معلوم نہیں، سو اس میں اسی کی کیا خصوصیت ہے، علم غیب کے بارے میں تو قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ) جتنی مخلوقات آسمانوں اور زمین (یعنی عالم) میں موجود ہیں (ان میں سے) کوئی بھی غیب کی بات نہیں جانتا، بجز اللہ تعالیٰ کے، اور (اسی وجہ سے) ان (مخلوقات) کو یہ خبر (بھی) نہیں کہ وہ کب دوبارہ زندہ کئے جائیں گے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کو تو بغیر بتلائے سب معلوم ہے اور کسی کو بغیر بتلائے کچھ بھی معلوم نہیں، مگر دیکھا جاتا ہے کہ بہت سے امور جن کا پہلے سے علم نہیں ہوتا واقع ہوتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کا علم نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ چیز موجود ہی نہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی حکمت سے بعض علوم کا پردہ غیب میں رکھنا منظور ہے، قیامت کی تعیین بھی انہی امور میں سے ہے، اسی لئے مخلوق کو اس کا علم نہیں دیا گیا، مگر اس سے قیامت کا واقع نہ ہونا کیسے لازم آ گیا۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ اس آیت میں مضمون سابق کی تکمیل اور مضمون لاحق کی تمہید ہے، شروع پارہ سے یہاں تک حق تعالیٰ کی قدرت تامہ اور ربوبیت کاملہ کا بیان تھا، یعنی جب وہ ان صفات وشؤن میں متفرد ہے تو الوہیت ومعبودیت میں بھی متفرد ہونا چاہیے، آیت حاضرہ میں اس کی الوہیت پر دوسری حیثیت سے استدلال کیا جا رہا ہے، یعنی معبود وہ ہوگا جو قدرت تامہ کے ساتھ علم کامل ومحیط بھی رکھتا ہو، اور یہ وہ صفت ہے جو زمین وآسمان میں کسی مخلوق کو حاصل نہیں، اسی رب العزت کے ساتھ مخصوص ہے، پس اس اعتبار سے بھی معبود بننے کی مستحق اکیلی اس کی ذات ہوئی۔

**تنبیہ:** کل مغیبات کا علم بجز خدا کے کسی کو حاصل نہیں، نہ کسی ایک غیب کا علم کسی شخص کو بالذات بدون عطائے الٰہی کے ہو سکتا ہے اور نہ مفاتیح غیب (غیب کی کنجیاں جن کا ذکر سورہ انعام میں گزر چکا) اللہ نے کسی مخلوق کو دی ہیں، ہاں بعض بندوں کو بعض عیوب پر باختیار خود مطلع کر دیتا ہے جس کی وجہ سے کہہ سکتے ہیں کہ فلاں شخص کو حق تعالیٰ نے غیب پر مطلع فرما دیا، یا غیب کی خبر دے دی، لیکن اتنی بات کی وجہ سے قرآن وسنت نے کسی جگہ ایسے شخص پر "عالم الغیب"، "فلان یعلم الغیب" کا اطلاق نہیں کیا، بلکہ احادیث میں اس پر انکار کیا گیا ہے، کیونکہ بظاہر یہ الفاظ اختصاص علم الغیب بذات الباری کے خلاف موہم ہوتے ہیں، اسی لیے علمائے محققین اجازت نہیں دیتے کہ اس طرح کے الفاظ کسی بندہ پر اطلاق کیے جائیں، گو لغۃً صحیح ہوں جیسے کسی کا یہ کہنا کہ: "اِنَّ اللّٰهَ لَا يَعۡلَمُ الۡغَيۡبَ" (اللہ کو غیب کا علم نہیں) گو اس کی مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے اعتبار سے کوئی چیز غیب ہی نہیں، سخت ناروا اور سوء ادب ہے، یا کسی کا حق سے موت اور فتنہ سے اولاد اور رحمت سے بارش مراد لے کر یہ الفاظ کہنا: "انی اکرہُ الحَق وَاُحِبُّ الۡفِتۡنَةَ وَافِرُّ مِنَ الرَّحۡمَةِ" (میں حق کو برا سمجھتا ہوں اور فتنہ کو محبوب رکھتا ہوں اور رحمت سے بھاگتا ہوں) سخت مکروہ اور قبیح ہے، حالانکہ باعتبار نیت ومراد کے قبیح نہ تھا، اسی طرح فلان عالم الغیب وغیرہ الفاظ کو سمجھ لو اور واضح رہے کہ علم غیب سے ہماری مراد محض ظنون وتخمینات نہیں اور نہ وہ علم جو قرائن ودلائل سے حاصل کیا جائے، بلکہ جس کے لیے کوئی دلیل وقرینہ موجود نہ ہو وہ مراد ہے، سورہ انعام واعراف میں اس کے متعلق کسی قدر لکھا جا چکا ہے، وہاں مراجعت کر لی جائے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی قیامت کب آئے گی جس کے بعد مردے دوبارہ زندہ کیے جائیں گے، اس کی خبر کسی کو نہیں، پہلے سے مبداء کا ذکر چلا آتا

تھا، یہاں سے معاد کا شروع ہوا۔

بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۣ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۣ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ﴿٦٦﴾

بلکہ تھک کر گر گیا ان کا فکر آخرت کے بارہ میں بلکہ ان کو شبہ ہے اس میں بلکہ وہ اس سے اندھے ہیں

**خلاصہ تفسیر:** اب ان کے شک و انکار پر تشنیع کی جاتی ہے، یعنی یہ بات تو سب میں مشترک ہے کسی کو قیامت کی تعیین کا علم نہیں، لیکن ان کفار منکرین میں صرف یہی نہیں کہ وہ تعیین قیامت کو نہیں مانتے:

بلکہ (اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ) آخرت کے بارے میں (خود) ان کا (نفس) علم (بالوقوع ہی) نیست ہوگیا (یعنی خود اس کے واقع ہونے کا بھی علم نہیں رکھتے، یہ علم نہ ہونے سے بھی بدتر ہے، کیونکہ علم نہ ہونے کی تو ایک یہ بھی صورت ہوسکتی ہے کہ ذہن خالی ہو، ادھر توجہ نہ ہوئی ہو، اور شک میں توجہ کے باوجود اس کو جھٹلاتا ہے) بلکہ (اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ) یہ لوگ اس (کے وقوع) سے شک میں ہیں، بلکہ (اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ) یہ اس سے اندھے بنے ہوئے ہیں۔

بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ: یعنی جیسے اندھے کو راستہ نظر نہیں آتا اس لئے مقصود تک پہنچنا دشوار ہے، اسی طرح آخرت کی تصدیق کا جو طریقہ ہے کہ صحیح دلائل میں غور کیا جائے، یہ لوگ انتہائی عناد کی وجہ سے ان دلائل میں غور تامل ہی نہیں کرتے، اس لئے وہ دلائل ان کو نظر نہیں آتے جس سے مقصود تک پہنچ جانے کی امید ہوتی، پس یہ شک سے بھی بڑھ کر ہے، کیونکہ شک والا بعض اوقات دلائل میں غور کر کے شک دور کر لیتا ہے اور یہ غور بھی نہیں کرتے، پس وقت کی تعیین نہ ہونے سے بالکل نہ معلوم ہونا بڑھ کر ہوا، اور اس سے بڑھ کر شک اور اس سے بڑھ کر اندھا پن ہوا، پس یہ انتقالات ترقی کے واسطے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ سب باتیں ان میں موجود ہیں، وقت کی تعیین بھی ان کو معلوم نہیں، اس کا واقع ہونا بھی معلوم نہیں، اور شک بھی اور اندھا پن بھی ہے، کیونکہ ترقی میں پہلے مضمون کی نفی نہیں ہوتی، بلکہ سب کا ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے، اس لیے تعارض کا شبہ نہیں ہوسکتا۔

* * *

**فائدہ:** یعنی عقل دوڑا کر تھک گئے، آخرت کی حقیقت نہ پائی، کبھی شک کرتے ہیں کبھی منکر ہوتے ہیں (موضح) اور بعض مفسرین نے یوں تقریر کی ہے کہ آخرت کے ادراک تک ان کے علم کی رسائی نہ ہوئی اور عدم علم کی وجہ سے صرف خالی الذہن رہے بلکہ اس کے متعلق شک و تردد میں پڑ گئے، اور نہ صرف شک و تردد بلکہ ان دلائل و شواہد سے بالکل آنکھیں بند کرلیں جن میں غور و تامل کرتے تو شک رفع ہوسکتا تھا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَاۗؤُنَآ اَىِٕنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ﴿٦٧﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ

اور بولے وہ لوگ جو منکر ہیں کیا جب ہم ہو جائیں مٹی اور ہمارے باپ دادے، کیا ہم کو زمین سے نکالیں گے، وعدہ پہنچ چکا ہے اس کا ہم کو

وَاٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٦٨﴾

اور ہمارے باپ دادوں کو پہلے سے، کچھ بھی نہیں یہ نقلیں ہیں اگلوں کی ۱۔

**خلاصہ تفسیر:** کفار پر تشنیع کے بعد اب ان کا ایک انکاری قول نقل کیا جاتا ہے۔

اور یہ کافر یوں کہتے ہیں کہ کیا ہم لوگ جب (مرکر) خاک ہوگئے اور (اسی طرح) ہمارے بڑے بھی تو کیا (پھر) ہم (زندہ کر کے قبروں سے) نکالے جائیں گے اس کا تو ہم سے اور ہمارے بڑوں سے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے) پہلے سے وعدہ ہوتا چلا آیا ہے (کیونکہ تمام انبیاء کا یہ قول ہمیشہ سے مشہور ہے، لیکن نہ آج تک ہوا، اور نہ کسی نے بتلایا کہ کب ہوگا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ) یہ بے سند باتیں ہیں جو اگلوں سے نقل ہوتی چلی آئی ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی پہلے ہمارے بڑوں سے یہ ہی وعدے کیے گئے تھے، جو پہلے کہہ گئے ان ہی کی نقل آج یہ پیغمبر بھی اتار رہے ہیں، لیکن

کتنے قرن گزر چکے ہم نے تو آج تک نہ دیکھا نہ سنا کہ کوئی مردہ مٹی میں مل جانے کے بعد دوبارہ زندہ ہوا ہو اور اس کو سزا ملی ہو۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝

تو کہہ دے پھرو ملک میں تو دیکھو کیسا ہوا انجام کار گناہ گاروں کا

**خلاصہ تفسیر:** اب ان کے انکار قیامت پر تنبیہ اور انہیں ڈرایا جاتا ہے۔

آپ کہہ دیجئے کہ (جب قیامت کے ممکن ہونے پر عقلی دلائل اور واقع ہونے پر نقلی دلائل جا بجا بار بار تم کو بتلا دیے گئے تو تم کو جھٹلانے سے باز آنا چاہئے، ورنہ جو حال اور جھٹلانے والوں کا ہوا کہ عذاب میں گرفتار ہوئے وہی تمہارا حال ہوگا، اگر ان کی حالت میں کچھ شبہ ہو تو) تم زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ مجرمین کا انجام کیا ہوا (کیونکہ ان کے ہلاک ہونے اور عذاب آنے کے آثار اب تک باقی تھے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی کتنے مجرموں کو دنیا ہی میں عبرتناک سزائیں مل چکی ہیں اور پیغمبروں کا فرمانا پورا ہو کر رہا، اسی پر قیاس کر لو کہ بعث بعد الموت اور عذاب اخروی کی جو خبر انبیاء دیتے چلے آئے ہیں یقیناً پوری ہو کر رہے گی یہ کارخانہ یوں ہی بے سر نہیں کہ اس پر کوئی حاکم نہ ہو، وہ اپنی رعایا کو یوں ہی مہمل نہ چھوڑے گا جب سب مجرموں کو یہاں پوری سزا نہیں ملتی تو یقیناً کوئی دوسری زندگی ہوگی جہاں ہر ایک اپنی کیف کردار کو پہنچے اگر تمہاری یہ ہی تکذیب رہی تو مکذبین کا جو انجام دنیا میں ہوا تمہارا ابھی ہو سکتا ہے۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ۝

اور غم نہ کر ان پر اور نہ خفا ہو ان کے فریب بنانے سے

**خلاصہ تفسیر:** اب اس انکار پر آپ ﷺ کو تسلی دی جاتی ہے۔

اور (اگر ان مؤثر نصائح کے بعد پھر بھی وہ مخالفت پر کمربستہ رہیں تو) آپ ان پر غم نہ کیجئے اور جو کچھ یہ شرارتیں کر رہے ہیں اس سے دل تنگ نہ ہو جائے (کیونکہ اور انبیاء کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا ہے)۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ: اس پر دلالت کرتا ہے کہ مخلوق کی طرف توجہ اگر چہ ارشاد و اصلاح کے ارادہ سے ہی ہو لیکن اس میں اعتدال ہونا چاہیے (یعنی جو وعظ و ارشاد کے فریضہ میں مشغول ہو اور اس کی بنا پر لوگوں سے میل جول رکھنا پڑے تو اس میں بھی میانہ روی اور اعتدال سے کام لینا چاہیے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی ان کو سمجھا کر اور بدی کے انجام پر متنبہ کر کے الگ ہو جائیے اگر یہ لوگ نہیں مانتے تو آپ بہت زیادہ غم و تاسف نہ کریں اور نہ ان کے مکر و فریب اور حق کے خلاف تدبیریں کرنے سے تنگدل اور خفا ہوں آپ اپنا فرض ادا کر چکے، اللہ تعالیٰ ایسے ضدی مجرموں سے خود نبٹ لے گا اور جس طرح پہلے مجرموں کو سزائیں دی گئی ہیں ان کو بھی دے گا۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ

اور کہتے ہیں کب ہوگا یہ وعدہ اگر تم سچے ہو ا تو کہہ کیا بعید ہے جو تمہاری پیٹھ پر پہنچ چکی ہے بعضی

الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝

وہ چیز جس کی جلدی کر رہے ہو ۲ اور تیرا رب تو فضل رکھتا ہے لوگوں پر ان میں بہت لوگ شکر نہیں کرتے ۳

**خلاصه تفسیر:** اب عذاب پر تنبیہ سے متعلق ان کا ایک شبہ اور اس کا جواب ہے۔

اور (قُلْ سِيْرُوْا الخ میں اور اسی طرح دوسری آیات میں جو ان کو عذاب کی وعید سنائی جاتی ہے تو چونکہ دل میں تصدیق نہیں اس لئے) یہ لوگ (بے باکانہ) یوں کہتے ہیں کہ یہ وعدہ (عذاب وقہر کا) کب ہوگا اگر تم سچے ہو (تو بتلاؤ) آپ کہہ دیجئے کہ عجب نہیں کہ جس عذاب کی تم جلدی مچا رہے ہو اس میں سے کچھ تمہارے پاس ہی آلگا ہو، اور (اب تک جو دیر ہو رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ) آپ کا رب لوگوں پر (اپنا) بڑا فضل رکھتا ہے (اس رحمت عامہ کی وجہ سے قدرے مہلت دے رکھی ہے) ولیکن اکثر آدمی (اس بات پر) شکر نہیں کرتے (کہ تاخیر کو غنیمت سمجھیں اور اس مہلت میں حق کو طلب کریں اور اس کو قبول کرلیں کہ عذاب سے ابدی نجات حاصل ہو، بلکہ اس کے برعکس انکار اور تمسخر کے طور پر عذاب کا جلدی آنا چاہتے ہیں)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی آخر وہ قیامت کب آئے گی؟ اور جس عذاب کی دھمکیاں دی جارہی ہیں کب نازل ہوگا؟

**فائدہ:** ۲؎ یعنی گھبراؤ نہیں، وعدہ پورا ہو کر رہے گا، اور کچھ بعید نہیں کہ وعدہ کا کچھ حصہ قریب ہی آلگا ہو (چنانچہ زیادہ دن نہ گزرے کہ "بدر" میں سزا کی ایک قسط پہنچ گئی) رہی قیامت کبریٰ، سو اس کے بھی بعض آثار وعلامات ظاہر ہونے شروع ہو گئے۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی حق تعالیٰ اپنے فضل سے اگر عذاب میں تاخیر کرتا ہے تو چاہیے تھا اس مہلت کو غنیمت سمجھتے اور اس کی مہربانی کے شکر گزار ہو کر ایمان وعمل صالح کا راستہ اختیار کرتے لیکن وہ اس کے خلاف ناشکری کرتے اور اپنے منہ سے عذاب مانگتے ہیں۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿٧٤﴾

اور تیرا رب جانتا ہے جو چھپ رہا ہے ان کے سینوں میں اور جو کچھ کہ ظاہر کرتے ہیں

وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿٧٥﴾

اور کوئی چیز نہیں جو غائب ہو آسمان اور زمین میں مگر موجود ہے کھلی کتاب میں ۱؎

**خلاصہ تفسیر:** اب پھر عذاب پر تنبیہ کی تاکید کی جاتی ہے۔

اور (یہ تاخیر چونکہ مصلحت کی وجہ سے ہے، اس لئے یہ نہ سمجھیں کہ ان افعال کی کبھی سزا ہی نہ ہوگی کیونکہ) آپ کے رب کو سب خبر ہے جو کچھ ان کے دلوں میں مخفی ہے اور جس کو وہ علانیہ کرتے ہیں، اور (یہ صرف علم خداوندی میں ہی نہیں بلکہ دفتر خداوندی میں لکھا ہوا ہے جس میں کچھ ان ہی کے افعال کی تخصیص نہیں، بلکہ) آسمان اور زمین میں ایسی کوئی مخفی چیز نہیں جو لوح محفوظ میں نہ ہو (اور دفتر خداوندی لوح محفوظ ہے)۔

جب مخفی چیزیں جن کو کوئی نہیں جانتا اس میں موجود ہیں تو ظاہر چیزیں تو بدرجہ اولی موجود ہیں، غرض ان کے اعمال بد کی اللہ تعالیٰ کو خبر ہے اور آسمانی دفتر میں بھی محفوظ ہیں، اور وہ اعمال خود سزا کے قابل بھی ہیں اور سزا کے واقع ہونے پر سب انبیاء علیہم السلام کی دی ہوئی صحیح خبریں بھی متفق ہیں، پھر یہ سمجھنے کی کیا گنجائش ہے کہ سزا نہ ہوگی، البتہ دیر ہونا ممکن ہے، چنانچہ بعض سزائیں ان منکرین کو دنیا میں بھی ہوئیں جیسے قحط، قتل وقید وغیرہ اور کچھ قبر وبرزخ میں ہوں گی جو کچھ دور نہیں، اور کچھ آخرت میں ہوں گی۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی تمہارے ظاہری و پوشیدہ اعمال، دلوں کے بھید نیتیں، ارادے اور زمین وآسمان کے چھپے سے چھپے راز سب اللہ تعالیٰ کے علم میں حاضر اور اس کے دفتر میں درج ہیں، ہر بات اسی کے موافق اپنے اپنے وقت پر وقوع پذیر ہوگی، جلدی مچانے یا دیر لگانے سے کچھ حاصل نہیں، جو چیز علم الٰہی میں طے شدہ ہے جلد یا بدیر اپنے وقت پر آئے گی اور ہر ایک کو اس کے عمل اور نیت وعزم کے موافق پھل مل کر رہے گا۔

إِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۷۶﴾

یہ قرآن سناتا ہے بنی اسرائیل کو بہت چیزیں جس میں وہ جھگڑ رہے ہیں

وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۷﴾

اور بیشک وہ ہدایت ہے اور رحمت ہے ایمان والوں کے واسطے [1]

**خلاصہ تفسیر:** چونکہ قیامت کا امکان عقل سے اور واقع ہونا نقل سے ثابت ہے، اور پیچھے اس کے واقع ہونے کی خبر دی گئی ہے تو یہ ثابت کرنا بھی ضروری ہے کہ قرآن کریم جس میں یہ خبر مذکور ہے سچا ہے، اس لیے اب قرآن کا سچا ہونا ایک خاص طریقہ سے بیان کرتے ہیں، ساتھ ہی اس کی برکتوں کا بھی بیان ہے۔

بیشک یہ قرآن بنی اسرائیل پر اکثر ان باتوں (کی حقیقت) کو ظاہر کرتا ہے جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں، اور (اس کی ظاہری برکت تو موافق ومخالف سب کے لیے عام ہے، لیکن اس کی باطنی برکتیں دیکھنی ہوں تو ایمان لاکر کوئی دیکھے کہ) یقیناً وہ ایمانداروں کے لئے (خاص) ہدایت اور (خاص) رحمت ہے (قرآن کا ہدایت ہونا اعمال وطاعات کے اعتبار سے ہے، اور قرآن کا رحمت ہونا ثمرات ونتائج کے اعتبار سے ہے)۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى: یعنی یہ قرآن بنی اسرائیل پر اکثر ان باتوں کی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں، اور پھر قرآن ظاہر بھی ایسے طور پر کرتا ہے کہ علماء بنی اسرائیل کو بھی کلام نہیں رہتا جو کہ ان میں کسی قدر منصف ہیں، اور علماء کے اختلاف کا فیصلہ کرنے والا ان سے زیادہ عالم ہونا چاہیے، اور زیادہ عالم ہونے کے دو طریقے ہیں: ① یا تو حق تعالی سے علوم حاصل کرے ② یا مخلوق سے، اور رسول اللہ ﷺ میں دوسری صورت ہرگز نہیں تھی، چنانچہ یہ دوسرا احتمال کسی مخالف نے بھی نہیں نکالا تھا، پس لامحالہ پہلی صورت متعین ہوگئی، پس آپ کا صاحب وحی ہونا اور قرآن کا وحی ہونا ثابت ہوگیا، اور وحی کا سچا ہونا ضروری ہے، پس قرآن کا سچا ہونا ثابت ہوگیا جو کہ قیامت کی خبر دے رہا ہے اور یہی مقصود تھا، اور اگرچہ اس آیت سے رسالت کا اثبات بھی صاف ہے لیکن طرز کلام سے قرآن کا صدق اور اس کی صحت ثابت کرنا مقصود ہے، اور بنی اسرائیل کے اختلافات کے فیصلہ کی مثالیں اس مقام پر تفسیر حقانی میں متعدد نقل کی ہیں وہاں ملاحظہ کرلی جائیں، اور جتنے اختلافات کا فیصلہ قرآن میں مذکور ہے اگر بنی اسرائیل میں ان کے علاوہ اختلافات تھے تب تو آیت میں لفظ اکثر اپنے ظاہری معنی پر ہے، ورنہ اکثر کے معنی یہ ہوں گے کہ بہت سے اختلافات کا فیصلہ کردیا ہے، اگرچہ ان کے علاوہ اور بھی بہت ہوں۔

* * *

**فائدہ:** [1] یعنی ابھی عملی فیصلہ کا وقت نہیں آیا، البتہ قرآن قولی وعملی فیصلہ کے لیے آیا ہے، اس وقت سماوی علوم اور مذہبی چیزوں کے سب سے بڑے عالم "بنی اسرائیل" سمجھے جاتے تھے مگر عقائد، احکام اور قصص وروایات کے متعلق ان کے شدید اختلافات کا فیصلہ کن تصفیہ بھی قرآن نے سنایا، فی الحقیقت قرآن ہی وہ کتاب ہے جس نے دنیا کو خداوند قدوس کا آخری پیغام پہنچایا، اور ایمان لانے والوں کی رہبری کی تاکہ لوگ اس دن کے لیے تیاری کر رکھیں، جبکہ ہر معاملہ کا عملی فیصلہ ہوگا۔

اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴿۷۸﴾

تیرا رب ان میں فیصلہ کرے گا اپنی حکومت سے اور وہی ہے زبردست سب کچھ جاننے والا

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے قرآن کا صحیح ہونا مذکور تھا جو کہ قیامت کی دلیل اور اسے ثابت کرنے والا ہے، جس کا مقتضا یہ تھا کہ کفار انکار سے باز آجاتے اور پھر بھی ان کے باز نہ آنے سے حضور ﷺ کو رنج ہوتا تھا، اس لیے اب آپ ﷺ کو تسلی دی جاتی ہے۔

( آپ ﷺ ان لوگوں کی حالت پر نہ افسوس کیجیے، کیونکہ ان کا کام سمجھنے سمجھانے کی حد سے آگے نکل چکا ہے، اب یہ عقلی اور شرعی فیصلہ کو نہ مانیں گے، بلکہ عملی فیصلہ کی ضرورت ہے جو خدا کا کام ہے اور ) بالیقین آپ کا رب ان کے درمیان اپنے حکم سے ( وہ عملی ) فیصلہ ( قیامت کے دن ) کرے گا ( اس وقت معلوم ہو جائے گا کہ دین حق کیا تھا اور غلط راستہ کیا تھا، تو ایسے لوگوں پر کیا افسوس کیا جائے ) اور ( اسی طرح مخالفت کی فکر بھی نہ کیجیے، کیونکہ ) وہ زبردست علم والا ہے ( اس کی مشیت کے بغیر کوئی کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا اور اس سے کسی کی تدبیر چھپی ہوئی نہیں، وہ سب کو جانتا ہے اور اپنی قدرت سے سب کو دفع کر سکتا ہے )۔

* * *

**فائدہ:** یعنی قرآن تو آیا ہے سمجھانے اور آگاہ کرنے کو، باقی تمام معاملات کا حکیمانہ اور حاکمانہ فیصلہ خدائے قادر و توانا کرے گا۔

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ۞79

سو تو بھروسہ کر اللہ پر بیشک تو ہے صحیح کھلے راستہ پر

**خلاصہ تفسیر:** سو ( جب وہ ایسا ہے تو ) آپ اللہ پر توکل رکھئے ( اللہ کی مدد ضرور ہوگی، کیونکہ ) آپ صریح حق پر ہیں ( اور اہل حق اہل باطل کے مقابلہ میں غالب ہوا کرتے ہیں، پس خوف اور فکر کچھ نہ کیجیے )۔

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ: توکل کرنے کی وجہ اور علت جو اگلے جملہ میں بیان کی گئی ہے یہ تعلیل اس کی دلیل ہے کہ حق پر ہونے کی خاصیت دل کی قوت اور مضبوطی ہے اور اس کا مشاہدہ ہوتا ہے ( یعنی جو انسان حق مسلک پر ہوتا ہے اس کا دل و دماغ بالکل مطمئن ہوتا ہے، کسی قسم کا شبہ باقی نہیں رہتا، اس بنا پر اللہ تعالیٰ پر توکل و بھروسہ روز بروز بڑھتا چلا جاتا ہے، اس کے برعکس جو انسان حق مسلک پر نہیں ہوتا اس کے دل میں روز بروز وساوس و شبہات بڑھتے چلے جاتے ہیں )۔

* * *

**فائدہ:** یعنی آپ ﷺ کسی کے اختلاف و تکذیب سے متاثر نہ ہوں، خدا پر بھروسہ کر کے اپنا کام کیے جائیں، جس صحیح و صاف راستہ پر ہو اور خدائے واحد پر بھروسہ رکھے پھر کیا غم ہے۔

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ۞80 وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِي الْعُمْيِ

البتہ تو نہیں سنا سکتا مردوں کو اور نہیں سنا سکتا بہروں کو اپنی پکار جب لوٹیں وہ پیٹھ پھیر کر، اور نہ تو دکھلا سکے اندھوں کو

عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ۭ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۞81

جب وہ راہ سے بچلیں [1] تو تو سناتا ہے اس کو جو یقین رکھتا ہو ہماری باتوں پر، سو وہ حکم بردار ہیں [2]

**خلاصہ تفسیر:** چونکہ بہ نسبت خوف اور فکر کے آپ ﷺ کو غم زیادہ ہوتا تھا اس لیے اس کے متعلق دوبارہ دوسرے عنوان سے تسلی فرماتے ہیں کہ:

آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ بہروں کو اپنی آواز سنا سکتے ہیں ( خصوصاً ) جبکہ وہ پیٹھ پھیر کر چل دیں، اور نہ آپ اندھوں کو ان کی گمراہی سے ( بچا کر ) رستہ دکھانے والے ہیں، آپ تو صرف ان ہی کو سنا سکتے ہیں جو ہماری آیتوں کا یقین رکھتے ہیں ( اور ) پھر وہ مانتے ( بھی ) ہیں ( مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ تو مردوں، بہروں اور اندھوں کے مشابہ ہیں، پھر ان سے ہدایت پانے اور سمجھنے کی توقع بیکار ہے، اور جب توقع نہ ہوگی تو غم بھی نہ ہوگا )۔

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى: اس آیت سے بعض علماء نے استدلال کیا ہے کہ مردے نہیں سنا کرتے اور اگرچہ یہاں مردوں سے کفار مراد

ہیں، لیکن تشبیہ جبھی درست ہوگی جبکہ مردے نہ سنتے ہیں، لیکن چونکہ بعض احادیث سے مردوں کا قریب جگہ سے سننا (نہ کہ دور سے) معلوم ہوتا ہے اس لیے بعض علماء نے کہا ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ مردوں کو سننے سنانے سے نفع نہیں ہوتا، چنانچہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی مردوں کو نصیحت کرے تو بے کار ہے، کیونکہ وہ جگہ عمل کی نہیں، اور ثواب سے ان کو نفع ہونا یا تلاوت قرآن سے انس ہونا یہ دوسری بات ہے، اس آیت سے اس کی نفی نہیں ہوتی، اور قرینہ اس کا یہ ہے کہ کفار کا بالکل نہ سننا تو مشاہدہ کے خلاف ہے، پس یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ وہ بالکل نہیں سنتے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ کفار کو حق بات سننے سے نفع نہیں ہوسکتا، پس یہی مردوں کے نہ سننے سے بھی مراد ہے کہ ان کو سننے سنانے سے نفع نہیں ہوتا، یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مردے بالکل نہیں سنتے، اس کے علاوہ حدیث اور قرآن کے تعارض کا دور کرنا بھی ضروری ہے اور تعارض اسی تقریر سے دور ہوتا ہے، بعض نے یہ جواب دیا ہے کہ حقیقی مردہ تو بدن ہے وہ نہیں سن سکتا، مگر اس سے روح کا بھی نہ سننا لازم نہیں آتا۔

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى: اس پر دلالت کرتا ہے کہ ہدایت شیخ یا کسی بھی انسان کے قبضہ میں نہیں ہے جیسا کہ بعض جاہلوں کا زعم ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جس طرح ایک مردہ کو خطاب کرنا یا کسی بہرے کو پکارنا خصوصاً جبکہ وہ پیٹھ پھیرے چلا جارہا ہو اور پکارنے والے کی طرف قطعاً ملتفت نہ ہو ان کے حق میں سودمند نہیں یہ ہی حال ان مکذبین کا ہے جن کے قلوب مرچکے ہیں اور دل کے کان بہرے ہو گئے ہیں اور سننے کا ارادہ بھی نہیں رکھتے کہ ان کے حق میں کوئی نصیحت نافع اور کارگر نہیں، ایک نپٹ اندھے کو جب تک آنکھ نہ بنوائے تم کس طرح راستہ یا کوئی چیز دکھلا سکتے ہو، یہ لوگ بھی دل کے اندھے ہیں اور چاہتے بھی نہیں کہ اندھے پن سے نکلیں، پھر تمہارے دکھلانے سے وہ دیکھیں تو کیسے دیکھیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی نصیحت سنانا انکے حق میں نافع ہے جو سن کر اثر قبول کریں اور اثر قبول کرنا یہ ہی ہے کہ خدا کی باتوں پر یقین کر کے فرمانبردار بنیں۔

وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ

اور جب پڑ چکے گی ان پر بات نکالیں گے ہم ان کے آگے ایک جانور زمین سے ان سے باتیں کرے گا

اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿٨٢﴾ ع ۲

اس واسطے کہ لوگ ہماری نشانیوں کا یقین نہیں کرتے تھے

خلاصہ تفسیر: پیچھے قیامت کا ذکر تھا، اب پھر اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور قیامت کی بعض علامتیں بیان کرتے ہیں، پھر حشر کا واقع ہونا، پھر ایک دلیل قیامت کے ممکن ہونے کی، پھر عین قیامت کے بعض واقعات اور پھر جزا و سزا کا طریقہ بتلایا ہے۔

اور جب وعدہ (قیامت کا) ان (لوگوں) پر پورا ہونے کو ہوگا (یعنی قیامت کا زمانہ قریب آپہنچے گا) تو ہم ان کے لئے زمین سے ایک (عجیب) جانور نکالیں گے کہ وہ ان سے باتیں کرے گا کہ (کافر) لوگ ہماری (یعنی اللہ تعالیٰ کی) آیتوں پر (خصوصاً ان آیتوں پر جو قیامت کے متعلق ہیں) یقین نہیں لاتے تھے (مگر اب قیامت آپہنچی، چنانچہ اس کی علامتوں میں ایک علامت میرا ظاہر ہونا بھی ہے)۔

دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ: اس سے مقصود کفار پر حجت قائم کرنا اور ان کو دھمکانا ہے اور چونکہ یہ معجزہ بہت بڑا ہوگا اس لیے مجبوراً اس کی تصدیق کریں گے تو اس میں کفار پر زیادہ طعن ہوا کہ انبیاء کو تو جھٹلاتے رہے، اب جانور کی کیوں تصدیق کی؟! چونکہ یہ جانور مغرب سے سورج طلوع ہونے سے ذرا پہلے یا ذرا بعد ہوگا جیسا کہ خازن میں مسلم سے نقل کیا، اس لیے اس وقت کا اقرار مقبول نہ ہوگا، اور دیگر تفاسیر میں اس کے متعلق کثرت سے روایات نقل کی ہیں، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ عجیب الخلقت جانور ہے جو قیامت کے قریب مکہ کی زمین سے نکلے گا اور انسان کی طرح باتیں کرے گا، اور یہاں من الارض سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی جانور کے پیٹ سے پیدا نہ ہوگا، بلکہ زمین سے خود بخود پیدا ہوگا۔

* * *

**فائدہ:** حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: "قیامت سے پہلے صفا پہاڑ مکہ کا پھٹے گا اس میں سے ایک جانور نکلے گا جو لوگوں سے باتیں کرے گا کہ اب قیامت نزدیک ہے اور سچے ایمان والوں کو اور چھپے منکروں کو نشان دے کر جدا کر دے گا"، (موضح) بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بالکل آخر زمانہ میں طلوع الشمس من المغرب کے دن ہوگا، قیامت تو نام ہی اس کا ہے کہ عالم کا سب موجودہ نظام درہم برہم کر دیا جائے لہٰذا اس قسم کے خوارق پر کچھ تعجب نہیں کرنا چاہیے جو قیامت کی علامات قریبہ اور اس کے پیش خیمہ کے طور پر ظاہر کی جائیں گی، شاید دابۃ الارض کے ذریعہ سے یہ دکھلانا ہو کہ جس چیز کو تم پیغمبروں کے کہنے سے نہ مانتے تھے، آج وہ ایک جانور کی زبانی ماننی پڑ رہی ہے، مگر اس وقت کا ماننا نافع نہیں، صرف مکذبین کی تجہیل وتحمیق مقصود ہے، ماننے کا جو وقت تھا گزر گیا۔

**تنبیہ:** دابۃ الارض کے متعلق بہت سے رطب و یابس اقوال وروایات تفاسیر میں درج کی گئی ہیں، مگر معتبر روایات سے تقریباً اتنا ہی ثابت ہے جو حضرت شاہ صاحبؒ نے لکھا، واللہ اعلم۔

---

**وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۸۳﴾**

اور جس دن گھیر بلائیں گے ہم ہر ایک فرقہ میں سے ایک جماعت جو جھٹلاتے تھے ہماری باتوں کو پھر ان کی جماعت بندی ہوگی

**خلاصہ تفسیر:** پھر قیامت آ ہی جائے گی جس کے واقعات آگے بیان فرماتے ہیں کہ اس دن کو یاد دلایئے:

اور جس دن (قبروں سے زندہ کرنے کے بعد) ہم ہر امت میں سے (یعنی پہلی امتوں میں سے بھی اور اس امت میں سے بھی) ایک ایک گروہ ان لوگوں کا (حساب کیلئے) جمع کریں گے جو میری آیتوں کو جھٹلایا کرتے تھے، پھر (ان کو حساب کے لئے میدان حشر کی طرف روانہ کیا جائے گا اور چونکہ آدمی کثرت سے ہوں گے اس لئے) ان کو (چلتے ہوئے پچھلوں کے آملنے کے واسطے) روکا جائے گا (تاکہ آگے پیچھے نہ رہیں، سب ساتھ ہو کر موقف حساب کی طرف چلیں، جب آدمیوں کی کثرت ہوتی ہے تو ایسا کیا جاتا ہے خواہ روک ٹوک ہو یا نہ ہو، پس مقصود اس سے ان کی کثرت کا بیان کرنا ہے)۔

* * *

**فائدہ:** ہر گناہ والوں کے جتھے اور جماعتیں الگ الگ ہوں گی۔

**تنبیہ:** عموماً مفسرین نے فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ کے معنی روکنے کے لیے ہیں، یعنی ہر امت کے مکذبین کو محشر کی طرف لے چلیں گے اور وہ اتنی کثرت سے ہوں گے کہ پیچھے چلنے والوں کو آگے بڑھنے سے روکا جائے گا، جیسے انبوہ کثیر میں انتظام قائم رکھنے کے لیے کیا جاتا ہے۔

**حَتّٰٓى إِذَا جَآءُوْ قَالَ أَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا أَمَّاذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾**

یہاں تک کہ جب حاضر ہو جائیں فرمائے گا کیوں جھٹلایا تم نے میری باتوں کو اور نہ آ چکی تھی تمہاری سمجھ میں یا بولو کہ کیا کرتے تھے

**خلاصہ تفسیر:** یہاں تک کہ جب (چلتے چلتے موقف میں) حاضر ہو جائیں گے تو (حساب شروع ہوگا اور) اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کہ کیا تم نے میری آیتوں کو جھٹلایا تھا حالانکہ تم ان کو اپنے احاطہ علمی میں بھی نہیں لاتے (جس کے بعد غور کرنے کا موقع ملتا اور غور کر کے اس پر کچھ رائے قائم کرتے، مطلب یہ کہ سنتے ہی غور وفکر کے بغیر ان کو جھٹلا دیا، اور صرف جھٹلانے پر ہی اکتفا نہ کیا) بلکہ (یاد تو کرو اس کے علاوہ) اور بھی کیا کیا کام کرتے رہے (مثلاً انبیاء اور اہل ایمان کو تکلیف دی جو انکار سے بھی بڑھ کر ہے، اسی طرح اور کفریہ عقائد اور فسق وفجور میں مبتلا رہے)۔

أَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا: اس سے معلوم ہوا کہ جس بات کی حقیقت معلوم نہ ہو اس کا انکار کرنا برا ہے، جیسا کہ بعض کوتاہ نظر لوگ عارفین کا کلام بغیر غور وفکر اور بغیر سمجھے رد اور انکار کر دیتے ہیں (سمجھ نہ آئے تو خاموشی اختیار کرنی چاہیے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی پوری طرح سمجھنے اور تمام اطراف و جوانب پر نظر ڈالنے کی کوشش بھی نہ کی، پہلے ہی جھٹلانا شروع کر دیا، یا بولو! یہ نہیں تو اور کیا

کرتے تھے، یعنی اسکے سوا تمہارا کام ہی کیا تھا، اور ممکن ہے یہ مطلب ہو کہ بے سوچے سمجھے تکذیب ہی کی تھی؟ یا بولو! اسکے سوا اور بھی کچھ گناہ سمیٹے تھے۔

وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۸۵﴾

اور پڑ چکی ان پر بات اس واسطے کہ انہوں نے شرارت کی تھی اب (سو) وہ کچھ نہیں بول سکتے

**خلاصہ تفسیر:** اور (اب وہ وقت ہے کہ) ان پر (جرم ثابت ہوجانے کی وجہ سے) وعدہ (عذاب کا) پورا ہوگیا (یعنی سزا کا مستحق ہونا ثابت ہوگیا) بوجہ اس کے کہ (دنیا میں) انہوں نے (بڑی بڑی) زیادتیاں کی تھیں (جن کا آج ظہور ثابت ہوگیا) سو (چونکہ ثبوت قوی ہے اس لئے) وہ لوگ (عذر وغیرہ کے متعلق) بات بھی نہ کرسکیں گے (اور بعض آیتوں میں جو ان کا عذر پیش کرنا مذکور ہے وہ ابتداء میں ہوگا، پھر حجت قائم ہونے کے بعد کوئی بات نہ کہہ سکیں گے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی ان کی شرارتوں کا یقینی ثبوت ہو چکا اور خدا کی حجت تمام ہوچکی، اب آگے وہ کیا بول سکتے ہیں، باقی بعض آیات میں جو ان کا عذر پیش کرنا مذکور ہے وہ شاید اس سے پہلے ہو چکے گا، بہرحال نفی واثبات کو اختلاف مواطن پر حمل کیا جائے۔

اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۸۶﴾

کیا نہیں دیکھتے کہ ہم نے بنائی رات کہ اسمیں چین حاصل کریں اور دن بنایا دیکھنے کا (کو) البتہ اسمیں نشانیاں ہیں ان لوگوں کیلئے جو یقین کرتے ہیں

**خلاصہ تفسیر:** یہ لوگ جو امکان قیامت کے منکر ہیں تو یہ ان کی محض حماقت ہے، کیونکہ سچے نقلی دلائل کے علاوہ اس پر دلیل عقلی بھی تو قائم ہے مثلاً:

کیا انہوں نے اس پر نظر نہیں کی کہ ہم نے رات بنائی تا کہ لوگ اس میں آرام کریں (اور یہ آرام موت کے مشابہ ہے) اور دن بنایا جس میں دیکھیں بھالیں (جو کہ موقوف ہے جاگنے پر اور نیند سے جاگنا موت کے بعد زندہ ہونے کے مشابہ ہے، پس) بلاشبہ اس (روزانہ سونے اور جاگنے) میں (دوبارہ زندہ ہونے کے امکان پر اور ان آیات کے حق ہونے پر جو اس پر دال ہیں) بڑی دلیلیں ہیں (اور یہ چونکہ عقلی دلیل ہے، اس لیے ہر شخص کے لیے عام ہے، مگر اس سے فائدہ اور نفع حاصل کرنا) ان (ہی) لوگوں کے لئے (ہے) جو ایمان رکھتے ہیں (کیونکہ وہ غور وفکر کرتے ہیں، اور دوسرے غور نہیں کرتے اور کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے نظر وفکر ضروری ہے اس لئے دوسرے اس سے فائدہ نہیں حاصل کرتے)۔

لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا: کیونکہ موت کی حقیقت یہ ہے کہ روح کا تعلق جسم سے زائل ہوجائے اور دوبارہ زندہ ہونے کی حقیقت یہ ہے کہ وہ تعلق پھر لوٹ آئے، اور نیند میں بھی وہ تعلق کسی درجہ میں زائل ہوجاتا ہے، اور بیداری میں پھر وہ تعلق جو کمزور ہو کر فی الجملہ زائل ہوگیا تھا لوٹ آتا ہے، پس نیند اور موت میں اور بیداری اور دوبارہ زندہ ہونے میں پوری مشابہت ہے، اور یہ تعلق خدا ہی نے پیدا کیا ہے، تو وہ پھر دوبارہ بھی پیدا کرسکتا ہے، اس کا محال ہونا کسی دلیل سے ثابت نہیں، پس اول تو دوسری حیات کا ممکن ہونا خود بدیہی ہے، پھر اس کی ایک نظیر رات دن تمہارے ساتھ ہے، اس سے اس کا بدیہی ہونا اور زیادہ پختہ ہوگیا، پھر دوبارہ زندہ ہونے کے متعلق خدا کی قدرت سے کیا انکار ہوسکتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی کیسے کھلے کھلے نشان اللہ تعالیٰ نے دنیا میں دکھلائے، پر ذرا بھی غور نہ کیا، ایک رات دن کے روزانہ ادل بدل ہی میں غور کرلیتے تو اللہ کی توحید پیغمبروں کی ضرورت اور بعث بعد الموت، سب کچھ سمجھ سکتے تھے، آخر وہ کون ہستی ہے جو ایسے مضبوط ومحکم انتظام کے ساتھ برابر دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن کو نمودار کرتا ہے اور جس نے ہماری ظاہری بصارت کے لیے شب کی تاریکی کے بعد دن کا اجالا کیا، کیا وہ ہماری باطنی بصیرت کے لیے اوہام واہواء کی تاریکیوں میں معرفت وہدایت کی روشنی نہ بھیجتا، پھر رات کیا ہے؟ نیند کا وقت ہے جسے ہم موت کا ایک نمونہ قرار دے سکتے

ہیں، اس کے بعد دن آیا پھر آنکھیں کھول کر ادھر ادھر پھرنے لگے، اسی طرح اگر حق تعالیٰ ہم پر موت طاری کرے اور موت کے بعد دوبارہ زندہ کر کے اٹھا لے تو اس میں کیا استحالہ ہے، غرض یقین کرنے والوں کے لیے اسی ایک نشان میں تمام ضروری چیزوں کا حل موجود ہے۔

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ

اور جس دن پھونکی جائے گی صور ۱ تو گھبرا جائے جو کوئی ہے آسمان میں اور جو کوئی ہے زمین میں مگر جس کو اللہ چاہے ۲

وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ﴿٨٧﴾

اور سب چلے آئیں اس کے آگے عاجزی سے ۳

**خلاصہ تفسیر:** ایک واقعہ ہولناک اس مذکورہ حشر سے پہلے ہوگا جس کا آگے ذکر ہے اس کی ہیئت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے:

اور جس دن صور میں پھونک ماری جائے گی (یہ پہلی دفعہ صور پھونکنے کا بیان ہے، اور پیچھے آیت: وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ میں اٹھائے جانے کا ذکر دوسری دفعہ صور پھونکنے کے بعد تھا) سو جتنے آسمان اور زمین میں (فرشتے اور آدمی وغیرہ) ہیں سب گھبرا جائیں گے (اور پھر مر جائیں گے اور جو مر چکے ہیں ان کی روحیں بے ہوش ہو جائیں گی) مگر جس کو خدا چاہے (تو وہ اس گھبراہٹ اور موت سے محفوظ رہے گا، مراد ان سے حدیث مرفوع کے موافق جبرئیل، میکائیل، اسرافیل، ملک الموت اور عرش کو اٹھانے والے فرشتے ہیں، پھر بعد میں بغیر صور کے اثر کے ان سب کی بھی وفات ہو جائے گی) اور (دنیا میں جیسے عادت ہے کہ جس سے گھبراہٹ اور ڈر ہوتا ہے اس سے بھاگ جاتے ہیں وہاں اللہ تعالیٰ سے کوئی بھاگ نہ سکے گا بلکہ) سب کے سب اسی کے سامنے دبے جھکے حاضر رہیں گے (یہاں تک کہ زندہ آدمی مردہ اور مردے بے ہوش ہو جائیں گے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱ صور پھونکنے والا فرشتہ اسرافیل ہے جو حکم الٰہی کے انتظار میں صور لیے تیار کھڑا ہے۔

**فائدہ:** ۲ بعض روایات میں ہے کہ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ جبرائیل، میکائیل، اسرافیل اور ملک الموت ہیں، اور بعض نے شہداء کو اس کا مصداق قرار دیا ہے، واللہ اعلم۔

**فائدہ:** ۳ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''ایک بار صور پھونکے گا جس سے خلق مر جائے گی، دوسرا پھونکے گا تو جی اٹھیں گے اس کے بعد پھونکے گا تو گھبرا جائیں گے پھر پھونکے گا تو بیہوش ہو جائیں گے اور پھر پھونکے گا تو ہشیار ہوں گے، صور پھونکنا کئی بار ہے''، (موضح) اور بہت سے علماء صرف دو نفخے مانتے ہیں یعنی کل دو مرتبہ پھونکے گا، اور سب احوال کو انہی دو میں درج کرتے ہیں، واللہ اعلم۔

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ؕ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ؕ

اور تو دیکھے پہاڑوں کو سمجھے کہ وہ جم رہے ہیں اور وہ چلیں گے جیسے چلے بادل ۱ کاری گری اللہ کی جس نے سادھا (درست کیا) ہے ہر چیز کو ۲

اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ﴿٨٨﴾

اس کو خبر ہے جو کچھ تم کرتے ہو ۳

**خلاصہ تفسیر:** گزشتہ آیت میں صور پھونکنے کا اثر و تغیر جانداروں میں بیان ہوا، اب صور پھونکنے کا بے جان چیزوں میں جو اثر ہوگا وہ بتلاتے ہیں:

اور (اے مخاطب!) تو (اس وقت) پہاڑوں کو ایسی حالت میں دیکھ رہا ہے جس سے (ان کی ظاہری مضبوطی کے سبب سرسری نظر میں) تجھ

کوخیال ہوتا ہے کہ یہ (ہمیشہ یوں ہی رہیں گے اور کبھی اپنی جگہ سے) جنبش نہ کریں گے حالانکہ (اُس وقت ان کی یہ حالت ہوگی کہ) وہ بادلوں کی طرح (ہلکے پھلکے خفیف اور روئی کی طرح منتشر اجزا ہوکر آسمانی فضا میں) اڑے اڑے پھریں گے (کقولہ تعالیٰ: وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا، فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا، اور اس پر کچھ تعجب نہ کرنا چاہئے کہ ایسی بھاری اور سخت چیز کا یہ حال کیسے ہوجائے گا وجہ یہ ہے کہ) یہ خدا کا کام ہوگا جس نے ہر چیز کو (مناسب انداز پر) بنا رکھا ہے (یہ تو پہلی بار صور پھونکنے کا حال ہوا، پھر اس کے بعد دوبارہ صور پھونکا جائے گا جس سے تمام روحیں ہوش میں آکر اپنے اپنے بدنوں سے مل جائیں گی اور پورا عالم نئے طرز سے درست ہوجائے گا اور پیچھے جو حشر کا ذکر تھا وہ اسی یعنی دوسری بار صور پھونکنے کے بعد ہوگا، آگے اصل مقصود یعنی قیامت میں جزاء وسزا کا بیان ہے، پس اول اس کی تمہید کے طور پر ارشاد ہے کہ) یہ یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب افعال کی پوری خبر ہے (کیونکہ جزا وسزا کی بڑی شرط یہی ہے کہ اعمال کی اطلاع بھی ہو اور قدرت وغیرہ اور بھی شرطیں ہیں جو مستقل دلائل سے ثابت ہیں، پس اس کا ممکن ہونا تو اسی سے ثابت ہوگیا، پھر حکمت خداوندی چاہتی ہے کہ اس کا وقوع بھی ہو، اس سے اس کا واقع ہونا ثابت ہوگیا)۔

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ: بات یہ ہے کہ پہلے پہل تو کسی چیز میں مضبوطی نہ تھی، کیونکہ خود کوئی چیز ہی نہ تھی، سو جیسے اس نے ناپید سے پیدا کیا اور کمزور سے قوی بنایا، اسی طرح اس کا الٹا بھی کرسکتا ہے، کیونکہ قدرت ذاتی کی نسبت تمام مقدورات کے ساتھ یکساں ہوتی ہے، بالخصوص جو چیزیں ایک دوسرے کی نظیر اور مشابہ ہیں ان میں تو زیادہ واضح ہے اسی طرح دوسری مخلوقات تو یہ آسمان وزمین وغیرہ میں تغیر عظیم ہونا دوسری آیات میں مذکور ہے: وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً. فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ. وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ الخ۔

وحدت الوجود والوں کا خیال ہے کہ یہ کائنات در اصل اللہ تعالیٰ ہی کا وجود ہے اور جس طرح اللہ کو زوال نہیں ایسے ہی کائنات کو بھی زوال نہیں، کیونکہ یہ ناممکن ہے، تو اس کا جواب اس آیت میں ہے کہ یہ مضبوطی سے بنا کر جمائے رکھنا اور پھر توڑ پھوڑ دینا دونوں حکمت ربانی کے تحت ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی جن بڑے بڑے پہاڑوں کو تم اس وقت دیکھ کر خیال کرتے ہو کہ ہمیشہ کے لیے زمین میں جمے ہوئے ہیں کبھی اپنی جگہ سے جنبش نہ کھاسکیں گے، قیامت کے دن یہ روئی کے گالوں کی طرح فضا میں اڑتے پھریں گے اور بادل کی طرح تیز رفتار ہوں گے: وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا (واقعہ:۵۶) وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ (القارعہ:۵) وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا (طٰہٰ:۱۰۵)

**تنبیہ:** آیت ہذا کو زمین کی حرکت وسکون کے مسئلہ سے کچھ علاقہ نہیں جیسا کہ بعض متنورین نے سمجھا ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی جس نے ہر چیز کو نہایت حکمت سے درست کیا اسی نے آج پہاڑوں کو ایسا بھاری اور مضبوط بنایا ہے اور وہی ان کو ایک دن ریزہ ریزہ کرکے اڑا دے گا، وہ اڑانا محض تباہ کرنے کی غرض سے نہ ہوگا بلکہ عالم کو توڑ پھوڑ کر اس درجہ پر پہنچانا ہوگا جہاں پہنچانے کے لیے ہی اسے پیدا کیا ہے، تو یہ اسی صانع حقیقی کی کاریگری ہوئی جس کا کوئی تصرف حکمت سے خالی نہیں۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی اس توڑ پھوڑ اور انقلاب عظیم کے بعد بندوں کا حساب کتاب ہوگا اور چونکہ حق تعالیٰ بندوں کے ذرہ ذرہ عمل سے خبردار ہے تو ہر ایک کو ٹھیک اس کے عمل کے موافق جزا وسزا دی جائے گی، نہ ظلم ہوگا نہ حق تلفی ہوگی، آگے اسی کے قدرے تفصیل ہے:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ﴿۸۹﴾ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ

جو کوئی لے کر آیا بھلائی تو اس کو ملے اس سے بہتر ۱؎ اور ان کو گھبراہٹ سے اس دن امن ہے ۲؎ اور جو کوئی لے کر آیا برائی

فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ ۭ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴿۹۰﴾

سو اوندھے ڈالیں ان کے منہ آگ میں، وہی بدلہ پاؤ گے جو کچھ تم کیا کرتے تھے ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** تمہید کے بعد اب اس کا واقع ہونا اور جزا وسزا کا قانون اور طریقہ بتلاتے ہیں۔

جو شخص نیکی (یعنی ایمان) لائے گا سو (وہ ایمان لانے پر جس اجر کا مستحق ہے) اس شخص کو اس (نیکی کے مذکورہ اجر) سے بہتر (اجر) ملے گا اور وہ لوگ بڑی گھبراہٹ سے اس روز امن میں رہیں گے (جیسا کہ سورۃ انبیاء میں ہے: لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ) اور جو شخص بدی (یعنی کفر و شرک) لائے گا تو وہ لوگ اوندھے منہ آگ میں ڈال دیئے جائیں گے (اور ان سے کہا جائے گا کہ) تم کو تو انہی اعمال کی سزا دی جارہی ہے جو تم (دنیا میں) کیا کرتے تھے (یہ عذاب بے وجہ تو نہیں ہو رہا)۔

وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ: یہاں بظاہر یہ شبہ ہوگا کہ پیچھے تو فرمایا تھا کہ آسمان اور زمین والے سب گھبرا جائیں گے اور یہاں فرمایا کہ ایمان والے اس گھبراہٹ سے امن میں رہیں گے، جواب یہ ہے کہ پیچھے پہلی بار صور پھونکنے کی گھبراہٹ کا ذکر تھا جس کا اثر موت ہے، اس سے کوئی نہ بچے گا، نہ مؤمن، نہ کافر، اور یہاں اس جگہ دائمی عذاب جہنم کی گھبراہٹ کا ذکر ہے جس سے ہر مؤمن بچا رہے گا، اگرچہ تھوڑے سے عذاب کی گھبراہٹ کسی کسی کو ہوگی مگر وہ بڑی گھبراہٹ نہ ہوگی، کیونکہ اس کے ساتھ ہی نجات کا یقین بھی ہوگا۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی ایک نیکی کا بدلہ کم از کم دس نیکیوں کے حساب سے دیا جائے گا، جو کبھی ختم ہونے والا نہیں۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی بڑی گھبراہٹ سے کما قال تعالیٰ: لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (الانبیاء: ۱۰۳) اگر کم درجہ کی گھبراہٹ ہو تو اس آیت کے منافی نہیں۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ زیادتی نہیں، جو کرنا، سو بھرنا، خود کردہ را چہ علاج۔

## اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَيْءٍ ۡ وَّاُمِرْتُ اَنْ

مجھ کو یہی حکم ہے کہ بندگی کروں اس شہر کے مالک کی جس نے اس کو حرمت دی اور اسی کی ہے ہر ایک چیز ۱؎ اور مجھ کو حکم ہے کہ

## اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۱﴾

رہوں حکم برداروں میں ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اوپر سورت میں جو مضامین تفصیل سے بیان ہوئے وہ نبوت، توحید اور قیامت ہیں، اب خاتمہ میں ان کا خلاصہ ہے۔

(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم! لوگوں سے کہہ دیجئے کہ) مجھے تو یہی حکم ملا ہے کہ میں اس شہر (مکہ) کے مالک (حقیقی) کی عبادت کیا کروں جس نے اس (شہر) کو محترم بنایا ہے (کہ اسی احترام کی وجہ سے اسے حرم بنادیا، مطلب یہ ہے کہ عبادت میں کسی کو شریک نہ کروں جیسا کہ اب تک رہا ہوں) اور (اس کی عبادت کیوں نہ کی جائے جبکہ وہ ایسا ہے کہ) سب چیزیں اسی کی (ملک) ہیں اور مجھ کو یہ (بھی) حکم ہوا ہے کہ میں (عقائد و اعمال سب میں) فرمانبردار رہوں (یہ تو توحید کا حکم ہوا)۔

اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ: اس میں صراحت ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے بھی تکالیف (احکام) شرعیہ ساقط نہیں ہوتیں چہ جائیکہ اولیاء سے (جیسا کہ بعض نادان لوگوں کا گمان ہے کہ وہ اولیاء اور بزرگوں کو احکام شرعیہ کا مکلف نہیں سمجھتے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ شہر سے مراد ہے مکہ معظمہ جسے خدا تعالیٰ نے معظم و محترم بنایا، اسی تخصیص و تشریف کی بناء پر رب کی اضافت اس کی طرف کی گئی ورنہ یوں ہر چیز کا رب اور مالک وہ ہی ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی ان لوگوں میں رہوں جو حق تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری کرنے والے اور اپنے کو ہمہ تن اسکے سپرد کردینے والے ہیں۔

وَاَنۡ اَتۡلُوَا الۡقُرۡاٰنَ ۚ فَمَنِ اهۡتَدٰى فَاِنَّمَا يَهۡتَدِىۡ لِنَفۡسِهٖ ۚ وَمَنۡ ضَلَّ فَقُلۡ

اور یہ کہ سنادوں قرآن ۱؎ پھر جو کوئی راہ پر آیا سو راہ پر آئے گا اپنے ہی بھلے کو، اور جو کوئی بہکا رہا ہے تو کہہ دے

اِنَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُنۡذِرِيۡنَ ﴿۹۲﴾

میں تو یہی ہوں ڈر سنا دینے والا ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (مجھ کو) یہ (بھی حکم ملا ہے) کہ میں (تم کو) قرآن پڑھ پڑھ کر سناؤں (یعنی احکام الہیہ کی تبلیغ کروں جو نبوت کے لوازم میں سے ہے) سو (میری تبلیغ کے بعد) جو شخص راہ پر آئے گا تو اپنے ہی فائدہ کے لئے راہ پر آئے گا (یعنی اس کو عذاب سے نجات اور جنت کی لازوال نعمتیں ملیں گی، میں اس سے کسی اپنے مالی یا جانی نفع کا خواہاں نہیں) اور جو شخص گمراہ رہے گا تو آپ کہہ دیجئے کہ (میرا کوئی نقصان نہیں، کیونکہ) میں تو صرف ڈرانے والے (یعنی حکم سنانے والے) پیغمبروں میں سے ہوں (یعنی میرا کام تو صرف حکم پہنچا دینا ہے، اس کے بعد میری ذمہ داری ختم ہے، نہ مانو گے تو وبال تمہیں ہی بھگتنا پڑے گا، یہ رسالت کا بیان ہوا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی بذات خود اللہ کی بندگی اور فرمانبرداری کرتا رہوں اور دوسروں کو قرآن سنا کر اللہ کا راستہ بتلاتا رہوں۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی میں نصیحت کر کے فارغ الذمہ ہو چکا، نہ سمجھو تو تمہارا ہی نقصان ہے۔

وَقُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ سَيُرِيۡكُمۡ اٰيٰتِهٖ فَتَعۡرِفُوۡنَهَا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۳﴾ ع

اور کہہ تعریف ہے سب اللہ کو ۱؎ آگے دکھائے گا تم کو اپنے نمونے (اپنی نشانیاں) تو انکو پہچان لوگے ۲؎ اور تیرا رب بے خبر نہیں ان کاموں سے جو تم کرتے ہو ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** اور آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ (تم جو قیامت کے آنے میں دیر کو اس کے نہ ہونے کی دلیل سمجھ کر انکار کرتے ہو یہ تمہاری بیوقوفی ہے، کسی چیز کے واقع ہونے میں دیر لگنا اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ وہ کبھی واقع ہی نہیں ہوگی، اس کے علاوہ تم جو مجھ سے کہتے ہو کہ میں جلد قیامت لے آؤں یہ دوسری غلطی ہے، کیونکہ میں نے یہ کب دعویٰ کیا ہے کہ قیامت کا واقع کرنا میرے اختیار میں ہے، بلکہ) سب خوبیاں خالص اللہ ہی کے لئے ثابت ہیں (قدرت بھی، علم بھی، حکمت بھی خالص خدا کے لیے ہیں، سو جب اس کی حکمت کا تقاضا ہوگا قیامت کو واقع کر دے گا، ہاں! اتنی بات ہمیں بھی بتلا دی گئی ہے کہ قیامت میں زیادہ دیر نہیں، بلکہ) وہ تم کو عنقریب اپنی نشانیاں (یعنی قیامت کے واقعات) دکھلائے گا، سو تم (واقع ہونے کے وقت) ان کو پہچانو گے (جبکہ پہچاننے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا) اور (صرف یہ علامات دکھلانے ہی پر اکتفا نہ ہوگا، بلکہ اپنے برے اعمال کی سزا بھی بھگتنا پڑے گی، کیونکہ) آپ کا رب ان کاموں سے بے خبر نہیں جو تم سب لوگ کر رہے ہو (پس رسول اور مؤمنین کو جزا، اور کفار کو سزا دے گا، یہ قیامت کا بیان ہو گیا، پس خاتمہ میں سورت کے تمام مضامین اجمالاً آ گئے)۔

**وَقُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ:** روح المعانی میں ہے کہ اس پر حمد کیجیے کہ آپ کو نبوت اور احکام کی تبلیغ عنایت ہوئی، پس یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ فیوض وبرکات کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا واجب ہے، اپنے مجاہدہ وعمل کی طرف منسوب نہ کرے۔

**سَيُرِيۡكُمۡ اٰيٰتِهٖ فَتَعۡرِفُوۡنَهَا:** یہاں واقعات کو "آیات" یا تو اس اعتبار سے فرمایا کہ وہ علامات قدرت ہیں، یا اس لیے کہ وہ آیات الہیہ کی تصدیق کرنے والی ہیں تو ان کا مشاہدہ صدق آیات کا مشاہدہ ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی اللہ کا ہزاراں ہزار شکر جس نے مجھ کو ہادی و مہتدی بنایا، فی الحقیقت تعریف کے لائق اسی کی ذات ہے، جس کو خوبی یا کمال ملا وہیں سے ملا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی آگے چل کر حق تعالیٰ تمہارے اندر یا تم سے باہر اپنی قدرت کے وہ نمونے اور میری صداقت کے ایسے نشان دکھلائے گا جنہیں دیکھ کر سمجھ لوگے کہ بیشک یہ اللہ کی وہ ہی آیات ہیں جن کی خبر پیغمبر نے دی تھی باقی اس وقت کا سمجھنا تم کو نافع ہو یا نہ ہو، جداگانہ چیز ہے، علامات قیامت وغیرہ سب اس کے تحت میں آگئیں۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی جو عمل اور معاملہ تم کرتے ہو، سب اس کی نظر میں ہے، اسی کے موافق آخر کار بدلہ ملے گا، اگر سزا وغیرہ میں تاخیر ہو تو نہ سمجھو کہ اللہ تعالیٰ ہماری کرتوت سے بے خبر ہے۔

آیاتها ۸۸ — ۲۸ سُوْرَةُ الْقَصَصِ مَكِّيَّةٌ ٤٩ — رکوعاتها ۹

**خلاصہ تفسیر:** گزشتہ سورت کا افتتاح حقانیت قرآن کے بیان سے ہوا، پھر اس کا اختتام تلاوت قرآن کے حکم پر ہوا، اس مناسبت سے اس سورت کا آغاز بھی حقانیت قرآن کے بیان سے فرمایا اور گذشتہ سورت کی طرح اس سورت کے شروع میں بھی موسیٰ علیہ السلام کا قصہ پہلے اجمالا ذکر کیا اور پھر اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جس سے مقصود رسالت محمدیہ کا اثبات اور منکرین نبوت اور اہل نخوت و رعونت کی تہدید ہے، دور تک اسی طرح سلسلہ کلام چلا گیا، گذشتہ سورت کے اختتام پر فرمایا تھا: **ومن ضلّ فقل انّما انا من المنذرین** (جو شخص گمراہ رہے گا تو آپ کہہ دیجئے کہ میں تو صرف ڈرانے والے پیغمبروں میں ہوں) اس سورت میں بیان کردہ قصوں سے اس جملہ کے مضمون پر فی الجملہ استدلال ہے جس سے دونوں سورتوں میں ربط بھی حاصل ہوسکتا ہے، اور جس طرح سورۃ نمل میں انبیاء کرام کے قصوں کے بعد دلائل توحید کا ذکر فرمایا اور پھر اثبات معاد اور تذکیر آخرت پر سورت مذکورہ کو ختم فرمایا، اسی طرح اس سورت میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مفصل قصہ کے بعد اول دلائل توحید کا ذکر فرمایا اور پھر تذکیر آخرت اور توحید الوہیت پر سورت کو ختم فرمایا، اس سورت کے اول میں فرعون کا قصہ اور اس سورت کے آخر میں قارون کا قصہ ذکر کیا تا کہ لوگ عبرت پکڑیں۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

طٰسٓمّٓ ۝۱ تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡكِتٰبِ الۡمُبِيۡنِ ۝۲

طٰسٓمّٓ، یہ آیتیں ہیں کھلی کتاب کی

نَتۡلُوۡا عَلَيۡكَ مِنۡ نَّبَاِ مُوۡسٰى وَفِرۡعَوۡنَ بِالۡحَقِّ لِقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ۝۳

ہم سناتے ہیں تجھ کو کچھ احوال موسیٰ اور فرعون کا تحقیقی (ٹھیک ٹھیک) ان لوگوں کے واسطے جو یقین کرتے ہیں ۱؎

**خلاصہ تفسیر:** طسم (اس کے معنی اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (مضامین جو آپ پر وحی کئے جاتے ہیں) کتاب واضح (یعنی قرآن) کی آیتیں ہیں (جن میں اس مقام پر) ہم آپ کو موسیٰ (علیہ السلام) اور فرعون کا کچھ قصہ ٹھیک ٹھیک پڑھ کر (یعنی نازل کر کے) سناتے ہیں ان لوگوں کے (نفع کے) لئے جو کہ ایمان رکھتے ہیں (کیونکہ ان قصوں سے جو مقصود ہے یعنی عبرت حاصل کرنا اور نبوت پر استدلال کرنا وغیرہ وہ مؤمنین ہی کے ساتھ خاص ہے، خواہ وہ سچ مچ مؤمن ہوں یا آئندہ ایمان لانے کا ارادہ رکھتے ہوں)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی مسلمان لوگ اپنا حال قیاس کرلیں ظالموں کے مقابلہ میں (موضح) جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو باوجود کمزوری کے فرعونیوں کی طاقت کے مقابلہ میں منصور و کامیاب کیا، ایسے ہی مسلمان جو فی الحال مکہ میں قلیل اور ضعیف و ناتواں نظر آتے ہیں اپنے بیشمار طاقتور حریفوں کے مقابلہ پر کامیاب ہوں گے۔

اِنَّ فِرۡعَوۡنَ عَلَا فِی الۡاَرۡضِ وَجَعَلَ اَهۡلَهَا شِيَعًا يَّسۡتَضۡعِفُ طَآئِفَةً مِّنۡهُمۡ يُذَبِّحُ

فرعون چڑھ رہا تھا ملک میں اور کر رکھا تھا وہاں کے لوگوں کو کئی فرقے کمزور کر رکھا تھا ایک فرقہ کو ان میں ۱؎ ذبح کرتا تھا

اَبۡنَآءَهُمۡ وَيَسۡتَحۡیٖ نِسَآءَهُمۡ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الۡمُفۡسِدِيۡنَ ④

ان کے بیٹوں کو اور زندہ رکھتا تھا اُنکی عورتوں کو ۲؎ بیشک وہ تھا خرابی ڈالنے والا ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** (اجمال تو اس قصہ کا یہ ہے کہ) فرعون سرزمین (مصر) میں بہت چڑھ گیا تھا اور اس نے وہاں کے باشندوں کو مختلف قسمیں کر رکھا تھا (اسی طرح کہ قبطیوں یعنی مصری لوگوں کو معزز بنا رکھا تھا اور سبطیوں یعنی بنی اسرائیل کو پست اور ذلیل وخوار کر رکھا تھا جس کا آگے بیان ہے) کہ ان (باشندوں) میں سے ایک جماعت (یعنی بنی اسرائیل) کا زور گھٹا رکھا تھا (اس طرح سے کہ) ان کے بیٹوں کو (جو نئے پیدا ہوتے تھے جلادوں کے ہاتھوں) ذبح کراتا تھا اور ان کی عورتوں (یعنی لڑکیوں) کو زندہ رہنے دیتا تھا (تاکہ ان سے خدمت لی جائے اور نیز ان سے اندیشہ بھی نہ تھا) واقعی وہ بڑا مفسد تھا۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی مصر میں ''قبطی'' بھی آباد تھے جو فرعون کی قوم تھی اور ''سبطی'' بھی جو بنی اسرائیل کہلاتے تھے لیکن فرعون ظلم وتکبر کی راہ سے بنی اسرائیل کو پنپنے اور ابھرنے نہیں دیتا تھا، گویا سب قبطی آقا بنے ہوئے تھے اور پیغمبروں کی اولاد بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا رکھا تھا، ان سے ذلیل کام اور بیگاریں لیتے اور کسی طرح اس قابل نہ ہونے دیتے کہ ملک میں وہ کوئی قوت ووقعت حاصل کرسکیں۔

**فائدہ:** ۲؎ کہتے ہیں فرعون نے کوئی خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر کاہنوں نے یہ دی کہ کسی اسرائیلی کے ہاتھ سے تیری سلطنت برباد ہوگی، اس لیے پیش بندی کے طور پر یہ احمقانہ اور ظالمانہ تدبیر سوچی کہ بنی اسرائیل کو ہمیشہ کمزور کرتے رہنا چاہیے کہ انھیں حکومت کے مقابلہ کا حوصلہ ہی نہ ہو اور آئندہ جو لڑکے ان کے پیدا ہوں ان کو ایک طرف سے ذبح کرڈالنا چاہیے، اس طرح آنے والی مصیبت رک جائے گی، البتہ لڑکیوں سے چونکہ کوئی خطرہ نہیں، انھیں زندہ رہنے دیا جائے، وہ بڑی ہوکر باندیوں کی طرح ہماری خدمت کیا کریں گی، اور ابن کثیر لکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل آپس میں حضرت ابراہیم خلیل کی ایک پیشین گوئی کا تذکرہ کیا کرتے تھے، جس میں خبر دی گئی تھی کہ ایک اسرائیلی جوان کے ہاتھ پر اس سلطنت مصر کی تباہی مقدر ہے، شدہ شدہ یہ تذکرے فرعون کے کانوں تک پہنچ گئے اس احمق نے قضاء وقدر کی روک تھام کے لیے ظلم وستم کی یہ اسکیم جاری کی۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی زمین میں خرابی پھیلانے والا تو تھا ہی، لہذا اسے ایسا ظلم وستم کرنے میں کیا جھجک ہوتی، بس جو دل میں آیا، اپنے کبر وغرور کے نشہ میں بے سوچے سمجھے کرگزرا۔

وَنُرِيۡدُ اَنۡ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا فِی الۡاَرۡضِ وَنَجۡعَلَهُمۡ اَئِمَّةً وَّنَجۡعَلَهُمُ الۡوٰرِثِيۡنَ ۙ⑤

اور ہم چاہتے ہیں کہ احسان کریں ان لوگوں پر جو کمزور ہوئے پڑے تھے ملک میں اور کردیں ان کو سردار اور کردیں ان کو قائم مقام

**خلاصہ تفسیر:** (غرض فرعون تو اس خیال میں تھا) اور ہم کو یہ منظور تھا کہ جن لوگوں کا زمین (مصر) میں زور گھٹایا جا رہا تھا ہم ان پر (دنیوی ودینی) احسان کریں اور (وہ احسان یہ کہ) ان کو (دین میں) پیشوا بنادیں اور (دنیا میں) ان کو (اس ملک کا) مالک بنائیں۔

**وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ:** اس میں اس پر دلالت ہے کہ کسی کو ناحق کمزور، مظلوم بنانا دراصل اس پر اللہ کی تائید ونصرت کو دعوت دینا ہے (لہذا مظلوم کو پریشان نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ اللہ کی طرف سے مظلوموں کی تائید ونصرت بہر حال ہوتی ہے) چنانچہ یہاں **استضعفوا** کے بعد **ونجعلھم ائمۃ** فرمایا (اور فضل الٰہی میں افضل ترین رتبہ دین میں امامت کا رتبہ ہے)۔

وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ⑥

اور جما دیں ان کو ملک میں ۱؎ اور دکھا دیں فرعون اور ہامان کو ۲؎ اور ان کے لشکروں کو ان کے ہاتھ سے جس چیز کا ان کو خطرہ تھا ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (مالک ہونے کے ساتھ) ان کو (ملک بھی بنائیں، یعنی) زمین میں ان کو حکومت دیں اور فرعون اور ہامان اور ان کے تابعین کو ان (بنی اسرائیل) کی جانب سے وہ (ناگوار) واقعات دکھلائیں جن سے وہ بچاؤ کر رہے تھے (مراد اس سے سلطنت کا زوال اور ان کی ہلاکت ہے کہ اسی سے بچاؤ کرنے کے لئے بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کر رہا تھا ایک خواب کی وجہ سے، جس کی تعبیر نجومیوں نے یہی دی تھی کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا، وہ تیری سلطنت کو زائل کرے گا، پس ہمارے قضاوقدر کے سامنے ان لوگوں کی تدبیر کچھ کام نہ آئی، یہ تو قصہ کا اجمال ہوا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی اس ملعون کے انتظامات تو وہ تھے، اور ہمارا ارادہ یہ تھا کہ کمزوروں کو قوی اور پستوں کو بالا کیا جائے، جس قوم کو فرعونیوں نے ذلیل غلام بنا رکھا تھا ان ہی کے سر پر دین کی امامت اور دنیا کی سرداری کا تاج رکھ دیں، ظالموں اور متکبروں سے جگہ خالی کرا کر اس مظلوم وستم رسیدہ قوم سے زمین کو آباد کریں اور دینی سیادت کے ساتھ دنیاوی حکومت بھی اس مظلوم ومقہور قوم کے حوالے کی جائے۔

**فائدہ:** ۲؎ ''ہامان'' وزیر تھا فرعون کا جو ظلم وستم میں اس کا شریک اور آلہ کار بنا ہوا تھا۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی جس خطرہ کی وجہ سے انہوں نے بنی اسرائیل کے ہزار ہا بچوں کو ذبح کر ڈالا تھا، ہم نے چاہا کہ وہ ہی خطرہ ان کے سامنے آئے، فرعون نے امکانی کوشش کر دیکھی اور پورے زور خرچ کر لیے کہ کسی طرح اسرائیلی بچہ سے مامون ہو جائے، جس کے ہاتھ پر اس کی تباہی مقدر تھی، لیکن تقدیر الٰہی کہاں ٹلنے والی تھی، خداوند قدیر نے اس بچہ کو اسی کی گود میں اسی کے بستر پر اسی کے محلات کے اندر شاہانہ ناز ونعم سے پرورش کرایا، اور دکھلا دیا کہ خدا جو انتظام کرنا چاہے، کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِيْ

اور ہم نے حکم بھیجا موسیٰ کی ماں کو کہ اس کو دودھ پلاتی رہ پھر جب تجھ کو ڈر ہو اس کا (اس پر) تو ڈال دے اس کو دریا میں ۱؎ اور نہ خطرہ کر

وَلَا تَحْزَنِيْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ⑦

اور نہ غمگین ہو ہم پھر پہنچا دیں گے اس کو تیری طرف اور کریں گے اس کو رسولوں (رسول) سے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (تفصیل اس کی اول سے یہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام اسی مصیبت کے زمانہ میں پیدا ہوئے تو) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کو الہام کیا کہ (جب تک ان کا چھپانا ممکن ہو) تم ان کو دودھ پلاؤ پھر جب تم کو ان کی نسبت (جاسوسوں کے مطلع ہونے کا) اندیشہ ہو تو (بے خوف وخطر) ان کو (صندوق میں رکھ کر) دریا (یعنی نیل) میں ڈال دینا اور نہ تو (غرق سے) اندیشہ کرنا اور نہ (مفارقت پر) غم کرنا (کیونکہ) ہم ضرور ان کو پھر تمہارے ہی پاس واپس پہنچا دیں گے اور (پھر اپنے وقت پر) ان کو پیغمبر بنا دیں گے (غرض وہ اسی طرح دودھ پلاتی رہیں)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ ان کی ماں کو الہام ہوا یا خواب دیکھا یا اور کسی ذریعہ سے معلوم کرا دیا گیا کہ جب تک بچہ کے قتل کا اندیشہ نہ ہو برابر دودھ پلاتی

رہیں، جب اندیشہ ہوتو صندوق میں رکھ کر دریائے نیل میں چھوڑ دیں، سورہ طٰہ میں یہ قصہ گزر چکا ہے۔

**فائدہ:** ۲ ماں کی تسلی کردی کہ ڈرے مت، بے کھٹکے دریا میں چھوڑ دے، بچہ ضائع نہیں ہوسکتا اور بچہ کی جدائی سے غمگین بھی مت ہو ہم بہت جلد اس کو تیری ہی آغوش شفقت میں پہنچادیں گے خدا کو اس سے بڑے کام لینے ہیں، وہ منصب رسالت پر سرفراز کیا جائے گا، کوئی طاقت اللہ کے ارادہ میں حائل و مانع نہیں ہوسکتی، تمام رکاوٹیں عبور کر کے وہ مقصد پورا کرتا ہے جو اس محترم بچہ کی پیدائش سے متعلق ہے۔

فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِیَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ؕ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕیْنَ ۝۸

پھر اٹھا لیا اس کو فرعون کے گھر والوں نے کہ ہو ان کا دشمن اور غم میں ڈالنے والا بیشک فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر تھے چوکنے والے

**خلاصہ تفسیر:** (پھر جب راز کے افشا کا خوف ہوا تو صندوق میں بند کر کے اللہ کے نام پر دریائے نیل میں چھوڑ دیا، اس کی کوئی شاخ فرعون کے محل میں جاتی تھی، یا تفریحاً فرعون کے متعلقین دریا کی سیر کو نکلے تھے، غرض وہ صندوق کنارے پر لگا) تو فرعون کے لوگوں نے موسیٰ (علیہ السلام) کو (یعنی صندوق کے ساتھ) اٹھا لیا تاکہ وہ ان لوگوں کے لئے دشمنی اور غم کا باعث بنیں، بلاشبہ فرعون اور ہامان اور ان کے تابعین (اس بارہ میں) بہت چوکے (کہ اپنے دشمن کو اپنی بغل میں پالا)۔

* * *

**فائدہ:** آخر ماں نے بچہ کو لکڑی کے صندوق میں ڈال کر چھوڑ دیا، صندوق بہتا ہوا ایسی جگہ جا لگا جہاں سے فرعون کی بیوی حضرت آسیہ کے ہاتھ لگ گیا، ان کو اس پیارے بچہ کی پیاری صورت بھلی معلوم ہوئی، آثار نجابت وشرافت سے نظر آئے، پالنے کی غرض سے اٹھا لیا، مگر اس اٹھانے کے آخری نتیجہ یہ ہونا تھا کہ وہ بچہ بڑا ہو کر فرعون اور فرعونیوں کا دشمن ثابت ہو، اور ان کے حق میں سوہان روح بنے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو اٹھانے کا موقع دیا، فرعون لعین کو کیا خبر تھی کہ جس دشمن کے ڈر سے ہزار ہا معصوم بچے تہہ تیغ کرا چکا ہوں وہ یہ ہی ہے جسے بڑے چاؤ پیار سے آج ہمارے ہاتھوں میں پرورش کرایا جا رہا ہے، فی الحقیقت فرعون اور اس کے وزیر ومشیر اپنے ناپاک مقصد کے اعتبار سے بہت چوکے کہ بیشمار اسرائیلی بچوں کو ایک شبہ پر قتل کرنے کے باوجود موسیٰ کو زندہ رہنے دیا، لیکن نہ چوکتے تو کیا کرتے، کیا خدا کی تقدیر کو بدل سکتے تھے یا مشیت ایزدی کو روک سکتے تھے ان کی بڑی چوک تو یہ تھی کہ سمجھے کہ قضاء وقدر کے فیصلوں کو انسانی تدبیروں سے روکا جا سکتا ہے۔

وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَیْنٍ لِّیْ وَلَكَ ؕ لَا تَقْتُلُوْهُ ۖۗ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ

اور بولی فرعون کی عورت یہ تو آنکھوں کی ٹھنڈک ہے میرے اور تیرے لیے ۱ اسکو مت مارو، کچھ بعید نہیں (شاید) جو ہمارے کام آئے یا ہم اسکو کرلیں

وَلَدًا وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ۝۹

بیٹا ۲ اور ان کو کچھ خبر نہ تھی ۳

**خلاصہ تفسیر:** اور (جب موسیٰ علیہ السلام صندوق سے نکال کر فرعون کے سامنے لائے گئے تو) فرعون کی بی بی (حضرت آسیہ) نے (فرعون سے) کہا کہ یہ (بچہ) میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے (یعنی ہم اس کی پرورش کریں گے، اس کو دیکھ کر میرا اور تیرا جی خوش ہوا کرے گا تو) اس کو قتل مت کرو عجب نہیں کہ (بڑا ہو کر) ہم کو کچھ فائدہ پہنچائے یا ہم اس کو (اپنا) بیٹا ہی بنالیں اور ان لوگوں کو (انجام کی) خبر نہ تھی (کہ یہ وہی بچہ ہے جس کے ہاتھوں فرعون کی سلطنت غارت ہوگی)۔

عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا: فرعون کا موسیٰ علیہ السلام کو قتل نہ کرنا باوجودیکہ سب بچوں کے قتل کا قانون تھا، اس کی وجہ سورہ طٰہ

میں گذر چکی ہے: والقیت علیك محبة منی، کہ جوان کو دیکھتا تھا اس کو بے اختیار پیار آتا تھا، اور جس اندیشہ سے یہ قانون تھا اس کی نسبت اول تو بچہ کا بنی اسرائیل سے ہونا معلوم نہ تھا، دوسرے اپنے جی کو یہ سمجھا لیا ہوگا کہ جب ہمارا پالا ہوا ہوگا تو ہمارا مخالف کیوں ہوگا، یہ خبر نہ تھی کہ خود تو ہمارا مخالف نہ ہوگا مگر وہ حق تعالیٰ شانہ کے موافق ہوگا جس کے ہم ناحق مخالف ہیں، اور یہ موافقت ہمارے ساتھ مخالفت کا باعث ہوگی اور حق ہوگی۔

**قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ:** فرعون کی بیوی حضرت آسیہ نے بچہ کو دیکھ کر محبت کا اظہار فرمایا، اور ان کے اس قول کا سبب محض طبعی محبت تھی، پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت فرمادی تو اس سے ثابت ہوا کہ اہل اللہ کی محبت اگرچہ طبعی ہی کیوں نہ ہو ایمان اور ہدایت میں نافع ہو جاتی ہے، عارفین نے لکھا ہے کہ اللہ والوں سے محبت کرنا خواہ طبعی حیثیت سے کیوں نہ ہو رائیگاں نہیں جاتا، اس کا فائدہ بہر حال ملتا ہے۔

* * *

**فائدہ: ۱** یعنی کیسا پیارا بچہ ہے، ہمارے کوئی لڑکا نہیں، لاؤ اسی سے دل بہلائیں اور آنکھیں ٹھنڈی کیا کریں، بعض روایات میں ہے کہ فرعون نے کہا: "لَكِ ! لاَ لِي" (تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہوگی میری نہیں) تقدیر ازلی یہ الفاظ اس ملعون کی زبان سے کہلا رہی تھی، آخر وہ ہی ہوا۔

**فائدہ: ۲** یعنی کم از کم بڑا ہو کر ہمارے کام آئے گا یا مناسب سمجھا تو متبنیٰ بنالیں گے۔

**فائدہ: ۳** یعنی یہ تو خبر نہ تھی کہ بڑا ہو کر کیا کرے گا، سمجھے کہ بنی اسرائیل میں سے کسی نے خوف سے ڈالا ہے ایک لڑکا نہ مارا تو کیا ہوا، کیا ضرور ہے کہ یہ ہی وہ بچہ ہو جس سے ہمیں خوف ہے، پھر جب ہم پرورش کریں گے وہ خود ہی ہم سے شرمائے گا، کس طرح ممکن ہے کہ ہم سے ہی دشمنی کرنے لگے، انھیں کیا خبر تھی کہ یہ اس کا دوست ہوگا جو سارے جہان کا پرورش کرنے والا ہے اور تم چونکہ اس کے دشمن ہو اس لیے مجبور ہوگا کہ پروردگارِ حقیقی کے حکم سے تمہاری مخالفت کرے، تم اپنی ظاہری تربیت پر تو ایسی اچھی امیدیں باندھتے ہو، مگر شرم نہیں آتی کہ اس ربِ حقیقی کے مقابلہ میں: اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (النازعات: ۲۴) کی آواز بلند کر رہے ہو۔

## وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ؕ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا

اور صبح کو موسیٰ کی ماں کے دل میں قرار نہ رہا قریب تھی کہ ظاہر کردے بے قراری کو اگر نہ ہم نے گرہ دی ہوتی اس کے دل پر

## لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ⑩

اس واسطے کہ رہے یقین کرنے والوں میں

**خلاصہ تفسیر:** اور (ادھر یہ قصہ ہوا کہ) موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کا دل (مختلف خیالات کے ہجوم سے) بے قرار ہو گیا (اور بے قراری بھی ایسی ویسی نہیں بلکہ ایسی سخت بے قراری کہ) قریب تھا کہ (انتہائی بے قراری سے) وہ موسیٰ (علیہ السلام) کا حال (سب پر) ظاہر کر دیتیں اگر ہم ان کے دل کو اس غرض سے مضبوط نہ کئے رہیں کہ یہ (ہمارے وعدہ پر) یقین کئے (بیٹھی) رہیں (غرض بمشکل انہوں نے دل کو سنبھالا اور تدبیر شروع کی جس کا آگے بیان ہے)۔

**وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا:** اللہ تعالیٰ کی طرف یہ وعدہ ہو چکا تھا کہ بچہ بہت جلد تمہارے پاس آجائے گا اس کے باوجود موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی یہ بے قراری اور تردّد اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کاملین میں بھی کبھی طبعی اثرات لوٹ کر آتے ہیں تو اس پر انہیں مغموم نہیں ہونا چاہیے، البتہ کامل کی شان ایسی حالت میں یہ ہے کہ وہ ان طبعی اثرات کے تقاضوں پر عمل نہیں کرتا، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے اپنے قلبی تردّد کا زبان سے اظہار نہیں فرمایا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں قوت دے دی۔

**لَوْلَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا:** اس پر دلالت کرتا ہے کہ اخلاق کی تکمیل کے لیے فقط انسانی قوت طاقت کافی نہیں، بلکہ اس کا مدار اللہ تعالیٰ

کی مدد ونصرت پر ہے۔

* * *

**فائدہ:** موسیٰ علیہ السلام کی والدہ بچہ کو دریا میں ڈال آئیں مگر ماں کی مامتا کہاں چین سے رہنے دیتی، موسیٰ کا رہ رہ کر خیال آتا تھا، دل سے قرار جاتا رہا، موسیٰ کی یاد کے سوا کوئی چیز دل میں باقی نہ رہی، قریب تھا کہ صبر وضبط کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹ جائے اور عام طور پر ظاہر کردیں کہ میں نے اپنا بچہ دریا میں ڈالا ہے کسی کو خبر ہوتو لاؤ، لیکن خدائی الہام: اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (القصص: ۷) کو یاد کر کے تسلی پاتی تھی، یہ خدا ہی کا کام تھا کہ اس کے دل کو مضبوط باندھ دیا کہ خدائی راز قبل از وقت کھلنے نہ پائے، اور تھوڑی دیر بعد خود موسیٰ کی والدہ کو عین الیقین حاصل ہوجائے کہ اللہ کا وعدہ ضرور پورا ہوکر رہتا ہے۔

## وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ ۫ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۙ﴿۱۱﴾

اور کہہ دیا اس (موسی) کی بہن کو پیچھے چلی جا پھر دیکھتی رہی اس کو اجنبی ہو کر اور ان کو خبر نہ ہوئی

**خلاصہ تفسیر:** اور (وہ تدبیر یہ کہ) انہوں نے موسیٰ (علیہ السلام) کی بہن (یعنی اپنی بیٹی سے) کہا ذرا موسیٰ کا سراغ تو لگا، سو (وہ چلیں اور یہ معلوم کر کے صندوق محل میں کھلا ہے محل میں پہنچیں، یا تو ان کی وہاں آمد و رفت ہوگی یا کسی حیلہ سے پہنچیں، اور) انہوں نے موسیٰ (علیہ السلام) کو دور سے دیکھا اور ان لوگوں کو یہ خبر نہ تھی (کہ یہ ان کی بہن ہیں اور اس فکر میں آئی ہیں)۔

**وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ:** اس سے معلوم ہوا کہ اعتدال کے ساتھ تدبیر کرنا توکل کے خلاف نہیں ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جب فرعون کے محل سرا میں صندوق کھلا اور بچہ برآمد ہوا تو شہر میں شہرت ہوگئی، موسیٰ کی والدہ نے اپنی بیٹی کو (جو موسیٰ کی بہن تھی) حکم دیا کہ بچہ کا پتہ لگانے کے لیے چلی جا اور علیحدہ رہ کر دیکھ کیا ماجرہ ہوتا ہے، لڑکی ہوشیار تھی، جہاں بچہ کے گرد بھیڑ لگی تھی وہاں بے تعلق اجنبی بن کر دور سے دیکھتی رہی، کسی کو پتہ نہ لگا کہ اس بچہ کی بہن ہے۔

## وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ

اور روک رکھا تھا ہم نے موسیٰ سے دائیوں کو پہلے سے پھر بولی میں بتلاؤں تم کو ایک گھر والے کہ اس کو پال دیں تمہارے لیے

## وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ﴿۱۲﴾

اور وہ اس کا بھلا چاہنے والے ہیں

**خلاصہ تفسیر:** اور ہم نے پہلے ہی سے (یعنی جب سے صندوق سے نکلے تھے) موسیٰ (علیہ السلام) پر دودھ پلائیوں کی بندش کر رکھی تھی (یعنی کسی کا دودھ نہ لیتے تھے) سو وہ (اس حال کو دیکھ کر موقع پا کر) کہنے لگیں کیا میں تم لوگوں کو کسی ایسے گھرانے کا پتہ بتاؤں جو تمہارے لئے اس بچہ کی پرورش کریں اور وہ (اپنی جبلت کے موافق دل سے) اس کی خیر خواہی کریں (پس ان لوگوں نے ایسے وقت میں کہ دودھ پلانے کی مشکل پڑ رہی تھی اس مشورہ کو غنیمت سمجھا اور اس گھرانے کا پتہ پوچھا، انہوں نے اپنی والدہ کا پتہ بتلا دیا، چنانچہ وہ بلائی گئیں اور موسیٰ علیہ السلام ان کی گود میں دیئے گئے، جاتے ہی دودھ پینا شروع کر دیا اور ان لوگوں کی اجازت سے چین سے اپنے گھر لے آئیں اور گاہے گاہے لے جا کر ان کو دکھلا آتیں)۔

**وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ:** درمنثور میں ابن جریج سے روایت ہے کہ اس بات سے فرعونیوں کو شبہ ہوا کہ یہ عورت اس بچہ کو پہچانتی ہے تو انہوں نے مجبور کیا کہ بتلاؤ یہ بچہ کس کا ہے؟ ورنہ تم کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ اس کی خیر خواہی کریں گے؟ انہوں نے فوراً ذہانت سے جواب دیا کہ: **وھم لہ**

نصحون، اس میں لہٗ کی ضمیر سے بادشاہ مراد ہے، یعنی وہ لوگ سرکاری خیر خواہ ہیں اور دوسرا جواب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی طبیعت سے ہر ایک کے خیر خواہ ہیں، اس لیے اس بچہ کے بھی خیر خواہ ہوں گے۔

درمنثور میں موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا دودھ پلانے پر اجرت لینا منقول ہے، جس پر شبہ ہوتا ہے کہ واجب کام پر اجرت لینا کب جائز ہے؟ ان کے ذمہ تو دودھ پلانا واجب تھا، اس کا ایک جواب یہ ہے کہ شاید اس زمانہ کی شریعت کا یہ حکم نہ ہو، دوسرا جواب یہ ہے کہ کافر حربی کا مال اس کی رضامندی سے لینا خواہ کسی طریقہ سے ہو جائز ہے، تیسرا جواب احقر کے نزدیک یہ ہے کہ اس وقت کسی شریعت کا موجود ہونا ہی ثابت نہیں تو انہوں نے اپنی رائے سے ایسا کیا ہوگا جو کہ شریعت آنے سے پہلے موجب ملامت نہیں، باقی مصلحت اس میں یہ معلوم ہوتی ہے کہ اجرت نہ لینے میں یہ شبہ پکا ہو جاتا کہ شفقت مادری کی وجہ سے ہی اجرت نہیں لے رہی کیونکہ انہی کا بیٹا ہے، چنانچہ اجرت لینے سے یہ شبہ دور کر دیا۔

* * *

**فائدہ:** یعنی فرعون کی بیوی نے اس ملعون کو بھی بچہ کی پرورش پر راضی کر لیا تو دودھ پلانے کی فکر ہوئی اور دائیاں طلب کی گئیں، مگر قدرت نے پہلے ہی سے بند لگا دیا تھا کہ موسیٰ اپنی ماں کے سوا کسی کا دودھ نہ پکڑے، سخت تشویش تھی کہ کہاں سے مرضعہ لائی جائے جس کا دودھ بچہ منہ کو لگا سکے، کسی عورت کا دودھ نہ پیتے تھے، فرعون کے آدمی اسی فکر و تجسس میں تھے کہ موسیٰ کی بہن نے کہا میں تم کو ایک گھرانے کا پتہ بتا سکتی ہوں جو امید ہے بچہ کو پال دیں گے اور جہاں تک ان کی طبائع کا اندازہ ہے، بہت خیر خواہی اور غور و پرداخت سے پالیں گے کیونکہ شریف گھرانا ہے اور بادشاہ کے گھر سے انعام و اکرام کی بڑی توقعات ہوں گی، پھر تربیت میں کمی کیوں کرنے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکی کے مشورہ کے موافق حضرت موسیٰ کی والدہ طلب کی گئیں، بس بچہ کو چھاتی سے لگانا تھا کہ اس نے دودھ پینا شروع کر دیا، فرعون کے گھر والوں کو بہت غنیمت معلوم ہوا کہ بچہ نے ایک عورت کا دودھ قبول کر لیا ہے، بڑی خوشیاں منائی گئیں اور انعام و اکرام کیے گئے، مرضعہ نے عذر کیا کہ میں یہاں نہیں رہ سکتی، اپنے گھر لے جا کر اس کی پرورش کروں گی، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام امن و اطمینان کے ساتھ پھر آغوش مادری میں پہنچ گئے، اور فرعون کے یہاں سے جو روزینہ ان کی ماں کا مقرر ہوا وہ مفت میں رہا۔

فَرَدَدْنٰهُ اِلٰۤى اُمِّهٖ كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا وَ لَا تَحْزَنَ وَ لِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾

پھر ہم نے پہنچا دیا اسکو اسکی ماں کی طرف کہ ٹھنڈی رہے اسکی آنکھ اور غمگین نہ ہو اور جانے کہ اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے [1] پر بہت لوگ نہیں جانتے [2]

**خلاصہ تفسیر:** غرض ہم نے موسیٰ (علیہ السلام کو اس طرح) ان کی والدہ کے پاس (اپنے وعدہ کے موافق) واپس پہنچا دیا تاکہ (اپنی اولاد کو دیکھ کر) ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور تاکہ (فراق کے) غم میں نہ رہیں اور تاکہ (معائنہ کے درجہ میں) اس بات کو (اور زیادہ یقین کے ساتھ) جان لیں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا (ہوتا) ہے لیکن (افسوس کی بات ہے کہ) اکثر لوگ (اس کا) یقین نہیں رکھتے (یہ کفار پر تعریض ہے)۔

**وَ لِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ:** اللہ تعالیٰ کا وعدہ ظاہر ہونے سے پہلے اطمینان کی کیفیت نہ ہونا کمال ایمان کے خلاف نہیں، کیونکہ کمال ایمان تو الہام کے ذریعہ پہلے بھی تھا (یعنی ایک شخص کو اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر ایمان و یقین تو ہے اس کے باوجود قلب کو اطمینان کی کیفیت حاصل نہ ہو تو یہ ایمان و یقین کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ ایسی تشویش فطرت کے طبعی تقاضوں میں شامل ہے جس پر شرعی مواخذہ نہیں ہوتا، یعنی انسانی طبیعت میں یہ چیز داخل ہے کہ یہ خبر کے مقابلہ میں اپنے مشاہدہ پر زیادہ یقین رکھتا ہے، لہٰذا مشاہدہ کی طلب اور خواہش کرنا کمال ایمان کے خلاف نہ ہوا، جیسے حضرت ابراہیم نے اللہ سے مشاہدہ طلب کیا تھا)۔

* * *

**فائدہ:** [1] یعنی اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَیْكِ وَ جَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ (القصص:۷) میں جو دو وعدے کیے تھے ایک تو آنکھوں سے دیکھ لیا کس حیرت انگیز طریقہ سے پورا ہو کر رہا، اور دوسرے کو اسی پر قیاس کرنے کا موقع ملا کہ بلاشبہ وہ بھی اپنے وقت پر پورا ہو کر رہے گا۔

**فائدہ:** [2] یعنی وعدہ اللہ کا پہنچ کر رہتا ہے ہاں بیچ میں بڑے بڑے پھیر پڑ جاتے ہیں اس میں بہت لوگ بے یقین ہونے لگتے ہیں (موضح)

وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَاسْتَوَىٰ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿١٤﴾

اور جب پہنچ گیا اپنے زور پر اور سنبھل گیا دی ہم نے اس کو حکمت اور سمجھ اور اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں نیکی والوں کو

**خلاصہ تفسیر:** اور جب (پرورش پاکر) اپنی بھری جوانی (کی عمر) کو پہنچے اور (جسمانی وعقلی قوت سے) درست ہو گئے تو ہم نے ان کو حکمت اور علم عطا فرمایا (یعنی نبوت سے پہلے ہی فہم سلیم وعقل مستقیم عطا فرمائی جس سے اچھے برے میں امتیاز کر سکیں) اور ہم نیکوکاروں کو یوں ہی صلہ دیا کرتے ہیں (یعنی نیک عمل سے فیضان علمی میں ترقی ہوتی ہے، اس میں اشارہ ہے کہ موسی علیہ السلام ہمیشہ سے نیکوکار تھے، آپ نے فرعون کا طریقہ کبھی اختیار نہ کیا، بلکہ اس سے نفرت تھی)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی موسیٰ علیہ السلام جب اپنی بھر پور جوانی کو پہنچے تو ہم نے ان کو بہت حکمت کی باتیں سجھائیں اور خصوصی علم وفہم عطا فرمایا کیونکہ بچپن ہی سے وہ نیک کردار تھے، ایسے ہونہار کو ہم اسی طرح نوازا کرتے ہیں۔

وَدَخَلَ الْمَدِينَةَ عَلَىٰ حِينِ غَفْلَةٍ مِّنْ أَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ هَٰذَا مِن شِيعَتِهِ

اور آیا شہر کے اندر جس وقت بے خبر ہوئے تھے وہاں کے لوگ ا۔ پھر پائے اس میں دو مرد لڑتے ہوئے یہ ایک اس کے رفیقوں میں

وَهَٰذَا مِنْ عَدُوِّهِ ۖ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِي مِن شِيعَتِهِ عَلَى الَّذِي مِنْ عَدُوِّهِ فَوَكَزَهُ مُوسَىٰ

اور یہ دوسرا اُسکے دشمنوں میں پھر فریاد کی اس سے اس نے جو تھا اس کے رفیقوں میں اسکی جو تھا اس کے دشمنوں میں پھر مکا مارا اُسکو موسیٰ نے

فَقَضَىٰ عَلَيْهِ ۖ قَالَ هَٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ ۖ إِنَّهُ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِينٌ ﴿١٥﴾

پھر اس کو تمام کر دیا بولا یہ ہوا شیطان کے کام سے بیشک وہ دشمن ہے بہکانے والا صریح

**خلاصہ تفسیر:** اور (اسی زمانہ کا ایک واقعہ یہ ہوا کہ ایک بار) موسیٰ (علیہ السلام) شہر میں (یعنی مصر میں کہیں باہر سے) ایسے وقت پہنچے کہ وہاں کے (اکثر) باشندے بے خبر (پڑے سو رہے) تھے (اکثر روایات سے یہ وقت دوپہر کا معلوم ہوتا ہے اور بعض روایات سے کچھ رات گئے کا وقت معلوم ہوتا ہے) تو انہوں نے وہاں دو آدمیوں کو لڑتے دیکھا، ایک تو ان کی برادری (یعنی بنی اسرائیل میں) کا تھا اور دوسرا اُن کے مخالفین (یعنی فرعون کے متعلقین اور ملازمین) میں سے تھا (دونوں کسی بات پر الجھ رہے تھے اور زیادتی فرعون والے آدمی کی تھی) سو وہ جو ان کی برادری کا تھا اس نے (جو) موسیٰ (علیہ السلام کو دیکھا تو ان) سے اس کے مقابلہ میں جو کہ ان کے مخالفین میں سے تھا مدد چاہی (موسیٰ علیہ السلام نے پہلے فرعون کے آدمی کو سمجھایا جب اس پر بھی وہ باز نہ آیا) تو موسیٰ (علیہ السلام) نے (تنبیہ کے طور پر ظلم دفع کرنے کے لیے) اس کو (ایک) گھونسا مارا سو اس کا کام بھی تمام کر دیا (یعنی اتفاق سے وہ مر ہی گیا) موسیٰ (علیہ السلام اس کے خلاف توقع مرجانے سے بہت پچھتائے اور) کہنے لگے کہ یہ تو شیطانی حرکت ہو گئی، بیشک شیطان (بھی آدمی کا) کھلا دشمن ہے کیسی غلطی میں ڈال دیتا ہے۔

**فَوَكَزَهُ مُوسَىٰ فَقَضَىٰ عَلَيْهِ:** یہ فرعون کا آدمی چونکہ کافر حربی تھا اس لیے اس کا قتل فی نفسہ جائز تھا اور قتل عمد نہ تھا جیسا کہ سورہ نمل آیت ۱۱ میں گذر چکا، اور نیز خطا و غلطی سے قتل ہو گیا تھا، مقصود تنبیہ کے طور پر مارنا تھا، لیکن کمال خوف کی وجہ سے خلاف اولی کو بھی گناہ سمجھا اور انبیاء پر شیطان کا تصرف ہونا نہ ہونا سورہ کہف آیت ۶۳ میں اس کی تحقیق گذر چکی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ گناہ کے علاوہ اور کام انبیاء کرام سے شیطان کے تصرف سے

صادر ہو سکتے ہیں اور یہ کام بھی معصیت نہ تھا اس لیے اشکال نہیں۔

* * *

**فائدہ:** لے یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام جوان ہو کر ایک روز شہر میں پہنچے جس وقت لوگ غافل پڑے سو رہے تھے شاید رات کا وقت ہوگا یا دوپہر ہوگی۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ ظَلَمۡتُ نَفۡسِیۡ فَاغۡفِرۡ لِیۡ فَغَفَرَ لَہٗ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۶﴾

بولا اے میرے رب میں نے برا کیا اپنی جان کا (اپنا)، سو بخش مجھ کو پھر اس کو بخش دیا بیشک وہی ہے بخشنے والا مہربان

**خلاصہ تفسیر:** (موسیٰ علیہ السلام نے نادم ہو کر حق تعالیٰ سے) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! مجھ سے قصور ہو گیا، آپ معاف کر دیجئے، سو اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا، بلاشبہ وہ غفور رحیم ہے۔

اگرچہ موسیٰ علیہ السلام کو اس معافی کا علم یقینی طور پر نبوت عطا ہونے کے وقت ہوا جیسا کہ سورہ نمل میں ہے: اِلَّا مَنۡ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسۡنًۢا بَعۡدَ سُوۡٓءٍ فَاِنِّیۡ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ، اور اس وقت خواہ الہام سے معلوم ہو گیا ہو، یا بالکل معلوم نہ ہوا ہو۔

**رَبِّ اِنِّیۡ ظَلَمۡتُ نَفۡسِیۡ فَاغۡفِرۡ لِیۡ:** یہاں پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ قبطی کافر شرعی اصطلاح کے لحاظ سے ایک حربی کافر تھا جس کا قتل عمداً بھی مباح اور جائز تھا، کیونکہ نہ یہ کسی اسلامی حکومت کا ذمی تھا، نہ موسیٰ علیہ السلام سے اس کا کوئی معاہدہ تھا، پھر موسیٰ علیہ السلام نے اس کو عمل شیطان اور گناہ کیوں قرار دیا؟ جواب یہ ہے کہ معاہدہ جیسے قولی اور تحریری ہوتا ہے جیسے عموماً اسلامی حکومتوں میں اہل ذمہ سے معاہدہ یا کسی غیر مسلم حکومت سے صلح کا معاہدہ اور یہ معاہدہ باتفاق واجب العمل اور اس کی خلاف ورزی غدر اور عہد شکنی کے سبب حرام ہوتی ہے اسی طرح معاہدہ عملی بھی ایک قسم کا معاہدہ ہی ہوتا ہے، اس کی بھی پابندی لازمی اور خلاف ورزی عہد شکنی کے مترادف ہے۔

معاہدہ عملی کی صورت یہ ہے کہ جس جگہ مسلمان اور کچھ غیر مسلم کسی دوسری حکومت میں باہمی امن و اطمینان کے ساتھ رہتے بستے ہوں، ایک دوسرے پر حملہ کرنا یا لوٹ مار کرنا طرفین سے غداری سمجھا جاتا ہو تو اس طرح کی معاشرت اور معاملات بھی ایک قسم کا عملی معاہدہ ہوتے ہیں ان کی خلاف ورزی جائز نہیں، خلاصہ یہ ہے کہ قبطی کا قتل اس عملی معاہدہ کی بناء پر اگر بالقصد ہوتا تو جائز نہیں تھا مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے قتل کا ارادہ نہیں کیا تھا، بلکہ اسرائیلی شخص کو اس کے ظلم سے بچانے کے لئے ہاتھ کی ضرب لگائی جو عادۃً سبب قتل نہیں ہوتی، مگر قبطی اس ضرب سے مر گیا تو موسیٰ علیہ السلام کو یہ احساس ہوا کہ اس کو دفع کرنے کے لئے اس ضرب سے کم درجہ بھی کافی تھا، یہ زیادتی میرے لئے درست نہ تھی، اسی لئے اس کو عمل شیطان قرار دے کر اس سے مغفرت طلب فرمائی، اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اگرچہ قبطی کا قتل مباح تھا مگر انبیاء علیہم السلام مباحات میں بھی اہم معاملات میں اس وقت تک اقدام نہیں کرتے جب تک خصوصی طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت و اشارہ نہ ملے، اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خصوصی اجازت کا انتظار کئے بغیر یہ اقدام فرمایا تھا، اس لئے اپنی شان کے مطابق اس کو گناہ قرار دے کر استغفار کیا۔

**فَاغۡفِرۡ لِیۡ فَغَفَرَ لَہٗ:** وہ مقتول فرعون کا آدمی اگرچہ حربی تھا مگر حال کے اعتبار سے معاہد تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قتل کا ارادہ نہ کیا تھا محض ظلم کو دفع کرنا چاہا تھا، تو یہ قتل بلا قصد و ارادہ ہوا، اگرچہ دوسرے طریقہ سے بھی اس ظلم کو دور کرنا ممکن تھا جو غصہ میں سمجھ نہ آیا اس لیے استغفار فرمایا، اس سے چند مسئلے ثابت ہوئے: ① کاملین سے بھی بعض طبعی امور مثلاً غصہ وغیرہ بھی صادر ہو جاتے ہیں ② حسنات الابرار سیئات المقربین اور یہاں وہ حسنہ ظلم کو دفع کرنا تھا ③ کاملین کو خشیت الٰہی دوسروں کی بہ نسبت زیادہ ہوا کرتی ہے جیسا کہ استغفار سے معلوم ہوا۔

* * *

**فائدہ:** حضرت موسیٰ علیہ السلام جب جوان ہوئے، فرعون کی قوم سے بسبب ان کے ظلم و کفر کے بیزار رہتے اور بنی اسرائیل ان کے ساتھ لگے رہتے تھے، ان کی والدہ کا گھر شہر سے باہر تھا، حضرت موسیٰ کبھی وہاں جاتے کبھی فرعون کے گھر آتے، فرعون کی قوم (قبط) ان کی دشمن تھی کہ غیر قوم کا شخص

ہے ایسا نہ ہو کہ زور پکڑ جائے، ایک روز دیکھا کہ دو شخص آپس میں لڑ رہے ہیں، ایک اسرائیلی دو قبطی، اسرائیلی نے موسیٰ کو دیکھ کر فریاد کی کہ مجھے اس قبطی کے ظلم سے چھڑاؤ، کہتے ہیں قبطی فرعون کے مطبخ کا آدمی تھا، موسیٰ پہلے ہی قبطیوں کے ظلم و ستم کو جانتے تھے، اس وقت آنکھ سے اس کی زیادتی دیکھ کر رگِ حمیت پھڑک اٹھی، ممکن ہے سمجھانے بجھانے میں قبطی نے موسیٰ علیہ السلام کو بھی کوئی سخت لفظ کہا ہو، جیسا کہ بعض تفاسیر میں ہے غرض موسیٰ علیہ السلام نے اس کی تادیب و گوشمالی کے لیے ایک گھونسہ رسید کیا ماشاء اللہ بڑے طاقتور جوان تھے ایک ہی گھونسہ میں قبطی نے پانی نہ مانگا، خود موسیٰ علیہ السلام کو بھی اندازہ نہ تھا کہ ایک گھونسہ میں اس کم بخت کا کام تمام ہو جائے گا، پچھتائے کہ بے قصد خون ہو گیا، مانا کہ قبطی کافر حربی تھا، ظالم تھا، اور موسیٰ علیہ السلام کی نیت بھی محض ادب دینے کی تھی، جان سے مار ڈالنے کی نہ تھی، مگر ظاہر ہے اس وقت کوئی معرکہ جہاد نہ تھا، موسیٰ علیہ السلام نے قبطی قوم کو کوئی الٹی میٹم نہیں دیا تھا، بلکہ مصر میں ان کی بود و ماند کا شروع سے جو طرز عمل رہا تھا اس سے لوگ مطمئن تھے کہ وہ یونہی کسی کی جان و مال لینے والے نہیں پھر ممکن ہے غیظ و غضب کے جوش میں معاملہ کی تحقیق بھی سرسری ہوئی ہو اور مکا مارتے وقت پوری طرح اندازہ نہ رہا ہو کہ کتنی ضرب تادیب کے لیے کافی ہے ادھر اس بلا ارادہ قتل سے اندیشہ تھا کہ فرقہ وارانہ اشتعال پیدا ہو کر دوسرے مصائب و فتن کا دروازہ نہ کھل جائے، اس لیے اپنے فعل پر نادم ہوئے، اور سمجھے کہ اس میں کسی درجہ تک شیطان کا دخل ہے انبیاء علیہم السلام کی فطرت ایسی پاک و صاف اور ان کی استعداد اس قدر اعلیٰ ہوتی ہے کہ نبوت ملنے سے پیشتر ہی وہ اپنے ذرہ ذرہ عمل کا محاسبہ کرتے ہیں اور ادنیٰ سی لغزش یا خطائے اجتہادی پر بھی حق تعالیٰ سے رو رو کر معافی مانگتے تھے، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے اپنی تقصیرات کا اعتراف کر کے معافی چاہی جو دے دی گئی اور غالباً اس معافی کا علم ان کو بذریعہ الہام وغیرہ ہوا ہوگا، آخر پیغمبر لوگ نبوت سے پہلے ولی تو ہوتے ہیں۔

قَالَ رَبِّ بِمَآ أَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ أَكُونَ ظَهِيرًا لِّلْمُجْرِمِينَ ﴿١٧﴾

بولا اے رب جیسا تو نے فضل کر دیا مجھ پر پھر میں کبھی نہ ہوں گا مددگار گنہگاروں کا

**خلاصہ تفسیر:** موسیٰ (علیہ السلام) نے (گذشتہ گناہ سے توبہ کے ساتھ آئندہ کے متعلق یہ بھی) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار چونکہ آپ نے مجھ پر (بڑے بڑے) انعامات فرمائے ہیں (جن کا ذکر سورہ طہ میں ہے: **وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَىٰ (الی قولہ) وَلَا تَحْزَنَ**) سو کبھی میں مجرموں کی مدد نہ کروں گا۔

**فَلَنْ أَكُونَ ظَهِيرًا لِّلْمُجْرِمِينَ**: یہاں مجرموں سے مراد وہ ہیں جو دوسروں سے گناہ کراتے ہیں، کیونکہ کسی سے گناہ کرانا یہ بھی جرم ہے، پس اس میں شیطان بھی داخل ہو گیا، وہ گناہ کراتا ہے اور گناہ کرنے والا اس کی مدد کرتا ہے خواہ قصداً یا غلطی سے جیسے اس آیت میں ہے: **وکان الکافر علی ربہ ظہیراً** أي للشيطان، مطلب یہ ہوا کہ میں شیطان کا کہنا کبھی نہ مانوں گا، یعنی جن مواقع میں غلطی کا احتمال بھی ہوگا وہاں احتیاط اور ہوشیاری سے کام لوں گا، اصل مقصود اتنا ہی ہے مگر حکم میں شامل کرنے کے لئے ''مجرمین'' جمع کا صیغہ لایا گیا کہ اوروں کو بھی عام ہو جائے۔

**فَلَنْ أَكُونَ ظَهِيرًا لِّلْمُجْرِمِينَ**: اس سے معلوم ہوا کہ ظالمین کی مدد کرنا جائز نہیں، اور چونکہ عہدہ حکومت کی دعا کرنا یہ بھی ایک قسم کی مدد ہے اس لیے اہل اللہ ظالم کے لیے ایسی دعا نہیں کرتے، اور اگر شدید ضرورت ہو تو اس میں یہ قید لگا دیتے ہیں کہ اگر خیر ہو، جیسے استخارہ میں بھی اسی قید سے دعا مانگی جاتی ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی آپ نے جیسے اپنے فضل سے مجھ کو عزت، راحت، قوت عطا فرمائی اور میری تقصیرات کو معاف کیا اس کا شکر یہ ہے کہ میں آئندہ کبھی مجرموں کا مددگار نہ ہوں گا، شاید اس فریادی (اسرائیلی) کی بھی کچھ تقصیر معلوم ہوئی ہوگی، مجرم اسے کہا ہو، یا مجرمین سے کفار اور ظالم لوگ مراد ہوں، یعنی تیری دی ہوئی قوتوں کو آئندہ بھی کبھی ان کی حمایت و اعانت میں خرچ نہ کروں گا، یا مجرمین سے شیاطین مراد ہوں یعنی شیاطین کے مشن میں ان کا مددگار کبھی نہ بنوں گا کہ وہ وسوسہ اندازی کر کے مجھ سے ایسا کام کرا دیں جس پر بعد کو پچھتانا پڑے، یا اسرائیلی کو مجرم اس حیثیت سے کہا کہ وہ وقوع جرم کا سبب بنا، واللہ تعالیٰ اعلم۔

فَاَصۡبَحَ فِى الۡمَدِيۡنَةِ خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِى اسۡتَنۡصَرَهٗ بِالۡاَمۡسِ يَسۡتَصۡرِخُهٗ ؕ

پھر صبح کو اٹھا اس شہر میں ڈرتا ہوا انتظار کرتا ہوا (راہ دیکھتا) ۱؎ پھر ناگہاں (دیکھا کہ) جس نے کل مدد مانگی تھی اس (موسیٰ) سے آج پھر فریاد کرتا ہے اس سے ۲؎

قَالَ لَهٗ مُوۡسٰٓى اِنَّكَ لَـغَوِىٌّ مُّبِيۡنٌ ۝۱۸

کہا موسیٰ نے بیشک تو بے راہ ہے صریح ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** غرض اس درمیان میں قبطی کے قتل کا چرچا ہو گیا مگر چونکہ اسرائیلی کے سوا کوئی اس راز سے واقف نہ تھا اور اسی کی حمایت میں یہ واقعہ ہوا تھا اس لئے اس نے اظہار نہیں کیا، اس وجہ سے کسی کو اطلاع نہ ہوئی مگر موسیٰ علیہ السلام کو اندیشہ رہا، یہاں تک رات گزری:

پھر موسیٰ (علیہ السلام) کو شہر میں صبح ہوئی خوف اور وحشت کی حالت میں کہ اچانک (دیکھتے کیا ہیں کہ) وہی شخص جس نے کل گزشتہ میں ان سے امداد چاہی ہے وہ پھر ان کو (مدد کے لئے) پکار رہا ہے کہ (کسی اور سے الجھ پڑا تھا) موسیٰ (علیہ السلام یہ دیکھ کر اور کل کے واقعہ کو یاد کر کے اس پر ناخوش ہوئے اور) اس سے فرمانے لگے بیشک تو صریح بدراہ (آدمی) ہے (کہ روز لوگوں سے لڑتا پھرتا ہے)۔

**اِنَّكَ لَـغَوِىٌّ مُّبِيۡنٌ:** موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم یعنی بنی اسرائیل کے آدمی سے فرمایا کہ بیشک تو صریح بدراہ ہے اور دوسری طرف فرعون کے آدمی کو بھی ظلم سے روکنا چاہا، اس سے معلوم ہوا کہ کاملین میں قومی عصبیت نہیں ہوتی بلکہ ان میں کامل عدل ہوتا ہے (یعنی دوست اور دشمن دونوں کے بارے میں انتہائی عدل سے کام لیتے ہیں، نہ تو دوست کی ناجائز طرف داری کرتے ہیں اور نہ مخالف کی بے لگام مخالفت، بلکہ راہ اعتدال پر گامزن رہتے ہیں)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی انتظار کرتے اور راہ دیکھتے تھے کہ مقتول کے وارث فرعون کے پاس فریاد لے گئے ہوں گے دیکھئے کس پر جرم ثابت ہو اور مجھ سے کیا سلوک کریں۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی اسی اسرائیلی کی لڑائی آج کسی اور سے ہو رہی تھی۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی روز ظالموں سے الجھتا ہے اور مجھ کو لڑواتا ہے۔

فَلَمَّآ اَنۡ اَرَادَ اَنۡ يَّبۡطِشَ بِالَّذِىۡ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ يٰمُوۡسٰٓى اَتُرِيۡدُ اَنۡ تَقۡتُلَنِىۡ

پھر جب چاہا کہ ہاتھ ڈالے اس پر جو دشمن تھا ان دونوں کا بول اٹھا (فریاد کرنے والا) اے موسیٰ کیا تو چاہتا ہے کہ خون کرے میرا

كَمَا قَتَلۡتَ نَفۡسًاۢ بِالۡاَمۡسِ ۖ اِنۡ تُرِيۡدُ اِلَّاۤ اَنۡ تَكُوۡنَ جَبَّارًا فِى الۡاَرۡضِ وَمَا تُرِيۡدُ

جیسے خون کر چکا ہے کل ایک جان کا ۱؎ تیرا یہی جی چاہتا ہے کہ زبردستی کرتا پھرے ملک میں اور نہیں چاہتا

اَنۡ تَكُوۡنَ مِنَ الۡمُصۡلِحِيۡنَ ۝۱۹

کہ ہو صلح کرا دینے والا ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** موسیٰ علیہ السلام کو قرائن سے معلوم ہوا ہوگا کہ اس بنی اسرائیلی کی طرف سے بھی کوئی قصہ ہوا ہے لیکن فرعونی کی زیادتی دیکھ کر اس فرعونی کو روکنے کا ارادہ کیا:

سو جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اس پر ہاتھ بڑھایا جو دونوں کا مخالف تھا (مراد فرعون کا آدمی ہے جو اسرائیلی کا بھی مخالف تھا اور موسیٰ علیہ السلام

کا بھی، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے ہیں اور وہ لوگ سب بنی اسرائیل کے مخالف تھے، اگر چہ خاص طور پر موسی علیہ السلام کو اس نے اسرائیلی نہ سمجھا ہو، یا یہ کہ موسی علیہ السلام کی فرعون کے طریقہ سے نفرت مشہور ہوگئی ہو اس لئے فرعون والے ان کے مخالف ہو گئے ہوں، بہرحال جب موسیٰ علیہ السلام نے اس فرعونی پر ہاتھ بڑھایا اور اس سے پہلے اسرائیلی پر خفا ہو چکے تھے تو اس سے اسرائیلی کو شبہ ہوا کہ شاید آج میری خبر لیں گے تو گھبرا کر) وہ اسرائیلی کہنے لگا اے موسیٰ! کیا (آج) مجھ کو قتل کرنا چاہتے ہو جیسا کہ کل ایک آدمی کو قتل کر چکے ہو (معلوم ہوتا ہے کہ) بس تم دنیا میں اپنا زور بٹھلانا چاہتے ہو اور صلح (اور ملاپ) کروانا نہیں چاہتے (یہ بات فرعون کے اس آدمی نے سنی، قاتل کی تلاش ہو رہی تھی اتنا سراغ لگ جانا بہت تھا، فوراً فرعون کو خبر پہنچا دی، فرعون اپنے آدمی کے قتل ہو جانے سے برہم تھا، یہ سن کر غصہ میں آ گیا اور شاید اس سے اس کو اپنے خواب کا اندیشہ قوی ہو گیا ہو کہ کہیں وہ شخص یہی نہ ہو، خصوصاً اگر موسیٰ علیہ السلام کا فرعونی طریقہ سے نفرت کرنا بھی فرعون کو معلوم ہو تو کچھ عداوت اس سبب سے ہوگی اس پر مزید یہ واقعہ ہو گیا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ ہاتھ ڈالنا چاہا اس ظالم پر بول اٹھا مظلوم جانا کہ زبان سے مجھ پر غصہ کیا ہے، ہاتھ بھی مجھ پر چلائیں گے، وہ کل کا خون چھپا رہا تھا کہ کس نے کیا، آج اس کی زبان سے مشہور ہوا۔ (موضح)

**فائدہ:** ۲؎ یعنی زورزبردستی سے قتل کرنا ہی آتا ہے، یہ نہیں کہ سمجھا بجھا کر فریقین میں صلح کروا دے۔

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى ۫ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ

اور آیا شہر کے پرلے سرے سے ایک مرد دوڑتا ہوا کہا اے موسیٰ دربار والے مشورہ کرتے ہیں تجھ پر کہ تجھ کو مار ڈالیں سو نکل جا

اِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۰﴾ فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ ۫ قَالَ رَبِّ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۱﴾ ع ۸

میں تیرا بھلا چاہنے والا ہوں ۱؎ پھر نکلا وہاں سے ڈرتا ہوا راہ دیکھتا بولا اے رب بچا لے مجھ کو اس قوم بے انصاف سے

**خلاصہ تفسیر:** بہرحال فرعون نے اپنے درباریوں کو مشورہ کیلئے جمع کیا اور اخیر رائے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی قرار پائی:

اور (اس مجمع میں) ایک شخص (موسیٰ علیہ السلام کے محب اور خیر خواہ تھے وہ) شہر کے (اس) کنارے سے (جہاں یہ مشورہ ہو رہا تھا موسیٰ علیہ السلام کے پاس نزدیک کی گلیوں سے) دوڑتے ہوئے آئے (اور) کہنے لگے کہ اے موسیٰ! اہل دربار آپ کے متعلق مشورہ کر رہے ہیں کہ آپ کو قتل کر دیں، سو آپ (یہاں سے) چل دیجئے میں آپ کی خیر خواہی کر رہا ہوں، پس (یہ سن کر) موسیٰ (علیہ السلام) وہاں سے (کسی طرف کو) نکل گئے، خوف اور وحشت کی حالت میں (اور چونکہ راستہ معلوم نہ تھا دعا کے طور پر) کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار! مجھ کو ان ظالم لوگوں سے بچا لیجئے (اور امن کی جگہ پہنچا دیجئے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی خون کی خبر فرعون کو پہنچ گئی، وہاں مشورے ہوئے کہ غیر قوم کے آدمی کا یہ حوصلہ ہو گیا ہے کہ شاہی قوم کے افراد اور سرکاری ملازموں کو قتل کر ڈالے، سپاہی دوڑائے گئے کہ موسیٰ کو گرفتار کر کے لائیں، شاید مل جاتے تو قتل کرتے، اسی مجمع میں سے ایک نیک طینت کے دل میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی خیر خواہی ڈال دی، وہ جلدی کر کے مختصر راستہ سے بھاگا ہوا آیا، اور حضرت موسیٰ کو واقعہ کی اطلاع کر کے مشورہ دیا کہ تم فوراً شہر سے نکل جاؤ، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: "یہ سنایا ہمارے پیغمبر کو کہ لوگ ان کی جان لینے کی فکر کریں گے اور وہ بھی وطن سے نکلیں گے، چنانچہ کافر سب اکٹھے ہوئے تھے کہ ان پر مل کر چوٹ کریں، اسی رات میں آپ وطن سے ہجرت کر گئے"۔

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّیْٓ اَنْ یَّهْدِیَنِیْ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ﴿۲۲﴾

اور جب منہ کیا مدین کی سیدھ پر بولا امید ہے کہ میرا رب لے جائے مجھ کو سیدھی راہ پر

**خلاصہ تفسیر**: اور جب موسیٰ (علیہ السلام یہ دعا کر کے خدا پر بھروسہ کر کے ایک سمت کی طرف چلے تو غیبی الہام وتائید سے) مدین کی طرف ہو لئے (چونکہ راستہ معلوم نہ تھا اس لئے دل کو تسلی اور قرار دینے کے لئے آپ ہی آپ) کہنے لگے کہ امید ہے کہ میرا رب مجھ کو (کسی مقام امن کا) سیدھا راستہ چلائے گا (چنانچہ ایسا ہی ہوا)۔

* * *

**فائدہ**: حضرت موسیٰ مصر سے نکل کھڑے ہوئے، راہ سے واقف نہ تھے، اللہ سے درخواست کی کہ سیدھی راہ پر چلائے، اس نے "مدین" کی سیدھی سڑک پر ڈال دیا، جہاں پہنچا کر انھیں امن واطمینان کے ساتھ متاہل بنانا تھا، صرف یہ ہی نہیں، بلکہ بہت دور تک کی سیدھی راہ پر لے چلنا تھا۔

وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْیَنَ وَجَدَ عَلَیْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ یَسْقُوْنَ ۟ۙ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَیْنِ

اور جب پہنچا مدین کے پانی پر پایا وہاں ایک جماعت کو لوگوں کی پانی پلاتے ہوئے ۱ اور پایا ان سے ورے دو عورتوں کو

تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ؕ قَالَتَا لَا نَسْقِیْ حَتّٰی یُصْدِرَ الرِّعَآءُ ٚ

کہ روکے ہوئے کھڑی تھیں اپنی بکریاں (اپنے جانور) بولا تمہارا کیا حال ہے، بولیں ہم نہیں پلاتیں پانی چرواہوں کے پھیر لیجانے تک ۲

وَاَبُوْنَا شَیْخٌ كَبِیْرٌ ﴿۲۳﴾

اور ہمارا باپ بوڑھا ہے بڑی عمر کا ۳

**خلاصہ تفسیر**: (موسیٰ علیہ السلام مدین جا پہنچے) اور جب مدین کے پانی (یعنی کنوئیں) پر پہنچے تو اس پر (مختلف) آدمیوں کا ایک مجمع دیکھا جو (اس کنوئیں سے پانی کھینچ کھینچ کر اپنے جانوروں کو) پانی پلا رہے تھے اور ان لوگوں سے ایک طرف (الگ) دو عورتیں دیکھیں کہ وہ (اپنی بکریاں) روکے کھڑی ہیں، موسیٰ (علیہ السلام) نے (ان سے) پوچھا تمہارا کیا مطلب ہے؟ وہ دونوں بولیں کہ (ہمارا معمول یہ ہے کہ) ہم (اپنے جانوروں کو) اس وقت تک پانی نہیں پلاتے جب تک کہ یہ چرواہے (جو کنوئیں پر پانی پلا رہے ہیں) پانی پلا کر (جانوروں کو) ہٹا کر نہ لے جائیں (اس معمول کا ایک سبب تو حیا تھا، دوسرے مردوں سے مزاحمت اور ان کے درمیان گھسنا خواتین سے کب ہوسکتا ہے) اور (اس حالت میں تو ہم آتے بھی نہیں مگر) ہمارے باپ بہت بوڑھے ہیں (اور گھر پر اور کوئی کام کرنے والا ہی نہیں اور کام ضروری ہے اس مجبوری سے ہم کو آنا پڑتا ہے)۔

اس قصہ سے بے پردگی کا شبہ نہ کیا جائے، کیونکہ ضرورت کے لیے عورت کو نکلنا جائز ہے جبکہ سارا بدن چھپالیا جائے۔

* * *

**فائدہ**: ۱ "مدین"، مصر سے آٹھ دس دن کی راہ ہے، وہاں پہنچے بھوکے پیاسے، دیکھا کنوئیں پر لوگ اپنے مواشی کو پانی پلا رہے ہیں۔

**فائدہ**: ۲ وہ دونوں بکریاں لے کر حیا سے کنارے کھڑی تھیں، اتنی قوت نہ تھی کہ مجمع کو ہٹا دیں یا بذات خود بھاری ڈول نکال لیں، شاید اوروں سے بچا ہوا پانی پلاتی ہوں۔

**فائدہ**: ۳ یعنی ہمارا باپ جوان اور توانا ہوتا تو ہم کو آنا نہ پڑتا، وہ خود ان مردوں سے نبٹ لیا کرتا۔

فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰىٓ اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ﴿۲۴﴾

پھر اس نے پانی پلادیا انکے جانوروں کو ۱؎ پھر ہٹ کر آیا چھاؤں (سایہ) کیطرف، بولا اے رب تو جو چیز اتارے میری طرف اچھی میں اسکا محتاج ہوں ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** پس (یہ سن کر) موسیٰ (علیہ السلام کو رحم آیا اور انہوں نے) ان کے لئے پانی (کھینچ کر ان کے جانوروں کو) پلایا (وران کو انتظار اور پانی کھینچنے کی تکلیف سے بچایا) پھر (وہاں سے) ہٹ کر (ایک) سایہ (کی جگہ) میں جا بیٹھے (خواہ کسی پہاڑ کا سایہ ہو، یا کسی درخت کا) پھر (جناب باری میں) دعا کی کہ اے میرے پروردگار! (اس وقت) جو نعمت بھی (کم یا زیادہ) آپ مجھ کو بھیج دیں میں اس کا (سخت) حاجت مند ہوں (کیونکہ اس سفر میں کچھ کھانے پینے کو نہ ملا تھا)۔

فَسَقٰى لَهُمَا: اس سے معلوم ہوا کہ کاملین اور بڑے لوگوں کو خدمت خلق سے عار نہیں ہوتی۔

- رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ: موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا سے کاملین کی شان معلوم ہوئی کہ وہ اپنی ہر چھوٹی بڑی حاجت کا اللہ کے سامنے اظہار کردیتے ہیں، زہد کے دعوے داران متکبروں کی طرح نہیں ہوتے کہ وہ حق تعالیٰ کی نعمتوں سے استغنا بلکہ نفرت ظاہر کیا کرتے ہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ پیغمبروں کے فطری جذبات وملکات ایسے ہوتے ہیں، تھکے ماندے، بھوکے پیاسے تھے مگر غیرت آئی کہ میری موجودگی میں یہ صنف ضعیف ہمدردی سے محروم رہے، اٹھے اور مجمع کو ہٹا کر یا ان کے بعد کنوئیں سے تازہ پانی نکال کر لڑکیوں کے جانوروں کو سیراب کیا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی اے اللہ کسی عمل کی اجرت مخلوق سے نہیں چاہتا، البتہ تیری طرف سے کوئی بھلائی پہنچے اس کا ہمہ وقت محتاج ہوں، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''عورتوں نے پہچانا کہ چھاؤں پکڑتا ہے مسافر ہے، دور سے آیا ہوا، تھکا، بھوکا، جا کر اپنے باپ سے کہا (وہ حضرت شعیب علیہ السلام تھے علی القول المشہور) ان کو درکار تھا کہ کوئی مرد ملے نیک بخت جو بکریاں تھامے اور بیٹی بھی بیاہ دیں''۔ (موضح)

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ۫ قَالَتْ اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ

پھر آئی اس کے پاس ان دونوں میں سے ایک چلتی تھی شرم سے ۱؎ بولی میرا باپ تجھ کو بلاتا ہے کہ بدلے میں دے حق اس کا کہ تو نے پانی پلادیا

لَنَا ؕ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ٚ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۵﴾

ہمارے جانوروں کو ۲؎ پھر جب پہنچا اس کے پاس اور بیان کیا اس سے احوال، کہا مت ڈر، بچ آیا تو اس قوم بے انصاف سے ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** حق تعالیٰ نے اس کا یہ سامان کیا کہ وہ دونوں بیٹیاں اپنے گھر لوٹ کر گئیں تو باپ نے معمول سے جلدی آجانے کی وجہ دریافت کی، انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کا پورا قصہ بیان کیا انہوں نے ایک لڑکی کو بھیجا کہ ان کو بلا لاؤ:

پھر موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس ایک لڑکی آئی کہ شرماتی ہوئی چلتی تھی (جو کہ شرفاء کی طبعی حالت ہے اور آ کر) کہنے لگی کہ میرے والد تم کو بلاتے ہیں تا کہ تم کو اس کا صلہ دیں جو تم نے ہماری خاطر (ہمارے جانوروں کو) پانی پلادیا تھا۔

(یہ ان صاحبزادی کو اپنے والد کی عادت سے معلوم ہوا ہوگا کہ احسان کا بدلہ ضرور دیا کرتے ہیں، موسیٰ علیہ السلام ساتھ ہو لئے، اگرچہ موسیٰ علیہ السلام کا مقصود یقیناً اپنی خدمت کا معاوضہ لینا نہ تھا، لیکن اس حالت میں امن کی جگہ اور کسی شفیق رفیق کی تلاش میں ضرور تھے، اور اگر بھوک کی شدت بھی اس جانے کا ایک جزوی سبب ہو تو مضائقہ نہیں، لیکن اس کو اجرت سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ کسی کا خود مہمان بن جانا خاص کر ضرورت کے وقت بالخصوص سخی اور شریف کا مہمان بن جانا تو اس میں کچھ ذلت نہیں ہے، چہ جائیکہ دوسرے کی درخواست پر ضیافت قبول کر لینا، راستہ میں موسیٰ علیہ السلام

نے ان بی بی سے فرمایا کہ تم میرے پیچھے ہوجاؤ، میں اولاد ابراہیم سے ہوں، اجنبی عورت کو بے وجہ بے قصد دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا، غرض اسی طرح ان بزرگ کے پاس پہنچے)۔

سو جب ان کے پاس پہنچے اور ان سے تمام حال بیان کیا تو انہوں نے (تسلی دی اور) کہا کہ (اب) اندیشہ نہ کرو تم ظالم لوگوں سے بچ آئے (کیونکہ اس مقام پر فرعون کی حکومت اور عملداری نہ تھی)۔

اِنَّ اَبِیۡ یَدۡعُوۡكَ لِیَجۡزِیَكَ اَجۡرَ: اس لڑکی کی یہ بات کہ ''میرے والد تم کو بلاتے ہیں تاکہ تم کو اس کا صلہ دیں'' اسے سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چلا آنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اگر کوئی کام بدلے اور معاوضہ کے اردہ سے نہ کیا جائے تو پھر اس کام کے بعد کچھ عوض یا بدلہ قبول کر لیا جائے تو یہ اخلاق کے منافی نہیں (یعنی اگر کسی نے کسی شخص کی خدمت اللہ تعالی کو راضی کرنے کے لیے مکمل اخلاص کے ساتھ کی اور اس خدمت سے کوئی دنیاوی نفع بھی مقصود نہیں تھا اور اس سب کے باوجود اگر کچھ معاوضہ مل جائے تو اس کے لینے میں کوئی مضائقہ نہیں)۔

* * *

**فائدہ:** لے جیسا کہ شریف اور پاکباز عورتوں کا قاعدہ ہے، کہتے ہیں کہ شرم کے مارے چہرہ چھپا کر بات کی۔

**فائدہ:** ٢ے حضرت موسیٰ اللہ تعالیٰ سے خیر طلب کر رہے تھے، اس نے اپنے فضل سے غیر متوقع طور پر خیر بھیجی، تو قبول کیوں نہ کرتے، اٹھ کر عورت کے ساتھ ہو لیے، لکھتے ہیں کہ چلتے وقت اس کو ہدایت فرمائی کہ میں آگے چلوں گا تم پیچھے آؤ، مبادا اجنبیہ پر عمدًا نظر کرنے کی نوبت آئے، چنانچہ وہ پیچھے پیچھے راستہ بتلاتی ان کو لے کر گھر پہنچی۔

**فائدہ:** ٣ے موسیٰ علیہ السلام نے حضرت شعیب کو اپنی ساری سرگذشت کہہ سنائی، انہوں نے تسلی دی اور فرمایا کہ اب تو اس ظالم قوم کے پنجہ سے بچ نکلا، ان شاء اللہ تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، (مدین فرعون کی حدود و سلطنت سے باہر تھا)۔

قَالَتۡ اِحۡدٰىهُمَا یٰۤاَبَتِ اسۡتَاۡجِرۡهُ ۫ اِنَّ خَیۡرَ مَنِ اسۡتَاۡجَرۡتَ الۡقَوِیُّ الۡاَمِیۡنُ ﴿۲۶﴾

بولی ان دونوں میں سے ایک اے باپ اس کو نوکر رکھ لے، البتہ بہتر نوکر جس کو تو رکھنا چاہے وہ ہے جو زور آور ہو امانت دار

**خلاصہ تفسیر:** (پھر) ایک لڑکی نے کہا کہ ابا جان! (آپ کو آدمی کی ضرورت ہے اور ہم سیانی ہوگئیں، ہمارا اب گھر میں رہنا مناسب ہے تو) آپ ان کو نوکر رکھ لیجئے، کیونکہ اچھا نوکر وہ شخص ہے جو مضبوط (ہو اور) امانت دار (بھی) ہو (اور ان میں دونوں صفتیں ہیں، چنانچہ ان کی قوت پانی کھینچنے سے اور امانت ان کے برتاؤ سے، خصوصاً راستہ میں عورت کو پیچھے کر دینے سے معلوم ہوئی تھی اور اپنے باپ سے بھی بیان کیا تھا)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی موسیٰ میں دونوں باتیں موجود ہیں، زور دیکھا ڈول نکالنے یا مجمع کو ہٹا دینے سے اور امانتدار سمجھا بے طمع اور عفیف ہونے سے۔

قَالَ اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ اَنۡ اُنۡكِحَكَ اِحۡدَی ابۡنَتَیَّ هٰتَیۡنِ عَلٰۤی اَنۡ تَاۡجُرَنِیۡ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ ۚ فَاِنۡ اَتۡمَمۡتَ

کہا میں چاہتا ہوں کہ بیاہ دوں تجھ کو ایک بیٹی اپنی ان دونوں میں سے اس شرط پر کہ تو میری نوکری کرے آٹھ برس لے پھر اگر تو پورے کر دے

عَشۡرًا فَمِنۡ عِنۡدِكَ ۚ وَمَاۤ اُرِیۡدُ اَنۡ اَشُقَّ عَلَیۡكَ ؕ سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۲۷﴾

دس برس تو وہ تیری طرف سے ہے ٢ے اور میں نہیں چاہتا کہ تجھ پر تکلیف ڈالوں تو پائے گا مجھ کو اگر اللہ نے چاہا نیک بختوں سے ٣ے

**خلاصہ تفسیر:** (اس پر) وہ (بزرگ موسیٰ علیہ السلام سے) کہنے لگے میں چاہتا ہوں کہ ان دو لڑکیوں میں سے ایک کو تمہارے ساتھ بیاہ دوں اس شرط پر کہ تم آٹھ سال میری نوکری کرو (اور اس نوکری کا معاوضہ وہی نکاح ہے، حاصل یہ کہ آٹھ سال کی خدمت اس نکاح کا مہر ہے) پھر

اگر تم دس سال پورے کردو تو یہ تمہاری طرف سے (احسان) ہے (یعنی میری طرف سے شرط نہیں) اور میں (اس معاملہ میں) تم پر کوئی مشقت ڈالنا نہیں چاہتا (یعنی کام لینے اور وقت کی پابندی وغیرہ میں اسی طرح معاملہ کی دیگر جزئیات میں آسانی برتوں گا اور) تم مجھ کو ان شاء اللہ تعالیٰ خوش معاملہ پاؤ گے۔

قَالَ اِنِّیْٓ اُرِیْدُ اَنْ اُنْکِحَکَ: یہ بزرگ والد حضرت شعیب علیہ السلام ہیں اور چونکہ موسیٰ علیہ السلام کا ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہونا ان کو معلوم ہو گیا تھا اس لیے یہ شبہ نہیں ہوسکتا کہ انہوں نے نکاح سے قبل کفاءت کی تحقیق کیوں نہ کی، حضرت شعیب علیہ السلام نے دونوں لڑکیوں میں سے کسی کو معین کر کے گفتگو نہیں فرمائی، بلکہ اس کو مبہم رکھا کہ ان میں سے کسی ایک کو آپ کے نکاح میں دینے کا ارادہ ہے، مگر چونکہ یہ گفتگو باقاعدہ عقد نکاح کی گفتگو نہ تھی جس میں ایجاب وقبول گواہوں کے سامنے ہونا شرط ہے، بلکہ معاملہ کی گفتگو تھی کہ آپ کو آٹھ سال کی نوکری اس نکاح کے عوض میں منظور ہو تو ہم نکاح کر دیں گے۔

عَلٰٓی اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ: یہ آٹھ سال کی ملازمت وخدمت نکاح کا مہر قرار دیا گیا، اس میں ائمہ فقہاء کا اختلاف ہے کہ شوہر اپنی بیوی کی خدمت وملازمت کو اس کا مہر قرار دے سکتا ہے یا نہیں؟ عوام کے لئے اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اگر یہ معاملہ مہر کا شریعت محمدیہ کے لحاظ سے درست نہ ہو تو ہوسکتا ہے کہ شریعت شعیب علیہ السلام میں درست ہو اور شرائع انبیاء میں ایسے فروعی فرق ہونا نصوص قطعیہ سے ثابت ہے، امام اعظم ابوحنیفہؒ سے ظاہر الروایت میں یہی صورت منقول ہے کہ خدمت زوجہ کو مہر نہیں بنایا جاسکتا مگر ایک روایت جس پر علماء متاخرین نے فتویٰ دیا ہے یہ ہے کہ خود بیوی کی خدمت کو مہر بنانا تو شوہر کی تکریم واحترام کے خلاف ہے مگر بیوی کا کوئی ایسا کام جو گھر سے باہر کیا جاتا ہے جیسے مواشی چرانا یا کوئی تجارت کرنا اگر اس میں شرائط اجارہ کے مطابق مدت معین کر دی گئی ہو جیسا کہ اس واقعہ میں آٹھ سال کی مدت معین ہے تو اس کی صورت یہ ہوگی کہ اس مدت کی ملازمت کی تنخواہ جو بیوی کے ذمہ لازم ہو تو اس تنخواہ کو مہر قرار دینا جائز ہے۔

ہاں! ایک دوسرا سوال یہاں یہ ہوتا ہے کہ مہر تو بیوی کا حق ہے بیوی کے باپ یا کسی عزیز کو بغیر اجازت زوجہ مہر کی رقم نقد بھی دے دی جائے تو مہر ادا نہیں ہوتا، اس واقعہ میں اَنْ تَاْجُرَنِیْ کے الفاظ اس پر شاہد ہیں کہ والد نے ان کو اپنے کام کے لئے ملازم رکھا تو ملازمت کا جو معاوضہ ہے وہ والد کو ملا، تو یہ زوجہ کا مہر کیسے بن گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بکریاں لڑکیوں ہی کی ملک ہوں اور یہ ملازمت کا فائدہ اس حیثیت سے خود لڑکی کو پہنچا، دوسرے اگر باپ ہی کا کام انجام دیا اور اس کی تنخواہ والد کے ذمہ لازم ہوئی تو یہ زر مہر لڑکی کا ہو گیا لڑکی کی اجازت سے والد کو بھی اس کا استعمال درست ہے، یہاں ظاہر ہے کہ یہ معاملہ لڑکی کی اجازت سے ہوا ہے۔

عَلٰٓی اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ: یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ نوکری یا مزدوری یا دیگر اسباب معاش اختیار کرنا توکل کے خلاف نہیں، البتہ جو شخص حصول علم میں مشغول ہو کر عمل کے لیے فارغ نہ ہو سکے اور وہ تحمل بھی کرسکتا ہو تو اس کے لیے اسباب کا ترک کرنا مستحسن ہے۔

* * *

**فائدہ**: ۱ شاید یہ ہی خدمت لڑکی کا مہر تھا، ہمارے حنفیہ کے ہاں اب بھی اگر بالغہ راضی ہو تو اس طرح کی خدمت اقارب مہر ٹھہر سکتا ہے (کذا نقله الشيخ الأنور أطال الله بقاءه) یہاں صرف نکاح کی ابتدائی گفتگو مذکور ہے، ظاہر ہے حضرت شعیب نے نکاح کرتے وقت ایک لڑکی کی تعیین اور اس کی رضامندی حاصل کر لی ہوگی۔

**فائدہ**: ۲ یعنی کم از کم آٹھ برس میری خدمت میں رہنا ضروری ہوگا، اگر دو سال اور زائد رہے تو تمہارا تبرع ہے۔

**فائدہ**: ۳ یعنی کوئی سخت خدمت تم سے نہ لوں گا، تم کو میرے پاس رہ کر ان شاء اللہ خود تجربہ ہو جائے گا کہ میں بری طبیعت کا آدمی نہیں، بلکہ خدا کے فضل سے نیک بخت ہوں، میری صحبت میں تم گھبراؤ گے نہیں، بلکہ مناسبت طبع کی وجہ سے انس حاصل کرو گے۔

عٓ قَالَ ذٰلِكَ بَيۡنِىۡ وَبَيۡنَكَ‌ؕ اَيَّمَا الۡاَجَلَيۡنِ قَضَيۡتُ فَلَا عُدۡوَانَ عَلَىَّ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوۡلُ وَكِيۡلٌ‏ ﴿۲۸﴾

بولا یہ وعدہ ہو چکا میرے اور تیرے بیچ، جونسی مدت ان دونوں میں پوری کر دوں سو زیادتی نہ ہو مجھ پر، اور اللہ پر بھروسہ اس چیز کا جو ہم کہتے ہیں

**خلاصہ تفسیر:** موسیٰ (علیہ السلام رضا مند ہو گئے اور) کہنے لگے کہ (بس تو) یہ بات میرے اور آپ کے درمیان (پکی) ہو چکی، میں ان دونوں مدتوں میں سے جس (مدت) کو بھی پورا کر دوں مجھ پر کوئی جبر نہ ہوگا، اور ہم جو (معاملہ) کی بات چیت کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کا گواہ (کافی) ہے (اس کو حاضر ناظر سمجھ کر عہد پورا کرنا چاہئے، یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ گواہ کافی ہے نکاح کے لیے کسی اور گواہ کی ضرورت نہیں)۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے معاہدہ کرلیا، آگے یہ خود بخود ظاہر ہے کہ باقاعدہ نکاح کیا گیا ہوا اور قرآن کریم عموماً قصہ کے ان اجزاء کو ذکر نہیں کرتا جن کا وقوع سیاق وسباق سے ظاہر اور یقینی ہو، اس تحقیق کی بناء پر یہاں یہ شبہ نہیں ہوسکتا کہ زوجہ منکوحہ کو متعین کئے بغیر نکاح کیسے ہو گیا یا گواہوں کے بغیر کیسے ہو گیا، اور اس معاہدہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسی وقت نکاح ہو گیا ہو، بلکہ کسی دوسرے وقت گواہوں کے سامنے ہوا ہوگا۔

* * *

**فائدہ:** یعنی مجھے اختیار ہوگا کہ آٹھ برس رہوں یا دس برس، بہر حال جو معاہدہ ہو چکا خدا کے بھروسہ پر مجھے منظور ہے، اللہ کو گواہ بنا کر معاملہ ختم کرتا ہوں، احادیث میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بڑی مدت (یعنی دس برس) پورے کیے۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''ہمارے حضرت ﷺ بھی وطن سے نکلے، سو آٹھ برس پیچھے آ کر مکہ فتح کیا، اگر چاہتے اسی وقت کافروں سے شہر خالی کرا لیتے لیکن اپنی خوشی سے دس برس پیچھے کافروں سے پاک کیا''۔

فَلَمَّا قَضٰى مُوۡسَى الۡاَجَلَ وَسَارَ بِاَهۡلِهٖۤ اٰنَسَ مِنۡ جَانِبِ الطُّوۡرِ نَارًا‌ ۚ قَالَ لِاَهۡلِهِ امۡكُثُوۡۤا اِنِّىۡۤ

پھر جب پوری کر چکا موسیٰ وہ مدت اور لے کر چلا اپنے گھر والوں کو دیکھی کوہ طور کی طرف سے ایک آگ کہا اپنے گھر والوں کو ٹھہرو میں نے

اٰنَسۡتُ نَارًا لَّعَلِّىۡۤ اٰتِيۡكُمۡ مِّنۡهَا بِخَبَرٍ اَوۡ جَذۡوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمۡ تَصۡطَلُوۡنَ‏ ﴿۲۹﴾ فَلَمَّاۤ اَتٰٮهَا نُوۡدِىَ

دیکھی ہے ایک آگ شاید لے آؤں تمہارے پاس وہاں کی کچھ خبر یا انگارا آگ کا تاکہ تم تاپو (سینکو)، پھر جب پہنچا اس کے پاس آواز ہوئی

مِنۡ شَاطِیٴِ الۡوَادِ الۡاَيۡمَنِ فِى الۡبُقۡعَةِ الۡمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنۡ يّٰمُوۡسٰٓى اِنِّىۡۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۙ‏ ﴿۳۰﴾

میدان کے داہنے کنارے سے برکت والے تختہ (جگہ) میں ایک درخت سے [1] کہ اے موسیٰ میں ہوں اللہ جہان کا رب

**خلاصہ تفسیر:** غرض جب موسیٰ (علیہ السلام) اس مدت کو پورا کر چکے اور (شعیب علیہ السلام کی اجازت سے) اپنی بیوی کو لے کر (مصر یا شام کی طرف) روانہ ہوئے تو (ایک رات ایسا اتفاق ہوا کہ سردی بھی تھی اور راستہ بھی بھول گئے اس وقت) ان کو کوہ طور کی طرف سے ایک (روشنی بشکل) آگ دکھلائی دی، انہوں نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ تم (یہاں ہی) ٹھہرے رہو، میں نے ایک آگ دیکھی ہے (میں وہاں جاتا ہوں) شاید میں تمہارے پاس وہاں سے (راستہ کی) کچھ خبر لاؤں یا کوئی آگ کا (دہکتا ہوا) انگارا لے آؤں تاکہ تم سینک لو۔

سو وہ جب اس آگ کے پاس پہنچے تو ان کو اس میدان کے داہنی جانب سے (جو کہ موسیٰ علیہ السلام کی داہنی جانب تھی) اس مبارک مقام میں ایک درخت میں سے آواز آئی کہ اے موسیٰ! میں رب العالمین ہوں۔

* * *

**فائدہ:** [1] یہ وہ ہی درخت تھا جس پر آگ بھڑکتی ہوئی نظر آئی۔

وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ؕ

اور یہ کہ ڈال دے اپنی لاٹھی پھر جب دیکھا اسکو پھنپھناتے (پھن ہلاتے جیسے پتلا سانپ) جیسے سانپ کی سٹک الٹا پھرا منہ موڑ کر اور نہ دیکھا پیچھے پھر کر

يٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۣ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ﴿۳۱﴾

اے موسیٰ آگے آ اور مت ڈر تجھ کو کچھ خطرہ نہیں۔

**خلاصہ تفسیر:** اور یہ (بھی آواز آئی) کہ تم اپنا عصا ڈال دو (چنانچہ انہوں نے ڈال دیا اور وہ سانپ بن کر چلنے لگا) سو انہوں نے جب اس کو لہراتا ہوا دیکھا جیسا پتلا سانپ (تیز) ہوتا ہے تو پشت پھیر کر بھاگے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا (حکم ہوا کہ) اے موسیٰ! آگے آؤ اور ڈرو مت (ہر طرح) امن میں ہو (یہ کوئی ڈر کی بات نہیں بلکہ تمہارا معجزہ ہے)۔

اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۫ وَّاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ

ڈال اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں نکل آئے سفید ہو کر نہ کہ کسی برائی سے [1] اور ملا لے اپنی طرف اپنا بازو ڈر سے [2]

فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۳۲﴾

سو یہ دو سندیں ہیں تیرے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے سرداروں پر [3] بیشک وہ تھے لوگ نافرمان

**خلاصہ تفسیر:** (اور دوسرا معجزہ اور عنایت ہوتا ہے کہ) تم اپنا ہاتھ گریبان کے اندر ڈالو (اور پھر نکالو) وہ بلا کسی مرض کے نہایت روشن ہو کر نکلے گا اور (جس طرح عصا کے بدل جانے سے خوف ہوا تھا اگر اس معجزہ سے بھی طبعاً خوف اور حیرت پیدا ہو تو) خوف (ختم کرنے) کے واسطے اپنا (وہ) ہاتھ (پھر) اپنے (گریبان اور بغل) سے (پہلے کی طرح) ملا لینا (تاکہ وہ پھر اصلی حالت پر ہو جائے گا اور پھر طبعی خوف بھی نہ ہوگا) سو یہ (تمہاری نبوت کی) دو سندیں (اور دلیلیں) ہیں تمہارے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس جانے کے واسطے (جس کا تم کو حکم کیا جاتا ہے کیونکہ) وہ بڑے نافرمان لوگ ہیں۔

* * *

**فائدہ:** [1] شروع رکوع سے یہاں تک کے مفصل واقعات سورہ طٰہٰ وغیرہ میں گزر چکے ملاحظہ کر لیے جائیں۔

**فائدہ:** [2] یعنی بازو کو پہلو سے ملا لو، سانپ وغیرہ کا ڈر جاتا رہے گا، شاید آگے کے لیے بھی خوف زائل کرنے کی یہ ترکیب بتلائی ہو۔

**فائدہ:** [3] یعنی معجزہ ''عصا'' و ''ید بیضاء'' بطور سند نبوت کے دیے گئے ہیں تاکہ فرعون اور اس کی قوم پر اتمام حجت کر سکے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ﴿۳۳﴾ وَاَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا

بولا اے رب! میں نے خون کیا ہے ان میں ایک جان کا سو ڈرتا ہوں کہ مجھ کو مار ڈالیں گے [1] اور میرا بھائی ہارون اسکی زبان چلتی ہے مجھ سے

فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِيْٓ ۫ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿۳۴﴾

زیادہ سو اس کو بھیج میرے ساتھ مدد کو کہ میری تصدیق کرے میں ڈرتا ہوں کہ مجھ کو جھوٹا کریں

**خلاصہ تفسیر:** انہوں نے عرض کیا کہ اے میرے رب! (میں جانے کے لئے حاضر ہوں مگر آپ کی خاص امداد کی ضرورت ہے

کیونکہ ) میں نے ان میں سے ایک آدمی کا خون کر دیا تھا سو مجھ کو اندیشہ ہے کہ ( کہیں پہلے ہی ) وہ لوگ مجھ کو قتل کر دیں ( تبلیغ بھی نہ ہونے پائے ) اور ( دوسری بات یہ ہے کہ زبان بھی زیادہ رواں نہیں ہے اور ) میرے بھائی ہارون کی زبان مجھ سے زیادہ رواں ہے تو ان کو بھی میرا مددگار بنا کر میرے ساتھ رسالت دیدیجئے کہ ( وہ میری تقریر کی تائیداور ) تصدیق ( مفصل اور مکمل طور سے ) کریں گے ( کیونکہ ) مجھ کو اندیشہ ہے کہ وہ لوگ ( فرعون اور اس کے درباری ) میری تکذیب کریں ( کیونکہ اس وقت مناظرہ کی ضرورت ہوگی اور زبانی مناظرہ کے لئے عادۃً وہ آدمی زیادہ مفید ہوتا ہے جس کی زبان رواں ہو )۔

**فَاَخَافُ اَنۡ یَّقۡتُلُوۡنِ:** یہ عذر بظاہر آپ نے اس لیے کیا کہ طویل عرصہ گذر جانے کی وجہ سے مصر میں چھپ جانے کی تو امید تھی، لیکن فرعون کے پاس جا کر اخفا کی توقع نہ تھی اور اگر اس وقت ملک شام کو جاؤں تو کچھ اشکال ہی نہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱۔ یعنی پہنچتے ہی قتل کر دیا تو آپ کی دعوت کیسے پہنچاؤں گا۔

**فائدہ:** ۲۔ یعنی کوئی تصدیق و تائید کرنے والا ساتھ ہو تو فطرۃً دل مضبوط و قوی رہتا ہے، اور ان کے جھٹلانے پر اگر بحث و مناظرہ کی نوبت آ جائے تو میری زبان کی لکنت ممکن ہے بولنے میں رکاوٹ ڈالے، اس وقت ہارون کی رفاقت مفید ہوگی، کیونکہ ان کی زبان زیادہ صاف اور تیز ہے۔

## قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيۡكَ وَنَجۡعَلُ لَـكُمَا سُلۡطٰنًا فَلَا يَصِلُوۡنَ اِلَيۡكُمَا ‌ۛۚ بِاٰيٰتِنَاۤ ‌ۛۚ

فرمایا ہم مضبوط کر دیں گے تیرے بازو کو تیرے بھائی سے اور دیں گے تم کو غلبہ پھر وہ نہ پہنچ سکیں گے تم تک ہماری نشانیوں سے

## اَنۡتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الۡغٰلِبُوۡنَ ۝۳۵

تم اور جو تمہارے ساتھ ہو غالب رہو گے

**خلاصہ تفسیر:** ارشاد ہوا کہ ( بہتر ہے ) ہم ابھی تمہارے بھائی کو تمہارا قوت بازو بنائے دیتے ہیں ( ایک درخواست تو یہ منظور ہوئی ) اور ( دوسری درخواست کی منظوری اس طرح ہوئی کہ ) ہم تم دونوں کو ایک خاص شوکت ( وہیبت ) عطا کرتے ہیں جس سے ان لوگوں کو تم پر دسترس نہ ہوگی ( پس ) ہمارے معجزے لے کر جاؤ تم دونوں اور جو تمہارا پیرو ہوگا ( ان لوگوں پر ) غالب رہو گے۔

**وَنَجۡعَلُ لَـكُمَا سُلۡطٰنًا:** اس سے معلوم ہوا کہ اللہ والوں کو من جانب اللہ ایک شان و شوکت عطا ہوتی ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی دونوں درخواستیں منظور ہیں، ہارون تمہارے قوت بازو رہیں گے اور فرعونیوں کو تم پر کچھ دسترس نہ ہوگی، ہماری نشانیوں کی برکت سے، تم اور تمہارے ساتھی ہی غالب و منصور رہیں گے۔

## فَلَمَّا جَآءَهُمۡ مُّوۡسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوۡا مَا هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّفۡتَـرًى وَّمَا سَمِعۡنَا بِهٰذَا

پھر جب پہنچا ان کے پاس موسیٰ لے کر ہماری نشانیاں کھلی ہوئی بولے اور کچھ نہیں یہ جادو ہے باندھا ہوا ۱۔ اور ہم نے سنا نہیں یہ

## فِىۡۤ اٰبَآئِنَا الۡاَوَّلِيۡنَ ۝۳۶

اپنے اگلے باپ دادوں میں ۲۔

**خلاصہ تفسیر:** غرض جب ان لوگوں کے پاس موسیٰ ( علیہ السلام ) ہماری صریح دلیلیں لے کر آئے تو ان لوگوں نے ( معجزات

دیکھ کر) کہا کہ یہ تو محض ایک جادو ہے کہ (خواہ مخواہ اللہ تعالیٰ پر) افترا کیا جاتا ہے (کہ یہ خدا کی طرف سے معجزات اور دلیل رسالت ہیں) اور ہم نے ایسی بات کبھی نہیں سنی کہ ہمارے اگلے باپ دادوں کے وقت میں بھی ہوئی ہو۔

* * *

**فائدہ:** ۱۔ یعنی معجزات دیکھ کر کہنے لگے جادو ہے اور جو باتیں خدا کی طرف منسوب کر کے کہتا ہے وہ بھی جادو کی باتیں ہیں جو خود تصنیف کر کے لے آیا، اور دعویٰ کرنے لگا کہ خدا نے مجھ پر وحی کی ہے، حقیقت میں وحی وغیرہ کچھ نہیں، محض ساحرانہ تخیل وافتراء ہے۔

**فائدہ:** ۲۔ یعنی جو باتیں یہ کرتا ہے (مثلاً ایک خدا نے ساری دنیا کو پیدا کیا، اور ایک وقت سب کو فنا کر کے دوبارہ زندہ کرے گا پھر حساب کتاب ہوگا اور مجھ کو اس نے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، وغیرہ وغیرہ) اپنے اگلے بزرگوں سے ہمارے کانوں میں یہ چیزیں کبھی نہیں پڑیں۔

وَقَالَ مُوْسٰى رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ

اور کہا موسیٰ نے میرا رب تو خوب جانتا ہے جو کوئی لایا ہے ہدایت کی بات اس کے پاس سے اور جس کو ملے گا آخرت کا گھر

اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۳۷

بیشک بھلا نہ ہوگا بے انصافوں کا

**خلاصہ تفسیر:** اور موسیٰ (علیہ السلام) نے (اس کے جواب میں) فرمایا کہ (جب صحیح دلائل قائم ہونے کے باوجود اور ان میں کوئی معقول شبہ نہ نکال سکنے کے بعد بھی نہیں مانتے تو یہ ہٹ دھرمی ہے جس کا اخیر جواب یہی ہے کہ) میرا پروردگار اس شخص کو خوب جانتا ہے جو صحیح دین اس کے پاس سے لے کر آیا ہے اور جس کا انجام (یعنی خاتمہ) اس عالم (دنیا سے) اچھا ہونے والا ہے (اور) بالیقین ظالم لوگ (جو کہ ہدایت اور دین صحیح پر نہ ہوں) کبھی فلاح نہ پائیں گے (کیونکہ ان کا انجام اچھا نہ ہوگا)۔

رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى: مطلب یہ کہ خدا کو خوب معلوم ہے کہ ہم میں اور تم میں کون ہدایت پر ہے اور کون ظالم ہے اور کس کا انجام اچھا ہے اور کون فلاح سے محروم ہے، پس ہر ایک کی حالت اور نتیجہ کا ظہور جلد ہی مرنے کے ساتھ ہو جائے گا، اب نہیں مانتے تم جانو۔

* * *

**فائدہ:** یعنی خدا خوب جانتا ہے کہ میں اپنے دعوے میں سچا ہوں اور اسی کے پاس سے ہدایت لایا ہوں اس لیے انجام میرا ہی بہتر ہوگا، جو لوگ اللہ تعالیٰ کی کھلی نشانیاں دیکھ کر اور دلائل صداقت سن کر ناانصافی سے حق کو جھٹلاتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہو سکتے، انجام کار ان کو ذلت و ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ

اور بولا فرعون اے دربار والو مجھ کو تو معلوم نہیں تمہارا کوئی حاکم ہو میرے سوا، سو آگ دے اے ہامان میرے واسطے گارے کو

فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝۳۸

پھر بنا میرے واسطے ایک محل تا کہ میں جھانک کر دیکھ لوں موسیٰ کے رب کو، اور میری اٹکل میں تو وہ جھوٹا ہے

**خلاصہ تفسیر:** اور (موسیٰ علیہ السلام کے دلائل دیکھ کر اور سن کر) فرعون کو (اندیشہ ہوا کہ کہیں ہمارے معتقدین موسیٰ علیہ السلام کی طرف مائل نہ ہو جائیں تو لوگوں کو جمع کر کے) کہنے لگا اے اہل دربار! مجھ کو تو تمہارا اپنے سوا کوئی خدا معلوم نہیں ہوتا (اس کے بعد فریب دینے کے

واسطے اپنے وزیر سے کہا کہ اگر ان لوگوں کا اس سے اطمینان نہ ہوتو) اے ہامان! تم ہمارے لئے مٹی ( کی اینٹیں بنوا کر ان ) کو آگ میں پزاوہ لگا کر پکواؤ پھر (ان پختہ اینٹوں سے) میرے واسطے ایک بلند عمارت بنواؤ تا کہ (میں اس پر چڑھ کر) موسیٰ کے خدا کو دیکھوں بھالوں اور میں تو (اس دعوی میں کہ میرے سوا کوئی اور خدا ہے) موسیٰ کو جھوٹا ہی سمجھتا ہوں۔

**فَاجۡعَلۡ لِّیۡ صَرۡحًا**: فرعون کا مقصود محل بنوانے سے لوگوں کو دھوکہ دینا تھا کہ اگر کوئی بڑا خدا ہوتا اور بڑے ہونے کے سبب اس کا مکان بہت اونچا ہوتا تو میں تحقیق کر کے آتا ہوں تاکہ لوگ اس کو بڑا محقق سمجھیں، اور اس کا محل بننا یا نہ بننا کسی صحیح روایت میں نہیں آیا، شاید دفع الوقتی مقصود ہو اور نہ بنوایا ہو۔

* * *

**فائدہ**: یعنی اپنے وزیر ہامان کو کہا کہ اچھا اینٹوں کا ایک پزاوہ لگواؤ تاکہ پکی اینٹوں کی خوب اونچی عمارت بنوا کر اور آسمان کے قریب ہو کر میں موسیٰ کے خدا کو جھانک آؤں کہ کہاں ہے اور کیسا ہے، کیونکہ زمین میں تو مجھے کوئی خدا اپنے سوا نظر نہیں پڑتا، آسمان میں بھی خیال تو یہ ہے کہ کوئی نہ ہوگا، تاہم موسیٰ کی بات کا جواب ہو جائے گا، یہ بات ملعون نے استہزاء و تمسخر سے کہی اور ممکن ہے اس قدر بدحواس و پاگل ہو گیا ہو کہ اس طرح کی لچر پوچ اور مضحکہ خیز تجویزیں سوچنے لگا۔

وَاسۡتَكۡبَرَ هُوَ وَجُنُوۡدُهٗ فِى الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَـقِّ وَظَنُّوۡۤا اَنَّهُمۡ اِلَيۡنَا لَا يُرۡجَعُوۡنَ ﴿۳۹﴾

اور بڑائی کرنے لگے وہ اور اس کے لشکر ملک میں ناحق اور سمجھے کہ وہ ہماری طرف پھر کر نہ آئیں گے

فَاَخَذۡنٰهُ وَجُنُوۡدَهٗ فَنَبَذۡنٰهُمۡ فِى الۡيَمِّ‌ ۚ فَانْظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۴۰﴾

پھر پکڑا ہم نے اس کو اور اس کے لشکروں کو، پھر پھینک دیا ہم نے ان کو دریا میں، سو دیکھ لے کیسا ہوا انجام گناہ گاروں کا

**خلاصہ تفسیر**: اور فرعون اور اس کے تابعین نے ناحق دنیا میں سر اٹھا رکھا تھا اور یوں سمجھ رہے تھے کہ ان کو ہمارے پاس لوٹ کر آنا نہیں ہے تو ہم نے (اس تکبر کی سزا میں) اس کو اور اس کے تابعین کو پکڑ کر دریا میں پھینک دیا (یعنی غرق کر دیا) سو دیکھئے ظالموں کا انجام کیسا ہوا (اور اس سے موسیٰ علیہ السلام کی یہ بات ثابت ہوگئی کہ ظالم لوگ کبھی فلاح نہ پائیں گے اور معلوم ہو گیا کہ انجام کس کا اچھا ہے: مَنۡ تَكُوۡنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ‌ؕ اِنَّهٗ لَا يُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ)۔

* * *

**فائدہ**: یعنی انجام سے بالکل غافل ہو کر لگے ملک میں تکبر کرنے یہ نہ سمجھا کہ کوئی ان کی گردن نیچی کرنے والا اور سر توڑنے والا بھی موجود ہے، آخر خداوند قہار نے اس کو لاؤ لشکر سمیت بحر قلزم میں غرق کر دیا تاکہ یادگار رہے کہ بدبخت ظالموں کا جو انجام سے غافل ہوں ایسا انجام ہوا کرتا ہے، غرق وغیرہ کے واقعات کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

وَجَعَلۡنٰهُمۡ اَئِمَّةً يَّدۡعُوۡنَ اِلَى النَّارِ‌ ۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ لَا يُنۡصَرُوۡنَ ﴿۴۱﴾

اور کیا ہم نے ان کو پیشوا کہ بلاتے ہیں دوزخ کی طرف ۱ اور قیامت کے دن ان کو مدد نہ ملے گی ۲

ع وَاَتۡبَعۡنٰهُمۡ فِىۡ هٰذِهِ الدُّنۡيَا لَعۡنَةً‌ ۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ هُمۡ مِّنَ الۡمَقۡبُوۡحِيۡنَ ﴿۴۲﴾

اور پیچھے رکھ دی ہم نے ان پر اس دنیا میں پھٹکار، اور قیامت کے دن ان پر برائی ہے ۳

**خلاصه تفسیر:** اور ہم نے ان لوگوں کو ایسا رئیس بنایا تھا جو (لوگوں کو) دوزخ کی طرف بلاتے رہے اور (اسی واسطے) قیامت کے روز (ایسے بے کس رہ جائیں گے کہ) ان کا کوئی ساتھ نہ دے گا، اور (یہ لوگ دونوں عالم میں خائب وخاسر ہوئے چنانچہ) دنیا میں بھی ہم نے ان کے پیچھے لعنت لگادی اور قیامت کے دن بھی وہ بدحال لوگوں میں سے ہوں گے۔

وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً: لعنت پیچھے لگادینے کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جو کوئی ظالموں اور کافروں پر لعنت کرتا ہے وہ ان پر بھی پڑتی ہے کیونکہ وہ لوگ بھی ایسے ہی تھے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی یہاں ضلالت وطغیان میں پیش پیش تھے اور لوگوں کو دوزخ کی طرف بلاتے تھے وہاں بھی ان کو دوزخیوں کے آگے امام بنا کر رکھا جائے گا: يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۭ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ (ہود:۹۸)

**فائدہ:** ۲؎ یعنی یہاں کے لشکر وہاں کام نہ دیں گے نہ کسی طرف سے کوئی مدد پہنچ سکے گی، اپنے لاؤلشکر سمیت جہنم میں جھونک دیے جائیں گے، کوئی بچانے والا نہ ہوگا۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی آخرت کی برائی اور بدانجامی تو الگ رہی، دنیا ہی میں لوگ رہتی دنیا تک ایسوں پر لعنت بھیجتے رہیں گے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَاۗىِٕرَ لِلنَّاسِ

اور دی ہم نے موسیٰ کو کتاب بعد اس کے کہ ہم غارت کر چکے پہلی جماعتوں کو ۱؎ سجھانے والی لوگوں کو

وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۳﴾

اور راہ بتانے والی اور رحمت تا کہ وہ یاد رکھیں ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ختم ہوا، اب آگے اس قصہ سے جو بڑا مقصود ہے یعنی رسالت محمدیہ کا اثبات اسے بیان فرماتے ہیں، ساتھ ہی کفار کے شبہات کا جواب بھی دیا جاتا ہے، اور تمہید کے لیے موسیٰ علیہ السلام کی رسالت کا صراحۃً ذکر فرماتے ہیں۔

اور (مخلوق اصلاح کی شدید محتاج ہے، اسی وجہ سے ہمیشہ سے رسالت کا سلسلہ چلا آیا ہے، چنانچہ) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو (جن کا قصہ ابھی پڑھ چکے ہو) اگلی امتوں (یعنی قوم نوح وعاد وثمود) کے ہلاک ہونے کے پیچھے (جبکہ پہلے زمانوں کے انبیاء کی تعلیمات ناپید ہوگئی تھیں اور لوگ ہدایت کے سخت محتاج تھے) کتاب (یعنی تورات) دی تھی جو لوگوں کے (یعنی بنی اسرائیل کے) لئے دانشمندیوں کا سبب اور ہدایت اور رحمت تھی تا کہ وہ (اس سے) نصیحت حاصل کریں۔

بَصَاۗىِٕرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً: طالب حق کی اول فہم درست ہوتی ہے یہ ''بصیرت'' ہے، پھر احکام قبول کرتا ہے یہ ''ہدایت'' ہے، پھر ہدایت کا ثمرہ یعنی قرب وقبول عنایت ہوتا ہے یہ ''رحمت'' ہے۔

بَصَاۗىِٕرَ لِلنَّاسِ: اس میں اگر لفظ ''ناس'' سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت ہے تو بات صاف ہے اُس امت کے لئے کتاب توراۃ ہی مجموعہ بصائر تھی اور اگر لفظ ''ناس'' سے تمام انسان مراد ہیں جن میں امت محمدیہ بھی داخل ہے تو یہاں سوال یہ پیدا ہوگا کہ امت محمدیہ کے زمانے میں جو تورات موجود ہے وہ تحریفات کے ذریعہ مسخ ہو چکی ہے تو ان کے لئے اس کا بصائر کہنا کیسے درست ہوگا؟ اور یہ کہ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ مسلمانوں کو بھی تورات سے فائدہ اٹھانا چاہئے حالانکہ حدیث میں یہ واقعہ معروف ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ سے اس کی اجازت طلب کی کہ وہ تورات میں جو نصائح وغیرہ ہیں ان کو پڑھیں تا کہ ان کے علم میں ترقی ہو، اس پر رسول اللہ ﷺ نے غضبناک ہو کر فرمایا کہ اگر

اس وقت موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو ان کو بھی میرا ہی اتباع لازم ہوتا (جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ آپ کو صرف میری تعلیمات کو دیکھنا چاہئے تورات وانجیل کا دیکھنا آپ کے لئے درست نہیں) مگر اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تورات کا جو اس وقت اہل کتاب کے پاس نسخہ تھا وہ تحریف شدہ تھا اور زمانہ ابتداء اسلام کا تھا جس میں نزول قرآن کا سلسلہ جاری تھا، اس وقت آنحضرت ﷺ نے قرآن کی مکمل حفاظت کے پیش نظر اپنی احادیث لکھنے سے بھی بعض حضرات کو روک دیا تھا کہ ایسا نہ ہو لوگ قرآن کے ساتھ احادیث کو جوڑ دیں، ان حالات میں کسی دوسری منسوخ شدہ آسمانی کتاب کا پڑھنا پڑھانا ظاہر ہے کہ احتیاط کے خلاف تھا، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مطلقاً تورات وانجیل کے مطالعے اور پڑھنے سے منع فرمایا گیا ہے، ان کتابوں کے وہ حصے جو رسول اللہ ﷺ سے متعلق پیشین گوئیوں پر مشتمل ہیں ان کا مطالعہ کرنا اور نقل کرنا صحابہ کرام سے ثابت اور معروف ومشہور ہے، حضرت عبداللہ بن سلام اور کعب احبار اس معاملہ میں سب سے زیادہ معروف ہیں، دوسرے صحابہ کرام نے بھی ان پر نکیر نہیں کیا، اس لئے حاصل آیت کا یہ ہو جائے گا کہ تورات وانجیل میں جو غیر محرف مضامین اب بھی موجود ہیں اور بلاشبہ بصائر ہیں، ان سے استفادہ درست ہے مگر ظاہر ہے کہ ان سے استفادہ صرف ایسے ہی لوگ کر سکتے ہیں جو محرف اور غیر محرف میں فرق کر سکیں اور صحیح وغلط کو پہچان سکیں وہ علماء ماہرین ہی ہو سکتے ہیں، عوام کو بیشک اس سے اجتناب اس لئے ضروری ہے کہ وہ کسی مغالطے میں نہ پڑ جائیں، یہی حکم ان تمام کتابوں کا ہے جس میں حق کے ساتھ باطل کی آمیزش ہے کہ عوام کو ان کے مطالعہ سے پرہیز کرنا چاہئے علماء ماہرین دیکھیں تو مضائقہ نہیں۔

* * *

**فائدہ: ۱** نزول تورات کے بعد دنیا میں ایسے غارت کے عذاب کم آئے، بجائے اہلاک سماوی کے جہاد کا طریقہ مشروع کر دیا گیا، کیونکہ کچھ لوگ احکام شریعت پر قائم رہا کیے۔

**فائدہ: ۲** یعنی تورات جو موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی تھی، بڑی فہم وبصیرت عطا کرنے والی، لوگوں کو راہ ہدایت پر چلانے والی، اور مستحق رحمت بنانے والی کتاب تھی تاکہ لوگ اسے پڑھ کر اللہ کو یاد رکھیں، احکام الٰہی سیکھیں اور پند ونصیحت حاصل کریں، سچ تو یہ ہے کہ قرآن کریم کے بعد ہدایت میں تورات شریف ہی کا درجہ ہے اور آج جب کہ اس کے پیروؤں نے اسے ضائع کر دیا، قرآن ہی اس کے ضروری علوم وہدایات کی حفاظت کر رہا ہے۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ إِذْ قَضَيْنَآ إِلٰى مُوْسَى الْأَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿٤٤﴾

اور تو نہ تھا غرب کی طرف جب ہم نے بھیجا موسیٰ کو حکم اور نہ تھا دیکھنے والا

**خلاصہ تفسیر:** اسی طرح جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دور بھی ختم ہو چکا اور لوگ پھر کسی نئی ہدایت کے محتاج ہوئے تو اپنی دائمی عادت کے موافق ہم نے آپ کو رسول بنایا، جس کے دلائل میں سے ایک یہی موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کی یقینی خبر دینا ہے، کیونکہ بغیر وحی کے یہ یقینی خبر آپ کو معلوم نہ ہو سکتی تھی، اس لیے کہ یقینی خبر حاصل ہونے کے چار طریقے ہیں: ① ایک تو عقل، سو یہ واقعہ عقلی باتوں میں سے نہیں ہے جو کہ عقل سے معلوم ہو سکتا ہو ② دوسرے اہل علم سے سننا، سو آپ نے کسی سے پڑھا نہ اہل علم سے اختلاط کیا ③ تیسرے اپنا مشاہدہ اور آپ میں اس کا نہ ہونا بھی ثابت ہے، چنانچہ ظاہر ہے کہ:

اور آپ (طور کے) مغربی جانب میں موجود نہ تھے جبکہ ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو احکام دیئے تھے (یعنی توراۃ دی تھی) اور (وہاں خاص تو کیا موجود ہوتے) آپ (تو) ان لوگوں میں سے (بھی) نہ تھے جو (اس زمانہ میں) موجود تھے (سو مشاہدہ کا احتمال بھی نہ رہا)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی کوہ طور کے غرب کی جانب جہاں موسیٰ کو نبوت اور تورات ملی۔

وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ

لیکن ہم نے پیدا کیں کئی جماعتیں پھر دراز ہوئی ان پر مدت ۱؎ اور تو نہ رہتا تھا مدین والوں میں کہ ان کو سناتا

اٰيٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴿٤٥﴾

ہماری آیتیں پر ہم رہے ہیں رسول بھیجتے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** ولیکن (بات یہ کہ) ہم نے (موسیٰ علیہ السلام کے بعد) بہت سی نسلیں پیدا کیں پھر ان پر زمانہ دراز گزر گیا (جس سے پھر صحیح علوم نایاب ہو گئے اور لوگ پھر ہدایت کے محتاج ہوئے اور اگر چہ درمیان درمیان میں انبیاء علیہم السلام آیا کئے، مگر ان کے علوم بھی اس طرح ناپید ہو گئے تو ہم نے اپنی رحمت سے آپ کو وحی اور نبوت سے مشرف فرمایا جو کہ چوتھا طریق ہے یقینی علم حاصل ہونے کا، حصول علم کے ذکر کردہ پہلے تین طریقے تو ظنی ہیں جو کہ بحث ہی سے خارج ہیں، کیونکہ آپ کی یہ خبریں بالکل یقینی اور قطعی ہیں، خلاصہ یہ کہ یقینی علم حاصل ہونے کے چار طریقے ہیں، تین طریقے تو آپ میں موجود ہی نہیں ہیں، پس چوتھا ہی طریقہ ہوسکتا ہے یعنی ''وحی'' اور یہی مقصود ہے)

اور (جس طرح تورات دیے جانے کا آپ نے مشاہدہ نہیں کیا اور محض وحی سے اس کی یقینی اور سچی خبر دے رہے ہیں اسی طرح آپ نے موسیٰ علیہ السلام کے قیام مدین کا بھی مشاہدہ نہیں فرمایا چنانچہ ظاہر ہے کہ) آپ اہل مدین میں بھی قیام پذیر نہ تھے کہ آپ (وہاں کے حالات دیکھ کر ان حالات کے متعلق) ہماری آیتیں (اپنے) ان (معاصر) لوگوں کو پڑھ پڑھ کر سنا رہے ہوں ولیکن ہم ہی (آپ کو) رسول بنانے والے ہیں (کہ رسول بنا کر وحی سے یہ واقعات آپ کو بتلا دیئے)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی تو اس وقت کے واقعات تو ایسی صحت وصفائی اور بسط وتفصیل سے بیان کر رہا ہے جیسے وہیں طور کے پاس کھڑا دیکھ رہا ہو، حالانکہ تمہارا موقع پر موجود نہ ہونا ظاہر ہے اور ویسے بھی سب جانتے ہیں کہ تم اُمی ہو، کسی عالم کی صحبت میں بھی نہیں رہے، نہ ٹھیک ٹھیک صحیح واقعات کا کوئی جید عالم مکہ میں موجود تھا، پھر غور کرنے کا مقام ہے کہ یہ عالم کہاں سے آیا، حقیقت یہ ہے کہ اقوام دنیا پر مدتیں اور قرن گزر گئے، مرورِ دہور سے وہ علوم محرف و مندرس ہوتے جارہے تھے اور وہ ہدایات مٹتی جارہی تھیں، لہٰذا اس علیم وخبیر کا ارادہ ہوا کہ ایک امی کی زبان سے بھولے ہوئے سبق یاد دلائے جائیں اور ان عبرتناک وموعظت آمیز واقعات کا ایسا صحیح فوٹو دنیا کے سامنے پیش کر دیا جائے جس پر نظر کر کے بےاختیار ماننا پڑے کہ اس کا پیش کرنے والا موقع پر موجود تھا اور اپنی آنکھوں سے من وعن کیفیات کا مشاہدہ کر رہا تھا، پس ظاہر ہے کہ تم تو وہاں موجود نہ تھے، بجز اس کے کیا کہا جائے کہ جو خدا آپ کی زبان سے بول رہا ہے اور جس کے سامنے ہر غائب بھی حاضر ہے، یہ بیان اسی کا ہوگا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی موسیٰ علیہ السلام کو مدین جا کر جو واقعات پیش آئے ان کا اس خوبی وصحت سے بیان تو یہ ظاہر کرتا ہے کہ گویا اس وقت تم شان پیغمبری کے ساتھ وہیں سکونت پذیر تھے اور جس طرح آج اپنے وطن مکہ میں اللہ کی آیات پڑھ کر سنا رہے ہو، اس وقت مدین والوں کو سناتے ہوں گے حالانکہ یہ چیز صریحاً منفی ہے، بات صرف اتنی ہے کہ ہم ہمیشہ سے پیغمبر بھیجتے رہے ہیں جو دنیا کو غفلت سے چونکاتے اور گذشتہ عبرتناک واقعات یاد دلاتے رہیں، اسی عام عادت کے موافق ہم نے اس زمانہ میں تم کو رسول بنا کر بھیجا کہ پچھلے قصے یاد دلاؤ، اور خواب غفلت سے مخلوق کو بیدار کرو، اس لیے ضروری ہوا کہ ٹھیک ٹھیک واقعات کا صحیح علم تم کو دیا جائے اور تمہاری زبان سے ادا کرایا جائے۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ

اور تو نہ تھا طور کے کنارے جب ہم نے آواز دی لیکن یہ انعام ہے تیرے رب کا ۱؎ تا کہ تو ڈر سنا دے ان لوگوں کو جن کے پاس نہیں آیا

نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۶﴾

کوئی ڈر سنانے والا تجھ سے پہلے تا کہ وہ یاد رکھیں ۲ؑ

**خلاصہ تفسیر:** اور (اسی طرح) آپ طور کی (مذکورہ مغربی) جانب میں اس وقت بھی موجود نہ تھے جب ہم نے (موسیٰ علیہ السلام کو) پکارا تھا (کہ: يٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ، وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ جو کہ ان کو نبوت عطا ہونے کا وقت تھا) ولیکن (اس کا علم بھی اسی طرح حاصل ہوا کہ) آپ اپنے رب کی رحمت سے نبی بنائے گئے تا کہ آپ ایسے لوگوں کو ڈرائیں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا (نبی) نہیں آیا، کیا عجب ہے کہ نصیحت قبول کرلیں۔

**وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ:** یہاں ان آیات میں پہلے آپ ﷺ کا تورات دینے کے وقت حاضر نہ ہونا بتلایا حالانکہ یہ واقعہ سب کے بعد ہوا، پھر قیام مدین کے وقت موجود نہ ہونا بتلایا حالانکہ یہ سب سے پہلے کا واقعہ ہے، پھر آخر میں موسیٰ علیہ السلام کو پکارنے کے وقت آپ ﷺ کا موجود نہ ہونا بیان فرمایا جو کہ حقیقت میں درمیان کا واقعہ ہے، غرض ان واقعات کو یہاں ترتیب سے نہیں بیان کیا، پس ترتیب کے بدلنے میں یہ نکتہ ہے کہ ہر موقع میں آپ ﷺ کا تشریف نہ رکھنا آپ کے صاحب وحی ہونے کی مستقل دلیل ہوجائے کہ یہ سب واقعات آپ کو وحی سے معلوم ہوئے، خود آپ نے کچھ نہیں معلوم کیا، اور اگر سب کو ترتیب وار ذکر فرماتے تو سب کو ملا کر ایک دلیل سمجھا جاتا۔

**مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ:** یعنی آپ ایسے لوگوں کو ڈرائیں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نبی نہیں آیا، کیونکہ حضور ﷺ کے زمانہ والوں بلکہ ان کے قریب کے باپ دادوں نے بھی کسی نبی کو نہیں دیکھا تھا، اگرچہ بعض احکام شرعیہ بالخصوص توحید کسی ذریعہ سے ان تک بھی پہنچی تھی پس دوسرے مقام پر آیت: وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا سے تعارض نہ رہا، کیونکہ مطلب اس آیت کا یہ ہے کہ ہم نے ہر امت کی طرف رسول بھیجا ہے خواہ بواسطہ ہو یا بلا واسطہ ہو، اس کے متعلق ضروری مضمون سورہ نحل آیت ۳۶ میں گذر چکا ہے وہاں ملاحظہ فرمالیا جائے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ؑ یعنی جب موسیٰ علیہ السلام کو آواز دی: اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (القصص: ۳۰) تم وہاں کھڑے سن نہیں رہے تھے، یہ حق تعالیٰ کا انعام ہے کہ آپ کو ان واقعات وحقائق پر مطلع کیا اور تمہارے ساتھ بھی اسی نوعیت کا برتاؤ کیا جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہوا تھا، گویا ''جبل النور'' (جہاں غار حرا ہے) اور ''مکہ'' میں ''جبل طور'' اور ''مدین'' کی تاریخ دوہرادی گئی۔

**فائدہ:** ۲ؑ یعنی عرب کے لوگوں کو یہ چیزیں بتلا کر خطرناک عواقب سے آگاہ کردیں، ممکن ہے وہ سن کر یاد رکھیں اور نصیحت پکڑیں۔

**تنبیہ:** مَّآ اُنْذِرَ اٰبَاۗؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ (یس: ٦) سے شاید آبائے اقربین مراد ہوں گے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ

اور اتنی بات کیلئے کبھی آن پڑے ان پر آفت ان کاموں کی وجہ سے جن کو بھیج چکے ہیں انکے ہاتھ تو کہنے لگیں اے رب ہمارے کیوں نہ بھیج دیا

اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾

ہمارے پاس کسی کو پیغام دے کر تو ہم چلتے تیری باتوں پر اور ہوتے ایمان والوں میں

**خلاصہ تفسیر:** اور (اگر یہ لوگ ذرا تامل کریں تو سمجھ سکتے ہیں کہ پیغمبر بھیجنے سے ہمارا کوئی فائدہ نہیں، بلکہ ان ہی لوگوں کو فائدہ ہے کہ یہ لوگ اچھی اور بری بات پر مطلع ہو کر عذاب سے بچ سکتے ہیں ورنہ جن باتوں کی برائی عقل سے دریافت ہوسکتی ہے ان پر بغیر پیغمبر بھیجنے کے بھی

عذاب آ سکتا تھا، لیکن اس وقت ان لوگوں کو ایک گونہ یہ حسرت ہوتی کہ ہائے! اگر رسول آ جاتا تو ہم کو زیادہ تنبہ ہو جاتا اور اس مصیبت میں نہ پڑتے، اس لئے رسول بھی بھیج دیا تاکہ اس حسرت سے بچنا ان کو آسان ہو ورنہ احتمال تھا کہ:) ہم رسول نہ بھی بھیجتے اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ان پر ان کے کرداروں کے سبب (جو کہ عقلاً قبیح ہیں) کوئی مصیبت (دنیا یا آخرت میں) نازل ہوتی (جس کی نسبت ان کو عقل کے یا فرشتے کے ذریعہ سے یقین ہو جاتا کہ یہ اعمال کی سزا ہے) تو یہ کہنے لگتے کہ اے ہمارے پروردگار! آپ نے ہمارے پاس کوئی پیغمبر کیوں نہ بھیجا تاکہ ہم آپ کے احکام کا اتباع کرتے اور (ان احکام اور رسول پر) ایمان لانے والوں میں سے ہوتے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی پیغمبر کا ان میں بھیجنا خوش قسمتی ہے، اگر بدون پیغمبر بھیجے اللہ تعالیٰ ان کی کھلی ہوئی بے عقلیوں اور بے ایمانیوں پر سزا دینے لگتا تب بھی ظلم نہ ہوتا، لیکن اس نے احسان فرمایا اور کسی قسم کی معقول عذرداری کا موقع نہیں چھوڑا، ممکن تھا سزا دہی کے وقت کہنے لگتے کہ صاحب ہمارے پاس پیغمبر تو بھیجا نہیں جو ہم کو ہماری غلطیوں پر کم از کم متنبہ کر دیتا، ایک دم پکڑ کر عذاب میں دھر گھسیٹا، اگر کوئی پیغمبر آتا تو دیکھ لیتے ہم کیسے نیک اور ایماندار ثابت ہوتے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى ؕ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ

پھر جب پہنچی ان کو ٹھیک بات ہمارے پاس سے کہنے لگے کیوں نہ ملا اس رسول کو جیسا ملا تھا موسیٰ کو ۱ کیا ابھی منکر نہیں ہو چکے اس سے جو

اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ٙ وَقَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۸﴾

موسیٰ کو ملا تھا اس سے پہلے ۲ کہنے لگے دونوں جادو ہیں آپس میں موافق اور کہنے لگے ہم دونوں کو نہیں مانتے ۳

**خلاصہ تفسیر:** سو (اس امر کا تقاضا تو یہ تھا کہ رسول کے آنے کو غنیمت سمجھتے اور اس کے دین کو قبول کرتے لیکن ان کی یہ حالت ہوئی کہ) جب ہماری طرف سے ان لوگوں کے پاس امر حق (یعنی رسول حق اور دین حق) پہنچا تو (شبہ نکالنے کے لئے یوں) کہنے لگے کہ ان کو ایسی کتاب کیوں نہ ملی جیسی موسیٰ (علیہ السلام) کو ملی تھی (یعنی قرآن بھی تورات کی طرح ایک دفعہ میں کیوں نہ نازل ہوا، آگے جواب ہے کہ:) کیا جو کتاب موسیٰ (علیہ السلام) کو ملی تھی اس کے قبل یہ لوگ اس کے منکر نہیں ہوئے (چنانچہ ظاہر ہے کہ مشرکین موسیٰ علیہ السلام اور تورات کو بھی نہ مانتے تھے کیونکہ وہ سرے سے اصل نبوت ہی کے منکر تھے) یہ لوگ (قرآن اور تورات دونوں کی نسبت) یوں کہتے ہیں کہ دونوں جادو ہیں جو ایک دوسرے کے موافق ہیں (یہ اس لئے کہا کیونکہ اصول شریعت میں دونوں متفق ہیں) اور یوں بھی کہتے ہیں کہ ہم تو دونوں میں کسی کو نہیں مانتے (خواہ یہی عبارت ان کا مقولہ ہوا، یا خواہ ان کے اقوال سے یہ لازم آتا ہو، اسی طرح ایک ہی ساتھ دونوں کا انکار کیا ہو یا مختلف قول جمع کئے گئے ہوں تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس شبہ کا منشاء یہ نہیں ہے کہ اگر قرآن تورات کی طرح دفعۃً نازل ہوتا تو یہ مان لیتے، بلکہ محض واویلا اور شرارت مقصود ہے جس کا آگے جواب ہے)۔

قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا: قرآن کو جادو کہنا تو قرآن ہی میں مذکور ہے، اور تورات کو بھی یا تو صراحۃً جادو کہا ہو، یا یہ کہ قرآن کو جادو کہنے سے تورات کو بھی جادو کہنا لازم آ گیا، کیونکہ جب دو چیزیں آپس میں متفق ہوں تو جو صفت ایک کی ہوگی وہی دوسری کی ہوگی، اور اسی سے انجیل کا نہ ماننا بھی لازم آ گیا، اگرچہ اس کا ذکر اس جگہ صراحۃً نہیں مگر حکماً وہ مذکور ہے، کیونکہ نہ ماننے کی ایک ہی علت ہے یعنی نبوت سے انکار کرنا اور شاید یہاں تورات کو خاص طور پر اس لیے ذکر کیا ہو کہ وہ زیادہ مشہور تھی۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی رسول نہ بھیجتے تو کہتے رسول کیوں نہ بھیجا، اب رسول تشریف لائے جو تمام پیغمبروں سے شان و رتبہ میں بڑھ کر ہیں تو کہتے ہیں کہ صاحب! ہم تو اس وقت مانتے جب دیکھتے کہ ان سے موسیٰ علیہ السلام کی طرح ''عصاء'' اور ''ید بیضاء'' وغیرہ کے معجزات ظاہر ہوتے اور ان کے

پاس بھی تورات کی طرح ایک دم ایک کتاب اترتی یہ کیا کہ دو دو چار چار آیتیں پیش کرتے ہیں۔

**فائدہ:** ۲ یعنی موسیٰ کے معجزات اور کتاب ہی کو کہاں سب نے مان لیا تھا؟ شبہے نکالنے والے ان کو بھی ''سحر مفتری'' کہتے رہے جیسا کہ ابھی ایک دو رکوع پہلے گزرا بس جن کو ماننا منظور نہیں ہوتا وہ ہر بات میں کچھ نہ کچھ احتمالات نکال لیتے ہیں۔

**فائدہ:** ۳ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''مکہ کے کافر حضرت موسیٰ کے معجزے سن کر کہنے لگے کہ ویسا معجزہ اس نبی کے پاس ہوتا تو ہم مانتے، جب یہود سے پوچھا تورات کی باتیں اس نبی کے موافق اور اپنی مرضی کے خلاف سنیں، مثلاً یہ کہ بت پرستی کفر ہے، آخرت کا جینا برحق ہے اور جو جانور اللہ کے نام پر ذبح نہ ہو مردار ہے (اور عرب میں ایک نبی آخر الزمان آئیں گے جن کی یہ نشانیاں ہوں گی وغیرہ وغیرہ) تب لگے دونوں کو جواب دینے کہ تورات اور قرآن دونوں جادو اور موسیٰ و محمد (علیہما الصلوٰۃ والسلام) دونوں جادوگر ہیں، (العیاذ باللہ) جو ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں''۔

## قُلْ فَأْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٤٩﴾

تو کہہ اب تم لاؤ کوئی کتاب اللہ کے پاس کی جو ان دونوں سے بہتر ہو کہ میں اس پر چلوں، اگر تم سچے ہو

**خلاصہ تفسیر:** گذشتہ آیت میں ان کے شبہ کا ذکر تھا، اب اس کا جواب ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!:

آپ کہہ دیجئے کہ اچھا تو (توراۃ و قرآن کے علاوہ) تم کوئی اور کتاب اللہ کے پاس سے لے آؤ جو ہدایت کرنے میں ان دونوں سے بہتر ہو میں اسی کی پیروی کرنے لگوں گا، اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو (کہ: ''دونوں جادو ہیں جو ایک دوسرے کے موافق ہیں'' جس سے مقصود ان دونوں کتابوں کا نعوذ باللہ جھوٹ اور غلط ہونا ہے)۔

**اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ:** خلاصہ یہ کہ مقصود تو حق کا اتباع ہے، پس اگر خدا کی کتابوں کو حق مانتے ہو تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرو، قرآن کی تو ہر ہر بات میں اور تورات کی توحید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارات اور تصدیق میں پیروی کرو، اور اگر ان کو حق نہیں مانتے تو تم کوئی حق پیش کرو اور اس کا ہدایت ہونا ثابت کردو، کیونکہ حق سے یہی مقصود ہوتا ہے کہ اس سے ہدایت ہو، اگر بالفرض تم یہ ثابت کردو گے تو میں اس کا اتباع کرلوں گا، غرض یا تو میں حق ثابت کردوں تم اس کا اتباع کرلو، یا تم حق ثابت کردو تو میں اس کے ماننے کے لیے تیار ہوں، اور اس سے آسمانی کتابوں کے سوا دوسری کتاب کا اتباع کرنا لازم نہیں آتا، کیونکہ یہ کلام بطور فرض کے ہے جس سے ان کا عاجز کرنا مقصود ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی آسمانی کتابوں میں سب سے بڑی اور مشہور یہ ہی دو کتابیں تھیں جن کی ہم سری کوئی کتاب نہیں کرسکتی، اگر یہ دونوں جادو ہیں تو تم کوئی کتاب الٰہی پیش کردو جو ان سے بہتر اور ان سے بڑھ کر ہدایت کرنے والی ہو، بفرض محال اگر ایسی کتاب لے آئے تو میں اسی کی پیروی کرنے لگوں گا، لیکن تم قیامت تک نہیں لاسکتے، اس سے زیادہ بدبختی کیا ہوگی کہ خود ہدایت ربانی سے قطعی تہی دست ہو اور جو کتاب ہدایت آتی ہے اسے جادو کہہ کر رد کردیتے ہو، جب یہ ایک انسان کا بنایا ہوا جادو ہے تو تم سارے جہان کے جادوگروں کو جمع کرکے اس سے بڑا جادو لے آتے، آخر جادو ایسی چیز تو نہیں کہ اس کا کوئی مقابلہ نہ کرسکے۔

## فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ؕ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ

پھر اگر نہ کر لائیں تیرا کہا تو جان لے کہ وہ چلتے ہیں نری (صرف) اپنی خواہشوں اور اس سے گمراہ زیادہ کون جو چلے اپنی خواہش پر

## بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٥٠﴾ ع

بدون راہ بتلائے اللہ کے بیشک اللہ راہ نہیں دیتا بے انصاف لوگوں کو

**خلاصہ تفسیر:** پھر (اس احتجاج کے بعد) اگر یہ لوگ آپ کا (یہ) کہنا (کہ: فَأْتُوْا بِكِتٰبٍ الخ) نہ کر سکیں (اور ظاہر ہے کہ نہ کر سکیں گے جیسا کہ اللہ نے ارشاد فرمایا: فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا اور پھر بھی آپ کا اتباع نہ کریں) تو آپ سمجھ لیجئے کہ (ان کے سوالات کا منشاء کوئی شبہ یا تردد یا حق کی تلاش نہیں ہے، بلکہ) یہ لوگ محض اپنی نفسانی خواہشوں پر چلتے ہیں (ان کا نفس کہتا ہے کہ جس طرح بن پڑے انکار ہی کرنا چاہئے، پس اگر چہ حق بھی واضح ہو جائے یہ ایسا ہی کریں گے) اور ایسے شخص سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو اپنی نفسانی خواہش پر چلتا ہو بدون اس کے کہ من جانب اللہ کوئی دلیل (اس کے پاس) ہو (اور) اللہ تعالیٰ ایسے ظالم لوگوں کو (جو کہ حق واضح ہونے کے بعد بھی بغیر کسی صحیح وجہ کے اپنی گمراہی سے باز نہ آئیں) ہدایت نہیں کیا کرتا (اور ہدایت نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ خود ہی لوگ گمراہ رہنے کا قصد کرتے ہیں اور خدا کی عادت ہے کہ جیسا کوئی قصد کرتا ہے ویسا ہی کر دیتے ہیں، اس لیے ایسا شخص ہمیشہ گمراہ رہتا ہے یہاں تک تو ان کے اس قول: لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى کا الزامی جواب تھا کہ قرآن تورات کی طرح دفعۃً ایک ہی بار میں کیوں نازل نہ ہوا؟ آگے تحقیقی جواب ہے)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی جب یہ لوگ نہ ہدایت کو قبول کرتے ہیں اور نہ اسکے مقابلہ میں کوئی چیز پیش کر سکتے ہیں تو یہ ہی اس کی دلیل ہے کہ ان کو راہ ہدایت پر چلنا مقصود ہی نہیں محض اپنی خواہشات کی پیروی ہے، جس چیز کو دل چاہا مان لیا، جس کو اپنی مرضی اور خواہش کے خلاف پایا رد کر دیا، بتلایئے ایسے ہوا پرست ظالموں کو کیا ہدایت ہو سکتی ہے، اللہ کی عادت اسی قوم کو ہدایت کرنے کی ہے جو ہدایت پانے کا ارادہ کرے اور محض ہوا و ہوس کو حق کا معیار نہ بنا لے۔

## وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٥١﴾

اور ہم پے در پے بھیجتے رہے ہیں ان کو اپنے (اپنا) کلام تا کہ وہ دھیان میں لائیں

**خلاصہ تفسیر:** اب آگے تحقیقی جواب ہے جس میں قرآن کے دفعۃً نازل نہ ہونے کی حکمت بیان فرماتے ہیں:

اور ہم نے اس کلام (یعنی قرآن) کو ان لوگوں کیلئے وقتاً فوقتاً یکے بعد دیگرے بھیجا تا کہ یہ لوگ (بار بار تازہ بتازہ سننے سے) نصیحت مانیں (یعنی ہم تو ایک ہی دفعہ بھیجنے پر بھی قادر ہیں مگر ان ہی کی مصلحت سے تھوڑا تھوڑا نازل کرتے ہیں پھر اندھیر ہے کہ اپنی ہی مصلحت کی مخالفت کرتے ہیں)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی ہماری وحی کا سلسلہ پہلے سے چلا آتا ہے، ایک وحی کی تصدیق و تائید میں دوسری وحی برابر بھیجتے رہے ہیں، اور قرآن کو بھی ہم نے بتدریج نازل کیا، ایک آیت کے پیچھے دوسری آیت میں سہولت ہو۔

النصف

## اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿٥٢﴾

جن کو ہم نے دی ہے کتاب اس سے پہلے وہ اس پر یقین کرتے ہیں

## وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ﴿٥٣﴾

اور جب ان کو سنائے تو کہیں ہم یقین لائے اس پر یہی ہے ٹھیک ہمارے رب کا بھیجا ہوا ہم ہیں اس سے پہلے کہ حکم بردار

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے موسیٰ علیہ السلام کے قصہ سے رسالت محمد یہ پر استدلال تھا، اب آگے گذشتہ آسمانی کتابوں کی پیشین گوئیوں کی بنا پر منصف اہل کتاب کے ایمان لانے سے آپ ﷺ کی رسالت پر استدلال ہے، اور ساتھ میں ان کی مدح بھی ہے جس میں بعض کے ناموں کی تصریح بھی آئی ہے، ابو رفاعہ اور ان کے ساتھ نو آدمی سلمان فارسی، عبداللہ بن سلام، امین بن یامین، اور نجاشی بادشاہ حبشہ اور ان کے ساتھی، ان میں بعض پہلے یہودی تھے اور بعض نصرانی اور ان کو مخالفین سے ایذا بھی پہنچی تھی۔

(رسول اللہ ﷺ کی رسالت ان بشارتوں سے بھی ثابت ہے جن کی ان علماء نے تصدیق کی ہے جن کو تورات وانجیل میں ان بشارتوں کا علم ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ کی رسالت پہلی کتابوں کے علماء کی تصدیق سے بھی ظاہر ہے، چنانچہ) جن لوگوں کو ہم نے قرآن سے پہلے (آسمانی) کتابیں دی ہیں (ان میں جو منصف ہیں) وہ اس پر ایمان لاتے ہیں، اور جب قرآن ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے بیشک یہ حق ہے (جو) ہمارے رب کی طرف سے (نازل ہوا ہے اور) ہم تو اس (کے آنے) سے پہلے بھی (اپنی کتابوں کی بشارتوں کی بناء پر) مانتے تھے (اور اب نزول کے بعد نیا عہد کرتے ہیں، یعنی ہم ان لوگوں کی طرح نہیں ہیں جو قرآن کے نزول سے پہلے تو اس کی تصدیق کرتے تھے بلکہ اس کے آنے کے منتظر اور شائق تھے مگر جب قرآن آیا تو اس کے منکر ہو گئے: فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ تورات وانجیل کی بشارتیں حضور ﷺ ہی کے حق میں تھیں اور آپ ہی ان کے مصداق تھے، یہ بھی نبوت محمدیہ کی ایک دلیل ہے چنانچہ سورۃ شعراء کے آخر میں فرمایا ہے: اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی ان جاہل مشرکین کا حال تو یہ ہے کہ نہ اگلی کتابوں کو مانیں نہ پچھلی کو، اور ان کے بالمقابل انصاف پسند اہل کتاب کو دیکھو کہ وہ دونوں کو تسلیم کرتے جاتے ہیں پہلے تورات وانجیل پر یقین رکھتے تھے، جب قرآن پاک آیا تو بول اٹھے کہ بلاشبہ یہ کتاب برحق ہے، ہمارے رب کی اتاری ہوئی، ہم اس پر اپنے یقین واعتقاد کا اعلان کرتے ہیں، ہم تو پہلے بھی اللہ کی باتوں کو مانتے تھے آج بھی قبول کرتے ہیں، فی الحقیقت ہم آج سے مسلمان نہیں بہت پہلے سے مسلمان ہیں، کیونکہ کتب سابقہ پر ہمارا ایمان تھا جن میں پیغمبر آخرالزمان اور قرآن کریم کے متعلق صاف بشارات موجود تھیں، لہٰذا ان پیشین گوئیوں پر بھی ہمارا پہلے سے اجمالی ایمان ہوا، آج اس کی تفصیل اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔

اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ

وہ لوگ پائیں گے اپنا ثواب دوہرا اس بات پر کہ قائم رہے [1] اور بھلائی کرتے ہیں برائی کے جواب میں [2]

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۵۴﴾

اور ہمارا دیا ہوا کچھ خرچ کرتے رہتے ہیں [3]

**خلاصہ تفسیر:** یہاں تک رسالت محمدیہ پر بنی اسرائیل کے علماء کی شہادت کا بیان ہوا، اب آگے ایمان لانے والے اہل کتاب کی فضیلت کا بیان ہے:

ان لوگوں کو ان کی پختگی کی وجہ سے دوہرا ثواب ملے گا (کیونکہ وہ پہلی کتاب پر ایمان رکھنے کے وقت بھی قرآن پر ایمان رکھتے تھے اور قرآن نازل ہونے کے بعد بھی اس ایمان پر قائم رہے اور اس کو از سر نو تازہ کیا، یہ تو ان کے اعتقاد اور ثواب کا بیان تھا، اب آگے ان کے اعمال و اخلاق کا ذکر ہے کہ) اور وہ لوگ نیکی (اور تحمل) سے بدی (اور ایذاء) کا دفعیہ کر دیتے ہیں اور ہم نے جو کچھ ان کو دیا ہے اس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔

**يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ:** یہ مضمون حدیث میں بھی آیا ہے کہ اہل کتاب جو ایمان لائیں ان کو دوہرا ثواب ملتا ہے اور اس کے ساتھ دو شخصوں کے لیے اور بھی دو ثواب کا وعدہ ہے، ایک وہ جس کے پاس شرعی باندی ہو اور وہ اس کو علم وآداب سکھا کر آزاد کر کے اس کی رضامندی سے اپنے آپ اس سے نکاح کرے، دوسرے وہ غلام جو اللہ تعالیٰ کی بھی اچھی عبادت کرے اور اپنے آقا کی بھی خدمت گذاری وخیر خواہی کرے، اور مشہور وجہ اس کی یہ ہے کہ ان لوگوں نے دو عمل کیے، اس لیے دوہرا ثواب ملا، اور بعض علماء نے یہ سمجھ کر کہ اس میں ان ہی کی کیا خصوصیت ہے جو شخص بھی دو عمل

کرے گا دو ثواب ملیں گے، یہ کہا ہے کہ ان لوگوں کو تمام اعمال میں یا ان ہی دو عملوں میں سے ہر ایک پر بہ نسبت دوسرے عمل کرنے والوں کے دوہرا ثواب ملے گا، مثلاً اوروں کو ایک عمل پر کم از کم دس گنا ثواب ہوتا ہے تو ان کو ہر عمل پر کم از کم بیس گنا ثواب ہوگا، جیسا کہ قرض کی نسبت اٹھارہ گنا ثواب آیا ہے اور بظاہر یہی دوسری توجیہ صحیح ہے، کیونکہ بظاہر ان لوگوں کی خصوصیت مقصود معلوم ہوتی ہے اور پہلی توجیہ سے ان کی کوئی خصوصیت ظاہر نہیں ہوتی، لیکن ان کے ساتھ ازواج مطہرات کو بھی شامل کیا جانا چاہیے جن کے لیے نؤتها اجرها مرّتین آیا ہے، ان کو بھی ہر عمل پر دوہرا ثواب ہوتا ہے۔

**وَيَدۡرَءُوۡنَ بِالۡحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ**: اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ حب جاہ سے خالی ہیں، اور **وَمِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ يُنۡفِقُوۡنَ**: اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ حب مال سے خالی ہیں، اور یہی دو امر یعنی حب مال اور حب جاہ اکثر ایمان سے مانع ہوتے ہیں، اور یہی نکتہ ذکر کیا گیا ہے سورہ بقرہ کی آیت ۴۳ واقیموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ وارکعوا مع الراکعین میں ان اعمال کی تخصیص کا، پس ایمان کے بعد اس طرف اشارہ ہو گیا کہ ان میں ایمان سے مانع ہونے والی کوئی چیز نہ تھی تو پھر کیسے ایمان نہ لاتے۔

اس میں اللہ والوں کے بعض اخلاق کا ذکر ہوا کہ وہ حب جاہ اور حب مال سے دور رہتے ہیں اور برائی کا جواب ہمیشہ اچھائی سے دیتے ہیں۔

* * *

**فائدہ**: ۱؎ یعنی مغرور و مستغنی ہو کر قبول حق سے گریز نہیں کیا بلکہ جس وقت جو حق پہنچا بے تکلف گردن تسلیم جھکا دی۔

**تنبیہ**: شیخ اکبر نے فتوحات میں لکھا ہے کہ ان اہل کتاب کا ایمان اپنے پیغمبر پر دو مرتبہ ہوا: اول بالاستقلال دوبارہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کے ضمن میں، کیونکہ حضور ﷺ تمام انبیاء سابقین کے مصدق ہیں اور ان پر ایمان رکھنا ضروری قرار دیتے ہیں، اور حضور ﷺ پر بھی ان کا ایمان دو مرتبہ ہوا، ایک اب بالذات اور بالاستقلال دوسرا پہلے اپنے پیغمبر پر ایمان لانے کے ضمن میں، کیونکہ ہر پیغمبر حضور ﷺ کی بشارت دیتے، اور پیشگی تصدیق کرتے چلے آئے ہیں اسی لیے ان لوگوں کو اجر بھی دو مرتبہ ملے گا باقی حدیث میں جو "ثَلَاثٌ يُؤۡتَوۡنَ اَجۡرَهُمۡ مَرَّتَيۡنِ" آیا ہے اس کی شرح کا یہاں موقع نہیں، ہم نے خدا کے فضل سے شرح صحیح مسلم میں اس کو تفصیل لکھا ہے اور اشکالات کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے، فللّٰہ الحمد والمنہ وبہ التوفیق والعصمہ۔

**فائدہ**: ۲؎ یعنی کوئی دوسرا ان کے ساتھ برائی سے پیش آئے تو یہ اس کے جواب میں مروت و شرافت سے کام لے کر بھلائی اور احسان کرتے ہیں، یا یہ مطلب کہ کبھی ان سے کوئی برا کام ہو جائے تو اس کا تدارک بھلائی سے کر دیتے ہیں تاکہ حسنات کا پلہ سیئات سے بھاری رہے۔

**فائدہ**: ۳؎ یعنی اللہ نے جو مال حلال دیا ہے اس میں سے زکوٰۃ دیتے ہیں، صدقہ کرتے ہیں اور خویش و اقارب کی خبر لیتے ہیں۔ غرض حقوق العباد ضائع نہیں کرتے۔

وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغۡوَ اَعۡرَضُوۡا عَنۡهُ وَقَالُوۡا لَنَاۤ اَعۡمَالُنَا وَلَكُمۡ اَعۡمَالُكُمۡ ۡ سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ ۡ

اور جب سنیں نکمی باتیں اس سے کنارہ کریں اور کہیں ہم کو ہمارے کام اور تم کو تمہارے کام، سلامت رہو

لَا نَبۡتَغِى الۡجٰهِلِيۡنَ ﴿۵۵﴾

ہم کو نہیں چاہیں بے سمجھ لوگ

**خلاصہ تفسیر**: اور (جس طرح یہ لوگ عملی ایذاؤں پر صبر کرتے ہیں اسی طرح) جب کسی سے (اپنے متعلق) کوئی لغو بات سنتے ہیں (جو کہ قولی ایذاء ہے) تو اسکو (بھی) ٹال جاتے ہیں اور (سلامت روی کے طور پر) کہہ دیتے ہیں کہ (ہم کچھ جواب نہیں دیتے) ہمارا عمل ہمارے سامنے آئے گا اور تمہارا عمل تمہارے سامنے (بھائی) ہم تو تم کو سلام کرتے ہیں (ہم کو جھگڑے سے معاف رکھو) ہم بے سمجھ لوگوں سے الجھنا نہیں چاہتے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی کوئی جاہل لغو بیہودہ بات کہے تو اس سے الجھتے نہیں، کہہ دیتے ہیں کہ بس صاحب! تمہاری باتوں کو ہمارا دور سے سلام، یہ جہالت کی پوٹ تمہی رکھو ہم کو ہمارے مشغلہ میں رہنے دو، تمہارا کیا تمہارے، اور ہمارا کیا ہمارے سامنے آ جائے گا، ہم کو تم جیسے بے سمجھ لوگوں سے الجھنے کی ضرورت نہیں، محمد بن اسحاق نے سیرت میں لکھا ہے کہ قیام مکہ کے زمانہ میں تقریباً بیس اشخاص حبشہ سے حضور ﷺ کی خبر سن کر آئے کہ تحقیق کریں کیسے شخص ہیں، آپ سے بات چیت کی، اور بڑے زور سے آپ ﷺ کی تصدیق کی، جب مشرف با ایمان ہو کر واپس ہونے لگے تو ابوجہل وغیرہ مشرکین نے ان پر آوازے کسے کہ ایسے احمقوں کا قافلہ آج تک کہیں نہ دیکھا ہوگا، جو ایک شخص کی تحقیق حال کرنے آئے تھے اور اس کے غلام بن کر اور اپنا دین چھوڑ کر جا رہے ہیں، انہوں نے کہا: "سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نُجَاهِلُكُمْ لَنَا مَا نَحْنُ عَلَيْهِ وَلَكُمْ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ لَمْ نَاْلُ اَنْفُسَنَا خَيْرًا" (بس ہم تم کو سلام کریں، معاف رکھو ہم تمہاری جہالت کا جواب جہالت سے دینا نہیں چاہتے، ہم اور تم میں سے جو جس حال پر ہے اس کا وہ ہی حصہ ہے ہم نے اپنے نفس کا بھلا چاہنے میں کچھ کوتاہی نہیں کی) اسی کے متعلق یہ آیات نازل ہوئیں، واللہ تعالیٰ اعلم، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: "جس جاہل سے توقع نہ ہو کہ سمجھائے پر لگے گا اس سے کنارہ ہی بہتر ہے"۔ (موضح)۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۵۶﴾

تو راہ پر نہیں لاتا جس کو چاہے پر اللہ راہ پر لائے جس کو چاہے [1] اور وہ ہی خوب جانتا ہے جو راہ پر آئیں گے [2]

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے اہل کتاب کا ایمان لانا اطاعت کرنا مذکور تھا اور اس سے پہلے فلما جاءھم الحق میں کفار قریش کا کفر وعناد مذکور تھا اور قریش آپ کے قرابت دار تھے اور اہل کتاب قرابت دار نہ تھے اور غیروں کے ایمان کو دیکھ کر قرابت داروں کے ایمان نہ لانے پر طبعاً زیادہ رنج ہوتا ہے اور ان میں سے بعض کے ایمان لانے کے متعلق آپ کو خاص اہتمام اور شوق غالب تھا اس میں کامیاب نہ ہونے سے زیادہ رنج ہوتا تھا، اس لیے اب آگے تسلی کا مضمون ہے کہ کسی کو ایمان کی توفیق ہو جانا یہ خدا کے قبضہ قدرت میں ہے نہ کہ آپ کے، پھر رنج کیوں کیا جائے۔

آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ اللہ جس کو چاہے ہدایت کر دیتا ہے (یعنی ہدایت کرنے کی قدرت تو کسی کو خدا کے سوا کیا ہوتی، اللہ کے سوا کسی کو اس کا علم تک بھی نہیں کہ کون کون ہدایت پانے والا ہے، بلکہ) ہدایت پانے والوں کا علم اسی کو ہے۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ: سورہ شوریٰ کے اخیر میں جو ہے: انك لتھدی الی صراط الخ کہ آپ سیدھے راستہ کی طرف ہدایت کرتے ہیں، وہاں ظاہری ہدایت یعنی صرف راستہ بتلا دینا مراد ہے اور یہاں حقیقی ہدایت یعنی مقصود تک پہنچا دینا مراد ہے، حاصل یہ ہوا کہ آپ کا کام صرف رستہ بتلا دینا ہے اور مقصود تک پہنچانا اور راستہ پر ڈال دینا یہ ہمارا کام ہے، صحیح مسلم میں اس آیت کا ابوطالب کے بارے میں نازل ہونا منقول ہے، لیکن چونکہ الفاظ عام ہیں، اس لیے دوسروں کو بھی شامل ہے، تفسیر روح المعانی میں ہے کہ ابوطالب کے ایمان وکفر کے معاملے میں بے ضرورت گفتگو اور بحث ومباحثہ سے اور ان کو برا کہنے سے اجتناب کرنا چاہئے کہ اس سے آنحضرت ﷺ اور خانوادۂ سادات کی طبعی ایذا کا احتمال ہے، واللہ اعلم۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہدایت خدا کے علاوہ کسی کی قدرت میں نہیں، بعض جاہلوں کا گمان ہے کہ شیخ کامل جس کو چاہے اپنے تصرف سے واصل الی اللہ (ہدایت یافتہ) کر دے تو یہ بالکل غلط ہے۔

* * *

**فائدہ:** [1] حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے چچا (ابوطالب) کے واسطے بہت سعی کی کہ مرتے وقت کلمہ پڑھ لے، اس نے قبول نہ کیا، اس پر یہ آیت اتری، (موضح) یعنی جس سے تم کو طبعی محبت ہو، یا دل چاہتا ہو کہ فلاں کو ہدایت ہو جائے لازم نہیں کہ ایسا ضرور ہو کر رہے، آپ کا کام صرف راستہ بتانا ہے آگے یہ کہ کون راستہ پر چل کر منزل مقصود تک پہنچتا ہے کون نہیں پہنچتا، یہ آپ کے قبضہ اختیار سے خارج ہے، اللہ کو اختیار ہے جسے چاہے قبول حق اور وصول الی المطلوب کی توفیق بخشے۔

**تنبیہ:** جو کچھ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا احادیث صحیحہ میں موجود ہے، اس سے زائد اس مسئلہ میں کلام کرنا اور ابوطالب کے ایمان وکفر

کو خاص موضوع بحث بنالینا غیر ضروری ہے، بہتر یہی ہے کہ اس قسم کی غیر ضروری اور پر خطر مباحث میں کف لسان کیا جائے۔

**فائدہ: ۲** یعنی کسی کو کسی شخص کے راہ پر لانے کا اختیار کیا ہوتا علم بھی نہیں کہ کون راہ پر آنے والا ہے یا آنے کی استعداد ولیاقت رکھتا ہے بہر حال اس آیت میں نبی کریم کی تسلی فرمادی کہ آپ جاہلوں کی لغوگوئی اور معاندانہ شور وشغب یا اپنے خاص اعزہ واقارب کے اسلام نہ لانے سے غمگین نہ ہوں، جس قدر آپ کا فرض ہے وہ ادا کیے جائیں، لوگوں کی استعدادیں مختلف ہیں، اللہ ہی کے علم واختیار میں ہے کہ ان میں سے کسے راہ پر لایا جائے۔

**وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ؕ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا**

اور کہنے لگے اگر ہم راہ پر آئیں تیرے ساتھ اچک لیے جائیں اپنے ملک سے ۱ کیا ہم نے جگہ نہیں دی ان کو حرمت والے پناہ کے مکان میں

**يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۵۷**

کھنچے لے آتے ہیں اس کی طرف میوے ہر چیز کے روزی ہماری طرف سے پر بہت ان میں سمجھ نہیں رکھتے ۲

**خلاصہ تفسیر:** اوپر دور سے کفار کے ایمان نہ لانے کا ذکر چلا آ رہا ہے، اب آگے آیات میں ان موانع یا رکاوٹوں کا ذکر ہے جو کفار کے ایمان لانے کی راہ میں حائل تھے، ایک سبب تو وہی شبہ کہ قرآن دفعۃً ایک ہی بار میں کیوں نہ نازل ہوا جس کا جواب پیچھے گذر چکا، اب دوسرے سبب کا بیان ہے کہ انہیں خوف تھا کہ ہم کو ایمان سے دنیوی نقصان پہنچے گا عرب کے لوگ ہمارے دشمن ہو جائیں گے اور مکہ سے نکال دیں گے:

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر آپ کے ساتھ ہو کر (اس دین کی) ہدایت پر چلنے لگیں تو فی الفور اپنے مقام سے مار کر نکال دیئے جائیں (جس سے بے وطنی کی بھی تکلیف ہو اور معاش کی پریشانی الگ ہو، لیکن اس عذر کا باطل ہونا بالکل ہی ظاہر ہے) کیا ہم نے ان کو امن وامان والے حرم میں جگہ نہیں دی جہاں ہر قسم کے پھل کھنچے چلے آتے ہیں جو ہمارے پاس سے (یعنی ہماری قدرت اور رزاقی سے) کھانے کو ملتے ہیں (پس حرم ہونے کی وجہ سے جس کا سب احترام کرتے ہیں بے وطن ہونے کا بھی اندیشہ نہیں اور جب یہ اندیشہ نہیں تو رزق فوت ہونے کا بھی احتمال نہیں رہا، پس ان کو چاہئے تھا کہ اس حالت کو غنیمت سمجھتے اور اس کو نعمت سمجھ کر قدر کرتے اور ایمان لے آتے) ولیکن ان میں اکثر لوگ (اس کو) نہیں جانتے (یعنی اس کا خیال نہیں کرتے)۔

**اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا:** یعنی ہم نے انہیں امن وامان والے حرم میں جگہ دی، پس نو مسلموں کو جو مکہ میں تکلیف پہنچی تو وہ اس مضمون **اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ** کے خلاف نہیں، کیونکہ اول تو وہ تخطف نہیں، دوسرے اس کمزوری کا سبب یہ تھا کہ مسلمان تھوڑے تھے، اگر کثرت سے حق قبول کرتے تو یہ نوبت نہ آتی اور یہاں سب ہی کے ایمان کی نسبت گفتگو ہے، تیسرے وہ تکلیف باہر والوں نے نہیں پہنچائی خود اہل مکہ نے حرم کی تعظیم فوت کر کے تکلیف دی، اور یہی تخطف ہے، غیر اہل حرم نے تو اہل حرم کو نہیں ستایا۔

* * *

**فائدہ: ۱** انسان کو ہدایت سے روکنے والی کئی چیزیں ہیں، مثلاً نقصان، جان ومال کا خوف، چنانچہ بعض مشرکین مکہ نے حضور ﷺ سے کہا کہ بیشک ہم جانتے ہیں کہ آپ حق پر ہیں، لیکن اگر ہم دین اسلام قبول کر کے آپ کے ساتھ ہو جائیں تو سارا عرب ہمارا دشمن ہو جائے گا، اردگرد کے تمام قبائل ہم پر چڑھ دوڑیں گے اور مل کر ہمارا لقمہ کر لیں گے، نہ جان سلامت رہے گی نہ مال، اس کا آگے جواب دیا ہے۔

**فائدہ: ۲** حضرت شاہ صاحب ؒ لکھتے ہیں: "مکہ کے لوگ کہنے لگے کہ ہم مسلمان ہوں تو سارے عرب ہم سے دشمنی کریں، اللہ نے فرمایا اب ان کی دشمنی سے کس کی پناہ میں بیٹھے ہو، یہ ہی حرم کا ادب (مانع ہے کہ باوجود آپس کی سخت عداوتوں کے باہر والے چڑھائی کر کے تم کو مکہ سے نکال نہیں دیتے) وہی اللہ (جس نے اس جگہ کو حرم بنایا) تب بھی پناہ دینے والا ہے"، (موضح) کیا شرک وکفر کے باوجود تو پناہ دی، ایمان وتقویٰ اختیار کرنے پر پناہ نہ دے گا، ہاں ایمان وتقویٰ کو پرکھنے کے لیے اگر چند روزہ امتحان کے طور پر کوئی بات پیش آئے تو گھبرانا نہیں چاہیے **فَاِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ**۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ

اور کتنی غارت کر دیں ہم نے بستیاں جو اترا چلی تھیں اپنی گزران میں اب یہ ہیں ان کے گھر آباد نہیں ہوئے ان کے پیچھے

اِلَّا قَلِيْلًا ؕ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵۸﴾

مگر تھوڑے ۱؎ اور ہم ہیں آخر کو سب کچھ لینے والے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اب ان کے ایمان نہ لانے کے تیسرے سبب کا بیان ہے کہ انہیں اپنی دولت اور خوش عیشی پر ناز تھا۔

اور (ایک سبب ان کے ایمان نہ لانے کا یہ ہے کہ یہ اپنی خوش عیشی پر نازاں ہیں لیکن یہ بھی حماقت ہے، کیونکہ) ہم بہت سی ایسی بستیاں ہلاک کر چکے ہیں جو اپنے سامانِ عیش پر نازاں تھے، سو (دیکھ لو) یہ ان کے گھر (تمہاری آنکھوں کے سامنے پڑے) ہیں کہ ان کے بعد آباد ہی نہ ہوئے مگر تھوڑی دیر کے لئے (کہ کسی آتے جاتے مسافر کا ادھر کو اتفاقاً گزر ہو جائے اور وہ تھوڑی دیر وہاں ستانے کو یا تماشا دیکھنے کو بیٹھ جائے یا رات کو رہ جائے) اور آخر کار (ان کے ان سب سامانوں کے) ہم ہی مالک رہے (کوئی ظاہری وارث بھی ان کا نہ ہوا)۔

ان بستیوں سے مراد ثمود و عاد کی بستیاں ہیں جو شام کی آمد و رفت میں نظر آتی تھیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی عرب کی دشمنی سے کیا ڈرتے ہو، اللہ کے عذاب سے ڈرو، دیکھتے نہیں کتنی قومیں گزر چکی ہیں جنہیں اپنی خوش عیشی پر غرہ ہو گیا تھا، جب انہوں نے تکبر اور سرکشی اختیار کی، اللہ تعالیٰ نے کس طرح تباہ و برباد کر ڈالا کہ آج صفحۂ ہستی پر ان کا نام و نشان باقی نہ رہا، یہ کھنڈر ان کی بستیوں کے پڑے ہیں جن میں کوئی بسنے والا نہیں بجز اس کے کہ کوئی مسافر تھوڑی دیر ستانے یا قدرت الٰہی کا عبرتناک تماشہ دیکھنے کے لیے وہاں جا اترے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی سب مر مرا گئے کوئی وارث بھی نہ رہا ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ

اور تیرا رب نہیں غارت کرنے والا بستیوں کو جب تک نہ بھیج لے ان کی بڑی بستی میں کسی کو پیغام دے کر جو سنائے ان کو ہماری باتیں ۱؎

وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۹﴾

اور ہم ہرگز نہیں غارت کرنے والے بستیوں کو، مگر جب کہ وہاں کے لوگ گناہ گار ہوں ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اب ان کے ایمان نہ لانے کے چوتھے سبب کا بیان ہے کہ کفر کے باوجود عذاب نازل نہ ہونے سے شبہ ہوتا تھا، یعنی شبہ ان کو یہ ہوتا ہے کہ اگر پہلے لوگ کفر کی وجہ سے ہلاک ہوئے تو ہم تو مدت سے کفر کرتے آ رہے ہیں، ہم کو کیوں نہ ہلاک کیا گیا جیسا کہ دوسری آیتوں میں ہے: وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ الخ اور اس شبہ کی وجہ سے ایمان نہیں لاتے، سو اس کا حل یہ ہے کہ:

اور آپ کا رب بستیوں کو (اول ہی بار میں) ہلاک نہیں کیا کرتا جب تک کہ (بستیوں) کے صدر مقام میں کسی پیغمبر کو نہ بھیج لے اور (پیغمبر کو بھیجنے کے بعد بھی فوراً) ہم ان بستیوں کو ہلاک نہیں کرتے مگر اسی حالت میں کہ وہاں کے باشندے بہت ہی شرارت کرنے لگیں۔

**حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا:** ''صدر مقام''، یعنی بستیوں کی اصل اور مدار کار، ''صدر مقام'' یعنی بڑے شہروں سے عادتاً عام طور پر تمام اردگرد کے علاقوں میں خبر پہنچ جاتی ہے، کیونکہ قصبات و دیہات عادتاً شہر کے تابع ہوتے ہیں، اپنی معاشی ضروریات میں بھی اور تعلیمی ضروریات میں بھی، اور شہر میں جو بات پھیل جائے اس کا تذکرہ ملحقہ قصبات و دیہات میں خود بخود پھیل جاتا ہے، دوسرے صدر مقام یعنی شہر کے لوگ بہ نسبت

دوسرے علاقوں کے زیادہ سمجھدار بھی ہوتے ہیں تو پہلے ایسے ہی لوگوں سے خطاب کرنا مناسب ہوتا ہے۔

**وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰى اِلَّا وَاَهْلُهَا:** یعنی جب ایک خاص مدت تک بار بار کے سمجھانے سے بھی نہ مانیں تو اس وقت ہلاک کردیتے ہیں، چنانچہ جن بستیوں کی ہلاکت کا اوپر ذکر تھا وہ بھی اسی قانون کے موافق ہلاک ہوئیں، سو اسی قانون کے موافق تمہارے ساتھ عمل درآمد ہو رہا ہے، نہ تم کو رسول آنے سے پہلے ہلاک کیا، نہ رسول آنے کے بعد فوراً ہلاک کیا، مگر چند روز گزرنے دو، اگر تمہاری یہی سرکشی رہی تو سزا ہوگی، چنانچہ بدر وغیرہ میں ہوئی۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی اللہ تعالیٰ اس وقت تک بستیوں کو غارت نہیں کرتا جب تک ان کے صدر مقام میں کوئی ہشیار کرنے والا پیغمبر نہ بھیج دے (صدر مقام کی تخصیص شاید اس لیے کی کہ وہاں کا اثر دور تک پہنچتا ہے اور شہروں کے باشندے نسبتاً سلیم وعقیل ہوتے ہیں) تمام روئے زمین کی آبادیوں کا صدر مقام مکہ معظمہ تھا: لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا (الشوریٰ: ۷) اسی لیے وہاں سب سے بڑے اور آخری پیغمبر مبعوث ہوئے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی ہشیار کرنے پر بھی جب لوگ باز نہیں آتے برابر ظلم وطغیان میں ترقی کرتے چلے جاتے ہیں تب اللہ تعالیٰ پکڑ کر ہلاک کرتا ہے۔

وَمَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ

اور جو تم کو ملی ہے کوئی چیز سو فائدہ اٹھالینا (کام چلالینا) ہے دنیا کی زندگی میں اور یہاں کی (اسکی) رونق ہے اور جو اللہ کے پاس ہے سو بہتر ہے

وَّاَبْقٰى ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۰﴾ ع

اور باقی رہنے والا، کیا تم کو سمجھ نہیں

**خلاصہ تفسیر:** اب ان کے ایمان نہ لانے کے پانچویں سبب کا بیان ہے کہ انہیں دنیا سے تعلق تھا اور آخرت سے بے تعلقی، یعنی ایک وجہ ایمان نہ لانے کی یہ ہے کہ دنیا نقد ہے اس لئے مرغوب ہے اور آخرت ادھار ہے اس لئے اس سے رغبت نہیں، پس دنیا کی رغبت سے دل خالی نہیں ہوتا کہ اس میں آخرت کی رغبت سمائے اور اس کے حصول کا طریقہ تلاش کیا جائے جو کہ ایمان ہے سو اس کی نسبت یہ سن رکھو کہ:

اور جو کچھ تم کو دیا دلایا گیا ہے وہ محض (چند روزہ) دنیوی زندگی کے برتنے کے لئے ہے اور یہیں کی (زیب و) زینت ہے (کہ عمر ختم ہونے کے ساتھ اس کا بھی خاتمہ ہو جائے گا) اور جو (اجر وثواب) اللہ کے ہاں ہے وہ بدرجہا اس سے (کیفیت کے اعتبار سے بھی) بہتر ہے اور (مقدار کے اعتبار سے بھی) زیادہ (یعنی ہمیشہ) باقی رہنے والا ہے، سو کیا تم لوگ (اس فرق کو یا اس فرق کے تقاضا کو) نہیں سمجھتے (غرض تمہارے سارے شبہات اور عذر جن کی وجہ سے کفر پر جمے ہوئے ہو محض بے بنیاد اور لغو ہیں، سمجھو اور مانو)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی آدمی کو عقل سے کام لے کر اتنا سمجھنا چاہیے کہ دنیا میں کتنے دن جینا ہے اور یہاں کی بہار اور چہل پہل کا مزہ کب تک اٹھا سکتے ہی، فرض کرو دنیا میں عذاب بھی نہ آئے، تاہم موت کا ہاتھ تم سے یہ سب سامان جدا کر کے رہے گا، پھر خدا کے سامنے حاضر ہونا اور ذرہ ذرہ عمل کا حساب دینا اگر وہاں کا عیش وآرام میسر ہو گیا تو یہاں کا عیش اس کے سامنے محض ہیچ اور لاشیٔ ہے، کون عقلمند ہوگا جو ایک مکدر ومنغص زندگی کے بےغل وغش زندگی پر اور ناقص وفانی لذتوں کو کامل وباقی نعمتوں پر ترجیح دے۔

اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ

بھلا ایک شخص جس سے ہم نے وعدہ کیا ہے اچھا وعدہ سو (اور) وہ اسکو پانے والا ہے برابر ہے اسکے جس کو ہم نے فائدہ دیا دنیا کی زندگانی کا پھر وہ

يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ مِنَ الۡمُحۡضَرِيۡنَ ﴿۶۱﴾

قیامت کے دن پکڑا ہوا آیا

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے بہت سی آیتوں میں کفر اور گمراہی پر دھمکی اور ایمان کی ہدایت اور ترغیب تھی، اب کفر و ایمان کے جو ثمرات قیامت کے دن ظاہر ہوں گے ان کا ذکر ہے، یہاں پہلے اجمال ہے پھر آگے تفصیل ہے۔

بھلا وہ شخص جس سے ہم نے ایک پسندیدہ وعدہ کر رکھا ہے پھر وہ شخص اس (وعدہ کی چیز) کو پانے والا ہے کیا اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جس کو ہم نے دنیوی زندگی کا چندروزہ فائدہ دے رکھا ہے پھر وہ قیامت کے روز ان لوگوں میں ہوگا جو گرفتار کر کے لائیں جائیں گے۔

مراد پہلے شخص سے مومن ہے جس سے جنت کا وعدہ ہے اور دوسرے سے مراد کافر ہے جو مجرم ہو کر آئے گا، اور دونوں کا برابر نہ ہونا اسی اعتبار سے ہے کہ قیامت کے دن دونوں کی حاضری یکساں نہ ہوگی، مگر چونکہ ایسے لوگ متاع دنیا ہی کے سبب بھول رہے ہیں اور وہی اس قیامت کے روز حاضری کی فکر سے مانع بھی ہے اس لیے متاع دنیا کا بھی ذکر فرما دیا۔

* * *

**فائدہ:** یعنی مومن و کافر دونوں انجام کے اعتبار سے کس طرح برابر ہو سکتے ہیں، ایک کے لیے دائمی عیش کا وعدہ جو یقیناً پورا ہو کر رہے گا اور دوسرے کے لیے چندروزہ عیش کے بعد گرفتاری کا وارنٹ اور دائمی جیل خانہ، العیاذ باللہ! ایک شخص خواب میں دیکھے کہ میرے سر پر تاج شاہی رکھا ہے، خدم و حشم پرے باندھے کھڑے ہیں اور الوان نعمت دسترخوان پر چنے ہوئے ہیں جن سے لذت اندوز ہو رہا ہوں، آنکھ کھلی تو دیکھا انسپکٹر پولیس گرفتاری کا وارنٹ اور بیڑی ہتھکڑی لیے کھڑا ہے، بس وہ پکڑ کر لے گیا اور فوراً ہی پیش ہو کر حبس دوام کی سزا مل گئی، بتاؤ اسے وہ خواب کی بادشاہت اور پلاؤ قورمے کی لذت کیا یاد آئے گی۔

وَيَوۡمَ يُنَادِيۡهِمۡ فَيَقُوۡلُ اَيۡنَ شُرَكَآءِىَ الَّذِيۡنَ كُنۡتُمۡ تَزۡعُمُوۡنَ ﴿۶۲﴾

اور جس دن ان کو پکارے گا تو کہے گا (فرمائے گا) کہاں ہیں میرے شریک جن کا تم دعویٰ کرتے تھے

**خلاصہ تفسیر:** اب اس حاضری کی کیفیت اور فرق کی تفصیل بیان کرتے ہیں کہ وہ دن یاد کرنے کے قابل ہے:

اور جس دن اللہ تعالیٰ ان کافروں کو (بطور سزا کے) پکار کر کہے گا کہ وہ میرے شریک کہاں ہیں جن کو تم (ہمارا شریک) سمجھ رہے تھے (مراد اس سے شیاطین ہیں کہ انہی کی اطاعت کے سبب شرک کرتے تھے اس لئے ان کو ''شرکاء'' کہا)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی وہ خدائی کے حصہ دار کہاں ہیں ذرا اپنی تائید و حمایت کے لیے لاؤ تو سہی۔

قَالَ الَّذِيۡنَ حَقَّ عَلَيۡهِمُ الۡقَوۡلُ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيۡنَ اَغۡوَيۡنَا ۚ اَغۡوَيۡنٰهُمۡ كَمَا غَوَيۡنَا ۚ

بولے جن پر (لگ چکا الزام) ثابت ہو چکی بات اے رب یہ لوگ ہیں جن کو ہم نے بہکایا ان کو بہکایا جیسے ہم آپ بہکے

تَبَرَّاۡنَاۤ اِلَيۡكَ‌ ۖ مَا كَانُوۡۤا اِيَّانَا يَعۡبُدُوۡنَ ﴿۶۳﴾

ہم منکر ہوئے تیرے آگے وہ ہم کو نہ پوجتے تھے

**خلاصہ تفسیر:** (اس کو سن کر شیاطین) جن پر (لوگوں کو گمراہ کرنے کی وجہ سے) خدا کا فرمودہ (یعنی عذاب کا مستحق ہونا اس قول سے کہ: لَاَمۡلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الۡجِنَّةِ وَالنَّاسِ) ثابت ہو چکا ہوگا وہ (بطور عذر کے) بول اٹھیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! بیشک یہ وہی لوگ ہیں

جن کوہم نے بہکایا (یہ جواب کی تمہید ہے اس حکایت کی تصریح اس لئے فرمائی گئی کہ جن کی شفاعت کی مشرکین کوامید ہے وہ اُلٹاان کے خلاف گواہی دیں گے اور آگے جواب ہے کہ ہم نے بہکایا تو ضرور لیکن ) ہم نے ان کو ویسا ہی ( بلا جبر واکراہ ) بہکایا جیسا ہم خود ( بلا جبر واکراہ ) بہکے تھے (یعنی جس طرح ہم خود اپنے اختیار سے گمراہ ہوئے کسی نے ہمیں مجبور نہیں کیا، اسی طرح ہمیں ان پر جابرانہ تسلط نہ تھا ہمارا کام صرف بہکانا تھا پھر اس کو انہوں نے اپنی رائے اور اختیار سے قبول کرلیا جیسا سورۃ ابراہیم میں ہے: وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ الآیۃ، مطلب یہ ہے کہ ہم بھی مجرم ہیں مگر یہ لوگ بھی بری نہیں کہ اپنے اوپر کوئی الزام نہ آنے دیں ) اور ہم آپ کی پیشی میں ان کے ( تعلقات ) سے دست برداری کرتے ہیں (اور ) یہ لوگ ( درحقیقت صرف ) ہم کو ( ہی ) نہ پوجتے تھے (یعنی جب یہ اپنے اختیار سے بہکے ہیں نہ کہ محض ہمارے بہکانے سے تو اس اعتبار سے یہ خود خواہش پرست ہوئے نہ کہ صرف شیطان پرست، مقصود اس سب حکایت سے یہ ہے کہ جن کی سفارش کے بھروسے پر مشرکین بیٹھے ہیں وہ قیامت کے روز ان سے دست بردار ہوجائیں گے اور ان کے خلاف گواہی دیں گے )۔

* * *

**فائدہ:** یعنی سوال تو مشرکین سے تھا، مگر بہکانے والے شرکاء سمجھ جائیں گے کہ فی الحقیقت ہمیں بھی ڈانٹ بتلائی گئی ہے، اس لیے سبقت کر کے جواب دیں گے کہ خداوندا! بیشک ہم نے ان کو بہکایا اور یہ بہکانا ایسا ہی تھا جیسے ہم خود بہکے، یعنی جو ٹھوکر بہکنے کے وقت کھائی تھی اسی کی تکمیل بہکانے سے کی، کیونکہ بہکانا بھی بہکنے کی انتہائی منزل ہے، پس اس جرم اغواء کا تو ہمیں اعتراف ہے، لیکن ان مشرکین پر کوئی جبر واکراہ ہمارا نہ تھا کہ زبرستی اپنی بات منوالیتے فی الحقیقت ان کی ہوا پرستی تھی جو ہمارے بہکانے میں آگئے، اس اعتبار سے یہ ہم کو نہیں پوجتے تھے بلکہ اپنے اہواء وظنون کی پرستش کرتے تھے ہم ان کی عبادت سے آج آپ کے سامنے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں كذا قال بعض المفسرين، اور حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''یہ شیطان بولیں گے، بہکایا تو ہے انہوں نے پر نام لے کر نیکوں کا، اسی سے کہا کہ ہم کو نہ پوجتے تھے''، واللہ تعالیٰ اعلم۔

**تنبیہ:** حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ سے مراد ہے: لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (السجدہ: ۱۳)

وَقِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَرَاَوُا الْعَذَابَ ۚ

اور کہیں گے پکارو اپنے شریکوں کو پھر پکاریں گے ان کو تو وہ جواب نہ دیں گے ان کو ۱؎ اور دیکھیں گے عذاب

لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ ﴿۶۴﴾

کسی طرح ( کاش کہ ) وہ راہ پائے ہوئے ہوتے ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور ( جب وہ شرکاء اس طرح ان مشرکین سے بیزاری و بے رخی کریں گے تو اس وقت ان مشرکین سے ) کہا جائے گا کہ ( اب ) اپنے ان شرکاء کو بلاؤ چنانچہ ( وہ فرط حیرت سے بالاضطرار ) ان کو پکاریں گے سو وہ جواب بھی نہ دیں گے ( اور اس وقت ) یہ لوگ ( اپنی آنکھوں ) سے عذاب کو دیکھ لیں گے، اے کاش یہ لوگ دنیا میں راہ راست پر ہوتے ( تو یہ مصیبت نہ دیکھتے )۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی کہا جائے گا کہ اب مدد کو بلاؤ، مگر وہ کیا مدد کرسکتے خود اپنی مصیبت میں گرفتار ہوں گے كذا قال المفسرون، اور حضرت شاہ صاحبؒ کی تحریر کا حاصل یہ ہے کہ شیاطین جب نیکوں کا نام لیں گے تو مشرکین سے کہا جائے گا کہ ان نیکوں کو پکارو! وہ کچھ جواب نہ دیں گے، کیونکہ وہ ان مشرکانہ حرکات سے راضی نہ تھے یا خبر نہ رکھتے تھے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی اس وقت عذاب کو دیکھ کر یہ آرزو کریں گے کہ کاش دنیا میں سیدھی راہ چلتے تو یہ مصیبت کیوں دیکھنی پڑتی۔

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ مَاذَآ أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ ﴿٦٥﴾

اور جس دن ان کو پکارے گا تو فرمائے گا کیا جواب دیا تھا تم نے پیغام پہنچانے والوں کو

فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْأَنْبَآءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُونَ ﴿٦٦﴾

پھر بند ہو جائیں گی ان پر باتیں اس دن سو وہ آپس میں بھی نہ پوچھیں گے

**خلاصہ تفسیر:** اور جس دن ان کافروں سے پکار کر پوچھے گا کہ تم نے پیغمبروں کو کیا جواب دیا تھا؟ (چونکہ اس دھمکی میں یہ احتمال تھا کہ وہ کہہ دیتے کہ ہمارے پاس پیغمبر نہیں آئے اس لیے سوال سے یہ جتلا دیا کہ پیغمبر تو آئے تھے اور سمجھایا بھی تھا، سو یہ کہنے کی تو گنجائش نہیں کہ کوئی نہیں آیا، مگر یہ بات بتلاؤ کہ تم نے کیا جواب دیا؟) سو اس روز ان (کے ذہن) سے سارے مضامین گم ہو جائیں گے تو وہ (خود بھی نہ سمجھ سکیں گے اور) آپس میں پوچھ پاچھ بھی نہ کر سکیں گے۔

* * *

**فائدہ:** پہلے سوالات توحید کے متعلق تھے، یہ سوال رسالت کی نسبت ہوا، یعنی اپنی عقل سے تم نے اگر حق کو نہ سمجھا تھا تو پیغمبروں کے سمجھانے سے سمجھا ہوتا، بتلاؤ ان کے ساتھ تم نے کیا برتاؤ کیا، اس وقت کسی کو جواب نہ آئے گا اور بات کرنے کی راہیں بند ہو جائیں گی۔

فَأَمَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسَىٰٓ أَنْ يَكُونَ مِنَ الْمُفْلِحِينَ ﴿٦٧﴾

سو جس نے کہ توبہ کی اور یقین لایا اور عمل کیے اچھے سو امید ہے کہ ہو چھوٹنے والوں میں

**خلاصہ تفسیر:** البتہ جو شخص (کفر و شرک سے دنیا میں) توبہ کرے اور ایمان لے آئے اور نیک کام کیا کرے تو ایسے لوگ امید ہے کہ (آخرت میں) فلاح پانے والوں سے ہوں گے (اور ان آفات سے محفوظ رہیں گے)۔

**فَأَمَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ:** اس میں وصول الی المقصو دیعنی مقصود تک پہنچنے کے لیے تین چیزوں کو بطور شرط فرمایا: ① قلب کی توجہ اور یہ توبہ ہے ② عقائد کی تصحیح اور یہ ایمان ہے ③ اور اصلاح اعمال، پس یہ آیت سلوک کے تمام طرق کی جامع ہے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی وہاں کی کامیابی صرف ایمان و عمل صالح سے ہے، اب بھی جو کوئی کفر و شرک سے توبہ کر کے ایمان لایا اور نیکی اختیار کی، حق تعالیٰ اس کی پہلی خطائیں معاف کر کے فائز المرام کرے گا۔

**تنبیہ:** فَعَسَىٰٓ أَنْ يَكُونَ مِنَ الْمُفْلِحِينَ وعدہ ہے شہنشاہانہ انداز میں یعنی اس کو فلاح کی امید رکھنا چاہیے، گو ہم پر کسی کا دباؤ نہیں کہ ناچار ایسا کرنے پر مجبور ہوں، محض فضل و کرم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ۗ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۚ

اور تیرا رب پیدا کرتا ہے جو چاہے اور پسند کرے جس کو چاہے، ان کے ہاتھ میں نہیں پسند کرنا [۱]

سُبْحَانَ اللَّهِ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٦٨﴾

اللہ نرالا ہے اور بہت اوپر ہے اس چیز سے کہ شریک بتلاتے ہیں [۲]

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے شرک پر دھمکاتے ہوئے شرک کی برائی بھی بیان فرمائی، اب آگے توحید اور اس کے ضمن میں انعامات واحسانات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

اور آپ کا رب (صفات کمال کے ساتھ تنہا موصوف ہے چنانچہ وہ) جس چیز کو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے (چنانچہ تکوینی اختیارات بھی اسی کو حاصل ہیں) اور جس حکم کو چاہتا ہے پسند کرتا ہے (اور انبیاء کے ذریعہ سے نازل فرماتا ہے، پس تشریعی اختیارات بھی اسی کو حاصل ہیں) ان لوگوں کو تجویز (احکام) کا کوئی حق (حاصل) نہیں (کہ جو حکم چاہے تجویز کرلیں، جیسے یہ مشرک اپنی طرف سے شرک کو جائز بنا رہے ہیں اور اس خصوصی اختیار سے ثابت ہوا کہ) اللہ تعالیٰ ان کے شرک سے پاک اور برتر ہے (کیونکہ جب تکوینی اور تشریعی طور پر خالق اور مختار ہونے میں وہ تنہا ویکتا ہے تو عبادت کا بھی تنہا وہی مستحق ہے، کیونکہ معبود ہونا صرف اس کا حق ہے جو تکوینی اور تشریعی دونوں اختیار رکھتا ہو)۔

**مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ:** یعنی لوگوں کو حق تعالیٰ کا سا اختیار نہیں، اس سے انسانی اختیارات وتصرفات میں انسان کے ''جبر محمود'' ہونے کا عقیدہ ثابت ہوتا ہے، یعنی انسان اپنے اختیارات میں نہ ''مجبور محض'' ہے اور نہ ''قادر مطلق'' ہے، بلکہ ''مجبور محمود'' ہے، یعنی ایسا مجبور جو اللہ کے ہاں پسندیدہ ہے، اور وہ اختیار یہ کہ اللہ تعالیٰ تو مستقلاً قادر ومختار ہے، اور بندہ اپنے غیر مستقل ہونے کا علماً وعملاً اعتقاد رکھے، یہی ''جبر محمود'' ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱ یعنی ہر چیز کا پیدا کرنا بھی اسی کی مشیت واختیار سے ہے اور کسی چیز کو پسند کرنے یا چھانٹ کر منتخب کر لینے کا حق بھی اسی کو حاصل ہے، جو اس کی مرضی ہو احکام بھیجے، جس شخص کو مناسب جانے کسی خاص منصب ومرتبہ پر فائز کرے، جس کسی میں استعداد دیکھے راہ ہدایت پر چلا کر کامیاب فرما دے اور مخلوقات کی ہر جنس میں سے جس نوع کو یا نوع میں سے جس فرد کو چاہے اپنی حکمت کے موافق دوسرے انواع وافراد سے ممتاز بنا دے، اس کے سوا کسی دوسرے کو اس طرح کے اختیار وانتخاب کا حق حاصل نہیں، حافظ ابن القیم نے زاد المعاد کے اوائل میں اس مضمون کو بہت بسط سے لکھا ہے، فلیراجع۔

**فائدہ:** ۲ یعنی تخلیق وتشریع اور اختیار مذکور میں حق تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں لوگوں نے اپنی تجویز وانتخاب سے جو شرکاء ٹھہرا لیے ہیں سب باطل اور بے سند ہیں۔

وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿٦٩﴾ وَهُوَ اللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۭ

اور تیرا رب جانتا ہے جو چھپ رہا ہے ان کے سینوں میں اور جو کچھ کہ ظاہر میں کرتے ہیں ۱ اور وہی اللہ ہے کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا

لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُولٰى وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٧٠﴾

اُسی کی تعریف ہے دنیا اور آخرت میں اور اسی کے ہاتھ حکم ہے اور اسی کے پاس پھیرے جاؤ گے ۲

**خلاصہ تفسیر:** اور آپ کا رب (علم ایسا کامل رکھتا ہے کہ وہ) سب چیزوں کی خبر رکھتا ہے جو ان کے دلوں میں پوشیدہ رہتا ہے اور جس کو یہ ظاہر کرتے ہیں (اور کسی دوسرے کا علم بھی ایسا نہیں، اس سے بھی اس کا یکتا ہونا ثابت ہوا) اور (آگے اس کو صراحت سے بیان فرماتے ہیں کہ) اللہ وہی (ذات کامل الصفات) ہے اس کے سوا کوئی معبود (ہونے کے قابل) نہیں، حمد (وثناء) کے لائق دنیا وآخرت میں وہی ہے (کیونکہ اس کے تصرفات دونوں عالم میں ایسے ہیں جو اس کی صفات کمال پر دلالت کرتے ہیں اور حمد وثنا کی قابلیت کا مدار اسی پر ہے) اور (اختیارات سلطنت اس کے ایسے ہیں کہ) حکومت بھی (قیامت میں) اسی کی ہوگی اور (اس کی سلطنت کی وسعت وقوت ایسی ہے) کہ تم سب اسی کے پاس لوٹ کر جاؤ گے (یہ نہیں کہ بچ جاؤ یا اور کہیں جا کر پناہ لے لو)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی دل میں جو فاسد عقیدے یا بری نیتیں رکھتے ہیں اور زبان، ہاتھ، پاؤں وغیرہ سے جو کام کرتے ہیں سب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں اور وہ ہی ہر ایک شخص کی پوشیدہ استعداد و قابلیت سے آگاہ ہے اسی کے موافق معاملہ کرے گا۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی جس طرح تخلیق و اختیار اور علم محیط میں وہ متفرد ہے الوہیت میں بھی یگانہ ہے، بجز اس کے کسی کی بندگی نہیں ہوسکتی، کیونکہ اسی کی ذات منبع الکمالات میں تمام خوبیاں جمع ہیں، دنیا اور آخرت میں جو تعریف بھی ہو خواہ وہ کسی کے نام رکھ کر کی جائے حقیقت میں اسی کی تعریف ہے، اسی کا حکم چلتا ہے اسی کا فیصلہ ناطق ہے، اسی کو اقتدار کلی حاصل ہے اور انجام کار سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، آگے بتلاتے ہیں کہ رات دن میں جس قدر نعمتیں اور بھلائیاں تم کو پہنچتی ہیں اسی کے فضل و انعام سے ہیں بلکہ خود رات اور دن کا ادل بدل کرنا بھی اس کا مستقل احسان ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ

تو کہہ دیکھو تو اگر اللہ رکھ دے تم پر رات ہمیشہ کو قیامت کے دن تک ۱؎ کون حاکم ہے اللہ کے سوائے کہ لائے تم کو کہیں سے

بِضِيَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ﴿۷۱﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ

روشنی پھر کیا سنتے نہیں ۲؎ تو کہہ دیکھو تو اگر رکھ دے اللہ تم پر دن ہمیشہ کو

الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۷۲﴾

قیامت کے دن تک کون حاکم ہے اللہ کے سوائے کہ لائے تم کو رات جس میں آرام کرو، پھر کیا تم نہیں دیکھتے ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** (اور اس قدرت کے اظہار کے لئے) آپ (ان لوگوں سے) کہئے کہ بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ تم پر ہمیشہ کے لئے قیامت تک رات ہی رہنے دے تو خدا کے سوا وہ کون سا معبود ہے جو تمہارے لئے روشنی کو لے آئے (پس قدرت میں بھی وہی منفرد ہے) تو کیا تم (توحید کے ایسے صاف دلائل کو) سنتے نہیں (اور اسی قدرت کے اظہار کے لئے) آپ (ان سے اس کے عکس کی نسبت بھی) کہئے کہ بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ تم پر ہمیشہ کے لئے قیامت تک دن ہی رہنے دے تو خدا کے سوا وہ کون سا معبود ہے جو تمہارے لئے رات کو لے آئے جس میں تم آرام پاؤ، کیا تم (اس شاہد قدرت کو) دیکھتے نہیں (قدرت میں اس کا یکتا و منفرد ہونا بھی اس کا تقاضہ و مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اکیلا معبود ہو)۔

الَّيْلَ سَرْمَدًا: رات ہمیشہ رہنے کی یہ صورت ہو کہ سورج کو افق سے نکلنے نہ دے، یا اس کی روشنی زائل کر دے۔

النَّهَارَ سَرْمَدًا: اور دن ہمیشہ ہونا اس طرح ہو کہ سورج کو غروب نہ ہونے دے، یا آفتاب کے بغیر ایسی روشنی پیدا کر دے جو کسی وقت زائل نہ ہو۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ مثلاً سورج کو طلوع نہ ہونے دے یا اس سے روشنی سلب کر لے تو اپنے کاروبار کے لیے ایسی روشنی کہاں سے لا سکتے ہو۔

**فائدہ:** ۲؎ یہ بات ایسی روشن اور صاف ہے کہ سنتے ہی سمجھ میں آ جائے۔ تو کیا تم سنتے بھی نہیں۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی اگر آفتاب کو غروب نہ ہونے دے ہمیشہ تمہارے سروں پر کھڑا رکھے تو جو راحت و سکون اور دوسرے فوائد رات کے آنے سے حاصل ہوتے ہیں ان کا سامان کون سی طاقت کر سکتی ہے، کیا ایسی روشن حقیقت بھی تم کو نظر نہیں آتی۔

**تنبیہ:** اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ. اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا کے مناسب ہے کیونکہ آنکھ سے دیکھنا عادۃً روشنی پر موقوف ہے جو دن میں پوری طرح ہوتی ہے، رات کی تاریکی میں چونکہ دیکھنے کی صورت نہیں، ہاں سننا ممکن ہے، اس لیے: اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا کے ساتھ: اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ فرمانا ہی موزوں تھا، واللہ اعلم۔

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ

اور اپنی مہربانی سے بنا دیئے تمہارے واسطے رات اور دن کہ اس میں چین بھی کرو اور تلاش بھی کرو کچھ اس کا فضل

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾

اور تا کہ تم شکر کرو

**خلاصہ تفسیر:** اور (وہ منعم ایسا ہے کہ) اس نے اپنی رحمت سے تمہارے لئے رات اور دن کو بنایا تا کہ تم رات میں آرام کرو اور تا کہ دن میں اس کی روزی تلاش کرو اور تا کہ (ان دونوں نعمتوں پر) تم (اللہ کا) شکر کرو (تو انعام واحسان میں بھی وہی یکتا و منفرد ہے، یہ بھی اس کی دلیل ہے کہ وہ اکیلا معبود ہو)۔

کل صفات کمال جو اس جگہ یعنی گذشتہ چھ آیات میں توحید کے استدلال میں مذکور ہوئے یہ ہیں: ① خالق ہونا ② مختار مطلق ہونا ③ صاحب علم ہونا ④ حکومت ⑤ قوت و وسعت سلطنت ⑥ قدرت ⑦ عطاء نعمت وغیرہ ہونا۔

* * *

**فائدہ:** یعنی رات دن کا الٹ پھیر کرتا رہتا تو رات کی تاریکی اور خنکی میں سکون و راحت بھی حاصل کرلو اور دن کے اجالے میں کاروبار بھی جاری رکھ سکو، اور روز وشب کے مختلف النوع انعامات پر حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتے رہو۔

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۷۴﴾ وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ

اور جس دن ان کو پکارے گا تو فرمائے گا کہاں ہیں میرے شریک جن کا دعویٰ تم کرتے تھے، جدا کریں گے ہم ہر فرقہ میں سے ایک

شَهِيْدًا فَقُلْنَا هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۷۵﴾ ع

احوال بتلانے والا ۱ پھر کہیں گے لاؤ اپنی سند ۲ تب جان لیں گے کہ سچ بات ہے اللہ کی اور کھوئی جائیں گی ان سے جو باتیں وہ جوڑتے تھے ۳

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے توحید کے دلائل سے پہلے بھی شرک پر دھمکی دیتے ہوئے اس کی برائی مذکور تھی، اب توحید کے دلائل کے بعد پھر اسی طرز سے شرک کی مذمت مذکور ہے اور دونوں میں فرق یہ ہوسکتا ہے کہ پہلی جگہ شرک کی مذمت کا بیان بطور دعوی کے تھا اور دلائل توحید سے اس پر استدلال کیا تھا کہ شرک کا برا ہونا ان دلائل سے ثابت ہے اور اس جگہ بطور نتیجہ کے ذکر ہے کہ شرک کا برا ہونا ان دلائل سے ثابت ہو چکا، یا اہتمام اور مبالغہ کی غرض سے اسے تکرار کہا جائے۔

اور جس دن اللہ تعالیٰ ان کو پکار کر فرمائے گا (تا کہ سب لوگ ان کی رسوائی سن لیں) کہ جن کو تم میرا شریک سمجھتے تھے وہ کہاں گئے؟ اور (اگرچہ خود ان کے اقرار سے بھی ان پر حجت قائم ہوجائے گی، لیکن ان کا جرم مزید پختہ کرنے کے لیے اقرار کے ساتھ ساتھ ان پر شہادت یعنی گواہی بھی قائم کردی جائے گی اس طرح کہ) ہم ہر امت میں سے ایک ایک گواہ (بھی) نکال کر لائیں گے (مراد اس سے انبیاء ہیں جو ان کے کفر کی گواہی دیں گے) پھر ہم (ان مشرکین سے) کہیں گے کہ (اب) اپنی کوئی دلیل (شرک کے دعوی کی صحت پر) پیش کرو، سو (اس وقت) ان کو (عین الیقین سے) معلوم ہوجائے گا کہ سچ بات خدا کی تھی (جو انبیاء کے ذریعہ بتلائی گئی تھی اور شرک کا دعویٰ جھوٹا تھا) اور (دنیا میں) جو کچھ باتیں گھڑا کرتے تھے (آج) کسی کا پتہ نہ رہے گا (کیونکہ حق منکشف ہوجانے کے بعد باطل کا غائب ہوجانا لازم ہے)۔

**وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ:** چند آیات قبل جو سوال: وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ میں کیا گیا، اس میں کفار سے انبیاء کو

جواب دینے کے متعلق باز پرس تھی اور یہاں خود انبیاء علیہم السلام سے شہادت دلوانا مقصود ہے اس لئے سوال میں کوئی تکرار نہیں۔

* * *

**فائدہ:** ۱ احوال بتلانے والا پیغمبر یا ان کے نائب جو نیک بخت تھے، (موضح) وہ بتلائیں گے کہ لوگوں نے شرائع سماویہ اور احکام الٰہیہ کے ساتھ کیا برتاؤ کیا۔

**فائدہ:** ۲ یعنی خدا تعالیٰ کے شریک کس سند اور دلیل سے ٹھہرائے اور حلال وحرام وغیرہ کے احکام کس مأخذ صحیح سے لیے تھے، پیغمبروں کو تو تم نے مانا نہیں، پھر کس نے بتلایا کہ خدا کا یہ حکم ہے، یہ نہیں۔

**فائدہ:** ۳ یعنی اس وقت نظر آ جائے گا کہ سچی بات اللہ کی ہے، اور معبودیت صرف اسی کا حق ہے، کوئی اس کا شریک نہیں، دنیا میں پیغمبر جو بتلاتے تھے وہ ہی ٹھیک ہے، مشرکین نے جو عقیدے گھڑ رکھے تھے اور جو باتیں اپنے دل سے جوڑی تھیں اس روز سب کافور ہو جائیں گی۔

**اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۪ وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَاۤ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ**

قارون جو تھا سو موسیٰ کی قوم سے پھر شرارت کرنے لگا ان پر ۱ اور ہم نے دیے تھے اسکو خزانے اتنے کہ اسکی کنجیاں اٹھانے سے تھک جاتے

**بِالْعُصْبَةِ اُولِى الْقُوَّةِ ۗ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ۝۷۶**

کئی مرد زور آور ۲ جب کہا اس کو اس کی قوم نے اِترا مت اللہ کو نہیں بھاتے اترانے والے ۳

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے مختلف عنوانات سے کفر کا عنداللہ برا ہونا اور موجب ناکامی ہونا اور مال ودولت پر ناز کا بے فائدہ ہونا، عذاب وہلاکت سے اس کا نہ بچا سکنا معلوم ہوتا ہے، اب آگے قارون کے قصہ سے ان سب باتوں کی تائید کی جاتی ہے۔

قارون (کا حال دیکھ لو کہ کفر ومخالفت سے اس کو کیا نقصان پہنچا اور اس کا مال ومتاع کچھ کام نہ آیا، بلکہ سب اسکے ساتھ ہی برباد ہو گیا، مختصر اسکا قصہ یہ ہے کہ وہ) موسیٰ (علیہ السلام) کی برادری میں سے (یعنی بنی اسرائیل میں سے، بلکہ ان کا چچا زاد بھائی) تھا سو وہ (کثرت مال کی وجہ سے) ان لوگوں کے مقابلہ میں تکبر کرنے لگا اور (اسکے مال کی یہ کثرت تھی کہ) ہم نے ان اس کو اس قدر خزانے دیئے تھے کہ ان کی کنجیاں کئی کئی زور آور شخصوں کو گرانبار کر دیتی تھیں (یعنی ان سے بمشکل اٹھتی تھیں تو جب کنجیاں اس کثرت سے تھیں تو ظاہر ہے کہ خزانے بہت ہی ہوں گے اور یہ تکبر اس وقت کیا تھا) جبکہ اس کو اس کی برادری نے (سمجھانے کے طور پر کہا) کہ تو (اس مال وحشمت) پر اترا مت، واقعی اللہ تعالیٰ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

**وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَاۤ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ:** بعض کم عقلوں کو کنجیوں کے مضمون میں اشکال ہوا ہے، لیکن اگر تھوڑا غور کیا جائے تو عادتا بھی یہ بات کچھ بعید نہیں، مثلا اگر کنجیاں اٹھانے والی جماعت دس آدمیوں کی مان لی جائے جیسا کہ بعض اہل لغت نے "عصبہ" کے یہی معنی بیان کیے ہیں، اور ایک ایک آدمی کے لیے پانچ پانچ کلو کا وزن فرض کیا جائے تو جس طرح کنجیوں کو لے کر چلنے کا طریقہ ہے کہ ہاتھ میں یا جیب میں یا کمربند وغیرہ میں رکھی جاتی ہیں تو یقینا اتنی وزنی کنجیوں کو لے کر چلنا تکلف کا محتاج ہوگا، پھر لوہا وغیرہ ٹھوس چیزیں اگر چہ وزن میں کم ہوں اس کا اٹھانا ویسے بھی بہ نسبت دوسری چیزوں کے تکلف کا محتاج ہوتا ہے، اگر چہ وزن دونوں کا برابر ہو، اور ایک ایک کنجی ایک ایک تولہ کی مانی جائے تو ایک ایک آدمی کے حصہ میں چار سو کنجیاں آتی ہیں اور دس آدمیوں کے لیے چار ہزار کنجیاں ہوتی ہیں، اگر ایک کنجی ایک صندوق کی سمجھی جائے تو چار ہزار صندوق ہوئے اور ایک امیر کبیر کے پاس چار ہزار صندوق نقد مال سے بھرے ہوئے ہونا کوئی بعید بات نہیں، یقینا ایسے لوگ اب بھی ہوں گے۔

**اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ:** اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو اپنے روحانی یا دینی احوال اور واردات قلبی کو اپنی طرف منسوب کر کے اس پر ناز یا فخر نہیں کرنا چاہیے، اور اگر ان نعمتوں کو اللہ کی عطا وبخشش سمجھ کر اس پر خوش ہو تو یہ مطلوب ہے اور آیت: **قل بفضل الله وبرحمته فبذلك فليفرحوا** میں اسی کا حکم ہے۔

**فائدہ:** ا۔ رکوع سابق کے آغاز میں دنیا کی بے ثباتی اور حقارت آخرت کے مقابلہ میں بیان کی گئی تھی، بعدہ ذکر آخرت کی مناسبت سے کچھ احوال عالم آخرت کے بیان ہوئے، رکوع حاضر میں پھر اصل مضمون کی طرف عود کیا گیا ہے اور اسی دعوے کے استشہاد میں قارون کا قصہ سنایا جاتا ہے، کہتے ہیں کہ قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچازاد بھائی تھا اور فرعون کی پیشی میں رہتا تھا، جیسا کہ ظالم حکومتوں کا دستور ہے کہ کسی قوم کا خون چوسنے کے لیے انہی میں سے بعض افراد کو اپنا آلہ کار بنا لیتے ہیں، فرعون نے بنی اسرائیل میں سے اس ملعون کو چن لیا تھا، قارون نے اس وقت موقع پا کر دونوں ہاتھوں سے خوب دولت سمیٹی اور دنیاوی اقتدار حاصل کیا، جب بنی اسرائیل حضرت موسیٰ کے زیر حکم آئے اور فرعون غرق ہوا تو اس کی مالی ترقی کے ذرائع مسدود ہو گئے اور سرداری جاتی رہی، اس حسد وغیظ میں حضرت موسیٰ سے دل میں خلش رکھنے لگا، تاہم ظاہر میں مومن بنا ہوا تھا، تورات بہت پڑھتا اور علم حاصل کرنے میں مشغول رہتا تھا، مگر دل صاف نہ تھا، حضرت موسیٰ اور ہارون کی خداداد عزت ووجاہت دیکھ کر جلتا اور کہتا کہ آخر میں بھی ان ہی کے چچا کا بیٹا ہوں، یہ کیا معنی کہ وہ دونوں تو نبی اور مذہبی سردار بن جائیں، مجھے کچھ بھی نہ ملے، کبھی مایوس ہو کر شیخی مارتا کہ انھیں نبوت مل گئی تو کیا ہوا، میرے پاس مال ودولت کے اتنے خزانے ہیں جو کسی کو میسر نہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک مرتبہ زکوٰۃ نکالنے کا حکم دیا تو لوگوں سے کہنے لگا کہ اب تک تو موسیٰ جو احکام لائے ہم تم نے برداشت کیے، مگر کیا تم یہ بھی برداشت کرلو گے کہ وہ ہمارا مال بھی ہم سے وصول کرنے لگے، کچھ لوگوں نے اس کی تائید میں کہا نہیں، ہم برداشت نہیں کر سکتے، آخر ملعون نے حضرت موسیٰ کو بدنام کرنے کی ایک گندی تجویز سوچی، کسی عورت کو بہکا سکھلا کر آمادہ کیا کہ بھرے مجمع میں جب موسیٰ علیہ السلام زناء کی حد بیان فرمائیں تو اپنے ساتھ ان کو متہم کرنا، چنانچہ عورت مجمع میں کہہ گزری، جب حضرت موسیٰ نے اس کو شدید قسمیں دیں، اور اللہ تعالیٰ کے غضب سے ڈرایا تو اس کا دل ڈرا، تب اس نے صاف کہہ دیا کہ قارون نے مجھ کو سکھایا تھا، اس وقت حضرت موسیٰ کی بددعا سے وہ مع اپنے گھر اور خزانوں کے زمین میں دھنسا دیا گیا۔

**فائدہ:** ۲۔ بعض سلف نے **مفاتح** کی تفسیر خزائن سے کی ہے، یعنی اس قدر روپیہ تھا کہ طاقتور مردوں کی ایک جماعت بھی اسے مشکل سے اٹھا سکتی، لیکن اکثر مفسرین نے **مفاتح** کی تفسیر کنجیوں سے کی ہے، یعنی مال کے صندوق اتنے تھے جن کی کنجیاں اٹھاتے ہوئے کئی زور آور آدمی تھک جائیں، اور یہ چنداں مستبعد نہیں جیسا کہ بعض تفاسیر میں اس کی صورت بتلائی گئی ہے۔

**فائدہ:** ۳۔ یعنی اس فانی وزائل دولت پر کیا اتراتا ہے جس کی وقعت اللہ کے ہاں پر پشہ کی برابر بھی نہیں، خوب سمجھ لے کہ خدا تعالیٰ کو اکڑنے اور اترانے والے بندے اچھے نہیں معلوم ہوتے اور جو چیز اس مالک کو نہ بھائے اس کا نتیجہ بجز تباہی وہلاکت کے کیا ہے۔

وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ

اور جو تجھ کو اللہ نے دیا ہے اس سے کما لے پچھلا گھر ا۔ اور نہ بھول اپنا حصہ دنیا سے اور بھلائی کر جیسے

اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۷۷﴾

اللہ نے بھلائی کی تجھ سے ۲۔ اور مت چاہ خرابی ڈالنی ملک میں اللہ کو بھاتے نہیں خرابی ڈالنے والے ۳۔

**خلاصہ تفسیر:** اور (یہ بھی کہا کہ) تجھ کو خدا نے جتنا دے رکھا ہے اس میں عالم آخرت کی بھی جستجو کیا کر اور دنیا سے اپنا حصہ (آخرت میں لے جانا) فراموش مت کر اور (مطلب **وابتغ** اور **ولا تنس** کا یہ ہے کہ) جس طرح اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی (بندوں کے ساتھ) احسان کیا کر اور (خدا کی نافرمانی اور واجب حقوق کو ضائع کر کے) دنیا میں فساد کا خواہاں مت ہو (یعنی گناہ کرنے سے دنیا میں فساد ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ خصوصا وہ گناہ جن کا اثر دوسروں پر پہنچتا ہو) بیشک اللہ

تعالیٰ اہل فساد کو پسند نہیں کرتا (یہ سب نصیحت مسلمانوں کی طرف سے ہوئی، غالباً یہ مضامین اول موسیٰ علیہ السلام نے فرمائے ہوں گے پھر دوبارہ دوسرے مسلمانوں نے بھی کہا ہوگا)۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی خدا کا دیا ہوا مال اسلیے ہے کہ انسان اسے آخرت کا توشہ بنائے، نہ یہ کہ غفلت کے نشہ میں چور ہوکر غرور تکبر کی چال چلنے لگے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی حصہ موافق کھا، پہن اور زیادہ مال سے آخرت کما، اور مخلوق کے ساتھ سلوک کر۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی حضرت موسیٰ کی ضد نہ کر، خدا کی زمین پر سیدھی طرح رہ، خواہ مخواہ ملک میں اودھم مچانا اور خرابیاں ڈالنا اچھا نہیں۔

قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ

بولا یہ مال تو مجھ کو ملا ہے ایک ہنر سے جو میرے پاس ہے ۱؎ کیا اس نے یہ نہ جانا کہ اللہ، غارت کر چکا ہے اس سے پہلے کتنی جماعتیں

مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۷۸﴾

جو اس سے زیادہ رکھتی تھیں زور اور زیادہ رکھتی تھیں مال کی جمع ۲؎ اور پوچھے نہ جائیں گناہ گاروں سے ان کے گناہ ۳؎

**خلاصہ تفسیر:** قارون (یہ سن کر) کہنے لگا کہ مجھ کو یہ سب کچھ میری ذاتی ہنرمندی سے ملا ہے (یعنی میں تلاش معاش کی تدبیریں خوب جانتا ہوں اسی سے میں نے یہ سب مال جمع کیا ہے، پھر میرا فخر کرنا بے جا نہیں اور نہ اس کو غیبی احسان کہا جا سکتا ہے اور نہ کسی دوسرے کا اس میں کچھ حق ہو سکتا ہے، آگے اللہ تعالیٰ اس کے اس قول کو رد فرماتے ہیں کہ:) کیا اس (قارون) نے (اخبار متواتر سے) یہ نہ جانا کہ اللہ تعالیٰ اس سے پہلے امتوں میں ایسے ایسوں کو ہلاک کر چکا ہے جو قوت (مالی) میں (بھی) اس سے کہیں بڑھے ہوئے تھے اور مجمع (بھی اس سے) اُن کا زیادہ تھا اور (صرف یہی نہیں کہ بس ہلاک ہو کر چھوٹ گئے ہوں بلکہ کفر کے جرم کی وجہ سے قیامت میں بھی ان کو عذاب ہوگا جیسا وہاں کا قاعدہ ہے کہ) اہل جرم سے ان کے گناہوں کا (تحقیق کرنے کی غرض سے) سوال نہ کرنا پڑے گا (کیونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ سب معلوم ہے)

**وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ:** اگرچہ زجر و تنبیہ یعنی دھمکانے کے طور پر آخرت میں سوال ہوگا: لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ، اس کے بعد عذاب میں گرفتار کر دیے جائیں گے، مطلب یہ کہ اگر قارون اس مضمون پر نظر کرتا تو ایسی جہالت کی بات نہ کہتا، کیونکہ پچھلی قوموں کی دنیوی ہلاکت و عذاب سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا، اور آخرت کے مواخذہ سے اس کا احکم الحاکمین ہونا ظاہر ہے، پھر کسی کو کیا حق ہے کہ اللہ کی نعمت کو اپنی ہنرمندی کا نتیجہ بتلائے اور ایسے شخص کی کیا رائے جو واجب حقوق سے انکار کرے۔

**اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ:** اس سے معلوم ہوا کہ ثمرات کو اپنی کوشش اور مجاہدہ کی طرف منسوب کرنا برا ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی میں ہنرمند تھا، کمانے کا سلیقہ رکھتا تھا، اپنی لیاقت و قابلیت یا کسی خاص علمی مہارت سے مجھے یہ دولت حاصل ہوئی، اللہ نے بھی میری لیاقت کو دیکھ کر اور قابل جان کر یہ کچھ دیا ہے، کیا یونہی بیٹھے بٹھائے بے محنت مل گیا ہے کہ موسیٰ کے حکم اور تمہارے مشورہ کے موافق خدا کے نام پر خرچ کر ڈالوں۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی دولت کمانے کی لیاقت کس نے دی، افسوس ہے منعم حقیقی کو بھول کر اس کی دی ہوئی دولت و لیاقت پر غرہ کرنے لگا، کیا اسی دولت کو اس نے اپنی نجات کا ضامن تصور کر رکھا ہے، اسے معلوم نہیں کتنی جماعتیں اپنی شرارت و سرکشی کی بدولت پہلے تباہ کی جا چکی ہیں، جن کے پاس بادشاہتیں تھیں اور اس ملعون سے زیادہ خزانوں اور لشکروں کے مالک تھے، ان کا انجام سن کر اسے عبرت نہ ہوئی۔

**فائدہ:** ۳؎ یعنی پوچھنے کی ضرورت کیا ہوگی، اللہ کو ان کے گناہ ایک ایک کر کے معلوم ہیں، فرشتوں کے ہاں سب لکھے ہوئے ہیں، ہاں بطور

توبیخ وتقریع اگر کسی وقت سوال ہو وہ دوسری بات ہے، یا یہ کنایہ ہے گناہوں کی کثرت سے، یعنی اتنی تعداد میں ہوں گے کہ ایک ایک جزئی کی پوچھ پاچھ کی ضرورت نہ رہے گی، اور حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''پوچھے نہ جائیں گے گناہ، یعنی گنہگار کی سمجھ درست ہو تو گناہ کیوں کرے، جب سمجھ الٹی پڑے تو الزام دینے سے کیا فائدہ کہ یہ برا کام کیوں کرتا ہے اس کی برائی نہیں سمجھتا''۔ (موضح)

فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ فِیْ زِیْنَتِهٖ ؕ قَالَ الَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَاۤ

پھر نکلا اپنی قوم کے سامنے اپنے ٹھاٹھ سے کہنے لگے جو لوگ طالب تھے دنیا کی زندگانی کے اے کاش ہم کو ملے جیسا کچھ

اُوْتِیَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ﴿۷۹﴾

ملا ہے قارون کو بیشک اس کی بڑی قسمت ہے

**خلاصہ تفسیر:** پھر (ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ) وہ اپنی آرائش (اور شان) سے اپنی برادری کے سامنے نکلا جو لوگ (اس کی برادری میں) دنیا کے طالب تھے (اگرچہ مومن ہوں جیسا ان کے اگلے قول: وَیْكَاَنَّ اللّٰهَ یَبْسُطُ الخ سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مؤمن تھے، وہ لوگ) کہنے لگے کیا خوب ہوتا کہ ہم کو بھی وہ ساز و سامان ملا ہوتا جیسا قارون کو ملا ہے واقعی وہ بڑا صاحب نصیب ہے (یہ حرص کی تمنا تھی، اس سے کافر ہونا لازم نہیں آتا، جیسا کہ اب بھی بعض لوگ مسلمان ہونے کے باوجود دن رات دوسری قوموں کی ترقیاں دیکھ کر للچاتے ہیں اور اس کی فکر میں لگے رہتے ہیں)۔

* * *

**فائدہ:** یعنی لباس فاخرہ پہن کر بہت سے خدم وحشم کے ساتھ بڑی شان وشکوہ اور ٹیپ ٹاپ سے نکلا، جسے دیکھ کر طالبین دنیا کی آنکھیں چندھیا گئیں، کہنے لگے کاش ہم بھی دنیا میں ایسی ترقی اور عروج حاصل کرتے جو اس کو حاصل ہوا، بیشک یہ بڑا ہی صاحب اقبال اور بڑی قسمت والا ہے۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَیْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَیْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ

اور بولے جن کو ملی تھی سمجھ اے خرابی تمہاری اللہ کا دیا ثواب بہتر ہے ان کے واسطے جو یقین لائے اور کام کیا بھلا[1]

وَلَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ﴿۸۰﴾

اور یہ بات انہی کے دل میں پڑتی ہے جو سہنے والے ہیں (صبر سے رہنے والے)[2]

**خلاصہ تفسیر:** اور جن لوگوں کو (دین کی) فہم عطا ہوئی تھی وہ (ان حریصوں سے) کہنے لگے ارے تمہارا ناس ہو (تم اس دنیا پر کیا للچاتے ہو) اللہ تعالیٰ کے گھر کا ثواب (اس دنیوی کرّوفر سے) ہزار درجہ بہتر ہے جو ایسے شخص کو ملتا ہے کہ ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور (پھر ایمان وعمل صالح والوں میں سے بھی) وہ (ثواب کامل طور پر) ان ہی لوگوں کو دیا جاتا ہے جو (دنیا کی حرص وطمع سے) صبر کرنے والے ہیں (پس تم لوگ ایمان کی تکمیل اور عمل صالح حاصل کرنے میں لگو اور حد شرعی کے اندر رہ کر دنیا حاصل کرو، زائد کی حرص وطمع سے صبر کرو)۔

**وَقَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ:** اس آیت میں الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ یعنی علماء کا مقابلہ گذشتہ آیت میں الَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا سے کیا گیا ہے جس میں واضح اشارہ اس طرف ہے کہ متاع دنیا کا ارادہ اور اس کو مقصود بنانا اہل علم کا کام نہیں، اہل علم کی نظر ہمیشہ آخرت کے دائمی فائدہ پر رہتی ہے، متاع دنیا کو بقدر ضرورت حاصل کرتے ہیں اور اسی پر قناعت کرتے ہیں، معتبر علم وہ ہے جس سے دنیا مقصود نہ ہو۔

**وَیْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَیْرٌ:** اس سے مقصود بددعا نہیں، بلکہ شفقت یا غلطی پر تنبیہ کرنے کے موقعہ پر ایسا کلمہ ہمارے محاورہ میں بھی بولا جاتا

ہے، اسی طرح ویلکم عربی کا محاورہ ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نصیحت وتعلیم میں زجر وتنبیہ جائز ہے جبکہ بات واضح ہو اور مخاطب قبول نہ کرے، اور خلاصہ تفسیر میں ''ثواب کامل'' کی قید اس لیے لگائی کہ کچھ ثواب تو ہر مسلمان کو حاصل ہوتا ہی ہے۔

**وَلَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ:** یہ مجاہدہ کے مطلوب ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی سمجھدار اور ذی علم لوگوں نے کہا کم بختو! اس فانی چمک دمک میں کیا رکھا ہے جو ریجھے جاتے ہو، مومنین صالحین کو اللہ کے ہاں جو دولت ملنے والی ہے اس کے سامنے یہ ٹیپ ٹاپ محض ہیچ اور لاشیٔ ہے اتنی بھی نسبت نہیں جو ذرہ کو آفتاب سے ہوتی ہے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی دنیا سے آخرت کو بہتر وہ ہی جانتے ہیں جن سے محنت سہی جاتی ہے، اور بے صبر لوگ حرص کے مارے دنیا کی آرزو پر گرتے ہیں، نادان آدمی دنیا کی آسودگی دیکھ کر سمجھتا ہے کہ اس کی بڑی قسمت ہے اس کی شب وروز کی فکر وتشویش، دردسری اور آخرت کی ذلت کو اور سو جگہ خوشامد کرنے کو نہیں دیکھتا اور یہ نہیں دیکھتا کہ دنیا میں کچھ آرام ہے تو دس بیس برس، اور مرنے کے بعد کاٹنے ہیں ہزاروں برس، (موضح بتغییر یسیر)

فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ ۣ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۤ

پھر دھنسا دیا ہم نے اس کو اور اس کے گھر کو زمین میں پھر نہ ہوئی اس کی کوئی جماعت جو مدد کرتی اس کی اللہ کے سوائے

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ﴿٨١﴾

اور نہ وہ خود مدد لاسکا

**خلاصہ تفسیر:** پھر ہم نے اس قارون کو اور اس کے محل سرائے کو (اس کی شرارت بڑھ جانے سے) زمین میں دھنسا دیا، سو کوئی ایسی جماعت نہ ہوئی جو اس کو اللہ (کے عذاب) سے بچا لیتی (اگر چہ وہ بڑی جماعت والا تھا) اور نہ وہ خود ہی اپنے کو بچا سکا۔

**فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ:** قارون جس شرارت کی وجہ سے دھنسایا گیا اس کی نسبت درمنثور میں حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اس کو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ احکام شرعیہ کی وجہ سے خصوصاً زکوۃ کے حکم کی وجہ سے دشمنی تھی، اس نے کسی بدکار عورت کو کچھ روپیہ دے کر بہکایا کہ تو مجمع عام میں موسیٰ علیہ السلام پر بدکاری کی تہمت لگانا، جب اس کا موقع ہوا اللہ تعالیٰ نے اس کو ہدایت کی اور اس نے سچا سچا واقعہ بیان کر دیا کہ مجھ کو قارون نے بہکایا تھا، اس وقت موسیٰ علیہ السلام کو غصہ آیا اور بددعا فرمائی جس سے وہ اپنے گھر بار کے ساتھ زمین میں غرق ہو گیا، اور سب سے بڑھ کر گناہ ایمان نہ لانا ہے، شاید یہ پہلے سے ہی ایمان نہ لایا ہو جیسا کہ سورہ مؤمن کی اس آیت سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے: ولقد ارسلنا موسیٰ بآیٰتنا وسلطٰن مّبین الی فرعون وھامان وقارون فقالو سٰحر کذّاب۔

* * *

**فائدہ:** یعنی نہ کوئی دوسرا اپنی طرف سے مدد کو پہنچا، نہ یہ کسی کو بلا سکا، نہ اپنی ہی قوت کام آئی نہ دوسروں کی۔

وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ

اور فجر کو لگے کہنے جو کل شام آرزو کرتے (مانگتے) تھے اس کا سا درجہ ارے خرابی یہ تو اللہ کھول دیتا ہے روزی جس کو چاہے

مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ۭ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿٨٢﴾ ع

اپنے بندوں میں اور تنگ کر دیتا ہے ۱؎ اگر نہ احسان کرتا ہم پر اللہ تو ہم کو بھی دھنسا دیتا، اے خرابی یہ تو چھٹکارا نہیں پاتے منکر ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور کل (یعنی پچھلے قریب زمانہ میں) جو لوگ اس جیسے ہونے کی تمنا کر رہے تھے وہ (آج اس کو زمین میں دھنسا دیکھ کر) کہنے لگے بس جی یوں معلوم ہوتا ہے کہ (رزق کی فراخی اور تنگی کا مدار خوش نصیبی یا بدنصیبی پر نہیں ہے، بلکہ یہ تو محض خدا کی تکوینی حکمت ہے، اور اللہ ہی کے قبضہ میں ہے، بس) اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے زیادہ روزی دے دیتا ہے اور (جس کو چاہے) تنگی سے دینے لگتا ہے (یہ ہماری غلطی تھی کہ اس کو خوش نصیبی سمجھتے تھے ہماری توبہ ہے، اور واقعی) اگر ہم پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی نہ ہوتی تو ہم کو بھی دھنسا دیتا (کیونکہ حرص اور دنیا کی محبت کا گناہ ہم سے بھی صادر ہوا تھا) بس جی معلوم ہوا کہ کافروں کو فلاح نہیں ہوتی (اگرچہ چند روز مزے لوٹ لیں مگر انجام پھر ناکامی ہے، بس یقینی کامیابی اہل ایمان ہی کے لیے ہے)۔

* * *

**فائدہ: ۱** یعنی جو لوگ قارون کی ترقی و ترفع کو دیکھ کر کل یہ آرزو کر رہے تھے کہ کاش ہم کو بھی ایسا عروج حاصل ہوتا، آج اس کا یہ برا انجام دیکھ کر کانوں پر ہاتھ دھرنے لگے، اب ان کو ہوش آیا کہ ایسی دولت حقیقت میں ایک خوبصورت سانپ ہے جس کے اندر مہلک زہر بھرا ہوا ہے، کسی شخص کی دنیاوی ترقی وعروج کو دیکھ کر ہم کو ہرگز یہ فیصلہ نہیں کر لینا چاہیے کہ اللہ کے ہاں وہ کچھ عزت و وجاہت رکھتا ہے، یہ چیز کسی بندے کے مقبول ومردود ہونے کا معیار نہیں بن سکتی، اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے، جس پر مناسب جانے روزی کے دروازے کھول دے جس پر چاہے تنگ کر دے، مال ودولت کی فراخی مقبولیت اور خوش انجامی کی دلیل نہیں، بلکہ بسا اوقات اس کا نتیجہ تباہی اور ابدی ہلاکت کی صورت میں نمودار ہوتا ہے سچ ہے:

كَمْ عَاقِلٍ عَاقِلٍ اَعْيَتْ مَذَاهِبه — وَكَمْ جَاهِلٍ جَاهِلٍ تَلْقَاهُ مَرْزُوْقاً

هٰذَا الَّذِيْ تَرَكَ الْاَوْهَامَ حَائِرَةً — وَصَيَّرَ الْعَالِمَ النَّحْرِيْرَ زِنْدِيْقًا

**فائدہ: ۲** یعنی خدا تعالیٰ کا احسان ہے اس نے ہم کو قارون کی طرح نہ بنایا، ورنہ یہی گت ہماری بنتی، اپنی طرف سے تو ہم حرص کے مارے یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ قَارُوْنُ کی آرزو کر ہی چکے تھے، خدا نے خیر کی کہ ہماری آرزو کو پورا نہ کیا، اور نہ ہماری حرص پر سزا دی، بلکہ قارون کا حشر آنکھوں سے دکھلا کر بیدار فرما دیا، اب ہمیں خوب کھل گیا کہ محض مال وزر کی ترقی سے حقیقی فلاح وکامیابی حاصل نہیں ہو سکتی، اور یہ کہ ناشکر گزار منکروں کے لیے عذاب الٰہی سے چھٹکارا نہیں۔

## تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ط

وہ گھر پچھلا ہے، ہم دیں گے وہ ان لوگوں کو جو نہیں چاہتے اپنی بڑائی ملک میں اور نہ بگاڑ ڈالنا

## وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۸۳﴾

اور عاقبت بھلی ہے ڈرنے والوں کی

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے قارون کے قصہ میں تکبر، معصیت اور اتراہٹ کا برا ہونا اور ایمان وعمل صالح کا بہتر اور مقصود ہونا بیان ہوا، اس سے پہلے بھی یہ مضمون ارشاد ہوا تھا، اب آگے اسی کی تائید اور وضاحت کے لیے بیان فرماتے ہیں کہ ثواب آخرت کا حاصل ہونا تکبر وفساد نہ کرنے اور تقویٰ اختیار کرنے پر موقوف ہے، اور آخرت کے ثمرات اعمال صالحہ ہی کی بدولت ملیں گے۔

یہ عالم آخرت (جس کے ثواب کا مقصود ہونا اوپر: ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ میں بیان ہوا ہے) ہم انہی لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا (یعنی نہ تکبر کرتے ہیں جو کہ نفسانی وباطنی گناہ ہے اور نہ کوئی دوسرا ظاہری گناہ کرتے ہیں، خصوصا وہ گناہ جس سے زمین میں فساد برپا ہو اور جس کا اثر دوسروں تک پہنچے، جیسا کہ فرعون وقارون تکبر وفساد کے مرتکب ہوئے) اور (صرف ان باطنی اور ظاہری برائیوں سے بچنا

کافی نہیں، بلکہ ) نیک نتیجہ متقی لوگوں کو ملتا ہے ( جو گناہوں کو چھوڑنے کے ساتھ احکام اور اعمال صالحہ کے بھی پابند ہوں )۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا: یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ آخرت کی زندگی جس طرح گناہوں سے خراب ہوتی ہے اسی طرح تکبر سے بھی خراب و ناکام ہوتی ہے، اس لیے مشائخ ترک معاصی کی طرح تکبر کے ازالہ کا بھی اہتمام کرتے ہیں (یعنی اخروی نعمتوں کے حصول کے لیے جس طرح گناہوں کا چھوڑنا ضروری ہے اسی طرح غرور تکبر اور اس کے متعلقات یعنی عجب وخود پسندی وغیرہ کو چھوڑنا اور اجتناب کرنا بھی ضروری ہے، اسی لیے شیوخ طریقت مختلف طریقوں سے اس سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں )۔

لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا: یہ تکبر اور فساد اگر حد کفر تک ہے تب تو بالکل ثواب سے مانع ہے، اور یہ جو فرمایا کہ ''دنیا میں بڑا بننا نہیں چاہتے''، اس میں تکبر اور فساد کے ارادہ پر دار آخرت سے محروم ہونے کی وعید ہے، اس سے معلوم ہوا کہ کسی معصیت کا پختہ ارادہ جو عزم مصمم کے درجہ میں آجائے وہ بھی معصیت ہی ہے، البتہ اگر پھر وہ خدا کے خوف سے اس ارادہ کو ترک کردے تو گناہ کی جگہ ثواب اس کے نامہ اعمال میں درج ہوتا ہے اور اگر کسی غیر اختیاری سبب سے اس گناہ پر قدرت نہ ہوئی اور عمل نہ کیا مگر اپنی کوشش گناہ کے لئے پوری کی تو وہ بھی معصیت اور گناہ لکھا جائے گا۔

* * *

**فائدہ:** یعنی قارون کی دولت کو نادانوں نے کہا کہ اس کی بڑی قسمت ہے، بڑی قسمت یہ نہیں، آخرت کا ملنا بڑی قسمت ہے، سو وہ ان کے لیے ہے جو اللہ کے ملک میں شرارت کرنا اور بگاڑ ڈالنا نہیں چاہتے اور اس فکر میں نہیں رہتے کہ اپنی ذات کو سب سے اونچا رکھیں، بلکہ تواضع وانکسار اور پرہیزگاری کی راہ اختیار کرتے ہیں، ان کی کوشش بجائے اپنی ذات کو اونچا رکھنے کی یہ ہوتی ہے کہ اپنے دین کو اونچا رکھیں، حق کا بول بالا کریں اور اپنی قوم مسلم کو ابھارنے اور سربلند کرنے میں پوری ہمت صرف کر ڈالیں، وہ دنیا کے حریص نہیں ہوتے، آخرت کے عاشق ہوتے ہیں، دنیا خود ان کے قدم لیتی ہے، اب سوچ لو کہ دنیا کا مطلوب کیا دنیا کے طالب سے اچھا نہیں ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھ لو! وہ سب سے زیادہ ترک الدنیا تھے مگر متروک الدنیا نہ تھے، بہرحال مومن کا مقصد اصلی آخرت ہے، دنیا کا جو حصہ اس مقصد کا ذریعہ بنے وہ ہی مبارک ہے ورنہ ہیچ۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ

جو لے کر آیا بھلائی اس کو ملنا ہے ( ملے گا ) اس سے بہتر [1] اور جو کوئی لے کر آیا برائی سو برائیاں کرنے والے ان کو وہی سزا ملے گی

اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۸۴

جو کچھ کرتے تھے [2]

**خلاصہ تفسیر:** ( گناہوں کو چھوڑنے اور اعمال کے بجالانے پر جزا و سزا کی کیفیت یہ ہوگی کہ ) جو شخص ( قیامت کے دن ) نیکی لے کر آئے گا اس کو اس ( کے مقتضا ) سے بہتر ( بدلہ ) ملے گا ( کیونکہ نیک عمل کا اصل تقاضہ تو یہ ہے کہ اس کی حیثیت کے موافق بدلہ ملے، مگر وہاں اس سے زیادہ دیا جائے گا جس کا کم سے کم درجہ اس کی حیثیت سے دس گنا ہے ) اور جو شخص بدی لے کر آئے گا سو ایسے لوگوں کو جو بدی کا کام کرتے ہیں اتنا ہی بدلہ ملے گا جتنا وہ کرتے تھے ( یعنی اس کے تقاضہ سے زیادہ بدلہ سزا کا نہ ملے گا )۔

* * *

**فائدہ:** [1] یعنی جو بھلائی یہاں کرے گا اس سے کہیں بہتر بھلائی وہاں کی جائے گی، ایک نیکی کا جو مقتضی ہوگا کم از کم اس سے دس گنا ثواب پائے گا۔

**فائدہ:** [2] حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں نیکی پر وعدہ دیا نیکی کا، وہ یقیناً ملنا ہے، اور برائی پر برائی کا وعدہ نہیں فرمایا کہ ضرور مل کر رہے گی کیونکہ ممکن ہے معاف ہو جائے، ہاں یہ فرما دیا کہ اپنے کیے سے زیادہ سزا نہیں ملتی۔

اِنَّ الَّذِیۡ فَرَضَ عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ ؕ قُلۡ رَّبِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَنۡ جَآءَ بِالۡهُدٰی

جس نے حکم بھیجا تجھ پر قرآن کا وہ پھیر لانے والا ہے تجھ کو پہلی جگہ ۱؎ تو کہہ میرا رب جانتا ہے کون لایا ہے راہ کی سوجھ

وَمَنۡ هُوَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۸۵﴾

اور کون پڑا ہے صریح گمراہی میں ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** پیچھے رسالت وتوحید اور قیامت کے مضامین دور سے چلے آرہے ہیں، بلکہ موسیٰ علیہ السلام کے قصہ سے بھی اگر رسالت محمدیہ کا ثابت کرنا مقصود مانا جائے اور اس قصہ کو بھی مضمون رسالت کے متعلق کہا جائے تو گویا شروع سورت ہی سے یہ سلسلہ چلا آرہا ہے، اب آگے خاتمہ میں نہایت بلاغت اور اختصار کے ساتھ ان ہی مضامین کو بطور خلاصہ کے مکرر فرماتے ہیں اور مضمون رسالت کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی اور مضمون توحید کے ساتھ تمام عالم کے وجود کا فانی ہونا اور مضمون قیامت کے ساتھ جزا وسزا ہونا مذکور ہے، پس خاتمہ گویا تمام سورت کے مضامین کا اجمالی طور پر میزان کل ہے، یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ کو چلے اور جحفہ پہنچ کر آپ کو مکہ کا جو آپ کا وطن تھا اشتیاق غالب ہوا، وہاں بطور وعدہ کے یہ آیت نازل ہوئی جس میں یہ پیشین گوئی ہے کہ آپ مکہ میں پھر چین کے ساتھ داخل ہوں گے۔

(آپ کے مخالفین نے جو آپ کو پریشان کر کے ترک وطن یعنی ہجرت پر مجبور کیا ہے جس کی اضطراری مفارقت کا آپ کو صدمہ ہے تو آپ تسلی رکھیں) جس خدا نے آپ پر قرآن (کے احکام پر عمل اور اس کی تبلیغ) کو فرض کیا ہے (جو مجموعی طور پر آپ کی نبوت کی دلیل ہے) وہ آپ کو (آپ کے) اصلی وطن (یعنی مکہ) میں پھر پہنچا دے گا (اور اس وقت آپ آزاد اور غالب اور صاحب سلطنت ہوں گے اور ایسی حالت میں اگر دوسری جگہ قیام کے لئے تجویز کی جاتی ہے وہ مصلحت اور اختیار سے ہوتی ہے جس سے رنج نہیں ہوتا)۔

(کفار مکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کرتے تھے کہ تم گمراہی میں ہو، اس کی بابت ارشاد فرماتے ہیں کہ آپ کی نبوت ثابت ہونے کے باوجود جو یہ لوگ آپ کو غلطی پر اور اپنے کو حق پر سمجھتے ہیں تو) آپ (ان سے) فرما دیجئے کہ میرا رب خوب جانتا ہے کہ کون سچا دین لے کر (من جانب اللہ) آیا ہے اور کون صریح گمراہی میں (مبتلا) ہے (یعنی میرے حق پر ہونے اور تمہارے باطل پر ہونے کے قطعی دلائل موجود ہیں مگر جب ان سے کام نہیں لیتے تو اخیر جواب یہی ہے کہ خیر، خدا کو معلوم ہے وہ بتلا دے گا)۔

حاصل کلام کا یہ ہے کہ جس نے آپ کو نبی اور صاحب وحی بنایا ہے اور نبی سے جو وعدہ کیا جاتا ہے وہ یقیناً سچا ہوتا ہے، کیونکہ وحی دلیل قطعی ہے، وہ آپ سے یہ وعدہ کرتا ہے، پس بالیقین ایسا ہوگا، چنانچہ فتح مکہ کے دن نہایت خوبی وکامیابی کے ساتھ یہ وعدہ پورا ہوا، اس پیشین گوئی کا واقع ہونا عقلاً آپ کی نبوت کی دلیل ہے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ پہلے فرمایا تھا: وَالۡعَاقِبَةُ لِلۡمُتَّقِیۡنَ کہ انجام بھلا پرہیزگاروں کا ہے، یعنی آخرت میں جیسا کہ اوپر معلوم ہوا، اب بتلاتے ہیں کہ دنیا میں بھی آخر فتح ان ہی کی ہوتی ہے، دیکھو آج کفار کے ظلم وستم سے تنگ آکر تم کو مکہ چھوڑنا پڑا ہے مگر جس خدا نے آپ کو پیغمبر بنایا اور قرآن جیسی کتاب عطا فرمائی وہ یقیناً آپ کو نہایت کامیابی کے ساتھ اسی جگہ واپس لائے گا، حضرت شاہ صاحب ؒ لکھتے ہیں: ''یہ آیت اتری ہجرت کے وقت، یہ تسلی فرما دی کہ پھر مکہ میں آؤ گے، سو خوب طرح آئے پورے غالب ہو کر''۔

بعض مفسرین نے **معاد** سے مراد موت لی ہے، بعض نے آخرت بعض نے جنت، بعض نے سرزمین شام جہاں پہلے ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج میں تشریف لے گئے تھے، حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ نے ان اقوال میں بہت عمیق ولطیف تطبیق دی، یعنی **معاد** سے مراد اس جگہ مکہ معظمہ ہے (کمافی البخاری) مگر فتح مکہ علامت تھی قرب اجل کی جیسا کہ ابن عباس اور عمر رضی اللہ عنہما نے اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا،

آگے اجل کے بعد ''حشر'' حشر کے بعد ''آخرت'' اور آخرت کی انتہائی منزل جنت ہے، مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ اول آپ ﷺ کو نہایت شاندار طریقہ سے لوٹا کر لائے گا مکہ میں، اس کے چند روز بعد اجل واقعہ ہوگئی، پھر ارض شام کی طرف حشر ہوگا (جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے) پھر آخرت میں بڑی شان وشکوت سے تشریف لائیں گے اور اخیر میں جنت کے سب سے اعلیٰ مقام پر ہمیشہ کے لیے پہنچ جائیں گے۔

**فائدہ:** ۲؎ یعنی حق تعالیٰ میری ہدایت کو مکذبین و معاندین کی گمراہی کو خوب جانتا ہے، یقیناوہ ہر ایک کے ساتھ ان کے احوال کے موافق معاملہ کرے گا، یہ نہیں ہوسکتا کہ میری کوششوں کو ضائع کردے، یا گمراہوں کو رسوانہ کرے۔

وَمَا كُنتَ تَرْجُوٓا۟ أَن يُلْقَىٰٓ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبُ إِلَّا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ۖ فَلَا تَكُونَنَّ ظَهِيرًا لِّلْكَٰفِرِينَ ﴿٨٦﴾

اور تو توقع نہ رکھتا تھا کہ اتاری جائے تجھ پر کتاب مگر مہربانی سے تیرے رب کی ۱؎ سو تو مت ہو مددگار کافروں کا ۲؎

**خلاصہ تفسیر:** اور (آپ کی یہ دولت نبوت محض خداداد ہے حتی کہ خود) آپ کو (نبی ہونے سے قبل) یہ توقع نہ تھی کہ آپ پر یہ کتاب نازل کی جائے گی مگر محض آپ کے رب کی مہربانی سے اس کا نزول ہوا، سو آپ (ان لوگوں کی خرافات کی طرف توجہ نہ کیجئے اور جس طرح اب تک ان سے الگ تھلگ رہے آئندہ ہمیشہ بھی اسی طرح) ان کافروں کی ذرا تائید نہ کیجئے۔

* * *

**فائدہ:** ۱؎ یعنی آپ پہلے سے کچھ پیغمبری کے انتظار میں نہ تھے، محض رحمت وموہبت الٰہیہ ہے جو حق تعالیٰ نے پیغمبری اور وحی سے سرفراز فرمایا، وہ ہی اپنی مہربانی اور رحمت سے دنیا وآخرت میں کامیاب فرمائے گا لہٰذا اسی کی امداد پر ہمیشہ بھروسہ رکھیے۔

**فائدہ:** ۲؎ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں یعنی اپنی قوم کو اپنا نہ سمجھ جنہوں نے تجھ سے یہ بدی کی (کہ وطن چھوڑنے پر مجبور کیا) اب جو تیرا ساتھ دے وہ ہی اپنا ہے۔

وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ ءَايَٰتِ ٱللَّهِ بَعْدَ إِذْ أُنزِلَتْ إِلَيْكَ ۖ وَٱدْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ ۖ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ ﴿٨٧﴾

اور نہ ہو کہ تجھ کو روک دیں اللہ کے حکموں سے بعد اس کے اتر چکے تیری طرف اور بلا اپنے رب کی طرف اور مت ہو شریک والوں میں

**خلاصہ تفسیر:** اور جب اللہ کے احکام آپ پر نازل ہو چکے تو ایسا نہ ہونے پائے (جیسا اب تک بھی نہیں ہونے پایا) کہ یہ لوگ آپ کو ان احکام سے روک دیں اور آپ (بدستور) اپنے رب (کے دین) کی طرف (لوگوں کو) بلاتے رہئے اور (جس طرح اب تک مشرکوں سے کوئی تعلق نہیں رہا، اسی طرح آئندہ ہمیشہ) ان مشرکوں میں شامل نہ ہوجایے۔

* * *

**فائدہ:** یعنی دین کے کام میں اپنی قوم کی خاطر اور رعایت نہ کیجئے اور نہ آپ کو ان میں گنیے گو کہ اپنے قرابت دار ہوں۔ ہاں ان کو اپنے رب کی طرف بلاتے رہیے اور خدا کے احکام پر جمے رہیے۔

وَلَا تَدْعُ مَعَ ٱللَّهِ إِلَٰهًا ءَاخَرَ ۘ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ كُلُّ شَىْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُۥ ۚ وقف لازم

اور مت پکار اللہ کے سوائے دوسرا حاکم ۱؎ کسی کی بندگی نہیں اس کے سوائے ہر چیز فنا ہے مگر اس کا منہ ۲؎

لَهُ ٱلْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٨٨﴾ ع ۹ الثلثة ۱۲

اس کا حکم ہے اور اسی کی طرف پھر جاؤ گے ۳؎

**خلاصہ تفسیر**: اور (جس طرح اب تک شرک سے معصوم ہیں اسی طرح آئندہ بھی) اللہ کے ساتھ کسی معبود کو نہ پکارنا (یہاں تک رسالت کے متعلق مضمون قصداً تھا، اگرچہ توحید کا ذکر بھی ضمن میں آ گیا، اب آگے توحید کا مضمون قصداً ہے کہ) اس کے سوا کوئی معبود (ہونے کے قابل) نہیں (اس لئے کہ) سب چیزیں فنا ہونے والی ہیں بجز اس کی ذات کے (پس اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہ ٹھہرا، یہ مضمون توحید کا ہو گیا، آگے آخرت کا مضمون ہے کہ) اسی کی حکومت ہے (جس کا کامل ظہور قیامت میں ہے) اور اسی کے پاس تم سب کو جانا ہے (پس سب کو ان کے کئے کی جزا دے گا، آخرت کا مضمون بھی ختم ہو گیا، اور شاید یہاں رسالت کا مضمون ذرا زیادہ اس لیے بیان ہوا کہ اس کے ماننے سے بقیہ دونوں مسئلے یعنی توحید و آخرت بآسانی مان لیے جاتے اس لیے رسالت کے بیان کا زیادہ اہتمام ہوا ہو)۔

**وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ** مذکورہ بالا تین آیتوں میں کفار ومشرکین کو ان کی درخواستوں سے ناامید کرنا منظور ہے اور مقصود ان ہی کو سنانا ہے کہ تم جو حضور ﷺ سے اپنے دین میں موافق ہونے کی درخواست کرتے ہو اس کی کامیابی کا کبھی احتمال نہیں مگر عادت ہے کہ جس پر زیادہ غصہ ہوا کرتا ہے اس سے بات نہیں کیا کرتے، اپنے محبوب سے باتیں کر کے اس کو سنایا کرتے ہیں، اسی لیے اس کلام کو اس عنوان سے شروع کیا کہ آپ کو خود بھی یہ توقع نہ تھی کہ آپ پر یہ کتاب نازل ہوگی، مگر محض آپ کے رب کی مہربانی سے یہ نزول ہوا تا کہ اشارہ ہو جائے کہ جو شخص خداداد طور پر خدا تعالیٰ کی رحمت سے نبوت کے ساتھ نواز ا گیا ہو وہ کب کافروں کا موافق ہوگا اور خدا تعالیٰ کے احکام کی تعمیل سے کیسے دور ہوگا، جب وہ خود دوسروں کو حق کی طرف بلاتا ہے تو خود کیسے مشرک بن جائے گا اور اس توجیہ کی تائید ابن عباسؓ کے اس قول سے ہوتی ہے جو معالم میں ہے کہ یہ خطاب صرف ظاہر میں آپ کو ہے اور مقصود آپ نہیں ہیں۔

**كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ** فنا اور معدوم ہو جانا قدیم نہ ہونے کی دلیل ہے اور قدیم نہ ہونے سے یہ لازم آیا کہ ان کا وجود ہمیشہ ضروری نہیں، اور معبود ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ اس کا وجود ہمیشہ ضروری ہو، اور شرط فوت ہونے سے مشروط بھی فوت ہو جاتا ہے، پس اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہ ٹھہرا، اور جن روایتوں میں جنت ودوزخ، عرش وکرسی کا فنا نہ ہونا آیا ہے اگر وہ صحیح سند سے ثابت ہو جائیں تب بھی اس دلیل کے صحیح ہونے میں کوئی اشکال نہیں، کیونکہ فنا ذات وصفات دونوں کو شامل ہے، اور بجز ایک ذات منزہ کے سب کے صفات بدلتے ہیں، اس سے کوئی خالی نہیں، اور جس کے صفات فنا ہو جائیں وہ حادث ہوتا ہے، اور حادث کا وجود ہمیشہ ضروری نہیں ہوتا، پس اب بھی استدلال عام رہا۔

روح المعانی میں ہے کہ ذات حق کے علاوہ ہر موجود ھالك یعنی معدوم ہے، کیونکہ ھالك اسم فاعل ہے جس کے معنی یہ نہیں کہ آئندہ کسی زمانہ میں ہلاکت طاری ہوگی، بلکہ مراد یہ ہے کہ عملی فنا ہر موجود پر مستقلا طاری رہتا ہے اور اس کا تحقق اسی صورت میں ممکن ہے کہ ھالك کو کالھالك اور معدوم کو کالمعدوم کے معنی میں لیا جائے اور مراد یہ سمجھی جائے کہ موجودات کا وجود ذاتی اور مستقل نہ ہونے کے سبب ہر وقت قابل عدم ہے اور ان کا وجود، لاوجود جیسا ہے، اور وحدۃ الوجود کا حاصل بھی یہی ہے، مذکورہ آیت اس مسئلہ پر روشنی ڈالتی ہے۔

* * *

**فائدہ**: ۱یہ آپ ﷺ کو خطاب کر کے دوسروں کو سنایا، اوپر کی آیتوں میں بھی بعض مفسرین ایسا ہی لکھتے ہیں۔

**فائدہ**: ۲یعنی ہر چیز اپنی ذات سے معدوم ہے اور تقریباً تمام چیزوں کو فنا ہونا ہے، خواہ کبھی ہو، مگر اس کا منہ یعنی وہ آپ نہ کبھی معدوم تھا، نہ کبھی فنا ہو سکتا ہے، سچ ہے: "اَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَاخَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ"، قال تعالیٰ: **كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ** (الرحمٰن: ۲۶-۲۷) اور بعض سلف نے اس کا یہ مطلب لیا ہے کہ سارے کام مٹ جانے والے اور فنا ہو جانے والے ہیں بجز اس کام کے جو خالصۃً بوجہ اللہ کیا جائے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

**فائدہ**: ۳یعنی سب کو اس کی عدالت میں حاضر ہونا ہے جہاں تنہا اسی کا حکم چلے گا، صورۃً وظاہراً بھی کسی کا حکم واقتدار باقی نہ رہے گا، اے اللہ اس وقت اس گنہگار بندہ پر رحم فرمایئے اور اپنے غضب سے پناہ دیجئے۔

# یادداشت

Banuri
بنوری